تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبدالدائم جلالی

دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان ۲۱۳۷۶۸

تفسیر مظہری

جلد اوّل

سورۂ بقرہ

پارہ ۱ و پارہ ۲

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبد الدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دار الاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ —— فون ۲۱۳۷۶۸

marfat.com

کاپی رائٹ رجسٹریشن نمبر
اس ترجمہ وکمپوزنگ کے حقوق ملکیت پاکستان میں بحق دارالاشاعت کراچی محفوظ ہیں۔

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی
طباعت : ۱۹۹۹ء شکیل پریس کراچی۔
ضخامت : صفحات در ۶ جلد

﴿......ملنے کے پتے......﴾

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 26- نابھ روڈ لاہور
کشمیر بک ڈپو۔ چینوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور

marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ کئی ماہ کی کوشش کے بعد دارالاشاعت کراچی کی جانب سے تفسیر مظہری اردو کا ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

میرے والد ماجد جناب الحاج محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں اشاعت دین کے پیش نظر قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، سیرت و تاریخ کی متعدد گرانقدر کتب کی طباعت کی خدمات انجام دی وہاں ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ تفسیر مظہری کی طباعت و اشاعت کا شرف بھی حاصل کریں کیونکہ حضرت قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی ؒ نے اس تفسیر میں ایک خاص طرز یہ بھی اختیار فرمایا کہ مسلک کے اعتبار سے احناف اور شافعی مسلک کے نظریاتی اختلافات بھی واضح فرمائے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ احناف کا اس سلسلے میں کیا مقام ہے۔ اس وجہ سے اس کی افادیت اور بھی بہت بڑھ گئی ہے، نیز مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف قرآن و حدیث اور فقہ میں اپنے وقت کے نامور علماء میں شامل تھے تو دوسری طرف باطنی علوم اور تزکیہء سلوک میں بھی شیخ وقت سمجھے جاتے تھے، شاید اسی وجہ سے یہ تفسیر تمام دینی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی ہے۔

اس تفسیر کا اردو ترجمہ مولانا سید عبدالدائم جلالی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوۃ المصنفین دہلی کے زیر اہتمام فرمایا تھا، لیکن یہ تفسیر اب تک عوام کو بسہولت دستیاب نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم نے (حسب اجازت حکومت سندھ پاکستان
DPR (NO /2/PB/91.213.24.3.1991) سے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

حتی الامکان اس کی اشاعت میں کوشش کی ہے کہ اغلاط نہ رہ جائیں، لیکن پھر بھی تمام حضرات سے درخواست ہے کہ کوئی غلطی نظر آئے تو ادارے کو مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو شرف قبولیت سے نوازیں اور دنیا و آخرت کے لئے نافع بنائیں، آمین

طالب دعا خلیل اشرف عثمانی
ولد محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نوٹ:- پہلے یہ تفسیر ہاتھ کی کتابت اور لیتھو طریقہ طباعت پر دستیاب تھی اب الحمدللہ کمپیوٹر کی عمدہ کتابت اور آفسٹ طریقہ طباعت کے ساتھ اور آیات کے نمبر کے ساتھ اور عنوان کے مقامات کو انڈر لائن کر کے پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین

marfat.com

تفسیر مظہری اور اس کے مصنف

قرآن کریم بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وہ آخری کتاب ہے جو رہتی دنیا تک مشعل راہ اور ہدایت کا سامان ہے، یہ وہ کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ اور نقطہ محفوظ اور اس کا ایک ایک جملہ دریا بکوزہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا پڑھنا اتنا آسان کہ دنیا کے ہر خطے میں دس بارہ سال کے معصوم بچے بآسانی پورے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے ہیں، اس کی تعلیمات اتنی ہمہ گیر کہ جن کی مثال کہیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی، اس کے احکام اس قدر مستحکم کہ صدیوں پر صدیاں گزرنے کے باوجود ان کی حقانیت روز بروز مسلّم ہوتی جاتی ہے، اس کے الفاظ اتنے جامع کہ مفسرین و محققین اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کے معانی و مفاہیم کو اپنے قابو میں لانے سے عاجز نظر آتے ہیں۔ یہ وہ کلام اللہ ہے جسے خالق دو جہاں نے خاتم النبیین سیدنا احمد مصطفیٰ محمد مجتبیٰ ﷺ پر تیئس سال میں نازل فرمایا اور دنیا بھر کے تمام فصیح و بلیغ انسانوں کو اس کے مقابلے کا چیلنج دے کر اسے ہمیشہ کے لئے معجزہ بنا دیا۔

قرآن مجید کا اعجاز اس کے الفاظ میں بھی ہے اور اس کے معانی میں بھی، الفاظ کی بندش، نشست و برخاست، روانی و تسلسل، شوکت و دبدبہ کے ساتھ لطافت و حلاوت کا حیران کن امتزاج، صوتی تاثرات کی ہم آہنگی اور دلوں پر بجلی کی طرح گرنے والی تاثیر، حسن تلاوت اور حسن استماع کی ناقابل بیان خوبصورت کیفیات، آفتاب قرانی کی چند کرنیں ہیں جن سے اعجاز قرآنی کی کچھ جھلک نمودار ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ معانی کی سحر آفرینی، اس کی ہمہ گیری وسعت، انسانی زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واضح ہدایات، انباء الغیب کی منہ بولتی صداقت، ترغیب اور ترہیب کی دلوں پر غیر معمولی تاثیر، آفاقی رہنما اصول اور ان کی صداقت، معانی کے اعجاز کی وہ چند پنکھڑیاں ہیں جن سے قرآن کا معجزہ ہونا کھلی آنکھوں نظر آتا ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ ہر انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں مگر ان کی ذات وصفات کا مکمل ادراک، محدود انسانی عقل کے بس سے باہر ہے، اسی طرح اللہ کے کلام کا پڑھنا آسان، اسے یاد کرنا آسان، اس سے نصیحت حاصل کرنا اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا آسان، مگر اس کے معانی و مطالب کا مکمل استیعاب اور اس کے جملہ پہلوؤں کا زبان و قلم سے احاطہ کر لینا اسی طرح ناممکن ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی دیگر صفات کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

رحمت عالم حضور اقدس ﷺ نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعے سے نہ صرف قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر کی بلکہ آپ کی ذات اقدس قرآن مجید کا عملی نمونہ تھا اور آپ کی احادیث طیبہ قرآن حکیم کی مکمل تفسیر علم و عمل کی یہ تفسیر اور اس کا نمونہ پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور اس کے بعد تابعین رحمہم اللہ کی عملی زندگی اور ان کے اقوال کی شکل میں منتقل ہوا اور پھر اس مقصد کے لئے بے شمار مفسرین نے تفاسیر لکھیں جن میں کلام خداوندی کے معانی و مفاہیم کو اجاگر کر کے لوگوں کے لئے راہ عمل کو آسان بنایا گیا، ان میں ہر طرح کی تفاسیر تھیں مختصر بھی طویل بھی، یہ تفاسیر مختلف ادوار میں مختلف مفسرین اپنے اپنے ذوق علمی کے پیش نظر تحریر کرتے رہے اور خدمت قرآن کی سعادت حاصل کرتے رہے، مگر ان سب میں صرف وہ تفاسیر ممتاز رہیں جنہیں قبولیت عامہ نصیب ہوئی اور جن پر جمہور اہل سنت والجماعت نے بھرپور اعتماد کیا انہیں تفاسیر میں سے ایک تفسیر "تفسیر مظہری" ہے۔ جس کا ترجمہ شائع کرنے کی سعادت دارالاشاعت کو حاصل ہو رہی ہے۔

مصنف: اس تفسیر کے مصنف علامہ قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ مشائخ چشت کے مشہور بزرگ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس سرہٗ کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا سلسلہ نصب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے جس کی وجہ سے انہیں عثمانی بھی لکھا جاتا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پت میں پیدا ہوئے وہیں قرآن مجید حفظ کر کے ابتدائی درجات کی دینی تعلیم مکمل کی جس کے بعد دہلی جا کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ جیسی جلیل القدر شخصیت سے حدیث کا باقاعدہ علم حاصل کیا، اٹھارہ سال کی عمر میں

marfat.com

تحصیل علوم سے فارغ ہو کر تزکیہ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اولاً شیخ محمد عابد سنامیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مدارج طے کئے۔ ان کی وفات کے بعد اس وقت کے نامور ولی اللہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ (۱۱۹۵ھ) کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور ان کے نامور خلفاء میں شامل ہوئے، حضرت میرزا مظہر جان جاناںؒ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے کسی تحفے کا مطالبہ فرمائیں تو میں ثناء اللہ کو پیش کردوں گا، یہ بھی فرماتے تھے کہ ثناء اللہ کی دیانت و تقویٰ اور ان کی نیکی کی وجہ سے میرے دل پر ہیبت رہتی ہے، یہ پیشین گوئی بھی فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان سے ترویج شریعت اور اظہار طریقت کا کام لیں گے، یہی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے حضرت میرزا صاحب قدس سرہٗ نے اپنے اس چہیتے خلیفہ کا لقب "علم الہدیٰ" رکھا ہوا تھا۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف لکھتے ہیں کہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے علم و تدبر اور فقہ و حدیث میں مہارت کی وجہ سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے انہیں بیہقی کا خطاب دیا ہوا تھا۔

آپ کے پیر بھائی شیخ غلام علی دہلویؒ (۱۲۴۰ھ) اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ قاضی ثناء اللہ تقویٰ و تدین کے اندر اپنے دور میں اپنی مثال آپ تھے، دن بھر میں درس و تدریس، وعظ و تصنیف، مراقبہ و اشغال، ذکر و اذکار کے علاوہ سو رکعت نوافل اور قرآن مجید کی سات منزلوں میں سے روزانہ ایک منزل کا معمول تھا، خداداد ذہانت اور سلامت طبع ان کا خاص وصف تھا۔

تلامذہ اور مسترشدین کی کثیر تعداد کے علاوہ مختلف موضوعات پر وقیع دینی تصانیف حضرت قاری صاحبؒ اپنے بعد بطور صدقہ جاریہ چھوڑ کر گئے، تفسیر میں "تفسیر مظہری" سات جلدوں میں اور حدیث میں "کتاب مبسوط" دو جلدوں میں تحریر کی، فقہ حنفی میں مشہور درسی کتاب "مالابد منہ" ان ہی کی تحریر کردہ ہے، تردید شیعہ میں "السیف المسلول"، "تصوف و سلوک میں"، "ارشاد الطالبین"، "تذکرہ الموتیٰ والقبور"، "تذکرۃ المعاد" اور "حقیقت الاسلام" ان کی معروف تصانیف ہیں، ان کے علاوہ موسیقی کی حرمت، متعہ کی حرمت اور حشر و خراج کے احکام پر ان کے رسائل بھی مفید خواص و عام رہے ہیں، حضرت قاضی صاحب کا انتقال یکم رجب ۱۲۲۵ھ کو پانی پت میں ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

تفسیر مظہری: حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں سب سے نمایاں حیثیت ان کی تفسیر مظہری کو حاصل ہے جسے انہوں نے عربی زبان میں سات بڑی جلدوں میں تحریر کیا اور اپنے مربی و شیخ حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کے نام پر اس کا نام "مظہری" رکھا اس تفسیر کو منجانب اللہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی، عربی میں تو اس سے استفادہ ہوتا ہی رہا، اردو ترجمہ کے بعد اس کا افادہ اور عام ہوگیا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم (فرزند ارجمند حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ) دور حاضر کی مقبول و معروف تفسیر معارف القرآن کے مقدمے میں رقم طراز ہیں۔

> "تفسیر مظہری علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی تصنیف ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انہوں نے الفاظ کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔"
> (معارف القرآن اول صفحہ ۵۸ جلد ۱)

امید ہے کہ دارالاشاعت کے زیر اہتمام چھپنے والا تفسیر مظہری کا یہ نیا ایڈیشن انشاء اللہ عوام و خواص میں مقبول ہوگا اور قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین۔

احقر محمود اشرف عفی عنہ،

استاد دارالعلوم کورنگی کراچی

marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست عنوانات

تفسیر مظہری اردو پارہ الٓمّٓ وسیقول

عنوان	صفحہ
(سورۂ فاتحہ)	
وجہ تسمیہ و اسماء و آیات سورۂ فاتحہ اور وہ کہاں اور کب اور	۲۱
کہاں سے نازل ہوئی اور یہ بیماری کیلئے شفا ہے۔	〃
بسم اللہ اور اس کو لکھنے کا قاعدہ	〃
ہر بڑا کام بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا جائے	〃
اللہ، الرحمٰن، الرحیم کی تحقیق اور یہ کہ بسم اللہ کسی سورت یا	۲۲
قرآن کریم کا جزو ہے یا نہیں۔	〃
نماز میں بسم اللہ کو بلند آواز سے نہ پڑھنا	〃
ذکر الحمد و بیان رب و تحقیق عالم	۲۳
قواعد قرأت	۲۴
بیان اتباع سنت	۲۸
غیر المغضوب علیہم الخ سے کون لوگ مراد ہیں اور	
قاضی صاحبؒ کی تحقیق، فضائل سورۂ فاتحہ	۲۹
ذکر نزول سورۂ بقرہ اور اس کے آیات اور کلمات و حروف کی	۳۱
تعداد، تحقیق مقطعات کی روایات۔	〃
اقسام حروف اور یہ کہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور رسول	۳۳
میں راز کی باتیں ہیں۔	
حضرت مجدد صاحبؒ کا ارشاد کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قرآنی	۳۴
مقطعات اور اس کے اسرار کی تاویل ظاہر فرمادی ہے۔	
دعا حضور نبی کریم ﷺ	۳۵
متقی کی تعریف اور تقویٰ کے درجے	۳۷
حدیث: حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے	۳۸
ایمان کے لغوی و شرعی معنی	۴۰

عنوان	صفحہ
حدیث جبرائیل علیہ السلام و ذکر اسلام و زکوٰۃ و روزہ و	
رمضان و حج و احسان و علامات قیامت)	۴۰
ذکر غیوبات خمسہ یعنی پانچ اشیاء کا علم بجز خدا تعالیٰ کے کسی	
کو نہیں۔	〃
اسلام کی تعریف	〃
نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر اور بلا دیکھے ایمان لانے کا ذکر،	〃
کن تین اشخاص کو دوہرا اجر ملتا ہے	۴۱
مسئلہ مد منفصل و متصل و لازم	〃
دنیا و آخرت و یقین کی تحقیق	۴۲
شکل و مقام قلب و ذکر حواس خمسہ	۴۵
حدیث: تمام بنی آدم کے دل خدائے تعالیٰ کی دو انگلیوں میں	〃
حدیث: جب مؤمن گناہ کرتا ہے تو ایک چھوٹا سا سیاہ نقطہ	〃
اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔	
حدیث: جو لوگوں سے ٹھٹھا کرتے ہیں ان میں سے ایک	
کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔	۵۱
آیت مثلهم	۵۲
بارش آسمان سے برستی ہے یا ابر سے	۵۳
تمام اسباب کی تاثیر حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ہی چاہنے سے	۵۴
ہے لفظ شئی باری تعالیٰ کو بھی شامل ہے۔	
حدیث: جب اللہ تعالیٰ نے جنت پیدا کی تو حضرت جبرائیلؑ	۵۵
کو حکم ہوا کہ جاؤ دیکھو الخ	
بیان وجہ دو مثالوں کی منافقین کے واسطے جیسا کہ سلف نے	〃
مقرر کیا ہے اور جو کچھ مجھ کو معلوم ہوا ہے۔	

marfat.com

عنوان	صفحہ
حدیث: جماعت پر اللہ کا ہاتھ یعنی حفاظت ہے۔	۵۷
آیت یایہا الناس اعبدوا سے عبادت اور توحید کا واجب ہونا ایمان خوف اور امید دونوں کو مقتضی ہے۔	۵۹
آیت فاتوابسورہ سے قرآن پاک کا اعجاز اور رسول پر ایمان لانے کا وجوب۔	۶۱
آتش دوزخ اور اس کے ایندھن کا بیان	
عمل صالح کی تعریف	۶۳
جنت اور اسکی انتہا اور اس کی نہروں اور اس کے سامان کا ذکر	//
حدیث: اول جو گروہ جنت میں جائے گا الخ	۶۵
حدیث: اگر جنت کی کوئی عورت زمین پر جھانک بھی لے الخ	//
حدیث: جنتی سب کے سب بے رونگٹے بے ڈاڑھی سرمگیں ہوں گے الخ	//
حدیث: جنت میں ایک بازار ہوگا الخ	//
حدیث قدسی: میں نے اپنے بندوں کے لئے جنت میں ایسی ایسی نعمتیں تیار کی ہیں الخ	۶۶
حدیث: اللہ تعالیٰ جنت میں اہل جنت سے فرمائے گا الخ	//
حدیث: اللہ تعالیٰ اپنے اور جنتیوں کے درمیان سے حجاب اٹھائے گا۔	//
حدیث: سب سے کم درجہ کا جنتی	//
آیت: بیشک اللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیان کرنے میں ذرہ بھر بھی نہیں جھینپتا۔	//
اللہ تعالیٰ کو بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے حیا آتی ہے	۶۷
تم کیونکر خدا تعالیٰ کا انکار کر سکتے ہو الخ	۶۹
بیان عالم خلق و عالم امر	//
قبر میں ثواب وعذاب کا بیان	//
آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں	۷۰
حدیث: ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کا نام لے کر پکارتا ہے	//
آیت: تکالیف شرعیہ	//
ذکر پیدائش آسمان	۷۱
اہل ارصاد کا قول آسمانوں کے بارے میں اور شرع سے آسمانوں اور زمینوں کا ثبوت	۷۲
حدیث ابر اور آسمان وزمین اور انکی مسافت کا بیان الخ	۷۳

عنوان	صفحہ
عرش اور آسمان کروی ہیں۔	
قول صوفیہ کرام در بارۂ معیت اللہ تعالیٰ	۷۴
مؤمن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے	//
ذکر تجلیات باری تعالیٰ شانہ	//
ذکر آبادی فرشتوں کا آسمان پر اور جنوں کا زمین پر	۷۶
مٹی اور پہاڑوں اور درختوں اور امر مکروہ و نور و چوپاؤں وغیرہ کے پیدا ہونے کے دن	//
خلافت آدمؑ پر فرشتوں کا استبعاد	//
حدیث: کونسا کلام افضل ہے	//
حدیث: آدمی اپنے محبوب کے ساتھ ہے۔	//
حدیث قدسی: میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب طلب کرتا رہتا ہے۔	//
حدیث: اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدمؑ میں بیمار ہوا تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔	۷۸
صوفیائے کرام کا قول کہ تجلی ذاتی کو انسان ہی برداشت کر سکتا ہے۔	//
حضرت آدمؑ کی پیدائش تمام روئے زمین کی مٹی سے	//
قاضی صاحبؒ کی تحقیق کہ آدم علیہ السلام کو تمام روئے زمین کی مٹی سے کیوں پیدا کیا۔	//
خدا تعالیٰ نے انسان کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر فرمائی جب کہ فرشتوں نے پیدائش آدمؑ پر اعتراض کیا۔	//
اس میں اختلاف کہ آدمؑ کو کن کن چیزوں کے نام بتلائے گئے اور قاضی صاحبؒ کا فیصلہ	//
قاضی صاحبؒ اور دیگر مفسرین کی تحقیقات میں موافقت	۸۰
حدیث کنت نبیا وادم بین الروح والجسد	۸۱
ھؤلاء کی ہمزوں کی قرأت	//
فرشتوں نے جب اپنے عجز ونادانی اور بشر کی فضیلت کا اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بطور انعام آدمؑ کو فرمایا کہ تم کو جو علم دیا گیا فرشتوں کو سکھا دو۔	۸۲
ابلیس لعین کا حضرت آدمؑ پر گزرنا جب کہ ان کا جسد بلا روح مکہ اور طائف کے درمیان پڑا تھا۔	//
انبیاء علیہم السلام خاص فرشتوں سے افضل ہیں۔	//

عنوان	صفحہ
حدیث : مؤمن اللہ کے نزدیک بعض فرشتوں سے افضل ہے	۸۲
حدیث : حضرت آدمؑ کو جب پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا الخ	״
آخرت میں انسان ہی کو دیدار جناب باری تعالیٰ ہوگا۔	״
رؤیت جناب باری تعالیٰ پر اعتراض اور اس کا قاضی صاحبؒ کی طرف سے جواب	۸۳
فرشتوں کے علوم اور کمالات میں ترقی ہوتی ہے۔	״
فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرو	״
سجدہ سے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی معنی	״
حضرت آدمؑ کو کیوں سجدہ کرایا گیا	۸۴
حدیث : جس نے بندہ کا شکر ادا نہیں کیا اسنے خداوند تعالیٰ کا شکر نہیں ادا کیا۔	״
فرشتوں کے معصوم ہونے نہ ہونے کا ذکر	״
جنوں اور فرشتوں کی پیدائش کا ذکر	״
شیطان کے کفر کی وجہ	۸۵
حضرت حوا علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر	״
درخت کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ	״
وہ کون سا درخت تھا جس کے پاس جانے سے حضرت آدمؑ و حوا کو منع کیا تھا۔	״
شیطان کی وجہ تسمیہ۔	״
جب شیطان جنت سے نکالا گیا تو پھر کس طرح سے آدمؑ و حواؑ کو بہکانے کو جنت میں پہنچا اور کس طرح بہکایا۔	״
حضرت آدمؑ و حوا کے جنت سے نکلنے کی کیفیت	۸۶
حضرت حواؑ اور ان کی لڑکیوں پر اس لغزش کی وجہ سے کیا سزا تجویز ہوئی۔	״
بنی آدم اور سانپوں میں دشمنی پیدا ہوگئی۔	״
وہ کون سے کلمات تھے جن کو آدمؑ و حواؑ نے پڑھا اور توبہ قبول ہوئی	۸۷
کتنی مدت تک حضرت آدمؑ و حواؑ روتے رہے اور باہم ملاقات نہیں ہوئی۔	״
توبہ کے شرعی و لغوی معنی	״
جناب باری تعالیٰ کا دو مرتبہ یہ فرمانا کہ اتر جاؤ اور اسکی وجہ	״
لفظ ھدی کے مکرر فرمانے کی وجہ	۸۸
خوف اور حزن میں فرق	״

عنوان	صفحہ
قصہ آدم علیہ السلام سے تین امر معلوم ہوئے انکی تفصیل	۸۸
فرقۂ حشویہ کا استدلال کہ انبیاء علیہم السلام معصوم نہیں ہیں اور اس کی تردید	״
بنی اسرائیل کو خطاب کرنے کی وجہ اور لفظ اسرائیل کی تحقیق، ذکر دل سے یاد کرنے کو کہتے ہیں۔	۸۹
کون کون سی نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل کو عطا فرمائی گئی تھیں	״
آیت اوفوا بعھدی اوف بعھدکم میں عہد سے کیا مراد ہے	״
عہد کے متعلق علامہ بغوی "کی بحوالہ کلبی" تحقیق	״
قاضی صاحبؒ کی تحقیق دربارۂ لفظ عہد	۹۰
عہد کے متعلق جو اختلاف ہوا ہے اس میں قاضی صاحبؒ کا فیصلہ	״
آیت ولاتکونوا اول کافر بہ میں اول سے کون لوگ مراد ہیں اور اس پر اعتراض و جواب اور قاضی صاحبؒ کی تحقیق۔	۹۱
آیت ولا تشتروا بایاتی کا شان نزول	۹۲
فارھبون اور فاتقون فرمانے کی توجیہ	״
آیت ولاتلبسوا الحق بالباطل کس کے بارے میں نازل ہوئی	״
کفار اصول ایمان کی طرح کیا فروع ایمان کے بھی مکلف ہیں	۹۳
لفظ زکوٰۃ کی تحقیق	״
آیت وارکعوا مع الراکعین سے نماز باجماعت پڑھنے کی ترغیب	״
آیت اتامرون الناس کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کے شان نزول کی وجہ	״
عقل کے لغوی معنی	״
حدیث ان لوگوں کے بیان میں جو دوسروں کو نصیحت کریں اور خود عمل نہ کریں	״
غرض آیت اتامرون الناس سے واعظ لوگوں کو اپنے نفس کے اصلاح کرنیکا حکم ہے نہ وعظ سے روکنا	۹۶
عالم کا گناہ جاہل سے زیادہ برا ہے	״
آیت واستعینوا کو آیت اتامرون الناس کے بعد ذکر فرمانے کی وجہ	״
مراد صبر سے روزہ ہے	״
جب کوئی مصیبت پیش آتی تو آپ ﷺ نماز کی طرف توجہ فرماتے۔	״

marfat.com

عنوان	صفحہ
صلوٰۃ کے معنی اور صلوٰۃ الحاجات کا بیان	۹۴
ربیعہ کو نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے	۹۶
حدیث: سجدہ میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب ہوتا ہے	″
انبیاء علیہم السلام اور نیک بندوں کی شفاعت کا بیان	۹۷
آل کی تحقیق	″
فرعون کا نام اور لفظ فرعون کی تحقیق	۹۸
فرعون کا بنی اسرائیل کو عذاب دینا ان کے بیٹوں کا قتل کرانا	″
اور لڑکیوں کو زندہ رکھنا اور اس کی وجہ	″
قبطیوں کی فرعون سے شکایت جب بنی اسرائیل نوے ہزار	″
تک قتل ہو چکے	
لفظ بلاء کی تحقیق	″
بنی اسرائیل کا فرعون سے نجات پانا اور فرعون کا ڈوب جانا	۱۰۰
قصہ: موسیٰ علیہ السلام کا طور کی طرف تشریف لیجانا اور	۱۰۱
تورات کا لانا اور پیچھے بنی اسرائیل کا گوسالہ کی عبادت کرنا۔	
لفظ عفو کی تحقیق	
شکر سے کیا مراد ہے اور شکر کن اعضاء سے ادا ہوتا ہے	۱۰۲
شکر کے بارے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ	″
لفظ فرقان سے کیا مراد ہے	″
بنی اسرائیل نے جب گوسالہ پرستی کی تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو کیا حکم دیا۔	″
بنی اسرائیل کی توبہ کیونکر قبول ہوئی۔	″
نقل: بنی اسرائیل کا قصہ اور یہ قتل اللہ تعالیٰ کے نزدیک	۱۰۳
بہتر اور بہتر ہونے کی وجہ۔	″
قصہ بنی اسرائیل کی گستاخی اور بیہودہ سوال پر ان کا مر جانا اور	۱۰۴
پھر موسیٰ کی دعا سے زندہ ہونا اور ابر کا مقام تیہ میں ان پر	
سایہ کرنا اور آسمان سے من و سلویٰ اترنا۔	
من اور سلویٰ سے کیا مراد ہے؟	۱۰۵
لفظ خطایا کی اصل اور تحقیق	۱۰۶
بنی اسرائیل کی نافرمانی اور ان پر رجز کا عذاب	″
رجز سے کیا مراد ہے اور اس کے لغوی معنی	″
موسیٰ کا مقام تیہ میں اپنی قوم کے واسطے پانی طلب کرنا	۱۰۷
وہ پتھر کون سا تھا جس میں حضرت موسیٰ نے عصا مارا	″
بنی اسرائیل کا من و سلویٰ کی جگہ مسور اور پیاز طلب کرنا	۱۰۸

عنوان	صفحہ
یہود پر ذلت و غضب الٰہی کی وجہ	۱۰۹
ان الذین امنوا اور من امن منہم سے کون لوگ مراد ہیں	۱۱۰
من امن منہم سے قاضی صاحبؒ نے کون سے لوگ	″
مراد لئے ہیں۔	
تم میں سے کوئی مؤمن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے	″
نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور پیارا نہ ہوں	″
بندہ ایمان کی حقیقت کو نہیں پہنچتا جب تک کہ اپنی زبان کو	″
محفوظ نہ کرے۔	″
آیت واذاخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم کا شان نزول	۱۱۱
یہودیوں کی آزمائش کا ذکر	″
واقعہ ذبح بقرہ	۱۱۳
گائے کے اوصاف کے متعلق بنی اسرائیل کے سوالات	″
مطلق سے مقید مراد لینے نہ لینے کی بحث	۱۱۴
جملہ حوادث اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہیں	۱۱۶
معتزلہ اور کرامیہ کا مذہب اور اہل سنت والجماعت کی طرف	″
سے جواب	
گائے میں اتنی شرطیں لگانے کی وجہ	۱۱۷
طالب کو چاہئے کہ خداوند تعالیٰ کی راہ میں عمدہ اور قیمت	″
میں گراں چیز صرف کر کے قربت حاصل کرے	″
حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین سو اشرفی کی اونٹنی	″
اللہ کی راہ میں قربان کی	″
بعض بنی آدم کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں	۱۱۸
مسئلہ اہل سنت والجماعت کا مذہب، جمادات و حیوانات کی	″
تسبیح اور ان میں خوف الٰہی کے متعلق۔	
پتھر اور درختوں کے نبی کریم ﷺ کو السلام علیکم کرنے کے	۱۱۹
بارے میں جو احادیث آئی ہیں	
حدیث احد: پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے۔	″
پہاڑ وغیرہ کا آپ سے کلام کرنا اور ستون کا گریہ وزاری کرنا	″
رسول اللہ ﷺ کو منافقین کے ایمان لانے سے ناامید کر دینا	″
یہودیوں کے قبائح اور خباثتوں کا ذکر	۱۲۰
لفظ امانی کے معنی اور تحقیق	۱۲۲
لفظ ویل کی تحقیق کہ اس سے کیا مراد ہے	″

marfat.com

عنوان	صفحہ
حدیث: ویل جہنم میں ایک جنگل کا نام ہے اور صعود جہنم میں ایک آگ کا پہاڑ ہے۔	١٢٢
آیت ثم یقولون ھذامن عنداللہ کے متعلق قصہ	〃
دنیا کی مدت یہودیوں کے نزدیک سات ہزار سال کی ہے	١٢٣
آیت الاایاما معدودات سے کتنے روز یہود نے مراد لئے ہیں	〃
آیت واحاطت بہ خطیئتہ سے کیا مراد ہے	١٢٤
بنی اسرائیل سے کن کن باتوں کا عہد لیا گیا	〃
بنی اسرائیل سے جو عہد جناب باری تعالیٰ نے لیا تھا اس کا قصہ	١٢٦
جب عہد کو بنی اسرائیل نے توڑ دیا تو کیا سزا تجویز ہوئی	١٢٧
موسیٰ کے بعد کون کون انبیاء علیہم السلام تشریف لائے	〃
روح القدس سے کیا مراد ہے	١٢٨
شیطان کا اولاد آدمؑ کو پیدا ہوتے وقت مس کرنا	〃
آیت افکلما جاءکم رسول الخ کیوں نازل ہوئی	〃
یہود کا انبیاء علیہم السلام کی تکذیب اور ان کو قتل کرنا	١٢٩
حدیث: رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا	〃
یہودیہ کا گوشت میں زہر ملا کر آپ کو کھلادینا	〃
غلف کے معنی اور اس کی قرأت	١٣٠
حدیث: ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے	〃
نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل یہودیوں کی جہالت	١٣١
بغی کے معنی اور باغی کس کو کہتے ہیں	〃
لفظ وراء کی تحقیق	١٣٢
قد کی دال کا ادغام نو حرفوں میں	١٣٣
مؤمن کا تحفہ موت ہے	١٣٤
حدیث: موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملادیتا ہے	〃
حدیث: اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو فوراً سب اپنے آپ مرجاتے	١٣٥
مسئلہ: موت کی تمنا کرنا جائز ہے یا نہیں	〃
جب چھ باتیں پائی جائیں موت کی تمنا کیا کرو	〃
ذوالنون مصری کا قول شوق کے بارے میں	١٣٦
مرض موت میں رسول اللہ ﷺ کی دعا	〃
حضرت ابراہیمؑ کا ملک الموت سے مرض الموت میں گفتگو کرنا	〃

عنوان	صفحہ
موت کی تمنا میں قاضی صاحبؒ کا فیصلہ	١٣٧
حدیث جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات چاہتا ہے	〃
قل من کان عدوا لجبریل الخ کے شان نزول میں	١٣٩
اختلاف اور قاضی صاحبؒ کا فیصلہ	١٤١
فرشتوں اور رسولوں سے دشمنی کرنا کفر ہے	〃
آیت اوکلما عاھدوا عھدا میں عہد سے کیا مراد ہے	١٤٢
آیت ولما جاء ھم رسول میں رسول سے کون رسول مراد ہیں؟	
قصہ شیطان کے سلیمانؑ کو ساحر مشہور کرانے کا	١٤٣
سحر کی حقیقت، اور سحر کفر ہے یا نہیں	١٤٤
جادو کے ذریعہ کسی کو مار ڈالنے کا حکم	〃
اس شخص کا حکم جو دعا اور سیفی اور عملیات سے کسی کو مار ڈالے	〃
ہاروت وماروت کے قصہ میں ابن عباسؓ سے روایت	١٤٦
منجانب قاضی صاحبؒ قصہ ہاروت وماروت کی تضعیف	〃
قول علامہ بیضاویؒ کہ یہ قصہ یہود سے لیا گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ پہلے لوگوں کے اشارات سے ہو اور قاضی صاحبؒ کی طرف سے اس کا حل تصوف کے اعتبار سے	١٤٧
علم کی تقسیم	〃
علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں	١٤٨
قصہ شان نزول آیت یاایھا الذین امنوا لاتقولوا راعنا	١٤٩
شان نزول مایود الذین کفروا الخ اور فضل کے معنی	١٥٠
شان نزول ماننسخ اور نسخ کے معنی	〃
حکم منسوخ کی اقسام اور یہ کہ نسخ کس چیز میں ہوتا ہے	〃
لفظ ننسھا کے معنی اور قرأت کا اختلاف	〃
حدیث: چند صحابہؓ نماز کو کھڑے ہوئے اور سورت پڑھنی چاہی یاد نہ آئی	١٥١
آیت ماننسخ الخ سے مسائل کا استنباط	〃
ولی اور نصیر میں فرق اور ولی کے معنی	〃
آیت ام تریدون ان تسئلو الخ کا شان نزول	〃
ودکثیر من اھل الکتاب کا شان نزول	١٥٤
ذکر آیت وقالوا لن یدخل الجنۃ الخ	〃
شان نزول آیت وقالت الیہود لیست النصاریٰ کا	١٥٥

marfat.com

عنوان	صفحہ
شان نزول ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ کا	۱۵۵
ممن منع مساجد اللہ کے متعلق قصہ	″
رسول اللہ ﷺ کا سواری پر نفل نماز پڑھنا	۱۵۶
شان نزول وللہ المشرق والمغرب کا	″
اندھیری رات میں نماز پڑھنا اور قبلہ معلوم نہ ہو	″
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول نماز کی صفت میں	۱۵۷
حدیث کذبنی ابن آدم الخ کے متعلق	″
قنوت کے معنی	″
قضا کے معنی اور قول فعل دونوں میں استعمال ہوتا ہے	۱۵۸
آیت کن فیکون اور اس میں چند بحثیں	″
صوفیہ کرام کا قول کہ ممکن کے لئے دو وجود ہیں	۱۵۹
آیت ولا تسئل عن اصحاب الجحیم کا شان نزول	۱۶۰
آیت ولن ترضیٰ عنک الیھود کا شان نزول	″
آیت الذین آتینا ھم الکتاب کا شان نزول	۱۶۱
لفظ ابراہیم کی قرأت کے بیان میں	۱۶۲
آیت واذابتلی ابراھیم ربہ بکلمات سے کون کلمات مراد ہیں	۱۶۳
آیت انی جاعلک للناس اماما میں امام سے مراد نبوت ہے	۱۶۴
فاسق کی امامت کے متعلق گفتگو	″
حدیث: خالق کی نافرمانی کی صورت میں مخلوق کی تابعداری جائز نہیں	″
حدیث: مسجد حرام کی ایک نماز کی فضیلت	۱۶۵
خانہ کعبہ امن کی جگہ کیوں ہے اور اس کی حرمت کا بیان	″
مقام ابراہیم سے کیا مراد ہے؟	″
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان کہ میری رائے میرے رب سے تین باتوں میں موافق آگئی	″
طواف کے بعد کی دو رکعتوں کے وجوب پر امام صاحبؒ کا استدلال	۱۶۶
اسماعیلؑ وہاجرہؑ کو مکہ چھوڑ آنے اور بیت اللہ کی تعمیر کا واقعہ	۱۶۷
حدیث: حجر اسود اور مقام ابراہیم دونوں جنت کے یاقوت ہیں	۱۶۸
دعائے ابراہیمؑ بابت مکہ معظمہ	″
طائف کے ذکر میں	″
اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی کیا حقیقت ہے	۱۶۹
ایک شبہ اور اس کا جواب	″

عنوان	صفحہ
دنیا اور جو کچھ اس میں ہے ملعون ہے الخ	۱۶۹
مجاہد رضی اللہ عنہ کا قول بابت مکہ معظمہ	″
خانہ کعبہ کی ابتداء اور اس کے بنانے کا ذکر	۱۷۰
حدیث: صحیح اور کامل مسلمان کی پہچان	۱۷۱
عرفہ کی وجہ تسمیہ	″
حدیث: میں نبی تھا جبکہ آدمؑ پانی اور مٹی میں تھے	″
میں اپنی ابتدا کی خبر تم کو دیتا ہوں	″
حکمت سے کیا مراد ہے	۱۷۲
لفظ عزیز کے معنی	″
شان نزول آیت ومن یرغب الخ	″
لفظ سفہ کے معنی اور من سفہ نفسہ کی تفسیر	″
صلاحیت کا کمال عصمت ہے۔	۱۷۳
لفظ اسلم کی تفسیر جو کلبیؒ نے فرمائی ہے	″
جب ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تو جبرئیلؑ تشریف لائے	۱۷۴
وصیت کے لغوی معنی	″
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔	″
آیت فلا تموتن الا وانتم مسلمون کی تفسیر	″
شان نزول آیت ام کنتم شھداء الخ	″
پیغمبر کو موت سے پہلے اختیار دیا جاتا ہے	″
حدیث: آدمی کا چچا مثل باپ کے ہے	″
تلک امۃ میں امت سے مراد کیا ہے	۱۷۵
آیت قالوا کونوا ھودا او نصاریٰ کا شان نزول	۱۷۶
لفظ حنیف کے معنی	″
حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا ذکر	″
لفظ اسباط سے کیا مراد ہے	″
حدیث دنیا اور آخرت میں عیسیٰ علیہ السلام سے مجھے زیادہ تعلق ہے	۱۷۷
تمام انبیاء بھائی بھائی ہیں الخ	″
صبغۃ اللہ سے کیا مراد ہے اور اس کا شان نزول	″
اخلاص کے متعلق سعید بن جبیرؒ کا قول	″
شہادت کو چھپانے والے کے لئے وعید	۱۷۹

marfat.com

پارہ سیقول ۲

عنوان	صفحہ
سفہاء سے کیا مراد ہے؟	۱۸۰
عن قبلتہم سے کیا مراد ہے اور اس خبر میں کیا فائدہ اور نکتہ ہے	″
قبلہ کی وجہ تسمیہ اور آیت سیقول السفہاء کا شان نزول	″
استقبال قبلہ عبادت ہے	″
صراط مستقیم سے کون سا راستہ مراد ہے	″
وسط کے معنی کے بیان میں حدیث شریف	۱۸۱
وسط کے معنی لغوی اور اس امت مرحومہ کو وسط کیوں فرمایا	″
اس آیت سے علماء نے اجماع امت کو حجت اور دلیل مانا ہے	″
امت مرحومہ کی تعریف میں احادیث	″
تورات میں حضرت ﷺ کے حالات	″
اس امت مرحومہ کو عادل اور وسط کیوں قرار دیا گیا	۱۸۲
امت محمدیہ کے دوسری امتوں پر گواہ ہونے کی روایات	″
سوال دربارۂ علم باری تعالیٰ بابت تحویل قبلہ اور اسکے جوابات	″
سوال مذکور کا تحقیقی جواب	۱۸۳
شان نزول آیت لیضیع ایمانکم اور لفظ ایمان سے کیا مراد ہے	۱۸۴
ہجرت سے پہلے قبلہ کون سا تھا بیت المقدس یا بیت اللہ اس میں اختلاف کا بیان ہے	″
بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف کتنے زمانہ تک نماز پڑھی	۱۸۵
اس میں اختلاف اور منجانب قاضی صاحبؒ قول فیصل اور روایات مختلفہ میں باہم تطبیق	″
شان نزول آیت فلنولینک	″
لفظ شطر کی تحقیق	۱۸۶
مسجد حرام کی وجہ تسمیہ	″
کعبہ کی جگہ مسجد حرام کا لفظ فرمایا اس میں کیا حکمت ہے	″
حدیث تحویل قبلہ کے بیان میں	″
اس میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کس نماز میں تحویل قبلہ کا حکم ہوا تھا اور باہم تطبیق روایات	″

عنوان	صفحہ
رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی اس میں اختلاف اور فیصل قول	۱۸۷
شان نزول آیت ولئن اتیت الذین الخ کا	″
آیت ولئن اتبعت اھوائھم پر اعتراض اور اسکا جواب	″
حدیث دربارہ یعرفونہ کمایعرفون ابناء ھم	۱۸۸
آیت فلاتکونن من الممترین کی تحقیق	″
لفظ وجھۃ کے بیان میں	۱۸۹
حدیث شریف اس بیان میں کہ اس امت کو دیگر امتوں پر تین باتوں سے فضیلت ہے	۱۹۰
تحویل قبلہ سے اغراض کیا کیا ہیں	″
خداوند تعالیٰ نے جو نعمتیں امت پر پوری فرمائی ہیں ان نعمتوں سے کیا مراد ہے۔	۱۹۱
ابراہیم علیہ السلام کی دو دعائیں	″
علوم کے دو برتن	۱۹۳
احادیث کے جو دوسرے معنی شراح نے لکھے ہیں قاضی صاحبؒ کی طرف سے جواب اور تحقیق	″
احادیث دربارۂ فضائل ذکر	۱۹۵
صوفیہ کرام کے ذکر لا الہ الا اللہ کو پسند فرمانیکی وجہ	″
اور مجدد صاحبؒ نے جس کو ترجیح دی اس کا ذکر	″
صبر کے معنی	″
خاص نماز سے مدد چاہنے کی وجہ اور اس بارے میں احادیث اور مجدد صاحبؒ کا قول	″
آیت ان اللہ مع الصابرین کے بارے میں قاضی صاحبؒ کی توجیہ باعتبار تصوف اور آیت ولا تقولوا الخ کا شان نزول	۱۹۶
حیات شہداء کے معنی	″
شہداء بدر کی ارواح کے متعلق علامہ بغویؒ کا قول	″
احادیث فضائل شہداء کے بارے میں	″

marfat.com

عنوان	صفحہ
حیات شہداء اور غیر شہداء کے متعلق بحث اور صوفیہ کرام کا	۱۹۶
قول اور مجدد صاحبؒ کا قول اور قاضی صاحبؒ کی تحقیق بحدیث	۱۹۷
مسئلہ مردہ کو قبر سے نکالنے کے بارے میں	
حدیث: حامل قرآن کے گوشت کو زمین نہیں کھاتی اسکے	"
بارے میں قاضی صاحبؒ کی تحقیق	۱۹۸
ذکر آیت ولنبلونکم بشیئ	"
خوف کا لفظ جو آیت ولنبلونکم میں مذکور ہے امام شافعی	"
صاحبؒ نے اس سے کیا مراد لیا ہے۔	"
مصیبت کے معنی اور اس کے فضائل	۱۹۹
مصیبت کے وقت کے کلمات کی اسی امت کو تعلیم دیا ہے۔	"
آیت اولئک هم المهتدون کا ذکر	"
صابرین اور اہل بلاء کی فضیلت کی احادیث	"
حج اور عمرہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی	۲۰۰
ان الصفا و المروۃ الخ کا شان نزول	"
صفا و مروہ میں سعی یعنی دوڑنا واجب ہے یا فرض اسمیں اختلاف	"
سعی کے وجوب کی دلیل اور اس کی شرائط	۲۰۱
من تطوع خیرا سے کیا مراد ہے	۲۰۲
آیت ان الذین یکتمون الخ کا شان نزول	"
یلعنہم اللّٰعنون سے کیا مراد ہے اور اس میں اختلاف	۲۰۳
فضائل توبہ ذیل آیت وانا التواب الرحیم	"
ذکر آیت ان الذین کفرو اور ماتوا وھم کفار الخ	"
شان نزول آیت والھکم الہ واحد	۲۰۴
حدیث: الھکم الہ واحد الخ اور لا الہ الا	"
ھوالحیّ القیوم کے اسم اعظم ہونے میں۔	"
شان نزول آیت ان فی خلق السمٰوات والارض الخ	"
سموات کو جمع کے اور ارض کو مفرد کے صیغہ سے لانیکی وجہ	۲۰۵
لفظ ریاح میں قرأت کا اختلاف۔	۲۰۶
ذکر آیت ومن الناس من یتخذ من دون اللّٰہ اندادا	۲۰۷
لفظ یرون میں قراء کا اختلاف	۲۰۹
ذکر آیت اذتبرء الذین اتبعوا	"
لفظ سبب کے معنی	۲۱۰
شان نزول آیت یاایھا الناس کلوا ممافی الارض الخ	"

عنوان	صفحہ
خطوات سے کیا مراد ہے؟	۲۱۰
لفظ سوء اور فحشاء سے کیا مراد ہے اس میں اختلاف کا ذکر	۲۱۱
حدیث کہ شیطان اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے۔	"
حدیث: آدمی میں شیطان کا بھی اثر اور فرشتہ کا بھی	"
شان نزول آیت واذاقیل لھم اتبعوا الخ	"
لفظ بل نتبع کی قرأت کا بیان اور لفظ ھل وبل کے لام کو	۲۱۲
جن حرفوں میں ادغام کرتے ہیں ان کا ذکر	"
آیت اولوکان اباء ھم لایعقلون شیئا کے اعتراض	"
کا جواب	
ذکر آیت ومثل الذین کفرو اکمثل الذی ینعق الخ	"
آیت یاایھا الذین امنوا کلوا الخ کا پہلے آیت	۲۱۳
یاایھا الناس کلوا ممافی الارض سے ربط	"
حدیث: حلال اور طیبات کے بیان میں	"
حدیث قدسی: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا جن اور انسان	۲۱۴
کے ساتھ ایک حیرت ناک واقعہ ہے۔	
لفظ انما حرم پر شبہ کا جواب	"
علماء کا اجماع ہے کہ مردار کی بیع و شراء اور چربی وغیرہ	"
سب حرام ہیں اس کا ثبوت احادیث سے۔	
مردار کی کھال کا حکم	۲۱۵
مردار کی ہڈی، پٹھے، سینگ، سم وغیرہ کا حکم	"
سور کی جملہ چیزیں نجس العین ہیں	۲۱۶
ذکر آیت مااھل بہ لغیر اللّٰہ کا اور اہلال کے لغوی معنی	۲۱۷
آیت فمن اضطر میں قراء کا اختلاف	
حالت اضطرار میں مردار کا حکم	"
آیت غیر باغ ولاعاد کی تحقیق	"
شان نزول آیت ان الذین یکتمون ماانزل اللّٰہ من	۲۱۸
الکتاب الخ	
شان نزول آیت لیس البران تولوا	۲۱۹
فرشتوں کا ذکر	۲۲۰
احادیث: اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے بارے میں	۲۲۱
حدیث: رشتہ داروں پر مال خرچ کرنے کے بارے میں	۲۲۲
یتیم کس کو کہتے ہیں اور ان پر صرف کرنے کے بیان میں	"

marfat.com

عنوان	صفحہ
مسکین اور ابن سبیل سے کیا مراد ہے۔	۲۲۲
احادیث: سوال کرنے کے بارے میں	۲۲۳
آیت واٰتی الزکوٰۃ سے اور آیت واٰتی المال سے کیا مراد ہے	〃
حدیث: خلاف وعدہ کرنے کی مذمت میں	۲۲۴
لفظ الصابرین کی حرکت کے بیان میں	〃
شان نزول آیت یاایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم القصاص الخ	〃
مسئلہ: قصاص کے متعلق ائمہ کا اختلاف	۲۲۵
مسئلہ: قصاص کے معاف کردینے کے متعلق اور عفو کے معنی	۲۳۱
حدیث: جو قصاص معاف کرنے کے بعد قتل کرے اس کے بیان میں۔	۲۳۲
آیت ولکم فی القصاص حیوۃ کے بیان میں۔	〃
آیت ان ترک خیرا سے مال کا مراد لینا احادیث سے ثبوت	۲۳۳
ورثہ کے حق میں وصیت کا منسوخ ہونا	〃
تہائی مال سے زیادہ کی کسی کو وصیت کرنا جائز نہیں اس کا ثبوت احادیث سے	۲۳۴
لفظ موص میں قراء کا اختلاف	۲۳۵
حدیث: اصلاح وصیت کے ذکر میں	〃
حدیث: جو وصیت میں حق تلفی کرے اس کے ذکر میں	〃
صوم کے لغوی اور شرعی معنی	۲۳۶
پہلے امت کتنے روزے رکھا کرتی تھی اس کا ذکر	〃
روزوں سے ہم کو کیا نفع ہے۔	〃
آیت ایاما معدودات سے کیا مراد ہے	〃
مسائل مریض اور مسافر کو روزہ رکھنے کے بیان میں	۲۳۷
آیت وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ کے بیان میں	۲۳۹
جو روزہ کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کا حکم	〃
مسافر کو سفر میں اگر روزہ سے زیادہ تکلیف نہ ہو تو افضل ہے ورنہ نہیں اس کا ثبوت احادیث سے	۲۴۱
علاوہ مسافر کے مریض، حاملہ، مرضعہ وغیرہ کو اگر تکلیف نہ ہو تو روزہ رکھنا واجب ہے۔	〃

عنوان	صفحہ
جو روزہ کی طاقت رکھے اسکے حق میں فدیہ کا حکم منسوخ ہے	۲۴۲
قرآن شریف کو قرآن کیوں کہتے ہیں	〃
قرآن شریف کے نزول کا حال	〃
حیض اور نفاس والی عورت کو روزہ رکھنا حرام ہے	〃
جو شخص مقیم ہو اور رمضان کا مہینہ آجائے اور وہ سفر کرے	〃
اس کو افطار جائز ہے یا نہیں اس میں علماء کا اختلاف	〃
مسئلہ: اگر کوئی شخص اول دن میں مقیم ہو اور پھر سفر کرے اس کو افطار جائز ہے یا نہیں۔	۲۴۴
مسئلہ: اگر مریض یا مسافر نے روزہ حالت مرض یا سفر میں رکھ لیا اور پھر افطار کا ارادہ ہوا تو اس کا حکم	〃
آیت ومن کان مریضا اوعلیٰ سفر کو مکرر فرمانے کی وجہ	〃
حائضہ اور نفاس والی مریض اور مسافر کی طرح روزہ قضا کریں گی نماز کی قضا واجب نہیں	〃
مسئلہ: مریض یا مسافر پر اچھا ہونے یا مقیم ہونے کے بعد قضا واجب ہے	〃
مسئلہ: اگر کوئی شخص مر گیا اور اس کے ذمہ روزہ واجب ہے اس کا حکم	۲۴۵
مسافر یا مریض پر افطار واجب نہیں	۲۴۶
آیت ولتکملوا العدۃ کے متعلق	〃
آیت ولتکبروا اللہ سے کیا مراد ہے	۲۴۷
ماہ رمضان اور اس کے روزوں کی فضیلت کا بیان	〃
شان نزول آیت و اذا سألک عبادی الخ	〃
آیت واذا سألک الخ سے ذکر خفی کی ترجیح	۲۴۹
اللہ تعالیٰ کے بندوں سے قریب ہونے کے کیا معنی ہیں	〃
آیت اذا دعان میں قراء کا اختلاف	〃
آیت ولیؤ منوابی میں ایمان لانے سے کیا مراد ہے	۲۵۰
اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اور پھر بندوں کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اس میں خلاف وعدہ لازم آتا ہے۔ اس کا جواب	〃
آیت احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الخ کے شان نزول میں مختلف واقعات۔	۲۵۱
آیت ھن لباس لکم وانتم لباس لھن کا ذکر۔	۲۵۲

marfat.com

عنوان	صفحہ
بیوی سے مجامعت کی غرض کیا ہے اور اس کے متعلق حدیث	۲۵۲
آیت کلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخ کے متعلق تحقیق	〃
مسئلہ : جنبی روزہ دار کو صبح صادق کے بعد غسل کرنا جائز ہے	۲۵۴
حدیث : متعلق آیت ثم اتموا الصیام الی اللّیل	〃
نیت کے متعلق بحث اور تحقیق	〃
اعتکاف کے لغوی اور شرعی معنی	۲۵۶
آیت ولا تباشروھن وانتم عاکفون الخ کا شان نزول	〃
مسائل متعلق اعتکاف اور اس کے متعلق احادیث	〃
اعتکاف سنت مؤکدہ ہے	۲۵۷
حد کے لغوی معنی	〃
حدود اللہ کے قریب بھی نہ جانے کے بارے میں حدیث۔	〃
آیت ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الخ کا شان نزول	۲۵۸
بیان معنی آیت وتدلوا بها الی الحکام کے	〃
حاکم کا فیصلہ کسی امر میں کر دینا حرام کو حلال نہیں کرتا	〃
امام صاحبؒ کے نزدیک بیع، اجارہ، نکاح وغیرہ میں قاضی کا حکم ظاہر باطن ہر طرح سے نافذ اور جاری سمجھا جاتا ہے۔	〃
حضرت علیؓ کا فیصلہ دربارۂ نکاح	۲۵۹
شان نزول آیت ویسئلونک عن الاهلة	〃
چاند کے کبھی چھوٹے کبھی بڑے ہونے کی حکمت کا بیان	۲۶۰
جو علوم آخرت میں فائدہ نہ دیں ان میں عمر برباد کرنا جائز نہیں	〃
لیس البر بأن تأتوا البیوت الخ کا شان نزول	〃
شان نزول آیت وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین الخ کا	۲۶۲
آیت ولا تعتدوا کا شان نزول	〃
جب کفار پہلے لڑیں تب تم لڑو۔ یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قاضی صاحبؒ کی تحقیق۔	〃
آیت وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة الخ	۲۶۳

عنوان	صفحہ
شان نزول آیت الشھر الحرام بالشھر الحرام الخ کا	۲۶۴
بعض مفسرین کے نزدیک آیت الشھر الحرام کا پہلی آیت۔	〃
وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ کے ساتھ تعلق ہے اور اس صورت میں آیت فمن اعتدی کا مضمون بہت مناسب ہوگا۔	〃
آیت وانفقوا فی سبیل اللّٰہ کا شان نزول	۲۶۵
احسان عبادات اور معاملات دونوں میں ہوا کرتا ہے۔ اس کی روایات۔	〃
آیت واتموا الحج والعمرة کا ذکر اور حج کے فرض ہونے پر اجماع اور عمرہ کے بارے میں اختلاف اور ہر ایک کے دلائل اور امام صاحبؒ کی تحقیق۔	〃
جمہور علماء کا مذہب ہے کہ احرام حج کو عمرہ سے بدل کر ناجائز نہیں	۲۶۷
آیت فان احصرتم حدیبیه کے قصہ میں نازل ہوئی۔	۲۶۹
احصار کی تفسیر اور احصار کس شئے سے ہوا کرتا ہے اس میں آئمہ کا اختلاف معہ دلائل کا ذکر۔	
آیت فما استیسر من الھدی سے کیا کیا مراد ہے اور ھدی پر قدرت نہ ہو تو کیا کرے۔	۲۷۱
ھدی کو کب اور کس جگہ ذبح کیا جائے۔	۲۷۲
امام صاحب کے نزدیک قران کرنے والا یعنی حج اور عمرہ دونوں کی نیت کرنے والا اگر احرام باندھ کر رک جائے تو دو ھدی دے۔	〃
حج یا عمرہ سے روکا گیا تو وہ کب حلال ہو۔	〃
جس شخص کا احرام حج یا عمرہ کا ہو اور وہ روکا گیا اور ھدی دیدی اب اس پر قضا واجب ہے یا نہیں۔	۲۷۳
آیت فمن کان منکم مریضا او بہ اذی کا شان نزول	۲۷۴
لفظ نسک کے معنی	〃
معذور اگر عذر کی وجہ سے ممنوعات احرام کا مرتکب ہو تو کیا کرے	〃
تمتع کرنے والا یا قران کرنے والا جو ھدی ذبح کرتا ہے اس کے کھانے کا حکم، ہدی تمتع کو دسویں دن سے پہلے ذبح کرنے کا حکم	۲۷۵
جو شخص ہدی کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ کس قدر روزے رکھے اور کہاں اور کب رکھے اس کا ذکر	〃

marfat.com

عنوان	صفحہ
اثنائے روزوں یا بعد روزے رکھ لینے کے ہدی مل گئی تو وہ کیا کرے	۲۷۶
تمتع یا قران کا حکم کس کے لئے ہے ؟	″
مکی نے باوجود منع ہونے کے تمتع یا قران کر لیا تو اس پر دم	۲۷۷
دینا واجب ہے یا نہیں اس میں ائمہ کے اختلاف کا ذکر	
تمتع اور قران اور افراد کس کو کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ	۲۷۸
نے قران فرمایا تھا یا تمتع اس کا ذکر اور ان تینوں میں سے کونسا افضل ہے	
حج کے احرام باندھنے کے کون سے مہینے ہیں اور ذی الحجہ کا	″
مہینہ پورا ہے یا دس دن اس میں ائمہ کے اختلاف کا ذکر	
حج کے مہینوں سے پہلے اگر حج کا احرام باندھ لیا تو احرام ہوگا یا نہیں۔	
آیت فمن فرض فیھن الحج کے بیان میں	۲۷۹
رفث کے معنی اور اس میں اختلاف کا ذکر	۲۸۰
فسوق سے وہ شئے مراد ہے جس سے محرم کو منع کیا گیا ہے	″
اور ممنوعات کی تفصیل	
محرم حالت احرام میں نکاح کرے یا نہیں	۲۸۱
آیت ولا جدال کا شان نزول	″
آیت وتزودوا کے متعلق قصہ اور شان نزول	۲۸۲
آیت لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم	″
کا شان نزول	
عرفات کی وجہ تسمیہ کا بیان	″
مزدلفہ کی وجہ تسمیہ	۲۸۳
یوم ترویہ آٹھویں تاریخ کو کہتے ہیں اور اس روز کو ترویہ	″
کیوں کہتے ہیں اس کا بیان۔	
مشعر حرام کس جگہ کو کہتے ہیں اور مشعر حرام کیوں نام ہوا	″
شان نزول آیت ثم افیضوا من حیث افاض الناس	۲۸۴
لفظ الناس سے کون لوگ مراد ہیں اس میں اختلاف ہے	″
لفظ ثم پر شبہ اور اس کی توجیہ	″
مزدلفہ میں حاجی کو دسویں تاریخ کی رات کو ٹھہرنا واجب ہے یا فرض	″
عرفات میں ٹھہرنا فرض ہے اگر نہ ٹھہرا تو حج نہ ہوگا۔	″
عرفات میں حاجی کے لئے ٹھہرنے کا کیا وقت ہے	۲۸۶
آیت فاذکروا اللہ کذکرکم اباء کم کا شان نزول	۲۸۷
ذکر آیت فمن الناس من یقول ربنا فی الدنیا حسنة	۲۸۸
حدیث صحابی کو دعاء ربنا آتنا فی الدنیا کی تعلیم فرمانا	″

عنوان	صفحہ
آیت واللہ سریع الحساب کے تحت میں مفسرین کے اقوال	″
آیت فاذکروا اللہ فی ایام معدودات میں	″
معدودات سے ایام تشریق مراد ہیں	
ایام تشریق ۱۱۔۱۲۔۱۳ ذی الحج ہیں اور تیرھویں کی رات کا	″
اعتبار ہے یا دن کا اس میں اختلاف	
دسویں تاریخ میں رمی کرنے کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے	۲۹۰
آیت ومن الناس من یعجبک قوله الخ کا شان نزول	۲۹۱
فضول جھگڑا کرنے والے کے بارے میں حدیث	
آیت واذا تولی سعی فی الارض کس کے بارے	۲۹۲
میں نازل فرمائی	
آیت ومن الناس من یشری نفسه کا شان نزول اور	۲۹۳
مختلف قصے	
لفظ سلم میں قراء کا اختلاف	۲۹۶
حدیث ایمان کی ستر سے اوپر شاخیں ہیں	″
حدیث دربارۂ شان نزول آیت یاایھا الذین امنوا	″
ادخلوا فی السلم	
لفظ ینظرون اور غمام کے معنی	۲۹۷
اللہ تعالیٰ تمام صفات جسمیہ اور علامات حدوث سے پاک ہے	″
ذکر آیت سل بنی اسرائیل کم آتینا ہم الخ	۲۹۹
شان نزول آیت ویسخرون من الذین امنوا	۳۰۰
حدیث شریف دربارۂ فضیلت غرباء متقین	″
تفسیر آیت کان الناس امة واحده الخ	۳۰۱
انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جن میں سے تین	۳۰۲
سو پندرہ رسول ہیں۔	
قرآن شریف میں جن نبیوں کا نام آیا ہے وہ اٹھائیس ہیں	″
بعض مفسرین حضرت مریم کی نبوت کے قائل ہوئے	″
یہود اور نصاریٰ کن باتوں میں باہم مختلف تھے	۳۰۲
آیت ام حسبتم ان تدخلوا الجنة کے شان نزول میں مختلف قصے	۳۰۳
شان نزول آیت یسئلونک ماذا ینفقون الخ	۳۰۴
جہاد فرض ہے یا نفل یا واجب یا فرض کفایہ	″
فصل، جہاد کی فضیلت میں	۳۰۵
آیت یسئلونک عن الشهر الحرام قتال فیه	۳۰۷
الخ کا شان نزول	

marifat.com

صفحہ	عنوان
۳۰۸	آیت قل قتال فیہ کبیر کے منسوخ ہونے میں اختلاف کہ
۳۰۹	مہینے حرام یعنی شوال، ذی قعد، ذی الحجہ، رجب میں قیامت تک جنگ حرام ہے اس میں قاضی صاحبؒ کی تحقیق
۳۱۰	ابن ہمامؒ آیت قل قتال فیہ کبیر کے منسوخ ہونے میں جو دلیل لائے تھے قاضی صاحبؒ کی طرف سے اس کا جواب
۳۱۱	جو شخص مرتد ہو گیا ہو اسکے اعمال صالحہ جو پہلے کر چکا ہے وہ ضائع ہوئے یا نہیں ائمہ کا اس میں اختلاف ہے
″	ان الذین امنوا والذین ھاجروا الخ کا شان نزول
۳۱۲	شان نزول آیت ویسئلونک عن الخمر الخ
۳۱۵	خمر کے معنی میں ائمہ کا اختلاف اور قاضی صاحبؒ کی تحقیق
۳۱۶	خمر اور دیگر شرابوں کے متعلق احکام شرعیہ کا بیان
″	(نبیذ) کھجور یا انگور پانی میں بھگوئی ہوئی جب تک نشہ نہ ہو اس کی حلت احادیث سے
″	جوئے کی حرمت میں احادیث
۳۱۷	شراب کی مذمت کی روایات
″	شراب اور جوئے کے منافع
۳۱۸	حالت اضطرار میں شراب سے نفع اٹھانا جائز ہے
″	دوا میں شراب کا استعمال جائز ہے یا نہیں
۳۱۹	شراب کا سرکہ بنانا جائز ہے یا نہیں
″	شان نزول آیت ویسئلونک ماذا ینفقون
۳۲۰	حاجت سے جو زیادہ مال ہو اس کو اللہ کی راہ میں صرف کرے یا جمع رکھے
۳۲۲	شان نزول آیت ویسئلونک عن الیتمٰی قل اصلاح لھم خیر
۳۲۳	شان نزول آیت ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن الخ
۳۲۳	آیت ولامۃ مؤمنۃ خیر من مشرکۃ کا شان نزول
۳۲۴	دیندار عورت اگرچہ غریب ہی ہو اس سے نکاح کرنے کے بارے میں حدیث
″	شان نزول آیت ویسئلونک عن المحیض الخ
″	حائضہ عورت سے سوائے صحبت کے جملہ امور جائز ہیں
۳۲۵	آیت حتی یطھرن کی قرأت میں اختلاف
″	حالت حیض میں صحبت کرنا سب کے نزدیک حرام ہے اگر کسی نے کرلی تو کفارہ واجب ہے یا نہیں
۳۲۶	حالت حیض میں نماز، روزہ اور مسجد میں جانے وغیرہ کا حکم

صفحہ	عنوان
۳۲۷	آیت ویحب المتطھرین سے دبر میں بدفعلی کرنے کی حرمت
″	آیت نساءکم حرث لکم سے دبر میں بدفعلی کرنے کی حرمت
″	امام شافعیؒ اور ابن عبدالحکم کا معارضہ دربارۂ دبر میں وطی کرنے کے
۳۲۸	دبر میں وطی کرنے سے امام شافعی صاحبؒ کا رجوع فرمانا
۳۲۹	احادیث، دبر میں وطی حرام ہونے کے بارے میں
″	جو لوگ وطی دبر میں جائز ہونے کے قائل ہیں ان کی دلیل
۳۳۰	شان نزول آیت نساءکم حرث لکم الخ
۳۳۱	حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما دربارۂ شان نزول آیت نساءکم حرث لکم
۳۳۲	آیت وقدموا لانفسکم سے کیا کیا مراد ہے
″	حدیث: بیوی سے صحبت کرنے میں بھی ثواب ہے
″	حدیث کہ نیک اولاد اور صدقہ جاریہ اور علم سے مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچتا ہے
″	حدیث: جس مسلمان کے تین بچے مرجاویں اور وہ صبر کرے تو کیا ثواب ہے
۳۳۳	شان نزول آیت ولا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم الخ
	زیادہ قسمیں کھانا مکروہ ہے
″	حدیث: اگر قسم کھالی اور اس کا خلاف بہتر معلوم ہو تو کیا کرے؟
۳۳۳	بعض مفسرین کا قول کہ آیت ولا تجعلوا اللہ عرضۃ الخ حضرت ابوبکرؓ کے شان میں نازل ہوئی
۳۳۴	آیت لایؤاخذکم اللہ اور ولکن یؤاخذکم سے کس قسم کا مواخذہ مراد ہے اور قسم کا کفارہ کب واجب ہو جاتا ہے
″	لغو سے کون سی قسم مراد ہے
″	امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر بلا ارادہ قسم کھالی اور توڑ دی تو کفارہ واجب ہے اس کے متعلق حدیث اور حدیث کے متعلق اختلاف الفاظ کا ذکر اور قاضی صاحبؒ کی تحقیق
۳۳۵	امام صاحبؒ کے نزدیک قسم لغو کس کو کہتے ہیں
″	قسم لغو میں کفارہ اور گناہ دونوں نہیں
۳۳۶	بیان آیت ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم میں قسم کی قسموں کا بیان اور ان کے احکام
۳۳۸	آیت للذین یؤلون من نساءھم الخ کی تفسیر
۳۴۲	والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء کی تفسیر

marfat.com

عنوان	صفحہ
لفظ قرء کے لغوی معنی اور امام صاحبؒ اور امام شافعیؒ کا اختلاف	″
آیت وبعولتھن میں بعل کے لغوی معنی اور شوہر کو کیوں کہتے ہیں	۳۴۴
طلاق رجعی میں وطی یا بوسہ وغیرہ سے رجعت ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔	۳۴۵
مسئلہ رجعت کرنے پر گواہ ہونا ضروری ہے یا نہیں۔	″
قول ابن عباسؓ کہ جیسے میری بیوی میرے واسطے زینت کرتی ہے میں بھی اس کے واسطے زینت کروں	″
شوہر پر بیوی کے حقوق	″
بیوی پر شوہر کے حقوق	۳۴۶
آیت الطلاق مرتان الخ کا شان نزول	″
لفظ مرتان جناب باری نے فرمایا، اثنتان نہ فرمایا اور اس کی حکمت	″
تینوں طلاقیں ایک لفظ دفعۃً دیدینے کا حکم	″
بعض کے یہاں تین سے ایک ہی پڑے گی	۳۴۷
اگر شوہر طلاق دینا چاہے تو بہتر طریقۂ طلاق کا کیا ہے	″
حدیث کہ ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے الخ	۳۴۹
مسئلہ حیض کی حالت میں طلاق بالاتفاق پڑ جاتی ہے فرقہ امامیہ مخالف ہے	۳۵۰
حیض میں طلاق دیدینے اور رجعت کرلینے کے بعد اگر پھر سنت طریقہ پر طلاق دینا چاہے تو اس کا کیا طریقہ ہے	″ ″
طلاق میں عورتوں کا اعتبار ہے یا مردوں کا	۳۵۱
امام صاحبؒ کے قاعدہ کلیہ پر کسی معترض کا اعتراض اور اس کا جواب معہ دلائل	″
اوتسریح باحسان سے کیا مراد ہے	۳۵۲
شان نزول آیت ولایحل لکم ان تأخذوا مماآتیتموھن کا	۳۵۳
خلع عورت کو کرنا کب درست ہے اور مرد کو مال لے کر طلاق دینا کیسا ہے	۳۵۵
خلع مہر سے زیادہ پر مرد کو کرنا جائز ہے یا نہیں امام صاحبؒ نے مکروہ بتایا۔	۳۵۶
سوائے سعید بن مسیبؒ کے سب کے نزدیک حلالہ میں دوسرے شوہر کی صحبت شرط ہے۔	۳۵۸
شان نزول آیت فان طلقها فلاتحل له من بعد الخ کا	
حلالہ کے بعد پہلا شوہر کتنی طلاقوں کا مالک ہوگا	۳۵۹
حلالہ بالشرط کا بیان	۳۶۰
اگر بلا شرط عورت نے نکاح کرلیا مگر شوہر کے دل میں تھا کہ طلاق دیدوں گا یہ نکاح سب کے نزدیک صحیح ہوگیا۔	″
شان نزول آیت ولاتتخذوا ایات الله هزوا الخ	۳۶۱
شان نزول آیت واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن الخ	
شوافع کا استدلال اور امام صاحبؒ کا جواب	۳۶۲
مسئلہ : آزاد، عاقلہ، بالغہ بغیر ولی کے نکاح کرسکتی ہے یا نہیں	″
مسئلہ : سب ائمہ کا اختلاف ہے کہ باکرہ صغیرہ کے نکاح کا باپ کو اختیار ہے اور بیوہ صغیرہ میں اختلاف مع ہر ایک کے دلائل	۳۶۶
ماؤں پر بچوں کا دودھ پلانا واجب ہے۔	۳۶۷
اگر مائیں دودھ پلانے سے عاجز ہوں تو واجب نہیں، اس کا ذکر	″
مسئلہ : عورتوں کو اپنے بچے کے دودھ پلانے پر اجرت لینا اپنے خاوند سے جائز نہیں۔	″
طلاق ہوجانے اور عدت گزر جانے کے بعد بچے کو دودھ پلانے کی اجرت لے سکتی ہے یا نہیں	۳۶۸
دودھ پلانے کی مدت کب تک ہے	۳۶۹
بچے کے جملہ اخراجات کس کے ذمے ہیں	″
لفظ لاتضار میں قراء کے اختلاف کا ذکر	″
آیت وعلی الوارث میں لفظ وارث کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف	″
دولت مند پر اپنے عزیز قریب کا نفقہ واجب ہے۔	۳۷۰
حدیث کہ تو اور تیرا مال سب باپ کے واسطے ہے	۳۷۱
حدیث : مال طیب وہ ہے جو آدمی اپنی اولاد کے مال سے کھاوے۔	
ذکر آیت فان ارادا فصالا الخ	″
جس عورت کا خاوند مرجائے اس کی عدت اور حاملہ کی عدت کا بیان	۳۷۲
مسئلہ : جس باندی کا شوہر مرجاوے اس کی عدت بالاتفاق دو مہینہ پانچ دن ہیں	۳۷۳
مرنے کی عدت میں سوگ اور غم کرنا اور زینت نہ کرنا بالاتفاق واجب ہے اور سوگ کے مسائل کا ذکر۔	″
بعد ختم عدت زینت وغیرہ جس کو شریعت نے جائز کہا ہو	۳۷۴

marfat.com

عنوان	صفحہ
وہ عورت کے لئے جائز ہے۔	
آیت عرضتم میں تعریض کے معنی کا بیان	٣٧٥
حالت عدت میں نکاح کا پیغام صراحتاً یا کنایتہً بھیجنے کا حکم	〃
پورا مہر کب واجب ہوتا ہے اور نصف کس صورت میں	٣٧٦
اگر بغیر مہر مقرر کئے نکاح کر لیا اور بغیر صحبت کئے طلاق دیدی تو شوہر پر کیا واجب ہے	〃
جس عورت کو صحبت سے پہلے طلاق دیدی ہے وہ اپنا نصف مہر معاف کردے یا شوہر پورا مہر ادا کر چکا تھا اب بلا صحبت کئے طلاق دیدی اس نے اپنا نصف مال عورت کو معاف کردیا	٣٧٧
ربط آیت حافظوا علی الصلوات کا پہلی آیات سے نمازوں کی محافظت کے بیان میں	٣٧٨
تمام امت کا اجماع ہے کہ منکر نماز کا کافر ہے اور جو جان بوجھ کر ترک کرے اس کے کفر میں ائمہ کا اختلاف ہے۔	٣٧٨
احادیث دربارہ فضائل نماز	〃
نماز وسطیٰ کون سی نماز ہے اس میں اختلاف کا ذکر مع دلائل	٣٧٩
شان نزول آیت وقوموا للہ قانتین	٣٨٠
قنوت کے معنی کی تحقیق اور اختلاف	٣٨١
اونٹ اور گھوڑوں کی سواری پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں	〃
دشمن کے خوف کے وقت نماز پڑھنے کا طریقہ	〃
مسئلہ خوف کی وجہ سے نماز کی رکعتوں میں کمی نہیں ہوتی	٣٨٢
بیوی کے لئے سال بھر کے نفقہ کی وصیت پہلے واجب تھی	〃
ماں باپ کے واسطے وصیت کرنا پہلے واجب تھا بعد کو منسوخ ہوگیا	٣٨٣
زمانۂ جاہلیت کی عدت کا ذکر اور اس کا نسخ	〃
آیت والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیة لازواجھم الخ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔	〃
عدت طلاق کا نفقہ شوہر کے ذمے واجب ہے یا نہیں اس کی مکمل بحث	٣٨٤
ذکر آیت الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم اور اس کے متعلق قصے۔	٣٨٦
الم تر الی الذین میں جو قصہ مذکور ہے اس کے نزول میں کیا حکمت ہے۔	〃
آیت من ذالذی یقرض اللہ قرضا حسنا الخ کا	٣٨٨

عنوان	صفحہ
شان نزول اللہ تعالیٰ کو قرض دینے سے کیا مراد ہے۔	
حدیث قدسی: اللہ تعالیٰ فرمادیں گے کہ اے بندے میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تو نے نہیں دیا الخ	〃
جو اللہ کی مرضی میں مال خرچ کرے اس کو کہاں تک ثواب ملتا ہے۔	٣٨٩
بخل کی مذمت اور سخاوت کی فضیلت میں احادیث	〃
لفظ ملاء کے معنی	٣٩٠
آیت اذقالوا لنبی لھم میں نبی سے کونسے نبی مراد ہیں	〃
آیت الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ کے متعلق قصہ	〃
طالوت کا بنی اسرائیل پر بادشاہ ہونے کا قصہ	٣٩١
تابوت کے لغوی معنی	٣٩٢
تابوت کا بیان کہ وہ کیا تھا	〃
سکینہ سے کیا مراد ہے	〃
تابوت میں کیا کیا تھا	〃
تابوت کے متعلق قصہ	〃
لفظ غرفہ کی قرأت کا بیان اور غرفہ کس کو کہتے ہیں	٣٩٤
اصحاب طالوت کتنے آدمی تھے۔	〃
صوفیہ کرام کے ہاں مع الصابرین سے کیسی معیت مراد ہے۔	٣٩٥
لفظ فئة کی تحقیق	〃
داؤد علیہ السلام کے جالوت کو قتل کرنے کا قصہ۔	〃
داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کیا کیا عطا فرمایا تھا۔	٣٩٦
آیت لفسدت الارض میں کس قسم کا فساد مراد ہے۔	〃
حدیث کہ اللہ تعالیٰ ایک بندے مؤمن نیک کی وجہ سے اس کے ہمسایہ کے سو گھر والوں سے بلا دور فرمادیتا ہے۔	〃

فہرست مضامین ختم شد

marfat.com

تفسیر مظہری اردو جلد اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ فاتحہ مکی و مدنی

وجہ تسمیہ :- سورۂ الحمد شریف کا نام فاتحۃ الکتاب اور اُمّ القرآن اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ سورہ قرآن مجید کی اصل ہے قرآن اسی سے شروع ہوتا ہے اسی سورت کو سبع مثانی کہتے ہیں کیوں کہ اس کی بالاتفاق سات آیتیں ہیں اور نماز میں مکرر پڑھی جاتی ہیں یا اس لئے مثانی کہا گیا ہے کہ ایک بار مکہ میں نازل ہوئی ہے اور ایک بار مدینہ میں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ مکی ہے۔ سورۂ حجر سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ ابن جریر رضی اللہ عنہ نے بحوالہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سورۂ فاتحہ یعنی الحمد اُمّ القرآن ہے، فاتحۃ الکتاب ہے، سبع مثانی ہے۔ انتہی۔ سورۂ الحمد کا نام سورۃ الکنز بھی ہے۔ اسحٰق بن راہویہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورت اس خزانہ سے نازل ہوئی ہے جو عرش کے نیچے ہے اس سورت کا نام سورۂ شفا بھی ہے چنانچہ ہم اس کے فضائل میں عنقریب ذکر کریں گے کہ یہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ (شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ) میں لفظ اسم کا الف کثرت استعمال کے باعث ساقط ہو گیا ہے اور اس کے بدلے ب لمبی لکھی جاتی ہے بغوی نے عمر بن عبدالعزیز کا قول نقل کیا ہے کہ لو گو ب کو دراز لکھو اور اس کو اچھی طرح ظاہر کرو اور م کو گول لکھا کرو اس میں کتاب اللہ کی تعظیم ہے۔ اسم سمو سے مشتق ہے نہ کہ وسم سے کیونکہ سُمَیٌّ اور سُمَیَّۃ اس کی دلیل ہیں۔[1] اور حرف ب مصاحبت یا استعانت یا تبرک کے لئے اور استعانت اللہ کے ذکر سے ہوا کرتی ہے اور یہ ب اس فعل سے متعلق ہے جو الرحیم کے بعد مقدر ہے (یعنی اقرأ) جیسے بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَ مُرۡسٰىهَا میں اور یہ بات محقق ہے کہ ابتدا بسم اللہ ہی سے ہونی چاہئے۔ عبدالقادر نے ہاوی اربعین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بڑا کام بسم اللہ سے شروع نہ ہو وہ ناتمام رہے گا (بسم اللہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کے نام سے پڑھنا شروع کرتا ہوں) لفظ اللہ بعض قول کے مطابق اسم جامد ہے اور حق یہ ہے کہ اِلٰہ بمعنی معبود سے مشتق ہے، ہمزہ حذف کر کے الف لام اس کے عوض لایا گیا ہے اور چونکہ یہ عوض بطور لزوم ہے اس لئے یا اللہ کہنا جائز ہو گیا۔ جو مجمع کمالات اور رذائل سے پاک ہے اور اسی لئے یہ لفظ خود موصوف ہوا کرتا ہے۔ کسی اور لفظ کی صفت واقع نہیں ہوتا اور (اظہار) توحید کے وقت لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا جاتا ہے اور کبھی اس کا اطلاق اصل معنی پر ہوتا ہے فرمایا وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الۡاَرۡضِ (آسمانوں اور زمینوں میں صرف وہی معبود ہے)۔

اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (بخشش کرنے والے مہربان کے) یہ دونوں لفظ رحمۃ سے مشتق ہے اور رحمت رقت قلب (دل

---

[1] عربی زبان کا عام ضابطہ ہے کہ کسی لفظ کے مادہ کے اصلی حروف تصغیر میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں اس قاعدہ کے موافق اگر اسم کی اصل سِمْوٌ نہ قرار دی جائے بلکہ وَسْمٌ قرار دی جائے تو تصغیر میں وُسَیْمٌ اور وُسَیْمَۃٌ ہونا چاہئے مگر ایسا نہیں ہے بلکہ اسم کی تصغیر سُمَیٌّ اور سُمَیَّۃٌ آتی ہے، معلوم ہوا کہ اسم کی اصل سِمْوٌ تھی اور سِمْوٌ کی سُمَیٌّ اور سُمَیَّۃٌ قاعدہ کے مطابق ہے۔

marfat.com

کی نرمی) کو کہتے ہیں جس کا مقتضیٰ فضل و احسان ہے مگر یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات میں مبادی و الفاظ کا لحاظ نہیں ہے بلکہ غایت و معانی کا لحاظ رکھا گیا ہے (رحمت کا انجام احسان ہے انجام کو غایات کہتے ہیں اور آغاز کو مبادی) اور یہ ظاہر ہے کہ مبادی انفعالات ہوا کرتے ہیں (اور انفعالات سے اللہ تعالیٰ منزہ ہے) بعض کا قول ہے کہ یہ دونوں ہم معنٰی لفظ مبالغہ کے صیغے ہیں اور حق یہ ہے کہ رحمٰن میں زیادتی لفظ کے باعث رحیم کی نسبت مبالغہ زیادہ تر ہے۔ اسی لئے لفظ رحیم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوا (رسول اللہ ﷺ کی نسبت بالمؤمنین رؤف رحیم موجود ہے اور رحمٰن صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے) ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ دونوں اسم مہربانی پر دال ہیں اور ایک دوسرے کی نسبت زیادتی اور مبالغہ پایا جاتا ہے پھر یہ زیادتی کبھی مقدار (کی بیشی) کے لحاظ سے ہوتی ہے (یعنی رحمت سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ ہوتے ہیں اس اعتبار سے اللہ کو رحمٰن الدنیا ور حیم الآخرہ کہتے ہیں کیونکہ رحمت آخرت میں صرف پرہیزگاروں کا حصہ ہے[1] اور کبھی یہ زیادتی محض کیفیت کے لحاظ سے ہوتی ہے اس لحاظ سے اللہ کو رحمٰن الدنیا والآخرہ ورحیم الدنیا کہتے ہیں کیونکہ آخرت کی تمام نعمتیں بیش قیمت ہیں اور دنیا کی بعض نعمتیں حقیر ہیں اور بعض جلیل القدر چونکہ لفظ رحمٰن اعلام کی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے لفظ رحیم پر مقدم رکھا گیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رحمت کو تقدم زمانی حاصل ہے اور عموم رحمت دنیا میں مقدم ہے۔ قراء مدینہ و بصرہ اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فقہاء کوفہ کا یہ مذہب ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جز ہے نہ اور کسی سورت کا بلکہ تبرکاً (یا دو سورتوں کو جدا کرنے کے لئے) ہر سورت کا آغاز اس سے ہوا ہے۔ پھر بعض کا قول ہے کہ بسم اللہ قرآن ہی میں داخل نہیں مگر حق یہ ہے کہ بسم اللہ ضرور داخل قرآن ہے (دو سورتوں میں) فاصلہ کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ حاکم نے شیخینؒ کی شرطوں پر اس روایت کی تصحیح کی ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول خدا ﷺ دو سورتوں کا فاصلہ معلوم نہ فرماتے تھے یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی۔ ابو داؤد نے اس حدیث کو مرسلاً روایت کر کے لکھا ہے کہ اس کا مرسل ہونا اصح ہے۔ امام محمد بن حسن سے بسم اللہ کی بابت سوال ہوا تو فرمایا جو کچھ دونوں پٹھوں میں ہے سب قرآن مجید ہے میں کہتا ہوں کہ بسم اللہ اگر داخل قرآن نہ ہوتی تو لکھنے والے باوجود قرآن میں مبالغہ تجرید[2] کے اسے ہر سورت سے پہلے نہ لکھتے جیسا کہ لفظ امین کو نہیں لکھا اور بسم اللہ کے جزء فاتحہ نہ ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے جناب رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جناب عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں۔ ان میں سے کسی نے بسم اللہ کو بلند آواز سے نہیں پڑھا۔ اور دوسری دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ہے قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ (میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندہ کے مابین آدھوں آدھ تقسیم کر دیا ہے) اس حدیث کو ہم فضائل میں عنقریب بیان کریں گے۔ تیسری دلیل وہ حدیث ہے جو احمد نے عبد اللہ بن مغفل سے روایت کی ہے کہ مجھ کو میرے باپ نے نماز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ بلند آواز سے پڑھتے سنا اور بعد فراغ کہا بیٹے اسلام میں بدعت اور نئی بات پیدا کرنے سے احتراز کر، میں نے رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں یہ تو قرأت کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کرتے تھے اور میں نے نہیں دیکھا کہ ان سے زیادہ کوئی بدعت کا دشمن ہو۔ ترمذی نے اس روایت میں یہ لفظ کہے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ اور ابو بکر و عمر اور عثمان

---

[1] یعنی آخرت میں رحمت سے فائدہ اٹھانے والے صرف مؤمن ہوں گے اور دنیا میں سب ہی لوگ تمتع اندوز ہیں۔ مومن بھی اور کافر بھی۔ ۱۲

[2] بعض مؤلف کا قاعدہ تھا کہ جو لفظ قرآن مجید کا جز نہ ہوتا اس کو قرآنی عبارت کے ساتھ اس طرح نہیں لکھتے تھے کہ سطحی نظر والے کو وہ قرآن کی آیت کا جزء معلوم ہونے لگے اسی لئے (ولا الضالین کے بعد آمین) نہیں لکھی جاتی تھی اگرچہ سورۂ فاتحہ ختم کرنے کے بعد آمین کہنا مسنون ہے اور تمام علمائے سلف قرأت فاتحہ کے بعد آمین ضرور کہتے تھے۔ لیکن قرآن میں لکھتے نہ تھے تاکہ جزو قرآن ہونے کا دھوکہ نہ ہو۔

marfat.com

رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے نہیں سنا۔ قراء مکہ اور کوفہ اور اکثر فقہاء حجاز اس طرف گئے ہیں کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کے سوا اور کسی سورت کا جز نہیں ہے بلکہ دیگر سورتوں میں فصل کے لئے لکھ دی گئی ہے کیونکہ حاکم نے سند صحیح کے ساتھ ولقد اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ کی تفسیر میں سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن جبیر کی یہ روایت بیان کی ہے کہ سبع مثانی ام القرآن سورۂ فاتحہ ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کی ساتویں آیت ہے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کو اسی طرح پڑھا جس طرح میں نے پڑھا اور پھر یہ فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ساتویں آیت ہے دوسری دلیل ترمذی کی حدیث ہے جو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول خدا ﷺ اپنی نماز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں پہلی حدیث میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول کہ بسم اللہ ساتویں آیت ہے فقط ابن عباس کا گمان ہے مرفوع حدیث نہیں اور ترمذی کی حدیث باعتبار اسناد قوی نہیں۔ ایک گروہ کا یہ قول ہے کہ بسم اللہ سورۂ توبہ کے سوا سورۂ فاتحہ اور دیگر تمام قرآنی سورتوں کا جز ہے۔ سفیان ثوریؒ، ابن مبارکؒ اور شافعیؒ اسی طرف گئے ہیں کیونکہ بسم اللہ قرآن میں ہر جگہ اسی خط سے لکھی گئی ہے جس خط سے تمام قرآن لکھا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تو اس بات کی دلیل ہے کہ بسم اللہ داخل قرآن ہے نہ کہ اس بات کی کہ وہ ہر سورت کا جز ہے اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے حالانکہ صحیح حدیث ہے کہ جناب رسول اکرم ﷺ نے سورۂ ملک کی بابت فرمایا ہے سورۃ من القرآن ثلٰثون اٰیۃ (سورۂ ملک تیس آیتوں کی ہے) اس کو ہم اپنے موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ مفصل بیان کریں گے۔ یہاں اسی قدر کہنا کافی ہے کہ سورۂ ملک کی آیت گننے والوں نے اتفاق کیا ہے کہ اس سورت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو الگ کر کے تیس آیتیں ہیں۔

اَلْحَمْدُ (سب تعریف) کسی اختیاری خوبی پر زبان سے تعریف کرنے کو حمد کہتے ہیں (اس میں) نعمت کی خصوصیت نہیں ہے ہو یا نہ ہو، اس لئے حمد باعتبار متعلق شکر کی نسبت عام ہے کیونکہ شکر نعمت کے ساتھ مخصوص ہے اور باعتبار مورد کے خاص ہے کیونکہ شکر زبان و دل اور دیگر تمام اعضا سے صادر ہو سکتا ہے (اور حمد صرف زبان سے خصوصیت رکھتی ہے) اسی لئے رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ حمد شکر کی اصل ہے۔ جس شخص نے خدا کی حمد نہ کی اس نے ذرا بھی شکر نہ کیا۔ اس حدیث کو عبد الرزاق نے بروایت قتادہ اور انہوں نے بروایت عبد اللہ بن عمر سے بیان کیا ہے اور مدح حمد کی نسبت عام ہی کیونکہ مدح صرف خوبی پر ہوا کرتی ہے (اس کا اختیار یا غیر اختیاری ہونا ضروری نہیں) الحمد میں لام تعریف یا تو جنس کے لئے ہے اور حمد کے اس مضمون کی طرف اشارہ کر رہا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے یا استغراقی ہے کیونکہ ہر طرح کی حمد اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے وہ افعال عباد کا خالق ہے خود فرماتا ہے وما بکم من نعمۃ فمن اللہ (لوگو! تم کو جو کچھ نعمت ملی ہے خدا ہی کی طرف سے ہے) اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زندہ، قادر، ارادہ کا مالک اور عالم ہے اس لئے ہر طرح کی حمد کا مستحق ہے۔ **لِلّٰهِ** (اللہ کو ہے) اس میں لام اختصاص کا ہے جیسا کہ الدار لزید میں (یعنی ہر طرح کی حمد اللہ کے لئے مخصوص ہے) اور جملہ خبریہ اسمیہ استحقاق حمد کے استمرار پر دلالت کر رہا ہے اور اس جملہ سے ثنا کرنا مقصود ہے اور بندوں کو حمد کی تعلیم دی گئی ہے۔ تقدیر جملہ یہ ہے قُوْلُوْا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (لوگو! الحمد للہ کہا کرو) اس تقدیر کی ضرورت اس لئے ہے کہ آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے مناسبت پیدا ہو جائے (کیونکہ نعبد کے قائل بندے ہیں)۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱ (جو صاحب سارے جہاں کا ہے) رب کے معنی مالک کے ہیں جیسا کہ رب الدار (گھر کا مالک) اور لفظ رب تربیت (مصدر) کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہنچا دینے کو تربیت کہتے ہیں اس وقت مصدر کا اطلاق بطور مبالغہ ہوگا جیسا کہ خَالِدٌ صَوْمٌ اور زَیْدٌ عَدْلٌ میں۔ رب کا اطلاق بلا قید اضافت وغیرہ غیر اللہ پر نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ عالم لابتداء کی طرح بقاء میں بھی رب کا محتاج ہے۔ اور عَالَمِیْنَ عالم کی جمع ہے اور

ؔ یعنی قرآن اور حدیث میں لفظ عالم بصیغہ مفرد استعمال نہیں کیا گیا۔

marfat.com

استعمال میں اس کے لفظ سے اس کا واحد نہیں پایا جاتا۔ عالم اس چیز کو کہتے ہیں جس سے صانع معلوم ہو جیسا کہ خاتم (وہ چیز ہے جس سے مہر کی جائے) اور عالم تمام ممکنات ہیں کیونکہ تمام ممکنات پر عالم صادق آتا ہے۔ فرعون نے جب کہا وما رب العٰلمین (رب العٰلمین کیا چیز ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا رب السمٰوت و الارض ومابینھم (یعنی رب العٰلمین وہ ہے جو آسمان و زمین اور ان کے مابین کا مالک ہے) چونکہ عالم کے تحت میں اجناس مختلف موجود ہیں اس لئے عالمین بصیغہ جمع لایا گیا ہے اور جمع ذوی العقول باعتبار تغلیب ہے۔ وہب کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں ان میں سے ساری دنیا ایک عالم ہے، تمام مکانات اور جنگلوں کو ایسا سمجھنا چاہئے گویا کسی صحرا میں ایک طشت رکھا ہوا ہے۔ کعب احبار کہتے ہیں عالموں کی تعداد اور خدا کے لشکروں کی گنتی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ بعض کا قول ہے کہ اہل علم یعنی فرشتوں اور انسان اور جنات کا نام عالم ہے۔ دیگر اشیاء تبعاً ان کے ماتحت ہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝٢ (بہت مہربان نہایت رحم والا) قراء اس میں بحالت وقف بلکہ ہر حرف مکسور میں روم (حرکت خفیف جو سنی جائے) کو جائز رکھتے ہیں یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے ورنہ لفظ الرحمٰن الرحیم کی تکرار لازم آتی ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ الفاظ رب العٰلمین کی تعلیل کیلئے مکرر ہوئے ہیں۔[1]

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ (مالک انصاف کے دن کا) عاصم و کسائی اور یعقوب کی قرأت میں مالک آیا ہے اور دیگر قاریوں نے مَلِک پڑھا ہے۔ ابو عمر الرَّحِیم مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن پڑھتے ہیں یعنی میم کو میم میں ادغام کرتے ہیں۔ اسی طرح ان دو متحرک حرفوں میں ادغام ہوتا ہے جو ایک جنس یا ایک مخرج کے ہوں یا دونوں قریب المخرج ہوں اس کی تفصیل یہ ہے کہ

جب ایک جنس کے دو حرف دو کلموں میں واقع ہوں تو ایسے سترہ حرفوں میں باہم ادغام جائز ہے (لیکن چند مواقع ادغام سے مستثنیٰ ہیں) وہ سترہ حروف یہ ہیں۔ با، تا، ثا حائے حطی، رائے غیر منقوطہ، سین مہملہ، عین مہملہ اور عین کے بعد والے دس حرف (غین سے لے کر یائے تحتانی تک) ان حرفوں میں سے ایک جنس کے دو حرف جب دو کلموں میں پاس پاس جمع ہو جائیں تو ادغام جائز ہے (ترتیب وار مثالیں الذھبَ بِسَمْعِھِمْ (دیکھو لذھب کی ب اور بسمعھم کی ب دو کلموں میں واقعہ ہیں مگر پاس پاس ہونے کے سبب ان میں ادغام جائز ہے) علیٰ ہذا القیاس غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ (الشوکۃ اور تکون کی ت) ثالثُ ثَلٰثَۃٍ (ثا) لَا اَبْرَحُ حَتّٰی (حائے حطی) فَاسْتَغْفِرْ رَبَّہٗ (راء بائے غیر مفقوطہ) وَتَرَى النَّاسَ سُکٰرٰی (سین سہملہ) وَطَبَعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (عین مہمل) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ (غین معجمہ) تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْھِھِمْ (فا) اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ قَالَ (قاف) اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا (کاف) جَعَلَ لَکُمْ (لام) یَعْلَمُ مَا اَحْسَنَ نَدِیًّا (میم و نون) اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ (واؤ) اِنَّہٗ ھُوَ (ہائے ہوز) یہاں ہائے ہوز کا صلہ ہونا مانع ادغام نہیں ہے۔ نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی (یائے تحتانی) ان تمام حرفوں میں باہم ادغام جائز رکھا گیا ہے۔ مگر اس قسم کے ادغام میں یہ شرط ہے کہ پہلا حرف تائے متکلم یا تائے مخاطب نہ ہو ورنہ ادغام جائز نہیں چنانچہ کُنْتُ تُرٰبًا اور اَنْتَ تُکْرِہُ میں ت کا ادغام نادرست ہے اور اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ پہلا حرف تنوین یا تشدید نہ رکھتا ہو اس لئے وَاسِعٌ عَلِیْمٌ کا عین اور تَمَّ مِیْقَاتُ کا میم مدغم نہ ہو سکے گا۔ جو موقعے ادغام سے مستثنیٰ ہیں ان میں ایک لَا یَحْزُنْکَ کُفْرُہٗ ہے چونکہ کاف سے پہلے اتفاقاً نون کا اخفا ہے اس لئے ابو عمرو نے ادغام نہیں کیا۔ دوسرا موقع ہے جہاں پہلے کلمہ کا پچھلا حرف محذوف ہو اور اس حذف کے باعث دو ہم جنس حرف ایک جا جمع ہو گئے ہوں مثلاً یَبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ (دراصل یَبْتَغِیْ تھا) اور اِنْ یَّکُ کَاذِبًا (کہ اصل میں یَکُنْ تھا) اور یخل لکُمْ (دراصل یَخْلُوْ تھا) ان کلمات میں ابو عمرو نے ادغام اور اظہار دونوں باتوں کو جائز رکھا ہے۔ تیسرا موقع بعض کے نزدیک ال لوط ہے مگر صحیح یہ ہے کہ اس میں ادغام جائز ہے۔ چوتھا موقع لفظ ھو کا واؤ ہے جس کے ہائے ہوز ابو عمر کی قرأت کے مطابق مضموم ہو اور اس کے بعد واو واقع

---

[1] یعنی اللہ کے رب العالمین کی وجہ یہ ہے کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے

marfat.com

ہو مثلاً ھُوَ وَمَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ یہ تیرہ جگہ ہے اور اس کے ادغام میں اختلاف ہے لیکن ادغام کی روایت قوی ہے۔ پانچوں موقع اسی ہو کا واو ہے جبکہ ابو عمر کی قرأت کے مطابق ہائے ہوز ساکن ہو اور یہ تین جگہ ہے فَھُوَوَلِیُّھُمْ ،وَھُوَ وَاقِعٌ بِھِمْ اس میں بعض قراء بلا خلاف اظہار کے قائل ہیں اور بعض باخلاف مگر اظہار زیادہ قوی ہے۔ یہ سب باتیں اس وقت ہیں کہ وہ جنس حرف دو کلموں میں ہوں لیکن اگر ایک کلمہ میں ہوں تو ابو عمرو سے ادغام کی روایت صرف دو جگہ آئی ہے اول مَنَاسِکَکُمْ سورۂ بقرہ میں دوم سَلَکَکُمْ سورۂ مدثر میں مذکورہ بالا تمام قاعدے دو ہم جنس حرنوں کے ادغام کی بابت تھے۔ وہاں اگر دو قریب المخرج حرف ایک کلمہ میں جمع ہو جائیں تو قاف کاف میں مدغم ہوگا بشرطیکہ دونوں میں کا پہلا حرف ساکن ہو اور دونوں کے بعد میم واقع ہو اسی لئے یَرْزُقْکُمْ میں ادغام ہو سکتا ہے۔ مِیْثَاقَکُمْ اور نَرْزُقُکَ میں نہیں ہو سکتا طَلَّقَکُنَّ کے ادغام میں اختلاف ہے۔ اس کے سوا اور کہیں ادغام نہیں۔ البتہ اگر دو قریب المخرج حروف دو کلموں میں ہوں تو سولہ حرفوں میں ادغام جائز ہے بشرطیکہ وہ حروف تنوین والے اور تائے مخاطب یا مجزوم یا مشدد نہ ہوں چنانچہ (۱) زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ میں حائے حطی عین میں مدغم ہو گئی اور یہ بھی مروی ہے کہ یہ دونوں حرف جہاں کہیں مل جائیں تو حائے حطی عین میں مدغم ہو سکتی ہے مثلاً ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ ،الْمَسِیْحُ عِیْسٰی ،لَاجُنَاحَ عَلَیْھِمَا (۲۔۳) قاف میں کاف مدغم ہوتا ہے اور کاف قاف میں بشرطیکہ دونوں کا ما قبل متحرک ہو مثلاً خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ، لَکَ قُصُوْرًا اور فوق کل ذی علمٍ اور تَرَکُوْکَ قَائِمًا میں اس لئے ادغام نہیں ہوا کہ دونوں کا ما قبل ساکن ہے (۴) جیم تا میں مدغم ہوتا ہے چنانچہ ذِی الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ۔ علیٰ ہٰذا القیاس جیم کا ادغام شین میں درست ہے مثلاً اَخْرَجَ شَطْأَہٗ (۵) شین معجمہ سین مہملہ میں مدغم ہوتا ہے مثلاً ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا (۶) ضاد منقوطہ کو شین میں مدغم کرتے ہیں مثلاً لِبَعْضِ شَأْنِھِمْ (۷) سین مہملہ کا ادغام زائے منقوطہ میں درست ہے مثلاً اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ علیٰ ہٰذا القیاس شین منقوط میں مثلاً وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا (۸) دال مہملہ جہاں کہیں آئے دس حرفوں میں مدغم ہو جاتی ہے (۱) ت میں مثلاً عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْکَ (۲) س میں مثلاً عَدَدَ سِنِیْنَ (۳) ذ میں مثلاً وَالْقَلَائِدَ ؕ ذٰلِکَ (۴) ش میں مثلاً وَشَھِدَ شَاھِدٌ (۵) ض میں مثلاً مِنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ (۶) ث میں یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا (۷) ز میں مثلاً تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۸) ص میں مثلاً نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِکِ (۹) ظ میں مثلاً مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ (۱۰) ج میں مثلاً دَاوٗدُ جَالُوْتَ البتہ دَارُ الْخُلْدِ جَزَآءً میں اختلاف ہے۔ تمام قرآن مجید میں دال طائے مہملہ کے ساتھ کہیں جمع نہیں ہوئی۔ دال مفتوحہ اگر ساکن کے بعد واقعہ ہو توت کے سوا اور کسی حرف میں مدغم نہیں ہوتی مثلاً لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ۔ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ۔ اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا۔ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْہُ بَعْدَ ظُلْمِہٖ۔ بَعْدَ ثُبُوْتِھَا (ان مثالوں میں کہیں دال کا ادغام نہیں ہوا) لیکن کَادَ تَزِیْغُ اور بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا میں ادغام جائز ہے اور اس کی تیسری مثال نہیں پائی جاتی۔ ت ان ہی دس حرفوں میں مدغم ہوتی ہے۔ لیکن جہاں ۲ ت جمع ہو جائیں اس کے متعلق ادغام کے قاعدے بیان ہو چکے ہیں علیٰ ہٰذا القیاس ت جہاں کہیں آئے کی ط میں مدغم ہو جائے گی۔ ت ہمیشہ ساکن ہو کر دال سے ملا کرتی ہے مثلاً قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا الیسی صورت میں ادغام واجب ہے۔ جواز ادغام کی مثالیں یہ ہیں اَلْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ۔ بِالسَّاعَۃِ سَعِیْرًا۔ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا۔ بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ۔ وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا۔ ت کے ض میں ادغام ہونے کی دوسری مثال (قرآن مجید میں نہیں ہے۔ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلُ۔ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا۔ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا۔ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ (یہ لفظ صرف سورۃ نساء اور سورۃ نحل میں ہے۔ تیسری مثال قرآن مجید میں نہیں ہے) عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ حرف ساکن کی تائے مفتوحہ جہاں کہیں واقع ہوگی اس کا نام تائے خطاب ہے اور اس میں ادغام درست نہیں مگر ہاں چند موقعے مستثنیٰ ہیں مثلاً الف کے بعد واقعہ ہو جیسا کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ ان میں بلا خلاف ادغام جائز ہے البتہ حُمِّلُوا التَّوْرٰۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا میں اختلاف ہے۔ اسی طرح بعض موقعوں میں تائے مکسورۃ کی بابت اختلاف ہے۔ مثلاً اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی ،وَلْتَاْتِ طَآئِفَۃٌ میں کسی نے ادغام جائز رکھا ہے کسی نے ناجائز جِئْتِ شَیْئًا کی ت اگرچہ تائے خطاب مکسور ہے مگر اس کے ادغام میں بھی اختلاف ہوا ہے ہاں تائے مفتوحہ کے ادغام میں

marfat.com

اختلاف نہیں ہے مثلاً لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ۔ ث ہر جگہ پانچ حرفوں میں مدغم ہوتی ہے مثلاً حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ (۲) وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ (۳) وَالْحَرْثَ ذٰلِكَ ۔ ذ میں مدغم ہونے کی صرف یہی ایک مثال ہے (۴) حَيْثُ شِئْتُمْ (۵) حَدِيْثُ ضَيْفِ (ض میں مدغم ہونے کی اور کوئی مثال نہیں) ذ سین اور صاد میں ادغام کر دی جاتی ہے۔ مثلاً فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ سورۂ کہف میں دو جگہ ہے اور مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً لام ر میں اور ر لام میں ادغام کر دی جاتی ہے۔ لیکن جب کسی حرف ساکن کے بعد یہ دونوں مفتوح واقع ہوں گے تو ادغام نہ ہوگا (ادغام کی مثال كَمَثَلِ رِيْحٍ، هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (عدم ادغام کی مثال) فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ مگر قال کا لام اگرچہ مفتوح بعد ساکن ہی کیوں نہ ہو جب اس کے بعد ر ہو گی مدغم ہو جائے گا۔ مثلاً قَالَ رَبِّ، قَالَ رَجُلَانِ، قَالَ رَبُّكُمْ ۔ نون ر اور ل دونوں میں مدغم ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا ماقبل متحرک ہو۔ مثلاً اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ، خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّكَ، لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ، تَبَيَّنَ لَهُمْ ہاں سکون ماقبل کی حالت میں ادغام جائز نہیں مثلاً يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ، بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ ۔ مگر نحن کا نون جہاں آئے گا باوجود سکون ماقبل مدغم ہو سکے گا مثلاً نَحْنُ لَهٗ، وَمَا نَحْنُ لَكَ اور یہ دس جگہ آتا ہے میم جس کے ماقبل حرف متحرک اور مابعد ب واقع ہو ساکن خفی کر دیا جاتا ہے اور يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ میں ب ہر جگہ میم میں مدغم ہو جاتی ہے اور یہ سورۂ بقرہ کے سوا پانچ جگہ ہے سورۂ بقرہ میں ابو عمرو کی قرأۃ کے لحاظ سے یعذب کی ب ساکن اور اس میں ادغام صغیر ہے۔ ابو عمرو اس جگہ ادغام کبیر کو جائز نہیں رکھتے وہاں تین صورتیں اور ہیں (۱) اشمام (۲) روم (۳) اظہار۔ اشمام صرف حرف مضموم میں ہوتا ہے اور روم مفتوح کو چھوڑ کر مضموم اور مکسور میں۔ اشمام دونوں ہونٹوں کے ملانے کو کہتے ہیں گویا کسی معشوق کا بوسہ لے لیا۔ اس میں ضمہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور روم اخفا اور بعض حرکت کے تلفظ کا نام ہے۔ ابو عمرو کے نزدیک اشمام اور روم تمام حروف میں جائز ہے لیکن ب میم کے ساتھ جمع ہو یا میم ب کے ساتھ تو ان صورتوں میں نہ اشمام جائز ہے نہ روم مثلاً نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا، يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ، يَعْلَمُ مَا، اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا اور جب دونوں حرفوں کے ماقبل حرف علت ساکن ہو تو ادغام نہ ہو سکے گا مثلاً خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ، بَعْدَ ظُلْمِهٖ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا، دَارُ الْخُلْدِ جَزَاءً، اور میں اگر ادغام کیا جائے تو اجتماع ساکنین لازم آتا ہے ایسے موقع پر بعض حرکت کا تلفظ یعنی اخفاء اور روم ہی بمنزلہ ادغام ہے اس کو ادغام سے تعبیر کرنا مجاز ہے۔ اگر دونوں حرفوں کے ماقبل حرف علت ساکن ہو تو ادغام کرنا درست ہے مثلاً فِيْهِ هُدًى، وَقَالَ لَهُمْ، يَقُوْلُ رَبَّنَا، وَقَوْمُ مُوْسٰى، وَكَيْفَ فَعَلَ واللہ اعلم۔ بعض کا قول ہے کہ مَلِك اور مَالِك کے ایک معنی ہیں جیسا کہ فَرِهِيْنَ، فَارِهِيْنَ، حَذِرِيْنَ اور حَاذِرِيْنَ لیکن حق یہ ہے کہ مَالِك بمعنی رب مَلْكٌ بکسر المیم سے مشتق ہے۔ یہ عرب کا محاورہ ہے مَالِكُ الدَّارِ اور رَبُّ الدَّارِ (گھر والا) اور ملک بمعنی سلطان مُلك بضم المیم سے لیا گیا ہے۔ دونوں لفظ خدا کی صفتیں ہیں اور دونوں قرائتیں متواتر ہیں اس لئے صرف قرأت مَلِك کو مختار کہنا جائز نہیں اور بعض کا قول ہے کہ مَلِك اور مَالِك وہ ہے جو نیست سے ہست کر دینے پر قادر ہو اس لئے ان لفظوں کا اطلاق (مجاز سے قطع نظر) اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر درست نہیں۔

قیامت کا دن ہے۔ دین جزاء اور بدلے کو کہتے ہیں لور كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ دین ہی سے مشتق ہے (یعنی تو جیسے فعل کرے گا ویسا ہی بدلہ ملے گا) یہ ایک مشہور مثل اور مرفوع حدیث ہے۔ اس کو ابن عدی نے کامل میں ضعیف سند سے روایت کیا ہے لور بیہقی کے نزدیک ایک حدیث مرسل اس کی شاہد ہے۔ احمد مالک بن دینار سے نقل کرتے ہیں کہ یہ توریت میں ہے اور دیلمی نے فضالہ بن عبید سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ یہ انجیل کا مضمون ہے مجاہد کہتے ہیں کہ يَوْمِ الدِّيْنِ بمعنی یوم الحساب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ یعنی یہ سیدھا حساب ہے اور بعض کا قول ہے کہ دین بمعنی قہر ہے عرب کہتے ہیں دِنْتُهٗ فَدَانَ (میں نے اس کو اطاعت پر مجبور کر دیا اور وہ مطیع ہو گیا) یا لفظ دین سے اسلام اور اطاعت مراد ہے کیونکہ وہ ایسا دن ہے جس میں اسلام اور اطاعت کے سوا کوئی چیز نفع نہ دے گی۔ یہاں اس دن کو مخصوص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ لفظ ملک کا اطلاق اس دن کے علاوہ لور ایام میں بطور مجاز غیر اللہ پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں اس

marfat.com

میں بندوں کو ڈرانا اور ان کو اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی طرف بلانا مقصود ہے۔ صفت کو ظرف یعنی مَالِکِ کو یوم کی طرف اس لئے مضاف کیا گیا ہے کہ یہاں ظرف مفعول بہ کے قائم مقام ہے چنانچہ سَارِقُ اللَّیْلَۃِ میں بھی اسی قسم کی اضافت ہے مَالِک ہے تو اسم فاعل کا صیغہ (اور اسم فاعل حال اور مستقبل دونوں زمانوں میں مشترک ہوا کرتا ہے) مگر یہاں اس کے معنی ماضی کے ہیں جیسا کہ نَادٰی اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ میں کیونکہ جس چیز کا وقوع یقینی اور قطعی ہوا کرتا ہے۔ وہ بمنزلہ واقع کے ہوا کرتی ہے۔ اور جب یہ ہے تو اس کا معرفہ کی صفت واقع ہونا صحیح ہے۔ صفات مذکور یعنی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ اس لئے ذکر کی گئی ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ صرف ایک خدا ہی مستحق حمد اور سزاوار تعریف ہے اور جو ان صفات کے ساتھ متصف نہ ہو وہ قابل حمد نہیں چہ جائیکہ معبود قرار دیا جائے۔ نیز آئندہ جملے اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی تمہید قائم کرنا بھی مقصود ہے اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (جیسا کہ) اختیار (کلی) پر دلالت کرتا ہے (ویسا ہی) ایجاب بالذات کی نفی بھی کرتا ہے[۱]۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اپنی ذات مقدس کی نسبت اس بات کا اظہار فرما چکا کہ ہر طرح کی تعریف کا سزاوار میں ہی ہوں اور ساتھ ہی ان بڑے اور عظیم الشان اوصاف سے اپنی ذات مبارک کو موصوف کر چکا جو تمام مخلوقات کی ذوات سے ممتاز اور جدا ہے اس طرح ایک معین ذات بندوں کے دماغوں میں مستحضر ہو گئی تو غیب کے درجہ سے مرتبۂ خطاب کی جانب عدول کر کے فرمایا۔[۲]

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ (یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں) قراء نے نَسْتَعِیْنُ کے نون کو اور نہ صرف نَسْتَعِیْنُ ہی کے نون کو بلکہ ہر مضموم حرف کو بحالت وقف روم اور اشمام دونوں طرح سے پڑھا ہے۔ آیت کے خلاصۃً معنی یہ ہیں کہ اے خدا جو صفات مذکورہ کے ساتھ متصف ہے ہم خاص کر تیری ہی بندگی کرتے اور تجھی سے توفیق اطاعت کے خواستگار ہیں اور نہ صرف عبادت میں ہی تجھ سے امداد کے طالب ہیں بلکہ اپنے سارے چھوٹے بڑے کاموں میں تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ چونکہ سلسلہ کلام میں ایک طرز سے دوسرے طرز کی طرف انتقال کرنا غیبت سے خطاب، خطاب سے غیبت، تکلم سے خطاب و غیبت اور غیبت و خطاب سے تکلم کی جانب التفات کرنا عرب کی عام عادت ہے اور اس سے ان کی غرض صرف سننے والے کے دل میں رغبت و شوق کا پیدا کرنا منظور ہوتا ہے اس لئے یہاں بھی اسی کی رعایت کی گئی اور غیبت کے اسلوب سے خطاب کی طرف انتقال کیا گیا۔ عبادت اصل میں انتہا درجہ کے خضوع اور اظہار فروتنی کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان اپنے محاورات میں بولا کرتے ہیں طَرِیْقٌ مُعَبَّدٌ یعنی پامال راستہ اور

---

[۱] ارسطو اور اس کے متبعین اس کے قائل ہیں کہ واجب تعالیٰ تمام ممکنات کی علت العلل ہے یعنی اس کائنات کا واجب سے صدور بلا ارادہ اور بے اختیار ہوا ہے جس طرح سورج سے شعاعوں کا خروج بے ارادہ ہے اور نہ صرف حدوث کائنات میں ارادۂ واجب کو دخل نہیں بلکہ صدور عالم واجب تعالیٰ سے بالذات لازم ہے یعنی یہ کائنات اصلاً اگرچہ ممکن ہے حادث ہے مگر قدیم بالغیر ہے اس باطل نظریہ کی بیخ کنی لفظ الرحمٰن الرحیم سے ہو جاتی ہے۔ رحمت یعنی مہربانی اور احسان غیر واجب تفضل کو کہتے ہیں۔ رحمت کرنے والا اپنے ارادہ اور اختیار سے غیر لازم مہربانی کرتا ہے ضروری حق ادا کرنے کو رحمت اور احسان نہیں کہا جاتا، بلکہ اداء فرض کہا جاتا ہے۔ پس اللہ کے رحمٰن و رحیم ہونے کا تقاضا ہے کہ اس کائنات کا صدور اس کے ذمہ واجب اور لازم نہ تھا نہ وجود و بقاء وجود کا کوئی حق اس پر لازم تھا بلکہ اس نے اپنی مہربانی سے اس جہاں کو بنایا اسباب بقاء پیدا کئے اور رفتہ رفتہ ترقی دے کر نوازا۔

[۲] اگر کسی چیز کے احوال و صفات ناقابل اشتراک اور مخصوص ہوں اور وہ صفات ذکر کر دی جائیں تو اس چیز کی ذہن میں ایسی تعیین ہو جاتی ہے کہ گویا وہ نظر کے سامنے آگئی شدت تخیل غیر محسوس کو محسوس کر کے دکھا دیتی ہے علم غائبانہ شہود سے بدل جاتا ہے۔ حضور ذہنی وجود خارجی کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ علم حصولی معاینہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس جب ذات الوہیت کا نام ذکر کر دیا اور مخصوص صفات کو بھی بیان کر دیا تو ذات غائب شدت استحضار کی وجہ سے عارف کی نظر کے سامنے آگئی اس لئے اس نے غائبانہ طرز کلام سے انتقال کر کے تخاطب کا اسلوب اختیار کیا جس ذات کا وہ غائبانہ ذکر کر رہا تھا وہ اس کے سامنے حاضر ہو گئی اور اس نے حاضر ذہنی سے اس طرح بات کرنی شروع کر دی جیسے حاضر مرئی خارجی سے کی جاتی ہے۔

marfat.com

نَعْبُدُ و نَسْتَعِيْنُ دونوں فعلوں میں ضمیر جمع متکلم ہے اس سے قاری اور اس کے ساتھ والے مراد ہیں اور اس میں التزام جماعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اِيَّاكَ (جو بلحاظ ترکیب نحوی مفعول واقع ہوا۔ اگرچہ اس کا درجہ فعل اور فاعل سے پیچھے ہے مگر یہاں) تعظیم اور اظہار اہمیت اور حصر کے فائدہ کی غرض سے مقدم کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا نَعْبُدُ کے معنی ہیں نَعْبُدُكَ وَلَا نَعْبُدُ غَيْرَكَ (یعنی خداوندا ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں غیر کو شریک نہیں کرتے) اس اثر کو ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے بطریق ضحاک ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔ بعض مفسروں کا بیان ہے کہ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں واؤ (عاطفہ نہیں بلکہ) حالیہ اور معنی یہ ہیں کہ اے خدا ہم تجھی سے طلب امداد کرتے ہوئے تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

اِهْدِنَا یہ اس اعانت اور مدد کا بیان ہے جو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں طلب کی گئی تھی (مطلب یہ ہے کہ خداوندا ہمیں سیدھی راہ دکھا) یا چونکہ سیدھے رستہ کی ہدایت تمام باتوں میں اہم اور مقصود اعظم تھی اس لئے اس کو علیحدہ ذکر کر دیا گیا۔ ہدایت کے معنی لطف و مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنے اور رستہ بتانے کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا استعمال ہمیشہ خیر و نیکی میں ہوا کرتا ہے۔ یہ لفظ اور اس کے مشتقات اصل میں تو لام اور الیٰ ہی کے ساتھ متعدی ہوا کرتے ہیں مگر کبھی کبھی بغیر کسی واسطہ کے خود ہی متعدی ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ دعا ہے نبی کریم ﷺ کی اور نیز تمام مسلمانوں کی اور اگرچہ وہ پہلے ہی سے آسمانی ہدایت پر تھے مگر پھر بھی خدا تعالیٰ نے استقامت و ثابت قدمی اور مزید ہدایت طلب کرنے کے لئے دعا تعلیم فرمائی کیونکہ اہل سنت کے مذہب کے مطابق خدا تعالیٰ کے الطاف و ہدایات کی کوئی انتہا اور حد نہیں ہے۔ ابن کثیر نے قنبل کی روایت کے مطابق لفظ۔

الصِّرَاطَ خواہ معرف باللام اور مصاف ہو یا نکرہ نہ صرف سورۃ فاتحہ بلکہ تمام قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی آیا ہے السِّرَاطَ سین کے ساتھ پڑھا ہے اور سِرَاطَ کے لغوی معنی نگل لینے کے ہیں اہل زبان بولا کرتے ہیں۔ سَرَطَ الطَّعَامَ اَیْ اِبْتَلَعَهٗ (یعنی جب کوئی کھانے کا لقمہ نگل جاتا ہے تو سَرَطَ الطَّعَامَ بولا جاتا ہے) اسی طرح جس راہ میں کثرت سے مسافر چلتے ہیں اس کی نسبت کہا جاتا ہے اَلطَّرِيْقُ يُسْرِطُ السَّابِلَةَ اور باقی قراء نے صاد سے پڑھا ہے اور یہ قریش کا لغت ہے۔ خلف نے صاد اور زاء کے درمیان اس لفظ کو قرآن میں ہر جگہ پڑھا ہے اور خلاد نے صرف اس جگہ اَلْمُسْتَقِيْمَ کے معنی مستوی اور سیدھے کے لئے ہیں مگر مراد طریق حق ہے۔ اور بعض کہتے ہیں ملت اسلام ان دونوں قولوں کی نسبت ابن جریرؒ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف کی ہے۔ ابو العالیہ اور امام حسن نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر میں کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اور ان کے دو اصحاب ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا راستہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو خوب مضبوط پکڑو اور فرمایا میرے بعد دو شخصوں ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اقتدا کرو۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یہ اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے بدل ہے اور بدل بھی بدل کل جس کا فائدہ تاکید ہے اور اس بات پر استدلال ہے کہ ان لوگوں کا راستہ وہ ہے جس کے مستقیم ہونے کی شہادت دے دی گئی ہے (مطلب یہ ہے کہ خداوندا ہمیں ان لوگوں کا رستہ دکھا جن پر تو نے اپنا فضل کیا) اور ان سے وہ باخدا اور نیک دل لوگ مراد ہیں جنہیں خدا نے ایمان اور اطاعت پر ثابت قدم رکھا یعنی انبیاء علیہ السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ لفظ علیہم اور الیہم اور لدیہم کو جہاں کہیں بھی قرآن میں آیا ہے حمزہ نے وصل اور وقف دونوں حالتوں میں ضمہ، ہا سے پڑھا ہے لیکن حمزہ کے علاوہ اور تمام قاریوں نے ہ کو مکسور پڑھا ہے۔ ابن کثیرؒ نے ہر میم جمع کو حالت وصل میں ضمہ اور اشباع سے پڑھا ہے جبکہ اس کے بعد ساکن نہ ہو۔ قالون ہر حالت میں خواہ اس کے بعد کا حرف ساکن ہو یا نہ ہو اشباع اور عدم اشباع دونوں طرح سے پڑھنا جائز رکھتے ہیں۔ لیکن ورش صرف الف قطع کے اتصال کے وقت اشباع سے پڑھنا جائز بتاتے ہیں اور جب میم جمع کے بعد الف وصل ہو اور ہ سے پیشتر کسرہ یا یای ساکن ہو جیسے بِهِمُ الْاَسْبَابُ و عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تو حمزہ اور کسائی ہ اور م دونوں کو مضموم پڑھتے ہیں اور ابو

عمرو مکسور اور اسی طرح یعقوب بھی ابو عمرو کے ساتھ متفق ہیں جبکہ اس سے پیشتر کا حرف مکسور ہو۔ ان قراء کے علاوہ باقی لوگ م کو مضموم پڑھتے ہیں اس واسطے کہ وہی اصل ہے اور ہ کو کسرہ سے اس واسطے کہ اس سے پیشتری ساکنہ یا کسرہ ہے لیکن یہ اختلاف وصل کی حالت میں تھا۔ رہی وقف کی حالت تو اس صورت میں سب لوگ ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ البتہ حمزہ کا اختلاف اس صورت میں بھی باقی رہتا۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ یہ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے بدل ہے یعنی جن ع ۱
پر خدا نے اپنا فضل کیا۔ ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو غضب خداوندی اور گمراہی سے سالم و محفوظ ہیں یا صفت کاشفہ یا صفت احترازیہ ہے۔ بشرطیکہ موصول نکرہ کے قائم مقام فرض کیا جائے اور اس سے کوئی معین اور مقرر گروہ مراد نہ لیا جائے جیسا کہ اس مصرعہ میں ہے مصرعہ وَلَقَدْ أَمُرُّ عَلَى اللَّئِيمِ يَسُبُّنِي (یعنی جب میں کسی دنی الطبع اور نالائق شخص کی طرف سے گزرتا ہوں جو مجھے گالیاں دیتا ہے) یا یوں کہیے کہ لفظ غیر چونکہ ایسی چیز کی طرف مضاف ہوا ہے جس کی ایک ہی ضد موجود ہے اس لیے بہر حال معرفہ ہے اور اس اضافت کے سبب سے اس میں ایک قسم کی تعیین ہو گئی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے عَلَيْكُمْ بِالْحَرَكَةِ غَيْرِ السُّكُونِ لفظ عَلَيْهِمْ فاعل کے قائم مقام واقعہ ہونے کی وجہ سے رفع کے محل میں ہے (یعنی ترکیب میں المغضوب کا مفعول مالم یسم فاعلہ واقع ہوا ہے) اور لا اس نفی کی تاکید مزید کر رہا ہے جو غیر کے معنی سے مستفاد ہوتی ہے گویا تقدیر عبارت یوں ہے لا الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ (یعنی نہ ان کا رستہ جن پر خدا کا غضب نازل ہوا) انتقام کے ارادہ سے نفس کے برانگیختہ اور پر جوش ہونے کو غضب کہتے ہیں لیکن جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس سے نتیجہ غضب (اور) اس کا منتہیٰ مراد ہوا کرتا ہے یعنی عتاب۔ اور ضلالۃ ہدایۃ کی ضد ہے (یعنی اس راہ سے عدول کرنے کو ضلالت کہتے ہیں جو خدا تک پہنچانے والی ہے) اور اس کے بہت سے مراتب و مدارج ہیں۔ عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ان سے یہود اور گمراہوں سے نصاریٰ مراد ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں اور ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی تحسین کی اور ان کے علاوہ اوروں نے عدی ابن حاتم سے روایت کیا ہے ابن مردویہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے اسی کے قریب قریب ایک اور حدیث نقل کی ہے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما و حضرت ابن مسعودؓ، ربیع بن انس اور زید بن اسلم کی طرف اسی تفسیر کی نسبت کی ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ باوجود تحقیقات کے مجھے اب تک معلوم نہیں ہوا کہ اس تفسیر میں مفسروں کا اختلاف ہو۔

میں کہتا ہوں الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ایسے دو عام لفظ ہیں جن کے تحت میں تمام کفار اور خدا کے نافرمان اور بدعتی سب لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس شخص کے حق میں جو کسی ممنوع القتل کو عمداً قتل کر دے غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ فرمایا اور کفار و بدعتیوں کے بارے میں ارشاد ہوا فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ اور الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ سورۂ فاتحہ کے ختم پر قدرے فصل کے ساتھ آمین کہنا مسنون ہے اور یہ لفظ بدون تشدید مد و قصر دونوں طرح سے منقول ہوا ہے۔ امام بغویؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بیان کیا کہ میں نے جناب نبی کریم ﷺ سے آمین کے معنی دریافت کئے فرمایا اس کے معنی ہیں افعل ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں اور امام بیہقی نے دلائل میں حضرت ابو میسرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جناب نبی کریم ﷺ کو سورۂ فاتحہ پڑھائی اور ولا الضالین پر پہنچ کر فرمایا آمین کہیے ابو داؤد نے اپنی سنن میں حضرت ابو زہیر کی روایت سے جو ایک جلیل القدر صحابی ہیں بیان کیا کہ آمین ایسی ہے جیسی خط پر مہر۔ حضرت ابو زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک رات آنحضرت ﷺ کے ساتھ باہر نکلے اور چلتے چلتے ہمارا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو جناب الٰہی میں دعا کر رہا تھا اور نہایت الحاح وزاری سے کر رہا تھا۔ نبی ﷺ نے اس کی یہ الحاح وزاری دیکھ کر فرمایا اس کی دعا قبول ہوئی اگر اس نے دعا پر مہر بھی لگائی۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ دعا پر کس چیز کی مہر لگائی جاتی ہے فرمایا لفظ آمین کی۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

marfat.com

روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا (لوگو) جب امام ولا الضَّآلِّیْن تک پہنچ جائے تو آمین کہا کرو کیونکہ اس وقت فرشتے بھی آمین کہتے ہیں اور .... جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق پڑ جائے گی اس کے تمام گزشتہ گناہوں پر قلم عفو کھینچ دیا جائے گا۔ ابو داؤد، ترمذی، دار قطنی، میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب ولا الضَّآلِّیْن پڑھ چکتے تو آمین کہتے اس حدیث کی تصحیح میں ابن حبان نے نہایت پرزور اور بیش بہا الفاظ لکھے ہیں۔

فصل در بیان فضائل سورۂ فاتحہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے اس ذات پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ سورۂ فاتحہ جیسی کوئی سورت نہ تو توریت و انجیل اور زبور میں نازل ہوئی نہ قرآن مجید میں یہ وہی سبع مثانی ہے جو خدا تعالیٰ نے مجھے عطاء فرمائی ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کر کے حسن صحیح بتایا ہے۔ اور حاکم کہتے ہیں کہ شرط مسلم پر صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ہم صحابیوں کی ایک جماعت جناب نبی اکرم ﷺ کے حضور میں حاضر تھی اور جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے دفعۃً اوپر سے دروازہ کھلنے کی سی آواز آئی جبرئیل (علیہ السلام) نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور فرمایا یہ دروازہ جو اس وقت کھلا ہے اس سے پیشتر کبھی نہیں کھلا۔ راوی کا بیان ہے کہ اتنے میں ایک فرشتہ آسمان سے اترا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔ کہ آپ کو ایسے دو نوروں کا ثمرہ ہو جو آپ سے پیشتر کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ ایک فاتحۃ الکتاب دوسرے سورۃ بقرہ کا خاتمہ ان دونوں میں سے اگر آپ ایک حرف بھی پڑھیں گے تو وہ نور آپ کو دے دیا جائے گا۔ (مسلم)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے اور بندہ کے درمیان نماز کو آدھوں آدھ تقسیم کیا ہے اس کا نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندہ کے واسطے اور میرے بندہ کو وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواستگاری کرے گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندہ نے میری تعریف کی) اور جب وہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ (میرے بندہ نے میری خوب حمد و ثنا کی) بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے۔ مجدنی عبدی (میرے بندہ نے میری بزرگی اور عظمت کا اظہار کیا) بندہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے ھٰذَا بَیْنِیْ وَ بَیْنَ عَبْدِیْ وَ لِعَبْدِیْ مَاسَاَلَ (یعنی یہ مضمون میرے اور میرے بندہ کے درمیان تقسیم ہے اور میرے بندہ کے لئے میرے پاس وہ چیز موجود ہے جس کی وہ درخواست کرے) جب بندہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہتا ہے تو فرماتا ہے فَھٰؤُلَاءِ لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ (یعنی میرے بندہ کی یہ تمام درخواستیں مقبول ہیں اور اس کے علاوہ جو بھی درخواست کرے گا منظور کروں گا، (مسلم)۔

عبد المالک بن عمیر سے مرسلاً روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا فاتحۃ الکتاب ہر مرض کے لئے شفا ہے اور دارمی نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت نبی ﷺ نے فرمایا جابر میں تجھے بہترین سورت کی جو قرآن میں نازل ہوئی ہے خبر دوں۔ جابر کہتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول ﷺ اللہ فرمایئے ارشاد ہوا کہ وہ فاتحۃ الکتاب ہے اور میرا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ ہر مرض کے لئے شفا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فاتحۃ الکتاب بجز موت کے ہر مرض کی دوا ہے۔ اسے خلعی نے اپنے فوائد میں نقل کیا ہے۔ سعید بن المعلی سے روایت ہے کہ قرآن میں سب سے بڑی سورت (باعتبار ثواب یا بلحاظ قدرو

marfat.com

وقعت) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہے اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ بیہقی اور حاکم نے حدث ابن عباس نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ فاتحۃ الکتاب قرآن کے دو ثلث کے برابر ہے۔ ابو سلیمان کہتے ہیں کہ ایک دفعہ چند صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کسی غزوہ میں شریک تھے وہاں پر ان کا گزر ایک مرگی والے پر ہوا جو بالکل بیہوش پڑا تھا۔ کسی نے سورۃ فاتحہ کو پڑھ کر اس کے کان میں پھونک دیا (۔ اور وہ اچھا بچھا ہو گیا) حضرت کو خبر ہوئی تو فرمایا وہ اُمّ القرآن ہے اور ہر مرض کی دوا ہے۔ اسے ثعلبیؒ نے بروایت معاویہ بن صالح رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحوالہ ابو سلیمان بیان کیا ہے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا فاتحۃ الکتاب زہر تک کی دوا ہے۔ اسے سعید بن منصور نے (اپنے سنن میں) اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ ہم لوگ سفر میں تھے چلتے چلتے ایک موضع میں اترے، وہاں ایک لونڈی آکر کہنے لگی کہ اس قبیلہ کے سردار کو سانپ ڈس گیا ہے کیا تم میں کوئی منتر پڑھنے والا بھی ہے۔ یہ سن کر ہم میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ اور لونڈی کے ہمراہ جا کر سورۂ فاتحہ پڑھ کر سانپ کے ڈسے ہوئے پر پھونک دی وہ فوراً اچھا ہو گیا۔ جب ہم سفر سے واپس آئے تو حضور ﷺ سے یہ ماجرا عرض کیا آپ نے اس شخص سے دریافت کیا تجھے کیوں کر معلوم ہوا کہ وہ منتر ہے۔ اسے امام بخاریؒ نے روایت کیا اور ابو الشیخ اور ابن حبان نے ثواب میں ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن یزید کہتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر مجھ پر دم کیا اور آفات وبلا سے محفوظ رہنے کے لئے یہ سورۃ پڑھ کر میرے منہ میں لعاب دہن مبارک ڈال دیا۔ اسے طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب تو بچھونے پر لیٹ کر سورۂ فاتحہ اور قل ھُو اللہ احد پڑھے گا تو موت کے سوا ہر چیز سے محفوظ و بے خوف رہے گا۔ اسے براء نے روایت کیا ہے۔

...... سورۃ البقرۃ ......

مدنی ہے، امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بیان کیا ہے کہ سورۃ البقرہ اور اور سورۂ نساء کے نزول کے وقت میں حضور ﷺ کے پاس ہی تھی اس کی آیتیں ۲۸۷ اور کلمے ۶۱۲۱، اور حروف ۲۵۵۰۰ ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

الٓمّٓ ① قرآن مجید کی بعض سورتوں کی ابتداء میں جو حروف مقطعات (جستہ جستہ) آتے ہیں ان کی تحقیق میں علماء مفسرین کی مختلف رائیں اور متعدد اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں ان سورتوں کے نام ہیں جن کی ابتداء میں یہ واقعہ ہوئے ہیں اور بعض کہتے ہیں ان سے ایک کلام کے منقطع ہونے اور دوسرے کلام کے شروع ہونے پر مزید تنبیہ مقصود ہوا کرتی ہے (یعنی حروف مقطعہ کے واضع کی اصلی غرض یہ ہے کہ وہ ایک کلام کے انقطاع اور دوسرے کلام کے از سر نو شروع ہونے پر دلالت کریں) کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ حروف مقطعہ سے ان کلمات کی طرف اشارہ ہے جن کے شروع میں یہ حروف واقع ہیں جیسا کہ عرب کے ایک نامور اور مشہور شاعر کا قول ہے فقلتُ لَھَا قِفِی فقالتْ لِیْ قَافْ یعنی وقفت۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم ابو العالیہ سے روایت کرتے ہیں کہ الٓمّٓ میں الف سے آلاء اللہ، لام سے لطف خدا، اور میم سے

marfat.com

اس کا ملک بے زوال مراد ہے۔ عبد بن حمید اور ابن جریرؒ اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم ابو العالیہ سے یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ الٓر اور حٰمٓ اور ن کا مجموعہ الرحمٰن ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ الٓمّٓ کے معنی ہیں اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ (یعنی انا کا الف اللہ کا لام اور اعلم کی میم ہے) علامہ بغویؒ نے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ الٓمّٓصٓ کے معنی ہیں اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ وَاَفْصِلُ (یعنی میں خدا ہوں سب چیزوں سے واقف اور ہر بات میں بہتر فیصلہ دینے والا) اسی طرح الٓرٰ کے معنی ہیں اَنَا اللّٰہُ اَرٰی (یعنی میں خدا ہوں ہر چیز کو دیکھتا) اور الٓمّٓرٰ سے اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ وَاَرٰی مراد ہے (یعنی میں خدا ہوں جانتا ہوں اور دیکھتا ہوں) [۱] بعض علماء کا خیال ہے کہ حروف مقطعہ سے قوموں کی زندگی کی مدتیں اور اس امت کے بڑے انقلابات مراد ہیں بحساب ابجد [۲] چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور ابن جریرؒ نے بسند ضعیف بیان کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ یہودی آئے اور آپ نے ان کے روبرو سورۂ بقرہ پڑھی تو انہوں نے حساب لگا کر اور جی ہی جی میں کچھ شمار کر کے کہا کہ ہم ایسے دین میں کیوں کر داخل ہو سکتے ہیں جس کے رواج کی مدت زیادہ سے زیادہ اکہتر (۷۱) برس ہیں (کیونکہ الٓمّٓ کے کل اعداد بحساب ابجد اکہتر ہوتے ہیں) نبی کریم ﷺ نے سنا تو مسکرا کر خاموش ہو گئے اس پر یہودیوں نے حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کیا اس کے علاوہ کچھ اور بھی آپ پر نازل ہوا ہے۔ فرمایا ہاں! الٓمّٓصٓ اور الٓرٰ اور الٓمّٓرٰ یہ سن کر یہود بولے کہ ابو القاسم! تم نے ہم کو اشتباہ میں ڈال دیا (کیونکہ الٓمّٓصٓ کے عدد ۱۶۱ اور الٓرٰ کے عدد ۲۳۱ اور الٓمّٓرٰ کے عدد ۲۷۱ ہیں) اب ہم حیران اور سخت حیران ہیں کہ کس کو لیں اور کس کو چھوڑیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تمام اقوال جو حروف مقطعات کی تحقیق میں بعض مفسرین نے نقل کئے ہیں (اور جن کا میں نے قدرے بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے) سب کے سب علماء محققین کے نزدیک مردود اور نامقبول ہیں قول اول اس لئے غلط ہے کہ حروف مقطعات کو سورتوں کے نام تسلیم کر لینے کی تقدیر پر لازم آتا ہے کہ ایک ہی واضع کی طرف سے اعلام میں اشتراک واقع ہو اور یہ (نہ صرف بلغاء کے نزدیک ناپسند اور مکروہ ہے بلکہ) مقصود بالعلمیۃ کے صریح منافی ہے۔ علاوہ بریں ایک چیز کا تین یا تین سے زیادہ کلمات سے مرکب کر کے نام رکھنے کو اہل دانش کا ذوق سلیم انکار کرتا ہے اور نیز بعض سورتوں کا ان ناموں کے ساتھ موسوم ہونا اور بعض کا نہ ہونا یہ بھی شان متکلم سے بعید ہے۔ دوسرا قول اس لئے غلط ہے کہ حروف مقطعات نہ صرف وضعاً بلکہ عرفاً بھی اس لئے مقرر نہیں کئے گئے ہیں کہ ان سے ایک کلام کے منقطع ہونے اور دوسرے کلام کے از سرنو شروع ہونے پر مزید تنبیہ مقصود ہو وجہ یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو ہر سورت کی ابتداء میں حروف مقطعات کا ہونا ضروری اور لازمی تھا۔ تیسرے قول کی غلطی کی یہ وجہ ہے کہ حروف مقطعات سے کلمہ کے بعض حرف پر اقتصار کرنے کی طرف اشارہ ہونا یہ کلام عرب میں غیر مستعمل ہے اور اس پر شعر سے سند لانا محض شاذ اور نامقبول ہے۔ علاوہ ازیں شعر میں کلمہ قٓ اس بات پر قرینہ صریح ہے کہ شاعر کی مخاطبہ کا قول قاف وَقَفْتُ سے ماخوذ ہے بخلاف حروف مقطعات کے کہ وہاں اس قسم کا کوئی قرینہ پایا نہیں جاتا مثلاً الٓمّٓ میں کوئی قرینہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ الف کلمہ آلاء اللہ سے اور لام لطف اللہ سے اور میم ملک اللہ سے ماخوذ ہے (اور جب یہ ہے تو الف سے خداوندی نعمتیں اور لام سے اس کا لطف اور میم سے ملک بے زوال مراد لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا) اب رہی یہ بات کہ بعض صحابیوں اور تابعیوں سے جو اس قسم کے آثار و اقوال منقول ہیں ان کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ وہ اقوال مصروف عن الظاہر ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو گا تو ان کے اقوال میں تعارض ماننا پڑے گا (اور قطع نظر اس کے ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی جو

---

[۱] ابو العالیہ اور حضرت ابن عباسؓ کے مختلف الروایۃ اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف حروف مقطعہ مختلف کلمات کے مخففات ہیں اور ایک ایک حرف ایک ایک کلمہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ۱۲

[۲] اہل فارس نے کسی کے سنہ ولادت و وفات یا کسی بادشاہ کی تاج پوشی یا کسی غیر معمولی واقعہ کی مدت وقوع یاد رکھنے کے لئے حروف ابجد کا عددی حساب مقرر کر رکھا تھا۔ عدد ابجد کا واضع عرب نہیں۔ نہ عرب میں اس کا استعمال کبھی ہوا اس لئے اس حساب کو ملحق بالعربیۃ یا معرب بھی نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن یہودی علماء حساب ابجد سے واقف تھے اس لئے حساب لگا کر انہوں نے سوال کیا تھا۔ ۱۲

marfat.com

شیوہ متکلم اور شان فصیح کے سراسر خلاف ہے) کیونکہ جب چند کلمے کئی حرفوں کو شامل ہیں تو ان میں سے صرف ایک کلمہ کے ساتھ حرف کی تخصیص کرنا اور دیگر حرفوں سے اعراض کرنا بھی ترجیح بلا مرجح ہے۔ رہا جناب نبی کریم ﷺ کا فہم یہودی پر مسکرانا تو ظاہر یہ ہے کہ آپ کا یہ تبسم (تبسم رضانہ تھا بلکہ) اس کی جہل و نادانی اور کم فہمی پر تعجب اور تعجب کے ساتھ تبسم تھا۔ اور بعض مفسروں نے جو یہ کہا ہے کہ حروف مقطعہ قسمیہ حروف ہیں۔ یعنی یہ حروف چونکہ خاص قسم کی شرافت و بزرگی رکھتے ہیں کیونکہ یہ مادۂ اسماء الٰہی اور اصول لغات ہیں اور اس لئے خدا نے ان کی قسم کھائی ہے تو یہ تاویل چند ایسی چیزوں کی محتاج ہے جن پر اب تک کوئی یقینی دلیل اور قطعی برہان قائم نہیں کی گئی (الغرض علماء محققین نے مفسروں کی ان توجیہات کی جو حروف مقطعات کے بارے میں یہاں مذکور ہوئیں بوجوہ بالا تردید کی ہے اور کسی توجیہ کو قابل تسلیم نہیں بتلایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی بیضاوی نے (جو مفسرین کے طبقہ میں بڑی پائگاہ رکھتے ہیں) ان تمام توجیہات سے پہلو بچا کر ایک عجیب (اور نہایت معرکتہ الآرا) توجیہ اختیار کی ہے (چنانچہ فرماتے ہیں کہ) چونکہ حروف تہجی عنصر کلام اور مادّۂ لغات ہیں اور کلام ان ہی سے ترکیب پاتا ہے اس لئے ان میں سے بعض حروف کے ساتھ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتداء کی گئی ہے اس سے ان لوگوں کو تنبیہ کرنی مقصود ہے جو قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کرتے اور اسے غیر خدا کا کلام بتاتے تھے کہ جو کلام تمہیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے ان ہی حرفوں سے مرکب ہے جن سے تم اپنے کلام کو ترکیب دیتے ہو پھر اگر یہ خدا کا کلام نہیں ہے تو اس جیسے کلام بنالانے سے تم کیوں عاجز ہوتے ہو اور نیز حروف تہجی اس لئے بھی سورتوں کی ابتداء میں لائے گئے ہیں کہ سب سے پیشتر جو سامعین کے کانوں میں پہنچے وہ اعجاز کی ایک نوع مستقل ہو کیونکہ (حرفوں کے نام بغیر لکھنے پڑھنے کی مشق کے پہچاننے نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہیں اور جب یہ ہے تو) امی محض کا اسماء حروف کو ذکر کرنا صریح معجزہ ہے (علاوہ ازیں) ان حرفوں کے لانے میں ان نکات و دقائق کی رعایت کی گئی ہے جن سے بڑے سے بڑا ادیب جو فن ادب میں فائق و مشہور ہو محض عاجز و قاصر رہتا ہے اور ماہر عربیت ان کی نگہداشت نہیں کر سکتا۔ مجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ قرآن مجید کی انتیس سورتوں میں (جو گنتی کے لحاظ سے حروف تہجی کے برابر ہیں) چودہ حروف لائے گئے ہیں (جو حروف تہجی سے نصف ہیں) اور ایسے انداز سے لائے گئے ہیں کہ حروف کی تمام قسموں یعنی مہموسہ، مجہورہ، شدیدہ اور رخوہ وغیرہ سب کو احاطہ کئے ہوئے ہیں کیونکہ ہر قسم کے نصف نصف حروف ان میں موجود ہیں جیسا کہ اس کی تفصیل سابق میں گزر چکی ہے۔ مجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں کی ابتداء میں وہی چودہ حروف لائے گئے ہیں جن سے اکثر کلام مرکب ہوا کرتا ہے ان کے علاوہ باقی چودہ حروف جو مقطعات کی فہرست سے خارج ہیں وہ ترکیب کلام کا کام نہیں دیتے گویا الٓمٓ اور الٓرٰ وغیرہ کے معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن جس کے مقابلہ کی دعوت دی جارہی ہے ان ہی حروف کی جنس سے مرکب ہے جنسے تمہارے کلام ترکیب پاتے ہیں (تو اگر یہ کلام خدا نہیں بلکہ کلام بشر ہے) تو تم اے منکرین قرآن اس جیسا کلام بنالانے سے کیوں عاجز ہوتے ہو۔

قرآنی مقطعات میں میرے نزدیک (قطعی فیصلہ اور) حق بات یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے متشابہات اور ان مخفی رموز و اسرار میں سے ہیں جو صرف حق تعالیٰ اور اس کے نبی کریم ﷺ کے مابین دائر ہیں اور جنہیں عام لوگ سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتے بلکہ خود خدا کو منظور نہیں کہ عام لوگ ان سے مطلع ہوں۔ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کریم ﷺ کو اور آپ کے کامل پیروں اور معتقدوں میں سے جسے چاہا اس کو سمجھا دیا۔ امام بغویؒ کہتے ہیں کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہر کتاب میں ایک مخفی بھید اور پوشیدہ راز ہوا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں خدا کا بھید اوائل سور یعنی حروف مقطعات ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ہر کتاب کا ایک انتخاب اور خلاصہ ہوا کرتا ہے۔ قرآن مجید کا خلاصہ حروف تہجی ہیں۔ اس روایت کو امام ثعلبیؒ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علیؓ وغیرہ سے روایت کیا ہے اور سمرقندی نے حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔ قرطبی نے سفیان ثوری سے اور ربیع بن خثیم اور

marfat.com

ابو بکر بن الانباری اور ابن ابی حاتم اور محدثین کی ایک کثیر جماعت نے (مختلف رواۃ سے) نقل کیا ہے۔

حضرت سجاوندیؒ کا قول ہے کہ حروف مقطعات کے بارہ میں صدر اول کے تمام لوگوں کے متفقہ الفاظ یہ ہیں اِنَّهَا سِتْرٌ بَيْنَ اللّٰهِ وَبَيْنَ نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (یعنی وہ خدا اور اس کے نبی کریم ﷺ کے درمیان میں ایک بھید ہیں) اور کبھی ایسے دو شخصوں کے درمیان جو باہم ایک دوسرے کے راز دار اور مزاج شناس ہوتے ہیں وہ راز کی باتیں اور معمے جاری ہوتے ہیں جو ان کے باہمی اسرار کی طرف مشیر ہوتے ہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ مقطعات اور متشابہات کا علم صرف خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے نہ تو جناب نبی کریم ﷺ ہی ان پر مطلع ہوئے اور نہ آپ کے اتباع اور پیروؤں ہی میں سے کوئی شخص مطلع ہوا۔ نہایت بعید اور دور از قیاس ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ قرآن کریم معلوم المعنی نہ ہو نیز متکلم کی جانب سے جب خطاب ہوتا ہے تو اس سے سامع کی تفہیم مقصود ہوا کرتی ہے تو اگر حروف مقطعات سے سننے والوں کو کوئی فائدہ مترتب نہ ہوگا اور شارع کو ان سے کسی طرح کی تفہیم و افہام مدّ نظر نہ ہوگی تو حروف مقطعات سے لوگوں کو خطاب کرنا گویا مہمل اور بے معنے کلمات سے خطاب کرنا ہوگا یا ہندی شخص سے عربی زبان میں کلام کرنا اور اس صورت میں قرآن مجید بتمامہ بیان و ہدایت نہ رہے گا اور نیز خدا کا اپنے اس قول ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ میں معاذ اللہ وعدہ خلاف ہونا لازم آئے گا کیونکہ یہ آیت بطریق اقتضاء صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن مجید متشابہ ہو یا محکم۔ اس کا بیان و تفسیر نبی ﷺ کے لئے خدا کی طرف سے واجب و ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ حروف مقطعات اور متشابہات کا علم جناب نبی کریم ﷺ کو ضرور تھا اور نہ صرف نبی ﷺ کو بلکہ آپ کے اتباع کاملین کو بھی تھا چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ میں راسخین فی العلم میں سے ہوں اور جو لوگ متشابہات اور مقطعات کی تفسیر کے عالم ہیں ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ یہی قول (بہ تبدیل الفاظ) حضرت مجاہد کا بھی ہے اس امت مرحومہ میں سے کہ جس کا حال معلوم نہیں کہ اس کا اول بہتر ہے یا آخر اور شاید اس کا آخر کثرت کے اعتبار سے بڑا عریض اور بڑا عمیق ہے اور نہایت اچھا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے جو اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قرآنی مقطعات اور اس کے اسرار کی تاویل ظاہر کی ہے لیکن ان کا بیان و تفسیر عام لوگوں کے لئے ناممکن ہے تو اس سے بھی حروف مقطعات کا اسرار الٰہی میں سے ایک سر ہونا اور ان کے علم کے ساتھ صرف خدا ہی کا مخصوص ہونا باطل اور غلط ٹھیرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حروف مقطعات اسمائے الٰہی ہیں جیسا کہ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح بتایا ہے۔ ابن ماجہ کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے یا كٓهٰيٰعٓصٓ اِغْفِرْلِيْ۔ ربیع بن انس کہتے ہیں كٓهٰيٰعٓصٓ کے یہ معنی ہیں کہ وہ جس کو چاہے پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دیتا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ حروف مقطعات قرآن کے نام ہیں جیسا کہ عبد الرزاق نے قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے قتادہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ حروف مقطعات سے قرآن اور کتاب ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ [1]

میں کہتا ہوں کہ اگر قرآنی مقطعات کی بابت اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اسماء الٰہی ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی قطعاً ماننا پڑے گا کہ وہ خدا کی بعض صفات پر دلالت کرتے ہیں جیسے کہ اور اسماء صفات دلالت کرتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جب وہ قرآن کے نام مان لئے جائیں گے تو بعض صفات قرآنی پر ضرور دلالت کریں گے جیسا کہ لفظ قرآن اور فرقان اور نور اور حیات اور روح اور ذکر اور کتاب وغیرہ قرآنی صفات میں سے ایک نہ ایک صفت پر ضرور دلالت کرتے ہیں مگر مقطعات کی دلالت دونوں

---

[1] جب کتاب اور قرآن کو حروف مقطعات کی خبر قرار دیا گیا اور خبر و مبتدا میں اتحاد وجود ضروری ہے تو معلوم ہوا کہ حروف مقطعات قرآن کے اسماء ہیں۔ کیوں کہ اسم و مسمّی متحد بالذات ہوتے ہیں۔

marfat.com

تقدیر پر اس طرح کی نہیں ہے جسے عام لوگ سمجھ سکتے ہوں بلکہ فہم مخاطب کے ساتھ مختص ہے یا جسے خدا تعالیٰ سمجھانا چاہے اور اس بات کا حکم لگا دینا کہ وہ اسماء الٰہی ہیں اسی وقت متصور ہو سکتا ہے جبکہ ان کے معنی بھی سمجھے جاتے ہوں تو یہ دونوں قول بر تقدیر صحت اسی قول کی طرف راجع ہوں گے جس کی ہم سابق میں تحقیق کر آئے ہیں کہ حروف مقطعات خدا اور اس کے نبی کریم علیہ السلام کے درمیان اسرار ہیں جنہیں نبی علیہ السلام کے سوا دوسرا سمجھ نہیں سکتا۔ ہاں اگر خدا چاہتے تو آپ کے اتباع کاملین بھی سمجھ سکتے ہیں (اس قول کی بنا پر جس طرح حروف مقطعات کی حقیقت فہم عوام سے خارج ہے) اسی طرح قرآنی متشابہات کی حقیقت بھی انہیں دریافت نہیں ہو سکتی مثلاً آیت یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ، اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی اور هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وغیرہ اس قسم کی آیتیں ہیں جن کو ان کے ظاہری معنی پر حمل کرنا جیسا کہ کج فہم فرقہ مجسمہ نے کیا ہے مشکل اور محال ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک آیت صفات الٰہی میں سے ایک ایسی صفت خاص پر دلالت کرتی ہے جس کے سمجھنے کی عام لوگ قابلیت نہیں رکھتے البتہ نبی کریم علیہ السلام اور آپ کے اتباع میں سے بعض کاملین حضرات اس کی حقیقت اور تہ کو پہنچ گئے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل اور ابہام کی توضیح یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات لا متناہی اور غیر محدود ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔ قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ (یعنی اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے گا) اور فرمایا وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰهِ (یعنی زمین میں جتنے درخت ہیں اگر ان سب کے قلم ہوں اور سمندر کی سیاہی اور وہ بھی اس طرح پر کہ اس کے ہو چکے پیچھے ویسے ہی سات سمندر اور اس کی مدد کریں غرض ان تمام قلموں اور ساری روشنائیوں سے خدا کی باتیں لکھی جائیں تو بھی خدا کی باتیں تمام نہ ہوں)۔

اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو الفاظ معانی کے مقابلہ میں موضوع ہوئے ہیں وہ متناہی اور محدود ہیں۔ ادھر عقول انسانیہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کی کنہ اور حقیقت دریافت کرنے سے محض قاصر و عاجز ہیں ہاں معیت ذاتیہ یا صفات غیر متکیفہ میں سے ایک نوع کے ساتھ اس کا دریافت کرنا ممکن اور متصور ہو سکتا ہے اور یہ بات فہم عوام اور نہ صرف فہم عوام بلکہ فہم خواص سے بھی بہت دور ہے کیونکہ خواص لوگ باوجود حصول ادراک کے اس کی حقیت کا ادراک مرتبہ ذات میں نہیں کر سکتے جیسا کہ رئیس الصدیقین کا قول ہے۔ شِعْرٌ العجزُ عَنْ دَرْکِ الْاِدْرَاکُ ادراکٌ ۔ والبحث عن سِرِّ الذَّاتِ اِشْرَاکٌ (یعنی ادراک کے پالینے سے عاجز ہونا بھی ایک قسم کا ادراک ہے اور ذات خداوندی کے سر کی تلاش و جستجو میں مستغرق رہنا شرک) مگر چونکہ بعض صفات باری تعالیٰ کو صفات ممکنات کے ساتھ غایات یا بعض طرح کی مشاکلات میں شرکت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان صفات کو ایسے اسماء کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو ان صفات پر دلالت کرتے ہیں جو مخلوقات میں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً حیات اور علم اور سمع اور بصر اور ارادہ اور رحمت اور قہر یا اس قسم کی اور صفات باری جب بیان کی جاتی ہیں تو آدمی بجائے خود گمان کر لیتا ہے کہ میں سب صفات الٰہیہ کو سمجھ گیا اور ان کی حقیقت مجھے معلوم ہو گئی۔ حالانکہ واقع میں بجز بعض وجوہ صفات کے اور کچھ خاک نہیں سمجھتا، وجہ یہ کہ بعض دوسری صفات جو ممکنات کی صفات سے شرکت نہیں رکھتیں وہ اس طریقہ کے ساتھ تعبیر ہی نہیں کی جاتیں تو ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جن کا علم صرف خدا ہی کو ہوتا ہے اور بعض صفات وہ بھی ہوتی ہیں جن کا علم و فہم اپنی مخلوقات میں سے خواص (اور اخص الخواص) کو عنایت فرما دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی اکرم علیہ السلام دعا میں فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اِسْمٍ هُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَکَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ (یعنی اے بار خدایا میں تیرے ہر اس نام کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو تیرے لئے مخصوص ہے اور جو تو نے اپنے پاس رکھ کر کسی کو اس کی اطلاع تک نہیں دی ہے) حدیث کو ابن حبان نے اپنی

maarifat.com

صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد اور ابو یعلی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بڑی طویل حدیث میں روایت کیا ہے۔ جس کا شروع ان لفظوں سے ہے لمن اصابه الهم۔ اسی طرح طبرانی نے حدیث ابی موسیٰ میں روایت کیا ہے۔ الغرض ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان اسماء میں سے جو عام لوگوں سے مخفی ہیں اور جن کے مقابلہ میں ان کی زبان و لغت میں الفاظ وضع نہیں کئے گئے ہیں بعض اسماء اپنے نبی ﷺ کو اور نبی ﷺ کے علاوہ ان لوگوں کو بھی تعلیم و الہام کر دیئے ہوں جنہوں نے نبی اکرم کی پیروی میں انتہا سے زیادہ سرگرمی دکھائی اور نہ صرف تعلیم و الہام پر بس کی ہو بلکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا بدیہی اور یقینی علم پیدا کر دیا ہو جو (خود بخود) ان حرفوں سے مستفاد ہوتا ہو جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام تعلیم کر دیئے اور ان میں ایک بدیہی علم پیدا کر دیا بغیر اس کے کہ انہیں پہلے سے اس بات کا علم ہو کہ یہ لفظ اس معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تسلسل لازم آتا اور ممکن ہے کہ یہ اسماء اور اسماء کے ساتھ صفات جناب نبی عربی ﷺ پر ان حروف تہجی یعنی مقطعات کی تلاوت کے وقت جلوہ گر ہو گئے ہوں۔ میرے شیخ و استاد قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا ہے اور کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص سارے قرآن کو من اولہ الیٰ آخرہ نظر کشف سے دیکھے گا تو اس پر یہ بات بخوبی ظاہر ہو جائے گی کیونکہ قرآن مجید گویا برکات الٰہیہ کا ایک نہایت عمیق اور گہرا دریا ہے اور اس عمیق اور طویل و عریض دریا میں حروف مقطعات ایسے ظاہر ہوتے ہیں جیسے بحر ذخار میں ابلتے ہوئے چشمے اور جوش مارتے ہوئے فوارے جنسے ایک بڑا دریا نکل کر بہتا ہے۔ اس مکاشفہ کے لحاظ سے اگر قرآنی مقطعات اسماء قرآنی قرار دیئے جائیں تو چنداں بعید نہیں گویا سارا قرآن اس اجمال کی تفصیل ہے جو حروف مقطعات میں موجود ہے واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں یہ توجیہ اس قول کے ہرگز مخالف و منافی نہیں جسے بیضاوی نے اختیار کیا ہے کیونکہ قرآن کی ہر آیت کے لئے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد علم کے واسطے ایک مطلع ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ ہر حرف کے لئے حد ہے اور ہر حد کے لئے مطلع ہے۔ اس کو بغوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا پس جس طرح حروف تہجی ظاہر میں عنصر قرآن اور بسائط قرآن ہیں اور اکثر کلام ان ہی سے ترکیب پاتا ہے نیز قرآن میں طرح طرح کے لطائف اور قسم قسم کے اعجاز کی رعایت رکھی گئی ہے اسی طرح یہی حروف اجمال قرآن اور برکات الٰہیہ کے بحر ذخّار کے جوش زن چشمے اور خدا اور رسول کے درمیان وہ اسرار ہیں جن پر خدا کے سوا اور کوئی مطلع نہیں ہو سکتا ہاں وہ شخص اطلاع پا سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ خطاب کا اعزاز بخشے یا کسی اور طرح سے اپنے اسرار خاص پر واقف کرنا چاہے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یعنی وہ کتاب ہے جسے محمد ﷺ پڑھتے اور مشرکین اس کی تکذیب کے درپے ہوتے ہیں ذٰلِکَ سے قرآن مجید کے اس حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سورۃ بقرۃ سے پیشتر نازل ہو چکا تھا اور ممکن ہے کہ سارے قرآن مجید کی طرف اشارہ ہو جس کا کچھ حصہ اس سے پہلے نازل ہو چکا تھا بہر صورت ذٰلک مبتدا ہے اور الکتٰب خبر یعنی یہ وہ کتاب ہے جس کا وعدہ پیغمبر صاحب کو دیا گیا۔ یا یوں کہو کہ یہی وہ کامل مکمل کتاب ہے جو کتاب کے ساتھ نامزد ہونے کے قابل ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے الکتاب صفت ہو اور مابعد خبر۔ بعض مفسروں کا بیان ہے کہ یہاں ھٰذا کا لفظ مضمر ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے کہ اے محمد ﷺ یہ جو کچھ تم پر وحی کیا جاتا ہے یہ وہ کتاب ہے جس کے اتارنے کا وعدہ ہم نے توریت اور انجیل میں کیا ہے۔ یا یہ وہ کتاب ہے جس کا ہم نے اس سے پیشتر اپنے قول اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً میں تم سے وعدہ کیا تھا اس صورت میں لفظ ذلک مبتدا محذوف کی خبر ہو گا اور الکتاب اس کی صفت۔ کتاب ہے تو مصدر لیکن معنی میں ہے مکتوب کے (اور مصدر کا مفعول کے معنی میں مستعمل ہونا کثرت سے شائع ہے) اور اس کے اصلی معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں۔ لشکر کو اسی واسطے کتیبہ کہا جاتا ہے کہ اس میں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ کتاب کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس میں ایک حرف دوسرے حرف سے ملتا اور جمع ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ وہ لکھی جاتی ہے۔ پھر ذٰلک کا لفظ جو بعید مشار الیہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے یہاں اس سے کتاب کی تعظیم شان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

marfat.com

لَا رَیْبَ ۚۛ فِیْهِ ۚۛ یعنی اس کتاب کے دلائل ایسے واضح اور براہین اس درجہ روشن ہیں کہ نظر صحیح کے بعد منصف آدمی اس کی وحی اور منجانب اللہ ہونے میں ذرا شک نہیں کر سکتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں خبر انشا کے معنٰی میں ہے یعنی لوگو! اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں شک وشبہ نہ کرو۔ لَا رَیْبَ میں لَا نفی جنس کے لئے رَیْبَ اسم ہے اور فِیہ خبر یا یوں کہو کہ فیہ صفت اور للمتقین خبر اور ھدی بلحاظ حال منصوب یا لا کی خبر تو محذوف مانو جیسے لا ضیر میں اور فیہ کو ھدی کی خبر کہہ دو جو ھدی کے نکرہ ہونے کی وجہ سے اس پر مقدم ہو گئی ہے۔ تقدیر عبارت یوں سمجھ لاریب فیہ فیہ ھدی (یہ سب توجیہیں گو بجائے خود درست اور بجا ہیں) لیکن بہتر اور سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ یہ سب مسلسل مگر علیحٰدہ علیحٰدہ جملے قرار دیئے جائیں اور ہر جملہ لاحقہ کو سابقہ کی تاکید مانا جائے یہی وجہ ہے کہ دو جملوں کے بیچ میں حرف عطف نہیں لایا گیا پس ذلک الکتب ایک ایسا جملہ ہے جو اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ یہ کتاب ایسے اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے جو غایت کمال کے ساتھ موصوف ہے اور اس حیثیت سے اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہو سکتا اسی پر قیاس کر لو ھدی للمتقین کو۔ ابن کثیرؒ نے فیہ کی ہ کو حالت وصل میں اشباع سے پڑھا ہے اور نہ صرف فیہ کی ہ کو بلکہ جس ضمیر غائب کا پہلا حرف ساکن ہوا سے وصل کی حالت میں اشباع سے یعنی کسرہ کو ی کی آواز میں پڑھا ہے بشرطیکہ حرف ساکن ی ہو ورنہ و کی آواز میں جیسے منہ اسی طرح تمام قراء ہ کو اشباع سے پڑھتے ہیں اگر اس سے پہلے کا حرف متحرک ہو۔ پھر اگر وہ متحرک حرف مکسور ہے تو اشباع ی کے ساتھ ہوتا ہے ورنہ و سے جیسے یضربہ اور لہ میں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آخر میں حرف ساکن لاحق نہ ہو کیونکہ آخر میں ساکن لاحق ہو گا تو اجتماع ساکنین کی وجہ سے باتفاق تمام قراء اشباع ساقط ہو جائے گا جیسے علیہ الکتب اور لہ الحکم، مگر جب کلمہ ناقص ہو یعنی جزم کی وجہ سے آخر کا اصلی حرف حذف ہو گیا ہو مثلاً یُؤَدِّهٖ، نُوَلِّهٖ، نُصْلِهٖ، فَاَلْقِهْ، یَتَّقِهٖ، یَاْتِهٖ، یرضہ اور جب ہ کا پہلا حرف متحرک بھی ہو تو اس میں قراء کا اختلاف ہے۔ جس کی تفصیلی بحث تو ہم آگے چل کر انشاء اللہ تعالیٰ اس کے موقع پر کریں گے مگر مجمل یہ ہے کہ بعض قاری ماقبل کے حرف کے تحرک پر نظر کر کے اشباع سے پڑھتے ہیں اور بعض قاری بایں خیال سکون سے پڑھتے ہیں کہ ماقبل کے حرف کی حرکت محذوف حرف کے قائم مقام ہے۔ اور بعض اس لحاظ سے کہ ہ کے پہلے حرف کی حرکت عارضی اور محذوف حرف پر تنبیہ کر رہی ہے اختلاس سے پڑھتے ہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (یہ کتاب پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے) یہ تیسرا جملہ ہے جو کتاب یعنی قرآن کے برحق ہونے اور اس میں کسی طرح کے شک وشبہ کو دخل نہ پانے کی تاکید کر رہا ہے یا ان میں کا ہر ایک جملہ یعنی سابق کے پیچھے لاحق اس طرح لگا چلا آتا ہے جس طرح دلیل کے پیچھے مدلول یا علت کے پیچھے معلول ہوا کرتا ہے گویا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ کتاب حد کمال کو پہنچ گئی ہے لہٰذا اس کے منجانب اللہ ہونے میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا (اور جب یہ ہے) تو (پرہیزگاروں کے لئے سرتاپا) ہدایت ہے۔ ہدایت کا استعمال دو معنی میں ہوا کرتا ہے ایک صرف مقصد کا رستہ بتا دینے میں دوسرے نہ صرف رستہ بتا دینے میں بلکہ مقصد تک پہنچا دینے میں۔ ھُدًی ہے تو مصدر لیکن معنی ہے ہادی کے یا مصدر کا ذکر مبالغۃً ہوا ہے جیسے زیدٌ عدلٌ میں پھر ہدایت کی تخصیص پرہیزگاروں کے ساتھ بلحاظ معنی اول تو اس لئے ہے کہ قرآنی ہدایت سے خاص کر یہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں یعنی ہرچند کہ قرآنی ہدایت عام طور پر ہر مسلمان اور کافر کو شامل ہے جیسا کہ قرآن کے دوسرے موقع پر ارشاد ہوا ہے۔ ھُدًی لِّلنَّاسِ لیکن اس سے متمتع ہونا اور فائدہ حاصل کرنا صرف پرہیزگاروں کا حصہ ہے اور معنی ثانی کے اعتبار سے تخصیص کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ مقصود کی طرف رہنمائی ان ہی لوگوں کو مفید پڑتی ہے جن کی عقل کا آئینہ صاف اور کدورت زندگی سے مجلی اور روشن ہوتا ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے غذائے صالح کہ بدن صحیح کو مفید پڑتی ہے نہ مریض وفاسد کو اسی لئے خدا تعالیٰ نے قرآن کے ایک موقع پر یوں ارشاد فرمایا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا۔ متقی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی حس ایسی چیز سے محفوظ رکھے جو اسے آخرت میں ضرررساں اور تکلیف دہ ثابت ہو پھر اگر وہ (مضرت دہ چیز) شرک ہے اور اس سے آدمی بچتا ہے تو یہ تقویٰ کا ادنیٰ مرتبہ ہے

marfat.com

گناہ اور معصیت سے بچنا تقویٰ کا وسطی مرتبہ ہے۔ مگر اعلیٰ درجہ کا متقی وہ ہے جو لایعنی چیزوں سے منہ موڑ کر ذکر الٰہی میں مستغرق ہو اسی تقویٰ کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں اصل میں تقویٰ اس کا نام ہے کہ تو اپنے نفس کو کسی سے بہتر و برتر نہ دیکھے۔ شہر بن حوشب کہتے ہیں متقی وہ ہے جو حرام اور ناجائز باتوں میں پڑ جانے کے خوف سے ان چیزوں کو ترک کر بیٹھے جن میں کوئی شرعی خطرہ نہ ہو۔ صحیحین میں بروایت ابن عدی بحوالہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان میں بہت سے مشتبہ امور ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جان سکتے تو جو شخص مشتبہ امور سے بچ گیا اس نے اپنی آبرو اور دین کو بے لوث اور پاک کر لیا اور جو مشتبہ امور میں پڑ گیا وہ حرام میں جا پڑا مثلاً اگر کوئی چرواہا کسی محفوظ ممنوع چراگاہ کے ارد گرد جانور چرا رہا ہو تو قریب ہے کہ وہ چراگاہ میں جا پڑے سنو !اور غور سے سنو کہ ہر بادشاہ کا ایک ممنوع باڑہ ہوتا ہے اور زمین پر خدا کا ممنوعہ علاقہ اس کے محارم ہیں! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست اور اصلاح یافتہ ہوتا ہے تو سارا بدن درست اور صحیح رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو !وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے۔

طبرانی صغیر میں روایت کرتے ہیں کہ حلال و حرام دونوں ظاہر ہیں تو جو چیز تجھے شک میں ڈالے اسے ترک کر کے غیر مشکوک کی طرف رخ کر۔

میں کہتا ہوں حدیث میں جو دل کی صلاحیت اور درستی کا ذکر ہوا ہے اس سے اصطلاح صوفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے مطابق فنائے قلب مراد ہے یعنی دل کی صلاحیت یہی ہے کہ اسے فنافی اللہ کر دیا جائے اور یہ مراتب ولایت میں سے پہلا مرتبہ ہے اور درستی جسم کو مستلزم ہے نیز ارتکاب محرمات کے خوف کے سبب مشتبہ امور سے تحفظ اسی کی بدولت حاصل ہوتا ہے الغرض تقویٰ ولایت کو لازم ہے (اور ہر متقی بشرطیکہ وہ کامل اور پورا متقی ہو ولایت کے ممتاز مرتبہ تک پہنچتا اور ضرور پہنچتا ہے) ان ہی متقیوں کی بابت خدا نے فرمایا ہے۔ اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ یعنی خدا کے ولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں۔ لیکن اس آیت میں مجازاً اس شخص کو متقی کہا گیا ہے جو تقویٰ کے دروازے کو کھٹکھٹا رہا ہے (اور گو ابھی تقویٰ کے لباس سے آراستہ نہیں ہوا مگر آخر کار اس کے درجے تک ضرور پہنچ جانے والا ہے) اس صورت میں ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے بالکل ویسے ہی معنی ہوں گے جو من قتل قتیلا فلہ سلبہ کے ہیں (یعنی جس طرح اس حدیث میں اس شخص کو مقتول کہا گیا ہے جو بالفعل نہیں مگر آئندہ مقتول ہوگا اسی طرح آیت میں اس شخص کو متقی کہا گیا ہے جو آئندہ تقویٰ کے مرتبہ کو پہنچے گا۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ یہ المتقین کی صفت ہے پھر اگر تقویٰ کی تفسیر شرک سے بچنے کے ساتھ کی جائے گی تو صفت احترازیہ ہوگی ورنہ کاشفہ یعنی تمام اصول اعمال کو جو ایمان اور نماز اور زکوٰۃ ہیں شامل ہوگی ان چیزوں کو اصول اعمال کہنے کی یہ وجہ ہے کہ ایمان ہر عمل کا سر ہے اور نماز دین کا ستون اور زکوٰۃ اسلام کا پل، اور ممکن ہے کہ صفت مادحہ ہو پھر اس صورت میں اَلَّذِیْنَ مبتدا ہوگا اور اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی خبر۔ ابو جعفر اور ابو عمرو اور ورش نے یُؤْمِنُوْنَ کو واؤ سے پڑھا ہے جو ہمزہ سے بدلا ہوا ہے اسی طرح ابو جعفر ہر ساکن ہمزہ کو حذف کرتے اور ضمہ کے بعد واقع ہو تو واؤ سے اور کسرہ کے بعد واقع ہو تو یا سے بدلتے ہیں مگر انبئھم اور نبئھم کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ ابو عمرو بغیر استثناء سب جگہ ساکن ہمزہ کو حذف کرتے ہیں مگر جہاں کہیں حالت جزم میں ہمزہ ساکن ہو یا وہ کلمہ ایک لغت سے نکل کر دوسرے لغت میں منتقل ہو گیا ہو تو حذف نہیں کرتے جیسے یھیی اور مُؤْصَدَۃٌ اور رئیا وغیرہ۔ ورش اس ساکن ہمزہ کو حذف کرتے ہیں جو فعل میں فاکلمہ کی جگہ واقع ہو لیکن نوعدی اور نوتہ کو مستثنیٰ بتاتے ہیں۔ فعل میں عین کلمہ کی جگہ ہمزہ واقع ہو تو بجز باب رئیا اور مکسور العین فعل کے کہیں حذف نہیں کرتے۔ ایمان کے لغوی معنی تصدیق کے ہیں جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (یہاں مؤمن بمعنی مصدق ہے) اور یہ تصدیق دل اور زبان دونوں سے تعلق رکھتی ہے لیکن شرعی ایمان یہ ہے کہ دل اور زبان دونوں سے اس

marfat.com

چیز کی تصدیق کی جائے جس کو جناب نبی عربی ﷺ خدا کے ہاں سے لائے اور جس کا علم یقینی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دلی تصدیق بغیر لسانی تصدیق کے معتبر نہیں البتہ حالت اکراہ اور اجبار میں معتبر ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ (یعنی باوجود یہ کہ فرعونیوں کے دل موسوی معجزوں کا یقین کر چکے تھے مگر انہوں نے ہیکڑی اور شیخی کے مارے ان کو نہ مانا) دیکھئے یہاں چونکہ دلی تصدیق کے ساتھ زبانی تصدیق نہ تھی اس لئے دلی تصدیق کا اعتبار نہیں کیا گیا اور فرمایا يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (یعنی یہودی جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اسی طرح (ہمارے) ان (پیغمبر محمد ﷺ) کو بھی پہچانتے ہیں) یہاں بھی یہودیوں کی دلی تصدیق کا اعتبار نہیں کیا گیا ہاں حالت اکراہ میں صرف تصدیق قلبی معتبر ہو سکتی ہے جیسا کہ قرآن میں ایک موقع پر ارشاد ہوا ہے اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ (یعنی جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو تو اس سے کچھ مواخذہ نہیں)۔

خلاصہ یہ کہ تصدیق قلبی بدون تصدیق زبانی کے حالت اکراہ میں معتبر ہے لیکن زبانی تصدیق بغیر دلی تصدیق کے مطلقاً کسی حالت میں معتبر نہیں جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (یعنی اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بے شک جھوٹے ہیں) رہے اعمال وہ ایمان میں داخل نہیں ہیں اس وجہ سے يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کا يُؤْمِنُوْنَ پر اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا اٰمَنُوْا پر عطف صحیح ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عمر بن الخطاب ؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک دن آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ دفعتہً ایک شخص نمودار ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت سیاہ تھے نہ تو اس پر سفر کا کچھ اثر معلوم ہوتا تھا اور نہ ہم میں سے کوئی اسے پہچان ہی سکتا تھا غرض یہ کہ وہ یہاں تک بڑھا چلا آیا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس آ گیا اور اپنے زانو حضرت کے زانو سے ملا کر بیٹھ گیا اور اپنی دونوں ہتھیلیاں حضرت کے زانوں پر رکھ دیں اور عرض کیا اے محمد ﷺ! مجھے اسلام کی حقیقت بتلائیے۔ آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ خدا کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور محمد رسول خدا ہیں اور نماز ٹھیک طور پر پڑھ زکوٰۃ دے، رمضان کے روزے رکھ، اگر کسی سواری کا مقدور ہو تو خانہ خدا کا حج کر۔ اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے بالکل سچ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ یہ شخص خود ہی تو سوال کرتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے پھر اس نے کہا حضرت! مجھے ایمان کی حقیقت بتلائیے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو خدا کو، اس کے فرشتوں، کو اس کی کتابوں کو، اس کے پیغمبروں کو، روز قیامت کو، تقدیر کے برے بھلے کو دل سے مانے۔ اس نے کہا آپ ﷺ نے ٹھیک فرمایا پھر کہا اب احسان کی حقیقت سے اطلاع دیجئے۔ ارشاد ہوا احسان یہ ہے کہ تو خدا کی اس طرح عبادت کرے جیسے کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر اس طرح نہ ہو سکے تو (یہ یقین رکھ کہ) وہ تجھے دیکھ رہا ہے، پھر اس نے کہا قیامت کے متعلق فرمایئے کہ کب برپا ہو گی ارشاد فرمایا کہ کیا جواب دیئے (پوچھے) ہوئے والے سے اس کو کچھ زیادہ نہیں جانتا (یعنی قیامت کی نا واقفی میں میں اور آپ دونوں برابر ہیں) اس نے کہا تو اس کے پتے (ہی بتا دیجئے) فرمایا قیامت کی نشانی یہ کہ لونڈی اپنے مالک اور آقا کو جنے۔ مطلب یہ کہ قیامت کے قریب لونڈی کے بچوں کی کثرت ہو گی) دوسری نشانی یہ ہے کہ ننگے پاؤں برہنہ بدن محتاج بکریوں کے چرواہے باہم مقابلہ میں اونچی اونچی عمارتوں پر فخر کریں گے۔

حضرت عمر ؓ کہتے ہیں اس کے بعد وہ شخص چلا گیا میں تھوڑی دیر تک حضرت کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا عمر! تم جانتے ہو یہ سائل کون تھا میں نے عرض کیا خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا جبرئیل تھے اور اس غرض سے آئے تھے کہ تمہیں تمہارے دین کی تعلیم دیں۔ یہی روایت شیخین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قدرے لفظی اختلاف کے ساتھ نقل کی ہے چنانچہ اس روایت میں بجائے وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ کے یہ الفاظ آئے ہیں اِذَا رَاَيْتَ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوْكَ الْاَرْضِ فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَرَءَ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الاية (یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے سائل (جبرئیل علیہ السلام) سے فرمایا کہ قیامت کے برپا ہونے کی ایک یہ بھی

marfat.com

نشانی ہے کہ تو برہنہ جسم، برہنہ پا، گونگوں، بہروں کو زمین کا بادشاہ اور ملک کا حکمران دیکھے۔ قیامت مجملہ ان پانچ چیزوں کے ہے جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ازاں بعد حضور ﷺ نے (سورۃ لقمان کے آخر کی) یہ آیت پڑھی اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ الایۃ (خدا ہی کو قیامت کے آنے کا علم ہے اور وہی ایک وقت مقررہ پر جس کو اس کی سوا کوئی نہیں جانتا۔ مینہ برساتا اور نر و مادہ جو کچھ ماؤں کے پیٹ میں ہے وہی اس کو جانتا ہے اور کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ خود کل کیا کرے گا۔ اور کوئی شخص یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ سب باتوں کا جاننے والا اور باخبر ہے) الغرض حدیث مذکور صاف طور پر بتا رہی ہے کہ اسلام ظاہری اعمال کا نام ہے اور یہی معنی ہیں آیت قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا کے (یعنی عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اے پیغمبر ﷺ تم ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہاں یوں کہو کہ مسلمان ہو گئے) قرآن و حدیث کے اکثر مواقع سے ایمان و اسلام کی باہمی مغائرت اور تضاد کا ثبوت ملتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان اور چیز ہے اور اسلام اور چیز۔ لیکن قرآن و حدیث کے اکثر مواقع پر اسلام کا اطلاق ایمان پر بھی ہوا ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کچھ تفاوت و فرق نہیں جیسا کہ اس آیت میں اِذۡ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسۡلِمۡ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (یہاں باتفاق علماء امت اسلام سے ایمان مراد ہے) خلاصہ یہ کہ شرعی اصطلاح میں اسلام کا لفظ ظاہری اعمال اور باطنی افعال دونوں معنوں میں مشترک ہے۔ غیب مصدر ہے اور اس کا تعلق یؤمنون کے ساتھ مبالغۃً ہوا ہے جیسے شہادت کے لفظ کا قال اللہ تعالیٰ "عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ" غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو آدمیوں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، فرشتے، آدمیوں کا مرے پیچھے زندہ اٹھ کھڑا ہونا، جنت و دوزخ، پل صراط، میزان عذاب قبر وغیرہ

بِالۡغَیۡبِ اگرچہ بظاہر ترکیباً جار مجرور واقع ہوا ہے لیکن حقیقت میں یُؤۡمِنُوۡنَ کا مفعول بہ ہے اور با زائد ہے یا یوں کہو مصدر فاعل کے معنی میں ہے اور یُؤۡمِنُوۡنَ کے فاعل سے حال واقع ہوا ہے تقدیر عبارت یوں ہے یُؤۡمِنُوۡنَ غَآئِبِیۡنَ عَنۡکُمۡ اس بنا پر جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ متقی وہ صاف باطن لوگ ہیں جو اے مسلمانو تم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی ویسے ہی ایمان کا دلی اعتراف کرتے ہیں جیسے منہ در منہ اور سامنے۔ وہ ان بد باطن اور دغاباز منافقوں جیسے نہیں ہیں جو مسلمانوں کے سامنے تو ان کو رضا جوئی کیلئے ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر پیٹھ پیچھے صاف انکار کر جاتے ہیں یا یوں کہیے کہ مؤمن بہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) سے غائب ہونے کی حالت مراد ہے۔ اس وقت مفعول بہ سے حال ہوگا عبارت کا مطلب صاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے جناب نبی کریم ﷺ کو آنکھوں سے دیکھا اور آپ کی پاک صحبت میں حاضر ہوا اس پر آپ کی نبوت آفتاب سے زیادہ واضح اور ظاہر تھی اور اس کا حضور پر ایمان لانا آپ کے دعوت کی تصدیق کرنا قابل تعریف نہ تھا ایمان تو اس شخص کا قابل تعریف اور لائق مدح و ثنا ہے جو نادیدہ آپ پر ایمان لایا مجھے اس قادر مطلق خدا کی قسم جس کے سوا کوئی پرستش کا استحقاق نہیں رکھتا کوئی متنفس ایمان میں اس سے بہتر و افضل نہیں ہو سکتا جو بن دیکھے حضور ﷺ پر ایمان لاتا اور آپ کے دعاوی کی تصدیق کرتا ہے پھر انہوں نے استشہاداً یہ آیتیں یعنی الٓمّٓ سے الۡمُفۡلِحُوۡنَ تک پڑھیں۔

وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ اور نماز پڑھتے ہیں یقیمون کے معنی یحافظون کے ہیں یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو نماز کی کما حقہ، نگرانی کرتے ہیں اس کی حدود و شرائط بجا لاتے اور ارکان اور صفات ظاہرہ یعنی سنن و آداب اور صفات باطنہ یعنی خشوع و خضوع اور دلی توجہ سے ادا کرتے اور اوقات کی پوری حفاظت کرتے ہیں اس وقت یُقِیۡمُوۡنَ اَقَامَ الۡعُوۡدَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جب کوئی لکڑی کو سیدھا اور سڈول کر لیتا ہے۔ تو عرب اَقَامَ الۡعُوۡدَ بولا کرتے ہیں یا یُدِیۡمُوۡنَ اور یُوَاظِبُوۡنَ کے معنی میں ہے یعنی وہ نماز پر ہمیشگی کرتے اور پابندی اوقات کے ساتھ ہمیشہ وقت پر ادا کرتے ہیں۔ اس صورت میں یُقِیۡمُوۡنَ قامت السوق سے مشتق ہوگا۔ جب بازار پر رونق اور ترقی پر ہوتا ہے تو اہل محاورہ اسے قامت السوق سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ صلوٰۃ کے اصلی معنی ہیں دعا اور چونکہ نماز میں دعا بھی شامل ہوتی ہے اس لئے اسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ مدش نے صلوٰۃ کی لام کو پُر کر کے پڑھا

marfat.com

ہے جبکہ وہ صاد یا طاء یا ظاء کے بعد واقع ہو اور نیز فتح کی حرکت رکھتا ہو جیسے الصلوٰۃ مصلّٰے۔ الظلم، الطلاق، معطل، بطل وغیرہ مگر ورش کے سوا باقی قاریوں نے باریک کر کے پڑھا ہے البتہ لفظ اللہ کے لام کو پر کر کے پڑھنے میں تمام قراء کا اتفاق ہے بشرطیکہ لام کا پہلا حرف مفتوح یا مضموم ہو۔

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ اور جو کچھ ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے کچھ راہ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں۔ رزق کے لغوی معنی ہیں نصیب اور حصہ جیسا کہ آیت وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ میں (رزق سے یہی لغوی معنی حصہ (بہرہ) مراد ہیں مگر عرف میں رزق کہتے ہیں اس چیز کو جس سے جاندار فائدہ اٹھائے۔ رہا انفاق اس کے اصلی معنی کسی چیز کو ہاتھ سے یا ملک سے نکال دینے کے ہیں اور اسی سے نفاق السوق لیا گیا ہے یعنی رائج اور پر رونق بازار اور یہ اس لئے کہ بازار میں مال واسباب نکالا جاتا اور بیع کے لئے پیش کیا جاتا ہے لیکن اصطلاح میں انفاق کہتے ہیں نیک راہ میں مال صرف کرنے کو یہ جملہ ان مشرکین عرب کے بارہ میں نازل ہوا ہے جو جناب نبی عربی ﷺ پر (بے ردو کد) ایمان لائے تھے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ یعنی قرآن وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ”اور اے پیغمبر متقی وہ ہیں کہ جو (قرآن) تم پر اترا ہے اس پر اور جو (کتابیں یعنی) توریت وانجیل اور وہ تمام صحیفے جو) انبیاء علیہم السلام پر تم سے پیشتر اترے ہیں سب پر ایمان لاتے ہیں ان سے مومنین اہل کتاب مراد ہیں جیسے کہ ابن جریرؒ نے حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اس تقدیر پر دونوں آیتیں متقین کی تفصیل واقع ہوں گی یا ان سے وہی پہلے والے لوگ مراد ہیں جیسا کہ شاعر کے اس شعر میں

اِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَ اِبْنِ الْهُمَامِ وَلَيْثَ الْكَتِيْبَةِ فِى الْمُزْدَحَمِ

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایمان کی دونوں شقیں جمع کر لی ہیں ان چیزوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جن کو عقل ادراک کر سکتی اور جوارح محسوس کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی شرعی امور بھی بجالاتے ہیں اور ان باتوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جن کی طرف بجز آلہ سمع کے اور کسی حس کو راہ نہیں ملتی یا یوں کہو کہ یہ دونوں جملے عطف خاص علی العام کے قبیلے سے ہیں جیسے تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ میں وَالرُّوْحُ کا عطف اَلْمَلٰٓئِكَةُ پر تعظیم شان کی غرض سے ہوا ہے شیخین نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کے لئے دوہرے اجر ہیں منجملہ ان کے ایک وہ اہل کتاب ہے جو اپنے پیغمبر پر بھی ایمان رکھتا ہے اور محمد ﷺ پر بھی، الحدیث۔

انزال کہتے ہیں کسی چیز کے اوپر سے نیچے کی طرف انتقال کرنے کو اور یہاں کلام الٰہی کا جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے لوح محفوظ سے زمین پر منتقل ہونا مراد ہے یا بلحاظ رتبہ اور قدر و منزلت کے علو و سفل مقصود ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے علم سے علم بشر کی طرف نازل کیا گیا۔ جو مد دو کلموں کے بیچ میں واقع ہوا سے ابو جعفر اور ابن کثیر اور یعقوب اور سوسیؒ قصر سے پڑھتے ہیں اور قالون اور دوری قصر اور مد دونوں سے۔ ان کے علاوہ تمام قراء مد سے ہی پڑھتے ہیں اسی لئے اس قسم کے مد کو مد جائز اور مد منفصل کہتے ہیں اس کے سوا ایک اور مد ہے جسے مد متصل کہتے ہیں یعنی وہ مد جو کلمہ واحد میں حرف مد کے بعد واقع ہوتا ہے جیسے اَلسَّمَآءُ اَلْمَآءُ وغیرہ کلمہ کو کھینچ کر پڑھنے میں کسی کا اختلاف نہیں بلکہ تمام قراء مد سے پڑھنے میں متفق ہیں اور اس مد کا نام مد

ا عمل ذہنی اور تصور کے بعد جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو حصولی کہتے ہیں لیکن اگر صورت ذہنیہ کے حصول کے بغیر، نفس شئے مبدا انکشاف ہو جیسے ہر شخص اپنی ذات کو بغیر تصور ذہنی کی وساطت کے جانتا ہے تو یہ انکشاف حضوری کہلاتا ہے۔ علم حصولی اگر نظر و استدلال کے بعد حاصل ہو تو کسبی اور نظری کہا جاتا ہے، اگر نظر و فکر کی ضرورت نہ ہو جیسے دھوپ کو دیکھنے اور آگ کی حرارت معلوم کرنے کے لئے کسی ترتیب ذہنی اور غور و خوض کی ضرورت نہیں ہوتی تو ایسا علم ضروری اور بدیہی کہلاتا ہے، اللہ کا علم حضوری ہے، اس لئے اس کے علم کو نہ ضروری کہہ سکتے ہیں نہ کسبی اور نظری، یقین، ظن اور تقلید وغیرہ چونکہ علم کسبی ہی کی شاخیں ہیں۔ اس لئے اللہ کے علم کو علم یقینی یا ایقان نہیں کہا جاسکتا۔

marfat.com

واجب ہے۔ مد متصل اور اسی طرح مد منفصل کی مقدار کشش میں البتہ قراء کا اختلاف ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو اور قالون مد متصل کو تین حرکتوں کی مقدار کھینچ کر پڑھتے ہیں اور ابن عامر رضی اللہ عنہ اور کسائی بقدر چار حرکتوں کے، عاصم بقدر پانچ حرکتوں کے، ورش اور حمزہ بقدر چھ حرکتوں کے مگر یہ اختلاف اس مد میں ہے جہاں حرف مد کے بعد ہمزہ ہو کیونکہ جب مد کے ...... بعد حرف ساکن واقع ہوتا جیسے وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور الٓمّٓ تو اسے تمام قراء چھ حرکتوں کی مقدار کھینچ کر پڑھتے ہیں اور اس قسم کے مد کو مد لازم کہتے ہیں لیکن جب حرف ساکن کو وقف عارض ہو جائے تو تمام قراء اس بات پر متفق ہیں کہ قاری مختار ہے چاہے تو بقدر دو حرکتوں کے کھینچ کر پڑھے چاہے بقدر چار حرکتوں کے یا چھ حرکتوں کے البتہ جو حرف ساکن اصل میں مضموم ہو جیسے نستعین اسے بقدر سات حرکتوں کے کھینچ کر پڑھنے میں سب کا اتفاق ہے، واللہ اعلم۔

وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ (اور وہ آخرت کے گھر کا بھی یقین رکھتے ہیں) دنیا مشتق ہے دنو بمعنی قرب سے (اور چونکہ وہ حال سے قریب اور بہت ہی قریب ہے اس لئے اسے دنیا کہتے ہیں اسی طرح) آخرت کو اس کے متاخر اور پیچھے ہونے کی وجہ سے آخرت کہتے ہیں، اصل میں دنیا اور آخرت دونوں دو صفتیں تھیں اب ان پر اسمیت غالب آگئی اور استعمال میں دنیا اور آخرت دونوں اسم کہلائے جانے لگے۔ ایقان کہتے ہیں استحکام علم کو یعنی از روئے نظر اور استدلال کے نفی شک کے بعد جو آدمی کو علم کا ایک مرتبہ اور مضبوط و استوار درجہ حاصل ہو جاتا ہے اسے یقین اور ایقان سے تعبیر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خدا موقن کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔ ؎ امام ورش بِالْاٰخِرَةِ کو نقل حرکت ہمزہ اور پھر حذف ہمزہ دونوں سے پڑھتے ہیں (یعنی اول ہمزہ کی حرکت لام کو دیتے پھر حمزہ کو گرا دیتے ہیں اور یہ کچھ اسی لفظ کے ساتھ خصوصیت نہیں ہے) بلکہ جس کلمہ میں ہمزہ متحرکہ واقع ہو ابتدائے کلمہ میں اور اس سے پہلے کا حرف یعنی دوسرے کلمہ کا اخیر حرف ساکن تو ہو مگر مد ولین نہ ہو تو ہمزہ کی حرکت ماقبل کے ساکن حرف کو دے کر اسے حذف کر دیتے ہیں عام ہے کہ حرف ساکن نون تنوین یا لام تعریف یا اس کے علاوہ کوئی اور حرف ہو جیسے مِنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا مُبِيْنٌ اَنِ، اعْبُدُوا اللّٰهَ، كُفُوًا اَحَدٌ، بِالْاٰخِرَةِ، الْاَرْضِ الْاُوْلٰى مگر امام یعقوبؒ کے پیرووں نے كِتَابِيَهْ اِنِّيْ ظَنَنْتُ کو اس قاعدے سے مستثنیٰ کر لیا ہے اور عَادَاِنِ الْاُوْلٰى اور اٰلْاٰنَ میں قراء کا اختلاف ہے بعض تو یہاں بھی ورش کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں اور بعض اختلاف۔ پھر ورش کبھی تو اس کلمہ کو مد طویل یعنی زیادہ کھینچ کر پڑھتے ہیں کبھی بہت ہی کم۔ کبھی متوسط اور اسی طرح حرف مدہ ہمزہ کے بعد واقع ہو خواہ وہ ہمزہ لفظوں میں موجود اور ظاہر ہو جیسی اٰمَنَ اور اُوْتِيَ اور اِيْمَانًا میں یا نقل حرکت کے بعد حذف ہو گیا ہو جیسے بِالْاٰخِرَةِ اور قُلْ اُوْحِيَ مَنْ اٰمَنَ میں یا کسی حرف سے بدل ہو گیا ہو جیسے هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً میں کہ ورش هٰٓؤُلَآءِ يَا اٰلِهَةً یعنی ہمزہ کو یا سے بدل کر مع المد پڑھتے ہیں مہملہ ہو جیسے جَآءَ اٰلَ اِلْ يَاءِ اِسْرَائِيْلَ تو ورش ان سب صورتوں میں ابدال اور مد دونوں سے پڑھتے ہیں مگر بنی اسرائیل کے لفظ کو اس قاعدے سے بایں وجہ مستثنیٰ بتاتے ہیں کہ اس میں پے در پے اور متواتر تین مدوں کا ہونا لازم آتا ہے (اور یہ نہ صرف زبان پر ثقیل اور گراں ہی گزرتا ہے بلکہ صحیح طور پر ادا کرنا مشکل اور سخت مشکل پڑ جاتا ہے) بعض (قراء جو فن قرأۃ میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہیں اور مقتدائے فن تسلیم کئے جاتے ہیں) اس قاعدہ میں ورش کی مخالفت کرتے ہیں اور بجز ہمزہ ثابتہ کے اور کسی موقع پر مد کر نا جائز نہیں بتاتے۔ حمزہ بہ روایت خلف بِالْاٰخِرَةِ کے لام کو سکتہ سے پڑھتے ہیں اور قاعدہ نہ صرف اسی صورت کے ساتھ مخصوص بتاتے ہیں بلکہ جو ساکن بشرطیکہ وہ مدہ نہ ہو اور اس کے بعد ہمزہ آجائے تو وہ اس پر سکتہ اور ایک نہایت لطیف سکتہ کرتے ہیں (جس میں سننے والے کو) قطع اور فصل کا احتمال بھی نہیں ہوتا جیسے هَلْ اَتٰكَ اور عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اور اِنْبِئْ اٰدَمَ اور خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ اور الْاٰخِرَةِ الْاَرْضِ وغیرہ۔ حمزہؒ ہی سے یہ بھی روایت نقل کی جاتی ہے کہ وہ لام تعریف اور شَيْءٍ اور شَيْئًا کے علاوہ اور کہیں سکتہ کو جائز نہیں بتاتے ضمیر هُمْ حصر کے فائدہ کی غرض سے يُوْقِنُوْنَ پر مقدم کی گئی ہے ورنہ شان عبارت کا تقاضا تھا کہ یوں کہا جاتا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ يُوْقِنُوْنَ یعنی آخرت کے گھر کا یقین صرف ان ہی پرہیزگاروں کو حاصل ہے جن کی چند صفتیں اوپر مذکور ہو چکیں اور اس طرح کا یقین ان کے علاوہ اور لوگوں کو مثلاً اہل کتاب کو ہرگز میسر نہیں کیونکہ اعتقاد واقع کے مطابق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے

marfat.com

کہ وہ (کھلم کھلا) کہتے ہیں۔ لن یدخل الجنة الامن کان ھودا اونصاریٰ۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ق (یہی لوگ اپنے پروردگار کے سیدھے رستہ پر ہیں) یہ جملہ محل رفع میں ہوگا اگر اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ اور اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ میں سے ایک موصول کو المتقین سے جدا اور منفصل قرار دیا جائے گویا یہ صفات مذکورہ پر مرتب ہونے والا نتیجہ ہوگا کیونکہ اسم اشارہ کا صفات کے بعد ذکر کرنا گویا موصوف کا اس کے صفات سمیت اعادہ کرنا اور مکرر مذکور کرنا ہے۔[1] اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صفات مذکورہ اس حکم کو واجب کرنے والی ہیں اور کلمہ علیٰ میں اس بات کا پتہ دیا گیا ہے کہ متقی لوگ ہدایت خداوندی پر متمکن اور مستقر ہیں اور لفظ ھدی صرف تعظیم کے ثبوت کے لئے نکرہ کی صورت میں لایا گیا ہے اور چونکہ ہدایت کی توفیق صرف خدا ہی کی طرف سے ہے اس لئے من ربھم کہہ کر تعظیم کی تاکید کردی گئی۔

وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤ (اور یہی لوگ آخرت کے گھر میں من مانی مرادیں پائیں گے) یعنی تمام مقصودوں پر فتحیات ہوں گے اور ہر قسم کی کامیابیاں انہیں حاصل ہوں گی۔ مُفْلِحُوْنَ ، فَلَحٌ مصدر سے بنایا گیا ہے اور فَلْجٌ، فَلْقٌ، فَلْذٌ، فَلْیٌ سب مرادف لفظ ہیں اور سب مفہوم شق یعنی جانب اور قطع کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں گویا مُفْلِحٌ یعنی کامیاب ہونے والا شخص اپنے غیر سے علیحدہ اور یکسو ہو جاتا ہے اور ان دونوں میں فرق بعید اور دور دراز کی مسافت واقع ہو جاتی ہے (مطلب یہ ہے کہ) پرہیزگاروں کے لئے (جن کا ذکر اوپر ہوا) دنیا و آخرت دونوں میں ہر طرح کی خیر و خوبی اور فلاح فوز موجود ہے اور وہ قطعی و یقینی طور پر کامیاب ہونے والے ہیں۔ اسم اشارہ مکرر اور دوبارہ اس تنبیہ کے لئے لایا گیا ہے کہ پرہیزگاروں کا صفات مذکورہ کے ساتھ متصف ہونا اس بات کو مقتضی ہے کہ ہدایت اور فلاح دونوں میں سے ہر ایک ان کے لئے ثابت ہے اور چونکہ دونوں جملے یعنی اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی الخ اور اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ بلحاظ مفہوم مختلف تھے اس لئے بیچ میں حرف عطف (یعنی و) لایا گیا بخلاف اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ کے۔ کہ یہاں دونوں جملوں میں اختلاف نہ تھا اس لئے حرف عطف بیچ میں نہیں لایا گیا (وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ) میں ھم ضمیر فصل ہے یعنی خبر کو صفت سے جدا اور ممتاز کرنے کے لئے لائی گئی ہے۔ اور اس کا فائدہ تاکید نسبت اور اختصاص ہے یا یوں کہئے (کہ ضمیر ھم) فصل کے لئے نہیں ہے بلکہ مبتدا واقع ہوئی ہے اور الْمُفْلِحُوْنَ اس کی خبر اور دونوں جملہ ہو کر اولٰئک کی خبر ہے۔ فرقۂ معتزلہ نے اسے ضمیر حصر قرار دے کر استدلال کیا ہے کہ یہ جملہ مرتکب کبیرہ کے ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن (حقیقت میں ان کا یہ تمسک واستدلال نہایت ضعیف و کمزور اور نہ صرف کمزور بلکہ) مردود ہے (اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ) المفلحون سے مراد وہ لوگ ہیں جو فلاح و خیر میں کامل اور مکمل ہیں۔ ہاں اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ جو لوگ ان جیسے نہ ہوں ان کو کمال درجہ کی خیر و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی نہ یہ کہ مطلقاً فلاح میسر ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر جب خدا تعالیٰ ذکر قرآن کے ضمن میں یا مستقلاً (اگر موصول یعنی اَلَّذِیْنَ کو اَلْمُتَّقِیْنَ سے جدا اور منفصل قرار دیا جائے) اپنے برگزیدہ اور خاص بندوں کا اور دوستوں کا ذکر فرما چکا تو ان کے پیچھے اب ان سرکش اور متمرد لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو پہلی قسم کے لوگوں کے بالکل مخالف اور ضد ہیں اور اختلاف سیاق کی وجہ سے کچھ ضرورت نہ تھی کہ حرف عطف لایا جاتا چنانچہ ارشاد ہوا۔

---

[1] اولئک اسم اشارہ ہے۔ اس سے ان مومنوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کی صفات کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے، گویا اختصار کلام کے پیش نظر موصوف اور صفات کے مجموعہ کو لفظ **اولئک** سے تعبیر کیا اور شیخ عبدالقاہر جرجانی نے صراحت کی ہے جس کو صاحب مطول نے بھی نقل کیا ہے کہ **کسی کا حکم** کسی وصف پر ترتب ظاہر کرتا ہے کہ وہ وصف ، حکم کی علت ہے جیسے اَحْسِنْ اِلٰی زَیْدٍ صَدِیْقِکَ اپنے دوست زید کے ساتھ بھلائی کر۔ اس مثال میں زید کا دوست ہونا حسن سلوک کے حکم کی علت ہے۔ پس آیت کا **مطلب بھی یہی ہے** کہ ایمان بالغیب ، ایمان بالانبیاء والکتب ایمان بالآخرۃ، اقامت صلوٰۃ اور اداء زکوٰۃ ، ہدایت یافتہ ہونے کے اسباب موجب ہیں۔ ان اوصاف کا تقاضا ہے کہ ان کے دل ہدایت یافتہ ہوں ۱۲

marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (اے پیغمبر جن لوگوں نے قبول اسلام سے انکار کیا) کفر کے لغوی معنی ہیں نعمت کا چھپانا اور شرع میں کفر کہتے ہیں ایمان کی ضد اور خداوندی نعمت کے چھپانے کو۔

سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ ان کے حق میں یکساں ہے کہ تم ان کو عذاب الٰہی سے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ) یہ اِنَّ کی خبر ہے اور سَوَاء اسم ہے معنی میں اِسْتَوَاءٌ کے۔ اس کا حمل مبتدا پر ویسا ہی ہوا ہے جیسا مصادر کا حمل اسماء پر ہوا کرتا ہے۔ (ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اور اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ دونوں جملے بتاویل سواء کے فاعل ہیں اور تقدیر عبارت یوں ہے مُسْتَوٍ عَلَیْهِمْ) اِنْذَارُکَ وَعَدَمُهٗ یا یوں کہو کہ سَوَاءٌ عَلَیْهِمْ خبر اور ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اور اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ مبتدا ہے اور عبارت کی تقدیر یوں ہے اِنْذَارُکَ وَعَدَمُهٗ سِیَّانِ علیہم اور فعل (اگرچہ بلحاظ قوانین نحو مبتدا واقع نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں مخبر عنہ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے مگر صرف اس لحاظ سے کہ وہ) مصدر کے معنی کو متضمن ہے مجازاً مبتدا واقع ہو گیا ہے اور مصدر سے فعل کی طرف عدول کرنے کی وجہ ایہام تجدد ہے۔ ءَاَنْذَرْتَهُمْ میں ہمزہ اور ام لم تُنْذِرْهُمْ میں اَمْ یہ دونوں گو استفہام کے لئے آیا کرتے ہیں لیکن یہاں معنی استفہام سے مجرد ہیں اس جگہ ان کا ذکر معنی استواء کی تقریر و تاکید کے لئے ہوا ہے انذار کہتے ہیں عذاب الٰہی سے خوف دلانے کو۔ یہاں صرف انذار پر اکتفا کرنے اور اس کی ضد مذکور نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ضرر کا دفع کرنا نفع حاصل کرنے سے زیادہ مہتم بالشان ہوا کرتا ہے۔ ورش نے ءَ اَنْذَرْتَهُمْ کے دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل کر پڑھا ہے اور قالون اور ابن کثیر اور ابو عمرو دوسرے ہمزہ کو تسہیل اور بین بین سے پڑھتے ہیں لیکن قالون باوجود تسہیل کے دو ہمزوں کے بیچ میں الف بھی داخل کرتا ہے اور ہشام دونوں ہمزوں کے بیچ میں الف داخل کرنے میں تو قالون کے ساتھ متفق ہے مگر تسہیل میں اختلاف رکھتا ہے (یعنی دوسرے ہمزہ میں تسہیل جائز نہیں رکھتا) ان کے علاوہ باقی تمام قراء دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں اور (ادخال سے انکار کرتے ہیں) یہی گفتگو ان دو مفتوح ہمزوں میں بھی جاری ہو سکتی ہے جو ایک کلمے میں واقع ہوں۔ تیسیر میں مذکور ہے کہ اس بارہ میں ہشام کا مذہب بھی قالون کی رائے کے قریب قریب ہے لیکن جب دونوں ہمزے بلحاظ حرکت مختلف ہوں یعنی ایک مفتوح دوسرا مکسور ہو جیسے ءَ اِذَا کُنَّا تُرَاباً میں تو حرمیان اور ابو عمرو دونوں دوسرے ہمزہ کو تسہیل سے پڑھنا تجویز کرتے ہیں اور قالون اور ابو عمرو دونوں میں الف داخل کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی قراء دونوں ہمزوں کے تحقیق سے پڑھنے کے قائل ہیں۔ ہشام سے دونوں ہمزوں کے بیچ میں الف داخل کرنے کی جو روایت نقل کی جاتی ہے اس میں اختلاف ہے یعنی دو مختلف روایتیں ذکر کی جاتی ہیں ایک میں تو مطلقاً ہر جگہ داخل کرنا ثابت ہوتا ہے اور دوسری روایت سے صرف سات موقعوں کی تخصیص سمجھی جاتی ہے۔ سورۂ اعراف اور سورۂ فصلت میں ءَ اِنَّكُمْ اور اعراف و شعراء میں اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اور مریم میں ءَ اِذَا مَامِتُّ اور صٰفّٰت میں ءَ اِنَّکَ اور ءَ اِفْكًا لیکن جب دو ہمزہ کلمہ واحد میں مختلف بالحرکت اس طرح ہوں کہ ایک کو فتحہ دوسرے کو ضمہ ہو تو حرمیان اور ابو عمرو تو دوسرے ہمزہ کو تسہیل سے پڑھتے ہیں اور قالون دونوں میں الف داخل کرتا ہے۔ رہا ہشام وہ سورۂ صٓ ءَ اُنْزِلَ عَلَیْهِ میں اور سورۂ قمر ءَ اُلْقِیَ میں تو قالون کی رائے کے ساتھ اتفاق رکھتا ہے اور سورۂ آل عمران قل ءَ اُنَبِّئُكُمْ میں جمہور کا ساتھ دیتا ہے اور باقی قراء تحقیق سے پڑھنا پسند کرتے ہیں اور ان تین کے سوا چوتھا کوئی موقعہ نہیں ہے۔

لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۶ (وہ تو ایمان لانے والے ہیں نہیں) اپنے ماقبل کے اجمال کی تفسیر کر رہا ہے (یعنی جملہ سَوَاءٌ عَلَیْهِمْ میں جو ایک طرح کا اجمال تھا لَا یُؤْمِنُوْنَ سے اس کی تفسیر ہو گئی) اس صورت میں اس جملہ کا کوئی محل اعراب نہ ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ حال مؤکدہ ہو یا بدل یا ان کی خبر اور اس تیسرے احتمال میں درمیانی عبارت بطریق جملہ معترضہ واقع ہو گی۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (ان کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے) تو وہ بھلائی اور نیک باتوں کو یاد نہیں رکھ سکتے قلب ایک گوشت کے لوتھڑے کا نام ہے (جو صنوبری شکل میں بائیں جانب پسلیوں کے قریب لٹکا ہوا ہے) لیکن کبھی اس کا

marfat.com

اطلاق عقل اور معرفت پر بھی ہوا کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ واضح ہو کہ خدا تعالیٰ تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے خواہ وہ اعراض ہوں یا جواہر اور اسباب سب کے اسباب نظریہ ہیں جن کے عقب میں خدا تعالیٰ ان کے نتائج پیدا کرتا ہے تو جب آدمی اپنے حواس یعنی کان آنکھ وغیرہ سے کام لیتا اور انہیں استعمال میں لاتا ہے تو اس کے بعد خدا علم بالمحسوسات پیدا کرتا ہے اور جب اسے علم بالمحسوسات حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ذہن کو دو مقدموں کی ترتیب میں خرچ کرتا ہے تو حق سبحانہ وتعالیٰ علم بالنتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اگر خدا چاہے تو کوئی چیز بھی پیدا نہ کرے اور حواس کو معطل و بے کار اور ذہن کو مشوش و پریشان کر دے اور چاہے تو علم بالمحسوسات حاصل کرا دے لیکن یہ علم قلب میں ذرا بھی مؤثر و مفید نہ ہو۔ اسی واسطے جناب نبی عربی ﷺ نے فرمایا کہ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ کَقَلْبٍ وَاحِدٍ یُصَرِّفُہٗ کَیْفَ یَشَاءُ ثُمَّ قَالَ اللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ (رواہ مسلم عن عبد اللّٰہ بن عمر) (یعنی تمام بنی آدم کے دل خدا کی دو انگلیوں میں اس طرح واقع ہیں جیسے ایک دل، وہ دل کو جس طرف چاہتا ہے پلٹ دیتا ہے پھر آپ نے فرمایا بار خدایا دلوں کے پلٹ دینے والے تو ہمارے دلوں کو اپنی فرمانبرداری کی طرف پلٹ دے (مسلم)۔

الغرض چونکہ خدا تعالیٰ کو کفار کے دلوں کا پاک کرنا منظور نہ تھا اس لئے ان کو آیات میں فکر کرنے اور قدرت کی نشانیوں میں غور کرنے سے روک دیا اگرچہ انہوں نے آیات و معجزات بھی دیکھے مگر اس کے بعد بھی ان کے دلوں میں ایمان و یقین کے اثر قبول کرنے کا ملکہ پیدا نہیں کیا۔ اسی عدم تاثر اور تصریف قلوب کو کہیں ختم سے اور کہیں طبع سے کسی موقعہ پر اغفال سے کسی جگہ اقساء اور غشاوۃ سے مجازاً تعبیر کیا گیا ہے مثلاً خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے یہ معنی نہیں ہے کہ خدا نے اس گوشت کے لوتھڑے پر جسے ہم دل کہتے ہیں کوئی پتھر یا شیشے کی سچ مچ مہر لگا دی ہے بلکہ مہر لگانے کا یہ مطلب ہے کہ اس نے دلوں میں یہ صلاحیت و قابلیت ہی پیدا نہیں کی کہ وہ ایمان و یقین کے اثر کو قبول کر لیں یا یوں کہیے کہ خدا نے ان کے دلوں کو اور حواس کو ان چیزوں سے تمثیل دی ہے جن پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ ختم سے وہ سیاہی مراد ہے جو گناہوں کے مرتکب ہونے کی وجہ سے خدا تعالیٰ گنہگاروں کے دلوں پر پیدا کر دیتا ہے چنانچہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا المؤمن اذا اذنب ذنبا کانت نکتۃ سوداء فی قلبہ فان تاب و نزع واستغفر صقل قلبہ منھا وان زاد زادت حتی تعلو قلبہ فذلک الران الذی ذکر اللّٰہ فی کتابہ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (یعنی مؤمن جب گناہ کرتا ہے تو ایک چھوٹا سا سیاہ نقطہ اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر اس نے جھٹ پٹ توبہ کر لی اور آگے کو گناہ سے باز رہا اور بارگاہ الٰہی میں عفو جرائم کی درخواست کی تو اس کے دل سے وہ سیاہ نقطہ چھیل دیا جاتا اور قلب صاف شفاف کر دیا جاتا ہے اور اگر اور گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ سیاہ نقطہ بھی بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتا ہے تو جس زنگ کا خدا نے اپنی کتاب یعنی آیت کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ میں ذکر فرمایا ہے یہ وہی زنگ ہے)۔

میں کہتا ہوں یہاں دل کے سیاہ ہونے کا وہی مطلب ہے جو سابق کی حدیث میں مذکور ہو چکا یعنی دل کا بگڑ جانا اور اس کا خراب و فاسد ہو جانا ارشاد فرمایا تھا اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اور فساد قلب ضد ہے صلاح قلب کی اور جب مومن کے گناہ کی یہ کیفیت ہے کہ ایک گناہ کرنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے تو کافر کی کیا کچھ کیفیت ہو گی اسی کیفیت اور ہیئت کے پیدا کرنے کو کہیں طبع سے تعبیر کیا ہے اور کہیں اغفال سے اور کہیں اقساء وغیرہ سے۔ ختم کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں چونکہ کسی چیز پر مہر لگانے سے اس کے مضبوط کرنے اور چھپانے میں مبالغہ کرنا مقصود ہوا کرتا ہے اس لئے دلوں پر مہر لگانے کو ختم سے تعبیر کیا گیا یا یوں کہیے کہ جس طرح کسی چیز پر مہر لگانا یہ اس شخص کا آخری فعل ہے جو اس چیز کے محفوظ کرنے اور چھپانے میں کیا کرتا ہے اسی طرح دلوں کے فاسد و خراب ہونے کا یہ آخری نتیجہ ہے کہ وہ اس مہر لگانے کے بعد بالکل نکمے اور بے کار ہو

marfat.com

جاتے ہیں۔

وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ط (اور ان کے کانوں پر بھی مہر لگادی ہے) سمع اگرچہ لفظاً مفرد ہے لیکن معنٰی میں ہے جمع کے یعنی وَعَلٰۤی اَسْمَاعِهِمْ اور چونکہ التباس کا خوف نہ تھا اور نیز اعتبار اصل بھی مقصود اور مد نظر تھا اس لئے ایسا کیا گیا سمع اصل میں مصدر ہے اور مصادر جمع کی صورت میں نہیں لائے جاتے اس لئے یہاں لفظ سمع مفرد لایا گیا۔ اس کا عطف عَلٰی قُلُوْبِهِمْ پر ہے جیساکہ قرآن مجید میں دوسرے موقعہ پر ارشاد ہوا ہے وَخَتَمَ عَلٰی قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً اور جبکہ دل اور کان کا کسی چیز کو دریافت کرنا ہر طرف سے ممکن تھا اور اس میں سب جہتیں مساوی و یکساں تھیں تو ان دونوں کی مانع و حاجب ایک ہی چیز یعنی ختم قرار دی گئی۔ بخلاف آنکھ کے کہ وہ صرف مقابلہ کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے اس کا مانع غشاوہ (پردہ) ٹھیر لیا گیا جو مقابلہ کے ساتھ مختص ہے چنانچہ فرمایا۔

وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز (اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے) ابصار جمع ہے بصر کی اور اس کے معنٰی ہیں کسی چیز کا آنکھ سے ادراک کرنا۔ لیکن اس کا اطلاق کبھی قوت باصرہ پر بھی ہوا کرتا ہے مجازاً اور کبھی نفس آنکھ کو بھی بصر کہتے ہیں۔ اور اسی پر قیاس کر لیجئے سمع کو بھی۔ ابو عمرو ابصار کو امالہ سے پڑھتے ہیں اور کسائی ہر اس الف میں کبھی بحالت وصل اور بحالت وقف امالہ جائز بتاتے ہیں جس کے بعد راء مجرور واقع ہو اور واقع بھی ہو تو لام کلمہ کی جگہ جیسے وَعَلٰی ابصار ہِم اور اٰثارِ ھِم اور النَّار اور النہار اور بقنطار اور بدینار اور الابرار وغیرہ۔ ابوالحارث اس قاعدہ میں ابو عمرو اور کسائی دونوں کی تقلید تو کرتے ہیں مگر مطلق نہیں بلکہ صرف اس موقعہ میں جہاں راء مکرر واقع ہو جیسے الاشرار اور الاَبْرار وغیرہ۔ ورش ان تمام مقامات میں بین بین سے پڑھتے ہیں اور حمزہ اس قاعدہ میں ان کے تابع ہیں مگر اسی موقعہ میں جہاں ر مکرر واقع ہو یہاں اَلْقَهَّارُ اور دَارُ الْبَوَار کو مستثنٰی کرتے ہیں باوجودیکہ یہاں ر مکرر واقع نہیں لیکن پھر بھی امالہ جائز رکھتے ہیں ابن ذکوان نے فقط سورۃ بقرہ اور جمعہ کے ان لفظوں میں اِلٰی حِمَارِکَ، الحمار میں امالہ پڑھا ہے۔ غِشَاوَة اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو حاوی ہو اور اسے سب طرف سے ڈھانک لے، یہ مرفوع ہے یا تو اس وجہ سے کہ ترکیباً مبتدا مؤخر واقع ہوا ہے یا اس لئے کہ ظرف کا فاعل ہے۔

وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ع ۷ (اور آخرت میں ان کو بڑا عذاب ہونے والا ہے) عذاب لیا گیا ہے اَعْذَبَ ع ۱
الشیئ سے اور جب کوئی شخص کسی چیز کو منع کرنے اور روک دینے والا ہوتا ہے تو اہل محاورہ ایسے موقع پر اَعْذَبَ الشیئ بولا کرتے ہیں چونکہ سزا بھی مجرم کو دوبارہ جرم پر دلیر ہونے سے منع کرتی اور روکتی ہے اس لئے اسے عذاب کہنے لگے پھر اس کے معنی میں یہاں تک توسیع ہو گئی کہ ہر دکھ اور درد کو عذاب کہنے لگے اگرچہ وہ سزا اور مانع نہ ہو۔ یا یوں کہیئے کہ عذاب مشتق ہے تعذیب سے جس کے معنی ہیں عذب یعنی شیرینی کے زائل اور دور کرنے کے۔ عظیم ضد ہے حقیر کی (جیساکہ کبیر نقیض ہے صغیر کی) اور جب یہ ہے تو عظیم کبیر سے بھی ایک درجہ اوپر رکھتا ہے جیسے حقیر صغیر سے کم رتبہ ہو جاتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ (اور لوگوں میں سے) ابو عمرو سے اَلنَّاسِ کے فتحہ کا امالہ موضع جر میں جہاں بھی آوے مروی ہے وصل اور وقف میں ان سے خلاف مروی ہے۔

مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بعض ایسے بھی ہیں جو منہ سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم خدا اور روز آخرت یعنی قیامت پر ایمان لائے) یہ آیت عبد اللہ بن ابی بن سلول اور معتب بن قشیر اور جد بن قیس اور ان کے رفقاء کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن میں اکثر تو یہودی تھے اور بعض منافق۔ ناس اصل میں اُناس تھا ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض حرف تعریف یعنی الف لام لے آئے اسی وجہ سے ہمزہ اور حرف تعریف ایک کلمہ میں جمع نہیں ہو سکتے (کیونکہ عوض اور معوض میں اجتماع ناجائز ہے) یہ جمع ہے انسان کی اور بعض کے نزدیک جمع نہیں بلکہ اسم جمع ہے کیونکہ جمع کے اوزان میں فعال نہیں آیا۔ پھر یہ یا تو انس سے مشتق ہے اور یہ اس لئے کہ آدمی باہم ایک دوسرے سے مانوس و مالوف ہوتے ہیں یا اِنْس سے اور انس کے معنی ہیں ظَهَرَ کے (جیساکہ قرآن مجید کے دوسرے مقام میں ارشاد ہوا...... اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا) اور

marfat.com

چونکہ آدمی آپس میں ایک دوسرے پر ظاہر ہوتے اور دکھائی دیتے ہیں اس لئے انہیں ناس کہتے ہیں جس طرح جنوں کو ان کے مخفی اور پوشیدہ ہونے کے سبب سے جن کہتے ہیں۔ اَلنَّاسِ میں الف لام جنس کا ہے اور مِنْ موصوفہ ہے اس لئے کہ یہاں کوئی معہود نہیں اور بعض کہتے ہیں عہد کا اور معہود اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ہے یا مِنْ کو موصولہ کہیئے اور اس سے ابن ابی اور اس جیسے لوگوں کو مراد لیجئے کیونکہ وہ ان کفار میں داخل ہیں جن کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے۔ بلکہ ان سے بڑھ کر ایک اور خصوصیت بھی رکھتے ہیں یعنی فریب، مکر، دھوکہ یہاں صرف خدا اور روز قیامت پر ایمان لانے کا خاص کر ذکر اس واسطے ہوا ہے کہ سلسلہ ایمان کی فہرست میں یہی دو باتیں مقصود اعظم اور مہتم بالشان ہیں۔

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾　(حالانکہ وہ ایمان لائے نہیں) ان کے دعویٰ باطل کی تردید ہے اور اگرچہ سیاق کلام کے اقتضاء کی وجہ سے اس کی جگہ وَمَا اٰمَنُوْا کہنا چاہئے تھا کہ ان کے قول کے بالکل مطابق ہو جاتا کیونکہ اس میں فاعل کی تصریح نہیں بلکہ فعل کی ہے لیکن اس کے برعکس وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جس قدر ان کی تکذیب میں مبالغہ ہے وہ مَااٰمَنُوا میں نہیں پایا جاتا کیونکہ انہیں ایماندار لوگوں کے جرگہ میں سے نکال دینا گزشتہ زمانہ میں ان کے ایمان کی نفی کر دینے سے زیادہ مؤکد ہے یہی وجہ ہے کہ نفی کی تاکید حرف ب کے ساتھ کی گئی۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج　(اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لاچکے ہیں دھوکا دیتے ہیں) اصل میں خَدْعٌ اسے کہتے ہیں کہ تم کسی شخص کو اس مکروہ اور ناپسند بات کے برخلاف دھوکہ ڈالو جسے تم مخفی رکھتے ہو اور یہ عرب کے قول خَدَعَ الضَّبُّ سے لیا گیا یعنی جب گوہ اپنے بل میں چھپ کر شکاری کو ظاہر ہونے اور نکلنے کا دھوکا دیتی ہے (تو اہل زبان اسے خدع الضبّ سے تعبیر کرتے ہیں) خدع کے لغوی معنی پوشیدہ کرنے کے ہیں۔ خدا کو دھوکا دینے کا یہ مطلب ہے کہ وہ رسول خدا ﷺ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس صورت میں يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ میں ایک مضاف محذوف ماننا پڑے گا۔ یا یوں کہو کہ منافقوں کا رسول کے ساتھ یہ معاملہ کرنا گویا عین خدا کے ساتھ معاملہ کرنا ہے کیونکہ رسول زمین میں خدا کا نائب اور اس کا خلیفہ ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اور فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ط يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ يُخٰدِعُوْنَ ہے تو باب مفاعلۃ سے اور اس کا خاصہ ہے مشارکت یعنی ایک فعل کا دو شخصوں میں اس طرح واقع ہونا کہ ایک دوسرے کے ساتھ وہی برتاؤ کرے جو اس کے ساتھ کرتا ہے لیکن یہاں يَخْدَعُوْنَ کے معنی میں ہے اور مفاعلۃ کا صیغہ مبالغہ کے لئے اختیار کر لیا گیا ہے کیونکہ فعل بوقت مقابلہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ منافقوں کا خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ معاملہ کہ ظاہر میں ایمان کا دعویٰ کرتے اور دلوں میں کفر کی جڑ مخفی رکھتے ہیں اور خدا کا ان کے ساتھ یہ برتاؤ کہ ان پر اسلام کے احکام جاری فرماتا ہے، باوجود یہ کہ وہ کافروں سے بھی زیادہ خبیث اور گندے ہیں ادھر جناب نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کا حکم الٰہی بجالانا کہ ان کا حال مخفی رکھتے۔ اور اسلام کے احکام ان پر جاری کرتے تھے۔ یہ سب معاملات چونکہ صورۃً ایسے دو شخصوں کے فعل تھے جو باہم ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں (اس لئے يُخٰدِعُوْنَ کا لفظ جو مشارکت کو مقتضی تھا لایا گیا) پھر یہ جملہ يَقُوْلُ کا بیان ہے یا علیحدہ اور جدا مقصود کے بیان کے لئے جملہ شروع کیا۔

وَمَا يَخْدَعُوْنَ　حرمین اور ابو عمرو کی قرأت وَمَا يُخٰدِعُوْنَ ہے۔

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ　(اور حقیقت میں دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو) کیونکہ خدا پر کوئی چھوٹی سی چھوٹی اور پوشیدہ سے پوشیدہ چیز بھی چھپی نہیں رہتی اور وہ اپنے برگزیدہ اور مقدس نبی ﷺ اور پاک باز مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً ان کے حال پر مطلع کرتا ہے تو وہ اس لحاظ سے خود دھوکہ میں پڑ گئے کہ اپنے نفسوں کو اس بات پر فریب خوردہ کر دیا کہ ہم عذاب و فضیحت سے بے خوف ہوگئے (اور نبی وقت اور مسلمانوں پر ہمارا دھوکا چل گیا لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا اور جب یہ ہے) تو ان کے دھوکا دینے کا ضرر انہیں پر پلٹ پڑا نہ ان کے غیر پر۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾　(اور اپنی غفلت و بے خبری میں منہمک ہونے کی وجہ سے اس بات کو محسوس نہیں کرتے)

marfat.com

اور نہیں سمجھتے کہ ہمارے دھوکہ دینے کا ضرر خود ہم ہی پر پلٹ پڑتا ہے۔ شعور کہتے ہیں حواس سے کسی چیز کے معلوم کرنے کو یہاں انہیں کی طرف ضرر پلٹ جانے کو اس محسوس چیز کے قائم مقام کیا گیا جو صرف ماؤف الحواس شخص پر مخفی رہتی ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ (ان کے دلوں میں یہ پہلے ہی سے کفر کا مرض تھا) مَرَض اسے کہتے ہیں جو بدن کو عارض ہو کر اسے حد اعتدال سے خارج کر دے اور (رفتہ رفتہ) ضعیف و کمزور کر کے ہلاکت (کے گڑھے) تک پہنچا دے۔ اور کبھی اس کا اطلاق اعراض نفسانیہ جیسے جہل، حسد، کفر اور سوء اعتقاد پر بھی مجازاً ہو جایا کرتا ہے کیونکہ (جس طرح مرض حقیقی مانع صحت ہوتا اور ہلاکت و موت کے پنجہ میں گرفتار کر دیتا ہے اسی طرح) یہ اوصاف بھی فضائل و محامد کے حاصل ہونے سے مانع ہوتے ہیں اور ہلاکت ابدی تک پہنچا دیتے ہیں۔ منافق جن اعراض نفسانیہ کی بیماری میں مبتلا تھے وہ نہایت ہی موذی اور خبیث تھی۔ اس کے علاوہ ریاست و عظمت کے فوت ہونے اور مسلمانوں کی رفعت شان و شوکت ظاہر ہونے سے سخت متالم اور رنجیدہ تھے۔

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ (تو اب خدا نے ان کے ان اعراض خبیثہ کو زنگ اور ختم سے تقویت دے کر ان کا مرض اور بھی زیادہ کر دیا) اور قرآنی آیتیں نازل فرما کر ان کی اصل بیماری میں زیادتی کر دی کہ جوں جوں آیات الٰہی کے ساتھ کفر کرتے جاتے ہیں کفر و عداوت میں بڑھتے جاتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ خدا نے اپنے نبی اکرم ﷺ کی مدد کر کے اور منافقوں کی دشمنی و عداوت طشت از بام کر کے ان کے مرض کو اور بھی زیادہ کر دیا) حمزہ نے زاد اور اسی طرح جَاءَ اور شَاءَ اور رَانَ اور خَافَ اور خَابَ اور طَابَ اور حَاقَ کو امالہ سے پڑھا ہے جس جگہ بھی اور جہاں کہیں بھی واقع ہوں۔ علیٰ ہٰذا القیاس سورۂ والنجم میں لفظ زَاغَ کو اور سورۂ صف میں زَاغُوْا کو امالہ سے پڑھنا جائز بتایا ہے خواہ یہ افعال ضمیر سے متصل ہوں یا نہ ہوں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ افعال مذکور ثلاثی مجرد ہوں اور بس۔ ابن ذکوان اس قاعدہ میں حمزہ کے تابع ہیں لیکن نہ مطلقاً بلکہ صرف جَاءَ اور شَاءَ میں جہاں کہیں بھی واقع ہوں اور زاد کو بھی امالہ سے پڑھتے ہیں مگر نہ ہر جگہ بلکہ صرف اسی موقعہ پر اور ایک روایت میں آیا ہے کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ (اور ان کو دردناک عذاب ہوتا ہے اَلِیْمٌ معنی میں ہے مولَم کے اور یہ عذاب کی صفت میں بطریق مبالغہ واقع ہوا ہے بِمَا كَانُوْا ما مصدریہ ہے۔

يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ اس کو کوفیوں نے تخفیف سے اور باقی قراء نے تشدید سے پڑھا ہے۔ پہلی تقدیر پر معنی یہ ہوں گے کہ منافق اپنے دعویٰ اٰمَنَّا میں جھوٹے ہیں اور دوسری توجیہ پر یہ مطلب ہوگا کہ منافقوں کو جناب نبی کریم ﷺ کی درپردہ تکذیب پر عذاب دردناک ہوگا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد نہ پھیلاؤ) فساد ضد ہے صلاح کی اور یہ دونوں لفظ ہر قسم کی ضرر دینے والی اور نفع بخشنے والی چیزوں کو عام ہیں (یعنی فساد کا لفظ ہر طرح کی مضرت رساں اور تکلیف دہ چیزوں کو شامل ہے اور صلاح کا لفظ ہر قسم کی مفید اور نفع بخش چیزوں کو) منافقوں کا ملک میں فساد پھیلانا (کیا تھا) مسلمانوں کو دھوکا دے کر لڑائیوں کی شورش پھیلانا، آتش جنگ ہر طرف بھڑکانا، مسلمانوں کے بھیدوں کو طشت از بام کر کے کافروں کو ان پر پل پڑنے کی ترغیب دینا، جناب نبی کریم ﷺ اور قرآن مقدس پر ایمان لانے سے لوگوں کو روکنا تھا۔ کسائی نے قیل کو اور نہ صرف قیل کو بلکہ غیض اور جئی اور حیل اور سیق اور سیئی اور سیئت کو اشمام سے پڑھا ہے اور ابن عامر نے اخیر کے چاروں کلموں میں موافقت کی ہے مگر نافع نے صرف اخیر کے دو صیغوں میں موافقت کی ہے۔ یہاں اشمام سے مراد ہے فاء کلمے کے کسرہ کو ضمے کی طرف اور یاء کو واؤ کی طرف مائل کرنا (یعنی کسرہ کو ضمے اور یاء کو واؤ کی بو میں پڑھنا) اور بعض کہتے ہیں کہ فاء کلمے کو ضمے سے بطور اشباع اور بعضوں کے نزدیک بطور اختلاس پڑھنا۔ بعض قراء اس بات کے قائل ہیں کہ دونوں ہونٹوں سے ضمہ مقدرہ کی طرف اشارہ کرنا اور پھر اسے خالص کسرے سے پڑھنا اشمام ہے۔ لیکن پہلی روایت صحیح تر ہے (اور اسی پر قراء کا اتفاق بھی ہے) کسائی اور ابن عامر اور نافع کے علاوہ باقی قاری قیل کو صرف کسرے سے

marfat.com

پڑھتے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ (تو وہ کہتے ہیں کہ کہ ہم تو لوگوں میں میل جول کرانے والے ہیں) حالانکہ وہ محض جھوٹے اور دروغ گو ہیں۔ یہ منافقوں کا مقولہ ہے اور ان لوگوں کے رد میں استعمال کیا گیا ہے جو انہیں ملک خدا میں فساد نہ پھیلانے کی بابت نصیحت کرتے تھے۔ رد بھی پرزور طور پر کلمۂ انّما کے ساتھ ہے (یعنی جب مسلمان ان سے کہتے تھے کہ ملک میں فساد نہ ڈالو تو وہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کہہ کر ان کے قول کی تردید کرتے تھے) یا یوں کہو کہ جب مسلمان انہیں فساد کے برپا کرنے سے روکتے تھے تو وہ باہم کہتے تھے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ گویا وہ فساد کو صلاح کی صورت میں دیکھتے تھے اور یہ اس لئے کہ ان کو ان کے تمام برے کرتوت اچھی اور مزین صورت میں دکھائے جاتے تھے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫ (سنو جی! یہی لوگ فسادی ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں) یہ خدا کی طرف سے منافقوں کے دعویٰ کی تردید ہے اور یہ تردید بھی نہایت بلیغ (یعنی منافق جو اس بات کے دعویدار تھے کہ ہم ملک میں فساد نہیں پھلاتے بلکہ لوگوں میں میل جول پیدا کراتے ہیں تو خدا تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ باطل کو ایسے پُرزور طرز کے ساتھ رد کیا کہ اس سے بلیغ زیادہ کوئی وجہ ہو نہیں سکتی مثلاً جملے کا مستاقہ ہونا۔ حرف تنبیہ کے ساتھ شروع کرنا جو تحقیق مضمون کا فائدہ دیتا ہے پھر کلمہ اِنَّ سے اس کی تاکید مزید کرنا خبر کو معرف با لام لانا، اسم اور خبر کے بیچ میں ضمیر فصل داخل کرنا اور جملہ لَا يَشْعُرُوْنَ کو استدراک کے ساتھ بیان کرنا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ,اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تم بھی ایمان لے آو) یعنی جس طرح مہاجرین وانصار اسلام میں سچے دل سے داخل ہو گئے ہیں تم بھی ویسے ہی صاف دل سے داخل ہو جاؤ۔ یا یہ معنی کہ جس طرح یہودیوں میں سے عبد اللہ بن سلام وغیرہ ایمان لے آئے ہیں تم بھی اسی طرح ایمان لے آؤ۔ یہ جملہ ان ہی ناصحین کا مقولہ ہے جو منافقوں کو ملک خدا میں فساد پھیلانے سے منع کرتے تھے اور تکمیل نصیحت کے لئے لایا گیا ہے کیونکہ فساد سے اعراض کرنا اور تقاضائے ایمان کو بجالانا یہی کمال انسان ہے كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ نصب کے محل میں ہے کیوں کہ اٰمِنُوْا کا مفعول مطلق واقع ہوا ہے اور ما مصدریہ ہے یا کافہ جیسا کہ رُبَّمَا میں۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (تو کہتے ہیں باہم کہ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح اور احمق ایمان لے آئے ہیں) سفہ کہتے ہیں خفت عقل کو اور اس کی ضد ہے حلم۔ بعض کہتے ہیں جو شخص عمداً اور قصداً جھوٹ بولتا ہے اسے سفیہ کہتے ہیں۔ منافقوں نے مسلمانوں کو یا تو اس وجہ سے احمق اور بے وقوف کہا کہ واقعی وہ ان کے فساد رائے کے معتقد تھے یا تحقیر شان کی وجہ سے کہا۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ (سنو جی! یہی لوگ احمق ہیں) کیونکہ رات دن معجزات دیکھتے ہیں توراۃ سے پیغمبر آخر الزماں کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور باوجود اس کے ایمان نہیں لاتے تو جو شخص آسمانی کتاب کی شہادت اور معجزات کے ثبوت کے بعد بھی خدا کے کلام مقدس پر ایمان نہ لائے اس کے نبی کریم ﷺ کا انکار کرے اس سے بڑھ کر اور کون احمق ہو سکتا ہے اس جملہ میں بھی ویسا ہی رد اور مبالغہ ہے جیسا کہ سابق جملہ میں تھا۔ حرمین اور ابو عمرو نے السفھاء کو خاص کر وصل کی حالت میں دوسرے ہمزہ کی تسہیل سے پڑھا ہے اور یہی حال ہے اور دو ہمزوں کا جو دو کلموں میں واقع ہوں اور دونوں حرکت میں مختلف ہوں جیسے مِنَ الْمَآءِ اور بِمَآ اور شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ اور مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ اور جَآءَ اُمَّةً میں اور تسہیل کا حکم یہ ہے کہ ہمزہ کا اس کے مخرج اور اس حرف کے مخرج کے درمیان تلفظ کریں کہ جس کے مناسب ہمزہ کی حرکت ہے یہ حکم دائمی نہیں ہے بلکہ اس وقت تک ہے جب تک کہ ہمزہ کا ماقبل مفتوح یا مکسور یا مضموم نہ ہو کیونکہ جس حالت میں کہ ہمزہ کسرہ ماقبل کے ساتھ ہو تو وہ یاء مفتوحہ سے اور جس حالت میں ضمہ ماقابل کے ساتھ ہو واو مفتوحہ سے بدل دیا جاتا ہے اور جس ہمزہ مکسورہ کا ماقبل مضموم ہو واؤ مکسور سے بدل دیا جاتا ہے اور حرمین اور ابو عمرو کے سوا اور قراء نے سُفَهَاء

اور اَلَا اِنَّھُم کے ہمزوں کو تحقیق سے پڑھا ہے (یعنی ابدال و تسہیل وغیرہ نہیں کیا بلکہ ہمزہ کو اسی کے مخرج سے پڑھا ہے)
وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ (لیکن وہ جانتے نہیں) اس آیت میں حق تعالیٰ نے لَا یَعْلَمُوْنَ فرمایا اور اس سے پہلی آیت میں لَا یَشْعُرُوْنَ تو اس اختلاف عنوان کی وجہ یہ ہے کہ دینی کاموں کے آگاہ ہونے اور معلوم کرنے میں تو فکر اور غور اور نظر کرنے کی حاجت ہے اس لئے لایعلمون فرمایا اب رہا فساد تو وہ حس ظاہری اور ادنیٰ التفات سے بھی معلوم ہو سکتا ہے اس وجہ سے وہاں لا یشعرون ہی فرمانا مناسب ہوا۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ (اور جب مؤمنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لا چکے ہیں) یعنی ہم بھی تمہاری طرح ایمان لے آئے ہیں۔ یہ آیت منافقین کے معاملہ کا بیان ہے کہ جس کو وہ کفار اور مومنین سے کیا کرتے تھے۔ اور جس آیت سے اصل قصہ منافقین کا شروع کیا گیا ہے (یعنی وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ) وہ آیت ان کے نفاق کی تمہید کے لئے بیان کی گئی ہے (مضمون مکرر نہیں ہے جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔

وَاِذَا خَلَوْا (اور جب تنہائی میں) لفظ خَلَوْا یا تو خلوت بفلان الیہ سے مشتق ہے اور یہ اس وقت بولتے ہیں جبکہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ تنہا اور اکیلا ہو یا یہ کہ خلاک ذم سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تجھ سے مذمت بر طرف ہوئی اور القرون الخالیۃ بھی اسی سے مشتق ہے۔ اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ (اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں) شیاطین سے مراد منافقین کے سردار و پیشوا ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ پانچ شخص یہود میں سے منافقین کے سردار و پیشوا تھے۔ مدینے میں کعب بن اشرف قبیلہ بنی اسلم میں، ابو بردہ قبیلہ جہینہ میں، عبد الدار بنی اسد میں، عوف بن عامر شام میں، عبد اللہ بن سوداء۔ شیطان لغت میں سرکش اور حد سے گزرنے والے کو کہتے ہیں خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا آدمیوں میں سے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (یعنی اسی طرح ہم نے پیدا کر دیئے ہر نبی کے دشمن شیطان آدمیوں میں سے اور جنات میں سے) اور دوسری آیت میں فرمایا مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (یعنی پناہ مانگتا ہوں میں شیطان کی برائی سے جو جنوں اور آدمیوں میں سے ہو) اور یا مراد شیاطین سے کاہن ہیں۔ کہ ہر کاہن کے ساتھ شیطان ہوتا تھا جو اس کا تابع ہوتا تھا۔ لفظ شیطان یا تو شَطَنَ سے مشتق ہے کہ جس کے معنی ہیں دور ہوا جیسا کہ عرب اپنے محاورہ میں بولتے ہیں بیئر شطون (یعنی بہت گہرا کنواں) چونکہ شیطان شر میں بڑھا ہوا ہے اور خیر سے دور ہے اس لئے اس کا نام شیطان رکھا گیا۔ یا یہ کہ شاط سے مشتق ہے کہ جس کے معنی ہیں باطل ہوا۔ چنانچہ شیطان کا ایک نام باطل بھی ہے اس صورت میں نون شیطان میں زائد ہوگا۔

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ (کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں) یعنی دین اور اعتقاد میں تمہارے ساتھ ہیں جملہ اسمیہ کے ساتھ اور پھر اس کو اِنَّ سے مؤکد کر کے کافروں کو مخاطب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ کافروں کو یقینی طور پر منافقوں کا اپنے دین و اعتقاد پر ثابت قدم رہنا معلوم ہو جائے۔

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴ (ہم تو مؤمنین کے ساتھ ٹھٹھا کرنے والے ہیں) یہ جملہ یا تو پہلے جملہ کی تاکید ہے کیونکہ جو شخص کسی کے ساتھ ٹھٹھا کرنے والا اور اسے ہلکا سمجھنے والا ہوتا ہے وہ اس کے خلاف پر مصر ہوا کرتا ہے۔ یا پہلے جملے سے بدل ہے کیونکہ جو اسلام کی تحقیر کرتا ہے وہ بڑے کفر کا مرتکب ہے یا جملہ مستانفہ ہے گویا یہاں ایک سوال پیدا ہوتا تھا اس کا یہ جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب منافقین نے اپنے شیطان سے کہا کہ ہم دین واعتقاد میں تمہارے ساتھ ہیں تو انہوں نے کہا جب یہ بات ہے تو تم ایمان کا دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ اس وقت منافقین نے اس کے جواب میں یہ جملہ کہا۔ استھزاء لغت میں سخریت یعنی ٹھٹھا کرنے اور استخفاف یعنی ہلکا سمجھنے کو کہتے ہیں اور لفظ ھزا ٔت اور استھزاٴت ہم معنی ہیں جیسا کہ اجبت اور استجبت کے ایک معنی ہیں اور اصل استھزاء کے معنی خفتہ کے ہیں چنانچہ ناقتہ تھزاء یعنی سبک رو اونٹنی کہا جاتا ہے۔ ابو جعفر نے ان الفاظ میں ہمزہ کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ مستھزون، یستھزون، استھزا، فبواطوا، ویستنبونک،

خاطون ،خاطین، متکون ،متلین ،فمالون المشون

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (خدا ان کے ساتھ ٹھٹھا کرتا ہے) یعنی انہیں ٹھٹھا کرنے کی جزا دیتا ہے لفظی مقابلہ کے طور پر ٹھٹھا کرنے کی سزا کو ٹھٹھا کرنے سے تعبیر کر دیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ کا ٹھٹھا کرنا یہ ہے کہ ان کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جائے گا۔ جب وہ اس دروازہ تک پہنچیں گے تو فوراً بند کر دیا جائے گا اور آگ کی طرف دھکیل دیئے جائیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ کا ٹھٹھا کرنا یہ ہے کہ مؤمنین کے لئے ایک نور پیدا کیا جائے گا کہ جس کی روشنی سے پل صراط پر چلیں گے جب منافق اس نور تک پہنچیں گے تو ان کے اور مؤمنین کے مابین ایک پردہ حائل ہو جائے گا جیسا کہ حق تعالیٰ اپنے کلام پاک میں ایک جگہ فرماتا ہے۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ (یعنی پھر بنادی جائے گی ان کے درمیان ایک دیوار کہ جس کا ایک دروازہ ہوگا) حسنؒ نے فرمایا کہ ٹھٹھا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے نفاق کو مؤمنین پر ظاہر فرمادیتا ہے۔ ابن ابی الدنیا نے کتاب الصمت میں حسنؒ سے روایت کیا ہے کہ جو لوگوں سے ٹھٹھا کرتے ہیں ان میں سے ایک کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا اور اسے پکارا جائے گا کہ آ، یہاں آ جب وہ وہاں تک پہنچے گا اور دروازہ سے پرے ہی ہوگا کہ دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ حدیث کا مضمون ختم ہوا۔ یہ حدیث مرسل اور جید ہے جملہ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کو علیحدہ بیان کیا گیا اور پہلے کلام پر عطف نہیں کیا گیا تاکہ یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ اللہ ہی ان کی جزا دینے کے لئے کافی ہے۔ مؤمنین کو ان سے تعرض کرنے کی حاجت نہیں اور بجائے اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے اَللّٰهُ مُسْتَهْزِئٌ بِهِمْ نہیں فرمایا تو اس میں یہ حکمت ہے کہ سزاء استہزاء انہیں متواتر ملتی رہے گی (اور اس تکرار پر مضارع کا صیغہ خود دلالت کر رہا ہے) چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ یعنی کیا نہیں دیکھتے وہ کہ سال میں ایک یا دو دفعہ مبتلائے مصیبت ہوتے رہتے ہیں۔

وَيَمُدُّهُمْ (اور اللہ انہیں مہلت دیتا ہے) لفظ یمد، مَدَّ الْجَيْشَ سے مشتق ہے اور مدالجیش کے معنی ہیں لشکر کو زیادہ کیا اور اسے قوت دی۔ مد کے اصلی معنی زیادتی کے ہیں۔ لفظ مد اور امداد ہم معنی ہیں صرف فرق ہے تو اتنا ہے کہ مد کا استعمال اکثر شر میں آتا ہے اور امداد کا خیر میں جیسا کہ حق تعالیٰ کے اس قول میں امداد کا استعمال خیر میں آیا ہے وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ (اور ہم نے مال اور اولاد سے تمہاری مدد کی ہے) فِىْ طُغْيَانِهِمْ (اپنی سرکشی میں طغیان سے مراد گناہ اور کفر میں حد سے متجاوز ہونا۔ کسائی نے لفظ طغیان کو ہر جگہ امالہ سے پڑھا ہے) يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵ (بھٹکے پھرتے ہیں) لفظ عمہ لغت میں بصیرت یعنی دانائی اور سمجھ کے ضائع ہونے کو کہتے ہیں جیسا کہ لفظ عمٰی بینائی کے ضائع ہونے کو بولتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ (یہی ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی سو نفع نہ لائی ان کی سوداگری) اِشْتَرَوا میں اِشْتَراء سے مراد استبدال اور ضَلَالَۃً سے مراد کفر اور ھدٰی سے مراد ایمان ہے اور خرید و فروخت کے ذریعے سے اصل سرمایہ پر زیادتی طلب کرنے کو تجارۃ کہتے ہیں اور ربح (یعنی نفع کو) تجارۃ کی طرف مجازاً اسناد کر دیا ہے اور وجہ مناسبت یہ ہے کہ لفظ تجارت ربح کے فاعل کے ساتھ متصل ہے یا یہ مناسبت ہے کہ تجارۃ ربح کا سبب ہے جیسا کہ فاعل ربح کا سبب ہوتا ہے۔

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶ (اور وہ راہ پانے والے نہ ہوئے) یعنی تجارت سے انہوں نے راہ نہ پائی کیونکہ تجارت سے مقصود سرمایہ کی سلامتی کے ساتھ نفع کا حاصل ہونا ہے سو انہوں نے اصل سرمایہ ہی کو ضائع کر دیا۔ یہاں سرمایہ سے فطرت (یعنی قبول حق کی استعداد) مراد ہے اور نفع حاصل نہ کرنے سے مراد حق اور کمال کا حاصل نہ کرنا ہے۔

مَثَلُهُمْ (ان کا عجیب حال) لفظ مَثَل اور مِثْل اور مثیل اصل میں نظیر کو کہتے ہیں پھر اس قول مشہور کو کہنے لگے جس کا محل استعمال محل وضع سے مشابہ ہو۔ اور مثل وہی قول بن سکتا ہے جس میں کسی قسم کی غرابت ہو اس کے بعد ہر حال عجیب و نادر کو مثل بولنے لگے چنانچہ اس آیت میں مثل کے معنی حال عجیب اور نادر کے ہی ہیں۔

marfat.com

كَمَثَلِ الَّذِي (ان لوگوں کے حال عجیب کی مانند ہے) اس مقام میں الذی بمعنی الذین ہے جیسا کہ آیت وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوْا (میں الذی بمعنی الذین ہے) اور الذی کو بجائے الذین کے ذکر کرنا جائز ہے حالانکہ لفظ القائم کو بجائے القائمین کے بولنا جائز نہیں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ الذی کی صورت میں مقصود بیان الذی خود نہیں ہے بلکہ اس جملہ کو بیان کرنا مقصود ہے جو صلہ ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ الذی اسم تام نہیں بلکہ اس تام کا گویا جز ہے اور کسی اسم کی جز کی جمع نہیں آتی (بلکہ اسم تام کی جمع آتی ہے) اور الذین اس کی جمع نہیں بلکہ وہ اسم مستقل ہے کہ اس میں کسی قدر زیادتی ہے کہ وہ زیادتی معنی زائد پر دال ہے اور اسی واسطے الذین ہمیشہ یا کے ساتھ آتا ہے۔

اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ (جنہوں نے آگ سلگائی پس جب آگ نے آگ جلانے والوں کے ارد گرد کو روشن کو دیا) ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (تو لے گیا اللہ ان کی روشنی کو) یہ آیت لما کا جواب ہے اور بجائے روشنی کے آگ نہیں فرمایا کیونکہ یہاں مقصود آگ سے ان کو روشنی ہی تھی اور نور کے ضائع کرنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ تمام امور اسی کے پیدا کرنے سے موجود ہوتے ہیں اور یا یہ ہے کہ اس موقع میں آگ بجھنا کسی خفی یا سماوی سبب سے وقوع میں آیا ہوگا۔ اس لئے اس فعل کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا یا ذہاب نور کو مؤکد بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر دی اور یا جواب لما کا اختصار اور التباس نہ ہونے کی وجہ سے محذوف ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کے قول فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ میں جواب لما کا حذف کر دیا گیا ہے اس تقدیر پر جملہ ذَهَبَ اللّٰهُ الخ یا تو مستانفہ ہے یعنی ایک کلام سابق سے پیدا ہونے والے سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہو سکتا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ منافقین کو اس شخص کے حال سے تشبیہ دی جس نے آگ سلگائی اور پھر وہ آگ بجھ گئی۔ یا یہ کہ جملہ تشبیہ یعنی كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا سے بیان کے طور پر بدل ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ میں ضمیر منافقین کی طرف راجع ہوگی۔

وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (اور انہیں چھوڑ دیا اندھیریوں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے) اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے چند امور کو اختیار فرمایا اول یہ کہ ظلمت کو ذکر فرمایا (حالانکہ اصل مقصود بغیر ذکر ظلمت کے بھی حاصل تھا) دوسرے یہ کہ صیغہ جمع سے ذکر فرمایا، تیسرے یہ کہ بصورت نکرہ بیان فرمایا چوتھے، یہ کہ ظلمت کی صفت لا یبصرون ذکر کی۔ یہ چاروں امر ظلمت کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے ذکر فرمائے۔ حاصل یہ ہوا کہ گویا وہ ایک ظلمت تہ بر تہ متعدد تاریکیوں کا مجموعہ ہے اور چونکہ لفظ ترک آیت میں صیّر کے معنی کو شامل ہے اس لئے قائم مقام افعال قلوب کے کر دیا گیا اور لا یبصرون کا مفعول ترک کر دیا گیا گویا یہ فعل متعدی ہی نہیں اور اس طرح نفس رویئت کی ہی نفی ہو گئی۔ یہ آیت یا تو بطور مثل اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے حق میں بیان فرمائی ہے جس کو ایک قسم کی ہدایت عطاء فرمائی اور اس نے ضائع کر دی اس کو نعمت ابدی تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بنایا جب وہ ہدایت ضائع ہو گئی تو حیران اور حسرت مندرہ گیا۔ پس یہ آیت سابق آیت کے مضمون کی توضیح و اثبات کے لئے ذکر فرمائی کیونکہ منافقوں نے اس کلمہ حق کو جو ان کی زبانوں سے نکلا تھا، دلوں میں کفر کو پوشیدہ کر کے ضائع کر دیا تھا۔ یا یہ آیت مثل نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے منافقین کے ایمان کو آگ سے تشبیہ دی کیونکہ دنیا میں وہ ایمان ان کے خون اور مال کو محفوظ رکھتا ہے اور احکام اور غنائم میں ان کو مسلمانوں کا شریک بنا دیتا ہے مگر اس کا اثر باقی رہنے والا نہیں ایسا ایمان ان کو آخرت میں تباہ کر دے گا اور دنیا میں ان کا حال سب پر ظاہر ہو جاتا ہے گویا آگ بجھا دی جاتی ہے۔

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ (وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں) مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے آگ سلگائی تھی جب اللہ نے ان کے نور کو ضائع کر دیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا تو ان کو مدہوش کر دیا اور ان کے حواس میں خلل آ گیا۔ پس اس تفسیر کے موافق یہ کلام حقیقت ہے (مجاز ماننے کی ضرورت نہیں) اور اگر بنورھم میں ضمیر منافقین کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ جب انہوں نے حق کی طرف کان نہ لگائے حق بات کہنے اور آیات کو سمجھنے اور حق پر غور کرنے سے انکار کیا تو گویا ان کے حواس اور قویٰ جاتے رہے اور اس تقدیر پر ان کو بہرے گونگے اندھے کہنا تمثیل کے طور پر ہے استعارہ نہیں ہے

marfat.com

کیونکہ مستعار بہ یعنی کلمہ "ہم" اگرچہ لفظاً محذوف ہے لیکن حکم میں ملفوظ ہی کے ہے پس جو استعارہ کی شرط ہے وہ فوت ہو گئی اس صورت میں یہ آیت تشبیہ سابق کا گویا نتیجہ ہو گی۔

فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ (سو وہ نہیں لوٹے) یعنی وہ حیران ہیں اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس جگہ سے آئے تھے وہاں کس طرح واپس ہوں یا یہ معنی کہ گمراہی سے اس ہدایت کی طرف جس کو ضائع کر دیا واپس نہیں ہوتے۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ (یا انکا حال آسمانی بارش والوں کا سا ہے) لفظ صیب صوب بمعنی نزول سے فیعل کے وزن پر ہے بارش کو صیب اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی نازل ہوتی ہے اور لفظ صوب میں مبالغہ ہے کیونکہ صوب کے معنی بے حد بہنے کے ہیں اور خود صیغہ فیعل میں بھی مبالغہ ہے اور تنکیر صیب کی تفخیم کے لئے ہے اور کلمہ "او" شک میں مساوات کے لئے اصل میں موضوع ہے پھر اس کے لئے استعمال میں وسعت کر لی گئی اور جو مساوات بغیر شک کے ہو اس کے لئے بھی استعمال کرنے لگے۔ اس آیت میں او کے یہ معنی ہوں گے کہ منافقین کو دونوں قصوں سے تشبیہ دینا برابر ہے گویا مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب تجھ کو تشبیہ میں اختیار دیا جاتا ہے۔ دونوں قصوں میں سے جس قصہ کے ساتھ چاہے تشبیہ دے جیسا کہ آیت وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ اے مخاطب تجھ کو کفار کی خصلتوں میں اختیار دیا جاتا ہے (یعنی نہی اطاعت میں سب برابر ہیں) اور السماء کو معرف باللام لانا بتا رہا ہے کہ ابر آسمان کے تمام اطراف کو محیط ہو گیا تھا کیونکہ آسمان کے ہر جانب کو سماء کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ سماء کے معنی آیت میں ابر کے ہیں کیونکہ ہر اونچی شئے کو سماء بولتے ہیں اور الف ولام تعریف جنس کے لئے ہے لیکن اور آیتیں ظاہر الفاظ کے لحاظ سے یہ بتلا رہی ہیں کہ بارش آسمان سے برستی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا یعنی اتارا ہم نے آسمان سے پانی پاک کرنے والا) اور ابن حبانؒ نے بیان کیا ہے کہ حسنؒ سے کسی نے دریافت کیا بارش آسمان سے برستی ہے یا ابر سے فرمایا آسمان سے ابر تو محض علامت ہے۔ اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بیان کیا کہ خالد بن معدان نے فرمایا بارش عرش کے نیچے سے نکل کر ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف اترتی ہوئی آسمان دنیا میں ایک مقام پر جس کو ارزم کہتے ہیں جمع ہو جاتی ہے پھر سیاہ ابر ہو جاتا ہے اور وہ بارش اس میں داخل ہو جاتی ہے اور ابر اس کو پی لیتا ہے پھر اس کو اللہ تعالیٰ جس طرف چاہتا ہے لے جاتا ہے اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ بارش ساتویں آسمان سے اترتی ہے۔

فِيهِ (کہ اس بارش میں اندھیری اور گرج اور بجلی ہے) فیہ میں ضمیر یا تو صیب کی طرف راجع ہے یا سماء کی طرف کیونکہ لفظ سماء مذکر و مونث دونوں طرح آتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے السَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ اور فرمایا انفطرت۔ ظُلُمَاتٌ مطلب یہ ہے کہ ظلمتیں تہ بر تہ ہیں اول ظلمت بارش کی دوسری ابر کی تیسری رات کی وَرَعْدٌ رعد اس آواز کو کہتے ہیں جو ابر سے سنائی دیتی ہے۔

وَبَرْقٌ برق اس آگ کو کہتے ہیں جو ابر سے نکلتی ہے اور لفظ رعد اور برق دونوں مصدر ہیں اسی واسطے ان کی جمع نہیں آتی۔ علیؓ اور ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ رعد فرشتہ کا نام ہے جو ابر کو چلاتا ہے اور برق آگ کے کوڑے کی چمک ہے فرشتہ اس کوڑے سے ابر کو چلاتا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ آواز ابر کے دفع کرنے کی ہے اور بعض نے کہا کہ یہ آواز فرشتہ کی تسبیح کی ہے۔ مجاہدؒ نے فرمایا کہ رعد فرشتہ کا نام ہے اور اس کی آواز کو بھی رعد کہتے ہیں اور بارش کو رعد اور برق کا مقام اس لئے فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں بارش برسنے کے وقت ہوتی ہیں اور لفظ رعد و برق کا رفع فاعل ظرف ہونے کی وجہ سے ہے۔

يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم (اپنی انگلیاں کانوں میں دے لیتے ہیں) یجعلون میں ضمیر اصحاب صیب (بارش والوں) کی طرف راجع ہے (اگرچہ لفظ) اصحاب لفظاً مذکور نہیں مگر معنی نیت میں ہے۔ کسائی نے اٰذانھم اور اٰذاننا طغیانھم کو ہر جگہ امالہ سے پڑھا ہے اور بجائے پوروں کے انگلیاں مبالغہ کیلئے ذکر کر دی ہیں، یہ جملہ

marfat.com

مستانفہ (یعنی جواب سوال کا ہے) گویا سوال کرتا ہے کہ باوجود ان شدائد کے جو اوپر مذکور ہوئیں ان لوگوں کی اس وقت کیا حالت تھی۔

مِّنَ الصَّوَاعِقِ (کڑک کے مارے) جار مجرور یجعلون کے متعلق ہے صعق ایسی شدید آواز کو کہتے ہیں کہ جو سنے مر جاوے یا بیہوش ہو جاوے اور خود موت اور بیہوشی کو کہ جو اس آواز کا اثر ہے صعق کہتے ہیں چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ (یعنی مر جائیں گے آسمان والے) اور صواعق جمع صاعقہ کی ہے۔ اور تا مبالغہ کے لئے ہے یا مصدری ہے۔ اور ہر عذاب مہلک کو بھی صاعقہ کہتے ہیں اس آیت میں صواعق سے مراد خوفناک رعد کا ازدحام اور دھکا پیل ہے آگ لئے ہوئے جس شئے پر گزرتا ہے بغیر ہلاک کئے نہیں چھوڑتا ہے۔ یا مراد مطلق رعد ہے۔

حَذَرَ الْمَوْتِ (موت کے ڈر سے) یہ یجعلون کی علت ہے۔ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹ (اور اللہ کافروں کا احاطہ کرنے والا ہے) یعنی اللہ سے کفار بچ نہیں سکتے جیسا کہ محیط سے وہ شئے نہیں بچ سکتی جو اس کے احاطہ میں ہو کفار مکر و فریب کر کے اللہ کے عذاب سے نجات نہیں پا سکتے ابو عمرؒ اور کسائیؒ نے دوری کی روایت کے موافق کاف کی فتحہ کو جب راء کے بعد ہو اور جس جگہ بھی واقع ہو امالہ سے پڑھا ہے اور ورش نے بین بین پڑھا ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ (قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے) یہ جملہ مستانفہ یعنی جواب سوال مقدر کا ہے گویا کوئی سائل سوال کرتا ہے کہ جب اس کڑک وغیرہ نے ان کو گھیرا تو ان کی کیا حالت ہوئی اس سوال کے جواب میں یہ جملہ فرمایا، لفظ کاد یہ بتانے کے لئے وضع کیا گیا ہے کہ اس کی خبر قریب الوقوع تھی لیکن کسی شرط کے مفقود ہونے یا کسی مانع کے موجود ہونے کی وجہ سے واقع نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کاد مع اپنی خبر کے خبر محض ہے جملہ انشائیہ نہیں ہے بخلاف عسیٰ کے کہ وہ امید اور انشاء کے لئے موضوع ہے خطف کے معنی جھپٹ کر کسی شئے کو لینے کے ہیں۔

كُلَّمَآ (ہر مرتبہ) لفظ کلما تکرار پر دلالت کرتا ہے اَضَآءَ لَهُمْ (وہ ان پر چمکتی ہے) اضاء یا تو لازم ہے بمعنی چمکنے کے یا متعدی ہے اور مفعول محذوف ہے اس تقدیر پر معنی یہ ہوں گے کہ جب بجلی کی چمک راستہ کو روشن کرتی ہے مَّشَوْا فِيْهِ (تو وہ اس میں چلتے ہیں) وجہ چلنے کی یہ ہے کہ وہ چلنے کے حریص ہیں اسی واسطے لفظ کلما جو تکرار پر دال ہے اضاء کے ساتھ ذکر فرمایا اور اظلم کے ساتھ اذا ذکر فرمایا۔

وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (اور جب ان پر اندھیر اطاری ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں) اور اظلم بھی مثل اضاء کے متعدی بھی ہے اور لازم بھی وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ (اور اگر اللہ چاہتا) یعنی اگر اللہ ان کے کانوں کو رعد کی شدت سے اور آنکھوں کو بجلی کی چمک سے ضائع کرنا چاہتا۔ مفعول شاء کا حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جواب لو اس پر دال ہے۔

لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ (تو ضرور ان کے کانوں اور آنکھوں کو ضائع کر دیتا) کانوں اور آنکھوں کے جاتے رہنے کو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وابستہ کیا حالانکہ رعد اور برق آنکھوں اور کانوں کے جانے کا ظاہری سبب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام اسباب کی تاثیر حقیقت میں اللہ کے ہی چاہنے سے ہے سو حقیقی سبب اللہ ہی کا چاہنا ہے اسی طرح کل جواہر اعراض اور بندوں کے تمام افعال اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اسی کی مشیت سے وابستہ ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰ (بے شک اللہ ہر شئے پر قادر ہے) یہ آیت پہلے مضمون کی تصریح اور اثبات کے لئے ہے۔ اور لفظ شئ شاء کا مصدر ہے کبھی اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے یعنی شئے بمعنی شائی اس استعمال کے موافق لفظ شئے باری تعالیٰ کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ اور کبھی بمعنی اسم مفعول آتا ہے یعنی شئے بمعنی مشئی، مشئی سے مراد ہے وہ چیز جس کا وجود مطلوب ہو۔ اس استعمال کے موافق لفظ شئ ممکن ہی کو شامل ہو گا اور اسی استعمال کے موافق حق تعالیٰ کا یہ قول ہے اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (یعنی اللہ ہر شئے کا پیدا کرنے والا ہے) اس تقدیر پر لفظ شئ اس آیت میں اپنے عموم پر رہے گا (بخلاف استعمال سابق کے کہ باری تعالیٰ کو مستثنیٰ کرنا پڑے گا) قدرت کسی شئے کے ایجاد پر قابو رکھنے کو کہتے ہیں

marfat.com

اور قادر کے یہ معنی ہیں کہ جو فعل وہ کرنا چاہے کر گزرے نہ کرنا چاہے نہ کرے۔لفظ قدیر میں قادر کے بہ نسبت معنی کی زیادتی ہے باری تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس کا اطلاق بہت ہی کم آتا ہے۔یہ آیت یا تو تمثیل ہے یعنی منافقین کی حیرت و شدت کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی ہے کہ جسے اندھیری رات میں بارش نے آلیا ہو اور ساتھ ہی اس کے گرج، بجلی کی چمک اور کڑک کی خوفناک آوازیں بھی ہوں۔یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو تو بارش والوں سے تشبیہ دی اور دین مستقیم اور قرآن پاک کو بارش سے۔اس تقدیر پر فِيْهِ ظُلُمٰتٌ کے یہ معنی ہوں گے کہ دین میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو اتباع اور پیروی کرنے سے روک رہی ہیں اور وہ ہیں عبادات، مجاہدۂ نفس، اور نفسانی خواہشوں کا ترک کرنا جو سراسر محنت و مشقت اور رنج اور تکلیف سے لبریز ہیں۔ مسلم، امام احمد اور ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا جنت نامرغوبات اور شدائد سے اور دوزخ مرغوبات سے ڈھانکی گئی ہے۔

ترمذی، ابو داؤد اور نسائی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب حق تبارک و تعالیٰ نے جنت پیدا کی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام گئے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے جنت والوں کے لئے اس میں تیار کیا تھا دیکھ کر حاضر ہوئے اور عرض کیا قسم ہے تیرے عزو جلال کی جو اسے سنے گا بغیر جائے اس میں نہ رہے گا پھر اسے اللہ تعالیٰ نے سختیوں اور تکلیفوں سے ڈھانک دیا اور بار دیگر ارشاد ہوا کہ اب پھر جا کر دیکھو چنانچہ حضرت جبرئیل بموجب ارشاد باری پھر دیکھ کر واپس آئے اور عرض کیا کہ تیری عزت و جلال کی قسم اب تو مجھے یہ خوف ہے کہ کوئی بھی اس میں نہ جائے گا۔اسی طرح جب جہنم کو پیدا کیا تو اس وقت بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھنے کا حکم ہوا۔حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دیکھ کر عرض کیا کہ رب العالمین تیری عزت و قدرت کی قسم جو اسے سنے گا وہ کبھی اس میں نہ جائے گا۔پھر اللہ تعالیٰ نے اسے مرغوبات سے ڈھانک کر دوبارہ دیکھنے کا حکم فرمایا۔حضرت جبرئیل علیہ السلام گئے اور دیکھ کر عرض کیا کہ الٰہ العٰلمین تیری عزت و جلال کی قسم کوئی بھی اس میں بغیر داخل ہوئے نہ رہے گا۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی اس مضمون کو اس طرح فرمایا ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (نماز بے شک گراں ہے مگر انہیں گراں نہیں جو اللہ کے ساتھ عاجزی کرنے والے ہیں) (یعنی انہیں آسان و لذیذ ہے)۔

رعد سے مراد وہ آیات ہیں جو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والی ہیں۔برق سے مراد فتوحات اور غنائم کثیرہ ہیں جنہیں منافقین حاصل کرتے تھے اور اس سبب سے انہیں اتباع اور ظاہری اطاعت سہل تھی اور تکلیفوں کی تاریکی دفع ہوتی تھی (یعنی منافقین چونکہ خالص ایمان کی دولت سے محروم تھے اس لئے وہ جو کچھ بھی اطاعت کرتے تھے اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ غنیمتوں کے مال ہاتھ لگیں اور قتل و قید سے نجات پائیں۔اس لئے جب انہیں غنائم ہاتھ آجائیں تو اطاعت گراں نہ ہوتی اور جب ہاتھ نہ لگتیں تو گراں گزرتیں یا برق سے مراد وہ واضح و روشن دلائل ہیں جو راہ راست کی طرف بلا رہی ہیں اور عبادات کی مشقت کو سہل و آسان کر رہی ہیں۔کانوں میں انگلیاں دینے کی وجہ رعد اور کڑک ہے جو خوف کے سبب کانوں میں انگلیاں دے لیتے اور آپس میں کہتے تھے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں بک بک نہ کیا کرو شاید تم ہی غالب آجاؤ۔اور یہ جو فرمایا کہ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں تو اس کا مطلب اس تقدیر پر یہ ہے کہ انہیں یہ خوف لگا رہتا تھا کہ اگر ہم ایمان لے آئے تو عبادتوں کی محنت و مشقت میں پڑھ جائیں گے اور جو کبھی جہاد کا نمبر آگیا تو قتل و قتال کرنا ہوگا۔سو یہ قتل و قتال اور عبادات کی تکالیف ان کی نظر میں بمنزلہ موت تھی چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کے حال کو دوسرے موقع پر اس طرح فرمایا ہے فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (یعنی اے محمد ﷺ آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ جب خوف پیش آتا ہے تو وہ آپ کی طرف دیکھتے ہیں ان کی آنکھیں ایسی چکراتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو) یا کانوں میں انگلیاں دینے سے ان کا یہ مطلب ہو کہ وہ بزعم فاسد یہ سمجھے ہوئے تھے کہ عذاب کی آیتیں سننے سے کانوں کا بند کرنا گویا ان کو عذاب سے بچالے گا جیسا کہ احمق جب رعد اور کڑک سے سہمتا ہے تو کان بند کر لیتا ہے حالانکہ وہ اس بند کرنے سے نجات نہیں پاسکتا۔اور اسی طرح خرگوش جب شکاری کو سامنے آتا ہوا دیکھتا ہے اور کوئی جگہ نجات کی نہیں پاتا تو وہ یہ خیال

marfat.com

کر کے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ اس کا نہ دیکھنا قتل و ہلاکت سے بچالے گا اور وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ سے اس تقدیر پر یہ مراد ہے کہ جو کچھ رنج، رسوائی، عذاب وغیرہ دنیا میں اور دائمی عذاب آخرت میں ان کے لئے کہا گیا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ یا یہ مطلب کہ کانوں کا بند کرنا انہیں مفید نہیں اور نہ یہ فعل انہیں عذاب کی آفتوں سے رستگاری دے سکتا ہے جیسا کہ خرگوش کو شکاری سے آنکھیں بند کرنا خلاصی نہیں دے سکتا بلکہ اسے مغلوب و عاجز کر دیتا ہے اور يَكَادُ الْبَرْقُ میں بھی برق سے مراد فتوحات اور غنائم اور شوکت اسلام ہے اس تقدیر پر آیت کے یہ معنی ہوں گے۔ چونکہ یہ لوگ دنیا کے حریص زیادہ ہیں اس لئے فتوحات و غنائم وغیرہ ان کی آنکھوں کو عنقریب راہ حق دیکھنے سے اندھا کرنے والی ہیں یا یہ کہ برق سے مراد روشن اور واضح دلائل ہوں۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اسلام کی حقانیت کی واضح اور روشن دلائل عنقریب ان کی آفت رسیدہ نگاہوں اور ان کی بیہودہ عقلوں کو جن سے وہ باطل کو حق اور حق کو باطل خیال کرتے اور دیکھتے ہیں سلب کرنے والی ہیں۔ پس جب ایسی عقلیں اور نگاہیں مسلوب ہو جاتی ہیں تو وہ حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھنے لگتی ہیں اور دل میں ایمان آجاتا ہے۔

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ یعنی جب مسلمانوں کی دولت و فتح ظاہر ہوتی ہے اور وہ اسلام کی کھلی حجتیں دیکھتے ہیں تو اس روشنی میں چلتے ہیں۔ یعنی مؤمنین کا اتباع کرتے ہیں اور جب برق غائب ہو جاتی اور تاریکی چھا جاتی ہے یعنی فتح ظاہر نہیں ہوتی اور دین میں رنج و مشقت پاتے ہیں تو اسلام کے روشن دلائل کو بھول جاتے ہیں اور کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور چلنے سے ٹھیر جاتے ہیں اسی مضمون کے مطابق حق تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بھی فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (یعنی بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ اللہ کی عبادت شک اور تردد سے کرتے ہیں اگر کوئی نعمت حاصل ہو گئی تو مطمئن ہو گئے اور جو کوئی بلا آگئی تو الٹے پھر گئے) وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو ان کے کانوں اور آفت رسیدہ آنکھوں کو رعد کی شدت سے ضائع کر دے اور حق کو دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان عنایت فرمادے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّىْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ (یعنی اگر ہم چاہتے ہیں تو ہر شخص کو اس کی ہدایت عطا فرماتے مگر میری یہ بات پوری ہو گئی کہ میں جہنم کو بھروں گا۔

ابن جریرؒ نے سدی کبیرؒ کے طریق سے بروایت ابی مالکؒ بحوالہ ابن عباسؓ نیز ابن جریرہی نے مرہ سے بحوالہ ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ روایت کیا ہے کہ دو منافق سرور عالم ﷺ کے حضور سے مشرکین میں شامل ہونے کے لئے مدینہ سے چلے راستہ میں ان کو ایسی ہی بارش نے کہ جس کی نسبت حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس میں رعد اور برق اور ظلمت تھی آگھیرا۔ جب کڑک کی ہولناک آوازیں کانوں میں آتیں تو اس وقت اس ڈر سے کہ کہیں یہ کانوں میں گھس کر ہلاک نہ کر دے کانوں میں انگلیاں دیتے اور جب بجلی کوندتی تو اس کی روشنی میں چلتے اور جب نہ کوندتی تو انہیں کچھ دکھائی نہ دیتا اسی طرح گرتے پڑتے اپنے مقام و منزل پر آئے اور کہنے لگے کہ خدا کرے جلدی صبح ہو تو ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیں چنانچہ جب صبح ہوئی تو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے اور سچے دل سے بیعت کر لی اور اسلام ان کا کامل ہو گیا پس اللہ تعالیٰ نے ان دونوں منافقوں کے حال کو مدینہ کے منافقین کے لئے مثل بنا دیا کیونکہ ان کی حالت بھی انہیں کے مشابہ تھی چنانچہ جب سرور کائنات ﷺ کی مجلس شریف میں آتے تو کانوں میں انگلیاں دیئے رہتے کہ کبھی کوئی ایسی آیت نہ سن لیں جو ان کے بارہ میں نازل ہوئی ہو یا یہ کہ ایسی بات کا ذکر نہ سن پائیں کہ جو ان کے قتل کا سبب بن جائے جیسا کہ وہ دونوں انگلیاں کانوں میں دیتے اور تاریکی کے وقت توقف کرتے تھے۔

منافقین کی حالت یہ تھی کہ جب ان کے پاس مال و اولاد کثرت سے ہو جاتا اور غنیمت و فتح میسر ہو جاتی تھی تو اسلام کا اتباع کرتے اور کہتے تھے کہ محمد ﷺ کا دین اب تو سچا ہی معلوم ہوتا ہے اور دین پر کچھ قائم رہتے تھے جیسے کہ وہ دونوں بھی جب بجلی نہ چمکتی تو حیران کھڑے رہ جاتے تھے۔ تمام ہوا مضمون روایت جریرؒ کا۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ ظلمات سے مراد آیات متشابہات ہوں کہ جو رائے و عقل سے سمجھ میں نہیں آسکتیں اور برق

marfat.com

سے مراد آیات محکمات ہوں کہ جو عقل متوسط سے سمجھ میں آسکیں تو مؤمن خالص اور فرقہ ناجیہ اہلسنت تو یہی کہتے ہیں کہ ہم سب پر ایمان لاتے ہیں خواہ ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں جو کچھ ہے اللہ کی طرف سے ہے اور جن کے دل میں نفاق اور کجی ہے وہ فساد و فتنہ ڈالتے اور اپنی رائے کے موافق آیات میں تاویلات باطلہ کرتے ہیں اور اگر اس کی ممانعت سنائی جاتی ہے تو کان بند کر لیتے ہیں اور حَذَرَ الْمَوْتِ میں اس توجیہ کے موافق موت سے مراد آیات کے وہ معانی حقہ ہیں کہ جو ان کی رائے ناقص اور ان کے مذہب باطل کے موافق و معین نہیں ہیں کیونکہ ان معانی کو گویا وہ موت سمجھتے ہیں اور قرآن کو اپنی کجی رائے کے موافق بنانا چاہتے ہیں۔ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ یعنی جب کوئی حکم ان کے رائے ناقص کے موافق ہوتا ہے تو اس کا اتباع کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا۔ یعنی جب ان کی عقل وہاں تک نہیں پہنچتی تو اس پر ایمان لانے سے توقف کرتے اور اپنی رائے فاسد کی موافق اس کی تاویل کی فکر میں لگتے ہیں پس ایسی تاویلات باطلہ کرنے والوں کے بہت سے فرقے ہو گئے بعض تو وہ ہیں کہ کہتے ہیں ہر موجود مجسم ہی ہوتا ہے اور ہر شے کا مثل ہو سکتا ہے تو ان کی عقل کو اس طرف رسائی ہی نہ ہوئی کہ کوئی موجود غیر ذی جسم اور بے مثل بھی ہوتا ہے اسی بناء پر تنزیہ باری تعالیٰ کا انکار کر بیٹھے اور حق تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کر دیا یہ تو مجسمہ بن گئے اور بعض نے رویت کا انکار کیا اور بعض نے عذاب قبر کو اور وزن اعمال کو اور صراط وغیرہ کو نہ مانا اور بعض نے قرآن کے غیر مخلوق ہونے سے انکار کیا حالانکہ قرآن اللہ کا کلام ہے یہاں تک کہ بہتر (۷۲) فرقے ہو گئے۔ رافضی، خارجی، معتزلہ، مجسمہ وغیرہا گویا یہ سب (زبان حال سے) کہہ رہے ہیں نُؤْمِنُ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (یعنی ہم کتاب کے بعض حصہ پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار و کفر کرتے ہیں) وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ یعنی اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو ضائع فرما دیتا کیونکہ انہوں نے کتاب اللہ کو اپنی رائے کے تابع بنالیا۔ اس تفسیر کے موافق وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ سے آخر رکوع تک تمام آیات اہل ہواء کے بہتر فرقوں کو کہ جنہوں نے اپنے دین میں اختلاف ڈال دیا اور سب کے سب اپنے حال میں مست ہو گئے متضمن اور شامل ہوں گی (۔ تقریر و توضیح اس کی مندرجہ ذیل ہے) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لے آئے۔ یعنی ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ حالانکہ وہ ایمان والے نہیں یعنی رسول اللہ ﷺ جن احکام کو لائے ہیں ان سب پر ایمان نہیں لائے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (یعنی اللہ اور مؤمنین کو) (آیات قرآنی میں تاویلات فاسدہ کر کے) دھوکا دیتے ہیں۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ یعنی وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں لیکن اس کو سمجھتے نہیں بلکہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور معنی قرآن کے یہی ہیں جو ہم نے تراشے ہیں۔ سنو! بے شک یہ لوگ جھوٹے ہیں فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یعنی ان کے دلوں میں کجی ہے۔ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا اللہ نے ان کی کجی کو بڑھا دیا چنانچہ شیطان نے ان کے دل میں تاویلات فاسدہ ڈال دیں، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ یعنی ان کے لئے اللہ پر جھوٹ باندھنے اور ظاہر نصوص کی تکذیب کرنے کے سبب سخت عذاب ہے، وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ (یعنی جب ان کو کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت کرو یعنی آیات میں تحریف مت کرو اور دین مستقیم میں کجی مت ڈالو۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ آگاہ رہو بے شک وہی فسادی ہیں کہ تاویلات باطلہ کر کے فتنہ ڈالتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ (یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے) یعنی اصحاب محمد ﷺ و اہل بیت اور عامۃ المسلمین یعنی اہل سنت والجماعت کیونکہ سب فرقوں میں سب سے زیادہ ماشاء اللہ یہی ہیں اور اکثر کو کل کا حکم ہوتا ہے) چنانچہ ترمذی نے ابن عباسؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ یعنی حفاظت ہوتی ہے قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لے آئیں جیسے کہ بے وقوف لوگ ایمان لے آئے) مؤمنین کو وہ بے وقوف اس وجہ سے کہتے تھے کہ ان کے عقائد ان کی رائے کے موافق نہ تھے اور وہ یہ کلمہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان میں یا تو صراحۃً کہتے تھے جیسے روافض و خوارج بھی اصحاب نبی ﷺ کو احمق اور کافر کہتے ہیں (معاذ اللہ) اور یا دلالۃً کہتے تھے ان کی مخالفت کرتے

marfat.com

تھے اور کہتے تھے کہ یہ عقائد کچھ سمجھ میں نہیں آئے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ اس آیت سے اللہ تعالیٰ ان مذاہب باطلہ کے فساد اور خرابی وفتنہ کو بیان فرماتا ہے اور مؤمنین سے ملنے کے وقت جو وہ ایمان کا دعویٰ کرتے اور کہتے تھے کہ ہم مؤمن ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ مؤمنین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے موافق زمین کا خلیفہ بنادیا تھا اور جو دین ان کے لئے پسند فرمایا تھا اس پر جمادیا تھا اس لئے وہ اہل حق سے ڈرتے تھے اور مَثَلُھُمْ کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں یا تو یہ منافقین اور اہل ہوا دونوں کے لئے مثل ہو کیونکہ اہل ہوا کا ایمان اور اس کے نور کی چمک ایسی ہی ہے جیسے آگ جلانے والے کی روشنی کہ وہ صرف اس کے ارد گرد ہی ہوتی ہے اسی طرح اہل ہوا کا ایمان بھی صرف دنیا ہی میں ان کو نفع دیتا ہے جب موت آئے گی تو وہ ایمان ان کے کام کا نہیں اور اللہ تعالیٰ اس نور کو ضائع فرمادے گا۔

اور یا یہ صرف منافقین کی مثل ہو اور اَوْ کَصَیِّبٍ اہل ہوا کی مثل ہو اس تقدیر پر لفظ او، اَوْ کَصَیِّبٍ میں تقسیم کے لئے ہوگا یعنی اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ پہلی مثل تو ایک خاص فریق کی ہے یعنی منافقین کی اور دوسری مثل دوسرے خاص گروہ یعنی اہل ہوا کی یہ مطلب نہیں کہ دونوں مثل ایک ہی گروہ کی ہوں اور لفظ او اختیار دینے کے لئے مستعمل ہو جیسا کہ آیت اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ میں او توزیع کا ہے۔ اگر (اس توجیہ پر جو میں نے لکھی ہے) کوئی معترض یہ کہے کہ اس مثل کو اہل ہوا کے حق میں کہنا کیوں کر بن سکتا ہے۔ نبی ﷺ کے زمانے میں تو ان کا پتہ ونشان بھی نہ تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے خطابات بالاتفاق سب کو شامل ہیں خواہ وہ اس زمانہ میں موجود ہوں یا بعد میں موجود ہوں، دیکھو آیت فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ تمام اہل ہوا کی شان میں ہے حالانکہ وہ سب کے سب زمانہ خیر میں موجود نہ تھے۔ اور اگر کوئی کہے کہ ان آیات کا نزول منافقین کے ہی حق میں ہے۔ احادیث اور علماء سلف کی تفسیریں اس پر صاف صاف دلالت کرتی ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آیات منافقین کے بارے میں ہیں لیکن مورد کی خصوصیت لفظ عام کی تخصیص کو مقتضی نہیں ہے پس بنا بریں یہ آیات اگرچہ منافقین کے بارہ میں نازل ہوئیں لیکن سبب عموم الفاظ کے اہل ہواء کو بھی شامل ہیں فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ (اے لوگو) یہ خطاب سب آدمیوں کو ہے جو قابل خطاب ہوں (یعنی مکلف) خواہ وہ خطاب کے وقت موجود ہوں یا بعد میں موجود ہونے والے ہوں کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ کی شریعت مطہرہ عہد رسالت میں موجود لوگوں کو اور ان سب لوگوں کو جو قیامت تک ہوں گے شامل ہے اسی طرح جو جمع و اسم جمع معرف باللام ہو وہ عموم پر دلالت کیا کرتی ہے نیز صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کر کے خطاب فرمایا گیا ہے اس سے مراد اہل مکہ ہیں اور جہاں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے یاد فرمایا گیا ہے وہاں اہل مدینہ، اس لئے کہ مکہ میں اکثر کافر تھے اور مومن کم تھے اسی لئے ایسا لفظ ارشاد فرمایا گیا کہ دونوں گروہ اس میں داخل ہوگئے اور مدینہ میں چونکہ مؤمن زیادہ تھے اس لئے ان کی بزرگی ظاہر فرمانے کے لئے ایمان سے تعبیر فرمایا۔

اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ (اپنے پروردگار کی عبادت کرو) اور یوں نہ فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو۔ اس عنوان کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پرورش عبادت کا باعث وسبب ہے کیونکہ محسن ومربی کا شکر یہ ضروری ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ بذاتہ عبادت کا مستحق ہے اور عبادت کا حکم مؤمن اور کافر سب کو شامل ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ کافروں کو ایمان لانے کے بعد ہے کیونکہ ایمان شرط عبادت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن میں عبادت سے مراد توحید ہے۔ کفار کو یہ حکم ہے کہ تم توحید اختیار کرو اور مؤمنین کو یہ ارشاد ہے کہ توحید پر جمے رہو۔

الَّذِیْ خَلَقَکُمْ (جس نے تمہیں پیدا کیا) یہ ربکم کی صفت ہے جو تعظیم اور علت بیان کرنے کے لئے لائے ہیں۔ خلق کسی شئے کے ایجاد کرنے کو کہتے ہیں کہ جس کی مثل پہلے نہ ہو۔

marfat.com

وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (اور انہیں جو تم سے پہلے تھے) اس لفظ میں جو شئے انسان سے پہلے ہے وہ سب داخل ہو گئی اور یہ کلام کہ اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ایسے طرز سے لائے کہ جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس مضمون کے مقر و معترف تھے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ بے شک اے محمد ﷺ اگر آپ ﷺ کفار سے پوچھیں کہ زمین و آسمان کس نے بنایا تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے) اور یا یہ وجہ ہے کہ یہ مضمون چونکہ ادنیٰ غور و تامل سے بھی معلوم ہو سکتا تھا۔ اس لئے انہیں ایسا فرض کیا گیا کہ گویا وہ اس کے قائل ہی ہیں (اور گویا اشارۃً یہ حکم ہے کہ یہ مضمون کسی طرح بھی انکار کے قابل نہیں)۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ (شاید کہ تم بچو) یہ جملہ یا تو اُعْبُدُوْا کے فاعل سے حال ہے اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ عبادت کے وقت اس بات کی امید رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہمیں نجات ہو گی اور امید کے ساتھ خوف بھی برابر ہی لگا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے جو چاہے کرے کیونکہ ایمان خوف اور امید دونوں کو مقتضی ہے اور یا یہ معنی ہوں گے کہ عبادت کے وقت یہ آرزو رکھو کہ ہم اہل تقویٰ کے پاک گروہ میں داخل ہو جائیں گے لیکن یہ اخیر معنی اس تقدیر پر ہوں گے کہ تقویٰ کے معنی تمام خلاف شرع امور سے بچنے کے جو تمام واجبات ادا کرنے کو مستلزم ہے لئے جائیں بلکہ ذات باری تعالیٰ کے سوا ہر شئے سے بیزاری کو تقویٰ کا مفہوم قرار دیا جائے اور یا خلقکم کے مفعول سے حال ہے اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ تمہیں ایسے حال میں پیدا فرمایا کہ تم سے تقویٰ کی امید ہو سکتی ہے یعنی چونکہ تم میں تقویٰ کی امید ہو سکتی ہے یعنی چونکہ تم میں تقویٰ کے اسباب و دواعی بکثرت ہیں اس لئے ظاہراً تم سے تقویٰ کی امید ہو سکتی ہے بعض علماء نے کہا کہ یہ ماقبل کی علت ہے اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ تمہیں اس لئے پیدا کیا تاکہ تم بچو۔

قاضی بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ توجیہ ضعیف ہے لغت میں اس طرح کا استعمال کہیں ثابت نہیں۔ سیبویہ نے کہا ہے کہ لَعَلَّ اور عَسٰى دونوں حرف ترجی ہیں مگر کلام باری تعالیٰ میں جہاں کہیں بھی یہ دو لفظ آئیں گے اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ ان کے مدخول کا واقع و موجود ہونا ضروری ہے میں کہتا ہوں کہ سیبویہ کا یہ قول صحیح نہیں کیونکہ یہ بات اگر ہوتی تو ساری مخلوق کا متقی ہونا ضروری تھا حالانکہ یہ صریح مشاہدہ کے خلاف ہے ہاں سیبویہ کے قول کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ تمہیں ایسی حالت میں پیدا کیا کہ تم سے تقویٰ کا فعل واقع ہونا ضروری ہے اگرچہ یہ وقوع بعض ہی سے ہے۔ اور نعمتوں کو عبادت کا سبب قرار دینے سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ ثواب محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ استحقاق ثواب کی وجہ عبادت نہیں کیونکہ عبادت اگر استحقاق ثواب کا باعث ہو تو اس صورت میں انسان ایک مزدور جیسا ہو گا کہ جس نے اپنی اجرت کام سے پہلے وصول کر لی اور احسان جتلانا بے موقع ہو گا۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ کی معرفت کا طریق یہ ہے کہ مصنوعات میں فکر اور غور کرے اور معرفت سے مراد یہاں معرفت صفات ہے کیونکہ ذات کی معرفت ایک وہبی شئے ہے نہ کسبی۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا (جس نے بنا دیا تمہارے لئے زمین کو بچھونا) جَعَلَ بمعنی صَيَّرَ زمین کو بچھونا بنانے کے یہ معنی ہیں کہ ایسا نرم بنا دیا کہ جس پر بسہولت ٹھہراؤ اور جماؤ ہو سکتا ہے نہ زیادہ سخت نہ زیادہ نرم کہ جس پر انتہا درجہ کی سختی یا نرمی کے سبب سکونت پذیر نہ ہو سکیں۔ اَلَّذِيْ جَعَلَ الخ یا تو رَبَّكُمْ کی دوسری صفت ہے یا منصوب بنا بر مدح یا مرفوع بنا بر مدح یا مبتداء ہے اور خبر فَلَا تَجْعَلُوْا ہے۔

وَالسَّمَآءَ (اور آسمان کو) اَلسَّمَآءَ اسم جنس ہے ایک اور ایک سے زیادہ پر بھی اس کا اطلاق آتا ہے بِنَآءً (عمارت) مصدر بمعنی اسم مفعول یعنی تم پر آسمان کا خیمہ نصب کیا۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (اور اتارا آسمان سے پانی) اور آسمان سے پانی کا اترنا ظاہر ہے کیونکہ اول بارش آسمان [1] سے بادل میں آتی ہے پھر بادل

---

[1] یعنی اسباب سماویہ کی وجہ سے بخارات پیدا ہوتے ہیں اور بخارات بصورت ابر نزول بارش کے اسباب ہیں تو گویا بارش کا نزول آسمان سے ہوا۔

marfat.com

سے زمین پر انزل کا عطف جعل پر ہے۔
فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (پھر نکالا پانی کی وجہ سے پھلوں سے تمہارا کھانا) پھلوں کا نکلنا (اور ایسا ہی نباتات کا اگنا) حقیقۃً تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے لیکن قادر مطلق نے ایسے پانی کو جو مٹی کے ساتھ مخلوط ہو اس اگنے کا ظاہری سبب بنا دیا ہے (اور ایسے ہی ہر شئے اپنے ظاہری سبب کے ساتھ مربوط و متعلق ہے) مِنَ الثَّمَرَاتِ میں مِنْ یا تبعیضیہ ہے یا بیانیہ اور رِزْقًا یا تو اَخْرَجَ کا مفعول ہے بمعنی مرزوق اور لکم رِزْقًا کی صفت۔ اور یا مفعول لہ ہو اس صورت میں رزقا مصدر (اپنے معنی میں) ہوگا اور لکم رزقا کا مفعول بہ اس تقدیر ثانی کے موافق معنی یہ ہوں گے کہ پھلوں کو تمہارے رزق دینے کے لئے اگایا۔
فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (سو نہ ٹھیراؤ کسی کو اللہ کے برابر) اللہ تعالیٰ کے برابر و شریک بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہیں اللہ تعالیٰ جیسی کسی اور کی عبادت کرنے لگو اور یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مد مقابل اور ضد نہ بناؤ کہ اللہ تعالیٰ ضد اور مثل دونوں سے پاک ہے جملہ فَلَا تَجْعَلُوا الخ اُعْبُدُوْا سے متعلق ہے اور فَلَا تَجْعَلُوا یا تو نہی ہے۔ اُعْبُدُوْا پر معطوف ہے یا نفی جو اَنْ کے مقدر ہونے کے سبب منصوب ہے اور وجہ نصب یا تو یہ ہے کہ اُعْبُدُوْا کا جواب ہے یا یہ کہ لَعَلَّكُمْ میں لَعَلَّ کا جواب ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کے قول لَعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ الْاٰیہ میں فَاَطَّلِعَ بھی اسی لئے منصوب ہے اس توجیہ پر آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر تم ڈرو گے تو اللہ کا شریک نہ بناؤ گے یا متعلق ہے اَلَّذِیْ جَعَلَ کے اگر استیناف ہو اس بناء پر کہ وہ نہی ہے مگر خبر واقع ہوئی ہے اس تاویل پر کہ مَقُوْلٌ فِیْهِ محذوف قرار دیا جائے (یعنی اس بارہ میں یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا شریک نہ ٹھیراؤ) اور مبتدا میں شرط ہونے کی وجہ سے فَلَا تَجْعَلُوا پر فاء سببیت لائی گئی ہے معنی یہ ہوئے کہ جس نے تم کو ان نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا وہ اسی لائق ہے کہ اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔
وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ (حالانکہ تم جانتے ہو) یہ جملہ تَجْعَلُوا کی ضمیر سے حال ہے اور تَعْلَمُوْنَ کا مفعول یا تو ترک کر دیا ہے یعنی تمہارا حال یہ ہے کہ تم اہل علم و عقل ہو جانتے بوجھتے ہو اگر ادنی تامل بھی کام میں لاتے تو کبھی شریک نہ کرتے اور مقصود اس سے صرف دھمکی ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ گر تم اہل علم و عقل نہ ہوتے تو شرک جائز ہو جاتا اور یا مفعول محذوف ہے کہ تم جانتے ہو کہ سارے عالم کا خالق ایک ہے کیونکہ تم خود مقر و معترف ہو چنانچہ فرمایا وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (یعنی اے محمد ﷺ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو ضرور یہ کہیں گے کہ اللہ نے) شروع رکوع سے یہاں تک تو حق تعالیٰ شانہ نے توحید کے پہچانے کے طریق یعنی مصنوعات میں نظر و فکر کرنے کی تعلیم دی اب وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ سے جناب سرور کائنات ﷺ کی رسالت اور قرآن پاک کی صداقت کو جو تمام ایمانیات اور اعتقادیات کو شامل ہے بیان فرماتا ہے۔
وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا (اور اگر تم اس کلام سے شک میں ہو جو ہم نے اتارا) نَزَّلْنَا کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت و واقعات نازل کیا اور یہ اس لئے فرمایا کہ زیادہ تر شک کا سبب یہی تھا کیونکہ لوگ اور شعراء کے کلام پر اسے بھی قیاس کرتے تھے (یعنی کہتے تھے اگر یہ کلام باری تعالیٰ ہوتا تو ایک ہی دفعہ کل کا کل نازل ہو جاتا یہ تو بشر کا کلام ہے جیسے اور شاعر بتدریج اشعار کہتے ہیں اسی طرح یہ بھی ہے چنانچہ) ان کے اس زعم فاسد کو حق تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بیان بھی فرمایا ہے لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (یعنی یہ قرآن محمد ﷺ پر ایک ہی مرتبہ کیوں نہ اتارا گیا) تو ان سے معارضہ اسی طرز کلام سے چاہئے تھا تاکہ شبہ کی بیخ کنی بالکل ہو جائے اور اس پر بوجہ احسن حجت قائم ہو جائے۔
عَلٰی عَبْدِنَا (اپنے بندے پر) عبد سے مراد سرور عالم ﷺ ہیں حق تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کو اپنی ذات پاک کی طرف نسبت فرمایا اور عبدنا (یعنی ہمارا بندہ) فرمایا اس نسبت کی دو وجہ ہو سکتی ہے ایک تو حضور ﷺ کے ذکر کی تعظیم و اہمیت کا اظہار۔ دوسرے اس بات کا اظہار کہ آپ حکم الٰہی کے پورے پورے مطیع و فرمانبردار ہیں۔

marfat.com

فَأْتُوا بِسُورَةٍ (تو لے آؤ ایک سورۃ......امر تعجیز کے لئے ہے سورۃ۔ قرآن کے ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کا اول و آخر معلوم و ممیز ہو یہ سور المدینہ سے مشتق ہے کیونکہ شہر کی فصیل کی طرح سورت بھی قرآن کے ایک مخصوص حصہ کو محیط ہوتی ہے یا سور بمعنی رتبہ سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کے پڑھنے والے کو ایک قسم کا رتبہ اور شرف حاصل ہوتا ہے اور یہاں سورۃ سے مراد ایک سورۃ کی مقدار ہے (نہ خود سورۃ) اور سورۃ کی مقدار تین چھوٹی آیتیں ہیں۔

مِّن مِّثْلِهِ (اس قسم کی) سورۃ کی صفت ہے اور مثلہ میں ہ کی ضمیر یا تو مَانَزَّلْنَا کی طرف راجع ہے اس صورت میں من تبعیضیہ یا بیانیہ یا زائدہ ہوگا اور آیت کے معنی اس تقدیر پر یہ ہوں گے کہ بلاغت اور حسن نظم میں قرآن جیسی کوئی سورۃ لے آؤ یا عَبْدِنَا کی طرف راجع ہے اور من ابتدائیہ ہے اس توجیہ پر یہ معنی ہوں گے کہ کوئی سورۃ محمد ﷺ جیسے اُمّی شخص کی بنائی ہوئی لے آؤ یا فاتوا کا صلہ ہے پہلی ترکیب اولیٰ وانسب ہے کیونکہ دوسری ترکیب سے یہ وہم ہوتا ہے کہ شاید قرآن کا مثل غیر امی شخص سے ممکن ہو حالانکہ قرآن پاک بذاتہ ہر حال میں معجز ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (اے محمد ﷺ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر آدمی اور جن جمع ہو کر اس کی کوشش کریں کہ اس قرآن جیسا (اور کلام) بنا کر لائیں تو بھی ایسا کلام نہ لا سکیں گے اگرچہ بعض بعض کے لئے پشت پناہ ہو جائیں۔

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم (اور بلاؤ اپنے معبودوں کو) یعنی اپنے معبودوں سے مدد مانگو جن کی تم عبادت کرتے ہو اور سمجھ رہے ہو کہ قیامت کو اللہ کے سامنے وہ ہماری گواہی دیں گے۔ یا یہ معنی کہ ان لوگوں کو بلا لو جو تمہارے پاس آ کر تمہاری امداد و اعانت کریں۔

مِّن دُونِ اللَّهِ (اللہ کے سوا) یعنی اللہ کے اولیاء اور دوستوں کے سوا اور عرب کے فصحاء کو بلاؤ کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ جو کلام تم نے اپنے گمان کے موافق قرآن کی مثل بنایا ہے آیا وہ واقع میں قرآن پاک کی مثل ہے (فصحاء عرب کو جو شہادت کے لئے طلب فرمایا حالانکہ وہ کفار تھے ممکن تھا کہ وہ جھوٹی شہادت دیں اور ان کی بکواس کو قرآن پاک کے ہم پلہ کہہ دیں تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ عقل سلیم اس بات کو پسند ہی نہیں کر سکتی کہ جس شئے کی خرابی اور فساد آفتاب کی طرح روشن ہو اس کی صحت اور حسن کی گواہی دے دے۔ یہ تو ایسا ہے کہ جیسا کوئی آسمان کو زمین کہے یا ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بڑا شاعر، فصیح و بلیغ ماہر فن شعر کہے اور اس کے مقابلہ میں ایک ادنیٰ آدمی جو تک بندی سے بھی آشنا نہ ہو تک ملانے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کے اشعار آبدار کے سامنے اس کی تک بندی کو کونسا عاقل سن سکتا ہے خواہ وہ موافق ہو یا مخالف سب کے سب ان کی تکذیب کرنے کو موجود ہو جائیں گے۔

إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾ (اگر تم سچے ہو) کہ یہ قرآن بشر کا کلام ہے (تو کوئی سورت اس کی مثال لے آؤ) إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ کا جواب محذوف ہے کیونکہ ماقبل اس پر دال ہے۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا (اگر قرآن کا مثل نہ بنا سکے) زمانہ ماضی میں۔

وَلَن تَفْعَلُوا (اور ہرگز نہ بنا سکو گے) یہ جملہ شرط اور جزا کے مابین جملہ معترضہ ہے اور جملہ خبر غیب ہے اس مقام پر کلام پاک کے حق تعالیٰ نے دو اعجاز بیان فرمائے (ایک تو اس کا مثل بنانے سے عاجز ہونا دوسرے پیشن گوئی کہ اس کا مثل آئندہ بھی ہرگز نہ بنا سکو گے۔

فَاتَّقُوا (تو بچو) یعنی جب یہ بات خوب ظاہر ہو گئی کہ قرآن معجز ہے تو اس پر ایمان لے آؤ اور ایمان لا کر بچو۔

النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا (اس آگ سے جس کا ایندھن) وقود اس شئے کو کہتے ہیں جس سے آگ سلگائی جائے۔

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (آدمی اور پتھر ہیں) لفظ وقود مصدر بھی ہو سکتا ہے اس وقت النَّاسُ والحجارة سے پہلے مضاف محذوف ہوگا معنی یہ ہوں گے کہ روشن ہونا جہنم کی آگ کا آدمیوں اور پتھر کا جلنا اور سلگنا ہے۔

marfat.com

عبدالرزاق اور سعید بن منصور اور ابن جریر اور ابن منذر اور حاکم اور بیہقی اور دیگر رواۃ نے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اور ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اور ایسا ہی ابن ابی حاتم نے مجاہد اور ابو جعفر کے اقوال نقل کئے ہیں اور صدر اول میں سے کسی نے اس کے خلاف نہیں کہا کہ جو پتھر جہنم کا ایندھن ہو گا وہ گندھک سیاہ کا پتھر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ سب قسم کے پتھر مراد ہیں۔ اور یہ اس لئے فرمایا تاکہ اس آگ کی عظمت وہیبت معلوم ہو جائے اور بعض نے کہا ہے کہ حجارۃ سے مراد بت ہیں حق تعالیٰ نے اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا میں ان ارشاد فرمایا ہے کہ جس کا ترجمہ "اگر" ہے حالانکہ یہ موقع اِذَا کا تھا کہ جس کا ترجمہ "جب" ہے کیونکہ "اگر" کا لفظ شک کے موقع پر استعمال ہوا کرتا ہے (چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر زید آیا تو میں بھی آؤں گا) اور "جب" کا لفظ یقین کے محل پر بولتے ہیں (چنانچہ کہا جاتا ہے جب سورج نکلے گا تو آؤں گا زید کا آنا مشکوک اور سورج کا نکلنا یقینی ہے) اور یہ امر ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی قسم کا شک نہیں اس کے نزدیک گزشتہ اور آئندہ سب برابر ہے تو اس طرز سے کلام فرمانے کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے ساتھ ٹھٹھا و استہزاء کرنا منظور ہے (جیسے کوئی کہے کہ میں تمہارے پاس جمعہ کے دن آؤں گا اور دوسرا کہے کہ اگر ہفتہ میں جمعہ ہی نہ آئے تو یہ کلام محض استہزاء و تمسخر ہو گا اسی طرح قرآن کے مثل سے عاجز ہونا اللہ تعالیٰ کو محقق و معلوم تھا اس لئے اس طرز سے کلام کرنا محض استہزاء کے لئے ہے) دوسری وجہ یہ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے ان کے گمان کے موافق کلام فرمایا ہے کیونکہ قبل از تامل و غور مثل سے عاجز ہونا ان کے نزدیک محقق و ثابت نہ تھا۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ (تیار کی گئی ہے کافروں کے واسطے) یہ جملہ مستانفہ (یعنی جواب سوال مقدر کا ہے گویا سائل سوال کرتا تھا کہ ایسی آگ کس کے لئے ہے تو اس کا جواب دیا گیا) یا اَلنَّارُ سے حال ہے اور قد اس سے پہلے مقدر ہے اور وَقُوْدُهَا کی ضمیر ہا سے حال نہ ہو گا کیونکہ اس پر وقودھا کی خبر (ذوالحال اور حال کے درمیان) فاصل ہو جائے گی اور (یہ جائز نہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے نَارُكُمْ هٰذِهٖ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِيْنَ جُزْءً مِّنْ نَّارِ جَهَنَّمَ متفق علیہ (یعنی تمہاری یہ آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے اس حدیث کو بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے) نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مَنْ لَّهٗ نَعْلَانِ وَشِرَاكَانِ مِنْ نَّارٍ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ كَمَا يَغْلِي الْمِرْجَلُ مَا يَرٰى اَنَّ اَحَدًا اَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا وَاِنَّهٗ لَاَهْوَنُهُمْ عَذَابًا۔ متفق علیہ (یعنی جہنم میں سب سے کم عذاب والا وہ شخص ہو گا جسے دو جوتیاں اور تسمے[1] آگ کے پہنچائے جائیں گے اور اس سے اس کا دماغ ایسا جوش مارتا ہو گا جیسے دیگ جوش مارتی ہے اور وہ خیال کرے گا کہ مجھ سے زیادہ سخت عذاب کسی کو نہیں حالانکہ وہ باعتبار عذاب سب سے کم ہو گا اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے اُوْقِدَ عَلَى النَّارِ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى احْمَرَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى ابْيَضَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى اسْوَدَّتْ فَهِيَ سَوْدَاءُ مُظْلِمَةٌ رواہ الترمذی (یعنی جہنم کی آگ ایک ہزار برس تک دھونکائی گئی یہاں تک کہ وہ بالکل سرخ ہو گئی پھر ایک ہزار برس اور دھونکائی تو سفید ہو گئی اور پھر ایک ہزار اور دھونکائی گئی یہاں تک کہ سیاہ ہو گئی اب بالکل سیاہ تاریک ہے اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ (یعنی میں تمہیں جہنم کی آگ سے ڈراتا ہوں) راوی حدیث نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ یہی الفاظ فرماتے رہے اور آپ نے اتنی بلند آواز سے فرمایا کہ اگر حضور ﷺ اس وقت میری جگہ تشریف رکھتے تو آپ کی آواز مبارک کو بازار والے سن لیتے اور اس جوش سے آپ فرماتے رہے کہ جو گلیم آپ زیب تن فرمائے ہوئے تھے وہ قدموں پر آپڑی تھی۔ اس حدیث کو دارمی نے روایت کیا ہے اور ان آیات واحادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہنم اب موجود ہے۔

[1] شراک تسمے کو کہتے ہیں۔

marfat.com

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اور اے پیغمبر ﷺ انہیں بشارت دو جو ایمان لائے) یہ جملہ جملۂ سابقہ پر عطف ہے عادت الٰہیہ قرآن پاک اسی طرح جاری ہے کہ ترہیب کے بعد ترغیب اور ترغیب کے بعد ترہیب ذکر کی جاتی ہے۔ عطف فعل کا فعل پر نہیں تاکہ دونوں میں کوئی وجہِ مشارکت تلاش کرنے کی ضرورت پڑے۔ فَاتَّقُوْا پر عطف ہے یعنی مراد یہ ہے کہ ایمان لے آؤ اور آگ سے بچو اور ڈرو اور جنت کی بشارت پاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے خود ان ہی کو براہ راست بشارت سے یاد نہیں فرمایا یعنی اسی طرح نہیں فرمایا کہ بشارت پاؤ بلکہ فرمایا کہ بشارت دو وجہ یہ کہ ایمان اور تقویٰ کے سبب ان کی تعظیم شان منظور ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ اب یہ اس کے سزاوار ہیں کہ انہیں ہر شخص بشارت اور مبارک باد دے (ظاہر ہے کہ خود انہیں بشارت دینے میں یہ بات حاصل نہ ہوتی گویا یہ معنی ہوئے کہ اے مخاطب انہیں مبارک باد دے کیونکہ یہ اس کے لائق و مستحق ہیں) بشارۃ خوش کرنے والی خبر کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قول فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ میں لفظ بشارت بطور استہزاء مستعمل ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ بشارۃ کا استعمال اچھی اور بری دونوں خبروں میں آتا ہے مگر اچھی خبر میں زیادہ۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور انہوں نے نیک عمل کئے) لفظ صالحات ان غالبہ صفات میں سے ہے جو قائم مقام اسماء کے ہوتے ہیں۔ اور اعمال صالحہ ان عملوں کو کہتے ہیں جن کو شرع نے اچھا کہا ہو اور لفظ صالحات کو مؤنث ذکر کرنا اس بناء پر ہے کہ یہ لفظ خصلت محذوف کی صفت ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمل صالح وہ ہے جس میں چار چیزیں ہوں۔ عمل، نیت، صبر، اخلاص۔ امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے وَعَمِلُو الصَّالِحَاتِ پڑھ کر فرمایا کہ عمل صالح کے معنی ہیں کہ ریا سے خالی کر کے خالص لوجہ اللہ کرے اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا کہ اعمال ایمان سے خارج ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت کی بشارت کے استحقاق کا پورا سبب ایمان اور عمل دونوں وصف ہیں۔

اَنَّ لَهُمْ (کہ بے شک ان کے لئے) (ترکیب میں) یا تو منصوب بنزع حرف جر ہے اور بَشِّرْ سے متعلق ہے۔ یا مجرور کہ حرف جر باء مقدر ہے۔

جَنّٰتٍ (جنتیں ہیں) جَنّٰتٍ جنۃ کی جمع ہے جس کے معنی باغ کے ہیں کیونکہ باغ بھی درختوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔[1]

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا (جن کے نیچے (نہریں) بہہ رہی ہیں) جنت کے نیچے نہریں بہنے کا یہ مطلب کہ جنت کے درختوں اور مکانوں کے نیچے بہہ رہی ہیں اَلْاَنْهٰرُ (نہریں) اور نہروں کے بہنے کے یہ معنی کہ ان میں پانی بہہ رہا ہے یا تو لفظ ماء (پانی) انہار سے پہلے محذوف ہے یا مجاز لغوی اور یا اسناد میں جاز ہے اَلْاَنْهَارُ میں الف اور لام جنس کا ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جنت کی نہریں بغیر کھائیوں اور گڑھوں کے بہتی ہیں (یعنی جس طرح دنیا کی نہریں گڑھوں میں چلتی ہیں اسی طرح جنت کی نہریں نہیں بہتیں) اس حدیث کو ابن مبارک اور ابن جریر اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (جب انہیں ان میں کا کوئی میوہ کھانے کو ملے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے مل چکا ہے) قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ یا تو جنت کی دوسری صفت ہے یا خبر ہے مبتدا محذوف کی، تقدیر ثانی پر یہ معنی ہوں گے کہ جب انہیں جنتی پھل کھلائے جائیں گے تو وہ یہ کہیں گے الخ۔ یا جملہ مستانفہ ہے جو جنت کے میوہ جات کے حال کی توضیح کے لئے لایا گیا ہے اور كُلَّمَا ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور رِزْقًا رُزِقُوْا کا مفعول بہ ہے اور لفظ من دونوں جگہ یا تو ابتدائیہ ہے یا پہلے مقام پر تو ابتدائیہ اور دوسرے موضع پر بیانیہ ہے اور دونوں مِن مع اپنے مجرور کے مل کر قائم مقام حال کے ہیں۔

لفظ هٰذَا سے نوع رزق کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی اس نوع کے افراد پے درپے موجود ہونے کے سبب ہمیشہ موجود رہیں گے اَلَّذِيْ رُزِقْنَا سے پہلے لفظ مثل محذوف ہے اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ یہ پہلے رزق کی مثال ہے۔ لفظ مثل تشبیہ

[1] لغت میں "جن" کا معنی ہے چھپانا گھنے باغ کو جس میں سایہ دار درخت بکثرت ہوں جنت کہتے ہیں۔

marfat.com

کے بلیغ کرنے کے لئے حذف کر دیا گیا گویا یہ دوسری دفعہ کا میوہ بعینہٖ پہلا ہی ہے مِن قبلُ اس سے پہلے یعنی دنیا میں جنت کے ثمرات اور نعمتیں دنیا کی نعمتوں کی مشابہ اس لئے پیدا کی گئی ہیں کہ طبیعتیں غیر مالوف ہونے کے سبب متنفر نہ ہوں اور وہاں کی چیزوں کی فضیلتیں خوب ظاہر ہوں (اس لئے کہ اگر وہاں کے پھل وغیرہ یہاں کے پھلوں کے مشابہ نہ ہوتے اور بالکل نئی قسم کے ہوتے تو ان پر ان نعمتوں کی زیادتی و ترجیح ظاہر نہ ہوتی کیونکہ ترجیح و فضیلت ایک جنس کی چیزوں میں ہوا کرتی ہے) بعض نے کہا ہے کہ جنت کے پھل رنگ و روپ میں تو ایک دوسرے کے مشابہ اور دیکھنے میں یکساں مگر ذائقہ میں مختلف ہیں۔ اور جنتی پھلوں کے کھاتے وقت رُزِقنا من قبلُ اس لئے کہیں گے کہ وہ صورۃً سب پھلوں کو یکساں دیکھیں گے مگر جب ذائقہ میں نمایاں تفاوت معلوم کریں گے اور یہ مزا پائیں گے تو بہت ہی خوش ہوں گے۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ (اور انہیں وہ پھل ایک دوسرے سے ملتے ہوئے دیئے جائیں گے) پہلی تفسیر پر جبکہ دنیا کے پھلوں سے تشبیہ دی جائے تو بِہٖ کی ضمیر رزق جنت اور دنیا کی طرف راجع ہو گی اور یہ آیت جملہ معترضہ ہے کہ مضمون سابق کی توضیح و تاکید کرتا ہے۔ ابن عباسؓ اور مجاہدؒ نے فرمایا ہے کہ مُتَشَابِهًا کے یہ معنی ہیں کہ رنگ میں تو وہ پھل یکساں ہوں گے مگر مزہ میں مختلف ہوں گے۔ حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ جنت کے پھل نفاست اور ستھرے میں ایک دوسرے کے مثل ہوں گے یعنی وہاں کے سارے پھل بہتر اور عمدہ ہوں گے کہ ان میں نقص کا نام تک نہ ہو گا (مطلب یہ کہ جیسے دنیا کے پھل ہیں کہ کوئی اچھا اور کوئی برا، کوئی پکا، کوئی کچا وہاں کے پھل ایسے نہ ہوں گے بلکہ سب کے سب اعلیٰ ہی قسم کے ہوں گے۔

علامہ بغویؒ نے اپنی سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنتی سب کچھ کھائیں پئیں گے لیکن پیشاب پاخانے کے اور منہ اور ناک کی ریزش اور جملہ آلائش سے پاک صاف ہوں گے اور انہیں حمد اور تسبیح ایسی الہام کی جائیں گی جیسے سانس کا آنا (یعنی تسبیح و تحمید بجائے سانس لینے سے ہو جائے گی) ان کا کھانا، پیناڈکار کے ذریعے ہضم ہو جایا کرے گا اور پسینہ مشک کی خوشبو کا سا ہو گا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے کہ آیت کے ایک یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ ان اعمال و معارف الٰہیہ کا ثواب ہے جو ہمیں دنیا میں عطا کئے گئے تھے۔ اس کی نظیر کلام پاک میں بھی ہے جیسا کہ فرمایا ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (یعنی چکھو جو تم کرتے تھے)۔

امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کی مٹی نہایت پاکیزہ اور پانی نہایت شیریں ہے اور یاد رکھو کہ جنت بالکل ہموار میدان ہے اس کے درخت تسبیح تحمید اور تکبیر ہیں۔ اس تفسیر کے بموجب وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ ثواب شرف و فضیلت میں ان کے معارف و طاعات کے مشابہ ہو گا۔ اور جیسا کہ اعمال میں باہم تفاوت ہو گا ویسا ہی اس ثواب میں ہو گا امام ترمذی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں ہر درجے کی مسافت ایک سے دوسرے درجہ تک سو برس کی ہے۔ عبادہ بن الصامت رضی اللہ سے بھی یہی مضمون مروی ہے مگر اس میں اتنا اور بھی ہے کہ ہر دو درجوں کے مابین ایسی مسافت ہے جیسی آسمان و زمین کے درمیان کی۔ صاحب مصابیح نے اس حدیث کو صحاح میں اور ترمذی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

وَلَهُمْ فِيْهَا (اور وہاں جنت میں ان کے لئے (بیبیاں پاک صاف) ہوں گی۔ اَزْوَاجٌ (بیویاں) ازواج سے مراد حوریں ہیں۔ حسن نے فرمایا کہ اَزْوَاجٌ سے مراد یہی تمہاری بوڑھیاں اندھی چندھی ہیں وہاں دنیا کی نجاستوں سے پاک صاف کر دی جائیں گی۔

مُّطَهَّرَةٌ ۙ (پاک و صاف) یعنی پیشاب، پاخانہ، حیض، نفاس، تھوک، سنک، منی اور ہر نجاست اور میل کچیل اور برے اخلاق سے پاک صاف کی گئی ہیں۔ تطہیر کا لفظ جیسا کہ اجسام کے پاک کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے ویسا ہی اس کا اطلاق افعال و اخلاق کی تہذیب پر بھی آتا ہے لفظ مطہرہ میں بہ نسبت طاہرہ مبالغہ زیادہ ہے کیونکہ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ پاک نے

marfat.com

خود انہیں پاک کیا ہے۔ لفظ زوج کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر آتا ہے اور اصل لغت میں زوج اسے کہتے ہیں کہ جس کا کوئی جوڑ ہو اسی کی جنس سے جیسے موزہ ،جوتا وغیرہ۔

وَّهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ (اور وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ رہیں گے)(مطلب یہ کہ)نہ تو وہاں موت آئے گی اور نہ وہاں سے نکلیں گے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں رہیں گے اور یہ اس لئے فرمادیا کہ پہلے سے جنت کی نعمتوں کا بیان چلا آرہا تھا تو سننے والے کو اس سے یہ وہم ہو سکتا تھا کہ دیکھئے یہ نعمتیں ہمیشہ کے لئے باقی رہیں گی یا دنیا کی نعمتوں کی طرح فنا اور زائل ہو جائیں گے تو یہ خوف اس عیش کو مکدر کرنے والا تھا اس لئے اسے دفع فرمایا کہ تم اطمینان رکھو تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔

علامہ بغوی نے اپنی سند سے بطریق بخاری ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو گروہ جنت میں پہلے داخل ہو گا وہ ایسا چمکتا دمکتا ہو گا جیسا چودھویں رات کا چاند اور اس کے بعد جو داخل ہو گا وہ ایسا چمکتا ہوا ہو گا جیسا آسمان میں سب سے زیادہ چمکتا ستارہ، جنتی پیشاب، پاخانہ ، تھوک ، سنک اور سب آلائشوں سے پاک صاف ہوں گے۔ کنگھیاں ان کی سونے کی، پسینہ ان کا مشک کی خوشبو کا ، انگھوٹیاں ان کی خوشبو کی ہوں گی اور بیویاں ان کی حور عین (یعنی نہایت خوب صورت حسین بڑی آنکھوں والی ہوں گی) اور ان سب کے اخلاق ایک شخص جیسے ہوں گے (یعنی سب سے ملے جلے ہوں گے جیسے ایک شخص خود اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے اور بغض نہیں رکھتا اور ایک ہی تمنائیں ہوتی ہیں ایسے ہی وہ سب کے سب ہوں گے اور قد ان سب کا مثل قد آدم علیہ السلام ۶۰ گز کا ہو گا۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اول جو گروہ جنت میں جائے گا ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند جیسے ہوں گے اور دوسرا گروہ ایسا ہو گا جیسا آسمان میں روشن ستارہ۔ ہر شخص کی دو بیویاں ہوں گی اور ہر ایک پر ستر حلے ہوں اور بوجہ نفاست کے ان کی پنڈلیوں کی ہڈی کا گودہ گوشت اور خون ان لباسوں کے اوپر سے نظر آئے گا۔

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر جنت کی کوئی عورت زمین پر جھانک بھی لے تو آسمان سے زمین تک اس کی چمک اور خوشبو پھیل جائے اور وہاں کی حور کے سر کا دوپٹہ بھی دنیا اور اس کی ساری نعمتوں سے بہتر ہے۔ اس حدیث کو بھی بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (ہم سب سے) فرمایا کوئی ہے جو جنت کے حاصل کرنے کے لئے تیار اور مستعد ہو بے شک جنت ایسی شئے ہے کہ اس کا کسی دل میں خطرہ تک نہیں گزرا اور قسم ہے رب کعبہ کی کہ جنت ایک چمکتا ہوا نور ، مہکتی پھلواری، اونچے اونچے مضبوط محل، بہتی نہریں تیار اور پکے میوے ، خوبصورت گوری گوری بیویاں اور طرح طرح کے بے شمار لباس اور ہمیشہ رہنے کی جگہ اور انواع انواع کے میوے ، سبزے ، لباس، بیل بوٹے اور طرح طرح کی نعمتیں ہیں۔ سب نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سب اس کے لئے تیار اور مستعد ہیں۔ فرمایا انشاء اللہ کہو۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنتی سب کے سب بے رونگٹے ، بے داڑھی، سرمگیں چشم ہوں گے نہ ان کی جوانی ختم ہو گی نہ ان کا لباس پرانا ہو گا یہی مضمون مسلم کی حدیث میں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنت میں ایک بازار ہو گا کہ اس میں خرید و فروخت تو کچھ ہو گی نہیں مگر اس میں عورتوں اور مردوں کی صورتیں ہوں گی جو کوئی جس صورت کو چاہے گا اس میں داخل ہو جائے گا اور جنت میں حور عین کا ایک مجمع ہو گا کہ وہ سب کی سب اپنی بے مثل آواز سے پکار پکار کر کہیں گی کہ ہم سب کی سب ہمیشہ رہیں گی کبھی ہلاک نہ ہوں گی اور عیش و عشرت سے رہیں گی نہ ہم پر کبھی تنگی آئے گی نہ فقر و فاقہ نہ غیظ و غضب بلکہ ہم سب ہنسی خوشی رہیں گی ان مردوں کے لئے بڑی خوشی ہے جو ہمارے لئے ہوں اور ہم ان کے لئے۔ اس حدیث کو ترمذی نے علی رضی اللہ عنہ سے اور احمد بن منیع نے ابو معاویہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اور مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنت میں ایک بازار ہے کہ جنتی ہر جمعہ وہاں آیا کریں گے اور شمالی ہوا چل کر ان کے چہروں کو زیادہ حسین بنادے گی اور ان کے

marfat.com

فاخرہ لباس کی طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر کردے گی تو وہ حسن و جمال میں پہلے سے بدرجہا بڑھ جائیں گے اسی حالت میں جب اپنی بیویوں کے پاس آئیں گے تو وہ کہیں گی آج تو تم بہت ہی حسین و جمیل ہو وہ جواب دیں گے کہ واللہ ہم تمہیں بھی زیادہ خوبصورت پاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں چونکہ اہل دنیا کی نظر نعمتوں میں سے صرف پہننے کھانے اور نکاح کرنے ہی پر ہے (دوسری نعمتوں کی طرف دنیا میں نہ موجود ہونے کے سبب نظر نہیں جاتی اور جو کوئی بیان کرے تو ذہن بھی اس طرف منتقل نہیں ہو سکتا) اس لئے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول پاک ﷺ نے صرف ایسی ہی چیزوں کے ذکر پر اکتفا فرمایا ورنہ جنت کی نعمتیں تو بڑی بڑی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسی ایسی نعمتیں تیار کی ہیں کہ انہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر خطرہ گزرا دلیل اگر چاہتے ہو تو یہ ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (یعنی کوئی نفس نہیں جانتا جو آنکھ کی ٹھنڈک ان کے لئے وہاں چھپائی گئی ہے) اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور نیز حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ فخر عالم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جنت میں اہل جنت سے فرمائے گا کہ اب میں تم پر اپنی رضامندی اتارتا ہوں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور ایک طویل حدیث میں مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پاک جنت میں اپنے اور جنتیوں کے درمیان حجاب اٹھادے گا کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی زیارت کریں گے اور اس کے دیدار سے زیادہ کوئی شے بھی ان کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو گی۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے اس آیت کو پڑھا لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ (یعنی نیک کاروں کے لئے حسنیٰ یعنی جنت اور زیادتی ہے (زیادتی سے مراد رویت باری تعالیٰ ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے کم درجہ کا جنتی وہ ہو گا جس کے مکانات، بیویاں، نوکر، چاکر اور تخت اس کثرت سے ہوں گے کہ ہزار برس کی راہ سے وہ انہیں دیکھے گا اور سب سے زیادہ نعمت یافتہ اللہ کے نزدیک وہ شخص ہو گا جو اللہ پاک کے دیدار سے صبح و شام مشرف ہوا کرے گا پھر حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (یعنی بہت سے چہرے اس روز تروتازہ اور اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے) اس حدیث کو احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے ابن جریر نے سدی کبیر سے بسند معتبر روایت کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا الخ اور آیتہ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ الخ میں منافقوں کی دو مثلیں بیان فرمائیں تو منافقین نے سن کر یہ ہذیان سرائی کی کہ اللہ تعالیٰ کی شان والا تو نہایت ارفع و اعلیٰ ہے پھر ایسی ایسی حقیر مثالیں کیوں بیان فرمائیں تو اس وقت اللہ پاک نے ان کے ان گستاخانہ کلمات کے جواب میں ذیل آیت نازل فرمائی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً (بے شک اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں جھینپتا (خواہ وہ مثال مچھر کی ہو) یا اس سے بھی بڑھ کر کسی چیز کی۔ بعض مفسرین نے اس کا شان نزول اس طرح بیان کیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے مشرکین کے بارے میں مکھی کا ذکر فرمایا جیسا کہ فرمایا وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (اگر مکھی ان سے یعنی بتوں سے کچھ چھین کر لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے) اور ان کے مکر و فریب کو مکڑی کے جالے کی مثل ارشاد فرمایا تو انہوں نے سن کر کہا دیکھو اللہ تعالیٰ باوجود اپنی اس عالی شان کے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بکواس کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ پچھلی روایت شان نزول میں واحدی نے بطریق عبدالغنی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور عبدالغنی ایک نہایت ضعیف راوی ہے اور اس میں یہ بھی خدشہ موجود ہے کہ آیت تو مدنی ہے اور یہ معارضہ مشرکین سے مکہ میں ہوا تھا تو معلوم ہوا کہ روایت اولیٰ (جو ہم نے آیت سے پہلے لکھی ہے) شان نزول میں باعتبار سند اور معنے کے نہایت صحیح ہے۔ حیا نفس کے بھچنے اور چھپنے کا نام ہے جو کسی برے

marfat.com

فعل سے بخوف مذمت پیدا ہو۔ حیا، وقاحتہ اور خجل کے درمیانی درجہ کا نام ہے کیونکہ وقاحتہ تو جراۃ اور برے فعلوں سے لاپروائی کرنے کو کہتے ہیں اور خجل کسی فعل سے رک جانے کو بولتے ہیں خواہ وہ برا ہو یا بھلا۔ حق تعالیٰ کی ذات پاک بھی حیا کی صفت سے موصوف کی جاتی ہے چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بوڑھے مسلمان کے عذاب دینے سے حیا آتی ہے اس حدیث کو بیہقی نے باب زہد میں حضرت انسؓ سے اور ابن ابی الدنیا نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جب بندہ اپنے مالک کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو ارحم الرحمین کو اس کے ہاتھ خالی پھیر دینے سے بہت حیا آتی ہے اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حدیث حسن کہا ہے اور حاکم نے سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے کہا ہے کہ صحیح ہے (ظاہر ہے کہ ان مقامات میں حیا کے حقیقی معنی تو بن ہی نہیں سکتے کیونکہ حقیقی معنی تو برے فعل سے نفس میں بھنچاؤ اور گرفت اور انفعال یعنی اثر قبول کر لینے کے ہیں اور حق تعالیٰ اس سے بالکل پاک و منزہ ہے پس) حیا سے مراد یہاں اس فعل کا ترک ہے جو حقیقی معنی کو لازم ہے (کیونکہ آدمی جب کسی شئے سے حیا کرتا ہے تو اسے چھوڑ دیتا ہے) آیت میں حیا کا استعمال اشکال سے خالی نہیں کیونکہ حیا کے معنی ظاہر ہے کہ یہاں فعل قبیح کے ترک کے ہوں گے اور مثل کا بیان کرنا کسی درجہ میں بھی قبیح نہیں تو جواب اس کا یہ ہے کہ جب کفار نے یہ بکواس کی کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی مثالوں سے شرماتا نہیں تو جواب میں ارشاد ہوا کہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حیا کا استعمال محض مقابلہ کے وارد ہوا ہے جیسا کہ اسی انداز پر دوسرے مقام میں ارشاد ہے وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (اور بدلہ برائی کا ویسی ہی برائی ہے) تو معلوم ہوا کہ برائی کے بدلہ کو برائی سے تعبیر فرمانا حالانکہ وہ برائی نہیں محض مقابلہ پر مبنی ہے) ضرب مثل کے معنی مثل بیان کرنا ہے۔ ضرب کے اصلی معنی کسی شئے کو دوسری شئے پر مارنے کے ہیں لفظ اَنْ مع اپنے صلہ کے بتقدیر بِمِنْ خلیل کے نزدیک مجرور ہے اور سیبویہ کے نزدیک فعل یعنی لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ پر بعد حذف من واقع ہوا ہے (اس لئے اَنْ مع اپنے صلہ کے منصوب ہو گا) لفظ مَا یا تو ابہامیہ ہے نکرہ میں ابہام کی زیادتی کے لئے لایا گیا ہے اور اس کی تعیین و تقیید کے باب کو بالکل مسدود کر دیا ہے اور یا زائدہ ہے جو اس لئے لایا گیا ہے کہ کسی غیر اسم کے ساتھ شامل ہو کر اس کی قوت کو بڑھا دے۔ بَعُوْض بوزن فعول بَعْض سے مشتق ہے جس کے معنی قطع کے ہیں پشہ ء خرد پر اس کا اطلاق غالب ہو گیا ہے گویا کہ وہ بھی کسی بڑے پشہ کا ایک جزو ہے اور اس میں تا وحدہ کے لئے ہے۔

فَمَا فَوْقَهَا (یا اس سے بھی بڑھ کر) بعوضہ پر معطوف ہے اور اس کی دو تفسیریں ہیں ایک تو یہ کہ جو مچھر سے جثہ میں زیادہ ہو جیسے مکھی، مکڑی۔ اس تفسیر پر آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ مچھر تک کی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا چہ جائیکہ اس سے کوئی بڑی شئے ہو۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ جو مچھر سے بھی جثہ میں کم اور حقارت میں زیادہ ہو اس سے بھی نہیں شرماتا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ (سو جو لوگ ایمان لا چکے وہ تو جانتے ہیں کہ یہ (مثال یا اس کا بیان کرنا) ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے اور جو منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس (حقیر و ذلیل) مثال سے اللہ کو کیا غرض تھی وقف لازم

یعنی جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ مثل یا اس کا بیان کرنا ٹھیک ہے یعنی جیسا کہ ہونا چاہئے اسی طریقہ پر ہے کہ اس کا انکار جائز نہیں۔ عرب کا محاورہ ہے ثوب محقق یعنی اس کی بناوٹ مضبوط ہے شئے حقیر کی حقیر سے ہی مثال دے کر بیان کرنا چاہئے جیسا کہ ذی عظمت کو عظمت والی سے، اگرچہ تمثیل دینے والا ہر عظیم سے عظیم ہو وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور جو منکر ہیں وہ کمال جہل کی وجہ سے جانتے نہیں اور کہتے ہیں اللہ کی اس سے کیا مراد ہے مَاذَا میں ما استفہامیہ مبتدا ہے اور ذا بمعنی الذی مع اپنے صلہ کے خبر ہے اور یا ماذا مجموعہ ایک اسم بمعنی ای شیئی ہے اور مفعول ہونے کے سبب محلاً منصوب ہے اور ارادہ ایسی صفت کا نام ہے جو اپنی قدرت کے دو فعلوں میں سے ایک کو ترجیح دے اور لفظ ہذا میں ایک قسم کا استحقار ہے (ہماری زبان میں

marfat.com

کسی حقیر آدمی کو یا کسی کی حقارت کے وقت بولا کرتے ہیں کہ "یہ وہ ہے" اس لئے لفظ ہٰذا حقیر اور ذلیل سمجھنے پر دلالت کرتا ہے اور مثلاً کا نصب یا تو حال ہونے کی بناء پر ہے یا تمیز واقع ہونے کی وجہ سے۔

یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (۲۶) (اللہ گمراہ کرتا ہے ایسی مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہوں بہتیروں کو لیکن انہیں کو گمراہ کرتا ہے جو بدکار ہیں) یہ آیت مَاذَا کا جواب ہے (یعنی جب کفار نے ٹھٹھے کے طور سے یہ کہا کہ خدا کو ایسی مثال سے کیا غرض پڑی تھی تو جواب میں ارشاد ہوا کہ اس سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیں یعنی تمہیں اور بہتیروں کو ہدایت دیں (یعنی مؤمنین کو) اور کثرت سے مراد اضافی کثرت نہیں بلکہ کثرت فی حد ذاتہ مراد ہے مومن اگرچہ کفار سے بہت کم ہیں لیکن فی نفسہ بہت ہیں اور بجائے صیغہ مصدر یعنی لفظ اضلال و ہدایت کے یضل ویھدی اس لئے فرمایا تاکہ حدوث اور تجدد سمجھا جائے (مطلب یہ ہے کہ یہ موقع تو مصدر کا تھا کیونکہ سوال یہ تھا کہ اس مثال سے کیا غرض تو جواب ظاہر کلام کے مقتضا کے موافق یہ تھا کہ اللہ کی مراد اس سے گمراہ کرنا اور ہدایت کرنا ہے لیکن چونکہ مقصود یہ تھا کہ جواب کے ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح مفہوم ہو جائے کہ یہ گمراہ کرنا اور ہدایت کرنا پے در پے واقع ہوتا رہے گا اس لئے مضارع کے صیغہ کا استعمال فرمایا کہ اس معنی پر مضارع ہی کا صیغہ دلالت کرتا ہے۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ جو آیت متضمن مثل نازل ہوتی ہے تو مؤمنین اس پر صدق و اخلاص کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں اور انہیں کچھ شک و شبہ نہیں رہتا اس لئے وہ اس سے ہدایت پاتے ہیں اور کفار اسے نہیں مانتے اور انکار کرتے ہیں اور طرح طرح کے اعتراضوں سے اپنی زبان کو آلودہ کر کے گمراہ ہوتے ہیں۔ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفَاسِقِیْنَ میں فاسقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو دائرۂ ایمان اور حکم الٰہی سے نکلنے والے ہیں چنانچہ کھجور جب اپنے پوست سے نکل آتی ہے تو عرب فَسَقَتِ الرَّطْبَةُ بولتے ہیں۔ اصطلاح شرع میں فسق کے معنی کبیرہ گناہ کرنے کے ہیں۔ فسق کے تین درجے ہیں سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ جن امور پر ایمان لانا واجب ہے ان کا انکار و کفر کرے اور کفر سب گناہوں میں بدتر گناہ ہے اور قرآن مجید میں فسق سے اکثر یہی معنی مراد ہیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ کبائر میں منہمک ہو اور تیسرا یہ کہ کبائر میں تو منہمک یعنی ڈوبا ہوا نہ ہو مگر کبیرہ کا مرتکب ہو یا یہ کہ صغیرہ پر اصرار کرتا ہے مگر معاصی کو برا سمجھتا ہو۔

اَلَّذِیْنَ (جو) یہ الْفَاسِقِیْنَ کی صفت ہے یا تو مذمت اور فسق کی تاکید کے لئے لائی گئی ہے اور یا اگر فاسقین سے کفار اور مسلمان عاصی مراد ہوں تو اس وقت فاسقین کو اس صفت سے مقید کرنا منظور ہے۔

یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ (اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں) اللہ کے عہد سے یا تو وہ عہد مراد ہے جو اہل کتاب سے توریت میں لیا گیا تھا کہ محمد ﷺ پر ایمان لائیں اور جو نعت اس میں مذکور ہے اسے ظاہر کر دیں اخفانہ کریں یا وہ عہد الست مراد ہے جو تمام بنی آدم سے لیا گیا تھا نقض کے اصلی معنی رسّی وغیرہ کے بَل کھولنے کے ہیں پھر اس کا استعمال عہد توڑنے میں ہونے لگا کیونکہ عہد کو بھی حبل یعنی رسی سے تعبیر کرتے ہیں اور تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ جیسے رسی سے دو چیزیں میں بستگی اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح عہد سے بھی آپس میں عہد کرنے والوں کا ایک ارتباط اور تعلق ہو جاتا ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ (اس کو مضبوط کئے پیچھے) میثاقہ میں ہ کی ضمیر عہد کی طرف راجع ہیں اور میثاق یا تو مصدر بمعنی وثوق ہے اور یا میثاق سے وہ آیات و کتب مراد ہوں جن سے اس عہد کو تقویت دے کر یاد دلایا گیا ہے مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ میں من ابتداء غایت کے لئے ہے کیونکہ عہد توڑنے کی ابتدا اس کے محکم و مضبوط کرنے کے بعد ہی واقع ہوئی ہے۔

وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ (اور جن (تعلقات) کے ملائے رکھنے کا اللہ نے حکم فرمایا انہیں قطع کرتے ہیں) اَنْ یُّوْصَلَ ضمیر مجرور سے جو بہٖ میں ہے بدل ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم فرمایا تھا کہ تمام انبیاء علی نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ رشتہ ایمان ملایا جائے اسے وہ قطع کرتے ہیں اور حکم تو یہ دیا جاتا ہے کہ یوں کہو لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (ہم فرق نہیں کرتے ہیں اس کے پیغمبروں میں) اور وہ اس کے مقابلہ میں اس کو توڑ کر کہتے

marfat.com

ہیں نُؤْمِنُ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (یعنی ہم کتاب کے بعض حکم تو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں) یا یہ معنی ہیں کہ جن حقوق کی بستگی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے جیسے رحم و قرابت وغیرہ وہ اس کی قطع و برید کرتے ہیں۔

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں) فساد پھیلانے سے مراد قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کفر کرنا اور کھیتی و مویشی کا تباہ کرنا ہے۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۲۷﴾ (یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں) نقصان و خسارہ میں اس لئے پڑے کہ انہوں نے صلاح ورسد وہدایت کے بدلے گمراہی و فساد کو مول لیا جب حق تعالیٰ نے آیات سابقہ میں کفار کے اوصاف کو خوب کھول کر بیان فرمایا اور ان کے ہذیان و بکواس کو نقل کیا (تو یہ بات بھی اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ اپنے منعم حقیقی کے اداء حق سے بالکل غافل ہیں اور انہیں اس کی طرف بالکل توجہ نہیں) تو حق تعالیٰ انہیں آگے صنعت التفات کے طور پر استفہام انکاری سے خطاب فرما کر جتلاتا ہے کہ یہ کفر و سرکشی جن حالات میں تم کر رہے ہو وہ کسی طرح مقتضی نہیں کہ کفر و ناشکری کی جائے چنانچہ جو حالات آدمی پر وارد ہوتے ہیں مثلاً اول محض لاشئے ہونا پھر زندہ ہونا اس کے بعد مرنا اور پھر زندہ ہونا اور پھر جناب باری کی طرف لوٹ کر جانا اور اس کے علاوہ دیگر احوال و انقلابات جو قادر مطلق کی طرف سے وارد ہوتے ہیں یہ سب صاف صاف بول رہے ہیں کہ ایسے قادر، رحیم و مالک الملک پر ایمان لانا ضروری و واجب ہے اور کفران نعمت کسی طرح اور کسی حال میں زیبا نہیں۔ ذیل کی آیت میں ان کے کفر و انکار پر ایک زبردست دھمکی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۸﴾ (تم کیونکر خدا کا انکار کر سکتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے پھر اسی نے تم میں جان ڈالی پھر وہی تمہیں مارتا ہے پھر وہی تمہیں (قیامت میں دوبارہ) جلائے گا پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے یعنی باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر بے انتہاء دلائل ہیں پھر کیونکر انکار کر سکتے ہیں۔ اَمْوَاتًا سے مراد عناصر، غذائیں، اخلاط اور نطفہ، خون بستہ، گوشت کے ٹکڑے اور جسم بلا روح ہے (کیونکہ جان پڑنے سے پہلے آدمی ان ہی اشیاء میں سے کوئی شئے ہوگا۔

جاننا چاہئے کہ انسان دس چیزوں سے مرکب ہے پانچ عالم خلق سے یعنی چار تو عناصر (پانی، آگ، ہوا، خاک) پانچوں نفس حیوانی جو اربعہ عناصر سے ہی پیدا ہوتا ہے اور پانچ عالم امر سے قلب، روح، سر، خفی، اخفی (اول کے پانچ جز تو ظاہر ہی ہیں دلیل کی حاجت نہیں) آخر الذکر پانچ بھی جسکی فراست صحیح اسلامیہ ہو اس پر مخفی نہیں۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان جملہ اجزاء میں سے عناصر اربعہ خصوصاً خاک زیادہ مہتم بالشان ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے مجملہ اور اجزاء کے اس خاک کو خاص کر کے فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ یعنی اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور اسی لئے کافر یعنی شیطان (قیامت کے دن جبکہ اس طائر قفس خاکی مراتب اور درجات دیکھے گا تو بے اختیار بول اٹھے گا يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا (اے کاش میں مٹی ہوتا) اور اسی وجہ سے مجملہ انواع مخلوق کے یہ حضرت انسان ہی حق تعالیٰ کی رؤیت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور اسی لئے وہ مشاہدہ قلبیہ کو رستہ کی پڑی ہوئی چیز جیسی خیال کرتے ہیں۔ فَأَحْيَاكُمْ پھر اسی نے تم میں جان ڈالی یعنی پھر تمہیں عالم امر کے عناصر خمسہ مذکورہ کے ساتھ ترکیب دے کر زندہ کیا اور فا کے ساتھ عطف اس لئے فرمایا کہ زندہ کرنے اور اس موت میں جو عناصر کو لازم ہے کوئی مدت فاصل نہیں ہے ثُمَّ يُمِيتُكُمْ پھر تمہیں مدت گزر جانے کے بعد مارتا ہے (یہاں ثم کے ساتھ اس لئے عطف کیا کہ یہ موت عمر کے ختم ہونے پر ظہور میں آتی ہے) بے جان ہونے کو نعمتوں میں سے اس لئے شمار کیا کہ نیست سے ہست ہونا نعمت اور خیر محض ہے کیونکہ اس میں وجود حقیقی سے مشابہت ہے اور پھر موت کو جو عمر کے اختتام پر واقع ہوتی ہے اس لئے انعامات میں سے گنا کہ وہ ابدی حیات تک پہنچنے کا ذریعہ ہے ثُمَّ يُحْيِيكُمْ یعنی جس دن صور پھونکا جائے گا تو پھر تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قبر میں حیات نہ ہوگی کیونکہ حیات دس اجزاء مذکورہ کی ترکیب کا نام ہے اور یہی ظاہر ہے کہ قبر میں یہ اجزاء مجتمع نہ ہوں گے اس لئے وہاں زندگی متصور نہیں ہو سکتی (رہی یہ

marfat.com

بات کہ جب قبر میں حیات نہ ہوگی تو ثواب و عذاب کیسے ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے لئے خاصیۃ اس حیات کا ہونا ضروری نہیں ہے) ثواب و عقاب اجزاء بسیط پر بھی ہو سکتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کی ان آیات پر ایمان رکھتا ہے اسے تو عذاب قبر کے انکار کی گنجائش ہی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ اس کی تسبیح نہیں سمجھتے) اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ کیا تو نے نہیں دیکھا (اے مخاطب) کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے اور پہاڑ، درخت چوپائے اور بہت سے آدمی) اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کا نام لے کر پکارتا اور دریافت کرتا ہے کہ تجھ پر کوئی اللہ کا یاد کرنے والا بھی آیا ہے وہ اگر جواب دیتا ہے کہ ہاں آیا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا (ہم نے دکھائی امانت (تکلیف شرعیہ) آسمان اور زمین اور پہاڑوں کو پھر سب نے (از راہ عجز) قبول نہ کیا کہ اسے اٹھائیں اور اس سے گھبرا گئے) یہ بات ظاہر ہے کہ نصوص میں تسبیح سجود زبان حال اور دلالت حال سے مراد نہیں کیونکہ جو فرمادیا ہے کہ تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے اور دوسرے مقام پر فرمادیا کہ بہت سے لوگ بھی سجدہ کرتے ہیں تو یہ دونوں مضمون اس تاویل کا بڑے زور سے انکار کر رہے ہیں۔ [1] (بلکہ قطعاً حقیقی سجود اور حقیقی تسبیح مراد ہے) ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ یعنی حشر کے بعد پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمہارے اعمال کی تم کو جزا دے گا، یعقوب کی قرأت تمام قرآن میں تَرْجِعُوْنَ اور یَرْجِعُوْنَ بفتح تا و یا معروف کے صیغہ سے ہے یہ آیت مدنیہ ہے اس میں کفار یہود اور منافقوں کو خطاب ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہود حشر و نشر کے معتقد و معترف تھے (کہ اہل کتاب ہیں تو اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مخاطب تو حشر و نشر کے قائل نہیں پھر یہ آیت ان پر کس طرح حجت ہو سکتی ہے) ایک طرح منکرین بعث کو بھی خطاب ہو سکتا

---

[1] امام رازی، امام غزالی اور اکثر علماء تفسیر نے جمادات، نباتات اور جانوروں کی تسبیح کو تسبیح حالی قرار دیا ہے یعنی ان کی بناوٹ پر حکمت خلقت اور لطیف ترین تکوینی خصوصیت زبان حال سے خدا کی ہستی، توحید، تمام نقائص و عیوب سے پاکی اور تمام صفات کمالیہ کی جامعیت پر دلالت کر رہی ہے۔ حضرت مؤلف کے نزدیک ساری کائنات تسبیح حالی کے علاوہ تسبیح قولی میں بھی مشغول ہے اس دعوے کے ثبوت دو آیات سے ہوتا ہے [1] وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ اس آیت میں تسبیح تکوینی غیر اختیاری مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ آخری فقرہ میں انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہر مصنوع کی صانع پر ہر مخلوق کی خالق پر دلالت اور ساری کائنات کا ایک نظام میں مربوط ہونا اور کسی نوع یا فرد کا نظام کلی سے سرتابی نہ کرنا اتنی بدیہی حقیقت ہے جس سے ہر شخص واقف ہے اس تسبیح حال سے کوئی شخص جاہل نہیں اگر کوئی منکر ہو تو اس کے انکار کی بناء محض عناد یا کوردانشی پر ہوگی جب ہر شخص اس تکوینی حالی تسبیح کو جانتا اور سمجھتا ہے تو ظاہر ہے کہ آیت میں اس کی نفی مراد نہیں ہے بلکہ تسبیح قولی کو سمجھنے کی نفی مقصود ہے ان گنت درختوں اور ان کے پتوں کی لا محدود جمادات اور معدنیات کی اور بے شمار جانداروں اور کیڑے مکوڑوں یہاں تک کہ خارج از حساب خلیات و ذرات کی زبانیں کوئی نہیں سمجھتا اور آیت میں اسی تسبیح کو سمجھنے کی نفی کی گئی ہے جو کائنات کا ہر ذرہ اپنی زبان حال سے کر رہا ہے [2] اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ الخ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ ارض و سماء اور انقیاد کائنات سے مراد اطاعت اختیاری ارادی ہے اضطراری تکوینی فطری فرمان پذیری مراد نہیں ہے ورنہ آیت کے آخر میں من الناس نہ کہا جاتا کیونکہ اطاعت تکوینی اور تسخیر خلقی کی زنجیر میں تو ساری کائنات کے ساتھ تمام انسان بھی بندھے ہوئے ہیں کثیر کی قید نہ فقط غیر مقید بلکہ موہم خلاف مقصود ہے ہاں سجدہ اختیاری ضرور کچھ انسان کرتے ہیں کچھ نہیں کرتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یسجد لہ میں سجدہ سے مراد سجدہ اختیاری اور اطاعت شعوری ہے مذکورہ بالا دونوں آیات سے بطور دلالت النص مستفاد ہو رہا ہے کہ اس نظام تکوینی کا ہر پرزہ اور ترکیب عالم کا اول ترین جزء ثومہ بھی ذی شعور اور صاحب ارادہ ہے اگرچہ شعور و ارادہ کے مراتب میں انواع و افراد کے مراتب کے لحاظ سے بہت بڑا تفاوت ہے، ۱۲۔

marfat.com

ہے یا تو اس طرح کے انکار کو بوجہ دلائل کثیرہ صدق رسول اللہ ﷺ بمنزلہ عدم ٹھہرا کر خطاب کیا گیا ہے (جیسا کہ بلاغت کا قاعدہ ہے) اور یا اس طریق سے کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرف اشارہ فرمانا منظور ہے کہ جس قادر مطلق نے تمہیں عدم محض سے موجود کر دیا ہے وہ دوسری دفعہ زندہ کرنے پر تو بطریق اولیٰ قادر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ (وہی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے) پھر متوجہ ہوا آسمان (بنانے کی طرف) خَلَقَ لَكُمْ یعنی (جو کچھ زمین میں ہے وہ دنیا و آخرت میں) تمہارے نفع اور فائدہ مند ہونے کے لئے پیدا کیا ہے دنیا میں (اس کی تمام چیزوں سے سود مند ہونا تو محتاج دلیل نہیں) بواسطہ یا بلاواسطہ (دنیا کی) سب چیزوں سے انسان منتفع ہوتا ہے) رہا آخرت کا نفع سو وہ یہ ہے کہ دنیا و مافیہا کو دیکھ کر عبرت حاصل کی جاتی ہے۔

مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (سب کا سب جو کچھ زمین ہے) اور اس آیت کریمہ میں جو نعمت بیان کی گئی ہے وہ نعم مذکورہ آیت سابقہ پر مرتب ہے (کیونکہ دنیا کی اشیاء سے منتفع ہونا تو ظاہر ہے کہ بعد اعطاء حیات وجود میں آیا ہے)۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ (پھر آسمان کا قصد کیا (کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر سلف صالحین نے تو یہ تفسیر فرمائی ہے کہ پھر آسمان کی طرف صعود فرمایا۔ اس تفسیر پر یہ آیت مثل اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (رحمٰن عرش پر قائم ہوا) کے متشابہات میں سے ہوگی۔ ابن کیسان اور فراء اور نحویوں کی ایک جماعت کا میلان اس طرف ہے کہ استوا کے یہ معنی ہیں کہ آسمان پیدا کرنے کی طرف توجہ و قصد کیا۔ (اس وقت علی العرش کا معنی ہوگا الی العرش) کہتے ہیں کہ استواء بمعنی قصد عرب کے قول استوٰی الیھم کالسھم المرسل سے مشتق ہے اور یہ اس وقت بولتے ہیں کہ جب سیدھ باندھ کر بغیر کسی دوسری طرف توجہ کئے کسی شئے کی جانب کسی نے قصد کیا ہو۔

بیضاوی نے کہا ہے کہ ثم استوی میں کلمۂ ثم (پھر) لانے کی دو وجہ ہو سکتی ہے اول یہ کہ زمین اور اس کی کل چیزیں پیدا کرنے اور آسمان کے پیدا کرنے میں مدت فاصل ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے یہ کہ بات ظاہر فرمائی ہے کہ آسمان کو زمین پر شرف و فضیلت ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر بھی کلمۂ ثم ترقی مرتبہ کے لئے ارشاد فرمایا ہے چنانچہ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الایہ اور یہ دوسری وجہ ہی صحیح ہے کیونکہ اگر مدت فاصل ہونا مراد ہوگا تو بظاہر دوسری آیت سے تعارض لازم آئے گا اور وہ آیت یہ ہے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (یعنی زمین کو آسمان وغیرہ بنانے کے بعد بچھایا) یہ آیت صاف بول رہی ہے کہ زمین کا بچھانا آسمان کے پیدا کرنے اور اس کے برابر کرنے کے بعد واقع ہوا ہے اور (جب زمین کا درست کرنا اور بچھانا آسمان کے بعد ہوا ہے تو زمین کی اشیاء ظاہر ہے کہ بطریق اولے آسمان کے بعد ہوں گی اور جب آسمان کے بعد ہوئیں تو کلمۂ ثم کا لانا کس طرح درست ہوگا۔

علامہ بغویؒ نے آیت وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول زمین کو مع اس کی پیداوار کے جو اس کے اندر ہے پیدا فرمایا مگر اسے بچھایا نہیں، پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی تو سات آسمان برابر بنائے پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا، بعض نے کہا ہے کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا کے یہ معنی ہیں کہ آسمان کے پیدا کرنے کے ساتھ ہی زمین کو بچھا دیا اور لفظ بعد بمعنی مع ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے، عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِیْمٍ (یعنی بدخو ہے اور اس سب کے ساتھ بد اصل بھی ہے) یہاں بھی لفظ بعد بمعنی مع ہے، علامہ بغویؒ نے سورۂ حٰم السجدہ کی آیت خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ الآیہ کی تفسیر میں فرمایا کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ زمین کو اتوار اور پیر دو دن میں بنایا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا (اور دو دن یعنی منگل اور بدھ میں اس کے رہنے والوں کی خوراک مقرر کر دی) تو یہ دو دن پہلے دو سے مل کر چار روز ہو گئے، اسی واسطے فرمایا ہے وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ (یعنی زمین میں اس کے رہنے والوں کی خوراک چار دن کے اندر مقرر فرمادی) اس کے بعد فرماتا ہے فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ (پھر انہیں پنج شنبہ اور جمعہ دو دن میں سات

marfat.com

آسمان بنا دیئے) یہی اقوال سلف سے مستفاد ہے، واللہ اعلم۔
فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ (تو انہیں سات آسمان ہموار بنا دیئے) یعنی ہموار و برابر پیدا کیے کہیں ان میں رخنہ اور دراڑ نہیں، هن کی ضمیر اَلسَّمَآءُ کی طرف اس تقدیر پر راجع ہے کہ سماء سے مراد ہیں اجرام سماویہ کیونکہ سَمَاءٌ یا تو جمع ہے یا جمع کے معنی میں ہے اور سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اس ضمیر هن سے بدل ہے اور السماء کی تفسیر اجرام سے نہ کریں تو اس وقت ضمیر هُنَّ مبہم ہے (یعنی کسی کی طرف راجع نہیں اور سَبْعَ سَمٰوٰت اس کی تفسیر ہے) جیساکہ عرب کے قول رُبَّهٗ رَجُلاً میں (ضمیرہ مبہم ہے اور رجلاً اس کی تفسیر ہے) اب اگر کوئی کہے کہ اہل ارصاد نے تو نو افلاک ثابت کئے ہیں سات یہ اور آٹھویں فلک اطلس جو فلک الافلاک ہے اور نواں فلک ثوابت ہے[۱] یہ دونوں بے جزکے ہیں ہے[۲] اور انہوں نے سات فلک کے کچھ اجزاء ثابت کئے ہیں، بعض تو ان میں سے تین افلاک سے مرکب ہیں کہ وہ افلاک مرکز کے باہر واقع ہیں اور ان میں ایک کوکب اور ایک متمم حاوی ہے اور بعض ان میں سے پانچ افلاک خارج مرکز اور دو متمم حاوی اور دو متمم محوی سے مرکب ہیں اور اس میں اور بھی افلاک ہیں کہ جو بالکل ٹھوس ہیں اور ان میں بالکل خلا نہیں اور اس میں کواکب متحیرہ قائم ہیں اہل ہیئت نے اس کا نام فلک التدویر رکھا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اہل ہیئت نے افلاک کا شمار کواکب کی حرکات کے اعتبار سے کیا ہے جب انہوں نے دیکھا کہ کل کواکب اور آفتاب رات دن دورہ کرتے ہیں تو ایک فلک الافلاک ثابت کیا جو تمام کواکب کو مشرق سے مغرب کی طرف حرکت قسری دیتا ہے اور جب یہ دیکھا کہ کواکب سبعہ کے سوا اور کواکب ایک طرح حرکت کرتے ہیں اور کواکب سبعہ سیارہ کی حرکت تیزی اور سستی میں مختلف ہے اور کبھی بروج شمالیہ سے جنوبیہ کی طرف اور کبھی بروج جنوبیہ سے شمالیہ کی طرف حرکت کرتے ہیں تو انہوں نے ان کی حرکات کے موافق فلک کی شمار کی اور جب یہ دیکھا کہ آفتاب کے سوا اور سیاروں کی حرکت کبھی تیز ہو جاتی ہے کبھی دھیمی کبھی مشرق کی طرف ہوتی ہے اور کبھی مغرب کی طرف اور کبھی ٹھیر ٹھیر[۳] کر تو انہوں نے تدویرات متعددہ ثابت کردیں، تو اس حساب سے افلاک کی شمار قریب تیس کے پہنچ گئی، اگر مفصل بحث دیکھنی منظور ہو تو علم ہیئت[۴] کی طرف رجوع

---

[۱] یہاں آٹھویں اور نویں آسمان کی ترکیب ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ اہل ہیئت کے نزدیک آٹھواں آسمان فلک ثوابت اور نواں فلک اطلس یعنی فلک الافلاک ہے، ۱۲۔

[۲] یعنی فلک ثوابت اور فلک اطلس میں افلاک جزئیہ نہیں ہیں، باقی ساتوں افلاک میں افلاک جزئیہ بھی ہیں۔

[۳] قولہ ٹھیر ٹھیر کر، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ ٹھہرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اگر اس طرح افلاک کے درمیان اتصال فرض کر لیا جائے تو جدا جدا افلاک ان کی حرکات سے واجب اور ضروری ہوں گے (اور اس میں کوئی قباحت نہیں) ہاں محوی کا متحرک ہونا اسی صورت میں لازم ہو سکتا ہے کہ حاوی اور محوی دونوں میں تلاصق اور اتصال ہو اور یہ تعدد افلاک کے علاوہ دوسرا امر ہے (جس سے یہاں بحث نہیں) (حضرت قاضی صاحبؒ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں افلاک کے متلاصق ہوتے ہوئے توقف (ٹھیر جانے) کی وجہ اہل ہیئت کا یہ خیال ہے کہ ہر کوکب اور ایسے ہی شمس و قمر کی دو حرکتیں ہیں، ایک حرکت قسری جو نویں فلک کے تابع ہے جس سے اس کا دورہ ایک رات دن میں پورا ہوتا ہے، اور اسی حرکت پر رات اور دن کی بناء ہے، اور دوسری حرکت طبعی مشرق کی طرف ہے جس سے ان کی حرکتوں میں اختلاف ہوتا ہے اور جس پر فصلوں کا اور مہینوں وغیرہ کے اختلاف کا مدار ہے، بلکہ ہر کوکب کی بوجہ قسر کے بہت سی حرکتیں ہیں، ایک تو یہی ہے جو فلک الافلاک کے تابع ہے دوسری متممات حاویہ اور محویہ کے قسر کی وجہ سے اور متحیرہ کی طبعی حرکت ان کی تدویرات کی ہی حرکت ہوا کرتی ہے اور جس کوکب کی تدویر نہ ہو تو اس کی حرکت طبعی وہی ہوا کرتی ہے جو اس کے فلک کی ہوتی ہے جس میں وہ مرکوز ہوتا ہے اور حرکت قسری تو بدون تلاصق کے متصور ہی نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک اس مقام کی تحقیق میں شبہات ہیں جن کی گنجائش اس جگہ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کواکب اور شمس و قمر سب کے سب آسمان دنیا میں ہیں اور ہر ایک کی علیحدہ اور مختلف حرکت ہے، ہر کوکب اپنے فلک میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مچھلی پانی میں، ان میں سے کوئی بھی دوسرے فلک کے قسر سے نہیں، رات دن اور موسموں کا اختلاف کواکب کی حرکت کے اختلاف سے مربوط ہے، یہ بحث طویل ہے یہ مقام اس کے مناسب نہیں، ۱۲ انتہی۔

[۴] آسمانوں کی یہ گنتی اور ترتیب اور اتصال ہیئت قدیم کا مسئلہ ہے، اکثر علماء تفسیر نے آیات قرآنی کو اسی مسلمہ پر (باقی اگلے صفحہ پر)

marfat.com

کرنا چاہئے جب یہ بات معلوم ہو گئی تو اب جاننا چاہئے کہ اس طرح پر افلاک کا شمار باعتبار حرکات کواکب ثابت کرنا محض باطل اور وہ بھی چند مفروضات پر مبنی ہے کہ وہ بھی بے اصل ہیں، ان مفروضات میں سے ایک مفروضہ تو یہ ہے کہ وہ زعم کرتے ہیں کہ توڑ جوڑ اجسام فلکیہ کا بالکل محال ہے اور ایک مفروضہ یہ ہے کہ تمام افلاک ایک دوسرے سے باہم ملے ہوئے ہیں جیسا کہ پیاز کے چھلکے کہ وہ ایک دوسرے سے باہم متصل ہیں اور یہ مقدمات اسے مستلزم ہیں کہ فلک الافلاک کی حرکت سے تمام افلاک میں حرکت جبریہ ہو اور یہ جملہ مفروضات سے جو لازم آتا ہے سب کا سب باطل محض ہے کیونکہ آسمان کا پھٹ جانا عقلاً جائز اور نقلاً واجب ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ (کہ جب آسمان پھٹ جائے گا) اور مثل اس کے بہت سی آیتوں سے آسمان کا پھٹنا ثابت ہوتا ہے اور اس طرح آسمانوں کا باہم متصل نہ ہونا اور ہر دو آسمان کے مابین مسافت کا ہونا شرعاً ثابت ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک وقت حضور فخر عالم ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم تشریف فرما تھے کہ ایک بادل آیا، آپ نے فرمایا جانتے ہو یہ کیا ہے صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اللہ کے رسول ؐ کو زیادہ علم ہے، فرمایا ابر ہے، زمین کے لئے روایا کی مثل ہے، اللہ تعالیٰ اسے ایسی قوم کی طرف بھی بھیجتا ہے کہ جو اس کا شکر نہیں کرتی نہ اس سے دعا مانگتی ہے، پھر فرمایا جانتے ہو یہ تمہارے اوپر کیا ہے صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ عالم ہیں، فرمایا آسمان ہے جو ایک سقف محفوظ اور موج بستہ ہے، پھر فرمایا جانتے ہو تمہارے اور آسمان کے درمیان کس قدر مسافت ہے، صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور رسول ﷺ ہی کو خبر ہے فرمایا پانسو برس کی۔ پھر فرمایا جانتے ہو کہ اس کے اوپر کیا ہے عرض کیا اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو علم ہے، فرمایا ایک اور آسمان ہے کہ اس آسمان اور اس کے مابین پانسو برس کی مسافت ہے اس طرح رسول خدا ﷺ فرماتے رہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سنتے رہے اور جواب دیتے رہے حتیٰ کہ آپ نے سات آسمان گنوائے اور ہر دو آسمان کے درمیان مثل اسی بعد (۵۰۰) پانسو برس کے جو آسمان دنیا اور زمین کے مابین ہے ثابت فرمایا، پھر فرمایا جانتے ہو ان سب کے اوپر کیا ہے صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ خبر ہے، فرمایا ان سب کے اوپر عرش عظیم ہے اس کے اور آسمان کے مابین پانسو برس کی مسافت ہے، پھر فرمایا جانتے ہو تمہارے نیچے کیا ہے، صحابہؓ نے کہا اللہ اور رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں فرمایا زمین ہے، پھر فرمایا کچھ خبر ہے کہ اس کے نیچے کیا ہے صحابہؓ نے مثل سابق ہی جواب دیا، فرمایا اس کے نیچے ایک اور زمین ہے اور دونوں زمینوں کے مابین پانسو برس کی مسافت ہے غرض یہ

(بقیہ) منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے نزدیک تاویل زائغ یا تحریف ہے۔ تحقیقات کائنات کی کوئی آخری حد نہیں نہ کسی قول کو آخری قول کہا جاسکتا ہے نہ کسی مسلمہ کو یقینی قطعی ناقابل شک کہہ سکتے ہیں ہاں اگر تطبیق ہی دینی ہے تو علوم عقلیہ کو نص قرآنی کے مطابق بنانے کی کوشش مضر نہیں منصوصات الٰہیہ کو اصل ناقابل شک قرار دینا ضروری ہے اور تصریحات علماء کو ان کی شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے، موجودہ ہیئت ترتیب اتصالی کی قائل نہیں نہ افلاک کا حصر صرف نو میں کرتی ہے اس وقت تک کی تحقیقات سے اس کائنات کے چالیس کروڑ کرے ثابت ہو چکے ہیں دس کروڑ آسمان اور تیس کروڑ زمینیں۔ ہر آسمان کے آس پاس تین زمینیں ہیں، ہر کرہ بعلاقہ کشش اپنی جگہ قائم ہے اور حرکت متدیر کر رہا ہے کوئی کسی سے متصل نہیں ہر کرہ کا فاصلہ دوسرے کرہ سے لاکھوں میل کا ہے بلکہ بعض کا فاصلہ تو کروڑوں اور اربوں میل تک پہنچتا ہے ہاں ایک کرہ کو دوسرے کرہ کے اوپر یا نیچے کہا جاسکتا ہے اور وہ بھی اضافی طور پر ورنہ حقیقی فوق و تحت تو موجودہ ہیئت میں مفقود الوجود ہے نہ کوئی مرکز عالم ہے نہ محیط کل۔ ہر کرہ کا مرکز اور محیط جدا جدا ہے کسی فلک کے مادۂ تخلیق کی تعیین بھی ابھی تک نہیں ہو سکی کہ کس قسم کے اجزاء سے بنا ہے اور اس کی فضا میں کون سے اجزاء موجود ہیں ہاں اگر مجمل لفظ بولا جاسکتا ہے تو برقیات مکفوفہ یا بستہ لہریں یا محدود شعاعیں یا اسی قسم کا کوئی دوسرا لفظ بول سکتے ہیں مگر یہ لفظ بھی صرف فہمائش کے لئے بولا جائے گا حقیقت کی تعبیر کے لئے یہ بھی کافی نہیں پھر ہر فلک کا رنگ، حجم اور دوسری کیفیات کا علم حاصل کرنے کے لئے ارشادات نبویہ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اصطلاحی علوم اس کے واقعی بیان سے قاصر ہیں، ہر روز کی تنقیح ترقی پذیر ہے اور ترقی پذیر رہے گی، قرآن اور احادیث میں جو سبع سماوات کا لفظ آیا ہے اور عرش و کرسی کی صراحت کی گئی ہے اس کو ہیئت قدیم کی خرافات کی تائید میں پیش کرنا احمقانہ کوشش ہے، سبع سماوات کو سات اونچے کرے یعنی سیارات سبعہ کیوں نہ قرار دیا جائے اور عرش و کرسی کو اقتدار الٰہی کیوں نہ کہہ لیا جائے مگر یہ تاویلیں بھی قطعی نہیں۔

marfat.com

کہ حضور ﷺ نے ساتوں زمینیں شمار فرما کر ہر ایک کے مابین پانسو برس کی مسافت ظاہر فرمائی، پھر فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے اگر تم یہاں سے ایک رسّی سب سے نیچے کی زمین کی طرف لٹکاؤ تو وہ رسّی اللہ کی ذات پر جاکر اترے گی، پھر حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی، ھُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ وَھُوَبِکُلِّ شَیْئٍ عَلِیْمٌ (وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر وہی باطن ہے اور وہی ہر شئے کو جاننے والا ہے) اس حدیث کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اس آیت کو تلاوت فرمانا اس پر دلیل قاطع ہے کہ حضور ﷺ نے ان الفاظ سے کہ وہ رسی اللہ پر اترے گی، یہ مراد لی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت پر اترے گی اور اللہ کا علم ہر مکان میں ہے اور وہ خود عرش پر ہے (چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف نسبت فرمایا ہے، اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (یعنی رحمٰن عرش پر قائم ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''وہ رسی اللہ پر اترے گی'' متشابہات[1] میں سے ہے، جیسا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی، اور ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی مراد اس سے یہ ہو کہ وہ رسی اللہ کے عرش پر اترے گی مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، اس تقدیر پر حدیث اس پر دلالت کرے گی کہ عرش اور اس کے اندر جس قدر سمٰوٰت ہیں سب کے سب کروی ہیں اور عرش زمین کے اطراف کو محیط ہے تو حدیث کے معنی اس تقدیر پر یہ ہوں گے کہ اگر تم ایک رسّی سب سے نیچے کی زمین کی طرف لٹکاؤ، تو وہ ساتوں آسمانوں اور اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم پر جاکر لگے گی، اور صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معیت بلا کیف ہر شیئے کے لئے ثابت ہے اور نیز فرماتے ہیں کہ مومن کے قلب پر جو عالم صغیر میں اللہ تعالیٰ کا عرش ہے ایک خاص تجلی ہے اور ایک تجلی خاص کعبہ کے اندر رکھی گئی ہے اور اسی طرح ایک تجلی رحمانی عرش پر واقع ہے جو عالم کبیر کا قلب ہے اور آیت اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں اسی تجلی کی طرف اشارہ ہے اور اسی لئے بعض نے کہا ہے کہ حدیث سابق میں جو آیا ہے ''اگر تم ایک رسّی سب سے نیچے کی زمین کی جانب لٹکاؤ تو وہ اللہ کی ذات پر اترے گی'' اس میں تاویل کی حاجت نہیں بلکہ حقیقتاً اس رسی کا اللہ پر اترنا جائز ہے اور یہ ایک ایسا مضمون ہے جیسا کہ جناب باری نے اپنے کلام پاک میں فرمایا کہ ''مجھے بندۂ مومن کے دل کے سوا کوئی شئے بھی سما نہیں سکتی'' (حدیث قدسی) ترمذی اور ابو داؤد نے بروایت حضرت عباسؓ ایک حدیث ذکر کی ہے کہ جس میں یہ مضمون ہے کہ آسمان اور زمین کے مابین اکہتر یا بہتر یا تہتر برس کا فاصلہ ہے اور جو آسمان اس سے اوپر ہے اس کے اور اس کے مابین بھی اسی قدر فاصلہ ہے اور اس طرح حضور سرور عالم ﷺ نے سات آسمان تک شمار فرمائے اور فرمایا کہ ساتویں آسمان کے اوپر ایک دریا ہے کہ اس کے نیچے اور اوپر والے حصہ کے مابین اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا، پھر اس سب کے اوپر آٹھ فرشتے بزکوہی جیسے ہیں کہ ان کے سُموں اور سُرینوں کے مابین اتنی مسافت ہے جتنی ایک آسمان سے دوسرے

---

[1] ظاہر حدیث سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے سات آسمان ہیں ہر آسمان کا فاصلہ دوسرے آسمان سے پانچ سو برس کی راہ ہے، ہر آسمان دوسرے آسمان سے اوپر ہے، عرش سب کے اوپر ہے، سات زمینیں ہیں ہر زمین کا فاصلہ دوسری زمین سے پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے اگر زمین کی طرف کوئی رسّی لٹکائی جائے تو ذات خدا پر منتہی ہوگی، اس کے ثبوت میں حضور ﷺ نے آیت ھو الاول الخ تلاوت فرمائی۔

ترمذی کے نزدیک ذات خدا سے علم اور قدرت مراد ہے، مؤلف کے نزدیک رسی کا ذات پر منتہی ہونا متشابہات میں سے ہے، ناقابل فہم۔

صوفیہ کے نزدیک اللہ کی معیت بلا کیف ہر شئی کے لئے ثابت ہے، اس فقیر کے نزدیک حدیث باجزاء بغیر کسی تاویل کے صحیح ہی اور صوفیہ کا قول بھی حقیقت پر مبنی ہے ترمذی کی تاویل کی ضرورت نہیں نہ حدیث کا آخری حصہ متشابہات میں سے ہے، حضور ﷺ کا آیت ھوالاول الخ کو بطور ثبوت تلاوت فرمانا خود اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ حدیث کا آخری حصہ متشابہات میں سے نہیں ہے ورنہ آیت قرآنی کو بطور دلیل نہ پیش کیا جاتا، متشابہات یونہی واجب التسلیم ہیں، دلیل کی روشنی میں فہم وافہام نازیبا ہے، سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ متشابہات میں سے نہیں ہے ورنہ ایک متشابہ کی ثبوت میں دوسرے متشابہ کو پیش کرنا جو بجائے خود ناقابل فہم ہے نہ فقط غیر مفید بلکہ کلام بلغاء کے خلاف ہے، ترمذی کا ذات سے علم وقدرت مراد لینا یا آیت مذکورہ کی تاویل میں بعض متکلمین کا یہ کہنا کہ اللہ کے اول آخر اور ظاہر باطن ہونے سے مراد ہے اس کی قدرت اور حکمت کا ظاہر اور باطن ہونا، قصور علمی کی سپر اندازی اور کلام کو صحیح کرنے کیلئے خود ساختہ توجیہ ہے، حقیقی مطلب وہی ہے جو صوفیہ صافیہ نے بیان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

marfat.com

آسمان کی اور ان کی پشت پر عرش عظیم ہے کہ اس کے اعلیٰ اور اسفل کے درمیان بھی اتنی ہی مسافت ہے جتنی ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی اس پر اللہ تعالیٰ ہے۔

میں کہتا ہوں یہ اختلاف جو دربارۂ مسافت احادیث میں آیا ہے سو یہ اختلاف یا تو چلنے والوں کے اختلاف کی وجہ سے ہو کہ اگر رفتار تیز ہو تو مسافت کم مدت میں طے ہو گی اور جو دھیمی ہے تو زیادہ مدت لگے گی اور یا یہ وجہ ہو کر مسافت کا بتلانا منظور نہیں بلکہ اس کی زیادتی بیان کرنی مقصود ہے (جیسا کہ ہم اپنے محاورے میں بولا کرتے ہیں "سیکڑوں، ہزاروں" تو اس سے محض کثرت مراد ہوتی ہے نہ عدد) اور یہ جو وارد ہوا ہے کہ اکہتر بہتر یا تہتر تو یہ راوی کا شک ہے کہ یا تو اکہتر فرمایا یا بہتر یا تہتر واللہ اعلم، سلسلہ کلام یہاں بہت طویل ہو گیا ہے، حاصل مقصود یہ ہے کہ علم ہیئت بالکل باطل اور نقش بر آب ہے، اور عقلاً یہ امر جائز اور شرعاً ثابت ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (یعنی آسمان دنیا کو ہم نے کواکب سے زینت دی) پس تمام کواکب اپنے فلک میں تیز ہو یا دھیمی جس چال سے اللہ میاں چاہتا ہے چلتے ہیں جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے اس تقدیر پر آسمان کو حرکت نہیں، واللہ اعلم۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾ (اور وہ ہر شئے کو جاننے والا ہے) یہ آیت مضمون سابق کے لئے بمنزلہ دلیل اور علت کے ہے، گویا حاصل مرام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ چونکہ تمام اشیاء کی حقیقت کو پوری طرح جانتا ہے اس لئے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ بطرز مناسب کامل اور بطریق احسن نافع پیدا کیا ہے۔ ابو جعفر، ابو عمرو کسائی اور قالون وَهُوَ اور وَهِيَ کو جبکہ ہاء سے پہلے واو ہو بسکون ہاء پڑھتے ہیں جیسے یہاں اور جیسے وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ اور ہاء سے پہلے فا یا لام ہو تو جب بھی سکون ہی سے پڑھتے ہیں جیسے

ع ۹
۳

(بقیہ) کیا کہ اللہ ہر چیز کے ساتھ ہے، لیکن اس کی معیت بے کیف ہے نہ اس کا کوئی رنگ ہے، نہ بو، نہ شکل، نہ مسافت، نہ احتیاج زمانی، نہ اقتران مکانی، ذات خداوندی اتنی لطیف ہے کہ اس کی لطافت ہر تصور سے ماوراء ہے وہ ایسی نازک حقیقت ہے جو ہر بے حقیقت کو حقیقت کے لباس میں نمودار کرتی اور ہر جگہ، ہر وقت، ہر شئ کو محیط ہونے کے باوجود نہ مرئی ہے، نہ مسموع، نہ مشموم، نہ ملموس، نہ معقول، نہ مقصود، گویا ہر چیز اسی کی پرتواندازی سے ظاہر ہے ورنہ حقیقت میں بے حقیقت، روحانیت کی لطیف ترین تنقیح اور مشاہدات سے قطع نظر کر کے مادّی موشگافیاں بھی اسی نتیجہ تک پہنچ جاتی ہیں جس نتیجہ تک صوفی کا مشاہدہ پہنچتا ہے مادۂ اولیٰ کیا ہے۔ جرثومہ اولیٰ جوہر اول کائنات کا سنگ بنیاد، اول ترین ایٹم کیا ہے اس کی کیا حقیقت ہے پوست کھینچ کر دیکھو تو برقیات مثبت منفی لہریں اور متضاد القوی کرنیں ہیں جن میں کوئی رنگ نہیں کوئی بو نہیں لیکن قوام ہے وزن ہے حجم ہے مسافت ہے لیکن مثبت منفی لہروں کی کیا حقیقت ہے، محض طاقت خالص جو پیمائش سے خارج ہے ضخامت نہیں رکھتی حجم سے منزہ ہے پھر طاقت اور قوت کی مزید تحلیل کرو قوت برقیہ کی تلطیف کرو تو بر ایک بے کیف نور ہر روشنی سے بلند اور ہر تصور سے ماوراء ہر طاقت کو طاقت بنانے والا ہر قوت میں چھپا ہوا اور ہر طاقت کے روپ میں جھلکنے والا ملے گا اس سے آگے کی حقیقت ناقابل تعبیر ہے، صحیح ہے، "اللہ نور السموات والارض" ہر چیز کی تحلیل کرتے جاؤ تو تصور کی آخری حد پر وہی حقیقت ملے گی پھر ہر چیز کی تکثیف، تشکیل، تکوین اور تجسیم کرتے آؤ تو وہی باطن حقیقت سب سے زیادہ ظاہر نظر آئے گی بلکہ وہی ظاہر ہو گی، اس کے علاوہ کچھ دست نظر میں نہ آئے گا، پس اول بھی وہی ہے اور آخر بھی وہی، تلطیف کی آخری حد بھی وہی اور تکثیف کا انتہائی نقطہ بھی وہی ہے ہر سلسلۂ خیال تحتانی ہو یا فوقانی تکثیف کی جانب اس کو کھینچا جائے یا تلطیف کی جانب اسی حقیقت بے مثال پر جاکر ٹوٹ جائے گا پس وہ ہر شئ کے ساتھ ہے مگر بلا کیف اور ہر مادّی مسلسل رسّی اسی کی ذات پر پہنچ کر اترے گی، رہا سموات کا باہمی فاصلہ اور عرش کا سب سے بالا ہونا تو یہ حقیقت بالکل بدیہی ہے کہ اس کائنات میں کوئی کرہ دوسرے سے متصل نہیں نہ چسپاں ہے نہ دوسرے کو محیط، ایک فضائی خلاء ہے ہر کرہ اس میں معلق ہے اور ہر سیارہ اور ستارہ سریع اور بطی حرکت کے ساتھ ہموار رفتار سے اس میں تیر رہا ہے پانچ سو برس کی راہ کوئی محدود مسافت نہیں، معین مقدار نہیں نہ مسافر کی تعیین ہے نہ رفتار کی نہ سرعت اور بطوء کی سفر جسمانی ہے یا نظری یا برقی یا نوری کچھ نہیں معلوم، اس لئے اتنا ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ کروں کے مابین مسافت بعیدہ ہے اور اقتدار خداوندی سب سے بالا ہے سب سے اعلیٰ ہے ممکن ہے کہ کسی کرہ کو عرش بریں فرمایا ہو اور وہ مظہر نور جمال خصوصیت کے ساتھ اسی طرح ہو جس طرح قلب مومن جلوہ گاہ الوہیت ہے، واللہ اعلم۔

marfat.com

فَهُوَ وَلِيُّهُمْ اور إِنَّ اللهَ لَهُوَ الْوَلِيُّ اور فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اور لَهِيَ الْحَيَوَانُ اور کسائی و قالون ثُمَّ کے بعد جب ہاء واقع ہو تو اس وقت بھی ہاء کو ساکن کرتے ہیں جیسے ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ، علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ کسائی اور قالون نے ھو کی ہاء کو آیت أَنْ يُّمِلَّ هُوَ میں بھی ساکن پڑھا ہے لیکن قراء کے نزدیک بالاتفاق ایسے موقع میں اسکان نہیں، شاطبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ (اور یاد کیجئے اے محمد (ﷺ) اس وقت کا تذکرہ جبکہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا) اب یہاں سے جناب باری ایک تیسری نعمت کو بیان فرماتے ہیں، کیونکہ حضرت آدمؑ کو پیدا کرنا اور انہیں تمام فرشتوں پر فضیلت کا دینا ایسی نعمت ہے کہ کل اولاد آدمؑ کو شامل ہے۔ اور اس کلام سے طاعات کے ادا کرنے اور معاصی سے اجتناب کرنے کی ترغیب مستفاد ہوتی ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے اول آسمان اور زمین اور ملائکہ کو پیدا کیا، ملائکہ کو آسمان اور جنوں کو زمین میں بسایا، جن ایک مدت دراز تک زمین میں آباد ہے پھر ان میں حسد، عداوت اور بغاوت پھیل گئی اور آپس میں فساد اور خون ریزی کی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ایک گروہ زمین کو ان مفسدوں سے پاک کرنے کے لئے بھیجا، ان فرشتوں کو بھی جن کہا جاتا تھا اور وہ فرشتے جنت کے محافظ تھے اور ان کا نام جن، جنت سے مشتق کیا گیا ہے کیونکہ وہ جنت کے محافظ تھے اور ان سب کا سردار و مرشد اور سب سے زیادہ عالم ابلیس تھا تو وہ سب کے سب بحکم الٰہی زمین پر اترے اور جنوں کو پہاڑوں کی کھوؤں اور جزیروں میں نکال دیا اور خود زمین میں آباد ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت ان پر ہلکی فرمادی اور ابلیس کو زمین اور آسمان دنیا کی سلطنت اور جنت کی محافظت عطا فرمائی تو وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی عبادت زمین میں کرتا تھا کبھی آسمان میں کبھی جنت میں بس ان مراتب جلیلہ کے باعث اسے غرور ہو گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ سلطنت و مرتبہ اس لئے عطا کیا ہے کہ میں سب فرشتوں سے زیادہ بزرگ ہو جاؤں تو حق تعالیٰ نے اسے اور اس کے لشکر کو ذیل کی آیت سے خطاب فرمایا۔

إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ط (بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں)

علامہ بغویؒ کی روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ابلیس فرشتہ تھا اور اسی پر آیت فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ إِلَّآ إِبْلِيْسَ میں جو استثناء واقع ہوا ہے دلالت کرتا ہے اور جو کوئی یہ کہے کہ مسلم نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتہ کے دن پیدا کیا اور اس میں پہاڑوں کو یکشنبہ کے دن اور درختوں کو دوشنبہ کے دن اور امر مکروہ کو سہ شنبہ کے دن اور نور کو چہار شنبہ کے دن اور چوپاؤں کو زمین میں پنج شنبہ کے دن پیدا کیا اور حضرت آدمؑ کو جمعہ کے دن تمام مخلوق کے بعد دن کی اخیر ساعت میں مابین عصر اور رات کے پیدا کیا۔ تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت آدمؑ زمین سے چھ دن بعد پیدا کئے گئے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن مدت دراز تک زمین میں آباد رہے ہوں اور پھر انہیں پہاڑوں میں نکال دیا ہو اور اس میں ابلیس مع لشکر خود اور فرشتے ایک عرصہ دراز تک سکونت پذیر رہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس جمعہ کو حضرت آدمؑ پیدا کئے گئے ہیں یہ وہی جمعہ ہے جو زمین کے پیدا کرنے کے بعد آیا تھا، ممکن ہے کہ وہ جمعہ اور ہو جو مدتوں کے بعد آیا ہو اور یہ تاویل اس حدیث میں ضروری ہے اس لئے کہ اگر یہ تاویل نہ کی جائے گی تو یہ لازم آتا ہے کہ آسمان اور زمین وغیرہ سات روز کے اندر پیدا ہوئے ہیں حالانکہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا کئے گئے ہیں، واللہ اعلم۔

خلیفہ سے مراد حضرت آدم ہیں کیونکہ وہ احکام الٰہیہ اور ضوابط کے اجراء اور بندوں کی ہدایت اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دینے اور مراتب قرب پر فائز کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلیفہ تھے۔ ان کے خلیفہ بنانے کی کچھ یہ وجہ نہ تھی کہ خدا تعالیٰ کو ان کی حاجت تھی وہ تو غنی اور بے نیاز ہے اسے کسی شئے کی بھی حاجت نہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جن لوگوں کے خلیفہ بنائے گئے وہ حق تعالیٰ سے بلاواسطہ مستفیض نہیں ہو سکتے تھے اور نہ اس کے اوامر کو بلاوسیلہ اخذ

marfat.com

کر سکتے تھے پھر حضرت آدم کے بعد ہر نبی خدا کا خلیفہ ہوا۔

قَالُوْٓا (فرشتوں نے عرض کیا) یہ بطور تعجب اور استفاضہ عرض کیا تھا نہ اعتراض اور حسد کے طور پر کیونکہ فرشتوں کی شان میں عباد مکرمون فرمایا گیا ہے۔

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ (اے پروردگار) کیا تو زمین میں ایسے شخص کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد اور خونریزی کرے) فساد اور خونریزی کرنے والوں سے مراد اولا آدم ہے ان کا فساد اور خونریزی کرنا انہیں حق تعالیٰ کے اطلاع دینے سے معلوم ہو گیا تھا۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں) یہ جملہ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے جو سبب اشکال کو اور زیادہ قوت دینے والا ہے۔ آیت کے حاصل معنی یہ ہیں کہ اے پروردگار کیا تو نافرمانوں کو خلیفہ بناتا ہے حالانکہ ہم معصوم اور مستحق خلافت ہیں، تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کو برائی سے منزہ اور پاک سمجھنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ سبح فی الارض و الماء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "دور چلا گیا زمین اور پانی میں" اور بِحَمْدِكَ محل میں حال کے ہے کہ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں اس حال میں کہ تیری حمد بھی اس پر کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں اپنی تسبیح کی توفیق عطا فرمائی۔

وَنُقَدِّسُ لَكَ (اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں) تقدیس بھی تسبیح کے معنوں میں ہے قدس نجاستوں سے پاک ہوا اور نُقَدِّسُ لَکَ میں لام یا تو زائدہ ہے اور یا زائدہ نہیں۔ زائدہ نہ ہونے کی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ہم تیرے لئے اپنے نفسوں کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں یعنی اس وقت نقدس کا مفعول محذوف ہوگا اور زائد ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ مفعول ضمیر ک ہے۔ فرشتوں نے فساد کے مقابل میں جس سے مراد شرک ہے تسبیح کو قرار دیا اور خونریزی کے مقابل میں تقدیس کو گویا یہ عرض کیا کہ آدمی فساد کریں گے اور ہم ان کے مقابلہ میں تقدیس کرتے ہیں فخر عالم ﷺ سے کسی نے عرض کیا کہ حضور کون سا کلام افضل ہے فرمایا وہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے اختیار فرمایا ہے اور وہ یہ ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ کلمات خلق کے لئے رحمت کے باعث ہیں اور ان ہی کے باعث خلق کو رزق ملتا ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ (خدا نے فرمایا میں وہ مصلحتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) نافعؒ اور ابن کثیرؒ اور ابو عمروؒ نے اِنِّیْٓ کو یا کے فتح سے پڑھا ہے اور دوسرے قاریوں نے سکون سے۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے یہ جانتے تھے کہ بعض انسان نیک اور فرمانبردار ہوں گے اور بعض نافرمان و کفار اس لئے انہیں یہ اعتقاد ہو گیا کہ ملائکہ انسان سے افضل ہیں کیونکہ وہ سب کے سب معصوم ہیں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے جو حکم کر دیئے گئے اس کے موافق کرتے ہیں اور اسی بنا پر یہ بھی سمجھ گئے کہ ہمیں خلیفہ بنانا اولیٰ اور بشر کو خلافت کا عطا فرمانا فساد کا سبب ہوگا۔ چنانچہ جو فسادی تھے ان سے فساد ہی واقع ہوا اور ہو رہا ہے مگر انہوں نے یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کے دلوں میں اپنی حقیقی محبت امانت رکھیں گے کہ اس کے سبب انہیں معیت ذاتیہ اور محبوبیت خالص نصیب ہوگی چنانچہ سید المحبوبین سرور کائنات علیہ الصلوات والتحیات نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (یعنی آدمی اپنے محبوب کے ساتھ ہے) اس حدیث کو بخاری و مسلم نے ابن مسعود اور انس رضی اللہ عنہما اور ابن حبانؒ نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب طلب کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اسے دوست رکھتا ہوں اور جب میں اسے دوست رکھتا ہوں تو میں ہی اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے فرشتوں نے یہ نہ سمجھا کہ بارگاہ الٰہی میں آدمی کو وہ قرب اور منزلت ہوگی کہ دوسرے کے لئے

marfat.com

وہ کسی طرح متصور ہی نہیں ہو سکتی اور اس کے نیک بندوں کو مرتبۂ تقرب نصیب ہو گا۔
مسلم نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کو ایک شخص سے فرمائے گا اے ابن آدم میں بیمار ہوا تھا تو نے میری عیادت نہ کی وہ کہے گا پروردگار میں آپ کی عیادت کس طرح کرتا آپ تو رب العالمین ہیں، امراض سے پاک ہیں۔ ارشاد ہو گا تجھے یاد نہیں فلاں بندہ بیمار ہوا تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر ارشاد ہوا کہ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے نہ دیا وہ پھر مثل سابق عرض کرے گا۔ جاننا چاہئے کہ اکابر صوفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ جیسے سورج کی روشنی کو زمین اپنی کثافت کے سبب برداشت کر سکتی ہے اور دیگر عناصر لطافت کے سبب متحمل نہیں ہو سکتے اسی طرح تجلی ذاتی کو بھی عنصر خاکی ہی برداشت کر سکتا ہے اور باقی عناصر میں جتنی کثافت ہے اس کے سبب تجلی صفاتی کو تو برداشت کر بھی سکتے ہیں مگر تجلی ذاتی کے متحمل نہیں ہو سکتے اور عالم امر کے لطائف چونکہ لطیف ہیں اس لئے انہیں تجلیات ذاتیہ سے تو حصہ ملتا نہیں لیکن تجلیات ظلیہ سے کچھ بہرہ مل جاتا ہے اور انسان چونکہ ان دس لطائف سے مرکب ہے جو اجزاء عالم کبیر ہیں اور سوائے انسان کے اور افراد عالم میں یہ لطائف مجتمع نہیں اس لئے وہ خلافت کے قابل اور اس بار امانت کا حامل ہوا۔ جس کی نسبت حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (بیشک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب اس کے اٹھانے سے خائف ہوئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا بے شک وہ بڑا ظالم و جاہل تھا) ظالم تو اس لئے فرمایا کہ اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا کہ جس شئے کی برداشت کی طاقت نہ تھی اس کی برداشت کی اور جاہل اس لئے کہ اس نے بار امانت کی عظمت کو نہ جانا اور یہ انسان گو بظاہر عالم صغیر کہلاتا ہے مگر واقع میں عالم کبیر سے بڑھ کر ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے نہ میری زمین سما سکتی ہے نہ آسمان مگر مؤمن بندۂ کامل کا قلب مجھے سما سکتا ہے۔
القصہ: جب حق تعالیٰ ملائکہ سے یہ فرما چکا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ تو حضرت آدم کو ادیم زمین یعنی روئے زمین سے پیدا کیا یعنی زمین سے تمام اقسام کی مٹیاں لے کر اسے مختلف پانیوں سے گوندھا پھر ہموار کر کے روح پھونک دی۔ امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن جریر، ابن منذر، ابن مردویہ، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ فخر عالم ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو ایک مشت خاک سے پیدا کیا اور اس مٹی کو تمام روئے زمین کی مٹیوں سے لیا اسی وجہ سے اولاد آدم میں کوئی سرخ، کوئی گورا، کوئی بین بین، کوئی نرم خو، کوئی ترش رو، کوئی ناپاک، بدطینت، کوئی پاکیزہ منش ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمام زمین سے مٹی لینے میں یہ حکمت ہے کہ سب قسم کی استعداد اس میں جمع ہو جائے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے آپس میں چرچا کیا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا کرے مگر ہم سے زیادہ بزرگ کوئی مخلوق پیدا نہ کرے گا اور بالفرض کوئی مخلوق ہم سے زیادہ بزرگ پیدا بھی کی تو علم میں بہر حال ہم ان سے زیادہ ہوں گے کیونکہ ایک تو ہم اس سے پہلے پیدا کئے گئے ہیں اور دوسرے ہم وہ عجائبات دیکھ چکے ہیں جو اس مخلوق نے دیکھے بھی نہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کی فضیلت کو ان پر ظاہر فرمایا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔
وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (اور سکھا دیے اللہ تعالیٰ نے آدم کو سب کے نام) مفسرین نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کے نام سکھلائے۔ جمہور مفسرین تو یہ کہتے ہیں کہ تمام خلائق کے نام سکھلائے۔ بغوی کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہر شئے کا نام سکھا دیا حتی کہ پیالہ، پیالی کا نام بھی بعض نے کہا ہے کہ جو کچھ پہلے ہو چکا اور جو آئندہ ہو گا سب کے نام بتلا دیئے۔ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ ملائکہ کے نام سکھا دیئے بعض نے کہا اولاد کے نام اور بعض نے کہا ہر قسم کی صنعت۔ اہل تاویل نے کہا تمام لغات سکھا دیئے اسی لئے اولاد آدم مختلف لغت بولتے ہیں۔
میں کہتا ہوں کہ یہ کل اقوال میرے نزدیک غیر پسندیدہ ہیں کیونکہ بزرگی کا مدار و مبنیٰ کثرت ثواب اور مراتب قرب پر

marfat.com

ہے نہ ان امور پر جو یہی امور مدار فضیلت ہوتے تو یہ لازم آتا کہ حضرت آدمؑ حضرت خاتم النبین سید المرسلین ﷺ سے افضل ہوں۔ کیونکہ آپ فرماتے ہیں "تم اپنے دنیا کے کاموں میں مجھ سے زیادہ واقف ہو" اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضور سرور عالم ﷺ لغات کے عالم نہ تھے میرے نزدیک یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام اسمائے الٰہیہ تعلیم فرما دیئے (اور جو کوئی یہ کہے کہ اسمائے الٰہیہ تو غیر متناہیہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَوْكَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ (یعنی اگر سمندر میرے رب کے کلمات لکھنے کے لئے سیاہی ہو تو تمام سمندر ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں) اور دوسری جگہ فرمایا وَلَوْاَنَّ مَافِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّانَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ پس بشر کا متناہی علم اسماء الٰہیہ کو کس طرح محیط ہو سکتا ہے اور نیز ایک حدیث میں وارد ہے کہ سرور عالم ﷺ نے اپنی ایک دعا میں فرمایا خداوندا میں آپ سے اس نام کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں جس سے آپ نے اپنے ذات پاک کو مسمی فرمایا اور جو نام آپ نے اپنی کتاب میں نازل کئے اور جو نام مخلوق میں سے کسی کو سکھلائے اور ان ناموں کے وسیلہ سے جن کا علم کسی کو نہیں۔ ابن حبان اور حاکم اور ابن ابی شیبہ اور طبرانی اور امام احمد نے حضرت ابن مسعود و ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے یہ حدیث صاف اس کی دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کے بعض اسماء ایسے بھی ہیں جو اسی کو معلوم ہیں اور مخلوق میں کوئی انہیں نہیں جانتا۔ تو جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ حضرت آدم کو تمام اسماء کا علم حاصل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں تمام اسماء کا تفصیلی علم دیا گیا تھا اگر یہ مراد ہوتی تو البتہ اشکال مذکور وارد ہوتا یہاں اجمالی علم مراد ہے کیونکہ جب انہیں ذات پاک کی معیت نصیب ہوگئی تو انہیں حق تعالیٰ کے ہر اسم و صفت سے ایسی معیت اور تامہ مناسبت حاصل ہوگئی کہ جب وہ کسی اسم یا صفت کی طرف متوجہ ہوتے تھے وہ صفت یا اسم ان پر پر تو فگن ہو جاتا تھا جیسا کسی شخص کو کسی علم میں ایسا ملکہ اور استعداد حاصل ہو کہ جب وہ کسی مسئلہ کی طرف توجہ کرے تو فوراً مستحضر ہو جائے۔ اگر کوئی معترض اعتراض کرے کہ مفسرین میں سے کسی نے بھی اس آیت کے یہ معنی بیان نہیں کئے یہ تو محض تمہاری رائے اور قیاس ہے اور قرآن مجید میں اپنی رائے سے کچھ کلام کرنا حرام ہے جیسا کہ علامہ بغویؒ نے باسانید متعددہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کلام کرے اور ایک روایت میں ہے کہ جو بغیر علم کے قرآن میں کچھ کلام کرے اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں ڈھونڈ لے۔ تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ ہمارے شیخ امام نے فرمایا ہے کہ قرآن میں اپنی رائے سے کلام کرنے والے کے بارے میں جو وعید آئی ہے یہ وعید اس کے لئے ہے جو اپنی طرف سے بغیر علم کے قرآن کی تفسیر کرے یعنی مثلاً اپنی طرف سے اسباب نزول اور اس کے متعلق کوئی قصہ بیان کرے تو یہ جملہ امور نقل کے متعلق ہیں جب تک کسی سے نہ سنے اس بارے میں اپنی رائے اور عقل سے کوئی بات کہنی جائز نہیں اور تفسرہ ماخوذ ہے تفسرہ سے اور تفسیرہ کہتے ہیں قارورہ کو جسے طبیب دیکھ کر مرض کا سبب معلوم کرتا ہے اس کے موافق مفسر اسی کو کہا جائے گا جو آیت کا سبب نزول اور قصہ بیان کرے۔ اور تفسیر کے معنی اسباب نزول بیان کرنے کے ہوں گے تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ ممنوع وہ تفسیر ہے جس کے معنی اسباب نزول اور شان نزول بیان کرنے کے ہیں اور تاویل کسی آیت کی ناجائز اور حرام نہیں۔ اور تاویل اسے کہتے ہیں کہ آیت کے کوئی معنی جس کا وہ احتمال رکھتی ہے کہ جو ماقبل و مابعد کے موافق اور کتاب و سنت کے مخالف نہ ہوں بطور استنباط بیان کئے جائیں اہل علم نے اس کی اجازت دی ہے اور تاویل مشتق ہے اول سے جس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے اَوَّلْتُهٗ یعنی صَرَّفْتُهٗ۔

علامہ بغوی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ وَّلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ (یعنی قرآن شریف سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد کے لئے ایک محل اطلاع ہے۔ طبرانی نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو ان لفظوں سے نقل کیا ہے۔ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ لِكُلِّ حَرْفٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ وَّلِكُلِّ حَرْفٍ

marfat.com

حَدٌّ وَلِکُلِّ حَدٍّ مَّطْلَعٌ۔

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے قول لکل حد مطلع میں مطلع کے معنی مقعد یعنی جائے صعود کے ہیں کیونکہ جسے حق تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے وہ اپنے علم کے ذریعہ سے اس پر صعود کرتا ہے (یعنی معانی کے درجات پر اطلاع پاتا ہے) اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ جو آیات میں تدبر و تفکر کرتا ہے حق تعالیٰ اس پر معانی کے وہ ابواب مفتوح فرماتا ہے کہ اور لوگ ان سے محروم رہتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ یعنی جو علم والا ہے اس سے زیادہ اور عالم ہے۔ ختم ہوا کلام امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے کچھ اس آیت کے تحت میں لکھا ہے اگر اس پر غیر منقول ہونے کے سبب اعتراض کیا جاتا ہے تو اس سے پہلے جو اقوال مفسرین کے گزرے ہیں ان میں سے کوئی قول بھی نہ تو مرفوع و منقول ہے اور نہ ایسا ہے جو صرف رائے سے معلوم نہ ہو سکے اگر تصریحاً مرفوع نہ ہوتا اور رائے سے غیر مدرک ہوتا تب بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ یہ تمام اقوال تاویلات ہیں جو ان کے افکار کا نتیجہ ہیں اور اسی لئے ان اقوال میں باہم اختلاف ہے پس اسی طرح یہ تاویل جو میں نے لکھی ہے منجملہ ان ہی تاویلات کے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو فرمایا ہے کہ ہر شئے کا نام سکھا دیا حتیٰ کہ پیالے اور پیالی کا بھی۔ اور نیز یہ جو بعض نے تفسیر کی ہے کہ جو کچھ ہوا اور جو ہونے والا ہے سب کے نام سکھا دیئے اور تمام ذریت کے نام تعلیم فرما دیئے اور بعض نے کہا ہے کہ ہر شئے کا بنانا سکھا دیا تو یہ کل اقوال اسماء الٰہیہ کی تعلیم کے (جو ہم نے توجیہ کی ہے) منافی نہیں بلکہ یہ ایسی توجیہ ہے جو ان سب اقوال اور اس سے زائد کو شامل ہے۔ کیونکہ اسماء الٰہیۃ میں الاول ہے کہ جس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شئے اس سے پہلے نہ تھی اَلْاٰخِرُ یعنی کوئی شئے اس کے بعد نہیں اَلظَّاہِرُ کوئی شئے اس کے اوپر نہیں۔ الباطن کوئی شئے اس کے نیچے نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ممکنات کے نام پر اس لئے اکتفا فرمایا تاکہ عوام کی سمجھ میں آجائے اور تمام اکابر کی یہی شان تھی کہ لوگوں سے ان کی عقل کے موافق کلام کیا کرتے تھے فقط۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ (پھر ان اشیاء کو فرشتوں کے سامنے کیا) مفسرین نے کہا ہے کہ عَرَضَھُمْ میں ضمیر ھُمْ ان اشیاء کی طرف راجع ہے جن کے اسماء حضرت آدم کو تعلیم کئے گئے تھے اور وہ اشیاء اگرچہ پہلے حقیقتاً مذکور نہیں مگر تقدیراً مذکور ہیں کیونکہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کی تقدیر وَعَلَّمَ اٰدَمَ اسماء المسمیات ہے مضاف الیہ یعنی المسمیات حذف کر کے الف و لام تعریف کا اس کے عوض مضاف پر لے آئے جیسا کہ آیت اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا (بھڑک اٹھا سر بڑھاپے سے) میں الراس مضاف محذوف ہے اور ضمیر مذکر کی لانا اس بنا پر ہے کہ مسمیات میں عقلاء بھی شامل ہیں۔ اور جب کہ مراد الاسماء سے اسماء الٰہیہ ہوں جیسا کہ ہم نے لکھا ہے تو ضمیر عَرَضَھُمْ میں حضرت آدم کی طرف راجع ہوگی اور ضمیر جمع کی یا تو تعظیم کے لئے لائی گئی یا آدم سے خود حضرت آدم اور ان کی ذریت مراد لی جائے کیونکہ اکثر ہوتا ہے کہ اولاد کو دادا کے نام سے نامزد کر دیتے ہیں جیسا کہ ربیعہ و مضر کہ یہ نام ان قبیلوں کے جد اعلیٰ کے ہیں۔ اب قبیلہ کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ قاضی بیضاوی نے بھی یہ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فرعون و ملئھم کی تفسیر میں یہی کہا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے نکال کر حضرات انبیاء کو فرشتوں پر پیش کیا اور سب سے عہد لیا اور نیز حضرت محمد ﷺ اور حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، علیہم الصلوٰۃ والسلام سب سے محکم عہد لیا اور یہ توجیہ یعنی عَرَضَھُمْ کی ضمیر حضرت آدم کی طرف راجع کرنا انسب اور اولیٰ ہے کیونکہ مسمیات ضمیر سے پہلے مذکور نہیں اور نیز ضمیر مذکر عقلاء کی ہے تو بغیر کسی تکلیف کے ضمیر مسمیات کی طرف راجع نہیں ہو سکتی اور چونکہ حضرت آدم ضمیر سے پہلے مذکور ہیں اس لئے کچھ تاویل و تکلف کی احتیاج نہیں۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت عَرَضَھَا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عَرَضَھُنَّ ہے اس لئے ان دونوں قرأتوں کے موافق ضمیر اسماء کی طرف راجع ہوگی۔

marfat.com

فَقَالَ (پھر فرمایا) فرشتوں میں خلافت کی صلاحیت نہ ہونے پر ان کو سرزنش کرنے کے لئے فرمایا۔
اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (مجھے ان کے نام بتاؤ) عامۂ مفسرین کی تاویل کے موافق ھٰٓؤُلَآءِ کا مشار الیہ مسمیات ہوں گے۔ اور میری توجیہ پر حضرت آدم اور ان کی ذریت اور اسماء کی اضافت ھٰٓؤُلَآءِ کی طرف ادنیٰ ملابست اور تعلق کی وجہ سے ہوگی اور معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ آدم اور ان کی ذریت کو جو نام ہم نے سکھائے ہیں وہ بتاؤ۔ اس کے بعد معلوم کرنا چاہئے کہ حدیث شریف میں ہے کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس حالت میں نبی تھا کہ جب حضرت آدم روح اور جسم کے درمیان تھے۔ اس حدیث کو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابو نعیم رضی اللہ عنہ نے حلیہ میں اور ابن سعد رضی اللہ عنہ نے ابوالجدعاء سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو جو علوم اور کمال نبوۃ حضور ﷺ کو عطا فرمانے منظور تھے اور وہ تجلیات ذاتیہ جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں سب کی سب اسی وقت عطا فرمادی تھیں۔ جبکہ حضرت آدم مابین روح و جسد تھے یعنی روح جسد کے ساتھ مرکب ہو چکی تھی کیونکہ جو تجلیات خالصہ ہیں وہ اس جسد خاکی کے ساتھ مشروط تھیں تو جب حضرت آدم کا جسد بن گیا اور ان کی ذریت کی روحیں ان کی پشت میں جاگزیں ہو گئی تو وہ سب تجلیات ذاتیہ کے قبول کرنے کے لائق ہو گئے۔
اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۳۱ (اگر تم سچے ہو) یعنی اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ جو ہم مخلوق پیدا کریں گے اس سے تم ہی افضل ہو (جیسا کہ تمہارا خیال ہے) تو ان کے نام بتاؤ۔ قنبل اور ورش نے ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ میں ہمزہ ثانیہ کو یائے ساکنہ سے بدل کر پڑھا ہے اور قالون، بزی ہمزہ اولیٰ کو یاء مکسور سے بدلتے ہیں اور ابو عمرو ہمزہ ثانیہ کو ساقط کر کے پڑھتے ہیں۔ باقی قراء دونوں ہمزہ کو ثابت رکھتے ہیں اور جہاں کہیں دو ہمزہ مکسور دو کلموں میں جمع ہو جائیں وہاں بھی یہی اختلاف ہے۔ ورش سے ایک یہ روایت ہے کہ ھٰٓؤُلَآءِ میں ہمزہ ثانیہ کو خاص اس جگہ اور سورۂ نور میں عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی ہمزہ کو یاء مکسورہ سے بدلتے ہیں اور ان دو مقام کے سوا وہ قنبل کے موافق ہیں اور جب دو ہمزہ مفتوح دو کلموں میں جمع ہو جائیں جیسے جَآءَ اَجَلُهُمْ تو ورش اور قنبل ہمزہ ثانیہ کو مدہ کر لیتے ہیں جیسا کہ وہ مکسورہ کو بھی مدہ کرتے ہیں اور قالون، بزی اور ابو عمرو ہمزہ اولیٰ کو ساقط کر دیتے ہیں۔ باقی قراء دونوں ہمزہ کی تحقیق کرتے ہیں یعنی کسی کو حذف یا بدل نہیں کرتے اور جب دو ہمزہ مضموم دو کلموں میں جمع ہوں اور یہ اجتماع صرف ایک جگہ سورۂ احقاف میں ہوا ہے اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ تو اس ہمزہ کا حکم مثل مکسورہ کے ہے اور ورش اور قنبل دوسری ہمزہ کو واؤ ساکن سے اور قالون، بزی ہمزہ اولیٰ کو واؤ مضموم سے بدلتے ہیں اور ابو عمرو ہمزہ اولیٰ کو ساقط کر دیتے ہیں باقی قراء دونوں کو ثابت رکھتے ہیں۔
قَالُوۡا (بولے) جب فرشتوں کو ثابت ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام ہم سے زیادہ عالم اور افضل ہیں تو اپنے عجز اور بشر کی افضلیت اور استحقاق خلافت کا اقرار کیا اور اس نعمت کا شکر کیا کہ حق تعالیٰ نے ان کے پیدا کرنے کے حکمت ظاہر فرمائی اس لئے ذیل کی آیت کے مضمون کو عجز و زاری اور تضرع کے ساتھ درگاہ الٰہی میں (ادا کیا) بولے۔
سُبۡحٰنَكَ (تو پاک ہے) سبحانک فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اس کی تقدیر نُسَبِّحُکَ سُبْحَانًا ہے اور یہ معنی ہیں کہ خداوند آپ کے افعال، مصلحتوں اور حکمتوں سے خالی ہونے سے بالکل پاک اور منزہ ہیں۔
لَا عِلۡمَ لَنَآ (نہیں ہے ہمیں علم) یعنی ہم آپ کے کسی علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔
اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳۲ (اس کے سوا جو تو نے ہمیں بتا دیا ہے بے شک تو اپنی مخلوق کو جاننے والا اور اپنے امر میں حکمت والا ہے) علیم اور حکیم کے ایک اور معنی بھی ہیں علیم کے معنی حاکم عادل اور حکیم کے معنی اپنے حکم کو محکم اور راست کرنے والا۔ جب فرشتوں نے درگاہ خداوندی میں گزارش کر دی اور یہ بھی انہیں اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ ہم محض عاجز ہیں تو حق تعالیٰ نے ان پر یہ انعام فرمایا کہ جو علم حضرت آدم کو عطا فرمایا تھا وہ ان کے ذریعہ سے فرشتوں کو بھی عطا فرمایا چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

marfat.com

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (فرمایا اے آدم تم فرشتوں کو ان (چیزوں) کے نام بتادو) مفسرین کے قول کے مطابق بِاَسْمَآئِهِمْ میں ضمیر ہم ان اشیاء کی طرف راجع ہے کہ جن کے نام حضرت آدم کو سکھلائے گئے تھے اور جو ہم نے تفسیر لکھی ہے اس کے موافق ملائکہ کی طرف راجع ہوگی اور یہ معنی ہوں گے کہ اے آدم فرشتوں کو ان ناموں کی خبر دو جو وہ سیکھ سکتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ وہ نام بتاؤ جس کا سیکھنا ہم نے ان کے لئے مقدر کیا ہے اور بجائے بِاَسْمَآئِهِمْ کے بِاَسْمَآئِكُمْ (اے آم جو تمہیں نام تعلیم کئے گئے ہیں وہ انہیں بتادو) اس لئے نہیں فرمایا کہ اجمالاً تمام اسماء الٰہیہ کا سیکھنا اس پر موقوف ہے کہ ذات باری تعالیٰ تک رسائی ہو اور یہ رسائی بشر کے ساتھ مخصوص ہے ملائکہ کو میسر نہیں۔

فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ

(سو جب آدم نے فرشتوں کو ان (چیزوں) کے نام بتادیئے تو (خدا نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر) فرمایا کیوں ہم نے تم سے نہ کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں ہمیں معلوم ہیں) یہ جو فرمایا ہم نے تم سے نہ کہا تھا الخ، یہ پہلی آیت اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی طرف اشارہ ہے۔ حرمین اور ابو عمرو نے اِنِّیْٓ کو یاء کے فتح سے پڑھا ہے اور اسی طرح ہر یاء اضافہ کو کہ اس کے بعد الف قطع مفتوح ہو فتحہ دیتے ہیں مگر چند حروف جو اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں انہیں ہم ان کے محل پر ذکر کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔ باقی قراء اس یاء کو سوائے چند جگہ کے فتح نہیں دیتے۔ ان مقامات کو بھی ہم ان کی جگہ پر ذکر کریں گے انشاء اللہ۔

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ (اور میں وہ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو) حسن رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ میں مَا تُبْدُوْنَ سے مراد مضمون آیت تَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ہے اور

وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۳۳ (جو تم چھپاتے تھے) سے مراد فرشتوں کا وہ قول ہے جو آپس میں چپکے چپکے کہا تھا کہ خدا تعالیٰ ہم سے زیادہ بزرگ کوئی خلق پیدا نہ کرے گا۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت آدمؑ کا جسد جب مکہ اور طائف کے درمیان پڑا تھا ابلیس ادھر سے گزرا اور کہا اس کو کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ پھر اس میں منہ کی راہ سے داخل ہو کر پیچھے کو نکل گیا اور کہا یہ مخلوق اپنے آپ کو کسی شئے سے بچانہ سکے گی کیونکہ یہ اندر سے بالکل خالی اور کھوکھلا ہے پھر اور فرشتے جو اس کے ساتھ تھے ان سے کہا اگر اس کو تم سے افضل بنایا گیا اور تم کو اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تو بولو کیا کرو گے سب نے ایک زبان ہو کر کہا ہم اپنے رب جلیل کی اطاعت کریں گے۔ ابلیس نے اپنے دل میں کہا خدا کی قسم اگر میں اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے تباہ کر کے رہوں گا اور جو یہ مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں اس کی نہ مانوں گا اور سرکشی و سرتابی کے سوا اور کچھ نہ کروں گا۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ یعنی فرشتوں نے جو ہماری اطاعت ظاہر کی اسے ہم جانتے ہیں اور شیطان نے جو سرکشی اور معصیت اپنے جی میں چھپا رکھی اس سے بھی ہم واقف ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی نکلتا ہے کہ انبیاء جو انسانوں میں سب سے افضل و خاص بندے ہیں۔ وہ خاص اور افضل فرشتوں سے بھی افضل و اعلیٰ ہے۔ اور فرشتوں میں افضل وہ ہیں جو انبیاء کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے قاصد بن کر پیام رسانی کرتے ہیں اہل سنت کا مذہب بھی یہی ہے اور یہ جو علماء نے کہا ہے کہ عوام بشر یعنی اولیاء، متقی اور صالح عام ملائکہ سے افضل ہیں سو یہ امر قرآن سے ثابت نہیں ہاں حدیثوں سے ثابت ہے چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن اللہ کے نزدیک بعض فرشتوں سے افضل ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی ذریت کو پیدا کیا تو ملائکہ نے عرض کیا اے رب کریم یہ تیرے بندے کھاتے پیتے، نکاح کرتے اور سوار ہوتے ہیں اور ہم سب کے سب ان تمام چیزوں سے بالکل پاک صاف ہیں تو انہیں دنیا کے ساتھ مخصوص کر دے اور ہمیں آخرت عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بھلا جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور اپنی روح کو اس میں پھونکا تو اس مخلوق کی طرح ایسی مخلوق کو کس طرح کر دوں گا جو میرے کن کے کہتے ہی فوراً پیدا ہو گئی۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ جنت میں بنی آدم اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے مشرف ہوں گے اور فرشتے اس دولت عظمیٰ اور غنیمت کبریٰ

marfat.com

سے محروم رہیں گے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بشر ملائکہ سے افضل ہیں اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت تو جنت میں اولیاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس رؤیت سے تو تمام مؤمنین مشرف ہوں گے البتہ درجوں کے تفاوت سے رؤیت میں تفاوت ہوگا۔ چنانچہ بعض کو تو صبح و شام رؤیت نصیب ہوگی اور بعض کو ہر جمعہ اور بعض کو ہر برس اور بعض کو اس سے زیادہ مدت میں تو اس سے عوام ملائکہ پر تمام مومنین کی افضلیت لازم آتی ہے خواہ وہ فاسق ہی ہوں کیونکہ سب مؤمن خواہ فاسق و فاجر ہوں یا مطیع و فرمانبردار عذاب بھگتنے کے بعد آخر کار جنت میں جائیں گے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ، یعنی جو ذرہ برابر بھی عمل کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے اور اس کے جی میں گیہوں کے دانہ برابر خیر ہو یا فرمایا ایمان ہو تو وہ آگ سے نجات پا جائے گا۔ اور فرمایا جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے اور اس کے دل میں ایک ذرہ برابر خیر ہو یا فرمایا ایمان ہو تو وہ جہنم سے خلاصی پا جائے گا۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جو شخص لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے اور پھر اسی پر اس کی موت آجائے تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا اگرچہ زنا اور چوری کرے خواہ ابوذر ناراض ہی ہو ضرور جنت میں جائے گا۔ اس کو مسلم نے حضرت ابوذر سے روایت کیا۔ اور ظاہر ہے کہ فاسق کا معصوم سے افضل ہونا نہ تو عقلاً جائز ہے، اور نہ شرعاً چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ کیا ہم (اپنے) فرمانبردار بندوں کو گناہ گاروں کی برابر کردیں گے! تو میں اس اشکال کے جواب میں کہتا ہوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ فساق عقاب و سزا کے بعد مغفرت پا کر جنت میں جائیں گے اور وہ عذاب یا تو دنیا کی مصیبتوں میں سے ہوگا یا عذاب قبر یا دوزخ میں یا توبہ کرلیں گے تو بلا عقاب چلے جائیں گے اور بعض کو محض فضل باری تعالیٰ شامل حال ہوگا نہ توبہ کریں گے نہ عقاب ہوگا اور جب مغفرت ہوگئی تو نہ فسق رہے گا نہ معصیت بلکہ اولیاء اور متقی اور صلحاء میں جا ملیں گے اگرچہ اولیاء کرام باعتبار مراتب ان سے زیادہ ہوں تو اب مغفرت کے بعد نہ کوئی معصیت رہے گی نہ فسق۔ لہٰذا کوئی اشکال ان کی افضلیت میں نہیں واللہ اعلم۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم اور کمالات ترقی پذیر ہیں اور وہ بشر سے کسب کمالات کرسکتے ہیں اور جو کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ہم میں سے (یعنی فرشتوں میں سے) ہر ایک کا ایک درجہ اور مقام معین ہے) اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے ایک مقام سے دوسرے مقام تک ترقی نہیں کرتے جو جس کا مقام ہے وہیں رہتا ہے تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ مقام اسماء اور صفات سے آگے مقام ذات تک ترقی نہیں کرسکتے بخلاف بشر کے کہ وہ مقام محرومی سے مقام ظلال تک اور وہاں سے صفات اور اسماء اور شؤنات اور پھر مقام ذات تک ترقی کرسکتا ہے۔ اس ذیل میں بہت سے درجات اور اعتبارات ہیں کہ ان کی تفصیل کی یہ مقام گنجائش نہیں رکھتا اور نہ زبان کو قوت کہ اسے بیان کرسکے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو) ابو جعفر نے لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا میں مَلٰٓئِكَه کی تا کو اُسجُدُوا کے ہمزۂ وصل کا ضمہ دے کر مضموم پڑھا ہے اور اسی طرح قٰلَ رَبِّ احْكُمْ میں رب کی با کو مضموم پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرِ باء سے پڑھا ہے سجود کے معنی لغت میں تذلل یعنی فروتنی کے ہیں اور اصطلاح شرع میں سجود کے معنی عبادت کے قصد سے زمین پر پیشانی رکھنے کے ہیں۔ فرشتوں کو جس سجدہ کا حکم ہوا تھا یا تو اس سے مراد سجدہ شرعیہ ہے تو اس وقت حقیقت میں خدا تعالیٰ مسجود ہوگا اور حضرت آدم کو محض عزت بڑھانے اور ان کی افضلیت کا اقرار کرانے کے لئے قبلہ بنادیا گیا تھا۔ امام احمد اور مسلم کی ایک حدیث جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے شرعی معنی مراد ہونے پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جب ابن آدم سجدہ کی آیت پڑھتا ہے اور سجدہ کرتا ہے تو شیطان ایک گوشہ میں الگ جا کر روتا اور کہتا ہے کہ افسوس ابن آدم کو سجدہ کا حکم کیا گیا تو اس نے سجدہ کرکے جنت لے لی اور مجھے سجدہ کا حکم کیا گیا تو میں نے نافرمانی کی اور حکم نہ مانا میں جہنم میں جاؤں گا۔ اس تقدیر پر لِاٰدَمَ میں لام الیٰ کے معنی میں ہوگا اور یہ معنی ہوں گے کہ آدم کی طرف متوجہ ہو کر ہمیں سجدہ کرو جیسا کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے شعر میں جو جناب صدیق

marfat.com

اکبر رضی اللہ عنہ کی مدح میں ہے لام الیٰ کے معنی میں ہے شعر یہ ہے۔

اَلَیْسَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰی لِقِبْلَتِکُمْ وَاَعْرَفَ النَّاسِ بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَنِ

کیا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں جو قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتے ہیں سب سے اول نہیں اور کیا وہ سب سے زیادہ قرآن اور حدیث سے واقف نہیں (یعنی ضرور ہیں) اس شعر میں لِقِبْلَتِکُمْ میں لام قطعاً بمعنی الی ہے۔ اور یا یہ کہا جائے کہ فرشتوں سے چونکہ بظاہر آدم کے پیدا کرنے پر ایک اعتراض صادر ہوا تھا اس لئے بطور توبہ کے ایک سجدہ ان کے ذمہ واجب ہوا تو اس سجدہ کا سبب بعید حضرت آدم ہوئے اس لئے لِاٰدم فرمایا تو اب آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ حضرت آدم کی وجہ سے ہمیں سجدہ کرو اس تقدیر پر لام لِاٰدم میں سببیت کا ہو گا جیسا کہ صَلِّ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ (نماز پڑھ سورج ڈھلنے کے سبب) میں لام سببیت کا ہے۔ یا سجدہ لغویہ مراد ہے یعنی حضرت آدم کے سامنے تحیہ اور تعظیم کے طور پر تذلل اور تواضع کرنا مراد لیا جائے جیسا کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں سجدہ تحیتہ کیا تھا۔ علامہ بغوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ قول صحیح تر ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اس سجدہ میں فرشتوں نے زمین پر پیشانی نہیں رکھی بلکہ آدم علیہ السلام کے سامنے تعظیم کے لئے جھک گئے تھے اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام بھیجا تو اسے بھی باطل و منسوخ کر کے بجائے اس کے سلام مقرر فرما دیا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت آدم کی تعظیم کا جو حکم دیا گیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدم نے جو انہیں اسماء الٰہیہ تعلیم فرمائے تو بطور شکر اور ادائے حق انہیں آدم کی تعظیم کا حکم ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے آدمی کی شکر گزاری نہیں کی اس نے اللہ کا بھی شکر نہیں کیا۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

فَسَجَدُوْٓا (سب نے سجدہ کیا) یعنی ملائکہ نے سب کے سب نے۔

اِلَّآ اِبْلِیْسَ (سوا ابلیس کے) یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا ورنہ استثناء صحیح نہ ہو گا۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو ہم پہلے لکھ آئے ہیں وہ بھی اس کی موید ہے اور اس سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ تمام فرشتے معصوم نہیں ہوتے بلکہ اکثر ان میں معصوم ہیں جیسا کہ آدمیوں میں بعض معصوم اور اکثر غیر معصوم ہیں بعض نے کہا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا ملائکہ میں پیدا ہوا اور ہزاروں برس ان میں رہا اس لئے تغلیباً اس پر بھی ملک کا اطلاق کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرشتوں کے ساتھ جنوں کو بھی سجدہ کا حکم ہوا تھا لیکن صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفا فرمایا کہ جب بڑوں کو سجدہ کا حکم ہوا تو چھوٹے کس شمار میں ہیں انہیں تو سجدہ کا حکم ہونا بغیر ذکر کے خود سمجھا جاتا تھا اس لئے انہیں صراحت کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کی بعض قسم ایسی ہو کہ شیاطین اور ان کی جنس ایک ہو اور اختلاف عوارض کی وجہ سے ہو۔ اگر اس پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے اور جن خالص آگ سے اور آدم اس شئے سے جو تمہیں بتائی گئی (یعنی مٹی سے) تو یہ حدیث صاف اس پر دلالت کرتی ہے کہ ملائکہ اور جن مختلف الجنس ہیں نہ متحد الجنس تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس حدیث میں جنوں کی ایک خاص قسم کا بیان ہے کہ ان کی اور فرشتوں کی حقیقت بالکل مختلف ہے کہ وہ مذکر و مؤنث اور صفت توالد سے موصوف نہیں ہوتے یا یہ تاویل کی جاوے کہ نور اور آگ ایک جنس ہے۔ فرق دونوں میں صرف اتنا ہے کہ نور میں شستگی و صفائی بہ نسبت نار کے زیادہ ہوتی ہے اور آیت وَ جَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (اور ٹھہرا لیا ہے کفار نے جنوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان نسب اور رشتہ کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جن اور ملائکہ کی ایک حقیقت ہے۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال۔

اَبٰی (اس نے انکار کیا) یعنی سجدہ کرنے سے رکا

وَاسْتَکْبَرَ (اور بڑا بنا) یعنی اس بات سے بڑائی ظاہر کی کہ آدم کی تعظیم کرے یا انہیں حق تعالیٰ کی عبادت کا ذریعہ بنائے۔

marfat.com

وَكَانَ (اور تھا) یعنی اللہ کے علم میں اول سے کافر تھا یا یہ معنی کہ اب ہو گیا۔
مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴ (کافروں میں سے) اور ترک واجب کی وجہ سے کافر نہیں ہوا کیونکہ ترک واجب کفر نہیں۔ بلکہ حق تعالیٰ نے جو اسے حضرت آدم کے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے اس حکم کو قبیح سمجھا اور استخفاف کیا اور اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھا چنانچہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (یعنی میں اس سے بہتر ہوں بول اٹھا اس لئے کافر ہوا۔
وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں بسو) بغوی نے فرمایا ہے کہ جنت میں حضرت آدم کا کوئی ہم جنس نہ تھا (اس لئے اکثر ان کی طبیعت ہم جنس نہ ہونے کے سبب گھبرا لیا کرتی تھی) ایک دن وہ سو رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں جانب سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا کیا جب سو کر اٹھے تو دیکھا کہ سر کے قریب ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ حضرت آدم نے پوچھا تو کون ہے انہوں نے جواب دیا میں حوا آپ کی بیوی ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ آپ کو میری وجہ سے آرام ہو اور مجھے آپ کی وجہ سے چین ہو۔ اللہ نے صرف آدم کو خطاب فرمایا اور اول سے دونوں کو خطاب نہ فرمایا اس لئے کہ حضرت آدم ہی کو امر فرمانا مقصود تھا اور حوا ان کی تابع تھیں۔
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا (اور اس میں سے بافراغت کھاؤ)۔
حَيْثُ شِئْتُمَا (جہاں کہیں سے تمہارا جی چاہے)۔
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵ اور اس درخت کی پاس نہ پھٹکنا (اگر ایسا کرو گے) تو اپنی جانوں کو نقصان دینے والوں میں سے ہو گے) حکم میں قوت پیدا کرنے کے لئے درخت کے پاس جانے سے منع فرمایا ورنہ مقصود اس کے کھانے سے منع کرنا تھا اور نیز اس لئے منع فرمایا کہ کسی شئے کے پاس جانے سے اس کی طرف خواہش اور رغبت ہوتی ہے اور فرط خواہش میں حکم شرع بھی یاد نہیں رہتا۔ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ جو چیز معصیت کے قریب کرنے والی ہے وہ مکروہ ہے۔ اور شجر کے بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا وہ کونسا شجر (درخت) تھا حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم تو یہ کہتے ہیں کہ وہ گیہوں کی بال تھی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انگور تھا۔ ابن جریج کہتے ہیں انجیر تھا اور علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کافور تھا۔ بعض کا قول ہے کہ مراد شجرۃ العلم ہے اس میں بھی اختلاف ہے کہ شجر سے مراد جنس شجر ہے یا شجرہ مخصوص۔ ظالمین کے معنی اپنی جانوں کو ضرر دینے والے کے ہیں ظلم کے اصل معنی کسی شئے کو بے موقع رکھنے کے ہیں۔
فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا (پھر پھسلا دیا شیطان نے انہیں وہاں سے) عنہا میں ضمیر ہا یا تو شجرہ کی طرف راجع ہے اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ شیطان نے آدم و حوا کو اس درخت کے کھانے کے سبب رستہ سے ڈگمگا دیا اور یا جنت کی طرف راجع ہے اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ شیطان نے انہیں جنت سے دور کر دیا اور اس اخیر معنے کی مؤید حمزہ کی قرائت فَاَزَالَهُمَا ہے جس کے معنی ہیں دور کیا ان دونوں کو۔ شیطان شطن بمعنی بعد (دوری) سے مشتق ہے کیونکہ شیطان بھی خیر اور رحمت سے دور اور پرے ہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ جب شیطان بارگاہ خداوندی سے ملعون اور راندہ درگاہ ہوا اور اسے نکل جانے کا حکم ہوا تو پھر کس طریق سے اسے آدم تک رسائی ہوئی کیونکہ وہ تو جنت میں تھے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ابلیس نے آدم و حوا کو بہکانے کے لئے جنت میں جانے کا ارادہ کیا تو اسے جنت کے نگہبانوں نے روکا تو اس کے پاس سانپ آیا چونکہ ابلیس کی پہلے سے اس کے ساتھ دوستی تھی اور یہ سانپ کل جانوروں سے زیادہ خوبصورت تھا اس کے چاروں پاؤں مثل اونٹ کے تھے اور یہ بھی جنت کا محافظ تھا ابلیس نے کہا تو مجھے اپنے منہ میں رکھ کر جنت میں پہنچا دے اس نے قبول کیا اور منہ میں لے کر چلا جب جنت کے اور محافظ ملے تو انہیں کچھ خبر نہ ہوئی کہ ابلیس اس کے منہ میں بیٹھا ہے یہ اس طریق سے جنت میں چلا گیا۔

marfat.com

ابن جریر نے ابن مسعود، ابن عباس، ابوالعالیہ، وہب بن منبہؒ اور محمد بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی اسی روایت کے موافق روایت کیا ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ آدم و حوا اکثر جنت کے دروازے پر آیا کرتے تھے ایک روز جو وہ معمول کے موافق آئے تو شیطان نے انہیں بہکا دیا۔

علامہ بغوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب حضرت آدم جنت میں گئے تو بولے کیا خوب ہو جو ہمیشہ اس میں رہا کریں پھر جبکہ شیطان جنت میں آدم و حوا کے پاس جا کھڑا ہوا تو انہیں خبر نہ تھی کہ یہ ابلیس ہے (یہ بات سنتے ہی) بے اختیار زار و قطار رونے لگا اور اتنا رویا اور نوحہ کیا کہ ان دونوں پر بھی رقت طاری ہوگئی (سب سے پہلے نوحہ کرنے والا ابلیس ہے) جب آدم و حوا نے اس کے نوحہ وزاری کو دیکھا تو بولے کیوں روتا ہے۔ ابلیس نے کہا مجھے تمہارے ہی اوپر رونا آتا ہے کہ اب تم دونوں مرو گے اور جنت کی نعمتیں تم سے چھوٹ جائیں گے یہ خبر وحشت اثر سن کر آدم و حوا کو بھی اثر ہوا اور دونوں کے دونوں غمزدہ ہو گئے جب ابلیس لعین نے دیکھا کہ میرا جادو اثر کر گیا تو چارہ گری کے لہجے میں کہنے لگا کہ خیر جو مقدر میں ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا لیکن اب میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فلاں درخت کھانے سے ہمیشہ کی زندگی نصیب ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم نے انکار کیا اور کہا کہ میں اس درخت کو کبھی نہ کھاؤں گا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے ہاتھ سے شکار نکلا تو بولا خدا کی قسم میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ آدم و حوا اس لعین کی باتوں میں آکر دھوکہ کھا گئے اور خیال کیا کہ بھلا ایسا کون ہے جو خدا کی جھوٹی قسم کھائے (آخر کار) پہلے تو حضرت حوا نے پیش قدمی کی اور جا کر اسے کھا لیا پھر حضرت آدم نے کھایا۔ سعید بن المسیبؒ خدا کی قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت آدم نے ہوش و حواس میں نہیں کھایا بلکہ حوا نے انہیں شراب پلا دی تھی جبکہ خود نشہ میں مست ہو گئے تو حوا انہیں کھینچ کر اس درخت کے پاس لے گئیں انہوں نے کھا لیا۔

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ (پس نکلوا دیا دونوں کو اس (آرام) سے کہ جس میں تھے)

ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے فرمایا آدم! جو نعمتیں ہم نے تمہارے لئے جنت میں جائز اور مباح کر دی تھیں کیا وہ کافی نہ تھیں جو یہ تم نے کھایا۔ آدم نے عرض کیا خداوندا جنت کی نعمتیں بے شک میرے لئے بہت تھیں مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ کوئی تیرے نام کی جھوٹی قسم بھی کھاتا ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا آدم تم نے یہ فعل کیوں کیا۔ انہوں نے عرض کیا الٰہ العالمین حوا نے ایسی باتیں بنائیں کہ وہ درخت مجھے بھلا معلوم ہوا۔ جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ میں اس پر عذاب مسلط کروں گا۔ یعنی حمل میں تکلیف ہوگی اور پھر وضع حمل کے وقت دکھ اور تکلیف اور رنج علیحدہ اور ہر مہینے جو خون آیا کرے گا وہ جدا۔ یہ سن کر حوا رونے لگیں حکم ہوا کہ تجھ پر اور تیری سب بیٹیوں پر رونا مسلط کیا گیا۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا (اور ہم نے حکم دیا کہ تم سب اتر جاؤ)۔

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ (تم ایک دوسرے کے دشمن ہو) بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ حال ہے ضمیر کی وجہ سے واو حالیہ کی ضرورت نہ رہی۔ علامہ بغوی رحمتہ اللہ علیہ نے عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہی ہے کہ نبی ﷺ سانپوں کے مار ڈالنے کا حکم فرمایا کرتے تھے اور فرمایا ہے جو انہیں خوف کی وجہ سے چھوڑ دے اور نہ مارے وہ ہم میں سے نہیں۔ ایک روایت میں ہے جب سے ہماری ان کی (یعنی سانپوں کی) لڑائی ہوئی پھر صلح نہیں ہوئی۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ میں جنوں کی ایک قوم مسلمان ہوگئی ہے اگر تم کہیں سانپ دیکھو تو (اسی وقت نہ مارو ممکن ہے کہ کوئی ان جنوں میں سے ہو) اول اسے تین بار مہلت دو پھر اگر دل چاہے تو مار ڈالو کیونکہ وہ شیطان ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ (اور تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے) مستقر موضع قرار ہے۔

وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ اور نفع مند ہونا ہے ایک مدت تک (یعنی موت

marfat.com

کے آنے تک) پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے (معذرت کے) چند کلمے۔
ابن کثیر نے فَتَلَقّٰٓی اٰدَمَ میں آدم کو منصوب اور کَلِمٰتٍ کو مرفوع پڑھا ہے اس قرائت پر یہ معنی ہوں گے کہ آدم کے پاس ان کے رب کی طرف سے کلمات آئے اور یہ کلمات حضرت آدم کی توبہ قبول ہونے کے سبب تھے۔ باقی اور قاریوں نے آدم کو مرفوع اور کلمات کو منصوب پڑھا ہے اس تقدیر پر تلقی کے معنی سیکھ لئے ہوں گے اور وہ کلمات یہ ہیں رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور برباد ہو جائیں گے) بعض نے کہا ہے کہ وہ کلمات یہ نہ تھے بلکہ اور کلمات استغفار و زاری کے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آدم و حوا دو سو برس روئے اور چالیس روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ حضرت آدم سو برس تک حوا کے پاس نہ آئے۔ یونس بن حباب اور علقمہ بن مرثد فرماتے ہیں کہ اگر سارے زمین والوں کے آنسو جمع کئے جائیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کے آنسو ان سے زیادہ ہوں گے اور اگر حضرت داؤد اور زمین والوں کے آنسو جمع کئے جائیں تو حضرت آدم کے آنسو بڑھ جائیں گے۔ شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آدم نے گناہ کی شرمندگی سے تین سو برس تک سر نہیں اٹھایا۔

فَتَابَ عَلَيْهِ (تو اللہ ان پر متوجہ ہوا) یعنی پھر آدم کی توبہ قبول کرلی۔
توبہ گناہ کا اقرار کرنے اور اس پر نادم و شرمندہ ہونے اور آئندہ ایسا کام نہ کرنے کا عزم مصمم کرنے کو کہتے ہیں۔ صرف حضرت آدم کی توبہ قبول ہونے کو اس لئے ذکر فرمایا کہ حضرت حوا تبعاً مذکور ہو گئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں عورتوں کا ذکر نہیں کیا گیا (تبعاً مردوں کے ساتھ عورتیں مذکور ہو گئیں۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ (بے شک وہی توجہ فرمانے والا) یعنی بندوں پر مغفرت کے ساتھ رجوع کرنے والا اور متوجہ ہونے والا ہے۔ توبہ کے اصل معنی لغت میں رجوع کے ہیں۔ اگر بندہ کی طرف منسوب کریں تو گناہ سے پھرنا اور باز رہنا مراد ہوگا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کریں تو عذاب کرنے سے اعراض فرمانا اور مغفرت کی طرف توجہ فرمانا مقصود ہوگا۔

الرَّحِيْمُ ۝۳۷ (بہت بڑا مہربان ہے) مبالغہ کا صیغہ ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ (ہم نے حکم دیا کہ تم سب کے سب یہاں سے اتر جاؤ) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلی آیت میں جو اترنا مذکور ہے۔ تو وہ جنت سے آسمان پر تھا اور اس آیت میں جو مذکور ہے وہ آسمان سے زمین پر اترنا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ دوسری مرتبہ یا تو تاکید کے لئے ذکر فرمایا ہے یا اختلاف مقصود کی وجہ سے کیونکہ اول تو بطور عقاب و عذاب اور دوسری دفعہ حکم تکلیفی دینے کے طریق پر ارشاد فرمایا۔ جمیعاً ترکیب میں حال ہے اور معنی کے اعتبار سے پہلے مضمون کی تاکید ہے سو یہ اس کو مقتضی نہیں کہ انہیں جمع ہی ہو کر اترنے کا حکم ہو۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى (پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آوے) فا عطف کے لئے ہے۔ ان حرف شرط اور ما زائد ہے۔ ان کی تاکید کے لئے بڑھا دیا گیا ہے اور اسی بناء پر یاتی فعل پر نون تاکید لانا صحیح ہو گیا ورنہ اس میں طلب کے معنی نہیں اور نون تاکید ایسے ہی افعال میں آتا ہے جن میں طلب کے معنی ہوں۔ هدی سے مراد رسول ﷺ اور کتاب ہے اور خطاب اولاد آدم کو ہے (جو آدم کی پشت میں موجود تھی)۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ (تو جو میری ہدایت پر چلیں گے) من حرف شرط ہے اور شرط ثانی یعنی مَنْ تَبِعَ اپنی جزا سے مل کر جزاء شرط اول (فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى) کی ہے اس کلام سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہدایت کے آنے میں شک اور احتمال ہے تو اس طرز سے بیان فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اور کتاب کا بھیجنا عقلاً واجب نہیں بلکہ ممکن ہے۔ کسائی نے هُدَایَ، مَثْوَایَ، مَحْيَایَ کو جہاں کہیں بھی واقع ہوں امالہ سے پڑھا ہے اور رؤیاک کو صرف سورۂ یوسف کے اول میں امالہ

marfat.com

سے پڑھا ہے اور ابو عمرو اور ورش نے خاص ر، ویاک کو بین بین پڑھا ہے۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ نے لفظ ھدی کو مکرر ذکر فرمایا اور پہلے ھدی کی طرف ضمیر راجع نہ فرمائی اس کی وجہ یہ ہی کہ اول مقام پر تو ھدی سے مراد عام معنی ہیں اور دوسری جگہ خاص اور وہ یہ ہے کہ جو ہدایت رسول لائے ہیں اور جسے عقل مقتضی ہے تو اس کے موافق یہ معنی ہوں گے کہ جو میری ہدایت کا اتباع اس طرح پر کرے کہ جس امر پر عقل گواہی دیتی ہے اس کی بھی اس میں رعایت رکھے۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ (انہیں نہ کچھ ڈر ہوگا)۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۳۸ اور نہ وہ کبھی غمگین ہوں گے) یعنی جس امر سے انہیں خوف ہوگا وہ اس خوف سے غمگین نہ ہوں گے مطلب یہ کہ خوف ہی نہ ہوگا کیونکہ خوف تو ایسے امر پر ہوتا ہے جو آئندہ ہونے والا ہو اور حزن ایسے امر پر ہوتا ہے جو واقعہ ہو چکا ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ آخرت میں تکلیف دہ امر کا انہیں خوف نہ ہوگا اور نہ کسی محبوب شئے کے فوت ہونے کا غم۔ گویا بطور مبالغہ عذاب کی نفی فرمائی ہے اور ثواب ثابت کیا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا (اور جو نافرمانی کریں گے) مَنْ تَبِعَ پر عطف ہے گویا یہ ارشاد ہے جو ہماری ہدایت کو نہ مانے بلکہ کفر کرے۔

وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اور ہماری آیتوں (قرآن وغیرہ کتب) کو جھٹلائیں گے۔

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ (وہی دوزخی ہوں گے) قیامت میں۔

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۳۹ (وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) یعنی اس میں رہیں گے نہ نکلیں گے نہ مریں گے۔ اس قصہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جنت پیدا کر دی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اوپر کی جانب ہے۔ تیسرے یہ کہ کافروں کو ہمیشہ ہمیشہ عذاب ہوگا۔ کبھی نجات نہ پائیں گے۔ فرقۂ حشویہ نے اس قصہ سے یہ نکالا ہے کہ حضرات انبیاء معصوم نہ تھے۔ کہتے ہیں کہ دیکھو حضرت آدم باوجود یہ کہ نبی تھے مگر پھر ایک امر ممنوع کے مرتکب ہوئے ہمارے علماء نے ان کو مختلف طور سے جواب دیئے ہیں۔ (رکوع ۴)

(۱) جب یہ واقعہ ہوا اس وقت وہ نبی نہ ہوئے تھے اور جو اس کا مدعی ہے اسے دلیل لانی چاہئے (۲) یہ کہ وہ نہی تنزیہی تھی اور ظالم و خاسر اپنے آپ کو اس لئے کہا (اگرچہ ظالم و خاسر کا اطلاق مرتکب کبیرہ پر آتا ہے) کہ انہوں نے ایک ادنیٰ و افضل کے ترک سے اپنے نفس کو ظلم و خسران میں ڈالا (۳) انہوں نے بھول کر کھایا تھا نہ قصداً و ارادۃً چنانچہ خدا تعالیٰ خود اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا یعنی پس آدم بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ نہ پایا) اور یہ بھولنا اس طرح واقع ہوا کہ جب ابلیس لعین نے باتیں بنائیں اور قسمیں کھائیں تو اس کے کہنے سننے اور قسمیں کھانے سے حضرت آدم کا میلان اس درخت کی طرف ہوا مگر انہوں نے اپنے نفس کو اللہ کے حکم کی وجہ سے روک لیا اس کے بعد شراب پی اور نشہ چڑھا تو کچھ یاد نہ رہا اور میل طبعی جوش زن ہوا اور کھالیا۔ اب رہی یہ بات کہ جب بھولے سے یہ فعل کیا تو معتوب کیوں ہوئے تو اس کی وجہ یہ ہی کہ عتاب اس بات پر ہوا کہ ایسے امور کے مرتکب کیوں ہوئے جس سے یہ آفت بھولنے کی پیش آئی، ہوشیار کیوں نہ رہے اور ممکن ہے کہ بھولنا امت سے تو معاف کر دیا گیا ہو اور انبیاء سے بوجہ ان کے مقرب اور معزز ہونے کے معاف نہ کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خطا و نسیان صرف امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ سے معاف کیا گیا ہو، یہ مسئلہ عنقریب سورت کے آخر میں مفصل طور سے آئے گا (۴) اجتہاد میں خطا واقع ہوئی تھی تحریم کو نہی تنزیہ سمجھ گئے۔ یا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ سے خاص معین درخت سمجھے اور اس قسم کے دوسرے درخت سے کھالیا حالانکہ مراد خداوندی یہ تھی کہ اس قسم کا جو بھی درخت ہو اسے نہ کھاؤ۔ رہا عتاب تو وہ بطور مواخذہ نہیں ہوا بلکہ بطور سببیت کے ہوا۔ جیسا کہ کوئی بھولے سے زہر کھالے تو وہ اس کے اثر سے ضرور مرے گا۔

شروع سورت سے یہاں تک حق تعالیٰ نے توحید اور رسالت ہی کے دلائل بیان فرمائے ہیں اور کسی خاص قوم کی طرف خطاب کر کے نہیں فرمایا بلکہ عام طور سے سب کو مخاطب بنایا۔ اور جو نعمتیں تمام نبی آدم کو شامل اور عام تھیں وہ سب بیان

marfat.com

فرمائیں اب عنان خطاب خاص گروہ بنی اسرائیل کی طرف منعطف فرماتے ہیں اور منجملہ دیگر قبائل اور گروہوں کے انہیں اس لئے خطاب فرمایا کہ یہ سورت مدنی ہے۔ مدینہ میں بنی اسرائیل کثرت سے تھے اور ان لوگوں میں اکثر اہل علم بھی تھے اور ان کی بہ نسبت دوسری قوموں کا اتنا غلبہ بھی نہ تھا اور نیز دوسرے لوگ بے چارے اُمّی اور کم سمجھ تھے اس لئے مناسب ہوا کہ انہیں اسلام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ تاکہ اور لوگ بھی ان کی تقلید سے راہ حق پر آجائیں اور ان کا اتباع اوروں کے لئے حجت بن جائے اس لئے ارشاد ہوتا ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (اے اسرائیل کی اولاد) بنی اصل میں بنین تھا نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ بنین ابن کی جمع ہے اور ابن۔ بناء سے مشتق ہے جس کے معنی بنا اور تعمیر کرنے کے ہیں کیونکہ ابن (پسر) بھی باپ کا بنا کیا ہوا ہوتا ہے۔ (یعنی باپ ایک ظاہری سبب اس کی بنا کا بن جاتا ہے) اسرائیل حضرت یعقوب کا لقب ہے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں عبد اللہ (اللہ کا بندہ) اسرا بمعنی عبد اور ایل بمعنی اللہ۔ بعض نے کہا ہے کہ اسرائیل کے معنی ہیں صفوۃ اللہ (اللہ کا برگزیدہ) ابو جعفر نے اسرائیل کو بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔

اذۡکُرُوۡا (یاد کرو) ذکر اصل میں دل سے یاد کرنے کو کہتے ہیں اور جو زبان سے یاد ہو اسے بھی اس وجہ سے ذکر کہہ دیتے ہیں کہ زبان سے یاد کرنا دل سے یاد کرنے کی دلیل ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اذکروا کے معنی ہیں شکر کرو کیونکہ شکر میں یہی نعمت کا ذکر ہوتا ہے۔ حسن فرماتے ہیں کہ نعمت کا ذکر کرنا ہی شکر ہے۔

نِعۡمَتِیَ (میرے احسان) لفظ نعمت لفظاً بصیغہ واحد ہے مگر اس کے معنی جمع کے ہیں کیونکہ نعمت ایک نہ تھی بلکہ غیر متناہی نعمتیں تھیں۔

الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ (جو میں نے تم پر کئے) خاص انہیں نعمتوں کے یاد کرنے کا امر اور حکم فرمانا کہ جو انہیں دی گئی تھیں اس بناء پر ہے کہ یہ یاد رضا و شکر اور اطاعت نبوی کا باعث ہو کیونکہ جو نعمت اپنے پر ہوا کرتی ہے وہی موجب شکر و اطاعت ہوا کرتی ہے اور غیروں کی نعمت و خوشحالی بعض اوقات حسد اور غیرت کا سبب بن جاتی ہے چہ جائے کہ شکر اور اطاعت کا سبب بنے (اس میں اختلاف ہے کہ وہ کون کون سی نعمتیں ہیں جنہیں بنی اسرائیل کو یاد کرنے کا حکم ہوا) قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ وہی نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل ہی کے ساتھ خاص تھیں جیسا کہ فرعون سے نجات دینا اس کو غرق کر کے دریا میں راستہ بنا دینا۔ بیاباں میں ابر کا سائباں بننا۔ دیگر مفسرین نے فرمایا ہے کہ تمام نعمتیں مراد ہیں جو ان پر اور سب پر ہیں۔

وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ (اور تم پورا کرو میرا اقرار) اقرار پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایمان لاؤ اور اطاعت اختیار کرو۔

اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ (پورا کروں گا میں اقرار تمہارا) یعنی تمہیں اطاعت اور ایمان کا بدلہ اور اجر دوں گا۔ عہد کی اضافت معاہد اور معاہَد دونوں کی طرف ہوتی ہے چنانچہ اس آیت میں ایسا ہی ہوا ہے کیونکہ عہد کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے کہ بنی اسرائیل سے ایمان کا عہد لیا اور ثواب کا وعدہ فرمایا۔ پس بِعَھۡدِیۡ میں اضافت عہد کرنے والے کی طرف ہے اور بِعَھۡدِکُمۡ میں جس سے عہد کیا ہے اس کی طرف ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ دونوں جگہ اضافۃ مفعول ہی کی طرف ہے اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ تم نے جو مجھ سے عہد کیا ہے اسے تم پورا کرو تو میں نے جو عہد کیا ہے اسے میں پورا کر دوں گا۔ ابن جریر نے بسند صحیح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ میرے عہد کو پورا کرو یعنی محمد ﷺ پر ایمان لاؤ میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا یعنی احکام شاقہ مثل قطع موضع نجاست وغیرہ تم سے اٹھا دوں گا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی زبانی بنی اسرائیل سے یہ عہد کیا تھا کہ میں بنی اسماعیل میں ایک نبی اُمّی بھیجوں گا جو تم میں سے اس کا اتباع کرے گا اور جو نور اس کے پاس ہوگا اس کی تصدیق کرے گا تو میں اس کے گناہ بخش دوں گا اور جنت میں داخل کر کے دو چند اجر دوں گا۔ اس میں اختلاف ہے کہ قرآن پاک میں اس عہد کا ذکر کونسی آیت میں ہے۔

marfat.com

کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ عہد یہ ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یعنی یاد کرو اس وقت کو جبکہ اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا یعنی محمد ﷺ کے بارہ میں جو عہد لیا ہے اسے یاد کرو۔

میں کہتا ہوں کہ وہ عہد حق تعالیٰ کا وہ قول ہے جو موسیٰؑ کے جواب میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَھْلَکْتَھُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ سے اِنَّا ھُدْنَآ اِلَیْکَ قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ تک۔ قتادہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ عہد سے مراد سورہ مائدہ کی یہ آیت ہے وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ بَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَلَاُدْخِلَنَّکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ فَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ۝ یعنی اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان ہی میں کے بارہ سردار مقرر کئے اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ گے اور ان کے مدد کرو گے اور اللہ کو نیک قرض دیتے رہو گے تو میں بالضرور تم سے تمہارے گناہ دور کر دوں گا۔ اور تمہیں جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں پھر جس نے تم میں سے اس کے بعد کفر کیا وہ بے شک سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ اور حسن نے فرمایا ہے کہ عہد سے مراد سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّ اذْکُرُوْا مَا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی اور جب لیا ہم نے تم سے عہد اور بلند کیا تم پر پہاڑ اور کہا ہم نے پکڑو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم بچ جاؤ اور جو شے بنی اسرائیل کو دی تھی وہ شریعت موسوی تھی (تو حسن کے قول کے موافق عہد سے مراد شریعت موسوی ہوئی) میں کہتا ہوں کہ ان اقوال میں باہم کچھ مخالفت اور اختلاف نہیں حسنؒ اور قتادہؒ کے ہر دو قول کا حاصل بھی وہی ہے جو کلبی اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قول کا ہے کیونکہ اول قول جو قتادہ اور مجاہد کا ہے اس میں یہ ہے اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ گے اور پیغمبروں میں محمد ﷺ بھی ہیں تو آپ پر بھی ایمان لانے کا اقرار ہوا اور بعینہٖ یہی قول ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اور دوسرا قول حسن کا ہے وہ یہ ہے کہ عہد سے مراد شریعت توراۃ ہے اور ظاہر ہے کہ شریعت توراۃ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ محمد ﷺ پر ایمان لاؤ پس حسن کے قول کا حاصل بھی وہی ہوا جو ابن عباسؓ اور کلبیؒ کے قول کا ہے۔

وَاِیَّایَ (اور مجھ سے) فعل مقدر کا مفعول ہے۔

فَارْھَبُوْنِ ۝ (ڈرتے رہو) اس فعل کی تفسیر کر رہا ہے۔ فَارْھَبُوْنَ یعنی مجھ سے عہد شکنی اور تمام اوامر نواہی میں ڈرو، رھبۃ ایسے خوف کو بولتے ہیں جس میں پرہیز اور بچاؤ ہو۔ اور یہ کلام تخصیص کا فائدہ دیتا ہے (معنی یہ ہیں کہ مجھ ہی سے ڈرو اور سے نہ ڈرو اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے اس میں زیادہ تخصیص ہے کیونکہ اس میں مفعول مقدم اور مکرر لایا گیا ہے اور فعل مکرر ہے کیونکہ ایک فعل مقدر ہے دوسرا ملفوظ اور پھر فاء جزائیہ بھی ذکر کی گویا تقدیر کلام یہ ہوئی اِنْ کُنْتُمْ رَاھِبِیْنَ فَاِیَّایَ اِرْھَبُوْا فَارْھَبُوْنِیْ (یعنی اگر تم ڈرنے والے ہو تو مجھ ہی سے ڈرو اور پھر مجھ ہی سے ڈرو) اور یہ جملہ امور مفید تخصیص ہیں (اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں اتنے امور مجتمع نہیں) اور یہ آیت وعدہ اور وعید دونوں کو شامل ہے (چنانچہ فرمایا ہے کہ میں تمہارا اقرار پورا کروں گا یعنی اجر اور ثواب دوں گا یہ وعدہ ہے اور فرمایا کہ مجھ سے ڈرو یہ وعید ہے) اور نیز وجوب شکر اور وفاء عہد پر دلالت کرتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن کو مناسب یہ ہے کہ اپنے اللہ کے سوا اور کسی سے نہ ڈرے۔ جن الفاظ میں ی محذوف ہے جیسے فارھبون، فاتقون، واخشون وغیرہ۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ سب جگہ ان کو تحریر کے اندر ثابت رکھتے ہیں اور ایسی (یا) قرآن میں اکسٹھ ہیں اور نافع رحمۃ اللہ علیہ بروایت ورش وصل کی حالت میں ان میں سے سینتالیس کو ثابت رکھتے ہیں اور قالون کی روایت کے موافق بیس جگہ ثابت کرتے ہیں اور قالون کی روایت کے موافق دو جگہ اختلاف ہے اور وہ التلاق اور

marfat.com

التناد ہے۔ ابن کثیر وصل اور وقف دونوں حالتوں میں اکیس جگہ یا کو لکھنے میں باقی رکھتے ہیں اور ابن کثیر سے چھ موقعوں میں مختلف روایت ہے اور وہ چھ مواقع یہ ہیں (۱) تَقَبَّلْ دُعَاءِ سورۂ ابراہیم میں (۲) یَدْعُ الدَّاعِ سورۂ قمر میں اس میں یدع کی واؤ کو بھی باقی رکھتے ہیں (۳) اَکْرَمَنِ (۴) اَهَانَنِ سورۂ فجر میں (۵) اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ سورۂ یوسف میں (۶) یَسْرِ سورۂ فجر میں۔ چنانچہ اول کے پانچ موقعوں میں بزی وصل اور وقف دونوں حالتوں میں (یا) کو لکھنے میں باقی رکھتے ہیں اور مَنْ یَّتَّقِ میں قنبل وصل اور وقف دونوں حالتوں میں یا کو ثابت رکھتے ہیں یَسْرِ کی یا کو صرف وصل میں ثابت رکھتے ہیں اور اس میں ان سے خلاف بھی مروی ہے اور ابو عمرو وصل کی حالت میں چونتیس جگہ یا کہ ثابت رکھتے ہیں۔ اور اَکْرَمَنِ اور اَهَانَنِ میں اختیار دیا ہے خواہ (یا) لکھی جائے یا نہ لکھی جائے۔ کسائی یَوْمَ یَاْتِ کی یا کو سورۂ ہود میں اور مَاکُنَّانَبْغِ کی یا کو سورۂ کہف میں ثابت رکھتے ہیں اور ان دونوں کے سوا اور جگہ ثابت نہیں رکھتے اور حمزہ تَقَبَّلْ دُعَاءِ کی یا کو صرف وصل میں اَتُمِدُّوْنَنِ کی یا کو سورۂ نحل میں وصل اور وقف دونوں حالتوں میں لکھنے میں باقی رکھتے ہیں اور عاصم سب جگہ حذف کرتے ہیں اور دوسرے دو موقعوں میں عاصم سے مختلف روایت ہے ایک فَمَآ اٰتٰنِیَ اللّٰهُ وصل کی حالت میں حفص اس (یا) کو مفتوح کرتے ہیں اور وقف میں ساکن اور دوسرے یٰعِبَادِ سورۂ زخرف میں وصل کی حالت میں ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس (یا) کو مفتوح پڑھتے اور وقف میں ساکن کرتے ہیں اور شعبہ پہلے موقع پر یعنی فَمَآ اٰتٰنِیَ اللّٰهُ میں یا کو حذف کرتے ہیں اور حفص یٰعِبَادِ میں حذف کرتے ہیں اور ابن عامر ہشام کی روایت کے موافق سورۂ کہف میں فَلَا تَسْئَلْنِیْ کی یا کو ثابت رکھتے ہیں اور یہ تمام اختلاف اپنے اپنے موقع میں انشاء اللہ تعالیٰ مفصل مذکور ہوگا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ (اور مان لو جو میں نے اتارا ہے) اس سے مراد قرآن پاک ہے اس آیۃ کا اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ پر عطف تفسیری ہے یا یہ آیت تخصیص بعد تعمیم ہے یعنی اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ سے عام شئے یعنی مطلق ایمان لانے کا حکم ہوا تھا اس کے بعد پھر خاص شئے یعنی قرآن پاک پر ایمان لانے کا امر ہے۔

مُصَدِّقًا (اس شئے کی تصدیق کرنے والی) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک ان تمام امور کی تصدیق کرتا ہے جو تورات انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں مذکورہ ہیں مثلاً مختلف قصص نبی ﷺ کی بعثت صفت اور بعث، دعوۂ ثواب، وعید عذاب، بیان توحید تمام انبیاء پر بلا تفریق ایمان لانے کا حکم، تمام احکام کا امتثال اور ممنوعات سے اجتناب یا یہ معنی ہیں کہ قرآن شریف اس کا گواہ ہے کہ جو کتب الٰہیہ تمہارے پاس ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہیں۔

لِّمَا مَعَكُمْ (جو تمہارے پاس ہے) یعنی کتب آسمانی توراۃ وغیرہ۔ حاصل یہ ہوا کہ توراۃ اور انجیل کا اتباع اس کا مقتضی ہے کہ تم قرآن پر ایمان لاؤ اور اسی لئے بطور تعریض ارشاد ہوا کہ اول اس کے ساتھ کفر کرنے والے نہ بنو (بلکہ سب سے اول ایمان لاؤ جیسے ورقہ بن نوفل چونکہ توراۃ کے عالم تھے دیکھو سب سے پہلے ایمان لے آئے۔

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (اور نہ بنو اس کے پہلے منکر) اس سے مراد حقیقی معنی نہیں بلکہ یہ کلام بطور تعریض فرمایا ہے جیسے تعریضاً کہا کرتے ہیں کہ بھائی میں تو جاہل نہیں ہوں، تو مراد اپنے سے جہل کی نفی منظور نہیں ہوتی بلکہ کسی شخص کے جہل کا اثبات مقصود ہوا کرتا ہے۔ اب یہ اعتراض واقع نہ ہوگا کہ مشرکین مکہ تو قرآن کے ساتھ یہود سے پہلے کفر کر چکے تھے پھر یہود پر کس طرح یہ متوجہ ہو سکتی ہے کہ تم اول کافر مت ہو یہ معنی ہیں کہ تم اہل کتاب میں سے ہو اول کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ یا یہ مراد کہ اپنی کتاب کے ساتھ اول کفر کرنے والے نہ بنو کیونکہ قرآن شریف کے ساتھ کفر کرنا بعینہ دیگر کتب الٰہیہ کے ساتھ کفر کرنا ہے اس صورت میں بِهٖ میں ضمیر مَا مَعَكُمْ کی طرف راجع ہوگی۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ اولیت سے مراد اولیت ذاتی یعنی اوروں کے کفر کا سبب بننا ہو کیونکہ علماء اور رؤساء کا ایمان لانا اوروں کے ایمان لانے کا سبب اور ان کا کفر دوسروں کے کفر کا سبب ہوتا ہے اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگاہ رہو کہ سب سے بدتر علماء بے عمل ہیں اس حدیث کو دارمی نے احوص بن حکیم سے اور احوص نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اس تقدیر پر

marfat.com

آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ تم اپنے متبعین کے کفر کا سبب نہ بنو ورنہ ان کا گناہ بھی تمہارے ہی ذمہ ہوگا۔ اور اَوَّلَ کَافِرٍ ضمیر جمع سے خبر ہے اور تاویل میں اول فریق کے ہے یہ معنی ہیں "تم میں سے ہر ایک اول کافر نہ بنے" جیسا بولتے ہیں کہ ہمیں فلاں شخص نے جوڑا پہنایا تو یہاں بھی یہی تاویل کی جاتی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو ایک ایک حلّہ پہنایا۔ اور لفظ اَوَّل افعل التفضیل ہے اس کا کوئی فعل اس کے لفظوں سے نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل اَوَّل کی یا تو اَوْاَلَ تھی وال بروزن سَالَ سے مشتق ہے۔ ہمزہ ثانیہ خلاف قیاس واؤ سے بدل دیا گیا اور یا اَاْوَلَ تھی جو اَوْلٌ سے مشتق ہے ہمزہ واؤ سے بدل کر ادغام کر دیا گیا۔ علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کعب بن اشرف اور دیگر علماء یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ (اور نہ لو میری آیتوں کے عوض) یعنی میری آیتوں پر ایمان لانے کے بدلے میں دنیا کا سامان نہ لو یا یہ معنی کہ تورات کی ان آیات کے بدلہ میں کہ جن میں محمد ﷺ کی نعت مذکور ہے دنیا کا سامان نہ لو۔

ثَمَنًا قَلِيْلًا (مول تھوڑا) یعنی دنیا کا سامان کیونکہ دنیا کا سامان خواہ کتنا ہی ہو لیکن آخرت کی لذات کے مقابلہ میں وہ بالکل لاشئے اور حقیر ہے۔ شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ یہود کے علماء اور رؤساء کو جہلاء اور عوام سے آمدنی بہت ہوتی تھی ان بیچاروں سے سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا اور ہر قسم کے مال کھیت، مویشی اور نقد سب چیزوں سے حصہ لیتے تھے اب اسلام پھیلا تو ڈرے کہ اگر ہم نے محمد ﷺ کی نعت ظاہر کی اور ان کا اتباع اختیار کر لیا تو یہ سب آمدنی ہمارے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ اس لئے انہوں نے دنیا کو دین پر ترجیح دی اور دین چھوڑ بیٹھے اور توراۃ میں آپ ﷺ کی نعت کو بدل دیا اور آپ ﷺ کے اسم مبارک کو محو کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ (اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو) یعنی ایمان لاؤ اور آخرت کو اختیار کرو۔ پہلی آیت میں چونکہ عوام بنی اسرائیل کو خطاب تھا اس لئے فَارْهَبُوْنَ فرمایا کیونکہ رہبت اسی خوف کو بولتے ہیں جو ابتدائے تقویٰ میں ہوتا ہے گویا رہبت تقویٰ کا مقدمہ ہے اور اس آیت میں علماء کو خطاب ہے اس لئے فَاتَّقُوْنَ لائے کیونکہ تقویٰ رہبت کے بعد ہوتا ہے اور آخری حالت میں ظہور پاتا ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (اور نہ ملاؤ سچ میں جھوٹ) لَبسٌ کے معنی لغت میں خلط (ملانا) ہے اور یہاں ایک بات کو دوسری کے ساتھ ایسی طرح رلانا ملانا مراد ہے جس سے دونوں میں کچھ فرق اور تمیز نہ رہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ اے بنی اسرائیل جو سچی بات یعنی محمد ﷺ کی نعت اور صفت میں نے تم پر اتاری ہے اسے باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اس کو اپنے ہاتھوں متغیر نہ کرو کہ حق اور باطل میں بالکل تمیز نہ رہے۔ مقاتلؒ نے فرمایا ہے کہ توراۃ میں جو سرور کائنات خلاصۂ موجودات محمد ﷺ کی صفت اور نعت وارد ہوئی تھی اس میں سے یہود نے بعض چیزوں کا تو اقرار کیا اور بعض کو چھپالیا اور یہ انہوں نے اس لئے کیا تاکہ اپنا کام بھی بن جاوے اور خدا تعالیٰ کے دربار میں بھی جھوٹے نہ ہوں۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اس کے موافق۔ ولا تلبسو الحق میں الحق سے مراد بعض اشیاء کا اقرار اور الباطل سے بعض کا چھپانا مراد ہے۔

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ (اور نہ چھپاؤ حق بات) یا تو لا نہی کے تحت میں داخل ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور یا بعد واؤ کے ان مقدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ترکیب اخیر کے موافق معنی یہ ہوں گے کہ حق و باطل کے ملانے جلانے اور حق بات کے چھپانے میں ان دونوں فعل کو جمع نہ کرو۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ (جان بوجھ کر) یعنی باوجود اس کے کہ تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ نبی برحق ہیں اور اس سے بھی خوب واقف ہو کہ یہ ہمارا فعل ایک امر حق کو چھپانا ہے پھر بھی ایسے امور پر دلیر ہو یہ نہایت قبیح اور برا ہے کیونکہ اگر جاہل ہوتے تب تو بظاہر یہ عذر بھی ہو سکتا تھا کہ ہم جاہل تھے ہم کو خبر نہ تھی جان بوجھ کر جرأت کرنا بہت بے حیائی ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (اور قائم کرو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ) مراد یہ ہے کہ جیسی نماز مسلمان پڑھتے اور جیسی زکوٰۃ مسلمان دیتے ہیں ایسی ہی نماز اور زکوٰۃ تم بھی پڑھو اور ادا کرو۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار جس

marfat.com

طرح اصول (اللہ پر ایمان لانے اور رسالت کا اقرار کرنے اور تمام عقائد کو درست کرنے) کے مکلّف ہیں اسی طرح فروع (یعنی احکام مثل نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ) کے بھی ادا کرنے کے مخاطب اور مکلّف ہیں۔ لفظ زکوٰۃ یا توز کا الزرع (بڑھی کھیتی) سے مشتق ہے اور یا تزکی (پاک ہوا) سے مشتق ہے کیونکہ زکوٰۃ میں مال پاک بھی ہو جاتا ہے اور بڑھتا بھی ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے یَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِي الصَّدَقٰتِ یعنی اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

وَارۡكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ (اور جھکو جھکنے والوں کے ساتھ) یعنی محمد ﷺ اور حضور کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر نماز پڑھا کرو نماز کو بلفظ رکوع ذکر فرمایا حالانکہ رکوع نماز کا ایک رکن ہے خود عین نماز نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ حکم یہود کو ہے اور یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا۔ اس آیت میں باجماعت نماز پڑھنے کی ترغیب و تحریض ہے۔

مسئلہ :- داؤد ظاہریؒ کے نزدیک جماعت رکن ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک فرض ہے رکن نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ واجب کے قریب ہے۔ چنانچہ صبح کی سنتیں سب سنتوں سے زیادہ مؤکد ہیں ہاں اگر یہ خوف ہو کہ جماعت فوت ہو جائے گی تو سنت ترک کر دینا ضروری ہے اس سے معلوم ہوا کہ جماعت واجب کے قریب ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔ جماعت کی نماز ستائیس درجے افضل ہے علیحدہ نماز پڑھنے سے۔

اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ (کیا تم لوگوں کو نیک کام کا حکم کرتے ہو) یہ آیت سابقہ آیت کے مضمون کی تاکید و تقریر ہے اور اس میں ایک تعجب آمیز دھمکی بھی ہے۔ البرّ (خوب دل کھول کر نیکی کرنا) بر (بمعنی میدان وسیع) سے مشتق ہے اور ہر قسم کی نیکی کو بر بولتے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت علماء یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ شان نزول اس کا یہ ہوا تھا کہ یہود میں سے کچھ لوگ جو مسلمان ہو گئے تھے اپنے غیر مسلم یہودی اعزاء اور اقرباء سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے کہ تمہاری کیا رائے ہے آیا یہ دین حق ہے یا کیا ہے تو ان کے عزیز و قریب کہتے کہ تم جس دین پر ہو جمے رہو کیونکہ جو کچھ محمد ﷺ کہتے ہیں وہ سب حق اور سچ ہے اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ واحدی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ علماء یہود عوام کو تو تورات پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے تھے مگر خود عمل نہ کرتے تھے اور محمد ﷺ کی جو نعت اس میں موجود تھی اسے متغیر کر دیتے تھے۔

وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ (اور اپنے آپ کو بھولتے ہو) اپنے نفس کو بھولنے کے معنی اسے ہر بھلائی سے آزاد چھوڑ دینے کے ہیں جیسے دل سے بھلائی ہوئی چیزیں چھوٹ جاتی ہیں۔ حقیقی بھولنے کے معنی مراد نہیں ہیں (کیونکہ کوئی شخص اپنے آپ کو بھولا نہیں کرتا۔

وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ (حالانکہ تم کتاب الٰہی پڑھتے ہو) الکتٰب سے مراد توراۃ ہے معنی یہ کہ تم اوروں کو تو نیک بات بتاتے ہو اور خود اس پر عمل نہیں کرتے حالانکہ تم تورات پڑھتے ہو اور اس میں محمد ﷺ کی نعت اور صفت موجود اور مخالفت و سرکشی اور نیک کام کے ترک پر سخت وعید مذکور ہے۔

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (کیا تم (اپنے بد افعال کو) سمجھتے نہیں) یا یہ معنی کیا تمہیں عقل نہیں جو ایسے افعال سے تمہیں باز رکھے۔ عقل کے معنی لغت میں حبس (روکنا) کے ہیں اور اس سے عقال الدابہ (چوپایہ کا زانو بند) مشتق ہے چونکہ عقل انسان کو مضر چیزوں سے روکتی ہے اس لئے اسے عقل کہتے ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ یہ تمہارے افعال علم اور عقل کے صریح مخالف ہیں۔ علامہ بغویؒ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معراج کی رات میں نے کچھ آدمی دیکھے کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کترے جا رہے تھے۔ میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں انہوں نے کہا یہ آپ کی امت کے واعظ ہیں لوگوں کو نیک کام بتاتے تھے اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے حالانکہ کتاب الٰہی پڑھتے تھے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص لایا جائے گا کہ اسے آگ میں پھینک دیا

marfat.com

جائے گا آگ میں اس کی انتڑیاں اور اوجھ سب نکل پڑے گا پھر اس کے پیچھے اس طرح گھومے گا جیسا کہ گدھا اپنی چکی کے گرد گھومتا ہے اس کا یہ حال دیکھ کر دوزخ والے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور پوچھیں گے تیرا کیا حال ہے تو تو ہمیں بھلی بات بتلایا کرتا تھا لیکن خود عمل نہیں کیا کرتا تھا وہ کہے گا ہاں میں تمہیں بری بات سے روکتا تھا اور خود اسی میں مبتلا تھا۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ مقصود اس آیت سے عالم اور واعظ کو تزکیہ اور اصلاح نفس کا حکم کرنا ہے۔ وعظ سے روکنا اور منع کرنا مراد نہیں کیونکہ وعظ اور لوگوں کو بھلی بات بتانا یہ بھی اللہ کا حکم ہے اور اپنے نفس کو پاک کرنا اور معاصی سے بچنا یہ بھی ضروری ہے اور ایک حکم پر عمل نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے حکم کو بھی چھوڑ بیٹھے (اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی کہے میاں جب ہم غیبت اور حق تلفیاں کرتے ہیں تو نماز کیوں پڑھیں ظاہر ہے کہ ایسا شخص سب کے نزدیک بے وقوف ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سخت ناپسند ہے اللہ کے نزدیک یہ بات کہ ایسی بات کہو جو خود نہ کرو) اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی خود بد عمل ہو تو دوسروں کو بھی وہ بھلی بات کرنے کا حکم نہ کرے کیونکہ یہ اللہ کے نزدیک برا ہے۔ لیکن آیت کے یہ معنی نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ عالم کا گناہ اللہ کے نزدیک جاہل کے گناہ سے زیادہ ناپسند ہے نہ یہ کہ عالم گناہ گار کا امر بالمعروف ناپسند ہے واللہ اعلم۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہود کو ایسی باتوں کا حکم فرمایا جس سے ان کی دنیا کا نقصان اور مال و جاہ میں فرق آتا تھا تو یہ ان پر بہت ہی شاق گزرا اور دل میں گو اسلام کو حق سمجھتے تھے مگر قبول اسلام سے چونکہ ریاست اور جاہ و مال سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا اس لئے دائرۂ کفر سے نہ نکلتے تھے اور قبول اسلام انہیں ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ آیت ذیل میں اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و رحم سے انہیں ایسے طریقہ کی ہدایت فرماتا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے قبول اسلام اور ترک دنیا سہل ہو جائے اور تمام دنیوی و دینی حاجتیں پوری ہو جائیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ (اور مدد چاہو صبر سے) مطلب یہ ہے کہ تم کو جو طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں نے منہ دکھار کھا ہے ان کے دفع کرنے کے لئے صبر اور نماز سے مدد چاہو یعنی صبر کرو اور نماز پڑھو۔ لفظ صبر بہت سے معانی کو شامل ہے اول یہ کہ اللہ پر توکل کر کے خوشی اور حاجت روائی کا انتظار کرو۔ دوسرے یہ کہ اپنے نفس کو فریاد اور جزع و فزع سے روکو کیونکہ جزع و فزع کچھ نافع نہیں جو کچھ مقدر میں ہے وہی ہو کر رہے گا۔ تیسرے یہ کہ اپنے نفس کو معاصی سے بچاؤ اور طاعات پر جماؤ اس سے سب مصیبتیں جاتی رہیں گی کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (یعنی جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچتی ہے یہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے) مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ صبر سے مراد روزہ ہے۔ اس لئے رمضان کے مہینے کو شہر صبر کہتے ہیں روزہ اور نماز یہ دونوں حب جاہ و مال کے ترک کا باعث اس لئے ہیں کہ روزہ دنیا سے بے رغبت کرتا اور نماز آخرت کی طرف مائل کرتی ہے۔

وَالصَّلٰوةِ (اور نماز سے) بعض مفسرین نے کہا ہے والصلوٰۃ میں واؤ بمعنی علیٰ ہے اس تقریر پر آیت کے یہ معنی ہیں کہ نماز پر صبر سے مدد چاہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (یعنی اے محمد ﷺ آپ اپنی اہل کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس پر قائم رہئے) تفکرات کے رفع کرنے اور حوائج کے پورا ہونے میں نماز کو بڑا دخل ہے۔ چنانچہ امام احمدؒ اور ابو داؤد اور ابن جریر نے عبد العزیز سے جو حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی مہم پیش آتی تو نماز کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد دعا (جو اس کے لغوی معنی ہیں) بھی ہو سکتی ہے کیونکہ دعا سے بھی پریشانیاں دور ہوتی ہیں اور دینی و دنیوی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کو اللہ سے یا کسی بندہ سے کوئی حاجت ہو تو اسے چاہئے کہ وضو کرے اور اترے دل سے وضو نہ کرے بلکہ خوب اچھی طرح سنوار کر کرے پھر دو رکعت پڑھ کر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے پھر یہ دعا پڑھے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا

marfat.com

غَفَرْتَہٗ وَلَا ھَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَہٗ وَلَا حَاجَۃً ھِیَ لَکَ رِضًا اِلَّا قَضَیْتَھَا یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ اس حدیث کو ترمذی نے عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور مستدرک میں حاکم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ (اور بیشک نماز شاق ہے) اِنَّھَا میں ضمیر ہایا تو استعانت (مدد طلب کرنا) کی طرف راجع ہو کیونکہ وہ اِسْتَعِیْنُوْا میں معنی موجود ہے اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ نماز اور روزہ سے مدد چاہنا شاق اور گراں ہے یا تمام او امر و نواہی کی طرف راجع ہے۔ یا صبر اور صلوٰۃ کی طرف کیونکہ ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن مرجع میں کوئی تاویل کر کے ضمیر واحد کی لانا جائز ہے۔ یہاں یہ تاویل کرلی جائے گی کہ انہا کی ضمیر ہر ایک خصلت کی طرف راجع ہے تو اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ دونوں خصلتوں (صبر و صلوٰۃ) میں ہر ایک گران اور شاق ہے چنانچہ آیت کریمہ کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَھَا (دونوں باغ اپنے پھل لائے) میں بھی یہی تاویل کی گئی ہے۔ اور اگر اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ میں واؤ بمعنی علیٰ ہو تو ضمیر اِنَّھَا صلوٰۃ کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ صبر سے نماز پر مدد چاہو (یعنی اپنے نفس کو حب جاہ و مال سے رد کو تو نماز سہل ہو جائے گی) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ضمیر اِنَّھَا خاص صلوٰۃ (نماز) ہی کی طرف راجع ہے کیونکہ نماز کی ستان بہت عظیم ہے اور نیز اس میں کئی قسم کے صبر ہیں نماز میں کئی قسم کے صبر آجانے کی مثال ایسی سمجھنی چاہئے جیسا کہ حق تعالیٰ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ انہیں راضی رکھیں چونکہ اللہ کی رضا بعینہ رسول کی رضا تھی اس لئے اَنْ یُّرْضُوْہُ میں ضمیر واحد اللہ کی جانب راجع فرما دی۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ صبر سے مدد چاہو اور بے شک وہ شاق ہے اور نماز سے بھی اعانت طلب کرو بے شک وہ بھی گراں ہے اختصار کی وجہ سے دونوں کو ایک جگہ ذکر فرما دیا۔

اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ﴿۴۵﴾ (مگر ان لوگوں پر جن کے دل پگھلے ہوئے ہیں) خشوع کے معنی لغت میں سکون کے ہیں اور اسی سے خشعتہ (بمعنی ریتلی نرم زمین) مشتق ہے اور خشوع ہوتا ہے آواز و نگاہ میں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ اور دب جائیں گی آوازیں رحمٰن کے خوف سے) اور فرماتا ہے خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ (نظریں جھکی ہوئی ہوں گی) خضوع کے معنی لغت میں نرم ہو جانے اور منقاد و مطیع ہونے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ خشوع تو اعضاء سے ہوتا ہے اور خضوع قلب سے اَلْخَاشِعِیْنَ سے آیت میں وہ مومن بندے مراد ہیں جن کے جی کو حق تعالیٰ کی طاعت سے اطمینان اور چین حاصل ہو گیا اور وہ اللہ سے ڈرنے والے اور متواضع ہیں۔

الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ (جنہیں خیال ہے) یعنی وہ لوگ جو اللہ کے ملنے کی امید یا یقین رکھتے ہیں۔

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ظن اضداد سے ہے کبھی تو اس کے معنی شک کے ہوتے ہیں اور کبھی یقین کے۔ مراد یہ کہ لفظ ظن مشترک ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ مشترک تو نہیں اس کے معنی فقط گمان غالب کے ہیں لیکن مجازاً کبھی کبھی یقین کو ظن اس لئے بول دیتے ہیں کہ اس میں بھی ایک طرف غالب ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے جو لفظ ظن ارشاد فرمایا اور علم و یقین کا لفظ نہ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ جسے اس امر کا گمان غالب بھی ہوگا کہ میں اللہ سے ملنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ نیکی بدی کا بدلہ دے گا تو وہ اگر عقل صحیح و تعلیم رکھتا ہوگا تو طاعت پر قائم رہنا اور معصیت سے مجتنب رہنا ضرر سے بچنے کے لئے اس پر سہل و آسان ہو جائے گا۔ دیکھو اگر کسی کو بظن غالب یہ بات معلوم ہو کہ اس کوزہ کا پانی زہر آلود ہے تو وہ پیاس کی تکلیف اور شدت کو برداشت کرلے گا اور اس پانی کو کبھی نہ پئے گا۔ ایسے ہی اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ فلاں کوزہ کا پانی امراض سے شفا دیتا اور بدن میں قوت بخشتا ہے تو وہ اگرچہ تلخ اور بدمزہ ہی کیوں نہ ہو اسے خوشی خوشی پی جائے گا تو جب ایسے قلیل ضرر سے بچنے اور فانی نفع کے حاصل کرنے کے لئے آدمی ایسی مشقت کو برداشت کرلیتا ہے تو بھلا وہ شخص جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے وہ تعب و مشقت محبوب حقیقی کی رضا کے لئے کیونکر نہ گوارا کرلے گا اور چونکہ ان تکالیف کا محبوب نے حکم فرما دیا ہے اس لئے اس کی برداشت اور

marfat.com

مشغولی میں اسے ایک طرح کی لذت اور مزہ آئے گا۔اسی لئے فخر موجودات سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ (یعنی میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے) اس حدیث کو حاکم اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ　　(کہ ضرور وہ اپنے رب سے ملنے والے) یعنی وہ اس کی توقع رکھتے ہیں کہ اپنے رب کو آخرت میں دیکھنے والے ہیں۔ سچ ہے کہ نماز مؤمن کی معراج ہے بندہ کے لئے رؤیت باری تعالیٰ کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (یعنی اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھو یہ تمہارے لئے فرض زائد ہے۔ عنقریب تمہیں تمہارا رب مقام محمود میں کھڑا کرے گا) ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں سرور عالم ﷺ کے قریب سویا کرتا تھا ایک رات کا ذکر ہے کہ میں حضور ﷺ کے پاس وضو کا پانی اور بعض حاجت کی چیزیں لایا تو حضور ﷺ نے فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے ساتھ جنت میں رہوں فرمایا اس کے سوا کچھ اور میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بس یہی فرمایا اگر یہی مطلوب ہے تو یہ ہمت کر کہ کثرت سے سجدے کیا کر۔ (یعنی کثرت سے نوافل پڑھا کر) اس کو مسلم نے روایت کیا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب حالتوں میں سجدہ کی حالت خدا تعالیٰ سے زیادہ قرب کی ہے اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مُلٰقُوْا رَبِّھِمْ میں لقاء سے حشر اور معاملہ خداوندی مراد ہے۔

وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾　　(اور بلاشبہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) یعنی جو اسے جانتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف جانے والے ہیں اور وہاں اللہ تعالیٰ نیک و بد کا بدلہ دینے والا ہے جو شخص اس کا لحاظ کرے گا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے معاملہ پڑنا ہے اور وہاں جزاو سزا ابھی ہونی ہے تو اسے صبر آسان ہو جائے گا۔ اسی لئے جو شخص مصیبت زدہ ہو اس کے لئے مسنون یہ ہے کہ وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھا کرے۔ ع ۵

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ　　(اے بنی اسرائیل یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا) حق تعالیٰ نے اس مضمون کو تاکید کے لئے مکرر ذکر فرمایا اور اس میں ایک نعمت اور زیادہ یاد دلائی کہ تمہیں اوروں پر فضیلت دی اور یہ نعمت سب نعمتوں سے زیادہ ہے اور اسے بڑی سخت وعید کے ساتھ مربوط فرمایا ہے (چنانچہ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ　　(اور میں نے تمہیں فضیلت دی) ان کو فضیلت دینے سے ان کے آباؤ اجداد کا فضیلت دینا مراد ہے (جیسے کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تم لوگوں کو ہمیشہ دیتے لیتے رہے ہیں یعنی تمہارے باپ دادا کے ساتھ سلوک کرتے رہے ہیں) آباؤ اجداد سے بھی وہی لوگ مراد ہیں جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں تھے اور جو ان کے بعد گزرے مگر انہوں نے اپنے دین میں رخنہ اندازی و فتنہ پردازی نہیں کی نبوت، کتاب اور علم، ایمان، اعمال صالحہ، ملک و عدالت اور انبیاء کی نصرت یہ سب نعمتیں اللہ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائیں۔ باپ دادا کی نعمت کو اولاد پر جتلانے کی وجہ یہ ہے کہ باپ دادوں میں اگر کوئی فضیلت ہوتی ہے تو وہ اولاد کے شرف کا باعث بن جاتی ہے، تو وہ نعمتیں جو انہیں دی گئی تھیں گویا کہ وہ انہیں بھی دی گئیں۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ تم نے اپنے شرف آبائی کو کم کر دیا ہے اسے حاصل کرنا چاہئے اور اس کے حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ محمد ﷺ اور قرآن پاک کا اتباع کرو اور یہی موسیٰ اور تورات کا اتباع ہے کیونکہ تمہارے آباء کو جو شرف و فضل حاصل ہوا تھا اس کی یہی صورت تھی کہ انہوں نے وحی اور انبیاء اور کتاب اللہ کا اتباع کیا تھا اسی طرح تم بھی کرو۔

عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾　　(جہان کے لوگوں پر) سارے جہان والوں پر فضیلت دینے کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں موجود تھے ان پر فضیلت عطا فرمائی۔ ابن جریرؒ نے مجاہد، ابوالعالیہ اور قتادہؒ سے اسی طرح روایت کی ہے یا یہ مطلب کہ جہان والوں میں سے جن میں یہ فضائل نہیں ان پر فضیلت دی۔

marfat.com

وَاتَّقُوْا يَوْمًا (اور ڈرو اس دن سے) دن سے ڈرنے کا مطلب ہے اس دن کے عذاب و شدائد سے ڈرنا۔

لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا (کہ نہ کام آئے گا کوئی کسی کے کچھ) مراد یہ ہے کہ کوئی کسی کافر کو کچھ نفع نہ پہنچا سکے گا یہ معنی نہیں کہ مسلمان بھی مسلمان کے کام نہ آئے گا کیونکہ آیات واحادیث یہ صاف بتا رہی ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور دیگر نیک بندے گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے اور اس پر جملہ اہل حق کا اجماع ہے اور شیئا سے مراد اگر حق ہو تو اس وقت لفظ شیئا آیت میں مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہو گا اور آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ کوئی کسی کے لئے حق کا بدلہ نہ دے گا اور اگر شیئا سے مراد جزا ہو تو مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہو گا اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ کوئی کسی کو بدلہ نہ دے گا۔ خواہ کسی قسم کا بدلہ دینا ہو، بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا، بعض نے کہا ہے یہ معنی ہیں کہ کوئی قیامت کی سختیوں اور عذاب میں کسی کے لئے کفایت نہ کرے گا۔ جملہ لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ الخ یوما کی صفت ہے اور ضمیر جو موصوف کی طرف عائد ہوتی ہے محذوف ہے تقدیر عبارت یہ ہے لا تجزی فیه یعنی اس دن کوئی کام نہ آئے گا۔

وَلَا يُقْبَلُ (اور نہ قبول ہوگی) ابن کثیر، ابو عمرو اور یعقوب نے لا تقبل تاء فوقانی کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء یا کے ساتھ پڑھتے ہیں کیونکہ فاعل جب مونث غیر حقیقی ہوتا ہے تو اس میں فعل کو مذکر مؤنث پڑھنا دونوں جائز ہیں۔ مِنْهَا (اس کی طرف سے) ضمیر ہا دو احتمال رکھتی ہے (۱) یا تو نفس عاصیہ (گناہ گار نفس) کی طرف راجع ہو۔ اس تقدیر پر آیت کے یہ معنی ہوں گے گناہ گار کی طرف سے سفارش مقبول نہ ہوگی (۲) یا نفس شافعہ (شفاعت کرنے والے) کی طرف راجع ہو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ کسی متنفس کی شفاعت منظور نہ ہوگی۔

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (کوئی سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی بدل) عدل سے مراد فدیہ بعض نے کہا بدل لغت میں عدل کے معنی برابر کرنے کے ہیں۔

وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (اور نہ انہیں مدد پہنچے گی) یعنی وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ نہیں رہیں گے۔ ضمیر ہم دوسرے نفس کی طرف راجع ہے۔ بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جمع کی ضمیر واحد کی طرف کس طرح راجع ہوئی تو جواب یہ ہے کہ لفظ نفس چونکہ نفی کے نیچے آگیا ہے اس لئے وہ عام ہو گیا اب نفس واحد محض نہیں رہا بلکہ جمع کے حکم میں ہو گیا۔ باری تعالیٰ کا مقصود اس آیت سے یہ ہے کہ کفار سے کوئی شخص کسی طرح سے عذاب دفع نہیں کر سکتا کیونکہ کسی پر سے عذاب دور کرنے کی چند صورتیں ہوا کرتی ہیں یا تو زبردستی اس سزا دینے والے کے ہاتھ سے چھڑائے جسے نصرہ (مدد) کہتے ہیں یا زبردستی تو نہیں کر سکتے مگر کسی کے کہنے سے اسے مفت چھوڑ دیا جاتا ہے، اسے شفاعت کہتے ہیں یا جو اس کے ذمے ہو وہ ادا کر دیا جاتا ہے یہ جزا ہے یا جو اس کے ذمے ہے وہ تو ادا نہیں کیا مگر اس کا بدل دیدیا یہ عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب صورتوں کی نفی فرمادی۔ تو حاصل یہ ہوا کہ قیامت میں کوئی بھی کسی کافر سے کسی تدبیر کے ساتھ عذاب دفع نہ کر سکے گا۔

شان نزول :- اس آیت کا یہ ہوا تھا کہ یہود دعویٰ کرتے تھے کہ ہمارے باپ دادا ہماری شفاعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمان کو رد فرمادیا۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ (اور یاد کرو جب ہم نے تم کو چھڑا لیا) یعنی تمہارے باپ دادوں کو، بنی اسرائیل پر جو نعمتیں حق تعالیٰ نے مبذول فرمائی ہیں ان کو یہاں تفصیل سے بیان فرماتا ہے۔ شروع رکوع میں تو اجمالاً سب نعمتوں کا بیان آچکا تھا اب یہاں سے اس اجمال کی تفصیل ہے چونکہ آباؤ اجداد کے نجات پانے سے اولاد کو بھی نجات حاصل ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اولاد کو مخاطب بنا کر فرمایا کہ جب ہم نے تمہیں چھڑا لیا۔

مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (فرعون کے لوگوں سے) فرعون کے متعلقین اور اس کے ہم مشرب لوگ مراد ہیں اور آل اصل میں اہل تھا کیونکہ اس کی تصغیر اہیل آتی ہے اور آل کے لفظ کا استعمال انبیاء اور بادشاہ اور بڑے بڑے لوگوں میں آتا

marfat.com

ہے۔ فرعون قوم عمالقہ کے بادشاہ کا لقب ہے حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے فرعون کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا اس کی عمر چار سو برس سے زیادہ ہوئی ہے اور حضرت یوسفؑ کے زمانہ کا فرعون ریان تھا ان دونوں فرعونوں کے درمیان چار سو برس کی مدت کا فاصلہ ہے۔

یَسُوْمُوْنَکُمْ (تمہیں سخت تکلیف دیتے ہیں) سوم کے معنی لغت میں کسی شئے کی تلاش و جستجو میں جانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ تمہیں طرح طرح کے عذاب کی گردش میں رکھتے ہیں۔ اس تقدیر پر یَسُوْمُونکم الابل السائمۃ (اونٹ باہر پھرنے والے) سے ماخوذ و مشتق ہوگا۔ کیونکہ فرعون بنی اسرائیل کو طرح طرح کے عذاب میں رکھتا تھا عمارتیں بنواتا، کھیتی کراتا، بوجھ اٹھواتا، جزیہ لیتا ان کی عورتوں سے سوت کتواتا تھا۔

سُوْٓءَ الْعَذَابِ (یعنی سخت عذاب) سوء ساء یسوء کا مصدر ہے اور ترکیب میں یَسُوْمُوْنَکُمْ کا مفعول ہے اور جملہ یَسُوْمُوْنَکُمْ یا تو نَجَّیْنٰکُمْ کی خبر سے حال ہے اور یا اٰلِ فِرْعَوْنَ سے یا دونوں ضمیروں سے حال کہا جائے۔

یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ (تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے) یَسُوْمونکم کا بیان ہے (یعنی عذاب کا بیان ہے کہ وہ کیا عذاب تھا) اس لئے واؤ عطف درمیان میں نہیں لائے بلکہ بدل کے طور پر ذکر فرمایا۔

وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ (اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے) علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ بیٹوں کو ذبح کرنے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا کہ آگ بیت المقدس کی طرف سے آئی اور سارے مصر کو اس نے گھیر لیا اور قبطیوں کو جلا دیا۔ فرعون یہ خواب دیکھ کر ڈرا۔ کاہنوں کو بلا کر ان سے اس خواب کی تعبیر پوچھی انہوں نے کہا بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تجھے ہلاک کردے گا اور تیرا سب ملک و مال جاتا رہے گا۔ ابن جریرؒ نے سدیؒ سے اسی طرح روایت کی ہے۔

علامہ بغویؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کے بعد سے فرعون نے یہ حکم دیدیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اسے قتل کردیا جائے اور شہر کی سب دائیوں کو جمع کر کے حکم دیدیا کہ دیکھو آج سے بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو زندہ نہ چھوڑا جائے ہاں لڑکیوں کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ روایت ہے کہ اس جستجو و تلاش میں اس مردود نے بارہ ہزار بچے قتل کروائے۔ وہبؒ فرماتے ہیں مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ فرعون نے نوے ہزار بچے ذبح کرائے پھر بنی اسرائیل کے بوڑھے لوگوں میں مری پھیل گئی۔ قبطیوں کے رئیسوں نے یہ حالت دیکھ کر فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل کے بچے تو آپ کے حکم سے مارے جاتے ہیں اور بوڑھے اپنی موت مر رہے ہیں اگر یہی حالت رہی تو بنی اسرائیل بالکل نیست و نابود ہو جائیں گے اور ساری بیگار ہم پر آپڑے گی اور کوئی مزدور و بیگاری ہمیں نہ مل سکے گا۔ فرعون نے یہ بات سن کر حکم دیا کہ اچھا ایک سال تو بچے قتل کئے جائیں اور ایک سال چھوڑ دیئے جائیں۔ تقدیر الٰہی سے حضرت ہارونؑ اس سال پیدا ہوئے جس میں بچوں کو چھوڑا جاتا تھا اور حضرت موسیٰؑ اس وقت رونق افروز عالم ہوئے جس میں بچوں کو قتل کیا جاتا تھا۔

وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾ (اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی) بلاء کے معنی ہیں آزمائش کے اور آزمائش کبھی تو شدت عذاب سے ہوتی ہے اس وقت امتحان ہوتا ہے کہ آیا صبر کرتے ہیں یا نہیں اور کبھی نعمت و فراخی سے ہوتی ہے اس وقت یہ جانچ ہوتی ہے کہ آیا شکر کرتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً (اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی سے آزماتے ہیں) اس لئے کشائش میں شکر اور تنگی میں صبر واجب ہے اور ذٰلِکُمْ کا مشار الیہ یا تو آلِ فرعون سے نجات دینا ہے اس صورت میں آزمائش کی دوسری صورت (یعنی نعمت و فراخی) مراد ہوگی اور یا مشار الیہ فرعون کا بنی اسرائیل کو تکالیف و شدائد میں رکھنا ہے اس تقدیر پر امتحان کی پہلی صورت (یعنی شدّت عذاب) مراد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہونے کی پہلی تقدیر پر (جبکہ آزمائش سے عذاب اور تکلیف مراد ہو) یہ معنی ہوں گے کہ تم پر حق تعالیٰ نے فرعون کو مسلط فرمادیا۔ اور دوسری صورت میں (جبکہ نعمت و فراخی سے

marfat.com

امتحان ہو) یہ معنی ہوں گے کہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو مبعوث فرمایا اور انہیں تمہارے چھڑانے کی توفیق عطا فرمائی عَظِيمٌ بَلَاءٌ کی صفت ہے۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (اور یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑا) فَرَقْنَا بِكُمُ یعنی ہم نے تمہارے داخل ہونے کے سبب دریا کو چیر دیا۔ بعض نے یہ معنی بیان کئے کہ دریا کو تمہارے لئے چیر دیا یہ قصہ یوں ہوا تھا کہ جب فرعون کے ہلاک ہونے کا زمانہ قریب آیا اور حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر چلے جاؤ تو موسیٰ نے سب کو کہہ دیا کہ راتوں رات یہاں سے چل نکلو اور کوچ کا سب سامان اپنے اپنے گھروں کے اندر ہی کریں حتیٰ کہ گھوڑوں کے زین بھی اندر ہی اندر کسیں تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور قبطیوں میں جس قدر بنی اسرائیل کے ولد الزنا تھے ان سب کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں جمع کر دیا۔ اور بنی اسرائیل میں جو قبطیوں کے ولد الزناء تھے خدا نے انہیں وہاں بھیج دیا اور قبطیوں میں ایسی مری پڑی کہ بہت سے آدمی ان کے مر گئے اور وہ صبح تک بلکہ طلوع شمس تک ان کے کفن دفن ہی میں لگے رہے اور حضرت موسیٰ چھ لاکھ یا زیادہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے۔ حضرت یعقوب جب مصر میں آئے تھے تو کل بہتر آدمی ان کے ساتھ تھے (اب اتنا سلسلہ ان کا بڑھا) القصہ : یہ سب کے سب ابھی حدود مصر سے نکلے بھی نہ تھے کہ ایک میدان ایسا بے پایاں دکھائی دیا کہ حضرت موسیٰ حیران رہ گئے کہ کس طرف چلیں بوڑھے بوڑھے لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ کیا تدبیر کرنی چاہئے انہوں نے عرض کیا کہ جب حضرت یوسف کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے بھائیوں کو بلا کر وصیت کی تھی کہ جب تم مصر سے نکلو تو مجھے ساتھ لے کر نکلنا میرے بغیر یہاں سے نہ نکلنا تو یہ اس وصیت کا اثر ہے کہ اب ہم راہ بھول گئے جب تک ان کا جسد مبارک اپنے ساتھ نہ لیں گے رستہ نہ ملے گا حضرت موسیٰ نے ان کی قبر کا پتہ دریافت کیا تو سب نے کہا ہمیں خبر نہیں ان کی قبر کہاں ہے پھر آپ نے پکار کر کہا کہ میں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ جو تم میں سے یوسف کی قبر سے واقف ہو وہ مجھے بتلا دے اور جو نہ جانتا ہو اس کے کانوں میں میری آواز نہ پہنچے۔ اللہ کی قدرت کہ آپ کی آواز کو ایک بوڑھیا کے سوا اور کسی نے نہ سنا اس نے کہا اگر میں تمہیں بتادوں تو جو مانگوں گی وہ مجھے دوگے۔ حضرت موسیٰ نے کہا میں اپنے پروردگار سے پوچھ لوں اگر حکم ہوا تو تجھ سے وعدہ کرلوں گا جناب باری سے ارشاد ہوا کہ موسیٰ تم اس سے وعدہ کرلو کہ جو مانگے گی دیں گے اور اس سے پوچھو کیا مانگتی ہے بڑھیا نے کہا دو چیزیں مانگتی ہوں ایک دنیا کی ایک آخرت کی دنیا کی تو یہ ہے کہ مجھ سے چلا نہیں جاتا مجھے تم یہاں سے کسی طرح لے چلو اور آخرت کی یہ ہے کہ جنت میں جس بالا خانہ پر آپ تشریف لے جائیں میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔

موسیٰ نے فرمایا دونوں باتیں منظور۔ بڑھیا نے کہا یوسف کی قبر دریائے نیل کے بیچ میں ہے یہ سن کر آپ نے جناب باری میں عرض کیا دریا پھٹ گیا قبر شریف ظاہر ہو گئی آپ نے وہاں سے تابوت نکلوا کر لدوا دیا اور پھر ملک شام میں لا کر دفن کیا۔ حاصل کلام یہ کہ رستہ مل گیا اور وہاں سے چلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سب سے پیچھے اور ہارون آگے آگے تھے ادھر تو یہ گزری۔ اب فرعون کی سنئے کہ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نکل گئے قوم کو حکم دیا کہ مرغ کے بولتے ہی بنی اسرائیل کی تلاش میں چل نکلو خدا کی قدرت اس رات کوئی مرغ ہی نہ بولا۔ صبح کو فرعون اور اس کے آگے آگے ہامان ایک کروڑ سات لاکھ آدمی لے کر نکلا ستر ہزار سیاہ گھوڑے بھی ہمراہ تھے بنی اسرائیل ابھی دریا ہی تک پہنچے تھے کہ دن نکل چکا تھا اور دریا خوب زناٹے سے بہہ رہا تھا کہ دیکھتے کیا ہیں فرعون مع اپنی قوم کے پیچھا کئے چلا آرہا ہے۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی اور حیران رہ گئے چنانچہ حق تعالیٰ اس قصہ کو دوسرے مقام پر اس طرح ذکر فرماتا ہے فَلَمَّا تَرَاءَى الْجَمْعَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُدْرَكُونَ قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ (یعنی دونوں جماعتیں جب ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ کے لوگ کہنے لگے ہم تو پکڑے گئے موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے جو مجھے راہ دکھائے گا) حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ تو اپنا عصا دریا پر مار (موسیٰ نے مارا) پس دریا پھٹ گیا تو ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ جیسا ہو گیا) بارہ گروہ کے لئے بارہ رستے پیدا ہو گئے اور دونوں رستوں کے مابین اتنا پانی اونچا

marfat.com

ہو گیا کہ پہاڑ کی طرح نظر آنے لگا اور اللہ تعالیٰ نے ہوا اور دھوپ کے ذریعہ سے دم کے دم میں رستے خشک کر دیئے اور ہر گروہ نے اپنا اپنا رستہ لیا اور پانی چونکہ اونچا چڑھ گیا تھا اس لئے چلتے میں ایک گروہ دوسرے کو دیکھتا نہ تھا تو وہ خوف کھانے لگے کہ کہیں ہمارے بھائی ڈوب نہ گئے ہوں۔ حق تعالیٰ نے اس خوف کو بھی دور کر دیا اور پانی میں مورچے کھول دیئے کہ آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں سننے لگے اس طرح عافیت کے ساتھ صحیح وسالم دریا سے پار ہوئے۔

فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ (اور پھر تمہیں بچلیا اور فرعون کے لوگوں کو ڈبو دیا) اب فرعون کی سنئے۔ کہ کیا گت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ دریا پھٹا ہوا ہے اور رستے بنے بنائے موجود ہیں تو اپنے لوگوں سے فخریہ کہنے لگا کہ دیکھو دریا میرے خوف سے اس لئے پھٹ گیا کہ اپنے گئے ہوئے بندوں کو پکڑلوں فرعون ایک سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور سارے لشکر میں گھوڑے تھے گھوڑی نہ تھی۔ حضرت جبرئیل بحکم الٰہی بصورت انسان گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور فرعون کے آنے سے پہلے دریا میں گھس گئے فرعون کا گھوڑا مادہ کی بو پا کر اس کے پیچھے ہی دریا میں ہو لیا اور فرعون بالکل بے بس ہو گیا اور جتنے گھوڑوں کے سوار تھے وہ بھی فرعون کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلے اور حضرت میکائیل ایک گھوڑے پر سوار ہو کر فرعون کی قوم کے پیچھے پیچھے آئے اور سب کو آگے کو دھکیلا اور کہتے چلے۔ چلو چلو اپنے ساتھیوں سے جلد ملو حتیٰ کہ سب کے سب دریا میں گھس گئے (جب یہ سب کے سب پانی میں آگئے تو جو راستے بنی اسرائیل کے لئے بنائے گئے برابر ہو گئے اور سب ڈوب مرے) اس دریا کا پاٹ چار فرسخ تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ فرعون کون سے دریا میں ڈبویا گیا۔ بعض نے کہا بحر قلزم جو فارس کے دریاؤں میں سے ایک دریا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ مصر سے ورے ایک دریا تھا جسے اساف کہتے ہیں۔ یہ سب قصہ فرعون کے ڈوبنے کا بنی اسرائیل کی دیکھتی آنکھوں ہوا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ (اور تم دیکھ رہے تھے) یعنی تم ان کے ڈوبنے اور ہلاک ہونے کی جگہ دیکھ رہے تھے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً (اور جب ہم نے وعدہ کیا) ابو جعفر اور ابو عمرو نے واعدنا کو ہر جگہ وعدنا بلا الف پڑھا ہے اور باقی قراء نے واعدنا الف سے پڑھا ہے اور مفاعلۃ اگرچہ مشارکت کے لئے آتا ہے لیکن یہاں وعدنا اور واعدنا دونوں کے ایک ہی معنی ہیں جیسے عاقبت اللص میں مفاعلۃ مشارکتہ کے لئے نہیں۔ زجاج نے کہا ہے کہ مشارکتہ کے معنی بھی بن سکتے ہیں اس طرح پر کہ حق تعالیٰ کی طرف سے تو امر ہوا اور موسیٰؑ کی طرف سے قبول یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجنے کا وعدہ فرمایا اور موسیٰؑ نے طور پر آنے کا وعدہ کیا۔ حمزہ اور کسائی نے موسیٰؑ کو امالہ سے پڑھا ہے اسی طرح جس اسم یا فعل کے آخر میں یا ہو حمزہ اور کسائی اسے امالہ سے پڑھتے ہیں جیسا کہ موسیٰ عیسیٰ یحییٰ، موتیٰ، اخریٰ، کسالیٰ، اساریٰ، یتامیٰ، فرادیٰ، نصاریٰ، ایامیٰ حوایا، بشریٰ، ذکریٰ، ضیزیٰ اور ان کے علاوہ جس اسم میں تانیث ہو اسے امالہ سے پڑھتے ہیں اور اسی طرح ہر اسم مقصور میں جیسے عمیٰ، ھدیٰ، ضحیٰ، رء یا ناواہ ء ماواکم، مثواہ، مثواکم میں امالہ کرتے ہیں۔ جتنے صفت کے صیغے ہیں جیسے ادنیٰ، اذکیٰ، اولیٰ، اعلیٰ سب میں امالہ کرتے ہیں اور جن افعال کا الف یا سے بدلا ہوا ہے ان میں بھی امالہ کرتے ہیں جیسے اتیٰ، سعیٰ، فسویٰ، یخفیٰ، یرضیٰ یھویٰ اور حمزہ وکسائی اَنّٰی بمعنی کیف میں جیسے اَنّٰی شِئْتُمْ واَنّٰی لَک میں بھی امالہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح جو حرف یاء کے ساتھ لکھے جاتے ہیں انہیں بھی امالہ سے پڑھتے ہیں جیسے متیٰ، بلیٰ، عسیٰ مگر پانچ الفاظ میں امالہ نہیں کرتے انہیں سب مفتوح پڑھتے ہیں حتیٰ، لدیٰ، علیٰ، الیٰ، مازکیٰ اور ایسے ہی جس اسم یا فعل کے آخر میں واؤ ہو اس میں امالہ کرتے ہیں جیسے الصفا، سنابرقہ، بدا، دنا، عفا، علا وغیرہ لیکن جو آیتیں یا پر ختم ہوتی ہیں اگر اس میں کوئی اسم واوی یا فعل واوی یا فعل یائی کے درمیان واقع ہو تو امالہ نہیں کرتے اور ایسے ہی اگر فعل میں کوئی زیادتی آخر یا اول میں ہو تو اس میں بھی امالہ نہیں کرتے جیسے تدعیٰ، تبلیٰ، فمن اعتدیٰ، من استعلےٰ، وانجاکم، انجانا، ونجاکم، زکاھا، یہ زیادتی سے یاء کے حکم میں ہو جائیں گے۔

marfat.com

اور ابو عمرو الفاظ سابقہ میں سے جس میں راء بعد یا کے ہو اس میں امالہ کرتے ہیں اور جس سورہ کی آیتیں یاء یا ھاء یا الف پر ختم ہوں یا جس سورۃ کے آخر کے الفاظ فعلی یا فعلی یا فعلی کے وزن پر ہوں ان سب کو ابو عمرو بین بین پڑھتے ہیں۔ اور ان کے سوا اور الفاظ کو فتح سے پڑھتے ہیں۔ اور ورش نے ان سب الفاظ کو بین بین پڑھا ہے اور ابو بکر نے سورۂ انفال میں لفظ رمیٰ اور اور سبحان الذی میں لفظ اعمیٰ ان دونوں جگہ امالہ کیا ہے اور ابو عمرو اور علی نے پہلے اعمیٰ میں صرف امالہ کیا ہے اور دوسری جگہ فتحہ دیا ہے اور حفص نے سورۂ ہود میں لفظ مجریھا کو امالہ سے پڑھا ہے اور سوائے اس کے کسی جگہ امالہ نہیں کیا اور ابو عمرو یا ویلتی یاحسرتیٰ اور انی استفہامیہ کو بین بین اور یااسفی کو مفتوح پڑھتے ہیں اور الف ممال اگر اجتماع ساکنین کی وجہ سے وصل کی حالت میں گر پڑے تو امالہ نہ کریں گے لیکن وقف میں کریں گے جیسے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ وَ مُوْسَی الْکِتَابَ تو اگر موسیٰؑ اور ھدًی پر وقف کریں گے تو امالہ کریں گے اور وصل کی حالت میں نہ کریں گے۔ اور ابو عمرو سے بروایت یزیدی ثابت ہوا ہے کہ راء مہملہ میں جب اس کے بعد حرف ساکن ہوا مالہ کرتے ہیں جیسے یری الذین امنوا والنصاریٰ، المسیح، الکبریٰ، اذھب، القویٰ، التی وغیرہ اور کسائی ذیل کے الفاظ میں امالہ کرتے ہیں اور دیگر قراء نہیں کرتے فاحیابہ، واحیاھا، خطایاکم، خطایا ھم رئویاء رؤیایء مرضات اللّٰہ مرضاتی اور ان الفاظ میں بھی امالہ کرتے ہیں اور دیگر قراء سے منقول نہیں۔ حق تقاتہ آل عمران میں، قدھدان انعام میں، من عصانی ابراہیم میں، ماانسانیہ کہف میں، اتانی الکتاب اور اوصانی بالصلوٰۃ مریم میں، مما اتانی اللّٰہ نمل میں، محیاھم جاثیۃ میں، دحاھا نازعات میں، تلاھاء طحاھا والشمس میں سجیٰ والضحیٰ میں اور ذیل کے الفاظ میں کسائی کے ساتھ حمزہ بھی متفق ہیں۔ یحیی ولا یحیی و امات واحیا لیکن امالہ اس وقت کرتے ہیں جب ان الفاظ اربعہ کے ساتھ واؤ آئے اور اگر واؤ نہ آئے تو امالہ نہیں کرتے۔ کسائی اور حمزہ دونوں ذیل کے الفاظ کے امالہ میں شریک ہیں۔ الدنیا، العلیا، الحوایا، الضحیٰ، ضحاھا، الریا، انی، ھدانی، اتانی، سورۂ ہود میں لوانّ اللّٰہ ھدانیء منھم تقاۃ، مزجاۃ، اتاہ ان الفاظ میں اتاہ کے امالہ میں ہشام نے بھی حمزہ اور کسائی کا اتباع کیا ہے اور باقی قراء ان سب الفاظ میں فتحہ پڑھتے ہیں۔

اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً (چالیس رات کا) مفسرین کہتے ہیں کہ جن چالیس رات کا حق تعالیٰ نے موسیٰؑ سے وعدہ فرمایا ان میں سے تیس راتیں تو ذی قعدہ کی تھیں اور دس ذی الحجہ کی اور یہ قصہ اس طرح ہے کہ جب فرعون ہلاک ہو گیا اور بنی اسرائیل پھر مصر میں آکر بسے تو حق تعالیٰ نے موسیٰؑ سے وعدہ فرمایا کہ ہم تم پر توریت اتاریں گے اور چالیس رات کا وعدہ فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور ہارون کو اپنا خلیفہ بناتا ہوں جبرئیل اسپ حیات پر سوار ہو کر انہیں لینے کے لئے تشریف لائے جہاں اس گھوڑے کا قدم پڑتا سبزہ اگ آتا تھا۔ سامری نے یہ عجیب واقعہ دیکھ پایا۔ یہ سامری ایک سنار باجرمی کا رہنے والا تھا۔ بعض نے کہا کرمان کا ظاہراً اسلام لے آیا تھا مگر منافق تھا اور اس قوم میں سے تھا جو گائے کو پوجتے ہیں جب اس نے یہ بات دیکھی تو حضرت جبرئیل کے گھوڑے کے زیر قدم کی ایک مٹھی خاک اٹھا کر رکھ لی اور بنی اسرائیل نے کہیں فرعون کی قوم سے خروج مصر سے پہلے بہت سا زیور شادی کے بہانے سے مستعار لے لیا تھا جب حق تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا تو وہ زیور انہی کے پاس رہا جب حضرت موسیٰؑ توریت لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو اس سامری نے بنی اسرائیل سے کہا وہ زیور جو تمہارے پاس ہے غنیمت کا مال ہے اور تمہیں حلال نہیں اسے کہیں گڑھا کھود کر دبا دو جب حضرت موسیٰؑ تشریف لائیں گے جیسی ان کی رائے ہو گی کیا جائے گا۔

سدیؒ نے کہا کہ انہیں یہ مشورہ ہارونؑ نے دیا تھا القصہ انہوں نے حسب مشورہ سامری یا ہارونؑ وہ زیور سب کا سب ایک جگہ دفن کر دیا۔ سامری نے خفیہ طور پر وہ مال نکال لیا اور اس کا تین دن میں ایک بچھڑا تیار کر کے زیور سے مرصع کیا اور وہ خاک جو اس نے جبرئیل کے گھوڑے کے قدم کی اٹھائی تھی اس میں ڈال دی چونکہ اس میں مادۂ حیات تھا مٹی پڑتے ہی بولنے لگا اور ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ سامری نے بنی اسرائیل سے کہا ھٰذَا اِلٰھُکُمْ وَاِلٰہُ مُوْسٰی فَنَسِیَ یعنی تمہارا اور موسیٰؑ کا

معبود تو یہ ہے وہ بھول گئے (یعنی معبود کو بھول کر کوہ طور چلے گئے) اور بنی اسرائیل کا قاعدہ تھا کہ وہ ایک دن رات کو دو دن شمار کرتے تھے جب بیس دن گزر گئے اور موسیٰ نہ آئے تو سب کہنے لگے کہ چالیس دن تو گزر گئے اور حضرت موسیٰ اب تک نہ آئے معلوم ہوتا ہے کہ انتقال کر گئے ادھر سامری نے یہ فتنہ پھیلایا کہ لوگوں کو بہکانا شروع کر دیا۔ بعض نے کہا کہ حضرت موسیٰ نے قوم سے تیس رات کا وعدہ کیا تھا پھر دس رات اور بڑھا دی گئیں اس لئے فتنہ میں پڑ گئے اور بچھڑا پوجنے لگے۔ ہارون اور ان کے ہمراہ بارہ ہزار آدمی تو راہ حق پر رہے اور باقی سب کے سب گمراہ ہو گئے۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ (پھر تم نے موسیٰ کے بعد بچھڑے کو (معبود) بنالیا اور تم ظلم کر رہے تھے) اخذت اور اتخذت کی ذال کو ابن کثیر اور حفص جہاں کہیں بھی ہو ظاہر کرتے اور دیگر قراء ادغام کرتے ہیں من بعدہ میں ہ موسیٰ کی طرف راجع ہے۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (یعنی تم اپنا نقصان کرنے والے تھے) کہ عبادت بے محل کرتے تھے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ (پھر اس کے بعد بھی ہم نے تم سے درگزر کی تا کہ تم احسان مانو) یعنی جب تم نے توبہ کی تو ہم نے درگزر کی عفو (گناہ کے محو کرنے کو کہتے ہیں) عفا (مٹ گیا۔ محو ہوا) سے مشتق ہے مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ (یعنی بعد اس معبود بنانے کے) مفسرین نے کہا ہے کہ شکر سے مراد طاعت ہے اور شکر قلب، زبان، اعضا، سب سے ہوتا ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ نعمت کا شکر اس کا ذکر کرنا ہے اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت کو منعم حقیقی کی رضا میں صرف کیا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ شکر کی حقیقت شکر سے عجز کا ظاہر کرنا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں منقول ہے کہ موسیٰ بارگاہ باری تعالیٰ میں عرض کیا کرتے تھے خداوند مجھے آپ نے سینکڑوں نعمتیں عطا فرمائیں اور مجھے آپ نے ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا بھی حکم فرمایا مگر اے پروردگار میرا کسی نعمت پر شکر ادا کرنا بھی تو تیری ہی نعمت ہے ارشاد ہوا موسیٰ! تم بڑے عالم ہو تم سے زیادہ اس زمانے میں کسی کا علم نہیں یاد رکھو میرے بندہ کو شکر اتنا ہی کافی ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھے کہ جو نعمت ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ حضرت داؤد اپنی مناجات میں عرض کیا کرتے تھے کہ پاکی اس ذات کے لئے جس نے بندہ کے شکر سے عاجز ہونے کے اقرار کو شکر قرار دیا جیسا کہ معرفت سے عاجز ہونے کے اقرار کو معرفت بنالیا۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ (اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت فرمائی اور قانون فیصل) الکتاب سے مراد توریت اور الفرقان سے مراد بھی بعض مفسرین کے قول پر توریت ہی ہے۔ توریت ہی کو حق تعالیٰ نے دو ناموں سے ذکر فرمایا ہے۔ کسائی نے کہا کہ الفرقان الکتاب کی نعت ہے اور واؤ زائد ہے الفرقان کے معنی ہیں حق اور باطل میں فرق کرنے والی۔ بعض نے کہا الفرقان سے مراد معجزات ہیں اور فرقان (فرق کرنے والا) انہیں اس لئے کہا کہ معجزات اہل حق اور اہل باطل میں فرق کر دیتے ہیں۔ بعض نے کہا الفرقان شریعت موسوی ہے جو حلال و حرام میں فرق کرنے والی تھی۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ (تا کہ تم ہدایت پاؤ) یعنی تا کہ تم کتاب میں تدبر اور تفکر کرنے سے ہدایت پاؤ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ

(اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم نے بچھڑے کی پرستش سے اپنے اوپر (بڑا ہی) ظلم کیا سو اب اپنے خالق کی جناب میں توبہ کرو) لِقَوْمِهٖ سے مراد وہ قوم ہے جنہوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی۔ ظلمتم انفسکم یعنی اپنا نقصان کیا الی بارئکم یعنی اس ذات کی طرف رجوع کرو جس نے تمہیں اعتدال کے ساتھ پیدا کیا اور کسی طرح کا نقص تم میں نہ کیا۔ اور ایک دوسرے کی شکل و صورت ممیز و جدا بنائی اور اصل ترکیب ان حروف (یعنی ب ر ء) کی کسی

ے یعنی حرکت تخفیف سے پڑھی ہے، ۱۲۔

marfat.com

شئے کو دوسری شئے سے چھانٹ لینے اور خاص کرنے کے لئے ہے اب یہ خاص کرنا خواہ اس طرح پر ہو کہ اس شئے کو علیحدہ کر دیا جائے جیسے بولتے ہیں۔ بری المریض والمدیون (رستگار ہوا بیمار اور مقروض) یعنی مریض مرض سے اور مقروض دین سے علیحدہ ہو گیا اور یا یہ کہ خاص کرنا ایک شئے سے دوسری شئے کو ایجاد و اختراع کے طور پر ہو برأ اللّٰہ اٰدم من الطین (پیدا کیا اللہ نے آدم کو گارے سے) یعنی نمناک مٹی سے انہیں خاص اور علیحدہ کر لیا۔ ابو عمرو نے بارئکم میں دونوں جگہ اور اسی طرح یامرکم، یا مرھم، ینصرکم و یشعرکم میں جہاں جہاں یہ آئے ہیں اختلاس لمہ حرکت سے پڑھا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ابو عمرو نے بارئکم کی ہمزہ کو ساکن کر کے پڑھا ہے اس روایت کے موافق ہمزہ ابو عمرو کے نزدیک یا سے بدل جائے گا اور ابو عمرو کے سوا اور قراء نے پوری حرکت سے پڑھا ہے۔ اور کسائی نے بارئکم میں دونوں جگہ اور البارئی، المصور سارعوا، یسارعون، یسارع میں امالہ کیا ہے اور اسی طرح الجار میں دونوں جگہ اور جبار میں دونوں مقام میں اور الجوار میں سورۂ شوریٰ اور رحمٰن اور کورت میں اور من انصاری الی اللّٰہ میں دونوں جگہ اور کمشکوٰۃ میں سورۂ نور میں بھی امالہ کیا ہے اور ورش نے الحار اور الجبارین کو بین بین پڑھا ہے۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اور ہلاک کر ڈالو اپنی جانیں) مطلب یہ ہے کہ توبہ کی تکمیل کے لئے تم میں سے جو بری ہیں وہ مجرموں کو قتل کریں اس تقریر پر یہ قتل توبہ کا تتمہ ہو گا اور خود توبہ نہ ہو گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ فا تفسیر کے لئے ہو اس کے موافق یہ قتل ہی خود توبہ ہو گا اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم اپنے لوگوں کو قتل کر دو یہی توبہ ہے۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ (یہی (قتل) بہتر ہے تمہارے حق میں تمہارے خالق کے نزدیک) اور اس قتل کے بہتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ قتل شرک سے پاک کرنے اور حیات ابدی و سرور سرمدی تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس حکم الٰہی کے پہنچتے ہی موسیٰؑ نے یہ فرمان واجب الاذعان قوم کے گوش گذار کیا سب نے یہ حکم سن کر عرض کیا کہ ہم اپنے مولیٰ کے حکم پر دل سے صابر ہیں سب کے سب ایک صحن میں اپنی چادروں سے گوٹ مار کر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ حکم ہوا کہ اگر کوئی اپنی گوٹ کھولے یا نگاہ اٹھا کر قاتل کو دیکھے یا ہاتھ پیر کے ذریعہ سے بچے تو وہ ملعون ہے اور اس کی توبہ مقبول نہ ہو گی۔ سب نے حکم الٰہی کی تعمیل کی اور اپنی اپنی گردنیں کھول دیں۔ مجرمین میں ان قاتلین کے عزیز و اقارب بھی تھے کوئی کسی کا باپ، کوئی بیٹا، کوئی بھائی، کوئی قریبی رشتہ دار، کوئی دوست تھا۔ جب امتثال حکم الٰہی کے لئے تلوار اٹھائی تو فرط محبت و شفقت کی وجہ سے تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی اور حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکی۔ سب نے حضرت موسیٰؑ سے عرض کیا یا نبی اللہ! اب ہم کیا کریں ہم تو مغلوب ہو گئے۔ حق تعالیٰ نے زمین سے بخارات یا آسمان سے ایک ابر سیاہ بھیجا کہ اس سے تاریکی چھا گئی کہ کوئی ایک دوسرے کو نہ دیکھتا تھا۔ القصہ: قتل شروع ہوا اور کئی روز تک یہ قتل رہا صبح سے شام تک برابر قتل کرتے تھے جب بنی اسرائیل کثرت سے مقتول ہوئے تو حضرت موسیٰؑ اور ہارون علیہما السلام نے بارگاہ الٰہی میں رو رو کر دعا فرمائی کہ خداوندا بنی اسرائیل یک لخت ہلاک ہوئے جاتے ہیں اب اپنا رحم نازل فرمایئے۔ حق تعالیٰ نے اس سیاہ ابر کو ہٹا دیا اور حکم بھیجا کہ اب قتل نہ کریں جب ابر کھلا تو دیکھا گیا کہ ہزاروں آدمی مارے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کو بہت غم ہوا حق تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ موسیٰؑ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ میں قاتل اور مقتول دونوں کو جنت میں داخل کروں اور جو قتل ہوئے انہیں شہادت کا مرتبہ دوں اور جو باقی رہیں ان کے گناہ معاف کر دوں۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ (پھر اللہ تعالیٰ تم پر متوجہ ہوا) یہ جملہ محذوفہ کے متعلق ہے۔ اگر اسے حضرت موسیٰؑ کا کلام قرار دیا جائے تو تقدیر یہ ہو گی کہ اگر تم قتل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرے گا۔ اور اگر حق تعالیٰ کا مقولہ ہو تو اس کلام میں صنعت التفات کے طور پر غیبت سے خطاب کی طرف میلان ہو گا اور آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کے بعد جو تمہیں حکم ہوا تھا (یعنی قتل کا) سو تم بجا لائے تھے تو حق تعالیٰ تم پر متوجہ ہوا۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ (بیشک وہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے) توّاب کے معنی کثرت سے

marfat.com

توبہ قبول کرنے والا یا توبہ کی توفیق دینے والا۔ اس قصہ کے بعد حق تعالیٰ کی طرف سے موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ تم چند آدمی بنی اسرائیل کے لے کر آؤ اور اس بچھڑے کی پوجا سے توبہ اور عذر کرو حضرت موسیٰؑ نے ان میں سے ستر نیک اور صالح منتخب کئے اور انہیں کہا کہ تم روزہ رکھو اور خوب نہادھو کر پاک صاف ہو جاؤ اور پاکیزہ کپڑے پہنو۔ سب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی تعمیل کی اور ان سے استدعا کی کہ آپ جناب باری میں عرض کیجئے کہ ہمیں اپنا کلام پاک سنائے جب موسیٰؑ پہاڑ کے قریب ہوئے تو ایک ابر مثل ستون نمودار ہوا اور سارے پہاڑ پر محیط ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ اس ابر میں گھس گئے اور اپنی قوم سے کہہ دیا کہ جب تم اس ابر میں آؤ تو سجدہ میں گر پڑنا۔ حضرت موسیٰؑ جب حق تعالیٰ سے کلام کرتے تو ان کے مبارک چہرہ پر ایک ایسا نور چمکتا تھا کہ کسی کو اس طرف دیکھنے کی تاب نہ ہوتی تھی پھر ان میں اور نور خداوندی کے مابین ایک حجاب پیدا ہو گیا انہوں نے سنا کہ حق تعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو امر و نہی فرماتا ہے۔ منجملہ ان کے یہ بھی گوش زد ہوا بیشک میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں قاہر ہوں میں نے تمہیں اپنی قوت شدیدہ سے مصر سے نکالا تم میری ہی عبادت کرو اور کسی غیر کی عبادت نہ کرو جب موسیٰؑ مناجات سے فارغ ہوئے اور وہ ابر کھل گیا تو ان سب نے حضرت موسیٰؑ سے یہ آیت ذیل کا مضمون کہا۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ (اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم ہرگز تیرا یقین نہ کریں گے) یعنی ہم تمہارے کہنے سے ہرگز ایمان نہ لائیں گے یا یہ معنی کہ ہم ہرگز اس بات کا اقرار نہ کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں توریت عطا فرمائی ہے اور تم سے کلام کیا ہے یا تم نبی ہو۔

حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً یہاں تک کہ دیکھ لیں ہم اللہ کو کھلم کھلا) جهرة اصل میں جَهرتُ بالقرأة (میں نے پڑھنے میں آواز بلند کی) کا مصدر ہے مگر یہاں معاینہ کے معنی میں مستعار لے لیا گیا ہے اور جهرة یا تو نریٰ کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ جهرة میں بھی ایک قسم کی رؤیت پائی جاتی ہے یا یہ فاعل یا مفعول بہ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ (پھر پکڑ لیا تمہیں کڑک نے) اس سے مراد موت ہے اور بعض نے کہا کہ صاعقہ سے مراد آگ ہے جو آسمان سے آئی تھی اور انہیں جلادیا تھا۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ (اور تم دیکھ رہے تھے) یا تو یہ معنی کہ تمہیں جو مصیبت پہنچی اسے تم دیکھ رہے تھے (جب صاعقہ سے مراد آگ ہو) یا یہ مراد کہ اس مصیبت کا اثر تم دیکھ رہے تھے (جب صاعقہ سے مراد موت ہو) کیونکہ موت خود تو نظر آتی نہیں اس کا اثر ہی نظر آتا ہے۔ جب سب کے سب ہلاک ہو چکے تو حضرت موسیٰؑ بارگاہ الٰہی میں رونے اور آہ و زاری کرنے لگے اور عرض کیا خداوندا میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دوں گا ان میں کے جو بزرگ لوگ تھے وہ تو آپ نے ہلاک کر ڈالے اور پھر عرض کیا رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا (یعنی اے پروردگار اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ان کو مجھ سمیت ہلاک کر دیتا کیا تو ہلاک کئے دیتا ہے ہمیں اس حرکت پر جو کر بیٹھے ہم میں سے احمق لوگ) حضرت موسیٰؑ برابر عجز و زاری کرتے رہے حتیٰ کہ دریائے رحمت میں جوش آیا۔ ایک دن رات مرے پڑے رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سب کو یکے بعد دیگرے زندہ کر اٹھایا اور جو زندہ ہو کر اٹھتا وہ دوسرے کو دیکھتا کہ کیونکر اٹھتے ہیں چنانچہ اس مضمون کو حق تعالیٰ ذیل کی آیت میں بیان فرماتا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ (پھر ہم نے تمہیں زندہ کھڑا کیا) بعث کے معنی لغت میں کسی شئے کو اسکی جگہ سے اٹھانے کے ہیں

مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (تمہارے مرنے کے بعد) قتادہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے انہیں اس لئے زندہ کر دیا تا کہ وہ اپنی بقیہ عمریں اور رزق پورے کر لیں اور اگر اپنی عمر ختم کر کے مرتے تو پھر قیامت ہی میں اٹھائے جاتے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ (شاید تم احسان مانو) یعنی تا کہ تم اس زندہ اٹھانے کا شکر کرو یا صاعقہ کے پہنچنے سے جو تمہیں عذاب پہنچا اور اس سے تمہارے گناہ معاف کئے گئے اس کا شکر کرو۔

marfat.com

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ (اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا) غمام (ابر) غم (بمعنی چھپانے اور پوشیدہ کرنے) سے مشتق ہے اور ابر کو غمام اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ آفتاب کو چھپالیتا ہے یہ قصہ اس طرح ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کو قوم عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ہوا یہ تعمیل حکم میں جھجکے اور سستی کی اس پر انہیں ایک سنسان ہو کے میدان میں چالیس سال تک حیران و پریشان پھرنے کی سزا ملی آخر کار اس ہولناک میدان میں کہ جس میں نہ کوئی درخت سایہ دار تھا اور نہ کوئی سایہ کی شئے تھی بھٹکتے پھرے۔ سب نے موسیٰؑ سے شکایت کی، آپ کی مناجات پر حق تعالیٰ نے ایک پتلا پتلا سفید ابر بارش کے ابر میں سے سایہ کے لئے بھیجا اور ایک نور کا ستون مرحمت فرمایا وہ اندھیری راتوں میں روشن ہو جاتا۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ (اور ہم نے اتارا تم پر من) یعنی تیہ میں اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ من سے مراد ترنجبین ہے اور بعض نے کہا پتلی چپاتی۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ من گوند کی مثل ایک شئے ہے درختوں پر آ آکر گر جاتی تھی اس کا مزہ شہد کا سا ہوتا تھا۔ مروی ہے کہ اول اللہ تعالیٰ نے صرف مَنّ نازل فرمایا تھا جب کھاتے کھاتے انہیں بہت دن گزر گئے تو سب نے حضرت موسیٰؑ سے عرض کیا کہ حضرت اس من کی مٹھاس نے تو ہمیں تباہ کر دیا کہاں تک اسے کھائیں جناب باری میں دعا کیجئے کہ ہمیں گوشت کھلائے اس پر اللہ تعالیٰ نے سلویٰ نازل فرمایا۔

وَالسَّلْوٰى (اور سلویٰ) سلویٰ اکثر مفسرین کے نزدیک ایک پرندہ ہے جو بٹیر کے مشابہ ہوتا ہے اور بعض نے کہا خود بٹیر ہی تھا اور اس کے نزول کی یہ کیفیت ہوتی کہ اللہ تعالیٰ ایک ابر بھیجتا اس میں سے طلوع آفتاب تک نیزہ برابر طول اور میل بھر عرض میں سلویٰ برابر برستا، ہر ایک شخص اس میں سے ایک دن رات کی قدر اٹھالیتا اور جمعہ کے روز دو دن کی قدر کیونکہ ہفتہ کے دن کچھ نہ برستا تھا۔ اور ہم نے ان سے کہہ دیا۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں دیں) طیبات حلال اور لذیذ چیزیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ ہر روز جس قدر کھاسکو لیا کرو مگر دوسرے دن کے لئے ذخیرہ کر کے نہ رکھنا۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل نہ کی اور سینت سینت کر رکھنے لگے آخر کار وہ نعمت بند ہو گئی اور جو اٹھا رکھتے وہ خراب ہو جاتا۔ امام احمدؒ، بخاری اور مسلم نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو کھانا اور گوشت کبھی نہ سڑتا اور حواؑ نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے خاوند سے بے وفائی نہ کرتی۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا (اور ان لوگوں نے ہمارا تو کچھ نہ بگاڑا) اس میں اختصار ہے معطوف علیہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ پھر ان لوگوں نے نعمت کی ناشکری کر کے اپنا نقصان کیا اور ہمارا کچھ نہ کیا۔

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (لیکن کچھ اپنا ہی کھوتے رہے) اور اپنا نقصان اس طرح کیا کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ہوئے اور دنیا میں اپنا رزق کھویا جو بلا مشقت دنیوی اور بلا حساب اخروی انہیں ملتا تھا۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ (اور (وہ وقت) یاد کرو جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس گاؤں میں) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ھٰذِہِ القریۃ سے مراد "اریحا" ہے۔ قریۂ جبارین بھی یہی ہے اس میں قوم عاد کے بقیہ لوگ رہتے تھے جو عمالقہ کے نام سے مشہور تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ بیت المقدس مراد ہے۔ بعض نے کہا ایلیا بعض نے کہا شام۔

فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (اور اس میں جہاں چاہو با فراغت کھاؤ) رغداً یا تو مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یا فکلوا کی ضمیر سے حال ہونے کے سبب۔ حال ہونے پر یہ معنی ہوں گے کھاؤ جہاں سے چاہو اس حال میں کہ رزق تمہارے لئے وسیع ہے۔

وَّادْخُلُوا الْبَابَ (اور دروازہ میں گھسو) یعنی گانوں کے دروازوں سے کسی دروازہ میں داخل ہو۔ مروی ہے کہ ان گانوں کے سات دروازے تھے۔

سُجَّدًا (عاجزی کرتے ہوئے) یعنی عاجزی کرتے ہوئے جھکے جھکے جاؤ۔ وھب کہتے ہیں سجداً کے یہ معنی ہیں کہ

marfat.com

جب داخل ہو جاؤ تو حق تعالیٰ کو شکر کا سجدہ کرو۔

وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ (اور حطۃ کہتے ہوئے جاؤ) لفظ حطۃ مبتدا محذوف مسئلتنا کی خبر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے اللہ ہمارے گناہ معاف اور ساقط کر دے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہے کہ لا الہ الا اللہ کہو کہ یہ کلمہ بھی گناہوں کو حط یعنی ساقط کر دیتا ہے۔

نَّغۡفِرۡ لَـكُمۡ (تو ہم معاف کر دیں گے) غفر بمعنی ستر (پوشیدہ کرنا) سے مشتق ہے۔ نافع نے نغفرلکم کو یُغفرلکُم یا مضموم اور فتحہ فاء سے پڑھا ہے اور ابن عامر نے تاء مضموم سے اور سورۂ اعراف میں نافع عامر اور یعقوب تینوں نے تاء مضموم سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے نون مفتوح اور کسر فاء سے۔

خَطٰيٰكُمۡ‌ؕ (تمہارے قصور) خطایا اصل میں خطائی بروزن ذبائح تھا۔ یاء زائدہ کو ہمزہ سے بدل دیا تو دو ہمزہ جمع ہو گئے سیبویہ کے نزدیک اول ہمزہ کو ی سے بدل لیا اور خلیل کے نزدیک خطائی میں ہمزہ ی پر مقدم کر دیا خطائی ہو گیا۔ پھر دونوں صورتوں میں ی کو الف سے بدل لیا۔ اب ہمزہ دو الف کے درمیان واقع ہو گیا۔ اس لئے اسے ی سے بدلا خطایا ہو گیا۔

وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۵۸ (اور نیک بندوں کو ثواب زیادہ دیں گے) مطلب یہ ہے کہ اگر تم اطاعت کرو گے تو تم میں سے جو گناہ گار ہیں ان کے تو ہم گناہ بخش دیں گے اور جو پہلے ہی سے نیک ہیں ان کے لئے ثواب بڑھا دیں گے اور جملہ سَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ کو قولوا کے جواب سے علیحدہ اور مستقل اس لئے ذکر فرمایا تاکہ اس طرف اشارہ ہو جائے کہ نیکوکار تو اطاعت ضرور ہی کریں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ (تو بدل ڈالی شریر لوگوں نے وہ بات جو ان سے کہی گئی تھی) دوسرے لفظ سے بظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی کل بنی اسرائیل سے صادر نہیں ہوئی اس لئے بَدَّلُوۡا ضمیر راجع کر کے نہیں فرمایا۔ بلکہ ان میں سے بعض نے استغفار و توبہ کی بجائے جس کا حکم ہوا تھا لذائذ دنیوی کی طلب کے کلمات بدل دیئے تھے۔ علامہ بغویؒ نے اپنی سند سے بخاری کے طریق سے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ دروازہ میں سجدہ کرتے اور حطۃ کہتے ہوئے داخل ہونا سو انہوں نے حطۃ کو بدلا اور سُرین کے بل گھسٹتے ہوئے گئے اور بجائے حطّۃ کے حَبَّةٌ فِىۡ شَعۡرَةٍ (گیہوں جو میں) کہا۔

فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا (تو ہم نے ان شریروں پر نازل کیا) لفظ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مکرر ذکر فرمایا حالانکہ علیہم کافی تھا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ ان کی حالت قبیحہ کا پوری طرح معاینہ کرانا منظور ہے اور نیز یہ تنبیہ فرمانا مقصود ہے کہ یہ عذاب ان پر بوجہ ان کے ظلم کے نازل ہوا کیونکہ وہ بجائے طاعت کے نافرمانی کرتے اور اپنی ہلاکت کا خود سامان کرتے تھے

میں کہتا ہوں کہ اس طور پر بیان کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر علیہم فرماتے تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ تمام بنی اسرائیل پر عذاب نازل ہوا اور اب یہی سمجھا جاتا ہے کہ عذاب خاص مجرموں پر ہی نازل ہوا تھا۔

رِجۡزًا (عذاب) ابن جریر نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں لفظ (رجز وارد ہوا ہے اس سے مراد عذاب ہے اور لغت میں (رجز اور (رجس) اس شئے کو کہتے ہیں جس سے طبیعت کو گھن آئے اور نفرت ہو۔

مِّنَ السَّمَآءِ (آسمان سے) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ عذاب طاعون تھا کہ اس سے ایک ساعت میں ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے کہ طاعون ایک رجز ہے جو تم سے پہلوں پر نازل ہوا تھا (اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر طاعون آیا تھا)۔

بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ۝۵۹ (ان کی نافرمانی کی سزائیں)۔ ع ۶

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰى مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ اور (یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ

marfat.com

السلام) نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا (اے موسیٰ ؑ اپنا عصا مار۔ یہ قصہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل اس میدان لق ودق میں پیاسے تھے۔ مروی ہے کہ موسیٰؑ کا عصا جنتی آس کا تھا آپ کے قد کی برابر دس ہاتھ لمبا تھا اور اس میں دو شاخیں تھیں تاریکی میں روشن ہو جاتیں، اس عصا کو آدم جنت سے لائے تھے۔ حضرت آدم کے بعد انبیاء میں نسلاً بعد نسل چلا آیا حتیٰ کہ حضرت شعیبؑ کو مرحمت فرمایا۔

اَلْحَجَرَ (پتھر پر) اس میں لام عہد کا ہے (یعنی خاص پتھر مراد ہے) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ پتھر آدمی کے سر کے برابر بصورت مربع تھا۔ حضرت موسیٰ ؑ علیہ السلام اسے اپنے توبرہ میں رکھتے تھے۔ عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس پتھر کے چار گوشے تھے۔ ہر گوشہ میں سے تین چشمے نکلے بارہ گروہوں کے لئے بارہ چشمے نکل آئے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ پتھر وہی تھا جس پر موسیٰؑ نے غسل کرنے کیلئے کپڑے اتار کر رکھ دیئے تھے۔ پھر وہ پتھر کپڑے لے بھاگا تھا اور حضرت موسیٰ ؑ اس کے پیچھے دوڑے تھے حتیٰ کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر گزر ہوا انہوں نے آپ کی نسبت کہا تھا کہ انہیں ادرہ[1] کا مرض ہے اسی لئے پردہ کی بہت احتیاط کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان بند کرنے کے لئے حضرت موسیٰ ؑ کا بدن دکھلا دیا اور اسی وقت جبرئیلؑ تشریف لائے اور موسیٰ ؑ سے کہا، حکم الٰہی یہ ہے کہ اس پتھر کو اٹھالو اس میں میری ایک قدرت اور تمہارا ایک معجزہ ظاہر ہوگا۔ آپ نے اٹھا کر اپنے توبرہ میں رکھ لیا۔ اور اس پتھر کے بھاگنے کا قصہ بخاری و مسلم میں مذکور ہے مگر بخاری و مسلم میں یہ نہیں ہے کہ جبرئیل آئے اور یہ فرمایا الخ۔ عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ وہ طور کا پتھر تھا۔ بنی اسرائیل اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ پتھر کس نوع کا تھا بعض نے کہا سنگ مرمر تھا۔ بعض نے کہا سنگ کدان اس میں بارہ گڑھے تھے ہر گڑھے میں سے ایک شیریں چشمہ جوش زن ہوتا تھا جب ہر گروہ پانی سے سیراب ہو لیتا اور حضرت موسیٰ ؑ اسے اٹھانا چاہتے تو اس میں عصا مارتے تھے پانی بند ہو جاتا۔ وہ پتھر چھ لاکھ آدمیوں کو روزانہ سیراب کرتا تھا۔

وھب اور دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ الحجر میں الف لام جنس کا ہے یعنی کوئی خاص پتھر نہ تھا بلکہ یہ حضرت موسیٰ ؑ کا معجزہ تھا کہ جس پتھر پر عصا مارتے اس میں سے چشمے اُبل پڑتے۔ عطاء نے فرمایا حضرت موسیٰ ؑ بارہ جگہ اس پر بارہ دفعہ عصا مارتے تھے ہر جگہ سے ایک شئے عورت کے پستان کی مثل ظاہر ہوتی اور اس میں سے ذرا ذرا پانی رستا پھر تھوڑی دیر کے بعد نہریں پھوٹ پڑتیں۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾

(سو بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے (اور) ہر قوم نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا (اور ہم نے انہیں کہہ دیا) کھاؤ پیو اللہ تعالیٰ کی روزی اور نہ پھرو زمین میں فساد مچاتے) فانفجرت متعلق ہے کلام محذوف کے تقدیر کلام یہ ہے فَاِنْ ضَرَبْتَ اِنْفَجَرَتْ (یعنی اے موسیٰ ؑ اگر تم مارو گے تو بہہ نکلیں گے) یا تقدیر کلام اس طرح ہے فَضَرَبَ فَانْفَجَرَتْ یعنی حضرت موسیٰ ؑ نے عصا مارا تو بہہ نکلے۔ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ اِنْفَجَرَتْ اور اِنْبَجَسَتْ کے ایک معنی ہیں۔

ابو عمروؒ کہتے ہیں کہ انبجست کے معنی ہیں رسنے لگے اور انفجرت کے معنی ہیں بہہ نکلے بارہ چشمے ان کے گروہوں کی گنتی کے موافق تھے۔ مَشْرَبھم میں مَشْرَب ظرف مکان ہے۔ مطلب یہ کہ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ اختیار کر لیا۔ دوسرے کے گھاٹ پر کوئی نہ جاتا تھا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا یعنی من اور سلویٰ کھاؤ اور چشموں کا پانی پیو۔ مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ یعنی اگرچہ سب رزق اللہ تعالیٰ ہی کے دیئے ہوئے ہیں مگر اور رزقوں میں بظاہر تمہارے خیال میں تمہارے کسب کو بھی کچھ دخل ہے لیکن یہ رزق تمہیں بلا تمہاری مشقت کے ملتا ہے۔ عثی کے معنی سخت فساد کے ہیں مُفْسِدِیْنَ لَا تَعْثَوْا کا حال مؤکد ہے۔ بیضاویؒ کہتے

[1] درد فوطے بڑا ہوتا، ۱۲۔

marfat.com

ہیں کہ مفسدین کے لانے میں ایک جدید فائدہ یہ ہے کہ عثی سے مراد اگرچہ اکثر فساد ہی ہوتا ہے لیکن کبھی عثی کا مفہوم عدم فساد میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی ظالم جابر کا مقابلہ کرنا اور کبھی صلاح جو فساد کی ضد ہے کے ضمن میں متحقق ہوتا ہے جیسے خضر کا طفل معصوم کو قتل کرنا اور کشتی کو توڑ ڈالنا۔

میں کہتا ہوں[1] ممکن ہے کہ عثی سے مطلق تبذیر (فضول خرچی و اسراف بیجا) مراد ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں عثی کا استعمال اس معنی میں آیا ہے حدیث کے یہ لفظ ہیں قال لرسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم کسری و قیصر یعیثان فیما یعیثان فیہ وانت ھکذا یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ (یارسول اللہ ﷺ یہ کسریٰ اور قیصر مال کو خوب اڑا رہے ہیں اور آپ اس فقر و فاقہ کی حالت میں ہیں اس تقدیر پر مفسدین حال مؤکد نہ ہوگا بلکہ حال مقید ہوگا۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے کہا اے موسیٰ ؑ ہم تو ایک کھانے پر ہرگز نہ رہیں گے) طعام واحد ایک ایک کھانے سے مراد مَنّ اور سلویٰ ہے۔ واحد سے مراد وہ ہے جو تبدیل نہ کیا جائے یعنی دونوں وقت ایک ہی قسم کا کھانا ہو یہ مراد نہیں کہ ایک شئے ہو۔

فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا (پس مانگئے ہمارے لئے اپنے پروردگار سے کہ پیدا کردے) یخرج جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (ان چیزوں میں سے جنہیں زمین اگاتی ہے، سبزی، ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز) مِمّا میں من تبعیض کا ہے اور تنبت فعل ارض کی طرف مجازاً مسند کر دیا گیا ہے۔ گویا قابل (زمین) کو فاعل قرار دیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ فوم سے مراد اور رُوٹی ہے اور عطاءؒ کہتے ہیں کہ گیہوں مراد ہیں۔ من بَقْلِها میں مِنْ تبیین کے لئے یعنی مماتنبت کا بیان ہے قائم مقام حال اور بعض نے کہا ہے کہ مماتنبت سے باعادہٴ جار (من) بدل ہے۔

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی (موسیٰ ؑ نے کہا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے) قال میں ضمیر یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یا موسیٰ ؑ کی طرف۔ ادنیٰ سے خسیس اور ردی شئے مراد ہے اور دنو کے اصل معنی قرب مکانی کے ہیں لیکن یہاں حقارت کے لئے مجازاً استعمال کیا گیا ہے جیسے بعد کو کبھی شرف اور رفعت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ (اس چیز کے بدلے جو بہتر ہے) خیر سے مراد من اور سلویٰ ہے اور خیر اسے اس لئے فرمایا کہ نہ تو دنیا میں اس کے حاصل کرنے میں مشقت اور نہ آخرت میں اس کا کچھ حساب کتاب اور دنیا کی دوسری نعمتوں کے مقابلہ میں بدن کے لئے نہایت نافع۔

اِهْبِطُوْا مِصْرًا (اچھا) اتر پڑو کسی شہر میں) یعنی اگر تم نہیں مانتے تو کسی شہر میں جا اترو، ضحاک نے کہا ہے کہ شہر سے مراد فرعون کا شہر ہے۔ مصر ساکن الاوسط ہونے کے سبب منصرف ہے۔

فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ (تمہیں ملے گا جو کچھ تم مانگتے ہو اور لگا دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی) اس تقدیر پر تو ضُرِبَتْ، عَلَیْہِمُ القُبّۃ (کھینچ دیا گیا ان پر خیمہ) سے ماخوذ ہوگا اور یا یہ

---

[1] حدیث میں لفظ یعیثان آیا ہے یعیثان کا مادہ عیث ہے اور تعثو کا مادہ عثی ہے، اول اجوف یائی ہے اور دوسرا ناقص یائی۔ لغت میں دونوں ہم معنی ہے، ہم معنی ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ عثی عیث کا مقلوب ہے جیسے طمح طرح کا اور آرام، آرام کا حروف کے مکان کا قلب عربی الفاظ میں بکثرت وارد ہے شاید حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے عثی کی معنوی تحقیق میں لفظ یعیثان کو پیش کیا جس کا مصدر عیث ہے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کے نزدیک بھی عثی۔ عیث کا مقلوب ہے۔ واللہ اعلم

marfat.com

معنی کہ ذلت اور فقر لیس دیا اور چپکا دیا گیا۔ اس صورت میں ضربت ، ضُرِبَتِ الطِّيْنُ عَلَى الْحَائِطِ (مٹی دیوار پر لیس دی گئی) سے مشتق ہوگا۔ اس ذلت و محتاجی کی وجہ کفران نعمت تھی۔ مَسْكَنَةٌ فقر کو اس لئے کہتے ہیں کہ فقر آدمی کو نچلا بٹھا دیتا اور ساکن کر دیتا ہے، چلبلا پن اور اکڑ سب جاتی رہتی ہے۔ یہودیوں کی حالت دیکھو اگرچہ کیسے ہی مالدار ہوں لیکن فقیر و گدا گر معلوم ہوتے ہیں اور بعض نے کہا مسکنۃ سے مراد دل کا فقر اور مال کی حرص ہے۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (اور وہ لوٹے اللہ کے غضب میں یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے) باءوا بمعنی رجعوا (وہ لوٹے) اس لفظ کا استعمال شر کے سوا خیر میں نہیں آتا ذلک کا مشارُ الیہ غضب ہے بِاٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد انجیل اور قرآن اور تورات کی وہ آیتیں ہیں جو محمد ﷺ کی نعت میں ہیں۔

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ (اور نبیوں کو قتل کیا کرتے تھے) نافع نے النبین اور النبی، الانبیاء اور النبوۃ کو ہمزہ سے پڑھا ہے اور قالون نے سورۂ احزاب میں وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اور بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ میں النبی کو خاص وصل کی حالت میں بلا ہمزہ کے پڑھا ہے۔ جو قاعدہ دو ہمزہ مکسورہ کے جمع ہونے میں جاری کرتے ہیں وہی یہاں بھی جاری کرتے ہیں اور باقی قراء ان الفاظ میں کہیں ہمزہ نہیں پڑھتے جو لوگ ہمزہ پڑھتے ہیں ان کے نزدیک یہ الفاظ مہموز ہوں گے اور جو نہیں پڑھتے ان کے نزدیک بھی یا تو مہموز ہوں گے اور ہمزہ کو تخفیف اور کثرت استعمال کے سبب حذف کر دیتے ہیں اور یا ناقص اور نبوۃ (بمعنی مکان مرتفع) سے مشتق ہوں گے۔

بِغَيْرِ الْحَقِّ (ناحق) یعنی وہ انبیاء کے قتل کو اپنے اعتقاد کے اعتبار سے بھی ناحق سمجھتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے انبیاء سے کوئی ایسا امر نہ دیکھا تھا جو ان کے قتل کی اجازت دے، صرف نفسانی خواہش اور حب دنیا ہی اس کا باعث ہوئی اور بغیر الحق کے یہ معنی بیان کرنے کی ہمیں اس لئے ضرورت ہوئی کہ اگر یہ توجیہ نہ کی جائے تو پھر بغیر الحق (ناحق) کے کوئی معنی ہی نہ ہوں گے کیونکہ انبیاء کا قتل تو ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے کوئی بھی صورت ایسی نہیں جو ان کا قتل حق ہو۔ مروی ہے کہ یہود نے ایک دن میں ستر نبیوں کو قتل کیا تھا۔

ذٰلِكَ (اس کا مشار الیہ کفر اور قتل ہے اگرچہ ذلک سے ایک ہی چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے مگر یہاں بتاویل مذکور دو شئے یعنی کفر اور قتل کی طرف اشارہ کرنا جائز ہو گیا (اور معنی یہ ہوں گے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا یعنی کفر اور قتل نافرمانی کے سبب ہوا الخ) اور ذلک سے دو چیزوں کی طرف اشارہ کرنا اس لئے بھی جائز بلکہ احسن ہو گیا ہے کہ مضمرات اور مبہمات یعنی اسماء اشارات و اسماء موصولات کا تثنیہ اور جمع حقیقت میں تثنیہ اور جمع نہیں ہے اسی واسطے الذی بمعنی جمع آتا ہے۔

بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ (نیز) اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے) یعنی کثرت گناہ اور حد سے تجاوز کرنے کے سبب کفر اور انبیاء کے قتل تک کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اسم اشارہ یعنی ذلک کو اس لئے مکرر ذکر فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان پر غضب الٰہی کے نزول کا سبب جیسا کہ کفر ہوا اسی طرح معاصی اور حدود اللہ سے تجاوز کرنا بھی ہوا۔ ع ۷

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (جو ایمان لائے) ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ (ﷺ) پر زبانی ایمان لے آئے ہیں خواہ ایمان ان کے دلوں میں داخل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ اس تقدیر پر اس میں منافقین بھی داخل ہو گئے (۔اب اس تفسیر پر آگے جو مَنْ اٰمَنَ منھم الخ آتا ہے وہ مکرر نہ ہوگا کیونکہ اس سے مراد خالص مؤمن ہیں کما سیجئی ۔

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا (اور جو یہودی ہوئے) بمعنی تَهَوَّدُوْا چنانچہ هَادَ اس وقت بولتے ہیں جبکہ کوئی دین یہودیت میں آ جائے اور لفظ یہود تو عربی ہے ہاد بمعنی تاب (توبہ کی) سے مشتق ہے۔ یہود کو یہود یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے گوسالہ کی عبادت سے توبہ کی تھی۔ یا اس لئے کہ وہ مقولہ انا ھدنا الیک (اے اللہ ہم آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں) کے قائل ہوئے تھے۔ اور یا یہ لفظ یہودا کا جو یعقوب کے بڑے صاحبزادہ کا نام ہے معرب ہے، پھر پورے گروہ کو یہود کہنے لگے جیسا کہ

marfat.com

اکثر قبائل کے نام ان کے بزرگوں کے نام پر ہوتے ہیں۔

وَالنَّصٰرٰی (اور عیسائی) جمع ہے نصران کی جیسے ندامیٰ جمع ہے ندمان کی اور ی، نصرانی میں مبالغہ کی ہے جیسے لفظ احمری (بہت سرخ) میں بھی ی مبالغہ کی ہے۔ نصرانیوں کو یا تو اس لئے نصرانی کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نصرت کی تھی اور یا یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے ہمراہ موضع ناصرہ یا نصران میں آئے تھے۔

وَالصّٰبِـِٕيْنَ (اور بے دین) اہل مدینہ نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے ہمزہ سے صبوء کے اصلی معنی خروج (نکلنا) ہیں اور صَبَأَ فلان اس وقت عرب بولتے ہیں جب کوئی ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہو جائے اور صَبَأَ ناب البعیر (اونٹ کا دانت نکلا) اس وقت بولتے ہیں جب اونٹ کا دانت نکل آتا ہے اور فرقہ صابئین کو صابئین اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کسی دین میں بھی داخل نہیں ہر دین سے نکلے ہوئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ صابئین اہل کتاب ہی کی ایک قوم کا نام ہے لیکن یہ دونوں ان کے احکام میں اختلاف کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز اور مجاہد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صابئین اہل کتاب میں سے ایک قوم ہے ان کا دین مجوسیت اور یہودیت کے بین بین ہے اور کلبی کہتے ہیں کہ ان کا دین نصرانیت اور یہودیت کے درمیان میں ہے نہ پورے نصرانی نہ بالکل یہودی۔ قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صابئین اس قوم کا نام ہے جو زبور پڑھتی اور فرشتوں کی عبادت کرتی ہے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتی ہے انہوں نے ہر دین میں سے کچھ کچھ حصہ لے کر ایک علیحدہ دین قائم کیا ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (ان میں سے جو لوگ اللہ اور آخرت کے روز پر ایمان لائے) ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ اور محمد ﷺ اور قیامت کے دن پر زبان اور دل دونوں سے ایمان لائے ہیں اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا میں اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے امت محمد ﷺ کے خالص مؤمن مراد ہیں اور بعض نے کہا پہلی امتوں کے مؤمن مراد ہیں (بعض نے کہا) وہ لوگ مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ایمان لا چکے تھے اور دین حق کی تلاش و جستجو میں تھے جیسے حبیب نجار، قیس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، البراء الشنی، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، بحیرا راہب اور وفد نجاشی۔ ان میں سے بعض نے تو اپنا مقصود حاصل کر لیا یعنی نبی اکرم ﷺ کی دولت محبت سے مشرف ہو کر آپ کے جاں نثاروں میں شامل ہوئے اور بعض یہ آرزو اپنے ساتھ لے کر پہلے ہی راہی ملک عدم ہوئے۔ خطیب نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت موسیٰ کے دین پر منسوخ ہونے سے پہلے قائم تھے ان سب تفسیروں پر مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ الخ سے وہ لوگ مراد ہوں گے جو ایمان پر مرے میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ الخ سے وہ لوگ مراد ہوں جن کا ایمان تصفیہ و تزکیۂ قلب و قالب سے کامل و منور ہو گیا ہے اور وہ حضرات صوفیہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے تم میں سے کوئی کامل مؤمن نہ ہو گا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، احمد نسائی اور ابن ماجہ نے انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے تم میں سے کوئی مومن نہ ہو گا جب تک اس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ جو اپنے لئے چاہتا ہے وہی دوسرے کے لئے چاہے۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، احمد ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا بندہ ایمان کی حقیقت پر نہیں پہنچتا جب تک کہ اپنی زبان پر غمگین نہ ہو (یعنی جب تک زبان سے نکلے ہوئے برے الفاظ پر غمگین نہ ہو) اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغویؒ کہتے ہیں ممکن ہے کہ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ الخ سے پہلے واؤ مقدر ہو اور آیت کے یہ معنی ہوں کہ اے محمد ﷺ جو لوگ آپ کے بعد ایمان لائیں گے۔

وَعَمِلَ صَالِحًا (اور نیک کام کرتے رہے) یعنی حق تعالیٰ کے امر کے موافق عمل کئے۔

marfat.com

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (تو ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے) اجر سے مراد وہ اجر ہے جس کا حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور وہ جنت، مراتب قرب اور چشمۂ تسنیم ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے مقرب لوگ سیراب ہوں گے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (اور نہ ان کو کسی قسم کا ڈر ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے) یعنی جس وقت کفار عقاب سے ڈریں گے اور کوتاہی کرنے والے اپنی عمر کے اکارت جانے اور درجات سے محروم رہنے پر غمگین ہوں گے اس وقت ان کے پاس نہ خوف کا گزر ہوگا نہ غم کی بازیابی مَنْ اٰمَنَ منهم میں من مبتدا ہے اور فَلَهُمْ اجرهم خبر۔ مبتدا خبر سے ملکہ جملہ اسمیہ ہو کر اِنَّ کی خبر ہے۔ اور یا اِنَّ کے اسم سے بدل ہے اور خبر اِنَّ کی اس صورت اخیرہ میں فلهم اجرهم ہوگی اور مسند الیہ یعنی اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا معنی شرط کو شامل ہے اس لئے فلهم اَجْرُهُمْ خبر پر ف لانا جائز ہو گیا۔ سیبویہ کے نزدیک خبر اِنَّ پر ف لانا ممنوع ہے۔ لیکن سیبویہ کے اس قول کی تردید میں آیت اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ کافی ہے کہ یہاں خبر اِنَّ پر صریح ف آرہی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور طور (پہاڑ) تم پر اٹھایا (لٹکایا) یہ عہد حضرت موسیٰؑ کے اتباع اور تورات پر عمل کرنے کا تھا طور سریانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ علامہ بغویؒ کہتے ہیں کہ یہ قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی تو موسیٰؑ نے اپنی قوم کو اس کے قبول کرنے اور ماننے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا حکم فرمایا وہ صاف انکار کر بیٹھے کیونکہ اس میں طرح طرح کے احکام شاقہ تھے اور شریعت موسوی نہایت سخت تھی اس انکار پر حضرت جبرئیل نے حق تعالیٰ کے حکم سے بنی اسرائیل کے پھیلاؤ کے موافق ایک پہاڑ کو اس کی جگہ سے الگ کو کے قد آدم بلند سائبان کی طرح ان کے سر پر لا کھڑا کیا اور کہہ دیا کہ اگر تم تورات کو نہ مانو گے تو یہ پہاڑ تم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قصہ کو اسی طرح نقل کیا ہے اور عطاءؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے سروں پر طور کو لا کھڑا کیا اور ایک آگ ان کے سامنے سے بھیجی اور دریائے شور پیچھے سے آیا اور حکم ہوا کہ قبول کرو ورنہ یہ چیزیں تمہیں ہلاک کر ڈالیں گی۔

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اور ہم نے کہا کہ (اسے مضبوطی سے پکڑے رہو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو۔ تاکہ تم بچ جاؤ) یعنی تورات پر عمل کرو تاکہ معاصی یا ہلاکت سے دنیا میں اور عذاب سے آخرت میں بچو یا یہ معنی کہ تورات پر اس امید سے عمل کرو تاکہ معاصی یا ہلاکت سے دنیا میں اور عذاب سے آخرت میں بچو یا یہ معنی کہ تورات پر اس امید سے عمل کرو کہ متقی ہو جاؤ۔ القصہ: جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ اب تو کوئی بچاؤ کی جگہ بھی نہیں تو جھٹ قبول کر لیا اور سجدہ میں گر پڑے اور اسی حالت میں لگے پہاڑ کو دیکھنے۔ اسی لئے یہود میں یہ طریقہ جاری ہو گیا کہ وہ اپنے آدھے چہرہ سے سجدہ کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم پر سے اسی سجدہ کی بدولت عذاب اٹھایا گیا ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ (پھر تم اس کے بعد پھر گئے (یعنی عہد کے پورا کرنے سے تم نے منہ پھیرا) تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی) فضل سے مہلت دینا اور عذاب کو مؤخر کرنا مراد ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل اگر محمد ﷺ کے وجود باجود کا فضل تم پر نہ ہوتا تو تم پر ضرور عذاب الٰہی نازل ہوتا کیونکہ حق تعالیٰ نے حضور سرور عالم ﷺ کو رحمت للعالمین بنایا ہے اس لئے حضور ﷺ کے وجود سراپا جود سے عذاب مؤخر کر دیا گیا اور دھنس جانے اور صورتیں بدل جانیکا عذاب اٹھا لیا گیا۔

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (تو بے شک تم خسارہ یاب ہوتے) یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو تم اب بھی خسارہ اور عذاب میں گرفتار ہوتے جس طرح کہ پہلے اگر اللہ کا حکم قبول نہ کرتے تو پہاڑ سے ہلاک کر ڈالے جاتے

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ (اور تم جان چکے ہو جنہوں نے ہفتہ کے

marfat.com

دن میں زیادتی کی) لفظ سبت کے معنی اصل میں قطع کے ہیں اور ہفتہ کو سبت یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو قطع کیا یعنی پیدا کیا یا اس لئے کہ یہود کو اس دن عبادت کے سوا اور کل کاموں سے قطع تعلق کرنے کا حکم ہوا تھا۔

یہ قصہ اس طرح ہوا تھا کہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں دریا کے کنارے ایک شہر آباد تھا اس میں ستر ہزار بنی اسرائیل تھے ان پر اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار حرام فرمایا تھا ان کی آزمائش کیلئے کل مچھلیاں دریا کے اوپر جمع ہو جاتیں اور اس کثرت سے جمع ہوتیں کہ پانی بھی دکھائی نہ دیتا اور ہفتہ کے سوا اور دنوں میں ایک مچھلی بھی نظر نہ آتی۔ جب انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو شکار کے لئے ایک حیلہ نکالا کہ لب دریا حوض کھود دیتے اور دریا سے پانی اور مچھلیاں آنے کیلئے نالیاں بنا لیتے جب ہفتہ کا دن ہوتا تو پانی کی موج سے مچھلیاں حوض میں آجاتیں اور حوض چونکہ گہرے خوب تھے اور پانی ان میں کم ہوتا تھا اس لئے وہ ان میں سے نکل نہ سکتی تھیں ہفتہ گزرتے ہی اتوار کو ان کا شکار کرتے اور بعض مفسرین نے کہا یہ حیلہ کرتے کہ جال اور کانٹے لگا دیتے مچھلیاں آکر اس میں پھنس جاتیں وہ اتوار کو نکال لیتے اور حیلہ والے تین قسم کے ہوگئے ایک وہ کہ خود حیلہ نہ کرتے اور اوروں کو منع کرتے، دوسرے وہ کہ خود تو حیلہ نہ کرتے مگر اوروں کو منع بھی نہ کرتے، تیسری قسم کے وہ لوگ جو حیلہ کرتے تھے۔ منع کرنے والے بارہ ہزار آدمی تھے۔ جب انہوں نے منع کرنے والوں کا کہنا نہ مانا تو داؤدؑ نے ان پر لعنت کی اور اللہ کا غصب نازل ہوا بندر بن گئے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۶۵﴾ (تو ہم نے انہیں کہا بن جاؤ بندر دھتکارے ہوئے) یہ امر تکوینی ہے نہ تشریعی۔

فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا (پس بنادیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت) نَکَل کے اصل معنی منع یعنی روکنے کے ہیں چونکہ عبرت صاحب عبرت کے لئے گناہوں اور ناشائستہ افعال سے روکنے والی ہوا کرتی ہے اس لئے اسے بھی نکال بولنے لگے۔ اور اسی وجہ سے قید کو بھی نکل بولتے ہیں کہ وہ اسیر کو فرار سے مانع ہے۔

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا (موجودہ اور گزشتہ لوگوں کے لئے) اس کے یا تو یہ معنی ہیں جو ہم نے (آیت کے ترجمہ میں) اختیار کئے ہیں اور اس صورت میں ما دونوں جگہ بمعنی من ہوگا۔ اور یا یہ معنی کہ ہم نے اس واقعہ کو ان کی گزشتہ اور آئندہ حرکات اور معاصی کی وجہ سے عبرت بنادیا۔ اس صورت میں ما اپنے معنی پر رہے گا اور لام تعلیل کا ہوگا اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کی عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے فَجَعَلْنَاهَا وَمَا خَلْفَهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا اس صورت میں حاصل یہ ہوگا کہ ہم نے اس واقعہ کو اور جو اس کے بعد اس کی عقوبت جو قیامت میں مرتب ہوگی ان کے موجودہ گناہوں کی وجہ سے عبرت بنادیا (اس میں سراسر تکلف ہے)۔

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾ (اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت) متقین سے امت محمد ﷺ کے متقی مومن مراد ہیں۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ (جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے) اس قصہ کا شروع تو اللہ نے دوسرے رکوع وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا الخ سے بیان فرمایا ہے اور یہاں اس مقام پر بقیہ قصہ ارشاد ہوتا ہے اور اس تقدیم و تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ اگر قصہ کو ترتیب سے بیان فرماتے تو من وجہ یہ سمجھا جاتا کہ قصہ مقصود ہے اس لئے آخر کو اول بیان فرمایا تاکہ یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو مستقل طور سے بنی اسرائیل کا کفران نعمت اور حکم الٰہی سے تمسخر کرنا اور اس میں کرید کرنا اور حکم پہنچنے پر تعمیل نہ کرنا بیان فرمانا مقصود ہے۔ قصہ اس طرح ہوا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص عامیل نامی مالدار تھا اور اس کا ایک چچازاد بھائی فقیر تھا اور عامیل کا اس چچازاد بھائی کے سوا کوئی وارث نہ تھا جب اس نے دیکھا کہ میرے سوا اس کا کوئی اور وارث نہیں اور آخر کار اس کا ترکہ مجھے ہی ملے گا تو لاؤ اس کا کام ابھی تمام کردو۔ اور سارا مال اپنے قبضہ میں لاؤ یہ سوچ کر اسے قتل کر ڈالا اور اس کی نعش کو ایک دوسرے گاؤں میں لے جا کر عین آبادی میں پھینک دیا پھر دوسرے دن اس کی جستجو و تلاش کرنے لگا اور کئی آدمیوں پر خون کا دعویٰ بھی کردیا۔ موسیٰؑ نے جب ان لوگوں کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے کہا ہم نے قتل نہیں کیا۔ موسیٰؑ بہت حیران ہوئے پھر ان

marfat.com

سب نے حضرت موسیٰؑ سے التجا کی کہ آپ جناب باری میں دعا فرمائیں کہ یہ معاملہ فیصل ہو جائے اور قاتل کا پتہ لگ جائے حضرت موسیٰؑ نے دعا کی حکم ہوا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ (اللہ تعالیٰ تمہیں حکم فرماتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو) بقرۃ، بقر بمعنی شق (چیرنا) سے مشتق ہے۔ بقرۃ کو بقرۃ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ زمین کو زراعت کے لئے چیرتی ہے۔

قَالُوْٓا (انہوں نے کہا)۔

اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ (کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو) گائے ذبح کرنے کے حکم کو اس لئے انہوں نے تمسخر قرار دیا کہ بھلا گائے ذبح کرنے اور قاتل معلوم ہونے میں کیا مناسبت وہ اسے دل لگی و تمسخر سمجھ گئے اور یہ نہ سمجھے کہ احکام الٰہیہ میں اسرار ہوا کرتے ہیں، عقول متوسط ان کے فہم سے قاصر ہوا کرتی ہیں۔ انہیں چاہئے تھا کہ فوراً تعمیل حکم کرتے۔ ھزوا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کیا تو ہمیں مسخرہ بناتا ہے۔ یا ھزوا کو بمعنی اسم مفعول نہ کہا جائے بلکہ مصدر کو خود اپنے ہی معنی پر رکھا جائے اس وقت یہ توجیہ کی جائے کہ مبالغہ کے لئے بجائے مھزوا، ھزوا کہہ دیا اس تقدیر پر یہ مطلب ہوا کہ اے موسیٰؑ کیا آپ نے ہمیں مذاق اور دل لگی سمجھ لیا۔ اور یا ھزوا سے پہلے لفظ اھل محذوف مانا جائے اس صورت میں یہ حاصل ہوگا کہ کیا ہمیں مسخری کرنے والے بنا رہے ہو۔ حفص نے ھزوا اور کفوا میں زاء اور فاء کو مضموم پڑھا ہے اور حمزہ نے فا اور زا کو ساکن کر کے پڑھا ہے اور حمزہ نے کفوا اور ھزوا کو وصل کی حالت میں ہمزہ سے پڑھا ہے اور وقف کی صورت میں ہمزہ کو واؤ سے بدل کر پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمۂ فاء اور زاء اور ہمزہ سے پڑھا ہے۔

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞ حضرت موسیٰؑ نے (کہا پناہ اللہ کی اس سے کہ میں نادان بن جاؤں) مطلب یہ ہے کہ ہنسی اور دل لگی اور جواب مطابق سوال نہ دینا تو جاہلوں کی عادت ہے جاہلوں سے اللہ کی پناہ میں ایسا کیوں ہوتا گویا اس کلام میں موسیٰؑ نے تمسخر کی تہمت کا انکار کر دیا۔ اعوذ باللّٰہ سے یہ ظاہر کر دیا کہ یہ تہمت استہزاء اور خاص کر مجھ پر کہ میں نبی برحق ہوں نہایت سخت اور عظیم ہے۔ جب ان لوگوں نے جانا کہ گائے ذبح کرنا اب ہم پر اللہ کی طرف سے آہی پڑا اور پہلے سے گائے کے ذبح کرنے اور اپنے مقصود کے حصول میں بُعد سمجھے تھے اس لئے یہ خیال ہوا کہ جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم ہوا ہے وہ کوئی بڑی عجیب گائے ہوگی اس لئے اس کی صفات کے طالب ہوئے اور یہ ان کی بڑی حماقت تھی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر یہ لوگ کوئی سی گائے لے کر ذبح کر دیتے تو کافی تھی لیکن انہوں نے اپنے آپ تنگی کی اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر تنگی و تشدد فرما دیا۔

اس حدیث کو حضرت سعید بن منصور نے عکرمہؓ سے مرسلاً روایت کیا ہے اور ابن جریر نے بسند صحیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کیا ہے ان کی اس پوچھ گچھ میں جو انہیں ایک خاص گائے ذبح کرنی پڑی خدا تعالیٰ کی ایک عجیب حکمت تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک مرد صالح تھا اور اس کا ایک صغیر سن لڑکا تھا اور اس کے پاس ایک گائے کا بچہ تھا جسے وہ اپنے مرنے سے پہلے جنگل میں لایا اور اللہ تعالیٰ سے مناجات کی۔ خداوندا میں اس گائے کے بچہ کو اپنے بیٹے کے جوان ہونے تک آپ کے پاس امانت رکھتا ہوں پھر اسے چھوڑ کر چلا آیا۔ اور آ کر مر گیا وہ بچھیا جنگل میں چرا کرتی جو اسے دیکھتا اس سے دور بھاگ جاتی جب وہ لڑکا جوان ہوا تو بڑا نیک اٹھا۔ والدہ کا بہت خدمت گزار بنا۔ رات کے تین حصے کر کے ایک میں سوتا، دوسرے حصہ میں نماز پڑھتا، تیسرے میں اپنی والدہ کے سرہانے بیٹھ جاتا اور سویرے جنگل سے لکڑیاں لا کر بازار میں فروخت کرتا اور اس کی قیمت کے تین حصہ کر کے ایک حصہ تو اللہ کی راہ میں دیتا اور ایک حصہ والدہ کو دیتا اور ایک میں آپ کھاتا پیتا۔ ایک دن اس کی والدہ نے کہا بیٹا تیرا باپ تیرے لئے ایک گائے میراث میں چھوڑ گیا ہے اور فلاں جنگل میں سپرد خدا ہے تو جا اور یہ کہہ کر آواز دے کہ اے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے معبود وہ گائے عنایت فرما دے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ جب تو اسے دیکھے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی کھال سے گویا سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور چونکہ وہ گائے بہت خوبصورت اور زرد رنگ تھی اس لئے لوگ اسے

marfat.com

سنہری گائے کہا کرتے تھے وہ جوان اپنی والدہ کے فرمانے کی بموجب اس جنگل میں آیا تو اسے چرتے دیکھ کر جس طرح ماں نے پکارنے کو کہا تھا پکارا، وہ گائے بحکم الٰہی دوڑ کر سامنے چلی آئی جوان گردن پکڑ کر کھینچنے لگا گائے بولی اے ماں کے خدمت گزار مجھ پر سوار ہو لے تجھے آرام ملے گا اس نے کہا میری والدہ کا یہی حکم ہے کہ گردن پکڑ کر لانا نہ کہ سوار ہو کر۔ گائے بولی اے جوان تو میرے کہنے سے سوار ہو جاتا تو پھر میں ہرگز تیرے قابو میں نہ آتی اور تیرا ماں کی اطاعت کے سبب وہ مرتبہ ہے کہ اگر تو پہاڑ کو حکم دے تو تیرے ساتھ چلنے لگے۔ القصہ وہ گائے لے کر اپنی ماں کے پاس آیا۔ ماں نے کہا بیٹا تو فقیر ہے دن کو لکڑیاں لانے رات کو قیام کرنے کی تجھ پر سخت مشقت و تکلیف ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اسے فروخت کر دے جوان نے قیمت پوچھی کہا تین دینار کو دے دی۔ (اس وقت گائے کی عام قیمت یہی تھی) ساتھ ہی یہی کہہ دیا کہ جب بیچنے لگے تو مجھ سے پوچھ لینا جوان اپنی مادر مہربان کے فرمانے کے بموجب گائے کو بازار میں لے گیا ادھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھلانے اور اس کو اس کی والدہ کی خدمت میں جانچنے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا آتے ہی اس نے قیمت پوچھی جوان نے کہا تین دینار مگر شرط یہ ہے کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ لوں فرشتہ نے کہا تو مجھ سے چھ دینار لے اور گائے مجھے دے دیں ماں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، اس نے کہا تو مجھے اگر اس کے برابر سونا بھی تول دے تو میں بلا رضامندی اپنی والدہ کے نہ دوں گا یہ کہہ کر اپنی ماں کے پاس آیا اور کیفیت بیان کی ماں نے کہا جاؤ چھ ہی دینار کو دے دینا مگر خریدار سے میری رضامندی کی شرط کر لینا۔ جوان پھر بازار گیا اور اس سے ملا اس نے کہا تو نے اپنی والدہ سے پوچھ لیا کہا ہاں پوچھ لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ میری رضامندی کی شرط کر لینا اس خریدار غیبی نے کہا تو اپنی ماں سے نہ پوچھ اور مجھ سے بارہ دینار لے جوان نے انکار کیا اور اپنی ماں کے پاس آیا اور سارا قصہ بیان کیا ماں نے کہا وہ فرشتہ ہے تیرا امتحان لیتا ہے اب اگر اس سے ملنا ہو تو یہ پوچھنا کہ ہم اسے فروخت کریں یا نہ۔ جب وہ بازار گیا اور اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے بیچنے کی بابت دریافت کیا اس نے کہا اپنی والدہ سے کہنا کہ اسے ابھی فروخت نہ کرنا چنانچہ انہوں نے اسے فروخت نہ کیا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر یہ امر مقدر فرما دیا تھا کہ یہ فلاں گائے ذبح کریں گے اس لئے وہ اس کی اوصاف حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھتے رہے اور اللہ تعالیٰ اس گائے کے اوصاف بیان فرماتا رہا حتیٰ کہ اس کے تمام و کمال اوصاف بیان کر دیئے گئے یہ سب اس جوان کی نیک نیتی اور اپنی والدہ کی خدمت کا ثمرہ تھا اور اللہ تعالیٰ کا اس پر فضل و رحم تھا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ط (کہنے لگے پوچھ ہمارے رب سے بیان فرما دے ہمیں کہ وہ کیسی (گائے) ہے) لفظ ما سے اکثر جنس سے سوال ہوتا ہے اور یہاں جنس معلوم تھی جانتے تھے کہ گائے ہے لیکن یہاں اس کی حالت دریافت کرنی منظور ہے اور بظاہر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ای بقرۃ (وہ کونسی گائے) کَيْفَ هِيَ (وہ کیسی ہے) استعمال فرماتے لیکن ان الفاظ کے ترک کرنے اور مَا هِيَ کے اختیار کرنے میں یہی وجہ ہے جو پہلے گزر چکی کہ بنی اسرائیل اسے بہت عجیب سمجھتے تھے کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ گائے ذبح کرنے سے قاتل کا پتہ لگ جائے وہ اپنے جی میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ کوئی عجیب گائے ہوگی جس کی تمام گایوں سے شان نرالی ہوگی گویا کہ وہ گائے کی جنس ہی نہ ہوگی بلکہ کچھ اور ہوگی صرف برائے نام گائے ہوگی اس لئے یہ قرار دے کر کہ انہیں اس کی حقیقت ہی معلوم نہیں لفظ ما ہی استعمال کیا۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ (حضرت موسیٰ نے (کہا (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے) یقول انھا میں ضمیر ھا اس گائے کی طرف راجع ہے جس کا حکم ہوا تھا۔ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ اس گائے کی طرف ضمیر راجع ہونے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے انہیں ایک خاص گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا اور اس صورت میں وقت خطاب سے بیان کی تاخیر لازم آتی ہے اور یہ جائز نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ وقت خطاب سے بیان کی تاخیر جائز ہے البتہ وقت حاجت سے تاخیر نہ ہونی چاہئے نیز ضمیر کے راجع ہونے سے تعیین ہرگز معلوم نہیں ہوتی کیونکہ مطلق اطلاق پر دلالت کرتا ہے سو ضمیر سے اتنا سمجھا جاتا ہے کہ ایک گائے ذبح کر و اور وہ مطلق ہے تعیین کہاں سمجھی گئی۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل کوئی سی ایک گائے ذبح کر دیتے تو کافی تھا۔ ہاں اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی مطلق کا اول حکم ہو تو

marfat.com

اس کی تقیید جائز ہے اور یہ تقیید اگر اطلاق سے کچھ مدت بعد ہو گی تو نسخ کے حکم میں ہو گی اور اور نسخ ادا سے پہلے جائز ہے۔ چنانچہ شب معراج میں پچاس نمازیں واجب ہوئی تھیں پھر اسی وقت منسوخ کر دی گئیں اور اگر مطلق اور اس کی تقیید میں کچھ مدت فاصل نہ ہو تو یہ تقیید تخصیص ہو گی جیسا کہ آیت فصیام ثلثۃ ایام میں ابن مسعودؓ کی قراءہ میں لفظ متتا بعات زیادہ ہے تو یہ لفظ ثلثۃ ایام کا مخصص ہو جائے گا اور اسی بناء پر امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ اگر مطلق اور مقید دو واقعوں میں ہوں تو مطلق کو مقید پر حمل نہ کریں گے جیسا کہ کفارۂ ظہار میں تحریر رقبہ (آزاد کرنا ایک غلام کا) اور کفارۂ قتل میں مؤمنہ کی قید زیادہ ہے تو ہر ایک پر عمل کریں گے مطلق کی جگہ مطلق پر، مقید کی جگہ مقید پر عمل اور جو مطلق و مقید ایک واقعہ میں ہوں اور تقیید و اطلاق اسباب کے اندر ہوئی ہو تو اس صورت میں بھی دونوں پر عمل کریں گے چنانچہ حدیث میں صدقۂ فطر کے باب میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "صدقۂ فطر ہر آزاد کی طرف سے ادا کیا کرو"۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ "غلام مسلمان اور آزاد مسلمان کی طرف سے دیا کرو"۔ تو حنفیہ ان دونوں پر عمل کرتے اور مسلمان اور کافر دونوں کی طرف سے دیتے ہیں۔ مسلمان غلام کی طرف سے تو ہر دو حدیث کی وجہ سے اور کافر غلام کی طرف سے اول حدیث کی وجہ سے البتہ اگر ایک ہی حکم اور ایک ہی واقعہ میں مطلق اور مقید وارد ہوں تو مطلق کو مقید پر حمل کریں گے کیونکہ ایسے موقع پر دونوں کو کسی طرح جمع نہیں کر سکتے اور مطلق میں تقیید کا احتمال موجود ہی ہے اس لئے حنفیہ نے قسم کے کفارہ میں روزوں کے اندر پے در پے ہونے کی شرط کی ہے۔

ابن جریرؒ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (اللہ کے لئے لوگوں پر خانۂ کعبہ کا حج ہے) نازل ہوئی تو عکاشہ بن محصنؓ نے سرور عالم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہر سال حج فرض ہے۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر پوچھا۔ پھر بھی آپ نہ بولے۔ جب تیسری دفعہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہر سال فرض نہیں اور فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا اور تم سے ہو نہ سکتا۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلق میں تقیید کا احتمال ہے۔

لَّا فَارِضٌ (نہ بوڑھی) یعنی نہ ایسی بوڑھی ہو کہ بچہ دینے کے قابل نہ رہی ہو۔ گائے جب بچہ دینے کے قابل نہیں رہتی تو عرب فرضت البقرۃ فروضا (گائے بوڑھی ہو گئی) بولتے ہیں اور یہ لفظ فرض بمعنی قطع سے مشتق ہے بوڑھی کو فارض کہنے کی وجہ یہ ہے کہ گویا اس کی عمر کے برس منقطع ہو گئے۔

وَّلَا بِكْرٌ ۭ (اور نہ بن بیاہی) یعنی نہ ایسی چھوٹی ہو کہ بچہ دینے کے قابل بھی نہ ہو۔ "ب ک ر" کی ترکیب اولیت کے واسطے ہے۔ جس کلمہ میں یہ حرف ہوں گے اس میں اولیت کے معنی پائے جائیں گے چنانچہ باکورہ اس پھل کو کہتے ہیں جو پہلے پہل اترے۔ فارض اور بکر سے تائے تانیث اس لئے حذف کر دی گئی کہ یہ دونوں صفتیں مؤنث کے ساتھ مختص ہیں جیسا کہ لفظ حائض سے حذف کر دی گئی ہے۔

عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ (ان دونوں میں بیچ کی راس) اخفش نے کہا ہے کہ عوان اس مادہ کو کہتے ہیں جو کئی دفعہ بچے دے چکی ہو چنانچہ عونت المرۃ (عورت ادھیڑ ہو گئی) عرب اس وقت بولتے ہیں جبکہ عورت کا سن تیس سے متجاوز ہو جائے۔ ذلک کا مشار الیہ بتاویل مذکور فارض اور بکر ہے کیونکہ بین ہمیشہ متعدد کی طرف مضاف ہوا کرتا ہے۔

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝۶۸ (اب کرو جو تمہیں حکم دیا گیا) ما یا تو موصولہ ہے یا مصدریہ اگر موصولہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ "جس شئے کا حکم کئے جاتے ہو اسے کرو" اور اگر مصدریہ ہو تو مصدر کو اسم مفعول کی تاویل میں کریں گے اور معنی یہ ہوں گے کہ "اپنے امر شدہ حکم کو بجا لاؤ"۔ ان لفظوں میں امتثال امر الٰہی پر تحریض و ترغیب اور بار بار سوال کرنے پر تہدید و توبیخ ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا

(وہ کہنے لگے ہمارے لئے اپنے رب سے دریافت کرو کہ ہمیں اچھی طرح سمجھا دے کہ اس کا کیا رنگ ہے (موسیٰ علیہ السلام

marfat.com

نے) کہا (خدا) فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے زرد ہے اور اس کا رنگ خوب گہرا ہے) لفظ فاقع۔ صفراء کی تاکید ہے۔ اور لونہا فاعلیت کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ فاقع کے معنی گہری زردی کے ہیں اور حسن نے کہا زردی سیاہی مائل۔
میں کہتا ہوں کہ فاقع کے معنی زردی سیاہی مائل کے نہیں ہیں کیونکہ فقوع خالص زردی کو بولتے ہیں اور اسی لئے فاقع کو اس کی تاکید کہا گیا جیسا کہ اسود حالک (کالا بھجنگ) احمر قانی (گہرا سرخ) اخضر ناصر (خوب سبز) ابیض تفق (بہت سفید) مبالغہ کے لئے بولتے ہیں۔
تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴿۶۹﴾ (دیکھنے والوں کو بھلی لگتی ہو) یعنی ایسی گہری زردی ہو کہ دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہو۔ سرور اصل میں اس لذۃ قلبی کا نام ہے جو کسی نفع کے حاصل ہونے یا حاصل ہونے کی امید سے پائی جائے۔
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ (بولے اپنے رب سے ہمارے لئے پوچھو کہ ہمیں اچھی طرح سمجھادے کہ وہ کس قسم میں ہے) یہ پہلے ہی سوال کی تکرار ہے جو مزید انکشاف کی طلب کے لئے کیا ہے۔
اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا (ہمیں گایوں میں شبہ پڑ گیا) یہ مکرر سوال کرنے کا عذر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن صفات کی گائے ارشاد ہوئی ہے اس جیسی بکثرت پائی جاتی ہیں اس لئے ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی گائے سے ہمارا مقصود حاصل ہوگا اور تشابهت مؤنث کا صیغہ اس لئے نہیں استعمال کیا کہ لفظ بقر مذکر ہے (اگرچہ مراد مؤنث ہے)۔
وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ﴿۷۰﴾ (خدا نے چاہا تو ہم ٹھیک پتہ لگالیں گے) یعنی اگر خدا نے چاہا تو ہم ایسی گائے ذبح کرنے کی طرف راہ یاب ہوں گے یا یہ مطلب کہ ہمیں قاتل مل جائے گا۔ آیت وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ سے ہمارے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جہاں جو واقعات ہوتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوتے ہیں۔ معتزلہ اور کرامیہ نے یہ مستنبط کیا ہے کہ ارادہ خداوندی حادث ہے۔ اہل سنت کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ میں تعلیق باعتبار تعلق ہے (یعنی ارادہ جو جناب باری کی صفت ہے وہ تو قدیم ہی ہے لیکن واقعات کے ساتھ اس کا تعلق حادث ہے) جناب سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰت والتحیات نے فرمایا ہے کہ اگر بنی اسرائیل لفظ ان شاء اللہ نہ کہتے تو ابدالآباد تک اس گائے کا پتہ نہ چلتا۔ اس حدیث کو بغوی نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور ابن جریرؒ نے اس کی سند کو معضل کہا ہے۔
قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا (خدا) فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے نہ تو محنت والی اور نہ زمین جوتتی اور نہ کھیتی کو پانی دیتی صحیح و سالم بے داغ (بے دھبہ) لاتسقی الحرث میں لا زائد ہے۔ یہ دونوں فعل یعنی تثیر اور لاتسقی، ذلول کی صفت ہیں۔ مسلمة کے یا تو یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عیوب سے صحیح و سالم رکھا ہو یا یہ مطلب کہ اس گائے کے مالک نے اسے کام لینے سے سلامت رکھا ہو۔ جو رنگ کھال کے رنگ کے مخالف ہو سے شیة بولتے ہیں، عدة کی وزن پر وشی یشی کا مصدر وشی اور شیة ہے۔ جب کسی شئے کے رنگ کے ساتھ دوسرا رنگ ملا دیا ہو تو اسے وشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جزری نے کہا ہے کہ وشی کے معنی نقش کرنے کے ہیں۔
قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ (وہ بولے ہاں اب تم ٹھیک پتہ لائے) یعنی اے موسیٰ علیہ السلام تم نے اب پوری حقیقت اس گائے کی بیان کی ہے۔ القصہ بنی اسرائیل ایسی گائے کی ٹوہ میں لگے اور بہت تلاش و جستجو کی کہیں ایسی گائے نہ ملی آخر الامر نہایت کدوکاوش کے بعد وہ گائے اسی جوان کے پاس ملی کہ جس کا قصہ ابھی بیان ہوا ہے اور اس کی کھال بھر سونا دیا اور اسے خریدا۔ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ﴿۷۱﴾ (سو انہوں نے ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ کریں گے) یعنی ان کے بار بار پوچھنے اور آپس میں اختلاف کرنے یا قاتل کے ظاہر ہونے سے جو رسوائی ہوتی اسی کے خوف سے یا ایسی صفات کی گائے نہ ملنے کے سبب یا اس کی قیمت کی گرانی سے یہ معلوم ہوتا تھا، کہ بنی اسرائیل گائے ذبح نہ کریں گے۔ ع ۸
وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا (اور وہ وقت یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا یہ اس قصہ کا شروع ہے اور اس سے

marfat.com

پہلے جو بیان ہوا وہ اس کے بعد کا واقعہ ہے۔

فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡهَا ؕ (پھر لگے تم ایک دوسرے پر دھرنے) یعنی اس قصہ کو تم میں سے ایک دوسرے کے سر دھرتا تھا اور خود اپنے کو بری کرتا تھا۔

وَاللّٰهُ مُخۡرِجٌ (اور اللہ کو اس کا فاش کرنا تھا) صیغۂ اسم فاعل بمعنی مستقبل ہے کیونکہ کلام کرنے کے وقت زمانۂ آئندہ کی حکایت ہے اسی واسطے اسے عمل دیا گیا ہے جیسے باسط ذراعیہ میں باسط کو عمل دیا گیا ہے کیونکہ وہ حال ماضیہ کی حکایت ہے۔

مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۷۲﴾ (جو تم چھپاتے تھے) یعنی قاتل قتل کو چھپاتا تھا۔

فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ (تو ہم نے کہا مار اس (مردے کو) ادّٰرأتم پر عطف ہے اور ان دونوں کے درمیان کلام جملہ معترضہ ہے اور اضربُوہُ میں ضمیرہ بتاویل شخص نفس کی طرف راجع ہے۔

بِبَعۡضِهَا ؕ (اس گائے کے ایک ٹکڑے سے) مطلب یہ ہے کہ مردے کو گائے کے ٹکڑے پارچہ سے خواہ کوئی ٹکڑا پارچہ ہو مس کردو (یعنی گائے کا پارچہ لے کر اس مردے سے چھوادو) اور بیان کلام میں اختصار ہے تقدیر عبارت یہ ہے فضر ب فحیی یعنی مردے کو ارشاد کے موافق گائے کے ٹکڑے سے لگایا تو وہ زندہ ہو گیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس ہڈی کو لگایا تھا جو غضروف کے متصل ہے اور وہ ایسا مقام ہے کہ وہاں کی چوٹ لگنے سے جاندار بے جان ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا دُم کی ہڈی سے لگایا تھا اور بعض نے کہا زبان سے اور بعض نے کہا دائیں ران لگائی تھی۔ الحاصل وہ مقتول بحکم الٰہی اٹھ کھڑا ہوا اس کے حلقوم کی رگیں خون میں تربتر تھیں اٹھتے ہی بول پڑا کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے یہ کہہ کر پھر مردہ ہو کر گر پڑا اور اس کا قاتل میراث سے محروم رہا۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ کوئی قاتل اس گائے والے قاتل کے بعد اپنے مقتول کا وارث نہیں ہوا۔

كَذٰلِكَ (اسی طرح) ذٰلِکَ سے اس مقتول کے زندہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ (اللہ تعالیٰ مردے جلاتا) یہ یا تو ان لوگوں کو خطاب ہے جو اس مقتول کے زندہ ہونے کے وقت موجود تھے اور یا اس آیت کے نزول کے وقت جو لوگ تھے انہیں ارشاد ہے اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی لوگوں کو ارشاد ہے جو اس واقعہ میں موجود تھے کیونکہ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۳﴾ (اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے شاید تم سمجھ جاؤ) حاصل تمام آیت کا یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل کے احمقو! دیکھو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس مردہ کو زندہ کر دیا اسی طرح مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم اس سے سمجھ لو کیونکہ جو ایک مردہ کے زندہ کرنے پر قادر ہے وہ اسی طرح تمام مردوں کے جلانے پر قدرت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اس مردہ کو پہلے زندہ نہ کیا اور اس میں یہ شرطیں لگائیں تو اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ کسی کام کو بلا کسی ظاہری سبب کے ظہور میں نہیں لاتے اور نیز یہ وجہ ہے کہ اس طرح کرنے میں بندوں کو اپنے مولیٰ سے تقرب اور ایک واجب ادا کرنے کا ثواب اور ایک یتیم کا نفع ہو اور اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طالب کو چاہئے کہ قرب الٰہی طلب کرے اور قرب والے کو چاہئے کہ اچھی سے اچھی شئے خدا کی راہ میں خرچ کرے اور اس کی قیمت دل کھول کر لگائے۔ ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک نہایت عمدہ اونٹنی قربانی کی جسے تین سو دینار کو خریدا تھا۔

ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ (پھر سخت ہوگئے تمہارے دل) قَسَاوۃ اصل میں اس منائی کو کہتے ہیں جو سختی دکر خشکی لئے ہوئے ہو اور یہاں رحمت و نرمی اور خیر کا دلوں سے نکل جانا مراد ہے اور ایسے ہی قساوہ پر طول آرزو ذکر سے نسیان اور شہوات

marfat.com

نفسانیہ کے اتباع کے پھل پھول لگتے ہیں۔ اور کلمۂ ثُمَّ (پھر) یہاں بعد مکانی کے لئے نہیں بلکہ اس لئے ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اتنی رقت اور نرمی کے اسباب دیکھنے پر یہ قساوۃ ہے جو نہایت بعید ہے (جیسے کوئی کہے کہ میاں زید کو ہم نے ہر چند سمجھایا اس نے پھر بھی نہ مانا) تو یہاں لفظ ثم استبعاد کے لئے ہے نہ بعد مکانی کے لئے۔

مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ (اس کے بعد) یعنی مقتول کے زندہ کرنے اور تمام نشانیوں کے ظاہر کرنے کے بعد پھر تمہارے دل پتھر ہو گئے۔ کلبی نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد بھی بنی اسرائیل نے یہی کہا کہ ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔

فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ (کہ گویا وہ (سختی میں پتھر ہیں۔

اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً ‌ؕ (بلکہ سختی میں ان سے بھی زیادہ) اس کا یہ معنی ہے کہ ان کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں یا یہ کہ ان کے دل اس شئے کی مثل ہیں جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو۔ اس صورت میں اَشَدُّ سے پہلے لفظ مثل محذوف ہوگا اور مضاف الیہ یعنی اشد اس کے قائم مقام ہوگا اور لفظ اَشَدّ میں کہ جس کے معنی ہیں "بہت زیادہ شدید" اس قدر مبالغہ ہے کہ اقسی میں اتنا نہیں اور لفظ او (یا) یا تو تشبیہ میں اختیار دینے کے لئے ہے (یعنی یہ مراد ہے کہ اے مخاطب تجھے اختیار ہے کہ ان کے دلوں کو خواہ تو پتھر سے تشبیہ دے یا جو پتھر سے بھی زیادہ کوئی سخت شئے ہو اس سے تشبیہ دے دونوں صورتیں صحیح ہیں) اور یا تردید کے لئے ہے یعنی جو ان کے دلوں کے حالات کو پہچانتا ہو وہ انہیں پتھر سے تشبیہ دے گا یا پتھر سے بھی زیادہ سخت چیز سے اور مفضل علیہ یعنی حجارہ کی طرف ضمیر اس لئے راجع نہیں کی گئی کہ اس میں کسی قسم کا التباس نہ تھا خود ظاہر تھا اور حجارہ (پتھر) کے ذکر فرمانے اور دوسری سخت چیزوں مثلاً لوہا، کانسی وغیرہ کے ذکر نہ فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ پتھر کے سوا کل چیزیں آگ پر پگھل جاتی ہیں اور پتھر آگ پر نہیں پگھلتا۔ آگے بیان فرمایا ہے کہ قساوہ والے دل اور پتھر میں بڑا فرق ہے پتھر میں ایک طرح کی نرمی اور خیر پائی جاتی ہے اور قلب قاسی میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔

وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ‌ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ‌ؕ

(اور پتھروں میں تو بعض ایسے بھی ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹ کر نکلتی ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جھڑنے لگتا ہے) یعنی بعض پتھر تو ایسے ہیں کہ ان سے نہریں نکلتی ہیں اور بعض ایسے کہ ان سے سوتیں نکلتی ہیں اور پانی جھڑتا ہے جن سے خدا کے بندے فائدہ اٹھاتے ہیں بخلاف کفار کے دلوں کے کہ ان میں بالکل منفعت نہیں۔

وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ‌ؕ (اور بعض ایسے ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں) یعنی بعض پتھر ایسے ہیں کہ خدا کے خوف کے سبب پہاڑ سے نیچے آپڑتے ہیں۔ مگر اے کافرو! تمہارے دل ویسے کے ویسے ہی ہیں ان میں ذرا بھی نرمی اور خشوع نہیں آتا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ پتھر تو بے جان چیز ہے اس کو خوف خدا کیسے ہوتا ہے تو بیضاوی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ لفظ خشیتہ (خوف) کے معنی یہاں مجازی مراد لئے ہیں یعنی اوامر الٰہیہ کا اتباع اور انقیاد مراد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جواب کچھ نہیں ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اوامر سے بیضاوی نے اوامر تکوینیہ مراد لئے ہیں اور اوامر تکوینیہ کا انقیاد اور اتباع تو خود کفار میں بھی موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) چنانچہ کفار نے اس مہر لگانے کا اتباع کیا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا (اور اللہ کے لئے آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب طوعاً و کرہاً سجدہ کرتے ہیں) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں میں اس طرح ہیں جیسے ایک قلب وہ اس دل کو جس طرف چاہتا ہے پھیرتا ہے پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا مانگی اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الۡقُلُوۡبِ صَرِّفۡ قُلُوۡبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ (اے خدا دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر لے) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے پس اس حدیث و آیت سے یہ معلوم ہو گیا کہ انقیاد تکوینی سب میں موجود ہے خواہ کفار ہوں یا مسلمان۔

تحقیقی جواب وہ ہے جو علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے کہ جمادات اور حیوانات میں بھی اللہ

marfat.com

تعالیٰ کا عطاء کیا ہوا ایک علم ہے کہ اسے اس صاحب علم کے سواء کوئی اور نہیں جانتا اس لئے تمام جمادات و حیوانات دعا بھی کرتے ہیں اور تسبیح بھی اور خوف الٰہی بھی موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْئٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (یعنی ہر شئے اللہ کی پاکی اور حمد کرتی ہے) اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ دیکھو پرندے کیسی صف باندھے ہوئے ہیں ہر ایک اپنی عبادت اور تسبیح کو جانتا ہے۔ اس کی زیادہ تحقیق عذاب قبر کے بیان میں آیت ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ جناب سرور عالم ﷺ کوہ ثبیر پر جلوہ افروز تھے اور کفار حضور ﷺ کی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے کہ پہاڑ بول اٹھا یا نبی اللہ آپ مجھ پر سے اتر جائیے مجھے خوف ہے کہ کہیں کفار آپ کو پکڑ لیں اور مجھے اس کے سبب اللہ تعالیٰ عذاب کرے اور کوہ ثور نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ یہاں تشریف لے آئیے اور میرے پاس آئیے۔

اور نیز علامہ بغویؒ نے اپنی سند سے جابر بن سمرۃؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں مکہ کے اس پتھر کو خوب پہچانتا ہوں جو مجھے میرے نبی ﷺ ہونے سے پہلے سلام کیا کرتا تھا میں اسے اب بھی پہچانتا ہوں۔ یہ حدیث صحیح ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ آپ کو احد پہاڑ نظر پڑا تو فرمایا کہ یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم کو دوست رکھتا ہے اور ہم اس کو دوست رکھتے ہیں اور حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ ہمیں جناب رسول خدا ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی پھر نماز پڑھا کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ایک وقت کا واقعہ ہے کہ ایک شخص ایک بیل ہانکے لئے جاتا تھا جب چلتے چلتے تھک گیا تو اس پر سوار ہو لیا اور اسے مارا، بیل بول پڑا ہم سواری کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہم تو زراعت میں کام آنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ لوگ یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھ کر کہنے لگے سبحان اللہ بیل بھی باتیں کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اور ابو بکر و عمرؓ اس قصہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر و عمرؓ وہاں موجود نہ تھے اور نیز جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص اپنی بکریوں میں تھا کہ ناگاہ ایک بھیڑیئے نے بکری کو جا دبایا وہ ابھی پوری طرح اس کے قابو میں نہ آئی تھی کہ مالک جا پہنچا اور اسے چھڑا لیا بھیڑیا بول اٹھا اب تو تو نے چھڑا لیا مگر جس دن درندوں ہی کا تسلط ہوگا۔ اس وقت ان کا کون حامی و مددگار ہوگا اس دن ہمارے سوا کوئی اس کا چرواہا نہ ہوگا لوگوں نے سن کر کہا سبحان اللہ بھیڑیا بھی باتیں کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں اور ابو بکر و عمرؓ اس قصہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ وہاں موجود نہ تھے اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ فخر عالم ﷺ کوہ حرا پر تشریف فرما تھے اور حضرت ابو بکر و عمر و عثمان و علی و طلحہ و زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بھی حاضر تھے کہ ایک پتھر کو جنبش ہوئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ٹھیر جا تجھ پر سوائے ایک نبی ﷺ یا صدیق یا شہید کے اور کوئی نہیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ ہم مکہ میں جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ سو جب ہم مکہ سے باہر ادھر ادھر پہاڑوں اور درختوں میں گئے تو جس درخت یا پہاڑ پر ہمارا گزر ہوتا تھا وہ پکارتا تھا اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اور نیز صحیح مسلم میں جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ (منبر تیار ہونے سے پہلے) مسجد کے ایک ستون سے جو کھجور کی لکڑی کا تھا تکیہ اور سہارا فرماتے جب منبر تیار ہو گیا اور اس پر آپ جلوہ افروز ہوئے تو وہ ستون بے قرار ہو کر مثل اونٹنی کے رونے لگا حتیٰ کہ اس کی آواز مسجد والوں نے سنی۔ رسول اللہ ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اور اسے گلے سے لگایا وہ آپ کے گلے سے لگاتے ہی بالکل چپ ہو گیا (ان سب احادیث سے معلوم ہوا کہ جمادات میں بھی علم اور حیات ہے) علامہ بغویؒ کہتے ہیں کہ مجاہدؒ نے فرمایا جو پتھر اوپر سے نیچے آتا ہے وہ اللہ کے ڈر سے نیچے آتا ہے۔

وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ (اور اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو) یہ کفار کو دھمکی ہے۔ ابن کثیرؒ نے تَعْمَلُوْنَ کو یَعْمَلُوْنَ (یائے تحتانیہ سے) پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء سے پڑھا ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ (مسلمانو) کیا تم توقع رکھتے ہو کہ (یہود) تمہاری بات مان لیں گے

معجزہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

marfat.com

اَفَتَطْمَعُوْنَ یہ خطاب ہے تمام مؤمنین اور رسول اکرم ﷺ کو۔ یُّؤْمِنُوْا کی ضمیر یہود کی طرف راجع ہے لکم یعنی تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے یا یہ مطلب کہ تمہاری تصدیق کریں گے۔

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ (حالانکہ ان ہی میں ایسے لوگ بھی تھے جو اللہ کا کلام سنتے) کلام اللہ سے مراد توراۃ ہے۔

ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ (پھر اسے سمجھے پیچھے بدل ڈالتے) یعنی وہ اسے بلاشک وشبہ سمجھ گئے۔ اور پھر تحریف کر دی جیسا کہ ہمارے حضرت محمد ﷺ کی نعت اور رجم کی آیت میں تبدیل وتغیر کی۔

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ (اور وہ جانتے تھے) یعنی وہ اپنے جھوٹے ہونے کو خوب جانتے تھے۔ اس آیت کی یہ تفسیر تو مجاہد اور عکرمہ اور سدی وغیرہ رحمہم اللہ کے قول کے موافق ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد میں جو ایک فریق تھا انہوں نے کلام الٰہی سن سنا کر تحریف کر دی۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حسب حکم خداوندی ستّر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ گاہ کے لئے انتخاب کر لیا اور انہیں وہاں لے گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا پھر جب وہاں سے واپس آئے تو جو ان میں سچے تھے انہوں نے تو جس طرح سنا تھا اسی طرح قوم کو پہنچا دیا اور جن کے دلوں میں فساد تھا انہوں نے آکر یہ کہا کہ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر تم ان احکام کے کرنے کی طاقت رکھتے ہو تو کرو اور اگر نہ چاہو نہ کرو۔ پس یہی تحریف تھی حالانکہ وہ جانتے تھے کہ کلام الٰہی ایسا نہیں ہے۔

وَاِذَا لَقُوْا (اور جب ملتے ہیں) اس سے مراد وہ یہود ہیں جو لوگوں کو نیک بات بتاتے تھے اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے ان کا ذکر پہلے ہو بھی چکا ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (مسلمانوں سے) اس سے اہل مدینہ کے مومن مراد ہیں۔ مطلب اس تقدیر پر یہ ہے کہ جب مومنین نے جناب رسول اکرم ﷺ کے اتباع کی بابت یہود سے مشورہ کیا تو۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ (انہوں نے کہا ہم اپنے جی میں تصدیق کرتے ہیں) کہ یہ تمہارے رسول وہی ہیں جن کی نسبت توراۃ میں خوشخبری دی گئی ہے۔ تمہیں چاہئے کہ تم ان کا اتباع کرو اور ان پر ایمان لاؤ۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ منافقین یہود مراد ہیں اور حاصل آیت کا اس بنا پر یہ ہے کہ جب منافقین یہود مومنین خالص سے ملتے ہیں تو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری طرح خالص ایمان لے آئے۔

وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ (اور جب اکیلے ہوتے ہیں ایک دوسرے کے پاس) بعض سے کعب بن اشرف اور وہب بن یہود اور دیگر رؤساء یہود مراد ہیں۔

قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ (تو کہتے ہیں کیا تم کہے دیتے ہو مسلمانوں سے وہ علم جو اللہ نے تم پر ظاہر کیا تاکہ تم سے جھگڑیں اس کے ذریعہ تمہارے رب کے آگے) حاصل یہ ہے کہ جب آپس میں ایک جگہ تنہائی میں جمع ہوتے ہیں اور کوئی غیر نہیں ہوتا تو جو کافر اوروں کو ایمان کی ترغیب دیتے ہیں اور خود اپنے کو بھول گئے ہیں ان کو دوسرے کافر برا بھلا کہتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ اے بیوقوفو! ان سے ایسا بر تاؤ مت کرو اور محمد ﷺ کی نعت جو تورات میں اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے وہ ان لوگوں سے نہ کہو ورنہ قیامت میں اللہ کے سامنے ان کو یہ تمہارا کہنا ایک حجت ہو جائے گا۔ کہیں گے کہ اے اللہ یہ لوگ محمد ﷺ کی سچائی کو خوب جانتے تھے اور ہم کو ان کے اتباع کا حکم کرتے اور اس پر بھی کھلم کھلا اور پوشیدہ ہر حالت میں کفر کرتے تھے۔ بیضاوی نے اس موقع پر یہ کہا ہے کہ اس آیت کی اس تفسیر میں مجھے کچھ تامل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو عالم الاسرار ہے وہ تو دلوں کے حال کو خوب جانتا ہے اگر یہود مسلمانوں سے اس نعت محمدی اور مشورہ کو نہ بھی ظاہر کرتے جب بھی اللہ تعالیٰ اسے جانتا تھا کہ یہود دل میں تو محمد ﷺ کو سچا جانتے ہیں گو تعصب سے ایمان

marfat.com

نہیں لاتے پھر چھپانے سے کیا کار بر آری ہو سکتی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ بے شک یہ بات صحیح ہے کہ چھپانے سے کچھ کام نہ چل سکتا تھا لیکن وہ اپنی غایت بے وقوفی اور حماقت کی وجہ سے اس بات کو جانتے تھے اور یہی سمجھتے تھے کہ چھپانے سے یہ بات چھپ جائے گی۔ چنانچہ ان کا اسی جہالت اور حماقت سے بھرا ایک اور مضمون بھی دوسرے مقام میں حق تعالیٰ نقل فرماتا ہے وہ یہ ہے مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ (یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی پر کچھ نہیں اتارا) حالانکہ یہ جانتے تھے کہ تورات حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام پر نازل ہوئی ہے اور شروع پارہ میں اس قوم کے اور قصوں سے خود معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال وافعال کچھ ایسے غیر منضبط تھے کہ معجزات و آیات موسوی دیکھنے کے بعد بھی ان سے دیوانوں اور پاگلوں جیسی حرکتیں صادر ہوتی تھیں اور اس تہدید وتنبیہ پر بھی ان کے کان پر جوں نہ رینگتی تھی اور شروع پارہ میں اصحاب صیب (بارش والے) کے قصہ میں ہے کہ موت کے ڈر سے کڑک کے سبب کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔ حالانکہ یہ یقین ہے کہ کانوں میں انگلیاں دینا موت کو دفع نہیں کر سکتا۔

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾ (کیا تم سمجھتے نہیں) سے اس آیت کو ختم کرنا اور اس سے اگلی آیت اس کی تائید کے لئے کافی ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ کافروں نے منافقین سے کہا اے بیو قوفو! تم ان کو سب باتیں کیا اس لئے بتائے دیتے ہو کہ وہ یعنی اصحاب محمد ﷺ تم سے کتاب اللہ کے ذریعہ سے حجت کریں (یعنی دنیا میں) اب رہی یہ بات کہ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ کے کیا معنی ہوں گے سووہ آگے مذکور ہیں اور عِنۡدَ رَبِّكُمۡ کے معنی میں مجاز لینا پڑے گا یعنی کتاب اللہ سے حجت کرنے کو عِنۡدَ رَبِّكُمۡ سے تعبیر کر دیا ہے چنانچہ بولتے ہیں کہ یہ حکم اللہ کے نزدیک اس طرح ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ کتاب اللہ میں یہ حکم اس طرح ہے یا یہ کہا جاوے کہ ربکم سے پہلے مضاف لفظ کتاب یا رسول محذوف ہے یعنی عند کتاب ربکم یا عند رسول ربکم۔ بیضاوی نے گزشتہ تاویلات کو پسند کیا ہے اور اس آیت کو منافقین کا مقولہ بنایا ہے اور جو کھلم کھلا کافر تھے اور لوگوں کو اسلام لانے کا حکم کرتے اور خود اس سے روگرداں تھے ان کا مقولہ نہیں قرار دیا۔

میں کہتا ہوں کہ تاویلات لول تو سراپا تکلیفات ہیں اور مع ہذا معنی بن بھی نہیں سکتے کیونکہ مؤمنین کا منافقین سے حجت اور نزاع کرنا دنیا میں متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو بظاہر حق کے منقاد اور مطیع تھے اگر ان سے خصومت ہو سکتی ہے تو آخرت ہی میں ممکن ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ منافقین کی حرکات ناشائستہ پر جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کچھ عذاب چکھا دیا تو انہوں نے اس کا ذکر مؤمنین سے کر دیا اور پھر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تم پر عذاب کا دروازہ کھول دیا ہے کیا اس کا ذکر تم ان مؤمنین سے کرتے ہو یہ مناسب نہیں ورنہ قیامت میں حق تعالیٰ کے نزدیک حجت کریں گے یعنی اللہ کے نزدیک اپنے مرتبہ کو تم سے زیادہ دیکھیں گے اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (کیا تمہیں عقل نہیں) یعنی اے بے وقوف یہودیو! تمہیں اتنی سمجھ نہیں کہ مؤمنین کا احتجاج کرنا اللہ کے نزدیک اس پر موقوف نہیں کہ تم آپس میں یہ امور ایک دوسرے سے کہو یا خطاب مؤمنین کو ہے اس تقدیر پر اَفَتَطۡمَعُوۡنَ کے متعلق ہو گا اور معنی یہ ہوں گے اے مؤمنو! تم ان سے ایمان کی کیا طمع رکھتے ہو حالانکہ ان کے ایسے حالات تھے کیا تم کو اتنی سمجھ نہیں اور یا ان ہی لوگوں کا مقولہ ہے جو اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ الخ کے قائل تھے مطلب اس صورت میں یہ ہو گا تم سمجھتے نہیں کہ یہ تم سے حجت کریں گے۔

اَوَلَا يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾ (کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اَوَلَا يَعۡلَمُوۡنَ میں ضمیر ان کفار کی طرف ہے جن کا ذکر اول گزر چکا ہے جو اوروں کو ملامت کرتے تھے۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے یہ لوگ جو انہیں ملامت کرتے ہیں اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے ظاہر اور پوشیدہ سب امور کی خبر ہے پس ان کا محمد ﷺ کی نعت کو چھپانا کیا کام آسکتا ہے اور کیا ان سے احتجاج کو دفع کر سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ منافقین کی طرف ضمیر راجع ہو کیونکہ ان کے نفاق کی خبر اگرچہ جناب رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین کو نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ تو بخوبی جانتا تھا۔ یا تمام یہود کو مرجع ضمیر قرار دیا جاوے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے

marfat.com

چھپا کر کفر کرنے اور کھلم کھلا کفر کرنے اور نعت محمد ﷺ اور کلمات الٰہیہ کی تحریف اور تمام حرکات ناشائستہ کو جانتا تھا۔

وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ (اور بعض ان میں ان پڑھ ہیں کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے باندھی ہوئی آرزوؤں کے) لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ میں کتاب سے مراد توراۃ ہے اِلَّاۤ اَمَانِىَّ استثناء منقطع ہے۔ امانی جمع امنیہ کی ہے اصل میں امنیہ اس آرزو اور تمنا کو بولتے ہیں جسے انسان اپنے دل ہی دل میں پکاتا ہے۔ یہاں مراد امانی سے وہ جھوٹی باتیں ہیں جنہیں علماء یہود نے گھڑا تھا۔ مجاہدؒ اور قتادہؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ امانی جھوٹی باتوں کو کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ کا قول ہے۔ ماتمنیت منذ اسلمت (یعنی جب سے میں مسلمان ہوا ہوں جھوٹ نہیں بولا) یا مراد امانی سے آیت میں وہ من گھڑت آرزوئیں ہیں جو انہوں نے اپنے جی میں بلا دلیل و حجت پکار کہی تھیں چنانچہ کہا کرتے تھے لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَـنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى یعنی جنت میں یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی بھی نہ جاویگا اور کہتے تھے لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً کہ ہم کو جہنم کی آگ گنتی کے چند دن لگے گی۔ حسن اور ابو العالیہ نے اسی طرح فرمایا ہے یا یہ مطلب ہے کہ اہل کتاب توراۃ کو کچھ نہیں جانتے سوائے زبانی پڑھنے کے معانی اور مطالب تک رسائی نہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ یعنی جب پڑھتا ہے تو القا کرتا ہے شیطان اس کی قرائت میں یہ ابن عباسؓ کی تفسیر ہے۔ ابو جعفر نے لفظ امانی کو کل قرآن میں تخفیف یا سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے تشدید سے۔

وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ ۝۷۸ (اور یہ ان کا خیال ہی خیال ہے) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے گمان کی تقلید کرتے ہیں حقیقت کا علم انہیں خاک نہیں۔

فَوَيۡلٌ (پس وائے ہے) لفظ ’ویل‘‘ کے معنی حسرت اور ہلاکت کے ہیں۔

زجاج نے کہا ہے کہ ویل ایک کلمہ ہے جو ہلاکت میں پڑنے والا کہا کرتا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ویل کے معنی شدت عذاب کے ہیں اور سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ویل جہنم میں ایک وادی ہے اگر اس میں جہنم کے پہاڑ بھی جلائے جاویں تو وہ بھی ریت ہو جاویں اور یا شدت حرارت سے بالکل پگھل کر پانی کی طرح بہہ جاویں۔

علامہ بغویؒ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ویل جہنم میں ایک وادی ہے کہ کافر اس میں چالیس برس اترتا چلا جاویگا تب بھی اس کی تہہ تک نہ پہنچے گا اور صعود جہنم کی آگ کا پہاڑ ہے کہ اس پر کافر ستر برس تک چڑھایا جاویگا پھر وہاں سے اتنی ہی برسوں تک گرے گا۔

لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ (ان پر جو لکھتے ہیں کتاب) کتاب سے تحریف شدہ کتاب مراد ہے۔

بِاَيۡدِيۡهِمۡ (اپنے ہاتھوں سے) تاکید ہے جیسے کہہ دیا کرتے ہیں کہ میں نے یہ شئے اپنے ہاتھ سے لکھی ہے۔

ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا

(پھر کہہ دیتے ہیں یہ خدا کے ہاں سے ہے تاکہ لیویں اس کے ذریعہ سے تھوڑے سے دام) ثَمَنًا قَلِيۡلًا سے دنیا کا مال متاع مراد ہے اور قلیل اس لئے فرمایا کہ اس حرکت سے جس عذاب کے وہ مستحق ہوئے ہیں اس کی نسبت یہ دنیا کا مال و اسباب کچھ بھی نہیں اگرچہ دنیا میں اس کو بہت شمار کیا جاتا ہو۔ قصہ یہ تھا کہ علماء یہود یہ تو خوب جانتے تھے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نبی برحق ہیں مگر ایمان لانے سے اس لئے کھٹکتے تھے کہ اگر ایمان لے آئے تو یہ آمدنی جو ہم کو عام لوگوں سے ان کی مرضی کے موافق مسائل بتا بتا کر اور علم کی قدر دانی کے سبب سے ہو رہی ہے یہ سب گاؤ خورد ہو جاویگی اور نیز یہ بھی سوچتے کہ اگر عوام کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ توریت میں جو صفات نبی آخر الزماں کی لکھی ہیں وہ محمد ﷺ میں سب موجود ہیں تو سب کے سب مسلمان ہو جاویں گے اور ہماری کمائی سب جاتی رہے گی۔ اس لئے تورات میں جو صفت لکھی تھی اسے متغیر کر دیا۔ چنانچہ تورات میں جناب سرور کائنات فخر عالم رسول مقبول ﷺ کا حلیہ یہ لکھا تھا۔

النصف

marfat.com

خوبصورت اچھے بالوں والے، سرمگیں چشم، متوسط قد والے، اس کی جگہ ان ظالموں نے یہ لکھ دیا لمبے قد والے، نیلگوں چشم، چھدرے بالوں والے جب عام لوگوں نے ان نام نہاد علماء سے پوچھا کہ نبی آخر الزماں کا تورات میں کیا حلیہ لکھا ہے تو انہوں نے یہی متغیر شدہ الفاظ پڑھ دیئے، ان سب نے دیکھا کہ محمد ﷺ ان سب احوال سے جدا ہیں اس لئے تکذیب کرنے لگے

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝۷۹ (پس وائے ان پر ان کے ہاتھ کے لکھے سے اور وائے ان پر ایسے مال اور اعمال کی کمائی سے)۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (اور کہتے ہیں کہ ہم کو آگ چھوویگی بھی نہیں مگر گنتی کے چند روز) جلد کو کوئی شئے ایسی طرح پر لگے جو محسوس ہو اسے مس کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہود یہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کی ساری عمر سات ہزار برس کی ہے ہر ہزار برس کے عوض ایک دن ہم کو عذاب ہوگا اور قتادہ وعطاء فرماتے ہیں کہ یہود کی مراد وہ چالیس دن ہیں جن میں ان کے آباؤ اجداد نے گوسالہ کی عبادت کی تھی حسن اور ابو العالیہ نے فرمایا کہ یہود کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایک امر کے بارے میں عتاب فرمایا تھا اور یہ قسم کھائی تھی کہ چالیس دن ان کو عذاب کروں گا۔ اس لئے ہم کو قسم پوری کرنے کے واسطے صرف چالیس دن عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کے لئے آیت قل اتخذتم الخ نازل فرمائی۔

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ (کیا لے لیا ہے تم نے) یہ استفہام انکاری ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے اتحذتم اور اخذتم اور جو اس کے مثل الفاظ ہیں ذ کو ظاہر کر کے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے ادغام کیا ہے۔

عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (اللہ سے کوئی عہد) مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد لیا ہے کہ اتنا ہی عذاب کرے گا۔

فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ (کہ ہرگز خلاف نہ کرے گا اللہ اپنے عہد کے) یہ شرط محذوف کا جواب ہے حاصل یہ ہے کہ اگر عہد لے لیتے تو اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں مخالفت نہیں ہو سکتی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وعدہ کے خلاف کرنا خصائل ذمیمہ میں سے ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ عہد سے توحید کا عہد مراد ہے جیسا کہ آیت اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا میں بھی عہد سے مراد لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے کا عہد ہے۔ اس تقدیر پر حاصل معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اے بنی اسرائیل تم نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا تو اقرار کیا نہیں کہ تمہارے لئے اللہ کے نزدیک عہد ہوتا۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰ (یا جوڑتے ہو اللہ پر جو نہیں جانتے) اَمْ تقولون میں اَمْ متصلہ اور منقطعہ دونوں ہو سکتا ہے بَلٰی (سچ تو یہ ہے) یہود نے جو لاف زنی کی تھی کہ ہم کو جہنم کی آگ صرف چند دنوں لگے گی اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا ہے۔

مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً (کہ جس نے برائی کی) کسب کے معنی لغت میں نفع حاصل کرنے کے ہیں اور سیئۃ (گناہ) کے ساتھ اس کا تعلق بطور استہزاء کے ہے کیونکہ گناہ تو سراسر نقصان کی شئے ہے نفع کی اس میں کون سی بات ہے (جیسے کہتے ہیں کہ میاں کیوں آگ کھا رہے ہو، مطلب یہ ہوتا ہے کہ کیوں ایسے کام کرتے ہو جس سے آگ میں جاؤ) جیسے آیت فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (پس خوشخبری دیجئے ان کو سخت عذاب کی) میں بشارت کا لفظ استہزاء کے طور پر ہے۔

وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ (اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہوں نے) مطلب یہ ہے کہ گناہ اس پر غالب ہو گئے اور اس کے گرد و پیش کو محیط ہو گئے اور وہ گھیرے ہوئے شخص کی طرح ہو گیا کہ کوئی جانب اس کی ایسی نہ رہی جو گناہوں سے خالی ہو۔ آیت کا یہ مضمون کفار ہی پر صادق ہے جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہے اس پر صادق نہیں کیونکہ اس کے ہر جانب اور ہر حصہ کو گناہ محیط نہیں ہوتا بلکہ جس جگہ ایمان ہے وہ حصہ سالم ہے اور اسی بناء پر ابن عباسؓ اور ضحاک اور ابو العالیہ اور ربیع اور

marfat.com

دیگر علماء رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں خطیئۃ سے مراد وہ شرک ہے جس پر آدمی مر جاوے۔ اس معنے کے موافق معتزلہ اور خوارج نے جو اس آیت سے یہ نکالا ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ آیت مرتکب کبیرہ پر صادق ہی نہیں۔ اہل مدینہ نے خطیئاتہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد اور حمزہ نے وقف کی حالت میں ہمزہ کو ی سے بدلا ہے اور ادغام کیا ہے۔ ایسے ہی جس جگہ ہمزہ متحرک ہو اور وسط میں واقع ہوا (اور ماقبل اس کے ی ساکن ہو اور زائد ہو جیسے هنیئا مریٔا، بریٔا، بریٔون، خطیٔة، خطیأتکم وغیرہ اور اگر ہمزہ سے پہلے سوائے ی کے کوئی اور حرف ساکن ہو تو اگر وہ الف نہیں تو اس کو ہمزہ کی حرکت دے کر ہمزہ کو ساقط کردو جیسے شیئا وخطأ والمشئمة و تجئرون ویسئلون وسئل والظمأن والقرأن ومذء ومأو مسئولا وسیئت والمؤدة اور اگر ساکن الف ہو خواہ وہ ہمزہ سے بدلا ہوا ہو یا زائد تو اس کے بعد ہمزہ کو بین بین کرتے ہیں اور تم کو الف پر مد پڑھنے اور قصر کرنے میں اختیار ہے جیسے نسائکم و ابنائکم و ماءً و غثاءً و سواءً واباؤکم وهاؤم اقرءوا ومن اٰبائهم وملٰئکة اور اگر ہمزہ مفتوح ہو اور اس کا ماقبل مکسور ہو تو اسکو ی سے بدلو اور مضموم ہو تو و سے جیسے ننشئکم اوان شانئک ولؤلؤا ویئوده اور اگر ایسی صورت نہ ہو اور ہمزہ ی کی صورت میں نہ ہو تو اس کو بین بین پڑھو اور اگر ی کی صورت میں ہو تو اس ہمزہ کو یاء مضموم سے بدل کر پڑھو جیسے انبئکم سنقرئک اور جس صورت میں ہمزہ متوسط ساکن ہو اور ہمزہ کا ماقبل متحرک ہو تو اس کو خالص حرف سے تسہیل کی حالت میں بدلا جاتا ہے جیسے المؤمنون، یؤفکون، الرؤیا۔

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (وہی لوگ دوزخی ہیں) یعنی ان کو دوزخ لازم ہے جیسے کہ وہ یہاں اسباب دوزخ کو لازم ہیں۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا) یہ عہد تورات کے اندر ہوا ہے۔ میثاق کے معنی مستحکم عہد کے ہیں۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے لا تعبدون کو لا یعبدون یا کے ساتھ صیغۂ غائب سے پڑھا اور باقی قراء نے تا سے پڑھا ہے اور لا تعبدون خبر بمعنی نہی ہے جیسے آیت لا یضار کاتب ولا شهید (یعنی نہ نقصان پہنچایا جاوے لکھنے والا اور نہ گواہ) میں لا یضار بمعنی نہی ہے اور اسی بناء پر احسنوا اور قولوا کا عطف لا تعبدون پر مستحسن ہو گیا اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اصل کلام تھا ان لا تعبدوا جب ان حذف کر دیا تو فعل مرفوع ہو گیا اس تقدیر پر لا تعبدون یا تو میثاق سے بدل ہو گا اور یا میثاق کا بحذف یاء معمول ہو گا۔ ابی بن کعب نے لا تعبدوا (نہ عبادت کرو) بصیغۂ نہی پڑھا ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لا تعبدون جواب قسم ہے اور معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو قسم دی کہ غیر اللہ کی عبادت نہ کریں۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (اور ماں باپ سے سلوک کرتے رہنا) یہ فعل محذوف کے متعلق ہے تقدیر عبارت کی یا تو یہ ہے تُحْسِنُوْنَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا یا یہ ہے اَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا یعنی اور احسان کرو والدین کے ساتھ احسان کرنا) اس تقدیر پر یہ لا تعبدون پر معطوف ہو گا اور یا تقدیر عبارت کی یہ لی جاوے وَصَّيْنَاهُمْ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (یعنی ہم نے ان کو والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا) اس صورت میں اس کا عطف اخذنا پر ہو گا اور ماں باپ کے ساتھ سلوک کرنا یہ ہے کہ ان کی خدمت کرے اور ان سے محبت سے پیش آوے اور جب تک ان کا قول اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف نہ ہو ان کا کہا مانے۔

وَّذِي الْقُرْبٰى (اور رشتہ داروں) اس کا عطف الوالدین پر ہے اور قربیٰ مثل الحسنیٰ کے مصدر ہے۔

وَالْيَتٰمٰى یتیم (کی جمع ہے۔ یتیم اس بچہ کو کہتے ہیں جس کا باپ نہ رہا ہو۔

marfat.com

وَالْمَسٰكِيْنِ جمع ہے مسکین بروزن مفعیل کی اور سکون سے مشتق ہے۔ مسکین کو مسکین اس لئے کہتے ہیں کہ اسے فقر اور تنگدستی نے ایک جگہ ساکن کر دیا ہے، طبیعت میں چلنے پھرنے کا نشاط نہیں رہا اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ ان پر رحم کھائے اور ان کے حقوق ادا کرے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ (اور کہو لوگوں سے) اس کا احسنوا پر عطف ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے قلنا مقدر ہو اور اس کا عطف اخذنا پر ہو۔

حُسْنًا (نیک بات) حمزہ اور کسائی اور یعقوب نے حُسْنًا کو حاء اور سین کے فتح سے صیغہ صفت سے پڑھا ہے۔ اور دیگر قراء نے حسنا بضمۂ حاء و سکون سین پڑھا ہے، اس صورت میں مصدر ہوگا اور مبالغہ کے طور پر قول کو حسن (نیکی) کہہ دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی بات کہو کہ جو سر تاپا نیکی ہو اور لفظ قَوْلًا حُسْنًا (نیک بات) ہر قسم کی بھلی بات کو شامل ہے۔ ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ کی شان والا اور آپ کی صفت بیان کرنے میں سچی بات کہو۔ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں معنی یہ ہیں کہ نیک بات لوگوں کو بتاتے رہو اور بری بات سے روکتے رہو یا یہ مطلب کہ آپس کے برتاؤ میں نرم بات بولو یا یہ مراد کہ سچی گواہی دو یا یہ مقصود کہ ایسی بات کہو جس پر ثواب ہو۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ (اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہو پھر تم سب پھر گئے) شروع رکوع سے بنی اسرائیل کو بطور غیبت خطاب فرمایا اور ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ صیغۂ خطاب سے کلام کا رخ موڑ دیا جو بنی اسرائیل نبی ﷺ کے زمانہ میں اور جو آپ سے پہلے تھے سب کو بطور تغلیب خطاب ہے۔

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ (سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے تم میں سے) مطلب یہ ہے کہ عہد سے سوائے چند آدمیوں کے سب پھر گئے اور یہ چند آدمی وہ اہل کتاب تھے جو ایمان لے آئے تھے جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ (اور تم لوگ ہو بھی پھرنے والے) یعنی تمہاری تو عادت ہی عہد سے پھرنے کی ہے یا ثم تولیتم الا قلیلا الخ کے یہ معنی کہ پھر تمہارے باپ دادے عہد سے پھر گئے، اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوگی ثُمَّ تَوَلَّتْ اٰبَاۗؤُكُمْ (پھر تمہارے باپ دادے عہد سے پھر گئے) اٰباء مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو قائم مقام کر دیا اور فعل کو اس کی طرف مسند کر دیا۔ اس صورت میں انتم معرضون کے یہ معنی ہوں گے کہ تم اپنے باپ دادے کی طرح اعراض کرنے والے ہو۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاۗءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (اور وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے اقرار لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور نہ اپنے شہروں سے اپنے لوگوں کو جلاوطن کرنا) لَا تَسْفِكُوْنَ کی وہی تفسیر ہوگی جو لَا تَعْبُدُوْنَ کی تھی جو شروع رکوع میں گزر چکی۔ اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ نہ تو اپنے خون بہاویں اور نہ اپنے شہروں سے اپنی جانوں کو نکالیں۔ مطلب یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کریں اور دوسرے کے قتل کرنے اور نکالنے کو اپنے قتل کرنے اور نکالنے سے اس لئے تعبیر کیا کہ بنی اسرائیل سب آپس میں باعتبار نسب اور دین کے ایک تھے، نیز محاورہ بھی اسی طرح ہے۔ بعض مفسرین نے کہا مطلب یہ ہے ایسے کام نہ کرو جو تمہارے خون بہانے اور جلاوطن کرنے کو مباح کر دیں۔ بعض نے فرمایا لا تخرجوا الخ کے یہ معنی کہ تم اپنے ہمسایوں سے برا برتاؤ نہ کرو جس سے ناچار ہو کر وہ نکل جاویں۔

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ پھر تم نے (اس عہد کا) اقرار کیا۔ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ (اور تم گواہ ہو) یا تو یہ معنی کہ تم اس بات کے گواہ ہو کہ یہ عہد ہوا تھا اس تقدیر پر وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ماقبل کی تاکید ہو گی یا یہ مطلب کہ اے موجودہ بنی اسرائیل کے گروہ تم گواہ ہو کہ تمہارے بزرگوں نے ایسا اقرار کیا تھا۔ اس صورت میں ثم اقررتم میں اقرار کی اسناد موجودین کی طرف مجازاً ہو گی۔

marfat.com

ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ (پھر وہی تم ہو کہ خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ کو ان کے وطن سے) یہاں ثم بعد زمانی کے لئے نہیں بلکہ بعد عہد کے لئے ہے۔ عہد کے توڑ دینے کے استبعاد کو ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے (جیسے کہتے ہیں کہ میاں ہم نے کہا تم نے پھر بھی نہ مانا) انتم مبتدا ہے اور ھؤ لا خبر ہے اور معنی یہ ہیں پھر تم وہی بد عہد ہو۔ جیسے کہا کرتے ہیں کہ کیا تم وہی شخص ہو جس نے ایسا کیا۔ صفت کے بدلنے کو بمنزلۂ ذات کے بدلنے کے ٹھیرا کر ایسے کلام کا استعمال کیا کرتے ہیں اور جملہ تقتلون انفسکم یا تو حال ہے اور عامل اس میں معنیٰ اشارہ کے ہیں اور یا انتم، ھٰؤ لاء کا بیان ہے یا یہ کہا جائے کہ انتم مبتدا ہے اور ھٰؤ لاء تاکید ہے اور تقتلون انفسکم خبر ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ ھٰؤ لاء بمعنی الذی ہے اور جملہ تقتلون الخ صلہ موصول ملکر انتم کی خبر ہے یا یہ توجیہ کی جاوے کہ ھٰؤ لاء پر حرف ندا مقدر ہے اور معنی یہ ہیں پھر تم اے لوگو قتل کرتے ہو اپنی جانوں کو۔

تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِؕ (ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ان کے مقابلہ میں گناہ اور ظلم سے) عاصم، حمزہ اور کسائی نے تظاھرون کو باب تفاعل سے ت کو حذف کر کے پڑھا اور اسی طرح سورۂ تحریم میں پڑھا ہے اور دیگر قراء نے تظاھرون کی ایک ت کو ظ میں ادغام کر کے پڑھا ہے۔ تظاہر کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ ظہر سے مشتق ہے اور تظاھرون، یخرجون کے فاعل یا مفعول یا دونوں سے حال ہے۔

وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى (اور اگر وہی لوگ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں) حمزہ نے اساریٰ کے بجائے اسریٰ پڑھا ہے اور اساریٰ اور اسریٰ دونوں اسیر کی جمع ہیں۔

تُفٰدُوۡهُمۡ (تو عوض دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو) یعنی ایک قیدی کو دے کر دوسرے قیدی کو چھڑا لیتے ہو۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر حمزہ اور ابو جعفر نے تفدوھم (مالی عوض دے کر چھڑا لیتے ہو) پڑھا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں لفظ یعنی تفادوھم و تفدوھم کے ایک معنی ہیں۔ سدیؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں اور ایک دوسرے کو جلا وطن نہ کریں اور جو غلام یا باندی بنی اسرائیل میں سے کہیں پائیں تو اسے خرید کر آزاد کر دیں اس پر جو کچھ انہوں نے عمل کیا اس کا قصہ یہ ہے کہ بنو قریظہ اوس کے حلیف تھے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اور ان کے حلیف نضیر اور نضیر کے حلیفوں سے قتال کرتے اور جب ایک دوسرے پر غالب آجاتے تو گھروں کو برباد کر دیتے اور گھر والوں کو جلا وطن کر دیتے تھے لیکن اگر کسی اور موقع پر دونوں گروہوں میں سے کسی گروہ کا کوئی آدمی قید ہو جاتا تو مال جمع کر کے فدیہ دے کر اس کو دونوں گروہ چھڑا لیتے اس پر عرب ان پر طعن کرتے اور کہتے کہ تم ان سے قتال بھی کرتے ہو اور پھر فدیہ دیکر چھڑاتے بھی ہو، تو جواب میں کہتے ہمیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے کہ فدیہ دے کر چھڑا لو۔ عرب کہتے کہ پھر قتال کیوں کرتے ہو تو کہتے کہ ہم اس بات سے شرماتے ہیں کہ ہمارے حلیف ذلیل سمجھے جاویں، اپنے حلیفوں کی نصرت کے لئے قتال کرتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ الخ غرض اللہ تعالیٰ نے ان کو تین احکام ارشاد فرمائے تھے۔

(۱) آپس کا قتل و قتال چھوڑنا (۲) جلا وطن کرنے کو ترک کرنا (۳) ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ انہوں نے تینوں ارشادوں میں مخالفت کی اور صرف فدیہ دے کر چھڑا لینے کو اختیار کر لیا۔

وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ (حالانکہ حرام کر دیا گیا تم پر) ھو یا تو ضمیر شان کی ہے اور یا یُخۡرِجُوۡنَ میں جو مصدری معنی ہیں اس کی طرف راجع ہے اور یا اخراج محذوف کی طرف راجع ہے اور تقدیر عبارت یہ ہو گی وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ مع ماصدر منکم اخراجھم وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ یعنی اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آتے ہیں تو تم عوض دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو باوجود اس کے کہ پہلے تمہاری طرف سے نکالنا صادر ہو چکا حالانکہ یہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام کیا گیا تھا۔

اِخۡرَاجُهُمۡؕ (ان کا نکالنا بھی) اور اخیر کی دو صورتوں پر اخراجھم تاکید ہے یا ضمیر ھو کو مبہم مانا جاوے اور اخراجھم کو اس کی تفسیر قرار دی جائے اور جملہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ کو کلام سابق سے مربوط قرار دیا جاوے ربط کی تقریر یہ

marfat.com

ہے کہ بنی اسرائیل نے جب فدیہ کا حکم ماننے کے وقت ایک حرام کام یعنی جلاوطن کرنے کا ارتکاب کیا، تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کی طاعت بھی معصیت سے خالی نہیں تو خود معصیت خالص تو کیسی کچھ ہوگی۔ اس تقریر سے خاص جلاوطن کرنے کے حرام ہونے کو مکرر ذکر فرمانے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی اور بیضاوی نے کہا ہے کہ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ تخرجُوْن فَرِیْقًا مِّنْکُمْ مِنْ دِیَارِھِمْ کے متعلق ہے اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تم ایک فریق کو ان کے وطن سے نکالتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام کیا گیا ہے۔ اور ان کے درمیان جو کلام ہے وہ جملہ معترضہ ہے اس صورت میں نکالنے کے حرام کرنے کو مکرر ذکر فرمانے کی وجہ ظاہر نہ ہوگی واللہ اعلم۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ (کیا مانتے ہو کتاب کی بعض بات) بعض الکتاب سے فدیہ کا واجب ہونا مراد ہے۔

وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (اور نہیں مانتے بعض بات) اس بعض سے مراد قتل اور جلاوطن کرنے کی حرمت ہے۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ حاصل اَفَتُؤْمِنُوْنَ الخ سے یہ ہے کہ کیسی حماقت اور ظلم کی بات ہے کہ اپنے بھائیوں کو اگر غیر کے پاس پاتے ہو تو فدیہ دے کر سب کو چھڑاتے ہو اور پھر خود اپنے ہاتھ سے انہیں قتل کر ڈالتے ہو۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ (پس کچھ سزا نہیں اس کی جو کوئی تم میں سے (اے یہود یہ کام کرتا ہے) ذلک سے کتاب کی بعض بات ماننا اور بعض کا انکار کرنا مراد ہے منکم کے مخاطب یہود ہیں۔

اِلَّا خِزْیٌ (مگر رسوائی) یعنی عذاب اور ذلت۔ خزی کے اصل معنی ہیں ایسی ذلت جس سے شرم آئے۔

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (دنیا کی زندگی میں) چنانچہ یہ رسوائی اور عذاب واقع ہوا۔ قریظہ کے لئے تو یہ رسوائی اور عذاب ہوا کہ قتل ہوئے اور قید کر لئے گئے اور نضیر کے لئے یہ ہوا کہ مقام اذرعات اور اریحا میں نکال دیئے گئے اور وہاں ان پر اور دوسروں پر بھی جزیہ مقرر کیا گیا۔

وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (اور قیامت کے دن پہنچائے جائیں گے سخت سے سخت عذاب میں) اس سے جہنم کی ہمیشہ کی آگ مراد ہے۔

وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ (اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو تم کر رہے ہو) ابن کثیر، نافع اور ابو بکر نے عَمَّا تَعْمَلُوْنَ میں تَعْمَلُوْنَ کو ی سے بصیغہ غائب پڑھا ہے اور اس صورت میں ضمیر تعملون میں من کی طرف راجع ہوگی جو من یفعل میں مذکور ہے اور دیگر قراء نے صیغہ خطاب سے پڑھا ہے۔

ع ۱۰ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ۫ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ (یہی لوگ ہیں جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا کی زندگانی آخرت کے بدلے، سو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی) یعنی وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ نہ ہوں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ ز (اور ہم نے دی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول) یعنی ہم نے بعد موسیٰ (علی نبینا وعلیہ السلام) کے کتنے ہی رسول پے در پے بھیجے۔ اس سے معلوم ہوا کہ من بعدہ (بعد اس کے) تاکید کے لئے بڑھایا گیا ہے کیونکہ قفینا میں خود پیچھے لانے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے بعد یوشع، شموئیل، شمعون، داؤد، سلیمان، ایوب، شعیا، ارمیا، عزیر، حزقیل، الیسع، یونس، زکریا، یحییٰ اور الیاس وغیرہم علیہم السلام پیغمبر ہوئے ہیں۔

وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ (اور دیئے ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلے معجزے) بینات سے مراد نبوت کی کھلی کھلی دلیلیں ہیں، جیسے اندھے مادرزاد اور برص والے کو شفا دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا وغیرہ وغیرہ یا بینات سے مراد انجیل ہے۔

marfat.com

وَاٰیَدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط (اور قوت دی اس کو روح پاک (جبرئیل) سے) ابن کثیر نے بروح القدس میں قدس کی دال کو سکون سے اور دیگر قراء نے ضمہ سے پڑھا ہے اور روح القدس سے مراد یا تو جبرئیل علیہ السلام ہیں یا وہ روح مراد ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ نے پھونکی تھی۔ القدس یعنی طہارت مصدر بمعنی اسم فاعل یعنی طاہر ہے اور قدس (پاک) سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ تعظیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی طرف نسبت فرمائی ہے جیسے بیت اللّٰہ (اللہ کا گھر) اور ناقۃ اللّٰہ (اللہ کی اونٹنی) اور اسی کے ہم معنی دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔ وَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا (پھونکا ہم نے اس میں اپنی روح سے) یا روح کی اضافت القدس کی طرف ایسی ہے جیسے حاتم الجود (حاتم سخاوت کا) میں حاتم کی اضافت الجود کی طرف اس صورت میں القدس (پاکی) صفت روح کی ہوگی اور جبرئیلؑ اور عیسیٰ علیہ السلام کو معاصی سے معصوم اور پاک ہونے کی وجہ سے پاک فرمایا ہے اور خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں پاکی کی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ ولادت کے وقت شیطان کے لگنے سے انہیں اللہ تعالیٰ نے پاک رکھا تھا، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بچہ اولاد آدم علیہ السلام میں پیدا ہوتا ہے اسے ولادت کے وقت شیطان چھوتا ہے سوائے مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے کے کہ وہ دونوں شیطان سے محفوظ رہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ایک وجہ طہارت کی یہ تھی کہ وہ مردوں کی پشت اور حیض والے رحم سے محفوظ رہے تھے۔ اور جبرئیل علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام کو تائید کی صورت یہ تھی کہ جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہو گیا تھا کہ جس جگہ عیسیٰ علیہ السلام چلیں پھریں تم ان کے ساتھ ہو چنانچہ حسب ارشاد خداوندی جبرئیل علیہ السلام ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے حتیٰ کہ ان کو آسمان پر لے گئے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ روح سے اسم اعظم مراد ہے جس کے ذریعہ سے عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے اور لوگوں کو عجائبات دکھاتے تھے۔ بعض نے کہا کہ روح سے مراد انجیل ہے چنانچہ آیت اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (وحی کی ہم نے طرف آپ ﷺ کے اے محمد ﷺ روح (یعنی قرآن) اپنے حکم سے) میں بھی روح سے مراد قرآن پاک ہے۔ کتاب اللہ کو روح سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ جس طرح روح بدن کی حیات کا سبب ہے اسی طرح کتاب اللہ دلوں کی حیات کا ذریعہ ہے اخیر کی دو تفسیروں پر روح کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کو طہارت (پاکی) کے ساتھ موصوف کرنا ظاہر ہے کیونکہ روح سے مراد جب کتاب ٹھیری تو اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت کرنا اور اس کو پاک کہنا دونوں صحیح اور ظاہر ہیں۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ جب یہود نے جناب رسول ﷺ سے عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر سنا تو عرض کیا کہ معجزات عیسیٰ علیہ السلام اور جو قصے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ہم سے کہتے ہو ہم تو آپ کو جب سچا سمجھیں کہ جب اسی قسم کے افعال اور معجزات تم بھی لاؤ اس پر ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَھْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ (تو کیا جب کبھی لایا تمہارے پاس کوئی رسول وہ حکم کہ نہ پسند کیا تمہارے جی نے) جَآءَکُمْ میں خطاب یہود کو ہے۔ ھوی کسرہ واؤ کے ساتھ بمعنی "محبت" اور ھَوَی بفتحہ "اوپر سے نیچے گرنا"۔ اَفَکُلَّمَا کا پہلے جملوں پر عطف ہے افکلما الخ میں فاء اور مضمون متعلق فاء کے درمیان ہمزہ، یہود کو زجر و توبیخ کرنے اور ان کی حالت پر تعجب ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے متواتر بھیجنے پر انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسی بیجا فرمائش کرنے لگے (جیسے کہا کرتے ہیں کہ تم کو ہم نے پالا پرورش کیا لکھایا پڑھایا اس پر تمہاری یہ حالت ہے کہ ہمارا کہنا نہیں مانتے) اور یہ بھی تفسیر ہو سکتی ہے کہ اَفَکُلَّمَا سے کلام مستقل شروع ہوا اور فاء ایک کلام محذوف پر عطف کرنے کے لئے لائی گئی ہو اور چونکہ مضمون سابق (انبیاء کے بھیجنے) پر سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ پھر ان لوگوں نے انبیاء علیہ السلام کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تو جواباً ارشاد ہوا فَکَفَرُوْا بِھِمْ (یعنی انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کفر کیا) پھر توبیخ کے طور پر خطاب ہوا اَکَفَرْتُمْ بِھِمْ فَکُلَّمَا جَآءَکُمْ کیا تم نے ان کا انکار کیا پس جب کبھی لایا تمہارے پاس الخ۔

اسْتَکْبَرْتُمْ (تکبر کرنے لگے) یعنی تم ایمان لانے اور پیغمبروں کے اتباع سے تکبر کرنے لگے۔

marfat.com

فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ ز (پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا) یعنی ایک فریق کی جیسے عیسیٰ علیہ السلام و محمد ﷺ وغیرہما کی تم نے تکذیب کی۔

وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿۸۷﴾ (اور ایک جماعت کو قتل کرنے لگے) یعنی انبیاء کی ایک جماعت کو جیسے زکریاؑ اور یحیٰؑ اور شعیاؑ وغیرہم کو قتل کر دیا۔ انبیاء علیہم السلام کے قتل کو جو کہ زمانہ گزشتہ میں ہو چکا ہے صیغۂ مضارع سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ یہ ایک امر عظیم ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو امر عظیم ہوتا ہے اس کو اس طرح بیان کیا کرتے ہیں کہ وہ بالکل پیش نظر ہو جاوے گویا اب ہو رہا ہے اس بناء پر قتل انبیاء علیہم السلام کو جو نہایت ہولناک اور عظیم اور حیرت ناک امر ہے مضارع کے صیغہ سے تعبیر فرمایا (جیسے کہتے ہیں کہ میں دہلی گیا وہاں دیکھتا ہوں کہ بڑی جامع مسجد ہے اور آگے چلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک قلعہ ہے) نیز آیات چونکہ پہلے سے نون پر ختم ہو رہی ہیں اس لئے اس کی رعایت سے تقتلون فرمایا اور اس لئے بھی صیغۂ مضارع سے تعبیر فرمایا کہ یہ بات بخوبی معلوم ہو جائے کہ پہلے تو تم نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا مگر اب بھی تم اس سے خالی نہیں ہو اور رسول اللہ ﷺ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہو چنانچہ تم نے ان پر سحر کیا اور بارادۂ قتل آپ سے قتال کرتے ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ پر کسی نے سحر کیا حتیٰ کہ حضور ﷺ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ آپ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ فلاں کام کر لیا حالانکہ وہ کام کیا ہوا نہیں ہوتا تھا، چند روز یہی حالت رہی پھر ایک روز آپ نے اللہ تعالیٰ سے خوب دعا کی پھر مجھ سے فرمایا عائشہ تمہیں بھی خبر ہے کہ جس کی تحقیق کے لئے میں نے جناب الٰہی میں مناجات کی تھی کہ اس کا حال مجھے معلوم ہو گیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیا ہے فرمایا دو شخص میرے پاس آئے ایک میرے سرہانے بیٹھا اور دوسرا پائینتی۔ پھر ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان کو کیا بیماری ہے، دوسرے نے جواب دیا جادو ہے، پھر پہلے نے پوچھا کس نے کیا ہے، دوسرے نے کہا لبید بن عاصم یہودی نے، پوچھا کس شئے میں کیا ہے، کہا ایک کنگھی اور کچھ بال اور کھجور کے پھل کے غلاف کے اندر کیا ہے۔ پھر پوچھا یہ سب چیزیں کہاں ہیں کہا چاہ ذروان میں۔ اس کے بعد جناب رسول اکرم ﷺ مع ایک جماعت صحابہؓ کے اس کنویں پر تشریف لے گئے، حضور ﷺ نے فرمایا کنواں یہی ہے جس کی صورت اور پانی مجھے دکھایا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تقتلون صیغۂ استقبال بھی ہو سکتا ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ ایک فریق کو تم قتل کرو گے اور مراد فریق سے محمد ﷺ ہیں اور اس قتل کا ظہور اس طرح ہوا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو خیبر کی ایک یہودن نے بکری کے گوشت میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا سو اس کا اثر حضور ﷺ کو وفات کے وقت تک رہا اور اس صورت میں اور انبیاء کے قتل کا ذکر یا تو بالکل متروک اور یا مقدر ہو گا اور تقدیر عبارت کی یہ ہو گی۔ وفریقاً قتلتم و فریقاً تقتلون یعنی انبیاء کے ایک فریق کو تو تم قتل کر چکے اور ایک جماعت کو قتل کرو گے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ خیبر کی یہودن بکری کا گوشت زہر آلود کر کے رسول اللہ ﷺ کے لئے ہدیہ میں لائی۔ حضور ﷺ نے ایک دست اس میں سے اٹھایا اور کھانا شروع کیا اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی کھانا شروع کیا جب کچھ کھا لیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ کھانے سے سب ہاتھ اٹھا لو اور یہودن کے بلانے کو آدمی بھیجا جب وہ آئی تو دریافت کیا کہ تو نے اس گوشت میں زہر ملایا ہے۔ اس نے پوچھا آپ کو کس نے خبر دی۔ فرمایا کہ بکری کے اس ہاتھ نے خبر دی ہے جو میرے ہاتھ میں ہے۔ اس نے اقرار کر لیا اور کہا میں نے یہ فعل اس وجہ سے کیا کہ اگر آپ ﷺ نبی ہیں تو آپ ﷺ کو کچھ نقصان نہ ہو گا اور جو نبی نہیں ہیں تو ہم آرام سے ہو جاویں گے۔

حضور ﷺ نے اس کے اس قصور کو معاف فرمایا اور کچھ سزا نہیں دی اور جس جس نے اس گوشت میں سے کھایا وہ وفات پا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس زہر کو خارج کرنے کے لئے شانہ مبارک سے خون نکلوایا۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ مرض الموت میں فرماتے تھے، عائشہ خیبر میں زہر آلود کھانا جو میں نے کھایا تھا اس کا الم اب تک مجھے معلوم ہوتا رہا اب اس وقت اسی زہر کی وجہ سے میری زندگی کی رگ منقطع ہو رہی ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے جو یہودیوں کو انبیاء کے ایک فریق کا مکذب قرار دیا اور فرمایا فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ (ایک فریق

کی تم نے تکذیب کی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض انبیاء کی تکذیب نہیں کی جیسے یوشع اور عزیر علیہما السلام۔ اگر کوئی شبہ کرے کہ بعض انبیاء دونوں فریق میں داخل ہیں یعنی لوگوں نے ان کی تکذیب بھی کی اور قتل بھی کیا وہ ان میں سے کسی فریق میں نہ آئے۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ شبہ تو جب وارد ہو سکتا تھا جب کہ عطف "او" کے ساتھ ہوتا یعنی مضمون اس طرح ہوتا کہ یا تو تم نے تکذیب کی اور یا قتل کیا، تو اس سے مستفاد ہوتا کہ تکذیب اور قتل میں سے انبیاء کے ساتھ ایک شئے ضرور ہوئی ہے اور دونوں نہیں ہوئیں اور یہاں عطف "واؤ" کے ساتھ ہے اس لئے یہ شبہ خود ہی مرتفع ہے، واللہ اعلم۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (اور کہتے ہیں ہمارے دل غلافوں میں ہیں) غلف جمع اغلف کی ہے۔ اغلف وہ قلب ہے جس پر خلقی پردہ پڑا ہوا ہو کہ اس کی وجہ سے نہ حق بات کو سنے اور نہ سمجھے اور دوسری جگہ اسی کی نظیر یہ آیت ہے وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِی اَکِنَّۃٍ (اور کہا کفار نے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں) مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے اسی طرح فرمایا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ غلف کی اصل غُلُفٌ ضمۂ لام سے تھی پھر لام کو تخفیف کے لئے ساکن کر دیا اور اعرج اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت سے اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں حضرات نے غلف کو ضمۂ لام سے پڑھا ہے اس تقدیر پر غلف جمع غلاف کی ہے اور معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ ہمارے دل ہر قسم کے علم کے غلاف اور برتن ہیں، یعنی ان میں ہر قسم کا علم بھرا ہوا ہے تمہارے علم کی ضرورت نہیں۔ ابن عباس ﷺ اور عطاءؒ نے اسی طرح فرمایا ہے اور کلبی نے فرمایا ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہمارے دل پر علم کے برتن ہیں جو بات سنتے ہیں اسے محفوظ کر لیتے ہیں لیکن تمہاری بات کو نہ سمجھتے ہیں نہ محفوظ کرتے ہیں سو اگر تمہاری بات میں کسی قسم کی خیر اور نیکی ہوتی تو ہمارے دل ضرور اسے محفوظ رکھتے اور سمجھتے۔ اس پر حق تعالیٰ نے ان کے قول کو رد کیا اور فرمایا کہ ان کے دل خلقۃً پردوں میں نہیں ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ملعون بنا دیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر بچہ فطرت (یعنی قبول حق کی استعداد) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین یا تو اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی و مشرک بنا دیتے ہیں۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ جو اس سے پہلے (یعنی بلوغ اور کسی دین کے سمجھنے سے پہلے) ہی مر گئے ہیں ان کا کیا حال ہوگا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو خبر ہے کہ وہ کیا عمل کرتے۔

بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ (نہیں) (بلکہ پھٹکار دیا ان کو اللہ نے) مطلب یہ ہے کہ ان کے دل علم کے مخزن اور برتن ہرگز نہیں۔ ان کا یہ کہنا محض لاف و باطل ہے بلکہ وجہ اس انکار کی یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں کو ہر قسم کی خیر سے دور کر دیا اور دھتکار دیا ہے۔

بِكُفْرِهِمْ (ان کے کفر کی وجہ سے) چنانچہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ (بہرا کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور ان کی بینائیوں کو اندھا کر دیا) پھر یہ دعوئے علم اور یہ استغناء انہیں کس طرح شایاں ہو سکتا ہے۔

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ (سو بہت ہی کم ایمان لاتے ہیں) قَلِیْلًا یا تو حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یا مبالغہ کے لئے زیادہ کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی ہوں گے کہ یہ لوگ ایمان لاتے ہیں بہت ہی کم تعداد میں چنانچہ مشرکین یہود سے زیادہ ایمان لائے۔ قتادہ نے اس آیت کی تفسیر اسی طرح فرمائی ہے یا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ ایمان لاتے ہیں بہت کم ایمان لانا اور یا منصوب بنزع حرف جر ہے اور اس تقدیر پر آیت کے یہ معنی ہیں کہ جس جس شئے پر ایمان لانا واجب ہے ان میں سے بہت کم پر ایمان لاتے ہیں کیونکہ کتاب اللہ کے بعض حصہ پر ایمان لاتے اور بعض کو چھوڑ دیتے ہیں اور واقدیؒ نے فرمایا ہے معنی یہ ہیں کہ نہ قلیل ایمان لاتے ہیں نہ کثیر یعنی بالکل ایمان نہیں لاتے جیسے بولتے ہیں مَا اَقَلَّ مَا تَفْعَلُ کَذَا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ فلاں کام تم بہت کم کرتے ہو اور مراد یہ ہے کہ فلاں کام تم بالکل نہیں کرتے پس اس صورت میں قلت سے مجازاً عدم مراد ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (اور جب پہنچی ان کے پاس خدا

marfat.com

کی طرف سے کتاب جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو ان کے پاس ہے) کتاب سے مراد قرآن شریف ہے لِمَا مَعَهُمْ میں ما سے مراد تورات ہے اور لما کا جواب محذوف ہے اور دوسرے لما کا جواب اس پر دلالت کرتا ہے

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ (اور وہ پہلے سے) یعنی نبی ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے۔

يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا (کافروں پر فتح بھی مانگا کرتے تھے) یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے اہل کتاب کی یہ حالت تھی کہ مشرکین عرب کے مقابلہ میں حضور ﷺ کے وسیلے اور برکت سے مدد طلب کرتے اور کہا کرتے تھے کہ اے اللہ اس نبی کی برکت سے جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوگا اور اس کی صفت اور حالات ہم تورات میں دیکھتے ہیں ہماری مدد کر اور حق تعالیٰ کی طرف سے امداد ہوتی تھی اور مشرکین جو ان کے مقابل ہوتے ان سے کہا کرتے کہ اب نبی آخر الزماں کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے، وہ ہماری تصدیق فرمائیں گے پھر ہم ان کے ساتھ ہو کر تمہیں اس طرح قتل اور ہلاک کر ڈالیں گے جیسے عاد اور ثمود اور ارم برباد اور ہلاک کئے گئے۔ یا یہ معنی ہیں کہ یہود مشرکین پر جناب رسول اللہ ﷺ کی نعت اور اوصاف ظاہر کرتے اور کہتے کہ عنقریب ایک نبی تشریف لانے والے ہیں۔ اس تقدیر پر یستفتحون میں سین مبالغہ کے لئے ہوگا اور نیز سین سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کی نعت بیان کرنے والا گویا اپنے نفس سے خود یہ سوال کرتا ہے کہ ایسے نبی کب ہوں گے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا (پس جب آ پہنچا ان کے پاس وہ جس کو جان پہچان رکھا تھا) ما موصولہ ہے اور ضمیر جو اس کی طرف عائد ہے محذوف ہے اور مراد ما عرفوا سے محمد ﷺ ہیں کیونکہ تورات میں جو آپ ﷺ کی صفت مذکور ہے اس سے آپ کو بخوبی پہچان چکے تھے۔

كَفَرُوا بِهِ (تو انکار کر دیا) اس کفر کی وجہ دو ہو سکتی ہیں یا تو اس بات کی ضد کہ یہودیوں میں سے کوئی نبی کیوں نہ ہوا اور یا مال اور ریاست کے جانے کا خوف۔

فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۸۹﴾ (پس خدا کی پھٹکار کافروں پر) بجائے علی الکافرین کے علیھم ضمیر کے ساتھ لانے کا موقع تھا لیکن اسے اس لئے ظاہر کر دیا کہ معلوم ہو جائے کہ یہی لوگ لعنت کے مستحق ہیں کیونکہ ان میں کفر موجود ہے اس صورت میں الکافرین میں "ال" عہد کا ہوگا اور یا "ال" جنس کا لیا جائے اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ اللہ کی لعنت تمام کافروں پر ہے اور منجملہ ان کے یہ بھی ہیں، سو یہ بھی ملعون ہوئے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ (بُری ہے وہ شئے جس کے بدلے خرید اانہوں نے اپنی جانوں کو) مطلب یہ ہے کہ جس شئے کے عوض انہوں نے اپنے نفس کے آخروی نصیب اور حصے کو بیچ ڈالا وہ بہت بری ہے اور یا یہ معنی ہوں کہ جس شئے کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو اپنے گمان فاسد میں خرید لیا ہے یعنی چھڑ لیا ہے وہ بہت بری ہے۔

أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (کہ انکار کرنے لگے ایک کلام کا جو اتارا اللہ نے) یہ بئس کا مخصوص بالذم ہے۔

بَغْيًا (اس حسد میں) يَكْفُرُوا کا مفعول لہ ہے اِشْتَرَوْا کا نہیں کیونکہ اِشْتَرَوْا اور بَغْيًا کے درمیان میں فاصلہ ہے۔ بغی کے معنی ہیں طلب اور فساد۔ چنانچہ بغي يبغي بغياً اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی شئے کو طلب کرے اور بغی الجرح اس وقت بولتے ہیں جب زخم میں فساد آجائے اور ظالم کو باغی اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہ فساد کرتا ہے اور جو امام وقت کی مخالفت پر مقابلہ کے لئے نکلے اسے بھی اسی لئے باغی بولتے ہیں کہ وہ فساد کرتا ہے اور حاسد کو اس وجہ سے باغی کہتے ہیں کہ وہ محسود پر ظلم کرتا اور اس کی نعمت کا زوال چاہتا ہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں "کہ حسد اور غیر موجود کی طلب اور فساد کی وجہ سے کفر کرتے ہیں"۔

أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ (کہ اتارے اللہ) (قرآن) بتقدیر لام بغیاً کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس پر حسد کرنے کی وجہ سے کفر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو اتارتا ہے۔ ابو عمرو اور ابن کثیرؒ نے يُنَزِّلُ کو ہر جگہ تخفیف زاء پڑھا ہے بلکہ تنزل اور منزل کو بھی غیر مشدد باب افعال سے پڑھا ہے لیکن ابن کثیر نے چند موقعوں کو مستثنیٰ کیا ہے اول و ماننزلہ سورۂ حجر میں،

marfat.com

دوم وننزل مِنَ القرآن، سوم حتی تنزل علینا سورۂ اسراء میں۔ ان تینوں جگہ میں ابن کثیر نے تشدید سے پڑھا ہے اور ابوعمرو نے بھی چند موقعوں میں تشدید سے پڑھا ہے اول علی ان ینزل آیت الآیۃ سورۂ انعام میں، دوم ماننزلہ سورۂ حجر میں جو اول گزر چکا اور مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ میں سب قراء تشدید سے پڑھتے ہیں اور باقی قراء سب جگہ تنزّلُ سے مشتق کر کے تشدید سے پڑھتے ہیں لیکن حمزہ اور کسائی لفظ ینزل الغیث کو سورۂ لقمان اور سورۂ شوریٰ میں تخفیف سے پڑھتے ہیں۔

مِنْ فَضْلِهٖ (اپنے فضل سے) یعنی بلا اس کے کہ کوئی عمل ان سے ایسا وجود میں آئے کہ جس سے وہ اس نعمت کے مستحق ہوں۔

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے) مراد اس سے محمد ﷺ ہیں۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ (پس کمایا انہوں نے غصہ پر غصہ) یعنی رسول اللہ ﷺ اور قرآن کا انکار کیا ایک تو اللہ کا ان پر اس سبب سے غصہ ہوا اور پہلے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کرنے اور تورات پر عامل نہ ہونے اور گوسالہ کی عبادت کرنے اور ہفتہ کے دن حد سے زیادتی کرنے وغیرہ سے بھی غضب الٰہی میں مبتلا تھے اب غضب پر غضب ہو گیا۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰ (اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلت کا) مطلب یہ ہے کہ کافروں کو عذاب ہو گا اس سے ان کو ذلیل و رسوا کرنا مقصود ہو گا اور گناہ گار مؤمنوں کو جو عذاب ہو گا وہ ذلت اور رسوائی کے لئے نہ ہو گا بلکہ ان کو گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہو گا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم تو ایمان لائیں گے اسی پر جو اترا ہے ہم پر (تورات) اور کفر کرتے ہیں اس کے ماسوا کے ساتھ) (قرآن وانجیل) مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (سے قرآن اور تمام کتب سماویہ مراد ہیں) وَيَكْفُرُوْنَ قَالُوْا کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔ لفظ وراء اصل میں مصدر ہے ظرف بنادیا جاتا ہے جب فاعل کی طرف مضاف ہو تو وراء بمعنی ماتیواری بہ (وہ جانب جس سے پوشیدگی حاصل کی جاوے یعنی پشت) ہوتا ہے اور جب مفعول کی طرف اضافت ہو تو وراء بمعنی مایواریہ (وہ جانب جو پوشیدہ کردے) یعنی آگے کی جانب ہوتا ہے اور اسی واسطے وراء کو اضداد میں گنا جاتا ہے اور کبھی وراء کے معنی "سوا" کے بھی ہوتے ہیں جیسا فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ (پس جو طلب کرے اس کے سوا) میں وراء بمعنی "سوا" ہے۔

وَهُوَ الْحَقُّ (حالانکہ وہ سچا ہے) ضمیر ھو ماوراءہٗ یعنی قرآن پاک اور انجیل کی طرف راجع ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ (سچ بتانے والا اس کتاب کو جو ان کے پاس ہے) یہ حال موکدہ ہے یہود جو یہ کہتے تھے کہ ہم تو اسی پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے یعنی تورات پر تو اس سے ان کی تردید ہو گئی کیونکہ جب وہ قرآن کو نہیں مانتے جو تورات کے موافق ہے اور تورات اس کے موافق ہے تو یہ نہ ماننا خود تورات کو نہ ماننا ہے۔

قُلْ (کہہ دیجئے اے محمد ﷺ)۔

فَلِمَ (پھر کیوں) لِمَ اصل میں لِمَا تھا، خبریہ اور استفہامیہ میں فرق کرنے کے واسطے الف حذف کر دیا چنانچہ فِيْمَ و بِمَ وعَمَّ آتا ہے۔

تَقْتُلُوْنَ (قتل کرتے رہے) بمعنی قتلتم ہے انبیاء کا قتل کرنا اگرچہ ان کے آباء واجداد سے ظہور میں آیا تھا لیکن چونکہ یہ خلف اپنے سلف کے افعال سے راضی اور ان کے متبع ہیں اور نیز یہ بھی نبی کریم محمد ﷺ کے قتل کے درپے ہیں اس لئے قتل کو ان کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

marfat.com

اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ (خدا کے نبیوں کو اس سے پہلے اگر مؤمن تھے) یعنی اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہوتے تو انبیاء کو کیوں قتل کرتے ہو کیونکہ تورات تو یہ بول رہی ہے ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ (پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول جو تصدیق کرتا ہو اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہو تم ضرور اس کو ماننا اور ضرور اس کی مدد کرنا) اور تکذیب سے صاف صاف منع کررہی ہے چہ جائیکہ انہیں قتل کرنا۔ ان کنتم الخ جزاء محذوف ہے پہلا کلام اس پر دلالت کرنے والا موجود ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ (اور آچکے تمہارے پاس) ابو عمرو و حمزہ و کسائی اور ھشام نے قَدْ جَآئَكُمْ میں جہاں کہیں ہو قد کی دال کو جیم میں ادغام کرکے پڑھا ہے اور اسی طرح لَقَدْ ذَرَاْ نَا میں دال اور ذال میں اور لَقَدْ زَيَّنَّا میں دال اور زاء میں اور قَدْ سَمِعَ میں دال اور سین میں اور قَدْ شَغَفَهَا میں دال اور شین میں اور فَقَدْ ضَلَّ میں دال اور ضاد میں اور فَقَدْ ظَلَمَ میں دال اور ظاء میں ادغام کرکے پڑھا ہے اور طاء مہملہ قرآن شریف میں جس جگہ بعد دال کے واقع ہوئی ہے اس میں ادغام ضروری ہے اور ھشام کے سوا اور قراء نے لَقَدْ صَرَّفْنَا کی دال کو صاد میں ادغام کیا ہے اور ابن ذکوان نے چار موقعوں میں حمزہ کسائی اور ہشام کا اتباع کرکے ادغام کیا ہے یعنی ذال اور زاء اور ضاد اور ظاء جب قد کے بعد واقع ہوں اور ورش نے صرف اخیر کے دو حرفوں میں یعنی ضاد اور ظاء میں موافقت کی ہے اور ابن کثیر اور عاصم اور قالون نے ان آٹھوں حروف گزشتہ میں بغیر ادغام کے پڑھا ہے اور قد کے بعد اگر دال ہو تو وہاں سب کے نزدیک ادغام ہوگا جیسے قَدْ دَخَلُوْا اسی طرح قد کے بعد اگر تاء ہو تو وہاں بھی سب کے نزدیک ادغام ہوگا جیسے قَدْ تَبَيَّنَ لیکن حسین نے نافع سے روایت کیا ہے کہ اگر تاء بعد قد کے ہوگی تو ادغام نہ کریں گے بلکہ اظہار کریں گے۔

مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ (موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر) اس سے نبوت کی صاف صاف نشانیاں یعنی معجزات مراد ہیں اور وہ تو معجزے تھے۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (پھر بنالیا تم نے گوسالہ کو معبود ان کے پیچھے) یعنی موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد یا موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ (اور تم ظلم کرتے تھے) یہ یا تو حال ہے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ تم نے گوسالہ کو معبود بنالیا اس حالت میں کہ تم ظالم تھے۔ یا جملہ معترضہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہاری تو عادت ہی ظلم کی ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیت یہود کی تردید کے لئے لائی گئی ہے کیونکہ انہوں نے یہ دعوی کیا تھا کہ نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا یعنی ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے۔ خلاصہ آیت کا رد کے پیرایہ میں یہ ہے کہ کیوں جی تم جو یہ کہتے ہو کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں (بولو کیا یہی ایمان لانا ہے کہ گوسالہ کو معبود بنالیا ہے اور باوجود معجزات دیکھنے کے بھی ایمان نہ لائے) اور نیز اس امر پر تنبیہ کرنا منظور ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی ان لوگوں کا برتاؤ ایسا ہی ہے جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اس تفسیر پر اس قصہ کی تکرار بے وجہ نہ ہوگی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا (اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور اٹھایا تمہارے اوپر طور (اور کہا ہم نے) کہ پکڑو جو کچھ دیا ہے ہم نے تم کو مضبوطی سے اور سنو) یعنی قبول کرو اور اطاعت کرو۔ اطاعت کو سننے سے اس لئے تعبیر کیا کہ سننا اطاعت کا سبب ہے۔

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (تو بولے سنا ہم نے اور نہیں مانا) یعنی ہم نے تمہاری بات تو سن لی اور تمہارا حکم نہ مانا۔ اہل معانی نے کہا ہے کہ یہود نے سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا زبان سے نہیں کہا تھا بلکہ زبان سے تو اقرار اطاعت ہی کیا لیکن بعد میں جب نافرمانیاں کرنے لگے تو اب معلوم ہوا گویا اس وقت زبان حال سے انہوں نے یہی کہا تھا اس لئے یہی قول ان کی طرف منسوب کردیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اہل معانی کا یہ قول بظاہر صحیح ہے کیونکہ اگر اس وقت زبان سے یہی کہتے تو طور ان پر سے ہرگز نہ الگ کیا جاتا

marfat.com

اور ہلاک کر دیئے جاتے۔

وَ اُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡ ؕ (اور رچ گیا تھا ان کے دلوں میں گوسالہ، ان کے کفر کی وجہ سے) یعنی گوسالہ کی محبت ان کے دلوں میں ایسی سرایت کر گئی تھی جیسے کہ رنگ کپڑے میں ساری ہو جاتا ہے اور گوسالہ کو معبود سمجھ جانے کی توجیہ یہ ہے کہ یہ لوگ غایت حماقت کی وجہ سے یا تو مجسمہ تھے اور یا حلولیہ تھے اور ایسا عجیب جسم دیکھا نہ تھا اس لئے سامری نے جو کچھ بہکا یا وہ دلوں میں راسخ ہو گیا۔

قُلۡ بِئۡسَمَا یَاۡمُرُكُمۡ بِهٖۤ اِیۡمَانُكُمۡ (اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے بہت برا سکھاتا ہے تم کو تمہارا ایمان) بِئۡسَمَا یَاۡمُرُكُمۡ میں مخصوص بالذم محذوف ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تم جو تورات پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہو (چنانچہ کہا تھا نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا) تو اس تورات پر ایمان لانے نے تمہیں یہ بات (گوسالہ کی عبادت) کیسی بری بتائی یا یہ حاصل ہے کہ تورات پر ایمان لانے نے یہ قبیح باتیں کہ جن کی قباحت بہت ظاہر ہے کیسی بری سکھلائی (اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بچہ شرارت کرتا ہو تو اسے کہتے ہیں کیوں صاحب تمہیں تمہارے استاد نے یہی تعلیم دی ہے)۔

اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۳﴾ (اگر ہو تم ایمان والے) یہ ان کے دعوے میں اور زیادہ جرح و قدح ہے اور جواب شرط کا محذوف ہے، پہلا کلام اس پر دلالت کرتا ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہوئی اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ بِالتَّوۡرٰىةِ فبئسما یأ مرکم به ایمانکم یعنی اگر تم (موافق اپنے دعوے کے) ایمان والے ہو تو یہ تمہارا ایمان بہت بری بات بتاتا ہے کیونکہ مؤمن جو کام کرتا ہے وہ اپنے ایمان کے مقتضی کے موافق کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایمان برے کام نہیں بتاتا اور یہ لوگ امور قبیحہ میں مبتلا ہیں، معلوم ہوا کہ مؤمن نہیں اور یا یہ معنی ہوں کہ اگر تم ایمان والے ہوتے تو ایسے امور قبیحہ تم سے سرزد نہ ہوتے لیکن سرزد ہوئے تو معلوم ہوا کہ مؤمن نہیں ہو۔ یہود جھوٹے دعوے اور لاف زنی کیا کرتے تھے کہ لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً (ہم کو آگ چھوئے گی بھی نہیں مگر گنتی کے چند روز) اور لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَـنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى (ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو یہودی یا عیسائی ہوں گے) اور نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں) اللہ تعالیٰ نے ان کی ان بیہودہ گوئیوں کا ذیل کی آیت سے جواب ارشاد فرمایا۔

قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَـكُمُ (کہہ دیجئے اے محمد ﷺ اگر تمہارے واسطے) لَكُمُ، کانت کی خبر ہے اور

الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ (عاقبت کا گھر) کانت کا اسم ہے۔ عِنۡدَ اللّٰهِ (خدا کے ہاں) یہ کانت کا ظرف ہے۔

خَالِصَةً (خاص ہے) دار سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ (دوسروں کے لئے نہیں) اَلنَّاسِ میں "اَل" یا تو استغراق کا ہے یا جنس کا اور یا مراد اس سے مسلمان ہوں اور "ال" عہد کا ہو۔

فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ (تو مرنے کی آرزو کرو) یعنی اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو موت مانگو اس لئے کہ جس شخص کو یہ یقیناً معلوم ہو جائے کہ میں جنتی ہوں اور اللہ کے پیاروں میں سے ہوں تو وہ ضرور اس طرح کی پریشانی والے گھر سے خلاصی اور نجات کی تمنا کرے گا اور اللہ کے ملنے کا مشتاق ہوگا۔

ابن مبارک نے باب زھد میں اور بیہقی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مومن کا تحفہ موت ہے اور دیلمی نے بھی حضرت جابرؓ سے اس مضمون کو نقل کیا ہے اور حسین بن علیؓ سے مرفوعاً منقول ہے کہ مؤمن کا پھول موت ہے اور حبان بن الاسود فرماتے ہیں کہ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔ یہ آیت و احادیث اس پر دال ہیں کہ آخرت کی منزلوں میں سے قبر پہلی منزل ہے اور اس مضمون کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل بھی کیا ہے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے بلا کیف وصل موت کے بعد قیامت سے پہلے دنیا سے زیادہ حاصل ہوگا کیونکہ اگر یہ امر نہ ہوتا تو موت کی تمنا میں کوئی فائدہ نہ ہوتا اور نہ موت دوست سے

marfat.com

ملنے کا اہل ہوتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس فراق کے عذاب شدید سے خلاصی کے لئے موت مانگو اس تقدیر پر یہ آیت آیت مباہلہ کی نظیر ہو گی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جناب رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ یہودی موت کی تمنا کرتے تو اسی دم ہر شخص کا ان میں سے اپنے آب دہن سے گلا گھٹ جاتا اور روئے زمین پر ایک بھی یہودی باقی نہ رہتا سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ اس حدیث کو بیہقی نے دلائل میں لکھا ہے اور بخاری اور ترمذی نے بھی مرفوعاً کچھ الفاظ بدل کر اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کو موقوفاً نقل کیا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ (اگر تم سچے ہو) اس کی جزا محذوف ہے کلام گزشتہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

فصل اس مقام پر یہ مسئلہ قابل نظر ہے کہ آیا موت کی تمنا کرنا جائز ہے یا نہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی مصیبت مالی یا جسمانی یا اولاد واہل وعیال کے مرنے کی وجہ سے موت کی تمنا کرتا ہے تو جائز نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مصیبت کے سبب کوئی تم میں سے موت کی ہرگز تمنا نہ کرے اگر اس تمنا کرنے کو جی ہی چاہتا ہے اور بغیر تمنا کے رہ ہی نہیں سکتا تو اس قدر کہہ دے کہ اے اللہ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہو تو مجھے زندہ رکھ اور جب میرا مرنا بہتر ہو تو موت دے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور انہیں سے ایک روایت میں ہے کہ جب کوئی تم میں سے مرتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے اور عمر خیر ہی کو بڑھاتی ہے (یعنی عمر بری چیز نہیں کچھ نہ کچھ اس میں مؤمن خیر ہی کرے گا) اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کوئی تم میں سے موت کی ہرگز تمنا نہ کرے کیونکہ یہ شخص یا تو نیک کار ہوگا تو شاید نیکی زیادہ کرے اور یا بدکار ہے تو ممکن ہے کہ بدی سے باز آجاوے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور نیز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی تم میں موت کی تمنا نہ کرے اور نہ موت کے آنے سے پہلے اس کی دعا کرے کیونکہ موت آنے کے بعد آدمی کا عمل بالکل منقطع ہو جاتا ہے اور مؤمن کی عمر خیر اور نیکی ہی بڑھاتی ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور موت کی تمنا ممنوع ہونے میں اور بہت سی حدیثیں احمد اور بزاز اور بیہقی نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہیں اور مروزی نے قاسم مولیٰ معاویہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور نیز اسی موضوع پر احمد اور ابو یعلی اور حاکم اور طبرانی نے امّ الفضل سے روایت کی ہے اور یہ سب رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

ایک امر ضروری یہاں قابل تنبیہ یہ ہے کہ زبان سے موت کی تمنا کرنے اور سوال کرنے سے نہی وارد ہوئی ہے ویسے تمنا اور رغبت اگر ہو تو اس سے نہی نہیں۔ کیونکہ دل کا میلان تو ایک مجبوری امر ہے اس کے دفع پر آدمی کو قدرت نہیں ہاں اگر کوئی دینی فتنہ کے خیال سے موت کا سوال کرے تو کچھ حرج نہیں چنانچہ امام مالک اور بزاز، ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ جب آپ لوگوں میں فتنہ ڈالنا چاہیں تو مجھے اس فتنہ سے محفوظ رکھ کر اپنے پاس بلا لیجیو اور امام مالک نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی دعا میں فرمایا کہ اے اللہ میری قوت ضعیف ہو گئی اور میری عمر زیادہ ہو گئی اور میری رعیت جا بجا پھیل گئی اب اے اللہ مجھے صحیح سالم بلا کسی کے حق کے ضائع اور کوتاہی کئے ہوئے اپنے پاس بلا لے، چنانچہ اس دعا کو ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی۔

اور طبرانی نے عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے ہاں اگر اپنے عمل پر اعتماد نہ ہو (کہ شاید برا عمل ہو جائے) تو موت کی تمنا جائز ہے اور جب اسلام میں چھ خصلتیں دیکھو تو موت کی تمنا کرو اور تمہاری جان (بالفرض) تمہارے قبضہ میں بھی ہو تو اس کو چھوڑ دو (یہ تمنا اور دعائے موت میں مبالغہ ہے) وہ چھ خصائل یہ ہیں (۱) خونریزی (۲) لڑکوں کی سلطنت (۳) شرط کی کثرت (۴) جاہل بیوقوفوں کا امیر ہونا (۵) فیصلۂ حکم کی

marfat.com

بیع (یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے کو بیچنا) (۶) قرآن پاک کو راگ بنانا۔ اور ابن عبد البر نے تمہید میں روایت کیا ہے کہ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے موت کی تمنا کی بابت بعض لوگوں نے پوچھا کہ آپ موت کی کیوں تمنا کرتے ہیں اس سے تو منع کیا گیا ہے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے چھ چیزیں ظاہر ہونے سے پہلے مر رہو۔ (یعنی موت کا سوال کرو) جاہل بے وقوفوں کی سلطنت، ۲ شرط کی کثرت، ۳ حکم کی بیع، ۴ خون کے معاملہ کی پرواہ نہ کرنا، ۵ قرابت کو قطع کرنا۔ ۶ قرآن کو مزامیر بنانا۔ حاکم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور ابن سعد نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور خوف فتنہ کی وجہ سے بعض سلف صالحین نے اکثر تمنا کی ہے چنانچہ اس قسم کے مضامین ابن سعد نے خالد بن معدان سے اور ابن عساکر اور ابو نعیم نے خالد مذکور سے اور مکحول اور ابن ابی الدنیا نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے اور ابن ابی شیبہ اور ابن ابی الدنیا نے ابی جحیفہ سے اور ابن ابی الدنیا اور خطیب اور ابن عساکر نے ابو بکرہ سے اور ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور طبرانی اور ابن عساکر نے عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کئے ہیں اور اگر موت کی تمنا اللہ کے ملنے کے شوق میں کرے تو یہ بہت ہی اچھا ہے۔ ابن عساکر نے ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے آپ فرماتے تھے کہ شوق سب مقامات سے برتر مقام ہے اور سب درجوں سے بڑھ کر درجہ ہے جب بندہ کو یہ مقام نصیب ہوتا ہے تو اپنے پروردگار کے شوق میں موت کی آرزو کرتا ہے اور اس کے دیر میں آنے سے اکتاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں مقصود خطاب سے یہی تمنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے شوق میں ہو اب اس تقدیر پر فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کی تفسیر یہ ہوگی کہ اللہ کے شوق میں موت کی تمنا کرو۔

ابن سعد اور بخاری و مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ میں سنا کرتی تھی کہ ہر نبی کو وفات سے بیشتر اختیار دیا جاتا ہے کہ خواہ دنیا میں رہو یا یہاں چلے آؤ۔ جب رسول اللہ ﷺ کو مرض کی شدت ہوئی تو میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا (ان کے ساتھ جن پر خدا تعالیٰ نے احسان اور انعام فرمایا ہے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور نیک بندے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں) میں سمجھ گئی کہ اب حق تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملا ہے اور آپ نے آخرت کو اختیار فرمایا ہے۔ اور نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ (مرض الموت میں) رسول اللہ ﷺ میری گود میں لیٹے تھے کہ آپ پر بیہوشی طاری ہوئی، میں آپ کے بدن مبارک پر ہاتھ پھیرتی تھی اور آپ کے لئے ان کلمات سے دعائے شفا کرتی تھی اَذْهِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ (اے لوگوں کے پروردگار شدت کو دور فرمایئے) اس کے بعد آپ کو افاقہ ہوا تو آپ نے ہاتھ کو میرے ہاتھ سے الگ کر لیا اور فرمایا نہیں میں تو اللہ تعالیٰ سے رفیق اعلیٰ کا سوال کرتا ہوں۔

طبرانی نے روایت کی ہے کہ ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ان کی روح قبض کرنے آئے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ملک الموت! بھلا کہیں ایسا دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے دوست کی روح قبض کرے۔ ملک الموت نے یہ سنکر حق تعالیٰ سے عرض کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہہ دو کہ تم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے دوست کے ملنے کو ناگوار جانے۔ ابراہیم علیہ السلام نے سن کر فرمایا میری روح ابھی قبض کر لو! اور یوسف علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ مجھ کو اسلام کی حالت میں وفات دے اور نیک بندوں سے ملادے اور علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مجھے کچھ پرواہ نہیں خواہ موت مجھ پر گرائی جائے یا میں موت پر گرایا جاؤں، اس کو ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور عمار رضی اللہ عنہ صفین میں فرماتے تھے کہ میں آج اپنے دوستوں سے یعنی محمد ﷺ اور آپ کے گروہ سے ملوں گا۔ اس قول کو طبرانی نے کبیر میں اور ابو نعیم نے دلائل میں نقل کیا ہے

اس پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ امام احمد نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں بیٹھے تھے آپ نے وعظ فرمایا اور ہمارے دلوں کو نرم کیا، سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ یہ وعظ سن کر خوب روئے اور کہہ اٹھے اے کاش میں تو مر جاتا حضور ﷺ نے فرمایا کہ سعد! میرے پاس ہو کر موت کی تمنا کرتے ہو اور یہی مضمون

marfat.com

تین بار فرمایا، پھر فرمایا سعد اگر تم جنت کے لئے پیدا کئے گئے ہو اور تمہاری عمر طویل اور عمل اچھے ہوں تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موت کی تمنا کرنا ہر حال میں ناجائز ہے خواہ کوئی مالی یا جسمانی ضرر ہو یا نہ ہو، چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس قصہ میں موت کی تمنا کسی مالی یا بدنی ضرر وغیرہ سے نہیں کی بلکہ اللہ کے عذاب کے خوف سے کی تھی۔

میں کہتا ہوں بے شک یہ امر صحیح ہے کہ عذاب کے خوف سے تمنا کی لیکن موت سے اللہ کا عذاب دفع نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے تو استغفار کرنا اور اعمال صالحہ میں سبقت کرنا اور گناہوں سے بچنا ضروری ہے اور اسی بناء پر جناب رسول اللہ ﷺ نے موت کی تمنا کرنے کو منع فرمایا ہے۔

تحقیق مقام یہ ہے کہ گناہ میں مبتلا ہو جانے یا طاعت میں کوتاہی کے خوف سے موت کی تمنا کرنا جائز ہے اس میں شبہ نہیں اور محبوب حقیقی کی لقاء کے شوق میں خود تمنا کرنا بعض سلف سے مرض الموت میں وارد ہوا ہے چنانچہ پہلے ہم نے جناب رسول اللہ ﷺ اور ابراہیم علیہ السلام اور عمار وغیر ہم سے نقل کیا ہے کہ جب موت کا وقت قریب ہوا اور اعمال صالحہ کی زیادتی کی ان کو امید نہ رہی تو اللہ تعالیٰ کی لقاء کے شوق میں موت کو حیات پر ترجیح دی۔

عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے اللہ اس سے ملنا چاہتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے ملنے کو مکروہ سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ملنے کو بھی مکروہ جانتا ہے۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا اور کسی زوجہ مطہرہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تو سب موت کو مکروہ اور برا سمجھتے ہیں، فرمایا یہ مطلب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مؤمن جب مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اللہ کی رضا مندی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعزاز کی خوشخبری[1] اس کو دی جاتی ہے پھر اس وقت اس کو کوئی شئے آخرت سے زیادہ پیاری نہیں ہوتی پس وہ اللہ کے ملنے کو دوست رکھتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کے ملنے کو چاہتا ہے اور کافر کی موت جب قریب ہوتی ہے تو اللہ کے عذاب اور عقاب کی خوشخبری اس کو دی جاتی ہے اس وقت کوئی شئے اسے آئندہ حالت سے زیادہ بری اور مبغوض اور مکروہ نہیں ہوتی پس وہ اللہ کے ملنے کو مکروہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ملنے کو مکروہ جانتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور تندرستی کی حالت میں کسی سلف سے موت کی تمنا کرنا منقول نہیں لیکن ہاں خوف فتنہ کی وجہ یا عمل میں تقصیر کے خوف سے البتہ منقول ہے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہم نے اوپر نقل کیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقولہ بھی اسی پر محمول ہے اور غلبۂ حال میں بھی موت کی تمنا کرنا اولیاء کرام رحمہم اللہ سے وارد ہے انبیاءؑ اور صحابہؓ اور اصحاب صحو (ہوشیاری والے یعنی ان پر حال غالب نہیں حال پر وہ خود غالب ہیں) سے یہ تمنا نہیں ہو سکتی وہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ سے ملنے کے لئے تڑپتے ہیں مگر اعمال صالحہ کی زیادتی کو غنیمت سمجھتے ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔

فَاِنِّیْ فِی الْوِصَالِ عُبَیْدُ نَفْسِیْ   وَفِی الْهِجْرَانِ مَوْلٰی لِلْمَوَالِیْ

(یعنی میں وصال میں تو اپنے نفس کا غلام ہوں (یعنی حسنات اور اعمال صالحہ میں جو کہ حظ نفس کے لئے ہیں مشغول رہتا ہوں اور ہجر میں غلاموں کا بھی غلام ہوں) یہود چونکہ شدت جہل اور عناد کی وجہ سے مدعی تھے کہ ہم اللہ کے دوست ہیں ہمیں عمل کی حاجت نہیں اس لئے ان کو کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرنا تمہارے لئے ضروری ہے اور چونکہ ان کا دعویٰ جھوٹا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو ذیل کی آیت میں رد فرمایا

وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (اور کبھی ہرگز آرزو نہ کریں گے موت کی) اس جملہ میں پیشین گوئی اور غیب کی خبر کے طور پر ایک معجزہ ہے۔

---

[1] اولیائے کرام کو خوشنودی باری تعالیٰ کا علم قریب موت کے وقت یا تو کشف سے معلوم ہوتا ہے، یا ہاتف کے کلام سے یا اس حالت میں کثرت سے ان پر برکات نازل ہونے کو ان کا ذوق محسوس کرتا ہے، یا ملک الموت اور رحمت کے فرشتوں کو جب دیکھتے ہیں تو رضائے حق کا ان کو علم ہو جاتا ہے، منہ رحمہ اللہ تعالیٰ، ۱۲۔

marfat.com

اَیۡدِیۡهِمۡ ؕ اِبِمَا قَدَّمَتۡ (بوجہ ان گناہوں کے جوان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں) اس سے مراد جہنم میں جانے کے وہ اسباب ہیں جن کا یہود ارتکاب کرتے تھے مثلاً محمد رسول اللہ ﷺ کو رسول اور قرآن کو کلام اللہ نہ ماننا اور تورات کی تحریف کرنا وغیرہ وغیرہ۔ خود ان کی ذات کے فعل کو ان کے ہاتھوں کی طرف اس لئے نسبت کر دیا کہ انسان کے لئے ہاتھ قدرت کا آلہ ہے اور اکثر نفع نقصان کے کام اسی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے ید (ہاتھ) سے خود ذات مراد لے لی اور کبھی ید (ہاتھ) سے قدرت بھی اسی وجہ سے مراد لیتے ہیں۔

وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۹۵﴾ (اور اللہ جاننے والا ہے گناہ گاروں کو) یہ یہود کو دھمکی اور اس امر پر تنبیہ ہے کہ وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ (اور البتہ پاؤ گے تم ان کو سب لوگوں سے زیادہ حریص جینے کے) لَتَجِدَنَّهُمْ میں لام قسم کا ہے اور نون تاکید قسم کے واسطے ہے اور تجد افعال قلوب سے ہے لَتَجِدَنَّهُمْ میں ھم ضمیر تجد کا مفعول اول ہے اور مفعول ثانی احرص الناس ہے اور حیاۃ کو نکرہ لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حیات کی کوئی بڑی قسم مراد لی گئی ہے یعنی حیات دراز۔

وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚ (اور ان لوگوں سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں) باعتبار معنی کے اس کا عطف الناس پر ہے۔ گویا عبارت اس طرح ہو گی۔ احرص من الناس وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوا یا احرص پر عطف ہے اور دوسرا اَحْرَصَ مقدر ہے اور جار مجرور اس کے متعلق ہے۔ مشرکین اگرچہ الناس میں داخل تھے لیکن کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے ان کو علیحدہ ذکر کیا جیسے جبرئیل کا عطف الملائکۃ پر قوت کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین کو زندگی کی اور لوگوں سے زیادہ حرص تھی کیونکہ وہ تو حیات اخروی کے قائل ہی نہ تھے دنیوی حیات ہی کو حیات سمجھتے تھے اور یہود باوجود اس کے کہ ثواب وعقاب کو جانتے تھے پھر بھی ان کا سب سے زیادہ حریص دنیا ہونا اس پر دلیل ہے کہ جہنم کی آگ پر ان کو بدرجۂ کمال صبر ہے اور جہنم سے ان کو بالکل کسی درجہ میں بھی خوف نہیں پس اس لحاظ سے آیت وَلَتَجِدَنَّهُمْ میں زیادہ توبیخ اور دھمکی ہو گی۔

يَوَدُّ اَحَدُهُمۡ لَوۡ يُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ (ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے اے کاش جیتا رہے ہزار برس) لَو کو بعض مفسرین نے مصدریہ بمنزلہ اَنۡ کے بنلایا ہے لیکن فرق اَنۡ اور لَو میں یہ ہے کہ اَنۡ نصب کرتا ہے اور لَو نصب نہیں کرتا اس تقدیر پر لَوْ يَعمر، يَوَدّ کا مفعول ہو گا اور بیضاوی نے کہا ہے کہ لَو بمعنی لَیۡتَ ہے اور اصل کلام لَوْ اُعَمّر (کاش عمر دیا جاؤں میں) صیغۂ متکلم سے تھا لیکن يَوَدّ چونکہ صیغۂ غائب کا تھا اس لئے اس کی رعایت سے اس کو بھی صیغۂ غائب سے لائے اس تفسیر پر کلمۂ تمنی یعنی لَو ان کی خواہش اور رغبت کی حکایت کے لئے لایا گیا ہے اور مفعول يَوَدّ کا محذوف ہے جس پر يَوَدّ کے بعد کا مضمون دلالت کرتا ہے اور لَوْ يُعَمّر گویا ان کی زیادتی حرص کے بیان کے لئے علیحدہ مستقل کلام ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جملہ يَوَدّ مبتدا محذوف کی صفت ہو اور ظرف مستقر یعنی مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اس مبتدا کی خبر ہو اور تقدیر عبارت کی اس طرح ہو وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اُنَاسٌ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ الخ اور مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے مراد یہود ہیں جو قائل تھے کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں (نعوذ باللہ) ابو العالیہ اور ربیع نے کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے مجوس مراد ہیں کیونکہ ان کا سلام آپس میں یہ تھا "زی ہزار سال" (یعنی تو ہزار برس زندہ رہے) پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ یہود سب لوگوں سے زیادہ زندگی کے حریص ہیں مجوس سے بھی زیادہ حریص ہیں اور مجوس ہزار برس کی زندگی کی تمنا کرتے ہیں اور اصل سَنَةٌ کی سَنْوَةٌ ہے کیونکہ جمع سنوات آتی ہے اور بعض نے کہا ہے اصل سَنَةٌ کی سَنْهَةٌ ہے۔

وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ يُّعَمَّرَ ؕ (اور نہیں اس کو نجات دینے والا عذاب سے اس قدر جینا) ضمیر ہو یا تو اَحَدُهُمْ کی طرف راجع ہے اور اَنْ يُعَمَّرَ مُزَحْزِحِهٖ کا فاعل ہے اور معنی یہ ہیں کہ کوئی ان میں ایسا نہیں کہ اس کو عمر دیا جانا عذاب سے بچا سکے اور یا ضمیر هُوَ، يُعَمَّر کے مصدر کی طرف راجع ہے اور يُعَمَّر اس سے بدل ہے یا یہ ضمیر مبہم

marfat.com

ہے یعنی کسی کی طرف راجع نہیں اور اَنۡ یُّعَمَّرَ اس کی تفسیر ہے۔ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ دنیا میں عمر زیادہ ہونے سے عذاب اخروی لامحالہ دور ہو ہی جاتا ہے پھر یہ کیسے فرمایا کہ عذاب دور نہیں ہوتا۔

میں کہتا ہوں کہ ہزار سال بلکہ دنیا کی تمام عمر جب دوامی آخرت کے مقابلہ میں ایسی نسبت رکھتی ہے جیسے ایک ساعت کو ایک دن سے یا ایک مرتبہ آنکھ جھپکنے کو ایک زمانہ متناہی سے تو عذاب سے وہ دوری جو ہزار برس یا زیادہ کی عمر کی وجہ سے حاصل ہو کس شمار میں ہوئی، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ نا قابل توجہ ہے اور یا مراد وہ دوری ہے جو عمل صالح کی وجہ سے عذاب سے ہوتی ہے اس صورت میں اور بھی زیادہ دھمکی ہو گی کہ عمر کا بڑھنا عذاب کو دور کرنے والا نہیں بلکہ عذاب کو بڑھانے والا ہے کیونکہ جس قدر عمر بڑھے گی گناہ بڑھیں گے اور اعمال صالحہ کم ہوں گے اور یہ زیادتی عذاب کا موجب ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾ (اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں) یعقوب نے یعملون کو بصیغۂ خطاب (تعملون) پڑھا ہے اس قرأۃ پر خطاب یہود کو ہوگا۔ اور باقی قراء نے صیغۂ غائب سے پڑھا ہے۔ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بطرق مختلفہ شعبی سے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ یہود کے پاس تشریف لاتے اور تورات سنتے تھے اور اس سے خوش ہوتے اور تعجب فرماتے کہ یہ قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے ایک روز حسب دستور یہود تورات پڑھ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اس طرف تشریف لے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں سچ بتاؤ تم جانتے ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ان میں سے جو عالم تھا اس نے کہا ہاں، ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا پھر تم لوگ اتباع کیوں نہیں کرتے کہا کہ اس وجہ سے کہ ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ وحی کون لاتا ہے تو معلوم ہوا جبرئیل وحی لاتا ہے اور وہ ہمارا دشمن ہے وہی شدت اور ہلاکت اور عذاب لاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے پوچھا ملائکہ میں سے کس سے تمہاری صلح ہے جواب دیا میکائیل سے کیونکہ وہ بارش اور رحمت لاتے ہیں۔ میں نے پوچھا حق ؐ کے ہاں ان دونوں کا مرتبہ کیا ہے کہا ایک اللہ کے دائیں ہے اور دوسرا بائیں، میں نے کہا جب ان کے قرب اور مرتبہ کی یہ کیفیت ہے تو جبرئیلؑ کو یہ روا نہیں کہ میکائیلؑ سے عداوت رکھے اور نہ میکائیلؑ کو یہ جائز ہے کہ جبرئیلؑ کے دشمن سے صلح رکھے اور میں بے شک اس کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اور جبرئیل اور میکائیل سے جو صلح رکھے اس سے یہ بھی صلح رکھتے ہیں اور جو ان کو دشمن رکھے اس کے یہ بھی دشمن ہیں[1]۔ پھر میں وہاں سے اٹھ کر نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں آیا اور میرا ارادہ تھا کہ آپ کو اس قصہ کی خبر کروں کہ مجھ سے پہلے ہی آپ نے فرمایا عمر آج جو آیات نازل ہوئی ہیں کیا ان کی تمہیں خبر نہ دوں یہ فرما کر حضور ﷺ نے ذیل کی آیت کو کفرین تک پڑھنا شروع کیا۔

قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِیۡلَ (یعنی اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی دشمن ہو جبرئیل کا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ابھی میں حضور کی خدمت میں یہود کے پاس سے آیا ہوں اور بعینہ یہی قصہ پیش آیا جو حق تعالیٰ نے ان آیات پاک میں بیان فرمایا میرا ارادہ تھا کہ حضور ﷺ سے سب واقعہ عرض کروں کہ حق تعالیٰ نے مجھ سے پہلے ہی آپ کو مطلع فرما دیا۔ سند اس حدیث کی شعبی تک صحیح ہے کلام اس قدر ہے کہ شعبی نے حضرت عمر رضی

---

[1] حاکم نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا فرمایا رسول اللہ ﷺ نے میرے دو وزیر آسمان والوں میں سے تو جبرئیل و میکائیل ہیں اور زمین والوں میں سے ابو بکر و عمرؓ۔ طبرانی نے بسند حسن حضرت امّ سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا آسمان میں دو فرشتے ہیں ایک سختی کا حکم دیتا ہے دوسرا نرمی کا اور ہر ایک ٹھیک کرتا ہے، یہ دونوں حضرت جبرئیل و میکائیل ہیں پھر فرمایا دو نبی ہیں ایک سختی کا حکم دیتا ہے دوسرا نرمی کا اور دونوں حق پر ہیں، یہ دونوں حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہ السلام ہیں، پھر فرمایا میرے دو ساتھی ہیں، ایک نرمی کا حکم دیتا ہے دوسرا سختی کا اور دونوں حق کرتے ہیں، فرمایا یہ دونوں حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ ہیں۔ ۱۲ منہ رحمتہ اللہ تعالیٰ۔

marfat.com

اللہ عنہ کو نہیں پایا۔ اور اس حدیث کو ابن جریر نے بطریق سدی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور بطریق قتادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے لیکن یہ دونوں سندیں بھی منقطع ہیں اور اس کو ابن ابی حاتم نے ایک اور طریق سے عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملا اور کہا کہ یہ جبرئیل جس کو تمہارے پیغمبر ذکر کرتے ہیں ہمارے دشمن ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ (جو اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور پیغمبروں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہے بے شک اللہ اس کا دشمن ہے)۔

راوی حدیث حضرت عبد الرحمٰن فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر نازل ہوئی اور ابن جریر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ نزول آیت کا سبب یہی قصہ ہے اور امام بخاریؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (اپنے اسلام لانے سے پیشتر) اپنی زمین کا کام کاج کرتے تھے اسی حالت میں انہوں نے سنا کہ جناب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہیں یہ سن کر آپ کی خدمت مبارک میں آئے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں آپ سے تین باتیں پوچھتا ہوں کہ ان کو نبی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ ایک تو یہ کہ قیامت کی علامتوں میں سے سب سے پہلی علامت کون سی ہے اور دوسرے یہ کہ سب سے پہلے جنت والوں کا کھانا کیا ہوگا۔ تیسرے یہ کہ بچہ کبھی باپ کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی ماں کے ہم شکل اس کی وجہ کیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا مجھے ابھی جبرئیل علیہ السلام نے ان تینوں سوالوں کا جواب بتلایا ہے۔ عبد اللہ بن سلام نے جبرئیل کا نام سن کر کہا کہ یہ تو فرشتوں میں سے یہود کے دشمن ہیں آپ نے فوراً یہ آیت یعنی قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ الآية پڑھی۔ شیخ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ظاہر عبارت کے طرز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے یہ آیت یہود کا زعم فاسد رد کرنے کے لئے پڑھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسی وقت خاص اسی واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہو اور یہی قول قابل اعتماد ہے۔ امام احمد ترمذی اور نسائی نے بطریق بکیر بن شہاب حضرت سعید بن جبیر سے اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہودی جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ابو القاسم ہم آپ سے پانچ باتیں دریافت کرتے ہیں اگر آپ نے بتادیں تو ہم جانیں گے کہ بیشک آپ نبی ہیں، راوی نے تمام حدیث بیان کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہود نے ایک تو یہ دریافت کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا شئے اپنے اوپر حرام کرلی تھی اور پیغمبر کی علامت کیا ہے اور رعد اور اس کی آواز کا حال پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ عورت کے کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی۔ حضور علیہ السلام سب باتوں کا جواب دیتے رہے آخر کار یہ پوچھا کہ آسمانی خبریں آپ کے پاس کون لاتا ہے اور آپ کا ساتھی خدائے تعالیٰ کی طرف سے کون ہے۔ حضور نے فرمایا جبرئیل۔ جبرئیل کا نام سنتے ہی بولے وہ جو قتال حرب اور عذاب ہم پر لے کر اترتا تھا اور ہمارا دشمن ہے۔ اگر آپ میکائیل فرماتے کہ جو رحمت اور سبزی اور بارش لے کر آسمان سے اترتے ہیں تو بہت اچھا ہوتا۔

علامہ بغویؒ نے بلا سند بیان کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ علماء یہود میں سے ایک عالم عبد اللہ بن صوریا کے نام سے مشہور تھا اس نے جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس کون سا فرشتہ آسمان سے آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا جبرئیل، کہا یہ تو فرشتوں میں سے ہمارا دشمن ہے۔ اگر میکائیلؑ ہوتے تو بے شک ہم آپ پر ایمان لے آتے جبرئیل علیہ السلام نے بارہا ہم سے دشمنی کی باتیں کی ہیں، مجملہ ان کے یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کو خبر دی کہ بیت المقدس ایک شخص کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگا اور اس شخص کا نام بخت نصر بتلایا اور ہم کو اس کے آنے اور تباہی ڈالنے کا وقت بھی بتادیا۔ ہم نے اس کے دفعیہ کی یہ تدبیر سوچی کہ ایک شخص کو بھیجا کہ بخت نصر کو پہلے ہی قتل کر ڈالے اور وہ اس وقت ایک مسکین سا لڑکا تھا اور بابل میں رہتا تھا ہمارا آدمی جب پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے اس کی حمایت کی اور ہمارے آدمی کو وہاں سے الگ کر دیا حتیٰ کہ بخت نصر بڑا ہو گیا اور بیت المقدس کو برباد کیا۔

marfat.com

مقاتل نے فرمایا کہ یہود نے کہا تھا جبرئیل ہمارے دشمن ہیں کیونکہ ان کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ نبوت ہم میں اتاریں انہوں نے غیروں کو دی۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ یہ دونوں قصے جو شان نزول میں بیان کئے گئے ہیں نزول آیت سے پیشتر واقع ہوئے ہوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی یہود سے ملے ہوں اور ان سے یہ گفتگو یہود کی ہوئی ہو اور یہود بھی اسی وقت جناب رسول اللہ ﷺ سے ملے ہوں اور آپ سے یہ باتیں کی ہوں۔ ابن کثیرؒ نے جبرئیل کو یہاں دونوں جگہ اور سورۂ تحریم میں جیم کے فتحہ اور راء کے کسرہ سے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور ابو بکرؒ نے جبرئیل جیم اور راء کے فتحہ اور ہمزہ مکسورہ سے پڑھا ہے اور حمزہ اور کسائی نے بھی اسی طرح پڑھا ہے لیکن یہ دونوں بعد ہمزہ کے ی بھی بڑھاتے ہیں اور جبرئیل پڑھتے ہیں باقی قراء جیم اور راء کے کسرہ سے بغیر ہمزہ کے جبریلؑ پڑھتے ہیں۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (اس نے تو اتارا ہے یہ کلام آپ کے دل پر) فَاِنَّهٗ میں ضمیرہ جبرئیل علیہ السلام کی طرف اور نَزَّلَهٗ میں قرآن پاک کی طرف راجع ہے۔ اضمار قبل الذکر قرآن شریف کی عظمت شان کی وجہ سے ناجائز نہیں ہے کیونکہ ذہن اس طرف فوراً منتقل ہو جاتا ہے مرجع کا ذکر پہلے ہونے کی ضرورت نہیں۔ قلب کی تخصیص اس وجہ سے فرمائی کہ وحی کو قبول کرنے والا اول قلب پاک نبوی ہی ہے حق عبارت یہ تھا کہ قلبی (میرے دل پر) فرماتے لیکن بطور حکایت کلام باری تعالیٰ کے قَلْبِكَ فرمایا (گویا حاصل یہ ہوا کہ اے محمد ﷺ جو کچھ میں کلام کروں وہ ان سے بجنسہٖ نقل کر دو۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ (خدا کے حکم سے) یعنی اس کے حکم سے جبرئیل علیہ السلام نے اتارا ہے۔ یہ نَزَّلَ کے فاعل سے حال ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۷﴾ (جو سچ بتاتا ہے اس کلام کو جو اس سے پہلے ہے اور ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے) یہ بھی نَزَّلَ کے مفعول سے حال ہیں۔ اور جواب شرط (جو اصل میں قائم مقام جواب شرط ہے) بظاہر فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ ہے۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ جو شخص جبرئیل علیہ السلام کا دشمن ہو اس نے انصاف کا خون ہی کیا اور کتاب الٰہی جو اس کے پاس ہے اس کا کھلا انکار کیا کیونکہ جبرئیل علیہ السلام نے قرآن پاک کو اتارا اور قرآن بھی کیسا جو پہلی آسمانی کتابوں کو سچا بتانے والا ہے۔ جواب شرط کو حذف کر کے اس کی علت کو اس کے قائم مقام کر دیا یا یہ مطلب ہے کہ جو شخص جبرئیل علیہ السلام سے دشمنی اور عداوت باندھتا ہے تو اس کی عداوت کا سبب یہ ہے کہ اس نے قرآن پاک کو اللہ کے حکم سے آپ پر اتارا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جواب شرط محذوف ہے موقع کے مناسب جملہ مقدر ہے مثلاً جو جبرئیل علیہ السلام کا دشمن ہو اس کو چاہئے کہ اپنے اسی غیظ و غضب میں مر رہے یا جو شخص جبرئیل علیہ السلام کا دشمن ہو وہ میرا دشمن ہے یا میں اس کا دشمن ہوں اور آخر کی تقدیر پر آئندہ آیت یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ کا مفہوم دلالت کر رہا ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْكٰىلَ (اے محمدؐ) کہہ دیجئے کہ جو دشمن ہے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور رسولوں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا) مجملہ اور فرشتوں کے خاص جبرئیل اور میکائیل کا ذکر بطور تخصیص بعد تعمیم اس لئے فرمایا کہ تا کہ ان دونوں کی فضیلت کا اظہار ہو، گویا یہ فرشتوں میں داخل ہی نہیں۔ علو مرتبہ کی وجہ سے ان کی جنس ہی اور ہے نیز کلام بھی ان ہی دونوں میں تھا۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر علیحدہ کر دیا پھر یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ ایک کی عداوت ہو یا سب کی کفر اور اللہ کی دشمنی میں یکساں ہے۔ حفص، یعقوب اور ابو عمرو نے میکال کو بغیر ہمزہ اور بغیر یا کے پڑھا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۹۸﴾ (بیشک اللہ کافروں کا دشمن ہے) اس میں بجائے ضمیر کے اسم ظاہر لانے کی (یعنی موقع اس کا تھا کہ یوں فرماتے اِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لَّهُمْ یعنی بے شک اللہ ان کا دشمن ہے) وجہ اس امر کو ظاہر کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دشمنی کا سبب ان کا کفر ہے نیز ملائکہ اور پیغمبروں سے دشمنی رکھنا کفر ہے۔ ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ابن صوریا یہودی نے جناب رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ تم کوئی ایسی نشانی تو اپنی نبوت کی لاتے نہیں جسے ہم بھی پہچان لیں اس پر اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

marfat.com

وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكۡفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۹۹﴾ (اور ہم نے اتاریں آپ کی طرف کھلی نشانیاں اور نہ انکار کریں گے ان کا مگر وہی جو نافرمان ہیں) اَلۡفٰسِقُوۡنَ کے معنی کفر میں بڑھنے اور سرکشی کرنے والے کے ہیں کیونکہ جب کسی معصیت پر فسق کا اطلاق آتا ہے تو اس معصیت کی عظمت پر دلالت کیا کرتا ہے۔ الفاسقون میں الف لام جنس کا ہے عہد کا ہونے کی صورت میں اشارہ یہود کی طرف ہوگا۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مالک بن حنیف یہودی سے ذکر فرمایا کہ دین محمدی کے بارے میں تم سے عہد و پیمان لیا گیا ہے کہ جب وہ دین ظاہر ہو اس کا اتباع کرنا، مالک نے سن کر کہا کہ قسم اللہ کی ہم سے ہرگز اس قسم کا عہد نہیں لیا گیا۔ اس کی تکذیب میں اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت کریمہ نازل فرمائی۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوۡا عَهۡدًا (کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں) اَوَكُلَّمَا میں ہمزہ استفہام کا انکار کے لئے ہے اور ایک کلام مقدر پر عطف کرنے کے واسطے ہے۔ تقدیر عبارت کی اس طرح ہے اَكَفَرُوۡا بِالۡاٰيٰتِ وَكُلَّمَا عٰهَدُوۡا الخ (کیا آیات کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں اور جب کبھی عہد کرتے ہیں الخ) اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوۡا میں ضمیر فاعل سے یہود مراد ہیں اور وہ عہد جو یہود نے کیا تھا یہ تھا کہ اگر محمد ﷺ تشریف لائے تو ہم ان پر ایمان لے آویں گے۔

چنانچہ ابو رجاء عطاردی کی قرأت اَوَكُلَّمَا عُوۡهِدُوۡا (جب کبھی عہد لئے گئے) بھی یہی بتلا رہی ہے کہ عہد سے مراد یہی ہے کہ نبی آخر الزماں پر ایمان لے آویں گے (اس قرأت سے یہ معنی اس طور سے معلوم ہوئے کہ عہد جو یہود سے لیا گیا تھا وہ بالیقین یہی تھا کہ محمد ﷺ پر ایمان لانا چنانچہ دوسرے مقام پر ہے وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ اگرچہ ذکر اس آیت میں انبیاء کے عہد کا ہے لیکن مقصود ان کی امم سے عہد لینا ہے) اور عطاء فرماتے ہیں کہ اس عہد سے مراد وہ عہد ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور یہود کے درمیان ہوئے تھے کہ مشرکین کی قتال میں اعانت نہ کریں۔ انہوں نے ان عہدوں کو پورا نہ کیا بلکہ توڑ دیا جیسا کہ بنی قریظہ اور بنی نضیر نے توڑا۔ اس تفسیر پر گویا یہ آیت اَلَّذِيۡنَ عٰهَدۡتَّ مِنۡهُمۡ ثُمَّ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَهُمۡ (وہ لوگ کہ ان سے آپ نے عہد لیا پھر اپنے عہد کو وہ توڑتے ہیں) کے ہم معنی ہوئی۔

نَّبَذَهٗ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ ؕ (پھینک دیا اور توڑ دیا) اس عہد کو ایک گروہ نے ان میں سے) اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بد عہدی کرنے والے کم تھے اس لئے آگے فرمایا۔

بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ (بلکہ ان میں سے بہت تو ایمان ہی نہیں رکھتے) یعنی بد عہدی تو ادنیٰ درجہ کی شئے ہے بہت سے تو ان میں سے اللہ تعالیٰ یا تورات پر ایمان ہی نہیں رکھتے جب ایمان ہی نہیں تو بد عہدی کرنے کو وہ کیا گناہ سمجھیں گے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (اور جب آیا ان کے پاس خدا کی طرف سے رسول) رسول سے مراد عیسیٰ اور محمد ﷺ ہیں۔

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ نَبَذَ فَرِيۡقٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ (جو ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے تو جس فرقہ کو کتاب دی گئی تھی اس نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا) ما سے مراد تورات۔ ہے پیٹھ کے پیچھے پھینکنے سے حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ پر عمل نہ کیا اگر عمل کرتے تو ہر نبی پر ایمان لانا پڑتا کیونکہ اس کا مقتضی تو یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے اعراض کرنے اور احکام مندرجہ تورات (یعنی بعد کے انبیاء پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے) پر عمل نہ کرنے کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی کہ جو کسی شئے کو پس پشت ڈال دے اور اس کی طرف کچھ التفات نہ کرے۔

كَاَنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾ (گویا وہ کچھ جانتے ہی نہیں) یعنی کتاب اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں گویا کہ

marfat.com

جانتے ہی نہیں کہ یہ کتاب اللہ ہے۔ یا یہ مطلب کہ جانتے تو ہیں کہ کتاب اللہ ہے لیکن عناد کی وجہ سے تجاہل کرتے ہیں۔
وَاتَّبَعُوْا (اور پیچھے پڑ گئے) یعنی یہود نے جادو کے علم پر عمل کیا اس کو سیکھا اور آپس میں ایک دوسرے کو تعلیم دی وَاتَّبَعُوْا کا نَبَذَ پر عطف ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کتاب اللہ کو تو پس پشت ڈال دیا اور سحر و شعبدہ کی کتابوں کے پیچھے پڑ گئے۔
میں کہتا ہوں کہ نَبَذَ پر عطف کرنا اس کا بظاہر صحیح نہیں کیونکہ نَبَذَ مقید ایک شرط (رسول کے آنے) کے ساتھ ہے اور وَاتَّبَعُوْا الخ کا اس شرط سے تعلق سمجھ میں نہیں آتا اسلئے وَاتَّبَعُوْا کا عطف جملہ شرطیہ وَلَمَّا جَآءَھُمْ پر ہونا مناسب ہے۔
مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ (جو پڑھتے تھے شیطان) تَتْلُوْا اگرچہ صیغہ مضارع کا ہے لیکن حال ماضیہ کی حکایت کے طور پر بمعنی ماضی ہے اور کلام عرب میں اکثر مضارع بمعنی ماضی اور ماضی بمعنی مضارع مجازاً مستعمل ہوتا ہے اور تَتْلُوْ کو یا تو تلاوت بمعنی قرأت (پڑھنا) سے مشتق کہا جاوے اور یا تلوا بمعنی جعیت (پیچھے پڑنا) سے لیا جاوے۔ تقدیر اول پر معنی آیت کے وہ ہوں گے جو ترجمہ میں اختیار کئے گئے ہیں اور تقدیر ثانی پر معنی یہ ہوں گے کہ یہود نے اس علم کا اتباع کیا جس کا شیطان، سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں اتباع کرتے تھے۔
عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ (سلطنت حضرت سلیمان علیہ السلام میں) یہ تَتْلُوْ کی مؤخر الذکر توجیہ سے متعلق ہے اگر تَتْلُوْ میں معنی اِفْتِرَاء کے بقاعدہ تضمین لے لئے جاویں۔ گویا حاصل یہ ہوگا کہ اس علم کا اتباع کیا جس کو شیطان یہ سمجھ کر پڑھتے تھے کہ اس علم سے سلیمان علیہ السلام کی سلطنت قائم ہے اس تفسیر پر وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ کو ما قبل سے پورا ارتباط ہو جاوے گا اور یا عَلٰی کو بمعنی فی لے لیا جاوے معنی عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ کے یہ ہوں گے کہ سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں اس تقدیر پر تضمین وغیرہ کے تکلف سے نجات ہو گی۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ سدیؒ نے کہا ہے کہ زمانہ گزشتہ میں شیطان آسمان پر چڑھا کرتے اور ملائکہ جو آپس میں آئندہ واقعات کے متعلق گفتگو کرتے، سنتے اور سن کر اس میں بہت سا اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر کاہنوں سے کہتے اور کاہن لوگوں کو خبر دیتے لوگ ان اخبار کو لکھ لیتے تھے حتی کہ بنی اسرائیل میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ جن علم غیب جانتے ہیں۔ یہ قصہ دیکھ کر سلیمان علیہ السلام نے ایسی تمام کتابوں کو جمع کیا اور انہیں ایک صندوق میں رکھ کر اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دی اور حکم دیا کہ خبردار آج کے بعد میں یہ بات کسی سے نہ سنوں کہ جن علم غیب جانتے ہیں اگر میں نے پھر کسی سے یہ بات سنی تو اس کی گردن ماروں گا۔ جب سلیمان علیہ السلام نے وفات پائی اور وہ علماء بھی رحلت کر گئے جو سلیمان علیہ السلام کے اسرار اور اس دفن کے قصہ سے واقف تھے اور بعد کے لوگ پچھلوں کے جانشین ہوئے تو ایک شیطان آدمی کی صورت میں بنی اسرائیل کے چند آدمیوں کے پاس آیا اور کہا کہ میں تمہیں ایسا خزانہ نہ بتاؤں کہ جسے تم لوگ تمام عمر نہ کھا سکو اس کرسی کے نیچے سے کھودو لوگوں نے کھودنا شروع کیا اور وہ شیطان الگ جا کھڑا ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ کرسی کا یہ خاصہ تھا کہ جو شیطان اس کے پاس آتا فوراً جل جاتا تھا۔ لوگوں نے اس جگہ کو کھودا اور وہ کتب مدفونہ نکالیں۔ شیطان نے کہا سلیمان علیہ السلام جن و انسان اور پرند چرند کو اسی کے ذریعہ سے مسخر کرتے تھے شیطان تو یہ بتا کر اڑ گیا اور لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ سلیمان علیہ السلام ساحر تھے اور بنی اسرائیل نے وہ کتابیں لے لیں۔ اسی واسطے اکثر یہود میں سحر پایا جاتا ہے جب ہمارے پیغمبر ﷺ رونق افروز عالم ہوئے اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی قرآن پاک میں برأت ظاہر فرمائی۔
میں کہتا ہوں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جو دفن کیا تھا وہ سحر کی کتابیں تھیں اور جو شیطان کاہنوں کو ملائکہ سے روزانہ حوادث کے متعلق خبریں دیتے تھے وہ نہ تھیں کیونکہ سالہا سال گزرنے کے بعد وہ خبریں کیا مفید ہو سکتی تھیں۔ اور کلبیؒ فرماتے ہیں کہ شیطانوں نے سحر اور شعبدہ کی کتابیں آصف بن برخیا کی زبانی لکھیں پھر ان کو سلیمان علیہ السلام کے مصلے کے نیچے دفن کر دیا اور سلیمان علیہ السلام کو اس کی خبر نہ ہوئی جب سلیمان علیہ السلام کی وفات ہوئی تو شیطانوں نے ان کتابوں کو نکالا اور لوگوں سے کہا کہ سلیمان علیہ السلام نے اسی کی بدولت تمہیں مسخر کیا تھا۔ یہ افسوں شاطین کا عوام کالانعام پر تو چل گیا لیکن جو علماء صلحاء تھے انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ یہ سلیمان علیہ السلام کا علم نہ تھا عوام اور رذیل لوگ اس پر

maarfat.com

کرے اور اسے سیکھنا شروع کیا اور کتب الٰہیہ کو جو انبیاء علیہم السلام نے پہنچائی تھیں چھوڑ بیٹھے۔ اور سلیمان علیہ السلام ساحر مشہور ہو گئے حتی کہ قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے ان کی برأت ان لفظوں سے بیان فرمائی۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ (اور نہیں کفر کیا سلیمان نے) یعنی سلیمان علیہ السلام نے سحر نہیں کیا کہ اس سے کافر ہوتے۔ سحر کو کفر سے اس لئے تعبیر فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ سحر کفر ہے اور نبی کفر سے معصوم ہوتا ہے۔

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (لیکن شیطانوں نے کفر کیا) ابن عامر اور حمزہ اور کسائی نے ولکن کو تخفیف نون اور شیاطین کے نون کو رفع سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے نون مشدد اور شَیَاطِیْنَ کے نون کو نصب سے پڑھا ہے اور ایسا ہی اختلاف وَلٰكِنَّ الْبِرَّ اور سورۂ انفال میں وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ اور وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى میں ہے۔

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (کہ سکھاتے تھے لوگوں کو جادو) یہ کَفَرُوْا کی ضمیر مستتر ھم سے حال ہے۔ سحر ایسے الفاظ اور اعمال کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعہ سے انسان کو شیاطین سے قرب ہو جاتا ہے اور شیاطین اس کے مسخر ہو جاتے ہیں اور اس کی منشاء کے مطابق امداد کرتے ہیں اور وہ الفاظ آدمی کے نفس اور بدن میں مرض اور موت اور جنون کا اثر پیدا کر دیتے ہیں اور کان اور آنکھ میں خلاف واقع امر کا خیال جما دیتے ہیں جس سے آدمی ایک شئے کو دیکھتا ہے حالانکہ وہ شئے کچھ اور شئے ہوتی ہے جیسا کہ فرعون کے ساحروں نے رسیاں اور عصا ڈال کر موسیٰ علیہ السلام اور حاضرین کے خیال میں جما دیا تھا کہ یہ چلتے سانپ بچھو ہیں اور یہ جملہ تاثیرات حق تعالیٰ نے آزمائش کے لئے پیدا کر دی تھیں۔

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ سحر کا وجود اہل سنت کے نزدیک حق ہے لیکن اس پر عمل کرنا کفر ہے اور شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ مطلقاً یہ کہنا کہ سحر کفر ہے ٹھیک نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اگر اس کے اندر کوئی ایسی بات ہو کہ جس سے کسی شرعی بات کی تردید ہوتی ہے تو البتہ کفر ہے ورنہ کفر نہیں۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ سحر کی تاثیرات عجیب ہیں، خلاف واقع کو متخیل کر دیتا ہے۔ تندرست کو مریض کر دیتا ہے اور بسا اوقات اس کے اثر سے قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے حتی کہ جس نے اس کے ذریعہ سے کسی کو قتل کیا ہے اس پر قصاص واجب ہو جاتا ہے، ختم ہوا قول امام شافعیؒ کا۔ امام شافعیؒ کے اس قول سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سحر کا بعض حصہ تو کفر ہے اور بعض نہیں۔ اور مدارک میں ہے کہ جو سحر کفر ہے اسے اگر کوئی مرد سیکھے تو حنفیہ کے نزدیک قتل کر دیا جائے۔ عورت اگر سیکھے تو قتل نہ کی جائے جیسا کہ مرتد کے بارے میں یہی حکم ہے اور جو سحر کفر نہیں ہے لیکن ایسا ہے کہ اس سے کسی کو ہلاک کر سکتے ہیں تو ایسے سحر سیکھنے والوں کا حکم قطاع الطریق (رہزن) کا سا ہے اس میں مرد اور عورت برابر ہیں دونوں کو سزا دی جائے اور اگر ساحر توبہ کرے تو توبہ اس کی قبول کی جائے گی خواہ وہ سحر کفر ہو یا نہ ہو جس نے یہ کہا ہے کہ ساحر کی توبہ مقبول نہیں اس نے غلطی کی، دیکھو فرعون کے ساحروں کی توبہ مقبول ہو گئی حالانکہ وہ کفار تھے۔

میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ نے جو سحر کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے اور نیز فرمایا ہے وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (اور نہیں کفر کیا سلیمان (علیہ السلام) نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو سحر سکھاتے تھے) اور یہ آیت کریمہ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (اور بے شک وہ جان چکے تھے کہ جس نے اس سحر کو خریدا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں) ان جملہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر کے کل یا اکثر الفاظ و اعمال کفر کے موجب اور شرائط ایمان کے بالکل مخالف ہیں اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے کیونکہ شیطان آدمی سے جب ہی راضی ہوتا ہے جب وہ کفر کرے اور بغیر راضی ہوئے اس کی تسخیر اور اس سے تقرب ممکن نہیں۔ رہا امام شافعیؒ اور شیخ ابو منصورؒ کا قول (کہ سحر کے کل اعمال و الفاظ کفر نہیں ہیں) سو اس کی بنا احتمال عقلی پر ہے (یعنی ممکن ہے کہ سحر کا کوئی فرد ایسا نکلے کہ اس کے الفاظ و اعمال کفر نہ ہوں)۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ جو شخص بذریعہ سیفی یا دعا یا بذریعہ اسماء جلالیہ ایسے آدمی کو قتل کر ڈالے کہ جس کا خون حلال

marfat.com

نہیں یا اس کی نعمت بدنی یا مالی کو ضائع کردے تو وہ اگرچہ کافر نہیں لیکن فاسق قطعاً ہے اور اس کا حکم رہزنوں جیسا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا (جو لوگ مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں کو بلا قصور ستاتے ہیں وہ بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں) اور جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَیَدِهٖ (یعنی مسلمان تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچیں) اور بلعم بن باعور کا موسیٰ علیہ السلام کے لئے بد دعا کرنا بھی اسی نوع سے ہے۔ بلعم بن باعور کا پورا قصہ سورۂ اعراف کی آیت وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ الآیۃ کی تفسیر میں آئے گا۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَكَیْنِ (اور اس علم پر جو دو فرشتوں پر اترا تھا) اس کا یا تو السِّحْرَ پر عطف ہے یا مَا تَتْلُوْا پر اور معطوف و معطوف علیہ سے ایک ہی شئے مراد ہے۔ عطف یا تو تغایر اعتباری کی وجہ سے ہے اور یا اس لئے کہ معطوف یعنی وما انزل الخ سے اور نوع سحر کی مراد ہے جو پہلے سے زیادہ قوی ہے۔

بِبَابِلَ (بابل میں) یا تو الْمَلَكَیْنِ کا ظرف ہے یا حال اور یا اُنْزِلَ کی ضمیر سے حال ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بابل کوفہ کی زمین کا نام ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بابل جبل دماوند ہے واللہ اعلم۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ منجملہ دیگر علوم آسمانیہ کے سحر بھی آسمانی علم ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے لئے اترا ہے کیونکہ ھادی مضل تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس پر اگر کوئی یہ کہے کہ حق تعالیٰ نے تو سحر سے بچنے کا حکم فرمایا ہے بھلا وہ اسے کس طرح نازل فرماتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو نازل ہو اور جس کا ارادہ ہو وہ شرعاً بھی مامور بہ ہو ارادۂ الٰہی جس کے متعلق ہوتا ہے وہ اور شئے ہے اور امر شرعی کا تعلق دوسری شئے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں کا اپنے دو فرشتوں کے ذریعہ سے امتحان فرمایا جو شقی ازلی تھا وہ سحر سیکھتا اور اللہ کے ساتھ کفر کرتا اور جو سعید ازلی تھا وہ ترک کر دیتا اور ایمان پر باقی رہتا اور وہ دونوں فرشتے سحر کے بطلان کو ظاہر کر دیتے، اس سے بچنے کا حکم فرماتے واللہ اعلم۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ وَمَآ اُنْزِلَ میں مانافیہ ہے اس تقدیر پر آیت کی توجیہ اس طرح ہوگی کہ یہود کہا کرتے تھے کہ سحر کا علم آسمان سے فرشتوں پر اترا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے زعم فاسد کو رد فرمایا اور معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے سحر کو فرشتوں پر نازل نہیں فرمایا اور مَآ اُنْزِلَ کا عطف اس تفسیر پر مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ پر ہوگا اور بِبَابِلَ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ کے متعلق ہوگا۔

هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (ہاروت و ماروت پر) اَلْمَلَكَیْنِ کا تقدیر اول پر عطف بیان ہے اور یہی ظاہر ہے اور مَا کے نافیہ ہونے کی صورت میں اَلشَّیٰطِیْنَ سے بدل البعض ہے۔

وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ (اور نہ سکھاتے وہ ہاروت و ماروت کسی کو) مِنْ اَحَدٍ میں من زائدہ ہے۔

حَتّٰی یَقُوْلَآ (جب تک کہ ان سے یہ نہ کہہ دیتے) یعنی خیر خواہی کے طور پر وہ فرشتے کہتے۔

اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ (کہ ہم تو ذریعۂ آزمائش ہیں۔)

فَلَا تَكْفُرْ (تو کافر مت ہو) یعنی سحر مت سیکھ تو اس کے سبب کافر ہو جائے گا نتیجہ (کفر) کا اطلاق سبب (سحر) پر کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے وہ فرشتے سیکھنے والے کو سات دفعہ یہی نصیحت کرتے تھے۔ عطاء اور سدی فرماتے ہیں جب وہ کسی طرح نہ مانتا تو کہتے اچھا فلاں فلاں جگہ کی راکھ پر تو پیشاب کر دے وہ پیشاب کرتا پیشاب کرتے ہی اس کے اندر سے ایک چمکتا ہوا نور نکلتا اور آسمان کی طرف چلا جاتا یہ ایمان و معرفت تھی اور آسمان سے ایک سیاہ شئے دھوئیں جیسی آتی اور کانوں کے ذریعہ اندر اتر جاتی اور یہ اللہ کا غضب اور کفر ہوتا تھا نعوذ باللہ منہ اور تقدیر ثانی یعنی ما کے نافیہ ہونے کی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ شیطان اس سیکھنے والے کو سکھاتے نہ تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو امتحان فتنہ میں پڑے ہوئے ہیں تو ہمارے جیسا کیوں ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ کہنا نصیحت ہے اور شیطان سے اس کا صدور ممکن نہیں اس واسطے ہم نے کہہ دیا کہ تفسیر اول ظاہر ہے۔

marfat.com

فَيَتَعَلَّمُوْنَ (پھر سیکھتے تھے) ضمیر ہم مستتر مِنْ اَحَدٍ سے جو عموم سمجھا گیا ہے اس کی طرف راجع ہے۔

مِنْهُمَا (ان دونوں سے) یعنی ہاروت ماروت سے اور فَيَتَعَلَّمُوْنَ کا عطف یا تو جملہ مقدرہ پر ہے اور تقدیر عبارت کی یہ ہے فَيَأْبَوْنَ فَيَتَعَلَّمُوْنَ یعنی وہ لوگ انکار کئے جاتے تھے اور یَاْیُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ پر عطف ہے۔

مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ط (وہ باتیں کہ جدائی ڈال دیں ان کی وجہ سے میاں بی بی میں) یعنی سحر کی وہ قسم تعلیم کرتے تھے جس سے میاں بی بی میں بغض اور عداوت واقع ہو جائے۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (اور وہ نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اس سے کسی کو بغیر حکم خدا کے) هُمْ کی ضمیر یا تو ساحروں کی طرف اور یا شیاطین کی جانب راجع ہے۔ مِنْ اَحَدٍ میں من زائد ہے اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یعنی ساحر یا شیطان سحر کے ذریعہ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے مگر اللہ کی قضا اور قدر اور مشیت سے کیونکہ اسباب دنیا یہ سب کے سب عادی و ظاہری ہیں مؤثر بالذات نہیں عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ جب ان اسباب کا وجود ہوتا ہے تو تاثیر ان کے بعد پیدا کر دیتے ہیں۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ (اور سیکھتے تھے جو ان کو نقصان پہنچاوے) مَا يَضُرُّهُمْ سے مراد سحر ہے اور ضرر اس کا ظاہر ہے کہ کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

وَلَا يَنْفَعُهُمْ ط (اور نفع نہ دے) اس طرف اشارہ ہے کہ علوم غیر نافعہ جیسے طبعی[1] ریاضی وغیرہ کا سیکھنا بسبب وقت برباد ہونے کے مکروہ ہے۔ اسی واسطے جناب رسول اللہ ﷺ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ (یعنی اے اللہ میں علم غیر نافع سے پناہ مانگتا ہوں۔

(فائدہ) علم غیر نافع کی دو قسمیں ہیں ایک قسم تو وہ ہے جو کسی کو نافع نہ ہو کیونکہ اس سے نفع متصور ہی نہیں جیسے طبعی اور مثل اس کے اور دوسری قسم وہ ہے کہ اس کا عالم جب اس پر عمل نہ کرے تو نافع نہ ہو واللہ اعلم۔ اور جو علم ضرر کرنے والے ہیں جیسے سحر و شعبدہ اور فلاسفہ کے الٰہیات بلا دلیل صریح ان کی حرمت میں تو شک ہی نہیں۔

علامہ بغویؒ نے ابن عباسؓ کلبی اور قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ہاروت ماروت کے قصہ کو اس طرح نقل کیا ہے کہ جب فرشتوں نے دیکھا کہ اولاد آدم کے دفتر گناہوں کے آسمان پر جاتے ہیں تو بطور طعن کہا کہ دیکھو یہ کیسے بندے ہیں اپنے مالک حقیقی کی نافرمانی کرتے ہیں حق تعالیٰ نے فرمایا اگر میں تمہیں زمین پر اتار دوں اور جو قوی ان میں رکھے ہیں وہی اگر تم میں بھی پیدا کر دوں تو تم بھی ایسے ہی گناہوں میں مبتلا ہو جاؤ۔ فرشتوں نے عرض کیا خداوند تو پاک ہے ہم ہرگز تیری نافرمانی نہ کریں گے۔ حکم ہوا کہ جو تم میں بہت اچھے ہیں انہیں منتخب کر لو فرشتوں نے ہاروت اور ماروت اور عزرائیل کو منتخب کیا اللہ تعالیٰ نے ان میں شہوات کو پیدا کر دیا اور حکم کیا زمین پر جاؤ اور لوگوں کے مقدمات عدل کے ساتھ فیصل کیا کرو اور شرک خون ناحق اور زنا اور شراب سے ان کو منع فرمایا۔ حسب ارشاد خداوندی تینوں فرشتے زمین پر آئے اور اپنی خدمات میں مصروف ہوئے ایک

---

[1] طبعی علوم ہوں یا ریاضی یا الٰہی بہر حال غیر مفید اور بیکار علوم کی تحصیل کی عقل سلیم بھی اجازت نہیں دیتی۔ قاضی صاحبؒ نے ایسے ہی علوم کی تحصیل کو شرعاً مکروہ قرار دیا ہے لیکن وہ طبیعیات اور ریاضیات جو عمرانیات کی جان ہیں، ہندسہ، حساب، علم الاشکال، معدنیات، ارضیات، نباتات اور خواص کائنات عنصریہ ان سب کی تحصیل اگر اصول اسلام کو توڑنے اور تعلیم اسلام کے خلاف دلائل قائم کرنے کے لئے ہو تو ظاہر ہے کہ حرام ہوگی، اسلام کے خلاف کوئی کوشش جائز نہیں ہو سکتی لیکن اگر اسلامی افکار و مسائل کی تنقیح اور اشاعت کے لئے ہو تو نہ فقط یہ کہ مکروہ نہیں بلکہ مستحب بلکہ بعض مواقع پر واجب ہو جاتی ہے۔ علوم لسانیہ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ حلت و حرمت کی بنا پر اغراض و غایات کے اختلاف پر ہے جیسی غایت و غرض ویسا ہی حکم۔ رہے الٰہیات فلسفیہ تو ظاہر ہے کہ ان کی بنا بھی فساد علل پر ہے۔ اندھیرے میں پتھر پھینکنا لاحاصل غیر مفید بلکہ بعض وقت ضرر رساں ہوتا ہے۔ ہاں اگر افکار فلسفیہ کی تحصیل عقائد اسلامیہ کی صداقت ثابت کرنے کے لئے کی جائے اور منکرین اسلام کے اعتراضات کو دفع کرنا مقصود ہو تو ان کی تحصیل میں بھی کوئی کراہت نہ ہوگی۔ اسی لئے متکلمین اسلام نے مشائیہ اور اشراقیہ کے فلسفہ کو حاصل کیا تھا تاکہ اس کو حاصل کر کے اس کی تردید کریں۔ چنانچہ علم کلام کی وضع کی اصل وجہ یہی تھی۔ واللہ اعلم

marfat.com

مرتبہ عزرائیل کے قلب میں شہوت پیدا ہوئی۔ اسی وقت حق تعالیٰ سے معافی چاہی اور توبہ کر کے دعا کی خداوند مجھے تو آسمان کی طرف اٹھا لیجئے اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اس کے بعد عزرائیل علیہ السلام اس داعیۂ معصیت کے کفارہ میں چالیس برس سجدہ میں پڑے رہے اور اب تک ندامت کی وجہ سے سرنگوں رہتے ہیں۔ اب رہے ہاروت و ماروت دونوں دن بھر تو لوگوں میں برابر حکومت کرتے رہتے شام کو اسم اعظم کے ذریعہ آسمان پر چلے جاتے۔ ابھی ایک مہینہ بھی اس حالت میں نہ گزرا تھا کہ امتحان خداوندی پیش آیا۔ وہ یہ ہوا کہ ایک عورت مسماۃ زہرہ اور اس کے شوہر کا قصہ ان کے اجلاس میں پیش آیا اور یہ زہرہ اہل فارس کی ملکہ نہایت حسینہ جمیلہ تھی یہ اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہوگئے اور اس کو پھسلانا شروع کیا اس نے انکار کیا اور کہا جب تک تم بت پرستی اختیار نہ کرو اور میرے خاوند کو قتل نہ کرو اور شراب نہ پیو میں تمہارے پاس نہیں آسکتی۔ غرضیکہ پہلے اس نے شراب پیش کی وہ انہوں نے پی پھر ان سے قتل کرلیا۔ پھر ان کے ساتھ ہم بستر ہوئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے زہرہ کو تو مسخ کر کے شہاب بنا دیا اور ان پر یہ گزری کہ جب شام ہوئی اور حسب معمول انہوں نے آسمان پر چڑھنا چاہا تو بازوؤں نے یاری نہ دی۔ اس زمانہ میں حضرت ادریس علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام زمین پر نبی تھے یہ دونوں فرشتے ان کی خدمت میں آئے اور دعا اور شفاعت طلب کی، بارگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ ان معاصی پر تمہیں عذاب تو ضرور ہوگا لیکن اس قدر تخفیف کی جاتی ہے کہ دنیوی اور اخروی عذاب میں تمہیں اختیار دیا جاتا ہے جو چاہو پسند کرلو۔ فرشتوں نے دنیوی عذاب کو بہت سہل و آسان سمجھا کیونکہ یہاں کا عذاب تو عنقریب منقطع ہونے والا ہے چنانچہ اب تک وہ بابل میں الٹے ایک آگ بھرے کنوے میں لٹکے ہوئے ہیں۔ ابن راہویہ اور ابن مردویہ نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ زہرہ پر لعنت کرے کہ اسی نے ہاروت ماروت دو فرشتوں کو فتنہ میں ڈالا واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قصہ اخبار احاد بلکہ روایات ضعیفہ شاذہ سے ہے اور قرآن پاک اس پر کسی طرح دلالت نہیں کرتا اور اس قصہ میں بعض روایات تو ایسی بے سروپا ہیں کہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہیں مثلاً ربیعۂ بن انس سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زہرہ کو مسخ کر کے ستارہ بنا دیا تھا۔ اور وہ اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چڑھ گئی اور ہاروت و ماروت باوجود اسکے کہ زہرہ کے معلم تھے اور ارتکاب معصیت میں اس کی برابر تھے بلکہ بوجہ سکر کے زہرہ سے معصیت میں کم تھے لیکن وہ آسمان پر نہ چڑھ سکے۔ واللہ اعلم۔

محمد بن یوسف صالحی سبیل الرشاد میں بحوالہ شیخ کمال الدین فرماتے ہیں کہ علماء نے اس قصہ کو صحیح نہیں مانا اور نہ حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس کی روایت کو ثابت سمجھا۔ شیخ کمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس قصہ کے متعلق تمام روایتیں سرتاپا موضوع ہیں، اس بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت صحیح نہ سقیم مروی نہیں اور فرمایا کہ یہ روایتیں یہود کی گھڑت اور ان کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ صالحی فرماتے ہیں کہ جب یہ قصہ محض بے اصل اور گھڑت ٹھہرا تو اس آیت کی تفسیر اس تقدیر پر کچھ اور ہونی چاہئے سو وہ یہ ہے کہ علماء نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ جب سحر اور ساحروں کا شیوع ہوا اور معجزہ اور کرامات اور سحر میں اشتباہ ہو گیا تو حق تعالیٰ نے دو فرشتے اس غرض سے بھیجے کہ لوگوں کا امتحان کریں اور لوگوں کو سحر کی حقیقت بتادیں تاکہ حقیقۃ والامر معلوم ہو جاوے اور سحر اور معجزہ و کرامات میں فرق معلوم ہو، چنانچہ جو شخص ان کے پاس سحر سیکھنے آتا تھا اس کو اول ڈراتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آزمائش کے لئے آئے ہیں چنانچہ جو شخص اس غرض سے سیکھتا تھا کہ اس سے پرہیز کرے اور معجزہ و کرامات میں فرق معلوم کرے تو وہ حق تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول ہوتا تھا اور جو اس لئے نہ سیکھتا تو اس کی کفر تک نوبت پہنچتی اسی واسطے فرشتے اول ہی کہہ دیتے تھے۔ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (ہم تو آزمانے کے لئے ہیں تو کافر نہ بن) پھر اسے بتاتے کہ جب ساحر فلاں کام کرتا ہے تو میاں بی بی میں عداوت اور بغض پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تفسیر کے موافق فرشتوں کا یہ فعل سراسر حق تعالیٰ کی طاعت ہوگی اور ملائکہ کی عصمت متفقہ کے خلاف نہ ہوگا۔ علامہ بیضاوی نے فرمایا ہے کہ یہ قصہ یہود سے لیا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سلف صالحین کے رموز سے ہو اور اس کا حل ارباب بصیرت پر

maktabat.com

مخفی نہیں۔
میں کہتا ہوں کہ حل اس کا یہ ہے کہ مَلَکَیْنِ سے مراد قلب اور روح اور عالم امر کے تمام لطائف ہیں اور صرف دو کویا تو اس لئے ذکر فرمایا کہ یہ بتانا منظور رہا ہے کہ وہ لطائف متعدد ہیں ان کی تعداد بتانی مقصود نہیں اور یا اس واسطے کہ بعض سالکوں پر مجملہ لطائف ستہ یہ دو ہی منکشف ہوئے ہیں پس اس سالک نے لفظ مَلَکَیْنِ سے اپنے مکشوف (قلب اور روح) سے کنایہ کیا اور عورت جس کا نام زہرہ تجویز کیا ہے اس سے مراد نفس ہو جو کہ عناصر سے پیدا ہوا ہے اور وجہ اس کنایہ کی یہ ہے کہ جس طرح اس قصہ میں اس عورت نے ملکین کو گناہ کا حکم کیا تھا اسی طرح یہ نفس امارہ بھی برائی کا حکم کرتا ہے اور جب حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے عالم امر کے لطائف کو نفس کے ساتھ مزدوج فرمادیا اور ان میں محبت اور عشق رکھ دیا تو یہ لطائف تاریک اور مکدر اور اپنے خالق سے غافل ہوگئے چنانچہ اس تاریک قلب میں جو شہوت کی آگ سے بھرا ہوا ہے یہ لطائف محبوس اور اوندھے پڑے ہیں۔ بابل کے آگ بھرے ہوئے کنویں سے یہی مراد ہے۔ پھر جب انسان مرجائیں گے اور قیامت قائم ہوگی تو اگر کچھ نور ایمان ہے تو ان لطائف کو اس قید خانہ سے نجات ہو جاویگی۔ اب رہا نفس سو اگر وہ نیک بندوں کا ہے تو لطائف کے قرب و مجاورت اور ریاضات تکلیفیہ اور اسم اعظم یعنی اللہ کے نام پاک کی بدولت آسمان پر ایسا پرواز کر جاوے گا گویا چمکتا ہوا روشن سفید ستارہ ہے اور اسے اس طرح خطاب کیا جائے گا۔ یَاۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی سو داخل ہو میرے خاص بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں) نفس اگرچہ ابتدا میں خبیث اور شریر تھا لیکن اپنی قوت استعداد یہ کی بدولت جو کہ اس خاک دان میں رکھی ہے لطائف پر بھی فوق لے گیا۔ جیسا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ جاہلیت میں اچھے ہیں وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں جب کہ دینی سمجھ رکھتے ہوں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ (اور بے شک وہ (یہود) جان چکے تھے کہ جس نے اس (سحر) کو خریدا) یعنی سحر کو کتاب اللہ کے عوض لیا۔ لَمَنِ اشْتَرٰىهُ میں لام ابتدا کا ہے۔ اس لام نے علموا کو عمل سے معلق کر دیا ہے۔

مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

(اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بے شک وہ شئے بہت بری ہے جس کے عوض وہ اپنی جان بیچ رہے ہیں اگر جانتے ہوتے) (تو نہ خریدتے) لو کا جواب محذوف ہے کام سابق اس پر دال ہے اگر کوئی بطور شبہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو تاکید سے یہ فرمادیا کہ وَلَقَدْ عَلِمُوْا (بے شک جان چکے) تو پھر لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (اگر جانتے) کے کیا معنی ہوں گے۔ اس شبہ کے علماء نے مختلف جواب دیئے ہیں۔ بعض نے یہ فرمایا ہے کہ جب انہوں نے اپنے علم پر عمل نہ کیا تو گویا جانا ہی نہیں۔ اور بعض نے فرمایا ہے کہ جس علم کا اثبات کیا ہے وہ عقل طبعی اور اپنے فعل کی برائی اور اس پر عقاب کے مرتب ہونے کا علم اجمالی ہے اور جس کی نفی کی ہے وہ قیامت کے عذاب لاحق کی حقیقت کا علم ہے۔
میرے نزدیک عمدہ جواب یہ ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم تو وہ جو سطحی ہو، ظاہر قلب سے اس کا تعلق ہو اس علم کا مقتضی عمل نہیں ہے اور یہود کا جناب رسول اللہ ﷺ کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچاننا بھی اسی قبیل سے تھا کہ یہ پہچان ان کو کچھ نافع نہ تھی ان کی بعینہ ایسے ہی مثال تھی جیسے گدھے پر دفتر لدے ہوں اور دوسرا علم وہ جو قلب کی تہہ میں جا گھسے اور اس کو منور کر دے اور نفس کے اندر اطمینان بخشے، آیت کریمہ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں) میں یہی علم مراد ہے۔ اور حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ جناب سرور کائنات ﷺ نے فرمایا ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں آسمان والے ان کو دوست رکھتے ہیں اور جب وہ مرتے ہیں تو قیامت تک دریا کی مچھلیاں ان کے لئے استغفار کرتی ہیں۔ تو اس حدیث کے مصداق اسی علم کے عالم ہیں۔ علم کی ان دونوں قسموں کی طرف جناب رسول اللہ ﷺ

marfat.com

نے اشارہ بھی فرمایا ہے۔ فرمایا ہے کہ بہترین بندے علماء حق ہیں اور بدترین لوگ برے علماء ہیں۔ اس حدیث کو دارمی نے احوص بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم دو ہیں ایک علم دل میں ہے اور وہ نافع ہے اور دوسرا علم محض زبان پر ہے، یہ علم آدمی کے خلاف اللہ کی طرف سے حجت ہے اس کو بھی دارمی نے روایت کیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ (اور اگر وہ (یہود) ایمان لے آتے (محمد ﷺ پر) اور (اللہ کے عذاب سے معاصی اور سحر کو چھوڑ کر) بچتے تو ان کا بدلہ) کسی فعل کے بدلہ کو ثواب اور مثوبہ اس لئے کہتے ہیں ثَابَ، یَثُوْبُ کے معنی لوٹنے کے ہیں چونکہ نیکوکار بندہ بھی نیک کام کے بدلہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس لئے اس بدلہ کو بھی ثواب کہنے لگے۔

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ (اللہ کے پاس بہتر ہوتا) لَمَثُوْبَةٌ الخ لو کا جواب ہے اور اصل اس کی لَاُثِيْبُوْا مَثُوْبَةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرًا بِمَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ ہے (بے شک ایسا ثواب دیئے جاتے کہ وہ اللہ کے یہاں اس سے بہتر ہوتا جس کے بدلہ انہوں نے اپنے نفس بیچے) فعل کو حذف کر کے باقی کو جملہ اسمیہ اس غرض سے بنا دیا کہ ثواب کے دوام اور ثبات اور اس کے یقینی خیر ہونے پر دلالت کرے اور مفضل علیہ (سحر) کو یا تو اس لئے حذف کیا کہ مفضل کو اس سے عالی سمجھا کہ مفضل علیہ سے اس کو کسی قسم کی مناسبت ہو اور یا اس واسطے کہ تخصیص کسی شئے کی نہ رہے۔ تفضیل کل ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ جملہ اشیاء سے بہتر ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ لو تمنی کا ہے اور لَمَثُوْبَةٌ کلام مستقل ہے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲ (اگر جانتے ہوتے تو ایمان لے آتے) یعنی اگر جانتے کہ اللہ کا ثواب بہتر ہے۔ اس کی جزا میں بھی مثل سابق کے کلام ہے۔ ۱۲

ابن منذر نے روایت کیا ہے کہ مسلمان جناب رسول اللہ ﷺ سے کہا کرتے تھے (راعنا اور اسے مراعاۃ سے مشتق گردانتے اور مطلب اس کلمہ کا یا تو یہ ہوتا کہ یا رسول اللہ کلام سننے میں ہماری رعایت فرمائیے۔ یعنی ہماری عرض معروض غور سے سنئے اور یا یہ معنی کہ جو کچھ آپ ہماری تعلیم کے لئے فرماتے ہیں اس میں رعایت فرمائیے اور ہمارے سمجھنے تک توقف فرمائیے۔ (رعی کے معنی لغت میں دوسرے کی مصلحت کی نگہداشت کے ہیں۔ یہود کی زبان میں لفظ (راعن نہایت فحش گالی تھی۔ بعض نے کہا کہ ان کے نزدیک اس کے یہ معنی تھے اِسْمَعْ لَا سَمِعْتَ یعنی سن خدا کرے تو نہ سنے (یعنی معاذ اللہ تیرے کان پھوٹیں) معاذ اللہ۔ اور بعض نے کہا اس کے معنی تھے اور احمق گویا رعونت سے مشتق قرار دیتے تھے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوں یہود نے جو سنا کہ مسلمان جناب سرور کائنات ﷺ کی خدمت میں یہ کلمہ بولتے ہیں تو انہیں ایک شگوفہ ہاتھ آ گیا اور انہوں نے بھی اس کلمہ کو بہ نیت معنی قبیح استعمال کرنا شروع کیا اور آپس میں (خدا ان پر لعنت کرے) خوب ہنسی اڑاتے۔ ایک روز سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کی اس نیت فاسد کو پہچان گئے سن کر فرمایا اگر اب میں نے تم سے یہ کلمہ جناب فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں کہتے سنا تو یاد رکھنا گردن اڑا دوں گا وہ بولے کہ تم بھی تو کہتے ہو اس پر حق تعالیٰ نے ذیل کی آیت کریمہ نازل فرمائی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (اے ایمان والو تم راعنا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ یعنی ہماری طرف نظر شفقت فرمائیے اور ہماری گزارش سماعت فرمائیے یا یہ معنی کہ ہمارا انتظار فرمائیے اور ذرا توقف فرمائیے تاکہ ہم آپ کا کلام سمجھ لیں۔

وَاسْمَعُوْا (اور سنا کرو) یا تو یہ معنی کہ جو تم کو حکم کیا جاتا ہے اس کو سنو اور اطاعت کرو اور یا یہ مطلب کہ مجمع میں حضور ﷺ کا کلام اچھی طرح سن لیا کرو تاکہ دوسری مرتبہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ (اور کافروں کے لئے) کافرین سے مراد یہود ہیں جنہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو برے کلمہ سے یاد کیا تھا۔

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ (دردناک عذاب ہے) مسلمانوں کے جو یہود میں حلیف تھے ان سے مسلمان بطور خیر خواہی

marfat.com

کہتے تھے کہ محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ، وہ جواب دیتے تم جس شئے کی طرف ہمیں بلاتے ہو وہ ہمارے دین سے بہتر نہیں اگر بہتر ہوتا تو ہم ضرور اسے پسند کرتے ان کی تکذیب کے لئے حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ (اور وہ لوگ جو کافر ہیں کتاب والے ہوں یا مشرک خوش نہیں ہیں) ود کے معنی ہیں کسی شئے سے تمنا آمیز محبت کرنا اسی واسطے اس لفظ کا استعمال تمنا اور محبت دونوں میں الگ الگ بھی آیا ہے۔ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ میں من بیانیہ ہے اور لا زائدہ ہے المشرکین کا اهل الکتاب پر عطف ہے۔

أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ (اس بات سے کہ اتاری جائے تم پر بھلائی خدا کی طرف سے) مِنْ خَيْرٍ، يَوَدُّ کا مفعول ہے پہلا من استغراق کے واسطے زیادہ کیا گیا ہے اور دوسرا من ابتدا کے لئے ہے۔ خیر سے مراد وحی ہے۔ مطلب یہ کہ اے مومنو! کافر تم سے حسد رکھتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ وحی تم پر اترے۔

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۱۰۵﴾ (اور اللہ اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑی مہر والا ہے) رحمت سے مراد نبوۃ ہے۔ فضل بلاوجہ ابتداءً کسی کے ساتھ نیکی کرنے کو کہتے ہیں۔ مشرکین کہا کرتے تھے کہ محمد ﷺ اپنے صاحب کو ایک شئے کا امر فرماتے ہیں پھر اسی بات سے منع کرتے ہیں اور اس کے خلاف کا حکم کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اپنی طرف سے کہتے ہیں۔ اس پر حق تعالیٰ نے ذیل کی آیت شریفہ نازل فرمائی۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ (جو منسوخ کر دیتے ہیں ہم کوئی آیت) مِنْ بیانیہ ہے اور نسخ کے دو معنی آتے ہیں ایک نقل اور کاپی (نسخ الکتاب) بھی اسی سے ماخوذ ہے دوسرے معنی رفع اور ازالہ (اٹھانا علیحدہ کرنا) ہیں چنانچہ بولتے ہیں نسخت الشمس الظل (علیحدہ کر دیا دھوپ نے یا آفتاب نے سایہ کو) یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ یہ کلام تو باعتبار لغت کے تھا۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ کتاب اللہ میں نسخ چند وجوہ پر آیا ہے ایک تو کسی آیت کی تلاوت کا وقت انتہا بیان فرمانا اور حکم کا اپنے حال پر باقی رہنا جیسے آیت رجم کا حکم باقی ہے اور تلاوت منسوخ ہو گئی۔ یا حکم کی انتہا بیان کرنا اور قرأت علیٰ حالہا باقی رہنا جیسے اقارب کے لئے وصیت کرنے کی آیت اور وہ آیت جس میں عدت وفات ایک سال آئی ہے اور یا تلاوت اور حکم دونوں کی غایت بیان فرمانا، چنانچہ کہتے ہیں کہ سورۂ احزاب مثل سورۂ بقرۃ طویل تھی اس کے اکثر حصہ کی تلاوت اور حکم دونوں اٹھا دیئے گئے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ جس آیت کا حکم منسوخ ہو اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ اس حکم منسوخ کی جگہ دوسرا حکم قائم مقام نہ ہو جیسے اپنے رشتہ داروں کو وصیت کرنا میراث سے منسوخ ہو گیا اور ایک سال عدت وفات کا ہونا چار ماہ دس روز سے منسوخ ہو گیا اور دوسری قسم وہ ہے کہ دوسرا حکم قائم مقام نہ ہو۔ جیسے عورتوں کا امتحان کہ ابتداء میں تھا بعد میں منسوخ ہو گیا اور نسخ اوامر و نواہی پر وارد ہوتا ہے اخبار میں نسخ جاری نہیں ہوتا۔ جمہور نے مَا نَنْسَخْ کو فتحۂ نون اور سین سے نسخ بمعنی رفع سے مشتق کر کے پڑھا ہے معنی یہ ہوں گے "جو اٹھاتے ہیں ہم کوئی آیت" الخ اور ابن عامر نے ضمہ نون اور کسرہ سین سے انساخ سے مشتق قرار دے کر پڑھا ہے اس صورت میں یا تو یہ معنی ہوں گے کہ "ہم آپ کو یا جبرئیل علیہ السلام کو کسی آیت کے منسوخ کرنے کا حکم دیتے ہیں"۔ اور یا یہ کہ "ہم کسی آیت کو منسوخ پاتے ہیں"۔ اور مانسنخ میں ما شرطیہ ہے جو ننسخ کو جزم کرنے والا ہے اور ما مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

أَوْ نُنْسِهَا (یا بھلا دیتے ہیں) ابن کثیر اور ابو عمرو نے نُنْسِهَا کو نون اول اور سین کے فتح سے نساء بمعنی تاخیر سے مشتق کر کے پڑھا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوں گے مؤخر کر دیتے ہیں حکم کسی آیت کا اور اس کی تلاوت کو اٹھا لیتے ہیں اس تفسیر کے موافق نسخ کے معنی "تلاوت اور حکم کا اٹھانا" ہوں گے۔ اور یا یہ معنی کہ ہم اس آیت کو لوح محفوظ میں مؤخر

marfat.com

کر دیتے ہیں یعنی آپ پر نازل نہیں کرتے، اس تفسیر پر نسخ کے معنی کسی آیت کو اتارنے کے بعد اٹھانا اور نساء کے معنی بالکل نہ اتارنا ہوں گے اور باقی قراء نے ننسہا کو ضمہ نون اور کسرۂ سین سے انساء (بھلانا) اور نسیان سے "بھولنا" جو حفظ کے مقابل ہے پڑھا ہے اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ ہم آپ کے قلب سے کسی آیت کو محو کرتے ہیں۔ ابوامامہ بن سھل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چند صحابہؓ ایک شب نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور ایک سورت پڑھنی چاہی تو وہ سورت بالکل یاد نہ آئی صرف بسم اللہ یاد رہ گئی۔ صبح ہی جناب فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس سورت کی تلاوت اور حکم دونوں اٹھا لئے گئے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ ننسہا کے معنی نترکہا ہیں یعنی چھوڑتے ہیں، منسوخ نہیں کرتے جیسے آیت کریمہ نسوا اللّٰہ فنسیھم میں بھی نسیان سے مراد ترک ہے مگر یہ معنی یہاں درست نہیں ہیں کیونکہ آگے نات بخیر منہا اس پر چسپاں نہیں ہوتا۔

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ (تو نازل کر دیتے ہیں اس سے بہتر) یعنی جب کوئی آیت منسوخ یا محو کرتے ہیں تو نفع یا سہولت عمل یا کثرت ثواب میں اس سے بہتر آیت نازل فرماتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ کوئی آیت کسی آیت سے بہتر ہے اور دوسری بہتر نہیں ہے کیونکہ تمام کلام اللہ ایک ہے اور سب بہتر ہے۔

اَوْ مِثْلِهَا (یا اس جیسی) یعنی نفع یا سہولت یا کثرت ثواب میں برابر کی آیت نازل کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ (کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے) یہ استفہام تقریری ہے یعنی بیشک آپ جانتے ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت سے چند مسائل اپنے مسلک کے موافق استنباط کئے ہیں اول تو یہ کہ نسخ بغیر بدل نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ کہ حکم منسوخ کے عوض گراں حکم نہیں ہو سکتا، تیسرے یہ کہ کتاب اللہ کا حدیث سے منسوخ ہونا جائز نہیں۔ اور جواب اس کا یہ ہے کہ کسی حکم کا بالکل نہ ہونا ہی خیر ہوتا ہے اور جو زیادہ گراں ہوتا ہے وہ ثواب کی رو سے کبھی زیادہ نافع ہوتا ہے اور حدیث بھی اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے نبی ﷺ کو دی اور سکھائی ہے اس لئے وہ نأت بخیر کے خلاف نہیں ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (تم کو معلوم نہیں کہ آسمان و زمین کی سلطنت اسی اللہ کی ہے) مطلب یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے اور بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اسی کو ہے تو پھر اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس حکم کو چاہے منسوخ بھی کر سکتا ہے گویا کلام سابق کی یہ دلیل ہے۔

وَمَا لَكُمْ (اور تمہارے لئے کوئی نہیں) یعنی اے کافرو تمہارے لئے عذاب کے وقت کوئی حامی و مددگار نہیں ہے۔

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ (اللہ کے مقابل کوئی حامی اور نہ کوئی مددگار) ولی قریب کو کہتے ہیں ولی اور نصیر میں یہ فرق ہے کہ ولی کبھی نصیر سے ضعیف ہوتا ہے اور نصیر کبھی ولی نہیں ہوتا بلکہ کوئی اجنبی بھی نصیر ہو سکتا ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص من وجہ ہے واللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم نے بطریق سعید اور عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رافع بن حریملہ اور وہب بن زید یہودی نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ اگر آپ سچے رسول ہو تو ہمارے پاس آسمان سے کوئی کتاب لے آؤ ہم اس کو پڑھیں یا زمین سے چشمے جاری کر دو اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم سب آپ کا اتباع کریں گے اس پر حق تعالیٰ نے ذیل کی آیت کریمہ ارشاد فرمائی۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ (کیا تم یہ چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے) علامہ بغویؒ نے اس آیت کا شان نزول اس طرح بیان کیا ہے کہ یہود نے کہا تھا کہ آپ آسمان سے ساری کتاب ایک دفعہ لے آیئے جیسے موسیٰ علیہ السلام تورات لائے تھے۔ اس کے جواب میں یہ آیت ارشاد ہوئی اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ مشرکین نے جو یہ کہا تھا اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (یعنی ہم تو ہرگز آپ کا یقین نہ کریں گے یہاں تک کہ آپ چڑھ جاویں آسمان میں اور ہم ہرگز بھی چڑھنے کا یقین نہ کریں گے جب تک آپ ہم پر ایک کتاب اتار کر نہ

marfat.com

لاویں گے جس کو ہم پڑھ لیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ابن جریرؒ نے مجاہدؒ سے روایت کیا ہے کہ قریش نے حضور ﷺ سے کہا کہ صفا کو آپ سونا بنا دیجئے آپ نے فرمایا ہاں اس کا سونا بنانا ممکن ہے لیکن یہ یاد رہے اگر تم نے اس کے بعد انکار اور کفر کیا تو یہ بنی اسرائیل کے خوان کی طرح ہوگا (کہ جب انہوں نے باوجود فرمائشی خوان اترنے کے کفر کیا تو سور بنا دیئے گئے) اس کے بعد آیت کریمہ اَمْ تریدون الخ نازل ہوئی۔ اور سدی نے نقل کیا ہے کہ عرب نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کو لائیں تاکہ ہم اسے کھلم کھلا دیکھیں۔ اس کے جواب میں یہ آیت ارشاد ہوئی اور اسی طرح علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ عرب نے سوال کیا تھا اوتأتی باللّٰه والملئکة قبیلا (یعنی ہم یقین نہ کریں گے جب تک لے آئے تو اللہ اور فرشتوں کو مقابل) اس پر یہ آیت اللہ تعالیٰ نے اتاری۔ اور سدی نے ابو العالیہ سے اس آیت کے شان نزول میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر ہمارے گناہوں کے کفارے بھی ایسے ہی مقرر ہوتے جیسے کہ بنی اسرائیل کے لئے تھے تو بہت اچھا ہوتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو طریقہ حق تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمایا ہے یہی بہتر ہے بنی اسرائیل میں تو یہ تھا کہ جب کوئی ان میں سے گناہ کرتا تو وہ گناہ اس کے دروازے پر لکھ دیا جاتا۔ پھر اگر اس نے اس گناہ کا کفارہ دیدیا تو آخرت کی رسوائی اور عذاب سے محفوظ رہتا لیکن دنیوی رسوائی پھر بھی باقی رہتی تھی اور اگر کفارہ نہ دیا تو آخرت کی رسوائی اور عذاب مزید ہو جاتا تھا تمہیں تو اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا طریقہ مرحمت فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (یعنی جو کوئی گناہ کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر اللہ سے استغفار کرے تو پائے گا اللہ کو بخشنے والا مہربان) اور پنج گانہ نماز اور ایک جمعہ کی نماز دوسرے جمعہ تک اپنے درمیانی گناہوں کا کفارہ ہیں۔ اس واقعہ کے بعد حق تعالیٰ نے آیت کریمہ ام تریدون الخ نازل فرمائی ام تریدون میں ام منقطعہ ہے اور حاصل آیت کا یہ ہے کہ اپنی طرف سے اس قسم کے سوالات نہ کیا کرو۔

علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ ام بمعنی ہمزہ ہے اور میم زائدہ ہے اور بعض نے کہا کہ ام بمعنی بل (بلکہ) ہے اور ممکن ہے کہ ام متصلہ ہو اور جملہ اَلَمْ تَعْلَمْ الخ اور جملہ تریدون الایہ میں برابری ظاہر کرنے کے لئے آیا ہو اور اَمْ تُرِیْدُوْنَ کا اَلَمْ تَعْلَمْ پر عطف ہو، رہا یہ اشکال کہ اس صورت میں معطوف و معطوف علیہ ایک حال میں نہ ہوں گے کیونکہ معطوف علیہ یعنی اَلَمْ تَعْلَمْ میں خاص حضور ﷺ کو خطاب ہے اور یہاں اَمْ تُرِیْدُوْنَ میں سب کو خطاب ہے تو جواب یہ ہے کہ اگرچہ اَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب خاص آپ کو ہے لیکن مراد اس سے آپ اور آپ کی امت اجابت یا امت دعوت ہے اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ آگے چل کر بخطاب عام فرماتے ہیں وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ رہی یہ بات کہ صیغہ واحد کیوں استعمال فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ حضور سرور عالم ﷺ سب سے زیادہ عالم بلکہ سب کے علم کے آپ ہی منشا ہیں اس لئے آپ کو مخاطب بنایا اور مراد سب کو لیا۔ اس تفسیر کے موافق حاصل آیت کا مع اس کے معطوف علیہ اَلَمْ تَعْلَمْ کے یہ ہوگا کہ اے لوگو کیا تم جانتے نہیں کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کو ہے اور وہ تمام اشیاء پر قادر ہے جس طرح چاہے حکم کرتا ہے کیا تم جانتے اور جان کر بھی ویسے سوالات تراشتے ہو جیسا کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے کئے تھے لیکن یہ تفسیر یعنی ام کا متصلہ ہونا وغیرہ جب ہی درست ہو سکتا ہے کہ جب دونوں آیتیں یعنی اَلَمْ تَعْلَمْ الایۃ اور اَمْ تُرِیْدُوْنَ الآیہ کا ایک ہی وقت میں نزول ہوا ہو اور اگر مختلف اوقات میں ارشاد ہوئے ہوں تو یہ تفسیر نہیں ہو سکتی کما لا یخفے علی الماھر اور سکاکی نے کہا ہے کہ یہ ام متصلہ نہیں ہے اور علامہ نے کہا ہے کہ ام کا متصلہ ہونا یہ ہے کہ اس کے بعد مفرد واقع ہو اور منقطع ہونا یہ ہے کہ اس کے بعد جملہ ہو۔

كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ط (جس طرح سوال کئے گئے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے پہلے) موسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے یہ بھی سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا دکھلا دو۔

وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ (اور جو بدل لے کفر کو ایمان سے) یعنی کھلی کھلی نشانیوں اور

marfat.com

دلیلوں کا انکار کرے اور اپنی طرف سے نئی نئی باتیں تراش کر درخواست کرے۔

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۱۰۸) (وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا) حتیٰ کہ ایمان کی سیدھی راہ سے کفر کے چاہ میں جا پڑا۔ حاصل یہ ہوا کہ ایسی باتوں کا اپنی طرف سے سوال نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ جب غزوۂ احد کا واقعہ ہو چکا تو چند یہودیوں نے حذیفہ بن الیمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ اگر تم حق پر ہوتے تو تم ہرگز شکست نہ کھاتے، اس لئے اب مناسب یہ ہے کہ ہمارے دین میں آجاؤ کیونکہ ہماری راہ راہ ہدایت ہے اس پر ذیل کی آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب) ابن ابی حاتم نے اس کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ حیی اور ابو یاسر اخطب یہودی کے بیٹے عرب سے اس وجہ سے بہت حسد کرتے تھے کہ ان میں پیغمبر ﷺ کیوں ہوئے اور رات دن لوگوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے ان کے بارے میں حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ (کہ تم کو پھیر کر بناویں) کم سے مؤمنین مراد ہیں اور لو مصدریہ ہے معنی میں اِنْ شرطیہ کا قائم مقام ہے لفظی عمل میں ان جیسا نہیں ہے اس کے موافق لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ ترکیب میں ود کا مفعول ہوگا اور لَوْ بمعنی لَيْتَ (کاش) ہے اور یہ ان کی تمنا کا جس کو ود سے تعبیر فرمایا ہے بیان ہے۔

مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا (مؤمن ہونے کے بعد کافر) كُفَّارًا ضمیر كُمْ سے حال ہے حسدًا یا تو مفعول لہ ہونے کی وجہ سے اور یا فعل محذوف یعنی یحسدون کا مفعول مطلق ہونے کے باعث منصوب ہے۔

مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ (دلی حسد کی وجہ سے) یہ یا تو ود کے متعلق ہے مطلب اس تقدیر پر یہ ہے کہ ان کی یہ تمنائے فاسد ان کے نفس کی خیانت سے پیدا ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو کہیں اس کا حکم نہیں کیا اور یا حسدًا سے اس کا علاقہ ہو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ یہ حسد ان کے نفوس خبیثہ سے پیدا ہوا ہے۔

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا ان پر حق) یعنی یہ سب ان کی گزشتہ کارروائی اس پر ہے کہ ان معجزات اور حضور ﷺ کی ان صفات سے جو توراۃ میں مذکور ہیں حق ظاہر ہو چکا۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا (سو تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ) یہ معاف کرنے کا حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے۔

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم) یعنی یہ معافی کا حکم اسی وقت تک ہے کہ جب تک اللہ اپنا حکم ثانی نہ بھیجے۔ وہ حکم قتال کرنے اور جزیہ کے مقرر کرنے کا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قریظہ کے قتل کرنے اور بنی نضیر کے جلاوطن کرنے کا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۰۹) (بیشک اللہ ہر شئے پر قادر ہے) پس ان کفار سے بدلہ لینے پر بھی اس کو پوری قدرت ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ (اور درست رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ) فاعفوا پر اس کا عطف ہے یہ معنی ہوں گے کہ ان کو چھوڑ دو اور جانے دو اور ان کی مخالفت اس طور پر کرو کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاؤ۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ (اور جو کچھ بھیج دو گے آگے اپنے لئے بھلائی) خیر سے مراد نیکی ہے جیسے نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ۔

تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۰) (وہ پاؤ گے اللہ کے پاس بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے) پاؤ گے اس کو یعنی اس کا ثواب تم کو ملے گا۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ (اور وہ کہتے ہیں ہرگز نہ جاویں

marfat.com

گے جنت میں مگر جو یہودی یا عیسائی ہوں گے قالُوا کی ضمیر فاعل سے اہل کتاب مراد ہیں خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ۔ اس مقام پر سامع کے فہم پر اعتماد کر کے یہود اور نصاریٰ دونوں گروہ کے قولوں میں صنعت لف کا استعمال کیا گیا۔ حاصل یہ ہے کہ یہود نے تو یہ کہا کہ جنت میں سوائے یہودیوں کے کوئی نہ جاویگا اور دین حق یہودیت ہی ہے اور نصاریٰ نے یہ بکواس کی کہ نصرانیوں کے علاوہ کوئی بہشتی نہ ہوگا اور سچا دین نصرانیت ہی ہے اور یہ قصہ اس وقت ہوا تھا جب کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نجران کے نصاریٰ یہود کے ساتھ جمع ہوئے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک نے ایک دوسرے کی تکذیب اور اپنی تصویب کی۔ فراء نے کہا ہے کہ ھُوْدًا بمعنی یہوْدًا ہے یاء زائدہ حذف کر دی گئی۔ اخفش نے کہا ہے کہ ھود جمع ہائد کی ہے جیسے عوذ جمع عائد کی ہے کَان کے اسم کی ضمیر کو واحد اور خبر (ھُوْدًا او نصارٰی) کو جمع لفظ اور معنی دونوں کی رعایت کے لئے لائے ہیں۔[1]

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (یہ ان کی من مانی آرزوئیں ہیں) تلک کا مشارٌ الیہ یہود کی یہ خواہش ہے کہ کسی قسم کی خیر مسلمانوں پر نازل نہ ہو اور یہ مضمون آیت سابقہ مایود الذین الخ اور آیت ود کثیر سے مستفاد ہوا ہے یا تلک سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ تقدیر عبارت کی یہ ہے مثال تلک الامنیۃ امانیھم یعنی مثل ایسی تمناؤں کے ان کی آرزوئیں ہیں۔ امانیھم میں امانی سے مراد شہوات باطلہ ہیں۔ امانی جمع امنیہ کی ہے بروزن افعولہ کے ہے اور تمنی سے مشتق ہے جیسے اضحوکہ اور اعجوبہ اور تلک امانیھم جملہ معترضہ ہے۔

قُلْ هَاتُوْا (کہہ دیجئے اے محمد ﷺ پیش کرو) ھاتو دراصل اٰتوا تھا ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا۔

بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۱۱) (اپنی دلیل اگر تم سچے ہو) یعنی اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس امر کی دلیل لے آؤ کہ خاص تم ہی جنت میں جاؤ گے کیونکہ کسی آئندہ امر پر بلا دلیل صحیح دعویٰ کرنا لغو اور باطل اور غیر مسلم ہے ان کنتم شرط کا جواب محذوف ہے کلام گزشتہ اس پر دال ہے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (بے شک جس نے جھکایا اپنا منہ خدا کے سامنے) یعنی بات یوں نہیں جیسا ان کا گمان فاسد ہے بلکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو اپنے نفس یا قصد کو خاص اللہ وحدہٗ لاشریک کے لئے خاص کر دے۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ (اور وہ نیکوکار بھی ہے) اور اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کرے کہ گویا اسے دیکھ رہا ہے (احسان کی تفسیر حدیث جبرئیل میں یہی مذکور ہے) تو اس سے جس اجر کا وعدہ اس پر عمل کیا گیا ہے ملے گا۔

فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (تو اس کے لئے اس کا ثواب اس کے پروردگار کے ہاں ہے) یہ من اسلمہ کی جزا ہے اور اگر من موصول ہو تو فلہ اجرہ اس کی خبر ہو جائے گی اور معنی شرط کے پائے جانے کے سبب سے خبر پر فاء لائی گئی ہے اور بلیٰ پر وقف ہے اگر من شرطیہ ہو تو لفظ بلیٰ سے ان کے فاسد گمان کا رد ہو جائے گا اور اگر من موصولہ ہے تب بھی یہ ترکیب ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصول مع صلہ کے فعل محذوف کا فاعل ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ کیوں نہیں داخل ہوگا جنت میں وہ جس نے جھکا دیا اپنے قصد کو الخ اس صورت میں فلہ اجرہ الگ جملہ اور ماقبل پر معطوف ہوگا۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۱۲) (اور نہ ان پر کچھ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے) یعنی ان پر آخرت ۱۳ ع ۱۳
میں نہ خوف ہے اور نہ وہاں وہ غمگین ہوں گے۔ ابن ابی حاتم نے بطریق سعید و عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نجران کے نصاریٰ آئے تو علماء یہود بھی ان کو سن کر آگئے اور دونوں فریق آپس میں منازعت کرنے لگے۔ رافع بن حرملہ یہودی نصاریٰ سے کہتا تھا کہ تم کسی راہ پر نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کرتا تھا اور نجران کا ایک شخص یہود سے کہتا تھا کہ تم کسی راہ پر نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور تورات کی تکذیب کرتا تھا حق تعالیٰ نے اس پر یہ آیت کریمہ ارشاد فرمائی۔

---

[1] کیونکہ لفظ مَنْ لفظاً مفرد اور معنی جمع ہے لفظ کی رعایت سے کَانَ بصیغہ مفرد ذکر کیا اور معنوی رعایت سے ھودا اور نصاریٰ بصیغۂ جمع فرمایا۔ ۱۲

marfat.com

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (اور یہود تو کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی راہ پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی راہ پر نہیں حالانکہ وہ سب کتاب الٰہی پڑھتے ہیں) یعنی حالانکہ یہودی تورات پڑھتے ہیں اور تورات عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تصدیق کرتی ہے اور نصرانی انجیل پڑھتے ہیں اور انجیل موسیٰ علیہ السلام اور تورات کو سچا بتاتی ہے اس پر بھی آپس میں جھگڑتے ہیں۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ (اسی طرح ان جیسی باتیں وہ کہتے ہیں جن کے پاس علم نہیں) اس سے مشرکین عرب اور دیگر بت پرست اور مجوس مراد ہیں اور ان کے علاوہ جو فرقے کفار کے گزرے ہیں کیونکہ ہر فرقہ دوسرے کی تکذیب کرتا رہا ہے مثل قولھم، ذلک کا بیان ہے۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۱۳ (سو اللہ فیصلہ کردے گا ان میں قیامت کے دن جس میں یہ جھگڑتے ہیں) یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان دونوں فریق اور دیگر گروہوں کا فیصلہ فرمادے گا یعنی اہل باطل کی تکذیب کرے گا اور انہیں آگ میں جھونک دے گا اور اہل حق کی تصدیق فرمائے گا اور انہیں جنت میں لے جائے گا۔ ابن جریر نے عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت کیا ہے کہ حدیبیہ کے دن جب مشرکین مکہ نے جناب سرور عالم ﷺ کو مکہ میں نہ آنے دیا تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ (اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو منع کرے خدا کی مسجدوں میں) ومن اَظلَمُ میں من استفہامیہ مبتدا ہے اور اَظلَمُ اس کی خبر ہے۔ کفار نے اگرچہ ایک ہی مسجد سے روکا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بصیغۂ جمع یعنی مساجد اس لئے ذکر فرمایا کہ حکم تو عام ہی ہے اگرچہ شان نزول خاص ہو۔

اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (کہ لیا جائے ان میں خدا کا نام) یہ مَنَعَ کا مفعول ثانی ہے جیسا کہ آیت کریمہ وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ میں ان نرسل، مَنَعَنا کا دوسرا مفعول ہے ان یذکر پر سے من جارہ محذوف ہے یا ان یذکر مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ (اور کوشش کرے ان کے اجاڑنے کی) اجاڑنے میں کوشش کرنا یہ ہے کہ ذکر اللہ اس میں نہ ہونے دے۔ علامہ بغویؒ نے ابن عباس اور عطاء رضی اللہ عنہم سے اس کی تفسیر اسی طرح نقل کی ہے اور قتادہ اور سدی سے یہ بھی منقول ہے کہ ممن منع مساجد اللّٰہ سے مراد طیطوس بن اسپیانوس رومی اور اس کے متبعین ہیں۔ اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ اس کو یہود سے بغض تھا اس لئے اس نے بخت نصر بابلی کی اعانت کی اور سب نے جمع ہو کر یہود سے قتال کیا اور ان میں سے بڑے بڑے سواروں کو قتل کر ڈالا اور ان کی اولاد کو قید کر لیا اور تورات کو جلادیا اور بیت المقدس کو اجاڑ دیا اور اس میں سور ذبح کئے اور مردار ڈالے بیت المقدس نصاریٰ کے حج اور زیارت کی جگہ تھی۔

میں کہتا ہوں کہ شاید اس کے بیان فرمانے سے یہ غرض ہو کہ نصاریٰ کو ان کے آباؤ اجداد کے کرتوت یاد دلا کر عار دلائیں کیونکہ یہ بھی تو آخر اپنے اجداد کے افعال سے راضی ہیں جیسا کہ صدر پارہ میں گوسالہ کی عبادت و دیگر حرکات سے یہود کو طعن اور عار دلائی گئی ہے۔

اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ (یہ لوگ اس لائق نہیں کہ گھسنے پائیں مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے) یعنی ان کو اس میں داخل ہونا اللہ کے علم اور قضا میں شایاں نہیں مگر ڈرتے ڈرتے۔ اس آیت میں مؤمنین سے نصرت اور مساجد کے مشرکین اور کفار کے ہاتھوں سے چھوٹنے کا وعدہ ہے۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہوا تو حق تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا فرمادیا، یعنی بیت اللہ ان کے پنجوں سے چھوٹ گیا اور حضور ﷺ نے اعلان عام کرادیا کہ خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے اور نیز اس وعدہ کا ایفا اس طور پر ہوا کہ روم اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں فتح کر لیا اور بیت المقدس بالکل خراب تھا اس کو مسلمانوں نے تعمیر کیا اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت یعنی اولٰئک

marfat.com

ماکان لھم الآیۃ خبر بمعنی امر یا نہی ہے اور معنی اس تقدیر پر یا تو یہ ہیں کہ ان کفار سے یہاں تک قتال کرو کہ ان میں سے کوئی مساجد میں جانے نہ پائے اور اگر جاوے تو قتل اور قید سے ڈر تا ڈرتا جاوے اور یا یہ کہ ان کو مساجد میں داخل ہونے کی قدرت مت دو اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ ان کفار کے لئے تو مساجد میں جانا ہی مناسب نہیں اور اگر جائیں تو خوف اور خضوع سے جائیں چہ جائیکہ اس کے اجاڑنے کے درپے ہوں اس صورت میں جملہ اُولٰئک ماکان لھم الخ منع اور سعی کے فاعل سے حال ہوگا۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب) دنیا کی رسوائی تو قتل اور قید ہونا اور جزیہ ادا کرنا ہے اور آخرت کا بڑا عذاب یہ ہے کہ اپنے کفر اور ظلم کی وجہ سے ہمیشہ کی آگ میں رہیں گے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (اور اللہ ہی کا ہے پورب اور پچھم) یعنی ساری زمین مشرق اور مغرب اسی کی ملک اور مخلوق ہیں اور تمام مخلوقات اس کے وجود کے مظاہر اور اس کے نور کے جلوہ گاہ ہیں اور وہی آسمانوں اور زمین کا نور اور تمام چیزوں کا تھامنے والا ہے اس لئے وہ کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں اور قبلہ کا مسئلہ تعبدی ہے اور تکلیف بقدر وسعت ہوا کرتی ہے اس لئے اے مسلمانو اگر تم فرائض میں بسبب کسی دشمن یا قبلہ کے دریافت نہ ہونے کے قبلہ کی طرف منہ کرنے پر قادر نہ ہو یا قبلہ کے بارے میں تم نے تحرّی کی اور اس میں غلطی ہوئی یا نوافل میں سواری سے اترنے میں تم اپنا حرج سمجھو کیونکہ نوافل میں فرائض سے زیادہ سہولت کی گئی۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا (تو جدھر تم اپنا منہ کرلو گے) فاینما شرط ہے اور تولّوا مجزوم ہے۔ فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (پس ادھر ہی خدا کا سامنا ہے) یعنی وہی جہت قبلہ ہے۔ حسنؒ اور مجاہدؒ اور قتادہؒ اور مقاتلؒ نے وجہ اللہ کی اسی طرح تفسیر کی ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہی جہت اللہ کی رضا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت متشابہات سے ہے جیسا کہ کل شئی ھالک الا وجھہ اور آیت کریمہ یداللّٰہ فوق ایدیھم متشابہات سے ہیں۔ مسلم ترمذی اور نسائی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ آنے کے وقت اپنی سواری پر نوافل پڑھتے تھے سواری خواہ کسی طرف متوجہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بطور استدلال آیت وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الایۃ پڑھی اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ مجاہد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ آیت کریمہ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرف تمہاری سواری کا رخ ہو ادھر ہی نفل پڑھو اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث مسلم کی شرط کے موافق صحیح ہے اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جس وقت قبلہ تبدیل ہوا اور آیت مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (کس چیز نے پھیر دیا ان کو ان کے قبلہ سے جس پر یہ تھے) نازل ہوئی تو اس کے جواب میں آیت کریمہ وللّٰہ المشرق و المغرب الآیۃ نازل ہوئی اور سند اس حدیث کی قوی ہے میں کہتا ہوں کہ اول روایت شان نزول میں سند اور معنی دونوں کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ ماولھم کا جواب تو خود وہاں ہی قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ سے مذکور ہے اور اس آیت کے شان نزول میں اور روایات بھی آئی ہیں لیکن وہ سب ضعیف ہیں۔ مجملہ ان کے یہ ہے کہ ترمذی و ابن ماجہ اور دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ اندھیری رات میں بحالت سفر جناب رسول اللہ ص کے ہمراہ تھے نماز کے وقت یہ نہ جانا کہ قبلہ کس طرف ہے ہر شخص نے اپنے خیال کے موافق نماز ادا کی جب صبح کو جناب رسول اللہ ﷺ سے ہم نے اس کا ذکر کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اور بیہقی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک مختصر لشکر کسی جگہ بھیجا۔ اس میں میں بھی تھا راستے میں ہمیں تاریکی نے آگھیر ا اور قبلہ کی پہچان نہ رہی سب نے اپنے خیال کے موافق نماز پڑھی اور جس طرف پڑھی خط کھینچ دیئے۔ صبح کو دیکھ تو وہ سب خطوط قبلہ کی طرف

marfat.com

تھے۔ جب ہم سفر سے واپس آئے تو یہ واقعہ حضور علیہ السلام سے ذکر کیا آپ نے سن کر سکوت فرمایا۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آیت وللّٰہ المشرق نازل فرمائی۔

ابن مردویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس قصہ کو اسی طرح نقل کیا ہے اس میں اس قدر اور ہے کہ ابر کی وجہ سے قبلہ نہ ملا تھا۔ ابن جریر نے مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب آیت کریمہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مجھ سے دعا مانگو میں تمہارے لئے قبول کروں گا) نازل ہوئی تو عرب نے کہا اللہ تعالیٰ کس طرف اور کہاں ہے کہ ہم دعا کریں اس کے جواب میں آیت شریفہ وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ الآیہ نازل ہوئی۔

اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ (بے شک اللہ بڑی گنجائش والا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نور سے تمام اشیاء اور مشارق و مغارب کو محیط ہے اور وہ احاطہ کسی خاص کیفیت پر نہیں اور نہ اس کی حقیقت دریافت ہو سکتی ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ حقیقت الصلوۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس وسعت سے مراد ذاتی وسعت بلا کیفیت ہے اور اس کی کنہ مدرک نہیں ہو سکتی۔

عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾ (خبر دار ہے) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے عذر اور ان کی مصلحتوں اور ان کی نیتوں کو خوب جانتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا (اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے) مدینہ کے یہود کہا کرتے تھے کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور نجران کے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کہتے تھے کہ اللہ کے بیٹے ہیں اور مشرکین عرب بکتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ان سب کے رد میں حق تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ ارشاد فرمائی۔

سُبْحٰنَہٗ (سبحان اللہ) (کیا مہمل بات ہے) یعنی میں اللہ تعالیٰ کی اس امر سے پاکی اور تنزیہہ بیان کرتا ہوں کیونکہ ولادت اس امر کو مقتضی ہے کہ مولود اور والد میں مشابہت ہو اور ولد والد کا جز ہو اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ابن آدم نے میری تکذیب کی اور اسے یہ بات شایاں نہ تھی اور ابن آدم نے مجھے سبّ و شتم کیا اور یہ بات اسے سزاوار نہ تھی۔ تکذیب تو یہ ہے وہ گمان کرتا ہے میں اس کے مرنے کے بعد جیسا تھا اس طرح پر زندہ نہیں کر سکتا۔ اور سب و شتم یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیوی بچوں والا ہے حالانکہ میں اس سے بالکل پاک ہوں اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسی مضمون کے قریب قریب روایت کی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ بندہ کا مجھ کو جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دوبارہ پیدا نہیں کرے گا دیسا، جیسا کہ اول بار پیدا کیا۔ حالانکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا دوبارہ پیدا کرنے سے میرے لئے سہل نہیں (یعنی لوٹانا تو ابتدا سے بہت سہل ہے) اور سب و شتم یہ ہے کہ اللہ بچوں والا ہے حالانکہ میں احد صمد ہوں کہ نہ میں نے جنا نہ میں کسی سے جنا گیا اور نہ کوئی میرے برابر کا ہے۔

بَلْ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بلکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے) یعنی جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اسی کا ہے یعنی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسی کی ملک ہے، پھر بیٹے ہونے کا تعلق کہاں رہا کیونکہ باپ اور بیٹے میں تو کچھ مناسبت اور مجانست ضرور ہونا چاہئے اور یہاں کچھ بھی تعلق نہیں، کہاں ممکن محتاج عاجز مخلوق اور کہاں واجب غنی مستقل خالق۔

کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ (سب اسی کے تابعدار ہیں) یعنی جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب اس کی توحید کی شہادت دینے والے اور اس کے معبود ہونے کے مقر ہیں کیونکہ ممکن کا وجود بزبان حال شہادت دے رہا ہے کہ بندہ ایک ایسے خالق واجب کا محتاج ہے کہ کوئی اس کا مثل نہیں۔ اس تفسیر کے موافق یہ آیت کریمہ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ ان کی تسبیح سمجھتے نہیں) کی نظیر ہوگی۔ ان کی شہادتِ تحمید و تسبیح صاحب دل، دل کے حواس سے سمجھتے ہیں اور ان ہی حواس سے ان کی حیات انہیں معلوم ہوتی ہے اور یا عقول متوسط والے بھی ان کی صفت احتیاج اور دیگر آثار سے استدلال کرتے ہیں۔ قنوت کا اصل

marfat.com

معنی ہے قیام یعنی کھڑا ہونا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ افضل نماز وہ ہے جس میں طول قنوت (یعنی زیادہ دیر کھڑا ہوتا) ہو۔ اس حدیث کو مسلم احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے یا یہ معنی ہیں کہ سب اس کے مطیع ہیں۔

چنانچہ امام احمد نے بسند حسن ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی لفظ قنوت ہو اس سے مراد طاعت ہے۔

مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ کوئی چیز اس کی مشیت و تکوین سے علیحدہ نہیں ہوتی اور جس کی یہ حالت ہو اسے واجب سے کچھ بھی مجانست نہیں اور حرف ما اس لئے لائے تاکہ غیر ذی عقل بھی شامل ہو جائے اور آگے قانتون صیغۂ جمع مذکر سالم (جو ذوی العقول کے لئے ہے) ذوی العقول کو غلبہ دے کر استعمال فرمایا۔ اور یا اس لئے کہ قنوت (قیام) ذوی العقول کی خصوصیات میں سے ہے اس لئے جس صیغہ پر ذوی العقول کی جمع آتی ہے اسی کے موافق اسے بھی جمع کر دیا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ جن کو یہ لوگ معبود سمجھتے ہیں مثلاً مسیحؑ، عزیرؑ اور فرشتے سب اللہ کے مطیع اور عبودیت کے مقر ہیں اس تقدیر پر یہ آیت بعد دلیل کے الزام کے طور پر ہو گی۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِؕ (موجد ہے آسمان اور زمین کا) یعنی جس طرح وہ آسمان و زمین کی چیزوں کا خالق ہے اسی طرح وہ خود آسمان و زمین کا بھی خالق و موجد ہے اور یا یہ معنی کہ آسمان اور زمین اسی کے پیدا کردہ اور مخلوق ہیں تقدیر اول پر بدیع بمعنی اسم فاعل مبدع ہوگا اور صورت ثانی پر بمعنی اسم مفعول یعنی مبدع ہوگا۔

وَاِذَا قَضٰٓى اَمۡرًا (جب ارادہ کرتا ہے کسی کام کا) یعنی جب کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے۔ اصل معنی قضا کے کسی شئے سے فراغ پانے کے ہیں اسی واسطے کسی شئے کے تمام کرنے پر اس کا اطلاق آتا ہے خواہ وہ شئے قولی ہو جیسے فرمایا وقضٰی ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ (اور قطعی حکم دے دیا آپ کے پروردگار نے کہ کسی کو نہ پوجو اس کے سوا) یا وہ شئے فعلی ہو جیسے فرمایا فَقَضٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ (پھر پورا بنا دیا ان کو سات آسمان) اور کبھی اس کا اطلاق اس ارادۂ الٰہی پر آتا ہے جو کسی شئے کے وجود کے ساتھ بحیثیت موجب وجود ہونے کے متعلق ہو یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾ (تو بس فرمادیتا ہے کہ ہو سو وہ ہو جاتا ہے) کُن اور فیکون دونوں کان تامہ سے مشتق ہیں کیونکہ چیز کہیں مذکور نہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ پیدا ہو وہ شئے پیدا ہو جاتی ہے یہ مطلب نہیں کہ کسی صفت سے موصوف ہو جمہور نے فیکون کو بطور کلام مستقل کے یا یقول پر عطف کر کے سب جگہ رفع سے پڑھا ہے اور کسائی نے ابن عامر کو متابعت کر کے سورۂ نحل اور سورۂ یٰسٓ میں نصب سے پڑھا ہے اور ابن عامر رضی اللہ عنہ نے سب جگہ نصب سے پڑھا ہے لیکن سورۂ آل عمران میں كُنۡ فَيَكُوۡنُ اَلۡحَقُّ کو اور سورۂ انعام میں كُنۡ فَيَكُوۡنُ قَوۡلُهُ الۡحَقُّ کو رفع سے پڑھا ہے۔ نصب کی وجہ یہ ہے کہ جواب امر میں فاء کے بعد ان مقدر مانا ہے۔ اس مقام پر چند بحثیں ہیں۔ اول یہ کہ معدوم کو خطاب کرنا تو جائز نہیں (بلکہ متصور نہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ کن کیوں اور کسے فرمایا۔ بعض علماء نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس شئے کا وجود چونکہ مقدر تھا اس لئے گویا وہ وقت خطاب میں موجود تھی اس طرح خطاب صحیح ہو گیا اور ابن انباری نے کہا ہے کہ یقول لہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کو پیدا کرنے کے لئے یوں فرماتا ہے یہ مطلب نہیں کہ خود اس کو فرمان دیتا ہے اس مطلب پر یہاں خطاب ہی نہیں۔

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ حقیقتاً یہ مراد نہیں کہ کسی شئے کو امر فرمایا ہو اور اس نے امتثال کیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی یہ ایک مثال دی ہے کہ جس طرح کوئی آمر کسی مامور کو کہے اور وہ فوراً مطیع ہو جائے اسی طرح ہم جب چاہتے ہیں تو شئے کو پیدا کر دیتے ہیں۔ دوسری بحث یہ ہے کہ یکون کا نصب جو ان مقدرہ کی وجہ سے ہے چاہتا ہے کہ صیغہ امر اپنے معنی میں ہو کیونکہ ان تو امر حقیقی کے بعد ہی مقدر ہوتا ہے اور حالانکہ یہاں امر اپنے معنی میں نہیں بلکہ یہ مراد جلد حاصل ہو جانے کی مثال ہے پھر نصب کس طرح متصور ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ نصب ظاہر لفظ کے اعتبار سے ہے نہ معنی کے

marfat.com

اعتبار سے اور ظاہر صیغہ امر ہے۔ تیسری بحث یہ ہے کہ ان کے مقدر ہونے کی شرط یہ ہے کہ فا کا ما قبل مابعد کا سبب ہو اور اس صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ ممکن کے لئے دو مرتبہ کون (وجود) ہوں۔ اس کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ کون اول سے مجازاً وجوب اس طور پر مراد ہے کہ مسبب کا سبب پر اطلاق کیا گیا ہے، کیونکہ ممکن جب تک حد وجوب میں نہیں آتا موجود نہیں ہوتا پس حاصل کن کا یہ ہونا چاہئے کہ وجوب اس شئے کا ہو جائے۔

میں کہتا ہوں کہ جواب اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ اول کون سے مراد اس کا دار العمل (دنیا) میں سبب ہونا اور دوسرے کون سے دار الجزاء (آخرت) میں مسبب ہونا مراد ہو لیکن اس صورت میں یہ آیت مکلفین کے ساتھ خاص ہو گی حالانکہ طرز کلام عموم کو چاہتا ہے اور عمدہ جواب یہ ہے کہ اول کون سے مراد اس شئے کا وجود علمی کے ساتھ مرتبۂ اعیان ثابتہ (یعنی مرتبہ تقرر) میں موجود ہونا ہے اور دوسرے کون سے اس شئے کا خارج میں بوجود ظلی موجود ہونا ہے۔ صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی طرح فرمایا ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اعیان ثابتہ کا مرتبہ بحدوث زمانی حادث ہے اور اس تفسیر کے موافق یہ آیت توحید شہودی پر دال ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے، توحید وجودی پر دلالت نہیں کرتی جیسا کہ شیخ اکبر محی الدین عربی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ ممکنات نے خارج میں وجود کی بو تک نہیں سونگھی۔ واللہ اعلم۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (اور کہتے ہیں وہ لوگ جو نہیں جانتے) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ سے مراد یہود ہیں اور اسی طرح ابن جریر اور ابن ابی حاتمؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رافع بن حرملہ یہودی نے جناب رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اگر تم اللہ کی طرف سے سچے رسول ہو تو اللہ تعالیٰ سے کہو کہ ہم سے باتیں کرے اور ہم اس کی باتیں سنیں اور مجاہد نے فرمایا ہے کہ نصاریٰ مراد ہیں اور یہود اور نصاریٰ اگرچہ کتاب سماوی کے عالم تھے لیکن جب انہوں نے اپنے علم پر عمل نہ کیا تو گویا جاہل ہی ہیں اور قتادہ نے فرمایا ہے کہ مشرکین عرب کے ان پڑھ لوگ مراد ہیں۔

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ (کیوں نہیں باتیں کرتا ہم سے خدا) لولا بمعنی ھلاّ (کیوں نہیں) ہے اور اسی طرح جہاں کہیں قرآن پاک میں لولا آیا ہے وہ بمعنی ھلا ہے سوائے آیت کریمہ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ کے کہ وہاں لولا بمعنی لولم یکن (اگر نہ ہوتا) ہے یعنی اللہ ہم سے اس طرح باتیں کرتا جس طرح فرشتوں سے کرتا ہے یا جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا ہے تو حاجت رسول کی ہی نہ ہوتی، یا اللہ ہم سے فرمادے کہ یہ ہمارا رسول ہے۔

اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ (یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی) یعنی یا کوئی دلیل تمہاری سچائی کی آتی۔ اول درخواست کا مبنی تکبر ہے اور دوسرے سوال کا حاصل دلائل اور آیات کا بطور عناد انکار ہے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ (اسی طرح کہہ چکے وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے ہیں) یعنی گزشتہ یہود اور نصاریٰ بھی اسی قسم کی باتیں کہا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہود نے کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کو علی الاعلان دکھادے اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی تھی کہ ہم پر آسمان سے کھانے کا بھرا ہوا خوان اترے۔

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ (ملے جلے ہیں ان سب کے دل) یعنی عناد اور نابینائی میں پہلے پچھلوں کے دل برابر ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (بے شک ہم بیان کر چکے نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں) یعنی ہم نے اس قوم کے لئے دلائل بیان کر دیئے جو حق بات کے ساتھ یقین کے طالب ہیں، یہ جو فرمایا کہ یقین کرنے والوں کے لئے بیان کر دیا حالانکہ سب کے لئے بیان فرمایا ہے تو وجہ تخصیص یہ ہے کہ چونکہ آیات کی منفعت یعنی ہدایت اور رشد سے ایسے ہی منتفع ہیں اور جو عناد اور جدال کرنے والے ہیں وہ محروم اور نامراد ہیں تو گویا آیات ان کے لئے ہی بیان ہوئیں۔

marfat.com

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ (ہم نے تجھ کو بھیجا ہے حق (کلام) دیکر) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ بالحق میں حق سے مراد قرآن ہے جیسا کہ آیت کریمہ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ (بلکہ جھٹلایا انہوں نے حق کو جب ان کے پاس آیا) میں بھی الحق سے مراد قرآن پاک ہے۔

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا) یعنی اہل طاعت کے لئے خوشخبری دینے والے اور اہل معصیت کے واسطے ڈرانے والے۔

وَّلَا تُسْئَلُ (اور تجھ سے پوچھ نہ ہو گی) نافع اور یعقوب نے ولا تسأل کو صیغۂ نہی معروف سے اور باقی قراء نے رفع سے مضارع منفی مجہول سے پڑھا ہے۔

عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴿۱۱۹﴾ (دوزخ والوں کی) جحیم سخت آگ کو کہتے ہیں۔ جمہور کی قراءت کے موافق وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کے یہ معنی ہوں گے کہ اے محمد ﷺ آپ سے اس کی پوچھ گچھ نہ ہو گی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہ لائے آپ کے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے اور حساب ہمارے ذمہ ہے اور نافع کی قراءۃ پر سوال سے نہی کرنا شدت عذاب سے کنایہ ہو گا جیسے کہا کرتے ہیں کہ اس کا حال مت پوچھو (یعنی وہ بہت تکلیف میں ہیں کیا پوچھتے ہو مجھے یارائے بیان نہیں ہے) بہت سخت حالت میں ہے اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک روز جناب رسول خدا ﷺ نے فرمایا کاش مجھے خبر ہوتی کہ میرے والدین کس حال میں ہیں، اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اور عبد الرزاق نے کہا ہے کہ مجھ سے ثوری نے موسیٰ بن عبیدہ سے اور موسیٰ نے محمد بن کعب قرظی سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ حدیث روایت کی ہے اور اسی طرح ابن جریر نے ابن جریج کے طریق سے کہا ہے کہ مجھ سے داؤد بن عاصم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ شان نزول جو علامہ بغویؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے میرے نزدیک پسندیدہ نہیں اور نیز قوی بھی نہیں اگر یہ حدیث پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ جاوے تو یہ محض ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا خیال ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ حضور ﷺ نے ایسا فرمایا ہو اور اسی دن اتفاق سے یہ آیت بھی نازل ہوئی ہو تب بھی کوئی دلیل اس امر پر نہیں کہ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ سے حضور ﷺ کے والدین مراد ہوں اور اگر یہ بھی مان لیا جاوے کہ حضور ﷺ کے والدین ہی مراد ہوں تو یہ آیت ان کے کفر پر کسی طرح دال نہیں کیونکہ مؤمن بھی گناہوں کے سبب جہنم والوں میں سے ہوتا ہے اور پھر شفاعت یا اور کسی وجہ سے یا مدت عذاب کے تمام ہونے سے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ دیکھو امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اولاد آدم کے سب قرنوں میں بہترین اور افضل ترین قرن میں پیدا کیا گیا۔ اور فرمایا کہ جب کبھی کسی گروہ کے دو ٹکڑے ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں سے کیا جو بہتر ٹکڑا تھا حتیٰ کہ میں اپنے والدین سے پیدا ہوا اور جاہلیت کی ناپاکیوں میں سے کوئی ناپاکی مجھے نہیں لگی اور میں آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے ماں باپ تک نکاح سے پیدا ہوا ہوں، زنا سے نہیں پیدا ہوا ہوں۔ اس لئے میں اپنی ذات سے اور باعتبار آباؤ اجداد کے تم سے بہتر ہوں۔ اس حدیث کو بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور ابو نعیم نے اپنی کتاب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور شیخ اجل شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے رسول اللہ ﷺ کے والدین شریفین کے اسلام کے بارے میں چند رسائل تصنیف کئے ہیں۔ میں نے ان رسائل میں سے ایک رسالہ اخذ کیا ہے اس میں دلائل اور اعتراضات وارادہ کے شافی جوابات لکھے ہیں۔ فللہ الحمد۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (اور ہرگز نہ خوش ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی تاوقتیکہ نہ اختیار کر لیں آپ ان کا دین) ملت وہ طریقہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے واسطے اپنے انبیاء کی زبانی مقرر فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اہل کتاب نے جناب رسول اللہ ﷺ سے صلح

کی درخواست کی تھی اور یہ طمع دلاتے تھے کہ اگر آپ ہمیں مہلت دیں گے تو ہم ایمان لے آویں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ثعلبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جب حضور ﷺ اہل کتاب کے قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے تو مدینہ کے یہود اور نجران کے نصاریٰ اس بات کی امید میں تھے کہ آپ ہم میں آملیں گے جب کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا تو ناامید ہوگئے اور اس کے بعد آیت لَنْ ترضیٰ الخ نازل ہوئی۔ اور اُس آیت میں جناب رسول اللہ ﷺ کو اہل کتاب کے اسلام لانے سے نہایت ناامیدی دلائی گئی کہ ان کا تو یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ آپ ان کے دین کا اتباع کریں پھر یہ آپ کا کیسے اتباع کریں گے اور شاید ایسا ہوا ہو کہ اہل کتاب نے اس مضمون کو کہا ہو۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اس کا جواب آیت کریمہ قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ارشاد فرمایا۔

قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی ؕ (کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کی ہدایت ہدایت ہے) یعنی اللہ کی ہدایت یعنی اسلام ہی حق ہے جس کی طرف یہ کفار بلاتے ہیں وہ حق نہیں۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ (اور اگر آپ چلے ان کی خواہشوں پر اس کے بعد کہ آچکا آپ کے پاس علم۔ من العلم، علم سے مراد یا تو وحی ہے اور یا دین ہے جس کا صحیح ہونا معلوم ہو چکا۔

مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾ (تو آپ کے لئے نہ کوئی حمایتی ہے کہ اللہ سے بچالے نہ کوئی مددگار) یعنی کوئی مددگار نہ ہوگا جو اللہ کے عذاب کو دور کردے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ (وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے) یعنی قرآن۔ قتادہ اور عکرمہ نے فرمایا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ سے صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عام مؤمن مراد ہیں اور اہل کتاب کے مؤمن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا شان نزول یوں بیان فرمایا ہے کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حبشہ سے چالیس آدمی آئے تھے بتیس تو ان میں سے حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے اور ان میں بحیرا راہب بھی تھا ان سب کے بارے میں آیت کریمہ الّذین الخ نازل ہوئی اور ضحاک نے فرمایا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنَا ھُمْ الخ سے مؤمنین یہود مراد ہیں، انہی میں عبداللہ بن سلام اور سعید بن عمرو اور تمام یہود اور اسید۔ اسد پسران کعب بن یامین اور عبداللہ بن صوریا رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ اس تقدیر پر اسم موصول عہد کے لئے ہوگا۔

یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ (وہ اسے پڑھتے رہتے ہیں جو اس کے پڑھنے کا حق ہے) خطیب نے ایک سند سے جس میں راوی مجہول ہیں امام مالک سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کی ہے کہ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس کا اتباع کرتے ہیں پورا اتباع اور حضرت عمرؓ سے یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کا معنی یہ مروی ہے کہ جب کتاب اللہ میں جنت کا ذکر آئے تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے اور جب دوزخ کا ذکر آئے تو پناہ مانگے۔ ضمیرہ، الکتاب کی طرف راجع ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف کو تحریف سے بچا کر تدبیر اور عمل کے ارادہ سے پڑھتے ہیں اور کلبی نے کہا کہ ضمیرہ دونوں جگہ جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہیں کہ مؤمنین اہل کتاب سے اگر کوئی محمد ﷺ کا حال دریافت کرتا ہے تو اس سے آپ کا حال جس طرح ان کی کتاب میں لکھا ہے بعینہ صحیح صحیح بتاتے ہیں اور یہ معنی جب ہی ہوں گے کہ الّذین اسم موصول سے مؤمنین اہل کتاب مراد ہوں اور یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ یا تو حال مقدر ہو اور الذین کی خبر اس کے بعد ہو اور یا خود الذین کی خبر ہو اور

اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ ؕ (وہی لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر) خبر بعد خبر ہو اور بہ میں ضمیرہ یا تو کتاب کی طرف اور یا محمد ﷺ کی طرف راجع ہو۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ (اور جو اس کا انکار کرتے ہیں) یعنی جو لوگ کتاب کے ساتھ کفر کرتے ہیں یعنی تحریف کرتے

ہیں یا جس کی وہ تصدیق کرتی ہے اس کا انکار کرتے ہیں یا محمد ﷺ کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ (وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں) کیونکہ کفر کو ایمان کے عوض مول لیتے ہیں۔

ع ۱۴

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(اے بنی اسرائیل یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت دی سارے جہان کے لوگوں پر اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جاویگا اور نہ کسی کی سفارش اسے فائدہ دے گی اور نہ لوگوں کی مدد کی جائے گی) اللہ تعالیٰ نے شروع پارہ میں بنی اسرائیل کا ذکر بھی ان ہی الفاظ سے فرمایا تھا جس کا حاصل نعمتوں کا یاد دلانا اور قیامت کا خوف وغیرہ ہے اور کلام کو ختم بھی اسی مضمون پر فرمایا تاکہ وصایائے مذکورہ سابقہ میں قوت بڑھ جاوے اور یہ معلوم ہو جاوے کہ تمام قصہ کا مقصود اور نچوڑ یہی ہے۔

اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (اور (یاد کرو) جب آزمایا ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں) ہشام نے اس تمام سورت میں ابراہیم کو ابراہام پڑھا ہے اور اس سورت میں ابراہیم پندرہ جگہ ہے اور سورۂ نساء میں تین مقام پر اور سورۂ انعام میں ایک بار آخر میں اور سورۂ توبہ کے آخر میں دو جگہ اور سورۂ ابراہیم میں ایک جگہ اور سورۂ نحل میں دو جگہ اور سورۂ ابراہیم میں ایک جگہ اور سورۂ نحل میں دو جگہ اور مریم میں تین جگہ اور عنکبوت میں ایک جگہ اور شوریٰ میں ایک جگہ اور ذاریات میں ایک جگہ اور نجم میں ایک جگہ اور حدید میں ایک جگہ اور ممتحنہ میں ایک جگہ۔ ان کل تینتیس مقام پر ہشام نے ابراہام پڑھا ہے اور تمام قرآن شریف میں ابراہیم اٹھتر ۷۸ جگہ ہے اور ابن ذکوان نے خاص سورۂ بقرہ میں ابرام اور ابراہام دونوں طرح پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ابراہیم سب کو جگہ ی سے پڑھا ہے۔ ابتلاء کے اصل معنی کس امر شاق کی تکلیف دینے کے ہیں یہ بلاء سے مشتق ہے۔ تکلیف دینا آزمائش کو، مستلزم ہوتا ہے اکثر گمان ہوتا ہے کہ ابتلاء اور اختبار (آزمانا) دونوں مرادف ہیں۔ اور کلمات سے مراد ان کے مدلول یعنی مضمون مراد ہیں خود کلمات مراد نہیں اور مضمون یہی امر و نہی ہے۔ عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کلمات سے مراد تیس خصلتیں ہیں کہ وہ سب اسلام کے شرائع ہیں کسی نے سوائے ابراہیم علیہ السلام کے انہیں پورا نہیں کیا اور اسی واسطے ان کے لئے جہنم کی آگ سے براءت لکھی گئی۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے آزمائش میں پورے اترنے کو اس طرح تعبیر فرمایا وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ (ابراہیم جس نے پورا کیا) اب ہم ان تیس خصلتوں کو مفصل بیان کرتے ہیں۔ دس سورۂ براۃ میں ہیں۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (یعنی یہ لوگ توبہ کرنے والے عبادت گزار، ثنا کرنے والے، اللہ کی راہ میں سفر کرنے والے رکوع و سجدہ کرنے والے، نیک کام کو کہنے والے اور برے کام سے منع کرنے والے اور تھامنے والے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کے ہیں اور خوش خبری سنا دے مسلمانوں کو اور دس سورۂ احزاب میں ہیں۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ یعنی بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صابر مرد اور صابر عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں اور دس

marfat.com

سورۂ مؤمنون اور سَأَلَ سَائِلٌ میں ہیں۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۙ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۚ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۚ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۞ الآیہ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۙ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۙ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۙ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۙ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۙ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۙ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۚ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۚ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۞

(ترجمہ) اپنی مراد کو پہنچ گئے ایمان والے کہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں اور جو نکمی بات سے منہ موڑتے ہیں اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا اپنے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈیوں) سے کہ (ان میں) ان پر کچھ ملامت نہیں پھر جو طلب کرے اس کے علاوہ تو وہی لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں جو اپنی نماز پر ہمیشہ قائم ہیں اور جن کے مال میں حصہ ٹھہرا ہوا ہے سائل کا اور حاجتمند کم سوال کا اور جو یقین رکھتے ہیں روز جزا کا اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے خائف ہیں۔ بیشک ان کے پروردگار کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں یا اپنے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈیوں) سے تو ان پر کچھ ملامت نہیں پھر جو کوئی طلبگار ہو اس کے سوائے اور کا تو وہی لوگ حد سے باہر نکلنے والے ہیں اور وہ لوگ کہ اپنی امانتوں اور اپنے قول کو نباہتے ہیں اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں اور وہ جو اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔

اور طاؤس نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دس چیزوں سے آزمایا تھا کہ وہ دسوں فطرت کے مقتضی ہیں۔ پانچ تو ان میں سے سر میں ہیں مونچھیں کتروانا، کلی کرنا، ناک میں پانی دینا، مسواک کرنا، سر میں مانگ نکالنا اور پانچ اور بدن سے متعلق ہیں ناخن ترشوانا، بغل کے بال اکھاڑنا، زیر ناف کے بال مونڈنا، ختنہ کرنا، پانی سے استنجا کرنا، ربیع اور قتادہ نے فرمایا کہ کلمٰت سے مراد حج کے طریقے ہیں اور حسن نے فرمایا سات چیزیں مراد ہیں ان سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی تھی۔ ستارے، چاند، سورج حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو خوب بنظر غور دیکھ کر معلوم کیا کہ پروردگار ہمیشہ رہنے والا ہے ان کی طرح زوال پذیر نہیں اور چوتھے آگ سے آزمائش فرمائی کہ نمرود نے اس میں ڈال دیا اس پر ابراہیم علیہ السلام نے صبر فرمایا۔ پانچویں ہجرت اور چھٹے بیٹے کے ذبح کرنے اور ساتویں ختنہ کرنے سے جانچا ان سب پر ابراہیم علیہ السلام نے صبر کیا۔

سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کلمات سے مراد ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا الآیہ ہے کہ جس کو وہ دونوں بیت اللہ کے بنانے کے وقت اللہ تعالیٰ سے کرتے تھے اور یمان بن رباب نے فرمایا کہ کلمٰت سے مراد ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ ہے جو قوم سے ہوا تھا۔ جس کو اللہ تعالیٰ آیت کریمہ وَ حَاجَّهُ قَوْمُهُ الخ سے بیان فرمایا ہے اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ کلمٰت سے مراد اگلی آیتوں کا مضمون ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسے معنی بیان کرنے مناسب ہیں کہ سب اقوال اس میں آجائیں اور وہ یہ معنی ہیں کہ کلمٰت سے مراد تمام اوامر و نواہی ہیں۔ تیس خصائل جو اول مذکور ہوئیں وہ بھی اسی میں ہیں اور دس اور سات چیزیں جو بعد میں مسطور ہیں وہ بھی ان ہی کلمات میں شامل ہیں۔

فَأَتَمَّهُنَّ ؕ (سو اس نے پورا کر دکھایا) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں پوری طرح ادا کیا۔

قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ؕ (تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا

وَالَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۙ

marfat.com

ہوں) وَاِذِ ابۡتَلٰٓی، قال کا ظرف ہے اور اگر اِذِ ابۡتَلٰٓی کو اذکُر (یاد کر) محذوف کے متعلق مانا جاوے تو قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ کلام مستقل اور جواب سوال مقدر کا کہا جاویگا، گویا سائل سوال کرتا ہے کہ جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں پوری طرح ادا کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا۔ جواب دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اِنِّیۡ جَاعِلُکَ الخ فرمایا یا یہ کہا جاوے کہ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، اِبۡتَلٰٓی کا بیان ہو، اس صورت میں کلمات سے مراد امامت اور بیت اللہ کو پاک کرنا اور اس کی بنیادوں کو اٹھانا اور اسلام وغیرہ ہیں جو آگے مذکور ہیں اور جَاعِلٌ اسی جَعۡلٌ سے مشتق ہے جس کے لئے دو مفعولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ امامت سے مراد اس مقام پر نبوت ہے یا عام معنی مراد لئے جائیں یعنی امام وہ ہے جس کی اقتدا کی جاوے اور جس کی طاعت واجب ہو اور سلطنت اور امامت بمعنی خاص مراد نہیں ہے جسے امامیہ مذہب والوں نے گھڑا ہے اور امامت کا اس معنی میں شرع اور لغت میں کہیں استعمال نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت عامہ عطا فرمائی تھی حتیٰ کہ سید الانبیاء ﷺ کو بھی حکم ناطق آیا اِتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا یعنی اتباع کرو دین ابراہیم کا جو ایک کا ہو رہا تھا۔

قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ (ابراہیم علیہ السلام نے کہا اور میری اولاد میں سے) اس کا عطف جاعلک کے ک ضمیر پر ہے یعنی اے اللہ میری بعض اولاد کو بھی امام بنا۔ ذریۃ آدمی کی نسل کو کہتے ہیں۔ ذُرِّيَّةٌ یا تو فُعۡلِيَّةٌ اور یا فُعُّوۡلَةٌ کے وزن پر ہے دوسری ر کو ی سے بدل لیا ہے جیساکہ دسّی میں دوسرے س کو ی سے بدلا ہے۔ الذر پراگندہ و متفرق ہونا ذریت ذر سے مشتق اور یا الذرٔ سے مشتق ہے اور الذرٔ کا معنی ہے پیدا کرنا۔ اس وقت اس کا وزن فعولۃ یا فعلیۃ ہوگا، اس صورت میں ہمزہ کو ی سے بدلا ہے۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِي الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾ (فرمایا (ہاں مگر) ہمارے اس عہد میں وہ داخل نہیں جو ظالم ہیں) عہد سے مراد امامت مذکورۃ الصدر ہے۔ حفص اور حمزہ نے عہدی کی ی کو ساکن اور باقی قراء نے فتحہ سے پڑھا ہے یعنی اے ابراہیم علیہ السلام آپ کی اولاد میں سے جو لوگ ظالم ہیں انہیں امامت نہ پہنچے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمالیا اور امامت کو متقیوں کے ساتھ خاص فرمایا اگر امامت سے مراد نبوت ہو تو ظَالِمِیۡنَ سے مراد فاسق ہیں۔ کیونکہ نبوت میں معصوم ہونا بالاتفاق شرط ہے اور اگر امامت سے عام معنی مراد ہوں تو ظالم سے کافر بھی مراد ہو سکتا ہے، کیونکہ کافر کو امیر اور مقتدا بنانا جائز نہیں اخیر تقدیر پر لَا يَنَالُ عَهۡدِي الظّٰلِمِيۡنَ سے یہ مستفاد ہوگا کہ فاسق اگرچہ امیر ہو لیکن اس کی طاعت ظلم اور معصیت میں جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی طاعت جائز نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام مالک و امام احمد رحمہما اللہ نے عمران اور حکیم بن عمرو الغفاری رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ بخاری، مسلم اور ابوداؤد و نسائی نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کی معصیت میں کسی کی طاعت نہیں۔ طاعت نیک کام میں ہوتی ہے اور رہیں وہ آیات جو کہ امراء کی طاعت میں وارد ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِي الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اطاعت کرو رسول کی اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اطاعت کرو اور سنو اگرچہ امیر تمہارا حبشی غلام ہو تو ان نصوص سے مراد مطلق طاعت نہیں ہے خواہ جائز ہو یا ناجائز بلکہ ان ہی امور میں طاعت مراد ہے جو شرع کے مخالف نہیں چنانچہ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِيۡ شَيۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ (پس اگر جھگڑا کرو تم کسی شئے میں تو اس کو اللہ و رسول کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو) اس تقریر کے موافق اس آیت سے امام کا معصوم ہونا جیساکہ روافض کا خیال ہے مستنبط نہیں ہوتا واللہ اعلم۔

وَاِذۡ جَعَلۡنَا اور (یاد کرو) جب ٹھیرایا ہم نے ابو عمرو اور ہشام نے اذ جَعَلۡنَا میں اور جہاں کہیں ایسا موقع ہو ذ کو ج میں ادغام کیا ہے اور اسی طرح واذ کے ذ کو وَاِذۡ زَيَّنَ کے ز میں اور وَاِذۡ سَمِعۡتُمُوۡهُ کے س میں اور وَاِذۡ صَرَفۡنَا کے ص میں

marfat.com

اور وَاِذْ تَبَرَّأَ کے ت میں اور وَاِذْ دَخَلُوْا کی د میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور ابن ذکوان نے صرف د میں تو ادغام کیا ہے اور کسی جگہ نہیں کیا اور حلف نے دا ور ت میں کیا ہے اور خلاد اور کسائی نے ج کی صورت میں صرف اظہار کیا ہے اور نافع اور ابن کثیر اور عاصم ان سب صورتوں میں اذ کی ذال کو اظہار کرتے ہیں۔

اَلْبَیْتَ (بیت کو) اس سے مراد خانہ کعبہ ہے اگرچہ بیت عام ہے جیسے النجم کا اطلاق ثریا پر اکثر آتا ہے۔

مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (لوگوں کے لئے اجتماع کی جگہ) یعنی خانہ کعبہ کو ہم نے مرجع بنا دیا ہے کہ چاروں طرف سے لوگ وہاں آتے ہیں یا یہ کہ ثواب کی جگہ بنا دی کہ وہاں حج اور عمرہ اور نماز پڑھ کر ثواب حاصل کرتے ہیں، چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

وَاَمْنًا (اور امن کا مقام) یعنی خانہ کعبہ کو ہم نے امن کی جگہ بنایا کہ وہاں مشرکین کی ایذا رسانی سے امن ہوتا ہے کیونکہ مشرکین اہل مکہ سے کچھ تعرض نہ کرتے اور کہتے کہ یہ لوگ اہل اللہ ہیں اور آس پاس کے لوگوں کو ایذائیں پہنچاتے تھے جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے بنایا ہے حرم کو امن کی جگہ اور لوگ اچکے جا رہے ہیں ان کے آس پاس سے) اور جناب سرور کائنات ﷺ نے فتح مکہ کے روز فرمایا کہ جس دن سے اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اس شہر (مکہ) کو حرام فرمایا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی حرمت سے وہ قیامت تک حرام ہے اور اس میں کسی کے لئے قتال حلال نہیں، صرف میرے لئے دن کی ایک ساعت میں حلال ہو گیا تھا اس کے بعد پھر قیامت تک حرام ہے نہ اس کا کانٹا کاٹا جاوے اور نہ شکار کو بھگایا جاوے اور نہ یہاں کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے مگر ہاں جو تعریف (تشہیر) کرے وہ لقطہ[1] اٹھالے اور نہ یہاں کی گھاس کاٹی جاوے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا لیکن اذخر کو (مرچیاگند) مستثنیٰ فرما دیجئے کیونکہ وہ لوہاروں کے کام میں آتی ہے اور گھروں میں بہت کار آمد ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں اذخر مستثنیٰ ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مضمون کی حدیث منقول ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (اور ہم نے حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ) یعنی بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ اس نماز سے طواف کی دو رکعتیں مراد ہیں۔ مسلم نے حدیث طویل میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب ہم جناب رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ بیت اللہ تک آئے تو حضور نے رکن کو بوسہ دیا اور تین مرتبہ رمل فرمایا اور چار مرتبہ معمولی چال سے چلے، پھر مقام ابراہیم کے پاس آئے اور آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى تلاوت فرما کر نماز پڑھی اور مقام ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کیا۔ واللہ اعلم

ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد تمام حرم ہے اس کے موافق مِن مقام میں مِن تبعیضیہ ہے اور یا مقام ابراہیم سے مسجد حرام مراد ہے جیسا کہ ابن یمان کا خیال ہے یا حج کے تمام مشاہد جیسے عرفہ اور مزدلفہ وغیرہ مراد ہیں اور اگر مقام ابراہیم سے وہ پتھر مراد ہو جس کی طرف ائمہ نماز پڑھتے ہیں اور جس پر بیت اللہ بنانے کے وقت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے اور اس پر آپ کے پاؤں کی انگلیوں کا نشان تھا پھر لوگوں کے ہاتھ پھیرنے سے مٹ گیا تو اس صورت میں مِن ابتدائیہ ہوگا اور یہ قول صحیح ہے اور حدیث جابر رضی اللہ عنہ جو اول گزر چکی ہے اس پر دلالت بھی کرتی ہے اس کے موافق معنی آیت کے یہ ہیں کہ مقام ابراہیم کے قریب مسجد یا حرم میں نماز کی جگہ بناؤ۔ نافع اور ابن عامر نے واتخذو کی خاء کو فتحہ سے بصیغۂ ماضی جعلنا پر عطف کر کے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے بصیغۂ امر کسرۂ خا سے پڑھا ہے بصیغۂ امر کی صورت میں واتخذوا میں امت محمدیہ ﷺ کو خطاب ہوگا۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے

---

[1] گری پڑی چیز۔

marfat.com

اتفاقاً میرے رب سے تین باتوں میں موافق آگئی یا یوں فرمایا کہ تین باتوں میں میرے رب نے مجھ سے موافقت فرمائی۔ ایک تو یہ کہ میں نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ میں اگر مقام ابراہیم کو مصلّے بناؤں تو بہتر ہو، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آیت واتخذوا الخ نازل فرمائی۔ دوسری بات یہ کہ میں نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ آپ کی خدمت میں نیک کار اور بدکار سب ہی طرح کے آدمی آتے ہیں۔ آپ امہات مؤمنین (یعنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن) کو اگر پردہ کا حکم فرمادیں تو اچھا ہو۔ اسی وقت اللہ نے پردہ کی آیت نازل فرمائی۔ اور تیسرے یہ کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور ﷺ نے بیویوں پر عتاب فرمایا ہے۔ یہ سن کر میں گیا اور کہا کہ یا تو تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں عطا فرمائے گا اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آیت عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ۔ الایہ (اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دیں تو کچھ بعید نہیں کہ ان کا پروردگار ان کو تمہارے عوض ایسی بیویاں مرحمت فرمائے جو تم سے بہتر ہوں)

اس حدیث کو بخاری نے ذکر کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ نے اس آیت سے استنباط کیا ہے کہ طواف کے ہر سات پھیروں کے بعد دو رکعت پڑھنا واجب ہیں کیونکہ صیغۂ امر وجوب کے لئے ہوتا ہے اور اگر صیغہ ماضی ہو تو ثبوت اور وجوب پر زیادہ دال ہے اور قیاس تو مقتضی تھا کہ یہ دو رکعتیں فرض ہوں کیونکہ نص قطعی موجود ہے لیکن چونکہ اس آیت کا نزول خاص اس نماز کے اندر احادیث احاد سے معلوم ہوا ہے اس لئے ہم ان دو رکعتوں کی فرضیت کے قائل نہیں ہوئے۔ نیز ان دو رکعتوں کا وجوب جناب رسول اللہ ﷺ کے ہمیشہ پڑھنے سے بھی ثابت ہوا اور کبھی ایک دو مرتبہ بھی ترک ثابت نہیں اور یہ خود آپ نے حج میں فرمایا ہی تھا کہ مجھ سے (یعنی میرے افعال دیکھ کر) اپنے حج کے طریقے سیکھ لو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حج یا عمرہ میں طواف فرماتے تو اول آتے ہی تین مرتبہ لپک کر طواف کرتے اور چار مرتبہ معمولی چال سے چلتے پھر دو رکعت ادا فرماتے پھر صفا و مروہ کے درمیان چکر لگاتے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری میں تعلیقاً (بلا سند) مروی ہے کہ اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں کہ میں نے زہری سے پوچھا کہ عطا کہتے ہیں کہ فرض نماز طواف کی دو رکعتوں کے بدلے کافی ہے عطاء نے فرمایا کہ سنت کی اقتدا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب کبھی سات پھیرے طواف کے فرماتے تو دو رکعتیں ضرور پڑھتے اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ بصیغۂ امر و اتخذوا استحباب کے لئے ہے اور مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ اور شافعی رحمۃ اللہ کے دو قول ہیں لیکن ان ائمہ کا اس امر کو استحباب پر حمل کرنا جائز نہیں کیونکہ اصل تو وجوب ہے، اگر وجوب نہ بنے تو استحباب وغیرہ پر حمل کریں گے۔ طواف کی یہ دو رکعتیں تمام مسجد میں بلکہ مسجد کے باہر بھی بالاتفاق جائز ہیں اور صحیحین میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب صبح کی جماعت ہو اور لوگ نماز پڑھتے ہوں تو تم اپنے اونٹ پر چڑھ کر طواف کر لینا۔ ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا اور بعد طواف کے نماز نہ پڑھی حتی کہ مسجد سے نکل آئے اور بخاری نے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے طواف کی رکعتیں حرم سے باہر ذی طویٰ میں پڑھیں۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس نماز کو ایک خاص جگہ کے ساتھ مقید کر دیتے تو اس میں سخت تنگی ہوتی اور بہت سے ضروری امور میں تنگی مقام کی وجہ سے سہولت نہ ہوتی دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ الآیہ (اللہ کی عبادت کرو خالص اس کے فرمانبردار ہو کر) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اعمال نیتوں سے ہیں تو اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اگر اخلاص نیت سے نہ ہوں تو یہ عبادات درست ہی نہ ہوں، لیکن اس میں ظاہر ہے کہ تنگی ہے اس لئے نماز اور حج میں تو شروع ہی میں نیت کا ہونا کافی سمجھا گیا اور زکوٰۃ میں قدر واجب مال کو علیحدہ کرنے کے وقت نیت کا ہونا ضروری قرار پایا اور روزہ میں اگر طلوع فجر کے وقت نیت کو مشروط کر دیتے تو چونکہ یہ وقت خواب اور غفلت کا ہے اس لئے بہت دشواری ہوتی اس واسطے روزہ میں رات ہی سے نیت کر لینا کافی ہے بلکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو چاشت تک نیت جائز ہے اسی طرح یہاں بھی قیاس اسی کو چاہتا تھا کہ یہ طواف کی نماز بھی مقام ابراہیم کے پاس ہی جائز ہوتی

marfat.com

کیونکہ ظاہر آیت کا منشا یہی ہے لیکن اس میں دشواری تھی اس لئے یہ نماز مسجد میں بلکہ تمام حرم میں جائز قرار دی گئی اور حرم کو تو اللہ تعالیٰ نے مسجد ہی فرمایا ہے چنانچہ فرمایا المسجد الحرام اَلَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ اور فرمایا ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامَ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جوذی طوی میں طواف کی دو رکعتیں ادا فرمائیں تو کسی ضرورت سے واجب کو ادا فرمایا۔ یا تفسیر ہی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى کی اسی طرح کی جاوے کہ جس سے شبہ ہی واقع نہ ہو، وہ یہ ہے کہ مقام ابراہیم کا ذکر اس لئے فرمایا کہ غالب یہی تھا کہ جب ازدحام نہ ہوتا تھا تو یہ رکعتیں مقام کے پاس ادا کی جاتی تھیں، مقام کا ذکر تقیید اور تعیین کے لئے نہیں ہے جیسا کہ آیت کریمہ وَرَبَائِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ میں فی حُجُوْرِكُمْ کی قید باعتبار غالب عادت کے ہے پس اگر کوئی مانع نہ ہو تو غالب عادت یہی ہے کہ یہ نماز مقام کے پاس ہی ادا کی جاوے جیسا کہ (ربائب کا حجور (گود) میں ہونا غالب ہے ضروری نہیں واللہ اعلم۔

علامہ بغوی ؒ نے نقل کیا ہے کہ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑ دیا اور اس قصہ پر ایک مدت گزر گئی اور وہاں جرہمی لوگ آئے اور اسماعیل علیہ السلام نے ایک جرہمیہ عورت سے نکاح کر لیا۔ ایک روز ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بی بی سارہ علیہ السلام سے ہاجرہ کے پاس آنے کی اجازت چاہی انہوں نے اجازت دیدی لیکن یہ شرط کر لی کہ وہاں اتریں نہیں ابراہیم علیہ السلام مکہ تشریف لائے اس وقت ہاجرہ علیہا السلام کی وفات ہو گئی تھی آپ اسماعیل علیہ السلام کے گھر پر تشریف لائے اور حضرت اسماعیل کی بیوی سے دریافت کیا تمہارے خاوند کہاں ہیں۔ اس نے کہا شکار کو گئے ہیں اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کی شئے بھی ہے۔ اس نے کہا میرے پاس کچھ نہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان کے گزران کا حال دریافت فرمایا۔ اس عورت نے کہا کہ ہم تو بڑی تنگی اور سختی میں ہیں اور بہت شکایت کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے سن کر فرمایا جب تمہارا خاوند آوے تو میری طرف سے سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی دہلیز بدل دے یہ کہہ کر ابراہیم علیہ السلام چل دیئے۔ جب اسماعیل علیہ السلام شکار سے آئے تو باپ کی خوشبو معلوم ہوئی۔ اپنی بیوی سے پوچھا کیا یہاں کوئی آیا تھا۔ اس نے مری سی زبان سے کہا کہ ہاں ایک بڈھا ایسی ایسی صورت کا آیا تھا اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا کیا انہوں نے کچھ فرمایا، جو کچھ ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا اس نے کہہ دیا اسماعیل علیہ السلام نے کہا وہ میرے پدر بزرگوار تھے اور تجھ سے علیحدہ ہونے کا حکم فرما گئے ہیں اس لئے اب تو اپنے گھر جا میں نے تجھے طلاق دی پھر آپ نے اسی قوم میں سے ایک دوسری عورت سے نکاح کر لیا ایک مدت کے بعد ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ سے اجازت لے کر پھر تشریف لائے اسماعیل علیہ السلام اس وقت بھی گھر پر موجود نہ تھے اس نئی زوجہ سے پوچھا کہ تمہارا خاوند کہاں ہے کہا شکار کے لئے گئے ہیں اور اب انشاء اللہ تعالیٰ آرہے ہوں گے آپ تشریف رکھئے ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا کہ کچھ کھانے پینے کی چیز بھی تمہارے پاس ہے کہا ہاں بہت اسی وقت دودھ اور گوشت لائی۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان کی گزران کا حال دریافت فرمایا اس عورت نے کہا بفضل خدا ہم خوب فراخی میں ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں میاں بیوی کے لئے دعائے برکت فرمائی اگر وہ اس وقت گیہوں یا جو کی روٹی یا کھجوریں ابراہیم علیہ السلام کے سامنے پیش کرتی تو آپ کی دعا کی برکت سے زمین میں گیہوں، جو، کھجوریں بہت ہو جاتیں۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ نے عرض کیا کہ آپ سواری سے نیچے تشریف لائیے۔ میں آپ کا سر مبارک دھودوں لیکن آپ نہ اترے وہ فوراً ایک پتھر (یعنی مقام ابراہیم) لائی اور اس کو دائیں طرف رکھا ابراہیم علیہ السلام نے اس پر اپنا قدم مبارک رکھا اس نے سر کے دائیں جانب دھویا پھر پتھر کو بائیں طرف رکھا آپ نے اس طرف جھک کر بائیں جانب دھویا اس پتھر پر آپ کے قدم مبارک کا نشان ہو گیا۔ پھر چلتے وقت فرمایا کہ جب تمہارا خاوند آئے تو میری طرف سے سلام کہنا اور کہہ دینا کہ تمہارے دروازے کی چوکھٹ اب خوب درست ہے اسے نہ اکھاڑنا۔ جب اسماعیل علیہ السلام گھر تشریف لائے تو باپ کی خوشبو معلوم کر کے پوچھا کوئی یہاں آیا تھا زوجہ نے عرض کیا ہاں ایک ضعیف سے آدمی بڑے خوبصورت اور بڑی خوشبو والے آئے تھے اور مجھ سے یہ یہ باتیں ہوئیں اور میں

marfat.com

نے ان کا سر دھویا اور دیکھئے اس پتھر پر ان کے قدم کا نشان ہو گیا۔ اسماعیل علیہ السلام نے سن کر فرمایا وہ ابراہیم علیہ السلام میرے باپ تھے اور چوکھٹ سے مراد تو ہے یہ فرما گئے کہ اسے اپنے پاس رکھو۔

پھر چند روز کے بعد ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے اس وقت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک درخت کے نیچے تیر تراش رہے تھے، باپ کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور آداب بجالائے انہوں نے دعائے خیر کی پھر ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اسماعیل علیہ السلام مجھے اللہ نے ایک بات کا حکم دیا ہے تو میری اس میں اعانت کیجو اسماعیل علیہ السلام نے عرض کیا میں ضرور امداد کروں گا ارشاد ہو فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک گھر بنانے کا حکم دیا ہے یہ کہہ کر ابراہیم علیہ السلام مستعد ہو گئے اور خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھائیں اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام بناتے تھے جب دیواریں بلند ہو گئیں تو اس پتھر یعنی مقام ابراہیم علیہ السلام کو لائے ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے اور اسماعیل علیہ السلام بدستور پتھر پکڑاتے اور رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ پڑھتے جاتے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رکن اور مقام جنت کے یاقوتوں میں سے دو یاقوت ہیں۔ اس حدیث کو امام مالک نے انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رکن اور مقام یہ دونوں جنت کے یاقوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نور کو سلب کر دیا ہے اور اگر ان کا نور رہتا تو یہ مشرق سے مغرب تک کو روشن کر دیتے۔ بزرگان دین یہاں سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ جس جگہ اولیاء اللہ میں سے کوئی شخص ایک مدت تک رہے وہاں آسمان سے تبرکات اور سکینہ اترتی ہے اور اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی طرف دل کھنچتے ہیں اور وہاں نیک کام پر جیسے اجر زیادہ ملتا ہے ویسے ہی وہاں گناہ کرنے پر عذاب بھی دگنا لکھا جاتا ہے۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ　(اور کہہ دیا ہم نے ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام سے) یعنی ہم نے ان دونوں کو حکم دیا اور ان کو نصیحت کی۔

اَنْ طَهِّرَا　(کہ پاک صاف رکھو) یہاں یا تو باء جارہ مقدر ہے اور یا اَنْ کو مفسرہ کہا جاوے کیونکہ عهد بمعنی قول ہے۔

بَيْتِيَ　(میرے گھر کو) اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو اپنی ذات پاک کی طرف اس کی فضیلت دینے کو نسبت فرمادیا ورنہ حق تعالیٰ ظاہر ہے کہ مکان سے پاک ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس گھر کو طہارت اور توحید پر بناؤ اور سعید بن جبیر اور عطاء نے فرمایا اس کے یہ معنی ہیں کہ بتوں اور جھوٹ اور بری باتوں سے اسے پاک رکھو اور بعض مفسرین نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ اس میں خوشبو جلاؤ اور خوب پاک صاف رکھو۔ نافع ھشام اور حفص نے یہاں اور سورۂ حج میں اور حفص نے سورۂ نوح میں بھی بیتی کی یا کو فتح سے پڑھا ہے۔

لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾　(طواف کرنے والوں اور مجاہدہ کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے) یعنی جو لوگ وہاں مقیم ہیں یا جو اس میں اعتکاف کرنے والے ہیں اور الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ جمع ہے راکع اور ساجد کی اس سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا　(اور (یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا کہ خداوندا اس (شہر) کو امن کا شہر) یعنی امن والا جیسے عیشة راضية پسندیدہ زندگی یا یہ معنی کہ جو اس مکان میں آجائے وہ امن میں ہو جاتا ہے جیسے لیل نائم (رات سونے والی) یعنی رات میں سونے والا۔

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ　(اور عطا فرما اس میں رہنے والوں کو پھل) پھلوں کی دعا ابراہیم علیہ السلام نے اس لئے فرمائی کہ مکہ ایسی جگہ ہے کہ وہاں زراعت وغیرہ کچھ نہیں خشکی کا ملک ہے۔ منقول ہے کہ طائف جو مکہ معظمہ سے کچھ دور ہے شام کے شہروں میں سے تھا جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تو جبرئیل علیہ السلام نے بامر الٰہی اسے وہاں سے اکھاڑ کر مکہ معظمہ کے پاس لاکر قائم کر دیا اسی واسطے اس میں پھل بکثرت ہوتے ہیں اور مکہ میں آتے ہیں۔

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ　(ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لاویں خدا پر اور روز

marfat.com

آخرت پر) اَهْلَهٗ سے بدل البعض ہے دعا میں مؤمنین کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ مبادا یہ دعا کافروں کے لئے کفر پر اعانت نہ ہو۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ (فرمایا اور جو کفر کریں) وَمَنْ كَفَرَ کا عطف مَنْ اٰمَنَ پر ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے وارزق من کفر (یعنی میں کافروں کو بھی دونگا) اور یہاں کلام تمام ہو گیا۔ اس آیت میں تنبیہ اس امر پر ہے کہ رزق جو رحمت دنیویہ ہے اس میں مؤمن و کافر دونوں شامل ہیں اسی واسطے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں رحمٰن الدنیا و رحیم الاٰخرة آیا ہے بخلاف نبوت اور دینی پیشوائی کے کہ یہ رحمت مؤمنین ہی کے حصے میں ہے یا مَنْ كَفَرَ مبتدا اور معنی شرط کو شامل ہے اور فَاُمَتِّعُهٗ خبر ہے۔

فَاُمَتِّعُهٗ (ان کو بھی فائدہ اٹھانے دوں گا) ابن عامر نے فَاُمْتِعُهٗ کو تخفیف کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے مشدّد پڑھا ہے اور معنی دونوں کے ایک ہیں۔

قَلِيْلًا (تھوڑے دنوں) قلیلاً یا تو معفول مطلق محذوف ہے یعنی متاعاً قلیلاً (دنیا کا فائدہ تھوڑا) اس صورت میں یا تو یہ معنی ہیں کہ دنیا کا نفع آخرت کے اعتبار سے کم ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اور یا یہ مطلب کہ اللہ کے نزدیک یہ متاع کچھ بھی نہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک اگر دنیا کی ایک مچھر کے پر کی برابر بھی قدر ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔ اس حدیث کو ترمذی نے سہل بن سعد سے روایت کیا ہے اور یا قلیلاً کے یہ معنی کہ ہم ان کو تھوڑے دنوں یعنی ان کی موت تک نفع دیں گے۔ اگر کوئی شبہ کرے کہ شرط و جزا میں تو یہ علاقہ ہوتا ہے کہ شرط جزا کا سبب ہوتی ہے اور یہاں کفر سبب تمتع کا نہیں پھر خبر پر فاء کیوں لائے۔ جواب یہ ہے کہ کفر اگرچہ تمتع کا سبب نہیں لکن تمتع کے کم ہونے کا باعث ہے کیونکہ کافر اپنے کفر کی وجہ سے دنیا ہی کی نعمتوں میں رہتا اور آخرت کے درجات سے نامراد رہتا ہے اور یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ دنیا کے متاع اللہ کے نزدیک ملعون اور خبیث ہیں اس لئے ممکن ہے کہ کفر اس کے حاصل ہونے کا سبب ہو چنانچہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ وَزُخْرُفًا وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (یعنی اگر یہ احتمال نہ ہوتا کہ تمام لوگ ایک ہی دین پر ہو جائیں گے تو ہم ضرور بنادیتے ان کے لئے جو منکر ہیں رحمٰن کے، ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں کہ ان پر چڑھا کرتے اور ان کے گھروں کے دروازے (بھی چاندی کے بنادیتے) اور تخت کہ ان پر تکیے لگا کر بیٹھے اور یہ سب کا سب کچھ نہیں مگر دنیا کی زندگانی کا فائدہ ہے اور آخرت تیرے پروردگار کے ہاں پرہیزگاروں کے لئے ہے) خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ کفر کا مقتضی اصلی دنیا کی زندگی کا فائدہ ہے اگر لوگوں کے ایک دین پر ہو جانے کا احتمال نہ ہوتا تو کفر تو اس کو چاہتا ہے کہ ان کے گھر اور دروازے اور تخت سونے چاندی کے ہوں اور جناب رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ذکر اللہ اور اس کے متعلقات اور عالم اور متعلم کے سوا ہے وہ بھی ملعون ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور طبرانی نے بسند صحیح اوسط میں بھی روایت کیا ہے اور کبیر میں بھی بسند صحیح ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں یہ ہے کہ سوائے ان چیزوں کے جس سے اللہ کی رضامندی طلب کی جاوے سب ملعون ہے۔

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ (پھر اس کو مجبور کروں گا دوزخ کے عذاب کی طرف اور وہ برا ٹھکانا ہے) اس کا امتعه پر عطف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفر اور متاع کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کے سبب میں اس کو مجبور کی طرح دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا۔ بِئْسَ کا مخصوص بالذم لفظ عذاب محذوف ہے۔ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ مقام کے پاس یہ مضمون لکھا پایا کہ میں اللہ مکہ کا مالک ہوں جس دن میں نے چاند سورج پیدا کئے اسی دن مکہ کو بھی پیدا کیا اور آسمان و زمین کے پیدا ہونے کے دن سے میں نے اس کو حرمت والا بنایا ہے اور سات فرشتوں کے ذریعہ سے میں نے اس کی حفاظت کی ہے اور اس میں تین راہ سے رزق آتا ہے اور یہاں گوشت اور پانی میں برکت رکھی گئی ہے۔

marfat.com

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ اور (وہ وقت یاد کرو) جب اٹھارہے تھے ابراہیم بنیادیں خانہ کعبہ کی یَرْفَعُ گزشتہ حال کی حکایت ہے۔ قواعد جمع ہے قاعدہ کی جس کے معنی بنیاد کے ہیں۔ قواعد صفات غالبہ سے ہے۔ قعود کو ثبات کے معنی میں مجازاً لے کر اس سے قواعد کو مشتق کیا ہے اور بنیادوں کو اٹھانے سے مراد ہے تعمیر کرنا۔ کسائی نے کہا ہے کہ قواعد کے معنی دیواروں کے ہیں کیونکہ ہر دیوار اپنے مافوق کا قاعدہ ہوتی ہے اور اس کا اٹھانا تعمیر کرنا ہے۔

وَاِسْمٰعِیْلُ ط اور اسماعیل) اس کا ابراہیم پر عطف ہے اور مفعول کو مقدم لا کر فاصلہ اس لئے کر دیا کہ تعمیر کرنے والے تو صرف ابراہیم علیہ السلام ہی تھے اس واسطے اول ان کا ذکر فرمایا اور اسماعیل علیہ السلام پتھر پکڑاتے تھے اس لئے ان کو بھی تعمیر میں دخل ہوا اور اس لئے فاصلہ لا کر عطف فرمایا۔

علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے منقول ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زمین کے پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے بیت اللہ کا مقام پیدا فرما دیا تھا اور وہ مقام ایک سفید جھاگ پانی پر قائم تھا پھر زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو انہیں بڑی وحشت ہوئی اللہ تعالیٰ سے عرض کیا حق تعالیٰ نے جنت کے یاقوت کا بنا ہوا بیت المعمور اتارا اس کے دروازے زمرد کے تھے ایک دروازہ شرقی اور ایک غربی اور اس کو بیت اللہ کے مقام پر رکھ دیا اور حکم ہوا آدم علیہ السلام ہم نے تمہارے لئے یہ گھر اتارا ہے اس کا تم ایسے ہی طواف کرو جیسے عرش کے گرد کرتے تھے اور اس کے پاس اسی طرح نماز پڑھو جس طرح میرے عرش کے پاس پڑھتے تھے اور حجر اسود بھی اتارا اور اس وقت یہ پتھر روشن سفید تھا پھر جاہلیت میں حائضہ عورتوں کے چھونے سے کالا ہو گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام یہ حکم سنتے ہی ہند سے مکہ کو پاپیادہ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کے ذریعہ سے انہیں بیت اللہ کا رستہ بتایا انہوں نے مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا حج کیا اور تمام طریقے حج کے ادا کئے جب حج سے فارغ ہوئے تو فرشتوں نے کہا آدم علیہ السلام تمہارا حج مقبول ہوا اور ہم اس گھر کا آپ سے دو ہزار برس پہلے حج کر چکے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہند سے مکہ تک پیادہ چل کر چالیس حج کئے۔ القصہ طوفان نوح تک بیت المعمور اسی طرح قائم رہا جب طوفان واقع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو چوتھے آسمان پر اٹھا لیا اب ہر دن اس میں ستر ہزار فرشتے زیارت کے لئے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر نہیں آتے، دوسرے دن اور ستر ہزار آتے ہیں اسی طرح ہمیشہ آتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ حجر اسود کو کوہ ابو قبیس میں چھپا دے تاکہ طوفان میں غرق ہونے سے محفوظ ہو جائے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک بیت اللہ کی جگہ بالکل خالی رہی پھر جب اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام پیدا ہوئے تو حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ بنانے کا حکم فرمایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ وہ جگہ مجھے بتا دے جہاں تعمیر کرنے کا حکم ہے اللہ تعالیٰ نے سکینہ بھیجی کہ اس نے بیت اللہ کی جگہ بتائی اور سکینہ ایک تند ہوا تھی کہ اس کے سانپ کی طرح دو سر تھے اور ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جس جگہ یہ سکینہ قائم ہو جائے وہاں خانہ کعبہ بناؤ۔ ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے ہو لئے جس جگہ اس وقت بیت اللہ ہے وہاں آ کر سکینہ مثل ڈھال کے بیٹھ گئی پھر وہاں ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ بنایا۔ یہ علی اور حسن کا قول ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی برابر ایک بدلی بھیجی وہ چلتی تھی اور ابراہیم علیہ السلام اس کے سایہ میں چلتے تھے حتیٰ کہ وہ بدلی خانہ کعبہ کی جگہ آ کر ٹھہر گئی اور ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بلا کمی وبیشی کے اس کے سایہ میں تعمیر کرو۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے بامر الٰہی بیت اللہ کا مقام ابراہیم علیہ السلام کو بتایا آیت کریمہ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ الآیہ کے یہی معنی ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کو پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بنایا۔ طور سینا، طور زیتا، لبنان جو ملک شام کا پہاڑ ہے اور جودی جو جزیرہ میں ایک پہاڑ ہے اور بنیادیں کوہ حراء سے بنائیں اور کوہ حراء مکہ میں

marfat.com

ہے، جب حجر اسود کی جگہ تعمیر کو پہنچی تو ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ یہاں کوئی خوبصورت سا پتھر لگانا چاہئے تاکہ لوگوں کے واسطے ایک علامت ہو جاوے۔ اسمعیلؑ ایک خوب صورت پتھر لائے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اس سے بھی عمدہ پتھر لاؤ، اسماعیل علیہ السلام پھر تشریف لے گئے تو کوہ ابو قبیس نے چلا کر کہا کہ آپ کی ایک امانت میرے پاس موجود ہے اسے لیجئے۔ اسماعیل علیہ السلام نے حجر اسود وہاں سے لے لیا اور اس کی جگہ قائم کر دیا اور بعض نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان میں ایک گھر بیت المعمور بنایا اور اس کا نام ضراح رکھا اور ملائکہ کو حکم فرمایا کہ اس کے مقابلے میں اسی کے انداز کے موافق خانہ کعبہ بناؤ اور بعض کا قول ہے کہ اول کعبہ آدم علیہ السلام نے بنایا وہ طوفان سے بالکل مٹ گیا پھر ابراہیم علیہ السلام کے لئے وہ بر آمد کیا گیا جس پر ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کی۔ واللہ اعلم۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾ دعا کرتے جاتے تھے کہ (اے ہمارے پروردگار ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے) یعنی اے اللہ تو ہماری دعا کو سننے والا اور ہماری نیتوں کو جاننے والا ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ (اور اے ہمارے پروردگار ہم کو بنا اپنا فرمانبردار) یعنی اے اللہ ہم کو اپنے تمام حکموں کا خالص فرمانبردار بنادے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقی مسلمان وہ ہے کہ جس سے کوئی معصیت صادر نہ ہو اور دوسرے لوگ اس کی ایذاء سے بچے ہوئے ہوں۔ اسلام حقیقی سے ایسا ہی اسلام مراد ہے اور یہ درجہ بعد اطمینان نفس کے نصیب ہوتا ہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ۠ (اور ہماری نسل میں بھی ایک گروہ فرمانبردار پیدا کر) مِنْ تبعیضیہ ہے۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے اپنی اولاد کے واسطے شفقت کی وجہ سے دعا فرمائی اور سب کے لئے اس لئے دعا نہ کی کہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بعض ان میں سے کفار بھی ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِن بیانیہ ہو۔

وَأَرِنَا (اور ہم کو بتا) اصل میں أَرْإِنَا بروزن اکفنا ہے۔ ابن کثیر اور ابو شعیب نے أَرْنَا اور أَرْنِی کی را کو جہاں کہیں ہوں ساکن اور ہمزہ کو مع حرکت حذف کر کے پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو نے اختلاس سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کو حذف کر کے اور اس کی تمام حرکت رکو دے کر پڑھا ہے۔

مَنَاسِكَنَا (ہماری عبادت کے طریقے) مَنَاسِکَ سے مراد دین کے احکام اور حج کے ارکان ہیں۔ نسک کے اصل معنی ہیں خوب عبادت کرنا پھر اس سے حج کے ارکان اس وجہ سے مراد لینے لگے کہ حج میں بھی اکثر کلفت اور مشقت ہوتی ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہما السلام عرفات میں پہنچے تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا اے ابراہیم علیہ السلام آپ نے سب مناسک پہچان لئے، فرمایا ہاں پہچان لئے، اسی دن سے اس مقام اور اس دن کا نام عرفہ ہو گیا۔

وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ (اور توبہ قبول کیجئے ہماری) اگرچہ خود ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہما السلام بوجہ پیغمبر ہونے کے گناہوں سے معصوم تھے لیکن اس کے باوجود بطور تواضع اور امت کی تعلیم کے لئے یہ دعا فرمائی۔

إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾ (بے شک تو ہی معاف کرنے والا مہربان ہے) یعنی اس کے لئے جو تیری طرف رجوع کرے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ (اور اے رب ہمارے بھیج ان میں ایک پیغمبر ان ہی میں کا) اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو بھی قبول فرمایا اور جناب رسول اللہ ﷺ کو اپنی رحمت کاملہ سے نبی بنا کر بھیجا۔ عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام ہنوز آب و گل کے درمیان تھے مگر میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین تھا۔ میں تمہیں اپنی شروع کی حالت بتاؤں، میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں جو کہ میری پیدائش کے وقت میری ماں نے دیکھا تھا کہ مجھ سے ایک ایسا نور نکلا ہے کہ اس کی روشنی سے شام کے

marfat.com

محل روشن ہو گئے۔ اس حدیث کو علامہ بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے اور امام احمد نے ابوامامہ سے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ (کہ پڑھے ان پر تیری آیتیں) آیات سے مراد توحید اور نبوت کی آیات ہیں۔

وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ (اور ان کو سکھاوے کتاب اور علم) حکمت سے مراد یا تو معارف اور احکام ہیں یا سنت۔ بعض نے کہا ہے کہ قضا مراد ہے بعض نے فقہ کہا ہے۔

وَ یُزَکِّیۡہِمۡ (اور پاک و صاف بنادے ان کو) یعنی شرک اور گناہوں سے ان کو پاک کردے اور بعض نے وُیزَکِّیھِمۡ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ مالوں کی زکوۃ لے اور ابن کیسان نے کہا ہے وُیزَکِّیھِمۡ کے یہ معنی ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کے عدم فسق کی شہادت دے۔

اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ (بے شک تو ہی زبردست) حضرت ابن عباسؓ نے تفسیر میں کہا ہے کہ عزیز اسے کہتے ہیں جس کا کوئی مثل نہ ہو اور کلبی نے عزیز کی منتقم سے تفسیر کی ہے اور بعض نے کہا عزیز اسے کہتے ہیں کہ جس پر کسی کا قابو نہ چلے اور بعض نے کہا عزیز اس غالب کو کہتے ہیں جس پر کوئی غالب نہ ہو۔

۱۵ ع ۸ ۱۵ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾ (صاحب تدبیر ہے) یعنی حکمت بالغہ والا ہے، واللہ اعلم۔ ابن عساکر نے کہا ہے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے سلمہ اور مہاجر اپنے بھتیجوں سے کہا تم مسلمان ہو جاؤ، تم خوب جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے کہ میں اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک نبی پیدا کروں گا اور نام پاک ان کا احمد ﷺ ہو گا جو ان پر ایمان لائے گا وہ ہدایت پاویگا اور جو ایمان نہ لاویگا وہ ملعون ہو گا۔ سلمہ تو چچا کی یہ نصیحت سن کر مسلمان ہو گیا اور مہاجر نے صاف انکار کر دیا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

وَ مَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ (اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا) یعنی ملت ابراہیمی کا حق ہونا نہایت واضح ہے، ایسا کون ہے جو اس طریقہ سے پھرے۔ رغبت کے بعد جب اِلیٰ آتا ہے تو اس سے مراد ارادہ ہوتا ہے اور جو عن آتا ہے تو اعراض کے معنوں میں آتا ہے۔

اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ (مگر وہی شخص جس نے بے وقوف بنایا اپنے آپ کو) سفہ کے اصل معنی ہیں خفت یعنی سُبکی۔ جو شخص بغیر نفع نقصان سوچے اپنی خواہشات کو پورا کیا کرتا ہے اسے خفیف اور سفیہ کہتے ہیں اور اس کی ضد حلیم ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے سفہ کی اسناد خود کسی شخص کی ذات کی طرف بھی کی جاتی ہے اور اس کی رائے کی جانب بھی چنانچہ بولتے ہیں سَفِہَ زید فی نفسہ وفی رأیہ (زید اپنی ذات اور اپنی رائے کے اعتبار سے بے وقوف بنا) اور جب سفاہت یعنی بیوقوفی اور سبکی سے کسی موقع پر بے حرمتی اور اہانت یا ہلاکت لازم آجاوے اور رائے کی خفت جہالت کو مستلزم ہو جاوے تو لفظ سفہ اس وقت اہانت یا ہلاک کرنے یا جہل کے معنی میں مستعار لے لیا جاتا ہے، چنانچہ سَفِہَ نَفۡسَہٗ کے یہ معنی کہ اس نے اپنے نفس کی آپ اہانت کی یا ہلاک کر دیا اس کو یا انجان رہا، اس صورت میں سفہ کے بعد مفعول آئے گا اور یا یوں کہا جاوے کہ ان صورتوں میں سفہ اہانت اور ہلاک کرنے اور جہل کے معنی کو متضمن ہو جائے گا اسی واسطے اِلَّا من سَفِہَ نَفۡسَہٗ کی تفسیر میں بعض نے کہا کہ سَفِہَ نَفۡسَہٗ کے یہ معنی ہیں کہ نفس کو ذلیل بنا دیا اس واسطے کہ اپنے خالق کا انکار کیا اور اپنے جیسی مخلوق کی عبادت کی اور ابو عبیدہ نے کہا سفہ نفسہ کے معنی ہیں ہلاک کر دیا اپنے نفس کو اور اخفش نے کہا کہ سَفِہَ نَفۡسَہٗ اصل میں سَفِہَ فِیۡ نَفۡسِہٖ تھا فی کو بنزع حافض حذف کر دیا اور نفسہ کو نصب کر دیا اور فراء نے کہا سَفِہَ نَفۡسَہٗ اصل میں نفسہ کے رفع سے تھا جب فعل کی نسبت صاحب نفس کی طرف کر دی گئی تو نفسہ کو تمیز ہونے کے سبب سے نصب دیدیا گیا جیسا کہ بجائے ضاق زرعی (میں تنگ دل ہوا) اور طابَ نفسُ زیدٍ کے (زید کا نفس اچھا ہے) ضقت بہ ذرعا وطاب زیدٌ نفسا بولتے ہیں اور ابن کیسان اور زجاج نے کہا کہ سَفِہَ نَفۡسَہٗ کے معنی ہیں انجان بنا اپنے نفس سے کیونکہ جس نے غیر اللہ کی

marfat.com

عبادت کی اس نے اپنے نفس کو نہ جانا اور نفس کو نہ جانا تو خالق کو نہیں پہچانا مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ مسلم ہے۔ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

میں کہتا ہوں کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے یہ معنی ہیں کہ جس نے اپنے نفس کی حقیقت جان لی کہ یہ ایک ممکن شئے ہے خود بالذات وجود کو مقتضی نہیں فی نفسہ اس کا وجود اور قیام اور بقا متصور نہیں اور اس کی ذات پر اس کا حمل اولی نہیں ہو سکتا مثلاً نا ممکن ہے کہ زید بذات خود زید ہو جو کچھ اس کا وجود اور بقا اور قیام نظر آتا ہے یہ اسی وقت ہے جب کہ اس کو واجب الوجود قائم بالذات قیوم کا فیض قرار دیں۔ وہ ذات پاک سب اشیاء کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے عکس کے مقابلہ میں اصل وہ تمام آسمانوں اور زمین کا نور ہے، سب چیزوں سے حتیٰ کہ ان کی ذات سے بھی زیادہ نزدیک ہے کیونکہ ان اشیاء کو بغیر اس کی طرف نسبت کئے ہوئے ان کی ذات پر محمول نہیں کر سکتے ایسے شخص کو ضرور حق تعالیٰ شانہ کی معرفت نصیب ہو جاویگی اور جو اپنے نفس کی اس حقیقت سے ناواقف رہا اسے اپنے پروردگار کی معرفت بھی نصیب نہ ہو گی۔

منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد علیہ السلام کو وحی فرمائی داوٗد! اپنے نفس کو پہچان پھر تو مجھ کو پہچان لے گا۔ داوٗد علیہ السلام نے عرض کیا پروردگار اپنے آپ کو کیونکر پہچانوں اور آپ کو کس طرح؟ حکم ہوا اپنے نفس کو اس طرح پہچانو کہ اپنا عجز اور فنا اور ضعف پیش نظر کر لو اور ہم کو اس طرح جانو کہ ہماری قدرت اور بقاء اور قوت ملاحظہ کرو۔ جاننا چاہئے کہ اگر کسی نسبت کلامیہ کا یقینی علم اور نا قابل شک اعتقاد ہو تو (شرعی اصطلاح میں) اسے علم کہتے ہیں اور جہل اس کی ضد ہے اور جہل اپنی ضد یعنی علم کی طرح دو مفعول چاہتا ہے۔ علم کے حاصل ہونے کے چند اسباب ہیں، کبھی تو علم کسی شئے کا اس شئے کے بدیہی یعنی غیر خفی ہونے کے سبب سے ہوتا ہے، کبھی استدلال سے، کبھی وحی سے اور کسی وقت الہام سے اور علم کی ضد یعنی جہل جو کہ عدم اصلی ہے ان اشیاء کے نہ ہونے کا نام ہے اور معرفت صرف مفعول واحد کو مقتضی ہے، معرفت کا اطلاق صرف تصورات پر ہوتا ہے اور معرفت کسی شئے کی کبھی اس کے بدیہی ہونے سے حاصل ہوتی اور کبھی صاحب دلوں کو حق تعالیٰ کی دی ہوئی بصیرت سے نصیب ہو جاتی ہے اور جہل جس طرح علم کی ضد ہے اسی طرح معرفت کی بھی ضد ہے۔ اس مقام پر سفہ سے وہ جہل مراد ہے جو معرفت کی ضد ہے کیونکہ ایک مفعول کی طرف اس کا تعدیہ ہو رہا ہے اس تقریر کے موافق سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی یہ ہوئے کہ اپنے نفس کو بصیرت سے نہیں پہچانا۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ (اور بے شک ہم نے دنیا میں اس کا انتخاب کر لیا) یعنی خلیل کے معزز خطاب سے مشرف فرمایا۔

وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿۱۳۰﴾ (اور بے شک ابراہیم علیہ السلام آخرت میں نیکوکار انبیاء میں سے ہوں گے) صلاح فساد کی ضد ہے اور بگاڑ معاصی سے ہوتا ہے، خواہ معاصی قلب سے متعلق ہوں یا اعضاء سے۔ اس بنا پر صلاح عصمت سے حاصل ہو گی اور جس قدر عصمت میں کمی ہو گی صلاح میں بھی نقصان ہو گا اور آیت میں صلاح کامل مراد ہے یہ آیت گویا ما قبل کی دلیل اور حجت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس شخص میں اس قدر صفات موجود ہوں اس کی اتباع اور اطاعت سے سوائے جاہل بے وقوف سر تاپا حماقت کے کوئی سر تابی نہ کرے گا۔

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ (جب ان سے کہا ان کے پروردگار نے حکم بردار بن جا)

عطاء نے فرمایا ہے کہ اَسْلِمْ کے یہ معنی ہیں کہ اپنے تمام کام اور نفس حق تعالیٰ کو سونپ دو۔ اور کلبی نے اَسْلِمْ کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ اپنے دین اور عبادت کو اخلاص کی زینت سے مزین کرو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہ خطاب اس وقت فرمایا تھا جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام غار سے نکلے تھی۔ اذقال یا تو اصْطَفَيْنَا کے متعلق اور اس کی علت ہے اور یا بتقدیر اذکر منصوب ہے۔ صورت اخیرہ میں حاصل یہ ہو گا کہ اس وقت کو یاد کرو جب حق تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا" تاکہ تمہیں معلوم ہو جاوے کہ ابراہیم (علیہ السلام) ہمارا برگزیدہ بندہ تھا"۔

marfat.com

قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں (عرض کیا میں نے اپنے تمام کام عالم کے ملک کے سپرد کردیئے) بس آپ کی اس تسلیم کا یہ ثمرہ ہوا کہ جب نمرود مردود نے آپ کی مشکیں باندھ کر بذریعہ منجنیق آگ میں پھینکا تو فوراً جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا تمہیں کچھ حاجت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تمہاری تو حاجت نہیں۔ کہا پھر اللہ سے سوال کرو۔ فرمایا میرا حال اسے خوب معلوم ہے۔ مجھے سوال کی حاجت نہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کی اس تفویض اور تسلیم کی برکت سے اس آتش کدہ کو گلزار بنادیا اور اس آگ نے بجز ان کے ہاتھ پاؤں کی بیڑیوں کے بال برابر بھی نہ جلایا۔

وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ (اور اسی کی وصیت کر گئے ابراہیم) مدینہ اور شام کے قراء نے ووصّٰی کو وَاَوۡصٰی باب افعال سے پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں اسی طرح درج ہے اور باقی قراء نے وَوَصّٰی پڑھا ہے جس فعل میں بھلائی اور ثواب ہو اسے دوسرے کے سامنے پیش کرنے کو وصیت کرنا کہتے ہیں۔ اصل لغت میں توصیۃٌ کے معنی ہیں وصل یعنی ملانا اور وصیت کرنے میں ملانے کے معنی اس طرح ہیں کہ گویا موصی (وصیت کرنے والا) اپنے فعل کو موصی (وصیت کیا گیا) کے فعل سے ملاتا ہے بہا کی ضمیر یا تو ملت کی طرف اور یا بتاویل کلمہ اسلمت کی طرف راجع ہے۔

بَنِیۡهِ (اپنے بیٹوں کو) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے، اسماعیل علیہ السلام ان کی والدہ تو ہاجرہ قبطیہ تھیں اور اسحاق علیہ السلام کی والدہ سارہ تھیں اور باقی چھ فرزندوں کی والدہ قنطورا کنعانیہ دختر یقطن تھیں۔ حضرت سارہ کی وفات کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے انہی سے نکاح کیا تھا۔ وَيَعۡقُوۡبُ (اور یعقوب نے بھی) اس کا عطف ابراھیم پر ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آٹھ بیٹوں کو وصیت کی تھی اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بارہ بیٹوں کو یہی سمجھایا تھا۔

يٰبَنِىَّ (کہ اے بیٹو) اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَـكُمُ الدِّيۡنَ (تمہیں اللہ نے چن کر دین عطا کیا ہے) الذین سے دین اسلام مراد ہے۔

فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ (سو تم مسلمان ہی ہو کر مرنا) یعنی ایسی حالت میں مرنا کہ خالص مومن ہو اور اپنے امور کو اللہ کے سپرد کرچکے ہو۔ بظاہر بغیر ایمان کے مرنے کی ممانعت فرمائی، مگر حقیقت میں یہ مراد نہیں ہے (کیونکہ نہی امر اختیاری سے ہوا کرتی ہے اور موت غیر اختیاری امر ہے) بلکہ مطلب یہ ہے کہ دیکھو ہوشیار رہو اسلام اور تفویض کو کسی وقت ہاتھ سے نہ دینا، مبادا کسی وقت اسلام کو چھوڑ بیٹھو اور اس وقت تم کو موت آجاوے تو ایسی موت میں کچھ خیر نہیں۔ گویا نہی واقع میں ترک اسلام سے ہے۔ یہود نے جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا آپ کو معلوم نہیں یعقوب علیہ السلام نے اپنے انتقال کے وقت اپنے بیٹوں کو یہودیت پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی اب تم اسی یہودیت سے ہمیں علیحدہ کرنا چاہتے ہو اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے یہ آیت ارشاد فرمائی۔

اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ (کیا تم موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا) حضر کے معنی موت قریب ہوئی ام کنتم میں ام منقطعہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اے یہودیو! جس طرح تم کہتے ہو اس طرح نہیں ہوا کیا تم وہاں موجود تھے یعنی موجود نہ تھے تو پھر کیوں ایسے بلا دلیل دعوے ہانکتے ہو۔ بعض مفسرین نے کہا ام کنتم میں مؤمنین کو خطاب ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس وقت تم وہاں موجود نہ تھے بلکہ یہ قصہ تم کو وحی سے معلوم ہوا ہے۔

اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ (جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا) یہ اِذۡ حضر سے بدل ہے۔

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ (تم لوگ میرے بعد کس چیز کی پرستش کرو گے) یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹوں سے یہ امر دریافت کرنے سے ان کو توحید اور اسلام پر پکا کرنا اور ان سے عہد لینا منظور تھا۔

عطاء نے فرمایا ہے کہ جب کسی پیغمبر کی موت قریب آتی ہے تو موت سے پہلے حق تعالیٰ انہیں زندگی اور موت میں

marfat.com

اختیار عطا فرماتا ہے کہ تمہیں اختیار ہے چاہے دنیا میں رہو یا عالم بقا میں چلو۔ حسب معمول جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ اختیار ملا تو عرض کیا خداوندا کچھ دیر کے لئے مجھے مہلت عطا فرمائیے تاکہ میں اپنے بیٹوں کو کچھ وصیت کر دوں۔ مہلت مل گئی اس وقت یعقوب علیہ السلام نے اپنے سب بیٹوں پوتوں کو جمع کر کے یہ وصیت فرمائی۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ (انہوں نے جواب دیا ہم اس کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیم اور اسماعیل و اسحاق علیہم السلام پرستش کرتے آئے ہیں) ابراہیم و اسماعیل و اسحاق، 'اٰبائک سے عطف بیان ہے اور اسماعیل علیہ السلام اگرچہ ان کے چچا تھے لیکن عرب کے لوگ چچا کو بھی باپ ہی کہتے ہیں جیسے خالہ کو ماں کہہ دیتے ہیں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چچا آدمی کا اس کے باپ کی مثل ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے علی رضی اللہ عنہ سے اور طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ نیز جناب سرور کائنات ﷺ نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ میرے باپ کو میرے پاس لے آؤ۔ میں ڈرتا ہوں کہ قریش ان سے بھی وہی معاملہ نہ کریں جو ثقیف نے عروہ بن مسعودؓ سے کیا تھا (ثقیف نے عروہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تھا۔

اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ (یعنی وہی معبود جو واحد (لاشریک لہٗ) ہے) یہ الٰھک والٰہ 'ابائک کے مضاف سے بدل ہے۔ اگرچہ الٰھک والٰہ 'ابائک سے خود معلوم ہوتا تھا کہ معبود برحق مراد ہے لیکن اِلٰهًا وَّاحِدًا کی زیادتی سے توحید کی اور زیادہ تصریح ہو گئی اور نیز مضاف کو عطف کے تعذر کی وجہ سے جو مکرر کیا گیا ہے اس سے وہم ہوتا تھا کہ یعقوب علیہ السلام کا الٰہ اور ہے اور آباؤ اجداد کا الٰہ دوسرا ہے اِلٰهًا وَّاحِدًا سے اس وہم کو بھی دفع فرما دیا اور یا اِلٰهًا وَّاحِدًا نرید مقدر کا مفعول ہے مطلب یہ ہو گا کہ ہم اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ سے الٰہ واحد مراد لیتے ہیں۔

وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳ (اور ہم اسی کی اطاعت پر رہیں گے) یا تو نعبد کے فاعل یا مفعول اور یا دونوں سے حال ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ معترضہ ہو۔

(وہ ایک جماعت تھی) اس سے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد علیہم السلام مراد ہے امت اصل میں مقصود کو بولتے ہیں، جماعت کو امت اس لئے کہنے لگے کہ جس جانب جماعت ہوتی ہے لوگ اسی کا قصد کرتے ہیں۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ (ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا) یعنی جب یہ امر مسلم ہے کہ جو جس نے کیا ہے وہی اس کے سامنے آئے گا تو پھر تم اے یہودیو اپنے آپ کو اس شرف نسبت کی وجہ سے ناجی اور رستگار سمجھتے ہو یہ سراسر حماقت ہے، یاد رکھو جب تک تم ان کی اطاعت نہ کرو گے وہ اور ان کی نیکیاں تمہارے کچھ کام نہ آئیں گی۔

وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۴ (اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ گچھ نہ ہو گی) بلکہ ہر شخص سے اس کے اعمال کی بازپرس ہو گی۔ ابن ابی حاتم نے بطریق سعید و عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابن صوریا نے جناب رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ہدایت تو یہی ہے جس پر ہم قائم ہیں تم بھی اتباع کرو تو ہدایت یاب ہو گے اور نصاری بھی اسی طرح اس سے پہلے کہہ چکے تھے۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مدینہ کے بڑے بڑے یہودی جیسے کعب بن اشرف اور مالک بن حنیف اور وہب بن یہودا اور ابی یاسر بن اخطب اور نجران کے نصاریٰ سب جمع ہوئے اور مسلمانوں سے دین کے بارے میں مناظرہ کیا ہر فرقہ اپنی حقانیت کا دعویٰ کرتا تھا چنانچہ یہود نے کہا ہمارے نبی موسیٰ علیہ السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں اور ہماری کتاب تورات تمام کتابوں سے اچھی ہے اور ہمارا دین تمام دینوں سے فائق ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل اور حضرت محمد ﷺ اور قرآن مجید کا کھلا انکار کیا اسی طرح نصاریٰ نے اپنے نبی اور اپنی کتاب اور اپنے دین کو افضل بتایا اور قرآن مجید اور دیگر کتب کا انکار کیا اور ہر فریق نے مسلمانوں سے کہا کہ تم ہمارے دین پر ہو جاؤ اس پر حق تعالیٰ نے یہ

marfat.com

آیت نازل فرمائی۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ) وَقَالوا میں ضمیر ھم سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى میں کلمہ او تنویع کے لئے ہے یعنی یہودیوں نے یہودیت کی طرف بلایا اور نصرانیوں نے نصرانیت کی ترغیب دی۔

تَهْتَدُوْا (تو راہ راست پر آجاؤ گے) یہ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ (آپ کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیم پر رہیں گے) یعنی ہم نہ یہودی ہیں نہ نصرانی، ہم تو ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کا اتباع کرنے والے ہیں یا یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہیں یا یہ معنی کی ملت ابراہیمی کا اتباع کرتے ہیں یا یہ مطلب کہ اے یہود و نصاری تم ملت ابراہیم کا اتباع کرو۔

حَنِیْفًا (کہ اس میں کجی کا نام نہیں) اصل میں حنف کسی طریق سے مڑنے اور علیحدہ ہونے کو کہتے ہیں اور حنیف کے معنی ہیں تمام دینوں سے مڑ کر اسلام کی طرف جھکنے والا۔ حنیفا یا تو مضاف یعنی ملت سے حال ہے اس وقت معنی یہ ہوں گے کہ ہم ایسی ملت پر ہیں کہ جو باطل سے علیحدہ ہونے والی ہے اور یا مضاف الیہ یعنی ابراہیم سے حال ہے اور کوفہ کے نحویوں کے نزدیک مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ منصوب علی القطع ہے یعنی اصل میں مِلَّةَ ابراهیم الحنیف تھا الحنیف سے الف ولام کو دور کر دیا اب نکرہ معرف کی صفت نہیں بن سکتا۔ اس لئے اس سے منقطع ہو کر منصوب ہو گیا۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۳۵ (اور نہ تھے ابراہیم مشرکین میں سے) یہ اہل کتاب پر تعریض ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور شرک میں بھی مبتلا ہیں۔

قُوْلُوْٓا (کہہ دو) یہ مؤمنین کو خطاب ہے۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا (ہم ایمان رکھتے ہیں خدا پر اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا) اس سے مراد قرآن مجید ہے، اسے اس لئے مقدم فرمایا کہ قرآن ہی اور کتابوں پر ایمان لانے کا سبب ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ (اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور اولاد یعقوب علیہم السلام کی طرف بھیجا گیا) اس سے دس صحیفے مراد ہیں جو ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔ ان ہی دس پر ان کی اولاد کا عمل در آمد رہا۔ اسی واسطے ان کے نزول کو اولاد کی طرف بھی منسوب فرمایا جیسا کہ قرآن پاک کا نزول جناب رسول اللہ ﷺ کی متابعت سے ہماری طرف بھی منسوب ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ قرآن ہم پر نازل ہوا ہے۔ اسباط بنی اسرائیل کی جماعتوں کو کہتے ہیں جیسے قبائل عرب کے گروہوں اور شعوب عجم کے فرقوں کو بولا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کی بارہ جماعتیں تھیں کیونکہ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے ہر بیٹے کی اولاد ایک ایک مستقل جماعت علیحدہ گنی جاتی تھی۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اسباط سے مراد خود یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہیں اور اسباط انہیں یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی اولاد ایک سبط اور جماعت تھی اور یا اس لئے کہ سبط اولاد کی اولاد کو کہتے ہیں اسی واسطے حسنین رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ سبطین فرماتے تھے اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے اس لئے انہیں اسباط فرمایا۔

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى (اور اس پر بھی جو ملا موسیٰ کو) اس سے مراد توارت ہے۔

وَعِیْسٰى (اور اس پر بھی جو دیئے گئے حضرت عیسیٰ) اس سے انجیل مراد ہے۔

وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ (اور اس پر بھی جو اور انبیاء علیہم السلام کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، اس کیفیت سے کہ ہم ان میں سے ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے) یعنی ہم یہود

marfat.com

اور نصاریٰ کی طرح کسی نبی میں فرق نہیں کرتے کہ کسی پر ایمان لاویں اور کسی پر نہ لاویں بلکہ سب ہمارے مقتدر اور دین و ایمان ہیں۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ (اور ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں) اور یہ ہمارا دین اسلام ملت ابراہیمی اور ہر نبی اور جناب خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا دین ہے اور یہود اور نصاریٰ جس طریقہ پر ہیں وہ کھلا شرک ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا و آخرت میں عیسیٰ علیہ السلام سے مجھے زیادہ تعلق اور قرب ہے انبیاء سب بھائی بھائی ہیں مائیں ان کی مختلف ہیں اور سب کا ایک دین ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے درمیان نبی نہیں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انبیاء کے آپس میں بھائی ہونے اور ماؤں کے مختلف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سب انبیاء کی اصل ایک ہے اور وہ وحی الٰہی ہے کہ اسی کے سبب سے نبی نبی ہوتا ہے اور استعدادیں کہ جو بمنزلہ ماؤں کے ہیں مختلف ہیں اور اس اختلاف کی ہی وجہ سے شرائع کے فروع میں اختلاف ہوا ہے۔ اور دین کے ایک ہونے سے مراد یہ ہے کہ سب انبیاء کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو بجالاؤ اور منہیات سے بچو اور خواہش نفسانی کو چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ کی ذات (صفت اور احکام اور مبداء و معاد کے احوال) پر ایمان لاؤ۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات عبرانی زبان کی پڑھا کرتے اور عربی میں اہل اسلام کے سامنے اس کی تفسیر کرتے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو۔ اور نہ تکذیب کرو بلکہ یہ کہو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا الخ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ (سو اگر ایمان لاویں وہ جس طرح تم ایمان لائے ہو) بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ میں باء زائد ہے جیسے جَزَاءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا میں باء زائد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ تمہارے ایمان لانے کی طرح ایمان لاویں یا یہ کہا جاوے کہ مثل کا لفظ بیچ میں زائد ہے جیسے کہ آیت کریمہ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مثلہ میں مثل کا لفظ زائد کہا گیا ہے اور ابن عباسؓ کی قرأت فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ اس اخیر توجیہ کی مؤید بھی ہے۔

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ (تو بیشک ہدایت پائیں گے اور اگر انحراف کریں تو بس وہی ضد پر ہیں) یعنی جانب حق کے خلاف ہیں اور بعض نے شقاق کی تفسیر عداوت سے بھی کی ہے۔

فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ [1] (سو کافی ہے تمہاری طرف سے ان کو اللہ) یہ مومنین کے لئے حفاظت اور نصرت کا وعدہ ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس وعدہ کو اس طرح پورا فرمایا کہ اہل کتاب میں سے فرقہ نضیر کو جلاوطن کرادیا اور قریظہ کو قتل کرا دیا اور یہود و نصاریٰ پر جزیہ مقرر ہو گیا۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ (اور وہ سننے والا واقف کار ہے) یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین اور کفار کے اقوال کو سنتا اور ان کی نیتوں اور حالوں سے واقف ہے، ہر ایک کو اس کے کئے کی جزا ملے گی۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ (لے لیا ہم نے رنگ اللہ کا) اس سے اللہ کا دین مراد ہے۔ کلبی، قتادہ اور حسن نے ابن عباسؓ نے اسی طرح اس کی تفسیر نقل کی ہے۔ دین کو رنگ سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ جیسے رنگ کپڑے پر چڑھ جاتا ہے اسی طرح دین دار پر دین کا اثر ہو جاتا ہے۔ صبغۃ اللہ ترکیب میں یا تو اٰمَنَّا کا مفعول مطلق من غیر لفظہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا ملت ابراہیم

---

[1] بطریق متعددہ مروی ہے کہ مصری لوگ حضرت عثمان غنیؓ پر چڑھ کر آئے اور ان کا محاصرہ کر لیا اور حضرت عثمانؓ کے پاس گھر میں پہنچے اس وقت ان کے سامنے قرآن شریف کھلا رکھا تھا، تلوار سے حضرت کے ہاتھ پر وار کیا خون جو جاری ہوا تو آیہ فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم پر گرا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسلام میں۔ یہ پہلا ہاتھ ہے جو ناحق قطع کیا گیا کہا جاتا ہے کہ اشقیا میں سے کوئی اچھی حالت میں نہیں مرا۔ ۱۲ منہ

marfat.com

سے بدل ہونے کے سبب منصوب ہے یا حالت نصب میں ذکر کرنے سے مراد ہے برانگیختہ کرنا۔ تقدیر عبارت اسی طرح ہوگی عَلَيۡكُم صبغۃ اللّٰہ (اللہ کے رنگ کو اپنے اوپر لازم پکڑو) اور بعض مفسرین نے کہا کہ صبغۃ اللّٰہ سے مراد ختنہ ہے کیونکہ اس سے مختون خون آلودہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی صبغۃ اللّٰہ منصوب علی الاغراء ہوگا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ نصاریٰ کے ہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا اور اس پر سات روز گذر جاتے تو وہ اسے ایک پانی میں جسے معمودیہ کے نام سے موسوم کرتے غوطہ دیتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سے یہ پاک ہو گیا اور سب آلائشیں دور ہو گئیں اور یہ فعل بجائے ختنہ کے کرتے۔ جب اسے غوطہ دیتے تو کہتے کہ اب یہ سچا نصرانی ہو گیا اس پر حق تعالیٰ نے آیت کریمہ صبغتہ اللّٰہ الخ نازل فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا دین اسلام اور احکام ہیں۔

وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ؗ (اور کس کا رنگ بہتر ہے خدا کے رنگ سے) یعنی تمام رذائل سے پاک کرنے میں اللہ کے دین سے کوئی طریقہ اچھا نہیں۔

وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾ (اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں) یہ اہل کتاب پر تعریض ہے یعنی ہم تمہاری طرح شرک میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر صبغۃ اللّٰہ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہو تو وَنَحۡنُ له عابدون کا اٰمَنَّا پر عطف ہے ورنہ صبغۃ اللّٰہ پر یا اتَّبِعُوۡا مِلَّةَ ابراھِیۡمَ پر بتقدیر قولوا عطف ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو اور کہو کہ ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں یا یہ معنی کہ ملت ابراہیمی کا اتباع کرو اور کہو کہ ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ **قُلۡ** اے محمد ﷺ آپ (یہود سے) کہہ دیجئے۔

اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِى اللّٰهِ (کیا تم جھگڑا کرتے ہو خدا کے بارے میں) یعنی اللہ کے دین میں اور اس بارے میں کہ اس نے عرب میں سے پیغمبر پیدا فرمایا اور تم میں سے پیغمبر نہ بنایا جھگڑتے ہو۔

وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ ۚ (حالانکہ وہی ہمارا اور تمہارا رب ہے) یعنی اس بارے میں ہم تم برابر ہیں کہ حق تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، اسے کسی خاص قوم سے زیادہ خصوصیت نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے نبوت کے لئے انتخاب کر لے اس میں تمہارا کچھ اجارہ نہیں۔

وَلَنَآ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ۚ (اور ہمارے واسطے ہیں ہمارے اعمال اور تمہارے لئے ہیں تمہارے اعمال) یعنی ہر شخص کو اس کے کئے کی جزا ملے گی۔

وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ﴿۱۳۹﴾ (اور ہم خالص اسی کو مانتے ہیں) یعنی تم تو مشرک ہو اور ہم مخلص۔ اس لئے ہم تم سے زیادہ مستحق ہیں سعید بن جبیرؒ نے فرمایا ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ بندہ عمل محض اللہ کے واسطے کرے، کوئی غرض اور نمائش نہ ہو۔ اور فضیل نے فرمایا کہ لوگوں کے دیکھنے کی وجہ سے (برے) عمل کو چھوڑ دینا ریا ہے اور لوگوں کے دکھاوے کے لئے عمل کرنا شرک ہے۔ اخلاص تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں سے نجات بخشے۔

اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ (کیا تم کہتے ہو) اَمۡ تقولُوۡنَ میں ام منقطعہ ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ام بمعنی ہمزہ ہے اور مراد توبیخ (دھمکانا) ہے۔ ابن عامر، حمزہ اور کسائی، حفص نے تقولون کو صیغۂ خطاب سے اور باقی قراء نے صیغہ غائب سے پڑھا ہے۔

اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ

(کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھی۔ اے محمد کہہ دیجئے کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ) یعنی تم تو ابراہیم و اسماعیل و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام کو یہودی اور نصرانی بتاتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی خالص مسلمان تھے، بخلاف یہود و نصاریٰ کے کہ وہ مشرک ہیں اور جو لوگ دین حق کا اتباع کرتے تھے وہ سب کے سب ابراہیم علیہ السلام کے پیرو تھے نہ کہ مشرک۔ اور تورات و

marfat.com

انجیل دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی تو ابراہیم علیہ السلام نصرانی یا یہودی کس طرح ہو سکتے ہیں، بلکہ دین ابراہیمی کے منسوخ ہونے سے پہلے موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام خود اسی دین کے متبع تھے۔ اب تم بتاؤ تمہیں زیادہ علم ہے یا اللہ کو اور یہود و نصاریٰ یہ سب کچھ جان بوجھ کر چھپاتے تھے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ (اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے چھپائی گواہی جو اس کے پاس خدا کی طرف سے تھی) یعنی تورات میں شہادت اس بات کی موجود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مخلص تھے، مشرک نہ تھے اور یہودیت و نصرانیت سے بری تھے اور نیز جناب رسول اللہ ﷺ کی شہادت موجود ہے پھر جو شخص اس شہادت کو چھپاوے اس سے زیادہ کوئی ظالم نہیں۔

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۰﴾ (اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو تم کر رہے ہو) یہ اہل کتاب کو دھمکی ہے کہ ان کے سب کرتوت سے اللہ تعالیٰ واقف ہے۔

۱۶ ع ۱۲ ۱۶ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۱﴾

(یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ان کا کیا ہوا ان کے کام آئے گا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے کام آئے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ گچھ نہ ہوگی) اس مضمون کو مبالغہ کے لئے مکرر بیان فرمایا تاکہ اپنے آباؤ اجداد کے بھروسے پر نہ رہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ پہلے مضمون میں تو خطاب اہل کتاب کو تھا اور اس میں ہم کو ہے کہ مبادا یہ مسلمان ان کا اقتداء کرنے لگیں اور بعض نے کہا ہے کہ پہلی آیت سے انبیاء علیہم السلام مراد ہیں اور دوسری سے یہود اور نصاریٰ کے آباؤ اجداد۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆☆☆

marfat.com

پارہ سیقول

جز (۲)

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ (عنقریب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ ان کو کس بات نے پھیر دیا ان کے اس قبلہ سے جس پر کہ یہ تھے) سُفَهَآءُ سے مراد[1] وہ ہیں جن کی عقل اپنے آباؤاجداد کی تقلید اور نظر صحیح سے روگردانی اور عناد کے سبب سے کم ہو گئی یعنی منافقین اور یہود اور مشرکین مراد ہیں۔ قِبْلَتِهِمْ میں قبلہ سے مراد بیت المقدس ہے۔ اس پیشین گوئی کا فائدہ اور نکتہ یہ ہے کہ تحویل قبلہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا اور اگر دفعتہً تحویل و تبدیل کا حکم نازل ہوتا تو طبیعتوں میں اس سے لگاؤ پیدا نہ ہوتا اور مِنْ وجہٍ انکار کی صورت پیدا ہوتی، اس خبر دینے سے یہ بات جاتی رہی اور تحویل کا حکم دلوں میں خوب جم گیا، نیز یہ قبل از وقت اطلاع اس اعتراض کے جواب کے لئے پہلے سے مستعد کر دیتی ہے۔ قبلہ اصل میں کسی شئے کے سامنے ہونے کی حالت اور ہیئت کو کہتے ہیں جیسے جلسہ بیٹھنے کی حالت کو بولتے ہیں۔ پھر بطور نقل کے اس مکان کو کہنے لگے جس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ یہود اور مشرکین نے بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تحویل پر اعتراض و طعن کیا تھا اس وقت آیت نازل ہوئی تھی۔ ابن جریرؒ نے سدی کے طریق سے باسانید مختلفہ روایت کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو کعبہ کی طرف توجہ کرنے کا حکم فرمایا تو مشرکین مکہ نے کہا کہ محمد ﷺ کو اب اپنے دین میں خود کچھ حیرانی ہونے لگی اور اب یہ سمجھ گئے ہیں کہ ہم لوگ راہ راست پر ہیں۔ اسی لئے اپنے قبلہ کو چھوڑ کر ہمارے قبلہ کو اختیار کر لیا اور عنقریب شدہ شدہ ہمارے دین میں شامل ہو جائیں گے۔ علامہ بغویؒ کہتے ہیں کہ تحویل قبلہ پر یہود نے معاذ بن جبلؓ سے کہا محمد ﷺ نے ہمارے قبلہ کو حسد سے ترک کر دیا۔

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۴۲ (کہہ دیجئے خدا ہی کا ہے پورب اور پچھم، چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر) حاصل آیت کا یہ ہے کہ سب جہات اور تمام مکان اللہ ہی کے ہیں اور استقبال قبلہ عبادات میں سے ہے اور عبادت میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر اعتماد کرنا چاہئے، کسی خصوصیت مکانی کا لحاظ اس میں معتبر نہیں تو ہم کو اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا اسی لئے ہم حکم کا اتباع کرتے ہیں۔ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ سے مراد وہ راہ ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے۔

وَكَذٰلِكَ (اور اسی طرح) اے امت محمد ﷺ۔ ذلک کا مشار الیہ یا تو پہلی آیت کا مضمون ہے۔ اس صورت میں

---

[1] سفاہت کا لغوی معنی ہے خفت، سبکی، ہلکا ہونا۔ سفیہ سبک سر، بے وقوف، قاصر الفہم۔ سفاہت عقل کے تین ہی سبب ہوتے ہیں، اسلاف کی کورانہ تقلید۔ نابینا کچھ نہیں جانتا کہ اس کا راہبر اس کو کہاں لے جارہا ہے، بے وقوف جاہل بھی اسلاف کا اندھا پیرو ہوتا ہے۔ سلف کے زمانہ کی اولیت کو وہ ان کی صداقت، حق پرستی اور روشنی عقل کی دلیل خیال کرتا ہے اور کسی معاصر کی راہنمائی کو جو راہ اسلاف کے خلاف ہو کجروی خیال کرتا ہے۔ جہالت، خواہش نفس، محبت اسلاف، توہم پرستی، قومی رسم و رواج، خاندانی وطنی لسانی تہذیبی اور اسی طرح کے دوسرے بیہودہ جذبات اس کے اندر ضد پیدا کرتے ہیں اور اس ضد کی وجہ سے علمبرداران صداقت اور اہل حق سے ان کو عناد ہو جاتا ہے اور یہی عناد اس کو سبک سر بنا دیتا ہے۔ منافقین، مشرکین اور یہود اسلاف کے بالکل مقلد بھی تھے اور اہل عناد بھی اور نظر و فکر سے روگرداں بھی ۱۲ منہ

marfat.com

حاصل ہو گا کہ جس طرح ہم نے تم کو سیدھی راہ کی ہدایت کی اسی طرح تم کو امت معتدل اور بہتر بنایا اور یا آیت وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا الآية کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ جس طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ کیا اسی طرح تم کو بہتر امت بنایا۔

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (ہم نے تم کو بنایا ہے امت معتدل) یعنی ہم نے تم کو اوروں سے بہتر اور عادل، علم و عمل و معرفت سے آراستہ بنایا، امام احمدؒ اور حاکمؒ نے بروایت حضرت ابو سعید خدریؓ مرفوعاً بیان کیا اور اس حدیث کو صحیح بھی قرار دیا کہ وسطاً کے معنی ہیں عدلاً (معتدل) لفظ وَسَط ایسی درمیان جگہ کہ کہتے ہیں جس کے ہر جانب کا فاصلہ برابر ہو۔ پھر خصائل محمودہ کے لئے مجازاً اس کا استعمال کیا جانے لگا کیونکہ اچھے خصائل افراط و تفریط کے درمیان ہی ہوتے ہیں جیسے جود اسراف اور بخل کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور شجاعت تہور اور بزدلی کے بین بین ہے۔ پھر اس کا اطلاق خود اس شخص پر ہونے لگا جو خصائل محمودہ سے آراستہ ہو۔ واحد و جمع مذکر اور مؤنث سب پر اس کا اطلاق آتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ فرماتا ہے قَالَ اَوْسَطُهُمْ (کہا اس شخص نے جو ان میں سے بہتر تھا) یہاں اوسط کا اطلاق واحد پر آیا ہے۔

کلبیؒ کہتے ہیں کہ آیت میں مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا ہے۔ تقدیر آیت کی یہ ہے جعلنکم اھل دین وسط یعنی ہم نے تم کو دین وسط والا بنایا۔ اسلام کو دین وسط اس وجہ سے فرمایا کہ احکام شرعیہ میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ علماء نے اس آیت کو اجماع امت محمدیہ کے احکام میں حجت ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے کیونکہ اگر مسئلہ اجماعی واجب القبول نہ ہو تو امت کا غیر عادل ہونا لازم آئے گا۔ اگر اعتراض کیا جائے کہ یہ مسلم ہے کہ مجتہد اگر اپنے اجتہاد میں خطا کرے تو اس سے اس کی عدالت میں کوئی نقصان نہیں ہوتا تو اب اگر خطا پر سب کا اتفاق ہو جائے تو اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ ان کی عدالت میں بھی کچھ نقصان ہے۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ اول ہم کہہ چکے ہیں کہ لفظ وسط کا اطلاق مجازی اول خصائل حمیدہ پھر ہوتا ہے پھر اس شخص پر اطلاق ہونے لگا جو ان خصائل کے ساتھ متصف ہو۔ اور کلبیؒ کے قول کے موافق وسط سے پہلے لفظ دین محذوف ہے۔ بہر حال خواہ خود امت کو وسط کہا جائے یا ان کے دین کو وسط کہیں ہر حال میں اس آیت سے یہ صاف سمجھا جاتا ہے کہ اس دین کے احکام اور ان کے خصائل سب کے سب محمود ہیں، تو اجماع میں خطا واقع ہونے سے اگرچہ وہ معذور قرار دیئے جائیں گے لیکن یہ ضرور سمجھا جائے گا کہ بعض خصائل ان کی مذموم ہیں۔ تو تمام خصائل کا محمود ہونا جو آیت سے معلوم ہوتا ہے کس طرح ثابت ہو گا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک روز سرور عالم ﷺ بعد عصر کے کھڑے ہوئے اور جو کچھ قیامت تک واقعات ہونے والے تھے آپ ﷺ نے ایک ایک کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ جب دھوپ درختوں کی چوٹیوں اور دیواروں کی منڈیروں پر چلی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی عمر اب اتنی ہی باقی ہے جس قدر کہ یہ دن باقی ہے، اور اسی قدر گذر چکی ہے جس قدر کہ دن گذر چکا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ امت (یعنی امت محمدیہ ﷺ) ستر امتوں کا کام دیتی ہے اور ان سب سے اللہ کے نزدیک یہ امت بہتر اور بزرگ ہے۔ اس حدیث کو بغویؒ نے روایت کیا ہے اور ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے اس کو بروایت بہز بن حکیم بیان کیا ہے دارمی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کا بیان تورات میں کس طرح ہے انہوں نے کہا ہم نے تورات میں لکھا پایا ہے کہ وہ محمد بن عبد اللہ ہیں مکہ میں پیدا ہوں گے اور طابہ (مدینہ) کی طرف ہجرت فرمائیں گے اور ملک شام ان کے قبضہ میں ہو جائے گا، نہ وہ بدزبان ہوں گے اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے اور برائی کے بدلہ میں برائی نہ کریں گے بلکہ درگذر کریں گے، ان کی امت اللہ تعالیٰ کی حمد بہت کرنے والی ہو گی، ہر سختی اور نرمی خوشی اور غم کی حالت میں اللہ کی حمد کرے گی، بلند جگہ پر چڑھتے ہوئے تکبیر کہنے والی اور اپنے دست و پا کو وضو سے منور کرنیوالی ہو گی، وسط کمر پر تہ بند باندھیں گے نمازوں میں ایسی صف بندی کریں گے جیسی کہ لڑائی میں۔ مسجدوں میں ان کی آوازیں شہد کی مکھی کی آواز سی نرم اور پست ہوں گی لیکن نہ اتنی پست کہ دوسرا (پاس والا) نہ سن سکے۔

marfat.com

لِتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (تاکہ بنو تم گواہ لوگوں پر) یعنی قیامت کے روز امت محمدیہ حق تعالیٰ کے سامنے گواہی دے گی کہ انبیاء نے اپنی امت کو احکام پہنچائے دیئے۔ یہی معنی گواہ ہونے کے ہیں اور لتکونو الآیۃ امت محمدیہ ﷺ کے عادل بنانے کی علت ہے۔ اس آیت سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ شہادت کے لئے عدالت شرط ہے۔

وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَھِیۡدًا (اور ہو جائے رسول تم پر گواہ) رسول سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے گواہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ قیامت میں آپ ﷺ اپنی امت کے گواہ اور مزکی ہوں گے۔ اور گواہ چونکہ مثل رقیب یعنی نگراں کے ہوتا ہے اور رقیب کا صلہ علیٰ آتا ہے اس لئے شہید کا صلہ علیہ لائے اگرچہ بظاہر لام لانا مناسب معلوم ہوتا تھا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو ایک جگہ جمع کرے گا پھر گذشتہ امتوں کے کفار سے خطاب کر کے فرمائے گا کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہمارے پاس کوئی نہیں آیا پھر اللہ تعالیٰ انبیاء سے دریافت فرمائے گا، انبیاء متفق اللفظ ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ ہم پیام پہنچا چکے۔ یہ صریح جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ باوجودیکہ عالم الغیب ہے، مگر اتمام حجت کے لئے انبیاء سے گواہ طلب فرمائے گا۔ اس وقت امت محمد ﷺ حاضر ہو گی اور گواہی دے گی کہ انبیاء نے سب احکام انہیں پہنچا دیئے ہیں۔ کفار بولیں گے انہیں کیسے معلوم ہوا کہ پہنچا چکے یہ تو ہم سے برسوں بعد پیدا ہوئے ہیں۔ امت محمدیہ جواب دے گی کہ حق تعالیٰ نے ہمارے پاس رسول بھیجا اور اس پر کتاب نازل فرمائی، اس میں ہم کو خبر دی کہ سب انبیاء نے اپنی اپنی امت کو احکام پہنچا دیئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب سچوں سے زیادہ سچا ہے۔ اس کے بعد محمد ﷺ بلائے جائیں گے اور امت کی حالت ان سے پوچھی جائے گی آپ ان کی سچائی اور عدالت کی گواہی دیں گے۔

بخاری، ترمذیؒ اور نسائی نے ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن نوح علیہ السلام بلائے جائیں گے اور ان سے دریافت کیا جائے گا کیا تبلیغ کی؟ نوح علیہ السلام عرض کریں گے۔ پروردگار میں نے بے شک تیرا پیام پہنچا دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ انکی امت سے دریافت فرمائے کہ تم کو نوح علیہ السلام نے احکام پہنچائے وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی آیا نہیں۔ پھر نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے۔ نوح علیہ السلام عرض کریں گے میرے گواہ محمد ﷺ اور ان کی امت ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر تم وہاں آکر گواہی دو گے۔ پھر آپ ﷺ نے آیت وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ الخ اور فرمایا تم تو نوح علیہ السلام کی تبلیغ کی گواہی دو گے اور میں تمہاری گواہی دوں گا۔ امام احمد نسائی اور بیہقی نے ابو سعید خدریؓ کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک نبی آئیں گے کہ ان کے ساتھ صرف ایک ہی آدمی ان کا امتی ہو گا پھر ایک اور نبی آئیں گے ان کے ساتھ دو آدمی ہوں گے اس طرح آتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان سب سے دریافت فرمائیں گے کہ تم نے تبلیغ کی۔ سب کہیں گے کہ خداوندا کی تھی پھر ان کی امتوں سے دریافت کیا جائے گا کہ انہوں نے تمہیں احکام پہنچائے۔ وہ سب انکار کریں گے پھر انبیاء سے گواہ طلب کئے جائیں گے۔ وہ امت محمد ﷺ کو پیش کریں گے پھر امت محمدیہ سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا عرض کریں گے ہمارے پاس نبی کتاب لے کر آئے اس میں یہ بھی تھا کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنی امت کو احکام پہنچائے ہم نے اس کی تصدیق کی، کہا جائے گا بیشک تم سچ کہتے ہو۔

وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَۃَ الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡھَاۤ (اور نہیں بنایا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر آپ پہلے تھے) جَعَلَ یا تو ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اس تقدیر پر التی اپنے مابعد سے مل کر القبلۃ کی صفت ہو گا اور مضاف محذوف ہو گا تقدیر عبارت کی اس طرح ہو گی وَمَا جَعَلۡنَا تحویل الۡقِبۡلَۃَ الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡھَا (یعنی نہیں کی ہم نے تبدیل اس قبلہ کی جس پر آپ پہلے سے تھے مگر اس لئے الخ) اور قبلہ سے مراد اس وقت بیت المقدس ہو گا یا دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے اس صورت میں تقدیر آیت کی یہ ہو گی۔ وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَۃَ الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡھَا مَنۡسُوۡخَۃً (یعنی نہیں کیا ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ پہلے سے تھے منسوخ مگر اس لئے الخ) اور یہ بھی ممکن ہے کہ القبلۃ، ماجعلنا کا مفعول اول ہو

marfat.com

اور الجھتہ محذوف ہو اور التی اپنے مابعد سے مل کر اسی محذوف لفظ کی صفت ہو۔ اس صورت میں حاصل آیت کا یہ ہو گا کہ اصل تو یہی تھا کہ قبلہ بیت اللہ ہو لیکن ہم نے جو اول بیت المقدس کو قبلہ بنادیا تو وجہ اس کی یہ ہے الخ اور ہو سکتا ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ نہیں بنایا ہم نے قبلہ اس وقت اس جہتہ کو جس پر آپ پہلے ہجرۃ سے تھے یعنی کعبہ کو مگر اس واسطے الخ اور یہ تفسیر اس پر مبنی ہے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ حضور سرور عالم ﷺ نے قبل از ہجرت کعبہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔ اور تفسیر کے موافق یہ بھی لازم آتا ہے کہ نسخ قبلہ کا دو مرتبہ ہو۔ نیز آیت سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ الخ کی رفتار اور طرز سے جو سمجھا جاتا ہے یہ تفسیر اس کے مخالف ہے یہاں اَلَّتِیْ کَانُوْا عَلَيْهَا سے مراد قطعاً بیت المقدس ہے اس کے موافق اس آیت میں اَلَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا سے بھی بیت المقدس ہی ہونا چاہئے۔ قیاس مقتضی تھا کہ عبارت اس طرح ہو وَمَا جَعَلْنَا الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا قِبْلَةً یعنی اَلَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا مقدم ہو اور قبلةً مؤخر لیکن اظہار اہمیت کے لئے قبلة کو اول مفعول بنایا، یوں کہو کہ یہ عبارت باب قلب سے ہے۔

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ (مگر اس واسطے کہ ہم معلوم کرلیں ان لوگوں کو جو پیروی کریں رسول کی) یعنی تبدیل قبلہ اس غرض سے ہوئی ہے[۱] کہ ہم اس شخص کو جان لیں جو نماز میں رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرتا ہے کہ جس طرف آپ بحکم الٰہی توجہ فرماتے اسی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور ایسا شخص ان لوگوں میں سے جو الٹے پاؤں پھر جائیں یعنی اطاعت نہ کریں متمیز ہو جاوے۔

مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (الگ ان لوگوں سے جو پھر جائیں الٹے پاؤں) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو تحویل قبلہ کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جب قبلہ کی تحویل واقع ہوئی تو مسلمانوں میں سے ایک قوم یہودی بن گئی اور یہ کہا کہ محمد ﷺ پھر اپنے باپ دادا کے دین پر ہو گئے اِلَّا لِنَعْلَمَ علم یا تو بمعنی معرفت ہے اور مَنْ يَّتَّبِعُ لِنَعْلَمَ کا مفعول ہے اور مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ، لنعلم کا مفعول کہا جائے اور مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ کو مفعول ثانی قرار دیا جاوے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے تاکہ ہم اس شخص کو جو رسول کی پیروی کرتا ہے جدا جان لیں اس شخص سے جو الٹے پاؤں پھرے۔ اس مقام پر ایک سوال مشہور ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم تحویل قبلہ کی غایت کس طرح بن سکتا ہے وہ تو پہلے ہی سے ہر شخص کی حالت جانتا ہے۔ اس کے مختلف جواب دئے گے ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ اہل معانی نے کہا ہے کہ لام تعلیل کے لئے ہی غایت کا نہیں ہے اور صیغہ مضارع کا بمعنی ماضی ہے۔ جیسے فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ میں مضارع بمعنی ماضی ہے تو اس جواب کے معنی اس طرح ہوں گے کہ تحویل قبلہ اس وجہ سے ہوئی کہ پہلے سے ہم رسول کی پیروی کرنے والے کو غیر مطیع اور الٹے پھر جانے والے سے (الگ) جانتے ہیں یعنی ہم اول سے جانتے تھے کہ تحویل قبلہ ایک قوم کی ہدایت کا سبب ہے اور ایک قوم کی گمراہی کا سبب ہے۔

بعض[۱] نے یہ جواب دیا ہے کہ علم سے مراد تمیز ہے جو علم کا سبب ہے۔ سبب کا نام مسبب کو دے دیا اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے تاکہ ہم حق پرست کو اہل باطل سے متمیز کرلیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مضاف محذوف ہے اور معنی یہ ہیں، تاکہ ہمارے رسول اور اولیاء جان لیں۔ تو اس صورت میں علم، رسول اور اولیاء کی صفت ہو گا اور مجازاً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور

---

[۱] اللہ کا علم ازلی، قدیم، محیط کل ہے۔ وہ ہر چیز کو اس کی پیدائش سے بہت پہلے ازل میں ہی جانتا تھا یہ علم زمانہ اور زمانیات سے پاک ہے اور اجمالی ہے لیکن اجمالی ناقص نہیں ہمارا اجمالی علم ناقص ہوتا ہے البتہ اللہ کا اجمالی علم ناقص نہیں ہوتا۔ اجمالی کہنے کی صرف یہ وجہ ہے کہ ہر چیز کے وجود سے پہلے بحیثیت مجموعہ انکشاف ہوتا ہے۔ اس کا تعلق حدوث شئ سے نہیں ہوتا یعنی شئ کے وجود بالفعل پر موقوف نہیں۔ اسی لئے یہ اللہ کی صفت کمالیہ ہے، لیکن اللہ کو ایک دوسرا علم بھی ہوتا ہے جس کو تمیز یا ظہور فعلی کہہ سکتے ہیں یہ علم حادث ہوتا ہے۔ شئ کے وجود کے بعد ہوتا ہے اسی لئے یہ اللہ کی صفت کمالیہ نہیں۔ حضرت مؤلف نے دونوں طرح کے علم کی طرف اشارہ کر دیا اور دوسری شق میں علم حادث کی طرف۔

marfat.com

اولیاء کے اظہار شرف کے لئے اپنی ذات کی طرف منسوب کر دیا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے فرمائے گا کہ میں مریض ہوا تو نے میری عیادت نہ کی۔ تو جس طرح اس حدیث میں بندہ کے مریض ہونے کو اپنا مریض ہونا قرار دیا اسی طرح یہاں بندوں کے علم کو اپنا علم قرار دیا یہ جس قدر تاویلات اور جوابات ہیں تکلف سے خالی نہیں۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ شیخ ابو منصور ماتریدیؒ کہتے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ جس شئے کو ہم اول سے جانتے تھے کہ وہ موجود ہوگی اس کو ہم موجود جان لیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ازل میں اس امر کو تو جانتا تھا کہ جس وقت ہم چاہیں گے فلاں شئے موجود ہو جائے اور ازل میں یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت فلاں شئے کو جواب تک موجود نہیں ہوئی موجود جانتا ہے کیونکہ جو شئے موجود نہیں ہوئی اس کو موجود کس طرح جان سکتا ہے یہ تو خلاف واقع ہے۔ اس صورت میں علم باری میں تغیر لازم نہیں آتا کیونکہ تغیر معلوم میں ہوا ہے نہ علم میں۔ اور بعض نے اسی طرح تقریر کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ مراد علم سے علم کا تعلق حالی ہے جو مدار جزا کا ہے اور معنی لنعلم کے یہ ہیں تا کہ علم ہمارا اس کے وجود سے متعلق ہو۔

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً (اور بے شک یہ شاق گذرا ہے) ان مثقلہ سے مخفف کر لیا ہے اور لَکَبِیْرَۃً کا لام اِن شرطیہ اور اس اِن میں فرق کرنے کے لئے آیا ہے سیبویہ کہتے ہیں کہ ان تاکید کے لئے آیا ہے اور مشابہ قسم کے ہے اسی واسطے اس کے جواب پر لام آیا اور کوفیوں نے کہا ہے کہ ان نافیہ ہے اور لام بمعنی الا ہے اور وَاِنْ کَانَتْ کی ضمیر وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ میں جو جَعَلَ مفہوم ہوتا ہے یا تو اس کی طرف راجع ہے اور یا قبلہ یا تبدیل و تحویل کی طرف راجع ہے۔

اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ (مگر ان پر جن کو اللہ نے ہدایت دی اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کر دے تمہارے ایمان) هَدَى اللّٰهُ میں مفعول هم محذوف ہے۔

لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ میں ایمان سے یا تو ایمان پر جما اور قائم رہنا مراد ہے اور یا قبلہ منسوخ شدہ پر ایمان رکھنا مقصود ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد ایمان سے نماز ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حیی بن اخطب یہودی اور اس کے رفیقوں نے مسلمانوں سے کہا تھا تم نے جو اتنے زمانہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے۔ یہ ہدایت تھی یا گمراہی اگر ہدایت تھی تو تم نے ہدایت سے روگردانی کی اور اگر گمراہی تھی تو تم نے گمراہی کے ساتھ اللہ کی عبادت کی۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہدایت وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ حکم فرمائے اور گمراہی وہ ہے جس سے منع کرے۔ جب تک بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم رہا اس وقت تک وہ ہدایت تھا اور جب منع کر دیا تو گمراہی ہے۔ تحویل قبلہ سے پہلے بنی النجار میں سے اسعد بن زرارہؓ اور بنی سلمہ میں سے براء بن معرورؓ وفات پا گئے تھے اور یہ دونوں نقباء میں سے تھے اور بھی بہت سے لوگ اس سے پہلے انتقال کر گئے تھے تو ان کے عزیز و اقارب حضور سرور دو عالم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو قبلہ ابراہیمی کی طرف منہ کرنے کا حکم فرما دیا ہے اور ہمارے بھائی جو بیت المقدس کی طرف ہی نماز پڑھتے پڑھتے مر گئے ان کا کیا حال ہوگا اللہ تعالیٰ نے آیت وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ نازل فرمائی یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہاری نماز کو جو بیت المقدس کی طرف تم نے پڑھی ہے ضائع فرمائے۔

صحیحین میں براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ تحویل قبلہ سے قبل بہت سے آدمی مر گئے اور شہید ہو گئے ہم کو کچھ علم نہ تھا کہ ان کے بارے میں کیا کہیں (آیا ان کی نمازیں پڑھی ہوئی اکارت گئیں یا انہیں ثواب ملے گا) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴۳ (بے شک اللہ لوگوں پر شفقت رکھنے والا بڑا مہربان ہے) نافع ابن کثیر اور حفصؒ نے لرؤفٌ کو فعولٌ کے وزن پر ضمہ کو خوب ظاہر کر کے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے فَعُلٌ کے وزن پر اختلاس حرکت سے پڑھا ہے۔ رأفۃ کے معنی شدت رحمت کے ہیں اور رحیم پر اس کو مقطع آیات کی رعایت کی وجہ سے مقدم کیا ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ (ہم دیکھ رہے ہیں آپ کے منہ کا آسمان کی طرف پھر پھر

marfat.com

جانا) سرور دو عالم ﷺ کا دل اس بات کو چاہتا تھا کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو جائے کیونکہ وہ قبلہ ابراہیمی تھا نیز مشرکین کو ایمان کی طرف اور یہود کو مخالفت کی طرف زیادہ مائل کرنیوالا تھا۔ یہ آیت تحویل قبلہ کے قصہ کا ابتدائی حصہ ہے تلاوت میں اس کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ ہجرت کے بعد احکام شرعیہ میں سے اول جو حکم منسوخ ہوا وہ یہی قبلہ تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ ہجرت سے پہلے قبلہ بیت اللہ تھا یا بیت المقدس۔ بعض کہتے ہیں کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف توجہ فرماتے تھے اور کعبہ بھی سامنے ہوتا تھا۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اور سند اس کی جید ہے۔ اور بعض نے مطلقاً کہا ہے کہ بیت المقدس کی طرف رخ فرماتے تھے اس کا ذکر نہیں کیا کہ کعبہ کس طرف ہوتا تھا۔

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ مکہ میں حضور سرور عالم ﷺ کعبہ کی طرف رخ فرماتے تھے اور جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ ابن جریرؒ وغیرہ نے بسند قوی ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو امر فرمایا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کیا کریں۔

ابن جریج کہتے ہیں کہ اول رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی پھر مکہ میں ہی رہتے ہوئے بیت المقدس کی طرف پڑھنے کا حکم ہو گیا۔ چنانچہ تین برس برابر بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی پھر مدینہ کی ہجرت فرمائی اول قول یعنی علامہ بغوی کا مسلک صحیح اور قوی ہے اور دیگر احادیث اسی کی طرف راجع ہیں۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ بعد ہجرت کے بیت المقدس کی طرف کتنے زمانہ تک حضور ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔ ابو داؤد کے نزدیک بروایت ابن عباسؓ سترہ مہینے نماز پڑھی۔ طبرانی اور بزاز کے نزدیک حسب روایت عمرو ابن عوف اور ابن ابی شیبہ نیز ابو داؤد وغیرہما کے نزدیک موفق روایت ابن عباسؓ اور امام مالکؒ کے نزدیک حسب روایت سعید بن المسیبؒ سولہ مہینے پڑھی اور بخاری کے نزدیک حسب روایت براء بن عازبؓ سولہ یا سترہ مہینے پڑھی۔ حق یہ ہے کہ سولہ مہینے اور کچھ دنوں پڑھی ہے کیونکہ حضور ﷺ نے مکہ سے ربیع الاول کی پانچویں تاریخ بروز دوشنبہ ہجرت فرمائی اور مدینہ میں بارہویں ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ کو تشریف لائے اور تحویل قبلہ کا حکم قول صحیح کے موافق ۱۵ ر رجب دو ہجری واقعۂ بدر سے دو ماہ پہلے بوقت زوال ہوا۔ جمہور علماء نے اسی قول کو معتبر ٹھہرایا ہے۔ اور سترہ مہینے جو بعض کا قول ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کو پورا مہینہ شمار کر کے سترہ مہینے کہہ دیئے۔ بعض روایت میں جو تیرہ یا انیس یا اٹھارہ مہینے یا دو ماہ یا دو برس آئے ہیں یہ اقوال سب ضعیف ہیں۔ مدینہ منورہ میں جب حضور ﷺ تشریف رکھتے تھے تو یہودی کہا کرتے تھے کہ محمد دین میں تو ہماری مخالفت کرتے ہیں مگر اتباع ہمارے قبلہ ہی کا کرتے ہیں اس لئے آپ یہ چاہتے تھے کہ بیت اللہ قبلہ ہو جائے۔ چنانچہ حضور نے جبرئیل علیہ السلام سے اپنی یہ تمنا ظاہر کی۔ کہ بیت اللہ چونکہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبلہ بنادے۔ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں مثل آپ کے بندہ ہوں اور آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجھ سے زیادہ بزرگ اور مقرب ہیں آپ خود اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی اور اکثر اللہ کے حکم کے انتظار میں آسمان کی طرف دیکھتے رہتے آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور قَدْ نَرٰى الآیہ نازل ہوئی۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ص (پس بیشک ہم پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں)

وَلَنُوَلِّيَنَّكَ میں نے اسے والی بنادیا۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہم آپ کو استقبال پر قدرت عطا کر دیں گے یا یہ معنی ہیں کہ ہم آپ کو بیت اللہ کی طرف متصل کر دیں گے یا یہ معنی ہوں گے پھیر دیں گے ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں تَرْضٰهَا یعنی جس قبلہ کو چند اغراض صحیحہ پسندیدہ کی وجہ سے آپ چاہتے ہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے (یعنی پہلے قبلہ سے آپ ناراض نہ تھے بلکہ پہلے قبلہ سے بھی آپ راضی تھے کیونکہ وہ مامور بہا تھا مگر اس قبلہ کو چند مصالح دینیہ کی وجہ سے چاہتے تھے)

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط (تو اب پھیر لو اپنا منہ (بیت المقدس سے نماز کے وقت) مسجد

marfat.com

حرام کی طرف) یعنی جس جہت میں مسجد حرام ہے اس جہت کی طرف۔
لفظ شطرا اصل میں اس شئے کو کہتے ہیں جو کسی شئے سے علیحدہ ہو چنانچہ عرب دَارٌ شَطُوْرٌ اس گھر کو بولتے ہیں جو اور گھروں سے جدا ہو۔ پھر اس کا استعمال بمعنی جانب آنے لگا اگرچہ وہ جانب علیحدہ نہ ہو اور شَطْرَ منصوب بنزع خافض ہے (یعنی اصل میں اِلٰی شَطْرِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تھا) اِلٰی حرف جر کو حذف کر کے شَطْرَ کو منصوب کر دیا (ایسے منصوب کو منصوب بنزع خافض کہتے ہیں) اور بعض نے کہا ہے کہ شَطْرَ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ مسجد حرام اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں قتال اور شکار کرنا اور درخت کا کاٹنا حرام ہے اور اسی کو حرام کہتے ہیں۔ اور بظاہر یہ مناسب تھا کہ بجائے مسجد حرام کے کعبہ فرماتے کیونکہ قبلہ تو کعبہ ہی ہے لیکن مسجد حرام اس لئے فرمایا کہ اس طرف اشارہ ہو جائے کہ جو کعبہ سے دور ہو اس پر جہت کعبہ کا استقبال واجب ہے عین کعبہ کا نہیں۔ چنانچہ ترمذی نے ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مابین مشرق اور مغرب کے قبلہ ہے (اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دور والوں کے لئے قبلہ جہت کعبہ ہے)

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں مشرق سے بہت چھوٹے دنوں کی مشرق مراد ہے اسی طرح مغرب سے مراد بہت چھوٹے دنوں کی مغرب ہے اس کے مابین جہت جنوب ہوئی یہی قبلہ اہل مدینہ کا ہے۔ اسی طرح ہر ملک کے لوگوں کا علیحدہ قبلہ ہے۔ چنانچہ اہل ہند کا قبلہ دو مغربوں کے درمیان ہے اور وہ دونوں مغرب راس جدی کی مغرب ہیں۔ مواہب اور سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ قبیلہ بنی سلمہ میں ام بشر ابن بَرا ابن معرور سے ملنے بَراء کے انتقال کے بعد تشریف لے گئے ام بشر نے حضورؐ کے لئے کھانا تیار کیا وہاں آپ ﷺ کو ظہر کا وقت آگیا۔ آپ نے مع اصحاب کے مسجد بنی سلمہ میں نماز شروع فرمائی جب آپ دو رکعتیں پڑھ چکے تو جبرئیل علیہ السلام نے آکر اشارہ کیا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھو آپ نماز ہی میں کعبہ کی طرف میزاب کی جانب پھر گئے۔ جس جگہ مرد تھے وہاں عورتیں آگئیں اور جہاں عورتیں تھیں وہاں مرد آگئے۔ غرض سب نماز میں پھر گئے اسی واسطے اس مسجد کو مسجد القبلتین کہتے ہیں۔ واحدی نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ قصہ نہایت قوی سند سے ثابت ہے۔ غرض آپ نے ظہر کی دو رکعت تو بیت المقدس کی طرف پڑھیں اور دو رکعت کعبہ کی طرف۔ عباد بن بشرؓ آپ کے ساتھ نماز پڑھ کر جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ بنی حارثہ عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں اور رکوع میں ہیں انہوں نے باآواز بلند کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ کر آرہا ہوں وہ سن کر فوراً بیت اللہ کی طرف پھر گئے اور صحیح بخاری میں براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اول نماز جو کعبہ کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی۔ یہ حدیث پہلی حدیث کے خلاف ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سب سے پہلے ظہر کی نماز پڑھی لیکن تحقیق یہ ہے کہ ظہر ہی کی نماز پڑھی ہے اور دوسری حدیث میں جو عصر کی نماز آئی ہے تو ممکن ہے کہ براء بن عازبؓ کو آپ ﷺ کے بنی سلمہ میں ظہر پڑھنے کی اطلاع نہ ہوئی ہو یا ان کی مراد یہ ہو کہ پوری نماز سب سے پہلے کعبہ کی طرف عصر کی نماز پڑھی کیونکہ ظہر کی تو دو ہی رکعتیں پڑھی تھی۔ یا یہ مقصود ہو کہ اپنی مسجد میں جو حضور ﷺ نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور تحویل قبلہ کی خبر قبا والوں کو اگلے روز فجر کی نماز میں ہوئی ہے۔ چنانچہ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قبا میں لوگ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ رسول ﷺ کو اللہ کی طرف سے کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہو گیا وہ سب اسی وقت کعبہ کی طرف پھر گئے۔ اول ان کے منہ شام کی طرف تھے اور رافع بن خدیج فرماتے ہیں کہ ہم بنی عبد الاشہل میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر پکارا کہ رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو گیا ہمارا امام یہ سن کر کعبہ کی طرف پھر گیا اور ہم سب بھی پھر گئے۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (اور تم جہاں کہیں ہوا کرو تو کر لیا کرو اپنے منہ اسی کی طرف)

marfat.com

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمام امت کو خطاب فرمایا۔ اول خاص جناب سرور کائنات ﷺ کو آپ کی تعظیم شان کے لئے خطاب فرمایا تھا آپ کو خطاب فرمانا بھی اگرچہ امت کو شامل تھا لیکن تصریح اور توضیح اور تاکید کے لئے امت کو مستقل خطاب کا تمغہ عطا فرمایا۔ بخاری نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب نبی ﷺ بیت اللہ میں تشریف لے گئے تو بیت اللہ کے سب گوشوں میں آپ نے دعا مانگی اور اندر نماز نہیں پڑھی جب باہر تشریف لائے تو کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا کہ یہ قبلہ ہے۔ صحیحین میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور سرور دو عالم ﷺ اور آپکے ہمرکاب اسامہ، بلال اور عثمان بن طلحہؓ بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے اور دروازہ بند کر دیا گیا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ سب حضرات جب باہر آئے تو میں نے بلال سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ نے اندر جا کر کیا کیا، بلالؓ نے کہا کہ کعبہ کے دو ستون اپنے بائیں جانب چھوڑے اور ایک ستون دائیں جانب اور تین ستون پیچھے نماز پڑھی۔

راوی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں بیت اللہ کے چھ ستون تھے۔ **میں کہتا ہوں** ان دونوں حدیثوں میں کچھ تعارض نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے باہر آکر نماز پڑھی ہو اور ایک مرتبہ اندر پڑھی ہو۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (اور بے شک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی بخوبی جانتے ہیں کہ یہ برحق ہے ان کے خدا کی طرف سے) یعنی اہل کتاب یہ خوب جانتے ہیں کہ یہ تحویل قبلہ حق ہے کیونکہ توراۃ میں موجود ہے کہ نبی آخر الزماں دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے اب عناد اور حسد سے انکار اور اعتراض کرتے ہیں۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ (اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں) ابو جعفر، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے یعملون کو تعملون تاء سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں خطاب مومنین کو ہوگا اور ان کے لئے وعدہ ہوگا (معنی اس تقدیر پر یہ ہوں گے کہ اے مومنو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں تمہیں اس کا ثواب دیں گے) باقی قراء نے یَعْمَلُوْنَ کا یاء سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہود کے فعل کا بیان اور ان کے لئے وعید ہوگا (معنی یہ ہوں گے کہ جو کچھ وہ حرکتیں کرتے ہیں ہم اس سے بے خبر نہیں ان افعال کی ان کو سزا دیں گے) تحویل قبلہ پر یہود و نصاریٰ نے جناب سرور عالم ﷺ سے یہ کہا کہ تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ بیت اللہ قبلہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ (اور اگر آپ لے ہی آئیں تمام دلائل ان لوگوں کے پاس جن کو کتاب ملی ہے تو وہ پیروی نہ کریں گے آپ کے قبلہ کی) وَلَئِنْ اَتَيْتَ الخ میں لام تمہید قسم کا ہے اور مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ جواب قسم قائم مقام جواب شرط کے ہے۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اہل کتاب کا انکار اور اعتراض کسی شبہ پر مبنی نہیں اس لئے دلیل سے کوئی نفع نہیں۔ یہ جو کچھ بکتے ہیں اس کا باعث حسد اور عناد ہے۔

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ (اور نہ آپ ہی پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی) مطلب یہ ہے کہ اب بیت اللہ ہمیشہ قبلہ رہے گا کبھی منسوخ نہ ہوگا۔ اور یہ اس لئے فرمایا تا کہ اہل کتاب رسول اللہ ﷺ سے اپنے قبلہ کی طرف رجوع فرمانے سے ناامید ہو جائیں۔ یہود اور نصاریٰ ہر ایک فریق کا الگ الگ قبلہ ہے، لیکن باطل اور خلاف حق ہونے میں چونکہ دونوں یکساں ہیں اس لئے قِبْلَتَهُمْ بصیغۂ واحد فرمایا **وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ** (اور نہ ان میں سے ایک پیروی کرنے والا ہے دوسرے کی) اور چونکہ یہود کا قبلہ بیت المقدس تھا اور بیت المقدس مغرب میں ہے اور نصاریٰ کا قبلہ مشرق تھا اس لئے فرمایا کہ یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کی موافقت نہ کریں گے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ (اور اگر آپ نے ان کی خواہشوں کا اتباع کیا اس علم حاصل ہو جانے کے بعد) یعنی بعد اس کے کہ قبلہ کے باب میں آپ کو حق ظاہر اور روشن ہو گیا ہے **اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾** (تو بیشک ایسی حالت میں آپ بھی نافرمانوں میں سے ہوں گے) وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآ

marfat.com

اَنَّھُمْ سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ توبہ یہ امر جائز ہے کہ رسول اللہ ﷺ اہل کتاب کا اتباع کریں کیونکہ یہ قضیہ شرطیہ ہے اور قضیہ شرطیہ کے صدق کے لئے یہ لازم نہیں کہ اس کے طرفین بھی صادق ہوں (مثلاً اگر کوئی پیر ضعیف یوں کہے کہ اگر میں جوان ہو جاؤں تو فلاں کام کروں تو اس سے اس کے جوان ہونے اور اس کام کو کرنے کا جواز لازم نہیں آتا) چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (کہ اگر اللہ کے کوئی اولاد ہوتی تو میں اس کی اول عبادت کرنے والا ہوتا) اس تقریر کے موافق اس آیت کا مضمون عصمت کے منافی نہ رہا۔ اگر کوئی کہے کہ جب ممکن ہی نہیں کہ آپ ان کا اتباع کریں، تو اس آیت سے فائدہ کیا ہوا اور کیوں اس کو بیان فرمایا۔ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے امت کو تہدید اور تادیب مقصود ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے خلاف اہل کتاب کی خواہشوں کا اتباع کریں اور تہدید بھی نہایت مبالغہ کی اور مبالغہ بھی بہت سی وجوہ سے۔ چنانچہ اول تو قسم مقدر سے اس مضمون کو مؤکد فرمایا، دوسرے لام تمہید قسم کا لائے، تیسرے فعل کو ان (اگر) کے ساتھ معلق کیا کیونکہ یہ تعلیق اس پر صاف دال ہے کہ اگر کچھ بھی اتباع پایا جائے گا تو یہ بھی ظلم ہی شمار ہوگا۔ چوتھے رسول اللہ ﷺ کو باوجود حبیب ہونے کے یہ خطاب فرمایا تو اس سے اوروں کو نہایت بلیغ دھمکی ہو گئی (جیسے کوئی حاکم اپنی رعایا کے سنانے کے لئے کسی اپنے مطیع و فرماں بردار سے کہے کہ دیکھو اگر تم بھی ایسا کرو گے تو سزا پاؤ گے) پانچویں مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ میں تفصیل بعد اجمال ہے کہ اول ما موصولہ سے علم کو مجملاً ذکر فرمایا۔ مِنَ الْعِلْمِ سے اس کی تفصیل فرمادی اور ظاہر ہے کہ تفصیل بعد اجمال میں زور ہی ہوتا ہے۔ چھٹے علم کو معرف باللام ذکر فرمایا۔ ساتویں جزاء کو ان اور لام تاکید اور جملہ اسمیہ سے مؤکد کیا۔ آٹھویں کلمہ اذا (اس وقت) کہ یہ بھی مفید مبالغہ کو ہے لائے۔ نویں من تبعیضیہ لائے کہ اس سے نہایت مبالغہ ہو گیا کیونکہ جملہ زید علماء میں سے ہے بہ نسبت زید عالم ہے کہ زیادہ بلیغ ہے۔ دسویں الظّٰلِمِيْنَ کو معرف باللام لائے کہ کمال ظلم کو مقتضی ہے۔ گیارہویں ظلم کو کسی قید سے مقید نہیں کیا اس سے فائدہ تعمیم کا ہو۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ (وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی محمد ﷺ کو پہچانتے ہیں) حاصل آیت کا یہ ہے کہ اہل کتاب کے علماء محمد ﷺ کو خوب جانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر تورات میں ہے اور جن پر ایمان لانے اور جن کی مدد کرنے کا ہم کو حکم ہوا ہے۔ اس تفسیر کے موافق يَعْرِفُوْنَهٗ میں ضمیرہ محمد ﷺ کی طرف راجع ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ علم یا قرآن یا تحویل قبلہ کی طرف راجع ہے۔ مگر محمد ﷺ کی طرف راجع ہونا زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر قرآن یا علم یا تحویل قبلہ کی طرف راجع ہوتی تو۔

كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ ط (جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو) فرمانا مناسب نہ تھا۔ بیٹوں کے پہچاننے سے اسی لئے تشبیہ دی کہ اپنا بیٹا جو اپنے گھر پیدا ہوا وہ کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتا اب جو شخص حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کرتا تھا اس کا مبنی تعصب اور عناد تھا۔ جی میں سب جانتے تھے کہ آپ نبی برحق ہیں۔ نیز اگر یعرفونہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہوتی تو بجائے یعرفون ابناء ھم کے کما یعرفون التوراۃ (جیسے پہچانتے ہیں تورات کو) فرمانا مناسب تھا۔ مروی ہے کہ عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سلام سے دریافت کیا کہ آپ صاحبان رسول اللہ ﷺ کو بیٹے کی طرح کس طرح پہچانتے تھے۔ فرمایا جب میں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو فوراً ایسا ہی پہچان لیا تھا جیسا اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں بلکہ اپنے بیٹے سے بھی زیادہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ کیسے کہا اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب میں آپ ﷺ کی صفت اور علامات بیان فرمائی ہیں اس سے ہم نے فوراً معلوم کر لیا کہ آپ ﷺ نبی برحق ہیں۔ اور بیٹوں کا بیٹا ہونا تو صرف قرائن ظاہرہ محتملہ سے معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ بیٹا کسی اور کا ہو، عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بے شک آپ نے سچ کہا اللہ نے آپ کو خیر کی توفیق دی۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْھُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ (اور کچھ لوگ ان میں ہیں کہ چھپاتے ہیں حق بات حالانکہ وہ جانتے ہیں) یعنی محمد ﷺ کی صفت اور آپ کا نبی قبلتین ہونا جو تورات میں مذکور ہے اس کو چھپاتے ہیں۔

وقف منزل

marfat.com

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (حق وہی ہے جو خدا کی طرف سے ہے) الحق یا تو خبر مبتدا محذوف کی ہے اور من ربک یا حال ہے یا خبر بعد خبر ہے یا فاعل فعل مقدر کا ہے۔ تقدیر اس صورت میں اس طرح ہو گی جاءَ کَ الحق (آیا آپ کے پاس حق) یا الحق مبتدا ہے اور من ربک خبر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے حق وہی ہے جو آپکے پروردگار کی طرف سے ثابت ہے اور جس پر آپ ہیں اور سوائے اس کے جس پر اہل کتاب ہیں خلاف حق اور باطل ہے۔

ع ۱۷ / ۱ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۴۷﴾ (سو آپ شک کرنیوالوں میں سے نہ ہو جئے) اس کے یا تو یہ معنی ہیں کہ آپ ان لوگوں میں سے نہ ہوں جو اس کے پرودگار کی طرف سے ہونے میں شک کرتے ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان لوگوں میں سے نہ ہوں جو حق کو باوجود اس کے عالم ہونے کے چھپاتے ہیں اور باوجود علم یقینی ہونے کے شک کرتے ہیں۔ حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کو شک سے نہی فرمانا مراد نہیں کیونکہ آپ کو تو شک ہو ہی نہیں سکتا اور نیز نہی ایسے فعل سے ہوتی ہے جس میں آدمی کو اختیار ہو اور شک کا وجود و عدم دونوں اختیار سے خارج ہیں، اس لئے شک سے نہی فرمانا تو بن نہیں سکتا بلکہ مراد یا تو یہ ہے کہ حق ایسی شئے ہے کہ اس میں کسی صاحب نظر کو شک کی گنجائش ہی نہیں اور یا یہ کہا جائے کہ امت کو اس بات کی تعلیم ہے کہ وہ عارفین کی صحبت اختیار کریں اور معارف کو حاصل کریں تاکہ شک سے برکنار ہو جائیں اور شک والوں کی صحبت سے اجتناب و احتراز کریں۔ کیونکہ ان کی صحبت قسم قسم کے شکوک اور اوہام پیدا کرنے والی ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جس طرف کو وہ منہ کرتا ہے) لِکُلٍّ میں تنوین مضاف الیہ (امت) کے عوض میں ہے۔ وجھۃٌ اس جانب کو کہتے ہیں جس طرف منہ کرتے ہیں یعنی ہر امت اور گروہ کا ایک قبلہ ہے اور ضمیر ہو کُلّ کی طرف راجع ہے۔ مُوَلِّیھَا کا دوسرا مفعول وجھہ محذوف ہے یعنی جس کی طرف وہ اپنا رخ کرنے والا ہے۔ چنانچہ عرب ولیتہ وولیت الیہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی شئے کی طرف توجہ کی جائے اور ولیت عنہ اس وقت بولتے ہیں جب اعراض کیا جائے۔ ابن عامر نے ھُوَ مُوَلَّاھَا پڑھا ہے۔ اس تقدیر پر معنی یہ ہوں گے وہ پھیرا گیا ہے اس کی طرف۔ حاصل یہ ہے کہ عادت اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اسی طرح ہے کہ ہر ایک امت کا ایک قبلہ مقرر فرماتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے علیحدہ قبلہ بنایا اور محمد ﷺ کا علیحدہ۔ اسی طرح ہر نبی کا قبلہ جدا مقرر فرمایا۔ غرض قبلہ کا مسئلہ عبادات سے ہے کہ جس میں رائے کو دخل نہیں اور نہ کسی خصوصیت مکانی پر اس کا مدار ہے اس لئے اس میں نزاع جائز نہیں۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (سو تم دوڑو نیکیوں کی طرف) یعنی امتثال امر خداوندی میں پیش قدمی کرو جس وقت اللہ تعالیٰ بیت المقدس کے استقبال کا حکم فرمائے اس طرف توجہ کرو اور جس وقت کعبہ کی طرف توجہ کرنے کا حکم دے تو کعبہ کی طرف مائل ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہے حکم کرے تم کو نزاع کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

أَيْنَ مَا تَكُونُوا (تم جہاں کہیں ہو گے) مطلب یہ ہے کہ تم خواہ ہماری مرضی کے موافق استقبال کرو یا نہ کرو۔

يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۴۸﴾ (لائے گا اللہ تعالیٰ تم کو اکٹھا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے) بہر حال حق تعالیٰ تمہاری سب کی ارواح قبض فرمائے گا اور پھر تمہیں بدلہ دینے کے لئے جمع کرے گا۔ اور تمہارے اعمال کے موافق تمہیں پاداش دے گا تو کیا اچھی بات ہو کہ قبض روح کے وقت تم نماز میں ہو یا نماز سے فارغ ہو چکے ہو یہ عین سعادت و فوز ہے۔ ایک تفسیر ولِکُلٍّ وجھۃٌ الخ کی یہ تھی جو ہم نے بیان کی اور ایک معنی اور ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر مسلمان کا ایک قبلہ ہے اگر جہت کعبہ کو جانتا ہے تو وہی قبلہ ہے اس کی طرف منہ کرے اور اگر معلوم نہیں ہے کہ قبلہ کس طرف ہے تو اس کا قبلہ وہی ہے جس طرف دل گواہی دے اور اگر آبادی کے باہر سواری پر نفل پڑھنا چاہتا ہے تو جدھر سواری کا رخ ہو وہی قبلہ ہے۔ تو تم کو چاہئے کہ نماز کو اپنے وقت پر پڑھو اگر سفر میں بالفرض قبلہ کا پتہ نہ چلے تو اس میں حیلہ سے نماز میں دیر نہ کرو جس طرح دل گواہی دے، اس طرف پڑھ لیا کرو۔ خواہ تم شرق میں ہو یا غرب میں جہاں کہیں ہو گے اللہ تعالیٰ تمہاری نماز قبلہ ہی کی طرف کر دے گا اور اسے ایسا کرے گا کہ گویا کعبہ کی طرف پڑھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے۔

marfat.com

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ (اور جس جگہ سے آپ نکلیں) من حیث خرجت کا معطوف علیہ مقدر ہے اور معنی شرط کو شامل و متضمن ہے اسی واسطے جواب فول پر فاء لائے۔ معنی یہ ہوں گے کہ اے محمد ﷺ جہاں کہیں تم ہو اور جس جگہ سے نکلو تو اپنا منہ مسجد حرام کی جانب کر لو۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے۔ ومن حیث خرجت کے معنی بطور مجاز کے یہ ہیں کہ آپ جہاں کہیں ہوں اور جس طرف متوجہ ہوں اور علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ حیث مضاف ہے اور خرجت مضاف الیہ اور مضاف مضاف الیہ سے مل کر من کا مجرور ہے۔ جار مجرور مل کر متعلق ہے فول کے اور ایسے موقع پر فا کا مابعد بھی اپنے ماقبل میں عمل کرتا ہے لیکن اس ترکیب کے موافق واو اور فا کا اجتماع لازم آتا ہے اور یہ ناجائز ہے البتہ اگر و من حیث کا معطوف علیہ مقدر مان لیا جائے تو دشواری جاتی رہے گی، تقدیر عبارت کی اس طرح ہو جائے گی فَوَلِّ وَجْهَکَ اینماکنت و من حیث خرجت یعنی پس پھیر لیجئے منہ اپنا جہاں کہیں آپ ہوں اور جس جگہ سے آپ نکلیں۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ (تو کر لیجئے اپنا منہ مسجد حرام کی جانب) تکرار حکم یہ بتانے کے لئے ہے کہ سفر اور حضر میں حکم یکساں ہے کچھ فرق نہیں۔

مسلم نے حذیفہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم کو اور امتوں پر تین باتوں سے فضیلت ہے۔ اول تو ہماری نماز میں جماعتیں مثل ملائکہ کی جماعت کے بنائی گئیں۔ دوسرے ہمارے لئے زمین کو مسجد بنا دیا یعنی جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ تیسرے زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک کرنے والی بنائی گئی۔ (یعنی پانی نہ ہونے یا مضر ہونے کے وقت تیمم مشروع فرمایا)

وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۱۴۹ (اور وہی حق ہے آپکے پروردگار کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو) تَعْمَلُوْنَ کو ابو عمرو نے یاء سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے تاء سے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (اور اے محمد ﷺ جہاں کہیں سے آپ نکلیں تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیجئے اور اے مسلمانوں تم بھی جہاں کہیں ہو اپنے منہ اسی طرف کر لیا کرو) مفسرین نے کہا ہے کہ تحویل قبلہ سے تین امر مقصود تھے اور وہ تینوں امر گویا تحویل کی علت ہیں۔ اول تو رسول اللہ ﷺ کا اظہار شرف و عظمت کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رضا کے موافق تبدیل قبلہ منظور فرمایا۔ دوسرے عادت اللہ اول سے جاری ہے کہ اولو العزم پیغمبروں کے لئے مستقل جداگانہ قبلہ مقرر فرماتے ہیں (چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے الگ اور موسیٰ علیہ السلام کا جدا قبلہ تھا) اس لئے حضور ﷺ کے لئے بھی الگ قبلہ قائم فرمایا۔ تیسرے مخالفین کے الزام اور حجت کو دفع فرمانا منظور تھا اور کلام کی خوبی یہ ہے کہ علت معلول دونوں ساتھ ذکر کئے جائیں، یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا (۔ اول غرض یعنی اظہار شرف نبوی کے لئے تو اول مرتبہ ذکر فرمایا اور دوسری علت یعنی ہر نبی کا الگ مستقل قبلہ ہونا اس کو وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ الخ سے بیان فرمایا اور تیسرے علت کو مع معلول کے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ سے آخر رکوع تک بیان فرمایا) اس تقریر کے موافق عبارت میں کوئی تکرار نہیں رہی اور نیز مکرر بیان فرمانے کی یہ بھی وجہ ہے کہ چونکہ تحویل قبلہ ایک مہتم بالشان واقعہ ہے اور علاوہ بریں کسی حکم کا منسوخ ہونا محل فتنہ اور موجب شبہ ہے تو مناسب اور لائق ہوا کہ یہ مسئلہ مکرر بیان کر کے مؤکد کر دیا جائے۔

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ڎ (تاکہ لوگوں کا تم پر کوئی الزام نہ رہے) یہ فَوَلُّوْا کی علت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے مومنو تحویل قبلہ کی یہ وجہ ہے کہ یہود کو تم پر کسی طرح کا الزام نہ رہے کیونکہ توراۃ میں صاف لکھا ہے کہ کعبہ قبلہء ابراہیمی ہے اور نبی آخر الزماں کا بھی قبلہ وہی کر دیا جائے گا تو اب اگر تحویل قبلہ نہ ہوتی تو یہود حجت پکڑتے اور کہتے کہ دیکھو توراۃ میں جو علامت نبی آخر الزمان کی لکھی ہے وہ ان میں موجود نہیں ہے اور نیز یہ وجہ ہے کہ مشرکین مکہ تم کو طعن نہ کریں کیونکہ وہ بھی جانتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا پس اگر تحویل نہ ہوتی تو اعتراض کرتے کہ محمد ﷺ ملت ابراہیمی کے تو مدعی ہیں لیکن ان کے قبلہ سے روگرداں ہیں اب ہر دو فریق کی زبان بند ہو گئی۔

marfat.com

اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ (سوائے ان لوگوں کے جو ان میں ظالم ہیں) یہ للناس سے استثناء ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی زبان بند ہو جائے گی کوئی طعن نہ کر سکے گا۔ مگر ظالم اور معاند اب بھی نہ مانیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ قریش میں جو لوگ معاند تھے انہوں نے تو یہ کہا کہ محمد ﷺ کو اب خبر ہوئی ہے کہ ہم لوگ راہ راست پر ہیں پہلے سے ہم کو گمراہ سمجھتے تھے اس لئے ہمارے قبلہ کو اختیار کیا اور یہود میں جو سرکش تھے انہوں نے یہ بکواس کی کہ محمد ﷺ جانتے تھے کہ بیت المقدس قبلہ ہے باوجود اس علم کے جو اس طرف پھر گئے اس کی وجہ حسد یا خود رائی ہے۔ کفار کے ان بے ہودہ الفاظ کو حجت اس لئے فرمایا کہ وہ اپنے نزدیک ان خرافات کو حجت ہی سمجھتے تھے اور آیت حجتهم داخضة میں بھی اسی وجہ سے حجت کو بمعنی احتجاج کہا ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ استثناء کی وجہ یہ ہے کہ بطور مبالغہ یہ امر اچھی طرح ظاہر ہو جائے کہ لوگوں کے پاس تحویل قبلہ کے باب میں کسی اعتراض والزام کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ظالم اور معاند کے پاس تو کوئی حجت ہوا ہی نہیں کرتی ان سب توجیہات پر الذین ظلموا مجرور ہو گا الناس سے بدل ہو گا اور بعض نے کہا ہے کہ استثناء منقطع ہے اور معنی یہ ہیں کہ کسی کو تم پر مجال طعن کی نہ ہو گی لیکن معاندین البتہ خواہ مخواہ کا مجادلہ و جھگڑا کریں گے۔

فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِیۡ ۚ (سو تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو) یعنی ان معاندین سے مت ڈرو کیونکہ ہم تمہارے حمایتی و مددگار ہیں تم کو ہی ان پر حجت میں غلبہ رہے گا اور انکا طعن تم کو مضر نہ ہو گا البتہ ہماری مخالفت نہ کرو اور ہم سے ڈرو۔

وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَلَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ (اور تاکہ پورا کروں میں تم پر اپنا فضل اور تم ہدایت پاؤ) یا تو لِئَلَّا الخ پر عطف ہے اور یا محذوف پر ہے اس صورت میں تقدیر عبارت کی یوں ہو گی اخشونی لا حفظکم ولا تم نعمتی یعنی مجھ سے ڈرو تاکہ میں تمہاری حفاظت کروں اور تاکہ اپنی نعمت تمام کروں۔ حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نعمت کا پورا ہونا جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے خلاصی پانا ہے۔ اس حدیث کو بخاری اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نعمت کی تکمیل اسلام پر مرنا ہے۔

کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ (جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں) اس میں قریش کو خطاب ہے اور لوگ ان کے تابع ہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا تھا کہ اے ابراہیم ہم تم کو امام بنائیں گے تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ اے اللہ میری اولاد میں سے بھی امام بنایئے تو یہ اس دعاء کی قبولیت ہے کہ قریش اور لوگوں کے سردار ہیں۔ دوسرے لوگ ان کے تابع ہیں۔ جناب سرور دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ لوگ قریش کے تابع ہیں کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا، لِاُتِمَّ کے متعلق ہے اور معنی یہ ہیں کہ تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں جیسے کہ رسول بھیجنے کی نعمت پوری کی۔

محمد ابن جریرؒ کہتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے دو دعائیں کی تھیں ایک تو یہ تھی اَجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّکَ یعنی اے اللہ ہم کو اپنا فرمانبردار بنایئے اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو بھی اپنا فرمان بردار بنایئے اور دوسری دعاء یہ تھی کہ اے اللہ ان میں سے ایک رسول بھیجئے سو آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم ابراہیمؑ کی دعا قبول کرینگے یعنی تم کو ہدایت دیں گے اور مسلمان بنا دیں گے اور اپنی نعمت تم پر کامل کریں گے جیسے ہم نے ان کے رسول بھیجنے کی دعا قبول کر لی ہے اور کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا اُذۡکُرُوۡنِیۡ جو بعد میں مذکور ہے اس کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے میں نے تم کو رسول بھیج کر یاد کیا تم مجھ کو یاد کرو پھر میں تم کو یاد کروں گا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بندہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اس کے یاد کرنے سے پہلے اور پیچھے اس کو اللہ تعالیٰ یاد کرتا ہے۔ پہلے تو اس طرح کہ ذکر کی توفیق دیتا ہے اور بعد میں اس طور پر کہ اس یاد کی جزا دے گا۔

رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾ معانقۃ

(ایک رسول تم ہی میں سے جو پڑھتے ہیں تم پر ہماری آیتیں اور تم کو پاک صاف کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں کتاب اور علم اور بتاتے ہیں تم کو وہ باتیں جو نہ جانتے تھے تم) رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ میں رسول سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ تعلیم کو دو مرتبہ ذکر فرمانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تعلیم اور قسم کی ہے تو ممکن ہے کہ اس دوسری تعلیم سے مراد علم لدنی ہو

marfat.com

کہ جو ظاہر قرآن سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ باطن قرآن اور سینہ بہ سینہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا سوائے انعکاس اس نور کے اور کوئی طریقہ نہیں اور اس کی حقیقت کا ادراک بعید از قیاس ہے۔ چنانچہ رئیس صدیقین فرماتے ہیں کہ ادراک کے ادراک سے عاجز ہونا ہی خود ادراک[1] ہے۔ حنظلہ بن ربیع اسیدی سے مسلم میں مروی ہے کہ مجھ سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ملے اور پوچھا کہ اے حنظلہؓ کیا حال ہے میں نے عرض کیا کیا پوچھتے ہو حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ فرمایا سبحان اللہ یہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا جس وقت ہم بارگاہ اقدس ﷺ میں حاضر ہوتے ہیں تو حضور ﷺ ہم کو دوزخ اور جنت کا وعظ فرماتے رہتے ہیں اس وقت یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب وہاں سے چلے آتے ہیں تو بیوی بچوں اور جائیداد کے قصوں میں ایسے مشغول ہو جاتے ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ ابو بکرؓ نے فرمایا بھائی واللہ

[1] علم اور انکشاف دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کے عمومی اور خصوصی احوال کو ذہن میں ترتیب دے کر ایک مخصوص نتیجہ اخذ کیا جائے مثلاً آگ کا محرق ہونا اس طرح سمجھا جائے کہ آگ ایک بہت زیادہ شدید الحرارت عنصر ہے اور ہر شدید الحرارت عنصر محرق ہوتا ہے اس لئے یقیناً آگ محرق ہے گویا احراق نار کا علم چند اصول کی مقررہ ترتیب کے بعد حاصل ہوا۔ اولاً آگ کا شدید الحرارت عنصر ہونا تسلیم کیا گیا پھر ہر شدید الحرارت عنصر کا محرق ہونا مانا گیا اس ترتیب فکری کے بعد آگ کا محرق ہونا سمجھ میں آیا یہ انجلاء اور انکشاف ذہنی عمل ترتیبی کے بعد حاصل ہوا لیکن اس ترتیب فکری کے لئے ضروری ہے کہ اول ذہن میں آگ کا مفہوم اور شدت حرارت کا تصور موجود ہو اگر آگ کی بالذات حرارت کا تصور کرنے سے ذہن عاجز ہو گا تو آگ کے محرق ہونے کا انکشاف نہیں ہو گا۔ علم کی دوسری نوعیت اس طرح ہوتی ہے کہ بغیر ترتیب مقدمات کے نتیجہ کا انکشاف ہو جاتا ہے مثلاً سورج کا طلوع، برف کی سردی، آگ کی گرمی، ہم بغیر کسی غور و فکر کے سمجھتے جانتے اور محسوس کرتے ہیں یہ دونوں قسمیں علم تحصیلی اور عملی کی ہیں۔ علم کی ایک اور قسم ہے جس کو علم حضوری کہتے ہیں اس میں تصور ذہنی کی ضرورت ہی نہیں پڑھتی نہ شئی معلوم کی صورت ذہن میں آتی ہے بلکہ انسان کے نفس کے سامنے خود معلوم اپنی پوری حقیقت اور احوال کے ساتھ بالاجمال موجود ہوتا ہے۔ جیسے ہم اپنے وجود اور اپنی انانیت کو جانتے اور یقین رکھتے ہیں کہ ہم ہم ہیں۔ باری تعالیٰ کی ذات و صفات اور مبدءٔ معاد کے تمام فوق الطبعیات تفصیلی احوال کا انکشاف ذہنی ترتیب سے ممکن نہیں ہے۔ ذہنی ترتیب میں مقدمات کا علم پہلے سے ہونا چاہئے اور الٰہیات کے مباحث میں اس کا امکان نہیں۔ پھر ذہنی عمل کبھی غلط بھی ہوتا ہے۔ طبعیات اور محسوسات میں بھی انسان کا فکر یہ کبھی صحیح نہیں ثابت ہوتا۔ الٰہیات کا تو ذکر ہی کیا ہے وہاں فکر سے کام لینا ایسا ہے جیسے تاریکی میں مادرزاد بینا کا ہاتھ پاؤں مار کر سیدھا راستہ دریافت کرنا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکری اور کسبی عمل الٰہیات کے مباحث کو دریافت کرنے کے لئے قطعاً بے سود بلکہ ضرر رساں ہے۔ رہا بدیہی علم کا حصول تو اس کی نفی بالکل ہی واضح ہے۔ جس علم کو ہم غور و فکر کے ساتھ بھی حاصل نہیں کر سکتے اس کا حصول بغیر فکر و نظر کے کس طرح ہو سکتا ہے لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ ہم باری تعالیٰ کی ذات و صفات، ملائکہ، عالم مثال اور مبدء و معاد کے متعلق جو کچھ علم رکھتے ہیں اور ہم کو اس سلسلہ کا جو انکشاف ہوتا ہے وہ فوق العقل ہے۔ عقل اس میدان میں دوڑنے سے عاجز ہے۔ اس روشنی کے حصول کا آلہ صرف وجدان ہے۔ لیکن ہمارا عرفانی وجدان اتنا روشن اور مصفی نہیں کہ براہ راست صفحات قدسیہ اور موجودات غیر مادیہ اور حقائق ماضیہ و مستقبلہ کا ادراک کر سکے۔ ہم کو ضرورت ہے کہ کوئی قوی روشن عکاس وجدان والی ہستی ہو جو آئینہ کی طرح دو رخ رکھتی ہو اس کی پشت پر مادیت کا مصالحہ چسپاں ہو اور سامنے کا رخ روشن ہو وہ اپنے روشن رخ کی صفائی کی وجہ سے غیر مادی الٰہیات کی آفتابی شعاعوں کو حاصل کر کے مادی پشت کی وجہ سے اپنے اندر سما سکے اور آفتاب معرفت کی طرف سے ہماری طرف ذرا اپنے رخ کو موڑ کر ہم پر پرتو انداز ہو سکے۔ یہی آئینہ نبوت ہے جو علوم غیر مادیہ اور صفات قدسیہ کا نور چین بھی ہے اور ہم پر عکس ریزی بھی کرتا ہے۔ ہمارا وجدان اسی آئینہ کے توسط سے روشن اور تابناک بن جاتا ہے ہم اسی سراج منیر سے اپنے اپنے وجدانی چراغوں کو بقدر ظرف روشن کرتے اور دوسروں تک اس سراج منیر کی روشنی پہنچاتے ہیں۔ لیکن اس نور چینی پر تو اندوزی اور عکاسی کی حقیقت کو ادراک کرنے سے ہم عاجز ہیں۔ ہمارا یہ علم حصولی تو قطعاً نہیں ہو تاہم حکمت اور کتاب کی ظاہری تعلیم یقیناً تحصیلی اور کسبی ہوتی ہے مگر یہ باطنی وجدانی روشنی حصولی نہیں ہو سکتی حضوری ہوتی ہے۔ تصور اور تصویر کے توسل سے نہیں ہوتی۔ مشاہدہ اور معائنہ کی شکل میں ہوتی ہے مگر ہم اس ادراک کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایک کیف ہوتا ہے ناقابل فہم و افہام۔ ایک تاثر ہوتا ہے ادراک کی رسائی سے خالی پس صدیق اکبرؓ کا یہ قول اپنے اندر ایک حقیقت عرفانیہ رکھتا ہے کہ ذات و صفات کے ادراک الادراک سے قاصر رہنا ہی ہمارے لئے ادراک ہے۔ واللہ اعلم۔

marfat.com

ہماری بھی یہی حالت ہے (چلو حضور ﷺ سے چل کر اس بارے میں دریافت کریں) حضور ﷺ کی خدمت بابرکت میں آئے اور عرض کیا یارسول اللہ حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ فرمایا یہ کیا، میں نے عرض کیا یارسول اللہ آپ کی خدمت میں جب تک ہم رہتے ہیں تو آپ ہم کو جنت دوزخ کا ذکر سناتے ہیں حتیٰ کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب چیز ہمارے سامنے ہے اور جب ہم یہاں سے جاتے ہیں تو بیوی بچوں اور دنیا کے دھندوں میں مشغول ہو جاتے ہیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ حضور ﷺ نے سن کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تمہاری ہمیشہ وہی حالت رہے جو میرے پاس رہتی ہے تو تم سے ملائکہ تمہارے بچھونوں پر اور راستوں میں آکر مصافحہ کرنے لگیں۔ لیکن حنظلہ یہ حالت کبھی کبھی ہوا کرتی ہے (حاصل یہ ہے کہ اگر یہی حالت رہے تو ملکیت غالب ہو جائے اور کارخانۂ عالم بالکل درہم برہم ہو جائے اور یہ عالم عالم ملکوت ہو جائے اور اس عالم کے پیدا کرنے کی حکمت مفقود ہو جائے اس لئے یہی مناسب ہے کہ یہ حالت کبھی کبھی ہو)۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کئے ہیں ایک تو ان میں سے تم کو تقسیم کر دیا اور دوسرے کی اگر میں تم میں اشاعت کروں تو میرا حلقوم کاٹ دیا جائے۔ اس حدیث کو بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ شراح حدیث نے کہا ہے کہ اس دوسرے علم سے مراد وہ احادیث ہیں کہ جن میں ظالم بادشاہوں اور خلفاء کے نام اور حالات تھے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے اللہ میں ۶۰ ہجری کے شروع سے اور لڑکوں کی سلطنت سے پناہ مانگتا ہوں۔ لڑکوں کی سلطنت سے یزید بن معاویہؓ کی خلافت مراد ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے جو ان شراح نے لکھا ہے کیونکہ چند واقعات جزئیہ کے علم کو علم کا برتن کہنا اور علوم شرعیہ کا قسیم بنانا کسی طرح مناسب نہیں۔ علم کا برتن کہنے اور علوم شرعیہ کا مقابل ٹھہرانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس علم سے مراد کوئی بڑا علم ہے جو علوم شرعیہ کی مثل اور مقابل بن سکتا ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ اس علم سے مراد علم لدنی ہے۔ اگر اس پر کوئی کہے کہ اچھا علم لدنی ہی سہی تو پھر اس میں گلا کٹنے کی کیا بات ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر میں اس علم کو زبان سے بیان کروں تو لوگ گلا کاٹ دیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علم لدنی کے معارف اور علوم کی تعلیم اس زبان قال سے ہرگز نہیں ہو سکتی اگر ہو سکتی ہے تو زبان حال سے یا ایک قلب کا دوسرے قلب پر عکس واقع ہونے سے کیونکہ زبان سے تعلیم و تعلم چند امور پر موقوف ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ شئے اس قسم کی ہو کہ جو علم اکتسابی سے حاصل ہو سکتی ہو اور دوسرے یہ کہ الفاظ اس کے مقابلہ میں موضوع ہوں اور تیسرے یہ کہ سامع کو وضع کا علم ہو اور علم لدنی میں یہ سب امور مفقود ہیں نہ تو علم حصولی سے مدرک ہو سکتا ہے بلکہ اس کا ادراک علم حضوری سے ہوتا ہے کہ جس سے کسی وقت غفلت نہیں ہوتی اور نہ ان معارف کیلئے الفاظ موضوع اور نہ سامعین کو علم بالوضع۔ جب یہ بات ہے تو اب جو کوئی ان معارف و علوم کو تعبیر کریگا۔ ضرور اُ[1] استعارات مجاز کو کام میں لائے گا اور استعارات سے مقصود تک راہ یابی نہیں ہوتی بلکہ عوام تو ان استعارات کے مقصود سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں، اسی لئے خبط میں پڑ جاتے ہیں اور جو متکلم کی مراد ہے اس کے خلاف معنی سمجھتے ہیں۔ اب یا تو متکلم کی تفسیق

---

[1] جب تک حقیقت و مجاز کے درمیان کوئی علاقہ اور مناسبت نہ ہو اس وقت تک مجازی معنی مراد نہیں ہو سکتے۔ حقیقت وضعیہ کو چھوڑ کر مجاز کا استعمال قرآن مجید میں بکثرت ہے اور قرآنی مجاز واضح ہیں۔ لیکن معارف باطنہ اور علوم لدنیہ کیلئے کلام عربی بلکہ کسی زبان میں الفاظ کی وضع ہی نہیں ہے کیونکہ کسبی اور تحصیلی معانی کیلئے الفاظ کی وضع ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ حضوری اور کشفی حقائق مادی صورتوں سے خالی ہوتے ہیں اس لئے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے الفاظ کی وضع ناممکن ہے۔ اب بطور استعارہ اگر ان غیر مادی حقائق کو بیان کیا جاتا ہے تو چونکہ مخاطب کے کسبی ذہن کی رسائی سے وہ حقائق خارج ہیں اس لئے اس کی سمجھ میں اصل حقیقت نہیں آ سکتی اور استعارہ آمیز بیان اس کے لئے گمراہ کن ثابت ہوتا ہے اور اس کا اعتقاد غلط ہو جاتا ہے یا استعارہ کے قابل فہم مطلب کو سمجھ کر وہ متکلم کو فاسق اور کافر کہنے لگتا ہے جیسا کہ حضرت محی الدین ابن عربی کے کلام حقیقت آگیں کو پڑھ کر اور استعارات کا صحیح مطلب نہ سمجھ کر کچھ علماء شرک آمیز توحید میں مبتلا ہو گئے اور کچھ لوگوں نے ابن عربی کے کافر ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ہاں وہ علماء اس فتنہ سے محفوظ رہے جنہوں نے علوم غیر مادیہ اور حقائق ملکوتیہ کا ادراک فصوص الحکم اور فتوحات کے الفاظ سے نہیں کیا بلکہ اللہ نے براہ راست یا کسی صاحب باطن کی قلبی عکس ریزی کے ذریعہ سے غیر صوری معانی کا انکشاف حضوری مجمل طور پر عطا فرمادیا اور اصل حقیقت انکے وجدان میں آگئی اب تفصیل توضیح اور تطبیق کیلئے جب انہوں نے ان کتابوں کو پڑھا تو اپنے وجدانی مجمل خاکہ کی تفصیل ان کو ان ☆

☆ کتابوں میں نظر آئی اور انکا علم حضوری اجمالی ان کتابوں کی ...

اور تکفیر کرتے یا خود کفر کے اعتقاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے فرمایا کہ اگر میں اس علم کو اس زبان سے بیان کروں تو لوگ سمجھیں گے نہیں اور مجھے کافر مرتد بنا کر قتل کر ڈالیں گے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب اس علم کی یہ حالت ہے کہ کوئی اسے بیان نہیں کر سکتا اور اگر بیان بھی کرے تو اس سے مفاسد اور قتل وقتال تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ تو پھر اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے حالانکہ بزرگوں نے اس باب میں بڑی بڑی صحیح کتابیں تصنیف کی ہیں جیسے فصوص الحکم، فتوحات وغیرہ۔ تو جواب یہ ہے کہ ان کتابوں سے یہ غرض نہیں کہ محصلین کو یہ علوم حاصل ہو جائیں یا یہ کہ ان کے دیکھنے سے کچھ قرب اور ولایت مل جاوے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو سالکین جذب یا سلوک سے ان علوم کو اجمالاً حاصل کر چکے ہیں وہ ان کتابوں کو دیکھ کر تفصیل پر قادر ہو جائیں اور اپنے احوال وکیفیات کو اکابر کے حالات سے تطبیق دیں تاکہ صحت ان احوال کی ہویدا ہو جائے اور قلوب مطمئن ہو جائیں۔ دوسرا[1] جواب یہ ہے کہ ان بزرگوں نے قصداً اس قسم کی کتابیں نہیں لکھیں بلکہ غلبۂ حال میں بہت سے مضامین ان کی زبان سے نکل گئے لوگوں نے انہیں نقل کر لیا۔ اب عوام کے لئے یہ مناسب ہے کہ اگر ایسی کتب کا مطالعہ کریں یا بزرگوں کے کلام سنیں تو ان پر انکار نہ کریں اور تا بامکان تاویل کر کے ظاہر شریعت کے موافق انکے کلام کے معنی سمجھیں یا ان کے معانی اللہ تعالیٰ کے حوالہ کریں کیونکہ انکے کلام میں طرح طرح کے مجاز و استعارات ہیں اور وہ کسی طرح مخالف شرع کے نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کتاب وسنت کا مغز یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی یہ دولت اپنے فضل سے بخشیں آمین۔ جب یہ معلوم ہو چکا کہ معارف و حقائق یا تو انعکاس قلوب سے حاصل ہوتے ہیں اور یا القاء سے دستیاب ہوتے ہیں۔ اور کثرت ذکر ومراقبہ خواہ مجلس ذکر میں ہو یا خلوت میں اس انعکاس کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے لو وہ انعکاس خود جناب رسول اللہ ﷺ سے بلا واسطہ یا وسائط کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ذیل کی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اس ذکر کو بیان فرماتا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ (تو یاد رکھو تم مجھ کو) ابن کثیر نے فاذکرونی کی یا کو مفتوح پڑھا ہے اور باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے۔

اَذْكُرْكُمْ (میں یاد رکھوں گا تم کو) ابو الشیخ نے اور دیلمی نے مسند فردوس میں جویبر کے واسطے سے جویبر نے ضحاک سے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فاذکرونی اذکرکم کے بارے میں فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے بندو! تم مجھ کو میری عبادت سے یاد کرو یعنی میری عبادت کرو میں تم کو مغفرت سے یاد رکھوں گا میں تمہارے گناہوں سے در گذر کروں گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ جیسا میرے ساتھ اعتقاد رکھتا ہے میں اس سے اسی طرح پیش آتا ہوں اور وہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں اگر مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے میں بھی اس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس کی مجلس سے اچھی مجلس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور اگر ایک ہاتھ میری طرف چلتا ہے تو میں ایک گز اس کی طرف چلتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور علامہ بغویؒ نے اس حدیث کو انسؓ سے روایت کیا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کو جناب رسول اللہ ﷺ سے اپنی انگلیوں کی گنتی کی برابر سنا۔

اور عبد اللہ بن شقیقؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر آدمی کے دل میں دو کوٹھڑیاں ہیں۔ ایک میں فرشتہ رہتا ہے اور دوسری میں شیطان۔ جب آدمی ذکر اللہ کرتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے اور جب ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو

---

[1] یعنی جذب، استغراق اور غلبۂ حال کے زیر اثر ان بزرگوں نے اپنے الفاظ میں مافوق المادیت حقائق کی تعبیر کی، جو ظاہر ضوابط شرعیہ کے خلاف ہے لیکن حالت جذب میں وہ چونکہ مرفوع القلم ہیں فقدان ہوش ان کو غیر مکلف بنا دیتا ہے۔ مجنوں تو ازن حواس کھو بیٹھتا ہے اس لئے حالت جنون میں مکلف نہیں رہتا۔ اصحاب جذب کا جذبہ و استغراق تو حسی دماغ کو بگاڑنے کے لئے معمولی جنون سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے اس لئے ایسے لوگ مکلف ہی نہیں ہیں۔ یہ عبارتیں تو ان کی زبانوں پر حالت جذب میں آ گئی تھیں لوگوں نے ان کو جمع کر کے کتابوں کی شکل دے کر شائع کر دیا ورنہ ان کا مقصد شریعت کے خلاف طریقت قائم کرنے کا نہ تھا۔ ۱۲

maktabah.org

شیطان اپنی چونچ اس کے قلب میں رکھتا اور بہکاتا ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مفردین سبقت لے گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مفردین کون ہیں۔ فرمایا اللہ کا بہت ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اے عزیز جاننا چاہئے کہ ذکر کی حقیقت غفلت کو دفع کرنا ہے کیونکہ غفلت ہی سبب قساوت کا ہے اور جس امر مشروع سے خواہ وہ فعل ہو یا قول یا تفکر اللہ کی رضا مندی، اخلاص اور حضور قلب سے طلب کی جائے یہی ذکر ہے اور اگر بلا اخلاص ہو تو شرک ہے اور جو غفلت سے ہو تو وہ لغو غیر معتبر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ یعنی بے شک مراد کو پہنچے وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں اور فرمایا فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ یعنی خرابی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔ نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور مالک نے بسند صحیح جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ افضل الذکر "لا الہ الا اللّٰہ" ہے اور افضل دعا "الحمد للہ" ہے اور سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل کلام چار کلمات ہیں۔ سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ، اللّٰہ اکبر۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ یہ کلمات قرآن کے بعد افضل کلام ہیں اور یہ خود قرآن ہی سے ماخوذ ہیں۔ اس روایت کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے اور حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص قرآن مجید میں مشغول رہے اور اس کی مشغولی کی وجہ سے میرے ذکر اور اپنی حاجت مانگنے کی بھی اسے فرصت نہ رہے تو میں اسے سائلوں سے زیادہ دوں گا۔ اور فرمایا کلام اللہ کی فضیلت اور کلام پر ایسی ہے کہ جیسے اللہ کی فضیلت تمام مخلوق پر۔ اس حدیث کو ترمذی اور دارمی نے ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا ہے۔ ان ہی احادیث کی وجہ سے صوفیہ کرام رحمہم اللہ نے ذکر لا الہ الا اللّٰہ کو خواہ قلب سے ہو یا زبان سے جہری ہو یا خفی اختیار فرمایا ہے۔ لیکن حضرت مجدد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک قرآن مجید کی تلاوت زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ ایک تو قرآن مجید کی فصیلت خود زیادہ ہے اور دوسرے قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی صفت حقیقیہ بلا واسطہ ہے۔ گویا یہ ایک رسّی ہے کہ ایک کنارہ اسکا اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور ایک ہماری طرف ہے۔ سو جو اس میں فنا ہو گیا اس سے زیادہ اسے کوئی نعمت نہیں ملی اور نیز مجدد صاحبؒ نے کثرت نوافل کو اختیار فرمایا ہے کیونکہ نماز مؤمن کی معراج ہے۔ لیکن یہ تلاوت قرآن مجید اور مشغولی نوافل بعد فناء نفس کے اختیار کرنے کو فرماتے ہیں اور قبل از فناء نفس ذکر نفی و اثبات پر اقتصار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کی مشغولی قبل از فناء مناسب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (یعنی نہیں مس کر سکتے قرآن کو مگر پاک لوگ) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رذائل نفس سے اب تک پاک و صاف نہیں ہوئے ان کو قرآن کی تلاوت سے زیادہ مناسب ذکر کرنا ہے۔

وَاشْكُرُوْا لِيْ (اور میرا احسان مانو) یعنی میری نعمتوں کا مثلاً رسول کے بھیجنے کا اور ہدایت دینے کا اور جذب اور توفیق سلوک وغیرہ کا شکریہ ادا کرو۔

وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ (اور میری ناشکری نہ کرو) یعنی کفران نعمت نہ کرو۔ مثلاً نعمتوں کا انکار اور انبیاء کی تکذیب اور ع ۱۸ ۵ ۲
نیک کام کا حکم دینے والے کی مخالفت اور وقت کو ضائع اور ذکر سے اعراض مت کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ (اے ایمان والوں مدد چاہو صبر سے) یعنی اپنے حوائج دینی اور دنیوی میں خاص کر درجات قرب و معرفت کے حاصل کرنے میں صبر اور نماز سے مدد لو، صبر لغت میں روکنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی خواہشات نفسانیہ کو روکو کیونکہ جہنم ان ہی سے ڈھکی ہوئی ہے اور اپنے نفس کو جانی اور مالی مشقتوں اور سختیوں پر روکو کیونکہ جنت ان ہی سے گھیری ہوئی ہے۔ نیز بری مجالس سے یکسوئی اور ذکر و اطاعت پر نفس کو مجبور کرد کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خلوت کی فضیلت میں فرمایا ہے کہ مسلمان کا عمدہ مال بکریاں ہیں کہ انہیں لے کر کسی پہاڑ کی چوٹی میں چلا جائے اور فتنوں سے اپنے دین کو بچائے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

marfat.com

وَالصَّلٰوةِ (اور نماز سے) صبر میں اگرچہ نماز بھی داخل ہو گئی تھی لیکن نماز کے مہتم بالشان اور ام العبادات اور معراج مؤمن ہونے کی وجہ سے اسے خاص طور پر جداگانہ ذکر فرمایا۔ حضرت علیؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔ اس حدیث کو صاحب مسند فردوس نے روایت کیا ہے۔ اور انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز مؤمن کا نور ہے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبادت گزاروں کے درجات کی انتہا اور بازگشت نماز کی حقیقت ہے اور نماز کی کثرت سے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ اور صلوٰۃ حاجت کا ذکر پہلے گذر چکا۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ (اور بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

اللہ کے صبر کرنے والوں کے ساتھ ہونے کے معنی مفسرین نے یہ بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مدد اور نصرت اور قبول دعا سے صابروں کے ساتھ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ساتھ ہونے سے ایک بلا کیف قرب مراد ہے کہ وہ عارفین پر روشن ہے اور اس کی پوری حقیقت عالم الغیب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ (اور نہ کہو جو لوگ مارے جائیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردے ہیں) اَمْوَاتٌ مبتدائے محذوف (هُمْ) کی خبر ہے۔ یہ آیت شہدائے بدر کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ شہداء بدر میں چھ آدمی تو مہاجرین میں سے تھے اور آٹھ انصار سے۔ لوگ ان کی نسبت کہا کرتے تھے کہ ہائے فلاں شخص مر گیا اور دنیا کی نعمت اس سے چھوٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمان کے ازالہ اور ان کے درجات پر آگاہ کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

بَلْ اَحْيَآءٌ (بلکہ وہ زندہ ہیں) شہداء کے زندہ ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ارواح کو جسم کی سی قوت عطا فرماتے ہیں کہ اسکے ذریعہ سے وہ زمین، آسمان، جنت سب جگہ کی سیر کرتے ہیں اور[1] اپنے دوستوں کی مدد کرتے اور اپنے دشمنوں کو ہلاک کرتے ہیں اور اسی حیات کی وجہ سے زمین ان کے بدن اور کفن کو نہیں کھاتی۔

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ شہدائے بدر کی روحیں ہر رات عرش کے نیچے سجدہ کرتی ہیں اور اسی طرح قیامت تک کرتی رہیں گی اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہداء جب شہید ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک نہایت عمدہ جسم میں ان کو اتارتے ہیں اور روح کو حکم ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہو، وہ اس میں داخل ہو کر اپنے پہلے جسم کو دیکھتی ہے اور بولتی ہے اور سمجھتی ہے کہ لوگ میرا کلام سنتے ہیں اور مجھے دیکھتے ہیں، اسی حالت میں حوریں اس کے پاس آتی اور اس کو آ کر لے جاتی ہیں۔ اس حدیث کو ابن مندہ نے مرسلاً روایت کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ شہداء کی ارواح اللہ تعالیٰ کے یہاں سبز طائروں میں رہتی اور جنت میں جہاں چاہیں سیر کرتی پھرتی ہیں اور عرش کے نیچے جو قندیلیں ہیں ان میں آرام کرتی ہیں۔ ان احادیث پر نظر کر کے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حیات شہداء ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ یہ حیات شہداء ہی کو عطا نہیں ہوئی بلکہ آثار اور احکام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاءؑ میں یہ حیات سب سے زیادہ ہے حتیٰ کہ اس کا اثر خارج میں یہ ہے کہ نبی ﷺ کی ازواج مطہرات سے آپ کی وفات کے بعد نکاح جائز نہیں، بخلاف شہید کے کہ اس کی زوجہ سے نکاح جائز ہے اور صدیق اس حیات ہی میں شہداء سے اعلیٰ درجہ میں ہیں اور صالحین یعنی اولیاء شہداء سے کم ہیں لیکن ان کے ساتھ ملحق ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے وہ نبی اور صدیق اور شہداء اور صالحین ہیں) ترتیب ذکر سے ترتیب مرتبہ کی طرف اشارہ اکثر کلام میں ہوتا ہے، اس واسطے صوفیہ کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ ہماری ارواح ہمارے بدن ہیں۔ اور ہمارے بدن ہماری ارواح ہیں۔ اور سینکڑوں ہزاروں معتبر حکایتیں ایسی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے[1] کہ اولیاء اپنے دوستوں کی اعانت کرتے اور اپنے دشمنوں کو ہلاک و تباہ کرتے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ کی

---

[1] دوستوں کی مدد کرنا اور دشمنوں کو ہلاک کرنا شہداء کے متعلق کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ نہیں معلوم حضرت مؤلف قدس سرہٗ نے کس حدیث کی بناء پر ایسا لکھا ہے۔

marfat.com

طرف سے حکم ہوتا ہے اس کو اللہ کی راہ دکھاتے ہیں۔

حضرت مجدد صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ نبوت کے کمالات وراثۃً چلے آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ جن کو کمالات نبوت وراثۃً مرحمت ہوتے ہیں، انہیں اصطلاح شرع میں صدیق اور مقرب کہتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وجود وہبی عطا ہوتا ہے۔ ذیل کی احادیث واخبار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اور شہداء اور بعض صالحین کے بدن کو بھی زمین نہیں کھاتی۔ حاکم اور ابوداؤد نے ارس بن اوس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کا جسم حرام فرمادیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے بھی ابوالدرداءؓ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ امام مالکؒ نے عبدالرحمٰن بن صعصعہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ عمرو بن الجموحؓ اور عبداللہ بن جبیر انصاریؓ کی قبر سیلاب کی وجہ سے دھنس گئی۔ یہ دونوں حضرات احد کے دن شہید ہوئے تھے اور دونوں ایک ہی قبر میں دفن کردیئے گئے تھے۔ جب قبر سیل کی وجہ سے خراب ہوگئی تو چاہا کہ انہیں یہاں سے اور جگہ دفن کردیا جائے، قبر کھودی گئی دیکھا تو اسی طرح ہیں کوئی تغیر نہیں آیا گویا کل دفن کئے گئے تھے۔ حالانکہ ان کی شہادت کو اس وقت چھیالیس برس ہوچکے تھے۔ طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر کو نہ کھودا جائے کہ مردہ کی مخفی حالت معلوم ہوجائے کیونکہ قبر میں مردہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مخفی معاملے ہیں، نیز فرمایا کہ مردہ کو دفن کرنے کے بعد قبر میں سے نہ نکالنا چاہئے مگر اس صورت میں کہ زمین غصب کی ہوئی ہو یا شفعہ کی زمین ہو یا پانی اور دریا کے قرب کی وجہ سے اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو یا دارالحرب کی زمین میں دفن کیا گیا ہو یا مقبرہ آبادی میں آکر پرانا ہو گیا ہو اور وہاں آنے جانے میں قبروں کا خیال نہ کیا جاتا ہوں اور اونٹوں وغیرہ کا گھیر بنالیا گیا ہو۔ ان صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آجائے تو مردہ کو قبر سے نکالنا جائز ہے۔ اس پر ہی فتوےٰ ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ مردہ کو قبر میں سے نہ نکالا جائے۔ مگر کسی عذر سے اور عذر وہی ہیں جو ہم ذکر کرچکے۔ مستحب یہ ہے کہ میت کو جہاں دفن کیا جائے وہیں رہنے دیں کیونکہ بعض صحابہؓ ارض حرب میں مدفون ہوئے اور وہاں سے ان کی قبر کو کھود کر ان کے جنارہ کو نہیں لائے اور اس کو وہیں رہنے دینا مستحب ہے اور اگر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف لے جائیں تو کچھ حرج نہیں۔ اس لئے کہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انتقال مصر میں ہوا اور عذر کی وجہ سے ان کو شام لے گئے۔

اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا انتقال مدینہ سے چار فرسخ پر ہوا اور لوگ اپنی گردنوں پر اٹھا کر مدینہ شریف لائے اور یہ واقعہ ان کے دفن کردینے کے بعد کا ہے۔ ان دو کے علاوہ اوروں کی لاشوں کو بھی نقل کرنا مروی ہے۔ کہ جب امیر معاویہؓ کا ارادہ نہر کظامہ کے جاری کرنے کا ہوا تو اس کے بہنے کی جگہ شہداء احد کی قبریں واقع ہوئیں، تو حضرت معاویہؓ نے اعلان کرادیا کہ احد میں جو لوگ شہید ہوئے تھے ان کے وارث سب یہاں آئیں اور اپنے اپنے لوگوں کو لے جاکر اور جگہ دفن کریں لوگ آئے تو شہداء کو دیکھا کہ سب ترد تازہ ہیں اور بال بڑھے ہوئے ہیں۔ اتفاقاً ایک شہید کے پاؤں پر پھاوڑا پڑ گیا تو خون کا ایک فوارہ جوش مارنے لگا اور مٹی کھودنے کی حالت میں ایک جگہ سے جو مٹی کھودی تو تمام جگہ مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ اس قصہ کو ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اور بیہقیؒ نے اس قصہ کو حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے اور اس میں اتنا زیادہ ہے کہ پھاوڑا حمزہؓ کے پاؤں پر پڑا تھا۔ اور طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب حامل قرآن مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ زمین کو حکم دیتا ہے کہ اس کے گوشت کو نہ کھانا۔ زمین عرض کرتی ہے۔ اے اللہ میں اس کے گوشت کو کیسے کھاسکتی ہوں اس کے پیٹ میں تو آپ کا کلام ہے۔

۱؎ مباحث شرعیہ کے ثبوت کے لئے حکایات کافی نہیں پھر شہداء بلکہ صدیقین اور انبیاء کی ارواح سے دنیوی امور میں استعانت باجماع علماء غیر صحیح ہے۔ سخاوی اور سبکی جیسے لوگ اس کو صحیح قرار دیتے ہوں تو دیتے ہوں اجماع محدثین وفقہاء کے مقابلہ میں ان کا قول ناقابل قبول ہے استعانت بالموتیٰ کا جواز صرف استفاضہ من الارواح کی صورت میں بعض علماء (جیسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ) کے نزدیک ثابت ہے۔ عام محدثین اس کے بھی قائل نہیں۔ واللہ اعلم

marfat.com

ابن مندہ کہتے ہیں کہ اسی مضمون کی احادیث ابو ہریرہؓ اور ابن مسعودؓ سے بھی آئی ہیں۔ **میں کہتا ہوں** کہ اس حدیث میں حامل قرآن سے مراد ممکن ہے کہ صدیق ہوں کیونکہ قرآن پاک کی برکات ان کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کے سوا اور تو برائے نام ہی حامل قرآن ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ (یعنی نہ مس کرے قرآن کو سوائے پاک صاف لوگوں کے) یعنی جو اخلاق رذیلہ سے پاک ہیں وہ مس کریں اور ایسا شخص صدیق ہوتا ہے۔ مروزی نے بیان کیا کہ قتادہؓ نے فرمایا مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ زمین اس شخص کے جسم پر قابو نہیں پا سکتی، جس نے بالکل گناہ نہ کیا ہو۔ **میں کہتا ہوں** ممکن ہے کہ اس سے مراد اولیاء اللہ ہوں کیونکہ وہ گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں ان کے قلوب اور اجسام دونوں میں ایسی صلاحیت آجاتی ہے کہ اس سے گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴿۱۵۴﴾ (لیکن تم سمجھ نہیں سکتے) یعنی چونکہ ان کی حیات اس قسم کی نہیں ہوتی کہ ہر شخص کو محسوس ہو اور نہ وہ کوئی ایسا امر ہے کہ عقل کی وہاں تک رسائی ہو بلکہ وحی سے یا ایسی فراست صحیحہ سے جو وحی سے حاصل ہو وہ حیات معلوم ہو سکتی ہے اس لئے تم اس کو نہیں سمجھ سکتے)۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ (اور بے شک ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر) مطلب یہ ہے کہ اے امت محمد ﷺ ہم کسی قدر مصائب پہنچا کر برکات سماویہ سے مستفید کریں گے جیسے کوئی کسی قوم کو آزمایا کرتا ہے کہ آیا یہ بلا پر صبر کرتے ہیں یا نہیں اور رضا بالقضاء سے آراستہ ہیں یا اس جوہر سے خالی ہیں۔ اس پیشنگوئی کی وجہ یہ ہے کہ مصائب کے نزول کے وقت نفس کو اطمینان رہے اور زیادہ پریشانی نہ ہو۔ مصائب فی نفسہ اگرچہ بہت ہیں لیکن جن مصائب سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو بچار کھا ہے ان کی نسبت یہ کچھ بھی نہیں اس لئے تنوین تنکیر کے ساتھ قلت بیان فرمائی۔ نیز تقلیل کی وجہ یہ بھی ہے کہ سننے والوں پر گراں نہ ہو اور یہ جان لیں کہ اللہ کی رحمت کسی حالت میں جدا نہیں ہوتی۔

مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ (ڈر اور بھوک سے) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خوف سے مراد دشمن کا خوف اور جوع سے مراد قحط ہے۔

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے)

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کا یا توشَیْءٍ پر عطف ہے اور یا الخوف پر۔ خسارہ سے مراد بالکل مال کا ہلاک ہو جانا ہے۔ جانوں کی کمی یہ کہ قتل ہوں یا مریں اور یا اس سے مرض اور بڑھاپا مراد ہے۔ پھلوں کی کمی یہ ہے کہ کوئی آفت آجائے جس سے پھل جاتے رہیں یا کم ہو جائیں۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ خوف سے مراد اللہ عزوجل کا خوف ہے اور بھوک سے رمضان کے روزے اور مالوں کی کمی سے مراد زکوٰۃ اور صدقات ہیں اور جانوں کا نقصان امراض ہیں اور پھلوں کی کمی اولاد کا مرنا۔

ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب کسی کا بچہ مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کی روح قبض کر لی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں جی ہاں۔ پھر فرماتے ہیں کیا تم نے اس کے دل کی ٹھنڈک کو لے لیا۔ فرشتے کہتے ہیں جی ہاں! پھر دریافت فرماتا ہے میرے بندہ نے اس مصیبت پر کیا کہا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور آپ کی حمد کی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اچھا میرے بندہ کے لئے جنت میں ایک گھر تیار کرو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کر کے حسن کہا ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴿۱۵۶﴾

(اور اے محمد ﷺ خوشخبری سنا دیجئے ان صبر کرنے والوں کو جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم اسی کے بندے اور مملوک ہیں اور جو نعمتیں اس نے عطا فرمائی ہیں یہ سب اسی کی طرف سے ہمارے پاس مستعار ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے حکم پر راضی ہوں اور اس کی امانت طلبی سے ناشکری نہ کرنے لگیں۔ کیونکہ مالک کو اختیار ہے کہ اپنی ملک میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ وَاِنَّآ اِلَیْہِ

marfat.com

رٰاجِعُوْنَ اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں یعنی آخرت میں ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں اور اسی طرح دنیا میں بھی ذکر اور مراقبہ کے ذریعہ سے اس کی طرف باز گشت کرنیوالے ہیں۔ جب ہر حال میں وہی مرجع وماوٰی ہے تو اس نے اگر کوئی نعمت اپنی ہم سے لے لی تو ہمارا کیا نقصان ہے وہ اس سے افضل اور بہتر عطا فرمائے گا۔ وَ بَشِّرِ میں یا تو خطاب نبی ﷺ کو ہے یا جو بشارت کے لائق ہو اس کو خطاب ہے۔ مُصِیْبَۃٌ اس امر مکروہ کو کہتے ہیں جو انسان کو پہنچے۔ چنانچہ مروی ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسول ﷺ کے نعل مبارک کا تسمہ ٹوٹ گیا آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ پڑھا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ بھی مصیبت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن کو جو امر ناگوار پہنچتا ہے وہی مصیبت ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جایا کرے تو اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا کرو کیونکہ یہ بھی مصیبت ہے۔

ابن ابی حاتم اور طبرانی اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰاجِعُوْنَ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اچھا بدل عطا فرماتا ہے اور اتنا دیتا ہے کہ وہ راضی ہو جاتا ہے۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ مصیبت میں جیسے کلمات اس امت کو تعلیم کئے گئے ایسے اور کسی کو نہیں سکھائے گئے۔ اگر سوائے امت محمدیہ ﷺ کے کسی اور کو یہ کلمات عطا کئے جاتے تو یعقوب علیہ السلام کو عطا کئے جاتے مگر انہیں بھی نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے فراق میں انہوں نے یَا اَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ (اے افسوس یوسف پر) فرمایا اگر یہ کلمات تعلیم کئے جاتے ہیں تو یہی کہتے۔

اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (یہی ہیں جن پر رحمتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے) اُولٰٓئِكَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو صفات مذکورہ کے زیور سے آراستہ ہیں۔ صَلٰوۃ کے معنی لغت میں دعا کے ہیں اور جب اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کریں تو اس سے مراد دعا نہیں ہوتی بلکہ دعا پر جو ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً برکت، مغفرت، رحمت اور چونکہ رحمت اور برکت کی بہت سی انواع ہیں اس لئے صَلَوٰاتٌ بصیغہ جمع ارشاد فرمایا اور پھر لفظ رحمت تاکید اً زیادہ فرمایا۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (یہی لوگ ہدایت پر ہیں) یعنی چونکہ ان لوگوں نے مصیبت پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا اور حکم خداوندی پر رضامندی کو اپنا شیوہ بنایا اسی لئے یہی لوگ راہ راست پر ہیں۔ مروی ہے کہ حضرت معاذؓ کا ایک فرزند دلبند وفات پا گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو تعزیت نامہ لکھا اس میں یہ مضمون تھا کہ اے معاذ تمہارے بیٹے کو احکم الحاکمین نے بہت سے ثواب کے عوض لے لیا ہے اور وہ اجر صلوٰۃ اور رحمت اور ہدایت ہے (مگر یہ سب کچھ جب ہے کہ تم نے اس مصیبت میں امید ثواب کی رکھی ہو اور واویلا اور جزع فزع نہ کی ہو) حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ دو چیزیں بہت ہی اچھے ساتھی ہیں اور ان پر ایک بہترین اضافہ بھی ہے۔ وہ دو چیزیں صلوٰۃ اور رحمت ہیں۔ اور وہ زیادتی ہدایت ہے۔ صابرین اور اہل بلاء کی فضیلت میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ہم یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث نقل کرتے ہیں۔

ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جب دنیا کے مصیبت زدوں کو ثواب ملے گا تو جو لوگ یہاں آرام یافتہ ہیں وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہماری کھال دنیا میں مقراض سے کاٹ دی جاتی کہ ہمیں بھی یہ نعمتیں ملتیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کو جو رنج یا غم یا حزن یا کچھ تکلیف پہنچتی ہے حتیٰ کہ کانٹا بھی اگر چبھتا ہے تو اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ بندہ کو جو مصیبت پہنچتی ہے اور پھر اس پر وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰاجِعُوْنَ اَللّٰھُمَّ اْجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاَخْلِفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْھَا پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس مصیبت کا اسے ثواب دیتا اور اچھا عوض عنایت فرماتا ہے اور محمد بن خالد سلمی اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب بندہ کے مقدر میں کوئی مرتبہ لکھا ہوتا ہے اور عمل اس کے ایسے

marfat.com

ہوتے نہیں کہ وہ مرتبہ اس کو ملے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدن یا مال یا اولاد میں کچھ مصیبت پہنچا دیتا ہے وہ اس پر صبر کرتا ہے اور اس صبر کی بدولت اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس حدیث کو احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے سوال کیا، یارسول اللہ سب سے زیادہ بلاء اور مصیبت میں کون رہتا ہے۔ فرمایا انبیاء پھر جو انبیاء سے کم ہیں اور اوروں سے افضل ہیں، اسی طرح دین کی قوت وضعف کے اعتبار سے مصائب بھی قوی وضعیف ہوتے ہیں۔ اگر دین میں پختہ ہوتا ہے تو اس پر مصائب بھی سخت آتے ہیں اور اگر دین میں خام اور ضعیف ہوتا ہے تو مصیبت میں بھی کم گرفتار ہوتا ہے اور مؤمن مصیبت میں گرفتار چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بالکل گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (بے شک صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی آداب گاہوں میں سے ہیں) صفا اور مروہ مکہ میں دو پہاڑ ہیں۔ شَعَائِر جمع شَعِیرَۃ بمعنی علامت۔ یہاں مراد شعائر سے عبادت کے طریقے ہیں۔ اور شعائر انہیں اس لئے فرمایا کہ وہ طاعت الٰہی کی علامت ہیں۔ صفا اور مروہ میں سعی کرنا سب کے نزدیک واجب ہے لیکن امام احمدؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے سنت فرمایا ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے۔

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (تو حج کرے خانہ کعبہ کا یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں کہ طواف کرے ان دونوں میں بھی) کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ طواف کرنے والے پر کچھ گناہ نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مباح ہے اور نیز آگے آیت فمن تَطَوَّعَ بھی ان کی دلیل ہے۔ کیونکہ تطوع نفل کو کہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ مباح ہونا اور نفل ہونا یہ دونوں وجوب سے عام ہیں، اس لئے اس کے کچھ منافی و مخالف نہیں۔ ایک شئے پر اطلاق واجب اور مباح کا آسکتا ہے۔ حج لغت میں قصد کو کہتے ہیں اور اعتمار زیارت کرنے کو۔ یہاں مراد دو مخصوص عبادتیں ہیں۔ طریق متوسط سے منحرف ہونے کو جناح کہتے ہیں۔ شان نزول اس آیت کا اس طرح ہے کہ صفا اور مروہ پر اساف اور نائلہ دو بت تھے۔ اساف صفا پر تھا نائلہ مروہ پر تھا۔ اہل جاہلیت ان بتوں کی تعظیم کے لئے صفا و مروہ کے درمیان طواف کیا کرتے اور ان کو مس کرتے جب اسلام کا ستارہ چمکا تو مسلمان صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے سے ان بتوں کی وجہ سے احتراز کرتے اور جی میں نفرت کرتے۔ ادھر انصار قبل از اسلام منات بت کی عبادت کیا کرتے اور اس کے سامنے پکار کر دعا کرتے، اس لئے انصار بھی صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے سے کراہت کرتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں فریق کے باب میں یہ آیت نازل فرمائی۔ چنانچہ احادیث ذیل سے یہ سب قصہ صاف معلوم ہوتا ہے۔

حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان زمانہ جاہلیت میں شیطان تمام رات طواف کرتے تھے اور صفا و مروہ کے درمیان بت تھے، جب اسلام آیا تو مسلمانوں نے کہا یارسول اللہ صفا و مروہ کے درمیان ہم طواف نہ کریں گے کیونکہ ہم جاہلیت میں ایسا کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس پر آیت اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ الخ نازل فرمائی۔

بخاریؒ نے عاصم سے روایت کی ہے عاصم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صفا و مروہ کی سعی کے بارے میں پوچھا فرمایا کہ ہم قبل از اسلام اس سعی کو جاہلیت کی بات سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو ہم نے سعی چھوڑ دی۔ اس پر آیت اِنَّ الصَّفَا و المروۃ الخ نازل ہوئی اور صحیحین میں عروہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ فلا جناح علیہ ان یطوف بہما (پس نہیں کچھ گناہ اس پر کہ طواف کرے ان میں) سے معلوم ہوتا ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سن کر فرمایا اے بھانجے تم نے کیسی بات کہی اگر آیت کا یہ مطلب ہوتا جو تم نے بیان کیا ہے تو عبارت قرآنی اس طرح ہوتی فلا جناح علیہ ان لا یطوف بہما یعنی ان کا طواف نہ کرنے سے کچھ گناہ نہیں۔ یہ آیت تو انصار کے بارے میں ان کے مسلمان ہونے سے پہلے کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ قصہ اس طرح ہوا تھا کہ انصار منات بت کی عبادت کرتے تھے جب مسلمان ہوئے تو صفا و مروہ کے درمیان طواف سے ان کو کراہت محسوس ہوئی اس لئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ہم قبل از اسلام صفا و مروہ کی سعی کیا

marfat.com

کرتے تھے، اس لئے اب سعی سے جی میں تنگی معلوم ہوتی ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ الصفاوَ المروۃ نازل فرمائی اور حبیبہ بنت ابی تجرات کی حدیث سے بھی جو صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے مروی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صفاو مروہ میں دوڑنا واجب ہے اور وہ حدیث یہ ہے حبیبہ رضی اللہ عنہا مذکورہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ صفاو مروہ کے درمیان طواف فرمارہے ہیں اور لوگ آپ کے آگے اور آپ سب کے پیچھے ہیں اور اس شدت سے آپ سعی فرماتے ہیں کہ تہبند شریف گھوم جاتا ہے اور فرماتے جاتے ہیں کہ اے لوگو سنو! اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی مقرر فرمادی ہے۔ اس حدیث کو امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن مؤمل ہیں ان کو دار قطنی اور بہت سے علماء نے ضعیف کہا ہے۔ لیکن ابن جوزی کہتے ہیں کہ یحییٰ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مؤمل میں کچھ ضعف نہیں اور اس حدیث کو دارہ قطنی نے ایک اور طریق سے روایت کیا ہے کہ اس میں ایک راوی منصور بن عبدالرحمٰن ہیں ابو حاتم نے ان کی نسبت لفظ لَا یُحتج بہٖ (ان کا قول حجت نہیں) کہا ہے اور یحیی بن معین نے ثقہ، کہا ہے اور ذہبی نے ثقہ مشہور اور رجال مسلم سے بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ طبرانی کے نزدیک اس حدیث کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور سندیں ہیں کہ جب پہلی سند کے ساتھ جمع کی جاتی ہیں تو فائدہ قوت کا دیتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اس کے بعد تم خانہ کعبہ اور صفاو مروہ کا طواف کرو۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سعی صفاو مروہ کی واجب ہے کیونکہ حضور ﷺ نے صیغۂ امر سے ارشاد فرمایا ہے اور امر وجوب کے لئے ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد جاننا چاہئے کہ جو لوگ وجوب کے قائل ہیں ان میں یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ سعی واجب ہے یا رکن۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو واجب ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ قاعدہ ہے کہ وجوب کی دلیل اگر ظنی ہو تو اس سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ سعی بین الصفاوالمروۃ حج میں رکن نہیں، واجب ہے۔ اگر کوئی ترک کردے گا تو حج میں ایک قسم کا نقصان رہے گا اگر ایک بکری ذبح کردے گا تو وہ نقصان جاتا رہے گا اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رکن ہے کیونکہ ان کے نزدیک فرض اور واجب میں کچھ فرق نہیں ہے اس پر سب علماء کا اتفاق ہے کہ صفاو مروہ کی سعی کے سات پھیرے ہیں اور اس پر بھی اجماع ہے کہ صفا سے مروہ تک ایک پھیرا ہے اور صفا تک لوٹنا یہ دوسرا پھیرا ہے اور شافعیہ میں سے جریر طبری، ابو بکر صوفی اور حنفیہ میں سے علامہ طحاوی حنفی سے منقول ہے کہ صفا سے مروہ تک جانا اور پھر مروہ سے صفا پر جانا یہ ایک پھیرا ہے جیسا کہ خانہ کعبہ کا طواف جہاں سے شروع ہوتا ہے اسی مقام پر ختم ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ہر پھیرا صفا سے شروع ہونا چاہئے تو ان کے نزدیک صفا سے مروہ تک ایک پھیرا ہوا اور پھر مروہ سے صفا تک لوٹنا یہ دوسرے پھیرے کے لئے ہے اور یہ خود دوسرا پھیرا نہیں ہے۔

ہماری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ اس میں یہ مضمون موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آخری پھیرا مروہ پر کیا اور نیز جمہور علماء کا عمل ہماری کافی دلیل ہے اور علماء نے اس پر بھی اجماع کیا ہے کہ سعی کے چند شرائط ہیں ایک تو ترتیب ہے اور وہ یہ ہے کہ سعی صفا سے شروع کی جائے اور مروہ پر ختم کردی جائے اور بعض نے جو کہا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ترتیب شرط نہیں تو انہوں نے غلطی کی ہے۔ دلیل اس ترتیب کی رسول اللہ ﷺ کا اس پر مداومت کرنا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سعی میں، میں بھی اسی شئے سے ابتدا کرتا ہوں جس کا اللہ تعالیٰ نے اول ذکر فرمایا ہے یہ کہہ کر آپ صفا پر تشریف لے گئے، اس حدیث کو مسلم اور امام احمد و امام مالک و ترمذی و ابن ماجہ و ابن حبان و نسائی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے اور دار قطنی نے اس حدیث کو بصیغہ امر روایت کیا ہے اور ابن حزم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے تو اگر صیغۂ امر کی روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تب تو اس سے صاف طور سے وجوب معلوم ہوتا ہے اور اگر اس کے ثبوت میں کچھ کلام کیا جائے تب بھی اس سے وجوب مستفاد ہو سکتا ہے کیونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ لوگو! حج کے طریقے مجھ سے لے لو۔ شاید اس حج کے بعد میں حج نہ کروں اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے صفا سے سعی شروع کی ہے۔ اور ایک شرط یہ ہے کہ یہ سعی ایک نہ ایک طواف کے بعد ہونی چاہئے۔ طواف قدوم کے بعد ہو یا طواف زیارت کے۔ لیکن طواف اور سعی کے درمیان

maarfat.com

وقوف عرفہ فاصل نہ ہو اب اگر کسی نے طواف قدوم سے پہلے سعی کرلی تو کسی کے نزدیک یہ معتبر نہیں۔ لیکن عبدالرزاق عطاء سے روایت کرتے ہیں عطاء کہتے ہیں کہ اگر سعی کے بعد طواف کرے تو جائز ہے اور دلیل اس کی اسامہ بن شریک کی حدیث ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور ﷺ سے کسی نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی آپ نے فرمایا کچھ حرج نہیں۔ ہماری طرف سے جواب اس کا یہ ہے کہ امت نے اس حدیث پر عمل ترک کردیا اس لئے یہ شاذ ہے اور نیز ہماری دلیل یہ ہے کہ سعی ایک خلاف قیاس عبادت ہے تو جس کیفیت و طریق سے شرع میں وارد ہوئی ہے اسی طرح کرنا چاہئے اور شرع میں طواف کے بعد ہی سعی آئی ہے اب اس کے خلاف کرنا جائز نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں مکہ آئی اور میں اس زمانہ میں حائضہ تھی اس لئے میں نے نہ خانہ کعبہ کا طواف کیا اور نہ صفا و مروہ میں سعی کی اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنا حال عرض کیا تو آپ نے فرمایا تم تو سوائے خانہ کعبہ کے طواف کے اور سب کام ایسے ہی کرو جیسے حاجی کرتے ہیں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو طواف سے منع فرمادیا اور سب امور کی اجازت دی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہ طواف کیا نہ سعی کی اور حضور ﷺ کو بھی اس کی اطلاع ہوئی اور نیز آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بعد پاکی کے خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کرلینا حج اور عمرہ دونوں تمہارے ذمے سے اتر جائیں گے۔

اب اس قصہ سے صاف طور سے معلوم ہوگیا کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا طواف کے تابع ہے اور یہاں سے یہ مسئلہ بھی سمجھا گیا کہ اگر کسی نے طواف زیارت کیا اور سعی بالکل نہ کی نہ بعد طواف قدوم اور نہ بعد طواف زیارت، تو اس پر اس سعی کے ترک کی وجہ سے ایک بکری واجب ہے اور سعی کی قضا نہیں کیونکہ سعی کوئی مستقل عبادت نہیں، بعد طواف کے اگر ہو تو عبادت ہے ورنہ نہیں اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی سے طواف اور سعی دونوں چھوٹ جائیں تو دونوں کی قضا لازم ہے اور سنت یہ ہے کہ جب صفا پر ٹھہرے تو تین مرتبہ تکبیر کہہ کر پڑھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور پھر دعا مانگے۔ اسی طرح تین مرتبہ کرے اور ایسا ہی مروہ پر بھی کرے اور جب صفا سے اترنے لگے تو دوڑے نہیں بلکہ اپنی چال چلے جب بطن وادی میں پہنچے تو دوڑے جب اس سے نکل کر مروہ پر چڑھے تو پھر دوڑنا موقوف کردے اور اپنی چال چلے، صحیحین میں جابرؓ سے ایسا ہی مروی ہے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ (اور جو اپنے شوق سے کرے کوئی نیکی) حمزہ اور کسائی نے تَطَوَّعَ کو يَطَّوَّعْ یا اور تشدید طاء سے بصیغۂ مضارع مجزوم پڑھا ہے اور ایسے ہی فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا کو بھی یا سے پڑھا ہے اور یعقوب نے صرف اس مقام پر یا سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے تَطَوَّعَ تاء بصیغۂ ماضی۔ تطوع کے معنی طاعت کے ہیں خواہ وہ طاعت فرض ہو یا نفل، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں معنی یہ ہیں کہ جس نے اپنے شوق سے صفا و مروہ کے درمیان طواف کیا کیونکہ یہ طواف سنت ہے۔ مقاتل اور کلبیؒ کہتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ جس نے بعد طواف واجب کے زیادہ طواف کیا اور بعض مفسرین نے کہا معنی یہ ہیں کہ جس نے بعد حج فرض کے ایک حج و عمرہ اور کیا اور حسنؒ نے کہا ہے کہ مراد اس سے سب اعمال ہیں حج کی کوئی تخصیص نہیں اس کے موافق معنی یہ ہوں گے کہ جس نے کوئی کام نفل خواہ نماز ہو یا زکوٰۃ یا طواف وغیرہ کیا۔ خیرًا یا تو مفعول مطلق محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا منصوب بحذف حرف جر یا یہ کہا جائے کہ چونکہ تطوع معنی اتی (کیا) کو شامل ہے اس وجہ سے متعدی کردیا گیا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝۱۵۸ (تو بیشک اللہ تعالیٰ قدر دان واقف کار ہے) یعنی طاعت پر ثواب دینے والا ہے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ معاذ بن جبل اور سعد بن معاذ اور خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم نے علماء یہود سے کوئی تورات کا مضمون دریافت کیا انہوں نے اس کو چھپایا اور بتلانے سے صاف انکار کردیا اس پر حق تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِۙ اُولٰٓىٕكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ۝۱۵۹ (بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتاریں کھلی کھلی نشانیاں حکم اور ہدایت کی باتیں اس کے بعد کہ ہم ان کو بیان کر چکے لوگوں کے لئے کتاب میں، یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرتے ہیں سب لعنت کرنے والے) اَلْبَیِّنٰتِ سے مراد وہ علامتیں ہیں جو محمد ﷺ کی سچائی بتلا رہی ہیں۔ اَلْهُدٰى سے مراد وہ شئے ہے جو سیدھی راہ اور محمد ﷺ کے اتباع کی راہ بتائے الکتاب سے مراد توراۃ ہے۔ لَعْنٌ کے اصل معنی طرد (دھتکار ہے) لاعنون جو لعنت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں خواہ وہ ملائکہ ہوں یا جن ہوں یا انسان یا زمین کے جانور۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان پر لعنت کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنازہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے آپ نے فرمایا کہ کافر جب مرتا ہے تو اس کی پیشانی پر مار پڑتی ہے اور اس کو سوائے انسان اور جن کے ہر روئے زمین کا چلنے والا سنتا ہے اور لعنت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ سے یہی مراد ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے روایت کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لاعنون سے سوائے جن وانس تمام مخلوق مراد ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ فرشتے مراد ہیں۔ عطاء فرماتے ہیں کہ جن وانس مقصود ہیں اور حسنؒ کا میلان اس طرف ہے کہ تمام اللہ کے بندے مراد ہیں اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قحط پڑتا ہے اور بارش بند ہو جاتی ہے تو جانور گناہ کرنے والوں پر لعنت کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ ان کم بختوں کی نحوست ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا (مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی) یعنی جن لوگوں نے علم کو چھپانے اور دیگر معاصی سے توبہ کر لی ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

وَ اَصْلَحُوْا (اور اصلاح کی) یعنی جو کچھ خرابی کی تھی اس کا تدارک کر دیا۔

وَ بَیَّنُوْا (اور صاف صاف بیان کر دیا) یعنی توراۃ میں جو کچھ ہے اس کو صاف صاف بیان کر دیا۔

فَاُولٰٓىٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ (تو یہ لوگ ہیں جن کی توبہ میں قبول کروں گا) قبول توبہ سے مراد معاف کرنا ہے کیونکہ توبہ اگر بندہ کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی گناہ سے باز رہنے کے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہو تو سزا دینے سے رجوع فرمانا مراد ہوتا ہے۔

وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝۱۶۰ (اور میں توبہ کا بڑا قبول کرنے والا مہربان ہوں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کرتا اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ کے توبہ کرنے سے اس شخص سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جس کی سواری ایک سنسان جنگل میں گم ہو جائے اور اسی پر اس کا کھانا پانی ہو اور اس کے ملنے سے ناامید ہو کر ایک درخت کے سایہ میں آکر لیٹ رہے اور وہ اسی فکر اور رنج میں ہو کہ ناگاہ سواری آکر اس کے پاس کھڑی ہو جائے یہ اس کی باگ پکڑ کر شدت خوشی میں کہے کہ اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا پروردگار ہوں (یعنی خوشی میں حواس ٹھکانے نہ رہیں اور الٹی پلٹی باتیں بکنے لگے) تو اس شخص سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ کی توبہ کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓىٕكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَۙ۝۱۶۱ (بے شک جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے کافر یہی لوگ ہیں جن پر پھٹکار ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے کلام کو چھپاتے ہیں اور بے توبہ مر گئے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ یہ لعنت قیامت کو ہو گی قیامت کے دن کافر کو کھڑا کیا جائے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا۔ پھر ملائکہ اور آدمی لعنت کریں گے اگر کوئی کہے کہ جس پر لعنت کی گئی ہے وہ بھی آدمی ہے تو وہ اپنے اوپر کیسے

marfat.com

لعنت کرے گا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا (یعنی لعنت کرے گا بعض تم میں سے بعض پر) اور بعض نے کہا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ظالموں پر لعنت ہے اور چونکہ خود بھی ظالم ہیں اس طور سے وہ خود اپنے اوپر بھی لعنت کرتے ہیں۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (ہمیشہ رہیں گے اس میں) ضمیر ہایا تو لعنت کی طرف راجع ہوگی اور یا نار کی طرف صورت اخیر میں ضمیر کو مرجع سے پہلے لانا نار کی شان کی عظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔

لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ (نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ان کو مہلت ملے گی) ینظرون یا تو انظار بمعنی مہلت دینا سے مشتق ہے اور یا انتظار سے ماخوذ ہے۔ اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے نہیں انتظار کیا جائے گا کہ کسی قسم کی معذرت کریں اور یا نظر سے بمعنی دیکھنا لیا جائے تو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے ان کی طرف نظر رحمت نہ کی جائے گی۔ علامہ بغوی نے فرمایا ہے کہ کفار قریش نے یہ کہا اے محمد آپ اپنے رب کی صفت اور نسب بیان کیجئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص اور ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (اور تمہارا معبود وہی خدائے واحد ہے) وَاحِدٌ، اِلٰهٌ کی صفت مؤکدہ ہے کیونکہ اِلٰهٌ کی تنوین سے خود وحدت مترشح ہے اور الٰہ موصوف کو وحدانیت کی تائید اور تاکید کے لئے ذکر فرمایا۔ الٰھکم واحد (معبود تمہارا ایک ہے) میں اس قدر تقریر نہ ہوتی اور اِلٰهُكُمْ میں خطاب عام مخلوق کو ہے کسی خاص گروہ کو نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے جہان والو عبادت کے لائق ایک ایسا معبود ہے کہ جس کا نظیر اور شریک ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاص تورات کی آیات چھپانے والوں کو (جن کا ذکر آیت گزشتہ میں ہے) توبیخ و تہدید کے لئے خطاب ہو کیونکہ جس طرح وہ محمد ﷺ کے اوصاف کا اخفا کرتے تھے اسی طرح توحید کو بھی چھپاتے تھے، چنانچہ عزیر اور مسیح علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا کہا کرتے تھے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (اس کے سوائے کوئی معبود نہیں) یا تو زیادتی تاکید و تقریر کے لئے الٰہ کی دوسری صفت ہے اور یا الٰھکم کی دوسری خبر ہے۔

الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۳﴾ (وہ بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے) یا تو الٰھکم کی خبریں ہیں یا مبتدا محذوف ع ۱۹/۱۱ ۲
کی۔ الرحمن الرحیم گویا استحقاق عبادت کی حجت اور دلیل ہے کیونکہ جب منعم حقیقی وہی ہے اور تمام نعمتیں خواہ وہ اصول ہوں یا فروع اسی ہی کی طرف سے ہیں تو وہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ الخ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الخ ان دونوں آیتوں میں اسم اعظم ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی ابی الصخر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ نازل ہوئی تو مشرکین کو بہت تعجب ہوا اور بولے کہ اگر معبود ایک ہے تو اس کی دلیل کیا ہے اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں) اور ان اشیاء میں جو ان میں ہیں جیسے سورج، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، درخت، نہریں، جواہر، نباتات، حیوانات اور زمین کے حصوں کا مختلف ہونا، کوئی سرد ہے اور کوئی گرم ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے سند معتبر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ قریش نے نبی ﷺ سے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ صفا کو سونا بنا دے تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے اپنے دشمن پر غالب رہیں اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں ان کی یہ درخواست پوری کردوں گا لیکن اس کے بعد بھی اگر انہوں نے کفر کیا تو میں انہیں ایسے عذاب میں گرفتار کروں گا کہ پھر کسی کو ایسا عذاب نہ دوں گا۔ رسول کریم ﷺ نے عرض کیا کہ اے اللہ آپ درگزر فرمائیے اور مجھے اور میری قوم کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے، میں انہیں ہمیشہ راہ حق کی دعوت کروں گا۔ اس کے بعد اللہ نے آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ نازل فرمائی۔ اس روایت کے موافق آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ لوگ صفا کو سونا بنانے کا کیا

marfat.com

سوال کرتے ہیں اس سے بڑی بڑی دلیلیں کے جو ہر وقت ان کے مشاہدہ میں رہتی ہیں موجود ہیں۔ سموات کو صیغہ جمع اور ارض کو صیغہ واحد سے ذکر فرمانے کی یہ وجہ ہے کہ کفار ستاروں کی حرکت کی وجہ سے جانتے تھے کہ آسمان متعدد ہیں اور زمین کے تکثر کی انہیں آگاہی نہ تھی اور اس مقام پر اس مضمون کو دلیل وحدانیت کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے اور دلیل وہی شئے ہو سکتی ہے جو مخاطب کو پہلے سے معلوم ہو۔ اس لئے سموات کو تو جمع لائے اور ارض کو واحد لانے پر اکتفا فرمایا اور بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ چونکہ ہر آسمان کی حقیقت مختلف ہے اس لئے اس کے تکثر کا اعتبار فرمایا اور زمین کی ماہیت میں اختلاف نہیں ہر زمین کی حقیقت مٹی ہے اس لئے اسے[1] واحد گردانا اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ آسمانوں کے طبقے آپس میں ایک دوسرے سے علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں اس لئے انہیں جمع سے تعبیر فرمایا اور زمین کے طبقات ایک دوسرے سے متصل و ملتصق ہیں، اسی لئے اس کو واحد قرار دیا۔ میں کہتا ہوں کہ وجہ اخیر کچھ نہیں نقش بر آب ہے کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آسمان اور زمین دونوں کے طبقات میں فصل ہے فَسَوّٰهُنَّ اور سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کی تفسیر میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (اور رات دن کی آمد و رفت میں) یعنی روز و شب کا آمد و رفت میں ایک دوسرے کے پیچھے ہونا اور موسم کے اختلاف سے رات دن کا گھٹنا بڑھنا مراد ہے کہ گرمیوں میں دن بڑا ہوتا ہے اور سردیوں میں چھوٹا۔

وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ (اور جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں) یعنی دیکھو اللہ تعالیٰ نے جہازوں کو کس طرح مسخر کیا ہے باوجود اس کے کہ ہزاروں لاکھوں من بوجھ لدا ہوتا ہے۔ پھر بھی کیسے فراٹے سے جاتے ہیں اور غرق نہیں ہوتے فلک کا واحد اور جمع برابر ہے اسی وزن پر واحد کا صیغہ آتا ہے اور یہی صیغہ جمع کا ہے۔ جب جمع ہو تو اس کی صفت مونث لائی جائے گی اور جب مفرد مراد ہو تو صفت مذکر ہوگی جیسے اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ میں مفرد مراد ہے اور وَكُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ اور تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ میں جمع مراد ہے۔

بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ (وہ چیزیں لے کر جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں) ما یا تو مصدری ہے۔ اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ چلتے ہیں لوگوں کے نفع کے ساتھ یعنی ان کے چلنے میں لوگوں کا نفع ہے اور یا موصولہ ہے اس تقدیر پر یہ حاصل ہوگا کہ اشیاء نافعہ کے ساتھ چلتے ہیں مثلاً ان پر سوار ہوتے اور تجارتی مال لے جاتے اور اپنے دیگر مقاصد حاصل کرتے ہیں۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ (اور پانی میں جو اتارا ہے اللہ نے آسمان سے) پہلا من ابتدائیہ ہے اور دوسرا بیانیہ۔

فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ (پھر حیات بخشی اس سے زمین کو) زمین کے زندہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں نباتات کو اگایا۔

بَعْدَ مَوْتِهَا (بعد اس کی موت کے) زمین کی موت سے مراد خشکی اور قحط سالی ہے۔

وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ (اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور) مطلب یہ ہے کہ زمین میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے جانور پراگندہ اور منتشر کر دیئے۔ ان میں سے بعض جانور تو اس قدر چھوٹے ہیں کہ دکھائی بھی نہیں دیتے اور بعض اس قدر بڑے ہیں کہ بدون اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قوت کے آدمی انہیں کسی طرح قبضہ میں نہیں لا سکتا۔ وَبَثَّ کا عطف یا تو انزل پر ہے یا اَحْيَا پر ہے کیونکہ جانوروں کی نشو و نما اور زندگی کا مدار سرسبزی پر ہے اور سرسبزی پانی ہی سے ہوتی ہے۔

---

[1] اس قول کا مدار ارسطو اور اس کے کاسہ لیسوں کی فلکی تحقیقات پر ہے ارسطو اور اس کے اسلامی دور کے متبعین فارابی اور ابن سینا قائل ہیں کہ ہر آسمان کا مادہ جدا جدا ہے اور تمام عناصر کا مادہ ایک ہی ہے۔ گویا ان کے نزدیک کائنات کے دس مادے ہیں نو مادے تو آسمانوں کے اور ایک عناصر کا کیونکہ ان کا مسلمہ ہے کہ عقول دس ہیں۔ ہر عقل اپنے ماتحت عقل اور ایک آسمان کی جاعل ہے۔ اسی ترتیب نزولی کے موافق دسویں عقل عناصر کی جاعل ہے۔ ۱۲

marfat.com

وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ (اور ہواؤں کے پھیرنے میں) ہواؤں کے پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہوائیں کبھی مشرق کو اور کبھی مغرب کو چلتی ہیں، کبھی جنوب کا دورہ کرتی ہیں، کبھی شمال کا کبھی مفید ہوتی ہیں، کبھی مضر، ایک وقت تند ہیں اور دوسرے وقت نرم، کبھی گرم ہیں، کبھی ٹھنڈی۔ جاننا چاہئے کہ سورۂ ذاریات میں تمام قراء نے الرِّيْحُ الْعَقِيْمَ میں الرّیح کو بصیغۂ واحد پڑھا ہے اور سورۂ روم میں الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ میں بصیغۂ جمع پڑھا ہے اور اس کے سوا جہاں کہیں بھی یہ لفظ معرف باللام واقع ہوا ہے اس میں قراء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ اس موقع پر حمزہ اور کسائی نے تصریف الریاح کو صیغۂ جمع سے پڑھا ہے اور سورۂ کہف، سورۂ جاثیہ، سورۂ اعراف، سورۂ نمل اور سورۂ روم میں دوسری جگہ اور سورۂ فاطر میں بصیغۂ مفرد پڑھا ہے اور ابن کثیر نے اخیر کے چار مقامات میں کسائی اور حمزہ کا اتباع کیا ہے اور ابن کثیر نے سورۂ فرقان میں اور حمزہ نے سورۂ حجر میں بصیغۂ واحد پڑھا ہے اور باقی قراء نے سب مقامات میں بصیغۂ جمع پڑھا ہے اور نافع نے سورۂ ابراہیم اور سورۂ شوریٰ میں الریاح صیغۂ جمع سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے الریح مفرد پڑھا ہے اور ابو جعفر نے ان سب مقامات میں بصیغۂ جمع پڑھا ہے اور لفظ ریح بلا الف ولام کے جہاں آیا ہے وہ بالاتفاق بصیغۂ مفرد ہے۔

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اور ابر میں جو آسمان اور زمین کے درمیان رکا ہوا ہے) یعنی دیکھو آسمان اور زمین کے درمیان ابر کیسا معلق ہے نہ گرتا ہے نہ پھٹتا ہے۔ حالانکہ اس کی طبیعت کا مقتضی یا صعود ہو گا یا نزول اور جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اسے بھیج دیتا ہے۔ ابن وہب کہتے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ کسی کو ان کی خبر نہیں کہ وہ کہاں سے آتی ہیں۔ ایک کڑک، دوسری بجلی، تیسرا ابر۔

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ (ان سب میں سمجھدار لوگوں کے لئے دلیلیں ہیں) یعنی ان اشیاء میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو ان میں فکر کرتے اور سوچتے ہیں کہ یہ تمام[1] اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے حادث اور ممکن ہیں ان کی ذات ان کے وجود کو نہیں چاہتی اور ایسے ہی ان کے آثار جو مختلف وجود اور متعدد طریقوں سے واقع ہوتے ہیں ممکن ہے اور حادث ہیں اب لامحالہ کوئی نہ کوئی ان کا صانع ضرور ہے اور وہ صانع ایسا ہے کہ اس کی ذات خود وجود کو مقتضی ہے اور حی علیم حکیم قادر مطلق تمام صفات کمال سے آراستہ اور تمام نقائص اور عیوب سے منزہ ہے اور اس کا کوئی مماثل و معارض نہیں۔ ہے وہ ہر صفت میں یکتا ہے کیونکہ اگر دوسرا بھی ایسا ہی قادر مان لیا جائے تو دو خرابیوں میں سے ایک خرابی ضرور لازم آئے گی یا تو

---

[1] حضرت مؤلف کے اس قول کی بنا فلاسفہ اور بعض متکلمین کے اس مسلمہ پر ہے کہ شئے ممکن کی ذات الگ ہے اور اس کا وجود الگ۔ ذات حقیقت کو کہتے ہیں اور وجود اس کی صفت زائدہ ہے۔ گویا ذات ممکن موصوف ہے اور وجود دوسری صفات کی طرح ایک صفت۔ لیکن امام اہل حق ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ ممکن کی ذات وجود کی عینیت کے قائل ہیں ان کا قول ہے کہ شئی کی جو ذات ہے وہی اس کا وجود ہے اور چونکہ ممکن کا وجود حادث اور واجب کا محتاج ہے اس لئے ہر ممکن اپنی ذات میں بھی کسی صانع کی محتاج ہے الخ خلاصۂ دلیل یہ ہے کہ یہ سارا سنسار خود بخود نہیں ہو گیا اس کا حدوث تغیر اور نیرنگی و بے ثباتی بتا رہی ہے کہ کوئی اس کا بنانے والا ہے اور چونکہ اس کے نظم میں یگانگت مناسبت اور وحدت نظام ہے اس لئے اس کا بنانے والا ضرور صاحب علم و قدرت و ارادہ ہونا چاہئے۔ جہالت، عجز، کمزوری اور اضطرار سے پاک، حوادث اور لوازم حدوث سے منزہ اور تمام عیوب و نقائص سے مبرا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ہستی صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ کوئی اثر شخصی مثلاً زید کا سات بج کر پانچ منٹ دو سیکنڈ اور تین پل پر پیدا ہونا دو فاعلوں کا فعل نہیں ہو سکتا یا تو کرنے والا ایک ہو گا اور دوسرا اس کا مددگار یا دوسرا اس سے متفق یا اس کا مخالف اول الذکر دونوں تقدیروں پر عجز ایک کا یا دونوں کا لازم آئے گا اور آخر الذکر تقدیر پر جو غالب ہو گا وہی مستحق الوہیت ہو گا۔ اہل کلام کی اصطلاح میں اس دلیل کو برہان تمانع کہتے ہیں اور آیت لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔ علامہ تفتازانی نے اس دلیل کو اقناعی کہا ہے۔ عقلی ہونے سے انکار کیا ہے اور اعتراض کیا ہے کہ اثر شخصی کا فاعل اگر ایک ہی ہو اور دوسرا اس سے متفق ہو تو نہ کسی کا عجز لازم آتا ہے نہ احتیاج۔ مگر علامہ نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اتفاق بغیر ارتباط افتقاری کے ممکن نہیں اور افتقار علامت حدوث ہے۔ واللہ اعلم۔

marfat.com

ایک اثر شخصی پر دو مؤثروں کا اجتماع لازم آئے گا اور یہ محال ہے یا ایک کا عجز لازم آئے گا۔ تو یہ مفروض کے خلاف ہے اور یا باہم ان میں نزاع لازم آئے گا اور یہ نزاع موجب فساد عالم ہے اور عالم کو ہم نہایت انتظام سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ معبود ایک ہی ہے۔ نیز ان لوگوں کے لئے دلائل موجود ہیں جو غور کرتے ہیں کہ مخلوق میں اللہ کی رحمت کے کس قدر آثار ہیں۔ یہ آثار صاف بول رہے ہیں کہ پرستش اور شکر کا مستحق ایک اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔

ابن ابی الدنیا نے کتاب الفکر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جناب سرور کائنات ﷺ نے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ کو پڑھ کر فرمایا۔ افسوس ہے اس شخص کے حال پر جو ان آیات کو پڑھے اور پھر غور و فکر نہ کرے۔ اوزاعیؒ سے کسی نے پوچھا کہ فکر کا غایت درجہ کیا ہے فرمایا ان آیات کو پڑھے اور ان کے مضمون کو سمجھے۔ واللہ اعلم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (اور بعض لوگ ہیں کہ بناتے ہیں خدا کے سوا شریک) انداد اسے مراد یا تو بت ہیں اور یا رؤساء ہیں جن کی اطاعت میں کفار کو دین کی بالکل پرواہ نہ تھی اور یا ہر وہ چیز مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دے خواہ وہ کچھ بھی ہو۔

یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ (محبت رکھتے ہیں مثل اللہ کی محبت کے) یعنی ان کی ایسی تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں جس طرح اللہ کی تعظیم کرتے ہیں محبت اور اطاعت میں اللہ تعالیٰ کو اور ان کو برابر کرتے ہیں یا یہ معنی کہ اپنے معبودوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے کہ مؤمنین اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے کہ محبت لغت میں میلان قلب کو کہتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (اور جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو ان سے زیادہ اللہ کی محبت ہے) یعنی جس قدر کافر اپنے معبودوں سے محبت رکھتے ہیں مؤمن اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ مؤمنین کی محبت تو کبھی منقطع نہیں ہوگی خواہ کچھ ہو خوشی ہو یا رنج ہو، کشائش ہو یا تنگی ہو۔ بخلاف کفار کی محبت کے کہ ان کی محبت اپنی غرض کی ہے اور وہ غرض بھی موہوم۔ اس لئے وہ ایک ادنیٰ بات میں جاتی رہتی ہے اور اسی واسطے شدائد اور مصائب میں معبودوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آج ایک بت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کل اس کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کر لیتے ہیں۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو بتوں کی محبت میں گھل گئے اور اپنی جان کو اسی دھن میں تباہ کر دیا۔ امر فرمائیں گے کہ اگر تمہیں ان کی سچی محبت ہے تو ان کے ساتھ جہنم میں جاؤ۔ وہ صاف انکار کریں گے اور ہرگز نہ جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے عشاق اور دلدادوں سے کافروں کے روبرو فرمائے گا کہ اگر تم میرے دوست ہو تو جہنم میں جاؤ۔ وہ یہ حکم سنتے ہی سب کے سب جہنم میں کود پڑیں گے۔ اس کے بعد ایک منادی ندا کرے گا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ ل

میں کہتا ہوں کہ آیت کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں جس کو جس سے محبت ہے اس سے زیادہ مؤمنوں کو اللہ کی محبت ہے کیونکہ جو محبت غیر اللہ سے ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی سبب اور واسطہ پر مبنی ہوتی ہے یا تو اس سے کسی منفعت کی توقع ہوتی ہے یا کسی مضرت کے دفع کرنے کی امید یا اس کے جمال سے لذت حاصل کرنے کی وجہ یا اپنے سے کوئی تعلق نسبی ہوتا ہے مثلاً بیٹا ہے یا باپ۔ تو غیر اللہ سے محبت فی الحقیقت اپنے سے محبت ہے اس محبوب سے محبت نہیں، چنانچہ یہ وسائط اگر زائل ہو جاتے ہیں تو محبت بھی جاتی رہتی ہے اور اللہ کی محبت ان سب سے پاک ہے اس لئے وہ باقی رہتی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ کفار کی نظر صرف دنیوی منافع اور لذائذ پر ہے اور اللہ سبحانہ کا وجود برائے نام جانتے ہیں اور اپنے منافع اور مضار کو بندوں یا ستاروں یا اور اشیاء موہومہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اسی لئے انہیں مثل خدا کے یا اس سے بھی زیادہ چاہتے ہیں اور جو لوگ اہل اہواء میں سے مدعی اسلام ہیں جیسے معتزلہ، روافض اور خوارج۔ انہیں بھی اللہ تعالیٰ سے اور

ل اور جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو ان سے زیادہ اللہ کی محبت ہے۔ ۱۲

marfat.com

چیزوں سے زیادہ محبت ہے کیونکہ اخروی منافع اور مضار کا انہیں اعتقاد ہے اور اس کے معترف ہیں کہ جزا کے دن کا مالک اللہ واحد قہار ہے، اسی واسطے اللہ تعالیٰ کو غیر اللہ سے زیادہ چاہتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ دنیا کا نفع نقصان تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ہی۔ لیکن ابدالآباد تک اللہ تعالیٰ سے ہی معاملہ رہے گا۔ یہ حال تو ان میں سے ان لوگوں کا ہے جو دیندار اور متبع ہیں اور جو ان میں دنیادار ہیں وہ تو اسلام سے بالکل ہی خارج ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اوروں کو شریک کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ محبت کا مدار نفع اور ضرر پر ہے اور وہ بندوں کو نافع اور ضار سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے نہیں بلکہ بندے خود اپنے افعال کے خالق ہیں وہ تو فلاسفہ کی نجاسات میں واقع ہو کر مشرکین کے ہم پلّہ ہو گئے۔ اب رہے اہلسنت والجماعت ان کو سوائے اللہ کے اور کسی شئے کی محبت نہیں کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کو نفع وضرر پہنچانے والا سمجھتے ہیں اور جیسے یہ لوگ غیر اللہ کی عبادت نہیں کرتے اسی طرح حمد بھی غیر اللہ کی نہیں کرتے۔ اسی طرح ان کا بغض اور حب اور سب افعال اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اگر کسی دوسرے کی مدح وغیرہ کریں گے تو مجازاً اور ظاہراً ہو گی۔ لیکن یہ محبت اور بغض ان کا اپنی دینی غرض کے لئے ہے۔ خالص اللہ کی رضامندی کے لئے نہیں ہے مثلاً اس خیال سے عبادت کرتے ہیں کہ اگر ہم محبت اور اطاعت نہ کریں گے تو اللہ ہم کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہ تو عام اہل سنت کی حالت ہے اور جو محققین اہل سنت ہیں اور وہ صوفیہ کرام رحمہم اللہ ہیں ان کا مسلک یہ ہے کہ جو محبت کسی خوف یا دینی یا دنیوی طمع پر مبنی ہو وہ محبت ہی نہیں۔ ان کا قول ہے کہ محبت کی آگ جب محبّ کے دل میں شعلہ مارتی ہے تو وہ سوائے محبوب حقیقی کے کسی کو بھی نہیں چھوڑتی حتیٰ کہ خود اپنا نفس بھی محبّ کی نظر میں نہیں رہتا نفع اور ضرر اور ماسوا تو کہاں۔ اس کا تو یہ حال ہو جاتا ہے کہ اگر محبوب حقیقی کی طرف سے یہ سوال ہو هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا یعنی کیا انسان پر کوئی ایسا وقت آیا ہے کہ اس میں وہ کوئی شئے قابل ذکر نہیں تھا۔ تو وہ زبان حال سے جواب دیتا ہے۔ نَعَمْ رَبِّ قَدْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ مُسْتَمِرٌّ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا وَّلَا مَخْطُوْرًا یعنی اے اللہ ہاں بیشک انسان پر ایک وقت کیا بلکہ ایک زمانہ دراز ایسا گزرا ہے کہ وہ کوئی شئے قابل ذکر نہ تھا بلکہ دل میں اس کا خیال بھی نہ گزرتا تھا (یعنی مرتبۂ فنا کو پہنچ گیا تھا۔ ماسوا اللہ تعالیٰ کوئی شئے حتیٰ کہ اپنا وجود بھی پیش نظر نہ تھا) اور اس کی وجہ اور راز یہ ہے کہ عوام کے نزدیک سب سے زیادہ قریب شئے ان کا نفس ہے اس لئے وہ اپنے نفس کو چاہتے ہیں اور اللہ کی محبت بھی اگر ہوتی ہے تو وہ بھی اپنے نفس کے لئے (مثلاً اس واسطے کہ اگر ہم عبادت کریں گے تو وہاں راحت و آرام ہو گا) اور محققین یہ سمجھتے اور جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے خود ہمارے نفس سے بھی زیادہ قرب ہے چنانچہ فرماتا ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (یعنی ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ قریب ہیں لیکن اے عام لوگو! تمہیں نظر نہیں آتا) اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنی جان کو بھی نہیں چاہتے اور اپنے نفس کو بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہی چاہتے ہیں اور اسی طرح ہر محبوب شئے سے اللہ ہی کے لئے محبت کرتے ہیں تو سچی محبت اور ذاتی الفت ان ہی لوگوں کو ہے اور سچ تو یہ ہے کہ محبت میں سچے لوگ یہی لوگ ہیں اور جب اس پاک گروہ کو اللہ کی محبت اس درجہ ہوتی ہے کہ ہر شئے سے محبت اللہ ہی کے واسطے ہو جائے تو اس وقت محبوب کا ستانا بھی ان کے نزدیک انعام سے کم نہیں ہوتا بلکہ ستانے میں انعام کی نسبت اور زیادہ لطف آتا ہے کیونکہ اس میں اخلاص خوب ظاہر ہوتا ہے بخلاف انعام کے کہ اس میں اس قدر اخلاص مترشح نہیں ہوتا (کیونکہ مثل مشہور ہے جس کا کھائے اس کا گائے) اور قیامت کے روز ان لوگوں کو علی الاعلان کفار کے روبرو حکم دیا جائے گا کہ اگر تم میرے دوست ہو تو جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ وہ سنتے ہی اس میں گھس جائیں گے اس وقت عرش کے نیچے ایک پکارنے والا پکارے گا۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ تو یہ ان ہی لوگوں کی ہمت ہے کہ جلتی آگ میں کود پڑیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کی عبادت جہنم کے خوف اور جنت کی امید پر کرتے ہیں تو وہ اللہ کی رضامندی کے لئے دیدہ و دانستہ آگ کو ہرگز اختیار نہ کریں گے۔ یہ تو اسی سے ہو سکتا ہے جس کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ معیت اور قرب ذاتی ہو اور بار امانت کا حامل ہو۔

marfat.com

وَلَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا (اور اگر کوئی دیکھے ان لوگوں کو جو ظالم ہیں) نافع ابن عامر اور یعقوب نے تری تاء سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں یا تو نبی ﷺ مخاطب ہوں گے یا ہر شخص کی طرف کلام کا رخ ہو گا۔ اور مفعول تری کا اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ہو گا اور دیگر قراء نے یری یا سے پڑھا ہے اس تقدیر پر یری کا فاعل یا تو ضمیر واحد غائب ہو گی جو سامع کی طرف راجع ہے اور یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ہو گا۔ ظَلَمُوْا میں ظلم سے اللہ کا شریک ٹھہرانا اور ان سے اللہ کی سی محبت کرنا مراد ہے اور ظلموا کا مفعول اَنْفُسَهُمْ ہے یعنی جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ (جبکہ دیکھیں گے وہ عذاب) ابن عامر نے یُرَوْنَ صیغہ مجہول سے بضم یاء پڑھا ہے اور باقی قراء نے فتحہ سے جواب لو محذوف ہے اگر تری کی بصیغۂ حاضر قرأت کی جاوے تو جواب لَرَاَیْتَ اَمْرًا فَظِیْعًا (دیکھیں گے آپ ایک امر ہولناک) نکالا جائے گا اور یری بصیغۂ غائب لیا جائے تو جواب لَنَدِمُوْا نَدَامَةً شَدِیْدَةً (بے شک سخت نادم ہوں گے) مقدر مان لیا جائے گا اور لو کا جواب حذف کر دینے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر لو کسی ایسے امر پر آیا ہے کہ اس کی طرف قلب کو میلان اور شوق ہو تو جواب حذف کرنے سے کمال شوق مترشح ہوتا ہے اور اگر کسی امر خوفناک پر آیا ہے تو کمال خوف مستفاد ہوتا ہے کیونکہ حذف میں تعین تو ہوتی نہیں، جو چاہے جواب مقدر کر لیا جائے۔ تو حذف کرنا گویا اس کو بتلا رہا ہے کہ یہ امر ایسا ہے کہ اگر واقع ہو تو سب کچھ ہو بخلاف ذکر کر دینے کے کہ اس میں تعین ہو جاتی ہے (مثلاً ہماری زبان میں کہا جاتا ہے کہ "اگر زید آتا" تو مطلب یہ ہوا کہ اگر زید آتا تو کیا پوچھتے ہو، کیا ہوتا، غضب ہو جاتا یا بہت اچھا ہوتا لو اور اذ دونوں ماضی پر آتے ہیں۔ یہاں مستقبل پر اس لئے آئے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تو مستقبل بھی مثل ماضی کے ہے جیسے ماضی کا وقوع یقینی ہوتا ہے اسی طرح اللہ کے نزدیک مستقبل کا وقوع بھی یقینی ہے۔

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ (تو بڑے خوف کا وقت دیکھیں اس لئے کہ ہر طرح کی قوت اللہ ہی کو ہے اور بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے) اَنَّ الْقُوَّةَ پر لام حرف جر مقدر ہے اور جار مجرور مل کر جواب مقدر کے متعلق ہیں۔ ابو جعفر اور یعقوب نے اَنَّ الْقُوَّةَ اور اَنَّ اللّٰهَ میں اِنَّ کو ہمزہ کے کسرہ سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ دونوں سوال مقدر کے جواب ہوں گے۔ گویا کوئی سائل سوال کرتا ہے کہ مضمون بالا کی کیا وجہ ہے تو جواباً ارشاد ہے کہ قوت اللہ کو ہے اور اس صورت میں کلام اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ پر تمام ہو جائے گا۔ یری بصیغۂ واحد غائب کی قرأت پر یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ یری فعل قلب ہو اور اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اس کا فاعل قرار دیا جائے اور اَنَّ الْقُوَّةَ الخ کو قائم مقام دو مفعول کے ٹھہرا لیا جائے اور اس تقدیر پر یا تو آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر ظالم عذاب اور مصائب دنیوی دیکھتے وقت یہ جانتے کہ تمام قوت اللہ ہی کو ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ضار اور نافع ہے اور بندوں کے افعال اسی کی مشیت اور قدرت سے صادر ہوتے ہیں اور یہ جانتے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے اور یہ جانتے کہ جس کو اللہ تعالیٰ دینا چاہے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو نہ دے اس کو کوئی دینے والا نہیں اور اس کی قضاء کا کوئی رد کرنے والا نہیں جیسا کہ یہ سب باتیں مؤمنین جانتے ہیں تو ہرگز اللہ کا شریک نہ ٹھہراتے اور نہ غیر اللہ سے محبت کرتے اور یا معنی یوں ہوں گے کہ اگر یہ ظلم کرنے والے قیامت کے دن عذاب دیکھنے کے وقت یہ بات جانیں گے کہ تمام قوت اللہ تعالیٰ کو ہے تو سخت نادم ہوں گے اور ممکن ہے کہ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جمیعا کا جواب ہو اس تقدیر پر معنی یہ ہوں گے کہ اگر ظلم کرنے والے اپنے معبودوں کو دیکھتے کہ یہ کچھ نفع و ضرر دینے والے نہیں تو جان لیتے کہ تمام قوت اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ (یاد کرو اس وقت کو کہ) (جب الگ ہو جائیں گے وہ سردار جن کی پیروی کی گئی تھی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی تھی اور دیکھیں گے عذاب) اِذْ تَبَرَّاَ یا تو بتقدیر اُذْکُرْ منصوب ہے اور یا اِذْ یَرَوْنَ سے بدل ہے۔ وَرَاَوُا الْعَذَابَ میں واو حالیہ ہے اور قد اس پر سے مقدر ہے اور یا واؤ عطف کا ہے اور عطف تَبَرَّاَ پر ہے۔ اسی طرح وَتَقَطَّعَتْ میں بھی دونوں احتمال ہیں اور یہ بیزاری و علیحدگی قیامت میں اس

marfat.com

وقت ہوگی جب اللہ تعالیٰ سرداروں کو اور ان کے تابعین کو ایک جگہ جمع فرمائے گا۔ اور بعض نے کہا اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ شیطان آدمیوں سے بیزاری و علیحدگی چاہیں گے۔

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ (اور ٹوٹ جائیں گے ان سے سب تعلقات) یعنی دنیا میں محبت کے جو اسباب ان کے درمیان تھے مثلاً کسی کو نفع کی توقع ہے، کسی کو دفع ضرر کی تمنا ہے، قیامت کو وہ سب اسباب جاتے رہیں گے۔ سبب اصل میں اس ذریعۂ قرابت یا دوستی کو کہتے ہیں جس سے کوئی شئے دوسری شئے سے ملے اور اسی واسطے رسی کو اور راہ کو سبب کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک شئے سے ملنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ (اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے اتباع کیا تھا کہ اے کاش ہم کو ایک بار لوٹ جانا ملے تو الگ ہو جائیں ہم بھی ان سے) فنتبّرأ جواب لو ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ لو یہاں بمعنی لَیتَ ہے۔

كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ (جیسے یہ الگ ہو گئے آج ہم سے اسی طرح دکھائے گا اللہ انہیں ان کے عمل ان کے افسوس دلانے کو) یری اگر افعال قلوب سے ہو تو حسرات اس کا تیسرا مفعول ہو جائے گا ورنہ حال ہوگا۔ پیغمبروں کا اتباع اور نیک کام کو چھوڑنے اور اپنے اوقات کو بیہودہ ضائع کرنے پر تو کفار کو ندامت اور شرمندگی ہوگی اور اللہ کی نافرمانی اور دنیا کو دین پر ترجیح دینے سے حسرت اور افسوس ہوگا۔

سدی نے کہا ہے کہ کفار اگر اللہ کی اطاعت کرتے اور اس اطاعت پر ان کو جو درجات جنت میں ملتے وہ قیامت کو ان کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اگر تم اللہ و رسول کی اطاعت کرتے تو تمہیں یہ درجے ملتے۔ پھر ان کے سامنے ہی وہ سب درجے مؤمنین کو تقسیم کر دیئے جائیں گے، تو اس واقعہ سے بہت نادم ہوں گے اور حسرت و افسوس کر کے روئیں گے پیٹیں گے۔

وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ (اور وہ کبھی دوزخ سے نہ نکلیں گے) وَمَاهم بخارجین اصل میں مَایَخرُجُونَ تھا۔ جملہ فعلیہ سے جملہ اسمیہ اس لئے بنالیا گیا کہ بطور مبالغہ یہ سمجھا جائے کہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے اور اس لئے کہ نجات اور خلاصی پانے سے بالکل مایوس ہو جائیں، جملہ فعلیہ میں اتنا مبالغہ نہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ (اے لوگو کھاؤ ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں) جب قبائل ثقیف و خزاعہ و عامر بن صعصعہ و بنی مدلج نے اپنے اوپر بہت سی چیزیں جیسے حرث اور انعام اور بحیرہ اور سائبہ و حام و وصیلہ وغیرہ حرام کر لئے تو آیت یٰاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوا الخ نازل ہوئی۔

حَلَالًا طَيِّبًا (حلال اور ستھری) حَلاَلاً یا تو کُلُوا کا مفعول ہے یا مَافِی الْاَرْضِ سے حال ہے اور عَمَّا فِی الْاَرْضِ میں مِن تبعیضیہ ہے۔ جس کو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منع کیا ہو وہ حلال ہے کیونکہ اصل ہر شئے میں حلت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَلَقَ لَکُمْ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ (اور نہ چلو شیطان کے قدموں پر) یعنی شیطان کی پیروی کر کے خواہش نفس میں مت پڑو اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ بناؤ۔ ابو جعفر، ابن عامر، کسائی، حفص اور یعقوب نے خطوات کو بضم طاء پڑھا ہے اور دیگر قراء نے طاء کو ساکن کر کے پڑھا ہے۔ ضمۂ طاء کے ساتھ ہو یا سکون کے ساتھ ہر حال پر یہ لفظ خطوۃ کی جمع ہے اور خطوۃ چلنے والے دونوں قدموں کی درمیانی مسافت کا نام ہے یہاں خطوات سے مراد شیطانی راستے ہیں۔

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾ (بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے) مُبِیْنٌ کے یا تو یہ معنی کہ اس کی عداوت اہل بصیرت کے نزدیک بہت ظاہر ہے اگرچہ بظاہر جس کو بہکاتا ہے، اس سے دوستی جتاتا ہے اور اس دوستی جتانے ہی کے سبب آیت اَوْلِیَاءُ هُمُ الطَّاغُوْتُ میں اس کو ولی (دوست) سے تعبیر کیا ہے اور یا یہ معنی کہ عداوت کو ظاہر کرنے والا ہے، چنانچہ آدم کے

marfat.com

سجدہ کرنے سے صاف انکار کر گیا اور ان کو جنت سے نکلوایا اور قسم کھائی کہ آدم علیہ السلام کی اولاد کو بہکاؤں گا۔ اَبَانَ (ظاہر کیا) لازم و متعدی دونوں آتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شیطان کی عداوت کو بیان فرماتا ہے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ بس وہ تم کو برائی اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے) سُوء اصل میں اس شئے کو کہتے ہیں جو آدمی کو غمگین کرنے والی ہو فَحْشَآءُ، بَاساء کے وزن پر مصدر ہے۔ سُوء اور فحشاء دونوں سے مراد گناہ ہے۔ وصف کے اختلاف سے ایک کا دوسرے پر عطف کر دیا گیا۔ چنانچہ گناہ سوء بھی ہے اس لئے کہ عاقل اس سے مغموم ہوتا ہے اور فحشاء بھی ہے کیونکہ آدمی اسے قبیح سمجھتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سوء سے مطلق گناہ مراد ہے اور فحشاء سے کبیرہ۔ بعض نے کہا کہ جس میں حد واجب ہوتی ہو وہ گناہ مراد ہیں۔ شیطان کے حکم کرنے کے یہ معنی کہ برائی کا وسوسہ ڈالتا ہے اور اس وسوسہ ڈالنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسے غلبہ بھی حاصل ہو، غلبہ تو اسے اس کے متبعین کے سوا اور کسی پر ہوتا ہی نہیں۔

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابلیس علیہ اللعنۃ اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے پھر اپنے لشکر کے لوگوں کو بہکانے کے لئے بھیجتا ہے۔ اس کے یہاں ادنیٰ ادنیٰ مرتبہ کے شیطان بھی عالم میں بڑے بڑے فتنے پھیلا دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ بہکا کر آتے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ میں نے آج فلاں برا کام کرا دیا۔ ابلیس کہتا ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ایک اور آتا ہے وہ کہتا ہے میں نے بہت بڑا کام کیا ہے، ایک شخص اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دی۔ ابلیس سن کر خوب خوش ہوتا ہے اور اس کو مقرب بناتا ہے اور کہتا ہے تو نے خوب کام کیا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے اندر شیطان کا بھی اثر ہے اور فرشتہ کا بھی۔ شیطان کا اثر تو یہ ہے کہ شر کا وعدہ دلاتا اور حق کی تکذیب کرتا ہے اور فرشتہ کا اثر یہ ہے کہ بھلائی کا وعدہ دلاتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے تو جو شخص ملکوتی خیال اپنے جی میں پائے تو جانے کہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی حمد کرے اور جو برائی کا وسوسہ آئے تو شیطان کے مکر سے اللہ کی پناہ مانگے۔ پھر حضور ﷺ نے آیت اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (شیطان تم سے فقر کا وعدہ کرتا ہے اور تم کو برائی کا حکم کرتا ہے) تلاوت فرمائی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ شیطان کے امر کو وسوسہ ہی پر ٹالا۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ (اور اس بات کا کہ اللہ پر بہتان باندھو جو تم نہیں جانتے) وَاَنْ تَقُوْلُوْا کا عطف بالسوء پر ہے اور محلاً مجرور ہے۔ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی جس کی خبر نہیں وہ اللہ پر باندھنے لگو مثلاً اللہ تعالیٰ نے کھیتی، چوپائے اور سانڈھ وغیرہ حرام نہیں فرمائے تم اپنی طرف سے حرام ٹھہراؤ۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (اور جب کہا جاتا ہے ان (یہود) سے کہ چلو اس پر جو خدا نے اتارا ہے) یہاں سے نیا قصہ شروع ہوا ہے لَهُمْ میں اضمار قبل الذکر ہے۔

ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو اسلام کی دعوت دی اور جنت کی رغبت دلائی اور عذاب سے ڈرایا تو رافع بن حرملہ یہودی اور مالک بن عوف یہودی نے کہا کہ اے محمد ہم آپ کا اتباع نہ کریں گے بلکہ جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے اسی پر چلیں گے۔ کیونکہ وہ ہم سے زیادہ عالم اور ہم سے اچھے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا الخ نازل فرمائی۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد یا تو قرآن ہے یا تورات ہے کیونکہ تورات بھی محمد ﷺ کے اتباع ہی کا حکم کرتی ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت عرب کے مشرکین اور کفار قریش کے بارہ میں نازل ہوئی وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ میں ضمیر هُمْ النَّاس کی طرف راجع ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت عرب کے مشرکین اور کفار قریش کے بارے میں نازل ہوئی وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ میں ضمیر هُمْ النَّاس کی طرف راجع ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ يٰاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا میں جو الناس ہے اس کی طرف راجع ہے۔ یہود کو صیغہ خطاب سے ذکر نہ فرمانے کی یہ وجہ ہے کہ ان کی گمراہی کا سب کو علم ہو جائے کسی پر ان کی حماقت مخفی نہ رہے۔ گویا عقلاء کی طرف متوجہ ہو کر فرما رہے ہیں۔ کہ ان احمقوں کو ذرا ملاحظہ

marfat.com

فرمائیے کہ جب انہیں ٹھیک بات بتلائی تو کیا جواب دیتے ہیں۔

قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ (تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ چلیں گے ہم) کسائیؒ نے بل نتبع میں لام کو نون میں ادغام کر کے پڑھا ہے۔ کیونکہ کسائی ھل اور بل کے لام کو ان حروف میں لزعام کرتے ہیں۔ وہ حرف یہ ہیں تاثا زاسین طاظا ضاد نون جیسے ھل تعلم۔ ھل ثوب۔ بل زین، بل سولت، بل طبع، بل ظننتم، بل ضلوا ھل ندلکم، ھل نبئکم، ھل نحن وغیرہا اور حمزہؒ صرف تاثاسین میں ادغام کرتے ہیں۔ اور ھل طبع میں۔ خلادؒ سے مختلف روایتیں ہیں۔ اور ہشامؒ نون اور صاد میں اظہار کرتے ہیں اور ھل تسوی کی تاء میں سورۂ رعد میں اظہار کرتے ہیں اور باقی اور مقامات پر ادغام کرتے ہیں اور ابو عمروؒ ھل تریٰ من فطور سورۂ ملک میں اور فھل تریٰ لھم سورۂ حاقہ میں ادغام کرتے ہیں اور ان کے سوا اور قراء آٹھوں حرفوں میں ادغام نہیں کرتے اظہار کرتے ہیں۔

مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ط (اس پر کہ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے) اس سے مراد یا تو اتباع تورات ہے اور یا بعض حلال کو حرام سمجھنا۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (بھلا اگر ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر چلتے ہوں) واؤ اصل میں ہے تو عطف کے لئے لیکن اَوَلَوْ كَانَ میں کہتے ہیں کہ واؤ تعجب کا ہے اور اس پر ہمزۂ استفہام کا توبیخ کے لئے ہے۔ تقدیر عبادت کی ہے۔ اَيَتَّبِعُوْنَ اٰبَآئَهُمْ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ يَعْقِلُوْنَ وَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (کیا اپنے باپ دادا کا اتباع کریں گے چاہے باپ دادے ان کے سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں) صدر جملہ حذف کر دیا گیا۔ یہ جملہ ترکیب میں حال ہے۔ لفظ شیئًا تحت میں نفی کے آکر عام ہو گیا ہے تو مقتضے اس کا یہ ہے کہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں، مگر وہ تو بہت سی باتیں سمجھتے تھے۔ اس لئے یہاں ایک قید کا لحاظ کیا جائے گا یعنی دینی امور بالکل نہیں سمجھتے۔ اگرچہ دنیا کے دھندے سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ آیت یہود کے بارہ میں نازل ہوئی تھی تو یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں کیونکہ وہ تو تورات کے متبع تھے تو جواب اس کا یہ ہے کہ وہ تورات کے ہرگز مطیع نہ تھے اگر وہ تورات پر عمل کرتے تو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے۔ یا یوں کہا جائے کہ یہ کلام بطور تعریض کے ہے اور حاصل یہ ہے کہ یہود نے شاید اپنے باپ دادوں کو تورات کی تحریف کرتے ہوئے پایا ہوگا۔ اسی واسطے یہ خود بھی تحریف کرتے ہیں۔ اگر ان کو تورات کا متبع پاتے تو یہ خود اسلام کے طالب اور منتظر ہوتے نہ کہ مخالف (جیسے کوئی برا کام کرے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ تمہارے باپ دادا بھی ایسے ہی ہوں گے)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ط (اور مثال ان لوگوں کی کہ کافر ہیں اس شخص کی سی ہے جو چلا چلا کر ایسی شئے کو پکار رہا ہے جو کچھ بھی سوائے پکارنے کے اور چلانے کے نہیں سنتے) نعق اور اسی طرح نعیق چرواہے کے بکریوں پر چلانے اور آواز دینے کو کہتے ہیں۔ اگر یہ آیت بت پرستوں کے بارے میں ہو تب تو سہل ہے کچھ تاویل و توجیہ کی ضرورت نہیں۔ حاصل یہ ہوگا کہ بتوں کو پکارنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی جانوروں کو پکارے کہ وہ سوائے آواز سننے کے خاک بھی نہیں سمجھتے۔ اس تقدیر پر یہ آیت مضمون میں آیت لَا يَسْمَعُوْا دُعَآئَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ (نہیں سنتے ہیں وہ پکار تمہاری اور اگر سنیں تو جواب نہ دیں گے) کے قریب قریب ہو جائے گی اور یہ تمثیل تمثیل مرکب ہوگی (یعنی ہر جزو مثال کا ممثل لہ کے ہر جزو کے مشابہ ہونا ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ صرف تشبیہ پکار کے فضول اور بے فائدہ ہونے میں ہوگی) اور اِلَّا دعاء و نداء سے بھی کچھ فساد تشبیہ میں لازم نہ آئے گا (فساد یہ تھا کہ کوئی کہہ سکتا تھا کہ بت جو ممثل لہ ہیں ان میں یہ امر کہاں پایا جاتا ہے کہ آواز سنتے ہوں وہ تو آواز سننے سے بھی معرا ہیں) اور اگر اس آیت کو یہود کے بارے میں کہا جائے تو اس وقت معنی آیت کے یوں ہوں گے کہ اے محمد ﷺ آپ جو ان کو اسلام کی طرف دعوت فرماتے ہیں اور وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کی اقتدا کرتے ہیں، تو اس جواب کی

marfat.com

ایسی مثال ہے جیسے کوئی بہائم کو آواز دے یعنی جیسے بہائم کو آواز دینا بالکل مہمل اور بے سود اور حماقت ہے اسی طرح ان کا یہ جواب مہمل اور غیر مقبول ہے اور یا اس آیت میں کفار کو بہائم سے تشبیہ دینا منظور ہے۔ اس تقدیر پر تاویل کی ضرورت ہوگی اور وہ تاویل یہ ہے کہ یا تو وَمَثَلُ الَّذِیْنَ سے پہلے وَمَثَلُکَ مقدر مانا جائے اور یا مشبہ یعنی اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے پہلے مضاف محذوف مانا جائے اور تقدیر یہ قرار دی جاوے وَمَثَلُ دَاعِی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ۔ معنی آیت کے پہلی صورت میں یہ ہوں گے کہ محمد ﷺ آپ کی اور کافروں کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بہائم کو آواز دے یعنی آپ تو گویا مثل آواز دینے والے کے ہیں اور یہ کفار مثل بہائم کے ہیں) اور دوسری صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ جو شخص کفار کو اسلام کی طرف بلاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی جانوروں کو پکارے یا یہ توجیہ کی جائے کہ اَلَّذِی یَنْعِقُ سے پکارنے والا مراد نہ لیا جائے بلکہ جس کو پکارا گیا ہے یعنی بہائم وغیرہ مراد لئے جائیں اور ایسا استعمال کلام عرب میں شائع ہے کلام کو بدل لیتے ہیں چنانچہ بولتے ہیں فُلَانٌ یَخَافُکَ خَوْفَ الْاَسَدِ لفظوں کے اعتبار سے معنی یہ ہیں کہ فلاں شخص تجھ سے ایسا ڈرتا ہے جیسے شیر ڈرتا ہے اور مراد یہ ہے کہ ایسا ڈرتا ہے جیسے شیر سے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَۃِ لفظی معنی یہ ہیں کہ کنجیاں اس کی بیشک تھک جاتی تھیں۔ جماعت سے اور مراد یہ ہے کہ ایک جماعت اس کی کنجیوں سے تھک جاتی تھی۔

اس تقدیر پر حاصل یہ ہے کہ کافر اپنے باپ دادا کی تقلید کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ جو احکام ان کو سنائے جاتے ہیں ان پر کان نہیں دھرتے اور ان میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے، بہائم کی سی حالت ہے کہ ان کو خواہ کتنا ہی آواز دو آواز سننے کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے۔ یا یہ معنی ہوں گے کہ یہ یہود اپنے باپ دادا کا اتباع تو کرتے ہیں لیکن ان کو ان کے حقیقت حال کی خبر نہیں جیسے بہائم ہوتے ہیں کہ آواز سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں ان کے باپ دادا کا تو یہ حال تھا کہ تورات کے منسوخ ہونے سے پہلے تورات کے بتلائے ہوئے احکام کا اتباع تو کرتے تھے اور محمد ﷺ اور قرآن کا انتظار کرتے تھے اور ان کی یہ حالت ہے کہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم تورات کا اتباع کرتے ہیں، لیکن واقع میں اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ تورات تو بتلا رہی ہے کہ قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لاؤ اور یہ اس کا صاف انکار کر رہے ہیں۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ (بہرے، گونگے، اندھے ہیں) صُمٌّ بُکْمٌ الخ مرفوع علی الذم ہے (یعنی اس سے پہلے فعل ذم (مذمت کئے گئے) مقدر مانا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کافر آیات کو فکر سے نہیں سنتے اس لئے بہرے ہیں اور نہ کلمات خیر ان کی زبان سے نکلتے ہیں اس لئے گونگے ہیں اور ہدایت کو دیکھتے نہیں اس وجہ سے اندھے ہیں۔

فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ (سو وہ کچھ نہیں سمجھتے) یعنی چونکہ ان کی فکر و نظر میں خلل واقع ہو گیا ہے، اس لئے دین کی بات کو سمجھتے نہیں، اول حق تعالیٰ نے لذیذ اور حلال نعمتیں کھانے کا حکم فرمایا اب اس کے بعد حلال کھانے کی غایت اور غرض یعنی شکر کرنے کا امر فرماتے ہیں، لیکن چونکہ اس امر اور اس کی غایت میں اور مضامین بھی درمیان میں آگئے تھے اس لئے اس امر کو پھر اعادہ فرماتے ہیں اور چونکہ شکر قابل اعتبار اہل ایمان کا ہے اس لئے یہاں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ سے خطاب فرماتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (اے ایمان والو ہم نے جو تم کو رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ حلال اور ستھری چیزیں)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہیں اس لئے پاکیزہ ہی چیز کو قبول کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو حلال کھانے کا حکم فرمایا جیسا کہ پیغمبروں کو بھی یہی حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (اے پیغمبر و حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو) اور فرمایا یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ پھر فرمایا کہ آدمی سفر طویل کرتا ہے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتا ہے اور بال بکھرے ہوئے اور غبار آلودہ ہیں یعنی سامان قبولیت دعا کے سارے مجتمع ہیں، لیکن

marfat.com

اس کا کھانا پینا اور پہننا سب حرام ہے اور حرام رزق سے اس کی غذا ہے پھر دعا کیسے قبول ہو۔

وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۷۲﴾ (اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو) مطلب یہ ہے کہ اگر تم خاص اللہ ہی کی پرستش کرنے والے ہو اور اسی کو مولا جانتے ہو تو اس کا شکر کرو۔ کیونکہ عبادت کی تکمیل بغیر شکر کے نہیں ہوتی۔ سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا جن وانس کے ساتھ ایک بہت بڑا حیرات ناک واقعہ ہے، وہ یہ ہے کہ ان کو پیدا تو میں کرتا ہوں اور وہ غیر کی عبادت کرتے ہیں اور میں رزق دیتا ہوں اور وہ اوروں کا شکر کرتے ہیں۔ اس حدیث کو طبرانی نے مسندات شامیین میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں اور دیلمیؒ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے راویت کیا ہے۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ (بس اس نے تو حرام کیا ہے تم پر مردار) ابو جعفر نے المیتہ کو تمام قرآن میں تشدید سے پڑھا ہے اور قراء نے بعض مواقع میں مشدد پڑھا ہے اور بعض میں نہیں۔ ہم انشاء اللہ عنقریب مفصلاذ کر کریں گے۔ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ لفظ انما (سوائے اس کے نہیں) مفید حصر کو ہے، تو معلوم ہوا کہ اللہ نے سوائے مردار اور خون کے اور کوئی شئے حرام نہیں فرمائی، حالانکہ سینکڑوں چیزیں حرام ہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک کوفہ کے نحویوں کا قول مختار اور پسندیدہ ہے اور ان کے نزدیک لفظ انما حصر کے لئے نہیں، بلکہ یہ لفظ انَّ حرف تحقیق اور ما کافہ سے مرکب ہے اور اگر بالفرض حصر کے موافق آیت کا ترجمہ کیا جائے اور انما کو حصر ہی کے لئے رکھا جائے تو یہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ یعنی ان چیزوں کے اعتبار سے حصر ہے، جن کو کفار نے اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا جیسے بحیرہ وسائبہ ووصیلہ وحام وغیرہا واللہ اعلم۔

میتہ اس جاندار کو کہتے ہیں جو بغیر ذبح کئے مر جائے مگر اس میں اتنی قید اور ہے کہ ذبح ہونے کی اس میں شرعاً قابلیت بھی ہو۔ اب اس کے موافق مچھلی اور مری ہوئی ٹڈی میتہ سے نکل جائیں گے۔ یا تو یہ توجیہ کی جائے کہ تعریف میتہ میں تو ان کو داخل رکھا جائے لیکن یہ کہا جائے کہ حدیث نے ان کی تخصیص کر دی ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ اور حاکم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کر دیئے گئے۔ مردار تو مچھلی اور ٹڈی اور خون جگر اور تلی اور اسی طرح جو گوشت زندہ جانور سے علیحدہ کر لیا جائے۔ وہ بھی بحکم حدیث مردار کے حکم میں ہے۔ چنانچہ ابو داؤد اور ترمذی رحمتہ اللہ علیہما نے ابی واقد لیثیؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو گوشت زندہ جانور سے کاٹ لیا جائے وہ مُردار ہے۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مردار کی بیع وشراء اس کی قیمت کھانا اور اس کی چربی اور کھال سے بغیر دباغت کے نفع اٹھانا جملہ امور ناجائز ہیں۔

چنانچہ صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے جس سال مکہ فتح ہوا تھا رسول اللہ ﷺ سے مکہ میں سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور مُردار اور سؤر اور بتوں کی بیع کو حرام فرما دیا۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ مردار کی چربی کا کیا حکم ہے لوگ تو کشتیوں میں مالش کرتے ہیں اور کھالوں میں اس کا روغن لگاتے اور روشنی سے اس کی منتفع ہوتے ہیں۔ فرمایا سب حرام ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ یہود کو خدا کھودے اللہ تعالیٰ نے ان پر مردار کی چربی حرام فرمائی تھی، انہوں نے اس کو پگھلا کر اس کی خرید وفروخت کی اور اس کی قیمت کھائی۔ نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا یہود کو کھودے ان پر مردار کی چربی حرام ہوئی، انہوں نے اسے پگھلا کر بیچنا شروع کر دیا۔ اس حدیث کو بخاری ومسلم رحمتہ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور امام شافعیؒ واحمدؒ اور چاروں اصحاب سنن نے عبد اللہ بن حکیمؒ سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا اس مضمون کا خط آیا کہ آگاہ ہو مردار کی غیر مدبوغ کھال اور اس کے پٹھے سے فائدہ اندوز نہ ہو۔ ابو داؤد نے اپنی روایت میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ یہ واقعہ آپ کی وفات سے ایک ماہ پیشتر کا ہے اور امام احمدؒ کی روایت میں ایک ماہ یا دو ماہ پہلے آیا ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مردار کے کسی جزو سے نفع نہ لو۔ اس حدیث کو ابو بکر شافعی نے

marfat.com

روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔
اور ابو داؤد اور نسائی و حاکم رحمتہ اللہ علیہم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے درندوں کی کھال سے منع فرمایا ہے۔ حاکم نے اتنا بڑھایا ہے کہ درندوں کی کھال کو فرش بنانے سے منع فرمایا ہے اور معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے چیتوں کی کھال پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے۔ اور احمد و نسائی رحمتہ اللہ علیہما نے مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ریشم اور سونے اور چیتوں کی کھال کے تکیوں سے منع فرمایا ہے اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کپڑے میں چیتے کی کھال ہو فرشتے اس سے علیحدہ رہتے ہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا مردار کی کھال سے بعد دباغت کے بھی منتفع ہونا جائز ہے یا نہیں۔ ابو حنیفہ اور شافعی رحمہما اللہ کا تو یہ مسلک ہے کہ دباغت کے بعد کھال پاک ہو جاتی ہے اس سے نفع اٹھانا بھی جائز ہے اور اس کی بیع بھی جائز اور امام احمد اور مالک رحمہما اللہ عدم جواز کے قائل ہیں۔ ہماری دلیل مندرجہ ذیل احادیث ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک مری ہوئی بکری کی طرف سے گزر ہوا فرمایا تم اس کی جلد کو کام میں کیوں نہ لائے لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ تو مردار ہے۔ فرمایا اس کا کھانا حرام ہے، کیا یہ کھال پانی اور قرظ سے پاک نہ ہو جاتی (قرظ ایک دوا ہے جس سے کھالوں کو دباغت دیتے ہیں) اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس کا گوشت حرام ہے اور جلد کی اجازت ہے۔ دار قطنی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سب سندیں صحیح ہیں۔

اور نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے جو کھال دباغت دی جائے وہ پاک ہو جاتی ہے اور اسی مضمون کی اوروں سے بھی احادیث مروی ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دباغت ہر کھال کو پاک کرنے والی ہے۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امر فرمایا ہے کہ کھالوں کو جب دباغت دیدیا جائے تو اس نے منتفع ہوا کریں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ ہماری ایک بکری مرگئی تھی ہم نے اس کی کھال کو دباغت دیدی اور مالکیہ و امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ مردار کے جزو سے منتفع ہونا جائز نہیں اور کہتے ہیں کہ آخری قول رسول اللہ ﷺ کا یہی ہے کیونکہ عبداللہ بن حکیم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مصرح ہے کہ ہمارے پاس حضور ﷺ کا خط اس مضمون کا وفات سے ایک ماہ یا دو ماہ پیشتر آیا کہ مردار کے کچے چمڑے اور پٹھے سے نفع حاصل نہ کرو۔ ہماری طرف سے مالکیہ اور امام احمد کو یہ جواب ہے کہ عبداللہ بن حکیمؒ کی حدیث کی سند اور متن مضطرب ہے۔ اس لئے ہم نے جو صحیح صحیح حدیثیں پیش کی ہیں ان کے مزاحم نہیں ہوسکتی اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ عبداللہ بن حکیم کی حدیث میں لفظ اھاب مروی ہے اور اھاب کچے چمڑے کو کہتے ہیں۔ کچے چمڑے سے ہمارے نزدیک منتفع ہونا جائز نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ عبداللہ بن حکیمؒ کی حدیث اوسط میں طبرانی اور ابن عدیؒ کے نزدیک اس مضمون کی ہے کہ ہم جہینہ کی زمین میں تھے کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے تحریر فرمایا کہ میں تم کو مردار کی کھال کے بارہ میں اجازت دے چکا تھا مگر اب لکھتا ہوں کہ مردار کی کھال اور پٹھے سے نفع حاصل نہ کرو۔ تو اس سے تو صریح عدم جواز معلوم ہوتا ہے نیز یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخری قول آپ کا یہی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس کی سند میں فضالہ بن مفضل راوی ہے اور ابو حاتم رازی نے اس کی نسبت کہا ہے کہ وہ اس کا اہل نہیں ہے کہ اہل علم اس سے حدیث لکھیں۔ مردار کے بال ہڈی پٹھے سینگ اور سم میں علماء کا اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اشیاء پاک ہیں ان کی بیع اور انتفاع دونوں جائز ہیں امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ناپاک ہیں امام احمد و مالک رحمہما اللہ بال کو پاک فرماتے اور باقی چیزوں کو ناپاک کہتے ہیں۔ شافعی و احمد و مالک رحمہم اللہ تینوں حضرات کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مردار کے کسی جزو سے انتفاع حلال نہیں اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ بالوں کی نجاست کے لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

marfat.com

فرمایا۔ ناخن اور خون اور بالوں کو دفن کر دیا کرو کہ یہ سب مردار ہیں۔ حنفیہ کی طرف سے ان حضرات ثلثہ کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ دوسری حدیث کی سند میں ہم کلام کرتے ہیں کیونکہ اس میں ایک راوی عبد اللہ بن عزیز ہے اور اس کی نسبت ابو حاتم رازی نے یہ کہا ہے کہ اس کی احادیث منکر ہوتی ہیں اور میرے نزدیک پایۂ صدق پر بھی نہیں پہنچیں۔ اور علی بن حسین رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن عزیز کچھ نہیں اس لئے ہم اس سے جھوٹی احادیث نہیں لیتے اور رہی پہلی حدیث سو اس کی سند میں بھی کلام ہے اور قطع نظر اس کے ایک صحیح حدیث کے بھی معارض ہے اور وہ صحیح حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مردار کا صرف کھانا حرام ہے۔ چنانچہ تمامہ اسے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور جس قدر سندیں اس حدیث اول کی ہیں سب منکر ہیں۔ اس لئے قابل اعتماد نہیں۔ ہماری دلیل ایک اور حدیث ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف مردار کا گوشت کھانا منع فرمایا ہے۔ باقی جلد اور بال اور ان میں کیا برائی ہے۔ لیکن اس کی سند بھی مخدوش ہے کیونکہ اس میں عبد الجبار راوی ضعیف ہے، اگرچہ ابن حبان رضی اللہ عنہ نے اسے ثقات میں شمار کیا ہے۔ نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ مردار کا وہ حصہ جو کھایا جاتا ہے وہ تو حرام ہے۔ باقی جلد، بال، صوف، دانت، استخوان سب سے انتفاع حلال ہے۔ لیکن اس کی سند بھی خالی از نظر نہیں اس میں ابو بکر ہذلی راوی متروک ہے۔ غندر نے اس کی نسبت کذاب کا لفظ کہا ہے اور یحییٰ بن معین اور علی نے کہا ہے کہ ابو بکر ہذلی کچھ نہیں اور ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے ایک ہار عصب کا اور دو کنگن ہاتھی دانت کے خرید فرمائے۔ اس کی سند بھی نقش بر آب ہے کیونکہ حمید اور سلیمان دونوں مجہول راوی ہیں اب ہمارا استدلال ذیل کے آثار سے ہے کہ جو بخاری نے تعلیقاً لکھے ہیں۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ نے مردار کی ہڈی جیسے ہاتھی دانت وغیرہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں نے علماء سلف کو ہاتھی دانت کے کنگھے سے بال درست کرتے اور ہاتھی دانت کی پیالی وغیرہ میں تیل لگاتے دیکھا ہے اس میں وہ کچھ حرج نہ جانتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ زہریؒ کے سلف یا تو صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں یا بڑے بڑے تابعین ہیں۔ اس تقدیر پر یہ فعل صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کا ہوا پھر اس کے جواز میں کیا کلام رہا۔ حماد بن سلمہ کہتے ہیں کہ مردار کے پروں سے نفع مند ہونے میں کچھ حرج نہیں ابن سیرین اور ابراہیم نے کہا ہے کہ ہاتھی دانت کی تجارت میں کچھ برائی نہیں واللہ اعلم۔

وَالدَّمَ (اور خون) اس سے سب کے نزدیک اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا کی موافقت کی وجہ سے بہتا خون مراد ہے۔

وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ (اور سؤر کا گوشت) سؤر بالاتفاق نجس العین ہے اس کے اجزاء کی حتیٰ کہ بالوں کی بیع وغیرہ بھی جائز نہیں۔ قرآن پاک میں صرف گوشت کی اس لئے تخصیص فرمائی کہ حیوان سے بڑا مقصود گوشت ہی ہے اور باقی اجزاء تو مثل تابع کے ہیں۔ خنزیر کے نجس العین ہونے پر آیت فَاِنَّهٗ رِجْسٌ صاف دال ہے اور اس کی مفصل تفسیر مع مالہ وماعلیہ کے انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں آئے گی۔ خنزیر کے بالوں سے نفع حاصل کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ وامام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو اس سے جوتے و مشک سینے کی اجازت دیتے ہیں۔ امام شافعیؒ حرام فرماتے ہیں اور امام احمدؒ کراہت کے قائل ہیں۔ اگر سور کا بال قلیل پانی میں گر پڑے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک پانی نجس ہو جائے گا۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ نجس نہ ہوگا کیونکہ انتفاع کی اجازت پاکی کی دلیل ہے اور امام ابو یوسفؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اجازت ضرورت کے وقت ہے اور ضرورت کا ظہور حالت استعمال میں ہوتا ہے۔ پانی میں گرنا اور شئے ہے اور استعمال اور شئے ہے۔ ہدایہ میں ایسا ہی مذکور ہے۔ فقیہ ابو اللیثؒ کہتے ہیں کہ اگر سور کے بال خریدنے سے ہی ملتے ہوں تو خریدنا جائز ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ سینا حد ضرورت سے خارج ہے اور شئے سے بھی سی سکتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابن سیرینؒ خنزیر کے بالوں کا سلا موزہ پہنتے تھے۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ اس کے موافق نہ اس کی بیع جائز اور نہ انتفاع جائز ہے۔

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ (اور جس پر پکارا گیا اللہ کے غیر کا نام) ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ مراد اس سے وہ

marfat.com

جانور ہے کہ جس کے ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو۔ اہلال اصل میں ہلال (پہلی رات کا چاند) دیکھنے کو کہتے ہیں چنانچہ بولتے ہیں اہل الہلال یعنی دیکھا چاند چونکہ چاند دیکھنے کے وقت لوگ بلند آواز سے تکبیر کہا کرتے ہیں۔ اس لئے مطلق آواز بلند کرنے کو اہلال کہنے لگے۔ اور کفار کی یہ عادت تھی کہ جب اپنے معبودوں کے لئے ذبح کرتے تو ان معبودوں کا با آواز بلند ذکر کرتے تھے پھر اس فعل نے اس قدر شہرت پائی کہ ہر ذبح کرنے والے کو مُہِلٌ (آواز بلند کرنے والا) کہنے لگے اور جس جانور پر بسم اللہ پڑھنی سہواً یا قصداً ترک کر دی جائے اس کا ذکر انشاء اللہ ہم سورۂ انعام میں کریں گے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ (جو کوئی ناچار ہو جائے) عاصم اور ابو عمرو اور حمزہ نے فَمَنِ اضْطُرَّ اور اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ اور اَنِ احْكُمْ اور وَلٰكِنِ انْظُرْ اور اَنِ اغْدُوْا میں نون کو مکسور پڑھا ہے اور لَقَدِ اسْتُهْزِءَ کی دال کو اور قَالَتِ اخْرُجْ کی تاء کو اور فَتِيْلًا انْظُرْ اور مُبِيْنَانِ اقْتُلُوْا کی تنوین کو جب دوسرے ساکن کے بعد ضمہ لازم ہو اور ہمزۂ وصل کی ابتداء ضمہ سے ہو، مکسور پڑھا ہے اور ابن عامر تنوین کی صورت میں اتفاق کرتے ہیں اور اسی طرح قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ کے لام کو اور اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ کے واؤ کو عاصم اور حمزہ نے مکسور پڑھا ہے اور لام کی صورت میں یعقوبؒ بھی موافق ہیں اور باقی قراء نے تمام الفاظ مذکورہ میں فعل اول کو ضمہ سے پڑھا ہے اور ابو جعفر نے فَمَنِ اضْطُرَّ کی طاء کو نون کے کسرہ کی وجہ سے مکسور پڑھا ہے۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ جس کو بھوک کی شدت یا کسی کے زبردستی کرنے سے چار ناچار مردار یا خون یا سور کا گوشت کھانا پڑے اس کے لئے کھانا ان چیزوں کا حلال ہے اور یہ مسئلہ متفق علیہا ہے۔

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (کہ نہ خلاف کرنے والا اور نہ حد سے بڑھنے والا) ترکیب میں حال واقع ہوا ہے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کو صرف جان بچانے کے لئے کھایا لذت اور خواہش کا طالب ہو کر نہیں کھایا اور نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھایا۔ یہاں سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ مضطر کو جان بچانے کی قدر کھانا جائز ہے اور زیادہ کی اجازت نہیں۔ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول کے موافق سیر ہو کر کھانا بھی جائز ہے اور یہی قول امام مالک کا ہے اور امام احمد سے بھی ایک روایت کے موافق یہی منقول ہے اور راجح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر یہ توقع ہو کہ حلال قریب مل جائے گا، تب تو سوائے جان بچانے کے زیادہ کھانا جائز نہیں اور اگر امید نہ ہو تو اس کے لئے سیر ہونا اور کچھ ساتھ توشہ کے طور پر لے لینا بھی جائز ہے۔ بعض شافعیہ نے غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ ضرورت کے وقت ان چیزوں کو کھایا۔ مگر حاکم سے بغاوت نہیں کی اور نہ راہزنی اور فساد کیا۔ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کا مذہب یہی ہے کہ جو گناہ کی نیت سے سفر کرتا ہو اس کو ضرورت کے وقت بھی مردار وغیرہ کھانے کی اجازت نہیں اور جس قدر مسافر کے لئے سہولت اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے وہ بھی اسے بلا توبہ کئے جائز نہیں۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد اور سعید بن جبیرؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ باغٍ اور عادٍ میں بغی (خلاف حکم کرنا) اور عدوان (حد سے متجاوز ہونا) سے کھانے میں بے حکمی کرنا اور حد سے متجاوز ہونا مراد ہے اور مقاتل بن حبان نے کہا ہے کہ باغ کے معنی حلال سمجھنے والا اور عاد کے معنی طلب حلال میں کوتاہی کرنے والا ہیں۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (تو اس پر کچھ گناہ نہیں) یعنی اضطرار کی حالت میں ان چیزوں کے کھانے سے کچھ گناہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ (بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے) یعنی جو کچھ مجبوری کی حالت میں کھا لیا اللہ تعالیٰ اسے بخشنے والا ہے اور ان اشیاء کے کھانے کی اجازت دیدی اس لئے رحم کرنے والا ہے۔ یہ آیت اس پر دال ہے کہ مضطر اگر مردار نہ کھائے اور مر جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں کیونکہ مجبوری اور ناچاری میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی اور مباح فرما دیا ہے واجب نہیں فرمایا اور امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مر جائے گا اور نہ کھائے گا تو گناہ گار ہوگا۔ اس لئے کھانا واجب ہے اور دلیل ان کی یہ آیت ہے وقد فصل لکم ماحرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ (یعنی جو کچھ تم پر حرام کیا گیا ہے اسکو خوب

marfat.com

بیان کر دیا گیا ہے، مگر جس وقت مجبور ہو جاؤ اس کی جانب) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں سے ناچاری اور مجبوری کی حالت کی شئے کو استثناء فرمادیا ہے۔ تو اس سے استثناء شدہ چیز مباح ثابت ہوئی اور یہ مسلم ہے کہ اگر ہلاکت کا خوف ہو تو مباح چیز کا کھانا واجب ہے اس لئے میتہ وغیرہ کا اضطرار کے وقت کھانا واجب ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کو رخصت کیوں کہتے ہیں تو یہ اطلاق مجاز ہے ورنہ واقع میں وہ واجب ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ (بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں وہ آیتیں کہ اتاریں اللہ نے کتاب میں) مَاانزل اللّٰہ سے مراد تورات کی وہ آیتیں ہیں جو محمد ﷺ کی شان میں وارد ہوئی ہیں۔ اس آیت کا شان نزول اس طرح ہوا تھا کہ یہود کے رؤساء اور علماء بیچارے غریب لوگوں سے طرح طرح کے ہدیا اور کھانے پینے کی چیزیں لیا کرتے تھے اور جی میں یہ سمجھتے تھے کہ نبی آخر الزماں ہم لوگوں میں سے ہوں گے۔ جب جناب سرور عالم ﷺ ان میں مبعوث نہ ہوئے، تو اب یہ ڈرے کہ اگر ہم نے آپ کا اتباع کر لیا تو یہ ساری آمدنی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ اس لئے انہوں نے یہ بیہودگی کی کہ آپ کی صفت کو بدل ڈالا پھر وہ صفت عوام کے روبرو بیان کی، تو وہ صفت حضور کی صفات سے مخالف و مغائر پائی۔ اس لئے آپ ﷺ کا اتباع نہ کیا۔ علامہ بغویؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور ایسے ہی ثعلبی نے ابو صالح سے انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اور آل عمران کی آیت دونوں یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًاۙ (اور لیتے ہیں اس کے بدلہ کچھ مول) ثمناً قلیلاً سے مراد دنیاوی اغراض ہیں اور قلیل انہیں اس لئے فرمایا کہ اگرچہ فی نفسہ وہ بہت ہیں لیکن آخرت کے ثواب کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

اُولٰٓىٕكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ (یہ نہیں کھاتے مگر پیٹ بھر کر آگ) الا النار میں نار سے مراد رشوت اور حرام ہے کیونکہ یہ نار (آگ) تک پہنچانے والی ہے یا اس لئے نار فرمایا کہ آخر کار آخرت میں یہ چیزیں نار (آگ) ہو جائیں گی یا یہ معنی کہ آخرت میں یہ لوگ نار کے سوا کچھ نہ کھائیں گے۔

وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (اور بات بھی نہ کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ کے کلام نہ کرنے سے یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام رحمت نہ فرمائیں گے یا کلام کے حقیقی معنی مراد نہ لئے جائیں بلکہ یہ کہا جائے کہ مراد کلام نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا غصب ہے، نعوذ باللہ من غضب اللہ۔

وَلَا یُزَكِّیْهِمْ (اور نہ ان کو پاک کرے گا) اس سے یا تو یہ مراد کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدح و ثنا نہ کرے گا اور یا یہ مطلب کہ اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں کی نجاست سے پاک نہ کرے گا۔ بخلاف مؤمنوں کے کہ اگر ان کو عذاب بھی کرے گا تو یہ ان کو گناہوں سے پاک کرنے اور ان کو جنت میں داخل کرنے کے لئے ہوگا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۷۴) (اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے)۔

اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ (یہی ہیں جنہوں نے خریدی گمراہی ہدایت کے بدلے اور قہر مہر کے بدلے) الخ یعنی یہ لوگ حق بات کو اپنی اغراض فاسدہ کی وجہ سے مخفی رکھ کر سود مند نہ ہوئے ہر طرح سے خسارہ ہی خسارہ میں رہے۔ دنیا میں تو یہ خسارہ کہ ہدایت کی دولت چھوڑ کر چاہ ضلالت میں گر گئے اور آخرت کا یہ نقصان کہ مغفرت سے روگردانی کر کے عذاب دائمی میں گرفتار ہوئے۔

فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۱۷۵) (سو کس قدر سہار ہے ان کو آگ کی) یہ مؤمنوں کے تعجب دلانے کے لئے فرمایا۔ حاصل یہ ہے کہ اے مؤمنو دیکھو تو یہ لوگ کیسے جرأت سے جہنم میں جانے کے اسباب کو جان بوجھ کر اختیار کر رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جہنم کی آگ پر بڑا صبر ہے۔

ذلک کا مشار الیہ عذاب ہے۔

marfat.com

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ط (اس لئے کہ اللہ ہی نے اتاری کتاب سچی) کتاب سے یا تورات مراد ہے اور یا مطلق کتاب مراد ہے کہ جو تورات اور قرآن اور دیگر کتب سماویہ کو شامل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ نے تو اپنی سچی اور حق کتاب نازل فرمائی تھی، لوگوں نے اس میں اختلاف کیا۔ کسی نے کفر اختیار کر لیا کسی نے گمراہی کو شیوہ بنالیا کوئی راہ راست پر رہا اس سبب سے مستوجب عذاب ہوئے اور بعض مفسرین نے کہا ہے بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الکتاب میں الکتاب سے مراد آیت سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ الخ ہے یعنی خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کو سب برابر ہے ایمان نہ لائیں گے۔ مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر۔ حاصل آیت کا اس صورت میں یہ ہے کہ یہود کو ارتکاب معاصی اور اخفاء حق کی اس لئے جرأت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدھی سچی دو ٹوک بات فرمادی ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے یہ سن کر جری ہو گئے کہ جب ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے تو آؤ خوب دل کھول کر شرارتیں کریں۔

ع ۲۱ / ۵ — وَإِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ع ﴿۱۷۶﴾ (اور جنہوں نے اختلاف کیا کتاب میں بے شک وہ پرلے درجہ کی مخالفت میں ہیں) الکتاب میں الف لام یا تو جنس کا ہے اور اختلاف کے یہ معنی ہیں کہ کتاب کے بعض حصے پر تو ایمان لائے اور بعض کے ساتھ کفر کیا اور یا الف ولام عہد کا ہے، اس صورت میں اشارہ یا تو تورات کی جانب ہے اور اس میں اختلاف کرنے کے یہ معنی ہیں کہ بعض احکام تو مانتے ہیں اور بعض پر مطلق کان نہیں دھرتے مثلاً محمد ﷺ کا اتباع نہیں کرتے حالانکہ یہ بھی تورات کا ہی حکم ہے اور یا الف ولام سے قرآن پاک کی طرف اشارہ ہے، اس میں یہ اختلاف کرتے ہیں کہ کبھی اس کو سحر سے تعبیر کرتے ہیں کبھی اس کا کلام بشر ہونا گاتے پھرتے ہیں کبھی بکتے ہیں کہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ یعنی حق سے مرحلوں اور منزلوں دور ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا کرو) حفص اور حمزہ نے البر کو لیس کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے اور اَن تولوا الخ لیس کا اسم ہونے کی وجہ سے محلاً مرفوع ہے اور دیگر قراء نے البر کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں ترکیب برعکس ہوگی اللہ کے نزدیک جو فعل پسندیدہ ہو اس کو بر کہتے ہیں۔

عبد الرزاق نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ یہود مغرب یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حاصل آیت کا اس تقدیر پر یہ ہے کہ جس دین پر یہود و نصاریٰ ہیں یہ کوئی خوبی نہیں ہے کیونکہ ان کا قبلہ منسوخ اور ان کا دین کفر ہے، اس لئے اس کی طرف منہ کرنا نیکی کی بات نہیں اور اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے روایت کی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ قتادہ اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کے اندر مسلمان مخاطب ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جس وقت تک فرائض اور احکام پوری طرح نازل نہ ہوئے تھے، اگر آدمی توحید و رسالت کا اقرار کر لیتا تھا اور جدھر چاہتا منہ کر کے نماز پڑھ لیتا تھا اور سوائے اس کے کوئی عمل نہ کرتا تھا، تو جنت میں جانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ جب سرور عالم ﷺ نے ہجرت فرمائی اور حدود اور احکام اور فرائض نازل ہوئے اور شریعت خوب کامل ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے آیت لیس البر الخ نازل فرمائی۔ حاصل اس صورت میں یہ ہوگا کہ نیکی صرف یہی نہیں کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لو اور اس کے سوا کچھ عمل نہ کرو نیکی تو یہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں۔

علامہ بغوی نے کہا ہے ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہ اور ضحاک رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن جریرؒ اور ابن منذرؒ نے بھی قتادہؒ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کا منہ پھیرنے کے عنوان سے ذکر کرنا اور نماز پڑھنے کے الفاظ سے ذکر نہ کرنا اس پر قرینہ ہے کہ اس آیت کے مخاطب یہود اور

marfat.com

نصاری ہیں۔ مؤمنین نہیں ہیں چنانچہ مؤمنین کو دوسرے مقام پر لایضیع ایمانکم (یعنی نہیں ضائع فرمائیں گے اللہ تعالیٰ تمہاری نماز کو) کے عنوان سے یاد فرمایا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ (بلکہ نیکی ان کی ہے) نافع اور ابن عامر نے لکن کو مخفف پڑھا ہے اور البر کو دونوں جگہ مرفوع پڑھا ہے اور دیگر قراء نے مشدد اور منصوب پڑھا ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (جو ایمان لائے اللہ پر) من اٰمن کو البر پر حمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مصدر بمعنی فاعل بطور مبالغہ لیا جائے یا اسم میں یا خبر میں مضاف مقدر مانا جائے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی لکن البار یا ذا البر یا لکن البربر من اٰمن آخری تقدیر سیاق کے زیادہ موافق ہے۔ اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس کو جلال ذات اور کمال صفات میں یگانہ اعتقاد کرے اور حدوث کے عیب اور ضد و مثل سے پاک سمجھے اور جیسا اپنے آپ کو اس نے بتایا ہے ویسا ہی اعتقاد کرے۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اور روز آخرت پر) اس سے مراد یا تو قیامت کا دن ہے کیونکہ وہی سب سے پچھلا دن ہے اور یا قبور سے اٹھنے کے وقت سے ہمیشہ ہمیشہ تک مراد ہے۔ اس میں حساب و کتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ، شفاعت و مغفرت، ثواب، عذاب دائمی سب آگیا۔

وَالْمَلٰٓئِكَةِ (اور فرشتوں پر) ملائکہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ یہ سمجھے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، نور سے پیدا ہوئے ہیں، جسم و روح والے ہیں، کسی کے ان میں دو دو بازو ہیں، کسی کے تین تین، کسی کے چار چار۔ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے اور نیز یہ اعتقاد رکھے کہ وہ نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ نکاح کرتے ہیں۔ ان کی روزی تسبیح اور تہلیل ہے۔ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے، جو ان کو حکم ہو جاتا ہے وہی کرتے ہیں، موت ان کو بھی آئے گی اور پھر مثل اوروں کے زندہ ہو کر اٹھیں گے اور بعض ان میں سے اللہ کے قاصد ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے پاس وحی لاتے تھے اور ان کے اعمال کا بدلہ اللہ کی رضامندی اور مراتب قرب ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے عندذی العرش مکین یعنی وہ عرش والے کے نزدیک صاحب مرتبہ ہے۔ اسی واسطے وہ اعمال کے ثواب لیتے ہیں۔ جنت میں جانے کے محتاج نہیں بلکہ خود جہنم کے محافظ اور عذاب کے فرشتے بھی اپنے اپنے ثواب کو پورا پورا پالیں گے۔ اس مقام پر یہ امر قابل یاد داشت ہے کہ عوام مؤمنین فرشتوں سے افضل نہیں کیونکہ عام مؤمن تو اپنے ثواب اور بدلے کے لئے جنت میں جائیں گے۔ اور فرشتے نہ جائیں گے ہاں یہ امر ضروری ہے کہ خواص بشر یعنی انبیاء اور رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام ملائکہ سے افضل ہیں کیونکہ جو تجلیات ذاتیہ اس مشت خاک کے ساتھ خاص ہیں وہ ان ہی کو نصیب ہوں گی، ملائکہ اس دولت سے محروم رہیں گے کیونکہ ان کی پیدائش خاک سے نہیں ہے اور جاننا چاہئے کہ جس طرح فرشتوں کے اعمال کا ثواب اور بدلہ جنت میں جانے پر موقوف نہیں اسی طرح بعض برگزیدہ لوگوں کو بھی دنیا میں وہ نعمتیں اور دولتیں حاصل ہو جاتی ہیں کہ جو جنت میں ہوں گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کا ثواب دنیا میں دے دیا تھا اور آخرت میں بیشک وہ نیک کاروں میں سے ہوں گے۔

وَالْكِتٰبِ (اور کتاب پر) اس سے یا مطلق کتاب مراد ہے اس صورت میں سب آسمانی کتابیں اس میں داخل ہو جائیں گی یا صرف قرآن پاک مراد ہے کیونکہ اس پر ایمان لانا تمام کتب سماویہ پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ قرآن اور تمام کتب الٰہیہ سب اللہ کے کلام ہیں اور غیر مخلوق ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ قرآن نام الفاظ کا ہے یا معنی کا یا دونوں کا تو حق یہی ہے کہ الفاظ اور معنی دونوں قرآن ہیں اور بعض علامات جو حدوث کی اس میں پائی جاتی ہیں مثلاً الفاظ کا یکے بعد دیگرے زبان پر آنا اور کان میں پڑنا تو ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ باری تعالیٰ کے اندر بھی یہ صفت کلام اسی طرح پائی جاتی ہو اللہ تعالیٰ اس سے پاک و منزہ ہیں۔

وَالنَّبِيّٖنَ (اور پیغمبروں پر) پیغمبروں پر ایمان لانے میں یہ امر ملحوظ رہے کہ تمام انبیاء پر یکساں ایمان لائے کسی

کے درمیان فرق نہ کرے سب سے پہلے ان میں آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر اور تمام سے افضل ہمارے نبی محمد ﷺ ہیں۔ پیغمبروں پر ایمان لانے میں کسی عدد کا لحاظ نہ کرے کیونکہ صحیح طریق سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انبیاء کس قدر ہیں۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں منھم من قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ بعض ان میں وہ ہیں جن کے احوال ہم نے آپ کو سنا دیئے اور بعض ایسے ہیں کہ جن کا قصہ نہیں سنایا اور بعض احادیث میں جو عدد وارد ہوئے ہیں تو وہ احادیث احاد ہیں اور احاد مفید قطعیت نہیں ہیں اور ایمان کا مدار ایسے نصوص پر ہے جو قطع اور یقین کا فائدہ دیں۔ انبیاء سب کے سب صغائر اور کبائر سے معصوم اور پاک ہیں۔ اعتقادیات میں تو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں۔ اگر مخالفت ہے تو فروع میں ہے کیونکہ ان میں نسخ جاری ہو سکتا ہے۔ روافض کہتے ہیں کہ ائمہ پر بھی ایمان لانا ایمان کے مفہوم میں داخل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے ان کے اس مسلک کا بطلان ظاہر ہے کیونکہ ائمہ پر ایمان لانا اگر ایمان کی حقیقت میں داخل ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے جس طرح یہاں انبیاء اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانے کو ذکر فرمایا ہے ائمہ پر بھی ایمان لانے کو ذکر فرماتے، واللہ اعلم۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (اور دیا مال باوجود اس کی محبت کے) علٰی حبہ میں جار مجرور محلاً حال ہے اور ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ معنی اس صورت میں یہ ہوں گے دیا مال اللہ تعالیٰ کی محبت میں کیونکہ جو مال خالص اللہ تعالیٰ کے واسطے دیا جاتا ہے تو اس کا ثواب اللہ تعالیٰ دیتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اول جن کا فیصلہ ہوگا تین شخص ہوں گے تیسرا ان میں وہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں وسعت اور ہر قسم کا مال دیا ہوگا وہ پیش کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ یاد ہے ہم نے تجھ کو فلاں فلاں نعمت دی تھی۔ وہ اقرار کرے گا اور عرض کرے گا۔ پروردگار بے شک یہ نعمتیں مجھ کو ملی تھیں۔ اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے پھر تو نے اس میں ہمارے لئے کیا۔ عمل کیا وہ عرض کرے گا اے اللہ جتنی آپ کی راہ ہیں میں نے کوئی نہیں چھوڑی، سب میں آپ کے لئے مال خرچ کیا، حکم ہوگا تو جھوٹا ہے تو نے اس واسطے دیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں سو لوگوں نے تجھے سخی کہا پھر حکم کریں گے کہ اس کو منہ کے بل آگ میں جھونک دو۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں سب شرکاء سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں، جو شخص ایسا عمل کرے کہ اس میں میرے غیر کو شریک کرے میں اس کو اور اس کے عمل کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں وہ عمل اسی کو سزاوار ہے جس کے لئے اس نے کیا ہے۔ یا علٰی حبہ میں ہ کی ضمیر مال کی طرف راجع ہے اس تقدیر پر یہ معنی ہیں کہ دیا مال کو تندرستی اور اس کی محبت کی وقت۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہی تفسیر فرمائی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ کون سے صدقہ کا زیادہ ثواب ہے فرمایا کہ زیادہ ثواب اس وقت ہے کہ صدقہ کرنے کی حالت میں تندرست، ہٹا کٹا اور حاجتمند ہو، فقر سے ڈرتا ہو اور تونگری کی امید میں ہو اور ایسا نہ کرے کہ دینے میں ٹال مٹول کئے جائے جب روح حلق تک آ جائے اور جان نکلنے لگے تو اس وقت دینے بیٹھے کہ فلاں کو اس قدر اور فلاں کو اس قدر، اس وقت تو وہ مال وارثوں کا ہے ہی۔

اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (ہرگز نہ پہنچو گے تم نیکی کو جب تک اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر علٰی حبہ میں مال کی طرف راجع ہونا مناسب ہے اور مال کی طرف ضمیر راجع ہونے کی تقدیر پر یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایسے مال کو دیا جو سب قسم کے مالوں سے زیادہ پیارا تھا اس صورت میں یہ آیت انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا

marfat.com

الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ (الآیۃ) (یعنی خرچ کرو اپنی کمائی کی پاکیزہ اور عمدہ چیزیں اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیں اور بری چیز کے دینے کا ارادہ مت کرو) کہ ہم معنی و ہم پلہ ہو جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضمیر مصدر ایتاء (دینا) کی طرف راجع ہو۔ مطلب یہ ہو گا دیا مال کو دینے کی محبت سے یعنی دل ان کا دینے سے ناخوش اور ناراض نہیں ہوا بلکہ خوب جی کھول کر دیا۔

ذَوِي الْقُرْبَىٰ (رشتہ داروں کو) قربیٰ بمعنی قرابت مصدر ہے اور اہل حقوق پر رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے اسی لئے مقدم فرمایا کہ اوروں سے ان کو دینا زیادہ بہتر اور موجب اجر ہے۔ ذوی القربیٰ میں سب طرح کے رشتہ دار شامل ہو گئے خواہ ان سے نسب کا تعلق ہو یا اور کوئی جیسے خاوند، بیوی، غلام۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر تو ایک دینار اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور ایک دینار مسکین کو دے اور ایک دینار اپنی اہل کو دے ان میں سب سے زیادہ ثواب اس دینار کا ہے جس کو تو نے اہل پر صرف کیا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور زینب زوجہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے عورتوں کے گروہ صدقہ اور خیرات کرو اگرچہ اپنے زیور سے ہی ہو۔ زینب رضی اللہ عنہا اور ایک دوسری عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اپنے خاوند کو اور جو یتیم اپنی پرورش میں ہو اس کو اگر صدقہ دے تو کفایت کرے گا یا نہیں۔ فرمایا کہ ایسے دینے میں دو ثواب ہیں ایک ثواب رشتہ داری کا اور ایک صدقہ کا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسکین کو صدقہ دینا تو صدقہ ہی ہے اور رشتہ دار کو صدقہ دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

وَالْيَتَامَىٰ (اور یتیموں کو) یتیم اس بچہ کو کہتے ہیں جس کا باپ بالغ ہونے سے پہلے مر جائے یا گم ہو جائے۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ ذوی القربیٰ اور یتامیٰ سے مراد حاجتمند رشتہ دار اور یتیم ہیں چونکہ اس قید کا لحاظ بہت ظاہر تھا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس قید کو ذکر نہیں فرمایا۔

میں کہتا ہوں کہ اس قید کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ منظور نظر اور مقصود اصلی مال کے دینے کو ذکر کرنا ہے خواہ وہ دینا فرض ہو یا نفلی ہو، اگر خاص فرض کو بیان کرنا منظور ہوتا تو البتہ ضرورت اس قید کی تھی اور زکوٰۃ فرض کا بیان خود آگے آتا ہے اور مال کا نفل کے طور پر دینا، یہ ضروری نہیں کہ حاجتمندوں کو ہی ہو۔ چنانچہ صلہ رحمی اور یتیم کا جی خوش کرنا باوجود اس کے مالدار ہونے کے بھی ہو سکتی ہے بلکہ صلہ رحمی تو اسلام پر بھی موقوف نہیں۔ کافر کے ساتھ بھی صلہ رحمی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وصاحبهما فی الدنیا معروفاً یعنی ان کا دنیا میں عمدہ طور پر ساتھ دے۔

حضرت اسماء ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دختر فرماتی ہیں کہ میری ماں میرے پاس آئی اور وہ مشرکہ تھی، میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ میری ماں آئی ہے اور وہ مشرکہ ہے میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کروں فرمایا کہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ فلاں قبیلہ والے میرے دوست نہیں ہیں میرا دوست تو اللہ تعالیٰ اور نیک مؤمن ہیں ہاں ان کی مجھ سے قرابت ہے اس کی رعایت البتہ میں کروں گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بدلہ دینے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں۔ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے کہ ٹوٹی ہوئی رشتہ داری کو جوڑ دے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اتنے قریب ہوں گے جیسے شہادت کی انگلی بیچ کی انگلی سے قریب ہے۔ اس کو امام بخاری و احمد و ابوداؤد و ترمذی نے روایت کیا ہے۔

وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ (اور محتاجوں اور مسافروں کو) مجاہد فرماتے ہیں کہ ابن سبیل سے مراد مسافر ہے

marfat.com

جو اپنے اہل و عیال سے الگ ہو۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ مراد مہمان ہے۔ ابو شریح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی مدارات کرے، اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

وَالسَّآئِلِيْنَ (اور مانگنے والوں کو) ام بجید رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سائل کو ضرور کچھ دو اگرچہ بکری کا جلا ہوا کھر ہی سہی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اے ام بجید اگر تجھ کو بکری کے جلے ہوئے کھر کے سوا کچھ اور میسر نہ ہو تو وہی دیدے۔ اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مانگنے والے کا حق ہے اگرچہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آتے اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا۔ ابوداؤد نے علی رضی اللہ عنہ سے اور ابن راھویہ نے فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا سے اور طبرانی نے ہرماس بن زیاد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام احمد نے کتاب الزہد میں سالم بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ سائل کا حق ہے اگرچہ وہ تمہارے پاس ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے جس کا حلقہ چاندی کا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائل کو اگرچہ بوجہ اس کے مالدار ہونے کے سوال حرام ہے لیکن اس کو دینا ضروری ہے۔

وَفِي الرِّقَابِ (اور اگر دنوں کے چھڑانے میں) رقاب سے مراد یا تو مکاتب ہیں اس تقدیر پر تو یہ آیت وَاٰتُوْهُمْ مِّن مال اللّٰه الذی اٰتاکم (دو مکاتبوں کو اللہ کے دیئے ہوئے مال سے) کے ہم پلّہ ہو گی اور یا غلام آزاد کرانا مراد ہے اس صورت میں یہ آیت فک رقبۃ (چھڑانا گردن کا) کے ہم پایہ بنے گی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت سے قیدیوں کا فدیہ دینا مراد ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما واسیرًا یعنی اور کھلاتے ہیں کھانا باوجود اس کی خواہش کے مسکین اور یتیم اور قیدی کو۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ (اور درست کرتے رہے نماز) مطلب یہ ہے کہ نماز فرض اور نفل کو خوب آداب اور مستحبات اور سنن کے ساتھ پڑھتے رہے۔

وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (اور دیتے رہے زکوٰۃ) یہاں زکوٰۃ سے زکوٰۃ فرض مراد ہے اور اتی المال سے مراد یا تو صدقات نافلہ ہیں یا مطلق مال دینا مراد ہے خواہ نفل ہو یا فرض۔ اخیر صورت میں زکوٰۃ کو بعد میں مکرر فرمانا زیادتی اہتمام کے لئے ہو گا۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ دونوں جگہ زکوٰۃ مفروضہ مراد ہے لیکن اول جگہ مصارف کو بیان کرنا منظور ہے اور دوسری جگہ زکوٰۃ کا ادا کرنا اور اس پر ترغیب دینا مقصود ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اول توجیہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو بد (نیکی) کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اور برّ اس فعل کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہو خواہ وہ فرض ہو یا نفل ہو۔ چنانچہ اس تفسیر کی یہ حدیث تائید کرتی ہے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مال میں سوائے زکوٰۃ کے اور بھی حق ہیں پھر آپ نے لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الآیۃ تلاوت فرمائی۔ اس حدیث کو ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے روایت کیا ہے اور حق سے مراد عام ہے خواہ واجب ہو یا مستحب۔ چنانچہ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں ایک شخص حاضر ہوا اور اسلام کی حقیقت دریافت کی فرمایا کہ پنجگانہ نماز اور رمضان کے روزے اور زکوٰۃ۔ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھ پر اور بھی کچھ ہے فرمایا نہیں لیکن اگر تیرا جی چاہے تو نفل کے طور پر کچھ کر لے۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (اور پورا کرتے رہے اپنا اقرار جب کوئی عہد کرتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کرتے ہو تو اس کو پورا کرتے ہیں مثلاً روز ازل میں جو عہد ہوا اس کو پورا کرتے ہیں اور دنیا میں جب قسم کھاتے ہیں اس کو سچا کر دکھاتے ہیں اور جب منت مانتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں۔ ایسے ہی جب مخلوق سے عہد کرتے

marfat.com

ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں مثلاً جب وعدہ کرتے ہیں تو اس کو وفا کرتے ہیں اور جب کچھ کہتے ہیں۔ تو سچ کہتے ہیں ان کے پاس کوئی امانت رکھتا ہے تو اس کو جوں کی توں ادا کرتے ہیں اور جب حق بات پر ان سے گواہی طلب کی جاتی ہے تو گواہی دیتے ہیں۔

ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں جب بات کہے تو جھوٹ کہے اور جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ مسلم کی روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ اگرچہ وہ روزہ نماز کا پابند ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔

اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ چار خصلتیں جس میں پائی جائیں وہ منافق خالص ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو اس میں اس خصلت کے چھوڑنے تک ایک خصلت نفاق کی رہے گی۔ جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ جب بات کہے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے والموفون الخ کا من اٰمَنَ پر عطف ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ (اور صبر کرتے رہے) وَالصَّابِرِيْنَ بھی مَنْ اٰمَنَ پر معطوف ہے اور درمیان میں ایک کلام طویل فاصل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور عرب کی عادت ہے کہ جب کلام طویل ہو جاتا ہے تو اعراب کو متغیر کرتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے اسی طرح کہا ہے اور ایسے ہی سورۂ مائدہ میں وَالصَّابِئُوْنَ اور سورۂ نساء میں وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ کلام طویل ہونے کے سبب سے مرفوع منصوب ہے اور خلیل نے کہا ہے وَالصَّابِرِيْنَ منصوب علی المدح ہے اور عطف نہ کرنے کی یہ وجہ ہے کہ صبر اور اعمال سے زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ اعمال میں افضل وہ ہے جس پر مداومت ہو اور صبر میں مداومت سب سے زیادہ ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت کی اس طرح ہو گی اَخُصُّ الصَّابِرِيْنَ بمز یدالبرّ اَوْ اَمْدَحُ الصَّابِرِيْنَ بِمَزِيْدِ الْبِرِّ یعنی خاص کرتا ہوں میں صابروں کو یا مدح کرتا ہوں میں صابروں کی زیادتی نیکی کے ساتھ۔ اور اس وقت جملہ کا جملہ پر عطف ہو گا اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وَالصَّابِرِيْنَ کا ذوی الْقُرْبٰى پر عطف ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت کی یوں ہو گی۔ وَاٰتَى الْمَالَ الصَّابِرِيْنَ یعنی اور دیا مال صابروں کو اور یہ آیت اس توجیہ پر معنی کے اعتبار سے آیت لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (ترجمہ) "دیا کرو مفلسوں کو جو گھرے ہوئے ہیں خدا کی راہ میں نہیں چل پھر سکتے ملک میں سمجھتا ہے ان کو انجان آدمی مالدار ان کی بے سوالی کی وجہ سے" کے قریب قریب ہو جائے گی۔

فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ (تنگی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت) بَاسَاء شدت اور فقر کو کہتے ہیں ضَرَّاء مرض اور اپاہج پن کو بولتے ہیں۔ بَاْس کے معنی قتال اور حرب کے ہیں۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ؁ (یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں) مطلب یہ ہے کہ یہی لوگ ایمان اور نیکی میں سچے ہیں اور یہی کفر اور تمام بری خصلتوں سے بچتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ (اے ایمان والو تم پر لازم کیا جاتا ہے برابری کرنا مقتولوں میں) شعبی اور کلبی اور قتادہ نے کہا ہے کہ زمانۂ اسلام سے کچھ ہی پہلے عرب کے دو قبیلوں میں خوب قتل و قتال ہوا اور آپس میں ایک دوسرے کے ذمہ بہت سے خون ہوئے۔ جب اسلام کا عہد برکت آیا تو آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ نازل ہوئی۔ مقاتل بن حبان نے کہا ہے کہ یہ قتل و قتال قریظہ اور نضیر میں ہوا تھا اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اوس اور خزرج میں ہوا تھا اور سعید اور مقاتل اور بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ ان میں ایک قبیلہ دوسرے سے تعداد اور غلبہ میں زیادہ تھا اسی واسطے دوسرے قبیلہ کی عورتوں سے بغیر مہر نکاح کر لیتے تھے اور طرح طرح کی زیادتیاں کرتے تھے جب ان پر ایسی زیادتی ہوئی تو یہ قسم کھا بیٹھے کہ ہم اپنے غلام کے عوض آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو اور ایک کے بدلے دو کو قتل کریں گے اور ایک زخم کے عوض دو زخم لگائیں گے اور اس واقعہ کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ

maktabah.org

آیت نازل فرمائی اور مساوات کا حکم فرمایا اس پر وہ سب راضی ہو گئے اور تسلیم کر لیا۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں ان کا راضی ہونا اور تسلیم کرنا اور یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ سے ان کو خطاب فرمانا اس پر صاف دلیل ہے کہ مخاطب اس آیت میں اوس اور خزرج ہیں جو کہ اللہ کے دین کے مددگار ہیں قریظہ اور نضیر نہیں کیونکہ یہ اللہ کے دشمن اور کفار تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عمداً قتل کرنے میں فقط قصاص واجب ہے۔ خون بہا بغیر قاتل کی رضامندی کے واجب نہیں۔ امام صاحب کے اس مسلک کی اللہ تعالیٰ کے قول کُتِبَ عَلَیْکُم القصاصُ (لکھا گیا تم پر قصاص) سے تائید ہوتی ہے اور نیز حدیث فِی العَمَدِ القَوَد (قتل عمد میں قصاص ہو) بھی امام صاحب کے مذہب پر صاف دال ہے۔ اس حدیث کو امام شافعی اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ محدثین نے اس حدیث کے مرسل اور متصل ہونے میں اختلاف کیا ہے دار قطنی کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مرسل ہے اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے اور دار قطنی نے اسی حدیث کو مرفوعاً عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن حزم سے بواسطہ ان کے باپ اور جد کے بایں الفاظ العمد قود والخطاء دیۃ (قتل عمد میں قصاص ہے اور خطا میں دیت ہے) روایت کیا ہے لیکن ان کی سند میں کسی قدر ضعف ہے۔ امام شافعیؒ اور مالکؒ اور امام احمد رحمہم اللہ کے اس مسئلہ میں دو دو قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ قصاص واجب ہے لیکن مقتول کے وارثوں کو یہ پہنچتا ہے کہ بغیر قاتل کی رضا کے قصاص کے عوض میں دیت لے لیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ قصاص اور دیت میں سے ایک شئے واجب ہے یا قصاص ہی اختیار کر لو یا دیت لے لو اور ان دونوں قولوں میں مآل کار کچھ فرق نہیں۔ ایک صورت میں آکر البتہ فرق ہوگا وہ یہ ہے کہ جب مقتول کے وارث یہ کہیں کہ ہم نے قصاص معاف کر دیا اور دیت کا کچھ ذکر نہ کریں تو پہلے قول کے موافق تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور دیت ساقط نہ ہوگی اور دوسرے قول کے مطابق قصاص کے معاف کر دینے سے دیت ثابت و مقرر ہو جائے گی۔ ائمہ ثلثہ مذکورین رحمتہ اللہ علیہم اجمعین نے بغیر رضا مجرم کے مال لینے پر احادیث ذیل سے استدلال کیا ہے۔

ابو شریح کعبیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح ہونے کے دن فرمایا کہ اس کے (کسی مقتول کے بارہ میں) وارثوں کو اختیار ہے خواہ قتل کریں یا دیت لیں۔ اس حدیث کو ترمذی اور امام شافعی نے روایت کیا ہے۔ اور ابن جوزی اور دارمی نے ابو شریح خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ جس شخص کا کوئی عزیز قتل کیا جائے یا اس کو کوئی زخمی کر دے تو اس کو تین باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے چوتھی بات کا اگر ارادہ کرے تو اس کے ہاتھ پکڑ لو۔ یا تو قصاص لے، یا معاف کر دے، یا دیت لے سوا گر ان تینوں باتوں میں سے ایک کو اختیار کر لیا اور پھر حد سے تجاوز کیا تو اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ آگ ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کا کوئی مقتول ہو اس کو اختیار ہے یا فدیہ لے لے یا قتل کر دے۔

اور عمرو بن شعیب بواسطہ اپنے اب وجد کے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی کو جان کر قتل کر دے، تو اس کو مقتول کے وارثوں کو دیدیا جائے یا تو وہ اس کو قتل کر دیں اور یا دیت لے لیں اور دیت تیس حقے اور تیس جذعے اور چالیس خلفے (جن کے پیٹ میں بچے ہوں) ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حنفیہ ان احادیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ معنی ان احادیث کے یہ نہیں ہیں جو تم سمجھے ہو بلکہ مقصود رسول کریم ﷺ کا یہ ہے کہ مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے کہ خواہ قصاص لیں یا صلح کریں اور صلح بغیر قاتل کی رضا کے نہیں ہو سکتی اور ظاہر یہ ہے کہ قاتل اپنے خون کے بچاؤ کے لئے راضی ہو جائے گا۔ اسی لئے نبی ﷺ نے قاتل کی رضا کو ذکر نہیں فرمایا اور ظاہر پر چھوڑ دیا واللہ اعلم۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی (آزاد کے بدلے قتل کیا جائے آزاد کے غلام کے بدلے غلام اور عورت کے عوض عورت) اس آیت سے یہ نہیں نکلتا کہ آزاد غلام کے عوض اور غلام آزاد کے عوض اور مرد عورت

marfat.com

کے بدلے قتل نہ کئے جائیں ان احکام سے اس آیت میں کچھ بحث نہیں آیت اس بارے میں محض ساکت ہے اور مفہوم مخالف کا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اعتبار نہیں ہے۔ اور جو لوگ مفہوم مخالف کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی اس آیت سے یہ احکام منتخرج نہیں ہوتے کیونکہ مفہوم ان کے نزدیک اس وقت معتبر ہوتا ہے جب تخصیص ذکر کا سوائے اختصاص حکم کے کوئی فائدہ نہ ہو اور اگر کوئی فائدہ ہو تو اس وقت مفہوم کا اعتبار نہیں کرتے اور اس آیت میں تخصیص ذکر کا یہ فائدہ ہے کہ تخصیص سے یہ معلوم کرانا ہے کہ ایک حیثیت کو دوسری پر کچھ زیادتی و شرف نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت سے یہ مفہوم ہوگا کہ آزاد جب کسی آزاد کو قتل کرے تو اس کے عوض اس آزاد ہی کو قتل کیا جائے اور مقتول کے شرف یا مرتبہ کی وجہ سے اس کے ساتھ اوروں کو قتل نہ کیا جائے اسی طرح جب کوئی غلام کسی غلام کو مار ڈالے تو اس کے قصاص میں قاتل ہی کو مارا جائے کسی آزاد کو اس مقتول کے کسی شرف و کمال کی وجہ سے نہ مارا جائے اور ایسے ہی کوئی عورت جب کسی دوسری عورت کو قتل کر ڈالے تو اس کے بدلے اس عورت کو ہی مارا جائے اس عورت کے کسی کمال و شرف کی وجہ سے کسی مرد کو اس قاتلہ کے ساتھ مارنے میں شریک نہ کیا جائے۔ اب رہے وہ احکام جو آیت سے نہیں نکلتے ہیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جان دوسری جان کی عوض قتل کر دی جائے گی خواہ کوئی ہو آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا کافر کیونکہ اللہ تعالیٰ عام طور سے بلا تفصیل فرماتا ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (یعنی اور لکھ دیا ہم نے ان پر (بنی اسرائیل پر) تورات میں کہ بیشک جان کے بدلے جان لی جائے گی) اور پہلی امتوں پر جو احکام اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں ان کے ناقل اگر خود یہود اور نصاریٰ ہوں تب تو کچھ اعتبار نہیں اور اگر خود اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ بلا انکار نقل فرمائیں تو ان احکام کا ہم کو بھی اتباع ضروری ہے۔ کیونکہ جب حاکم ایک اور طریقہ ایک ہے پھر اتباع و اطاعت نہ کرنا چہ معنی۔ اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ یعنی آپ ان ہی کے طریقہ کی پیروی کریں اور فرماتا ہے شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی راہ مقرر فرمائی جس کا نوح علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا اور جو ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی اور وہ جس کا ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم کیا تھا) اور احکام میں بغیر منسوخ ہوئے اختلاف نہیں ہوتا خواہ وہ منسوخ ہونا ایک کتاب میں ہو یا چند کتابوں میں ہو اور جب تک نسخ ظاہر نہیں ہوگا حکم باقی رہے گا اس حکم کے باقی رہنے پر ذیل کی دو حدیثیں صاف دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان آدمی جو اللہ کے ایک ہونے اور میرے رسول ہونے کا اقرار اور گواہی دیتا ہو، اس کا خون گرانا بغیر تین باتوں کے جائز اور حلال نہیں یا تو اس نے کسی کو قتل کر دیا ہو، اس لئے اس کو قصاص میں قتل کیا جائے یا باوجود نکاح ہونے کے زنا کرے یا اپنے دین اور مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ دے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور ابو امامہ سے مروی ہے کہ بروز محاصرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے اوپر سے جھانک کر محاصرین سے کہا کہ میں تم سے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کا خون بغیر تین باتیں ہوئے حلال نہیں یا تو احصان کے بعد زنا کرے یا اسلام کے بعد کفر کرے یا ناحق کسی جان کو مار ڈالے۔ اس حدیث کو شافعی اور احمد رحمہما اللہ اور ترمذی اور ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور اس بارے میں مسلم اور ابو داؤد وغیرہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت کیا ہے لیکن ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ ضرور فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو یا اپنے مدبر کو یا اپنے مکاتب کو یا ایسے غلام کو جس کے بعض حصہ کا یہ مالک ہے یا اپنے بیٹے کے غلام کو مار ڈالے تو اس کے عوض قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ اگر قصاص میں یہ قتل کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ خود اپنے سے قصاص لے اور آدمی دوسرے سے پانے کا مستحق ہے نہ کہ اپنی ذات سے۔ اسی طرح بیٹا بھی دیت باپ سے نہیں لے سکتا اور داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ ان سب صورتوں میں قصاص لیا جائے گا اور دلیل میں ترمذی اور ابو داؤد اور ابن ماجہ اور دارمی کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں حسن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے غلام کو قتل کر دے اس کو ہم قتل کر ڈالیں گے اور جو اپنے

marfat.com

غلام کی ناک کاٹے ہم بھی اس کی ناک کاٹیں گے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث سیاست پر محمول ہے۔ نیز یہ حدیث مرسل بھی ہے کیونکہ حسن کو سمرۃ سے سماعت نہیں ہوئی اور نیز دار قطنی نے عمرو بن شعیب سے بواسطہ ان کے اب وجد کے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو جان کر مار ڈالا تھا تو نبی ﷺ نے اس کے سو کوڑے مارے اور ایک سال کے لئے اس کو جلاوطن کر دیا اور غنیمت سے اس کو حصہ نہیں دیا، مگر قصاص نہیں لیا اور اس کو حکم فرمایا کہ ایک غلام آزاد کر دے لیکن اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش راوی ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

۲ اور سوائے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اور سب اس پر متفق ہیں کہ غلام آزاد کے بدلے اور عورت مرد کے بدلے اور کافر مسلمان کے بدلے قتل کئے جائیں اور اس کا عکس جائز نہیں، کیونکہ پہلی صورتوں میں تو ادنیٰ اعلیٰ کے عوض قتل کیا جاتا ہے اس میں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اعلیٰ کا عوض ادنیٰ ہو سکتا ہے اور دوسری صورتوں میں اعلیٰ ادنیٰ کے عوض میں جاتا ہے یہ نامناسب ہے۔ لیکن اس پر متفق ہیں کہ مرد عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ عمرو بن ھشام سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اہل یمن کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مرد عورت کے عوض قتل کیا جائے۔ یہ ایک حدیث مشہور کا ٹکڑا ہے جس کو امام مالک اور شافعی رحمتہ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔ محدثین نے اس حدیث کی صحت میں اختلاف کیا ہے ابن حزم نے کہا ہے کہ عمرو بن حزم کا صحیفہ جس میں یہ حدیث ہے منقطع ہے قابل احتجاج نہیں اور نیز سلیمان بن داؤد راوی کے ترک پر سب کا اتفاق ہے اور ابو داؤد نے کہا ہے کہ سلیمان بن داؤد کسی نے وہم سے کہہ دیا ہے واقع میں یہ سلیمانؒ بن ارقم ہیں اور حاکمؒ اور ابن حبانؒ اور بیہقیؒ نے اس حدیث کی تصحیح بھی کی ہے اور امام احمد سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں مجھے امید ہے کہ یہ حدیث صحیح ہو اور ابو زرعہ اور ابو حاتم اور حفاظ کی ایک جماعت نے سلیمان بن داؤد کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے اور اس حدیث کو ائمہ کی ایک بڑی جماعت نے اس کی شہرت کے اعتبار سے صحیح کہا ہے اگرچہ سند کی حیثیت سے صحیح نہیں کہا ہے چنانچہ امام شافعی اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں۔

کہ علماء نے اس حدیث کو جب تک ان کو یہ ثابت نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا نامہ ہے قبول نہیں کیا۔ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ یہ خط اہل سیر کے نزدیک بہت مشہور ہے اور اس کا مضمون اہل علم کے نزدیک بخوبی روشن ہے۔ رہی یہ بات کہ آزاد کو دوسرے کے غلام کے بدلے قتل کیا جائے یا نہیں۔ امام مالک اور شافعی اور احمد رحمہم اللہ تو یہ فرماتے ہیں کہ نہ قتل کیا جائے اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قتل کیا جائے گا۔ ائمہ ثلثہ رحمہم اللہ کی دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آزاد غلام کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔ اس حدیث کو دار قطنی اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے۔ حنفیہ کی طرف سے اس کا یہ جواب ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کے اندر جویبر اور عثمان بزی دو راوی ضعیف اور متروک ہیں۔ ابن جوزی اور حافظ ابن حجر نے اسی طرح کہا ہے اور اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں جابر جعفی ایک راوی ہے اس کو لوگوں نے کذاب کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ مسلمانوں کو کافر کے عوض قتل کریں یا نہیں، امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ تو فرماتے ہیں کہ قتل نہ کریں گے کیونکہ ابو جحیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس سوائے قرآن کے اور بھی کچھ ہے، فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو چیرا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس سوائے قرآن پاک کے کچھ نہیں ہے، مگر ہاں ایک سمجھ ہے جو مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب سمجھنے کے لئے عطا فرمائی ہے اور ایک وہ شئے ہے جو اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے فرمایا اس میں دیت اور اسیر کے چھوڑنے کے احکام ہیں اور اس میں یہ بھی ہے کہ مسلمان کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام احمد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اس میں اتنا اور زیادہ ہے کہ کوئی ذمی اپنے ذمہ کی حالت میں قتل نہ کیا جائے اور نیز امامین مذکورین رحمہما اللہ عمرو بن شعیب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ بواسطہ اپنے اب وجد کے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ مسلمان کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن نے سوائے نسائی کے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ نے

marfat.com

ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن حبان نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور امام شافعی نے عطا اور طاؤس اور حسن اور مجاہد رضی اللہ عنہم سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ کوئی مؤمن کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔ امام بیہقی نے بھی اس حدیث کو عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کا کسی حالت میں سوائے تین حالتوں کے قتل کرنا جائز نہیں یا تو محصن ہو کر زنا کرے تو اس صورت میں سنگسار کر دیا جائے گا یا کسی مسلمان کو جان کر مار ڈالے یا اسلام سے نکل کر اللہ و رسول سے مقابلہ کرے اس صورت میں قتل کر دیا جائے یا سولی دیا جائے یا جلاوطن کر دیا جائے۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور عبدالرزاق نے معمر سے معمر نے زہری سے زہری نے سالم سے سالم نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کو مار ڈالا یہ قصہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روبرو پیش ہوا، تو حضرت عثمان نے اس کو قتل نہیں کیا مگر دیت میں بہت شدت فرمائی۔ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ حدیث نہایت صحیح ہے اور اس بارے میں صحابہؓ سے سوا اس کے اور کوئی حدیث پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی، لیکن ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس قصہ میں اتنا منقول ہے کہ انہوں نے لکھا کہ ایسے موقع میں قصاص لیا جائے۔ پھر اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا کہ ایسے شخص کو قتل مت کرو دیت لو۔ ان سب احادیث کا جواب یہ ہے کہ ان احادیث میں کافر سے مراد حربی ہے ذمی نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا قول ولا ذو عهد في عهده (یعنی نہ قتل کیا جائے ذمہ والا ذمہ کی حالت میں) اس پر صاف دال ہے کیونکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ ذمی اپنے عہد کی حالت میں کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ ذمی ذمی کے بدلے قتل کیا جاتا ہے تو لا محالہ کافر سے مراد حربی ہوگا۔ رہا حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا فتویٰ سو وہ ان کا اجتہاد اور رائے ہے۔ اسی واسطے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب اس بارے میں مختلف ہوا۔ باقی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سو اس میں اسلام کی قید اتفاقاً واقع ہوئی ہے اور مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل کرنے پر صاحب ہدایہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ سے مروی ہے کہ مسلمان ذمی کے بدلے قتل کیا جائے میں کہتا ہوں کہ دار قطنی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان کو ذمی کے بدلے خود قتل کیا ہے اور فرمایا کہ میں ذمہ کے پورا کرنے والوں میں زیادہ کریم ہوں۔ لیکن دار قطنی نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث کو سوائے ابراہیم بن یحییٰ کے کسی نے سنداً روایت نہیں کیا اور ابراہیم بن یحییٰ متروک الحدیث ہے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ ابراہیم بن یحییٰ کذاب ہے اور ٹھیک یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے ابن سلیمان پر جا کر ختم ہو جاتی ہے اور ابن سلیمان مرسل تو علیحدہ اگر متصل سند بھی بیان کرے تب بھی ضعیف ہے قابل سند نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اولیٰ یہ ہے کہ آیت اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الخ اور حضرت ابن مسعود اور عثمان اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے استدلال کیا جائے، باقی سب چھوڑ دیا جائے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ باپ بیٹے کے عوض مارا جائے گا یا نہیں۔ امام مالک تو یہ فرماتے ہیں کہ جب باپ نے اس کو لٹا کر ذبح کیا ہو تو قتل کر دیا جائے اور داؤد ظاہری اور امام ابو حنیفہ اور شافعی اور احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ کسی حالت میں قتل نہ کیا جائے گا، ہماری دلیل حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ باپ سے بیٹے کے عوض قصاص نہ لیا جائے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں حجاج بن ارطات راوی ہے اور امام احمد کے نزدیک یہ حدیث اور طریق سے ہے اور دار قطنی کے نزدیک ایک اور طریق سے مروی ہے کہ وہ طریق پہلے دو طریق سے زیادہ صحیح ہے اور بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے اور ترمذی نے اس حدیث کو سراقہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے اور نیز اس میں عمرو بن شعیب پر آکر اختلاف اور اضطراب ہے۔ بعض نے تو عمرو سے روایت کیا ہے اور بعض نے سراقہ سے اور امام احمد کے نزدیک عمرو بن شعیب سے بلا واسطہ مروی ہے لیکن اس میں ابن لھیعہ راوی ضعیف ہے اور نیز اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے مگر اس سند میں اسماعیل بن مسلم مکی ضعیف ہے۔ لیکن بیہقی نے کہا ہے کہ حسن بن

marfat.com

عبداللہ عنبری نے عمرو بن دینار سے اس کی متابعت کی ہے۔ شیخ عبدالحق کہتے ہیں کہ یہ سب احادیث معلول ہیں کوئی ان میں درجۂ صحت کو پہنچی ہوئی نہیں اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے اہل علم سے یہ مضمون محفوظ کیا ہے کہ باپ بیٹے کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور یہی میرا مذہب ہے واللہ اعلم۔

جب ایک جماعت مل کر ایک آدمی کو قتل کر ڈالے

مسئلہ :- ایسی صورت میں کہ جماعت میں سے ہر شخص نے ایسا زخمی کیا ہو کہ ہلاکت کے قریب کر دینے والا ہو تو ان سے قصاص لیا جائے گا۔ بخلاف قطاع طریق کے کیونکہ قطاع الطریق پر قتل بوجہ اعانت کے آتا ہے اور یہاں ہر ایک سے زخم کا ہونا شرط ہے۔

مسند اور چلپی میں ہے کہ ایسی حالت میں کہ جماعت قاتلین میں سے ہر ایک سے زخمی کرنا ثابت ہو سب سے قصاص لیا جائے گا اور اگر بعض سے صادر ہو اور بعض سے نہ ہو تو اس شخص سے قصاص لیا جائے گا جس نے زخم لگایا ہے اور جس نے زخم نہیں لگایا...... اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا خواہ اس نے اعانت کی ہو یا نہ کی ہو۔ بخلاف قطاع طریق کے کہ وہاں سب پر قتل واجب ہو گا سب کو قتل کیا جائے گا اور داؤد کہتے ہیں کہ ایک روایت امام احمد سے بھی یہی ہے کہ قتل نہ کئے جائیں بلکہ دیت لی جاوے۔

سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص صنعاء میں مارا گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے عوض سات آدمیوں کو مارا اور یہ فرمایا کہ اگر اس کے قتل میں تمام اہل صنعاء شریک ہوتے تو سب کو قتل کر دیتا۔ اس حدیث کو امام مالک نے موطا میں اور امام شافعی نے امام مالک سے اور بخاری نے ایک اور سند سے روایت کیا ہے اور اگر ایک شخص جماعت کو قتل کرے تو اس میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تو یہ فرماتے ہیں کہ قصاص کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر اس نے جماعت کو یکے بعد دیگرے قتل کیا ہے تو فقط اول مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا اور باقی مقتولوں کے لئے دیت ہو گی اور اگر دفعتاً ایک حالت میں سب کو مارا ہے تو ان مقتولین کے وارثوں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے گا جس کا قرعہ نکلے گا اس کے عوض تو قتل کر دیا جائے گا اور باقی کے لئے دیت لے جائے گی اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وارث سب آئیں اور قصاص طلب کریں تو سب کے عوض قتل کر دیا جائے گا اور دیت نہیں ہے اور اگر بعض نے تو قصاص طلب کیا اور بعض دیت کے طالب ہوئے تو جو طالب قصاص ہیں ان کے واسطے قتل کیا جائے گا اور جو دیت کے طالب ہیں ان کے لئے دیت واجب ہو گی اور اگر سب کے سب دیت ہی کے طالب ہوں تو ایک دیت پوری ہر ایک کو ملے گی۔ اس پر سب متفق ہیں کہ قتل خطا میں قصاص نہیں قصاص عمد میں ہے اور عمد کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام احمد، ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ قتل عمد یہ ہے کہ کسی ہتھیار یا دھار دار لکڑی یا پتھر یا آگ سے جان کر مارا جائے اور شعبی اور نخعی اور حسن بصری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ قتل عمد صرف لوہے کے ہتھیار سے ہوتا ہے اور عمد کے سوا اور کسی قتل میں قصاص نہیں اور اگر ہتھیار یا کسی دھار دار شئے کے سوا اور کسی چیز سے جان کر مارا تو یہ قتل شبہ عمد کہلاتا ہے اور اس میں قصاص نہیں دیت واجب ہے اور امام ابو یوسف و محمد و شافعی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی بڑے پتھر یا بڑی بھاری لکڑی سے مارا اور یہ گمان غالب ہے کہ اس کے لگنے سے آدمی مر جاتا ہے تو یہ بھی عمد ہے اور اس میں قصاص ہے اور اگر پانی میں غرق کر دیا یا گلا گھونٹ دیا یا چند روز تک کھانا پانی روک دیا اور مر گیا تو یہ سب قتل عمد میں شمار ہو گا اور قصاص واجب ہو گا اور امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر ایسے عصا یا کوڑے یا چھوٹے پتھر سے جان کر مار ڈالا کہ عادۃً اس کے لگنے سے آدمی مرتا نہیں تو یہ بھی عمد ہے اور اس میں بھی قصاص ہے اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ خطاء العمد ہے اور اس میں قصاص نہیں ہے بلکہ دیت واجب ہے۔ لیکن شافعیؒ اتنا زیادہ فرماتے ہیں کہ اگر کئی مرتبہ مارا حتیٰ کہ مر گیا تو قصاص واجب ہے۔ غرض سوائے امام ابو حنیفہؒ کے اس پر سب متفق ہیں کہ اگر کسی بھاری چیز سے اگرچہ دھار دار نہ ہو جان کر مارا تو قصاص واجب ہے

marfat.com

اور دلیل صحیحین کی حدیث ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے ایک عورت کا سر دو پتھروں کے بیچ میں کچل کر مار ڈالا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے سر کو بھی دو پتھروں کے بیچ میں رکھ کر کچل دیا اور امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن عباسؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے جنین کے بارے میں فیصلہ فرمایا میں حاضر تھا اور قصہ یوں ہوا تھا کہ ابن مالک آئے اور آکر حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرے یہاں دو عورتیں تھیں وہ دونوں آپس میں لڑیں اور ایک نے دوسری پر خیمہ کا ستون کھینچ مارا کہ وہ مر گئی اور اس کے پیٹ میں جو بچہ تھا وہ بھی راہی ملک عدم ہوا۔ حضور ﷺ نے اس بچہ کے بدلے تو ایک غلام دیدینے کا حکم فرمایا اور اس عورت مقتولہ کے عوض قاتلہ کے قتل کرنے کو ارشاد فرمایا۔ اور کوڑے اور عصا سے مارے جانے میں قصاص نہ ہونے کی دلیل جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ خطا یعنی شبہ عمد کا مقتول کوڑے اور عصا کا مقتول ہے اس میں سو اونٹ ہیں چالیس ان میں ایسے ہوں کہ ان کے پیٹ میں اولاد ہو۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اس کی تصحیح کی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دو عورتیں قبیلہ ہذیل کی آپس میں لڑیں ایک نے دوسرے کے ایک پتھر مارا اس کے صدمہ سے وہ مر گئی اور جو اس کے پیٹ میں بچہ تھا وہ بھی مر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جنین کی دیت تو ایک غلام یا باندی دیدینا چاہئے اور عورت کی دیت اس کے عاقلہ پر مقرر فرمائی اور مغیرہ بن شعبہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر کسی کے اندھا دھند اور گڑبڑ میں کوئی پتھر لگا، یا کوئی کوڑا یا لاٹھی آلگی اور اس سے وہ مر گیا تو یہ قتل خطا ہے اور اس کی دیت بھی قتل خطا کی دیت ہوگی اور جو جان کر مارا گیا تو قصاص واجب ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ وزنی چیز بے دھار سے مارے جانے میں قصاص کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی دلیل علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سوائے لوہے کے کسی اور چیز سے مارے جانے میں قصاص نہیں ہے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس کی سند میں معلیٰ بن جلال راوی ہے۔ یحییٰ بن معین نے اس کی نسبت کہا ہے کہ وہ حدیث کو بنا لیا کرتا تھا اور جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اول تو یہ حدیث پایۂ ثبوت اور صحت کو نہیں پہنچی اور اگر مان بھی لی جائے تو حدیث لا قود الا بالسیف (یعنی قصاص سوائے تلوار کے اور کسی چیز سے نہ لیا جائے گا) پر محمول ہے (یعنی جو اس کے معنی ہیں وہ ہی اس حدیث کے لئے جائیں گے) اور یہ حدیث یعنی لا قود الا بالسیف ابوہریرۃ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور اس کی سند میں ابو معاذ سلیمان بن ارقم متروک ہے اور ابو بکرہ اور نعمان بن بشیرؓ سے بھی یہ حدیث منقول ہے اور ان کی راوی مبارک بن فضالہ کا امام احمد کچھ اعتبار نہ کرتے تھے اور نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سوائے تلوار کے ہر شئے سے مارنا خطا ہے اور ہر خطا میں دیت ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ہر شئے سے سوائے لوہے کے مارنا خطا ہے اور اس کی سند میں جابر جعفی کذاب ہے۔
اس میں اختلاف ہے کہ آیا جس شئے سے قاتل نے قتل کیا ہے اسی سے قصاص لیا جائے یا تلوار سے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تو یہ فرماتے ہیں کہ قصاص تلوار ہی سے لینا چاہئے اور اس مضمون کی حدیث اور اس کی سند اور جو کچھ اس میں کلام ہے وہ پہلے گزر چکی ہے اور امام شافعی و مالکؒ فرماتے ہیں اور نیز امام احمد کا دوسرا قول ہے کہ جس شئے سے قاتل نے مارا ہے اس سے اس کو مارا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لفظ قصاص فرمایا ہے اور قصاص کے معنی برابری کرتا ہے اور نیز صحیحین کی حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اول گزر چکی ہے کہ ایک یہودی نے ایک عورت کا سر پتھروں سے کچل دیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کا سر پتھروں ہی سے کچلا۔ اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ قصاص یہی ہے کہ جس چیز سے قاتل نے مارا ہے اسی سے اس کو مارا جائے۔ اور نیز مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کسی کو غرق کرے اس کو ہم بھی غرق کردیں گے اور جو کسی کو آگ سے جلا دی اس کو ہم بھی جلا دیں گے۔ اس حدیث کو بیہقی نے معرفہ بن عمرو بن نوفل بن یزید بن براء سے، عمرو نے اپنے باپ

marfat.com

سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (پھر جس کو معاف ہو جائے اس کے بھائی کی جانب سے کچھ) صاحب قاموس نے کہا ہے کہ عفو کے معنی در گزر کرنا اور مستحق عقوبت کی عقوبت چھوڑنا ہے اور کہا ہے کہ عرب عفی عنه ذنبه اور عفی له ذنبه (اس کا گناہ معاف کیا گیا) بولتے ہیں۔ صاحب قاموس کی اس عبارت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عفو، ذنب (گناہ) کی طرف تو بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے اور مجرم کی جانب بواسطۂ عن یا لام کے متعدی ہوتا ہے۔ اس صورت میں مَنْ، فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ میں خواہ شرطیہ ہو یا موصولہ ہو مبتدا ہوگا اور مراد مَنْ سے قاتل ہوگا اور مِنْ، مِنْ اَخِيْهِ میں یا تو ابتدائیہ اور ظرف لغو ہوگا اور مراد اخ سے مقتول کا ولی ہوگا اور یا تبعیضیہ ہوگا اور اخیه سے پہلے دم مضاف محذوف ہوگا اور تقدیر عبارت کی یہ ہو جائے گی فمن عفی له من دم اخیه شئی (پس اگر قاتل کے لئے اس کے بھائی کے خون سے کچھ معاف کیا جائے) اور مراد اخ سے اس صورت میں مقتول ہوگا اور ظرف اس تقدیر پر مستقر ہوگا اور ترکیب میں حال مقدم بنے گا اور شئے عفو کا مفعول بہ قرار دیا جائے گا کہ جس کی طرف فعل مسند کر دیا گیا اور مراد شئے سے جنایت (قصور و خطا ہوگی) اگر من تبعیضیہ لیا جائے تو حاصل اس صورت میں یہ ہوگا کہ جس قاتل کی کسی قدر خطا و قصور کہ جو اپنے بھائی مسلمان کے خون سے ہوئی ہے معاف کر دی جائے اور اگر من ابتدائیہ لیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ جس قاتل کی خطاء ولی مقتول کی طرف سے معاف ہو جائے۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ عفا لازم ہے اور بعض نے جو یہ کہہ دیا ہے کہ عفی بمعنی ترک ہے (چھوڑ دی جائے) اور شئے مفعول بہ ہے یہ قول ضعیف ہے کیونکہ عفی بمعنی ترک اب تک ثابت نہیں ہوا بلکہ عفی عنه بمعنی ترک مستعمل ہے اور عفو بواسطہ عن کے مجرم اور جرم دونوں کی طرف متعدی ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عفا الله عنک (معاف کیا اللہ نے آپ سے) یہاں خطا کرنے والے کی طرف متعدی ہے اور فرمایا عفی عنها (معاف کی وہ خطا) یہاں گناہ کی جانب تعدیہ ہوا ہے اور جب عفو ذنب (گناہ) کی جانب متعدی ہو تو مجرم کی طرف بواسطۂ لام کے متعدی ہوتا ہے۔ یہ آیت کریمہ اسی استعمال کے موافق ہے گویا حاصل اس تقدیر پر یہ ہوگا کہ جس شخص کو اس کے قصور سے اس کے بھائی مسلمان کی طرف سے کچھ معافی دی جائے۔ پس اس صورت میں عفی مصدر کی طرف مسند ہوگا اور من اخیه میں من ابتدا کے لئے ہوگا۔ اخیر کی ان دونوں ترکیبوں پر شئے کی تنکیر پہلی صورت میں تو اس لئے ہوگی کہ یہ سمجھا جائے کہ قاتل کی کسی قدر خطا معاف ہوئی ہے اور دوسری صورت میں اس سبب سے ہوگی تاکہ یہ مفہوم ہو کہ کچھ حصہ عفو کا موجود ہے کل نہیں ہے۔ اور اسی بناء پر یہاں فعل کی اسناد مصدر کی طرف صحیح ہوگئی کیونکہ اس صورت میں مصدر بیان نوع کے لئے ہوگا اور مراد عفو قلیل (کسی قدر معاف کرنا) ہوگا جیسے آیت ان نظن الا ظنا (بس خیال سا ہم کو بھی آتا ہے) میں ظنا سے ظن قلیل مراد ہے۔ اس تفسیر کے موافق آیت سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ جب مقتول کے تمام وارث معاف کر دیں اور پوری جنایت معاف ہو جائے اس وقت دیت واجب ہے اور امام شافعی اور ان کے متبعین کی اس مسلک پر یہ آیت حجت ہوگی۔

ازہری کہتے ہیں کہ عفو اصل میں بمعنی فضل (پس ماندہ) ہے اور آیت یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (اے محمد ﷺ) آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا شئے خرچ کریں آپ فرما دیجئے کہ جو بچے) میں عفو بمعنی فضل ہی مستعمل ہے اور نیز جب کسی کو بچا ہوا مال دیدیا ہو تو عرب اس کو عفوت لفلان بمالی اور عفوت له عمالی علیه سے تعبیر کرتے ہیں اس توجیہ پر اخیه میں اخ سے مراد مقتول کا وارث ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ جس ولی مقتول کو اس کے مسلمان بھائی یعنی قاتل کے مال سے بطور صلح کے کچھ دیا گیا۔ اور ان تفاسیر پر قاتل یا مقتول یا ولی مقتول کو اللہ تعالیٰ نے لفظ برادر سے کہ وہ برادری محض جلیسیت اور اسلام کی وجہ سے ہے اس لئے یاد فرمایا تاکہ اس پر رقت اور مہربانی سے متوجہ ہو اور اس عنوان سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قتل سے مسلمان کافر نہیں ہوتا کیونکہ اگر کافر ہو جاتا تو لفظ اخ (بھائی) سے ذکر نہ فرماتے اور نیز صدر آیت میں اے ایمان والو سے خطاب فرمانا بھی اس پر صاف دال ہے۔

marfat.com

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ (تو کچھ چلنا چاہئے دستور کے موافق اور اس کو دیدینا چاہئے خوش معاملگی سے، یہ آسانی ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے اور مہربانی) فاتباع یا تو فعل محذوف کا فاعل ہے۔ اس صورت میں تو یہ حاصل ہوگا کہ ولی مقتول کی طرف سے اتباع یعنی قبول ہونا چاہئے اور یا مبتدا محذوف کی خبر ہے اس تقدیر پر یہ ملخص ہوگا کہ ولی مقتول کو اتباع کا حکم ہے بالمعروف یعنی ولی مقتول کو سختی نہ کرنی چاہئے بلکہ سلوک اور ملاطفت سے قبول کرلے۔ واداء الخ مبتدا محذوف الخبر ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قاتل کے ذمہ پر ولی مقتول کو ادا کرنا ہے۔ باحسان یعنی ادا کرنے میں ٹال مٹول نہ کرے اور نہ مقدار میں کمی کرے پورا پورا وقت پر دیدے ذلک الخ یعنی یہ صلح کے جائز ہونے اور بعض ورثہ کے معاف کردینے کے بعد دوسرے ورثہ کے لئے دیت واجب ہونے کا حکم تمہارے پروردگار کی جانب سے تخفیف اور رحمت ہے۔

ابن جریر نے قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس امت محمدیہ ﷺ پر بڑی رحمت ہے کہ ان کو دیت کا مال حلال فرمادیا۔ پہلے کسی کے لئے حلال نہیں فرمایا۔ یہود کے ذمہ قصاص تھا یا خون معاف کرنا۔ دیت نہ تھی اور اہل انجیل کو خون معاف کردینے کا حکم تھا۔ قصاص بھی نہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس امت پر کیسی تخفیف اور سہولت فرمائی کہ ان کے لئے قصاص اور معاف کردینا اور دیت لینا تینوں امر مشروع فرمادیئے۔ للہ الحمد۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ (پھر جو زیادتی کرے اس کے بعد اس کے لئے عذاب دردناک ہے) یعنی جو کوئی معاف کردینے یا دیت لینے کے بعد پھر بھی قتل کرے تو اس کو آخرت میں سخت عذاب ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص عفو یا دیت میں سے ایک چیز کو اختیار کرے اور پھر حد سے متجاوز ہو یعنی قتل کے درپے ہو وہ آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ ایسے شخص کو قتل کردینا واجب ہے، ہرگز معافی نہ دی جائے، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص دیت لینے کے بعد قتل کرے اس کو معافی نہیں دوں گا۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو) القصاص میں الف لام جنس کا ہے اور حیاۃ کی تنکیر تعظیم کی ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ اس قصاص کے حکم میں ایک بڑی بھاری زندگی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب قصاص کا حکم معلوم ہو جائے گا، تو یہ قاتل کو قتل کے ارادہ سے باز رکھے گا کیونکہ وہ ڈرے گا کہ اگر میں قتل کردوں گا تو قصاص میں میری بھی جان جائے گی، تو اس قصاص کے مشروع ہونے سے دو جانیں بچ گئیں۔ نیز اہل جاہلیت کی یہ عادت تھی کہ ایک شخص کے عوض سیکڑوں کو مار ڈالتے تھے اور اس سے فتنہ عظیمہ اٹھتا تھا۔ جب قصاص کا حکم ہو گیا تو ہزاروں کی جانیں بچ گئیں۔ پہلی صورت میں تو یہ معنی ہوں گے کہ تمہارے لئے قصاص کے مشروع ہونے میں زندگی ہے اور دوسری صورت میں یہ حاصل ہوگا کہ قصاص میں تمہارے لئے سوائے قاتل کے اوروں کی حیات ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمہارے لئے قصاص کے اندر اخروی حیات ہے کیونکہ جب دنیا میں اس سے قصاص لے لیا جائے گا تو آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا اور پاکیزہ زندگی ابدی ملے گی اور عقل والوں کو اس لئے خطاب فرمایا کہ اہل عقل ہی احکام شرعیہ کی حکمتیں اور مصالح سمجھتے ہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (تاکہ تم باز آجاؤ) یعنی تاکہ تم قصاص کے خوف سے قتل سے بچ جاؤ یا یہ معنی کہ تم قصاص کی وجہ سے آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ یا یہ مطلب تاکہ تم قصاص کی حکمت پر اطلاع پانے سے قصاص کو ٹالنے سے بچ جاؤ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ (تم پر لازم کیا جاتا ہے جب سامنے آموجود ہو تم میں سے کسی کی موت اگر چھوڑے کچھ مال) یعنی موت کے اسباب اور علامات موجود ہو جائیں اور ظن غالب ہو جائے کہ

marfat.com

اب موت آنے والی ہے۔ ان ترک میں ترک ماضی سے مستقبل مراد ہے۔ خیر سے مراد مال ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَاتنفقوامن خیر یعنی جو کچھ تم مال خرچ کرو اور فرمایا وانہ لحب الخیر لشدید یعنی اور بیشک انسانوں کو مال کی بہت ہی محبت ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خیر سے مراد مال کثیر ہے۔ چنانچہ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے آزاد کردہ غلام نے وصیت کا ارادہ کیا اور اس کے پاس کل نو سو درہم تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو منع فرمایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کے بارے میں ان ترک خیرًا (اگر چھوڑے خیر کو) فرمایا ہے اور خیر مال کثیر کو کہتے ہیں، اس لئے تو وصیت مت کر اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا میں نے اس سے پوچھا کہ تیرے پاس کس قدر مال ہے اس نے کہا کہ تین ہزار درہم ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تیرا کنبہ کتنا ہے اس نے کہا کہ چار آدمی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان ترک خیرا فرمایا ہے اور یہ مال تھوڑا ہے اس کو تو اپنے عیال کے لئے چھوڑ دے۔

ۨ الْوَصِيَّةُ (کہ وصیت کر مرے) الوصیۃ، کتب کا نائب فاعل ہے اور کتب کو باوجود جواز تانیث یا تو نسبت فصل کے مذکر ذکر فرمایا یا وصیت کو بمعنی مصدر مانا گیا اور اسی بنا پر فمن بدلہ میں ضمیر مذکر ذکر کی گئی اور اذا کا عامل کتب کے اندر جو ضمناً مصدر بمعنی فرض ہونا موجود ہے وہی اذا کا عامل ہے۔ وصیت عامل نہیں کیونکہ وصیۃ مؤخر ہے اور مصدر اپنے سے مقدم میں عمل نہیں کرتا۔

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ (ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے) للوالدین الخ وصیۃ کے متعلق ہے ابتداء اسلام میں اس آیت کی وجہ سے وصیت فرض تھی پھر یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کو آیت میراث نے منسوخ کیا ہے اور نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق پہنچا دیا ہے، آگاہ ہو جاؤ کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس استدلال میں نظر ہے اس واسطے کہ آیت میراث تو اس آیت کے معارض نہیں بلکہ اس کی مؤکد ہے۔ کیونکہ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وصیت میراث پر مقدم ہے اور جب اسکے معارض بھی نہیں ہے تو ناسخ کیسے بن سکتی ہے اور رہی حدیث سو وہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے کتاب کا نسخ کیسے ہو سکتا ہے اور تحقیق یہ ہے کہ یہ آیت اس وجہ سے منسوخ ہے کہ بغیر ورثہ کی رضا کے کسی وارث کے لئے وصیت ناجائز ہونے پر اجماع ہو گیا ہے اور نیز ائمہ اربعہ اور جمہور علماء نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ غیر وارث کے لئے وصیت واجب نہیں اور زہری اور ابو بکر حنبلی سے اور بعض اصحاب ظواہر سے جو مروی ہے کہ رشتہ داروں میں سے جو وارث نہ ہوں ان کے لئے وصیت واجب ہے تو اس کا کچھ اعتبار نہیں کہ یہ قول سراسر جمہور کے خلاف ہے۔ جب اجماع ثابت ہو گیا تو یہ بات معلوم ہو گئی کہ سلف کے پاس ضرور کوئی دلیل قطعی اس قسم کی ہو گی جس سے انہوں نے صریح کتاب کو چھوڑ دیا ورنہ ہرگز نہ چھوڑتے اگرچہ وہ ناسخ ہم کو کسی معتبر قطعی طریق سے معلوم نہ ہو۔ اب یہاں چند احادیث لکھتے ہیں کہ وہ سند اجماع بن سکتی ہیں۔

ابو امامہ باھلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرما رہے تھے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دیدیا ہے اس لئے اب وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے اور امام احمد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے عمرو بن خارجہ سے اور نیز ابن ماجہ نے سعید بن ابی سعید سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور بیہقی نے بطریق شافعیؒ ابن عیینہ سے اور ابن عیینہ نے سلیمان احول سے اور سلیمان نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سند سے یہ مرسل ہے اور علیؓ سے بھی روایت کیا ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند حسن روایت کیا ہے اور نیز دار قطنی

marfat.com

نے عمرو بن شعیب سے بواسطہ ان کے اب وجد کے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وارث کے لئے بدون اجازت ورثہ کے لئے وصیت نہیں ہے اور ان ہی الفاظ سے ابو داؤد نے عطاء خراسانی سے مرسلاً روایت کیا ہے اور یونس بن راشد نے عطاء سے اور عطاء نے عکرمہ سے اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کو متصل بھی روایت کیا ہے۔ یہ جملہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت حق ورثہ میں منسوخ ہے اور سوائے وارثوں کے اور اقارب کے بارے میں ساکت ہے اس سے نہ اثبات نکلتا ہے نہ نفی۔ لیکن وصیت کے واجب نہ ہونے پر ابن جوزی ایک حدیث لائے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص پر دو یا تین راتیں گزریں اور اس کے پاس کچھ مال ہو اور وہ وصیت کرنے کا ارادہ کرتا ہو تو اس کی وصیت لکھی گئی ہے (یعنی وصیت کا ثواب اس کو ملے گا) اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے وصیت واجب نہ ہونا اس حدیث سے اس طرح نکلتا ہے کہ حضور ﷺ نے وصیت کو اس کے ارادہ پر رکھا ہے اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ وصیت واجب نہیں۔ اپنے اقارب میں سے غیر وارث کے لئے وصیت کے جائز ہونے پر سب علماء کا اتفاق ہے بلکہ اپنے رشتہ دار کو وصیت کرنا اور بھی زیادہ اولی اور باعث ثواب ہے کیونکہ یہ وصیت صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے اور نیز اس سب کے بعد اس پر بھی اتفاق ہے کہ بغیر رضامندی ورثہ کے تہائی سے زائد میں وصیت جائز نہیں۔ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک قول کے موافق وارثوں کی رضامندی سے بھی تہائی سے زائد میں وصیت جائز نہیں تہائی سے زائد میں جائز نہ ہونے پر ذیل کی دو حدیثیں صاف دلالت کرتی ہیں، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں سخت بیمار تھا رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ میری حالت تو ملاحظہ فرما ہی رہے ہیں کہ کیسی ابتر ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ اپنے تمام مال کی وصیت کر مروں، فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نصف کی کر دوں۔ فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ تہائی۔ فرمایا ہاں تہائی اور تہائی بھی بہت ہے، اپنے بال بچوں کو خوش حال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ در در لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے راویت کیا ہے۔

اور دار قطنی اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے مرنے کے وقت تمہارا تہائی مال نیکیاں بڑھانے کے واسطے تم کو دے ڈالا ہے۔ تاکہ اس کو تمہارے مال کی زکوٰۃ بنادیا جائے، لیکن اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش اور اس کا شیخ دونوں ضعیف راوی ہیں اور اس حدیث کو امام احمدؒ نے ابو الدرداءؓ سے روایت کیا ہے اور نیز ابن ماجہؒ اور بیہقیؒ نے ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، لیکن سند ضعیف ہے اور اس باب میں عقیلی نے بطریق حفص بن عمرو ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے لیکن حفص بن عمر در اوی متروک ہے۔

بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨٠﴾ (دستور کے موافق یہ ضروری ہے پرہیز گاروں پر) یعنی وصیت عدل سے کرنا چاہئے۔ ایک رشتہ دار کو دوسرے پر بلاوجہ ترجیح نہ دے اور ایسا نہ کرے کہ مالدار کو وصیت کرے اور مفلس کو چھوڑ دے حقا یا تو فعل محذوف حق کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس صورت میں یہ حاصل ہوگا کہ یہ وصیت پرہیز گاروں پر حق ہے حق ہونا۔ اور یا مفعول بہ ہونے کے سبب سے منصوب ہو تو اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ کر دیا اللہ نے وصیت کو حق۔

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ (جو کوئی وصیت کو بدل دے) بَدَّلَهٗ میں ضمیرہ ایصاً (وصیت کرنا) کی طرف راجع ہے اور ایصاء الوصیۃ میں ضمناً مذکور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وارثوں یا گواہوں یا وصیتوں میں سے اگر کوئی وصیت کو بدل ڈالے تو اس کے لئے یہ سزا ہے۔

بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ (اس کے بعد کہ سن چکا ہے) یعنی وصیت کرنے والے کا قول سنا، یا اپنے نزدیک اس کا قول ثابت اور محقق ہو چکا پھر بھی وصیت کو بدل دے۔

فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ (تو بس اس کا گناہ) ضمیر ہا تو تبدیل شدہ ایصاء کی طرف راجع ہے اور یا خود تبدیل کی طرف راجع ہے۔

marfat.com

عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ (ان ہی لوگوں پر ہے جو اس کو بدلیں بیشک اللہ سننے والا واقف کار ہے) یعنی وصیت کرنے والے نے جو وصیت کی ہے اللہ تعالیٰ اس کو سننے والے ہیں اور اس میں بدل سدل کرنے والے کی حرکت سے واقف ہیں۔

فَمَنْ خَافَ (پھر جس نے اندیشہ کیا) خوف کے معنی اس جگہ ڈر کے نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ جس شخص کو اندیشہ ہو جیسے آیت فان خفتم ان لا یقیما میں بھی خوف کے یہی معنی ہیں۔

مِنْ مُّوْصٍ (وصیت کرنے والے کی جانب سے) حمزہ اور کسائی اور ابو بکر اور یعقوب نے موص کو واؤ مفتوح اور صاد مشدد باب تفعیل سے مشتق کر کے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے واؤ کے سکون سے باب افعال سے پڑھا ہے۔

جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ (طرف دری کا یا گناہ کا پس صلح کرادی آپس میں) جَنَفٌ سے مراد حق سے روگردانی ہے جو خطاء صادر ہو۔ اثما سے مراد وہ ظلم ہے جو جان کر کیا ہو فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ۔ مجاهد فرماتے ہیں کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ کوئی شخص کسی مریض کے پاس آئے اور اس کو وصیت کرتا دیکھے اور دیکھے کہ وصیت میں یہ حق سے اعراض کر رہا ہے تو اس کو راہ حق کی ہدایت کرے اور بے راہی سے منع کرے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کو تہائی سے زیادہ میں وصیت کرنے کو منع فرمایا تھا اور حضرت علی و عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما نے خود وصیت ہی سے روک دیا تھا۔ چنانچہ ہر سہ قصے گزر چکے اور نعمان بن بشیر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میرے باپ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت بابرکت میں لائے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں نے اپنے اس بیٹے کو کچھ دیا ہے (مقصود آپ کو گواہ بنانا تھا) آپ نے دریافت فرمایا، کیا تم نے اپنی سب اولاد کو اسی قدر دیا ہے۔ جتنا اس کو دیا ہے کہا یارسول اللہ ﷺ نہیں سب کو تو نہیں دیا فرمایا اگر یہ بات ہے تو پھر جو تم نے اس کو دیا ہے وہ لوٹا لو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں ظلم پر گواہ نہیں ہوتا۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور باقی مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ معنی ہیں کہ جب میت نے وصیت میں خطا کی تو اس کا ولی یا وصی یا جو مسلمانوں کا حکم ہو وہ اس وصیت کو منسوخ کر دے اور اس میں عدل کرے۔

میں کہتا ہوں کہ اولیٰ یہ ہے کہ ایسے معنی بیان کئے جائیں کہ یہ دونوں معنی اس میں آجائیں۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ (تو اس پر کچھ گناہ نہیں) بلکہ خود اس وصیت کنندہ پر گناہ ہے اور اصلاح کرنے والے کو اصلاح کا ثواب اور اجر ملے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسا ہو جاتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ساٹھ برس تک اللہ کی اطاعت میں رہتے ہیں پھر مرتے وقت وصیت میں ظلم اور نقصان پہنچاتے ہیں اور جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور فلا اثم علیہ (اس پر کچھ گناہ نہیں) اس واسطے فرمایا کہ وصیت کا بدل ڈالنا شرعاً منع ہے اور اس مصلح نے صورتاً تبدیل کی تھی اگرچہ معنیً وہ اصلاح اور درستی تھی تو یہ تبدیل مظنۂ گناہ کا تھا اسی لئے اس کی نفی فرمادی۔

کلبی فرماتے ہیں کہ جب آیت فَمَنْ بَدَّلَهٗ الخ سے تبدیل وصیت کی وعید شدید نازل ہوئی تو وصی اور وارث میت کی وصیت کو (اگرچہ وہ تمام مال کی وصیت کر مرے اور ورثہ کے لئے کچھ باقی نہ رکھے) نافذ اور جاری کرتے تھے چند روز اسی طرح عمل در آمد رہا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیت فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ الخ سے اس کو منسوخ فرمایا۔

۲۲ ع ۲ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ (بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے) یہ مصلح کے لئے وعدہ ہے اور مغفرت کا ذکر اثم (گناہ) کے ذکر کی تقریب سے ہوا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (اے ایمان والو فرض کر دیئے گئے تم پر روزے) صوم لغت میں امساک (رکنا) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ جب ٹھیک برابر دوپہر ہوتا ہے عرب بولتے ہیں صام النہار (رک گیا دن) کیونکہ سورج جب دوپہر کو بیچوں بیچ آسمان کے آتا ہے۔ اس وقت بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ٹھہر گیا ہے اور

marfat.com

اصطلاح اہل شرع میں صوم کے معنی ایک وقت مخصوص میں نیت کے ساتھ کھانے پینے اور جماع سے رکنا ہے۔ چنانچہ عنقریب تفصیلاً معلوم ہوگا۔

کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (جس طرح فرض تھے ان پر جو تم سے پہلے تھے) اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ سے مراد انبیاء علیہم السلام اور امم سابقہ ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کَمَا کُتِبَ سے نفس وجوب میں تشبیہ دینا مراد ہے اور کیفیت اور وقت وغیرہ کے اندر مماثل کرنا مقصود نہیں (یعنی یہ مطلب ہے کہ جیسے اوروں پر روزہ واجب تھا تم پر بھی کیا گیا یہ مراد نہیں کہ جس کیفیت سے اور جتنے دنوں کے روزے اوروں پر تھے۔ اسی طرح اور اسی مدت کے موافق تم پر بھی واجب کئے جاتے ہیں) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلے لوگوں پر رات کی تاریکی شروع ہونے سے دوسری رات تک کا روزہ فرض تھا اور ابتدائے اسلام میں بھی اسی طرح روزہ فرض تھا اس لئے دونوں مشابہ ہوئے۔ اہل علم کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ جس طرح ہم پر ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں اسی طرح نصاریٰ پر بھی اس مہینے کے روزے فرض تھے تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب یہ روزے سخت گرمی میں واقع ہو جاتے تھے تو تشنگی کی شدت سے روزے ان پر بھاری ہوتے تھے اور جب موسم سرما میں آتے تھے تو بھوک کی وجہ سے شاق ہو جاتے تھے جب یہ حالت دیکھی تو سب علماء اور رؤساء جمع ہوئے اور آپس میں مشورہ کر کے روزوں کو موسم بہار میں قرار دیا اور اپنی اس کرتوت کی وجہ سے دس دن بطور کفارہ کے اور بڑھا دیئے۔ اب کل چالیس دن کے روزے اپنے اوپر مقرر کر لئے پھر اتفاقاً جو ان میں بادشاہ تھا وہ بیمار ہو گیا اس نے یہ نذر کی کہ اگر مجھے شفا ہو گئی تو میں ایک ہفتہ کے روزے اور بڑھا دوں گا اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا دی اسے ایک ہفتہ کے روزے اور مقرر کر دیئے۔ پھر اس کے بعد ایک اور بادشاہ ہوا اس نے پورے پچاس کر دیئے اور مجاہد فرماتے ہیں کہ نصاریٰ میں ایک مرتبہ مری پڑی۔ کثرت سے لوگ مرنے لگے انہوں نے آپس میں کہا کہ روزے بڑھا دو۔ دس روزے اول بڑھائے پھر چند روز کے بعد دس اور بڑھا دیئے۔

شعبی نے کہا ہے کہ اگر میں تمام سال کے سال روزے رکھوں تو جس دن میں شک کیا جاتا ہے کہ کوئی اس کو رمضان سے شمار کرے اور کوئی شعبان سے اس میں ضرور افطار کروں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب نصاری پر رمضان کے روزے فرض ہوئے تو انہوں نے یہ کیا کہ ادھر تیس شعبان سے پہلے ایک روزہ رکھا اور اسی طرح تیس رمضان کے بعد روزہ رکھا اور اسی طرح ہر سال روزے بڑھاتے گئے حتیٰ کہ پچاس تک نوبت پہنچ گئی۔ علامہ بغویؒ نے اسی طرح کہا ہے اور ابن جریر نے سدی سے بھی اس قصہ کو نقل کیا ہے۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ (تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ) یعنی روزہ رکھو تاکہ معاصی سے بچ جاؤ کیونکہ روزہ سے شہوت منکسر ہوتی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے جوانوں کے گروہ جو تم میں سے نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ نکاح کرے کیونکہ نکاح نگاہ کو پست کر دیتا ہے اور فرج کو حرام سے محفوظ بنا دیتا ہے اور جس میں نکاح کا مقدور نہ ہو اس کو روزے رکھنے چاہئیں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ روزہ اسی لئے فرض کیا گیا ہے کہ روزے میں تم خلل ڈالنے سے بچو (یعنی جب تک فرض نہ تھا تو اس میں یہ خلل ہوتا تھا کہ کبھی رکھا کبھی چھوڑ دیا اب چونکہ فرض کر دیا گیا اس سے محفوظ رہو گے)۔

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (چند روز ہیں گنتی کے) فعل محذوف صوموا (روزہ رکھو) کا مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ الصیام مصدر کی وجہ سے منصوب نہیں ہے کیونکہ درمیان میں اجنبی فاصل ہے۔ معدودات کا مطلب یہ ہے کہ گنتی کے چند دن ہیں کیونکہ عادۃً جو چیز کم ہوتی ہے اسی کو شمار کیا کرتے ہیں اور بہت کو شمار نہیں کرتے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایاما معدودات (گنے ہوئے دن) سے ہر مہینے کے تین روزے اور ایک روزہ عاشورہ کا مراد ہے۔ کیونکہ یہ روزے ربیع الاول سے لے کر رمضان تک ہر مہینے میں تین تین روزے واجب تھے، پھر رمضان کے روزوں کا حکم ہو گیا اور یہ منسوخ ہو گئے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہجرت کے بعد اول جو حکم منسوخ ہوا وہ قبلہ کا اور روزہ کا حکم تھا اور بعض مفسرین نے یہ

marfat.com

فرمایا ہے کہ رمضان کے روزوں کا حکم بدر کے واقعہ سے ایک ماہ اور چند دن پیشتر نازل ہوا ہے اور غزوہ بدر ۱۷ رمضان ۲ ہجری روز جمعہ کو ہوا ہے۔

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے روزے نازل ہونے سے پہلے عاشورہ کے روزہ کا حکم فرمایا کرتے تھے جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو پھر یہ ہو گیا کہ جو چاہے اس دن روزہ رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا کہ اعلان کر دو کہ آج یوم عاشورا ہے جس نے کچھ کھا پی لیا ہے وہ شام تک نہ کھائے پیئے اور جس نے نہیں کھایا وہ اب نہ کھائے روزے کی نیت کر لے کیونکہ آج کا دن روز عاشورا ہے۔ اس کو بھی بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایامًا معدودات سے مراد رمضان کا مہینہ ہے اور آیت منسوخ نہیں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ سب اقوال میں سے راجح یہ ہے کہ عاشورہ کا روزہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل فرض نہ تھا بلکہ نبی ﷺ نے اپنے اجتہاد سے اس کو پسند فرمایا تھا ایسا ہو کہ حضور ﷺ کی عادت شریف اس دن روزہ رکھنے کی ہو اس لئے اوروں کو بھی اس کا حکم فرماتے ہوں غرض کچھ ہو فرض نہ تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب جناب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ وہ عاشورا کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا یہ بہت مبارک دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دشمن سے نجات دی تھی تو اس دن موسیٰ علیہ السلام نے شکریہ کے طور پر روزہ رکھا تھا اس لئے ہم بھی رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو میں موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا کرنے کا تم سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔ اس لئے حضور ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور اوروں کو بھی رکھنے کا حکم فرمایا۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش عاشورہ کے دن ایام جاہلیت میں روزہ رکھا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی قبل از بعثت اس دن روزہ رکھتے تھے جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں بھی اس روز روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو پھر عاشورا کا روزہ چھوڑ دیا۔ اس حدیث کو بھی بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے فرمایا ہے کہ امام احمد اور ابو داؤد اور حاکم نے معاذ بن جبلؓ سے عاشورا کا روزہ اور ہر مہینے میں تین روزے کا واجب ہونا روایت کیا ہے لیکن یہ وجوب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا اور اس آیت سے منسوخ ہو گیا بس معلوم ہوا کہ ایامًا معدودات سے مراد رمضان کا مہینہ ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا (پھر جو شخص تم میں سے بیمار ہو) مریضًا سے مراد وہ شخص ہے کہ وہ یا تو فی الحال مریض ہو اور روزہ رکھنے سے مرض بڑھے یا دیر میں شفا ہونے کا خوف ہو یا بالفعل تو تندرست ہے، لیکن ایسا سست اور کمزور ہے کہ گمان غالب ہے کہ اگر روزہ رکھوں گا تو مرض پیدا ہو جائے گا اسی میں شامل ہیں وہ حاملہ عورتیں اور دودھ پلانے والی کہ ان کو اپنی یا اپنے بچے کی جان کا خوف ہو۔

جاننا چاہئے کہ مریض کو روزہ رکھنے کی اجازت پر سب علماء کا اتفاق ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کھانا پینا تو جائز ہے لیکن عورت سے صحبت کرنی درست نہیں اگر مسافر یا مریض جماع کرے گا تو ان کے نزدیک اس پر کفارہ واجب ہے لیکن ہاں اگر قبل از جماع کچھ کھا پی لیا ہے اور بعد اس کے جماع کیا تو کفارہ نہیں ہے۔ اور دیر میں شفا ہونے یا مرض بڑھنے کے اندیشے سے روزہ نہ رکھنے پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی بیماری بھی جس کو بیماری کہا جاتا ہے افطار کے لئے کافی ہے کیونکہ آیت میں بلا کسی قید کے مریض کا لفظ ہے اور حسنؒ اور ابراہیم فرماتے ہیں کہ ایسی بیماری مراد ہے کہ جس کی وجہ سے نماز بیٹھ کر پڑھنا درست ہو جاوے۔

اَوْ عَلٰى سَفَرٍ (یا سفر پر ہو) لفظ عَلٰی (اوپر) اس طرف مشیر ہے کہ اگر کوئی شروع دن میں روزہ سے ہو اور پھر اس کو سفر پیش آئے تو اس کو افطار جائز نہیں اور اسی پر اجماع ہے۔ لیکن داؤد ظاہری سے منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سفر خواہ طویل

marfat.com

ہو یا قصیر افطار جائز ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ جس سفر سے روزہ کے افطار اور نماز کے قصر کی اجازت ہے اس کی کتنی مسافت ہے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ اور احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ادنیٰ مقدار سفر کی سولہ فرسخ چار برید ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے مکہ والو چار برید سے کم کی مسافت میں قصر مت کرو اور چار برید کی مقدار اس قدر ہے جیسے مکہ سے عسفان تک۔ اس حدیث کو دار قطنیؒ نے روایت کیا ہے لیکن اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ضعیف راوی ہے اور عبد الوہاب بہت ہی ضعیف ہے۔

امام احمد اور یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ عبد الوہاب کچھ نہیں اور سفیان ثوری فرماتے ہیں کذاب ہے اور نسائی نے کہا ہے متروک الحدیث ہے اور امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ ایک دن کی مسافت میں قصر کرے اور امام ابو حنیفہؒ تین دن تین رات کی مسافت میں کہ جو اونٹ اور آدمی کی چال سے ہو افطار و قصر جائز فرماتے ہیں اور امام ابو یوسفؒ دو دن پورے اور تیسرے دن کے اکثر حصہ کی مسافت کے قائل ہیں۔ ابو حنیفہؒ کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ان سے موزوں پر مسح کرنے کی مدت دریافت کی گئی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تین دن تین رات مسافر کے لئے اور ایک دن اور ایک رات مقیم کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے یہ حدیث تو صحیح ہے مگر یہ استدلال ضعیف ہے اور اطلاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کے لئے اگر کوئی سفر کرے تو اس میں بھی افطار جائز ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے اور امام مالک و شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گناہ کے سفر سے افطار مباح نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فمن اضطر غیر باغ الخ اور حق یہ ہے کہ بغی اور عدوان سفر کی ذات میں داخل نہیں بلکہ سفر سے ان کا تعلق ہے اور اس آیت کی تفسیر اور امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کے مذہب کا مستنبط نہ ہونا ہم اس کے موقع میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (تو ضروری ہے گنتی دوسرے دنوں سے) فَعِدَّةٌ الخ یا تو فعل محذوف کتب کا نائب فاعل ہوا اور یا مبتدا محذوف کی خبر اس صورت میں عدت کا مضاف اور مضاف الیہ اور ایک شرط محذوف ماننی ہوگی کہ یہ سب بقرینہ مقام حذف کر دیئے گئے۔ تقدیر عبارت کی اس طرح ہوگی۔ فالواجب علیہ صیام عدۃ ایام مرضہ و سفرہ من ایام اخران افطر یعنی اگر مریض اور مسافر افطار کرے تو اس پر بیماری اور سفر کے دنوں کی شمار کی قدر روزے واجب ہیں اور اطلاق آیت سے یہ معلوم ہوا کہ قضا روزوں کی پے در پے رکھنا واجب نہیں اس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ داؤد ظاہری فرماتے ہیں کہ پے در پے ہونا ضروری ہے اور اطلاق سے جو پے در پے ہونے کی شرط نہ ہونا مستفاد ہوتا ہے اس کی ایک حدیث بھی تائید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قضاء رمضان کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر چاہے تو جدا جدا رکھے اور چاہے پے در پے رکھے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے متصل اور مرسل دونوں طرح روایت کیا ہے اور حدیث میں ہے کہ محمد بن المنکدر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے رمضان کی قضا روزوں کو جدا جدا رکھنے کو دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا تجھ کو اختیار ہے جس طرح چاہے رکھ۔ اس حدیث کو دار قطنی نے مرسل روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے اور متصل بھی روایت کی گئی ہے لیکن اتصال صحیح نہیں اور اس مضمون کی حدیث دار قطنی نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کی ہے لیکن اس کی سند میں واقدی اور لہیعہ دونوں ضعیف راوی ہیں۔ اور سعید بن منصور نے انس رضی اللہ عنہ سے بھی اس کو روایت کیا ہے اور بیہقی نے ابو عبید اور معاذ بن جبل اور انس رضی اللہ عنہ اور ابو ھریرہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ داؤد پے در پے کے واجب ہونے پر ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ کی اسی حدیث کو دلیل لاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس کے ذمہ رمضان کے روزے ہوں اس کو چاہئے کہ مسلسل رکھے اور بیچ میں نہ توڑے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں عبد الرحمٰن بن ابراہیم بن العاص ایک راوی ہے اس کی نسبت یحییٰ الفاظ لیس بشئی (کچھ نہیں) استعمال کرتے ہیں اور دار قطنی نے ضعیف لیس بالقوی (ضعیف ہے قوی نہیں) کہا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی جب افطار کریں تو ان پر قضاء کے ساتھ فدیہ

marfat.com

بھی واجب ہے یا نہیں حالانکہ اس پر سب متفق ہیں کہ مریض اور مسافر پر قضا کے ساتھ فدیہ واجب نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں کہ قضا ہی واجب ہے فدیہ نہیں۔ اور ایک روایت امام مالک سے بھی یہی ہے اور ایک روایت امام مالک سے یہ ہے کہ دودھ پلانے والی پر فدیہ ہے اور حاملہ پر نہیں۔ اور امام احمد اور شافعی رحمتہ اللہ علیہما کے نزدیک واجب ہے لیکن وجوب کی دلیل قابل اعتماد کسی کے پاس نہیں۔ حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی پر کفارہ واجب ہے۔ قضا واجب نہیں اور اگر قضاء رمضان میں بغیر عذر تاخیر کرے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ پہنچا تو اس میں اختلاف ہے کہ قضا کے ساتھ فدیہ بھی واجب ہے یا نہیں۔ امام احمد اور شافعی رحمہما اللہ تو فرماتے ہیں کہ واجب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر برسوں کے بعد بھی قضا کرے تب بھی قضا کے سوا اور کچھ واجب نہیں کیونکہ یہ کتاب اللہ پر بغیر قطعی دلیل کے زیادتی ہے اور اگر مرض یا سفر کے عذر کے سبب سے دوسرے رمضان سے بھی تاخیر ہو جائے تو اس میں بالاتفاق قضا کے سوا کچھ واجب نہیں۔ عبد الرزاق اور ابن منذر نے بطریق صحیح نافع سے انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ جس کو بیمار میں پے در پے دو رمضان گزر گئے اور اس کے بیچ میں تندرست نہیں ہوا تو دوسرے رمضان کی تو قضا واجب ہے اور پہلے رمضان کا کفارہ طحاوی نے کہا ہے کہ یہ قول ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سواء اور کسی کا نہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ عبد الرزاق نے ابن جریج سے ابن جریج نے یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے یحییٰ فرماتے ہیں مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے لیکن عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور قول اس کے خلاف ہے۔ قضا کے ساتھ کفارہ واجب ہونے کی دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہوا اور اس نے روزے رکھے پھر تندرست ہو گیا اور روزے نہیں رکھے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اس رمضان موجودہ کے روزے رکھے اور اس کے بعد پہلے رمضان کے رکھے اور ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا دے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے لیکن یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ اس کی سند میں ابراہیم بن نافع راوی ہے اور ابو حاتم نے اس کی نسبت لفظ کان یکذب (جھوٹ بولتا تھا) کہا ہے اور ایک راوی عمر بن موسیٰ ہے وہ جھوٹی حدیث بنالیا کرتا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ کفارہ کے وجوب میں کوئی حدیث مرفوع پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی البتہ آثار صحابہ سے کچھ اس کا ثبوت ہوتا ہے اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں علیؓ اور جابر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے بھی آثار وارد ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھے سوائے ابو ہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے آثار کے کسی اثر کی سند صحیح نہیں پہنچی اور اگر بالفرض کوئی حدیث مرفوع بھی اس بات میں ہوتی تو اس وقت بھی اس سے استدلال نہ ہو سکتا کیونکہ زیادتی کتاب اللہ پر لازم آتی ہے اور خبر واحد سے زیادتی جائز نہیں۔

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ (اور ان لوگوں پر جن کو طاقت ہے فدیہ ہے)

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تاویل اور حکم میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اکثر علماء تو یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ ابن عمر اور سلمۃ بن اکوع رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی مذہب ہے۔ شان نزول اس کی یہ ہوئی کہ ابتداء اسلام میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اختیار دیا تھا کہ اگر ہمت ہو تو روزے رکھیں ورنہ افطار کر لیں اور فدیہ دیں اور یہ اس واسطے تھا کہ لوگوں کو روزہ رکھنے کی عادت نہ تھی۔ اگر ابتداً روزے ہی کا حکم ہو جاتا تو شاق ہوتا پھر اس کے بعد یہ اختیار منسوخ ہو گیا اور فمن شهد منكم الشهر الخ سے روزے ہی کا حکم قطعی ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر مریض اور مسافر کو تین باتوں کا اختیار ہو گا۔ روزہ، افطار بہ نیت قضاء فدیہ۔ پھر جب فدیہ منسوخ ہو گیا تو روزہ رکھنے اور قضا میں اختیار ہو گیا۔ اور قتادہؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص بہت بوڑھا ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت تو

marfat.com

ہو لیکن اس کو روزہ رکھنا بوجہ بڑھاپے کے شاق ہو تو اس کو اس آیت کی وجہ سے اول روزہ افطار کرنے اور فدیہ دینے کی اجازت تھی پھر یہ اجازت منسوخ ہو گئی اور حسن فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس مریض کے بارے میں ہے کہ جو روزہ کی طاقت رکھتا ہو اس کو اختیار ہے یا تو روزہ رکھے اور یا افطار کرے اور فدیہ دے پھر یہ اختیار منسوخ ہو گیا۔ ان سب اقوال کے موافق قرآن کریم سے ایسے بوڑھے کا حال معلوم نہ ہوا جو بسبب ضعف کے روزہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی واسطے امام مالک فرماتے ہیں اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول یہی ہے کہ شیخ فانی کو افطار کرنا جائز ہے کیونکہ وہ عاجز ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو اس کے وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور اس پر فدیہ واجب نہیں کیونکہ فدیہ کے واجب ہونے کے لئے کوئی دلیل چاہئے کیونکہ فدیہ روزہ کا مثل غیر معقول ہے اور مثل غیر معقول رائے اور عقل سے ثابت نہیں ہوتی۔ اور ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اور معنی اس کے یہ ہیں کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی جوانی میں طاقت رکھتے ہیں اور پھر بعد بڑھاپے کے عاجز ہو گئے ان پر بجائے روزے کے فدیہ واجب ہے لیکن نظم کلام اس تاویل سے انکار کر رہی ہے۔ شیخ اجل جلال الدین اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یطیقون پر ایک لا مقدر ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے ان کے ذمہ پر فدیہ ہے جیسے آیت یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا میں اَنْ تَضِلُّوْا پر لا مقدر مانا گیا ہے۔ **میں** کہتا ہوں کہ لا کا مقدر ماننا بھی بعید ہے کیونکہ ظاہر عبارت کی بالکل ضد ہے پہلے ایجاب مفہوم ہوتا تھا اور اس تقدیر پر سلب سمجھا جائے گا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ امام ابو حنیفہ اور احمد اور شافعی اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کا مذہب یہ ہے کہ شیخ فانی پر بجائے روزے کے فدیہ واجب ہے اور مبنی ان مذاہب کا اس آیت کے سوا اور کچھ نہیں اور اس آیت کی اگر یہ تاویل بعید نہ کی جائے تو شیخ فانی پر اور اس مریض پر جس کی صحت یابی کی امید نہیں کس دلیل سے فدیہ واجب ہو گا۔ تو **میں** کہتا ہوں کہ عمدہ اور سالم تاویل اول ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں قوی لوگوں کو روزہ اور فدیہ میں اختیار دیا گیا تھا اور جو لوگ طاقت نہ رکھتے تھے وہ تو دلالت النص سے بطریق اولیٰ مختار تھے کیونکہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قوت والوں کو اپنے فضل سے ان کی آسانی وسہولت کے لئے اختیار دیدیا تو جو کمزور اور ضعیف تھے وہ تو اس رخصت کے پہلے سے بھی مستحق تھے اور اسی بناء پر ہم نے اول ذکر کیا ہے کہ مریض اور مسافر کو تین باتوں کا اختیار دیا گیا تھا پھر جب آیت فَمَنْ شَہِدَ مِنْکُمُ الشَّہْرَ نازل ہوئی تو جو لوگ روزہ کی قوت رکھتے تھے ان کے حق میں فی الفور اور جو لوگ اب بسبب کسی عذر کے روزہ نہیں رکھ سکتے تھے جیسے وہ مریض اور مسافر کہ بعد سفر یا مرض ختم ہونے کے قضا رکھ سکتے ہیں ان کے حق میں مال کار حکم فدیہ کا منسوخ ہو گیا اور جو لوگ نہ اب روزہ رکھ سکتے ہیں اور نہ آئندہ کو بسبب بڑھاپے یا بیماری کے رکھنے کی توقع ہے ان کے لئے فدیہ کے جائز ہونے کا حکم بدلالت النص اسی طرح رہا جیسا کہ تھا کیونکہ وہ فَمَنْ شهد منكم الشهر (جو تم میں سے ماہ رمضان میں حاضر ہو) میں داخل ہی نہیں ہوئے کیونکہ من شہد سے مراد تندرست مقیم ہے اور فمن كان منكم مريضا میں مریض سے مراد وہ مریض ہے جو شفا کی توقع رکھتا ہو کیونکہ جو ایسا بیمار ہے کہ اچھے ہونے کی امید نہیں ہے اس کو قضا کی تکلیف دینا۔ تکلیف مالا یطاق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو حکم عبارت النص سے ثابت ہو چکا ہے اس کا منسوخ ہونا اس حکم کے منسوخ ہونے کو مقتضی نہیں جو دلالت النص سے ثابت ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

طَعَامُ مِسْکِیْنٍ (ایک محتاج کا کھانا کھلانا ہے) نافع اور ابن ذکوان نے فدیۃ طعام مسکین میں فدیہ کو طعام کی طرف مضاف کر کے اور مسکین کو مساکین بصیغۂ جمع پڑھا ہے اور ھشام نے فدیۃ کو تنوین سے اور طعام کو مرفوع فدیۃ سے بدل قرار دے کر اور مسکین کو صیغۂ جمع سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے فدیۃ کو تنوین اور طعام کو رفع اور مسکین کو صیغۂ واحد سے پڑھا ہے۔

فدیۃ بدلہ کو کہتے ہیں اور فدیۃ کی اضافت طعام کی طرف بیانیہ ہے اور فدیۃ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے موافق صدقۂ فطر کی طرح گندم کا نصف صاع اور جو یا کھجور کا پورا صاع ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو غلہ اس شہر میں اکثر کھایا جاتا ہے اس کا ایک مد ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو دے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو کا نصف

marfat.com

صاع اور گیہوں کا ایک مد واجب ہے اور بعض فقہاء کا قول ہے کہ جو غذا اس روز کھائے وہ دے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر مسکین کو رات اور سحری کا کھانا دیدے اور طعام فدیہ کی تحقیق انشاء اللہ آیت ومن کان منکم مریضا او بہ اذی الخ کی تفسیر میں عنقریب آئے گی۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (پھر جو اپنی خوشی سے نیکی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے اور یہ صورت کہ تم روزہ رکھو تمہارے واسطے بہتر ہے) فمن تطوع خیرا (جو اپنی خوشی سے نیکی کرے) یعنی فدیہ میں قدر واجب سے زیادتی کرے فھو خیرلہ (تو وہ اس کے لئے بہتر ہے) یعنی یہ زیادتی تنہا فدیہ سے بہتر ہے وان تصوموا میں روزہ کی قوت اور طاقت رکھنے والے مخاطب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے روزہ کی طاقت رکھنے والو روزہ رکھنا فدیہ سے بہتر ہے اس سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ وعلی الذین یطیقونہ میں روزہ کی قوت رکھنے والے مراد ہیں اور جن کو قوت نہیں جیسے بوڑھے اور بیمار وہ مراد نہیں کیونکہ جن کو طاقت نہیں ان کے لئے روزہ رکھنا بہتر نہیں بلکہ روزہ کا نہ رکھنا بہتر ہے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسافر کو روزہ سے زیادہ تکلیف نہ ہو تو اس کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے لیکن امام احمد اور اوزاعی اور سعید بن میسب رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ روزہ رکھنا افضل نہیں ان کی دلیل ذیل کی چند احادیث ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ ﷺ سفر میں تھے کہ ایک اژدحام دیکھا جس کے اندر ایک شخص پر لوگ جھکے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا یہ کیا قصہ ہے لوگوں نے عرض کیا کہ یہ شخص روزہ دار ہے۔ فرمایا سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کی بات نہیں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ ﷺ رمضان میں مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی روزہ رکھا جب کراع غمیم پر پہنچے تو ایک پیالہ پانی منگایا اور اس کو اونچا کر کے سب کو دکھایا پھر سب کے سامنے نوش فرمایا۔ لوگوں نے اس قصہ کے بعد عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہے فرمایا یہ لوگ نافرمان ہیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سفر میں رمضان کا روزہ رکھنے والا ایسا ہے جیسے حضر میں افطار کرنے والا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

ہماری طرف سے ان احادیث کا یہ جواب ہے کہ احادیث اس شخص کے حق میں ہیں جس کو روزہ سے بہت تکلیف ہو اور اس کے حق میں افطار کرنا افضل ہے خواہ وہ مسافر ہو یا مریض اور اسی طرح جب جہاد میں جائے تو افطار کرنا افضل ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو تم دشمن کے قریب آگئے ہو اب تمہارے لئے افطار کرنا موجب قوت ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ افطار کی اجازت رخصت تھی اس لئے ہم میں سے بعض نے تو روزہ رکھا اور بعض نے افطار کیا پھر جب ایک اور منزل میں ہم اترے تو آپ نے فرمایا کہ اے لوگو صبح کو دشمن کا سامنا ہے افطار کرنا تمہارے واسطے موجب قوت ہے، سب نے افطار کیا اور یہ افطار کرنا عزیمت ہوا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ نیز امام مالک نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہ سے موطا میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور امام شافعی نے ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مسند میں اور ابوداؤد اور حاکم اور ابن عبدالبر نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اگر روزہ رکھنے سے تکلیف نہ ہو تو اس آیت کی وجہ سے روزہ رکھنا افضل ہے۔ چنانچہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھا اور گرمی کی اس قدر شدت تھی کہ تپش سے بچنے کے لئے ہم سر پر ہاتھ رکھ لیتے تھے اور ہم میں سوائے رسول اللہ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ کے کوئی روزہ دار نہ تھا۔

میں کہتا ہوں کہ سب تفصیل مسافر کے حق میں ہے کیونکہ اس کے لئے رخصت کا مدار محض سفر پر ہے خواہ اس کو روزہ رکھنے میں مشقت ہو یا نہ ہو رہے۔ شیخ اور مریض اور ضعیف اور حاملہ اور مرضعہ تو ان کے حق میں رخصت کا مبنی خود مشقت

marfat.com

اور روزہ سے تکلیف ہوتا ہے اگر روزہ سے ان کو تکلیف نہ ہوتی ہو تو رخصت بھی نہیں اور جب روزہ سے تکلیف ہوتی ہو اور وہ تکلیف یہی ہے کہ یا تو مرض کے بڑھنے کا خوف ہو اور یا نیا مرض پیدا ہونے کا ڈر ہو اس وقت ان کا حکم بھی ایسا ہے جیسے سفر کی وجہ سے مشقت ہونے کا۔ واللہ اعلم۔

کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ (اور اگر تم سمجھو) جواب ان محذوف ہے مطلب یہ ہے۔ کہ اگر تم روزہ کی فضیلت کو جانتے تو اس کو افطار اور فدیہ پر اختیار دینے کے باوجود ترجیح دیتے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اب چونکہ یہ فدیہ کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اس لئے اب اگر کوئی بلا عذر رمضان میں روزہ نہ رکھے اور اس کو حلال سمجھتا ہو تو کافر ہے اور اگر حلال نہیں جانتا تو فاسق ہے اور قضا اس پر واجب ہے۔ کیونکہ تدارک بقدر امکان ضروری ہے نیز جب معذور کو قضا کا حکم ہے تو جو بلا عذر رمضان میں روزے نہ رکھے اس کے لئے تو بطریق اولیٰ قضا کا حکم ہوگا اور استغفار بھی اس پر بالا جماع لازم و واجب ہے۔ امام نخعی فرماتے ہیں کہ اگر بلا عذر رمضان میں روزے نہ رکھے تو ہزار برس تک اگر روزے رکھے تب بھی تدارک نہ ہوگا اور علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تمام عمر اگر روزے رکھے جب بھی تلافی نہ ہوگی۔

شَهْرُ رَمَضَانَ (رمضان کا مہینہ) یہ یا تو مبتدا ہے اور خبر اس کے بعد ہے اور یا مبتدا محذوف ذلک کی خبر ہے اور صورت اخیر میں معنی یہ ہوں گے یہ مہینہ رمضان کا ہے۔ اور یا بدل ہے الصیام سے جو صدر رکوع میں مذکور ہے بحذف مضاف۔ اس تقدیر پر معنی یہ ہوں گے مقرر کئے گئے تم پر روزے ماہ رمضان کے اور یہ ترکیب جب ہوگی جس وقت یہ آیت یاایھا الذین اٰمنوا کتب عَلَیْکُمُ الصّیام کے ساتھ نازل ہوئی اور اگر اس سے ایک مدت کے بعد نازل ہوئی ہو اور اس کی ناسخ ہو تو اس وقت یہ ترکیب نہ ہوگی لفظ شہر۔ شہرت سے مشتق ہے اور رمضان، رمض بمعنی احترق (جل گیا) سے مشتق ہے۔ پھر اس کی طرف شہر مضاف کر کے ایک خاص مہینے کا علم بنا دیا گیا۔ علمیت اور الف و نون زائدہ کی وجہ سے لفظ رمضان غیر منصرف ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ رمضان کو رمضان اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کو رمض کر دیتا ہے یعنی جلا دیتا ہے اس حدیث کو اصفہانی نے ترغیب میں روایت کیا ہے۔

الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (ایسا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) قرآن کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ قرء کے معنی لغت میں جمع کرنے کے ہیں چونکہ قرآن پاک میں بھی سورتیں اور آیتیں اور حروف اور قصے اور امر و نہی اور وعدہ و وعید جمع کئے گئے ہیں اس لئے اس کا نام بھی قرآن رکھ دیا اور یا قراءت سے اس کو مشتق مانا جائے اس وقت قرآن بمعنی مقروء (پڑھا گیا) ہوگا۔ ابن کثیر نے القرآن، قرانا، قرانه کو جہاں کہیں واقع ہوں ہمزہ کو حذف کر کے اور اس کی حرکت را کو دے کر پڑھا ہے اور حمزہ نے حالت وقف میں ابن کثیر کا اتباع کیا ہے اور ان کے سوا دیگر قراء نے ہمزہ سے پڑھا ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ شافعی لفظ قرآن کو بغیر ہمزہ کے پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ لفظ قرات سے مشتق نہیں بلکہ کتاب اللہ کا نام ہے جیسے توراۃ و انجیل نام ہیں۔ علامہ بغویؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مقسم فرماتے ہیں کہ کسی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد موقعوں میں قرآن شریف کے نزول کا حال مختلف طور سے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک رمضان میں نازل ہوا ہے اور دوسری جگہ فرماتے ہیں ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے اور ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ ہم نے اس قرآن کو برکت والی رات میں اتارا ہے۔ حالانکہ تمام مہینوں میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے قرآنا فرقناہ یعنی قرآن کو ہم نے متفرق طور سے نازل کیا ہے۔ یہ کیا بات ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن سب کا سب لوح محفوظ سے رمضان کے مہینہ کی لیلۃ القدر میں آسمان دنیا کے بیت العزت میں نازل ہوا، پھر جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس تھوڑا تھوڑا بیس برس میں بتدریج لائے۔ آیۃ کریمہ بمواقع النجوم کے بھی یہی معنی ہیں اور داؤد بن ابی ہند فرماتے ہیں کہ میں نے شعبی سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن ماہ رمضان میں اتارا گیا ہے کیا تمام سال میں نہیں نازل ہوا۔ فرمایا کیوں نہیں تمام سال ہی میں نازل ہوا ہے۔ رمضان میں نازل ہونے کو اس لئے فرمایا

marfat.com

کہ جس قدر نازل ہو چکتا تھا اس مہینے میں جبرئیل علیہ السلام اسکا دور کرتے تھے۔ پس جس مقدار کو اللہ تعالیٰ چاہتے تھے محکم اور ثابت رکھتے تھے اور جتنا چاہتے تھے بھلا دیتے تھے اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کو اور ایک روایت کے موافق یکم رمضان کو نازل ہوئے اور تورات موسیٰ پر ۶ ر رمضان کو نازل ہوئی اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر ۱۳ ار مضان کو نازل ہوئی اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر ۱۸ ر رمضان کو نازل ہوئی اور قرآن پاک محمد ﷺ پر رمضان کی اخیر چھ راتوں میں نازل ہوا۔

امام احمد اور طبرانی نے واثلہ بن الاسقع سے روایت کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی اول رات میں نازل ہوئے اور تورات ۶ رمضان کو نازل ہوئی اور انجیل ۱۳ ار مضان کو نازل ہوئی، واللہ اعلم۔ شہر رمضان اگر مبتدا ہو توالذی اپنے صلہ سے مل کر اس کی خبر ہو گا اور اگر مبتدا محذوف کی خبر ہو یا بدل ہو تو موصول صلہ سے مل کر شہر رمضان کی صفت قرار دیا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مبتدا کی صفت ہو اور خبر فمن شھد ہو اور مبتدا چونکہ معنی شرط کو متضمن ہے اس لئے خبر پر فالائے اور اس تقدیر پر انزل فیہ القران کے معنی یہ ہوں گے کہ ماہ رمضان جس کی شان میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔ قرآن سے مراد آیت کتب علیکم الصیام (فرض کئے گئے تم پر روزے) ہو گی اور یہ اس لئے تفسیر کی گئی تاکہ قرآن کے نازل ہونے کو روزے کے واجب ہونے سے کچھ خصوصیت حاصل ہو (کیونکہ اگر یہی معنی رکھے جائیں جو اول لکھے گئے ہیں تو اس مبتدا کی خبر یعنی فمن شھد جس سے وجوب صوم مستفاد ہوتا ہے اس کو نزول قرآن سے کچھ تعلق نہ ہو گا)۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت اور امتیاز حق وباطل کے صاف صاف حکم ہیں) یعنی قرآن اپنے اعجاز سے گمراہی سے نکالتا ہے اور قرآن میں ایسی آیات واضح ہیں کہ وہ حلال، حرام اور حدود اور احکام کی طرف راہ دکھاتی ہیں اور حق جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور باطل جو شیاطین انس و جن کی جانب سے ہے دونوں میں فصل اور فرق کرتی ہیں اور ھدی اور الفرقان دونوں القرآن سے حال ہیں۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ (سو جو شخص تم میں سے یہ مہینہ پائے) مطلب یہ ہے کہ جو تم میں سے مہینہ رمضان کا پائے اور تندرست اور مقیم ہو اور حیض و نفاس سے پاک وصاف ہو وہ روزے رکھے۔ تندرست اور مقیم کو تو ہم نے اس لئے استثناء کیا ہے کہ اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مریض اور مسافر کو افطار کی اجازت ہے اور حیض و نفاس سے پاک ہونے کی شرط احادیث مشہورہ سے لگائی گئی اور نیز اس پر اجماع بھی منعقد ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ عورتوں کے دین میں کیا کمی ہے۔ آپ نے فرمایا دیکھتی نہیں ہو کہ جب حیض آتا ہے تو روزہ نماز کچھ نہیں کر سکتیں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

فائدہ: سب علماء نے اجماع کیا ہے کہ حیض والی عورت پر روزہ حرام ہے اور اگر رکھ لے تو صحیح نہیں اور قضا لازم ہے، اللہ اعلم۔

فَلْيَصُمْهُ (تو ضرور اس کے روزے رکھے) یعنی روزہ رکھنا چاہئے۔ جیسے شروع اسلام میں فدیہ کافی تھا۔ اب کافی نہیں۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مقیم ہو اور رمضان کا مہینہ آجائے پھر اس نے سفر کیا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا اس کو افطار کرنا جائز ہے یا نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تو یہ منقول ہے کہ افطار جائز نہیں۔ اور عبیدہ سلمانی کا بھی یہی قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَمَنْ شھد منکم الشھر فلیصمہ یعنی جو تم میں رمضان کا مہینہ پائے اور وہ تندرست اور مقیم ہو تو روزہ رکھے یعنی تمام ماہ کے روزے رکھے اور اکثر صحابہؓ اور فقہاء یہ کہتے ہیں کہ جب ماہ رمضان میں سفر کرے تو اس روز تو افطار جائز نہیں اس کے بعد افطار جائز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی پر اجماع منعقد ہے۔ اور اس صورت میں فلیصمہ کے معنی یہ ہیں کہ جتنے دن پائے روزہ رکھے اگر تمام مہینہ پائے تمام مہینے روزہ رکھے۔ اور کچھ دن پائے تو اس میں روزہ

marfat.com

رکھے۔ اس تفسیر کی تائید حضرت جابر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی یہ حدیث کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ تشریف لے گئے اور رمضان کے دن تھے اور آپ نے روزہ رکھا جب آپ کدید پہنچے تو روزہ افطار کیا اور لوگوں نے بھی افطار کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم جناب رسول اللہ ﷺ کے پچھلے سے پچھلے فعل و قول پر عمل کیا کرتے تھے۔

مسئلہ :- اگر کوئی شخص اول دن میں مقیم ہو اور پھر سفر کرے تو اس کو اس دن امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ اور شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس آیت کی وجہ سے افطار جائز نہیں کیونکہ اس نے اول دن کو تو پالیا اس لئے روزہ رکھنا چاہئے اور امام احمد اور داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ اس دن بھی افطار جائز ہے اور دلیل اس کی علامہ ابن جوزی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گزشتہ حدیث کو (کہ جس میں یہ ہے کہ جب جناب سرور کائنات ﷺ کراع غمیم میں پہنچے تو آپ نے افطار کیا) لائے ہیں اور نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں سفر کیا جب آپ عسفان میں پہنچے تو ایک پیالہ پانی منگایا تاکہ سب کو دکھادیں اور پیا، پھر سفر سے واپسی تک آپ برابر ناغہ فرماتے رہے (ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی اول دن میں مقیم اور روزہ دار ہو اور پھر اسی دن سفر کرے تو افطار جائز ہے)

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ان دونوں قصوں میں جناب رسول اللہ ﷺ اس روز شروع دن میں مقیم نہ تھے کیونکہ موضع کراع غمیم اور عسفان مدینہ کی اول ہی منزل میں واقع تھے۔ مسئلہ : اگر مریض یا مسافر نے حالت مرض یا سفر میں روزہ رکھ لیا اور پھر افطار کا ارادہ کیا تو امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ صاحب منہاج نے کہا ہے کہ شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کو افطار اس وقت جائز ہے کہ جب روزہ کی نیت نہ کی ہو اور اگر رات ہی میں نیت کر چکا ہے اور صبح اس حالت میں کی ہے کہ قبل از فجر اپنے ارادہ کو اس نے توڑا نہیں تو وہ روزہ دار ہے اس کو اس دن افطار جائز نہیں لیکن اس پر بھی اگر افطار کیا تو کفارہ نہیں جیسا گزشتہ مسئلہ میں کفارہ نہیں اور کراع غمیم والی حدیث اس مسئلہ میں امام احمد اور شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے لئے حجت ہے۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو لازم ہے گنتی دوسرے دنوں سے) اس حکم کو مکرر اس لئے بیان فرمایا کہ یہ معلوم ہو کہ فدیہ منسوخ ہے اور معذور کے لئے افطار اور قضا کرنا منسوخ نہیں اور اگر فدیہ کا حکم منسوخ نہ ہوتا اور ایاماً معدودات سے مراد صرف رمضان ہی کا مہینہ ہوتا تو البتہ مریض اور مسافر کے حکم کو مکرر بیان فرمانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

فائدہ : قضا واجب ہونے کے حکم میں حائضہ اور نفساء بھی اجماع اور احادیث کی رو سے مریض اور مسافر کی طرح ہیں۔ چنانچہ معاذہ عدویہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ حیض والی عورت روزہ کی تو قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا نہیں کرتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ زمانۂ نبوی میں ہم کو حیض آتا تھا تو ہم کو روزہ ہی کی قضا کا حکم تھا اور نماز کی قضا کا حکم نہ تھا۔

مسئلہ :- اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسافر جب مقیم ہو اور مریض جب تندرست ہو تو بعد رمضان جتنے دنوں تک مریض تندرست رہا اور مسافر مقیم رہا ان دنوں کی قضا لازم ہے۔ مثلاً کسی کے مرض یا سفر کی وجہ سے دس روزے فوت ہوئے اور بعد رمضان کے وہ دو دن تندرست یا مقیم رہا تو صرف ان ہی دو دن کی قضا لازم ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ جس نے رمضان کے سوا اور دن پائے اور روزے قضا نہ کئے اور مر گیا تو آیا وارث پر فدیہ یا قضا واجب ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ اور مالک رحمتہ اللہ علیہم تو فرماتے ہیں کہ وارث پر کچھ لازم نہیں لیکن ہاں اگر میت فدیہ کی وصیت کر مرے تو تہائی مال سے وصیت کو جاری کرنا واجب ہے اور تہائی سے زیادہ میں بغیر وارثوں کی رضا کے تصرف کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کے ذمہ نذر کیا کفارہ کے روزے ہوں وہ اگر وصیت کر مرے تو تہائی ترکہ میں وصیت جاری ہو سکتی ہے۔ امام شافعیؒ کا قدیمی قول تو یہ ہے کہ خواہ رمضان کے روزے ہوں یا نذر وغیرہ کے ہوں میت کی طرف سے ولی روزے رکھے اور جدید اور آخری قول یہ ہے کہ اس کی

marfat.com

طرف سے اس کا ولی کھانا کھلائے اور امام احمدؒ رمضان کے روزوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کھانا کھلایا جائے اور روزے رکھنا کافی نہیں اور اگر روزے نذر کے ہوں تو ولی روزے رکھ دے۔ ولی کے ذمہ روزے واجب ہونے پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث پیش کرتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک عورت جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میری ماں مر گئی ہے اور اس کے ذمہ ایک مہینے کے روزے ہیں اب میں اس کی طرف سے روزے رکھ دوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بھلا اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہو تو تو ادا نہ کرے گی۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ کیوں نہیں ضرور ادا کروں گی۔ فرمایا پھر اللہ کا فرض تو اور زیادہ ادا کے قابل ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت سراپا برکت میں آئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میری ماں کے ذمہ ایک ماہ کے روزے ہیں اگر میں روزے رکھوں تو کیا اس کی طرف سے ادا ہو جائیں گے۔ فرمایا ہاں۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک عورت نے دریا کا سفر کیا اور یہ نذر کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس سے نجات دیدی تو میں ایک مہینے کے روزے رکھوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو نجات دیدی۔ اس نے وہ روزے نہ رکھے حتیٰ کہ وہ مر گئی۔ اس کی کسی رشتہ دار عورت نے یہ قصہ فخر عالم ﷺ کی خدمت بابرکت میں ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تو اس کی طرف سے روزے رکھ دے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میری ماں کے ذمے ایک نذر تھی اور وہ بغیر کئے مر گئی۔ آپ نے فرمایا تو اس کی طرف سے ادا کر دے۔ ان احادیث میں سے بعض میں نذر کا صریح ذکر ہے اور بعض مطلق ہیں ان میں نذر کا ذکر نہیں۔ اب امام احمدؒ نے تو فرمایا ہے کہ نذر کی صورت میں ولی پر روزہ واجب ہے اور جس حدیث میں نذر کا ذکر نہیں اس کو بھی صوم نذر ہی پر محمول کریں گے۔

میں کہتا ہوں کہ جب الفاظ حدیث کے مطلق ہیں اور نذر کی اس میں قید نہیں پائی جاتی تو اس کو نذر پر حمل کرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ یہ احادیث صحیح جو مذکور ہوئیں ہیں، یہ تو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ولی کو میت کی طرف سے مطلقاً روزہ رکھنا جائز ہے خواہ وہ روزہ نذر کا ہو یا رمضان کا اور کوئی حدیث ان میں سے اس پر دلالت نہیں کرتی کہ وارث پر روزہ واجب ہے، اس لئے یہ احادیث امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو کچھ مضر نہیں اور خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تزر وازرۃ وزر اخری (یعنی کوئی نفس دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا) اور اس صورت میں اس آیت کے خلاف لازم آتا ہے کیونکہ اگر میت کی طرف سے وارث روزہ نہ رکھے تو واجب کا ترک ہوا اور واجب کے ترک میں عقاب ہوتا ہے۔ تو دوسرے کے فعل سے اس کا ماخوذ ہونا لازم آتا ہے اور جو لوگ میت کی طرف سے کھانا کھلانے کو فرماتے ہیں ان کی دلیل ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ ایک ماہ کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ ہم اس حدیث کی سند سوائے اس سند کے کہ جس میں اشعث بن سوار راوی ہے اور کوئی نہیں جانتے اور اشعث بن سوار کچھ نہیں اور اس میں محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلے بھی راوی ہے وہ بھی ضعیف اور مضطرب الحدیث ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے اور امام ابو حنیفہؒ ولی کے روزے رکھنے اور کھانا کھلانے کو جو ناکافی سمجھتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ طاعت میں نیابت جاری نہیں ہوتی کیونکہ طاعت سے نیت اور امتثال حکم خداوندی مقصود ہے اور یہ نیت اور امتثال ہی ثواب اور عقاب کا مدار ہے اور وارث پر روزہ یا مال واجب ہونے کو حق تعالیٰ کا قول ولا تزر وازرۃ وزر اخری صاف منع کر رہا ہے، اس لئے وارث پر کچھ واجب نہیں۔ ہاں اگر میت وصیت کرے تو اس کی وصیت کو پورا کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین یعنی میراث بعد وصیت یا قرض کے ہے کہ میت وصیت کرے اور اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ روزے کے عوض اس کو قبول فرمالیں واللہ اعلم۔

marfat.com

میں کہتا ہوں کہ تحقیق مقام یہ ہے اگر وارث میت کی طرف سے بطور تبرع واحسان روزہ رکھ دے یا صدقہ دیدے تو حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو قبول فرمالیں گے اور میت کو خلاصی بخشیں گے۔ لیکن یہ وارث کے ذمہ واجب نہیں جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ چنانچہ بزاز نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ اگر چاہے تو ولی میت کی طرف سے روزہ رکھ دے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے ذمہ واجب نہیں لیکن اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ یہ ابن لھیعہ کے طریق سے مروی ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تم پر آسانی کرنی اور نہیں چاہتا ہے سختی) یعنی اللہ تعالیٰ تم پر سہولت کا ارادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی واسطے مرض اور سفر میں فطر اور قضا کو مباح فرمایا۔ ابو جعفر نے العسر اور السر کو بضم سین پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کو ساکن کر کے پڑھا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مریض اور مسافر کے لئے افطار کرنا بوجہ سہولت کے رخصت ہے، عزیمت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر مریض اور مسافر روزہ رکھ لیں تو سب کے نزدیک صحیح ہے لیکن ابن عباس وابو ہریرہ وعروہ بن الزبیر وعلی بن الحسین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ سفر میں روزہ جائز نہیں اور اگر کوئی روزہ رکھ لے تو اس پر قضا واجب ہے۔ اس قول کی دلیل آیت فعدۃ من ایام اخر (اس پر گنتی ہے اور دنوں سے) ہے اس لئے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے اور دنوں میں ہی روزہ رکھنے کو مشروع فرمایا ہے اگر رمضان میں رکھ لیا تو گویا قبل از وجوب رکھا۔ اس لئے جائز نہ ہوگا۔

ہم کہتے ہیں کہ سبب وجوب ماہ رمضان ہے اور سفر وجوب ادا کو مانع ہے نفس وجوب کو مانع نہیں، اس لئے اگر رمضان میں مسافر نے روزہ رکھا تو وجوب کے بعد ہی رکھا اس لئے صحیح ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے سال گزرنے سے پیشتر زکوٰۃ ادا کر دی اور جمہور کے مذہب کی تائید ابو سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث کرتی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رمضان کی ۱۶ تاریخ کو غزوہ میں گئے، بعض نے تو ہم میں سے روزہ رکھا اور بعض نے افطار کیا تو جو روزہ دار تھے انہوں نے روزہ رکھنے والوں کو عیب اور طعنہ نہیں دیا اور نہ روزہ نہ رکھنے والوں نے روزہ داروں کو کچھ کہا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور اس مضمون کی حدیث جابر رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث تو مسلم میں ہے اور انس رضی اللہ عنہ کی موطا میں۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (اور تاکہ تم گنتی پوری کرو) العدۃ میں الف ولام مضاف الیہ کے عوض ہے۔ تقدیر عبارت کی یہ ہے عدہ شہر رمضان بقضاء ماافطر منہ یعنی تاکہ ماہ رمضان کی شمار افطار کئے ہوئے روزوں کو قضا کر کے پوری کرلو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے اس لئے بغیر چاند دیکھے روزہ نہ رکھو اور نہ بغیر دیکھے افطار کرو اور اگر انتیس کو چاند نہ دکھائی دے تو پورے تیس دن کرلو۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابو بکر نے ولتکملوا کو تشدید میم سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے تخفیف سے پڑھا ہے ولتکملوا العدۃ کا مع اپنے معطوف و لتکبر و الخ کے الیسر پر عطف ہے یا تو اس وجہ سے کہ الیسر باعتبار معنی کے ماقبل کی علت ہے۔ اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ ہم نے یہ احکام یعنی مریض اور مسافر کے لئے افطار کو مباح کرنا اور مرض کے ایام کی قدر قضا واجب کرنا اس لئے مشروع کر دیئے تاکہ تم پر سہولت ہو اور تاکہ تم ماہ رمضان کے دنوں کی گنتی افطار (کئے ہوئے روزوں کو قضا کر کے پوری کرلو الخ یا لتکملوا کے لام کو تاکید کے لئے زائد کیا جائے اور تکملوا کا بتقدیر ان الیسر پر عطف مانا جائے اور تکملوا کو یرید کا مفعول گردانا جائے۔ اس تقدیر پر یہ حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم پر سہولت کا (اور اس امر کا کہ تم ماہ رمضان کی گنتی قضا سے پوری کرلو اور اس بات کا کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اور اس کا شکر کرو) ارادہ کرتے ہیں۔

یا لتکملوا کو فعل محذوف کے متعلق کیا جائے اور اس فعل کا یرید اللہ الخ پر عطف کہا جائے۔ اس بنا پر یہ مطلب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سہولت کا ارادہ فرماتا ہے اور تم کو قضا کا حکم فرماتا ہے تاکہ تم ماہ رمضان کی شمار پوری کرلو۔

marfat.com

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اسباب پر کہ اس نے تم کو سیدھی راہ دکھائی) علیٰ ماھداکم میں مایا تو مصدریہ ہے یا موصولہ اگر مصدریہ ہو تو یہ معنی ہوں گے تاکہ تم اللہ کے ہدایت کرنے اور راہ بتانے پر اس کی بڑائی کرو اور اگر موصولہ ہو تو یہ حاصل ہوگا کہ تم اللہ کی بڑائی ان اشیاء پر کرو جن کی تم کو رہنمائی کی ہے اور جن کے ذریعہ سے تم اپنے پروردگار کی رضا حاصل کر سکتے ہو اور اپنے ذمہ کو فارغ کر سکتے ہو اور بہت بڑے ثواب کی دولت لے سکتے ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لتکبر واللہ الخ سے مراد عید الفطر کی رات کی تکبیرات ہے۔

امام شافعیؒ نے ابن مسیب اور عروۃ اور ابی سلمہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ لوگوں کی عادت تھی کہ عید الفطر کی رات میں تکبیرات پکار پکار کر پڑھتے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ خود عید الفطر کے دن کی تکبیرات مقصود ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ تکبیر سے مراد عید کی نماز ہو یا عید کی نماز کی تکبیرات ہوں۔ پس اس تقدیر پر اس آیت سے یہ مستنبط ہوا کہ تکبیرات عید کی واجب ہیں اور خود نماز بھی بالالتزام واجب ہے۔ کیونکہ صرف تکبیرات نماز سے باہر عید کی رات یا دن میں کسی کے نزدیک واجب نہیں، اس لئے ہم ان تکبیرات کو یا تو نماز عید کی تکبیرات پر محمول کریں گے اور یا جزو کا نام کل کو دینے کے طور پر خود نماز عید اس سے مراد لیں گے جیسے آیت وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ سے صبح کی نماز اسی طریق سے مراد ہے، واللہ اعلم اور چونکہ آیت کے اندر کئی احتمال ہیں اس لئے عید کی نماز فرض قرار نہیں دی گئی۔ رہا وجوب سو وہ جناب رسول اللہ ﷺ کے مداومت فرمانے سے سمجھا گیا۔ واللہ اعلم۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (اور تاکہ تم احسان مانو) یعنی تاکہ تم روزہ کے واجب ہونے پر شکر کرو، اس لئے کہ وہ درجات کے ملنے کا وسیلہ و ذریعہ ہے اور مریض اور مسافر کے لئے افطار کے مباح ہونے پر شکر کرو کیونکہ اس میں تمہارے لئے تخفیف اور رخصت ہے اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کا لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ پر عطف ہے۔

فصل ماہ رمضان اور اس کے روزوں کی فضیلت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو شیطان اور سرکش جن جکڑ دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، کوئی دروازہ اس کا کھولا نہیں جاتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اس کا کوئی دروزہ بند نہیں ہوتا اور منادی ندا دیتا ہے کہ اے بھلائی کے طالب اور اے برائی کے طالب بس کر آج جہنم سے اللہ کی طرف سے بہت سے نجات پانے والے ہیں۔ یہ ندا ہر رات ہوتی ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کو رمضان میں یاد کرنے والے کے لئے مغفرت ہوتی ہے اور دعا کرنے والا محروم نہیں رہتا اور مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص رمضان میں اخلاص سے اور ثواب کی امید کر کے روزے رکھے اس کے پچھلے گناہ بخشے جائیں گے اور جو لیلۃ القدر میں اخلاص اور ثواب کی امید سے قیام کرے اس کے بھی پچھلے گناہ بخشے جائیں گے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ۳۰ شعبان کو خطبہ پڑھا اور اس میں فرمایا اے لوگو! ایک بڑا عظیم الشان مہینہ آیا ہے یہ مہینہ بڑی برکت والا ہے اس مہینہ میں لیلۃ القدر ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزوں کو فرض فرمایا ہے اور اس کی رات میں قیام کرنے کو نفل فرمایا ہے جو شخص اس مہینے میں کوئی خیر کا کام کرے تو اس کا ایسا ثواب ہے جیسے اور مہینے میں فرض کا اور جو اس مہینے میں فرض ادا کرے اس کا ایسا ثواب ہے جیسے کسی نے ستر فرض ادا کئے۔ یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ مہینہ غم خواری کا ہے اور اس مہینے میں رزق بڑھتا ہے جو اس مہینے میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے اس کے گناہوں کی مغفرت اور ایک گردن آزاد کرنے کا ثواب ہوگا اور

marfat.com

اس کو مثل روزہ دار کے ثواب ہو گا اور اس کا ثواب بھی کم نہ ہو گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہر ایک کو تو اتنی مقدرت نہیں کہ روزہ افطار کرائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی ایک گھونٹ دودھ کا ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی کا پلائے گا اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر ثواب دیں گے اور جو روزہ دار کو شکم سیر کھانا کھلائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض کوثر سے ایسا گھونٹ پلائیں گے کہ جنت میں داخل ہونے تک پیاسا نہ ہو گا۔

اس مہینے کے شروع میں تو رحمت ہے اور درمیان میں مغفرت ہے اور آخر میں آگ سے خلاصی اس لئے تم کو اس ماہ میں چار خصلتوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ دو خصلتیں تو ایسی ہیں کہ ان سے تم اپنے پروردگار کو راضی کرو اور دو ان میں ایسی ہیں کہ ان سے تم کو لاپروائی نہیں ہو سکتی۔ پروردگار کے راضی کرنے کی دو خصلتیں یہ ہیں کہ اول تو گواہی اس بات کی دو کہ کوئی معبود سوائے اللہ کے نہیں اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہو۔ اور دو خصلتیں جن سے تم کو لاپروائی نہیں ہو سکتی ان میں سے اول تو یہ ہے کہ جنت کا سوال کرتے رہو اور دوسرے یہ کہ آگ سے پناہ مانگتے رہو۔ اس حدیث کو علامہ بغویؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کو ہر نیکی کا ثواب دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیوں تک ملتا ہے اور یہ سب ثواب روزہ کے سوا دوسرے اعمال خیر کا ہے۔ روزہ کی نسبت تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا ثواب دوں گا۔ وہ اپنا کھانا اور پینا اور شہوت میرے ہی لئے چھوڑتا ہے اور فرمایا روزہ دار کے لئے دو طرح کی خوشی ہے۔ ایک خوشی افطار کے وقت اور ایک خوشی پروردگار سے ملنے کے وقت۔ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔ سنو روزہ ڈھال ہے اس لئے روزہ دار کو چاہئے کہ جس دن روزہ رکھے تو بے ہودہ باتیں اور شور و شعب نہ کرے اور اگر کوئی اس کو برا کہے یا لڑے تو کہہ دے کہ بھائی میں روزہ دار ہوں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ روزہ اور قرآن یہ دونوں قیامت کے دن بندہ کی شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا کہ اے پروردگار میں نے اس کا کھانا اور خواہشیں دن کو روک دی تھیں، اب اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما۔ اور قرآن شریف کہے گا کہ اے اللہ میں نے رات کو اس کی نیند کھوئی تھی اس لئے میری سفارش قبول فرما اللہ تعالیٰ دونوں کی شفاعت قبول فرمالیں گے۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ رمضان کی آخری شب میں میری امت کی مغفرت کی جاتی ہے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ کیا وہ رات لیلۃ القدر ہے فرمایا نہیں لیلۃ القدر تو نہیں، لیکن قاعدہ ہے کہ جب کام کرنے والا اپنے کام سے فارغ ہوتا ہے تو اس کو مزدوری پوری دی جاتی ہے (ایسے ہی اس رات میں بندے مالک کے فرض سے ادا ہوتے ہیں اس لئے ان کو مغفرت ملتی ہے) اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے، واللہ اعلم۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ اور ابو الشیخ وغیرہم نے بطریق جریر بن عبد الحمید السجستانی سے اور انہوں نے صلت بن حکیم بن معاویۃ بن جبیر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ہمارا پروردگار کہاں ہے اگر قریب ہے تو اس سے چپکے چپکے دعا کریں اور دور ہے تو اس کو پکاریں حضور ﷺ نے سن کر سکوت فرمایا اس کے بعد ہی آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (اور جب پوچھیں آپ سے میرے بندے میری بابت (تو کہئے) میں پاس ہی ہوں) عبد الرزاقؒ نے حسنؒ سے روایت کی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ہمارا پروردگار کہاں ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔

میں کہتا ہوں کیا عجب ہے کہ سائل اعرابی ہو (اس صورت میں آیت سے ماقبل جو روایت لکھی گئی ہے اس سے موافقت ہو جائے گی) ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دعا میں کمی مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر آیت ادعونی استجب لکم (تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا) نازل فرمائی ہے

marfat.com

صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ کس وقت دعا کریں اس کے جواب میں واذا سألک عبادی الخ نازل ہوئی اور علامہ بغویؒ نے اس کا شان نزول یہ بیان فرمایا ہے کہ کلبیؒ نے ابو صالح سے اور ابو صالح نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ مدینہ کے یہود نے جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے محمد یہ تو بتاؤ کہ پروردگار ہماری دعا کس طرح سنتے ہیں۔ تم تو یہ کہتے ہو کہ آسمان کی ہم سے پانچ سو برس کی مسافت ہے اور ہر آسمان کا اتنا ہی دل ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

میں کہتا ہوں کہ سائل کو جو اللہ تعالیٰ نے لفظ عبادی (میرے بندے) کے معزز خلعت سے سرفراز فرمایا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائل یہودی کافر نہ ہوگا، واللہ اعلم۔ آیت نے پہلے شان نزول میں ہم نے ان الفاظ سے جو حدیث لکھی ہے کہ سائل نے پوچھا کہ یارسول اللہ ہمارا پروردگار کہاں ہے اگر قریب ہے تو اس سے مناجات کریں اور اگر دور ہے تو پکاریں اس کے جواب میں یہ آیت نازل فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ذکر خفی کو اختیار کرنا چاہئے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ خیبر پر تشریف لے گئے تو وہاں پہنچ کر بہت سے لوگ ایک وادی کی طرف جھک پڑے اور باآواز بلند تکبیر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَر کہنا شروع کیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگو اپنی جانوں پر نرمی کرو تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکارتے ہو تم تو ایسی ذات کو پکارتے ہو جو سمیع (بہت سننے والا) اور قریب (نزدیک) ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے مفسرین نے کہا ہے کہ انی قریب کے یہ معنی ہیں کہ علم کے اعتبار سے تمہارے قریب ہوں کوئی چیز مجھ پر پوشیدہ نہیں۔

بیضاویؒ نے کہا ہے کہ انی قریب بطور تشبیہ اور تمثیل کے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کو جو بندوں کے افعال و اقوال و احوال کا انکشاف تام ہے اس کو اس شخص کے حال سے کہ جو کسی شئے کے قریب ہو اور اس کا پورا حال معلوم ہو تشبیہ دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تاویل کرنے کی یہ وجہ ہے کہ قرب کو انہوں نے قرب مکانی میں منحصر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ مکان سے منزہ اور پاک ہے، اس لئے اس تاویل کی ضرورت ہوئی اور حق یہ ہے کہ اللہ سبحان کو ممکنات سے قرب واقعی ہے کہ اس قرب کا ادراک عقل سے ممکن نہیں بلکہ اس کا ادراک یا تو وحی سے ہوتا ہے اور یا فراست صحیحہ سے اور وہ قرب قرب مکانی کی جنس سے نہیں، نہ اس کو کسی مثال سے بیان کر سکتے ہیں، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ بے مثل اور بے نظیر ہیں تو ان کا قرب بھی ایسا ہی ہے۔ نہایت عرق ریزی کے بعد اگر اس کی کوئی مثال ہو سکتی ہے تو یہ ہے کہ اس کا قرب ایسا ہے جیسے کہ شعلۂ جوالہ کا قرب دائرۂ موہومہ سے کیونکہ شعلہ نہ تو اس دائرہ میں داخل ہے کیونکہ موجود حقیقی اور موجود وہمی میں بہت فرق ہے اور نہ وہ شعلہ اس سے خارج ہے اور نہ اس کا عین ہے اور نہ غیر ہے اور وہ دائرہ سے اتنا قریب ہے کہ وہ دائرہ اپنے سے اتنا قریب نہیں کیونکہ وہ دائرہ خود اس شعلہ ہی سے پیدا ہوا ہے اور اس دائرہ کا وجود خارج میں نہیں بلکہ خارج میں ایک نقطہ خارجیہ کے سبب سے اس کا وجود وہمی پیدا ہو گیا ہے، واللہ اعلم۔

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دعا جب مجھ سے دعا کرتا ہے) اہل مدینہ نے سوائے قالون اور ابو عمرو کے دعوة الداع اذا دعان میں الداع اور دعان کو وصل کی حالت میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور دیگر قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں حذف یاء سے پڑھا ہے اور جہاں کہیں اس قسم کی یا آئی ہے کہ لکھی نہیں جاتی اس میں قراء کا اختلاف ہے۔ بعض اس کو ثابت رکھتے ہیں اور بعض حذف کرتے ہیں اور یعقوب نے اس قسم کی یا کو سب جگہ وصل اور وقف کی حالت میں ثابت کیا ہے اور جو یا لکھنے میں آتی ہے وہ سب کے نزدیک وصل اور وقف دونوں صورتوں میں پڑھی جاتی ہے۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ

(تو چاہئے کہ وہ بھی میرا حکم مانیں) یعنی مجھ سے ہی اپنی دعا کی قبولیت طلب کریں۔ استجابة کو لام سے اس لئے متعدی کیا ہے کہ طلب اور دعا اللہ کی عبادت ہے اور بعض نے کہا ہے کہ فلیستجیبوالی کے یہ معنی ہیں کہ بندوں کو بھی چاہئے کہ جب میں ان کو طاعت کے لئے بلاؤں تو قبول کریں جیسا کہ میں ان کی دعائیں قبول کرتا ہوں۔

marfat.com

وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ (اور مجھ پر ایمان لائیں) بی کی یا کو ورش نے فتحہ سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے ساکن کر کے پڑھا ہے۔ یعنی ایمان پر قائم اور جمار ہنا چاہئے یہ معنی اس لئے بیان کئے گئے کہ اصل ایمان تو پہلے ہی سے لائے ہوئے تھے اب جو ایمان کا حکم ہوا ہے تو یہی مراد ہے کہ ایمان پر جمے رہو اور اولی یہ ہے کہ ایمان سے مراد ایمان حقیقی ہو جو بعد فناء نفس کے اس ایمان مجازی کے بعد حاصل ہوتا ہے کیونکہ تاسیس یعنی جدید معنی تاکید یعنی پہلے معنی کو مؤکد کرنے سے بہتر ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ (تاکہ وہ سیدھا راستہ پائیں) یا تو یہ معنی کہ گزشتہ خصال کے پابند رہو اور اللہ سے اپنی راہ یابی کی امید رکھو اور یا یہ معنی کہ خصال گزشتہ پر کاربند رہو تاکہ راہ پاؤ۔ رشد (راہ یابی) غی (گمراہی) کی ضد ہے۔ رشد سے مراد مقصود پر پہنچنا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کے قبول فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اور وعدہ خلافی ناجائز ہے حالانکہ بندہ بار بار دعا کرتا ہے اور قبول نہیں ہوتی۔ علامہ بغویؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ دعا کے معنی یہاں طاعت کے ہیں اور اجابت (قبول کرنا) کے معنی ثواب دینے کے ہیں۔ اس لئے کچھ اعتراض وارد نہیں ہوتا اور بعض نے کہا ہے کہ اس آیت کے معنی خاص ہیں اگرچہ الفاظ عام ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ میں دعا کرنے والے کی دعا اگر چاہوں تو قبول کرتا ہوں اور اس کی نظیر اور ہم معنی یہ آیت ہے فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ۔ یعنی تم جو مصیبت کے زائل ہونے کی دعا کرتے ہو تو اگر اللہ چاہے تو یہ مصائب دفع کر دے گا) اس تقدیر پر مقصود اس آیت سے کفار کے اس گمان کو دفع کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو نہیں سنتا، کیونکہ وہ غائب ہے یا یہ معنی ہوں کہ میں دعا قبول کرتا ہوں اگر قبول کرنا تمہارے لئے بہتر ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم کسی گناہ کے واسطے یا قطع رحم کے لئے دعا نہ کرو اور جلدی نہ مچاؤ تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرے گا، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ جلدی مچانے کے کیا معنی۔ فرمایا کہ جلدی مچانا یہ ہے کہ کہہ بیٹھے کہ اے اللہ میں نے آپ سے دعا کی تھی، آپ نے قبول نہ فرمائی۔ بس اکتا کر دعا کرنی چھوڑ دی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے یا یہ معنی ہوں کہ دعا قبول کرتا ہوں اگر بندے کسی امر محال کے طالب نہ ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ آیت عام ہے لیکن معنی قبول کرنے کے یہ ہیں کہ میں اس کی پکار سنتا ہوں، آیت سے پکار قبول کرنے سے زیادہ کچھ نہیں نکلتا۔ رہی یہ بات کہ آرزو اور تمنا بر آنا یہ دوسری بات ہے۔ آیت میں اس سے کچھ تعرض نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول کرتا ہے سو اگر مقدر میں اس کے وہ امر ہو جس کے لئے دعا کی ہے تو مل جاتا ہے اور اگر نہ ہو تو اس دعا کا یا تو آخرت میں ثواب ملتا ہے یا دنیا میں کوئی برائی اس سے دور ہو جاتی ہے۔

عبادۃ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی روئے زمین پر اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرتا ہے یا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کی مانگی ہوئی شئے عطا فرماتا ہے یا کوئی برائی اس کی مثل دور کر دیتا ہے مگر یہ جب ہے کہ جب کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کر بیٹھے۔ اس حدیث کو علامہ بغویؒ نے روایت کیا ہے اور امام احمدؒ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمان کسی حاجت کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو اللہ تعالیٰ یا تو اس کو وہ حاجت دیتا ہے اور یا اس کے لئے ذخیرہ کر رکھتا ہے وہاں اس کو ملے گی۔

ترمذیؒ نے بھی حضرت جابرؓ سے مرفوعاً اس مضمون کو روایت کیا ہے کچھ الفاظوں کا تفاوت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کی دعا اسی وقت قبول فرماتے ہیں یعنی پکار کا جواب دیتے ہیں، لیکن اس کی مراد کو اس لئے مؤخر کرتے ہیں تاکہ وہ دعا کرے تو اس کی آواز سنیں اور جس کو اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتے اس کی مراد اور آرزو جلدی پوری کر دیتے ہیں کیونکہ اس کی آواز کو پسند نہیں فرماتے اور بعض نے کہا ہے کہ دعا کے بہت سے آداب اور شرائط ہیں اور وہ شرائط قبولیت کے اسباب ہیں۔ جو شخص ان سب اسباب اور آداب کو پوری طرح حاصل کر لیتا ہے، اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور جو اس میں کمی کرتا ہے تو وہ دعا کے اندر اعتداء (حد سے تجاوز) کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے، اس لئے قبولیت کا مستحق نہیں ہوتا۔ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ

marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر کیا کہ جو سفر میں ہے اور اپنے ہاتھ آسمان کی طرف دعا کے لئے اٹھاتا ہے اور پراگندہ بال و حال ہے۔ (یعنی اسباب قبولیت کے سب مجتمع ہیں) لیکن حالت یہ ہے کہ کھانا بھی اس کا حرام اور پینا بھی حرام اور پہننا بھی خبیث اور اب تک غذا بھی حرام، پھر بھلا کہاں دعا قبول ہو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ یہ جس قدر اقوال لکھے گئے ہیں سب صحیح اور درست ہیں اور یہ بات صحیح ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ لیکن کلام اس میں نہیں۔ بحث اس میں ہے کہ مدلول آیت کا کیا ہے، سو میرے نزدیک مدلول آیت کا یہ ہے کہ دعا کا مقتضی یہ ہے کہ قبول ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ جواد کریم ہر شئے پر قادر ہیں اور جس میں یہ صفات ہوں وہ کسی سائل کو ہرگز عقلاً نقلاً رد نہیں کرتا۔

ترمذی اور ابو داؤد نے سلمانؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو! تمہارا پروردگار بہت حیا والا اور کرم والا ہے۔ جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی پھیرے۔ اب رہی یہ بات کہ اکثر دعا کیوں نہیں قبول ہوتی یا قبولیت میں کیوں دیر ہوتی ہے، تو اس کی کئی وجوہ ہوتی ہیں۔ کبھی تو کوئی حکمت ہوتی ہے اور یا قبولیت سے کوئی مانع ہوتا ہے اور کسی وقت کوئی شرط مفقود ہوتی ہے یا دعا مانگنے والے کے لئے اس میں کچھ عقوبت ہوتی ہے واللہ اعلم۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ (جائز کر دیا گیا تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں پاس جانا اپنی بیبیوں کے) لفظ رفث جماع سے کنایہ ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ رفث ایک لفظ جامع ہے جس قسم کا مرد عورتوں سے فائدہ اٹھائیں سب کو شامل ہے اور رفث کو الی سے اس لئے متعدی کیا ہے کہ اس لفظ کے اندر افضاء (جماع) کا مضمون ہے (اور افضاء کا صلہ الیٰ آتا ہے) امام احمد اور ابو داؤد اور حاکم نے عبدالرحمن ابن ابی لیلیٰ سے انہوں نے معاذ ابن جبلؓ سے روایت کی ہے کہ ابتداء اسلام میں لوگ اول شب میں سونے تک کھاتے پیتے تھے، عورتوں سے جماع کرتے تھے اور سونے کے بعد سے پھر صبح تک سب چیزوں سے باز رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا قصہ ہوا کہ ایک شخص انصاری حرمہ نام نے عشا کی نماز پڑھی پھر بغیر کچھ کھائے پیئے سو رہے۔ صبح کو یہ حالت ہوئی کہ بھوک پیاس کی بہت شدت تھی اور ایک مرتبہ عمرؓ کی بھی یہ کیفیت ہوئی کہ بعد سونے کے بی بی سے صحبت کر بیٹھے۔ یہ قصہ جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت آیت احل لکم الخ نازل فرمائی۔ یہ حدیث ابن ابی لیلیٰ سے مشہور ہے اور ابن ابی لیلیٰ نے حضرت معاذؓ سے نہیں سنا لیکن اس حدیث کے اور بہت سے شواہد ہے۔

امام بخاریؒ نے حضرت براءؓ سے روایت کی ہے کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی شخص روزہ رکھتا تھا اور افطار کا وقت آجاتا تھا اور روزہ افطار کرنے سے پہلے ہی سو جاتا تھا تو پھر وہ نہ اس رات کو کھاتا پیتا تھا اور نہ اگلے روز شام تک کچھ کھاتا پیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ قیس بن صرمہ انصاریؓ روزہ دار تھے جب افطار کا وقت ہوا تو اپنی زوجہ سے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانا ہے۔ اس نے کہا موجود تو نہیں لیکن تمہارے واسطے کہیں سے لائی ہوں۔ یہ تمام دن تو کام کاج کرتے تھے اس کے جاتے ہی نیند غالب ہوئی سو رہے جب وہ آئی تو ان کو سوتے دیکھ کر بولی۔ بدقسمتی اس کے بعد تو کھا ہی نہیں سکتے تھے، دوسرے دن جب دوپہر ہونے آئی تو ضعف کی وجہ سے ان پر غشی طاری ہو گئی، یہ قصہ جناب رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوا اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

بخاریؒ نے حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے کہ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو لوگ تمام رمضان عورتوں کے پاس نہ جاتے تھے اتفاقاً چند آدمی اپنی بیبیوں سے صحبت کر بیٹھے اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت علم اللہ انکم الخ نازل فرمائی۔ اور امام احمد اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن کعب کے طریق سے ان کے باپ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رمضان میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی شخص شام کو سو رہتا تھا تو اس پر کھانا پینا اور عورتوں کے پاس جانا سب حرام ہو

marfat.com

جاتا ہے۔ دوسرے دن افطار تک حرام رہتا تھا ایک روز رات کو حضرت عمرؓ کو جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں باتوں میں دیر ہو گئی جب وہاں سے تشریف لائے تو بی بی سے مشغول ہونے کا ارادہ فرمایا انہوں نے عذر کیا کہ میں سو گئی تھی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تو نہیں سویا۔ یہ کہہ کر مشغول ہو گئے اور یہی فعل کعب بن مالکؓ سے ہو گیا۔ صبح کو عمرؓ نے یہ واقعہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اور علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ ابتداء اسلام میں جب آدمی عشا کی نماز پڑھ لیتا تھا یا اس سے پہلے سو رہتا تھا تو اس پر کھانا پینا جماع اگلی رات تک سب حرام ہو جاتا تھا اور عمر بعد نماز عشاء کے اپنی بی بی سے صحبت کر بیٹھے، پھر رسول اللہ ﷺ سے عذر کیا نبی ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر تم کو یہ بات لائق نہ تھی پھر اور بھی چند آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے بھی اپنا اسی قسم کا واقعہ بیان کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس) ترکیب لغوی کے اعتبار سے یہ آیت ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ گویا کوئی سوال کرتا تھا کہ روزوں کی رات میں جماع کے حلال ہونے کی کیا وجہ ہے۔ تو اس کا سبب ارشاد ہوتا ہے کہ تم کو عورتوں سے صبر نہیں ہو سکتا اور کثرت میل جول اور شدت تعلق کی وجہ سے ایسی حالت ہو گئی جیسے ایک دوسری کا لباس ہو۔ احتراز مشکل تھا اس لئے روزوں کی رات میں جماع حلال کر دیا گیا۔ چونکہ مرد اور عورت آپس میں ایک دوسرے سے لپٹے ہیں اور ہر ایک دوسرے پر مثل لباس کے مشتمل ہو جاتا ہے اس لئے مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کے لباس سے تشبیہ دی اور یا اس لئے کہ لباس جس طرح لباس (پہننے والے) کو چھپا لیتا ہے اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کو حرام سے چھپاتا اور روکتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے نکاح کر لیا اس نے دو تہائی دین جمع کر لیا۔

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ (اللہ نے معلوم کیا کہ تم چوری سے اپنے نقصان کرتے تھے) یعنی بعد عشاء یا بعد سو رہنے کے مجامعت کر کے اپنی جانوں کو عقاب اور سزا کے مقام میں لا کر ان پر ظلم کرتے تھے اور ثواب کا حصہ کم کرتے تھے۔ اختیان میں خیانت سے زیادہ مبالغہ ہے۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ (سو اس نے معاف کیا تم کو یعنی جب تم نے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ نے بھی معاف کر دیا۔

وَعَفَا عَنكُمْ (اور در گزر کی تم سے) یعنی تمہارے گناہوں کو محو فرما دیا۔

فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ (پس اب تم ان سے ہم بستر ہو) یعنی اب حلال طور سے مجامعت کرو مباشرت بول کر صحبت مراد لی ہے۔

وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (اور چاہو جو اللہ نے لکھ دیا تمہارے لئے) یعنی جو تمہاری قسمت میں اولاد اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے وہ بذریعۂ صحبت کے طلب کرو۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ جب کوئی شخص اپنی عورت سے مجامعت کرے تو مناسب یہ ہے کہ مجامعت سے اولاد کی نیت کرے صرف اپنی خواہش ہی پوری کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کرو جو خاوند کو دوست رکھنے والی ہو اور خوب جننے والی ہو کیونکہ میں تمہاری کثرت پر اور امتوں کے سامنے فخر کروں گا۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور نسائی نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عزل (وقت انزال ذکر کو فرج سے باہر کرنا تاکہ منی فرج کے اندر نہ نکلے) مکروہ ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جماع بچہ پیدا ہونے کی جگہ ہی میں مباح ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ ما کتب اللہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی سیاق آیت سے بعید ہیں۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ (اور کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صاف نظر آنے لگے تمہیں صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے) خیط ابیض سے دن کی روشنی اور خیط اسود سے رات کی سیاہی مراد ہے اور خیط (دھاگا) اس لئے فرمایا کہ جب صبح ابتداً ظاہر ہوتی ہے تو جنوب سے شمال کو مثل

marfat.com

دھاگے کے کھچ جاتی ہے اور من الفجر- من الخیط الابیض سے حال اور اس کا بیان ہے اور خیط اسود کا بیان اس لئے نہیں لائے کہ جب خیط ابیض سے مراد فجر ہوئی تو خیط اسود سے رات مراد ہونا خود ہی سمجھ میں آجائے گا اور من الفجر میں من یا تو تبعیض کے لئے ہے۔ اس تقدیر پر تو یہ معنی ہوں گے کہ اس حال میں کہ وہ خیط ابیض خود فجر کا حصہ ہو۔ اور صراحۃً حتیٰ یتبین الفجر (یہاں تک کہ صبح صاف ظاہر ہو جائے) اس لئے نہیں فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ادنیٰ حصہ بھی ظاہر ہوتے ہی کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے اور بغیر ذکر من الخیط الاسود کے اس طرح بھی نہ فرمایا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الفجر (یہاں تک کہ سفید دھاری صبح کی تم کو صاف ظاہر ہو جائے) اس واسطے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ فجر سے مراد صبح صادق ہے کیونکہ صبح صادق ایک سفید دھاری جنوب سے شمال کو پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے متصل ہی اس سے قبل ایک سیاہ دھاری ہوتی ہے جو غربی جانب پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور وہ رات کی سیاہی کا ایک حصہ ہوتی ہے بخلاف فجر کاذب کے کہ وہ بھی ایک سفید دھاری لیکن لمبی شرق و غرب کو ہوتی ہے کہ اس کے بعد تاریکی تمام اطراف کا احاطہ کر لیتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کہ من الفجر، الخیط الاسود اور الخیط الابیض دونوں کا بیان ہو کیونکہ فجر میں دونوں باتیں ہوتی ہیں تاریکی بھی ہوتی ہے اور روشنی بھی اور یہ ترکیب اولیٰ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں حال اور ذوالحال میں اجنبی سے فصل لازم نہ آئے گا۔ واللہ اعلم۔

سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے لوگ! بلال کی اذان اور فجر طویل (صبح کاذب) کے سبب سے تم سحری کھانے سے مت رکا کرو بلکہ اس فجر سے رکا کرو جو افق میں پھیل جاتی ہے (یعنی صبح صادق) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ (اے لوگو) بلال رات سے ہی اذان دیتے ہیں تو تم ابن ام مکتوم کے اذان دینے تک کھاتے پیتے رہا کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ ابن اُمّ مکتومؓ اندھے آدمی تھے اور اذان اس وقت دیتے تھے کہ جب ان سے کئی مرتبہ کہا جاتا تھا کہ صبح ہو گئی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت علیؓ سے ثابت ہے کہ انہوں نے صبح کی نماز پڑھ کر فرمایا کہ اب سفید دھاری کالی دھاری سے متمیز ہوئی ہے۔ اس روایت کو ابن منذر نے روایت کیا ہے اور اسی طرح ابن منذر نے بسند صحیح حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کھانے کی رغبت اور حرص نہ ہوتی تو میں صبح کی نماز پڑھ کر سحری کھایا کرتا۔ اور ابن منذر اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے امر فرمایا کہ دروازہ فجر کے دکھائی دینے تک بند رہے۔ پس یہ سب آثار اس پر صاف دال ہیں کہ صبح کے پھیل جانے کے بعد کھانا جائز ہے اب ان اقوال کی کیا توجیہ ہو گی۔

میں کہتا ہوں کہ غیب کی خبر تو اللہ جانے بظاہر ان اقوال کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ابو بکر صدیقؓ اور علیؓ نے یہ سمجھا ہو گا کہ من الفجر میں من سببیہ ہے اور خیط سے حقیقی معنی (دھاگا) مراد ہیں۔ حالانکہ حدیث سے ثابت ہے کہ من الفجر میں من بیانیہ ہے اور خیط ابیض سے مراد صبح ہے اور اسی پر اجماع ہے۔ عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ جب آیت حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ دھاگا اور ایک سپید دھاگا لیا اور ان کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیا اور رات کو ان کو دیکھا تو مجھ کو دونوں میں کچھ فرق نہ معلوم ہوا، صبح کو میں جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ اس سے تو رات کی سیاہی اور دن کی سپیدی مراد ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ نے فرمایا کہ تو عریض القفا (کم عقل) ہے یہ تو دن کی سپیدی اور رات کی سیاہی ہے۔

سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ جب کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود نازل ہوئی اور اس وقت تک من الفجر نازل نہ ہوا تھا تو بہت سے آدمی یہ کرتے تھے کہ جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے تو اپنے دونوں پاؤں میں سپید اور سیاہ دھاگا باندھ لیتے اور کھاتے رہتے جب وہ دونوں صاف نظر آنے لگتے اس وقت کھانے پینے سے

marfat.com

رکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے من الفجر نازل فرمایا تو انہوں نے جانا کہ خیط ابیض اور خیط اسود سے دن اور رات مراد ہیں۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ سہل بن سعد کی حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے اور یہ جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ خیط ابیض اور اسود کا استعمال دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں شائع وذائع تھا۔ بیان کرنے کی حاجت نہ تھی اور اگر بالفرض بعض لوگوں پر تامل وتدبر نہ کرنے کی وجہ سے پوشیدہ بھی ہو تو پھر بھی یہ مجمل کی قسم سے نہ ہوگا بلکہ اس کو مشکل کہا جائے گا اور مشکل (اصطلاح میں) اس لفظ کو کہتے ہیں کہ متکلم کو جو کچھ اس سے مقصود ہے اس میں صیغہ کی رو سے یا استعمال مجاز سے خفا آجائے اور وہ خفا ایسا ہو کہ تامل اور طلب سے زائل ہو جاتا ہو۔ اب اس تقدیر پر لفظ من الفجر صرف اس لئے نازل فرمایا تاکہ اور زیادہ وضوح ہو جائے اور جو لوگ کوتاہ فہم ہیں وہ محفوظ کرلیں اور ان کو طلب وتامل کی ضرورت نہ رہے اور باب مجمل سے نہ ہوگا کہ جس کے معنی بغیر شارع کے بتائے سمجھ میں نہ آئیں۔ اس لفظ کے نزول میں دیر ہونے سے کسی قسم کا اشکال نہ رہا اور اگر بالفرض اس کا مجمل ہونا تسلیم بھی کرلیا جائے تو کیا عجب ہے کہ اس کا بیان شارع کی طرف سے وحی غیر تلاوت میں آچکا ہو اور حدیث سے ثابت ہو (چنانچہ عدی بن حاتمؓ کی حدیث اس پر دال ہے) اور اس کے بعد تائید اور تاکید کے طور پر من الفجر نازل ہوا ہو۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ خیط اسود اور خیط ابیض سے ان کے ظاہر معنی مراد ہیں اور من الفجر اس کا ناسخ ہے اور طحاویؒ کے اس قول کی حضرت حذیفہؓ کی حدیث ذیل تائید کرتی ہے فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بالکل دن نکلے سحری کھائی اتنی بات تھی کہ سورج نکلا نہ تھا۔ ورنہ بالکل روشنی تھی۔ اس حدیث کو سعید بن منصور نے روایت کیا ہے۔ پس کیا بعید ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے جناب سرور کائنات ﷺ کے ساتھ من الفجر کے نزول سے پہلے سحری کھائی ہو۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ لفظ من الفجر مستقل کلام نہیں اور ناسخ کلام مستقل ہوتا ہے تو من الفجر کیسے ناسخ بن سکتا ہے اور اگر اس کو نزول میں متاخر مانا جائے تو پھر کلام سابق کا مخصص بھی نہیں بن سکتا کیونکہ قصر اور تخصیص کے لئے یہ ضروری ہے کہ ماقبل سے متصل ہو تو جب نہ ناسخ بن سکتا ہے اور نہ مخصص تو اس کی کیا توجیہ ہے۔ اس اشکال کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اول پوری آیت بغیر لفظ من الفجر کے نازل ہوئی پھر ایک مدت کے بعد یہی آیت دوسری مرتبہ قید من الفجر کے ساتھ اتری اس لئے پہلے آیت کی باعتبار حکم اور تلاوت کے ناسخ بن گئی، واللہ اعلم۔

فائدہ عدی بن حاتمؓ کا قصہ من الفجر کے نازل ہونے کے بعد ہوا ہے کیونکہ عدی بن حاتمؓ ۹ھ میں اسلام لائے ہیں اور روزہ کی آیت ۲ھ میں نازل ہوئی ہے اور لفظ من الفجر اس کے تقریباً ایک سال بعد نازل ہوا تھا۔ پس عدی بن حاتمؓ نے جو دو دھاگے تکیہ کے نیچے رکھ لئے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے من الفجر میں من کو سبب کے لئے سمجھا تھا واللہ اعلم۔

فائدہ: جماع کو فجر تک جائز رکھنے سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ جنبی کو صبح کے بعد بھی غسل کرنا جائز ہے اور نیز یہ کہ کوئی اگر صبح تک جنابت کی حالت میں رہا تو اس کا روزہ بالاتفاق صحیح ہے۔

مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (پھر پورا کرو روزہ کو رات تک) یہ آیت روزہ کے آخر وقت کا بیان ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب رات کی سیاہی اس طرف چھا جائے اور دن اس طرف منہ پھیرے اور آفتاب غروب ہو جائے تو یہ وقت افطار کا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ روزہ کی حقیقت کھانے پینے اور جماع سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک نیت کے ساتھ رکنا ہے اور نیت کا وجوب لفظ ثم اتموا سے صاف ظاہر ہے کیونکہ اتمام (پورا کرنا) فعل اختیاری ہے یا یہ کہا جائے کہ روزہ جب عبادت ہے تو اس کے لئے نیت بھی ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مخلصین له الدین یعنی اور ان کو یہی حکم دیا گیا کہ اللہ کی عبادت کریں خالص اسی کی عبادت سمجھ کر۔ اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس کے نیت ہے۔ اس لئے جس شخص کی نیت اللہ ورسول کی طرف ہجرت کرنے کی ہے اس کو اسی کا ثمرہ ملے گا اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہے کہ دنیا ملے یا کسی عورت سے نکاح کرے تو اس کو اس کا پھل ملے گا۔ اس حدیث کو تمام

marfat.com

محدثین نے سوائے امام مالکؒ کے روایت کیا ہے لیکن امام مالکؒ سے بھی بخاری نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہے اور تمام امت محمدیہ ﷺ نے اس کو قبول کیا ہے اور اس پر سب علماء کا اتفاق ہے کہ ہر عبادت مقصودہ بغیر نیت کے صحیح نہیں۔ اس قاعدہ کا مقتضی یہ تھا کہ نیت پوری عبادت میں شرط ہے لیکن حرج اور تنگی کی وجہ سے یہ تمام اوقات میں ساقط ہو گئی۔ نماز میں تو نیت اول جزو یعنی تکبیر تحریمہ کے مقارن ہونا شرط ہو گئی اور دیگر اجزاء میں حکماً اعتبار کر لی جائے گی اور روزہ کے جزو اول میں بھی یہ شرط نہیں کیونکہ روزہ کا جزو اول طلوع فجر کے وقت ہے اور یہی وقت اکثر غفلت اور سونے کا ہے اس لئے روزہ میں شروع سے پہلے کی نیت بھی کافی ہے اور باقی وقت میں جب تک اس نیت کو توڑے نہیں اعتبار کر لی جائے گی۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا بعد طلوع فجر کے اگر نیت کرے تو روزہ ہو جائے گا یا نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر شرعی دن کے نصف سے پہلے پہلے نیت کر لے تو رمضان اور نذر معین اور نفل کے روزے صحیح ہو جائیں گے اور امام شافعی اور احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر زوال سے پہلے نیت کر لے تو نفل روزہ صرف صحیح ہے اور روزے صحیح نہ ہوں گے اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کوئی روزہ دن کی نیت سے صحیح نہ ہو گا اور حضرت حفصہؓ کی حدیث امام مالکؒ کی مؤید ہے، وہ فرماتی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص طلوع فجر سے پہلے روزے کا عزم نہ کرے اس کا روزہ نہیں۔ اس حدیث کو امام احمد اور ابو داؤد اور ترمذی اور نسائی اور ابن خزیمہ اور ابن ماجہ اور دار قطنی اور دارمی نے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں یہ مضمون ہے کہ جس شخص نے رات سے روزہ کا قطعی ارادہ نہ کیا اس کا روزہ نہیں اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جس نے اپنا روزہ فجر سے پہلے نہ ثابت کر لیا اس کا روزہ نہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس حدیث کی نسبت ابو داؤد نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع ہونا صحیح نہیں اور ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا موقوف ہونا صحیح تر ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ابن جریج اور عبد اللہ بن ابی بکرؒ نے اس کو مرفوع کہا ہے۔ یہ دونوں اس حدیث کو زہری سے اور زہری سالم سے اور سالم اپنے باپ سے اور وہ ام المؤمنین حضرت حفصہؓ سے اور وہ حضور ﷺ سے روایت کرتی ہیں۔ اور ابن جریج اور عبد اللہ بن ابی بکر دونوں ثقہ ہیں اور مرفوع کہنا اس حدیث کا زیادتی ہے اور زیادتی ثقہ کی مقبول ہوا کرتی ہے اور محدثین کی عادت ہے کہ موقوف اور مرسل دونوں کو موقوف کہتے ہیں اور موقوف کا اصح ہونا مرفوع کے صحیح ہونے کے منافی نہیں۔ اور حاکم نے اس حدیث کے مرفوع ہونے کی صورت میں کہا ہے کہ یہ حدیث شرط شیخین پر صحیح ہے اور مستدرک میں کہا ہے کہ شرط بخاری پر صحیح ہے اور بیہقیؒ اور دار قطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کے راوی سب ثقہ ہیں۔

اور اسی مضمون کی حدیث ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے منقول ہے وہ فرماتی ہیں کہ جس شخص نے روزہ کو قبل از فجر ثابت نہ کیا اس کا روزہ نہیں، اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں، لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن عباد ہے۔ ابن حبانؒ نے اس کو ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے اور ایک یحییٰ بن ایوب ہیں وہ بھی کچھ قوی نہیں۔

اور میمونہ بنت سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے رات سے ٹھان لیا کہ کل کو روزہ رکھوں گا تو اس کو رکھنا چاہئے اور جس نے صبح تک عزم نہ کیا ہو اس کو روزہ نہ رکھنا چاہئے۔ اس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے لیکن اس کی سند میں واقدی راوی کچھ نہیں۔

اور جو لوگ نفل روزہ کے لئے دن کو نیت کر لینا کافی سمجھتے ہیں۔ ان کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب میرے پاس تشریف لاتے تو فرماتے کہ تمہارے پاس کچھ کھانا ہے جب ہم کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہے تو فرماتے کہ بس تو میں روزہ دار ہوں۔

ایک روز کا قصہ ہے کہ آپ تشریف لائے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس کچھ حیس (کھجوریں اور گھی و مسکہ وغیرہ سے مرکب کر کے ایک کھانا بنایا جاتا ہے) ہدیہ میں آیا ہے۔ فرمایا کہ لاؤ اور صبح سے تو میں روزہ دار تھا اور مسلم کی

marfat.com

روایت میں یہ مضمون ہے کہ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ فرمایا کہ بس تو میں روزہ دار ہوں، یہ کہہ کر حضور ﷺ باہر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد ہمارے پاس کچھ ہدیہ آیا جب پھر گھر میں جناب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے پاس کچھ ہدیہ آیا ہے، فرمایا کیا ہے، میں نے عرض کیا حیس ہے فرمایا لاؤ، میں لائی تو حضور ﷺ نے نوش فرمایا۔ پھر فرمایا کہ صبح سے تو میں روزہ دار تھا۔ اس حدیث کا مالکیہ یہ جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے دن کو روزہ کی نیت کی اور رات سے نیت روزہ کی نہیں تھی بلکہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ صبح سے روزہ دار تھے اور رات سے نیت روزہ کی آپ نے فرمائی تھی پھر اپنی زوجہ مطہرہ کے پاس تشریف لائے تھے اور روزہ نفل کو توڑ دیا تھا چنانچہ مضمون "صبح سے میں روزہ دار تھا" اس پر صاف دال ہے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ (اور نہ ہم بستر ہونا ان سے جس حالت میں کہ تم اعتکاف میں بیٹھے ہو مسجدوں میں) عکوف کے معنی لغت میں کسی شئے پر اقامت کرنے اور ٹھہرنے کے ہیں اور اصطلاح اہل شرع میں اعتکاف مسجد میں نیت کے ساتھ اللہ کی عبادت پر ٹھہرنے اور اقامت کرنے کو کہتے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت چند صحابہؓ کے بارہ میں نازل ہوئی ہے وہ مسجد میں اعتکاف کرتے تھے جب کسی کو ان میں اپنی زوجہ کے پاس جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اعتکاف سے نکل کر اس سے صحبت کر لیتے اور پھر غسل کر کے مسجد میں آجاتے تھے پھر اس آیت سے رات اور دن دونوں میں اعتکاف سے فارغ ہونے تک عورت کے پاس جانا حرام ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جماع سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے اور سب کے نزدیک اعتکاف میں جماع حرام ہے۔ لیکن شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر بھول کر جماع کر لیا تو جیسے روزہ نہیں فاسد ہوتا اسی طرح اعتکاف بھی فاسد نہیں ہوتا۔

ہم کہتے ہیں کہ اعتکاف اور روزہ میں فرق ہے۔ اعتکاف کی حالت تو خود اعتکاف کو یاد دلانے والی ہے بخلاف روزہ کے کہ روزہ میں کوئی ایسی حالت جدیدہ نہیں ظاہر ہوتی کہ جس سے روزہ یاد رہے اور حسن بصریؒ اور زہری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جو اعتکاف میں اپنی زوجہ سے جماع کرے تو اس پر کفارہ لازم ہے اور کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ لیکن سب علماء کا اس پر اجماع ہے کہ کفارہ نہیں ہے اور اگر شہوت سے بوسہ لیا یا چھوا اور انزال ہو گیا تو سب کے نزدیک اعتکاف باطل ہو گیا اور اگر انزال نہیں ہوا تو فعل حرام ہوا لیکن اعتکاف فاسد نہیں ہوا۔ لیکن امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ اور اگر چھونے سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب جناب رسول اللہ ﷺ اعتکاف فرمایا کرتے تھے تو اپنا سر مبارک میرے قریب فرما دیتے تھے میں کنگھی کر دیتی تھی۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ مسلم کی روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ حضور ﷺ گھر میں حاجت انسانی کے سوا اور کسی شئے کے لئے تشریف نہ لے جاتے تھے اور وانتم عاکفون فی المساجد (اور تم اعتکاف کرنے والے ہو مسجدوں میں) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف سوائے مسجد کے اور جگہ صحیح نہ ہو گا اور مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جس میں جماعت ہوتی ہو گھر کی مسجد مراد نہیں اور المساجد کا اطلاق یہ بتا رہا ہے کہ اعتکاف ہر مسجد میں درست ہے۔ مسجد حرام اور مسجد اقصےٰ اور مسجد نبی ﷺ اور مسجد جمعہ کی کوئی خصوصیت نہیں اور حذیفہؓ سے مروی ہے کہ مساجد مذکورہ میں صحیح ہو گا دوسری مسجد میں درست نہیں اور عطا فرماتے ہیں کہ مسجد مکہ میں جائز ہو سکتا ہے اور ابن مسیبؒ مسجد مدینہ میں حصر کے قائل ہیں اور امام مالکؒ کے نزدیک مسجد جمعہ میں صحیح ہے۔ اور امام شافعیؒ کے بھی پہلے قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ مسجد جمعہ میں اعتکاف درست ہے اور دوسری مسجد میں مشروع نہیں۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ بغض اور عداوت کی چیز بدعات ہیں اور یہ بھی بدعات میں سے ہے کہ گھروں کی مسجدوں میں اعتکاف کیا جائے۔ اس حدیث کو بیہقی نے روایت کیا ہے اور علیؓ فرماتے ہیں۔ کہ اعتکاف سوائے مسجد جماعت کے

marfat.com

اور مسجد میں صحیح نہیں اس کو ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق نے اپنی اپنی مصنف میں لکھا ہے اور حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ لوگو سنو میں یہ امر خوب جانتا ہوں کہ مسجد جماعت کے سوا اور جگہ اعتکاف درست نہیں۔ اس حدیث کو طبرانی روایت کیا ہے اور ابن جوزی نے حذیفہؓ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس مسجد میں امام اور مؤذن ہے اس میں اعتکاف صحیح ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ یہ حدیث نہایت ضعیف ہے اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ معتکف کو چاہئے کہ کسی مریض کی عیادت نہ کرے اور نہ کسی جنازہ پر حاضر ہو اور نہ عورت کو ہاتھ لگائے اور نہ صحبت کرے اور سوائے بہت ضروری حاجت کے کہیں نہ نکلے اور اعتکاف روزہ ہی میں ہوتا ہے بغیر روزہ کے صحیح نہیں اور مسجد جامع کے سوا اور جگہ اعتکاف نہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مسجد جماعت کے سوا اور جگہ اعتکاف نہیں۔

مسئلہ :- رمضان المبارک کے آخر میں دس دن میں اعتکاف سنت مؤکدہ ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور وفات تک فرماتے رہے۔ پھر بعد آپ کے آپ کی ازواج مطہراتؓ نے اسی طرح اعتکاف فرمایا۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کی آخر دس راتوں میں اعتکاف فرماتے تھے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کی آخر دس راتوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اعتکاف نہ فرمایا آئندہ سال بیس رات اعتکاف فرمایا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ابی بن کعبؓ سے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ اور ازواج مطہرات سے تو بے شک اعتکاف کرنا ثابت ہے۔ لیکن اس کو اکثر صحابہؓ نے ترک فرمایا ہے۔

ابن نافعؒ فرماتے ہیں کہ اعتکاف مثل صوم وصال کے ہے کہ حضور ﷺ نے خود کیا ہے اور اوروں کو منع فرمایا ہے اور میرا گمان یہ ہے کہ صحابہؓ نے اعتکاف کو اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ اس میں ایک تنگی اور شدت ہے اور فرماتے ہیں کہ سلف میں سے کسی سے سوائے ابوبکر بن عبد الرحمن کے اعتکاف کرنا ثابت نہیں اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اکثر صحابہؓ سے اعتکاف کا ترک ثابت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ چونکہ اکثر صحابہؓ نے اس کو ترک فرمایا ہے۔ اسی بنا پر بعض حنفیہ نے اس کو سنت کفایہ فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا (یہ خدائی ضابطے ہیں سو ان کے نزدیک بھی نہ جاؤ) تلک کا مشارٌ الیہ احکام مذکورہ بالا ہیں۔ جیسے روزہ میں کھانا پینا، جماع کا حرام ہونا اور اعتکاف میں ہمبستری کا نادرست ہونا وغیرہ وغیرہ۔ حدود اللہ یعنی یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اللہ نے روک دیا ہے اور اصل معنی حد کے منع (روکنا) ہیں۔ فلا تقربوھا (مت قریب جاؤ ان کے) کا مطلب یہ ہے کہ ان حرام کی ہوئی چیزوں کو مت کرو۔ مبالغہ کے لئے فلا تقربوھا (مت قریب جاؤ) سے تعبیر کیا ہے (جیسے کہتے ہیں کہ تم اس کام کے پاس بھی نہ پھٹکنا) سورت کے شروع میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان میں بہت سے امور ایسے ہیں کہ جن میں اشتباہ اور دھوکہ ہوتا ہے ان کو بہت سے آدمی نہیں جانتے سو جو شخص ان امور سے بچا اس نے اپنی آبرو اور دین کو بچالیا اور جو ان امور مشتبہ میں پڑے گا وہ حرام میں جاگرے گا جیسے وہ چرواہا جو خاص چراگاہ (سلطانی) کے گرد چراتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ چراگاہ (سلطانی) میں واقع ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ یہ بادشاہ کے لئے ایک خاص چراگاہ ہوتی ہے کہ وہ اس میں دوسرے شخص کو دخل نہیں دیتا۔ خبر رکھو کہ اللہ کی محفوظ چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں (پس جو اس کی چراگاہ میں جائے گا یعنی محرمات کا ارتکاب کرے گا اللہ تعالیٰ سزا و عذاب کریں گے) اور چونکہ حرام شئے کے قریب بھی جانے کو حرام فرمایا ہے اس لئے ہمارے ائمہ نے فرمایا کہ جو چیزیں جماع کی طرف رغبت دلانی ہیں جیسے شہوت سے چھونا اور بوسہ وغیرہ اعتکاف اور روزہ میں یہ سب حرام ہیں اور اگر چھونے یا بوسہ سے انزال ہو گیا تو روزہ اور اعتکاف دونوں فاسد ہو جائیں گے۔

marfat.com

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ (اسی طرح صاف صاف بیان کرتا ہے اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تاکہ وہ پرہیزگار بنیں) یعنی ہم نے یہ احکام بیان کئے، لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یعنی تاکہ اوامر ونواہی کی مخالفت سے بچیں اور اس کے ذریعہ سے پھر جہنم کی آگ سے محفوظ رہیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (اور نہ کھاؤ اپنے آپس میں اپنے مال ناحق) باطل سے مال کھانا اس طرح ہے جیسے کسی شخص کے مال پر جھوٹا دعویٰ کر دیا یا جھوٹی گواہی دے دی یا کسی کی حق بات کا انکار کر کے اس پر قسم کھا بیٹھے یا کسی کا مال غصب کر لیا، لوٹ لیا، چرا لیا، خیانت کر لی، یا جوے سے کسی کا مال لے لیا اور جیسے زنا کی اجرت اور ڈوم کے گانے کی اجرت اور کاہن کو کچھ دینا اور نر کو مادہ پر کدانے کی مزدوری اور دیگر عقود فاسدہ اور رشوت وغیرہ یہ سب امور باطل میں داخل ہیں اور بین یا تو ظرف ہونے کی وجہ سے اور یا اموالکم سے حال ہونے کے باعث سے منصوب ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ امرا القیس پر ربیعہ بن عبدان حضرمی نے جناب رسول اللہ ﷺ کے دربار میں ایک زمین کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ اس نے مجھ سے فلاں زمین جو میری ملک تھی غصب کر لی۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرمی سے فرمایا کہ تمہارے پاس اس امر کے گواہ ہیں۔ حضرمی نے کہا کہ میرے پاس گواہ تو نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر گواہ نہیں تو امرء القیس مدعیٰ علیہ کی قسم پر فیصلہ ہوگا۔ امراءالقیس یہ سن کر قسم کھانے کیلئے مستعد ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر جھوٹی قسم اس غرض سے کھائے گا کہ اس کا مال ناحق کھائے تو قیامت کے دن اللہ سے ناراضگی کی حالت میں ملے گا۔ اس حدیث کو ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؒ سے روایت کیا ہے۔

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ (اور نہ ذریعہ بناؤ ان مالوں کو حاکموں تک رسائی کا) یا تو نہی یعنی تاکلوا پر معطوف اور لا کے تحت میں ہے اور یا بتقدیر ان منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے مؤمنو اموال کے فیصلہ کو حکام تک مت پہنچاؤ۔ اور مجاہد نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ آپس میں ظالم ہو کر خصومت اور نزاع مت کرو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ اس شخص کے بارے میں ہے جس کے ذمہ کچھ مال ہو اور اس پر گواہ نہ ہو اور وہ اس مال کا انکار کر بیٹھے اور حاکم تک جب یہ جھگڑا پہنچے تو وہاں جھوٹی قسم کھا بیٹھے۔ کلبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس شخص کا حال ہے جو جھوٹی گواہی دے۔

میں کہتا ہوں کہ الفاظ آیت ان جملہ تفاسیر کو شامل اور عام ہیں، سب معنی ہو سکتے ہیں۔

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ (تاکہ کھاؤ تھوڑا سا لوگوں کا مال گناہ کے ساتھ) بالاثم میں اثم سے مراد وہ شئے ہے جس سے گناہ لازم آجائے جیسے جھوٹی شہادت اور جھوٹی قسم۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع (حالانکہ تم جانتے بوجھتے ہو) کہ اس معاملہ میں تم حق پر نہیں بخلاف حکام کے کہ وہ ع ۲۳ ۷
حقیقت حال سے واقف نہیں، ظاہر حال پر فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حاکم اگر موافق شرع کے فیصلہ کر دے اور کسی جانب اس کا میلان نہ ہو، نہ مدعی کی طرف نہ مدعیٰ علیہ کی جانب تو اس کو اجر ملے گا۔ اگرچہ وہ فیصلہ فی نفسہ گناہ ہو اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قضاء قاضی سے کوئی حرام شئے حلال نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو! میں تمہاری طرح بشر ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے، مقدمے فیصلے کرانے کے لئے لاتے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض تم میں سے اپنی دلیل اور اظہار بیان میں دوسرے سے زیادہ لسان اور فصیح ہو، پھر اس کے بیان پر میں اس کے موافق فیصلہ کر دوں، تو تم کو چاہئے کہ جس کے لئے میں اس کے بھائی مسلمان کے حق میں سے کچھ دلاؤں اس کو نہ لو کیونکہ یہ لینے والے کے لئے میں نے گویا آگ کا ایک انگارہ دے دیا ہے (لہٰذا اس سے بچنا چاہئے) اس حدیث کو امام شافعیؒ نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے۔ اور بخاری اور مسلم میں بھی یہ حدیث اسی طرح منقول ہے۔

اور امام ابو حنیفہؒ بھی مثل دیگر علماء کے یہی فرماتے ہیں کہ یہ مال اس پر حرام اور خبیث ہے، لیکن اوروں کے خلاف یہ فرماتے ہیں کہ عقود (یعنی معاملات جیسے اجرۃ، بیع، نکاح وغیرہ) اور فسوخ (یعنی معاملات کے فسخ کرنے اور توڑنے) میں قاضی کا حکم ظاہر (یعنی دنیوی احکام میں) اور باطن (عند اللہ) میں یکساں بلا فرق نافذ اور جاری ہوتا ہے اور جمہور علماء اس میں امام صاحب

marfat.com

کے مخالف ہیں۔ امام صاحبؒ کی دلیل اس بات میں یہ ہے کہ دو گواہوں نے حضرت علیؓ کے حضور میں گواہی دی کہ فلاں شخص کا نکاح فلاں عورت سے ہو گیا ہے۔ حضرت علیؓ نے وہ عورت اس مرد کو دلا دی اور نکاح پر فیصلہ فرمایا۔ عورت نے کہا کہ ہمارا تو نکاح نہیں ہوا اگر آپ کو یہی منظور ہے تو میرا نکاح اس کے ساتھ پڑھا دیجئے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا ان گواہوں نے تیرا نکاح کر دیا۔[1]

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ (اے محمد ﷺ آپ سے پہلے رات کے چاندوں کا حال پوچھتے ہیں) اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ معاذ بن جبل انصاری اور ثعلبۃ بن غنم انصاریؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا بات ہے کہ ہلال اول تو باریک سا ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتے بڑھتے بالکل بھر جاتا ہے اور پورا ہو جاتا ہے اس کے بعد باریک ہونا شروع ہوتا ہے حتیٰ کہ ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ اول تھا، ایک حالت پر نہیں رہتا۔ اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یہ روایت علامہ بغویؒ نے نقل کی ہے اور ابو نعیم اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بطریق سدی صغیر

---

[1] یہ بعض علماء کی ذاتی رائے اور تخصی استنباط ہے نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ مقصود ہے کہ جھوٹی شہادتوں سے حرام چیز حلال ہو جاتی ہے نہ امام صاحبؒ کے قول کا یہ مطلب ہے۔ حضرت علیؓ کے فرمان کا یہ منشاء ہے کہ قاضی کو کسی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف کر دینے کا حق نہیں ہے، نہ نکاح پر نکاح ہونا ممکن ہے۔ جب شہادت سے نکاح ثابت ہو گیا تو قاضی عند اللہ ماخوذ نہ ہو گا کیونکہ اس کے فیصلہ کی بناء شہادت پر ہے لہٰذا اس کا حکم ظاہراً دنیا میں بھی نافذ ہو گا اور عند اللہ بھی اس سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ عذاب رہے گا تو جھوٹے مدعی اور غلط گو شاہدوں کی گردن پر۔ قاضی کا حکم ظاہراً و باطناً جاری ہونے کا مطلب بظاہر امام صاحبؒ کے نزدیک بھی یہی ہے کہ گویا امام صاحبؒ کے نزدیک بھی دیانۃً حرام چیز حلال نہیں ہو جاتی گو قضاء انفاذ ہو گیا ہو اور قاضی عند اللہ ماخوذ نہ ہو کیونکہ حضرت ام سلمہؓ کی روایت کردہ حدیث جو صحیحین میں مذکور ہے اور حضرمیؒ والی حدیث کا امام صاحب نے انکار نہیں کیا، حضرمی والی حدیث کا تعلق گو ایک زمین کے دعویٰ سے تھا لیکن صحیحین کی حدیث تو عام ہے عقود کا استثناء کس طرح اپنی رائے سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ درایت اسلامی کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ خدا کا فیصلہ حرمت قاضی کے فیصلہ ملت کے تابع کس طرح ہو سکتا ہے۔ حضرت علیؓ جو واقف اسرار شریعت تھے فرمان رسول اللہ ﷺ کے خلاف فیصلہ کر دیں اس کا امکان ہی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کا مطلب بھی وہی تھا جو ہم نے اوپر لکھ دیا کہ قضاء کی بناء شہادت پر ہے۔ شہادت سے نکاح ثابت ہو گیا قضاء نافذ ہو گئی اور قاضی عند اللہ ماخوذ بھی نہیں ہوا۔ اب مزید قضاءً نکاح کا کوئی حاصل نہیں، رہا دیانۃً نکاح تو اس کا اختیار قاضی کو نہیں۔ قاضی کے فیصلہ سے حرام چیز مدعی کے لئے حلال نہیں ہو جائے گی، واللہ اعلم۔ امام صاحبؒ کا یہ قول ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں عام طور پر مذکور ہے مگر نفاذ باطنی کی وہ تشریح جو سرخسی نے کی ہے کتب فقہ میں مذکور نہیں۔ امام محمدؒ چونکہ صرف نفاذ ظاہری کے قائل ہیں اور دیانۃً حلت کے قائل نہیں اس لئے غالباً سرخسی نے یہ سمجھ لیا کہ امام صاحبؒ قاضی کی قضاءً تحلیل کو عند اللہ بھی تحلیل مانتے ہیں۔ اسی فہم کی بناء پر محیط اور مبسوط میں سرخسی نے مختلف مسائل نکاح و طلاق کا تفرع کیا اور مختلف کتب فقہ نے اس تشریح کو اخذ کیا یہاں تک کہ صاحب ہدایہ نے بھی کتاب النکاح میں حضرت علیؓ کے قول مذکور کا یہی مطلب قرار دیا حالانکہ انہی کتابوں میں قضاء اور دیانت کا فرق موجود ہے۔ قضاءً نفاذ کو دیانۃً نفاذ نہیں قرار دیا گیا ہے۔ شامی اور عالمگیری میں صاف صراحت ہے کہ اگر عورت طلاق کا دعویٰ کرے اور گواہ نہ ہوں اور مرد منکر ہو تو اگر عورت حقیقت میں اپنے دعویٰ میں سچی ہو اور ثبوت سے قاصر ہو اور قاضی اس کے خلاف فیصلہ کر دے تب بھی عورت کے لئے مرد سے قربت دیانۃً جائز نہیں، جہاں تک ممکن ہو اپنے کو بچائے، ایک جگہ رہ کر نہ بچ سکے تو بھاگ جائے الخ۔ ممکن ہے اس کا جواب یہ دیا جائے کہ امام محمدؒ کے قول پر چونکہ فتویٰ ہے اس لئے فتاویٰ کی کتابوں میں ان مسائل کا بصورت مذکورہ اندراج ہے۔ امام صاحبؒ کا قول اس کے خلاف ہے جو مفتی بہ نہیں ہے لیکن یہ جواب بطریق تنزل ہے۔ امام صاحبؒ کے قول کا مطلب جب سرخسی کی تشریح کے مطابق مان لیا گیا اور امام محمدؒ کے قول کو اس کے خلاف ہے قرار دے دیا گیا تو مسائل متفرعہ میں بھی اختلاف قائم رکھا گیا اور پھر امام محمد کے قول پر فتویٰ ہونے کی صراحت کی گئی ورنہ اگر امام کے قول اور حضرت علیؓ کے فرمان و شاہد اک زوجاک کا مطلب وہ تسلیم کر لیا جائے تو اس تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور حضرت ام سلمہؓ کی صحیحین والی روایت اور حضرت علیؓ کے فیصلہ میں بھی کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

marfat.com

ابن عباسؓ سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے بطریق عوفی حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ لوگوں نے چاند کا حال جناب رسالت مآب ﷺ سے دریافت کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ چاند کیوں پیدا کیا گیا ہے اسی پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (فرما دیجئے کہ یہ وقت ہیں لوگوں کے (معاملات) کے لئے اور حج کے واسطے) اگر چاند کے مختلف ہونے اور تغیر و تبدل کی حکمت کا سوال ہو تو یہ جواب مطابق سوال کے ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ حکمت اس تغیر و تبدل میں یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ان کے معاملات دینی و دنیوی میں علامت ہو جائے کہ اس سے اپنے کاروبار کا وقت مقرر کر لیں۔ مثلاً حج کا وقت، روزہ کا وقت اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر چاند کے حالات بدلنے کی علت کا سوال ہو تو اس وقت بظاہر جواب مطابق سوال کے نہیں بنتا، لیکن نظر تحقیق سے دیکھا جائے تو نہایت عمدہ اور حکیمانہ جواب ہے۔ گویا حاصل جواب کا یہ ہے کہ سائل کے حال کے لائق یہ ہے کہ چاند کے اختلاف حال کا فائدہ اور نفع دریافت کرے، علت کی تحقیق سے کچھ نفع نہیں اس میں اشتغال بے فائدہ ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اس سے بچے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علوم[1] غریبہ یعنی جن علوم سے دین کا کوئی فائدہ خاص نہیں ہے جیسے ہیئت اور نجوم وغیرہ میں عمر برباد کرنا جائز نہیں۔ مواقیت جمع میقات کی ہے۔ میقات، وقت سے اسم آلہ ہے اور مراد مواقیت سے اس مقام پر وہ ہے جس سے حج، روزہ، عدت، قرض اور دیگر معاملات کی مدت اور وقت معلوم ہو۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا (اور نیکی یہ نہیں کہ تم آؤ گھروں میں ان کے پچھواڑے سے) ابن کثیر اور ابن عامر اور حمزہ اور کسائی نے الفاظ ذیل میں یا کی وجہ سے حرف اول کو مکسور کر کے پڑھا ہے۔ البیوت، العیون۔ الشیوخ اور ابن عامر اور حمزہ اور کسائی نے جیوبھن کو اور حمزہ اور ابو بکر نے العیوب کو بھی کسرۂ حرف اول سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے اپنی اصل کے موافق ضمہ سے پڑھا ہے۔ امام بخاریؒ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب احرام باندھ لیتے تھے تو گھروں میں دروازوں سے نہ آتے تھے بلکہ پچھواڑے

---

[1] عجیب تفرع اور استنباط ہے علوم دینیہ کون کون ہے اور علوم غریبہ کون کون اور کس علم دنیوی کی دین کے لئے ضرورت نہیں اور کس علم کی تحصیل بے کار ہے اس کا فیصلہ دشوار ہے علوم متداولہ سے ہر علم کا براہ راست یا بالواسطہ دین سے تعلق ہے۔ تفسیر اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث فقہ، اصول فقہ، تصوف، فرائض کلام وغیرہ علوم دینیہ ہیں صرف نحو، ادب، علم الامثال، عرب جاہلیت کا منظوم کلام اور خطبات مبادی۔ موقوف علیہ یا مددگار ہیں طب ہیئتہ نجوم، کیسٹری، پیتھالوجی اور سائنس کی تمام طبیعاتی شاخیں خصوصاً "وہ طبعی تنقیحات جو اسلامی سیاست و اقتدار کو مستحکم بنانے اور غیر مسلم اقتدار کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہیں سب کے سب اسلامی علوم ہی ہیں ستاروں کا طلوع غروب، مغارب اور مطالع کا پہچاننا لیل و نہار کی گردش، تعیین اوقات کی شناخت۔ نماز اور بکثرت اسلامی احکام کا علم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے قطبین کی سمت اور قبلہ کی جہت کو جاننا جغرافیائی حدود کو جانے بغیر کس طرح ممکن ہے پھر علم الاشکال۔ علم المساحت۔ علم الالوان۔ علم الحساب غرض تمام علوی اور سفلی طبعی تحقیقات عارف کے لئے معرفت کا دروازہ کھولتی ہیں اللہ کی قدرت صنعت حکمت، ربوبیت، حکومت اور الوہیت کا یقین پیدا کرتی ہیں، عارفانہ اور عالمانہ عقیدہ اگر مشاہدہ کی طرح بن جائے تو اس سے بڑھ کر مستحکم ایمان اور کونسا ہوتا ہے ہاں اگر علوم دنیوی اور مباحث دینی کو حصول دولت کا ذریعہ یا مکر و فریب کا جال یا فحاشی اور عیاشی کا آلہ یا محض تفریح مشغلہ بنالیا جائے تو یقیناً" یہ ناقابل عفو جرم ہے مگر جس طرح نوشت و خواند کی استعداد فعلی بہم پہنچانا مستحب یا مسنون یا واجب ہے۔ افسانہ نویسی اور بیہودہ داستانیں پڑھنا نوشت و خواند کی استعداد بہم پہنچانے کو ناجائز نہیں بنا سکتا حسن و عشق کے ناجائز ڈرامے اور ناول لکھنا پڑھنا فی نفسہٖ کتابت و قراءت کے جواز کے موانع نہیں ہو سکتے اسی طرح ہر وہ علم جس کو اصطلاح خاص میں دنیوی کہا جاتا ہے دینی ہے بشرطیکہ اس کی غرض دینی ہو۔ اشیاء کے احکام اغراض کے اختلاف سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ دنیوی یا دینی ہونے کا فیصلہ نصب العین پر مبنی ہے اس لئے حضرت مؤلف قدس سرہ کی یہ رائے کہ ہیئت نجوم وغیرہ علوم غریبہ میں دین کا کوئی خاص فائدہ ان میں نہیں محل تامل ہے۔

marfat.com

سے آیا کرتے تھے۔(اس کی وجہ انہوں نے یہ سوچی تھی کہ جن دروازوں سے آلودۂ معاصی و نجاسات ہو کر جاتے آتے ہیں احرام کی حالت میں انہی دروازوں سے آنا جانا برا ہے)اس پر حق تعالیٰ نے آیت کریمہ ولیس البرّبان تأ توا البیوت الآیہ نازل فرمائی۔اور ابن ابن حاتم اور حاکم نے حضرت جابرؓ کی روایت بیان کی ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ قریش خمس کہلاتے تھے۔انصار اور تمام عرب تواحرام کی حالت میں گھروں میں دروازوں سے نہ جاتے تھے اور قریش دروازوں سے آمدورفت رکھتے تھے۔ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ جناب رسول اللہ ﷺ بستان میں تھے۔جب آپ وہاں سے تشریف لانے لگے تو دروازہ سے نکلے۔حضور ﷺ کے ساتھ قطبہ بن عامر انصاری بھی نکلے۔لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ قطبہ ایک فاجر شخص ہے اور وہ بھی آپ کے ہمراہ دروازہ سے نکلا۔آپ نے اس سے پوچھا کہ تونے یہ کام کیوں کیا،اس نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں نے آپ ﷺ کو جس طرح کرتے دیکھا اسی طرح میں نے بھی کیا۔حضور ﷺ نے فرمایا میں دین باطل سے الگ ہوں۔قطبہ نے عرض کیا جو آپ کا دین ہے وہی میرا بھی دین ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ابن جریر نے ابن عباسؓ کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور عبد بن حمید نے قیس بن جبیر سے بھی اس کو روایت کیا ہے لیکن عبد بن حمید کی سند میں بجائے قطبہ بن عامر کے رفاعہ بن تابوت ہے۔علامہ بغویؒ نے اس قصہ کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ ایک روز جناب رسول اللہ ﷺ کسی انصاری کے گھر تشریف لے گئے اور آپ کے پیچھے رفاعہ بھی گئے اور دروازہ سے اندر داخل ہوئے۔زہریؒ نے اس کا شان نزول اس طرح بیان کیا ہے کہ چند انصاری جب عمرہ کا احرام باندھتے تھے تو اس کا التزام رکھتے تھے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان میں کوئی چیز (چھت وسائبان وغیرہ) حائل نہ ہو اور جب کوئی شخص اپنے گھر سے نکل کر عمرہ کا احرام باندھ لیتا تھا اور پھر اس کو گھر جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو دروازہ سے نہ جاتا تھا کیونکہ اگر دروازہ سے جائے گا تو چھت حائل ہو جائے گی اس لئے گھر میں جانے کی یہ تدبیر نکالی تھی کہ دیوار کو توڑ کر اندر جاتا تھا اور وہاں جا کر جو کام ہوتا تھا گھر والوں سے کہہ کر چلا آتا تھا۔جب رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دنوں میں عمرہ کا احرام باندھا اور آپ حجرہ میں دروازہ سے اندر تشریف لے گئے اور آپ کے پیچھے ایک شخص انصاری بنی سلمہ میں سے بھی گیا۔اس سے آگے پھر وہی قصہ ہے جو اول حدیث میں گزر چکا ہے۔ولیس البر کا ویسئلونک پر عطف ہے اس سے الگ نہیں ہے (اس لئے ربط کی ضرورت ہے) تو ان دونوں قصوں میں ربط کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ لوگوں نے شاید یہ دونوں باتیں ایک وقت میں ہی دریافت کی ہوں اور یا یوں کہو کہ جب اول انہوں نے چاند کا حال کہ جو ان کو کچھ نافع نہیں تھا اور نہ علم نبوی کے مناسب تھا دریافت کیا اور جو بات ان کے لئے نافع اور مفید تھی اور علم نبوت کے متعلق بھی تھی اس کا سوال نہ کیا اس لئے مناسب ہوا کہ اس کو بطور عطف کے ذکر کر دیا جائے گویا یہ فرمادیا کہ لائق یہ ہے کہ ایسی ایسی باتیں پوچھیں۔اور گھروں میں آنے جانے کے قصہ کو ماقبل سے مربوط ہونے کی ایک اور بھی وجہ لطیف ہے وہ یہ ہے کہ ممکنات کے حقائق کا بے سود سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے گھر میں پچھواڑے سے جانا اور دروازہ کو چھوڑ دینا کیونکہ علوم کے اندر مشغول ہونا ایسا ہے جیسے گھر میں داخل ہونا اور ظاہر ہے کہ گھر میں داخل ہونے اور گھر سے منتفع ہونے کے لئے دروازہ موضوع ہے،ان حقائق کے منافع اور پھر ان سے صانع کو دریافت کرنا ہے،نہ مباحث ہیئۃ وغیر کو حاصل کرنے کی تکلیف اٹھانا ان سے تو کوئی دینی فائدہ وابستہ نہیں۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ج (بلکہ نیکی اس کی ہے جو پرہیز گاری کرے) اس کے صحت حمل کی وجہ اور قرأت کا اختلاف رکوع لیس البر میں بیان ہو چکا اس لئے حاجت اعادہ کی نہیں۔

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (اور آؤ گھروں میں ان کے دروازوں کے طرف سے) یعنی گھروں میں احرام کی حالت میں ہمیشہ کی طرح دروازوں سے داخل ہو۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور ڈرو اللہ سے) یعنی جو اشیاء تم پر حرام کر دی گئیں ان سے بچو۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ (تاکہ نیکی سے فائز ہو) واحدی نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان

کیا ہے کہ جب کفار نے نبی ﷺ کو سال حدیبیہ میں بیت اللہ سے روک دیا اور پھر مشرکین نے اس پر صلح کی کہ سال آئندہ آپ پھر تشریف لائیں اور جب یہ خوف ہوا کہ شاید کفار بد عہدی کریں اور مثل سال سابق بیت اللہ سے روک دیں اور قتال شروع کر دیں اور صحابہؓ بلد حرام میں قتال کو مکروہ جانتے تھے اس تردد اور پریشانی کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (لڑو اللہ کی راہ میں)

الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (ان سے جو تم سے لڑائی کریں) ان سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن سے لڑائی کا اندیشہ ہو۔

وَلَا تَعْتَدُوا (اور زیادتی نہ کرو) یعنی عورتوں اور بچوں اور بہت بوڑھوں اور راہبوں اور صلح کرنے والوں کو قتل نہ کرو۔ بریدہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ جب کہیں لشکر بھیجتے تھے تو (بطور وصیت) فرماتے کہ اللہ کے نام پر اور اللہ کی راہ میں غزوہ کرو جو اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان سے قتال کرو اور قتال میں حد سے مت تجاوز کرو اور بد عہدی نہ کرو اور عورت اور بچہ اور بوڑھے کو قتل نہ کرو۔ اس حدیث کو بغویؒ نے روایت کیا ہے اور مسلم نے ایک حدیث طویل اسی مضمون کی نقل کی ہے۔ اس میں اس قدر مضمون اور ہے کہ مثلہ نہ کرو۔ اور بچہ کو قتل نہ کرو۔ اور عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے (لشکر بھیجنے کے وقت) فرمایا کہ اللہ کے نام پر اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر جاؤ، بہت بوڑھے کو اور بچے کو اور عورت کو قتل نہ کرنا، غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور غنیمتوں کو جمع کر لینا اور اپنے سب حالات کو درست رکھنا اور احسان کرنا۔ بے شک نیکی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتے ہیں۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے اس تفسیر کے موافق یہ آیت محکم ہو گی منسوخ نہ ہو گی۔ ابن عباس اور مجاہدؒ کا بھی یہی قول ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ ابتداء اسلام میں حق تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مشرکین کے قتل کرنے سے روک دیا تھا پھر جب حضور ﷺ مدینہ کو ہجرت فرما گئے تو اس آیت میں حکم دے دیا جو تم سے قتال کرے اس سے تم بھی قتال کرو۔ ربیع فرماتے ہیں کہ جہاد کے بارے میں یہ آیت اول نازل ہوئی پھر اس کے بعد یہ حکم ہو گیا اقتلوا المشرکین کافۃ یعنی تمام مشرکین کو قتل کرو خواہ ان میں سے کوئی تم سے قتال کریں یا نہ کریں۔ اس تقدیر پر ولا تعتدوا کے معنی یہ ہوں گے کہ تم ابتدا قتال کی مت کرو۔ اس تفسیر پر یہ آیت منسوخ ہو گی۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۱۹۰﴾ (بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو) یعنی اللہ حد سے بڑھنے والوں کے ساتھ ارادہ خیر کا نہیں کرتا۔

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ (اور مار ڈالو ان کو جہاں کہیں پاؤ) مقاتل بن حبان کا قول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام سے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ مخصص ہے اقتران کی وجہ سے جیسا کہ ارشاد باری واحل اللہ البیع و حرم الربوا اس لئے کہ ناسخ متراخی ہوتا ہے۔ ثقف کسی شئے کو تیزی سے اچھی طرح پالینا علم ہو یا عمل۔ یہ لفظ غلبہ کو متضمن ہے تو معنی یہ ہیں کہ جس جگہ ان کے قتل پر تم قادر ہو۔

وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ (اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے) یعنی مکہ سے اور یہ فتح مکہ کے دن ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو مسلمان نہ ہوئے تھے۔

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور فساد قتل سے بڑھ کر ہے) فتنہ سے مراد ہے کفار کا خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا اور مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا۔ اشد کے یہ معنی ہیں کہ باعتبار گناہ کے اللہ کے نزدیک بہت برا ہے۔ اور قتل سے یہ مطلب ہے کہ مسلمان ان کو قتل کریں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ قتل ایک خاص وقت میں مباح کر دیا تھا۔ علامہ ابن جریر نے حضرت مجاہد اور ضحاک اور قتادہ اور ربیع اور ابن زید کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔

marfat.com

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (اور نہ لڑوان سے مسجد حرام کے پاس) یعنی حرم کے پاس۔

حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ (جب تک کہ نہ لڑیں وہ تم سے اس جگہ، پس اگر وہ لڑیں تم سے تو قتل کروان کو) یعنی حرم میں اگر وہ قتال شروع کریں تو تم بھی ان سے وہیں لڑو۔ حمزہ اور کسائی نے وَلَا تقاتلوھم حتی یقتلو کم فان قتلوکم الخ میں لَا تَقْتُلُوْا، یَقْتُلُوْا، قتلوا کو چاروں جگہ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اس تقدیر پر یہ الفاظ قتل سے ہوں گے، مقاتلہ سے نہ ہوں گے اور معنی یہ ہوں گے کہ مت قتل کرو بعض کفار کو جب تک کہ وہ نہ قتل کریں تم میں سے بعض کو۔ چنانچہ عرب قَتَلَنَا بنو فلان (ہم کو فلاں قبیلہ نے قتل کیا) بولتے ہیں اور مراد یہ لیتے ہیں کہ ہمارے میں سے بعض کو قتل کیا۔ اور باقی قراء نے اول کے تین مقاموں میں الف سے پڑھا ہے اور آخر میں بے الف پڑھا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا کہ بلد حرام میں ابتداقتال کی کرنا حلال نہ تھی۔ پھر آیت وقاتلوھم حتّٰی لاتکون فتنة (اور لڑوان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد) سے یہ حکم منسوخ ہو گیا، یہ قول قتادہ کا ہے۔ مقاتلؒ نے فرمایا ہے کہ اس حکم کو سورۂ براۃ کی آیت سیف نے منسوخ کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک حق یہ ہے کہ اس آیت کا حکم باقی ہے منسوخ نہیں ہے قتال کی ابتدا کرنا حرم میں اب بھی ویسے ہی حرام ہے اور یہی قول مجاہد اور بہت سے علماء کا ہے۔ اس قول کی تائید بخاری و مسلم کی یہ حدیث کرتی ہے کہ ابن عباس وابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز فرمایا کہ اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش کے دن با حرمت کیا ہے اس لئے قیامت تک اللہ کا حرام کردہ حرام رہے گا۔ مجھ سے پہلے کسی کو اس میں قتل و قتال کی اجازت نہیں ہوئی اور میرے واسطے بھی دن کی ایک ساعت کے لئے صرف حلال ہوا ہے اس کے بعد بدستور قیامت تک حرام ہے۔ یہاں کی گھاس کانٹا وغیرہ نہ کاٹا جائے نہ یہاں کا شکار بھگایا جاوے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مکہ میں ہتھیار اٹھانا کسی کو حلال نہیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ (یہی سزا ہے کافروں کی) یعنی جیسا انہوں نے کیا ہے ایسا ہی ان کے ساتھ کیا جائے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ (پھر اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے) یعنی اگر یہ قتال اور کفر سے باز رہیں تو گزشتہ خطائیں اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بندوں پر رحمت کرنے والا ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ (اور لڑوان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور رہ جائے طریقہ ایک اللہ کا) وقاتلوھم میں ضمیر هُمْ مشرکین کی طرف راجع ہے۔ فتنہ سے مراد شرک اور فساد ہے۔ ویکون الدین الخ یعنی اطاعت اور عبادت اللہ وحدہ لاشریک کی رہ جائے، غیر کو معبود نہ بنایا جائے۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھ کو قتال کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ لوگ شہادت دیں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب ان امور کو کریں گے تو اپنی جان ومال کو مجھ سے بچالیں گے لیکن ان کے جان و مال میں اگر حق اسلام ہوگا تو وہ باوجود ان امور کے لیا جائے گا اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بت پرست سے اسلام ہی قبول کیا جائے اسلام سے اگر انکار کرے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کیونکہ کفر میں بت پرست اور مجوسی اور کتابی سب برابر ہیں۔ دین مقبول تو حق تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور فتنہ جس طرح بت پرست سے ہوتا ہے ایسا ہی کتابی اور مجوسی سے بھی ہوتا ہے اور اطاعت اور قبول جزیہ سے دونوں کا فتنہ جاتا رہتا ہے۔ اور جزیہ کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے قول حتّٰی یعطوا الجزیة الخ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو کسی سے بھی جزیہ قبول نہ کیا جاتا۔ جب اس آیت سے اہل کتاب سے جزیہ کا لینا معلوم ہوا تو

marfat.com

مجوسی اور بت پرست سے بھی لینا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قیاساً ثابت ہوا کیونکہ دین باطل کے اندر سب شریک ہیں اور سوائے ابو حنیفہؒ کے اور ائمہ کے نزدیک ثابت نہیں ہوا اور عنقریب سورۂ توبہ میں ہم جزیہ کا مسئلہ ذکر کریں گے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا (پھر اگر وہ باز آجائیں) یعنی اگر جزیہ دے کر حرب اور شرک سے باز رہیں تو پھر ان پر قتل اور قید کرنے اور لوٹنے کی راہ نہیں فان انتھوا کی فاء تعقیب کی ہے۔ اور

فَلَا عُدْوَانَ (تو کسی پر زیادتی نہیں) اس میں فاء جزائیہ ہے۔

اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ (سوائے ظالموں کے) یعنی جو ان میں سے شرک اور حرب پر باقی ہیں ان پر اب بھی قتل اور قید کی زیادتی باقی ہے۔ ابن عباسؓ نے عدوان کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔ (یعنی راہ نہیں ہے) جیسا کہ آیت اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ میں بھی عدوان کی یہی تاویل ہے۔ اور یا یہ کہا جائے کہ عدوان (زیادتی) کی جزاء کا مشاکلۃ کے طور پر عدوان نام رکھ دیا گیا ہے جیسا کہ آیت فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (زیادتی کرو اس پر جیسا کہ زیادتی کی اس نے تم پر) میں جزائے اعتدا کا نام اعتدا قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر کفار قتال سے باز رہیں تو پھر زیادتی کرنے کا گناہ ان پر ہی ہے جو ظالم ہیں یعنی اگر تم نے باز رہنے والوں سے تعرض کیا تو تم ظالم ہو گے۔ اس تفسیر پر یہ معنی پہلے معنی کے بالکل عکس ہو گئے۔ مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے جناب سرور کائنات ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر میری کسی کافر سے مڈ بھیڑ ہو جائے اور دونوں آپس میں لڑیں پھر وہ میرے ایک ہاتھ پر تلوار مار کر اس کو کاٹ ڈالے پھر کسی درخت کی آڑ میں مجھ سے بچ جائے اور جب میں اس کو قتل کرنے کا قصد کروں تو لا الٰہ الا اللہ بول اٹھے تو آیا میں اس کو اس کلمہ کے کہنے کے بعد قتل کروں۔ فرمایا اس کو مت قتل کر کیونکہ بالفرض اگر تو نے قتل کر دیا تو قتل کرنے سے پہلے جو تیرا مرتبہ تھا وہ اس کا اب ہے اور کلمہ پڑھنے سے پہلے جس مرتبہ میں وہ تھا وہ تیرا اب (قتل کرنے کے بعد) ہو گا۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے قتادہؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ اور آپ کے اصحابؓ عمرہ کی نیت سے مدینہ منورہ سے ذیقعد ٦ ھ میں چلے اور ہدی ان کے ساتھ تھی۔ جس وقت حدیبیہ میں پہنچے، تو حضور کو مشرکین نے روک لیا۔ آخر کار اہل مکہ سے اس پر مصالحت ہوئی کہ اس سال تو آپ تشریف لے جاویں اور سال آئندہ تشریف لائیں جناب رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور اگلے سال ذیقعدہ ٧ ھ میں پھر تشریف لائے اور عمرہ ادا فرمایا اور مکہ معظمہ میں تین شب قیام فرمایا۔ مشرکین آپ کے روکنے پر فخر کرتے تھے اس پر حق تعالیٰ نے ذیل کی آیت کریمہ نازل فرمائی۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ (حرمت کا مہینہ بدلہ میں ہے حرمت کے مہینے کے اور حرمت کی چیزوں میں برابری سرابری ہے) پہلے الشھر الحرام سے مراد ذیقعدہ ٧ ھ ہے جس میں مکہ میں گئے اور عمرہ ادا کیا اور دوسرے الشھر الحرم سے چھ ذیقعدہ ٦ ھ ہے کہ جس میں مشرکین نے روک لیا تھا۔ قصاص کے معنی مساوات (برابری) کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حرمت کی شئے میں برابری جاری ہوتی ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت گزشتہ وقاتلوا فی سبیل اللہ الخ کے لئے بمنزلۂ علت کے ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب سال آئندہ جناب رسول اللہ ﷺ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو مسلمانوں کو یہ خوف ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ مشرکین اپنا عہد پورا نہ کریں اور سال گزشتہ کی طرح پھر بیت اللہ سے روکیں اور حرم اور احرام اور ماہ حرام میں قتال واقع ہو جائے۔ اس پر حق تعالیٰ نے آیت الشھر الحرام بالشھر الحرام الخ نازل فرمائی۔ مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! اگر مشرکین ماہ حرام کی حرمت کی پروانہ کریں اور تم سے قتال کریں تو تم بھی قتال کرو کیونکہ یہ ان کے کرتوت کا بدلہ ہے یہ تفسیر مضمون لاحق فمن اعتدی الخ کے بہت مناسب ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (جو زیادتی کرے تم پر تم زیادتی کرو اس پر) یعنی

marfat.com

اگر کوئی باحرمت مقام باحرمت ماہ اور احرام کی حالت میں تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو۔ اعتدا (زیادتی) کی جزا کو اعتداء کہنا صرف لفظی مشابہت ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور ڈرتے رہو اللہ سے) یعنی جس سے شئے کی تم کو اجازت نہیں دی گئی اس میں اللہ سے ڈرو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ (اور جانو اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے) یعنی ان کی مدد[1] کرتا ہے اور ان کے حال کی اصلاح فرماتا ہے۔

مع وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ (اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو (یعنی اپنے آپ کو) ہلاکت میں) سبیل اللّٰہ سے مراد جہاد ہے۔ بایدیکم میں باز ائدہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اصل کلام اس طرح تھا کہ لاتلقوا انفسکم بایدیکم (یعنی اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو[2]) القا کا تعدیہ الیٰ سے اس واسطے ہوا ہے کہ القاء معنی انتہاء کو شامل ہے[3] اور القی بیدہ عرب جب ہی بولتے ہیں جب کوئی شر اور ضرر رس چیز میں اپنے کو مبتلا کر دے۔ تھلکہ اور ہلاک ہم معنی ہیں۔ بعض نے کہا جس شئے کا انجام کار ہلاک ہو اس کو تھلکۃ کہتے ہیں اور بعض نے فرمایا ہے۔ جس شئے سے بچنا ممکن ہو اس کو تھلکہ کہتے ہیں اور جس سے ناممکن ہو اس کو ہلاک بولتے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت حذیفہؓ کی روایت بیان کی ہے کہ آیت ولا تلقوا الخ جہاد کے اندر خرچ کرنے کے باب میں نازل ہوئی ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی اور ابن حبان اور حاکم وغیرہ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا قصہ یوں ہوا تھا کہ جب حق تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دیا اور حامی اسلام بکثرت ہو گئے تو ہم میں سے بعض لوگوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی کی کہ اب تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دے دیا (یعنی جہاد کی ضرورت نہیں) اور اس زمانۂ قتال میں ہمارے بہت سے مال جو برباد اور تباہ ہو گئے آؤ ان کا کچھ تدارک کریں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔ اس کے رد فرمانے کو حق تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ تھلکہ سے مال کی اصلاح اور تدارک نقصان اور جہاد چھوڑ بیٹھنا مراد ہے۔

میں کہتا ہوں معنی آیت کے یہ ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم جہاد چھوڑ بیٹھے تو تمہارا دشمن تم پر غالب آجائے گا، پھر تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد پھر ابوایوب انصاریؓ ہمیشہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو کر قسطنطنیہ کی شہر پناہ کے نیچے مدفون ہوئے۔ قسطنطنیہ والے ان کے وسیلے سے بارش کی دعا کرتے ہیں۔ اور ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مر گیا اور اس نے جہاد نہ کیا اور نہ اس کے جی میں کبھی جہاد کا خیال آیا تو وہ نفاق کی ایک شاخ لے کر مرا۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت بخل اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی، یہ قول حذیفہ اور حسن اور قتادہ اور عکرمہ اور عطا کا ہے اور ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ چنانچہ طبرانی نے بسند صحیح ابوجبیرہ بن الضحاک سے روایت کیا ہے کہ لوگ اللہ کی راہ میں صدقہ کرتے تھے اور خوب فقراء کو دیتے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ قحط نے گھیر لیا لوگوں نے صدقہ وخیرات کرنی چھوڑ دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور محمد بن سیرین اور عبیدہ سلمانیؒ فرماتے ہیں کہ تھلکۃ میں

---

[1] یعنی اللہ نہ جسم ہے نہ جسمانی، نہ وہ کسی چیز میں حلول کر سکتا ہے۔ ہاں ہر چیز اس کے زیر حکم ہے اس لئے متقین کے ساتھ خدا کے ہونے کی حقیقی مفہوم یہاں مراد نہیں، نہ معیت زمانیہ مقصود ہے، نہ معیت مکانیہ، بلکہ اس کی مدد اور نصرت کا ساتھ ہونا اور اصلاح حال فرمانا مراد ہے۔

[2] یعنی دوسری مفعول پر بجائے فی کے الیٰ اس لئے استعمال کیا کہ یہاں القاء کا سادہ معنی مراد نہیں ہے بلکہ ڈالنے سے مراد ہے ڈال کر پہنچانا یعنی اپنے نفسوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت تک نہ پہنچاؤ اور چونکہ پہنچاؤ فعل، مفعول دوئم پر الیٰ کو چاہتا ہے اس لئے لاتلقوا کے بعد الی التھلکۃ فرمایا۔

[3] یعنی القاء کا مطلق معنی تو ہے ڈالنا خواہ برائی میں یا اچھائی میں لیکن اگر القی بیدہ کہا جائے تو برائی اور ضرر میں ڈالنے کو ہی کہتے ہیں۔

marfat.com

ہاتھوں کو ڈالنے سے مراد اللہ کی رحمت سے ناامیدی کی ہے کہ لوگوں کی حالت یہ تھی کہ جب کسی سے گناہ سرزد ہو جاتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ بس اللہ تعالیٰ مجھ کو نہ بخشیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت ولا تلقوا الخ نازل فرمائی۔ یہ حدیث حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بھی آئی ہے۔

وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ (اور نیکی کرو بے شک اللہ محبت کرتا ہے نیک لوگوں سے) یعنی اپنے اعمال اور اخلاق کو درست اور نیک کرو۔ اور حاجت مندوں سے بھلائی کرو۔ جاننا چاہئے کہ خوبی عبادات میں بھی ہوتی ہے اور معاملات میں بھی۔ عبادات کی خوبی وہ ہے جو ایک طویل حدیث کے تحت میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ فرمائیے خوبی کیا چیز ہے، فرمایا خوبی یہ ہے کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کر کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھ کو دیکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور قلب اور خشوع اور خضوع سے عبادت کر اور معاملات میں خوبی وہ ہے جس کی صراحت رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے کہ جو تو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ ہی لوگوں کے لئے پسند کر اور جو اپنے لئے برا جانتا ہے وہ ہی لوگوں کے لئے برا جان۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے معاذ بن جبلؓ سے روایت کیا ہے اور فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ ہوں۔ اس حدیث کو اصحاب سنن نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور احمدؒ نے عمر بن عبسہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تم میں سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جس کے اخلاق پسندیدہ ہوں۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امور میں خوبی کردار کو فرض فرمایا ہے پس جب تم قتل کرو تو اس کو اچھی طرح کرو (یعنی مثلاً ناک، کان مت کاٹو بچہ، عورت بڈھے، کو مت قتل کرو) اور جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، چھری کو تیز کر لو اور جانور کو راحت دو۔ اس حدیث کو مسلم نے شداد بن اوسؓ سے روایت کیا ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ (اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے) یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حج اور عمرہ اور ان کا پورا کرنا اور حج کو عمرہ سے فسخ نہ کرنا جملہ امور واجب ہیں۔ حج پر تو اجماع ہو چکا ہے کہ حج فرض عین محکم غیر قابل نسخ ہے اور اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وللّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا (اور اللہ کا فرض ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جس کو مقدور ہو اس تک پہنچنے کا) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

۱۔ اول گواہی دینا اس امر کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، ۲۔ دوسرے قائم کرنا نماز کا، ۳۔ تیسرے ادا کرنا زکوٰۃ کا، ۴۔ چوتھے حج، ۵۔ پانچویں روزے رکھنا رمضان کے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور اس مضمون کی بہت حدیثیں ہیں۔ رہا عمرہ سو امام احمدؒ کے نزدیک عمرہ واجب ہے اور امام شافعیؒ کے دو قول ہیں۔ صحیح تر یہی ہے کہ عمرہ واجب ہے اور امام ابو حنیفہؒ سے وجوب مروی ہے اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ عمرہ سنت ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی مذہب مشہور یہی ہے۔ اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے کہ سنت ہے۔ جو لوگ سنیت کے قائل ہیں ان کے نزدیک تاویل آیت اس طرح ہو گی کہ عمرہ شروع کر لینے سے پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور حج کی بھی یہی شان ہے امام احمدؒ کے مذہب (وجوب عمرہ) کی تائید علقمہ اور ابراہیم نخعی کی قرأت واتموالحج والعمرة للّٰه سے ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ کی بھی یہی قرأت ہے اور بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرہ واجب ہے۔

چنانچہ چند احادیث نقل کی جاتی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت عمر بن خطابؓ کے حوالہ سے تعلیم جبرئیل کی حدیث میں روایت کرتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھ کو خبر دیجئے کہ اسلام کیا ہے فرمایا اس امر کی گواہی دینا کہ کوئی معبود سوائے اللہ کے نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قائم کرنا نماز کا اور ادا کرنا زکوٰۃ کا اور حج و عمرہ کرنا اور جنابت سے غسل کرنا اور وضو کو پورا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔ عمرہ کا ذکر اگرچہ صحاح میں نہیں ہے، لیکن اور ثقات نے اس کو روایت کیا ہے اور دار قطنی نے اس کو صحیح کہا ہے، نیز عمرہ کا ذکر ابو بکر جوسعی نے اپنی کتاب میں کیا ہے اس لئے یہ مقبول ہے۔

marfat.com

اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا عورتوں پر بھی جہاد ہے۔ فرمایا ان پر ایسا جہاد ہے کہ اس میں قتال نہیں، وہ حج اور عمرہ ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ضعیف ہیں کہ ان کو ہم ذکر نہیں کرتے ہیں اور آثار صحابہؓ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عمرہ واجب ہے۔ مجملہ ان کے یہ ہے کہ ضبی بن معبدؒ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ میں نے حج اور عمرہ دونوں کا بہ نیت فرض احرام باندھ لیا۔ فرمایا تجھے طریقہ رسول اللہ ﷺ پر چلنے کی توفیق عنایت کردی گئی۔

حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کوئی صاحب مقدور ایسا نہیں کہ حج اور عمرہ اس پر واجب نہ ہو۔ اس اثر کو ابن خزیمہؒ اور دار قطنیؒ اور حاکمؒ نے روایت کیا، سند اس کی سند صحیح ہے اور بخاری نے تعلیقاً اس کو ذکر کیا ہے اور اسی باب میں حضرت ابن عباسؓ کا اثر ہے کہ اس کو امام شافعیؒ نے ذکر کیا ہے اور بخاری اسے تعلیقاً لائے ہیں۔ اور جو لوگ عمرہ کے سنت ہونے کے قائل ہیں ان کا احتجاج اور استدلال ان احادیث سے ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے، کہ ایک اعرابی نے آکر عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ مجھے بتائیے کہ عمرہ واجب ہے یا نہیں حضور ﷺ نے فرمایا کہ واجب نہیں لیکن اگر کرے گا تو تیرے لئے بہتر ہے، اس حدیث کو ترمذیؒ اور امام احمدؒ اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے لیکن اس کے راویوں میں حجاج بن الطاة راوی مدلس اور متروک ہے۔ ابن مهدی اور عطان اور یحیٰی بن معین اور احمد بن حنبل اور ابن مبارک اور نسائی نے اس کو ترک کر دیا ہے، ہاں ذھبی نے اس کے بارہ میں لفظ صدوق (سچا) کہا ہے اور ترمذی نے اسی حدیث کو حسن صحیح کہا ہے اور بیہقی نے اسی حدیث کو ایک اور طریق سے روایت کیا ہے اس طریق میں یحیٰی بن ایوب ہے۔ اس کی نسبت امام احمد نے سئی الحفظ (برے حفظ والا) فرمایا ہے۔ اور ابو حاتم نے لا یحتج به (قابل استدلال نہیں) کے خطاب سے یاد کیا ہے اور ابن عدی صدوق (سچا) فرماتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت جابرؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ حج اور عمرہ دونوں فریضہ ہیں۔

ابن عدی نے ابن لھیعہ کے طریق سے اس حدیث کو روایت کیا ہے تو اس حدیث اور حدیث گزشتہ میں تعارض ہو گیا لیکن اس آخر کی حدیث میں ابن لھیعہ ضعیف ہے۔ ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص فرض نماز کے واسطے چلا اس کو مثل حج کے ثواب ملے گا اور جو نفل نماز کے لئے چلا اس کو مثل عمرہ کے ثواب ہو گا، اس حدیث کو طبرانی نے یحیٰی بن حارث کے طریق سے روایت کیا ہے۔ عبد اللہ بن قانع، ابو ہریرہؓ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے۔ اس حدیث کو امام شافعیؒ نے ابو صالح حنفی سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اور اسی مضمون کی حدیث طلحہ بن عبد اللہ اور ابن عباسؓ سے بھی بیہقی نے روایت کی ہے۔ دار قطنی نے عبد اللہ بن قانع کی نسبت کان یخطے (چوک جاتا تھا) کہا ہے۔ ترقانی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن شیخ تقی الدین نے کبار حفاظ (بڑے حافظوں) میں سے شمار کیا ہے۔ اور ابو صالح حنفی جس کا نام ماہان ہے۔ ابن حزم نے اس کی تضعیف کی ہے، لیکن ابن ھمام نے کہا ہے کہ اس کا ضعیف ہونا صحیح نہیں۔ ابن معین نے اس کی توثیق کی ہے اور ایک جماعت نے اس سے احادیث لی ہیں۔ اور طلحہؓ کی حدیث کی سند میں عمرو بن قیس راوی مجروح ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ رہی ابن عباسؓ کی حدیث سو اس کی سند میں بہت سے مجہول راوی ہیں۔ اور عمرہ واجب نہ ہونے میں آثار صحابہؓ کے بھی ہیں۔ ابن ھمام نے کہا ہے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ بہت اچھے مقتدا ہیں اس لئے ان کی اقتدا ضروری ہے۔ پس تحقیق یہ ہے کہ اس بارہ میں احادیث اور آثار سب متعارض ہیں، ابن ہمام نے فرمایا ہے کہ جب تعارض ہوا تو شک سے وجوب ثابت نہ ہو گا اور صاحب ھدایہؒ نے کہا ہے کہ تعارض کے ہوتے ہوئے فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی اور صاحب ہدایہ کا یہ قول نہایت مناسب ہے کیونکہ فرضیت کا مبنیٰ دلیل قطعی پر ہے اس لئے تعارض کے وقت احتیاطاً وجوب کا قائل ہونا بہتر ہے تاکہ تکرار نسخ لازم نہ آئے۔ جمہور علماء کا مذہب ہے کہ حج کو عمرہ سے فسخ کرنا جائز نہیں۔ ان کی دلیل یہی آیت و اتموا الحج الخ ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ حج کو عمرہ سے فسخ کرنا جائز ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حجتہ الوداع میں صحابہؓ کا احرام حج کا تھا جناب رسول اللہ ﷺ نے سب کو حکم فرمایا کہ حج کو فسخ کر کے عمرہ بنالیں اور فرمایا کہ ثم

marfat.com

اپنے حج کے احرام کو عمرہ بنالو مگر جس نے ہدی کے قلادہ ڈالا ہے وہ فسخ نہ کرے۔ اور دس سے زیادہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں ان سے شک زائل ہو جاتا ہے اور علم حاصل ہو جاتا ہے۔ مجملہ ان احادیث کے یہ ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو جناب رسول اللہ ﷺ نے یمن میں میری قوم کے پاس بھیجا جب میں وہاں سے واپس ہو کر آیا تو دیکھ کہ حضور ﷺ بطحا میں تشریف رکھتے ہیں، فرمایا تم نے کاہے کہ نیت کی ہے، میں نے عرض کیا جو حضور ﷺ نے نیت کی ہے وہ ہی میری ہے۔ پھر فرمایا کہ تمہارے پاس ہدی ہے میں نے عرض کیا نہیں پھر میں نے حضور کے حکم سے بیت اللہ اور صفامروہ کا طواف کیا۔ طواف کر کے حلال ہو گیا پھر ترویہ کے روز حج کا احرام باندھا۔ پھر جب حضرت عمرؓ کا زمانہ ہوا تو فرمایا کہ ہم کتاب اللہ پر عمل کریں گے اللہ تعالیٰ نے اتمام کا حکم فرمایا چنانچہ فرمایا واتموا الحج و العمرۃ للّٰہ اور حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ہدی کی قربانی ہونے تک احرام نہیں کھولا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ نے صرف حج کا احرام باندھا تھا۔ پھر جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیت اللہ اور صفامروہ کا طواف کر کے اپنے احرام کھول دو اور بال کترا ؤ پھر حلال ہو کر مقیم رہو۔ اور ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ صحابہؓ کو آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ حج کو عمرہ بنالیں۔ اور حضرت عائشہ و حضرت حفصہؓ سے بھی اسی مضمون کی حدیثیں مروی ہیں اور ان میں اتنا زیادہ ہے کہ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں احرام کھولتے، فرمایا میں نے اپنی ہدی کے قلادہ ڈالا ہے اس لئے میں نحر کرنے تک حلال نہیں ہوتا۔ اور ابن عمرؓ سے اسی مضمون کی حدیث مروی ہے اور یہ حدیثیں صحیحین میں ہیں۔ مسلم نے ابو سعید خدریؓ کی روایت بیان کی ہے کہ ہم نکلے اور حج کی لبیک پکارتے تھے حتیٰ کہ جب میں نے بیت اللہ کا طواف کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عمرہ بنالو لیکن جس کے پاس ہدی ہے وہ اپنے حال پر رہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر میرے ساتھ ہدی نہ ہوتی تو میں حلال ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کی احادیث حضرت براء بن عازبؓ اور ربیع بن صبرہؓ سے مروی ہیں۔ ہم نے منار الاحکام میں تفصیل سے لکھا ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ آیت واتموا الحج و العمرۃ الخ قطعی ہے اور قطعی کی تخصیص اور نسخ احادیث احاد سے جائز نہیں۔ تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ یہ احادیث بسبب کثرت شہرت کے اس حد تک پہنچی ہیں کہ اس واقعہ کا انکار نہیں ہو سکتا۔ نیز آیت واتموا الحج آیت فان احصرتم سے عام مخصوص بعض ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی ہے کہ واتموا کے عمومی حکم سے جناب رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو مخصوص فرمایا ہے، جس کا حج فوت ہو گیا ہو اور عمرہ کے افعال سے اس کے لئے حج سے نکلنے کی اجازت فرمائی ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے پس معلوم ہوا کہ یہ آیت ظنی الدلالت ہے اور خبر واحد سے اس کی تخصیص جائز ہے اور جمہور نے امام احمدؒ کے دلائل کا یہ جواب دیا ہے کہ فسخ حج جو ان احادیث سے مفہوم ہوتا ہے یہ صحابہؓ کے ساتھ خاص ہے اور خصوصیت کی دلیل یہ ہے کہ بلال بن حارثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ فسخ حج خاص ہمارے ہی لئے ہے یا سب کے واسطے۔ فرمایا نہیں بلکہ خاص ہمارے واسطے ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا حضرت عمرؓ سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ حج اور عمرہ میں فصل کرو کہ حج کو حج کے مہینوں میں ادا کرو۔ اور عمرہ کو ان مہینوں کے علاوہ۔ اس طرح تمہارا حج اور عمرہ پوری طرح ادا ہو گا۔

میں کہتا ہوں کہ غالباً یہ اس کا بیان ہے جو حضرت عمرؓ کے نزدیک افضل ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کو سوائے عبد العزیز بن محمد دراوردی کے کسی نے روایت نہیں کیا اور ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ حدیث قابل استدلال نہیں اور امام احمد فرماتے ہیں کہ کوئی حدیث صحیح اس مضمون کی نہیں ہے کہ فسخ حج خاص صحابہؓ کے لئے تھا۔ میں کہتا ہوں کہ عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ زمانہ رسول اللہ ﷺ میں دو متعہ تھے (ایک تو متعہ حج یعنی حج کو فسخ کرنا جو یہاں مراد ہے دوسرے متعہ نکاح جو بالاتفاق حرام ہے) میں ان کو حرام کرتا ہوں یعنی وہ حرمت جو رسول اللہ ﷺ سے میرے نزدیک ثابت ہے اس کو ظاہر کرتا ہوں پس حضرت عمرؓ کے اس قول سے وہ احادیث سب قابل العمل نہیں رہے۔ اگر یہ قول نہ ہوتا تو بے شک بلالؓ کی

marfat.com

حدیث ان احادیث کے دفع کے لئے کافی نہ تھی کیونکہ بظاہر ضعیف ہے لیکن حضرت عمرؓ کا قول اس حدیث کی صحت پر معنیً دلالت کرتا ہے۔ حضرت عثمانؓ سے کسی نے متعہ حج کے متعلق سوال کیا۔ فرمایا متعہ حج ہمارے لئے تھا تمہارے لئے نہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے بسند صحیح روایت کیا ہے اگر فسخ کا اختصاص صحابہؓ کے ساتھ حضرت عمرؓ و عثمانؓ کے نزدیک ثابت نہ ہوتا تو یہ دونوں جناب رسول اللہ ﷺ کے حکم کی کبھی مخالفت نہ فرماتے اور حضرت عمرؓ کے قول میں متعہ جو لفظ آیا ہے اس سے عمرہ سے حج کا فسخ کرنا مراد ہے۔ تمتع جو قرآن پاک سے ثابت ہے وہ مراد نہیں۔ اس کی مشروعیت پر تو اجماع منعقد ہے چنانچہ جب ضبی بن معبدؒ نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا تو حضرت عمرؓ نے ان کو فرمایا کہ تجھے اپنے نبی کی سنت کی توفیق مل گئی۔ اس حدیث کو ابو داؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

ایک شخص نے حج کی نیت کی تھی پھر عمرہ سے اس کو فسخ کر دیا۔ تو حضرت ابوذرؓ نے فرمایا یہ فسخ ان ہی لوگوں کے واسطے تھا جو جناب رسول ﷺ کے ہمراہ تھے۔ یہ قول ابوذرؓ کا بھی بلال بن حارثؓ کی حدیث گزشتہ کا مؤید ہے۔ دوسری روایت میں ہے۔ کہ حضرت ابوذرؓ کے اس اثر کو کوفہ کے ایک ایسے شخص نے روایت کیا ہے کہ وہ ابوذرؓ سے نہیں ملا۔ **میں کہتا ہوں** کہ اس سے اس اثر میں کوئی قدح نہیں کیونکہ اس تقدیر پر یہ اثر مرسل ہوگا اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے، واللہ اعلم۔

فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ (پھر اگر تم روک لئے جاؤ) یعنی اگر تم حج سے یا اس عمرہ سے جسکی تکمیل کا تم کو حکم دیا گیا ہے روکے جاؤ۔

علماء نے اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت حدیبیہ کے قصہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ امر ثابت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا حدیبیہ کے سال میں عمرہ کا احرام تھا، اس کے بعد آپ روک لئے گئے پھر آپ حلال ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ نے جو فرمایا ہے کہ احصار (روکنا حج یا عمرہ سے حج کے ساتھ خاص ہے عمرہ کی احصار سے حلال ہونا جائز نہیں یہ قول صحیح نہیں۔ احصر تم کے معنی یہ ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم مسلمان یا کافر دشمن کی وجہ سے یا مرض یا خرچ کے فنا ہونے یا عورت کے لئے محرم کے مرجانے کے سبب سے بیت اللہ تک پہنچنے سے روکے جاؤ۔ امام ابو حنیفہؒ نے احصار کی یہی تفسیر کی ہے کیونکہ احصار اور حصر کے معنی لغت میں منع (روکنا) ہے اب اس روکنے کا خواہ کچھ سبب ہو بلکہ اکثر استعمال تو اس لفظ کا اسی روکنے میں ہے جو مرض کی وجہ سے ہو۔ فراء اور کسائی اور اخفشؒ اور ابو عبیدہ اور ابن سکیت اور دیگر اہل لغت سے منقول ہے کہ احصار کا استعمال تو اس روکنے میں ہے جو مرض کے سبب سے ہو اور حصر کا استعمال اس رکاوٹ میں ہے جو دشمن کے سبب سے ہو۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے کہ تمام اہل لغت کا اس پر اجماع ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اہل لغت کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اکثر استعمال اس طرح ہے یہ مطلب نہیں کہ احصار کا استعمال مرض کے ساتھ اور حصر کا دشمن کے ساتھ خاص ہے۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو یہ اعتراض لازم آتا کہ آیت فان احصرتم دیکھو قصۂ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے اور وہاں مرض کی وجہ سے نہیں رکے تھے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ حصر اور احصار ہم معنی ہیں چنانچہ عرب بولتے ہیں حصرت الرجل عن حاجة (روکا میں نے اس شخص کو اس کی حاجت سے) اور احصرہ العدو دشمن نے چلنے سے روک دیا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ آیت اپنے عموم لفظ سے امام ابو حنیفہؒ کی دلیل ہے۔ اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمد جو فرماتے ہیں کہ حصر دشمن سے ہی ہوتا ہے، ان پر یہ آیت حجت ہے اور امام شافعیؒ نے حصر حدیبیہ کے بسند صحیح ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اسی لئے ائمہ ثلثہ کا قول ہے کہ یہ آیت دشمن کے ہی روکنے میں نازل ہوئی ہے۔

ہم جواب میں کہتے ہیں کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نزول کے سبب خاص کا اعتبار نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ سیاق آیت سے تو تخصیص مفہوم ہوتی ہے، چنانچہ آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فاذا امنتم (جب امن میں ہو تم) اور امن خوف سے ہی ہوتا ہے۔ تو ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس تقریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ احصار دشمن سے ہی ہوتا ہے بلکہ اس سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ دشمن سے جو روک ہو وہ بھی احصار ہے جیسے کہ آیت کریمہ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ (وہ عورتیں جن کو طلاق دی گئی ہے روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیض) اور آیت کریمہ وبعولتهن أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (اور ان

marfat.com

کے شوہر زیادہ حقدار ہیں ان کے لوٹا لینے کے) اس پر دال نہیں ہیں کہ مطلقات سے مراد فقط رجعی طلاق دی ہوئی عورتیں ہیں بلکہ اس پر دال ہے کہ رجع طلاق والیاں بھی المطلقات میں داخل ہیں۔ مرض کے سبب سے احصار کے ثبوت کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ ضباعۃ بنت زبیرؓ کے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ تونے حج کا ارادہ کیا ہے ضباعہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں تو بیمار ہوں (یعنی بوجہ مرض اندیشہ ہے کہ شاید حج کو تمام نہ کرسکوں) فرمایا نہیں حج کر اور شرط کرے، یہ کہہ دے کہ اے اللہ جس جگہ مرض کی وجہ سے تو مجھ کو روک دے گا۔ وہی میرے حلال ہونے کی جگہ ہوگی۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم نے ضباعہؓ کے قصہ کو ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ابو داؤد اور نسائی کی روایت اس طرح ہے کہ ضباعہؓ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں کیا مشروط ارادہ کرسکتی ہوں فرمایا ہاں! ضباعہ نے عرض کیا کس طرح کہوں فرمایا اس طرح کہو لبیک اللّٰھم لبیک محلی من الارض من حیث تحبسنی (یعنی میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں زمین کے جس حصہ میں تو مجھ کو روکے وہ ہی میرے حلال ہونے کی جگہ ہے) اس کہہ لینے سے تجھ کو اختیار ہو جائے گا کہ جہاں مرض کی وجہ سے آگے نہ جاسکے وہاں حلال ہو جائے۔ اس حدیث کو ترمذی نے صحیح کہا ہے لیکن مرسل ہے۔

عقیلی نے فرمایا ہے کہ ابن عباسؓ سے ضباعہ کا قصہ باسانید صحیحہ جیدہ مروی ہے اور ابن خزیمہؒ نے خود ضباعہ ہی سے اس کو روایت کیا ہے اور بیہقی نے انس اور جابرؓ سے اس قصہ کو روایت کیا ہے اور اسی حدیث سے امام احمد اور شافعیؒ نے مستنبط کیا ہے کہ اگر شرط کرلے تو اگرچہ احصار دشمن سے نہ ہوا ہو تب بھی حلال ہونا جائز ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمار، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے بھی شرط کرنا ثابت ہے۔ علامہ ابن جوزی نے فرمایا ہے کہ اگر مرض ہی حلال ہونے کو مباح کرنے والا ہے تو پھر شرط کرنا لغو ہے۔ حدیث ضباعہ کا ہم جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اس لئے آیت کے معارض نہیں ہوسکتی۔ اور بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ شرط کرنا منسوخ ہے۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے ایک حدیث مروی ہے اس سے منسوخ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں حسن بن عمارہ راوی متروک ہے۔ میرے نزدیک حدیث ضباعہ کے یہ معنی ہیں کہ یہ حدیث استحباب پر محمول ہے جس شخص کو یہ خوف ہو کہ میں مریض ہو جاؤں گا یا اور کسی عذر کا خیال ہو تو مستحب ہے کہ احرام کے وقت شرط کرلے تاکہ خلاف وعدہ لازم نہ آئے اگرچہ عذر کی وجہ سے یہ خلاف وعدہ جائز ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تائید عکرمہ کا وہ قول کرتا ہے جو حجاج بن عمر وانصاری سے مروی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کا کوئی عضو شکستہ ہو جائے یا لنگڑا ہو جائے (حالت احرام میں) وہ حلال ہو گیا اور آئندہ سال اس کے ذمہ ایک حج ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابو داؤد اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ لیکن علامہ بغویؒ نے اس کی تضعیف کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کو ضعیف کہنے کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سند میں یحییٰ بن کثیر پر آکر اختلاف ہوا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ اس حدیث کو یحییٰ نے عکرمہ سے اور عکرمہ نے حجاج سے روایت کیا ہے اس کے آخر میں اتنا زیادہ ہے کہ عکرمہ کہتے ہیں میں نے ابو ہریرۃ اور ابن عباسؓ سے اس حدیث کی نسبت پوچھا تو فرمایا حجاج نے سچ کہا ہے اور یحییٰ القطان کی روایت میں عکرمہ نے حجاج سے بلفظ سماع روایت کیا ہے (یعنی یہ کہا ہے کہ میں نے حجاج سے سنا ہے) اور ابو داؤد اور ترمذی نے عکرمہ اور حجاج کے درمیان میں عبداللہ بن رافع کو زیادہ کیا ہے۔

اور ترمذی نے فرمایا ہے کہ اس زیادتی پر معاویہؒ بن سلامہ نے معمر کی متابعت کی ہے اور میں نے محمد یعنی بخاری سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ معمر اور معاویہ کی حدیث اصح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ زیادتی صحت حدیث کے منافی نہیں، اس لئے کہ اگر عکرمہؒ نے خود حجاج سے سنا ہے تو فھو المراد، ورنہ عبداللہ بن رافعؒ جو واسطہ ہیں وہ بھی ثقہ ہیں اگرچہ بخاریؒ نے خود ان کے واسطہ سے روایت نہیں کیا۔ حافظ نے اسی طرح کہا

ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ عکرمہ نے حجاج سے بلاواسطہ اس حدیث کو سنا ہو اور بواسطہ عبداللہ بن رافع بھی حاصل کیا ہو، واللہ اعلم اور ہمارا مذہب حضرت ابن مسعودؓ سے بھی مروی ہے۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ (تو جو کچھ ہو سکے قربانی بھیجو) یہ یا تو مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت کی اس طرح ہے۔ فَعَلَيْكُمْ مَا اسْتَيْسَرَ الخ یا مبتدا محذوف کی خبر ہے اور تقدیر اس طرح ہے الواجب مَا استیسر الخ اور یا فعل محذوف کا مفعول اس کو مانا جائے یعنی اھد وامّا استیسر الخ "ہدی" یا اونٹ ہے یا گائے یا بکری اور بکری ادنیٰ درجہ ہے۔ یہ آیت امام مالکؒ پر حجت ہے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ محصر پر ہدی واجب نہیں اور جو لوگ ہدی کی واجب ہونے کے قائل ہیں ان میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ سے تو ایک روایت یہ ہے کہ اگر ہدی نہ ملے تو بکری کی قیمت کا کھانا مساکین کو کھلا دے اور اگر اس کا بھی مقدور نہ ہو تو ہر ایک مد غلہ کے عوض ایک دن روزہ رکھے۔ شافعیؒ نے اس کو دم جنایت پر قیاس فرمایا ہے اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں اور ایک روایت امام شافعیؒ سے بھی یہی ہے کہ بجز ہدی کے اور کچھ جائز نہیں کیونکہ بدلہ کا مقرر کرنا رائے اور قیاس سے جائز نہیں اور دم احصار کو دم جنایت پر بسبب فرق ہونے کے قیاس نہیں کر سکتے۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ (اور نہ منڈاؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی اپنے ٹھکانے) مَحِلّه کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ محل ہدی سے مراد حرم ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ثمّ محلّھا الی البیت العتیق (پھر ہدی کے اترنے کی جگہ بیت اللہ ہے) اور اس لئے کہ خون بہانا فی نفسہ تو عبادت نہیں ہے کسی زمانہ خاص یا مکان خاص میں ہو تو اس وقت یہ عبادت ٹھہر لیا جائے گا اور اس لئے اگر حرم میں ذبح نہ ہو تو عبادت نہ ہو گا اور جب ذبح عبادت نہ ہوا تو محصر حلال نہ ہو گا۔ اس لئے واجب یہ ہے کہ محصر ہدی کو حرم میں بھیجے اور ذبح کے لئے کوئی دن مقرر کر دے کہ فلاں دن ذبح کر دینا۔ جب وہ دن آئے، محصر حلال ہو جائے گا۔ ابو حنیفہؒ کے نزدیک ذبح کے لئے دسویں تاریخ کا ہونا ضروری نہیں

اور امام ابو یوسف اور محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر حج سے روکا گیا ہے تو دسویں ہی تاریخ کو جو یوم نحر کہلاتا ہے ذبح کرے۔ اس بنا پر ان کے نزدیک دن معین کرنے کی ضرورت نہیں اور امام مالک، شافعی اور احمدؒ نے فرمایا ہے محلّہ سے وہ موضع مراد ہے جہاں وہ روکا گیا ہے خواہ وہ جگہ حرم ہو یا حرم سے باہر، کیونکہ قصۂ حدیبیہ میں مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ جب عہد نامہ کے لکھنے سے فراغت ہوئی تو جناب رسول اللہ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا کہ اٹھو نحر کرو پھر بال منڈواؤ۔ حضور ﷺ نے تین بار یہ کلمات فرمائے لیکن کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھا[1] حتیٰ کہ خود حضور ﷺ نے اپنے اونٹ کو نحر کیا اور حجام کو بلا کر سر منڈا لیا۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو اٹھے اور نحر کیا اور آپس میں ایک دوسرے کا سر مونڈا اور غم کی وجہ سے یہ حالت تھی کہ ہو گویا ایک دوسرے کو قتل کرتا تھا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور یعقوب بن سفیان نے مجمع بن یعقوب کے طریق سے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ جب جناب سرور کائنات ﷺ اور آپ کے اصحاب روکے گئے تو حدیبیہ میں سب نے نحر کیا اور سر منڈایا اور اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی کہ اس نے سب کے بالوں کو حرم میں جا کر ڈال دیا۔ اور امام مالکؒ نے موطا میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحابؓ حدیبیہ میں حلال ہوئے تو ہدی کا نحر کیا اور سروں کو منڈایا اور ہر شئے سے حلال ہو گئے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ حدیبیہ حرم سے باہر ہے۔

حنیفہ نے اس کا دو طرح سے جواب دیا ہے۔ اول یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی ہدی حرم میں ناجیہ بن جندب اسلمیؓ کے ہاتھ بھیجی تھی۔ اس حدیث کو امام طحاوی اور نسائی نے ناجیہؓ سے روایت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ حدیبیہ کا بعض حصہ تو حل میں ہے اور بعض حصہ حرم میں۔ چنانچہ طحاویؒ نے مسور سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حدیبیہ میں خیمہ تو حل میں تھا اور مصلے حرم میں۔ جب یہ امر ثابت ہو گیا تو ظاہر یہ ہے کہ حرم میں ہی نحر کیا ہو گا۔

---

[1] وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ صلح صحابہؓ کو ناگوار ہوئی تھی سب یہ کہتے تھے کہ مغلوب ہو کر کیوں صلح کریں۔ ۱۲ منہ

marfat.com

میں کہتا ہوں کہ ناجیہ کی حدیث شاذ اور مشہور کی مخالف ہے اور اگر اس کا ثبوت بھی ہو جائے تو دونوں روایتوں کی تطبیق کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنی بعض ہدی حرم میں بھیج دی ہوں اور بعض کا حل میں نحر کیا ہو اور نیز آیت ھم الذین کفرا وصدو کم عن المسجد الحرام والھدی معکوفاً ان یبلغ محلہ (یہ لوگ وہ ہی تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو روکا مسجد حرام سے اور قربان کے جانور کو روکا کہ وہ رکی کھڑی رہے نہ پہنچنے پائے اپنی جگہ) سے بھی یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہدی اپنی جگہ نہیں پہنچی اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہدی کی جگہ حرم ہے۔ اس لئے بہتر جواب یہی ہے کہ بخاری نے ابن عباسؓ سے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ محصر اگر ہدی کو حرم میں بھیجنے کا مقدور نہ رکھتا ہو تو جہاں کہیں روکا جائے نحر کر دے اور اگر ہو سکے تو اس پر بھیجنا واجب ہے۔ اس تقدیر پر آیت وَلَا تحلقوا رؤ سکم حتیٰ یبلغ الھدی محلّہ کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر تم سے ہو سکے تو ہدی کے اس کی جگہ پہنچنے تک سر مت منڈاؤ۔ اور یہ آیت عام ہو گی لیکن بعض افراد جناب رسول اللہ ﷺ کے فعل سے اور آیت والھدی معکوفا الخ سے مخصوص ہوں گے واللہ اعلم۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ابوداؤد نے محمد بن اسحاق سے محمد بن اسحاق نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو حاضر حمیری سے سنا ہے کہ وہ ابو میمون بن مہران سے یوں بیان کرتے تھے کہ جس سال اہل شام نے مکہ میں ابن زبیرؓ کا محاصرہ کیا تھا اسی سال میں بھی عمرہ کرنے کے لئے گیا اور میری قوم کے چند لوگوں نے میرے ساتھ ہدی روانہ کر دی تھیں کہ ان کو حرم میں ذبح کر دینا۔ جب ہم یہاں آئے تو اہل شام نے ہم کو حرم میں گھسنے سے روکا۔ میں نے ہدی کو اسی جگہ نحر کیا پھر حلال ہو کر وہاں سے واپس ہو گیا۔ جب سال آئندہ عمرہ قضا کرنے آیا تو ابن عباسؓ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور ان سے یہ مسئلہ پوچھا انہوں نے فرمایا کہ ہدی کے عوض دوسری ہدی بھیج دو۔ کیوں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا تھا کہ جو ہدلیا تم نے حدیبیہ میں نحر کی تھیں ان کے عوض دوسری قربانیاں کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حرم سے باہر نحر کرنا جائز نہیں اور اگر کر دیا تو اعادہ کرنا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ محمد بن اسحاق راوی اس کی سند میں مختلف فیہ ہے اور اس حدیث پر تمام امت نے عمل ترک کیا ہے کوئی اس کا قائل نہیں اس مقام پر اور مسائل میں بھی اختلاف ہے چند مسئلے ہم ذکر کرتے ہیں۔

مسئلہ :- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قران کرنے والے پر دو دم واجب ہیں کیونکہ اس کے دو احرام ہیں ایک حج کا اور ایک عمرہ کا۔ اور جمہور کے نزدیک ایک دم ہے۔ جمہور تو یہ کہتے ہیں کہ احرام ایک ہے اس لئے ایک ہی دم کافی ہے۔ فان احصر تم فما استیسر من الھدی کا عموم جمہور کے قول کی تائید کرتا ہے۔

مسئلہ :- اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی حج یا عمرہ سے روکا گیا تو آیا محض اس رکنے ہی سے وہ حلال ہو گیا یا حلال ہونے کی نیت کے ساتھ ذبح کر لینا بھی ضروری ہے یا نیت اور ذبح اور سر منڈانا تینوں لازم ہیں۔ تیسرا قول امام شافعی اور جمہور کا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ روکے جانے سے حج کے افعال ساقط ہو گئے احرام کے افعال باقی ہیں۔ حلق (سر منڈانا) شرع میں محلل (حلال کرنے والا) قرار دیا گیا ہے، اس لئے بغیر حلق کے حلال نہ ہو گا۔ اور حلق کا بحیثیت محلل ہونے کے حرم کے ساتھ مقید ہونا ثابت نہیں۔ حلق (سر منڈانا) یا قصر (کتروانا) کے واجب ہونے اور حلق کے اولیٰ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حدیبیہ کے دن جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ سر منڈانے والوں پر رحم فرمائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اور کتروانے والوں پر بھی۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا منڈانے والوں پر اللہ رحمت فرمائے۔ صحابہؓ نے پھر عرض کیا کتروانے والوں پر بھی، تیسری مرتبہ میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ کتروانے والوں پر بھی۔ اس حدیث کو طحاویؒ نے ابن عباسؓ اور ابو سعیدؓ سے روایت کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر حرم میں روکا گیا تو حلق واجب ہے اور اگر حل میں روکا گیا تو واجب نہیں کیونکہ حلق کا عبادت ہونا خاص زمانہ یا مکان کے ساتھ مخصوص ہے۔ کافی میں اسی طرح ہے اور ہدایہ میں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک حلق واجب نہیں ذبح ہی سے حلال ہو جاتا ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حلق لازم ہے کیونکہ نبی ﷺ نے حدیبیہ کے

marfat.com

سال اس کا حکم فرمایا تھا لیکن اگر حلق نہ کیا تب بھی کچھ حرج نہیں (یعنی دم وغیرہ اس کے ذمے واجب نہیں) فقط ذبح ہی سے حلال ہو جائے گا اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ صرف احصار سے حلت احرام ہو جاتی ہے، ذبح واجب نہیں۔ یہ آیت امام مالکؒ کے خلاف حجت ہے۔ دلیل امام مالکؒ کی یہ ہے کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حدیبیہ کے دن ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ستر اونٹ ذبح کئے۔ ہر اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے تھا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک ہدی کے اندر سات تک شریک ہو جائیں۔ اس حدیث کو دار قطنیؒ نے روایت کیا ہے اور شیخین نے جابرؓ سے اس طرح روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے ۶ھ میں عمرہ کا احرام باندھا۔ آپ کے ہمراہ ایک ہزار چار سو آدمی تھے۔ اب ان دونوں حدیثوں کے ملانے سے یہ امر معلوم ہوا کہ ہدی ہر محصر پر واجب نہیں اور صرف نیت سے احرام کھل جاتا ہے ذبح کی ضرورت نہیں کیونکہ ستر اونٹ پانچ سو آدمیوں کو بھی کافی نہیں تو اور باقی آدمی بغیر ہدی کے رہ گئے۔

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ اور لوگوں نے بکریاں ذبح کی ہوں اور علاوہ ازیں یہ ہے کہ یہ امام مالکؒ کا استدلال نص قطعی کے مقابلہ میں خبر واحد سے ہے اس لئے مقبول نہیں۔

مسئلہ :- اس میں اختلاف ہے کہ جس شخص کا حج یا عمرہ کا احرام ہو اور وہ محصر ہو جائے اور ذبح سے حلال ہو جائے تو آیا اس پر قضا واجب ہے یا نہیں۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قضا واجب نہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر حج سے حلال ہوا ہے تو ایک حج اور ایک عمرہ اور اگر عمرہ سے حلال ہوا ہے تو ایک عمرہ اور اگر قران سے حلال ہوا ہے تو ایک حج اور دو عمرے بطور قضا کے واجب ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو صرف ہدی پر اکتفا فرمایا ہے اور آگے اور کچھ قضا وغیرہ کا ذکر نہیں فرمایا یہ دلیل اس امر کی ہے کہ قضا واجب نہیں۔ ابن جوزیؒ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ۶ھ میں عمرہ کا احرام باندھا اور حضور ﷺ کے ہمراہ ایک ہزار چار سو آدمی تھے۔ پھر دوسرے سال آپ تشریف لائے اور آپ کے ہمراہ تھوڑی سی جماعت تھی۔ اگر قضا واجب ہوتی تو ضرور آپ ان کو متنبہ فرماتے اور وہ سب قضا کرنے آتے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے متواتر احادیث سے معلوم کیا ہے کہ جب حضور ﷺ نے عمرۃ القضا کا ارادہ فرمایا تو بعض صحابہؓ بغیر ضرورت کے الگ ہو گئے اگر قضا ان پر لازم ہوتی تو ضرور آپ ان کو ہمراہی کا حکم فرماتے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو اس عمرہ کا نام عمرۃ القضا کیوں رکھا گیا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ عمرۃ القضا اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ قضا کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں تو چونکہ قریش سے اس زمانہ میں فیصلہ ہوا تھا اس لئے اس عمرہ کا نام عمرۃ القضار کھا گیا۔ واقدی نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ عمرہ قضا (فیصلہ) نہ تھا صرف یہ شرط ہو گئی تھی کہ اگلے سال مسلمان اسی ماہ میں عمرہ کریں گے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حج یا عمرہ شروع کر لینے کے بعد پورا کرنا بالاتفاق واجب ہے اور دلیل اس کی آیت واتموا الحج والعمرة للہ ہے قضا کے واجب ہونے کے لئے نئی دلیل کی حاجت نہیں اور آیت فان احصر تم الخ صرف اس پر دلالت کرتی ہے کہ عذر احصار سے تحلل جائز ہے اس پر دال نہیں کہ قضا ساقط ہو گئی۔ اس لئے قضا ساقط نہ ہو گی۔

ائمہ ثلثہ کے دلائل کا جواب دو طرح سے ہو سکتا ہے اول یہ ہے کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ دوسرے سال حضور ﷺ کے ہمراہ تھوڑے سے آدمی تھے اور نہ اس کو ہم مانتے ہیں کہ حضور ﷺ نے قضا کا حکم نہیں فرمایا۔ چنانچہ واقدی نے مغازی میں اپنے مشائخ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ جب ۷ھ میں ذوالقعدہ کا مہینہ آیا تو جناب رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ جس عمرہ سے رد کے گئے تھے اس کی قضا کرو اور جو حدیبیہ میں حاضر ہوا تھا وہ الگ نہ ہو چنانچہ جو خیبر میں شہید ہو گئے تھے ان کے علاوہ باقی سب آپ ﷺ کے ہمراہ تھے اور بعض لوگ ایسے بھی آئے جو حدیبیہ میں نہیں آئے تھے اور تمام مسلمان حضور ﷺ کے ہمراہ اس وقت دو ہزار تھے اور واقدی کی روایت مغازی کے باب میں اگر روایات صحیحہ کی معارض نہ ہو تو مقبول ہے دوسرے یہ کہ امام شافعیؒ کا یہ فرمانا کہ بہت سے آدمی بلا عذر الگ رہ گئے اس کی بناء راوی کے زعم پر ہے اور نفی پر شہادت مقبول

marfat.com

نہیں ہوتی (کما ہو المسلم) پس جو الگ رہ گیا تو ممکن ہے ان کو کوئی عذر ہو اور بعد میں اس نے قضا کی ہو۔ نیز ہماری دلیل یہ ہے کہ حجاج بن عمر انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو لنگڑا ہو گیا یا اس کا کوئی عضو ٹوٹ گیا تو وہ حلال ہو گیا اور سال آئندہ اس کے ذمہ حج ہے، واللہ اعلم۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ

(پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو اس پر بدلہ لازم ہے روزے یا خیرات یا قربانی) منکم میں خطاب احرام والوں کو ہے۔ مریضاً ایسا مرض مراد ہے کہ جس میں سر منڈانے کی احتیاج ہو۔ او اذیً من راسہ الخ (یا اس کو تکلیف ہو سر میں) مثلاً کوئی زخم ہو یا جوئیں ہوں اور ان سے سر منڈا لیا تو اس کے ذمہ فدیہ واجب ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی عذر سے خوشبو لگائے یا سلا کپڑا پہنے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ من صیام سے تین روزے مراد ہیں کیونکہ تین ادنیٰ فرد جمع کا ہے اور ان روزوں کو پے در پے رکھنا ضروری نہیں کیونکہ نص اس بارہ میں مطلق ہے او صدقۃ صدقہ بیان نہیں فرمایا کیونکہ یہ مجمل ہے۔ حدیث نے اس کی تعیین کر دی ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے کعب بن عجرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھا کہ منہ تک جوئیں آ رہی ہیں فرمایا اس نے تجھ کو ستار کھا ہے، عرض کیا حضور ﷺ بے شک ستار کھا، ہے آپ نے ان کو سر منڈانے کا حکم فرمایا اس وقت آپ حدیبیہ میں تشریف رکھتے تھے اور اب تک یہ امر ظاہر نہ ہوا تھا کہ سب یہاں حلال ہوں گے بلکہ مکہ جانے کے ارادہ سے بیٹھے تھے پھر اس وقت اللہ تعالیٰ نے فدیہ کا حکم نازل فرمایا پس حضور ﷺ نے کعب بن عجرہؓ کو حکم فرمایا کہ یا تو ایک فرق[1] غلہ چھ مساکین کو تقسیم کر دیں یا ایک بکری ذبح کریں یا تین روز کے روزے رکھیں۔

میں کہتا ہوں کہ فرق تین صاع کا ہوتا ہے۔ نسک، جمع نسیکہ کی ہے نسیکہ کے معنی ذبیحہ ہیں۔ اعلیٰ درجہ ذبیحہ کا اونٹ ہے اوسط گائے، ادنیٰ بکری۔ من صیام الخ فدیہ کا بیان ہے جو ہدی محرم کے ذمہ پر واجب ہے اس کو بالاجماع مکہ میں ذبح کرنا واجب ہے سوائے دم احصار کے کہ اس میں اختلاف ہے۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۥ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ (پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو جائے تو جو شخص نفع اٹھانا چاہے عمرہ کو حج سے ملا کر) فاذآ امنتم یعنی جب تم احصار سے امن میں ہو مثلاً دشمن کا خوف جاتا رہا یا مریض تھے تندرست ہو گئے اور اب تک اپنے احرام سے حلال نہیں ہوئے یا یہ کہ پہلے ہی سے امن میں تھے۔ فمن تمتع الخ یعنی جو شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہو۔ اس تفسیر سے قران کے الفاظ قران اور تمتع دونوں کو شامل ہو جائیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنے عمرہ سے حلال ہو کر احرام میں جو چیزیں ممنوع ہو گئیں تھیں ان سے احرام حج تک منتفع ہو۔ اس تفسیر پر قران کا ذکر نہ آئے گا۔ اور نیز اس تقدیر پر بالعمرۃ کی باکے کچھ معنی نہ ہوں گے کیونکہ تمتع (نفع مند ہونا) تو احرام کی ممنوعات سے حاصل ہوا، عمرہ سے کہاں حاصل ہوا۔ پس اس لئے پہلی تفسیر لفظاً اور معنیً دونوں طرح اولیٰ ہے لفظاً تو اس لئے کہ با کے معنی بن جاتے ہیں اور معنیً اس واسطے کہ قارن پر ہدی بالاجماع لازم ہے۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ (تو جو کچھ میسر ہو قربانی کرے) یعنی ایسے شخص پر تمتع کی نعمت کا شکر ادا کرنے کے واسطے جیسی ہدی میسر ہو واجب ہے اور ادنیٰ درجہ اس کا بکری ہے۔ یہ تفسیر امام ابو حنیفہ اور امام احمدؒ کے مذہب کے موافق ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ شکر کا دم ہے اس لئے اس کا کھانا خود ہی جائز ہے۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دم جبر ہے اس لئے خود کھانا جائز نہیں ہے۔ کھانے کے جائز ہونے کی دلیل میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ بجملہ ان کے یہ ہے کہ جابرؓ کی حدیث طویل میں ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ہر ہر اونٹ سے ایک ایک ٹکڑا کاٹنے کا حکم فرمایا اور سب ٹکڑوں کو ایک ہنڈیا میں ڈال کر پکایا گیا اور جناب رسول اللہ ﷺ اور حضرت علیؓ نے اس میں سے گوشت بھی کھایا اور شوربا بھی پیا۔ وجہ استدلال یہ کہ حضور ﷺ قارن تھے اور جب آپ ﷺ نے ہر اونٹ کا ایک ٹکڑا کاٹنے کا حکم فرمایا پھر اسے کھایا تو قران کی ہدی سے کھانا آپ کا

[1] ایک پیمانہ کا نام ہے ۱۲

marfat.com

ثابت ہو ابلکہ کھانے کا استحباب ثابت ہوا۔ ورنہ ہر لونٹ کے ٹکڑے کا حکم نہ فرماتے۔

علامہ ابن جوزیؒ نے فرمایا ہے دوسری دلیل جواز اکل کی عبدالرحمن بن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مجھ کو جناب رسول ﷺ نے سوائے کھانے کی مقدار کے ہدی تمتع کے گوشت کو صدقہ کرنے کا حکم فرمایا یہ اور بھی زیادہ صریح ہے کہ کھانا جائز ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک جو ہدی واجب ہے اس سے خود کھانا حرام ہے۔ دلیل ان کی یہ ہے کہ ناجیہ خزاعیؓ کے پاس جناب رسول اللہ ﷺ کے اونٹ تھے انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر کوئی اونٹ ہلاک ہونے لگے تو کیا کروں۔ فرمایا اس کو نحر کردے اور نعل کو اس کے خون میں رنگ کر اس کے پہلو پر چھاپہ لگادے اور لوگوں کے کھانے کے لئے اس کو چھوڑدے۔ اس حدیث کو امام مالک، احمد، ترمذی اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ واقدی کی روایت میں اس قدر اور زیادہ ہے کہ یہ بھی فرمایا کہ تو اور تیرا کوئی رفیق اس میں سے نہ کھائے۔ ایسے ہی ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سولہ اونٹ ایک شخص کے ہمراہ بھیجے اور اس کو امیر بنایا اور فرمایا کہ اس میں سے تو اور تیرا کوئی رفیق مت کھانا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور ذویب سے بھی اسی مضمون کی حدیث مروی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان احادیث کو قران اور تمتع سے کیا تعلق ہے کیونکہ یہ احادیث حجۃ الوداع میں نہیں ہیں بلکہ یا تو حدیبیہ کا قصہ ہے یا کوئی۔ اور جناب رسول اللہ ﷺ نے بعد ہجرت کے سوائے حجۃ الوداع کے اور کوئی حج ہی نہیں کیا۔ پھر یہ ہدایا جو ان احادیث میں مذکور ہیں ہدی تمتع کیسے ہو جائے گی بلکہ یقیناً یہ ہدی نفل کا ذکر ہے۔ اور ہم خود قائل ہیں کہ نفل ہدی اگر راہ میں ہلاک ہونے لگے اور اس کو ذبح کیا جائے تو اس سے خود کھانا جائز نہیں، واللہ اعلم۔

مسئلہ :- امام ابو حنیفہ، شافعی اور احمدؒ کے نزدیک ہدی تمتع کو یوم نحر یعنی دسویں تاریخ سے پہلے ذبح کرنا جائز نہیں بلکہ بعد رمی کے ذبح کرنا چاہئے۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ پہلے بھی جائز ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت حفصہؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمارے ساتھ کیوں نہ حلال ہوئے، فرمایا میں ہدی روانہ کر چکا ہوں اور سر کو چکا چکا ہوں اب میں ہدی کے نحر ہونے تک حلال نہ ہوں گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں ہدی نہ لاتا تو حلال ہو جاتا۔ یہ دونوں حدیثیں اول گزر بھی چکی ہیں۔ اگر ہدی، قران کو یوم نحر سے قبل ذبح کرنا جائز ہوتا تو حضور ﷺ کا ہدی لانے کو حلال نہ ہونے کا عذر بیان فرمان صحیح نہ ہوتا۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ (اور جس کو (ہدی) نہ میسر ہو تو (رکھے) تین روز کے روزے زمانۂ حج میں) فصیام ثلثۃ ایام مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی واجب ہیں اس پر تین دن کے روزے فی الحج یعنی احرام حج میں۔ ان تین دن میں آخر دن یوم عرفہ ہونا چاہئے اور اگر احرام کی حالت میں اس سے پہلے روزے رکھ لئے تب بھی اجماعاً جائز ہے لیکن ان ایام کے بعد احرام نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ہے کہ یوم نحر اور ایام تشریق کو روزہ رکھنا حرام ہے اس لئے ان ایام کے روزوں سے واجب بھی ادا نہ ہوگا۔ صحیحین میں عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ دو دن کے روزوں سے جناب رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے ایک تو وہ دن جس میں فرض روزے ختم کرتے ہو یعنی روز عید الفطر اور دوسرا وہ دن جس میں اپنی قربانی کا گوشت کھاتے ہو۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور ابو سعید اور ابو ہریرہؓ سے بھی اسی مضمون کی حدیثیں مروی ہیں۔ عمرو بن العاصؓ ایام تشریق کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ ان دنوں کے روزوں سے جناب رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے اور ان میں روزہ نہ رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ابن منذر نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور مسلم نے کعب بن مالک سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ یہ کھانے اور پینے کے دن ہیں۔ اور مسلم میں نبیشہ ہذلی سے بھی اسی مضمون کی حدیث مروی ہے اور نسائی میں بسند صحیح بشر بن سحیم سے بھی اسی مضمون کی حدیث منقول ہے اور اصحاب سنن اور حاکم اور ابن حبان نے بسند صحیح عقبۃ بن عامر سے روایت کی ہے اور ابن عبد البر نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ ایام تشریق کھانے اور پینے اور نماز کے دن ہیں ان میں کوئی روزہ نہ رکھے۔ اس کے

marfat.com

علاوہ اور احادیث اس مضمون کی بکثرت منقول ہیں اور امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ فرماتے ہیں کہ متمتع اگر ہدی پر قادر نہ ہو اور یوم نحر سے پیشتر اس نے روزے بھی نہیں رکھے تو اس کے لئے ایام تشریق میں روزے رکھنے جائز ہیں اور خاص یوم نحر کو اجماعاً جائز نہیں۔ ابن عمرؓ اور عائشہؓ نے فرمایا ہے کہ ایام تشریق کو روزے نہ رکھے جائیں لیکن جس نے ہدی نہ پائی وہ اگر رکھ لے تو اجازت ہے۔ اس حدیث کو بخاریؒ نے روایت کیا ہے اور امام بخاری نے روایت کی ہے کہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ روزے یوم عرفہ تک اس شخص کے واسطے ہیں جو تمتع کرے اگر ہدی اس کو نہ ملے اور روزے یوم عرفہ تک بھی نہ رکھے ہوں تو ایام منیٰ میں روزے رکھ لے۔ ائمہ ثلثہ فرماتے ہیں کہ یہ اثر حکم میں مرفوع کے ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ حکم میں مرفوع کے ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ نے آیت کریمہ ثلثة ایام فی الحج سے یہ سمجھا ہے کہ ایام تشریق بھی ایام حج ہیں کیوں کہ بعض افعال حج مثلاً رمی ان دنوں میں ہوتے ہیں اس لئے ان دنوں میں بھی روزے جائز ہونے چاہئیں۔ اس بناء پر روزے کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ دار قطنی نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ متمتع اگر ہدی نہ پائے تو اس کو رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی ہے کہ ایام تشریق میں روزے رکھ لے اور طحاوی نے عائشہؓ اور ابن عمرؓ سے اسی مضمون کی حدیث روایت کی ہے۔ اس کا کیا جواب ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ کی حدیث میں یحیٰی بن سلام راوی قوی نہیں۔ دار قطنی اور طحاوی نے اس کی تضعیف کی ہے۔ نیز اسی حدیث میں یحیٰی بن سلام راوی قوی نہیں۔ دار قطنی اور طحاوی نے اس کی تضعیف کی ہے پھر احادیث نہی کے کیسے معارض ہو سکتی ہے۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ آثار متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ جناب رسول اللہ منیٰ میں مقیم تھے اور حجاج بھی وہاں موجود تھے اور ان میں متمتع بھی تھے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ کل متمتع یا قارن تھے کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس سال حج کے فسخ کرنے کا حکم دیا تھا اور بروز ترویہ احرام کا حکم فرمایا تھا باوجود ان سب امور کے حضور ﷺ نے ان ایام کے روزوں سے نہی فرمائی۔

فائدہ: امام مالک و شافعی و احمدؒ کے قول کے موافق ثلثه ایام فی الحج کے معنی یہ ہیں " ثلثة ایام فی ارکان الحج او ایام الحج " (یعنی تین دن کے روزے ارکان حج میں یا ایام حج میں)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر صحیح نہیں کیونکہ ارکان حج صیام کا ظرف نہیں بن سکتا، رہے ایام حج سو وہ عرفہ تک ختم ہو جاتے ہیں چنانچہ عنقریب آنے والا ہے کہ الحج اشھر معلومات میں اشھر معلومات سے مراد دو ماہ نو روز یا دس رات یوم نحر کے طلوع صبح تک ہیں اور نیز آیت کریمہ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (تو نہ عورت کے پاس جانا ہے اور نہ کوئی گناہ کا کام اور نہ جھگڑا ایام حج میں) اس کی مقتضی ہے کہ ایام تشریق ایام حج نہ ہوں کیونکہ یہ دن تو کھانے پینے اور جماع کرنے کے ہیں ان میں شکار کرنا وغیرہ سب جائز ہے واللہ اعلم۔

مسئلہ:- جس شخص کو سر منڈانے سے پہلے روزے رکھنے کے درمیان میں یا روزے رکھنے کے بعد ہدی مل جائے اس پر ہمارے نزدیک ذبح واجب ہے اور امام مالکؒ و شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک ذبح واجب نہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ شخص خلف پر عمل کرنے سے پیشتر اصل پر قادر ہو گیا۔ اس لئے خلف باطل ہو گیا، اس کی مثال ایسی ہو گئی جیسے کوئی تیمم سے نماز پڑھتا تھا کہ پانی مل گیا۔ اور اگر ہدی بعد سر منڈانے کے پائی تو روزے رکھ ہی چکا اس پر ہدی اتفاقاً واجب نہیں جیسے کسی نے تیمم سے نماز پڑھ کر پانی پایا۔ تو اس پر نماز کا اعادہ نہیں اور اگر ایام حج میں یہ تین روزے فوت ہو گئے تو ایک قربانی اس کے ذمہ واجب ہو گئی اور امام مالکؒ و شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان تین روزوں کو بعد حج کے رکھ لے کیونکہ یہ قضا بمثل معقول ہو جائے گی۔

ہم کہتے ہیں کہ روزے ہدی کے بدل ہیں اور بدل کا اپنی رائے سے مقرر کرنا جائز نہیں اور روزے کے ہدی کا بدل ہونا خصوصیات منصوصہ سے ہی ہو سکتا ہے، رائے کو اس میں دخل نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۖ (اور سات جب تم لوٹو) یعنی سات روزے رکھو جب لوٹو یعنی جس وقت اعمال حج سے

marfat.com

فارغ ہو جاؤ۔ رجعتم کی یہ تفسیر امام ابو حنیفہ اور محمدؒ کے نزدیک ہے اور امام مالکؒ اور ایک قول امام شافعیؒ کا یہ ہے کہ جب مکہ سے اپنے اپنے وطن کو لوٹنے کے ارادہ سے چلو۔ مشہور مذہب امام شافعیؒ کا یہ ہے اور ایک روایت امام احمدؒ سے بھی یہی ہے کہ جب تم اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹو یعنی اپنے وطنوں میں جا پہنچو۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ لوٹنا تو یہی ہے کہ اپنے گھر واپس ہو اس لئے اس سے پہلے یہ روزے جائز نہیں اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب مکہ سے بقصد وطن نکلا تو اس پر رجوع کا لفظ صادق آ گیا اس لئے اس کی وطن پہنچنے سے پہلے ہی یہ روزے رکھنے جائز ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ رجوع کے معنی حج سے فارغ ہونا ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ جس نے بعد حج کے مکہ میں رہنا اختیار کر لیا یا اس کا کوئی وطن نہ ہو اس کے لئے سب کے نزدیک مکہ میں روزے رکھنا جائز ہیں پس اسی طرح جس کا وطن مکہ کے سوا اور کوئی ہو اس کو بھی حج سے فراغت کے بعد یہ روزے رکھنا جائز ہیں ورنہ حقیقت اور مجاز کا جمع ہونا لازم آ جائے گا اور یہ باطل ہے، واللہ اعلم۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ (یہ دس ہیں پورے) یہ جملہ تاکید کے طور پر اس لئے ذکر فرمادیا کہ مبادا کوئی یہ نہ سمجھے کہ وسبعة میں واؤ بمعنی او ہے نیز یہ وجہ بھی ہے کہ جس طرح عدد تفصیلاً معلوم ہوا ہے جمع ہو کر بھی معلوم ہو جائے کیونکہ عرب کے اکثر لوگ حساب میں اچھی طرح مہارت نہ رکھتے تھے۔ کاملةٌ، عشرةٌ کی صفت مؤکدہ ہے۔ عدد کے یاد رکھنے کے اندر مبالغہ کو بڑھا رہی ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (یہ اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہیں) یعنی تمتع غیر مکی کے لئے جائز ہے۔ اور اس بنا پر مکی کے لئے تمتع جائز نہ ہوا۔ یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے اور امام مالکؒ اور شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک مکی کو بھی تمتع جائز ہے لیکن اس پر ہدی واجب نہیں اور فرماتے ہیں کہ ذالک کا مشارٌ الیہ "ہدی کا واجب ہونا" ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ "لمن لم یکنّ کا لام ہماری تفسیر کے صحیح ہونے پر دال ہے کیونکہ لام کا استعمال اکثر ایسے موقع میں آتا ہے کہ جس کا کرنا ہم کو جائز ہو، اسی واسطے ہم نے اوپر کہا ہے کہ غیر مکی کے لئے تمتع جائز ہے۔ اگر مشار الیہ "وجوب ہدی" ہوتا تو اس وقت یجب (واجب ہے) مقدر ہوتا پھر اس کے اوپر علیٰ ہوتا۔ اور جو ہم نے تفسیر کی ہے یہی تفسیر حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ ابن عمرؓ سے کسی نے حج کے متعہ یعنی تمتع کے متعلق پوچھا کہ جائز ہے یا نا جائز۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمتع کا ذکر اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور حدیث میں بھی موجود ہے اور سوائے اہل مکہ کے سب کے لئے مباح فرمادیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ذٰلک لمن لم یکن اھلہٗ حاضری المسجد الحرام۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ عمرؓ سے ثابت ہو چکا ہے کو اہل مکہ کو تمتع اور قران جائز نہیں اور حاضری المسجد الحرام سے مراد امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو میقات سے پرے رہتے ہیں۔ عکرمہؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ مراد ہیں جن کا وطن مکہ سے مسافت سفر شرعی سے کم پر ہو۔ طاؤس اور دیگر اہل علم نے فرمایا کہ اہل حرم مراد ہیں۔ کیونکہ خود مسجد تو بالاتفاق مراد نہیں، پس حرم ہی مقصود ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ اور آیت کریمہ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ میں کعبہ اور مسجد حرام سے بھی حرم مراد ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ خاص مکہ والے ہیں۔ نافع و اعرج اور حنفیہ میں سے طحاوی نے بھی اس قول کو اختیار کیا ہے واللہ اعلم۔ پس اگر مکی نے باوجود ممنوع ہونے کے تمتع کر لیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کے ذمہ بطور تاوان کے ایک بکری کی قربانی ہے کیونکہ اس نے ایک ممنوع فعل کا ارتکاب کیا روزہ اس قربانی کے قائم مقام نہیں ہو سکتا اور خود اس بکری کا کھانا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ اور دیگر ائمہؒ فرماتے ہیں کہ اس کے ذمہ کچھ واجب نہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور ڈرو اللہ سے) یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾ (اور جانے رہو کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے)۔

marfat.com

فائدہ :- جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حج اور عمرہ کے مناسک ذکر فرمادیئے اور ہر ایک کے ادا کرنے کو علیحدہ علیحدہ بیان فرمایا اور دونوں کے تمام کرنے کو بھی واجب فرمایا۔ پھر تمتع یعنی دونوں کو جمع کر کے ادا کرنے کو بھی ذکر فرمایا۔ اس کے بعد معلوم کرنا چاہئے کہ از روئے حدیث اس جمع کرنے کی دو قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ حج اور عمرہ دونوں کا ایک مرتبہ احرام باندھ لے پھر دونوں سے ایک وقت میں حلال ہو جائے اس کو تو قران بولتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اول عمرہ کا احرام باندھے پھر عمرہ ادا کر کے مکہ میں حلال ہو کر رہے اور یہ صورت اس وقت ہے کہ ہدی لے گیا ہو پھر بروز ترویہ مکہ سے حج کا احرام باندھے اور یوم نحر کو حلال ہو یہ فقہاء کے نزدیک تمتع کہلاتا ہے اور یہ سب بلا خلاف جائز ہیں۔ اختلاف ان امور میں ہے کہ ان میں کون افضل ہے اور نبی ﷺ حجۃ الوداع میں قارن تھے یا متمتع تھے یا مفرد تھے۔ اور قارن کو آیا حج اور عمرہ کے واسطے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے۔ جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے یا دو طواف اور دو سعی کی ضرورت ہے جیسے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ سو یہ بحثیں بہت طویل ہیں۔ منار الاحکام میں ہم نے سب کو ذکر کیا ہے۔

امر محقق یہی ہے کہ نبی ﷺ قارن تھے اور قران تمتع سے افضل ہے۔ بشرطیکہ ہدی بھی لے گیا ہو۔ اور اگر ہدی نہیں لے گیا تو تمتع افضل ہے اور افراد سے ہر ایک افضل ہے۔ اور نبی ﷺ جب مکہ واپس تشریف لائے تو طواف فرمایا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی فرمائی۔ پھر عرفات سے واپس ہونے تک آپ ﷺ نے طواف نہیں فرمایا۔ اس کو بخاری نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ طواف اور سعی عمرہ کی تھی اور یہی طواف قدوم کے لئے بھی کافی ہو گیا۔ یہ طواف و سعی آپ ﷺ نے پیادہ فرمائی، سوار نہیں ہوئے۔ چنانچہ حبیبہ بنت ابی تجراۃ اور ابن عمر اور جابرؓ کی احادیث جو مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں ان میں یہ مصرح ہے۔ پھر طواف زیارت کے بعد جناب رسول ﷺ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی فرمائی۔ چنانچہ جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی سوار ہو کر اس غرض سے فرمائی تاکہ لوگ آپ کی زیارت سے مشرف ہوں اور مسائل پوچھیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ حجۃ الوداع میں حضور ﷺ اپنی سواری پر طواف فرماتے تھے اور لکڑی سے رکن کا بوسہ لیتے تھے۔ یہ تحقیق وہ ہے جو مختلف روایات جمع کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہے واللہ اعلم۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ (اور حج کے چند مہینے معلوم ہیں) یعنی حج کا وقت بلکہ احرام کا وقت چند مہینے معلوم ہیں۔ کیونکہ ارکان کا وقت تو یوم عرفہ اور یوم نحر کے سوا اور نہیں ہے۔ طبرانی نے ابوامامہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حج کے مہینے شوال اور ذیقعدہ اور ذی الحجہ ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ پورا شوال اور پورا ذی قعد اور نو دن یوم نحر کی صبح تک ماہ ذی الحجہ کے مراد ہیں۔ اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ شوال اور ذیقعد اور دس دن ذی الحجہ کے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ دونوں روایتوں کے الفاظ صحیح ہیں کیونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے جس نے دس کہا ہے اس نے دس رات مراد لی ہیں اور جس نے نو ذکر کئے ہیں اس نے نو دن لئے ہیں اور دو ماہ دس روز کو لفظ جمع سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ عرب کی عادت ہے کہ وقت کو پورا ذکر کرتے ہیں اگرچہ فعل اس کے بعض حصہ میں ہوا ہو جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کو لے گیا) حضور رات کے بعض حصہ میں تشریف لے گئے مگر پوری رات ذکر فرمائی اور عروۃ بن زبیر فرماتے ہیں کہ اشہر سے شوال اور ذیقعدہ اور پورا ذی الحجہ مراد ہے کیونکہ بعد عرفہ کے بھی حاجی پر بہت سے افعال کرنے واجب ہوتے ہیں مثلاً ذبح کرنا۔ رمی اور سر منڈانا۔ اور طواف زیارت اور منٰی میں رہنا۔ اور ایام تشریق میں رمی جمار کرنا اس لئے یہ بقیہ ایام بھی حج میں ہی شمار کر لئے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جملہ افعال ذی الحجہ کی تیرہ تاریخ تک تمام ہو جاتے ہیں، اب پورے مہینہ کو شمار کرنا بظاہر صحیح نہیں ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ تمام ذی الحجہ حج کا مہینہ ہے کیونکہ وقت حج سے مراد ان کے نزدیک یہ ہے کہ سوائے حج کے اور مناسک اس میں مستحسن نہ ہوں۔ چنانچہ امام مالکؒ بقیہ ذی الحجہ میں عمرہ کو مکروہ بتاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ

marfat.com

یہ توجیہ درست نہیں کیونکہ حج کے مہینوں میں آفاقی کے لئے بالاتفاق عمرہ مکروہ نہیں اور خود جناب رسول اللہ ﷺ نے ذیقعدہ میں چار عمرے کئے ہیں اسی طرح امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک مکی کو تمتع جائز ہے، چنانچہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ امام شافعیؒ اس آیت سے مستنبط کر کے فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں سے پہلے حج کا احرام جائز نہیں اور اگر احرام باندھا بھی تو وہ حج کا نہ ہوگا عمرہ کا ہو جائے گا اور داؤدؒ نے فرمایا کہ ان مہینوں سے پہلے احرام حج کا ہوتا ہی نہیں لغو ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ اور احمدؒ فرماتے ہیں اگر ان مہینوں سے پہلے حج کا احرام باندھا تو منعقد ہو جائے گا لیکن مکروہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ احرام حج کی شرط ہے۔ رکن نہیں ہے اسی واسطے اگر کسی نے مبہم احرام باندھا یعنی نہ حج کی نیت کی نہ عمرہ کی اور پھر اس کے بعد حج یا عمرہ یا قران کی نیت کر لی تو جائز ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ یمن سے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا تم نے کاہے کی نیت کی ہے اور کس چیز کا احرام باندھا ہے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا جو حضور ﷺ کی نیت ہے وہی میری ہے اور ابو موسیٰؓ کی حدیث بھی اسی مضمون کی ہے۔ یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں موجود ہیں۔ جب ثابت ہو گیا کہ احرام شرط ہے تو وقت پر اس کی تقدیم جائز ہے جیسے وضو نماز سے پہلے کرنا درست ہے۔ لیکن فرق اس قدر ہے کہ وضو تو محض شرط ہے اور اس میں کچھ مشابہت رکن کی بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ غلام نے اگر احرام باندھ لیا تھا اور اس کے بعد یوم عرفہ سے پہلے وہ آزاد کیا گیا تو اس کا فرض ادا نہ ہوگا۔ اسی مشابہت کی وجہ سے ہم کراہت کے قائل ہوئے ہیں۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ احرام حج کا وقت چند معین مہینے ہیں اور یہ مہینے ارکان کا وقت نہیں ہیں۔ ارکان کا وقت صرف دو دن ہے۔ تو اب بظاہر امام شافعیؒ کا قول درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ احرام اگرچہ حج کی شرط ہے رکن نہیں اور شرط اگرچہ مشروط کے وقت پر مقدم ہو سکتی ہے لیکن شرط کی خود اس کے وقت پر تقدیم جائز نہیں جیسا کہ عشا ادائے وتر کی شرط ہے تو جس نے عشا غروب شفق سے پہلے ادا کر لی اس کے وتر جائز نہیں اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ عشا کو وقت وتر سے پہلے ادا کیا بلکہ اس سبب سے کہ عشا کو خود اس کے وقت سے پیشتر پڑھا، واللہ اعلم بالصواب۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ (پس جس نے لازم کر لیا ان میں حج) یعنی جس نے اپنے ذمہ ان مہینوں میں حج کو واجب کر لیا یعنی حج کا احرام باندھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ احرام کیا ہے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ و احمدؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ احرام نام قلب سے نیت کرنے کا ہے جیسا کہ روزہ کی نیت ہوتی ہے اور تلبیہ اس میں شرط نہیں، لیکن امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ احرام کے وقت تلبیہ واجب ہے، اگر چھوڑ دیا تو ایک قربانی واجب ہے اور امام احمدؒ و شافعیؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ لیکن مشہور مذہب ان دونوں کا یہ ہے کہ تلبیہ سنت ہے اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ احرام نیت کے ساتھ تلبیہ ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسے نماز میں تکبیر ہے اور ایک روایت امام شافعیؒ سے بھی اسی طرح ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ نماز پر اس کو قیاس کرنا باعتبار روزہ کے زیادہ مناسب ہے۔ ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ حج کا فرض اہلال (یعنی تلبیہ کے اندر آواز بلند کرنا) ہے اور ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تلبیہ فرض ہے اور ابن ابی شیبہؒ نے ابن مسعودؓ کا قول بھی مثل ابن عمرؓ کے قول کے روایت کیا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اہل مدینہ ذی الحلیفہ سے اہلال کریں اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس کے پاس ہدی ہو اس کو چاہئے کہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھے۔ تو دیکھو کہ حضور ﷺ نے اہلال کا حکم فرمایا اور اہلال کے معنی تلبیہ کو پکار کر کہنا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے تو جو تلبیہ کے وجوب کے قائل نہیں یہ احادیث ان پر حجت ہیں اور احرام کو حضور ﷺ نے اہلال سے تعبیر فرمایا اور پہلے معلوم ہو چکا کہ اہلال پکار کر تلبیہ کہنا ہے، تو معلوم ہو گیا کہ احرام کی حقیقت تلبیہ ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس نے اونٹ کے قلادہ ڈالا اور اس کو لے کر حج کے ارادہ سے چلا تو وہ محرم ہو گیا اگرچہ اس نے تلبیہ نہ کہا ہو تو اس صورت میں امام صاحب نے فعل کو قول کا نائب قرار دیا کیونکہ ذکر جس طرح قول سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح فعل سے بھی اس کا وجود ہوتا ہے دیکھو جو شخص اذان سن کر نماز کے لئے فوراً چلا تو یہ چلنا ہی جواب اذان کی جگہ ہو جائے گا کیونکہ پکارنے والے کی اجابت فعل

marfat.com

سے کرنا زیادہ بہتر ہے اور تلبیہ کے معنی ہی خود حاضر اور اطاعت کے لئے مستعد ہونے کے ہیں واللہ اعلم۔ صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جس نے اونٹ کے قلادہ ڈالا وہ محرم ہو گیا لیکن یہ حدیث مجہول ہے۔ ابن ہمام نے فرمایا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں اس حدیث کو ابن عباس اور ابن عمرؓ پر موقوف کیا ہے۔

میں کہتا ہوں ان دونوں اثروں کو اصل مدعیٰ سے کچھ بھی لگاؤ نہیں کیونکہ یہ تو ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کا مذہب ہے کہ جس نے مکہ کو ہدی بھیجی اور اس کا ارادہ حج کا نہیں وہ محرم ہو گیا جو چیزیں محرم پر حرام ہو جاتی ہیں وہ اس پر قربانی ذبح ہونے تک حرام ہو گئیں اور ابن عباسؓ وابن عمرؓ کے قول کے یہی معنی ہیں اسی طرح اور صحابہؓ سے بھی منقول ہے لیکن پھر اس کے خلاف پر اجماع منعقد ہو گیا۔ امام بخاریؒ نے روایت کی ہے کہ زیاد بن ابی سفیان نے حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ جس نے ہدی بھیج دی اس پر نحر کرنے تک وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو حاجی پر ہوتی ہیں حضرت عائشہؓ نے سن کر فرمایا یہ بات درست نہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھ سے رسول اللہ ﷺ کی ہدی کے قلادے بٹے ہیں اور پھر حضور ﷺ نے ان قلادوں کو ہدی کے گلے میں ڈال کر میرے باپ کے ہمراہ مکہ بھیجا ہے اور کوئی شئے حضور ﷺ نے اپنے اوپر حرام نہیں فرمائی۔ حافظ نے فرمایا ہے کہ یہ واقعہ ۹ ہجری کا ہے اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مسئلہ ابتداء اسلام کا ہے اور پھر منسوخ ہو گیا۔

فَلَا رَفَثَ (تو نہ عورت کے پاس جانا ہے) زجاج نے کہا ہے کہ رفث ہر اس شئے کو کہتے ہیں جو مرد عورت سے چاہتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ رفث فحش اور بری بات کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ فحش اور بری بات تو ہمیشہ حرام ہے احرام کیساتھ اس کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔

وَلَا فُسُوْقَ (اور نہ کوئی گناہ کا کام کرنا) ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ فسوق اس شئے کو کہتے ہیں جس سے محرم منع کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ محرمات احرام کا ارتکاب مت کرو۔ اور ایسی چیزیں بالاتفاق چھ ہیں۔ ۱۔ اول رفث یعنی وطی اور جو چیزیں وطی کی طرف مائل کریں جیسے بوسہ وغیرہ۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے الگ کر کے اس کے لئے ذکر فرمادیا کہ ایسی شئے ہے کہ حج اور عمرہ کو بالکل ہی فاسد کر دیتی ہے بخلاف اور محرمات کے کہ ان کے ارتکاب سے صرف قربانی لازم آتی ہے۔ اور حج و عمرہ فاسد نہیں ہوتا لیکن اگر جماع وقوف عرفہ کے بعد ہو تو اس وقت حج کے فاسد ہونے میں اختلاف ہے لیکن حرمت میں اس وقت بھی شک نہیں۔ ۲۔ دوسرے خشکی کے شکار کا قتل کرنا اور اس کی طرف اشارہ کرنا یا اور کسی طرح سے دوسرے کو بتانا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (شکار کو تم حالت احرام میں قتل مت کرو) اور فرمایا وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (تم پر خشکی کا شکار حرام کیا گیا جب تک تم محرم رہو) انشاء اللہ تعالیٰ اس کی مفصل بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

۳۔ تیسرے بالوں کا اور ناخن کا دور کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (اور مت منڈاؤ سروں کو یہاں تک کہ ہدی اپنے ٹھکانے پر جا پہنچے) اور جوں جو میل سے پیدا ہوتی ہے اس کا قتل کرنا بال منڈانے کے حکم میں ہے۔ ۴۔ چوتھے بدن یا کپڑے میں عطر کا استعمال کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسی شئے مت پہنو جس کو زعفران یا ورس لگا ہو، اس حدیث کو ابن عمرؓ نے روایت کیا اور بخاری و مسلم میں ہے یہ چار اشیاء تو مردوں اور عورتوں دونوں پر حرام ہیں۔ اور دو چیزیں خاص مردوں پر حرام ہیں۔ اول سلا کپڑا اور موزے پہننا لیکن اگر کسی کے پاس جوتی نہ ہو اس کو موزے پہننے کی اور جس کے پاس تہبند نہ ہو اس کو پائجامہ پہننے کی اجازت ہے۔ دوسرے سر کا ڈھانکنا، رہا چہرہ کا ڈھانکنا سو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک تو یہ مردوں عورتوں سب پر حرام ہے اور امام شافعیؒ اور احمدؒ فرماتے ہیں کہ خاص عورتوں پر حرام ہے کیونکہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مرد کا احرام سر میں ہے اور عورت کا احرام چہرہ پر ہے اس حدیث کو دار قطنیؒ اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے اور بعض نے اس حدیث کو مرفوع بھی کہا ہے لیکن صحیح نہیں۔

اور عثمان بن عفانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حالات احرام میں چہرہ مبارک ڈھانکتے تھے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کا موقوف ہونا ہی صحیح ہے۔ چنانچہ موطا میں ہے کہ فراقصہ بن عمیر حنفی نے

marfat.com

حضرت عثمانؓ کو عرج میں دیکھا کہ حالت احرام میں اپنا چہرہ ڈھانکے ہوئے تھے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک محرم کو اس کی سواری نے پٹک دیا تھا (جب تکفین کے وقت اس کا سر اور چہرہ ڈھانکنے لگے) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے سر اور چہرہ کو مت ڈھانکو کیونکہ قیامت میں یہ تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا۔ ایک ساتویں شئے اور ہے حالت احرام میں اس کی حرمت کے اندر اختلاف ہے وہ عقد نکاح ہے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ اور احمدؒ تو فرماتے ہیں کہ محرم کو جائز نہیں کہ اپنا یا دوسرے کا عقد نکاح کرے یا دوسرے کو نکاح کا وکیل کرے اور اگر کیا تو منعقد نہ ہوگا۔ دلیل ان کی یہ حدیث ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ محرم نہ نکاح کرے اور نہ نکاح کیا جائے اور نہ منگنی کرے۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ محرم کو نکاح کرنا جائز ہے اور منعقد بھی ہو جائے گا کیونکہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے عقد نکاح کیا اور آپ محرم تھے اور وطی آپ نے ان سے حلال ہونے کے بعد کی اور حضرت میمونہؓ مقام سرف میں رحلت فرما ہوئیں۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ جمہور نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس نکاح میں خود اختلاف ہے۔ چنانچہ مسلم نے یزید بن اصم سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے خود میمونہ بنت الحارثؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے نکاح کیا اور آپ اس وقت حلال تھے اور یزید فرماتے ہیں کہ حضرت میمونہ میری اور ابن عباسؓ کی خالہ ہوتی ہیں۔

جمہور کہتے ہیں کہ خود میمونہؓ کا بیان زیادہ معتبر ہے کیونکہ وہ اپنے حال سے بنسبت ابن عباسؓ کے زیادہ واقف تھیں اور اگر بالفرض تعارض بھی مان لیا جائے تو حضرت عثمانؓ کی حدیث جو صاف حرمت کو بتا رہی ہے وہ تو معارضہ سے سالم ہے۔ اور علاوہ ازیں حضرت عثمانؓ کی حدیث قولی ہے اور میمونہؓ کا قصہ ایک آپ کا فعل ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کی خصوصیت ہو خصوصاً نکاح کے باب میں آپ کے لئے بہت سی ایسی خصوصیات ہیں کہ دوسرے کے واسطے نہیں ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ فسوق تمام معاصی کو کہتے ہیں لیکن فسوق کی تفسیر اول ظاہر ہے کیونکہ معاصی اگر مراد ہوں تو حج کے ساتھ خصوصیت نہ رہے گی۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے لا رفث لا فسوق کو رفع اور تنوین سے لا کا عمل باطل کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے نصب سے بلا تنوین پڑھا ہے۔ اور دونوں طرح پڑھنا جائز ہے اور نظیر اس کی لا حول ولا قوہ اِلّابا للّٰہ ہے۔

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (اور نہ جھگڑا کرنا ہے حج میں) وَلَا جِدَال کو ابو جعفر نے رفع اور تنوین سے پڑھا ہے۔ اور دیگر قراء نے نصب سے پڑھا ہے۔ اہل جاہلیت کی عادت تھی کہ عرفات میں مختلف مواقع پر ٹھہرتے تھے۔ اور ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ میں ابراہیم علیہ السلام کی جگہ ٹھہرا ہوں اور اسی پر آپس میں لڑائی جھگڑا ہوتا تھا۔ اسی بناء پر بعض عرفات میں قیام کرتے تھے اور بعض مزدلفہ میں بعض ذیقعدہ میں حج کرتے تھے اور بعض ذی الحجہ میں اور ہر ایک کہتا تھا کہ جو میں کرتا ہوں یہی ٹھیک ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ ولا جدال یعنی جس طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے اب اس پر حج قرار پکڑ گیا۔ اس میں اختلاف نہ کرو۔ مجاہد نے فرمایا کہ ولا جدال کے یہ معنی ہیں کہ اب اس میں کچھ شک اور نزاع نہیں ہے کہ حج ذی الحجہ میں ہے۔ تو اس سے اللہ تعالیٰ نے نسی[1] کو باطل فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سنو! یہ زمانہ پھر کر اسی ہیئت پر آ گیا جیسا آسمان زمین کی پیدائش کے وقت تھا (یعنی اب اس میں کوئی گھٹانا بڑھانا نہ کرے) اس حدیث کو بخاری و مسلم نے ابو بکرؓ سے روایت کیا ہے فی الحج، لا کی خبر ہے۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ (اور جو کچھ تم کرو گے نیکی اللہ اس کو جان لے گا) مطلب یہ ہے کہ

---

[1] قبائل مضر کے معاشی ذرائع بہت محدود تھے۔ ملک میں زراعت تھی نہ بڑی تجارت۔ قبائل حمیر (یمنی) کی حالت مضر سے بہتر تھی۔ ان کا ملک بھی زرخیز تھا اور غیر ملکی تجارت بھی انکے ہاتھ میں تھی اور صنعت میں بھی وہ مضر سے بہتر تھے لیکن کعبہ کی تولیت مضر کے ہاتھ میں تھی۔ قریش قبائل مضر ہی کی ایک شاخ تھی اسلئے مذہبی سیادت اور فرائض حج کا تعلق مضر ہی سے تھا۔ مضر کی معاش کا بیشتر تعلق آپس کی لوٹ مار سے تھا ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر چڑھائی کرتا اس کے مویشیوں کو لوٹتا اور عورتوں (اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے)

ﷺ

marfat.com

جو کچھ تم بھلا کام کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں تم کو اس کا بدلہ دیں گے نہی عن المنکر کے بعد خیر پر برانگیختہ فرمایا ہے۔

وَتَزَوَّدُوا (اور زاد راہ لے جایا کرو) اس کے متعلق ایک قصہ ہے، بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ اہل یمن کی عادت تھی کہ جب وہ حج کو آتے تو زاد راہ ساتھ نہ لاتے اور یہ کہتے تھے کہ ہم لوگ متوکل ہیں اور جب مکہ آتے تو لوگوں سے بھیک مانگتے تھے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ لوٹ اور غصب تک ان کی نوبت پہنچتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا و تزودوا یعنی زاد راہ اس قدر لے جایا کرو کہ جس سے وہاں تک پہنچ جاؤ اور آبرو کو بچاؤ۔

فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بے شک بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے) التقوی سے مراد وہ شئے ہے جو سوال کرنے اور لوٹ مار کرنے سے محفوظ رکھے۔

وَاتَّقُوْنِ (اور مجھ سے ڈرو) ابو عمرو نے والتقون کو وصل کی حالت میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں حذف یا سے پڑھا ہے۔

يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾ (اے عقلمندو) اس خطاب سے اسلئے یاد فرمایا کہ عقل کا اقتضا ہے کہ اللہ غالب سے ڈریں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (تم پر کچھ گناہ نہیں کہ چاہو فضل اپنے پروردگار کا) فضلاً یعنی تجارت وغیرہ سے اللہ تعالیٰ کی عطا اور رزق اگر سفر حج میں طلب کرو تو کچھ گناہ نہیں۔ بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جاہلیت میں تین بازار تھے عکاظ اور مجنہ اور ذو المجاز۔ جب اسلام کا زمانہ آیا تو لوگ گناہ سمجھ کر ان بازاروں میں تجارت سے رکے اس پر حق تعالیٰ نے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا الخ نازل فرمائی۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ ابن عباسؓ نے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فِیْ مواسم الحج پڑھا ہے۔

اور امام احمد اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر اور حاکم وغیرہم نے روایت کی ہے کہ ابو لامہ تیمی نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ ہم لوگ مکہ تک سواریاں کرایہ پر چلاتے ہیں، اب لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا حج ادا نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کیا تم اوروں کی طرح احرام نہیں باندھتے، طواف نہیں کرتے، رمی نہیں کرتے۔ میں نے کہا کیوں نہیں سب ارکان ادا کرتے ہیں۔ فرمایا بس تو حج ادا ہو گیا۔ اس کے بعد ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور یہی سوال پیش کیا جو تو نے کیا، حضور ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا حتی کہ جبرئیل علیہ السلام آیت لیس علیکم جناح الخ لے کر نازل ہوئے۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ (پھر جب تم لوٹو میدان عرفات سے) افاضہ کے معنی بکثرت چلنے کے ہیں۔ عرفات جمع عرفہ کی ہے عرفات ایک میدان کا نام ہے۔ جمع اس کی اس اعتبار سے ہے کہ اس کا ہر ٹکڑا گویا عرفہ ہے۔ عرفات کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ مقام علامات سے بتایا گیا تھا، جب اس کو دیکھا تو پہچان لیا اس لئے اس کا نام عرفات رکھ

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) مردوں اور بچوں کو گرفتار کر کے باندی غلام بناتا اور بازار میں لے جا کر فروخت کر دیتا۔ یہ عام دستور تھا اور ہر زمانہ میں قتل و غارت کا بازار گرم رہتا تھا۔ لیکن حج کے مہینوں میں علاوہ مذہبی فرض ادا کرنے کے تین میلے بھی لگتے تھے۔ ذو المجاز، ذو المجنہ اور عکاظ۔ اس لئے ان مہینوں میں راستوں کا مامون رہنا ضروری تھا ورنہ تجارت قطعاً بند ہو جاتی اور کوئی حج کو نہ آسکتا تھا اس لئے ماہ رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم کو عرب نے ماہ ہائے حرام قرار دے رکھا تھا یعنی ان چار مہینوں میں جدال، قتال، مار دھاڑ، بالکل بند رکھی جاتی اور جو شخص جہاں چاہتا امن کے ساتھ چلا جاتا مگر جب کو چھوڑ کر مسلسل تین ماہ تک جدال قتال سے رکا رہنا عرب کی جنگجو طبائع کے خلاف تھا اس کے علاوہ مسلسل بندش قتال سے ان کی معاش پر بھی اثر پڑتا تھا اس لئے انہوں نے کبس یا کبیسہ یا نسی کی ایک رسم ایجاد کر رکھی تھی۔ حج کے بعد عکاظ کے میلہ میں جب سب لوگ شریک ہوتے تھے تو قریش کا ایک سردار کھڑے ہو کر اعلان کر دیتا کہ آئندہ محرم کے مہینہ میں میں نے جدال قتال جائز کر دیا اس سال محرم کا مہینہ ماہ محرم کا مہینہ ماہ حرام نہیں رہا۔ بلکہ محرم کی حرمت کی جگہ میں نے ماہ صفر کو حرام بنا دیا۔ آئندہ صفر میں جدال قتال ناجائز ہے اس رسم نسی کو قرآن نے زیادت فی الکفر قرار دے دیا اور اس جگہ نفی الحج فرما دیا۔ ۲۔

marfat.com

دیا۔یا اس لئے کہ جبرئیل علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کو تمامی مشاعر میں گھمایا، جب سب مقامات دکھائے، تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "عرفت" یعنی میں نے پہچان لیا۔ اس مضمون کو ابن جریرؒ نے ابن عباسؓ اور علیؓ سے نقل کیا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ ضحاک نے کہا ہے کہ جب ادم علیہ السلام زمین پر اترے تو ہند میں آئے اور حوا جدہ میں رہیں۔ ایک مدت تک ایک دوسرے کی تلاش میں رہے۔ عرفات میں آکر دونوں ملے اور وہاں ایک دوسرے کی معرفت ہوئی۔ اس لئے اس میدان کو عرفات کہتے ہیں۔ اور سدی نے کہا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا۔ اور سب نے تلبیہ سے اس کی اجابت کی اور جن کو آنا تھا وہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا کہ عرفات میں جائیں اور علامات سے اس کو بتادیا۔ جب عقبہ کے پاس ایک درخت پر پہنچے تو سامنے سے شیطان آیا اور وہاں سے لوٹانے لگا تو ابراہیم علیہ السلام نے اس کے ساتھ کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ شیطان وہاں سے بھاگا اور دوسرے جمرہ پر آیا وہاں بھی ابراہیم علیہ السلام نے رمی کی اور تکبیر کہی وہاں سے بھی اڑا اور تیسرے پر آیا ابراہیم علیہ السلام نے وہاں بھی کنکریاں ماریں۔ جب شیطان نے دیکھا کہ یہ تو مانتے ہی نہیں تھک کر چلا گیا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام وہاں سے چل کر ذوالمجاز میں تشریف لے گئے اور اس کے بعد عرفات میں قیام فرمایا اور اس کو بتائی ہوئی علامات سے پہنچانا اس لئے وہ وقت تو عرفہ اور وہ مقام عرفات کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جب شام ہوئی تو ابراہیم علیہ السلام مزدلفہ میں آئے اور ازدلاف کا معنی ہے قرب چونکہ ابراہیم علیہ السلام اس مقام کے پاس آئے تھے اس لئے اس کو مزدلفہ کہنے لگے اور ابو صالح سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ترویہ کی رات یہ خواب دیکھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں صبح ہوئی تو تمام دن فکر کیا کہ یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان کی جانب سے اور ترویہ کے معنی لغت میں فکر کرنا ہے اس لئے اس دن کو یوم ترویہ کہنے لگے پھر یہی خواب عرفہ کی رات دیکھا جب صبح ہوئی تو پہچانا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اس لئے یہ دن عرفہ کہلانے لگا کیونکہ معرفت کے معنی لغت میں پہچاننا ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (تو یاد کرو اللہ کی مشعر حرام کے پاس) مشعر حرام مزدلفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان کی جگہ کا نام اور اس کی حد مازمان سے محسر تک ہے خود مازمان اور محسر، مشعر کے اجزا نہیں ہیں۔ اس مقام کو مشعر اس لئے کہتے ہیں کہ مشعر، شعار بمعنی علامت سے ماخوذ ہے چونکہ یہ مقام بھی معالم حج سے ہے۔ اس لئے اس کو مشعر کہنے لگے۔ اور حرام کے اصل معنی منع (روکنا) ہیں اور معنی منع کے اس میں یہ ہیں کہ یہ مشعر حرام حرم میں ہے اس لئے جن امور کی اجازت شرع سے نہیں وہ اس میں بھی کرنا ممنوع ہیں اور مزدلفہ کو جمع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ اور عرفہ سوائے بطن عرنہ کے تمام ٹھہرنے کی جگہ ہے اسی طرح مزدلفہ میں بھی اجازت ہے کہ جہاں چاہو ٹھہرو مگر وادی محسر مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عرفہ سب ٹھہرنے کی جگہ ہے لیکن بطن محسر سے الگ ہو جاؤ۔ اس حدیث کو طبرانی نے اور طحاوی اور حاکم نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے اس کو موقوف اور مرفوع دونوں طرح روایت کیا ہے اور اسی مضمون کی احادیث جابرؓ، جبیر بن مطعمؓ، ابوہریرہؓ اور ابو رافعؓ سے بھی منقول ہیں لیکن ان کی سندوں میں کلام ہے اور امام مالکؒ نے موطا میں اسی حدیث کو مرفوع روایت کیا ہے۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ (اور یاد کرو اسے جس طرح اس نے تم کو بتلایا ہے) یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو سکھایا ہے یا ہدایت کیا ہے اس طور پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو یعنی توحید کے ساتھ یاد کرو۔ شرک کے ساتھ کفار کی طرح اللہ کا ذکر نہ کرو۔ کما ھداکم میں ما مصدریہ یا کافہ ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ (اور بے شک تم تھے اس سے پہلے گمراہوں میں) یعنی بے شک تم اس ہدایت سے پہلے مشرک تھے، یا اطاعت اور ایمان سے بالکل جاہل تھے۔ وان کنتم میں ان مخففہ ہے اور لام فارقہ ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان نافیہ ہے اور لام بمعنی الا ہے جیسے کی آیت کریمہ وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ میں بھی

marfat.com

بھی صورت ہے۔

ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (پھر تم بھی چلو جہاں سے چلیں دوسرے لوگ) ابن جریرؒ
نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حج کے واسطے عرب تو عرفہ میں ٹھہرتے تھے اور قریش مزدلفہ میں قیام
کرتے تھے۔ اس پر حق تعالیٰ نے ثم افیضوا الخ نازل فرمائی اور ابن منذر نے اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت کی ہے کہ قریش
مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور اور لوگ سوائے شیبہ ابن ربیعہ کے عرفہ میں ٹھہرتے تھے اس لئے حق تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ
نازل فرمائی۔ علامہ بغوی نے فرمایا ہے کہ قریش جو حمس (شدت اور حیثیت والے) کہلاتے تھے اور ان کے حلیف عرفات میں
دوسرے اہل عرب کے ساتھ ٹھہرنے کو عار سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہل اللہ ہیں اور اس کے حرم کے رہنے والے
ہیں۔ اس لئے ہم حرم کو نہیں چھوڑتے اور یہاں سے نہیں نکلتے اور دوسرے لوگ عرفات میں ٹھہرتے تھے۔ پھر جب لوگ
عرفات سے چلتے تھے تو حمس مزدلفہ سے کوچ کرتے تھے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ سے ارشاد فرمایا ہے کہ مثل
اوروں کے عرفات میں ٹھہریں اور مزدلفہ میں سب کے ساتھ جائیں۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بتادیا کہ عرفات میں ٹھہرنا
ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ ان روایت کے موافق آیت میں الناس سے سوائے حمس کے تمام لوگ مراد ہیں اور
ضحاک نے فرمایا ہے کہ الناس سے یہاں ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں جیسے اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ الآیۃ میں النَّاس سے محمد ﷺ
مقصود ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ اِذْ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ پہلے الناس سے نعیم بن مسعود اشجعی مراد
ہے۔ زہری نے فرمایا ہے کہ اس مقام پر الناس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، دلیل اس کی یہ ہے کہ سعید بن جبیرؒ کی قرأت ثُمَّ
اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسِىْ ہے اور ناسی آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ ناسی کے معنی بھولنے والا ہے اور آدم علیہ
السلام بھی اللہ کے عہد کو بھول گئے تھے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں ثم یعنی عرفات سے آنے کے
بعد افیضوا الخ یعنی مزدلفہ سے منیٰ کو چلو۔ اور تفسیر اول اکثر مفسرین کا قول ہے لیکن تفسیر اول پر لفظ ثم نہیں بنتا کیونکہ
عرفات سے چلنا مشعر حرام سے پہلے ہوتا ہے۔ اس لئے بعض مفسرین۔ نے تو اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں ثم بمعنی واو ہے اور
وجہ یہ ہے کہ ثم اس مقام پر عرفات اور مزدلفہ کے ٹھہرنے میں فرق مرتبہ بیان کرنے کے واسطے آیا ہے کیونکہ عرفات کا
وقوف تو فرض اور حج کا رکن ہے اس کے فوت ہونے سے حج فوت ہو جاتا ہے۔ بخلاف مزدلفہ میں ٹھہرنے کے کیونکہ وہ بالاتفاق
حج کا رکن نہیں۔ لیکن لیث اور علقمہ فرماتے ہیں کہ مزدلفہ کا وقوف بھی رکن ہے اور اس کی نظیر قرآن شریف میں یہ آیت ہے فَكُّ
رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ (چھڑانا
گردن کا یا کھانا کھلانا بھوک کے دن یتیم رشتہ دار کو یا محتاج خاک افتادہ کو بعد ازاں ہونا ان لوگوں میں جو ایمان لائے ہیں) مقصود
اس آیت کا یہ ہے کہ ایمان تمام نیکیوں سے مرتبہ میں زیادہ ہے[1] واللہ اعلم۔ اس کے بعد معلوم کرنا چاہئے کہ اس پر تو سب کا
اتفاق ہے کہ مزدلفہ کا ٹھہرنا رکن نہیں ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ آیا واجب ہے کہ اگر فوت ہو جائے تو قربانی واجب ہو یا
سنت ہے۔ جمہور تو واجب کہتے ہیں لیکن قدر واجب میں اختلاف ہے۔ ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یوم نحر کی طلوع فجر کے بعد
مزدلفہ کا وقوف واجب ہے۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نحر کی شب کو مزدلفہ میں ٹھہرنا واجب ہے اگرچہ ایک ہی ساعت ہو اور

[1] عربی زبان میں ثمَّ (پھر) عطف ترتیبی کیلئے آتا ہے لیکن اس ترتیب میں تعقیب اور تاخیر شرط ہے یعنی ثمَّ سے پہلے جس چیز یا
فعل کا وقوع ہوا ہو اس سے کچھ دیر کے بعد اس چیز یا فعل کا وقوع ہونا چاہئے جو ثمَّ کے بعد مذکور ہو ثم کا یہ حقیقی استعمال ہے۔ لیکن آیت
میں تعقیب کا معنی درست نہیں ہے بلکہ واقعہ برعکس ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ عرفات سے روانگی سے مزدلفہ کا قیام پہلے ہو کیونکہ ثم سے
پہلے مزدلفہ کے قیام کا بیان ہے اور ثم سے بعد عرفات سے روانگی کا حکم ہے مگر واقع میں اس کے خلاف ہوتا ہے۔ عرفات کا قیام پہلے ہوتا
ہے اور مزدلفہ کا قیام اس کے بعد۔ معلوم ہوا کہ آیت میں ثم کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے کیونکہ ثم مجازاً ترتیب مرتبہ
کے لئے بھی آتا ہے اگر بعض چیزوں کا مرتبہ کم ہو اور بعض کا زیادہ تو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کیلئے ثم (باقی اگلے صفحے پر)

marfat.com

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ آدھی رات کے بعد ٹھہرنا واجب ہے۔ وجوب کی دلیل یہی آیت کریمہ فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ الخ ہے۔ یہ آیت شریفہ اپنی عبارت سے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور اس کے اشارہ سے وقوف عرفات سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کلام سے مقصود تو مشعر حرام کے پاس ذکر کرنا ہے اور عرفات سے چلنا اس کی شرط ہے اس لئے وقوف مزدلفہ واجب ہوا۔ اگر کوئی کہے کہ ذکر مشعر حرام کے پاس کسی کے نزدیک واجب نہیں اور یہ امر بطور استحباب کے ہے پھر وقوف مزدلفہ کے واجب ہونے پر استدلال اس آیت سے کیسے صحیح ہوگا۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ ذکر کے معنی غفلت کو دور کرنا ہے اور غفلت کا ازالہ جیساکہ زبان سے ہوتا ہے اسی طرح اعضاء کے کام میں لانے سے بھی ہوتا ہے۔

صاحب حسین نے فرمایا ہے کہ جو اللہ کا مطیع ہے وہ ذاکر ہے اس بناء پر مزدلفہ کا وقوف عبادت کی نیت سے لامحالہ ذکر ہے اور یہی مامور بہ ہے اس لئے وقوف واجب ہوا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب مزدلفہ میں ٹھہرنا ہوگا تو تلبیہ اور دعا اور مغرب اور عشاء اور فجر کی نماز بھی ضرور ہی وہاں پڑھنی ہوگی اور یہ سب ذکر ہے تو ممکن ہے کہ لازم (نماز، دعا، تلبیہ) بول کر ملزوم (وقوف) مراد لیا ہو جیساکہ آیت کریمہ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (پڑھو جو آسان ہو قرآن میں سے) اس میں نماز پڑھنا مراد ہے لیکن چونکہ قرأت نماز کے لئے لازم تھی اس لئے اس کو ذکر فرمایا۔ یہ تو وقوف کے واجب ہونے کا اثبات قرآن سے تھا اب سنئے کہ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مزدلفہ کا ٹھہرنا واجب ہے۔ عروۃ بن مضرسؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مزدلفہ میں ہمارے ساتھ فجر کی نماز میں یوم نحر کے دن حاضر رہا اور ہمارے ساتھ چلنے تک ٹھہرا اور عرفہ میں رات یا دن کو اس سے پہلے ٹھہرا اس کا حج پورا ہوا۔ اس حدیث کو اصحاب سنن اور ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکمؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث تمام اہل حدیث کی شرط کے موافق صحیح ہے۔ تو دیکھئے کہ اس حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے حج کی تکمیل کو مزدلفہ کے ٹھہرنے پر موقوف فرمایا ہے۔ یہی دلیل وجوب کی ہے اور نسائی نے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے کہ جس نے مزدلفہ کے ٹھہرنے کو امام کے ساتھ پالیا اس نے حج پالیا اور جس نے نہیں پایا اس نے حج نہیں پایا اور ابو یعلےٰ نے اس مضمون کو اس طرح کہا ہے کہ جس نے مزدلفہ کو نہیں پایا اس کا حج نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مزدلفہ میں ٹھہرنا بعد صبح کے واجب ہے اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔ نیز اس آیت سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ مزدلفہ میں بعد صبح کے ٹھہرنا واجب ہے کیونکہ آیت میں مزدلفہ کا ٹھہرنا عرفات کے ٹھہرنے پر مرتب ہے اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ عرفات میں ٹھہرنے کا وقت آخر رات تک ہے۔ اس بنا پر جو شخص عرفات میں آخر دسویں رات تک اگرچہ ایک ساعت ہی ٹھہرا ہو اس نے حج پالیا۔ اب لامحالہ مزدلفہ میں ٹھہرنے کا وقت بعد صبح کے ہوگا۔ اور عبد الرحمن بن یعمر دیلمی فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ عرفات میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور لوگ آرہے ہیں۔ نجد والے بھی آئے اور انہوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ حج کیا ہے فرمایا کہ حج بروز عرفہ ہے (یعنی عرفات میں نویں تاریخ کو ٹھہرنا) اور جس نے مزدلفہ کو صبح کی نماز سے

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) ثم کا استعمال کرلیا جاتا ہے جیسے آیت فک رقبہ او اطعام الخ میں مذکور ہے غلام آزاد کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور یتیموں کی پرورش کرنا سب اچھے کام ہیں اور ضروری بھی ہیں مگر ایمان کا درجہ سب سے اونچا ہے اس لئے ثم سے پہلے مذکورہ نیکیوں کا تذکرہ کیا اور ثم کے بعد ایمان کا۔ یہ فقیر کہتا ہے کہ یہ مطلب اس تقدیر پر ہوگا جب ثم کان کو کلام مثبت قرار دیا جائے اور فک رقبۃ پر اس کا معنوی عطف ہونا کہا جائے لیکن بعض علماء تفسیر نے ثم کان کو معنی منفی کلام قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ثم کان کا عطف اقتحم العقبہ پر ہے اور دونوں لا کے تحت ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہ گھاٹی میں داخل ہوا نہ مومنوں کی صف میں شامل ہوا، اس وقت ثم کا استعمال اپنے حقیقی معنی میں ہوگا کیونکہ جو امور مسلم الثبوت کارہائے خیر تھے مثلاً یتیم پروری، غریب نوازی غلاموں کی آزادی۔ یہ کام اسلام سے پہلے کافروں کی نظر میں بھی اچھے تھے اور کچھ لوگ یہ نیکیاں کرتے تھے لیکن شرپسند لوگ اس زمانہ میں بھی ان نیکیوں سے محروم تھے۔ پس آیت کی مراد یہ ہے کہ یہ شخص دور جاہلیت کے محاسن اور خصائل حمیدہ سے بھی محروم تھا پھر جاہلیت کے بعد جب اسلام آیا تو یہ ایمان سے بھی بے بہرہ رہا۔ ۱۲ منہ

marfat.com

پہلے پالیا اس نے حج پالیا۔ اور ایام منیٰ ایام تشریق ہیں جو دو ہی دن ٹھہر اور چل دیا اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہا اس پر بھی کچھ گناہ نہیں۔ اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اس حدیث کو طحاوی نے روایت کیا ہے اور اس حدیث سے امام مالکؒ یہ مسئلہ مستنبط کرتے ہیں کہ مزدلفہ میں صبح سے پہلے ٹھہرنا واجب ہے۔ لیکن یہ استنباط صحیح نہیں کیونکہ اصحاب سنن اور حاکم اور دار قطنی اور بیہقی نے اس حدیث کو اس مضمون سے روایت کیا ہے کہ حج عرفہ ہے جو شخص صبح کی نماز سے پہلے مزدلفہ کو رات کو آگیا اس کا حج پورا ہو گیا۔ یہ مضمون مزدلفہ میں ٹھہرنے پر بالکل دال نہیں۔ اور امام احمدؒ حدیث مذکور سے یہ مستنبط فرماتے ہیں کہ مزدلفہ میں رات گزارنا واجب ہے کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ میں رات گزاری اور بعد نماز صبح کے آپ ٹھہرے اور آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اپنے حج کے طریقے سیکھ لو۔

میں کہتا ہوں کہ مقتضٰی اس استدلال کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب باشی اور بعد صبح کے قیام کرنا دونوں واجب ہیں لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے کنبہ کے ضعیف لوگوں کو مزدلفہ سے منیٰ کی طرف صبح ہی جانے کی اجازت عطا فرمادی تھی اس سے معلوم ہوا کہ صبح کے بعد کا ٹھہرنا واجب نہیں۔ چنانچہ شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ میں بھی ان ہی لوگوں میں تھا جن کو رسول اللہ ﷺ نے آگے بھیج دیا تھا اور صحیحین میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہم کو منیٰ کی طرف چاند چھپنے کے بعد چلنے کی اجازت دیدی تھی اور ابن عمر اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہم سے بھی اسی مضمون کی احادیث منقول ہیں۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ضعفاء کو اجازت ہو جانے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اور قوی لوگوں کے ذمہ بھی مزدلفہ میں ٹھہرنا واجب نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے جب یہ نتیجہ نکلا کہ عرفہ اور مزدلفہ میں ٹھہرنا واجب ہے اور مزدلفہ میں ٹھہرنا رکن نہیں ہے تو پھر تم کیسے کہتے ہو کہ عرفات میں ٹھہرنا رکن ہے۔ تو جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ وقوف عرفہ کے رکن ہونے پر اجماع ہے اگر عرفہ میں ٹھہرنا فوت ہو جائے تو حج فوت ہو جائے گا۔ اور اگر مزدلفہ کا ٹھہرنا فوت ہو تو حج نہیں جاتا۔ اور سند اجماع یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حج عرفہ ہے (یعنی عرفہ کا ٹھہرنا) اور خبر واحد اجماع کی سند بن سکتی ہے اور کیا عجب ہے کہ اہل اجماع نے وقوف عرفات کی رکنیت کو حضور ﷺ کے ہی قول سے لیا ہو۔ واللہ اعلم۔

اس میں اختلاف ہے کہ عرفات میں ٹھہرنے کا وقت کیا ہے۔ امام احمدؒ نے تو یہ فرمایا ہے کہ عرفہ کے دن کی صبح صادق کے بعد سے ٹھہرنے کا وقت ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ عرفہ کے دن بعد زوال سے ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عرفہ کے دن غروب آفتاب سے دسویں تاریخ کی صبح صادق تک ٹھہرنے کا وقت ہے امام مالکؒ کا استدلال عبدالرحمٰن بن یعمر دیلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث گزشتہ سے ہے کیونکہ اس میں صاف مذکور ہے کہ جو شخص مزدلفہ کی رات صبح کی نماز سے پہلے آیا اس کا حج پورا ہو اور امام احمد رحمۃ اللہ کی دلیل عروہ بن نضرس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کیونکہ اس میں مذکور ہے کہ جو عرفات میں اس سے پہلے آیا رات کو یا دن کو اس کا حج تمام ہوا اور امام ابو حنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہما کی دلیل یہ ہے کہ مسلم اور دیگر اہل حدیث نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ یوم ترویہ کو منیٰ کی طرف چلنے کے لئے سوار ہوئے اور وہیں آکر ظہر، عصر، مغرب، عشا، فجر پانچوں نمازیں پڑھیں۔ پھر تھوڑی دیر ٹھہرے حتیٰ کہ سورج نکل آیا اس کے بعد حضور ﷺ نے ایک چرمی خیمہ (عرفات میں) نصب کرنے کا حکم دیا اسی وقت ایک چرمی قبہ آپ کیلئے نصب کر دیا گیا اسکے بعد آپ منیٰ سے چلے اور عرفات میں پہنچے تو قبہ نصب کیا ہوا پایا آپ وہاں اترے جب دن ڈھل گیا اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہو کر بطن وادی میں تشریف لائے۔ اب اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ٹھہرنے کا وقت بعد زوال کے ہے اگر قبل از زوال ہوتا تو ضرور حضور ﷺ پہلے بطن وادی میں تشریف لاتے اور قبہ میں تشریف نہ رکھتے۔ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث تو صرف اس پر دال ہے کہ بعد زوال کے ٹھہرنا افضل ہے اس سے یہ نہیں نکلتا کہ اگر زوال سے پہلے ٹھہرا تو کافی نہیں اور سالم بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عرفہ کے دن زوال کے بعد حجاج کے پاس آئے اور میں

marfat.com

ساتھ تھا پس فرمایا کہ اے حجاج اگر سنت کا اتباع چاہتا ہے تو اس وقت چل اس نے کہا اچھا ابھی چلتا ہوں۔ لیکن اس حدیث سے بھی زوال کے بعد ٹھہرنے کی افضلیت سمجھی جاتی ہے یہ نہیں نکلتا کہ اگر زوال سے پہلے ٹھہرا تو جائز نہیں۔

اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ (اور گناہ بخشواؤ اللہ سے بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے) یعنی جاہلیت میں جو حرکات ناشائستہ حج کے دنوں میں کرتے تھے ان کو اللہ سے بخشواؤ۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (پھر جب تم پورے کر چکو اپنے حج کے ارکان) یعنی جب ارکان حج سے فارغ ہو جاؤ اور یہ فراغت جمرۂ عقبہ کی رمی اور ذبح اور سر منڈانے اور طواف اور سعی کے بعد یوم نحر کو ہوتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ ارکان حج احرام اور وقوف عرفہ اور طواف زیارت تو بالاجماع ہیں اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ سعی اور سر منڈانا بھی ہے اور سعی کی بحث پہلے گزر چکی ہے حلق (سر منڈانا) کی بحث انشاء اللہ ہم سورۂ حج میں ذکر کریں گے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ (تو یاد کرو اللہ کو) یعنی اللہ کی تحمید اور تکبیر اور ثنا بیان کرو۔

كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ (مثل اپنے باپ دادے کے یاد کرنے کے) اس کا قصہ یہ ہے کہ جاہلیت میں اہل عرب جب حج سے فارغ ہوتے تھے تو بیت اللہ کے پاس کھڑے ہو کر اپنے باپ دادا کے فضائل اور مفاخر بیان کرتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کا حکم فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب اور سب کے باپ دادوں کا مولیٰ ہے، اس کا ذکر کرنا چاہئے باپ دادوں نے ان کو پیدا نہیں کیا بلکہ سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (بھلا دیکھو تو سہی جو عورتوں کے رحم میں ٹپکاتے ہو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا فرمانے والے ہیں) ابن عباس اور عطاء رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ کی ایسی یاد کرو جس طرح چھوٹے ننھے بچے اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر تو بہ نسبت باپوں کے ماؤں کا ذکر کرنا زیادہ زیبا تھا۔

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یاد ہو) اشد یا تو مجرور اور ذکر پر معطوف ہے اس وقت تقدیر عبارت کی یہ ہوگی وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذکرا کذکرکم اٰباء کم او کذکر اشد منہ (یاد کرو اللہ کو مثل اپنے باپ دادوں کی یاد کے بلکہ مثل ایسی یاد کے جو پہلی یاد سے بڑھی ہوئی ہو) اور یا کذکرکم کا مضاف الیہ پر عطف ہے یا منصوب ہے۔ اس تقدیر پر یا تو اٰباء کم پر عطف ہوگا اور ذکرا مصدر بمعنی مفعول ہوگا اور یا تقدیر اس طرح ہوگی کہ کونوا اشد ذکر اللہ منکم لاٰباء کم اس عبارت کا بھی حاصل وہی ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ (پھر بعض آدمی کہتے ہیں) ان سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی طمع صرف دنیا ہی پر منحصر ہے یعنی وہ مشرک جو حشر و نشر کے منکر ہیں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا (اے ہمارے پروردگار دیدے ہم کو دنیا ہی میں) اٰتنا کا مفعول ثانی بغرض تعمیم حذف کر دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا ہی میں ہر شئے دیدے۔ مشرکین کی عادت تھی کہ حج میں دنیا ہی کو مانگتے تھے۔

وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

(اور نہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ اور کوئی ان میں سے کہتا ہے اے ہمارے پروردگار دے ہم کو دنیا میں بھلائی) حسنة میں تنکیر تعظیم کی ہے یعنی بڑی بھلائی یعنی عمل کا خالص اللہ کے لئے کرنا۔ اور ممکن ہے کہ عموماً سب بھلائیاں مراد ہوں کیونکہ نکرہ موقع اثبات میں بھی بعض مرتبہ قرینہ اور مقام کی وجہ سے عام ہو جاتا ہے جیسا کہ تمرةٌ خَيْرٌ مِّنْ جَرَادَةٍ یعنی ہر تمرہ ہر ٹڈی سے بہتر ہے۔ اس بنا پر ٹڈی کے قتل کرنے کے بدلے اگر کوئی تمرہ دے تو کافی ہو جائے گا۔ یہ آیت نظیر ہو گئی اس دعا کی جو حدیث شریف میں آئی ہے اللّٰھم انی اسألک من الخیر کلہ عاجلہ واٰجلہ ما علمت منہ و مالم اعلم۔

marfat.com

وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (اور آخرت میں بھی بھلائی) حسنة سے مراد اللہ کی رضامندی اور تمام نعمتیں ہیں۔
وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ (اور ہم کو بچالے دوزخ کے عذاب سے) علامہ بغوی نے اپنی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایسا دبلا ہو رہا ہے کہ جیسے بیضہ میں سے پرندہ کا بچہ نکلتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تو اللہ سے کچھ دعا کرتا تھا یا کچھ مانگا کرتا تھا اس نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں یوں کہا کرتا تھا کہ اے اللہ جس قدر آپ مجھ کو آخرت میں عذاب کریں گے دنیا ہی میں کر لیجئے، حضور ﷺ نے فرمایا، سبحان اللہ تیرے اندر اس عذاب کی برداشت کی قوت نہیں ہے تو نے اس طرح کیوں نہ کہا ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة وقنا عذاب النار۔ نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اکثر یہ آیت یعنی ربنا اٰتنا فی الدنیا الخ (بطور دعاء) تلاوت فرمایا کرتے تھے اور عبد اللہ بن سائب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ رکن بنی جمح اور رکن اسود کے درمیان ربنا اٰتنا فی الدنیا الاٰیة پڑھتے تھے۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی اور ابن حبان اور حاکم اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے اور ابوالحسن بن الضحاک نے روایت کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اگر سو مرتبہ بھی دعا فرماتے تھے تو ربنا اٰتنا فی الدنیا ہی سے دعا شروع فرماتے اور اسی پر ختم فرماتے تھے اور اگر دو دعائیں فرماتے تو ان دونوں میں سے ایک یہی دعا ہوتی تھی اور تقی بن مخلد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی دعا کے اول میں اور اوسط میں اور آخر میں یہی آیت ہوتی تھی ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة الخ الاٰیة۔

النصف

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ (یہی ہیں جن کے لئے حصہ ہے ان کے کئے کا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے اور یاد کرتے رہو اللہ کو گنتی کے چند دنوں میں، پھر جو جلدی چلا گیا دو ہی دن میں) اولئک سے فریق ثانی (جو دین اور دنیا دونوں کی بھلائی کے طالب ہیں) کی طرف اشارہ ہے اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ دونوں فریق مراد ہیں مما کسبوا دعا کو کسب اس لئے فرمایا کہ وہ اعمال میں سے ہے۔ واللّٰہ سریع الحساب اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جتنی دیر میں آنکھ جھپکتی ہے اس سے بھی جلدی حساب لے لیں گے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ قیامت عنقریب آنے والی ہے اس لئے آخرت کو طلب کرو۔ ایام معدودات سے ایام تشریق مراد ہیں ان کو معدودات کمی کے سبب سے فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین سے اسی طرح منقول ہے اور نیز آیت فمن تعجّل فی یومین بھی اس پر دال ہے۔ فمن تعجل فی یومین یعنی جس نے کوچ کرنے میں جلدی کی اور ایام تشریق کے دوسرے دن چلدیا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جو شخص دوسرے دن نہ چلا اور ایام تشریق کا تیسرا دن آگیا تو اس دن کی رمی اس پر واجب ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ تشریق کی راتوں میں سے تیسری رات کا اعتبار ہے یا تیسرے دن کا۔ جمہور تو رات کا اعتبار کرتے ہیں اس بنا پر جو شخص منیٰ میں ٹھہرا رہا حتیٰ کہ تیسری رات آگئی تو اس کے لئے کوچ کرنا بغیر رمی جمار کے حلال نہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر رمی ضروری نہیں ہاں اگر منیٰ میں اس کو تیسرے دن کی صبح ہو جائے تو البتہ اس دن کی رمی اس پر واجب ہوگی اور جب تک صبح نہ ہوئی اس کو اجازت ہے کہ رات کو کوچ کرے امام ابو حنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ رمی کا وقت دن ہے تو جو شخص رات کو چل دیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے جمعہ کے وقت سے پہلے کسی نے سفر کیا کہ اس پر جمعہ واجب نہیں اور جمہور یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ کنکریاں مارنے کا وقت رات نہیں ہے لیکن ٹھہرنے کا وقت تو ہے اور منیٰ میں شب باشی کرنا رات ہو جانے کے بعد واجب ہے، کوچ کرنا حلال نہیں۔ واللہ اعلم۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ (تو اس پر کچھ گناہ نہیں) گناہ اس لئے نہیں ہے کہ اس نے رخصت پر عمل کیا۔
وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ (اور جو ٹھہرا رہا اس پر بھی کچھ گناہ نہیں یہ ان کے لئے ہے جو پرہیز

marfat.com

گاری کریں) یعنی جس نے کوچ میں تاخیر کی اور تیسرے دن رمی کی اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور یہ اولیٰ اور افضل ہے۔ اس آیت میں اہل جاہلیت کا رد ہے۔ بعض لوگ تو جلدی چلے جانے والوں کو گناہ گار سمجھتے تھے اور بعض تاخیر کرنے والوں پر گناہ کا دھبہ لگاتے تھے لمن اتقی یعنی یہ احکام اس شخص کے لئے ہیں جو پرہیز گاری اختیار کریں کیونکہ وہی ان سے منتفع ہوگا اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ لمن اتقی کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنے حج میں ان اشیاء سے بچا جن کو اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا ہے تو وہ بخشا بخشایا وہاں گیا اس پر کچھ گناہ نہیں خواہ وہ کوچ میں جلدی کرے یا دیر کرے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت علیؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔ اور ایک حدیث مرفوع اس کی مؤید بھی ہے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے اللہ کے واسطے حج کیا اور نہ اس میں جماع کیا نہ فسق کیا وہ ایسا ہو کر آیا گویا اس کی ماں نے ابھی اس کو جنا ہے (بے گناہ)۔ اس حدیث کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، نیز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حج مبرور (جس میں کوئی امر خلاف شرع نہ ہوا ہو) کا بدلہ سوائے جنت کے اور کچھ نہیں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حج اور عمرہ دونوں فقر اور گناہوں کو ایسا دور کر دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے کے میل کو۔ اس حدیث کو امام شافعی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی امام احمد نے اسی مضمون کی حدیث روایت کی ہے۔

جاننا چاہئے کہ ایام تشریق میں منی میں ٹھہرنا اور راتوں کو رہنا اور رمی یہ سب بالاتفاق رکن نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فاذاقضیتم مناسککم فاذکرو اللہ الآیۃ۔ اس آیت میں مناسک کے ادا کر لینے پر منیٰ میں ذکر کرنے کو مرتب فرمایا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بعد کے سب افعال داخل مناسک نہیں ہیں، رہا وجوب سو اس میں اختلاف ہے امام احمد رحمتہ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں کہ رات کو رہنا اور رمی کرنا دونوں واجب ہیں اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ٹھہرنا واجب اور رمی سنت موکدہ اور امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بالعکس فرماتے ہیں یعنی رمی واجب اور ٹھہرنا سنت اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے دو قول ہیں ایک قول تو امام احمدؒ کے موافق اور دوسرا امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے موافق ہے اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ رمی تو تکبیر کی حفاظت کے لئے مشروع ہوئی ہے۔ پس اگر رمی ترک کر دی اور تکبیر کہہ لی تو کافی ہے۔ اس مذہب کو ابن جریر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے اور ظاہر آیت کے بھی یہ موافق ہے لیکن اجماع کے خلاف ہے۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ آیت کریمہ واذکرو اللہ فی ایام الآیۃ سے استدلال کرتے ہیں کہ یہ آیت رمی اور اقامت دونوں کے واجب کرنے کا احتمال رکھتی ہے۔ گویا مجمل ہے جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے فعل سے دونوں کا وجوب صاف ظاہر فرما دیا اور اپنے اتباع کا حکم فرمایا کہ مجھ سے اپنے حج کے طریقے سیکھ لو اور امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقصود ٹھہرنے اور رات گزارنے سے رمی ہے، خود رات کا گزارنا مطلوب نہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بطن وادی سے رمی کی، لوگوں نے ان سے کہا کہ اور لوگ تو اوپر کی طرف سے رمی کرتے ہیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی کہ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں جس مقام سے میں نے رمی کی ہے یہی مقام اس ذات پاک کا ہے جس پر سورۂ بقرہ نازل ہوئی ہے (یعنی جناب رسول اللہ ﷺ۔ پس ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیت رمی ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ دوسری دلیل امام صاحب کی یہ ہے کہ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے منی میں اونٹ کے چرواہوں کو رات سے چل دینے کا حکم فرمایا اور فرمایا کہ یوم نحر کی رمی کر لو اس کے بعد گیارہویں تاریخ اور بارہویں کو اور پھر کوچ کے دن رمی کرو اور نسائی میں اس طرح ہے کہ چرواہوں کو حضور ﷺ نے رات سے چلنے کی اجازت عطا فرمائی اور فرمایا کہ یوم النحر میں رمی کر لیں اور دو دن بعد کی رمی بھی اس دن کر لیں ایک دن میں تینوں دن کی رمی جمع کر لیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تفسیر یہ ہے کہ یوم النحر میں رمی

maarifat.com

کریں پھر جب یوم النحر سے اگلا روز گزر جائے تو بارہویں تاریخ کو اول گیارہویں کی رمی کی قضا کریں پھر بارہویں کی رمی کریں۔ وجہ استدلال اس حدیث سے یہ ہے کہ دیکھو رسول اللہ ﷺ نے رمی کی قضا کو واجب فرمایا اقامت کی قضا کو لازم نہیں فرمایا پس معلوم ہوا کہ رمی مقصود ہے اور وہاں کا ٹھہرنا اور رات گزارنا تبعاً واجب ہے۔

امام احمدؒ جواب دیتے ہیں کہ چرواہوں کو ضرورت کے لئے اجازت دے دینا اس امر کو نہیں چاہتا کہ وہاں ٹھہرنا واجب نہ ہو بلکہ رخصت اور اجازت تو ایسے ہی امر کی ہوا کرتی ہے جو واجب ہو۔ اور امام مالکؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما ان ایام میں نمازوں کے بعد اور مجالس میں اور بچھونے پر جاکر اور خیموں میں اور راہ میں غرض ہر حال میں تکبیر کہتے تھے اور لوگ بھی ان کی تکبیر سن کر تکبیر کہتے تھے اور اسی آیت سے استدلال کرتے تھے۔ وجہ استدلال کی یہ ہے کہ ایام تشریق میں مطلقاً کسی جگہ ذکر بالاتفاق واجب نہیں، صرف منیٰ میں واجب ہے اور یہ آیت کریمہ فمن تعجل اس پر دال ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بنیت عبادت و ثواب وہاں رہنا ذکر ہے اور ذکر لسانی اگر ہو تو اور بھی اولیٰ و افضل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس آیت کا محمل اور مصداق منیٰ میں قیام کرنا ہے رمی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تم نے جو کچھ بیان کیا ہے یہ اس کے کچھ منافی نہیں کہ محمل آیت رمی اور اقامت دونوں ہوں، واللہ اعلم۔

جاننا چاہئے کہ حدیث نے اس آیت کا اجمال اس طرح واضح کیا ہے یوم النحر میں صرف جمرہ عقبہ کی رمی سات کنکریوں سے واجب ہے اور امام ابو حنیفہ و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اس رمی کا وقت یوم النحر کی طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور امام احمد و شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک دسویں شب کی نصف کے بعد سے ہے اور مجاہد رضی اللہ عنہ کے نزدیک یوم النحر کی طلوع آفتاب سے اس کا وقت ہے۔ مجاہد کی دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل میں سے ضعفاء کو آگے بھیج دیا اور یہ فرمایا کہ آفتاب نکلنے تک تم رمی نہ کرنا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ استحباب پر محمول ہے اور طلوع آفتاب سے پہلے صبح صادق کے بعد بھی رمی جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ طحاوی نے خود اپنی سندوں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اور دوسرے ضعفا کو آگے بھیج دیا اور فرمایا کہ جمرہ کی صبح تک رمی نہ کرنا اور یہی حدیث اس امر کی بھی دلیل ہے کہ قبل از صبح رمی جائز نہیں اما شافعی و احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ قبل از صبح جائز ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو دسویں شب کو بھیج دیا۔ انہوں نے قبل از فجر جمرہ کی رمی کی پھر آگے چل کر طواف افاضہ کیا۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ضحاک بن عثمان رضی اللہ عنہ راوی ہے اور قطان نے اس کو (لین) ضعیف کہا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ نماز فجر سے پہلے رمی کی، طلوع فجر سے پہلے نہیں کی۔ اس تقدیر پر یہ خود ہماری دلیل مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہو جائے گی۔ رمی کا آخری وقت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زوال تک ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ سے لوگ مختلف سوال کرتے تھے آپ فرماتے تھے کچھ حرج نہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ میں نے ذبح سے پہلے سر منڈا لیا فرمایا کچھ حرج نہیں اب ذبح کر لے ایک نے پوچھا کہ میں نے عشاء کے بعد رمی کی ہے فرمایا کچھ ڈر نہیں۔ اس حدیث کو بخاری اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے اور عشاء کے بعد کا مطلب یہ ہے کہ بعد زوال کے رمی کی ہے کیونکہ عشاء کا اطلاق اس وقت پر ہے جو بعد زوال کے ہے غروب کے بعد مراد نہیں کیونکہ یوم نحر غروب سے پہلے پہلے کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس حدیث کی بعض طرق میں صریح مذکور ہے کہ یہ سوال سائل نے ظہر کے وقت کیا تھا اور اس رمی کا آخری وقت گیارہویں تاریخ کے طلوع فجر تک ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چرواہوں کو رات کے وقت رمی کرنے کی اجازت عطا فرمائی تھی۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اس اجازت عطا فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ معذور کو تو بلا کراہت رات کو رمی جائز ہے اور غیر معذور کو بکراہت جائز ہے اور ایام تشریق یعنی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں کو تینوں جمروں کی رمی کرے چاہے ہر جمرہ کی رمی سات

marfat.com

کنکریوں سے کرے۔ اس رمی کا اول وقت پہلے دن تو صبح سے ہے اور دوسرے دن بعد زوال کے ہے کیونکہ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ پھر جناب رسول اللہ ﷺ نے دن ڈھلے تک رمی نہیں فرمائی۔ اور آخر وقت ہر دن میں بلا کراہت غروب تک رمی کا وقت ہے اور معذور کے واسطے اگلے دن کی صبح صادق تک ہے اور غیر معذور کے واسطے صبح تک تاخیر کرنا مکروہ ہے۔ دلیل اس کی وہی چرواہوں کو اجازت عطا فرمانے کی حدیث ہے۔ اسی طرح تیسرے دن یعنی تیرہویں تاریخ بھی بعد زوال کے اول وقت ہے اور آخر وقت غروب تک ہے اور یہی امام ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ کا مسلک ہے۔ صرف اول دو دونوں اور اس تیسرے دن میں اس قدر فرق ہے کہ اس تیسرے دن میں بعد غروب کے رمی بالاتفاق جائز نہیں کیونکہ وہ رات ایام تشریق کی نہیں اور رمی ایام تشریق ہی میں ہوتی ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تیرہویں تاریخ کو زوال سے پہلے بھی رمی جائز ہے لیکن مجھے اب تک اس قول کی دلیل صحیح معلوم نہیں ہوئی۔

ابن ہمامؒ نے اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یوم نفر (تیرہویں تاریخ) کو جب دن بلند ہو تو رمی اور طواف صدر کا وقت آگیا۔ اس حدیث کو بیہقیؒ نے روایت کیا ہے لیکن اس کی سند میں طلحہ بن عمر راوی ہے۔ بیہقی اور ابن معین اور دار قطنی نے اس کو ضعیف کہا ہے اور امام احمد اس کو متروک الحدیث کے لقب سے یاد کرتے ہیں اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا ایام تشریق میں رمی جمار کے اندر ترتیب واجب ہے یا نہیں جمہور کے نزدیک تو ترتیب واجب ہے۔ (یعنی اول پہلے جمرہ کی رمی کرے، پھر دوسرے کی، پھر تیسرے کی) اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ترتیب سنت ہے۔ جمہور کی دلیل تو یہ ہے کہ رائے سے کوئی امر تعبدی ثابت نہیں ہوتا اس لئے جس طریق وہیئت سے احادیث میں وارد ہے وہ طریق وہیئت واجب ہے اور ترتیب کا فوت ہونا کسی جگہ نہیں آیا اسی لئے ترتیب واجب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر تینوں جمروں کی رمی ایک نسک ہوتی تو بیشک تمام خصوصیات کی رعایت ضروری تھی لیکن یہ امر ثابت ہے کہ ہر جمرہ کی رمی علیحدہ مستقل نسک ہے، اس لئے ہر جمرہ کی رمی میں تو تمام خصوصیات واردہ کی رعایت لازم ہے اور تمام جمروں کی رمی میں جو کہ مختلف علیحدہ علیحدہ نسک ہیں واجب نہیں جیسا کہ رمی اور ذبح اور حلق میں ترتیب شرط نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ امام صاحبؒ کے قول کے موافق تو قیاس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہ ترتیب اگرچہ شرط نہیں ہے لیکن پھر بھی واجب ہے۔ اس کے ترک پر قربانی واجب ہونا چاہئے جیسے کہ اگر رمی اور ذبح اور حلق میں ترتیب فوت ہوتی ہے تو قربانی واجب ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی قربانی واجب ہونا ضروری ہے۔ اب تک مجھ کو ان دونوں مسئلوں میں فرق صاف سمجھ میں نہیں آیا۔ واللہ اعلم۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۝۲۰۳ (اور ڈرتے رہو خدا سے اور جانتے رہو کہ تم اس کے پاس جمع ہو گے) مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور جانتے رہو کہ تم سب اسی کے پاس جمع ہو گے پھر وہ تم کو تمہارے اعمال اور اخلاص کے موافق بدلہ دیں گے فقط واللہ اعلم۔

علامہ بغویؒ نے بروایت کلبیؒ و مقاتلؒ و عطاؒ فرمایا کہ اخنس بن شریف بنی زہرہ کا حلیف تھا۔ اخنس اس کو اس لئے کہتے تھے کہ خنس لغت میں الگ ہو جانے کو کہتے ہیں چونکہ اخنس بھی بدر کے دن تین سو اشخاص کو لے کر جناب رسول اللہ ﷺ کی معیت سے ہٹ گیا تھا اس لئے اس کا نام اخنس ہو گیا۔ یہ شخص بہت شیریں کلام، خوبصورت، ملیح تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتا بیٹھتا اور باتیں بناتا تھا اور قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور حضور ﷺ بھی اس سے ملاطفت فرماتے تھے واقع میں وہ منافق تھا اس کے بارے میں حق تعالیٰ نے ذیل کی آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ (اور بعض آدمی ایسا ہے کہ تم کو پسند آتی ہے اس کی بات) یعنی آپ کو اخنس کی بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ابن جریرؒ نے سدیؒ سے اس آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔ اور ابن ابی حاتم اور ابن اسحاق نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک مختصر لشکر جناب رسول اللہ ﷺ نے کسی جگہ بھیجا تھا۔ اس میں عاصم اور

marfat.com

مرشد رضی اللہ عنہما بھی تھے، اتفاقاً اس لشکر نے شکست کھائی تو منافقین میں سے دو شخصوں نے کہا کہ یہ لوگ بھی کیسے بدنصیب تھے نہ تو چین سے اپنے اہل وعیال میں رہے اور نہ اپنے سردار (جناب رسول اللہ ﷺ) کا پیغام ہی ادا کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت ومن الناس من یعجبک الخ نازل فرمائی۔

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (دنیا کی زندگی میں) یا تو یعجبک کے متعلق ہے اس وقت یہ مطلب ہوگا کہ اس شخص کی بات آپ کو دنیا ہی میں پسند آتی ہے کیونکہ کلام فصیح اور شیریں ہوتا ہے اور آخرت کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہے کیونکہ فصیحت اور رسوائی اس کا انجام ہے اور یا قولہ کے متعلق ہے اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ یہ جو دنیا کی غرض سے دعوی محبت کرتا ہے اور اسلام ظاہر کرتا ہے یہ ہی آپ کو پسندیدہ ہے (نصاحت اور شیرینی کی حیثیت سے)

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ (اور وہ گواہ بناتا ہے اللہ کو) یعنی یہ منافق اللہ کی قسم کھاتا ہے اور اللہ کو گواہ بناتا ہے۔

عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ (اس بات پر جو اس کے دل میں ہے) یعنی اس پر قسمیں کھاتا ہے کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہ زبان کے مطابق ہے اور کہتا ہے کہ قسم اللہ کی میں آپ پر ایمان لانے والا ہوں اور آپ سے محبت کرتا ہوں۔

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ (حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے) یعنی حالانکہ یہ منافق مسلمانوں سے اشد درجہ کی عداوت اور خصومت رکھتا ہے۔ خصام، خاصمت کا مصدر ہے۔ زجاج نے کہا کہ خصام، خصم کی جمع ہے جیسے بحار جمع بحر کی ہے اور وھو الدالخصام۔ یشہد کے فاعل سے حال ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مغوض وہ شخص ہے جو الد خصم ہو۔ قتادہ فرماتے ہیں یعنی جو معصیت کے اندر سخت قساوت والا، باطل پر اڑنے والا ہو، کلام تو حکمت کے کرے اور اعمال اچھے نہ ہوں۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (اور جب لوٹ کر جائے تو دوڑتا پھرے ملک میں، تاکہ فساد پھیلائے اس میں اور تباہ کرے کھیتی اور نسل) مروی ہے کہ اخنس مذکور اور ثقیف کے درمیان کچھ نزاع تھا۔ اخنس نے ان پر شب خون مارا اور ان کی کھیتیاں جلا ڈالیں اور ان کے مویشی ہلاک کردیئے اور مقاتل نے فرمایا ہے کہ اخنس اپنے ایک مدیون کے پاس تقاضے کے لئے طائف گیا تھا وہاں جا کر اس کی کھیتی جلادی اور اس کی ایک گدھی تھی اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے۔ اسی قصہ کو حق تعالیٰ نے واذا تولی الخ سے بیان فرمایا ہے۔ نسل ہر چوپایہ اور انسان کی نسل کو بولتے ہیں۔ ضحاک نے فرمایا کہ اذا تولی کے معنی یہ ہیں کہ کسی ملک کا والی اور بادشاہ ہوتا ہے تو فساد کرتا ہے اور مجاہد نے فرمایا واذا تولی الخ کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی ملک کا والی اور بادشاہ ہوتا ہے تو ظلم اور زیادتی کرتا ہے، پھر اس ظلم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش روک لیتے ہیں اور کھیتی اور مویشی ہلاک کردیتے ہیں چونکہ موجب اور باعث اس ہلاکت کا یہی تھا اس لئے مجازاً اسی کی طرف نسبت کردی۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ (اور اللہ پسند نہیں کرتا فساد کو) یعنی اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند فرماتے ہیں اس لئے اس پر جو اللہ کا غضب ہو اس سے بچنا چاہئے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (اور جب اس سے کہا جائے کہ ڈر اللہ سے تو آمادہ کرتا ہے اس کو غرور گناہ پر) قیل لہ میں ہ ضمیر سے مراد اخنس ہے۔ اخذتہ العزة الخ یعنی عار اور جاہلیت کی غیرت اور تکبر اس کو گناہ پر آمادہ کرتے ہیں۔ عرب بولتے ہیں اخذ بکذا یعنی میں نے اس کو فلاں کام پر برانگیختہ اور آمادہ کیا۔ بالاثم میں باء سببیت کی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو گناہ اس کے قلب میں ہے یعنی کفر اس پر تکبر اس کو آمادہ کرتا ہے۔

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (بس کافی ہے اس کو دوزخ) یعنی جہنم اس کو عذاب اور بدلہ کے لئے کافی ہے۔ جہنم سزا کی جگہ کا نام ہے۔ اصل میں یہ لفظ نار (آگ) کا ہم معنی ہے۔ بعض نے کہا یہ معرب ہے مہاد کے معنی فرش یعنی بچھونا۔

وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ (اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے) یہ قسم مقدر کا جواب ہے اور مخصوص بالذم یعنی جہنم محذوف ہے۔ علامہ

maktat.com

بغویؒ نے بیان کیا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص بندہ کو یہ کہے کہ اللہ سے ڈر، وہ جواب میں کہے کہ میاں تم اپنی تو خبر لو۔ مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ اللہ سے ڈرو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنا رخسارہ براہ تواضع زمین پر رکھ دیا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ (اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو دیدیتے ہیں اپنی جان) یعنی جہاد یا امر بالمعروف میں اپنی جان بیچ دیتے ہیں اور خرچ کر ڈالتے ہیں۔ اسی کی ہم معنی آیت کریمہ ان اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ ہے (بیشک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا مؤمنوں سے ان کی جانوں کو) ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا جہاد افضل ہے۔ فرمایا افضل جہاد بادشاہ ظالم کے سامنے سچ بات کہنا ہے۔ اس حدیث کو حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے امام احمدؒ اور ابن ماجہ اور طبرانی اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے۔

ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (اللہ کی رضا جوئی میں) یعنی اللہ کی رضا طلب کرتا ہے۔ گویا خدا کی رضا اس کی جان خرچ کر دینے کا بدلہ ہے۔

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ یعنی اللہ بندوں پر بہت ہی شفقت اور رحمت کرنے والے ہیں کہ ایسی نفع کی تجارت کا طریقہ سکھایا۔ حارث بن ابی اسامہ رضی اللہ عنہ اور ابن ابی حاتم نے سعید بن میسب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ صہیب رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آرہے تھے کہ راہ میں قریش کے چند آدمیوں نے ان کا پیچھا کیا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سواری سے اتر پڑے اور ترکش میں سے تیر لے کر مستعد ہوگئے اور ان کو خطاب کر کے کہا کہ اے قریش کے گروہ تم جانتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ تیر انداز ہوں اور قسم ہے اللہ کی کہ جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی ہے تم مجھ پر قابو نہیں پاسکتے اور تیروں کے ختم ہونے کے بعد جب تک تلوار کا کچھ حصہ بھی رہے گا شمشیر زنی کروں گا اس کے بعد پھر تم جو چاہے کیجیو اور اگر تم چاہو تو میں تم کو مکہ میں اپنا مال بتادوں تم اس پر جا کر قابض ہو جاؤ اور مجھے چھوڑ دو۔ انہوں نے اس کو منظور کر لیا جب ان سے چھوٹ کر جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ آئے اور سارا قصہ عرض کیا تو حضور ﷺ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اے ابو یحییٰ تمہاری بیع خوب نافع ہوئی، تمہاری بیع خوب نافع ہوئی۔ اس کے بعد پھر آیت کریمہ و من الناس من یشری الخ نازل ہوئی۔ حاکم نے مستدرک میں بھی اس قصہ کو ابن میسب کے طریق سے خود صہیب رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے، نیز حاکم نے اس قصہ کو حماد بن سلمہ سے اور انہوں نے ثابت رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں تصریح کی ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب ہی کے بارے میں نازل ہوئی۔ حاکم نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث شرط مسلم کے موافق صحیح ہے۔

ابن جریر رضی اللہ عنہ نے عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ قصہ اس کا یوں ہوا تھا کہ ان کو مع چند مسلمانوں کے مشرکین نے پکڑ لیا تھا اور بہت تکلیف پہنچائی تو صہیب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ میں تو بوڑھا ضعیف ہوں اگر میں تم میں ہوں یا غیروں میں ہوں تمہارا کیا نقصان ہے اگر تمہاری رائے ہو تو میرا مال لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس حدیث کا طرز کلام پہلی حدیث کے خلاف ہے اور اول ہی قصہ صحیح ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت رجیع کو جانے والے رستہ کے متعلق نازل ہوئی تھی چنانچہ ابن اسحاق اور محمد بن سعد وغیر ہم نے ذکر کیا ہے کہ قبیلہ بنی لحیان جو ہذیل میں سے تھا جب سفیانؓ نیح ہذلی کو قتل کر چکے تو قبیلہ عضل اور قبیلہ قارہ کی طرف آئے اور ان سے کہا کہ تم لوگ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چلو اور آپ سے کچھ بات چیت کر لو۔ اس کے بعد چند صحابہ رضی اللہ عنہ تمہارے پاس آکر دعوت اسلام کیا کریں گے اور دین کی باتیں بتائیں گے اور ہم تمہارے لئے کچھ مقرر کر دیں گے۔ انہوں نے اپنے جی میں کہا کہ جو لوگ وہاں سے آئیں گے ہم ان میں سے جس کو چاہیں گے قتل کر ڈالیں گے اور جو

marfat.com

رہ جائیں گے ان کو مکہ جا کر بیچ دیں گے کچھ روپیہ ہی ہاتھ آئے گا۔ القصہ : عضل اور قارہ کے چند لوگوں نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں آکر سلام کیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے یہاں مسلمان ہیں آپ چند صحابہؓ کو ہمارے ہمراہ بھیج دیجئے تاکہ وہ دین کی باتیں ہم کو سکھائیں۔ حضور ﷺ نے خبیب بن عدی انصاری اور مرثد بن ابی مرثد غنوی اور خالد بن بکر اور عبداللہ بن طارق اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہم کو بھیج دیا اور عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔ صحیح بخاری میں ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دس آدمی بھیجے اور عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا۔ القصہ : ان کافروں نے بدعہدی کی اور چاروں طرف سے تقریباً سو تیر اندازان کے گرد شوروغل کرنے لگے۔ ایک روایت میں دوسو آدمی آئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ تیرانداز ان میں سو ہی ہوں گے جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ان کو دیکھا تو ایک ٹیلے پر چلے گئے کافروں نے چاروں طرف سے احاطہ کرلیا اور کہا کہ ہم عہدو پیمان کرتے ہیں کہ ہم تم کو قتل نہ کریں گے اور نہ ہمارا ارادہ قتل کا ہے ہم تو تم کو اس لئے لائے ہیں کہ تم کو دے کر مکہ والوں سے کچھ مال لیں تم اتر آؤ۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو کافر کی ذمہ داری پر اترتا نہیں۔ اے اللہ میں آج تیرے دین کی حمایت کرتا ہوں تو میرے گوشت کی حفاظت کر۔ اے اللہ اپنے رسول ﷺ کو ہماری خبر کردے۔ چنانچہ یہ دعا ان کی قبول ہوئی اور جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس قصہ سے جس دن وہ قتل ہوئے مطلع فرمادیا۔ الغرض قتال شروع ہو گیا کفار نے تیراندازی کی اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کو مع سات ساتھیوں کے شہید کردیا اور خبیب اور عبداللہ بن طارق اور زید رضی اللہ عنہم باقی رہ گئے۔ جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ مقتول ہوئے تو ھذیل نے ان کا[1] سر مبارک لینا چاہا اتفاقاً بہت سی بھڑیں آگئیں ان کی وجہ سے وہ سر کو ہاتھ نہ لگا سکے۔ اسی دن سے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا لقب حمی الدبر (بھڑوں کی حفاظت کئے ہوئے) ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک بدلی بھیج دی وہ اس قدر برسی کہ پانی خوب بہا اور حضرت عاصم کے سر مبارک کو بہالے گیا۔

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ نہ میں کسی مشرک کو مس کروں گا اور نہ مجھ کو کوئی مشرک مس کرے گا اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم کو پورا کردیا۔ اب رہ گئے زید اور عبداللہ اور خبیب رضی اللہ عنہم ان کو مشرکوں نے قید کرلیا اور بیچنے کے خیال سے مکہ لے چلے جب ظہران میں پہنچے تو عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ ہتھکڑی سے چھڑالیا اور تلوار لے لی کفار نے جب یہ دیکھا تو ان کو پتھروں سے مار کر شہید کردیا اور ظہران ہی میں ان کو دفن کردیا اور زید اور خبیب رضی اللہ عنہما کو مکہ میں لاکر بیچ دیا۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے کہا ہے کہ زید کو تو صفوان بن امیہ نے خریدا (یہ صفوان آخر میں مسلمان ہوگئے تھے) انہوں نے اس لئے خریدا تھا کہ اپنے بیٹے امیہ بن خلف کے بدلہ میں ان کو قتل کرے، الغرض صفوان نے ان کو خرید کر اپنے غلام نسطاس کے ہاتھ قتل کرنے کے واسطے تنعیم بھیجا اور قریش کی ایک جماعت جس میں ابوسفیان بھی شامل تھا جمع ہوگئی۔ ابوسفیان نے کہا کہ زید میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ محمد ﷺ تمہاری جگہ ہوں اور (معاذ اللہ) ان کی گردن ماری جاوے اور تم چین سے اپنے گھر جاؤ۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قسم ہے اللہ کی میں ہرگز نہیں چاہتا کہ جناب رسول اللہ ﷺ اس وقت میری جگہ ہوں اور ان کو کوئی کانٹا تک بھی ستائے اور میں اپنے گھر بیٹھا رہوں۔ یہ سن کر ابوسفیان نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ کسی کو کسی سے اس قدر محبت ہو جس قدر کہ اصحاب محمد کو محمد ﷺ سے ہے۔ اس کے بعد نسطاس غلام نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا۔ اب رہ گئے خبیب رضی اللہ عنہ ان کو حارث کے بیٹوں نے خرید لیا کیونکہ بدر کے دن حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے حارث کو قتل کیا تھا۔ حضرت خبیب ان کے یہاں قید رہے ایک روز حارث کی ایک بیٹی سے حضرت خبیب نے بال وغیرہ لینے کے لئے استرہ مانگا اس نے دیدیا۔ اتفاقاً اس کا ایک بچہ بھی جہاں خبیب تھے وہاں جانکلا اور اس کی ماں کو خبر نہ تھی کچھ دیر بعد حارث کی اس بیٹی نے دیکھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اس بچہ کو ران پر بٹھار کھا ہے اور استرہ

---

[1] یہ اس لئے سر لینا چاہتے تھے کہ سلافہ بن سعد قبیلہ کی ایک عورت تھی اس کے ایک بیٹے کو حضرت عاصمؓ نے احد کے دن قتل کیا تھا اس نے نذر کی تھی کہ اگر مجھے عاصم رضی اللہ عنہ کا سر مل گیا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پیونگی (۔ معالم)

marfat.com

ہاتھ میں ہے۔ وہ عورت یہ دیکھ کر چلائی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا تو اس بات سے ڈرتی ہے کہ میں اس کو قتل کر دوں گا میں ہرگز ایسا نہ کروں گا، بد عہدی ہم لوگوں کا شیوہ نہیں ہے، اس عورت کا بیان ہے کہ واللہ میں نے کوئی قیدی خبیب سے اچھا نہیں دیکھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ خبیب انگور کا خوشہ کھا رہے ہیں، حالانکہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور مکہ مکرمہ میں بھی اس وقت انگور نہ تھا۔ ضرور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس سے کھلایا۔ اس کے بعد کفار نے ان کے قتل کا ارادہ کیا اور ان کو حرم سے نکال کر حل میں لائے اور سولی دینے کا ارادہ کیا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے ذرا سی دیر مہلت دو تاکہ میں دو رکعت پڑھ لوں، کفار نے چھوڑ دیا، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے دو رکعتیں پڑھیں اور یہ نماز کا طریقہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ہی سے شروع ہوا کہ جب کوئی مسلمان اس طرح روک کر قتل کیا جائے وہ دو رکعتیں پڑھے۔ پھر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کفار سے کہا تم یہ گمان کرو گے کہ موت سے گھبراتا ہے اگر یہ گمان نہ ہوتا تو میں اور زیادہ نماز پڑھتا پھر کہا کہ اے اللہ ان کفار میں سے ایک ایک کو قتل اور تباہ کر اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ اور یہ اشعار پڑھے۔ اشعار

لست ابالی حین اقتل مسلما علی ای شق کان فی اللہ مصرعی
و ذلک منی للالہ وان یشاء یبارک فی اوصال شلو ممزع

(یعنی جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں تو مجھے اس امر کی پرواہ نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس کروٹ گروں گا۔ اور یہ قتل ہونا اللہ کی راہ میں ہے اور اگر اللہ چاہے گا۔ تو میرے پارہ پارہ اعضاء کے جوڑوں پر برکت بھیجے گا) اس کے بعد کفار نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی پر چڑھا دیا اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ اپنے رسول ﷺ کو میرا سلام پہنچا دے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص سلامان ابو میسرہ نامی تھا اس نے نیزہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے سینہ پر رکھا، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اللہ سے ڈر۔ اس کہنے سے وہ اور زیادہ بھڑکا اور نیزہ کوچ کر آر پار کر دیا۔ واذا قیل لہ اتق اللہ الآیہ سے یہی مراد ہے محمد بن عمرو بن مسلمہ نے روایت کی ہے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے فرمایا ہے کہ ہم نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے ابھی مجھ کو خبیب کا سلام پہنچایا ہے۔ جب جناب رسول اللہ ﷺ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو حضور ﷺ نے اصحاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم میں کوئی ایسا ہے کہ جو خبیب کو سولی پر سے اتار لائے جو لائے گا اس کے لئے جنت ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اور میرا ساتھی مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ اس کام کو کریں گے۔ غرض یہ دونوں چلے رات کو چلتے اور دن کو مخفی رہتے چلتے چلتے تنعیم پہنچے، دیکھا کہ سولی کے پاس چالیس مشرک ہیں۔ انہوں نے جا کر اتار دیکھا تو اسی طرح ترو تازہ تھے حالانکہ چالیس روز کے بعد اتارا تھا۔ ہاتھ زخم پر تھا اور زخم میں خون ترو تازہ تھا اس کا رنگ خون کی طرح سرخ تھا مگر خوشبو مشک کی سی آرہی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو گھوڑے پر لادا اور دونوں چلے کفار بھی جاگ گئے دیکھا کہ خبیب رضی اللہ عنہ نہیں ہیں۔ قریش کو جا کر خبر دی اسی وقت ستر سوار دوڑے جب قریب آگئے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے خبیبؓ کو وہاں ہی گرا دیا لاش گرتے ہی زمین نگل گئی اسی دن سے ان کو بلیع الارض (زمین کے نگلے ہوئے) کہتے ہیں۔ زبیر و مقدادؓ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور اس وقت جبرئیل علیہ السلام بھی آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اے محمد ﷺ ملائکہ ان دونوں (زبیر اور مقداد رضی اللہ عنہما) پر بہت فخر کرتے ہیں پھر ان کے بارے میں آیت کریمہ ومن الناس من یشری نفسہ الآیہ نازل ہوئی۔ اس واقعہ کے مطابق یشری نفسہ کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے نفسوں کو خبیب رضی اللہ عنہ کے اتارنے کے لئے بیچ ڈالا۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے عکرمہؓ سے روایت کیا ہے کہ یہود میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان میں سے حضرت عبداللہ بن سلام اور ثعلبہ اور ابن یامین اور اسد اسید کعب کے بیٹے اور سعید بن عمرو اور قیس بن زید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم ہفتہ کے دن کی تعظیم کیا کرتے تھے اب بھی ہم کو آپ اجازت دیجئے کہ اس کی توقیر کیا کریں اور تورات بھی تو آخر کتاب الٰہی

ہے اس کو ہم رات کو کھڑے ہو کر پڑھا کریں۔ علامہ بغویؒ نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ بعد اسلام لانے کے بھی یہ لوگ اونٹ کے دودھ اور گوشت کو حرام جانتے تھے اس پر یہ آیت کریمہ ارشاد ہوئی۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (اے ایمان والو داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے) سلم کسرہ اور فتحۂ سین سے صلح اور طاعت کو کہتے ہیں اور اسی واسطے اس کا اطلاق اسلام پر بھی آیا ہے اور یہاں مراد اسلام ہی سے ہے۔ نافع اور ابن کثیر اور کسائی نے السلم کو یہاں فتح سین سے اور باقی قراء نے کسرہ سے پڑھا ہے اور ابو بکر نے اسی لفظ کو سورۂ انفال میں کسرہ سے اور باقی قراء نے فتحہ سے پڑھا ہے۔ کافہ کے معنی کل ہیں کیونکہ کف کہتے ہیں روکنے کو چونکہ کل بھی اجزائی پراگندگی سے مانع ہو جاتا ہے اس لئے اس کو کافہ کہنے لگے اور کافہ یا تو ادخلوا کے ضمیر سے اور یا السلم سے حال ہے۔ السلم بھی اپنی ضد یعنی حرب کی طرح مونث آتا ہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سب دل سے ظاہراً و باطناً منقاد اور مطیع ہو جاؤ۔

میں کہتا ہوں کہ ایسی ظاہری باطنی طاعت تو صوفیہ کے سوا اور کسی کو میسر نہیں آسکتی، یا یہ معنی ہیں کہ اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، اس میں سوائے اسلام کے اور کچھ مت ملاؤ یا یہ مطلب کہ اسلام کی تمام شاخوں میں اور احکام میں داخل ہو جاؤ اور کسی حکم میں خلل انداز مت ہو۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اسلام کے آٹھ سہام ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ، جہاد، امر بالمعروف[۱] نہی عن المنکر[۲]۔ جس کے پاس ان میں سے ایک حصہ بھی نہیں وہ بے مراد اور محروم رہا۔

میں کہتا ہوں کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ ذکر فرمایا یہ بطور مثال کے ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اسلام کے کل اجزاء یہی ہیں اور آیت میں تو ہر مامور کا ماننا اور ممنوع سے باز رہنا مراد ہے۔ یا یہ توجیہ کی جائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سب چیزیں آگئیں کیونکہ کسی کو بھلی بات بتانے کا تقاضا ہے کہ بتانے والا خود بھی اس کام کو کرتا ہے اور بری خصلت سے روکنا اس امر کو بتاتا ہے کہ وہ خود اس سے برکنار ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں۔ افضل ان میں سے لا الہ الا اللہ کہنا اور ادنیٰ راستہ سے ایذا کی چیز ہٹانا ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ اس حدیث کو مسلم اور ابو داؤد اور نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (اور نہ چلو شیطان کے قدموں پر) خطوات میں جو اختلاف قرأت کا ہے وہ اول گزر چکا ہے، حاجت اعادہ نہیں۔ یعنی شیطان کے نشان قدم پر مت چلو مثلاً روز ہفتہ کی حرمت کرنے لگو اور اونٹ کو حرام کر لو حالانکہ یہ سب امور منسوخ ہو چکے۔

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ (بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہم کو اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر حضور کی رائے ہو تو ہم ان میں سے بعض باتیں لکھ لیا کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم بھی اسی طرح حد سے بڑھو گے جس طرح یہود اور نصاریٰ بڑھ گئے۔ میں تو تمہارے واسطے صاف روشن شریعت لایا ہوں اگر موسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کو بھی سوائے میرے اتباع کے اور کچھ بن نہ پڑتا۔ اس حدیث کو امام احمد نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾ (پھر اگر تم بچلے اس کے بعد کہ آچکیں تمہارے پاس نشانیاں تو جان رکھو کہ اللہ زبردست، حکمت والا ہے) یعنی پھر اگر تمہارے قدموں نے لغزش

---

۱ بھلی بات کا حکم کرنا۔ ۲ بری بات سے منع کرنا۔

marfat.com

کھائی اور اسلام پر مستقیم نہ رہے۔ البینات سے مراد وہ نشانیاں اور دلائل ہیں جو حقانیت اسلام کا پتہ دے رہی ہیں۔ فاعلموا ان اللہ عزیز یعنی اگر تم نے لغزش کھائی تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، بدلہ لینے سے اس کو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ حکیم یعنی حکمت والا ہے، انتقام حق پر لیتا ہے، کسی حکمت کی وجہ سے مہلت دے رکھی ہے۔ لفظ عزیز سے وہم ہوتا تھا کہ جب زبردست ہے تو کیوں نہیں بدلہ لیتا، حکیم سے اس کو دفع فرمادیا کہ مہلت کسی حکمت پر مبنی ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (کیا وہ اس کے منتظر ہیں کہ آجائے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں) ینظرون یہاں نظر بمعنی انتظار ہے۔ ظلل، ظُلَّةٌ کی جمع ہے۔ الغمام: علامہ بغویؒ کا قول ہے کہ غمام پتلے سفید ابر کو کہتے ہیں کیونکہ غم کا معنی ہے ڈھانک لینا اور غمام بھی ڈھک لیتا ہے۔ اور مجاہد فرماتے ہیں کہ غمام سحاب کے علاوہ ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل پر تیہ میں یہی غمام سایہ کئے ہوئے تھا۔ حسن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فی ظلل من الغمام کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ غمام کے پردہ میں آئے جس کو زمین والے نہ دیکھ سکیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ (اور فرشتے) ابو جعفر نے غمام پر عطف کر کے یا برابر والے لفظ کے مجرور ہونے کی وجہ سے مجرور پڑھا ہے اور باقی قراء نے مرفوع پڑھا ہے یعنی ویاتیہم الملائکۃ

وَقُضِيَ الْاَمْرُ (اور طے ہو جائے معاملہ) یعنی کفار کے لئے عذاب واجب ہو اور مؤمنین کے لئے ثواب اور حساب سے فراغت ہو جائے۔ یہ واقعہ قیامت کا ہے، واللہ اعلم۔ علماء اہل سنت نے سلف سے لے کر خلف تک تواتر کے ساتھ اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اللہ سبحانہ صفات اجسام اور علامات حدوث سے منزہ ہے تو اس آیت میں (جس سے بعض صفات جسمیہ کا پتہ چلتا ہے) انہوں نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ ۱۔ اول یہ کہ اس معاملہ میں بحث سے کنارہ کشی کی جائے اور کہا جائے کہ اس کا علم باری تعالیٰ کو ہی ہے اور اسی پر ایمان لایا جائے۔ یہ طریقہ تو سلف کا ہے۔ کلبی فرماتے ہیں کہ یہ مخفی امر ہے جو قابل تفسیر نہیں۔ مکحول، زہری، اوزاعی، مالک، ابن مبارک، سفیان ثوری، لیث، احمد، اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ ایسی آیتوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ انہیں ایسے ہی رہنے دو جیسے وارد ہوئی ہیں۔ سفیان بن عیینہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو جن اوصاف سے اپنی کتاب میں متصف فرمایا ہے اس کی تفسیر یہی ہے کہ اس کو پڑھتے رہو اور اس کی بحث سے سکوت ہو، کسی کو سوائے اللہ اور رسول اللہ کے حق نہیں کہ ایسی آیات کی تفسیر اس طرف سے کرنے لگے۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے کیونکہ انہوں نے متشابہات کے بارے میں فرمایا ہے لایعلم تاویلہ الا اللّٰہ اور اس پر وقف کیا ہے اور والراسخون کو الگ جملہ بنایا ہے۔ ۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مناسب طریقہ سے ایسی آیات کی تاویل کی جاوے کیونکہ بعض کا قول ہے کہ ومایعلم تاویلہ الا اللّٰہ والراسخون فی العلم میں والراسخون کا عطف لفظ اللّٰہ پر ہے اور الا اللّٰہ پر وقف نہیں کرتے۔ علامہ بیضاویؒ وغیرہ نے الا ان یا تیہم اللّٰہ کی تاویل میں اَمْرُہٗ او بَاْسُہٗ (خدا کا حکم یا اس کا خوف) کہا ہے۔ مضاف کو محذوف مانا ہے تو اس تقدیر پر یہ آیت بعینہ دوسری آیت اویاتی امر ربک اور فجاء ھم بأسنا کی طرح ہوگی۔ یا یہ معنی کہ ان یاتیہم اللّٰہ بباسہ (اتارے ان پر اپنا خوف)۔

مطلب یہ ہے کہ غمام جس سے رحمت کی توقع ہوتی ہے اس سے عتاب نازل فرمائے گا۔ تو اس صورت میں سخت رسوائی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ میں کہتا ہوں علامہ بیضاویؒ کی اس تاویل کا وہ احادیث جو اس آیت یا اس کے امثال کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں بالکل انکار کرتی ہیں۔

حاکم، ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یوم تشقق السماء بالغمام کی تفسیر میں فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام مخلوق جن انسان، بہائم، درندوں، پرندوں، غرض تمام مخلوق کو جمع فرمائے گا۔ پھر آسمان دنیا پھٹ جائے گا اور آسمان والے جو زمین والوں سے زیادہ ہوں گے اس میں سے اتریں گے تو آسمان والے زمین والوں کو گھیر لیں گے اس وقت زمین والے ان سے کہیں گے کیا ہمارا پروردگار تم میں ہے۔ وہ

marfat.com

جواب دیں گے نہیں پھر دوسرے آسمان والے اتریں گے جو ان دونوں گروہوں سے زیادہ ہوں گے تو یہ دونوں گروہ ان سے کہیں گے کیا ہمارا رب تم میں ہے وہ کہیں گے نہیں اور ان ملائکہ کا جو ان سے پہلے آئے تھے اور زمین والوں کا احاطہ کر لیں گے پھر اسی طرح تیسرے آسمان والے آئیں گے پھر چوتھے اور پانچویں اور چھٹے اور ساتویں آسمان والے اسی طرح آئیں گے اور وہ پہلے آسمان والوں اور زمین والوں سے زیادہ ہوں گے اور یہ ان سے پوچھتے رہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے۔ وہ کہتے جائیں گے نہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں نزول فرمائے گا اور اس کے گرد کروبی ہوں گے جو ساتوں آسمانوں اور زمین والوں سے زیادہ ہوں گے اور حاملین عرش بھی جن کے سینگ ایسے ہوں گے جیسے نیزہ کی ابھری ہوئی جگہ۔ ان میں سے ہر ایک کے قدموں کا فاصلہ اتنا اتنا ہوگا۔ (راوی نے اس کی تعین نہیں کی صرف لفظ کذا وکذا ذکر کر دیا ہے) اور ان کے پیروں کے تلووں سے ٹخنوں تک پانچ سو برس کی مسافت ہے اور ٹخنوں سے گھٹنوں تک پانچ سو برس کا راستہ ہے اور حلقہ گردن سے کانوں کی لو تک پانچ سو برس کی دوری ہے۔ نیز میں کہتا ہوں کہ بیضاویؒ نے مضاف کو حذف کر کے جو معنی بنائے ہیں اگر وہی معنی ہوں تو آیت واسئل القریۃ یعنی واسئل اھل القریۃ کی نظیر ہو گی جس کو متشابہات میں سے کسی نے بھی نہیں کہا۔ اس کے علاوہ ایسی توجیہات کی بنا پر تو کوئی آیت قرآن شریف میں متشابہات میں سے نہ ہو گی حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے منہ اٰیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابہات اہل دل (حضرات صوفیہ صافیہ) کا ایسی آیات میں اور ہی مسلک ہے وہ یہ کہ اللہ کی تجلیات بلا کیف اس کی بعض مخلوق میں ہوتی ہیں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مؤمن کے قلب میں کعبہ شریف میں عرش عظیم پر خاص تجلیات ہوتی ہیں اور عام تجلیات ہر انسان پر ہوتی ہیں کیونکہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور خلیفۃ اللہ ہے اور یہ تجلیات کبھی تو برقی ہوتی ہیں کہ برق کی طرح چمک جاتی ہیں اور کبھی دائمی ہوتی ہیں۔ ان تجلیات سے ذات اقدس باری تعالیٰ میں کوئی حدوث لازم نہیں آتا اور نہ اس کا فعل حوادث ہونا یا مرتبۂ تنزیہہ سے نیچے آجانا اس کو مستلزم ہے بلکہ ان کا مبنی ممکن میں کسی امر کا حادث ہونا ہے۔ جیسا کہ آفتاب اور آئینہ کہ جس قدر آئینہ صاف ہوگا اسی قدر آفتاب کی تجلی اس میں اچھی طرح جلوہ گر ہو گی۔ اور اس قدر آثار یعنی روشنی وغیرہ اس میں زیادہ ہوں گے ان آثار کی کمی زیادتی سے جیسا کہ ذات آفتاب میں کوئی کمی یا زیادتی متصور نہیں، ایسے ہی یہاں بھی ہے باری تعالیٰ کے ارشاد و تجلّٰی ربہ الجبل اور یاتیہم اللّٰہ فی ظلل من الغمام میں بھی تجلیات مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی تجلی غمام میں ظاہر فرمائے گا۔ ہاں جس شخص کے قلب نے دنیا میں مجاہدات سے نور اور بصیرت حاصل کر لی ہے اس کی نظر ان بادلوں سے پرے پہنچے گی جیسے صاف شفاف آنکھ میں سے نظر پرلے پار آسمان تک پہنچتی ہے اور بلا تکلیف بغیر عینک لگائے ہوئے آسمان کو دیکھتی ہے۔ جنت میں جب رؤیت باری احادیث سے ایسی ثابت ہے جیسے چودھویں رات کا چاند تو بادلوں سے پرے صاف نظر کا پہنچنا کیسے محال ہو سکتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں بصیرت قلبی حاصل نہیں کی وہ تو دنیا میں بھی اندھے ہیں اور آخرت میں بھی راستہ سے دور بھٹکے ہوئے ہوں گے ایسے لوگوں کے لئے وہ غمام پردہ ہو جائے گا۔

بدور سافرہ میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں نے شیخ بدر الدین زرکشی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا کہ سلمۃ بن القاسم نے کتاب غرائب الاصول میں یہ حدیث نقل کر کے کہ اللہ قیامت کے دن جلوہ افروز ہوگا کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ظلل میں آنا اس پر محمول ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی نظروں کو متغیر کر دے گا کہ ان کو ایسا ہی نظر آئے گا۔ حالانکہ وہ عرش پر ہوگا۔ نہ متغیر ہوگا اور نہ منتقل۔

میں کہتا ہوں اس سے لطیف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ان بادلوں سے جو آئینہ سے زیادہ صاف ہوں گے پرلی طرف دیکھیں گے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں عبد العزیز ماجشون سے بھی ایسے ہی معنی منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی نظروں کو متغیر کر دے گا وہ اللہ تعالیٰ کو نازل ہوتا ہوا، تجلی فرماتا ہوا، خلقت سے سرگوشی سے خطاب کرتا ہوا دیکھیں گے حالانکہ وہ غیر متغیر اور غیر منتقل ہے۔ احادیث سے ہم کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کبھی اپنی

marfat.com

اصلی صورت میں آتے تھے اور کبھی دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں۔ حالانکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت سے بزرگ و برتر ہیں۔ سیوطی کا کلام تمام ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ ہم نے جو تاویل ذکر کی ہے اس کو خلف کے اقوال سے مساس بھی نہیں ہے ہاں اقوال سلف سے یہی مراد ہے یعنی یہ کہ وہ عرش پر ہے اور غمام وغیرہ میں نزول فرمائے گا یہ آیات جیسے قرآن پاک میں آئی ہیں انہیں ویسے ہیں بلاکیف رہنے دو تاکہ مرتبۂ تنزیہ کے مزاحم نہ ہو۔ یہ ایسی بات ہے کہ ؂

ذوق ایں می نشناسی بخدا تا نچشی

اور جن کو ان کا پتہ چلا ہے وہ اس کی تفسیر پوری طرح نہ کر سکے۔ سننے والوں کے افہام مخبوط ہو جاتے ہیں اور جو مراد نہیں وہ سمجھ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسی باتوں سے سکوت لازم ہے اور ان پر بلاکیف ایمان لانا واجب ہے، کسی کو حق نہیں کہ ایسی آیات کی تفسیر اپنی طرف سے کرے۔ سوائے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے۔ رسول کا عطف لفظ اللہ پر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی متشابہات کی تفسیر جانتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کے جو کامل درجہ کے متبع ہیں وہ بھی جانتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۲۵
ع۴
۹
وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾ (اور سب کام اللہ کے حوالے ہیں) امام ابن عامر اور حمزہ اور کسائی اور یعقوب نے ترجع الامور کو جہاں کہیں آیا ہو، تا کے فتحہ اور جیم کے کسرہ سے رجوع سے جو لازم ہے پڑھا ہے اور باقی قراء تا کے ضمہ اور جیم کے فتحہ سے ارجاع سے جو متعدی ہے پڑھتے ہیں۔

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ (اے محمد ﷺ) (آپ بنی اسرائیل سے پوچھئے) یہاں بنی اسرائیل سے مراد خاص مدینہ منورہ کے یہودی ہیں اور اس سوال سے مقصود ان کو زجر و توبیخ کرنی ہے۔

كَمْ آتَيْنَاهُمْ (ان کو ہم نے کتنی کچھ دی ہیں) ھم ضمیر سے موجودہ یہود کے باپ دادا مراد ہیں اور کم یا تو استفہامیہ ہے اس صورت میں یہ سل کو مفعول ثانی سے مانع ہے (یعنی سل جو پہلے سے دو مفعولوں کو چاہتا تھا۔ اب کم کے آنے سے مفعول ثانی کی اسے ضرورت نہ رہی) اور یا کم خبریہ ہے اس صورت میں کم مع اپنے ممیز کے سل کا مفعول ثانی ہے اور من آیۃ الخ کا ممیز۔

مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ (کھلی نشانیاں) احتمال ہے کہ کم مبتدا ہو اور ضمیر جو مبتدا کی طرف پھرتی ہے خبر میں سے محذوف ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی کھلی نشانیاں ہیں جو ہم نے ان کو دی تھیں اور انہوں نے انہیں پہچان لینے کے بعد بدل ڈالا۔ اور جملہ کم اتیناھم، کم کے استفہامیہ ہونے کی تقدیر پر سل بنی اسرائیل سے حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے پوچھئے کہ کم اتینا ھم الخ اور کم کے خبریہ ہونے کی تقدیر پر (جملہ کم اتیناھم) جواب سوال کا ہے یعنی بنی اسرائیل سے پوچھئے کہ ان کے پاس بہت سی نشانیاں تھیں یا نہیں اور ان نشانیوں سے مراد وہ کھلے کھلے معجزے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دال تھے یا توریت کی وہ محکم آیتیں مراد ہیں جو محمد ﷺ کی نبوت پر دال ہیں اور یہ دوسرے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔

وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ (اور جس نے اللہ کی نعمت کو بدل دیا) نعمت سے مراد وہ معجزے ہیں جو اللہ نے اس پر انعام کئے۔ نعمت ان کو اس لئے کہا کہ وہ ہدایت کا سبب ہیں یا اس سے اللہ کی کتاب مراد ہے (اور تبدیل سے مقصود یہ ہے) کہ اس پر عمل نہ کیا۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ (اس (نعمت) کے آجانے کے بعد) یعنی وہ نعمت اس کے پاس پہنچ گئی اور اس کو تحقیق کرنے کا بھی موقع مل گیا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان لوگوں نے ان کو تحقیق کرنے کے بعد بدلا ہے۔

فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ (بے شک اللہ تعالیٰ اس کو سب سے سخت عذاب دینے والا ہے) یعنی چونکہ وہ

marfat.com

سب سے سخت جرم کا مرتکب ہوا ہے لہٰذا اس کو عذاب بھی اللہ سب سے سخت دے گا۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (دنیاوی زندگانی ان لوگوں کے لئے خوشنما کردی گئی جنہوں نے کفر کیا) اور خوشنما کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ تمام خوبصورت چیزوں اور عجیب منظروں کو اسی نے پیدا کیا ہے علیٰ ہٰذا القیاس ان لوگوں میں قوت شہوانیہ بھی اسی نے پیدا کی تھی اور ان کے دلوں میں ان چیزوں کی محبت یہاں تک ملائی کہ وہ ان ہی پر مرمٹے۔ زجاج کہتے ہیں کہ شیطان نے ان کے لئے خوشنما کردی یعنی ان لوگوں کو شہوانی خیالات سوجھادیئے۔

میں کہتا ہوں کہ بندوں کے سب افعال کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور شیاطین بھی بندوں ہی میں سے ہیں لہٰذا خوشنما کرنے والا تو اللہ ہی ہوگا ہاں شیطان کی طرف اس حیثیت سے نسبت کرنا جائز ہے کہ وسوسہ کا فاعل وہی ہے، واللہ اعلم۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت عرب کے مشرکین ابوجہل وغیرہ کے حق میں نازل ہوئی تھی۔

وقف لازم

وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اور یہ (کفار) ان لوگوں سے ہنستے ہیں جو ایمان لے آئے) یعنی فقراء مؤمنین سے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں مؤمنین سے عبداللہ بن مسعود، عمارؓ، خبیبؓ، بلالؓ، صہیبؓ وغیرہ مراد ہیں۔ اور مقاتل کہتے ہیں کہ یہ آیت چند منافقین یعنی عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی، جو دنیا میں عیش وعشرت سے رہتے تھے اور غریب مسلمانوں سے مسخری کرتے اور کہتے تھے ذرا ان لوگوں کو دیکھنا (ان کے رسول) محمد ﷺ کہتے ہیں کہ ہم ان ہی لوگوں کی وجہ سے سب پر غالب آجائیں گے۔ عطا فرماتے ہیں کہ یہ آیت سرداران یہود کے حق میں نازل ہوئی، جو غریب مسلمانوں پر ہنسا کرتے تھے مسلمانوں سے اللہ نے یہ وعدہ کرلیا کہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے سب قسم کے مال بلا لڑائی بھڑائی کے ہم تمہارے حوالے کردیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا (اور جن لوگوں نے پرہیزگاری کی) یعنی وہی فقراء جو الذین اٰمنوا سے مراد تھے۔ یہ موقع اگرچہ ضمیر لانے کا تھا مگر اسم ظاہر یہاں اس لئے لایا گیا ہے تاکہ اس سے تین امر معلوم ہوجائیں۔ ایک یہ کہ متقی (پرہیزگار) بھی یہی لوگ ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کا عالی مرتبہ ہونا تقویٰ کی وجہ سے ہے۔ تیسرے یہ کہ عمل ایمان سے خارج ہے۔

فَوْقَهُمْ (ان سے اوپر ہوں گے) مکان میں یا رتبہ میں یا غلبہ میں کیونکہ متقی لوگ اعلیٰ علیین اور اللہ کے اعزاز میں ہوں گے اور کفار پر فخر کرکے ان پر اس طرح ہنسیں گے جس طرح کفار دنیا میں ان پر ہنستے تھے اور کفار اسفل السافلین اور ذلت میں ہوں گے۔

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (قیامت کے دن) جیسا کہ دارین میں اللہ کے نزدیک مؤمنین کفار سے بہتر اور معزز ہیں۔ سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس سے نکل رہا تھا، حضور ﷺ نے ایک دوسرے آدمی سے پوچھا جو آپ کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کہ اس کو تم کیسا سمجھتے ہو۔ اس نے عرض کیا حضور یہ بڑا شریف آدمی ہے اور قسم اللہ کی یہ اس شان کا آدمی ہے کہ اگر کہیں رقعہ بھیجے تو فوراً (منظور ہوکر) اس کی شادی ہوجائے اور اگر کسی کی کہیں سفارش کرے تو فوراً قبول ہوجائے۔ حضور ﷺ یہ سن کر خاموش ہوگئے۔ اتنے میں ایک اور آدمی ادھر آنکلا۔ آپ نے اس کے متعلق پوچھا کہ اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو اس نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ یہ مسلمانوں میں بہت غریب آدمی ہے یہ ایسا ہے کہ اگر کہیں رقعہ بھیجے تو کوئی شادی بھی نہ کرے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو وہ بھی کوئی منظور نہ کرے اور اگر کچھ کہے تو کوئی سنے بھی نہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ویسے آدمیوں کی بھری ہوئی زمین سے یہ اکیلا بہتر ہے۔ یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے۔

اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں بہشت کے دروازہ پر کھڑا ہوں گا تو اکثر اہل بہشت مساکین کو دیکھوں گا اور دوزخ کے دروازہ پر کھڑا ہوں گا تو اکثر دوزخی عورتوں کو دیکھوں گا اور اس وقت دولت مندر کے ہوئے ہوں گے ہاں جو ان میں سے دوزخی ہوں گے انہیں دوزخ میں جانے کا حکم ہوجائے گا۔ یہ حدیث بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔

marfat.com

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ (اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے) یعنی دارین میں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یعنی بہت سا رزق کیونکہ جو حساب میں آجاتا ہے وہ کم ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اللہ کے دیئے کا اللہ کے ذمہ کوئی حساب نہیں نہ اس پر کوئی اعتراض ہے وہ کبھی ایسے شخص کو بہت سا رزق دیتا ہے جسے اس کی ضرورت نہ ہو اور کبھی اسے کم دیتا ہے جسے ضرورت ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنے خزانے خالی ہونے سے نہیں ڈرتا کہ وہ حساب کر کے دے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴿۲۱۳﴾ (پہلے سب لوگ ایک ہی دین رکھتے تھے) بزارؒ نے اپنی مسند میں اور ابن جریرؒ، ابن ابی حاتم، ابن منذر نے اپنی اپنی تفسیر میں اور حاکمؒ نے مستدرک میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے نقل کی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان میں دس قرن کا فاصلہ تھا یہ سب لوگ ایک حق ہی حق دین پر تھے پھر ان میں اختلاف ہو گیا اور اسی طرح ابن ابی حاتم نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ یہ سب دس قرن تھے۔ سب لوگ علماء اور ہدایت یافتہ تھے پھر ان میں اختلاف پڑ گیا۔ اس وقت اللہ پاک نے حضرت نوح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا اللہ نے سب سے پہلے زمین پر حضرت نوح علیہ السلام ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور حسن اور عطا کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی وفات کے وقت سے لے کر نوح علیہ السلام کے آنے تک سب لوگ مثل چوپاؤں کے مذہب کفر پر تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام وغیرہ چند نبیوں کو بھیجا (قتادہ اور حسن وعطا کی ان روایتوں میں تعارض ہے) اور تطبیق ان دونوں میں اس طرح ہو سکتی ہے کہ پہلے تو وہ سب لوگ مسلمان تھے پھر ان میں اختلاف پڑ کر یہاں تک نوبت ہو گئی کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں سوائے آپ کے والدین کے اور سب لوگ کافر ہو گئے پس وہ دونوں مسلمان رہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ الآیۃ۔

بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے سارے عرب کے لوگ مراد ہیں۔ حافظ عماد الدین بن کثیر فرماتے ہیں کہ عمرو بن عامر خزاعی کے مکہ کا حاکم ہونے تک سارے اہل عرب دین ابراہیمی پر تھے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے سب سے پہلے سانڈ چھوڑنا نکالا اور بتوں کی پرستش جاری کی وہ ابو خزاعہ عمرو بن عامر ہے۔ میں نے اس کی آنتیں نکلی ہوئی اسے دوزخ میں دیکھا ہے اور صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عمرو بن عامر بن لحی بن قمعۃ بن خندف کو میں نے دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے سب سے پہلے اسی نے سانڈ چھوڑنا نکالا تھا۔

اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ دین ابراہیمی کو سب سے پہلے اسی نے بدلا تھا لیکن (آیت میں) ناس سے عرب مراد لینے سے لفظ نبیین انکار کر رہا ہے کیونکہ عرب میں سوائے محمد ﷺ کے اور کوئی نبی نہیں ہوا۔ اس کی دلیل یہ ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ابو العالیہ نے ابی ابن کعب سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جس وقت سب لوگ (ازل میں) حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے کئے گئے اور آپ کی پشت سے نکالے گئے اس وقت سب نے ایک امت ہو کر اپنے بندے ہونے کا اقرار کیا اور اس وقت کے سوا کبھی ایک امت ہو کر نہیں رہے ہمیشہ ان میں اختلاف رہا۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کے یہ معنی لئے جائیں کہ سب لوگ حق کو قبول کرنے کی استعداد رکھنے والے اور فطرت پر پیدا کئے ہوئے تھے پھر شیاطین انس و جن نے انہیں بہکایا تو ان میں اختلاف پڑ گیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوس کر لیتے ہیں جیسے کہ چوپایہ اپنے ہی جیسا بچہ دیتا ہے جو سب طرح صحیح سالم ہوتا ہے کیا ان میں تم نے کوئی کان کٹا دیکھا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

marfat.com

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (پھر اللہ نے انبیا کو بھیجا) اس کا عطف کان الناس امۃ واحدۃ پر ہے اگر اس سے کفر پر اجتماع مراد لیا جائے اور اگر اس سے حق پر اجتماع ہونا مراد لیا جائے تو اس کا عطف ایک مقدر فعل پر ہے۔ یعنی ان میں اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا کیونکہ انبیاء کو بھیجنا کفر اور فساد ہی دفع کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ ابوذر کہتے ہیں (نبیین کی بابت) میں نے آنحضرت سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ کل نبی کتنے ہوئے ہیں فرمایا ایک لاکھ اور چوبیس ہزار ان میں سے ایک بڑی جماعت تین سو پندرہ رسول تھے۔ یہ روایت امام احمد نے نقل کی ہے اور ایک روایت میں ابوذر سے تین سو دس سے کچھ اوپر ہونے بھی مروی ہیں۔ بغویؒ کہتے ہیں کہ رسول ان میں تین سو تیرہ ہوئے ہیں اور جن کا صریح نام قرآن شریف میں آیا ہے اٹھائیس نبی ہیں۔

میں کہتا ہوں بلکہ قرآن شریف میں تو کل چھبیس مذکور ہیں جن میں سے اٹھارہ تو اس آیت میں وَتِلْكَ حُجَّتُنَا اٰتَيْنٰهَا اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ الآیۃ وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ اور آٹھ ان کے سوا ہیں یعنی آدم، ادریس، ھود، صالح، شعیب، ذالکفل، عزیر، محمد سید الانبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین، بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ سورۂ مؤمن میں جو یوسف مذکور ہیں وہ یوسف بن یعقوب نہیں ہیں بلکہ وہ یوسف بن ابراہیم بن یوسف بن یعقوب ہیں اس حساب سے ستائیس ہو گئے اور بعض مفسرین عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کی بھی نبوت کے قائل ہیں۔ اس حساب سے پورے اٹھائیس ہو گئے مگر یہ آیت وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى مریم کی نبوت کا انکار کرتی ہے اور احتمال ہے کہ اٹھائیسویں نبی لقمان (حکیم) ہوں، واللہ اعلم۔

مُبَشِّرِيْنَ (خوشخبری دینے والے) ثواب ملنے کی اس کو جس نے اطاعت کی۔

وَمُنْذِرِيْنَ (اور ڈرانے والے) اللہ کے عذاب سے اس کو جس نے نافرمانی کی۔

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ (اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل کی تاکہ فیصلہ کرے) کتاب سے مراد جنس کتاب ہے۔ بالحق کتاب سے حال واقع ہے۔ یعنی شاہدا با لحق لیحکم یعنی اللہ یا کتاب یا جو اس کتاب کے ساتھ نبی ہے۔ وہ حکم کرے۔ ابو جعفر نے لیحکم کو یا کے ضمہ اور کاف کے فتحہ سے یہاں اور آل عمران میں سورۂ نور میں دو جگہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں نائب فاعل ظرف یعنی بہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کا حکم کیا جائے۔

بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (لوگوں میں اس امر کا جس میں انہوں نے اختلاف کیا) یا جس امر میں انہیں شک ہو گیا۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ (اور نہیں اختلاف کیا اس کتاب میں مگر ان لوگوں نے ہی جن کو وہ کتاب دی گئی) الذین موصول عہد کے لئے ہے اور اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (اپنے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد) یعنی وہ محکم آیتیں جو تورات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والی اور محمد ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت دینے والی اور آپ کے اوصاف کریمہ کو بیان کرنے والی تھیں۔ ان کے اختلاف سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ بعض کتاب پر ہم ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ علی ہذا القیاس آیتوں اور احکام کو ان کے موقعوں سے بدل دینا اور محمد ﷺ کی صفات اور قرآن شریف کا انکار کرنا۔

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (آپس کی ضد سے پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں (یعنی محمد ﷺ کی امت) کو اپنے حکم (یا اپنے ارادے یا اپنے لطف) سے وہ راہ حق دکھا دی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے) من الحق، ما کا بیان ہے۔ ابن زید کہتے ہیں ان لوگوں کا اختلاف قبلہ میں تھا کوئی مشرق کی طرف نماز

marfat.com

پڑھتا تھا کوئی مغرب کی طرف، کوئی بیت المقدس کی طرف۔ اس بارے میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے کعبہ (کی طرف پڑھنے) کا اشارہ فرمایا اور ان کا اختلاف روزوں میں بھی تھا پھر ہمیں اللہ تعالیٰ نے رمضان شریف کے روزے رکھنے کا حکم دیا اور اسی طرح (عبادت کے) دنوں میں بھی ان کا اختلاف تھا۔ نصاریٰ نے اتوار کا دن لے لیا اور یہود نے ہفتہ کا دن۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی ہدایت فرمائی اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب میں بھی ان کا اختلاف تھا یہود ان کو یہودی کہتے تھے اور نصاریٰ نصرانی۔ اس بارے میں بھی ہمیں اللہ نے حق بات بتادی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا اختلاف تھا یہودی ان کو حرامی بچہ بتاتے تھے (معاذ اللہ) اور نصاریٰ نے ان کو معبود ٹھہرالیا تھا (معاذ اللہ) اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں حق بات بتلادی۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۤءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ (اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھادیتا ہے) کہ اس پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ (کیا تم نے یہ سمجھا ہے) ام منقطعہ ہے اس لئے کہ ام متصلہ کو ہمزہ لازم ہوتا ہے اور یہ ام بمعنی بل اور ہمزہ کے ہے۔ لفظ بل کلام سیاق سے اعراض کے لئے آتا ہے۔ یہاں یہود و نصاریٰ کے اختلاف سے اعراض کرنے کے لئے ہے اور ہمزہ مؤمنین کے خیال کے انکار اور استبعاد کے واسطے۔

اس سے غرض یہ ہے کہ مؤمنین صبر سے، سختی اور تکلیف میں کام لیں۔ فراء کا قول ہے کہ اس کے معنی ہیں اَحَسِبْتُمْ اور میم زائد ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی بل حسبتم ہیں۔ یہ آیت جنگ احزاب کے دن نازل ہوئی تھی جس وقت آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سخت مصیبت اور محاصرہ اور شدت خوف اور سردی اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچیں۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی ہے۔ عطا کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ پہنچے تو حضور ﷺ کے ہمراہیوں پر بہت تنگی گزرنے لگی کیونکہ وہ لوگ بالکل خالی مدینہ گئے تھے اپنے گھربار اور مال وغیرہ سب مشرکین کے قبضہ میں چھوڑ گئے تھے اس کے علاوہ (مدینہ کے) یہود عداوت ظاہر کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ام حسبتم الخ

اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

(کہ جنت میں (یونہی) چلے جاؤ گے حالانکہ جو تم سے پہلے (انبیاء اور مؤمنین) گزر گئے ہیں ان کی سی حالت (تنگی کی) تمہیں پیش نہیں آئی، انہیں سختی (بھی) پہنچی اور (فقر و بیماری کی) تکلیف (بھی) اور (طرح طرح کی بلاؤں اور سختیوں میں) جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول علیہم الصلوٰۃ والسلام اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے (مدد ہونے میں دیر ہونے کی وجہ سے) کہنے لگے کہ خدا کی مدد کب ہوگی (ان سے کہا گیا) آگاہ ہو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔ یقول میں رفع اور نصب دونوں جائز ہیں کیونکہ حتیٰ کے مابعد جب مستقبل بمعنی ماضی ہو تو اس میں دونوں اعراب جائز ہیں۔ نافع نے رفع سے اور باقی قراء نے نصب سے پڑھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت مصیبتوں سے اور دوزخ لذتوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ روایت مسلم نے انس رضی اللہ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور امام احمد نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود سے نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن منذر نے ابن حبان سے روایت کی ہے کہ عمرو بن جموح نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم کس قسم کے مال اور کہاں کہاں خرچ کیا کریں۔ ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں مسلمانوں نے یہی سوال کیا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْـَٔــلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ

(اے محمد لوگ) (آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں تم کہہ دو کہ جو مال تم خرچ کرو تو (اول) ماں باپ اور رشتہ داروں کو اور (اس کے بعد) یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کو دو) اللہ تعالیٰ نے ماانفقتم من خیر عام فرما کر خرچ کرنے کی مدوں کو صراحتاً اور سائل کے جواب کو اشارۃً بیان فرمادیا ہے اس لئے کہ مصرف کا خیال رکھنا زیادہ اہتمام کے قابل ہے کیونکہ خرچ کرنے کا اعتبار مصرف ہی کے لحاظ سے ہوتا ہے۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ (اور تم جو کچھ نیکی کرو گے) یعنی کوئی سی نیکی صدقہ ہو یا اور کچھ یہ جملہ شرط کے معنی میں ہے اور اس کا جواب آئندہ آیت ہے۔

فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۲۱۵﴾ (تو بیشک اللہ اس کو جانتا ہے) یعنی اس کی حقیقت اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے پھر تمہاری نیتوں کے مطابق اس کا پورا پورا اجر دے گا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ حکم زکوٰۃ کے فرض ہونے سے پہلے تھا پھر حکم زکوٰۃ (نازل ہونے) سے یہ آیت منسوخ ہوگئی اور حق یہ ہے کہ یہ حکم زکوٰۃ کی فرضیت کے منافی نہیں ہے کہ اس سے منسوخ ہو جائے۔ لہٰذا یہ آیت محکم ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (مسلمانو) تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے) عطا کہتے ہیں (اب) جہاد نفل ہے اور اس آیت میں جو جہاد کا حکم کیا گیا ہے یہ آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کے ساتھ مخصوص تھا اوروں کو یہ حکم نہیں ہے۔ یہی مذہب امام ثوری کا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کو وہ اپنی حجت کہتے ہیں کہ فَضَّلَ اللّٰهُ المجاهدين باموالهم وانفسهم على القاعدين درجةً وكلا وعدالله الحسنىٰ (یعنی مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے فضیلت دی ہے (اور ان دونوں میں سے) ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے) عطاء اور ثوری دونوں فرماتے ہیں کہ اگر جہاد سے بیٹھ رہنے والا فرض کا تارک ہوتا تو اس کے لئے خدا کی طرف سے بھلائی کا وعدہ نہ ہوتا۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ قیامت تک ہر ایک مسلمان پر جہاد کرنا فرض عین ہے اور آیت (كتب عليكم القتال الآية) ان کی دلیل ہے اور ذیل کی حدیث کو بھی وہ اپنی حجت گردانتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مر گیا اور اس نے کبھی جہاد نہ کیا اور نہ کبھی اس کے جی میں جہاد کا خیال آیا تو یہ شخص ایک قسم کے نفاق پر مرا اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے کہ جب کچھ لوگ جہاد کرنے پر کھڑے ہو جائیں تو اور لوگوں کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے جیسا کہ جنازہ کی نماز (کا وجوب) ہے اور اسی پر اجماع (بھی) ہو گیا ہے اور سب ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سب شہر والوں پر واجب ہے کہ جو کفار ان کے قریب ہوں ان سے جہاد کریں اگر ان سے نہ ہو سکے یا یہ ہمت ہار دیں تو پھر جو ان سے قریب کے مسلمان ہیں اور پھر ان سے جو قریب کے مسلمان ہیں (ان پر ان کی مدد کرنی واجب ہے) اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب جہاد کا اعلان عام ہو اور کفار اسلامی شہروں پر چڑھ آئیں تو پھر ہر ایک شخص پر جہاد کرنا فرض ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ جو شخص جہاد کے لئے متعین نہ ہو اور اس کے والدین مسلمان ہوں تو بلا ان کی اجازت کے یہ جہاد میں نہ جائے اور جس کے ذمہ قرض ہو وہ اپنے قرض خواہ کی اجازت کے بغیر نہ جائے۔ جمہور کی حجت وہی ہے جو فریقین کے دلائل میں ہم ذکر کر چکے ہیں اس کے علاوہ یہ آیت بھی ان کی دلیل ہے۔ یاایھا الذین امنوا مالکم اذاقیل لکم انفروا فی سبیل اللّٰہ اثاقلتم اس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ سورۃ توبہ میں (مفصل) آئے گا۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے ایک شخص نے جہاد میں جانے کی اجازت مانگی۔ حضور ﷺ نے پوچھا تیرے ماں باپ زندہ ہیں۔ عرض کیا ہاں زندہ ہیں۔ فرمایا جاؤ ان ہی کی خدمت کر کے انہیں آرام دو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ نے بھی اسی کے ہم معنی نقل کی ہے۔

وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (اور وہ تمہیں ناگوار ہے) اہل معانی نے کہا ہے کہ یہ ناگوار ہونا بحیثیت طبعی نفرت کے ہے کیونکہ اس میں جان پر مشقت اور مال کا خرچ کرنا ہوتا ہے نہ یہ کہ صحابہؓ کو حکم الٰہی ناگوار معلوم ہوتا تھا۔

وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (اور شاید کہ تمہیں ایک چیز بری لگے حالانکہ وہ تمہارے

marfat.com

حق میں بہتر (ہی) ہو اور اسی قسم میں سے جہاد ہے کیونکہ اس میں فتح یابی، مال غنیمت کا ملنا، دنیا پر قبضہ ہونا، شہادت حاصل ہونا اور ثواب ملنا سب ہی بھلائیاں ہیں۔

وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّوا شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (اور شاید ایک چیز تمہیں اچھی معلوم ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو) جیسے جہاد سے بیٹھ رہنا کیونکہ اس میں گناہ، ذلت، ثواب اور مال غنیمت سے محروم رہنا ہے۔ اور لفظ عسی جو اصل میں شک کے لئے ہے یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ جس وقت نفس پاکیزہ ہو جاتا ہے تو اس کی تمام خواہشیں حکم شرعی کے موافق ہو جاتی ہیں اس وقت وہ ان ہی چیزوں (اور ان ہی افعال) کو برا سمجھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بری ہوں اور ان ہی چیزوں کو پسند کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ (اور اللہ (تمہاری بھلائی برائی کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) پس تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ادا کرنے میں جلدی کرو تا کہ تمہیں ایسی چیز نصیب ہو جائے جو دین و دنیا میں تمہارے حق میں بہتر ہو۔ ع ۲۶/۱۰

فصل

جہاد کے فضائل کا بیان

ابن مسعودؓ کہتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ سب سے افضل کون سا عمل ہے۔ فرمایا نماز وقت پر پڑھنا میں نے کہا پھر کون سا، فرمایا ماں باپ کو آرام دینا۔ میں نے کہا اس کے بعد، فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ (ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ میں نے بس اتنا ہی پوچھا) اور اگر میں اور پوچھتا تو آپ اور بھی فرماتے، یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کسی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ سب عملوں سے افضل کون سا عمل ہے، فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ اس نے عرض کیا پھر کون سا، فرمایا راہ خدا میں جہاد کرنا۔ اس نے کہا اس کے بعد، فرمایا مقبول حج۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور یہ حدیث اگرچہ بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ پہلی حدیث سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ نماز جہاد سے افضل ہے اور اس دوسری حدیث سے اس کے برعکس معلوم ہوا لیکن ان دونوں کے معنی اس طرح بن سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہر سائل کے حال کے موافق تھا (جو جس کے حق میں بہتر ہوا آپ نے وہی فرمادیا) یا یہ کہا جائے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایمان کے لفظ سے فرض نماز اور فرض زکوٰۃ مراد ہیں اب کوئی تعارض نہیں رہتا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یوں کہا جائے کہ ایمان کے بعد جہاد کرنا درست ہے اگرچہ جہاد، نماز اور زکوٰۃ کے بعد ہے۔

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کا صف جہاد میں (ایک روز) کھڑا ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے۔ یہ حدیث حاکم نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ بخاری کی شرط کے موافق یہ حدیث صحیح ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ تم میں سے ایک کا راہ خدا میں (ایک دفعہ) کھڑا ہونا اپنے گھر میں ستر برس نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ روایت ترمذی نے نقل کی ہے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ جہاد کے برابر بھی کوئی عمل ہے، فرمایا تم میں اس کی طاقت نہیں ہے اس نے دوبارہ تین مرتبہ۔ پوچھا حضور یہی فرماتے رہے کہ تم میں اس کے کرنے کی طاقت نہیں ہے پھر فرمایا کہ جو شخص خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو (ہر وقت) کھڑا ہوا قرآن شریف پڑھ رہا ہے۔ اپنے نماز، روزہ میں ہرگز

marfat.com

فرق نہیں آنے دیتا (یہ مثال مجاہد کی ہے) یہاں تک کہ وہ جہاد سے واپس آجائے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔
ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایک دستہ فوج میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلے، رستہ میں ایک صحابی کا ایک ایسے غار پر سے گزر ہوا جہاں پر کچھ ہریالی اور پانی تھا (وہ جگہ ان کو پسند آگئی) انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ بس تارک الدنیا ہو کر اب یہیں رہا کریں گے۔ پھر آنحضرت ﷺ سے اجازت چاہی، حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہودی یا نصرانی بنانے کے لئے میں نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ میں ایک صاف ستھرا دین دے کر بھیجا گیا ہوں اور قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ (قدرت) میں محمد کی جان ہے کہ فقط صبح یا شام کو جہاد میں چلا جانا ساری دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے اور صف جہاد میں (فقط ایک دفعہ) تمہارا کھڑا ہو جانا ساٹھ برس کی نماز سے بہتر ہے۔ یہ حدیث امام احمدؒ نے نقل کی ہے۔
میں کہتا ہوں یہ سب حدیثیں نفلی نماز، روزہ سے جہاد کے افضل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے جب ایک نے ادا کر دیا تو اس کی فرضیت ادا ہو گئی اور وہ ہر وقت ادا ہو سکتا ہے لیکن جہاد شہادت کا ذریعہ بھی ہے جو نبوت کے قریب قریب ہے۔ بخلاف نماز اور روزہ کے کہ یہ دونوں غیر وقت میں ادا کرنے سے نفل ہی ہوتے ہیں اور نفل فرض کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی کہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا سوائے ذکر الٰہی کے کوئی عمل نہیں ہے، صحابہ نے عرض کیا اور نہ جہاد، فرمایا اور نہ جہاد اگرچہ (کفار پر) اس قدر تلوار چلائی جائے کہ تلوار کے ٹکڑے ہو جائیں۔ یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے۔ یہ حدیث امام احمد طبرانیؒ ابن ابی شیبہؒ نے معاذ کی سند سے نقل کی ہے۔ یہ حدیث ان تین حدیثوں کے جو حضرت عمرانؓ، ابو ہریرہؓ، ابو امامہؓ سے منقول ہو چکی ہیں) معارض ہے تو ان دونوں کے معنی باہم موافق ہو جانے کی کیا صورت ہے۔ ہم کہتے ہیں اس حدیث میں ذکر سے مراد ہو حضور دائمی ہے جس میں کبھی کمی نہیں ہوتی نہ وہ نماز اور روزہ جو زاہد لوگوں کا حصہ ہے اور یہی جہاد اکبر سے مراد ہے۔ اس روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک غزوہ سے لوٹتے ہوئے فرمایا رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر (یعنی اب ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹتے ہیں) اگر کوئی کہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ جہاد اصغر میں تھے کیا جہاد اکبر میں مشغول نہ تھے۔
ہم کہتے ہیں ہاں اس میں بھی مشغول تھے لیکن زیادہ اہتمام کرنے کی وجہ سے حال مختلف ہو جاتا ہے اس لئے پہلے گویا جہاد اصغر کا زیادہ اہتمام تھا اور اب جہاد اکبر کا زیادہ اہتمام ہو گا[1]۔ واللہ اعلم
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے راہ خدا میں جان دینے والوں کے لئے تیار کئے ہیں اور ہر دو درجوں کا درمیان فاصلہ اس قدر ہے جیسا آسمان و زمین کے درمیان میں ہے۔ پس جس وقت اللہ سے سوال کرنا چاہو تو فردوس کا سوال کیا کرو کیونکہ وہ سب سے اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس کے اوپر ہی خدا تعالیٰ کا عرش ہے اور وہیں سے اور بہشتوں میں نہریں آتی ہیں۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اشرفی، روپیہ، روٹی، کپڑے کے بندہ کا ناس ہو کہ اگر اسے مل گئی تو راضی ہو گیا اور نہ ملی تو ناراض ہے۔ خوشی اس بندہ کے لئے ہے جو جہاد میں اپنے گھوڑے کی باگ تھامے رہا اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں پیروں پر ریتا چڑھا ہوا ہے اگر پہرہ داروں میں ہے تو وہیں ہے اگر مقدمۃ الجیش میں ہے تو وہیں ہے اگر کسی کے پاس داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے تو اجازت نہیں ملتی اور اگر کسی کی سفارش کرتا ہے تو کوئی قبول نہیں کرتا۔ یہ حدیث بخاری نے

---

[1] حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس کے قدم خدا کے راستے میں غبار آلود ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ایک رات مورچہ پر خدا کے لئے پہرہ دینا ہزار رات کی عبادت کھڑے ہو کر کرنے اور ہزاروں کے روزوں سے افضل ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قوم جہاد چھوڑ بیٹھے اس پر اللہ تعالیٰ ضرور عذاب عام نازل کرے گا ۱۲ منہ

marfat.com

نقل کی ہے جہاد میں شامل ہونے کے فضائل سورۂ آل عمران کے آخر میں انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب آئیں گے۔ اصل میں جہاد کو تمام حسنات پر اس وجہ سے فضیلت دی گئی اور کوہان اسلام اس کو اس لئے کہا گیا کہ یہ اسلام کی اشاعت اور خلق (اللہ) کی ہدایت کا سبب ہے پس جس شخص کو کسی مجاہد کی کوشش کے سبب سے ہدایت ہوئی تو اس کی نیکیاں بھی اس مجاہد کی نیکیوں میں لکھی جائیں گی اور علوم ظاہرہ اور علوم باطنہ کی تعلیم دینا اس سے بھی افضل ہے کیونکہ اس میں اسلام کی حقیقت کی اشاعت ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ (اے محمد مسلمان) آپ سے ماہ حرام میں جنگ کرنے کی بابت پوچھتے ہیں) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اور طبرانی نے کبیر میں اور ابن سعد اور بیہقی نے اپنی اپنی سنن میں جندب بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ جنگ بدر سے دو مہینے پہلے ماہ جمادی الاخری ۲ ھجری میں آنحضرت ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن جحش کو ان کی اردلی میں آٹھ نفر مہاجرین دے کر بھیجا ان مہاجرین کے نام یہ ہیں۔ سعد بن ابی وقاص زھری، عکاشہ بن محصن اسدی، عتبہ بن عزوان سلمی، ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ، سھیل بن بیضا، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ، خالد بن کبیر۔ اور بعض راویوں نے سھیل بن بیضا کو ذکر کیا ہے اور سھیل، خالد، عکاشہ کو ذکر نہیں کیا اور بعض نے مقداد بن عمرو کو ذکر کیا ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں یہ سب (اصل میں) بارہ آدمی تھے اور دو دو آدمی ایک ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور حضور انور رسول مقبول ﷺ نے ان کے افسر عبداللہ بن جحش کو ایک حکمنامہ لکھ کر دیدیا تھا اور یہ فرمادیا تھا کہ اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ اور جب تک دو دن کا سفر طے نہ کرلو اس حکم نامہ کو (کھول کر) نہ دیکھنا دوسری منزل پر پہنچ کر اس حکم نامہ کو دیکھنا اور (جو کچھ اس میں تحریر کیا ہے) وہ اپنے ساتھیوں کو بھی بتادینا پھر ہمارے حکم کا اجراء کرنا اس کے علاوہ اپنے ساتھ لے جانے میں اپنے کسی ساتھی پر زبردستی نہ کرنا۔ اس کے بعد جب عبداللہ چلنے لگے تو چلنے سے پہلے ہی پوچھا یارسول اللہ میں کس طرف جاؤں فرمایا نجد کی طرف عبداللہ وہاں سے روانہ ہو گئے اور دو روز کا سفر کرلینے کے بعد ایک جگہ پڑاؤ کیا اور وہ حکمنامہ کھولا تو اس میں یہ مضمون (لکھا ہوا) تھا۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم امابعد فسر علی برکة اللّٰہ بمن تبعک من اصحابک حتی تنزل بطن نخلة فترصدبھا عیر قریش لعلک ان تاتینا منہ بخیر (یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بعد حمد و صلوٰۃ کے واضح ہو کہ تم اللہ کی برکت پر (اور اس کی رحمت پر بھروسہ کر کے) اپنے ان ہمراہیوں کو لے کر چلے جاؤ جو تمہارے کہنے میں ہوں اور جس وقت بطن نخلہ میں پہنچو تو قریش کے قافلہ کے منتظر رہو، امید ہے کہ ان کا مال تمہارے ہاتھ لگے اور تم اسے ہمارے پاس لاؤ) جس وقت عبداللہ نے اس حکم نامہ کو دیکھا فوراً (رضامندی ظاہر کرنے کے لئے) سمعاً و طاعةً کہا، اس کے بعد وہ مضمون اپنے ساتھیوں کو سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ حضور ﷺ نے اس سے مجھے منع فرمادیا ہے کہ تم میں سے کسی پر میں زبردستی کروں اب تم میں سے جس کا ارادہ شہادت (یعنی شہید ہونے) کا ہو وہ تو چلے اور جسے یہ پسند نہ ہو وہ لوٹ جائے پھر آپ آگے بڑھے اور آپ کے سب ساتھی بھی ساتھ ہی رہے کوئی ان میں سے نہیں پھرا۔ جب یہ لوگ معدن پہنچے جو علاقہ حجاز میں فرع سے اوپر ایک مقام ہے جسے لوگ نجران کہتے ہیں تو وہاں پہنچ کر سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن عزوان کا اونٹ جس پر یہ دونوں سوار ہوتے تھے گم ہو گیا یہ دونوں اس اونٹ کو تلاش کرنے میں پیچھے رہ گئے اور عبداللہ اپنے باقی ہمراہیوں کو لے کر آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے درمیان بطن نخلہ میں جا اترے ابھی یہ ٹھہرنے (بھی) نہ پائے تھے کہ اتنے میں قریش کا قافلہ دکھلائی دیا جو طائف کی تجارت کا مال کشمش اور چمڑے (وغیرہ) لئے آرہا تھا انہیں میں عمرو حضرمی، حکم بن کیسان مولی ہشام بن مغیرہ، عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ مخزومی بھی تھے۔ جس وقت ان لوگوں نے ان مسلمانوں کو دیکھا تو ان سے دہشت کھاگئے (افسر) عبداللہ بن جحش نے کہا کہ وہ لوگ تم سے خوف کھاگئے ہیں اب تم یہ کرو کہ اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ کر ان کے پاس بھیج دو (تاکہ انہیں کچھ اطمینان ہو جائے) چنانچہ عکاشہ کا سر مونڈ کر ان کی طرف بھیج دیا گیا جب عکاشہ ان کے پاس پہنچے تو وہ دیکھتے ہی کہنے لگے کہ یہ تو عمار کی قوم (کے آدمی) ہیں ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ غرض کہ ان سے

marfat.com

وہ بے خوف سے ہوگئے اور یہ واقعہ اس تاریخ کو ہوا جس کو وہ لوگ تو جمادی الثانی کا آخری دن سمجھ رہے تھے اور تھی اصل میں رجب کی پہلی، پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر آج کی رات تم انہیں چھوڑے دیتے ہو تو پھر یہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور تمہارے قبضہ سے نکل جائیں گے (کیونکہ حرم میں لڑنا جائز نہیں) اس کے علاوہ ماہ حرام (رجب) بھی شروع ہو جائے گا یہ سمجھوتہ ہونے کے بعد واقد بن عبداللہ سہمی نے عمرو حضرمی کے تیر مار کر اسے تو وہیں مار دیا اور باقی مسلمانوں نے بڑی مردانگی سے ان پر حملہ کیا عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور حکم بن کیسان کو مقید کر لیا اور نوفل بھاگ گیا وہ ان کے ہاتھ نہ آیا پھر ان دونوں قیدیوں اور اونٹوں کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس مال غنیمت میں سے عبداللہ بن جحش نے رسول اللہ ﷺ کے لئے خمس علیحدہ کر کے باقی مال اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اسلام میں سب سے پہلا خمس اور سب سے پہلا مال غنیمت یہی تھا اور مشرکین میں جو سب سے پہلے قتل ہوا وہ یہی عمرو حضرمی تھا اور سب سے پہلے قیدی عثمان اور حکم ہیں اور یہ واقعہ مال غنیمت میں خمس فرض ہونے سے پہلے کا ہے، پھر عبداللہ بن جحش کی اس کارروائی کے مطابق خمس فرض ہوا اور جب یہ لوگ آنحضرت ﷺ سے ملے تو آپ نے فرمایا کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا میں نے حکم نہیں دیا تھا (یہ تم نے عدول حکمی کی) اور اس مال غنیمت میں سے آپ نے کچھ نہ لیا۔ اس مال اور ان دونوں قیدیوں کو ویسے ہی رہنے دیا اور (جب یہ خبر مکہ میں پہنچی تو) قریش نے ان مسلمانوں سے جو مکہ میں رہتے تھے طعنہ کے طور پر کہا کہ اے بے دینو تم نے ماہ حرام کو بھی حلال سمجھ لیا اور اس میں بھی قتل و قتال کرنے لگے یہ سن کر ان لشکریوں کو بہت بڑا صدمہ ہوا اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ بس ہم ہلاک ہو گئے (ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی) اور حضور انور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ عمرو حضرمی کو قتل کرنے کے بعد شام کو ہم نے رجب کا چاند دیکھا لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ خون ہم نے رجب میں کیا یا کہ جمادی الثانی میں۔ پھر اس کے بارے میں لوگوں نے مختلف اقوال بیان کئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تب آنحضرت ﷺ نے وہی خمس لے لیا جو عبداللہ بن جحش نے نکالا تھا آپ نے سارا مال لے کر اس میں سے خمس نکال لیا اور باقی مال ان لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔

بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ (جنگ) بدر سے واپس آنے تک یہ اہل نخلہ کا مال غنیمت ویسے ہی رکھا رہا اور بدر کی غنیمتوں کے ساتھ ہی یہ بھی تقسیم ہوا اور اہل مکہ نے اپنے دونوں قیدیوں کے فدیہ میں انہیں چھوڑانے کی امید پر) کچھ مال بھیجا حضرت نے فرمایا کہ سعد اور عتبہ کے آنے تک ان دونوں قیدیوں کو ہم قید ہی میں رکھیں گے کیونکہ ہمیں تمہاری طرف سے اندیشہ ہے اگر (ہمارے) وہ دونوں آدمی نہ آئے تو ان کے عوض ہم ان دونوں کو قتل کر دیں گے کچھ دنوں کے بعد سعد اور عتبہ بھی (بخیر و عافیت) آ گئے۔ تب آنحضرت ﷺ نے ہر قیدی کے فدیہ میں چالیس چالیس اوقیہ لے کر دونوں کو رہا کر دیا۔ حکم بن کیسان تو یہیں مسلمان ہو گئے اور آنحضرت اس کے پاس ہی مدینہ منورہ میں رہنے لگے پھر بیر معونہ (کی لڑائی) میں شہید بھی ہو گئے، لیکن عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ مکہ چلا گیا اور وہیں کفر ہی کی حالت میں مر گیا۔ رہا نوفل اس نے جنگ خندق میں اپنے گھوڑے کو خندق میں ڈالنے کی غرض سے اس کے ایڑ لگائی اور مع گھوڑے کے خندق میں گر پڑا اور دونوں کا کچلا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے وہیں اس کی جان لے لی۔ اس کے بعد مشرکین نے کچھ قیمت پر اس کا لاشہ مانگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ لے لو کیونکہ اس کا لاشہ بھی ناپاک اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے۔

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ (اے محمد ان سے) کہہ دو کہ اس ماہ حرام میں لڑنا بڑا گناہ ہے) اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے آیت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم سے (یعنی مشرکین کو تم جہاں پاؤ قتل کر دو) ابن ہمام فرماتے ہیں کہ (منسوخ کہنا) اس بنا پر ہے کہ حیث کا لفظ زمانہ (کے معنی) میں مجازاً ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ کثیر الاستعمال ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حیث کے لفظ کو مکان کے معنی میں حقیقی اور زمانہ کے معنی میں مجازی کہنے کی کوئی دلیل نہیں ہے

marfat.com

اور اگر ہم یہ مان لیں کہ یہ لفظ مکان اور زمان دونوں میں مشترک ہے تب بھی تمام زمانوں کو شامل ہونے میں شک رہتا ہے اور شک کے ہوتے ہوئے منسوخ کہنا جائز نہیں ہے۔ بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ عام سے خاص کا منسوخ ہونا ہے اور اس میں اختلاف ہے یعنی عام سے خاص کا منسوخ ہونا امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ عام بھی اپنے افراد میں خاص کی طرح قطعی دلیل ہوتا ہے اور امام شافعی وغیرہ کے نزدیک جائز نہیں ہے ان کا قول یہ ہے کہ عام ظنی دلیل ہے بخلاف خاص کے کیونکہ کوئی عام ایسا نہیں جس میں سے بعض افراد خاص نہ ہو گئے ہوں اور اس کی مفصل بحث اصول فقہ میں ہے۔

قاضی بیضاوی کہتے ہیں اولیٰ یہ ہے کہ اشہر حرام میں مطلقاً جنگ حرام ہونے پر اس آیت کو دلیل نہ کہا جائے کیونکہ قتال (کالفظ) نکرہ ہے جو مثبت (فعل) کے تحت میں ہے۔ لہٰذا یہ عام نہ ہوگا (کیونکہ نکرہ منفی فعل کے تحت میں آکر عام ہوا کرتا ہے نہ مثبت کے تحت ہیں) میں کہتا ہوں کہ مثبت (فعل) میں بھی قرینہ موجود ہونے کے وقت نکرہ عام ہو جایا کرتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں کہ ثمرة خیر من جرادة اگر یہاں نکرہ عموم کے لئے نہ ہو تو سائل کا جواب نہیں ہو سکتا۔

ابن ہمام نے اس حرمت کے منسوخ ہونے پر چند عمومات سے استدلال کیا ہے مثلاً یہ آیت اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً اور آنحضرت علیہ السلام کا یہ قول امرت ان اقاتل الناس حتّٰی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ۔

میں کہتا ہوں یہ استدلال ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ان آیتوں کا عام ہونا مکلفین اور ان کے احوال کے بارے میں ہے نہ کہ زمانوں کی بابت کہ اس میں اشہر حرم داخل ہو جائیں اور ان پر منسوخ ہونے کا حکم لگ جائے بلکہ زمانوں کا عموم اگر ثابت ہوگا تو اقتضاء النص سے ہوگا اور اقتضاء النص یہاں ہے نہیں، لہٰذا اس میں تخصیص اور نسخ جاری نہیں ہو سکتا۔ اور اشہر حرم میں قتل و قتال کی حرمت منسوخ ہونے کا کوئی کس طرح دعویٰ کر سکتا ہے حالانکہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان عدة الشھور عنداللّٰہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللّٰہ یوم خلق السموات والارض منھا اربعة حرم ذٰلک الدین القیم فلا تظلموا فیھن انفسکم (یعنی بے شک مہینوں کا شمار اللہ کے نزدیک اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہیں جس دن کہ اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ان میں چار (مہینے) حرام ہیں یہ مضبوط دین ہے پس ان (مہینوں) میں (قتل و قتال کر کے) اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو) وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۝ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (یعنی اور تمام مشرکوں سے لڑو جس طرح وہ تم سب سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ سوا اس کے نہیں کہ (مہینے کا) آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے جو لوگ کافر ہیں اس کے ذریعہ سے گمراہ کئے جاتے ہیں ایک سال (تو) وہ اس مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال اسے حرام کر لیتے ہیں تاکہ ان (مہینوں) کا شمار پورا کر لیں جن کو اللہ نے حرام کیا ہے اور جسے اللہ نے حرام کیا ہے اسے (اس تدبیر سے) حلال کر لیں۔ ان کے لئے ان کے برے کام زینت دیئے گئے ہیں اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا) یہ آیت قتال کی آیتوں میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے اور یہی آیت سیف ہے جو ۹ ہجری کے آخر میں نازل ہوئی ہے اور اس میں ان مہینوں کے حرام ہونے کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس سے یہ خصوصیت ثابت ہوئی کہ ان مہینوں کے سوا ہی میں قتل و قتال کرنا واجب ہے ان میں جائز نہیں) واللہ اعلم۔

اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ کی وفات سے دو مہینے پہلے حجة الوداع میں بقر عید کے روز کا خطبہ جو حضور ﷺ نے پڑھا تھا ان اشہر حرم میں قتل و قتال کرنے کی حرمت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں آپ نے فرمایا تھا کہ یاد رکھو زمانہ پھر اسی حالت پر آگیا ہے کہ جس حالت پر آسمان و زمین پیدا ہونے کے دن تھا۔ سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں ان میں سے چار مہینے حرام ہیں تین پے در پے ذیقعدہ ذی الحجہ اور محرم اور ایک (ان سے علیحدہ یعنی) رجب۔ اسی حدیث کے آخر میں فرمایا کہ تمہارے خون تمہارے مال، تمہارے اسباب ایک کے دوسرے پر ایسے حرام ہیں جیسے تمہارے اس شہر اور اس مہینے میں آج کے دن کی حرمت

marfat.com

ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مسند سے متفق علیہ ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ ماہ ذی الحجہ کی بیسویں تاریخ کو آنحضرت ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا تھا اور یہ محاصرہ محرم کے آخر تک یا ایک مہینہ تک رہا غرض یہ ہے کہ اس سے اس آیت کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ قول ٹھیک نہیں ہے کیونکہ طائف کا محاصرہ ماہ شوال ۸ ہجری میں ہوا تھا۔ ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال ماہ رمضان شریف کی دوسری تاریخ کو ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ سے چلے تھے۔ یہ روایت امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ بیہقی نے زہری سے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ رمضان شریف کی تیرہویں تاریخ کو آنحضرت ﷺ نے مکہ پر فتح پائی تھی۔

میں کہتا ہوں اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بارہ روز آنحضرت کہیں راستہ میں ٹھہر گئے تھے۔ اور انیس روز اور ایک روایت میں سترہ روز آپ نے مکہ معظمہ میں قیام کیا۔ یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے اور ایک روایت میں اٹھارہ روز ہیں پھر مکہ فتح ہو جانے کے بعد شوال کی چھٹی تاریخ کو ہفتہ کے دن آپ حنین کو روانہ ہو گئے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ آپ پانچویں (شوال) کو روانہ ہوئے تھے یہی قول عروہ اور ابن جریر کا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ شوال کی دسویں کو آنحضرت حنین پہنچ گئے تھے اور جب (قبیلہ) ہوازن کے لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے اور آپ نے سب غنیمتیں اکٹھی کرالیں تو (قبیلہ) ثقیف کا سردار نوفل طائف چلا آیا اور سب لوگوں کو اندر کر کے شہر کے دروازے بند کر دیئے اور ان لوگوں نے جنگ کی تیاری کر لی۔ ادھر حضور ﷺ بھی لوٹ کے مکہ نہیں گئے اور نہ حنین کی غنیمتیں تقسیم کرنے سے پہلے سوائے جنگ طائف کے اور کہیں کی چڑھائی کی۔ قیدیوں کو آپ جعرانہ ہی میں چھوڑ آئے تھے یہاں آکر آپ نے طائف کا محاصرہ کر لیا۔ مسلم نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہ محاصرہ چالیس روز رہا تھا۔ ہدایہ میں اس روایت کو غریب کہا ہے۔ ابن اسحاق نے محاصرہ کی مدت تیس دن بیان کی ہے اور ابن اسحاق کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ محاصرہ بیس روز سے کچھ اوپر رہا تھا۔ بعض بیس روز ہی کہتے ہیں اور بعض نے دس روز سے کچھ اوپر کہا ہے یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ بلاشک یہی صحیح ہے پھر آنحضرت ﷺ نے مکہ کو کوچ فرمایا اور ذیقعدہ کی پانچویں تاریخ کو جمعرات کے دن آپ جعرانہ پہنچ گئے۔ جعرانہ سے آگے نہیں بڑھے تیرہ روز وہیں رہے اور وہیں عمرہ کر لیا۔ پھر ذیقعدہ کی اٹھارہویں کو بدھ کے دن آپ ﷺ مدینہ کو روانہ ہو گئے اور ذیقعدہ کی ستائیسویں تاریخ کو جمعہ کے دن مدینہ پہنچ گئے۔ ابو عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے مدینہ میں نہ رہنے کی مدت اس وقت سے لے کر کہ آپ مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے اور اول مکہ فتح کیا پھر ہوازن پر چڑھائی کی پھر اہل طائف سے جنگ کی (ان سب سے فارغ ہو کر) مدینہ واپس آنے تک دو مہینے اور سولہ دن بلکہ دو مہینے اور چھبیس دن ہیں۔ پھر ابن ہمام کا یہ کہنا کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ طائف کا محاصرہ ذی الحجہ کی بیسویں تاریخ سے لے کر محرم کے آخر تک رہا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کا منسوخ ہونا ثابت نہیں ہوا، واللہ اعلم۔ ہاں یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ کیونکہ یہ آیت اشہر حرم میں قتل و قتال کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے ایسی حالت میں کہ جنگ کی ابتدا کفار کی طرف سے ہو کیونکہ یہ آیت جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے اور وہ آیت عمرۂ قضاء ۷ ہجری میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں پس اشہر حرم میں (مسلمانوں کو) جنگ شروع کرنا حرام ہی رہا، واللہ اعلم۔

وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (اور اللہ کی راہ سے یعنی اسلام اور طاعات سے) روکنا اور اس کو (یعنی اللہ کو) نہ ماننا اور مسجد حرام سے روکنا) المسجد الحرام میں مضاف محذوف ہے یعنی وصد المسجد الحرام اور مجرور ضمیر پر (جو بہ ہے) اس کا عطف جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں (حرف) جار کا اعادہ واجب ہوگا اور نہ سبیل اللہ پر جائز ہے کیونکہ کفر بہ کا عطف اس سے مانع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صد پر عطف ہونا اس

marfat.com

عطف سے مقدم نہیں ہو سکتا جو موصول پر ہے اور یہاں وکفر، المسجد الحرام سے مقدم ہے۔

وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ (اور اس کے رہنے والوں کو نکال دینا) یعنی مسجد والوں کو اور وہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہؓ ہیں۔

مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے) اس سے جو (حضور کے) اس چھوٹے سے لشکر نے کیا تھا کیونکہ کفار مکہ سے جس قدر گناہ سرزد ہوئے قصداً اور عناداً سرزد ہوئے اور اس لشکر سے وہ گناہ بلا قصد اور ایک گمان کی وجہ سے سرزد ہو گیا تھا۔

وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (اور فساد یعنی شرک کرنا اس قتل سے بھی زیادہ سخت ہے) یعنی حضرمی کو قتل کر دینے سے پھر یہ کفار مکہ ان مسلمانوں پر کیوں طعن و تشنیع کرتے ہیں باوجودیکہ ان سے وہ فعل غلطی سے ہو گیا انہوں نے تو اس سے بدر جہا بڑھ کر جان بوجھ کر کیا ہے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (اور وہ تو تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے (کفار قریش کی طرف اشارہ ہے) یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر قابو پائیں (اس میں قابو نہ پانے کا اشارہ ہے) اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا اور کفر کی حالت میں مر جائے گا تو ایسوں کے عمل ضائع ہو جائیں گے) اس آیت سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ جو شخص مرتد ہو جائے تو جب تک وہ کفر کی حالت پر نہ مرے اس کے عمل ضائع نہیں ہوتے کیونکہ مثلاً جس نے ظہر کی نماز پڑھی پھر وہ مرتد ہو گیا نعوذ باللہ منہا اور ابھی وقت (نماز کا) باقی تھا کہ وہ پھر مسلمان ہو گیا تو اس نماز کو پھر پڑھنا اس پر واجب نہیں ہے اور اسی طرح جو شخص حج کر کے مرتد ہو جائے پھر مسلمان ہو جائے تو اس پر بھی دوبارہ حج کرنا واجب نہیں ہے۔ شافعی کا یہ استدلال صفت کے مفہوم کے ساتھ ہے اور یہ (یعنی مفہوم صفت) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے اور وقت نماز کا باقی ہو تو دوبارہ نماز پڑھنا اس پر واجب ہے اور اسی طرح حج بھی دوبارہ کرنا لازم ہے۔ ہماری دلیل یہ آیت ہے ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ (یعنی جو کوئی ایمان سے پھر گیا اس کے عمل ضائع ہو گئے) اور یہ آیت مطلق ہے اور مطلق کو مقید پر حمل کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے واللہ اعلم۔

فِي الدُّنْيَا (دنیا میں) پس ایسے شخص کے دنیا میں مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کا خون اور مال محفوظ نہ رہے گا اس کو قتل کر دیا جائے گا اور (رفع شکوک کے لئے) تین دن تک اسے مہلت دینی بھی واجب نہ ہو گی ہاں مستحب ہے پس یہ آیت امام شافعی پر حجت ہے کیونکہ مہلت دینے کو وہ واجب فرماتے ہیں۔

وَالْاٰخِرَةِ (اور آخرت میں) یعنی ثواب ساقط ہو جائے گا۔

وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ (اور یہی لوگ دوزخی ہیں وہ ابد الآباد تک اس میں رہیں گے) جیسے کہ اور کفار۔ پھر ان لشکریوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہمارے اس سفر کا ہمیں اجر ملے گا اور کیا یہ جہاد شمار ہو گا اس وقت اللہ پاک نے یہ (اگلی) آیت نازل فرمائی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ (بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا (اس آیت میں) ہجرت اور جہاد کی عظمت بیان کرنے کی وجہ سے موصول مکرر لایا گیا ہے گویا امید محقق ہونے میں یہ دونوں فعل مستقل ہیں۔

اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ (یہی ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں) یعنی اللہ کے اجر دینے کے (امیدوار ہیں) امید کو ان کے لئے اس لئے ثابت کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ عمل نہ موجب ثواب ہے اور نہ ثواب کے ثبوت کا یقین دلانے والا ہے، خاص کر اس صورت میں کہ اعتبار خاتموں ہی کا ہوتا ہے۔

marfat.com

وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ (اور اللہ بخشنے والا ہے (یعنی ان کی خطا کو) اور مہربان ہے) یعنی ثواب عطا کرتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ (اے محمد یہ لوگ تم سے شراب کی بابت دریافت کرتے ہیں) امام احمد نے ابوھریرہ سے روایت کی ہے کہ حضور انور رسول مقبول ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے اس وقت مدینہ کے باشندے شراب پیتے اور جوا کھیلتے تھے ان دونوں کی بابت انہوں نے خود ہی آنحضرت ﷺ سے پوچھا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وہ لوگ کہنے لگے کہ (اس آیت سے ہم پر (اس کی) حرمت ثابت نہیں ہوئی کیونکہ فقط اتنا فرمایا گیا ہے کہ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (یعنی ان دونوں میں بڑا گناہ ہے) اور یہ خیال کر کے شراب وہ برابر پیتے رہے۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ مہاجرین میں سے ایک شخص نے نماز پڑھائی یعنی اپنے ساتھیوں کو مغرب کی نماز پڑھانے کھڑا ہوا تو وہ شراب کے نشہ میں تھا اسے قرأت میں متشابہ لگ گیا۔ تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (یعنی اے مسلمانو! نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب بھی نہ جایا کرو) اس کے بعد سورۂ مائدہ میں اس سے بھی زیادہ سختی کا حکم نازل ہوا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ سے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک۔ تب سب نے کہا کہ اب ہم کبھی شراب نہ پئیں گے یہ حکم ہمیں کافی ہے آخر حدیث تک۔ بغویؒ فرماتے ہیں خلاصہ اس بیان کا یہ ہے کہ شراب کے بارے میں اللہ نے چار آیتیں نازل فرمائی ہیں۔ اول تو مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اس وقت سب مسلمان شراب پیتے تھے اور اس زمانہ میں وہ ان کے لئے حلال بھی تھی پھر جب عمر بن خطاب اور معاذ بن جبل اور چند انصاری آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ شراب اور جوئے کی بابت ہمیں کچھ فتویٰ دیجئے کیونکہ یہ دونوں عقل اور مال کو برباد کردینے والے ہیں تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ الآیۃ اس پر بعض لوگوں نے تو اللہ کے اثم کبیر فرمانے کی وجہ سے شراب کو چھوڑ دیا اور بعض وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ کو دلیل کو سمجھ کر پیتے رہے۔ ایک روز عبدالرحمٰن بن عوف نے کچھ مہمانداری کی اور اس میں آنحضرت کے بہت سے صحابہؓ کو بھی بلایا اور اس دعوت میں شراب بھی پلائی شراب پی کر ان کو نشہ ہوا اور مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا اسی حالت میں انہوں نے ایک شخص کو نماز پڑھانے کے لئے آگے کر دیا اس نے نشہ میں قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھا اور آخر سورہ تک اسی طرح بلا لا کے پڑھتا چلا گیا، تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى الآیۃ پس (اس آیت سے) نماز کے وقتوں میں نشہ حرام کر دیا گیا۔ بعض لوگوں نے تو شراب کو بالکل چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ ایسی چیز میں کوئی خوبی نہیں ہے جو ہمیں نماز نہ پڑھنے دے اور بعض لوگ نماز کے وقتوں کے علاوہ اور وقتوں میں پیتے رہتے کوئی عشاء کی نماز کے بعد پی لیتا تو صبح تک اس کا نشہ اتر جاتا اور کوئی صبح کی نماز کے بعد پی لیتا تو اس کا نشہ ظہر کے وقت تک اتر جاتا ایک روز عتبان بن مالک نے بہت سے آدمیوں کی دعوت کی اور چند مسلمانوں کو بھی بلایا ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے اور عتبان نے ان کے لئے اونٹ کا سر اپکوایا تھا ان لوگوں نے کھانا کھا کر شراب اس قدر پی کہ وہیں نشہ ہو گیا۔ اور نشہ کی حالت میں بڑائیاں مارنے اور اشعار پڑھنے لگے۔ سعد نے وہیں ایک قصیدہ پڑھا جس میں انصار کی ہجو اور ان کی قوم کی بڑائی تھی۔ انصار میں سے ایک شخص نے اونٹ کا جبڑا لے کر سعد کے سر میں مارا جس سے سعد کا سر پھٹ گیا۔ سعد نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر اس انصاری کی شکایت کی۔ (انصاری نے سارا قصہ بیان کیا) تب آنحضرت ﷺ نے یہ دعا کی کہ خداوند ہمارے لئے شراب کا حکم صاف طور سے بیان فرما دے اس پر وہ آیت نازل ہوئی جو سورۂ مائدہ میں ہے۔ واللہ اعلم۔

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ خمر (کا لفظ جو قرآن شریف میں آیا ہے) کیا چیز ہے امام ابوحنیفہ کا قول یہ ہے کہ خمر انگور کے کچے شیرہ کو کہتے ہیں جس وقت اس میں نشہ ہو جائے اور جھاگوں سے ابل جائے۔ صاحبین کے نزدیک جھاگوں سے ابلنے کی شرط نہیں ہے) امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ (تینوں) کا قول یہ ہے کہ جس شربت کا زیادہ پی لینا نشہ کرتا ہو وہی خمر ہے۔

marfat.com

حنفیہؒ کہتے ہیں کہ خمر خاص اسی کا نام ہے جس کو ہم نے ذکر کیا ہے اور یہی اہل لغت کے نزدیک مشہور ہے اور اسی وجہ سے (خاص) اسی شربت میں اس کا استعمال مشہور ہو گیا ہے اس کے علاوہ اور نشہ کی چیزوں کے اور نام مشہور ہیں جیسے مثلث، طلا، منصف، باذق وغیرہ اور لغت میں قیاس نہیں چلا کرتا۔ جمہور کا یہ قول ہے کہ لغت میں خمر اس چیز کا نام ہے جو عقل کو خبط کر دے۔ اور میرے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ خمر ایک ایسا لفظ ہے جو عام اور خاص کے درمیان میں مشترک ہے یا تو حقیقی طور پر اور یا عموم مجاز کے طریقہ سے اور اس میں وہ عام ہی معنی مراد ہیں۔

صاحب قاموس کہتے ہیں کہ خمر یا تو انگور کے اس شربت کا نام ہے جو نشہ کرتا ہو یا عام ہے اور عام ہونا زیادہ صحیح ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جس وقت خمر حرام ہوئی ہے مدینہ میں یہ (انگوری شراب) بالکل نہ تھی۔ یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے اور انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ خمر حرام ہونے کے دن میں ساقی بنا ہوا تھا اور اس وقت کچے پکے چھواروں کی شراب کے سوا اور کوئی شراب نہ تھی۔ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ میں کھڑا ہوا ابو طلحہ اور فلاں فلاں کو پلا رہا تھا اور بعض روایتوں میں یہ نام لئے ہیں کہ ابو عبیدہ بن جراح، ابی بن کعب، سہیل کو اتنے میں ایک آدمی نے آکر کہا کہ خمر حرام ہو گیا ہے یہ سنتے ہی ان پینے والوں نے کہا کہ اے انس رضی اللہ عنہ یہ برتن اوندھا دو۔ اس خبر کے بعد نہ اس شخص سے پھر شراب کی بابت کچھ پوچھا اور نہ کسی سے اس کی تحقیق کی۔ انس بھی کہتے ہیں کہ جس وقت خمر حرام ہوئی ہمارے ہاں انگور کی شراب بہت کم ملتی تھی اور اکثر شراب کچے پکے چھواروں کی ہوتی تھی۔ پس یہ آثار ہیں جو ہمارے بیان پر دلالت کرتے ہیں کہ خمر (کے لفظ) کا استعمال کبھی خاص معنی میں بھی کیا جاتا ہے لیکن آیت میں عام ہی معنی مراد ہیں اگرچہ مجازاً ہی ہوں اور اگر آیت میں خمر سے مراد وہ عام معنی نہ ہوں تو جواب سوال کے مطابق نہ ہوگا کیونکہ سوال تو اسی شراب کے بارے میں تھا جسے سوال کے وقت لوگ پیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا یا رسول اللہ (ﷺ) ہمیں اس خمر کی بابت فتویٰ دیجئے کیونکہ یہ عقل کو خراب کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ اس میں شیرۂ انگور کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ ان لوگوں میں انگور کے شیرہ کا استعمال بھی نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

اور اسی بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ خمر کی حرمت نازل ہو گئی ہے اور خمر ان پانچ چیزوں سے بنتی ہے انگور، کھجور، گیہوں، جو، شہد اور خمر اسی کو کہتے ہیں جو عقل کو خراب کر دے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ گیہوں، جو، کھجور، کشمش، شہد ان سب چیزوں کی خمر ہوتی ہے اور اسی بارے میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً اسی طرح مروی ہے اس کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور امام احمد نے ایک روایت نقل کی ہے اس کے آخر میں یہ ہے (آنحضرت نے فرمایا) کہ نشہ کرنے والی ہر چیز سے میں منع کرتا ہوں۔ اور یہ بھی مروی ہے آنحضرت نے فرمایا کہ ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور ہر نشہ کرنے والی چیز خمر ہے۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انگور، کھجور، شہد، جوار، ان سب چیزوں سے خمر بنتی ہے اور جو ان میں سے نشہ لائے وہ ہی خمر ہے۔ یہ روایت امام احمد نے نقل کی ہے جب یہ ثابت ہو گیا کہ خمر کا لفظ ان سب شربتوں کو شامل ہے جو کہ نشہ لاتے ہیں تو نص قرآن ہی سے یہ ثابت ہو گیا کہ نشہ کی چیز خواہ تھوڑی ہو یا بہت سب حرام اور ناپاک ہے اس کے پینے (کھانے) والے کو شریعت کے موافق سزا دی جائے گی نہ اس کا بیچنا وغیرہ جائز ہے نہ اس کو تلف کر دینے والے پر اس کا تاوان لازم آتا ہے، ہاں اس اختلاف ہونے کی وجہ سے یہ فرق رہے گا کہ انگور کے کچے شیرہ کے علاوہ جو اور (گیہوں وغیرہ کی) شراب کو حلال سمجھے گا اسے کافر نہ کہا جائے گا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خمر کے سوا تین قسم کی شرابیں حرام ہوتی ہیں ایک ان میں سے طلا ہے یہ انگور

marfat.com

کے شیرہ کی ہوتی ہے جس وقت اتنی پکائی جائے کہ تہائی حصہ سے کم جل جائے اور اگر نصف جل جائے تو اسے منصف کہتے ہیں یا اس سے کم جلے تو اسے باذق کہتے ہیں۔ جس وقت خوب جوش آجائے اور جھاگ اٹھ کر ابلنے لگے۔ دوسری قسم سکر ہے یہ شراب کھجور کے شربت سے بنائی جاتی ہے جس وقت اس میں خوب جوش آجائے اور جھاگ اٹھ کر ابلنے لگے۔ تیسری قسم کشمش کا شیرہ ہے یہ کشمش کے کچے شیرہ سے بنائی جاتی ہے جس وقت اس میں خوب جوش آکر ویسے جھاگ اٹھنے لگیں۔ امام ابو یوسفؒ جھاگ اٹھنے کی شرط نہیں لگاتے۔ پس یہ سب شرابیں ناپاک ہیں ایک روایت میں نجاست خفیفہ ہیں اور دوسری میں نجاست غلیظہ ہیں ان میں سے تھوڑی سی شراب بھی ایسی حرام ہے جیسے پیشاب حرام ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے کہ خمر ان دو درختوں سے بنائی جاتی ہے لیکن جب تک کہ نشہ نہ کرے اس کے پینے والے کو حد نہ لگائی جائے گی کیونکہ اس کی حرمت اجتہادی ظنی ہے اور حدود شبہ سے جاتی رہتی ہیں۔

اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان کا بیچنا بھی جائز ہے اور ان کے تلف کردینے والے سے تاوان بھی لیا جائے گا۔ صاحبینؒ اس کے مخالف ہیں اور مثلث انگوری اور کھجور اور کشمش کے شیرہ کو جس وقت تھوڑا سا جوش دے کر پی لیا جائے اگرچہ وہ غلیظ ہو جائے لیکن غالب گمان یہ ہو کہ اس سے نشہ نہ ہوگا تو یہ سب امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک حلال ہے۔ امام محمد رحمتہ اللہ علیہ اس کے مخالف ہیں۔ یہ حکم اس وقت ہے کہ جب کوئی ان کو طاقت آنے کی غرض سے پئے اور اگر اس سے لہو ولعب ہی مقصود ہو تو یہ بالاتفاق حرام ہیں اور ان تینوں میں سے اتنی پی لینا جو نشہ لائے بالاتفاق حرام ہے اور اس کے پینے والے کو حد لگائی جائے گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ تینوں شرابیں نشہ کریں تو ان کا فقط اخیر کا پیالہ حرام ہوتا ہے کیونکہ حقیقت میں وہی نشہ لانے والا ہے اور اس کے سوا اور شرابیں یعنی گیہوں، جو، جوار، شہد، فانیذ، بھنگ اور رماک کے دودھ وغیرہ سے جو بنائی جاتی ہیں امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک سب حلال ہیں اگرچہ نشہ کرتی ہوں، ان کے پینے والے کے حد نہ لگائی جائے گی اور نہ ان کے نشہ میں طلاق دینے سے طلاق پڑے گی۔ اور ایک روایت میں دونوں سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر نشہ کرے گی تو حرام ہے اور اس کے پینے والے کے حد بھی لگائی جائے گی۔

ہدایہ میں ہے علماء نے کہا ہے کہ صحیح مذہب یہی ہے کہ ان کے پینے والے کے حد لگائی جائے گی اور یہی مذہب امام محمد رحمتہ اللہ کا ہے کہ یہ شرابیں حرام ہیں اور ان کے پینے والے کو حد لگائی جائے گی اور نشہ کی حالت میں طلاق دینے سے طلاق بھی پڑ جائے گی جیسے کہ اور شرابوں کا حکم ہے لیکن تینوں کے نزدیک یہ ناپاک نہیں ہیں کیونکہ ان کی تھوڑی سی مقدار کو وہ حرام نہیں فرماتے۔ فتاویٰ نسفی میں ہے کہ بھنگ پینا حرام ہے اور بھنگ باز کے طلاق دینے سے طلاق پڑ جاتی ہے اور جو اسے حلال سمجھے اسے قتل کر دیا جائے اور اس کے پینے والے کو ایسی ہی حد لگائی جائے گی جیسے شرابی کے لگائی جاتی ہے اور بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور اس پر بھی کہ ہر نشہ کی چیز خواہ تھوڑی ہو یا بہت ہو سب حرام ہے۔ جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی یمن سے آیا اس نے نبی ﷺ سے جوار کی شراب کو دریافت کیا (کہ حلال ہے یا نہیں) جس کو وہاں کے لوگ پیتے اور اسے مزر کہتے تھے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ اس سے نشہ ہوتا ہے، عرض کیا ہاں فرمایا نشہ کی ہر چیز حرام ہے۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو چیز بہت سی نشہ لائے وہ تھوڑی سی بھی حرام ہے۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کر کے اسے صحیح کہا ہے ابو داؤد اور ابن ماجہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس شراب کا ایک فرق (یعنی بہت سا) پینا نشہ لائے اس میں سے ایک چلو بھر بھی پینا حرام ہے۔ یہ روایت امام احمد نے نقل کی ہے اور ترمذی نے نقل کر کے اسے حسن کہا ہے ابو داؤد اور ابن حبان نے بھی اپنی اپنی صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نشہ اور بیہوش کرنے والی ہر چیز سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے دیلم حمیری کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ حضور ہم سرد ملک کے رہنے والے ہیں اور

marfat.com

وہاں بڑی مشقت کے کام کرتے ہیں اور اس کاموں کے کرنے کی طاقت آنے اور اس ملک کی سردی سے بچنے کی غرض سے اس گیہوں کی ہم شراب بنالیتے ہیں۔ حضور نے پوچھا کہ اس میں نشہ ہوتا ہے میں نے عرض کیا ہاں فرمایا اس سے پرہیز کرو میں نے کہا حضور لوگ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں فرمایا اگر نہ چھوڑیں تو تم ان سے جہاد کرنا۔ یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے ابومالک اشعری سے روایت ہے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ میری امت کے لوگ ضرور شراب خوری کریں گے اور اس کا نام اور رکھ لیں گے۔ یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے اسی بارے میں دار قطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے خوات بن جبیر سے اسی طرح مستدرک میں مروی ہے جو علماء نبیذ کی اباحت کے قائل ہیں انہوں نے چند حدیثوں سے حجت کی ہے۔ مجملہ ان کے ایک حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے کہ نبی ﷺ کے لئے شام کو کھجوریں بھگودی جاتی تھیں اور صبح کو ان کا شربت آپ پی لیتے تھے اور پھر اس دن کی رات کو اور اگلے دن صبح کو اور شام کو اور پھر تیسرے دن صبح کو عصر تک اسی کو پیتے رہتے تھے، اس کے بعد اگر کچھ شربت رہ جاتا تو یا تو خادم کو پلادیتے اور یا پھنکوادیتے تھے۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ شربت حرام ہوتا تو خادم کو نہ پلاتے اور اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اس میں نشہ نہ ہوتا تھا لیکن چونکہ اس کا مزہ جاتا رہتا تھا اور اندیشہ تھا کہ عنقریب اس میں نشہ ہو جائے گا اس لئے آپ خادم کو دیدیتے تھے اور اگر اس میں نشہ ہونے پر آپ کو غالب گمان ہوتا تھا تو اسے آپ پھینکوادیتے تھے۔ لہٰذا اس سے حجت نہیں ہو سکتی۔ اور اس مسئلہ پر کہ خمر کے سوا (اور شرابوں میں) فقط اخیر کا پیالہ حرام ہے نہ کہ تھوڑی بھی اس روایت سے حجت کی ہے جو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کل مسکر حرام سے وہ شربت مراد ہے جو تمہیں نشہ کر دیتا ہو۔ یہ روایت دار قطنی نے نقل کی ہے ابن ھمام فرماتے ہیں یہ روایت ضعیف ہے۔

حجاج بن ارطاۃ اور عمار بن مطر اس میں راوی ہیں اور حقیقت میں یہ قول نخعی کا ہے اور ابن مبارک سے سند کے ساتھ ثابت ہے کہ کسی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اسی حدیث کو ان کے سامنے بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ حدیث باطل ہے اور ان علماء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ خمر تو بعینہ حرام کر دی گئی باقی اور شربتوں میں نشہ حرام ہے۔ ابن ھمام فرماتے ہیں کہ یہ روایت مسلم نہیں ہے۔ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ نبی ﷺ سے ابوسعید نے اسی طرح حدیث نقل کی ہے پھر کہا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے ابوسعید رضی اللہ عنہ تک نہیں پہنچی۔ ابن ہمام کہتے ہیں ہاں یہ حدیث بہت عمدہ سند سے ابن عباس رضی اللہ عنہما تک ان لفظوں سے پہنچتی ہے کہ خمر کی ذات کو حرام کیا گیا ہے خواہ تھوڑی ہو یا بہت اور ہر شراب جو نشہ لائے۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جو شراب نشہ لائے وہی حرام ہے۔ ابن ھمام فرماتے ہیں کہ نشہ کا لفظ یہاں کہنا تصحیف ہے۔

میں کہتا ہوں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی مراد یہ ہے کہ نشہ کرنے والی ہر شراب حرام ہے خواہ تھوڑی ہو یا بہت ہو۔ اور انہیں علماء نے ابو مسعود انصاری کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے پیاس لگی تو کسی نے مشکیزہ میں سے نبیذ لاکر حضور ﷺ کو دیا آپ اس پر بہت ناراض ہوئے۔ اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ حرام ہے فرمایا نہیں لیکن زمزم کے پانی کا ایک ڈول میرے پاس لاؤ (اسی وقت پانی لایا گیا تو) پھر آپ نے اس میں پانی ملا کر طواف ہی کرتے ہوئے اسے پی لیا۔ مطلب بن وداعہ سہمی سے بھی اس طرح مروی ہے اور اس کے آخر میں یہ ہے کہ جس وقت تمہیں زیادہ پیاس لگا کرے تو اسی طرح کر لیا کرو کسی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس نبیذ کی بابت پوچھا جس میں حدت آگئی ہو فرمایا کہ ایک جلسہ میں رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے آپ کو نبیذ کی کچھ بو معلوم ہوئی آپ نے کسی کو بھیج کر اسے اپنے پاس منگوالیا اور ناک لگا کر اسے سونگھا تو اس میں حدت پائی گئی آپ نے اس میں پانی ملوا کر اسے پی لیا پھر فرمایا کہ جب تمہاری نبیذوں میں حدت آجایا کرے تو پانی سے اسے کم کر لیا کرو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی نبی ﷺ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ان سب حدیثوں کو دار قطنی نے نقل کیا۔

marfat.com

ابو مسعود انصاری سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے آنحضرت ﷺ سے نبیذ کی بابت دریافت کیا کہ حلال ہے یا حرام۔ فرمایا حلال ہے یہ روایت ابن جوزی نے نقل کی ہے سعید بن ذی لقوہ فرماتے ہیں کہ ایک دہقانی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لوٹے میں سے نبیذ پی لی تو اسے نشہ ہو گیا حضرت نے اس کی حد میں اس کے درے لگوادیئے وہ بولا کہ میں نے تو آپ ہی کے برتنوں میں سے نبیذ پیا تھا فرمایا ہم تو فقط نشہ کی وجہ سے تیرے درے لگواتے ہیں، یہ روایت ابن جوزی نے نقل کی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی بابت دار قطنی نے کہا ہے کہ وہ یحیٰی بن یمان سے مشہور ہے اور امام احمد بن حنبل نے یحیٰی بن یمان کو ضعیف راوی کہا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ یہ غلطیاں بہت کرتا ہے کسی نے ان سے پوچھا کہ اس روایت کو اور کسی نے بھی نقل کیا ہے فرمایا نہیں۔ ہاں ایک ایسے راوی نے جو اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ یہ مضطرب الحدیث ہے اور مطلب بن وداعہ کی حدیث محمد بن سائب کلبی کے طریقہ سے مشہور ہے اور محمد بن سائب کذاب ہے اعتبار کرنے کے لائق نہیں۔ لیث، سعدی، سلیمان کا بھی یہی قول ہے۔ نسائی اور دار قطنی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میں متروک ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ جھوٹ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی سند میں عبد الملک بن نافع راوی ہے اور وہ مجہول ضعیف ہے اور صحیح حدیث ابن عمر سے فقط اتنی مرفوع ہے کہ ما اَسْکَرَ کثیرہ فقلیلہٗ حرام (یعنی جو نشہ لائے وہ تھوڑی ہو یا بہت سب حرام ہے)۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کا روایت کرنے والا فقط قاسم بن بہرام ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ اس سے کسی طرح حجت کرنا جائز نہیں ہے اور ابو مسعود کی حدیث میں عبد العزیز بن ابان راوی ہے امام احمد فرماتے ہیں میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے (یعنی میں اس کی حدیث نہیں لیتا) اور ابن ضمیر فرماتے ہیں کہ یہ کذاب ہے اپنی طرف سے حدیث گھڑ لیتا ہے اور سعید بن لقوہ کی حدیث کی بابت ابو حاتم فرماتے ہیں کہ یہ سعید دجال کا بھی استاد ہے اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے مگر وہ روایت منقطع ہے۔ ان سب کے علاوہ نبیذ میں کچھ اختلاف نہیں ہے کیونکہ اگر اس میں خوب جوش آکر نشہ ہو گیا ہے تو وہ بالاتفاق حرام ہے خواہ تھوڑا ہو یا بہت ہو اور اگر نشہ نہیں ہوا تو وہ بالاتفاق حلال ہے لہٰذا ان حدیثوں کو خلاف کے بارے میں بالکل دخل نہیں ہے، واللہ اعلم۔

وَالْمَيْسِرِ (اور جوئے کی بابت) لفظ میسر مصدر ہے جیسے موعد، جوئے کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس میں غیر کا مال آسانی سے لیا جاتا ہے۔ عطا، طاؤس، مجاہد تینوں کا قول یہ ہے کہ جس چیز میں جوا ہو وہ اس میسر کے حکم میں ہے یہاں تک کہ لڑکوں کا اخروٹ اور کوڑیوں سے کھیلنا بھی۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ شطرنج عجم کے لوگوں کا جوا ہے۔ نرد اور شطرنج وغیرہ کے منع ہونے کے متعلق بریدہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نرد شیر سے کھیلا گویا اس نے اپنا ہاتھ سور کے گوشت میں سان لیا۔

عبدان، ابو موسیٰ، ابن حزم نے حبہ بن مسلم سے مرسل روایت کی ہے کہ جو شخص شطرنج سے کھیلے وہ ملعون ہے اور اسے دیکھنے والا سور کا گوشت کھانے والے کے برابر ہوتا ہے۔ ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نرد سے کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔ یہ حدیث امام احمد اور ابو داؤد نے روایت کی ہے۔ ابو موسیٰ ہی سے روایت ہے کہ شطرنج سے سوائے گناہ گار کے اور کوئی نہیں کھیلتا۔ اور ان ہی سے کسی نے شطرنج کی بابت پوچھا تھا فرمایا کہ یہ فعل باطل ہے اور باطل کو اللہ پاک پسند نہیں کرتا۔ یہ روایت بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت ہے کہ شراب، جوا، کوبہ[۱] تینوں سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مرفوعاً اسی طرح مروی ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ کوبہ طبلہ کو کہتے ہیں یہ روایت بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو کبوتر کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر فرمایا کہ شیطان

[۱] اس کے معنی اگلی روایت میں ہیں، ۱۲۔

marfat.com

شیطان کے پیچھے جارہا ہے۔ یہ حدیث امام احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کی ہے اور تحقیقی بات یہ ہے کہ کھیلنا خواہ کسی چیز کے ساتھ ہو بالاتفاق حرام ہے۔ اور وہ جو امام شافعیؒ سے مروی ہے کہ آپ نے شطرنج سے کھیلنے کو مباح فرمایا ہے تو اس بارے میں صحیح یہ ہے کہ اس قول سے آپ نے رجوع کرلیا ہے۔ مال برباد کرنا اور فضول خرچی کرنا خواہ کسی طرح ہو جیسے رشوت دینا جوا کھیلنا اور سود وغیرہ دینا یہ سب بالاتفاق حرام ہیں، اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (یعنی فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں) اور جوئے میں دونوں باتیں ہیں کھیلنا اور مال برباد کرنا اس لئے اس کی اور بھی زیادہ ممانعت ہوگئی اور یہ بالاتفاق کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے خواہ وہ جوا اس قسم کا ہو جو عرب کھیلتے ہیں اور یا اس کے سوا شطرنج اور نرد وغیرہ ہو۔

قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (تم ان سے کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے) کیونکہ ان دونوں سے بڑے بڑے گناہ صادر ہوتے ہیں مثلاً آپس میں لڑائی جھگڑا کرنا اور گالم گلوچ ہونا۔ علی ہذا القیاس ان سے آپس میں بغض وعداوت وغیرہ بڑھ جاتی ہے اور ذکر الٰہی اور نماز سے یہ روک دیتے ہیں حمزہ اور کسائی نے اثم کبیر ثائے مثلثہ سے پڑھا ہے جس سے قسم قسم کے گناہ مراد ہیں اور باقی قاریوں نے کبیر باء موحدہ سے پڑھا ہے کیونکہ کبیر سے گناہ کبیرہ ہونا مراد ہے اور یہ دونوں فعل کبیرہ گناہوں میں سے ہیں۔

معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شراب تم ہرگز نہ پینا کیونکہ تمام بے حیائیوں کی جڑ ہے۔ یہ حدیث امام احمد نے نقل کی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ نہ تو زانی زنا کرتے وقت مؤمن رہتا ہے اور نہ چور چوری کرتے وقت مؤمن رہتا ہے اور نہ شرابی شراب پیتے وقت مؤمن رہتا ہے۔ آخر حدیث تک یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ شراب خوری سب بے حیائیوں کی جڑ ہے اور سب کبیرہ گناہوں سے بڑا گناہ ہے، جس نے شراب پی لی اس نے نماز ترک کردی (یعنی اس کی نماز نہیں ہوتی) اور اس نے اپنی ماں، خالہ، پھوپھی سے زنا کیا۔ یہ حدیث طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ عبد اللہ بن عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ جس نے شراب پی لی اس کی نماز چالیس روز تک اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا اگر پھر اس نے توبہ کرلی تو اللہ اس کی خطا کو معاف کردیتا ہے اور اگر پھر پی تو پھر چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی پھر اگر توبہ کرلی تو پھر خدا اس کو معاف کردیتا ہے اور تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور اگر چوتھی مرتبہ بھی پی لی تو پھر چالیس روز تک اسکی نماز قبول نہیں اب اگر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسکی توبہ بھی قبول نہیں کرتا اور قیامت کے دن پیپ وغیرہ کی نہر سے اس کو پلایا جائے گا۔ یہ حدیث نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارمی نے نقل کی ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ شراب سب برائیوں کی جڑ ہے جس نے شراب پی اس کی نماز چالیس روز تک مقبول نہیں ہوتی اگر وہ پی کر مر گیا تو جاہلیت کی موت مرا۔ یہ حدیث حسن سند کے ساتھ طبرانی نے نقل کی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی آنحضرت سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ والدین کا نافرمان اور جواری اور احسان جتانے والا اور ہمیشہ شراب پینے والا بہشت میں نہ جائے گا۔ یہ حدیث دارمی نے روایت کی ہے۔ ابن عمر ہی مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ تین آدمی ہیں جن پر اللہ نے بہشت حرام کردی ہے ہمیشہ شراب پینے والا، والدین کا نافرمان، دیوث۔ یہ حدیث امام احمد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

ابو امامہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کیلئے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے اور سب قسم کے باجوں اور بت اور صلیب اور رسوم جاہلیت کو نیست و نابود کردینے کا مجھے حکم دیا ہے اور اس خداوند عالم نے اپنی عزت کی قسم کھا کے فرمایا کہ میرا جو بندہ شراب کا ایک گھونٹ بھی پیئے گا تو اسی کی برابر ضرور میں اسے پیپ پلاؤں گا اور جو میرے خوف کی وجہ سے شراب کو چھوڑ دے گا تو قدس کے حوضوں سے میں ضرور اسے شراب طہور وغیرہ پلاؤنگا۔ یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے۔

ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا تین آدمی ایسے ہیں جو جنت میں نہ جائیں گے یعنی ہمیشہ شراب پینے والا، بے رحم، جادو کو حق سمجھنے والا۔ یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ہمیشہ کا شرابو مر گیا تو وہ بت پرستوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی حضور میں پیش کیا جائے گا۔ یہ حدیث امام

marfat.com

احمد نے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے بھی ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ابو موسیٰؓ سے روایت ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک شراب پینا اور اللہ کو چھوڑ کے اس ستون کی پرستش کرنا دونوں برابر ہیں۔ یہ روایت نسائی نے نقل کی ہے۔

وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں) کیونکہ شراب میں پینے کے وقت مزہ آتا ہے، فرحت ہوتی ہے، کھانا جلدی ہضم ہوتا ہے، بزدلوں میں بہادری آجاتی ہے، مروت بڑھ جاتی ہے، طبعیت قوی ہو جاتی ہے اور بعض بیماریاں بھی جاتی رہتی ہیں اور جوے میں بلا محنت اور مشقت کے مال ہاتھ آجاتا ہے۔

مسئلہ:- اس پر سب (ائمہ) کا اتفاق ہے کہ اختیاری حالت میں شراب سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، ہاں مجبوری اور اضطراری حالت میں جائز ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ اور فرمایا فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ بس جس کے حلق میں لقمہ اٹک گیا اور سوائے شراب کے اور کوئی چیز نہ ملی تو امام ابو حنیفہ، امام شافعیؒ، امام احمد کے نزدیک لقمہ اتارنے کے لئے اسے شراب پی لینی جائز ہے اور امام مالک سے مشہور قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے۔ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ شراب کا دوا میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں، امام ابو حنیفہ امام مالک، امام احمد فرماتے ہیں کہ جائز نہیں ہے ایک صحیح قول امام شافعی کا بھی یہی ہے اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ (دوا میں) تھوڑی سی شراب استعمال کر لینا جائز ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ شراب کی تلچھٹ وغیرہ بھی پینی مکروہ ہے کیونکہ اس میں شراب کے اجزاء ہوتے ہیں اور حرام چیز سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے اور اسی واسطے اسے زخم پر لگانا اور جانوروں کے کیڑوں میں ڈالنا بھی جائز نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ دوا کے طور پر بچہ یا آدمی کو پلائے اور اگر پلا دے تو اس کا وبال پلانے والے کے ذمہ رہتا ہے اور اسی طرح جانوروں کو بھی پلانا جائز نہیں ہے۔ وائل بن حجر کہتے ہیں ایک آدمی نے آنحضرت ﷺ سے شراب کے استعمال کو پوچھا تو حضور نے اسے شراب سے منع کر دیا وہ بولا کہ میں تو فقط دوا کے لئے بناتا ہوں، فرمایا یہ دوا نہیں ہے بلکہ یقیناً بیماری پیدا کرنے والی ہے۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے۔ طارق بن سوید کہتے ہیں میں نے حضرت سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ہمارے ملک میں انگور ہوتے ہیں اور انہیں نچوڑ کر ہم شربت بنالیتے ہیں فرمایا یہ نہیں چاہئے میں نے پھر پوچھا تو آپ نے پھر اسی طرح فرمادیا میں نے کہا کہ دوا کے طور پر بیماروں کو بھی ہم شراب پلادیتے ہیں۔ فرمایا اس میں شفا نہیں ہے بلکہ یہ یقیناً بیماری ہے۔ یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے۔

ام سلمہؓ فرماتی ہیں میں نے ایک پیالہ نبیذ تیار کیا تھا پھر تھوڑی سی دیر میں نبی ﷺ تشریف لے آئے اور اس وقت اس میں جوش آرہا تھا پوچھا یہ کیا ہے کہ میں نے کہا میری بچی کو کچھ تکلیف ہے اس کے واسطے میں نے یہ دوا بنائی ہے۔ فرمایا ان چیزوں میں تمہارے لئے اللہ نے شفا نہیں رکھی جو اس نے تم پر حرام کر دی ہیں۔ یہ روایت بیہقی اور ابن حبان نے نقل کی ہے ابن حبان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حرام چیزوں میں تمہارے لئے اللہ نے شفا نہیں رکھی۔ یہی روایت ابن مسعود سے بخاری نے تعلیقاً روایت کی ہے۔

میں کہتا ہوں آنحضرت کے اس اشارہ کا کہ حرام چیزوں میں اللہ نے تمہارے لئے شفا نہیں رکھی یہ مطلب نہیں ہے کہ شفا ان میں پیدا ہی نہیں کی کیونکہ یہ تو نص آیت کے خلاف ہے اس کے علاوہ حرام ہونے سے خلقی اور جبلی فائدے نہیں بدل جایا کرتے لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ بلکہ مقصود اس سے یہ ہے کہ حرام چیز سے شفا حاصل کرنے کی تمہیں اجازت نہیں دی گئی۔ اور کبھی حرام چیز کا دوا میں استعمال جائز ہونے پر حضرت انسؓ کی حدیث سے حجت کی جاتی ہے، وہ حدیث یہ ہے انسؓ کہتے ہیں کہ عکل یا عرینہ کے خاندان کے چند آدمی مدینہ منورہ میں آئے اور مدینہ کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی تو آنحضرت ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اونٹوں کے گلے کے ساتھ جنگل چلے جایا کریں اور ان کا دودھ موت پیتے رہیں۔ وہ پینے لگے جب خوب تندرست ہو گئے تو چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹ لے کر اپنے وطن کا راستہ لیا۔ آخر حدیث تک یہ حدیث بخاری و مسلم نے روایت کی ہے۔

marfat.com

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے کیونکہ ان عرنیوں کا قصہ سورۂ مائدہ کے نازل ہونے سے پہلے ہوا ہے۔ امام شافعیؒ اس حدیث سے استدلال لاتے ہیں کہ جس جانور کا گوشت کھایا جائے اس کا پیشاب پاک ہے پس اس حدیث سے اس مسئلہ پر حجت کرنا جائز نہیں ہے کہ حرام چیز کے ساتھ دوا کرنا جائز ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ شراب کا سرکہ بنالینا جائز ہے یا نہیں امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں جائز ہے اور سرکہ ہو کر وہ شراب پاک ہو جاتی ہے۔ امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ مکروہ ہے لیکن سرکہ ہو کر پاک ہو جاتی ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمد فرماتے ہیں جائز نہیں ہے اور نہ سرکہ ہو کر پاک ہوتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل ام سلمہؓ کی حدیث ہے کہ ان کے ہاں دودھ کی ایک بکری تھی پھر (ایک روز) حضور ﷺ نے اس بکری کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ تمہاری بکری کیا ہوئی۔ ہم نے کہا مر گئی فرمایا کہ اس کی کھال کو اپنے کام میں کیوں نہیں لائیں۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ وہ مردہ تھی فرمایا دباغت سے وہ پاک ہو جاتی ہے جیسا کہ شراب سرکہ ہو کر پاک ہو جاتی ہے۔ یہ روایت دار قطنی نے نقل کی ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ اس کو روایت کرنے والا فرج بن فضالہ اکیلا راوی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ راوی سندوں کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے اور واہی تباہی متون کے ساتھ صحیح سندیں لگا دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی روایت کو حجت بنانا جائز نہیں ہے اور انہوں نے بہت سی حدیثیں ایسی ذکر کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ مجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ تمہارے لئے عمدہ سرکہ شراب کا ہے اور کھال دباغت سے اس طرح پاک ہو جاتی ہے جیسے سرکہ ہونے سے شراب حلال ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث مشہور نہیں ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی دلیل حضرت انسؓ کی یہ حدیث ہے کہ ابو طلحہؓ نے آنحضرت ﷺ سے ان یتیموں کی بابت دریافت کیا جن کے ورثہ میں شراب آئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسے پھینک دو، ابو طلحہؓ نے کہا حضور ہم اس کا سرکہ نہ بنالیں فرمایا نہیں۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے۔ اور یہ حدیث اور طریقوں سے بھی مروی ہے جن کو دار قطنی نے نقل کیا ہے اور بعض میں یہ ہے ابو طلحہؓ نے کہا کہ چند یتیم بچے جو میری پرورش میں ہیں میں نے ان کے لئے شراب خرید لی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ شراب پھینک دو اور اس کے مشکوں کو توڑ دو، آپ نے تین مرتبہ اسی طرح فرمایا۔ دوسری حدیث ابو سعیدؓ کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جب شراب حرام ہو گئی تو ہم نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارے پاس ایک یتیم بچہ کی شراب ہے، فرمایا اسے پھینک دو۔ ہم نے پھینک دی۔

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۗ (اور ان کے فائدہ سے ان کا گناہ زیادہ ہے) بغوی کہتے ہیں ضحاک (اس کے یہ معنی) کہتے تھے کہ حرام ہونے کے بعد ان کا گناہ اس فائدے سے بڑا ہے جو حلال ہونے سے پہلے تھا اور بعض کا قول یہ ہے کہ حرام ہونے سے پہلے ہی ان کے فائدے سے ان کا گناہ زیادہ تھا اور میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ حرام ہونے کے بعد ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھ کر ہے کیونکہ گناہ کی مضرتیں آخرت میں ہوں گی اور اس کے فائدے دنیا میں حاصل ہو جاتے ہیں اور دنیا چند روزہ ہے اور آخرت بڑی سخت کٹھن ہے، واللہ اعلم۔

شان نزول :- ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جس وقت صحابہؓ کو راہ خدا میں مال خرچ کرنے کا حکم ہوا تو چند صحابہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس خرچ کرنے سے کیا مراد ہے جس کی بابت ہمیں حکم ہوا ہے لہٰذا ہم کیا خرچ کریں۔ ابن ابی حاتم نے بھی یحییٰ سے روایت کی ہے کہ انہیں کہیں سے یہ خبر ملی تھی کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہؓ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس چند غلام اور گھر کے لوگ ہیں اب ہم اپنے مالوں میں سے کیا خرچ کریں اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ۗ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کیا خرچ کریں کہہ دو حاجت سے زیادہ کو) ابو عمرو نے (العفو کو) رفع کے ساتھ پڑھا ہے (اس وقت معنی یہ ہیں) کہ جو یہ خرچ کریں وہی عفو ہے۔

عطا، سدی، قتادہ تینوں کا قول یہ ہے کہ عفو حاجت سے زیادہ مال کو کہتے ہیں اور اسی آیت کے حکم کی وجہ سے صحابہ کی یہ حالت تھی کہ مالک کما کر اپنے خرچ کے موافق رکھ کر باقی خیرات کر دیتے تھے۔

ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ اصحاب صفہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے پاس ایک اشرفی نکلی، حضرت نے (یہ سن کر) فرمایا کہ یہ (دوزخ کی آگ کا) ایک داغ ہے۔ پھر ایک اور کا انتقال ہو گیا تو اس نے دو اشرفیاں چھوڑیں اس وقت حضور نے فرمایا کہ یہ دو داغ ہیں۔ یہ حدیث امام احمد نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے روایت کی ہے۔ ابی ہاشم بن عقبہ فرماتے ہیں کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے یہ عہد لے لیا تھا کہ تمہیں مال جمع کرنے کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک خادم اور بقدر ضرورت مال کافی ہے۔ یہ حدیث امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے روایت کی ہے پھر یہ حکم زکوٰۃ کی آیت سے منسوخ ہو گیا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ (کہنا) ٹھیک نہیں کیونکہ زکوٰۃ کا حکم سورۂ بقرہ کے شروع میں نازل کیا گیا ہے اور اس کا نزول ا ہجری یا ۲ ہجری میں ہے۔ پس زکوٰۃ کی آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اب یا تو یہ جواب دیا جائے کہ اس آیت سے مراد یہ شرط بیان کرنا ہے کہ زکوٰۃ میں مال کا نصاب حاجت اصلیہ یعنی قرض وغیرہ سے زیادہ ہو۔ یا یہ کہا جائے کہ (صحابہؓ کا) یہ سوال نفلی صدقہ کی بابت تھا۔ اور آیت کا مقتضی یہ ہے کہ افضل صدقہ وہی ہے جو تونگری کے ساتھ ہو۔ مجاہد کہتے ہیں اس (عفو) کے معنی یہ ہیں کہ صدقہ تونگری کے ساتھ ہو تا کہ لوگوں پر گراں نہ گزرے۔

عمرو بن دینارؒ کہتے ہیں کہ عفو کے معنی اوسط درجہ کے ہیں یعنی نہ اسراف ہو اور نہ بخل ہو۔ اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا الآیۃ (اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں) طاؤس کہتے ہیں عفو سے مراد یہ ہے کہ جو جسے آسان ہو اور یہی مطلب اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ہے کہ خذالعفو (یعنی جو لوگوں کو عادۃً دینا) آسان ہو تم وہی لے لو) پس آدمی راہ خدا میں وہی خرچ کرے جو جسے آسان ہو اور جس کے خرچ کرنے سے تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں آنحضرت نے فرمایا کہ سب سے بہتر صدقہ وہی ہے جو تونگری کے ساتھ ہو اور اپنے متعلقین سے دینا شروع کرو (یعنی سب سے مقدم انہیں سمجھے) یہ حدیث بخاری، ابو داؤد اور نسائی نے روایت کی ہے حکیم بن حزام سے بھی اسی طرح مروی ہے اور وہ متفق علیہ ہے۔ بغوی نے ابوہریرہؓ سے اسی طرح نقل کی ہے اور اتنا زیادہ کیا ہے اور کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح ان لفظوں سے مروی ہے کہ بہتر صدقہ وہی ہے جس میں تونگری باقی رہے۔ یہ روایت طبرانی نے نقل کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک اشرفی ہے (کسے دوں) حضور ﷺ نے فرمایا اپنی جان پر خرچ کرو۔ عرض کیا میرے پاس ایک اور ہے فرمایا وہ اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ وہ بولا میرے پاس ایک اور بھی ہے فرمایا وہ اپنے گھر والوں پر خرچ کرو۔ کہا میرے پاس ایک اور ہے۔ فرمایا وہ اپنے خادم کو دے دینا۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے فرمایا اب تجھے اختیار ہے۔ یہ حدیث ابو داؤد۔ نسائی نے روایت کی ہے حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی سونے کی خود لے کر جو کسی غنیمت میں سے اس کے ہاتھ لگی تھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ یہ میری طرف سے صدقہ میں لے لیجئے۔ حضور ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پھر اس نے کئی مرتبہ اسی طرح کہا تب آپ نے غصہ ہو کر فرمایا کہ لا اور لے کر اسے اس زور سے پھینکا کہ اگر اس کے سر میں لگ جاتی تو سر پھٹ جاتا۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے لئے آجاتے ہو اور پھر بیٹھ کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو یاد رکھو صدقے وہی (مقبول ہوتے) ہیں جو تونگری کے ساتھ ہوں۔ یہ حدیث بزاز، ابو داؤد، ابن حبان اور حاکم نے روایت کی ہے۔ بزاز کی روایت میں یہ بھی ہے کہ کسی غنیمت میں سے اس کے حصہ میں آئی تھی اور باقی محدثین کی روایت میں ہے کہ کسی جنگ میں سے اس کے ہاتھ لگی تھی اگر کوئی کہے کہ یہ حدیث اور آیت دونوں تمام مال خرچ کرنے اور جہد المقل[1] کی کراہت پر دلالت

---

[1] جہد المقل سے مراد یہ ہے کہ نہوت والا مزدوری کر کے خیرات کرے، ۱۲۔

marfat.com

کرتی ہیں کیونکہ جہد عفو کی ضد ہے اور ابوامامہؓ کی حدیث تمام مال خرچ کرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے اور آنحضرت ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ کسی نے آپ سے پوچھا تھا کہ صدقہ کونسا افضل ہے فرمایا جہد المقل اور اول اپنے متعلقین کو دے۔ یہ حدیث ابوداؤد نے ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تین روز مجھ پر نہ گزریں کہ اس میں سے کچھ بھی میرے پاس رہے، ہاں فقط اتنا کہ جو قرض میں دینے کے لئے میں رکھ لوں۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے۔

اسماءؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا کہ خرچ کرو اور روک کر نہ رکھو ورنہ اللہ تمہیں دینے سے روک لے گا اور نہ بند کر کے رکھو ورنہ اللہ تمہیں دینا بند کرے گا، تم سے جہاں تک ہو سخاوت کرو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ احوال اور اشخاص کے مختلف ہونے کے باعث حکم بھی مختلف ہو جاتا ہے پس جو شخص ایسا ہو کہ اپنا سارا مال خیرات کر دینے کے بعد لوگوں کے آگے ہاتھ پسارتا پھرنے لگے۔ اور فقر و فاقہ پر صبر نہ کر سکے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے (کہ اپنا سارا مال خیرات کر دے) اور جو شخص صبر کر سکے اور لوگوں کے حقوق بھی اس کے ذمہ نہ ہوں تو اس کے حق میں راہ خدا میں خرچ کرنا ہی افضل ہے اور لوگوں کے حقوق یعنی قرض اور متعلقین اور خادم کا خرچ، اجنبی پر خیرات کرنے سے یقینی مقدم ہے کیونکہ وہ (نفقہ) فرض ہے اور یہ صدقہ نفل ہے اور جس نے زاہد بن کر رہنا اور نبی ﷺ کی طرح زندگی گزارنا اپنے اوپر لازم سمجھ لیا ہو جیسے صحابہؓ میں اہل صفہ اور صوفیوں میں اہل خانقاہ تھے تو اس کو حاجت سے زیادہ چیز اپنے لئے رکھنا مکروہ ہے اور ابوامامہ کی حدیث کو بھی اسی پر حمل کر لیا جائے گا اور شاید افضل عمل کے فوت ہو جانے پر افسوس ہونے کو نبی ﷺ نے (ابوامامہ کی حدیث میں) داغ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اگر کوئی کہے کے نصاب زکوٰۃ تک مال کے پہنچنے اور پورا سال گزرنے سے پہلے اگر کسی نے حاجت سے زائد مال کو خرچ کر دیا تو اس نے نفلی فعل ادا کیا اور اگر نصاب اور سال پورا ہونے کے بعد خرچ کیا تو فرض ادا کیا اور فرض ادا کرنا نفل ادا کرنے سے افضل ہوتا ہے تو پھر اس کے برعکس کا (یعنی نفل بہتر ہونے کا) کوئی کس طرح قائل ہو سکتا ہے۔

ہم کہتے ہیں خرچ کرنے کے واجب ہونے کا سبب فقط مال کا مالک ہونا ہے اور اس سے قدرت ممکنہ حاصل ہوتی ہے کیونکہ شکر سے مراد یہی ہے کہ نعمت کو منعم کی رضا جوئی میں خرچ کیا جائے نصاب اور بڑھوتری اور سال پورا ہونے کی شرط یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل اور ایک قسم کی آسانی ہے اور اسی سے قدرت میسرہ حاصل ہوتی ہے پس اگر کسی نے قدرت میسرہ نہ ہونے کے باعث خرچ نہ کیا تو اسی آسانی کی بناء پر اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن جس نے قدرت ممکنہ کے بعد قدرت میسرنہ ہونے پر بھی خرچ کیا تو اس نے اصل ہی دے ڈالا مال میں (سے زکوٰۃ ادا کرنا) نصاب کے بعد واجب ہے مگر جس نے سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دیا تو اس سب کے دینے سے فرض (زکوٰۃ) ادا ہو جائے گا۔ جیسا کہ نماز میں قرأت واجب ہے۔ الحمد اور چھوٹی چھوٹی تین آیتیں پڑھنے سے وہ ادا ہو جاتی ہے لیکن جس نے سارا قرآن ایک رکعت میں پڑھا لیا تو یہ سب پڑھنا قرأت مفروضہ ہی میں شمار ہو گا کیونکہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اور اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ ان دونوں صورتوں کو شامل ہے اور مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ میں من تبعیضیہ صادق آنے کے لئے مال کا حاجت سے زیادہ ہونا کافی ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ (اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے صاف صاف آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو) دلائل میں اور احکام میں اور جان جاؤ کہ یہ آیتیں سوائے اس خدا کے اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتیں جو ہر کام کی مصلحت اور ان کے انجام سے خوب واقف ہے۔ پس اس کے احکام کو ادا کرنے اور جن باتوں سے اس نے منع کیا ہے ان سے باز رہنے میں تم جلدی کرو تاکہ تمہیں دونوں جہاں کے فائدے حاصل ہوں۔ کذالک میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے صاف صاف آیتیں بیان کرتا ہے جیسا کہ نفقہ و دیگر احکام کو صاف صاف بیان کر دیا ہے کذالک میں (ک) علامت خطاب واحد ہے اور اس کے مخاطب جمع یا تو بتاویل جماعت

میں یا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور آپ کو خطاب تمام امت کو خطاب ہے جیسا کہ آیت یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ الآیۃ

فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (دنیا میں (بھی) یہ ظرف یبین کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے وہ ایتیں بیان کرتا ہے جو دین و دنیا میں تمہارے لئے بہتر ہوں تاکہ تم غور کرو اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ ظرف تتفکرون کے متعلق ہے اور معنی یہ ہیں کہ تم ان چیزوں میں غور کرو جن کو دین و دنیا سے تعلق ہو۔ پس تم اسی کو اختیار کرو جو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہو اور اپنے مال میں سے فقط اتنا رکھ لیا کرو جو دنیا میں تمہاری معاش کے لئے کافی ہو۔ باقی سب خرچ کر دیا کرو تاکہ اس سے تمہیں عقبیٰ میں فائدہ ہو۔ اصل مقصود یہ ہوا کہ دین و دنیا میں تم غور کرو تاکہ ان میں سے جو ہمیشہ رہنے والا اور زیادہ نفع پہنچانے والا ہو اسی کو اختیار کرو۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ دنیا پیٹھ پھیرے جاتی ہے اور آخرت سامنے سے منہ کئے آتی ہے اور ان دونوں کے اولاد ہے پس تم آخرت کی اولاد ہو جاؤ اور دنیا کی اولاد نہ ہو۔ کیونکہ آج (دنیا میں) عمل ہے اور حساب نہیں ہے اور کل (قیامت میں) حساب ہوگا عمل نہ ہوگا۔ یہ روایت بخاری نے ترجمۃ الباب میں نقل کی ہے اور یہی روایت بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابرؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ بوریئے پر (بلا بستر) سوگئے اور اٹھے تو آپ کے جسم مبارک پر بوریئے کے نشان ہوگئے تھے میں نے کہا، یارسول اللہ ﷺ اگر آپ ہمیں حکم دیں تو ہم آپ کے لئے بچھونا بچھا دیا کریں فرمایا مجھے دنیا سے کیا تعلق ہے میری اور دنیا کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی سوار ایک درخت کے نیچے سایہ میں بیٹھ گیا اور پھر اسے چھوڑ کر چل دیا۔ یہ روایت امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے نقل کی ہے۔ ابو درداء سے مرفوعاً مروی ہے کہ تمہارے آگے ایک بڑی گہری گھاٹی (یعنی آخرت) ہے جسے (گناہوں کے) بوجھ والے نہیں پھلانگ سکتے۔ یہ روایت بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہے واللہ اعلم۔

ابو داؤد، نسائی اور حاکم نے روایت کی ہے اور ابن عباسؓ کی سند سے اسے صحیح کہا ہے کہ جب آیت وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اور آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا الآیۃ نازل ہوئی تو اس حکم سے سارے مسلمان بہت ہی ڈر گئے یہاں تک کہ (اسی ڈر سے) انہوں نے یتیموں کے مال اپنے مال سے بالکل علیحدہ کر دیئے کھانا بھی یتیم کا علیحدہ ہی پکایا جاتا اور اس میں سے کچھ بچتا تو اسے ویسی ہی رہنے دیتے خود نہ کھاتے آخر وہ خراب ہو کر یوں ہی جاتا پھر یہ (نقصان ہوتا) بھی انہیں ناگوار گزرا اور سب نے مل کے آنحضرت ﷺ سے پوچھا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَیَسْــَٔلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَیْرٌ (اور اے محمد ﷺ) آپ سے (یہ لوگ) یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیں کہ ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے) یعنی یتیموں کے مال اور ان کے ہر امر کی اصلاح کرنا بہتر ہے پس اگر تم دیکھو کہ ان کی اصلاح (اور خیر خواہی) ان کا مال علیحدہ کر دینے میں ہے تو یہ کرو۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ (اور اگر انہیں اپنے شریک رکھو) اور شریک رکھنے میں ان کی بہتری سمجھو۔

فَاِخْوَانُکُمْ (تو وہ تمہارے بھائی ہیں) یعنی دین میں اور نسب میں بے شک وہ تمہارے بھائی ہیں اور بھائی آپس میں ایک دوسرے کی امداد کیا کرتے ہیں اور خیر خواہی کے طور پر ایک دوسرے کے مال سے نفع اٹھا ہی لیتے ہیں۔

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ (اور اللہ جانتا ہے مفسد کو) یعنی اس کو جو شرکت کرنے سے خیانت کرنا اور یتیم کا مال خراب کرنا چاہے اور ناحق کھائے۔

مِنَ الْمُصْلِحِ (اور مصلح کو) یعنی جو یتیم کی خیر خواہی کا قصد کرے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَاَعْنَتَکُمْ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مصیبت میں ڈال دیتا) یعنی تم پر تنگی کر دیتا اور یہ

marfat.com

شرکت کرنا تمہارے لئے مباح نہ کرتا لیکن اس نے تم پر آسانی کی اور بطور خیر خواہی یتیموں کے شریک رکھنے کو تمہارے لئے مباح کر دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ (بے شک اللہ زبردست ہے) یعنی غالب ہے جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے خواہ وہ حکم بندوں پر آسان ہو یا گراں گزرے۔

حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ (حکمت والا ہے) یعنی اپنے فضل سے اپنی حکمت کے مطابق اور لوگوں کی طاقت کے موافق حکم دیتا ہے، واللہ اعلم۔

شان نزول :- بغویؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو مرثد غنوی کو اس لئے مکہ بھیجا کہ وہاں سے مسلمانوں کو پوشیدہ طور پر نکال لائیں۔ جب یہ مکہ پہنچے تو ایک مشرکہ عورت نے جس کا نام عناق تھا اور جاہلیت کے زمانہ میں وہ ان کی آشنا تھی ان کی آمد کی خبر سن پائی وہ ان کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اے ابو مرثد کیا تم مجھ سے خلوت نہیں کرتے۔ انہوں نے فرمایا کم بخت عناق مجھے اسلام نے ایسی باتوں سے روک دیا ہے وہ بولی (اچھا) تم مجھ سے نکاح کر سکتے ہو۔ انہوں نے کہا ہاں لیکن رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر آپ سے اجازت لوں گا اس نے کہا کیا تم مجھ سے نخرے کرتے ہو۔ اتنا کہتے ہی دہائی مچا دی۔ مشرکوں نے (آکر) ابو مرثد کو بے انتہا مار اپھر چھوڑ کے چلے گئے۔ جب ابو مرثد مکہ آنے کا کام پورا کر چکے اور حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو جو کچھ ان کا اور عناق کا قصہ ہوا تھا سب آپ سے بیان کر دیا اور پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا اس سے نکاح کرنا میرے لئے جائز ہے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اگلی آیت نازل فرمائی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ (اور مشرک عورتیں جب تک ایمان نہ لائیں تم ان سے نکاح نہ کرو) ابن منذر، ابن ابی حاتم، واحدی نے بھی مقاتل سے اسی طرح روایت کی ہے۔ سیوطی کہتے ہیں کہ ان صحابیؓ کے بارے میں یہ آیت نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً الاٰیۃ کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے ابن عمرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے اور یہ آیت اہل کتاب کی عورتوں کے حق میں آیت وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے منسوخ ہے باوجودیکہ وہ بھی مشرک ہیں کیونکہ مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کی پرستش کرتی ہیں۔

وَلَاَمَةٌ (اور بے شک لونڈی) یعنی عورت خواہ حرہ ہو، خواہ لونڈی ہو کیونکہ سب مرد و عورت اللہ تعالیٰ کے غلام اور باندیاں ہیں۔

مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ (مسلمان عورت مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھی معلوم ہو) یعنی اپنے مال یا جمال یا عادات کی وجہ سے۔ بغویؒ کہتے ہیں۔ یہ آیۃ خنساء کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حذیفہ بن یمان کی ایک حسین لونڈی تھی پھر حذیفہ نے اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ واحدی نے واقدی کے طریق سے بحوالۂ ابو مالک ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ بن رواحہ کی ایک بد صورت لونڈی تھی ایک دن عبد اللہ نے اس پر خفا ہو کر اس کے طمانچہ مار دیا (لیکن پھر گھبرائے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ قصہ حضور سے عرض کیا آپ نے پوچھا کہ عبد اللہ اس کی حالت کیا ہے عرض کیا وہ کلمہ پڑھتی ہے اشہدان لآ اله الا اللّٰه و انّک رسول اللّٰه اور رمضان شریف کے روزے رکھتی ہے، اچھی طرح وضو کرتی ہے نماز پڑھتی ہے۔ حضرت نے فرمایا پھر وہ تو مؤمنہ ہے۔ عبد اللہ بولے یا رسول اللہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں اسے آزاد کر کے اس سے اپنا نکاح کر لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ بعض مسلمانوں نے ان کو طعنہ دیا اور کہا کہ کیا لونڈی سے شادی کرتے ہو اور ایک حرۃ مشرک عورت ان کو دکھلائی (کہ اس سے شادی کو لو) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور بطور قیاس کے اس آیت سے یہ نکلتا ہے کہ خوش اخلاق نیک بخت عورت اگرچہ کنگال بد صورت ہو نکاح کرنے میں اس عورت سے بہتر ہے جو بدکار بد اخلاق ہو اگرچہ یہ دولت

marfat.com

مند خوبصورت ہو۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عورت سے نکاح چار وجہ سے کیا جاتا ہے مال، جمال، حسن، دین لیکن تم دیندار ہی کو اختیار کرنا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔

عبداللہ بن عمرو سے مرفوعاً مروی ہے کہ (آنحضرت ﷺ نے) فرمایا دنیا ایک پونجی ہے اور اس کی بہتر پونجی نیک بخت عورت ہے۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے۔ ابوسعید خدریؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ عورتوں سے بچتے رہنا کیونکہ بنی اسرائیل میں اول تباہی عورتوں ہی کے ذریعے سے آئی تھی۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے۔

وَلَا تُنْكِحُوا (اور نہ نکاح کرو) یعنی مسلمان عورت کا یہ خطاب یا تو (عورتوں کے) ولیوں کو ہے یا حکام کو ہے مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مشرک مردوں سے نکاح نہ کرنے دو۔

الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا (مشرک مردوں سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں) یہ آیت محکم ہے (لہٰذا) مسلمان عورت کا نکاح مشرک سے کردینا بالاتفاق جائز نہیں خواہ وہ مشرک اہل کتاب میں سے ہو یا اور کسی مذہب کا ہو۔

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ (اور بیشک مسلمان غلام (یعنی آدمی) مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ (مال یا جاہ وغیرہ کی وجہ سے) تمہیں اچھا معلوم ہو یہ (یعنی مشرک عورتیں اور مرد مسلمانوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں) یعنی کفر اور معاصی کی طرف کیونکہ صحبت اور ملاقات کا دلوں میں اثر ہو کر آدمی کو اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر کردیتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا (اور اللہ بلاتا ہے) اپنے پیغمبروں کی زبانی یا یہ مراد ہے کہ اولیاء اللہ بلاتے ہیں۔ ان کی بزرگی ظاہر کرنے کی وجہ سے مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ (یعنی لفظ اللہ) کو اس کے قائم مقام کردیا ہے۔

اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ (جنت اور مغفرت کی طرف) یعنی ایسے عقیدوں اور عملوں کی طرف جو جنت اور مغفرت کو واجب کرتے ہیں پس اولیاء اللہ ہی کے ساتھ رہنا چاہئے۔

بِاِذْنِهٖ (اپنے حکم سے) یعنی توفیق دے کر اور آسانی کر کے یا اپنے حکم اور اپنے ارادے سے۔

ع ۲۷ ۱۱ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۲۱) (اور اپنے احکام (اور نواہی) لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں) یا ایسے ہو جائیں کہ ان سے نصیحت یاب ہونے کی امید ہو، واللہ اعلم۔

شان نزول:- بخاری، مسلم، ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہود کی یہ عادت تھی کہ جب ان میں کی کسی عورت کو ایام آتے تو نہ اسے وہ اپنے ساتھ کھلاتے تھے اور نہ اپنے ساتھ گھروں میں رہنے دیتے تھے۔ صحابہؓ نے اس کی بابت حضور ﷺ سے دریافت کیا، ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ دریافت کرنے والے ثابت بن دحداح تھے ابن جریر نے سدی سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَيَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (اور اے محمد ﷺ) لوگ تم سے حیض کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ محیض مصدر (میمی) ہے جیسے مجی اور مبیت اور معنی یہ ہیں کہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ عورت سے حیض کی حالت میں کس طرح برتاؤ کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے یسئلونک (پہلے) تین جگہ بغیر واؤ کے فرمایا ہے اور پھر تین جگہ واؤ کے ساتھ فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تین سوال تو متفرق وقتوں میں کئے گئے تھے اور اسی واسطے ان کو جمع کے لفظ کے ساتھ فرمایا ہے۔

قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ (اے محمد ﷺ) کہہ دو کہ وہ (یعنی حیض) ناپاکی ہے اس لئے حیض میں عورتوں سے تم الگ رہو) اور الگ رہنے سے مراد سب علماء کے نزدیک ان سے صحبت نہ کرنا ہے نہ یہ کہ کھانے پینے اور پاس بیٹھنے وغیرہ میں (ان سے) پرہیز کیا جائے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو پہلے مذکور ہو چکی ہے نقل کیا ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سوائے صحبت کے اور سب کچھ کرلیا کرو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ میں اور نبی ﷺ دونوں ناپاکی کی حالت میں ایک برتن سے

marfat.com

نہالیتے تھے اور بعض اوقات میں ناپاک ہوتی تو حضرت مجھے تہبند باندھ لینے کیلئے فرماتے اور جب میں باندھ لیتی تو آپ میرے پاس لیٹ جاتے تھے۔ اور اعتکاف کی حالت میں (مسجد سے) آپ باہر سر نکال دیتے تو میں حضور کا سر دھو دیتی تھی یہ روایت متفق علیہ ہے۔

اور فرماتی ہیں کہ میں پانی پی کر پیالہ حضرت کو دیدیتی تھی تو آپ اس میں میرے منہ کی جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے تھے۔ اسی طرح میں ایک ہڈی کو چوس کر آپ کو دیدیتی تھی آپ میرے منہ کی جگہ منہ لگا کر اسے چوس لیتے تھے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے اور فرماتی ہیں کہ میری ناپاکی کی حالت میں حضرت میری گود میں سر رکھ لیتے اور پھر قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور فرماتی ہیں کہ ایک روز حضرت نے مسجد میں سے مجھ سے فرمایا بوریا اٹھا دو میں نے کہا ناپاک ہوں، فرمایا تمہارے ہاتھ میں ناپاکی نہیں ہے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے۔

ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایسی چادر میں نماز پڑھ لیتے تھے کہ کچھ ان پر ہوتی تھی اور کچھ مجھ پر اور میں ناپاک ہوتی تھی۔ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں ایام سے ہوئی تو میں نے اپنے وہی ایام کے کپڑے پہن لئے۔ حضرت نے پوچھا کیا تمہیں ایام آگئے ہیں، میں نے کہا ہاں پھر آپ نے مجھے اپنی چادر میں لے لیا۔ یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ) یہ حکم سابق کی تاکید اور اس کی انتہا کا بیان ہے۔

عاصم نے بروایت ابوبکر اور حمزہ اور کسائی نے یطھرن کو ط اور ہ کے تشدید سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ط کے جزم اور ہ کے ضمہ سے مخفف پڑھا ہے اور معنی دونوں قرائتوں کے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ کے نزدیک ایک ہی ہیں یعنی جب تک وہ نہانہ لیں پس خون منقطع ہونے کے بعد ان کے نہانے سے پہلے مردوں کو ان کے قریب جانا ہرگز جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تخفیف کی قرأت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں تک کہ وہ حیض سے پاک ہو جائیں اور خون بند ہو جائے اس قرأت پر خون بند ہونے کے بعد نہانے سے پہلے قریب جانا جائز ہے اور تشدید کی قرأت کے معنی نہانے کے ہیں اس قرأت پر یہ جائز نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تخفیف کی قرأت کو اس صورت پر حمل کیا ہے کہ جب دس روز کے بعد خون بند ہو اور تشدید کی قرأۃ کو دس روز سے کم پر لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ تشدید کی قرأت تو اس معنی پر ناطق (اور دال) ہے کہ نہانے سے پہلے (عورتوں کے) قریب جانا منع ہے اور تخفیف کی قراۃ نہانے سے پہلے قربت کے مباح ہونے پر دال نہیں ہے بلکہ فقط اس کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے اور (حکم) مفہوم (حکم) منطوق کا مقابل نہیں ہو سکتا اور سب علماء کا اس پر اجماع ہونے کے بعد کہ حیض کی حالت میں صحبت کرنا حرام ہے اس بارے میں اختلاف ہے کہ جو شخص اس فعل کا مرتکب ہو جائے آیا اس پر کفارہ واجب ہے یا نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ کفارہ واجب نہیں ہوتا، محض استغفار کر لینا کافی ہے اور جدید قول امام شافعیؒ کا بھی یہی ہے اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک دینار خیرات کرے، اگر اتنی توفیق نہ ہو تو نصف دینار اور امام شافعیؒ کا پہلا قول یہ ہے کہ جو شروع حیض میں صحبت کرے اس پر ایک دینار صدقہ کرنا لازم ہے اور جو اخیر میں کرے اس پر نصف دینار ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آنحضرت ﷺ سے ایسے شخص کے بارے میں روایت کی ہے جس نے اپنی بیوی سے ایام کی حالت میں صحبت کر لی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ایک یا نصف دینار صدقہ کر دے۔ یہ روایت امام احمدؒ نے یحییٰ سے انہوں نے شعبہ سے انہوں نے حکم سے انہوں نے عبدالحمید سے انہوں نے مقیم سے نقل کی ہے اور اہل سنن اور دار قطنی نے بھی اسے نقل کیا ہے اور یہ حدیث صحیحین میں بھی مروی ہے مگر مقیم کی روایت کو فقط بخاری ہی نے نقل کیا ہے اور ابن قطان، حاکم، ابن دقیق العید نے اسے صحیح کہا ہے پس جس نے اسے موقوفاً روایت کیا ہے اس کی روایت بھی کچھ مضر نہیں ہے کیونکہ ثقہ کا

marfat.com

مرفوع کرنا زیادتی مقبولہ ہے۔
امام شافعیؒ کے پہلے قول کی دلیل علماء نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جس وقت خون زرد آتا ہو (اور کوئی صحبت کرے) تو نصف دینار ہے اگر سرخ آتا ہو تو پورا دینار اس حدیث کی روایت کا مدار عبدالکریم ابوامیہ پر ہے اور ابوامیہ کی روایت کے ترک پر سب کا اجماع ہے۔ ابو ایوب سختیانی اسے جھوٹا کہتے تھے۔ احمد اور یحییٰ کا قول ہے کہ یہ آدمی معتبر نہیں ہے۔ سوائے جماع کے کچھ دوسری لذت آفریں حرکت کرنے کے جواز و عدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام احمد کا قول ہے کہ لذت اٹھانا جائز ہے اور جمہور کہتے ہیں جائز نہیں، امام احمد کی دلیل حضرت انسؓ کی وہ حدیث ہے جو پہلے گزر چکی کہ اصنعوا کل شئی الا النکاح (یعنی سوائے جماع کے اور سب کچھ کو لیا کرو) اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جس وقت ناپاک عورت سے کچھ کرنا چاہتے تو اس کی شرمگاہ پر کچھ ڈال لیتے تھے۔ یہ روایت ابن جوزی نے نقل کی ہے اور جمہور حضرت معاذ بن جبل کی حدیث سے حجت لاتے ہیں۔ حضرت معاذ کہتے ہیں میں نے (حضرت سے) پوچھا تھا کہ یارسول اللہ مجھے اپنی بیوی سے ناپاکی کی حالت میں کیا کیا کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ پاجامہ کے اوپر سب کچھ کرنا درست ہے اور اس سے بھی بچنا زیادہ افضل ہے۔ یہ روایت رزین نے نقل کی ہے۔ محی السنۃ کہتے ہیں کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے اور عبداللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور زید بن اسلم سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے لئے اپنی بیوی سے ناپاکی کی حالت میں کیا کرنا جائز ہے فرمایا کہ اسے پاجامہ پہنا کر اس سے اوپر تمہیں سب کچھ کرنے کا اختیار ہے۔ یہ روایت امام مالک، اور دارمی نے مرسلاً نقل کی ہے اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اگر کسی کی شہوت اس کے بس میں ہے تب تو فرج کے علاوہ پاجامہ کے اوپر مساس کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے کیونکہ آیت سے صحبت ہی کا منع ہونا مراد ہے اور حقیقت و مجاز میں جمع کرنا جائز نہیں ہے، ورنہ پھر اس کا ترک واجب ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو کھیت کے گرد گھومتا ہے اس کا اندر گھس جانا کچھ بعید نہیں ہوتا۔ اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ عورت کو ناپاکی آنا نماز کے وجوب اور جواز دونوں کو روک دیتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس روزہ کے جواز کو بھی روک دیتا ہے، ہاں اس کے وجوب کو نہیں روکتا۔ (یعنی اس حالت میں روزہ رکھنا تو جائز نہیں لیکن ذمہ واجب ہو جاتا ہے، اس لئے نماز کی قضا نہیں کی جاتی اور روزوں کی قضا کی جاتی ہے کہ بعد میں رکھنے پڑتے ہیں)۔
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہم ایام سے ہوتیں تھیں تو حضور ﷺ ہم سے روزوں کی قضا کراتے تھے اور نماز کی قضا نہیں کراتے تھے۔ یہ حدیث مسلم اور ترمذی نے نقل کی ہے اور یہ حدیث مشہور ہے اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم سے صراحتاً اور دلالتاً اس کے معنی مروی ہیں اور صحیحین میں بھی آنحضرت علیہ السلام کا یہ قول مروی ہے کہ آپ نے ایک عورت سے فرمایا تھا الیس اذا حاضت لم تصل ولم تصم (یعنی کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب کسی کو ایام آتے ہیں تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے) علاوہ اس کے (ایک عورت سے) آپ نے یہی فرمایا تھا کہ جس وقت ایام آئیں تو نماز تم چھوڑ دیا کرو۔ ایام آنے کی حالت میں مسجد میں جانا، طواف کرنا، قرآن شریف چھونا اور پڑھنا بالا جماع منع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لا یمسہ الا المطھرون (یعنی اس (قرآن شریف) کو پاک ہی لوگ ہاتھ لگایا کریں) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ان مکانوں (کے دروازوں) کو مسجد سے پھیر دو کیونکہ ناپاک عورت اور جنبی کا مسجد میں آنا میں جائز نہیں سمجھتا۔ یہ حدیث ابوداؤد نے نقل کی ہے اور آنحضرت نے فرمایا کہ ناپاک عورت اور جنبی قرآن مجید کی کوئی آیت وغیرہ نہ پڑھا کریں۔ یہ روایت ترمذی ابن ماجہ دار قطنی نے نقل کی ہے اور اسی کی شاہد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بھی حدیث ہے دار قطنی نے مرفوعاً روایت کی ہے لیکن ان دونوں حدیثوں کی سند میں کچھ شبہ ہے، واللہ اعلم۔

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ (پس جس وقت وہ پاک ہو جائیں) یہاں سب قاریوں کا تشدید کے ساتھ پڑھنے پر اتفاق ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ مقاربت مباح ہونے کے لئے غسل شرط ہے۔

marfat.com

فَأْتُوهُنَّ　(پس ان سے مجامعت کرو) یعنی پاک ہونے کے بعد جماع کو تمہارے لئے اللہ نے مباح کر دیا ہے۔

مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ط　(جہاں سے تمہیں اللہ نے امر کیا ہے) یعنی فرج میں نہ کہ دبر میں اور مباح ہونا ہم نے اس لئے کہا ہے کہ جماع کا امر اباحت کے لئے ہے، نہ کہ وجوب کے لئے۔ مجاہد قتادہ، عکرمہ نے کہا ہے (اس آیت کے معنی یہ ہیں) یعنی جہاں سے تمہیں اللہ نے عورتوں سے بچنے کا حکم کیا تھا اور وہ فرج ہے اور یہی ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں مِن کے معنی فی کے ہیں یعنی جس جگہ میں تمہیں اللہ نے اجازت دے رکھی ہے اور وہ جگہ فرج ہی ہے جیسا کہ اس آیت میں إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ یعنی فی یوم الجمعۃ اور ابن حنفیہ نے یہ معنی کہے ہیں یعنی "جس جگہ مقاربت کرنا حلال ہے نہ کہ جہاں گناہ ہے"۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ　(کفر اور گناہ سے) توبہ کرنے والوں کو بیشک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے۔

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾　اور پاک ہونے والوں سے بھی محبت رکھتا ہے) یعنی جو ناپاکیوں سے بچتے ہیں جیسے ایام والی عورت سے مقاربت کرنا یا دبر میں (بد فعلی) کرنا اس کے علاوہ اور ناپاکیوں اور پلیدیوں سے بچنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کی دبر میں وطی کرنے کی حرمت اس آیت سے اشارتاً ثابت ہے یا ایام والی عورت کے ساتھ وطی کرنے کی حرمت پر قیاس کرنے سے ثابت ہے کیونکہ یہ بھی ایسا ہی برا فعل ہے جیسا کہ حیض میں وطی کرنا بلکہ وطی تو ہر طرح برا ہی فعل ہے خواہ فرج میں ہو خواہ دبر میں ہو عورت کے ساتھ ہو یا مرد کے ساتھ ہو اور اسی وجہ سے اس کے بعد غسل کرنا واجب ہوتا ہے لیکن فرج میں وطی کرنا محض نسل باقی رکھنے کی ضرورت کی وجہ سے مباح کر دیا گیا ہے تاہم اس کے مباح ہونے میں چند شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح ہو چکا ہو۔ دوسرے عورت محرم نہ ہو۔ تیسرے رحم (دوسرے کے نطفہ سے) خالی ہو۔ چوتھے حیض سے پاک ہو وغیرہ وغیرہ۔ اور دبر میں وطی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے چاہے مفعول بہ مرد ہو یا عورت ہو پس برا فعل ہونے کی وجہ سے اس کا حکم حرمت کا رہے گا۔ مردوں کو مردوں کے ساتھ بد فعلی کرنے کی حرمت نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے اور اسی (فعل کی سزا) میں لوط علیہ السلام کی قوم ہلاک ہو چکی ہے اور ایسا ہی عورتوں کی دبر میں بد فعلی کرنا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آیت فاتوھن کو من حیث امرکم اللّٰہ کے ساتھ مقید کر دیا ہے اور ناپاکی ہونے کی وجہ سے جماع حرام ہونے کے وہم کو دفع کرنے اور مباح ہونے کی ضرورت کا بیان کرنے کے لئے اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قول بیان کیا ہے۔

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ　(تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں) یعنی تمہارے کھیتیوں کی جگہ ہیں۔ کھیتیوں کے ساتھ انہیں اس لئے تشبیہ دی ہے کہ ان کے رحموں میں جو نطفے ڈالے جاتے ہیں وہ تخموں کے مشابہ ہیں غرض اس سے یہ ہے کہ عورتوں سے صحبت کرنا محض نسل باقی رکھنے کے لئے تمہارے واسطے مباح کر دیا گیا ہے۔

فَأْتُوا حَرْثَكُمْ　(پس تم اپنی کھیتیوں میں آؤ) یعنی ان کی فرجوں میں صحبت کرو گویا یہ آیت فاتوھن من حیث امرکم اللّٰہ کا بیان ہے۔

أَنّٰى شِئْتُمْ ز　(جہاں سے چاہو) یعنی جس طرح تم چاہو کیونکہ کلمہ انی، کیف اور این کے معنی میں مشترک ہے اور این کے معنی یہاں بن نہیں سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جگہ کے عام ہونے پر دلالت کرے گا۔ حالانکہ کھیتی کی جگہ ایک ہی ہے اس لئے یہاں کیف ہی کے معنی معین ہو گئے اس آیت کے شان نزول میں جو ایک تحقیق ہم عنقریب بیان کریں گے۔ اس کا مقتضی بھی یہی ہے، واللہ اعلم۔

عورتوں کی دبر میں وطی کرنے کی جو ہم نے حرمت بیان کی ہے امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ اور جمہور اہل سنت کا یہی قول ہے، امام مالکؒ سے اس کے جواز کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے لیکن امام مالکؒ کے شاگرد امام مالک کی طرف جواز کے انتساب کے منکر ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ پہلے ان کا یہ مذہب تھا پھر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ اور امام شافعیؒ کے اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول جو ابن عبد الحکم نے نقل کیا ہے یہ ہے کہ اس کی حرمت اور حلت میں رسول اللہ ﷺ سے کچھ ثابت نہیں ہے اور قیاس بھی

یہی (چاہتا) ہے کہ یہ حلال ہو، گویا انہوں نے اس فعل کو اس پر قیاس کیا ہے کہ کوئی شخص اپناذ کر اپنی بی بی کے ہاتھ میں یا ران سے لگا کر حاجت پوری کرے۔

حاکم نے سند کے ساتھ ابن عبدالحکم سے نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں، میں نے امام شافعیؒ سے گفتگو کی تھی انہوں نے یہ جواب دیا کہ محمد بن حسن نے بھی (اس بارے میں) مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے ان سے یہ کہا کہ اگر تم اس بارے میں محض جھگڑا کرنا اور روایتوں کو صحیح کرنا چاہتے ہو (اگرچہ اس کی بابت روایت کوئی بھی صحیح نہیں ہے) تو تم خود واقف اور جاننے والے ہو اور اگر منصفانہ بحث کرتے ہو تو میں موجود ہوں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں منصفانہ ہی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ تب میں نے ان سے پوچھا کہ تم اس فعل کو کس دلیل سے حرام کہتے ہو، کہا اللہ عزوجل نے فرمایا کہ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ[1]، فاتوا حرثکم انی شئتم[2] اور کھیتی فقط فرج ہی میں ہوتی ہے میں نے پوچھا کیا اس جگہ کے سوا اور سب جگہیں اس آیت سے حرام ہو جائیں گی کہا ہاں۔ میں نے پوچھا کہ اس میں تم کیا کہتے ہو کہ کوئی شخص اپنی بی بی کی پنڈلیوں کے بیچ میں یا بغل میں وطی کرلے یا اپناذ کر اس کے ہاتھ میں دیدے کیا اس میں بھی کوئی کھیتی ہے کہا نہیں۔ میں نے کہا کیا یہ فعل حرام ہے کہا نہیں۔ تب میں نے کہا کہ تم ایسی آیت کو اپنی دلیل کیوں بناتے ہو جو کسی طرح دلیل نہیں ہو سکتی۔ کہنے لگے (دوسری جگہ) اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (یعنی جو اپنی فرجوں کی حفاظت کرنے والے ہیں) تو اس میں فرج کو نام لے کر کہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی دلیل ہے جس سے علماء اس کے جواز پر حجت لاتے ہیں کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جنہوں نے اپنی بی بی اور اپنی لونڈی کے علاوہ اوروں سے اپنی شہوت پوری کرنے کو روکا اور اس کے تو تم بھی قائل ہو۔

میں کہتا ہوں کہ جب ہم نے یہ بیان کر دیا کہ عورتوں سے بدفعلی کرنے کی حرمت کا سبب پلیدی ہی ہے اور یہ پلیدی اس صورت میں منتفی ہے کہ جب کوئی عورت کی پنڈلیوں وغیرہ میں وطی کرے تو اس سے امام شافعیؒ کے قیاس کا ضعیف ہونا صاف معلوم ہو گیا امام موصوف نے اسی وجہ سے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا ہے (اب ان کا یہ قول نہیں ہے)۔

حاکم کہتے ہیں شاید امام شافعیؒ اس (کے جواز) کے پہلے قائل ہونگے ورنہ اب ان کا یہ قول نہیں ہے اب تو ان سے بھی اس کی حرمت ہی مشہور ہے۔ ربیع کہتے ہیں کہ ابن عبدالحکم نے (جو امام شافعیؒ سے یہ روایت کی ہے اس نے) صریح جھوٹ بولا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں کہ امام موصوف نے اپنی سنن میں اس کی حرمت کی خوب تشریح کر دی ہے اور ان سے بہت سے علماء نے اسے نقل بھی کیا ہے۔ منجملہ ان کے ماوردی نے حاوی میں اور ابو نصر بن صباح نے شامل میں اور ان کے علاوہ اوروں نے بھی۔ شیخ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ ربیع کی ابن عبدالحکم کی تکذیب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں نکلتا کیونکہ وہ اس بارے میں اکیلے ہی راوی نہیں ہیں بلکہ ان کے بھائی عبدالرحمٰن نے بھی اس میں ان ہی کی موافقت کی ہے۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ اس بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں اخیر قول یہ ہے کہ اس سے انہوں نے رجوع کر لیا ہے وہ اس کی حرمت میں جمہور کے موافق ہیں۔ اس بدفعلی کی حرمت میں بہت سی حدیثیں وارد ہیں۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت سے یہ مروی ہے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کو روایت کیا ہے۔ منجملہ ان کے عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، خزیمہ بن ثابت، ابوہریرہ، ابن عباس، عبداللہ بن عمرو بن عاص، ابن مسعود، عقبہ بن عامر، براء بن عازب، طلق بن علی، ابوذر، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اس کے راوی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کی حدیث نسائی اور بزاز نے زمعتہ بن صالح کی سند سے روایت کی ہے۔ زمعہ نے طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ھادی سے انہوں نے عمرؓ سے اور زمعہ ضعیف ہیں۔ احمد اور ابو حاتم نے ان کا ضعیف ہونا بیان کیا ہے اور ذہبی کہتے ہیں کہ یہ صالح الحدیث ہیں لیکن ان پر موتوف اور مرفوع ہونے میں اختلاف ہے۔ باقی رہی

---

[1] (ترجمہ) آؤ تم (اپنی بیویوں کے پاس) جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا۔

[2] (ترجمہ) تم اپنی کھیتیوں میں جس طرح چاہو آؤ۔

marfat.com

حضرت علیؓ کی حدیث اس کو ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے ان لفظوں سے نقل کیا ہے ان اللّٰہ لایستحیی من الحق لا تأ توا النساء فی اعجار ھن (یعنی اللہ حق بات بیان کرنے سے نہیں شرماتا تم عورتوں سے بد فعلی (یعنی دبر میں وطی نہ کیا کرو) اور خزیمہ بن ثابت کی حدیث کہ نبی ﷺ سے ایک آدمی نے عورتوں کی دبر میں وطی کرنے کو پوچھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جائز ہے جب وہ پشت پھیر کے چلنے لگا تو آپ ﷺ نے پھر بلا کے فرمایا تم نے کیا پوچھا تھا آیا یہ پوچھتے تھے کہ دونوں راستوں میں سے کونسے میں جائز ہے سو اگر پیچھے ہو کر فرج میں وطی کرے تو جائز ہے اور اگر پیچھے ہو کر دبر ہی میں کرنے لگے تو یہ ہرگز جائز نہیں ہے بے شک اللہ تعالیٰ حق (بات بیان کرنے) سے نہیں شرماتا۔ تم لوگ عورتوں کی دبر میں وطی ہرگز نہ کیا کرو۔ یہ روایت امام شافعیؒ، امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی نے نقل کی ہے اور اس میں عمرو بن اجنحہ راوی) مجہول الحال ہیں اور یہی روایت وھب بن سوید بن ھلال کے طریق سے نسائی نے نقل کی ہے اس طرح کہ انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے علی ابن سائب سے انہوں نے حصین بن محصن سے انہوں نے ہرمی بن عبد اللہ سے انہوں نے خزیمہ سے روایت کی ہے اور ھرمی کے طریق سے بھی اسے امام احمد، نسائی، ابن حبان نے نقل کیا ہے اور ان کا حال بھی معروف نہیں ہے بزاز کہتے ہیں مجھے اس بارے میں کوئی صحیح حدیث معلوم نہیں ہوتی۔ اور جو خزیمہ بن ثابت سے روایت کی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اسی طرح حاکم نے حافظ ابو علی نیشاپوری سے نقل کیا ہے اور ایسا ہی نسائی سے مروی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ ان دونوں روایتوں کو امام بخاری نے تسلیم کر لیا ہے۔ رہی ابوہریرہؓ کی حدیث کہ نبی ﷺ نے فرمایا ملعون من اتی امراۃ فی دبرھا (یعنی جو عورت کی دبر میں وطی کرے وہ ملعون ہے)۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا جو عورت کی دبر میں وطی کرے۔ اس روایت کو امام احمد اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور باقی اصحاب سنن نے سھل بن ابی صالح کے طریق سے انہوں نے حارث بن مخلد سے انہوں نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے اور بزارؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ حارث بن مخلد مشہور نہیں ہیں اور ابن قطانؒ کہتے ہیں کہ ان کا حال معروف (بین المحدثین) نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سھیل پر اس میں اختلاف بھی ہے چنانچہ اسمٰعیل بن عیاش نے سہیل سے انہوں نے محمد بن منکدر سے انہوں نے جابرؓ سے روایت کی ہے جسے دار قطنی اور ابن شاھین نے نقل کیا ہے اور اسی کو عفرہ کے مولیٰ عمر نے سہیل سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے جابرؓ سے روایت کی ہے۔ جو ابن عدی نے نقل کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے اور ابوہریرہؓ کی حدیث ایک اور سند سے بھی مروی ہے جسے امام احمد اور ترمذی نے حماد بن سلمہ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ حماد حکیم اثرم سے وہ ابو تمیمہ سے وہ ابوہریرہؓ سے اسی طرح روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے ایام والی عورت سے یا عورت کی دبر میں وطی کی یا کسی نے کاہن (نجومی) کے کہنے کو سچا جانا اس نے محمد ﷺ پر نازل شدہ احکام کا کفر کیا۔

ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث غریب ہے سوائے حکیم کے طریق کے اور کسی سند سے ہم اسے نہیں جانتے اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابو تمیمہ کا ابوہریرہؓ سے سننا کچھ مشہور نہیں ہے۔ بزاز کا قول یہ ہے کہ یہ حدیث منکر ہے اور حکیم (والی سند) دلیل بنانے کے لائق نہیں ہے جس سند میں وہی اکیلے ہوں) کہ وہ اور روایت اور سند سے مروی نہ ہو) تو وہ تو کوئی چیز ہی نہیں ہے یہ حدیث ایک تیسرے طریق سے بھی مروی ہے جسے نسائی نے زہری کی روایت سے انہوں نے ابو سلمہ سے انہوں نے ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ حمزہؒ کنانی کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے اور اس میں عبد المالک جو راوی ہیں ان کے بارے میں رحیم اور ابو حاتم وغیرہ نے گفتگو کی ہے اور محفوظ یہی ہے کہ وہ روایت موقوف ہے۔ اس حدیث کی روایت ایک چوتھے طریق سے بھی آئی ہے جسے نسائی نے بکر بن خنیس کے طریق سے انہوں نے لیث سے انہوں نے مجاہدؒ سے انہوں نے ابوہریرہؓ سے ان لفظوں سے نقل کیا ہے کہ من[1] اتی شیئامن الرجال و النساء فی الادبار فقد کفر بکر اور لیث دونوں ضعیف ہیں۔ یہی روایت

[1] ترجمہ: جس شخص نے مرد یا عورت کے ساتھ دبر میں وطی کی اس نے کفر کیا۔

marfat.com

پانچویں طریق سے بھی مروی ہے جسے عبد اللہ ابن عمر بن ابان نے مسلم بن خالد زنجی سے انہوں نے علاء سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ابو ہریرہؓ سے ان لفظوں سے روایت کیا ہے کہ ملعون من اتی النساء نی ادبار ھن (یعنی وہ آدمی ملعون ہے جو عورتوں کی دبر میں وطی کرے) یہ روایت امام احمد اور نسائی نے نقل کی ہے اور نسائی وغیرہ نے مسلم (بن خالد کو ضعیف کہا ہے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ بہت سچا آدمی ہے۔ یحیٰی بن معین وغیرہ نے اسے معتبر راوی کہا ہے، رہی ابن عباسؓ کی حدیث سو اس کو ترمذی، نسائی، ابن حبان، امام احمد، بزاز نے کثیر بن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے۔ بزاز کہتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ وھب کی سند سے زیادہ اچھی سند کے ساتھ کسی نے اس کو ابن عباسؓ سے روایت کیا ہو۔ ابو خالد الاحمر اس کے اکیلے راوی ہیں جو ضحاک بن عثمان سے وہ محمد بن سلیمان سے وہ کریب سے روایت کرتے ہیں اور اسی طرح ابن عدی نے کہا ہے اور اسی کو نسائی نے ھناد سے انہوں نے وکیع سے انہوں نے ضحاک سے موقوفاً روایت کیا ہے اور ان کے نزدیک مرفوع سے یہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ ابن عباسؓ سے ایک اور طریق سے بھی موقوفاً مروی ہے جسے بزاز نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی ہے کہ ابن عباس سے ایک آدمی نے عورتوں کی دبر میں وطی کرنے کو پوچھا تو آپ نے فرمایا تو مجھ سے کفر کی بات کیوں پوچھتا ہے۔ اسے نسائی نے ابن المبارک کی روایت سے انہوں نے معمر سے نقل کیا ہے اور اس کی سند قوی ہے رہی۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص کی حدیث سو اسے امام احمد نے عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ ان لفظوں سے نقل کیا ہے کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ مرد عورت کی دبر میں وطی کرے تو کیسا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ لواطت صغریٰ ہے (یعنی جائز نہیں ہے) نسائی نے اسے نقل کیا ہے اور محفوظ یہ ہے کہ یہ عبد اللہ بن عمرو کا قول ہے، عبد الرزاق وغیرہ نے اسے اسی طرح بیان کیا ہے اور اس بارے میں حضرت انسؓ سے بھی روایت ہے جو اسماعیلی نے معجم میں نقل کی ہے لیکن اس میں یزید رقاشی راوی ضعیف ہیں اور ابیؓ بن کعب سے بھی بہت ہی ضعیف سند کے ساتھ جزء الحسن بن عرفہ میں روایت ہے اور ابن مسعودؓ سے بھی بہت واہی سند کے ساتھ ابن عدی کے ہاں روایت ہے علی ہذا القیاس۔

عقبہ بن عامر سے امام احمد کے ہاں اس میں ابن لھیعہ راوی ہیں اور یہ سب حدیثیں اگرچہ ضعیف ہیں لیکن ایک کی دوسری سے قوت ہو جانے کے باعث اس کا علم یقیناً ہو جاتا ہے کہ نبی ﷺ سے اس بارے میں ایسی نہی وارد ہے، جواب کسی طرح رد نہیں ہو سکتی لہٰذا اس کا قائل ہونا بے شک واجب ہے، واللہ اعلم۔ اور جو لوگ اس فعل کے مباح ہونے کے قائل ہیں انہوں نے ابن عمرؓ کی روایت کو اپنی دلیل بنایا ہے جو ان سے بہت سے طریقوں کے ساتھ صحیح طور پر مروی ہے کہ عورتوں کی دبر میں وطی کرنے کی بابت انہوں نے فرمایا نساؤکم حرث لکم فأتو احرثکم انی شئتم (یعنی تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں اب تم اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو آؤ) اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور اسی طرح طبرانی نے بہت عمدہ سند کے ساتھ ان سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا یہ آیت دبر میں وطی جائز ہونے کے بابت نازل ہوئی ہے۔ ابن عمرؓ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں ایک آدمی نے عورت کی دبر میں وطی کر لی تھی لوگوں نے اسے برا بھلا کہا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نساؤکم حرث لکم (الآیہ) نازل فرمائی۔

اسی طرح ابن جرید، ابو یعلی ابن مردویہ عبد اللہ بن نافع کی سند سے انہوں نے ہشام سعد سے انہوں نے زید بن اسلم سے انہوں نے عطا بن یسار سے انہوں نے ابو سعید خدری سے یہ روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے ایک عورت کی دبر میں وطی کر لی تھی لوگوں نے اسے اس پر لعنت ملامت کی تو اللہ تعالیٰ نے نساؤکم حرث لکم آیت نازل فرمائی۔

میں کہتا ہوں کہ ابن عمرؓ اور ابو سعید خدری دونوں کا یہ وہم ہے اس آیت کے معنی میں دونوں نے غلطی کھائی ہے اور اگر اس آیت کے نازل ہونے کا یہی سبب تھا (جو ان دونوں نے بیان کیا ہے) تو حکم واقعہ کے مطابق نہیں ہوتا اس لئے کہ فاتوا حرثکم انی شئتم اللہ تعالیٰ کا فرمان کھیتی میں جانے کا حکم ہے نہ کہ دبر میں وطی کرنے کا کیونکہ یہ کھیتی کا موقع ہی نہیں ہے

marfat.com

لہٰذا دبر کے مباح کرنے پر یہ آیت حجت ہرگز نہیں بن سکتی۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ وہم نافع کا ہے کیونکہ عبداللہ بن حسن سے مروی ہے کہ وہ سالم بن عبداللہ سے ملے اور ان سے کہا کہ اے ابو عمر وہ کیسی حدیث ہے جو نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عمرؓ عورتوں کی دبر میں وطی کرنے میں کچھ برائی نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ نافع جھوٹ بولتا ہے اور اس کی غلطی ہے بلکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ عورتوں کے پیچھے سے ہو کر فرجوں ہی میں وطی کیا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سالم کا قول بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ ابن عمر سے اس کو روایت کرنے میں نافع ہی تنہا نہیں ہیں بلکہ اس کو زید بن اسلم، عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر، سعید بن یسار وغیرہ نے بھی ابن عمر سے روایت کیا ہے اسی طرح شیخ ابن حجر عسقلانی نے ذکر کیا ہے۔ پس صحیح یہ ہے کہ یہ وہم تو یقیناً ابن عمر ہی سے ہوا ہے اور ابن عمرؓ سے اس وہم ہونے کا رأس المفسرین حضرت ابن عباسؓ نے بھی حکم کیا ہے، ابو داؤد اور حاکم نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ ابن عمرؓ کی خدا مغفرت کرے ان سے یہ غلطی ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انصاری کے ایک قبیلہ کے لوگ پہلے بت پرست تھے ان کا زیادہ میل جول ایک یہودی قبیلہ کے ساتھ تھا وہ اہل کتاب تھے یہ (بے چارے) انصار علم میں انہیں اپنے سے افضل سمجھتے تھے اسی لئے ان کے افعال میں اکثر ان کا اقتداء کر لیتے تھے اور اہل کتاب کی یہ عادت تھی کہ وہ عورتوں سے فقط ایک ہی طرف سے وطی کرتے تھے اور اس میں عورت کے لئے پردہ زیادہ رہتا ہے پس انصار کے اس قبیلہ نے یہ ان ہی کا طریقہ لے لیا تھا۔ قریش کے قبیلہ کے لوگ عورتوں کو خوب چرتے تھے اور کبھی سیدھی کبھی الٹی کبھی چت لٹا کے خوب ان سے مزے لیتے تھے۔

پھر جب مہاجرین مدینہ منورہ میں آئے تو ان میں سے ایک شخص کا نکاح انصاریہ عورت سے ہو گیا یہ مہاجر اس عورت کے ساتھ بھی ویسا ہی کرنے لگے اس عورت نے اس کو برا سمجھ کر انکار کر دیا اور کہا ہمارے ہاں تو فقط ایک ہی طرح سے ہم بستری کی جاتی ہے پھر ان کا یہ قصہ سب لوگوں میں پھیل گیا اور رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ نساؤکم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم یعنی خواہ انہیں سیدھی الٹی خواہ چت لٹا کر کسی طرح کرو اور مراد اس سے ولادت ہی کی جگہ تھی (نہ کہ دبر) اس آیت کے شان نزول میں اسی طرح بخاری، ابو داؤد، ترمذی نے جابرؓ سے روایت کی ہے۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ یہود کہا کرتے تھے کہ جس وقت عورت سے کوئی پیچھے سے صحبت کرے تو بھینگا بچہ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا کیا اور فرمایا کہ نساؤکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم یعنی پیشاب گاہ میں تو جس طرح کر لو اللہ تعالیٰ کا مقصود اس سے بچہ پیدا ہونے ہی کی جگہ ہے کہ وہ کھیتی کے لئے ہے۔ اسی طرح امام احمدؒ نے عبدالرحمن بن ثابت سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں عبدالرحمن کی بیٹی حفصہؓ کے پاس گیا میں نے کہا کہ میں تم سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن تم سے پوچھتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے کہنے لگیں کہ بھتیجے شرم نہ کرو (پوچھو) میں نے کہا عورتوں کی دبر میں وطی کرنے کو پوچھتا ہوں فرمایا یہود کہا کرتے تھے کہ جو کوئی عورت کو پھیر کے وطی کرے تو اس کا بچہ بھینگا ہو گا۔ پھر جب مہاجر لوگ مدینہ منورہ میں (مکہ سے ہجرت کر کے) آئے تو انصار کی عورتوں سے ان کی شادیاں ہونے لگیں اور انہوں نے عورتوں کو پھیر کے وطی کی تو ایک عورت نے اپنے میاں کا کہا ماننے سے انکار کر دیا اس نے کہا کہ جب تک رسول اللہ ﷺ نہ آجائیں ہم اس طرح نہ کرائیں گے۔ پھر میں ام سلمہؓ کے پاس گئی اور ان سے یہ قصہ مین نے ذکر کیا وہ بولیں کہ بیٹھ جاؤ حضرت ﷺ کو آنے دو (دریافت کر لیں گے) جب حضرت ﷺ تشریف لائے تو اس انصاریہ کو تو آپ ﷺ سے دریافت کرتے ہوئے شرم آئی وہ تو نکل کے چلی گئی اور ام سلمہؓ نے حضرت ﷺ سے یہ قصہ بیان کیا آپ نے فرمایا اس انصاریہ کو بلا لو وہ بلائی گئی تو (اس کے آنے پر) حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر اسے سنائی کہ (نساؤکم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم (یعنی راستہ تو ایک ہی ہے اور اس میں جس طرح چاہے کر لیا کرو)۔

امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ عمرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں تو ہلاک ہو گیا۔ فرمایا کیا سبب، عرض کیا کہ رات میں نے (صحبت کرتے ہوئے) اپنی بی بی کو پھیر لیا تھا اور

marfat.com

اس نے کچھ انکار نہ کیا اسی وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ الآیہ) تب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جاؤ چت پٹ جس طرح چاہو کرلو لیکن دبر اور ایام کی حالت میں بچا کرو۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر یہی فرمائی کہ چت پٹ جس طرح چاہو کرو لیکن دبر اور ایام کی حالت میں نہ کیا کرو جیسا کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے قول فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ[1] کی تفسیر فرمائی تھی کہ اصنعوا کل شئی الا النکاح (یعنی سوائے وطی کے سب کچھ کرلیا کرو) اگرچہ بظاہر یہ آیت اس پر بھی دلالت نہ کرتی تھی کہ عورتوں کے کھانے پینے میں شریک رہنا جائز ہے پس اس سے اس روایت کا رد صاف ظاہر ہو گیا جو ابن عبدالحکم نے امام شافعیؒ سے نقل کی ہے کہ یہ آیت دبر (میں وطی کرنے) کو حرام کرنے والی نہیں ہے جیسا کہ یہ پنڈلی میں وطی کرنے کو حرام نہیں کرتی۔

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ ط (اور اپنے لئے (اعمال صالحہ) آگے بھیجو) یعنی صحبت کرنے سے فقط اس وقت کی لذت ہی مقصود نہ رکھو بلکہ ان فائدوں کا قصد کرو جو دین کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ مثلاً حرام کاری سے بچنا، نیک اولاد ہونا کہ تمہارے لئے دعا اور استغفار کرے اور مر جائے تو قیامت میں پیش خیمہ ہو کیونکہ مباح امور اگر خالص صحیح نیت کے زیر اثر ہوں تو عبادت بن جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ تمہارے صحبت کرنے میں بھی ثواب ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنی شہوت پوری کریں تو جب بھی ہمیں اجر ملتا ہے۔ فرمایا تم ہی بتاؤ اگر کوئی حرام کاری کرے تو کیا اس کا اس کے ذمے گناہ نہیں ہوتا۔ پس اسی طرح اگر کوئی حلال جگہ کرے گا تو اسے اجر بھی ملے گا۔ اس کو مسلمؒ نے ابوذرؓ کی حدیث میں نقل کیا ہے۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے عمل سب ختم ہو جاتے ہیں سوائے تین چیزوں کے یا تو صدقہ جاریہ ہو، یا علم ہو جس سے (اس کے مرنے کے بعد) لوگ فائدہ اٹھائیں، یا نیک اولاد ہو کہ اس کے حق میں دعا کرے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے اور ابوہریرہؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس مسلمان کے تین بچے مر جائیں تو اسے دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی، ہاں قسم پوری ہونے کے لئے یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک انصاری عورت سے فرمایا تھا کہ تم میں سے جس کے تین بچے مر جائیں اور وہ ان پر صبر کرتی رہے تو ضرور بہشت میں جائے گی۔ ایک عورت نے کہا یا رسول یا دو ہوں فرمایا ہاں دو بھی اس کو بھی مسلم نے نقل کیا ہے اور ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے (حضور ﷺ نے فرمایا) کہ میری امت میں سے جس کے دو (بچے) بھی پیش خیمہ ہوں گے تو ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بہشت میں بھیج دے گا۔ حضرت عائشہؓ کہنے لگیں کہ آپ کی امت میں سے جس کا ایک بچہ ہی ہو، فرمایا ایک والی کا بھی یہی حکم ہے، الحدیث۔ یہ روایت ترمذی نے نقل کی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وقد موا لانفسکم پہلی آیت فاتوا حرثکم کے لئے عطف تفسیری ہو اور معنی یہ ہوں کہ تمہارے اپنی کھیتی میں جانے (یعنی اپنی بی بی سے ہم بستری کرنے) میں تمہارے ہی لئے پیش خیمہ بنانا اور دعوات اور استغفارات کرانا ہے یعنی اگر نیک اولاد ہو جاوے۔ اس سے نکاح کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے اگرچہ اس کی نیک نیتی نہ ہو۔ عطا اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس (وقد موا لانفسکم) سے وطی کرتے وقت بسم اللہ اور دعا پڑھنی مراد ہے۔ امام بخاری نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ نبی نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی اپنی عورت سے صحبت کرتے وقت یہ دعا پڑھ لیا کرے اللّٰھم جنّبنا الشیطان وجنّب الشیطان ما رزقتنا تو اگر ان مرد وعورت کے مقدر میں اس صحبت سے کوئی بچہ ہو گا تو اسے شیطان کبھی ضرر نہ دے گا

وَاتَّقُوا اللّٰہَ (اور اللہ سے ڈرو) یعنی گناہوں سے بچنے کے ساتھ۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ مُّلٰقُوْہُ ط (اور جان لو کہ تمہیں (ایک نہ ایک روز) اس سے ملنا ہے) پس وہ تمہیں تمہارے

[1] ترجمہ:- عورتوں سے بحالت حیض جدا رہو، ۱۲۔

marfat.com

اعمال کی جزا دے گا اگر نیک عمل ہیں تو نیک جزا ملے گی اور اگر برے عمل ہیں تو بری سزا ملے گی۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ (اور (اے محمد ﷺ) مسلمان کو خوشخبری سنادو) صہیبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مسلمان کا عجیب حال ہے اگر اسے خوشی ہوتی ہے اور (اللہ کا) شکریہ ادا کرتا ہے تب بھی اس کے لئے بہتری ہوتی ہے اور اگر کوئی تکلیف ہو جائے اور اس پر صبر کر لیتا ہے تب بھی اس کے لئے بہتری ہوتی ہے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے۔

شان نزول :- بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن رواحہ اور ان کے بہنوئی بشیر بن نعمان انصاری کے درمیان میں کوئی ایسی بات ہو گئی کہ عبد اللہ نے قسم کھالی کہ نہ بشیر کے پاس کبھی جاؤں گا اور نہ ان سے بولوں گا نہ ان کے اور ان کے مخالف کے درمیان میں کبھی صلح کراؤں گا۔ جب عبد اللہ سے اس کی بابت کوئی کچھ کہتا تو جواب دے دیتے کہ میں نے تو اللہ کی قسم کھائی ہے کہ میں ایسا نہ کروں گا لہٰذا اب بلا قسم سے بری ہوئے مجھے یہ جائز نہیں ہے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (اور اللہ کو اپنی قسموں کی آڑ نہ بناؤ) عرضۃ کے معنی روکنے والی چیز کے ہیں مراد یہ ہے کہ تم اللہ کی قسم کو نیکیوں سے روکنے والی چیز نہ کر لو اور ایمان سے مراد وہ امور ہیں جن پر قسم کھائی جاتی ہے۔

اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ (کہ سلوک کرو اور پرہیزگاری کرو اور لوگوں میں صلح کراؤ) ان تبروا مع اپنے معطوفوں کے ایمانکم کا عطف بیان ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ لایمانکم میں لام علت کا ہو اور ان فعل لاتجعلوا یا عرضۃ کے متعلق ہو یعنی لَاتَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لاجل ایمانکم لان تبروا (یعنی اللہ تعالیٰ کی قسم کو لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے سے تم آڑ نہ بناؤ) کہ تم اللہ تعالیٰ کی قسم کھالو کہ فلاں شخص کے ساتھ سلوک نہ کریں گے اور کبھی عرضہ کا اطلاق ایسی چیز پر ہوتا ہے جو دوسری شئے کے سامنے گاڑ دی جائے (جیسے نشانہ) عرب کا محاورہ ہے جعلتہ عرضۃ لکذا یعنی فلاں کام کے واسطے فلاں شئے کو میں نے گاڑ دیا۔ تو اب یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو کہ ہر بات میں اس کی قسم کھانے لگو۔

قاموس میں ہے العرضۃ الاعتراض فی الخیر والشر اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ (ہر وقت) خدا کی قسم نہ کھایا کرو (آخر کی دو صورتوں میں) ان تبروا یا تو نہی کی علت ہو گی یعنی تمہیں قسم سے منع کیا جاتا ہے تاکہ تم متقی ہو جاؤ یا منہی کی علت ہو گی اس صورت میں ایک لا مقدر مانا جائے گا۔ یعنی زیادہ قسمیں نہ کھایا کرو (کہ زیادہ قسمیں کھانے سے) تم پرہیزگار نہ ہو گے (اور لوگوں میں تمہارا اعتبار نہ رہے گا تو لوگوں میں صلح کرانا جو اہم کام ہے اس کو انجام نہ دے سکو گے)۔

اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ زیادہ قسمیں کھانا مکروہ ہے اور یہ بھی کہ زیادہ قسمیں کھانے والا اللہ پر جرأت کرنے والا ہے نہ وہ صالح پرہیزگار ہوتا ہے اور نہ لوگوں میں صلح کرانے کے اندر وہ اعتبار کے قابل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یا تو قسم ٹوٹ جاتی ہے یا اس سے ندامت ہوتی ہے۔ یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ حاکم نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے اور بخاری نے اپنی تاریخ میں نقل کی ہے ایک امر یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ جو شخص کسی نیک عمل کے چھوڑنے کی قسم کھالے تو اس پر واجب ہے کہ اپنی (اس) قسم کو نیکی کرنے سے آڑ نہ بنائے۔ بلکہ قسم توڑ کے کفارہ دے دے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص قسم کھالے اور پھر اسے اس کے خلاف میں بہتری معلوم ہو تو چاہئے کہ اپنی اس قسم کا کفارہ دے کر جو بہتر ہے اسے کر لے۔

یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے، صحیحین میں عبد الرحمٰن بن سمرہؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ فرماتے تھے کہ خدا کی قسم انشاء اللہ تعالیٰ میں جس بات پر کبھی قسم کھاؤں گا اور پھر اس کے خلاف کو اس سے بہتر دیکھوں گا تو میں اپنی قسم کا کفارہ دے کر ضرور اسی کو کروں گا جو اس سے بہتر ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت حضرت صدیق اکبرؓ کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ یعنی جس وقت آپ نے قسم

marfat.com

کھائی کہ مسطح کے ساتھ کبھی سلوک نہ کروں گا۔ کیونکہ اس نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگائی تھی۔ یہ روایت ابن جریرؒ نے ابن جریجؒ سے نقل کی ہے۔

وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۴﴾ (اور اللہ سنتا اور جانتا ہے) یعنی تمہاری قسموں کو سنتا اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ (اللہ تم سے مواخذہ نہ کرے گا) یعنی آخرت میں عذاب کے ساتھ یہاں دونوں کلموں میں مواخذہ مراد ہے۔

اور اسی طرح (سورۂ مائدہ) میں نہ کہ جیسا بعض نے کہا ہے کہ سورۂ مائدہ دنیوی مواخذہ کفارہ کے ساتھ مراد ہے یا عمومی مواخذہ مراد ہے۔

(یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے) کیونکہ کفارہ زکوٰۃ کی طرح خالص اللہ ہی کا حق ہوتا ہے، اس کا دنیا میں مواخذہ نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے (یہ حکم ہے کہ) جو شخص مرجائے اور کے ذمہ زکوٰۃ یا کفارہ ہو اور اس نے وصیت نہ کی ہو تو وارثوں کے حق سے ان دونوں کو کوئی تعلق نہ ہوگا بخلاف بندوں کے قرض اور عشر اور خراج کے (کہ یہ تینوں ورثہ کے حق میں سے لے لئے جائیں گے) اس کے علاوہ صرف قسم (کھانے سے کفارہ لازم نہیں ہوتا بلکہ قسم کے بعد اس کے توڑنے سے لازم آتا ہے۔ پس قسم کے ساتھ کفارہ کے مواخذہ کو متعلق کرنا ہرگز خیال میں نہیں آتا لہٰذا مواخذہ سے مراد عذاب ہی ہے اور کفارہ اس مواخذہ کو رفع کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے۔

بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ (تمہاری قسموں میں بیہودہ پر) لغت میں لغو ایسی نکمی چیز کو کہتے ہیں جس کا اعتبار نہ کیا جاتا ہو کلام میں ہو یا اور کسی چیز میں۔

قاموس میں اسی طرح ہے۔ یہاں اس سے وہ قسم مراد ہے جو زبان سے بلا خیال اور بلا قصد کے نکل جائے، خواہ انشاء میں ہو یا خبر میں، ماضی میں ہو یا مستقبل میں۔ یہی تفسیر حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

امام شافعیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ آدمی کی لغو قسم اس طرح کہنا ہے کہ لا واللّٰہ، بلٰی واللّٰہ۔ یہی روایت ابو داؤد نے مرفوعاً نقل کی ہے۔ شعبیؒ اور عکرمہؒ بھی اسی طرف گئے ہیں امام شافعیؒ کا قول بھی یہی ہے اور لغوی معنی مذکور کے یہی مناسب بھی ہے۔ کیونکہ جب یہ بلا قصد ہے تو یہ اعتبار کرنے کے قابل نہیں ہے اور نہ اس سے اجماعاً گناہ ہوتا ہے۔ اگر یہ اخبار میں ہو۔

اسی طرح امام شافعیؒ کے نزدیک اس وقت قسم منعقد نہیں ہوتی، جب اس طریق کی قسم انشاء میں ہو اور اس کو توڑ دے (یعنی اگر ایسی قسم کو توڑ دے) تو اس کے ذمہ کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ ان کی دلیل یہی آیت اس تفسیر کے ساتھ ہے۔

اور امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ قسم منعقد ہو جاتی ہے اور حانث ہو جانے پر کفارہ دینا لازم ہوگا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ثلٰث جد ھن جد و ھز لھن جد النکاح والطلاق والیمین (یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو سچ مچ کہنا تو سچ مچ ہوتا ہی ہے۔ لیکن ان کو ہنسی سے کہنا بھی سچ مچ ہی ہوتا ہے (وہ تینوں یہ ہیں) نکاح، طلاق، قسم۔

اسی طرح صاحب ہدایہؒ نے کہا ہے۔ یہ حدیث ہمیں حدیث کی کتابوں میں نہیں ملی، ہاں ابو ہریرہؓ کی حدیث ہمیں اس سند سے ملی ہے کہ عبد الرحمٰن بن حبیب نے عطاء سے انہوں نے یوسف بن ماھک سے انہوں نے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ ثلٰث جدھن جد وھزلھن جد النکاح والطلاق والرجعۃ (یعنی نکاح، طلاق، رجعت۔ ان تینوں کا یہ حکم ہے جو پہلے مذکور ہوا۔

اس روایت کو امام احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم اور دار قطنی نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے حاکم نے صحیح کہا ہے۔

ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عطا عجلان کے بیٹے ہیں جو حدیث میں متروک ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا یہ ابن جوزی کا وہم

marfat.com

ہے کیونکہ وہ عطا ابی رباح کے بیٹے ہیں (عجلان کے بیٹے نہیں ہیں اور عبد الرحمن بن حبیب میں بھی محدثین کا اختلاف ہے۔
امام نسائی فرماتے ہیں کہ یہ منکر الحدیث ہیں۔ لیکن اوروں نے ان کی توثیق بھی کی ہے پس یہ حدیث حسن ہے۔
اور اسی کو ابن عدی نے کامل میں ان لفظوں سے نقل کیا ہے۔ ثلث لیس فیھا لعب من کلم بشئی منھا لا عبا فقد وجب الطلاق والعتاق و النکاح یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی نہیں ہوتی جو شخص انہیں ہنسی کے طور پر زبان سے نکال دے وہ اس کے ذمہ لازم ہو جائیں گی (وہ یہ ہیں) نکاح، طلاق، عتاق۔
اس میں ابن لھیعہؒ راوی ضعیف ہیں اور عبد الرزاق نے حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے موقوفاً روایت کی ہے ان دونوں نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مزاح نہیں ہوتا۔ نکاح، طلاق، عتاق۔
اور ایک روایت ان ہی دونوں سے یہ ہے کہ ایسی چار چیزیں ہیں اور نذر کا لفظ زیادہ کیا ہے۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں اس میں شک نہیں کہ قسم بھی نذر کے معنی میں ہے پس اس کو بھی نذر پر قیاس کر لیا جائے گا۔
میں کہتا ہوں کہ جو امام شافعیؒ نے ذکر کیا ہے وہ مرفوع حدیث ہے جو آیت کے لئے تفسیر اور بیان ہو گیا ہے اور نص کے مقابلہ میں قیاس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ مقیس علیہ فقط ایک موقوف اثر میں وارد ہے وہ مرفوع نہیں ہے۔
ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر قسم کی حدیث ثابت بھی ہو جائے تو اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس میں تو فقط اتنا مذکور ہے کہ ہنسی سے قسم کھانے والا بمنزلہ جان بوجھ کر قسم کھانے والے کے شمار ہوگا اور ہنسی سے قسم کھانے والا ارادہ سے قسم کھانے والا ہے ہاں اس کے حکم سے راضی نہیں ہے۔ پس ارادی تخلیق سبب کے بعد اس کے رضامند نہ ہونے کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ اور بھول کر کوئی بات کہنے والا تو کسی شئے کا قصد بھی نہیں کرتا ہے اور نہ اس کو یہ خبر ہوتی ہے کہ میں کیا کرتا ہوں اور اسی طرح غلطی سے کہہ دینے والا ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کو زبان سے نکالنے کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ اس کا ارادہ کوئی اور بات کہنے کا ہوتا ہے (اور غلطی سے نکل کچھ جاتا ہے) پس یہ بھی ہنسی سے کہنے والے کے حکم میں نہیں ہے لہٰذا اس کے بارے میں نہ کوئی نص ہے اور نہ قیاس ہے اس کے علاوہ لغو قسم کی تفسیر میں امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی شئے پر یہ سمجھ کر قسم کھالے کہ میں اس میں سچا ہوں پھر اسے اس کے خلاف ظاہر ہو تو اس کو لغو قسم کہا جائے گا۔
زہریؒ، حسنؒ، ابراہیم نخعیؒ کا یہی قول ہے اور قتادہؒ اور مکحولؒ فرماتے ہیں کہ ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ کچھ گناہ ہے۔ باوجود یہ کہ اس میں قسم کھانے والے کا ارادہ قسم کا ضرور ہوتا ہے اگرچہ یہ گمان بھی اس کو ہوتا ہے کہ میں اس میں بری ہوں پس جس قسم کا کسی نے ارادہ ہی نہیں کیا بلکہ وہ مثل سونے والے کے تھا کہ کچھ اس کی زبان سے نکل گیا تو اس کی قسم کا اعتبار نہ کیا جانا اولیٰ درجہ ہے۔
امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ جو قسم ارادہ کے ساتھ ہو اگرچہ سچ بھی ہونے کے گمان پر ہو اگر وہ نفس الامر کے خلاف ہو گی تو اس میں کفارہ دینا واجب ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تفسیر کے مطابق یہ قسم لغو قسم میں سے نہیں ہے بلکہ یہ قلبی کسب میں سے ہے۔ جیسے (یمین) غموس ہوتی ہے۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ وہ اپنے گمان کے باعث معذور ہے اس لئے اس میں گناہ نہیں ہوگا۔
میں کہتا ہوں کہ اگرچہ یہ قسم (لغو قسم) میں سے نہیں ہے، لیکن نہ اس میں کفارہ ہے اور نہ گناہ ہے۔ گناہ ہونے کی دلیل تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (یعنی جو تمہارے منہ سے غلطی سے نکل جائے اس میں تم پر گناہ نہیں ہے ہاں جس کا تم دل سے ارادہ کر کے کہو) اور کفارہ نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کفارہ کا دار و مدار تو گناہ ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ کفارہ گناہ رفع کرنے کے لئے ہے اور جب گناہ نہیں تو کفارہ بھی نہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ قسم فیما عقدتم الایمان میں داخل نہیں ہے حالانکہ کفارہ اسی طرف راجع ہوتا ہے اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ (تمہارے کہنے کے مطابق) اگر کفارہ کا دار و مدار گناہ ہی پر ہے تو از روئے اجماع وحدیث خطأ اور نسیان میں تو گناہ نہیں ہوتا، پس

marfat.com

(اس قاعدہ کے مطابق) خطأ سے قتل کر دینے پر بھی کفارہ نہ ہو گا۔
ہم کہتے ہیں قتل کر دینا بہت سخت کام ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے (اس میں) دو گناہ مقرر کئے ہیں۔ ایک گناہ تو اس جان کے مارنے (یعنی خون کرنے) کا اور یہ کبیرہ گناہ ہے جو جان کے قتل کر دینے میں ہوتا ہے اور یہ کفارہ سے رفع نہیں ہوتا اسی لئے اس میں کفارہ واجب ہونے کے ہم قائل نہیں ہیں اور خطأ سے قتل کر دینے میں یہ گناہ رفع ہو جاتا ہے اور دوسرا گناہ احتیاط نہ کرنے کا ہے اور اسی گناہ کی وجہ سے خطأ سے قتل کر دینے میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ قسم لغو وہ ہے جو معصیت پر ہے اس میں حانث ہو جانے پر اللہ مواخذہ نہیں کرتا بلکہ اس میں حانث ہو جائے اور کفارہ دے دے اور اس قول پر لغو اور منعقدہ دونوں قسمیں ایک ہو جائیں گی۔ حالانکہ آیت دونوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے پر دلالت کرتی ہے جو شرکت کے بالکل منافی ہے اس کے علاوہ کفارہ واجب ہونے کا قائل ہونا مواخذہ نہ ہونے کے منافی ہے۔ کیونکہ کفارہ تو گناہ ہی پر مبنی ہوتا ہے اور مسروق فرماتے ہیں کہ معصیت پر قسم کھانے میں کفارہ نہیں ہے۔ کیا کہیں شیطانی لغزشوں پر بھی کفارہ دیا جاتا ہے اور شعبی نے ایک آدمی کے حق میں فرمایا تھا جس نے معصیت کرنے پر قسم کھالی تھی کہ اس کا کفارہ یہی ہے کہ اس معصیت سے توبہ کرلے۔ میں کہتا ہوں کہ معصیت پر قسم کھالی تو اللہ تعالیٰ کے قول ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان کے عموم میں داخل ہے کیونکہ اس قسم میں تو اس کے پورا کرنے کا ارادہ یقینی ہوتا ہے۔ پس وہ منعقدہ میں سے ہوئی نہ کہ لغو میں سے اور منعقدہ قسم کفارہ واجب کر دیتی ہے ہاں اس کا معصیت پر ہونا اس کے توڑ دینے کو واجب کرتا ہے اور یہ بعینہٖ آنحضرت ﷺ کے اس قول کا مقتضیٰ ہے کہ فَلْيُكَفِّرْ وَلْيَأْتِ بِمَا هُوَ خَيْرٌ، واللہ اعلم۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (لیکن ان قسموں پر تم سے مواخذہ کرے گا جن کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہے) یعنی جس جھوٹی قسم کا تم نے قصد اور ارادہ کیا ہو اور قصد و ارادہ ہی سے معصیت کے مرتکب ہوئے ہو۔ ہم نے یہ تفسیر مواخذہ کے قرینہ سے کی ہے۔ کیونکہ مواخذہ تو معصیت ہی پر ہوتا ہے پس اس قید سے سچی قسمیں سب نکل گئیں اور وہ قسمیں بھی جو سچی ہونے کے خیال سے ہوں اور اسی طرح اس قید سے منعقدہ (قسم) بھی نکل جاتی ہے کیونکہ اس میں بھی (فقط قسم کھانے میں) معصیت نہیں ہوتی بلکہ قسم کھانے کے بعد حانث ہو جانے میں ہوتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ سورۂ مائدہ میں یہ آیت ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ (یعنی اللہ تم سے ان پر ضرور مواخذہ کرے گا جن قسموں کا تم نے ارادہ کیا ہو) اور یہ معصیت ہونے اور اس پر مواخذہ ہونے پر دلالت کرتی ہے پھر تم کیونکر کہتے ہو کہ اس سے منعقدہ قسم نکل گئی، الی آخرہ میں کہتا ہوں وہاں تقدیر کلام کی یہ ہے لیکن اللہ تم سے ان قسموں پر مواخذہ کرے گا جن کا تم نے ارادہ کیا ہو اگر تم حانث ہو جاؤ اور یہاں یہ تقدیر نہیں ہے کیونکہ تقدیر بھی مجاز کی ایک قسم ہے اور حقیقت اور مجاز دونوں جمع نہیں ہوتے ہیں اور (یمین) غموس پر مواخذہ محض قسم کھانے سے ہوتا ہے۔ پس اس آیت سے مراد فقط یمین غموس باقسامہ ہے اور یہاں وہ تقدیر نہیں ہے اور سورۂ مائدہ کی آیت سے مراد فقط منعقدہ قسم ہے اور اس میں یہ تقدیر ہے، واللہ اعلم۔

اور امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ بماکسبت قلوبکم اور بما عقدتم الایمان دونوں کا مطلب ایک ہی ہے اور وہ لغو (قسم) کی ضد ہے۔ (عرب) کہتے ہیں کہ قلب کا کسب عقد اور نیت ہے پس ماکسبت قلوبکم اور ماعقدتم الایمان دونوں (یمین) غموس (یمین) منعقدہ (یمین) مظنونہ سب کو شامل ہیں لہٰذا ان سب میں کفارہ دینا واجب ہو گا۔ ہم کہتے ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ عقد یمین (یعنی منعقدہ قسم) سے مراد یہ ہے کہ قسم کھا کر اپنے اوپر ایک چیز کو ایسا لازم کرلینا کہ اس کا پورا کرنا اس آیت کی وجہ سے واجب ہو يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (یعنی اے ایمان والو اپنے عقدوں کو پورا کیا کرو) اور اس میں نہ کوئی معصیت ہے اور نہ کچھ مواخذہ ہے ہاں حانث ہونے کے بعد۔ اور کسب قلب حضرت عائشہؓ کی تفسیر کے مطابق لغو قسم کی ضد ہے۔ پس وہ اس سے مطلقاً عام ہے لیکن مواخذہ کے قرینہ سے آیت میں بلا کسی قسم کی تقدیر کے ہم اسے اس معصیت پر حمل کرتے ہیں جو محض قسم کھانے سے حاصل ہو بس یہ فقط (یمین غموس ہی ہے اور غموس میں کفارہ نہیں ہے کیونکہ اللہ کے قول

marfat.com

فکفارتہ، کی ضمیر فقط ما عقد تم الایمان کی طرف راجع ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ غموس محض کبیرہ گناہ ہے پس اگر اس قسم پر کفارہ واجب ہوگا۔ تو پھر یہ کفارہ غموس کی معصیت کے لئے یا تو اسے چھپانے اور زائل کرنے والا ہوگا یا نہ ہوگا اگر نہیں ہے تو کفارہ کفارہ نہ رہا اور اگر ہے تو پھر یہ بہت سی صورتوں کو شامل ہے۔ مثلاً کوئی جھوٹی قسم کھا کے کسی مسلمان کا مال دبا لے پھر اس کا کفارہ دے دے (تو تمہارے قول کے مطابق یہ بری ہو جائے گا) حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (یعنی اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے) اور فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ پانچوں نمازیں اور جمعہ دوسرے جمعہ تک اور رمضان دوسرے رمضان تک اپنی درمیانی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں جب تک کہ آدمی کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔ پس اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ طاعات صغیرہ ہی گناہوں کے کفارہ ہوتے ہیں کبیرہ کے نہیں ہوتے۔ باقی رہے کبیرہ گناہ سو ان سے خلاصی ہونے کی صورت سوائے استغفار کے اور کوئی نہیں ہے، ہاں اگر اللہ اپنی رحمت سے اسے چھپا لے اور اس کی مغفرت کر دے اور شاید اللہ تعالیٰ نے اپنے اس آئندہ قول سے اسی طرف اشارہ کیا ہو کہ

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ (اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے) اگر وہ چاہے تو توبہ سے یا بلا توبہ بھی کبیرہ گناہوں کو بخش دیتا ہے اور یہ مغفرت اور بردباری کا وعدہ بظاہر اس آیت کی طرف راجع ہے کہ لا یؤاخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم کیونکہ رفتار کلام لغو قسم ہی کی بابت ہے اور یمین غموس اس کے تابع ہونے کے طور پر ذکر کر دی گئی ہے اس پر بخاری کی وہ روایت جو انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نقل کی ہے دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے فرمایا آیت لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ ایسے شخص کے بارے میں نازل کی گئی ہے جو کہتا تھا لا واللّٰہ وبلٰی واللّٰہ، واللہ اعلم۔ جاننا چاہئے کہ یمین کے معنی اصل میں قوت کے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لاخذ نا منہ بالیمین (یعنی بے شک ہم نے اسے قوت کے ساتھ پکڑ لیا) اور بائیں ہاتھ کے خلاف عضو کو (یعنی سیدھے ہاتھ کو) بھی اس کی قوت ہی کی وجہ سے یمین کہتے ہیں اور قسم کو بھی یمین اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا نام بول کر اس میں کلام کی تقویت ہو جاتی ہے۔ قسم دو طرح کی ہوتی ہے اول قسم یہ کہ بلا ارادہ زبان سے نکل جائے خواہ وہ گذشتہ خبر کے متعلق ہو یا آئندہ کے متعلق۔ صادق ہو یا کاذب ہو یا انشاء میں ہو اسی کا نام لغو یمین ہے اور اس کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا نہ اس کے ساتھ کوئی حکم متعلق ہوتا ہے۔ سوائے اس کے جو ہم بیان کر چکے ہیں انشاء میں امام ابو حنیفہؒ کا خلاف ہے۔ دوسری قسم وہ جو ارادہ سے ہو اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں یا تو خبر میں ہو یا انشاء میں۔ اگر خبر میں ہے تو وہ خبر اگر فی الواقع اور متکلم کے گمان میں بھی سچی ہے مثلاً تم نے یہ کہا قسم ہے اللہ کی محمد ﷺ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور قیامت یقیناً آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور آفتاب یقیناً نکلا ہوا ہے تو اس میں کسی قسم کا کلام نہیں ہے کہ ایسی قسم بے شک عبادت ہے اسی واسطے اللہ کے سوا اور کسی کی قسم کھانی جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں منع کرتا ہے کہ تم اپنے باپ دادوں کی قسمیں کھایا کرو۔ جسے قسم کھانی ہو وہ اللہ ہی کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ ابن عمرؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ سے میں نے خود سنا کہ جس نے اللہ کے سوا اور کسی کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے باپ دادوں اور ماؤں اور بتوں کی قسمیں ہرگز نہ کھایا کرو اور اللہ کی بھی قسم نہ کھاؤ، ہاں اگر تم سچے ہو۔ یہ حدیث ابو داؤد اور نسائی نے نقل کی ہے اور اگر خبر فی الواقع جھوٹی ہے اور متکلم اسے اپنے گمان میں سچ سمجھ رہا ہے تو پھر دیکھنا چاہئے کہ اگر اس کا گمان کسی ظنی دلیل پر مبنی ہے۔ جیسے خبر واحد کہ اس میں کسی راوی نے جھوٹ بول دیا ہے یا اس کے معنی میں غلطی کر دی ہو یا کسی سلف صالح کا اثر ہو یا حس وغیرہ میں غلطی ہو گئی ہو اور اس کے جھوٹ پر کوئی یقینی دلیل وہاں نہ ہو تو امام ابو حنیفہؒ کی تفسیر کی مطابق اسی کا نام یمین مظنون اور یمین لغو ہے اور اس کا حکم ہم بیان کر چکے ہیں اور اگر اس کا گمان کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے (مثلاً کوئی بلا جانے بلا دیکھے بلا کسی کے خبر دیئے یہ کہہ دے کہ زید کھڑا ہے یا اب کھڑا ہوگا) تو اس کا نام یمین غموس ہے۔ جس سے منع کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولا

ع نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

marfat.com

تقف مالیس لک بہ علم (اور نہ در پے ہو اس چیز کے جس کا تجھے علم نہ ہو)۔
اور اگر کسی کے جھوٹے پر دلیل بھی قائم ہو تو وہ بطریق اولیٰ یمین غموس ہو گی جیسا کفار کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور قبروں والوں کو (زندہ کر کے) اللہ تعالیٰ نہیں اٹھائے گا اور اگر خبر فی الواقع سچی اور متکلم کے گمان میں جھوٹی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ سے منافق لوگ کہتے تھے کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں یا وہ خبر فی الواقع بھی جھوٹی اور متکلم کے گمان میں بھی جھوٹی ہے جیسے یہود کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی شئے نہیں نازل کی اور کہتے ہیں کہ جو مر گیا اللہ اسے نہیں اٹھائے گا اور جیسے قرض دار (قرض خواہ سے) کہا کرتا ہے کہ میرے ذمہ تیرا کچھ نہیں ہے پس اس کا نام یمین غموس ہے اس کے قریب جانا (یعنی ارادہ کرنا) بھی جائز نہیں ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔
حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کبیرہ گناہ یہ ہیں اللہ کے ساتھ شریک ماننا۔ والدین کی نافرمانی کرنا، خون کر دینا اور یمین غموس۔ یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے یمین پر حلف کیا تا کہ اس کے ذریعہ سے کسی مسلمان آدمی کا مال دبا لے حالانکہ ہے اس میں جھوٹا۔ تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پیشی کے وقت اس پر سخت ناراض ہو گا پھر اس کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ وَ اَیۡمَانِہِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا الآیۃ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔
ابو امامہؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنی قسم سے کسی مسلمان کا حق چھین لیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوزخ واجب کر دی اور جنت اس پر حرام کر دی۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے۔ عبد اللہ بن انیسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ سب سے بڑے کبیرہ گناہ یہ ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ماننا، والدین کی نافرمانی کرنا اور یمین غموس۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے۔ خریمؓ بن فاتک نے مرفوعاً تین مرتبہ کہا کہ جھوٹی شہادت اللہ کے ساتھ شریک کرنے کے برابر ہے پھر یہ آیت پڑھی فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ وَ اجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ یہ روایت ابو داؤد اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے اور اگر وہ خبر انشاء میں ہے اس پر کہ متکلم اپنے اوپر کوئی شئے لازم کرتا ہے یا کسی شئے سے اپنے آپ کو روکتا ہے تو اس کا نام یمین منعقدہ ہے اور سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے وَلٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا عَقَّدۡتُّمُ الۡاَیۡمَانَ اس کا حکم انشاء اللہ تعالیٰ یہاں ہم عنقریب ذکر کریں گے۔
لِلَّذِیۡنَ یُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ (جو لوگ اپنی بیویوں (کے پاس جانے) سے قسم کھا بیٹھتے ہیں) یعنی یہ حلف کر لیتے ہیں کہ ہم ان سے مجامعت نہ کریں گے۔ اَلِیَّۃُ کے معنی قسم کے ہیں اور اس کا تعدیہ علیٰ سے ہوتا ہے لیکن جب یہ دوری کے معنی کو متضمن ہوتا ہے تو اس کا تعدیہ من سے کر دیا جاتا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں ایلاء اہل جاہلیت کی طلاق تھی۔ سعیدؒ بن مسیّب فرماتے ہیں کہ ایلاء اہل جاہلیت کا ستانا تھا جب کسی کو اپنی بیوی سے محبت نہ ہوتی تھی اور نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ دوسرا اس سے نکاح کرے۔ تو وہ یہ قسم کھا لیتا تھا کہ میں کبھی اس کے نزدیک نہ جاؤں گا اس کو اس طرح چھوڑے رکھتا تھا کہ وہ نہ بیوہ ہوتی تھی نہ خاوند والی رہتی تھی۔ شروع اسلام میں سب لوگ اس کے پابند تھے پھر اسلام میں اس کی مدت معین ہو گئی۔
تَرَبُّصُ اَرۡبَعَۃِ اَشۡہُرٍ (انہیں چار مہینے انتظار کرنا (لازم) ہے) یہ سارا مبتدا ہے اور اس سے پہلے اس کی خبر ہے یا یہ ظرف کا فاعل ہے۔ تربص کے معنی انتظار اور توقف کرنے کے ہیں۔ ظرف کی طرف اس کی نسبت مجازاً کر دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مدت میں ایلاء کرنے والے کو ٹھہرنے کا حق ہے اس میں طلاق نہیں پڑتی یا اس میں طلاق کا مطالبہ نہیں کیا جاتا یہ اختلاف آگے آئے گا۔
فَاِنۡ فَآءُوۡ (پس اگر رجوع کر لیں) یعنی چار مہینے گزرنے کے بعد وطی کے ساتھ اپنی قسم سے عورتوں کی طرف رجوع کر لیں۔ یہ معنی امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے قول کے مطابق باعتبار ظاہر آیت کے ہیں کیونکہ "ف" تعقیب کے لئے ہے اس کے علاوہ یہ وجہ بھی ہے کہ آدمی اس طرح مولی (ایلاء کرنے والا) نہیں ہوتا کہ چار مہینے (تک نہ جانے) یہ قسم کھا

marfat.com

لے جیسا کہ اس سے کم میں بھی مولی نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب اس سے زیادہ پر قسم کھائے کیونکہ رجوع ایلاء کی مدت میں ہونا ضروری ہے دوسرے یہ کہ چار مہینے گزر جانے سے طلاق نہیں پڑتی اور ابن مسعودؓ کی قرأت اس طرح ہے فان فاء وافیھن یعنی ان (چار مہینے) میں (اگر رجوع کرلیں) اسی قرأت کی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ اگر کسی نے چار مہینے کی قسم کھائی تو وہ مولی ہو جائے گا اور ان چار مہینے میں ہی رجوع کرنا درست ہے۔ پس اس اختلاف کا دارومدار اس پر ہے کہ قرأت شاذہ پر عمل کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اور ائمہ کا قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے کیونکہ نہ وہ حدیث ہے اور نہ قرآن ہے۔ اگر قرآن کی آیت ہوتی تو متواتر ہوتی اور امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا واجب ہے کیونکہ اس سے خالی نہیں کہ یا تو وہ قرآن (کی آیت) ہے اور یا قرآن کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے اور یہ دونوں حجت ہیں اگر کوئی کہے کہ یہ ہم نے مانا کہ قرأت شاذہ حجت ہے۔ لیکن جب اس کے اور قرأت متواترہ کے درمیان تعارض ہو جائے تو اس وقت اس کا ساقط ہونا ضروری ہے۔ ہم کہتے ہیں، ساقط ہونا اس صورت میں ضروری ہے کہ دونوں جمع نہ ہو سکیں اور یہاں تو جمع ہو سکتی ہیں کیونکہ ف جیساکہ تعقیب کے لئے آتی ہے، اسی طرح کبھی کسی مجمل وغیرہ کی تفصیل کے لئے بھی آتی ہے جو مجمل اس سے پہلے ہو جیساکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ اور جیسے اس آیت میں یَسْئَلُکَ اَهْلُ الْکِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤی اَکْبَرَ مِنْ ذٰلِکَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً اور یہاں جب یہ بیان کیا گیا کہ ایسے مردوں کو بلاوطی کے چار مہینے انتظار کرنا چاہئے تو ایسا موقع ہے جو تفصیل کو چاہتا ہے اس لئے فان فائو فرما کر سمیع علیم تک اس کی تفصیل کی اس کے علاوہ اگر "ف" کو زمانہ میں تعقیب کے لئے مان لیں تو یہ احتمال ہوتا ہے کہ شاید یہ باعتبار ایلا کے ہو یعنی "پس اگر وہ ایلا کے بعد رجوع کریں اور متواتر قرأت مطلقاً رجوع کرنے پر دلالت کرتی ہے خواہ وہ ان چار مہینے میں ہو یا ان کے بعد ہو اور قرأت شاذہ مقید ہے کہ رجوع ان ہی چار مہینے میں ہو۔ پس مطلق کو مقید پر حمل کرلیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ابن مسعودؓ کی قرأت مشہورہ ہے (شاذہ نہیں ہے) اس سے کتاب (اللہ) کی تخصیص اور مطلق کو مقید پر حمل کرلینا جائز ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۲۶﴾ (تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے) حسنؒ۔ ابراہیمؒ۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ جس وقت مولی (ایلاء کرنے والا) رجوع کرے تو اس کے ذمہ کفارہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور رحمت کا وعدہ کیا ہے اور جمہور کے نزدیک اس کے ذمہ کفارہ واجب ہے۔ کیونکہ مغفرت کا وعدہ کرنا اس کفارہ کی نفی نہیں کرتا جو سورۂ مائدہ کی آیت سے ثابت ہو چکا ہے اور آنحضرت ﷺ کے اس قول سے بھی کہ من حلف علٰی یمین فرئٰ غیر ھا خیرا منھا فلیکفر ولیأ ت بما ھو خیر۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (اور اگر انہوں نے طلاق کا ارادہ کرلیا ہو) امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ فرماتے ہیں اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اگر چار مہینے کے بعد انہوں نے رجوع نہ کیا اور طلاق دینے کا ارادہ کر کے طلاق دے دی۔

فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾ (تو بے شک اللہ سننے والا ہے (ان کے طلاق دینے کو) جاننے والا ہے) (ان کی نیتوں کو) اور اسی تاویل کی بنا پر انہوں نے کہا ہے کہ محض چار مہینے گزر جانے سے طلاق نہیں پڑے گی بلکہ طلاق کا پڑنا طلاق دینے پر موقوف رہے گا کیونکہ اگر طلاق دینے پر موقوف نہ رہے اور فقط چار مہینے ختم ہوتے ہی طلاق پڑ جائے۔ تو اس کے طلاق کا ارادہ کرنے کے کوئی معنٰی نہ ہوں گے اور نہ اس کے ذیل میں اللہ کا قول ان اللّٰہ سمیع مناسب رہے گا۔ اس تاویل پر تردید نفی و اثبات میں دائر نہیں ہے بلکہ ایک تیسری صورت اور ہے وہ یہ کہ نہ وہ رجوع کرے اور نہ طلاق دے اور اس صورت کے حکم سے یہاں سکوت ہے سو اس میں اس تاویل کے قائلین کا بھی قول مختلف ہے۔ اکثر فقہاء کا قول یہ ہے کہ حاکم اسے طلاق دے دے کیونکہ جب ایلاء کرنے والا امساک بالمعروف سے رکا رہا تو تسریح بالاحسان میں حاکم اس کے قائم مقام ہو جائے گا جیسا کہ عنین کا حکم ہے اور ایک روایت میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ حاکم اس پر زبردستی کر کے طلاق دلوا

marfat.com

دے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اگر انہوں نے ارادتاً طلاق کی وجہ سے رجوع کو چھوڑے رکھا یہاں تک کہ وہ مدت (چار مہینے کی) گزر گئی اور اس سے طلاق پڑ گئی (تو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے)۔

نیز علماء فرماتے ہیں کہ اگر اس سے طلاق نہیں پڑے گی تو اس کے لئے چار مہینے کے بعد رجوع کر لینا جائز ہو گا پھر رجوع کرنے کی قید جو ابن مسعودؓ کی قرأت میں ان کے قول فیھن سے ہوتی ہے اس کے کوئی معنٰی نہ ہوں گے اور اگر ہم یہ کہیں کہ چار مہینے کے بعد رجوع کرنا جائز نہیں ہے اور طلاق دینا اس پر لازم ہے تو (اس کہنے سے) اجماع مرکب کا خلاف لازم آئے گا کیونکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آیت میں جو تردید ہے وہ بھی اس کا انکار کرتی ہے اور اس تاویل پر اللہ تعالیٰ کے قول فان اللّٰہ سمیع کے یہ معنی ہیں کہ اللہ اس لڑائی جھگڑے وغیرہ کو سننے والا ہے جو رجوع نہ کرنے کا سبب ہو جیسا کہ وہ شیطان کے وسوسہ کو سنتا ہے یا وہ اس ایلاء کو سننے والا ہے جو طلاق ہے اور بلا وطی کے چار مہینے گزر جانے پر موقوف رہتی ہے علیم جاننے والا ہے ان کے ظلم کو جو ہمیشہ اس پر رہتے ہیں۔ اس تاویل پر آیت کا معنی وعید آمیز ہو گا اور آثار صحابہ اس بارے میں متعارض ہیں چنانچہ حضرات عمر، عثمان، علی، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تو یہی فرماتے ہیں جو امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے سوائے اس روایت کے جو حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ رجعی طلاق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ دار قطنی نے اسحاق سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں مجھ سے مسلم بن شہاب نے بیان کیا اور وہ سعید بن مسیب اور ابو بکر بن عبد الرحمٰن سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب فرماتے تھے کہ جب چار مہینے گذر جائیں تو وہ ایک طلاق ہے اور جب تک عورت عدت میں رہے خاوند کو رجوع کر لینے کا پورا اختیار ہے۔ عبد الرزاق نے نقل کیا ہے کہ ہم سے معمر نے انہوں نے عطاء خراسانی سے انہوں نے ابی سلمہ بن عبد الرحمٰن سے نقل کیا کہ عثمان بن عفان اور زید بن ثابتؓ دونوں ایلاء کی بابت فرماتے تھے کہ جب چار مہینے گزر جائیں تو وہ ایک ہی طلاق ہے اور عورت اپنی جانب کی زیادہ حقدار ہے وہ طلاق والی عورت کی طرح عدت پوری کرے، اور عبد الرزاق ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ہم سے معمر نے انہوں نے قتادہ سے نقل کیا کہ علی اور ابن مسعودؓ دونوں فرماتے تھے کہ جب (ایلا کے) چار مہینے گزر جائیں تو وہ ایک طلاق ہوتی ہے اور عورت اپنی جانب کی سب سے زیادہ حقدار ہے طلاق والی عورت کی طرح وہ بھی عدت گزارے اور عبد الرزاق ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ہم معمر اور ابن عیینہ نے بیان کیا وہ ابی قلابہ سے نقل کرتے تھے۔ ابو قلابہ کہتے ہیں کہ نعمان نے اپنی بیوی سے ایلاء کر لیا تھا آپ (ایک روز) ابن مسعودؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ابن مسعود نے ان کی ران پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ جب چار مہینے گزر جائیں تو تم ایک طلاق کا اقرار کر لینا۔ ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے کہ ہم سے ابو معاویہ نے انہوں نے اعمش سے انہوں نے حبیب سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے ابن عباس اور ابن عمر سے نقل کیا وہ دونوں فرماتے تھے کہ جب کسی نے ایلاء کر کے رجوع نہ کیا یہاں تک کہ چار مہینے گزر گئے تو یہ بائنہ طلاق ہے اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت ابن عمر سے ایک ایسی روایت بھی ہے جو اس کے خلاف ہے اور امام شافعیؒ کے مذہب کے موافق ہے اسی طرح ان کے علاوہ اور صحابہ سے بھی مروی ہے دار قطنی نے روایت کی ہے کہتے ہیں ہم سے ابو بکر میمونی نے بیان کیا وہ کہتے تھے میں نے امام احمد بن حنبلؒ کو عطاء خراسانی کی حدیث سنائی جسے وہ حضرت عثمانؓ سے روایت کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں یہ کیسی ہے۔ عثمان غنیؓ سے تو اس کے خلاف مروی ہے کسی نے پوچھا اس کا راوی کون ہے فرمایا حبیب ابن ثابت بروایت طاؤس از حضرت عثمانؓ۔ امام مالک نے موطا میں جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے علی بن ابی طالبؓ سے روایت کی ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ جب کسی نے اپنی بیوی سے ایلاء کر لیا تو اسے طلاق نہیں ہوئی پھر اگر چار مہینے گزر گئے تو اب انتظار کیا جائے کہ یا تو وہ طلاق دے دے یا رجوع کر لے۔ امام بخاریؒ نے سند کے ساتھ ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ آپ اس ایلاء کی بابت فرماتے تھے جس کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے کہ اس مدت گزرنے کے بعد عورت حلال نہیں رہتی ہاں یا تو خوش خوئی کے ساتھ

marfat.com

رکھے یا طلاق کا ارادہ کر لے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم کیا ہے اور امام بخاری کہتے ہیں مجھ سے اسمٰعیل بن اویس نے فرمایا کہ مجھ سے امام مالکؒ نے انہوں نے نافع سے انہوں نے ابن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ چار مہینے گزر جانے پر انتظار کرنا چاہئے تاکہ وہ طلاق دے دے۔ امام شافعی فرماتے ہیں ہم سے سفیان نے انہوں نے یحییٰ بن سعید سے انہوں نے سلیمان بن یسار سے روایت کی سلیمان فرماتے تھے کہ دس سے کچھ اوپر صحابہ سے میں ملا ہوں وہ سب کے سب یہ فرماتے تھے کہ ایلاء کرنے والے کا انتظار کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ صحابہ میں سے جو لوگ انتظار کی طرف گئے ہیں۔ بغوی نے حضرت عمرؓ اور ابوالدرداء کو بھی ان ہی میں ذکر کیا ہے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ جو روایت ہم نے حضرت عثمان اور زید بن ثابتؓ سے نقل کی ہے وہ اس سے بہتر ہے جو امام احمد نے حضرت عثمانؓ سے نقل کی ہے۔ کیونکہ ہماری سند بہت قوی اور سلسلہ وار ہے بخلاف امام احمدؒ کی روایت کے کہ اس میں حبیبؒ تک چند راویوں کا حال کچھ معلوم نہیں اور نہ یہ کہیں معلوم ہوتا ہے کہ طاوسؒ نے حضرت عثمانؓ سے حدیث سنی ہے اور محمد بن علی کی روایت جسے وہ علی ابن ابی طالبؓ سے روایت کرتے ہیں مرسل ہے جیسے کہ قتادہ کی روایت حضرت علیؓ سے مرسل ہے اور یہ دونوں ہم عصر بھی ہیں اور جو روایت ہم نے ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے نقل کی ہے اس کے سب راویوں سے شیخینؒ نے صحیحینؒ میں حدیثیں نقل کی ہیں پس اس روایت پر اس روایت کو جو صحیح بخاری میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کسی طرح کی ترجیح نہیں ہے۔ بغوی کہتے ہیں کہ (ایلاء میں) انتظار کرنے کی طرف تابعین میں سے سعید بن جبیر سلیمان بن یسار اور مجاہد گئے ہیں اور اس کے خلاف کی طرف سفیان ثوری، سعید بن مسیب اور زہری گئے ہیں۔ لیکن ان دونوں کا قول یہ ہے کہ ایک رجعی طلاق پڑ جائے گی۔ عبدالرزاق نے امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کے موافق تابعین میں سے عطاء، جابر بن یزید، عکرمہ، سعید بن مسیب، ابو بکرؒ بن عبدالرحمٰن و مکحول سے روایت کی ہے اور اسی طرح دار قطنی نے ابن حنفیہ، شعبی، نخعی، مسروق، حسن، ابن سیرین، قبیصہ، سالم، ابی سلمہ سے روایت کی ہے اور ترجیح میں یہ کہا گیا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ظاہر میں قرأت متواترہ امام شافعیؒ وغیرہ کے مذہب کی موئد ہے، امام ابو حنیفہؒ کا مذہب اس سے بلا ایسے تکلف کے مستفاد نہیں ہوتا کہ جس کی طرف بغیر سماعت کے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ پس صحابہ میں سے جس نے یہ کہا کہ یہ ظاہر آیت کے مطابق ہے تو جان لیا جائے گا کہ یہ بات انہوں نے رائے سے کہی ہے اور جس نے امام ابو حنیفہؒ کی تاویل کے مطابق کہا اس کا قول سننے پر محمول کر لیا جائے گا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ ترجیح کا عام قاعدہ ہے، واللہ اعلم اور یہاں اور بھی چند اختلاف ہیں ایک یہ کہ جب کسی نے بلا اللہ کی قسم کھائے ایلاء کیا تو وہ مولی (ایلاء کرنے والا) شمار ہو گا یا نہیں جیسے کہ طلاق، عتاق، صدقہ اور عبادتوں کو واجب کر لے (مثلاً کہے کہ اگر میں ایسا کروں تو غلام آزاد یا میرے ذمہ حج واجب) اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ وہ شخص مولی شمار ہو گا خواہ اس نے عورت کو فقط تکلیف میں رکھنے ہی کا ارادہ کیا ہو یا اس کی کوئی بہتری سمجھی ہو مثلاً وہ بیمار ہو یا اپنی بہتری سمجھی ہو کہ مثلاً خود بیمار ہو اور امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ وہ مولی نہیں شمار ہو گا ہاں اسی صورت میں کہ غصہ میں یا عورت کو تکلیف دینے کے ارادے سے قسم کھالے اور امام احمدؒ کا قول یہ ہے کہ فقط عورت کو تکلیف دینے کی صورت میں مولی ہو گا اور امام شافعیؒ سے دونوں (طرح کے) قول مروی ہیں لیکن ان میں سے صحیح امام ابو حنیفہؒ ہی کے قول کے مطابق ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تکلیف دینے کے لئے بلا قسم کھائے چار مہینے سے زیادہ تک وطی نہ کی تو وہ مولی شمار ہو گا یا نہیں امام مالکؒ اور امام احمدؒ سے ایک روایت میں یہ ہے کہ ہاں (مولی ہو جائے گا) اور جمہور کا قول یہ ہے کہ نہیں۔ تیسرا اختلاف یہ ہے کہ غلام کے ایلاء کی مدت بھی عموم آیت کی وجہ سے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک چار ہی مہینے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ایسے امر کے لئے بیان کی گئی ہے جس کا میلان طبیعت کی طرف ہے اور وہ یہ کہ اتنی مدت تک عورت کو بلا خاوند کے صبر کم ہوتا ہے پس اس میں غلام اور آزاد برابر ہیں جیسے کہ عنین کی مدت میں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک غلام ہونے کی وجہ سے مدت نصف ہو جائے گی۔ ہاں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورت کی رقیت (یعنی باندی ہونے) کا اعتبار ہو گا اور امام مالکؒ کے نزدیک خاوند کے غلام ہونے کا۔ یہ اختلاف ان دونوں کے طلاق میں اختلاف ہونے پر مبنی ہے۔ چوتھا اختلاف یہ ہے کہ جب کوئی وطی کرنے سے معذور ہو جائے تو

maarfat.com

وہ رجوع کس طرح کرے امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ اتنا کہہ دے کہ میں نے رجوع کر لیا (اس سے رجوع ہو جائے گا) پھر اگر وہ اس مدت کے گزرنے سے پہلے وطی پر قادر ہو جائے گا تو وطی کرنی اس پر واجب ہو گی اور امام شافعیؒ کے نزدیک بلا وطی کے رجوع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قسم کی خلاف ورزی بھی اس کے بغیر نہیں ہوتی۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ (اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو) یہ لفظ عام ہے تمام مطلقہ عورتوں کو شامل ہے۔ طلاق رجعی ہو یا بائنہ عورت کو حمل ہو یا نہ ہو، عورت سے صحبت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو، لونڈی ہو یا حرۃ، حدیث اور اجماع کی وجہ سے لونڈیوں کو اس آیت سے خاص کر لیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ باندی کے لئے دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت بھی دو ہی حیض ہیں۔ یہ روایت ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی نے حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے۔ اس بحث کو جو اس حدیث میں ہے اور یہ مسئلہ کہ عموم قرآن کی تخصیص خبر واحد سے کی گئی ہے آیت الطلاق مرتان کی تفسیر میں انشاء اللہ تعالیٰ ہم عنقریب ذکر کریں گے اس آیت کا حکم حاملہ عورتوں کے حق میں آیت وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ کی وجہ سے منسوخ ہے اسی طرح حکم مذکور کا عموم اس عورت کے حق میں بھی منسوخ ہے جس سے صحبت نہ کی گئی ہو کیونکہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ الآیت۔

يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ (وہ اپنے آپ کو روکے رکھیں) اور یتربصن خبر بمعنی امر تاکید کے لئے ہے بانفسھن کے لفظ سے عورتوں کو رکے رہنے پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے یعنی وہ اپنی جانوں کو روکے رکھیں اور اس پر غالب رہیں اگرچہ یہ ان کی خواہش کے خلاف ہے۔

ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (تین حیض آنے تک) اس مدت میں خاوند نہ کر لیں۔ لفظ قرء اضداد میں سے ہے اور مشترک ہے۔ باتفاق اہل لغت حیض اور طہر دونوں پر بولا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں اور یہی حضرت عائشہؓ، ابن عمرؓ و زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ یہاں (اس قرء سے) مراد طہر ہے۔ ابن عمرؓ کی اس روایت کی وجہ سے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تھی پھر حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا حضور ﷺ سنتے ہی غصہ میں بھر گئے پھر فرمایا اسے چاہئے کہ عورت سے رجوع کر لے، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے، پھر اسے حیض آئے، پھر پاک ہو جائے، اس کے بعد اگر طلاق ہی دینی ہو تو طہر کی حالت میں ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے طلاق دے دے۔ پس یہی وہ عدت (اور وقت) ہے جس میں عورتوں کو طلاق دینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے اور اس حدیث کو دلیل بنانے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے۔ يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (یعنی اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے وقت میں دو) وہ کہتے ہیں کہ لعدتھن میں لام کے معنی وقت کے ہیں یعنی ان کی عدت کے وقت میں دو اور اس حدیث میں اس عدت کا اشارہ اس طہر کی طرف ہے جس میں (عورت کو) ہاتھ تک نہ لگایا ہو پس اس سے ظاہر ہو گیا کہ (آیت میں) قروء سے مراد چند طہر ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ استعمال میں لام وقت کے معنوں میں وہاں ہوتا ہے جہاں عہد کا نہ ہو اور یہاں (لام کو وقتیہ کہنے سے) عدت کا طلاق پر مقدم یا اس کے ساتھ ساتھ ہونا لازم آتا ہے کیونکہ اس کا مقتضا یہ ہے کہ طلاق کا وقوع عدت کے وقت میں ہو (اور یہ ٹھیک نہیں) بلکہ یہاں لام آئندہ عدت ہونے کے معنی کا فائدہ دینے کے لئے ہے باتفاق تمام اہل عربیہ تاریخ کے متعلق اس طرح کہا کرتے ہیں کہ خرج لثلث بقین من رمضان ہمارے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ اس طرح پڑھتے تھے یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن فی قبل عدتھن اور اسی حدیث میں جو مسلم نے روایت کی ہے موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح پڑھا وا ذا طلقتم النساء فطلقوھن بقبل عدتھن یا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں کہ فتلک العدۃ التی امر اللہ بھا۔ ہم یہ کہیں گے کہ اس عدت سے مراد طلاق کا وقت ہے یعنی وہ یہی وقت ہی جس میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے نہ کہ (یہ) وہ

marfat.com

عدت (ہے) جو طلاق کے بعد واجب ہوتی ہے بھی امام شافعی کی طرف سے (اس آیت سے) اس طرح بھی حجت پیش کی جاتی ہے کہ ثلٰثۃ میں ت ممیز کے مذکر ہونے پر دلالت کرتی ہے اور جس قروء کے معنٰی حیض کے ہیں وہ مؤنث ہے اور جو بمعنی طہر ہے وہ مذکر ہے لہٰذا یہاں یہ (طہر) ہی مراد ہے اور یہ حجت بھی کچھ نہیں۔ کیونکہ جب کسی چیز کے دو نام ہوں ایک مذکر ہو جیسے بر (گیہوں کو کہتے ہیں) اور دوسرا مونث ہو جیسے حنطتہ (اس کے بھی معنٰی گیہوں کے ہیں) اور وہاں حقیقی ثانیت نہ ہو تو اعتبار ان میں سے مذکر کا ہوتا ہے (یہ قاعدہ مسلمہ ہے) اور یہاں اسی طرح ہے کیونکہ حیض مؤنث ہے اور قرء مذکر ہے اور جس وقت تانیث حقیقی ہوتی ہے اور لفظ مذکر جیسے شخص (کے لفظ) سے عورت مراد لے لیں تو اس میں دونوں صورتیں جائز ہوتی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا قول یہ ہے کہ اس (قرء کے لفظ) سے حیض مراد ہے اس کی چند دلیلیں ہیں ایک تو وہی جو امام شافعیؒ کے ابن عمرؓ کی حدیث کو حجت بنانے میں گزر چکی ہے۔ جو مسلم نے نقل کی ہے اور ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کی قرأت بھی ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ ثلٰثۃ کا لفظ ایک خاص عدد ہے نہ اس سے کم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور نہ اس سے زیادہ ہونے پر اور طلاق سنت طریقہ کے مطابق بالاجماع طہر ہی میں ہوتی ہے۔ اجماع کے علاوہ اس کی دلیل ابن عمرؓ کی حدیث بھی ہے جو پہلے گزر چکی ہے پس ثلٰثۃ قروء حیض ہی میں بنتا ہے نہ کہ طہر میں کیونکہ اس میں شک نہیں کہ یہ طہر جس میں طلاق واقع ہوئی ہے یا تو عدت میں شمار ہی نہ ہوگا۔ حالانکہ یہ اجماع کے بالکل خلاف ہے اس کا کوئی قائل نہیں اس کے باوجود اس وقت تین پر زیادتی لازم آتی ہے یا یہ طہر عدت میں شمار ہوگا۔ تو اب عدت یہ ہوگی کہ دو طہر پورے اور ایک طہر کا کچھ حصہ (یعنی جس میں طلاق واقع ہوئی ہے) اور یہ تین طہر نہ رہے اور اگر دو طہر پورے اور ایک طہر کے کچھ حصہ پر ثلٰثۃ کا اطلاق کر دینا جائز ہے تو اللہ تعالیٰ کے قول فعدتھن ثلٰثۃ اشھر میں ثلٰثۃ اشھر کا بھی اطلاق (دو مہینے پورے اور ایک مہینے کے کچھ حصہ پر) جائز ہوگا حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول الحج اشھر معلومات میں اشہر کا اطلاق دو مہینے پورے اور ایک مہینے کے کچھ حصہ پر ہوا ہے۔ ہم کہتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ الحج ثلٰثۃ اشھر بلکہ فقط اشہر کہا ہے اور یہاں یہ نہیں کہا کہ قروء بلکہ فرمایا ثلٰثۃ قروء اور یہ اور بھی بڑی دلیل صراحت کے ساتھ ہے۔ پس اس قروء کو تین سے کم پر حمل کرنا مجازاً بھی جائز نہیں ہے کیونکہ ثلٰثۃ کا لفظ مجازی معنے لینے سے مانع ہے کہ یہاں معتبر پورے پورے قرء ہیں قرء کا کچھ حصہ معتبر نہیں ہے۔ اس کی دلیل وہی ابن عمرؓ کی حدیث ہے جس سے امام شافعیؒ نے حجت کی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس طہر میں طلاق دینے کی اجازت نہیں دی جو اس حیض کے متصل تھا جس میں پہلے طلاق دی گئی تھی تاکہ بلا پورے پورے قرء کا فاصلہ ہوئے دو طلاقیں جمع نہ ہو جائیں۔

تیسری دلیل آنحضرت علیہ السلام کا یہ قول ہے۔

طلاق الامۃ تطلیقتان وعدتھا حیضتان (یعنی باندی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں) باوجود یہ کہ اس پر اجماع ہے کہ لونڈی حرۃ کے عدت کرنے میں مخالف نہیں بلکہ فقط مقدار کے اندر دونوں میں تفاوت ہے پس اس سے ظاہر ہو گیا کہ قروء سے مراد حیض ہی ہیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ عدت فقط اس لئے مشروع کی گئی ہے تاکہ رحم کا (بچہ سے) خالی ہونا معلوم ہو جائے اور یہ حیض ہی آنے سے (معلوم) ہوتا ہے نہ کہ طہر سے اور اسی واسطے لونڈی میں استبراء کرنا حیض ہی سے واجب ہے نہ کہ طہر سے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ اگر قرء بمعنی طہر ہو تو تیسرا حیض آنا شروع ہوتے ہی عدت ختم ہو جائے گی اور اگر بمعنی حیض ہو تو جب تک عورت تیسرے حیض سے پاک نہ ہو عدت ختم نہ ہوگی پس شک سے عدت نہیں پوری ہوتی۔

ہمارا مذہب خلفاء راشدین، عبادلہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابی الدرداء، عبادہ بن صامت، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے معبد جہنی کو بھی انہی میں شمار کیا ہے اور تابعین میں سے سعید بن مسیب، ابن جبیر، عطاء، طاؤس، مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ضحاک، حسن بصری، مقاتل، شریک القاضی، ثوری، اوزاعی، ابن شبرمہ، ربیعہ،

marfat.com

سدی، ابو عبیدہ اسحاق سے بھی یہی مروی ہے اور اسی کی طرف امام احمد بن حنبل نے بھی رجوع کیا ہے۔ امام محمد بن حسن موطا میں فرماتے ہیں کہ ہم سے عیسیٰ بن ابی عیسیٰ خیاط نے انہوں نے شعبی سے شعبی نے نبی ﷺ کے تیرہ صحابہ سے روایت کی ہے۔ وہ سب کے سب یہ فرماتے تھے کہ مرد اپنی بیوی کا سب سے زیادہ حقدار ہے یہاں تک کہ وہ تیسرے حیض سے (پاک ہو کر) غسل کر لے واللہ اعلم۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ (اور عورتوں کو اس کا چھپانا جائز نہیں ہے جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے) یعنی عدت پوری ہونے کی جلدی کرنے اور رجعی طلاق کا شوہر کا حق باطل کرنے کے لئے حمل اور حیض کو چھپانا جائز نہیں ہے اور اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ اس بارے میں عورت کا قول مقبول ہے۔

اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اگر اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں) جزا محذوف ہے یعنی اگر وہ اللہ پر ایمان رکھتی ہیں تو نہ چھپائیں کیونکہ مؤمن کی شان یہی ہے کہ حرام فعل کا مرتکب نہ ہو اس سے غرض تاکید اور توبیخ کرنی ہے، واللہ اعلم۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ (اور ان کے خاوند) بعول، بعل کی جمع ہے اور ت اس میں جمع کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ عمومۃ میں۔ اور اصل میں بعل کے معنی مالک اور سردار کے ہیں۔ خاوند کا نام اس لئے بعل رکھ دیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنی بیوی کا کار مختار ہوتا ہے اور ہن کی ضمیر رجعی طلاق والی عورتوں کی طرف ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ اگر ظاہر کو مکرر کر کے دوبارہ اس کی تخصیص کرتے، یا بعولۃ مصدر ہے۔ مضاف محذوف کے قائم مقام ہے یعنی اہل بعولتھن۔

اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (ان کو (اپنی زوجیت میں) واپس لینے کے حقدار ہیں) یعنی نکاح کی طرف رجعت کرنے کے ساتھ۔ خواہ عورت رضامند ہو یا نہ ہو اور افعل یہاں بمعنی فاعل ہے یعنی حقیق۔

فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (اس (انتظار کرنے کے زمانہ) میں اگر انہیں) اس رجعت سے) اصلاح منظور ہو) نہ کہ عورت کو ستانا جیسا کہ جاہلیت کے زمانہ میں لوگ کرتے تھے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تھا۔ اور جب اس کی عدت پوری ہونے کو ہوتی تھی تو پھر رجعت کر لیتا تھا بعد اس کے پھر طلاق دے دیتا تھا اور اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ رجعت کے لئے اصلاح کا قصد شرط ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے ستانے ہی کے قصد سے رجعت کی تو بھی رجعت نہ ہو گی۔ بلکہ یہ ستانے سے منع کرنے اور اصلاح (کا قصد کرنے) کی رغبت دلانے کے لئے ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر انہیں اصلاح کرنی منظور ہو تو رجعت کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ رجعی طلاق سے رجعت کرنے پر سب کا اتفاق ہے اس میں اختلاف ہے کہ اس عدت میں وطی کرنا بھی جائز ہے یا نہیں۔

امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا قول اظہر روایت میں یہ ہے کہ جائز ہے اور دوسری روایت میں ان کا قول بھی امام شافعی کے موافق ہے کہ جائز نہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ قاطع یعنی طلاق ہونے کی وجہ سے زوجیت کا علاقہ بالکل جاتا رہا۔

ہم کہتے ہیں کہ طلاق کا عمل عدت پوری ہونے تک بالاتفاق ہوتا کیونکہ دونوں (میاں بیوی) میں میراث جاری ہوتی ہے اور عورت کی رضامندی بغیر رجعت جائز اور اس کا نان نفقہ واجب ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ (عدت میں) نکاح قائم رہتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا قول و بعولتھن بھی دلالت کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں بعل کا اطلاق تو ہو سکتا ہے کہ باعتبار گزشتہ زمانہ کے ہو اور رد کا لفظ نکاح نہ رہنے پر دلالت کرتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بعل کے مجازی معنی لینے رد کے مجازی معنی لینے سے بہتر نہیں ہیں کیونکہ اس طرح بولا جاتا ہے ردالبیع فی البیع اس سے بائع کے لئے اختیار ثابت ہو جاتا ہے اس کے علاوہ جب اس آیت میں لفظ بعل اور لفظ رد کے مجازی معنی مراد لینے میں تعارض ہوا تو ان دونوں کا اعتبار کرنا ساقط ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا قول فامساک بمعروف اور امسکوھن بمعروف سالم رہا کیونکہ امساک (نکاح کے) باقی رہنے پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ رد کو پہلے

marfat.com

حالت کی طرف رد کرنے پر محمول کر لیا جائے اور وہ حالت عورت کی اس طرح ہوتی ہے کہ عدت گزرنے کے بعد وہ حرام نہ ہو پس اس وقت کوئی اشکال نہ ہوگا۔ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ رجعت میں (عورت سے) کہنا شرط ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ بلا عورت سے کہے رجعت نہ ہوگی۔ ان کے اس قول کی وجہ یہ ہے کہ رجعت ان کے نزدیک بمنزلہ نئے سرے سے نکاح کرنے کے ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا قول یہ ہے کہ جب خاوند نے اس سے صحبت کر لی یا اس کا بوسہ لے لیا یا شہوت سے اسے ہاتھ لگا دیا یا شہوت سے اس کی شرمگاہ کو دیکھ لیا تو ان سب سے رجعت ہو جائے گی جیسے کہ کہنے سے رجعت ہو جاتی ہے۔ ان کے اس قول کی وجہ وہی ہے جو پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان دونوں کے نزدیک رجعت بمنزلۂ جدید نکاح کے نہیں ہے بلکہ وہ پہلے ہی نکاح کو باقی رکھنے کے لئے ہے۔ لہٰذا اس میں ایسا فعل کافی ہے جو اس کے باقی رکھنے پر دلالت کرے جیسا کہ خیار ساقط کرنے میں۔ اور امام مالکؒ کا قول مشہور روایت میں یہ ہے کہ اگر صحبت کرنے سے رجعت کی نیت کر لی ہے تو رجعت ہو جائے گی ورنہ نہ ہوگی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ رجعت پر گواہ کرنے شرط ہیں یا نہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ شرط ہے اور یہی ایک قول امام شافعیؒ سے بھی مروی ہے اور قول کی بناء ایک آیت پر ہے جو سورۂ طلاق میں ہے۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (کہ تم اپنے میں سے دو منصف گواہ کر لیا کرو) امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں اور ایک صحیح قول امام شافعیؒ کا بھی یہی ہے اور ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی مذہب یہی ہے کہ یہ شرط نہیں ہے اور آیت میں امر استحباب پر محمول ہے۔ کیونکہ اگر (رجعت پر) گواہ کرنا واجب ہے تو طلاق پر بھی کرنا واجب ہوگا کیونکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے قول فار قوھن بمعروف کے ساتھ ہی ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے اور اگر وہاں بھی واجب ہے تو بالاستقلال واجب ہوگا اور فقط رجعت کے لئے شرط نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ عام ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ (اور عورتوں کا حق مردوں پر ایسا ہے جیسا عورتوں پر ہے) یعنی عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ایسے ہی ہیں جیسے عورتوں کے ذمہ مردوں کے لیکن وجوب اور مطالبہ کے مستحق ہونے میں نہ کہ جنس میں (کہ دونوں کے حقوق ایک ہی قسم کے ہوں)۔

بِالْمَعْرُوْفِ (دستور کے مطابق) یعنی جو شریعت سے معلوم ہو مثلاً نکاح کے حقوق ادا کرنا اور حسن سلوک سے رہنا۔ پس دوسرے کو ستانے کا ارادہ کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ بلکہ سب کو اصلاح ہی کرنی منظور ہونی چاہئے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنی بیوی کے (خوش کرنے کے) لئے ویسی ہی زینت کروں جیسے وہ میرے (خوش کرنے کے) لئے زینت کرنے کو پسند کرتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ معاویہ قشیری کہتے ہیں میں نے (حضرت سے) پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم پر ہماری بیوی کا حق کیا ہے فرمایا جب تم کھاؤ اسے بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ اور منہ پر نہ مارو اور نہ برا کہو اور نہ اس سے کشیدگی کرو) ہاں گھر ہی گھر میں) یہ حدیث امام احمد، ابو داؤد، اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے جعفر بن محمد اپنے باپ سے وہ حضرت جابر سے حجۃ الوداع کے قصہ میں نقل کرتے ہیں کہ عرفہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ تم عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ ان کو تم نے (اپنے قبضہ میں) اللہ کے امان پر لیا ہے اور اللہ ہی کے ایک حکم کی وجہ سے تم نے ان کی شرمگاہوں کو حلال سمجھا ہے تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ایسے شخص کو نہ لٹائیں جو تمہیں ناگوار گزرے اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں مارو لیکن حد سے زیادہ نہیں، تمہارے ذمہ ان کا یہ حق ہے کہ تم دستور کے مطابق انہیں کھانا کپڑا دو۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم خلقا وخیارکم خیارکم لنسائھم (یعنی سب مسلمانوں میں پورا ایماندار وہ ہے جو سب سے زیادہ خوش خلق ہو اور اچھے لوگ تم میں وہی ہیں جو اپنی بیبیوں سے اچھی طرح رہیں) یہ حدیث ترمذی نے نقل کی اور کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے ابو داؤد نے بھی یہ حدیث خلفاء تک نقل کی ہے اور ترمذی نے ایسی ہی روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نقل کی ہے اور عبد اللہ بن زمعہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ

marfat.com

ﷺ نے فرمایا کہ کوئی تم میں سے اپنی بیوی کو اس طرح نہ مارا کرے جس طرح غلام کو مارتے ہیں۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔
حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم سب میں اچھا وہی ہے جو اپنی اہل سے اچھی طرح رہے اور میں تم سب سے اپنی اہل سے اچھی طرح رہتا ہوں۔ یہ حدیث ترمذی اور دارمی نے نقل کی ہے اور ابن ماجہ نے بھی ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے میں تم میری وصیت یاد رکھنا۔ کیونکہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں زیادہ ٹیڑھا پن اوپر کی طرف ہوتا ہے پس اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ بیٹھو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ لہٰذا ان کے بارے میں میری وصیت یاد رکھنا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے) یعنی مردوں کا حق اور مرتبہ زیادہ ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو (اللہ تعالیٰ کے سوا) سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو اپنے خاوند کے لئے سجدہ کرنے کا ضرور حکم دیتا، بوجہ اس حق کے جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ذمہ مردوں کا کر دیا ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد نے قیس بن سعد سے نقل کی ہے اور امام احمد نے معاذ بن جبلؓ سے اور ترمذی نے ابوہریرہؓ سے اسی طرح نقل کی ہے اور بغوی نے ابوظبیان سے اور ام سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس عورت کا خاوند مرتے وقت اس سے راضی ہو تو وہ ضرور بہشت میں جائے گی۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے۔ طلق بن علی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس وقت خاوند اپنی بیوی کو بلائے تو اسے اس کے پاس آجانا چاہئے۔ اگرچہ تنور پر (روٹی پکا رہی) ہو یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِيزٌ (اور اللہ غالب ہے) یعنی جو کسی پر ظلم کرے اس سے بدلا لینے پر قادر ہے۔

حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾ (حکمت والا ہے) یعنی حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے احکام کو مشروع کرتا ہے۔ ۲۸ع۱۲

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ (طلاق دو بار تک) ہے یعنی جس کے بعد رجعت ہو سکتی ہے کیونکہ تیسری کا ذکر اور دو کے بعد رکھنے کا حکم عنقریب آتا ہے۔

مروی ہے کہ نبی ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ (یہ تو دو ہی طلاقیں ہوئیں) تیسری کہاں ہے فرمایا اوتسریح باحسان (سے تیسری مراد ہے) یہ روایت ابوداؤد نے اپنی ناسخ میں اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور ابن مردویہ نے ابن رزین اسدی کی سند سے نقل کی ہے اور دار قطنی اور ابن مردویہ نے حضرت انس کی سند سے بھی نقل کی ہے۔ بغوی کہتے ہیں کہ عروہ بن زبیر کہتے تھے کہ شروع اسلام میں لوگ کی یہ حالت تھی کہ بے حد وحساب طلاقیں دے دیتے تھے کوئی یہ کرتا تھا کہ بیوی کو طلاق دے دی اور جب اس کی عدت ختم ہونے پر آئی تو اس سے رجعت کر لی پھر اسی طرح طلاق دے دی اسے ستانے کے ارادہ سے پھر رجعت کر لی اس پر یہ حکم نازل ہوا، کہ الطلاق مرتان اور جب کسی نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اب کسی اور سے نکاح کئے بغیر یہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ کے مرتان فرمانے اوثنتان نہ فرمانے میں اس امر کی دلیل ہے کہ ایک ہی دفعہ دو طلاقیں دے دینی مکروہ ہیں کیونکہ مرتان کا لفظ عبارۃً تو تفرق پر دلالت کرتا ہے اور اشارۃً عدد پر اور (الطلاق میں) لام جنس کے لئے ہے اور جنس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے پس قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ اکھٹی دو طلاقیں معتبر نہ ہوں اور جب دو طلاقیں معتبر نہ ہوئیں تو تین طلاقیں اکھٹی دے دینی تو بدرجہ اولیٰ معتبر نہ ہوں گی کیونکہ تین میں دو کے علاوہ اور زیادتی ہے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ طلاق سے مراد تطلیق ہے اور معنی (آیت کے) یہ ہیں کہ شرعی طلاق دینا یہ ہے کہ اطہار میں متفرق طور پر یکے بعد دیگرے طلاق دے نہ کہ اکھٹی اور اس وقت مرتین سے تثنیہ مراد نہ ہوگا بلکہ تکریر مقصود ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے ثم ارجع البصر کرتین یعنی کرۃ بعد کرۃ لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کے قول فامساک بمعروف کا عطف ہونا مشکل ہو جائے گا اور اسی طرح فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ کا عطف بھی دشوار ہوگا۔ کیونکہ اس تاویل پر الطلاق تینوں طلاقوں کو بھی شامل ہو سکتا ہے ان دونوں تاویلوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو طلاقیں یا تین طلاقیں

marfat.com

ایک لفظ سے ہوں یا مختلف الفاظ سے ایک طہر میں اکٹھی دے دینی حرام، بدعت، باعث گناہ ہیں۔ امام شافعیؒ اس کے مخالف ہیں، ان کا قول یہ ہے کہ اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جس نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو بالاجماع تینوں طلاقیں پڑ جائیں گی۔

امامیہ کا قول ہے کہ اگر کسی نے ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دے دیں تو اس آیت کی وجہ سے ایک بھی طلاق نہ پڑے گی اور بعض حنبلیوں کا قول یہ ہے کہ ایک ہی طلاق پڑے گی کیونکہ صحیحین میں مروی ہے کہ ابو الصہبا نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کیا آپ کو یاد نہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں بھی دو سال تک تین طلاقیں ایک شمار کی جاتی تھیں ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بے شک لوگوں نے ایسے امر میں جلدی کی جس میں انہیں تاخیر کرنی چاہئے تھی۔ پس اگر اب اسے ان پر جاری کریں تو کر سکتے ہیں۔ ابن اسحاق نے عکرمہ سے انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے وہ فرماتے تھے کہ رکانہ بن عبد نے اپنی بیوی کو ایک ہی جگہ بیٹھے تین طلاقیں دے دی تھیں پھر انہیں اس پر بہت رنج ہوا بعد میں آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کس طرح طلاق دی ہے عرض کیا کہ (حضور) میں نے تو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی ہیں فرمایا یہ تو ایک ہی طلاق ہے۔ لہٰذا تم اس سے رجعت کر لو۔ طاؤس اور عکرمہ سے منقول ہے وہ کہتے تھے جس نے تین طلاقیں دیں اس نے سنت کے خلاف کیا اس لئے وہ سنت کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یہی قول ابن اسحاق کا ہے اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ انت طالقٌ ثلثا کہنے سے مدخول بہا کو تین طلاقیں ہو جائیں گی اور غیر مدخول بہا کو ایک طلاق ہو گی۔ کیونکہ مسلم ابو داؤد، نسائی نے روایت کی ہے کہ ابو الصہبان ابن عباسؓ سے بہت پوچھنے والے آدمی تھے (ایک روز ابن عباسؓ سے) انہوں نے کہا۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب کوئی اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیتا تھا تو صحابہ اس کو ایک شمار کیا کرتے تھے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ بات نہ تھی بلکہ جب کوئی اپنی بیوی کو دخول کرنے سے پہلے تین طلاقیں دے دیتا تھا تو اس کو آنحضرت اور ابو بکرؓ کے زمانہ میں اور حضرت عمرؓ کی شروع خلافت میں صحابہ ایک ٹھہراتے تھے۔ لیکن جب علماء نے یہ دیکھا کہ اکثر لوگ ایسا ہی کرنے لگے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ان کے خلاف عورتوں کی تائید کرنی چاہئے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ ایک کلمہ سے چند طلاقیں دینی جائز ہیں اور وہ بلا گناہ ہوئے پڑ جاتی ہیں۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو سہل بن سعد کی سند سے صحیحین میں مروی ہے کہ عویمر عجلی نے اپنی بیوی پر لعان کیا جب (میاں بیوی) دونوں لعان کر چکے تو عویمر نے (حضور کی خدمت میں) عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر اب میں اس عورت کو رکھوں گا تو اس کی وجہ سے جھوٹا کہلاؤں گا۔ لہٰذا میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اسے تین طلاقیں ہیں۔ اس پر نبی ﷺ نے بھی انہیں منع نہ کیا۔ فاطمہ بنت قیس کی بعض روایتوں میں یہ ہے کہ میرے میاں نے مجھے تین طلاقیں دے دی تھیں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے نہ مجھے نان نفقہ دلوایا اور نہ (رہنے کو) کوئی گھر دلوایا اور عبد الرحمٰن بن عوف نے اپنی بیماری میں تماظر کو طلاق دے دی تھی اور حسن بن علی نے اپنی بیوی شہباء کو تین طلاقیں دے دی تھیں جس وقت اس نے حضرت علیؓ کے وصال کے بعد آپ کو خلافت کی مبارک باد دی، پس یہاں دو مقام ہیں۔ ایک یہ کہ تین طلاقیں دیئے کی صورت میں تین ہی طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کے باعث آدمی گنہگار ہوتا ہے۔

ہماری دلیل حدیث اور اجماع دونوں ہیں حدیث تو وہی ابن عمرؓ کی کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض میں طلاق دے دی تھی۔ پھر یہ چاہا کہ اور دو طلاقیں دو حیض کے وقت دے دیں۔ یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو بھی ہو گئی۔ حضور نے فرمایا اے ابن عمر کیا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسی طرح کرنے کا حکم دیا ہے۔ بے شک تم نے سنت (طریقہ) کو چھوڑ دیا۔ سنت (طریقہ) یہ ہے کہ اول طہر ہونے دو پھر ہر حیض کے لئے طلاق دو۔ ابن عمر کہتے ہیں میں نے حضور کے حکم سے اس سے رجعت کر لی۔ پھر حضور نے فرمایا کہ جب وہ پاک ہو جائے اس وقت یا تو طلاق دے دینا اور یا رکھ لینا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں اسے تین طلاقیں دے دوں تو پھر میرے لئے اس سے رجعت کرنی جائز ہے یا نہیں۔ فرمایا نہیں۔ وہ تم سے بائنہ ہو جائے گی اور یہ گناہ

marfat.com

ہوگا۔ یہ روایت دار قطنی لے اور ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں حسن سے نقل کی ہے حسن کہتے ہیں ہم سے ابن عمر نے بیان کی بیہقی نے اس روایت کو عطاء خراسانی کی وجہ سے ضعیف کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ عطاء نے چند زیادتیاں بیان میں کی ہیں کہ کسی نے ان میں ان کی موافقت نہیں کی اور یہ خود ضعیف ہیں۔ جس روایت کو یہ اکیلے بیان کریں وہ مقبول نہیں ہوتی۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ بیہقی کا اسے ضعیف کہنا مردود ہے۔ کیونکہ عطاء کی موافقت سند اور تین دونوں میں شعیب بن رزیق نے کی ہے جسے طبرانی نے نقل کی ہے اور جو ابن عباسؓ کی حدیث ذکر کی جاتی ہے اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ وہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ بہت سے صحابہ کے سامنے حضرت عمر کا تین طلاقوں کو جاری کرنا اور اسی پر عمل در آمد ہونا ان کے نزدیک ناسخ کے ثابت ہونے پر دلالت کرتا ہے اگرچہ حضرت عمرؓ سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کی خلافت میں یہ مسئلہ مبہم میں رہا۔ اور ابن عباسؓ نے جو روایت کی ہے اس کے خلاف ان کا فتویٰ صحیح طور پر ثابت ہے، ابو داؤد نے مجاہد سے نقل کیا ہے۔ مجاہد کہتے ہیں میں ابن عباس کے پاس موجود تھا کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے یہ کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں (یہ سن کر) آپ خاموش ہوگئے یہاں تک کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ آپ ان طلاقوں کو لوٹا دیں گے۔ اتنے میں آپ نے فرمایا کہ تم لوگ طلاقیں دے کر حماقت پر سوار ہو جاتے ہو، پھر کہتے ہوائے ابن عباس (یہ ہو گیا اور وہ ہو گیا تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کی خلاصی کی صورت کر دیتا ہے) تو نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور عورت تجھ سے بائنہ ہوگئی۔ طحاوی نے ان لفظوں سے نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دی تھیں (اس سے) ابن عباس نے فرمایا کہ تو نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے بائنہ ہوگئی، تو اللہ سے نہیں ڈرا کہ وہ تیری خلاصی کی صورت کر دیتا۔ موطا امام مالک میں ہے کہ ایک آدمی نے ابن عباسؓ سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دی ہیں آپ کی کیا رائے ہے ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تیری طرف سے تین طلاقیں تو اسے ہوگئیں اور باقی ستانوے کے ساتھ تو نے اللہ کی آیتوں کو کھیل بنایا اور تین طلاقیں پڑ جانے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور بڑے بڑے فقہاء صحابہ سے مروی ہے۔ موطا امام مالک میں ہے کہ ایک آدمی ابن مسعود کے پاس آیا اور یہ کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دے دی ہیں آپ نے پوچھا کہ تجھے علماء نے کیا جواب دیا کہا یہ جواب ملا ہے کہ وہ مجھ سے بائنہ ہوگئی آپ نے فرمایا انہوں نے سچ کہا۔ حکم یہی ہے جو انہوں نے کہا ہے اس سے بھی اس جواب پر اجماع ظاہر ہوتا ہے۔ عبد الرزاق نے علقمہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی ابن مسعودؓ کے پاس آیا اور یہ بیان کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ننانوے طلاقیں دی ہیں۔ ابن مسعود نے اس سے فرمایا کہ اسے تو تین ہی طلاقوں نے بائنہ کر دیا ہے اور باقی سب (تمہاری) سرکشی میں داخل ہیں۔ سنن ابی داؤد اور موطا امام مالک میں محمد بن ایاس بن بکیر سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاقیں دی تھیں۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ اس سے نکاح کر لوں اس خیال سے وہ فتوے پوچھنے جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا اس نے اس کی بابت اول ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا دونوں نے جواب دیا کہ جب تک وہ عورت اور کسی سے نکاح نہ کر لے تمہارے ساتھ اس کا نکاح جائز نہیں ہے وہ بولا کہ میں نے تو ایک ہی مرتبہ (تین) طلاقیں دے دی تھیں اس پر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بس جو کچھ تمہارے پاس بچا کھچا تھا تم نے سب ہی اپنے آگے کر لیا۔ موطا امام مالک میں ابن عمر سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ وکیع نے اعمش سے انہوں نے حبیب بن ثابت سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے پاس آیا اور بیان کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دی ہیں آپ نے فرمایا کہ وہ تو تجھ سے تین ہی طلاقوں سے بائنہ (یعنی علٰحدہ ہو گئی تھی اور باقی طلاقوں کو تو اپنی اور بیبیوں پر تقسیم کر دے۔ وکیع نے معاویہ بن ابی یحییٰ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں ایک آدمی حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دی ہیں (اب میرے لئے کیا حکم ہے) فرمایا وہ تو تین ہی طلاقوں سے تجھ سے بائنہ ہو چکی۔

عبد الرزاق نے عبادہ بن صامت سے سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ ان کے باپ نے اپنی ایک بیوی کو ایک ہزار

marfat.com

طلاقیں دے دیں۔ پھر عبادہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے یہ مسئلہ پوچھا۔ حضور نے فرمایا کہ باوجود خدا کی نافرمانی ہونے کے تین طلاقوں سے وہ عورت بائنہ ہو گئی اور باقی ستانوے طلاقیں سرکشی اور ظلم ٹھیریں۔ اگر اللہ چاہے گا عذاب کرے گا اور چاہے گا بخش دے گا۔ طحاوی نے حضرت انسؓ سے (اسی مسئلہ کی بابت) روایت کی ہے کہ وہ عورت بغیر دوسرے سے نکاح کئے اس کے واسطے حلال نہیں ہے، حضرت عمرؓ کی خدمت میں جب کوئی ایسا آدمی آتا تھا۔ جس نے اپنی بیوی کو (ایک بارگی) تین طلاقیں دی ہوتیں تو اس کی پشت پر آپ درے لگوایا کرتے تھے، حضرت انس نے حضرت عمرؓ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ آپ نے اس شخص کی بابت فرمایا جس نے کنواری لڑکی سے نکاح کر کے اسے تین طلاقیں دے دی تھیں کہ بغیر دوسرے سے نکاح ہوئے یہ لڑکی اس کے لئے حلال نہیں ہے۔ مخالف نے جو حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ذکر کی ہے اس میں اس طرح تاویل ہو سکتی ہے کہ شروع اسلام میں تین مرتبہ اس طرح کہنے سے کہ تجھے طلاق ہے۔ تجھے طلاق ہے ایک ہی طلاق ہوتی تھی کیونکہ اس زمانہ میں اس طرح کہنے سے ان لوگوں کا مقصود محض تاکید کرنی ہوتی تھی پھر جب وہ چند طلاقوں ہی کے قصد سے اس طرح کہنے لگے تو ان کا قصد معلوم ہونے پر (شارع نے) ان کے ذمہ تین ہی طلاقیں لازم کر دیں یا احتیاط کی غرض سے ایسا کیا گیا ہو۔ باقی رکانہ کی حدیث منکر ہے اور صحیح اس طرح ہے جو ابوداؤد۔ ترمذی ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو بائنہ طلاق دے دی تھی لیکن حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ اس نے ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا ہے اس لئے آپ نے اس سے رجعت کرادی پھر رکانہ نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسے دوسری طلاق دی اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں تیسری دے دی۔ ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہی روایت زیادہ صحیح ہے اور جس قدر حدیثیں اور آثار ہم نے ذکر کئے ہیں ان سے جیسا تین طلاقوں کا ایک بارگی پڑ جانا ثابت ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ فعل بدعت اور گناہ ہے اور امام شافعیؒ نے جو عویمر کے بارے میں یہ ذکر کیا ہے کہ انہوں نے لعان کرنے کے بعد تین طلاقیں دی تھیں تو یہ امام شافعیؒ ہی پر حجت ہے اس طرح کہ آنحضرت ﷺ نے عویمر کو منع نہیں فرمایا پس یہ منع نہ فرمانے پر شہادت ہے۔ لیکن دوسرے قصہ میں حضور کا منع فرمانا ثابت ہو جانے کے بعد اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور شاید حضرت نے منع فرمایا ہو۔ لیکن راوی نے اسے چھوڑ دیا یا آپ نے منع ہی نہ فرمایا ہو اس وجہ سے کہ لعان کے بعد عورت محل طلاق نہیں رہتی اور فاطمہ بنت قیس کی وہ روایت صحیح نہیں ہے۔ جس میں تین طلاقوں کا ذکر ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے شوہر نے انہیں بائنہ طلاق دے دی تھی۔ اس کے علاوہ ان کا شوہر طلاق دینے کے وقت کسی لشکر میں تھا، اپنی بیوی فاطمہ کے پاس موجود نہ تھا کہ اس کے کہنے کو سب سن لیتے۔ ہاں تین طلاقوں کا دینا ان کی طرف سے (اوروں کی زبانی) ثابت ہوا اور نیز فاطمہ بنت قیس کی روایت کو حضرت عمرؓ نے تسلیم نہیں کیا اور یہ فرمایا ہم نہیں جانتے کہ یہ سچ کہتی ہے یا جھوٹ بولتی ہے اور اسے یاد بھی ہے یا کہ بھول گئی اور عبدالرحمن بن عوف اور حسنؒ کا اثر مرفوع حدیث کے مقابلہ میں حجت نہیں بن سکتا۔

مسئلہ :- یک بارگی تین طلاقیں دینی بدعت اور حرام ہے اور ہر طہر میں ایک ایک طلاق دینا فان طلقها الآیۃ کی وجہ سے جائز اور مباح ہے۔ اور ان سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہی ہو جائے تو ایک طلاق دے دے پھر اگر رجعت کرنے کا ارادہ نہ ہو تو اسے ویسے ہی رہنے دے، یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مباح چیزوں میں طلاق دینی سب سے زیادہ بری ہے اور ضرورت ایک ہی کے دینے سے پوری ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جادو کی برائی میں فرمایا ہے۔ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ (یعنی لوگ ان دونوں (ہاروت ماروت) سے ایسا جادو سیکھتے ہیں جس سے میاں بیوی میں جدائی کرادیں) اس سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی میں جدائی کرا دینا بہت بری بات ہے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھا کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے گرگوں کو لوگوں میں فساد پھیلانے کے لئے بھیج دیتا ہے اور ان سب میں اس کا بڑا مقرب وہ ہوتا ہے جس نے فساد زیادہ پھیلایا۔ ہو ایک آکر کہتا ہے کہ میں نے ایسا ایسا کیا ہے۔ ابلیس کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا۔ دوسرا آکر کہتا ہے کہ میں نے ایک شخص

marfat.com

کے ایسا پیچھے پڑا کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان میں جدائی کرا کے چھوڑی پس اس سے ابلیس کہتا ہے کہ ہاں بس کام تو تو نے کیا ہے۔

اعمش کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ حضرت جابرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ ابلیس اس کو اپنی چھاتی سے لگالیتا ہے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے ابن عمر نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا حلال چیزوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بری طلاق ہے یہ حدیث ابوداؤد نے نقل کی ہے۔

مسئلہ :- حیض کی حالت میں طلاق دینے سے بالاتفاق طلاق پڑ جاتی ہے۔ امامیہ اس کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ بالکل طلاق نہیں پڑتی اور ہمارے نزدیک طلاق پڑ جاتی ہے ہاں (ایسا کرنا) حرام ہے۔ اس کے بعد رجعت کر لینی واجب ہے اور ابن عمرؓ کی حدیث جو پہلے گزر چکی ہے وہ طلاق پڑ جانے اور حرام ہونے اور رجعت واجب ہونے تینوں پر دلالت کرتی ہے اس میں (ائمہ کا) اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص رجعت کرنے کے بعد سنت کے موافق طلاق دینی چاہے تو کب دے۔

امام ابو حنیفہ کا قول یہ ہے کہ جب وہ اس حیض سے پاک ہو جائے جس میں طلاق دی ہو اور پھر حیض آکر اس سے بھی پاک ہو جائے تو اس وقت اسے (دوسری) طلاق دے۔ امام محمد نے مبسوط میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور امام ابو حنیفہ کا اور صاحبین کا خلاف انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ یہی قول امام مالک اور امام احمد کا ہے یہی مذہب امام شافعیؒ کا مشہور ہے اور یہی ابن عمر کی اس حدیث سے نکلتا ہے۔ جو صحیحین میں مذکور ہے کیونکہ حضرت ﷺ نے (حضرت عمر سے) فرمایا کہ ابن عمر سے کہو کہ اس سے رجعت کر لے اور اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے اور پھر دوسرا حیض آکر اس سے بھی پاک ہو جائے پھر اگر اسے طلاق دینی ہی ہو تو اس طہر میں ہاتھ لگانے سے پہلے اسے طلاق دے دے۔ پس یہی عدت (کا وقت) ہے جس کا اللہ عزوجل نے حکم دیا ہے اور ایک روایت میں یوں ہے یہاں تک کہ اس حیض کے سوا جس میں طلاق دی ہے اسے ایک اور حیض آلے (تب طلاق دے) اور طحاوی نے امام ابو حنیفہ کا قول ذکر کیا ہے کہ اس طہر میں طلاق دے جو اس حیض کے بعد ہو جس میں پہلے طلاق دی تھی۔ یہی قول امام شافعی کا بھی ہے۔

طحاوی کہتے ہیں کہ پہلا قول امام ابو یوسف کا ہے اور دوسرے قول کی دلیل ابن عمر کی گزشتہ حدیث میں سالم کی روایت ہے کہ ابن عمر سے کہو کہ اس سے (اب تو) رجعت کر لے اس کے بعد طہر یا حمل کی حالت میں طلاق دے دے۔ یہ روایت مسلم اور اصحاب سنن نے نقل کی ہے۔ لیکن بہتر پہلا ہی قول ہے۔ کیونکہ وہ صحیح بھی اس سے زیادہ ہے اور تشریح بھی اس میں بہتر ہے اس کے علاوہ اس میں زیادتی (بیان) ہے اور زیادتی کی اختیار کرنا بہتر ہوتا ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں آنحضرت ﷺ کا (ابن عمر کے حق میں) یہ فرمانا کہ اسے اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے اس پر دلالت کرتا ہے کہ رجعت کا مستحب یا واجب ہونا اسی حیض کے ساتھ خاص ہے۔ جس میں طلاق دی ہے اگر اس میں رجعت نہ کی یہاں تک کہ وہ پاک ہو گئی تو پھر یہ گناہ (اس کے ذمہ) ثابت ہو جاتی ہے۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ (پھر خوش خوئی کے ساتھ رکھے) یعنی رجعت کر کے سلوک کے ساتھ رہے اور یہ یعنی دو طلاقوں کے بعد رکھنا بالاتفاق ثابت ہے۔ جس وقت میاں بیوی دونوں آزاد ہوں اور اگر دونوں[1] غلام لونڈی ہوں تو پھر دو طلاقوں کے بعد بالاتفاق رجعت نہیں ہو سکتی اور اگر لونڈی آزاد مرد کے نکاح میں ہو یا آزاد عورت غلام کے نکاح میں ہو تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ تینوں کا قول یہ ہے کہ اگر خاوند آزاد ہے تو اس کی تین طلاقیں ہیں اگرچہ اس کے نکاح میں لونڈی ہو اور اگر غلام ہے تو دو طلاقیں ہیں اگرچہ اس کی بیوی آزاد ہو یہی قول حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور زید بن ثابتؓ کا ہے۔ امام ابو حنیفہ اس کے بالعکس فرماتے ہیں یعنی وہ طلاق کا اعتبار عورتوں پر کرتے ہیں، یہی قول حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ

[1] جہاں اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ طلاق دینے والا لڑکا ہے وہاں لونڈی کو باندی کے لفظ سے بدل دیا ہے (۔ مترجم)

marfat.com

کا ہے۔
ابن جوزی فرماتے ہیں کہ دونوں فریق (کے قول) کی تائید میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں لیکن سب ضعیف ہیں۔
ابن جوزی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ غلام کی دو طلاقیں ہیں اور باندی کی عدت دو حیض ہیں۔ ابو داؤد ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، دار قطنی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ باندی کے لئے دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں۔
ابن جوزی کہتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں کی سند میں مظاہر بن اسلم (راوی) ہے جس کی بابت یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ مظاہر کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔
ابو حاتم کہتے ہیں کہ مظاہر منکر الحدیث ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے مظاہر کو معتبر کہا ہے اور حاکم کہتے ہیں کہ مظاہر اہل بصرہ کے استاد ہیں۔ ہمارے مشائخ متقدمین میں سے کسی نے ان کی نسبت جرح نہیں کی۔
ابن جوزی کہتے ہیں جن لوگوں نے طلاق میں مردوں کا اعتبار کیا ہے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلاق مردوں کے اعتبار سے ہوتی ہے اور عدت عورتوں کے اعتبار سے۔ مگر واقع میں یہ کلام ابن عباسؓ کا ہے۔ ابن جوزی نے دار قطنی کے طریق سے ابن عمر سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ باندی کے لئے دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں۔ ابن جوزی کہتے ہیں یہ دونوں حدیثیں بھی ثابت نہیں ہیں پہلے تو اس لئے کہ اس (کی سند) میں سلیم بن سالم (راوی) ہے ابن مبارک اسے جھوٹا فرمایا کرتے تھے اور یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ اس کی حدیث کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔
سعدیؒ کہتے ہیں کہ سلیم ثقہ نہیں ہے اور دوسری حدیث اس لئے ثابت نہیں کہ اس کو مرفوع روایت کرتے ہیں۔ عمرو بن شبیب تنہا ہے اور یہ راوی ضعیف ہے۔
یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ عمرو بن شبیب کا اعتبار نہیں ہے۔ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ یہ واہی تباہی حدیثیں روایت کرتا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ ابن عمر کا قول ہے (مرفوع حدیث نہیں ہے) امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کو اس طرح ترجیح ہو سکتی ہے کہ پہلے ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ طلاقوں کو طہروں پر بانٹ دینا ضروری ہے۔ پس طلاقوں کی تعداد بھی طہروں ہی کی تعداد کے موافق ہوگی اور اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہیں۔ پس اس سے ثابت ہو گیا کہ اس کی طلاقیں بھی دو ہیں، واللہ اعلم۔
اور یہاں امام ابو حنیفہ کے مذہب پر ایک اشکال لازم آتا ہے وہ یہ ہے کہ امام موصوف کے قاعدہ کے موافق عام اپنے افراد کو یقیناً شامل ہوتا ہے (اسی وجہ سے) قرآن شریف کے عام (لفظ) کی تخصیص خبر واحد یا قیاس سے جائز نہیں ہے، نہ خبر واحد اور قیاس سے اس کا منسوخ ہونا جائز ہے۔ حالانکہ آیۃ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اور دوسری آیۃ الطلاق مرتان یہ دونوں کی دونوں آزاد عورتوں اور لونڈیوں سب کو شامل ہیں (یعنی ان آیتوں سے سب کے لئے ایک ہی حکم معلوم ہوتا ہے پھر آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد طلاق الامۃ ثنتان وعدتہا حیضتان سے ان دونوں آیتوں کی تخصیص کر لینا درست نہیں ہے کیونکہ یہ خبر واحد ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ عام قطعی میں سے جس وقت کسی قطعی دلیل کے ساتھ اول بعض افراد خاص کر لئے جائیں تو پھر وہ عام باقی افراد میں ظنی ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کی تخصیص خبر واحد اور قیاس سے جائز ہو جاتی ہے۔ اور اللہ کا قول والمطلقات یتربصن پہلے چند آیتوں کے باعث مخصوص ہو چکا ہے ایک تو یہ آیت واولات الاحمال اجلہن الایۃ دوسری یہ آیت واللائی یئسن من المحیض الایۃ پس اس وقت اس کی تخصیص خبر واحد سے کر لینی جائز ہے! تو یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ مخصص وہ (حکم) ہوتا ہے جو اس کے متصل ہو اور جو متراخی ہو وہ ناسخ ہوتا ہے مخصص نہیں ہوتا اور یہ آیتیں جو تم نے پیش کی ہے ان میں سے اس آیت کے کوئی متصل نہیں ہے بلکہ متراخی ہیں

marfat.com

لہٰذا یہ اس کے لئے ناسخ ہوئیں اور عام کے بعض افراد سے حکم کا منسوخ ہونا اس عام کو باقی افراد میں ظنی نہیں کیا کرتا بلکہ باقی افراد میں وہ قطعی رہتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے تھا۔ ہاں اس اشکال سے چھوٹنے کی یہ صورت بن سکتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ جب تمام امت کا اجماع اس پر (ہونا) ثابت ہو گیا کہ عدت کی آیت اور طلاق کی آیت دونوں آزاد عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں تو اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ پہلے اجماع والوں نے (جو صحابہ کرام ہیں) رسول اللہ ﷺ سے کوئی ایسا قول سنا ہو گا جو ان کے حق میں قطعی تھا۔ اس قول سے انہوں نے ان آیتوں کی تخصیص کر لی اگرچہ ہم تک وہ قول تواتر کے ساتھ نہیں پہنچا اور اگر وہ اس بارے میں آنحضرت ﷺ سے کچھ نہ سنتے تو قطعی آیت کی تخصیص کرنے پر کبھی جرأت نہ کرتے اور گمراہی پر ان سب کا اتفاق نہیں ہو سکتا۔ پھر تابعین نے بھی انہیں کا طریقہ اختیار کیا کیونکہ ان کا طریقہ چھوڑ کر اور طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس پر اجماع نہیں ہے کہ طلاق کا اعتبار مردوں کے ساتھ ہے یا کہ عورتوں کے ساتھ۔ تو پھر یہ جواب یہاں کس طرح بن سکتا ہے۔

ہم کہتے ہیں اجماع سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ کے قول الطلاق مرتان کے عام معنی مراد نہیں ہیں اور یہ خلاف کچھ مضر نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (یا حسن سلوک کے ساتھ (رخصت کردے)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد تیسری طلاق ہے۔

میں کہتا ہوں یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا عطف فامساک بمعروف پر ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک کو اختیار کرے یا تو خوش خوئی کے ساتھ رکھے اور یا تیسری طلاق دے کر حسن سلوک ساتھ رخصت کر دے حالانکہ (حکم) اس طرح نہیں ہے بلکہ اس کے لئے جائز ہے کہ نہ رکھے اور نہ طلاق دے اور عدت پوری ہونے تک ویسے ہی رہنے دے۔

بعض کہتے ہیں تسریح باحسان سے یہ مراد ہے کہ اس سے رجعت نہ کرے یہاں تک کہ وہ عدت گزار کر علیحدہ ہو جائے اور اس قول پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو پہلے پر وارد ہوتا تھا۔

بغویؒ وغیرہ نے ان دونوں قولوں کو ذکر کیا ہے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ او تسریح باحسان کی یہ تفسیر کی جائے کہ اس سے عورت کو فقط علیحدہ کر دینا مراد ہے خواہ تیسری طلاق دے کر یا عدت پوری کرا کر اور معنی (آیت کے) یہ ہوئے کہ پس واجب یہ ہے کہ یا تو خوش خوئی کے ساتھ اسے رکھے یا حسن سلوک کے ساتھ علیحدہ کر دے، برابر ہے کہ تیسری طلاق دے یا نہ دے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ (عورت کو) محض ستانے کے لئے خلاف دستور کے روکے رکھنا حرام ہے اور اس بنا پر آیۃ فان طلقها فلا تحل له من بعد اس کے بعد احتمالوں میں سے ایک کی تفصیل ہے اور اگر تسریح سے علیحدہ طلاق مراد ہو تو پھر یہ چوتھی طلاق ہو جائے گی۔

اگر کوئی کہے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ الطلاق مرتان (کے بعد) تیسری طلاق کہاں مذکور ہے۔ فرمایا او تسریح باحسان۔ یہ روایت ابو داؤد نے اپنے ناسخ میں اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور ابن مردویہ نے ابی رزین اسدی سے مرسلاً نقل کی ہے یہی روایت دار قطنی نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے قتادہ سے انہوں نے انسؓ سے متصل روایت کی ہے ابن قطان نے اسے صحیح کہا ہے۔

بیہقی کہتے ہیں کہ یہ روایت ٹھیک نہیں ہے اس کے علاوہ دار قطنی اور بیہقی نے عبد الواحد بن زیاد کی سند سے انہوں نے اسمٰعیل سے انہوں نے انسؓ سے روایت کی ہے اور ان دونوں نے کہا ہے کہ اس کی عمدہ سند اس طرح ہے کہ اسمٰعیل نے ابو رزین سے انہوں نے نبی ﷺ سے مرسلاً روایت کی ہے۔

بیہقی کہتے ہیں کہ معتبر راویوں میں سے (محدثین کی) ایک جماعت نے اس کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن قطان کہتے ہیں

marfat.com

کہ یہ روایت مرفوع بھی صحیح ہے۔
ہم کہتے ہیں کہ تیسری طلاق کے سوال کے جواب میں آنحضرت نے فرمایا او تسریح باحسان اس کا معنی یہ ہے کہ دونوں احتمالوں میں سے ایک احتمال یہ ہے، واللہ اعلم۔
شان نزول :- ابوداؤد نے ناسخ منسوخ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ پہلے لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جو مال اپنی بیوی کو دے دیتے یا اسی کا ہو تا اس کو کھالینا حلال سمجھتے اور اس میں کچھ گناہ نہیں سمجھتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (اور جو تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ لینا تمہیں جائز نہیں ہے) یعنی مہر میں سے۔ یہ خطاب خاوندوں کو ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ خطاب حکام کو ہے اور لینا اور دینا انہیں کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے کے وقت وہی فیصلہ کیا کرتے ہیں لیکن یہ قول ٹھیک نہیں۔
اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ (مگر جب دونوں کو خوف ہو) چھ قاریوں کی قرأت مبنی الفاعل کی ہے یعنی میاں بیوی کو اپنی اس حالت کا یقین ہو جائے۔
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (کہ وہ دونوں خدائی قانونوں پر قائم نہ رہ سکیں گے) یعنی عورت کو یہ اندیشہ ہو کہ خاوند کا کہنا ماننے میں اللہ کی نافرمانی ہو گی اور خاوند کو یہ اندیشہ ہو کہ مجھ سے اس عورت کے حقوق نہ ادا ہوں گے یا یہ کہ جب اسے طلاق نہ دے گا تو اس مرد کی طرف سے عورت پر ظلم ہو گا۔
ابو جعفر، حمزہ اور یعقوب نے یخافا مبنی للمفعول پڑھا ہے یعنی زوجین سے اندیشہ کیا جائے اب ان (ان لا یقیما میں) مع صلہ کی یخافا کی ضمیر سے بدل الاشتمال ہے۔
فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (تو اگر (اے حاکمو) تمہیں ڈر ہو کہ خدائی قانونوں پر وہ دونوں قائم نہ رہ سکیں گے تو (اگر) عورت مرد کو کچھ دے کے پیچھا چھڑا لے تو اس میں ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں) فراء کہتے ہیں (اس آیت میں) علیہما کے لفظ سے فقط خاوند مراد ہے عورت مراد نہیں اور محض ان کے باہمی اتصال کے سبب سے دونوں کو اکٹھا بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ (موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے نسیا حوتہما یعنی موسیٰ اور ان کے خادم دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے حالانکہ بھولنے والے خادم ہی تھے نہ کہ موسیٰ۔
میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ اس مال کے لینے میں جیسا کہ مرد کو گناہ ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا الآیۃ۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔ اسی طرح طلاق کی خاطر اس مال کے دینے میں عورت کو بھی گناہ ہوتا ہے کیونکہ طلاق مانگنا گناہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو عورت بلا کسی خوف کی بات کے اپنے خاوند سے طلاق مانگے تو اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔ یہ حدیث امام احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے ثوبان سے نقل کی ہے اور باوجود گناہ ہونے کے مال دینا حرام ہے۔ بلکہ ناحق مال کو برباد کرنے سے یعنی جس میں کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ نہ ہو انسان کو منع کیا گیا ہے۔ اور آنحضرت علیہ السلام کے اس ارشاد کا کہ المختلعات هن المنافقات دراصل یہی مطلب ہے (اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے) پس جس وقت خدائی قانونوں کی پابندی نہ کرنے اور گناہ کے مرتکب ہو جانے کا میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو تو دونوں کو دینا اور لینا جائز ہے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جانبین سے جھگڑا ہونے کا اندیشہ ہو اور اگر فقط خاوند ہی کی طرف سے ہو تو اس کو یہ مال لینا جائز نہیں ہے۔
صاحب ہدایہ کہتے ہیں کہ اس کو یہ مال لینا مکروہ تحریمی ہے اور حق یہ ہے کہ یہ حرام ہے۔ اس کی دلیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں دوسرے اس کے مباح ہونے کی کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

marfat.com

حرمت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ناحق ایک مسلمان کا مال چھیننا اور عورت کو بلا خواہش کے اس لئے روکنا کہ وہ تنگی اور تکلیف میں رہے، تاکہ اس سے کچھ مال وصول ہو، حرام ہے اور اگر زیادتی عورت ہی کی طرف سے ہے تب بھی مال دینا حرام ہے اور عورت گناہ گار ہوگی نہ کہ خاوند جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور اگر زیادتی کسی طرف سے بھی نہ ہو اور نہ انہیں اللہ کے قانونوں کی رعایت نہ رکھنے کا اندیشہ ہو تو پھر نہ خاوند کو مال لینا جائز ہے اور نہ عورت کو طلاق مانگنا اور مال دینا جائز ہے۔ ہاں خلع ہو جائے گا اور بالاتفاق سب صورتوں میں عورت کے ذمہ مرد کا مال حکماً واجب ہو جائے گا (فرقہ) ظاہریہ (کے لوگ) اس کے مخالف ہیں۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ خلع خواہ طلاق (کا حکم رکھتا) ہو یا فسخ (نکاح) ہو دونوں صورتوں میں یہ امر شرعی ہے اور امر شرعی کا ممنوع ہونا ان کے منعقد اور جاری ہو جانے پر دلالت کرتا ہے تاکہ اس میں مبتلا ہونا معلوم ہو۔

مزنی کا مذہب یہ ہے کہ خلع شریعت میں بالکل معتبر نہیں ہے اور یہ آیت مذکورہ اس آیت سے منسوخ ہے ان اردتم استبدال زوج الآیۃ

اس کا جواب یہ ہے کہ اس نکاح کے معاوضہ میں میاں بیوی کی رضامندی کے ساتھ لینے دینے کا اس آیت میں کچھ ذکر نہیں ہے۔ پس ان دونوں میں تعارض نہ ہوا اور بدون تعارض کے منسوخ نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ خلع طلاق ہے یا فسخ (نکاح)۔

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور مشہور قول امام شافعیؒ کا یہ ہے کہ خلع طلاق ہے اور ایک روایت امام احمد سے بھی یہی ہے۔

دوسرا قول امام احمد کا اور ایک روایت امام شافعیؒ سے یہ ہے کہ خلع فسخ (نکاح) ہے طلاق نہیں ہے۔ پس جو خلع کو فسخ کہتے ہیں نہ اس سے ان کے نزدیک طلاق کا عدد کم ہوتا ہے اور نہ اس کے ساتھ دوسری طلاق ملتی ہے اور نہ عدت کے اندر میاں بیوی میں وراثت جاری ہوتی ہے اور دونوں فریق اسی آیت کو دلیل پیش کرتے ہیں۔ فسخ کہنے والوں کی دلیل اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول آیت میں دو طلاقوں کو ذکر کر کے پھر خلع کو ذکر کیا ہے اور اس کے بعد پھر اپنے قول فان طلقها فلا تحل له سے تیسری طلاق کو ذکر کیا ہے پس اگر اب خلع بھی طلاق ہو تو چار طلاقیں ہونی لازم آتی ہیں (حالانکہ طلاقیں بالاتفاق تین ہی ہیں) یہ استدلال ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

ابن جوزی نے سند کے ساتھ طاؤس سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں میں نے ابراہیم بن سعد سے سنا۔ ابن سعد نے ابن عباسؓ سے اس آدمی کی بابت مسئلہ پوچھا جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیدی تھیں اور پھر اس عورت نے اس سے خلع کر لیا تھا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اگر وہ چاہے تو اس عورت سے نکاح کر لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول میں اور آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع اس کے درمیان میں ہے۔ عبدالرزاق نے بھی اسے نقل کیا ہے اور ابن عباسؓ سے دار قطنی نے نقل کیا ہے کہ خلع علیحدگی ہے۔

ابن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام نافع سے مروی ہے کہ انہوں نے معوذ ابن عفرا کی بیٹی ربیع سے سنا، وہ ابن عمر سے بیان کر رہی تھی کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے زمانہ میں، میں نے اپنے خاوند سے خلع کر لیا تھا پھر میرے چچا حضرت عثمانؓ کی خدمت میں گئے اور ان سے بیان کیا کہ معوذ کی بیٹی نے آج اپنے خاوند سے خلع کر لیا ہے کیا وہ اب اپنے گھر چلی جائے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ ضرور چلی جائے، نہ اب ان میاں بیوی کے درمیان میں میراث ہے اور نہ عورت کے ذمہ عدت ہے، ہاں جب تک کہ اس کو ایک حیض نہ آلے تو اتنے تک یہ نکاح نہ کرے کیونکہ یہ اندیشہ ہے کہ شاید اسے حمل ہو۔ ابن عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ عثمان ہم سب سے بہتر اور ہم سب سے بڑے عالم تھے۔ ہمارے استدلال کی صورت یہ ہے کہ رجعت والی طلاق کو اللہ نے دو مرتبہ ذکر کیا ہے اور اس کے بعد عورت کے فدیہ دینے کا ذکر کیا ہے اور باوجودیکہ طرز کلام سے، فعل کی اسناد میاں بیوی دونوں کی طرف ہوتی ہے، پھر دینے کی اسناد خاص عورت کی طرف کرنا اور بغیر ادا کئے خاوند سے جدائی نہ ہونا اس امر کی صاف دلیل ہے

marfat.com

کہ طلاق خاوند ہی کا فعل ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک مال کے ساتھ دوسری بغیر مال کے پھر فرمایا فان طلقها فلا تحل لہ اور ف تعقیب کے واسطے ایک خاص لفظ ہے اور فدیہ دینے کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے طلاق کو بیان کیا ہے پس اگر خلع کے بعد طلاق واقع نہ ہو تو ف کا موجب باطل ہو جاتا ہے۔ باقی یہ کہنا کہ یہ پہلے کلام کے ساتھ متعلق ہے اور لا یحل لکم سے الظالمون تک جملہ معترضہ ہے ٹھیک نہیں ہے، اور بلا دلیل کے نظم کلام میں خلل ڈالنا ہے اور امام شافعیؒ کا فرمانا (کہ اس آیت کے اول اور آخر میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کا ذکر کیا ہے اور اس کے درمیان میں خلع کا ذکر ہے) بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ خلع اور فسخ کا تو اس کلام الٰہی میں بالکل بھی ذکر نہیں ہے ہاں فقط عورت کے دینے کو ذکر کیا ہے اور خاوند کے فعل سے سکوت ہے۔ پس اس کا فعل وہی طلاق ہے جو پہلے مذکور ہو چکا۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جس طلاق کا پہلے ذکر ہوا اگر وہ مال کے ساتھ نہیں تو رجعی ہے اگر مال کے ساتھ ہے تو بائن ہے تاکہ دینا متحقق ہو جائے اور بدل اور مبدل منہ (یعنی طلاق اور مال) خاوند کی ملک میں جمع نہ ہوں گے خواہ یہ (جمع نہ ہونا) طلاق کے لفظ سے ہو یا خلع کے لفظ سے ہو یا اور کسی لفظ سے جس سے یہ معنی حاصل ہو جائیں اور اس کا نام خلع رکھنا ایسی اصطلاح ہے جس کا ثبوت قرآن (مجید) سے نہیں ہے۔ واللہ اعلم اور خلع کے طلاق ہونے پر اس آیت کی شان نزول بھی دلالت کرتی ہے کہ عبد اللہ بن ابیؒ کی بیٹی ثابت بن قیس کی بیوی جمیلہ (اور دار قطنی نے کہا ہے کہ اس کا نام زینب تھا۔ ابن حجر کہتے ہیں، شاید اس کے دو نام ہوں ایک اور حدیث میں ہے کہ اس عورت کا نام حبیبہ بنت سہل تھا۔ ابن حجر کہتے ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل میں دو قصے ہیں دونوں دو عورتوں کے حق میں وارد ہیں کیونکہ دونوں حدیثیں بھی مشہور، دونوں کی سندیں بھی صحیح ہیں، ہاں دونوں کے طرز بیان میں اختلاف ہے) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حضور سے اپنے خاوند کی شکایت کی اور اپنے بدن پر اس کی مار پیٹ کے نشان بھی آپ کو دکھلائے اور کہنے لگی یا رسول اللہ نہ میں اس سے خوش ہوں اور نہ وہ مجھ سے۔ حضرت نے اسی وقت ثابت کے پاس آدمی بھیج کر اسے بلوایا اور پوچھا کہ تمہارا میاں بیوی کا کیا جھگڑا ہے۔ ثابت نے قسم کھا کے کہا کہ (حضرت) آپ کے سوا دنیا بھر میں اس سے زیادہ مجھے کوئی پیارا نہیں ہے۔ تب حضرت نے جمیلہ کی طرف اشارہ کیا کہ تو کیا کہتی ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ میں تو آپ سے ایک بات کہہ چکی ہوں اب اس کے خلاف نہ کہوں گی بیشک یہ سب سے زیادہ اپنی بیوی پر مہربان ہیں لیکن میرے دل کو نہیں بھاتے نہ میں ان سے (خوش) ہوں نہ یہ مجھ سے (خوش) ہیں۔

بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہنے لگی کہ یا رسول اللہ ثابت بن قیس کی عادت اور دین میں، میں کوئی برائی نہیں نکالتی لیکن اسلام میں کفر کرنا مجھے برا معلوم ہوتا ہے۔ حضور نے پوچھا کہ تم اس کا باغیچہ لوٹا سکتی ہو۔ کہا ہاں۔ تب حضور نے (ثابت سے) فرمایا کہ تم وہ باغیچہ لے لو اور انہیں ایک طلاق دے دو۔

بیہقی نے دوسرے طریق سے ابن عباسؓ ہی سے روایت کی ہے کہ جمیلہ خلع کے ارادے سے آنحضرت کی خدمت میں آئی۔ حضور نے پوچھا کہ تمہیں (تمہارے خاوند نے) مہر کیا دیا ہے کہا ایک باغیچہ۔ ہے۔ فرمایا اس کا وہ باغیچہ اسے واپس دے دو۔

ابن جریر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلا خلع ثابت بن قیس کی بیوی کا ہوا ہے۔ وہ حضرت کی خدمت میں آئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ میرا سر اور ثابت کا سر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ میں نے برقع اٹھا کر بہت سے لوگوں میں اسے آتے ہوئے دیکھا ہے کہ وہ سب سے زیادہ کالا اور سب سے چھوٹے قد کا اور سب سے زیادہ بد صورت ہے۔ حضور نے پوچھا تم اس کا باغیچہ واپس دے سکتی ہو۔ کہا ہاں اگر وہ چاہے تو میں اور کچھ زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔ تب حضور نے ان دونوں میں جدائی کرا دی۔

ابو داؤد، ابن حبان اور بیہقی نے حبیبہ بنت سہل سے روایت کی ہے کہ وہ ثابت بن قیس کے نکاح میں تھیں حضرت کی

marfat.com

خدمت میں آئیں اور کہا نہ میں (ثابت سے خوش) اور نہ ثابت (مجھ سے خوش ہے) آخر حدیث تک۔ ابن جریر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ثابت ابن قیس اور جمیلہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جمیلہ نے آنحضرت سے شکایت کی تھی۔ حضور نے پوچھا کہ تم ان کا باغیچہ واپس کر سکتی ہو۔ کہا ہاں۔ تب حضور نے ثابت کو بلا کر اس کا تذکرہ کیا۔ ثابت نے پوچھا کیا آپ بھی میرے حق میں یہی بہتر سمجھتے ہیں۔ حضور نے فرمایا ہاں۔ ثابت نے کہا (اچھا) میں نے رہا کر دیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

حاصل یہ ہے کہ یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع طلاق ہے جیسا کہ صحیح (حدیث) میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (ثابت سے) فرمایا کہ تم وہ باغیچہ لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو۔

اگر کوئی کہے کہ خود راوی کا اپنی روایت کے خلاف عمل کرنا امام ابو حنیفہؒ کے قاعدہ کے مطابق بمنزلہ ناسخ کے ہوتا ہے اور بخاری میں جو روایت ہے وہ ابن عباسؓ سے ہے اور پہلے ابن عباس کا یہ قول ذکر کیا گیا ہے کہ خلع جدائی ہے (یعنی خلع کے بعد طلاق کی ضرورت نہیں رہتی)۔

ہم کہتے ہیں شاید ابن عباسؓ نے یہ خیال کیا ہو کہ ثابتؓ نے آنحضرت ﷺ کے حکم کی پیروی کرنے کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور یہ طلاق مال کے عوض میں ہو گئی۔ خلع نہیں ہوا پھر انہوں نے آیت کی تاویل سے یہ فتویٰ دے دیا کہ خلع فسخ (نکاح) ہے۔ پس ابن عباسؓ کا عمل ان کے خیال کے مطابق ان کی روایت کے خلاف پر نہ ہوا اور ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کہ اسلام میں سب سے پہلا یہی خلع تھا مجاز پر حمل کیا جائے گا۔ اور ہم پر ابن عباسؓ کے خیال (اور گمان) کا اتباع کرنا لازم نہیں ہے۔ خلع کے طلاق ہونے کی جو دلیلیں ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو عبد الرزاق نے سعید بن مسیب سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے خلع کو ایک طلاق کر دیا تھا اور یہ روایت مرسل صحیح ہے اور ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے اور امام شافعی نے بھی فرمایا ہے کہ سعید بن مسیب کی مرسل حدیثیں مسند حدیثوں کے حکم میں ہیں اور یہ وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ میں نے ان کو مسند پایا ہے اور خلع کا طلاق ہونا ابن مسعود سے بھی مروی ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ بائنہ طلاق خلع یا ایلاء ہی میں ہوتی ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے اور اسی طرح حضرت علی سے بھی مروی ہے ام بکرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے خاوند سے خلع کر لیا تھا پھر ان کا یہ مقدمہ جب حضرت عثمان کے ہاں پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ یہ بائنہ طلاق ہے ہاں اگر ان دونوں نے کوئی چیز ٹھہرائی ہو تو اسی پر فیصلہ ہے۔ یہ روایت امام مالکؒ نے نقل کی ہے اور جو یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس اثر کے راویوں میں سے ایک راوی جمہان ہے جو مشہور نہیں ہے۔ تو ابن ہمام فرماتے ہیں کہ جمہان ابو یعلی اسلمیین کے مولیٰ ہیں اور بعض کا قول یہ ہے کہ جمہان یعقوب قبطی کے مولیٰ تابعی ہیں، انہوں نے سعد بن ابی وقاص، عثمان بن عفان ابو ہریرہ، ام بکرہ سے روایت کی ہے اور ان سے عروہ بن زبیر، موسیٰ بن عبیدہ الزبیدی وغیرہ نے روایت کی ہے ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ :- عموم آیت کی وجہ سے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ خلع مہر سے زیادہ پر درست ہے، لیکن امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک مکروہ ہے اور اکثر ائمہ کا قول یہ ہے کہ مکروہ نہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ سے جامع صغیر کی روایت ہے۔ اس مسئلہ میں صحابہؓ کے درمیان اختلاف ہونا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کراہت کی وجہ وہ ہے جو ابو داؤد نے اپنے مراسیل میں اور ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق نے ثابت بن قیس کی بیوی کے قصہ میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تم وہ باغیچہ واپس دو گی جو ثابت نے تمہیں مہر میں دیا تھا۔ بولی ہاں اور کچھ زیادہ بھی۔ حضور نے فرمایا کہ زیادہ تو نہیں چاہئے اور دار قطنی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ولید نے ابن جریج سے انہوں نے عطا سے انہوں نے ابن عباسؓ سے اس کو مسند کر کے بیان کیا ہے اور مرسل زیادہ صحیح ہے۔

ابن جوزی نے دار قطنی کے طریق سے انہوں نے ابی الزبیر سے نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی سلول کی بیٹی زینب ثابت بن قیس بن شماس کے نکاح میں تھی اور ثابت نے اس کے مہر میں اسے ایک باغیچہ دے دیا تھا پھر ثابت اس کو نہ بھایا (اور اس

marfat.com

نے حضرت سے شکایت کی) حضور نے پوچھا کہ وہ باغیچہ واپس دے سکتی ہو جو ثابت نے تمہیں دیا تھا۔ عرض کیا ہاں اور کچھ زیادہ بھی۔ آپ نے فرمایا زیادہ تو نہیں چاہئے لیکن باغیچہ ان کا ہو جائے گا۔ کہا بہتر ہے۔ حضور نے وہ باغیچہ ثابت کے لئے لے کر زینب کو چلتا کر دیا اور جب ثابت بن قیس کو خبر ہوئی تو بولے کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو میں نے قبول کر لیا۔

ابن جوزی کہتے ہیں اس کی سند صحیح ہے اور دار قطنی فرماتے ہیں کہ ابو الزبیر نے اس کو بہتوں سے سنا ہے اور دار قطنی نے سند کے ساتھ عطاء سے روایت کی ہے نبی ﷺ نے فرمایا کہ مرد خلع والی عورت سے اس سے زیادہ نہ لے کہ جس قدر اسے دیا ہو۔

ابن ماجہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ سلول کی بیٹی جمیلہ نبی ﷺ کی خدمت میں آئی۔ الحدیث اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور نے ثابت کو یہ حکم دیا کہ اپنا باغیچہ لے لینا اور زیادہ نہ لینا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرسل صحیح (حدیث) سے اس زیادتی کے ثابت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی اثر ہے کہ مرد نے جو عورت کو دیا ہو (خلع میں) اس سے زیادہ نہ لے اس کو عبد الرزاق نے اور اسی طرح وکیع نے نقل کیا ہے اور عبد الرزاق نے جو ربیع بنت معوذ سے یہ روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنے خاوند سے اپنی تمام مملوکہ چیزوں کے عوض میں خلع کیا تھا پھر اس میں جھگڑا ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں مقدمہ گیا تو آپ نے یہی حکم بحال رکھا اور ربیع کو یہ حکم دیا کہ اپنے سر کی چوٹی وغیرہ اس میں سے لے لے اور اسی طرح جو نافع سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی کی ایک آزاد کردہ لونڈی نے اپنی تمام چیزوں اور تمام کپڑوں پر خلع کیا تھا تو یہ دونوں اثر کراہت کے کہنے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ یہ دونوں تو قضاء (خلع کے) جاری ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور اس کا کوئی انکار نہیں کرتا اور جو لوگ کراہت کے قائل نہیں ہیں ان کی دلیل یہی آیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ اور ما کا لفظ عام ہے تھوڑے اور بہت سب کو شامل ہے اور احاد حدیثوں کے قبول ہونے میں یہ شرط ہے کہ وہ حکم قرآنی قطعی کے معارض نہ ہوں اور یہ معارض ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ امام ابو حنیفہؒ کے قاعدہ پر مبنی ہے کہ جو عام شامل ہونے میں قطعی الدلالت ہو تو خبر واحد سے اس کی تخصیص جائز نہیں ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ خبر واحد سے تخصیص جائز ہے تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آیت کا حکم مہر کی مقدار کے ساتھ مخصوص ہے اور اس سے کم ان حدیثوں کے ساتھ، واللہ اعلم۔ اور ابو سعید خدری سے ایک حدیث مروی ہے جو اس کے مکروہ نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری بہن ایک انصاری کے نکاح میں تھی اس انصاری نے اپنے ایک باغیچہ پر اس سے نکاح کیا تھا۔ (الحدیث) اور اسی میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے (میری بہن سے) پوچھا کہ تم اس کا وہ باغیچہ واپس دے سکتی ہو اور وہ تمہیں طلاق دیدے گا۔ عرض کیا ہاں بلکہ میں کچھ اور زیادہ بھی دوں گی۔ حضور نے فرمایا کہ اس کا باغیچہ بھی واپس کر دو اور کچھ زیادہ بھی دے دو۔ یہ حدیث ابن جوزی نے نقل کی ہے لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس میں عطیہ عوفی (راوی) ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ اس کی حدیث کو لکھنا بھی جائز نہیں ہے۔ اسی میں ایک راوی حسن بن عمارہ ہے شعبہ کہتے ہیں کہ یہ کذاب ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا

(یہ (یعنی اوامر اور نواہی) اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں (یعنی جن سے بڑھنا منع کیا گیا ہے) پس ان سے آگے نہ بڑھو اور جو خدا کی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہ ہی بے انصاف ہیں پس اگر (دو طلاقوں کے بعد بھی) عورت کو طلاق دیدے) اور یہ اللہ کے قول او تسریح باحسان کے دو احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی احتمال کا حکم بیان کرنے کے لئے فرمایا۔

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ (تو اب اس کے بعد وہ اس کے لئے حلال نہیں ہے) اور دوسرا احتمال باقی ہے وہ یہ کہ عدت گزرنے تک بلا طلاق کے اصلی حالت پر چھوڑ دے یعنی پہلے شوہر کی نکاح کی حالت پر۔

marfat.com

حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ (جب تک کہ شوہر ثانی کے نکاح میں نہ آئے) یعنی وہ نکاح صحیح نہ کرلے اور صحیح کی قید ہم نے اس لئے بڑھادی ہے کہ مطلق سے کامل (فرد) مراد لیا جاتا ہے۔ اور نکاح کی نسبت میاں بیوی دونوں کی طرف ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ایجاب اور قبول سے منعقد ہوتا ہے اور یہ دونوں سے صادر ہوتا ہے اور اس آیت کے ظاہری معنی کی وجہ سے سعید بن مسیّب اور داؤد فرماتے ہیں کہ دوسرے خاوند کی صحبت کے بغیر پہلے خاوند سے نکاح ہو جانا درست ہے۔ لیکن اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ دوسرے خاوند سے صحبت ہونا (پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح) درست ہونے کی شرط ہے اور اسی وجہ سے بعض (ائمہ) نے کہا ہے کہ آیت میں نکاح سے مراد صحبت ہے، کیونکہ لغت میں نکاح کے معنی صحبت کے ہیں۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ صحبت کرنا تو خاوند کا فعل ہے اور عورت اس کا محل ہے۔ پس عورت کی طرف اس کی نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں مجاز اً جائز ہے اور یہ آیت مجاز سے خالی نہیں ہے کیونکہ اگر نکاح کے معنی عقد کے ہیں تو زوج کے لفظ میں مجاز ہے گویا باعتبار آئندہ زوج کہہ دیا ہے اور اگر نکاح کے معنی صحبت کے ہیں تو نسبت میں مجاز ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نکاح سے مجاز اً یہ مراد ہے کہ وہ صحبت کر سکے اس آیت کی یہ تاویلات بعیدہ کرنے کا باعث حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے، فرماتی ہیں کہ میں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پاس تھے کہ اتنے میں رفاعہ قرظی کی بیوی آگئی اور حضرت سے کہنے لگی کہ رفاعہ نے مجھے مغلظہ طلاق دیدی تھی اور عبدالرحمٰن بن زبیر نے مجھ سے نکاح کرلیا تھا اور اس کے پاس (یعنی اس کا عضو تناسل) اس پھندنے جیسا ہے اور اپنے کھیس کا پھندنا پکڑ کر دکھایا۔ حضور ﷺ (اس کی اس بات سے) مسکرائے اور فرمایا کہ تو پھر رفاعہ کے پاس جانا چاہتی ہے۔ یہ نہیں ہوگا جب تک کہ تو اس کا مزہ اور وہ تیرا مزہ نہ چکھ لیں۔ اس حدیث کو (محدثین کی) ایک جماعت نے نقل کیا ہے اور صحیحین کی روایت میں یہ ہے کہ وہ رفاعہ کے نکاح میں تھی پھر رفاعہ نے اسے تین طلاقیں دے دی تھیں۔ موطا میں امام مالک نے مسور بن رفاعہ قرظی سے انہوں نے زبیر بن عبدالرحمٰن بن زبیر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رفاعہ بن سموال نے اپنی بیوی تمیمہ بنت وہب کو تین طلاقیں دیدی تھیں پھر تمیمہ سے عبدالرزاق بن زبیر نے نکاح کرلیا تھا لیکن یہ (نامرد ہونے کی وجہ سے) اسے ہاتھ بھی نہ لگا سکے اور اس سے علیحدگی کرلی اس کے بعد پھر رفاعہ نے اس سے نکاح کرنا چاہا تو حضور نے اسے منع کر دیا اور فرمایا جب تک عبدالرحمٰن کا مزہ نہ چکھ لے تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔ بہت سے محدثین نے حضرت عائشہؓ کی حدیث اس طرح نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی تھیں پھر اس نے دوسرے سے نکاح کرلیا اور اس سے خلوت بھی ہو گئی لیکن صحبت ہونے سے پہلے ہی اس نے بھی اسے طلاق دیدی تو اب یہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال ہے یا نہیں۔ حضرت نے فرمایا نہیں جب تک کہ یہ دوسرا خاوند اسی طرح اس سے صحبت نہ کرلے کہ جس طرح پہلا خاوند کر چکا ہے۔ ابن منذر نے مقاتل بن حبان سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عائشہ عبدالرحمٰن بن عتیک کی بیٹی کے حق میں نازل ہوئی ہے اور وہ رفاعہ بن وہب بن عتیک کے نکاح میں تھی اور رفاعہ اس کا چچیرا بھائی تھا اس نے اسے بائنہ طلاق دیدی اس کے بعد عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی نے اس سے نکاح کرلیا پھر اس نے بھی طلاق دیدی تب عائشہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ مجھے میرے (دوسرے) خاوند نے صحبت کرنے سے پہلے ہی طلاق دیدی ہے کیا اب میں اپنے پہلے خاوند کے پاس جاؤں، فرمایا نہیں جب تک کہ یہ صحبت نہ کرلے اور یہ آیت نازل ہوئی فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ اور اگر وہ صحبت کرنے کے بعد طلاق دے تو فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ (یعنی دونوں پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ (نکاح کر کے) پھر مل جائیں۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ (اس قصہ کے بعد) یہ عائشہ کچھ دنوں تک ٹھہری رہی پھر حضرت کی خدمت میں آئی اور کہنے لگی کہ یارسول اللہ اب میرے (دوسرے) خاوند نے مجھ سے صحبت کرلی ہے۔ حضور نے فرمایا کہ تو اپنے پہلے قول کو جھوٹا کرتی ہے لہٰذا اس دوسرے قول میں ہم ہرگز تیری تصدیق نہ کریں گے پھر یہ خاموش رہی یہاں تک کہ حضور کی وفات ہو گئی پھر

marfat.com

یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے (دوسرے) خاوند نے مجھ سے صحبت کر کے مجھے طلاق دیدی۔ ہے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ تو حضرت کے پاس بھی آئی تھی اور آپ نے جو کچھ تیرے بارے میں فرمایا تھا اسے سب جانتے ہیں، پس تو پہلے خاوند کے پاس نہیں جاسکتی۔ پھر جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بھی وفات ہو گئی تو یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور اسی طرح ان سے بھی بیان کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تو پہلے خاوند کے پاس گئی تو میں تجھے سنگسار کرادوں گا۔ (آیت میں) نکاح کے معنی عقد کے لینے پر اس حدیث سے کتاب (اللہ) پر زیادتی ہو گی اور خبر واحد سے کتاب (اللہ) پر زیادتی امام شافعی وغیرہ کے نزدیک جائز ہے لیکن امام ابو حنیفہ کے مذہب پر مشکل ہو گی کیونکہ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ بعض علماء نے ابو حنیفہؒ کے مذہب کی توجیہ میں کہا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے اس سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث احاد میں سے ہے، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اس حدیث کی موافقت پر اجماع ہو گیا اور جمہور امت نے اسے قبول کر لیا تو یہ حدیث مشہور حدیث کے حکم میں ہو گئی اس لئے اس سے کتاب (اللہ) پر زیادتی جائز ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَّتَرَاجَعَآ (پھر اگر یہ (دوسرا خاوند صحبت کرنے کے بعد) اسے طلاق دیدے تو دونوں (یعنی اس عورت اور پہلے خاوند) پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ (نکاح ثانی کر کے) پھر مل جائیں) یترا جعا فعل کا دونوں کی طرف منسوب ہونا نکاح ثانی مراد ہونے پر دلالت کرتا ہے بخلاف اس آیت کے جو پہلے گزر چکی ہے یعنی وبعولتہن احق بردہن کیونکہ وہاں فعل کی اسناد فقط خاوندوں ہی کی طرف ہے إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔

(بشرطیکہ دونوں کو (غالب) گمان ہو کہ ہم اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے) اور یہاں ظن کی تفسیر علم کے ساتھ نہیں ہو سکتی کیونکہ غیب کا علم ہو ہی نہیں سکتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان ناصبہ توقع کے لئے ہے اور توقع یقین کے منافی ہے۔

مسئلہ :- اس پر سب کا اتفاق ہے کہ دوسرے خاوند سے صحبت ہونا پہلے خاوند کی تینوں طلاقوں کو مٹا دیتا ہے پس اگر وہ عورت پھر پہلے خاوند کے پاس چلی جائے تو وہ بالاجماع پھر تین طلاقوں کا مالک ہو جاتا ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ تین طلاقوں سے کم کو بھی مٹا دیتا ہے یا نہیں یعنی اگر پہلے خاوند نے ایک یا دو طلاقیں دیدیں اور اس کے عدت بھی پوری ہو گئی پھر اس نے نکاح صحیح سے دوسرا خاوند کر لیا پھر اس دوسرے خاوند نے بھی صحبت کرنے کے بعد اسے طلاق دیدی اور اس کی عدت پوری ہو جانے کے بعد پھر یہ عورت پہلے خاوند کے پاس چلی گئی تو اب یہ پہلا خاوند تین طلاقوں کا مالک ہو جائے گا یا کہ ایک یا دو طلاقوں کے بعد ان کے بقیہ ہی کا مالک رہے گا امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کا قول ہے کہ دوسرے خاوند سے صحبت ہونا تین طلاقوں سے کم کو بھی مٹا دے گا اور پہلا خاوند اب نئے سرے سے پوری تین طلاقوں کا مالک ہو جائے گا

امام محمد فرماتے ہیں کہ وہ تین طلاقوں سے کم کو نہیں مٹائے گا کیونکہ اللہ پاک نے اپنے قول لَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ میں دوسرے خاوند کی صحبت کو اس مغلظہ حرمت کی انتہا ٹھہرائی ہے جو تین طلاقوں سے حاصل ہو، پس یہ حکم ان تین ہی طلاقوں کے لئے ہو گا اور کوئی شئے ثابت ہونے سے پہلے منع نہیں ہوا کرتی اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے خاوند کے صحبت کرنے کے بعد طلاق دینے کو پہلے خاوند کیلئے حلال ہونے کا سبب ٹھہرا دیا ہے کیونکہ فرمایا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَّتَرَاجَعَا اور اسی طرح آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد لعن اللہ المحلل و لمحلل لہ نے دوسرے خاوند کو پہلے خاوند کے لئے حلال کرنے والا ٹھہرا دیا ہے اور قاعدہ حلال ہونے میں یہ ہے کہ سب ہی حلال ہو لہذا پہلا خاوند تین طلاقوں کا مالک ہو جائے گا اس کے علاوہ جب دوسرے خاوند سے صحبت ہونا حرمت غلیظہ کو مٹا دیتا ہے تو خفیفہ کو وہ بدرجہ اولیٰ مٹائے گا، واللہ اعلم۔

مسئلہ :- اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ پہلے خاوند کے تین طلاقیں دینے کے بعد اگر عورت نے دوسرا خاوند کر لیا اور یہ

marfat.com

اس سے شرط کرلی کہ مجھے طلاق دیدینا، چنانچہ اس نے صحبت کرنے کے بعد اسے طلاق دیدی اور اس نے اپنی عدت پوری کردی تو امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نکاح صحیح میں صحبت ہو جانے کی وجہ سے یہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال ہو گئی اور شرطوں سے نکاح باطل نہیں ہوا کرتا اور امام محمد سے مروی ہے کہ نکاح تو (دوسرے خاوند سے) صحیح ہو جائے گا اسی دلیل سے جو ہم نے ابھی بیان کی ہے۔ لیکن پہلے خاوند کے لئے یہ حلال نہ ہو گی کیونکہ اس نے اس امر میں جلدی کی کہ جس کو شرع نے مؤخر کیا تھا پس اسے اس کا مقصود پورا نہ ہونے کی سزا دی جائے گی جیسا کہ مورث کو قتل کردینے میں ہوتا ہے (کہ قاتل کو میراث نہیں ملتی) اور امام احمد، امام مالک، امام ابو یوسف (تینوں) کا قول یہ ہے کہ وہ نکاح ہی صحیح نہ ہوگا اور امام شافعی کے اس بارے میں دو قول ہیں دونوں میں صحیح یہ ہے کہ نکاح ہی درست نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ موقف نکاح کے حکم میں ہے اور جب نکاح ہی صحیح نہ ہوا تو پہلے خاوند کے لئے حلال بھی نہ ہو گی، اس وجہ سے کہ حلال ہونے کی شرط نہیں پائی گئی اور وہ شرط نکاح صحیح ہے اور (اس نکاح کے) صحیح نہ ہونے پر ان ائمہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حجت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ محلل اور محلل لہ پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ اس حدیث کو دارمی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور ابن ماجہ نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن عباسؓ، عقبہ بن عامرؓ سے نقل کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ حدیث تو ہماری دلیل ہے نہ کہ ہمارے مخالف ہے۔ کیونکہ (اس میں) آنحضرت علیہ السلام نے دوسرے خاوند کو محلل (حلال کردینے والا) ٹھہرایا ہے پس یہ لفظ حلت کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے اور اس سے نکاح کا صحیح ہونا لازم آتا ہے۔ ہاں یہ بات جدا رہی کہ یہی دوسرے خاوند کے ایک حرام امر کے مرتکب ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے اور اس کے ہم بھی قائل ہیں۔ پس اگر اس عورت سے کسی نے نکاح کرلیا اور یہ شرط نہ کی گئی مگر اس کے دل میں یہ بات تھی کہ اسے طلاق دیدوں گا، تو امام ابو حنیفہ اور صاحبین اور امام شافعی کے نزدیک نکاح صحیح ہو جائے گا۔ امام مالک اور امام احمد کا قول ہے کہ اب بھی صحیح نہ ہوگا اور اس کے مکروہ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ امام بغوی کہتے ہیں نافع فرماتے تھے کہ ایک آدمی ابن عمرؓ کے پاس آیا اور بیان کیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی تھیں پھر اس کے بھائی نے جا کر بلا اس کے کہے اس عورت سے اس لئے نکاح کرلیا کہ وہ پہلے خاوند کیلئے حلال ہو جائے (اب اس بارے میں آپ کیا حکم دیتے ہیں) فرمایا حلال نہیں ہو گی۔ نکاح عورت کو رکھنے کیلئے ہوتا ہے (نہ کہ طلاق دینے کو) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم ایسے آدمی کو زانی شمار کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے محلل اور محلل لہ پر لعنت کی ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

(اور یہ (یعنی مذکورہ احکام) خدا کی حدود ہیں ان کو اس قوم کے لئے بیان کرتا ہے جو سمجھتے ہیں (اور موافق علم کے عمل کرتے ہیں) (اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کرنے کو ہوں) اجل کا لفظ مدت اور مدت کے منتہا دونوں پر بولا جاتا ہے۔ آدمی کی عمر کو بھی اجل کہتے ہیں اور اس موت کو بھی جس پر عمر ختم ہو جاتی ہے اور یہاں مراد منتہا ہے کیونکہ عدت کا آغاز طلاق کے بعد ہوتا ہے اور بلوغ کے (اصل) معنی کسی چیز تک پہنچنا کبھی مجاز کے طور پر اس سے قریب ہونے پر بھی بول دیتے ہیں۔ اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں تاکہ اگلی آیت کا اس پر مرتب ہونا درست ہو جائے۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (تو یا انہیں حسن معاشرت سے روکو یا سلوک کے ساتھ انہیں رخصت کردو) کیونکہ عدت پوری ہو جانے کے بعد روکنا جائز نہیں ہے۔ مقصود آیت سے یہ ہے کہ یا تو بلا ارادہ تکلیف ان سے رجعت کرلو، یا انہیں چھوڑ دو کہ وہ اپنی عدت پوری کرلیں۔

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (اور تکلیف دینے کے لئے انہیں نہ روکو) یعنی تکلیف دینے کے ارادے سے ان سے رجعت نہ کرو کہ پھر (ان پر) زیادتی کرنے لگو یعنی زیادہ دنوں تک رکھنے اور کچھ دینے پر مجبور کرنے کے ساتھ ان پر ظلم کرو۔ ضرارا مفعول لہٗ ہے یا اسم فاعل کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ لتعتدوا کا لام لاتمسکوھن کے متعلق ہے اور یہ بھی مفعول لہ ہو کر ضرارا کا بیان ہے یا لتعتدوا کا لام ضرارا کے متعلق ہے۔ اس تقدیر پر بھی ضرارا کا بیان ہے، قید نہیں ہے۔

marfat.com

کیونکہ ضرار تو مطلقاً ظلم اور زیادتی ہے جو ممنوع فعل ہے۔ اول اللہ پاک نے حسن معاشرت کے ساتھ رکھنے کا حکم فرمایا پھر اس کی ضد یعنی تکلیف دینے کے ارادے سے منع فرمایا پھر اس کے ظلم اور زیادتی ہونے کی تصریح کی اور اس کے بعد فرمایا۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ (اور جو ایسا کرے گا اس نے یقیناً اپنی ہی جان پر ظلم کیا) کہ اپنے کو خود مستحق عذاب کا بنالیا۔ ابن جریر نے عوفی کے طریق سے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں (پہلے یہ حالت تھی) کہ بعض لوگ اپنی بیوی کو ستانے اور مشکل میں ڈالنے کی غرض سے اسے طلاق دیدیتے تھے پھر اس کی عدت پوری ہونے سے پہلے اس سے رجعت کر لیتے تھے پھر طلاق دیتے اور اسی طرح کرتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ بغوی نے اور اسی طرح سدی سے ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ایک انصاری کے حق میں نازل ہوئی ہے، جن کا نام ثابت بن یسار تھا۔ ثابت نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی۔ جب اس کی عدت ختم ہونے لگی تو اس سے رجعت کر لی اور اسے محض ستانے ہی کی غرض سے پھر طلاق دیدی اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا۔ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا الآیۃ۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ز (اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ) یعنی ان سے اعراض اور تعمیل حکم میں سستی نہ کرو۔ کلبی فرماتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے اس حکم فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کو مذاق نہ بناؤ اور جس نے شرع کے خلاف کیا اسی نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا (گویا) مذاق اڑایا۔ ابن ابی عمرو نے اپنی مسند میں اور ابن مردویہ نے ابو الدرداء سے روایت کی ہے فرماتے ہیں (پہلے لوگوں کی یہ حالت تھی) کہ بعض آدمی اول طلاق دیدیتے اور پھر کہتے کہ ہم نے تو مذاق کیا تھا اور اسی طرح کوئی غلام لونڈی کو آزاد کر کے کہتا تھا کہ میں نے تو ہنسی کی تھی۔ بغوی نے بحوالہ حضرت ابودرداءؓ یہ بھی نقل کیا ہے کہ نکاح کر کے بھی لوگ ایسا ہی کہہ دیتے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے اور ابن جریر نے اسی طرح حسن سے مرسل روایت کی ہے اور ابن منذر نے عبادہ بن صامتؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ تین امر ہیں۔ جو شخص انہیں کہے خواہ ہنسی سے یا بلا ہنسی تو وہ اس پر جاری ہو جائیں گے۔ طلاق، عتاق، نکاح اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پہلے مذکور ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تین امر ہیں جن کو ہنسی سے اور بے ہنسی کہنا برابر ہے یعنی ایک حکم ہے نکاح، طلاق، رجعت۔

وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو) یعنی شکر کرنے اور اس کے حقوق کا لحاظ رکھنے کے ساتھ۔ مُجملہ اس احسان کے ہدایت کرنا اور محمد ﷺ پر قرآن نازل کرنا بھی ہے۔

وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ الثلثة ۲۹ ع ۱۲

اور جو کتاب تم پر نازل کی (یعنی قرآن) اور حکمت (یعنی وہ وحی غیر متلو جو محمد ﷺ پر کی گئی) اس سے تمہیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے (۔یہ تاکید اور تہدید ہے)

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں (یعنی ان کی عدت پوری ہو جائے) تو تم انہیں نہ روکو) یعنی منع نہ کرو عضل کے معنی منع کرنے کے ہیں اور اصلی معنی اس کے ضیق اور شدت کے ہیں (چنانچہ) الداء العضال عرب میں اس بیماری کو کہتے ہیں جس کا علاج نہ ہو سکے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ دونوں کلاموں کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ بلوغ کے الگ الگ معنی ہیں۔

اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (اس سے کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں) اس کے مخاطب (عورت کے) اولیاء (یعنی ورثاء) ہیں۔ یہ آیت معقل بن یسار کی بہن جملاء بنت یسار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بداح بن عاصم بن عجلان نے اسے طلاق دیدی تھی۔ بخاری، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے معقل بن یسار سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں۔ میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص سے کر دیا تھا پھر اس نے اسے طلاق دیدی اور جب اس کی عدت پوری ہو گئی تو وہ پھر پیغام لے کر آئے۔ میں نے ان سے یہ بات کہی کہ پہلے تو میں نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تھا تمہارا گھر بسا دیا تھا سب طرح تمہاری آبرو تھی لیکن تم نے اسے

marfat.com

طلاق دیدی اور اب پھر پیغام لے کر آئے ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم اب وہ تمہارے ہاں ہرگز نہیں جا سکتی اور وہ آدمی کچھ برا نہ تھا اور میری بہن بھی پھر اس کے ہاں جانا چاہتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ تب میں نے (حضور ﷺ کی خدمت میں) عرض کیا یا رسول اللہ اب میں ضرور کر دوں گا۔ چنانچہ پھر اسی سے نکاح کر دیا۔ ابن جریر نے بہت سے طریقوں سے بحوالہ سدی نقل کیا ہے کہ یہ آیت جابر بن عبد اللہ انصاری کے حق میں نازل ہوئی، ان کی ایک چچازاد بہن تھی اس کے خاوند نے اسے طلاق دیدی تھی اور جب اس کی عدت پوری ہو گئی تو پھر اس نے ان کی بہن سے نکاح کرنا چاہا تو جابر رضی اللہ عنہ نے صاف انکار کر دیا۔ پہلا قول زیادہ صحیح اور قوی ہے اور شاید یہ دونوں ہی قصوں میں نازل ہوئی ہے۔ آیت کا سیاق یہ چاہتا ہے کہ یہ خطاب ان مردوں کو ہو جنہیں آیت و اذا طلقتم النساء میں خطاب کیا گیا ہے (یعنی) جو اپنی بیویوں کو ان کی عدت پوری ہونے کے بعد دوسرے خاوندوں سے نکاح کرنے سے ظلماً روکتے تھے۔ اور ہم نے جو بخاری وغیرہ کی روایت شان نزول میں ذکر کی ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ یہ خطاب اولیاء کو ہو کیونکہ وہ روکنا جملاء کے بھائی معقل بن یسار کی جانب سے ہوا تھا۔ پس میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ یہ خطاب سب لوگوں کو ہو کیونکہ (یہ قاعدہ ہے کہ) جس وقت کوئی فعل ایک آدمی سے صادر ہوتا ہے تو اس کی نسبت ایک جماعت کی طرف کر دی جایا کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (ایک دوسرے کے مال نہ کھایا کرو) اور فرمایا وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ الآیہ (تم خود ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہ نکالو) اور اس وقت آیت کے سیاق اور شان نزول میں کوئی مزاحمت (اور مخالفت) نہیں ہے۔ اس وقت مطلب یہ ہو گا کہ جب تم میں کے کچھ مرد عورتوں کو طلاق دیدیں اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو اے اولیاء پہلے تم ان کو پہلے خاوندوں سے یا ان کے علاوہ اور کسی کے ساتھ نکاح کر لینے سے مت روکو۔ لفظ ازواج کے بہر صورت مجازی معنی مراد ہیں کیونکہ اس موقع پر خاوند کہنا یا تو باعتبار گزشتہ کے ہے (یعنی جو پہلے خاوند تھا اور یا باعتبار آئندہ کے ہے (یعنی جو نکاح کرنے کے بعد خاوند ہو جائیں گے) واللہ اعلم۔ شافعیہ نے اس آیت میں اولیاء کو مخاطب قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ آیت میں دلیل ہے اس امر کی کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی کیونکہ اگر وہ خود ایسا کر سکتی تو پھر ولی کے روکنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ شافعیہ نے عورت کی طرف نکاح کی نسبت کرنے کو مجاز پر حمل کیا ہے اور کہا ہے کہ نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف فقط اس سبب سے ہے کہ نکاح ان کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔ مگر یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ ولی اس صورت میں بھی روک سکتا ہے کہ جب نکاح عورت کا اختیاری فعل قرار دیا جائے۔ دیکھو آنحضرت ﷺ نے فرمایا لا تمنعوا اماء اللہ عن مساجد اللہ (یعنی اللہ کی لونڈیوں کو مسجدوں (میں آنے) سے تم نہ روکا کرو) باوجودیکہ مسجدوں میں آنا عورت کا اختیاری فعل ہے بلکہ روکنا اور برانگیختہ کرنا اختیاری ہی فعل میں ہوتا ہے۔ پس اس مسئلہ میں شافعیہ (کو اگر استدلال کرنا ہی تھا تو ان) کے لئے اس آیت سے استدلال کرنا بہتر تھا کہ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَتّٰى یُؤْمِنُوْا کیونکہ اصل اسناد میں حقیقت ہی ہے۔

مسئلہ: کیا آزاد عاقلہ بالغہ عورت بغیر ولی کے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ عورت کو خود اپنی گفتگو کے ساتھ اپنا نکاح کر لینا جائز ہے اور اس کی رضامندی سے اس کے وکیل کے ذریعہ سے بھی نکاح ہو جاتا ہے اگرچہ ولی اس پر رضامند نہ ہوں۔ برابر ہے کہ وہ خاوند اس کا کفو ہو یا نہ ہو، ہاں کفو نہ ہونے کی صورت میں ولی اعتراض کر سکتا ہے۔ اور ایک روایت میں ان سے یہ بھی مروی ہے کہ غیر کفو (کی صورت) میں نکاح نہیں ہوتا اور امام محمد کے نزدیک کفو اور غیر کفو دونوں سے نکاح ہو جاتا ہے لیکن ولی کی اجازت پر موقوف رہتا ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر عورت شریف زادی اور خوبصورت یا مالدار ہے کہ ایسی عورتوں سے نکاح کرنے کا ہر کوئی خواہاں ہوتا ہے تو اس کا نکاح بغیر ولی کے درست نہ ہوگا اور اگر عورت ایسی نہیں ہے تو اس کا نکاح اس کی رضامندی سے کوئی اجنبی بھی کر سکتا ہے ہاں اس کی گفتگو سے نہیں ہوتا۔ امام شافعی اور امام احمد کا قول یہ ہے کہ بغیر ولی کے نکاح ہوتا ہی نہیں اور یہی ایک روایت امام ابو یوسف سے بھی ہے انہوں نے اسی

marfat.com

(مذکورہ) آیت سے استدلال کیا ہے اور اس پر جو اعتراض ہے اس کو تم ابھی سن چکے ہو اور چند حدیثوں سے بھی استدلال کیا ہے۔ مجملہ ان کے ایک حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن ولیها فنکا حها باطل فنکا حها باطل فنکا حها باطل فان دخل بها فلها المهر بما استحل من فرجها فان اشتجروا فالسلطان ولی من لاولی له (یعنی جو عورت اپنے ولی کی اجازت بغیر اپنا نکاح کرلے تو اس کا نکاح باطل ہے تو اس کا نکاح باطل ہے اس کا نکاح باطل ہے پس اگر اس سے صحبت ہو جائے تو اس کی شرمگاہ کو حلال سمجھ لینے کی وجہ سے وہ مہر کی مستحق ہوگی اور اگر ان میں کچھ جھگڑا ہو جائے تو جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔ یہ حدیث اصحاب سنن نے ابن جریج کی سند سے انہوں نے سلیمان بن موسیٰ سے انہوں نے زہری سے انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ سے نقل کی ہے اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ طحاوی کہتے ہیں ہم سے ابن ابی عمران نے یہ بیان کیا کہ مجھ سے یحییٰ بن معین بیان کرتے تھے انہوں نے ابن عتبہ سے اور ابن عتبہ نے ابن جریج سے روایت کی ہے۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں زہری سے ملا اور یہی حدیث میں نے انہیں سنائی تو انہوں نے اس کا (صاف) انکار کردیا (کہ مجھے معلوم نہیں) ابن جوزی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ زہری نے سلیمان بن موسیٰ کی تعریف کی ہے، لہٰذا زہری کا یہ انکار کردینا ان کے بھول کی وجہ سے ہوا ہے، نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری حدیث ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لانکاح الابولی والسلطان ولی من لاولی له۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور اس (کی سند) میں حجاج بن ارطاہ (راوی) ضعیف ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لانکاح الابولی و شاهدی عدل (یعنی ولی اور دو منصف گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا) اس حدیث کو دار قطنی نے نقل کیا ہے اور اس کی سند میں یزید بن سنان اور اس کا باپ راوی ہیں جن کی نسبت دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں اور نسائی نے کہا ہے کہ یہ متروک الحدیث ہے اور امام احمد نے بھی اس کو ضعیف ہی شمار کیا ہے۔ نیز حضرت عائشہ ہی سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا لابدللنکاح من اربعة الولی و الزوج و شاهدین (یعنی نکاح کے لئے چار آدمیوں کا ہونا ضروری ہے ولی شوہر اور دو گواہ) یہ حدیث دار قطنی نے روایت کی ہے اور اس کی سند میں نافع بن میسر ابو خطیب (راوی) مجہول ہے اور ایک حدیث ابو بردہ کی ہے جو انہوں نے اپنے باپ ابو موسیٰ سے انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ نکاح بغیر ولی کے نہیں ہوتا) یہ حدیث امام احمد نے نقل کی ہے اور ایک مرفوع حدیث ابن عباسؓ کی ہے کہ نکاح بغیر ولی کے نہیں ہوتا اور جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔ یہ حدیث امام احمد نے حجاج بن ارطاہ کی سند سے روایت کی ہے اور یہ (راوی) ضعیف ہے اور یہی ایک اور سند سے بھی مروی ہے اس (سند) میں عدی بن فضل اور عبداللہ بن عثمان دونوں ضعیف ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ عورتیں زناکار ہیں جو اپنا نکاح خود کرلیں نکاح بغیر ولی اور دو گواہوں اور مہر کے نہیں ہوتا۔ مہر تھوڑا ہو یا بہت ہو۔ یہ حدیث ابن جوزی نے روایت کی ہے اور اس (کی سند) میں ایک راوی تھا اس کو یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ راوی ضعیف ہے اور ابن عدی کہتے ہیں کہ راوی کسی قابل نہیں اور ایک حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن مسعود کی ہے دونوں کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نکاح بغیر ولی اور دو عادل گواہوں کے نہیں ہوتا۔ ابن مسعود کی حدیث میں (ایک راوی) بکیر بن بکار ہے (اس کی بابت یحییٰ نے کہا ہے کہ راوی کچھ نہیں اور (ایک راوی) عبداللہ بن محرز ہے جسے دار قطنی نے متروک کہا ہے اور ابن عمر کی حدیث میں ثابت بن زبیر (راوی) منکر الحدیث ہے اسی طرح ابو حاتم نے کہا ہے ابن حبان کہتے ہیں کہ اسکی حدیث قابل حجت نہیں ہوتی اور ایک حدیث ابو ہریرہؓ کی ہے وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہ عورت کسی عورت کا نکاح کرے اور نہ خود اپنا نکاح کرے کیونکہ وہ زناکار عورت ہے جو اپنا نکاح آپ کرتی ہے۔ یہ حدیث دار قطنی نے دو طریقوں سے نقل کی ہے۔ ایک طریق میں جمیل بن حسن راوی ہے اور دوسرے میں مسلم بن ابی مسلم ہے یہ دونوں مجہول ہیں اور ایک مرفوع حدیث جابر کی ہے کہ بغیر مرشد ولی اور دو عادل گواہوں کے نکاح نہیں ہوتا۔ یہ حدیث ابن جوزی نے روایت کی ہے اس (کی سند) میں محمد بن عبید اللہ عزرمی ہے نسائی اور یحییٰ کہتے ہیں کہ یہ راوی متروک ہے اس کی

marfat.com

حدیث لکھنے کے قابل نہیں اور اس میں قطر بن یسیر (بھی) راوی ضعیف ہے اور ایک حدیث معاذ بن جبل کی ہے جو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا کہ جو عورت بغیر ولی کے اپنا نکاح کرلے تو وہ زناکار ہے، یہ حدیث دار قطنی نے نقل کی ہے اور اس میں ابو عصمہ اسم بن ابی مریم (راوی) ہے جس کی بابت یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ راوی کچھ نہیں اور دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔ حنفیہ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ اور اَنْ ینکحن اَزْوَاجَهُنَّ سے استدلال کیا ہے کیونکہ اصل اسناد میں حقیقت ہے یعنی یہ کہ عورت اپنا نکاح خود کرلے اور حضرت ابن عباسؓ کی اس مرفوع حدیث سے بھی کہ الایم احق بنفسها من ولیها والبکر تستاذن فی نفسها واذنها صماتها (یعنی بیوہ اپنی جان کی اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے۔ اور بن بیاہی کا نکاح کرنے میں اس سے اجازت لینی چاہئے اور اس کی اجازت اس کا خاموش ہو جانا ہے) یہ حدیث مسلم۔ امام مالک ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے روایت کی ہے اور اس سے استدلال کرنے کی یہ وجہ ہے کہ اولیاء کا سوائے نکاح کر دینے کے اور کوئی حق نہیں ہے اور بیوہ عورت اپنے نفس کی اس سے زیادہ حقدار ہے۔ تو پس یہ اپنا نکاح کرنے میں بھی اس سے اولیٰ ہوگی اور ابو سلمۃ بن عبد الرحمٰن کی حدیث سے (بھی) استدلال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہنے لگی کہ میرے باپ نے ایک آدمی سے میرا نکاح کر دیا ہے اور میں راضی نہیں ہوں۔ حضور ﷺ نے اس کے باپ سے فرمایا کہ تمہیں نکاح کا اختیار نہیں اور اس عورت سے فرمایا کہ جا تو جس سے چاہے نکاح کرلے۔ یہ حدیث ابن جوزی نے روایت کی ہے شافعیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل سے حجت نہیں ہو سکتی۔ ہم کہتے ہیں (ہمارے نزدیک مرسل (حدیث) حجت ہے۔ حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ہے کہ قتادہ (نامی ایک عورت) ان کے پاس آئی اور کہا کہ میرے باپ نے اس کا حسب (نسب) بڑھانے کے لئے میرا نکاح اپنے بھتیجہ سے کر دیا ہے اور یہ نکاح مجھے ناپسند ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بیٹھ جا۔ اتنے میں آنحضرت ﷺ بھی تشریف لے آئے، اس عورت نے یہ قصہ پھر حضور سے بیان کیا آپ نے اس کے باپ کے پاس ایک آدمی بھیجا اور اس بارے میں اس عورت ہی کو اختیار دیدیا، وہ بولی یارسول اللہ میں اپنے باپ کے کئے ہوئے نکاح کو ایسے ہی رہنے دیتی ہوں، میں نے فقط یہ چاہا تھا کہ سب عورتوں کو یہ بات جتلا دوں کہ باپوں کو اس بارے میں کچھ اختیار نہیں ہے۔ یہ حدیث نسائی نے روایت کی ہے یہاں استدلال کی یہ صورت ہے کہ اس حدیث میں اس عورت کے اس کہنے کو کہ اس بارے میں باپوں کو کچھ اختیار نہیں ہے آنحضرت ﷺ کا ثابت رکھنا (یعنی اس کا انکار نہ فرمانا) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث کے اور حدیث لانکاح الابولی کے معارض ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ جب نصوص آپس میں متعارض ہوں تو ان میں ترجیح کا کوئی طریقہ نکالنا یا کچھ تاویل کر کے دونوں کو جمع کرنا (یعنی دونوں کے معنی بنانا) واجب ہے۔ پس ترجیح کے طریقہ پر تو جو روایت مسلم نے نقل کی ہے وہ سند کی رو سے سب سے زیادہ صحیح اور قوی ہے۔ بخلاف ان حدیثوں کے جو اور محدثین نے نقل کی ہیں کیونکہ وہ ضعف یا اضطراب سے خالی نہیں ہیں۔ اور احادیث کا تعارض دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے قول لانکاح الابولی کے یہ معنی ہیں کہ وہ نکاح مسنون طریقہ پر نہیں ہوتا یا یہ مطلب ہے کہ نکاح اسی شخص کے ساتھ ہوتا ہے جس کے لئے ولایت ہوتا، کہ اس سے مسلمان عورت کے ساتھ کافر کے نکاح کرنے کی نفی ہو جائے، علیٰ ہٰذا القیاس نکاح فاسد میں سے محرم عورت کے ساتھ نکاح کرنے یا پہلے خاوند کی عدت میں نکاح کرنے وغیرہ کی بھی نفی ہو جائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے یہ معنی ہیں کہ عورت غیر کفو سے نکاح کرلے (وہ نکاح نہیں ہوتا) جو لوگ غیر کفو سے عورت کے نکاح کرنے کو بالکل ناجائز کہتے ہیں ان کے قول پر باطل کے معنی حقیقی ہیں اور جو لوگ اسے درست کہتے ہیں اور نکاح فسخ کرنے میں ولی کے حق کو ثابت کرتے ہیں ان کے قول پر باطل حکماً مراد ہے اور نصوص کے اطلاقات میں یہ سب تاویلیں شائع (ذائع) ہیں اور دفع تعارض کے لئے اس کا مرتکب ہونا واجب ہے، یا ہم کہیں گے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب عورت اپنا نکاح اپنے ولی کی اجازت سے

marfat.com

کرلے تو وہ نکاح جائز ہے۔ امام شافعی کے قاعدہ پر تو اس لئے کہ وہ مفہوم کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کے قاعدہ پر اس لئے کہ یہ بطلان کے حکم میں داخل نہیں ہے اور اصل جواز ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ عورت کا خود نکاح کر لینا (نفس) نکاح میں خرابی نہیں لاتا بلکہ خرابی لانے والا ولی کا حق ہے جو آنحضرت ﷺ کے اس قول سے مستفاد ہوتا ہے کہ الایم احق بنفسہا من ولیہا اور ولی کا حق غیر کفو (سے نکاح کر لینے) میں دفع عار کے لئے روک پیدا کرتا ہے۔

اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ (جب وہ باہم رضامند ہو جائیں) یعنی پیغام دینے والے مرد اور عورتیں۔ یہ رضامندی شرط ہونے کی بنا پر تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ بالغہ عورت جب بیوہ ہو اس پر زبردستی کرنا جائز نہیں ہے اور بن بیاہی بالغہ میں اختلاف ہے امام شافعی فرماتے ہیں کہ باپ اور دادا کے لئے ایسی لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضامندی کے کر دینا جائز ہے صرف باپ کے بارے میں یہی قول امام مالک کا ہے اور یہی ایک مشہور روایت امام احمد سے بھی ہے کیونکہ یہ آیت بیوہ عورتوں کے بارے میں ہے۔ ابن جوزی نے اس روایت کے مفہوم سے حجت کی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً ان لفظوں سے نقل کی ہے کہ الثیب احق بنفسہامن ولیہا والبکر یستا مرھا ابوھافی نفسہا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ استدلال ایسے مفہوم سے ہے جو حدیث یا آیت سے مخالف ہے اور مفہوم ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ حدیث اور یہ آیت ہماری حجت ہے نہ کہ ہمارے مقابلہ میں، کیونکہ یہ حدیث بکر سے اجازت لینے کے واجب ہونے پر صریح دال ہے اور اجازت لینا زبردستی کرنے کے بالکل منافی ہے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ذالکم ازکی لکم واطہر الآیہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ (عورتوں کو) روکنے کی حرمت اور رضامندی کی شرط ان خرابیوں کے خلاف ہے جو روکنے اور زبردستی کرنے میں ہوتی ہیں جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے اور یہ خرابیاں بکر اور بیوہ دونوں پر زبردستی کرنے میں برابر ہیں۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ جب اختیار ہونے میں بکر اور بیوہ دونوں برابر ہیں تو پھر آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد الثیب احق بنفسہا من ولیہا اور والبکر یستامر میں فرق کرنے کی کیا وجہ ہے اور اسی طرح مسلم کی روایت کے مطابق الایم احق کے بعد بکر کو ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ ہم کہتے ہیں فرق کی وجہ اس کی اجازت کی کیفیت بیان کرنا ہے کہ اِذنہا صما تہا (یعنی باکرہ کا اجازت دینا اس کا خاموش ہو جانا ہے) بخلاف بیوہ عورت کے کہ اس کا خاموش ہو جانا اجازت ہونے میں معتبر نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے سے ایک وکیل کر دے یا صریح اجازت دے اور اس کے علاوہ باکرہ لڑکیاں اپنا نکاح اکثر خود نہیں کیا کرتیں۔ اور اسی وجہ سے حضور ﷺ انور نے عام طور پر فرما دینے کے بعد پھر اس کو خصوصیت کے ساتھ فرمایا تاکہ لوگ اجازت لینے میں سستی نہ کرنے لگیں۔ ابن جوزی نے اس روایت سے بھی حجت لی ہے جو حسن سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لیستا مرالابکار فی انفسہن فان ابین اجبرن (یعنی باکرہ لڑکیوں کے نکاح کرنے میں ان سے اجازت لینی چاہئے اگر وہ انکار کریں تو ان پر زبردستی کی جائے) اور یہ حدیث متن اور سند دونوں اعتبار سے ساقط ہے۔ متن کے اعتبار سے تو اس لئے کہ اجازت لینے اور زبردستی کرنے میں صریح تناقص ہے کیونکہ اس وقت (یعنی جب اس پر زبردستی کر سکتے ہیں تو) اس سے اجازت لینے میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور سند کے اعتبار سے اس لئے کہ اس کی سند میں عبد الکریم (راوی) ہے، ابن جوزی نے (اس کی بابت) کہا ہے کہ اس کے متہم ہونے پر سب محدثین کا اجماع ہے۔ اور ہمارے موافق (بھی) بہت سی حدیثیں ہیں بعض ان میں سے وہ ہیں جو ہم نے ذکر کر دی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے کہ ایک باکرہ لڑکی نبی ﷺ کی خدمت میں آئی اور بیان کیا کہ میرے باپ نے میرا نکاح کر دیا ہے اور وہ مجھے ناپسند ہے اس پر حضور نے اس کو اختیار دے دیا۔ یہ حدیث امام احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ نے متصل سند کے ساتھ اور صحیح راویوں سے نقل کی ہے اور بیہقی کا یہ کہنا کہ یہ مرسل ہے کچھ مضر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ بعض طریقوں سے مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل (بھی) حجت ہے اور بعض صحیح طریقوں سے متصل ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے کہ ابن عباس کی یہ حدیث صحیح ہے اور یہ عورت خنساء بنت جذام نہیں ہے کہ جس کا نکاح اس کے باپ نے کر دیا تھا اور وہ بیوہ تھی، پھر

marfat.com

اس کی مرضی نہ ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا نکاح توڑ دیا۔ یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں مروی ہے کہ خنساء بھی باکرہ تھی۔ نسائی نے اس کی حدیث روایت کی ہے اور اس میں یہ (ذکر) ہے کہ یہ باکرہ تھی لیکن ترجیح بخاری کی روایت کو ہے اور دار قطنی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک باکرہ اور ایک بیوہ کا نکاح توڑ دیا تھا ان دونوں کا نکاح ان کے باپ نے بغیر ان کی رضامندی کے کر دیا تھا دار قطنی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے اپنی باکرہ لڑکی کا نکاح کر دیا تھا وہ اس نکاح سے راضی نہ تھی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا نکاح توڑ دیا اور ایک اور روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہتے ہیں کہ جو عورتیں اپنے باپوں کے نکاح کئے ہوئے کو پسند نہ کرتی تھیں تو آنحضرت ﷺ انہیں ان کے خاوندوں سے علیحدہ کر لیتے تھے خواہ وہ باکرہ ہوں یا بیوہ ہوں۔ دار قطنی نے جابر سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے اپنی باکرہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی اجازت کے کر دیا تھا پھر وہ لڑکی حضور ﷺ کی خدمت میں آئی (اور اس نے اپنی ناخوشی ظاہر کی) تو آپ نے ان میں تفریق کرا دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ قتادہ نبی ﷺ کی خدمت میں آئی، کہنے لگی کہ میرا باپ اچھا آدمی ہے اس نے میرا نکاح اپنے بھتیجہ سے اس لئے کر دیا ہے تاکہ اس کا رذیل پن جاتا رہے۔ یہ سنتے ہی حضور نے نکاح کے بارے میں اسے اختیار دیدیا، وہ بولی کہ میں نے اپنے باپ کے کئے ہوئے نکاح کو تو ویسے ہی رکھا ہے لیکن میں نے یہ چاہا تھا کہ سب عورتوں پر یہ بات ظاہر کر دوں کہ اس بارے میں باپوں کو کچھ اختیار نہیں ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جابرؓ اور عائشہ رضی اللہ عنہا تینوں کی حدیثیں مرسل ہیں اور ابن بریدہ کا حضرت عائشہؓ سے سننا ثابت نہیں ہے اور جابر کی حدیث کا امام احمد نے (بھی) انکار کیا ہے اور دار قطنی کہتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ یہ حدیث عطا سے مرسل ہے اور اس کے مرفوع (کر کے بیان) کرنے میں شعیب کو وہم ہو گیا ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ثابت نہیں کیونکہ ابن ابی ذئب نے نافع سے کچھ نہیں سنا بلکہ عمر بن حسین سے سنا ہے اور اسی حدیث کی بابت کسی نے امام احمد سے پوچھا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا (یہ باطل ہے) ہم کہتے ہیں کہ مرسل حدیثیں حجت ہیں خاص کر استشہاد اور تقویت کے لئے اور ابن جوزی کا یہ کہنا کہ یہ حدیثیں اس صورت پر محمول ہیں کہ کوئی باکرہ بالغہ غیر کفو سے نکاح کر لے تو یہ بلا سبب خلاف ظاہر پر حمل کرنا ہے اس کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اس حمل کے ابطال پر یہ لفظ صریح ہے کہ میرے باپ نے اپنے بھتیجہ سے میرا نکاح کر دیا ہے کیونکہ چچا کا بیٹا تو کفو ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ یہ بھتیجہ ان کی ماں کی طرف سے تھا تو یہ بھی احتمال بعید بلا دلیل ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ :- اس پر سب (فقہاء) کا اتفاق ہے کہ باکرہ صغیرہ کے نکاح کر دینے کا باپ کو اختیار ہے اور بیوہ صغیرہ میں اختلاف ہے امام مالک، امام شافعی، امام احمد فرماتے ہیں کہ بیوہ صغیرہ کا نکاح ہرگز جائز نہیں ہے کیونکہ بالغ ہونے سے پہلے اس کے اجازت دینے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجازت عقل پر موقوف ہے اور بالغ ہونے سے پہلے عقل (کا ہونا) معتبر نہیں ہے لہٰذا اس کا نکاح بغیر اس کی اجازت کے نہیں ہوتا اور بیوہ کا نکاح بغیر اس کی اجازت کے نہیں ہوتا پس اس کا نکاح بھی درست نہ ہوگا اس نتیجہ کا صغریٰ تو اجماع (ہونے) کے بعد بدیہی ہے، ہاں کبریٰ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ الثیب احق بنفسہا[1] اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور ابو ہریرہ کی حدیث کہ بیوہ کا نکاح اس سے اجازت لئے بغیر نہ کیا جائے، اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور خنساء کی حدیث کہ میرے باپ نے میرا نکاح کر دیا ہے اور میں رضامند نہیں ہوں اور وہ بیوہ تھی تو نبی ﷺ نے اس کا نکاح توڑ دیا۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کہ بیوہ کے ولی کو (اس کا) کچھ اختیار نہیں ہے، اسے دار قطنی نے نقل کیا ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے، دار قطنی نے اس میں نقص بیان کیا ہے اور جواب یہی ہے کہ خنساء بالغہ تھی کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ بیوہ صغیرہ سے اجازت نہ لی جائے اور نہ اس کا اجازت دینا صحیح ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اسے خود نکاح کر لینا جائز نہیں ہے اور امام

[1] ترجمہ: بیوہ عورتیں خود مختار ہیں۔ ۱۲ منہ

marfat.com

ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ باپ کے لئے اس کا نکاح کر دینا جائز ہے اگرچہ وہ رضامند نہ ہو کیونکہ باکرہ صغیرہ میں ولایت کا سبب یا تو صغیرہ ہونا ہوتا ہے یا باکرہ ہونا، اس کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہے اور بالغہ میں بکارت معتبر نہیں ہے جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں پس اسی طرح صغیرہ میں بھی اور اب فقط صغیرہ ہی ہونا (سبب) رہا اور وہ اس (مذکورہ صورت) میں بھی ہے بِالْمَعْرُوْفِ (دستور کے مطابق) یعنی جو شریعت میں معروف ہو اور شرافت (بھی) اسے مستحسن سمجھے بالمعروف ،فتراضوا کی ضمیر مرفوع سے حال ہے یا مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی تراضیاً کائناً بالمعروف اور اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ غیر کفو کے ساتھ نکاح کرنے سے اور اس نکاح سے جو شریعت میں جائز نہیں ہے جیسے عدت میں نکاح کرنا اور اس کے علاوہ اور نکاح جو ممنوع ہیں ان سے روکنا جائز ہے۔ اس آیت میں اس سے منع نہیں کیا گیا ذٰلِكَ (یہ) اشارہ اس طرف ہے جو (عورتوں کو) روکنے سے پرہیز کرنا اور باہم رضامندی کا خیال رکھنا پہلے بیان ہو چکا ہے یہ انفرادی خطاب ہر ایک کو ہے یا کاف محض خطاب کے لئے ہے مخاطب لوگوں کی تعین نہیں ہے ایک ہو یا چند، یا یہ خطاب آنحضرت ﷺ کو ہے جیسے یَاۤ اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ میں یا یہ کہا جائے کہ کاف کے لئے کچھ اعراب نہیں تو اس صورت میں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ کاف نفس کلمہ کا ہے، خطاب کے لئے نہیں ہے، اسی بنا پر واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث میں عرب کاف کو منصوب اور موحد پڑھتے ہیں یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے) یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ احکام شریعت کے کفار مخاطب نہیں ہیں یا یہ کہا جائے کہ خاص انہی کو اس لئے ذکر کیا ہے کہ نصیحت حاصل کرنے والے اور نفع اٹھانے والے اس سے یہی لوگ ہیں۔

ذٰلِكُمْ (یہ) سب لوگوں کو خطاب ہے۔ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ

(تمہارے حق میں نفع دینے والی اور بڑی پاک کرنے والی ہے) یعنی گناہوں کی پلیدی سے کیونکہ اگر (عورتوں کو) مطلق نکاح سے روکا جاتا ہے تو اکثر زنا (کاری) میں پڑ جاتیں اور اگر اس نکاح سے روکا جاتا جس سے وہ خود رضامند ہو گئی ہیں اور ایسے شخص سے نکاح کرنے پر زبردستی کی جاتی جس سے وہ رضامند نہیں ہیں تو اندیشہ تھا کہ یہ دونوں (میاں بیوی) اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھیں اور خلع کرنے یا طلاق دینے کی نوبت آئے وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ (اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے (اس کو جس میں نفع اور بہتری ہے) اور تم نہیں جانتے) یعنی اپنی کم عقلی اور انجام کار سے ناواقف ہونے کے باعث۔ وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں) بچوں کو ماؤں کی طرف اس لئے منسوب کر دیا ہے تاکہ یہ ان کے مہربان ہونے اور دودھ پلانے کا باعث ہو اور یہ امر وجوب کے لئے ہے جو مبالغہ کی غرض سے جملہ خبریہ سے بیان کر دیا گیا ہے لیکن یہ حکم اس صورت میں منسوخ ہے کہ جب ماں دودھ پلانے سے قاصر ہو یعنی اس میں قدرت نہ ہو اور باپ (انا کو) نوکر رکھ لینے پر قادر ہو تو باپ بچے کو اور عورت سے پلوائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فان تعاسر تم فسترضع له اخرٰی (یعنی اگر تم آپس میں تنگی کرو تو دودھ اور عورت پلائے) یا یہ آیت اللہ تعالیٰ کے ارشاد لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا سے مخصوص ہے اور اس کے ماسوا میں حکم اپنی اصل پر ہے اور اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر مرد اپنی بیوی یا اپنی معتدہ کو دودھ پلانے کے لئے نوکر رکھے تو یہ جائز نہیں ہے اور امام شافعی علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ اسے نوکر رکھ لینا جائز ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ دودھ پلانا دیانتہً عورت کے ذمہ ہے مگر جب وہ باوجود انتہا درجہ کی محبت ہونے کے دودھ نہ پلائے تو اس کے معذور ہونے کے خیال سے قضاءً اسے معذور سمجھ لیا گیا ہے۔ پھر جب وہ اجرت پر پلانے کے لئے آمادہ ہو گئی تو اس سے (دودھ پلانے پر) اس کا قادر ہونا ظاہر ہو گیا اور یہ دودھ پلانا اس پر واجب تھا تو اب اسے اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ دلیل چاہتی ہے کہ مطلقہ کی عدت پوری ہونے کے بعد اس کے بچہ کو دودھ پلانے کے لئے اسی کو نوکر رکھ لینا جائز نہ ہو حالانکہ یہ بالاتفاق جائز ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ عدت پوری ہونے کے بعد اس کو نوکر رکھ لینے کا جواز اللہ کے اس فرمان سے ثابت ہوا ہے فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ الآیہ پس اس سے معلوم ہوا کہ ماں پر دودھ پلانا واجب اس شرط سے ہے کہ باپ کے ذمہ آیت و علی المولود له

marfat.com

رزقھن وکسوتھن سے اس کا نان نفقہ واجب ہو، پس زوجہ ہونے اور عدت میں ہونے کی حالت میں وہ ایجاب اسے نان نفقہ دینے کی وجہ سے قائم ہے اور عدت کے بعد اس کے ذمہ نان نفقہ نہیں ہے اس لئے یہ اجرت اس کے قائم مقام ہو جائے گی حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (پورے دو برس) صفت کمال سے اس لئے تاکید کردی ہے کہ (اکثر مائیں وغیرہ) اس میں سستی کر دیتی ہیں اس قید کا مقتضایہ ہے کہ پورے دو برس تک دودھ پلانا واجب ہو، لیکن اس کے بعد چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ قید فقط اس لئے ہے کہ دو برس کے بعد دودھ پلانا جائز نہیں ہے۔ نیز دو برس کے بعد دودھ پلانے کے جواز کی نفی ہونا اپنی اصل پر ہے کیونکہ اصل یہی ہے کہ آدمی کی تعظیم کی وجہ سے اس کے اجزاء سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہے اس کے علاوہ یہ نفی اللہ کے اس ارشاد سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ (اس شخص کے لئے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے) کیونکہ دودھ کی مدت پوری ہونے کے بعد اور کوئی چیز نہیں ہے اور یہ اس شخص کے لئے بیان ہے جس کی طرف وجوب کا حکم متوجہ ہوتا ہے یعنی یہ دو برس تک دودھ پلوانا اس شخص کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے یا یہ یرضعن کے متعلق ہے کیونکہ باپ کے ذمہ دودھ پلوانا مثل نان نفقہ کے واجب ہے اور ماں کے ذمہ دودھ پلانا واجب ہے اگر اسے تکلیف نہ ہو۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے پورے دو برس دودھ پلانا ماؤں پر فرض کیا تھا پھر اپنے قول لمن اراد ان تیم الرضاعتہ سے اس میں تخفیف کردی۔ پس اس آیت سے ثابت ہوا کہ دودھ پلانے کی مدت دو برس ہے اس کے بعد جائز نہیں ہے اور نہ دو برس کے بعد دودھ پلانے سے محروم ہونا (یعنی رضاعی ماں وغیرہ ہونا) ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی قول امام ابو یوسف، امام شافعی، امام احمد کا ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ان دونوں روایتوں کو دار قطنی نے نقل کیا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے (بھی) مروی ہے ان دونوں کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے امام مالک کا قول یہ ہے کہ (دودھ پلانے کی مدت) دو برس سے کچھ زیادہ ہے اور اس زیادہ کی انہوں نے کوئی حد نہیں بیان کی۔ امام ابو حنیفہ نے (اس سے زیادہ کی حد) تین مہینے فرمائی ہے اور امام زفرؒ نے تین برس فرمائے ہیں اور سب ائمہ نے دو برس سے زیادہ ہونے کو اللہ کے ارشاد کاملین سے لیا ہے کیونکہ کمال یہ چاہتا ہے کہ ان دو برس میں بچہ (اچھی طرح) کھاتا نہیں لہٰذا اتنی مدت (اور) ہونی ضروری ہے کہ اس میں بچہ کو کھانا کھانے کی عادت ہو جائے اور اس زیادتی (کی مدت) کو ہر ایک امام نے اپنی اپنی رائے سے مقرر کیا ہے اور امام مالک نے کوئی مدت مقرر نہیں کی۔ ہم کہتے ہیں کہ کمال کا یہ تقاضا ہونا ممنوع ہے کہ دو برس میں بچہ کھانا نہیں کھاتا بلکہ کمال کو (اللہ نے) اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ لوگ سستی کر کے ان دو برس کو ان سے کم پر نہ حمل کریں، ہمارے اس قول پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا رضاع الاما کان فی حولین (یعنی دودھ پلانا وہی ہے جو دو برس کے اندر ہو) اس حدیث کو ابن جوزی اور دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں ابن عیینہ سے مروی ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ٹھیک ہیں سوائے ہیثم بن جمیل کے اور یہ (بھی) ثقہ (اور) حافظ ہے اسی طرح امام احمد، عجلی، ابن حبان وغیرہ نے اس کو ثقہ کہا ہے وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ (اور جس کا بچہ ہے اس پر) یعنی باپ پر کیونکہ بچہ اسی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ عبارت کا تغیر اس معنی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ دودھ پلوانے کا وجوب اور دودھ پلانے والی کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے اور (لہ میں) لام اختصاص کے لئے ہے اور اسی وجہ سے ظاہر الروایت میں امام ابو حنیفہ کا قول یہ ہے کہ بالغ لڑکی اور بالغ لڑکے کا خرچ خاص باپ ہی کے ذمہ ہے ماں کے ذمہ نہیں ہے جیسا کہ چھوٹے بچہ کا اور خصاف اور حسن کی روایت میں امام موصوف سے یہ مروی ہے کہ یہ خرچ دونوں کے ذمہ ہے لیکن میراث کے قاعدہ کے موافق تین حصے کر کے (یعنی دو حصے باپ کے ذمہ اور ایک حصہ ماں کے ذمہ)

رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (دستور کے مطابق ان (ماؤں) کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری ہے) اگر بچہ کی ماں اس (کے باپ) کی بیوی ہے یا عدت میں ہے تو یہ کھانا اور کپڑا اس کے بیوی ہونے کے حکم کی وجہ سے جائز ہے

marfat.com

اور اگر وہ عدت پوری ہونے کی وجہ سے اجنبی عورت ہو گئی ہے تو پھر یہ (باپ کے ذمہ) اجرت کے طور پر واجب ہے چنانچہ اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد فاتوہن اجورہن دلالت کرتا ہے اور اس خرچہ کی مقدار بقدر وسعت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (آگے) فرمایا ہے۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا (ہر شخص کو گنجائش ہی کے مطابق تکلیف دی جاتی ہے) اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ گنجائش سے زیادہ تکلیف (دیا جاتا) اگرچہ عقلاً جائز ہے لیکن شرعاً جائز نہیں ہے۔ خاص کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ (نہ بچہ کی وجہ سے ماں کو تکلیف دی جائے اور نہ بچہ کی وجہ سے اسے جس کا بچہ ہے (یعنی باپ کو) ابن کثیر اور یعقوب نے لا تضار کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس وجہ سے کہ یہ لا تکلف سے بدل ہے۔ پس یہ خبر بمعنی نہی ہے اور باقی قاریوں نے نہی کے صیغہ سے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور ان دونوں صورتوں میں یہ صیغہ معروف اور مجہول ہونے کا احتمال رکھتا ہے اور (ب) سببیت کے لئے ہے معنی یہ ہیں کہ نہ ماں اپنے بچہ کی سبب سے اپنے خاوند کو کوئی تکلیف دے یعنی اس سے نخرے کرے اور نفقہ یا اجرت میں اس سے زیادہ مانگے اور بچہ کی خبر گیری میں کمی کر کے اس کے دل کو پریشان کرے یا بچہ کے اپنے سے مانوس ہو جانے کے بعد اس سے کہے کہ اور انّا لے آؤ وغیرہ وغیرہ اور نہ باپ اپنے بچہ کے سبب سے اپنی بیوی کو تکلیف دے اس طرح کہ اس سے بچہ چھین لے حالانکہ وہ اسے اسی اجرت پر دودھ پلانا چاہتی ہے جو کوئی غیر عورت لے یا اس کی اجرت میں کمی کرے یا اس سے زبردستی پلوائے باوجودیکہ اور انّا مل سکتی ہے اور ماں دودھ نہیں پلا سکتی وغیرہ وغیرہ۔ یہ معنی لا تضار کے معروف ہونے کی صورت میں ہیں اور مجہول ہونے کی صورت میں بھی یہی معنی ہیں لیکن عکس ترتیب کے ساتھ اور احتمال ہے کہ کے معنی لا تضر کے ہوں اور ب زائد ہو یعنی نہ ماں اپنے بچہ کو تکلیف دے نہ باپ اپنے بچہ کو تکلیف دے اس طور پر کہ اس کی خبر گیری میں اور دودھ پلوانے میں اور اس پر خرچ کرنے میں کمی کرنے لگے اور ماں اسے باپ کو نہ دے یا ماں سے مانوس ہونے کے بعد باپ اسے چھین لے۔ اور بچہ کو دونوں کی طرف منسوب کر کے اس لئے ذکر کیا ہے کہ دونوں کو اس سے محبت زیادہ ہو جائے وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ (اور ایسا ہی اس کے وارث پر ہے) اس کا عطف وعلی المولود لہ پر ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے وہ معروف کی تفسیر اور معطوف و معطوف علیہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ وارث کی تفسیر میں اختلاف ہے امام مالک اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہاں وارث سے مراد وہ لڑکا ہی خود ہے جو اپنے باپ متوفی کا وارث ہے اس کے دودھ پینے کی اجرت اور اس کا خرچہ اس کے مال میں سے لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو ماں کے ذمہ ہے اور بچہ کے خرچ کے لئے سوائے والدین کے اور کسی پر جبر نہیں ہو سکتا اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس (وارث) سے مراد ہے ماں یا باپ جو بھی زندہ ہو اس کے ذمہ دودھ پلوانے کی اجرت اور روٹی کپڑا، ایسا ہی ہے جیسا باپ کے ذمہ یہ قول بھی امام شافعی اور امام مالک کے مذہب کے موافق ہے۔ پہلے قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بچہ کا خرچ اسی کے مال میں سے ہونا اس پر مقدم ہے کہ اس کا خرچہ اور کسی پر ہو خواہ وہ باپ ہو یا کوئی ہو۔ ہاں جس وقت یہ مان لیا جائے کہ بچہ کے پاس مال نہیں ہے۔ پس یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ بچہ کے ذمہ اس کا خرچہ ویسا ہی واجب ہے کہ جیسا اس کے باپ کے ذمہ تھا بلکہ یہ بات الٹی کہنی پڑے گی اور یہ کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے یہ مان لینے کے بعد کہ بچہ کے پاس مال نہیں ہے اور دوسرے قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر فقط باپ زندہ ہے یا دونوں زندہ ہیں تو یہ حکم تو پہلے گزر چکا ہے کہ ماں کا کپڑا باپ کے ذمہ ہے اس کے دوبارہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ آیت ان دونوں کے زندہ رہنے کی صورت میں یہ چاہتی ہے کہ نفقہ ان دونوں ہی کے ذمہ ہو اور یہ ماسبق کے منافی ہے اور اگر فقط ماں ہی زندہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ ماں پر ماں کا رزق ہے اور اس وقت یہ لازم آئے گا کہ وہی مستحق ہو اور اسی پر استحقاق ہو۔ امام احمد اسحاق، قتادہ، ابن ابی لیلیٰ کا قول یہ ہے کہ الوارث سے مراد بچہ کا وارث ہے خواہ مرد ہو یا عورت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وارث سے بقدر اس کی میراث کے زبردستی نفقہ لیا جائے وہ عصبہ ہو یا نہ ہو اور برابر ہے کہ وہ بچہ اس کا وارث ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ مثلاً جس صورت میں کوئی لڑکی ہو کہ اس کے چچا کا بیٹا اور اس کا بھتیجہ تو اس کے وارث ہوتے ہیں اور وہ ان کی وارث نہیں ہوتی اور ایک روایت میں امام احمد سے یہ بھی ہے کہ زبردستی اسی پر کی جائے کہ جہاں ان دونوں میں

marfat.com

توارث بھی جاری ہو (یعنی ایک دوسرے کا وارث بھی ہو) اور امام احمد کی پہلی روایت کے موافق امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے اور آیت سے یہی ظاہر و متبادر بھی ہے اور اس میں کوئی خفا نہیں ہے، ہاں امام ابو حنیفہ نے وارث میں ذی رحم محرم کی قید لگائی ہے۔ پس اس قید سے معتق اور چچازاد بھائی وغیرہ نکل جائیں گے اور وجہ اس قید کے بڑھانے کی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے کہ وعلی الوارث ذی رحم المحرم مثل ذالک ۔پس امام ابو حنیفہ نے اپنے اصل قاعدہ پر عمل کیا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت سے کتاب (اللہ) کی تخصیص اور اس پر کچھ زیادتی کرنا جائز ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ وارث سے مراد عصبہ ہے پس بچہ کے عصبوں پر (نفقہ کے بارے میں) زبردستی کی جائے جیسے دادا، بھائی، بھتیجا، چچا کا بیٹا۔ بغوی کہتے ہیں یہی قول حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے اور ابراہیم، حسن، مجاہد، عطا، سفیان بھی اسی کے قائل ہیں اور بعض (مفسرین) کا قول یہ ہے کہ یہاں نفقہ مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مفاد مراد ہے معنی یہ ہیں کہ وارث پر مضرت کا ترک کر دینا لازم ہے (یعنی وہ اس بچہ کو کسی طرح کی تکلیف نہ دے) بغوی کہتے ہیں یہی قول زہری اور شعبی کا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ معنی ہرگز ٹھیک نہیں ہیں کیونکہ ترک مضرت کا واجب ہونا تو وارث ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ والدین کے بارے میں یہ اس لئے ذکر دیا گیا ہے کہ مضرت کا وہ وہم دفع ہو جائے جو مذکورہ آیت سے ہوتا تھا اس کے علاوہ وضع کے اعتبار سے ذالک کا لفظ بعید کے لئے ہے اور بعید وجوب نفقہ ہے نہ کہ قریب کے لئے جو مضرت ہے، واللہ اعلم اور اسی آیت کی وجہ سے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ دولتمند پر (اس کے) ہر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہے جس وقت کہ وہ ذی رحم محرم صغیر (سن) تنگ دست ہو یا بالغہ عورت تنگدست ہو یا مرد ہی لنگڑا، لولا ہو یا اندھا تنگ دست ہو اور یہ قیدیں اس وجہ سے لگائیں ہیں کہ مورد نص تو صغیر ہے (یعنی نص صغیر سن ہی کے بارے میں آئی ہے) اور صغر محتاجگی کے اسباب میں سے ہے پس جس ذی رحم محرم میں کوئی محتاجگی کا سبب ہوگا تو اس سبب کی وجہ سے (اس حکم میں) اسے صغیر کے ساتھ کر دیا جائے گا بخلاف اس تنگدست کے جو کمانے والا ہو کیونکہ وہ اپنے کمانے کی وجہ سے غنی ہے اس کو صغیر کے ساتھ نہیں ملا سکتے اور نہ اس کا کسی پر نفقہ واجب ہوتا ہے اور (نفقہ میں) میراث کی مقدار کا اعتبار ہوگا (یعنی جسے جس قدر ورثہ پہنچتا ہوگا اس پر اسی قدر نفقہ بھی واجب ہوگا) کیونکہ ایک حکم کو کسی مشتق کی طرف منسوب کرنا اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ ماخذ اشتقاق اس حکم کی علت ہے پس ماں پر اور دادے پر تہائی نفقہ لازم ہوگا اور لپاہج بھائی تنگ دست کا نفقہ اس کی متفرق متمول بہنوں پر میراث کے موافق پانچواں حصہ ہوگا۔ علیٰ ہٰذا القیاس اور علماء کہتے ہیں کہ معتبر اہلیت وراثت ہے نہ کہ اس کا حاصل کرنا کیونکہ یہ تو مرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ پس (اس قول کے مطابق) جس کسی تنگدست کے ایک ماموں اور ایک چچازاد بھائی ہو تو اس کا نفقہ ماموں کے ذمہ ہوگا نہ کہ چچازاد بھائی کے ذمہ اور باوجود اختلاف دین کے نفقہ واجب نہیں ہوتا (یعنی اگر ایک کافر ہو دوسرا مسلمان ہو تو ان میں ایک کا دوسرے کے ذمہ نفقہ نہ ہوگا) کیونکہ ان میں اہلیت وراثت نہیں ہے اور (نفقہ کے) وجوب کی علت وہی ہے اور نہ تنگ دست پر نفقہ واجب ہے کیونکہ یہ صلہ رحمی کرنے کے لئے واجب ہوتا ہے اور صلہ رحمی میں خود تنگدست ہی کا اوروں پر استحقاق ہے پس اس پر کسی کا استحقاق کیونکر ہو سکتا ہے، لیکن ظاہر روایت میں جو امام ابو حنیفہ کا یہ قول ہے کہ ہر شخص پر اپنے والدین اور دادا دادی کو خرچ دینا واجب ہے جس وقت کہ وہ محتاج تنگ دست ہوں اگرچہ وہ کافر ہوں اور یہ کہ ان کا نفقہ اولاد ہی کے ذمہ ہے اور سب پر برابر ہے خواہ (اولاد) مرد ہوں یا عورتیں ہوں۔ تو یہ وراثت کے طریقہ پر نہیں ہے، اس میں امام احمد کا اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرد اور عورتوں پر تہائی کے طور پر ہے (یعنی مرد کے ذمہ دو حصے اور عورت کے ذمہ ایک حصہ) اور یہی ایک روایت امام ابو حنیفہ سے بھی ہے تو ان کے اس قول کا مبنی (اور دلیل) یہ آیت نہیں ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ان کا نفقہ جزئیت (یعنی اولاد ہونے) کی وجہ سے واجب ہے نہ کہ وراثت کی وجہ سے والدین کافر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وان جاھداک علی ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا (یعنی اور اگر تیرے ماں باپ تجھے اس بات پر مجبور کریں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں تو تو ان کی پیروی نہ کر اور دنیا میں ان کے ہمراہ اچھی طرح

marfat.com

رہ) اور یہ تو اچھی طرح رہنا نہیں ہے کہ وہ دونوں بھوکے مر جائیں اور وہ دولت مند ہو اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ انت و مالک لابیک (یعنی تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کی ملک ہے) اس حدیث کو نبی ﷺ سے صحابہ کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان اطیب ما اکل الرجل من کسب ولدہ وان ولدہ من کسبہ (یعنی مال طیب وہ ہے جو آدمی اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھائے اور اس کی اولاد اس (کی خود) کی کمائی میں سے ہے) اس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا ہے۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے باپ سے اور ان کے باپ نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے پاس مال ہے اور میرے والد (کے پاس کچھ نہیں وہ) میرے مال کے محتاج ہیں (انہیں دوں یا نہیں) تو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا انت و مالک لوالدک ان اولادکم من اطیب کسبکم کلوامن کسب اولادکم (یعنی تم اور تمہارا مال تمہارے والد کا ہے۔ تمہاری اولاد تمہاری ہی اعلیٰ درجہ کی کمائی میں سے ہے لہذا تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھایا کرو) ان حدیثوں کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بیٹے کے مال کا باپ مالک ہوتا ہے لیکن اجماع اور آیت میراث کی دلالت وغیرہ کی وجہ سے یہ ظاہری مقتضیٰ مراد نہیں لیا جاتا بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ ضرورت کے وقت باپ (بیٹے کے مال کا) مالک بن سکتا ہے لہذا ماں باپ کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے وارثوں میں سے اور کوئی شخص اس درجہ میں شریک نہیں اور جب یہ نفقہ وراثت کے طور پر ثابت نہ ہوا تو اس میں وراثت کا طریقہ بھی معتبر نہ ہوگا ہاں قیاس کی وجہ سے دادا دادی ماں باپ کے حکم میں ہیں۔ اسی واسطے وہ دونوں ماں باپ (کے نہ ہونے کی صورت میں ان) کی میراث کو لے لیتے ہیں اور دادا نکاح میں ولی ہو جاتا ہے۔ عمرو بن شعیب اپنے دادا سے ان کے دادا اپنے سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں فقیر ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے اور ایک یتیم بچہ میرے پاس (پرورش کے لئے) ہے آپ نے فرمایا کہ اپنے یتیم کے مال میں سے کھاؤ (پیو) لیکن اسراف نہ کرنا اور نہ اپنے پاس جمع کر لینا۔ یہ حدیث ابو داؤد۔ نسائی، ابن ماجہ نے نقل کی ہے اور جب امام شافعی اور امام مالک نے وارث کی یہ تفسیر کی جو ہم بیان کر چکے ہیں تو اب امام مالک فرماتے ہیں کہ سوائے والدین اور صلبی اولاد کے اور کسی کے لئے (نفقہ) واجب نہیں، نہ دادوں کے لئے، نہ دادیوں کے لئے، نہ پوتوں کے لئے اور نہ نواسوں کے لئے۔ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اصول اور فروع (یعنی باپ دادا وغیرہ ادھر اور بیٹا پوتا وغیرہ ادھر) دونوں کے لئے (ان کے آپس میں) نفقہ مطلقاً واجب ہے ہاں نسب کے ان دونوں ستونوں سے تجاوز نہیں کر سکتا اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ نفقہ کا بار خاص مردوں ہی پر ہے مثلاً دادا، بیٹا، پوتا، عورتوں پر نہیں ہے اور امام مالک فرماتے ہیں کہ نفقہ کا بار صلبی اولاد پر برابر ہے جس وقت وہ دونوں دولتمند ہوں (خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ہوں اور اگر ان میں ایک دولتمند ہے اور دوسرا فقیر ہے تو پھر فقط دولتمند ہوں

(خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ہوں اور اگر ان میں ایک دولتمند ہے اور دوسرا فقیر ہے تو پھر فقط دولتمند ہی پر ہے واللہ اعلم،

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا (پھر اگر وہ دونوں (یعنی ماں باپ) دودھ چھڑانا چاہیں (یعنی دو برس سے پہلے) کیونکہ دو برس کے بعد چھڑانا تو واجب ہے چنانچہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دودھ پلانے کی انتہائی مدت دو برس ہے اس شخص کے لئے جو پوری مدت تک پلوانا چاہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ فان ارادا کی فا اس بات کو چاہتی ہے کہ دودھ چھڑانا دو سال کے بعد ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں فا مطلق دودھ پلانے کی بعدیت کو بیان کرنے کے لئے ہے نہ دو سال کے بعد کو اور مدارک میں کہا ہے کہ یہاں مطلق حکم بیان کیا گیا ہے خواہ دو برس سے زیادہ ہو یا کم ہو۔ یہ ایک (مدت اور) حد بیان کرنے کے بعد وسعت دینا (اور آسانی کرنا) ہے۔ صاحب مدارک نے یہ اس لئے کہا ہے تاکہ یہ آیت امام ابو حنیفہ کے مذہب کے موافق ہو جائے (کیونکہ امام اعظم کا مذہب ہے) کہ دو برس کے بعد اور چھ مہینے دودھ پلانا جائز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ آیت اس تہدید کے لئے ناسخ ہے اور یہ حکم مطلق ہے یا دو برس کے بعد کے ساتھ مقید ہے تو اس سے تین برس کے بعد بھی دودھ پلانے کا جواز لازم آئے گا اور یہ اجماع کے خلاف ہے اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور نہ ڈھائی برس وغیرہ کی مدت معین کرنے کی کوئی وجہ ہے اور حنفیہ نے جو یہ کہا

marfat.com

ہے کہ ڈھائی برس تک دودھ پلانے کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے ارشاد و حمله و فصاله ثلثون شہرا سے ہوتا ہے تو یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس کو اس کے موقع پر یعنی سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کے قول و امہاتکم التی ارضعنکم کی تفسیر میں عنقریب بیان کریں گے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ فصال (دودھ چھڑانے) کو دو سال سے پہلے لینے کی صورت میں بھی تو دو سال کی مدت معین کرنے کا نسخ لازم آتا ہے ہم کہتے ہیں کہ پورے دو برس تک دودھ پلانے کے واجب ہونے میں اللہ کے اس قول کی قید ہے۔ لمن اراد ان یتیم الرضاعة اور یہ آیت دودھ چھڑانے کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے جس وقت کہ ان کا یہ ارادہ آپس کی رضامندی اور مشورہ سے ہو لہٰذا نہ یہاں منافات ہے اور نہ نسخ ہے واللہ اعلم۔

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ (آپس کی رضامندی اور مشورہ سے) یعنی اہل علم کے مشورہ سے تاکہ وہ بتلائیں کہ اس وقت میں دودھ چھڑانا اس بچہ کو کچھ مضر نہ ہوگا اور مشاورت کے معنی رائے زنی کرنا ہے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ط تو ان پر (اس میں کوئی گناہ نہیں ہے) اور دونوں رضامندی اس لئے معتبر رکھی گئی ہے تاکہ ان میں سے ایک کسی غرض وغیرہ کی وجہ سے ایسا نہ کر بیٹھے کہ جس سے بچہ کو ضرر ہو اور اس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک کے لئے بغیر آپس کی رضامندی اور رائے والوں سے مشورہ لینے کے دو برس سے پہلے دودھ چھڑانا جائز نہیں ہے۔

وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ اور (اے بچوں کے باپو) اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو) یعنی ان بچوں کی ماؤں کے سوا اور اناؤں سے جب کہ ان کی مائیں انہیں دودھ پلانے سے انکار کردیں یا تو اپنی کسی تکلیف کی وجہ سے یا دودھ نہ ہونے کی وجہ سے یا دوہ نکاح کرنا چاہتی ہیں یا وہ اور اناؤں سے زیادہ تنخواہ مانگتی ہیں اور یہ قیدیں ہم نے اس لئے لگادی ہیں کہ والدین میں سے ایک کے دوسرے کے ضرر نہ دینے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے مفعول اول کو استغناء کی وجہ سے حذف کردیا گیا ہے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم (تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے جبکہ تم نے جو کچھ دینا مقرر کیا تھا وہ ان کے (یعنی ان کی ماؤں کے) حوالے کردیا ہو۔ ما آتیتم سے یہ مراد ہے کہ جو کچھ تم نے ان کی ماؤں کے دودھ پلانے کی تنخواہ بقدر ان کے دودھ پلانے کے مقرر کردی ہو یا یہ مطلب ہے کہ جب تم اناؤں کی تنخواہیں ان کے حوالے کرچکے (تو اب تم پر کچھ گناہ نہیں ہے) اور حوالے کردینا اجماعاً مستحب ہے۔ جواز کی شرط نہیں ہے۔ ابن کثیر نے یہاں اور سورۂ روم میں آتیتم الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کے معنی مافعلتم کے ہیں اور اس وقت تسلیم کے معنی اطاعت کرنے اور اعتراض نہ کرنے کے ہیں یعنی جب والدین میں سے ایک نے دوسرے کے فعل یعنی دودھ پلوانے کی اطاعت کرلی (تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں بِالْمَعْرُوفِ دستور کے مطابق) یہ سلمتم کے متعلق ہے یعنی ایسے طریقہ پر جو شریعت میں مستحسن اور متعارف ہو اور شرط کا جواب محذوف ہے اس پر اس کا ما قبل دلالت کرتا ہے وَاتَّقُوا اللَّهَ (اور اللہ سے ڈرتے رہو) بچوں اور اناؤں کی بابت جو پہلے بیان کیا گیا ہے یہ آیت اس کی حفاظت کرنے (اور اس پر کاربند ہونے) کی تاکید کے لئے ہے۔

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾ (اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے) یہ ترغیب اور تہدید ہے۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ (اور جو تم میں سے مرجائیں) توفی کے معنی ایک شئے کو بتمامہ حاصل کرنے کے ہیں یعنی وہ اپنی عمریں پوری کرلیں۔

وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ (اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ رکیں) یعنی انتظار کریں اس میں ضمیر بیویوں کی طرف ہے یعنی ان مردوں کی بیویاں انتظار کریں اور مبتدا پر سے مضاف محذوف ہے یعنی وازواج الذین یتوفون تیربصن بعد ہم۔

بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ اپنے کو چار مہینے اور دس دن) لفظ عشر کو مؤنث ذکر کرنا لیالی کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ لیالی سے ہی مہینوں اور دنوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ عرب کا قاعدہ ہے کہ جب کسی عدد کو لیالی اور ایام میں مبہم کرنا منظور ہوتا ہے تو لیالی کو ایام پر غلبہ دے کر لیالی کا استعمال کرتے ہیں اور ایسے موقعہ میں مذکر کا استعمال نہیں کرتے چنانچہ کہتے ہیں۔ صمت عشر قرآن شریف میں ہے ان لبثتم الاعشرا اور آگے فرمایا ہے ان لبثتم الایوما یہ آیت حاملہ وغیرہ سب عورتوں کو

marfat.com

شامل تھی پھر اس کا حکم حاملہ عورتوں کے بارے میں اللہ کے اس قول سے منسوخ ہو گیا واو لات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن (یعنی حاملہ عورتوں کی عدت یہی ہے کہ وہ اپنے حملوں کو جن لیں) ابن مسعود کا قول ہے کہ میں ہر شخص سے (اس بارے میں) مباہلہ کر سکتا ہوں کہ چھوٹی سورۂ نساء یعنی سورۂ طلاق بڑی سورۂ نساء یعنی سورۂ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اسی پر اجماع ہو گیا ہے۔ مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ سبیعہ اسلمیہ کو نفاس آ گیا یعنی ان کے شوہر کے مرنے سے چند ہی روز کے بعد ان کے بچہ پیدا ہو گیا وہ نبی ﷺ کی خدمت میں آئیں اور نکاح کرنے کی آپ سے اجازت مانگی آپ نے انہیں اجازت دے دی۔ انہوں نے فوراً نکاح کر لیا۔ یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے اور صحیحین میں بھی سبیعہ کی حدیث اسی طرح ہے اور ام سلمہ کی سند سے بھی مروی ہے اور نسائی نے نقل کیا ہے کہ سبیعہ کے شوہر کے مرنے سے پندرہ روز کے بعد ان کے بچہ پیدا ہو گیا تھا اور بخاری کی روایت میں چالیس روز کے بعد ہے، ایک اور روایت میں دس رات کے قریب مذکور ہیں اور امام احمد نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے تھے کہ ان کے شوہر کے مرنے سے پندرہ روز کے بعد بچہ ہو گیا تھا حضرت علیؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایسی عورت اس عدت کو پوری کرے جو دونوں میں بڑی ہو (یعنی اگر چار مہینے دس دن سے زیادہ میں بچہ ہونے والا ہے تب تو بچہ کے پیدا ہونے کی عدت پوری کرے اور اگر اس سے کم میں ہونے والا ہے تو چار مہینے دس دن کی عدت گزارے) یہ روایت ابوداؤد نے اپنے ناسخ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ اگر عورت کے بچہ پیدا ہو جائے اور اس کے شوہر کا ابھی جنازہ ہی رکھا ہو تب بھی اس کی عدت پوری ہو گئی یہ روایت امام مالک اور امام شافعی اور ابن ابی شیبہ نے نقل کی ہے۔

مسئلہ: جس باندی کا شوہر مر جائے اس کی عدت بالاجماع دو مہینے اور پانچ دن ہیں۔

فصل: مرنے کی عدت میں سوگ کرنا بالاجماع واجب ہے سوائے اس کے کہ حسن اور شعبی سے یہ منقول ہے کہ واجب نہیں ہے اور رجعی طلاق کی عدت میں بالاجماع سوگ نہ کرنا چاہئے اور بائنہ طلاق کی عدت میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں واجب ہے اور امام مالک فرماتے ہیں واجب نہیں اور امام شافعی اور امام احمد سے بھی ایسے ہی دو قول منقول ہیں۔ ہمارے نزدیک صغیرہ (یعنی چھوٹی بچی) پر سوگ نہیں ہے کیونکہ وہ مکلف نہیں۔ اور نہ ذمیہ عورت پر ہے کیونکہ وہ شریعت کے احکام کی مخاطبہ نہیں ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ان دونوں پر بھی واجب ہے۔ سوگ کرنا اسے کہتے ہیں کہ خوشبو، سرمہ اور مہندی نہ لگائے نہ بناؤ سنگار کرے اور نہ سنگار کرنے کے لئے کسم اور زعفران وغیرہ کے رنگے ہوئے اور جریر اور دیباج کے کپڑے پہنے اور نہ سر کو اور بدن کو تیل لگائے، خواہ خوشبودار ہو یا بے خوشبو کا ہو۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ سر کے سوا اور بدن پر خوشبودار تیل لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پس اگر کسی عورت کو سرمہ لگانے کی بہت ہی سخت ضرورت ہو تو ایسی صورت میں اکثر علماء نے اس کی اجازت دیدی ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ رات کو سرمہ لگایا کرے اور دن کو اسے پونچھ دیا کرے اسی طرح کسی عذر کی وجہ سے خضاب وغیرہ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور رجعی اور بائنہ طلاق والیوں کو اپنے گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے نہ رات کو اور نہ دن کو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولاتخرجوھن من بیوتھن ولایخرجن (یعنی اور نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں) اور جس کا شوہر مر گیا ہو اس کو باہر نکلنا مطلقاً جائز ہے (خواہ دن ہو خواہ رات ہو) اور بائنہ (طلاق والی) کے لئے دن کو نکلنا جائز ہے۔ عطا کا قول ہے کہ میراث کی آیت نے (عورت کے لئے) گھر مقرر ہونے کو منسوخ کر دیا ہے اس لئے وہ جہاں چاہے عدت گزارے سوگ کرنے کا وجوب ام حبیبہ اور زینب بنت جحش کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے آپ نے فرمایا لایحل لامراۃ تؤمن باللہ والیوم الآخران تحد علی میت فوق ثلث لیال الاعلی زوج اربعۃ اشھر و عشرا (یعنی جو عورت اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہو اسے کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے سوائے خاوند پر چار مہینے اور دس دن سوگ کرنے کے) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ ام عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی عورت کو کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز

marfat.com

نہیں ہے سوائے خاوند پر چار مہینے اور دس دن سوگ کرنے کے اور اس سوگ میں نہ وہ رنگا ہوا کپڑا پہنے نہ سرمہ لگائے نہ خوشبو لگائے ہاں جب پاک ہو جائے تو تھوڑا سا قسط یا اظفار استعمال میں لے آئے۔ یہ حدیث (بھی) متفق علیہ ہے اور ابو داؤد نے یہ زیادہ بیان کیا ہے کہ نہ وہ خضاب کرے۔ ام سلمہ فرماتی ہیں کہ ایک عورت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میری بیٹی بیوہ ہو گئی ہے اور اس کی آنکھیں دکھتی ہیں کیا ہم اس کے سرمہ لگا دیں فرمایا نہیں پھر اس نے دو یا تین دفعہ پوچھا آپ ہر دفعہ یہی جواب دیتے رہے مگر نہیں پھر فرمایا کہ اب تو یہ عدت کل چار مہینے اور دس ہی دن ہے پہلے تو تمہاری یہ حالت تھی کہ بیوہ پر سال بھر کے بعد اونٹ کی مینگنیاں ماری جاتی تھیں یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ ام سلمہ ہی فرماتی ہیں کہ (میرے شوہر) ابو سلمہ کا انتقال ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے میں نے اس وقت اپنے چہرہ پر ایلوہ مل رکھا تھا آپ نے پوچھا ام سلمہ یہ کیا چیز ہے میں نے کہا حضرت یہ ایلوہ ہے اس میں کچھ خوشبو نہیں ہے فرمایا اس سے چہرہ پر رونق آجاتی ہے اس لئے اسے تم بس رات کو لگا لیا کرو اور دن کو اتار دیا کرو کسی خوشبو کو نہ لگانا اور نہ مہندی لگانا کیونکہ یہ خضاب ہے میں نے پوچھا یا رسول اللہ پھر کنگھی میں اور کون سی چیز لگا کے کروں فرمایا کہ بس بیری کے پتوں سے سر دھو لیا کرو۔ یہ حدیث ابو داؤد اور نسائی نے نقل کی ہے ام سلمہ ہی آنحضرت ﷺ سے روایت کرتی ہیں آپ نے فرمایا المتوفی عنہا زوجہا لا تلبس المعصفر من الثیاب ولا لممشقة ولا الحلی ولا تختضب ولا تکتحل (یعنی بیوہ عورت نہ کسمی کپڑے پہنے اور نہ گلابی اور نہ زیور پہنے اور نہ خضاب کرے اور نہ سرمہ لگائے) یہ حدیث ابو داؤد اور نسائی نے نقل کی ہے زینب بنت کعب سے روایت ہے کہ مالک بن سنان کی بیٹی فریعہ جو ابو سعید خدری کی بہن تھی یہ بیان کرتی تھی کہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس امر کی اجازت لینے کے لئے گئی کہ میں اپنے میکے بنی حذرہ میں چلی جاؤں کیونکہ میرا شوہر اپنے غلاموں کو ڈھونڈنے گیا تھا ان غلاموں نے اسے وہیں مار ڈالا میں (حضرت کی خدمت میں پہنچی اور میں) نے پوچھا یا رسول اللہ میں اپنے میکے چلی جاؤں کیونکہ میرے شوہر نے تو میرے لئے اپنا کوئی مکان بھی نہیں چھوڑا اور نہ کچھ کھانے پینے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا ہاں (چلی جاؤ) اور جب میں آنے لگی تو حجرہ یا مسجد تک آئی تھی مجھے پھر بلایا اور فرمایا جب تک عدت پوری نہ ہو جائے تم اپنے گھر ہی میں رہو۔ کہتی ہیں پھر چار مہینے اور دس دن تک میں عدت میں رہی۔ یہ روایت امام مالک نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی نے نقل کی ہے اور حاکم نے دو طریقوں سے نقل کی ہے اور صراحت کی ہے کہ دونوں طریقوں سے اس کی سند صحیح ہے اور ترمذی نے اس حدیث صحیح کہا ہے اور ابن عبد البر کہتے ہیں کہ یہ حدیث مشہور ہے اور علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو دار قطنی نے نقل کی ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک بیوہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ جہاں چاہے عدت گزار لے۔ بعض نے اس حدیث کی بابت کہا ہے کہ سوائے ابو مالک انجعی کے اور کسی نے اسے مرفوع نہیں بیان کیا اور ابو مالک ضعیف ہے ابن قطان نے کہا ہے کہ (اس کی سند میں) محبوب بن محرر (راوی) بھی ضعیف ہے۔ اور عطا ابن سائب مختلط ہے اور ابو بکر بن مالک ان سب سے زیادہ ضعیف ہے اسی واسطے دار قطنی نے بھی اسے معلل کہا ہے۔ امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ اگر میت (یعنی عورت کے مرے ہوئے شوہر کے مکان میں سے اس عورت کا اتنا ہی حصہ ہے کہ وہ اسے کافی نہیں ہوتا اور باقی ورثہ اپنے حصہ میں سے اسے نکالتے ہیں تو یہ عورت وہاں سے چلی آئے کیونکہ یہ آنا ایک عذر کی وجہ سے ہے اور عبادات میں عذر کا اثر ہوتا ہے۔ پس یہ ایسی صورت ہو گئی کہ جیسے کسی عورت کو مکان کے گرنے کا ڈر ہو یا وہ کرایہ پر رہتی تھی اور کرایہ دینے کو کچھ نہیں ہے۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (پھر جب وہ اپنی مدت پوری کر چکیں (یعنی ان کی عدت ختم ہو جائے) تو (اے ائمہ اور مسلمانو) تم پر اس کا کچھ گناہ نہیں جو وہ اپنے نفسوں میں دستور کے مطابق کریں (یعنی زینت کرنا اور نکاح کرنا اور باہر جانا وغیرہ) معروف سے یہ مراد ہے کہ ایسے طریقہ پر کریں جو شریعت کے خلاف نہ ہو اور اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر وہ کچھ خلاف شریعت کریں تو مسلمانوں پر انہیں روکنا لازم ہے کیونکہ خلاف شریعت سے روک

marfat.com

دینا واجب ہے اگر اس میں وہ کوتاہی کریں گے تو انہیں گناہ ہو گا۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (اور اللہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے) پس وہ تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں جزا دے گا۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ (اور (اے نکاح کے پیغام دینے والو) تم پر کچھ گناہ نہیں اس میں کہ تم اشارۂ (ان) عورتوں کو نکاح کا پیغام دو) خطبہ کے معنی نکاح کا پیغام دینے کے ہیں۔ اور تعریض اس کلام کو کہتے ہیں جس سے سننے والا متکلم کی مراد کو سمجھ لے بغیر اس کے کہ حقیقتاً یا مجازاً وہ لفظ اس کی مراد کے لئے موضوع ہو اور کنایہ اس کو کہتے ہیں کہ شئے کے لوازم کو ذکر کر کے اصل شئے کو بتایا جائے۔ چنانچہ طویل النجاد (لمبے پرتلے والا) لمبے قد والے کو اور کثیر الرماد (بہت راکھ والا) بہت مہماندار کو بولتے ہیں اور تعریض ہی کی قسم سے یہ ایک روایت ہے کہ سکینہ بنت حنظلہ بیوہ ہو گئی تھیں تو ان کی عدت کے اندر ابو جعفر محمد بن علی الباقر ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے بنت حنظلہ میں وہ ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سے میری قرابت داری کو تم خوب جانتی ہو اور میرے دادا علی کے حق سے اور ان کے قدیمی مسلمان ہونے سے بھی تم خوب واقف ہو۔ اس پر سکینہ بولیں کہ کیا میری عدت ہی میں تم مجھ سے نکاح کرنے کا پیغام دیتے ہو حالانکہ اس کا تم سے بھی مواخذہ ہو گا، کہنے لگے کہ میں نے تو اپنی آنحضرت سے قرابت داری ہونی تمہارے سامنے ظاہر کر دی ہے اور رسول اللہ بھی ام سلمہ کے پاس (اپنے نکاح کا پیغام دینے) ان کے شوہر ابو سلمہ کی عدت ہی میں تشریف لے گئے تھے اور اللہ عزوجل کے ہاں اپنا عالی مرتبہ ہونا ان سے بیان کیا تھا اور اس وقت آپ اپنے ہاتھ میں (ایک بہت بڑا) بوریا لئے ہوئے تھے اس کے بوجھ کی وجہ سے اس کے نشان آپ کے ہاتھ پر پڑ گئے تھے۔

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ (یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو) یعنی تم اسے ذکر نہ کرو نہ صریحاً اور نہ تعریضاً۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ (اللہ کو معلوم ہے کہ تم عنقریب ان کو یاد کرو گے) اور ان سے چپکے بیٹھ رہنے پر صبر نہ کر سکو گے، اس لئے اشارہ سے ذکر کرنا اس نے تمہارے لئے مباح کر دیا اور دل میں رکھنے پر کچھ مواخذہ نہیں کیا اس آیت میں (ایسی حالت میں) نکاح کا پیغام دینے پر ایک طرح کی توبیخ ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا (اور لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کرو) یہ محذوف (آیت) سے استثناء ہے جس پر ستذکرونہن دلالت کرتا ہے۔ یعنی تم انہیں دلوں میں ذکر کرو اور اشارۂ نکاح کا پیغام دو لیکن ان سے صراحتاً نکاح کا یا جماع کا وعدہ نہ کرو۔ سر کے لفظ سے جماع مراد ہوتا ہے اور کبھی نکاح بھی مراد لے لیا جاتا ہے کیونکہ یہ جماع کا سبب ہوتا ہے۔

اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (مگر یہ کہ کوئی ایسی بات کہہ دو جس کا رواج ہو) اور وہ یہ کہ اشارۂ کہو اور صراحتاً نہ کہو۔ مستثنیٰ منہ محذوف ہے تقدیر آیت یہ ہے لاتواعدوہن مواعدۃ الامواعدۃ معروفتاً یا مواعدۃ بقول معروف جاننا چاہئے کہ جو عورتیں (اپنے شوہروں سے) رضاعت وغیرہ (کا تعلق ہونے کی وجہ) سے علیحدہ ہو کر عدت میں ہوں یا جو لعان کی وجہ سے بائنہ ہو گئی ہوں یا جن کو تین طلاقیں مل گئی ہوں کہ ان سے ان کے پہلے شوہر کو نکاح کرنا جائز نہیں ہے، پس ان سے بھی اجنبی آدمی کو اشارۂ نکاح کا پیغام دینا جائز ہے اور اگر کوئی بائنہ ہو تو پھر دیکھنا چاہئے کہ اگر اس کے پہلے شوہر کو اس سے نکاح کرنا جائز ہے تو اس کے شوہر کو اس سے اشارۂ اور صراحتاً نکاح کا پیغام دینا جائز ہے لیکن غیر آدمی کو بھی اشارۂ جائز ہے یا نہیں۔ سو بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے جیسے کہ تین طلاقوں والی کو کیونکہ اس کے پہلے شوہر کا حق اس سے منقطع ہو چکا ہے اور بعض کہتے ہیں جائز نہیں ہے کیونکہ نکاح کا اثر باقی ہے پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (اور تم عقد نکاح کا قصد نہ کرو) یہ عدت میں عقد نکاح سے منع کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قصد عقد کے لئے لازم ہے اور اس نہی میں اس طرح کہنے سے زیادہ مبالغہ ہے کہ لا تعقدوا النکاح (یعنی عقد نکاح نہ کرو) اور قصد کے حرام ہونے پر اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ دلی سے قصد کرنے پر بالاجماع مواخذہ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ الآیہ سے اس کا مباح ہونا پہلے بیان ہو چکا ہے اور یہ ایسا ہے کہ کوئی کہے کہ زید

marfat.com

طویل النجاد اور کثیر الرماد ہے (عرب میں ان دونوں لفظوں سے بہادر اور سخی کو بیان کیا کرتے ہیں) پس اگر زید لمبے قد کا اور مہمان نواز ہو تو اس کہنے والے کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے اگرچہ نجاد اور رماد اس کے ہاں بالکل نہ ہو (اور یہ مجازی معنی ہوتے ہیں) اور ممکن ہے کہ اسے حقیقی ہی معنی پر حمل کرلیں اور یہ عدت میں عقد نکاح کے قصد کرنے سے نہی ہوگی اس صورت میں یہ نہی تنزیہی ہے اس وجہ سے کہ جو شخص قصد کرلے تو عجب نہیں کہ وہ نکاح ہی کر بیٹھے کیونکہ جو چراگاہ کے قریب قریب گھومتا ہے وہ اس میں گھس بھی جاتا ہے۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ (جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے) عدت کا نام اس کے فرض ہونے کی وجہ سے کتاب رکھ دیا ہے (کیونکہ کتب کے معنی فرض کے ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کتب علیکم یعنی تم پر فرض کردیا گیا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ (اور جان لو کہ اللہ اس کو جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے) یعنی قصد، یہ آیت قصد کرنے کے مکروہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ (تو اس سے ڈرو (اور ایسا قصد نہ کرو) اور یہ (بھی) جان لو کہ اللہ بخشنے ع ۳۰ ۱۴
والا بردبار ہے) یعنی اس شخص کو بخش دینے والا ہے جو قصد کرکے اللہ کے خوف کی وجہ سے اس کو نہ کرے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ښ (جب تک تم نے عورتوں کو ہاتھ نہ لگایا ہو اور نہ ان کے لئے مہر معین کیا ہو تو (ایسی حالت میں) اگر تم عورتوں کو طلاق دیدو تو اس کا تم پر کچھ گناہ نہیں) چونکہ مباح چیزوں میں طلاق سب سے بری چیز ہے اس لئے اللہ نے اسے ان لفظوں سے ذکر کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ اگر تم نے انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدی ہے تو تم پر مہر واجب نہیں ہے، ہاں اگر تم نے مقرر کرلیا ہو تو اس صورت میں نصف مہر واجب ہوگا جیسا کہ اس کا حکم عنقریب آتا ہے اور اگر ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی ہے تو مہر مقرر پورا واجب ہوگا کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے فاتوھن اجورھن بالمعروف اور اگر کچھ مقرر نہیں کیا تو پھر بالاجماع مہر مثل واجب ہوگا۔ حمزہ، کسائی نے یہاں اور احزاب میں لاتماسوھن باب مفاعلۃ سے پڑھا ہے۔ معنی دونوں کے ایک ہیں یعنی لم تجامعوھن (ان سے جماع نہ کیا ہو) اور تفرضوا میں او بمعنی الاان یا بمعنی حتی کے ہے یعنی مگر یہ کہ معین کردو ان کے لئے یا یہاں تک کہ مقرر کردو ان کے لئے یا اس کا عطف مدخول لم پر ہے (جس کا ترجمہ آیت کے ترجمہ میں لکھ دیا ہے) فریضۃ فعیلہ بمعنی مفعول ہے۔ اس میں (ت) اس لئے لائی گئی ہے کہ لفظ وصفیت سے اسمیت کی طرف منقول ہو جائے اور اس کا منصوب ہونا مفعول ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔

وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ (اور انہیں متعہ دے دو) یہ مقدر پر عطف ہے (گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا) فطلقوھن ومتعوھن (یعنی طلاق دیدو اور انہیں فائدہ پہنچاؤ) کہ اپنے مال میں سے انہیں اتنا دیدو کہ جس سے وہ کچھ فائدہ اٹھائیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد کے نزدیک جبکہ ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی ہو اور کچھ مہر مقرر نہ کیا ہو تو کچھ دے دینا واجب ہے۔ امام مالک کا قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے بلکہ یہ مستحب ہے اور یہ امر استحبابی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد حقا علی المحسنین میں حقا اور علی کا لفظ استحباب کے منافی ہے اور امر میں اصل وجوب ہی ہے اس میں (فقہاء کا) اختلاف ہے کہ (متعہ) کس قدر دینا واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ تین کپڑے دینے چاہئیں۔ ایک کرتہ ایک اوڑھنی ایک چادر اس قسم کے کپڑوں میں سے جو اس جیسی عورتیں پہنتی ہوں۔ امام عورت کے حال کا اعتبار کرتے ہیں اس وجہ سے کہ متعہ مہر مثل کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا یہ نصف مہر مثل سے نہ بڑھے اور نہ پانچ درہم سے کم ہو اور یہی قول کرخی کا ہے اور صحیح یہ ہے کہ مرد کا حال معتبر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ (وسعت والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق) ابن ہمام فرماتے ہیں اور یہی تقدیر (یعنی حیثیت شوہر کے مطابق دینا) حضرت عائشہ صدیقہ، ابن عباس،

marfat.com

سعید بن مسیب، عطا، شعبی سے مروی ہے۔ بغوی کہتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اعلیٰ درجہ کا متعہ یہ ہے کہ ایک خادم (بھی) ہو اور اوسط درجہ یہ ہے کہ تین کپڑے ہی ہوں ایک کرتہ ایک اوڑھنی ایک پاجامہ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک رقایہ (یعنی کوئی کپڑا جس سے بدن ڈھک جائے) یا کچھ چاندی ہو۔ امام شافعی کے دو قولوں میں صحیح قول اور ایک روایت میں امام احمد کا (بھی) قول ہے کہ یہ حاکم کے اجتہاد پر ہے (وہ جس قدر مناسب سمجھے دلادے) اور امام شافعی سے یہ بھی مروی ہے کہ اتنا دینا چاہئے کہ جسے مال کہہ سکیں تھوڑا ہو یا بہت ہو ان کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ تیس درہم سے کم نہ ہو اور ایک روایت امام احمد سے یہ ہے کہ متعہ کی مقدار یہ ہے کہ اتنا کپڑا دیدے جس سے نماز جائز ہو جائے اور وہ دو کپڑے ہیں ایک کرتہ ایک اوڑھنی۔ بغوی کہتے ہیں عبد الرحمٰن بن عوف نے ایک عورت کو طلاق دیدی تھی اور متعہ میں اسے ایک حبشی لونڈی دی تھی اور حسن بن علی نے ایک عورت کو متعہ میں دس ہزار درہم دیئے تھے۔

مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ (فائدہ پہنچانا اچھی طرح سے) یعنی ایسی طرح سے جو شرع میں مستحسن ہو نہ کہ حاکم کی زبردستی سے۔ متاعا مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے علیٰ ہذا حقا۔

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳۶﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (نیکی کرنے والوں پر لازم ہے اور اگر ہاتھ لگانے (جماع کرنے) سے پہلے تم طلاق دیدو اور ان کے لئے مہر معین کر چکے ہو تو جو کچھ تم نے معین کیا ہے اس کا آدھا (دینا) لازم ہے یعنی جو کچھ تم ان کے لئے مقرر کر چکے ہو اس کا آدھا دینا واجب ہے۔ اس صورت میں جمہور کے نزدیک آدھے مہر سے زیادہ متعہ دینا واجب نہیں ہے، مگر حسن اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ہر مطلقہ کے لئے متعہ واجب ہے، خواہ مہر مقرر کرنے اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدی ہو یا مقرر کرنے کے بعد اور ہاتھ لگانے سے پہلے دیدی ہو۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وللمطلقات متاع (یعنی مطلقہ عورتوں کیلئے متعہ ہے) اور سورۂ احزاب میں فرمایا، يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (یعنی اے ایمان والو جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر تم انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدو تو تمہارے لئے ان کے ذمہ عدت نہیں جسے تم گنواؤ۔ پس تم انہیں کچھ متعہ دو اور اچھی طرح سے رخصت کر دو) اور ان عورتوں میں مفوضات اور غیر مفوضات سب داخل ہیں اور جمہور کی دلیل یہ ہو سکتی ہے کہ اس صورت میں یہ متعہ ہی آدھا مہر ہے کیونکہ مہر بضع (یعنی عورت کی فرج) کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور بضع اس کی طرف سالم لوٹ گیا ہے (یعنی اس عورت سے صحبت وغیرہ نہیں ہوئی ہے) لہٰذا یہ آدھا مہر بطور متعہ ہی کے واجب ہوتا ہے۔

إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ (مگر یہ کہ وہ (یعنی مطلقہ عورتیں) معاف کر دیں) یعنی آدھا مہر چھوڑ دیں پھر سارا مہر شوہر کا ہو جائے گا۔

أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (یا وہ شخص معاف کر دے جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے) یعنی شوہر جو نکاح کے باندھنے اور کھولنے کا مالک ہے اس کا معاف کرنا یہ ہے کہ جو تقسیم ہونے کی وجہ سے اسے ملتا تھا اسے چھوڑ دے پھر پورا مہر عورت کی طرف آجائے گا اور الذی بیدہ عقدۃ النکاح کی تفسیر شوہر سے کرنا (یعنی اس سے شوہر مراد لینا) طبرانی نے اوسط میں عمرو بن شعیب سے مرفوعاً نقل کی ہے اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اور یہی قول سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، شعبی، شریح، مجاہد، قتادہ کا ہے اور یہی مذہب امام ابو حنیفہ کا ہے۔ اور امام شافعی کا بھی جدید اور راجح مذہب یہی ہے اور اس کو معاف کرنا اس لئے کہا کہ شوہر نکاح کرتے وقت عورتوں کو مہر دیتے تھے پھر جس نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدی تو وہ آدھا مہر واپس لینے کا مستحق ہو گیا اور جب اس نے وہ واپس نہ لیا تو (گویا) اس نے اپنی طرف سے معاف کر دیا۔ یا یعفون (مذکور) کی مناسبت سے اس کو بھی معاف کرنے سے تعبیر

marfat.com

فرمایا۔ جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے نکاح کیا اور پھر صحبت کرنے سے پہلے ہی اسے طلاق دیدی اور اسے پورا مہر دیا اور یہ فرمایا کہ معاف کرنے کا میں زیادہ حقدار ہوں۔ اس کو بیہقی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ الذی بیدہ عقدة النکاح سے (عورت کا) ولی مراد ہے۔ یہ قول بیہقی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے اور یہی مذہب امام مالک کا اور پہلا قول امام شافعی کا ہے اور امام احمد سے دو روایتیں ہیں پس ان کے نزدیک آیت کے یہ معنی ہیں مگر یہ کہ عورت آدھا مہر شوہر پر چھوڑ کے اسے معاف کر دے اگر وہ معاف کرنے کے قابل ہو یعنی ثیب ہو، اگر عورت بکر ہو تو اس کا ولی معاف کر دے یا وہ ایسی ہو کہ اس کا کہنا قابل اعتبار نہ ہو۔ تو اس صورت میں اس کے ولی کو معاف کر دینا جائز ہے اور یہی قول علقمہ، عطا، حسن، زہری ربیعہ کا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ مہر تو خالص عورت ہی کا حق ہے اس لئے اور کسی کو اس میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے اور اسی وجہ سے ولی کو یہ جائز نہیں کہ صغیر کے مال میں سے کوئی چیز ہبہ کر دے اور نہ بالاجماع طلاق سے پہلے اسے عورت کا مہر ہبہ کر دینا جائز ہے۔ لہٰذا آیت کے وہی معنی ٹھیک ہیں جو ہم نے کہے ہیں۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰىؕ　(اور اگر تم معاف کر دو تو پرہیز گاری کے بہت ہی قریب ہے) یہ خطاب مردوں اور عورتوں کو ہے کیونکہ مذکر مونث پر غالب ہوتا ہے اور ان تعفوا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی عَفْوُ بَعْضِكُمْ عَنْ بَعْضٍ (اور اقرب للتقوٰی اس کی خبر ہے۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْؕ　(اور بعض کے بعض پر افضل ہونے کو مت بھولو) کیونکہ دینے والا اس سے افضل ہوتا ہے جس کو دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷　(بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے

ربط۔ جب میاں بیوی اور اولاد کے احکام (بیان کرنے) میں کلام بہت طویل ہو گیا تو اب اللہ پاک نے اس پر متنبہ کیا کہ انہیں اپنی ہی حالت میں مشغول رہنا اللہ کے ذکر اور اس نماز سے غافل نہ کر دے جو (عمارت) دین کا ستون اور گناہوں کو مٹا دینے والی اور دلوں کے زنگ کو کھرچنے والی ہے اس لئے فرمایا۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ　(اور تمام نمازوں کی محافظت کرو) یعنی ان کے وقتوں میں ادا کرنے اور ان کا التزام رکھنے اور ان کے ارکان اور صفات کو پورا کرنے کے ساتھ۔ اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ نماز قطعی فرض ہے اس کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ لیکن جو جان بوجھ کے ترک کرے اس کی بابت امام احمد کا قول یہ ہے کہ وہ بھی کافر ہوتا ہے اور امام مالک اور امام شافعی کا قول یہ ہے اور یہی ایک روایت امام احمد سے بھی ہے کہ وہ کافر نہیں ہوتا لیکن اس سے توبہ کرائی جائے اگر توبہ کر لے تو خیر، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے اور امام ابو حنیفہ کا قول یہ ہے کہ قتل نہ کیا جائے ہاں اسے ہمیشہ قید میں رکھا جائے یہاں تک کہ یا تو توبہ کر لے یا مر جائے۔ امام احمد کی روایت کی دلیل جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی یہ حدیثیں ہیں جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بین العبد و بین الکفر ترک الصّلوٰة (یعنی بندہ اور کفر میں ترک نماز کا فرق ہے) یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے بریدہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا العھد الذی بیننا و بینھم ترک الصلوٰة فمن ترکھا فقد کفر یہ حدیث امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے روایت کی۔ عبداللہ بن عمرو آنحضرت سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز آپ نے نماز کا ذکر فرمایا کہ جو شخص اس کی محافظت کرے گا تو یہ اس کے لئے قیامت کے دن نور اور برہان اور نجات (کا باعث) ہو گی اور قیامت کے دن وہ قارون، فرعون، ہامان، ابی ابن خلف (منافق) کے ساتھ ہوگا۔ یہ روایت امام احمد نے نقل کی ہے جمہور ان حدیثوں کی تاویل کرتے ہیں اس بنا پر کہ اقامت نماز کا عطف ایمان پر ہے۔ ماحصل ان سب حدیثوں کا یہ ہے کہ نماز کا حکم تمام احکام اور تمام عبادات سے زیادہ سخت ہے پس جس نے اسے ترک کر دیا گویا وہ کافر ہو گیا یا یہ معنی ہیں کہ جس نے اسے حقیر اور ناچیز سمجھ کر ترک کر دیا تو بیشک کافر ہو گیا واللہ اعلم۔

نماز کے فضائل میں بہت سی حدیثیں ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

marfat.com

ارأیتم لوان نھراباب احد کم یغتسل فیه کل یوم خمسا ھل یبقٰی من دونه شئی قال لایبقٰی من شئی قال فذلک مثل الصلوات الخمس یمحواللّٰه بھن الخطایا (یعنی تم یہ بتاؤ اگر تم میں کسی کے دروازے کے آگے نہر بہتی ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ دفعہ نہائے تو کیا اس (کے بدن) پر کچھ میل رہے گا۔ عرض کیا نہیں میل بالکل نہیں رہے گا۔ فرمایا بس یہی مثال ان پانچوں نمازوں کی ہے ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمام خطاؤں کو نیست و نابود کر دیتا ہے) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ عبادہ بن صامت کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خمس صلوٰة افترضھن اللّٰه تعالیٰ من احسن وضوئھن وصلاھن لوقتھن واتم رکوعھن وخشوعھن کان له علی اللّٰه عھدا ان یغفرله ومن لم یفعل فلیس علی اللّٰه عھد ان شاء غفرله وان شاء عذبه (یعنی پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے فرض کر دی ہیں پس جس نے ان کے وضو کو اچھی طرح کیا اور انہیں ان کے وقت پر پڑھا اور ان کے رکوع اور سجود کو پورا ادا کیا تو ایسے آدمی کو بخش دینے کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لے لیا ہے اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ نہیں لیا وہ چاہے اسے بخش دے اور چاہے عذاب دے) یہ حدیث امام احمد اور ابوداؤد نے نقل کی ہے اور امام مالک اور نسائی نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے اس پر کہ تارک نماز کافر نہیں ہوتا، واللہ اعلم

وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ (اور بیچ کی نماز کی) مزید اہتمام کے لئے یہ خاص کا عطف عام پر ہے، اور وسطیٰ، اوسط کی تانیث ہے۔ بغوی کہتے ہیں اول صحابہ کا اور ان کے بعد علماء کا صلوٰة وسطیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں وہ صبح کی نماز ہے اور یہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا قول ہے اور یہی عطا اور عکرمہ اور مجاہد نے کہا ہے اور یہی مذہب امام مالک اور امام شافعی کا ہے اور بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ صلوٰة وسطیٰ ظہر کی نماز ہے اور یہ قول زید بن ثابت ابو سعید خدری اور اسامہ کا ہے کیونکہ ظہر کی نمازوں کے وسط میں ہوتی ہے اور وہ دن کی نمازوں کے درمیان میں ہے اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے جو بخاری نے اپنی تاریخ میں اور امام احمد، ابوداؤد، بیہقی اور ابن جریر نے زید بن ثابت سے روایت کی ہے (وہ کہتے ہیں) کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز عین دھوپ کے وقت پڑھا کرتے تھے اور اس وقت اس کا پڑھنا صحابہ پر بہت گراں گزرتا تھا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ حافظوا علی الصلوٰات والصلوٰة الوسطیٰ امام احمد نے دوسرے طریقہ سے زید بن ثابت (ہی) سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز عین دھوپ کے وقت پڑھایا کرتے تھے اور آپ کے پیچھے سوائے ایک یا دو صفوں کے اور نہ ہوتی تھی (باقی) لوگ دوپہر کو سوتے اور تجارت (وغیرہ) میں رہتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی حافظو اعلی الصلوٰت، الأیہ۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یا تو یہ لوگ باز آجائیں ورنہ میں ان کے گھروں کو پھونک دوں گا۔

ہم کہتے ہیں یہ دونوں حدیثیں (اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ صلوٰة وسطیٰ ظہر کی نماز ہے کیونکہ حافظوا علی الصلوٰت ظہر کی نماز کو بھی شامل ہے۔ اور اکثر کا قول یہ ہے اور یہی سب اقوال سے راجح بھی ہے کہ صلوٰة وسطیٰ عصر کی نماز ہے رسول اللہ ﷺ سے ایک جماعت نے نقل کیا ہے اور یہی قول علی، ابن مسعود، ابوایوب، ابوہریرہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی ابراہیم نخعی، قتادہ، حسن نے کہا ہے اور یہی امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا مذہب ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جنگ احزاب کے دن نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے گھروں کو اور ان کی قبروں کو آگ سے بھرے جیسا کہ انہوں نے ہمیں صلوٰة وسطیٰ (کے پڑھنے) سے روک دیا یہاں تک کہ آفتاب (بھی) غروب ہو گیا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور مسلم کی روایت میں اس طرح ہے کہ انہوں نے ہمیں صلوٰة وسطیٰ یعنی عصر کی نماز سے روک دیا خدا ان کے دلوں کو اور ان کے گھروں کو آگ سے بھرے۔ ایک اور حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے کہ (ایک مرتبہ) مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو عصر کی نماز نہیں پڑھنے دی تھی یہاں تک کہ دھوپ میں زردی آگئی یا کہا کہ سرخی آگئی اس وقت حضرت نے فرمایا کہ انہوں نے ہمیں صلوٰة وسطیٰ (کے پڑھنے) سے روک دیا خدا ان کے پیٹوں میں اور ان کی قبروں

marfat.com

میں آگ بھرے۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے ابو یونس (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ) کہتے ہیں کہ مجھے حضرت صدیقہ نے یہ حکم دیا کہ میرے لئے ایک قرآن مجید لکھ دو پھر فرمایا کہ جب تم اس آیت پر پہنچو تو مجھے اطلاع کر دینا چنانچہ جب میں اس آیت پر پہنچا تو میں نے اطلاع کر دی ام المؤمنین نے فرمایا کہ حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ اسی طرح سنا ہے۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے۔ براء بن عازب کہتے ہیں کہ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی تھی۔ حافظو اعلی الصلوٰت وصلوٰۃ العصر اور جب تک اللہ عزوجل کو منظور ہوا ہم اسے اسی طرح پڑھتے رہے پھر اللہ نے اسے منسوخ کر دیا اور اس طرح نازل ہوئی حافظو اعلی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے امام مالک وغیرہ نے عمرو بن رافع سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی بیوی حفصہ کے لئے قرآن شریف لکھتا تھا تو انہوں نے مجھ سے لکھوایا حافظو اعلی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر ابوداؤد نے عبد بن رافع سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں ام سلمہ کے لئے قرآن شریف لکھتا تھا فرمایا کہ (یہ آیت اس طرح) لکھو حافظو اعلی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر اور ابوداؤد ہی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ وہ بھی اس آیت کو اسی طرح پڑھتے تھے ابوداؤد نے حضرت حفصہ کے آزاد کردہ ابورافع سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں قرآن شریف لکھتا تھا حضرت حفصہ نے فرمایا کہ (یہ آیت اس طرح) لکھو حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر پھر میں ابی ؓ بن کعب سے ملا اور میں نے ان سے اس کو بیان کیا انہوں نے فرمایا یہ اسی طرح ہے۔ جس طرح وہ کہتی ہیں۔ کیا ہم ظہر کے وقت اپنی بکریاں اور اونٹنیوں میں زیادہ مشغول نہیں ہوتے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ کی حدیثوں کو اصحاب شافعی اپنی حجت ٹھہراتے اور یہ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ پر صلوٰۃ عصر کا عطف کرنا مغایرت کی دلیل ہے (یعنی اس عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ اور ہے اور صلوٰۃ عصر اور ہے) ہم کہتے ہیں نہیں بلکہ یہ عطف تفسیری ہے اور بغوی نے اپنی تفسیر میں عائشہ صدیقہ کی حدیث بغیر واؤ کے اس طرح نقل کی ہے حافظو اعلی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر واللہ اعلم ابو قبیصہ بن ذویب کہتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ مغرب کی نماز ہے کیونکہ یہ اوسط درجہ کی نماز ہے نہ سب نمازوں سے کم یعنی ثنائی ہے اور نہ سب سے زیادہ یعنی رباعی ہے اور خلف میں یہ کسی سے منقول نہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ عشا کی نماز ہے اور بعض متاخرین نے ذکر کیا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان ہے جن میں قصر نہیں ہوتا بعض کا قول ہے کہ پانچوں نمازوں میں سے بلا تعین ایک نماز صلوٰۃ وسطیٰ ہے اس کو اللہ نے اس لئے مبہم کر دیا ہے تاکہ تمام نمازوں کے ادا کرنے کی محافظت پر بندوں کو ترغیب ہو جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شب قدر کو اور ساعت جمعہ کو اور اسم اعظم کو پوشیدہ کر دیا ہے اکثر لوگوں کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعمیم کے بعد صلوٰۃ وسطیٰ کی تخصیص کرنا اس لئے ہے کہ یہ اور نمازوں سے کوئی زیادہ نماز ہے اور میرے نزدیک یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس طرح بیان کرنا زیادہ تاکید اور اہتمام کے لئے ہے کیونکہ عصر کی نماز کا وقت لوگوں کے بازاروں میں مشغول رہنے کا وقت ہے اس لئے اس میں تاکید اور اہتمام کی زیادہ رعایت کی گئی ہے تاکہ یہ نماز فوت نہ ہو جائے یا بغیر جماعت کے مکروہ طریقہ پر ادا نہ کی جائے یا مکروہ وقت میں ادا نہ کی جائے پس اس بنا پر پانچوں نمازوں میں سے جس نماز میں کوئی ایسا مانع ہو گا کہ اسے مسنون طریقہ پر ادا کرنے سے روکے تو اسی میں زیادہ اہتمام کرنا اور اس کی حفاظت رکھنی ضروری ہے مثلاً صبح اور عشا کی نماز جاڑوں میں اور ظہر کی نماز گرمیوں میں اور عصر کی نماز بازاریوں کے لئے اگر ان کے بازار کرنے کا رواج اسی وقت ہو اور مغرب کی نماز اہل مواشی کے لئے واللہ اعلم۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ (اور اللہ کے آگے مؤدب کھڑے رہا کرو (قنوت سے مراد لوگوں سے باتیں نہ کرنا ہے کیونکہ زید بن ارقم کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز میں باتیں کیا کرتے تھے ہم میں سے بعض آدمی اپنے پاس والے سے بات چیت کر لیتا تھا یہاں تک کہ آیت وقوموا للہ قانتین نازل ہو گئی تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم ہو گیا اور باتیں کرنے

marfat.com

سے ہمیں منع کر دیا گیا، یہ روایت پانچوں اماموں وغیرہ سے نقل کی گئی ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ لوگ نماز میں باتیں کیا کرتے تھے بعض آدمی اپنے بھائی کو کسی ضروری کام کے لئے کہہ دیتا تھا پھر اللہ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ وقوموا اللہ قانتین۔ اور مجاہد کہتے ہیں کہ قنوت سے مراد خشوع ہے اور فرمایا کہ رکوع طویل کرنا اور نگاہ نیچی رکھنی اور مونڈھوں کو جھکانا قنوت میں داخل ہے۔ علماء کی یہ حالت تھی کہ ان میں سے جس وقت کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا تھا تو پھر ادھر ادھر دیکھنے یا کنکریوں کو ہٹانے یا کسی چیز سے کھیلنے یا کوئی دنیاوی خیال دل میں لانے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ قنوت سے مراد طول قیام ہے کیونکہ ترمذی نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کسی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ افضل نماز کون سی ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ طول قنوت اور یہ قول ضعیف ہے کیونکہ امر میں اصل وجوب ہے اور طول قیام واجب نہیں ہے۔ اصحاب شافعی کا قول یہ ہے کہ قنوت سے دعا قنوت مراد ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ چند قبیلوں یعنی سلیم، رعل، ذکوان، عصیہ پر رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینہ لگاتار بددعا کی تھی۔ یہ قول بھی ضعیف ہے کیونکہ آیت کا سیاق سب نمازوں میں قنوت کے عام ہونے پر دلالت کرتا ہے نہ کسی مہینہ کی کچھ خصوصیت ہے اور نہ کسی نماز کی کہیں خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ صبح کی قنوت بدعت ہے۔ ابو مالک اشجعی کہتے ہیں میں نے اپنے والد سے کہا کہ ابا تم نے نبی ﷺ کے پیچھے بھی نماز پڑھی ہے اور ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے پیچھے اور یہاں کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی پانچ برس کے قریب نماز پڑھی ہے کیا یہ صاحبین (دعا) قنوت پڑھتے تھے فرمایا بیٹا یہ تو بدعت ہے یہ روایت امام احمد نے نقل کی ہے اور ایک روایت میں اس طرح ہے (ان کے والد نے کہا) کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے بھی پیچھے نماز پڑھی ہے آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بھی پیچھے نماز پڑھی ہے انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بھی پیچھے نماز پڑھی ہے انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی نماز پڑھی ہے انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی پھر فرمایا، بیٹا یہ بدعت ہے ابو مالک (اشجعی) کا نام سعد بن طارق بن اسلم ہے۔ بخاری نے کہا ہے کہ طارق بن اسلم صحابی ہیں اور اس حدیث کی سند صحیح ہے اور صبح (کی نماز) میں (دعا) قنوت نہ پڑھنے کی نو حدیثیں ہیں اور اس نماز میں قنوت پڑھنے کی بابت لوگوں نے جو حدیثیں نقل کی ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا مجہول ہیں قنوت نازلہ (جو حادثات پیش آنے کے وقت پڑھی جاتی ہے) کے بارے میں بہت طول طویل بحث ہے جو یہاں بیان نہیں ہو سکتی۔ شعبی، عطا، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ، طاؤس کا قول یہ ہے کہ قنوت کے معنی طاعت کے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا امہ قانتا یعنی مطیعاً کلبی اور مقاتل کہتے ہیں کہ ہر دین والوں کے لئے ایک نماز ہوتی ہے وہ اس میں عاصی ہو کر کھڑے ہوتے ہیں پس تم اپنی نماز میں قانت یعنی مطیع بن کر کھڑے ہو اور بعض کا قول یہ ہے کہ قانتین کے معنی مصلین کے ہیں جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا امن ھو قانت اناء اللیل یعنی مصل اور بعض کا قول یہ ہے کہ قنوت کے معنی ذکر کے ہیں، قانتین سے مراد یہ ہے کہ تم لوگ قیام میں اللہ کو یاد کرتے اور اس کا ذکر کرتے رہو اور سب سے زیادہ ظاہر وہ پہلے ہی معنی ہیں کیونکہ زید بن ارقم کی حدیث ان ہی معنی کے مراد ہونے میں بہت ہی صریح اور صحیح ہے بخلاف اور حدیثوں کے کیونکہ یہ سب احتمالات ہیں جو مسموع (بات) کے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا (پھر اگر تمہیں (دشمن وغیرہ کا) خوف ہو تو پیادہ یا سوار) امام شافعی اور امام احمد نے گھوڑ دوڑ کی حالت میں نماز (پڑھنے) کے جائز ہونے پر اس آیت سے استدلال کیا ہے اور ابن جوزی نے بخاری کی حدیث سے حجت کی جو نافع نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ جب ان سے کسی نے صلوٰۃ خوف (یعنی ڈر کی حالت میں نماز پڑھنے) کو پوچھا تو آپ نے اول اس کی تفصیل بیان کی پھر فرمایا کہ اگر خوف اس سے بھی زیادہ ہو تو پھر جس طرح بن پڑے۔ پڑھ لو خواہ پیادہ ہو یا چلتے ہو یا اپنے پیروں پر کھڑے ہو یا سوار ہو قبلہ رخ (بھی) منہ رہے یا نہ رہے۔ نافع کہتے ہیں میرا یہ خیال ہے کہ یہ ابن عمرؓ نے رسول

marfat.com

اللہ ﷺ سے ضرور سنا ہوگا (وہ اپنی طرف سے ایسا نہیں کہہ سکتے) امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ چلنے اور گھوڑ دوڑ کرنے کی حالت میں نماز (پڑھنا) جائز نہیں ہے اور گھوڑ دوڑ کی حالت میں نماز جائز ہونے کی اس آیت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ (آیت میں رجال کی جمع ہے اور راجل کے معنی چلنے والے کے نہیں ہیں بلکہ راجل اپنے دونوں پیروں پر کھڑے ہونے والے کو کہتے ہیں اور اسی طرح حدیث میں بھی رجالا اور قیاما میں عطف تفسیری ہے۔ اس لئے وہ حدیث بھی چلنے کی حالت میں نماز کے جائز ہونے پر دلالت نہیں کرتی اس کے علاوہ اس کا مرفوع ہونا فقط نافع کا خیال اور گمان ہے اور وہ صریح مرفوع نہیں ہے۔ اگر کوئی کہے کہ صلوٰۃ خوف میں چلنا پھرنا بالاجماع جائز ہے جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ نساء میں ہم عنقریب ذکر کریں گے تو پھر چلنے کی حالت میں نماز ضرور درست ہونا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب شرع سے کوئی ایسا حکم ثابت ہو جائے جس میں رائے (اور قیاس) نہ چل سکے اور اسے (ہم اپنی طرف سے) بڑھا نہیں سکتے اس کے علاوہ نماز کے درمیان چل لینا جیسا کہ نماز میں کسی کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ وضو کرنے کے لئے چلتا ہے یہ چلنے کی حالت میں نماز پڑھنے سے بہت کم درجہ ہے لہٰذا اعلیٰ کو ادنیٰ کے ساتھ (قیاس کر کے) نہیں ملا سکتے۔

مسئلہ: اسی آیت کی بنا پر تمام ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ اگر بہت ہی زیادہ خوف ہو اور لوگ قبلہ رخ منہ نہ کر سکیں تو پھر سوار ہوئے ہوئے جس طرف ہو سکے پڑھ لیں۔ رکوع سجدے اشاروں سے کریں لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ اکیلے اکیلے پڑھیں (جماعت سے نہ پڑھیں) اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ وہ جماعت سے پڑھیں۔ ہدایہ میں کہا ہے کہ یہ (یعنی امام محمد کا قول) ٹھیک نہیں کیونکہ سب لوگ ایک جگہ نہیں ہوتے۔ مسئلہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک خوف کی وجہ سے رکعتیں کم نہیں ہوتیں اور مسلم نے مجاہد سے انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے ابن عباس کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کی زبانی حضر میں نماز کی چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف (کی حالت) میں ایک رکعت فرض کی ہے اور یہی قول عطا، طاؤس، حسن، مجاہد، قتادہ کا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ صلوٰۃ خوف کے مسائل عنقریب سورۂ نساء میں ہم ذکر کریں گے۔

فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ (پس جب امن سے ہو جاؤ (اور تمہارا خوف جاتا ہے) تو اللہ کو یاد کرو) یعنی پوری نماز پڑھو مع اس کی تمام شرائط اور ارکان وغیرہ کے۔

كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾ (جیسا تمہیں (اللہ نے اپنی نبی ﷺ کی زبانی) سکھلایا جو تم نہ جانتے تھے) ما علمکم میں ما مصدر یہ ہے یا موصولہ اور مالم تکونوا علم کا مفعول ثانی ہوگا۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ

(اور (اے مردو) جو تم میں سے انتقال کر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو (ان پر واجب ہے کہ) وہ اپنی بیویوں کے لئے سال بھر تک کھانے کے خرچ اور گھر سے نہ نکالنے کی وصیت کر جائیں) ابو عمرو ابن عامر، حمزہ اور حفص نے وصیۃ کو منصوب پڑھا ہے اس صورت میں فلیوصوا کا مفعول ہوگا اور باقی قراء نے مرفوع پڑھا، تقدیر عبارت یہ ہوگی، کتب علیکم وصیۃ۔ رفع والی قرأت کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک قرأت کتب علیکم الوصیۃ لازواجکم ہے یا یہاں حکمھم (مبتدا محذوف ہو) متاعا یا تو مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے اے متعوھن متاعا یا فعل محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے یعنی لیوصوا متاعاً یا وصیۃ کا مفعول ہونے کی وجہ سے یعنی لیوصوا وصیۃ متاعا منصوب ہے اور متاعا سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عورتیں نفع اٹھائیں یعنی نان نفقہ اور کپڑا غیر اخراج یا تو بدل ہے یا مصدر مؤکد ہے جیسے تم کہو۔ ھذا القول غیر ما تقول یا ازواجھم سے حال ہے یعنی غیر مخرجات یا منصوب بنزع الخافض ہے یعنی من غیر اخراج۔ مقصود یہ ہے کہ مرنے والوں پر اپنی بیویوں کے لئے یہ وصیت کر دینا واجب ہے کہ وہ ان کے مال میں سے ایک سال بھر تک کھانے پہننے کا فائدہ اٹھاتی رہیں پس عورتوں کے لئے مردوں کے ذمہ اس آیت کی وجہ سے یہ وصیت کر دینا واجب ہے جیسا کہ والدین اور اقربین

marfat.com

کے لئے وصیت کر دینا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے واجب ہوئی تھی کتب علیکم اذاحضر احدکم الموت ان ترک خیران الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف پھر یہ حکم منسوخ وہ گیا جیساکہ وہ بھی منسوخ ہو گیا اور اس کا ناسخ بھی وہی ہے جو اس کا ناسخ ہے یعنی میراث کی آیت اور آنحضرت ﷺ کا یہ فرمادینا کہ لا وصیۃ لوارث (وارث کے لئے وصیت (کرنے کی کوئی ضرورت) نہیں) ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ عورت کے چوتھائی حصہ اور آٹھویں حصہ کے وارث ہونے کی وجہ سے اس کا نفقہ ساقط ہو گیا اور جو بحث اور تحقیق ہم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کتب علیکم اذاحضر احدکم الموت الآیۃ کی تفسیر میں ذکر کی ہے وہ یہاں بھی جاری ہے اب اسے ہم دوبارہ بیان نہیں کرتے۔

(زمانۂ) جاہلیت میں اور اسی طرح ابتداء اسلام میں عورتیں اپنے اپنے شوہروں کے مرجانے کے بعد سال بھر تک سوگ کیا کرتی تھیں جیساکہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ قدکانت احدٰلکن ترمی بالبعرۃ علی رأس الحول۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پھر (سال بھر کی) مدت اللہ کے قول اربعۃ اشھر و عشرا سے منسوخ ہو گئی۔ پس وہ آیت تلاوت میں اگرچہ اس آیت سے پہلے ہے مگر نزول میں وہ اس سے پیچھے ہی ہے۔ شیخین نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ (سال بھر کی) مدت اللہ تعالیٰ کے ارشاد اربعۃ اشھر و عشرا سے منسوخ ہوئی ہے۔ بغوی کہتے ہیں کہ یہ آیت ایک طائف کے رہنے والے کے حق میں نازل ہوئی تھی جسے لوگ حکیم بن حارث کہتے تھے اس نے مدینہ منورہ ہجرت کر لی تھی اور اس کے بال بچے اور ماں باپ بھی اس کے ساتھ تھے اس کا انتقال ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمایا۔ پھر نبی ﷺ نے اس کے ترکہ میں سے اس کے ماں باپ اور بچوں کو دیا اور اس کی جورو کو کچھ نہیں دیا بلکہ ان ہی سے فرمادیا کہ اس کے خاوند کے ترکہ میں سے ایک سال بھر تک اسے بھی خرچ دیتے رہو۔ اسحاق بن راہویہ نے بھی اپنی تفسیر میں مقاتل بن حبان سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ طائف کے باشندوں میں سے ایک آدمی مدینہ منورہ آرہا تھا آخر حدیث تک میں کہتا ہوں (یہ سب کچھ صحیح) لیکن سیاق آیت اس حدیث کے منافی ہے کیونکہ یہ آیت تو وصیت کے واجب ہونے کو چاہتی ہے اور وہ حدیث بغیر وصیت کے اس عورت کے خاوند کے ترکہ میں سے اس کا خرچ واجب ہونے کو چاہتی ہے اور شاید اس کا انتقال اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ہوا ہو اور اس نے اس آیت کے مطابق ایک سال بھر تک خرچ دینے کی وصیت کر دی ہو اور پھر نبی ﷺ نے بھی اس طرح عمل کیا ہو اس کے علاوہ یہ حدیث چاہتی ہے کہ یہ آیت اللہ کے ارشاد "یوصیکم اللہ فی اولادکم" کے بعد نازل ہوئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ اللہ کے قول ولھن الربع مماترکتم ان لم یکن لھن ولدا لآیۃ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ (پھر اگر وہ (یعنی عورتیں سال بھر پورا ہونے سے پہلے بغیر وارثوں کے نکالے) نکل جائیں تو (اے حاکمو!) تم پر کچھ گناہ نہیں اس میں جو شریعت کے مطابق وہ اپنے اندر کچھ کر لیں (یعنی سوگ کرنا چھوڑ دیں) اور بناؤ سنگار یا اور نکاح کرنے لگیں تو تمہارے ذمہ ان کو منع کرنا نہیں ہے) بغوی کہتے ہیں کہ یہاں خطاب میت کے ورثاء کو ہے اور جناح کے رفع کی دو وجہ ہیں ایک تو وہی جو پہلے مذکور ہو چکی ہے اور دوسری یہ ہے کہ جب وہ عورتیں ایک سال پورا ہونے سے پہلے نکل جائیں تو ان کا خرچ بند کر دینے پر تم پر کچھ گناہ نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ یہ معنی عبارۃ النص کے مناسب نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ معنی ہوتے تو (فیما فعلن کی جگہ) فیما فعلتم کہنا چاہئے تھا جس سے مراد خرچ بند کر دینا ہوتا اور فیما فعلن یہاں ٹھیک نہیں ہو سکتا، واللہ اعلم۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ پورے سال بھر تک عدت میں بیٹھنا اور سوگ کرنا عورتوں پر پہلے بھی واجب نہ تھا بلکہ وہ میت کے فراق پر افسوس ظاہر کرنے کے لئے جاہلیت کی رسم کے مطابق ایسا کرتی تھیں پھر اللہ نے بطور مروت کے ان کو خرچ دینا واجب کر دیا کہ جب تک وہ میت کے فراق پر افسوس کریں اور اس کے گھر سے نہ نکلیں تو اتنے وقت تک انہیں خرچ دیا جائے۔ غرض کہ مردے کی عدت میں جو اللہ تعالیٰ نے چار مہینے اور دس دن نازل فرمائے یہ جدید حکم ہے یہ اپنے سے پہلے کسی اور حکم کو منسوخ کرنے والا نہیں ہے واللہ اعلم۔

marfat.com

وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ (اور اللہ زبردست ہے) یعنی جو اس کے حکم کے خلاف کرے اس سے بدلہ لیتا ہے۔
حَكِيۡمٌ۝۲۴۰ (حکمت والا ہے) یعنی مروت کے موافق اور مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔
وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ؕ (اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو ان کو دستور کے مطابق فائدہ پہنچانا) یعنی دولتمند پر اس کی حیثیت کے موافق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے موافق واجب ہے۔
حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ۝۲۴۱ (یہ ان لوگوں پر لازم ہے جو (شرک سے) پرہیز کرنے والے ہیں) بعض کہتے ہیں کہ اس آیت میں متاع سے مراد ایام عدت کا نفقہ ہے اور یہی مراد اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وصية لازواجهم متاعاً الى الحول" میں ہے اور ان دونوں آیتوں کے ایک معنی مراد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں یعنی موت میں اور طلاق میں عورت شوہر کے حقوق کی وجہ سے مقید رہتی ہے اس لئے شوہر کے مال میں سے اس کو خرچ دینا واجب ہے۔ یہ حکم یعنی طلاق کی عدت میں عورت کا خرچ واجب ہونا اگر رجعی طلاق ہو تو اس پر سب کا اجماع ہے لیکن اگر طلاق بائنہ ہو تو اس آیت میں عام لفظ ہونے کی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک تب بھی یہی حکم ہے اور دوسری دلیل یہ آیت ہے۔ اسکنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں اسی طرح ہے۔ اسکنوهن من حيث سكنتم وانفقوا عليهن من وجدكم (یعنی ان (مطلقہ عورتوں) کو وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو اور اپنی حسب حیثیت ان پر خرچ کرو) تیسری دلیل جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا المطلقة ثلثا لها السكنى والنفقة (یعنی تین طلاق والی عورت کو (رہنے کو) گھر اور خرچ دینا چاہئے) یہ حدیث دار قطنی نے نقل کی ہے۔ اگر کوئی اعتراض کرے کہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اس (حدیث کی سند) میں حارث بن ابو العالیہ (راوی) ہے اور یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔ ہم کہتے ہیں ذہبی نے کہا ہے کہ حارث بن ابو العالیہ، ابو معاذ عبد اللہ قواریری کا استاد ہے اس کو ضعیف کہنا بلا حجت ہے۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ عورت کو خرچ ملنے کی جو وجہ وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے اور وہ شوہر کے حقوق کی وجہ سے یا تو اس کا مقید رہنا ہے تاکہ رحم کا (بچہ سے) خالی ہونا ظاہر ہو جائے یا اس کے ساتھ مروت کرنا ہے اور اس کے مقابلہ میں کہ وہ شوہر کی جدائی میں سوگ کرتی اور صدمہ اٹھاتی ہے اس کو خرچ دیا جاتا ہے۔ پھر بیوہ کا نفقہ بالکل ہی منسوخ نہیں ہوا بلکہ خرچ دینے کے بدلے میں اس کے لئے میراث واجب ہو گئی اس لئے گویا یہ حکم منسوخ ہی نہیں ہوا۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ بیوہ کے لئے نفقہ واجب نہیں ہے ہاں (رہنے کو) گھر دینا واجب ہے اور یہی ایک روایت امام احمدؒ سے بھی ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک نہ اس کے لئے نفقہ ہے اور نہ گھر ہے۔ انہوں نے فاطمہ بنت قیس کی حدیث سے دلیل لی ہے کہ (ان کے شوہر) ابو عمرو بن حفص نے کہیں باہر جا کر انہیں بائنہ طلاق دیدی تھی اور اپنے وکیل کے ہاتھ تھوڑے سے جو (ان کے کھانے کے لئے) بھیج دیئے تھے۔ فاطمہ ان پر بہت ناراض ہوئیں تو وکیل نے کہا کہ خدا کی قسم ہمارے پاس آپ کے لئے اور کچھ نہیں ہے۔ یہ دوڑی ہوئی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئیں اور یہ سارا ماجرا حضور ﷺ سے عرض کیا آپ نے بھی صاف فرمایا کہ لیس لک نفقة (تمہارے لئے نفقہ نہیں ہے) اور انہیں یہ حکم دیا کہ ام شریک کے گھر تم عدت گزار لو پھر خود ہی فرمایا کہ ام شریک کے ہاں تو میرے اکثر صحابہ آتے جاتے ہیں (تمہیں پردہ وغیرہ کی تکلیف ہوگی) تم ابن ام مکتوم کے ہاں عدت پوری کر لو۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ فاطمہ کے شوہر نے انہیں تین طلاقیں دیدی تھیں، وہ نبی ﷺ کی خدمت میں آئیں (آپ سے اس کا ذکر کیا) آپ نے فرمایا کہ تمہارے لئے نفقہ نہیں ہے ہاں اگر تم پیٹ سے ہوتیں (تو نفقہ مل جاتا) امام احمدؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں مجھ سے فاطمہ بنت قیس نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ مجھے (رہنے کو) کوئی گھر دلوایا تھا اور نہ کچھ خرچ دلوایا تھا اور اس حدیث (کی سند) میں حجاج بن ارطاۃ (راوی) ضعیف ہے، امام احمدؒ نے فاطمہ سے روایت کی ہے کہتی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ عورت کے لئے گھر اور نفقہ جب ہی تک ہے کہ اس کا شوہر اس سے رجعت کر سکے اور جب وہ اس سے رجعت نہیں کر سکتا تو نہ اس کے لئے نفقہ ہے اور نہ گھر ہے۔ پس اسی حدیث کی وجہ سے امام احمد فرماتے ہیں

marfat.com

کہ اس کے لئے گھر بھی نہیں ہے لیکن امام شافعی اور ان کے ساتھی گھر کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد اسکنوھن کی وجہ سے واجب کہتے ہیں گویا انہوں نے (بھی) اس حدیث پر من وجہ عمل چھوڑ دیا ہے ہماری طرف سے جواب یہ ہے کہ فاطمہ بنت قیس کی حدیث کتاب (الٰہی) کے مخالف ہے اس لئے وہ متروک ہے اور اکثر صحابہ کی موجودگی میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے (بھی) اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ترمذی نے سند کے ساتھ مغیرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے شعبی سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں فاطمہ بنت قیس نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دیدی تھیں اور آنحضرت نے (مجھ سے) فرمادیا تھا کہ تیرے لئے (تیرے خاوند کے ذمہ) نہ گھر ہے اور نہ نفقہ ہے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے اس حدیث کا ابراہیم سے ذکر کیا وہ کہنے لگے کہ (فاطمہ کے جواب میں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ ایک عورت کے کہنے پر ہم اللہ کی کتاب اور اپنے نبی ﷺ کے طریقہ کو نہیں چھوڑتے ہمیں نہیں معلوم کہ اس کو خوب یاد ہے یا یہ کچھ بھول گئی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی عورت کو (رہنے کے لئے) گھر برابر دلاتے تھے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ ابراہیم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا اور اکثر لوگوں نے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ (اس کے کہنے سے) ہم اللہ کی کتاب کو نہیں چھوڑ سکتے اور نبی کے طریقہ کا ذکر نہیں کیا تھا اور یہی صحیح بھی ہے۔

دوسرے یہ کہ جب کسی صحابی کے قول کے خلاف رسول اللہ ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہو جائے تو اس کے مقابلہ میں صحابی کا قول نہیں مانا جاتا۔ ہم کہتے ہیں اگر ابراہیم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا تو یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ "ہم اپنے نبی کے طریقہ کو نہیں چھوڑ سکتے" ثابت ہو گیا تو یہی ان کی مرفوع روایت ہے اور اگر ہم اس کو تسلیم بھی کرلیں تو جب ابن جوزی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے صحیح ہونے کا اقرار کرلیا کہ ہم اللہ کی کتاب کو نہیں چھوڑ سکتے تو ہمارے مدعا کے لئے یہی کافی ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ کا قول ابن مسعودؓ کی قرأت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے اَنْفِقُوْهُنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ پس اسی سے مدعا ثابت ہو گیا اور اسی آیت کی تاویل میں بعض کا قول یہ ہے کہ متاع بالمعروف سے متعہ مراد ہے جو نفقہ کے سوا ہو، اور وہ (یعنی متعہ) تین کپڑے ہیں جیسا کہ اس عورت کے حق میں ہے کہ جسے بے ہاتھ لگائے طلاق دیدی گئی ہو۔ اس تاویل کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک للمطلقات میں لام عہد خارجی کے لئے ہے اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو ابن جریر نے ابن زید سے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جب آیت وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ نازل ہوئی تو ایک آدمی نے کہا کہ اگر میں (اپنی جورو پر) احسان کرنا چاہوں تو کردوں اور اگر نہ چاہوں تو نہ بھی کروں۔ (مطلب اس کا یہ تھا کہ اس کو دینا میرے ذمہ لازم نہیں ہے) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین۔ پس اس معنی پر متعہ اسی عورت کے لئے ثابت ہوتا ہے جسے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدی گئی ہو اور یہی قول امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر یہی تاویل ہے تو پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہ فرمانے کی کیا وجہ ہے کہ متعہ اس عورت کو دینا مستحب ہے جسے ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی گئی ہو مہر مقرر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی ہوئی عورت کو متعہ دینے کا مستحب ہونا اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا واللہ اعلم۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ لام (للمطلقات میں) استغراق کے لئے ہے اور اسی وجہ سے ان کے نزدیک ہر مطلقہ کے لئے متعہ واجب ہے، سوائے اس عورت کے کہ جسے ہاتھ لگانے سے پہلے اور مہر مقرر کرنے کے بعد طلاق دی گئی ہو۔ میں کہتا ہوں اگر تاویل اسی طرح ہے (یعنی تم اس لام کو استغراق کے لئے لیتے ہو) تو پھر اس عورت کو استثناء کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جسے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔ ہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ استثناء کی یہ وجہ ہے کہ اس صورت میں متعہ وہ نصف مہر ہی ہے جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں۔ تو اب ہم کہتے ہیں کہ امام شافعی نے جو یہ تاویل ذکر کی ہے یہ بھی ان ہی

marfat.com

مذکورہ احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے، جیسا کہ تم پہلے سن چکے ہو لہٰذا ہر مطلقہ کے لئے متعہ واجب ہونے میں شک پڑ گیا اور شک سے وجوب ثابت نہیں ہوتا اس لئے ان احتمالوں میں سے ایک احتمال پر عمل کرنے کے لئے ہم استحباب کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

كَذٰلِكَ (اسی طرح) یہ اس طرف اشارہ ہے جو طلاق اور عدت کے احکام پہلے گزر چکے ہیں۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے) یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے (فائدہ کے)۔ لئے عنقریب وہ دلائل اور احکام بیان کرے گا جن کی انہیں معاش اور معاد (دونوں) کے لئے ضرورت ہوگی۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ (تاکہ تم سمجھو) اور ان میں عقل کو کام میں لاؤ۔ ع ۳۱ / ۱۵

اَلَمْ تَرَ (کیا تم نے نہیں دیکھا) یہ لفظ مابعد کا حال سنانے کے لئے شوق اور تعجب دلاتا ہے پس (الم تر کہنا) تعجب دلانے میں ایک مثل ہو گیا اور اس سے ایسے شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ جس نے اس سے پہلے یہ واقعہ نہ سنا ہو اور نہ دیکھا ہو یا یہ تقریر (اور تاکید) ہے ایسے شخص کے لئے جس نے ان کا قصہ اہل کتاب اور اہل تواریخ سے سن لیا ہو یا اس کے یہ معنی ہیں کہ (اے مخاطب) کیا تو میرے بتانے سے بھی نہیں سمجھتا اور اس میں بھی ایک قسم کا تعجب دلاتا ہے اور قرآن شریف میں جہاں کہیں اَلَمْ تَرَ کا لفظ آیا ہے اور اس کو نبی ﷺ نے نہیں دیکھا وہاں سب جگہ اسی قسم کے معنی مراد ہیں۔

اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ (ان لوگوں کو جو اپنے گھروں سے نکل کے چل دیئے اور وہ ہزاروں تھے) عطاء خراسانی کہتے ہیں کہ تین ہزار تھے، وہب کہتے ہیں چار ہزار تھے، حاکم نے اسی طرح نقل کیا ہے اور اس کا ابن عباس سے ہونا صحیح کہا ہے اور بعض کہتے ہیں آٹھ ہزار تھے، سدی فرماتے ہیں کہ کچھ اوپر تیس ہزار تھے اور ابن جریج کہتے ہیں چالیس ہزار تھے۔ ابن جریر نے ایک منقطع سند کے ساتھ ابن عباس سے چالیس ہزار اور آٹھ ہزار ہونا نقل کیا ہے اور عطاء بن رباح کہتے ہیں کہ ستر ہزار تھے اور بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ الوف، الفت سے ماخوذ ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ لوگ مؤلفۃ القلوب تھے۔

حَذَرَ الْمَوْتِ (موت کے ڈر کے مارے) یہ مفعول لہ ہے۔

بغوی کہتے ہیں کہ واسط کی طرف دَاوَرْدَان ایک گاؤں تھا وہاں طاعون پھیلا تو وہاں کے کچھ آدمی تو بھاگ گئے اور کچھ وہیں رہے جو وہیں رہ گئے تھے ان میں سے اکثر مر گئے اور جو بھاگ گئے تھے وہ بچ گئے اور جب طاعون رفع ہو گیا تو وہ آدمی پھر اپنے اپنے گھر چلے آئے اور جو وہیں رہ گئے تھے (انہیں دیکھ کر) کہنے لگے کہ ہمارے یہ ساتھی ہم سے بہت ہوشیار تھے اگر ہم بھی ایسا ہی کرتے جیسا کہ انہوں نے کیا تھا تو ہم سب بھی زندہ رہتے اور اگر اب کے دوبارہ طاعون پھیلا تو ہم بھی کہیں ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں بالکل وبا نہ ہو (قدرت الٰہی سے) اگلے سال پھر طاعون پھیل گیا اور اس گاؤں کے اکثر رہنے والے بھاگ گئے اور ایک چٹیل بیابان میں جا اترے، جب وہ ایسی جگہ پہنچ گئے کہ جہاں وہ (اپنی) نجات (اور تندرستی) چاہتے تھے تو ایک فرشتہ نے اس جنگل کی نشیبی جانب سے اور دوسرے نے اوپر سے انہیں یہ آواز دی کہ موتوا (مر جاؤ) وہ سب کے سب وہیں مر گئے۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، نسائی نے اسامۃ بن زید سے انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے حضور نے فرمایا اذا سمعتم بالطاعون فی الارض فلا تدخلوا علیه واذا وقع بارض فلا تخرجوا منها وانتم فرار منه (یعنی جب کسی مقام میں تم طاعون سنو تو اس مقام میں نہ جاؤ اور جب کسی مقام میں پھیل جائے (اور تم بھی وہیں ہو) تو تم اس سے ڈر کے نہ بھاگو)

بغوی نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ملک) شام کی طرف تشریف لے گئے تھے اور جب آپ (شام کے قریب موضع) سرغ پہنچے تو وہاں آپ نے یہ سنا کہ شام میں وبا کی بہت زور ہو رہا ہے اسی

marfat.com

وقت عبد الرحمٰن بن عوف نے انہیں یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اذا سمعتم بارض آخر تک اس لئے حضرت عمر سرغ ہی سے لوٹ آئے۔

کلبی، مقاتل، ضحاک کہتے ہیں کہ وہ لوگ (جن کا اس آیت میں ذکر ہے) جہاد سے بھاگے تھے اور اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ شاہان بنی اسرائیل میں سے ایک بادشاہ نے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے دشمن سے جنگ کرنے کے لئے چلیں اس وقت تو انہوں نے ہتھیار باندھ لئے لیکن پھر ہمت ہار دی اور مرنے کو برا سمجھنے لگے اور حیلے بہانے کر کے اپنے بادشاہ سے کہا کہ اس ملک میں تو وبا پھیل رہی ہے، جب تک وہاں سے وبا نہ نکل جائے گی ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر موت کو بھیج دیا اور یہ موت سے بھاگنے کے لئے سب کے سب اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے جب اس بادشاہ نے یہ کیفیت دیکھی تو اس نے یہ دعا کی کہ اے خدا اے یعقوب کے پروردگار اے موسیٰ کے معبود تو نے اپنے بندوں کی نافرمانی کرنی دیکھ لی ہے پس اب تو انہیں ان ہی کی جانوں کے متعلق کوئی ایسا نشانی دکھلا جس سے انہیں یہ یقین ہو جائے کہ یہ تجھ سے (بچ کر) نہیں بھاگ سکتے۔

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا (پھر اللہ نے انہیں (سزا دینے کے لئے) حکم دیا کہ مر جاؤ) یہ امر تحویلی ہے پس وہ اور ان کے مویشی سب کے سب اس طرح مر گئے جیسے فقط ایک آدمی مر جاتا ہے پھر اور لوگ ان کے پاس آئے تو وہ انہیں دفن نہ کر سکے آخر انہوں نے درندوں سے بچانے کے لئے ان پر ایک باڑہ بنوا دیا اور انہیں وہیں رہنے دیا ان کو اسی حالت سے پڑے ہوئے ایک مدت گزر گئی۔ بعض کہتے ہیں آٹھ روز گزرے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کے بدن تک گل گئے تھے اور فقط ہڈیاں رہ گئی تھیں۔

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (پھر اللہ نے) انہیں زندہ کر دیا) اس کا عطف محذوف فعل پر ہے جس پر موتوا دلالت کرتا ہے یعنی وہ مر گئے تو پھر اللہ نے انہیں زندہ کر دیا ابن جریرؒ نے سدی کے طریق سے ابو مالک سے روایت کی ہے کہ حزقیل علیہ السلام اہل داوردان کے پاس کو نکلے اور ان کی ہڈیاں (دھوپ میں) چمک رہی تھیں اور تمام جوڑ ان کے علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ حزقیل کو اس سے بہت تعجب ہوا (کہ بھلا اب یہ کیونکر زندہ ہوں گے) اللہ نے اسی وقت ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم ان کے پاس کھڑے ہو کر یہ پکارو کہ قوموا باذن اللّٰہ (تم اللہ کے حکم سے کھڑے ہو جاؤ آپ نے آواز دی تو وہ سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ حزقیل بن یوزی، موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلفاء بنی اسرائیل میں سے تیسرے خلیفہ تھے۔ حسن اور مقاتل کہتے ہیں کہ یہی ذوالکفل ہیں اور یہ نام ان کا اس لئے ہو گیا تھا کہ یہ ستر نبیوں کے کفیل ہوئے تھے اور انہیں قتل ہونے سے بچایا تھا۔ مقاتل اور کلبی کہتے ہیں کہ یہ لوگ حزقیل ہی کی قوم کے تھے جب ان پر یہ حادثہ پیش آ چکا تو حزقیل ان کی تلاش میں نکلے اور انہیں مرے ہوئے دیکھ کر آپ بہت روئے اور بارگاہ الٰہی میں التجا کی کہ اے میرے پروردگار میں ایسے لوگوں میں تھا جو تیری حمد کرتے تھے، تیری پاکی بیان کرتے تھے، تیری تسبیح پڑھتے تھے، تیری بڑائی بیان کرتے تھے، تیرا کلمہ پڑھتے تھے اور اب میں اکیلا رہ

۱؎ اشعث بن اسلم بصری سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے آپ کے پیچھے دو یہودی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ یہ وہی ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ ہماری کتاب میں تو یہ ہے کہ ان کے دو قرن لوہے کے ہوں گے اور جو حضرت حزقیل کو دیا گیا (کہ جنہوں نے مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کیا) وہ ان کو بھی ملے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد ان سے فرمایا قرآن شریف میں تو حضرت حزقیل کا ذکر نہیں اور نہ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور کسی کے مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر ہے۔ انہوں نے کہا کیا کتاب اللہ میں ورسلا لم نقصصهم عليك نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں ہے اور مردوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ہم آپ کو سنائیں کہ ایک دفعہ ان میں وبا پھیلی تو ایک قوم ان میں سے نکل بھاگی ایک میل گئے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر موت بھیج دی اسی حالت میں مرے ہوئے پڑے رہے، یہاں تک کہ جب ان کی ہڈیاں خشک ہو گئیں، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت حزقیل کو بھیجا ان پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کو جو منظور تھا وہ انہوں نے کہا تو سب کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت الم ترالی الذین خرجوا من دیارھم آخر تک نازل فرمائی۔ ۱۲ منہ

marfat.com

گیا۔ میرے پاس کوئی نہیں ہے اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ان کی زندگی تو میں نے تمہارے اختیار میں کردی ہے اس وقت حزقیل نے کہا۔ احیوا باذن اللّٰہ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ کے حکم سے سب زندہ ہو جاؤ) وہ فوراً زندہ ہو گئے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ جس وقت وہ زندہ ہو گئے تو انہوں نے کہا سبحانک ربنا و بحمدک لا الہ الا انت پھر وہ اپنی قوم کے پاس چلے گئے اور ایک عرصہ تک زندہ رہے موت نے ان کے چہروں کی کھال بوڑھی کر دی تھی وہ جو کپڑا پہنتے تھے وہ مثل کفن کے ہو جاتا تھا یہاں تک کہ پھر سب اپنی وہ عمریں پوری کر کے مر گئے جوان کے لئے لکھی گئی تھیں ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا اثر یہود کے خاندان میں اب تک پایا جاتا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ان کے موت سے بھاگنے کے باعث اللہ تعالیٰ کو ان پر غصہ آگیا تھا سزا دینے کے لئے انہیں اللہ تعالیٰ نے مار دیا اور پھر زندہ کیا تاکہ وہ اپنی اپنی عمریں پوری کرلیں اور اگر ان کی عمریں واقعی پوری ہو گئی ہوتیں تو وہ زندہ نہ ہوتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (بیشک اللہ لوگوں پر بڑا فضل والا ہے) کیونکہ ان کو زندہ کیا تاکہ وہ عبرت حاصل کر کے کامیابی حاصل کریں اور تم سے ان کا حال بیان کیا تاکہ تم (بھی) بصیرت حاصل کرو اور اس سے مراد اللہ کا تمام لوگوں پر فضل ہونا ہے اس قرینہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ (اور لیکن اکثر آدمی (یعنی کفار) اس کا شکر نہیں کرتے) یہ قصہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے ذکر کیا ہے کہ مسلمانوں کو توکل کرنے کی ترغیب ہو اور قضاء و قدر کو دل و جان سے مانیں اور جہاد پر جانے کے لئے دلیر رہیں گویا یہ آیت آئندہ آیت کے لئے تمہید ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اور اللہ کی راہ میں لڑو) کیونکہ موت سے بھاگنا فائدہ نہیں دیتا اور جو مقدر میں ہے وہ ضرور ہونے والا ہے۔ پس اولیٰ درجہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے کیونکہ اگر موت آگئی تو اللہ کی راہ میں مریں گے ورنہ فتح ہو گی اور ثواب ملے گا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ (اور جان لو کہ اللہ سنتا ہے) اس کو جو (جہاد سے) پیچھے رہنے والا اور آگے جانے والا کہتا ہے۔

عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ (جانتا ہے) یعنی جس بات کو وہ دونوں چھپاتے ہیں واللہ اعلم۔

شان نزول۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح (بخاری) میں اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ جب آیت مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ الآیۃ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے دعا کی کہ اے پروردگار میری امت کو اور زیادہ دے اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ (ہے کوئی ایسا جو اللہ کو قرض دے) من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور ذا اس کی خبر ہے اور الذی، ذا کی صفت یا اس سے بدل ہے۔ لغت میں قرض کے معنی قطع کرنے کے ہیں اور ایک آدمی جو اپنے مال میں سے دوسرے کو اس لئے دیتا ہے تاکہ اس کے برابر پھر اس کے پاس آجائے تو اس کو بھی قرض اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اس کے مال سے قطع ہونا پایا جاتا ہے اور یہاں قرض سے مراد دیا تو اس کے حقیقی معنی ہیں، پس اس کلام میں مضاف مقدر ہونے کی وجہ سے مجاز ہے۔ یعنی (یقرض اللّٰہ سے یہ مراد ہے کہ) یقرض عباد اللّٰہ۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ابو ہریرہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی قال یارب کیف اطعمک وانت رب العالمین قال استطعمک عبدی فلان فلم تطعمہ اماعلمت انک لواطعمتہ لوجدت ذلک عندی (الحدیث) ترجمہ (یعنی اے اولاد آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ وہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار میں تجھے کھانا کس طرح دے سکتا تھا تو تو رب العالمین ہے۔ سب جہان والوں کا پرورش کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فلاں میرے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا۔ اسے تو نے کھانا نہیں دیا کیا تو نہ جانتا تھا کہ اگر تو

marfat.com

اسے دیدیتا تو اسے اب میرے پاس ضرور پاتا۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے اور قرض کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کل قرضٍ صدقۃٌ (یعنی ہر قرض صدقہ ہے) یہ حدیث طبرانی اور بیہقی نے حسن سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں نبی ﷺ نے فرمایا مامن مسلم یقرض مسلما قرضامرۃ الاکان کصدقۃ مرتین (ترجمہ) یعنی جو مسلمان کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے تو وہ اس کی طرف سے دو دفعہ صدقہ کرنے جیسا ہوتا ہے) یہ حدیث ابن ماجہ نے روایت کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور بیہقی نے اسے مرفوعاً دونوں طرح نقل کیا ہے اور یا قرض کے یہاں مجازی معنی ہیں اور وہ دنیا میں ایسا نیک عمل کرنا ہے جس کے ذریعہ سے ثواب طلب کیا جائے۔ اس پر بخاری کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو ہم نے سبب نزول میں ذکر کی ہے۔

قَرْضًا حَسَنًا (قرض حسنہ) بنا بر مفعولیت منصوب ہے یا مفعول مطلق ہے یعنی قرضًا مقرونا بالاخلاص وطیبا لنفس (یعنی جو اخلاص اور خوش دلی سے ہو) ابن ابی حاتم نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا کہ قرض حسنہ مجاہدہ اور راہ خدا میں خرچ کرنے کا نام ہے۔

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس (کی جزا) کو کئی گونہ بڑھادے) ابن کثیر ابو جعفر، ابن عامر اور یعقوب نے فیضاعفہ کو جہاں بھی قرآن شریف میں آیا ہے باب تفعیل سے فَيُضَعِّفَهٗ پڑھا ہے۔ سورۂ احزاب میں ابو عمرو نے بھی ان کی موافقت کی ہے اور تشدید اس میں تکثیر کے لئے ہے۔ باقی قراء نے باب مفاعلۃ سے پڑھا ہے اور یہ مفاعلۃ مبالغہ کے لئے ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے یہاں اور سورۂ حدید میں استفہام کا جواب بنایا ہے اور اَنْ مقدر مان کر منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے یقرض پر عطف کر کے مرفوع پڑھا ہے۔ اب یہاں چار قرائتیں ہوئیں۔ ابن کثیر اور ابو جعفر نے فَيُضَعِّفُهٗ مرفوع پڑھا ہے اور ابن عامر اور یعقوب نے منصوب، عاصم نے فَيُضٰعِفَهٗ نصب سے، باقیوں نے رفع سے پڑھا ہے۔ اضعافاً، ضعف کی جمع ہے اور ضمیر منصوب فیضاعفہ سے حال ہونے کی وجہ سے یا مفعول ثانی ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اس لئے کہ مضاعفۃ کے معنی کے اندر بنادینے کا معنی ہے یا ضعف کو (جس کی جمع اضعاف ہے) اسم مصدر کہا جائے تو اب یہ مفعول مطلق ہوگا اور اس کو جمع بیان کرنا تنویع کے لئے ہے۔ سدی کہتے ہیں کہ اس بڑھانے (کی مقدار) کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور بعض کا قول ہے کہ ایک کی جزا سات سو تک دی جائے گی زیادہ صحیح پہلا ہی قول ہے بخاری کی اس حدیث کی وجہ سے جس کو ہم شان نزول میں ذکر کر چکے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ (اور اللہ ہی تنگدست کرتا ہے اور وہی فارغ البال بناتا ہے) ابو عمرو، قنبل، حفص، ہشام، حمزہ نے یہاں یبسط کو اور سورۂ اعراف میں بسط کو سین کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے صاد سے پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو تنگ (اور کم) کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے۔ پس تم صدقہ کرنے سے بخل نہ کیا کرو تاکہ تمہاری حالت نہ بدل دی جائے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مامن یوم یصبح العباد فیہ الا ملکان ینزلان من السماء فیقول احدھما اللّٰھم اعط منفقا خلفا و یقول الاٰخر اللّٰھم اعط ممسکا تلفا۔ ترجمہ (ہر روز صبح کو جب (اللہ کے) بندے اٹھتے ہیں تو دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے کہ الٰہی سخی کو عوض عطا کر اور دوسرا کہتا ہے الٰہی بخیل کا مال تلف کر۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ (قبض اور بسط) دلوں میں ہے کیونکہ جب اللہ نے انہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا تو انہیں یہ بھی بتادیا کہ وہ بغیر اس کی توفیق کے ایسا نہیں کر سکتے (اس وقت معنی یہ ہیں) یعنی بعض کے دل تنگ کر دیتا ہے وہ بھلائی سے خوش نہیں ہوتے اور بعض کے دل کھول دیتا ہے وہ اپنے لئے نیکی حاصل کرتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخیل اور سخی کی مثال ان دو آدمیوں جیسی ہے جو لوہے کے دو کرتے پہنے ہوئے ہوں اور ان کے ہاتھ ان کی چھاتیوں سے لگے ہوئے

marfat.com

ہوں، پس جب سخی خیرات کرنا چاہتا ہے تو اس کا ہاتھ کھل جاتا ہے اور جب بخیل خیرات کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا ہاتھ وہیں چپکا رہتا ہے اور (اس جبہ کا) ہر حلقہ اپنی جگہ پر ویسا ہی رہتا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا القلوب بين اصبعين من اصابع الرحمٰن يقلبها كيف يشاء (ترجمہ سب (کے) دل رحمٰن کی دو انگلیوں میں ہیں وہ انہیں جس طرف چاہے پھیر دے) اور بعض کا قول (اس آیت کے معنی میں) یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ) صدقات کو لے لیتا ہے اور جزا اور ثواب کو بڑھا دیتا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب ولا يقبل الله الا الطيب فان الله يتقبلها بيمينه ثم يربيها لصاحبها كما يربي احدكم فلوه حتى تكون مثل الجبل ترجمہ (یعنی جو شخص اپنی نیک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر خیرات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کر لیتا ہے پھر اسے اس طرح پالتا ہے جس طرح کوئی تم میں سے اپنے بچھیرے کو پالتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی برابر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نیک ہی کمائی کو قبول کرتا ہے) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ موت کے وقت اللہ تعالیٰ ارواح اور انفس کو قبض کرتا ہے اور جن کی موت نہیں آئی ان کو نیند میں قبض کرتا ہے پھر جس پر موت کا حکم کر دیتا ہے اسے روک لیتا ہے اور باقیوں کو ایک معین وقت مہلت دیدیتا ہے۔

وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾ اور (مرنے کے بعد) تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے) وہ تمہیں تمہارے ان اعمال کی جزا دے گا جو تم پہلے کر چکے ہو۔ قتادہ کہتے ہیں (الیہ کی) ضمیر مٹی کی طرف ہے۔ یہ غیر مذکور کی طرف اشارہ ہے یعنی تم مٹی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ (کیا تم نے اس جماعت کو نہیں دیکھا) ملا سر بر آوردہ اور اشراف لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں جو مشورہ کرنے کے لئے جمع ہوں اس کا مفرد کوئی نہیں ہے جیسے قوم ہاں اس کی جمع املاء ہے۔

مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ (جو بنی اسرائیل میں سے تھے کہ موسیٰ کے (مرنے کے) بعد جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا) قتادہ کہتے ہیں کہ وہ نبی یوشع بن نون تھے اور سدی کہتے ہیں شمعون تھے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ وہ شموئیل تھے۔ وہب اور ابن ابی اسحاق اور کلبی وغیرہ کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوئی تو ان کے بعد بنی اسرائیل میں یوشع بن نون (نبی) رہے پھر ان کا بھی انتقال ہو گیا تو بنی اسرائیل میں کالب رہے اور ان کے انتقال کے بعد حزقیل رہے اور جب حزقیل کا (بھی) انتقال ہو گیا اور بنی اسرائیل میں نئی نئی باتیں بہت پھیل گئیں اور وہ اللہ کے عہد کو بھلا کر بتوں کی پرستش کرنے لگے تو توراۃ کے بھولے ہوئے احکام کو رواج دینے کے لئے اللہ پاک نے الیاس علیہ السلام کو بھیجا پھر ان کے بعد الیسع کو بھیجا پھر الیسع کا بھی انتقال ہو گیا اور ان میں بہت سی مخالف شریعت باتیں پیدا ہو گئیں اور خطائیں حد سے بڑھ گئیں تو ان کے ایک دشمن یعنی عمالقہ نے ان پر چڑھائی کی وہ مصر اور فلسطین کے درمیان میں دریا کے کنارے رہنے والے جالوت کی قوم کے لوگ تھے وہ ان کے ملک پر غالب آ گئے انہوں نے ان کے بال بچوں کو قید کر لیا اور ان کے شاہی خاندان میں سے (بھی) چار سو چالیس لڑکوں کو قید کر لیا اور ان پر جزیہ مقرر کر دیا اور ان کی توریت چھین لی۔ بنی اسرائیل کو ان سے بہت سخت تکلیف پہنچی اور اس وقت ایسا نبی کوئی نہ تھا جو ان کی سلطنت کی تدبیر کرتا اور خاندان نبوت میں سے فقط ایک حاملہ عورت رہ گئی تھی اس کے لڑکا پیدا ہوا اس عورت نے اسکا نام شموئیل رکھا اور اسے توریت پڑھانے کی غرض سے بیت المقدس چھوڑ آئی اور وہیں کے علماء میں سے ایک بوڑھے اس بچہ کے کفیل ہو گئے جب وہ لڑکا بالغ ہو گیا تو ایک روز وہ انہی بوڑھے کے پاس سو رہا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام اس کے پاس آئے اور ان بوڑھے کے لہجہ میں اسے شموئیل کہہ کر آواز دی، لڑکا گھبرا کر بوڑھے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا۔ ابا کیا مجھے تم نے پکارا تھا انہوں نے اس وقت نہیں کہنے کو مناسب نہ سمجھا اس سے لڑکا اور گھبر لیا تب انہوں نے کہا۔ بیٹا ابھی اور سو جاؤ وہ پھر سو گیا تو جبرئیل نے اسے پھر آواز دی اس نے پھر اٹھ کر بوڑھے سے کہا۔ کیا مجھے تم نے پکارا تھا۔ انہوں نے فرمایا اب کے تیسری دفعہ میں تمہیں پکاروں تو میرے کہے کو نہ سننا پھر جب تیسری دفعہ یہ قصہ ہوا تو جبرئیل

وقف لازم

marfat.com

علیہ السلام اسے معلوم ہو گئے اور جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تم اپنی قوم کی طرف جاؤ اور انہیں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچاؤ کیونکہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کر دیا ہے (وہ گئے) لیکن ان لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور کہا اگر تم سچے (نبی) ہو تو۔

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ　(ہمارے لئے ایک ایسا بادشاہ بنا دو کہ (اس کے ساتھ ہو کر) ہم خدا کی راہ میں لڑیں) نقاتل پر جزم امر کا جواب ہونے کی وجہ سے ہے اس زمانہ میں سلطنت کا کام بادشاہوں سے ہوتا تھا اور وہ انبیاء کی اطاعت کرتے تھے۔

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ　(ان سے شموئیل نے) (کہا تم ایسا تو نہ کرو گے کہ اگر تم پر جہاد فرض کر دیا جائے) عسیتم کو جہاں بھی قرآن شریف میں آیا ہے نافع نے سین کے کسرہ سے پڑھا ہے اور باقیوں نے فتح سے هل کو فعل توقع (عسیتم) پر داخل کر کے اس شئے سے استفہام کرتے ہیں جو ان کے نزدیک متوقع ہے تاکہ اس کا پوری طرح ثبوت ہو جائے اِنْ كُتِبَ جملہ شرطیہ ہے جو عسیٰ اور اس کی خبر کے درمیان واقع ہوا ہے۔

أَلَّا تُقَاتِلُوا　(تو پھر نہ لڑو) یہ عسیٰ کی خبر ہے اور معنی یہ ہیں کہ اگر تم پر جہاز فرض کر دیا گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس بادشاہ کے ساتھ ہو کر جہاد نہ کرو گے۔

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ　(انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نہ لڑیں) اخفش نے کہا ہے کہ اَنْ یہاں زائدہ ہے معنی یہ ہیں کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے جو ہم نہ لڑیں اور کسائی کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں کیا چیز روکتی ہے جو ہم نہ لڑیں گے۔ صحیح یہ ہے کہ مالک لا تفعل و مالک ان لا تفعل (بتقدیر ان وبلا تقدیر ان) دونوں لغت صحیح ہیں۔

وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ　(حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں اور اپنے بال بچوں سے (جدا ہو گئے ہیں) پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان میں سے چند آدمیوں کے سوا سب پھر گئے) اور وہ چند آدمی وہ تھے جو نہر سے پار اتر گئے تھے جیسا کہ (اس کا بیان) عنقریب آئے گا۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾　(اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے) یہ جہاد نہ کرنے پر وعید ہے پھر شموئیل نے اپنے پاک پروردگار سے دعا کی کہ ان کے لئے ایک بادشاہ بھیج دے، اس پر شموئیل کو ایک عصا اور ایک سینگ دیا گیا جس میں بیت المقدس کا تیل تھا اور یہ حکم ہوا کہ جس کا قد اس عصا کے برابر ہو اور جب وہ مکان میں آئے تو اس تیل کو (خود بخود) جوش آجائے گا جو اس سینگ میں ہے تو تم یہ تیل اس کے سر پر مل کر اسے بنی اسرائیل پر بادشاہ کر دینا پھر اتفاق سے طالوت کے یکایک گدھے کھوئے گئے اور وہ انہیں ڈھونڈنے کو نکلے اور وہ (اصل میں) دباغ تھے یا سقہ تھے اور طالوت شموئیل کے گھر بھی آئے تاکہ ان سے (اپنے) گدھوں کو دریافت کریں ان کے گھر میں آتے ہی اس تیل میں جوش آ گیا اور شموئیل کھڑے ہو گئے پھر عصا سے طالوت کا قد ناپا تو وہ بھی اس کے برابر ہی تھا آپ نے ان کے سر کو تیل مل کر انہیں بادشاہ کر دیا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ　(اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے) اور چونکہ بنی اسرائیل میں نبوت کے خاندان میں سے لاوی بن یعقوب کی اولاد چلی آتی تھی اور شاہی خاندان میں سے یہود کی اولاد تھی اور طالوت بنیامین کی اولاد میں سے ایک فقیر آدمی تھے اس لئے۔

قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ

(انہوں نے کہا کہ اس کی سلطنت ہم پر کہاں سے ہو سکتی ہے حالانکہ سلطنت کے تو اس سے ہم زیادہ مستحق ہیں (کیونکہ ہم شاہی خاندان میں سے ہیں) اور اس کو تو کچھ مال (دولت) کی فراخی بھی نہیں دی گئی (اور ہم غنی ہیں) انی بمعنی من این ہے اور واؤ ونحن میں حالیہ ہے۔

marfat.com

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ (ان کے نبی نے) (کہا کہ بیشک اللہ نے اسے تمہارے مقابلہ میں برگزیدہ کرلیا ہے اور علم میں اسے فراخی دی ہے) کلبی کہتے ہیں کہ طالوت (فن) حرب کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔

وَالْجِسْمِ (اور جسم میں) طالوت بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ قد آور تھے آدمی اپنا ہاتھ اونچا کرتا تھا تو ان کے سر تک پہنچتا تھا اور بعض کا قول ہے کہ جب انہیں سلطنت مل گئی تو پھر ان پر وحی بھی آنے لگی تھی۔ میں کہتا ہوں چونکہ اللہ نے اصطفا اور بسطۃ علم کے ساتھ طالوت کی تعریف کی ہے اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علم سے علم شریعت مراد ہے کیونکہ دین و دنیا کے امور اسی سے سنورتے اور درست ہوتے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ طالوت کے قصہ میں جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ طالوت داؤد علیہ السلام کے داوا تھے اور انہیں مارنا چاہتے تھے اس لئے داؤد بھاگ گئے۔ پھر علماء بنی اسرائیل نے طالوت کو بہت طعنے تشنے دیئے تو طالوت نے ان سب عالموں کو قتل کرادیا یہ آخر تک قصہ بالکل جھوٹا ہے اس کی کہیں کوئی اصل نہیں ہے اسی لئے میں نے اسے ذکر نہیں کیا۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ اور اللہ اپنا ملک جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت دینے والا ہے) یعنی فقیر کو وسعت دے کر امیر کردیتا ہے۔

عَلِيْمٌ (۲۴۷) (جاننے والا ہے) اس کو جو بادشاہت کے لائق ہوتا ہے چونکہ ان لوگوں نے طالوت کے بادشاہ ہونے کو بہت بعید سمجھا تھا تو ان کے اس بعید سمجھنے کو اللہ نے اول تو اس طرح رد کیا کہ بادشاہت کے لئے حقیقی سبب تو اللہ کا دینا اور اس کا برگزیدہ کرلینا ہے اور یہ اس پر موقوف نہیں ہے کہ حسب و نسب وغیرہ کی رو سے پہلے ہی سے بھی اس کی قابلیت رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ سلطنت کے قابل ہونے اور لوگوں کے امور کی اصلاح کرنے کا ظاہری سبب یہ ہے کہ علم ہو اور قوت بدنیہ کے ساتھ اس علم کے موافق عمل کرنے کی قدرت بھی ہو نہ کہ مال کا زیادہ ہونا کیونکہ یہ تو آنے جانے والی چیز ہے اس کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہے، تیسرے یہ کہ اللہ کے اور اللہ کے رسول کے حکم کردینے کے بعد (کسی امر کو) بعید سمجھنا جائز نہیں ہے کیونکہ تمام مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ (اور ان کے نبی نے ان سے کہا) یعنی جبکہ انہوں نے طالوت کے برگزیدہ ہونے کی ان سے نشانی مانگی۔

اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ (کہ بیشک طالوت کے بادشاہ ہونے کی یہ نشانی ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا) تابوت بروزن نحلوت توب سے مشتق ہے جس کے معنی رجوع کے ہیں اور اسے تابوت اس لئے کہتے تھے کہ جو چیز اس میں سے نکالی جاتی تھی وہ پھر اسی میں چلی جاتی تھی۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد صندوق ہے جو شمشاد کی لکڑی کا تھا اور اس پر سنہرا کام تھا، تین ہاتھ کے قریب لمبا اور دو ہاتھ چوڑا تھا۔ یہ روایت ابن منذر نے وہب بن منبہ سے نقل کی ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم پر ایک تابوت نازل کیا تھا جس میں انبیاء کی تصویریں تھیں۔ اول تو وہ حضرت آدم کے پاس رہا پھر ان کے بعد شیث کے پاس رہا اور پھر انبیاء میں میراث در میراث ہوتا موسیٰ علیہ السلام تک پہنچ گیا، پھر موسیٰ نے توریت اور اپنا کچھ اسباب اس میں رکھ دیا اور جب موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوگیا تو پھر انبیاء بنی اسرائیل کو یکے بعد دیگرے ملتا رہا۔ بعض کا قول ہے کہ وہ توریت ہی کا ایک صندوق تھا، بنی اسرائیل جب کہیں لڑائی میں جاتے تھے تو اپنے آگے رکھتے تھے اس کی برکت سے ان کی فتح ہوجاتی تھی اور جب یہ صندوق چلتا تھا تو یہ بھی چلتے تھے اور جب وہ ٹھہر جاتا تو یہ بھی ٹھہر جاتے۔

فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (اس میں (یعنی اس کے لانے میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے تسکین ہے) یعنی اس سے تمہارے دلوں کو تسکین ہوجائے گی، پھر تمہیں طالوت کی بادشاہت میں شک نہ رہے گا۔ فیہ کی ضمیر تابوت کی طرف ہے

marfat.com

یعنی اس میں ایسی چیز رکھی ہوئی ہے جس سے تمہاری تسکین ہو جائے گی اور وہ توریت تھی یا یہ مطلب ہے کہ اس کی یہ خاصیت ہے کہ اس کے یہاں آنے سے تمہارے دلوں کی تسکین ہو جائے گی۔ ابن اسحاق اور ابن جریر نے وہب بن منبہ سے روایت کی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام جنگ کرتے تھے تو اسے آگے کر لیتے تھے اس سے بنی اسرائیل (جنگ پر) جمے رہتے تھے بھاگتے نہ تھے۔ میں کہتا ہوں اس میں شک نہیں ہے کہ اللہ کا ذکر کرنے اور انبیاء اور ان کے پیروکاروں میں سے نیک لوگوں کے آثار دیکھنے سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے اور شیطانی وسوسے جاتے رہتے ہیں۔ ابن عساکر نے کلبی کے طریق سے انہوں نے ابی صالح سے انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ سکینہ زبرجد یا یاقوت کی ایک تصویر تھی جو تابوت میں رکھی ہوئی تھی اس کا سر اور دم مثل بلی کے سر اور دم کے تھی اور اس کے دو بازو تھے وہ روتی چیختی تھی تو تابوت دشمن کی طرف دوڑتا تھا اور لوگ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے اور جب تابوت ٹھہر جاتا تھا تو یہ بھی ٹھہر جاتے تھے اور پھر مدد (الٰہی) نازل ہوتی تھی۔ بغوی نے مجاہد کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ ایک تیز ہوا تھی، بروایت کلبی اس کے دو سر تھے اور انسان کے منہ جیسا ایک منہ تھا۔ طبرانی نے حضرت علی سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا کہ سکینہ ایک تیز ہوا تھی واللہ اعلم اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سکینہ سونے کا ایک بہشتی طشت تھا اس میں انبیا کے دل دھوئے جاتے تھے۔

وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ (اور بقیہ وہ تبرکات ہوں گے جو آل موسیٰ اور آل ہارون چھوڑ گئے ہیں) یعنی خود موسیٰ اور ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں اور آل کا لفظ ان دونوں کی عصمت شان ظاہر کرنے کے لئے ہے یا ان دونوں کے آل سے مراد انبیاء بنی اسرائیل ہیں کیونکہ وہ ان دونوں کی چچا کی اولاد میں تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس تابوت میں دو تختیاں توریت کی (پوری) اور شکستہ تختیوں کے ٹکڑے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور آپ کے دونوں جوتے اور ہارون کا عمامہ اور ان کی لاٹھی اور اس من کا ایک قفیز تھا جو بنی اسرائیل پر (آسمان سے) نازل ہوتا تھا اور یہ تابوت وہی تھا کہ جس وقت بنی اسرائیل نے اللہ کی نافرمانی کی اور قربانی میں بدعتیں جاری کر دیں اور بیت المقدس میں بدافعالیاں کرنے لگے تو یہ تابوت ان کے ہاں سے گم ہو گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے اللہ نے آسمان پر اٹھا لیا تھا اور بعض کا قول یہ ہے کہ ان پر ایک دشمن غالب آ گیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ کانٹا جس سے وہ لوگ اپنی قربانی (کے گوشت) کو بھونتے تھے دوشاخا تھا اور جس قدر گوشت اس کانٹے سے ایک دفعہ نکلتا تھا وہ اس کاہن کا ہوتا تھا جو اسے بھونتا تھا اور جب قربانیوں کے کار مختار عیلی ہوئے جنہوں نے شموئیل کی پرورش کی تھی تو ان کے دونوں بیٹوں نے ان دو کانٹوں کے کئی کانٹے (یعنی زیادہ گوشت آنے کے لئے کئی شاخے) کر لئے اور جو عورتیں بیت المقدس میں نماز پڑھنے آتیں یہ دونوں انہیں چھیڑتے اور ان سے ہاتھا پائی کرتے تھے اس پر اللہ نے شموئیل کی زبانی عیلی سے فرمایا کہ تمہیں اولاد کی محبت نے اس سے روک دیا کہ تم اپنے دونوں بیٹوں کو میری قربانی اور میرے بیت المقدس میں بدافعالیاں اور بدعتیں کرنے سے روکتے اس کی سزا میں تم سے اور تمہاری اولاد سے میں کہانت چھین لوں گا اور تم سب کو برباد کروں گا کچھ عرصہ کے بعد ایک غنیم نے ان پر چڑھائی کی تو عیلی کے دونوں بیٹے اس کے مقابلہ کے لئے نکلے اور تابوت کو اپنے ساتھ لے گئے وہاں پہنچتے ہی یہ دونوں قتل ہو گئے اور وہ غنیم تابوت کو لے گیا جب عیلی نے یہ قصہ سنا تو ٹھنڈا سانس بھر کر گر پڑے اور وہیں دم نکل گیا پھر جب اللہ نے طالوت کو بادشاہ کیا تو اس تابوت کو اللہ نے پھر آسمان سے نازل کیا۔

تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ط (اس (تابوت) کو فرشتے اٹھا کر لاتے ہیں) یہ پہلے قول کے موافق ہے اور دوسرے قول کے مطابق یہ ہے کہ جب عمالقہ تابوت کو لے گئے تو اسے انہوں نے اپنے بت خانہ میں ایک بڑے بت کے نیچے رکھ دیا پھر (قدرت الٰہی سے) وہ بت تو تابوت کے نیچے ہو گیا اور تابوت اس کے اوپر ہو گیا اور باقی سب بت ٹوٹ گئے پھر انہوں نے ایک اور مکان میں رکھا تو اس گھر کے اکثر آدمی مر گئے پھر انہوں نے اسے ایک اور گاؤں میں بھیج دیا اس گاؤں والوں میں اللہ نے ایک اس قسم کا چوہا پیدا کر دیا کہ آدمی رات کو (اچھا خاصا) سوتا تھا اور صبح کو اٹھتا تھا تو اس کے پیٹ کی تمام آلائش وغیرہ وہ چوہا کھا جاتا تھا تب بنی

marfat.com

اسرائیل کے قیدیوں میں سے ایک عورت نے کہا کہ یہ تابوت جب تک تمہارے ہاں رہے گا تمہیں ہمیشہ اس قسم کے حادثے پیش آتے رہیں گے لہٰذا تم اسے اپنے سے کہیں دور کو چلتا کر دو، اس کے کہنے سے وہ ایک بچھڑا لائے اور اس پر اسے لاد دیا پھر اس میں دو بیلوں کو جوڑ کر انہیں خوب مار کر بھگا دیا پھر اللہ نے اس پر چار فرشتوں کو مقرر کر دیا تو ان فرشتوں نے ان بیلوں کو ہانک کر بنی اسرائیل تک پہنچا دیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ تابوت تیہ میں تھا موسیٰ علیہ السلام اسے یوشع بن نون کے پاس چھوڑ گئے تھے پھر وہ طالوت کے زمانہ تک وہیں رہا پھر اسے فرشتے اٹھا لائے اور طالوت کے گھر میں رکھ دیا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۴۸﴾ (بیشک اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو) ۳۲ ع ۱۶

احتمال ہے کہ یہ شموئیل نبی کے کلام کا بقیہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ علیحدہ خطاب ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ تابوت اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا بحیرۂ طبریہ میں ہیں اور یہ دونوں قیامت سے پہلے نکلیں گے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ (پھر جب طالوت فوجیں لے کر شہر سے باہر نکلا) فصل کے معنی اصل میں قطع کے ہیں اور یہ متعدی ہے یعنی اپنے آپ کو انہوں نے شہر سے الگ کر لیا۔ کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے مفعول کو حذف کر دیا۔ تو بمنزلۂ فعل لازم کے ہو گیا یعنی ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف کوچ کر جانا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے تابوت کو دیکھا اور (اپنی مدد ہونے کا انہیں یقین ہو گیا تو پھر سب کے سب فوراً جہاد کے لئے کمربستہ ہو گئے اس پر طالوت نے کہا کہ میرے ساتھ وہی آدمی چلیں جو جوان خوبصورت مجرد ہوں، اس کہنے پر مقاتل کے قول کے مطابق ستّر ہزار جوان نکلے اور بعض کا قول ہے کہ اسّی ہزار تھے اور اس وقت بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی انہوں نے (طالوت سے) التجا کی کہ اللہ تعالیٰ سے (اس وقت) ہمارے لئے ایک نہر جاری کرا دو۔ قَالَ (طالوت نے) کہا۔ اگر طالوت نبی تھے تو اللہ کی وحی کے ذریعہ سے اور اگر نبی نہیں تھے تو نبی کی ہدایت کی وجہ سے کہا۔

اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ (بیشک اللہ ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرے گا) ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی کہتے ہیں کہ وہ فلسطین کی نہر ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان میں ہے۔ ابتلا کے معنی امتحان کے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم سے اللہ تعالیٰ امتحان جیسا معاملہ کرے گا تاکہ مطیع اور عاصی میں فرق ظاہر ہو جائے۔

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ (پس جو اس (کے پانی) کو پیئے گا وہ مجھ سے نہیں ہے) یعنی میری پیروی کرنے والوں میں سے نہیں ہے یا وہ میرے ساتھ رہنے والا نہیں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ (اور جس نے اس کو نہ پیا (یعنی اس کا مزا نہ چکھا) تو وہ بیشک مجھ سے ہے ہاں اگر کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر کے پی لے لم یطعمہ، من طعم الشئی اذا ذاقہ ماکولاً اور مشروباً سے مشتق ہے (یعنی طعم الشئی اس وقت بھی بولا جاتا ہے کہ کسی چیز کو کھانے کی ہو یا پینے کی چکھے) منی کو نافع اور ابو عمر نے یا کے فتحہ سے اور باقی قراء نے یا کے جزم سے پڑھا ہے۔ الا من اغترف کا استثنا فمن شرب سے ہے۔ پہلے جملہ کو دوسرے جملہ پر اس لئے مقدم کر دیا تاکہ نہ پینے والوں کی اہمیت اور ان پر عنایت معلوم ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کم کی اجازت ہے زیادہ کی نہیں ہے۔ شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ سخت گرمی اور زیادہ پیاس میں بہت پانی پینا آدمیوں کو مضر ہوتا ہے، آدمی مر جاتا ہے یا اس میں لڑنے کی طاقت نہیں رہتی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حرمت ان کو سزا دینے کے لئے کر دی گئی ہو کیونکہ وہ نہر انہوں نے خود اپنی رائے سے جاری کرائی تھی۔ غرفۃ کو اہل حجاز اور اہل بصرہ نے غین کے زبر سے پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے پیش سے۔ کسائی کہتے ہیں کہ غرفہ پیش سے اس پانی کو کہتے ہیں جو چلو بھرنے کے وقت ہاتھ میں آجائے اور زبر سے اس کے معنی چلو بھرنے کے ہیں۔ غرفۃ کا منصوب ہونا یا تو مفعول بہ ہونے کی وجہ سے ہے یا مفعول مطلق کی وجہ سے ہے۔ حسب اختلاف قرأت۔

فَشَرِبُوْا مِنْهُ (جب نہر پر پہنچے) (تو اس سے سب نے پی لیا) یعنی (کنارے پر) جھک کر کے سب نے پی لیا، کیونکہ من

marfat.com

ابتدائیہ کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ چلو سے نہ ہو بلکہ منہ لگا کر پیا ہو یا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے بہت پی لیا اور لول (فمن شرب) میں تعمیم ہے (کہ منہ لگا کر یا چلو سے پیا ہو) اور یہ تعمیم استثناء کرنے سے معلوم ہوتی ہے۔

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۚ (مگر ان میں سے چند لوگوں نے) سدی کہتے ہیں یہ چار ہزار آدمی تھے اور صحیح یہ ہے کہ جو امام بخاری نے براء بن عازبؓ سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم محمد ﷺ کے صحابی یہ باتیں کیا کرتے (اور کہا کرتے) تھے کہ اصحاب بدر اور وہ اصحاب طالوت تعداد میں برابر تھے، جو طالوت کے ساتھ نہر اتر گئے تھے اور نہر سے ان کے ساتھ مسلمان ہی اترے تھے جو تین سو دس سے کچھ اوپر تھے اور یہ بھی مروی ہے کہ تین سو تیرہ تھے پس (ان میں سے) جس نے چلّو سے پانی لے کر پی لیا اس کا دل تو قوی ہو گیا اور اس کی پیاس بجھ گئی اور جن لوگوں نے زیادہ پی کر اللہ کے حکم کے خلاف کیا وہ نامرد (اور پست ہمت) ہو گئے لور نہ ان کی پیاس بجھی، ان کے ہونٹ سیاہ پڑ گئے اور وہ وہیں اس نہر کے کنارے رہ گئے، طالوت کے ساتھ نہر نہ اترے اور بعض کا قول یہ ہے کہ نہر سے سب کے سب پار ہو گئے تھے اور ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب پار نہیں ہوئے تھے کیونکہ آگے اللہ نے فرمایا۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا (پھر جب وہ (یعنی طالوت) اور ایمان والے جو ان کے ساتھ تھے (یعنی جنہوں نے پانی پینے میں طالوت کی اطاعت کی تھی) پار ہو گئے تو کہنے لگے کہ

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ (آج ہم میں طاقت نہیں ہے) یعنی شدت کی پیاس اور کمزوری ہونے کی وجہ سے یا آدمیوں کی کم ہونے کی وجہ سے

بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۚ (جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی) ان کے زیادہ اور قوی ہونے کی وجہ سے

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ (تو وہ لوگ کہنے لگے جنہیں یہ یقین تھا کہ ہمیں (مرنے کے بعد) خدا کو منہ دکھانا ہے) اور وہ اللہ سے ثواب ملنے کی امید رکھتے تھے، یہ وہی لوگ تھے جو ایک چلو بھر پانی پر اکتفا کر کے نہر اتر گئے اور احتمال ہے کہ قالوا کی ضمیر انہی لوگوں کی طرف راجع ہے جو نہر اتر گئے تھے اور (اس وقت) معنی یہ ہیں کہ انہوں نے لول تو آپس میں ایک دوسرے سے یہ کہا کہ آج ہم میں طاقت نہیں ہے پھر ان میں سے خاص خاص لوگوں نے کہا۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ (کہ بسا اوقات اللہ کے اذن سے (یعنی اس کے حکم اور ارادے سے) تھوڑی سی جماعت بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یعنی (ان کی مدد کرنے اور ثواب عطا کرنے کے طور پر اور صوفیہ رحمہم اللہ اس معیت سے وہ معیت مراد لیتے ہیں جس کی کوئی کیفیت ہی نہیں ہے۔ کم من فئة میں کم خبریہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یا کم استفہامیہ ہے اور استفہام تقریری مراد ہے اور من (من فئة) میں زائد ہے فئة آدمیوں کے ایک گروہ کو کہتے ہیں۔ فائت راسه سے یا فاء بمعنی رجع سے مشتق ہے بعض کا قول ہے کہ یہ جمع ہے اس کا واحد (مستعمل) نہیں۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

(اور جب وہ (یعنی طالوت اور ان کی فوج) جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ میں آئے (یعنی دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی) تو انہوں نے (یعنی طالوت اور ان کے ساتھیوں نے) دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں صبر (یعنی استقلال) دے لور ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں پر ہمیں فتح دے) یہ تمام انبیاء اور صالحین کا طریقہ ہے کہ جب انہیں کوئی دشوار امر پیش آتا تو وہ دعا کے ذریعہ سے اللہ کے سامنے التجا کیا کرتے تھے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ (پھر انہوں نے اللہ کے حکم سے (یعنی اس کی مدد سے) ان کو بھگا دیا) داؤد علیہ السلام مع اپنے والد اور تیرہ بھائیوں کے طالوت کے لشکر میں تھے اور طالوت کے ساتھ وہ بھی نہر اتر گئے تھے داؤد سب بھائیوں میں چھوٹے تھے بکریاں چرایا کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے نبی کی طرف وحی بھیجی کہ جالوت کو یہ (لڑکا) مارے گا اور اس راستہ میں

marfat.com

تین پتھروں نے ان سے کہا کہ ہم سے تم جالوت کو مارو گے، اس لئے داؤد نے انہیں اٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لیا۔ طالوت انہیں ایک گھوڑا اور ایک زرہ اور ایک تلوار دینے لگے تو انہوں نے جواب دیا اگر اللہ نے میری مدد نہ کی تو یہ تلوار وغیرہ مجھے کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اس لئے آپ نے ان سب چیزوں کو وہیں چھوڑ دیا اور اپنی جھولی اٹھا کے دشمن کی طرف بڑھے آپ کا قد چھوٹا تھا دائم المریض، زرد رنگ رہا کرتے تھے جب انہیں جالوت نے دیکھا تو وہ بڑا قوی قد آور تند خو تیز مزاج آدمی تھا اکیلا ہی بہت سے لشکروں کو بھگا دیتا تھا لیکن داؤد علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا وہ (انہیں دیکھ کر) کہنے لگا کیا تم میرے پاس گوپیا اور پتھر لے کے آئے ہو جیسے کوئی کتے کو مارنے آیا کرتا ہے، آپ نے فرمایا ہاں تو تو کتے سے بھی بدتر ہے، پھر آپ نے ان تینوں پتھروں کو گوپھن میں رکھا اور (بسم اللہ کی جگہ) کہا باسم اللہ ابراہیم واسحاق ویعقوب اور گوپیا مارا تو پتھر جالوت کے بھیجے میں لگ کے گدّی میں کو نکل گیا۔

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ (اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا) اور طالوت نے اپنی بیٹی سے ان کی شادی کردی۔

وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ (اور اسے (یعنی داؤد کو) اللہ نے سلطنت دی) یعنی طالوت کے مرنے کے بعد بعض کہتے ہیں کہ داؤد سے پہلے بنی اسرائیل کسی سلطنت پر مجتمع نہیں ہوئے۔

وَالْحِكْمَةَ (اور نبوت) یہ دونوں چیزیں اللہ نے حضرت داؤد ہی کو دی تھیں اور اس سے پہلے یہ دونوں نعمتیں (ایک آدمی میں) کبھی جمع نہیں ہوئیں، بلکہ سلطنت شاہی خاندان میں رہتی تھی اور نبوت نبی کے خاندان میں۔

وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ (اور جو چاہا اسے سکھادیا) اللہ نے داؤد علیہ السلام کو زبور عنایت کی تھی اور زرہیں بنانا سکھا دیا تھا اور لوہے کو آپ کے واسطے نرم (مثل موم کے) کردیا تھا۔ پس آپ اپنے ہاتھ ہی کے کام کی مزدوری میں سے کھایا کرتے تھے مقدام بن معدیکرب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کھانے سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے جو اپنے ہاتھوں سے کر کے کھائے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے کر کے کھاتے تھے۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولی اور چیونٹی وغیرہ کی زبان سکھلادی تھی اور اعلیٰ درجہ کی خوش آوازی عطا کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جب آپ زبور پڑھا کرتے تھے تو جنگلی جانور آپ کے قریب آجاتے تھے اور لوگ انہیں ہاتھوں سے پکڑ لیتے تھے اور پرند آپ پر سایہ کر لیتے تھے اور چلتا پانی ٹھہر جاتا اور ہوا رک جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو موسیٰ اشعری سے فرمایا کہ اے ابو موسیٰ تمہیں آل داؤد علیہ السلام کی خوش آوازیوں میں سے ایک خوش آوازی عطا ہوئی ہے یہ روایت متفق علیہ ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو (یعنی کفار کو) بعض سے (یعنی مؤمنین سے) دفع نہ کرتا رہے) نافع اور یعقوب نے دفع اللہ کو دفاع اللہ یہاں اور سورۂ حج میں بھی دال کے کسرہ اور فاء کے بعد الف بڑھا کر پڑھا ہے۔ دفاع کے معنی میں دفع کے مفہوم سے زیادتی ہے۔ باقی قراء نے دال کے فتح اور فاء کے جزم سے بغیر الف کے پڑھا ہے۔

لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ (تو تمام زمین میں فساد پھیل جائے) یعنی تمام روئے زمین پر مشرک غالب آکر فساد برپا کردیں، پھر تمام شہروں کو ویران کردیں اور بندگان الٰہی کو قتل کردیں اور ان پر ظلم کریں اور تمام یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے اور مسجدیں ڈھا دیں، جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا اور اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور لوگوں کو اللہ پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے سے روک دیں۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کا ہے اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ جہاد فرض ہونے (کا باعث اور اس) کی علت فساد رفع کرنا ہے جیسا کہ آیت لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کی تفسیر میں ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ بعض مفسرین نے یہ معنی لئے ہیں کہ اگر مؤمنین اور نیک لوگوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کفار اور فجار سے عذاب کو دفع نہ کرتا تو تمام روئے زمین کی مخلوق برباد ہو جاتی۔ بغوی نے عبد الرحمٰن بن احمد کے طریق سے انہوں نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان اللہ یدفع بالمسلم الصالح عن مائة اهل بيت من جيرانه البلاء یعنی ایک نیک مسلمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ

marfat.com

اس کے ہمسایوں میں سے سو گھر والوں کی بلا کو دفع کر دیتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض الآیة اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اگر (مخلوق میں) نماز پڑھنے والے اور دودھ پیتے بچے اور بے خطا جانور نہ ہوں تو تم پر بہت سخت عذاب ڈال دیا جائے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ (اور لیکن اللہ سارے عالم (کے لوگوں) پر فضل کرتا ہے)

تِلْكَ (یہ) تلک مبتدا ہے اور آگے اس کی خبر ہے۔ یہ مذکورہ قصوں کی طرف اور طالوت کو بادشاہ کرنے اور تابوت بھیجنے اور سرکش لوگوں کو بھگانے اور داؤد علیہ السلام کے جالوت کو مار ڈالنے اور ان کو سلطنت اور حکمت دینے اور جو چاہا انہیں سکھا دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اٰيٰتُ اللّٰهِ (اللہ کی آیتیں ہیں) یعنی اس کی قدرت اور تمہاری نبوت کی دلیلیں ہیں۔

نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (ہم سچائی کے ساتھ پڑھ کر تمہیں سناتے ہیں) یعنی اس طریقہ پر جو واقعہ کے مطابق ہے، جس میں اہل کتاب کو بھی شک نہیں ہے۔

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾ (اور بیشک تم پیغمبروں میں سے ہو) اور یہ آیتیں تمہاری پیغمبری پر یقینی شاہد ہیں کیونکہ جس نے کسی کتاب کو نہ پڑھا ہو وہ ان کو ہرگز نہیں جان سکتا۔ اللہ نے کفار کا یہ قول کہ "تم پیغمبر نہیں ہو" رد کرنے کے لئے یہاں اِنَّ وغیرہ سے تاکید کی ہے۔

تمت بالخیر

marfat.com

تفاسیر و علوم قرآنی اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر

دار الاشاعت کی مطبوعہ مستند کتب

تفاسیر و علوم قرآنی

تفسیر عثمانی بطرز تفسیر مع عنوانات جدید کتابت ۱ جلد ____ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔ اضافہ عنوانات جناب محمد ولی رازی

تفسیر مظہری اردو ____ ۱۲ جلدیں ____ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ

قصص القرآن ____ ۴ حصے در ۲ جلد کامل ____ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

تاریخ ارض القرآن ____ علامہ سید سلیمان ندویؒ

قرآن اور ماحولیات ____ انجینئر شفیع حیدر دانش

قرآن سائنس اور تہذیب و تمدن ____ ڈاکٹر حقانی میاں قادری

لغات القرآن ____ مولانا عبد الرشید نعمانی

قاموس القرآن ____ قاضی زین العابدین

قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی انگریزی) ____ ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی

ملک البیان فی مناقب القرآن (عربی انگریزی) ____ حسان پینٹرس

اعمال قرآنی ____ مولانا اشرف علی تھانویؒ

قرآن کی باتیں ____ مولانا احمد سعید صاحب

حدیث

تفہیم البخاری مع ترجمہ و شرح اردو ۳ جلد ____ مولانا ظہور الباری اعظمی۔ فاضل دیوبند

تفہیم المسلم ۳ جلد ____ مولانا زکریا اقبال۔ فاضل دار العلوم کراچی

جامع ترمذی ۲ جلد ____ مولانا فضل احمد صاحب

سنن ابو داؤد شریف ۳ جلد ____ مولانا سرور احمد صاحبؒ، مولانا خورشید عالم قاسمی صاحب فاضل دیوبند

سنن نسائی ۳ جلد ____ مولانا فضل احمد صاحب

معارف الحدیث ترجمہ و شرح ۳ جلد، ۷ حصے کامل ____ مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ

مشکوٰۃ شریف مترجم مع عنوانات ۳ جلد ____ مولانا عابد الرحمن کاندھلویؒ، مولانا عبد اللہ جاوید

ریاض الصالحین مترجم ۲ جلد ____ مولانا خلیل الرحمن نعمانی مظاہریؒ

الادب المفرد کامل مع ترجمہ و شرح ____ از امام بخاری

مظاہر حق جدید شرح مشکوٰۃ شریف ۵ جلد کامل اعلیٰ ____ مولانا عبد اللہ جاوید غازی پوری فاضل دیوبند

تقریر بخاری شریف ____ ۳ حصص کامل ____ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ

تجرید بخاری شریف ____ ایک جلد ____ علامہ حسین بن مبارک زبیدی

تنظیم الاشتات ____ شرح مشکوٰۃ اردو ____ مولانا ابو الحسن صاحبؒ

شرح اربعین نووی ____ ترجمہ و شرح ____ مولانا مفتی عاشق الٰہی البرنی

قصص الحدیث ____ مولانا محمد زکریا اقبال۔ فاضل دار العلوم کراچی

ناشر:- دار الاشاعت اردو بازار کراچی فون ۲۶۳۱۸۶۱-۲۲۱۳۷۶۸-۰۲۱

marfat.com

سیرۃ اور سوانح پر دار الاشاعت کراچی کی مطبوعہ مستند کتب

سیرۃ حلبیہ اردو اعلیٰ ۶ جلد (کمپیوٹر)	سیرۃ النبیؐ پر نہایت مفصل و مستند تصنیف	امام برہان الدین حلبیؒ
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۷ حصص در ۲ جلد	اپنے موضوع پر ایک شاندار علمی تصنیف مستشرقین کے جوابات کے ہمراہ	علامہ شبلی نعمانیؒ / سید سلیمان ندویؒ
رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ۳ حصے یکجا (کمپیوٹر)	عشق میں سرشار ہو کر لکھی جانے والی مستند کتاب	قاضی محمد سلیمان منصور پوری
محسن انسانیت اور انسانی حقوق	خطبہ حجۃ الوداع سے استشہاد اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب	ڈاکٹر حافظ محمد ثانی
رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی	دعوت و تبلیغ سے سرشار حضورؐ کی سیاست اور عملی تعلیم	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
شمائل ترمذی	حضور اقدسؐ کے شمائل و عادات مبارکہ کی تفصیل پر مستند کتاب	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
عہد نبوت کی برگزیدہ خواتین	اس عہد کی برگزیدہ خواتین کے حالات و کارناموں پر مشتمل	احمد خلیل جمعہ
دورِ تابعین کی نامور خواتین	تابعین کے دور کی خواتین 〃	〃
جنت کی خوشخبری پانے والی خواتین	اُن خواتین کا تذکرہ جنہوں نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے خوشخبری پائی	〃
ازواجِ مطہرات	حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا مستند مجموعہ	ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری
ازواج الانبیاء	انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے حالات پر پہلی کتاب	احمد خلیل جمعہ
ازواجِ صحابہ کرام	صحابہ کرامؓ کی ازواج کے حالات و کارنامے۔	عبدالعزیز الشناوی
اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم	ہر شعبۂ زندگی میں آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ آسان زبان میں۔	ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ
اسوۂ صحابہ ۲ جلد کامل یکجا	حضور اکرمؐ سے تعلیم یافتہ حضرات صحابہ کرام کا اسوہ۔	شاہ معین الدین ندوی
اسوۂ صحابیات مع سیر الصحابیات	صحابیات کے حالات اور اسوہ پر ایک شاندار علمی کتاب۔	〃
حیاۃ الصحابہ ۳ جلد کامل	صحابہ کرام کی زندگی کے مستند حالات۔ مطالعہ کے لئے راہ نما کتاب	مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ
طبِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات طب پر مبنی کتاب	امام ابن قیمؒ
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم	〃 کے حالات اور عربی قصائد مع تراجم پر مشتمل عشق و ادب میں ڈوبی تصنیف	مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ
سیرۃ خاتم الانبیاء	بچوں کے لئے آسان زبان میں مستند سیرت، مدارس میں داخل نصاب	مولانا مفتی محمد شفیعؒ
رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم	مشہور کتاب سیرۃ النبیؐ کے مصنف کی بچوں کے لئے آسان کتاب	سید سلیمان ندویؒ
سیرۃ خلفائے راشدین	مختصر انداز میں ایک جامع کتاب	مولانا عبدالشکور لکھنویؒ
الفاروق	حضرت عمر فاروقؓ کے حالات اور کارناموں پر محققانہ کتاب	علامہ شبلی نعمانی
حضرت عثمان ذوالنورین	حضرت عثمانؓ 〃	سعید الحق عثمانی

سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم — مختصر و آسان زبان میں — حضرت شاہ ولی اللہ

پیارے نبی کی پیاری صاحبزادیاں — ڈاکٹر حقانی میاں

تاریخِ اسلام ۴ حصص در ۲ جلد کامل	آغاز اسلام سے آخری خلیفہ کے زوال تک کی مستند تاریخ	شاہ معین الدین ندویؒ
اخبار الاخیار	ہند و پاک کے مشاہیر صوفیاء کا مستند تذکرہ	شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
حالاتِ مصنفینِ درسِ نظامی	پورا درس نظامی تصنیف کرنے والے ائمہ و علماء کے مستند حالات	مولانا محمد حنیف گنگوہی
نقشِ حیات	مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح۔	مولانا حسین احمد مدنیؒ
جہنم کے پروانہ یافتہ	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں پہنچانے والے ملعون کفار کے حالات	احمد خلیل جمعہ

ناشر: دار الاشاعت اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی ۱ پاکستان، فون و فیکس (۲۱۳۶۱۸۶۱) (۰۲۱)

اور مستند اسلامی و علمی کتب کا مرکز، قرآن پاک

دیگر اداروں کی کتب دستیاب ہیں، بیرون ملک بھیجنے کا انتظام ہے۔ / فہرست کتب مفت ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں۔

marfat.com

عربی زبان و لغت پر شاہکار تصانیف

قاموس الفاظ القرآن الکریم اردو
ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی / پروفیسر عبدالرزاق

قرآن کریم کی یہ لغت جذری ترتیب اور معنوی سیاق کے مطابق بشمول صرفی ونحوی ایضاحات اور مشہور جگہوں اور شخصیات کی تفصیل کے ساتھ مرتب کی جانے والی لغت۔ قرآن فہمی کے لئے ایک نایاب تحفہ
سفید کاغذ، عمدہ طباعت، کمپیوٹر کمپوزنگ، خوبصورت پائیدار جلد۔

کلمات القرآن
ڈاکٹر حقانی میاں قادری

کلمات القرآن کا یہ مجموعہ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ایک عام مبتدی اگر قرآن کریم کے معانی سیکھنا چاہے تو بہت آسانی کے ساتھ سیکھ سکتا ہے اور ہر سورۃ کا مختصر مفہوم بھی ہر سورۃ کے شروع میں دے دیا گیا ہے

مختار الصحاح اردو
اردو ترجمہ پروفیسر عبدالرزاق

الفاظ حدیث کے مستند معانی کی مشہور لغت جس سے ایک زمانے سے طالبان علوم حدیث استفادہ کررہے ہیں۔ اب اردو ترجمہ کے ساتھ پہلی بار
اعلیٰ کاغذ، ۲ رنگ طباعت، حسین جلد کے ساتھ

المنجد جامع عربی اردو باتصویر لغت
بیروت سے شائع ہونے والی مشہور زمانہ لغت المنجد الکبیر کا مستند ترجمہ جس میں ساٹھ ہزار عربی الفاظ محاورات وضرب الامثال درج ہیں۔ صفحات ۱۲۰۰
اعلیٰ کاغذ اعلیٰ جلد ۲۰×۳۰/۸

المعجم جامع اردو عربی لغت
چالیس ہزار الفاظ کی اردو سے عربی ڈکشنری اس کے علاوہ آخر میں بہت سی علمی معلومات کا قابل قدر ذخیرہ۔ صفحات ۸۸۰، اعلیٰ طباعت کاغذ اعلیٰ جلد سائز ۲۰×۳۰/۱۶

مصباح اللغات عربی اردو لغت
از مولانا عبدالحفیظ بلیاوی استاذ الادب لکھنؤ۔ پچاس ہزار عربی الفاظ کا نہایت جامع ومستند ذخیرہ۔ یہ عربی اردو لغت اپنی اشاعت اول سے اب تک اہل علم سے خراج تحسین حاصل کررہی ہے آخر میں دو ہزار الفاظ کا اضافہ بھی شامل ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۰۵۰ اعلیٰ کاغذ اعلیٰ جلد

قاموس القرآن قرآنی ڈکشنری عربی اردو
از: قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
قرآن کریم تمام الفاظ مع اردو تشریح اور ضروری صرفی ونحوی ترکیب اور اہم الفاظ پر تفسیری نوٹ لکھے گئے ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۸۱۶
اعلیٰ کاغذ وطباعت اعلیٰ جلد

القاموس الاصطلاحی الجدید عربی اردو
از: مولانا وحید الزماں کیرانوی
بیس ہزار جدید عربی الفاظ واصطلاحات کا قابل قدر ذخیرہ جو جدید عربی الفاظ، اخبارات ورسائل ودفاتر وغیرہ میں آج کل مستعمل ہیں، کاغذ وطباعت اعلیٰ جلد سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۵۲۸

قاموس المدرسی عربی سے انگریزی / انگریزی سے عربی
دو ڈکشنریوں کا مجموعہ
جو عربی انگریزی کے خوب صورت ٹائپ میں چھپی ہیں۔ اعلیٰ کاغذ وطباعت خوبصورت جلد
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۸۱۶

بیان اللسان عربی اردو ڈکشنری
از: قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
چالیس ہزار سے زیادہ قدیم وجدید عربی الفاظ کی تشریح مع ضروری لغوی مباحث کے کی گئی ہے۔ عربی ممالک میں مستعمل جدید اور قرآن کریم کے تمام لغات شامل ہیں
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۹۳۲ اعلیٰ کاغذ وطباعت

لغات القرآن (کلاں) چھ جلد مع فہرست الفاظ
مولانا رشید احمد نعمانی — مولانا عبدالدائم جلالی
قرآن پاک کے معانی ومطالب کو سمجھنے کیلئے نہایت مفصل اور جامع لغات القرآن اردو زبان میں سب سے زیادہ مستند اور بڑی لغات القرآن۔ کل صفحات ۲۱۷۶
اعلیٰ کاغذ وطباعت حسین جلدیں

لغات کشوری اردو
از: مولوی سید تصدق حسین رضوی
ہند وپاک کی مشہور ومعروف اور مستند لغت جو نولکشور پریس لکھنؤ سے چھپتی تھی جس میں چالیس ہزار الفاظ واصطلاحات شامل ہیں۔ اعلیٰ کاغذ اعلیٰ جلد
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۶۱۲

فرہنگ فارسی فارسی سے اردو جامع لغت
مولانا محمد رفیع فاضل دیوبند
فارسی وعربی کے قدیم وجدید پچاس ہزار الفاظ کے معنی نہایت سلیس عبارت میں درج ہیں۔ ضرورت کے تمام الفاظ پر حاوی لغت۔ اعلیٰ کاغذ اعلیٰ جلد
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۸۰۰

فرہنگ نامہ جدید فارسی اردو انگریزی
از: پروفیسر فیروز الدین رازی
بیس ہزار فارسی الفاظ کی اردو اور انگریزی میں بہترین تشریح۔ یہ لغت پہلی مرتبہ چھپی ہے۔
اعلیٰ کاغذ وطباعت اعلیٰ جلد

جامع اللغات اردو
از: مولانا محمد رفیع عثمانی فاضل دیوبند
پچاس ہزار الفاظ کی نہایت مستند لغت۔ جو ضرورت کے تمام الفاظ پر حاوی ہے۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ اعلیٰ کاغذ وطباعت صفحات ۸۰۰

عربی بول چال عربی اردو انگریزی
استاد محمد ابن المصری کی مشہور کتاب "طریقہ جدیدہ" کا اردو اور انگریزی ترجمہ۔ دو حصے کامل قیمت
جدید کمپیوٹر ایڈیشن

عربی کے جدید لغات مع اردو تشریح
جدید عربی زبان کے دو ہزار الفاظ کا مجموعہ مع اردو تشریح۔ رنگین ٹائٹل۔ قیمت

عربی صفوۃ المصادر
مع لغات جدیدہ
اعلیٰ طباعت، سفید کاغذ، رنگین ٹائٹل قیمت

فہرست کتب مفت ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں
دارالاشاعت اردو بازار **کراچی** فون ۲۱۳۷۶۸

marfat.com

تفسیر مظہری

جلد دوم

بقیہ سورۂ بقرہ سے سورۂ نساء
پارہ ۳ تا پارہ ۴

تالیف
حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ
تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات
مولانا سید عبد الدائم الجلالی
رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر
دار الاشاعت
اردو بازار کراچی ۱
فون ۲۱۳۷۶۸

marfat.com

کاپی رائٹ رجسٹریشن نمبر
اس ترجمہ وکمپوزنگ کے حقوق ملکیت پاکستان میں بحق دارالاشاعت کراچی محفوظ ہیں۔

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی
طباعت : ۱۹۹۹ء شکیل پریس کراچی۔
ضخامت : صفحات در ۶ جلد

ملنے کے پتے

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 26-نابھہ روڈ لاہور
کشمیر بک ڈپو۔ چینوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انار کلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور

marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین تفسیر مظہری اردو جلد دوم

عنوان	صفحہ
تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض	۱۵
رسول اللہ ﷺ کی تمام انسانوں پر فضیلت	〃
رسول اللہ ﷺ کے بعض معجزات اور خصوصیات	۱۶
حدیث ان اللہ خلق خلقه فی ظلمة الخ کی تشریح	۱۷
مسئلہ :- تقدیر الٰہی پر ایمان	۱۸
احادیث :- لا تفضلوا بین انبیاء اللہ اور لا تخیرونی علی موسیٰ اور لا اقول ان احدا افضل من یونس کی تشریح	〃
مسئلہ :- تمام حوادث اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں	〃
حضرت عمرؓ کا قول کہ رسول اللہ ﷺ کے وفات پاتے ہی عرب مرتد ہوگئے اور انہوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا الخ	۱۹
مسئلہ :- جتنا سایہ اصل کا محتاج ہوتا ہے اس سے بڑھ کر یہ کائنات اپنی ہستی اور بقاء ہستی کے لئے خالق کی محتاج ہے	۲۰
حدیث :- اللہ سوتا نہیں اور نہ سونا اس کے لئے زیبا ہے۔	〃
کرسی کا ذکر اور تمام زمینوں اور آسمانوں کا کرسی سے توازن	۲۱
آیۃ الکرسی کے فضائل	۲۲
جہاد کی غرض دفع فساد ہے جبراً مسلمان بنانا مقصود نہیں	۲۳
مسئلہ :- ایمان محض عطاء خداوندی ہے	۲۴
حدیث ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ کی تشریح	۲۷
نمرود اور حضرت ابراہیمؑ کا قصہ	۲۸
آیت :- اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ کے ذیل میں ارمیاؑ یا عزیرؑ کا قصہ اور اس امر کی تشریح کی قریہ سے کون سا قریہ مراد ہے	۲۹
حدیث :- ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء کی تفصیل	۳۱
آیت :- وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کی تفصیل	۳۳
حدیث :- نحن احق بالشک من ابراہیم	۳۴
حدیث :- لیس الخبر کالمعاینة	〃
صوفیہ کے نزدیک عروج و نزول کی حقیقت	۳۵
حدیث :- ماضر عثمان ماعمل بعد الیوم	۳۸
حدیث :- لا یدخل الجنة منان ولا عاق	۴۰
ریاء اور شہرت پرستی کی ممانعت	〃
حدیث :- ایکم مال وارثه احب الیه من ماله	
حدیث :- نفی کتفهامن الانفاق	۴۱
مسئلہ :- نابالغ کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں	۴۲
حدیث :- حرام مال سے صدقہ قبول نہیں	۴۳
اگر مال اسباب اور غیر منقولہ املاک بغرض تجارت ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب ہے، کیا ہر سال کی زکوٰۃ واجب ہے	۴۴
حدیث :- ما من مسلم یغرس غرسا او یزرع زرعاً کی تشریح۔	〃
حدیث :- لا یدخل هذا فی بیت قوم الا ادخله الذل	۴۵
مسئلہ :- انگور، چھوارے اور ہر قسم کے غلہ کا عشر یا نصف عشر ادا کرنا واجب ہے۔	〃
سبزیاں اور ترکاریاں کیا عشر سے مستثنیٰ ہیں۔	
مسئلہ :- کیا غلہ کی زکوٰۃ دینے کیلئے سال تمام ہونا اور عاقل، بالغ ہونا ضروری ہے یا صرف اسلام کافی ہے اور کیا غلہ کا	۴۷

marfat.com

عنوان	صفحہ
نصاب یعنی پانچ وسق ہونا لازم ہے	۴۷
مسئلہ :- خراجی زمین کی پیداوار کا حکم اور اس کی تفصیل	〃
مسئلہ :- چاندی اور سونے کی کان کا حکم، عام معدن کا حکم	۴۸
مسئلہ :- کھرا مال بچا کر ردّی مال زکوٰۃ میں دینا جائز نہیں	۵۰
اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت اور کنجوسی کی مذمّت	
علماء کی فضیلت	۵۲
چھپا کر دینا ظاہر طور پر دینے سے افضل ہے	
حدیث :- سبعة يظلهم الله، کی تفصیل	۵۳
حدیث :- ثلاثة يحبهم الله و ثلاثة يبغضهم کی تفصیل	
حدیث :- صدقة السر تطفئي الذنب	۵۴
مسئلہ :- مال کو برباد کرنا حرام ہے	۵۵
مسئلہ :- نفلی خیرات غیر مسلم ذمی کو دی جا سکتی ہے، زکوٰۃ عشر وغیرہ کا مستحق صرف مسلمان ہے	۵۵
مسئلہ :- دینی طالب علم اور مجاہدین اور سوال نہ کرنے والے فقراء جیسے اصحاب صفّہ جن کی تعداد چار سو تھی خیرات کے زیادہ مستحق ہیں	۵۶
سوال کی ممانعت اور مقدار مال جس کی موجودگی میں سوال کی ممانعت ہے	۵۷
جہاد کے لئے گھوڑا پالنے کے متعلق حدیث	۵۸
آیت :- اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا کی تشریح	〃
حدیث معراج کے ذیل میں سود خوروں کو دیکھنے کا بیان جن کے پیٹ کیا تھے کوٹھڑیاں تھیں	〃
سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور گواہی دینے والے کے متعلق حدیث	۵۹
مسئلہ :- دوامی عذاب کافروں کے لئے مخصوص ہے	۶۰
مسئلہ :- بیع کیا ہے، دیوانہ اور ناسمجھ بچہ کی بیع درست نہیں سمجھ رکھنے والے بچہ کی بیع درست ہے	〃
مسئلہ :- بغیر زبان سے الفاظ کہے، بیع کے لین دین	〃
مسئلہ :- فضولی کی خرید فروخت، بیع کی صحت کیلئے ولایت شرعیّہ لازم ہے	۶۱
مسئلہ :- بیع کے چار اقسام اور ان کے احکام	۶۲

عنوان	صفحہ
مسئلہ :- سود کی حرمت، سود کی حرمت کی علت کیا ہے۔	۶۴
کیا آیت ربوا مجمل ہے؟	
مسئلہ :- ناپ تول کی چیزوں کو اگر ہم جنس چیزوں کے عوض فروخت کیا جائے تو کمی بیشی اور ادھار ناجائز ہے کسی ایک چیز کی تاخیر ادا کے عوض یا ردّی ہونے کی وجہ سے مقدار میں کمی بیشی کرنا ناجائز ہے	〃
مسئلہ :- چھواروں کے عوض کھجوروں کی اور کشمش کے عوض انگوروں کی اور تر گندم کے عوض خشک گندم کی بیع کا حکم	〃
مسئلہ :- گنتی سے بکنے والی چیزیں جن کا حجم تقریباً برابر ہوتا ہے	〃
مسئلہ :- جو کی بیع گیہوں کے عوض	
مسئلہ :- گیہوں کی بیع لوہے کے عوض	〃
مسئلہ :- کسی جانور کی بیع لوہے یا گیہوں کے عوض	
مسئلہ :- ہم جنس یا غیر جنس جانوروں کا باہمی تبادلہ	۶۶
مسئلہ :- بیع کو شرائط سے مشروط کرنے کا حکم اور اس میں اختلاف بعض شرائط بیکار ہوتی ہیں نہ ان سے بیع فاسد ہوتی ہے، نہ خود ان کی پابندی کی جاتی ہے، بعض شرطیں بیع کو فاسد نہیں کرتیں اور خود بھی ان کی پابندی ضروری ہوتی ہے، بعض شرطیں بیع کو فاسد کر دیتی ہیں ایسی بیع سود کے حکم میں ہوتی ہے	۶۹
مسئلہ :- حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے	۷۳
حدیث :- مااحداكثرمن الربوا الاكان عاقبة امره الى قلة کی توضیح	۷۴
حدیث :- مانقصت صدقة من مال ومازادالله بعفو الاعزأ وماتواضع احدلله الارفعه	۷۴
حدیث :- الخلق عيال الله	〃
خطبۃ الوداع کی حدیث :- الاكل شئ من امرالجاهلية تحت قدمي موضوع	۷۵
حدیث :- نهى رسول الله ﷺ ان تشترى التمرة حتى تطعم وقال اذاظهرالربوا فى قرية الخ	〃
حدیث :- مامن قوم يظهر الربوافيهم الخ	〃
مسئلہ :- سود خور کو قید کر دیا جائے جب تک توبہ نہ کرے نہ چھوڑا جائے، اگر وہ طاقتور ہو اور گرفتار نہ ہو سکے تو حاکم اسلام اس کے خلاف جنگ کرے، ہر تارکِ فریضہ اور	۷۶

marfat.com

عنوان	صفحہ
مرتکب کبیرہ کے متعلق یہی حکم ہے کہ اگر وہ گناہ اور ترک فریضہ پر جمے ہوئے ہوں تو ان کو قید کیا جائے تاوقتیکہ وہ توبہ نہ کرلیں	
حضرت ابو بکرؓ کا قول لو منعونی عقالا جاهدتهم	٧٦
حدیث :- مالدار اگر قرض کی ادائیگی کو ٹالتا ہے تو یہ ظلم ہے	//
مسئلہ :- مرتد کے مال کا حکم کہ کیا اس کا مال فئی ہے یا وارثوں کی میراث	//
مسئلہ :- تنگدست کو اداء قرض کی مہلت دینی واجب ہے	//
حدیث :- من یسر علیٰ معسر الخ	٧٧
نادار کو اداء قرض کی مہلت دینے اور قرض معاف کردینے کے متعلق احادیث	//
آیت :- واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله کی تشریح	٧٨
سب سے آخر میں یہی آیت نازل ہوئی اس کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کم وبیش ۲۱ روز زندہ رہے اور ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ کو حضور ﷺ کی وفات ہوئی۔	
مسئلہ :- بیع سَلم جائز ہے	٧٩
مسئلہ :- اگر ادائے مبیع کی مدت مقرر نہ ہو تو سَلم جائز نہیں اگر قیمت فوراً ادا نہ کی جائے اور ادائیگی کی مدت مقرر کرلی جائے تو درست ہے	٨٠
مسئلہ :- ادائے ثمن، ادائے مبیع، ادائے مہر کی میعاد مقرر کرنی لازم ہے، معیاد سے پہلے مطالبہ جائز نہیں مگر قرض کی ادائیگی کی میعاد لازم نہیں، میعاد سے پہلے مطالبہ صحیح ہے	
مسئلہ :- جب تک چیز کی جنس، نوع، صفت اور مقدار معلوم نہ ہو، بیع سلم ناجائز ہے، میعادِ اداء بھی مقرر ہونی چاہئے لیکن کیا رأس المال کی مقدار اور اداء مبیع کا مقام بھی معلوم ہونا ضروری ہے اور کیا وقت بیع سے وقت ادا تک مبیع کا بازار میں موجود ہونا لازم ہے یہ مسئلہ اختلافی ہے	//
مسئلہ :- ناپ تول والی اور غیر متفاوت گنتی کی چیزوں کی بیع سَلم جائز ہے کیا معدودات متفاوتہ کی بیع سَلم درست ہے	٨١
مسئلہ :- کیا جانور کی بیع سَلم درست ہے	//
مسئلہ :- کیا جانور قرض لینا دینا جائز ہے	٨٣
مسئلہ :- نکاح، خلع، صلح اور وہ تمام عقود جن میں مال کا مال سے تبادلہ نہیں ہوتا ان کے اندر شئ مبادلہ کا کسی قدر مجہول ہونا بھی درست ہے لیکن جہاں مال کا مال سے تبادلہ ہوتا ہے جیسے بیع اجارہ اور اقرار تو ان میں مکمل علم کی ضرورت ہے	٨٤
مسئلہ :- شریعت نے قرض کو عاریت کی طرح قرار دیا ہے مگر بدل قرض کو اصل قرض کا حکم دیا ہے	//
مسئلہ :- کن چیزوں کا قرض لینا دینا جائز ہے	//
مسئلہ :- قرض لینے والا قرض دینے والے کو کوئی تحفہ دینے کی شرط، قرض لینے کے وقت نہیں کرسکتا یہ ناجائز ہے لیکن بغیر شرط لگائے اگر دونوں میں تحفہ دینے لینے کی رسم ہو تو کوئی حرج نہیں	//
مسئلہ :- کیا روٹی اور خمیر قرض دینا لینا جائز ہے	٨٥
مسئلہ :- تحریر قرض اور اس سے متعلق بحث	٨٦
مسئلہ :- قرض دار کا اقرار کرنا قرض کا ثبوت ہے	
مسئلہ :- دیوانے، پاگل، دماغی مریض اور بچہ کی گواہی جائز نہیں	٨٧
کیا غلام کی شہادت معتبر ہے	//
مسئلہ :- مسلمان کے خلاف کافر کی گواہی معتبر نہیں، ہاں ایک فرقہ کے کافر کی دوسرے فرقہ کے کافر کے خلاف شہادت قابل قبول ہے	//
مسئلہ :- زنا کے گواہ چار مرد ہونا لازم ہیں	٨٨
دوسرے امور کی شہادت کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں	//
تعزیری جرائم اور قصاص میں عورتوں کی شہادت غیر مقبول ہے	//
کیا عورتوں کی شہادت نکاح طلاق وغیرہ میں معتبر ہے ؟	//
مسئلہ :- حدیث کی روایت کے لئے راوی کا آزاد ہونا یا مرد ہی ہونا یا متعدد ہونا لازم نہیں	٨٩
حدیث :- ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم حرام	٩٠
حدیث :- حرمة مالکم کحرمة دمکم	//
حدیث :- من قتل دون ماله فهو شهيد الخ	//
مسئلہ :- مالی معاملہ نہ ہو تو ایک گواہی کیساتھ مدعی کو ملا کر	//

marfat.com

عنوان	صفحہ
ڈگری دیدینا درست نہیں، مالی معاملہ تومسئلہ اختلافی ہے	
مسئلہ :- گواہ پر لازم ہے کہ لفظ اشہد کہہ کر گواہی دے	۹۲
مسئلہ :- جن امور کی مردوں کو اطلاع نہیں ہوتی اور مرد مشاہدہ نہیں کرتے ان کے متعلق تنہا عورتوں کی شہادت معتبر ہے، کیا تنہا ایک عورت کی شہادت کافی ہے یا دو ہونی چاہئیں یا چار یہ مسئلہ نزاعی ہے	″
مسئلہ :- فاسق کی شہادت ناقابل قبول ہے	۹۳
مسئلہ :- عدالت یعنی فاسق نہ ہونے کا معنی ہے فرائض کو ادا کرنا اور کبائر سے پرہیز رکھنا اور صغائر پر جم نہ جانا۔	″
فسق کی وجہ سے جن لوگوں کی شہادت مقبول نہیں یا اشتراک نسبی یا باہمی دشمنی کی وجہ سے مقبول نہیں انکا بیان۔	
مسئلہ :- کیا حاکم گواہ کے صرف ظاہری حال کو دیکھ لے یا اس کی اندرونی انکوائری بھی ضروری ہے	۹۴
مسئلہ :- ہمارے زمانہ میں کچھ شرطوں کے ساتھ فاسق کی شہادت قابل قبول ہے	″
مسئلہ :- متاخرین کے نزدیک اندرونی انکوائری کی جگہ گواہوں سے قسم لینی کافی ہے	″
حدیث :- انکم فی زمان من ترک منکم عشر ما امر به هلک	۹۵
مسئلہ :- فاسق اہل شہادت ہے حاکم اگر اس کی شہادت کو قبول کرلے تو درست ہے لیکن گناہ گار ہوگا	″
مسئلہ :- اگر حاکم کی عدالت قریب ہو اور گواہ کو طلب کیا جائے تو جانا لازم ہے، حدیث من کتم شهادة الخ	۹۶
مسئلہ :- اگر گواہ زیادہ بوڑھا ہو اور مدعی اس کو سوار ہونے کیلئے کوئی سواری دیدے تو کیا اسکی شہادت قبول کی جاسکتی ہے؟	″
مسئلہ :- گواہ کو کھانا کھلانا جبکہ پہلے سے شرط نہ کرلی ہو	″
حدیث :- رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنم میں	″
مسئلہ :- اگر واقعہ یاد نہ ہو تو صرف اپنی تحریر کو دیکھ کر کیا شہادت دینی جائز ہے	۹۷
مسئلہ :- کیا یہ جائز ہے کہ حاکم اپنے رجسٹر کے اندراجات پر عمل کرے۔	″
حدیث :- اذا رایت مثل الشمس فاشهد	″
مسئلہ :- خرید و فروخت کا گواہ بنانا مستحب ہے	۹۷
حدیث :- ابتاع النبی ﷺ فرساً من اعرابی اس حدیث میں تنہا خزیمہ کی شہادت کو دو گواہوں کے قائم مقام قرار دیا گیا	۹۸
حاکم کو اگر واقعہ خود معلوم ہو تو اپنے علم کی بناء پر فیصلہ کرنا جائز ہے	″
مسئلہ :- بادشاہ ہو یا کوئی اور اگر کسی پر اس کا کوئی حق ہو اور اس کو اپنے حق کا یقینی علم بھی ہو اور مدعی علیہ منکر ہو تو اس سے جبراً اپنا حق وصول کرنا جائز ہے	″
مسئلہ :- اگر دوسری عدالت میں مقدمہ لے جایا گیا ہو تو پہلی عدالت یا سابق حاکم کے علم کی بناء پر یہ دوسرا حاکم فیصلہ نہیں دے سکتا	″
مسئلہ :- مشتری اور بائع کسی کاتب یا شاہد کو ضرر نہ پہنچائیں اور نہ کاتب و گواہ مشتری و بائع کو ضرر پہنچائیں	″
مسئلہ :- رہن عقد لازم ہے اگر ایک درہم بھی قرض کا ادائیگی سے رہ گیا ہو، راہن مالِ مرہون کو واپس نہیں لے سکتا	۹۹
مسئلہ :- بغیر سفری حالت کے بھی رہن درست ہے	″
مسئلہ :- مالِ مرہون پر قبضہ کے بغیر رہن لازم نہیں ہوتا مشاع کا رہن درست نہیں ہے۔	″
مسئلہ :- بغیر مرتہن کی رضامندی کے راہن مال مرہون سے کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں کرسکتا	۱۰۰
مسئلہ :- راہن مالِ مرہون میں کسی طرح کا شرعی تصرف نہیں کرسکتا اگر مالِ مرہون کو بیع یا ہبہ وغیرہ کرے گا تو یہ بیع اور ہبہ مرتہن کی اجازت پر موقوف رہے گا	″
مسئلہ :- مرہون کا نفقہ راہن کے ذمہ واجب ہے	۱۰۱
مسئلہ :- مرہون کی پیداوار کا مالک راہن ہے مگر مالِ رہن کے ساتھ اس کی پیداوار بھی رہن رہے گی	″
مسئلہ :- مرتہن نے مرہون پر جو کچھ خرچ کیا ہو اسکا حکم	″
مسئلہ :- راہن مر جائے تو مرتہن کا حق مالِ مرہون کو فروخت کر کے ادا کیا جائے گا راہن کے وارث مالِ مرہون کو میراث میں نہیں لے سکتے۔	″
مسئلہ :- اگر راہن کے قبضہ میں مالِ مرہون ہلاک ہو جائے	۱۰۲

marfat.com

عنوان	صفحہ
اور راہن کی کوئی خطا نہ ہو تو کیا اس کو ہلاکت کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا یا نہیں	
حدیث :۔ لاایمان لمن لاامانة له ولادین لمن لاعهدله الخ	۱۰۳
مسئلہ :۔ شہادت کو پوشیدہ رکھنا حرام ہے	۱۰۴
مسئلہ :۔ اگر مشہود لہ (مدعی) گواہ کے گواہ ہونے سے ناواقف ہو تو شاہد پر واجب ہے کہ وہ اپنا شاہد ہونا مدعی کو بتادے	۱۰۴
حدیث :۔ خیرامتی قرنی ثم الذین یلونهم	〃
حدیث :۔ الااخبرکم بخیرالشهداء الخ	〃
مسئلہ :۔ غیر مادی مخلوق بھی ممکنات کی ایک قسم ہے	〃
مسئلہ :۔ قلبی افعال کا مواخذہ ہو سکتا ہے	〃
اندرونی برائیوں اور خوبیوں کا بیان	〃
حدیث :۔ من هم بسیئة علم یعمل بها الخ	۱۰۶
مسئلہ :۔ حساب حق ہے	〃
مسئلہ :۔ چھوٹے بڑے گناہوں کی سزا دینے کا اللہ کو حق ہے لیکن ان پر عذاب لازم نہیں اللہ جس کو چاہے بخش دے	〃
فصل	
بعض لوگ بلا حساب جنت میں جائیں گے بلا حساب جنت میں جانے والا گروہ صوفیہ اور شہداء وغیرہم کا ہوگا	〃
مسئلہ :۔ صحابہؓ اور اہل السنت والجماعت کے ایمان کی تعریف	〃
بنی اسرائیل کے بہتر فرقے بن جانے کی صراحت (الحدیث)	۱۰۸
مسئلہ :۔ ناممکن عمل پر مکلف کرنا شریعت میں وارد نہیں قدرت شرط ہے، قدرت موجود قبل از فعل اور قدرت حقیقی موجود مع الفعل کا فرق	۱۰۹
حدیث :۔ ان الله تجاوز عن امتی ماوسوست به صدورها	۱۱۱
فائدہ :۔ اگر مؤمن نفسانی اور قلبی واردات خبیثہ کو دفع کرنے کی کوشش میں لگا رہے تو مجھے امید ہے کہ واردات خبیثہ پر اس کی گرفت نہ ہوگی	〃

عنوان	صفحہ
حدیث :۔ ترکت فیکم الثقلین	۱۱۲
مسئلہ :۔ اللہ کی کتاب اور آلِ رسولؐ اور فقراء، صوفیہ کا دامن پکڑنا ضروری ہے	〃
مسئلہ :۔ گناہ کرنے سے دل پر زنگ آجاتا ہے آخرت میں اللہ بھول چوک کا مواخذہ نہیں کرے گا، دنیا میں نسیان اور خطاء کو کالعدم نہیں کہا جاسکتا، بھول کر ترک کی ہوئی نماز یا روزہ کی قضاء سجدۂ سہو، کفارہ اور قتل خطاء کی وجہ سے میراث سے محرومی دنیوی احکام شریعت میں موجود ہے	〃
مسئلہ :۔ نماز میں بھول کر کلام کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے	۱۱۳
مسئلہ :۔ کیا بھول کر جماع کرنے سے حج فاسد ہو جاتا ہے	〃
مسئلہ :۔ کیا غلطی سے یا جبر کی وجہ سے دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔	〃
مسئلہ :۔ کیا بھول کر کچھ کھا لینے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور غلطی سے کھا لینے سے فاسد ہو جاتا ہے۔	〃
مسئلہ :۔ کیا ذبح کرتے وقت اگر بسم اللہ کہنی بھول گیا تو ذبیحہ حلال ہے	〃
سورۂ بقرہ ختم کر کے آمین کہنا مستحب ہے	۱۱۴
فصل	
سورۂ بقرہ اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کے فضائل	۱۱۵
کبائر کی وجہ سے مؤمن ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا	
سورۂ آل عمران	
اللہ کے اسم اعظم کی تحقیق	۱۱۸
جو دعاء حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ کے اندر کی تھی	〃
اللہ کا اسم اعظم لے کر دعاء کی جائے تو وہ قبول فرماتا ہے	〃
فائدہ	
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۱۲۰
الفرقان کی تحقیق	〃
اللہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے	۱۲۱

marfat.com

عنوان	صفحہ
اللہ ماں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بنا دیتا ہے	۱۲۲
حدیث :- ان خلق احدکم یجمع فی بطن امہ اربعین یوماً	//
آیات محکمات کی تشریح	//
آیات متشابہات کی تشریح	۱۲۳
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۱۲۴
فی قلوبہم زیغ سے کون لوگ مراد ہیں	//
آیات محکمات اور متشابہات کی بحث، کیا متشابہات کی تاویل جائز ہے، کیا کسی حکم کو وقت حاجت سے مؤخر کرنا جائز ہے۔	۱۲۴
رویت الٰہی کی بحث	//
متشابہات میں پڑنا دین میں فتنہ ڈالنے کے لئے ہے	//
متشابہات کی تاویل سے صرف خدا واقف ہے	۱۲۵
اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان متشابہات ایک راز ہے	//
راسخین فی العلم کون لوگ ہیں	۱۲۶
حدیث :- کوئی قلب ایسا نہیں جو رحمٰن کی چٹکی میں نہ ہو	۱۲۷
مسئلہ :- وعدۂ خداوندی کے خلاف ہونا ناممکن ہے لیکن وعید عذاب کی خلاف ورزی جائز ہے	۱۲۸
غزوۂ بدر کا قصہ	//
بدر کے مجاہدین کی تعداد	۱۲۹
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۱۳۰
تزئین شہوات کی بحث	۱۳۱
قنطار کی تشریح	۱۳۲
جنت کی نعمتوں کی تفصیل اور اس کی صراحت کہ تمام انسانی مرغوبات جنت میں ملیں گے	۱۳۳
جنت کی نعمتوں میں ازواج کے خصوصی تذکرہ کی وجہ	//
دنیوی نعمتیں اللہ کو پسند نہیں	۱۳۴
حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے والہانہ محبت ہونے کا راز	۱۳۵
محض ایمان مستحقِ مغفرت بنا دیتا ہے	۱۳۶
سحر کے وقت استغفار کرنے کا ذکر	//
اللہ ہر رات دنیوی آسمان کی طرف نزول اجلال فرماتا ہے	۱۳۷
مستغفرین بالاسحار کی تفصیل	//
حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اللہ نے اجسام سے چار ہزار برس پہلے ارواح کو پیدا کیا	۱۳۸
حدیث :- الاسلام ان تشہد ان لاالہ الااللہ الخ	//
آیت :- شہداللہ انہ الخ کی نقلی تشریح	۱۳۹
رسول اللہ ﷺ کی نبوت میں اہل کتاب کے اختلاف کی تفصیل	//
اہل کتاب کا رسول اللہ ﷺ سے مناظرہ کا ذکر	۱۴۰
نبی ﷺ کے ذمے صرف تبلیغ ہے	//
حدیث :- ای الناس اشدعذاباً	۱۴۱
علماء یہود کا تذکرہ	۱۴۲
یہودی عالم ابن صوریا کا ذکر	//
قرآن کا فیصلہ کہ اہل کتاب حق پر نہیں ہیں	۱۴۳
یہودیوں کا غلط اعتقاد	//
آیت :- قل اللہم مالک الملک کی شان نزول	//
آیت :- قل اللہم مالک الملک کی تفسیر	//
اللہم کی تحقیق	۱۴۴
مسئلہ :- وجود خالص خیر ہے جو واجب کی طرف سے حاصل ہوئی ہے اور عدم شر ہے جو ممکن کا جزءِ ذاتی ہے	۱۴۵
آیت :- ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر کی تفسیر	//
وہ آیات جو مقبولُ الشّفاعت ہیں	۱۴۶
آیت :- لایتخذ المومنون الکافرین کی شان نزول	//

فصل

عنوان	صفحہ
حب فی اللہ اور بغض فی اللہ، فاسق کی دوستی کی ممانعت	۱۴۷
مسئلہ :- تقیہ کی بحث	//
کفار کی دوستی، خدا کی دوستی سے محروم کردیتی ہے	۱۴۸
آیت :- ان اللہ یدنی العبد فیضع علیہ کتفہ	۱۴۹
آیت :- مامنکم من احدالاسیکلمہ ربہ	//
بندہ کی خدا سے محبت اور خدا کی بندہ سے محبت اللہ سے	۱۵۰
محبت کے لئے رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم ہے	۱۵۱
ایک سوال اور اس کا جواب	//

marfat.com

عنوان	صفحہ
آل ابراہیم و آل عمران کی تشریح	۱۵۲
علمین کا معنی	۱۵۳
امرأۃ عمران کا قصہ	۱۵۴
گرجا کی خدمت کے لئے لڑکے کو وقف کئے جانے کا دستور	//
حدیث :- جو بچہ پیدا ہوتا ہے، پیدائش کے وقت شیطان اس کو مس کرتا ہے سوائے حضرت عیسیٰؑ کے	۱۵۵
حضرت فاطمہؓ اور آپ کی اولاد کا معصوم ہونا	//
حضرت مریمؑ اور حضرت فاطمہؓ کی کرامتیں	//
حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش کا واقعہ	۱۵۶
حضرت زکریاؑ کا مریمؑ کی کفالت کرنا	//
حضرت مریمؑ کے پاس رزق جنت سے آتا تھا	۱۵۷
اولیاء اللہ کی کرامت کا ثبوت	//
حضرت زکریاؑ کی دعاء	۱۵۸
حضرت زکریاؑ کو حضرت یحییٰؑ کے پیدائش کی بشارت	//
حضرت یحییٰؑ کی فضیلت	//
حضرت زکریا علیہ السلام کا اپنے بڑھاپے کے باوجود لڑکے کی پیدائش پر اظہار حیرت	۱۵۹
حضرت مریمؑ، حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت آسیہؓ زوجہ فرعون کے فضائل	۱۶۱
قرعہ اندازی کے لئے دریا میں قلموں کا ڈالنا	۱۶۲
لفظ مسیح کی تحقیق	//
حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش	۱۶۳
حضرت عیسیٰؑ کے معجزات اور فضائل	۱۶۴
حضرت عیسیٰؑ کو طبی معجزہ کیوں دیا گیا	۱۶۵
حضرت عیسیٰ کا مکتب میں جا کر بچوں کو غیب کی باتیں بتانا	//
حضرت عیسیٰؑ کی قوم کو تبلیغ	۱۶۶
حضرت عیسیٰؑ کا اپنے حواریوں کو مدد کے لئے بلانا	۱۶۷
ومکروا و مکر اللہ کی تفسیر	۱۶۸
حضرت عیسیٰؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا اور قیامت سے پہلے اترنا	//
حضرت عیسیٰؑ کے زمین پر اترنے کی تفصیل	۱۶۹
حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تفصیل	۱۷۰
قیاس بھی ایک شرعی دلیل ہے	۱۷۲

عنوان	صفحہ
مباہلہ کا بیان اور خلفاء ثلاثہ کے خلیفہ نہ ہونے پر رافضیوں کی دلیل کا رد	۱۷۳
مسئلہ :- اگر اپنے مذہب کے خلاف صحیح حدیث مل جائے تو حدیث پر عمل واجب ہے	۱۷۵
حدیث :- لاطاعة للمخلوق فی معصية الخالق	//
علماء اور صوفیہ کے اس قول پر عمل کرنا جس کی شرعی سند نہ ہو جائز ہے یا ناجائز	۱۷۶
مسئلہ :- قبروں پر مسجدیں بنانا چراغ جلانا اور طواف کرنا ناجائز ہے	//
رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک ہرقل کے نام	۱۷۷
حضرت جعفرؓ کی حبشہ کو ہجرت اور نجاشی کے سامنے کفار قریش سے مناظرہ	۱۷۹
آیت :- ودت طائفة من اهل الكتاب کی شان نزول	۱۸۱
یہودی علماء کی تدبیر مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لئے کارگر نہیں ہوئی	
ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے	۱۸۲
مسلمان کی امانت داری اور یہودی کی خیانت	۱۸۴
حدیث :- امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا الخ	//
منافق کی نشانیاں	۱۸۵
یمین غموس	//
حدیث :- الدواوین ثلثه لاالعبابه	۱۸۶
تین آدمی جن سے اللہ بات نہیں کرے گا	۱۸۷
عبادت خداوندی کا حصر صرف توحید میں ہے	۱۸۸
ربانیین کی تشریح	//
اللہ کا تمام نبیوں سے عہد و پیمان	۱۸۹
ایک انصاری کا مرتد ہونا اور پھر مسلمان ہو جانا	۱۹۲
ان الذین کفروا بعد ایمانهم الخ کی شان نزول	۱۹۴
حدیث :- یقول الله لاهون اهل النار عذابا	۱۹۵
کفر کی حالت میں مرنا خیرات قبول نہ ہونے کا سبب ہے	//
پارہ لن تنا	
آیت :- لن تنالوا البر حتی تنفقوا کی تفسیر، محبوب ترین	۱۹۶

marfat.com

عنوان	صفحہ
مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنا اور صدقہ دینا	۱۹۶
اگر مقدار واجب سے کم دے گا تو واجب ادا نہ ہوگا	//
زکوٰۃ کس مال پر واجب ہے	۱۹۷
کیا آیت میں انفاق سے مراد زکوٰۃ ہے ؟	//
حضرت ابو طلحہؓ کا باغ بَیرحاء صدقہ میں دینا	//
راہِ خدا میں دینے کا مفہوم کیا ہے	۱۹۸
آیت :- کل الطعام کان حلالبنی اسرائیل کی تفسیر	//
آیت :- وعلیکم بالصدق وایاکم والکذب	۲۰۰
اللہ پر جھوٹ باندھنے والے ہی ظالم ہیں	//
آیت :- اول بیت وضع سے مراد کعبہ ہے	۲۰۱
سب سے پہلی مسجد مسجد حرام کس نے بنائی اور کیسے بنی ؟	//
کعبہ اور بیت المقدس وغیرہ میں نماز کے فضائل، کیا یہ حکم فضیلت صرف فرض نماز کے سلسلہ میں ہے یا عام ہے ؟	۲۰۲
بیت اللہ کا احترام احادیث اور آیات کی روشنی میں	//
مسجد حرام میں داخل ہونے والا مامون ہے	۲۰۳
حج کی فرضیت اور شرائط ائمہ کا باہمی اختلاف مع دلائل	۲۰۴
کیا عورت بلا محرم کے حج کر سکتی ہے ؟	۲۰۶
حج میں توشہ لے جانا واجب ہے	۲۰۸
ترکِ حج پر سخت وعید	//
کعبہ کی صورت اور حقیقت	۲۰۹
نماز و قرآن کی صورت و حقیقت	//
انصار میں پھوٹ پیدا کرانے کیلئے یہودیوں کی فتنہ انگیزی	۲۱۰
حدیث :- انی تارک فیکم کتاب اللہ واھل بیتی	۲۱۲
اہل بیت اور ان علماء کا ذکر جو ہدایت کے قطب ہیں	//
تقویٰ کا حق دل اور نفس وغیرہ کی تونگری ہے	۲۱۳
کمالِ ولایت کیا ہے ؟	//
اسلام ہی پر تمہاری موت ہو، اس کی تشریح	۲۱۴
اجماع کے اتباع کا حکم	//
اس امت کے تہتر فرقے بننے کی صراحت	۲۱۵
اسلام میں اول ترین بغاوت	//
گروہِ انصار پر اللہ کا احسان	//
حدیث :- ان اللہ یرضی لکم ثلاثا ویبغض لکم ثلاثا	۲۱۴

عنوان	صفحہ
انصار کے ابتدائی اسلام کا واقعہ اور عقبۂ اولیٰ کی بیعت	۲۱۶
مصعبؓ بن عمیر کی تبلیغ اسلام اور ان کی اسلام سے متعلق گفتگو	۲۱۷
عقبۂ ثانیہ کی بیعت	۲۱۸
عقبۂ ثانیہ کی بیعت کے بعد شیطان کا چیخنا	۲۱۹
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ان لوگوں کا بیان جو دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرتے ہیں اور خود اپنے کو بھول جاتے ہیں	۲۲۰
ضوابطِ الٰہیہ میں سستی کرنے والے کی تمثیل	۲۲۱
ایک سوال اور اس کا جواب	۲۲۲
مسائل میں علماء کا مختلف الرائے ہونا	//
حدیث :- اختلاف العلماء رحمۃ	۲۲۳
آیت :- فاماالذین اسودت وجوھھم میں بدعتی مراد ہیں اسی طرح حدیث انی علی الحوض میں پرے روکے جانے والوں سے مراد بدعتی ہیں	//
حدیث :- با ادروابالاعمال فتنا	//
حدیث :- لایدخل الجنة احد أعمله	۲۲۴
امت محمدیہ اور صحابہؓ کی فضیلت	۲۲۵
امت محمدیہ کے مردان ہدایت کی قوتِ ارشاد	۲۲۶
حدیث :- اتدرون ما الایمان بالله وحده	۲۲۷
حدیث :- نمازِ عشاء کو دیر سے پڑھنے کے متعلق	۲۲۹
کافروں اور بدعتیوں سے اندرونی دوستی رکھنے کی ممانعت	۲۳۱
کافروں سے دوستی کا جواز بشرطیکہ مسلمانوں سے اسلام کی وجہ سے ان کو دشمنی نہ ہو	//
حدیث :- هل نفعت اباطالب شیئا الخ	//
صابر متقی اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والے کو دنیا کی کوئی طاقت ضرر نہیں پہنچا سکتی	۲۳۳
غزوۂ احد کے لئے رسول اللہ ﷺ کا برآمد ہونا اور غزوۂ احد کے متعلق آیت کا نازل ہونا	۲۳۴
غزوۂ بدر کا مجمل تذکرہ	۲۳۷
بنو قریظہ کا محاصرہ	۲۳۸
احد کی لڑائی میں حضرت جبرئیلؑ و حضرت میکائیلؑ کا کافروں سے لڑنا	۲۳۹

marfat.com

عنوان	صفحہ
آیت :- لیس لک من الامر شیئ کا شان نزول	۲۴۰
احد کے دن رسول اللہ ﷺ نے کافروں پر لعنت کی اور بعض قبائل کیلئے بد دعاء کی، اس کی ممانعت میں آیت کا نزول	〃
سود کھانے کی ممانعت، سود کھانے سے دل میں ایسی سختی پیدا ہو جاتی ہے کہ انجام کار کفر تک پہنچا دیتی ہے	۲۴۲
حدیث :- بادروابالاعمال سبعا	〃
سخاوت کی فضیلت	۲۴۳
غصہ کو ضبط کرنے کا ذکر	
احسان اور حسن سلوک اللہ کو مرغوب ہے	۲۴۴
استغفار اور صلوٰۃ استغفار کا بیان	〃
حدیث :- استغفار کرنیوالا گناہ پر قائم رہنے والا نہیں ہوتا۔	۲۴۵
حدیث :- گناہوں پر قائم رہتے ہوئے استغفار کرنے والا ایسا ہے جیسے کوئی خدا سے مذاق کرے۔	۲۴۶
صغائر پر جمار ہنا کبیرہ ہو جاتا ہے	〃
جنگ احد کا بیان	۲۵۲
کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے اعمال کا مقصد صرف شکر ادا کرنا ہوتا ہے، ان کو دنیا سے یا آخرت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا	۲۵۵
مسئلہ :- مسلمانوں کو مصائب میں مبتلا کرنا اللہ کی مہربانی ہے	۲۵۹
مسئلہ :- جنگ احد میں فرار ہونے کی وجہ سے صحابہؓ پر طعن کرنا جائز نہیں۔	۲۶۲
حدیث :- من تشبہ بقوم فھو منھم	۲۶۳
باہم مشورہ کرنے کا حکم	۲۶۵
توکل کیا ہے؟	۲۶۶
مالِ غنیمت میں چوری کرنے پر وعید	۲۶۸
قریش اور عرب کے فضائل	۲۶۹
احد کے شہیدوں کی تعداد	۲۷۱
مسئلہ :- کیا شہید کے درجہ کو کوئی اور بھی پہنچ سکتا ہے	۲۷۴
چاہ معونہ کو بھیجے ہوئے جہادی دستہ کا ذکر	۲۷۵
باجماعِ علماء شہید کو غسل نہ دیا جائے، اگر کوئی شخص بحالت جنابت شہید ہوا ہو تو کیا اس کو غسل دیا جائے گا	۲۷۸
شہید کے جنازہ کی نماز کے متعلق ائمہ کا اختلاف	۲۷۹
احد کے شہیدوں کی نماز پڑھی گئی؟	〃
احد کے شہیدوں کی نماز رسول اللہ ﷺ نے آٹھ برس کے بعد پڑھی	۲۸۱
نماز سے کیا مراد ہے؟	〃
غزوہ حمراء الاسد کا بیان	۲۸۲
غزوہ بدر صغریٰ کا ذکر	۲۸۳
حدیث :- کچھ مانگو تو اللہ سے مانگو اور مدد چاہو تو اللہ سے چاہو	۲۸۷
حدیث :- سب سے اچھا آدمی کون سا ہے فرمایا جس کی عمر لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں	۲۸۸
بخل اور ترکِ زکوٰۃ پر وعید	۲۸۹
حدیث :- قبر جنّت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے	۲۹۴
کعب بن اشرف کو قتل کرنے کیلئے محمد بن مسلمہ اور ابو نائلہ کا جانا	۲۹۵
مسئلہ :- کیا رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے کی وجہ سے کسی معاہد کافر کو قتل کرنا جائز ہے	۲۹۷
صبر کیا ہے؟ کیا صبر کافروں سے انتقام لینے کے منافی ہے	۲۹۸
علم کو چھپا رکھنے کی ممانعت	〃
بیمار، نماز پہلو کے بل یا چت لیٹ کر پڑھے	۳۰۰
فکر کا معنی	۳۰۱
اللہ کی ذات میں تفکّر کرنے کی ممانعت	〃
اللہ کا ذاتی علم نہ حصولی ہے نہ حضوری بلکہ سب سے وراء ہے	〃
حدیث :- فاجر پر رشک نہ کرو	۳۰۸
حدیث :- دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے، جیسے کوئی سمندر میں اپنی انگلی ڈبولے	〃
حدیث :- حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا کہ کسریٰ اور قیصر تو ایسے عیش و راحت میں ہیں اور آپ رسول خدا ہوتے ہوئے ایسی حالت میں	۳۰۹
حدیث :- دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے	〃
نجاشی کے جنازہ کی غائبانہ نماز کا ذکر	〃
صبر رکھنا، جنگ میں ثابت قدم رہنا، فوج کی دیدبانی کرنا اور	۳۱۰
ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا	〃
سورۂ آل عمران کے فضائل	〃

marfat.com

سورۃ النساء

عنوان	صفحہ
حدیث :- عورتیں آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں	۳۱۳
رشتۂ قرابت جوڑنے اور توڑنے کا بیان	۳۱۴
حدیث :- لایتم بعد الاحتلام	۳۱۵
مسئلہ :- پیام نکاح دینے والا جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے	۳۱۷
چار عورتوں سے زیادہ کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں	۳۱۸
مسئلہ :- اگر مسلمان ہونے کے وقت چار عورتوں سے زیادہ یا دو بہنیں اس کے نکاح میں ہوں تو کیا کرے؟	۳۱۹
مسئلہ :- غلام کے لئے دو عورتوں سے زیادہ کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں، نکاحوں کی کثرت افضل ہے اور جوش شہوت سے مغلوب کے لئے نکاح فرض ہے	۳۲۰
عدل نہ کرسکنے کی صورت کا حکم	″
مسئلہ :- نکاح شغار (یعنی تور) کا نکاح ناجائز ہے	۳۲۱
مسئلہ :- اپنا کل مال بیوی بچوں کو دے کر خود ان کا دست نگر بن جانا جائز نہیں	۳۲۳
مسئلہ :- لڑکے اور لڑکی کا بالغ ہونا	۳۲۴
مسئلہ :- سادہ لوح بے وقوف کو مالی تصرفات سے روک دینے کا حکم	۳۲۵
مسئلہ :- ہوشمند اگر سادہ لوح ہو جائے تو کیا حکم ہے	۳۲۶
مسئلہ :- قرض داری کی وجہ تصرفات سے روک دینا	۳۲۷
مسئلہ :- کیا ادائے قرض کے لئے قرض دار مفلس کی اجازت درست ہے	۳۲۷
مسئلہ :- کیا یتیم کے سرپرست کے لئے یتیم کا مال کھانا جائز ہے	۳۲۷
آیت :- للرجال نصیب مما ترک الوالدان کا شان نزول	۳۲۹
آیت :- واذا حضر القسمة اولوا القربی والیتمی الخ کی تشریح اور یتیم کا مال کھانے کی ممانعت	۳۳۰
تقسیم میراث کے مسائل	۳۳۲
میت کی اولاد اور میت کے بیٹے کی اولاد کا حکم	۳۳۲
والدین کا حکم	۳۳۴
مسئلہ :- ماں کا حصہ ایک تہائی سے گھٹ کر چھٹا کب ہوتا ہے	۳۳۶
مسئلہ :- اگر جد صحیح میت کے بھائی بہنوں کے ساتھ موجود ہو تو کیا حکم ہے	″
مسئلہ :- جدۂ صحیحہ کا حکم	″
مسئلہ :- ترکہ سے تعلق رکھنے والے حقوق کی ترتیب	۳۴۱
مسئلہ :- ایک تہائی ترکہ میں وصیت کا نفاذ	″
حدیث :- جب کوئی جنت میں داخل ہوتا ہے تو اپنے ماں باپ بیوی اور اولاد کے متعلق سوال کرتا ہے	″
حدیث :- وارث کے لئے وصیت نہیں	۳۴۲
شوہر اور بیوی کا حکم	″
اخیافی بھائی بہن کی میراث	۳۴۵
مقدار وصیت، اور وارثوں کی میراث کی کاٹ	″

فصل

عنوان	صفحہ
وصیت کے اقسام	″
مسئلہ :- عول کی بحث	۳۴۷
مسئلہ :- عصبہ کے اقسام	۳۴۸
مسئلہ :- رد کی بحث	۳۴۹
مسئلہ :- اگر فرضیت اور عصبیت دونوں وجوہ استحقاق جمع ہو جائیں تو کیا حکم ہے	۳۵۰
مولی عتاقہ کی وراثت کب ثابت ہوگی	″
مسئلہ :- ذوی الارحام کی بحث	″
ذو جہتین (یعنی عصبہ اور اہل فرض) کا حکم	″
مسئلہ :- ذوی الارحام کے اقسام	۳۵۲
مسئلہ :- قاتل کو میراث نہیں مل سکتی، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قتل عمد اور قتل خطاء میں کوئی فرق نہیں	″
مسئلہ :- نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے نہ کافر مسلمان کا	۳۵۳
مسئلہ :- عیسائی یہودی کا اور یہودی عیسائی کا وارث ہوتا ہے	″
مسئلہ :- انبیاء کسی کے وارث نہیں ہوتے نہ کوئی ان کا وارث ہوتا ہے	۳۵۴
زنا اور اس کی سزا	۳۵۵

marfat.com

عنوان	صفحہ
مسئلہ :- لواطت اور اس کی سزا	۳۵۵
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۳۵۷
توبہ کر لینے کے بعد اذیت نہ دی جائے	؍؍
سانس کا غرغرہ ہونے یا مغرب کی جانب سے سورج نکلنے سے پہلے توبہ قبول ہو سکتی ہے اس مضمون کی احادیث	۳۵۸
بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کا بیان	۳۶۱
رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیوں اور بیبیوں کے مہر کا ذکر	؍؍
مسئلہ :- جماع سے مہر کا وجوب ہوتا ہے یا خلوت صحیحہ سے	۳۶۲
مسئلہ :- باپ کی منکوحہ سے نکاح حرام ہے	۳۶۴
زناء باعث حرمت مصاہرت ہے	۳۶۵
مس بالشہوۃ سے بھی مصاہرت حرام ہو جاتی ہے	۳۶۶
نسبی اور رضاعی محرمات کے مسائل	؍؍
کتنا ہی کم دودھ پیا ہو حرمت رضاعت ہو جاتی ہے	۳۶۷
شیر خوارگی کی مدت کے بعد عورت کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت نہیں ہوتی	۳۶۸
مسئلہ :- شیر خوارگی کی مدت دو سال ہے	؍؍
مسئلہ :- وہ خسرالی عورتیں جن سے نکاح حرام ہے	۳۷۰
مسئلہ :- دو بہنوں کو نکاح میں جمع رکھنا حرام ہے	۳۷۲
مسئلہ :- دودھ پلانے والی انّا کا اعزاز اور رضاعی رشتہ داروں کے رشتہ کو قطع کرنے کی حرمت	؍؍

marfat.com

تفسیر مظہری اردو جلد ۲

پارہ تلک الرسل (البقرة)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تِلْكَ الرُّسُلُ تِلْكَ سے مرسلین کی جماعت کی جانب اشارہ ہے آیت مندرجۂ بالا وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ سے جماعت مرسلین کا علم ہو چکا تھا الرُّسُل میں لام استغراقی ہے (یعنی تمام پیغمبر) تِلْكَ موصوف ہے۔ الرُّسُل اس کی صفت ہے۔ دونوں کا مجموعہ مبتدا ہے اور فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ خبر ہے۔

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (ہم نے (مذکورہ بالا) پیغمبروں کی جماعت میں سے ایک کو دوسرے پر برتری عطا فرمائی) (لغت میں) فضل کا معنی ہے کسی صفت میں زیادتی یعنی وصف مشترک میں ایک چیز کا دوسری چیز سے بڑھ جانا لیکن عرف اور اصطلاح میں فضل ایسے کمال کی زیادتی کو کہتے ہیں جس پر دنیا میں ستائش اور آخرت میں ثواب مرتب ہو۔ اب اگر ایک میں مخصوص طور پر ایک کمال ہو اور دوسرے میں خصوصیت کے ساتھ دوسرا کمال تو فی الجملہ ہر ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہو جاتی ہے یعنی (جدا جدا) دینوی ستائش اور اخروی ثواب کا استحقاق دونوں کو حاصل ہوتا ہے لیکن پوری پوری فضیلت اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو ثواب اور قرب الٰہی زیادہ حاصل ہو تمام انبیاء اور پیغمبر اگرچہ وصف رسالت و نبوت میں شریک ہیں اور سب کو اجر و ثواب کا استحقاق ہے لیکن کثرتِ ثواب اور مراتبِ قرب میں ان کے آپس میں اتنا تفاوت ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی اس سے واقف نہیں ہاں اللہ کے بتانے سے ہی اس کا علم ہو سکتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ان میں سے کوئی تو وہ تھا جس سے اللہ نے کلام کیا۔ اہل تفسیر کہتے ہیں اس سے مراد حضرت موسیٰ ہیں کیونکہ اللہ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق ہی فرمایا ہے فَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ الخ لیکن اس آیت سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت موسیٰ کو ہی یہ فضیلت دی گئی تھی (ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہونا اس سے ثابت ہوتا ہے پس ہو سکتا ہے کہ اللہ نے کسی دوسرے پیغمبر سے بھی کلام کیا ہو) اسی لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ دونوں مراد ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے طُور پر کلام کیا اور حضور سرور کائنات فخر موجودات (علیہ التحیۃ والسلام) سے شب معراج میں جبکہ بقدر دو کمانوں کے یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا اس وقت اللہ نے اپنے بندہ کو وحی سے سرفراز فرمایا ان دونوں حالتوں اور کلاموں میں عظیم الشان تفاوت ہے۔

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (اور کوئی وہ تھا جس کو بمراتبِ بلندی عطا فرمائی) یعنی بعض کو بعض پر یا بعض کو باقی تمام پر بہت درجے؟ اونچا کر دیا بعض انبیاء کو بعض پر بمراتبِ بلندی تو بہت سے انبیاء کو حاصل ہوئی تھی رسولوں کو انبیاء پر فضیلت عطا کی گئی تھی پھر اُولُوا العزم رسولوں کو دوسرے رسولوں پر بھی بہت رفعت حاصل تھی لیکن تمام رسولوں اور نبیوں پر برتری صرف رسول ﷺ کو حاصل ہوئی تھی۔ اس قول کا ثبوت احادیث سے ہوتا ہے اور اسی پر اجماعِ امت ہے۔

marfat.com

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میں بنی آدم کا سردار ہونگا اور (میرا یہ کلام بطور) فخر نہیں ہے۔ میرے ہاتھ میں حمد کا پھریرا ہوگا اور (میرا یہ قول بھی بطور) فخر نہیں ہے آدم کی تمام اولاد اور اس کے علاوہ دوسرے بھی میرے ہی جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور زمین پھٹ کر سب سے اوّل میں ہی برآمد ہونگا اور (یہ بھی بطور) فخر نہیں ہے اور میں ہی سب سے اوّل سفارشی ہونگا اور میری ہی سفارش سب سے پہلے قبول کی جائے گی۔ احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ کچھ صحابیؓ بیٹھے باتیں کررہے تھے حضور اقدس ﷺ برآمد ہوئے اور صحابیوںؓ کو باتیں کرتے سنا۔ ایک صاحبؓ کہہ رہے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا خلیل بنالیا تھا۔ دوسرے نے کہا موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے کلام کیا۔ تیسرے نے کہا عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔ چوتھے بولے آدم علیہ السلام کو صفی اللہ بنایا تھا۔ حضور ﷺ نے برآمد ہوکر فرمایا میں نے تمہاری تعجب آگیں باتیں سنیں کہ ابراہیمؑ خلیل اللہ تھے بیشک وہ ایسے ہی تھے اور موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے واقعی وہ ایسے ہی تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے حقیقت میں وہ ایسے ہی تھے اور آدم علیہ السلام صفی اللہ تھے وہ اسی طرح تھے لیکن میں حبیب اللہ ہوں (ﷺ) اور میرا یہ کلام بطور) فخر نہیں۔ میں ہی جنّت کی زنجیر سب سے پہلے کھٹ کھٹاؤں گا اور اللہ میرے لئے جنّت کو کھول دیگا اور مجھے اندر داخل فرمائے گا۔ اس وقت میرے ساتھ فقراء مسلمین بھی ہونگے اور (یہ بات بطور) فخر نہیں۔ میں اللہ کے ہاں تمام اگلوں پچھلوں سے زیادہ معزز ہوں اور (یہ کلام بھی بطور) فخر نہیں۔ (ترمذی و دارمی)۔

حضرت جابر راوی ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا میں قائد مرسلین ہوں اور (یہ کلام بطور) فخر نہیں۔ میں خاتم النّبیین ہوں اور (یہ کلام بطور) فخر نہیں میں سب سے اوّل سفارش کرنے والا ہوں اور سب سے پہلے میری سفارش مانی جائے گی اور (یہ بات بھی بطور) فخر نہیں۔ (دارمی) حضرت ابی بن کعب راوی ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا قیامت کا دن ہوگا تو میں انبیاء کا امام خطیب اور ان کی طرف سے سفارشی ہونگا اور کوئی فخر نہیں۔ (ترمذی) حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا زمین پھٹ کر سب سے اوّل میں ہی برآمد ہونگا اور مجھے جنّت کا خلعت پہنایا جائے گا۔ پھر عرش کے دائیں جانب اس مقام پر میں کھڑا ہونگا کہ میرے سوا اس جگہ پر مخلوق میں سے کوئی کھڑا نہ ہوگا۔ (ترمذی)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (میرے لئے) اللہ سے وسیلہ طلب کرو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وسیلہ کیا چیز ہے فرمایا جنّت کا سب سے اونچا درجہ ہے جس پر صرف ایک شخص پہنچے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ پہنچنے والا میں ہی ہونگا، (ترمذی) یہ تمام احادیث اگرچہ آحاد ہیں لیکن معنیٰ کے لحاظ سے ان میں تواتر ہے اور امت اسلامیہ نے ان کو مانا ہے۔

امام محی السنۃ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رسول ﷺ کو ان جیسے تمام معجزات دیئے گئے تھے جو دوسرے پیغمبروں کو الگ الگ دیئے گئے تھے اور اس مجموعہ معجزات کے علاوہ بھی آپ کو معجزات عطا فرمائے گئے تھے جیسے انگلی کے اشارہ سے چاند کا پھٹ جانا۔ آپ کے جدا ہونے کی وجہ سے ستونِ حنانہ کا رونا پتھروں اور درختوں کا آپ کو سلام کرنا چوپایوں کا کلام کرنا اور آپ کی رسالت کی شہادت دینا۔ آپ کی انگلیوں کے درمیان سے فوارہ کی طرح پانی کا پھوٹ کر نکلنا، ان کے علاوہ بیشمار معجزات تھے جن میں سب سے نمایاں قرآن مجید ہے جس کی مثل پیش کرنے سے آسمان و زمین کے باشندے عاجز ہے اس بیان کے بعد بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو کوئی ایسا معجزہ دیا گیا جو دوسرے انسانوں کی قدرت سے خارج تھا اور مجھے جو معجزہ عطا کیا گیا وہ اللہ کا کلام ہے جو میرے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجا گیا پس مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے متبعین کی تعداد زیادہ ہوگی۔ (بخاری و مسلم)۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے بحوالہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں عطا کی گئیں ایک ماہ کی مسافت تک میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی زمین

marfat.com

کو میرے لئے مسجد اور پاک قرار دیا گیا للذا میری امّت میں سے جس کسی کو (جہاں) نماز کا وقت آجائے وہ (وہیں) نماز پڑھ لے (خواہ مسجد ہو یا گھر یا صحرا وغیرہ) میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا مجھ سے پہلے کسی نبی کے لئے حلال نہیں کیا گیا اور مجھے شفاعت (کا حق) دیا گیا اور ہر نبی کو صرف اسی کی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجا جاتا رہا مگر مجھے سب لوگوں کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا۔ (متفق علیہ)

بغوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی سند سے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کیا کہ رسول ﷺ نے فرمایا چھ امور میں مجھے انبیاء پر برتری عطا فرمائی گئی مجھے الفاظ جامعہ (یعنی ایسے الفاظ جو باوجود مختصر ہونے کے معانی کثیرہ اور حقائق عظیمہ کو حاوی ہوں) دیئے گئے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال کر میری مدد کی گئی۔ مال غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا۔ میرے لئے زمین کو مسجد اور پاک قرار دیدیا گیا۔ مجھے تمام مخلوق (جن وانس) کے لئے بھیجا گیا۔ مجھ پر انبیاء کو ختم کر دیا گیا، (مسلم) اس مبحث کی تفصیل بہت طویل ہے تنگی مقام مفصل بیان کی اجازت نہیں دیتی اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کی جاچکی ہیں۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ اور عیسیٰؑ بن مریمؑ کو ہم نے کھلے ہوئے معجزات عطا کئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پالنے کے اندر ہی لوگوں سے باتیں کیں آپ مادر زاد نابینا اور برص کی بیماری والے کو تندرست کر دیا کرتے تھے۔ آپ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور آسمان سے آپ پر خوان اتار اگیا تھا۔

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (اور جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ سے ہم نے اس کی مدد کی تھی) اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی حد سے زیادہ آپ کی توہین کرتے تھے (نعوذ باللہ حرامی بچہ کہتے تھے) اور عیسائی آپ کی تعظیم میں بہت آگے بڑھ چکے تھے (نعوذ باللہ خدا کا بیٹا کہنے لگے تھے)۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ (مفعول محذوف ہے) یعنی اگر اللہ سب لوگوں کو ہدایت کرنا چاہتا تو

مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ پیغمبروں کے بعد لوگ باہم نہیں لڑتے۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ کھلے ہوئے معجزات آنے کے بعد۔

وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا لیکن اللہ نے اپنی جلالی و جمالی صفات اور اپنے مختلف اسماء (مثلاً) ہادی، مضل غفار، قہار، منتقم اور عفو کا ظہور چاہا اس لئے (کفر و اسلام اور ہدایت و گمراہی میں) لوگ مختلف ہو گئے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ پس کچھ تو ایمان لے آئے (یعنی اللہ نے اپنی مہربانی سے دین انبیاء کا پابند رہنے کی ان کو ہدایت، توفیق عطا فرمادی) یہ وہی لوگ تھے جن کا دین اللہ کی صفت ہدایت کا مظہر قرار پایا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ اور کچھ وہ لوگ ہوئے جنہوں نے کفر کیا یعنی اللہ نے تقاضائے عدل کے تحت انکی مدد نہیں کی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کا دین اللہ کی صفت اضلال کا مظہر قرار پایا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور ڈالا پس جس نے وہ نور پالیا ہدایت یاب ہو گیا اور جو نور کو نہ پاسکا وہ گمراہ ہو گیا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ علم الٰہی کے مطابق قلم (لکھ کر) خشک ہو گیا، (احمد و ترمذی)۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا اس جملہ کا دوبارہ ذکر اوّل جملہ کی تاکید کے لئے ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ لیکن اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اس پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ کوئی اس کی حکمت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ بغوی کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی بن ابی طالب سے دریافت کیا امیر المؤمنین مجھے تقدیر کی حقیقت بتا دیجئے۔ فرمایا یہ تاریک راہ ہے اس پر نہ چل۔ اس نے مکرّر سوال کیا آپ نے فرمایا یہ گہرا سمندر ہے اس میں داخل نہ ہو اس نے سوال کا پھر اعادہ کیا تو فرمایا یہ پوشیدہ راز ہے اس کی جستجو نہ کر۔ یعنی حقیقت تقدیر نا قابل فہم ہے

marfat.com

انسانی دانش کی وہاں تک رسائی نہیں جس طرح گہرے سمندر میں گھسنا اور تاریک راہ میں چلنا تباہی آفریں ہے اسی طرح اس حقیقت (سربستہ) کی جستجو ہلاکت انگیز ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جس نے تقدیر کے معاملہ میں کچھ گفتگو کی اس سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی اور اگر کچھ نہ کہا تو سوال نہ ہوگا۔ (ابن ماجہ)۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر اللہ تمام آسمان وزمین کے رہنے والوں کو عذاب دے تو اس کا عذاب ظلم نہ ہوگا اور اگر سب پر رحم فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی (یعنی اعمال موجب سزا ہیں اور مجرم کو سزا دینا ظلم نہیں اور رحم کرنا اس کی مہربانی ہے اور مہربانی اعمال کے زیر اثر نہیں بلکہ اعمال سے بہتر ہوگی اگر تم کوہِ احد کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کرو تو اللہ قبول نہیں فرمائے گا۔ تاوقتیکہ تمہارا ایمان تقدیر پر نہ ہو اور جب تک تم کو اس کا یقین نہ ہو کہ جو کچھ تم کو پہنچنے والا ہے وہ پہنچ کر رہے گا اور نہیں پہنچنے والا ہے تو نہیں پہنچے گا۔ اگر اس عقیدہ کے خلاف دوسرے عقیدہ پر مروگے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت خدیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم کے اقوال بھی اسی مضمون کے مروی ہیں بلکہ حضرت زید بن ثابت نے تو فرمان نبوی اسی مضمون کا بیان کیا ہے۔ (احمد ابوداؤد، ابن ماجہ)۔

...... ایک شبہ

آیتِ مذکورہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ بعض انبیاء بعض سے افضل تھے لیکن حضرت ابو سعید و حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کے پیغمبروں کے درمیان (باہمی) تفضیل نہ کرو۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک کو دوسرے پر برتری نہ دو (صحیحین) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے موسیٰ (علیہ السلام) سے برتر نہ کہو ایک دوسری حدیث میں فرمایا میں قائل نہیں کہ کوئی بھی یونس بن متیؑ سے افضل ہے (متفق علیہ)۔

...... ازالہ

حضور ﷺ کی مراد یہ ہے کہ جب تک اللہ نہ بتادے خود اپنی رائے سے دلیل شرعی کے بغیر ایک پیغمبر کو دوسرے پر فضیلت دینا جائز نہیں کیونکہ فضیلت کا معنی کثرتِ ثواب اور قربِ خداوندی کے زیادتی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور انسانی رائے سے اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہاں اگر قرآن یا حدیث سے بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت ثابت ہو تو تفضیل بین الانبیاء میں کوئی حرج نہیں ہے اب اگر دلیل فضیلت قطعی ہو تو تفضیلِ شخصی کا عقیدہ رکھنا واجب ہے اور اگر دلیل متنِ حدیث یا اسنادِ حدیث کے لحاظ سے ظنی ہو جس میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہو تب بھی تفضیل بین الانبیاء کا عقیدہ رکھنے میں کوئی گناہ نہیں اسی پر انبیاء کے علاوہ دوسروں کو قیاس کرنا چاہئے کہ دلیل ظنی کی بنا پر کسی عالم (صحابی، تابعی وغیرہ) کو دوسرے عالم پر فضیلت دینے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مؤخر الذکر دونوں حدیثیں اس وقت کی ہوں جبکہ رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیاء پر اپنی فضیلت معلوم نہ ہوئی ہو، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ معتزلہ کا قول ہے کہ جو چیز بندوں کے لئے اصلح یعنی زیادہ مفید ہے اس کو کرنا خدا پر واجب ہے اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں تمام حوادث اس کی مشیت کے تابع ہیں وہ سب کچھ کر سکتا ہے اچھائی ہو یا برائی ایمان ہو یا کفر اس آیت سے اہل سنت کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام آدمیوں کے دل ایک آدمی کے دل کی طرح رحمن کی چٹکی میں ہیں جس طرح چاہتا ہے موڑ دیتا ہے اس کے بعد حضور ﷺ نے دعا کی اے اللہ! اے دلوں کو پھیر دینے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے (مسلم، احمد، ترمذی) ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت انس کی روایت سے اور امام احمد نے

marfat.com

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ اے اہل ایمان ہم نے اپنے عطا کردہ رزق میں سے جس چیز کو خرچ کرنا تم پر واجب کر دیا ہے اس کو خرچ کرو۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ اس دن کے آنے سے پہلے جس میں تم اپنے قصور کی تلافی اور عذاب خداوندی سے بچاؤ نہیں کر سکو گے۔

لَّا بَیْعٌ کیونکہ اس روز خرید و فروخت نہ ہو گی کہ مال حاصل کر کے راہِ خدا میں خرچ کر سکو یا عذاب سے اپنی جانوں کو بچانے کے لئے بطور عوض مال دے سکو۔

فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ اور نہ دوستی ہو گی کہ دوست تمہاری مدد کر سکیں یا دوستی کی وجہ سے چشم پوشی کر سکیں۔

وَّلَا شَفَاعَةٌ (اور نہ بغیر اذنِ خدا سفارش ہو گی) ابو عمرو اور ابن کثیر نے اس آیت میں لا کے بعد تینوں لفظوں پر اور سورۂ ابراہیم کی آیت لَا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ میں دونوں لفظوں پر اور سورۂ طور کی آیت لَا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیْمٌ میں دونوں لفظوں پر فتحہ بغیر تنوین کے پڑھا ہے اور اصل استعمال یہی ہے (یعنی لا نفی جنس کے لئے ہے اور یہی لا کا اصل استعمال ہے باقی قاریوں نے ہر جگہ لا کے بعد رفع مع تنوین پڑھا ہے کیونکہ یہ سوال محذوف کا جواب ہے سوال ہوتا تھا کہ کیا اس روز بیع یا دوستی یا سفارش ہو سکے گی اس کا جواب دیا اس روز نہ بیع ہو گی نہ دوستی نہ سفارش۔

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اور کافر ہی بیجا حرکتیں کرنے والے ہیں عبادت بے محل کرتے ہیں اور مالی صرف بے محل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اللہ کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے اور اپنی جانوں کو عذاب خداوندی میں مبتلا کرتے ہیں اس طرح وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ پس اے ایمان والو! تم ان کی طرح نہ بنو۔ یا آیت میں الکافرون سے مراد وہ کافر ہیں جو زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر تھے۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے الکافرون سے مراد ہیں زکوٰۃ نہ دینے والے، ترک زکوٰۃ کی برائی کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے زکوٰۃ نہ دینے کو کفر سے تعبیر کیا۔ جیسے حج نہ کرنے کو کفر کرنے سے تعبیر کیا ہے اور من لم یحج کی جگہ من کفر فرمایا ہے نیز آیت وَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ میں عدمِ ادائے زکوٰۃ کو مشرکوں کی صفت قرار دیا ہے اور یہ اشارہ کیا ہے کہ ترک زکوٰۃ کافروں کی خصوصیت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کی وفات کے بعد عرب مرتد ہو گئے اور کہنے لگے ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر یہ اونٹ کی ٹانگ باندھنے کی رسی دینے سے بھی انکار کریں گے تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا میں نے کہا اے جانشین رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ملائے رکھئے ان سے نرمی کیجئے فرمایا تم جاہلیت میں تو بڑے پکے تھے (اب) اسلام میں کیا ضعیف ہو گئے یقیناً وحی ختم ہو گئی دین کامل ہو گیا تو کیا میری زندگی میں دین میں نقصان ہو سکے گا۔ (رواہ رزین)۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ (یعنی عبادت کا مستحق اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ اسی کا دانا بینا شنوا اور صاحب قدرت و ارادہ ہونا درست ہے اور تمام مناسب صفات اس کیلئے لازم ہیں وہ خود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس کی تمام صفات بھی ازلی ابدی ہیں کیونکہ عدمِ فعلیت اور امکان سے وہ پاک ہے پس حیات ہی اس کی تمام صفاتِ کمالیہ کا سرچشمہ ہے۔

الْقَیُّوْمُ (مخلوق کو تھامنے والا) عمرو بن مسعودؓ کی قرات میں اَلْقَیَّامُ اور علقمہ کی قرات میں اَلْقَیِّمُ ہے۔ بغویؒ نے لکھا ہے ان تمام الفاظ کا معنی ایک ہی ہے۔ قیوّم کا معنی ہے نگراں (ابن مجاہد) یا ہر نفس کے اعمال کا نگراں (کلبی) قیوّم کا ترجمہ منتظم بھی کیا گیا ہے۔ ابو عبیدہؒ نے کہا قیوّم کا معنی ہے غیر فانی، بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ قیوّم وہ ہے جو ہمیشہ مخلوق کی حفاظت اور تدبیر کرنے والا ہو سیوطی نے ترجمہ کیا ہے ہمیشہ باقی رہنے والا میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کا مشترک معنی یہ ہے کہ اللہ لازوال

marfat.com

ہے بذات خود موجود ہے دوسری چیزوں کی نگرانی کرنے اور ہستی کو قائم رکھنے والا ہے اس کے بغیر کسی چیز کی بقاء اور ہستی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اللہ کے قیوم ہونے کا تقاضا ہے کہ جس طرح ہر چیز اپنی ہستی کے لئے خدا کی محتاج ہے اسی طرح بقائے ہستی میں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہے جس طرح سایہ اصل شئی کا محتاج ہوتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ کائنات اللہ کی محتاج ہے شانِ اعلیٰ اللہ کی ہی ہے۔

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند) اونگھ کا ذکر نیند سے پہلے کیا باوجودیکہ زور بیان کا تقاضا تھا کہ نیند کا ذکر اونگھ سے پہلے کیا جاتا (کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو نیند نہیں آتی نیند تو نیند اونگھ بھی نہیں آتی)

طرز بیانِ مذکور کی وجہ یہ ہے کہ وجودِ خارجی کے لحاظ سے اونگھ نیند سے پہلے ہوتی ہے اونگھ اعصاب دماغی کی وہ سستی ہوتی ہے جو نیند کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور نیند اس استرخائی کیفیت کو کہتے ہیں جو مرطوب بخارات کے چڑھنے سے دماغی اعصاب میں پیدا ہو جاتی ہے اور پٹھوں کے اسی ڈھیلے پن کی وجہ سے ظاہری حواس (بیرونی) احساس سے بیکار ہو جاتے ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں صفتِ سلبیہ کا اظہار ہے جس سے تشبیہ (مخلوق سے مشابہت) کی نفی ہو رہی ہے گویا اللہ کے حی قیوم ہونے کی یہ تائید ہے۔ نیند موت کی بہن ہے جس کو نیند یا اونگھ آتی ہے اس کا (بیرونی) نظامِ زندگی درست نہیں رہتا وہ اشیاء کی حفاظت اور نگہداشت سے (نیند کے اوقات میں) قاصر ہو جاتا ہے اسی لئے اَلْقَیُّوْمُ اور لَا تَاْخُذُہٗ کے درمیان حرف عاطف نہیں لایا گیا (کیونکہ حرف عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے اور یہاں فقدان نعاس ونوم اللہ کی قیومیت کی دلیل ہے) حضرت ابو موسیٰ اشعری کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے مجمع میں کھڑے ہو کر پانچ باتیں فرمائیں۔ فرمایا کوئی شک نہیں کہ اللہ نہیں سوتا اور نہ سونا اس کیلئے زیبا ہے وہ میزان کو نیچا اونچا کرتا ہے اسکے سامنے رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے لائے جاتے ہیں اور دن کے اعمال کی پیشی رات کے اعمال (آنے) سے پہلے ہو جاتی ہے۔ اس کا حجاب نور ہے اگر پردہ نور الٹ جائے تو اس کے انوارِ جمال حدِ نگاہ تک مخلوق کو سوختہ کر دیں، (مسلم)۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے یہ جملہ اللہ کی قیومیت کی تائید اور توحیدِ الوہیت کی دلیل ہے مراد یہ ہے کہ زمین و آسمان کی حقیقت کا جن اجزاء سے قوام ہوا ہے یا وہ اشیاء جو آسمان و زمین کے قوامی اجزاء تو نہیں ہیں مگر ان کے اندر موجود ہیں سب کی سب اللہ ہی کی ہیں اگر لَهُ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَافِیْهِنَّ کہا جاتا تو مفہومِ مذکور اس جملہ سے پورے طور پر ادا نہیں ہوتا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے کون سفارش کر سکتا ہے) یہ عظمت خداوندی کا اظہار ہے اور اس امر کا بیان ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے برابر اور ہمسر نہیں کہ خود سفارش کر کے اللہ کے عذاب کو دور کر سکے مقابلہ کر کے عذاب کو روک دینے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (وہی ان کے سامنے کی اور پیچھے کی چیزوں کو جانتا ہے) یعنی ان سے پہلے کی اور بعد کو آنے والی چیزوں کو یا ان چیزوں کو جانتا ہے جن کو انسان جانتے ہیں اور ان چیزوں کو بھی جن کو انسان نہیں جانتے یا ان چیزوں کو جانتا ہے جن کو لوگ لیتے یا ترک کرتے ہیں کسی چیز کو انداز کر دینا بتاتا ہے کہ انداز کرنے والے نے اس چیز کو پس پشت پھینک دیا۔ ھم کی ضمیر مَافِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کی طرف راجع ہے مَافِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عاقل اور بے عقل دونوں کو شامل ہے لیکن اہل عقل کو بے عقل مخلوق پر ترجیح دے کر ایسی ضمیر ذکر کر دی جو اہلِ عقل کے لئے مخصوص ہے اور بے عقل مخلوق اہل عقل کے ذیل میں آگئی یا ھُمْ کی ضمیر ذَا کی طرف راجع ہے (جو مَنْ ذَالَّذِیْ میں مذکور ہے) اور ذَا سے مراد ہیں انبیاء اور ملائکہ۔

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ (اور اہل علم اللہ کے علم کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے) یعنی اللہ کے معلومات کے کسی حصہ کو پورے طور پر نہیں جان سکتے۔ اللہ کو ہر چیز معلوم ہے پھر مِنْ عِلْمِهٖ کی قید لگانے سے اس بات پر

marfat.com

تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ کوئی علمی احاطہ نہیں کر سکتا۔ احاطۂ علمی کی نفی سے مراد ہے ایسے علم کامل کی نفی جو تمام اشیاء کی حقیقت کو محیط ہو۔ علم محیط صرف باری تعالیٰ کی خصوصیت ہے کسی مخصوص چیز کی حقیقت کا کامل علم بطور ندرت ممکن ہے کہ کسی کو ہو جائے لیکن تمام اشیاء کی حقیقت کوئی نہیں جانتا یا علم سے مراد وہ علم غیب ہے جو اللہ کے لئے مخصوص ہے یعنی اللہ کے علم غیب کے کسی حصہ کو کوئی احاطہ کے ساتھ نہیں جانتا۔

اِلَّا بِمَا شَآءَ (ہاں جس چیز کا علم اللہ دینا چاہے) تو اس کو مخلوق کا علم محیط ہوتا ہے اور اسا کم ہے اللہ نے خود ارشاد فرمایا ہے وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ط وَلَا يُحِيْطُوْنَ میں واوَ حالیہ ہے اور يَعْلَمُ کی ضمیر فاعلی ذوالحال ہے۔ یا واوَ عاطفہ ہے دونوں جملوں کا مجموعہ بتا رہا ہے کہ محیط کل اور ہمہ گیر علم ذاتی اللہ کی خصوصیت ہے اور یہ اللہ کی وحدانیت کا ثبوت ہے اس لئے دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف کو ذکر کیا۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اس کی کرسی آسمانوں اور زمینوں کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے) بیضاویؒ نے لکھا ہے یہ محض تمثیل ہے اللہ کی عظمت کی تصویر کشی مقصود ہے ورنہ واقع میں نہ اللہ کی کرسی ہے اور نہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کرسی سے مراد علم ہے مجاہدؒ کا بھی یہی قول ہے صحیفۂ علمی کو کراسہ اسی وجہ سے کہتے ہیں بعض علماء کا قول ہے کہ کرسی سے مراد حکومت اور اقتدار ہے موروثی حکومت کو عرب کرس کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کرسی کا معنی علم یا اقتدار قرار دیا جائے تو آیت لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ کے بعد جملہ مذکورہ کا ذکر بے سود ہوگا (کیونکہ آیت مذکورہ کا ابتدائی حصہ اللہ کے اقتدار پر اور آخری حصہ اللہ کے کمالِ علمی پر دلالت کر رہا ہے)۔

محدثین کا مشہور قول یہ ہے کہ کرسی ایک جسم ہے (جس میں لمبائی، چوڑائی اور موٹائی ہے) بغویؒ کا بیان ہے کہ کرسی (کے مصداق) میں علماء کا اختلاف ہے حسن کا قول ہے کہ کرسی ہی عرش ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ کرسی عرش کے سامنے قائم ہے اور آیت وَسِعَ الخ کا مطلب یہ ہے کہ کرسی کی وسعت زمین اور آسمان کی وسعت کے برابر ہے۔

ابن مردویہ رحمۃ اللہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہیں جیسے کسی بیابان میں کوئی چھلا پڑا ہو اور کرسی سے عرش کی بڑائی (بھی) ایسی ہے جیسے چھلے سے بیابان کی بڑائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ کرسی کے اندر ساتوں آسمان ایسے ہیں جیسے کسی ڈھال میں سات درہم ڈال دیئے جائیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور مقاتل رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ کرسی کے ہر پایہ کا طول ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے برابر ہے کرسی عرش کے سامنے ہے کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں ہر فرشتے کے چار منہ ہیں ان فرشتوں کے قدم ساتویں نچلی زمین کے نیچے پتھر پر ہیں یہ مسافت پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے ایک فرشتہ کی شکل ابوالبشر یعنی حضرت آدمؑ کی طرح ہے جو سال بھر تک آدمیوں کے لئے رزق کی دعا کرتا رہتا ہے۔ دوسرے فرشتہ کی صورت چوپایوں کے سردار یعنی بیل کی طرح ہے۔ چوپایوں کے لئے سال بھر رزق مانگتا رہتا ہے لیکن جب سے گوسالہ کی پوجا کی گئی اس وقت سے اس کے چہرہ پر کچھ خراشیں ہو گئی ہیں تیسرے فرشتہ کی صورت درندوں کے سردار شیر کی طرح ہے جو سال بھر درندوں کے لئے رزق کا طالب رہتا ہے چوتھے فرشتہ کی صورت پرندوں کے سردار یعنی گدھ کی طرح ہے جو پرندوں کے لئے سال بھر رزق کا سوال کرتا رہتا ہے۔

marfat.com

بعض احادیث میں آیا ہے کہ حاملینِ عرش اور حاملینِ کرسی کے درمیان ستر حجاب تاریکی کے اور ستر حجاب نور کے ہیں اور ہر حجاب کی موٹائی پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے اگر یہ حجابات نہ ہوں تو کرسی کے اٹھانے والے عرش کو اٹھانے والوں کے نور سے سوختہ ہو جائیں۔

اصل میں کرسی صرف اتنی ہی جگہ کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے نشست گاہ سے فاضل جگہ کو کرسی نہیں کہا جاتا گویا لفظ کرسی ''کرس'' سے بنا ہے کرس کا معنی ہے کسی چیز کے اجزاء کو باہم جوڑ دینا۔ کرسی، عرش اور بیت کی نسبت خدا کی طرف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں ایک خاص قسم کے جلوہ الٰہی کے لئے مخصوص ہیں۔

آیت فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے لکھا ہے کہ عرش کی شکل کا کروی ہونا اور اس کا آسمانوں کو محیط ہونا حدیث سے مستنبط ہے لیکن اس جگہ حضرت ابوذرؓ کی روایت مذکورہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ کرسی آسمانوں کو محیط ہے اور عرش کرسی کو گھیرے ہوئے ہے اور بعض آسمان بعض کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس قول کا تقاضا ہے کہ ہر آسمان بھی کروی ہو اسی لئے بعض لوگ قائل ہیں کہ آٹھواں آسمان کرسی ہے اور نواں آسمان عرش، لیکن اللہ ﷻ نے جو آسمانوں کی تعداد سات بتائی ہے اور عرش و کرسی کا شمار آسمانوں میں نہیں کیا اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دوسرے آسمانوں سے عرش و کرسی کی ماہیت جدا ہے اور خاص تجلیات کے لحاظ سے ان کو دوسرے آسمانوں سے امتیاز حاصل ہے، واللہ اعلم۔ ۱؎

۱؎ ہیئت قدیم کے یونانی اور مصری علماء کہتے تھے جیسا کہ سبع شداد اور شرح چغمینی وغیرہ کتب میں مذکور ہے کہ مجموعۂ عالم کی شکل کروی ہے گویا یہ کائنات ایک پیاز کی گانٹھ ہے جس کے تیرہ پرت ہیں اور ہر چھلکا اپنے اندرونی چھلکوں کو محیط ہے سب کو محیط فلک الافلاک یا فلک اطلس ہے اس کے اندر فلک ثوابت ہے اس کے نیچے فلک زحل پھر فلک مشتری پھر فلک مریخ پھر فلک شمس پھر فلک زہرہ پھر فلک عطارد پھر فلک قمر گویا فلک قمر فلک دنیا ہے اور ہماری جانب سب سے اول یہی ہے اور آخری انتہائی نواں آسمان فلک الافلاک ہے فلک قمر کے نیچے کرۂ نار ہے اور کرۂ نار کے نیچے کرۂ ہوا اور ہوا کے نیچے پانی اور پانی کے نیچے زمین اور یہی زمین مرکز عالم ہے، علماء ہیئت قدیم افلاک کو تہ بر تہ محیط مانتے تھے قرآن مجید اور احادیث مقدسہ میں عرش کرسی اور سبع سموات کے الفاظ آئے ہیں سبع سموات کے ساتھ طباقاً کا لفظ بھی مذکور ہے کچھ علماء اسلام نے یونانی ہیئت و فلسفہ کی صداقت تسلیم کرنے میں اتنا غلو کیا کہ قرآن مجید کی عبارت کو بھی اس کے مطابق بنانے کی مکروہ کوشش کی، کچھ احادیث کے اشارات یا صراحتوں کو اپنے مطلب کی تائید میں لے آئے فضلوا واضلوا عرش کو نواں اور کرسی کو آٹھواں آسمان بنا دیا، طباقاً کا ترجمہ تہ بر تہ کر دیا، عرش و کرسی کو الگ ذکر کرنے کی وجہ ماہیات کے امتیاز اور خصوصی تجلّیات کی بارش کو قرار دیا لیکن فلسفہ قدیم تو آسمانوں کو ازلی ابدی قدیم بالغیر کہتا ہے عمر میں خدا کے برابر قرار دیتا ہے ان کا پھٹنا اور پھر جوڑا جانا محال سمجھتا ہے بلکہ مادۂ عناصر کو بھی لازوال کہتا ہے اور زمانہ کو بھی حادث نہیں مانتا، فلسفہ کا وہ کون سا عقیدہ اور فکر یہ ہے جو قرآنی صراحت یا حدیث کی عبارت سے جوڑ کھا سکتا ہے پھر صرف ترتیب عالم کے سلسلہ میں قرآنی صراحت اور وحی غیر منطوق کی عبارت کو ہیئت قدیم کے مطابق بنانے کی کوشش مہلک نہیں تو اور کیا ہے کیا یہ تفسیر بالرائے نہیں اگر فلسفہ اور ہیئت کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کی جاتی تو پھر بھی یہ کاوش قابل برداشت ہوتی، سود مند نہ ہوتی مگر تباہ کن بھی نہیں ہوتی مگر قرآن کو توڑنا اور بے مزہ تاویلیں کر کے فلسفہ سے جوڑنا تو قرآن کو بازیچہ حکماء بنا دے گا، کسی فلسفہ کو اصل صداقت کا حامل نہیں قرار دیا جا سکتا، ایک فلسفہ دوسرے کی تکذیب کرتا ہے جدید قدیم کو داستان پارینہ قرار دیتا ہے، موجودہ سائنس افلاک کو محیط مانتی ہی نہیں سات آسمان نہیں دس کروڑ آسمان کہتی ہے تیس کروڑ زمینیں قرار دیتی ہے وہ کہتی ہے چالیس کروڑ گیندیں خلاء میں فطری ضابطۂ جذب کے زیر اثر معلق ہیں کوئی اونچی کوئی نیچی دکھائی دیتی ہے واقع میں نہ کوئی اوپر ہے نہ نیچے کوئی منتہی ہی نہیں پھر تحت اور فوق کا حقیقۃً تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، ہر کرہ کا دوسرے کرہ سے فاصلہ لاکھوں کروڑوں میل بلکہ بعض کا فاصلہ تو ناقابل احاطہ ہے، اس کا حساب کرنے سے علم حساب عاجز ہے، کوئی کرہ اتنا چھوٹا ہے کہ ہمارے ایک دن ایک رات میں اس کی دوری حرکت پوری ہو جاتی ہے کوئی اتنا بڑا ہے کہ اس کی دوری حرکت ہمارے پچیس ہزار سال میں پوری ہوتی ہے، یہ ساری فضا مادۂ سیال یا چمکدار برقیات سے بھری ہوئی ہے، ہر کرہ اپنے محور پر گھوم رہا ہے، زمین بھی گھوم رہی ہے، بڑے بڑے یہی سات سیارے ہیں چاند، سورج، مریخ، زحل، مشتری، عطارد، زہرہ باقی سیاروں کی کامل شناخت آلات اور مراصد پر موقوف ہے چالیس کروڑ کروں میں بھی کائنات کا حصر نہیں یہ آخری گنتی نہیں جتنا معلوم ہوا ہے وہ بہت قلیل حصہ ہے، خدا جانے نامعلوم کتنا باقی ہے کیا سائنس کے یہ مسلّمات غلط ہیں ممکن ہے کچھ وہم کی کارپردازی ہو کچھ حقیقت ثابتہ ہو جس زمانہ میں جس فلسفہ نے جو کچھ کہا صحیح سمجھ کر ہی کہا کہ۔ فلسفہ کا یونہی ردوبدل ہوتا رہے گا اور ہوتا رہا ہے لیکن حقیقت قرآنیہ اپنی جگہ ثابت ہے ناقابل تغیر ہے۔ فلسفہ قدیم یا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

marfat.com

وَلَا يَئُودُهٗ (یہ لفظ اَوْدٌ سے ماخوذ ہے اَوَدٌ کا معنی ہے کجی)
حِفْظُهُمَا (یعنی آسمان وزمین یا کرسی اور کرسی کے اندر سمائی ہوئی چیزوں کی حفاظت کا اللہ پر بار نہیں پڑتا، ان کی نگہداشت اللہ کو تھکا نہیں دیتی)، یہ اور اس سے پہلے کا جملہ اللہ کی علمی وسعت اور اس کی عمومی واقفیت کی ہمہ گیری کا بیان ہے یا مرتبہ خداوندی کی عظمت وجلال اور اس کی قیومیت محیطہ کا اظہار ہے مذکورہ بالا دونوں جملے ایک ہی جملہ کا حکم رکھتے ہیں اور چونکہ گزشتہ کلام میں سے ہر جملہ سابق جملہ کی تاکید اور توضیح ہے (گویا ایک ہی کلام کے متعدد اجزاء ہیں) اس لئے کسی جملہ کا دوسرے پر عطف نہیں کیا۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ (اللہ ہر مثل اور نظیر سے برتر وبالا ہے) کوئی کسی طور پر اس کی طرح نہیں نہ ذات کے لحاظ سے نہ اوصاف کے لحاظ سے۔ تعریف کرنے والے اس کی تعریف کرتے ہیں اور بیان کرنے والے اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں لیکن وہ ہر تعریف اور بیان سے برتر ہے اس کی شان وہی ہے جو اسی کے لئے زیبا ہے۔

الْعَظِيمُ ﴿۲۵۵﴾ وہ اتنی عظمت والا ہے کہ تمام کائنات اس کے مقابلہ میں بے مقدار ہے۔

آیت الکرسی میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی ذات وصفات کے مباحث بیان کئے گئے ہیں یہ آیت بتارہی ہے کہ اللہ ہی کا وجود اصلی اور حقیقی ہے اسکی ہر صفت کامل ہے اس کی حیات اور حیات کی تابع دوسری صفات مثلاً علم، قدرت، ارادہ، سننا، دیکھنا اور کلام کرنا سب ہی اوصاف کمال ہیں وہ ساری کائنات کو ہستی اور قوام ہستی عطا کرنے والا ہے ہر چیز کا قیام اسی کی ذات سے ہے لیکن یہ قیام ایسا نہیں جیسا عرض کا جوہر کے ساتھ ہوتا ہے بعض اکابر کا قول ہے کہ عالم ایک مجموعہ اعراض ہے جو ذات واحد میں جمع ہیں اس قول سے دھوکہ ہو سکتا ہے کہ ذاتِ خداوندی سے عالم کا قیام اس طرح ہے جس طرح جوہر کے ساتھ عرض کا قیام ہوتا ہے مگر یہ مطلب غلط ہے قیام عالم باللہ کی کیفیت ناقابل تصور ہے خیال کی پہنائیاں اس کو نہیں سما سکتیں قیام کے مفہوم کی قریب الفہم تعبیر کے لئے ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہماری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے مگر یہ قرب مکانی نہیں، نہ حلولی ہے اللہ احتیاج مکانی اور حلول سے پاک ہے، ہر تغیر اور ضعف سے منزہ ہے مالک الملک والملکوت ہے، اسکی گرفت بہت سخت ہے اس کا انتقام ناقابل برداشت ہے اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس سے سفارش بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا علم

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) تحقیقات جدیدہ کے موافق بنانے کے لئے آیات واحادیث میں تاویل بارد کرنا مذہبی افلاس کا ثبوت اور عقلی دہشت زدگی کی علامت ہے۔

قرآن مجید میں سبع سمواتِ کلمۂ حصر نہیں کہ زیادتی کا انکار کیا جائے نہ مزید کی کوئی خاص شمار بتائی ہے کہ تعداد کو محدود کر دیا جائے طِباقاً کا ترجمہ تہ برتہ محض احتمالی ہے احتمال سے تعیین نہیں ہوتی طَبَقاً عَن طَبَقٍ کا ترجمہ تہ برتہ نہیں درجہ بدرجہ ہے طِباقاً کا ترجمہ بھی درجہ بدرجہ ہو سکتا ہے اور یہ ترتیب درجات بھی اضافی اور عرفی ہے حقیقی فوق وتحت کو تسلیم کرنا ضروری نہیں غیر محاذی اشیاء میں زیر وزبر اور بالا وپست کا تصور بلکہ وقوع ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ احاطہ کا قول غلط ہو اور تاثیر جذب کے زیر اثر تمام کروی اجسام جدا جدا معلق ہوں، حدیث معراج میں ایک آسمان کا دوسرے آسمان سے فاصلہ پانسو برس کی راہ کے برابر بتایا گیا ہے اگر یہ طباقاً کے لفظ کے منافی نہیں تو پھر تمام کرات کو جدا جدا اور درجہ بدرجہ قرار دینا کیوں طباقاً کے مفہوم کے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے، حضرت ابوذر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی احاطۂ کرسی صراحۃً ثابت ہوتا ہے نہ استنباطاً کیونکہ اس میں عظمت کرسی کی تصویر کشی کی گئی ہے، دوسرے آسمانوں کو کرسی کے مقابلہ میں اتنا چھوٹا دکھایا گیا ہے جیسے سپر کے اندر سات چھلے یا صحراء میں ایک چھلا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرسی سموات کو محیط ہے لیکن یہ احاطہ محتاج تاویل ہے جسمانی احاطہ ہے یا اقتدار اور حکم کا احاطہ یا عظمت وبزرگی کا احاطہ کوئی تعیین از خود نہیں کی جا سکتی اللہ ہر چیز کو محیط ہے کیا یہ احاطہ جسمانی ہے یا قدرت حکمت اور علم کا احاطہ ہے یا حکم اور اقتدار کا احاطہ ہے اہل ایمان کے قلوب کا رحمٰن کی چٹکی میں ہونا کیا قلوب کے جسمانی احاطہ پر دلالت کرتا ہے پھر وسعت کرسی کو جسمانی جوف سے تعبیر کرنا اور فلک ہشتم کو ہر طرف سے سماوات کو محیط ماننا فلسفہ قدیم سے شکست خوردگی کی علامت نہیں تو اور کیا ہے، پس مسلک اس فقیر کی نظر میں یہ ہے کہ احادیث مقدسہ اور قرآن مجید کی صراحتوں میں کوئی ایسی تاویل اور تعیین اور خواہ مخواہ ایسا استنباط نہ کیا جائے جس کا مقصود ہی فلسفہ سے تطبیق ہو، ہاں اگر کوئی فلسفہ قرآنی صراحت کی تائید کر رہا ہو تو اس کو شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے، واللہ اعلم۔

marfat.com

ہمہ گیر ہے ہر ظاہر اور پوشیدہ چیز کی حقیقت کو ہر طرح محیط ہے اس کی معلومات کا علم کسی کو نہیں ہاں اگر وہی کچھ بتادے تو ہو سکتا ہے اس کی حکومت اور قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں وہ بعض مخلوق پر جلوہ انداز ضرور ہوتا ہے لیکن یہ پرتوافگنی اس کی ذاتی برتری میں رخنہ انداز نہیں ہوتی کوئی امر دشوار اس کے لئے تعب آفریں نہیں ہوتا کسی شئے میں مشغولیت اس کو دوسری چیز سے غافل نہیں بناسکتی وہ تمام نامناسب اوصاف سے پاک اور کل حمد کرنے والوں کی ستائش سے برتر ہے۔ وہ رسول مکرم ﷺ جس کے دست مبارک میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا ہوگا خود ذات الٰہی کی حمد کا حق ادا کرنے سے قاصر تھا اسی لئے اس نے (اپنی دعا میں) کہا تھا تو ویسا ہی ہے جیسی تو نے اپنی ثنا کی ہے۔ اللہ کی عظمت کے سامنے ہر چیز حقیر ہے۔ اس کی بزرگی پورے طور پر کوئی عالم نہیں جانتا نہ کسی عابد کی عبادت اللہ کی عظمت کا حق ادا کر سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی عبادت کے قصور کا اقرار کیا ہے فرمایا ہے ہم نے تیری عبادت تقاضائے عبادت کے برابر نہیں کی اسی لئے جب حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا یارسول اللہ ﷺ قرآن میں سب سے بڑھ کر عظمت والی آیت کونسی ہے۔ فرمایا آیۃ الکرسی اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ ۔عرض کیا گیا سب سے زیادہ عظمت والی سورت کونسی ہے فرمایا قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ (دارمی بروایت اسقع بن عبدکلاب)

حارث بن اسامہ رضی اللہ عنہ نے بروایت حسن مرسلاً بیان کیا کہ سب سے بڑھ کر عظمت والی آیت آیت الکرسی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوالمنذر (رضی اللہ عنہ) اللہ تعالیٰ کی کتاب کی سب سے زیادہ عظمت والی آیت کونسی ہے میں نے عرض کیا اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ حضور ﷺ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا تجھ کو علم مبارک ہو۔ پھر فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس آیت کی ایک زبان اور دو لب ہیں پایۂ عرش کے پاس فرشتہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے۔ (مسلم)

میں کہتا ہوں شاید اس آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اس آیت کی تلاوت کر کے اللہ کی تقدیس کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عالم مثال میں ہر چیز کی ایک صورت ہے یہاں تک کہ قرآن کی آیات قرآن کی اور رمضان کی بھی (عالم مثال میں) شکلیں معین ہیں۔ ابن مردویہ نے بروایت حضرت ابن مسعودؓ اور ابن راہویہ نے اپنی مسند میں بروایت حضرت عوف بن مالکؓ اور امام احمد و امام مالک نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ آیت والکرسی آیات قرآنی کی سردار ہے (ترمذی و حاکم) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آیت والکرسی (ثواب میں) چوتھائی قرآن (کی برابر) ہے (احمد) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص آیت الکرسی اور حٰمٓ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ کی دو آیتیں صبح کو پڑھے گا وہ دن بھر شام تک محفوظ رہے گا اور جو شام کو پڑھے گا وہ رات بھر (اللہ کی) امان میں صبح تک رہے گا۔ (رواہ الترمذی والدارمی) ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے رمضان کی زکوٰۃ کے مال کی حفاظت پر مامور فرمایا (رات کو) کوئی آکر لپ بھر بھر کر غلہ اٹھا کر لینے لگا میں نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے کہا میں تجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے کر جاؤں گا وہ بولا میں محتاج ہوں، عیالدار ہوں بڑا ضرورت مند ہوں میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا حضور ﷺ نے فرمایا ابوہریرہؓ رات والے تمہارے قیدی کا کیا ہوا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اس نے اپنی سخت محتاجی اور عیالداری کا دکھ ظاہر کیا تھا مجھے اس پر رحم آگیا میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ فرمایا آگاہ ہو جاؤ اس نے تم سے جھوٹ بولا آئندہ وہ پھر لوٹ کر آئیگا یہ سن کر مجھے اس کے دوبارہ آنے کا یقین ہو گیا۔ چنانچہ میں اس کی تاک میں رہا وہ آیا اور پھر لپ میں غلہ بھرنے لگا فوراً میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا اب تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تجھے ضرور لے کر جاؤں گا۔ اس نے پہلے کی طرح پھر وہی بات کہی کہ مجھے چھوڑ دو الخ۔

اور (صبح کو) رسول اللہ ﷺ نے بھی وہی بات فرمائی جو پہلے فرمائی تھی آخر تیسری بار (جب وہ پھر چوری کرنے آیا تو) میں نے کہا یہ آخری باری ہے تو دوبارہ نہ آنے کا وعدہ کرتا رہا اور پھر واپس آتا رہا (اب تو میں تجھے ضرور ہی لے جاؤں گا) اس نے

marfat.com

کہا تم مجھے چھوڑ دو۔ میں تم کو چند لفظ ایسے سکھاتا ہوں جن سے اللہ تم کو فائدہ عطا فرمائے گا۔ جب تم اپنے بستر پر (رات کو لیٹنے کے لئے) جاؤ تو آیۃ الکرسی اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الخ پڑھ لیا کرو تمہاری نگہداشت کے لئے اللہ کی طرف سے ایک نگراں مقرر رہے گا پھر صبح تک کوئی شیطان تمہارے پاس آنے نہ پائے گا۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح کو خدمت گرامی میں پہنچا تو حضور ﷺ نے فرمایا تمہارا رات والا قیدی کیا ہوا۔ میں نے عرض کیا حضور اس نے کہا میں تم کو چند لفظ ایسے بتاتا ہوں کہ ان کے ذریعہ سے اللہ تم کو فائدہ عطا فرمائے گا۔ ارشاد فرمایا سنو وہ ہے تو جھوٹا مگر اس نے یہ بات تم سے سچ کہی کیا تم واقف ہو کہ تین راتوں سے تم کس سے گفتگو کرتے رہے میں نے عرض کیا نہیں فرمایا وہ شیطان ہے (بخاری) نسائی، ابن حبان اور دار قطنی نے بروایت حضرت ابو امامہ اور شعب الایمان میں بیہقی نے بروایت حضرت صلصال ؓ دیہمی وحضرت علی ؓ بن ابی طالب مرفوعاً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا اس کو (حجاب) موت کے علاوہ جنت کے داخلہ سے اور کوئی چیز روکنے والی نہ ہوگی۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جو شخص بستر خواب پکڑتے وقت آیت الکرسی پڑھے گا اللہ اس کے گھر کو اس کے ہمسایہ کے گھر کو اور گرد اگرد کے دوسرے گھر والوں کو اپنی امان میں رکھے گا۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس ؓ کی مرفوع روایت لکھی ہے کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا اللہ اگلی نماز تک اس کا محافظ رہے گا اور اسکی پابندی صرف نبی کرتا ہے یا صدیق یا شہید [1]

لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ابو داؤد نسائی اور ابن حبان نے حضرت ابن عباس ؓ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ (اسلام سے پہلے مدینہ میں) جس عورت کا بچہ نہ جیتا تھا وہ منت مان لیتی تھی کہ اگر میرا بچہ کوئی زندہ رہا تو میں اس کو یہودی بنا دوں گی (یہ منت قبائل انصار کی عورتیں مانتی تھیں) چنانچہ بنو نضیر (کے یہودیوں) کو جب جلاوطن کیا گیا تو ان کے اندر کچھ انصار کے بچے بھی تھے (جن کو یہودی بنا دیا گیا تھا) انصار کہنے لگے یہ تو ہمارے بچے ہیں ہم ان کو نہیں جانے دیں گے اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی نزول آیت کے بعد رسول ﷺ نے فرمایا تم اپنے آدمیوں کو اختیار دے دو اگر وہ تمہارے ساتھ رہنا پسند کریں تو تم میں سے ہیں (ان کو مدینہ سے خارج نہ کیا جائے) اور اگر وہ ان (یہودیوں) کے ساتھ رہیں تو یہودیوں کے ساتھ ان کو بھی جلاوطن کر دو۔ مجاہد کا بیان ہے کہ قبیلہ اوس کے کچھ لوگ یہودی قبائل میں اپنے بچوں کو دودھ پلوایا کرتے تھے (جب یہودیوں کو جلاوطن کیا گیا تو) جن لڑکوں نے یہودنوں کا دودھ پیا تھا وہ کہنے لگے کہ ہم بھی انہی کے ساتھ جائیں گے ورنہ (کم از کم) ان کا مذہب اختیار کریں گے ان لڑکوں کے سرپرستوں نے ان کو (دونوں باتوں سے) روکا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریر نے بوساطت سعید یا عکرمہ حضرت ابن عباس ؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قبیلہ سالم بن عوف کے انصاریوں میں سے ایک آدمی تھا جس کا نام حصین تھا۔ حصین کے دو بیٹے عیسائی تھے لیکن وہ خود مسلمان ہو گئے تھے انہوں نے رسول ﷺ کی خدمت میں عرض کیا میرے دونوں بیٹے تو عیسائیت کے سوا کسی دین کو مانتے نہیں کیا میں جبر کر کے ان کو مسلمان بنالوں اس پر آیت لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ نازل ہوئی، آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایماندار ہونے میں جبر کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اکراہ

---

[1] دینوری نے مجالس میں حسن کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرئیل ؑ نے مجھ سے آکر کہا کہ جنی شیطان تمہارے ساتھ فریب کرنے (کی گھات) میں لگا رہتا ہے لہٰذا جب بستر پر پہنچا کرو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، فردوس میں حضرت ابو قتادہ ؓ کی روایت سے منقول ہے کہ بے چینی کے وقت جو شخص آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک روز برآمد ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ عظمت والی سب سے بڑھ کو عدل آگیں اور خوفناک ترین اور سب سے بڑھ کر امید آفریں کونسی آیت ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے خود آنحضور ﷺ سے سنا ہے کہ قرآن میں سب سے زیادہ عظمت والی آیت اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الخ ہے اور سب سے بڑھ کر عدل آگیں آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ ہے اور خوفناک ترین آیت فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ، وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ہے اور سب سے زیادہ امید آفریں آیت قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِہِمْ الی اخرہ ہے، مولف رحمۃ اللہ۔

marfat.com

(جبر) کا صرف یہ معنی ہے کہ کسی سے بزور ایسا کام کرایا جائے جس کو وہ اپنی خوشی سے نہ کرنا چاہتا ہو ایسا اکراہ قول و فعل میں تو ممکن ہے ایمان میں ممکن نہیں ایمان تو صرف ایک قلبی عقیدہ کا نام ہے اور قلبی عقیدہ اکراہ سے نہیں پیدا ہو تا یا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ہے تو جملہ خبر یہ منفیہ مگر اس کا معنی (انشائی یعنی) نہی کا ہے یعنی ایمان پر کسی کو مجبور نہ کرو کیونکہ ایمان جبر سے نہیں پیدا ہو تا جبر کرنا بے فائدہ ہے یا ممانعت کی یہ وجہ ہے کہ ایمان اور دوسری تمام عبادتوں کا حکم آزمائش کے لئے (کہ کون کرتا ہے اور کون نہیں کرتا) اللہ نے فرمایا ہے لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا اور تعمیل حکم میں خلوص کا ہی اعتبار ہے اللہ نے فرمایا فَاعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لیکن جبر کرنے میں نہ آزمائش رہتی ہے نہ خلوص۔

کیا یہ حکم عام ہے یا مخصوص، بعض علماء کا قول ہے کہ عدم اکراہ کا حکم صرف اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ بیان مذکور بالا ہو گیا ہے کہ انصاریوں کے جو بچے یہودی یا عیسائی ہو گئے تھے اونہی کے سلسلہ میں آیت لا اکراہ فی الدین کا نزول ہوا تھا۔ میں کہتا ہوں مورد کی خصوصیت حکم کی خصوصیت کو نہیں چاہتی اس لئے حکم عام رہے گا۔

بعض علماء نے کہا آیت مذکورہ کا حکم آیت قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً اور جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ کے حکم سے منسوخ ہو گیا بقول بغویؒ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے، میں کہتا ہوں نسخ تو اسی وقت ممکن ہے جب دو حکموں میں تعارض ہو، مگر یہاں تو ایک حکم دوسرے کی ضد نہیں ہے قتال اور جہاد کا حکم اس لئے تو نہیں دیا گیا کہ جبراً مؤمن بنایا جائے بلکہ زمین پر بگاڑ اور تباہی کو روکنے کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا ہے کافر ملک میں تباہی مچاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو راہ مستقیم پر چلنے اور اللہ کی عبادت کرنے سے روکتے ہیں پس ان کو قتل کرنا ایسا ہی جیسے سانپ، بچھو اور کاٹنے والے کتے کو قتل کرنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے، اسی لئے اللہ نے ادائے جزیہ کی صورت میں قتال کے حکم کو ختم کر دیا ارفرمادیا حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں، عورتوں، درویشوں تارک الدنیا عالموں، اپاہجوں اور اندھوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرمادی کیونکہ ان کی طرف سے بگاڑ اور تباہی ممکن نہیں، جبراً ایمان کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا پھر اسکے منسوخ ہونے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یعنی حقیقت کھل گئی ہے، رسول ﷺ کے معجزات اور عقلی شواہد نے بتادیا کہ ایمان ہی سیدھا راستہ ہے جو لازوال سعادت تک پہنچاتا ہے اور کفر کا راستہ ٹیڑھا ہے جو ابدی بدبختی تک پہنچاتا ہے اب انسانوں کا ہر عذر ختم ہو گیا حجت تمام ہو گئی آزمائش صحیح ہو گئی اکراہ کی ضرورت نہیں رہی۔

بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اِکراہ کا معنی ہے کسی کو ایسا کام کرنے پر مجبور کرنا جس میں اسے خود بھلائی نظر نہ آتی ہو لہٰذا دین میں اکراہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دین کی بھلائی، گمراہی سے ممتاز ہو گئی ہے اور ہر دانشمند پر جب ہدایت واضح ہو گئی تو لامحالہ نجات و سعادت کی طلب میں وہ ہدایت کو ماننے کی طرف پیش قدمی کرے گا ہی اِکراہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں، بیضاوی کے اس بیان پر لازم آتا ہے کہ ہر عقلمند اپنی مرضی اور خوشی سے مؤمن ہو جائے (کیونکہ ہر ہوشمند دین کی بھلائی دیکھ چکا) حالانکہ بکثرت عاقل کافر ہیں اور اگر دانشمند سے عقل سلیم رکھنے والا مراد ہو اور کافر اگرچہ بکثرت دانشمند ہیں مگر ان کی عقل سلیم نہیں ہے اس لئے ایمان میں ان کو بھلائی نظر نہیں آتی تو لامحالہ اِکراہ کی ضرورت ان کے لئے باقی رہتی ہے (یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ دین میں اِکراہ کی ضرورت نہیں رہی)۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ طاغوت طغیان سے ماخوذ ہے اس کا وزن فعلوت ہے (اصل میں طغووت تھا) اول واؤ کو طاء اور غین کے درمیان لے گئے اور الف سے بدل دیا، یا طاغوت کا وزن فاعول ہے لام کو تاء سے بدل دیا یعنی اصل میں طاغول تھا لام کو حذف کر کے تاء کو بڑھادیا۔

طاغوت سے مراد ہے اللہ کے سوا دوسرے تمام معبود یا وہ معبود جو اللہ کی عبادت سے مانع ہوں خواہ جنی شیطان ہو یا انسان

وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (یعنی جس نے اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کیا اور اللہ کو اس طرح مانا جس طرح رسول

marfat.com

ﷺ نے بتایا کیونکہ رسول کو مانے بغیر اور آپ کی ہدایت سے ہٹ کر اللہ کو بالکل صحیح طور پر ماننا ممکن ہی نہیں (ذات و صفات کا مسئلہ عقل کی رسائی سے خارج ہے رسولِ برحق کی مشعل راہ کی ضرورت ہے)۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (تو اس نے پکڑنا چاہا مضبوط رسی کو) مضبوط رسی کو پکڑنے سے مراد ہے حق کو تھام لینا حق کو پکڑنے کی تعبیر بطور استعارہ مضبوط رسی کو پکڑنے سے کی ہے۔

لَا انْفِصَامَ لَهَا رسی بھی ایسی جو ٹوٹ نہیں سکتی۔[۱]

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ یعنی تم جو لوگوں کو دعوت حق دے رہے ہو اور جو تمہارا قول ہے اور جو ان کے اقوال ہیں اللہ سب کو سننے والا ہے۔

عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اللہ سب کی نیتوں سے واقف ہے تم ان کے مؤمن ہونے کے جتنے خواہشمند ہو اس کو بھی اللہ جانتا ہے؛ اس آیت میں اعمال اور ارادوں کو درست رکھنے کی ترغیب اور کفر و نفاق سے توبیخی باز داشت ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی اللہ ایمان والوں کا دوست ہے ان کا کارساز ہے، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ مؤمن بنانا چاہتا ہے۔

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ یعنی جن لوگوں کا مؤمن ہونا خدا چاہتا ہے ان کو اپنی توفیق و ہدایت کی مدد سے جہالت، نفس پرستی، ذہنی وسوسوں اور کفر تک پہنچانے والے شبہات سے نکال کر اس صراطِ مستقیم پر لاڈالتا ہے جو ایمان تک ان کو پہنچادیتی ہے۔

واقدیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں جس جگہ الفاظ ظلمت و نور آئے ہیں ان سے مراد کفر و ایمان ہے وہاں صرف سورۂ انعام کی آیت جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ میں شب و روز مراد ہیں، آیت مذکورہ بتا رہی ہے کہ ایمان (اختیاری نہیں) صرف عطیۂ خداوندی ہے، جملہ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ یا تو لفظ اللہ کی دوسری خبر ہے یا اٰمنوا کی ضمیر کا حال ہے یا الذین کا حال ہے یا دونوں سے حال ہے یا مستقل علیحدہ کلام ہے جس سے مفہوم ولایت کی توضیح یا تاکید ہو رہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یعنی جن لوگوں نے ایمان سے انکار کر دیا ان کے دوست شیطان ہیں انسانی شیطان اور جناتی شیطان، انسانی شیطانوں میں سے کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب (یہودی) بھی تھے، یا طاغوت سے مراد ہے انسان کو گمراہ کرنے والی ہر چیز خواہ خواہش نفس ہو یا شیطان وغیرہ کافروں کے خیال میں یہ گمراہی آفریں چیزیں ان کی دوست اور کارساز ہوتی ہیں مگر درواقع میں وہ دوست نہیں دشمن ہیں۔

يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ یعنی کافروں کے یہ دوست ان کو فطری نور سے نکال کر شکوک و شبہات، نفس پرستی اور کفر انگیز تباہی کے اندھیریوں کی طرف لے جاتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جناب رسول ﷺ نے فرمایا کوئی بچہ ایسا نہیں کہ فطرت پر نہ پیدا کیا جائے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور عیسائی اور مجوسی بنا لیتے ہیں (بخاری و مسلم) ابن جریر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدہؒ بن ابی لبابہ کا قول نقل کیا ہے کہ الذین کفروا سے وہ عیسائی مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو مانتے تھے لیکن جب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کو نہیں مانا۔

ظُلُمٰت سے مراد ہیں شکوک و شبہات، نفس پرستی اور فطری قابلیت کا بگاڑ جس کا نتیجہ کفر ہے نور سے تاریکی کی طرف نکال کر لے جانے کا سبب طاغوت ہے اس لئے اخراج کی نسبت طاغوت کی طرف کر دی گئی لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ کی قدرت اور ارادہ کا تعلق اخراج سے نہیں (یقیناً اللہ کی قدرت اور ارادہ سے ہر قسم کا گناہ ہوتا ہے مگر گناہ کا ذریعہ اور سبب شیطان ہوتا ہے) لفظ طاغوت کا اطلاق مذکر پر بھی ہوتا ہے اور مونث پر بھی واحد پر بھی اور جمع پر بھی، اللہ نے فرمایا ہے، يُرِيْدُوْنَ اَنْ

---

[۱] حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میرے بعد ابو بکر اور عمرؓ کی اقتداء کرنا یہ اللہ کی تانی ہوئی رسی ہیں۔ جس نے ان کو پکڑ لیا اس نے اللہ کی مضبوط رسی کو پکڑ لیا جو ٹوٹ نہیں سکتی۔ (مؤلف رحمۃ اللہ)

marfat.com

یَتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (اس میں طاغوت کے لئے واحد مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے) دوسری آیت ہے وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْھَا (اس میں واحد مونث کی ضمیر طاغوت کے لئے استعمال کی گئی ہے) ابن جریرؒ نے مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان رکھتے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان نہ لائے اور کچھ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے منکر تھے رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ کی نبوت پر وہ ایمان لے آئے ان دونوں فرقوں کے متعلق آیت مذکورہ کا نزول ہوا، طبرانی نے کبیر میں اور ابن منذرؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان لے آئے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے منکر ہوئے، واللہ اعلم۔

اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ یہی لوگ دوزخی ہیں دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے یہ کافروں کے لئے دھمکی اور وعیدِ عذاب ہے اس سے پہلے مؤمنوں کے لئے وعدۂ ثواب کا اس لئے ذکر نہیں کیا کہ اہل ایمان کی شان بڑی باعظمت ہے (کافروں کی وعید کا مؤمنوں کے وعدہ سے مقابلہ نہ کیا) یہ توجیہ بعض علماء نے کی ہے لیکن صحیح ترین توجیہ یہ ہے کہ آیت اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہر قسم کے وعدہ کو متضمن ہے (صراحت وعدہ کی کوئی ضرورت نہیں)۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ کیا تم کو اس شخص کا واقعہ معلوم نہیں ہوا جس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے متعلق جھگڑا کیا تھا، نمرود کی کٹ حجتی اور حماقت پر اس آیت میں تعجب دلایا گیا ہے، بغویؒ نے لکھا ہے کہ نمرود ہی پہلا شخص ہے جس نے سر پر تاج اوڑھا، ربوبیت کا دعوی کیا اور زمین پر زبردستی کی۔

اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ ۘ اَنْ سے پہلے لام محذوف ہے جھگڑا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے اس کو حکومت عطا کی تھی اس لئے اس نے سرکشی کی حکومت کا غرور اس کے جھگڑا کرنے کی علت تھا یعنی اس نے عطاءِ خداوندی کے تقاضے کے خلاف کیا عطاء کا لازمی تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شکر کرتا مگر کیا اس نے برعکس عرب کہتے ہیں عَادَیْتَنِیْ لِاَنِّیْٓ اَحْسَنْتُ اِلَیْکَ (تو میرا دشمن اس لئے ہو گیا کہ میں نے تجھ سے بھلائی کی) یا لفظ وقت محذوف ہے یعنی جبکہ اللہ نے اس کو حکومت عطا کی تھی اس وقت اس نے جھگڑا کیا۔

بعض معتزلہ جو کہتے ہیں کہ اللہ کافر کو حکومت نہیں دیتا ہے ان کے قول کے خلاف اس آیت میں (کافر کو ملک عطا کرنے کی) صراحت ہے، بغوی نے لکھا ہے کہ روئے زمین کے چار بادشاہ ہوئے دو مؤمن اور دو کافر حضرت سلیمان اور ذوالقرنین مؤمن، اور نمرود و بخت نصر کافر روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑ دیئے تو نمرود نے ان کو قید کر دیا، پھر جلا ڈالنے کے لئے جیل سے باہر نکال کر پوچھا تیرا رب کون ہے حضرت نے فرمایا میرا رب وہ ہے جو زندگی عطا فرماتا اور موت دیتا ہے اس طرح حضرت ابراہیمؑ غالب آگئے اور نمرود کچھ نہ کر سکا، دوسری روایت میں آیا ہے کہ یہ واقعہ آگ میں پھینکے جانے سے بعد کا ہے آپ کو آگ میں جب پھینک دیا گیا (اور اللہ نے بچالیا) تو ملک میں کال پڑ گیا لوگ راشن مانگنے نمرود کے پاس آنے لگے نمرود کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص غلہ مانگنے اس کے پاس آتا تو اول وہ پوچھتا کہ تیرا رب کون ہے اگر وہ جواب دیتا آپ میرے رب ہیں تو نمرود اس کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا۔ حضرت ابراہیمؑ بھی اس کے پاس پہنچے اور اس کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ تو وہ لاجواب ہو گیا اور آپ کو کچھ نہیں دیا حضرت ناکام واپس آگئے اثناء واپسی میں ریت کے ایک ٹیلہ کی طرف سے گزرے اور گھر والوں کو بہلانے کے لئے تھیلے میں کچھ ریت بھر لی اور گھر پہنچ کر سامان کو یونہی رکھ کر سو گئے بیوی نے اٹھ کر سامان کو کھول کر دیکھا تو اس کے اندر سے اعلیٰ ترین غلہ برآمد ہوا بیوی نے کھانا پکایا اور لے کر حضرت ابراہیم کے پاس پہنچیں آپ نے فرمایا یہ کہاں سے آیا بیوی نے کہا اسی آٹے سے بنایا گیا ہے جو آپ لائے تھے آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ اذ ظرف زمان ہے اور ”قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ“ حَآجَّ کا بیان ہے یا جد اکلام ہے اور

ایک محذوف سوال کا جواب ہے یعنی کیفیّت خصومت کے متعلق سوال مقدر کا جواب ہے ان دونوں صورتوں میں ظرف زمان کا تعلق جملہ قَالَ سے ہوگا یا یوں کہو کہ ظرف کا تعلق حَاجَّ سے ہے اور قَالَ حَاجَّ کا بیان ہے یا جدا کلام ہے یا یوں کہا جائے کہ یہ ظرف جملہ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ سے بدل ہے۔

رَبِّیَ حمزہ کی قرات میں وصل و وقف دونوں حالتوں میں اس جگہ یاء ساکن ہے مندرجہ ذیل آیات میں بھی یاء کی قرآت حمزہ کے نزدیک اسی طرح ہے، رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ، عَنْ اٰيَاتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ، قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰتَانِيَ الْكِتَابَ، مَسَّنِيَ الضُّرُّ، عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ، عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ، مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ، اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ، اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ۔ کسائی صرف آیت لِعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں حمزہ کے موافق ہیں اور ابن عامر آیت لِعِبَادِيَ الَّذِيْنَ میں بھی اور اٰيَاتِيَ الَّذِيْنَ میں بھی ساکن پڑھتے ہیں (باقی آیات میں یاء کو فتحہ دیتے ہیں باقی قراء ان تمام مقامات میں یاء کو مفتوح پڑھتے ہیں۔

الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ نمرود نے حضرت ابراہیم سے سوال کیا تھا کہ تمہارا وہ رب کون ہے جس کی طرف سے تم ہم کو دعوت دے رہے ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا میرا رب وہ ہے جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی، نمرود شاید ملحد تھا اور بد عقل بھی دوسرے ملحدوں کی طرح اس کا خیال ہوگا کہ کائنات کے تمام حوادث محض اتفاقی ہوتے ہیں جب ہی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عالم امکان کی دو محسوس نشانیاں استدلال الوہیت و خلاقیت میں ذکر فرمائیں احیاء اور اماتت اللہ کے واجب الوجود اور صانع مطلق ہونے کی واضح نشانیاں ہیں، شاید نمرود کا یہ بھی گمان ہوگا کہ اہل عقل اپنے فعال کے خود خالق ہیں جیسے اس امت میں معتزلہ اور روافض کا خیال ہے اس لئے اس نے دو آدمیوں کو طلب کیا ایک کو قتل کرا دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور

قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ بولا میں ہی زندہ کرتا اور مارتا ہوں (گویا نمرود نے عمل حیٰوۃ و موت کو تخلیق موت و حیات قرار دیا اور خلاّقیّت و سببیّت میں فرق نہ کر سکا) اگر اَنَا کے بعد وصل کی حالت میں ہمزہ متحرک ہو تو اہل مدینہ اَنَا کے الف کو قائم رکھتے ہیں اور مد کے ساتھ پڑھتے ہیں باقی قراء حذف کر دیتے ہیں لیکن وقف کی حالت میں تمام قاری الف کو ثابت رکھتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ نمرود انتہائی غبی ہے جو معمولی حوادث کے استدلال کو بھی نہیں سمجھ سکتا تو روئے سخن بدلا اور

قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ کہا یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہی سورج کو مشرق سے برآمد کرتا ہے یعنی اللہ سورج کو مغرب سے نکال سکتا ہے یا جس طرح اس کی مشیّت ہو کر سکتا ہے۔

فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ۔ پس تو اگر اپنے اعمال پر خود اپنے کو قادر جانتا ہے اور اللہ کا انکار کرتا ہے تو سورج کو مغرب سے برآمد کر۔

فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ اس دلیل کو سن کر نمرود متحیر، دہشت زدہ اور لاجواب ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ابراہیم اپنے رب سے دعا کریگا تو اس کا رب سورج کو مغرب سے برآمد کر دے گا جس طرح آگ کو اس نے خنکی اور سلامتی میں تبدیل کر دیا۔

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ یعنی زبردست کافروں کو اللہ سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق نہیں دیتا خواہ ان کے سامنے اللہ کی کیسی ہی نشانیاں آجائیں جب تک وہ دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں ان کو راہ راست سجھائی نہیں دیتی

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ

قریہ سے مراد ہے بیت المقدس یا دیر ہر قل، آگے ہم قصہ ذکر کریں گے کَالَّذِیْ میں کاف زائد ہے اور اَلَّذِیْ کا عطف اَلَّذِیْ حَاجَّ پر ہے یہ گذرنے والا شخص ارمیا تھا بقول ابن اسحاق ارمیا ہی خضر تھے، لیکن حاکم نے حضرت علیؓ اور اسحاق بن بشیر نے حضرت عبد اللہ بن سلام کا قول نقل کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ (ارمیا نہیں) عزیر تھے،

marfat.com

مجاہدؒ نے واقعہ نمرود کے ساتھ اس قصہ کی تنظیم کو پیش نظر رکھ کر صراحت کی ہے کہ یہ شخص کوئی کافر تھا لیکن مجاہدؒ کا یہ استدلال غلط ہے کیونکہ کافر اس عزت افزائی کا مستحق نہیں ہو سکتا، اگر اس کی توجیہ میں کوئی یہ کہے کہ وہ کافر تھا لیکن نشانِ قدرت کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد وہ مؤمن ہو گیا تھا تو ہم کہیں گے کہ پھر یہ شخص مؤمن بالغیب نہ رہا اور ایمان بالشہود نا قابلِ اعتبار ہے (لہٰذا ایسا شخص عزت افزائی کے قابل نہیں) دونوں قصوں کی وجہ جامع صرف یہ ہے کہ دونوں واقعے تعجب انگیز ہیں اگرچہ ایک قصہ میں ادعاء ربوبیّت نہیں ہے جو شخص قدم بہ قدم اور لحمہ بہ لحمہ اپنی کمزوری محسوس کر رہا ہو اس کو اگر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر تعجب ہو تو کیا بعید ہے ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے دیکھو نطفہ سے آدمی اور بیج سے درخت کس طرح بن جاتا ہے (یہ کیا کچھ کم تعجب انگیز ہے)۔

وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ یعنی وہ بستی ویران ہو گئی تھی پہلے چھتیں گری تھیں اور اوپر سے دیواریں بھی گر گئیں۔

قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ تو اس نے کہا اس بستی کو (یعنی بستی والوں کو) مرے پیچھے اللہ کیسے زندہ کرے گا (یہ استفہام انکاری نہیں بلکہ) عادۃً چونکہ ایسا ہونا بعید تھا تو انہوں نے اس بستی کو زندہ کرنے کی تمنا کی اور آگے درخواست کی پھر وہ بطور تواضع اپنے کو اس قابل بھی نہ جانتے تھے کہ ان کی درخواست قبول ہو سکے اس لئے استفہام تمنائی کیا۔

محمد بن اسحاق نے بروایت وہب بن منبہ قصہ اس طرح لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیا کو ناشیہ بن اموص شاہ بنی اسرائیل کے پاس اس کی امداد کے لئے مقرر فرمایا تھا ناشیہ نیک آدمی تھا حضرت ارمیا اس کے پاس اللہ کے احکام لے کر جاتے تھے جب بنی اسرائیل کے گناہ بہت بڑھ گئے تو اللہ نے ارمیا کے پاس وحی بھیجی کہ آئندہ میں اسرائیلیوں کو عظیم ترین مصیبت میں مبتلا کروں گا ایک ظالم کو ان پر مسلط کروں گا اور ان کی بیشتر تعداد کو تباہ کر دوں گا یہ حکم سن کر ارمیا نے فریاد و زاری کی (اور بے قرار ہو گئے) اس پر وحی آئی جب تک تیری اجازت نہ ہو گی میں ان کو تباہ نہیں کروں گا اس حکم سے ارمیاؑ خوش ہو گئے اس طرح تین سال گزر گئے مگر بنی اسرائیل کی نافرمانیاں بڑھتی ہی گئیں وحی آنا بھی کم ہو گئی بادشاہ نے ہر چند توبہ و استغفار کا مشورہ دیا، مگر لوگوں نے نہ مانا آخر بخت نصر شاہِ بابل نے ناقابل مقابلہ فوج لے کر بنی اسرائیل کی طرف مارچ کیا بنی اسرائیل کا بادشاہ ڈر گیا، حضرت ارمیاؑ نے فرمایا مجھے اللہ کے وعدہ پر پورا اعتماد ہے اس کے بعد بحکم خدا ایک فرشتہ اسرائیلی آدمی کے بھیس میں حضرت ارمیا کے پاس آیا اور کہا اے اللہ کے نبی میں اپنے گھر والوں کے متعلق آپ سے مسئلہ پوچھنے آیا ہوں میں نے ہمیشہ ان سے اچھا سلوک ہی کیا مگر وہ میری ناراضگی بڑھانے کی حرکتیں کرتے ہیں حضرت ارمیا نے فرمایا تم ان سے بھلائی کرتے رہو قطع تعلق نہ کرو اور خیر کی بشارت دو (فرشتہ چلا گیا) کچھ مدت کے بعد وہی فرشتہ اسی آدمی کے بھیس میں پھر آیا اور پہلے کی طرح سوال کیا اور جواب بھی اس کو پہلے ہی کی طرح ملا کچھ زمانہ کے بعد بخت نصر نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا اس وقت ارمیا بیت المقدس کے دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے اور بنی اسرائیل کا بادشاہ آپ سے کہہ رہا تھا اللہ کا وہ وعدہ کیا ہوا جو آپ سے کیا تھا لیکن حضرت ارمیا علیہ السلام کو اللہ کے وعدہ پر بھروسہ تھا اور وہ خوش تھے اچانک وہی فرشتہ اسی آدمی کے بھیس میں پھر آیا اور اپنے گھر والوں کی شکایت کی حضرت ارمیا نے فرمایا کیا ابھی تک وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے فرشتہ نے کہا یا نبی اللہ اب تک تو جو دکھ مجھے پہونچتا تھا میں صبر کرتا تھا لیکن اب تو وہ اللہ کی ناراضگی کے عظیم ترین کام کرتے ہیں اس لئے مجھے اللہ کے لئے غصہ آیا ہے جس خدا نے آپ کو برا بر حق نبی بنا کر بھیجا ہے میں اسی خدا کے واسطے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان کے لئے بددعا کیجئے اللہ ان کو غارت کرے۔

یہ سن کر حضرت ارمیا علیہ السلام نے دعا کی اے زمین و آسمان کے بادشاہ اگر وہ تیری ناراضگی کے کام کر رہے ہیں تو ان کو تباہ کر دے، دعا کے بعد فوراً اللہ تعالیٰ نے ایک بجلی گرائی جس سے قربان گاہ میں آگ بھڑک اٹھی اور سات دروازے زمین

marfat.com

میں دھنس گئے حضرت ارمیا (علیہ السلام) نے عرض کیا اے میرے رب تیرا وعدہ کیا ہوا، ندا آئی ان پر جو عذاب آیا وہ صرف تیری بد دعا سے آیا ہے اس وقت حضرت ارمیا کو معلوم ہوا کہ وہ شخص حقیقت میں اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا اس کے بعد ارمیا جنگل کو نکل گئے۔

بخت نصر نے آکر بیت المقدس کو تباہ کر دیا اور ملک شام کو روند ڈالا، اسرائیلیوں کو قتل کیا اور قیدی بنایا، یہی وہ پہلی سزا تھی جو اللہ نے بنی اسرائیل کو ان کی بے جا حرکتوں کی وجہ سے دی تھی۔

جب بخت نصر لوٹ کر بابل کو چلا گیا تو ارمیا اپنے گدھے پر سوار ہو کر (جنگل سے واپس) آئے آپ کے ساتھ توشہ دان میں کچھ عرق انگور اور ایک ٹوکری انجیر تھے آکر بیت المقدس پر ٹھہر گئے اور تباہی کو دیکھ کر بولے اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا پھر آپ نے رسی سے گدھے کو باندھا اور اللہ نے آپ پر نیند مسلط کر دی۔

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ پس اللہ نے انکو مار ڈالا (یعنی موت نما نیند مسلط کر دی) سعید بن منصور نے حسنؒ بصری کا قول اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کا قول نقل کیا کہ یہ نیند چاشت کے وقت شروع ہوئی تھی پھر

مِائَةَ عَامٍ سو برس تک وہ مردہ رہا، گدھا، انگور اور انجیروں کا ٹوکرا بھی ان کے پاس ہی رہا، اللہ نے لوگوں کی نظروں سے ان کو چھپا دیا کوئی آپ کو نہ دیکھ سکا، ستر سال اسی حالت پر گزر گئے۔ ستر برس کے بعد اللہ نے ایک فرشتہ نوشک شاہِ فارس کے پاس بھیجا فرشتے نے جا کر کہا اللہ تجھے حکم دیتا ہے کہ بیت المقدس اور ایلیا کی از سر نو تعمیر کر، تاکہ یہ پہلے سے زیادہ آباد ہو جائیں، حسب الحکم نوشک نے آبادکاری شروع کر دی ادھر ایک مچھر بخت نصر کے دماغ میں گھس گیا اور اللہ نے مچھر کے ذریعہ سے اس کو ہلاک کر دیا اور جو اسرائیل بابل میں اس وقت تک زندہ رہ گئے تھے ان کو رہائی دلا دی وہ سب بیت المقدس اور اس کے مضافات میں واپس آگئے اور تیس برس میں پہلے سے بہتر آبادی ہو گئی اس وقت اللہ تعالیٰ نے ارمیا (علیہ السلام) کو پھر زندہ کر کے۔

ثُمَّ بَعَثَهٗ اٹھادیا یہ وقت غروب آفتاب سے کچھ پہلے کا تھا اللہ نے آپ کے پاس ایک فرشتہ بھیجا اور

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ اس نے ارمیاؑ سے پوچھا آپ کا یہاں توقف کتنا ہوا، ارمیاؑ کو خیال ہوا کہ یہ یوم خواب کا ہی سورج ہے (جو قریب غروب ہے) اس لئے

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا کہا کہ میں ایک دن یہاں ٹھہرا پھر سورج کی طرف منہ موڑ کر دیکھا تو سورج کو قریب غروب دیکھ کر فرمایا

اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ یا دن سے کچھ کم

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فرشتہ نے کہا نہیں، بلکہ آپ یہاں سو برس رہے۔

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ اب اپنے کھانے پینے یعنی انجیر اور عرق کو دیکھ لو کہ

لَمْ يَتَسَنَّهْ کوئی چیز بھی نہیں بگڑی ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انجیر ابھی درخت سے توڑے گئے ہیں اور عرق ابھی نچوڑا گیا ہے، کسائی نے کہا گویا برسہا برس کی مدت ان پر نہیں گزری تھی، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے حالت وصل میں لَمْ يَتَسَنَّهْ کی ہاء کو حذف کر کے يَتَسَنَّ پڑھا ہے لیکن حالت وقف میں باقی رکھا ہے اسی طرح آیت فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ میں بھی اصحاب ثلاثہ کی یہی قرات ہے جو لوگ ہاء کو حذف نہیں کرتے وہ اس کو اصلی (یعنی مادہ کی) ہا قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لفظ سَنَةٌ سے بنا ہے اور سَنَةٌ کی تاء اصل میں ہا تھی اور سَنَةٌ کی اصل سنھۃ تھی کیونکہ سَنَةٌ کی تصغیر سُنَيْهَةٌ آتی ہے اور مصدر مُسَانَهَةٌ آتا ہے لیکن اگر اس کو اصلی ہا نہ کہا جائے اور لام کلمہ میں اصلاً واؤ قرار دیا جائے تو یہ ہاء سکتہ ہو گی واؤ کو فتحہ ماقبل کی وجہ سے الف سے بدل دیا پھر الف کو حذف کر دیا اور ہا سکتہ حالت وقف میں بڑھا دی۔ بعض علماء کا قول ہے کہ لَمْ يَتَسَنَّهْ کی اصل لَمْ يَتَسَنَّنْ تھی (اصل مادہ سَنٌّ ہے) اَلْحَمَاِ الْمَسْنُوْنِ کا اور اس کا ایک مادہ ہے تیسرے نون کو حرف علت سے بدل دیا

maarifat.com

گیا ہے جیسے آیت دَسَّاھَا میں (دَسَّا اصل میں دَسَّسَ تھا) لَمْ یَتَسَنَّہْ کی مفرد ضمیر طعام و شراب کی طرف راجع ہے (مرجع اگرچہ تثنیہ ہے ضابطہ کے مطابق تثنیہ کی ضمیر ہونی چاہئے لیکن مفرد لانے کی وجہ یہ ہے کہ (طعام و شراب کی جنس ایک ہی ہے یعنی دونوں غذا ہیں۔

وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ اور اپنے گدھے کی طرف دیکھو حسب الحکم ارمیا نے گدھے کی طرف دیکھا، بقول بعض علماء گدھا ویسا ہی زندہ سالم کھڑا تھا جیسا اس کو باندھ کر سوئے تھے سو سال تک گدھے نے نہ کچھ کھایا نہ پیا، نئی رسی اس کے گلے میں بندھی ہوئی تھی رسی بھی خراب نہیں ہوئی تھی، بعض اہل علم کا قول ہے کہ گدھا مر چکا تھا ہڈیاں بھی گل چکی تھیں پھر ارمیا کی نظر کے سامنے بحکم خدا ایک ہوا میدان اور پہاڑ سے اس کی ہڈیاں سمیٹ کر لائی کیونکہ پرندے اور درندے ان کو جابجا لے جاچکے تھے (پھر اللہ نے گدھے کو زندہ کردیا)۔

میں کہتا ہوں کہ مؤخر الذکر قول پر لفظ وَانْظُرْ دلالت کر رہا ہے کیونکہ اگر کھانے پینے کی طرح گدھا بھی صحیح سالم باقی ہوتا تو فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ وَحِمَارِكَ کہنا چاہئے تھا (دوبارہ مستقل طور پر اُنْظُرْ کہنے کی ضرورت نہ تھی)۔

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ یعنی ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی دلیل لوگوں کو دکھانے کے لئے تجھے بنائیں گے، بعض علماء کے نزدیک آیت کے شروع میں واؤ زائد ہے، فراء نے کہا اس آیت کا تعلق فعل محذوف سے ہے (اور واؤ عطف جملہ کے لئے ہے) یعنی اور ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے تیری دوبارہ زندگی کو حیات بعد الموت کی دلیل بنائیں۔

وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ یعنی گدھے کی ہڈیوں کو دیکھو یہ مطلب اس صورت میں ہوگا جب گدھے کو مردہ اور فنا شدہ مان لیا جائے، اکثر اہل تفسیر کا یہی قول ہے بعض لوگوں کا قول ہے کہ خود حضرت ارمیا علیہ السلام کی ہڈیاں مراد ہیں (اول) آپ کی آنکھیں اور سر زندہ کیا گیا اس وقت تک باقی بدن فرسودہ بوسیدہ ہی تھا اور ہڈیاں صاف (بے گوشت اور) پراگندہ پڑی ہوئی تھیں۔

لیکن اس قول کی تردید رسول ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے کہ انبیاء کے اجسام اللہ نے زمین کے لئے حرام کردیئے ہیں (زمین ان کو گلا نہیں سکتی)۔

كَيْفَ نُنشِزُهَا کس طرح ہم ان کو زمین سے اٹھا کر باہم جوڑتے ہیں یہ ترجمہ نُنْشِزُ پڑھنے کی صورت میں ہوگا جو اہل حجاز و اہل بصرہ کے علاوہ تمام قاریوں کی قرأت ہے اہل حجاز و بصرہ نُنْشِرُھَا راء کے ساتھ پڑھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کو کیسے زندہ کرتے ہیں (اِنشار زندہ کرنا اور نُشور زندہ ہونا) آیت میں آیا ہے ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ ایک اور آیت ہے وَإِلَيْهِ النُّشُورُ

ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا (پھر ہم ہڈیوں کو گوشت پہناتے ہیں چنانچہ اللہ نے ہڈیوں کو گوشت اور خون (کا لباس) پہنا دیا اور وہ آدمی زندہ ہوگیا یا ہڈیاں گوشت کا لباس پہن کر گدھے کا مجسمہ بن گئیں پھر فرشتہ نے اس میں روح پھونک دی اور گدھا زندہ اٹھ کھڑا ہوا اور رینگنے لگا، آیت میں الفاظ کی کچھ تقدیم و تاخیر ہے اصل عبارت اس طرح تھی، بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ أَمَتْنَاكَ ثُمَّ أَحْيَيْنَاكَ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا وَفَعَلْنَا ذَٰلِكَ لِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ، بلکہ تو سو سال یہاں رہا ہم نے تجھے مردہ کردیا تھا پھر زندہ کردیا، اب اپنے کھانے پینے کو دیکھ لے کہ کوئی چیز خراب نہیں ہوئی ہے اور گدھے کو دیکھ اور ہڈیوں کو دیکھ کہ کس طرح ہم ان کو جمع کر کے جوڑتے اور پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں ہم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تجھے لوگوں کو (قیامت کا) یقین دلانے کے لئے نشانی بنائیں۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ جب اللہ کی حکمت (اور قدرت) اس شخص پر کھل گئی تو اس نے کہا

أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ مجھے یقین ہے کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے اَعْلَمُ قرأت جمہور کی ہے، حمزہ اور کسائی نے اِعْلَمْ بصیغہ امر پڑھا ہے، اس صورت میں کہنے والا فرشتہ ہوگا یا اللہ یا اس شخص نے خود اپنے نفس کو خطاب کیا ہوگا۔

روایت میں آیا ہے کہ بخت نصر بیت المقدس کو تباہ کر کے بنی اسرائیل کو قید کر کے بابل لے گیا، قیدیوں میں حضرت

marfat.com

عزیر علیہ السلام، حضرت دانیال علیہ السلام اور حضرت داؤد کی نسل کے کچھ لوگ بھی تھے کچھ مدت کے بعد عزیزؑ قید سے چھوٹ گئے اور گدھے پر واپس آگئے، دیر ہرقل پر پہنچے تو دجلہ کے ساحل پر اترے اور بستی میں چکر لگایا مگر کوئی آدمی نہ ملا، ہاں تمام درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے آپ نے کچھ پھل کھائے اور انگوروں کا عرق نچوڑ کر پیا اور بقیہ پھل ایک ٹوکری میں رکھ لئے اور بچا ہوا عرق مشکیزے میں بھر لیا اور بستی کی تباہی کو دیکھ کر بولے اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا الخ۔

قتادہؒ نے حضرت کعبؓ کا قول اور ضحاک و ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نیز سدی نے بروایت مجاہد حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب سو برس تک مردہ رکھنے کے بعد اللہ نے عزیزؑ کو زندہ کر دیا تو وہ گدھے پر سوار ہو کر اپنے محلّہ میں آئے لیکن نہ لوگوں کو پہچان سکے نہ ان کے مکانوں کو نہ لوگوں نے ان کو پہچانا صرف اندازہ سے اپنے گھر پر پہنچے تو ایک نابینا اپاہج بڑھیا ملی جس کی عمر ۱۲۰ سال تھی حقیقت میں وہ حضرت عزیر علیہ السلام کی باندھی تھی جب حضرت گھر سے نکلے تھے تو وہ بیس برس کی تھی آپ نے اس بڑھیا سے پوچھا کیا یہ عزیر کا مکان ہے بڑھیا نے کہا جی ہاں! لیکن میں نے عزیر کا تذکرہ اتنی مدت کے بعد آج سنا ہے (تم کون ہو) حضرت نے فرمایا میں عزیر ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے سو سال تک مردہ کر دیا تھا پھر زندہ کر دیا، بڑھیا نے کہا، عزیر علیہ السلام تو مقبولُ الدّعوات شخص تھے اگر تم عزیر ہو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ میری آنکھیں واپس مل جائیں حضرت نے دعا کی اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیا آنکھیں درست ہو گئیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑی ہو بڑھیا بالکل تندرست ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور حضرت کو دیکھ کر پہچان کر بولی میں شہادت دیتی ہوں کہ آپ بلاشبہ عزیر ہیں۔

اس وقت حضرت عزیر علیہ السلام کا بیٹا سو سال کا بوڑھا تھا اور پوتے پوتیاں بھی بوڑھے ہو چکے تھے مگر آپ کے سر اور داڑھی کے بال سیاہ تھے باندی آپ کو لے کر بنی اسرائیل کے جلسوں میں پہنچی اور پکار کر کہا، یہ عزیر ہیں لوگوں نے اس کی بات کو سچ نہ جانا باندی نے کہا میں تمہاری فلاں باندی ہوں، عزیر (علیہ السلام) کی دعا سے اللہ نے میری آنکھیں لوٹا دیں اور میرے پاؤں چلا دیئے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سو برس تک مردہ کر دیا تھا پھر زندہ کر دیا یہ سن کر لوگ اٹھے اور حضرت کے بیٹے نے کہا میرے باپ کے دونوں شانوں کے درمیان ہلالی شکل کا ایک کالا مسہ تھا کھول کر دیکھا گیا تو آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مسہ برآمد ہوا اور ثابت ہو گیا کہ آپ عزیزؑ ہی ہیں۔

سدیؒ اور کلبیؒ کا بیان ہے کہ جب حضرت عزیر اپنی قوم کے پاس لوٹ کر پہنچے تو تورات موجود نہ تھی کیونکہ بخت نصر نے تورات جلا دی تھی آپ رو دیئے ایک فرشتہ نے ایک برتن میں پانی لا کر پلایا، پلاتے ہی پوری تورات کا فوٹو دل میں اتر آیا، آپ بنی اسرائیل کے پاس لوٹ کر آئے تو تورات یاد تھی فرمایا میں عزیر ہوں لوگوں نے آپ کی بات جھوٹ جانی، آپ نے اپنی یاد سے پوری توریت لکھوا دی بنی اسرائیل کہنے لگے توریت تو ضائع ہو چکی تھی کسی کو بھی یاد نہ تھی، اب جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ نے توریت ڈالی وہ بلاشبہ خدا کا بیٹا ہی ہے سورۂ توبہ میں پورا قصہ انشاء اللہ ذکر کیا جائے گا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اور یاد کرو (اس واقعہ کو) جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا اے میرے رب مجھے دکھا دے کہ مردوں کو تو زندہ کس طرح کرتا ہے۔

(وجہ سوال) حسن، قتادہ، عطاء خراسانی اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ نے سوال مذکور کی وجہ یہ بیان کی کہ گدھے کی ایک لاش حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمندر کے کنارے پر پڑی دیکھی جب سمندر چڑھتا تھا تو دریائی (مردار خور) جانور (سمندر کے پانی کے ساتھ) آکر اس لاش کو کھاتے تھے اور پانی کے اتار کے بعد صحرائی درندے اور پرندے اس کو کھانے لگتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ کیفیت دیکھ کر تعجب ہوا اور عرض کیا میرے رب میں یہ تو جانتا ہوں کہ تو اس (مردار کے مختلف حصوں) کو سمندر و صحراء سے لا کر یکجا (کر کے زندہ) کر دے گا لیکن مجھے دکھا دے کہ تو اس کو کس طرح زندہ کرے گا تاکہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد میرے ایمان میں اضافہ ہو جائے۔

marfat.com

ایک روایت میں آیا ہے کہ جب نمرود نے دو آدمیوں کو بلوا کر ایک کو قتل کرا دیا اور دوسرے کو آزاد کر دیا، اور بولا اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ، تو حضرت ابراہیم نے فرمایا اللہ تو مرنے کے بعد زندہ کرے گا (اگر تو بھی کر سکتا ہے تو کر) نمرود نے کہا کیا تو نے خدا کو ایسا کرتے دیکھا ہے، ابراہیم علیہ السلام ہاں نہ کہہ سکے اور اس وقت اللہ نے مذکورہ بالا سوال کیا تاکہ نمرود کی ایسی بات کے جواب میں ہاں کہہ سکیں۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جب اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنالیا تو بحکم خدا فرشتۂ موت نے آکر آپ کو یہ بشارت دی ابراہیمؑ نے کہا، اس بات کی نشانی کیا ہے فرشتہ نے کہا اللہ آپ کی دعا قبول فرمائے گا اور آپ کی درخواست پر مُردوں کو زندہ کر دے گا اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مذکورہ بالا سوال کیا۔

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ اللہ نے فرمایا کیا تجھے یقین نہیں ہے کہ مار دینے کے بعد میں دوبارہ اجزاء کو جوڑ کر زندہ کر سکتا ہوں، اللہ اگرچہ واقف تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان سب سے زیادہ پختہ ہے لیکن صرف اس وجہ سے کہ ابراہیم علیہ السلام کے جواب کو دوسرے لوگ سن لیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مذکورہ بالا سوال کیا۔

قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ ابراہیم علیہ السلام نے کہا مانا کیوں نہیں مگر میرا یہ سوال تو اپنے دل کے ٹھہراؤ کے لئے ہے، یعنی مجھے قلبی اطمینان ہو جائے بصیرت اور سکون قلب معاینہ کے بعد بڑھ جائے استدلال (عقلی) اور وحی (وجدانی) کے ساتھ مشاہدہ مل جائے توجہ کا ٹھہراؤ ہو جائے، یا یہ مطلب ہے کہ میرے دل کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ تو نے مجھے اپنا خلیل بنالیا ہے اور میری دعا کو تو قبول فرمائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى (الایة) وَرَحِمَ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَاْوِیْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ، وَلَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ طُوْلَ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ (متفق علیہ) یعنی ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کے حق دار ہیں جب کہ انہوں نے رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى کہا تھا (اور اپنے لفظوں سے شک کا اظہار کیا تھا) اور لوط پر اللہ کی رحمت ہو وہ ایک قوی سہارے کی طرف رجوع کرنا چاہتے تھے (یعنی ظاہری سہارے کے طالب تھے) اور اگر میں قید خانہ میں اتنی طویل مدت تک رہتا جتنی مدت یوسف رہے تو میں (بادشاہ کی طرف سے) بلانے والے کے قول کو (بلا شرط) مان لیتا (اور اس کے ساتھ چلا جاتا)۔

اس حدیث کی معنوی تشریح مختلف طور پر کی گئی ہے، اسماعیل بن یحییٰ مزنی رحمتہ اللہ علیہ کہتے تھے کہ اللہ کا مُردوں کو زندہ کرنا نہ رسول ﷺ کے لئے کوئی شک کی چیز تھا نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اس میں کسی کو شک نہ تھا شک صرف اس بات میں تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہماری دعا بھی قبول فرمالے گا یا نہیں لیکن اس تشریح کی تردید خود آیت اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ سے ہو رہی ہے (آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد احیاء موتیٰ کے متعلق اطمینان قلب حاصل کرنا تھا)۔

امام ابو سلیمان خطابی نے کہا کہ حدیث میں شک کا اعتراف ہی نہیں ہے رسول ﷺ نے نہ اپنے شک کا اعتراف کیا نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شک کرنے کا بلکہ شک کی نفی موجود ہے مطلب یہ ہے کہ جب مجھے شک نہیں تو ابراہیم کو تو بدرجہ اولیٰ شک نہ ہونا چاہئے (گویا) حضورؐ نے تواضع و انکسارِ نفس کے طور پر اپنے کو چھوٹا اور ابراہیمؑ کو بڑا قرار دیا، حدیث لَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ کا بھی یہی مطلب ہے حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی درخواست شک کی وجہ سے نہیں تھی (یقین تو ان کو پہلے ہی تھا) بلکہ معاینہ سے علم و یقین میں اضافہ چاہتے تھے، استدلال سے اطمینان قلب اور معرفت کا حصول اتنا نہیں ہوتا جتنا آنکھوں سے دیکھنے سے ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ خبر معاینہ کے برابر نہیں ہوتی، اللہ نے حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی کی اطلاع دے دی، مگر آپ نے تورات کی تختیاں نہیں پھینکیں لیکن جب انکی حرکت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو تختیاں پھینک دیں کہ وہ ٹوٹ گئیں، یہ حدیث امام احمد اور طبرانی نے

marfat.com

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کی ہے لیکن جو حدیث طبرانی ؒ نے حضرت انس ؓ کی روایت سے اور خطیب نے حضرت ابوہریرہ ؓ کی روایت سے اچھی اسناد کے ساتھ بیان کی ہے اس میں حضرت موسیٰ کے واقعہ کا ذکر نہیں ہے (صرف لیس الخبر کالمعاینۃ مذکور ہے)۔

یہ بھی روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو شک کیا لیکن ہمارے حضور اقدس ﷺ نے شک نہیں کیا، میں کہتا ہوں یہ قول اور یہ توجیہ حدیث میں ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شک نہ کرنا تو خود آیت میں مذکور ہے دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کہا تھا اس کلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف شک کی نسبت کس طرح کی جاسکتی ہے اور دفع توہم کی ضرورت ہی کیا ہے میرے نزدیک تحقیق وہ ہے جو صوفیہ صافیہ نے بیان کی ہے کہ سلوک کے دو مقام ہیں (۱) عروج (۲) نزول۔

عروج یہ ہے کہ آدمی تمام بشری اوصاف کا لباس اتار پھینکے اس کے اندر ملکوتی صفات اور قدسی احوال پیدا ہو جائیں، رسول ﷺ نے جب خود پے درپے روزے رکھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو پے درپے روزے رکھنے کی ممانعت فرمائی صحابہ نے عرض کیا یارسول ﷺ آپ بھی تو پے درپے روزے رکھتے ہیں حضور (ﷺ) نے فرمایا میں تمہاری (اس ظاہری بشری) ہیئت کی طرح نہیں ہوں مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے اس حدیث میں مقامِ عروج ہی کا بیان ہے، اہل اللہ کی اصطلاح میں اس سیر حیٰوۃ کو سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کہتے ہیں۔ نزول کا یہ معنی ہے کہ عروج کے بعد پھر لوٹ کر بشری صفات سے موصوف ہو جائے اس رجوعی سیر کو سیر من اللہ باللہ کہتے ہیں، مقامِ نزول مقامِ تکمیل ہوتا ہے اس مقام پر پہنچنے والا مخلوق کو خالق کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے (یعنی صاحب دعوت ہوتا ہے)۔ [1]

نزول کی حکمت یہ ہے کہ فیض بخشنے والے اور فیض قبول کرنے والے میں باہم مناسبت ہونی ضروری ہو تاکہ فیض یابی میں سہولت ہو جیسے رنگ ریزی اور رنگ پذیری بغیر باہمی تناسب کے نہیں ہوتی (اسی طرح فیض بخشی اور فیض یابی کے درمیان خواص وصفات اور احوال میں قدرے مشابہت لازم ہے بالکل بیگانگی مانع استفادہ ہے) اسی لئے انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے انسانوں کو نبی بنا کر بھیجا، عوام براہ راست انبیاء کی وساطت کے بغیر بارگاہ الٰہی سے فیض یاب نہیں ہو سکتے (اللہ نور محض ہے اور

---

[1] یاد رکھنا چاہئے کہ سلوک میں مقام عروج تک پہنچنے سے صرف اپنی تکمیل ہوتی ہے عارف کا رخ صرف حق تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے، معرفت حق اس کو حاصل ہوتی ہے وہ صفات بشریہ فنا کر چکتا ہے، بشری انانیت کھو دیتا ہے وہ اس صاف آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس پر اگر آفتاب کا عکس پڑتا ہے تو پار ہو جاتا ہے اور اس کے ذرہ ذرہ کو روشن کر دیتا ہے یہاں تک کہ سوائے آفتاب کی شعاعوں کے آئینہ کی ہستی نظر ہی نہیں آتی وہ نور چیں ضرور ہوتا ہے مگر عکس ریز نہیں ہوتا خود روشن ہوتا ہے لیکن دوسروں کو روشنی نہیں دے سکتا، تاریک کمرہ میں اس کا عکس نہیں پہنچتا مقام عروج میں انسان میں محض ملکوتی صفات پیدا ہو جاتی ہیں نہ کھانے پینے کی خواہش نہ دکھ سکھ کا احساس نہ اس کے اندر بشری تقاضے کار فرما لیکن صاحب عروج کی مزید تکمیل کے لئے اس کو پھر لوٹا کر بشری صفات کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے، خالص ملکوتیت اور نری قدسیت باقی نہیں رہتی خواصِ بشریت اور لوازمِ انسانیت پھر بدرجہ اتم اس میں نمودار ہو جاتے ہیں اب وہ دوسرے انسانوں کی طرح ہوش حواس کی دنیا میں ہوتا ہے، علائق بشری سے وابستہ ہو جاتا ہے، لذت والم، پیاس اور بھوک سیری اور تشنگی خواہشات کا احساس اس میں پیدا ہو جاتا ہے، اب وہ دوسرے انسانوں سے علیحدہ نہیں ہوتا سب کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے جب دوسرے آدمیوں سے اس کو مناسبت تامہ ہو جاتی ہے تو مقام عروج میں جو کچھ دیکھ کر آتا ہے اس مقام نزول میں اتر کر دوسروں کو بھی بتاتا ہے جس چشمہ سے خود سیراب ہو چکا ہوتا ہے دوسروں کو بھی اسی پانی سے سیراب کرتا ہے اب وہ ایسا آئینہ ہو جاتا ہے جس کا ایک رخ روشن ہوتا ہے اور دوسرے رخ پر بشریت کا مصالحہ لگا ہوتا ہے روشن رخ سے وہ آفتاب الوہیت ووحدت کی شعاعیں کھینچتا ہے اور تاریک رخ کی وجہ سے اس نور بے کیف اور ہدایت الٰہی کی روشنی کو اپنے اندر روک کر تاریک دلوں پر عکس ریزی اور نور پاشی کرتا ہے، پس اس مقام پر اس کو دوسرے انسانوں سے جتنی زیادہ مناسبت ہوتی ہے اور اتنا ہی اس کی تبلیغ وہدایت سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، مرتبۂ عروج پر کامل طور پر فائز تو سب ہی انبیاء اور اہل عرفان ہوتے ہیں گو درجات کا فرق ہوتا ہے اور کمال عروج سب کو حاصل ہوتا ہے لیکن مقامِ نزول کے اعتبار سے انبیاء ایک جیسے نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کی تبلیغ سے بھی ایک جیسا فائدہ نہیں ہوتا، کسی سے فیض یاب کم لوگ ہوتے ہیں کسی سے زیادہ۔

marfat.com

عام انسان کثافت خالص۔ظلمت کا نور سے جوڑ نہیں ہو سکتا) یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے لئے فرشتوں کو بھی پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا (کیونکہ فرشتے بشری آلائشوں سے قطعاً پاک اور مجسم نور ہیں ان سے ظلمانی الطبع انسانوں کو کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا) اللہ تعالی نے فرمایا ہے۔

(ترجمہ) اگر زمین پر ملائکہ چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ان کی ہدایات کے لئے آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر اتارتے، دوسری جگہ فرمایا (ترجمہ) اگر ہم پیغامبر کو فرشتہ بناتے تو اس فرشتہ کو مرد بناتے اور انسانی جامہ پہناتے جس شخص کی حالت نزول جتنی کامل ہو گی اتنی ہی اس کی تبلیغ کامل اور دعوت آفاق گیر ہو گی، دیکھو اگر کوئی شکاری کسی بلند ترین مقام سے شکار کے تیر مارے تو اکثر نشانہ خطا ہو جاتا ہے (اسی طرح صاحب عروج جب تک مقام نزول پر اتر کر تبلیغ نہیں کرے گا دعوت ناکام رہے گی) حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ نے فرمایا حضرت نوح کی دعوت فراق کے ساتھ تھی اس لئے لوگوں نے رد کر دی اور رسول (ﷺ) کی دعوت مقارنت کے ساتھ تھی اس لئے لوگوں نے مان لی، شیخ کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی استعداد و صلاحیت انتہائی پست ہوتی ہے اور حضرت نوح مقام عروج پر تھے، آپ کے اور عوام کے درمیان زیادہ قرب نہ تھا فریقین کے احوال میں باہم مناسبت نہ تھی اس لئے دعوت ناکام رہی اور رسول (ﷺ) (تکمیل عروج کے بعد) انتہائے نزول پر اتر آئے تھے (اور عوام سے آپ کے احوال قریب اور متناسب ہو گئے تھے) اس لئے آپ کی دعوت پر لوگوں نے لبیک کہی عارف کامل پر جب نزول کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو اس وقت وہ بالکل عوام کی طرح اسباب (ظاہری) کے دامن سے وابستہ نظر آتا ہے اسی مقام پر اتر کر رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے موقع پر تہ بر تہ زرہ پہنی تھی (اور جسم مبارک کی حفاظت کے لئے لوہے کی زرہ استعمال کی تھی) اور مدینہ کے گرداگرد دشمن کی روک کے لئے خندق کھدوائی تھی، اسی مقام پر عارف کامل اپنے یقین کی زیادتی اور قلبی سکون حاصل کرنے کے لئے استدلال قطعی کا خواہاں ہوتا ہے پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اسی مقام کی تشریح ہے اور حضرت لوط علیہ السلام نے لَوْ اَنَّ بِكُمْ قُوَّةً اَوْاٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ اسی مقام میں کہا تھا، حدیث مذکور میں رسول اللہ ﷺ نے زیادتی یقین کی طلب کو (لفظی اور) ظاہری مشابہت کی وجہ سے شک فرمایا اور نحن احق بالشک من ابراہیم فرما کر اپنے مقام نزول کی تعبیر کی، مراد یہ ہے کہ ہمارا مقام نزول تو ابراہیم علیہ السلام کے مقام نزول سے زیادہ کامل ہے اس لئے زیادت یقین کی طلب ہم کو ابراہیم سے زیادہ ہونی چاہئے حقیقت میں بھی رسول اللہ ﷺ کا مقام نزول حضرت ابراہیم کے درجہ نزول سے بڑھا ہوا تھا اسی لئے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے آپ کو بھیجا گیا اسی طرح آپ کا مرتبہ عروج بھی ہر عروج سے بلند تھا، فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى ، گویا آپ کمال کے دونوں جہات (عروج و نزول) کو محیط تھے، رہا حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق حضور ﷺ کا ارشاد مذکور تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت لوط مقام نزول میں تھے اس تشریح پر یہ حضرت لوط علیہ السلام کی مدح ہو گی، باقی حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ والی حدیث سے تو ثابت ہو ہی رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ نزول حضرت یوسف علیہ السلام کے درجہ نزول سے زیادہ کامل تھا اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا نزول حضور ﷺ کے مرتبہ نزول کے برابر ہوتا تو (پہلی ہی مرتبہ بلانے والے کی دعوت کو قبول کر لیتے، واللہ اعلم۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ اللہ نے فرمایا (جب تو اطمینان قلب کے لئے اپنی نظر سے مُردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہے) تو چار پرندے پکڑ لے، الطیر مصدر (بمعنی اسم فاعل ہے یا طائر کی جمع ہے جیسے صحب صاحب کی جمع ہے مجاہد، عطا ابن رباحؒ اور ابن جریجؒ نے بیان کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندے لے لئے، مور، مرغ، کبوتر، کوا حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول میں بجائے کبوتر کے گدھ آیا ہے۔

عطا خراسانی کا بیان ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ سبز بطخ، کالا کوا، سفید کبوتر اور سرخ مرغ لے لے، میں کہتا ہوں، چار پرندے لینے کا حکم شاید اس وجہ سے دیا کہ انسان اور دوسرے تمام حیوان چار اخلاط سے بنے ہیں اور چار اخلاط چار عناصر سے پیدا ہوتے ہیں، سرخ مرغ خون کی تعبیر ہے اور سفید کبوتر بلغم کی اور سیاہ کوا سوداء کو بتارہا ہے

marfat.com

اور سبز سفراء کو۔ ان چاروں کو مرے پیچھے زندہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ انسانی اجزاء بھی مرنے کے بعد زندہ کئے جا سکتے ہیں۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ مذکورہ جانوروں کے خصوصی اوصاف کو فنا کئے بغیر نفس کو حیات ابدی حاصل نہیں ہو سکتی ظاہری سجاوٹ اور خواہشات کی محبت طاؤس کی خصوصیت ہے، رعب داب اور حملہ کرنے میں مرغ مشہور ہے، دناءت نفس اور طول آرزو کوے کی صفت ہے، بلندی کی طلب اور ہوا کی طرف اٹھنا کبوتر کا خاصہ ہے

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام نزول ودعوت میں تھے اس لئے آپ کو اللہ نے ہدایت کا طریقہ سکھایا کہ مرید کو فنا اور بقاء دونوں کی تعلیم دیں چنانچہ آپ نے جانوروں کو پکڑ کر پارہ پارہ کیا گویا یہ سلوک وفنا کی طرف اشارہ ہے پھر آپ نے ان کو بحکم خدا پکارا اس سے اشارہ جذب الی اللہ اور بقاء کی طرف ہے (ہماری یہ تمام تفصیل قرآن سے غیر متعلق ہے یہ صرف اہل بصیرت کی بصیرت اندوزیاں ہیں) واللہ اعلم۔

فَصُرْهُنَّ ابو جعفر اور حمزہ کی قرات فَصِرْهُنَّ ہے یعنی ان کو پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کر دے یہ لفظ صَارَ یَصِیْرُ صَیْراً سے مأخوذ ہے اور قراء کے نزدیک صَرٰی یَصْرِیْ صَرْیاً کا مقلوب ہے، باقی قاریوں کے فَصُرْهُنَّ پڑھا ہے یعنی ان کو ہلا لے ملا لے، اس وقت (اس لفظ کا مادہ صَوْرٌ ہوگا اور یہ) صُرْتُ اَصُوْرُ سے مأخوذ ہوگا عطاء نے کہا صُرْهُنَّ کا معنی ہے ان کو جمع کر لے، صَارَ یَصُوْرُ کا معنی جمع کرنے کا ہے۔

اِلَیْكَ (اپنی طرف) بر قرات جمہور اس کا تعلق فَصُرْهُنَّ سے ہے اور بر قرات حمزہ ایک لفظ محذوف سے تعلق ہے یعنی مُنْضَمًّا اِلَیْکَ۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک حصہ رکھ دے، عاصم نے بروایت ابو بکر جُزُءًا قرآن میں ہر جگہ پڑھا ہوا اور ابو جعفر نے جُزًّا اور جمہور نے جُزْءًا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ پرندوں کو ذبح کر کے ان کے پر نوچ کر سب پر اور خون اور گوشت مخلوط کرلیں پھر اس مخلوط کے حصے کر کے پہاڑوں پر رکھ دیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سات حصے کر کے سات پہاڑوں پر رکھ دیئے اور سب کے سر اپنے پاس روکے رکھے، ابن جریج اور سدی کی بھی روایت ہے لیکن ابن جریر نے بوساطت ابن اسحاق نیز قتادہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ہر پرندہ کے چار حصے کر کے ایک ایک حصہ پہاڑ پر رکھ دیا (یعنی چار پہاڑوں پر چار حصے رکھ دیئے)۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ پھر ان کو پکارو یعنی یوں کہو کہ بحکم خدا آجاؤ۔

یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا وہ جلد جلد اڑتے ہوئے یا تیز تیز پیدل دوڑے ہوئے آجائیں گے۔ حسب الحکم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پکارا فوراً ہر پرندہ کے خون کا ہر قطرہ دوسرے قطرہ سے ہر پر دوسرے پر سے اور ہر ہڈی اور ٹکڑا دوسری ہڈی اور ٹکڑے سے ملنے لگا اور ابراہیم علیہ السلام کی نظر کے سامنے ہر جسم بغیر سر کے پورا بن گیا پھر جسم اپنے اپنے سروں کی طرف آئے اور سروں سے جڑ کر بحکم خدا زندہ پرندے بن گئے۔

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ اور جان رکھ کر اللہ تعالیٰ غالب ہے یعنی کوئی چیز اس کو اس کے ارادہ سے روک نہیں سکتی۔

حَكِیْمٌ۠ (۲۶۰) پوری حکمت والا ہے) اس کا ہر فعل اور ترک مبنی بر حکمت ہے سابق میں (حضرت عزیزؑ یا ارمیا علیہم السلام کے قصہ کے خاتمہ پر) فرمایا تھا اِعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اس جگہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کے خاتمہ پر) فرمایا اِعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ (عزیر یا ارمیا کا قول اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا صرف اظہار

marfat.com

تعجب کے لئے تھا اور حیرت اس امر پر تھی کہ مرے پیچھے زندہ کرنا معمول دنیوی کے خلاف ہے [1] اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کی بنا ایک نازک ترین حقیقت (حالت نزول) پر تھی جس سے حکمت الٰہیہ کا تقاضا پورا ہوتا تھا، واللہ اعلم۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عزیرؑ کو سو برس مردہ رکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی مراد دکھائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مراد بڑی آسانی اور حسن اسلوب کے ساتھ فوراً پوری کر دی اس سے ثبوت مل رہا ہے اس امر کا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت عزیرؑ پر فضیلت حاصل تھی نیز حُسنِ ادب کے ساتھ سوال اور عاجزانہ دعا بہت برکت رکھتی ہے (یعنی حضرت عزیرؑ کے کلام میں صرف اظہار تعجب ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے کلام میں عاجزانہ طلب ملتجیانہ دعا اور باادب سوال ہے اسی دعا کی برکت تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال آسانی کے ساتھ پورا کر دیا گیا اور حضرت عزیرؑ کو سو برس مردہ رہنے کے بعد مراد ملی)۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہ خرچ سے مراد ہے جہاد میں یا ہر راہ خیر میں خرچ کرنا۔ اس عبارت میں مضاف محذوف ہے خواہ مبتدا کی جانب حذف مانا جائے یا خبر کی جانب یعنی جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے۔

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ جیسے غلہ کا کوئی ایک دانہ جس میں سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں (اس طرح ایک دانہ کے سات سو دانے ہو جائیں) یا یوں کہا جائے کہ راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بونے والا جس میں سات بالیں نکلیں الخ۔

اَنْۢبَتَتْ اس دانہ نے پیدا کیا، دانہ کی طرف پیدا کرنے کی نسبت مجازی ہے (پیدا کرنے والا حقیقت میں اللہ ہے) دانہ بالیاں پھوٹنے کا سبب ہے (مسبب کی جگہ سبب کا استعمال مجازاً ہوتا ہے) ایک بالی میں سو دانے (بعض اناج میں ہوتے ہیں) جیسے چینا یا دوان۔

وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ یعنی دنیا اور آخرت میں اللہ جس شخص کے لئے جتنے گنا چاہے کر سکتا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ کیونکہ اللہ بڑی سمائی والا ہے جس پر جتنی زیادہ مہربانی کرے کر سکتا ہے اس کیلئے کوئی تنگی نہیں۔

عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ وہ خرچ کرنے والوں کی نیتوں سے بخوبی واقف ہے نیتوں کے موافق ہی جزا عطا کرے گا۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بغویؒ نے بروایت کلبی بیان کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف چار ہزار درہم صرف خیر کے لے کر خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے چار ہزار تو میں نے اپنے اور اپنے بچوں کے لئے رکھ لئے ہیں اور چار ہزار میں اپنے رب کو قرض دینے لایا ہوں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو درہم تم نے اپنے پاس روک لئے اور جو راہ خدا میں دیئے ہیں سب میں اللہ برکت دے۔ حضرت عثمانؓ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کو ایک ہزار اونٹ ان کے کجاووں اور عرق گیر سمیت دیئے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کلبی نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ بھی بیان کیا کہ جیش عسرت (یعنی جنگ تبوک کی تیاری) کے موقع پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار دینار لا کر رسول اللہ ﷺ کی گود میں ڈال دیئے میں

---

[1] وہ ضابطۂ تخلیق جو اس دنیا میں جاری ہے آدمی اس کو ضابطہ فطرت سمجھتا ہے کیونکہ اس کے خلاف آدمی کو کوئی مثال نہیں ملتی، لیکن آدمی کے مسلمہ ضابطہ فطرت کے خلاف اگر کوئی صورت پیش آئے یا خرق فطرت کی اس کو اطلاع دی جائے تو خبر دینے والے کی سچائی پر اعتماد کرنے کی وجہ سے وہ اگرچہ اس کو مان لیتا ہے اور یقین کر لیتا ہے لیکن باوجود یقین کے اس کو تحیر اور تعجب ضرور ہوتا ہے، اسی حیرت اور تعجب کی وجہ سے وہ اپنے علمی یقین کو یقین مشاہدہ سے بدلنا چاہتا ہے اور علم الیقین سے ترقی کر کے عین الیقین حاصل کرنے کا خواستگار ہوتا ہے، حضرت مولف کا مطلب بھی یہی ہے کہ حضرت عزیرؑ یا حضرت ارمیاؑ کا سوال انکاری نہ تھا بلکہ تعجب آگیں تھا اور آپ عین الیقین کے خواستگار تھے ۱۲۔

marfat.com

نے خود دیکھا کہ (انتہائی مسرت کے ساتھ) رسول اللہ ﷺ ان میں دست مبارک ڈالتے ان کو الٹ پلٹ کرتے اور فرماتے تھے آج کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس کو (کسی عمل سے) ضرر نہیں ہوگا اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ امام احمد نے بھی حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی ہے لیکن اس میں نزول آیت کا ذکر نہیں ہے۔

ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى جو لوگ راہ خدا میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ کسی قسم کا احسان رکھتے ہیں نہ دکھ دینے کی کوئی بات کرتے ہیں۔ مَنًّا کا یہ معنی ہے کہ جس پر احسان کیا ہے اس پر احسان کی شمار کرے (یعنی احسان رکھے) اور اَذًى سے یہ مراد ہے کہ احسان کے بعد اس پر اپنی فوقیت قائم کرے اور اپنے کو بالادست قرار دے یا یہ کہے کہ تو مجھ سے کتنا مانگے گا۔ مجھے کتنا ستائے گا یا اپنے دینے کا ایسے لوگوں سے تذکرہ کرے جن کا مطلع ہونا لینے والے کو ناگوار ہو۔

بغوی ؒ نے نقل کیا ہے کہ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ میرے باپ کہا کرتے تھے جب تو کسی کو کچھ دے اور پھر تجھے محسوس ہو کہ اس کو تیرا سلام کرنا بھی گراں گزرتا ہے تو اس کو سلام بھی نہ کر۔

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۶۲ ان کا اجر خصوصیت کے ساتھ ان کے رب کے پاس ہے ان کو نہ (آئندہ کا) خوف ہوگا نہ (پچھلے کا) غم۔ (الذین مبتدا ہے اور لَهُمْ اَجْرُهُمْ خبر ہے) مبتدا کے اندر شرط کا معنی ہے لہٰذا خبر پر فاء آنی چاہئے لیکن اس جگہ فاء مذکور نہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ در پردہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ اس سلوک کے پہلے سے ہی مستحق ہیں خواہ انفاق کریں یا نہ کریں اور اب تو انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں اس لئے ان کا استحقاق مستحکم ہو گیا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ بھلی بات اور نرمی سے سائل کو رد کر دینا۔ کلبی نے کہا اس سے مراد وہ نیک دعا ہے جو کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں کرتا ہے۔ ضحاک نے کہا باہمی نزاع کو دور کرنے کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا (یعنی قول معروف سے وہ بات مراد ہے جو مسلمانوں کے باہمی نزاع کو دور کرنے کے لئے کہی جائے)۔

وَّمَغْفِرَةٌ اور معاف کر دینا یعنی جو سائل اصرار کے ساتھ سوال کرتا ہے اور پیچھے پڑ جاتا ہے اس کو مناسب الفاظ کے ساتھ رد کرنا اور در گزر کرنا (زجر نہ کرنا اور سخت الفاظ استعمال نہ کرنا) بغوی ؒ نے لکھا ہے مغفرت سے مراد یہ ہے کہ سائل کا پردہ فاش نہ کرے اور اس کی محتاجی پر پردہ ڈالے رکھے (گویا بغوی کے نزدیک مغفرت کا لغوی معنی یعنی چھپانا مراد ہے مجازی معنی یعنی معاف کرنا مراد نہیں ہے)۔

بعض علماء نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نرم الفاظ میں رد کرنے سے من جانب اللہ مغفرت کا حصول اس کو مقصود ہو بعض لوگوں کا قول ہے کہ مغفرت سے مراد یہ ہے کہ سائل رد کرنے والے کے انکار سے در گزر کرے اور اس کو معذور سمجھے۔ کلبیؒ اور ضحاکؒ کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جو شخص بھی اس کی حق تلفی کرے اس کو معاف کر دے۔

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ یعنی بھلی بات اور مغفرت اس دینے سے بہتر ہے جس کے پیچھے دینے والے کی طرف سے لینے والے کو دکھ پہنچے۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مبتدا ہے اور خَيْرٌ دونوں کی خبر ہے قَوْلٌ نکرہ مخصوصہ ہے اس لئے اس کا مبتدا ہونا درست ہے۔

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ یعنی جس عطاء کے بعد احسان رکھا جائے یا دکھ دیا جائے اس کی اللہ کو پرواہ نہیں۔

حَلِيْمٌ ۝۲۶۳ احسان رکھنے والے اور دکھ دینے والے کو فوری عذاب نہیں دیتا کیونکہ بڑی برداشت والا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ (اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو اپنی خیرات کے ثواب کو سائل پر احسان رکھنے اور دکھ دینے سے اکارت نہ بناؤ یعنی دونوں میں سے کوئی فعل کر کے صدقہ کو رائیگاں نہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک احسان رکھنے سے مراد ہے اللہ پر احسان رکھنا اور عام مفسرین نے لینے والے پر احسان رکھنا مراد لیا ہے۔

marfat.com

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دینے کے بعد احسان جتانے والا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا (یعنی جب تک لینے والا اس کو معاف نہ کردے اور ماں باپ راضی نہ ہو جائیں) واللہ اعلم رواہ النسائی والدارمی۔

كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِؕ جیسے وہ شخص اپنے ثواب کو اکارت کر دیتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لئے خیرات کرتا ہے حالانکہ اس کا ایمان نہ اللہ پر ہوتا ہے نہ روز آخرت پر۔

كَالَّذِىْ میں کاف محل نصب میں ہے اور نصب یا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے ہے یا حال ہونے کی بنا پر اول صورت میں اس طرح ترجمہ ہوگا کہ اس شخص کے ثواب کو رائیگاں کرنے کی طرح اپنے ثواب کو اکارت نہ کرو جوالح اور مؤخر الذکر صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ثواب کو برباد کرنے میں اس شخص کی طرح نہ ہو جاؤ جوالح رِئَآءَ النَّاسِ کا نصب مفعول لہ، یعنی فعل مذکور کی علت ہونے کی بنا پر ہے یعنی لوگوں کو دکھانے کی غرض سے وہ مال خرچ کرتا ہے یا حال ہونے کی وجہ سے نصب ہے۔ یعنی لوگوں کو دکھاتے ہوئے خرچ کرتا ہے یا مفعول مطلق ہوئے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی لوگوں کی دکھاوٹ کا خرچ کرنا۔ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ انفاق صدقہ کی قید نہیں ہے کیونکہ ریاکاری سے خیرات کا ثواب بہرحال برباد ہو جاتا ہے خواہ ریاکاری کرنے والا مومن ہی ہو۔ بلکہ اس جملہ کا ذکر حقیقت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ دکھاوٹ کیلئے خیرات کرنی مومن کی شان نہیں منافق کی خصوصیت ہے۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ اس ریاکار کی حالت ایسی ہے جیسے پتھر کی چکنی چٹان صفوان یا جمع ہے اور صفوانہ اس کا مفرد ہے یا مفرد ہے اور صفی جمع ہے۔

عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًاؕ جس پر خاک پڑی ہو اور موٹے قطروں کی بارش اس پر برسے اور صاف چکنا کر کے چھوڑ دے۔

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْاؕ یعنی جو کچھ دنیا میں کمائی کی تھی آخرت میں اس سے بالکل نفع حاصل نہ کر سکیں گے۔ چونکہ الذی سے جنس یا جمع مراد ہے گو لفظ مفرد ہے اس لئے معنوی لحاظ سے لایقدرون کی ضمیر جمع الذی کی طرف راجع ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اور اللہ کافر (یعنی کفر پر جم جانے والی) قوم کو ہدایت نہیں کرتا اس جملہ میں در پردہ اس طرف اشارہ ہے کہ ریاکاری اور منت نہی اور سائل سے اذیت رساں بات کہنا کافروں کی خصوصیات ہیں مؤمن کے لئے زیبا نہیں۔ یا (کافر سے مراد ہے ناشکری کرنے والا) منعم حقیقی کی نعمتوں کا کفران اور ناشکری کرنے والوں کو اللہ ہدایت نہیں کرتا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں سب سے زیادہ شرک سے لاپرواہ ہوں اگر کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس کے اندر کسی دوسرے کو میرا ساجھی قرار دیتا ہے (یعنی خالص میری رضا حاصل کرنے کے لئے نہیں کرتا) تو میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں میں اس سے بیزار ہوں اس کا عمل اسی شریک کے لئے ہوگا جس کے لئے اس نے کیا ہوگا۔ (رواہ مسلم)۔

حضرت جندبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص شہرت طلبی کے لئے عمل کرتا ہے اللہ بھی اس کے عمل کو شہرت طلبی کے لئے قرار دیتا ہے اور جو ریاکاری کرتا ہے اللہ بھی اس کے کام کو ریاکاری قرار دیتا ہے (بخاری و مسلم)

حضرت ابوسعید بن ابو فضالہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یعنی اس دن جس کا آنا یقینی ہے لوگوں کو جمع کرے گا تو ایک پکارنے والا ندا دے گا جس نے کوئی کام اللہ کے لئے کیا ہو اور اس میں کسی دوسرے کو اللہ کے ساتھ شریک بنایا ہو اس کو چاہئے کہ اپنا ثواب اسی شریک سے طلب کرے۔ اللہ سب سے زیادہ شرک سے بیزار ہے۔ (رواہ احمد)

حضرت محمودؓ بن لبید راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ اندیشہ شرک اصغر کا

marfat.com

ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر کیا ہے۔ فرمایا ریاکاری (رواہ احمد) بیہقی نے شعب الایمان میں اتنا مزید نقل کیا ہے کہ جزا سزا کے دن اللہ فرمائے گا۔ ان کے پاس جاؤ جن کو دنیا میں تم اپنے اعمال دکھایا کرتے تھے جاکر دیکھو کہ ان کے پاس تم کو جزا یا بھلائی ملتی ہے۔

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے مجھے اپنی امت کے متعلق شرک اور پوشیدہ خواہش نفس کا اندیشہ ہے میں نے عرض کیا، کیا حضور کے بعد حضور صلی اللہ ﷺ کی امت شرک کر سکے گی فرمایا ہاں، سنو کوئی شک نہیں کہ وہ نہ سورج کی پوجا کرے گی نہ چاند کی نہ پتھر کی نہ بت کی بلکہ وہ اپنے اعمال میں دکھاوٹ کرے گی اور پوشیدہ نفسانی خواہش کی صورت (مثلاً) اس طرح ہوگی کہ صبح کو لوگ روزہ دار ہوں گے لیکن (پھر) کوئی نفسانی خواہش ان کے سامنے آئے گی تو روزہ چھوڑ دیں گے۔ (رواہ احمد و بیہقی)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ قیامت کے دن سب سے اول ایک شہید کا فیصلہ ہوگا پیشی کے وقت اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا وہ ان کا اقرار کرے گا اللہ فرمائے گا تو پھر ان نعمتوں کے سلسلہ میں تو نے کیا کیا وہ عرض کرے گا میں تیری راہ میں لڑ کر شہید ہو گیا اللہ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے تو صرف بہادر کہلوانے کے لئے لڑا تھا چنانچہ تجھے بہادر کہہ دیا گیا اس کے بعد بحکم خداوندی منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص کی پیشی ہوگی جس نے علم سیکھا سکھایا اور قرآن پڑھا ہوگا اس کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی نعمت بتائے گا۔ وہ اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا تو نے اس نعمت کا کیا کیا وہ عرض کرے گا میں نے علم سیکھا سکھایا اور تیری خوشنودی کے لئے قرآن پڑھا اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا تو نے عالم کہا جانے کے لئے علم سیکھا تھا اور قاری کہلوانے کے لئے قرآن پڑھا تھا پھر اس کو بھی بحکم خداوندی منہ کے بل کھینچ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ پھر ایک شخص پیش ہوگا جس کو اللہ نے وسیع روزی عطا کی ہوگی اور ہر قسم کا مال مرحمت فرمایا ہوگا اس کو بھی اللہ اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ اقرار کرے گا اللہ پوچھے گا تو نے ان نعمتوں میں کیا کیا وہ عرض کرے گا میں نے کسی ایسے راستہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہیں کیا جس میں صرف کرنا تجھے پسند تھا اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا تو نے یہ کام صرف سخی مشہور ہونے کے لئے کئے تھے چنانچہ تجھے سخی کہہ دیا گیا پھر بحکم الٰہی اس کو منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ (رواہ مسلم) بغویؒ نے یہ حدیث بیان کرنے کے آخر میں اتنا زیادہ نقل کیا ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے میرے زانوں پر (ہاتھ) مار کر فرمایا ابو ہریرہؓ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں یہی تینوں ایسے ہوں گے کہ قیامت کے دن سب سے اول دوزخ ان پر بھڑکے گی (یعنی سب سے پہلے یہی تینوں دوزخ کا ایندھن ہوں گے)۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا اور ان لوگوں کی حالت جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب اور اسلام کو مضبوط بنانے اور اللہ کو مضبوط بنانے اور اللہ کے وعدۂ جزا کی تصدیق کرنے اور ثواب کی امید رکھنے کی وجہ سے اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ تثبیت سے مراد تثبیت مالی ہو یعنی مال کے نفع اخروی کو قائم رکھنے کی غرض سے خرچ کرتے ہیں کیونکہ قائم رہنے والا وہی مال ہے جو آخرت میں صاحب مال کے لئے سود مند ہو اس کے علاوہ ہر مال فانی ہے حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہے صحابہؓ نے عرض کیا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ پیارا نہ ہو فرمایا تو اس کا مال وہی ہے جو اس نے پہلے سے بھیج دیا اور وارث کا مال وہ ہے جو پیچھے چھوڑ گیا۔ (رواہ البخاری) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ لوگوں نے (تقسیم کرنے اور لوگوں کو کھلانے کے لئے) ایک بکری ذبح کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کتنا حصہ (دینے اور کھلانے سے) باقی رہ گیا صحابہؓ نے عرض کیا صرف شانہ باقی رہا ہے اور کچھ نہیں رہا فرمایا (یوں سمجھو کہ) سب باقی رہا شانہ نہیں رہا (یعنی شانہ کا ثواب جمع نہیں ہوا باقی گوشت کا ثواب جمع ہو گیا) (رواہ الترمذی) ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

مِّنْ اَنْفُسِهِمْ مِنْ ابتدائیہ ہے یعنی ایمان و تصدیق کو مضبوط کرنا یا مال کو قائم رکھنا خود ان کے نفسوں کی طرف

marfat.com

سے ہوتا ہے (کسی کے دباؤ یا لالچ کی وجہ سے نہیں ہوتا) یا مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی جو لوگ اپنے نفسوں کی بعض قوتوں کو ایمان پر مستحکم کرنے اور جمانے کے لئے راہ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں نفس کی قوتیں متعدد ہیں بعض کا تعلق مال کو خرچ کرنے سے ہے اور بعض روح کو کام میں لانے کا سرچشمہ ہیں مال جان کا ہمزاد ہے جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لئے مال صرف کرتا ہے وہ اس قوت کو ایمان پر مستحکم کرتا ہے جو صرف مال کا مبداء ہے اور جو مال و جان دونوں اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ نفس کی ساری قوتوں کو ایمان پر جماتا ہے۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے آیت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ راہ خدا میں مال صرف کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ بخل اور مالی محبت سے نفس پاک ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک بچہ کے مال پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہے کہ سرپرست اس کی طرف سے ادا کرے کیونکہ زکوٰۃ کی اصل علت یہ ہے کہ راہ خدا میں مال کو (جو جان کا ہمزاد ہے) خرچ کرا کے مأمور کا امتحان لیا جائے (کہ مال کی محبت دل گیر ہے یا حکم خدا کی تکمیل کا جذبہ غالب ہے) اور سرپرست کے ہاتھوں بچہ کی طرف سے صرف کرانے سے یہ مصلحت پوری نہیں ہوتی۔

كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ جیسے ہموار اونچے میدان کا باغ اس جگہ اور سورۂ مؤمنون کی آیت اِلٰی رَبْوَةٍ میں ابن عامر اور عاصم نے رَبوۃ بفتح راء پڑھا ہے لیکن دوسرے قاریوں نے بضم راء رُبوۃ پڑھا ہے دونوں لغت آئے ہیں۔ ربوۃ وہ اونچا ہموار مقام جہاں نہریں بہہ رہی ہوں لیکن نہروں کے کنارے طرفین کی زمین سے نہ اونچے ہوں نہ نیچے اس لئے نہ پانی اوپر آسکتا ہو نہ زمین اونچی اور پانی نیچا ہو۔ ایسے باغ کے درخت نہایت حسین اور صاف ستھرے ہوتے ہیں اسی لئے باغ کے ربوۃ پر واقع ہونے کی صراحت فرمائی۔

اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ جس پر اگر موٹے قطروں کی خوب بارش برس جائے تو اس کے درخت دوگنے پھل دیں۔ اُكْلَهَا بسکون کاف قرأت نافع و ابن کثیر و ابوعمرو بضم کاف قرات جمہور اُکُل (بمعنی مَاکُول کھائی جانے والی چیز یعنی) پھل ضِعْفَيْنِ حال ہونے کی بنا پر حالت نصب میں ہے یعنی بارش نہ ہونے سے جتنے پھل اس باغ میں پیدا ہو سکتے ہیں اس سے دگنے پھل بارش کے بعد پیدا ہوتے ہیں (گویا ضِعْفَيْنِ سے مراد ہوا ایک کا دوگنا) جیسے آیت زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ میں زوج سے مراد ہیں دو۔ بعض کے نزدیک دو ضِعف سے چار مراد ہیں کیونکہ ضعف ایک کا دوگنا ہوتا ہے اور دو ضعف چار گنا۔

فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ پس اگر اس پر بڑی بارش نہ ہو تو بارش کا ایک چھینٹا ہو جائے (تب بھی اس کے لئے کافی ہے) طَلٌّ کے بعد اَصَابَهَا محذوف ہے یا طَلٌّ سے پہلے محذوف ہے بہر تقدیر مقصد یہ ہے کہ بارش کی کمی بیشی سے اس باغ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا یا یہ معنی ہے کہ چونکہ اس کی زمین اچھی اور ہوا ٹھنڈی ہے اس لئے خفیف بارش ہی اس کے لئے کافی ہے طَلٌّ چھوٹی بوندوں کی بارش کو کہتے ہیں۔

اگر مضاف کو محذوف مانا جائے تو پوری آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی خیرات کی حالت مذکورہ باغ کی طرح ہے (باغ پر کثیر بارش ہو تو پھل زیادہ ہو جاتے ہیں کم بارش ہو تب بھی پھل ضرور پیدا ہوتے ہیں) یہی حالت مؤمن کی خیرات کی ہے اگر اس خیرات کے ساتھ ثواب کو دوگنا کر دینے والے اعمال بھی ملا دیئے جائیں تو ثواب چند در چند حسب مشیّت خداوندی ہو جاتا ہے ورنہ اصل عمل تو ضائع نہیں ہو سکتا اس کا اجر تو بہر حال لازمی ملے گا۔ اگر مضاف کو محذوف نہ مانا جائے تو مطلب اس طرح ہوگا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا مؤمن مذکورہ باغ کی طرح ہے جس طرح باغ میں پھل بقدر بارش پیدا ہوتے ہیں اسی طرح مؤمن کا ثواب بھی کم و بیش بقدر صرف ہوگا صرف اکارت نہیں جائے گا۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اس جملہ کا تعلق دونوں فریقوں سے ہے دکھاوٹ کے لئے خرچ کرنے والے فریق کے لئے اس میں تخویف ہے اور خوشنودی خدا کے لئے خرچ کرنے والے فریق کے

marfat.com

لئے (مزید) ترغیب ہے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ ہمزہ استفہامیہ انکاریہ ہے اور اس آیت کا ارتباط آیت لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى سے ہے۔

اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ

باغ میں درخت تو دوسرے بھی ہیں لیکن کھجور و انگور کی فضیلت اور ان کے منافع کی کثرت کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ انہی دونوں پھلوں کا ذکر کیا اور آخر میں فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ بھی اس لئے فرمایا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ باغ میں صرف کھجوریں اور انگور ہی ہیں اور کوئی پھل نہیں ہے یعنی اگر تم میں سے کسی کا ایک باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں کھجور اور انگور کے درخت خصوصیت کے ساتھ ہوں اور دوسرے پھلوں کے درخت بھی ہوں اور اسی حالت میں۔

وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ اس کو بڑھاپا آپہنچے اور کمائی کی طاقت نہ رہے واو حالیہ ہے (ہم نے حال ہی کا ترجمہ کیا ہے) یا عاطفہ ہے لیکن عطف معنوی ہوگا یعنی کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کا ایک باغ ہو اور اسکو بڑھاپا آپہنچے۔

ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے یا عورتیں ہوں جو کمانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اس جملہ میں بھی واو عاطفہ یا حالیہ ہے عطف اَصَابَهُ پر ہوگا اور حال اَصَابَهُ کی ضمیر مفعول کا

فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ پھر اس باغ پر ایسی آندھی آجائے جس میں آگ ہو اِعْصَارٌ وہ تیز طوفانی ہوا جو زمین سے بشکل عمودی اوپر کو جاتی ہے (بگولہ)۔

فَاحْتَرَقَتْ اور اس سے باغ جل جائے مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے پاس عمدہ اعلیٰ مال ہو اور جب اس کو اپنے مال کی سخت ضرورت کا وقت آئے تو مال جل جائے۔ اور وہ مرتے دم تک حسرت و نامرادی کی زندگی بسر کرتا ہے جب یہ بات ہے تو کوئی کس طرح پسند کر سکتا ہے کہ قیامت کے دن جب کہ نیکیوں کی سخت ضرورت ہوگی اس کی ساری نیکیاں اکارت جائیں اور وہ آخرت میں ہمیشہ کے لئے ناکام و نامراد ہے۔

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ سے دریافت کیا، آپ لوگوں کی رائے میں آیت اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ الخ کس بارہ میں نازل ہوئی تھی صحابہؓ نے جواب دیا اللہ اعلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غضب ناک ہو کر فرمایا کہو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے (اللہ اعلم) کیا جواب ہے اللہ تو جانتا ہی ہے تم اپنا جواب دو) حضرت ابن عباسؓ نے کہا اس آیت کا مجھے کچھ علم ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بھتیجے تم کہو اور اپنے کو (کم سن ہونے کی وجہ سے) حقیر نہ سمجھو حضرت ابن عباسؓ نے کہا اس آیت میں عمل کی تمثیل بیان کی گئی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس شخص کی تمثیل دی گئی ہے جو اللہ کی فرمان برداری کے کام کرتا ہے پھر اللہ اس پر شیطان کو مسلط کر دیتا ہے تو وہ گناہ کے کام کرنے لگتا ہے آخر وہ اپنے اعمال کو ڈبو دیتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ یونہی اللہ تمہارے لئے نشانیاں واضح کرتا ہے کہ تم ان پر غور کرو اور نصیحت حاصل کرو۔ ع ۳۶ / ۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ اے اہل ایمان اپنی پاکیزہ کمائی میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔ طَيِّبٰتِ سے مراد عمدہ کھری چیزیں لیکن حضرت ابن مسعودؓ اور مجاہد نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ حلال چیزیں مراد ہیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو بندہ حرام مال کما کر اس میں سے خیرات کرتا ہے اس کی خیرات قبول نہیں ہوتی۔ نہ حرام مال خرچ کرنے میں برکت حاصل ہوتی ہے اور جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ دوزخ تک جانے کا اس کے لئے سامان ہو جاتا ہے وہ برے (عذاب) کو بری (کمائی کی) خیرات سے مٹا نہیں سکتا بلکہ برے کو بھلے سے مٹا سکتا ہے ناپاک سے ناپاک دور نہیں ہوتا۔ رواہ احمد

marfat.com

یہ آیت اجماع علماء اور جمہور اہل سنت کی بڑی پکی دلیل ہے داؤد (ظاہری) کے اس قول کے خلاف کہ سوائے مویشی اور سونے چاندی کے اور کسی چیز میں زکوٰۃ واجب نہیں جمہور کے نزدیک منقولہ اور غیر منقولہ چیزوں پر بشرطیکہ تجارت کی ہوں زکوٰۃ واجب ہے تجارت کی شرط اس لئے ہے کہ مال زکوٰۃ کا نامی ہونا شرط ہے اور سامان میں بغیر نیت تجارت کے نمو نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا سامان میں زکوٰۃ واجب نہیں سوائے اس سامان کے جو تجارت کے لئے ہو۔ رواہ الدار قطنی۔

حضرت سمرہؓ بن جندب کا بیان ہے کہ ہم کو سامان تجارت کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم رسول اللہ ﷺ دیا کرتے تھے۔ رواہ ابوداؤد والدار قطنی والبزاز۔

بزاز نے سلیمان بن سمرہ کی روایت بھی بحوالہ سمرہ نقل کی ہے لیکن اس روایت کی اسناد میں کچھ جہالت ہے (بعض راوی مجہول ہیں)۔

سامان میں زکوٰۃ کا وجوب اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جو حماس نے روایت کی ہے حماس کا بیان ہے کہ کچھ کچے چمڑے اپنی گردن پر اٹھائے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے گزرا۔ امیر المؤمنین نے فرمایا حماس تم زکوٰۃ ادا نہیں کرتے میں نے عرض کیا۔ میرے پاس تو سوائے اس کے اور کوئی مال نہیں فرمایا۔ یہ تو مال ہے نیچے اتارو میں نے اتار کر آپ کے سامنے رکھ دیا آپ نے ان کی گنتی کی اور قابل زکوٰۃ پایا اور فرمایا ان کی زکوٰۃ واجب ہے چنانچہ ان چمڑوں لی آپ ﷺ نے زکوٰۃ وصول کر لی۔ رواہ الشافعی واحمد وعبد الرزاق وابن ابی شیبۃ وسعید بن منصور والدار قطنی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اونٹوں میں ان کی زکوٰۃ اور گائے بھینسوں میں ان کی زکوٰۃ اور کپڑے میں اس کی زکوٰۃ واجب ہے اس روایت میں اَلْبَزِّ زاء منقوطہ کے ساتھ آیا ہے دار قطنیؒ نے اس حدیث کو تین کمزور طریقوں سے نقل کیا ہے دو طریقوں میں موسیٰ بن عبیدہ زیدی آتا ہے جس کے متعلق امام احمدؒ نے کہا ہے کہ اس کی روایت لینا جائز نہیں اور تیسرے طریقہ میں عبداللہ بن معاویہ بن عاصم آتا ہے جس کو نسائی نے ضعیف اور بخاری نے منکر قرار دیا ہے اسی طریقہ میں ایک راوی ابن جریج بھی ہے جس نے عمران بن انیس سے سن کر یہ حدیث نقل کی ہے لیکن بخاریؒ نے کہا کہ ابن جریج نے عمران بن انیس سے حدیث نہیں سنی۔ ایک چوتھے سلسلہ سے دار قطنی اور حاکم نے اس حدیث کو اس طرح نقل کیا ہے۔ اونٹوں میں ان کی زکوٰۃ اور بکریوں میں ان کی زکوٰۃ اور گائے بھینسوں میں ان کی زکوٰۃ اور کپڑے میں اس کی زکوٰۃ واجب ہے اور جو شخص درہم یا دینار اٹھا رکھے گا کہ نہ قرض خواہ کو دیگا نہ راہ خدا میں خرچ کرے گا تو حقیقتاً یہ اس کے لئے کنز ہوگا جس سے قیامت کے دن اس کو داغا جائے گا۔ اس اسناد میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

ابن دقیق کا بیان ہے کہ میں نے (حاکم کی کتاب) مستدرک کے نسخہ میں البز کی جگہ البُرّ (گیہوں) دیکھا تھا۔ اگر کسی تجارتی سامان کو چند سال تک فروخت نہ کرے تو اس مسئلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہیں امام مالکؒ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں خواہ کتنا ہی طویل زمانہ گزر جائے لیکن جب فروخت کرے گا تو صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی باقی تینوں اماموں کے نزدیک ہر سال کی زکوٰۃ واجب ہے خواہ فروخت نہ کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو سامان تجارت کے لئے ہو اس کی زکوٰۃ دی جائے۔ اور یہ حکم عمومی ہے خواہ فروخت کیا جائے یا نہ کیا جائے (وجوب میں کوئی فرق نہیں آتا)

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ اور ان چیز میں سے کچھ راہ خدا میں خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اس آیت میں صدقۂ نافلہ مراد ہے (زکوٰۃ مراد نہیں) حضرت انسؓ بن مالکؒ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو مسلمان کوئی درخت یا کھیت بوتا ہے اور اس میں سے کوئی آدمی یا پرندے یا چوپائے کھاتے ہیں تو مالک کے لئے وہ خیرات ہوتی ہے (یعنی خیرات کا ثواب رکھتی ہے) رواہ احمد والشیخان والترمذی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی کرنی مستحب ہے لیکن حضرت ابوامامہؓ کی حدیث ہے کہ رسول

marfat.com

اللہ ﷺ نے فرمایا یہ یعنی کھیتی کے اوزار جس قوم کے گھر میں داخل ہوتے ہیں اس قوم کے اندر ذلت داخل ہو جاتی ہے۔ (رواہ البخاری) یہ حدیث کاشت کاری کی نحوست پر دلالت کر رہی ہے (واللہ اعلم) صحیح یہ ہے کہ آیت مذکورہ زکوٰۃ کے متعلق ہے کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے استحباب پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پس زمین کی پیداوار کا عُشر دینا اس آیت کی روشنی میں واجب ہے۔

مسئلہ :- علماء کا اتفاق ہے کہ کھجور، انگور اور ہر قسم کے غذائی غلہ میں دسواں حصہ ادا کرنا واجب ہے بشرطیکہ سینچائی بارش، چشمے، وادی اور دریا کے پانی سے ہو جس کو حاصل کرنے کے لئے (کھدائی وغیرہ کی) کوئی مشقت اٹھانی نہیں پڑتی لیکن اگر آب پاشی، ڈول یا چرس وغیرہ سے ہو تو پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے۔ گھاس اور ایندھن کی لکڑی پر زکوٰۃ واجب نہیں بشرطیکہ زمین اس کے لئے محفوظ نہ کر دی گئی ہو۔

اقسام مذکورہ کے علاوہ دوسری پیداوار کی زکوٰۃ واجب ہونے میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کے غلہ پھل اور سبزی میں زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ آیت مذکورہ کا حکم عام ہے اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا بھی فرمان ہے کہ جو چیز بارش اور چشموں کے پانی سے سیراب ہو یا عشری ہو اس میں عشر لازم ہے اور جس کی سینچائی آب پاشی سے ہو اس میں نصف عشر (بیسواں حصہ) لازم ہے۔ یہ حدیث حضرت ابن عمر کی روایت سے بخاریؒ، ابوداؤد، نسائیؒ ابن حبانؒ اور ابن جارودؒ نے نقل کی ہے اور مسلمؒ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اور ترمذیؒ وابن ماجہؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور نسائیؒ وابن ماجہؒ نے حضرت معاذؓ کی روایت سے اور ابوداؤد وغیرہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے بیان کی ہے۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک زکوٰۃ صرف اس پیداوار میں ہے جس میں غذائیت ہے جیسے کھجور، انگور، چنا، جو، گیہوں، چاول وغیرہ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک زکوٰۃ کا وجوب اس کیلی اور وزنی چیز میں ہے جو لوگوں کے پاس (بطور ذخیرہ) رہ سکتی ہو (ذخیرہ کر کے رکھنے سے خراب نہ ہوتی ہو) جیسے تل، بادام، فندق، پستہ، زعفران، زیرہ، کسم کے بیج وغیرہ۔ سبزی میں زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی دلیل حضرت معاذؓ کی حدیث ہے کہ جس کی سینچائی بارش یا دریائی پانی سے ہو اس میں عشر ہے اور جس کی سیرابی آب کشی سے ہوئی ہو اس میں نصف عشر ہے۔ اور یہ زکوٰۃ کھجور، گیہوں اور غلہ میں ہے کھیرا، ککڑی، خربوزہ، تربوز، انار، گنا اور سبزیاں معاف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں زکوٰۃ معاف کر دی ہے۔ رواہ الدار قطنی والحاکم والبیہقی۔

لیکن اس حدیث کی روایت میں ضعف بھی ہے اور انقطاع بھی۔ اس کے راویوں میں سے اسحاق اور ابن نافع ضعیف ہیں۔ یحییٰ بن معین (مشہور ناقد) نے کہا ہے کہ اسحاق کچھ نہیں اس کی حدیث نہ لکھی جائے اور امام احمد اور نسائی نے اس کو متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ ترمذی کی روایت بایں الفاظ آئی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے لکھ کر پوچھا کہ سبزی ترکاری کا کیا حکم ہے حضور ﷺ نے فرمایا ان میں زکوٰۃ نہیں۔

یہ روایت بھی ضعیف ہے ترمذی نے لکھا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے کسی فرمان کا اس بارے میں صحیح ثبوت نہیں۔ ہاں موسیٰ بن طلحہؒ نے رسول اللہ ﷺ سے مرسل نقل کی ہے۔ دار قطنی نے علل میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا صحیح ہے۔ بیہقی نے موسیٰ بن طلحہ کی حدیث سے اس کو نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ موسیٰ جلیل القدر تابعی تھے اور کوئی شک نہیں ہے کہ ان کی ملاقات حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی لیکن ابن عبد البرؒ کا قول ہے کہ موسیٰؒ نے نہ حضرت معاذؓ سے ملاقات کی نہ ان کا زمانہ پایا۔

دار قطنیؒ نے چند طریقوں سے موسیٰ بن طلحہ بروایت طلحہؓ مرفوعاً نقل کیا ہے کہ سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس روایت کے ایک طریقِ اسناد میں حراث بن ضبہان ہے جس کا ضعف ایک جماعت کے اقوال سے منقول ہے اور دوسرے طریق

marfat.com

میں نصر بن حماد واقع ہے جس کو یحییٰ نے کذاب کہا ہے اور یعقوب بن ابی شیبہ نے کہا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہے اور مسلم نے اس کو ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔ تیسرے طریق میں محمد بن جابرؒ داخل ہے جو کچھ نہیں ہے۔ اس کے متعلق امام احمدؒ نے کہا کہ اس کی روایت کردہ حدیث وہی نقل کرے گا جو اس سے بھی زیادہ شریر ہوگا۔ دار قطنی نے مردان بن محمد سخاوی کے طریق سے بروایت موسیٰ بن طلحہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے لیکن مردان بن محمدؒ کی روایت کو دلیل میں پیش کرنا درست نہیں۔

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں موسیٰ بن طلحہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ سوائے گیہوں جو کھجور، انگور اور کشمش کے اور چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ حضرت معاذؓ کے نام جو خط رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا وہ معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہم کو ملا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ موسیٰ بن طلحہؒ سے مرسل حدیث صحیح ہے۔ ترمذی وغیرہ کی یہی رائے ہے اور مرسل قابل حجت ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ دوسری روایات بھی اس کی تائید میں موجود ہیں جن کو مختلف سندوں سے ہم نقل کر چکے ہیں پھر دار قطنی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو مرفوع حدیث نقل کی ہے وہ بھی مؤید ہے اگرچہ اس کے سلسلہ میں صقر بن حبیب داخل ہے جو بہت ضعیف ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علیؓ والی حدیث کو موقوفاً نقل کیا ہے اس کے سلسلہ میں قیس بن ربیع آتا ہے جو ہے تو سچا لیکن اس کا حافظہ قوی نہیں۔

دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ زمین سے پیدا شدہ سبزی (ترکاری) میں زکوٰۃ نہیں ہے اس کے سلسلے میں صالح بن موسیٰ واقع ہے جو بخاری کے نزدیک منکر الحدیث اور نسائی کے نزدیک متروک الحدیث ہے۔

محمد بن جحش کا ایک بیان ہے کہ حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر چالیس دینار پر ایک دینار لینا اور سبزیوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ یہ بیان بھی دار قطنی نے نقل کیا ہے اس میں صالح بن موسیٰ داخل ہے (جو منکر اور متروک ہے) اس جگہ ہم کچھ دوسری احادیث بھی نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے کھجور، کشمش، گیہوں اور جو کے اور کسی پھل پر زکوٰۃ نہیں ہے بس انہی چار پر زکوٰۃ واجب ہے۔ حاکم اور بیہقی نے ابو بردہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما کو تعلیم دین کیلئے یمن بھیجا تو بقول حضرت ابو موسیٰؓ ان کو حکم دیا کہ سوائے ان چار چیزوں کے اور کسی چیز پر زکوٰۃ نہ وصول کرنا جو، گیہوں، کشمش، چھوراہ، بیہقی نے لکھا کہ اس حدیث کا سلسلہ متصل ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

طبرانی نے بروایت موسیٰ بن طلحہ حضرت عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان چار چیزوں میں زکوٰۃ کا طریقہ جاری فرمایا۔ دار قطنی نے اس حدیث کو بروایت عمرو بن شعیب از شعیب بحوالۂ والد شعیبؒ بیان کیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے بروایت موسیٰ بن طلحہ حضرت عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زکوٰۃ واجب نہیں ہے مگر چار میں چھوارہ، کشمش، گیہوں اور جو۔

بیہقی نے بروایت شعبی بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو لکھا تھا زکوٰۃ صرف چار میں واجب ہے گیہوں، جو، چھوارہ، کشمش، ان چار کے ساتھ ایک پانچویں چیز یعنی جوار میں بھی زکوٰۃ واجب ہونے کی روایت آئی ہے لیکن یہ روایت ضعیف اور کمزور ہے۔

میں کہتا ہوں جب علماء کا اجماع اور اتفاق ہو گیا کہ وجوب زکوٰۃ کا حصر مذکورہ بالا چار چیزوں ہی پر نہیں ہے تو لامحالہ حدیث کی کوئی توجیہ کرنی لازم ہے یعنی لفظ مثل کو مقدار قرار دیا جائے گا یعنی ان چاروں کی طرح کی چیزوں میں زکوٰۃ کا وجوب ہے (مثلاً حدیث۔ لازکوٰۃ الا فی اربعہ التمر والز بیب والحنطۃ والشعیر کی توجیہ بحذف مضاف اس طرح ہوگی کہ لازکوٰۃ الافی اربعۃ یعنی لازکوٰۃ الا فی مثل اربعۃ زکوٰۃ نہیں ہے مگر ان چار ایسی چیزوں میں، پس (جب زکوٰۃ کے وجوب

marfat.com

کا حصر نہیں بلکہ ان کی طرح دوسری چیزوں میں بھی زکوٰۃ واجب ہے اور مثلیتِ اشیاء وجوب زکوٰۃ کے لئے کافی ہے تو) امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک غذائیت علتِ مثلیت ہے (یعنی جو چیزیں غذائی طور پر مستعمل ہیں ان میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ وجہ مماثلت دو اوصاف کو قرار دیا جائے ایک تو یہ کہ) ان چاروں کی طرح دوسری چیزیں ذخیرہ اندوزی کے قابل ہوں (ذخیرہ اندوزی سے خراب نہ ہوتی ہوں ساگ پات اور سبز ترکاریاں جمع کر کے رکھ چھوڑنے سے خراب ہو جاتی ہے) اور سبب غناء بن سکیں۔ کھیتی کی پیداوار میں سال بھر جمع رہنا شرط نہیں ہے کیونکہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے مال کا نمو شرط ہے اور غلہ تو سراسر نامی ہی ہے یہ فیصلہ اجماعی ہے۔

مالکِ غلہ کا عاقل اور بالغ ہونا بھی وجوبِ عشر کے لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شرط نہیں ہے اور دوسرے اماموں کے نزدیک تو کسی مال کے مالک کا عاقل بالغ ہونا وجوب زکوٰۃ کی شرط نہیں ہے (یہاں تک کہ صغیر سن بچے اور دیوانے کے مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہے) دونوں مسئلوں میں امام اعظمؒ کے فرق کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مال کی زکوٰۃ خالص عبادت ہے اور ہر عبادت کے لئے نیت ضروری ہے اور صحت نیت کے لئے نیت کرنے والے کا عاقل بالغ ہونا لازم ہے لہٰذا نابالغ اور دیوانہ کے مال پر زکوٰۃ کا وجوب نہیں جس طرح ان دونوں پر نماز واجب نہیں) لیکن عشر عبادت ضرور ہے مگر مؤنت آمیز (گویا عشر کی دو خصوصیتیں ہیں عبادت ہونا اور مشقت آمیز ہونا) پس عبادت ہونے کے لحاظ سے عشر دینے والے کا مسلمان ہونا شرط ہے کافر پر عشر نہیں خراج لازم جیسے عشری زمین کو اگر غیر مسلم خرید لے تو جمہور کے نزدیک اس کے ذمہ خراج ہوگا عشر نہ ہوگا۔ امام محمد عشری زمین میں عشر ہی لازم ہونے کے قائل ہیں (خواہ اس کا مالک مسلم ہو یا غیرِ مسلم) اور مؤنت مالی ہونے کے لحاظ سے بچہ اور دیوانہ پر بھی عشر واجب ہے جیسے بیوی کا نفقہ وغیرہ ان کے مال میں لازم ہے۔

کیا پیداوار پر عشر لازم ہونے کے لئے مقدار نصاب شرط ہے؟

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقدارِ نصاب شرط نہیں ہے بلکہ پیداوار کتنی ہی ہو عشر واجب ہے کیونکہ احادیثِ مذکورہ میں الفاظ عام ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز، مجاہد اور ابراہیم نخعی کا بھی یہی قول ہے عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہؒ نے مؤخر الذکر تینوں حضرات کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہے پیداوار کم ہو یا زیادہ نخعی کے قول میں اتنا زائد ہے یہاں تک کہ دس دسچ میں بھی ایک دسچ ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے بھی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے بوساطت حماد، ابراہیم نخعی کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔ لیکن امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمد کے نزدیک عشر کے لئے نصاب شرط ہے اور مقدارِ نصاب پیمانہ سے ناپ کر بیچے جانے والی چیزوں میں پانچ وسق ہے ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے (اور ایک صاع رائج الوقت وزن سے تقریباً چار سیر ہوتا ہے) اور جو چیزیں وسق کے ناپ سے نہیں فروخت ہوتیں۔ ان میں وہ مقدار عددی معتبر ہے جس سے ان چیزوں کی فروخت ہوتی ہے پس ہر پانچ عدد ان کی مقدارِ نصاب ہوگی مثلاً روئی کی پانچ گانٹھیں مقدارِ نصاب ہیں ہر گانٹھ کا وزن تین سو سیر، زعفران پانچ سیر وغیرہ، پانچ وسق غلہ کی قیمت کا اندازہ ادنیٰ غلہ سے کیا جائے گا۔ یہ قول امام ابو یوسفؒ کا ہے۔ جمہور کے نزدیک جو عشر کے لئے مقدارِ نصاب شرط ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ رواہ البخاری و مسلم من حدیث ابی سعید الخدری، مسلمؒ نے یہ روایت حضرت جابرؒ کے حوالہ سے بھی اور بیہقی نے حضرت عمرو بن حزم کی روایت سے۔

مسئلہ:۔ ہر زمین کی پیداوار پر عشر واجب ہے آیت کا حکم مطلق ہے کسی خاص قسم کی زمین کی قید نہیں ہے اگر مسلمان خراجی زمین کا مالک ہو جائے تو (دو صورتیں ہیں) یا خراج ساقط ہو جائے گا صرف عشر قائم رہے گا یا خراج و عشر دونوں قائم رہیں گے خراج زمین کا اور عشر پیداوار کا۔ مؤخر الذکر قول جمہور کا ہے کیونکہ خراج زمین کا ٹیکس ہے پیداوار سے اس کا تعلق نہیں اور عشر پیداوار کی زکوٰۃ ہے زمین کی زکوٰۃ نہیں۔ اسی لئے پیداوار میں (بصورت مذکورہ) نصاب کی شرط ہے۔ امام اعظمؒ نے فرمایا خراجی زمین کا خراج کبھی ساقط نہیں ہو سکتا اور عشر و خراج جمع بھی نہیں ہو سکتے۔ عشر زمین کی زکوٰۃ ہے کھیتی کی نہیں اسی لئے

marfat.com

پیداوار کا نصاب تک پہنچنا امام صاحب کے نزدیک لازم نہیں ہے۔ حقیقت میں خراج کے ساقط ہونے یا نہ ہونے کی بحث کا یہ مقام ہی نہیں (یہ مقام صرف بیان عشر کا ہے) اور عشر و خراج کے جمع ہونے کی ممانعت پر کوئی شرعی دلیل نہیں (لہٰذا جمہور کے نزدیک خراجی زمین میں دونوں واجب ہیں) رہی وہ حدیث جو ابن عدی نے کامل میں اور ابن جوزی نے بروایت یحییٰ بن عبسہ ذکر کی ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حماد بتوسط ابراہیم بحوالہ علقمہ بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی مسلمان پر عشر اور خراج جمع نہیں ہوتے تو یہ روایت ہی غلط ہے ابو حاتم نے کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام نہیں ہے۔ یحییٰ بن عبسہ قریبی جھوٹا تھا اسے خود حدیث بنا کر ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ سے اوپر والے لوگوں پر دروغ بندی کی ہے۔ ابن عدی نے کہا اس اسناد کے ساتھ اس حدیث کا راوی یحییٰ بن عبسہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں یہ ابراہیم کے قول کی نقل ہے لیکن ابراہیم قابل حجت نہیں، نہ ان کا قول حجت ہے، اسی طرح شعبی اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے کہ عشر اور خراج جمع نہیں ہوتے نہ کسی ایک زمین میں نہ کسی ایک مال میں ان دونوں آثار کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے۔ صاحب ہدایہ کا یہ دعویٰ قابل تسلیم نہیں کیونکہ ابن منذر نے بیان کیا ہے کہ عمر بن عبد العزیز نے خراج و عشر کو جمع کیا تھا اور عمرؒ بن عبد العزیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلنے والے تھے اگر مسئلہ اجماعی ہوتا تو عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ سے یہ اجماع مخفی نہ رہتا۔

''مسئلہ''

کے اطلاق میں معدن سے نکلنے والا چاندی سونا داخل ہے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مشہور قول یہی ہے اگر مقدار نصاب کو پہنچ جائے گا تو زکوٰۃ کی طرح چالیسواں حصہ دینا ہوگا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا مصرف بھی زکوٰۃ ہی کی طرح ہے۔ مگر امام مالکؒ کے نزدیک اس کا مصرف مال فئے (کافروں کا جو مال بغیر جنگ کے ہاتھ آئے) کی طرح ہے۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ اور (مشہور قول کے اعتبار سے امام احمدؒ کے نزدیک یہ آیت معدنی اشیاء (یعنی سونے چاندی) کو شامل نہیں ہے بلکہ مال غنیمت کی طرح اس میں بھی پانچواں حصہ واجب الادا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ بات یہ ہے کہ سونا چاندی زمین ہی کا ایک جزو ہے پہلے کفار کے قبضہ میں تھا پھر مسلمانوں کو مل گیا لہٰذا اس کا حکم وہی ہوگا جو کافروں کی دوسری چیزوں کا ہے۔ اسی کی موافقت میں امام شافعیؒ کا بھی ایک قول مروی ہے۔ ہمارے نزدیک آیت مذکورہ معدنی اشیاء، (چاندی سونے) کو شامل نہیں ہے ہمارے اس قول کی دلیل یہ ہے کہ اخراج کا حقیقی معنی ہے کسی ایسی چیز کو برآمد کرنا جو پہلے اندر موجود ہو غلہ اور پھل زمین کے اندر پہلے موجود نہیں ہوتے اس لئے ان کے لئے لفظ اخراج کا استعمال حقیقی نہیں مجازی ہے (یعنی اس جگہ اخراج کا معنی ہے پیدا کرنا) اور یہی مجازی معنی آیت میں باتفاق علماء مراد ہے اب یہ نہیں ہو سکتا کہ حقیقی معنی بھی مراد لیا جائے (اور معدنی اشیاء کو حکم آیت میں داخل قرار دیا جائے) اور نہ حقیقت اور مجاز دونوں بیک وقت ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور اصول فقہ کی صراحت اس کے خلاف ہے۔ حقیقت اور مجاز کا بیک وقت مراد لینا جائز ہے لیکن امام شافعیؒ حقیقت و مجاز کے اجتماع کو جائز کہتے ہیں۔ اسی آیت کی طرح (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ) بھی ہے اس آیت میں لمس (چھونے) سے بالاجماع مراد مباشرت ہے یعنی مجازی معنی مراد ہے لہٰذا حقیقی معنی (یعنی چھونا) مراد نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورت کو صرف چھونا ناقض وضو نہیں امام شافعیؒ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک حقیقت و مجاز دونوں کو بیک وقت مراد لینا جائز ہے۔

امام احمدؒ کے نزدیک ہر معدنی چیز کا پانچواں حصہ واجب الاداء ہے خواہ وہ جامد نا قابل سیلان ہو جیسے جست چونا یا جامد قابل سیلان ہو جیسے سونا چاندی لوہا وغیرہ یا سیال ہو جامد نہ ہو۔ جیسے مٹی کا تیل پیٹرول تار کول وغیرہ کیونکہ اس سب کو مال غنیمت قرار دیا جا سکتا ہے (اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ واجب الادا ہے) امام اعظمؒ کہتے ہیں کہ صرف جامد قابل سیلان اشیاء

marfat.com

یعنی چاندی سونے لوہے وغیرہ میں پانچواں حصہ واجب ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے فِی الرِّکَازِ اَلْخُمُسُ رکاز میں پانچواں حصہ ہے اور لفظ رکاز کا اطلاق صرف ان ہی چیزوں پر ہوتا ہے جو جامد قابل سیلان ہوں زمین کے اندر کی وہ چیزیں جو جامد نا قابل سیلان ہوں (وہ رکاز نہیں ہیں) ان سے تیمم بھی جائز ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک زکوٰۃ کا وجوب صرف سونے چاندی میں ہے لوہے وغیرہ کی کان حکم وجوب سے خارج ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ثمنیّت (یعنی اشیاء کی قیمت بننے کی صلاحیت) جو زکوٰۃ کے لئے شرط ہے وہ صرف نمو پذیر ہونے کی وجہ سے ہے اور زمین سے جو چیز بر آمد ہوتی ہے وہ تو سراسر نمو ہی ہے اس لئے غلہ، پھل وغیرہ کی زکوٰۃ کے لئے باتفاق علماء سال کا دوران شرط نہیں ہے باوجودیکہ یہ چیزیں نقود میں سے نہیں ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ معدنی اشیاء کی زکوٰۃ کے لئے ان کا نقدی ہونا (یعنی قیمت بننے کی صلاحیت رکھنا) ضروری قرار دیا جائے۔

امام شافعیؒ معدن میں وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں اس قول کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام مالکؒ نے مؤطا میں لکھی ہے کہ ربیعہ بن عبدالرحمان نے کسی (نا معلوم الاسم) کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بلال بن حارث مزنی کو قبلہ کی طرف والی کانیں بطور جاگیر عطا فرمادیں یہ کانیں فرغ کی طرف تھیں اس وقت تک ان کانوں سے سوائے زکوٰۃ کے اور کچھ (سرکاری طور پر) نہیں لیا جاتا۔ ابن عبدالبر نے کہا مؤطا میں یہ حدیث منقطع ہے ابن جوزی نے کہا ربیعہ نے صحابہؓ کو پایا تھا ایسی حالت میں صحابی (کے نام) کو نہ جاننا (روایت میں) نقصان رساں نہیں اور اس کو مرسل نہیں کہا جاسکتا۔ ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال میں لکھا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے اور منقطع ہونے کے باوجود اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس میں زکوٰۃ لینے کا حکم دیا تھا بلکہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آج تک ان کی زکوٰۃ لی جاتی ہے اس لئے جائز ہے کہ وصول زکوٰۃ حاکموں کا اجتہاد ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث مذکور نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ علماء حدیث نے اس حدیث کو نہیں لیا ہے اور نہ (اپنی کتابوں میں) نقل کیا ہے نہ بطور جاگیر عطا کرنے سے زائد رسول اللہ ﷺ کا کوئی حکم اس میں ہے کانوں میں وجوب زکوٰۃ کا حکم رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں ہے۔

حاکم نے مستدرک میں دراوردی کا بیان لکھا ہے کہ ربیعہ نے بروایت حارث بن ہلال بن حارث مزنی بیان کیا ہے کہ رسول ﷺ نے قبلہ والی کانوں کی زکوٰۃ حارث کے باپ سے لی تھی ابن جوزی نے بھی دراوردی کی یہ روایت نقل کی ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ وہ حدیث ہے جو صحاح ستہ میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ رکاز میں پانچواں حصہ ہے۔ لفظ رکاز معدن کو بھی شامل ہے اور کنز (یعنی مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے کے گڑے ہوئے خزانہ) کو بھی قاموس میں رکاز کے معنی کے ذیل میں ہے کہ رکاز وہ ہے جو کانوں کے اندر اللہ پیدا کرتا ہے اور جاہلیت کے دفینے (مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے کے گڑے ہوئے خزانے) اور کان سے بر آمد ہونے والے سونے چاندی کے ٹکڑے۔ نہایہ میں ہے کہ اہل حجاز کے نزدیک رکاز اس خزانہ کو کہتے جو جاہلیت کے زمانہ کا ہو (یعنی مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے کافروں نے زمین کے اندر دبادیا ہو) اور اہل عراق کے نزدیک رکاز کان کو کہتے ہیں لفظ رکاز میں دونوں احتمال ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب رکاز کے ساتھ الف لام استغراق کا ہو تو رکاز کے تمام اقسام پر اس کا اطلاق واجب ہوگا لامحالہ کان سے بر آمد ہونے والی اشیاء میں پانچواں حصہ واجب الادا ہوگا بخاری کے نزدیک لفظ رکاز مشترک ہے لیکن واقعہ ایسا نہیں بلکہ رکاز کلی متواطی ہے لفظ رکاز ایک ہی معنی کے لئے موضوع ہے لیکن یہ معنی مشترک ہے (جاہلیت کے دفینوں کو بھی کہا جاسکتا ہے اور معدنی اشیاء کو بھی کیونکہ دونوں زمین کے اندر گڑے ہوئے ہوتے ہیں)۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رکاز میں خمس ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ رکاز کیا ہے؟ فرمایا سونا چاندی جو اللہ نے زمین کے اندر آسمان و زمین کی پیدائش کے دن ہی پیدا کر دیا ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔

marfat.com

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ دراوردی کی نقل کردہ روایت میں جو لفظ زکوٰۃ آیا ہے اس سے مجازاً خمس (پانچواں حصہ) مراد ہے دیکھو کہ کنز میں بالا جماع خمس واجب ہے لیکن امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا مصرف زکوٰۃ کی طرح ہے اور لفظ زکوٰۃ کا خمس پر اطلاق ہوتا ہے منہاج میں ہے کہ فقہ شافعیؒ کے مطابق کنز کا مالک وہی ہے جس کو کنز ملا ہو اور اس پر زکوٰۃ (خمس) لازم ہے اور بالفرض اگر دونوں حدیثوں میں تعارض مان بھی لیا جائے تب بھی حدیث (فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ) زیادہ صحیح اور قوی تر ہے، واللہ اعلم۔

وَلَا تَيَمَّمُوا (اور قصد نہ کرو لا تیمموا اصل میں لا تتیمموا تھا ایک تاء کو ساقط کر دیا گیا۔ ابن کثیر نے بروایت بزی وصل کی حالت میں قرآن میں ۳۱ جگہ ساقط شدہ تا کو لوٹا کر تشدید تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ نمبر۱ یہی لفظ، نمبر ۲ آل عمران میں ولا تفرّقوا، نمبر ۳ النساء میں اِنَّ الَّذِیْنَ تَّوَفّٰهُمُ، نمبر ۴ المائدہ میں وَلَا تَّعَاوَنُوْا، نمبر ۵ انعام میں فَتَّفَرَّقَ بِكُمْ، نمبر ۶ الاعراف میں فَاِذَا هِیَ تَّلْقَفُ، نمبر ۷ یہی طٰہٰ میں، نمبر ۸ یہی لفظ الشعراء میں، نمبر ۹ وَلَا تَّوَلَّوْا، نمبر ۱۰ وَلَا تَّنَازَعُوْا یہ دونوں لفظ الانفال میں آئے ہیں، نمبر ۱۱ التوبہ میں هَلْ تَّرَبَّصُوْنَ، نمبر ۱۲ ہود میں وَاِنْ تَّوَلَّوْا، نمبر ۱۳ اور فَتَّوَلَّوْا، نمبر ۱۴ وَلَا تَّكَلَّمُ نَفْسٌ، نمبر ۱۵ الحجر میں مَا تَّنَزَّلُ، نمبر ۱۶ میں اِذْ تَّلَقَّوْنَهٗ، نمبر ۱۷ فَاِنْ تَّوَلَّوْا، نمبر ۱۸ الشعراء میں مَنْ تَّنَزَّلُ نمبر ۱۹ الشَّیٰطِیْنُ تَّنَزَّلُ، نمبر ۲۰ احزاب میں وَلَا تَّبَرَّجْنَ نمبر ۲۱ وَلَا اَنْ تَّبَدَّلَ، نمبر ۲۲ الصّٰفّٰت میں لَا تَّنَاصَرُوْنَ، نمبر ۲۳ الحجرات میں ولا تَّنَابَزُوْا نمبر ۲۴ وَلَا تَّجَسَّسُوْا نمبر ۲۵ وَلِتَّعَارَفُوْا، نمبر ۲۶ الممتحنہ میں اَنْ تَّوَلَّوْهُمْ، نمبر ۲۷ الملک میں تَكَادُ تَّمَيَّزُ، نمبر ۲۸ ن میں لَمَا تَّخَيَّرُوْنَ، ۲۹ عبس میں عَنْهُ تَّلَهّٰى، نمبر ۳۰ واللیل میں نَارًا تَّلَظّٰى، نمبر ۳۱ القدر میں تَّنَزَّلُ، بعض لوگوں نے بروایت بزی دو لفظ اور بھی نقل کئے ہیں نمبر ۱ آل عمران میں وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَّمَنَّوْنَ نمبر ۲ الواقعہ میں فظلتم تَّفَكَّهُوْنَ۔

اگر وصل نہ ہو اور ابتداء میں تاء واقع ہو تو سوائے تخفیف (یعنی ایک تاء کو ساقط کرنے کے) اور کوئی صورت نہیں۔ اب اگر تاء سے پہلے حرف مد ہوگا جیسا کہ اس آیت میں ہے تو تمکین میں زیادتی کی جائے گی یہ تمام تفصیل شیخ ابن کثیرؒ سے بروایت بزی منقول ہے دوسرے قاریوں کے نزدیک ہر جگہ وصل ہو یا ابتداء ایک تاء کو تخفیف کیا جائے گا۔

الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ یعنی ردی مال، خراب، تنفقون حال ہے تیمموا کی ضمیر فاعل ذوالحال ہے یہ بھی احتمال ہے کہ منہ کا تعلق تنفقون سے ہو اور منہ کی ضمیر الخبیث کی طرف راجع ہو۔ حاکم، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت براء کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ہمارے گروہ انصار کے متعلق ہوا تھا ہم نخلستانوں والے تھے ہم میں سے کچھ لوگ دل سے خیرات دینا نہیں چاہتے تھے اس لئے اپنے درختوں سے جا کر کم و بیش چھواروں کا خوشہ ٹوٹا ہوا لا کر دیدیتے تھے اور خوشہ بھی کمزور گٹھلی والے خراب ردی چھواروں کا ہوتا تھا۔ ابوداؤد نسائی اور حاکم نے حضرت سہیل بن حنیف کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ اپنے بدترین پھل عشر میں لا کر دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حاکم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر میں ایک صاع چھواروں کا حکم دیا، میں خراب چھوارے لے آیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے لکھا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ارزاں غلہ خرید کر صدقہ میں دیتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ یعنی اللہ کی راہ میں تو تم برا مال دیتے ہو حالانکہ بغیر چشم پوشی کئے خود (باہم تبادلہ میں) ویسا مال نہیں لیتے۔ مطلب یہ کہ تم اپنے حق میں ردی مال نہیں لیتے اور راہ خدا میں دیتے ہو ایسا کرنے کا قصد بھی نہ کرو۔

اغماض کا معنی ہے آنکھ بند کرنا یہاں مجازاً درگزر کرنا مراد ہے (تفسیری مطلب عام اہل تفسیر کے نزدیک یہ ہے کہ) اگر کسی کا دوسرے پر حق ہو اور وہ ایسا خراب مال دے تو یہ شخص قبول نہیں کرتا ہاں قصداً اگر حق چھوڑ دینا چاہتا ہو تو لے لیتا

marfat.com

ہے۔ حسن بصری اور قتادہ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر ایسا ردی مال تم بازار میں بکتا دیکھتے ہو تو کھرے مال کی قیمت میں اس کو نہیں خریدتے۔ ایک روایت میں حضرت براء کی طرف اس (تشریح) کی نسبت کی گئی ہے کہ اگر ایسا مال تم کو ہدیہ میں بھیجا جاتا ہے تو قبول نہیں کرتے سوائے اس کے کہ بھیجنے والے کی شرم ہو تو ناراضگی کے ساتھ لے لیتے ہو تو جو چیز اپنے لئے پسند نہیں وہ اللہ کی راہ میں دینا کیوں پسند کرتے ہو۔ ردی مال راہِ خدا میں دینے کی ممانعت اس وقت ہے جب سارا مال کھرا ہو لیکن اگر سب ہی خراب ہو تو عشر میں خراب مال ہی دینا ممنوع نہیں۔ اگر کچھ مال کھرا اور کچھ خراب ہو تو ہر قسم کے مال میں سے کچھ کچھ دینا چاہئے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۲۶۷ اور جان رکھو کہ اللہ کو تو تمہارے صدقات کی ضرورت نہیں تمہارے صدقات کا نفع تمہارے ہی طرف لوٹ کر آئے گا، اللہ کے تمام افعال مستوجب حمد ہیں۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ شیطان تم کو مفلس ہو جانے سے ڈراتا ہے لفظ وعد کا استعمال خیر و شر (اچھے برے) دونوں میں ہوتا ہے لیکن اگر کوئی خصوصی قرینہ نہ ہو تو خیر کا وعدہ مراد ہوتا ہے اور شر کے لئے ایعاد (ڈرانا، باب افعال) استعمال ہوتا ہے، فقر کا معنی ہے بدحالی اور مال کی کمی، یہ لفظ فِقَارُ الظَّهر سے بنا ہے (فِقَارُ الظَّهر پشت کے مہرے) مطلب یہ ہے کہ شیطان تم کو ڈراتا ہے کہ اگر صدقات دو گے تو مفلس ہو جاؤ گے۔

وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ اور تم کو گناہ کا حکم دیتا ہے، الفحشاء سے مراد ہے زکوٰۃ نہ دینا یا عام معصیت کوئی ہو، کلبی نے کہا سوائے اس آیت کے قرآن میں ہر جگہ فحشاء سے مراد زنا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ اور اللہ تم سے تمہارے گناہوں کی معافی کا اور نعم البدل دینے کا وعدہ کرتا ہے (یعنی اگر تم راہِ خدا میں خرچ کرو گے تو اللہ وعدہ کرتا ہے کہ تمہارے گناہ معاف فرما دیں گے اور جو کچھ تم دو گے اس سے بہترین دنیا میں یا (صرف) آخرت میں تم کو عطا کرے گا۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۶۸ ۚ اور اللہ راہِ خدا میں خرچ کرنے والے کے لئے اپنے فضل کو وسیع کرنے والا اور جاننے والا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں ایک کہتا ہے الٰہی راہِ خیر میں خرچ کرنے والے کو عوض عطا فرما، دوسرا کہتا ہے کہ الٰہی بخیل کو بربادی دے، (بخاری و مسلم)۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا بے گنتی نہ خرچ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تجھے حساب سے دے گا اور جمع کر کے نہ رکھ ورنہ اللہ بھی جمع کر لے گا (تجھے نہیں دے گا) جہاں تک تجھ سے ہو سکے پیسے دیتی رہ (کچھ نہ کچھ دیتی رہ) بخاری و مسلم۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے کعبہ کے مالک کی وہ گھاٹا پانے والے ہیں، میں نے عرض کیا وہ کون، فرمایا وہ جو زیادہ مالدار ہیں لیکن اس حکم سے وہ مالدار مستثنیٰ ہیں جو اس طرح اور اس طرح آگے پیچھے اور دائیں و بائیں سے دیتے ہیں مگر ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔ بخاری و مسلم۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی اللہ کے قریب ہے، جنت کے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے، دوزخ سے دور ہے اور بخیل اللہ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے، دوزخ سے قریب ہے اور جاہل سخی عبادت گذار بخیل سے اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخاوت جنت میں ایک درخت ہے۔ (جس کی ٹہنیاں جنت سے باہر جھکی ہوئی ہیں) پس جو شخص اس کی کوئی شاخ پکڑ لیتا ہے تو وہ شاخ اس آدمی کو جنت کے باہر نہیں رہنے دیتی (اٹھا کر اندر لے جاتی ہے) اور کنجوسی دوزخ میں ایک درخت ہے (جس کی شاخیں دوزخ سے باہر ہیں) پس جو شخص اس کی کوئی شاخ پکڑ لیتا ہے تو وہ شاخ اس آدمی کو دوزخ کے اندر لے جائے بغیر نہیں چھوڑتی، بیہقی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان

marfat.com

مرفوعاً منقول ہے کہ خیرات دینے کی طرف جلد جلد آگے بڑھو کیونکہ مصیبت خیرات کو کود کر (تمہارے پاس) نہیں پہنچ سکتی، رواہ رزین۔

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ اللہ حکمت عطا فرماتا ہے، حکمت سے مراد ہے مفید صحیح علم اور اس کے مطابق عمل جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ ہو، ایسا علم بغیر وحی کے نہیں حاصل ہو سکتا اور وحی انبیاء کے پاس آتی ہے لہٰذا حکمت سب سے پہلے انبیاء کو حاصل ہوتی ہے اور انبیاء کی معرفت دوسروں کو۔

ابن مردویہؒ نے بطریق جویبر از ضحاک حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ حکمت سے مراد قرآن ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قرآن سے مراد ہے تفسیر قرآن کیونکہ قرآن تو نیک بیک سب ہی پڑھتے ہیں۔

مَنْ یَّشَآءُ (جس کو چاہتا ہے) یہ مفعول اول ہے (اَلْحِکْمَۃَ مفعول دوم ہے) اس جگہ اہمیت مفعول دوم کی تھی اس لئے اس کو مفعول اول سے پہلے ذکر کیا یہی وجہ ہے کہ

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ میں فعل مجہول ذکر کیا کیونکہ اصل مقصد حکمت کا ذکر ہے، (فاعل کا ذکر اس جگہ اصل مقصد نہیں ہے) یُؤْتَ جمہور کی قرات ہے یعقوب کی قرات میں یُؤْتِ ہے۔

فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا جس کو حکمت عطا کی گئی بلاشبہ اس کو بہت بڑی خیر دے دی گئی، خَیْرًا میں تنوین عظمت خیر کو ظاہر کر رہی ہے یعنی ایسی خیر جس کے اندر دونوں جہاں کی بھلائیاں موجود ہوں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دین (کے مسائل) کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ میں (دینی احکام) تقسیم کرنے والا (یعنی بتانے والا) ہوں دیتا (یعنی بھیجتا) اللہ ہے، متفق علیہ

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے صرف تین اعمال (کا سلسلہ باقی رہتا ہے)۔

۱۔ صدقہ جاریہ (جیسے کنواں، سبیل، مدرسہ، سڑک، مسافر خانہ وغیرہ، ۲۔ وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں (جیسے تالیف کی ہوئی کوئی کتاب یا متقی عالم شاگرد) ۳۔ صالح اولاد جو والدین کے لئے دعا کرے۔ رواہ مسلم

حضرت ابو مسعود انصاری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو بھلائی کا راستہ بتاتا ہے اس کو بھی نیکی کرنے والے کے برابر ثواب ملتا ہے، رواہ مسلم۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے عابد پر عالم (دین) کی فضیلت ایسی ہے جیسے تمام ستاروں پر چودھویں کے چاند کی، علماء (اسلام) انبیاء کے وارث ہیں لیکن انبیاء نے میراث میں کوئی درہم و دینار نہیں چھوڑا بلکہ علم کی میراث چھوڑی جو اس میراث کو لیتا ہے وہ بڑے نصیب والا ہے، رواہ احمد، والترمذی، وابو داؤد، وابن ماجہ والدارمی۔

حضرت ابو امامہ باہلی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا دو آدمی ہیں ایک عابد دوسرا عالم، عابد پر عالم کی برتری ایسی ہے جیسے تم میں سے ادنیٰ آدمی پر میری برتری، پھر فرمایا بلاشبہ اللہ اس کے فرشتے اور تمام زمین آسمان والے یہاں تک کہ سوراخوں کے اندر چیونٹیاں اور پانی کے اندر مچھلیاں سب اس شخص پر رحمت بھیجتے ہیں جو لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے (یعنی معلم خیر پر اللہ رحمت نازل کرتا ہے اور تمام مخلوق اس کے لئے دعا رحمت کرتی ہے) رواہ الترمذی۔

وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ یعنی نصیحت پذیر نہیں ہوتے مگر دانشمند، مراد یہ ہے کہ صرف خیر اور دوسرے احکام کے متعلق اللہ نے جو آیات نازل فرمائی ہیں ان سے نصیحت اندوز اور خداداد علوم پر غور کرنے والے صرف وہی سمجھ دار لوگ ہوتے ہیں جن کا فہم وہم کی مداخلت اور شیطانی خیالات سے پاک ہوتا ہے، میں کہتا ہوں کہ ایسا تفکر صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کامل طور پر نفس (امارہ) فنا ہو جائے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَۃٍ اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو کسی طرح کا خرچ ہو تھوڑا ہو یا بہت سب کے سامنے ہو یا چھپا کر

marfat.com

حق راستہ میں ہو یا باطل راستہ میں۔
اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ (اور جو اللہ کی نذر مانتے ہو یعنی اللہ کی فرمانبر داری کا جو کام (عبادت ہو یا مالی صرف) تم اپنے اوپر واجب کر لیتے ہو، خواہ نذر کسی شرط کے ساتھ مشروط ہو (جیسے اللہ اگر میرا یہ کام کر دے گا تو میں دس روزے رکھوں گا یا دس مسکینوں کو کھانا کھلاؤں گا) یا بلا شرط ہو۔
فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ (بلا شبہ اللہ اس کو جانتا ہے) تم کو اس کا بدلہ دے گا۔
وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ لیکن جو لوگ بے جا حرکتیں کرنے والے ہیں، راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے مانی ہوئی نذریں پوری نہیں کرتے یاد کھاوٹ کے لئے دیتے ہیں یا گناہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ (ان کا کوئی مددگار نہیں کہ اللہ کے عذاب کو دفع کر سکے)۔
اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ یعنی اگر تم لوگوں کے سامنے خیرات دو بشرطیکہ دکھاوٹ کے لئے نہ ہو تو یہ عمل اچھا ہے، (ابن کثیرؒ) ورشؒ اور حفصؒ نے اس آیت میں اور سورۃ النساء میں نِعِمَّا کو نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، قالون اور ابو بکر اور ابو عمرو نے نون کا تو کسرہ پڑھا ہے مگر عین کی حرکت کا اخفاء کیا ہے اور سکون عین بھی جائز ہے، باقی قاریوں نے نون کا فتحہ اور عین کا کسرہ پڑھا ہے یہ سب لغات صحیح ہیں۔
وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اور اگر اہل احتیاج کو تم چھپا کر دو تو یہ فعل سب کے سامنے دینے سے بہتر اور افضل ہے، حضرت ابو امامہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھپا کر خیرات کرنا رب کے غضب (کی آگ) کو بجھا دیتی ہے اور عزیزوں سے اچھا سلوک کرنا عمر بڑھا دیتا ہے، رواہ الطبرانی بسند حسن۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس روز اللہ کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا اس روز سات (قسم کے) آدمیوں کو اللہ اپنے سایہ میں لے لے گا۔

ا۔ خلیفہ عادل (یا منصف حاکم) ۲۔ وہ جوان جس کی اٹھان اللہ کی عبادت میں ہوئی ہے ۳۔ وہ شخص جس کا دل مسجد سے نکلنے کے بعد بھی واپس آنے تک مسجد میں ہی لگا رہے ۴۔ وہ دو آدمی جو اللہ کی خوشنودی کے لئے باہم محبت کرتے ہیں، باہم اکھٹے ہوتے ہیں تب توجہ اللہ اور الگ الگ چلے جاتے ہیں تب اسی غرض سے ۵۔ وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کی یاد کرتا ہے اور روتا ہے ۶۔ وہ شخص جس کو کوئی بڑے حسب والی خوبصورت عورت اپنی طرف گناہ کے لئے بلاتی ہے اور وہ کہتا ہے میں اللہ سے ڈرتا ہوں ۷۔ وہ شخص جو اللہ کی راہ میں کچھ دیتا ہے اور اتنا چھپا کر دیتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت ہے فرمایا تین آدمی ہیں جو اللہ کو پیارے ہیں ایک وہ جو رات سے اٹھ کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے، دوسرا وہ جو دائیں ہاتھ سے راہ خدا میں کچھ دیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے بھی چھپا کر دیتا ہے، تیسرا وہ جو کسی جہادی دستہ میں ہو ساتھی شکست کھا کر بھاگ گئے ہوں مگر وہ دشمن کے مقابل ثابت قدم رہے، (ترمذی)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن سے اللہ محبت کرتا ہے اور تین آدمی ہیں جن سے اس کو نفرت ہے۔ جن سے اللہ کو پیار ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس ایک آدمی بغیر کسی استحقاق قرابت کے محض اللہ کے واسطے کچھ مانگنے آیا لیکن کسی نے کچھ نہ دیا صرف ایک آدمی لوگوں کی نظر سے بچ کر ہٹ گیا اور جا کر سائل کو اتنا چھپا کر کچھ دیا کہ اللہ کے اور لینے والے کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہوا، دوسرا یہ کہ ایک جماعت رات بھر (دشمن سے لڑنے کے لئے) سفر کرتی رہی جب (آخر رات کو) ایسا وقت آیا کہ لوگوں کو ہر مساوی المرتبہ چیز سے نیند زیادہ محبوب ہو گئی اور سب نے سونے کے لئے اپنے سر رکھ دیئے تو ایک آدمی کھڑا ہو کر مجھ سے دعا کرنے اور میری آیات کی تلاوت کرنے لگا۔ تیسرا وہ شخص جو کسی جہادی دستہ میں تھا مقابلہ کے وقت (ساتھی) شکست کھا کر بھاگ نکلے مگر یہ شخص دشمن کے مقابل اس وقت تک

marfat.com

ثابت قدم رہا کہ شہید ہو جائے یا اللہ فتح عنایت کر دے۔ جن تین لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو نفرت ہے وہ یہ ہیں، زانی بوڑھا، اترانے والا فقیر اور ظالم غنی (ان تینوں کے پاس اپنے گناہ کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، بڑھاپے میں جوش جوانی نہیں ہوتا کہ زنا پر مجبور ہو، فقیر کے پاس دولت نہیں ہوتی کہ فخر اور غرور کرنے کا سامان ہو، مالدار اپنے گزارے کے لئے کسی کی حق تلفی پر مجبور نہیں ہوتا کیونکہ خود مالدار ہوتا ہے) رواہ الترمذی والنسائی۔

وَيُكَفِّرُ یہ قرأت حفص اور ابن عامر کی ہے ابن کثیر ابو عمرو اور ابو بکر نے نُكَفِّرُ پڑھا ہے بہر حال یہ جملہ فعلیہ ہے اور ماقبل پر معطوف نہیں، یہ جملہ اسمیہ ہے مبتدا محذوف ہے یعنی نَحْنُ نُكَفِّرُ یا اَللّٰہُ يُكَفِّرُ نافع، حمزہ اور کسائی نے نُكَفِّرْ پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف مدخول علیہ اور مدخول فاء مقام جزاء ہے اس لئے جزم ہونا چاہئے۔

عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ہم تمہارے گناہ ساقط کر دیں گے، مِنْ زائد ہو یا یہ کہ ہم تمہارے کچھ گناہ معاف کر دیں گے اس وقت تبعیضیہ ہوگا یعنی صغیرہ گناہ معاف کر دیں گے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھپا کر خیرات کرنا گناہ (کی آگ) کو بجھا دیتی ہے۔ رواہ الطبرانی فی الصغیر من حدیث ابی سعید الخدریؓ۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۷۱) اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے یہ چھپا کر دینے کی ترغیب ہے، (کہ تمہاری پوشیدہ خیرات ضائع نہ ہوگی)۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ آپ پر ان کا ہدایت یافتہ ہو جانا لازم نہیں، نسائی، طبرانی، بزاز اور حاکم وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان نقل کیا ہے کہ لوگ اپنے رشتہ دار مشرکوں کو کچھ دینا پسند نہیں کرتے تھے، یہ بات حضور اقدس ﷺ سے دریافت کی تو آپ نے (رشتہ دار مشرکوں کو دینے کی) اجازت دے دی اس پر آیت مذکور نازل ہوئی، ابن ابی شیبہ نے حضرت محمد بن حنفیہ کی مرسل روایت بھی اسی طرح نقل کی ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف اہل اسلام کو خیرات دینے کا حکم دیتے تھے اس پر یہ آیت اتری، اس کے بعد ہر مذہب کے آدمی کو خیرات دینے کا حکم حضور نے دے دیا، بغوی نے سعید بن جبیر کا قول بھی اسی طرح نقل آیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے مرسلاً سعید بن جبیر کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اپنے دین والوں کے علاوہ کسی کو خیرات نہ دو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کے بعد حضور ﷺ نے تمام مذاہب والوں کو خیرات دینے کی اجازت دیدی مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اسلام میں داخل کرنے کی غرض سے جو آپ غیر مسلموں کی مالی امداد سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں تو ایسا نہ کیجئے کیونکہ غیر مسلموں کو ہدایت یافتہ بنا دینا آپ کا ذمہ نہیں، کلبی نے شان نزول اس طرح نقل کی ہے کہ مسلمانوں کی کچھ سسرالی رشتہ داریاں یہودیوں سے تھیں اسلام سے پہلے یہ یہودیوں کی مدد کرتے تھے لیکن مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے یہودیوں کو کچھ دینا مناسب نہیں سمجھا اور (ہاتھ روک لیا) مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمان ہو جائیں (کیونکہ ان کی امداد کے سوا ان یہودیوں کے گذران کا کوئی ذریعہ نہ تھا) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے کیونکہ ہدایت اسی کی طرف سے اور اسی کی مشیت سے ہوتی ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ اور جو کچھ تم خیرات کرو گے یا مال خرچ کرو گے، خیر سے مراد ہے صرف خیرات یا مال۔

فَلِاَنْفُسِكُمْ تو خود اپنے لئے کرو گے یعنی اس کا نفع لوٹ کر تم کو ہی ملے گا لہٰذا دینے کے بعد نہ فقیر پر احسان رکھو نہ ناپاک مال راہ خدا میں خرچ کرو۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ واؤ حالیہ ہے تُنْفِقُوْا کی ضمیر فاعل ذوالحال ہے مطلب یہ کہ تم جو کچھ خیرات کرو جس کی غرض سوائے خوشنودی رب کے حصول کے اور کچھ نہ ہو تو وہ تمہارے ہی لئے مفید ہوگی، یا واؤ عاطفہ ہے مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! تمہاری خیر خیرات تو صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے پھر کیا وجہ کہ اپنی خیرات کا احسان

marfat.com

فقیر پر رکھتے ہو یا ناپاک مال دیتے ہو گویا یہ جملہ خبر یہ ہے کہ جس میں مسلمانوں کے حال کے تقاضے کو بیان کیا ہے، یا مَا تُنْفِقُوْنَ لفظاً جملہ منفی ہے اور معنی کے لحاظ سے نہی ہے مراد یہ ہے کہ تمہاری خیرات کا مقصود خوشنودی رب کی طلب ہونی چاہئے سوائے رضائے خدا کی طلب کے اور کسی غرض کے لئے خیرات نہ دو، اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ سوائے رضائے خداوندی کی طلب کے اور کسی غرض کے لئے خیرات کرنا ممنوع ہے، ورنہ مفت میں مال کی بربادی ہو گی اور مفت مال کی بربادی ناجائز ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ　اور جو مال راہ خدا میں تم صرف کرو گے وہ پورا پورا تم کو ادا کیا جائے گا یعنی اس کا ثواب کثیر چند در چند تم کو ملے گا، چونکہ یُوَفَّ کے اندر ادا کرنے کا معنی ہے اس لئے اس کے بعد اِلٰی لایا گیا، یا یہ مطلب ہے کہ جو مال راہ خدا میں تم خرچ کرو گے اس کا پورا نعم البدل تم کو دیا جائے گا (گویا اس آیت میں اس فرشتہ کی دعا کی قبولیت کی صراحت ہے جو کہتا ہے کہ الٰہی خیرات کرنے والے کو عوض عطا فرما، یہ حدیث ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

مذکورۂ بالا تینوں جملوں کے درمیان حرف عطف ذکر کیا گیا ہے حالانکہ بظاہر یہ جملہ شرطیہ سابق جملہ شرطیہ کی تاکید ہے اس لئے حرف عطف نہ ہونا چاہئے، حرف عطف کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ آخری جملہ سے پہلے جملہ کی صرف تاکید ہی مقصود نہیں ہے بلکہ منت نہی اور ایذا رسانی کی برائی کو الگ الگ دلائل سے مدلل کرنا مقصد ہے پہلے جملہ کا مفاد یہ ہے کہ جس چیز کے دینے میں خود تمہارا فائدہ ہے اس کے دینے کا فقیر پر احسان رکھنا درست نہیں، دوسرے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو دینے سے تمہارے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی کا حصول ہے اس کا فقیر پر احسان رکھنا تو گویا ایسے شخص سے عوض کی طلب کرنا ہے جس سے عوض مانگنے کے لئے عطا نہیں کی گئی تیسرا جملہ اس مضمون پر دلالت کر رہا ہے کہ جس چیز کا ایک بار بھی بدل لے لیا جائے اس کا احسان نہیں ہوتا جیسے بائع، جب اپنی چیز کی قیمت لے لیتا ہے تو خریدار پر اس کا احسان نہیں ہوتا اور تم کو تو کئی گنا معاوضہ ملے گا پھر فقیر پر تمہارا کیا احسان۔

وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۲)　اور تمہاری حق تلفی نہیں کی جائے گی یعنی تمہارے اعمال کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا، صدقہ فرض (زکوٰۃ عشر وغیرہ) صرف مسلمانوں کو دیا جائے گا، غیر مسلم کو دینا جائز نہیں، ہاں صدقہ نفل (یعنی وہ خیرات جو فرض نہیں) غیر مسلم کو بھی دینا جائز ہے، صدقہ فطر، کفارہ اور مال نذر کے متعلق علماء کا مسلک مختلف ہے امام اعظمؒ کے نزدیک ذمی (غیر مسلم) کو بھی دیا جا سکتا ہے کیونکہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ کا حکم عام ہے لیکن ذمی کو زکوٰۃ دینے کا عدم جواز (اس آیت سے نہیں بلکہ) حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے نکلتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ ﷺ نے یمن کو (وصول زکوٰۃ کے لئے) بھیجا تو فرمایا ان کے دولت مندوں سے فرض زکوٰۃ وصول کی جائے اور انہی کے غریبوں کو لوٹا کر دے دی جائے، (متفق علیہ) صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے کتاب اللہ کے عمومی حکم کو اس سے مقید کیا جا سکتا ہے (لہٰذا حدیث کا تقاضا ہے کہ ذمی کو زکوٰۃ نہ دی جائے اگرچہ کتاب اللہ میں حکم عام ہے فقراء مسلم ہوں یا ذمی سب کو زکوٰۃ دینا آیت کی رو سے درست ہے مگر حدیث نے فقراء مسلمین کے لئے زکوٰۃ کو مخصوص کر دیا)

ابن ہمام (شارح ہدایہ) نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ عام ہے لیکن بالاجماع حربی کافر کو مخصوص کر لیا گیا ہے (اور حربی کافر کو زکوٰۃ دینا ناجائز قرار دے دیا گیا ہے) اس کی وجہ دوسری آیت کا حکم ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ الخ (پس اس آیت کی وجہ سے حربی کافر کو زکوٰۃ دینا ناجائز قرار پایا) جب ایک آیت کے حکم کی دوسری آیت سے ایک بار تخصیص ہو گئی (اور عام مخصوص البعض ہو گیا) تو پھر (دوبارہ) خبر واحد سے اس کی تخصیص جائز ہے (لہٰذا ذمی کو بھی اس حکم سے از روئے حدیث خاص کر لیا گیا اور ذمی کافر کو بھی زکوٰۃ دینا ناجائز قرار دے دیا گیا)۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ　اس کا تعلق یا مَا تُنْفِقُوْا سے ہے یعنی جو مال راہ خدا میں تم فقراء کو دو گے یا اس کا تعلق محذوف فعل سے ہے گزشتہ فعل اس محذوف پر دلالت کر رہا ہے اس لئے دوبارہ ذکر فعل کی ضرورت نہیں یعنی فقراء کو دینے کا قصد کر دیا ہو کچھ خرچ کرو وہ فقراء کیلئے خاص کر دو، یا لِلْفُقَرَآءِ خبر مقدم ہے اور مبتدا مؤخر محذوف ہے یعنی فقیروں کا تم پر حق ہے۔

marfat.com

اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (ان فقراء کے لئے جن کو راہ خدا میں روک دیا گیا ہے (کہ دوسرے کام نہیں کر سکتے) یعنی ظاہری اور باطنی علوم کی تحصیل یا جہاد میں مشغول ہیں۔

لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ٘ کہ وہ علم اور جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے کہیں آجا نہیں سکتے (اور روزی نہیں کما سکتے)۔

یَحْسَبُهُمُ ابو جعفر، ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے یَحْسَبُ بروزن یَسْمَعُ سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے یَحْسِبُ بکسر سین لیکن اگر فعل میں بجائے فاء کلمہ کے حرف علت نہ ہو تو مضارع مکسور العین ہونا شاذ ہے۔

الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ٘ یعنی ان کے حال سے ناواقف لوگ ان کو اس وجہ سے غنی سمجھتے ہیں کہ وہ سوال سے بچتے ہیں، تعفّف (باب تفعّل کا مصدر) عفت سے بنا ہے اس سے مراد ہے قناعت کی وجہ سے سوال کو ترک کر دینا۔

تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ٘ یعنی اے پیغمبر آپ ان کو محتاجی اور مفلسی کو ان پر ہونے والی نشانیوں سے پہچان سکتے ہیں مطلب یہ کہ بھوک اور دکھ کی وجہ سے چہروں کی زردی اور لباس کی بوسیدگی فرسودگی سے ہی وہ پہچانے جا سکتے ہیں، سِیْمَا کسی چیز کی وہ خصوصی علامت جس سے وہ چیز پہچان لی جاتی ہے۔

لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا٘ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، الحاف سے مراد ہے سائل کا مسئول سے چمٹ جانا اور بغیر لئے نہ چھوڑنا، مطلب یہ ہے کہ وہ عموماً لوگوں سے سوال نہیں کرتے اسی وجہ سے ناواقف ان کو غنی جانتے ہیں مگر ان کی خصوصی نشانیاں ان کی محتاجی کو بتاتی ہیں اور اگر کبھی مانگتے بھی ہیں تو لپٹ کر چمٹ کر نہیں مانگتے بعض علماء نے کہا آیت میں مطلق سوال کی نفی مراد ہے یعنی وہ کسی سے مانگتے ہی نہیں کہ اصرار کرنا پڑے۔

اِلْحَافًا مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہے گویا الحاف (اصرار) ایک طرح کا سوال ہی ہے، یا مصدر بمعنی اسم فاعل ہو کر لَا یَسْئَلُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے یعنی لپٹتے ہوئے لوگوں سے نہیں مانگتے۔

ابن منذرؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ یہ لوگ اہل صفہ (چبوترہ پر پڑے رہنے والے) تھے ان کی تعداد کوئی چار سو تھی، نادار اور مہاجر تھے مدینہ میں نہ ان کا کوئی ٹھکانا تھا، نہ خاندان، قبیلہ، مسجد میں رہتے تھے اور ہمہ وقت عبادت اور مسائل دین سیکھنے میں لگے رہتے تھے (کبھی جہادی دستوں میں بھی رسول اللہ ﷺ ان کو بھیج دیا کرتے تھے۔ اللہ نے لوگوں کو ان کی امداد کی ترغیب دی تھی اس لئے شام کو جس کے پاس ضرورت سے زائد کھانے کی چیز ہوتی وہ لا کر ان کو دے دیتا تھا۔

عطا بن یسارؒ نے قبیلہ بنی اسد کے ایک شخص کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے پاس ایک اوقیہ یا اس کے مساوی (چاندی) موجود ہو اور وہ سوال کرے تو وہ سائل بالالحاف ہے۔ رواہ مالک و ابو داؤد و النسائی۔

حضرت زبیر بن عوام راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر (جنگل کو جا کر لکڑی کاٹ کر) گٹھا باندھ کر پشت پر لاد کر (بازار میں) لائے (اور فروخت کرے) اور اس طرح اللہ اس کی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے وہ دیں یا نہ دیں (رواہ البخاری)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ممبر پر تشریف فرما تھے اور کچھ خیرات اور سوال کرنے سے پرہیز رکھنے کا بیان فرما رہے تھے دوران بیان میں فرمایا اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص لوگوں سے کچھ مانگے حالانکہ

marfat.com

(سوال سے) غنی بنادینے والی (مقدار) اس کے پاس موجود ہو تو قیامت کے دن اس سوال سے اس کے منہ پر خراشیں لے پڑی ہوں گی۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ غنی کردینے والی مقدار کیا ہے فرمایا پچاس درہم یا اتنی قیمت کا سونا۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی۔

حضرت سہل بن حنظلہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ایسی حالت میں سوال کرے کہ اس کے پاس غنی کردینے والی (مقدار زر) موجود ہو تو یقیناً وہ آگ بڑھانا چاہتا ہے (اپنے لئے) نفیلی راوی کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ (کسی نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ وہ مقدار کیا ہے جس کی موجودگی میں سوال کرنا درست نہیں فرمایا جس سے صبح اور شام کا کھانا بنا سکے۔ دوسری روایت میں آیا ہے ایک دن رات کی پوری خوراک، رواہ ابوداؤد۔

میں کہتا ہوں کہ (احادیث مذکورہ میں بظاہر اختلاف ہے) کتنے مال کی موجودگی سوال کو حرام کردیتی ہے اس کی تعین میں احادیث مذکورہ کا باہم تعارض ہے اس تعارض کو اس طرح اٹھایا جاسکتا ہے کہ احادیث کے اختلاف کو لوگوں کے احوال کے اختلاف پر محمول کیا جائے مثلاً جس کے پاس آج کے لئے کھانا پورا پورا ہو اور کل کے لئے مل جانے کی امید ہو اس کو سوال کرنا درست نہیں لیکن اگر کل کو بھی میسر آنے کی امید نہ ہو تو سوال کرنا حلال ہے اور اس وقت تک سوال کرنا جائز رہے گا جب تک آئندہ کھانا میسر آنے کی امید نہ ہو جائے جس کے پاس کھانا تو بقدر ضرورت ہو مگر ستر عورت کے لئے لباس نہ ہو یا دوسری ضرورتیں پوری کرنے کی سبیل نہ ہو اس کیلئے اپنی ضرورت کے موافق سوال کرنا درست ہے۔ رہی چالیس درہم کی مقدار تو یہ ہر سوال کو حرام کردیتی ہے۔ (چالیس درہم کا مالک نہ کھانا مانگ سکتا ہے، نہ کپڑا، نہ کوئی اور ضرورت کی چیز۔

٣٧ ع ٢ ۵ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ (تم جو مال راہ خدا میں خرچ کرو گے اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ اس کلام میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی ترغیب ہے خصوصاً مذکورہ بالا فقراء کو دینے کی (یعنی) تمہارا دیا ہوا اللہ کے علم میں ہے کبھی اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا اس لئے بے تردد خدا کی راہ میں صرف کرو)۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال رات دن پوشیدہ اور ظاہر صرف کرتے ہیں یعنی ہر وقت اور ہر حالت میں دیتے ہیں جب کسی محتاج کی حاجت سامنے آتی ہے فوراً اس کو پورا کرتے ہیں قطعاً تاخیر نہیں کرتے نہ وقت کو بہانہ بناتے ہیں نہ مال کو۔

ابن منذر ؒ نے سعید بن میتب ؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے متعلق ہوا ان دونوں بزرگوں نے جیش عسرت (تبوک کو جانیوالے تنگ حال مجاہدین کے لشکر) کو خرچ دیا تھا۔

ابن جریر، عبدالرزاق، ابن ابی حاتم اور طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت علی بن ابی طالب (کرم اللہ وجہہ) کے حق میں ہوا۔ آپ کے پاس چار درم تھے آپ نے ایک درم رات کو ایک درم دن کو ایک چھپا کر اور ایک علانیہ خیرات کیا تھا۔ بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ جب آیت للفقراء الذین احصروا الخ نازل ہوئی تو حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے بہت سارے دینار اصحاب صفہ کو بھیجے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وسط رات میں ایک وسق چھوارے بھیجے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ دن میں علانیہ خیرات سے حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ بن عوف کا بھیجا ہوا روپیہ اور رات کو پوشیدہ خیرات سے

ا؎ امام احمد ؒ نے بروایت ابن ابی ملیکہ لکھا ہے کہ اکثر ایسا ہوا کہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے ہاتھ سے اونٹ کی مہار چھوٹ کر گر گئی تو آپ نے اونٹ کو بٹھا کر خود اتر کر نکیل اٹھالی لوگ کہتے کہ حضرت آپ نے ہم کو حکم کیوں نہ دے دیا ہم اٹھا دیتے فرماتے میرے حبیب ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ لوگوں سے میں کچھ نہ مانگوں، منہ رحمہ اللہ

ل؎ خموش یا خدوش خراشیں، خدوش خدش کی جمع ہے، خدش کا معنی ہے لکڑی یا کسی اور چیز سے کھال کو اکھاڑ دینا، کدوح بھی خموش کا ہم معنی ہے اور کدوح اس نشان کو بھی کہتے ہیں جو خراش یا دانت سے کاٹنے سے پیدا ہو جاتا ہے، کدح صفت مشبہ کا صیغہ ہے، نہایہ، منہ رحمہ اللہ۔

marfat.com

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے چھوارے مراد ہیں۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، مکحول اور اوزاعی کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو جہاد کے لئے گھوڑے پالتے تھے گھوڑوں کو رات دن پوشیدہ اور علانیہ چارہ دیا جاتا تھا۔ یہ قول ابن ابی حاتم اور طبرانی نے بحوالہ یزید بن عبد اللہ بن غریب رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے مگر یزید اور عبد اللہ دونوں مجہول ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے اور اس کے وعدہ کو سچا سمجھتے ہوئے کوئی گھوڑا راہ خدا میں کام آنے کیلئے پرورش کرتا ہے تو گھوڑے کا کھانا، پینا، لید، پیشاب (سب کچھ) قیامت کے دن اس کی میزان میں رکھا جائے گا۔ (اور نیکیوں کی تول میں آئے گا) رواہ البخاری۔

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (تو ان کا اجر اللہ کے پاس مخصوص ہے نہ ان کو (کسی حق تلفی یا عذاب کا) خوف ہوگا نہ وہ (کسی فوت شدہ چیز پر) غمگین ہوں گے) فَلَهُمْ الخ خبر ہے اور اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ مبتدا۔ فاء سببیّت کے لئے ہے (یعنی فاء کا ماقبل فاء کے مابعد کا سبب ہے) بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے یعنی مِنْهُمْ اس صورت میں فَلَهُمْ کی فاء عاطفہ ہوگی اور جملہ کا جملہ پر عطف ہوگا۔

وقف منزل

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا (جو لوگ سود کھاتے ہیں) الرِّبٰوا کو الصَّلٰوة کی طرح واؤ کے ساتھ ان لوگوں کے نزدیک لکھا جاتا ہے جو اس کو پڑھتے ہیں اور الربوا کی کتابت میں واؤ کے بعد الف بھی لکھا جاتا ہے کیونکہ یہ واؤ جمع کے مشابہ ہے۔

لَا يَقُوْمُوْنَ (یعنی وہ اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے عبد الرزاق نے اپنی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن سلام کی روایت سے یہی مطلب لکھا ہے۔

اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ (مگر اس طرح اٹھیں گے جیسے جن کے جھپٹے میں آیا ہوا شخص اٹھتا ہے، شیطان سے مراد جن خبط کا معنی ہے سخت ضرب جس کے ساتھ بگاڑ بھی ہو۔ قاموس میں ہے خَبَطَ الشَّيْطَانُ فُلَانًا یا خَبَطَهُ (الشَّیْطَانُ) تَلَدُّنَا"، فلاں شخص کو جن نے چھو کر دکھ پہنچادیا، اَلْمَسُّ سے مراد ہے جنون یا چھو جانا، مس المس کا تعلق یقوم سے ہے یا يَتَخَبَّطُ سے مطلب اس طرح ہوگا کہ سود خور قبروں سے اس طرح ہی اٹھیں گے جیسے جن کے جھپٹے میں آیا ہوا آدمی جنون زدہ ہو کر اٹھتا ہے اور شیطان اس کی عقل خراب کر دیتا ہے یا (اگر مس کا معنی لمس لیا جائے تو) یہ معنی ہوگا کہ وہ اس طرح اٹھیں گے جیسے وہ شخص اٹھتا ہے جس کو شیطان کے چھو جانے سے دکھ پہنچ گیا ہو یعنی جن کے چھو جانے سے اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ جسمانی بیماری، مرگی اور جنون کبھی جن کے چھو جانے سے پیدا ہو جاتا ہے اس لئے آیت میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں کیونکہ جن کے چھو جانے سے مرض کا پیدا ہو جانا قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی۔ قرآن میں حضرت ایوب کے قصہ میں آیا ہے رَبِّ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ اور حدیث رسول اللہ ﷺ میں استحاضہ کے بیان میں ہے کہ یہ شیطان کی ایک رگڑ (ایڑ) لگنے سے ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ عرب کا خیال تھا کہ جن انسان کو خبطی بنا دیتا ہے۔ عرب ہی کے گمان کے موافق آیت میں اظہار کیا گیا (یعنی واقع میں تو جن انسان کا کچھ نہیں بگاڑ تا یہ صرف دور جاہلیت کا مفروضہ اور مسلمہ تھا اسی مفروضہ کے ساتھ سود خور کے قیام کو تشبیہ دی) لیکن جب مس جن سے مرض پیدا ہو جانا کتاب اللہ اور حدیث سے ثابت ہے تو اس توجیہ کی ضرورت نہیں۔ سود خوروں کے پیٹوں کو بھی بڑھا بڑھا کر اللہ ان کو ٹھڑیوں کی طرح کر دے گا جن کے اندر سانپ بھرے ہوں اس لئے وہ بوجھل ہو کر ٹھیک طرح کھڑے نہ ہو سکیں گے۔

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج کے قصہ میں فرمایا پھر جبرئیل علیہ السلام مجھے لے

marfat.com

کر بہت سارے آدمیوں کے پاس پہنچے ان میں سے ہر ایک کا پیٹ بڑی کوٹھڑی کی طرح تھا یہ لوگ فرعون کے ساتھیوں کی گزر گاہ میں بالکل سامنے تھے فرعونیوں کی پیشی صبح شام دوزخ پر ہوتی ہے۔ فرعونی لوگ بھڑکائے ہوئے ان اونٹوں کی طرح جو اندھادھند پتھروں اور (چھوٹے موٹے) درختوں کو روندتے چلے جاتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں سامنے سے (دوڑے) آرہے تھے جب ان پٹیل لوگوں کو ان کی آہٹ محسوس ہوئی تو وہ کھڑے ہونے لگے (تاکہ راستہ سے ہٹ جائیں) لیکن ان کے پیٹ ان کو لے جھکے آخر وہ بچھڑ گئے پھر ایک شخص اٹھنے لگا لیکن اس کا پیٹ اس کو لے جھکا اور وہ بچھڑ گیا غرض وہ ہٹ نہ سکے اور فرعونی ان پر آپہنچے اور آتے جاتے ان کو روندتے رہے ان پر یہ عذاب برزخ میں دنیا و آخرت کے درمیان ہو رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا فرعونی کہہ رہے تھے الٰہی کبھی قیامت برپا نہ کرنا کیونکہ قیامت کے روز اللہ فرمائے گا کہ فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔ میں نے پوچھا جبرئیل علیہ السلام یہ کون لوگ ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا "یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے تھے یہ نہیں اٹھیں گے مگر اس طرح جیسا کہ جن زدہ آدمی جن کے جھپٹے کی وجہ سے اٹھتا ہے۔ (رواہ البغوی)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شب معراج میں میں ایسے لوگوں پر پہنچا جن کے پیٹ سانپ بھری کوٹھڑیوں کی طرح تھے اور پیٹ کے باہر ہی سے سانپ نظر آرہے تھے میں نے پوچھا جبرئیل یہ کون ہیں جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہ سود خور ہیں (رواہ احمد و ابن ماجۃ) ابو یعلی نے اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن وہ لوگ اسی علامت سے پہچان لئے جائیں گے وہ کھڑے نہ ہوسکیں گے مگر جس طرح جن زدہ لرزتا اٹھتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے صحیح سند سے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ سود خور قیامت کے دن پاگل دیوانہ (ہوکر) اٹھے گا۔ طبرانی نے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی اسی طرح نقل کیا ہے مگر اس روایت میں مجنون خبطی کا لفظ ہے۔

آیت کا معنی اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ سود خور سود خوری کے مقام سے دیوانہ کی طرح ہی اٹھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سود کا لقمہ کھاتے ہی سود خوار کا دل سیاہ پڑ جاتا ہے حق و باطل اور حلال و حرام کی تمیز اس کو جاتی رہتی ہے جس طرح دیوانہ کو اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔

بات یہ ہے کہ لقمہ حرام اس کے بدن کا جز بن جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی حقیقت ہی بدل جاتی ہے دوسرے گناہ چونکہ بیرونی ہوتے ہیں اس لئے ان سے اندرونی جوہر نہیں بدلتا عارضی احوال کا تغیر ہو جاتا ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سود خور پر لعنت کی ہے اور سود خوری کو زنا سے بھی سخت قرار دیا ہے۔ مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے اور سود کھلانے والے پر لعنت کی ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں اور مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اتنا زائد نقل کیا ہے کہ (حضور ﷺ نے لعنت کی ہے) سود کے لکھنے والے پر اور سود کے گواہوں پر (بھی) اور فرمایا یہ سب برابر ہیں۔ نسائی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے بھی حدیث اسی طرح نقل کی ہے لیکن اس روایت میں گواہان سود کی جگہ زکوٰۃ روکنے والے کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی جو سود کا ایک درہم دانستہ کھاتا ہے اس کا جرم چھتیس بار زنا سے زیادہ سخت ہے۔ رواہ احمد والدار قطنی۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اسی طرح منقول ہے اس روایت میں حسب نقل بیہقی اتنا زائد ہے کہ جس کا گوشت حرام کھا کر پیدا ہوا آگ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سود ستر گناہ (کا

marfat.com

مجموعہ) ہے جن میں سب سے چھوٹا گناہ ماں سے زنا کرنا ہے۔ رواہ ابن ماجہ والبیہقی

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ یہ عذاب اس لئے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔ یعنی یہ عذاب ان کے کفر اور حرام کو حلال قرار دینے کی وجہ سے ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عذاب مذکورہ صرف کافروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ مؤمن سود خور جس کو اپنے گناہ کا اقرار ہو ایسا عذاب نہیں پائے گا یا آیت میں عذاب کے دوامی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ لا یقومون میں غیر معین مستقبل کی نفی ہے مستقبل کا کوئی حصہ مقرر نہیں اور فعل کے اندر مصدر ہوتا ہے تو گویا غیر معین مصدر کی نفی ہوئی اور نکرہ جب نفی کے بعد آتا ہے تو نفی عمومی اور استغراقی ہوتی ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوامی عذاب صرف کافروں کے لئے ہے۔ اگر کوئی مؤمن سود خوری کا مرتکب ہو تو اس کو یہ عذاب ہوگا ضرور مگر (دوامی نہ ہوگا) نبی کی شفاعت یا رب کی (براہ راست) رحمت اور توحید و رسالت محمد یہ ﷺ کے اقرار کی وجہ سے جاتا رہے گا۔

آیت میں کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے ترتیب الفاظ کو الٹ دیا ہے ہونا تو چاہئے انما الربو امثل البیع سود بیع کی طرح ہے لیکن انہوں نے کہا بیع تو سود ہی کی طرح تھا گویا سود کو اصل قرار دیا اور بیع کو اس کے مشابہ (مطلب یہ کہ سود تو حلال ہی ہے اور بیع بھی منفعت خیزی میں کسی قدر سود کی طرح ہوتی ہے اس لئے وہ بھی درست ہے غرض اصلی صرف فائدہ اندوزی ہے)۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے۔ فخر الاسلام (بزدوی) نے لکھا ہے کہ لغت میں بیع مالی تبادلہ کو کہتے ہیں شریعت میں بھی اسی تبادلۂ مالی کو بیع کہا گیا ہے۔ مگر باہم رضامندی کی شرط شرعاً زائد لگا دی گئی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ لغوی معنی میں تراضی کی شرط ماخوذ ہے بغیر رضامندی کے اگر مالی تبادلہ ہو تو اس پر غصب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اختیار اور تراضی کے لئے اچھے برے اور نفع نقصان کی تمیز ضروری ہے اسی لئے پاگل اور نا سمجھ بچہ کی بیع اجماعاً درست نہیں (کیونکہ ان کے اندر قوت تمیز نہیں ہوتی) البتہ سمجھدار بچہ کی بیع کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی بیع بھی درست نہیں کیونکہ اس کی سمجھ ناقص ہوتی ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمدؒ کے نزدیک درست ہے مگر اس کے سرپرست کی رائے کا شامل ہونا ضروری ہے کیونکہ نقصان عقل کی وجہ سے اس کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے جب سرپرست کی رائے بھی اس کے موافق ہو جائے گی تو ضرر کا اندیشہ جاتا رہے گا۔ یہ شرط شریعت نے خود لگائی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ دوسری آیت میں ہے وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔

بیع سے مبادلہ مالی کا ایجاب و قبول ہوتا ہے اور ایجاب و قبول حقیقت میں انشاء ہے (بائع مشتری سے کہتا ہے یہ مال اتنے کو لے لے اور مشتری بائع سے کہتا ہے کہ یہ مال اتنے کو دیدے) لیکن شرعاً ایجاب و قبول کیلئے ماضی کے صیغے مقرر کئے گئے ہیں ایک کہتا ہے میں نے بیچ ڈالا دوسرا کہتا ہے میں نے قبول کیا خرید لیا۔ لیکن اگر (دست بدست) لین دین ہو اور الفاظ نہ استعمال کئے جائیں (جس کو بیع بالتعاطی کہتے ہیں) تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ لین دین لفظی ایجاب و قبول کے قائم مقام مان لیا جائے گا۔ ایک روایت میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ بیع بالتعاطی کم قیمت چیز کی تو ہو جائے گی اعلیٰ چیز کی نہ ہوگی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا (قوی) قول یہی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قوی قول یہ ہے کہ بیع بالتعاطی قطعاً نہیں ہوتی۔ ہم کہتے ہیں کہ اصل مقصد ہے باہمی رضامندی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ اور تعاطی بھی باہمی رضا پر دلالت کرتی ہے۔

عقد بیع کرنے والے کو شرعی ولایت حاصل ہونا ضروری ہے خواہ مالک ہو یا وکیل (مختار ایجنٹ) یا وصی یا عزیز قریب وغیرہ (یعنی مشتری اور بائع خود روپیہ اور مال کے مالک ہوں یا طرفین میں سے کسی نے انکو خرید و فروخت کیلئے مقرر کیا ہو وغیرہ)۔

marfat.com

مسئلہ:۔ بیع فضولی (کوئی غیر متعلق شخص جو بائع اور مشتری کی اجازت دینے سے پہلے بائع مشتری کے نام پر کچھ لین دین کرے) کے متعلق علماء کا اختلاف ہے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس کی فروخت درست ہے (اور بائع بعد میں اس کی خرید فروخت کو جاری اور قائم رکھ سکتا ہے) کیونکہ بعد میں حاصل ہونے والی اجازت سابقہ وکالت کی طرح ہو جائے گی (گویا اس کو پہلے سے فروخت کا اختیار حاصل تھا) مگر بعد میں بائع کی اجازت ضروری ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک فضولی کی خریداری بھی بعد میں مشتری کی اجازت پر موقوف ہے بشرطیکہ فضولی نے یہ کہا ہو کہ میں فلاں شخص کیلئے خرید رہا ہوں تم فلاں شخص کیلئے اپنا یہ مال فروخت کر دو لیکن اگر فضولی نے خرید کے وقت یہ نہ کہا ہو کہ میں فلاں شخص کیلئے خرید رہا ہوں تو خریداری اسی فضولی کی مانی جائے گی (اور اصل مشتری اس کو نہیں لے سکتا) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قدیم قول یہی ہے لیکن شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قوی قول یہ ہے کہ فضولی کی بیع ہی درست نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دونوں قول مروی ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکیم بن حزام سے فرمایا تھا جو چیز تیرے پاس نہ ہو اس کو فروخت نہ کر۔ ابن جوزی نے بسلسلہ عمرو بن شعیب نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو چیز تیرے پاس نہ ہو اس کی بیع (تیرے لئے) جائز نہیں اور نہ اس چیز کا تجارتی نفع (تیرے لئے) جائز ہے جو تیری ذمہ داری میں نہ ہو۔

ہم کہتے ہیں اس حدیث میں بیع سے مراد وہ بیع ہے۔ جس میں جانبین (یعنی جن کے لئے خرید و فروخت کی گئی ہو) کی طرف سے مطالبہ ہو سکے یعنی بیع نافذ پس حدیث کی مراد ہے اس بیع کی ممانعت جس کا مال وقت بیع بائع کے پاس موجود نہ ہو بلکہ بیع پہلے کر دے اور پھر کہیں سے خرید کر لا کر مشتری کو دیدے۔

حضرت حکیم بن حزامؓ کا قصہ ہمارے اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ حضرت حکیم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا۔ یا رسول اللہ ﷺ بعض لوگ میرے پاس ایسا سامان خریدنے آتے ہیں جو میرے پاس (اس وقت) نہیں ہوتا میں فروخت کر دیتا ہوں پھر بازار جا کر خرید کر لا کر دیدیتا ہوں سرکار عالی ﷺ نے فرمایا جو چیز تمہارے پاس نہ ہو اس کو نہ فروخت کیا کرو۔ بروایت یوسف رضی اللہ عنہ بن ماہک از حکیم یہ حدیث امام احمد اور اصحاب السنن نے نقل کی ہے اور ابن حبان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی صحیح میں بیان کی ہے اس روایت میں یوسف رضی اللہ عنہ نے صراحت کی ہے کہ مجھ سے حکیم نے یہ حدیث بیان کی۔ بعض استادوں میں یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان عبداللہ بن عصمہ کا نام آتا ہے لیکن شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ کو ضعیف اور ابن حزم نے مجہول قرار دیا ہے مگر ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جرح کی تردید کی ہے۔ اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت لی ہے اور نسائی نے اس کی روایت حجت میں پیش کی ہے اور ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ ہم دلیل میں عروہ بارقی کی روایت کو پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حکیم کو ایک دینار دے کر ایک بکری خریدنے بھیجا حکیم نے ایک دینار کی دو بکریاں خریدیں۔ ایک بکری تو ایک دینار کو فروخت کر دی اور دوسری بکری اور ایک دینار لا کر خدمت اقدس میں پیش کر دی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تیرے ہاتھ کی خرید و فروخت میں برکت عطا فرمائے چنانچہ (اس کے بعد) اگر حکیم مٹی بھی خریدتے تھے تو اس میں بھی ان کو نفع ہو جاتا تھا، رواہ ابوداؤد والترمذی و ابن ماجہ والدار قطنی۔

لیکن اس کی اسناد میں ایک راوی سعید بن زید بھی ہے جس کو قطان اور دار قطنی نے ضعیف کہا ہے مگر ابن معین نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے مسلم نے بھی (یہ حدیث) سعید ہی کے سلسلہ سے اپنی صحیح میں نقل کی ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک راوی ابولبید لمازہ بن زیاد واقع ہے جس کو مجہول کہا گیا ہے مگر ابن سعد نے اس کی توثیق اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تعریف کی ہے اور منذری و نووی نے لکھا ہے کہ اس کی اسناد حسن صحیح ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو دوسرے سلسلہ سے نقل کیا ہے جس کی اسناد یہ ہے کہ ابن عیینہ نے شبیب بن عرفدہ سے سنا اور شبیب نے اپنی

marfat.com

قوم سے اور اس کی قوم نے عروہ بارقی سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرمایا اگر یہ صحیح ہوتی تو میں اس کا قائل ہو جاتا۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ شبیب کی قوم چونکہ معروف نہ تھی اس لئے شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ضعیف قرار دیا لا محالہ یہ حدیث مرسل ہے (اور شافعی کے نزدیک مرسل قابل حجت نہیں ہے) کذا قال الخطابی کرخی نے اسی اسناد کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے لیکن اس اسناد میں شبیب اور عروہ کے درمیان حسن کا نام صراحۃً آیا ہے لہٰذا حدیث کا سلسلہ متصل ہو گیا اور روایت مرسل نہیں رہی اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے اور اس کی تائید تو مسند روایت سے ہو رہی ہے جو بحوالہ ابو لبید از عروہ

ہم نے اوپر نقل کر دی ہے۔

ترمذی نے حبیب بن ابی ثابت کی وساطت سے حضرت حکیم بن حزام کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے قربانی کا جانور خریدنے کے لئے ایک دینار دیا میں نے ایک بکری خرید کر دو دینار کو فروخت کر دی پھر ایک دینار کی ایک بکری خرید کر خدمت والا میں لا کر حاضر کر دی اور ایک دینار بھی پیش کر دیا اور حضور ﷺ سے واقعہ عرض کر دیا آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تجھے خرید و فروخت میں برکت عطا فرمائے۔ پھر آپ نے بکری کی قربانی کر دی اور دینار خیرات کر دیا۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صرف اسی طریق اسناد سے آئی ہے اور کسی طریقہ سے معروف نہیں۔ لیکن میرے خیال میں حبیب نے (خود) حضرت حکیم سے سماعت نہیں کی۔ ابوداؤد نے کسی مدنی بوڑھے کی وساطت سے حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بیان نقل کیا ہے بیہقی نے لکھا ہے کہ اسی (غیر معروف) بوڑھے کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

بیع کی حقیقت مبادلہ مالی ہے اور مال دو طرح کا ہوتا ہے۔

(۱) وہ مال جو بعینہٖ مقصود ہوتا ہے یعنی اس کی شخصیت اور ذات مطلوب ہوتی ہے اس کو عین کہتے ہیں۔

(۲) وہ مال جو بعینہٖ مقصود نہیں ہوتا (وہ ہو یا اس کی مثل دوسرا ہو) ایسا مال کسی دوسری چیز کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے اور فطری طور پر وہ دوسری (ضرورت زندگی کی) چیزیں حاصل کرنے کے کام میں آتا ہے یہ ثمن یعنی قیمت کہلاتا ہے (ثمن بننے کے لئے فطرۃً سونا چاندی معین ہے اس تقسیم کی روشنی میں بیع کی چار قسمیں ہو گئیں۔ (۱) کسی عین کی فروخت سونے چاندی کے عوض۔ اسی کو عموماً بیع کہتے ہیں لفظ بیع سے اسی مفہوم کی طرف انتقال ذہنی ہوتا ہے۔ ایسی بیع میں عین مبیع (فروخت شدہ چیز) ہوتا ہے اور سونا چاندی اس کی قیمت۔ اس بیع کے لئے ضروری ہے کہ بیع کے وقت مبیع موجود اور معین ہو کیونکہ اس وقت بیع کی ذات، صورت اور مالیت ہی مقصود ہوتی ہے۔ حضرت حکیم والی حدیث سے مبیع کا بوقت بیع موجود ہونا ضروری قرار پاتا ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع الکالی بالکالی کی ممانعت فرمائی ہے (کالی نسیہ کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس کی بعینہٖ سپردگی ضروری نہ ہو بلکہ وہ یا اس جیسی دوسری چیز دینا اس شخص کے ذمہ میں واجب ہو جیسے کسی چیز کی قیمت دس روپیہ ہو تو کوئی معین اور خاص دس روپیہ کا نوٹ دینا ضروری نہیں کوئی ایک نوٹ ہو یا ایک ایک روپیہ کے دس نوٹ ہوں یا پانچ پانچ کے دو ہوں بہر حال دس روپیہ کی ثمنیت ہو اس کا ادا کرنا خریدار کے ذمہ لازم ہوتا ہے مگر مبیع اگر موجود نہ ہو گا تو اس کی ذات معین نہ ہو گی بیچنے والے کے پاس موجود ہی نہیں ہے تو تعیین کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے لہٰذا وہ بھی کالی ہو جائے گا اور اس طرح یہ بیع الکالی بالکالی ہو گی جو بحکم حدیث ناجائز ہے)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث دار قطنی نے نقل کی ہے۔ ثمن کا مشتری کے پاس موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ نہ سامنے حاضر اور معین ہونا بلکہ مشتری کے ذمہ پر اس کی ادائیگی ضروری ہے کیونکہ بعینہٖ اس کی شخصیت اور ذات مقصود نہیں۔ قیاس کا تو تقاضا تھا کہ اگر مشتری کے پاس ثمن نہ ہو تو بیع جائز نہ ہو کیونکہ جو چیز موجود نہیں وہ (مشتری کا) مال ہی نہیں ہے (اور تبادلہ کے لئے دونوں طرف مال ہونا چاہئے)۔

marfat.com

لیکن اہل معاملہ کی دشواری کو دور کرنے کے لئے ثمن میں شارع علیہ السلام نے موجود ہونے کی شرط نہیں لگائی بلکہ مشتری کے ادائیگی کا وجوب کافی قرار دیا لیکن اگر قیمت فوری ادا نہ کی جائے تو چار چیزوں کو بیان کرنا لازم ہے۔ مدّتِ ادا کی تعین، جنسِ ثمن، مقدارِ ثمن، صفاتِ ثمن، تاکہ آئندہ جھگڑا پیدا نہ ہو۔ آئندہ نزاع کا اندیشہ جواز بیع کو روک دیتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی یہودی سے کچھ غلہ خریدا اور اس کے پاس اپنی فولادی زرہ رہن رکھ دی اور قیمت ادا کرنے کی مدت مقرر کر دی۔ متفق علیہ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس ۳۰ صاع جو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی۔ (رواہ البخاری) اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لکھا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

یہ فیصلہ باتفاق علماء ہے کہ مبیع کی تعین ضروری ہے اور ثمن کی تعیین (سامنے موجود ہونا یا قبضہ مشتری میں ہونا) ضروری نہیں البتہ (امور اربعہ مذکورہ کا) معلوم ہونا لازم ہے۔

(۲) دوسری بیع عین بعین (یعنی ایک جنس کا دوسری جنس سے تبادلہ) ہے اس بیع میں دونوں جانب مبیع ہوتا ہے (نقد یعنی ثمن نہیں ہوتی) اس لئے جو مبیع میں شرط ہے وہی دونوں طرف یہاں شرط ہوتی ہے بشرطیکہ دونوں جانب ایسی چیزیں ہوں جو قیمت والی ہوں مثلی نہ ہوں لیکن اگر ایک جانب قیمت والی چیز ہو اور دوسری طرف مثلی ہو تو مثلی چیز مبیع اور قیمت والی چیز ثمن قرار پائے گی کیونکہ ثمن کا موجود ہونا تو ضروری نہیں ہے بلکہ مشتری کے ذمہ اس کا وجوب ہوتا ہے اور ذمہ میں کسی چیز کا وجوب اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس چیز کی مقدار اور صفت معلوم ہو لہٰذا قیمت والی چیز کا ثمن ہونا یقینی ہے اور مثلی چیز کا بیع ہونا متعین ہے لیکن دونوں طرف اگر قیمت والی چیز ہو تو علماء حنفیہ کے نزدیک ایک کا وجود اور تعیین یعنی مبیع قرار پانا اور دوسری کا وجوب فی الذمہ یعنی ثمن قرار دیا جانا ضروری ہے میرے نزدیک دونوں کا موجود اور معین ہونا لازم ہے کیونکہ ایک کا ثمن اور دوسری کا مبیع ہونا یا برعکس ہونا بلا دلیل ہے ہر ایک ثمن یا مبیع بن سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے جب دونوں جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو (کمی بیشی کے ساتھ) فروخت کرو مگر دست بدست ہونا چاہئے۔ دوسری روایت میں دست بدست کی جگہ عین بمقابلہ عین آیا ہے (یعنی دونوں موجود اور معین ہوں) دست بدست کا بھی یہی معنی ہوگا۔ اس بیع کو مقایضہ کہتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم بیع صرف ہے اس میں دونوں طرف قیمت (یعنی سونا یا چاندی) ہوتی ہے کسی جانب بیع (سونے چاندی یعنی نقود کے علاوہ کوئی چیز) نہیں ہوتی نہ تعیین کے ساتھ کسی ایک کو مبیع اور دوسرے کو ثمن قرار دیا جا سکتا ہے (کیونکہ حقیقت میں دونوں طرف ثمن ہے اور فرضی طور پر ہر ایک کو مبیع کہا جا سکتا ہے) دونوں کو مبیع کہہ سکتے ہیں لہٰذا دونوں کا موجود اور معین ہونا ضروری ہے (کیونکہ مبیع کا موجود اور معین ہونا لازم ہے) بلکہ دونوں پر مجلس عقد کے اندر ہی قبضہ واجب ہے (کیونکہ مجلس بیع کے اندر مبیع پر قبضہ کرنا لازم ہے) تاکہ قبضہ کی وجہ سے ثمن کی تعیین ہو جائے اور اس کو مبیع قرار دیا جا سکے)۔

(۴) چوتھی قسم بیع سلم ہے یہ بیع مطلق کے بالکل برعکس ہوتی ہے (بیع مطلق میں مبیع موجود ہوتی ہے اور قیمت مشتری کے ذمہ واجب ہوتی ہے قیمت کا موجود اور معین ہونا ضروری نہیں ہوتا) بیع سلم میں مبیع (یعنی خریدی ہوئی چیز) بالفعل موجود نہیں مگر قیمت موجود ہوتی ہے اور مشتری پر قیمت فی الفور ادا کرنا اور بائع کا اس پر قبضہ کر لینا ضروری ہوتا ہے) گویا قیمت مبیع کا حکم رکھتی ہے۔ مبیع کی جانب کچھ مخصوص شرطیں ہونی لازم ہیں جسکا تذکرہ ہم آیت اِذَا تَدَايَنْتُم بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کی تفسیر میں کرینگے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ بیع میں مال کا مال سے تبادلہ ہوتا ہے تو یہ امر واضح ہو گیا کہ مردار یا خون یا شراب یا خنزیر کی بیع درست نہیں (کیونکہ شریعت کی نظر میں یہ چیزیں مال ہی نہیں ہیں) بلکہ ہر وہ چیز جو واقع میں مال نہ ہو یا لوگ اس کو مال جانتے

marfat.com

ہوں مگر شریعت نے اس کی مالیت کو لغو قرار دیا ہو اس کی بیع باطل ہے۔ کیونکہ بیع کی حقیقت ہی موجود نہیں اگر ان اشیاء کو قیمت قرار دیا جائے اور کپڑا، جو تا اور اسی طرح کی دوسری (حلال) چیزوں کو مبیع بنایا جائے تب بھی بیع باطل ہے۔ مگر امام اعظمؒ کا قول ہے کہ شراب اور خنزیر کو اگر ثمن قرار دیا ہو اور کپڑے وغیرہ کو مبیع تو بیع لغو باطل نہ ہوگی ہاں فاسد الحکم ضرور ہو جائے گی جس کو فسخ کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر مشتری کپڑے وغیرہ پر قبضہ کر لے تو کپڑے کا مالک ہو جائے گا مگر اس وقت کپڑے کی طے شدہ قیمت یعنی شراب یا خنزیر وغیرہ بائع کو نہیں دی جائے گی بلکہ کپڑے کی جو قیمت بازاری ہوگی وہ ادا کی جائے گی لیکن بیع فاسد بھی (اگرچہ مبیع پر قبضہ کے بعد مفید ملک ہو جاتی ہے مگر) گناہ ہے اس لئے بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو فسخ کر دینے کا حق ہوگا۔

وَحَرَّمَ الرِّبٰواؕ اور اللہ نے سود کو حرام کر دیا ربوا کا لغوی معنی ہے "بیشی" اللہ نے فرمایا ہے وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ اور اللہ صدقات (خیرات) کو بڑھاتا ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرض میں دی ہوئی رقم سے زیادہ لینے کو اور خرید و فروخت میں کسی ایک عوض کو دوسرے عوض کے مقابل زیادہ لینے دینے کو حرام کر دیا ہے۔

جمہور علماء کا قول ہے کہ آیت کا حکم مجمل ہے کیونکہ تجارتی نفع تو شرعاً حرام نہیں ہے ایک آیت میں صاف صراحت ہے کہ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ اپنے رب کا فضل (تجارتی نفع) طلب کرنے میں تم پر گناہ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ تجارتی نفع کی کوئی مخصوص شکل حرام ہے (جس کو آیت میں بیان نہیں کیا گیا) اور اس کا علم شارع کی طرف سے ہی ہو سکتا ہے لہٰذا آیت مذکورہ مجمل قرار پائی (اور دوسری جگہ شارع کے بیان سے اس کی توضیح ہوئی ہے) حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت کردہ مندرجہ ذیل حدیث میں جن چھ چیزوں کے تبادلہ میں کمی بیشی کو ممنوع قرار دیا ہے وہ اجمال آیت کا بیان ہو جائے گا۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گیہوں گیہوں کے عوض، جو جو کے عوض، چھوارے چھواروں کے عوض، اور نمک نمک کے عوض برابر برابر دست بدست فروخت کرو اور جب یہ اقسام مختلف ہوں تو جیسا (کمی بیشی کے ساتھ) چاہو فروخت کرو (مگر) دست بدست ۲ (رواہ مسلم) دوسری روایت میں ہے "مت فروخت کرو سونے کو سونے کے عوض، نہ چاندی کو چاندی کے عوض، نہ گیہوں کو گیہوں کے عوض، نہ جو کو جو کے عوض، نہ چھواروں کو چھواروں کے عوض، نہ نمک کو نمک کے عوض مگر برابر برابر نقد بہ نقد دست بدست"۔ ہاں سونا چاندی کے عوض، چاندی سونے کے عوض، گیہوں جو کے عوض، جو گیہوں کے عوض، چھوارے نمک کے عوض، اور نمک چھواروں کے عوض (یعنی اختلاف جنس کے ساتھ) فروخت کرو، دست بدست جس طرح چاہو نمک کم ہو یا چھوارے یا دونوں میں سے کوئی زیادہ (اتحاد جنس کی صورت میں) جو زیادہ دیگا یا زیادہ لیگا وہ سود لیگا دیگا، رواہ الشافعی۔

مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت بھی حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کی طرح نقل کی ہے لیکن اس روایت کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سود دیا لیا اس میں لینے والا اور دینے والا (دونوں) برابر ہیں۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے دوسرے سلسلہ اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر برابر برابر ایک کو دوسرے سے نہ بڑھاؤ اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ بیچو مگر برابر ایک کو دوسرے نہ بڑھاؤ اور غائب کو نقد (حاضر) کے عوض نہ فروخت کرو (رواہ البخاری و مسلم)۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ نہ فروخت کرو سونے کو سونے کے عوض اور نہ چاندی کو چاندی کے عوض مگر برابر وزن کے ساتھ۔ چھ چیزوں میں حرمت ربوا کی احادیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحاح ستہ میں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے (حاکم کی) مستدرک میں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مسلم میں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے دار قطنی میں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ علیہ کی روایت سے صحیحین میں اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایت

marfat.com

سے بزاز میں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیہقی میں مذکور ہیں۔ حدیثِ مذکورہ میں تعداد اشیاء کے پیش نظر اصحاب ظواہر (داؤد ظاہری اور ان کے متبعین) اور ابن عقیل حنبلی کا قول ہے کہ حرمتِ سود صرف انہی چھ چیزوں میں ہے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور طاؤس کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔

جمہور کے نزدیک مذکورہ اشیاء میں تو حرمت منصوص ہی ہے لیکن حکم کی بنا سبب پر ہے لہٰذا جہاں سببِ حرمت موجود ہو گا حکمِ حرمت بھی ہو گا چنانچہ ایک گروہ کے نزدیک محض مالیّت علتِ ربوا۔ اس قول پر تمام اموال میں ربوا حرام ہو گا۔ اکثر علماء کا مسلک ہے کہ ہر جگہ علت ایک نہیں بلکہ سونے چاندی میں علت جدا ہے اور باقی چار چیزوں میں جدا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ چاندی سونے میں ثمنیّت کو علت قرار دیتے ہیں پس سونے چاندی کے علاوہ جو چیزیں بطور ثمن استعمال کی جاتی ہوں ان میں بھی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ حرام ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک وزن علت ہے پس جو چیزیں وزن سے فروخت ہوتی ہوں جیسے لوہا، رانگ، زعفران وغیرہ ان سب میں ربوا حرام ہے۔ باقی چاروں چیزوں میں جنسی اتحاد کے ساتھ دونوں کا پیمانہ اور ناپ سے فروخت ہونا حرمت ربوا کی علت ہے خواہ وہ کھائی جاتی ہوں یا نہ کھائی جاتی ہوں یہ قول امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے دوسری روایت کے اعتبار سے امام احمدؒ کے نزدیک جنسی اتحاد کے ساتھ دونوں کا معلوم ہونا علت ربوا ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جنسیّت اور غذائیّت علت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اولین قول کے مطابق کسی چیز کا مطعوم ہونا اور مکیلی یا موزونی ہونا علت حرمت ہے لہٰذا جو مطعوم (کھائی جانے والی) چیز پیمانے یا وزن سے بکتی ہو اس میں حکم ربوا ثابت ہے لیکن اگر مکیلی یا موزونی نہ ہو جیسے انڈے تو اس میں ربوا حرام نہیں۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا آخری قول یہ ہے کہ جنسی اتحاد کے ساتھ دونوں چیزوں کا مطعوم ہونا علت ربوا ہے لہٰذا تمام کھائی جانے والی چیزوں میں پھل ہوں یا سبزیاں ترکاریاں دوائیں (مٹھائیاں وغیرہ) جنسی اتحاد کی صورت میں ربوا حرام ہے گویا شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اثمان میں ثمنی ہونا اور باقی چیزوں میں خوردنی ہونا علت ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ کے نزدیک خوردنی اشیاء میں قابل غذائیت ہونا علت ہے۔ دونوں قولوں کی دلیل یہ ہے کہ شارع نے ان چیزوں میں برابر برابر ہونے اور دست بدست قبضہ کر لینے کی شرط لگائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع کی نظر میں یہ چیزیں عظمت اور وقعت رکھتی ہے جیسے نکاح کے لئے شہادت کی شرط بتا رہی ہے کہ عورت سے تمتع اندوزی ایک باوقعت چیز ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس حکم کی علت بھی ایسی مستنبط کی جائے جو باوقعت اور عظمت والی ہو اور ظاہر ہے کہ اشیاء کا خوردنی بلکہ غذائی ہونا بہت ہی وقعت رکھتا ہے کیونکہ اس سے بقاء حیات وابستہ ہے اور ثمنیّت میں بھی غیر معمولی اہمیت ہے کیونکہ ثمنیّت سے ہی تمام چیزوں کا حصول ہوتا ہے لہٰذا یہی دونوں چیزیں علت ربواہیں، اتحاد جنسی اور وزن یا پیمانہ سے فروخت ہونے کی اس میں کوئی دخل نہیں اس لئے ان اوصاف کو ہم نے اصل علت نہیں قرار دیا بلکہ شرط خارجی قرار دیا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حکم کا تحقق شرط پر موقوف ہوتا ہے شرط مفقود ہو تو حکم بھی مرتفع ہو جاتا ہے جیسے زناء کی سزا سنگسار کرنا ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ زناء کرنے والا محصن ہو (اگر محصن نہ ہو گا تو اس کو سنگسار نہیں کیا جائے گا)۔

اس کے علاوہ حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ مرفوع حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ خوردنی ہونا علت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا طعام طعام کے عوض برابر برابر فروخت کرو، رواہ مسلم۔

دیکھو (طعام مشتق ہے طعم سے اور) مشتق پر حکم کا نفاذ لالت کرتا ہے اس بات پر کہ ماخذ اشتقاق (یعنی مصدر) علت حکم ہے۔ لہٰذا طعام سے طعام کے تبادلہ کی حرمت کی علت دونوں کا مطعوم ہونا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ علت کا مناسب حکم ہونا ضروری ہے، ماخذ اشتقاق بھی مشتق پر حکم مرتب ہونے کی علت اسی وقت ہو گا جب مناسبت رکھتا ہو لیکن یہاں آپ کی بیان کردہ علت غیر مناسب ہے کیونکہ جس چیز سے بقائے حیات وابستہ ہے اور جس کی حاجت بیش از بیش ہے اس میں تو عمومی اجازت ہونی چاہئے (شرائط اور قیود سے) تنگی نہ ہونی چاہئے جیسے پانی گھاس (وغیرہ) کی حلت عمومی اور مطلق ہے اس کے علاوہ یہ کہ طعام

marfat.com

مشتق ہی نہیں ہے (ہر وہ چیز جس میں طعم ہو طعام نہیں ہوتی) بلکہ گندم اور جو جیسی چند اجناس کو طعام کہتے ہیں، مخاطب لفظ طعام سے انہی چیزوں کو سمجھتا ہے۔ عرب باوجود یہ کہ چھواروں اور کھجوروں کے زیادہ ضرورت مند تھے اور زیادہ تر ان کی خوراک انہی سے ہوتی تھی لیکن لفظ طعام سے وہ چھوارے نہیں سمجھتے تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اتحاد جنسی اور مکیلی یا موزونی ہونا علت حرمت ہے اس قول کی دلیل یہ ہے کہ حرمت سود کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کا مال تلف ہونے سے محفوظ رہے۔ اس حفاظت کے لئے ہی ناپ تول کی وضع ہوئی ہے اور ناپ تول میں عدل رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے فرمایا، وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ۔ دوسری جگہ فرمایا، وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔ رسول اللہ ﷺ نے بیشی کو حرام قرار دیا اور برابر برابر لین دین کو واجب کیا اور مساوات کی شناخت صرف پیمانہ کی ناپ یا تول سے ہوتی ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ کیل اور وزن کو ہی علت قرار دیا جائے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی کا اعتبار کیا ہے اور فرمایا ہے جو موزون ہو اس کو برابر برابر جبکہ وہ ایک نوع کی ہو اور جو مکیل ہو اس کا بھی اسی طرح تبادلہ کرو اور جب نوعیں الگ الگ ہوں تو کمی بیشی میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبادہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث دار قطنی نے بیان کی ہے حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سوادؓ بن عزیہ کو خیبر کا امیر بنا کر بھیجا سواد نے وہاں کے عمدہ چھوارے خدمت مبارک میں پیش کئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا خیبر کے سب چھوارے ایسے ہی ہوتے ہیں سواد نے عرض کیا جی نہیں حضور (ﷺ) ہم گڈے کے مخلوط کے دو صاع دے کر ایک صاع اور تین صاع دے کر دو صاع خرید لیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو بلکہ اس کو قیمت سے بیچ دیا کرو پھر اس قیمت سے یہ خرید لیا کرو، یہی حکم ترازو کا یعنی ان چیزوں کا ہے جو تولی جاتی ہیں۔ (رواہ دار قطنی)۔

میری رائے میں آیت (ربوا مجمل نہیں ہے کیونکہ مجمل وہی ہوتا ہے جس کے معنی دماغی کاوش اور غور کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکیں بلکہ صرف شارع کے بیان سے ہی معلوم ہوں لیکن آیت (ربوا ایسی نہیں ہے وہاں اس میں ایک طرح کا اشکال ضرور ہے جو غور کرنے سے حل ہو جاتا ہے توضیح مقصد یہ ہے کہ (ربوا کا لغوی معنی ہے زیادتی جس کے مقابلہ میں کمی اور نقصان کا لفظ آتا ہے مساوات اور برابری سے بیشی ہو جانا اور بڑھ جانا۔ مثلیت کا یہی مفہوم دوسری آیت میں بھی مراد ہے اللہ نے فرمایا فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ یعنی جتنی زیادہ اس نے تم پر کی ہو اور اتنی ہی تم اس پر کرو گویا عدوان کا بدلہ برابر اور مساوی واجب ہے، بیع اور قرض میں بھی یہی مساوات اور برابری واجب ہے۔ اب جو چیزیں مکیلی یا موزونی ہیں یعنی پیمانوں سے ناپ کر یا وزن کر کے لی جاتی ہیں ان میں تعدی کا ضمان تعدی کے برابر ہوگا اور یہ برابری ظاہری بھی ہو گی اور معنوی بھی یعنی ویسی ہی جنس اتنی ہی مقدار میں دینی ہو گی لیکن جو چیزیں مثلی نہیں ہیں بلکہ قیمت سے ان کا لین دین ہوتا ہے ان میں ظاہری مثلیت تو ممکن ہی نہیں صرف معنوی برابری ملحوظ ہو گی اور ایسی چیزوں میں عدوان کے عوض ان کی قیمت دی جائے گی قیمت سے مراد ہے وہ قیمت جو بازار کے بصیرت رکھنے والے لوگ اس چیز کی قرار دیتے ہوں اور چونکہ زمانہ کے اختلاف اور خواہش مندوں کی کمی بیشی سے قیمت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لئے قیمت والی چیزوں میں نقصان کرنے کا بدلہ بھی کم و بیش ہوتا رہتا ہے، یہ تو ضرر مالی کے تاوان کی صورت تھی۔ رہے اشیاء کے تبادلے تو مثلی چیزوں کے باہمی تبادلہ میں اتحاد جنسی کی صورت میں مقداری برابری ہونا لازم ہے اور اختلاف جنسی کی صورت میں صرف معنوی برابری ہونا کافی ہے خواہ دونوں چیزیں مثلیات میں سے ہوں یا نہ ہوں یا ایک مثلی ہو اور دوسری غیر مثلی کیونکہ اختلاف جنسی ہونے کی وجہ سے ظاہری برابری ممکن ہی نہیں ہے۔

ضرر مالی کے تاوان اور تبادلہ اشیاء (بیع وغیرہ) دونوں کا حکم اس صورت میں ایک ہی ہے دونوں میں معنوی مساوات کافی ہے فرق یہ ہے کہ ضرر کے تاوان کی مثلیت کا فیصلہ اہل بصیرت اور اقدار مالی کے ماہروں کے سپرد کیا جائے گا کیونکہ مالک نے

marfat.com

اپنے مال کی کوئی قیمت پہلے سے مقرر نہیں کی اور تبادلہ اشیاء کی صورت میں فریقین اپنے اپنے مال کی قیمت کی تعین پہلے ہی کر چکتے ہیں اور ایک چیز کو دوسری کے مثل قرار دے چکتے ہیں لہٰذا ان کا باہمی فیصلہ مثلی اقدار معلوم کرنے کے لئے کافی ہوگا اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب جنس مختلف ہو تو جس طرح (کمی بیشی کے ساتھ) چاہو فروخت کرو اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ مکیلی اور موزونی چیزیں اگر متحد الجنس ہوں تو ان کی باہمی خرید و فروخت مساوات مقداری کے ساتھ ہونی چاہئے کمی بیشی ناجائز ہے (ربوا حرام ہے نیز ایک طرف سے فوری قبضہ اور دوسری طرف سے ادھار بھی درست نہیں طرفین کا دست بدست قبضہ ہونا چاہئے کیونکہ فوری قبضہ اور عدم قبضہ سے اشیاء کی اقدار مالیت میں فرق آجاتا ہے نقد کی مالی قدر اور ادھار سے زائد ہوتی ہے اس لئے اگر ایک طرف سے فوری قبضہ اور دوسری طرف سے ایک مدت کے بعد قبضہ کا وعدہ ہوگا تو سود کی شکل پیدا ہو جائے گی اور مساوات باقی نہیں رہے گی، یہ بھی درست نہیں کہ فوری ادا نہ کرنے والا تاخیر ادا کے عوض مقدار مال میں کچھ بیشی کر دے اور اس طرح فوری لینا اور تاخیر سے اس کا معاوضہ دینا باہم برابر ہو جائیں کیونکہ تاخیر ادا کے عوض مقدار مالی کی بیشی کوئی معنی نہیں رکھتی تاخیر ادا ایک وصف (یعنی عرض) ہے اور مالی بیشی نفس شئ کی بیشی ہوتی ہے تاخیر ادا کا مقابلہ نفس شئے کی بیشی سے کس طرح کیا جا سکتا ہے دس درہم نقد لے کر گیارہ درہم ادا کرنے کا وعدہ کرنا اور ایک زائد درہم کو مدت ادا کی تاخیر کا عوض قرار دینا دس کو گیارہ کے مساوی نہیں بنا سکتا شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے، اس طرح کھری چیز کے عوض بری چیز زیادہ دینا اور اول الذکر چیز کے کھرے پن کا عوض بری چیز کی بیشی کو قرار دینا بھی درست نہیں، مقدار زائد زائد ہی رہے گی، کم مقدار والی کھری چیز کا وزن کھرے پن سے نہیں بڑھ پاتا اور نہ بری چیز اپنی بیشی کی وجہ سے کھری بن سکتی ہے۔ حضرت سواد بن عربہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں براویت حضرت ابو سعید و حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما جو حدیث ہم نقل کر چکے ہیں اس میں اس کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

لیکن اگر ناپ تول میں دونوں چیزیں برابر ہوں لیکن ایک کھری ہو اور دوسری خراب تو کیا ایک کا کھرا پن سود پیدا کر دیتا ہے۔ جمہور کا قول ہے یہ ہے کہ کھرے پن کا کوئی اعتبار نہیں مقدار کی مساوات میں کسی ایک چیز کے کھرے پن سے کوئی فرق نہیں آتا اس لئے وصف جودت موجب ربوا نہیں۔

صاحب ہدایہ نے اس قول کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ کھری اور بری (اجناس) برابر ہیں، اگر یہ حدیث صحیح ہے تو یقیناً کافی دلیل ہے لیکن اگر حدیث کی صحت ثابت نہ بھی ہو تب بھی ہم کہیں گے کہ اوصاف کا صحیح اندازہ اور اقدار وصفی کی حدود کی تعیین ممکن نہیں اس لئے وصف جودت ورداءت ناقابل اعتبار ہے، ابن ہمام نے لکھا ہے کہ اگر وصف کے تفاوت کو موجب (ربوا قرار دیا جائے گا تو بیع و شراء کا دروازہ بند ہو جائے گا میں کہتا ہوں کہ دروازہ تو بند نہیں ہوگا کیونکہ ردی چیز کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے کھری چیز خریدی جا سکتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے (سواد بن عربہ کو) حکم دیا تھا البتہ قرض کا دروازہ بند ہو جائے گا اللہ نے فرمایا ہے وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ یعنی اگر تم میں سے کسی کا کوئی حق قرض وغیرہ ہو تو وہ کھری چیز کے عوض ردی چیز نہیں لیتا مگر چشم پوشی اور اغماض کرے تو خیر، اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرض میں جنس کے کھرے برے ہونے کا لحاظ ضروری نہیں (کھرے کے عوض برا بھی اغماض کی صورت میں لیا جا سکتا ہے) لیکن اگر حق دار اپنے کھرے قرض کے عوض ردی چیز لینے سے انکار کر دے تو اس کو اس کا حق ہے۔

مسئلہ :- کھجوروں کی چھواروں کے عوض اور کشمش کی انگوروں کے عوض بیع بظاہر کسی طرح درست نہ ہونی چاہئے نہ برابر برابر نہ کمی بیشی کے ساتھ۔ جمہور کا یہی قول ہے، اسی طرح تر اور خشک گندم کا تبادلہ یا خشک اور ابالے ہوئے یا بھونے ہوئے گیہوں کا باہم معاوضہ صحیح نہ ہونا چاہئے۔ کشمش کی انگوروں کے عوض بیع کے متعلق امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول (مثبت اور منفی) روایت میں آئے ہیں اور کھجوروں کی چھواروں کے عوض بیع کو امام جائز کہتے ہیں۔

جمہور کے قول کی دلیل حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے

marfat.com

کھجوروں کے عوض بیع کے متعلق دریافت کیا گیا حضور ﷺ نے فرمایا کیا (کھجوریں خشک ہونے کے بعد کم ہو جاتی ہیں عرض کیا گیا جی ہاں فرمایا تو اس وقت (جائز) نہیں، دوسری روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے اس کی ممانعت فرما دی۔ رواہ الشافعی واحمد وابن خزیمۃ وابن حبان والحاکم والدار قطنی والبزار والبیہقی واصحاب السنن، من حدیث زید ابی عیاش، صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ علماء روایت نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کسی روایت میں ثابت نہیں کہ کسی نے اس کو ضعیف کہا ہو، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ابو حنیفہ نے کہا زید ابو عیاش مجہول ہے اگر ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زید ابو عیاش کو نہیں جانتے تھے تو نہ جانیں علماء حدیث کے نزدیک تو زید مجہول نہیں، ابن حجرؒ نے کہا کہ زید کی روایت ترمذی نے ذکر کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور مسلم نے کتاب الکنی میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ زید نے حضرت سعد اور حضرت عبداللہ بن یزید کی روایت بیان کی ہے ابن خزیمہ نے عدول کی روایات کے سلسلہ میں زید کی روایت کو نقل کیا ہے، دار قطنی نے زید کو ثقہ (معتبر) کہا ہے حاصل یہ کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھجور کی رطوبت کا شمار کھجور کے اصلی اجزاء میں نہیں ہے اور اصلی اجزاء میں مساوات معتبر ہے لیکن یہ پتہ نہیں کہ کھجور کے اندر اجزاء اصلیہ کتنے ہیں اور رطوبت کتنی ہے اس لئے چھواروں کے عوض نہ برابر برابر اس کی بیع درست ہے نہ کمی بیشی کے ساتھ۔

حنفیہؒ کہتے ہیں کہ کھجوریں چھواروں کی جنس سے اگر ہوں گی تو برابری کے ساتھ ان کی بیع درست ہو گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ (اتحاد جنسی کی صورت میں) برابر برابر فروخت کرو اور اگر دونوں کی جنس الگ الگ مانی جائے تو تب بھی بیع درست ہو گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ (اختلاف جنس کی صورت میں) جس طرح چاہو فروخت کرو۔

ہم (جمہور کی طرف سے) اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ کھجوریں اور چھوارے ہم جنس ہیں لیکن کھجوروں میں رطوبت ہوتی ہے اور اس کے اجزاء میں کھوکھلا پن ہوتا ہے اس لئے پیمانہ کی برابری کے باوجود ناپ سے کھجوروں کا چھواروں کے برابر ہونا معلوم نہیں ہو سکتا ایسا ناپ تخمین اور اندازہ کی طرح ہوتا ہے (اور دو ہم جنس چیزوں کا اندازہ سے تبادلہ درست نہیں)

جو چیزیں عددی ہیں اور مقدار کا تفاوت ان میں کم ہوتا ہے جیسے اخروٹ اور ایک ہی نوع کے جانور کے انڈے ان کا بھی (بصورت اتحاد جنس) شمار سے تبادلہ ناجائز ہونا چاہئے ظاہر حکم یہی ہے کیونکہ اجزاء کی کمی بیشی کا احتمال باقی ہے (خواہ عددی کمی بیشی نہ ہو) ہاں وزن سے ان کا تبادلہ درست ہونا چاہئے کیونکہ دو چیزوں میں مساوات قائم کرنے کے لئے شریعت نے وزن کا اعتبار کیا ہے۔ وزن سے ہی اس میں مساوات ہو سکتی ہے اگرچہ وزن سے ان کی خرید و فروخت نہ ہوتی ہو، ہاں اگر انڈے دو مختلف النوع جانوروں کے ہوں تو ان کو مختلف الجنس قرار دیا جائے گا اور ان کا تبادلہ شمار سے ہو سکتا ہے۔

مسئلہ :- گندم جو کے عوض کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا اور خریدنا جائز ہے آپس کی رضامندی سے مقرر کردہ ہر مقدار دوسری جنس کی مقرر کردہ مقدار کے مقابل مان لی جائے گی لیکن طرفین کا قبضہ فوراً ہو جانا چاہئے کسی چیز کو کچھ مدت کے بعد دینے کا وعدہ کرنے سے اس چیز کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور نقد ادا کی ہوئی جنس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ اقدار کی یہ کمی بیشی سود ہے۔ اب اگر ایک جنس کی نقدیت کے مقابل دوسری جنس کی مقدار بڑھا دی جائے گی تو وصف نقدیت کے عوض بعض اجزاء مقداری ہو جائیں گے اور یہ درست نہیں۔

مسئلہ :- اگر لوہے وغیرہ کے عوض گیہوں فروخت کئے جائیں تو (چونکہ لوہا وزنی ہے اور گیہوں مکیلی اس لئے) کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ قیاساً درست ہے لیکن قبضہ دونوں چیزوں پر دست بدست ہونا چاہئے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے جب دونوں کی جنسیں الگ الگ ہوں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ دست بدست ہو، یہ فرمان عام ہے۔

مسئلہ :- اگر کسی جانور کا تبادلہ مکیلی یا موزونی چیز سے کیا جائے تو جانور مبیع اور اس کے مقابل والی جنس ثمن قرار پائے گی اور ثمن کا فی الفور موجود ہونا ضروری نہیں بلکہ مدت معین کے اندر قیمت ادا کرنے کا وعدہ باجماع علماء کافی ہے از روئے قیاس

marfat.com

یہ بیع ناجائز ہونی چاہئے لیکن نص اور اجماع کا فیصلہ تو قیاس کے خلاف ہو چکا ہے اس لئے قیاس واجب الترک ہے۔
مسئلہ :- اگر کسی جانور کا تبادلہ دوسرے ہم جنس یا غیر جنس کے جانور سے کیا جائے تو بالاجماع کمی بیشی جائز ہے، لیکن کیا قبضہ طرفین کا دست بدست ہونا چاہئے یا کسی طرف تاخیر قبضہ جائز ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تاخیر قبضہ بہر صورت ناجائز ہے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بہر طور جواز کے قائل ہیں امام مالکؒ کا قول ہے کہ اگر تبادلہ ہم جنس کا ہو تو تاخیر قبضہ کمی بیشی کی صورت میں ناجائز ہے اور بغیر کمی بیشی کے جائز ہے اور اگر تبادلہ غیر جنس کا ہو تو تاخیر قبضہ بہر صورت جائز ہے۔ مطلق جواز کے قائل اپنے استدلال میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا عبداللہ بن عمرو نے عرض کیا میرے پاس تو کوئی سواری نہیں ہے، حضور ﷺ نے حکم دیا کہ تحصیل دار زکوٰۃ کی واپسی تک قیمت ادا کرنے کے وعدہ پر کوئی سواری خرید لو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے دو اونٹ دینے کے وعدہ پر ایک اونٹ خرید لیا۔ یہ حدیث آیت اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ الخ کی تفسیر میں بسلسلہ بیع سلم ہم ذکر کریں گے۔
امام اعظمؒ کے قول کی دو دلیلیں ہیں ایک قیاسی دوسری نقلی، ۱۔ جانور میں یہ صلاحیت نہیں کہ نقد کی طرح ثمن بن سکے اور ثمن کی طرح اس کی ادائیگی بذمۂ مشتری واجب ہو جائے (یہاں تک کہ تعیین کے بعد بھی اس کی تعیین نہ ہو) کیونکہ یہ نہ کیلی اور وزنی چیز ہے کہ اس کی مقدار معلوم ہو سکے، نہ بیان سے اس کے اوصاف معلوم ہو سکتے ہیں جنس نوع اور وصف کے اظہار سے اس کی معین حد بندی نہیں ہو سکتی حد بندی اور تعیین وصفی نہ ہونے کی وجہ سے ہی اس میں بیع سلم جائز نہیں ہے۔
۲۔ امام احمد، ترمذی، نسائی، دارمی، ابن ماجہ اور ابو داؤد نے حضرت سمرۃ بن جندب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کے تبادلہ کی بصورت تاخیر قبضہ (خواہ ایک طرف سے تاخیر قبضہ ہو یا دونوں طرف سے) ممانعت فرمائی ہے، دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے، ترمذی اور امام احمد نے بسلسلۂ حجاج بن ارطاۃ از ابو الزبیر بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو جانوروں کو ایک کے عوض بیچنا خریدنا بصورت تاخیر قبضہ درست نہیں (لیکن) اگر دست بدست ہو تو کوئی حرج نہیں، ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔
ابن جوزی نے حضرت سمرۃ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت کردہ حدیثیں ذکر کی ہیں اور ان کی اسناد میں کوئی خرابی نہیں بیان کی، مثبتین جواز کی پیش کردہ حدیث سے ان احادیث کا تعارض ہو رہا ہے تو ایک اونٹ کی دو اونٹوں کی بیع والی حدیث پر ان احادیث کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ احتیاطاً حرمت والی حدیث حلت والی حدیث پر راجح ہوتی ہے اس کے علاوہ یہ کہ ہماری بیان کردہ احادیث قیاس کے موافق ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ والی حدیث مخالف قیاس ہے نیز اس حدیث کو راجح قرار دینے کی صورت میں نسخ کی تکرار لازم آئے گی۔
مسئلہ :- اگر تقاضائے بیع کے خلاف کچھ شرطیں بیع کے وقت لگادی جائیں اور بائع یا مشتری کا ان شرطوں میں فائدہ ہو تو ایسی بیع فاسد ہے اور حکم ربوا میں داخل ہے۔ امام اعظم اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی قول ہے لیکن ابن ابی لیلیٰ نخعی اور حسن کے نزدیک بیع ہو جائے گی۔ شرط فاسد مانی جائے گی (اس کو لغو قرار دیا جائے گا) ابن شبرمہ اور امام احمد کے نزدیک بیع اور شرط دونوں جائز ہیں۔ امام مالک نے فرمایا اگر شرط میں بائع کا کسی قدر نفع ہو تو درست ہے باقی مشروط درست نہیں۔
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ ربوا میں مدت تاخیر قبضہ اور چیز کا کھرا ہونا ناقابل اعتبار ہے ان اوصاف کے مقابل اصل بدل کے اجزاء میں اضافہ کرنا ربوا ہے جو مثلی چیزیں ہوں اور متحد الجنس ہوں ان میں مقدار کی برابری ضروری ہے اور غیر جنس ہو تو جو قیمت بطور بدل تجویز کر لی گئی ہو اس پر فی الفور قبضہ لازم ہے پس کسی قسم کی شرط جس میں فریقین میں سے کسی کا فائدہ ہو وہ بھی وصف جودت اور تاخیر قبضہ کی طرح ہے بلکہ جو شرط تقاضائے عقد کے خلاف ہو اور اس

marfat.com

میں مبیع کا فائدہ ہو اور مبیع فائدہ اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ ایسی شرط خود بھی فاسد ہے اور عقد کو بھی فاسد کر دیتی ہے جیسے کسی باندی، غلام کو اس شرط پر فروخت کرنا کہ مشتری خریدنے کے بعد اس کو آزاد کر دے گا یا باندی کو ام ولد بنا لے گا۔ ابن حزم نے محلی میں، طبرانی نے اوسط میں، حاکم نے علوم حدیث میں نیز خطابی نے بروایت محمد بن سلیمان ذہلی عبدالوارث بن سعید کا قول نقل کیا ہے ابن سعید نے کہا میں مکہ پہنچا تو وہاں ابوحنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ سے ملا، میں نے ابوحنیفہ سے پوچھا کہ کسی نے اگر بیع میں شرط فاسد لگائی ہو تو کیا حکم ہے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی باطل۔ پھر میں نے جا کر ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے پھر ابن شبرمہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا بیع درست ہے اور شرط بھی درست ہے۔ میں نے کہ سبحان اللہ عراق کے تین فقیہ ایک ہی مسئلہ میں اتنے مختلف ہیں۔ آخر ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر میں نے ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ کی رائے بیان کی تو انہوں نے فرمایا مجھے نہیں معلوم وہ دونوں ایسا کیوں کہتے ہیں مجھ سے تو عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کی روایت اور اپنے دادا کی وساطت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شرط (فاسد) والی بیع کی ممانعت فرمائی ہے بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی باطل۔

اس کے بعد میں ابن ابی لیلیٰ کے پاس گیا اور ان سے دونوں کی رائے بیان کی، ابن ابی لیلیٰ نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم کہ وہ دونوں ایسا کیوں کہتے ہیں، مجھ سے تو ہشام بن عروہ نے اپنے باپ کی وساطت سے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ بریرہ کو (اس شرط پر کہ حق ولاء اس کے مالکوں کا ہوگا) خرید لوں اور آزاد کر دوں (اور شرط کے باوجود حق ولاء بائع کا نہ ہوگا) پس بیع جائز ہے اور شرط باطل، پھر ابن شبرمہ سے جا کر میں نے واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا میں نہیں جانتا کہ وہ دونوں ایسا کیوں کہتے ہیں مجھ سے تو مسعر نے بروایت محارب بن دثار حضرت جابر کا قول نقل کیا تھا حضرت جابر کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ ایک اونٹنی فروخت کی تھی اور شرط کر لی تھی کہ اس پر سوار ہو کر مدینہ تک جاؤں گا لہٰذا بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

سوال

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ حدیث عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ہے، اکثر علماء کے نزدیک یہ مرسل ہے اور اس کے مقابل دونوں حدیثیں مسند ہیں اور مسند مرسل کے مقابل راجح اور اقوی ہے۔

جواب

ایسی حدیث کو اس وقت مرسل کہا جاتا ہے جب جدہ کی ضمیر کا مرجع صراحۃً کسی روایت میں مذکور نہ ہو لیکن ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی نقل کردہ اسناد میں عن جدہ عبداللہ بن عمرو بن العاص صراحۃً مذکور ہے اور اس اسناد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حلال نہیں ہے بیع کے ساتھ سلف (قرض) اور نہ بیع کے اندر دو شرطیں اور نہ ذمہ داری میں آئے بغیر کسی چیز کا نفع اور نہ اس چیز کی فروخت جو قبضہ میں نہ ہو، ترمذی نے لکھا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت حکیم بن حزام کی روایت سے بیان کی ہے اور طبرانی نے بوساطت محمد بن سیرین حضرت حکیم کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع کے اندر چار باتوں سے مجھے منع فرمادیا۔ بیع کے اندر سلف، بیع کے اندر دو شرطیں، جو چیز قبضہ میں نہ ہو اس کی بیع، جو چیز ذمہ داری میں نہ آئی ہو اس کا نفع، (انتہی)، بیع کے اندر سلف ہونے کا معنی یہ ہے کہ بائع مشتری کے ہاتھ کوئی چیز اس شرط کے ساتھ فروخت کرے کہ مشتری بائع کو کچھ روپیہ قرض دے دے یہ منفعت احد المتعاقدین (بائع اور مشتری میں سے کسی ایک کی منفعت) کی ایک خاص صورت ہے۔

ابن ابی لیلیٰ نے جو حدیث نقل کی ہے وہ صحیحین میں اس طرح مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا بریرہؓ نے مجھ سے آکر کہا کہ میں نے اپنے مالکوں سے نو اوقیہ ادائیگی پر عقد کتابت کیا ہے سالانہ ایک اوقیہ دینا ہوگا۔ آپ اس روپیہ کی ادائیگی میں

marfat.com

میری مدد کیجئے میں نے کہا اگر تیرے مالک پسند کریں تو میں یکدم کل روپیہ گن دوں گی اور تجھے آزاد کردوں گی لیکن حق ولاء میرا ہوگا۔ بریرہؓ نے جاکر اپنے گھر والوں سے یہ بات کہی انہوں نے اس شرط پر مکاتب کرنے سے انکار کردیا اور حق ولاء کے بغیر راضی نہ ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تم بریرہؓ کو (اس کے مالکوں کی شرط پر) لے کر آزاد کردو۔ اس کے بعد لوگوں کے مجمع میں کھڑے ہوکر (خطبہ دیا اور) حمد و ثناء کے بعد فرمایا لوگ ایسی شرطیں کیوں لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہیں اگر کوئی ایسی شرط ہو جو کتاب اللہ میں نہیں ہے تو وہ باطل ہے خواہ سو (بار) شرط (کردی گئی) ہو۔ اللہ کا حکم (ہر حکم سے زیادہ واجب کا) مستحق ہے اور اللہ کی قائم کی ہوئی شرط سب سے زیادہ محکم ہے۔ ولاء صرف آزاد کرنے والے کا حق ہے۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی کہ بریرہؓ کے آقا اس شرط کے بغیر اس کو نہیں فروخت کررہے ہیں کہ حق ولاء ان ہی کے لئے رہے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم خرید لو اور انہی کے لئے شرط ولاء مان لو، ولاء تو صرف اسی کا ہے جو آزاد کرے۔ بخاری و مسلم

رافعیؒ نے کہا شرط مان لو کے لفظ کی روایت صرف ہشام نے کی ہے اور کسی راوی نے یہ لفظ نہیں بیان کیا ہے ابن حجر کا بیان ہے کہ بعض اقوال میں آیا ہے کہ یہ لفظ عبدالرحمٰن بن ایمن کی روایت میں بھی آیا ہے، عبدالرحمٰن کی روایت از زہری از عروہ ہے۔ حضرت جابر والی حدیث شیخین (بخاری و مسلم) نے اس تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک جہاد میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب مجھے جانا ہوا میں تھا تو اونٹ پر مگر میرا اونٹ کچھ کمزور ہوگیا تھا اس لئے (تیز) چل نہ سکتا تھا رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا تیرے اونٹ کو کیا ہوگیا۔ میں نے عرض کیا کچھ کمزور ہوگیا ہے حضور ﷺ نے اونٹ کے پیچھے جاکر ڈانٹا اور اس کے لئے دعا فرمائی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا اونٹ سب اونٹوں سے آگے چلنے لگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اب تمہارے اونٹ کا کیا حال ہے میں نے عرض کیا بہتر ہے آپ کی برکت کا اثر ہے۔ فرمایا کیا ایک اوقیہ قیمت پر تم میرے ہاتھ اس کو بیچتے ہو میں نے (حضور ﷺ کے ہاتھ) اس شرط پر بیچ ڈالا کہ مدینہ تک مجھے اس پر سوار ہوکر پہنچنے کا حق رہے گا چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ پہنچ گئے تو میں اونٹ پر سوار خدمت گرامی میں پہنچا، حضور ﷺ نے مجھے قیمت عطا فرمادی اور اونٹ بھی مجھے واپس کردیا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میرے ہاتھ اس کو ایک اوقیہ میں فروخت کردو میں نے فروخت کردیا لیکن گھر تک اس پر سوار ہوکر پہنچنے کی شرط لگالی۔ بخاری و مسلم۔ بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس کو اس کا قرض چکادو اور زیادہ بھی دے دو چنانچہ حضرت بلالؓ نے ایک قیراط زیادہ دے دیا، ابن جوزی نے اسی حدیث سے بیع مع شرط کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ ابن جوزی کی ایک دلیل وہ حدیث بھی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جبکہ وہ حق کے مطابق ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے الفاظ یہ ہیں مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جو شرطیں حق کے موافق ہوں، احادیث مذکورہ بالا میں چونکہ تعارض ہے اس لئے غور کرکے توافق پیدا کرنے کی کوشش لازم ہے تاکہ اصل مقصد واضح ہوجائے۔

پہلی حدیث ہے ماكان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل وان كان مأة شرط۔ دوسری حدیث ہے المسلمون على شروطهم ماوافق الحق من ذلك۔ حقیقت میں ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہی نہیں ہے۔ دونوں حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بیع میں کچھ شرطیں باطل ہیں اور کچھ صحیح ہیں۔ اختیار رد کی شرط باجماع علماء درست ہے اور ولاء کو بائع کے لئے مشروط کرنا اجماعاً باطل ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث میں جو بیع مع شرط کی ممانعت آئی ہے اس میں ہر شرط عموماً مراد نہیں ہے بلکہ بعض مخصوص قسم کی شرطیں مراد ہیں۔ لہٰذا شرطوں کی توضیح ضروری ہے کچھ شرطیں ایسی ہوتی ہیں جو خود ہی باطل قرار پاتی ہیں، بیع ان کی وجہ سے باطل نہیں ہوتی۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کی شرط اسی نوع کی تھی۔ کچھ شرطیں ایسی ہوتی ہیں جن سے بیع فاسد ہوجاتی ہے، حضرت سمرہ والی

marfat.com

حدیث میں ایسی ہی شرط مراد ہے۔ کچھ شرطیں ایسی ہوتی ہیں جو خود صحیح ہوتی ہیں اور ان کا مشروط بھی صحیح ہوتا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث میں جس شرط کا ذکر ہے وہ اسی نوع کی ہے۔

جو شرط خود لغو قرار پاتی ہے اور اس سے بیع فاسد نہیں ہوتی اس کی ایک صورت وہ ہوتی ہے کہ مشروط علیہ کے لئے اس شرط کی پابندی ممکن ہی نہ ہو۔ جیسے بیع کے وقت یہ شرط کرلی جائے کہ مشتری اگر غلام کو خریدنے کے بعد آزاد بھی کردے گا تو آزادی واقع نہ ہوگی یا حق ولاء بائع کا ہوگا۔ اس طرح کی اگر سو شرطیں بھی لگادی جائیں تو نا قابل اعتبار اور ہیچ ہیں۔ ایسی شرطوں سے بیع فاسد نہیں ہوتی، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا قصہ اس کا شاہد ہے۔

شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس قصہ میں شرط عتق کی صراحت نہیں ہے بلکہ بائع کے لئے ولاء کی شرط کی صراحت ہے۔ اسی نوع میں اس شرط کا بھی شمار ہے جو تقاضائے عقد کے خلاف ہے اور بائع مشتری میں سے کسی کا کوئی خاص فائدہ بھی اس میں نہیں کہ حکم ربوا میں اس کو داخل کردیا جائے ایسی شرط ہیچ ہے، اس کی وجہ سے بیع فاسد نہیں ہوتی جیسے بائع کوئی کپڑا اس شرط کے ساتھ فروخت کرے کہ مشتری عید کے موقع پر اس کو استعمال کرے یا کوئی گھوڑا اس شرط پر فروخت کرے کہ مشتری اس کو دانہ گھاس خوب کھلائے گا۔ یہ شرطیں لغو ہیں بیع کی صحت پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دوسری حدیث جو حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جس میں شرط نا قابل اعتبار نہیں ہوتی بلکہ اس کو پورا کرنا لازم ہوتا ہے اس شرط کے ذیل میں مندرجہ ذیل صورتیں آتی ہیں مثلاً کسی نے ایسی شرط لگائی جو تقاضائے عقد میں پہلے سے داخل تھی مثلاً بائع شرط کرلے کہ جب تک میرا قبضہ ثمن پر نہ ہو جائے گا۔ میں مبیع پر قبضہ رکھوں گا۔ ایسی شرط میں کوئی خرابی نہیں یہ تو تقاضائے عقد کی مؤکد ہے۔ یا مثلاً ایسی شرط جس کا اختیار شرعاً ثابت ہے اور اس کی تردید ممکن نہیں جیسے بیع مطلق میں ادائے ثمن کی کوئی میعاد مقرر کرنا یا بیع سلم میں مبیع دینے کا کوئی وقت مقرر کرنا۔ ایسی شرط اگرچہ خلاف قیاس ہے لیکن احادیث میں اس کے جواز کی نص موجود ہے اس لئے جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کے ذیل میں ان شرائط کو بھی شمار کیا ہے جو قرن اول میں موجود تھیں مثلاً اس شرط پر جوتا خریدنا کہ بائع اس میں تسمہ ڈال کردیگا۔

شرائط جائزہ نافذہ میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ بیع کے وقت بائع مشتری سے ادلو قیمت کا کوئی کفیل طلب کرے یا کچھ مال بطور رہن اپنے پاس رکھنے کی شرط کرے یہ بھی تقاضائے عقد کے خلاف نہیں بلکہ مؤکد ہے اس لئے جائز ہے۔ مقتضائے عقد ادائے ثمن ہے اور کفالت یا رہن سے ادائے ثمن کے وعدہ میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اگر کفیل بیع کے وقت موجود ہو اور کفالت کو قبول کرلے یا مال رہن معین ہو اور مشتری کی اجازت سے اس پر بائع کا قبضہ ہو گیا ہو تو بیع اور کفالت اور رہن ہر ایک صحیح ہو جائے گا ورنہ (یعنی اگر کفیل وقت بیع موجود نہ ہو یا کفالت نہ کرے یا مطلوبہ رہن فی الفور مشتری نے بائع کو نہ دیا ہو) اگر مشتری (عقد کے بعد) شرط پوری کردے تو بہتر (بیع صحیح ہو جائے گی) اور ایسا بھی نہ ہو سکے تو مشتری کو ادائے ثمن کا حکم دیا جائے گا۔ ثمن ادا نہ کر سکے گا، تو بائع کو فسخ بیع کا اختیار ہوگا۔

جو شرط بیع کو باطل کردیتی ہے اس کی صورت مندرجہ بالا شرط کے خلاف ہوتی ہے اس میں بائع یا مشتری یا کسی اجنبی یا مبیع کا نفع ہوتا ہے اور مبیع نفع اندوزی کے قابل ہوتا ہے تو اس طرح کی شرط سے بیع فاسد ہو جاتی ہے جیسے گیہوں اس شرط پر فروخت کرنا کہ بائع ہی پیس کردے گا یا اپنے گھر ایک دن یا ایک ماہ یا ایک سال رکھے گا یا کوئی کپڑا اس شرط پر فروخت کرنا کہ بائع ہی اس کو سی کردے گا یا کوئی اونٹ اس شرط پر بیچنا کہ بائع اس پر سوار ہو کر مقررہ مسافت تک جائے گا یا مشتری خریدنے کے بعد مبیع کو کسی مقرر شخص کے ہاتھ فروخت کردے گا ایسی شرائط سے عقد فاسد ہو جاتا ہے اس میں زیادتی بلا معاوضہ ہے جو ربوا ہے۔

اس توضیح کے بعد احادیث میں تعارض باقی نہیں رہا اور آیت ربوا کا مفہوم واضح ہو گیا ہاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی

marfat.com

حدیث ضرور تنقیح طلب رہی (جس میں بائع کے سوار ہو کر مدینہ پہنچنے کی شرط ہے)۔
اس کے جواب میں بعض علماء نے کہا ہے کہ سوار ہو کر جانے کی شرط نفس عقد میں نہ تھی (یعنی بیع کو اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں کیا گیا تھا) بقول ابن ہمام امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔
میں کہتا ہوں کہ بخاری و مسلم کے روایت کردہ الفاظ اس کے خلاف ہیں (الفاظ حدیث صاف بتا رہے ہیں کہ سواری کی شرط سے بیع مشروط تھی) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر بائع یا مشتری کے لئے قلیل نفع والی شرط ہو تو کوئی حرج نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر والی حدیث کو پیش نظر رکھا۔ میں کہتا ہوں آیت ربوا کے مقابل یہ حدیث نہیں آسکتی آیت ربوا پر عمل کرنے سے حدیث پر عمل کرنا اولیٰ نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کو آیت ربوا سے منسوخ قرار دینا ہی اولیٰ ہے کیونکہ آیت ربوا کا شمار سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ پر سب سے آخر میں جو آیت نازل ہوئی وہ آیت ربوا ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی اصول فقہ میں تسلیم شدہ ہے کہ اگر حلت اور حرمت کے احکام میں تعارض ہو تو حرمت کے حکم کو حلت کے حکم پر تقدیم حاصل ہو گی تاکہ احتیاط کا تقاضا پورا ہو جائے اور تکرار نسخ لازم نہ آئے۔ ربوا کا معاملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے اس میں وہ احتیاط ملحوظ رہے گی جو دوسرے امور میں نہیں ہوتی اللہ نے ربوا کی وعید کا پانچ طور پر ذکر کیا ہے۔
(۱) تخبط شیطان کی وعید ہے۔ فرمایا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ۔
(۲) دوامی دوزخ کی وعید ہے فرمایا وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۳) محق (مٹادینے) کی وعید فرمایا یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا (۴) کفر کی وعید فرمایا وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۵) جنگ کی وعید فرمایا فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ سب سے آخر میں آیت ربوا نازل ہوئی حضور ﷺ نے وفات تک اس کی تشریح ہم سے نہیں فرمائی لہٰذا تم سود کو بھی چھوڑ دو اور سود کے شبہ کو بھی۔

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (یعنی رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ سے جس کے پاس سود کی حرمت اور ممانعت کا حکم پہنچ گیا)۔

فَانْتَهٰی (اور وہ سود (کے لین دین) سے باز آگیا رک گیا)۔

فَلَهٗ مَا سَلَفَ (تو حرمت سود سے پہلے جو کچھ وہ لے چکا ہے وہ اسی کا ہے اس سے واپس نہیں لیا جائے گا اور گذشتہ سود خوری اس کو معاف کر دی جائے گی۔

وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ (یعنی آئندہ گناہوں کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا۔ چاہے وہ معاف کر دے چاہے عذاب دے) بعض علماء کے نزدیک اس آیت کا یہ معنی ہے کہ اگر سچی نیت سے وہ سود (کے معاملہ) سے باز رہے گا تو اللہ اس کو جزا دے گا۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ممانعت کے بعد جو شخص باز رہے گا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا۔ وہ چاہے گا تو اس کو ثابت قدم رکھے گا اور نہ چاہے گا تو بے مدد چھوڑ دے گا اور وہ شخص دوبارہ سودی کاروباری کی طرف لوٹ جائے گا۔

وَمَنْ عَادَ (اور جو سود خوری کی طرف دوبارہ لوٹے گا۔ یا ربوا کو بیع کی طرح قرار دینے کی جانب دوبارہ لوٹے گا۔

فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷۵) (تو ایسے لوگ دوزخی ہوں گے، دوزخ میں وہ ہمیشہ رہیں گے) مَنْ عَادَ کی دوسری تفسیر کی بناء پر تو آیت کا مطلب صاف ہے کیونکہ حرام کو حلال قرار دینا کفر ہے اور کفر دوامی دوزخی بنا دیتا ہے۔ لیکن مَنْ عَادَ کی پہلی تفسیر پر یہ تاویل کرنی ہو گی کہ خلود سے مراد ہے مدت طویل تک دوزخ میں رہنا (کیونکہ سود خوری کتنا ہی بڑا گناہ ہو پھر بھی کفر نہیں اور کفر نہیں تو دائمی دوزخ اس کی سزا نہیں ہو سکتی) جس طرح کہ آیت وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا میں خلود سے مراد ہے طویل مدت تک رہنا۔

marfat.com

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا (یعنی اللہ سود کی برکت دور کر دیتا ہے) اور جس مال میں سود داخل ہو جائے اس کو تباہ کر دیتا ہے حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی کا مال سود سے زیادہ ہوگا آخر کار وہ قلت کی طرف جائے گا۔ رواہ ابن ماجۃ وصححہ الحاکم دوسری روایت میں آیا ہے کہ سود کتنا ہی زیادہ ہو جائے اس کا انجام کمی کی جانب ہوگا۔

وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (اور بڑھاتا ہے خیرات کو) یعنی جس مال میں سے خیرات نکالی جاتی ہے اس میں برکت عطا فرماتا ہے اور ثواب چند گنا کر دیتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت اوپر گزر چکی ہے کہ اللہ خیرات کو قبول فرماتا ہے اور اس کو اس طرح بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم اپنے بچھیرے کی پرورش کرتے ہو۔ (متفق علیہ) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا اور معاف کر دینے سے اللہ عزت ہی بڑھاتا ہے اور اللہ کے لئے جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو اور اونچا کرتا ہے۔ رواہ مسلم والترمذی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت میں حسب صراحت امام احمد حدیث مذکورہ کے یہ الفاظ ہیں کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی۔ ایک حدیث ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ روزانہ دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک کہتا ہے الٰہی خیرات کرنے والے کو عوض عنایت فرما۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ اور اللہ محبت نہیں کرتا یعنی نفرت کرتا ہے۔ اللہ قیوم ہے اور قیومیت کا تقاضا ہے کہ اس کو اس عالم سے محبت ہو لیکن محبت نفرت (بغض) میں کسی عارض کی وجہ سے ہی بدل جاتی ہے اور ایسا عارض جو محبت کو نفرت سے بدل دینے کا سبب ہو صرف کفر ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مخلوق اللہ کی عیال ہے جو اللہ کی عیال سے اچھا سلوک کرتا ہے وہی اس کو سب سے پیارا ہوتا ہے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن عبد اللہ۔

كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ ہر اس سخت کافر سے جو حرام کو حلال بنانے پر اڑا رہتا ہے اور گناہوں میں منہمک ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی جو لوگ اللہ پر اور اس کے پیغمبروں پر اور ان تمام کتابوں پر جو اللہ کی طرف سے پیغمبر لے کر آئے ایمان لائے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور انہوں نے نیک کام کئے یعنی پیغمبروں کی زبانی اللہ کے بھیجے ہوئے احکام کی پابندی کی۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ اور نماز ٹھیک پڑھی اور زکوٰۃ ادا کی نماز اور زکوٰۃ کی خصوصی بزرگی کو ظاہر کرنے کے لئے الصّٰلِحٰتِ کے بعد ان کا خصوصی ذکر کیا بدنی عبادتوں کی سردار نماز ہے اور مالی عبادات کی چوٹی زکوٰۃ۔

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ انہی کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا ثواب ہے نہ ان کو آئندہ کا خوف ہوگا نہ گذشتہ کا غم جب کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت ایمان اور اعمال صالحہ حاصل ہو چکی تو پھر گذشتہ زندگی اور مصائب و آلام کا کیا غم۔

ابن مندہؒ اور ابویعلیٰؒ نے مسند میں بحوالہ کلبی بروایت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ ہم تک یہ بات پہنچی تھی کہ اسلام سے پہلے عمرو بن عوف ثقفی کے قبیلہ والے مغیرہ بن عبداللہ بن عمیر بن مخزوم کے خاندان کو سودی قرض دیا کرتے تھے جب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مکہ کی فتح عنایت فرمادی اور آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن تمام سود کو ساقط کر دیا تو بنو عمرو اور بنی مغیرہ حضرت عتاب بن اسید کمشنر مکہ کے پاس آئے اور بنی مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں سے سود ساقط فرمادیا۔ تو یقیناً ہم ہی ایسے بدنصیب نہیں کہ ہم پر سود قائم رہے بنی عمرو بولے ہم سے تو مصالحت اس شرط پر ہوئی ہے کہ ہمارا سود (جو لوگوں پر ہے وہ) قائم رہے گا حضرت عتاب نے یہ واقعہ حضور ﷺ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا تو مندرجہ ذیل دو آیتیں نازل ہوئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا (اے مسلمانو اللہ سے ڈرو اور بقیہ سود چھوڑ دو یعنی شرط کے مطابق تمہارا جو سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہو وہ وصول نہ کرو چھوڑ دو۔

marfat.com

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾ اگر تم دل سے ایمان لائے ہو تو اللہ کے حکم کی تعمیل کرو اللہ کے احکام کی پابندی صدق ایمان کی دلیل ہے۔

ابن جریر رضی اللہ عنہ نے عکرمہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول قبیلہ ثقیف کے چار بھائیوں کے متعلق ہوا مسعود، عبدیالیل، حبیب، ربیعہ، یہ چاروں عمرو بن عمیر کے بیٹے تھے۔ مقاتل نے بھی یہی بیان کیا لیکن بغوی نے سدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید کے حق میں ہوا، یہ دونوں حضرات دور جاہلیت میں قبیلہ ثقیف کے بنی عمرو بن عمیر کو سودی قرض دیا کرتے تھے اور دونوں اس کاروبار میں شریک تھے اسلام آیا تو اس وقت ان کا بڑا سودی روپیہ لوگوں پر تھا انہی کے متعلق اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی چنانچہ حج وداع میں عرفہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمایا خوب سن لو جاہلیت کی ہر چیز میرے پاؤں کے نیچے (پامال ہو چکی) ہے جاہلیت کے خون ساقط کر دیئے گئے (اب ان کا باہمی قصاص نہ ہوگا) اپنے خونوں میں سب سے پہلا خون میں ربیعہ بن حارث کا ساقط کرتا ہوں۔ ربیعہ بنی حارث کے قبیلہ کے شیر خوار تھے بنو ہذیل نے ان کو قتل کر دیا تھا۔ جاہلیت کا سود (بھی) ساقط کر دیا گیا ہے سب سے پہلے میں عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کا سود ساقط کرتا ہوں عباس رضی اللہ عنہ کا سب سود چھوڑ دیا گیا۔

حج وداع میں بروز عرفہ رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ دیا اس کے الفاظ بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح نقل کئے ہیں لیکن اس میں یہ نہیں ذکر کیا کہ آیت مذکورہ کا نزول اس بارہ میں ہوا تھا۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ عکرمہ وعطاء بیان کیا ہے کہ حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم نے کچھ چھوارے بطور سلم خریدے تھے فصل ٹوٹنے کا زمانہ آیا تو چھوارے والے نے کہا اگر آپ لوگ اپنا پورا حق لے لیں گے تو میرے بچوں کی ضرورت کے لئے کچھ نہیں بچے گا اس لئے مناسب ہے کہ آپ آدھا واجب الادا حق اس وقت لے لیجئے اور باقی کے لئے مدت مقرر کر دیجئے میں آپ کو دوگنا کر کے دیدوں گا۔ دونوں حضرات اس تجویز پر راضی ہوگئے جب مدت مقررہ گزری اور وقت ادا آگیا تو (حسب وعدہ) زیادتی کا مطالبہ کیا اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو آپ نے دونوں کو ممانعت فرما دی اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی دونوں بزرگوں نے حکم کی تعمیل کی اور اپنا اصل مال لے لیا (سود چھوڑ دیا)۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا (یعنی اگر تم نے بقیہ سود نہ چھوڑا تو آگاہ ہو جاؤ حمزہ رضی اللہ عنہ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فَاٰذِنُوْا بروزن اٰمِنُوْا پڑھا ہے یعنی دوسروں کو اطلاع دیدو۔ لفظ اِیْذَان اُذُن سے بنا ہے یعنی کانوں میں ڈال دو، سنا دو۔ باقی اہل قرات نے فَاْذَنُوْا پڑھا ہے یعنی جان لو اور یقین کر لو۔

بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے جنگ کا۔ حرب کی تنوین سے جنگ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سود خور سے کہا جائے گا۔ لڑائی کے لئے اپنے ہتھیار لے لے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھواروں کو کھانے کے قابل ہونے سے پہلے خریدنے کی ممانعت فرمائی اور فرمایا جب کسی بستی میں سود کھلم کھلا ہو جاتا ہے تو اس بستی والے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اتار لیتے ہیں۔ رواہ الحاکم وصححہ۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے کہا میں نے حضور ﷺ سے سنا کہ جس قوم میں سود کھلم کھلا ہو جاتا ہے ان کی پکڑ بصورت قحط ہوتی ہے اور جس قوم میں رشوت کھلم کھلا ہو جاتی ہے وہ (دشمنوں کے خوف (کے عذاب) میں پکڑے جاتے ہیں۔ رواہ احمد۔

marfat.com

اہل حقیقت نے بیان کیا ہے کہ اللہ کی طرف سے جنگ دوزخ ہے اور اللہ کے رسول کی طرف سے جنگ تلوار ہے۔ اسی بنیاد پر بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ یہ لفظ چاہتا ہے کہ باغی کی طرح سود خور سے توبہ طلب کی جائے تاکہ وہ امر خداوندی کی طرف لوٹ آئے توبہ نہ کرے تو اس سے جنگ کی جائے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ سود خور کے پاس اگر اپنی حفاظت کی طاقت نہ ہو تو امام پر واجب ہے کہ اس کو قید کر دے اور جب تک توبہ نہ کرے قید رکھے اور اگر اس کے پاس حفاظتی طاقت ہو اور امام اس کو گرفتار نہ کر سکے تو وہ باغی قرار دیا جائے گا اور اس سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرلے۔ یہ ہی حکم ہر تارک فرض کا ہے نماز زکوٰۃ وغیرہ کا تارک اور کبیرہ گناہ کا مرتکب، جب کہ علی الاعلان وہ گناہ پر جما رہے۔ سب کا یہی حکم ہے۔

رزین نے مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی تو عرب اسلام سے پھر گئے اور کہنے لگے ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر یہ لوگ (زکوٰۃ کے) اونٹ کے پاؤں کی رسی دینے سے بھی انکار کریں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا۔ میں نے عرض کیا اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! لوگوں کو ملائے رکھئے اور ان کے ساتھ نرمی کیجئے فرمایا کیا تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے اور اسلام میں آکر کمزور ہوگئے۔ وحی کا سلسلہ بند ہوگیا دین مکمل ہوگیا اب کیا میرے جیتے جی دین میں نقصان آسکتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم میں اس شخص سے ضرور قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرتا ہے۔ زکوٰۃ مالی فریضہ ہے اگر یہ لوگ وہ بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کریں گے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو خدا کی قسم اس بازداشت پر میں ان سے لڑوں گا، حضرت عمرؓ نے فرمایا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہی حق ہے۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (یعنی اگر تم توبہ کرلو گے تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے اصل سے زیادہ لے کر تم (قرض دار پر) ظلم نہیں کرو گے اور نہ ادائیگی میں ٹال مٹول یا اصل مال میں کمی کر کے تم پر ظلم کیا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ادائے اصل میں) غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، متفق علیہ۔

بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے اس آیت سے سمجھا جاتا ہے کہ اگر (سود خوری کو حلال سمجھنے والے) توبہ نہ کریں تو اصل مال بھی ان کا نہ رہے گا کیونکہ حرام کو حلال قرار دینے پر اڑ جانے والا مرتد ہے اور اس کا مال مفت کی غنیمت ہے۔ بیضاویؒ کا یہ قول ہمارے بیان مذکور یعنی شافعیؒ کے قول کے مطابق ہے کیونکہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرتد کا کل مال غنیمتِ مفت ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر مرتد کو قتل کر دیا گیا ہو یا بھاگ کر وہ دار الحرب میں چلا گیا ہو تو اس کی حالتِ اسلام کی کمائی اس کے مسلمان وارثوں کو تقسیم کر دی جائے گی اور حالتِ ارتداد کی کمائی غنیمتِ مفت کے حکم میں ہوگی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کسی حکم کا مفہوم (مخالف) حجت نہیں ہے۔ پھر حالت اسلام کی کمائی جو وارثوں کو تقسیم ہوگی مرتد کی تو بہرحال نہ رہے گی۔ بیت المال میں داخل کی جائے یا وارثوں کو تقسیم کر دی جائے مرتد کے لئے تو دونوں صورتیں برابر ہیں اس کی ملک سے تو اخراج ہو ہی جائے گا)۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بنی عمرو اور دوسرے سود خوروں نے کہا ہم اللہ سے توبہ کرتے ہیں ہم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑنے کی طاقت نہیں چنانچہ سب لوگ صرف اپنا اصل مال لینے پر راضی ہوگئے۔ یہ ابویعلیٰ کی روایت کردہ حدیث کا تتمہ ہے۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کے بعد بنی مغیرہ نے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور فصل توڑنے تک مہلت

marfat.com

کے خواستگار ہوئے مگر قرض خواہوں نے مہلت دینے سے انکار کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ (اور اگر کوئی تنگدست ہو) اس جگہ کَانَ تامہ ہے خبر کی ضرورت نہیں ہے یعنی اگر کوئی تنگدست قرض دار ہو۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کان کی خبر اس جگہ نہیں ذکر کی گئی اگر اسم نکرہ ہو تو خبر کو ذکر نہ کرنا جائز ہے جیسے اس جملہ میں ہے اِنْ كَانَ رَجُلٌ صَالِحٌ فَاَكْرِمْهُ میں کہتا ہوں کہ بغوی کی مراد یہ ہے کہ غَرِيْمًا خبر محذوف ہے اصل عبارت اس طرح تھی اِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ غَرِيْمًا اگر کوئی تنگدست قرض دار ہو۔ ابو جعفر کی قرات میں عُسُرَةٍ اور باقی علماء کی قرات میں عُسْرَةٍ آیا ہے۔

فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ تو فراخدستی تک انتظار کا حکم ہے یا تم پر فراخ دستی تک انتظار لازم ہے (اول صورت میں مبتدا محذوف ہے اور نَظِرَةٌ اس کی خبر ہے اور دوسری صورت میں نَظِرَةٌ مبتدا مؤخر ہے یا یہ معنی ہے کہ انتظار ہونا چاہئے (اس صورت میں فعل محذوف ہوگا اور جملہ فعلیہ ہو جائے گا) نافع نے مَيْسُرَةٍ سین کے پیش کے ساتھ اور باقی قراء نے سین کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تنگدست کو سہولت دیگا اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کو سہولت دے گا۔ رواہ مسلم ورواہ ابن حبان رضی اللہ عنہ مختصراً۔

وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی قرض معاف کر دینا تمہارے لئے بہتر ہے ادا کی مہلت دینے سے اس کا ثواب زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تصدیق سے مراد مہلت دینا ہی ہو کیونکہ حضرت عمران بن حصین کی مرفوع حدیث ہے جس کسی مسلمان کے قرض کی ادائیگی کا وقت آ جائے اور وہ (قرض دار کو) مہلت دیدے تو ہر دن کے عوض اس کو ایک صدقہ (کا ثواب) ہوگا۔ رواہ احمد۔ مطلب یہ ہوگا کہ (وقت مقرر پر) لینے سے مہلت دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ واضح مطلب وہی ہے جو ہم نے ترجمہ میں بیان کر دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے قیامت کے دن جس شخص پر سب سے پہلے اللہ کا سایہ ہوگا وہ شخص وہ ہوگا جس نے کسی تنگ دست کو ادائے قرض کی مہلت اس وقت تک دی ہو جب تک اس کو میسر آئے یا اپنا مطالبہ بالکل معاف کر دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ میں اپنے حق سے اللہ واسطے تجھے سبکدوش کرتا ہوں اور (معافی کے بعد) قرض کی تحریر جلا دی ہو رواہ الطبرانی۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنۃ میں حدیث مذکور کی روایت ان الفاظ کے ساتھ کی ہے کہ جو قرض دار سے (قرض کو) دور کر دے گا یا مٹا دے گا تو قیامت کے دن وہ عرش کے سایہ میں ہوگا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ بغوی نے حضرت ابو الیسر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی طرح نقل کی ہے۔ طبرانی نے کبیر میں حضرت اسعد بن زرارہ کی اور اوسط میں حضرت شداد بن اوس کی روایت سے بھی حدیث مذکور اسی طرح نقل کی ہے۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ آپ کسی شخص سے اپنا قرض طلب کرتے تھے وہ آدمی چھپ گیا۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا اس نے جواب دیا تنگ دستی کی وجہ سے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس سے تنگدست ہونے کی قسم لی۔ اس نے قسم کھالی آپ نے اس کی تحریر منگوا کر اس کو دیدی اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص تنگدست کو مہلت دے یا اس کو قرض معاف کر دے اللہ اس کو روزِ قیامت کی سختیوں سے محفوظ رکھے گا۔ مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ابو قتادہ رضی اللہ کی یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے۔[۱]

---

[۱] حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے اور دنیا و آخرت میں اس کی سختی دور کر دے تو چاہئے کہ وہ تنگدست کو (ادائے قرض کی) مہلت دے اور قرض (کے مطالبہ) کو ترک کر دے اور جس شخص کو اس بات سے خوشی ہوتی ہو کہ قیامت کے دن اللہ اس کو قہر جہنم سے بچا کر اپنے سایہ میں لے لے، اور اس پر اپنا سایہ کر دے تو اس کو چاہئے کہ مؤمنوں پر درشت خو نہ ہو بلکہ ان کے لئے نرم دل ہو۔

marfat.com

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ گزشتہ اقوام میں سے ایک آدمی کی جان ملائکہ نے قبض کی اور روح سے پوچھا گیا تونے کبھی کوئی نیک کام کیا ہے اس نے جواب دیا نہیں۔ ملائکہ نے کہا یاد کرلے اس نے کہا اور تو کوئی نیکی نہیں کی۔ ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ میں لوگوں کو قرض دیدیا کرتا تھا اور میں نے اپنے کارندوں سے کہہ دیا تھا کہ فراخدست کو (ادائیگی کی) مہلت دیا کرو اور تنگدست سے (بالکل ہی) درگزر کرلیا کرو اللہ نے فرشتوں سے فرمایا تم بھی اس شخص سے درگزر کرو۔ (رواہ مسلم) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی مسلم میں اسی طرح ہے اور صحیحین میں حضرت حذیفہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ یعنی اگر مہلت دینے اور معاف کردینے کی فضیلت تم جان جاؤ تو پھر یہ کام تم پر دشوار نہ ہوگا۔ (یعنی آیت میں شرط مذکور ہے جس کی جزا محذوف ہے)۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ اور اس روز سے ڈرتے رہو جس میں تم کو اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اس سے مراد ہے قیامت کا دن یا مرنے کا دن۔ یعنی اللہ کی طرف جانے کی تیاری کرو۔ ابو عمرو اور یعقوب کی قرأت تَرْجِعُوْنَ بفتح تاء ہے اور باقی قراء تُرْجَعُوْنَ پڑھتے ہیں۔ تم لوٹو گے یا لوٹائے جاؤ گے۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر شخص کو اس کے اچھے برے کرتوت کا بدلہ دیا جائے گا۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ثواب گھٹا کر یا (جرم سے زیادہ) عذاب بڑھا کر ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا (سورۂ بقرہ کی) یہ آخری آیت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا اس کو سورۂ بقرہ کی دو سو اسی آیات کے کنارہ پر رکھو۔ کذا قال البغوی۔ ع ۳۸/۶

ثعلبی نے بحوالہ سدی صغیر بروایت کلبی از ابو صالح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ اکیس روز زندہ رہے۔ فریابی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول بیان کیا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ (صرف) سات رات زندہ رہے اور وفات مبارک پیر کے دن ۳/ ربیع الاول کو زوال کے بعد ۱۱ھ میں ہوگئی۔ ابن ابی حاتم رضی اللہ عنہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہی بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اللہ نے آیت تہدید پر وحی کو ختم کر دیا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ

(یعنی مسلمانو! جب تم آپس میں کوئی ایسا لین دین کرو جس میں دونوں میں سے کسی ایک کے ذمہ کچھ قرض ہو) ہم نے کسی ایک کی قید اس لئے لگائی کہ دونوں کے ذمہ قرض کا معاملہ ہونا درست نہیں بالاجماع غیر مقبوض کی بیع غیر مقبوض کے عوض صحیح نہیں۔ بیع الکالئ بالکالئ کی ممانعت میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے جس کو دار قطنی نے بیان کیا ہے۔ اس آیت کا حکم بیع، سلم، اجارہ، قرض بلکہ نکاح، خلع اور صلح سب کو شامل ہے۔

بِدَيْنٍ (کسی قرض) کا اس لفظ کے اضافہ سے معلوم ہوا کہ تَدَايَنْتُمْ سے مراد بدلہ دینا نہیں ہے کیونکہ تَدَايُن کا معنی بدلہ دینا بھی آتا ہے (بلکہ عقد مراد ہے یعنی لین دین کا معاملہ) نیز یہ بات بھی ملحوظ ہے کہ آئندہ فَاكْتُبُوْهُ آرہا ہے اس میں ضمیر ہ ہے جس کا مرجع متعین کرنا مقصود ہے۔

بِدَيْنٍ نکرہ ہے اور شرط (اذا) کے تحت آیا ہے اسلئے اس لفظ کے اندر ہر قسم کا دین داخل ہے۔ ثمن ہو یا مبیع۔ وزن سے فروخت ہونے والی چیز ہو یا پیمانہ کے ناپ سے یا کچھ اور ہو (عددی ہو تخمینی ہو) ادھار واجب فی الذمہ ہو یا فی الفور مقبوض ہو۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ایک مقررہ مدت میں ادائیگی پر، اس لفظ کی وجہ سے وہ معاملہ خارج ہو گیا جس میں طرفین سے فوری ادائیگی ہو اس لئے مقبوض الطرفین بیع کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔

مُسَمًّى سے مراد ہے معین جس دن مہینہ سنہ مقرر کر دیا گیا ہو۔ اس قید کے اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بیع جس میں

marfat.com

ثمن بذمہ مشتری قرض ہو اور سلم (جس میں ادائیگی مبیع بذمہ بائع شرط ہو) بغیر تقرر مدت کے صحیح نہیں، مدت ادا مقرر نہ ہو گی تو جھگڑا پیدا ہو گا۔ مدت کا تعین ہر جگہ ضروری ہے۔ بیع میں ادائیگی ثمن کے لئے سلم میں ادائیگی مبیع کے لئے اور نکاح میں (ادائیگی مہر کے لئے) ہاں قرض میں ادائیگی کی مدت مقرر کرنی ضروری نہیں۔ وقت ادا آنے سے پہلے صاحب حق کو تقاضے کا حق نہیں اور مدت ادا ختم ہونے کے بعد مطالبہ دار کو روکنے کا حق نہیں۔ ادائے قرض کی اگر مدت مقرر کر بھی دی جائے تو مقرر نہیں ہوتی (قرض خواہ کو ہر وقت مطالبہ کا حق رہتا ہے) گویا ادا کرنے والا عین مال کو ادا کرتا ہے اگر یہ اعتبار نہ کیا جائے تو نسیہ لازم آئیگا جو ایک طرح کا سود ہے۔

اس آیت کی عبارت سلم کو (جس میں مبیع کی ادائیگی ایک مقرر مدت کے بعد ہوتی ہے) شامل ہے اور اس بیع کو بھی جس کی ثمن (فی الفور ادا نہیں کی جاتی بلکہ اس کی ادائیگی) کی ایک مدت مقرر کر دی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا بھی یہی مطلب ہے آپ ﷺ نے فرمایا تھا میں شہادت دیتا ہوں کہ سلم جس کی ادائیگی ثمن کی ایک مدت مقرر کی جاتی ہے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور اس کی اجازت دی ہے فرمایا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ۔

یہ روایت حاکم نے مستدرک میں بیان کی ہے اور شرائط شیخین کے مطابق اس کو قرار دیا ہے اس کے راوی قتادہ از ابو حسان، اعرج از ابن عباسؓ ہیں، شافعیؒ نے اپنی مسند میں اور طبرانی و ابن ابی شیبہ نے اس کو بیان کیا ہے بخاری نے بصورت تعلیق اس کو نقل کیا ہے۔

قیاس چاہتا ہے کہ سلم جائز نہ ہو یہ معدوم کی بیع ہے بیع کا اصل مقصد حصول مبیع ہے ثمن تو حصول مبیع کا ذریعہ ہوتا ہے اس کے لئے تو صرف واجب فی الذمہ ہونا کافی ہے۔ نقد کی ضرورت نہیں۔ مبیع ہی ایسی چیز ہے جس پر عقد ہوتا ہے اس لئے اگر مبیع ہی موجود نہ ہو تو بیع کیسے ہو سکتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیز کی بیع کرنے کی ممانعت فرما دی تھی جو بائع کے پاس موجود نہ ہو، لیکن بیع سلم کے جواز کی صراحت نص میں موجود ہے اور اجماع بھی اس پر ہے اس لئے تقاضائے قیاس کو ترک کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (مدینہ میں) تشریف لائے تو (دیکھا کہ) لوگ سال دو سال کے وعدہ پر چھواروں کی بیع سلم کرتے تھے۔ بعض روایات میں تین سال کا لفظ بھی آیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا جو پھلوں میں بیع سلم کرے تو معین پیمانے، معین وزن اور معین مدت کے ساتھ کرے، متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اور حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں گیہوں، جو، چھوارے اور کشمش کی بیع بطور سلم کرتے تھے، (رواہ البخاری) ابن جوزی نے امام احمد کی روایت اس طرح نقل کی ہے، میں نے ابن ابی اوفی سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تم گیہوں، جو اور روغن زیتون کی بیع سلم کرتے تھے ابن ابی اوفی نے کہا جی ہاں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم کو مال غنیمت ملتا تھا تو ہم وہ مال دے کر گیہوں، جو، چھوارے اور روغن زیتون بطور سلم خریدتے تھے میں نے کہا (کس سے خریدتے تھے) کیا اس شخص سے جس کے کھیتی ہوئی تھی یا اس شخص سے جس کے ہاں کھیتی نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے جواب دیا ہم ان سے یہ بات پوچھتے ہی نہ تھے (کہ تم کاشت کرتے ہو یا نہیں کرتے) اس قصہ کے بعد راوی نے جا کر ابن ابی ابتری سے دریافت کیا انہوں نے بھی ابن ابی اوفی کی طرح جواب دیا۔

جواز سلم چونکہ تقاضائے قیاس کے خلاف ہے اس لئے صرف اسی صورت میں جائز ہو گا۔ جب مبیع دست بدست نہ دیا جائے کیونکہ نص شریعت میں اتنا ہی آیا ہے لہٰذا حکم سلم صرف اسی صورت میں ہو گا جس صورت کی صراحت شریعت نے کی ہے۔ اگر مبیع کی ادائیگی فوراً ہو جائے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک سلم درست نہیں ہاں امام شافعیؒ کے نزدیک صحیح ہے کیونکہ جب بیع کی ادائیگی ایک مدت کے بعد ہونے کی صورت میں سلم درست ہے تو فی الفور ادائیگی کی صورت تو بدرجہ اولیٰ درست ہونا چاہئے یا صورت ثانیہ کو صورت اول کی طرح ہی مان لیا جائے۔

marfat.com

ہم کہتے ہیں کہ سلم کا جواز صرف اس لئے ہوا تھا کہ جو نادار آدمی اپنے گھر کے مصارف سے مجبور ہو اس کو بچوں کے صرف کے لئے کچھ فوراً مل جائے آئندہ مبیع جب اس کے ہاتھ میں آئے گا (مثلاً چھ ماہ کے بعد اس کو غلہ میسر ہو گا) تو وہ ادائیگی کر دے گا اور مشتری کو اپنے گھر والوں کے لئے آئندہ کچھ نفع مل جائے۔ کیونکہ سلم میں اکثر مبیع کا نرخ سستا طے کیا جاتا ہے لہٰذا مبیع پر اگر دست بدست قبضہ ہو اور اسکی ادائیگی فی الفور ہو جائے تو نادار کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

مسئلہ :- باجماع علماء جواز سلم کیلئے ضروری ہے کہ مبیع کی جنس، نوع، حالت اور مقدار اس طرح بیان کر دی جائے کہ اس کو ذہنی تعیین حاصل ہو جائے، نیز مدت ادا کی تعیین بھی ضروری ہو، تا کہ بقدر امکان مبیع کی تعیین ہو جائے اور آئندہ کوئی جھگڑا باقی نہ رہے۔

جمہور کے نزدیک قیمت (راس المال) کی مقدار جاننا بھی ضروری ہے۔ لیکن امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ اگر راس المال کو اشارہ سے بتا رہا ہو تو مقدار بیان کرنے کی ضرورت نہیں، ہم اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ کبھی قیمت کا کچھ حصہ کھوٹا ہوتا ہے اور اس جگہ تو کھوٹا ہونا معلوم ہی نہ ہو گا کہ لوٹا کر کھرا لے لیا جائے اب اگر مقدارِ قیمت معلوم نہ ہو گی تو نہیں کہا جا سکتا کہ بیع سلم کے لئے کتنی قیمت ادا کی گئی اور کتنا مبیع خرید اگیا اس کے علاوہ بائع کبھی مبیع کو ادا نہیں کر سکتا (اس کے پاس ادا کرنے کے لئے کچھ ہوتا ہی نہیں) اس لئے اصل مال واپس کرنا ضروری ہوتا ہے اس لئے قیمت کی مقدار معلوم ہونا ضروری ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ تو محض امکانات ہیں ایسا ہوتا نہیں ہے (اور اگر ہوتا ہے تو محض اتفاقاً ہزاروں میں کبھی ایک بار) تو ہم کہتے ہیں کہ سلم کا جواز قیاس کے تو خلاف ہی ہے (بظاہر اس میں سود کا شائبہ نظر آتا ہے پھر اصل رکن بیع بھی مفقود ہے) لیکن شریعت نے اس کو جائز قرار دیا ہے اس لئے اس کے اندر ممکن الوقوع صورت کو بھی واقع کی طرح مانا جائے گا (اور ممکن الوقوع احتمال سے بھی پرہیز لازم ہو گا)۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحتِ سلم کی ساتویں شرط یہ ہے کہ اگر بار برداری میں کچھ خرچ اور محنت پڑتی ہو تو مبیع کی سپردگی کا مقام بھی وقت عقد معلوم ہونا لازم ہے، باقی ائمہ کے نزدیک مقام سپردگی وہی متعین ہے جو مقام عقد ہے (جس جگہ بیع ہوئی ہے اسی جگہ مبیع کی ادائیگی ہو گی) امام اعظمؒ کے نزدیک آٹھویں شرط یہ بھی ہے کہ وقت عقد سے وقت ادا تک مبیع (بازار میں یا ملک میں) موجود رہنا چاہئے، جمہور کے نزدیک یہ شرط ضروری نہیں صرف ادائیگی کے وقت مبیع کا (بازار یا شہروں وغیرہ میں) پایا جانا کافی ہے (تا کہ اگر بائع کے پاس اپنی پیداوار نہ ہو تو وہ دوسری جگہ سے خرید کر لا کر دے دے) کیونکہ یہ شرط شریعت کی طرف سے عائد کردہ نہیں (کہیں حدیث میں مذکور نہیں) اور قاعدہ یہ ہی ہے کہ جو شرط مذکور نہ ہو اس کو ضروری نہیں قرار دیا جاتا۔ عام احکام (جن میں کوئی قید اور شرط نہ ہو) مباح ہونے کے لئے کافی ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی بناء اس حدیث پر ہے جو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ ایک نجرانی (یمنی) شخص نے بیان کیا، میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ کیا میں چھواروں کی بیع سلم اس وقت کر سکتا ہوں جب کہ درختوں پر ان کے غنچے بھی بر آمد نہ ہوئے ہوں۔ فرمایا نہیں، میں نے کہا کیوں۔ فرمایا اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے اس طرح کی بیع سلم کی تھی مگر اس سال ان درختوں پر غنچے بر آمد ہی نہیں ہوئے مشتری کہنے لگا میں اس وقت تک مہلت دیتا ہوں کہ (آئندہ یا تیسرے سال) درختوں میں شگوفے بر آمد ہو جائیں (اس وقت میں مبیع وصول کر لوں گا) بائع نے کہا اسی سال کیلئے درختوں کا سودا ہوا تھا (اس سال پھل نہ آئے تمہارا حق ختم ہوا) دونوں جھگڑا لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے آپ ﷺ نے بائع سے فرمایا کیا اس نے تیرے درختوں سے کچھ حاصل کیا ہے، اس نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو پھر تو کیسے اس کے مال کو حلال سمجھتا ہے جو کچھ اس سے لیا ہے واپس دے دے جب تک درختوں پر صلاح (قابل استعمال پھل) بر آمد نہ ہو جائے اس وقت تک ان کی بیع سلم نہ کیا کرو۔

بخاریؒ نے ابو البختری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کھجور کے درختوں کی بیع سلم کا

marfat.com

حکم پوچھا فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے درختوں (کی بہار) کی بیع کرنے کی ممانعت فرمادی ہے جب تک کہ ان میں صلاحیت نہ ہو جائے (یعنی قابل استعمال نہ ہو جائیں) اور نقد کے مقابل نسیئۃً چاندی کی بیع کی بھی ممانعت فرمادی ہے (یعنی چاندی بصورت نقدی دی جائے اور مبیع بصورت چاندی فی الفور ادا نہ کیا جائے۔ یہ صورت بھی ممنوع ہے) میں نے حضرت ابن عباس سے کھجور کے درختوں کی (بہار کی) بیع سلم کا حکم پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے درختوں کی (بہار کی) بیع کی ممانعت کی ہے جب تک کہ وہ کھانے کے قابل نہ ہو جائیں۔ میں کہتا ہوں (یہ حدیث مجروح ہے) اس میں نجرانی شخص مجہول ہے اور ابن اسحاق کے معتبر ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے اور آثار کو دلیل میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول احتیاط پر مبنی ہے کیونکہ سلم عقد ہی ایسا ہے جس کا جواز خلاف قیاس ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

مسئلہ :- علماء کا اتفاق ہے کہ پیمانہ سے ناپ کر یا گز سے ناپ کر یا وزن کر کے فروخت کی جانے والی چیزوں کی بیع سلم درست ہے۔ لہٰذا اس ملک میں وہ موٹا کپڑا (جس کا عرض ۳۶ انچ یا چوالیس انچ یا ۶۰ انچ ہوتا ہے بیع سلم کے طور پر فروخت کیا جاسکتا ہے۔ (بشرطیکہ عرض بتادیا جائے) کیونکہ اس کپڑے میں تفاوت بہت کم ہوتا ہے مگر ایسے کپڑے کے علاوہ دوسرے (متفاوت) کپڑوں کی سلم صحیح نہیں۔ رہیں وہ چیزیں جو شمار کر کے بکتی ہیں اور ان کے افراد میں تفاوت نہیں ہوتا (یا تفاوت نا قابل اعتبار ہوتا ہے) جیسے اخروٹ اور انڈے وغیرہ ان کی بھی سلم درست ہے البتہ امام احمدؒ کی طرف ایک روایت میں عدم جواز کی نسبت کی جاتی ہے اور وہ عددی چیزیں جن میں (نمایاں) تفاوت ہوتا ہے جیسے خربوزہ، تربوز، انار وغیرہ ان میں امام اعظمؒ کے نزدیک بیع سلم کسی طرح درست نہیں، نہ گنتی کے اعتبار سے نہ وزن کے لحاظ سے۔ لیکن یہ حکم ان ممالک میں ہوگا جہاں یہ چیزیں گنتی سے بکتی ہیں ہمارے ملک میں تو ان کی بیع وزن سے ہوتی ہے لہٰذا ان میں یہاں بیع سلم درست ہے، امام مالکؒ کے نزدیک معدودات متفاوتہ کی بیع سلم ہر طرح جائز ہے وزناً بھی اور شمار سے بھی، امام شافعیؒ صرف وزناً جواز کے قائل ہیں، امام احمدؒ کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے

مسئلہ :- امام اعظمؒ کے نزدیک جانور کی بیع سلم درست نہیں دوسرے تینوں اماموں کے نزدیک درست ہے مؤخر الذکر مسلک کا ثبوت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت کردہ حدیث سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا مگر اونٹ ختم ہو گئے (فوج کے لئے کافی نہ ہوئے) تو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ زکوٰۃ کے اونٹوں (کی آمد) کی مدت کے ساتھ مشروط کر کے (لوگوں سے) لے لو (یعنی اب بقدر ضرورت اونٹ لے لو اور یہ شرط کر لو کہ جب زکوٰۃ کے اونٹ آئیں گے تو معاوضہ میں دے دیئے جائیں گے) چنانچہ حضرت عبداللہ ایک ایک اونٹ کے بدلے دو دو اونٹوں کے دینے کی شرط پر لینے لگے۔ یہ حدیث ابو داؤد نے نقل کی ہے، اس کی اسناد اس طرح ہے محمد بن اسحاق، یزید بن ابی حبیب، مسلم بن جبیر، ابو سفیان، عمرو بن حریش، عبداللہ بن عمرو، حاکم نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے اور شرط مسلم کے موافق صحیح کہا ہے۔

ابن قطان کے نزدیک یہ حدیث مضطرب الاسناد ہے۔ حماد بن سلمہؒ کی روایت تو مذکورہ اسناد کے ساتھ ہی ہے۔ لیکن جریر بن حازم کی روایت میں یزید بن ابی حبیب کا ذکر نہیں ہے اور ابو سفیان کے ذکر سے پہلے مسلم بن جبیر کا ذکر ہے۔ میں کہتا ہوں ابن جوزی نے بھی تحقیق میں اسی طرح بیان کیا ہے عفان نے بروایت حماد بن سلمہ اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے ابن اسحاق، یزید، ابو حبیب، مسلم ابو سفیان عمرو بن حریش (گویا یزید سے ابو حبیب نے کہا اور ابو حبیب سے مسلم نے) ابو بکر ابی شیبہ نے عبدالاعلیٰ کی روایت نقل کی ہے اس روایت میں یزید بن ابی حبیب کا نام نہیں ہے اور ابو سفیان کا ذکر مسلم سے پہلے ہے اور مسلم کی ولدیت جبیر نہیں، کثیر بیان کی ہے۔

اس سند کی اضطراب کے ساتھ ساتھ ایک خرابی یہ ہے کہ عمرو بن حریش مجہول شخص ہے اور مسلم بن جبیر کا ذکر مجھے کہیں نہیں ملا اور ابو سفیان کی حالت محل تامل ہے۔ شیخ ابن حجر نے ابن اسحاق کی شخصیت کو مختلف فیہ کہا ہے۔ بیہقی نے اس

marfat.com

حدیث کو سنن اور خلافیات میں باسناد عمرو بن شعیب از شعیب از جدہ نقل کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سلسلہ کو ابن جوزی نے بھی نقل کیا ہے میرا خیال یہ ہے کہ یہ حدیث اس حدیث کے خلاف ہے جو حضرت سمرہ اور حضرت ابن عباس اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کو جانور کے عوض بطور نسیہ فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے لہٰذا حسب قاعدہ تحریم والی حدیث کو حلت والی حدیث پر ترجیح دی جائے گی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جانور کی بیع سلم کے عدم جواز پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے، حاکم اور دار قطنی نے بروایت اسحاق بن ابراہیم بن حوتا از عبد الملک ذماری از سفیان ثوری از معمر از یحییٰ بن ابی کثیر از عکرمہ از ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کی بیع سلم سے منع فرمادیا۔ حاکم نے اس اسناد کو صحیح کہا ہے۔ ابن جوزی نے ابو زرعہ کا قول نقل کیا ہے کہ عبد الملک ذماری منکر الحدیث ہے۔ رازی نے کہا یہ قوی نہیں ہے۔ لیکن حلاس نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ اسحاق بن ابراہیم مجہول شخص ہے۔

میں کہتا ہوں شاید حاکم کو اسحاق کا علم ہو کہ اسکی روایت کو انہوں نے صحیح کہا ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن معین کا ابن حوتا کو ضعیف قرار دینا محل تأمل ہے، جبکہ متعدد صحیح اور حسن طریقوں سے ابن حوتا کی روایت کردہ حدیث ثابت ہے۔ متعدد طرق سے روایت معنوی اس حدیث کے معنی کو پایۂ حجت تک پہنچادیتی ہے اس لئے اس حدیث سے حجت پیش کی جاسکتی ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کے ایک اثر سے بھی ہوتی ہے جس کو حماد بن ابی سلیمان نے بروایت ابراہیم نخعی بیان کیا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے زید بن خویلہ بکری کو کچھ مال شرکت مضاربت کے طور پر دیا، زید نے عریس بن عرقوب شیبانی سے کچھ اونٹنیاں بطور سلم خریدیں۔ جب سپردگی کا وقت آگیا تو زید نے کچھ اونٹنیوں پر قبضہ کرلیا اور کچھ اونٹنیاں واجب الادارہ گئیں۔ عریس نادار ہوگیا، ادھر اس کو یہ اطلاع بھی مل گئی کہ اصل مال حضرت عبد اللہ کا تھا اس لئے وہ آپ ﷺ کی خدمت میں مطالبہ میں نرمی کا طلب گار بن کر حاضر ہوا، حضرت نے فرمایا کیا زیدؓ نے ایسا کیا ہے عریس نے عرض کیا جی ہاں! آپ نے دریافت کیفیت کے لئے زیدؓ کو طلب فرمایا۔ جب وہ حاضر ہوگیا تو فرمایا جو کچھ تم نے لیا ہے واپس کردو صرف اپنا اصل مال لے لو۔ اور ہمارے مال سے کسی جانور کو بطور سلم نہ خریدو۔ صاحب التنقیح نے لکھا ہے کہ اس سند میں انقطاع ہے یعنی ابراہیم نخعی اور حضرت عبد اللہ کا درمیانی راوی مذکور نہیں کیونکہ ابراہیم یا تو علقمہ کی روایت بیان کرتے ہیں یا اسود کی (علقمہ اور اسود کی وساطت کے بغیر براہ راست حضرت عبد اللہ بن مسعود کا اثر نہیں بیان کرتے)۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ ایسے بیان میں ہمارے نزدیک کوئی خرابی نہیں۔ خصوصاً ابراہیم نخعی کی مرسل حدیث تو یقیناً صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کی بیع سلم کی ممانعت فرمادی ہے تو یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید ایک اور اختلافی مسئلہ بھی کرتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جانور کو بطور قرض دینا درست نہیں۔ لیکن ائمہ ثلاثہ اس کے جواز کے قائل ہیں اور حضرت ابو رافع کی روایت کردہ حدیث کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص سے ایک نوجوان اونٹ بطور قرض لیا تھا۔ جب حضور ﷺ کے پاس زکوٰۃ کے اونٹ آگئے تو آپ نے فرمایا اس شخص کو دے دو صحابہؓ نے عرض کیا ہمارے پاس (وصول شدہ اموال زکوٰۃ میں) تو صرف چار سالہ عمدہ اونٹ ہیں (لو اس سے قرض نوجوان اونٹ لیا گیا تھا) فرمایا، دے دو، سب سے اچھا آدمی وہی ہے جو بہت اچھی طرح قرض چکاتا ہے۔ رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک آدمی کا رسول اللہ ﷺ پر کچھ حق (یعنی قرض) تھا اس نے کلام میں کچھ درشتی کی صحابہؓ نے اس (کو مارنے) کا ارادہ کیا حضور ﷺ نے فرمایا اس کو رہنے دو، حقدار کو کچھ کہنے کا حق ہے اور فرمایا اس کو یکسالہ اونٹ خرید دو، صحابہؓ نے عرض کیا ہم کو تو اس کے اونٹ سے بہتر یکسالہ اونٹ مل رہا ہے، فرمایا وہی خرید کردے دو، تم میں سب

marfat.com

سے اچھا وہی آدمی ہے جو قرض چکانے میں سب سے بہتر ہو۔ بخاری و مسلم۔
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ جانور کے اوصاف کا تعیینی بیان نہیں ہو سکتا لہٰذا اس کو قرض دینا درست نہیں۔ جس طرح بیع نسیہ میں جانور کو ثمن بنانا یا سلم میں مبیع بنانا درست نہیں، لیکن مذکورہ بالا دو صحیح حدیثوں کے مقابل امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی قیاسی وجہ قابل قبول نہیں، جب تک کہ یہ حدیث صحیح ثابت نہ ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے حیوان میں سلف کرنے کی ممانعت فرمائی ہے اگر اس حدیث کی صحت ثابت ہو جائے گی تو جانور میں سلم کرنا اور قرض دینا دونوں ناجائز ہو جائیں گے، کیونکہ سلف کا لفظ سلم کو بھی شامل ہے اور قرض کو بھی پس بر تقدیر صحت روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما تحریم والی حدیث حلت والی حدیث سے راجح ہو گی، اور بر تقدیر عدم صحت صرف نوجوان اونٹ کو بطور قرض لینا جائز قرار پائے گا۔ کیونکہ حدیث میں اسی کا ذکر ہے اور جو حکم نص میں آجائے مگر ہو مخالفِ قیاس اس حکم کو اسی مسئلہ پر محدود کر دیا جاتا ہے اس پر قیاس نہیں کیا جاتا پس اونٹ پر دوسرے جانوروں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اونٹ کا قرض کے طور پر لین دین بجائے خود تقاضائے قیاس کے خلاف ہے۔

...... ایک شبہ ......

اگر جانور کے اوصاف بیان کرنے کے بعد بھی اس کی ذہنی تعیین نہیں ہو سکتی اور بائع کے ذمہ اس کا ادا کرنا واجب نہیں ہو سکتا، تو کس طرح نکاح کے مہر اور خلع کے بدل میں غلام یا باندی یا گھوڑا مقرر کیا جا سکتا ہے اور غلام، باندی اور گھوڑا متوسط قسم کا ادا کرنا واجب ہوتا ہے۔
ازالۂ شبہ :- اس جگہ دو قیاس ہیں ایک تو بیع پر قیاس (اس لحاظ سے جانور میں بیع سلم قطعاً ناجائز ہو گی کیونکہ) رسول اللہ ﷺ نے بیع نسیہ سے منع فرمایا ہے۔
دوسرا قیاس دیت پر (اس لحاظ سے جانور کی بیع سلم جائز ہونی چاہئے کیونکہ) دیت میں اونٹوں کی ادائیگی شرعاً واجب ہے، دونوں قیاسوں میں تضاد ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ تبادلہ مال بمال کی صورت میں اوصاف مالی کی تعیین پوری ہونی چاہئے (کیونکہ مال کا مال سے مقابلہ ہے) جیسے بیع اور اجارہ اور اقرارِ مالی کے دعوے میں کچھ مال دے کر مصالحت (ان سب صورتوں میں مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے) لیکن جہاں تبادلہ مال بمال نہ ہو جیسے نکاح، خلع، قتل عمد کے عوض کچھ مال دے کر مصالحت اور انکار مالی کی صورت میں کچھ مال دے کر صلح ان صورتوں میں مالی اوصاف کا تعیینی بیان ضروری نہیں اور دیت پر قیاس کرتے ہوئے جانور کی خرید و فروخت بطور سلم جائز ہے۔
اسی لئے علماء اسلام کا اجماع ہے کہ حرۂ حاملہ کا شکمی بچہ ضرب سے ساقط کر دینے کی دیت ایک غلام یا باندی ہے اور حاملہ باندی کا جنین ضرب سے گرادینے کی دیت غلام یا باندی نہیں بلکہ نقد روپیہ ہے جس کی مقدار امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قیمت جنین کا دسواں حصہ (اگر جنین لڑکا ہو) یا بیسواں حصہ (اگر جنین لڑکی ہو) ہے اور دوسرے علماء کے نزدیک دیت کی مقدار جنین کی ماں کی قیمت کا بیسواں حصہ ہے اور جانور کے بچہ کے اسقاط کی دیت اتنی ہے جتنی اسقاط سے اس جانور کی قیمت کم ہو گئی ہو، دونوں میں فرق یہ ہے کہ مالی تبادلہ کی صورت میں اکثر نزاع (جھگڑا) اور اداء میں ٹال مٹول ہوتی رہتی ہے اور مال کا مال سے تبادلہ نہ ہو تو تاخیر ادا اور جھگڑا کم ہوتا ہے کیونکہ اس وقت مال مقصود نہیں ہوتا بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہوتا ہے۔
اونٹ کو قرض لینے اور بیع سلم کے طور پر خریدنے کے جواز کی وجہ شاید یہ ہو کہ عمر اور دوسرے اوصاف کے بیان کے بعد اس ملک میں اونٹوں کا باہمی تفاوت کم رہ جاتا ہو اور حقیر تفاوت ضرورتِ معاملات میں ناقابل توجہ ہوتا ہے (اس لئے خصوصیت کے ساتھ اونٹوں کا قرض اور بیع سلم جائز ہو)۔

...... تنقیح ......

marfat.com

ہر قسم کے قرض کا لین دین تقاضائے قیاس کے خلاف ہے کیونکہ اگر نقد روپیہ قرض دیا جائے گا تو بیع صرف میں نسیہ لازم آئے گا (ایک طرف سے روپیہ کی نقد سپردگی ہوگی اور دوسری طرف سے اس کے عوض کچھ مدت کے بعد نقد روپیہ کی شکل میں واپسی) اور اگر روپیہ کے علاوہ کوئی اور جنس قرض دی جائے (جس کے عوض کچھ مدت کے بعد وہی جنس واپس لی جائے) تو معدوم کی بیع لازم آئے گی اور بعض صورتوں میں نسیہ لازم آئے گا جو (بوا کے حکم میں ہے لیکن ضرورت کے پیش نظر قرض لینے دینے کی اجازت شریعت کی نص میں بھی آئی ہے اور اجماع بھی اس پر ہے اس لئے علماء نے قرض کو جائز قرار دینے کیلئے ایک تاویل کی ہے۔

تاویل یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں قرض عاریت (کے حکم میں) ہے گویا قرض لینے والا قرض دینے والی کی ایک چیز استعمال کے لئے لیتا ہے (جس کو عند الطلب واپس کرنا ضروری ہے) لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو خرچ نہ کر دیا جائے تو (صرف رکھنے یا کسی اور طریقہ سے استعمال کرنے سے) کوئی فائدہ نہیں جیسے روپیہ پیسہ اور کھانے کی چیزیں۔ ایسی چیزیں اگر خرچ کر دی جائیں تو بعینہ ان چیزوں کی واپسی ناممکن ہے۔ پس شریعت نے اس ضرورت کے تحت اجازت دے دی کہ نفس شئے خرچ ہو جانے کی صورت میں بالکل اسی کی طرح کوئی دوسری چیز واپس کر دی جائے (جیسے اگر ایک روپیہ یا کچھ کھانا لیا ہے اور اس کو خرچ کر دیا ہے تو ایک روپیہ دوسرا اور ویسا ہی کھانا واپس کیا جائے) قرض کا عاریت کے حکم میں ہونا اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رعایت دینے والے کی طرح قرض دینے والا بھی جب چاہے اپنا قرض واپس لے سکتا ہے خواہ قرض میعادی ہی دیا ہو جیسے عاریت دینے والا اپنی عاریت کا مطالبہ ہر وقت کر سکتا ہے، لہٰذا جن چیزوں کے مثل کی واپسی ممکن ہو (اصل شئے کی واپسی ممکن نہ ہو جیسے روپیہ پیسہ کھانا پھل وغیرہ) تو ان کو قرض دینا بھی جائز ہے اور جن کے مثل کے واپسی نہ ہو بلکہ اصل شئے کو واپس کرنا ضروری ہو اس کو قرض دینا بھی جائز نہیں، جیسے باندی، غلام، کپڑا، چوپایہ، مکان وغیرہ کیونکہ اس صورت میں نفس شئ کو واپس کرنا لازم ہے ایسی چیزیں اگر کسی کو استعمال کے لئے دی جائیں تو اس کو قرض نہیں بلکہ عاریت کہا جائے گا۔ یہی بنیاد ہے جس کی وجہ سے امام اعظمؒ نے جانور، لباس اور باندی، غلام کے بطور قرض دینے کو ناجائز کہا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ قربت صنفی کیلئے کسی کو اپنی باندی قرض دینا جائز ہے۔

مسئلہ :- اگر قرض دار قرض خواہ کو کچھ تحفہ دے یا اپنی سواری پر سوار کرے یا اپنا گھر رہنے کو دیدے اور اس سے پہلے ان کے آپس میں اس قسم کے تعلقات نہ ہوں یا جتنا قرض لیا ہو اس سے بڑھا کر (کچھ اپنی طرف سے بغیر شرط کئے) یا اس سے اعلیٰ اور کھری چیز دیدے تو کیا قرض خواہ کے لئے یہ صورتیں جائز ہیں؟

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ناجائز قرار دیتے ہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں اگر غیر شرط کئے قرضدار نے ایسا کیا ہو تو قرض خواہ کے لئے جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔

آئمہ ثلثہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی کسی کو قرض دے پھر قرض لینے والا کچھ تحفہ دے تو قبول نہ کرے اور اپنی سواری پر سوار کرے تو سوار نہ ہو ہاں۔ اگر پہلے سے اس سے ایسے تعلقات ہوں (تو خیر) رواہ ابن ماجہ۔ بخاری نے تاریخ میں اس لفظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ ہدیہ نہ لے۔

سالم بن ابی الجعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا میں نے ایک ماہی فروش کو بیس درہم قرض دیئے تھے پھر اس نے تحفہ میں مجھے ایک مچھلی دی، جس کی قیمت میرے اندازہ کے مطابق تیرہ درہم تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تو اب اس سے (صرف) سات درہم لینا، رواہ ابن الجوزی۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تمہارا کسی پر کچھ حق (قرض) ہو اور وہ تم کو گون بھر انجیر یا جو وغیرہ دے تو تم مت لو وہ سود ہے۔ (رواہ البخاری)۔

marfat.com

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے قرض کی ممانعت فرمائی ہے، جو نفع کو کھینچ کر لائے۔ (رواہ الحارث بن اسامہ فی مسندہ) اس روایت کی سند میں ایک راوی سوار بن مصعب ہے جو متروک الحدیث ہے۔

بیہقی نے المعرفۃ میں بروایت فضالہ بن عبید ان الفاظ کے ساتھ موقوفاً یہ حدیث نقل کی ہے۔ ہر قرض جو کسی قسم کے نفع کو کھینچ کر لائے وہ ایک قسم کا سود ہے۔ سنن کبیر میں بیہقی نے اس حدیث کو حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم پر موقوفاً درج کیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو رافع اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کیا ہے کہ (جب) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہم کو تو اس کی یک سالہ اونٹنی سے بہتر ہی دستیاب ہو رہی ہے (اس کی اونٹنی کی طرح نہیں ملتی تو) حضور ﷺ نے فرمایا وہی دیدو، تم میں بہترین شخص وہی ہے جو ادائے قرض میں سب سے اچھا ہو۔ امام شافعی رحمۃ علیہ کے قول کی تائید حضرت عائشہؓ کے بیان سے بھی ہوتی ہے، ام المومنینؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کچھ خمیر یا روٹی ہمسائے باہم قرض دے دیتے ہیں اور واپسی کے وقت کم یا زیادہ واپس کرتے ہیں۔ فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ تو ہمسایوں کا باہمی حسن سلوک ہے اس سے مقصود بیشی نہیں ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے خمیر اور روٹی کو بطور قرض لینے دینے کا مسئلہ پوچھا گیا، تو فرمایا سبحان اللہ، یہ تو اچھے اخلاق ہیں کم لے لو زیادہ دیدو، زیادہ لے لو کم دیدو۔ تم میں بہترین وہ شخص ہے جو ادا کرنے میں سب سے اچھا ہو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا ہے۔ یہ دونوں حدیثیں ابن جوزی نے نقل کی ہیں۔ امام شافعیؒ کے استدلال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ہمسایوں کے تعلقات میں یہ خوشگواری اور (کمی بیشی کے ساتھ) لین دین تو ہوتا ہی ہے (خواہ کوئی کسی سے قرض لے یا نہ لے) اور ہماری گفتگو کا موضوع وہ صورت ہے جب پہلے سے ایسے تعلقات نہ ہوں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک روٹی اور خمیر کا لین دین بطور قرض ناجائز ہے۔ جمہور کے نزدیک مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کی روشنی میں درست ہے۔ قائلین جواز میں سے کوئی قائل ہے کہ وزن کر کے قرض کا لین دین ہونا چاہئے اور کسی نے کہا کہ شمار سے ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

فَاكْتُبُوْهُ ؕ یعنی آئندہ نزاع کو دور کرنے اور معاملہ کو پختہ کرنے کے لئے عقد کو (مع تفصیل) لکھ لیا کرو جمہور کے نزدیک لکھنے کا حکم استحبابی ہے واجب نہیں۔ اگر نہ لکھا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں جیسے آیت فاذا قضیت الصلوة فانتشروا میں نماز ختم ہو جانے کے بعد منتشر ہو جانے کا حکم ہے۔ بعض علماء نے امر کو وجوبی کہا ہے یعنی لکھ لینا واجب ہے۔ شعبی نے کہا رہن اور قرض کو مع گواہوں کے لکھنا فرض تھا لیکن آیت فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ سے وجوب منسوخ ہو گیا۔

میں کہتا ہوں ناسخ کا زمانہ منسوخ سے پیچھے ہونا چاہئے اور مذکورہ دونوں آیتیں ایک ہی وقت میں نازل ہوئیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر وغیرہ کا حکم استحبابی ہے۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ یعنی لکھنے والا انصاف کے ساتھ طرفین کے حقوق کا لحاظ رکھ کر تحریر لکھے، کمی بیشی نہ کرے۔ کاتب کو عدل کے ساتھ لکھنے کا حکم وجوبی ہے۔ ذیلی طور پر فریقین کے معاملہ کے لئے بھی یہ حکم نکلتا ہے کہ سمجھدار دیندار کاتب کا انتخاب کریں۔

وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ یعنی جس کو لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے جس طرح اللہ نے اس کو لکھنا سکھایا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ نے جس طرح اپنے کرم سے اس کو لکھنا سکھایا ہے۔ ویسا ہی وہ بھی دوسروں کو اپنے فن سے فائدہ پہنچائے۔ دوسری آیت ہے اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی لوگوں سے بھلائی کرو۔

marfat.com

ﷺ نے اہل کتاب کے باہم ایک فریق کی دوسرے فریق پر شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ رواہ ابن ماجہ۔

تفصیلی حدیث اس طرح ہے کہ یہودی ایک مرد اور ایک عورت کو لے کر خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، دونوں باہم زنا کے مرتکب ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے فرمایا کیا وجہ ہے کہ تم خود ان دونوں کو شرعی سزا نہیں دیتے۔ کہنے لگے جب ہماری حکومت تھی تو ہم خود ایسا کیا کرتے تھے اب ہماری حکومت نہیں رہی اس لئے ہم خود ایسا کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ فرمایا تم اپنے سب سے بڑے دو عالم میرے پاس لے آؤ۔ یہودی صوریا کے دونوں بیٹوں کو لے آئے۔ آپ نے ان سے فرمایا کیا تم اپنے لوگوں میں سب سے بڑے عالم ہو انہوں نے جواب دیا لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔ فرمایا میں تم کو اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے توراۃ موسیٰ پر نازل کی تھی کہ توراۃ میں تم کو ان دونوں کی سزا کیا ملتی ہے انہوں نے عرض کیا کہ اگر چار آدمی شہادت دیں کہ انہوں نے مرد کو عورت کے اندر داخل کرتے اس طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی داخل کی جاتی ہے تو مرد کو سنگسار کر دیا جائے۔ ارشاد فرمایا تو گواہ پیش کرو۔ چنانچہ چار آدمیوں نے شہادت دی اور حضور ﷺ نے ان دونوں مجرموں کو سنگسار کرادیا۔ رواہ ابو داؤد و اسحٰق بن راہویہ و ابو یعلی الموصلی و البزاز و الدار قطنی۔ طحاوی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں میرے پاس اپنے میں سے چار مرد لے آؤ جو شہادت دیں۔ یہ دونوں حدیثیں سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں دونوں میں انتہا تنہا مجالد بن سعید پر ہوتی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مجالد کے متعلق فرمایا وہ کچھ نہیں ہے۔ اور یحییٰ نے کہا اس کی حدیث حجت میں نہیں پیش کی جاسکتی۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ (یعنی اگر وہ گواہ دو مرد نہ ہوں یعنی دو مردوں کو گواہ بنانا میسر نہ آسکے۔

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیا جائے۔ دو مردوں کے میسر نہ آنے کی صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کو شاہد بنانے کی صراحت بتا رہی ہے کہ دو عورتیں ایک مرد کے قائم مقام ہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ عورتوں کی شہادت نہ لی جائے لیکن ایک مرد کا بدل دو عورتوں کو مان لیا گیا ہے اسی شبہ بدلیّت کی بنا پر ان حدود و قصاص میں جن کا سقوط ادنیٰ اشتباہ سے ہو جاتا ہے۔ عورتوں کی شہادت اجماعاً غیر معتبر ہے۔ اس کی تائید زہری کے اس قول سے ہوتی ہے جو ابن ابی شیبہ نے بروایت حفص از حجاج بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد دونوں خلفاء کا طریقہ یہی رہا ہے کہ حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔

یہ حدیث مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل قابل احتجاج ہے۔ حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے خصوصی ذکر کی وجہ یہ ہے کہ انہی حضرات کے زمانہ میں بیشتر قوانین شرع کا قیام اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم ہوئے ہیں۔ ان کے بعد تو صرف اتباع (سابق) ہوا (تاسیس، ضوابط اور انعقادِ اجماع بہت کم ہوا) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ان دونوں کی اقتداء کرنا جو میرے بعد (خلیفہ) ہوں گے ابو بکر و عمر، رواہ الترمذی عن حذیفہ۔

ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن ابی شیبہ کی روایت کی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بروایت عقیل زہری کا قول نقل کیا ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ عورتوں کی شہادت حدود و قصاص میں جائز نہیں اور نہ نکاح میں اور نہ طلاق میں۔

لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت پایہ صحت کو نہیں پہنچی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ صرف مالی معاملات میں یا ان کے توابع میں عورتوں کی شہادت درست ہے۔ جیسے اجازت، خیار کی شرط، شفعہ، اجارہ، قتل خطاء اور ہر زخم جس میں مالی تاوان دینا پڑتا ہے۔ ان کے سوائے دوسرے امور میں عورتوں کی شہادت درست نہیں جیسے نکاح، طلاق، وکالت، وصیت، غلام کی آزادی، طلاق سے رجوع اور ثبوت نسب وغیرہ۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قائل ہیں کہ سوائے حدود و قصاص کے تمام حقوق میں عورتوں کی شہادت درست ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتیں بہر حال یہ شہادت ایک خبر کی حیثیت رکھتی ہے جس میں غلطی کا احتمال ہے اس سے مدعی کا دعویٰ یقینی طور پر ثابت نہیں ہوسکتا۔ ہو سکتا

marfat.com

ہے کہ مدعیٰ علیہ سچا ہو اور گواہ جھوٹے ہوں، اس لئے مدعیٰ علیہ مجبور نہیں ہو سکتا کہ وہ ضرور ہی شہادت کو سچا تسلیم کرے، لیکن شہادت کا ثبوت نص قرآنی سے ہے اس لئے تقاضائے قیاس کے خلاف ہوتے ہوئے بھی شاہدوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے مگر جو حکم خلاف قیاس ہو اس کا حصر صرف اسی مقام پر ہوتا ہے جو نص میں آگیا ہو اس لئے عورتوں کی شہادت اسی معاملہ میں جائز ہوگی جو نص میں آگیا ہے یعنی مالی معاملات میں۔ دیکھو اللہ نے رجعت کے متعلق فرمایا وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ وَ شَاهِدَیْ عَدْلٍ۔ [۱]

یہ حدیث حضرت عائشہ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے دار قطنی نے لکھی ہے لیکن نقل حدیث کی بات ہی اور ہے (کہ عورتوں کی روایت محدثین قبول کرتے ہیں) راوی کی روایت سے کسی مسلمان پر کسی حکم کا لزوم نہیں ہو جاتا، مسلمان پر تو پہلے ہی سے اللہ کے احکام کی پابندی لازم ہے۔ اس کو صرف علم احکام کی طلب ہوتی ہے اور علم کے راستہ کا وہ طلب گار ہوتا ہے اب اگر کسی یقینی راستہ سے اس کو علم ہو گیا تو اس کو حکم کا یقین بھی ہو جاتا ہے اور اس پر وہ عمل بھی بطریق یقین کرتا ہے اور اگر کسی ظنی راستہ سے اس کو علم ہوتا ہے تو اس کو یقینی علم حاصل نہیں ہوتا ظنی ہوتا ہے مگر وہ ثواب کی امید یا عذاب کے خوف سے اس پر عمل کرتا ہے بشرطیکہ کسی دوسرے قوی طریق روایت سے اول حکم کے خلاف کوئی دوسرا حکم اس کو نہ پہنچا ہو اور یہ بات تقاضائے عقل کے موافق ہے۔ پھر قطعی نصوص اور اجماع سے بھی احادیث آحاد کا موجب عمل ہونا ثابت ہے اس لئے اخبار آحاد کے ظنی العلم ہونے کے باوجود عمل کرنا واجب ہے یہی وجہ ہے کہ روایت احادیث میں وہ شرطیں ضروری نہیں جو شہادت کے لئے لازم ہیں یعنی آزادی اور تعداد اور مرد ہونا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ قبول شہادت بے شک خلاف قیاس ہے اور محض تعمیل حکم ہے لیکن قبول شہادت کا حکم تو بالاجماع تمام ہی حقوق میں ہے مالی حقوق ہوں یا غیر مالی اور اس آیت کی عبارت سے عورتوں کی شہادت قبول کرنے کا حکم ثابت ہو رہا ہے لہٰذا اور دوسرے حقوق میں قبول شہادت کا حکم دلالۃً بطریق اولیٰ یا کم سے کم بطریق مساوی معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کی حفاظت کی خاطر قبول شہادت کا حکم ہے اور حقوق عام ہیں مالی ہوں یا آبرو اور حرمت سے تعلق رکھنے والے بلکہ حرمت نسوانی و آبرو کا تحفظ تو اور بھی اولیٰ ہے یا کم سے کم حفاظت مالی کے برابر ہے۔ رسول

---

[۱] حاشیہ از مؤلف، فائدہ نمبر ۱۔ اعلان نکاح باجماع علماء ضروری ہے اکثر علماء کہتے ہیں کہ یہ اعلان دو مردوں کی شہادت سے ہو جاتا ہے امام مالکؒ اس کو کافی نہیں سمجھتے، بہر حال باجماع علماء اعلان نکاح ضروری ہے اور اجماع سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے، کتاب اللہ میں فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ اور وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اعلان کی شرط کے بغیر آیا ہے۔

فائدہ نمبر ۲۔ امام احمدؒ نے فرمایا شہادت نکاح (کے ضروری ہونے کا ذکر) کسی روایت میں نہیں، ابن منذر کا بھی یہی قول ہے اب اگر شبہ کیا جائے کہ نکاح کے لئے شہادت کی شرط جب کسی روایت میں نہیں آئی تو نکاح میں شہادت کو کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اَعْلِنُوا النِّكَاحَ صحیح حدیث ہے، جس کو امام احمدؒ اور ابن حبانؒ اور طبرانی نے بیان کیا ہے، نیز مستدرک میں حاکمؒ نے اور حلیہ میں ابو نعیمؒ نے حضرت ابن زبیرؓ کی روایت سے اور ترمذی نے حضرت عائشہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے۔ جب اس حدیث کی رو سے نکاح کا اعلان ضروری قرار پا گیا تو اب امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اعلان کی آخری حد تو کوئی نہیں ہو سکتی (لاکھ، دو لاکھ، کروڑ، ارب ساری دنیا کہاں کہاں اطلاع نکاح پہنچائی جائے) اس لئے ادنیٰ درجہ یعنی دو شاہدوں کی شہادت کافی ہے، شریعت نے اظہار کے اسی طریقہ کو معتبر مانا ہے، دو آدمیوں کی شہادت کے بعد نکاح پوشیدگی کے پردہ سے نکل جاتا ہے، کرخی کہتے ہیں (کہ شاہدوں کا شہادت ادا کرنا ضروری نہیں) جب حاضرین نکاح کے وقت موجود ہوں تو نکاح سری نہیں رہتا علانیہ ہو جاتا ہے، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اعلان نکاح دف بجانے سے بھی ہوتا ہے اور نکاح کے بعد اطلاع دینے سے بھی لیکن اگر دو مردوں کو نکاح کا گواہ بنانے کے بعد ان سے کہہ دیا جائے کہ کسی کو نکاح کی اطلاع نہ دینا تو اعلان (کا فائدہ) فوت ہو جاتا ہے، میں کہتا ہوں کہ بقاء اعلان کی شرط تو بالاجماع نہیں ہے، نکاح ہو جانے کے بعد کو چھپانے یا انکار کر دینے سے نکاح فسخ نہیں ہو جاتا اور دف سے اعلان تو انعقاد نکاح کے بعد ہوتا ہے (جو غیر ضروری ہے) اسی لئے ہم نے دو گواہوں کا ایجاب و قبول کے وقت حاضر ہونا اور ایجاب و قبول کو سننا ضروری قرار دیا ہے تاکہ انعقاد نکاح کے وقت اعلان نکاح ہو یعنی چھپ کر نکاح نہ ہو گواہوں کے سامنے ہو۔ مؤلف

marfat.com

اللہ ﷺ کا ارشاد ہے تمہارے مال کی حرمت تمہاری جانوں کی حرمت کی طرح ہے۔ حجۃ الوداع میں قربانی کے دن حضور اقدس ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا۔ تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں حرمت والی ہیں۔ (نہ کسی کی آبروریزی جائز ہے، نہ قتل و خون ریزی، نہ مال کی چوری اور غصب) یہ حدیث صحیحین میں موجود ہے۔ ایک اور حدیث ہے جس کو امام احمد اور ابن حبان نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو اپنے مال کو بچانے میں مارا گیا وہ شہید ہے اور جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے اور جو اپنے دین کو بچانے میں مارا گیا وہ شہید ہے اور جو اپنی بیوی بچوں کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔ رہی یہ بات کہ حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت بالاجماع نامقبول ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حدود وغیرہ شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں مگر نکاح کی کیفیت تو ایسی نہیں (کہ شبہات سے ساقط ہو جائے)۔

رہی آیت وَاَشۡہِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ تو اس سے عورتوں کی شہادت کا غیر مقبول ہونا ثابت نہیں ہوتا اور ایک نص پر زیادتی دوسری نص کی دلالت سے اجماعاً جائز ہے باقی حدیث لانکاح الابولی و شاہدی عدل سے استدلال تو یہ حدیث ہی نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ والی روایت میں تو ایک راوی محمد بن یزید سنان ہے جس کو امام احمد نے ضعیف، یحییٰ نے غیر ثقہ اور نسائی نے متروک الحدیث کہا ہے اور دار قطنی نے اس کو اور اس کے باپ کو ضعیف قرار دیا ہے اور دوسری سند میں نافع بن مسیر ابو خطیب مجہول ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی حدیث کے سلسلہ میں نہاش ہے جس کو یحییٰ نے ضعیف کہا ہے اور ابن عدی نے ہیچ قرار دیا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ والی حدیث میں بکر بن بکار ہے جس کے متعلق یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہے اسی سند میں ایک راوی عبداللہ بن محرز ہے جو دار قطنی کے نزدیک متروک ہے۔ حضرت ابن عمر والی حدیث میں ثابت بن زہیر منکر الحدیث ہے۔ اس کی روایت کردہ احادیث روایات ثقات کے خلاف ہیں اسی لئے یہ قابل احتجاج نہیں کذا قال ابو حاتم وابن عدی وابن حبان۔

مسئلہ :- اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس طرح غیر مالی امور میں بالاجماع ایک شاہد کی شہادت مدعی کی قسم کے ساتھ ملا کر ڈگری دینے کے لئے کافی نہیں اسی طرح مالی امور میں مدعی کی قسم اور اس کے ساتھ ایک شہادت پر فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ جمہور کے نزدیک اگر مالی امور ہوں تو ایک شاہد کی شہادت کافی ہے بشرطیکہ مدعی سے صداقت و عدی پر قسم لے لی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شاہد کی شہادت کے ساتھ مدعی کی قسم کی بناء پر ڈگری دے دی تھی۔ اس حدیث کو ابن جوزی نے حضرت جابرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے نقل کیا ہے اور حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو سعید خدری، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت سہل بن سعد، حضرت عمارہ بن خرم، حضرت عمرو بن حزم، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت بلال بن حارث، حضرت سلمہ بن قیس، حضرت انس بن مالک، حضرت تمیم داری، حضرت زینب بنت ثعلبہ اور حضرت بیرق رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی مروی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی اور طحاوی رحمہم اللہ نے بسلسلہ عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی بحوالہ جعفر بن محمد عن ابیہ نقل کیا ہے، ترمذی نے یہ بھی کہا ہے کہ اس حدیث کو ثوری وغیرہ نے بیان کیا ہے یعنی ثوری نے بروایت مالک از جعفر از محمد مرسل نقل کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ دار قطنی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے الفاظ حدیث اس طرح نقل کئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گواہ اور صاحب حق کی قسم پر ڈگری دے دی۔ یہ سلسلہ منقطع ہے۔

دار قطنی نے العلل میں لکھا ہے کہ حضرت جعفر نے اس کو کبھی مرسل بیان کیا ہے اور کبھی موصول امام شافعی اور بیہقی نے بیان کیا کہ عبدالوہاب نے اس کو موصولاً نقل کیا ہے اور عبدالوہاب ثقہ ہے میں کہتا ہوں کہ ذہبی نے لکھا ہے کہ عبدالوہاب آخر میں مختلط الحواس ہو گیا تھا۔

marfat.com

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ (مدعی کی) قسم پر مع ایک گواہ کے رسول اللہ ﷺ نے ڈگری دے دی۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور طحاوی نے بیان کیا ہے۔ ترمذی نے اسکو حسن کہا ہے لیکن طحاوی نے اس کو منکر کہا ہے کیونکہ اس کے سلسلے میں قیس بن سعد راوی ہے اور قیس کے مروی عنہ عمرو بن دینار ہیں۔ طحاوی نے کہا ہم نہیں جانتے کہ قیس نے عمرو بن دینار سے کوئی حدیث بھی روایت کی ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گواہ اور قسم پر ڈگری دے دی اس روایت کو امام شافعی اور اصحاب السنن اور ابن حبان نے بیان کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اس حدیث کو سہیل بن ابو صالح نے بروایت ابو صالح بیان کیا ہے اور ربیعہ بن ابو عبدالرحمن نے بھی سہیل سے سنا ہے لیکن سہیل کی یادداشت اپنے شیخ کے متعلق بگڑ گئی تھی، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ مجھ سے ربیعہ نے کہا کہ میں نے ربیعہ کو اپنے باپ کی روایت سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول کی اطلاع دی ہے یہ قصہ شافعی اور طحاوی نے بروایت دراوردی بیان کیا ہے، بیہقی نے یہ حدیث بروایت مغیرہ بن عبدالرحمٰن ابوزیاد از اعرج از ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کی ہے امام احمد کا قول منقول ہے کہ اس موضوع کی احادیث میں اعرج کی حدیث سے زیادہ صحیح کوئی اور سلسلہ نہیں۔ طحاوی نے بروایت سہیل بن ابی صالح از ابیہ حضرت زید بن ثابت کے حوالہ سے حدیث مذکورر لکھی ہے اور حدیث کے منکر ہونے کی صراحت کی ہے کیونکہ بقول طحاوی ابو صالح کی کوئی روایت زید سے معلوم نہیں اس کے علاوہ اس سند کے سلسلہ میں عبداللہ بن وہب کا شیخ عثمان بن الحکم بھی ہے جو اس پایہ کا شخص نہیں کہ اسکی روایت سے ایسی حدیث ثابت کی جاسکے۔ میں کہتا ہوں ذہبی کا قول ہے کہ ابو حاتم کے نزدیک ابن وہب کا شیخ عثمان بن الحکم جرامی حکم نہ تھا

امام اعظمؒ نے فرمایا اگر یہ حدیث صحیح بھی ثابت ہو جائے تب بھی خبر آحاد ہے جس سے کتاب اللہ پر زیادتی ناجائز ہے۔ پھر یہ اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو اس سے زیادہ قوی ہے۔ شیخینؒ نے صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو ان کے دعوے کے مطابق دے دیا جائے تو کچھ لوگ لوگوں کے خون اور مال کا دعویٰ کرنے لگیں گے۔ لیکن قسم مدعیٰ علیہ پر (عائد ہوتی) ہے۔ بیہقی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں اور گواہ (پیش کرنا) مدعی کے ذمہ ہے اور (بصورت عدم شہادت) قسم منکر پر (عائد ہوتی) ہے۔ عمرو بن شعیب کی روایت اس طرح ہے کہ گواہ (پیش کرنا) مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ پر۔ رواہ الدار قطنی والترمذی۔

حضرت وائل بن حجر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدعی سے فرمایا اپنے گواہ لاؤ اس نے عرض کیا میرے گواہ نہیں ہیں فرمایا تو اس کی قسم (لے لو) اس نے عرض کیا اس وقت تو اس کو یعنی زمین کو لے جائے گا۔ ارشاد فرمایا اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (رواہ الطحاوی بطرق)، اب دونوں حدیثوں کا تعارض اس طرح دور کیا جائے گا رسول اللہ ﷺ نے جنس قسم کو مدعیٰ علیہ کے ذمہ قرار دیا اور مدعی پر عائد ہونے والی چیز سوائے، جنس قسم کے اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ جب مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان تقسیم کر دی گئی کہ ایک کے ذمہ شہادت پیش کرنا ہے اور دوسرے کے ذمہ قسم کھانا تو پھر قسم اور شہادت دونوں ایک شخص پر کس طرح ہو سکتے ہیں، تقسیم مخالف اشتراک ہے۔

طحاویؒ نے شافعیؒ کی پیش کردہ حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ حدیث قضیٰ بالشاھد و الیمین کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ یمین سے مراد ہو یمین مدعی دوسرا یہ کہ جب مدعی ایک شہادت سے زیادہ نہ لا سکا تو رسول اللہ ﷺ نے اس شہادت کی پرواہ نہیں کی اور مدعیٰ علیہ سے قسم لی تاکہ اسکے حق میں فیصلہ ہو سکے اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلا کہ صرف دعویٰ کرنے سے مدعی کو مدعیٰ علیہ سے قسم لینے کا استحقاق ہو جاتا ہے ایسا نہیں ہے کہ دعویٰ دائر کرنے کے بعد پہلے مدعی یہ ثابت کرے اور گواہ پیش کرے کہ اسکے اور مدعیٰ علیہ کے درمیان کچھ تعلقات اور روابط تھے (جن کی وجہ سے باہم لین دین یا مالی ردو بدل ہوا اور پھر معاملات میں اختلاف ہوا اور نوبت دعوے تک پہنچی) جیسا کہ بعض لوگوں کا قول ہے۔

marfat.com

یہ بھی احتمال ہے کہ الشاہد جس کی تنہا شہادت پر رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کر دیا خزیمہؓ ہوں کیونکہ حضرت خزیمہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے دو شاہدوں کے برابر قرار دیا تھا (گویا یہ واقعہ حضرت خزیمہؓ کا ہے جس کا حدیث میں ذکر ہے عام ضابطہ کا اظہار حدیث میں نہیں ہے) مگر میرے نزدیک یہ توجیہ بہت ہی بعید از قرائن ہے (سیاق حدیث کے خلاف ہے)

ہاں یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ الشاہد میں الف لام عہدی ہو (اور ایک شاہد مراد نہ ہو بلکہ) وہ شاہد مراد ہو جس کو شریعت نے (فیصلہ خصومات کے لئے) شاہد تسلیم کیا ہے یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عوتیں اور الیمین میں بھی الف لام عہدی ہو (یعنی وہ یمین جس کا شریعت نے حکم دیا ہے اور اس کو بصورت عدم شہادت تسلیم کیا ہے) یعنی منکر کی قسم۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الشاہد اور الیمین میں الف لام جنسی ہو جیسا کہ حدیث البینة علی المدعی والیمین علیٰ من انکر میں ہے مطلب یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ صرف شاہد اور یمین پر مبنی تھا (خواہ شہادت اور قسم سچی ہو یا جھوٹی) وحی وغیرہ پر مبنی نہ تھا (وحی اور انکشاف قلبی کا دخل فصل مقدمات میں نہ تھا) یا یوں کہا جائے کہ الف لام جنسی ہی ہے اور الیمین سے مراد ہے شاہد کی قسم یعنی رسول اللہ ﷺ نے شاہد کی شہادت مع القسم پر فیصلہ کر دیا مطلب یہ کہ اس سے لفظ اشھد کہلوایا کیونکہ اشھد بجائے خود صیغہ قسم ہے اور قبول شہادت کے لئے لفظ اشھد کہنا لازم ہے (بغیر اشھد کہنے کے شہادت شہادت نہ رہے گی ایک اطلاع ہو جائے گی)۔

یہ توجیہات اگرچہ بعید ہیں لیکن نصوص کے تعارض کو دور کرنے کیلئے ان کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، واللہ اعلم۔

اصل بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کی بناء اس اختلافی بحث پر ہے جو اصول فقہ میں ائمہ کے درمیان موجود ہے کہ خبر آحاد سے کتاب اللہ کے مفہوم پر زیادتی دوسرے اماموں کے نزدیک درست ہے اور امام اعظمؒ کے نزدیک جائز نہیں (پس حدیث مذکور میں جو ایک شہادت کو مع حلف مدعی کافی قرار دیا گیا، یہ حدیث خبر واحد ہے اور قرآن نے جو دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی تعداد شہادت بیان کیا ہے اس کے بیان پر اس حدیث نے زیادتی کی ہے اور خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں لہٰذا ایک شہادت مع قسم مدعی کی ڈگری کے لئے کافی نہیں، دوسرے ائمہ کا قول اس کے برعکس ہے)۔

مسئلہ :- جن امور کی اطلاع مردوں کو عموماً نہیں ہوتی ان میں تنہا عورتوں کی شہادت اجماعاً کافی ہے جیسے بچہ کی پیدائش، دوشیزگی، عورتوں کے اندرونی عیوب وغیرہ، امام اعظم رحمۃ اللہ کے نزدیک ایسے امور میں صرف ایک مسلمان آزاد صالح، عورت کی شہادت کافی ہے اور دو ہوں تو زیادہ مناسب ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک دو ہونا ضروری ہیں ایک کافی نہیں۔ امام شافعیؒ چار عورتوں کی شہادت ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے قائم مقام شریعت نے مانا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کیا عورت کی شہادت مرد کی شہادت سے آدھی نہیں ہے؟

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شہادت میں دو چیزیں ضروری ہیں تعداد اور گواہ کا مرد ہونا۔ ضرورت کے زیر اثر مرد ہونے کی شرط ساقط کر دی گئی لیکن تعداد کی شرط کو ساقط کرنے کی کوئی وجہ نہیں وہ باقی رہے گی، حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ امام محمد بن حسنؒ نے بروایت امام ابو یوسفؒ بوساطت غالبؒ بن عبد اللہ از مجاہد بیان کیا ہے کہ سعید بن میسّب اور عطاء بن ابی رباح اور طاؤس نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جن امور کو مرد (عادۃً اور معمولاً) نہیں دیکھ سکتے ان میں عورتوں کی شہادت جائز ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے (صحابی کا حوالہ نہیں دیا گیا) اور اس پر عمل واجب ہے۔ النِّساء میں الف لام جنسی ہے کوئی معہود معین نہیں لہٰذا ایک شہادت کافی ہے زیادہ ہوں تو بہتر ہے۔

عبد الرزاق نے بروایت ابن جریج زہری کا قول بیان کیا ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے کہ طریقہ (یعنی طریقہ رسول و خلفاء) یونہی چلا آیا ہے کہ جن امور پر مرد مطلع نہیں ہوا کرتے جیسے بچوں کی پیدائش اور عورتوں کے خصوصی عیوب ان میں عورتوں کی شہادت جائز ہے۔ عبد الرزاق نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ سوائے ان امور

کے جن پر عورتیں ہی مطلع ہوتی ہیں یعنی عورتوں کی اندرونی چیزیں۔ دوسرے امور میں تنہا عورتوں کی شہادت کافی نہیں۔ اس اثر کی تخریج دوسرے طریقوں سے بھی کی گئی ہے (مختلف سندوں سے حضرت ابن عمر کا یہ قول مروی ہے)۔

حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے دایہ کی شہادت کو جائز رکھا ہے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے بروایت محمد بن عبدالملک از اعمش بیان کیا ہے لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ محمد بن عبدالملک نے اعمش سے خود سماعت نہیں کی دونوں کے درمیان کوئی تیسرا شخص نامعلوم ہے۔

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، یعنی جو شہادت میں متہم نہ ہوں، فاسق ہونا، شرافت نفس کی پاسداری نہ ہونا، شاہد اور مدعیٰ علیہ کے درمیان دنیوی عداوت ہونا، مدعی اور شاہد کے درمیان قرابت (قریبہ) ہونا یہ تمام چیزیں شاہد کی شہادت کو متہم کر دیتی ہیں فاسق کی شہادت باتفاق علماء قابل قبول نہیں۔ روایت و خبر میں راوی کا عادل ہونا ضروری ہے اللہ نے فرمایا ہے اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا۔ تو شہادت میں بدرجہ اولیٰ عادل ہونے کی شرط لازم ہے (کیونکہ خبر سے کسی پر کوئی حکم لازم نہیں ہو جاتا اور شہادت سے حق لازم ہو جاتا ہے)۔

عدالت کا معنی ہے واجبات کو ادا کرنا اور کبائر سے پرہیز رکھنا اور صغیرہ گناہوں پر جمانہ رہنا، تفسیر کبائر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اللہ کا ساجھی بنانا، جادو کرنا، کسی کو مار ڈالنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں معرکہ سے بھاگنا، محصن ایماندار عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا، (متفق علیہ بروایت حضرت ابوہریرہ) ماں باپ کی نافرمانی کرنا، دانستہ جھوٹی قسم کھانا (بخاری بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو) جھوٹی گواہی دینا (متفق علیہ بروایت حضرت انس و حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما)۔

حضرت انسؓ اور حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو سب سے بڑے گناہ نہ بتادوں، شرک اور والدین کی نافرمانی۔ حضور اقدس ﷺ اس وقت تکیہ کا سہارا لگائے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا سن لو اور جھوٹ بولنا، سن لو اور جھوٹی شہادت دینا، حضور ﷺ ان الفاظ کو بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم نے (دل میں) کہا کہ کاش حضور (ﷺ) خاموش ہو جاتے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ زانی زنا کرتے وقت بحالت ایمان زنا نہیں کرتا (الحدیث) چوری کرنا، شراب پینا، لوٹنا، مال غنیمت میں خیانت کرنا (یہ بھی کبائر ہیں) رواہ البخاری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چار خصلتیں ہیں جس میں یہ چاروں ہوں گی وہ خالص (عملی) منافق ہوگا اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک ایک خصلت ہوگی اس میں نفاق کی خصلت رہے گی تاوقتیکہ اس کو ترک نہ کر دے۔ امانت میں خیانت کرے، بات کرے تو جھوٹی کہے، معاہدہ کرنے کے بعد توڑ دے، جھگڑے کے وقت فحش بکے (متفق علیہ بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو، بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) آیا ہے کہ حضور ﷺ نے مؤخر الذکر دونوں خصلتوں کی بجائے فرمایا کہ وعدہ کر کے اس کے خلاف کرے (گویا نفاق کی تین خصائل بتائیں امانت میں خیانت، دروغ گوئی اور وعدہ خلافی)

بعض علماء نے کہا کہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس کی کوئی دنیوی سزا (شرعاً) مقرر ہو۔ بعض نے کہا کہ کبیرہ وہ ہے جس کی حرمت نص قرآنی میں آئی ہو۔ بعض نے کہا کبیرہ وہ ہے جو بعینہ حرام ہو جیسے لواطت۔ عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کی معرفت حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خائن مرد و عورت کی شہادت جائز نہیں اور نہ کسی کینہ رکھنے والے کی اپنے بھائی (مسلمان) کے خلاف اور نہ گھر والوں کی طرف سے قانع کی شہادت، دوسروں کے لئے اس کی شہادت جائز ہے۔ قانع وہ شخص ہے جس کا خرچ اس کے گھر والوں کے ذمہ ہو، رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ و ابن دقیق العید و البیہقی، ابو داؤد کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ نہ خائن عورت کی اور نہ زانی کی اور نہ زانیہ کی، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اس سند میں ایک راوی

marfat.com

محمد بن راشد ضعیف ہے لیکن تنقیح میں ہے کہ امام احمد نے اس کو ثقہ مانا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہادت درست نہیں خائن مرد کی، نہ خائن عورت کی، نہ اس شخص کی جس کو سزا میں کوڑے مارے گئے ہوں، نہ کسی دشمن کی اپنے (دشمن) بھائی کے خلاف، نہ قانع کی اپنے گھر والوں کے لئے، نہ اس شخص کی جس پر ولادت یا قرابت کا گمان کیا گیا ہو (یعنی باپ کی بیٹے کے لئے یا بیٹے کی باپ کے لئے یا کسی رشتہ دار کی رشتہ دار کے لئے) رواہ الترمذی والدار قطنی والبیہقی بروایت یزید بن زیاد الدمشقی، یزید بن زیاد ضعیف ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جائز نہیں ہے شہادت باپ کی، نہ ماں کی اولاد کے لئے، نہ عورت کی اپنے شوہر کے لئے، نہ شوہر کی اپنی بی بی کے لئے، نہ غلام کی اپنے آقا کے لئے، نہ آقا کی اپنے غلام کے لئے، نہ شریک کی اپنے شریک کے لئے جب کہ اس چیز کے متعلق ہو جس میں دونوں کی شرکت ہے لیکن دوسری چیز کے متعلق جائز ہے اور نہ مزدور (یا ملازم) کی اس شخص کے لئے جس کا مزدور (یا ملازم) ہو، رواہ الخصاف بسندہ۔

مسئلہ:- امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا حاکم گواہ کی ظاہری عدالت کو دیکھ لے اتنا ہی اس کے لئے کافی ہے لیکن اگر فریق ثانی گواہ کی عدالت پر طعن کرے تو حاکم اس کے احوال دریافت کرے۔ صاحبینؒ کے نزدیک ظاہر باطن ہر طرح سے شاہد کے احوال دریافت کرنا حاکم پر لازم ہے خواہ فریق ثانی گواہ کے چال چلن پر جرح کرے یا نہ کرے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا جس گواہ کا صالح ہونا مشہور ہو اس کے احوال دریافت نہ کرے اور جس کا فاسق ہونا مشہور ہو اس کی شہادت رد کر دے اور جس کے صالح اور فاسق ہونے میں تردد ہو اس کے احوال دریافت کرے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے اس شخص کے جس کو زنا کی تہمت تراشی کی وجہ سے کوڑوں کی سزا دی گئی ہو باقی مسلمان باہم عادل ہیں (ہر ایک دوسرے پر شہادت دے سکتا ہے) رواہ ابن ابی شیبہ۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے (اپنی خلافت کے زمانہ میں) حضرت ابو موسیٰ اشعری کو تحریر لکھوا کر دی تھی جس میں یہ بات بھی درج تھی کہ مسلمان باہم عادل ہیں (سب کی شہادت سب کے مقابل قبول کی جا سکتی ہے) سوائے اس شخص کے جس کو زنا کی تہمت تراشی کی وجہ سے سزا دی گئی ہو یا جھوٹی شہادت دینے کی وجہ سے کوڑے مارے گئے ہوں یا مولیٰ و غلام یا رشتہ قرابت کا گمان کیا گیا ہو، رواہ الدار قطنی اس روایت کے ایک سلسلہ میں عبد اللہ ابو حمید ضعیف راوی ہے اور دوسرے سلسلہ کو دار قطنی نے حسن کہا ہے اور بیہقی نے ایک تیسرے سلسلہ سند سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

علماء حنفیہؒ کا قول ہے کہ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ یہ بھی علماء نے کہا ہے کہ امامؒ اور صاحبینؒ کا اختلاف اختلافِ دلیل پر مبنی نہیں ہے صرف زمانہ کے مختلف ہونے سے دونوں کے فتویٰ میں اختلاف ہے۔ امام صاحبؒ کے زمانہ میں عموماً لوگ صالح ہوتے تھے (فسق بہت کم تھے) اور صاحبینؒ کے زمانہ میں لوگوں کی حالت بگڑ گئی، حقیقت بھی یہی ہے جو علماء نے بیان کی ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں امام صاحبؒ کے قول پر فتویٰ ہونا چاہئے کیونکہ اس زمانہ میں کتابی شرائط کے مطابق کوئی شخص صالح ملتا ہی نہیں (سب ہی کسی نہ کسی صورت میں فاسق ہیں) اب اگر ہم شہادت کے دائرہ کو تنگ کر دیں گے تو حقوق تباہ ہو جائیں گے اور فیصلہ کے تمام راستے بند ہو جائیں گے بلکہ ہمارے زمانہ میں تو فاسق کی شہادت بھی قبول ہونی چاہئے بشرطیکہ وہ دنیا میں باوجاہت اور آبرو دار ہو اور گمان غالب ہو کہ وہ جھوٹی شہادت نہیں دے گا یا قرائن سے اس کی سچائی معلوم ہو رہی ہو۔

متأخرین نے گواہوں کی اندرونی حالت کی تفتیش کے قائم مقام حلف کو قرار دیا ہے (گواہوں سے بقسم شہادت لینا کافی سمجھا گیا ہے)۔

ایک اعتراض

یہ تو نص کے مقابلہ پر قیاسی توجیہ ہے جو نا قابل قبول ہے۔

marfat.com

جواب :- ایسا نہیں ہے بلکہ نص کا تقاضا ہی یہ ہے

فَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ کا تقاضا ہے کہ گواہ ہر زمانہ کے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ ہمارے زمانہ میں ابو حنیفہؒ جیسے لوگ شہادت دینے کے لئے کہاں سے آئیں گے، اس زمانہ میں تو کوئی مرد صالح ملتا ہی نہیں، رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا تم ایسے زمانہ میں ہو کہ جن امور کا تم کو حکم دیا جاتا ہے اگر ان کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دو گے تو تباہ ہو جاؤ گے، پھر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ اس زمانے کے لوگوں کو جو حکم دیا جائے گا اس کا دسواں حصہ بھی اگر وہ کر لیں گے تو نجات پا جائیں گے، رواہ الترمذی عن ابی ہریرہؓ۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بگڑے ہوئے زمانہ کے جو لوگ اللہ اور آخرت کے طلب گار ہوں گے ان کے گناہ اتنی کثرت سے اللہ معاف کر دے گا کہ نیکی کے دور کے نیک لوگوں کے اتنے گناہ معاف نہیں کرے گا اگرچہ اول الذکر گروہ کے گناہ مؤخر الذکر گروہ کے گناہوں سے بہت زیادہ ہوں گے کیونکہ قرن اول کے لئے جو گناہ تھے وہ بگڑے ہوئے زمانہ کے لوگوں کے لئے مباح ہوں گے (گناہ نہ ہوں گے) اس کی مثال یوں سمجھو کہ مجاہدین کا ایک لشکر ایسا ہے جو سب کا سب پورا پورا جہاد میں سرگرم رہا ہے اور دوسرا لشکر ایسا ہے کہ اس کے اکثر فوجی مقابلہ کے وقت بھاگ نکلے مگر کچھ لوگ کسی قدر ثابت قدم رہے، انعام کے وقت بادشاہ نے انہی مؤخر الذکر چند لوگوں کو (جنہوں نے جنگ میں پوری پوری کوشش بھی نہیں کی تھی مگر کس قدر ثابت قدم رہے تھے) اتنا انعام دیا کہ مجاہدین کاملین کے پورے لشکر کو اتنا انعام نہیں دیا۔ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے کبائر بھی معاف کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے صغائر کی بھی سزا دیتا ہے۔

مِنَ الشُّهَدَاءِ (گواہوں میں سے) مِنْ تبعیضیہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق بھی شہادت دینے کا اہل ہے اگر حاکم اس کی شہادت قبول کر لے تو جائز ہے لیکن گنہگار ہو گا کہ اس نے جستجوئے حق کی پوری پوری کوشش نہیں کی۔

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى دو عورتوں کی شہادت اس لئے ہونی چاہئے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے، جمہور قراء کی قرأت اَنْ تَضِلَّ اور فَتُذَكِّرَ ہے اَنْ ناصبہ ہے تَضِلَّ اَنْ کی وجہ سے منصوب ہے اور فَتُذَكِّرَ کا عطف تَضِلَّ پر ہے اس لئے یہ بھی منصوب ہے۔

حمزہ کی قرأۃ میں اِنْ شرطیہ اور تَضِلَّ شرط ہے اور فَتُذَكِّرُ مرفوع ہے اور پورا جملہ بن کر جزا ہے۔ تَضِلَّ پر شرط کی وجہ سے جزم ہونا چاہئے، مگر تشدید کی وجہ سے جزم نہ آسکا اور فَتُذَكِّرُ کا فاعل ضمیر ہے اور اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى مفعول ہے اور پورا جملہ ہو کر مبتدا محذوف کی خبر ہے اور جملہ اسمیہ بنکر شرط کی جزا ہے ذکر (یاد) نسیان (بھول) کی ضد ہوتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی عقل ناقص اور حافظہ کمزور ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا دانشمند مرد کی عقل کو زائل کرنے والی ناقص العقل ناقص الدین عورتوں سے زیادہ میں نے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ عورتوں نے عرض کیا، ہماری عقل میں کیا کمی ہے فرمایا کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے آدھی نہیں ہے۔ عورتوں نے جواب دیا بے شک ہے۔ فرمایا یہ اس کی عقل کی کمی کی وجہ سے ہے۔ عورتوں نے عرض کیا، ہمارے دین میں کیا کمی ہے۔ فرمایا حیض کی حالت میں نہ وہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے کیا ایسا نہیں ہے۔ یہی اس کے دین کی کمی ہے۔

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور جب گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ بعض علماء نے کہا کہ طلب کئے جانے سے مراد ہے گواہ بن جانے کے لئے طلب ہونا چونکہ آئندہ ایسے لوگوں کو شاہد بننا ہوتا ہے اس لئے مجازاً پہلے سے ہی ان کو شُهَدَاءَ فرما دیا۔ اس تفسیر پر بعض لوگوں نے کہا کہ امر وجوبی ہے، بعض نے کہا کہ اگر کوئی اور شاہد نہ ہو تو واجب ہے اور دوسرے گواہ ہوں تو تعمیل طلب واجب نہیں اختیاری ہے، یہی قول حسن بصریؒ کا ہے بعض کے نزدیک امر استحبابی ہے، کچھ

marfat.com

علماء نے طلب سے مراد لی ہے ادائے شہادت کے لئے طلب۔ یہی قول مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ کا ہے۔ اس تفسیر پر امر جوبی ہو گا کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔

حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی کو ادائے شہادت کے لئے بلایا گیا اور اس نے شہادت کو چھپا لیا تو وہ جھوٹی شہادت دینے والے کی طرح ہو گا۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط۔ اس سند کے سلسلہ میں عبداللہ بن صالح راوی بھی ہے جو لیث (بن سعد) کا کاتب تھا اور بخاری نے اس کو حجت قرار دیا ہے۔

مسئلہ :- اگر گواہ کو ادائے شہادت کے لئے حاکم کے اجلاس میں طلب کیا جائے تو بعض کے نزدیک جانا واجب ہے۔ بشرطیکہ حاکم کا اجلاس قریب ہو دور ہو تو جانا واجب نہیں، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ دکھ نہ دیا جائے کاتب کو نہ گواہ کو۔ نصر کا قول ہے کہ اگر عدالت اتنی دور ہو کہ گواہ جا کر دن کے دن واپس گھر آسکتا ہو تو جانا واجب ہے اس وقت گواہ کو تکلیف نہ ہو گی۔

مسئلہ :- اگر گواہ بوڑھا ہو اور مدعی اسکو اپنی سواری پر سوار کرے تو کوئی حرج نہیں (ایسے گواہ کی شہادت قابل قبول ہے) سلیمان کا قول مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گواہوں کو کرایہ کی سواری پر سوار کر کے اپنی جائیداد کو لے گیا تو ایسے گواہوں کی شہادت غیر مقبول ہے۔ النوازل میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے کہ اگر گواہ بوڑھا ہے پیدل چل نہیں سکتا اور نہ سواری کا کرایہ دینے کے لئے پیسے ہیں (اور مدعی نے کرایہ دے دیا) تو اس کی شہادت مقبول ہے ورنہ نامقبول، ابن ہمام نے کہا یہ فتویٰ محل تائل ہے کیونکہ گواہوں کی عزت کرنے کا حکم ہے (اور پیدل گھسیٹنا اعزاز نہیں اہانت ہے)۔

مسئلہ :- اگر کھانا پہلے سے تیار ہو اور صرف گواہوں کے سامنے لا کر ان کو کھلا دیا جائے تو ایسے گواہوں کی شہادت مقبول ہے۔ لیکن اگر گواہوں کے لئے کھانا تیار کیا اور انہوں نے کھا لیا تو گواہی مردود ہے، یہ امام صاحبؒ کا قول ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں شہادت غیر مقبول ہو گی۔ امام ابو یوسفؒ دونوں صورتوں میں شہادت کو قبول کرتے ہیں۔ ابن ہمامؒ نے کہا یہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ عرفاً ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی عزت دار آدمی کسی کے گھر جاتا ہے تو صاحب خانہ اس کو کھانا کھلاتا ہے، جانے والا گواہ ہو یا نہ ہو۔ یہ فتویٰ اس صورت میں ہے کہ کھانے کی شرط پہلے سے نہ کر لی گئی ہو۔ اگر پہلے سے شرط کر لی تو یہ مزدوری اور رشوت ہو جائے گی جو حرام ہے۔ نہ گواہ کے لئے لینا جائز ہے نہ طالب شہادت کے لئے دینا۔ ایسے شاہد کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی خواہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا گواہ ہو یا صرف یہی گواہ ہو دوسرا کوئی گواہ نہ ہو اور اجرت مقرر کر دی گئی ہو، امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر گواہ متعین ہو کوئی دوسرا گواہ نہ ہو تو اجرت لینا جائز ہے اور شہادت کے لئے اگر یہی شخص متعین نہ ہو بلکہ دوسرے بھی گواہ ہوں تو اجرت لے لینا جائز ہے کیونکہ اس صورت میں گواہی دینا فرض نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی دوسرا گواہ نہ ہو تو شہادت دینا اس گواہ کے لئے فرض عین ہے ورنہ فرض کفایہ ہے اور اگر عدم فرضیت ہم تسلیم بھی کر لیں تو بہر حال مستحب ہو گا (یعنی عبادت نافلہ کے حکم میں) اور عبادت کی اجرت لینا ہمارے نزدیک درست نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں دوزخ میں۔ رواہ الطبرانی فی الصغیر عن ابن عمر باسناد حسن۔

وَلَا تَسْـَٔمُوٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا قرض یا حق یا تحریر کو لکھنے سے تم تنگ دل نہ ہو جاؤ معاملات کی کثرت تم کو تحریر کی طرف سے تنگدل نہ بنا دے چھوٹا ہو حق یا بڑا بہر حال۔

اِلٰٓى اَجَلِهٖ وقتِ ادا کے تعین کے ساتھ اس کو لکھ لو۔

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک بڑے انصاف کی بات ہے۔

وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ اور ادائے شہادت کو بہت قائم رکھنے والا ہے۔

وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا یعنی شہادت کے وقت تم قرض کی جنس یا مقدار یا وقتِ ادا کی میعاد کے متعلق شک میں نہ پڑ جاؤ

marfat.com

تحریر کو اس سے بڑا قرب حاصل ہے۔ اَقْوَمُ اور اَدْنٰیٓ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ کے مضمون کو واضح کر رہے ہیں۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ اللہ کے نزدیک تحریر مدعی اور مدعی علیہ دونوں کے حق میں بڑی انصاف کی چیز ہے۔ نہ مدعی بھولے گا نہ مدعی علیہ۔ مدعی زیادہ نہ مانگے گا اور مدعی علیہ صرف تحریر کے موافق اقرار کرے گا اور شاہد کی شہادت کو بھی تحریر بہت درست رکھنے والی ہے ادائے شہادت کے وقت وہ کمی بیشی نہیں کرے گا اور فریقین معاملہ نیز گواہوں کے شک میں نہ پڑ جانے سے اس کو بہت قرب حاصل ہے۔ (کسی کو شک کرنے کا موقع نہیں ملے گا)۔

مسئلہ :- شاہد کے لئے کتابت کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کو یاد کرے جس کی اس کو شہادت دینی ہے جب تک اس کو خود اپنا معاینہ (تفصیل کے ساتھ) یاد نہ ہو محض تحریر پر اپنی دستخط دیکھ کر گواہی دینا جائز نہیں۔ کذا ذکر القدوری وغیرہ۔ صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے یہ امام اعظمؒ کا قول ہے لیکن صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف اپنی دستخط دیکھ کر شہادت دینی جائز ہے خواہ اپنا معاینہ اس کو یاد نہ ہو۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ صرف دستخط دیکھ کر شہادت کا ناجائز ہونا بالاتفاق ہے، اختلاف اس امر میں ہے کہ کیا حاکم بھی ایسی شہادت پر ڈگری دیدے یا نہ دے۔ اسی طرح اس تحریر کا حکم ہے جو مدعی کے پاس ہو اور گواہوں کی شہادت اس میں درج ہو کیونکہ ایک تحریر دوسری تحریر کے مشابہ ہو سکتی ہے اور دستاویز میں ردوبدل کیا جانے کا احتمال ہے۔

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر تحریر شہادت شاہد کے قبضہ میں ہو تو گو اس کو معاینہ اور شہادت یاد نہ ہو لیکن اس کے مطابق شہادت دینا اس کے لئے جائز ہے کیونکہ ایسی تحریر میں تغیر کا احتمال نہیں ہے۔

یہ قول صاحبینؒ کا ہے لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ عدم جواز کے قائل ہیں۔ صاحبینؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ تحریر میں جب ردوبدل کا احتمال ہی نہیں تو وہ یادداشت کی طرح مانی جائے گی۔ دیکھو صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ رسول اللہ ﷺ کی تحریروں پر ویسا ہی عمل کرتے تھے جیسا زبانی احکام پر کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن جحش کی تحریر والا قصہ آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْہِ کی تفسیر کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ امام صاحبؒ کی دلیل یہ ہے کہ شہادت مشاہدہ پر موقوف ہے، اسی لئے لفظ شہادت ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب تم آفتاب کی طرح دیکھ لو تو شہادت دو (پس تحریر کا یادداشت کے حکم میں ہونا تحریر کو مشاہدہ نہیں بنا دیتا اور قطعی مشاہدہ کے بغیر شہادت درست نہیں اس لئے صرف اپنی دستخطی تحریر کو دیکھ کر شہادت دینا درست نہیں)۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ ہاں اگر دست بدست تجارت ہو جس کا لین دین تم فوراً کرتے ہو تو۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ (اس کو نہ لکھنے کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اَنْ تَکُوْنَ میں ضمیر ہے اور تِجَارَۃً خبر۔ بعض قاری تِجَارَۃٌ حَاضِرَۃٌ رفع کے ساتھ پڑھتے ہیں اور تُدِیْرُوْنَھَا کو خبر قرار دیتے ہیں۔ جمہور کی قرات پر تُدِیْرُوْنَھَا تجارت کی صفت ہے بشرطیکہ تَکُوْنَ کو تامہ قرار دیا جائے اور تِجَارَۃٌ کو مرفوع پڑھا جائے اور اگر تَکُوْنَ کو ناقصہ اور تجارۃ کو اس کا اسم کہا جائے گا تو تدیرونہا خبر ہوگی۔

لفظ حَاضِرَۃً عام ہے خواہ مبادلہ عین کا عین سے ہو یا کسی چیز کو قیمت سے خریدا جائے مگر ہو دست بدست نقد۔

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ اور خرید و فروخت کے وقت گواہ بنا لیا کرو۔ ضحاک اور داؤد نے (ظاہر لفظ کے لحاظ سے) امر کو وجوب کے لئے قرار دیا ہے، لہٰذا فروخت نقد قیمت پر ہو یا ادھار پر۔ بہر حال گواہ بنا لینا لازم ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا شروع میں وجوب تھا لیکن آیت فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا سے یہ وجوب منسوخ ہو گیا۔ جمہور کے نزدیک امر استحبابی ہے (بہتر ہے کہ گواہ بنا لیا کرو) بکثرت خرید و فروخت کے وقت رسول اللہ ﷺ نے کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ چنانچہ امام احمدؒ نے عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عمارہ رضی اللہ عنہ کے چچا جو صحابیؓ تھے بیان کرتے تھے

marfat.com

کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدا اور فوراً اس جگہ سے چل دیئے تاکہ گھوڑے کی قیمت ادا کر دیں۔ لیکن اعرابی نے کچھ تاخیر کی اتنے میں لوگ آکر اعرابی سے گھوڑے کا بھاؤ تاؤ کرنے لگے ان کو معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کو خرید چکے ہیں۔ بعض نے قیمت بڑھا بھی دی۔ قیمت میں اضافہ دیکھ کر اعرابی نے جناب رسول اللہ ﷺ کو آواز دی اور کہا اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو تم خرید د، ورنہ میں فروخت کئے دیتا ہوں۔ آواز سنتے ہی رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور اعرابی سے فرمایا کیا میں تم سے اس کو نہیں خرید چکا ہوں، اعرابی نے کہا نہیں خدا کی قسم میں نے تو نہیں بیچا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلا شبہ میں نے خرید لیا ہے۔ اعرابی بولا کوئی گواہ لاؤ جو شہادت دے کہ میری تمہاری خرید و فروخت ہو چکی ہے۔ لوگ اعرابی سے کہنے لگے ارے رسول اللہ ﷺ غلط بات نہیں کہہ سکتے، اتنے میں خزیمہ رضی اللہ عنہ آگئے اور بولے میں شہادت دیتا ہوں کہ تیری رسول اللہ ﷺ سے خرید و فروخت ہو چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف رخ موڑا اور فرمایا تم کس بنا پر شہادت دے رہے ہو (خرید و فروخت کے وقت تو موجود ہی نہ تھے) خزیمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ صرف آپ کی سچائی کا یقین رکھتے ہوئے (میں نے شہادت دی) چنانچہ خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔

(ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ ان دیکھے واقعہ کی شہادت جائز نہیں اور خزیمہؓ نے محض تصدیق رسول اللہ ﷺ کی بنا پر بغیر دیکھے ہوئے شہادت دی تھی۔ اول تو یہ فعل ناجائز تھا اور اگر اس سے خزیمہؓ کی ایمانی قوت پر استدلال بھی تسلیم کر لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی شہادت کو فیصلہ کن شہادت کیوں قرار دیا اس شبہ کو دور کرنے کے لئے)۔

ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو خرید و فروخت ہو چکنے کا پہلے ہی علم ویقین تھا آپ ﷺ جانتے تھے کہ اعرابی جھوٹا ہے جو فروختگی کا انکار کر رہا ہے۔ خزیمہؓ کی شہادت کی بنا پر آپ نے تکمیل عقد کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ رہی یہ بات کہ تنہا خزیمہؓ کی گواہی کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ نے خزیمہؓ کے ایمان کی قوت اور فہم و دانش کی پختگی ملاحظہ فرمائی تھی۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ اگر حاکم کو کسی واقعہ کا یقینی علم ہو تو اپنے علم کے مطابق اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ کیونکہ دو آدمیوں کی شہادت سے گمان غالب حاصل ہوتا ہے (یقین حاصل نہیں ہوتا) اور حاکم کا علم بجائے خود یقینی ہے اور یقین کا درجہ ظن سے اونچا ہے یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت سیدہ فاطمہؓ کے خلاف اس حدیث کی بناء پر فیصلہ کیا جو خود (تنہا) آپ نے سنی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا ہم انبیاء کے گروہ (اپنے بعد اپنے مال کا کسی کو) وارث نہیں بناتے۔

ایک مسئلہ یہ بھی اس حدیث سے نکلتا ہے کہ اگر بادشاہ یا حاکم وغیرہ کا کسی پر کوئی حق ہو یا اس نے کسی سے کچھ خریدا ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ اس سے اپنا حق جبراً وصول کرے خواہ وہ شخص انکاری ہو (اور حاکم کے پاس شہادت نہ ہو) لیکن اگر یہ مدعی حق کسی دوسرے حاکم کی عدالت میں اپنے حق کی چارہ جوئی کریگا تو اس وقت شہادت کی ضرورت ہو گی، تنہا اس کا ذاتی یقین دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہ ہوگا اور حاکم کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ بادشاہ یا کسی مدعی حق قاضی کے ذاتی یقین کی بنا پر اس کو ڈگری دیدے۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۚ طاؤسؒ، حسنؒ اور قتادہؒ نے اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر کاتب اور گواہ معین ہوں (یعنی وہاں نہ کوئی دوسرا کاتب ہو، نہ گواہ) تو کتابت یا شہادت سے انکار کر کے یہ دونوں خرید و فروخت کرنے والوں کو ضرر نہ پہنچائیں، نہ کتابت و شہادت میں رد و بدل اور تحریف کر کے کسی فریق کو نقصان پہنچائیں۔ اس صورت میں لا یضار فعل معروف ہو گا لیکن یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ فریقین معاملہ کی طرف سے نہ کاتب کو دکھ دیا جائے نہ گواہ کو۔ مثلاً کاتب کی اجرت نہ دیں اور گواہ کو شہادت کے لئے ایسی حالت میں طلب کریں کہ وہ اپنے کام میں مشغول ہو یا بیمار ہو یا کمزور ہو اور شہادت کا اس پر حصر بھی نہ ہو بلکہ دوسرے گواہان واقعہ موجود ہوں۔ اس صورت میں لا یضار فعل مجہول ہو گا۔

marfat.com

وَاِنْ تَفْعَلُوْا اور جس ضرر رسانی سے ہم نے تم کو منع کر دیا ہے، اگر وہ فعل کرو گے (اور ضرر پہنچاؤ گے)۔
فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ تو یہ اللہ کی نافرمانی ہو گی جس کا تم کو حق نہیں۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ کے حکم کی مخالفت سے ڈرتے رہو۔
وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ اور اللہ تم کو ایسی باتیں سکھاتا ہے جن سے تمہارے دین و دنیا کی مصلحتیں وابستہ ہیں۔
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ لفظ اللہ کو تین جملوں میں تین بار ذکر کیا کیونکہ ہر جملہ اپنا خاص مقصد رکھتا ہے۔ پہلے جملہ میں ترغیب تقویٰ ہے، دوسرے جملہ میں وعدۂ انعام ہے اور تیسرے جملہ میں اللہ کی عظمت شان کا اظہار ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ اور اگر تم سفر میں ہو یعنی مسافر ہو۔
وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا اور کوئی کاتب تمہیں نہ ملے۔
فَرِهٰنٌ ابن کثیرؒ اور ابو عمروؒ کی قرأت میں فَرُهُنٌ ہے باقی قراء نے فَرِهٰنٌ پڑھا ہے رهان، رَهْنٌ کی جمع ہے جیسے بغال بَغْلٌ کی۔ اور رُهُنٌ، رهان کی جمع ہے۔ فراءؒ اور کسائیؒ کی یہی تحقیق ہے۔ ابو عبیدہ کے قول پر رُهُنٌ، رَهْنٌ کی جمع ہے جیسے سُقُفٌ سَقْفٌ کی جمع ہے۔

لغت میں رَهْنٌ کا معنی ہے کسی چیز کو روک لینا۔ اللہ نے فرمایا کل نفس بما کسبت رهینۃ ہر شخص اپنے اعمال سے وابستہ ہے۔ اصطلاح شریعت میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کو کوئی شخص اپنے حق کے عوض (جائز طور پر) روک لے تاکہ اس سے اپنا حق وصول کر سکے۔ چونکہ روک لینا لغوی معنی ہے اور شرعی معنی میں لغوی معنی ملحوظ رہتے ہیں، اس لئے عقد رہن ایک عقد لازم ہے۔ گرو کرنے والا جب تک گرو رکھنے والے کے ایک درہم کا بھی قرضدار رہے گا اپنی چیز واپس لینے کا مستحق نہیں ہوتا فَرِهٰنٌ ترکیب نحوی کے لحاظ سے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یا فعل مجہول محذوف کا فاعل ہے یعنی فلیئو خذ رَهْنٌ یا فعلیکم رهان۔

بالاجماع امر ایجابی نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی رہنمائی ہے۔ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا شرط ضرور ہے۔ چونکہ ایسا ہوتا ہی ہے کہ کاتب نہ ملنے کی صورت میں اعتماد کے لئے کوئی چیز رہن رکھ دی جاتی ہے۔ اس لئے شرط کا مفہوم ان لوگوں کے نزدیک بھی اس جگہ معتبر نہیں جو مفہوم کو معتبر قرار دیتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ انتفاء شرط کے وقت انتفاء حکم ہو جاتا ہے) لہٰذا بالاجماع شہروں کے اندر قیام کی حالت میں جہاں کاتب بھی موجود ہوں رہن رکھنا جائز ہے۔ ہاں مجاہد اور داؤد کا قول ہے کہ رہن رکھنا صرف سفر کی حالت میں جب کہ کاتب نہ مل سکے جائز ہے (ورنہ ناجائز ہے) ہم اپنی دلیل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو پیش کرتے ہیں جو تمام کتب صحاح میں موجود ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں جس کو بخاری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس بیس صاع جو کے عوض رہن رکھی تھی۔ یہ جو حضور ﷺ نے اپنے گھر والوں کے صرف کے لئے (قرض) لئے تھے اور وفات اقدس تک وہ زرہ اس یہودی کے پاس رہن رہی۔

مَّقْبُوْضَةٌ یعنی رہن مع قبضہ کے ہو۔ اسی قید کی وجہ سے امام اعظمؒ اور امام احمدؒ اور امام شافعیؒ قائل ہیں کہ بغیر مال مرہون پر قبضہ کے عقد رہن لازم نہیں ہوتا۔ امام مالکؒ کہتے ہیں صرف عقد کرنے سے رہن لازم ہو جاتا ہے اور راہن کو مجبور کر کے مال رہن پر مرتہن کا قبضہ کرانا چاہئے۔

ہم کہتے ہیں رہن کا جواز مع لزوم لفظ مَقْبُوْضَةٌ سے ثابت ہو رہا ہے ورنہ قیاس کا تو تقاضا ہے کہ رہن عقد لازم نہ ہو، صرف راہن کا تبرع ہو، کیونکہ اپنا مال مرتہن کے پاس رکھنے کے عوض اس کو کچھ نہیں ملتا۔ (قرض کی ادائیگی تو بہر حال اس کے ذمہ لازم ہوتی ہے) لہٰذا اقتضائے قیاس کے خلاف جب رہن کا لزوم نص قرآنی میں آگیا ہے تو اس کا اقتصار اس کے مقام پر

marfat.com

ہی رکھا جائے گا اور لزوم رہن قبضۂ مرتہن کی صورت میں مانا جائے گا۔ لزوم رہن کے لئے قبضہ کی شرط چونکہ امام اعظمؒ کے نزدیک ضروری ہے اسی لئے آپ کے نزدیک مشاع (وہ مشترک چیز جس کے ہر جز میں شرکت ہو اور تقسیم اجزاء نہ کی گئی ہو) کا رہن جائز نہیں خواہ قابل تقسیم ہو یا نہ ہو کیونکہ دونوں شریکوں کی شرکت جب ہر ہر جز میں ہو گی تو وہ چیز ہمیشہ ایک کے قبضہ میں نہیں رہے گی بلکہ کچھ مدت کے لئے ایک کے قبضہ میں چلی جائے گی اور کچھ مدت کے لئے دوسرے کا اس پر قبضہ ہو جائے گا تو گویا مشاع کو رہن رکھنا ایسا ہو گا جیسے راہن بوقت رہن یوں کہے کہ میں تیرے پاس یہ چیز ایک دن کے لئے رہن رکھتا ہوں۔ دوسرے دن یہ چیز رہن نہ ہو گی (پھر تیسرے دن رہن رہے گی اور چوتھے دن نہ رہے گی) اور یہ طریقہ غلط ہے کیونکہ رہن بمعنی حبس (ادائیگی قرض تک) مرتہن کے مسلسل قبضہ کو چاہتا ہے مطلق کا رجوع فرد کامل کی طرف ہوتا ہے۔ ہبہ کی صورت اس کے خلاف ہے۔

(امام اعظمؒ کے نزدیک قابل قسمت چیزوں کا ہبہ بغیر قبضہ کے لازم نہیں اور جو چیز قابل تقسیم نہیں جیسے جائیداد اس کا ھبہ بغیر قبضہ کے درست ہے۔ ہبۂ مشاع سے مانع فقط یہ ہے کہ ہبہ کرنے والے پر تقسیم کا بار پڑے گا اور یہ بار تقسیم صرف قابل تقسیم چیزوں میں پڑتا ہے نا قابل تقسیم چیزوں میں نہیں پڑتا (لہٰذا اول الذکر صورت ناجائز ہے اور مؤخر الذکر جائز) امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مشاع کا رہن مطلقاً جائز ہے قابل تقسیم ہو یا نہ ہو۔

مسئلہ :- جب مرتہن کا مالِ مرہون پر قبضہ ہو جائے تو وہ چیز راہن کی ملک میں رہتی ہے۔ صرف مرتہن کے قبضہ میں چلی جاتی ہے گویا حق ملکیت راہن کا ہوتا ہے اور حق قبضہ مرتہن کا۔ اس لئے رہن کے قبضہ کی تکمیل کے بعد راہن کے لئے مالِ مرہون سے نفع اندوزی کی اجازت نہیں نہ سواری کے جانور پر سوار ہو سکتا ہے نہ کپڑا پہن سکتا ہے نہ مکان میں رہ سکتا ہے۔ ہاں اگر مرتہن اجازت دیدے تو خیر۔ بات یہ ہے کہ مال مرہون مرتہن کے قبضہ میں ہر وقت رہنا چاہئے اور راہن کی مال مرہون سے کسی قسم کی نفع اندوزی سے بعض اوقات (خواہ تھوڑی دیر ہی کے لئے ہو) مالِ مرہون پر مرتہن کا قبضہ نہیں رہے گا۔ یہ مسلک امام اعظمؒ کا ہے لیکن امام شافعیؒ کا قول ہے کہ مالِ مرہون سے نفع اندوزی راہن کے لئے جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ رہن (کے جانور) پر سواری لی جاتی ہے (اور اس کا) دودھ دوہا جاتا ہے۔ یہ حدیث دار قطنی اور حاکم نے بروایت اعمش از ابو صالح از ابو ہریرہؓ نقل کی ہے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے اس کو معلل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ میرے باپ نے ایک مرتبہ اس حدیث کو مرفوعاً بیان کیا تھا۔ پھر رفع کو ترک کر دیا (اور موقوفاً بیان کیا) دار قطنی اور بیہقی نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو مرفوع ہونے پر ترجیح دی ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث مجمل ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ رہن کے جانور پر سواری لیا جانا راہن کے لئے ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ مرتہن کے لئے ہو۔ لہٰذا اس حدیث سے راہن کے لئے جواز ثابت نہیں ہوتا۔

مسئلہ :- مالِ مرہون میں راہن کا ہر شرعی تصرف ناجائز ہے لیکن اگر اس نے کوئی تصرف کر لیا تو تصرف بجائے خود ہو جائے گا، مگر اس کا نفاذ مرتہن کی اجازت یا مالِ مرہون کی واگذاشت پر موقوف رہے گا۔ کیونکہ نفس شئی کی ملکیت تو راہن کو حاصل ہی ہے لیکن یہ حکم ان تصرفات کا ہے جو فسخ ہونے کے قابل ہیں جیسے بیع، ہبہ وغیرہ اور جو تصرفات فسخ کے قابل نہیں جیسے غلام کو آزاد کرنا تو چونکہ ان کے فسخ ہونے کا امکان ہی نہیں ہے اور ملکیت راہن کو حاصل ہی ہے اس لئے ایسے تصرفات کا نفاذ ہو جائے گا اب اگر راہن مالدار ہو گا تو آزاد کردہ غلام کی قیمت بجائے غلام کے مرتہن کے پاس بطور رہن رکھنا لازم ہو گا اور اگر مفلس ہو گا تو غلام محنت مزدوری کر کے اپنی قیمت مرتہن کے پاس رکھ دے گا۔ یہ مسلک امام اعظمؒ اور امام احمدؒ کا ہے۔ امام مالکؒ کی رائے ہے کہ بیع کی طرح غلام کی آزادی بھی مرتہن کی اجازت یا رہن کی واگذاشت پر موقوف رہے گی۔ امام شافعیؒ نے فرمایا اگر راہن مالدار ہو گا تو ہر صورت میں اس کا تصرف جاری ہو جائے گا۔ (اور مال مرہون کا عوض بطور رہن مرتہن کے پاس رکھنا ہو گا) اور مفلس ہو گا تو اس کا کوئی تصرف جاری نہ ہو گا۔

marfat.com

مسئلہ :- راہن چونکہ مرہون کا مالک ہے اس لئے مرہون کا ہر خرچ راہن کے ذمہ ہے اور مرہون سے جو کچھ پیدا ہو جیسے بچے، اون، دودھ، پھل وغیرہ وہ راہن کا ہے۔ اس پر اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کچھ فائدہ ہو وہ بھی راہن ہی کا ہے اور جو نقصان ہو وہ بھی راہن ہی کا ہے۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک مرہون کی پیداوار مرتہن کی ہے۔ لیکن التحقیق میں ابن جوزیؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتضاء یہی ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک بھی مرہون کی پیداوار راہن ہی کی ہے۔ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ مرتہن جو کچھ مرہون پر خرچ کرے اس کو مرہون کے دودھ اور سواری سے وصول کرنے کا اس کو حق ہے (گویا مرتہن کو مرہون کا دودھ لینا اور اس پر سوار ہونا جائز نہیں اور نہ اس کے ذمہ مرہون کا دانہ گھاس ہے لیکن اگر مرہون پر وہ کچھ خرچ کرے تو مرہون کی پیداوار اپنے خرچ کے عوض لے سکتا ہے)۔

مسئلہ :- مرہون کی تمام پیداوار (بچے، اون وغیرہ) مرتہن کے پاس بطور رہن رہے گی۔ اس کو بھی اصل مرہون کا حکم حاصل ہوگا البتہ راہن کی ملکیت ہوگی۔ مگر قبضہ مرتہن کا ہوگا اور چونکہ مرتہن کو حق ملکیت حاصل نہیں اس لئے مرہون میں وہ کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور نہ مرہون سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے ورنہ سود ہو جائے گا۔

مسئلہ :- مرتہن اگر راہن کی اجازت سے مال مرہون پر کچھ خرچ کرے تو وہ راہن پر قرض ہوگا اور اگر بغیر اجازت صرف کرے تو ایک قسم کا احسان ہوگا (راہن پر قرض نہ ہوگا) امام احمدؒ کا قول ہے کہ ہر صورت میں راہن کے ذمہ قرض ہوگا اور مرتہن مرہون کے دودھ اور سواری سے اس کو وصول کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ابن جوزیؒ نے اس قول کی دلیل میں حدیث الرہن مرکوب محلوب پیش کی ہے اور اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو بخاری نے بحوالہ شعبی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ الرہن بمافیہ یرکب بنفقتہ اذاکان مرہونا ولبن الدریشرب بنفقتہ اذاکان مرہونا وعلی الذی یرکب و یشرب النفقۃ۔ ابو داؤد کی روایت میں یشرب کی جگہ یحلب ہے۔ طحاوی کی روایت بالفاظ ذیل ہے الرہن یرکب بنفقتہ اذاکان مرہونا ولبن الدر یشرب بنفقتہ اذاکان مرہونا (حسب استدلال ابن جوزی مطلب یہ ہے کہ) رہن مع اُس چیز کے رہن ہے جو مرہون کے اندر ہو (یعنی جو مرہون سے پیدا ہو جیسے دودھ، اون، بچہ وغیرہ) اس پر جو کچھ خرچ ہو اس کے عوض اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور دودھ دینے والے (مرہون) جانور کا دودھ پیا جا سکتا ہے اور جو شخص سوار ہو یا دودھ پیئے اس کے ذمہ مرہون کا خرچ ہے۔ ہم جواب میں کہتے ہیں اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوار ہونے والے پر مرہون کا خرچ ہے لیکن اجماع اس امر پر ہے کہ رہن کا خرچ راہن کے ذمے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم حرمت ربوا سے پہلے تھا جب کہ منفعت آفریں قرض کی ممانعت نہیں کی گئی تھی اور جبکہ کسی چیز کو کسی چیز کے عوض لینے کی نہی نہیں ہوئی تھی، خواہ معیار شرعی کے لحاظ سے دونوں چیزیں مساوی نہ ہوں۔ بشرطیکہ دونوں کے مالکوں میں پہلے سے خرید و فروخت نہ ہوئی ہو۔ اس کے بعد آیت ربوا سے منفعت انگیز قرض کی حلت منسوخ کر دی گئی تقاضائے اجماع یہی ہے اللہ نے فرمایا ہے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ دوسری آیت میں ہے کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔

رہا حدیث کا یہ فقرہ کہ الرہن بمافیہ۔ تو یہ منسوخ نہیں ہے مگر اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ جس دَین (قرض) کے عوض کوئی مال رہن رکھا گیا ہے وہ مال قرض کی ضمانت میں رہے گا یعنی اگر قرض مال مرہون کی قیمت کے برابر یا اس سے کم ہوگا تو مال مرہون تلف ہونے کی صورت میں قرض بھی ساقط ہو جائے گا اور جتنا مال مرہون قرض سے زائد ہوگا وہ امانت سمجھا جائے گا اور اتنی مقدار کے تلف ہونے کا حکم امانت کے تلف ہونے کے حکم کی طرح ہوگا)۔

مسئلہ :- اگر راہن مر جائے تو گرو کا مال راہن کے قرض خواہوں کو نہیں دیا جائے گا بلکہ بیچ کر مرتہن کا قرض ادا کیا جائے گا کیونکہ مالِ رہن مرتہن کے قبضہ میں تو ہوتا ہی ہے اور اس کو ملکیت کا استحقاق بھی (دوسروں سے زائد) ہوتا ہے کیونکہ اس کا قبضہ اسی لئے ہوتا ہے کہ اگر اس کا قرض وصول نہ ہو سکے تو وہ مالِ رہن سے اپنا قرض وصول کرے۔

marfat.com

مسئلہ :- اگر مرتہن کے قبضہ میں رہن کا مال بغیر مرتہن کے قصور کے تلف ہو جائے تو امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک مرتہن پر اس کا ضمان پڑے گا (اگرچہ مالِ رہن کے تلف ہونے میں مرتہن کا کوئی قصور نہ ہو) کیونکہ مالِ رہن پر مرتہن کا قبضہ تھا اور وہ (عدم وصول قرض کی صورت میں) اس کو بیچ کر اپنا قرض وصول کر سکتا تھا یعنی قبضۂ استیفا تھا اب وہ مال اس کے قبضہ میں تلف ہو گیا تو (گویا) قرض مکمل وصول ہو گیا۔ اس کے بعد اگر راہن سے یہ اپنے قرض کا مطالبہ کرے گا تو سود ہو جائے گا۔ امام مالکؒ کے نزدیک مرتہن پر ضمان بالقیمہ ہوگا (یعنی مالِ رہن کی جو قیمت بازاری ہوگی وہ مرتہن پر پڑے گی۔ کیونکہ وصولِ قرض مالِ رہن کی قیمت کے اعتبار سے ہی ہوتا ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا قیمتِ رہن اور مقدارِ قرض سے جو چیز کم ہوگی اتنی مرتہن پر پڑے گی اور باقی حصہ بطور امانت رہے گا۔

طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی فیصلہ نقل کیا ہے۔

قاضی شریحؒ، حسنؒ بصری اور شعبیؒ کے نزدیک رہن مضمون بالدّین مانا جائے گا (رہن تلف ہو گیا اس کی قیمت کم تھی یا زیادہ بہر حال قرض کا معاوضہ وصول شدہ قرار دیا جائے گا، مالِ رہن کی قیمت زیادہ ہو تو راہن کو بقیہ قیمت نہیں دی جائے گی اور کم ہو تو مرتہن کو بقیہ قرض نہیں ملے گا)۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مالِ رہن امانت تھا اگر مرتہن کے قصور سے تلف ہوا ہو تو ضمان دینا ہوگا ورنہ کچھ نہیں (اصل قرض قابل وصول رہے گا) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ رہن کرنے والے سے رہن کے مال کو بند کر کے نہ رکھ لیا جائے مالِ رہن اسی کا ہے جس نے گرو رکھا ہے۔ رہن کا نفع بھی اسی کا ہے اور رہن کا نقصان اسی پر ہے۔ رواہ ابن حبان فی صحیحہ والدار قطنی والحاکم من طریق زیاد بن سعد عن الزہری عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرۃؓ مرفوعاً۔

دار قطنیؒ نے لکھا ہے کہ زیاد بن سعد حافظ اور ثقہ ہے اور یہ حدیث حسن اور متصل السند ہے۔ ابن ماجہ نے اسحاق بن راشد کے طریق سے بحوالہ زہری اس کو بیان کیا ہے اور حاکم نے مختلف طریقوں سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث اس کو لکھا ہے۔ اوزاعی، یونس اور ابن ابی ذئب نے بروایت زہری از سعید بن المسیب اس کو مرسل نقل کیا ہے۔ شافعی نے بروایت ابن ابی فدیک و ابن ابی شیبہ از وکیع از ابن ابی الذئب اور عبد الرزاق نے بروایت ثوری از ابن ابی ذئب اس کو نقل کیا ہے ابو داؤد، بزاز اور دار قطنیؒ کے نزدیک اس حدیث کا مرسل ہونا صحیح ہے۔ دار قطنی اور بیہقی نے کچھ دوسری سندوں سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ لیکن وہ تمام اسنادیں ضعیف ہیں۔ ابن حزم اور دار قطنی نے از شبابہ از ورقاء از ابن ابی ذئب از زہری از سعید بن مسیب و ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن از ابی ہریرۃؓ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رہن نہ روک رکھا جائے رہن رہن کرنے والے کا ہے رہن کا نفع اسی کا ہے اور نقصان بھی اسی پر ہے۔ ابن حزم نے اس سند کو حسن اور ابن عبد البر نے صحیح اور عبد الحق نے موصول قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے اس سند میں ایک شخص عبد بن نصر ہے جس کی احادیث منکر ہیں اور حدیث کے آخری الفاظ کہ رہن کا نفع اسی کا ہے اور نقصان بھی اسی پر ہے۔ بعض لوگوں نے سعید بن مسیب کے داخل کردہ قرار دیئے ہیں۔ ابو داؤد نے مراسیل میں یہی لکھا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا کہ ان الفاظ کا مرفوع یا موقوف ہونا مختلف فیہ ہے۔ ابن ابی ذئب اور معمر وغیرہ نے مرفوع کہا ہے اور دوسرے علماء نے موقوف کہا ہے۔ حدیث مذکور سے امام شافعیؒ کی صورت استدلال یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مال مرہون اصل راہن کی ملک سے خارج نہیں ہوتا (مرتہن کا اس پر صرف قبضہ ہو جاتا ہے) لایغلق الرھن کا یہی معنی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حدیث کا یہ معنی نہیں ہے۔ بلکہ اصل معنی وہ ہے، جو ابن جوزی کی روایت میں آیا ہے۔ ابن جوزی نے ابراہیم نخعی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ لوگ کسی کے پاس مال رہن رکھتے تھے اور کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر فلاں وقت تک ہم قرض ادا کر دیں تو خیر ورنہ یہ مال تمہارا ہو جائے گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لایغلق الرھن (یعنی اگر مدت مقررہ کے اندر فک رھن نہ ہو سکے تب بھی وہ مال مرتہن کا نہیں ہو جاتا) طحاوی نے بھی

marfat.com

اپنی سند سے ابراہیم نخعی کا یہ بیان نقل کیا ہے اور مالک بن انس اور سفیان بن سعید بھی حدیث کی تشریح اسی طرح کرتے تھے۔ رہ گئے آخری فقرے له غنمه اور علیه غرمه تو (اس کا یہ معنی نہیں کہ اگر مال مرہون سالم رہے، تب بھی راہن کا ہے اور تلف ہو جائے تب بھی راہن کا مال ہلاک ہوگا بلکہ) باجماع علماء یہ مطلب ہے کہ مال رہن میں کچھ بیشی ہو (مثلاً مرہون جانور کے بچے ہو جائیں یا دودھ ہو) تو وہ راہن کی ہے اور جو کچھ مرہون کے کھلانے پلانے میں صرف ہو وہ بھی راہن کے ذمہ ہوگا۔

ہم وجوبِ ضمان کے قائل ہیں، ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو طحاوی نے بسلسلہ محمد بن خزیمہ از عبید اللہ بن محمد تیمی از عبد اللہ بن مبارک از مصعب بن ثابت از عطاء بن ابی رباح بیان کی ہے کہ کسی آدمی نے ایک گھوڑا رہن لیا اور مرتہن کے قبضہ میں وہ گھوڑا مر گیا اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا حق جاتا رہا۔ یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے (یعنی تابعی نے اس حدیث میں صحابی کا ذکر نہیں کیا نہ کسی صحابی کا حوالہ دیا) اسی طرح ابن جوزی نے بحوالۂ دار قطنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت دو ضعیف سندوں سے بیان کی ہے۔ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ رہن کی قیمت کا جو زائد حصہ ہو (قرض میں مجرانہ کیا جاسکتا ہو) وہ امانت رہے گا اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ وصول قرض صرف اتنے حصہ سے ہو جاتا ہے جو قرض کے برابر ہو (باقی امانت ہی کے حکم میں ہونا چاہئے)۔

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا پس اگر تم میں سے ایک دوسرے کو امین سمجھتا ہو۔ یعنی قرض دینے والا قرض لینے والے کی طرف سے مطمئن ہو اور قرض دار کی امانت کی وجہ سے تحریر یا رہن رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا ہو۔ حضرت ابیؓ کی قرأت میں فَإِنِ ائْتَمَنَ ہے معنی ایک ہی ہیں۔

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ پس جس کی امانت پر اطمینان کر لیا گیا ہو اس پر لازم ہے کہ امانت دار کی امانت یعنی قرض دینے والے کا قرض ادا کر دے۔ قرض کو امانت اس لئے فرمایا کہ اس میں تحریر اور رہن کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور قرض دار کو امین سمجھ لیا گیا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ دوران خطبہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں وعدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔ رواہ البیہقی فی الشعب۔

وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ اور خیانت اور انکارِ حق کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اس بیان میں (حکم ادا کی) چند طرح سے تاکید کی گئی ہے۔ جس حدیث سابق الذکر میں منافق کی تین نشانیاں بیان کی گئی ہیں اس میں یہ بھی (منافق کی نشانی قرار دی گئی) ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ یعنی اے گواہو، قرض داروں کے خلاف گواہی کو نہ چھپاؤ، اگر وہ خیانت کریں اور اداء امانت نہ کریں اور واجب الاداء حق کے منکر ہو جائیں، یا یہ مراد ہے کہ اے قرض دارو، تم پر جو حقوق واجب ہیں ان کی شہادت کو نہ چھپاؤ اور اپنے خلاف حق کا اقرار کر لو۔

وَمَنْ يَكْتُمْهَا اور جو شہادت حق کو چھپائے گا۔

فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ تو بلا شبہ اس کا دل گناہ گار ہے۔ قَلْبُهُ آثِمٌ کا فاعل ہے یا آثِمٌ خبر مقدم اور قَلْبُهُ مبتدا مؤخر ہے اور پورا جملہ إِنَّ کی خبر ہے۔ گناہ کی نسبت قلب کی طرف اس لئے کی کہ چھپانا دل ہی کا فعل ہے۔ اصل فاعل کی طرف فعل کی نسبت کرنے سے فعل میں شدّت اور قوّت پیدا ہو گئی۔ جیسے کہتے ہیں میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اپنے کانوں سے سنا، اپنے دل سے یاد رکھا۔ یا دل کی طرف نسبت کرنے کی یہ وجہ ہے کہ دل تمام اعضاء کا سردار ہے، اس کے افعال کا مرتبہ بھی سب افعال سے بڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بنی آدم کے بدن میں ایک بوٹی ایسی ہے کہ جب وہ ٹھیک ہوتی ہے تو سارا بدن ٹھیک ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ بوٹی دل ہے۔ رواہ الشیخان عن النعمان بن بشیر۔ بعض علماء نے کہا کہ دل کے گناہ گار ہونے سے مراد ہے دل کا مسخ ہو جانا۔

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸۳﴾ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی واقف ہے یعنی شہادت دینے

ع ۳۹/۲

اور شہادت کو چھپانے سے واقف ہے یہ جملہ بطور تہدید ہے۔ اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ شہادت کو چھپانا حرام ہے مشہود لہ، خواہ طلب نہ کرے مگر ادائے شہادت فرض ہے اگر مشہود لہ کو شاہد کا شاہد ہونا معلوم بھی نہ ہو تب بھی شاہد پر لازم ہے کہ اپنے شاہد ہونے کی اطلاع مشہود لہ کو دے دے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ طلب شہادت کے بغیر شہادت دینی مذموم ہے کیونکہ حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری بہترین امت میرے زمانہ کی ہے۔ ان کے بعد ان لوگوں کا مرتبہ جو ان کے متصل آئیں گے پھر ان کا مرتبہ ہے جو ان (صحابہؓ) کے متصل ہوں گے ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو بلا طلب شہادت دیں گے خیانت کریں گے، امانت دار نہ ہوں گے، نذریں مانیں گے، مگر پوری نہیں کریں گے اور عموماً ان میں فربہی ہوگی (یعنی موٹے، بے غیرت، بے حیا، حرام خور ہوں گے)۔

دوسری روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ بلا طلب قسمیں کھائیں گے۔ (متفق علیہ) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہؓ کی عزت کرو۔ یہ تم میں سب سے اچھے ہیں ان کے بعد ان لوگوں کا مرتبہ ہے جو ان سے متصل آئیں گے پھر ان لوگوں کا درجہ ہے جو ان سے متصل ہوں گے پھر کذب پھیل جائے گا۔ یہاں تک کہ آدمی بلا طلب قسمیں کھائے گا اور بلا طلب شہادت دے گا۔ رواہ النسائی واسنادہ صحیح۔ اس موضوع پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی طرح ہے۔ حضرت ابن مسعود (رضی اللہ عنہما) کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ ان کی شہادت قسموں سے پہلے اور قسمیں شہادت سے پہلے ہوں گی طحاوی نے مؤخر الذکر دونوں روایتیں نقل کی ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ مذمومہ شہادت سے مراد ہے جھوٹ کی شہادت حدیث کے الفاظ ثم یفشو الکذب و یخونون ولا یؤتمنون و ینذرون ولا یوفون۔ کا یہی تقاضا ہے۔ طحاوی نے بوساطت مالک حضرت زید بن خالد جہنی کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم کو بتاؤں کہ سب سے اچھا گواہ کون ہے سب سے اعلیٰ گواہ وہ ہے جو درخواست سے پہلے ہی اپنی شہادت دیدے یا طلب شہادت سے پہلے اپنی شہادت کی اطلاع دیدے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے یعنی سب کچھ اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اسی کے زیر حکم ہے اور اسی کی ملک ہے۔ بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز مادی اور جسمانی ہے مادہ اور جسمیّت سے خالی کوئی مخلوق نہیں۔ ورنہ اس جگہ اللہ کی خالقیّت اور مالکیّت کا بیان ناقص ہوگا کیونکہ غیر مادی مخلوق کے مالک ہونے کا اظہار زیادہ اہم ہے (اور آیت میں غیر مادی مخلوق کو اللہ کے زیر حکم اور ملکیّت کے اندر ظاہر نہیں کیا گیا ہے) لیکن یہ استدلال غلط ہے۔ بکثرت ممکنات غیر مادی ہیں۔ انسانوں کی روحیں ملائکہ وغیرہ سب مادہ سے خالی ہیں۔ اہل دل واقف ہیں کہ قلب روح سر خفی اخفی تمام کے تمام غیر مادی ہیں، اللہ ہی اپنی مخلوق سے واقف ہے کہ کتنی ہے مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ رہی اس کی وجہ کہ آیت میں صرف موجودات سماوی وارضی کا ہی ذکر کیوں کیا گیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ عوام کی نظر صرف انہی چیزوں کو دیکھتی ہے، صانع کا وجود ثابت کرنے کے لئے انہی کا ذکر کافی ہے۔ استدلال میں صرف وہی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جو عوام کی نظر کے سامنے ہوں اور ان کو معلوم ہوں، ایسے امور کو محل استدلال میں نہیں پیش کیا جا سکتا جو خواص سے بھی پوشیدہ ہوں، اسی لئے اس جگہ عرش و کرسی کا ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ وہ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے خارج اپنی مستقل ہستی رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے اس کو ظاہر کر دیا چھپاؤ (اللہ اس سے واقف ہے) انسان کی نفسانی اور قلبی بیماریاں بہت ہیں جیسے نفاق، دکھاوٹ، بیجا تعصب، دنیا کی محبت، غصہ، غرور، پندار، آرزو، حرص، ترکِ توکل، ترکِ صبر، حسد، کینہ وغیرہ۔

حضرت جبیر بن مطعمؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جو اپنے (جاہلیت کے)

marfat.com

تعصب پر (کنبہ جتھ کو) بلاتا ہے اور ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جو اپنے (جاہلی) تعصب پر مرتا ہے۔ رواہ ابو داؤد۔

حضرت حارثہ بن وہبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے جنتی ہر وہ ضعیف ہے جس کو کمزور سمجھا جاتا ہے لیکن اگر وہ خدا کے اعتماد پر قسم کھالیتا ہے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دیتا ہے۔ میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے۔ دوزخی ہر وہ شخص ہے جو درشت خو، مال کو جوڑ جوڑ کر رکھنے والا اور مغرور ہو۔ (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں مال کو جوڑ جوڑ کر رکھنے والا زنیم مغرور۔ [1]

حسن بصریؒ کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا کی محبت ہر گناہ کی چوٹی ہے (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھنا ایمان ہے اور ان سے بغض رکھنا نفاق ہے۔ رواہ ابن عدی۔

حضرت جابرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھنا ایمان کا (جزء یا علامت) ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور انصار سے محبت رکھنا ایمان (کا جزء یا نشان) ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور عرب سے محبت رکھنا ایمان (کا جزء یا نشان) ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور جس نے میرے صحابہؓ کو گالی دی اس پر اللہ کی لعنت، اور جس نے میرے اصحابؓ کے بارہ میں میرا لحاظ رکھا میں قیامت کے دن اس کا لحاظ رکھوں گا۔ رواہ ابن عساکر۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علیؓ سے محبت کرنا عبادت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خود فرمایا قسم ہے اس کی جو دانہ کو چیر کر سبزہ نکالتا ہے اور جاندار کو پیدا کرتا ہے، مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تجھ سے محبت نہیں کرتا ہے مگر مؤمن اور تجھ سے بغض نہیں رکھتا ہے مگر منافق۔ رواہ مسلم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے اندر عیسیٰؑ کی مشابہت ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے یہودیوں نے اتنی عداوت کی کہ ان کی والدہ پر (زنا کی) تہمت لگائی اور عیسائیوں نے ان سے اتنی محبت کی کہ ان کو اس مقام پر لے گئے جو ان کے لئے سزا وار نہ تھا (یعنی خدا کا بیٹا کہنے لگے) یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے فرمایا میرے سلسلہ میں دو (طرح کے) آدمی ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک تو حد سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والا، جو میرے اندر افراطِ محبت کی وجہ سے ایسی چیزیں قرار دے گا جو مجھ میں نہیں ہیں۔ دوسرا وہ شخص جو مجھ سے بغض رکھتا ہے اور میری عداوت اس سے مجھ پر الزام تراشی کرائی ہے۔ (رواہ احمد)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کا ارشاد ہے بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری تہ بند (یعنی بڑائی اور عظمت میرا خصوصی وصف ہے) جو شخص ان میں سے کسی ایک کو مجھ سے کھینچے گا (یعنی بڑائی یا عظمت کا دعویدار بنے گا) میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا۔ (رواہ مسلم) حضرت عطیہؓ سعدی کی مرفوع روایت ہے کہ غصہ شیطان (کے اثر یا غلبہ) سے ہوتا ہے۔ رواہ (ابو داؤد)، بہز بن حکیم نے بوساطت حکیم اپنے دادا کی مرفوع روایت بیان کی کہ غصہ ایمان کو اس طرح بگاڑ دیتا ہے جیسے ایلوا شہد کو، رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

عمرو بن شعیب نے بوساطت شعیب اپنے دادا کی مرفوع روایت بیان کی کہ اس اُمت کی اول ترین سنوار یقین اور دنیا سے بے رغبتی ہے اور اول ترین بگاڑ بخل اور آرزو ہے۔ (رواہ البیہقی) حضرت سعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے فیصلہ پر راضی رہنا آدمی کی خوش نصیبی ہے اور قضاء خداوندی سے ناراضگی آدمی کی بدبختی۔ (رواہ احمد والترمذی) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ نصف شعبان کی رات میں اللہ اپنی مخلوق کی طرف خاص نظر فرماتا ہے اور سوائے مشرک اور دل میں کینہ رکھنے والے کے سب کو بخش دیتا ہے۔ (رواہ الدار قطنی) ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ نفسانی فضائل و عیوب کے متعلق ان گنت حدیثیں آئی ہیں۔

---

[1] زنیم اس شخص کو کہتے جو رشتہ اور قرابت کے لحاظ سے تو کسی اور خاندان کا فرد ہو لیکن اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلہ میں دو جا گھسے اور اپنا نسب مؤخر الذکر قبیلہ سے جوڑ دے۔

marfat.com

شعبی اور عکرمہ نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کی ہے کہ اخفاء شہادت کا جو خیال تمہارے دلوں کے اندر ہوگا اس کو ظاہر کر دیا نہ کرو۔ اللہ اس کی حساب فہمی کرے گا۔ مقاتل نے یہ مطلب بیان کیا کہ کافروں سے دوستی کا جو خیال تمہارے دلوں میں ہوگا اس کو ظاہر کر دیا چھپاؤ اللہ اس کا محاسبہ کرے گا۔ گویا اس آیت میں اسی مضمون کو بیان کیا ہے جس کو آل عمران میں بیان کیا ہے۔ آل عمران میں فرمایا ہے لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اس حکم کے آخر میں فرمایا قل اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ الآیۃ۔ تحقیق یہ ہے کہ اخفاء شہادت ہو یا کفار کی دوستی دونوں کو مافی انفسکم کا لفظ شامل ہے، تعین مراد بلا ثبوت ہے لفظ عام ہے۔ نصوص شرعیہ اور اجماع سے ثابت ہے کہ بلا تخصیص ہر ارادہ مخفی کا مؤاخذہ ہوگا۔ بعض علماء نے کہا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ سے مراد ہے عملی گناہ کا محکم عزم۔ عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے میں نے سفیان (ثوری) سے پوچھا کیا ارادہ پر بھی بندہ کا مؤاخذہ ہوگا، سفیان نے کہا ہاں، اگر ارادہ محکم ہو۔

میں کہتا ہوں کہ عزم پر بھی اگر مؤاخذہ ثابت ہو جائے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ عزم (اگرچہ عملی گناہ نہیں مگر) قلبی گناہوں میں داخل ہے (اور ہر گناہ کا مؤاخذہ ضروری ہے) لیکن صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی کسی گناہ کا ارادہ کرے اور کرنہ پائے تو وہ نہیں لکھا جاتا اور کر لیتا ہے تو اتنا ہی لکھا جاتا ہے (پس عمل سے پہلے ارادۂ گناہ خواہ محکم ہی ہو قابل مؤاخذہ نہیں۔ ہاں محاسبہ جدا چیز ہے وہ ضرور ہوگا)۔

یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ قیامت کے دن اللہ تم سے اس کی حساب فہمی کریگا۔

فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ اب یہ حساب فہمی اگر خفیف ہوگی صرف پیشی کی حد تک تو جس کو بخشنا چاہے گا بخش دیگا اور اگر تحقیقاتی حساب فہمی ہوگی تو اس کی گرفت ہوگی۔

وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ اور جس کو عذاب دینا چاہے گا اللہ عذاب دے گا ابو جعفر، ابن عامر عاصم اور یعقوب نے فَیَغْفِرُ اور وَیُعَذِّبُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے جواب شرط ہونے کی بنا پر جزم کے ساتھ قرأت کی ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھنے والا ہے یعنی عذاب و مغفرت وغیرہ پر۔ کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا وہ چاہے تو چھوٹے گناہ پر بھی عذاب دے اور چاہے تو بڑے گناہ کو بغیر توبہ کے معاف کر دے۔

اہل سنت کا اجماع ہے کہ تمام گناہوں کی حساب فہمی حق ہے۔ قلبی گناہ ہوں یا باطنی یا جسمانی اور چھوٹے بڑے تمام گناہوں کی سزا دینا بھی حق ہے۔ مگر لازم نہیں بلکہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے۔ کہ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اگر چاہے گا تو کبیرہ گناہوں کو بھی معاف کر دے گا، خواہ گناہ کرنے والے نے توبہ کی ہو یا نہ کی ہو اور وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے گا تو چھوٹے گناہ پر بھی عذاب دے گا، کوئی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ معتزلہ و رافضی آخرت کے حساب کے منکر ہیں۔ معتزلہ وغیرہ کہتے ہیں کہ گناہ گاروں کو عذاب دینا واجب ہے۔

ہمارے قول کا ثبوت اس آیت سے بھی ہوتا ہے اور دوسری آیات سے بھی اور احادیث سے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن جس شخص کا بھی محاسبہ ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا کیا اللہ نے فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا نہیں فرمایا ہے ارشاد فرمایا یہ تو صرف پیشی ہوگی مگر جس سے حساب میں جھگڑا کیا گیا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (متفق علیہ) حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ مؤمن کو (اتنا) قریب کر لے گا کہ اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر چھپا دے گا اور فرمائے گا کیا تجھے (اپنا) فلاں گناہ معلوم ہے، کیا تجھے (اپنا) فلاں گناہ معلوم ہے۔ بندہ عرض کرے گا، اے میرے رب بیشک (مجھے اپنا گناہ یاد ہے) جب اللہ اس سے اقرار کرا لے گا اور وہ خیال کرے گا کہ بس اب میں ہلاک ہو گیا۔ تو فرمائے گا دنیا میں میں نے تیرا یہ گناہ چھپایا تھا (تجھے رسوا نہیں کیا تھا) آج میں معاف کرتا ہوں اس کے بعد نیکیوں کا صحیفہ اس کے ہاتھ میں دیدیا جائے گا۔ رہے کافر اور منافق تو علی الاعلان ان کے متعلق پکار کر

marfat.com

فرمائے گا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ، متفق علیہ۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ایک آدمی حاضر ہوا، اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ کر اس نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ میرے کچھ غلام ہیں جو مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں، میرے مال میں خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں؛ میں ان کو گالیاں دیتا اور مارتا ہوں میرا ان سے یہ سلوک کیسا ہے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو ان کے جھوٹ، خیانت، نافرمانی اور تیری سزا کا حساب لگایا جائے گا اگر تیری سزا ان کے قصور کے برابر ہوگی تو برابر سرابر معاملہ چھوٹ جائے گا، نہ تیرا فائدہ ہوگا نہ ضرر۔ اگر سزا قصور سے کم ہوگی تو بقیہ حصہ تیرے لئے سودمند ہوگا (یعنی جس گناہ کی تو نے سزا نہیں دی ہوگی اس کا ثواب ملے گا) اور اگر سزا قصور سے زائد ہوگی تو زیادتی کا عوض ان کو تجھ سے دلوایا جائے گا۔ (رواہ الترمذی) حساب اور مغفرت کے سلسلہ کی حدیثیں اَن گنت بکثرت ہیں۔

فصل

بعض لوگ جنت میں بلا حساب داخل ہوں گے۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے مجھ سے میرے رب نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار آدمیوں کو بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمائے گا اور ہر ایک کے ساتھ ستر ستر ہزار شخص ہوں گے اور (پھر) میرے رب کے تین لپ (بھر) بھی (بلا حساب وکتاب) جنت میں داخل ہوں گے۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ۔
حضرت اسماء بنت یزیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا، پھر ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا، کہاں ہیں وہ لوگ جنکے پہلو بستروں سے الگ رہتے تھے۔ کچھ لوگ کھڑے ہوجائیں گے مگر وہ تھوڑے ہوں گے ان کو جنت میں بلا حساب داخل کر دیا جائے گا۔ پھر باقی لوگوں کو حساب کیلئے جانے کا حکم ہوگا۔ رواہ البیہقی۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے ہوں گے، شگون نہیں لیتے ہوں گے اور اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھتے ہوں گے۔ (متفق علیہ) حضرت ابن عباسؓ سے ایک طویل حدیث میں اسی طرح مروی ہے۔
میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کی رفتارِ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا حساب جنت میں جانے والے اہل تصوف ہی ہوں گے جو اللہ کے عاشق ہیں کیونکہ آیت وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ میں اللہ نے حساب فہمی کو نفسانی گناہوں سے متعلق فرمایا ہے۔ اس آیت میں اظہار اور اخفاء دونوں کو محاسبہ کے لئے مساوی قرار دیا ہے۔ جیسے آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ میں استغفار اور عدم استغفار کو مساوی قرار دیا ہے۔ حساب فہمی اگرچہ اعمال اعضاء کی بھی ہوگی کچھ نفسانی گناہوں کی ہی خصوصیت نہیں ہے۔ لیکن اعمال کے مقابلہ میں نفسانی رذائل شدید ترین ہوتے ہیں ان کی بدی زیادہ ہے اور جسمانی گناہ بھی انہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ تزکیۂ نفس اور جلاء قلب کے بعد گناہوں کا ارتکاب بہت ہی کم ہوتا ہے اس لئے صرف باطنی گناہوں کی حساب فہمی کا ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے بدن کے اندر ایک ایسی بوٹی ہے کہ جب وہ درست ہوتی ہے تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے اور وہ دل ہے۔
تمام آلودگیوں سے قلب کی صفائی اور نفس کے پاکیزہ و مطمئن ہونے کے بعد بھی آدمی سے کبھی گناہ کا صدور ہوجاتا ہے تو اس کو فوراً ندامت ہوتی ہے اور توبہ کرلیتا ہے۔ اس طرح اس کی بدیاں نیکیوں سے بدل جاتی ہیں اللہ غفور رحیم ہے اسکو معاف کر دیتا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت ہے کہ گناہ سے توبہ کرنیوالا بیگناہ کی طرح (ہوجاتا) ہے، رواہ ابن ماجہ والبیہقی
شرح السنۃ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث آئی ہے کہ گناہ پر پشیمانی توبہ ہے۔ صوفیہ ہی وہ لوگ ہیں جن کو حدیث مبارک میں فقراء مؤمنین کے نام سے ذکر کیا گیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت (کے دروازہ) کی زنجیر کو ہلانے والا سب سے پہلے میں ہی ہوں گا اللہ جنت (کا دروازہ سب سے پہلے) میرے لئے کھول دے گا اور مجھے اندر داخل

marfat.com

فرمائے گا اس وقت میرے ساتھ فقراء مؤمنین ہوں گے اور (میرا یہ کلام بطور) فخر نہیں ہے۔ آیت وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ کی تفسیر میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

فقیر وہی ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ صوفیہ کے پاس بھی کچھ نہیں ہوتا، نہ اپنا وجود، نہ متعلقاتِ وجود (وہ اپنی ہستی مرضیٔ مولیٰ کے حصول کے لئے وقف کر دیتے ہیں) امراض نفسانیہ اور باطنی گناہ تو ان سے بالکل ہی سلب ہو چکتے ہیں، وجود اور کمالاتِ ہستی ان کے پاس ضرور ہوتے ہیں مگر وہ ان کمالات کو اللہ کی امانت اور ودیعت سمجھتے ہیں اور ہر کمال کو خداداد جانتے ہیں اور ہر نیکی کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں (گویا اپنی ذات کو نیکی سے متصف بھی نہیں کرتے اور نہ کسی اچھے کام کا صدور اپنی ذات سے جانتے ہیں) اسی لئے کسی اچھے کام سے ان کے اندر نہ غرور پیدا ہوتا ہے، نہ فخر، نہ الوٰہیت باطلہ کا کوئی شائبہ۔ حدیث مذکور میں حضور اقدس ﷺ نے اپنے ساتھ ستر ہزار کا داخلہ بتایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے۔ غالباً اول ستر ہزار سے تو حضور ﷺ کی مراد وہ لوگ ہیں جو بجائے خود کامل ہونے کے بعد دوسرے کاملوں کے لئے رہنما ہوتے ہیں۔ جیسے انبیاء اور بہت سے اولیاء مرشدین ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایسے ستر ہزار علماء راسخین اور اولیاء صالحین اور صدیقین ہوں گے جن کے لئے اول گروہ راہنما اور مرشد ہوتا ہے اول گروہ کامل گروں کا ہے اور دوسرا کاملوں کا۔

رہا اللہ کے تین لپ بھر لوگوں کا داخلہ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد کثرت ہے (ورنہ اللہ کے لپ کا نہ کوئی مفہوم ہے نہ لپوں کی تعداد کا) اللہ کے تو ایک لپ میں اول آخر سارا جہان آجاتا ہے (تین لپ کا کیا معنی) قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں اور تمام آسمان لپیٹے لپٹائے اس کے دست قدرت میں ہوں گے۔ پس غالباً تین لپ فرمانے سے انسانوں کی تین قسمیں مراد ہیں۔ ایک گروہ وہ جنہوں نے راہ خدا میں اپنی جانیں دیدیں یعنی شہداء، دوسرا گروہ وہ جنہوں نے مرضیٔ مولیٰ کی طلب میں اپنی عمریں اس کی اطاعت میں صرف کر دیں یہ گروہ ان باصفا مریدوں کا ہے جو مذکورہ بالا مکملین و کاملین کے دامن سے وابستہ ہے۔ تیسرا گروہ وہ جنہوں نے مرضیٔ خدا حاصل کرنے کے لئے اپنے مال خرچ کئے وہ گروہ اول اور دوسرے نمبر کے گروہ کے درجہ تک تو نہ پہنچ سکا مگر ان کی راہ پر چلنے والا ضرور ہے (پس یہی تین گروہ اللہ کے تین لپوں میں ہوں گے اور ہر لپ بھر کر اللہ ایک ایک گروہ کو جنت میں داخل فرمائے گا) رب پر ہی بھروسہ رکھنا صوفیہ کی باطنی صفت ہے اور راتوں کو ذکر و عبادت کے لئے بستروں سے پہلو الگ رکھنا ظاہری علامت ہے۔

بخاریؒ، مسلمؒ اور امام احمدؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور مسلم وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب آیت وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ نازل ہوئی تو صحابہؓ پر یہ بات بہت شاق گزری اور دو زانو بیٹھ کر انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ نماز، روزہ، جہاد اور خیرات کا ہم کو حکم دیا گیا تھا اس کو ادا کرنے کی ہم میں طاقت تھی لیکن اب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی اس کو برداشت کرنے کی تو ہم میں طاقت نہیں (ہم نفسانی اور قلبی خطرات پر کس طرح قابو پا سکتے ہیں اور کس طرح محاسبہ سے بچ سکتے ہیں) حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کیا تم وہ بات کہنی چاہتے ہو جو تم سے پہلے دونوں کتابوں والوں نے کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا نہیں ایسا نہ کہو بلکہ یوں کہو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ حسب الحکم لوگ یہ آیت پڑھنے لگے جب زبانوں پر یہ الفاظ خوب رواں ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ رسول اللہ ﷺ اور مؤمن ان آیات پر ایمان رکھتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے رب کی طرف سے ان پر اتاری گئی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ آیت اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ کے نزول کے بعد شاید صحابہؓ سمجھے کہ خطرات نفس (وساوس) کا بھی اللہ محاسبہ فرمائے گا یا انکسار نفس کی وجہ سے انہوں نے نفسانی گناہوں کے ساتھ اپنے کو آلودہ قرار دیا اسلئے آیت کی (حکم آمیز) اطلاع ان پر شاق گزری۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے تسلیم و رضا اور توکل کا راستہ ان کو بتایا کیونکہ نفوس مطمئنہ کی یہی

marfat.com

صفات ہیں اور اللہ نے ان کے اس خیال کا ازالہ کر دیا کہ خطرات پر بھی محاسبہ ہوگا اور ان کو تسلی دی کہ تمہارے ایمان سچے ہیں تمہاری نیتیں درست ہیں تمہارے نفس پاکیزہ اور دل صاف ہیں، رذائل نفس کا زوال ایمان کا مقتضا ہے (اور اللہ نے انکے مؤمن ہونے کی شہادت آیت مذکورہ میں دی ہے تو گویا رذائل نفسانی سے ان کے نفوس کو پاک اور دلوں کو صاف قرار دیا ہے) کیونکہ کامل ایمان حقیقی اسی وقت ہوتا ہے جب نفس اور رذائل نفس بالکل فنا ہو جائیں (اور آیت میں ایمان سے مراد ایمان کامل ہی ہے کیونکہ) مطلق کا رجوع فرد کامل کی طرف ہوتا ہے (اور آیت میں لفظ اٰمَنَ مطلق ہے اس لئے ایمان کامل مراد ہے اور کمال ایمان کا تقاضا ہے کہ عیوب نفسانی فنا ہو جائیں) پس ایمان کامل کی شہادت اپنے ساتھ اس شہادت کو بھی لاتی ہے کہ صحابہؓ کے دل تمام نفسانی گناہوں سے پاک ہیں۔

المؤمنون سے مراد وہی مؤمن ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے یعنی صرف صحابہؓ مراد ہیں جیسے آیت یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ میں المؤمنین سے مراد صرف صحابہؓ ہیں۔ باقی وہ اہل السنۃ والجماعۃ جن کا ایمان صحابہؓ کے ایمان کی طرح ہو ان کا شمول صحابہؓ کے ساتھ (ذیلی طور پر) ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور سوائے ایک فرقہ کے سب فرقے ناری ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ (نجات پانے والا) کونسا فرقہ ہوگا فرمایا جو اس طریقہ پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابیؓ ہیں۔ رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن عمرو۔

کُلٌّ ان میں سے ہر ایک مضاف الیہ محذوف ہے۔ تنوین اس کے عوض ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ اَلْمُؤْمِنُوْنَ کا عطف یا اَلرَّسُوْلُ پر ہے اس صورت میں وہ ضمیر مضاف الیہ جس کی جگہ کُلٌّ کی تنوین لائی گئی ہے اَلرَّسُوْلُ اور اَلْمُؤْمِنُوْنَ دونوں کے مجموعہ کی طرف راجع ہوگی یا اَلْمُؤْمِنُوْنَ مبتدا ہے اس وقت ضمیر مضاف الیہ صرف اَلْمُؤْمِنُوْنَ کی طرف راجع ہوگی اور کُلٌّ اپنی خبر کے ساتھ مل کر اَلْمُؤْمِنُوْنَ کی خبر ہوگی اس صورت میں اٰمَنَ کا فاعل تنہا اَلرَّسُوْلُ ہوگا۔ عظمت شان رسول کی وجہ سے صرف اَلرَّسُوْلُ کی طرف اٰمَنَ کی نسبت کی گئی یا اس وجہ سے تنہا ایمان رسول کا ذکر کیا گیا کہ رسول کا ایمان مشاہدہ اور معاینہ کے ساتھ تھا اور دوسرے لوگوں کا ایمان نظری اور استدلالی۔

اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ ایمان لایا اللہ پر اور اسکے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر۔

حمزہؒ اور کسائیؒ کی قرأت میں وکِتَابِہٖ آیا ہے اور کتابہ سے مراد ہے قرآن مجید، قرآن عزیز پر ایمان کے ذیل میں باقی کتابوں کا ایمان داخل ہے یا کتابہ سے جنس کتاب مراد ہے۔ اسم جنس اور اسم جمع میں فرق یہ ہے کہ اول کا اطلاق افراد جنس پر اور دوسرے کا اطلاق جنس کے مجموعوں پر ہوتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ الکتاب (کا شمول) الکتب سے زیادہ ہے۔

وَرُسُلِہٖ اور اس کے پیغمبروں پر۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ یعنی انہوں نے کہا یا یہ کہتے ہوئے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے کہ ہم انبیاء کے درمیان ایمانی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر نہ لائیں) جیسا کہ یہودیوں نے کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے چونکہ اَحَدٍ نکرہ ہے اور نفی کے ذیل میں واقع ہوا ہے اس لئے مفید عموم ہے اور اس پر لفظ بَیْنَ آیا ہے۔ یعقوب کی قرأت میں لَا یُفَرِّقُ ہے اور ضمیر غائب لفظ کُلٌّ کی طرف راجع ہے جیسے اٰمَنَ کی ضمیر مفرد لفظ کُلٌّ کی طرف راجع ہے۔

وَقَالُوْا (اور انہوں نے کہا) یعنی رسول اللہ اور مؤمنوں نے، معنوی اعتبار سے لفظ کُلٌّ کی طرف ضمیر راجع ہے۔

سَمِعْنَا ہم نے آپ کا فرمان سنا۔

وَاَطَعْنَا اور ہم نے آپ کا حکم مانا۔ بغوی نے حضرت جابرؓ بن حکیم کا قول نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے کہا اللہ نے آپ کی اور آپ کی امت کی ثنا کی ہے۔ آپ اللہ سے کچھ سوال

marfat.com

کیجئے پورا کیا جائے گا پس اللہ کی تلقین سے آپ نے سوال کیا۔

غُفْرَانَكَ یعنی اپنی مغفرت عطا فرمایا ہم تجھ سے تیری مغفرت مانگتے ہیں۔

رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ اے ہمارے رب! اور مرنے کے بعد تیرے ہی طرف لوٹنا ہے یہ آخری فقرہ حشر کا اقرار ہے اسلئے ایمان میں داخل ہے صحیحین کی جو حدیث ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنوں کا قول سمعنا اس آیت کے نزول سے پہلے تھا اس جگہ اللہ نے اسی قول کو بطور نقل ذکر فرمایا ہے اور ثناء کا اظہار کیا ہے یہی توجیہ زیادہ قوی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا اللہ کسی کو مکلف نہیں کرتا مگر اس کی قدرت کی سمائی کے موافق۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب قدرت سے مراد امکانی قدرت ہو یا سمائی سے مراد ہے مقدار قدرت سے کم درجہ والی سمائی یعنی سہولت۔ اول قسم ان احکام میں جاری ہو گی جن کی بنا قدرت ممکنہ پر ہے اور دوسری قسم کا اجراء ان احکام میں ہو گا جن کی بناء سہولت آفریں قدرت پر ہے جیسے زکوٰۃ کے وجوب کے لئے مال کا نمو اور سال گزر جانا۔

آیت دلالت کر رہی ہے کہ شریعت نے ناممکن (فعل) پر مکلف نہیں کیا لیکن ناممکن فعل پر مکلّف کرنا (عقلاً) ممنوع ہے اس مفہوم پر آیت کی دلالت نہیں ہے۔ ؎

اس جگہ قدرت سے مراد ہے وہ استطاعت جو فعل سے پہلے موجود ہوتی ہے جیسے اسباب اور آلات کا فراہم ہونا (موانع اور عوائق کا نہ ہونا) اوامر واحکام کے دلائل کا موجود ہونا۔ وہ حقیقی قدرت (جس کو استطاعت فعلی کہا جاتا ہے) مراد نہیں ہے یہ تو فعل کے ساتھ ہوتی ہے (پہلے سے نہیں ہوتی) قدرت بالمعنی الاول کے موجود ہونے کی وجہ سے ہی قوم نوح و فرعون اور ابو جہل وابولہب مستحق عذاب قرار پائے اور ان کو عتاب کیا گیا اور مخاطب بنایا گیا حالانکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی اور کان بند کر دیئے اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا (یعنی غفلت کی مہر کر دی اور جہالت کا پردہ ڈال دیا) لیکن اس کے باوجود فرمایا لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ یہ قرآن تم میں سے اس شخص کے لئے ہدایت ہے جو سیدھا چلنا چاہے (مراد یہ ہے کہ اسباب ہدایت موجود ہیں آنکھیں دیکھنے کو، کان سننے کو، دماغ سمجھنے کو خدا نے دیدیا ہے۔ پیغمبر کو بھیج دیا، اپنا پیام ہدایت بھی بھیج دیا، پیغمبر نے حق و باطل کی تمیز بتادی، کوئی خارجی مانع بھی نہیں ہے اب جو چاہے سیدھی راہ چلے، قدرت بالمعنی الاول موجود ہے) مگر یہ بھی فرمادیا وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ یعنی بغیر مشیت خدا کے تمہاری مشیت ہی نہیں ہو گی اور مشیت خدا تو انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ لہٰذا انسانی مشیت جس کا وجود اللہ کی مشیت سے وابستہ ہے اس کا ہونا بھی محال ہے (گویا قدرت بالمعنی الثانی یعنی استطاعت فعلی جو فعل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے ؎ جس کو توفیق الٰہی بھی کہا جاسکتا ہے معدوم ہے۔ اس لئے فعل کا وقوع نہیں ہوتا لیکن یہ قدرت واستطاعت مدار تکلیف نہیں اور امر ونواہی کی اس پر بنا نہیں، یہ تو اللہ کی مشیت پر موقوف ہے احکام کی بناء اول قدرت پر ہے جو پہلے سے موجود ہے اور ہر مکلّف کو حاصل ہے) ایک طرف حکم دینا اور دوسری طرف توفیق نہ دینا یہ اللہ کا خصوصی راز ہے اس کی چھان بین اور کاوش کی ضرورت نہیں یہ بہت بڑی ذہنی اور فکری لغزش گاہ ہے اندیشہ ہے کہ کہیں قدم پھسل نہ جائے اس لئے صرف اس پر ایمان لانا اور خاموش رہنا ہی چاہئے۔

؎ اسی بناء پر اشاعرہ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں کسی ناممکن عمل کا حکم نہیں دیا گونگے سے قرأت کو، لنگڑے سے چلنے کو اور پاگل سے صحیح سوچنے کو نہیں کہا۔ نادار کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا وغیرہ وغیرہ لیکن اللہ کے احکام چونکہ ہر غرض سے پاک ہیں، خصوصاً حکم الٰہی امتثال کر سکنے سے منزہ ہے (بیضاوی) اس لئے عقل کی ممانعت نہیں ہے کہ آدمی کو ناممکن عمل کی تکلیف دی جائے اگر وہ عدم استطاعت کی وجہ سے نہ کر سکتا ہو تو نہ کرے امر تکلیفی بہر حال اپنی جگہ قائم رہے گا، لیکن دوسرے علماء کہتے ہیں کہ تکلیف بالمحال عقلاً بھی محال ہے، ۱۲۔

؎ صاحب تبصرہ نے لکھا ہے کہ استطاعت اور قدرت حقیقیہ وہ صفت ہے جو اللہ حیوان کے اندر پیدا کر دیتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے اختیاری افعال کرتا ہے گویا صاحب تبصرہ کے نزدیک استطاعت فعل عبد کی علت عادیہ ہے۔ لیکن جمہور کے نزدیک استطاعت اداء فعل کی شرط ہے، علت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس وقت بندہ کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور پہلے سے تمام اسباب و آلات فراہم ہوتے ہیں تو اللہ (باقی اگلے صفحہ پر)

marfat.com

شیخین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ جب آیت ان تبدوا مافی انفسکم صحابہؓ پر شاق گزری اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے انہوں نے سمعنا و اطعنا غفرانک ربنا و الیک المصیر کہا تو اس پر اللہ نے آیت لایکلف اللہ نازل فرما کر اس سے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نسخ کا لفظ بطور مجاز کہا کیونکہ حقیقی نسخ تو احکام میں ہوتا ہے۔ نسخ کا معنی ہے اس حکم شرعی کو اٹھا دینا جو پہلے دیا گیا تھا۔ اخبار میں نسخ نہیں ہوتا اور اس جگہ دونوں آیتیں خبری ہیں پہلی آیت میں قلبی افعال پر مؤاخذہ کی اطلاع دی ہے اور دوسری آیت میں طاقت سے زیادہ مکلف نہ کرنے کی خبر ہے اس لئے حقیقی نسخ کا اس جگہ احتمال ہی نہیں ہے لیکن چونکہ اس آیت سے صحابہؓ کے اس خیال کا ازالہ ہو رہا ہے کہ خطرات نفس پر بھی مؤاخذہ ہوگا اور یہ ان کی تسلی کا موجب ہے اس وجہ سے حضرت ابوہریرہؓ نے مجازاً اس کو لفظ نسخ سے تعبیر کیا۔

ہاں اگر نسخ حقیقی ہی مراد قرار دی جائے تو یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ آیت وان تبدو اگرچہ خبر ہے لیکن (امر کے حکم میں ہے کیونکہ) اس سے رذائل نفس کا حکم حرمت معلوم ہوتا ہے جیسے آیت کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (امر کے حکم میں ہے کیونکہ) وجوب صوم پر دلالت کر رہی ہے پس آیت وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ کا لفظ حرمت رذائل نفسانی کو شامل ہے اور آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نفس کے خطرات پر غیر مکلف ہونے کو بتا رہی ہے کیونکہ خطراتِ نفس ہماری وسعت میں نہیں ہیں اور حکم تحریم ایک قسم کی پابندی ہے پس یہ آیت عدم تحریم پر دلالت کر رہی ہے لہٰذا ناسخ تحریم ہوگئی واللہ اعلم (خلاصہ یہ کہ اللہ کے کلام میں خبر انشاء کے معنی میں ہوتی ہے اگر خبر کے بعد ممانعت نہ ہو تو وہ خبر مثل امر کے ہوتی ہے اور اس کی تعمیل امر کی طرح ضروری ہوتی ہے پس پہلی آیت میں مثبت خبر ہے۔ لہٰذا یہ سمجھا جائے گا کہ اللہ نے خطرات نفس پر مواخذہ کا حکم دیا ہے اور دوسری آیت میں منفی خبر ہے۔ اس لئے سمجھا جائے گا کہ اللہ نے خطرات نفس پر مواخذہ کی ممانعت فرما دی اور نہی امر کی ناسخ ہوتی ہے لہٰذا دوسری آیت پہلی آیت کی ناسخ ہوگئی)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو وسوسے دل میں پیدا ہوتے ہیں جب تک ان پر عمل نہ ہو یا ان کو زبان سے نہ کہہ دیا جائے، اللہ نے میری امت کے لئے ان سے درگزر فرمائی ہے۔ (متفق علیہ) بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عطاء اور اکثر اہل تفسیر کے نزدیک آیت وان تبدوا مافی انفسکم میں خطرات نفس (یعنی وسوسے) مراد ہیں۔

میں کہتا ہوں آیت وان تبدوا اور لایکلف اللہ نفسا کے احکام کا تعلق صرف خطرات نفس سے ہی نہیں ہے بلکہ آیتوں میں عموم ہے ہاں خطرات نفس بھی اس عموم میں داخل ہیں لہٰذا خطرات نفس پر مؤاخذہ کا نسخ حسب تقریر مذکور ہو جائے گا۔

فائدہ

جب ثابت ہو چکا کہ رذائل نفس کا مؤاخذہ اعمال بدنیہ کے مؤاخذہ سے زیادہ سخت ہے اور طاقت سے زیادہ آدمی مکلف

(باقی پچھلے صفحہ پر) اس کے اندر ایک صفت پیدا کر دیتا ہے جس کی موجودگی میں وہ اچھا برا کام کرتا ہے اور اس قسم کی استطاعت کا فعل کے ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے ورنہ وجود فعل بغیر استطاعت کے لازم آئے گا، گویا قدرت کے دو معنی ہیں ایک آلات و اسباب کا فراہم ہونا اور موانع کا نہ ہونا اس قدرت کا وجود پہلے سے ہوتا ہے، لیکن یہ قدرت ناقصہ ہے۔ دوسری وہ قدرت جس کے پیدا ہونے کے وقت تمام شرائط ضروریہ پہلے سے موجود ہوتی ہیں اور کام کرنے کے وقت اللہ کی طرف سے بندہ کو ایک خاص طاقت مل جاتی ہے جس کو ہم توفیق کہہ سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس فعل کا صدور لازم ہوتا ہے یا عادۃً ہو جاتا ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ استطاعت اور قدرت ایک قوت کا نام ہے جو بندہ کے اندر ہوتی ہے اور یہ پہلے سے ہوتی ہے فعل کے وقت اس کا وجود نہیں ہوتا ورنہ قوت اور فعل کا اجتماع لازم آئے گا حالانکہ قوت صرف استعداد ہوتی ہے اور فعل وجودی چیز ہے اور عدم و وجود کا اجتماع ممکن نہیں اسی بناء پر وہ بندہ کو اپنے افعال کا خالق قرار دیتے ہیں کیونکہ قدرت بندہ کے اندر پیدا کر دی گئی ہے گویا توفیق الٰہی کی معتزلہ کو ضرورت نہیں بس طاقت دے دینا ہی ان کے نزدیک توفیق ہے، ۱۲۔

marfat.com

نہیں ہے تو اگر بندہ اپنی امکانی کوشش کرے اور مجاہدۂ نفسانی کے ذریعہ امراض نفسانی کو دور کرنے کی جدوجہد کو کام میں لائے اور خواہش نفس کے پیچھے نہ پڑ جائے اور رذائل نفس کو دور کرنے کے لئے فقراء کے دامن سے وابستہ ہو جائے تو امید ہے کہ اللہ اس کے اندرونی معاصی معاف فرمادے گا، مؤاخذہ نہ کرے گا۔ کیونکہ طاقت سے زیادہ بندہ مکلف نہیں اور ممنوعات خداوندی پر کاربند ہونے کی وہ امکانی کوشش کر چکا۔ لیکن جو شخص اپنے اندرونی عیوب کی طرف توجہ ہی نہ کرے اور رذائل نفس کو دور کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو تو وہ یقیناً دوزخ میں جائے گا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیہ کے طریقہ پر چلنا اور فقراء کے دامن سے وابستہ ہونا ایسا ہی فرض ہے جیسے کتاب اللہ کی تلاوت اور اس کے احکام کو سیکھنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میں نے تم میں دو عظیم الشان چیزیں چھوڑی ہیں (ایک) کتاب اللہ (دوسری) اپنی آل۔ پس اللہ کی کتاب کو استنباط احکام، درستی اعمال، نصیحت پذیری اور مدارج قرب کی ترقی کیلئے پکڑنا ضروری ہے اور مرضیٔ خدا کے مطابق باطن کی صفائی اور نفس کے تزکیہ کیلئے آل رسول کے دامن سے وابستہ ہونا بھی لازم ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ (یعنی اعضاء جسمانی کے اعمال ہوں یا اندرونی افعال) بہرحال جو نیکی کوئی نفس کرے گا اس کا فائدہ اسی کو ملے گا۔

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ اور جو بدی کریگا اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا یعنی طاعت و معصیت سے نفع و نقصان انسان کا اپنا ہی ہے۔ کسب اور اکتساب میں یہ فرق ہے کہ کسب کا معنی ہے صرف کمانا اور اکتساب کا معنی ہے اپنے لئے کوئی کام کرنا۔ شر کی طرف انسان کے نفس کو رغبت ہوتی ہے اس کی طرف طبیعت کھینچتی ہے اس لئے تحصیل شر کی زیادہ کوشش کرتا ہے اور خیر کی حالت اس کے خلاف ہے (خیر کی طرف نفس کی کشش نہیں ہوتی) اس لئے خیر کیلئے لفظ کسب اور شر کیلئے لفظ اکتسب استعمال کیا۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ یعنی تم کہو کہ اے ہمارے رب، ہم سے مؤاخذہ نہ کرنا ہم کو سزا نہ دینا۔

اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ یعنی اگر ہم یاد نہ رہنے کی وجہ سے کسی واجب کو ترک کر دیں یا بے پروائی کی وجہ سے کسی کام کو درست طور پر نہ کر پائیں۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ نسیان و خطاء پر گرفت عقلاً ممنوع نہیں ہے کیونکہ گناہ زہر کی طرح ہیں، غلطی سے زہر کھانا بھی مہلک ہوتا ہے اسی طرح گناہ کا ارتکاب کبھی موجب عذاب ہے یا سینہ میں تنگی اور دل میں زنگ پیدا ہو جانے کا سبب ہے خواہ بغیر ارادہ کے ہی ہو۔ حضرت شیخ شہیدؒ نے اپنے شیخ سید نور محمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جب شیخ بدایونی کے پاس کھانا یا کچھ اور چیز ہدیہ میں آتی تھی تو شیخ بصیرت کی نظر سے اس پر غور کرتے تھے۔ اگر اس کے اندر کسی قسم کی تاریکی نظر نہ آتی تو خود کھا لیتے یا استعمال کر لیتے یا دوسرے کو دیدیتے اور کبھی ہدیہ میں آئے ہوئے کھانے کو زمین میں دفن کرا دیتے۔ کسی بے بصیرت شخص نے پوچھا شیخ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں کسی دوسرے کو ہی کھلا دیا کریں۔ فرمایا سبحان اللہ اگر مسلمان کو کھانے میں زہر ملا نظر آجائے اور وہ خود نہ کھائے تو کیا دوسرے کو کھانے کے لئے دینا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان استفت قلبک وان افتاک المفتون کا روئے خطاب انہی لوگوں کی طرف ہے۔ یعنی چاہے مفتی تم کو فتویٰ دے چکے ہوں پھر بھی اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو (اگر مفتیوں کے جائز قرار دینے کے باوجود تمہارا دل اس کے جواز کی طرف راغب نہ ہو تو مت اختیار کرو)۔

حدیث سے ثابت ہے اور اجماع بھی منعقد ہے کہ اس امت کی خطا و نسیان کو اللہ نے معاف فرمادیا ہے ایسی صورت میں آیت کے اندر جو دعا مذکور ہے اس کا ورود صرف طلب دوام اور شمار نعمت کیلئے ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرما چکے ہیں کہ میری امت سے خطا و نسیان اور مجبوری (کا مؤاخذہ) اٹھالی گئی ہے۔ یہ حدیث طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کی ہے اور پہلے گزر چکی ہے۔ اٹھانے سے مراد ہے گناہ کا اٹھالینا یعنی آخرت میں بھول چوک (اور مجبوری) کا مؤاخذہ نہ ہوگا دنیا میں اٹھالینے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دنیا میں بھول چوک اور مجبوری کا مواخذہ ہوتا ہے یہ دنیا دار العمل ہے یہاں اگر بھول چوک یا کسی کے جبر کرنے سے کوئی گناہ ہو جائے تو جہاں تک ممکن ہو اس کا تدارک ضروری ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے

marfat.com

ارشاد فرمایا تھا جو نماز سے سو جائے یا نماز پڑھنی بھول جائے تو جب یاد آئے پڑھ لے۔ بھول چوک کے عذر سے اجماعاً روزہ، نماز کی قضاء ساقط نہیں، نماز میں سہواً ہو جائے تو سجدہ سہو بالاجماع واجب ہے۔ قتل خطاء موجب کفارہ ہے اور میراث سے بھی اجماعاً محروم کر دیتا ہے۔ امام شافعیؒ بھول چوک کا اعتبار دنیوی احکام میں بھی کرتے ہیں۔

مسئلہ :- بھول کر نماز میں کلام کرنے سے امام اعظمؒ کے نزدیک نماز ٹوٹ جاتی ہے اس کی دلیل ہم لکھ چکے ہیں۔ لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹتی کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو پچھلے دن کی کوئی ایک نماز پڑھائی ظہر کی یا عصر کی اور دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور پھر مسجد کے قبلہ کی طرف تشریف لے جا کر ایک تنہ سے لگ کر غصہ کی حالت میں بیٹھ گئے۔ لوگوں میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما موجود تھے مگر دونوں کو بات کرنے سے ڈر لگا۔ لوگ جلدی جلدی مسجد سے باہر نکل گئے اور کہنے لگے نماز میں قصر ہو گیا۔ ذوالیدین نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ بھول گئے یا نماز میں قصر ہو گیا ہے۔ حضور ﷺ نے دائیں بائیں دیکھا اور فرمایا ذوالیدین کیا کہہ رہا ہے صحابہؓ نے عرض کیا۔ انہوں نے سچ کہا آپ نے صرف دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ حضور ﷺ نے فوراً (بقیہ) دو رکعتیں پڑھیں اور سلام پھیر دیا پھر تکبیر کہی پھر سجدہ کیا۔ پھر تکبیر کہی پھر سر اٹھایا پھر تکبیر کہی پھر سجدہ کیا پھر تکبیر کہی پھر سر اٹھایا (یعنی سہو کے دو سجدے کئے) متفق علیہ۔ ہم کہتے ہیں یہ حدیث آیت قُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِيۡنَ سے منسوخ ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت زید بن ارقمؓ کی روایت کردہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ :- جمہور کے نزدیک بھول کر جماع کرنے سے حج فاسد ہو جاتا ہے۔ شافعیؒ کا قول اس کے خلاف ہے ہمارے نزدیک جبر اور غلطی دونوں طرح کی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ شافعیؒ کا مسلک اس کے بھی خلاف ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد حدیث رفع عن امتی میں لفظ رفع کی تشریح کا اختلاف ہے (شافعیؒ کے نزدیک احکام دنیا کا رفع بھی مراد ہے اور ہمارے نزدیک صرف عذاب آخرت کا)۔

مسئلہ :- غلطی سے کچھ کھا لینے سے امام اعظمؒ اور صاحبینؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ امام احمدؒ اور شافعیؒ کے نزدیک فاسد نہیں ہوتا۔ بھول کر کچھ کھا لینے سے امام مالکؒ کے نزدیک روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ جمہور کے نزدیک فاسد نہیں ہوتا۔

بھول کر کھا لینے سے روزہ فاسد نہ ہونے کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی بھول کر کھا پی لے تو اپنے روزہ کو پورا کرے کیونکہ یہ تو اس کو اللہ ہی نے کھلایا پلایا ہے، متفق علیہ۔

مسئلہ :- ذبح کے وقت بسم اللہ بھول جانے سے امام مالکؒ کے نزدیک ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے۔ حدیث مذکور کی وجہ سے ہمارے نزدیک حرام نہیں ہوتا۔ حدیث قیاس کے خلاف ہے اس مسئلہ کا ذکر ہم سورۂ انعام میں کریں گے۔

فائدہ

کلبی کا بیان ہے کہ احکام کی بھول چوک پر بنی اسرائیل کو جلد سزا مل جاتی تھی فوراً کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے لئے حرام کر دی جاتی تھی۔

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَاۤ اِصۡرًا اے ہمارے رب اور نہ لاد ہم پر بھاری بوجھ۔ اِصر کا معنی ہے حبس۔ ایسا بار جو بوجھ والے کو روک دے۔ اصر کہلاتا ہے۔ یہاں وہ احکام شاقہ مراد ہیں جو اٹھائے نہ جا سکیں۔

كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ جیسا کہ تو نے ہم سے پہلوں پر یعنی یہودیوں پر لاد دیا تھا۔ اللہ نے یہودیوں پر پچاس وقت کی نماز فرض کی تھی اور زکوٰۃ میں ایک چوتھائی مال دینے کا حکم دیا تھا۔ ان کو یہ بھی حکم تھا کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو کپڑے کو کاٹ دیا جائے۔ اگر کسی سے کوئی گناہ ہو جاتا تو صبح کو اس کے دروازہ پر لکھا ہوا پایا جاتا۔ جب

marfat.com

انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تو حکم دیا گیا فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ بعض علماء کا قول ہے کہ اصر سے ایسا گناہ مراد ہے جس کی توبہ نہ ہو۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ اے ہمارے رب اور ہم پر نہ ڈال ایسا بار جس کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ نا قابل برداشت بار سے مراد ہے مصیبت اور عذاب یا سخت احکام۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف مالا یطاق (عقلاً) جائز ہے مگر اللہ کی مہربانی سے شریعت میں نا قابل طاقت کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ لا تحمل (باب تفعیل) اس جگہ تشدید کے ساتھ ہے کیونکہ اس جگہ پر فعل کے دو مفعول ہیں (نا اور ما)۔

وَاعْفُ عَنَّا ۗ اور ہمارے گناہوں کی سزا سے در گزر فرما۔

وَاغْفِرْ لَنَا ۗ یعنی ہمارے گناہوں کو مٹادے اور ان پر پردہ ڈال دے (لغت میں مغفرت کا معنی ہے چھپانا)۔

وَارْحَمْنَا ۗ اور ہم پر رحم فرما کیونکہ (ہم خود کچھ نہیں کرتے) جو نیکیاں ہم کرتے ہیں یا گناہوں کو چھوڑتے ہیں وہ صرف تیری رحمت سے کرتے ہیں۔

اَنْتَ مَوْلٰىنَا تو ہمارا آقا ہے، مدد گار ہے، حفاظت کرنے والا ہے، کار ساز ہے۔

فَانْصُرْنَا لہٰذا ہم کو فتح یاب کر۔ اس جگہ فا تفریعیہ ہے اور مفہوم آقائیت پر اس کی تفریع ہے۔ کیونکہ آقا کو اپنے غلاموں کی مدد کرنی ہی چاہئے۔

عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۲۸۶ کافر قوم پر۔ عام کافر مراد ہیں جنات ہوں یا انسان یہاں تک کہ نفس امّارہ بھی (کافر ہے اس کے خلاف بھی فتح یابی کی دعا ہے)۔ ع ۸

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت معاذ سورۂ بقرہ ختم کرنے کے بعد آمین کہتے تھے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث آئی ہے کہ اللہ نے فرمایا۔ اچھا یعنی رسول اللہ ﷺ جب آیت رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا پڑھ چکے تو اللہ نے فرمایا، اچھا، اسی طرح دوسرے جملہ کو مِنْ قَبْلِنَا تک اور تیسرے جملہ کو مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ تک اور چوتھے جملہ کو آخر سورۃ تک پڑھ چکے تو اللہ نے ہر جملہ کے بعد فرمایا۔ اچھا

مسلم و ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بجائے اچھا کے قد فعلت کا لفظ آیا ہے یعنی میں نے ایسا کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ لفظ غُفْرَانَكَ پڑھنے کے بعد اللہ نے فرمایا قد غفرت لکم میں نے تم کو بخش دیا اور جملہ اَوْ اَخْطَاْنَا کے بعد فرمایا لا اؤاخذکم میں تم سے مؤاخذہ نہیں کروں گا اور لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ کے بعد فرمایا لا احمل علیکم اور لا تحملنا کے بعد فرمایا لا احملکم اور واعف عنا کے بعد فرمایا قد عفوت عنکم و غفرت لکم و رحمتکم و نصرتکم علی القوم الکافرین یعنی میں نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے، بخش دیئے، اور تم پر رحمت فرمائی اور تم کو کافروں پر فتح یاب کیا۔ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کی طرف سے دعا قبول کرلی گئی۔ بھول چوک کا مؤاخذہ نہ ہونے کا حکم اجماعاً تمام امت کے لئے ثابت ہے۔ اسی طرح اصر کا بار نہ ڈالنا اور مالا یطاق پر مکلف نہ کرنا بھی تمام امت کے لئے عام ہے۔ دوسری آیت سے اس کی تائید ہو رہی ہے فرمایا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کیونکہ قانون شریعت ایک ہے اور دوامی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جو حکم اگلوں کے لئے ساقط تھا وہ پچھلوں کے لئے ساقط نہ ہو (حکم کی معافی ہے تو سب کے لئے ہے) اور رسول اللہ ﷺ کے بعد نہ کوئی حکم منسوخ ہو سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ ہاں تمام گناہوں کی معافی کا حکم اور عمومی رحمت اور کافروں پر فتح یابی کی صراحت یہ چیزیں بظاہر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے لئے مخصوص تھیں۔ عفوت اور غفرت اور رحمت اور نصرت کے (ماضی کے صیغے) اسی پر دلالت کر رہے ہیں۔ ورنہ فرقہ مرجیۂ کا قول حق ہو گا (کہ ایمان ہو تو کوئی کبیرہ گناہ بھی قابل مؤاخذہ نہیں رہتا سب گناہ معاف ہیں) عام امت کے گناہوں کا اختیار اللہ کو ہے چاہے معاف کر دے چاہے ان کی سزا دے، اسی لئے بہت مرتبہ مسلمانوں کی مدد خدا کی طرف سے نہیں کی جاتی اور کافروں کے

marfat.com

مقابلہ میں فتح یاب نہیں کیا جاتا (کیونکہ) فتح یابی کا حکم عمومی نہیں ہے جیسے مغفرتِ ذنوب کا حکم عام نہیں ہے نصرت اور فتح یابی کا مدار تو ولایتِ الٰہیہ پر ہے اور ارتکاب معاصی کی صورت میں ولایتِ الٰہیہ باقی ہی کہاں رہتی ہے۔ اے اللہ امت محمدیہ کو بخش دے اے اللہ امت محمدیہ پر رحمت فرما۔ اے اللہ امت محمدیہ کے اعمال کی اصلاح فرمادے۔ آمین

فصل

سورۂ فاتحہ کے فضائل میں یہ حدیث گزر چکی ہے کہ ایک فرشتہ آسمان سے اترا اور اس نے (رسول اللہ ﷺ سے) کہا آپ کو دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دیئے گئے۔ فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی خاتمہ والی آیات۔ آپ جو حرف بھی ان کا پڑھیں گے وہ آپ کو ضرور دیا جائے گا۔ یعنی ایک تو اللہ کی تعلیم سے جو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پڑھنے کا حکم ہوا ہے اس کو اگر پڑھا جائے گا تو ضرور سیدھا راستہ اللہ دکھادے گا اور دوسرے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا سے آخر سورت تک اگر پڑھا جائے گا تو اللہ قبول فرمائے گا اور حسب دعا عطا کرے گا) اور یہ دونوں نور صرف رسول اللہ ﷺ کو ہی عطا کئے گئے ہیں اسی لئے آپ کے بعد بھی آپ کی اُمت (بحیثیت مجموعی) گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ دوسری حدیث صحیحین میں معاویہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا، مدد نہ کرنے والے اس کو ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور نہ اس کی مخالفت کرنے والے نقصان پہنچا سکیں گے۔ اسی حالت میں اللہ کا امر یعنی قیامت بپا ہونے کا حکم آجائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب (معراج میں) لے جایا گیا اور آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان پر ہے۔ زمین سے چڑھنے والے (اعمال) بھی اسی جگہ تک پہنچتے ہیں اور لے لئے جاتے ہیں اور اوپر سے اترنے والے (احکام) بھی اسی جگہ تک پہنچتے اور لے لئے جاتے ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ پر ہی وہ چیز چھائی ہوئی ہے جس کا ذکر آیت اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى میں آیا ہے یعنی سنہری پتنگے۔ اس جگہ آپ ﷺ کو تین چیزیں عطا ہوئیں۔ پانچ وقت کی نمازیں، سورۂ بقرۃ کے خاتمہ کی آیات اور آپ ﷺ کی اُمت کے ان لوگوں کے کبائر کی معافی جو شرک نہیں کرتے۔ (رواہ مسلم)

یعنی غیر مشرک کے کبائر کی معافی کا وعدہ کرلیا ہے، خواہ توبہ کے بعد ہو یا بغیر توبہ کے محض رحمت سے بغیر عذاب دیئے ہو یا عذاب کے بعد ہو۔ خلاصہ یہ کہ مؤمن کو کبیرہ گناہوں کی وجہ سے ہمیشہ دوزخ میں نہیں رکھا جائے گا۔ وہ قول صحیح نہیں ہے جو معتزلہ اور رافضیوں[1] اور خارجیوں کا ہے (کہ مرتکب کبیرہ مؤمن نہیں رہتا)۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۂ بقرہ کے آخر کی دو آیتیں ہیں جو رات کو ان کو پڑھے گا۔ (رات بھر کے لئے) وہ اس کے لئے کافی ہوں گی۔ رواہ الائمۃ الستۃ۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آسمان و زمین کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے اللہ نے ایک تحریر لکھ دی تھی، جس میں سے دو آیات سورۂ بقرہ کے خاتمہ والی نازل فرمادیں، جس گھر میں یہ دونوں آیات تین رات پڑھی جائیں تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ شیطان اس کے قریب آسکے۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے جنت کے خزانوں میں سے دو آیات نازل فرمائیں، ان آیات کو پیدائشِ مخلوق سے دو ہزار برس پہلے رحمٰن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا جو شخص عشاء کی نماز کے بعد ان کو پڑھ لے گا قیامِ شب کی جگہ یہ اس کے لئے کافی ہوں گی۔ اخرجہ ابن عدی فی الکامل۔

---

[1] معتزلہ مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج قرار دیتے ہیں مگر کافر بھی نہیں کہتے اور خارجی کافر کہتے ہیں بہر حال دونوں فرقے مرتکب کبیرہ کو دوامی دوزخی کہتے ہیں لیکن روافض مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج نہیں قرار دیتے۔ معلوم نہیں حضرت مؤلف نے الروافض کا لفظ یہاں کیوں بڑھا دیا، ۱۲۔

marfat.com

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ سورت جس میں بقرہ کا ذکر ہے میزان قرآن ہے۔ تم لوگ اس کو سیکھو، اس کو سیکھنا برکت ہے اور اس کو چھوڑ دینا (باعث) حسرت ہے۔ باطلین اس کی تاب نہیں لاسکتے۔ عرض کیا گیا باطلین کون۔ فرمایا جادوگر۔ اخرجہ الدیلمی فی مسند الفردوس۔

سورۂ بقرۃ کی تفسیر ۲۵؍ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ کو ختم ہوئی۔

اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تفسیر مظہری سورۂ بقرہ کا ترجمہ ختم کرنے کی توفیق اس فقیر کو بخشی ولہ المنۃ والحمد۔

۱۱؍شعبان المعظم ۱۳۸۱ھ

حضرت مؤلف سرہٗ نے سورہ بقرہ کے ختم پر فضائل سورت کے سلسلہ میں چند روایات حاشیہ میں درج کی ہیں، ہم ...... نے ان کا ترجمہ حاشیہ میں درج کیا ہے۔[۱]

[۱] بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت صلصال ضعیف سند کے ساتھ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ پڑھے گا اس کو جنت میں تاج پہنایا جائے گا۔ دیلمی نے بروایت حضرت ابو ہریرہ مرفوعاً نقل کیا ہے کہ دو آیات ہیں جو قرآن (کا جزء) ہیں سورۂ بقرہ کے آخر کی ہیں دونوں شفاعت کریں گی یہ دونوں اللہ کو محبوب ہیں، ابو عبیدہؒ نے ایک حدیث سے تخریج کی ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے اور شیطان سنتا ہے تو شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے، اس مضمون کی احادیث حضرت ابن مسعودؓ و حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مغفل کی روایت سے بھی آئی ہیں، امام احمدؒ نے حضرت بریدہؓ کی حدیث سے تخریج کی ہے کہ سورۂ بقرہ سیکھو اس کو لینا برکت ہے اور چھوڑنا (باعث) حسرت، جادوگر اس کی تاب نہیں لاسکتے، سورۂ بقرہ اور آل عمران سیکھو، یہ دونوں دو شگفتہ پھول ہیں (قیامت کے دن پڑھنے والے پر سایہ افگن ہوں گے گویا دو عمامے یا دو بدلیاں ہوا میں تنظیم کے ساتھ رکے ہوئے پرندوں کی دو ٹکڑیاں ہوں گی، ابن حبانؒ وغیرہ نے حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث سے تخریج کی ہے کہ ہر شئ کی ایک چوٹی ہوتی ہے، قرآن کی چوٹی (کوہان) سورۂ بقرہ ہے۔ جو شخص گھر کے اندر دن میں اس کو پڑھے گا شیطان اس گھر میں تین دن تک داخل نہ ہوگا اور جو گھر کے اندر رات میں پڑھے گا شیطان اس گھر میں تین رات دخل نہ ہوگا۔ ابو عبیدہؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے تخریج کی ہے کہ جو شخص بقرہ اور آل عمران کو رات میں پڑھے گا اس کو قانتین میں لکھا جائے گا، دارمیؒ نے بروایت مغیرہؒ بن شفیع بیان کیا کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی دس آیات سوتے وقت پڑھے گا قرآن کو نہیں بھولے گا، چار آیات شروع کی، ایک آیۃ الکرسی دو آیات اس کے بعد والی اور تین آیات آخر سورت کی۔

منہ نور اللہ مرقدہ

سورۃ بقرہ ختم

marfat.com

سورۂ آل عمران

مدنی ہے، اس کی آیات دو سو ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابن ابی حاتم نے بروایت ربیع بن انسؓ بیان کیا کہ کچھ عیسائی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آپ ﷺ سے مناظرہ کرنے لگے اس پر اللہ تعالیٰ نے الٓمّٓ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سے کچھ اوپر[1] اَسّی آیات آل عمران کی نازل فرمائیں۔

ابن اسحاق نے بیان کیا کہ مجھ سے محمدؒ بن سہل بن ابی امامہ نے کہا کہ جب نجران کے نمائندے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے متعلق سوال کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو ان کے متعلق سورۂ آل عمران شروع سے اَسّی ۸۰ آیات کے آخر تک نازل ہوئی۔ بیہقی فی الدلائل۔

بغویؒ نے کلبی اور ربیع بن انسؓ کا قول بھی یہی لکھا ہے کہ ان آیات کا نزول نجران کے نمائندوں کے متعلق ہوا جن کی تعداد ساٹھ تھی۔ وہ اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے پوری جماعت کے سردار ۱۴ شخص تھے اور ان میں بھی صرف تین لیڈر تھے۔ عاقب سب کا امیر اور مشیر اعلیٰ تھا، جس کے مشورہ کے بغیر اہل وفد کچھ کام نہیں کرتے تھے۔ عاقب کا نام عبدالمسیح تھا۔ امیر سفر سید تھا جس کا نام ایہم تھا۔ اور ابو حارثہ بن علقمہ پادری اور اہل قافلہ میں مذہبی عالم تھا۔ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز پڑھ چکے تھے کہ یہ وفد مسجد میں داخل ہوا۔ یمنی منقش کپڑے کے چغے پہنے اور خوبصورت مردانہ چادریں اوڑھے ایسے بھلے معلوم ہوتے تھے کہ دیکھنے والے کہہ رہے تھے ہم نے اس شان کا کوئی ڈیپوٹیشن نہیں دیکھا، ان لوگوں کی نماز کا وقت بھی ہو گیا تھا اس لئے وہیں مسجد میں نماز کو کھڑے ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اجازت دیدی۔ مشرق کی طرف منہ کر کے انہوں نے نماز پڑھی۔ سید اور عاقب سے گفتگو ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے اسلام لانے کی دعوت دی۔ دونوں نے جواب دیا ہم تو آپ سے پہلے ہی اسلام لا چکے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم غلط کہتے ہو تم کو اسلام سے روک دینے والی چیز یہ ہے کہ تم اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہو، صلیب کی پرستش کرتے ہو اور خنزیر کھاتے ہو (یعنی خنزیر کے گوشت کو حلال سمجھتے ہو) کہنے لگے اچھا بتاؤ اگر عیسیٰؑ کا باپ خدا نہیں تو ان کا باپ اور کون تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم ناواقف ہو کہ ہمارا رب زندہ ہے، جس کو موت نہیں اور عیسیٰؑ پر موت آئے گی۔ اہل وفد نے کہا، بلاشبہ ایسا ہی ہے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو تھامے ہوئے ہے نگرانِ کل اور رزاق ہے۔ اہل وفد نے کہا جانتے کیوں نہیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا عیسیٰؑ کے قابو میں بھی ان امور میں سے کوئی شئے ہے۔ اہل وفد نے جواب دیا نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم کو علم نہیں کہ اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ نہ زمین میں، نہ آسمان میں، اہل وفد نے کہا جانتے کیوں نہیں۔ فرمایا تو کیا عیسیٰؑ بھی سوائے اپنے مخصوص علم کے اس میں سے کچھ جانتے ہیں، اہل وفد نے کہا، نہیں۔ فرمایا ہمارے رب نے عیسیٰؑ کی شکل ماں کے پیٹ کے اندر جیسی چاہی بنادی۔ ہمارا رب نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، اہل وفد نے کہا جی ہاں، فرمایا کیا تم کو اتنی سمجھ نہیں کہ عیسیٰؑ کو ماں نے اپنے پیٹ میں اسی طرح رکھا جس طرح عورت بچہ کو اپنے پیٹ میں

[1] حضرت مؤلف قدس سرہ نے لکھا ہے ظاہر یہ ہے کہ ان آیات کی شمار ۸۴ ہے یعنی لانفرق بین احد منھم و نحن لہ مسلمون تک، اس کے بعد آیت و من یبتغ غیر الاسلام دینا الخ مرتدوں کے متعلق نازل ہوئی۔

marfat.com

رکھتی ہے اور اسی طرح جنا جس طرح عورت جنتی ہے پھر عیسیٰؑ کو اسی طرح غذا دی گئی جیسے بچہ کو دی جاتی ہے۔ عیسیٰؑ کھاتے بھی تھے، پیتے بھی تھے اور پیشاب، پاخانہ بھی کرتے تھے۔ اہل وفد نے کہا ہم یہ باتیں جانتے ہیں۔ فرمایا تو عیسیٰؑ تمہارے دعوے کے بموجب اللہ کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اہل وفد خاموش ہو گئے اور اللہ نے سورۂ آل عمران کی شروع سے کچھ اوپر اسی ۸۰ آیات نازل فرمائیں۔

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ یعقوب کے نزدیک الم پر وقف ہے اور الله سے الگ ابتداء ہے۔ جمہور کے نزدیک وقف نہیں ہے اور الم الله قرأت ہے سیبویہ کے نزدیک الله کا الف ساقط کر دیا گیا اور میم کے فتحہ کو اللہ کے لام سے ملا دیا گیا۔ زمخشری کے نزدیک میم پر فتحہ الله کے الف کا دے دیا گیا۔ پھر الف کو ساقط کر دیا گیا۔ میم کو کم سے کم دو حرکات کے برابر اور زیادہ سے زیادہ چھ حرکات کے بقدر کھینچنا جائز ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی سوائے اللہ کے کوئی الٰہ موجود نہیں ہے۔

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ یعنی وہ حی و قیوم ہے، آیت الکرسی کی تشریح میں ہم ان دونوں لفظوں کے معنی کی توضیح کر چکے ہیں۔

ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے ابوامامہ کی مرفوع حدیث بیان کی کہ اللہ کا اسم اعظم تین سورتوں میں ہے۔ البقرة اور آل عمران اور طٰہٰ۔ حضرت ابو امامہؓ کے شاگرد قاسم نے کہا میں نے تینوں سورتوں میں تلاش کیا تو الحی القیوم کو تینوں سورتوں میں مشترک پایا ایک سورۂ بقرہ کی آیۃ الکرسی، میں دوسرے آل عمران کی اسی آیت میں اور تیسرے سورۂ طٰہٰ کی آیت وعنت الوجوه للحی القیوم میں۔

جزری مؤلف حصن حصین نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک اسم اعظم لا اله الا هو الحی القیوم ہے (یعنی تینوں سورتوں میں مذکور ہے) میں کہتا ہوں کہ اسم اعظم لا اله الا هو ہے۔ حدیثوں میں مطابقت اس طرح ہو جائے گی۔ ایک حدیث حضرت ابوامامہؓ کی روایت کردہ جو ابھی بیان کر دی گئی، دوسری حدیث اسماء بنت یزید کی روایت کردہ کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے خود سنا، فرما رہے تھے اللہ کا اسم اعظم ان دو آیات میں ہے الهکم اله واحد لا اله الا هوالرحمٰن الرحیم اور الله لا اله الا هوالحی القیوم، رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی۔

تیسری حدیث حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت کردہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ذوالنون (حضرت یونس علیہ السلام) نے مچھلی کے پیٹ کے اندر اپنے رب سے جو دعا کی تھی وہ یہ تھی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ جو مسلمان کسی چیز کے متعلق ان الفاظ کے ساتھ اللہ سے دعاء کرے گا تو اللہ اس کی دعا ضرور قبول کرے گا۔ رواہ احمد والترمذی، مستدرک میں حاکم نے لکھا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ اللہ کا وہ اسم اعظم ہے کہ اگر اس کے ذریعہ سے اللہ سے دعاء کی جائے تو اللہ قبول فرماتا ہے اور اس سے کچھ مانگا جائے تو عطا فرماتا ہے۔

چوتھی روایت حضرت یزیدؓ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو یہ کہتے سنا اللهم انی اسالک بانی اشهد ان لا اله الا انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفواً احد، فرمایا اس شخص نے اللہ سے ایسا اسم اعظم پڑھ کر دعا مانگی ہے کہ جب اس سے اس اسم کے ذریعہ سے کچھ مانگا جائے تو وہ عطا فرماتا ہے اور دعاء کی جائے تو قبول فرماتا ہے، رواہ احمد، ابو داؤد والنسائی وابن ماجۃ والترمذی والحاکم وابن حبان، ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے اور حاکم نے کہا کہ شرط شیخین کے مطابق صحیح ہے۔

پانچویں حدیث اس پوری جماعت نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا اس نے نماز میں کہا اللهم انی اسالک بان لک الحمد لا اله الا انت الحنان المنان بدیع السموت و الارض یا ذالجلال و الاکرام یاحی یا قیوم۔

marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نے اللہ کا ایسا اسم اعظم لے کر دعاء کی ہے کہ اگر اس سے یہ نام لے کر دعا کی جائے تو وہ قبول فرماتا ہے اور کچھ مانگا جائے تو عطا فرماتا ہے، ابن ابی شیبہؒ نے یا حی یا قیوم کے الفاظ کا ذکر نہیں کیا ان تمام احادیث کا تقاضا ہے کہ ان سب میں اور تینوں سورتوں میں اسم اعظم موجود ہے اور وہ صرف نفی و اثبات یعنی لا الہ الا ھو ہے سورۂ بقرۃ میں آیۃ الکرسی کے اندر اور آل عمران میں اسی آیت کے اندر کلمۂ توحید مذکور ہے اور سورۂ طٰہٰ میں آیت اللہ لا الہ الا ھو لہ الاسماء الحسنی موجود ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا الہ الا اللہ ہی افضل ذکر ہے ۔رواہ الترمذی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ لا الہ الا اللہ جنت کی جنجی ہے اس مفہوم کی احادیث متواتر المعنی آئی ہے۔

...... فائدہ ......

احادیث میں اسم اعظم لا الہ الا ھو اور لا الہ الا انت کو کہا گیا ہے لا الہ الا اللہ (بھی اگرچہ اسم اعظم ہے مطلب سب کا ایک ہی ہے ھو اور انت سے مراد بھی اللہ ہی ہے لیکن) سے مذکورۂ بالا دونوں جملوں کی عظمت زیادہ ہے کیونکہ ضمیریں (خواہ غائب کی ہوں یا مخاطب کی) محض ذات کے لئے موضوع ہیں (وصفی معنی کا ان کی وضع میں شائبہ بھی نہیں ہے ضمیروں سے ذہنی انتقال خالص ذات کی طرف ہوتا ہے۔ کسی نام یا صفت یا حالت کا تصوّر بھی نہیں ہوتا اور لفظ اللہ کی وضع اگرچہ ذات کے لئے ہے (کیونکہ یہ ذاتِ خداوندی کا علَم اور خصوصی نام ہے) لیکن یہ لفظ بولنے سے اول اسم کا تصوّر ہوتا ہے پھر ذات کی جانب ذہنی انتقال ہوتا ہے اور اگر اللہ کو اسم وصفی قرار دیا جائے تو اشتقاقی معنی یعنی الوہیت کا مفہوم ذہن میں آتا ہے (اور نفس وضع کے لحاظ سے وصفی معنی یعنی الوہیت کی خصوصی وضع ذات خداوندی کے لئے نہیں قرار پاتی) لیکن وصف الوہیت کا تقاضا ہے کہ الٰہ کے اندر تمام صفات کمالیہ موجود ہوں اور عیوب و نقائص اس میں بالکل نہ ہوں اس لئے دوسرے وصفی ناموں کے مقابلہ میں لفظ اللہ زیادہ جامع ہوگا (لیکن کوئی وصفی نام محض ذات پر دلالت نہیں کرتا اس لئے لفظ اللہ گو کتنا ہی جامعُ الصّفات ہو مگر اسم وصفی ہونے کی وجہ سے ذات خالص پر دلالت نہیں کرے گا)۔

صوفیہ نے مبتدی کے لئے لا الہ الا اللہ (کا ورد) ہی منتخب کیا ہے کیونکہ مبتدی کے لئے بغیر کسی اسم وصفی یا صفت کی وساطت کے ذات خالص تک رسائی ممکن نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس نفی و اثبات کے اسم اعظم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اثباتِ الوہیّت کا تقاضا ہے کہ تمام صفات کمالیہ اس کی ذات میں بالذات موجود ہوں اور کوئی عیب و نقص اس میں نہ ہو کیونکہ جو ذات ایسی جامعُ الصّفات اور منزہ از نقائص نہ ہو اس کو استحقاقِ معبودیت نہیں ہو سکتا۔

ایسی حالت میں غیر اللہ کی الوہیت کی نفی اور ذات الٰہی میں تمام صفات ثبوتیہ و سلبیہ کے حصر پر جو کلمہ دلالت کرے گا وہی اسم اعظم ہوگا اس لئے لا الہ الا اللہ ہی اسم اعظم ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ اسی نے سچائی کا حامل یا دین حق کا حامل قرآن آپ پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔ حق سے مراد ہے سچائی یا دین حق، تَنْزِیْل (تفعیل) کا معنی ہے قدرے قدرے اتارنا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ یہ قرآن اپنے سے پہلی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والی کتاب ہے اس لئے جو یہودی اور عیسائی پہلی کتابوں کو مانتے ہیں ان پر قرآن کی تصدیق بھی لازم ہے۔

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ اور اسی نے تورات و انجیل کو (جدا جدا) یکبارگی نازل فرمایا تھا، انزال کا معنی ہے قدرے قدرے یا مجموعۃً نازل کرنا اور تنزیل کا معنی ہے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کرنا۔ اسی لئے نزول قرآن کے لئے نزل اور نزول تورات و انجیل کے لئے انزل فرمایا۔

marfat.com

تورات عبرانی لفظ ہے، حضرت موسیٰ پر جو کتاب اتری تھی اس کا نام ہے اور انجیل سریانی لفظ ہے اور حضرت عیسیٰ پر جو کتاب اتری تھی اس کا نام ہے۔ یہ دونوں لفظ عربی نہیں ہیں بعض لوگوں نے کہا کہ توراۃ کا وزن فَوْعَلَةٌ یا تَفْعَلَةٌ ہے اور مادہ وَرْیٌ ہے۔ وَرْيُ الزَّنْدِ چقماق روشن کرنا اور انجیل نجل سے مشتق ہے۔ یہ توجیہ سراسر تکلف ہے۔

مِنْ قَبْلُ قرآن کو نازل کرنے سے پہلے، تاکہ لوگ قرآن کو ماننے کے لئے تیار ہو جائیں۔

هُدًى لِّلنَّاسِ سب لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر، بعض علماء کے نزدیک الناس سے مراد ہیں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی امتیں، مگر اس قول کی کوئی وجہ نہیں (بلکہ الناس سے سب لوگ ہی مراد ہیں) کیونکہ تمام آسمانی کتابیں تمام انسانوں کو توحید الٰہی، تصدیق جمیع انبیاء اور مبدء و معاد پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہیں۔ اللہ کے احکام و نواہی پر پابند رہنے کی ہدایت کر رہی ہیں اور تورات و انجیل و زبور نے محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی اطلاع دی ہے۔

ایک شبہ

قرآن مجید کے احکام سے گذشتہ آسمانی کتابوں کے بعض اعمالِ فرعیہ منسوخ ہو گئے، ایسی حالت میں ان سب کو ہدایت کے لئے بھیجنے کا کیا معنی؟۔

ازالہ

اگر بعض اوقات میں سابق کتب کے بعض فرعی احکام منسوخ ہو گئے تو اس سے ان کتابوں کا سراسر ہدایت ہونا منسوخ نہیں ہو گیا، جس طرح قرآن مجید کے بعض احکام دوسرے احکام سے منسوخ ہو گئے، بات یہ ہے کہ نسخ کا معنی (یہ نہیں ہے کہ منسوخ حکم غلط تھا بلکہ مطلب) یہ ہے کہ منسوخ حکم ایک مقررہ مدت کے لئے تھا اب نہیں رہا۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ گزشتہ انبیاء کی شریعتیں ہمارے لئے لازم نہیں۔ لیکن آیت مذکورہ اس قول کے خلاف ہمارے لئے شہادت دے رہی ہے کہ (باستثناء بعض احکام منسوخہ باقی) احکامِ سابقہ ہمارے لئے بھی ضروری ہیں۔

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اور اس نے (حق و باطل میں) تفریق کر دینے والی تمام آسمانی کتابیں نازل کیں۔ الفرقان میں لام استغراقی ہے اور توریت و انجیل و قرآن کے علاوہ جو آسمانی کتابیں ہیں ان سب کو یہ لفظ شامل ہے۔ یا الفرقان سے مراد بھی قرآن مجید ہے، مدح اور اظہار عظمت و شرف کے لئے دوبارہ قرآن کا ذکر فرمایا کیونکہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ تو سب ہی کتابیں ہیں لیکن قرآن کی عبارت بھی معجزہ ہونے کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان فرق قائم کرنے والی ہے۔

دوبارہ انزل کو ذکر کرنے کی دو وجوہ ہیں ا۔ معطوف علیہ کا ذکر ذرا دور ہو گیا اس لئے اگر دوبارہ انزل کو ذکر نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ کوئی الفرقان کو ہُدًی پر معطوف سمجھ لیتا جو غلط تھا، ۲۔ تکرار انزل سے اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول دو بار ہوا، ایک بار شب قدر میں (پورا قرآن) آسمان دنیا پر نازل ہوا، پھر دوسری بار ٹکڑے ٹکڑے ضرورت کے موافق اس زمین پر اتارا گیا۔

سدی کا قول ہے کہ عبارت میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے، اصل عبارت اس طرح تھی وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ وَالْفُرْقَانَ هُدًى۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ جن لوگوں نے اللہ کی اتاری ہوئی آیات کا انکار کیا خواہ وہ کسی آسمانی کتاب کی ہوں ان کے لئے اس کفر کی وجہ سے عذابِ شدید ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ اور اللہ غالب ہے عذاب دینے سے اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔

marfat.com

ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾ انتقام والا ہے، کوئی انتقام لینے والا اس جیسا انتقام نہیں لے سکتا۔ نقمة، سزا، اس سے فعل یَقِمُ آتا ہے۔ گذشتہ آیات میں اول اثبات توحید کیا پھر رسول کی سچائی کی طرف اشارہ کیا کہ قرآن مجید، دوسری آسمانی کتابوں کے مطابق ہے اور (عبارت کے لحاظ سے) طاقتِ بشریہ سے خارج بھی ہے آخر میں اس آیت میں انکار کرنے والوں کو عذاب کی تنبیہ فرمادی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۵﴾ یہ حقیقت ہے کہ اللہ سے زمین اور آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، مراد یہ ہے کہ سارے جہان میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں، خواہ کلّی ہو یا جزئی چونکہ حس کی رسائی صرف آسمان و زمین تک ہی ہے اس لئے انہی دونوں کا ذکر کیا مگر مراد سارا جہان ہے۔ پھر زمین کا ذکر آسمان سے پہلے کیا کیونکہ یہاں مقصود صرف یہ بیان کرنا ہے کہ بندوں کے اعمال سے اللہ واقف ہے اور وہ اعمال کی جزا و سزا دے گا (اور بندوں کے اعمال کا مقام زمین ہے اس لئے زمین کا ذکر پہلے کیا)۔

مذکورۂ بالا پورا جملہ اللہ کے حی ہونے کو ثابت کر رہا ہے (ورنہ اس کا علم محیطِ کل کس طرح ہو سکتا ہے، علم کا مدار تو حیات پر ہے) اس کے بعد آئندہ آیت اللہ کی قیومیّت کو ثابت کر رہی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ وہی ہے جو ماں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بنا دیتا ہے یعنی تمہارے رنگ، مختلف شکلیں اور نر و مادہ جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس کسی کو اس کے سوا نہ علم ہے، نہ قدرت ہاں جتنا اس نے عطا کر دیا ہے اتنا حاصل ہے۔

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾ وہی غالب اور حکمت والا ہے۔ اس میں اللہ کے کمالِ قدرت اور ہمہ گیر علم کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم سے اللہ کے سچے رسول (ﷺ) نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کا تخلیقی قوام ماں کے پیٹ کے اندر چالیس روز تک بصورت نطفہ، پھر اتنی ہی مدت بصورت علقہ، پھر اسی قدر بصورت مضغہ ہوتا ہے۔ پھر اللہ فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لئے بھیجتا ہے حسب الحکم فرشتہ اس کا رزق، (اچھے برے) اعمال، مدت زندگی اور نیک بخت یا بد بخت ہونا لکھ دیتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم میں سے بعض لوگ اہل جنت کے عمل (اتنے) کرتے ہیں کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے آخر تقدیر کا لکھا آگے آتا ہے اور وہ شخص دوزخیوں کے کام کرتا ہے اور دوزخ میں چلا جاتا ہے کچھ لوگ دوزخیوں کے اعمال (اتنے) کرتے ہیں کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے آخر تحریرِ خلقی غالب آتی ہے اور وہ شخص اہل جنت کے کام کرتا اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے، متفق علیہ۔

حضرت حذیفہ بن اسیدؓ کی مرفوع روایت ہے کہ رحم کے اندر نطفہ کے چالیس یا پینتالیس روز ٹھہرنے کے بعد ایک فرشتہ اسکے پاس آتا ہے اور عرض کرتا ہے الٰہی یہ بد بخت ہے یا نیک بخت (حسب الحکم) دونوں باتوں میں سے کوئی بات لکھ دی جاتی ہے، پھر عرض کرتا ہے مالک یہ نر ہے یا مادہ (حسب الحکم) یہ چیزیں بھی لکھ دی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے اعمال، احوال، مدّتِ زندگی اور رزق بھی تحریر کر دیا جاتا ہے پھر تحریر کو لپیٹ دیا جاتا ہے پھر اس میں زیادتی کمی نہیں کی جاتی، رواہ البغوی۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وہی ہے جس نے آپ ﷺ کے اوپر کتاب یعنی قرآن اتارا۔

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ جس کی کچھ مضبوط آیات ہیں یعنی ایسی محکم آیات ہیں جن کو زبان داں شخص سن کر اشتباہ میں نہیں رہتا، نہ ظاہری الفاظ اس کے لئے شبہ آفریں ہوتے ہیں، نہ مفہوم کلام، نہ مقتضائے کلام، خواہ غور کرنے کے بغیر ہی مفہوم اور مقتضاء سمجھ میں آجاتا ہو جیسے آیت قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم اور آیت وقضی ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ اور آیت لیس کمثلہ شئ وھو السمیع البصیر یا غور و تامل کے بعد کلام کا مقتضاء سمجھ میں آجاتا ہو۔ شارع کی طرف سے بیان کرنے کی ضرورت نہ ہو جیسے آیت السارق والسارقة الخ پر قدرے غور کرنے کے بعد خود ہی

marfat.com

معلوم ہو جاتا ہے کہ جیب تراش کو یہ آیت شامل ہے کیونکہ چوری کا معنی جیب تراشی میں موجود ہے بلکہ جیب تراشی کا مفہوم چوری کے مفہوم سے کچھ زائد ہے (جیب تراش پرایا مال پوشیدہ طور پر لیتا ہے اور مالک مال کے پاس سے بہت ہی چھپ کر اور چھپا کر لیتا ہے۔ اول چوری کا مفہوم ہے اور دوسرا جیب تراشی کا) لیکن کفن چور اس آیت کے حکم میں نہیں ہے کیونکہ کفن نہ میت کی ملک ہوتا ہے کیونکہ مردہ دنیوی اعتبار سے مٹی کی طرح ہے اور میت کے وارثوں کی ملک بھی نہیں ہے کیونکہ وارث کفن کے علاوہ دوسرے مال کے مالک ہوتے ہیں۔

ایک اور آیت بھی اسی طرح کی ہے اللہ نے فرمایا ہے وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھوؤں چونکہ اس آیت میں دھونے کی آخری حد مذکور ہے اسی لئے ظاہر ہے کہ اَرْجُلَکُمْ کا عطف وُجُوْھَکُمْ یا اَیْدِیَکُمْ پر ہوگا (ورنہ لازم آئے گا کہ ٹخنوں تک مسح کی حد مقرر کی جائے جو غلط ہے[1]) ایک اور آیت ہے ثلثۃ قروء (شافعیؒ کے نزدیک قرء سے حالت طہر مراد ہے اور حنفیہؒ کے نزدیک حیض) غور کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ تین حیض مراد ہیں طہر مراد ہونے کی صورت میں تین کا عدد پورا محقق نہ ہوگا کیونکہ طلاق طہر میں ہی مشروع ہے اب اگر طلاق والے طہر کو بھی مدتِ عدت میں شمار کیا جائے گا تو تین طہر پورے نہ ہوں گے اور شمار نہ کیا جائے گا تو تین طہر سے زائد ہو جائیں گے۔ اس لئے تین حیض ہی مراد ہیں، ایک اور آیت ہے قَوَارِیْرَ مِنْ فِضَّۃٍ۔ غور کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ قَوَارِیْرَ سے وہ ظروف مراد ہیں جو چاندی کے ہوں گے مگر چمک اور صفائی میں شیشہ کی طرح ہوں گے۔ ہم نے محکم کے معنی کی یہ توضیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی روشنی میں کی ہے اس توضیح پر ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل سب ہی محکمات کے اقسام قرار پاتے ہیں۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا کہ محکم وہ بیان ہوتا ہے جس کا صرف ایک ہی معنی محتمل ہوتا ہے دوسرے معنی کا احتمال ہی نہیں ہوتا، بعض نے کہا کہ محکم وہ بیان ہے جس کا معنی معروف ہو اور اس کی دلیل بالکل واضح ہو، مؤخر الذکر دونوں تفسیروں کی مراد بھی وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔

ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ آیات محکمہ اصول فرائض ہیں، قاموس میں ہے اُمّ ماں کو کہتے ہیں ہر چیز کی اُم اس کی اصل اور سہارا ہوتی ہے، اُمّ القوم سردار قوم ہر شے کی ام وہ ہے جو مختلف اشیاء کا مجموعہ ہو۔

میں کہتا ہوں اس جگہ لفظ کتاب بمعنی مکتوب ہے اور مکتوب سے مراد ہے فرض کردہ جیسے آیت کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ میں کُتِبَ کا معنی ہے فرض کیا گیا، اس صورت میں اُمُّ الْکِتَابِ میں اضافت بتقدیر لام ہوگی یعنی محکمات وہ ہیں جو فرائض مامورات و منہیات کی اصول ہیں، یا الکتاب سے قرآن مراد ہے اس صورت میں اُمُّ الْکِتَابِ کی اضافت یا بتقدیر مِنْ ہوگی یا بتقدیر لام۔ اول شق پر یہ معنی ہوں گے کہ محکمات احکام قرآن کے اصول ہیں انہی سے احکام اخذ کئے جاتے ہیں شارع کے (مزید) بیان کی ضرورت نہیں رہتی، دوسری شق پر یہ معنی ہوں گے کہ محکمات قرآن کو مدار اور سہارا ہیں، تمام آیات کی سردار ہیں دوسری آیات کی ان کو ضرورت نہیں بلکہ دوسری آیات کو انہی سے ملا کر مطلب نکالا جاتا ہے۔

آیات محکمات کا تعدد چاہتا تھا کہ امہات الکتاب (بصیغہ جمع) کہا جاتا لیکن تمام محکمات کا مجموعہ ایک ماں کی طرف ہے۔ احکام مجموعہ کا استخراج مجموعہ محکمات سے ہوتا ہے ہر ایک سے نہیں ہوتا اس لئے مفرد کا صیغہ استعمال کیا۔

وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ اور کچھ دوسری آیات متشابہات ہیں جب تک شارع کی طرف سے محکم عبارت میں ان کا بیان نہ ہو کوئی لغت شناس اور واقفِ زبان غور اور تامل کرنے کے بعد بھی ان کی مراد نہیں سمجھ سکتا۔ اب اگر شارع کی طرف سے

---

[1] فقہاء امامیہ کے نزدیک اَرْجُلَکُمْ کا عطف بِرُءُوْسِکُمْ پر ہے یعنی اپنے پاؤں کا مسح کرو کعبین تک۔ علماء شیعہ کہتے ہیں کہ کعب سے مراد ہے، بالائے قدم کا ابھار اور دو قدموں پر دو ابھار ہوتے ہیں پس مراد یہ ہے کہ پاؤں کے اوپر جہاں بلندی ہے یعنی پنجہ سے ذرا اوپر تک مسح کرو، کعب کا یہ ترجمہ خلاف ظاہر ہے، بالاجماع کعب سے مراد ٹخنہ ہی ہے اور ہر پاؤں کے دو ٹخنے ہوتے ہیں اور بِرُءُوْسِکُمْ پر عطف کرنے کی صورت میں کعبین مسح کی حد ہوگی جو غلط ہے۔

marfat.com

مراد کا بیان اور وضاحت ہو جائے تو اصول فقہ کی اصطلاح میں ایسے متشابہ کو مجمل کہتے ہیں جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، عمرہ اور آیت ربوا وغیرہ اور اگر شارع کی طرف سے بیان و تعلیم نہ ہو تو ایسے متشابہ کو اصول فقہ کی اصطلاح میں متشابہ کہتے ہیں۔ اس قسم کا تشابہ انہی امور میں ہو سکتا ہے جن سے عمل کا تعلق نہ ہو ورنہ تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی جیسے سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات ہیں یا آیت یَدُاللّٰہِ فَوقَ اَیدِیھِم اور آیت الرَّحمٰنُ عَلَی العَرشِ استَوٰی ہے، اس طرح کے متشابہات کا علم بعض اہل عرفان کو الہام اور تعلیم الٰہی کے ذریعے سے بھی ہو جاتا ہے جس طرح حضرت آدمؑ کو اللہ نے تمام اسماء کا علم عطا فرمایا تھا۔

مشکوٰۃ نبوت سے نور چینی شرح صدر کے بعد ہی ممکن ہے اور ایسی نور چینی کبھی کبھی ہوتی ہے اور اسی وقت ہوتی ہے جبکہ زبان اور لغت سے تعلیم و تعلم ممکن نہ ہو کیونکہ ان حقائق کے لئے کوئی لفظ موضوع ہی نہیں ہے اسی لئے عوام کا علمی خزانہ ان سے خالی ہے جن امور و احکام سے اعمال تکلیفیہ کا تعلق ہے ان کے متعلق تاخیر بیان جائز نہیں تاکہ تکلیف بالمحال لازم نہ آئے۔

ایک شبہ

آیت الٓرٰ کِتٰبٌ اُحکِمَت اٰیٰتُہٗ بتا رہی ہے کہ تمام آیات محکم ہیں لیکن دوسری آیت میں کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن متشابہ ہے اور اس جگہ بعض آیات کو محکم اور بعض کو متشابہ قرار دیا ہے یہ اختلاف بیان کیوں ہے۔

ازالہ

پورے قرآن کے محکم ہونے کا یہ معنی ہے کہ تمام قرآن فسادِ معنی اور ضعفِ عبارت سے محفوظ ہے ایسا محکم ہے کہ کوئی اس پر نکتہ چینی نہیں کر سکتا نہ مقابلہ کر سکتا ہے، اور پورے قرآن کے متشابہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ حسن اور کمال میں سارا قرآن ایک جیسا ہے تمام آیات باہم حسن میں متشابہ ہیں اور اس جگہ تفریق و تقسیم سے مراد یہ ہے کہ بعض آیات کے معانی واضح ہیں (کہ مراد کا تعدد ممکن ہی نہیں) اور بعض کے خفی ہیں (کہ بغیر شارع کے بیان کے معلوم نہیں ہو سکتے)۔

فَاَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِھِم زَیغٌ پس جن لوگوں کے دلوں میں حق سے کجی ہے۔ ربیع نے کہا آیت میں اہل نجران کا عیسائی وفد مراد ہے۔ اہل وفد نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کیا آپ عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ نہیں کہتے، حضور ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں کہتے، اہل وفد نے کہا بس ہمارے لئے یہی کافی ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

کلبیؒ نے کہا یہودی مراد ہیں جنہوں نے ابجد کے حساب سے اس امت کی مدت بقاء کا علم حاصل کرنا چاہا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف وغیرہ کا ایک یہودی گروہ خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔ حیی نے کہا ہم کو اطلاع ملی ہے کہ آپ پر الٓمٓ نازل ہوئی ہے۔ ہم آپ کو قسم دے کر دریافت کرتے ہیں کہ کیا اللہ نے آپ پر اس کو نازل فرمایا ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! حیی بولا اگر یہ بات صحیح ہے تو میں اس کو آپ کی امت کی مدت زندگی خیال کرتا ہوں اور یہ کل مدت ۷۱ سال ہوگی۔ کیا اس کے علاوہ کچھ اور بھی نازل ہوا ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں المص (بھی نازل ہوا ہے) حیی بولا اب تو بہت مدت ہو گئی ۱۶۱ سال ہو گئے کیا اس کے علاوہ کچھ ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں الرٰ۔ بولا اس کی شمار بھی زیادہ ہے اس کی تعداد دو سو اکتیس ہے کیا اور بھی کچھ اترا ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں المر کہنے لگا یہ بھی بہت مدت ہے ۲۷۱ سال کی ہے آپ نے ہمارے لئے گڑبڑ کر دی ہم نہیں سمجھتے کہ زیادہ مدت قائم کریں یا کم مدت۔ ہم ایسی باتوں کو نہیں مانتے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن جریجؒ نے کہا آیت میں منافق مراد ہیں اور حسن کے نزدیک خوارج مراد ہیں۔ امام احمد وغیرہ نے حضرت ابوامامہ کی

marfat.com

روایت سے ارشاد نبوی اسی طرح نقل کیا ہے۔ قتادہؒ جب یہ آیت پڑھتے تھے تو کہتے تھے اگر یہ لوگ حروریہ اور سابیہ گروہ نہیں تو میں نہیں جانتا کہ اور کون لوگ ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک تمام بدعتی مراد ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ لفظ عام ہے مذکورہ بالا تمام گروہ اس میں داخل ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت ھُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْہُ اٰیَاتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ...... اُولُوا الْاَلْبَابِ تک تلاوت فرمائی اور فرمایا اگر تم ایسے لوگ دیکھو کہ متشابہات قرآن کے پیچھے پڑے ہیں تو (سمجھ لینا کہ) یہ وہی لوگ ہیں جن کا اللہ نے ذکر فرمایا ہے اور ان سے احتیاط رکھنا۔ (رواہ البخاری)۔

حضرت ابو مالکؓ اشعری کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے مجھے اپنی امت کے متعلق صرف تین باتوں کا اندیشہ ہے ان تین باتوں میں حضور ﷺ نے ایک بات یہ بیان فرمائی کہ بعض (لوگ) کتاب کھول کر متشابہات کی تاویلیں کرنے کے طلب گار ہوں گے حالانکہ ان کی تاویل سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا، پکے علم والے تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارا اس (قرآن) پر ایمان ہے یہ سب ہمارے مالک کی طرف سے آیا ہے اور نصیحت پذیر صرف اہل دانش ہی ہوتے ہیں۔

فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ یعنی ٹیڑھے دلوں والے قرآنی متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اہل بدعت اپنی نفسانی خواہش کے زیر اثر متشابہ کے اس معنی سے وابستگی اختیار کرتے ہیں جو ان کے مسلک کے موافق ہوتا ہے اور الفاظ میں اس معنی کا کچھ احتمال ہوتا ہے نہ محکم آیات واحادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں نہ اس معنی پر کلام کو محمول کرتے ہیں جو دوسرے محکمات کے مطابق ہوتا ہے یا یہ مراد ہے کہ متشابہات پر ایمان رکھتے ہوئے اور ان کی مراد کو تسلیم کرتے ہوئے سکوت نہیں اختیار کرتے (بلکہ اپنی طرف سے تاویلیں کرتے ہیں) پس بقدر امکان متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹانا واجب ہے تاکہ مجمل کی مراد واضح ہو جائے اور اس پر عمل کیا جاسکے۔ جیسے نماز، زکوٰۃ اور سود وغیرہ (مجمل متشابہ ہیں لہٰذا دوسری محکم آیات واحادیث کی طرف رجوع کر کے ان کے معنی کی تعیین کی جائے) یا متشابہات کی تاویل اور تعیین معنی کو چھوڑ کر خاموشی اختیار کرلی جائے اور اس بات پر ایمان رکھا جائے کہ ان سے جو کچھ شارع کی مراد ہے وہ حق ہے، ہم اس کو مانتے ہیں۔

جب اجماع امت اور احادیث متواترہ کی نصوص سے ثابت ہو چکا ہے کہ چودھویں کے چاند کی طرح قیامت کے دن اہل ایمان کو دیدار الٰہی ہوگا تو اس پر ایمان رکھنا اور یہ کہنا لازم ہے کہ آیت وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں رؤیت اور نظر سے مراد آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ ہاں محکم نص سے اگر معنی کی تعیین نہ ہوئی جیسے يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ اور اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى میں (دست خدا اور استواء بالائے عرش کے معنی کی تعیین کسی محکم آیت یا متواتر حدیث میں نہیں آئی ہے) تو ایسی آیات کے معنی میں سکوت اختیار کیا جائے لیکن ان پر ایمان رکھنا لازم ہے اور ظاہری معنی پر ایسے متشابہ الفاظ کو محمول نہ کیا جائے اور محکم آیت لیس کمثلہ شئی کے معنی پر عمل کرتے ہوئے کہہ دیا جائے کہ اللہ ممکنات کی تمام صفات سے پاک ہے نیز مقطعات کی تفسیر میں خواہ مخواہ تکلیف نہ اٹھائی جائے۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔

اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ یعنی وہ متشابہات کے پیچھے اس غرض سے پڑتے ہیں کہ مسلمانوں میں دین کی طرف سے فتنہ بپا کر دیں، شک ڈال دیں، اشتباہ پیدا کر دیں اور محکم کا متشابہ سے مقابلہ کر کے محکم کو توڑ دیں[۱]۔ منافقوں کا یہی وتیرہ ہوتا

۱؎ (حاشیہ از مؤلف) دارمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان نقل کیا ہے کہ عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگ آئیں گے جو متشابہات قرآن میں تم سے جھگڑا کریں گے۔ تم سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کی پکڑ کرنا کیونکہ اہل سنت ہی کتاب اللہ کو خوب جانتے ہیں، حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے پاس موجود تھے کہ ایک شخص آیا اور قرآن کے متعلق پوچھنے لگا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق، حضرت عمرؓ کھڑے ہو کر اس کے کپڑوں سے لپٹ گئے اور اس کو کھینچ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس لے گئے اور فرمایا ابو الحسن سنتے ہو یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، مجھ سے آکر یہ پوچھنے لگا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اس بات (بقیہ اگلے صفحے پر)

marfat.com

ہے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ بعض یہودیوں نے جب اسلام کی شوکت اور بلندی دیکھی تو جل گئے اور یقین کر لیا کہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو یہ امداد ان کے دین کی وجہ سے ہو رہی ہے لہٰذا دو غلے بن گئے ظاہر میں اسلام لے آئے اور متشابہات کی غلط توجیہات تفسیری کرنے لگے اور مذاہب باطلہ کی ایجاد کرنی شروع کر دی چنانچہ حروریہ اور معتزلہ اور رافضی وغیرہ بن گئے۔

وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ اس کا عطف اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ پر ہے۔ یعنی وہ اپنی خواہش کے موافق متشابہات کی تفسیر کرنے کے لئے ان کے پیچھے پڑتے ہیں۔ تفسیر متشابہات کی طلب کبھی مبنی بر جہالت ہوتی ہے جیسا کہ بعض متأخرین اہل بدعت نے کیا ہے، البتہ متقدمین منافق اکثر مذکورہ بالا دونوں وجوہ کی وجہ سے ہی متشابہات کی تفسیر کے درپے ہوا کرتے تھے۔

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ حالانکہ متشابہات کی اصلی مراد سے واقف سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ یعنی عربی زبان کو جاننا متشابہات کی مراد جاننے کے لئے کافی نہیں۔ بغیر خدا کے واقف کئے ہوئے کوئی نہیں جان سکتا ہماری اس توضیح پر علم متشابہات کا اللہ میں حصر اضافی ہوگا حقیقی نہ ہوگا (یعنی یہ مطلب نہ ہوگا کہ اللہ کے سوا کوئی انسان یا فرشتہ متشابہات کی مراد سے واقف ہی نہیں ہو سکتا بلکہ یہ مطلب ہوگا کہ خدا کی طرف سے واقف کئے بغیر محض عربی دانی اور قیاس آرائی کی وجہ سے کوئی شخص ان کی صحیح مراد سے واقف نہیں ہو سکتا) لہٰذا آیت اس بات پر دلالت نہیں کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعض خصوصی کامل امتی بھی متشابہات کے معنی نہیں جانتے۔ جیسا کہ ایک اور آیت میں آیا ہے لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ۔ آسمانوں اور زمینوں میں کوئی بھی اللہ کے سوا غیب نہیں جانتا (یہ بھی حصر اضافی ہے یعنی بغیر خدا کی طرف سے واقف بنائے ہوئے کوئی بھی از خود غیب سے واقف نہیں) ہم نے حصر کو اضافی اس لئے قرار دیا کہ اللہ نے خود فرمایا ہے ثم ان علینا بیانہ اس آیت کا تقاضہ ہے کہ اللہ کی طرف سے قرآن کے محکم و متشابہ کا بیان رسول اللہ ﷺ کے لئے ہونا لازم اور ضروری ہے رسول اللہ ﷺ کے لئے قرآن کا کوئی حصہ بھی بغیر بیان کے نہ رہنا چاہئے ورنہ خطاب بیکار ہوگا اور خلافِ وعدہ لازم آئے گا۔

صحیح بات وہی ہے جو ہم نے سورۂ بقرہ کے اول میں لکھ دی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان متشابہات ایک راز ہیں عام لوگوں کو ان کا علم عطا کرنا مقصود ہی نہیں ہے بلکہ ان کے لئے متشابہات کا علم ممکن ہی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعض کامل امتیوں کو ہی بتانا مقصود ہے اور اخص الخواص حضرات ہی علم لدُنی کے ذریعہ سے ان سے واقف ہوتے ہیں اور علم لدُنی کا حصول صرف بے کیف ذاتی یا صفائی معیت کے سبب سے ہوتا ہے (تحصیل اور کسب اور غور و فکر سے نہیں ہوتا)

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ اور جو لوگ علم میں پکے اور جمے ہوئے ہیں کہ ان کو کوئی شک شبہ لاحق ہی نہیں

(بقیہ حصہ) کا (برا) پھل عنقریب نکلے گا۔ جو خلافت آپ کی ہے اگر میری ہوتی تو میں اس کی گردن مار دیتا، دارمی نے بروایت سلیمان بن یسار لکھا ہے کہ ایک آدمی جس کا نام صبیغ تھا مدینہ میں آیا اور متشابہات قرآن کے متعلق پوچھنے لگا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بلوایا اور کھجور کی ننگی قمچیاں اس کے لئے تیار رکھیں جب وہ آ گیا تو آپ نے فرمایا، تو کون ہے اس نے جواب دیا میں اللہ کا بندہ صبیغ ہوں حضرت عمر نے فرمایا میں اللہ کا بندہ عمر (رضی اللہ عنہ) ہوں یہ فرمانے کے بعد ایک قمچی لے کر اس کے ماری اور اس کے سر کو خون آلود کر دیا صبیغ فوراً بول اٹھا امیر المؤمنین بس کیجئے وہ چیز جاتی رہی جو پہلے میں اپنے سر میں پاتا تھا۔ ابو عثمان سندی کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ کو لکھ بھیجا تھا کہ صبیغ کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھنا اس کے بعد اگر وہ (ہمارے جلسہ میں) آتا تھا اور ہم سو آدمی بیٹھے ہوتے تھے تو سب الگ الگ ہو جاتے تھے (اور جلسہ برخاست کر دیتے تھے) حضرت محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھ بھیجا تھا کہ صبیغ کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھنا اور اس کو تنخواہ و روزینہ نہ دینا، امام شافعیؒ نے فرمایا میرا فیصلہ اہل کلام (معتزلہ اور قدریہ وغیرہ) کے بارہ میں بھی وہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ صبیغ کے بارہ میں تھا کہ ان کو قمچیوں سے مارا جائے اور اونٹ پر بٹھا کر قبائل اور خاندانوں میں گھمایا جائے اور ندا کرا دی جائے کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو کتاب و سنت کو چھوڑتا اور علم کلام کی جانب اپنا رخ کرتا ہے، ۱۲۔

marfat.com

ہوتا۔ یہ لوگ اہل السنّت والجماعت ہیں، جنہوں نے مضبوطی کے ساتھ قرآن وحدیث کے محکمات کو پکڑ لیا ہے اور قرآن مجید کی تفسیر میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے اجماع کی پیروی کی ہے اور متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا دیا ہے اور اپنی خواہشات اور نفسانی ملمع کاریوں کو ترک کر دیا ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ الراسخون فی العلم سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو مسلمان ہوگئے تھے۔ میں کہتا ہوں اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ اہل تصوف کہتے ہیں کہ راسخ فی العلم وہ لوگ ہیں۔ جو نفس اور عناصر کو فناء کر کے خواہشات سے بالکل الگ ہو چکے ہیں۔ تجلیاتِ ذاتیہ میں ایسے ڈوبے ہوئے ہیں کہ کوئی شبہ ان کو لاحق ہی نہیں ہو سکتا، وہ کہتے ہیں کہ اگر نقاب ہٹا بھی دیا جائے تو جتنا یقین ہم کو ہو چکا ہے اس سے زیادہ نہ ہوگا (یعنی ہمارے یقین میں اضافہ کی گنجائش ہی نہیں ہے ہمارا ایمان عین مشاہدہ ہے ہم کو حق الیقین حاصل ہو چکا ہے)۔

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے راسخین فی العلم کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا جو لوگ قسم کے پورے، زبان کے سچے، استقامت قلبی رکھنے والے اور شکم و شرم گاہ کو (حرام سے) بچانے والے ہیں وہ راسخین فی العلم میں سے ہیں میں کہتا ہوں یہ اوصاف صوفیہ کے ہیں۔

آیت کی ترکیب عبارت میں (حنفیہؒ اور شافعیہؒ کا) اختلاف ہے۔ ایک گروہ قائل ہے کہ وَالرّٰسِخُوْنَ میں واؤ عطف کا ہے اس وقت آیت کا معنی یہ ہوگا کہ متشابہات کو اللہ جانتا ہے اور راسخ علماء بھی جانتے ہیں اس صورت میں آئندہ جملہ

يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ حالیہ ہوگا یعنی علماء راسخین یہ کہتے ہوئے متشابہات کا علم رکھتے ہیں کہ پورا قرآن ہمارے رب کا بھیجا ہوا ہے ہم اس پر ایمان لائے۔ اسی کی نظیر ہے آیت لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ...... وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ۔ پھر فرمایا وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔ (اس آیت میں بھی یقولون جملہ حالیہ ہے) یہ قول مجاہد اور ربیع کا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے بھی فرمایا تھا کہ میں راسخین فی العلم میں سے ہوں (یعنی متشابہات کی تفسیر سے واقف ہوں) یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ مجاہد نے فرمایا میں بھی متشابہ کے مرادی معنی جاننے والوں میں سے ہوں۔

اکثر علماء کا خیال ہے کہ وَالرّٰسِخُوْنَ میں واو استیناف کلام کے لئے ہے گزشتہ کلام اِلَّا اللّٰهُ پر ختم ہو گیا، یہاں سے نیا کلام شروع ہے۔ یہ قول حضرت ابی بن کعب، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عروۃ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا ہے طاؤس کی روایت میں اس قول کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف بھی کی گئی ہے۔ حسنؒ بصری اور اکثر تابعین بھی اسی کے قائل ہیں۔ کسائی، فراء اور اخفش کے نزدیک بھی یہی قول پسندیدہ ہے اس کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کی دوسری قرأت سے بھی ہوتی ہے جس میں وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ کی جگہ اِنْ تَاْوِيْلُهٗ اِلَّا عِنْدَ اللّٰهِ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ الخ آیا ہے (اس قرات پر تو وَالرّٰسِخُوْنَ کا عطف اللہ پر ہو سکنا ممکن ہی نہیں) نیز حضرت ابی بن کعب کی قرأت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں آیت اس طرح آئی ہے وَيَقُوْلُ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ اٰمَنَّا بِهٖ (اس قرات پر بھی اَلرّٰسِخُوْنَ کا عطف اللہ پر نہیں ہوگا) اسی لئے عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا تھا کہ تفسیر قرآن کے علم میں رسوخ رکھنے والوں کے علم کی یہ آخری حد آگئی کہ انہوں نے آمنا بہ کہہ دیا۔

كُلٌّ سب یعنی محکم، متشابہ، ناسخ منسوخ اور جس کی مراد سے ہم واقف ہیں وہ اور جس کی مراد سے ہم واقف نہیں وہ سب

مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ راسخین فی العلم کا حال ان لوگوں کے حال سے بالکل برعکس ہے جن کے دل خواہشات نفسانی کی وجہ سے ٹیڑھے ہوگئے ہیں اور وہ اپنے ہی خیالات کے پیرو ہیں۔ جب کوئی علمی چمک ان کے سامنے آجاتی ہے اور نص شریعت ان

marfat.com

کے خیالات کے مطابق ہو جاتی ہے تو اس روشنی میں وہ (چند قدم) چل لیتے ہیں اور اس کو مان لیتے ہیں لیکن اگر نص قرآنی کی تاویل ان کو نہ سوجھی اور اندھیرا چھا گیا اور نصوص شریعت ان کے خیالات کے مطابق نہ ہوئیں تو متحیر ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نہیں مانتے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہ قول ظاہر آیت کے بھی مناسب ہے اور قواعد عربی کے بھی زیادہ مطابق ہے۔ بغوی کی مراد یہ ہے کہ واؤ کو عاطفہ نہ قرار دینا اور اَلرّٰسِخُوْنَ سے استیناف کلام ہونا قیاسِ نحوی کے زیادہ مطابق ہے، کیونکہ علماء نحو کا اجماع ہے کہ نفی سے استثناء اثبات ہوتا ہے اور اَلرّٰسِخُوْنَ میں الف لام استغراق کا ہے اب اگر واؤ کو عاطفہ کہا جائے گا تو یہ مطلب ہو جائے گا کہ متشابہات کو کوئی نہیں جانتا مگر اللہ اور تمام راسخین فی العلم۔ یہ مطلب بداہت اور روایت دونوں کے خلاف ہے (نہ تمام راسخین کا عالم متشابہات ہونا روایۃً ثابت ہے نہ واقع میں ایسا ہے)۔

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۞ اور صرف سالم عقلوں والے ہی مضمون قرآن سے نصیحت اندوز ہوتے ہیں۔ کیونکہ سلامتی عقل کا یہی تقاضا ہے کہ جس کا علم نہ ہو اس کے علم کو دانا بینا متکلم کے ہی سپرد کر دیا جائے (نہ جاننے کے باوجود جاننے کے مدعی بنکر) جہل مرکب کی دلدل میں پھنسنا اور وادی گمراہی میں سرگرداں رہنا خلاف دانش ہے۔ بعض اکابر کا قول ہے کہ میں علم کا آدھا حصہ بھی نہیں جانتا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو حق کی طرف سے نہ پھیر دے۔ ٹیڑھا نہ کر دے جس طرح تو نے ان لوگوں کے دلوں کو حق سے پھیر دیا ہے جن کے قلوب میں کجی ہے۔ یہ جملہ راسخین فی العلم کا مقولہ بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ یہ کہتے ہیں اور اللہ کی طرف سے تعلیم اور حکم بھی ہو سکتا ہے کہ جب متشابہات پر پہنچو تو یوں کہو کہ اے ہمارے رب الخ

بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا اس کے بعد کہ کتاب بھیج کر تو نے ہم کو ہدایت کر دی اور محکم و متشابہ پر ایمان لانے کی توفیق عنایت کر دی۔

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت یعنی توفیق اور ثبات ایمانی عطا فرما۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۞ بلاشبہ تو ہی وہاب ہے۔ ہر مانگ کو عطا فرماتا ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے اس امر کی کہ ہدایت ہو یا گمراہی سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اس کی توفیق و عدم توفیق پر موقوف ہے، اس پر کسی کا حق واجب نہیں بلکہ وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ حضرت نواس بن سمعانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی قلب ایسا نہیں کہ وہ رحمٰن کی چٹکی میں نہ ہو (ہر قلب رحمٰن کی چٹکی میں ہے) وہی سیدھا کرنا چاہتا ہے سیدھا کر دیتا ہے ٹیڑھا کرنا چاہتا ہے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ دعا کیا کرتے تھے اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم رکھ۔ (عزت وذلت کی) ترازو رحمٰن کے ہاتھ میں ہے، روز قیامت تک وہ کسی قوم کو اونچا اور کسی قوم کو نیچا کرتا رہے گا، رواہ البغوی۔

اسی قسم کی حدیث امام احمد اور ترمذی نے حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے اور ترمذی و ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کی ہے صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دل کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی پر کسی چٹیل میدان میں پڑا ہو اور ہوائیں اس کو الٹ پلٹ کر رہی ہوں، رواہ احمد۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ اے ہمارے رب تو لوگوں کو ضرور جمع کرے گا قیامت کے فیصلہ کے لئے یا قیامت کے دن۔ مؤخر الذکر شق پر لِیَوْمٍ کا لام فی کے معنی میں ہو گا۔

لَّا رَيْبَ فِيْهِ جس کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں، نہ اس دن اعمال کی جزا و سزا واقع ہونے میں کوئی شک

marfat.com

ع ۱۰

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ ۹ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا میعاد بروزن مفعال وعدہ سے ماخوذ ہے۔ بھلائی کا وعدہ کر کے خلاف ورزی کرنا شان الوہیت کے لئے عیب ہے اس لئے ناممکن ہے، ہاں وعید عذاب کی خلاف ورزی بصورتِ مغفرت ہمارے نزدیک جائز ہے خواہ توبہ کی ہو یا نہ کی ہو۔ وعید یہ معتزلہ کا قول ہے کہ وعید عذاب کی خلاف ورزی بھی جائز نہیں یہ لوگ اپنے قول کے ثبوت میں یہی آیت پیش کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ (یہ آیت مطلق نہیں مقید ہے) تمہارے اور ہمارے سب کے نزدیک وعید عذاب کی شرط یہ ہے کہ فاسق نے توبہ نہ کی ہو (توبہ کرنے کے بعد وعید عذاب متحقق نہ ہوگی) پس جس طرح وعید عذاب عدم توبہ کے ساتھ مشروط ہے اسی طرح ہمارے نزدیک عدم عفو کے ساتھ بھی مشروط ہے (کہ اگر گناہ گار کو اللہ معاف نہیں کرے گا تو عذاب ہوگا) کیونکہ مندرجہ ذیل آیات کا حکم عام ہے (کافروں کے علاوہ تمام گناہ گار اس کے اندر داخل ہیں) اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ تیسری آیت ہے وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ایک اور آیت میں حکم ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اس موضوع کی حدیثیں ان گنت آئی ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، كَفَرُوْا کا لفظ مشرکوں کو بھی شامل ہے اور اہل کتاب کو بھی

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا ان کے مال و اولاد اللہ کی رحمت یا طاعت کا عوض بالکل نہیں ہو سکتے۔ اس ترجمہ پر شَيْئًا موصوف محذوف کی صفت ہوگا یعنی اِغْنَاءً شَيْئًا اور لَنْ تُغْنِيَ کا مفعول مطلق بنے گا کیونکہ اِغْنَا (مصدر باب افعال) لازم ہے مفعول بہ کو نہیں چاہتا لیکن اگر ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ ان کے مال و اولاد اللہ کے عذاب کے کسی حصہ کو دفع نہیں کر سکیں گے تو چونکہ اس وقت اِغْنَاءُ دفع کے معنی کو متضمن ہوگا اس لئے شَيْئًا مفعول بہ ہو جائے گا۔

وَ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ ۱۰ اور یہی وہ لوگ ہیں جو آگ کا ایندھن ہوں گے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ دأب مصدر ہے دأب فی العمل کام میں محنت کی یعنی ان لوگوں کا فعل کفر و تکذیب انبیاء آل فرعون کے عمل کی طرح ہے حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؓ اور مجاہدؒ کا یہی قول ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ دأب کا معنی اس جگہ شان ہے یعنی ان کا حالِ کفر آل فرعون کے حال کی طرح ہے، ابو عبیدہؒ نے دأب کا ترجمہ طریقہ کیا ہے۔ اخفش نے امر ترجمہ کیا ہے، نضر بن شمیل نے عادت، طریقہ، شان، حال وغیرہ سے اس لفظ کی تشریح کی ہے

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور ان لوگوں کے حال کی طرح جو آل فرعون سے پہلے تھے۔

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کے جرائم کی وجہ سے ان کو پکڑا اور سزا دی۔

وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ۱۱ اور اللہ سخت سزا والا ہے یعنی اس کی سزا سخت ہے۔

ابو داؤدؒ نے سنن میں نیز ابن جریرؒ نے اور بیہقی نے دلائل میں محمد بن اسحاق کے سلسلۂ روایت سے بحوالہ سعیدؒ بن جبیرؒ و عکرمہؒ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بدر میں کامیاب ہو کر مدینہ کو واپس آئے تو آپ نے بنی قینقاع کے بازار میں یہودیوں کو جمع کر کے خطاب کیا اور فرمایا اے گروہ یہود قبل اس کے کہ قریشیوں کی طرح تم پر مصیبت آئے مسلمان ہو جاؤ۔ یہودیوں نے جواب دیا محمد (ﷺ) اس کا غرور نہ کرنا کہ چند قریشیوں کو تم نے قتل کر دیا ہے وہ تو ناتجربہ کار تھے جنگ سے واقف ہی نہ تھے، ہم سے لڑو گے تو معلوم ہوگا کہ آدمی ہم ہیں ہماری نظیر تم کو نہ ملی ہوگی۔ اس گفتگو

marfat.com

کے بعد اللہ نے مندرجہ ذیل آیات أُولِی الْاَبْصَارِ تک نازل فرمائیں۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا کافروں سے یعنی ان یہودیوں سے کہہ دو کہ

سَتُغْلَبُوْنَ عنقریب تم مغلوب ہو گے۔ اپنی یہ پیشین گوئی اللہ نے پوری کر دکھائی۔ بنی قریظہ کو قتل اور بنی نضیر کو دیس بدر کیا گیا۔ خیبر فتح ہوا اور وہاں کے یہودیوں پر جزیہ مقرر کیا گیا۔

مقاتل نے بیان کیا کہ ان آیات کا نزول بدر کے واقعہ سے پہلے ہوا تھا اور الذین کفروا سے مشرکین مکہ مراد ہیں یعنی مکہ کے کافروں سے کہہ دو کہ تم بدر کے دن مغلوب ہو گے چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن ان سے فرمایا کہ اللہ تم پر غالب آگیا اور تم کو ہنکا کر جہنم کی طرف لے گیا۔

کلبیؒ نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جب بدر کے دن مشرکوں کو شکست ہو گئی تو مدینہ کے یہودیوں نے کہا خدا کی قسم یہ تو وہی نبی ہیں، جن کی بشارت موسیٰؑ نے دی تھی ان کا پھریرا نہیں لوٹایا جاسکتا۔ چنانچہ یہودیوں نے آپ کے اتباع کا ارادہ کر لیا مگر پھر بعض لوگوں نے کہا ابھی جلدی نہ کرو، ایک واقعہ اور دیکھ لو اس کے بعد جب احد کی لڑائی میں صحابیوں کو شکست ہوئی تو یہودی شک میں پڑ گئے بدبختی غالب آئی اور مسلمان نہ ہوئے یہود اور صحابہؓ کا مدت مقررہ کے لئے ایک معاہدہ تھا، یہودیوں نے بین المیعاد اس معاہدہ کو بھی توڑ دیا اور کعب بن اشرف ساٹھ سواروں کو لے کر مکہ پہنچا اور اہل مکہ کو چڑھائی کرنے کی ترغیب دی اور سب نے باتفاق رائے رسول اللہ ﷺ سے لڑنے کا ارادہ کر لیا اس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ اور آخرت میں تم کو ہنکا کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔

وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔ یہ جملہ یا تو اس مقولہ کا جز ہے جو کافروں سے کہا گیا ہے یا جدا کلام ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰیَةٌ اگر آیت سابقہ میں یہودیوں کو خطاب ہے تو اس میں بھی یہودی ہی مخاطب ہیں اور اگر آیت کا نزول مشرکوں کے متعلق ہے تو یہ خطاب بھی انہی کو ہے۔ بر تقدیر اول یہ مطلب ہو گا کہ اے گروہ یہود میں جو تمہارے مغلوب ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوں اس دعوے کی دلیل کھلی ہوئی ہے۔ بر تقدیر دوم یہ مطلب ہو گا کہ اے گروہ مشرکین میری نبوت کی نشانی اور دلیل واضح ہے۔

فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ان دونوں گروہوں میں جن کا بدر کے دن مقابلہ ہوا تھا۔ فِئَةٌ بمعنی فرقہ۔ فَیْئٌ لوٹنا۔ لڑائی کے دن بعض لوگ بعض کی طرف (مارنے یا پناہ لینے کے لئے) لوٹتے ہیں اس لئے فرقہ کو فِئَةٌ کہا جاتا ہے۔ [1]

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا مؤمن گروہ اللہ کے حکم کی اطاعت میں لڑ رہا تھا۔ اس گروہ کی تعداد ۳۱۳ تھی ۷۷ مہاجر اور ۲۳۶ انصار۔ مہاجرین کے علمبردار حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے یہی صحیح روایت ہے۔ بعض نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علمبردار کہا ہے۔ انصار کے علمبردار حضرت سعدؓ بن عبادہ تھے۔ اس لشکر میں ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے ایک گھوڑا حضرت مقدادؓ بن عمرو کا اور دوسرا حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد کا۔ اکثر فوجی پیادہ تھے۔ اسلحہ میں صرف چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔

وَاُخْرٰی كَافِرَةٌ اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ یہ مکہ کے مشرک تھے۔ ان کی تعداد ۹۵۰ تھی اور سپہ سالار عتبہ بن ربیعہ بن عبد الشمس تھا ان کے پاس سو گھوڑے تھے۔ بدر کی لڑائی جس میں رسول اللہ ﷺ خود بنفس نفیس موجود تھے اول ترین جنگ تھی جو ہجرت سے اٹھارہ مہینے کے بعد ماہ رمضان ۲ھ میں ہوئی تھی۔

یَرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ نافعؒ اور یعقوبؒ کی قرات میں تَرَوْنَهُمْ آیا ہے۔ اب اگر یہودی مخاطب ہیں تو یہ مطلب

---

[1] حضرت مؤلف کا بیان کردہ یہ وجہ تسمیہ صرف فئۃ جنگ کے لئے ہو سکتی ہے حالانکہ فئۃ کا لفظ عام ہے عام گروہ یا جماعت کے معنی میں اس کا استعمال ہے، اس لئے اگر لڑائی کے دن کا لفظ وجہ تسمیہ سے ساقط کر دیا جائے تو مناسب ہے۔ ۱۲۔

marfat.com

ہو گا کہ تم کافروں کو مسلمانوں سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اس کے باوجود تمہاری نظروں کے سامنے فتح مسلمانوں کو ہوئی۔ بات یہ ہوئی کہ کچھ یہودی میدان قتال میں معاینہ جنگ کے لئے جا پہنچے تھے کہ دیکھیں پانسہ کدھر پڑتا ہے۔

ایک شبہ

مشرک تو مسلمانوں سے تین گنے تھے ان کو دوگنا کیوں کہا گیا۔

جواب

تعداد معین مراد نہیں ہے دوگنے سے مراد ہے تعداد کی کثرت جیسے آیت فارجع البصر کرتین میں کَرَّتَیْنِ سے دوبار مراد نہیں بلکہ بار بار مراد ہے۔

اگر آیت کے مخاطب مشرک ہوں تو یہ مطلب ہو گا کہ تم کو لڑائی کے وقت مسلمان اپنے سے دوگنے نظر آرہے تھے۔

سوال :۔ سورۂ انفال میں آیا ہے ویقللکم فی اعینھم اے مسلمانو! کافروں کی نظر میں تمہاری تعداد اللہ کم کر کے دکھا رہا تھا۔ اور اس آیت میں صراحت ہے کہ تمہاری تعداد ان کو اپنے سے دوگنی نظر آرہی ہے۔ دونوں بیانوں میں تناقض ہے۔

جواب :۔ دونوں بیانوں میں تناقض بالکل نہیں ہے لڑائی سے پہلے کافروں کو مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم کر کے دکھائی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ جری ہو گئے اور لڑائی پر آمادہ ہو گئے لیکن لڑائی شروع ہونے کے بعد ان کو نظر آیا کہ مسلمانوں کی تعداد ہم سے دوگنی ہے اس سے ان کے اندر بزدلی پیدا ہو گئی، ہمتیں پست ہو گئیں اور شکست کھا گئے (تناقض میں وحدت زمانہ بھی شرط ہے اور یہاں اختلاف وقت ہے اس لئے تناقض نہیں)۔

جمہور کی قرات یَرَوْنَهُمْ ہے یعنی مشرک مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھ رہے تھے یا جتنی تعداد واقعی مسلمانوں کی تھی اس سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان کافروں کو اپنے سے صرف دوگنا دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ دوگنے نہ تھے بلکہ تین گنے تھے۔ اللہ نے کافروں کی تعداد مسلمانوں کی نظر میں قلیل کر کے اس لئے دکھائی کہ مسلمانوں کو ثبات و اطمینان حاصل رہے اور فتح کے اس وعدہ پر یقین رکھیں جس کا اظہار اللہ نے آیت فان یکن منکم مأة صابرة یغلبوا مائتین میں فرمایا ہے۔ اس کے بعد ایسا بھی وقت آیا کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں کو اپنے برابر نظر آنے لگی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا اول ہم کو کافر اپنے سے دوگنے نظر آتے تھے پھر جو ہم نے دیکھا کہ اپنے برابر انکی تعداد نظر آئی ایک آدمی بھی زیادہ نہ دکھائی دیا۔ آخر میں اللہ نے کافروں کی تعداد ہماری نظر میں اتنی گھٹا دی کہ ہم ان کو اپنے سے کم دیکھنے لگے یہاں تک کہ میں نے اپنے برابر والے آدمی سے کہا ہم کو تو یہ کوئی ستر آدمی دکھائی دیتے ہیں، اس نے کہا مجھے تو سو معلوم ہوتے ہیں۔ آیت میں رؤیت بمعنی علم ہے کیونکہ مِثْلَيْهِمْ اس کا دوسرا مفعول ہے (اور رؤیت بمعنی نظر کا دوسرا مفعول نہیں ہوتا) مِثْلَيْهِمْ کو حال قرار دینا معنی کے لحاظ سے غلط ہے۔

رَأْيَ الْعَيْنِ ط آنکھوں دیکھتے۔ جب رویت مذکورۂ بالا بمعنی علم ہے تو علم کو رأی العین قرار دینے میں مبالغہ ہے علم کی تشبیہ علمی مشاہدہ کے ساتھ ہونے سے علم میں قوت پیدا ہو گئی۔ اس وقت رأی العین سے مراد ہو گا وہ علم جو آنکھوں سے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مسبب بول کر سبب مراد لینا بطور مجاز جائز ہے۔ یا حرف جر محذوف ہے یعنی مسلمانوں کا کافروں کی تعداد کو کم سمجھنا مشاہدہ کی طرح تھا۔

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی مدد سے قوی کر دیتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ مذکورہ تقلیل و تکثیر اور کمزور قلت کی مسلح کثرت پر فتح یابی کے اندر

لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ بصیرت والوں کے لئے یا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے دونوں گروہوں کو دیکھا تھا

marfat.com

بہت بڑی نصیحت ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ۔ زَيْنٌ (مصدر) شَيْنٌ کے برعکس ہے، اس کا مفہوم ہے کسی چیز کا آراستہ، خوبصورت قابل ستائش و محبوب خاطر ہونا۔ اسباب زینت کبھی (داخلی ہوتے ہیں کبھی خارجی، داخلی اسباب کبھی) غیر مادی ہیں جیسے علم عقل وغیرہ اور کبھی مادی بدنی ہوتے ہیں جیسے جسمانی طاقت، حسن قامت، جمال صورت، خارجی اسباب زینت لباس، گھوڑا، سواری، مال، مرتبہ وغیرہ ہیں۔ تزیین (مصدر باب تفعیل۔ متعدی) کسی چیز کو حامل زینت بنا دینا خواہ واقعی وہ حامل زینت ہو جائے جیسے زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ یا محض اعتقادی زینت ہو، اعتقادی زینت بھی دو طرح کی ہوتی ہے، واقع کے مطابق اور غیر مطابق۔ اول کی مثال جیسے وَحَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ اور دوسرے کی مثال جیسے زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ایمان اور بد عملی دونوں اعتقادی اسباب زینت ہیں لیکن اول واقعی سبب زینت ہے اور دوسرا محض فرضی۔

شہوت، کسی چیز کی طرف نفس کی انتہائی رغبت اور کمال میلان۔ آیت میں شہوات سے مراد ہیں مشتہیات (یعنی مرغوبات) کیونکہ حقیقت میں یہ مرغوب چیزیں ہی اسباب زینت اور جاذب محبت ہیں۔ محبت مرغوبات کی جگہ محبت شہوات کا ذکر اپنے اندر دو خوبیاں رکھتا ہے۔

(۱) تنبیہ اور زجر کا مقام ہے اور شہوات کو ذکر کرنے سے زجر میں زور پیدا ہو گیا۔ (۲) اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا کہ لوگ اسباب زینت کی محبت میں اتنے غرق ہیں کہ اسباب زینت کی خواہش سے بھی محبت رکھتے ہیں گویا اصل کلام اس طرح تھا زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ مَحَبَّةِ النِّسَاءِ وَ الْاَوْلَادِ وَ الْمَالِ وغیرہ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ مجھے خیر کی محبت بھی محبوب ہے۔ (جب لیلیٰ سے محبت ہے تو اس کی محبت بھی پیاری ہے اور عشق لیلیٰ بھی محبوب ہے۔ قیس نے کہا تھا۔

الٰہی مجھ سے جدا ہو نہ الفت لیلیٰ

صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ تقاضا مقام ہے کہ اشیاء دنیوی سے نفرت دلائی جائے اور ثواب عنداللہ کی طرف رغبت پیدا کی جائے اور بجائے مشتہیات کے شہوات کہنے سے نفرت دلانے میں زور پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ شہوت علامت دنأت اور دلیل بہیمیت ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ ان مذکورہ اشیاء میں مشغول رہنے اور ان کی طرف کامل توجہ رکھنے سے باز داشت اس لفظ کی وجہ سے پرزور طور پر کر دی گئی کیونکہ ان اشیاء دنیوی کو کمال مرغوبیّت و محبوبیّت حاصل ہے جس کی وجہ سے یہ چیزیں اپنی طرف کامل طور پر کھینچتی ہیں اور اللہ کے مقرر کردہ ثواب سے کاٹ دیتی ہیں۔

اسباب زینت بنانے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے کیونکہ وہی تمام جواہر، اعراض اور انسان کے اعمال و جذبات کا خالق ہے۔ ان چیزوں میں دل کشی اور زیبائش غالباً چند وجوہ کے لئے پیدا کی ایک تو آزمائش مقصود ہے جیسے خود ہی فرمایا ہے اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ دوسرے اہل ایمان کی عملی جدوجہد کا بھی یہ ذریعہ ہے۔ تیسرے شکر نعمت کا بھی سبب ہے، چوتھے سعادت آخرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، پانچویں ملائکہ پر آدمی کی فضیلت کا موجب ہے، چھٹے کافروں کو توفیق نہ دینے اور ان کو گمراہ کر دینے کا باعث ہے۔ فرمایا ہے يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ پھر شخصی اور نوعی زندگی کے بقاء کی حکمت بھی اس کے اندر ہے فرمایا قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں فاعل تزیین شیطان ہے کیونکہ آیت کا سیاق مذمت آگیں ہے اور مقام ذم میں فاعل تزیین شیطان کو ہی قرار دینا مناسب ہے۔ ہاں اللہ نے کبھی تزیین اشیاء کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے لیکن یہ نسبت تخلیق کے اعتبار سے ہے (کہ ہر دلکش چیز کا خالق اللہ ہے) فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ وَزَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ دوسری جگہ فرمایا ہے وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ اور کبھی شیطان کی طرف کی ہے اس لئے کہ دلوں میں

marfat.com

وسوسہ ڈالنے اور غافل بنانے کا سبب شیطان ہے فرمایا ہے اِذْزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَهُمْ اور لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ اور وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ۔

مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ قناطیر جمع، قنطار مفرد، تہ بر تہ کثیر مال (ڈھیر) قنطار میں مضبوطی کا مفہوم بھی ہے۔ محاورہ ہے قَنْطَرْتُ الشَّیْءَ میں نے اس چیز کو مضبوط کر دیا۔ قنطرة (پل) اسی سے بنا ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے قنطار کی مقدار دو سو اوقیہ قرار دی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بارہ سو مثقال یا بارہ ہزار درہم یا ایک ہزار دینار۔ سعید بن جبیرؒ اور عکرمہؒ نے سو ہزار اور سو سیر اور سو رطل (پونڈ) اور سو مثقال اور سو درہم (غرض ہر چیز کا ایک سینکڑہ)۔ سدیؒ نے چار ہزار مثقال، حکم نے کہا کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں قنطار ہیں۔ بعض نے کہا بیل کی کھال بھر مشک قنطار ہے۔

قنطار کا وزن فعلال ہے یا فنعال یہ بحث اختلافی ہے (یعنی قنطار کا نون اصلی ہے یا الحاقی یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے)۔

اَلْمُقَنْطَرَةِ یہ لفظ قنطار ہی سے بنا ہے، قنطار کے بعد مقنطرة کا لفظ تاکید کے لئے لایا (ڈھیروں جمع کیا ہوا مال) جیسے بدرة مبدرة کہا جاتا ہے، ضحاک نے مقنطرة کا ترجمہ کیا ہے مضبوط محکم۔ یمان نے دفن کردہ اور سدی نے ٹکسالی سکہ (مہری) اور فراء نے چند گنا ترجمہ کیا ہے پس القناطیر سے قنطار کی جمع اور المقنطرہ سے جمع الجمع مراد لی گئی ہے (یعنی ڈھیروں ڈھیر)۔ [۱]

مِنَ الذَّهَبِ ذہب، سونا بعض نے ذہب کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی کہ ذہب کا معنی ہے جانا اور سونا بھی آنے جانے والی چیز ہے۔

وَالْفِضَّةِ فضة چاندی، بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی کہ فض کا معنی ہے منتشر ہونا اور چاندی بھی منتشر ہونے والی چیز ہے۔

وَالْخَیْلِ خیل فرس کی جمع ہے خیل کے لفظ سے مفرد نہیں آتا۔

الْمُسَوَّمَةِ مجاہد نے اس کا ترجمہ کیا مکمل ساخت والے کامل الاعضاء۔ خوبصورت تسویم کا معنی ہے حسن۔ سعید بن جبیر نے کہا چرنے والے یعنی جنگل میں آزادی سے چرنے والے حسن بصریؒ اور ابو عبیدہؒ نے ترجمہ میں کہا نشاندار یہ لفظ سیماء سے مشتق ہے اور سیماء کا معنی ہے علامت لیکن سیماء سے کیا مراد ہے کسی نے کہا گھوڑے کی جلد کا دھبہ اور رنگ کسی نے کہا داغ

وَالْاَنْعَامِ انعام نعم کی جمع ہے اور نعم بھی جمع ہے مگر اس لفظ سے اس کا واحد نہیں آتا۔ انعام کا اطلاق اونٹ، گائے، بھینس اور بکری پر ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا جنگلی چوپایوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اسی لئے امام صاحب نے آیت جزاء مثل ما قتل من النعم کی تفسیر میں النعم سے جنگلی چوپایہ مراد لیا ہے۔

وَالْحَرْثِ اور کھیتی۔ یعنی انسانوں کے لئے اللہ کی طرف سے عورتوں میں، اولاد میں اور ڈھیروں ڈھیر سونے چاندی میں اور خوبصورت گھوڑوں اور چوپایوں میں اور کھیتی میں دل کشی کا سامان پیدا کیا گیا ہے۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یہ سب چیزیں دنیوی زندگی میں مزہ اڑانے کی چیزیں ہیں آخر فنا ہونے والی ہیں۔

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ اور انجام کی خوبی اللہ ہی کے پاس ہے یعنی اچھا انجام جو انتہائی خوب ہونے کی وجہ سے گویا مجسم خوبی ہے اللہ ہی کے پاس ہے۔ اس میں پوری پوری ترغیب ہے اس امر کی کہ دنیا کی فنا پذیر مرغوبات کو چھوڑ کر آخرت کی لذت آگیں لازوال چیزیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ [۲]

---

[۱] حاکم نے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ ہے، امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ ہے۔ ۱۲۔

[۲] قتادہؒ کا قول ہے کہ ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (اس آیت کی تلاوت کے بعد) کہتے تھے اللّٰهم زینت لنا الدنیا و انبانتنا ان مابعدها خیر منها فاجعل حظنا فی الذی هو خیر و ابقی، مؤلف

marfat.com

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ آپ کہہ دیجئے کہ کیا ان تمام مذکورہ چیزوں سے بہتر چیز میں تم کو بتاؤں۔
اس جملہ میں کافروں کے لئے زجر ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ (باوجود پیغمبر ہونے کے) اس امر میں متردد ہیں کہ کیا رحم و مہربانی کے تقاضے کے تحت اور اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کافروں کو اس بہترین چیز کی اطلاع دیدیں یا کافروں کے انکار اور حق سے نفرت کے پیش نظر ان کو نہ بتائیں۔ پہلے اشارۃً کہا تھا کہ اللہ کا عطا کردہ ثواب دنیوی لذتوں سے بہتر ہے۔ اس جملہ میں اسی مضمون کو پختہ کر دیا۔

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے اللہ کے پاس جنتیں ہیں۔
متقیوں کا خصوصی ذکر اس وجہ سے کیا کہ حقیقت میں ثواب آخرت سے فائدہ اندوز وہی ہوں گے۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا متقی ان جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے یعنی داخلہ کے دن کے بعد ان کیلئے وہاں ہمیشہ رہنا مقدر ہے۔

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اور پاک بیویاں یعنی عورتوں کی آلائش حیض، نفاس، اور بول و براز سے پاک بیویاں۔

وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اور اللہ کی عظیم الشان خوشنودی۔ بعض علماء نے بیان کیا کہ آیت میں اللہ نے جنات اور ازواج کا ذکر کیا، یہ دونوں چیزیں انسانی مرغوبات کی ہم جنس ہیں، جنتیں کھیتی کی جنس سے ہیں اور ازواج عورتوں کی جنس سے۔ اولاد کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ دنیا میں اولاد کا مقصد بقاء نوع اور زندگی کی مدد ہے اور آخرت میں اس کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح گھوڑوں کا، چوپایوں کا اور سونے چاندی کا بھی ذکر نہیں کیا کیونکہ جنت میں گھوڑوں وغیرہ کی سواری کی تکلیف نہ ہوگی اور حصول زر کے لئے جو بیع و شراء کی جاتی ہے اس کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ آخر میں ایک ایسی عظیم الشان نعمت کا اضافہ کیا جس پر زیادتی ممکن نہیں یعنی اللہ کی خوشنودی۔ پھر رضوان کو بصورت نکرہ (غیر معروف) لانے سے اشارہ کیا کہ اللہ کی رضا مندی (کی حد) کوئی سمجھ نہیں سکتا۔

حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ اہل جنت سے فرمائے گا، اے اہل جنت! جواب دیں گے لبیک ربنا و سعدیک والخیر فی یدیک، اللہ فرمائے گا، کیا میں اس سے بڑھ کر چیز تم کو دوں جنتی عرض کریں گے اے ہمارے رب، اس سے بڑھ کر کیا چیز ہے اللہ فرمائے گا میں تم پر اپنی خوشنودی نازل کروں گا تم پر کبھی غصے نہ ہوں گا۔ متفق علیہ

میں کہتا ہوں کہ آیت میں جنّات کا ذکر انسان کے تمام مرغوبات کے دوش بدوش واقع ہوا ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ۔ اولاد و اقرباً سب جنت میں جمع ہوں گے اور سب سے ہمیشہ ملاقات رہے گی۔ اللہ نے فرمایا ہے اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اولاد آنکھ کی خنکی اور دل کا کامل سرور ہوتی ہے تو کیا جنتیوں کے بچے پیدا ہوں گے، فرمایا مؤمن جب اولاد کی خواہش کرے گا تو ایک ہی ساعت میں استقرار حمل، وضع حمل اور سن (یعنی بالیدگی اور بڑھاؤ) اس کی خواہش کے مطابق ہو جائے گا۔

ترمذی نے روایت کے بعد اس کو حسن کہا ہے، بیہقی نے بھی یہ روایت لکھی ہے اور ہناد نے زہد میں حضرت ابو سعید کی روایت سے اس کو ذکر کیا ہے، اسی طرح حاکم نے تاریخ میں اور اصبہانی نے ترغیب میں اس کو نقل کیا ہے۔ رہے چاندی سونے کے ڈھیر تو (یہ ثابت ہے کہ) اللہ نے ایک جنت ایسی بنائی ہے جس کی ایک اینٹ چاندی کی، دوسری اینٹ سونے کی اور گارا مشک کا ہے (یعنی گنگا جمنی جنت) رواہ البزاز والطبرانی والبیہقی عن ابی سعیدؓ عن النبی ﷺ۔ ایک مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ دو جنتیں چاندی کی ہیں جن کے ظروف اور ان کے اندر کی تمام چیزیں چاندی کی ہیں اور دو جنتیں سونے کی ہیں جن کے برتن اور ان کے اندر کی تمام چیزیں سونے کی ہیں۔ (رواہ البخاری و مسلم من حدیث ابی موسیٰؓ) باقی گھوڑوں اور چوپایوں کا جنت کے اندر

marfat.com

ہونا تو یہ بھی ثابت ہے ایک اعرابی نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ ﷺ مجھے گھوڑوں سے محبت ہے کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے فرمایا جب تم جنت میں داخل ہو گے تو تمہارے سامنے یاقوت کا گھوڑا لایا جائے گا جس کے دو بازو ہوں گے تم کو اس پر سوار کیا جائے گا اور وہ تم کو تمہاری مرضی کے موافق اڑا کر لے جائے گا۔ رواہ الترمذی عن ابی ایوب وروی الترمذی والبیہقی نحوہ عن ابی بردۃ مرفوعاً والطبرانی والبیہقی بسند جید عن عبدالرحمٰن بن ساعدۃ مرفوعاً۔

ابن مبارکؒ نے حضرت شفی بن مانع رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کی آسائشوں میں سے یہ بات بھی ہوگی کہ جنتی باہم ملاقات کے لئے اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جائیں گے اور جمعہ کے روز ان کے سامنے زین پوش گھوڑے لائے جائیں گے، جن کے لگام میں لگی ہوں گی وہ لید اور پیشاب نہیں کریں گے۔ جنتی ان پر سوار ہو کر جہاں اللہ چاہے گا پہنچ جائیں گے۔

ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ اور اصفہانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کی بالائی چوٹی سے لباس کے جوڑے اور نچلے حصہ سے سونے کے ابلق گھوڑے پیدا ہوں گے، جن کی زمینیں اور لگامیں موتی اور یاقوت کی ہوں گی، ان کے پروں والے بازو بھی ہوں گے ان کا ایک پر بقدر رسائی نگاہ ہوگا، وہ لید اور پیشاب نہیں کریں گے، ان پر اولیاء اللہ سوار ہوں گے اور جہاں چاہیں گے گھوڑے اڑا کر لے جائیں گے۔ نیچے والے کہیں گے انہوں نے تو ہمارا نور ماند کر دیا (اللہ یا فرشتہ) کہے گا یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے، تم کنجوسی کرتے تھے، یہ جہاد کرتے تھے، تم بیٹھے رہتے تھے۔

ابن مبارکؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جنت میں عمدہ گھوڑے اور اعلیٰ اونٹنیاں ہوں گی جن پر جنتی سوار ہوں گے۔ ابن وہبؒ نے حسنؒ بصری کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کم سے کم مرتبہ والا جنتی وہ ہوگا جو ہزار در ہزار غلمان جنت کے ساتھ یاقوتِ سرخ کے گھوڑوں پر سوار ہوگا اور ان گھوڑوں کے بازو سونے کے ہوں گے۔ رہا کھیتی کا تذکرہ تو اس کے سلسلہ میں بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک جنتی اپنے رب سے کھیتی کرنے کی اجازت مانگے گا اللہ فرمائے گا کیا تو اپنی خواہش کے مطابق حالت میں نہیں ہے، جنتی عرض کرے گا کیوں نہیں لیکن میں کھیتی کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ کاشت کرے گا مگر پلک جھپکنے سے پہلے کھیتی اُگ آئے گی، پودے ٹھیک ہو جائیں گے اور کھیت کٹنے کے قابل ہو جائے گا اور پہاڑوں کی طرح کھیتی ہو جائے گی اللہ فرمائے گا اے آدمؑ کے بچے لے تجھے کوئی چیز سیر نہیں کرے گی۔ طبرانی اور ابوالشیخ نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ کھیتی کی ایک ایک بالی بارہ ہاتھ کی ہو جائے گی اور وہ شخص اپنی جگہ سے ہٹنے بھی نہ پائے گا پہاڑوں کے برابر (غلہ کا) ٹیلہ ہو جائے گا۔

جنت کی نعمتوں میں ازواج کے خصوصی تذکرہ کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عرب کو عورتوں کی خواہش شدت کے ساتھ ہوتی تھی یا یہ وجہ ہے کہ جنت میں ہر ایک کو ازواج (حوریں) ملیں گی۔

باقی اولاد تو صرف انہی کو ملے گی جن کی دنیا میں اولاد ہوگی یا جنت میں اولاد کے خواہشمند ہوں گے عموماً اہل جنت کو اولاد کی خواہش نہیں ہوگی کیونکہ حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت میں آیا ہے کہ جب جنت کے اندر مؤمن اولاد کا خواہشمند ہوگا تو فوراً اولاد ہو جائے گی مگر وہ خواہشمند ہی نہ ہوگا۔ (رواہ الترمذی والدارمی) مطلب یہ ہے کہ اکثر لوگ اولاد کے خواہشمند نہ ہوں گے ہم نے یہ تاویل مختلف روایات کو مطابق بنانے کے لئے کی ہے۔ اللہ نے (آخر میں) ایک ایسی نعمت کا ذکر فرمایا ہے جو دنیوی نعمتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے اور اس سے بڑی نعمت کا امکان ہی نہیں ہے یعنی اللہ کی خوشنودی۔ اللہ کی رضامندی ہی وہ امتیازی نعمت ہے جو جنت کی نعمتوں کو دنیوی نعمتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ دنیا ملعون ہے جو کچھ اس میں ہے وہ ملعون ہے ہاں دنیا کی چیزوں میں سے جس چیز سے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا مقصود ہو وہ ملعون نہیں ہے۔ بعض روایات میں اللہ

marfat.com

کے ذکر اور (علم دین کے) عالم و متعلم کو ملعون ہونے سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ طبرانی نے اوسط میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اور صغیر میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور ابن ماجہ نے سنن میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے اور جنت کی نعمتیں اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہیں حضرت ربیعہ حرسیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے خواب میں بتایا گیا ہے کہ کسی سردار نے کوئی مکان بنایا اور (پھر) دستر خوان چنوایا اور ایک منادی کو لوگوں کے بلوانے کے لئے بھیجا اب جس شخص نے منادی کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں آگیا اور اس نے دستر خوان پر کھانا کھایا اور وہ سردار اس سے خوش ہو گیا اور جس نے دعوت کرنے والے کی دعوت نہ قبول کی وہ گھر میں نہ آیا اور دستر خوان سے کچھ نہ کھا سکا اور سردار اس سے ناراض ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا سردار تو اللہ ہے اور اس کی طرف سے دعوت دینے والا محمد ﷺ ہے اور مکان اسلام ہے اور دستر خوان جنت ہے۔ رواہ الدارمی۔

میں کہتا ہوں کہ دنیا کی نعمتیں اللہ کو پسند نہیں ان کی طرف رخ پھیر کر دیکھنا بھی نہیں چاہئے اللہ نے فرمادیا ہے وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا اور جنت کی نعمتیں اللہ کو پسند ہیں ان کی رغبت کرنے والا قابل ستائش ہے اللہ نے فرمایا ہے وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ اس کا راز یہ ہے کہ موجودات دنیوی کا مبدء وجود عدم ہے (تمام ممکنات اصلاً معدوم ہیں پہلے نہ تھے پھر ہوئے ان کا وجود حادث ہے ازلی نہیں ہے) تمام اعدام کا تقرر اللہ کے علم میں تھا (وجود نہ تھا اندازہ وجود تھا) جب اللہ کی صفات کمالیہ کا ان پر پرتو پڑا تو ان میں (وجود کی) چمک آگئی اور ان کا وجود ظلی ہو گیا جیسے جہالت پر علم کا اور عجز پر قدرت کا عکس پڑتا ہے تو جہالت میں علم کا اور عجز میں قدرت کا ظلی وجود پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ موجودات دنیا کی اصل عدم ہے اسی لئے یہ جلد جلد فنا کی طرف جا رہے ہیں۔ (کیونکہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) اور عدم فی نفسہ خالص شر ہے اس میں نہ کوئی حسن ہے، نہ خیر، نہ کمال۔ ہاں (صفات خداوندی کا عکس پڑنے سے) اس میں اتنا ہی حسن پیدا ہو گیا ہے جتنا کسی ناقص الاصل چیز میں ملمع کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ آخرت کی موجودات کی حالت اس کے برخلاف ہے ان کی تعیین اور تحقق کے مبادی صفات خداوندی ہیں (صفات خداوندی ان کا سر چشمہ ہے، آفتاب صفات کی یہ شعاعیں ہیں[1]) اسی لئے ان کی محبت اللہ کی محبت اور ان کی طرف رغبت اللہ کی طرف رغبت ہے حضرت مجددؒ نے لکھا ہے کہ باوجودیکہ انبیاء اور اولیاء کی توجہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف نہیں ہوتی مگر حضرت

---

[1] ممکن وہی ہوتا ہے جو اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اس کا وجود ضروری نہیں ہوتا اور ہمارے نزدیک ہر ممکن حادث ہے کوئی ممکن نہ قدیم بالذات ہے نہ قدیم بالغیر البتہ ارسطو اور اس کے پیرو ممکن بالذات کو قدیم بالغیر کہتے ہیں یعنی ہر ممکن اپنے وجود کا خود مالک تو نہیں ہے مگر علت کی طرف سے اس کا وجود قدیم ازلی ہے جس کا کوئی آغاز نہیں، ہم کہتے ہیں کہ ہر ممکن کی اصل عدم ہے لیکن عدم محض نہیں کیونکہ عدم محض سے تو وجود نہیں پیدا ہو سکتا بلکہ عدم متقرر اصل ہے تقرر کا مرتبہ عدم محض اور وجود بالفعل کے درمیان ہے تمام حقائق کونیہ کا تقرر اور تقدر علم باری تعالیٰ میں ہے بلکہ تقرر کائنات نام ہی علم خداوندی کا ہے پس اصلاً یہ کائنات معدوم ہے جب صفات باری تعالیٰ کا پرتو کائنات پر پڑتا ہے تو کائنات کا وجود ظلی یا عکسی نمودار ہو جاتا ہے لوگ اسی ظلی وجود کو جو خداوندی پرتو سے نمودار ہو گیا ہے غلطی سے وجود اصلی کہنے لگتے ہیں حالانکہ اگر وجود اصلی ہوتا تو ہمیشہ سے ہوتا اور ہمیشہ رہتا کبھی فنا نہ ہوتا لیکن ہم محسوس کر رہے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز فنا پذیر ہے اور عدم کی طرف دوڑی جا رہی ہے اس لئے یہ امر ناقابل انکار ہے کہ اس کی اصل عدم ہے اور عدم کا مقابل وجود ہے عدم کی کوئی حقیقت نہیں اور جس کی حقیقت نہ ہو تو وہ نہ خیر ہو سکتی ہے نہ حسن و کمال...... لہٰذا دنیا کی ہستی نہ خیر ہے نہ حسن و کمال، علم واجب میں ساری دنیا کا تقرر ہی اصل وجود ہے اور وجود خارجی اس کا سایہ اور ظاہر ہے کہ سایہ کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ حسن و کمال، ہاں اس دنیا کے مقابل آخرت کی نعمتیں اور مصائب لازوال ہیں ان کا ابدی کنارہ کوئی نہیں اور ان کے مبادی تعین اعدام نہیں بلکہ اللہ کی صفات کاملہ ہیں صفات الٰہی آخرت میں بصورت مہر و قہر نمایاں ہوں گی، ہاں اس دنیا میں اگر کوئی چیز خیر ہے تو وہ وہی ہے جو نعمت آخرت کے حصول کا موجب ہے انبیاء اولیاء اور ان کی ہدایات اسی لئے خیر ہیں، واللہ اعلم۔

marfat.com

یعقوبؑ کی محبت حضرت یوسفؑ سے (عشق کی حد تک) تھی اس کی راز یہ ہے کہ حسن یوسفؑ حسن اہل جنت کی جنس سے تھا۔ یوسفؑ کی محبت حقیقت میں اللہ کی محبت تھی اور ان سے عشق خدا سے عشق تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکر کو بناتا مگر تمہارا ساتھی تو اللہ کو خلیل بنا چکا۔ رواہ مسلم۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۱۵ یہ جملہ گزشتہ کلام کی دلیل کے مقام میں ہے اور العباد میں الف لام استغراقی ہے یعنی اللہ تمام بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے اچھے ہوں یا برے سب کو ان کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ یا الف لام عہدی ہے یعنی متقی بندے اللہ کی نگاہ کے سامنے ہیں اسی لئے ان کے لئے اللہ نے جنتیں تیار کر رکھی ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۶ یعنی اللہ خوب دیکھ رہا ہے ان پرہیز گار بندوں کو جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم بلا شبہ ایمان لے آئے پس ہمارے گناہ بخش دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

فاغفر میں فاء سببیت کیلئے ہے (یعنی کلام سابق کلام لاحق کی علت ہے) مراد یہ ہے کہ ہم ایمان لے آئے اس لئے تو ہمارے گناہ بخش دے) اس آیت میں ثبوت ہے اس امر کا کہ صرف ایمان مغفرت کا استحقاق پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندوں پر اللہ کا حق ہے کہ اس کی عبادت کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور اللہ پر بندوں کا حق ہے کہ غیر مشرک کو وہ عذاب نہ دے۔ حضرت معاذؓ نے عرض کیا (یا رسول اللہ ﷺ) کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ دیدوں۔ فرمایا لوگوں کو اس کی بشارت نہ دو کہیں وہ (اسی پر) بھروسہ کر بیٹھیں (متفق علیہ)۔

اَلصّٰبِرِيْنَ نفس کی مخالفت پر جم جانے والے یعنی مصائب میں بے صبر ہونے سے نفس کو روکنے والے۔ خواہشات اور بری باتوں کی پیروی سے باز داشت کرنے والے۔ طاعت الٰہی اور اچھی باتوں کا پابند رکھنے والے۔[1]

وَالصّٰدِقِيْنَ اور سچے۔ یعنی قول۔ ادعاء احوال اور تمام دعووں میں نقل واقعات میں اور ادائے شہادت میں سچے اور سب سے بڑا سچ لا الہ الا اللہ اور محمد عبدہ و رسولہ کی شہادت ہے۔[2]

وَالْقٰنِتِيْنَ اور اللہ کی طاعت پر ہمیشہ پابندی رکھنے والے جنکے پیش نظر ہر وقت اللہ کی خوشنودی کا حصول ہی ہوتا ہے

وَالْمُنْفِقِيْنَ اور اپنے مالوں کو اللہ کی خوشنودی کیلئے خرچ کرنے والے اس جگہ تک کلام مذکور ہر قسم کی طاعت کو حاوی ہو گیا اس میں درستی اخلاق و اقوال بھی آ گئی اور جسمانی و مالی اعمال کی اصلاح بھی۔

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷ یعنی ظاہری اور باطنی اطاعت گزاریوں کے باوجود وہ اللہ سے ڈرتے ہیں اپنی کوتاہی کا

---

[1] حضرت مؤلف کی مراد یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ صبر کے بعد عن آتا ہے یا علیٰ بر صورت اول صبر کا معنی ہوتا ہے روکنا، باز رکھنا اور برشق دوئم معنی ہوتا ہے پابند بنانا، آیت میں الصابرین کے بعد نہ عن ہے، نہ علیٰ اس لئے مطلق معنی مراد ہے روکنا بھی اور پابند رکھنا بھی مطلب یہ ہے کہ متقی اپنے نفوس کو بری باتوں سے روکتے اور اچھی باتوں کا پابند بناتے ہیں۔ پہلا وصف سلبی ہے دوسرا وصف ثبوتی، سلبی وصف کا معنی ہے رذائل اور قبائح سے خالی اور پاک ہونا، ثبوتی وصف کا معنی ہے فضائل اور محاسن سے آراستہ ہونا، ۱۲۔

[2] صدق کا لفظ عام ہے جیسے کذب عام ہے قول میں سچائی، تمام دعووں میں سچائی، کسی واقعہ کو نقل کرنے میں سچائی، ادائے شہادت میں سچائی یہ تو صدق کی عام صورتیں ہیں لیکن صوفیہ کی اصطلاح میں صدق و کذب کا معیار ان صورتوں کے علاوہ ایک اور بھی ہے، سالک جب راہ سلوک طے کرتا ہے تو اثناء سیر میں کچھ مواقف ملتے ہیں اور کوئی موقف اصل منزل نہیں ہوتا لیکن صوفی دھوکہ کھا کر یا نادانی کی وجہ سے موقف کو منزل سمجھ لیتا ہے اور منزل پر پہنچنے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے یا ابتدائی موقف پر پہنچ کر اگلے موقف تک پہنچنے کا مدعی بن بیٹھتا ہے یہ سب کذب کی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً سیر آثار کرنے والا صوفی سیر افعال کا مدعی ہو جائے تو جھوٹ ہوگا یا سیر افعال کرنے والا سالک سیر صفات کا دعویٰ کرنے لگے تو یہ بھی غلط ہوگا یا سیر صفاتی میں مشغول رہنے والا عارف سیر ذاتی کا ادعاء کرے تو یہ بھی اس کی نادانی اور دروغ ہو گی، غرض ادعاء احوال میں بھی صدق ضروری ہے، واللہ اعلم۔

marfat.com

اقرار کرتے ہیں اس لئے معافی کے طلب گار رہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بندہ سے اللہ کی عبادت اس طرح ہو سکتی ہی نہیں جیسا اللہ کی عظمت و جلالت کا تقاضا ہے بلکہ بندہ جب یہ سمجھتا ہے کہ میرے تمام اعمال وافعال بھی اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں یہ اللہ کا احسان و کرم ہے کہ اس نے اپنی عبادت کی توفیق عنایت فرمائی اور مجھے اپنے لئے منتخب فرمالیا تو وہ جان لیتا ہے کہ میری کی ہوئی عبادت اگر قبول کے قابل ہو جائے تو یہ محض اللہ کا کرم ہے اس کا شکر ہے ورنہ اللہ کی نعمت کا کماحقہ شکر ادا کرنا تو ممکن ہی نہیں۔ اللہ ہی اپنی مغفرت اور خوشنودی سے ڈھانک لے تو نجات ہو سکتی ہے یَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا (قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ) بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰاكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وہ آپ پر اپنے مسلمان ہو جانے کا احسان دھرتے ہیں آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی توفیق دی۔ اگر تم سچے ہو۔

طلب معافی کے لئے سحر کے وقت کا خصوصی ذکر اس لئے کیا کہ یہ وقت قبول دعا سے بہت ہی قرب رکھتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ہر رات کا جب آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے باری تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے میں ہی (سارے جہان کا خود مختار) بادشاہ ہوں، کوئی ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں، کوئی ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اس کو عطا کروں، کوئی ہے جو مجھ سے گناہوں کی معافی چاہے اور میں اس کی مغفرت کروں۔ بخاری و مسلم۔

مسلمؒ کی روایت میں اتنا اور ہے کہ پھر پروردگار اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے اور فرماتا ہے کون ہے قرض دینے والا۔ ایسے شخص کو جو مفلس نہیں ہے اور نہ حق مارنے والا۔ یہ ندا صبح کی پُو پھٹنے تک ہوتی رہتی ہے۔ بغوی نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا بیٹے! اس مرغ سے بھی زیادہ عاجز نہ ہو جو سحر کے وقت چیختا ہے اور تو بستر پر پڑا سوتا ہوتا ہے۔

زید بن اسلمؒ نے فرمایا کہ المستغفرین بالا سحار سے وہ لوگ مراد ہیں جو فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سحر کا وقت صبح کے قریب ہی ہوتا ہے اس لئے بالا سحار فرمایا۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تشریح میں فرمایا کہ وہ سحر کے وقت تک نماز (تہجد) کو دراز کرتے ہیں پھر استغفار کرتے ہیں۔ نافع کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر رات کو (یا رات بھر) عبادت کرتے آخر میں فرماتے نافع کیا سحر ہو گئی میں عرض کرتا (ابھی) نہیں۔ آپ لوٹ کر پھر نماز پڑھنے لگتے اور اگر میں کہہ دیتا جی ہاں تو بیٹھ کر استغفار کرتے اور صبح تک دعا کرتے رہتے تھے۔

مذکورہ بالا تمام صفات کے درمیان واؤ عاطف کا لانا بتا رہا ہے کہ ہر صفت بجائے خود (متقیوں میں) کامل ہے اور وہ ہر صفت میں کمال رکھتے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ ہر صفت کے موصوف جدا جدا گروہ ہیں۔ صابر تو پاک دل اور پاکیزہ نفوس والا صوفیہ کا گروہ ہے مجاہدین اور شہداء کا شمار بھی انہی صابرین میں ہے۔ اور صادقین سے مراد وہ سچے علماء ہیں جو سچی روایات بیان کرتے ہیں اور قانتین سے مراد زاہدوں کا گروہ ہے جو طویل قنوت کے ساتھ نمازیں پڑھتے اور خوف ورجاء کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں اور منفقین سے مراد وہ دولتمند مؤمن صالح ہیں جو جائز راستوں سے کما کر راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور مُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ وہ لوگ ہیں جو نادانی سے برے کام کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو اللہ تم کو لے جائے گا (فنا کر دے گا) اور تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو گناہ کریں گے، پھر گناہ کرنے کے بعد معافی کے طلب گار ہوں گے اور انکے گناہ بخش دیئے جائیں گے، رواہ مسلم۔ امام احمد اور ابو یعلی نے حضرت ابو سعید کی روایت سے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

marfat.com

آیت میں اللہ نے ترتیب وار ہر گروہ کا ذکر اسکے مرتبہ کے موافق کیا ہے افضل ترین، افضل تر، افضل، فاضل وغیرہ وغیرہ۔

شَهِدَ اللّٰهُ اللہ شاہد ہے یعنی عقلی دلائل قائم کر کے اور کتابیں نازل فرما کے اس نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔

اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کہ وہی ہے اس کے سوا کوئی معبود موجود نہیں ہے۔ بغویؒ نے بروایت کلبی بیان کیا ہے کہ شام کے یہودی علماء میں سے دو عالم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادہ سے آئے۔ مدینہ کو دیکھ کر ایک نے دوسرے سے کہا یہ شہر تو اس شہر سے بہت ہی مشابہ ہے جہاں نبی آخر الزماں ﷺ کا ظہور ہوگا۔ جب دونوں خدمت گرامی میں پہنچے تو اپنی کتاب میں بیان کردہ صفات کو حضور ﷺ کی صفات سے مطابق پاکر پہچان لیا اور عرض کیا کیا آپ محمد ﷺ ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں۔ بولے کیا آپ احمد ﷺ بھی ہیں حضور ﷺ نے فرمایا میں محمد ﷺ بھی ہوں اور احمد ﷺ بھی۔ کہنے لگے ہم آپ سے کچھ پوچھتے ہیں اگر آپ ﷺ نے بتادیا تو ہم آپ کو مان لیں گے اور سچا قرار دیں گے، فرمایا پوچھو، کہنے لگے بتاؤ اللہ کی کتاب میں سب سے بڑی شہادت کون سی ہے اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا اور وہ دونوں مسلمان ہوگئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ نے اجسام سے چار ہزار سال پہلے ارواح کو پیدا کیا اور ارواح کی تخلیق سے چار ہزار سال پہلے رزق کو پیدا کر دیا اور مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے جب کہ وہ خود ہی تھا۔ نہ آسمان تھا، نہ زمین، نہ نیک، نہ بد خود ہی اپنے ایک ہونے کی شہادت دی اور فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ اور فرشتے اور اصحاب علم شاہد ہیں یعنی فرشتے اور ایماندار جن وانس اپنے دل سے مانتے اور زبانوں سے اللہ کی توحید کا اقرار کرتے ہیں۔

قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ قَائِمًا، شَهِدَ کے فاعل یعنی اللہ سے حال ہے یعنی عدل کے ساتھ تمام مخلوق کا انتظام قائم رکھنے کی حالت میں اللہ شاہد ہے عدل کے ساتھ اس کا انتظام مخلوق پر قیام توحید کی واضح دلیل ہے۔

یا ھو سے حال ہے یا فعل مدح محذوف ہے اور اس کا یہ مفعول ہے یا اُولُوا الْعِلْمِ کے اندر جو لفظ علم ہے قَائِمًا اس کا مفعول ہے یعنی علماء اللہ کو قائم بالعدل جانتے ہیں اور اس بات کو پہچانتے ہیں کہ اللہ تقسیم اور علم میں عادل ہے۔ اس کی شان میں ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مالک الملک ہے جس طرح چاہتا ہے اپنی ملک میں تصرف کرتا ہے نہ کسی اطاعت گزار کو ثواب دینا اس پر لازم ہے نہ نافرمان کو عذاب دینا۔ وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔ اس تفسیر کے مطابق آیت میں معتزلہ کے مسلک کی کوئی دلیل نہیں (جو قائل ہیں کہ نیکوکار کا ثواب اور بدکار کا عذاب اللہ پر واجب ہے)۔

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس جملہ کا دوبارہ ذکر مزید تاکید کے لئے کیا نیز توحید کے دلائل کو جاننے اور دلائل کو دیکھ کر توحید کا اعتراف کرنے کی جانب مزید توجہ دلائی۔

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۱۸ وہ اپنی حکومت میں غالب ہے صنعت میں حکیم ہے۔ اللہ کی قدرت کا علم پہلے ہوتا ہے اور اس کی حکمت کا علم پیچھے اسی لئے العزیز کو الحکیم سے پہلے ذکر کیا۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ یعنی اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہی ہے۔ کسائی کی قرأت میں اَنَّ الدِّيْنَ آیا ہے۔ اب اگر اسلام کو عین ایمان کہا جائے تو اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے یہ بدل الکل ہوگا۔ قتادہؒ نے بیان کیا کہ لا الہ الا اللہ کی شہادت اور اس بات کا اقرار کہ تمام پیغمبر جو کچھ لائے ہیں اللہ کی طرف سے لائے ہیں یہی وہ دین اللہ ہے جس کو اللہ نے پیغمبروں کو دے کر بھیجا ہے اور اپنے اولیاء کو اس کا راستہ بتایا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی دین کو وہ قبول نہیں کریگا نہ ثواب دیگا۔

(یا بدل کل من البعض ہوگا اگر) اسلام کے اندر ایمان کو داخل قرار دیا جائے (اور ایمان کو عین اسلام نہیں بلکہ جزاسلام کہا جائے) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دینا اور نماز ٹھیک ٹھیک ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور بشرط استطاعت راہ حج کرنا اسلام ہے۔ سوال جبرئیلؑ کے جواب میں رسول اللہ ﷺ

marfat.com

نے جو بیان فرمایا تھا اس طویل حدیث کا یہ ایک حصہ ہے جو ہم نے بیان کیا۔ متفق علیہ۔

لیکن اگر اسلام سے مراد صرف شریعت محمدیہ ہو کیونکہ تمام ادیان کے منسوخ ہونے کے بعد اس دور (محمدی) میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف شریعت محمدیہ ہے تو بدل اشتمال ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا اگر موسیٰ (اس زمانہ میں) زندہ ہوتے تو ان کے لئے بھی میری پیروی کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ رواہ احمد والبیہقی من حدیث جابرؓ۔

جمہور کی قرات میں اِنَّ الدِّیْنَ ہے اس صورت میں یہ مستقل ابتدائی کلام ہوگا۔ روایت میں آیا ہے کہ اعمشؒ رات سے اٹھ کر تہجد پڑھنے لگے جب آیت شھد اللہ الخ کی تلاوت کی تو کہا میں بھی وہی شہادت دیتا ہوں جو اللہ نے دی ہے اور اس شہادت کو اللہ کے پاس امانت رکھتا ہوں۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کی شہادت اللہ کے پاس میری ودیعت ہے۔ نماز پڑھ چکے تو کسی نے پوچھا حضرت آپ نے یہ کیا فرمایا تھا۔ فرمایا مجھ سے ابووائل نے حضرت عبداللہؓ کی روایت سے بیان کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شہادت والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا اللہ فرمائے گا میرے اس بندہ کا میرے پاس ایک عہد ہے اور میں سب سے زیادہ وعدہ پورا کرنے کے لائق ہوں میرے اس بندہ کو جنت میں داخل کردو۔ یہ حدیث بغویؒ نے اپنی سند سے نقل کی ہے اور طبرانی نے نیز بیہقی نے شعب الایمان میں ضعیف سند کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یعنی محمد ﷺ کی نبوّت اور اسلام کی حقانیّت میں یہود و نصاریٰ نے اختلاف نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوّت میں اہل کتاب کا اختلاف یہ تھا کہ بعض نے تو بالکل ہی انکار کر دیا اور بعض نے آپ کی نبوّت کو صرف عرب کے لئے قرار دیا۔

اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ مگر ان کو علم ہوجانے کے بعد کہ پسندیدہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اس کی اطلاع اللہ نے ان کو توراۃ وانجیل میں کھول کر دیدی تھی۔

بَغْیًا بَیْنَهُمْ یعنی کسی شبہ اور ناواقفیت کی وجہ سے انہوں نے نبوت محمدیہ اور حقانیت اسلام میں اختلاف اور حق کا انکار نہیں کیا بلکہ حقانیت کا ان کو علم ہو چکا تھا اس علم کے بعد صرف عناد اور حسد کی وجہ سے اور حکومت وریاست کے لالچ میں انہوں نے اختلاف کیا۔

ابن جریرؒ نے حضرت محمد (ﷺ) بن جعفر کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول نجران کے عیسائیوں کے متعلق ہوا تھا یعنی جن کو انجیل دی گئی تھی انہوں نے (کسی لاعلمی اور شبہ کی وجہ سے) عیسیٰؑ کے معاملہ میں یہودیوں سے اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ یہودیوں کے مقابلہ میں عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہہ دیا مگر اس بات کے علم کے بعد کہ اللہ واحد ہے وہ کسی کا باپ نہیں اور عیسیٰؑ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ محض یہودیوں کے عناد اور انکار کی وجہ سے اختلاف کیا۔ ایک طرف یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا انکار کیا اور آپ کی والدہ پر (زنا کی) تہمت لگائی باوجودیکہ توراۃ میں ان کو یقینی اطلاع دیدی گئی تھی کہ عیسیٰؑ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ دوسری طرف عیسائیوں نے یہودیوں کے انکار کے مقابل محض عناد کی وجہ سے عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہہ دیا، باوجودیکہ ان کے پاس بھی یقینی علم آچکا تھا کہ عیسیٰؑ خدا کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ وحدہ لاشریک ہے کوئی بھی اس کا بیٹا نہیں۔

ابن ابی حاتم نے ربیع کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت بنی اسرائیل کے ستر علماء کو طلب کیا اور توراۃ ان کی امانت میں دیدی اور یوشع بن نون کو اپنا جانشین مقرر کردیا جب پہلی دوسری اور تیسری صدی گزر گئی تو اس کے بعد یہودیوں میں تفرقہ پڑ گیا۔ آیت وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ میں انہی ستر علماء کی اولاد مراد ہے جن کو توراۃ دی گئی تھی۔ یہاں تک کہ ان میں خوب خوں ریزی ہوئی اور بدی پھیل گئی اور اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ سے مراد ہے اس چیز کا بیان جو توراۃ میں تھی (یعنی احکام توراۃ میں آپس کے عناد کی وجہ سے تفرقہ پڑ گیا) آخر اللہ نے ان پر جبابرہ (بخت نصر وغیرہ) کو مسلط کردیا۔

marfat.com

وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾ اور جو شخص اللہ کی آیات کا انکار کرے گا تو یقیناً اللہ اس سے جلد حساب لے گا اور اس کو کفر کی سزا دے گا۔ یہ کافروں کے لئے وعید ہے۔

فَاِنۡ حَآجُّوۡكَ پس اے محمد اگر وہ آپ سے مناظرہ کریں اور یہودی و عیسائی کہیں کہ یہودیت اور نصرانیت تو نسب ہے (مذہب نہیں ہے) دین تو ہمارا اسلام ہے۔

فَقُلۡ تو آپ ان سے کہہ دیں کہ لفظ اسلام میں کوئی جھگڑا نہیں۔

اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ لِلّٰهِ (بلکہ اسلام کی حقیقت بحث طلب ہے) میں تو اللہ کا فرماں بردار ہو گیا اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہیں دیتا۔ اس کے احکام کے مقابل اپنی خواہش کی پیروی نہیں کرتا بلکہ دل، زبان اور سارے اعضاء کو اسی کی اطاعت میں لگا دیا ہے۔ انسان کے (بیرونی) اعضاء میں چہرہ کا درجہ سب سے زیادہ ہے اس لئے چہرہ کا ذکر کیا ورنہ مراد تمام باطنی اور ظاہری اعضاء ہیں یا یہ مطلب ہے کہ میں نے تمام ظاہری اور باطنی اعضاء کی توجہ خالص اللہ کی طرف کر دی ہے کسی دوسرے کی طرف التفات بھی نہیں کرتا یا وجہ سے ذات مراد ہے یعنی میں نے اپنی پوری ہستی اللہ کے سپرد کر دی ہے اور ایسے اسلام کا تقاضا ہے کہ کسی کو اللہ کا ساجھی نہ قرار دیا جائے اسی کے اوامر و نواہی کی تعمیل فوراً کی جائے اور جو شریعت اس کی طرف سے آئی ہو اگر خود ہی اس نے منسوخ نہ کر دی ہو تو اس کی پابندی کی جائے۔

وَمَنِ اتَّبَعَنِ اور جو لوگ میرے پیرو ہیں انہوں نے بھی اپنی ہستی اللہ کے سپرد کر دی ہے۔

وَقُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡاُمِّيّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ‌ؕ اس کا عطف قُلۡ اَسۡلَمۡتُ پر ہے یعنی (اول) اپنے نفس سے آپ کہہ دیں کہ میں نے اپنے کو اللہ کے سپرد کر دیا اور اسلام پر دل کو مطمئن بنا لیں اور (پھر) یہود و نصاریٰ سے جو اہل کتاب ہیں اور ان لوگوں سے جو اہل کتاب نہیں ہیں جیسے مشرکین عرب سب سے کہہ دیں کہ جب عقلی دلائل سے بھی واضح ہو گیا اور تورات و انجیل میں بھی اس کی صراحت آ چکی کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہی ہے تو کیا میرے اسلام کی طرح تم بھی اسلام لے آئے یا تم ان کے بعد بھی کفر پر قائم ہو۔ اَاَسۡلَمۡتُمۡ صیغہ استفہام کا ہے مگر معنی امر کے ہیں یعنی تم بھی مسلمان ہو جاؤ جیسے آیت فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ کا مطلب ہے باز رہو، آیت میں اہل کتاب کو ان کے عناد اور حماقت پر شرم دلانی مقصود ہے (یعنی تمہارا اعناد اس حد تک پہنچ گیا کہ لفظ اسلام میں جھگڑا کرتے ہو اور اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اس لفظ میں جھگڑا نہیں بلکہ حقیقت مراد ہے اور حقیقت اسلام وہی ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں یعنی کامل سپردگی اور ہر شریعت کا اقرار اور تمہارے اندر اسلام کی یہ حقیقت نہیں، تم کسی شریعت کو مانتے ہو کسی کو نہیں مانتے کوئی کسی پیغمبر کو خدا کا بیٹا کہہ دیتا ہے اور دوسرا اسی پیغمبر کو حرامزادہ قرار دیتا ہے نہ تم کو خدا کا شریک بنانے سے اور اللہ کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں کا انکار کرنے سے شرم آتی ہے نہ باہم عناد اور ہوا پرستی سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور پھر اپنے دین کو اسلام کہتے ہو بس تمہارے اسلام کی یہی حقیقت ہے جس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں، اسلام تو میرا ہے میں نے اپنی خواہش اور میلان نفس کو چھوڑ دیا اور صرف اللہ سے اپنی ہستی کا تعلق جوڑ لیا تم بھی میری طرح مسلمان ہو جاؤ اور اپنے دعوے سے شرم کرو)۔

فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوْا ۚ اب اگر وہ بھی تمہاری طرح مسلمان ہو جائیں تو وہ بھی ہدایت یاب ہو جائیں گے، حسب الحکم رسول اللہ ﷺ نے (اہل کتاب کے سامنے) یہ آیت تلاوت فرمائی وہ کہنے لگے ہم تو پہلے ہی مسلمان ہو چکے آپ نے یہودیوں سے فرمایا عیسیٰؑ عبد اللہ تھے، رسول اللہ تھے، کلمۃ اللہ تھے (کیا تم کو اس کا اقرار ہے) بولے معاذ اللہ، آپ نے عیسائیوں سے فرمایا عیسیٰؑ عبد اللہ اور رسول تھے (کیا تم کو اس کا اعتراف ہے) کہنے لگے اللہ کی پناہ کہ عیسیٰؑ بندے ہوں اس پر اللہ نے فرمایا۔

وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ‌ؕ اور اگر وہ تمہارے اسلام سے روگردانی کریں تو تمہارا کوئی حرج نہیں وہ تم کو ضرر نہیں پہنچا سکتے تمہارے ذمہ تو صرف ہدایت پہنچا دینا ہے، ہدایت دینا نہیں۔

وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰﴾ اور اللہ تمام بندوں کو خوب دیکھتا ہے، مومن کو بھی کافر کو بھی ہر ایک کو اس کے کئے کا بدلہ ع ۱۱ ۱۰

marfat.com

دیگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، الذین یکفرون سے یہودی مراد ہیں انہوں نے قرآن اور انجیل کا انکار کیا تھا اور توراۃ کی ان آیات کا بھی جن میں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف بیان کئے گئے تھے۔

وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ اور انبیاء کو قتل کرتے ہیں، یعنی ان کے اسلاف نے انبیاء کو قتل کیا تھا اور انہوں نے اپنے اسلاف کے اس فعل کو پسند کیا تو گویا یہ بھی قاتل ہو گئے، خود بھی رسول اللہ ﷺ کی شان میں وہی فعل کرنا چاہتے ہیں جو ان کے اسلاف دوسرے انبیاء کے ساتھ کر چکے تھے چنانچہ حضور ﷺ سے انہوں نے لڑائیاں کیں، آپ ﷺ پر جادو کیا، آپ ﷺ کو زہر دیا، جس کے اثر سے آپ کی وفات ہوئی۔ جادو اور زہر کا تذکرہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

بِغَیْرِ حَقٍّ ناحق یعنی اپنے خیال میں بھی ناحق، بات یہ ہے کہ انبیاء کا قتل تو بہر حال ناحق ہی ہے (پھر اس قید کو بڑھانے کی کیا ضرورت تھی) اور وہ بھی اپنے خیال میں ناحق ہی جانتے تھے مگر ریاست کی ہوس نے ان کو قتل انبیاء پر آمادہ کر دیا ورنہ قتل کی کوئی وجہ جواز ان کی نظر میں بھی نہ تھی۔

وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ اور جو لوگ انصاف کرنے کا حکم دیتے تھے ان کو بھی وہ قتل کرتے تھے یعنی انبیاء کے متبعین کو بھی قتل کرتے تھے، ابن جریج نے بیان کیا کہ انبیاء بنی اسرائیل کے پاس وحی آتی تھی، کتاب نہیں آتی تھی، وحی کے مطابق انبیاء قوم کو نصیحت کرتے تھے اور شہید کر دیئے جاتے تھے پھر انبیاء کے پیرو نصیحت کرنے کھڑے ہو جاتے تھے مگر ان کو بھی شہید کر دیا جاتا تھا یہی وہ لوگ تھے جو لوگوں کو انصاف کرنے کا حکم دیتے تھے۔

بغوی نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کا قول نقل کیا ہے، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب کس کو ہو گا فرمایا جس نے کسی نبی کو قتل کیا یا منکر کا حکم دیا اور معروف سے ممانعت کی پھر حضور ﷺ نے آیت وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ سے وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ تک تلاوت فرمائی اس کے بعد ارشاد فرمایا ابو عبیدہؓ بنی اسرائیل نے ۴۳ انبیاء کو ایک ساعت کے اندر دن کے اول حصہ میں قتل کر دیا، شہادت انبیاء کے بعد بنی اسرائیل کے عابدوں میں سے ۱۲۰ آدمی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کیلئے کھڑے ہو گئے بنی اسرائیل نے اسی روز دن کے آخر حصہ میں ان کو بھی قتل کر دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ اللہ نے اپنی کتاب میں کیا اور ان کے بیان میں آیت نازل فرمائی۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۱﴾ اے محمد (ﷺ) تم ان کو دردناک عذاب کی بشارت یعنی اطلاع دے دو، خبر کو بشارت سے بطور استہزاء تعبیر کیا۔

سیبویہ کے نزدیک فبشرھم، ان الذین کی خبر نہیں ہو سکتا لیت و لعل کی خبر کی طرح ان کی خبر پر بھی فاء نہیں آسکتی (کیونکہ سب حروف مشبہ بفعل ہیں) اس قول پر ان کی خبر یا تو اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ ہو گی اور فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ جملہ معترضہ ہو گا جیسے زید فافھم رجل صالح میں فافھم جملہ معترضہ ہے اور زید کی خبر رجل صالح ہے۔ یا خبر محذوف ہے اصل کلام اس طرح تھا لھم عذاب الیم فبشرھم بعذاب الیم مسبب کو سبب کی جگہ ذکر دیا، جمہور کے نزدیک ان الذین کی خبر فبشرھم ہی ہے، بغوی نے اس صورت میں ان کو عمل سے معطل قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ کلام بغیر ان کے ہی تھا۔ لیکن اکثر اہل نحو قائل ہیں کہ اگر ان کا اسم، موصول ہو تو خبر پر فاء آسکتی ہے۔ کیونکہ اسم موصول شرط کے مشابہ ہوتا ہے جیسے بغیر ان کے اگر مبتداء موصول ہو تو (شرط کے مشابہ ہونے کی وجہ سے) خبر پر فاء کا لانا جائز ہے۔ لَیْتَ اور لَعَلَّ کے اسم پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ دونوں جملہ خبریہ کو انشاء کی طرف منتقل کر دیتے ہیں اس لئے شرط کی مشابہت فوت ہو جاتی ہے، پس جمہور کے مسلک پر آئندہ آیت کو دوسری خبر کہا جائے گا۔

marfat.com

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائیگاں ہو گئے۔
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ پس ان کے لئے دنیا میں لعنت اور رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب۔
وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿۲۲﴾ اور ان کا کوئی حمایتی نہیں کہ اعمال کو برباد ہونے سے بچالے اور عذاب کو دفع کر سکے۔
ابن المنذر، ابن اسحاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے مدرسہ میں یہود کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دی نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے پوچھا محمدؐ تم کس دین پر ہو، آپ ﷺ نے فرمایا ابراہیمؑ کی ملت اور دین پر، کہنے لگے ابراہیمؑ تو یہودی تھے، حضور ﷺ نے فرمایا آؤ ہمارے تمہارے درمیان تورات حاکم ہے (دیکھو تورات نے کیا فیصلہ کیا ہے) مگر انہوں نے انکار کیا اس پر مندرجہ ذیل آیت کا نزول ہوا۔
أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ یہ استفہام تقریری اور تعجب آفریں ہے۔ نصیباً میں تنوین تحقیر ہے اور مِنَ الْكِتَابِ میں مِنْ تبعیض یا بیان کے لئے ہے اور الکتاب سے مراد ہے تورات یا عام آسمانی کتابیں، یعنی دیکھو تو بڑی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو تورات کا ایک حقیر حصہ (یعنی تورات کا تھوڑا سا علم) دے دیا گیا ہے کہ نہ وہ کتاب کے اندرونی مضامین سے واقف ہیں نہ پوری تورات کے احکام پر ان کا ایمان ہے۔
يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ ان کو تورات (کے فیصلہ) کی طرف بلایا جاتا ہے یعنی محمد (ﷺ) ان کو تورات کی طرف دعوت دیتے ہیں، کلبی نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ خیبر کے باشندوں میں ایک مرد و عورت نے زنا کیا اور زناء کی سزا ان کی کتاب میں رجم (سنگسار کر دینا) مقرر تھی، لیکن زانی چونکہ عالی مرتبہ تھے۔ اس لئے یہودیوں نے ان کو سنگسار کرنا مناسب نہ سمجھا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں معاملہ پیش کیا ان کو یہ امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس سزا میں کچھ تخفیف مل جائے گی۔
لیکن حضور ﷺ نے دونوں کو رجم کر دینے کا حکم دے دیا، نعمان بن اوفیٰ اور بحری بن عمرو اس سزا کو سن کر بولے محمد ﷺ! آپ کا فیصلہ غلط ہے ان کے لئے سنگسار کرنے کا حکم نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میرے تمہارے قول کا فیصلہ تورات سے ہو سکتا ہے (تورات لاؤ) وہ بولے آپ ﷺ نے انصاف کی بات کہی، حضور ﷺ نے فرمایا تم میں تورات کا سب سے بڑا عالم کون ہے، انہوں نے جواب دیا ایک یک چشم آدمی ہے جو فدک کا باشندہ ہے اس کو ابن صوریا کہا جاتا ہے، چنانچہ یہودیوں نے ابن صوریا کو بلوا بھیجا اور وہ مدینہ میں آگیا۔
حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ ﷺ کو ابن صوریا کے حالات بتا دیئے تھے ابن صوریا حاضر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم ابن صوریا ہو، اس نے جواب دیا جی ہاں فرمایا کیا تم یہودیوں کے سب سے بڑے عالم ہو، ابن صوریا نے کہا لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں، حضور ﷺ نے تورات کا وہ حصہ طلب فرمایا جس میں رجم کا حکم مذکور تھا اور فرمایا اس کو پڑھو۔
حسب الحکم ابن صوریا نے تورات پڑھنی شروع کی اور جب آیت رجم پر پہنچا تو اپنی ہتھیلی اس پر رکھ دی اور آگے پڑھنے لگا، حضرت عبد اللہ بن سلام بولے یا رسول اللہ ﷺ یہ آیت رجم کو چھوڑ گیا، پھر عبد اللہؓ نے خود اٹھ کر اس کا ہاتھ آیت رجم سے ہٹایا اور رسول اللہ ﷺ کو نیز یہودیوں کو پڑھ کر سنایا کہ محصن اور محصنہ جب زنا کریں اور شہادت سے ثبوت ہو جائے تو ان کو سنگسار کر دیا جائے اور اگر عورت حاملہ ہو تو بچہ پیدا ہونے تک سزا موقوف رکھی جائے اس فیصلہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو سنگسار کرا دیا اور یہودی ناراض ہو کر لوٹ گئے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ تاکہ تورات یا رسول اللہ ﷺ کتاب کے موافق ان کا فیصلہ کر دے۔ کتاب سبب حکم ہے حکم کی نسبت کتاب کی طرف مجازی ہے۔
ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۲۳﴾ پھر ان میں سے ایک گروہ کترا کر (کتاب کے فیصلہ سے) منہ

marfat.com

موڑ لیتا ہے، ثُمَّ کا لفظ (بُعد مسافت یا بُعد زمان کو ظاہر کرتا ہے) اس جگہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ (رجم کی سزا کو حق جانتے ہوئے اس سے منہ موڑنا بہت بعید ہے، وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ کا جملہ فریق کی حالت بیان کر رہا ہے یعنی یہ قوم ایسی ہے کہ فیصلہ سے کترا جاتی ہے۔

قتادہؒ نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں کو کتاب اللہ یعنی قرآن کے فیصلہ کی طرف بلایا گیا مگر وہ قرآنی فیصلہ سے روگرداں ہو گئے، ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے یہود و نصاریٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان قرآن کو فیصلہ کن قرار دیا اور قرآن نے فیصلہ کر دیا کہ یہود و نصاریٰ حق پر نہیں ہیں مگر وہ اس فیصلہ سے روگرداں ہو گئے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ جانتے ہوئے کتاب اللہ کی طرف سے یہ اعراض اور حق سے روگردانی صرف اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے غلط اعتقاد کے سبب اپنے لئے عذاب کو خفیف قرار دے رکھا ہے اور خیال کر لیا ہے کہ ہم کو دوزخ کا عذاب چند گنتی کے بعد یعنی چالیس روز جتنے دن ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی چھووے گا، (یعنی چالیس روز بھی ہم کو پورا عذاب نہ ہوگا بلکہ برائے نام چھو جائے گا اور بس)۔

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۲۴ اور اپنے دین کے اندر جو افترابندیاں یہ کرتے چلے آئے ہیں اس نے ان کو دھوکہ میں رکھا ہے۔

ایک افترا تو یہی ہے کہ ہم کو صرف چالیس دن آگ چھوئے گی، دوسری دروغ بانی یہ ہے کہ ہمارے اسلاف جو انبیاء تھے ہماری شفاعت کر دیں گے، تیسری کذب تراشی یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے اللہ نے وعدہ کر لیا تھا کہ ان کی اولاد کو عذاب نہیں دے گا۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ پس ان کا کیا حال ہوگا اس وقت جب کہ ہم ان کو ایک یقینی دن کے حساب اور جزا و سزا کے لئے جمع کریں گے۔

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۲۵ اور کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی، هُمْ ضمیر جمع کل کی طرف راجع ہے کیونکہ لفظ کُلٌ معنی کے لحاظ سے جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کی نہ نیکی میں کمی کی جائے گی، نہ بدی میں اضافہ، قتادہؒ نے کہا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ فارس اور روم کا ملک میری امت کو عطا فرما دے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کر لیا تو آپ نے اپنی امت کے لئے فارس اور روم کی حکومت کا وعدہ فرمایا۔ منافق اور یہودی کہنے لگے ارے ارے کہاں محمد ﷺ اور کہاں فارس اور روم کی حکومتیں، وہ ان سے کہیں طاقتور اور مضبوط ہیں۔ کیا محمدؐ کے لئے مکہ اور مدینہ کافی نہیں کہ فارس اور روم کی حکومت کا لالچ کرنے لگے، اس پر اللہ نے آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ نازل فرمائی، دونوں روایتوں میں اختلاف ہے مگر نزول آیت پر اتفاق ہے (کہ آنحضرت نے فارس اور روم کی فتح کی بشارت دی تھی یا اللہ سے دعا کی تھی) دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے (اس طرح کہ فتح مکہ کے بعد آپ نے دعا کی ہو اور دعا قبول ہو گئی ہو اور وحی سے دعا کی قبولیت معلوم ہو گئی ہو اور آپ نے لوگوں کو بشارت دے دی ہو)۔

بیضاوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب (مدینہ کی حفاظت کیلئے) خندق کھودنے کے خطوط ڈالے اور ہر دس آدمیوں کیلئے بیس ہاتھ زمین کھودنا طے کر دی اور لوگوں نے کھدائی شروع کر دی تو کھودنے کے دوران زمین کے اندر ایک بڑی چٹان نمودار ہوئی جس پر کدال اثر نہیں کرتی تھی۔ لوگوں نے حضرت سلمانؓ کو اس بات کی اطلاع دینے کیلئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا آپ تشریف لے آئے اور کدال ہاتھ میں لے کر ایک ایسی ضرب لگائی کہ پتھر پھٹ گیا اور ایک چمک پیدا ہوئی جس سے مدینہ کے دونوں کناروں کا درمیانی حصہ چمک اٹھا گویا تاریک کوٹھڑی میں چراغ روشن ہو گیا، حضور ﷺ نے تکبیر کہی

marfat.com

مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ نعرۂ تکبیر لگایا، حضور ﷺ نے فرمایا اس ضرب سے میرے سامنے حیرہ (عراق علاقۂ فارس) کے محلات نمودار ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کتوں کے دانت، پھر آپ ﷺ نے دوسری ضرب لگائی اور فرمایا اس ضرب سے میرے سامنے سرزمین روم کی سرخ کوٹھیاں نمودار ہوگئیں۔ پھر تیسری ضرب لگائی اور فرمایا (اس ضرب سے) میرے سامنے صنعاء (تخت گاہ یمن) کے محل نمودار ہوگئے اور جبرئیلؑ نے مجھے بتایا کہ میری امت ان سب (ممالک) پر غالب آئے گی پس تم کو بشارت ہو، منافق کہنے لگے کیا تم کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا کہ محمد تم کو امیدیں دلا رہے ہیں تم سے جھوٹے وعدے کررہے ہیں اور تم کو بتارہے ہیں کہ مجھے یثرب سے حیرہ سرزمین فارس کے محل نظر آرہے ہیں اور تم ان کو فتح کردو گے حالانکہ تم دشمن کے خوف سے (مدینہ کی حفاظت کیلئے) خندق کھود رہے ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، بیہقی اور ابو نعیم نے دلائل میں یہ قصہ بیان کیا ہے مگر آیت کے نزول کا ذکر نہیں کیا، ابن خزیمہ نے قتادہ کی مختصر روایت نقل کی ہے اور اس میں نزول آیت کا ذکر کیا ہے

قُلِ اے محمد (ﷺ) آپ کہہ دیں۔

اللّٰهُمَّ یہاں سے مقولہ ہے (جس کو کہنے کا حکم دیا ہے) اللّٰهُمَّ کی اصل یَااللہ تھی۔ حرف ندا کو حذف کر کے اس کے عوض آخر میں میم زائد کر دیا گیا اسی لئے حرف ندا اور میم دونوں ساتھ نہیں آتے (اور یَااللّٰهُمَّ نہیں کہا جاتا تاکہ عوض و اصل دونوں کا اجتماع لازم نہ آئے) لفظ اللہ کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حرف ندا کے عوض اس کے آخر میں میم لایا جاتا ہے جیسے لام تعریف کے ساتھ حرف ندا کا لانا اس لفظ کی خصوصیت ہے (دیکھو یَا اللہ کہا جاتا ہے اور اللہ کے سوا کسی اور معرف باللام کے ساتھ حرف ندا نہیں آتا) اس اسم کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ قسم کی تاء اس پر آتی ہے (اور تاللہ کہا جاتا ہے اور کسی جگہ قسم کے لئے تاء کا استعمال نہیں ہوتا)۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اللّٰهُمَّ کی اصل یَااللہ اُمَّنَا بِخَیْرٍ تھی یعنی اے اللہ ہماری خیر کا ارادہ کر (اُمَّ امر کا صیغہ ہے اَمَّ یَؤُمُّ مَاضی اور مضارع ہیں) حرف ندا (یا) اور متعلقات فعل (نا بخیر) اور اُمَّ کا ہمزہ حذف کر دیا گیا اور میم مشدد کو اللہ سے ملا دیا گیا اللّٰهُمَّ ہوگیا، کبھی بطور تخفیف ال کو بھی ساقط کر دیتے ہیں اور صرف لَاهُمَّ کہتے ہیں یہ تمام محذوفات اور تخفیفات کثرت استعمال کے زیر اثر ہوتی ہیں جس طرح هَلُمَّ اِلَیْنَا کی اصل هَلْ اُمَّ اِلَیْنَا تھی یعنی ہمارا قصد کیا گیا ہے، جب اللّٰهُمَّ کے ساتھ اِغْفِرْلَنَا کہا جاتا ہے تو گویا اِغْفِرْلَنَا اُمَّنَا بِخَیْرٍ کا بیان ہوتا ہے اسی طرح اللّٰهُمَّ الْعَنْ عُلاً وَ ذَکْوَانَ (الحدیث) میں لعن اعداء اُمَّنَا بِخَیْرٍ کا بیان ہو سکتا ہے۔

مٰلِكَ الْمُلْكِ اے مالک ملک، منادیٰ کی صفت ہے (یعنی اے وہ اللہ جو مالک الملک ہے) بعض نے کہا دوسرا منادیٰ ہے اور حرف ندا محذوف ہے یعنی یا مالک الملک، مُلْكٌ مصدر ہے اس سے صفت کا صیغہ مَلِكٌ آتا ہے مُلْك (مصدر) سے مراد ہے مملوک (اسم مفعول) اور لام استغراقی ہے یعنی تمام جہان، کیونکہ اللہ تمام جہان کا خالق اور مالک ہے جیسا چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ جس کو جتنا چاہتا ہے بخشتا ہے۔ کوئی بھی اس کی اجازت اور حق ملکیت عطا کئے بغیر کسی چیز میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ الملک میں دونوں جگہ لام عہد ذہنی کا ہے یعنی اپنے ملک میں سے جس کو جتنا چاہتا ہے تو دیتا ہے اور جس سے جتنا چاہتا ہے واپس لے لیتا ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ اور جس کو چاہتا ہے دنیا یا آخرت یا دونوں جہان میں عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے یعنی اپنی مدد، توفیق اور ثواب عطا کر کے جس کو چاہتا ہے دنیا اور آخرت میں عزت بخشتا ہے اور بدبختی، عدم توفیق اور عذاب کی وجہ سے جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔

بِیَدِكَ الْخَیْرُ تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے بعض علماء نے کہا کہ اصل کلام بِیَدِكَ الْخَیْرُ وَالشَّرُّ تھا (کیونکہ

marfat.com

خیر و شر دونوں اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں) لیکن شر کو حذف کر کے صرف خیر کے ذکر پر اکتفا کیا جیسے آیت وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ میں وَالْبَرْدَ کو ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا، بعض علماء نے کہا کہ خیر کو خصوصیت کے ساتھ صرف اس لئے ذکر کیا کہ کلام کی رفتار کا تقاضا یہی تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو روم و فارس کی حکومت حاصل ہونے کی بشارت دی تھی، لوگوں نے کہا کہ قضاء خیر بالذات یعنی اصل ہے اور قضاء شر بالعرض یعنی کوئی چھوٹی شر اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ عمومی خیر وابستہ نہ ہو (تو اصل وجود خیر ہے شر کا وجود بالتبع اور ذیلی طور پر ہو جاتا ہے) یا یوں کہا جائے کہ باری تعالیٰ کو خطاب کرنا ادب کا خواستگار تھا اسی لحاظ ادب کی وجہ سے صرف خیر کا ذکر کیا۔

میں کہتا ہوں شاید خیر سے وجود مراد ہے اور وجود حقیقی جس میں عدم کا شائبہ بھی نہیں ہے، صرف واجب کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ سراسر خیر ہے اس میں شر کا شائبہ بھی نہیں ہے، رہا ممکنات کا وجود تو وہ ظلی ہے وجود واجب کا پرتو ہے ورنہ عدم جو شر کا ایک حصہ ہے ممکن کے لئے ذاتی اور اصلی ہے اور اللہ کی طرف شر کی نسبت کرنے کا صرف یہ معنی ہے کہ ممکن کو جو حصہ وجود ملا ہے وہ وجود حقیقی سے ملا ہے ورنہ ممکن کی حقیقت میں شر (یعنی عدم) داخل ہے (پس ممکن کی نسبت واجب کی طرف ہونا حقیقت میں شر کا انتساب ہے، حاصل یہ کہ خیر صرف وجود ہے اور وجود حقیقی خیر ہی خیر ہے۔ رہا ممکن کا وجود ظلی وہ وجود حقیقی کا ہی ایک حصہ ہے اور عدم عین شر ہے، ممکن کی حقیقت میں عدم داخل ہے یعنی ممکن کی حقیقت شر ہے اور ممکن کے بعض افراد شر میں زیادہ اور بعض کم ہیں بہر حال ممکن یعنی شریر الذات یا معدوم الذات کو وجود ظلی وجود حقیقی سے ملا ہے اس لئے شر کی نسبت بھی خدا کی طرف کر دی جاتی ہے ورنہ شر کا وجود ہی نہیں ہے شر اور عدم دونوں ایک ہی ہیں) پس صرف بیدک الخیر کہنا بالکل سچ ہے، (بیدک الشر) کا کوئی معنی ہی نہیں کیونکہ شر عدم ہے اور عدم علت کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ عدم کوئی چیز ہی نہیں ہوتا۔ ¹

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٦ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ تیرے قابو میں ہے تیرے سوا کسی کا کسی چیز پر کوئی قابو نہیں، بندوں کی قدرت ایک وہمی چیز ہے جس کی وجہ سے ان کو کاسب (اور عامل) کہہ دیا جاتا ہے ورنہ بندوں کا اور ان کے اعمال کا خالق اللہ ہی ہے واللہ خلقکم وما تعملون۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ شر بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہم کہتے ہیں بیشک اللہ کو شر پر قدرت حاصل ہے اور شر اس کے ہاتھ میں ہے مگر اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ (جس طرح خیر عطا کرنے پر قادر ہے اسی طرح) خیر نہ دینے پر بھی قادر ہے کیونکہ قدرت کا معنی ہی یہ ہے کہ اگر چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے پس اللہ جب خیر عطا نہ کرے تو ممکن اپنے اصلی شر پر رہ جائے گا یہی معنی قدرت علی الشر کا ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ز یعنی تو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اس طور پر کہ ایک کے پیچھے دوسرا آتا ہے یا اس طور پر کہ ایک گھٹتا اور دوسرا بڑھتا ہے۔

وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ اور تو جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جان دار سے نکالتا ہے۔

بعض علماء نے تفسیر مطلب اس طرح کی ہے کہ اللہ جانور کو نطفہ اور انڈے سے اور نطفہ و انڈے کو جانور سے اور سبزہ کو خشک بیج سے اور خشک بیج کو سبزہ سے پیدا کرتا ہے، حضرت ابن مسعودؓ، سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ، عکرمہؒ، کلبیؒ اور زجاجؒ نے یہی

---

¹ مزید توضیح کے لئے یوں سمجھو کہ ممکن اصلاً معدوم ہے اور عدم میں کوئی خیر نہیں، گویا ممکن ذات کے اعتبار سے شر ہی شر ہے رہا اس شر کا (یا معدوم کا یا ممکن کا) وجود تو وہ ظلی ہے اپنا نہیں۔ وجود تو صرف واجب کا ہے، واجب کا سایہ ممکن ہے۔ پس وجود حقیقی سے ممکن کو یہ وجود ظلی حاصل ہوا۔ خلاصہ یہ نکلا کہ شر کو جو وجود بالعرض حاصل ہوا ہے وہ وجود حقیقی سے ہوا ہے اس بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہی کے ہاتھ میں شر ہے ورنہ حقیقت میں جب شر کا کوئی وجود ہی نہیں تو اس کا خالق یا مالک کسی کو قرار دینے کا بھی کوئی معنی نہیں، عدم کی ملکیت اور تخلیق بداہۃً غلط ہے پس حقیقۃً بیدک الخیر یعنی بیدک الوجود ہی درست ہے۔

marfat.com

تشریح کی ہے لیکن حسن بصریؒ اور عطاءؒ نے کہا کہ اللہ کافر کو مؤمن سے اور مؤمن کو کافر سے پیدا کرتا ہے، کافر مردہ ہے اور مؤمن زندہ، اللہ نے فرمایا ہے اومن کان میتاً فا حییناہ، ابن ابی حاتمؒ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی طرف اس تشریح کی نسبت کی ہے۔

وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاۤءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ یعنی تو جس کو چاہتا ہے بغیر تنگی اور کمی کے اتنا دیتا ہے کہ مخلوق کو نہ اس کی گنتی معلوم ہو سکتی ہے نہ مقدار، اگرچہ خدا اس کی گنتی اور مقدار کو جانتا ہے آیت تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاۤءُ و تنزع الملک ممن تشاء کے ثبوت میں اللہ نے یہ پانچ جملے ذکر فرمائے (جن سے عطاء ملک اور انتزاع ملک پر اللہ کا قادر ہونا ثابت ہو رہا ہے)۔

بغویؒ نے اپنی سند سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب (سورۃ الحمد) اور آیۃ الکرسی اور سورۂ آل عمران کی دو آیات یعنی شَھِدَ اللّٰہُ سے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ تک اور قل اللھم مالک الملک سے بغیر حساب تک، مقبول الشفاعت ہیں ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں انہوں نے کہا تھا اے رب تو ہم کو زمین پر اتار کر ایسے لوگوں کے پاس بھیج رہا ہے جو تیری نافرمانی کریں گے۔ اللہ نے فرمایا میں اپنی قسم کھاتا ہوں کہ میرے بندوں میں جو کوئی ہر نماز کے بعد تمہاری تلاوت کرے گا وہ کیسا ہی ہو، میں جنت کو اس کا ٹھکانا ضرور بناؤں گا، میں حظیرۃ القدس میں اس کو ضرور ٹھہراؤں گا، میں اس کی طرف ضرور نظر رحمت کروں گا (یعنی روزانہ ستر ۷۰ بار) اور میں روز اس کی ستر ۷۰ حاجتیں پوری کروں گا، جن میں ادنیٰ درجہ گناہوں کی مغفرت کا ہوگا (یعنی دنیوی حاجات مراد نہیں ہیں بلکہ آخرت کے مراتب کی ترقی مراد ہے اور مراتب کی ترقی کا درجہ بعد کو آتا ہے سب سے پہلے گناہوں کی بخشش کی ضرورت ہے لہٰذا مغفرت کا درجہ سب سے ادنیٰ ہوگا) اور میں ہر دشمن اور حاسد سے اس کو پناہ دوں گا اور غالب کروں گا۔

طبرانی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تجھے ایسی دعا بتاؤں کہ اگر تو وہ دعا کرے تو اللہ تیرا قرض ادا کرا دے خواہ وہ کوہ ثبیر کے برابر ہی ہو یہ پڑھ اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ سے بِغَیْرِ حِسَابٍ تک (اور پھر عرض کر) رحمن الدنیا والاخرۃ و رحیمھما تعطی من تشاء منھما و تمنع من تشاء ارحمنی رحمۃ تغننی بھا عن رحمۃ من سواک، واللہ اعلم۔

ابن جریرؒ نے سعید اور عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حجاج بن عمرو جو عمرو بن اشرف کا حلیف تھا اور ابن ابی الحقیق اور قیس بن زید تینوں نے انصار کے چند آدمیوں سے اندرونی دوستی گانٹھی تاکہ دین کی طرف سے ان کو ورغلائیں اور بہکاویں، رفاعہ بن منذر اور عبداللہ بن جبیر اور سعید بن خیثمہ نے انصار سے کہا آپ لوگ ان یہودیوں سے بچتے رہیں کہیں دین کی طرف سے آپ کو بہکانہ دیں انصار نے اندرونی دوستی ترک کرنے سے انکار کر دیا اس پر آیت ذیل کا نزول ہوا۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَاۤءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ یعنی نہ بنائیں مؤمن کافروں کو دوست اہل ایمان کو چھوڑ کر، مؤمنوں کو کافروں سے موالات کی ممانعت فرمادی خواہ رشتہ داری کی صورت میں ہو یا دوستی کی شکل میں یا جہاد اور دینی امور میں طلب امداد کے طور پر ہو (سب کی ممانعت فرمادی) مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کہنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ کافروں کی دوستی مومنوں کی دوستی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، دو دشمنوں سے بیک وقت دوستی ممکن نہیں کفار کی دوستی بجائے خود بھی بری ہے اور اس لئے بھی بری ہے کہ مسلمانوں کی دوستی سے محروم ہو جانے کا سبب ہے۔

بغویؒ نے مقاتل کا قول نقل کیا ہے کہ آیت کا نزول حضرت حاطب بن ابی بلتعہ وغیرہ کے متعلق ہوا تھا جو کفار مکہ سے دوستی کا اظہار کرتے تھے اور کلبی کا قول بروایت ابو صالح بغوی نے یہ نقل کیا ہے کہ آیت کا نزول عبداللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھیوں کے بارہ میں ہوا جو مشرکوں اور یہودیوں سے دوستی رکھتے تھے اور مسلمانوں کی خبریں ان کو اس امید پر پہنچاتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ پر ان کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اہل ایمان کو منافقوں کے عمل سے

marfat.com

روک دیا۔

فصل

محض اللہ کی خوشنودی کے لئے دوستی اور دشمنی کرنا، ایمان کا ایک عظیم الشان دروازہ ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی، متفق علیہ، حضرت انس رضی اللہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تجھے محبت ہوگی، متفق علیہ، حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیک ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے مشک اپنے ساتھ رکھنے والا اور برے ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے بھٹی دھونکنے والا، مشک اپنے پاس رکھنے والا یا تو مفت تجھے مشک دے دے گا۔ یا تو اس سے خرید لے گا اور نہ ہوگا تو خوشبو تو بہر حال تجھے پہونچے گی اور بھٹی دھونکنے والا تیرے کپڑے جلادے گا یا کم سے کم تجھے اس کی طرف سے بدبو آئے گی، متفق علیہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا، ابوذرؓ ایمان (کے حصول) کا کونسا قبضہ (ذریعہ) سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں۔ فرمایا، اللہ کے لئے دوستی۔ اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے محبت اور بغض رکھنا۔ (رواہ البیہقی فی الشعب) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ۔ اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل ہے۔ رواہ احمد وابوداؤد۔ اس موضوع کی احادیث بکثرت آئی ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ اور جو ایسا کرے گا یعنی کافروں سے اندرونی دوستی رکھے گا۔

فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ تو اللہ سے اس کا کچھ بھی دوستی کا تعلق نہیں۔ شئی کی تنوین اظہار تحقر کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کی دوستی یا اللہ کے دین کی کم سے کم مقدار میں بھی اس کا دخل نہیں یعنی کافروں کی دوستی جس طرح مومنوں کی دوستی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دوستی کے ساتھ بھی نہیں ہو سکتی۔ اگر شروع میں ہی بجائے مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کے من دون الله و المومنين کہہ دیا جاتا تو بیان کردہ مطلب ادا ہو جاتا لیکن اللہ کی دوستی سے محرومی کا اظہار پرزور عبارت میں نہ ہوتا اس لئے آیت فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ کو (مستقل طور پر) ذکر کیا۔

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً مگر یہ کہ کافروں کی طرف سے تم کو کچھ شر کا اندیشہ ہو۔ تو کفار سے (ظاہری) دوستی جائز ہے اور اللہ کی دوستی سے محرومی نہ ہوگی۔

اس استثناء مفرغ کا معنوی حیثیت سے مذکورۂ بالا دونوں جملوں سے تعلق ہے یعنی کافروں سے موالات سوائے خوف کے وقت کے اور کسی وقت جائز نہیں اور جو شخص سوائے وقت خوف کے اور کسی وقت ایسا کرے گا اس کو اللہ کی دوستی بالکل حاصل نہ ہوگی۔

اتقاء باب افتعال (مصدر) وقاية سے ماخوذ ہے یعنی کافروں سے اپنے کو بچانا اور اس بچاؤ کے لئے شر سے ڈرنا لازم ہے اس لئے بعض لوگوں نے الا ان تتقوا کا ترجمہ کیا ہے مگر یہ کہ تم کو اندیشہ ہو تقاة اور تقی اور تقیة اور تقوی سب مصادر ہیں (اور ان کا باب ثلاثی مجرد ہے) مگر باب تفعل ثلاثی مزید) کے بعد آجاتے ہیں محاورہ میں توقية تقاة بولا جاتا ہے ہاں اتقیت کے بعد اگر مصدر ذکر کیا جاتا ہے تو اتقاء کہا جاتا ہے۔

اس جگہ مصدر یا تو بمعنی مصدر ہی ہے یعنی موالات کفار جائز نہیں، مگر اس وقت کہ تم کو ان کی طرف سے شر کا کوئی اندیشہ ہو یا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے یعنی موالات کفار اس وقت جائز ہے کہ کفار کی طرف سے تم کو کسی اندیشہ ناک چیز کا ڈر ہو۔ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ کافروں کے شر سے اندیشہ کے وقت ان سے موالات جائز ہے۔ لیکن ناجائز کا جواز بقدر ضرورت ہوتا ہے اس لئے صرف ظاہری دوستی جائز ہوگی اندرونی دوستی کا جواز نہیں ہو سکتا۔ اور کافروں کی دوستی میں کسی حرام

marfat.com

خون یا حرام مال کو حلال قرار دینا یا گناہ کا ارتکاب کرنا یا کافروں کو مسلمانوں کی نقصان رساں تدبیریں بتانا یا مسلمانوں کے رازوں سے واقف کرنا جائز نہیں۔ بعض لوگوں نے ظہور اسلام کے بعد تقیہ کرنے کو ناجائز کہا ہے کیونکہ حضرت معاذ بن جبلؓ کا قول ہے کہ ابتداء اسلام میں جب تک دین کا استحکام نہ ہوا تھا اور اسلام میں قوت نہ آئی تھی تقیہ جائز تھا لیکن اب مسلمانوں کے لئے دشمن سے تقیہ کرنا جائز نہیں۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ مذکورہ بالا آیات میں کفار کی دوستی کا نتیجہ مسلمانوں کی اور خدا کی دوستی سے محروم ہو جانا بیان کیا تھا اب مزید بازداشت کے لئے فرمایا کہ اللہ تم کو اپنی ناراضگی اور عذاب سے ڈرا رہا ہے جو موالات کفار کی صورت میں ہوگا۔

نفس کا ذکر عذاب کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے فرمایا تاکہ کافروں کی طرف سے جس شر کا اندیشہ ہو اس کی پروانہ رہے، اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ ولایت کفار جس کی ممانعت کی جا رہی ہے انتہائی بری ہے۔

وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨﴾ اور اللہ کے پاس تم کو جانا ہے یہ مزید وعید ہے کہ تم اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے اسی کے پاس تمہیں جانا ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ اے محمد ﷺ کہہ دو کہ کافروں کی موالات وغیرہ خواہ تم اپنے دلوں میں چھپائے رکھو یا قول و عمل سے اس کا اظہار کر دو بہر حال اللہ اس کو جانتا ہے یعنی چھپانا اور ظاہر کرنا دونوں برابر ہیں۔ خدا کو بہر حال علم ہوتا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾ یہ جملہ از سرنو مستقل ہے جزاء پر اس کا عطف نہیں ہے اور کلام سابق کی گویا علت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کی جب کوئی چیز اللہ سے مخفی نہیں اور وہ سب پر قابو رکھتا ہے تو تمہارے دلوں کی حالت اس سے کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔

عوام کی نظر کی رسائی چونکہ صرف آسمان و زمین تک ہے اس لئے انہی کا ذکر کیا مگر مقصود تمام کائنات ہے ہر چیز کا وجود اسی کے علم و قدرت سے ہے پھر اس کیلئے کوئی چیز کس طرح پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ علم و قدرت کی ہمہ گیری کی صراحت کر کے یحذرکم اللہ نفسہ کے مضمون کی توضیح مقصود ہے کہ جب اللہ کا علم ہمہ گیر اور قدرت محیط کل ہے تو اس کی نافرمانی پر جرأت کرنی خلاف عقل ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا و آخرت میں اللہ سے ایسی کوئی چیز مخفی نہیں جس کے ذریعہ سے تم کو عذاب دیا جا سکتا ہو اور اس کے قابو میں ہر چیز ہے پس وہ جس طرح چاہے گا دنیا یا آخرت یا دونوں جگہ تم کو عذاب دے گا اور کوئی شبہ نہیں اس حقیقت میں کہ کافروں سے موالات اور دین میں مداہنت دنیوی عذاب کو ذلت اور محکومی کی صورت میں لانے والی ہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ جس روز کہ ہر شخص اپنی کی ہوئی ہر نیکی (یا نیکی کے ثواب) کو اپنے سامنے موجود پائے گا اور جو بدی کی ہوگی اس کو بھی سامنے موجود پائے گا۔ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کے عمل بد کے درمیان لمبی مسافت ہوتی (کہ عمل بد کی شکل ہی سامنے نہ آتی) یَوْمَ ظرف کا تعلق تَوَدُّ سے ہے مَا موصولہ ہے شرطیہ نہیں ہے اسی لئے تَوَدُّ مرفوع ہے تَجِدُ کا معنی ہے تُصِيْبُ (پائے گا) اور مُحْضَرًا حال ہے دوسرا مفعول نہیں ہے کیونکہ جب تَجِدُ بمعنی تُصِيْبُ ہوا اس کو دوسرے مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ کا عطف مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ پر ہے۔ اس صورت میں غالباً نفس سے مراد ہے وہ ایماندار نفس جس نے کچھ اچھے کام کئے ہوں اور کچھ برے۔ رہے وہ لوگ جن کی صرف نیکیاں ہی ہوں بدی کوئی نہ ہو (جیسے انبیاء) یا صرف بدیاں ہی ہوں نیکی کوئی نہ ہو، تو ان کا حال مذکورہ کلام کے مفہوم قیاس کر کے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اللہ پاک اپنی مہربانی سے علی الاعلان مؤمن کے اچھے اعمال اس کے سامنے لائے گا مگر برے

marfat.com

عمل دوسروں کے سامنے نہ لائے گا بلکہ وہ خود اپنے گناہ محسوس کرے گا اور تمنا کرے گا کہ کاش اللہ اس کے گناہوں کی اطلاع ہی نہ دے اور اظہار کرنا ہی ہو تو پردے پردے کے اندر صرف اسی کو مطلع کردے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ مؤمن کو قریب بلا کر اپنی ہتھیلی اس پر رکھ کر خفیہ طور پر فرمائے گا کیا تو اپنے فلاں گناہ سے واقف ہے کیا تجھے اپنا فلاں گناہ معلوم ہے۔ بندہ عرض کرے گا بیشک میرے رب (مجھے معلوم ہے) جب اللہ اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرالے گا اور بندہ خیال کرے گا کہ اب میں تباہ ہوا تو اللہ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیرے گناہ چھپائے اور آج معاف کرتا ہوں اس کے بعد نیکیوں کا اعمال نامہ اس کو دیدیا جائے گا۔ رہے کافر اور منافق تو ان کے متعلق سب مخلوق کے سامنے ندا دی جائے گی کہ ھؤلاء الذین کذبوا علیٰ ربھم الا لعنة الله علی الظالمین۔

لیکن اگر تَجِدُ کا معنی تَعْلَمُ ہو تو مُحْضَرًا دوسرا مفعول ہو گا اور مَا عَمِلَتْ پہلا مفعول یعنی خیر و شر کو حاضر جانے گا۔ تَوَدُّ کے اندر تمنا کا معنی ہے لَو زائد (برائے تحسین کلام) یا مصدریہ۔ بَیْنَہٗ کی ضمیر یَوْمَ کی طرف یا مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ کی طرف راجع ہے۔

پورا مطلب اس طرح ہو گا کہ ہر شخص اپنی نیکیوں کو یا نیکیوں کے صحیفہ کو یا ان کے ثواب کو پالے گا نیکی یا صحیفہ یا ثواب سامنے ہو گا اسی طرح عمل شر کو یا اس کے صحیفہ کو یا اس کے عذاب کو پالے گا شر یا شر کا صحیفہ یا اس کا عذاب سامنے ہو گا یا خیر و شر دونوں کا بدلہ پائے گا جو اس کے سامنے لایا جائے گا۔ اس وقت اس کی تمنا ہو گی کہ اس کے اور روز جزا کے درمیان ایک بڑی مسافت حائل ہو جائے۔ اگرچہ یہ نیک اعمال بھی اس کے سامنے لائے جائیں گے لیکن عمل شر کی وجہ سے اس کی یہ تمنا ہو گی کیونکہ ضرر کے خوف کے وقت اس کو نیکی کے فائدہ کی امید نہیں رہے گی۔ اَمَد کا معنی ہے مدت اور آخری حد مسافت۔ حسن بصریؒ نے فرمایا۔ ہر آدمی کو یہ تمنا ہو گی کہ اس کی بدی اس کے سامنے کبھی نہیں آئے۔ بعض لوگوں نے تَوَدُّ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ شخص اس بات کی تمنا کرے گا کہ کاش اس نے یہ (برے کام) نہ کئے ہوتے۔

ممکن ہے کہ تَوَدُّ کا تعلق قَدِیْرٌ سے ہو، یوں تو اللہ ہر زمانہ میں قدیر ہے اس کی قدرت سے کوئی وقت خارج نہیں لیکن قیامت کا دن سزا و جزا کا ہو گا (اس لئے اس روز خصوصیّت کے ساتھ اس کی قدرت کا ظہور ہو گا) مطلب یہ کہ اللہ تم کو ہر طرح ثواب و عذاب دینے پر اس روز قادر ہو گا جبکہ ہر شخص کا اچھا برا کیا ہوا سامنے آئے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یَوْمَ کو اُذْکُرْ محذوف کا مفعول فیہ قرار دیا جائے یعنی اس دن کو یاد کرو جب ایسا ایسا ہو گا۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ یَوْمَ کو یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ کا مفعول کہا جائے یعنی اللہ تم کو ڈراتا ہے اس دن کے عذاب سے جبکہ ایسا ہو گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا پر جملہ ختم ہو جائے اور مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ مبتدا ہو اور تَوَدُّ خبر ہو اور وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ میں واؤ استیناف کے لئے ہو۔ یا واؤ عاطفہ ہو اور تَجِدُ کے دوسرے مفعول کی جگہ میں تَوَدُّ ہو۔ یعنی جس شخص نے جو برا عمل کیا ہو گا اس کو وہ اتنا ہولناک سمجھے گا کہ اپنے اور اس عمل کے درمیان مسافت بعیدہ ہو جانے کا خواستگار ہو گا۔

حضرت عدیؓ بن حاتم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک سے اس کا رب اس طرح کلام کرے گا کہ اس کے اور رب کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہو گا اور نہ کوئی حجاب مانع ہو گا وہ شخص اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو اس کو وہی اعمال نظر آئیں گے جو اس نے پہلے کئے ہوں گے اور بائیں طرف دیکھے گا تب بھی سابقہ اعمال دکھائی دیں گے اور سامنے دیکھے گا تو منہ کے سامنے آگ ہی آگ دکھائی دے گی پس آگ سے بچو اگرچہ چھوارہ کا ایک ٹکڑا ہی دے سکو۔ متفق علیہ

وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ؕ یہ جملہ مستقل مفہوم رکھتا ہے۔ سابق کی تکرار نہیں ہے کیونکہ پہلے کافروں کی موالات کے عذاب سے ڈرایا تھا اور اس جملہ میں ترکِ واجبات اور ارتکابِ معاصی سے ڈرایا ہے۔

وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ اور اللہ مؤمن بندوں پر بڑا مہربان ہے پچھلی آیت میں کفار سے اللہ کے برتاؤ کا بیان

ع ۱۰
۱۱

marfat.com

تھا اور اس آیت میں مؤمنوں کے ساتھ معاملہ کا اظہار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گزشتہ جملہ کی یہ جملہ علت ہو یعنی اللہ تم کو ڈراتا ہے اس لئے کہ اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے ان کی اصلاح چاہتا ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ ابن جریر اور ابن المنذر نے حسن بصریؒ کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے کہا محمدؐ خدا کی قسم ہم اپنے رب سے محبت رکھتے ہیں اس پر آیت قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ الخ نازل ہوئی۔

ابن اسحاقؒ اور ابن جریرؒ نے محمد بن جعفر بن زبیر کا قول نقل کیا ہے کہ وفد نجران نے کہا تھا ہم مسیح کی پرستش اللہ کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ آیت کا نزول یہود و نصاریٰ کے حق میں ہوا تھا کیونکہ انہوں نے کہا تھا نحن ابناء الله واحباء ہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا کہ کچھ قریشیوں نے کعبہ کے اندر بت نصب کئے تھے اور ان پر شتر مرغ کے انڈے لٹکائے تھے اور ان کے کانوں میں بالیاں پہنائی تھیں اور ان کو سجدے کر رہے تھے رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر کچھ توقف کیا اور فرمایا اے گروہ قریش تم نے اپنے باپ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے طریقہ کی مخالفت کی۔ قریشی کہنے لگے ہم تو اللہ ہی کی محبت میں ان کی پوجا کرتے ہیں تاکہ یہ ہم کو خدا کے قرب میں پہنچادیں اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

حُبٌّ حِبٌّ حِبَابٌ حُبَابٌ مَحَبَّةٌ سب مصدر ہیں اس سے ماضی اَحَبَّ مضارع یُحِبُّ اور اسم مفعول مَحْبُوْب آتا ہے اور یہ سب خلاف قیاس آتا ہے مُحَبٌّ اسم مفعول قلیل الاستعمال ہے باب ضرب سے حَبَبْتُهٗ (بروزن ضربتہٗ) اور اَحِبّہٗ (بروزن اَضْرِبُہٗ) شاذ ہے۔

محبت کے دل کا محبوب کے خیال میں مشغول رہنا اور ایسا استغراق ہو جانا کہ دوسرے کی طرف توجہ نہ رہے اور کسی وقت خیال محبوب کی طرف توجہ اور اشتغال کے بغیر چارہ ہی نہ ہو یہ محبت کا مفہوم ہے یہی مطلب ہے اس قول کا کہ عشق دل کی آگ ہے جو محبوب کے سوا ہر چیز کو سوخت کر دیتی ہے یعنی ہر چیز کی طرف سے توجہ کو ہٹا دیتی ہے، محبوب کے سوا ہر شئے کا تصور مٹا دیتی ہے گویا محبّ کی نظر میں محبوب کے علاوہ کوئی چیز موجود ہی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اس کو اپنی ہستی بھی نظر نہیں آتی ہر ماسوا تصور محبوب میں فنا ہو جاتا ہے۔ اس مغلوب الحالی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کو طبعاً وہی چیز پسند آتی ہے جو محبوب کو پسند ہو اور اس چیز سے ذاتی نفرت ہو جاتی ہے جس سے محبوب کو نفرت ہو وہ ہر وقت مرضیٔ محبوب کا خواستگار ہوتا ہے اس کو نہ ثواب اور فائدہ کا لالچ رہتا ہے نہ عذاب اور ضرر کا اندیشہ اگرچہ بالعرض اس کی طلب میں طمع اور خوف کی آمیزش ہوتی ہے (مگر آلائش نہیں ہوتی اس کی اصل غرض محبوب کی خوشنودی کی طلب ہوتی ہے)۔

یہ تو بندہ کی محبت کی حقیقت ہے، رہی اللہ کی محبت بندہ سے تو ظاہر ہے کہ اللہ قلب، استغراق تصور اور انہماک سے پاک ہے اس کو ایسی توجہ کسی طرف نہیں ہوتی کہ دوسری طرف توجہ نہ رہے اس کی محبت ایک سادہ الس کا نام ہے جو بندہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور دوسرے کی طرف بندوں کو مائل نہیں ہونے دیتا۔ اللہ کی طرف سے اسی کشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ سے محبت کرتا اور اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ پس بندہ کی محبت اللہ کی محبت کی شاخ اور اس کا سایہ ہے۔ اصل محبت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي دوسری جگہ فرمایا يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ۔ يُحِبُّهُمْ کو يُحِبُّونَهٗ سے پہلے اسی لئے ذکر کیا (کہ اصل محبت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اس کے بعد بندہ اس کی طرف کھنچتا ہے)۔

ہم نے محبت ذاتیہ کی یہ حقیقت بیان کی ہے۔ لیکن بیضاوی نے محبت کی تعریف کی ہے کہ جب کوئی شخص کسی میں کوئی کمال جان لیتا ہے تو اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس میلان کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کو اختیار کرے جو اس کو محبوب

marfat.com

سے قریب کردیں۔ اسی میلان اور نفس کے جھکاؤ کا نام محبت ہے۔ یہ صفاتی محبت کی تعریف ہے جو محبت ذاتیہ سے کوسوں دور ہے۔ دیکھو ماں کی اپنے بچہ سے محبت اس لئے نہیں ہوتی کہ بچہ کے اندر اس کو کوئی کمال نظر آتا ہے بلکہ (بالکل بے غرض) ایک قلبی کھنچاؤ ہوتا ہے۔ ماں کی محبت، محبت ذاتیہ کے قریب قریب تو ہوتی ہے مگر بعینہ محبت ذاتیہ نہیں ہوتی کیونکہ اس محبت کی بنا محض اس بات پر ہوتی ہے کہ ماں جانتی ہے کہ یہ میرا بچہ ہے۔ محبت الٰہی کا درجہ اس سے بہت اونچا ہے (وہاں رشتہ نسبی کا شائبہ بھی نہیں ہے) صحیحین وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہؓ سے مرفوع روایت آئی ہے جس کے الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب ایک ہی ہے کہ اللہ کی سو رحمتیں ہیں اس نے ایک رحمت مخلوق کو تقسیم کی ہے جس کی وجہ سے مخلوق آپس میں محبت کرتی ہے، ننانوے رحمتیں اللہ نے اپنے اولیاء کے لئے رکھ چھوڑی ہیں (جن کا ظہور کامل قیامت کے دن ہوگا) بغویؒ نے بیان کیا ہے کہ اللہ سے بندہ کی محبت یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرے، اس کی طاعت اختیار کرے اور اس کی مرضی کا طلب گار رہے اور بندہ سے اللہ کی محبت کا یہ معنی ہے کہ اللہ بندہ کی تعریف کرے اور اس کو ثواب دے اور اس کی مغفرت کردے۔ بغوی کا یہ بیان محبت کی تعریف نہیں ہے بلکہ تقاضائے محبت کا اظہار ہے۔

فَاتَّبِعُونِي یعنی تم اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ فاسببیہ ہے کیونکہ محبت طلب مرضی کا سبب ہے اور اللہ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند، یہ محض عقل سے بغیر اللہ کی اطلاع کے معلوم نہیں ہو سکتا اور اللہ کی طرف سے اطلاع پیغمبروں ہی کی معرفت سے آتی ہے پس محبت خدا، اتباع انبیاء کا سبب ہے، اتباع انبیاء ہی سے دل میں محبت الٰہی کا ہونا اور اتباع رسل نہ کرنے سے محبت کا نہ ہونا معلوم ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی محبتِ خدا کا مدعی اور طریقۂ رسول اللہ کے خلاف ہو، تو وہ جھوٹا ہے جس کو اللہ کی کتاب جھوٹا قرار دے رہی ہے۔

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یہ امر کا جواب ہے یعنی اگر میرا اتباع کروگے تو اللہ تم کو پسند فرمائے گا۔

ایک سوال

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ بندہ سے اللہ کی محبت اتباع انبیاء پر موقوف ہے اور اتباع انبیاء اسی وقت ممکن ہے جب بندہ اللہ سے محبت رکھتا ہو نتیجہ یہ نکلا کہ بندہ سے اللہ کی محبت اس وقت ہوگی جب بندہ اللہ سے محبت کرتا ہو۔ مگر بیان سابق سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اللہ سے بندہ کی محبت بعد کو ہوتی ہے اور بندہ سے اللہ کی محبت پہلے۔ محبت عبد نتیجہ ہے محبت اللہ کا، یہ تو کھلا ہوا دور (منطقی چکر) ہے۔

جواب

سابق میں جس محبت کا بیان تھا وہ اور تھی اور یہ محبت اس کے علاوہ ہے۔ حقیقت میں اللہ کی طرف سے دو محبتیں ہوتی ہیں ایک ابتدائی اور دوسری آخری۔ دونوں کے وسط میں اللہ سے بندہ کی محبت ہوتی ہے۔ اول اللہ کی طرف سے وہی محبت ہوتی ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دی اس کے نتیجہ میں بندہ اللہ کی طرف کھنچتا اور اتباع انبیاء کرتا ہے۔

اتباع انبیاء کے بعد اللہ کی طرف سے بندہ کی ایک اور محبت ہوتی ہے یعنی اللہ بندہ پر رحم اور کامل مہربانی کرتا ہے یہ مہربانی اور محبت وہی ہے جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کی سو رحمتیں ہیں۔ سو میں سے ایک رحمت تو اس نے مخلوق کو بانٹ دی ہے جس کی وجہ سے مخلوق آپس میں محبت کرتی ہے اور ننانوے رحمتیں اپنے اولیاء کے لئے اس نے رکھ چھوڑی ہیں۔ چونکہ اس آخری محبت کا تقاضا ہے کہ اللہ بندہ پر رحمت فرمائے اور اس کی مغفرت کر دے اس لئے فرمایا۔

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۱﴾ اور اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اللہ بہت معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

بغوی نے بیان کیا ہے کہ جب آیت فَاتَّبِعُونِي نازل ہوئی تو عبداللہ بن ابی (منافق) نے اپنے ساتھیوں سے کہا محمدؐ اپنی

marfat.com

اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دے رہے ہیں اور ہم کو حکم دے رہے ہیں کہ ہم ان سے ویسی ہی محبت کریں جیسے نصاریٰ عیسیٰؑ سے کرتے ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ آپ کہہ دیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت ایک ہی ہے۔ رسول کی حیثیت سے رسول کی اطاعت بعینہٖ اللہ کی اطاعت ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری سب امت جنت میں جائے گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ (امت میں ہوتے ہوئے) انکار کون کر سکتا ہے فرمایا جس نے میرا کہا مانا وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میرا کہنا نہ مانا تو اس نے انکار کیا، متفق علیہ۔ دیکھو اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جنت کے داخلہ کو اپنی اطاعت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ دوسری حدیث میں فرمایا جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ محمد ﷺ ہی نے اللہ کے فرمان برداروں اور نافرمانوں میں امتیاز قائم کر دیا ہے۔ رواہ البخاری فی حدیث طویل عن جابرؓ۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا پس اگر تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے روگردانی کی۔ تَوَلَّوْا ماضی کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور مضارع کا بھی۔ مؤخر الذکر صورت میں خطاب کی تاء حذف کر دی گئی ہے اصل میں تَتَوَلَّوْا تھا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾ تو (سمجھ لو کہ) اللہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا، اصل میں کلام یوں ہونا چاہئے تھا کہ اللہ تم سے محبت نہیں رکھتا، لیکن عام ضابطہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا اسی کے ذیل میں یہ بھی آ گیا کہ اللہ تم سے محبت نہیں رکھتا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جزا محذوف ہو اور فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكَافِرِیْنَ اس کی دلیل ہو اور مدلول کی جگہ دلیل کو ذکر کر دیا۔ (تاکہ کلام میں قوت پیدا ہو جائے) یعنی اگر تم نے روگردانی کی تو اللہ تم سے محبت نہیں کرے گا کیونکہ اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا ہے، اس کی محبت مومنوں کے لئے مخصوص ہے۔ خلاصہ یہ کہ پیغمبرؐ کی اطاعت سے روگردانی اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ایسے بندہ سے محبت نہیں کرتا (اور جب اللہ کی طرف سے جذب نہیں تو بندہ کی طرف سے بھی اللہ کی محبت نہیں ہوتی اور بندہ اللہ سے محبت نہیں کرتا تو اللہ کی وہ محبت جو بصورت مغفرت و رحمت ظاہر ہوتی ہے اس سے بھی بندہ محروم ہو جاتا ہے)۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی بلاشبہ اللہ نے چن لیا۔ اصطفی (ماضی) اصطفاء (مصدر) باب افتعال، صفوۃ سے ماخوذ ہے۔ صفوۃ کا معنی ہے خالص۔ یعنی اللہ نے اپنے لئے اپنی محبت کے لئے اور اپنی رسالت کے لئے چن لیا۔

اٰدَمَ آدم کو جو سب انسانوں کے باپ تھے یہاں تک کہ ملائکہ سے ان کو سجدہ کرایا جنت میں ان کا مسکن بنایا انہی کی نسل سے تمام انبیاء کو پیدا کیا، آپ اول ترین نبی تھے۔

وَ نُوْحًا اور نوح کو، پہلے سب لوگ شریعت الٰہی اور دین آدمؑ پر تھے پھر ان میں پھوٹ پڑ گئی اور کافر ہو گئے تو اللہ نے سب لوگوں میں سے حضرت نوحؑ کو نبوت کے لئے چن لیا آپ ﷺ کی بددعا سے تمام کافروں کو ہلاک کر دیا اور صرف آپؑ کی نسل کو باقی رکھا۔

وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ اور ابراہیمؑ و عمرانؑ کی اولاد کو بعض علماء نے کہا ہے کہ دونوں جگہ آل کا لفظ زائد ہے، ابراہیم و عمران مراد ہیں جیسے آیت بقیة من ماترک ال موسی و ال هارون میں لفظ آل زائد ہے اور موسیٰ و ہارون مراد ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ آل ابراہیمؑ سے مراد ہیں اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، اسباط اور تمام اسرائیلی پیغمبرؑ اور محمد ﷺ اور عمرانؑ سے بقول مقاتل مراد ہیں عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوبؑ، یہی عمران حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے والد تھے۔ بعض نے کہا کہ عمران بن ماثان مراد ہیں۔ ماثان حضرت سلیمانؑ کی اولاد میں سے تھے اور یہ عمران حضرت مریمؑ کے والد تھے۔

marfat.com

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور وہب کا قول ہے کہ آیت میں عمران سے عمران بن ماثان ہی مراد ہیں لیکن یہ حضرت مریمؑ کے باپ نہیں تھے بلکہ مریمؑ کے والد عمران بن اشہم بن امون تھے جو حضرت سلیمانؑ کی اولاد میں سے تھے، عمران بن ماثان اور عمران بن اشہم کے درمیان ایک ہزار اسی یا ایک ہزار آٹھ سو سال کا فصل تھا۔ ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ عمران سے مراد وہی شخص ہے جو حضرت مریم کا باپ تھا کیونکہ جس انتخاب کا یہاں ذکر کیا ہے اسی کی وضاحت آئندہ آیت و اذقالت امراۃ عمران میں کی ہے۔ یہ قرینہ بتارہا ہے کہ عمران سے مراد حضرت مریم کے باپ ہی ہیں۔

مذکورۂ بالا چاروں افراد کا ذکر اس لئے کیا کہ سب کے سب یا بیشتر انبیاء اور پیغمبر انہی کی نسل سے ہوئے۔

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ العالمین سے مراد یا تو سارا جہان ہے یہاں تک کہ ملائکہ بھی اس میں داخل ہیں۔ یہ مراد اس وقت ہوگی جب آل ابراہیمؑ کا لفظ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی طرح حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمد ﷺ کو بھی حاوی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بزرگ ملائکہ اور تمام انسانوں سے افضل تھے۔ اس صورت میں اس آیت سے خاص فرشتوں پر خاص انسانوں کی فضیلت ثابت ہوجائے گی۔ یا صرف مذکورہ بالا اشخاص کے اہل زمانہ مراد ہیں۔ یعنی ان بزرگوں کو ہم نے ان کے زمانہ والوں پر بزرگی عطا کی اور چن لیا۔

بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا تھا کہ ہم ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ کی اولاد ہیں اور ہم ہی ان کے دین پر ہیں۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی یعنی اللہ نے ان حضرات کو اسلام کے لئے چنا تھا اور تم دین اسلام پر نہیں ہو (پھر ان کے دین پر کیسے ہوسکتے ہو)۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ آیت بالا میں اللہ نے جب انبیاء کی اطاعت واجب قرار دی اور ظاہر کردیا کہ انبیاء کی اطاعت ہی محبت خدا کے حصول کا سبب ہے تو اس کے بعد انبیاء کی فضیلت بیان کی تاکہ لوگوں کو اطاعت انبیاء کی ترغیب ہو۔

بعض علماء نے بیان کیا کہ اول رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا حکم دیا آپ ﷺ کی اطاعت کو محبت خدا کے حصول کا ذریعہ اور عدم اتباع کو اللہ کی ناراضگی کا سبب اور محبت خدا سے محرومی کا باعث قرار دیا تو پھر حسب دستور قرآنی حکم بالا کو مؤکد کرنے کے لئے انبیاء کی برتری اور دشمنوں پر کامیابی اور ان کے مقابل دشمنوں کی ذلت اور بربادی کا ذکر کیا تاکہ اتباع رسول سے سرکشی کرنے والوں کو تنبیہ ہو۔ اول حضرت آدم کے انتخاب اور فضیلت کا ذکر کیا کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ نے مسجود ملائکہ بنایا اور آپ کے دشمن ابلیس پر لعنت کی۔ پھر حضرت نوحؑ کا ذکر کیا اللہ نے آپ کے تمام کافر دشمنوں کو تباہ کیا اور سب کو طوفان سے غرق کردیا اور صرف آپ کی نسل کو باقی رکھا پھر سب لوگوں پر حضرت ابراہیمؑ کی برگزیدگی ظاہر کی۔ آپ کے زمانہ میں سارا جہان انسانی کافر تھا۔ لیکن سب کے مقابلہ میں آپ کو انتخاب کرلیا اور آپ کے ہی دین کو پھیلایا اور تمام مخالفوں کو ذلیل کیا۔ پھر حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کا انتخاب کیا جادوگروں پر فتح عنایت کی وہ بے اختیار سجدہ میں گر پڑے، فرعون اور اس کی فوج کو غرق کیا، باوجود کثرت تعداد کے کوئی بھی نہیں بچا۔

میں کہتا ہوں کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھالیا تو آپ کے بعد آپ کے پیرو انتہائی مغلوبیت کی حالت میں تھے لیکن اللہ نے ان کو غالب بنایا اور کافروں پر ان کے قیامت تک غالب رہنے کی صراحت فرمادی ارشاد فرمایا۔ وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ۔ یہی وجہ ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ اور آل ابراہیمؑ و آل عمران کا تو ذکر کیا اور ابراہیمؑ کا ذکر نہیں کیا اور نہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا۔ ابراہیم کا ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پورے جہان پر آپ کو غلبہ نہیں عطا فرمایا تھا۔ یہ کلام اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ (حسب دستور انبیاء) رسول اللہ ﷺ بھی عنقریب کافروں پر غالب آئیں گے۔

ذُرِّيَّةً اس لفظ کا وزن فُعِّيْلَةٌ ہے یا فُعُّوْلَةٌ اول شق پر اس کا ذَرٌّ مادہ ہوگا ذَرٌّ چھوٹی چیونٹیاں، دوسری شق پر ذَرْءٌ مادہ ہوگا۔ ذرءٌ کا معنی پیدا کرنا۔ ذُرِّيَّت کا اطلاق اولاد پر بھی ہوتا ہے اور باپ دادا پر بھی اللہ نے فرمایا وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا

marfat.com

ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔ اولاد ذریت اس لئے ہوتی ہے کہ اللہ ان کو باپ سے پیدا کرتا ہے اور آباء کو ذریت اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اولاد کا مبداء تخلیق ہوتے ہیں۔ ذریت کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔

بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ یہ جملہ ذُرِّيَّةً کی صفت ہے یعنی اللہ نے نوحؑ اور آل ابراہیمؑ عمران کو پیدا کیا اور اتنی کثرت سے پیدا کیا کہ ان کی نسل چیونٹیوں کی طرح نکل پڑی ایک دوسرے کی نسل سے ہیں یا باہمی امداد اور دینی اتحاد کے لحاظ سے ایک دوسرے کے گروہ میں سے ہیں، اللہ نے فرمایا ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ یعنی نسلی یا دینی لحاظ سے ان کے گروہ میں سے ابراہیمؑ تھے۔

بعضها من بعض کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قوم کے اندر سے کسی ایک کو چن لینا اللہ کا دستور ہے لہٰذا قریش کو کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کا انتخاب اللہ نے قریش میں سے کر لیا۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ یعنی لوگ جو بعض لوگوں کے انتخاب پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں اللہ انکے اس قول کو خوب سنتا ہے اور عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ خوب جانتا ہے کہ منتخب کئے جانے کی صلاحیت کس میں ہے یا یہ مطلب ہے کہ عمران کی بیوی کے کلام کو اللہ خوب سنتا تھا اور ان کی نیت سے واقف تھا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ اذ کا تعلق عَلِيْمٌ سے ہے یا فعل محذوف سے یعنی یاد کرو جبکہ عمرانؑ کی بیوی نے کہا تھا۔

عمرانؑ کے باپ کا نام ماثان تھا یا اشہم۔ ماثان کی اولاد ہی بنی اسرائیل کی سردار تھی انہی میں سے علماء اور بادشاہ ہوتے تھے عمران کی بیوی کا نام حنہ بنت فاقودا تھا، حنہ بانجھ تھیں اور بوڑھی ہو گئی تھیں ایک روز کسی درخت کے نیچے سے انہوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچہ کو چونچ سے چوگا دے رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ان کے دل میں بچہ کے لئے ہوس اٹھی۔ تھیں اللہ کے مقبول گھرانے سے، فوراً اللہ سے بچہ کی دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور حاملہ ہو گئیں۔ ابن جریرؒ نے ابن اسحاقؒ کی روایت اسی طرح نقل کی ہے اور عکرمہؒ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا اے میرے رب میں تیرے لئے منت مانتی ہوں کہ میرے پیٹ کے اندر جو کچھ ہے میں اس کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے آزاد چھوڑ دوں گی۔ دنیا کے جھمیلوں میں نہیں ڈالوں گی۔ تاکہ وہ فراغ خاطر کے ساتھ تیری عبادت کر سکے۔ یہودیوں کے مذہب میں ایسی منت لڑکوں کے سلسلہ میں مانی مشروع تھی (لڑکیوں کو گرجا کی خدمت کے لئے وقف نہیں کیا جاتا تھا) کذا اخرجہ ابن جریر عن قتادہ والربیع۔

جب گرجا کی خدمت کے لئے کسی لڑکے کو وقف کیا جاتا تھا تو وہ جوان ہونے تک گرجا کی خدمت میں لگا رہتا تھا وہاں سے ہٹتا نہ تھا، جوان ہونے کے بعد اسکو اختیار ہوتا تھا کہ چاہے تو وہیں رہ کر گرجا کی خدمت کرتا رہے اور چاہے تو کہیں چلا جائے۔ کوئی پیغمبر اور مذہبی عالم ایسا نہیں ہوا کہ اس کی نسل کا کوئی فرد بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف نہ کیا گیا ہو مگر وقف کرنے کا دستور صرف لڑکوں کے لئے تھا لڑکیاں وقف نہیں کی جاتی تھیں۔ حنہ کا مذکورۂ دعائیہ جملہ یا تو صرف تمنائی تھا (کہ خدا کرے لڑکا پیدا ہو) یا صرف فرض پر مبنی تھا (کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو میں وقف کر دوں گی)۔

فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ پس تو میری نذر کو قبول فرما۔

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ بلا شبہ تو ہی میری بات کو سننے والا اور میری نیت کو جاننے والا ہے۔ عمران نے بیوی کی یہ دعا اور منت سن کر کہا ارے ارے تو نے یہ کیا کیا اگر لڑکی ہوئی تو کیا ہوگا اس خیال کے آتے ہی دونوں فکر میں پڑ گئے۔ مریمؑ کی پیدائش سے پہلے ہی عمران کا تو انتقال ہو گیا، حنہ بیوہ ہو گئیں۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ضمیر مونث حمل کی طرف راجع ہے کیونکہ واقع میں وہ لڑکی تھی یا نفس وغیرہ کی تاویل کے لحاظ سے مونث کی ضمیر راجع کر دی گئی (یعنی حمل بھی ایک نفس تھا اور عربی میں نفس مونث ہے) مطلب یہ کہ جب حنہ نے لڑکی جنی تو حسرت کے ساتھ کہا کہ اے میرے رب میں نے یہ لڑکی

marfat.com

جنی، یا اللہ کے سامنے معذرت پیش کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے کیونکہ لڑکی کو ہی بیت المقدس کی خدمت کے لئے حنہ نے وقف کیا (اور دستور کے خلاف کیا اس لئے اپنی مجبوری ظاہر کی)۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ یہ کلام بالکل ابتدائی ہے ماقبل سے اس کا تعلق نہیں۔ اس سے پیدا شدہ بچی کی عظمت اور لڑکی کی حالت سے حنہ کی ناواقفیت ظاہر کی گئی ہے۔ ابن عامرؒ، ابو بکرؒ اور یعقوب کی قرات وَضَعْتُ بصیغہ متکلم آیا ہے اس وقت یہ حنہ کے کلام کا جز ہوگا۔ حنہ نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کہا کہ جو لڑکی پیدا ہوئی ہے اس سے خدا کو بخوبی واقفیت ہے ممکن ہے اس کی اس میں کوئی مصلحت ہو اور یہ لڑکی لڑکے سے بہتر ہو۔

وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى یعقوب وغیرہ کی قرأت پر یہ جملہ بھی حنہ کے کلام کا جز ہوگا اور الذّکر نیز الانثیٰ میں الف لام جنسی ہوگا یعنی لڑکا چونکہ طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے گرجا کی خدمت کر سکتا ہے اور لڑکی کمزور ہوتی ہے پھر اس کو عوارض نسوانی بھی ہوتے ہیں اس لئے گرجا کی خدمت کی صلاحیت نہیں رکھتی اس لئے لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا (اور میں نے لڑکی جنی ہے وہ گرجا کی خدمت کس طرح کر سکے گی)۔

لیکن مشہور قرأت پر یہ جملہ معترضہ ہوگا اور اللہ کا مقولہ ہوگا اس وقت دونوں جگہ الف لام عہدی ہوگا یعنی وہ لڑکا جو حنہ نے مانگا تھا اس لڑکی کی طرح نہیں ہو سکتا جو اس کو دی گئی۔ بلکہ وہ لڑکی اس لڑکے سے افضل تھی (اللہ کو اس کے بطن سے ایک عظیم الشان پیغمبر کو پیدا کرنا اور عجیب طریقہ سے پیدا کرنا مقصود تھا) مؤخر الذکر تشریح اول مطلب سے بہتر ہے اول مطلب پر لیست الانثی کا لذکر کہنا چاہئے تھا (یعنی مشبہ یہ لڑکے کو اور مشبہ لڑکی کو قرار دے کر نفی تشبیہ کرنی چاہئے تھی)۔

وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ یہ بھی حنہ کے کلام کا جز ہے۔ مریم کا معنی ہے عابدہ۔ حنہ نے بیٹی کا نام عابدہ اس امید پر رکھا کہ اللہ اس کو عابدہ بنا دے۔ یعنی میں نے ہی اس کا نام مریمؑ رکھا ہے مراد یہ کہ یہ مہربانی کی مستحق ہے نام رکھنے والا اس کا باپ بھی نہیں ہے یہ یتیمہ ہے۔

وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ اور میں شیطان مردود سے بچانے کے لئے اس کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اصل لغت میں رجم کا معنی ہے پتھر مارنا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بچہ پیدا ہوتا ہے پیدائش کے وقت شیطان اس کو ضرور مس کرتا ہے جس کی وجہ سے بچہ چیختا ہے سوائے مریم اور اس کے بچہ کے (کہ شیطان نے پیدائش کے وقت ان کو مس نہیں کیا) (متفق علیہ) یعنی حنہ کی اس دعا کی برکت سے (مریمؑ اور ان کا بچہ شیطان کے مس سے محفوظ رہے) حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام اولاد آدم کے دونوں پہلوؤں میں شیطان انگلی سے (پیدائش کے وقت) ٹھونگ مارتا ہے سوائے عیسیٰ بن مریم کے شیطان ان کے ٹھونگ مارنے چلا تھا مگر پردہ پر ٹھونگ مار سکا۔

میں کہتا ہوں کہ صحیح روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کا نکاح جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کیا تو فرمایا الٰہی میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔ حضرت علیؓ سے بھی یہی فرمایا تھا۔ رواہ ابن حبان من حدیث انس رضی اللہ عنہ۔

ظاہر ہے کہ حنہ کی دعا سے رسول اللہ ﷺ کی دعا زیادہ قابل قبول ہے لہٰذا مجھے امید ہے کہ حضرت سیدہؓ اور آپ ﷺ کی اولاد (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کو اللہ تعالیٰ نے شیطان سے محفوظ رکھا ہوگا اور شیطان نے ان کو چھوا بھی نہ ہوگا۔ اس صورت میں حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے کے لئے شیطان کے عدم مس کی خصوصیت حقیقی نہیں ہوگی اضافی ہوگی یعنی ہر بچہ کو پیدائش کے وقت عام طور پر شیطان کچوکا مارتا ہے (کچھ خاص خاص افراد مستثنیٰ بھی ہیں جیسے) حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے (اور حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولادؓ) کو اللہ نے محفوظ رکھا۔

فَتَقَبَّلَهَا پس اللہ نے حنہ سے مریمؑ کو قبول کر لیا یا پیدائش ہوتے ہی لے لیا۔ مؤخر الذکر ترجمہ پر تَقَبَّلَ، اِسْتَقْبَلَ

marfat.com

کے معنی میں ہوگا جیسے تَعَجَّلَ اِسْتَعْجَلَ کے معنی میں آتا ہے۔
رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ قبول، وہ شئے جس کے ساتھ کسی چیز کو قبول کیا جائے (مثلاً کشادہ روئی، یاروگردانی، اظہار مسرت، ترش روئی وغیرہ) جیسے سَعُوْطٌ اور لدود (ناس جس سے چھینک لی جاتی ہے۔ جھگڑے کی چیز) یعنی اللہ نے اچھے طریقہ سے مریمؑ کو قبول کیا۔ قبول اس جگہ مصدر نہیں ہے ورنہ قبولا حسنا کہا جاتا اگر مصدری معنی لیا جائیگا تو (تاویل کرنی ہوگی)

تقدیر کلام اس طرح ہوگی فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِاَمْرٍ ذِيْ قَبُوْلٍ حَسَنٍ حضرت مریمؑ کو بغیر کسی سابق عمل اور کوشش کے اللہ نے اپنی مہربانی سے برگزیدہ بنایا، سارے جہان کی عورتوں پر فضیلت عطا کی، معاصی اور حیض سے پاک رکھا، اس لئے جس قبول حسن کے ساتھ اللہ نے ان کو لیا، اس سے مراد ہے ان لوگوں کا سا قبول جو درجہ مرادیت و محبوبیت پر فائز ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا سا قبول مراد نہیں جو اہل ارادت واجتہاد ہیں (کہ اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے اور ہر وقت مرضی الٰہی کے طلب گار رہتے ہیں آخر کار اللہ ان کے اعمال کو قبول فرمالیتا ہے) اور مصدری معنی کی صورت میں قبول سے مراد ہوگا اس امر کی وجہ سے قبول کرنا جس کو ہم اختصاص بھی کہہ سکتے ہیں، جس طرح تمام منتخب لوگوں کے تعین کا مبدء یہی اختصاص ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت مریمؑ کے تعین کا باعث بھی یہی اختصاص الٰہی تھا (یعنی اللہ نے اپنی طرف سے مریمؑ کے اندر ایک خصوصیت رکھی تھی جو مریم کے منتخب ہونے کا باعث ہوئی)۔

وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا اور اللہ نے مریمؑ کو اچھی بالیدگی کے ساتھ بڑھایا چنانچہ ایک دن میں آپ کا بڑھاؤ اتنا ہوتا تھا جتنا دوسرے بچوں کا سال بھر میں ہوتا ہے۔ ابن جریرؒ نے عکرمہؒ، قتادہؒ اور سدیؒ کے اقوال لکھے ہیں کہ جب مریمؑ پیدا ہوئیں تو حنہ نے ایک کپڑے میں لپیٹ کر ان کو مسجد میں لے جاکر مشائخ مسجد کے سامنے رکھ دیا، یہ مشائخ ہارون کی اولاد میں سے تھے اور بیت المقدس کے متولی تھے جیسے دربان کعبہ کے متولی ہوتے ہیں اور ان سے جاکر کہا لو یہ نذیرہ ہے (منت میں پیش کی ہوئی لڑکی) مریم علیہ السلام چونکہ ان کے امام اور متولی قربانی کی بیٹی تھیں اس لئے سب نے ان کو لے لینے کی بڑھ چڑھ کر خواہش کی۔ حضرت زکریاؑ نے فرمایا میں اس کا سب سے زیادہ مستحق ہوں کیونکہ اس کی خالہ میری بی بی ہے۔ آپ کی بیوی اشیاع بنت فاقود تھی جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی والدہ تھی۔ دوسرے مجاوروں نے بغیر قرعہ اندازی کے دینے سے انکار کیا، غرض سب مشائخ جن کی تعداد ستائیس تھی دریا پر گئے۔ سدیؒ نے اس دریا کا نام اردن بتایا ہے۔ سب نے اپنے قلم اس شرط پر پانی میں ڈالے کہ جس کا قلم پانی میں رک جائے گا اور سیدھا رہے گا وہی بچی کو لینے کا مستحق ہوگا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ لوگ توراۃ کی نقل کر رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں قلم تھے چنانچہ انہوں نے اپنے قلم پانی میں ڈال دیئے۔ زکریا علیہ السلام کا قلم ٹھہر گیا اور پانی کے اوپر اٹھ آیا باقی قلم پانی کے اندر چلے گئے، اور تہ نشین ہوگئے، یہ قول محمد بن اسحاق کا ہے۔ سدیؒ نے اور ایک جماعت نے لکھا ہے کہ زکریا کا قلم رک کر پانی کے اوپر کھڑا ہوگیا جیسے مٹی میں گڑ گیا ہو باقی لوگوں کے قلم بہہ گئے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ زکریاؑ کا قلم بھی بہا تھا مگر سیدھا ہو کر پانی کے اوپر چڑھتا ہوا، باقی قلم معمول کے موافق پانی کے ساتھ بہہ گئے۔ غرض زکریاؑ کے نام کا قرعہ نکل آیا، زکریا تمام مشائخ کے سردار اور نبی تھے۔

وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا اور اللہ نے زکریاؑ کو مریمؑ کا کفیل بنادیا کَفَّلَ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے کیونکہ تمام اذہان میں یہ بات راسخ ہے کہ یہ سب کام اللہ ہی کے حکم سے ہوئے (اس لئے مرجع کا پہلے ذکر ضروری نہیں) یا رَبُّهَا کی طرف ضمیر راجع ہے۔ بعض قراتوں میں كَفَلَهَا بغیر تشدید کے آیا ہے۔ جمہور کے نزدیک زکریا علیہ السلام فاعل ہے یعنی زکریاؑ، مریمؑ کے ذمہ دار بنے اور کوفیوں کے نزدیک زکریا علیہ السلام مفعول ہے یعنی اللہ نے قرعہ اندازی کے بعد زکریاؑ کو مریمؑ کا ذمہ دار بنادیا۔

زکریا بن اذن بن مسلم بن صدون حضرت سلیمانؑ کی نسل میں سے تھے۔ صدون حضرت سلیمانؑ کا بیٹا تھا۔ حضرت زکریاؑ نے مریمؑ کے لئے ایک حجرہ بنوادیا اور دودھ پلانے کے لئے ایک عورت مقرر کردی۔ محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے کہ

marfat.com

حضرت یحییٰ کی ماں یعنی مریمؑ کی خالہ کو مریمؑ کی نگہداشت اور پرورش پر مقرر کیا۔ جب مریمؑ جوان ہو گئیں تو ان کے لئے مسجد کے اندر ایک بالاخانہ بنوادیا جس کا دروازہ مسجد کے اندر تھا اور بغیر زینہ کے اس بالاخانہ پر چڑھنا ممکن نہ تھا جیسے آج کل کعبہ کا دروازہ ہے۔ حضرت زکریا کے علاوہ کوئی بالاخانہ پر مریم علیہ السلام کے پاس نہیں جاتا تھا آپ ہی کھانے پینے کی چیزیں اور مالش کے لئے تیل مریمؑ کو پہنچایا کرتے تھے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ چونکہ یہ جملہ گزشتہ جملہ کی یعنی فتقبلها ربها الخ کی تاکید ہے نیز کوئی وجہ جامع بھی نہیں ہے اس لئے حرف عطف نہیں لایا گیا اور کُلَّمَا ظرف زمان (مفعول فیہ) ہے اس میں شرط کا معنی ہے وَجَدَ جو آئندہ آرہا ہے اس میں عامل ہے مِحْرَاب سے مراد وہ بالاخانہ ہے جو حضرت زکریا نے مریمؑ کے لئے بنوادیا تھا۔ محراب (لغت میں) سب سے اونچی اور اعلیٰ نشست گاہ کو کہتے ہیں۔ مسجد کو بھی محراب کہا جاتا ہے کیونکہ مسجد شیطان سے جنگ کرنے کا مقام ہے۔ مبردؒ کا قول ہے کہ محراب کا اطلاق اسی کمرہ پر ہوتا ہے جس پر زینہ کے ذریعہ سے چڑھا جاتا ہو۔ ابن جریرؒ نے ربیع بن انسؒ رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ زکریا نے مریمؑ کو سات دروازوں کے اندر رکھا تھا یعنی جب بھی زکریا مریم کے پاس بالاخانہ پر جاتے تھے۔

وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ تو ان کے پاس غیر موسمی پھل رکھے ہوئے پاتے تھے گرمی کے پھل سردی میں اور سردی کے پھل گرمی میں۔

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ زکریا تعجب سے کہتے تھے مریمؑ یہ پھل تیرے پاس کہاں سے یا کس طرف سے آئے، مریمؑ جواب دیتی تھیں اللہ کے پاس سے آئے۔ ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مریمؑ کے پاس ان کا رزق جنت سے آتا تھا، حسن بصریؒ نے کہا کہ پیدا ہونے کے بعد مریمؑ نے دودھ پینے کے لئے کسی کا پستان منہ میں نہیں پکڑا بلکہ ان کا رزق جنت سے آتا تھا اور عیسیٰ کی طرح انہوں نے بھی بچپن میں ہی بات کی تھی۔

اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ اللہ بلاشبہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ یعنی اتنی روزی دیتا ہے کہ کثرت کی وجہ سے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا یا یہ مطلب ہے کہ اپنی مہربانی سے بغیر استحقاق کے عطا فرمایا ہے۔ یہ حنہ کا کلام بھی ہو سکتا ہے اور اللہ کا کلام بھی۔

اس قصہ سے اولیاء کی کرامت کا ثبوت ملتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو حضرت زکریا کا معجزہ قرار دیا ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ حضرت زکریا کو خود یقینی طور پر معلوم نہ تھا کہ رزق کہاں سے آتا ہے، اسی لئے تو انہوں نے مریمؑ سے پوچھا تھا۔ ابو یعلیٰ نے مسند میں حضرت جابرؓ کی روایت سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو خمیری روٹیاں اور ایک پارچہ گوشت بطور ہدیہ بھیجا، حضور والا وہ ہدیہ واپس لے کر خود ہی حضرت فاطمہؓ کے پاس پہنچ گئے اور فرمایا بیٹی یہ لے لے حضرت سیدہؓ نے طباق کھول کر دیکھا تو اس میں روٹیاں اور گوشت بھرا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا انی لک هذا تمہارے پاس یہ کہاں سے آیا۔ سیدہؓ نے کہا هومن عندالله ان الله یرزق من یشاء بغیر حساب۔ حضور ﷺ نے فرمایا ستائش ہے اس اللہ کے لئے جس نے تم کو زنان بنی اسرائیل کی سردار (مریمؑ) کی طرح کر دیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ اور حسنؓ و حسین اور سب گھر والوں کو جمع کر کے کھانے کا حکم دیا سب نے پیٹ بھر کر کھالیا اور کھانا پھر بھی بچ رہا تو حضرت سیدہؓ نے پڑوسیوں کو تقسیم کیا۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ جب حضرت زکریاؑ نے مریمؑ کی کرامت اور رحمت خدا کی وسعت دیکھی اور محسوس کیا کہ خاندان والے سب ختم ہو گئے اور میرا کوئی ایسا بچہ نہیں جو علم و نبوت کا وارث بنے اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ چچا کی اولاد میرے بعد دین کو کھو بیٹھے گی تو ایسے وقت میں یا اس جگہ دروازے بند کر کے اپنے مالک سے دعا کی اور

marfat.com

قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً عرض کیا پروردگار مجھے اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عطا فرما۔ چونکہ حضرت زکریاؑ کی بیوی بانجھ تھی اور آپ بہت بوڑھے ہوگئے تھے اس لئے عرض کیا کہ اپنی طرف سے یعنی معمول کے خلاف مجھے اولاد عطا فرما۔ جیسے دستور اسباب کے خلاف تو مریم کو رزق عطا فرماتا ہے۔ ذریۃ سے مراد ہے اولاد۔ اس کا اطلاق واحد، جمع اور مذکر، مونث سب پر ہوتا ہے۔ طیبہ سے مراد ہے نیک، گناہوں سے پاک معصوم۔

اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۳۸ بیشک تو دعا سننے والا یعنی قبول کرنے والا ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ پس ملائکہ نے زکریاؑ کو پکارا، پکارنے والے تنہا جبرئیلؑ تھے، یہ قول حضرت ابن مسعودؓ کا ہے، جس کو ابن جریر نے نقل کیا ہے۔ اس صورت میں ملائکہ کو بصیغہ جمع ذکر کرنے وجہ بر قول مفضل بن مسلمہ یہ ہے کہ جب کسی قول کا فاعل جماعت کا سردار ہوتا ہے تو جماعت کی طرف اس قول کی نسبت صحیح ہوتی ہے کیونکہ سب اپنے سردار کے قول پر متفق ہوتے ہیں۔ جبرئیل بھی سید الملائکہ تھے عموماً ان کے ساتھ فرشتوں کی جماعت رہتی تھی۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا کہ الملائکہ سے جنس مراد ہے یعنی فرشتوں کی جنس میں سے کسی نے پکارا جیسے کہا جاتا ہے زید یرکب الخیل زید گھوڑوں پر یعنی کسی نہ کسی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔

وَهُوَ قَاۗىِٕمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اور زکریاؑ اس وقت مسجد کے اندر کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ زکریا (علیہ السلام) شیخ اعظم تھے۔ قربانی پیش کرنا اور قربان گاہ کا دروازہ کھولنا آپ ہی کے سپرد تھا۔ آپ کی اجازت کے بغیر کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا ایک روز قربان گاہ کے پاس مسجد کے اندر کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ اجازت داخلہ کے منتظر تھے کہ اچانک ایک نوجوان سفید کپڑے پہنے نمودار ہوا وہ جبرئیل تھے آپ ڈر گئے جبرئیلؑ نے ندا دی زکریا۔

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى کہ اللہ تم کو یحییٰ کے پیدا ہونے کی بشارت دے رہا ہے۔ یحییٰ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ماں کے بانجھ پن کو اللہ نے ان کی وجہ سے کھو دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی فرمایا۔ قتادہ نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی کہ اللہ نے ان کے دل کو ایمان واطاعت کی وجہ سے زندگی عطا فرمائی تھی، کبھی آپ نے گناہ نہیں کیا بلکہ نافرمانی کا ارادہ بھی نہیں کیا۔

مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ یحییٰ علیہ السلام اللہ کے کلمہ کی یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والے ہوں گے عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ کہنے کی یہ وجہ ہے کہ آپ بغیر باپ کے صرف لفظ کن سے پیدا ہوئے تھے۔ سبب پر مسبب کا اطلاق کر دیا گیا (لفظ کن حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا سبب تھا لہٰذا عیسیٰؑ کو ہی کلمہ کہہ دیا گیا) بعض نے یہ وجہ تسمیہ بیان کی کہ جس طرح اللہ کے کلام سے لوگوں کو ہدایت ملتی ہے اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی ذات سے لوگ ہدایت یاب ہوتے تھے (گویا ہدایت آفرینی میں آپ کی ذات ہی کلام اللہ تھی) صوفیہ نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کا مبدء تعین اللہ کی صفت کلامیہ تھی (اسی لئے شیر خوارگی کی حالت میں آپ نے کلام کیا تھا)۔

حضرت یحییٰ نے سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔ حضرت یحییٰ کی عمر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ زیادہ تھی۔ صحیحین میں حدیث معراج کے ذیل میں آیا ہے کہ یحییٰ اور عیسیٰ باہم خالہ زاد بھائی تھے لیکن ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ یحییٰ مریم کی خالہ کے بیٹے تھے (گویا حضرت یحییٰ آپ کے ماموں تھے) اگر روایت کی صحت ثابت ہو جائے تو دونوں میں مطابقت اس طرح ہو جائے گی کہ حدیث میں خالہ زاد بھائی قرار دینا بر سبیل مجاز ہوگا جیسے رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا تمہارے چچا کا بیٹا کہاں ہے۔ حالانکہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ کے والد کے چچا کے بیٹے تھے لیکن مجازاً حضرت فاطمہؓ کے چچا کا بیٹا حضرت علیؓ کو قرار دیدیا۔ حضرت یحییٰ کی شہادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھانے سے پہلے ہوئی تھی۔ ابو عبیدہؒ نے کہا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ کا معنی ہے بِكَلِمَةٍ مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَمِنْ اٰيٰتِ كَلَامِ اللّٰهِ۔

وَسَيِّدًا اور یحییٰ اپنی قوم کے سردار ہوں گے یعنی علم، عبادت، پرہیزگاری اور تمام خصائل خیر میں سب کے

marfat.com

سردار ہوں گے۔ مجاہد نے سَیِّدًا کا ترجمہ کیا ہے عند اللہ معزز بعض نے کہا ایسا حلیم جس کو کسی وجہ سے غصہ نہ آئے۔ سفیان نے کہا حسد نہ کرنے والا۔ بعض نے قانع اور بعض نے سخی بھی ترجمہ کیا ہے۔ جنیدؒ نے کہا سید وہ ہے جس نے دونوں جہان دے کر خالق جہاں کو لے لیا۔ ؎

وَّحَصُوْرًا یہ لفظ حصر سے مشتق ہے۔ حصر کے معنی ہیں بندش روک۔ حضرت یحییٰؑ عورتوں سے قربت صنفی نہیں کرتے تھے۔ اس کی علت بعض نے یہ بیان کی کہ آپ پیدائشی نامرد تھے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یحییٰ پیدائشی نامرد بھی ہوں تب بھی اس جگہ حَصُوْرًا سے یہ مفہوم مراد نہیں ہے، مقام مدح کا ہے اور عنین ہونا قابل مدح چیز نہیں۔ بلکہ حَصُوْرًا سے مراد ہے اپنے نفس کو خواہشات اور لہو ولعب سے روکنے والا۔

ابن جریر ابن المنذرؒ ابن ابی حاتمؒ اور ابن عساکر نے حضرت عمروؓ بن عاص کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں کہ اللہ کے سامنے بغیر گناہ کئے جائے، سوائے یحییٰ بن زکریا کے اللہ نے خود ان کے متعلق فرمادیا ہے۔ وَسَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ یحییٰؑ کی شرم گاہ کپڑے کی جھالر کی طرح تھی (یعنی مادر زاد عنین تھے) حضور ﷺ کا آخری فقرہ کہ یحییٰؑ کی شرم گاہ کپڑے کی جھالر کی طرح تھی۔ حصور ہونے کا بیان نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ کا بیان ہے۔ حقیقت میں حصور ہونے کا بیان وہ ہے جو اوپر گزر گیا کہ آپ معصوم تھے بلکہ ابن ابی شیبہؒ نے (مصنف میں) اور امام احمدؒ نے الزہد میں نیز ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول موقوفاً ہی نقل بھی کیا ہے جو سابق کی حدیث مرفوع سے اسناد کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔

ابن ابی حاتمؒ اور ابن عساکرؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام ابن آدم جب اللہ کے سامنے جائیں گے تو اس گناہ کے ساتھ جائیں گے جو ان سے سرزد ہوا ہوگا اگر اللہ چاہے گا تو معاف کردے گا اور چاہے گا تو عذاب دے گا، سوائے یحییٰ بن زکریا کے کہ وہ سید اور حصور تھے (انہوں نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں اس لئے اللہ کے سامنے جائیں گے تو بے گناہ کے جائیں گے) اور نبی تھے اور صالحین کی نسل میں سے تھے اس کے بعد حضور ﷺ نے دست مبارک جھکا کر زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور فرمایا ان کی شرم گاہ اس تنکے کی طرح تھی۔

عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں قتادہ کا قول موقوفاً اور ابن عساکرؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت معاذؓ بن جبل کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ حضرت یحییٰؑ بچپن میں کچھ بچوں کی طرف سے گزرے لڑکوں نے ان کو کھیلنے کے لئے بلایا آپ نے فرمایا ہم کھیلنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے ہیں۔

وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ اور نبی تھے اور نیکوں کی نسل سے تھے یعنی معصوم انبیاء کی نسل سے تھے۔ یا ان لوگوں میں سے تھے جو صغیرہ کبیرہ گناہ سے پاک تھے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ حضرت زکریاؑ نے جبرئیلؑ کی طرف توجہ دیئے بغیر مناجات میں کہا اے میرے رب میرا لڑکا کہاں ہو سکتا ہے۔ حضرت زکریاؑ سے اس قول کا صدور بلا اختیار بتقاضاء بشریت ہوا تھا۔ آپ کو عادت قدرت کی اس شکست پر تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی اور اس بات کو آپ نے بہت بڑا بھی سمجھا مگر یہ سب کچھ طبیعت بشری کے زیر اثر ہوا کبھی طبیعت بشری عقل اور علم پر غالب آجاتی ہے۔ علم اور عقل کا فیصلہ ہے کہ قدرت خدا سے نہ کوئی چیز بعید ہے نہ تعجب انگیز، مگر طبیعتِ بشری معمولِ قدرت کی شکست کو بعید بھی جانتی ہے اور عجیب بھی۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کر لینے کے بعد بھی (بتقاضائے بشریت) حضرت خضر پر اعتراض کیا تھا حالانکہ پہلے کہہ چکے تھے سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِىْ لَكَ اَمْرًا۔

؎ جزری نے نہایہ میں لکھا ہے کہ لفظ کا اطلاق رب، مالک، سردار، فاضل، کریم، حلیم، متحمل، زوج، رئیس، قوم اور پیشوا سب ہی پر ہوتا ہے یہ ساد یسود سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے اصل میں سیود تھا ساکن یاء کی وجہ سے واؤ کو یاء سے تبدیل کر کے ادغام کر دیا، مولف

marfat.com

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ یہ مذکورہ قصے غیب کی اطلاعیں ہیں۔

نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وحی کے ذریعہ سے ہم آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ قرعہ اندازی کے لئے اپنے قلم دریا میں ڈال رہے تھے۔ یہ وحی ہونے کی تاکید اور منکرین کے ساتھ استہزائیہ کلام ہے کیونکہ علم کے تین ہی ذرائع ہیں۔ عقل یا کسی خبر کا کان سے سننا یا مشاہدہ کرنا۔ گزشتہ قصوں کا اپنی عقل سے دریافت کر لینا بداہۃً ممکن نہیں اور نہ سننا بھی تسلیم شدہ چیز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ خود لکھنا پڑھنا جانتے نہ تھے کہ کتابوں میں پڑھ کر معلوم کر لیتے اور خبر دینے والا کوئی موجود نہ تھا۔ رہ گیا مشاہدہ تو کوئی دانشمند اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا (کہاں حضور ﷺ کا زمانہ اور کہاں پانسو برس پہلے مریمؑ اور حنہؑ کا زمانہ) لامحالہ ایسی صحیح خبریں حضور ﷺ نے وحی سے حاصل کر کے معجزہ کے طور پر بتائیں اس سے آپ ﷺ کا یقینی طور پر نبی ہونا اور اس بیان کا وحی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وہ کہہ رہے تھے کہ مریمؑ کی ذمہ داری اپنے اوپر کون لے یا یہ مطلب ہے کہ وہ قرعہ اندازی یہ معلوم کرنے کے لئے کر رہے تھے کہ کون مریمؑ کی کفالت کرے۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اور آپ ان کے پاس اس وقت بھی نہ تھے جب وہ مریمؑ کی کفالت کیلئے باہم جھگڑا کر رہے تھے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یہ سابق اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ سے بدل ہے، درمیان میں کلام بطور معترضہ کے تھا۔ اس قصہ کو ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے رسول اللہ ﷺ کو وحی کا ممنون کرنا اور کافروں کو ان کی جہالت وعناد پر تنبیہ کرنا۔

يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ یاد کرو کہ جب جبرئیلؑ نے مریمؑ سے کہا مریمؑ تجھے اللہ ایسے کلمہ کی بشارت دے رہا ہے جس کا نام مسیح ہوگا۔ اسمہ کی ضمیر کلمہ کی طرف راجع ہے کلمہ سے مراد ہیں حضرت عیسیٰ، اس لئے ضمیر مذکر کی ذکر کی۔ مسیح کو مسیح برکت کی وجہ سے کہا گیا جیسے دجال کو دجال نحوست کی وجہ سے۔

مسیح عبرانی زبان میں مشیحا تھا جس کا معنی ہے مبارک۔ بعض نے عیسیٰ کو مسیح کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپ کی ذات سے تمام گندگیاں صاف کر دی گئیں اور آپ کو گناہوں سے پاک رکھا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے مسیح کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ آپ جس دکھی بیمار کو ہاتھ لگاتے تھے وہ تندرست ہو جاتا تھا (مذکورہ بالا دونوں قولوں پر مسیح کا مادہ مسح ہوگا اور مسح کا معنی پونچھنا، صاف کرنا۔ بر شق اول اور چھونا ہاتھ لگانا۔ بر شق دویم ہے) بعض نے کہا آپ ہمیشہ سیاحت کرتے رہتے تھے کہیں مقیم نہیں ہوتے تھے اس لئے مسیح کہا گیا (اس صورت میں مسیح کا مادہ سیح ہوگا) قاموس میں مسیح کا ترجمہ کثیر السیاحۃ لکھا ہے (گویا سیاحت سے مسیح مبالغہ کا صیغہ ہے) ابراہیم نخعی نے فرمایا مسیح صدیق حضرت عیسیٰ تھے اور مسیح کذاب دجال تھا۔ اس وقت یہ لفظ اضداد میں سے ہوگا۔ (کذا فی القاموس) صحاح میں جوہری نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا قول ہے کہ مسیح وہ شخص ہوتا ہے جس کی ایک آنکھ مٹادی گئی ہو اور روایت میں آیا ہے کہ دجال کی سیدھی آنکھ مٹی ہوئی ہوگی اور عیسیٰؑ کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی بائیں آنکھ مٹی ہوئی تھی ان دونوں قولوں کا مطلب یہ ہے کہ دجال کے اندر سے خصائل حمیدہ کا ازالہ کر دیا گیا تھا۔ ایمان، علم، عقل، حلم اور دوسرے محاسن سے وہ محروم تھا اور حضرت عیسیٰؑ کے اندر سے بری خصلتیں بالکل نکال دی گئی تھیں۔ جہالت، حرص، حب مال، کنجوسی وغیرہ، ہر بری بات سے آپ پاک تھے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ لفظ مسیح کے اشتقاق کے متعلق میں نے اپنی کتاب شرح مشارق الانوار وغیرہ میں پچاس قول لکھے ہیں۔

عِيْسَى یہ لفظ معرب ہے بعض کا قول ہے کہ عبرانی زبان میں اصل لفظ یشوع ہے جس کا معنی ہے سردار، عیسیٰ آپ کا نام اور مسیح لقب اور ابن مریم کنیت تھی۔ نام لقب اور کنیت سے زیادہ عام ہوتا ہے اس سے مسمی کا کامل امتیاز ہو جاتا ہے۔

ابْنُ مَرْيَمَ ابن مریم، ایک وصف ہے لیکن ایسی صفت ہے کہ اسماء کی طرح اپنے موصوف کو ممتاز کرتی ہے اس

marfat.com

لئے اسماء میں اس کا شمار کیا گیا۔ بجائے اسمہ کے اسماء ہ نہیں فرمایا باوجودیکہ اسماء تین ذکر کئے اس لئے کہ لفظ اسم، اسم جنس ہے جس کی اضافت استغراق کے لئے کی گئی ہے۔ استغراق اگرچہ افرادی ہے لیکن استغراق افرادی کے مجموعہ پر متعدد کو محمول کرنا درست ہے جیسے آیت مامن دابہ الا امم امثالکم میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابن مریم بجائے خود خبر ہو اور ہو ضمیر مبتدا محذوف ہو۔ ابن مریم عیسیٰؑ کی صفت نہیں ہے کیونکہ آپ کا نام صرف عیسیٰؑ تھا عیسیٰ ابن مریم نہیں تھا۔

باوجودیکہ خطاب مریم کو ہے پھر بھی (ابنک کہنے کی بجائے) ابن مریمؑ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا کہ عیسیٰ کا کوئی باپ نہیں ہوگا کیونکہ عام طور پر اولاد کی نسبت باپ کی طرف کی جاتی ہے ماں کی طرف صرف اسی صورت میں کی جاتی ہے کہ باپ موجود ہی نہ ہو۔

وَجِيهًا یعنی وہ باعزت، عالی مرتبہ اور باوجاہت ہوگا۔ یہ کلمہ کا حال ہے اور کلمہ نکرہ موصوفہ ہے اس لئے ذوالحال ہو سکتا ہے۔

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں نبی اور مقتداء خلق ہونے کی وجہ سے اور آخرت میں شفیع اقوام اور جنت میں عالی مرتبہ پر فائز ہونے کی وجہ سے۔

وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ اور اللہ کے مقربین میں سے ہوگا یعنی اس کو قرب ذاتی اور دوامی تجلیات ذاتیہ حاصل ہوں گی۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ اور پالنے میں لوگوں سے باتیں کرے گا یعنی شیر خوارگی کی حالت میں کلام کریگا۔

وَكَهْلًا اور درمیانی عمر کی حالت میں بھی لوگوں سے باتیں کرے گا۔ جیسے دوسرے انبیاء کرتے ہیں یعنی اس کے کلام کے لئے اول و آخر عمر کا کوئی فرق نہیں ہوگا۔ وہ متوسط عمر کی طرح شیر خوارگی میں بھی باتیں کرے گا۔ اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ سن کہولت کو پہنچنے سے پہلے اس کی وفات نہیں ہوگی۔ اور کہولت سے اس کی عمر آگے نہیں بڑھے گی۔ حسن بن فضل نے کہا یعنی آسمان سے اترنے کے بعد وہ کلام کرے گا کیونکہ آپ کو سن کہولت سے پہلے آسمان پر اٹھالیا گیا تھا (اس لئے آسمان پر اٹھانے سے پہلے بحالت کہولت کلام کرنے کا احتمال نہیں)۔

مجاہدؒ نے کہا کَهْلًا سے مراد ہے حلیم ہونا۔ عرب سن کہولت کی مدح کرتے ہیں اس عمر میں عقل میں پختگی، رائے میں جودت اور تجربہ ہو جاتا ہے۔ کہولت سے پہلے تجربہ ناقص ہوتا ہے اور عقل بھی درجہ کمال تک نہیں پہنچتی اور کہولت کے بعد عقل میں کمزوری آجاتی ہے۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ کا عطف وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ پر ہے حالت شیر خوارگی میں کلام کرنے کی صراحت میں مریمؑ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ بغیر شوہر کے بچہ ہونے پر جو لوگ ملامت کریں گے اس کا ازالہ یہ بچہ خود کردے گا تم کو اندیشہ نہ کرنا چاہئے۔

وَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝ اور وہ صالحین میں سے ہوگا اس کے دین میں کوئی نقص و بگاڑ نہیں ہوگا انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے گویا مِنَ الصَّالِحِينَ کے معنی ہیں مِنَ النَّبِيِّينَ۔

قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ مریمؑ نے کہا اے رب میرے بچہ کیسے ہوگا مجھے تو کسی مرد نے نہیں چھوا، مریمؑ نے یہ بات اظہار تعجب و حیرت کے طور پر کہی تھی یا یہ دریافت کرنا مقصود تھا کہ نکاح کے بعد بچہ پیدا ہوگا یا یونہی بغیر مرد کے۔

قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ اللہ نے جبرئیلؑ کی زبان سے فرمایا یونہی (بچہ ہوگا) اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا جب وہ کسی چیز کے ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ تو اس چیز کے ہونے کا حکم دے دیتا ہے بس فوراً وہ چیز ہو جاتی ہے یعنی جس طرح عادی اسباب اور مادہ کے ذریعہ ترتیب کے ساتھ اللہ چیزوں کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اسی طرح بغیر اسباب کے

marfat.com

یکدم بھی پیدا کر سکتا ہے۔
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ اس جملہ کا عطف یَخْلُقُ یا یُبَشِّرُکِ پر ہے۔ مریم کو جب معلوم ہوا کہ بچہ یونہی بغیر مرد کے پیدا ہوگا تو ان کو فکر ہوئی اور لوگوں کی لعنت ملامت کا اندیشہ پیدا ہوا، اس فکر کو دور کرنے اور ان کے دل کو تسکین دینے کے لئے فرمایا کہ اللہ اس کو لکھنا سکھائے گا، کتاب سے مراد ہے تحریر اور خط چنانچہ آپ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے خوش نویس تھے یا آسمانی کتابیں مراد ہیں یعنی اللہ ان کو آسمانی کتابوں کا علم عطا فرمائے گا من جملہ دیگر کتب کے تورات وانجیل کا خصوصی ذکر اس وجہ سے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ کے لئے یہ دونوں کتابیں زیادہ اہم تھیں فروع اعمال میں ان کی پابندی آپ کیلئے لازم تھی، اصول دین تو تمام آسمانی کتابوں کے ایک ہی ہیں۔
وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ اور سمجھ اور تورات وانجیل (یعنی سمجھ عطا فرمائے گا اور تورات وانجیل کے علوم خصوصیت کے ساتھ عنایت کرے گا)۔
وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ رسولاً میں تنوین اظہار عظمت کے لئے ہے اور فعل محذوف ہے یعنی ہم اس کو بنی اسرائیل کے پاس عظیم الشان پیغمبر بنا کر بھیجیں گے۔
اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ یہاں حرف جر محذوف ہے اور (رسولاً سے اس کا تعلق ہے یا احوال مذکورہ پر عطف ہے اور رسالت نطق کے معنی کو متضمن ہے۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ ہم اس کو بنی اسرائیل کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجیں گے، اور وہ ان سے کہے گا کہ میں تمہارے پاس معجزہ لے کر آیا ہوں جو میری رسالت کو ثابت کر رہا ہے، حضرت عیسیٰ کے معجزات اگرچہ متعدد تھے مگر آپ کی صداقت تمام معجزات سے ایک ہی طرح ثابت ہوتی تھی اس لئے بایات کی جگہ بِاٰيَةٍ فرمایا۔
مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ یہ اٰیۃ کی صفت ہے یعنی معجزہ ایسا ہوگا، جو اللہ کا دیا ہوا ہوگا، یا جِئْتُكُمْ سے اس کا تعلق ہے یعنی میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آیا ہوں۔
اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ کہ میں تمہارے سامنے مٹی کی ایک مورت بناؤں گا۔ خلق کا معنی ہے صورت بنانا اندازہ کرنا۔
كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ پرندہ کی شکل جیسی، ہیئت کا معنی ہے بنائی ہوئی صورت۔
فَاَنْفُخُ فِيْهِ یعنی اس مٹی میں پھونک ماروں گا یا فیہ کی ضمیر کاف کی طرف راجع ہے یعنی اس مورت میں پھونک ماروں گا جو پرندہ جیسی ہوگی۔
فَيَكُوْنُ طَيْرًا پس وہ پرندے یا پرندہ ہو جائے گی، بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے صرف چمگادڑ بنائی تھی چمگادڑ کی خصوصیت کی وجہ یہ تھی کہ تخلیق (اور ساخت) کے لحاظ سے چمگادڑ سب پرندوں سے زیادہ کامل ہے اس کے پستان بھی ہوتے ہیں اور دانت بھی اور اس کو حیض بھی آتا ہے (گویا چوپایہ سے زیادہ مشابہ ہے) وہب نے بیان کیا وہ پرندہ جب تک لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوتا تھا اڑتا رہتا تھا اور آنکھوں سے غائب ہوتے ہی گر کر مر جاتا تھا، ایسا صرف اس لئے ہوتا تھا کہ براہ راست خدائی تخلیق اور بندہ کی وساطت سے تخلیق میں فرق واضح ہو جائے۔
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ اللہ کی اجازت یعنی اللہ کے حکم سے، اس لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عطاء زندگی میری طرف سے نہیں ہوگی بلکہ اللہ کی طرف سے ہو۔
وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ اَکْمَہَ کا معنی ہے نابینا (حسن و سدی) یا وہ شخص جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی ہوں (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما) یا وہ شخص جس کی نظر کمزور ہو اور آنکھوں سے آنسو بہتے ہوں (عکرمہؒ) یا وہ شخص جس کو دن میں دکھتا ہو، رات کو نظر نہ آتا ہو (مجاہدؒ)۔
وَالْاَبْرَصَ اور میں تندرست کردوں گا اندھے کو اور سفید داغ والے کو، یہ دونوں بیماریاں لاعلاج ہیں۔

marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا زور تھا اس لئے آپ نے لوگوں کو طبی معجزہ دکھایا جیسے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جادو کا بہت شور تھا اس لئے آپ نے ہر ماہر جادوگر کو عاجز کر کے دکھادیا اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کلام کی بلاغت و فصاحت کا بڑا چرچا تھا اس لئے قرآن نے ان کو بلاغت میں زیر کر دیا اور حکم دیا فاتو بسورۃ من مثلہ۔

وہب بن منبہؒ نے بیان کیا کہ ایک ایک دن میں پچاس پچاس ہزار مریض حضرت کے پاس جمع ہو جاتے تھے جو خود آسکتا تھا آجاتا تھا جو نہیں آسکتا تھا آپ اس کے پاس چلے جاتے تھے اور بیماریوں، اپاہجوں اور اندھوں کیلئے ان الفاظ سے دعا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اِلٰهُ مَنْ فِي السَّمَاءِ وَاِلٰهُ مَنْ فِي الْاَرْضِ لَا اِلٰهَ فِيْهِمَا غَيْرُكَ وَاَنْتَ جَبَّارُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَجَبَّارُ مَنْ فِي الْاَرْضِ لَا جَبَّارَ فِيْهِمَا غَيْرُكَ وَاَنْتَ مَلِكُ مَنْ فِي السَّمَاءِ وَمَلِكُ مَنْ فِي الْاَرْضِ لَا مَلِكَ فِيْهِمَا غَيْرُكَ قُدْرَتُكَ فِي الْاَرْضِ كَقُدْرَتِكَ فِي السَّمَاءِ سُلْطَانُكَ فِي الْاَرْضِ كَسُلْطَانِكَ فِي السَّمَاءِ اَسْاَلُكَ بِاسْمِكَ الْكَرِيْمِ وَوَجْهِكَ الْمُنِيْرِ وَمُلْكِكَ الْقَدِيْمِ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ [1]

وہب نے لکھا یہ دعا خفقان اور جنون کے لئے ہے مجنون اور خفقانی پر یہ دعا پڑھ کر دم کی جائے اور لکھ کر پانی سے دھو کر پلائی جائے، انشاء اللہ صحت ہو جائے گی۔

وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ اور اللہ کے حکم سے میں مردوں کو زندہ کروں گا، مردوں کو زندہ کرنا بشری فعل کی جنس سے خارج ہے، تو تہم الوہیت کو دور کرنے کے لئے آپ نے مکرر باذن اللہ فرمایا، بغویؒ نے لکھا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار آدمیوں کو زندہ کیا، عاذر، ایک بوڑھیا کا بیٹا، عاشر کی بیٹی، سام بن نوح۔ عاذر آپ کا دوست تھا مرنے لگا تو اس کی بہن نے حضرت کے پاس پیام بھیجا کہ آپ کا دوست مر رہا ہے، درمیانی مسافت تین روز کا سفر چاہتی تھی آپ اپنے ساتھیوں سمیت پہنچے تو عاذر کو مرے تین دن ہو گئے تھے حضرت نے اس کی بہن سے فرمایا مجھے اس کی قبر پر لے چل عاذر کی بہن قبر پر لے گئی آپ نے اللہ سے دعا کی عاذر اٹھ کھڑا ہوا اس کے بدن سے روغن ٹپک رہا تھا پھر قبر سے نکل آیا اور مدت تک زندہ رہا اس کے اولاد بھی ہوئی۔

ایک بڑھیا کے بیٹے کا جنازہ چارپائی پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے گزرا، آپ نے دعاء کی وہ فوراً چارپائی پر اٹھ بیٹھا لوگوں کے کندھوں سے نیچے اتر آیا اور کپڑے پہن کر چارپائی اپنی گردن پر اٹھا کر لوٹ کر گھر پہنچ گیا وہ بھی بعد کو زندہ رہا اور اس کے بھی بچے ہوئے، ایک شخص عاشر یعنی محصل ٹیکس تھا۔ اس کی بیٹی ایک روز پہلے مر گئی حضرت نے دوسرے روز اللہ سے دعا کی اللہ نے اس کو زندہ کر دیا وہ بھی بعد کو زندہ ہی رہی اور اس کے بھی بچے پیدا ہوئے، سام بن نوح کی قبر پر آپ خود گئے اور اللہ کا اسم اعظم لے کر صاحب قبر کو پکارا سام قبر سے نکل آیا قیامت برپا ہونے کے اندیشہ سے اس کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا اس زمانہ میں لوگوں کے بال سفید نہیں ہوتے تھے، سام نے کہا کیا قیامت برپا ہو گئی، حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا نہیں، میں نے تم کو اللہ کا اسم اعظم لے کر پکارا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا اب مر جاؤ، سام نے کہا اس شرط پر (مرنے کو تیار ہوں) کہ اللہ موت کی تلخی سے محفوظ رکھے آپ نے اللہ سے دعا کی اور دعا قبول ہوئی۔

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۚ اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ گھروں میں اندوختہ رکھتے ہو میں تم کو بتادوں گا، چنانچہ آپ رات کی کھائی چیز اور دن میں جو کچھ کھایا جاتا تھا اور شام کے لئے جو کچھ بچا کر رکھا جاتا تھا سب کی تفصیل بتادیتے تھے۔

سدی نے بیان کیا کہ حضرت عیسیٰؑ مکتب میں جا کر بچوں کو بتادیتے کہ تمہارے باپوں نے یہ یہ بنایا ہے کہ کسی بچہ سے

[1] حضرت عیسیٰؑ کی زبان عبرانی یا سریانی تھی عربی نہ تھی اور یہ دعا عربی ہے اس لئے شاید وہب کی مراد یہ ہے کہ ان عربی الفاظ کے ہم معنی الفاظ میں حضرت عیسیٰؑ دعا کرتے تھے، واللہ اعلم۔

marfat.com

فرماتے جا تیرے گھر والوں نے فلاں فلاں چیز کھالی اور فلاں فلاں چیز اٹھا کر رکھ دی ہے بچہ گھر جا کر روتا آخر گھر والے وہ چیز اس کو دے دیتے اور پوچھتے تجھے کس نے بتادیا، بچہ کہتا عیسیٰؑ نے۔ غرض گھر والوں نے اپنے بچوں کو عیسیٰؑ سے ملنے کی ممانعت کردی اور کہہ دیا کہ اس جادوگر سے ہرگز نہ ملنا۔

ایک بار سب بچوں کو ایک گھر میں جمع کرلیا، حضرت ڈھونڈھتے ہوئے تشریف لائے اور بچوں کو دریافت فرمایا لوگوں نے کہا بچے یہاں نہیں ہیں، فرمایا اس گھر میں کیا ہے لوگوں نے کہا سور ہیں فرمایا ایسے ہی ہوجائیں گے لوگوں نے گھر کھولا تو سب سور برآمد ہوئے، یہ خبر بنی اسرائیل میں پھیل گئی اور انہوں نے آپ کو قتل کردینے کا ارادہ کرلیا، آپ کی والدہ کو جب آپ کے قتل ہوجانے کا اندیشہ ہوگیا تو اپنے گدھوں پر سوار کرکے مصر کو لے کر بھاگ گئیں۔

قتادہ نے کہا یہ واقعہ مائدہ کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ بنی اسرائیل جہاں بھی ہوتے من وسلویٰ کی طرح خوان نازل ہوتا لیکن حکم یہ تھا کہ خیانت نہ کریں اور چھپا کر نہ رکھیں، مگر بنی اسرائیل نے چرا چھپا کر رکھا، آپ ان کو بتادیتے کہ تم نے کتنا کھایا اور کتنا بچا کر رکھا آخر اللہ نے ان کی صورتیں بگاڑ کر سوروں جیسی کردیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۴۹﴾ مذکورہ معجزات میں عیسیٰؑ کے دعوئے نبوت کی سچائی کی تمہاری ہدایت یابی کے لئے بڑی دلیل ہے اگر تم کو ایمان کی توفیق ہے تو ایمان لاؤ۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ اس کا عطف رسولاً پر ہے یا فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے یعنی میں تمہارے پاس ایسی حالت میں آیا ہوں کہ اپنے سے پہلی تورات کی تصدیق کرتا ہوں۔ انبیاء کی شان یہی ہوتی ہے کہ ہر پیغمبر دوسرے پیغمبر کی اور تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ اور میں اس لئے آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تمہارے لئے حرام کردی گئی تھیں حلال کردوں یعنی بعض چربیاں اور گوشت جو تمہارے لئے تورات نے حرام کردی تھیں ان کی حرمت کو منسوخ کردوں، بعض احکام کا نسخ تصدیق کے منافی نہیں جیسے قرآن کے بعض احکام بعض کے ناسخ ہیں (باوجود یہ کہ احکام ناسخ احکام منسوخ کے مُنَزَّل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں کیونکہ نسخ کا معنی ہی یہ ہے کہ پچھلا حکم اگرچہ صحیح تھا لیکن وقتی اور ایک مدت خاص کے لئے تھا اب وہ وقت نہیں رہا لہٰذا وہ حکم بھی نہیں رہا)۔

وَجِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اور میں تمہارے پاس ایک بڑی نشانی لے کر آیا ہوں، یہ آیت پہلے بھی گزر چکی ہے لیکن وہاں آیت سے مراد تھے معجزات اور یہاں آیت سے مراد ہے انجیل کی آیات، لہٰذا تکرار نہیں ہوئی، یہ بھی جائز ہے کہ تاکید کے لئے تکرار ہی قرار دی جائے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ پس اللہ کے عذاب سے ڈرو، جو میری مخالفت اور تکذیب کی وجہ سے آجائے گا۔

وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اور اللہ کی توحید و اطاعت کا جو حکم میں تم کو دے رہا ہوں اس میں میری اطاعت کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ میں جو مضمون مجمل تھا، یہ اس کی تفصیل ہے اور اس میں قوت نظریہ اور قوت عملیہ دونوں کے استکمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صحیح اعتقاد جس کا بنیادی پتھر توحید ہے قوت نظریہ کا استکمال کرتا ہے۔ اس کا بیان اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ سے کردیا اور مامورات و منہیات کی پابندی سے قوت عملیہ کامل ہوتی ہے، اس کا اظہار فَاعْبُدُوْهُ سے فرمادیا۔ پھر پہلے اللہ کو اپنا رب قرار دیا اور اپنی عبدیت کا اقرار کیا تاکہ آئندہ ہونے والے فتنہ کا دروازہ بند ہوجائے کہیں لوگ آپ کو اللہ کا بیٹا یا تین میں کا تیسرا الٰہ نہ کہنے لگیں۔ آخر میں دونوں جملوں کے مضمون کو پختہ کرنے کے لئے فرمایا۔

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾ یہی سیدھا راستہ ہے یعنی اقرار توحید اور عبادت (تعمیل اوامر و نواہی) دونوں کو جمع رکھنا ہی ایسا راستہ ہے جس کا صحیح ہونا ثابت ہے، یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا قل اٰمنت باللہ ثم

marfat.com

استقم۔ ایک شخص نے عرض کیا تھا کہ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ نہ پوچھنا پڑے اس کے جواب میں حضور ﷺ نے مذکورہ بالا جملہ فرمایا تھا۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ لَمَّا ظرف زمان ہے مگر اس میں شرط کا معنی ہے اور جزا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ہے۔ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی طرف سے اپنی تکذیب اور کفریہ کلمات سنے جیسے عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دینا اور ایسی حرکتیں دیکھیں جن سے کفر مترشح ہو رہا تھا، اس جملہ میں کچھ الفاظ محذوف ہیں، اختصار کلام کے پیش نظر ان کو حذف کر دیا گیا ہے۔ پورا کلام اس طرح تھا کہ مریم سے عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور اپنی قوم سے شیر خوارگی کے زمانہ میں کلام کیا اور حد کمال کو پہنچ گئے، یہاں تک کہ آسمانی کتابوں کے عالم اور نبی ہو گئے اور لوگوں کو ہدایت کی طرف بلایا اور معجزات مذکورہ پیش کئے اور بنی اسرائیل نے آپ کا انکار کیا اور تکذیب کی اور کفریہ حرکات کا ان سے ظہور ہوا۔ پس جب عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی طرف سے ایسی باتیں سنیں اور ایسی حرکات دیکھیں اور کفریہ حالات محسوس کئے تو کہا۔

قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِلَى اللّٰهِ میں الٰی یا مَعَ کے معنی میں ہے یعنی اللہ کے ساتھ مل کر میری مدد کرنے والے کون کون ہیں، جیسے دوسری آیت میں آیا ہے لا تاکلوا اموالہم الی اموالکم، ان کا مال اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، یا الٰی بمعنی فِیْ ہے یعنی اللہ کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں یا بمعنی لام ہے یعنی اللہ کے واسطے میری مدد کرنے والے کون ہیں، یا الٰی کا استعمال اپنے اصلی معنی میں ہے یعنی نسبت و اضافت، نصرت میں اضافت کا مفہوم ہوتا ہے اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ میری امداد میں اللہ کے ساتھ اپنے نفسوں کو ملا دینے والے کون لوگ ہیں، ان تمام صورتوں میں الٰی کا تعلق اَنْصَارِیْٓ سے ہوگا۔ لیکن اگر کسی محذوف فعل سے تعلق قرار دیا جائے تب بھی جائز ہے اور مطلب اس طرح ہوگا کہ اللہ کی جانب جاتے ہوئے اس کے گروہ میں شامل ہوتے ہوئے اس کی پناہ لینے کے لئے کون میرا مددگار ہے۔

قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ حواری کہنے لگے، حواری خالص دوست۔ یہ لفظ حور سے بنا ہے، حور کا معنی ہے خالص سفیدی، رسول اللہ ﷺ نے جب غزوۂ خندق کے دن تین بار لوگوں کو پکارا اور ہر بار حضرت زبیر بن عوام نے ہی جواب دیا تو حضور ﷺ نے فرمایا ہر نبی کا کوئی حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیرؓ ہے، متفق علیہ۔

قاموس میں ہے، حواری مددگار یا پیغمبروں کا مددگار اور دھوبی اور گہرا دوست۔ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو حواری کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نیتیں دینی امور میں خالص تھیں یا اس وجہ سے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے مددگار تھے۔ حسن اور سفیان کا یہی قول ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہودیوں میں سے چند شاہزادے تھے جن سے حضرت عیسیٰؑ مدد کے خواستگار ہوئے تھے، چونکہ وہ سفید لباس پہنتے تھے اس لئے ان کو حواری کہا گیا۔ ابن جریر نے ابو رطاۃ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ دھوبی تھے لوگوں کے کپڑے دھو کر سفید کرتے تھے، ضحاک نے کہا ان کے دل صاف یعنی گناہوں سے پاک تھے اس لئے ان کو حواری کہا گیا ابن مبارک نے کہا ان کے چہروں پر عبادت کا اثر اور نور نمایاں تھا اس لئے حواری کہا گیا۔ حور کا اصل معنی ہے خوب سفیدی۔ کلبی اور عکرمہ نے کہا حواری کچھ برگزیدہ اشخاص تھے جن کی تعداد بارہ تھی۔ روح بن قاسم کا بیان ہے کہ میں نے قتادہ سے حواریوں کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا حواری وہ لوگ تھے جو خلافت (انبیاء) کے اہل تھے۔ دوسرے قول میں قتادہ نے حواریوں کی تعبیر وزراء سے کی ہے۔ مجاہد اور سدی نے کہا وہ ماہی گیر تھے کسی نے ملاح بھی کہا ہے۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ یعنی ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور اے عیسیٰ جس روز انبیاء اپنی امتوں کی موافقت یا مخالفت کی شہادت دیں گے آپ ہمارے فرماں بردار ہونے کی گواہی دیں، یہ آیت بتا رہی ہے کہ ایمان اور اسلام ایک ہی چیز ہے (کیونکہ پہلے حواریوں نے ایمان کا اظہار کیا اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اپنے اسلام کی شہادت کے خواستگار ہوئے معلوم ہوا ہے کہ ایمان و اسلام سے ان کی مراد ایک ہی تھی)۔

marfat.com

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ اے ہمارے رب تو نے جو کتابیں نازل کیں انجیل، تورات وغیرہ ہم اس پر ایمان لائے۔

وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ اور جو کچھ تیرے پیغمبر یعنی عیسیٰؑ نے ہم کو حکم دیا ہم اس پر چلے۔

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۳﴾ پس تو ہم کو ان لوگوں کی فہرست میں لکھ دینا جنہوں نے تیری وحدانیت اور تیرے انبیاء کی صداقت کی شہادت دی ہے، عطاء کے نزدیک اَلشَّاهِدِیْنَ سے مراد ہیں انبیاء کیونکہ ہر نبی اپنی امت کا شاہد ہوگا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اَلشَّاهِدِیْنَ یعنی محمد ﷺ اور آپ کی امت کیونکہ امت محمد ﷺ یہ (قیامت کے دن) انبیاء کی رسالت و تبلیغ کی شہادت دے گی۔

وَمَكَرُوْا اور جن لوگوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ نے کفر کا احساس کیا تھا، انہوں نے فریب کیا کہ حضرت کو (خفیہ) قتل کردینے کا ارادہ کیا، کلبی نے بوساطت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت حضرت عیسیٰؑ کے سامنے آئی آپ کو دیکھ کر کہنے لگے جادوگر جادوگرنی کا بیٹا آگیا۔ آپ پر بھی تہمت لگائی اور آپ کی والدہ پر بھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان پر لعنت کی اور ان کو بددعا دی۔ فوراً اللہ نے ان کو سور بنادیا، یہودیوں کا سردار یہودا تھا اس نے جو یہ بات دیکھی تو گھبرا گیا اور آپ کی بددعا سے ڈر گیا آخر تمام یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مار ڈالنے پر متفق الرائے ہوگئے اور قتل کرنے کے ارادہ سے حضرت کی طرف بڑھے لیکن اللہ نے جبرئیل کو بھیج دیا جبرئیل نے آپ کو چھت کے روزن میں داخل کردیا پھر وہاں سے اللہ نے آپ کو آسمان پر اٹھالیا۔ سردار یہود یعنی یہودا نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو جس کا نام طیطیانوس تھا کھڑکی کے اندر بھیجا تاکہ اندر جاکر حضرت کو قتل کردے، اللہ نے اس کی شکل حضرت عیسیٰؑ جیسی بنادی لوگوں نے اسی کو عیسیٰ (علیہ السلام) سمجھ کر قتل کردیا، آیت۔

وَمَكَرَ اللّٰهُ کا یہی معنی ہے (یعنی اللہ نے عیسیٰؑ کو بچانے اور قتل کے ارادہ سے آنے والے کو قتل کرانے کی خفیہ تدبیر کی) مکر اصل میں کسی کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کو کہتے ہیں (ظاہر ہے کہ اللہ کی طرف اس کی نسبت حقیقۃً نہیں کی جاسکتی بلکہ) بر سبیل تقابل اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے (جیسے اس جگہ مکروا کے مقابل مکر و اللہ آیا ہے)۔

زجاج نے کہا مکرِ خدا کا معنی ہے کافروں کے مکر کی سزا دینا جزاء کو مکر مقابلہ کی وجہ سے فرمایا۔

وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۵۴﴾ یعنی اللہ ایسے راستوں سے ضرر پہنچانے پر سب سے زیادہ قدرت اور قابو رکھتا ہے جو گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ النصف ۵ ع ۱۴

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یہ مکر اللہ سے متعلق ہے یا فعل محذوف سے۔ یعنی یہ اس وقت واقع ہوا جب اللہ نے فرمایا۔

یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ الیّ کا معنی یہ ہے کہ میں اپنے مقام عزت اور قرار گاہ ملائکہ کی طرف تجھے اٹھا کر لے جاؤں گا، حسن کلبی اور ابن جریج نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں تجھے پکڑ لوں گا اور بغیر موت کے دنیا سے اٹھا کر اپنے پاس لے جاؤں گا، بغوی نے لکھا ہے کہ آیت کا معنی دو طرح سے ہوسکتا ہے۔

۱۔ میں پورا پورا تجھے اٹھا کر اپنے پاس بلالوں گا وہ تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔ محاورہ میں تَوَفَّیْتُ کا معنی اِسْتَوْفَیْتُ (پورا پورا لے لینا) آتا ہے، ۲۔ میں تجھے اپنی سپردگی میں لے لوں گا۔ تَوَفَّیْتُ مِنْهُ كَذَا (میں نے اس کو خود لے لیا، اپنی سپردگی میں لے لیا، وصول کرلیا) یعنی تَسَلَّمْتُهٗ۔

ابن جریر نے ربیع بن انسؒ کا قول نقل کیا ہے کہ توفی سے مراد ہے نیند، جیسے دوسری آیت میں آیا ہے هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ اللہ ہی ہے جو تم کو رات کو سلاتا ہے، حضرت عیسیٰؑ کو نیند آگئی تھی اور سوتے میں اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا، اس وقت آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میں تم کو سلادوں گا اور سوتے میں اٹھا کر اپنے پاس بلالوں گا۔ بعض علماء نے کہا کہ توفی سے مراد موت ہی ہے، علی بن ابی طلحہؒ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ کا معنی ہے اِنِّیْ مُمِیْتُكَ، بغوی نے لکھا ہے اس صورت میں آیت کا معنی دو طرح ہوگا۔

marfat.com

ا۔ وہب کا قول ہے کہ دن میں تین ساعت کے لئے اللہ نے عیسیٰؑ کو موت دی پھر اپنی طرف اٹھالیا، محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ عیسائی کہتے ہیں اللہ نے دن میں سات گھنٹے عیسیٰؑ کو میت رکھا پھر زندہ کر کے اٹھالیا، ابن جریرؒ نے وہب بن منبہ کی یہ روایت نقل کی ہے، ۲۔ ضحاک نے کہا مطلب یہ ہے کہ آسمان سے اتارنے کے بعد یہودیوں کے قتل سے محفوظ رکھ کر مدت زندگی پوری کر کے میں تم کو وفات دوں گا اور اس سے پہلے تم کو اپنے پاس اٹھالوں گا۔ وَرَافِعُكَ میں واو ترتیب کے لئے نہیں ہے (کیونکہ واقع میں رفع پہلے ہوا اور وفات بعد کو ہوگی) بلکہ صرف دونوں فعلوں کے ہونے کے لئے ہے۔ آیت کی یہ تفسیر دوسری آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ کے خلاف ہے کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی توفی کے بعد عیسائی بنے اور یہ امر مسلم ہے کہ آپ کے رفع کے بعد لوگوں نے عیسائیت قبول کی تھی لہٰذا توفی سے مراد یا تو آسمان پر اٹھایا جانا ہے یا اٹھائے جانے سے پہلے وفات ہونا ہے، میرے نزدیک ظاہر اول صورت ہے یعنی توفی سے مراد بغیر موت کے آسمان پر اٹھالینا ہے کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے، وماقتلوہ وما صلبوہ نہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کیا نہ صلیب دی، وجدان شاہد ہے کہ اگر اٹھائے جانے سے پہلے عیسیٰؑ کی موت کی نفی تسلیم نہ کی جائے تو نفی قتل کی صراحت سے کیا فائدہ، قتل کا نتیجہ بھی تو موت ہی ہے (بلکہ قتل شہادت مزید اجر کی موجب ہے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، عنقریب ابن مریمؑ حاکم عادل ہو کر تمہارے اندر اتریں گے، صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو ساقط کر دیں گے، اور مال کو بہائیں گے کہ کوئی قبول بھی نہیں کرے گا۔ انتہا یہ ہوگی کہ ایک سجدہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہوگا۔ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ نے فرمایا اگر تم (اس کی تصدیق) چاہتے ہو تو پڑھو وان من اھل الکتاب الالیؤمنن بہ قبل موتہٗ الایۃ، (متفق علیہ)، بخاری و مسلم کی دوسری روایت میں حضور اقدس ﷺ کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں تمہارا کیا حال ہوگا اس وقت جب (عیسیٰؑ) ابن مریمؑ تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا، مسلم کی ایک روایت میں اتنا زائد آیا ہے کہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی ان پر سوار ہو کر دوڑ نہیں کی جائے گی، آپس کی دشمنی بغض اور حسد جاتا رہے گا، لوگوں کو مال لینے کے لئے بلایا جائے گا لیکن کوئی قبول نہیں کرے گا۔

بغوی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے متعلق فرمایا ان کے زمانہ میں تمام مذاہب سوائے اسلام کے مردہ ہو جائیں گے اور دجال بھی ہلاک ہو جائیں گے آپ زمین پر چالیس سال رہیں گے پھر آپ کی وفات ہو جائے گی اور مسلمان آپ کے جنازہ کی نماز پڑھیں گے۔

ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عیسیٰ بن مریمؑ زمین پر اتریں گے، نکاح کریں گے، ان کے اولاد ہوگی، پینتالیس سال رہیں گے، پھر آپ کی وفات ہو جائے گی اور میرے ساتھ میری قبر میں دفن کئے جائیں گے، میں اور عیسیٰ ابن مریمؑ ایک ہی قبر میں ابو بکرؓ و عمرؓ کے درمیان رہیں گے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کا ایک گروہ برابر حق پر جہاد کرتا رہے گا اور قیامت کے دن تک غالب رہے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر عیسیٰ بن مریمؑ اتریں گے۔ مسلمانوں کا امیر کہے گا آیئے ہم کو نماز پڑھایئے، عیسیٰ فرمائیں گے نہیں، تم ہی میں سے بعض بعض کے سردار ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ یہ بات صرف اس لئے کہیں گے کہ اللہ نے اس امت کو عزت عطا فرمائی ہے، مسلم۔ حدیث معراج میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو دوسرے آسمان پر دیکھا تھا، بخاری و مسلم۔

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا اور کافروں کے ساتھ رہنے کی برائی سے تم کو پاک کر دوں گا (یعنی ان کافروں سے الگ رکھوں گا)۔

وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ اور جن لوگوں نے تمہاری

marfat.com

پیروی کی ان کو کافروں پر قیامت تک فوقیت عطا کروں گا۔ یعنی تمہاری پیروی کرنے والے دلائل اور اکثر اوقات میں اقتدار کے اعتبار سے (بھی) کافروں پر غالب رہیں گے۔ آپ کے متبع حواری تھے نیز وہ اسرائیلی بھی تھے جو آپ کے دین پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے تھے اور بعثت کے بعد مسلمان بھی آپ ہی کے دین پر ہیں کیونکہ مسلمانوں نے آپ کی تصدیق کی اور آپ کے دین توحید کو قبول کیا اور آپ نے جو رسول اللہ ﷺ کے اتباع کی وصیت کی تھی، جس کا ذکر آیت و مبشرا برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد میں آیا ہے۔ مسلمانوں نے اس پر عمل کیا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ متبعین سے مراد ہیں نصاریٰ۔ نصاریٰ یہودیوں پر غالب رہیں گے اب تک کبھی عیسائیوں پر یہودیوں کا غلبہ نہیں سنا گیا۔ یہودیوں کی حکومت دنیا سے ختم ہو گئی نہ ان کا ملک رہا، نہ سلطنت۔ بنی اسرائیل کی ساری سلطنت اور حکومت نصاریٰ کو پہنچ گئی۔ اس قول پر اتباع سے مراد اتباع دین نہ ہوگا (کیونکہ موجودہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے اصل دین پر نہیں ہیں) بلکہ صرف محبت واتباع کا دعویٰ مراد ہوگا۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے متبعین اور منکرین سب کو ہے یعنی تم سب کی واپسی آخر میری ہی جانب ہوگی۔

فَاَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ فِیۡمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۵۵﴾ اور دین کے معاملہ میں جو تمہارا آپس کا اختلاف ہے اس کا فیصلہ کردوں گا اس فیصلہ کی تفصیل یہ ہے کہ

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۫ پس جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا ان کو دنیا میں سخت عذاب دوں گا۔ یعنی قتل، قید، جزیہ اور ذلت کا عذاب دنیا میں دوں گا اور آخرت میں دوزخ کا عذاب۔

وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾ اور ان کا کوئی حمایتی نہیں ہوگا جو ہمارے عذاب سے ان کو بچا سکے۔

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔

فَیُوَفِّیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ تو اللہ ان کی نیکیوں کا عوض ان کو پورا پورا دے گا۔

وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۷﴾ اور اللہ ظالموں کو یعنی کافروں کو پسند نہیں کرتا یعنی ان پر رحم نہیں کرے گا اور جب رحم نہیں کرے گا تو ان کے کفر کے موافق عذاب دے گا۔

اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ تیرہ سال کی عمر میں شکم مریم میں استقرار عیسیٰ ہوا اور سرزمین بابل پر سکندر کے حملہ کو ۶۵ سال گزرے تھے کہ آپ کی پیدائش ہوئی اور آغاز وحی کے وقت آپ کی عمر ۳۰ سال تھی اور جب آپ ۳۳ سال کے ہوئے تو شب قدر ماہ رمضان میں بیت المقدس سے (آسمان پر) اللہ نے آپ کو اٹھا لیا گویا اٹھانے کے وقت تک آپ کی نبوت کو تین سال گزرے تھے آپ کے بعد حضرت مریم چھ سال زندہ رہیں۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ہم شکل مسیح کو جب قتل کر دیا گیا اور صلیب پر لٹکا دیا گیا تو حضرت مریم علیہ السلام اور ایک اور عورت جس کے جنون کو اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کی دعا سے دور کر دیا تھا روتی ہوئی صلیب پر لٹکی ہوئی نعش کے پاس پہنچیں۔ اچانک حضرت عیسیٰؑ نے (نمودار ہو کر) ان سے کہا تم کیوں روتی ہو اللہ نے مجھے اٹھا لیا اور سوائے بھلائی کے مجھے اس نے کوئی دکھ نہیں دیا، باقی یہ صلیب کشیدہ شخص تو میرا ہم شکل ہے اللہ نے ان کی نظر میں اس کو میری شکل کا کر دیا ہے (یہ کہہ کر عیسیٰ غائب ہو گئے) پھر سات روز کے بعد اللہ نے عیسیٰ کو حکم دیا کہ مریم کے پاس پہاڑ پر جا کر اترو، وہ سوگوار ہے مریم کی طرح نہ کوئی رویا، نہ اس کی برابر کسی کو غم ہوا، وہاں جا کر حواریوں کو جمع کرنا اور اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے کے لئے ملک میں پھیلا دینا۔ حسب الحکم حضرت عیسیٰؑ پہاڑ پر نازل ہوئے آپ کے نزول کے وقت پہاڑ بقعہ نور بن گیا حواری آ کر آپ کے پاس جمع ہوئے آپ نے دین کی دعوت دینے کے لئے ان کو ملک میں پھیلا دیا اس کے بعد اللہ نے آپ کو اٹھا لیا صبح ہوئی تو جس جس حواری کو جس جس کی ہدایت کے لئے حضرت عیسیٰؑ نے مقرر فرمایا تھا اس حواری نے اسی کی زبان میں گفتگو کی۔

marfat.com

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ یعنی یہ عیسیٰؑ، مریمؑ اور حواریوں کے واقعات جو ہم تم کو پڑھ کر سنا رہے ہیں ان معجزات میں سے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ ان واقعات سے واقف نہ تھے اس کے باوجود اس طور پر بیان فرمایا جیسے بنی اسرائیل کے علماء جانتے تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اطلاع آپ کو اللہ کی طرف سے دی گئی اور آپ ضرور خدا کے رسول تھے یا معجزات سے قرآن کی آیات مراد ہیں۔

وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اور پر حکمت قرآن سے ہیں۔ مقاتل نے حکیم کا ترجمہ کیا ہے محکم جو باطل (کی آمیزش) سے محفوظ ہے بعض کے نزدیک اَلذِّکْرِ الْحَکِیْمِ سے لوح محفوظ مراد ہے۔ لوح محفوظ سفید موتی کی اتنی لمبی تختی ہے جیسے زمین سے آسمان تک درمیانی خلا یہ عرش سے آویزاں ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ دونوں جگہ مثل کا معنی ہے عجیب حالت یعنی اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی عجیب حالت آدم کی عجیب حالت کی طرح ہے۔ وجہ مشابہت یہ ہے کہ

خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ اللہ نے آدمؑ کو مٹی سے بنایا۔

ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ پھر اس کالبد سے کہا زندہ آدمی ہو جا۔

فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ فوراً وہ ہو گیا۔ یہ گذشتہ حال کی حکایت ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ آدم کو مٹی سے بنانے کا اندازہ کیا اور اندازۂ عملی کو موجود ہو جانے کا حکم دیا تو وہ موجود ہو گیا (ثم تاخیر زمانی کے لئے مستعمل ہے لیکن) یہاں واقعہ کی تاخیر مدت مراد نہیں ہے بلکہ ایک بیان کی دوسرے بیان سے تاخیر مراد ہے یعنی اول آدمؑ کا مٹی سے پیدا کرنا بیان کیا پھر پیدا کرنے کا طریقہ بتادیا کہ حکم دیدیا بس وہ پیدا ہو گیا۔ مطلب یہ کہ آدمؑ کے ماں باپ نہیں تھے، نہ پیٹ میں رہنے اور دودھ پینے اور دودھ چھوڑنے کی نوبت آئی۔ عیسیٰ کی پیدائش کی حالت بھی گو عجیب ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے مگر آدم کی پیدائش کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب ہوئی کہ بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔ تعجب آگیں ہونے میں دونوں کی پیدائش کی حالت مشترک ہے مگر ایک میں تعجب آگینی کم ہے اور دوسری میں زیادہ۔ کم عجیب کو زیادہ عجیب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ عمومی ضابطہ تولید کی خلاف ورزی دونوں جگہ ہے لیکن ایک میں کم اور دوسری میں زیادہ۔ اس طرز بیان سے مادۂ خصومت ہی کی بیخ کنی ہو جاتی ہے اور نزاع پیدا کرنے والے شبہ کا ہی استیصال ہو جاتا ہے۔

اس آیت کا نزول نجران کے عیسائی نمائندوں کے حق میں ہوا تھا۔ نجران کے نمائندوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا آپ ہمارے آقا کو کیوں گالی دیتے ہو حضور ﷺ نے پوچھا میں کیا کہتا ہوں۔ بولے آپ ان کو بندہ کہتے ہیں فرمایا بے شک وہ اللہ کے بندے اللہ کے رسول اور اللہ کا کلمہ (یعنی صرف حکم) تھے جو عذراء بتول کے شکم میں اللہ نے ڈال دیا تھا۔ یہ سن کر اہل وفد کو غصہ آگیا اور کہنے لگے کیا آپ نے کوئی آدمی ایسا دیکھا ہے جو بن باپ کے پیدا ہوا ہو اس گفتگو کے بعد اللہ نے وفد نجران کو لاجواب بنانے اور خاموش کر دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن ابی حاتم نے بطریق عوفی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے حسنؒ بصری کا قول بیان کیا ہے کہ نجران کے دو راہب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نے پوچھا عیسیٰؑ کا باپ کون تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی عادت تھی کہ اللہ کا حکم آنے سے پہلے آپ فوراً ہی جواب نہیں دیا کرتے تھے اس پر آیت ذٰلِکَ نَتْلُوْهُ سے مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ تک نازل ہوئی (اور وہ راہب لاجواب ہو گئے) کیونکہ بغیر ماں باپ کے آدم کے مٹی سے پیدا ہونے کا ان کو بھی اقرار تھا۔ وہ عیسائی بھی کس قدر جاہل تھے کہ یہ تو پوچھا کہ کیا کوئی انسان بن باپ کے پیدا ہوتے آپ نے دیکھا ہے اور خود یہ نہ سوچا کہ انہوں نے کبھی کسی بکری کا بچہ آدمی کو یا آدمی کا بچہ بکری کو دیکھا ہے حالانکہ دونوں میں حیوانی جنس کا اشتراک ہے۔ اختلاف ہے تو صرف نوعیت کا پھر (جنسی تباین بلکہ ہر طرح کے اختلاف کے باوجود) انہوں نے کیسے فیصلہ کر لیا کہ وہ اللہ جو ایک اور ہر چیز سے بے نیاز اور قدیم ہے اور اس کی مثل کوئی بھی نہیں ہے وہ عیسیٰؑ کا باپ ہو گیا حالانکہ عیسیٰؑ ایک مخلوق جسم رکھتا تھا جو

marfat.com

حادث تھا، کھانا کھاتا اور سوتا بھی تھا اور اس کو موت بھی آئے گی۔ لاریب اللہ نہ کسی کا والد ہے، نہ مولود، نہ اس کا کوئی ہم سر ہے۔

”......فائدہ......“

اس آیت سے قیاس کا شرعی حجت ہونا ثابت ہو رہا ہے کیونکہ تخلیق آدم پر قیاس کرتے ہوئے عیسیٰؑ کی بن باپ کے پیدائش کے جواز پر اللہ نے استدلال کیا ہے (پس مسلمانوں کا وہ گروہ جو صرف قرآن و سنت اور اجماع کو احکام کی علت قرار دیتا ہے اور قیاس کو دلیل حکم نہیں مانتا اس آیت سے اس کے قول کی تردید مستفاد ہوتی ہے)۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہی حق ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہے یا تمہارے رب کے پاس سے یہ حق آچکا۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ پس اے انکار کرنے والے مخاطب تو عیسیٰؑ کے معاملہ میں شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جیسا کہ یہودی شک میں پڑ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے عیسیٰؑ کی والدہ پر زنا کی تہمت لگائی اور عیسائی شک میں پڑ گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا کہنے لگے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ من شرطیہ ہے یا استفہام انکاری کے لئے ہے یعنی جب عیسائی مناظرہ سے عاجز ہو گئے تو اب عیسیٰؑ کے معاملہ میں یا اس حق بات میں کون آپ سے مناظرہ کر سکتا ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ یعنی اس علم کے آجانے کے بعد کہ عیسیٰؑ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول تھا جو شخص بھی تم سے عیسیٰؑ کے متعلق مناظرہ کرے۔ علم حاصل ہو جانے کی شرط جو مباہلہ کے لئے بیان کی اس میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ جب تک کسی بات کا پورا یقین نہ ہو گیا ہو مسلمان کے لئے اس میں مباہلہ کرنا زیبا نہیں۔

فَقُلْ تَعَالَوْا تو اے محمد ﷺ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ پختہ رائے اور عزم کے ساتھ آؤ۔ تَعَالَوْا جمع مذکر حاضر باب تفاعل، مادہ ہے علو، فراء نے اس کا ترجمہ کیا اوپر اٹھو۔ میں کہتا ہوں گویا مخاطب سے کہتا ہے کہ اونچی جگہ پر چڑھ کر دیکھو جو چیز تم کو نیچے سے نہیں دکھائی دیتی وہ اوپر سے دِکھ جائے گی۔ بطور استعارہ اس سے مراد ہوتا ہے کہ جو چیز تم سے مخفی ہے اس پر غور اور توجہ کرو۔ خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ پختہ رائے اور عزم کے ساتھ آؤ۔ کبھی اس لفظ کا استعمال ایسے مقام کی طرف بلانے کے لئے بھی ہوتا ہے جو بلانے والے کے قریب ہو (یعنی میرے پاس آؤ)۔

نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ یہ امر کا جواب ہے اسی لئے نَدْعُ پر جزم ہے (یعنی واؤ حذف کر دیا گیا ہے) مراد یہ ہے کہ ہم تم یعنی ہر ایک اپنی ذات کو اور اپنے عزیز ترین لوگوں کو بلا کر اپنے ساتھ ملالیں تاکہ جھوٹے پر جو عذاب نازل ہو وہ اس شخص پر بھی نازل ہو اور اس کے عزیز ترین بیوی بچوں پر بھی۔ اولاد و نساء کا ذکر انفس سے پہلے اس لئے کیا کہ آدمی انہی کے لئے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا اور ان کو بچاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ بلانے والے میں اور جس کو بلایا جائے اس میں غیریت ہونی چاہئے۔ بیوی بچے واقع میں شخصیت کے لحاظ سے آدمی کی ذات سے الگ ہوتے ہیں اور آدمی کی اپنے نفس سے مغایرت صرف فرضی ہوتی ہے لہٰذا حقیقی مغایرت والی ہستیوں کو پہلے ذکر کیا اور پھر فرضی غیریت والی ہستی یعنی اپنی ذات کو ذکر کیا۔

مسلم اور ترمذی نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلایا پھر کہا اے اللہ یہ ہی میرے اہل بیت ہیں۔

ثُمَّ نَبْتَهِلْ پھر ہم زاری کریں۔ استہال اگرچہ باب افتعال ہے لیکن باب تفاعل کے معنی میں ہے۔ باب تفاعل کو چھوڑ کر باب افتعال کو اس لئے اختیار کیا کہ (باب افتعال کی خاصیت ہے کسی چیز کو اپنے لئے حاصل کرنا اور لے لینا اور) یہاں مقصود یہ ہے کہ اگر جھوٹا ہو تو لعنت کو اپنے لئے کھینچ لے اور سچا ہو تو فریق مخالف کی طرف لعنت کا رخ پھر دے اور ظاہر ہے کہ

marfat.com

آدمی کے اپنے نفس پر کسی برائی کا وقوع مخالف پر واقع ہونے سے پہلے ہوتا ہے گویا (بصورت کذب) تحصیل لعنت اپنے لئے اصل غرض ہے (اور مخالف پر اس کے جھوٹے ہونے کی صورت میں لعنت کا پڑ جانا ایک ضمنی چیز ہے)۔
بُھْلَۃٌ اور بَھْلَۃٌ کا اصل معنی ہے ترک، بَھَلْتُ النَّاقَۃَ میں نے اونٹنی کو بلا قید چھوڑ دیا۔ لعنت میں ترک رحمت بھی ہوتا ہے اور دنیا و دین میں رحمت سے دوری بھی اور ترکِ رحمت وقوعِ عذاب کو چاہتا ہے کیونکہ عذاب سے بچاؤ بغیر رحمت کے ممکن نہیں۔ ثم کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عقلمند کو مباہلہ میں (جہاں تک ممکن ہو) تاخیر ہی کرنی چاہئے۔
فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔ یہ بصورت عطف نَبْتَهِلْ کی تشریح ہے فاء (جو بلا تاخیر عطف کیلئے مستعمل ہے) لانے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اِبْتِہَال کے بعد لعنت کا وقوع فوراً ہی ہو جائے گا۔ تاخیر نہ ہوگی۔
بغوی نے لکھا ہے کہ جب وفد نجران کے سامنے رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اور ان کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے جواب دیا ہم ذرا لوٹ کر اس معاملہ میں غور کر لیں ہم کل آئیں گے۔ عاقب اس سے زیادہ عقلمند اور سوجھ بوجھ والا تھا۔ اہل وفد نے تخلیہ میں اس سے پوچھا عبد المسیح آپ کی کیا رائے ہے۔ عاقب نے جواب دیا برادران عیسائیت تم خوب پہچان چکے ہو کہ محمد نبیٔ مرسل ہیں۔ خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ کیا ہو اور پھر ان میں کا کوئی بڑا زندہ رہا ہو یا چھوٹے کو بڑھنے کا موقع ملا ہو (یعنی چھوٹے بڑے سب ہی مر جاتے ہیں) اب اگر تم نے ایسا کیا تو سب تباہ ہو جاؤ گے لہٰذا اگر تم اپنے انکار پر ہی قائم رہنا چاہتے ہو تو اس شخص سے صلح کر لو اور اپنے ملک کو لوٹ جاؤ اس مشورہ کے موافق سب لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے رسول اللہ ﷺ صبح کو ہی گھر سے اس حالت میں برآمد ہو چکے تھے کہ حضرت حسینؓ آپ کی گود میں تھے، حضرت حسنؓ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، حضرت فاطمہؓ آپ کے پیچھے تھیں اور حضرت فاطمہؓ کے پیچھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے اور آپ فرما رہے تھے جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔
یہ دیکھ کر نجران کا پادری کہنے لگا۔ اے گروہ نصاریٰ! مجھے ایسے چہرے نظر آ رہے ہیں کہ اگر یہ اللہ سے دعا کریں تو اللہ پہاڑ کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دے گا لہٰذا تم ان سے مباہلہ نہ کرو، ورنہ سب مر جاؤ گے اور روز قیامت تک روئے زمین پر کوئی عیسائی باقی نہیں رہے گا۔ آخر اہل وفد نے کہا، ابو القاسم ہماری رائے یہ ہوئی ہے کہ ہم آپ سے مباہلہ نہ کریں آپ اپنے مذہب پر رہیں اور ہم اپنے مذہب پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم مباہلہ کرنے سے انکار کرتے ہو تو مسلمان ہو جاؤ جو مسلمانوں کے حقوق و فرائض ہیں وہ تمہارے بھی ہو جائیں گے۔
جب اہل وفد نے مسلمان ہونے سے انکار کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اب میری تمہاری جنگ ہوگی، کہنے لگے عرب سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے ہم آپ سے اس شرط پر صلح کر سکتے ہیں کہ آپ ہم پر نہ لشکر کشی کریں، نہ ہم کو خوف زدہ کریں، نہ اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور کریں اور ہم سالانہ دو ہزار جوڑے کپڑوں کے آپ کو ادا کرتے رہیں ایک ہزار صفر میں اور ایک ہزار رجب میں۔ حضور ﷺ نے اس شرط پر ان سے صلح کر لی اور فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اہل نجران کے سروں پر عذاب آ ہی گیا تھا اگر وہ مباہلہ کرتے تو ان کی صورتیں مسخ ہو کر بندروں اور سوروں جیسی ہو جاتیں، ساری وادی بھڑکتی ہوئی آگ سے بھر جاتی، نجران اور نجران کے رہنے والے یہاں تک کہ درختوں پر پرندے بھی بیخ و بن سے تباہ ہو جاتے اور سال پلٹنے نہ پاتا کہ سارے عیسائی ہلاک ہو جاتے کذا اخرج ابو نعیم فی الدلائل من طرق عن ابن عباسؓ۔
اس آیت سے رافضیوں نے خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے ابطال اور حضرت علیؓ کے خلیفہ اول ہونے پر استدلال کیا ہے ان کا قول ہے کہ اس آیت میں ابناء سے حضرت حسنؓ و حسینؓ اور نساء سے حضرت فاطمہؓ اور انفسنا سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ مراد ہیں۔ اللہ نے علیؓ کو نفس محمدؐ قرار دیا ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ علیؓ فضائل میں محمدؐ کے مساوی تھے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو امارت الناس کا سب سے زیادہ حق تھا اللہ نے فرمایا ہے اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔ پس علیؓ

marfat.com

بھی ایسے ہی ہوئے لہٰذا علیؓ ہی رسول اللہ ﷺ کے بعد امام ہوئے۔

اس استدلال کا جواب چند طرح سے ہو سکتا ہے۔ نمبر ۱۔ انفس جمع کا صیغہ ہے جو تعدد نفوس پر دلالت کر رہا ہے۔ ایک نفس رسول اللہ ﷺ کا اور دوسرے نفوس آپ کے متبعین کے۔ وحدت نفس پر کوئی لفظ دلالت نہیں کر رہا ہے اور وحدت نفس نہ ہونا ہے بھی ظاہر (کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت جدا تھی اور علیؓ کی شخصیت علیحدہ)۔

نمبر ۲۔ ممکن ہے کہ بطور عموم مجاز حضرت علی کا شمار بھی ابناء ہی میں ہو جائے کیونکہ عرف میں دلماد پر ابن کا اطلاق ہوتا ہے۔

نمبر ۳۔ ممکن ہے کہ انفسنا سے مراد وہ سب لوگ ہوں جو نسب اور دین کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سے وابستہ ہوں دیکھو آیت وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اور تقتلون انفسکم میں وہ لوگ مراد ہیں جو دین اور نسب میں متحد ہوں اسی طرح آیت ظن المومنون والمؤمنات بانفسھم خیرا اور ولا تلمزوا انفسکم میں انفس سے وہی لوگ مراد ہیں جن کے باہم دینی اور نسبی رشتہ ہو لہٰذا ضروری نہیں کہ فضائل میں مساوات ہو۔

نمبر ۴۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کی تمام ہی اوصاف میں مساوات تو باتفاق فریقین غلط ہے (کیونکہ وصف رسالت میں شرکت نہیں) اور بعض اوصاف میں برابر ہونے سے مدعٰی ثابت نہیں ہوتا (کیونکہ کیا ضروری ہے کہ وصف امامت میں حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کے مساوی ہوں)۔

نمبر ۵۔ اگر اس آیت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کا امیر المؤمنین ہونا ثابت ہوتا ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی ایسا ہونا ضروری قرار پاتا ہے مگر آپ اس کے قائل نہیں البتہ اس واقعہ سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک یہ بزرگ ہستیاں سب سے زیادہ محبوب تھیں۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ یعنی عیسیٰؑ و مریمؑ کا جو واقعہ بیان کیا گیا یہی سچا بیان ہے۔ هُوَ ضمیر فصل ہے۔ یا مبتدا ہے اور القصص اس کی خبر ہے اور پورا جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔ ضمیر فصل پر لام تاکید کا آنا صحیح ہے کیونکہ اصل میں تو یہ لام مبتدا پر آتا ہے اسی لئے اس کو لام ابتدا کہتے ہیں مگر خبر پر بھی آ جاتا ہے مگر جب مبتدا اور خبر کے درمیان ضمیر فصل ہو تو چونکہ ضمیر مبتدا کے قریب ہوتی ہے (اور خبر اس کے بعد آتی ہے) اس لئے اس پر لام آ جاتا ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اور کوئی بھی الٰہ نہیں ہے۔ استغراق نفی کی تاکید کیلئے من کو زیادہ کیا ہے۔ یہ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کا رد ہے۔

اِلَّا اللّٰهُ ۚ سوائے اللہ کے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ اور حقیقت میں اللہ ہی غالب اور حکمت والا ہے۔ اس جملہ کی نحوی ترکیب وہی ہے جو مذکورہ بالا جملہ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عزت، کمالِ قدرت اور احاطہ حکمت میں کوئی بھی اللہ کے برابر نہیں ہے پھر الوہیت میں کوئی کس طرح اس کا شریک ہو سکتا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا پس اگر اب بھی انہوں نے دلائل حق سے روگردانی اور توحید سے اعراض کیا تو اللہ ان کو عذاب دے گا (کیونکہ یہ مفسد ہیں)۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ اور اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے اِنَّ کی جزا محذوف ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا فَاِنْ تولّوا فا اللہ یعذبھم عذاب کا باعث تھا مفسد ہونا، پس علت کو معلول کے بجائے ذکر کر دیا (تاکہ حکم عذاب کی علت معلوم ہو جائے اور حکم کا ثبوت دلیل سے ہو جائے) کیونکہ کفر و معاصی کو دنیا میں پھیلا کر اور لوگوں کو ایمان سے روک کر ملک میں بگاڑ پیدا کرنا اور خود ولی نعمت کی ناشکری اور نافرمانی اور اس کے رسول کی مخالفت کر کے عالم کو تباہ کرنا عذاب پانے کا سبب ہے اور اللہ کو ان کا مفسد ہونا معلوم ہے (پس لامحالہ اللہ ان کو عذاب دے گا) اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ حق سے روگردانی فساد انگیز حرکت ہے (اس سے امن تباہ ہو جاتا ہے) واللہ اعلم۔

ركوع ۱۴

marfat.com

مفسرین نے لکھا ہے کہ نجران کا وفد مدینہ میں آیا تو اس کی ملاقات یہودیوں سے ہوئی اور حضرت ابراہیم کے متعلق دونوں فریق کا مناظرہ ہو گیا۔ عیسائیوں نے کہا کہ ابراہیمؑ نصرانی تھے اور ہم ان کے دین پر ہیں لہٰذا ہمارا ان سے خصوصی تعلق ہے اور یہودیوں نے کہا ابراہیمؑ یہودی تھے۔ ہم ان کے مذہب پر ہیں ان کا ہم سے قریب ترین تعلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں گروہوں کا ابراہیمؑ اور ان کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ابراہیمؑ ہر طرف سے کٹ کر اللہ ہی کے ہو گئے تھے اور اللہ کے فرمانبردار تھے میں ان کے دین پر ہوں لہٰذا تم سب ابراہیمؑ کے دین یعنی اسلام کا اتباع کرو، یہودی بولے آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰؑ کو رب بنا لیا اسی طرح ہم بھی آپ کو رب بنالیں۔ عیسائی کہنے لگے آپ کی تو یہ مرضی ہے کہ یہودیوں نے جو بات عزیرؑ کے بارے میں کہی ہے وہی ہم آپ کے متعلق کہنے لگیں۔ اس پر اللہ نے آیت ذیل نازل کی۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ آپ کہہ دیں اے اہل کتاب۔ اہل کتاب کا لفظ دونوں کتابوں والوں کو شامل ہے۔

تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ ایک بات کی طرف آجاؤ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جس قصہ کی کچھ تفصیل ہو عرب اس کو کلمہ کہہ دیتے ہیں اسی لئے قصیدہ کو کلمہ کہا جاتا ہے۔

سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ جو ہمارے تمہارے درمیان ایک جیسی ہے سَوَاء مصدر بمعنی اسم فاعل ہے اسی لئے اس کا مونث نہیں آتا کیونکہ مصدر کا تثنیہ آتا ہے نہ جمع نہ مونث یعنی اس بات میں قرآن، توریت، انجیل کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔

اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوائے ہم کسی کو نہ پوجیں یعنی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں نہ انسان کو، نہ بت کو، نہ فرشتہ کو، نہ شیطان کو۔

وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـــًٔا اور کسی شئی کو واجب الوجود ہونے میں اس کا ساجھی نہ قرار دیں جیسے یہودی عزیرؑ کو خدا کا بیٹا اور عیسائی مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور نصاریٰ اللہ کو تین میں کا تیسرا قرار دیتے ہیں اور نتیجہ میں عزیرؑ اور مسیحؑ کی پوجا کرتے ہیں۔

وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا اور ہم میں سے بعض بعض آدمیوں کو رب نہ بنائیں یعنی بعض لوگ بعض کی اطاعت نہ کریں۔

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اللہ کی اجازت کے بغیر۔ حضرت عدیؓ بن حاتم راوی ہیں کہ جب آیت اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔ نازل ہوئی تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم تو علماء و مشائخ کی پوجا نہیں کرتے تھے فرمایا کیا وہ (اپنی مرضی سے اشیاء کو) تمہارے لئے حلال حرام نہیں بنایا کرتے تھے اور پھر تم ان کے قول پر عمل نہیں کرتے تھے میں نے عرض کیا جی ہاں (ایسا تو کرتے تھے) فرمایا یہی تو وہ ہے (یعنی یہی تو غیر اللہ کو رب بنانا ہوا) ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔

اطاعت رسول حقیقت میں اللہ ہی کی اطاعت ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے اللہ نے فرمایا وَمَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ اسی طرح علماء، اولیاء، حکام اور بادشاہوں کا حکم جب کہ شریعت کے موافق ہو اللہ ہی کی اطاعت ہے اللہ کا ارشاد ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم اور جو خلاف شرع ہو اس کی اطاعت غیر اللہ کی ربوبیت کی تسلیم ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ معصیت خداوندی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ اطاعت تو معروف میں ہونی چاہئے۔ رواہ الشیخان فی صحیحیہما و ابو دائود والنسائی۔

حضرت عمران بن حصین اور حضرت حکیم بن عمرو غفاریؓ کی روایت ہے کہ خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ اس مقام سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگر کسی کی تحقیق میں کوئی مرفوع حدیث صحیح ثابت ہو جائے اور اس کے مقابل کوئی دوسری حدیث بھی نہ ہو اور کوئی حدیث اس کی ناسخ بھی نہ ہو اور امام ابو حنیفہؒ کا فتویٰ حدیث مذکور کے خلاف ہو اور

marfat.com

باقی آئمہ میں سے کسی امام کا مسلک حدیث مذکور کے موافق ہو تو اس صورت میں حدیث کا اتباع واجب ہے ایسی حالت میں اگر امام اعظمؒ کے فتوے پر جما رہے گا تو گویا یہ غیر اللہ کی ربوبیت کی تسلیم ہو گی۔ بیہقی نے مدخل میں صحیح اسناد کے ساتھ عبداللہ بن مبارک کا قول نقل کیا ہے ابن مبارکؒ نے کہا میں نے خود ابو حنیفہؒ کو یہ فرماتے سنا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث مل جائے تو ہمارے سر آنکھوں پر اور کسی صحابی کا قول مل جائے تو ان کے اقوال سے ہم (کسی مسلک کو) ترجیح دیں گے اور کسی تابعی کا قول ہو تو ہم اس سے مقابلہ کریں گے بیہقی نے روضۃ العلماء سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام اعظمؒ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور صحابہؓ کے قول کے مقابل میں میرے قول کو ترک کر دو۔ یہ بھی منقول ہے کہ امام صاحب نے فرمایا اگر حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ ہم نے عمل بالحدیث کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ چاروں اماموں میں سے کسی امام کا قول اس حدیث کے موافق ہونا ضروری ہے۔ اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں حدیث کے خلاف عمل کرنے سے اجماع کی خلاف ورزی لازم آئے گی کیونکہ تیسری یا چوتھی قرن کے بعد فرعی مسائل میں اہل سنت کے چار فرقے ہو چکے کوئی پانچواں مذہب باقی نہیں رہا۔ پس گویا اس امر پر اجماع ہو گیا کہ جو قول ان چاروں کے خلاف ہو وہ باطل ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کا اتفاق گمراہی پر نہیں ہو گا۔ اللہ نے بھی فرمایا ہے۔

وَمَن يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ○ اس کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ بات تو ممکن ہے کہ حدیث مذکور کا علم چاروں اماموں میں سے کسی کو نہ ہوا ہو اور نہ ان کے شاگردوں میں سے کسی بڑے عالم کو اطلاع ہوا اس سے معلوم ہوا کہ اگر سب نے بالاتفاق حدیث مذکور کے خلاف فتویٰ دیا ہے اور حدیث پر عمل ترک کر دیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہو گی کہ اس حدیث کو کسی دوسری حدیث سے انہوں نے منسوخ یا مؤول قرار دیا ہے۔

"......فائدہ......"

اگر علماء شرع کسی مسئلہ کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ کر چکے ہوں تو پھر اس فتوے کی خلاف ورزی یہ کہہ کر کرنی جائز نہیں کہ مشائخ صوفیہ کا طریقہ اس کے علاوہ ہے اور ہم صوفیہ کے طریقہ کے پابند ہیں۔ حقیقت میں صوفیائے کرام نے شرع کے خلاف کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ شریعت کا بگاڑ تو ان جاہلوں کی وجہ سے ہوا جو صوفیہ کے پیچھے آئے (اور تصوف کے علمبردار بنے)

"......فائدہ......"

اولیاء اور شہداء کے مزارات پر سجدے کرنا، طواف کرنا، چراغ روشن کرنا، ان پر مسجدیں قائم کرنا، عید کی طرح مزارات پر عرس کے نام سے میلے لگانا جس طرح آج کل جاہل کرتے ہیں۔ جائز نہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ مرض (وفات) میں رسول اللہ ﷺ نے دھاری دار کمبل سے چہرہ مبارک ڈھانک لیا اور دم گھٹا تو منہ سے ہٹا دیا اور اسی حالت میں فرمایا یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے حضور ﷺ نے اس ارشاد میں یہود و نصاریٰ کے فعل سے مسلمانوں کو باز داشت کی۔ بخاری و مسلم، امام احمد اور ابو داؤد طیالسی نے بھی حضرت اسامہ بن زید کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور ان لوگوں پر جو قبروں پر سجدہ گاہ بناتے اور چراغ جلاتے ہیں۔ اللہ کی لعنت ہو۔ مسلم نے حضرت جندب بن عبد الملک کا قول نقل کیا ہے۔ جندبؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا وفات سے پانچ رات پہلے حضور ﷺ فرما رہے تھے ہوشیار! قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تاکید کے ساتھ تم کو اس کی ممانعت کرتا ہوں۔

فَإِن تَوَلَّوْا یعنی اس سیدھی سادھی سچی بات سے جس پر اللہ کی تمام کتابیں اور پیغمبر متفق ہیں اگر یہ لوگ روگردانی کریں۔

فَقُولُوا تو اے پیغمبر تم اور سب مسلمان کہہ دیں کہ

marfat.com

اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝ اے اہل کتاب تم گواہ رہو کہ تمام آسمانی کتابوں کو ہم مانتے ہیں تم نہیں مانتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ ابو سفیان بن حربؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ ہرقل نے مجھے اور قریش کی ایک جماعت کو طلب کیا جس زمانہ میں ہماری اور رسول اللہ ﷺ کی صلح تھی، اس مدت صلح میں ہم شام میں بسلسلہ تجارت گئے ہوئے تھے، ایلیا میں ہم ہرقل کے پاس پہنچے ہرقل نے ہم سب کو اپنی مجلس میں طلب کر لیا سب اندر داخل ہوئے اس وقت اس کے گرداگرد سرداران روم موجود تھے اس کے بعد اس نے وہ خط منگوایا جو دحیہ کے ہاتھ رسول اللہ ﷺ نے حاکم بصریٰ کو بھیجا تھا اور حاکم بصریٰ نے وہ ہرقل کو پہنچادیا تھا خط ان الفاظ کے ساتھ تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے ہرقل سردار روم کے نام جو ہدایت پر چلے اس پر سلام ہو۔ امابعد۔ میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، مسلمان ہو جاؤ محفوظ رہو گے، اللہ تم کو دوہرا ثواب دے گا۔ اگر تم نے روگردانی کی تو رعایا کا گناہ بھی تم ہی پر پڑے گا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان برابر ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پوجا نہ کریں اس کا کسی چیز کو شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کی اطاعت اللہ کی اجازت کے بغیر نہ کرے۔ اس کے بعد بھی اگر انہوں نے روگردانی کی تو مسلمانو تم کہہ دو کہ (اے اہل کتاب) تم گواہ رہو کہ ہم (سب کو) مانتے ہیں (اور اللہ کے فرمان بردار ہیں)۔ متفق علیہ۔

"......فائدہ......"

رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت نجرانی نمائندوں کو پڑھ کر سنائی اور ہرقل کو لکھ کر بھیجی اور سب نے اس کو تسلیم کیا اور مضمون کا انکار نہیں کیا اور یہ کہہ کر رد نہ کردیا کہ یہ بات ہماری کتابوں میں نہیں ہے یہ امور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا قطعی ثبوت ہیں اور یہ بات یقینی ہے کہ مندرجۂ آیات امور پر تمام کتابوں اور پیغمبروں کا اتفاق ہے۔ رہا عزیرؑ اور عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینا یہ صرف دماغی تراشیدہ اور تقلیدی عقیدہ ہے۔ آسمانی کتابوں میں اسکی سند نہیں ہے۔ چونکہ عیسیٰؑ کا ابن اللہ ہونا کسی کتاب میں نہیں اسی لئے تو رسول اللہ ﷺ سے مناظرہ کے وقت انہوں نے (اپنی اختراعی عقلی یہ) دلیل پیش کی کہ کیا بن باپ کا آپ نے کوئی آدمی دیکھا ہے۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے قصہ میں کس قدر پرزور ہدایت کا طریقہ اختیار کیا اور مناظرہ میں کتنی خوبصورت ترتیب مناظرہ ملحوظ رکھی قابل غور ہے۔ اول حضرت عیسیٰؑ کے وہ احوال و اطوار بیان کئے جو الوہیت کے منافی ہیں پھر عیسیٰؑ کی تخلیقی حالت کو آدم کی تخلیقی حالت سے تشبیہ دے کر ان کے دل کی گرہ اور شبہ کو دور کرنے کا طریقہ اختیار کیا لیکن اس کے بعد بھی جب ان کی طرف سے ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو اعجاز آگیں طریقہ سے مباہلہ کی دعوت دی اور جب دیکھا کہ مباہلہ سے وہ کترا گئے اور کسی قدر اطاعت کا اظہار کرنے لگے تو پھر ان کو ہدایت کرنے کی طرف رخ کیا اور اس طریقہ سے ہدایت کی پیش کش کی جو بہت ہی آسان اور لاجواب بنادینے والا ہے یعنی ان کو ایسی چیز کی دعوت دی جس پر حضرت عیسیٰؑ انجیل و تمام پیغمبر اور کتابیں متفق ہیں اور یہ طریقہ بھی سودمند ثابت نہیں ہوا اور تمام آیات و تنبیہات غیر مفید ہوئیں تو پھر ہر طرف سے رخ موڑ کر فرمایا۔ اَشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔

ابن اسحاق نے اپنی مکرر سند سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نجران کے عیسائی اور یہودی علماء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جمع ہوئے علماء یہود نے کہا کہ ابراہیم تو یہودی ہی تھے اور عیسائیوں نے کہا کہ وہ عیسائی تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ اے اہل کتاب یہ خطاب دونوں فریقوں کو ہے۔

marfat.com

لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ تم ابراہیم کے دین کے متعلق باہم کیوں جھگڑا کرتے ہو۔

وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ حالانکہ توراۃ وانجیل تو ابراہیمؑ سے مدت کے بعد نازل کی گئی تھی اور توراۃ کے نزول کے بعد دین یہود پیدا ہوا اور انجیل کے نزول کے بعد دین عیسائیت۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک ہزار سال بعد حضرت موسیٰؑ آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار برس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوئے حضرت عیسیٰ انبیاء بنی اسرائیل میں آخری پیغمبر تھے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ کیا تم اپنے قول کی غلطی نہیں سمجھتے۔ غالباً یہود و نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ فرعی اعمال میں ابراہیم کا عمل توریت و انجیل کے موافق تھا۔ بلکہ ممکن ہے یہ بھی خیال ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر جانے کے بعد دونوں فریقوں نے جو مسائل فرعیہ از خود ایجاد کر رکھے تھے ان میں بھی ابراہیمؑ کا عمل ان کے اختراع کردہ اعمال کے مطابق تھا یہ ہی بحث دونوں گروہوں میں محل نزاع تھی جو سراسر غلط تھی کیونکہ ضابطۂ الٰہی اور سنّتِ خداوندی اس طرح ہے کہ جب گزشتہ شریعت کو زیادہ زمانہ گزر جاتا تھا تو ہر زمانہ کی مصلحت کے پیش نظر اللہ گزشتہ شریعت کے فرعی احکام منسوخ فرما دیتا تھا ایسی حالت میں یہودیت یا عیسائیت کے موافق دین ابراہیمؑ کا ہونا کس طرح ممکن ہے ہاں اصول دین اور غیر منسوخ فرعی احکام جیسے غیر اللہ کی عبادت کی حرمت اور کذب و ظلم کی ممانعت تو یہ امور تمام شرائع میں ایک ہی طرح موجود ہیں ان میں اختلاف کا احتمال ہی نہیں۔ واللہ اعلم

هٰٓاَنْتُمْ کوفیوں کی قرأت پر ھا حرف تنبیہ اور انتم ضمیر مذکر مخاطب ہے اور قنبل و ورش کی قرأت پر یہ لفظ بغیر مد کے ھانتم ہے جو اصل میں ءَ اَنْتُمْ تھا جیسے ھَرَقْتُ اصل میں اَرَقْتُ تھا ہمزہ استفہامیہ کو ھا سے بدل دیا۔ اس صورت میں جملہ استفہامیہ انکاریہ ہوگا اور اول صورت میں مخاطب کو غفلت پر تنبیہ ہوگی۔

هٰٓؤُلَآءِ اَنْتُمْ مبتدا ہے اور ھٰؤُلَاءِ اس کی خبر ہے اور آئندہ جملہ اس جملہ کے مضمون کا بیان ہے۔ یا اَنْتُمْ مبتدا ہے اور حَاجَجْتُمْ اس کی خبر۔ اور ھٰؤُلَاءِ منادی ہے اور حرف ندا محذوف ہے یعنی اے لوگو! تم نے باہم جھگڑا کیا ان امور میں جن کا تم کو عالم ہے بعض لوگوں نے ھٰؤُلَاءِ کو موصول کے معنی میں قرار دیا ہے کیونکہ کوفیوں کے نزدیک موصول کی جگہ اسم اشارہ کا استعمال جائز ہے یعنی کیا تم وہی لوگ ہو کہ تم نے جھگڑا کیا۔

حَاجَجْتُمْ تم نے باہم جھگڑا کیا۔

فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ان امور میں جن کا تم کو علم ہے یعنی تم نے موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جھگڑا کیا اور ان کے دین پر ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ تم واقف ہو کہ توریت وانجیل کا دین کیا ہے اور تم نے کتنی تلبیس کی ہے۔ توریت و انجیل میں محمد رسول اللہ کے اوصاف موجود ہیں اور یہ بھی مذکور ہے کہ دین محمدیؐ سے ان کے احکام منسوخ کر دیئے جائیں گے مگر تم نے جانتے ہوئے ان باتوں کو چھپایا مگر اللہ نے یہ پردہ چاک کر کے تم کو رسوا کر دیا۔

فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ پس اے بیوقوفو! جو اپنے دعویٰ کی غلطی کی طرف سے غافل ہو تم ان امور میں کیوں جھگڑا کرتے ہو جن کا تم کو کچھ علم نہیں ہے، یعنی ابراہیمؑ کے دین و شریعت میں تم کیوں نزاع کرتے ہو وہ تم سے ہزاروں برس پہلے تھے اور توریت وانجیل میں ان کی شریعت کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔

وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اور ہر نبی پر جو احکام نازل کیے گئے ان کو اللہ ہی جانتا ہے۔

وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اور تم نہیں جانتے مگر اتنا ہی جتنا تمہاری کتاب میں اللہ نے تم کو بتا دیا۔ بلکہ تم کو کچھ علم ہی نہیں کیونکہ جو کچھ اللہ نے کتاب میں نازل کیا تھا اس کو تم نے چھوڑ دیا اور اللہ کی کتاب کو پس پشت پھینک دیا۔ یہاں تک کہ تم محمد ﷺ پر ایمان نہ لائے حالانکہ اللہ تم سے اس کا پختہ وعدہ لے چکا تھا پس اس مناظرہ بازی میں بھی تم کو رسوائی ہوگی کیونکہ تم جاہل ہو اور جاہل عالم سے مناظرہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس آیت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے

marfat.com

دین ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سلسلہ میں مناظرہ صحیح ہے کیونکہ اللہ کے بتانے سے آپ کو دین ابراہیمؑ کا علم ہو گیا تھا۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا ابراہیم نہ یہودی تھے، نہ نصرانی یعنی دین ابراہیمؑ بہت سے فرعی مسائل میں نہ دین موسیٰؑ کے موافق تھا، نہ شریعت عیسیٰؑ کے۔

وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا بلکہ وہ تمام غلط عقائد سے روگرداں تھے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حنیف وہ ہے جو موحد ہو قربانی کرے، ختنہ کرائے اور کعبہ کی طرف (نماز میں) منہ کرے اور یہ باتیں نہ یہودیوں میں تھیں نہ عیسائیوں میں۔

مُّسْلِمًا ؕ اللہ کے تمام احکام کی تعمیل کرنے والے تھے، نفسانی خواہشات کے پیرو نہ تھے اور تم اللہ کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے تم اس پیغمبر کو ہی نہیں مانتے جس کا ذکر توریت وانجیل میں تمہارے پاس لکھا موجود ہے تم دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو اللہ کو تین میں کا تیسرا کہتے ہو اور عزیرؑ و مسیحؑ کو خدا کے بیٹے قرار دیتے ہو، پس تم ابراہیم کے دین وملت پر ہونے کا دعویٰ کس طرح کرتے ہو۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہیں تھے بلکہ موحّدین میں سے تھے۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ سب سے زیادہ ابراہیم سے خصوصیّت اور ان کے دین سے قرب رکھنے والے۔ اَوْلٰی وَلْیٌ سے مشتق ہے اور وَلْیٌ کا معنی ہے قرب۔

لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ بے شک وہی لوگ ہیں جنہوں نے ابراہیم کی امت میں سے ان کی پیروی کی کیونکہ وہی لوگ بلاشبہ آپ کے دین پر تھے۔

وَهٰذَا النَّبِيُّ اور یہ نبی یعنی محمد ﷺ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اور وہ لوگ جنہوں نے محمد ﷺ کو پیغمبر مانا۔ کیونکہ یہ لوگ اکثر احکام میں ملت ابراہیمی کے موافق ہیں موحّد ہیں، قربانی کرتے ہیں، ختنہ کراتے ہیں، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، حج اور عمرہ کرتے ہیں اور ان احکام کو پورا کرتے ہیں جن سے اللہ نے ابراہیم کی جانچ کی تھی اور ابراہیمؑ نے ان کو پورا کیا تھا۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ اور اللہ مؤمنوں کا دوست ہے کیونکہ ان کا ایمان اول سے آخر تک تمام انبیاء پر ہے یہودی اور عیسائی ایسے نہیں ہیں۔

بغوی نے کلبی کی روایت سے اور محمد بن اسحاقؒ نے زہری کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جب حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؓ کچھ صحابیوں کو ساتھ لے کر مکہ چھوڑ کر حبشہ کو چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ بھی مدینہ کو ہجرت کر گئے اور پھر بدر کی جنگ بھی ہو چکی (جس میں بڑے بڑے قریشی سردار مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہو گئے) تو اس کے بعد قریش نے مشورہ گھر میں کمیٹی کی اور کہنے لگے محمد (ﷺ) کے جو ساتھی نجاشی کے پاس چلے گئے ہیں ان کے ذمہ ہمارے مقتولین بدر کا قصاص ہے لہٰذا کچھ مال جمع کر کے نجاشی کے پاس بطور ہدیہ لے جاؤ ممکن ہے کہ تمہاری قوم کے جو لوگ اس کے پاس پہنچ گئے ہیں ان کو وہ تمہارے سپرد کر دے اور تم انتقام لے سکو) پس دو سمجھدار آدمیوں کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجو، چنانچہ عمرو بن عاصؓ اور عمارہؓ بن ابی معیط کو کچھ (طائف کے) چمڑے وغیرہ بطور ہدیہ دے کر نجاشی کے پاس سب نے باتفاق رائے بھیجا۔ یہ دونوں سمندری راستہ سے حبشہ جا پہنچے اور نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر اس کو سجدہ کیا اور دعا سلامتی دی اور عرض کیا ہماری قوم آپ کی خیر خواہ اور شکر گزار ہے اور آپ کی عافیت کی طلب گار ہے قوم والوں نے ہم کو آپ کی خدمت میں اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ کچھ لوگ آپ کے پاس (مکہ کے) آئے ہیں ان سے آپ ہوشیار رہیں یہ لوگ ایک بڑے جھوٹے آدمی کے ساتھی ہیں جس نے رسول خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے مگر سوائے بیوقوفوں کے ہم میں سے کوئی بھی اس کے پیچھے نہیں ہوا ہم نے ان کو اتنا تنگ کیا کہ مجبور ہو کر انہوں نے ہمارے ملک کی ایک گھاٹی میں پناہ لی اور وہاں لوگوں کی آمد ورفت

marfat.com

بند ہو گئی، نہ وہاں سے کوئی باہر نکلتا ہے، نہ باہر سے اندر جاتا ہے، بھوک اور پیاس سے ان کی جانوں پر بنی ہوئی ہے، آخر تختی سے تنگ آکر اس نے اپنے چچا کے بیٹے کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ وہ آپ کا مذہب خراب کر دے اور آپ کی حکومت و رعیت کو بھی تباہ کر دے آپ ان لوگوں سے احتیاط رکھیں اور ان کو ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہم ان کو آپ سے روک دیں اور آپ کا کام ہو جائے، ہمارے اس قول کا ثبوت یہ ہے کہ چونکہ وہ آپ کے دین اور طور طریقہ سے نفرت کرتے ہیں اس لئے جب وہ آپ کے سامنے آئیں گے تو سجدہ نہیں کریں گے۔ اور نہ دوسروں کی طرح آداب شاہی بجالائیں گے۔

نجاشی نے حضرت جعفرؓ کو ساتھیوں سمیت طلب کیا یہ حضرات دروازہ پر ہی پہنچے تھے کہ حضرت جعفرؓ نے چیخ کر کہا اللہ کا گروہ باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے نجاشی نے آواز سن کر کہا اس چیخنے والے کو حکم دو کہ دوبارہ یہی الفاظ کہے حضرت جعفرؓ نے پھر وہی کہا۔ نجاشی نے کہا جی ہاں اللہ کے اذن اور ذمہ داری کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ عمرو بن عاصؓ نے اپنے ساتھی سے کہا سن رہے ہو انہوں نے کس طرح لفظ حزب اللہ کہا اور نجاشی نے ان کو کیا جواب دیا۔ عمرو بن عاصؓ اور عمارہؓ کو حضرت جعفرؓ کے کلام اور نجاشی کے جواب سے دکھ ہوا۔ جب وہ حضرات اندر آئے تو نجاشی کو انہوں نے سجدہ نہیں کیا، عمرو بن عاص نے نجاشی سے کہا آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ آپ کو سجدہ کرنے سے بھی غرور کرتے ہیں (یعنی غرور کی وجہ سے آپ کو سجدہ بھی نہیں کرتے) نجاشی نے ان حضرات سے کہا کیا وجہ کہ تم نے مجھے سجدہ نہیں کیا اور وہ آداب بجانہ لائے جو باہر سے آنے والے بجالاتے ہیں۔ صحابہؓ نے کہا ہم اس خدا کو سجدہ کرتے ہیں جس نے آپ کو پیدا کیا اور بادشاہ بنایا۔ سلام کا یہ طریقہ ہمارا اس وقت تھا جب ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے (گویا آپ کو بھی ایک بت سمجھ کر سجدہ کر لیتے تھے) لیکن اللہ نے ہمارے اندر ایک سچا نبی مبعوث فرمایا اس نے ہم کو اسی طرح سلام کرنے کا حکم دیا جو اللہ کو پسند تھا یعنی لفظ سلام کہنے کا، یہی اہل جنت کا سلام ہے۔ اس گفتگو سے نجاشی سمجھ گیا کہ یہی بات حق ہے اور توریت و انجیل میں بھی یہی ہے۔ بولا تم میں سے کون ہے جس نے حزب اللہ کہہ کر باریاب ہونے کی چیخ کر اجازت طلب کی تھی۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا میں ہوں، اس کے بعد آپ نے فرمایا کوئی شبہ نہیں کہ آپ زمین کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں اور اہل کتاب میں سے ہیں آپ کے سامنے نہ زیادہ باتیں کرنا مناسب ہے نہ کسی پر ظلم (آپ کے لئے سزاوار ہے) میں چاہتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے (تنہا) خود جواب دوں۔ آپ ان دونوں آدمیوں کو حکم دیدیجئے کہ ان میں سے ایک بات کرے اور دوسرا خاموش رہ کر ہماری گفتگو سنتا رہے یہ سن کر عمرو نے حضرت جعفرؓ سے کہا بولو حضرت جعفر نے نجاشی سے کہا ان دونوں سے دریافت کیجئے کہ ہم کیا آزاد ہیں یا غلام (کہ بھاگ کر آگئے ہیں) عمرو نے کہا نہیں تم آزاد ہو اور معزز ہو۔ نجاشی نے کہا غلام ہونے (کے الزام) سے تو بچ گئے۔ جعفر نے کہا ان سے دریافت کیجئے کیا ہم نے ناحق کوئی خون کیا ہے جس کا قصاص ہم سے لیا جائے۔ عمرو نے کہا نہیں۔ ایک قطرہ خون بھی نہیں بہایا۔ جعفرؓ نے کہا کیا ہم نے ناحق لوگوں کا مال لے لیا ہے جس کی ادائیگی ہمارے ذمہ ہے۔ نجاشی نے کہا اگر (تمہارے ذمہ) قنطار (یعنی ڈھیروں مال) بھی ہوگا تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ، عمرو نے کہا کوئی مال نہیں ایک قیراط بھی نہیں۔ نجاشی نے کہا تو پھر تم ان سے کیا مطالبہ کرتے ہو۔ عمرو نے کہا ہم اور یہ ایک مذہب اور ایک طریقہ پر تھے باپ دادا کے دین پر تھے انہوں نے اس دین کو چھوڑ دیا اور دوسرے مذہب کے پیرو ہو گئے اس لئے ہماری قوم نے ہم کو آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ ان کو ہمارے حوالے کر دیں۔ نجاشی نے پوچھا مجھے سچ سچ بتاؤ وہ مذہب جس پر تم تھے وہ کیا تھا اور جس دین کے اب پیرو وہ کیا ہے؟ جعفرؓ نے کہا جس مذہب پر ہم تھے وہ شیطان کا دین تھا، ہم اللہ کا انکار کرتے تھے، پتھروں کو پوجتے تھے اور پلٹ کر جس دین کو ہم نے اختیار کیا وہ اللہ کا دین اسلام ہے، اللہ کے پاس سے اس دین کو لے کر ہمارے پاس ایک رسولؐ آیا اور ایک کتاب بھی ویسی ہی آئی جیسی ابن مریم لے کر آئے تھے یہ کتاب بھی اس کتاب کے موافق ہے۔ نجاشی نے کہا تم نے بڑا بول بولا ہے نرم رفتار پر رہو، اس کے بعد نجاشی کے حکم سے ناقوس بجایا گیا اور تمام عیسائی علماء و مشائخ جمع ہو گئے، جب سب اکٹھے ہو گئے تو نجاشی نے ان سے کہا میں تم کو اس خدا کی جس نے عیسیٰ پر انجیل نازل کی تھی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو (کتاب میں) یہ بات ملتی ہے کہ عیسیٰؑ اور قیامت کے درمیان کوئی نبی مرسل آئے

marfat.com

گا۔ علماء نے جواب دیا بے شک خدا گواہ ہے ایسا ہے ہم کو عیسیٰؑ نے اس کی بشارت دی ہے اور یہ بھی فرمادیا ہے کہ جو اس پر ایمان لایا وہ مجھ پر ایمان لایا اور جس نے اس کا انکار کیا اس نے میرا انکار کیا۔ نجاشی نے جعفرؓ سے کہا یہ شخص تم سے کیا کہتا ہے کیا کرنے کا حکم دیتا ہے اور کس چیز سے منع کرتا ہے جعفرؓ نے جواب دیا وہ ہمارے سامنے اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں، اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں، برے کاموں سے روکتے ہیں ہمسایوں سے حسن سلوک کرنے، قرابت داروں سے میل رکھنے اور یتیموں کو نوازنے کا حکم دیتے ہیں اور یہ بھی ہدایت فرماتے ہیں کہ ہم فقط اللہ ہی کی پوجا کریں جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

نجاشی نے کہا جو کلام وہ تمہارے سامنے پڑھتے ہیں اس میں سے کچھ مجھے سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ عنکبوت وروم کی تلاوت کی جس کو سن کر نجاشی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے نجاشی کے ساتھی بولے۔ جعفرؓ یہ پاکیزہ کلام ہم کو کچھ اور سناؤ، حضرت جعفرؓ نے سورۂ کہف پڑھ کر سنائی۔ یہ حالت دیکھ کر عمرو بن عاصؓ نے چاہا کہ نجاشی کو جعفرؓ پر غصہ دلادے اس لئے کہنے لگا یہ لوگ عیسیٰؑ اور ان کی ماں کو گالی دیتے ہیں اس پر نجاشی نے جعفرؓ سے پوچھا تم عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کے بارے میں کیا کہتے ہو حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریمؑ کی تلاوت کی اور مریمؑ و عیسیٰؑ کے تذکرہ پر پہنچے تو نجاشی نے اپنے مسواک کا اتنا باریک ریزہ جیسے آنکھ میں تنکا پڑ جاتا ہے اٹھایا اور کہنے لگا۔

خدا کی قسم مسیحؑ اس بیان سے اتنے بھی زائد نہ تھے۔ پھر جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں سے خطاب کر کے کہا جاؤ میرے ملک میں تم محفوظ ہو یعنی امن کے ساتھ رہو جو تم کو گالی دے گا یا کچھ ستائے گا اس کو ڈنڈ بھگتنا ہو گا۔ پھر کہنے لگا تم خوش رہو کچھ اندیشہ نہ کرو۔ ابراہیمؑ کے گروہ کا آج بگاڑ نہیں ہو گا۔ عمرو نے پوچھا نجاشی ابراہیم کی جماعت کونسی ہے نجاشی نے جواب دیا یہی گروہ اور ان کا وہ آقا جس کے پاس سے یہ آئے ہیں اور ان کی پیروی کرنے والے۔ مشرکین نے اس بات کو ماننے سے انکار کیا اور خود دین ابراہیمی میں ہونے کا دعویٰ کیا پھر نجاشی نے وہ مال واپس کر دیا جو عمرو اور اس کا ساتھی لے کر آئے تھے اور کہا تمہارا یہ ہدیہ محض رشوت ہے اس پر اپنا قبضہ کر لو اللہ نے بغیر رشوت لئے مجھے بادشاہت عطا فرمائی ہے۔ حضرت جعفر کا بیان ہے کہ پھر ہم لوٹ آئے اور بہترین مکان اور بڑی عزت کی عمدہ مہمانی میں رہے اور ادھر اللہ نے اسی روز مدینہ میں رسول اللہ ﷺ پر حضرت ابراہیم کے دین پر ہونے کے نزاع کے متعلق یہ آیت نازل فرمادی ان اولی الناس بابراهیم۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ حضرت معاذ بن جبل حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عمار بن یاسر کو یہودیوں نے اپنے مذہب کی دعوت دی تو اس آیت کا نزول ہوا یعنی یہودیوں کی ایک لَوْ یُضِلُّوْنَكُمْ ؕ جماعت چاہتی ہے کہ تم کو تمہارے دین سے اغوا کر لے اور لوٹا کر کفر کی طرف لے جائے، لو بمعنی ان مصدری ہے لیکن لفظی عمل اَنْ کی طرح نہیں ہے ورنہ یضلون کا نون حذف کر دیا جاتا) پورا جملہ (بتاویل مفرد ہو کر) ودت کا مفعول ہے یا لو تمنائی ہے اس صورت میں یہ مودت کا بیان ہو جائے گا۔

وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ اور وہ سوائے اپنے نفسوں کے کسی کو گمراہ نہیں کرتے یعنی اس اغواء کا وبال انہی پر لوٹ کر پڑے گا اور عذاب دوگنا ہو جائے گا مسلمان تو بہر حال اللہ کی مدد کی وجہ سے ان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ اس مطلب کی بناء پر گمراہ کو گمراہ کرنا لازم نہیں آتا۔ [1]

وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝۶۹ اور ان کو احساس بھی نہیں کہ ان کی ضرر رسانی (کی یہ کوشش) لوٹ کر انہی پر پڑے گی۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ اے اہل کتاب تم اللہ کی ان آیات کا کیوں انکار کرتے ہو جو توریت وانجیل میں مذکور ہیں اور جن میں محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور آپ کے اوصاف کی صراحت ہے یا یہ مراد کہ تم

[1] آیت پر یہ اعتراض کیا جاسکتا تھا کہ یہودی تو پہلے ہی گمراہ ہیں، دوبارہ اپنے آپ کو گمراہ کرنے کا کیا معنی، گم کردہ راہ کو دوبارہ گمراہ بنانے کا مطلب ہی کیا ہو سکتا ہے، حضرت مولف نے توجیہ مطلب اس طرح کی کہ مسلمان تو گمراہ ہونے سے محفوظ ہیں لیکن یہودیوں کی ضلالت انگیزی ان کے لئے موجب عذاب ہے، پس یہودیوں پر دوہرا عذاب ہو گا ایک تو خود گمراہ ہونے کا دوسرا اضلالت انگیزی کی کوشش کا۔

marfat.com

آیات قرآن کا کیوں انکار کرتے ہو۔

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ حالانکہ تم آپس میں چھپ چھپ کر اقرار کرتے ہو کہ محمد ﷺ سچے نبی ہیں جن کا بیان توریت وانجیل میں موجود ہے یا یہ مطلب ہے کہ معجزات کو دیکھ کر تم جانتے ہو کہ یہ نبی برحق ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرتے ہو یعنی اصل تورات کی آیات کے ساتھ اپنی طرف سے لکھے ہوئے باطل کو ملادیتے ہو

وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ اور حق کو چھپاتے ہو یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے جو اوصاف توریت میں مذکور ہیں انکو چھپاتے ہو۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ اور جانتے ہوئے ایسا کرتے ہو یعنی جو کچھ کرتے ہو قصداً کرتے ہو۔ ع ۸ ۱۵

محمد ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن الصیف اور عدی بن زید اور حارث بن عوف نے باہم مشورہ کیا اور کہا کہ محمد اور ان کے ساتھیوں پر جو کچھ اتارا گیا ہے (ہمارے لئے مناسب ہے کہ) شروع دن میں تو ہم اس کو سچ مان لیں اور پچھلے دن میں انکار کر دیں، اس تدبیر سے مسلمانوں کو بھی اپنے دین میں شبہ پڑجائے گا۔ ممکن ہے ہماری طرح وہ بھی کرنے لگیں اور اپنے مذہب سے لوٹ جائیں۔ انہی کے بارے میں اللہ نے یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے وَاسِعٌ عَلِيْمٌ تک آیات نازل فرمائیں۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ
یعنی اہل کتاب کے ایک گروہ نے (آپس میں) کہا کہ دن کے اول حصہ میں اس قرآن پر جو مسلمانوں پر اترا ہے صرف زبان سے اپنے ایمان لانے کا اظہار کرو۔

وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ اور پچھلے دن میں اسکا انکار کردو اور کہہ دو کہ ہم نے اپنی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنے علماء سے مشورہ بھی لیا ہم پر واضح ہو گیا کہ محمدؐ وہ (نبی موعود) نہیں ہیں ہم کو ان کا جھوٹ کھل گیا (اسلئے ہم اس مذہب کو ترک کرتے ہیں)۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ شاید اس ترکیب سے مسلمان بھی اپنے دین میں شک کرنے لگیں اور یہ خیال کرکے کہ تم ان کے مذہب میں کوئی خرابی پا کر ہی لوٹے ہو اپنے دین سے لوٹ جائیں۔ بغوی نے حسنؒ بصری کا قول نقل کیا ہے کہ اس رائے پر خیبر اور دیہات عرینہ کے بارہ یہودی عالموں نے اتفاق کیا تھا۔ ابن جریر نے سدی کی روایت بھی اسی طرح نقل کی ہے اور مجاہد مقاتل اور کلبی کا قول ہے کہ یہ گفتگو قبلہ کے بارے میں ہوئی تھی جب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف مسلمانوں کا رخ پھیر دیا گیا تو یہودیوں کو یہ بات شاق ہوئی کعب ابن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ کعبہ کی تحویل کو (بظاہر) مان لو اور دن کے ابتدائی حصہ میں کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھ لو پھر دن کے آخری حصہ میں انکار کردینا اور اپنے قبلہ کی طرف لوٹ آنا

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اور دل سے نہ ماننا۔ اس کا عطف اٰمِنُوْا پر ہے یعنی دل سے نہ ماننا اور کسی کو سچا نہ جاننا۔

اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ مگر انہی لوگوں کو جو تمہارے دین پر چلیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ شروع دن میں اپنے ایمان کا اظہار انہی لوگوں پر کرنا جو پہلے تمہارے ہم مذہب تھے کیونکہ انہی سے سابق مذہب کی طرف لوٹنے کی زیادہ امید ہو سکتی ہے اور انہی کی اہمیت بھی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لَا تُؤْمِنُوْا، کفروا کا بیان ہو یعنی دن کے آخر حصہ میں اسلام کا انکار کردینا اور سوائے اپنے ہم مذہب لوگوں کے کسی کی بات کو نہ ماننا۔

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اے محمد آپ کافروں سے کہہ دیں کہ مسلمانوں کو جو ہدایت ملی ہے وہ خدا داد ہے تم پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھا نہیں سکتے اللہ تو اپنے نور کی تکمیل کر کے ہی رہے گا تمہاری مکاری مسلمانوں کو ضرر نہیں پہنچا سکتی یا یہ مطلب ہے کہ اے محمد آپ خود بھی اپنے دل کو سمجھا دیں اور مسلمانوں سے بھی کہہ دیں کہ یہ ہدایت خداداد ہے۔ کسی مکار کی مکاری تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

marfat.com

اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے یعنی (اے اہل کتاب) تم اس جلن میں یہ مکاری کرتے ہو کہ جیسی کتاب و حکمت تم کو دی گئی ہے ویسی ہی دوسروں کو بھی عطا کی جارہی ہے۔

اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ یحا جوا کی ضمیر اَحَدٌ کی طرف راجع ہے۔

احد اگرچہ لفظاً مفرد ہے لیکن معنیً جمع ہے کیونکہ دائرہ نفی میں واقع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن دوسرے لوگ خدا کے سامنے تم پر غالب آجائیں گے کیونکہ تم ہدایت پر نہیں اور وہ ہدایت پر ہوں گے۔ مراد یہ ہے کہ ان دونوں باتوں پر حسد کرنے سے تم کو مکاری پر آمادہ کیا مگر یہ مکر و حسد مناسب نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَنْ يُّؤْتٰۤى کا تعلق لَا تُؤْمِنُوْا سے ہو اس صورت میں تین طرح مطلب کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔

(۱) لِمَنْ تَبِعَ میں لام زائد ہے جیسے رَدِفَ لَكُمْ میں لام زائد ہے۔ اَحَدٌ، يُؤْتٰى کا فاعل ہے اور مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ سے پہلے ذکر کیا ہے یعنی اس بات کی تصدیق نہ کرنا، نہ اس امر کا اقرار کرنا کہ کسی کو بھی سوائے تمہارے ہم مذہب لوگوں کے ویسی کتاب و حکمت عطاء کی جاسکتی ہے جیسے تم کو دی گئی ہے اور نہ اس بات کا یقین کرنا کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے کوئی تم پر غالب آسکے گا۔ اس مطلب پر اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ میں او بمعنی واؤ ہوگا جیسے آیت لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا میں او، واؤ کے معنی میں ہے۔

(۲) لام انتفاع کے لئے ہے یا زائد ہے۔ استثناء مفرغ ہے یعنی مستثنیٰ منہ محذوف ہے یعنی کسی کے کہنے کا یقین واقرار نہ کرنا کہ تمہارے علاوہ کسی دوسرے کو بھی ویسی ہی چیز دی جاسکتی ہے جو تم کو دی گئی یا کوئی دوسرا خدا کے ہاں تم پر غالب آسکے گا ہاں اپنے ہم مذہب لوگوں کا یقین کرنا اور انہی کے لئے اقرار کرنا۔ (۳) لَا تُؤْمِنُوْا کا ترجمہ لا تظهروا ہے اور لام صلہ کا ہے یعنی سوائے اپنے ہم مذہب لوگوں کے کسی پر اپنے اس ایمان کا اظہار نہ کرنا کہ کسی کو تمہارا جیسا مذہب مل سکتا ہے یا خدا کے ہاں کسی کو تم پر غلبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ سوائے اپنے ساتھیوں کے دوسروں کو اپنے ایمان کی اطلاع نہ دینا کیونکہ اگر اس کا اظہار کردو گے تو مسلمانوں کا ایمان اور مضبوط ہو جائے گا اور مشرکوں کو ایمان کی رغبت ہو جائے گی۔

ان تمام توجیہات پر آیت قل ان الهدى هدى الله جملہ معترضہ ہوگا، جس کو کلام کے درمیان اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے داخل کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کی مکاری سے نہ ان کو کچھ فائدہ ہوگا نہ مسلمانوں کو ضرر۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ھدی الله، الهدى سے بدل ہو اور ان یوتی، ان الهدى هدى الله کی خبر ہو۔ اور او یحا جوکم میں اوْ، حتی کے معنی میں ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت یعنی خداداد ہدایت یہ ہے کہ جس کسی کو اللہ چاہے ویسی ہی کتاب دیدے جیسی تم کو دی گئی ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے وہ تم پر غالب آجائیں۔

بعض علماء نے کہا کہ یؤتی سے پہلے سیاقاً لا محذوف ہے جیسے آیت یبین الله لکم ان تضلوا میں ان لا تضلوا مراد ہے۔ اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ تم ان کی تصدیق نہ کرنا تاکہ جیسا تمہارا علم ہے ان کا بھی علم ویسا ہی نہ ہو جائے اور تمہاری علمی فضیلت ان پر قائم نہ رہے اور اس لئے بھی ان کی تصدیق نہ کرنا کہ خدا کے سامنے تمہارے مقابلہ میں ان کو غلبہ حاصل نہ ہو جائے اور وہ قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگیں کہ تم کو ہمارے دین کا حق ہونا معلوم تھا مگر تم ایمان نہیں لائے۔ مطلب کی یہ توجیہ ابن جریج کے قول پر ہوگی مگر سب سے زیادہ پیچ در پیچ توجیہ ہے۔

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اے محمد ﷺ یہودیوں سے کہہ دیجئے کہ فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے تمہارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے پس اسی نے محمد اور ان کے ساتھیوں کو فضیلت عطا فرمائی ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۚ﴿۷۳﴾ اور اللہ کا فضل وسیع ہے اور وہی ان لوگوں سے بخوبی واقف ہے جو فضل کے اہل ہیں۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وہی اپنی رحمت و نبوت کے لئے جس کو

marfat.com

چاہتا ہے، مخصوص کرلیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اور بعض اہل کتاب یعنی عبداللہ بن سلام اور ان جیسے وہ اہل کتاب جو مسلمان ہو گئے تھے

مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں کثیر مال بھی دیدو تو وہ

یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ اپنی دیانت وایمانداری کی وجہ سے پورا پورا مال تم کو واپس کردیں۔

بغوی نے بسلسلہ جویبر از ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن سلام کے پاس بارہ سواوقیہ سونا امانت رکھا اور حضرت عبداللہ نے وہ امانت پوری ادا کردی (گویا یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق نازل ہوئی)۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں یعنی کعب بن اشرف اور اس جیسے دوسرے یہودی۔ کذا قال مقاتل۔

اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ کہ اگر ان کے پاس تم ایک دینار امانت رکھو تو وہ واپس نہ دیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ کسی قریشی نے فنحاص بن عازوراء یہودی کے پاس ایک دینار امانت رکھا مگر فنحاص نے بے ایمانی کرلی۔

اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآىٕمًا ؕ مگر جب کہ تم اس پر کھڑے رہو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قائما علیہ سے مراد ہے مُلِحًّا یعنی جب تک کہ تم سخت تقاضا نہ کرو اور تقاضے پر جم نہ جاؤ اور عدالت سے چارہ جوئی نہ کرو وہ امانت واپس نہیں کرتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ یعنی امانت واپس نہ کرنے اور خیانت کو حلال سمجھ لینے کا سبب یہ ہے کہ کافر یہودی کہتے ہیں کہ جو اہل کتاب نہیں ہیں، ان کے معاملہ میں اللہ کے ہاں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ یہودی کہتے تھے کہ عرب کا مال ہر طرح ہمارے لئے حلال ہے کیونکہ یہ ہمارے مذہب پر نہیں ہیں، ہماری کتاب میں ان کے حقوق ہی نہیں ہیں بلکہ یہودی غیر مذہب والوں پر ہر ظلم کو اور ان کی ہر حق تلفی کو حلال جانتے تھے۔

وَیَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ اور وہ اللہ پر دانستہ یہ دروغ بافی کرتے ہیں کہ اللہ نے عرب کا مال ان کے لئے حلال کردیا ہے۔

بَلٰى یعنی جس طرح یہودی کہتے ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ مؤمنین کے معاملہ میں بھی ان کی گرفت ہوگی یا یہ مطلب ہے کہ (کافروں کے) مال کے بچاؤ کی صرف دو صورتیں ہیں، مسلمان ہو جانا یا مسلمانوں کا ذمی بن جانا (یعنی یہودی الٹا سمجھے ہیں کہ مسلمان کے مال کو اپنے لئے مباح جانتے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے، ان کا مال مسلمانوں کیلئے مباح ہے ہر طرح سے لینا جائز ہے، بچاؤ کی صرف دو صورتیں ہیں، مسلمان ہو جانا یا جزیہ دینا) حضرت ابو موسیٰ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے لوگوں سے لڑنے کا اس وقت تک حکم دیا گیا ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اقرار کرلیں اور ٹھیک ٹھیک نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر وہ ایسا کرلیں، تو ان کی جانیں اور ان کے مال سوائے اسلامی حقوق کے ہر طرح مجھ سے محفوظ ہو جائیں گے اور (اندرونی) حساب فھی اللہ کے ذمہ ہے (کہ انہوں نے یہ اقرار توحید ورسالت دل کے یقین کیساتھ کیا ہے یا نفاق کیساتھ) سلیمان بن بریدہ نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے ایک طویل حدیث بیان کی ہے جس میں یہ (حکم) بھی مذکور ہے کہ اگر وہ یعنی کفار اسلام سے انکار کریں تو ان سے جزیہ طلب کرنا، اگر دیدیں تو لے لینا اور (جنگ کو) ان سے روک دینا، متفق علیہ۔

مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ جس کسی نے بھی اپنا عہد پورا کیا یا جو بھی اپنا عہد پورا کرے مَن شرطیہ ہے یا موصولہ اور عہد سے مراد ہے مالک مال سے واپسی امانت کا کیا ہوا وعدہ یا اللہ کا وہ حکم جو توریت میں اللہ نے دیا تھا کہ تمام انبیاءؑ پر اور محمد ﷺ پر اور قرآن پر ایمان لانا اور امانت ادا کرتے رہنا۔ اول مطلب پر عَهْدِهٖ کی ضمیر مَنْ کی طرف راجع ہے اور دوسرے مطلب پر اللہ کی طرف۔

وَاتَّقٰى اور کفر وخیانت سے بچتا رہا۔ تو اللہ اس سے محبت کرے گا۔

marfat.com

فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷۶ کیونکہ اللہ تقویٰ والوں کو پسند کرتا ہے (اور ایسے لوگ تقویٰ والے ہیں)
يُحِبُّهُمْ کی جگہ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ کہنے میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ تمام امور کا مدار تقویٰ پر ہے۔ وفاء عہد اور تمام فرائض کی ادائیگی اور ممنوعات سے اجتناب تقویٰ ہی کی شاخیں ہیں۔ اسی عموم کی وجہ سے بجائے ضمیر کے المتقین کو ذکر کیا۔ بلٰی بجائے خود ایک جملہ کا قائم مقام ہے اور اس جملہ کی تاکید مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ پورا جملہ کر رہا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار (خصلتیں) ہیں جس کے اندر یہ چاروں ہوں گی وہ خالص (عملی) منافق ہوگا اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک ہوگی وہ تاوقتیکہ اس کو ترک نہ کر دے نفاق کی ایک خصلت اس میں رہے گی جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، بات کرے تو جھوٹی کرے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، کسی سے جھگڑا ہو تو بیہودہ بکے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے تو جھوٹی کرے وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ مسلم کی روایت میں حدیث کے اتنے الفاظ زائد ہیں کہ خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعویدار ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا صحیحین میں ابو وائلؒ کی وساطت سے حضرت عبداللہ کی روایت منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی مسلمان کا مال مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا تو اللہ کے سامنے اس کی پیشی ایسی حالت میں ہوگی کہ اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔ اس کی تصدیق میں آیت مذکورہ آخر تک نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہؓ یہ حدیث بیان کر چکے تو حضرت اشعثؓ بن قیس باہر سے اندر آئے اور پوچھا ابو عبدالرحمٰنؓ نے تم سے کیا حدیث بیان کی تھی لوگوں نے بتا دیا کہ یہ یہ بیان کر رہے تھے حضرت اشعثؓ نے کہا یہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ میرا ایک کنواں میرے چچا کے بیٹے کی زمین میں تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اپنے گواہ پیش کرو۔ ورنہ اس کی قسم کو مانو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ تو اس پر قسم کھا لے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے مسلمان آدمی کا مال مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائی اور (دانستہ) وہ قسم میں جھوٹا ہو تو قیامت کے دن جب اللہ کی پیشی میں جائے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔

بخاری کے طریق سے بغوی نے اپنی سند سے یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے لیکن ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایت میں حضرت اشعث بن قیس کا قول اس طرح منقول ہے کہ میرے اور ایک یہودی کے درمیان کچھ زمین کا نزاع تھا یہودی (میرے حق کا) منکر تھا۔ میں اس کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گیا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کیا تیرے پاس گواہ ہیں، میں نے عرض کیا نہیں، آپ نے یہودی سے فرمایا تو قسم کھا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ تو قسم کھا لے گا اور میرا مال لے جائے گا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ بخاری نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص کچھ تجارتی سامان بازار میں لایا اور کسی مسلمان کو پھانسنے کے لئے اللہ کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ مجھے اس کی اتنی قیمت ملتی تھی حالانکہ اس کو اس کی بیان کردہ قیمت نہیں ملتی تھی (یا یوں ترجمہ کیا جائے کہ اس نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں نے اس سامان کی اتنی قیمت دی ہے یعنی اتنے کو خریدا ہے حالانکہ اس نے اتنی قیمت نہیں دی تھی) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حافظ ابن حجرؒ نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں (کہ ایک کو صحیح ماننے کی صورت میں دوسری کو غلط ماننا ہی پڑے) بلکہ ممکن ہے کہ نزول آیت کے دونوں سبب ہوں (ایک واقعہ بھی ہوا ہو، اور دوسرا بھی)۔

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۝ سے مراد ہے متاع دنیا خواہ قلیل ہو یا کثیر کیونکہ جنت کی نعمتوں کے مقابل تو دنیا کا کثیر سامان بھی قلیل ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اداء امانت کے عہد اور جھوٹی قسموں کے عوض متاع دنیا حاصل کرتے ہیں۔ ابن جریر نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت کا نزول کعب بن اشرف، حیی بن خطب اور ان جیسے دوسرے یہودیوں کے حق میں ہوا جو توریت میں

marfat.com

نازل شدہ اوصاف محمدی کو چھپاتے بدلتے اور ان کی جگہ دوسری چیزیں درج کیا کرتے تھے اور قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ اس تبدیل و تحریف سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان کو کھانے کو ملتا ہے اور جو رشوتیں وہ اپنے متبعین سے لیتے رہتے تھے ان میں فرق نہ آئے۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے آیت میں اس سبب نزول کا بھی احتمال ہے لیکن اصل سبب نزول وہی ہے جو صحیح حدیث میں آیا ہے۔

میں کہتا ہوں آیت کی رفتار اور کلام کا سیاق ابن جریر از عکرمہ کی روایت کی صحت کو چاہتا ہے اور جس طرح دونوں مذکورہ بالا حدیثوں میں باہم تضاد نہیں ہے اسی طرح ان حدیثوں سے عکرمہ کی روایت کا بھی تضاد نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اسباب نزول تینوں ہوں۔ علقمہ نے اپنے والد حضرت وائل کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو آدمی حاضر ہوئے ایک حضر موت کا دوسرا کندہ کا۔ حضرمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے میری زمین چھین لی۔ کندی نے جواب دیا وہ میری زمین ہے میرے قبضہ میں ہے اس میں کسی کا حق نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرمی سے فرمایا کیا تمہارے پاس گواہ ہیں اس نے کہا نہیں فرمایا تو تم کو اس سے قسم لینے کا حق ہے۔ حضرمی نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ شخص تو علانیہ فاسق ہے کسی چیز سے اس کو باک نہیں۔ اس کو قسم کھانے کی پروا بھی نہ ہوگی۔ فرمایا اس کے علاوہ اس سے تم کو کوئی حق نہیں۔ چنانچہ کندی جب قسم کھانے چلا اور پشت پھیری تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے ناحق مال کھانے کے لئے قسم کھالی تو اللہ کی پیشی کے وقت خدا تعالیٰ اس سے رخ پھیرے ہوئے ہوگا۔ رواہ مسلم۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ کندی کا نام امرء القیس بن عابس اور اس کے حریف کا نام ربیعہ بن عبدان تھا۔ ابو داؤد کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی قسم کھا کر (کسی کا) کوئی مال مار یگا وہ اللہ کی پیشی کے وقت کوڑھی ہوگا۔ یہ سن کر کندی نے قسم کھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی اس پر امرء القیس (یعنی کندی) نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور اپنے حریف کے حق کا اقرار کر لیا اور زمین اس کو دے دی۔

فَلِيلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ان لوگوں کا راحت آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا جس نے قسم کھا کر کسی مسلمان شخص کا حق مارا اللہ نے اس کیلئے دوزخ لازم کر دی اور جنت اس پر حرام کر دی۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگرچہ تھوڑی سی چیز ہو فرمایا اگرچہ درخت پیلو کی ایک ٹہنی ہو۔ رواہ مسلم۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ آخری لفظ تین مرتبہ فرمایا۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور قیامت کے دن اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا، بعض علماء نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ ان سے ایسا کلام نہیں کرے گا جس سے ان کو خوشی ہو اور نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا، صحیح یہ ہے کہ (آیت کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ) بطور کنایہ غضبناک ہونا اور رخ پھیر لینا مراد ہے گویا اس آیت کی تفسیر ہے جو حضرت عبد اللہ اور حضرت اشعت کی روایت سے ذکر کر دی گئی ہے کہ لقی اللہ وهو عليه غضبان، اور حضرت وائل کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ ليلقين الله وهو عنه معرض۔

وَلَا يُزَكِّيهِمْ اور اللہ ان کو پاک نہیں بنائے گا یعنی ان کی (پاکی کی) تعریف نہیں کریگا (یہ مطلب ضعیف ہے) صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ ان کا گناہ معاف نہیں کریگا کیونکہ یہ بندوں کا حق ہے اس کا بدلہ تو ضرور ملنا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اعمالناموں کی تین مدیں ہیں ایک مدوہ ہے جس کی پرواہ (سختی کے ساتھ) اللہ نہیں کریگا، دوسری مدوہ ہے جس میں سے کوئی چیز (بغیر عوض کے) نہیں چھوڑے گا، تیسری مدوہ ہے جس کو معاف نہیں فرمائے گا، جس مد کو معاف نہیں فرمائے گا وہ تو شرک ہے اور جس کی مد کی کوئی خاص پروا نہیں کرے گا وہ خود انسان کا اپنی ذات پر ظلم ہے یعنی وہ حقوق جو براہ راست خدا کے انسان پر ہیں ان کو ادا نہ کرنا (جیسے) کوئی روزہ ترک کر دیا یا کوئی نماز چھوڑ دی اور وہ مد جس (کے اندراجات) میں سے کوئی چیز (بغیر بدلہ کے) نہیں چھوڑے گا وہ بندوں کی باہم حق تلفیاں ہیں اس میں لامحالہ بدلہ دینا ہوگا۔ رواہ

marfat.com

الحاکم واحمد۔
طبرانی نے بھی ایسی ہی حدیث حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور بزارؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ اگر اوصاف رسول اللہ ﷺ کو چھپانے کی وجہ سے آیت کا نزول یہودیوں کے متعلق تسلیم کیا جائے تو عدم مغفرت کا حکم ان کے کفر کی وجہ سے قرار پائے گا۔
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۷﴾ اور انہی کے لئے دردناک عذاب ہوگا، یعنی ان کے اعمال کی سزا میں حضرت ابوذر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ کلام نہیں کریگا، اور نہ ان کی طرف نظر فرمائے گا اور نہ ان کو پاک کریگا اور انہی کیلئے دردناک عذاب ہوگا، حضور ﷺ نے یہ آیت تین بار تلاوت فرمائی۔ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ وہ ناکام اور نامراد ہوں گے مگر ہیں کون لوگ، فرمایا (غرور سے) تہبند نیچی لٹکانے والا (یعنی ٹخنوں سے نیچے) اور وہ احسان جتلانے والا کہ جب کچھ دیتا ہے تو اس کا احسان ضرور جتلاتا ہے اور جھوٹی قسم کھا کر اپنے مال کی فروخت کو فروغ دینے والا، رواہ مسلم واحمد وابوداؤد والترمذی والنسائی۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین ہیں جن سے اللہ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور انہی کے لئے دردناک عذاب ہوگا، ایک وہ شخص جس کے پاس بیابان میں ضرورت سے زائد پانی ہو اور وہ دوسرے مسافر کو نہ دے، ایک وہ شخص جس نے عصر کے بعد (جب کہ بازار میں رونق ہوتی ہے) کچھ سامان تجارت کا فروخت کرنا چاہا اور اللہ کی قسم کھا کر کہ میں نے یہ اتنے کو خرید اہے حالانکہ بیان کردہ قیمت پر اس نے نہیں خرید اتھا اور لوگوں نے اس کی بات سچ مان لی، اور ایک وہ آدمی جس نے امام کی بیعت کی اور صرف دنیا کے لئے کی اگر امام نے کچھ دنیا اسے دے دی تو وفادار رہا اور نہ دی تو اس نے بیعت کی وفا نہ کی (یعنی غداری کی) رواہ اصحاب الستہ واحمد۔
بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت اس طرح ہے کہ تین ہیں جن سے اللہ قیامت کے دن بات بھی نہیں کرے گا اور نہ ان پر نظر فرمائے گا۔ ایک وہ شخص جس نے کسی سامان کے فروخت پر جھوٹی قسم کھا کر کہا کہ میں نے یہ اتنے کو لیا ہے حالانکہ جو قیمت اس نے دی تھی اس سے بتائی ہوئی قیمت زیادہ تھی، دوسرا وہ شخص جس نے کسی مسلمان کا مال مارنے کے لئے عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائی، تیسرا وہ آدمی جس نے اپنی ضرورت سے بچا ہوا پانی (حاجت مند مسافر کو دینے سے) روک لیا (قیامت کے دن) اللہ اس سے فرمائے گا آج میں تجھ سے اپنا فضل روکتا ہوں جس طرح تو نے اپنے صرف سے بچی ہوئی وہ چیز روک رکھی تھی جو تو نے بنائی بھی نہ تھی، (یعنی پانی)۔
طبرانی اور بیہقی نے تین آدمیوں کی تفصیل حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس طرح نقل کی ہے ایک بوڑھا زانی، دوسرا شیخی خورا مفلس، تیسرا وہ شخص جس نے اپنا سرمایہ ہی اس بات کو بنا رکھا ہے کہ کچھ بیچے گا تو قسم کھا کر اور خریدے گا تو قسم کھا کر، طبرانی نے حضرت عصمہ بن مالک کی روایت سے بھی ایسی ہی مرفوع حدیث نقل کی ہے۔
وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا بے شک اہل کتاب کا ایک گروہ ہے یعنی کعب بن اشرف حیی بن اخطب، ابویاسر، مالک بن الصیف اور سفنہ بن عمرو شاعر۔
يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ جو (اللہ کی) کتاب پڑھتے وقت اپنی زبانوں کو نازل شدہ الفاظ سے اپنے اختراع کردہ الفاظ کی طرف پھیر دیتا ہے (یعنی نازل شدہ الفاظ کی جگہ خود ساختہ عبارت کو پڑھتا ہے)۔
لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ تاکہ اے مسلمانو تم اس کی پڑھی ہوئی عبارت کو (اللہ کی اصل) کتاب کا جزو سمجھ لو۔
وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ حالانکہ وہ کتاب اللہ کا حصہ نہیں ہے (بلکہ خود پڑھنے والے کا یا اس کے ساتھیوں کا بنایا ہوا ہے)۔
وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (اور صرف اسی پر بس نہیں کرتے کہ آہستہ سے پڑھتے چلے جائیں تاکہ مسلمان غلط فہمی میں پڑ جائیں بلکہ) وہ صراحتہً کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس (یونہی) آیا ہے حالانکہ وہ اللہ کی

marfat.com

طرف سے (آیا ہوا) نہیں ہے۔

وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ یہ لوگ دانستہ اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں یہ جملہ تاکید مزید ہے اور بالارادہ دروغ بندی کرنے کی محکم صراحت ہے، ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ سب کے حق میں نازل ہوئی تھی کیونکہ ان سب نے توریت وانجیل کو بگاڑ لیا تھا اور کتاب میں اس (عبارت) کو ملالیا تھا جو کتاب کی نہ تھی۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ

ابن اسحاق، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نیز دلائل میں بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ (جب علماء یہود اور نجران کے نصاریٰ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جمع ہوئے اور آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو) ابو رافع قرظی (مدنی) نے رسول اللہ ﷺ سے کہا محمد کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری ایسی ہی پوجا کریں جیسے نصاریٰ عیسیٰ کی کرتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کی پناہ کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو پوجنے کا میں حکم دوں، اللہ نے اس کے لئے مجھے نہیں بھیجا نہ اس کا مجھے حکم دیا اس پر اللہ نے آیت ماکان لبشر سے مسلمون تک نازل فرمائی۔

عبد نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حسنؒ بصری نے فرمایا مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کو اسی طرح سلام کرتے ہیں جیسے آپس میں ایک دوسرے کو کرتا ہے (آپ ﷺ کو سلام کرنے کا کوئی امتیاز نہیں) تو کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کیا کریں، فرمایا نہیں، بلکہ اپنے نبی کی عزت کرو اور اہل حق کا حق پہنچانو، اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مقاتل اور ضحاک کا بیان ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے کہا تھا کہ عیسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ان کو رب بنالیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی محمدؐ ہوں یا عیسیٰ کسی بشر کے لئے جائز نہیں۔ بشر انسان کی طرح اسم جنس ہے مذکر مونث مفرد جمع سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کبھی اس کا تثنیہ بھی آتا ہے جیسے آیت انومن لبشرین مثلنا میں آیا ہے بشر کی جمع ابشار آتی ہے (قاموس) بغوی نے لکھا ہے کہ بشر جمع ہے اس کا اطلاق انسانوں کی جماعت پر ہوتا ہے اس لفظ سے واحد نہیں آتا جیسے قوم، جیش اور واحد کے مقام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے، حکم سے مراد ہے حکمت و سنت یا حکومت۔

ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ يَقُولُ کا عطف يُؤْتِيَ پر ہے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی توحید کو چھوڑ کر تم میرے پرستار بن جاؤ (یعنی میری بھی پوجا کرو) اس آیت میں اشارہ ہے کہ عبادت خداوندی کا حصر صرف توحید میں ہے اگر غیر اللہ کو عبادت میں شریک کیا تو عبادتُ اللہ نہیں ہو سکتی، مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے تو عطاء کتاب و نبوت ہو اور بندہ کی طرف سے غیر اللہ کی عبادت کا حکم ہو ایسا ہونا ممکن نہیں (کوئی نبی غیر اللہ کی پوجا کا حکم نہیں دے سکتا کیونکہ) نبوت اور غیر اللہ کی عبادت کا حکم دو متضاد چیزیں ہیں اول دعوت توحید ہے اور دوسری دعوت شرک۔

وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بلکہ وہ کہتا ہے کہ تم ربانی ہو جاؤ، یعنی احکام خداوندی کے مبلغ۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ربانیین کا تفسیری ترجمہ کیا، فقہاء، علماء۔ قتادہ نے حکماء، علماء کہا۔ سعید بن جبیرؒ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ ربانیین سے مراد ہیں فقہاء معلمین۔ عطاءؒ نے ترجمہ کیا باوقار دانشمند علماء جو اللہ کی طرف سے مخلوق کے خیر خواہ ہوں۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا باعمل عالم۔ ابو عبیدؒ نے کہا میں نے ایک عالم سے سنا کہ ربانی وہ شخص ہے جو حلال حرام اور امر و نہی کو جانتا ہو امت کے گزشتہ اور آئندہ احوال سے واقف ہو۔ بعض نے کہا ربانی کا درجہ حبر سے اونچا ہے حبر تو عالم کو کہتے ہیں اور ربانی اس عالم کو کہتے ہیں جو صاحب بصیرت بھی ہو۔

تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ ربانی اس شخص کو کہتے ہیں جو علم، عمل، اخلاص اور درجات قرب میں خود بھی کامل ہو اور

marfat.com

کامل کر بھی ہو کیونکہ رَبَّ (ماضی) یَرُبُّ (مضارع) رَبًّا (مصدر) کا معنی ہے کسی چیز کی درستی اور تکمیل کرنا، ربانی علم کی ترقی اور تکمیل کرتے ہیں اور متعلمین کو تربیت دیتے ہیں، بڑے بڑے علوم سے چھوٹے چھوٹے علوم کی تدریجی تعلیم دیتے ہیں اسی لئے ان کو ربانی کہا جاتا ہے ایک روایت میں حضرت علیؓ کا قول آیا ہے کہ رَبَّانِیِّیْنَ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال سے علم کی تکمیل کرتے ہیں یہ ربّان کی جمع ہے جیسے ریّان، عطشان، یاء نسبت ملادی گئی ہے۔

بعض نے کہا ربانی وہ شخص ہے جو رب کی طرف منسوب ہو (اللہ والا) الف نون کو مبالغہ کے لئے زیادہ کر دیا گیا ہے (بڑا اللہ والا) جیسے لحیانی بڑی گھنی لمبی داڑھی والا اور (قبانی بڑی ہوئی گردن والا اگر مبالغہ مقصود نہ ہو اور صرف لحیہ اور قربہ کی طرف نسبت کرنی غرض ہو تو لحی اور رقبی کہا جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کی جس روز وفات ہوئی تو محمد بن حنفیہ نے فرمایا اس امت کے ربانی کا انتقال ہو گیا۔

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ یعنی تم ربانی ہو جاؤ اس وجہ سے کہ تم کتاب کے عالم اور معلم ہو اور ہمیشہ پڑھتے اور یاد رکھتے ہو۔ تَدْرُسُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ہمیشہ کتاب کو پڑھتے اور یاد رکھتے ہو، ممکن ہے کہ لوگوں کے سامنے پڑھنا یعنی لوگوں کو پڑھانا مراد ہو، صحاح میں ہے دَرَسَ الدَّارُ یعنی گھر مٹ گیا (او سکے) نشانات باقی رہ گئے، درس الکتاب والعلم کتاب کو اور علم کو پڑھا یعنی کتاب اور علم کا اثر اپنی یادداشت میں لے لیا اور چونکہ یادداشت ہمیشہ پڑھتے رہنے سے ہوتی ہے اس لئے ہمیشہ پڑھتے رہنے کی تعبیر لفظ درس سے کی اللہ نے فرمایا ودرسوا مافیہ، وبما کنتم تدرسون حاصل مراد یہ ہے کہ چونکہ تم کتاب کو پڑھتے پڑھاتے اور جانتے سکھاتے ہو اس لئے ربانی ہو جاؤ کیونکہ جاننے کا فائدہ عمل کرنا اور اپنی اصلاح کرنا ہے اور تعلیم کی غرض دوسروں کی اصلاح ہے مگر دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح لازم ہے تاکہ آیت لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ اور اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے مصداق نہ ہو جاؤ۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اور نہ اس کیلئے یہ جائز ہے کہ ملائکہ اور انبیاء کو رب بنا لینے کا تم کو حکم دے بلکہ وہ تو اس بات کی ممانعت کرتا ہے لا یامر کا عطف یَقُوْلَ پر ہے اور ماکان لبشر میں جو نفی کا معنی ہے اس کی تاکید کے لئے لا کو زائد کیا گیا ہے۔ قریش اور صابیوں کا فرقہ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتا تھا یہودی عزیز کو اور عیسائی مسیح کو خدا کی اولاد کہتے تھے (اس کی تردید میں فرمایا کہ قریش اور یہود و نصاریٰ کی طرح) کسی ایسے شخص کے لئے جس کو اللہ نے نبی بنایا ہو اپنی پوجا کا یا ملائکہ و انبیاء کو اولاد خدا کہنے کا حکم دینا جائز نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لا زائد نہ ہو اس وقت مطلب اس طرح ہو گا کہ اپنی پوجا کا حکم دینا اس کے لئے جائز نہیں اور نہ وہ ملائکہ و انبیاء کو ارباب بنانے کا حکم دیتا ہے بلکہ اس کی ممانعت کرتا ہے کہ خدا کی مثل ملائکہ اور انبیاء کو رب بنایا جائے۔

اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ استفہام تعجب و انکار کے لئے ہے (یعنی تعجب ہے کہ وہ تم کو کفر کا حکم دے ایسا نہیں ہو سکتا) کفر سے مراد ہے غیر اللہ کی پوجا۔

بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ اس کے بعد کہ تم اللہ کے فرمانبردار ہو اگر یہ خطاب ان مسلمانوں کو ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے آپ کو سجدہ کرنے کی خواہش کی تھی جیسا کہ حسن بصری کی روایت ہے۔ تو آیت کا مطلب صاف ہے اسی طرح اگر یہ نصاریٰ کے اس قول کی تردید ہو کہ حضرت عیسیٰؑ نے حکم دیا تھا کہ ہم ان کو رب بنالیں تب بھی مطلب میں کوئی خفاء نہ ہو گا کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں عیسائی مسلمان تھے لیکن اگر مخاطب وہ یہود و نصاریٰ ہوں جنہوں نے حضورؐ سے کہا تھا کہ محمدؐ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری پوجا کریں تو (آیت کا مطلب واضح نہ ہو گا کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے) اس وقت کلام کی توجیہہ اس طرح ہو گی کہ یہ خطاب بطور فرض ہے یعنی اگر مان لیا جائے کہ تم مسلمان ہو جاؤ گے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کو مان لو گے تو کیا تمہارے مسلمان ہونے کے بعد وہ غیر اللہ کی پرستش کا تم کو حکم دیں گے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ یعنی اللہ نے ہر نبی سے پختہ وعدہ لے لیا تھا کہ اپنے بعد آنے والے نبی کی تصدیق

ع ۸ ۱۶

کرنا اور اپنی امت کو بھی حکم دینا کہ وہ آنے والے نبی کی پیروی کریں۔ حضرت ابن عباسؓ نے جو تشریح کی ہے اس کا یہی مطلب ہے، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ آدمؑ اور آدمؑ کے بعد ہر نبی سے اللہ نے وعدہ لے لیا تھا کہ تم اور تمہاری امت محمد کی تصدیق کرنا اور اگر تمہاری زندگی میں محمد کی بعثت ہو جائے تو تم سب ان کی مدد کرنا (گویا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر رسول اللہ ﷺ سے عام پیغمبر مراد ہیں اور حضرت علیؓ کی تشریح پر صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک مراد ہے)۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ میثاق النبیین سے میثاق اہل کتاب مراد ہے یعنی بنی اسرائیل سے اللہ نے عہد لے لیا تھا، اس صورت میں یا مضاف محذوف مانا جائے گا یعنی میثاق اولاد النبیین، یا بطور استہزاء میثاق اہل کتاب کو میثاق انبیاء فرمایا کیونکہ اہل کتاب کا خیال تھا کہ ہم اہل کتاب ہیں ہم محمدؐ سے زیادہ نبوت کے مستحق ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ میثاق کی اضافت فاعل کی طرف ہے انبیاء نے اپنی امتوں سے عہد لیا تھا۔ اس توجیہ کی تائید حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کی قرأت سے ہوتی ہے ان دونوں حضرات کی قرآت میں مِیۡثَاقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ ہے (النبیین نہیں ہے)۔

مگر صحیح مطلب وہی ہے جو سب سے پہلے بیان کر دیا گیا، وہی متواتر قرأت کے موافق ہے پس اللہ نے حضرت موسیٰ سے عہد لیا تھا کہ تم خود عیسیٰؑ کی تصدیق کرو اور اپنی امت کو بھی حکم دو کہ وہ عیسیٰؑ پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰؑ سے بھی عہد لیا تھا کہ تم خود محمد ﷺ کی تصدیق کرو اور اپنی امت کو بھی حکم دو کہ وہ بھی ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں، اسی لئے تو حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا، یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ (پھر قرأت ابن مسعودؓ اور قرأت متواترہ میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ لیڈر کا عہد اس کے متبعین کا عہد ہوتا ہے، (جب انبیاء سے عہد لے لیا تو بس ان کی امتوں سے بھی لے لیا)۔

لَمَاۤ اٰتَیۡتُکُمۡ حمزہ کی قرأت میں لام جارہ مکسورہ ہے اور ما مصدریہ یا موصولہ، متواتر قرأت فتح لام کے ساتھ ہے، لام تمہید قسم کے لئے ہے کیونکہ میثاق لینے کا معنی ہی قسم لینا ہے۔ اس صورت میں ما یا شرطیہ ہے اور لتومنن بہ جواب قسم بھی ہے اور جزاء شرط بھی، اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ اللہ نے پیغمبروں سے قسم لے لی تھی کہ اگر میں تم کو کتاب عطا کروں پھر اس کتاب کی تصدیق کرنے والا رسول تمہارے سامنے آجائے تو تم اس کی تصدیق کرنا، یا ما موصولہ ہے اور من کتاب اس کا صلہ ہے اور لتؤمنن بہ خبر ہے یعنی اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ جو کتاب میں تم کو دی۔

مِّنۡ کِتٰبٍ وَّ حِکۡمَۃٍ حکمت سے مراد ہے سنت یا دین کی سمجھ۔

ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمۡ مَا مَعَکُمۡ سے مراد ہے کتاب۔ بعض علماء کے نزدیک رسول سے مراد ہے صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات کیونکہ تمام انسانوں کے لئے آپ ہی کی بعثت ہوئی تھی۔ حضرت ابن عمرؓ کے قول سے یہی مطلب اخذ کیا گیا اور حضرت علیؓ کے کلام میں تو اس کی صراحت ہے۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ لفظ عام ہے تعیین کی کوئی دلیل نہیں ہے گذشتہ امتیں ہوں یا آنے والی سب کے لئے تمام انبیاء پر ایمان لانا واجب ہے اور لا نفرق بین احد من رسلہ کہنا لازم ہے (دین کی وحدت اور عدم تفرق کے متعلق) اللہ نے فرمایا شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے قول میں رسول اللہ ﷺ کے ذکر کی خصوصیت صرف اہل کتاب کو قائل کرنے کے لئے ہے، کیونکہ اہل کتاب سے کلام صرف رسول اللہ ﷺ کے متعلق تھا۔ کسی دوسرے پیغمبر کے متعلق نہ تھا لیکن اس خصوصیت کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اس جگہ کوئی دوسرا پیغمبر مراد ہی نہیں ہے یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق خاص طور پر اخذ میثاق آپ کی فضیلت کے اظہار کے لئے ہو مصدق لما معکم کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس رسول کی تکذیب سے کتاب سابق کی تکذیب لازم آتی ہے۔

لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ تم ضرور اس رسول کی تصدیق کرنا۔

marfat.com

وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط اور اگر تم کو اس کا زمانہ مل جائے تو خود اس کی مدد کرنا اور اگر وہ تمہارے زمانہ میں نہ آتے تو اپنے متبعین کو نصیحت کر دینا کہ جو اس کے زمانہ میں ہو وہ مدد کرے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کی پشت سے (تمام) ذریات کو بر آمد کیا، جن میں انبیاء چراغوں کی طرح (روشن) تھے اور سب سے محمد ﷺ کے بارہ میں میثاق لیا۔

قَالَ واذاخذالله سے پہلے اگر لفظ اذکر محذوف قرار دیا جائے تو پورا جملہ اخذالله اس کا مفعول ہوگا ورنہ قال کا مفعول ہو گا یا قال علیحدہ جملہ ہے جس میں میثاق لینے کی تفصیل ظاہر کی گئی ہے۔

ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ط اللہ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اپنے اس اقرار پر میرا عہد لے لیا، یہ استفہام (سوالیہ نہیں ہے بلکہ) تقریری ہے (اقرار پر جمانے کے لئے ہے)۔

قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط انبیاء نے یا انبیاء اور ان کی امتوں نے بروز میثاق کہا ہم نے اقرار کیا۔

قَالَ فَاشْهَدُوْا اللہ نے پیغمبروں سے فرمایا تم اپنے اور اپنے متبعین کے اس اقرار کی قیامت کے دن شہادت دینا۔

وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۱﴾ اور میں بھی تمہارے اور ان کے اقرار پر تمہارے ساتھ شہادت دوں گا۔

فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ اب اس اقرار کے بعد جس نے پیغمبروں کے اتباع سے اپنا رخ پھیرا۔ یہ رخ پھیرنے والے یہود و نصاریٰ ہیں۔

فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ پس وہی ایمان سے خارج یعنی کافر ہیں۔ یہ آیت صراحۃً بتا رہی ہے کہ انبیاء اور ان کی امتوں سے سب سے عہد لیا گیا تھا مگر پیشواؤں کے ذکر کے بعد متبعین کے ذکر کی ضرورت نہ تھی اس لئے پیشواؤں ہی کے ذکر پر اکتفا کیا۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کے طلب گار ہیں اس جملہ کا عطف فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الفاسِقُوْنَ پر ہے اور استفہام انکاری ہے یا فعل محذوف پر عطف ہے اصلی عبارت اس طرح تھی ایفسقو فغیر دین الله یبغون یا اصل میں کلام اس طرح تھا ایتولون فغیر دین الله یبغون۔

مفعول کو فعل سے پہلے تخصیص کی وجہ سے ذکر کیا گیا گویا مخصص کا انکار مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا دین اللہ کے علاوہ کسی اور ہی دین کو وہ چاہتے ہیں۔ اس سے بطور اشارہ یہ بات معلوم ہوئی کہ دین اللہ کی طلب کے ساتھ دوسرے دین کی طلب نہیں ہو سکتی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر فریق نے دین ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ کیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ جھگڑا لے کر حاضر ہوئے، حضور ﷺ نے فرمایا دونوں فریق دین ابراہیم سے علیحدہ ہیں اس فیصلہ سے دونوں ناراض ہو گئے اور کہنے لگے ہم آپ کے فیصلہ کو نہیں مانتے اور نہ آپ کے مذہب کو پسند کرتے ہیں اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ حالانکہ اللہ ہی کے فرمان بردار اور مطیع ہیں جو آسمانوں میں ہیں یعنی ملائکہ۔ یہ جملہ لفظ اللہ سے حال ہے لفظ اللہ (اگرچہ مفعول نہیں ہے بلکہ دین کا مضاف الیہ ہے مگر) مفعول کے دائرہ میں واقع ہے۔

وَالْاَرْضِ اور جو زمین میں ہیں یعنی جن و انس۔

طَوْعًا یعنی اپنے اختیار سے۔ مطلب یہ ہے کہ ملائکہ اور ایماندار جن و انس اوامر تکلیفیہ کی تعمیل بخوشی خاطر اپنے اختیار سے کرتے ہیں اور اوامر تخلیقیہ میں اپنے محبوب کی مرضی پر راضی اور اللہ کے تکوینی فیصلہ سے خوش ہیں۔

وَّکَرْهًا اور مجبوراً بھی مطیع ہیں۔ خواہ اسلام کی قوت کی وجہ سے یا ایسے اسباب کا معائنہ کرنے کی وجہ سے جو اسلام پر مجبور کرتے ہیں جیسے (بنی اسرائیل کے سروں پر) پہاڑ کو اکھاڑ کر معلق کیا گیا یا آل فرعون کو غرق کیا گیا تھا یا موت کا پھندا گلے میں پڑنے لگتا ہے تو منکر بھی اسلام پر مجبور ہو جاتا ہے یہ صورت تو اوامر تکلیفیہ میں ہوتی ہے اور اوامر تکوینیہ میں تو کوئی اختیار

marfat.com

ہوتا ہی نہیں ہے، نیچرل تسخیر سب کو محیط ہے اور سب مسخر ہیں (بہر حال مؤمن و کافر سب چار و نا چار اللہ کے فرمانبر دار ہیں)۔

وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ اور اسی کی طرف سب کو واپس جانا ہوگا۔

قُلْ اٰمَنَّا آپ کہہ دیں کہ ہم مانتے ہیں۔ یہ خطاب یا رسول اللہ ﷺ کو ہے آپ کی عظمت کے اظہار کے لئے شاہانہ طریقہ کلام کا حکم دیا یا یہ حکم دیا کہ اپنے ساتھ اپنے متبعین کو بھی شامل قرار دے کر اظہار ایمان کرو، یا خطاب ہر مؤمن کو ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ساتھ ہر مؤمن بھائی کو شامل سمجھ کر اظہار ایمان کریں۔

بِاللّٰهِ تنہا اللہ کو۔ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا اور اس قرآن جو ہم پر اتارا گیا ہے، اگر خطاب ہر مؤمن کو مانا جائے تو ہم پر نازل ہونے سے مراد ہوگا، رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہم تک پہنچنا، یا یوں تاویل کی جائے گی کہ اگر جماعت کے کسی ایک فرد کی طرف کسی فعل کی نسبت کی جائے (اور وہ فرد اہم ہو) تو پوری جماعت کی طرف اس فعل کی نسبت ہو جاتی ہے (اہل ایمان میں رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ سب سے اہم ہے اور آپ پر قرآن نازل ہوا تو گویا سب پر نازل ہوا) مادۂ نزول کے بعد کبھی الٰی آتا ہے کیونکہ اللہ کا پیام پیغمبروں تک پہنچتا ہے کبھی علٰی آتا ہے کیونکہ اللہ کا پیام اوپر سے اترتا ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ اور ان کتابوں اور صحیفوں کو جو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب اور دوسرے اسرائیلی پیغمبروں پر اتارے گئے۔ اسباط سے مراد ہیں حضرت یعقوب کی نسل کے انبیاء۔

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَعِیْسٰى جن میں سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی تھے۔ لیکن یا تو ان دونوں حضرات کی جلالت قدر کی وجہ سے ان کا خصوصی ذکر کیا یا یہ وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے انہی کے متعلق خصوصی نزاع تھا اور ان کو یہ خیال تھا کہ مسلمان حضرت موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کو نہیں مانتے، اس گمان کو دفع کرنے کیلئے خاص طور پر ان کا ذکر کیا۔ سے اس جگہ بھی کتابیں اور صحیفے مراد ہیں، یا ما انزل سے وحی جلی اور ما اوتی سے وحی خفی مراد ہے، یا معجزات و فضائل مراد ہیں۔

وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ اور اسکو بھی مانتے ہیں جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو اللہ کی طرف سے دیا گیا تھا

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ ہم انبیاء کے باہم تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو سچا کہیں اور کسی کو جھوٹا۔

مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ اور ہم اللہ ہی کے فرمانبر دار ہیں۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا جو طلب کرے گا سوائے اسلام کے کوئی دوسرا دین، اسلام سے مراد ہے توحید اور اللہ کی فرمانبر داری، یا دین محمدی جو تمام مذاہب کا ناسخ ہے، دینا یا تمیز ہے یا یبتغ کا مفعول، اس صورت میں غیر الاسلام حال ہوگا جو دینا کے نکرہ ہونے کی وجہ سے پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔

فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ تو ہر گز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ دین اللہ کے حکم اور پسند کے خلاف ہوگا۔

وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۸۵﴾ اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا کیونکہ وہ اسلام کا تارک اور دوسرے دین کا طالب ہے اس نے اپنی فطرت سلیمہ کو بگاڑ لیا ہے اس لئے فائدہ سے محروم اور نقصان سے ہم کنار ہوگا۔[۱]

بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت اور اس کی بعد والی آیات کا نزول بارہ آدمیوں کے حق میں ہوا تھا، یہ لوگ مرتد ہو کر مدینہ سے مکہ کو چلے گئے تھے، انہیں میں سے حارث بن سوید انصاری بھی تھے (حارث مرتد ہو کر چلے گئے تھے لیکن پھر سچے دل سے

[۱] بیہقی نے دعوات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کسی کا سواری کا جانور سرکش ہو اور اس پر سوار ہونا دشوار ہو تو اس کے کانوں میں آیت ومن یبتغ غیر الاسلام الخ، پڑھی جائے، مؤلف رحمۃ اللہ علیہ۔

marfat.com

توبہ کر کے واپس آ گئے تھے)۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ یعنی اللہ جنت کا راستہ کیسے دکھائے گا، یہ استفہام انکاری ہے یعنی اللہ ان کو جنت کی ہدایت نہیں کرے گا ان کا ہدایت یاب ہونا بہت بعید ہے۔

قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ایسے لوگوں کو جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، جیسے بارہ آدمیوں نے کیا۔

وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ اور جو رسول کے حق ہونے کی شہادت دینے کے بعد کافر ہو گئے (اللہ ان کو ہدایت نہیں کرے گا) شَهِدُوْا اگرچہ فعل ہے لیکن مصدری معنی مراد ہے جیسے تَسْمَعُ بِالْمُعَيْدِيْ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاهُ میں تَسْمَعُ فعل بمعنی مصدر ہے معیدی کا ذکر سننا اس کو دیکھنے سے بہتر ہے یا اِيْمَانِهِمْ میں اِيْمَان (مصدر) ہونے کے باوجود اپنے اندر فعل کے معنی رکھتا ہے۔ اس لئے شَهِدُوْا کا عطف اس پر کر دیا گیا۔ یعنی ایسے لوگوں کو اللہ جنت کا راستہ نہیں بتائے گا جو ایمان لا چکے تھے اور حقانیتِ رسول کی شہادت دے چکے تھے اس کے بعد کافر ہو گئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شَهِدُوْا سے پہلے لفظ زمان محذوف قرار دیا جائے یہ بھی ممکن ہے کہ شَهِدُوْا کا عطف كَفَرُوْا پر ہو (شہادتِ رسالت اگرچہ کفر سے پہلے تھی لیکن) عطف بالواو میں ترتیب واقعی کی مطابقت ضروری نہیں، یا شَهِدُوْا حال ہے اور قَدْ محذوف ہے، بہر حال اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان سے اقرار رسالت کرنا ہی ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں (اسی لئے تو شَهِدُوْا کا عطف اِيْمَانِهِمْ پر کیا ہے، معطوف معطوف علیہ سے غیر ہوتا ہے)۔

وَجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَيِّنَات سے مراد ہیں روشن دلائل جیسے قرآن اور تمام معجزات۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اور اللہ کافروں کو جنت کی راہ پر نہیں لے جائے گا۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ یہی ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہو۔ لعنتُ اللہ سے مراد ہے اللہ کا غضب لیکن اللہ کے غضب کے بعد اس کی رحمت سے دوری ضروری ہے (اس لئے لعنت سے مراد ہوئی رحمت سے دوری)۔

وَالْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں کی لعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دور رہنے کی بد دعا۔

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ اور تمام لوگوں کی لعنت۔ تمام لوگوں سے مراد ہیں تمام مؤمن یا سب آدمی خواہ کافر ہوں یا مؤمن کیونکہ کافر بھی منکرِ حق پر لعنت کرتا ہے اگرچہ (اس کی لعنت اسی پر پڑتی ہے کیونکہ وہ بھی منکرِ حق ہوتا ہے مگر) وہ حق کی شناخت نہیں رکھتا یا یہ مراد ہے کہ قیامت کے دن بعض کافر بعض کافروں پر لعنت کریں گے اللہ نے فرمایا ہے یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے یا آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ آگ کا ذکر گو صراحتاً نہیں ہے مگر کلام اس پر دلالت کر رہا ہے (کیونکہ لعنت کے بعد دوزخ لازم ہے)۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی۔

وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی (کہ ٹھہر ٹھہر کر عذاب دیا جائے گا کچھ موقع دم لینے کا دے دیا جائے گا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ہاں جن لوگوں نے ارتداد سے توبہ کر لی۔

وَاَصْلَحُوْا اور اصلاح نفس کر لی۔ یہ تَابُوْا کی تفسیر ہے توبہ کر لی یعنی نیک ہو گئے مراد یہ ہے کہ مسلمان ہو گئے یا یہ مراد ہے کہ انہوں نے اپنے ایمان کو ٹھیک کر لیا یعنی (کفر کی وجہ سے) جو ملک میں بگاڑ کیا تھا اس کو (ایمان کے بعد) درست کر لیا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ تو بلاشبہ اللہ معاف کرنے والا ہے ان کی توبہ قبول فرما لے گا اور ان سے جو اللہ کی حق

marfat.com

تلفیاں ہوئی ہیں ان کو معاف کر دے گا۔
رَّحِیْمٌ ﴿۸۹﴾ وہ مہربان ہے۔ ان پر مہربانی کر کے جنت میں لے جائے گا۔ نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ ایک انصاری مسلمان ہونے سے کچھ مدت کے بعد مرتد ہو گیا لیکن پھر اسے پشیمانی ہوئی اس نے اپنے خاندان والوں کے پاس پیام بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی کو بھیج کر یہ دریافت کراؤ کہ کیا اب میرے لئے توبہ کی گنجائش ہے اس پر آیت کیف یھدی اللہ سے غفور رحیم تک نازل ہوئی اور انصاری کے خاندان والوں نے اس کے پاس (قبولِ توبہ کا) پیام بھیج دیا وہ (پھر) مسلمان ہو گیا۔ ابن المنذر نے (مسند میں) اور عبد الرزاق نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ حارث بن سوید آکر مسلمان ہوا لیکن کچھ عرصہ کے بعد کافر ہو کر اپنے قبیلہ میں لوٹ گیا۔ اللہ نے اس کے متعلق آیت کیف یھدی اللہ سے غفور رحیم تک نازل فرمائی، اس کے خاندان کے کسی شخص نے یہ آیت لے جا کر اس کو سنادی حارث نے کہا خدا کی قسم میری دانست میں تم بڑے سچے آدمی ہو اور رسول اللہ ﷺ تم سے زیادہ سچے ہیں اور اللہ دونوں سے بڑھ کر سچا ہے اس کے بعد حارثؓ واپس آکر مسلمان ہو گیا اور اچھا مسلمان ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا قتادہ اور حسن بصری کا بیان ہے کہ اس آیت کا نزول یہودیوں کے حق میں ہوا جنہوں نے حضرت موسیٰ اور توریت پر ایمان لانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو ماننے سے انکار کر دیا، پھر کفر میں اور ترقی کی کہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کو نہیں مانا۔ ابو العالیہ کے قول پر آیت کا نزول یہود و نصاریٰ دونوں کے حق میں ہوا دونوں نے رسول اللہ ﷺ کے اوصاف وحالات اپنی کتابوں میں پڑھے اور ان کو مانا لیکن بعثت نبوی کے بعد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لائے اور اس کفر کی حالت میں گناہوں کی وجہ سے مزید ترقی کی۔ مجاہد کے نزدیک آیت کا نزول تمام کفار کے حق میں ہوا جو اللہ کے خالق ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود شرک کرتے ہیں پھر کفر میں بڑھ جاتے ہیں یعنی مرتے دم تک کفر پر قائم رہتے ہیں۔ حسن نے کہا کہ کفر میں بڑھنے کا معنی یہ ہے کہ جو آیت نازل ہوتی گئی وہ اس کا انکار کرتے گئے۔ کلبی نے کہا کہ آیت کا نزول حارث بن سوید کے ساتھیوں کے متعلق ہوا کہ حارث کے دوبارہ مسلمان ہونے کے بعد بھی وہ کفر پر قائم رہے اور مکہ ہی میں مقیم رہے۔ بعض علماء کے نزدیک الذین کفروا سے منافق مراد ہیں علانیہ کافروں سے منافقوں کا کفر زیادہ تھا وہ کفر کو پوشیدہ رکھنے اور ظاہر میں باوجود کراہت خاطر کے نماز، روزہ ادا کرنے کی مشقت اٹھاتے تھے کفر سے انکو انتہائی محبت تھی۔

لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی جن لوگوں نے کفر کیا پھر کفر میں بڑھ گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ اگر الذین کفروا سے یہود و نصاریٰ یا عام کافر مراد ہوں تو توبہ قبول نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ کفر پر قائم رہیں گے گناہوں سے توبہ قبول نہیں کی جائے گی ہاں غرغرہ کے وقت (بھی) کفر سے توبہ مقبول ہے کیونکہ فتح مکہ کے بعد حارثؓ بن سوید کے ساتھیوں میں سے جس نے بھی کفر سے توبہ کی رسول اللہ ﷺ نے اس کی توبہ قبول فرمائی اور اگر آیت میں منافق مراد ہوں تو یہ مطلب ہو گا کہ جب تک دل سے کفر پر جے رہیں گے زبان سے توبہ ناقابل قبول ہے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اور یہی لوگ راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر سے توبہ نہ کی اور کفر کی حالت میں ہی مر گئے۔

فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا اگر بالفرض انہوں نے زندگی میں زمین بھر سونا خیرات کیا ہو گا تب بھی قیامت کے دن قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس سے کم کا تو ذکر ہی کیا ہے کیونکہ ایمان تمام صدقات وعبادات کے قبول ہونے کی شرط ہے بلکہ عبادت عبادت ہی نہیں ہوتی جب تک ایمان اور خلوص کے ساتھ نیت نہ ہو۔

چونکہ اَلَّذِیْنَ میں شرط کا مفہوم ہے اس لئے ان کی خبر یعنی فَلَنْ یُّقْبَلَ میں فاء (جزائیہ) لائی گئی اس سے یہ بات بھی معلوم

maktabah.org

ہو گئی کہ کفر کی حالت میں مرنا خیرات قبول نہ ہونے کا سبب ہے۔

وَلَوِافْتَدٰى بِهٖ اگر قیامت کے دن بالفرض وہ زمین بھر سونا بدلہ میں دے تب بھی قبول نہ ہوگا۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ عذاب قیامت کے عوض اگر کوئی زمین بھر اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور سونا دے گا تب بھی قبول نہ ہوگا۔ جیسے دوسری آیت میں آیا ہے کہ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ (گویا بِهٖ سے مراد ہے بِمِثْلِهٖ۔ لفظ مِثل محذوف ہے) چونکہ دو ایک طرح کی چیزوں کا حکم ایک ہی ہوتا ہے اس لئے کسی ایک چیز کے ذکر کے وقت اس جیسی دوسری چیز بھی اس کے ساتھ بکثرت مراد لے لی جاتی ہے۔

وَلَوِ افْتَدٰى میں لَو وصلیہ نہیں ہے (یعنی اگرچہ اور خواہ کا معنی نہیں ہے) کیونکہ شرط وصلی کی صورت میں نقیض شرط کا جزاء ہونا بدرجہ اولیٰ صحیح ہوتا ہے جیسے آیت یکاد زیتها یضیئ ولولم تمسسه نار کا مفہوم یہ ہے کہ (درخت زیتون اتنا چمکیلا اور شفاف ہوتا ہے کہ) اس کا تیل آگ کے چھوتے ہی مشتعل ہو جائے اور آگ اس کو نہ لگے تب بھی مشتعل ہو جائے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اگر وہ اپنے بدلہ میں زمین بھر سونا نہ دے تو قبول نہیں کیا جائے گا اور دے تب بھی قبول نہ ہوگا۔ (اور یہ مطلب غلط ہے) بعض علماء نے توجیہ مطلب اس طرح کی ہے کہ کوئی عوض قبول نہ ہوگا اگر زمین بھر سونے سے کم دے تب قبول نہ ہوگا اور زمین بھر سونا دے تب قبول نہ ہوگا۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ اور انہی کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس آیت میں پرزور تخویف ہے کیونکہ جس کی طرف سے کوئی معاوضہ (جرم) قبول نہ ہو اس کو (بلا معاوضہ) محض کرم ذاتی کے زیر اثر معافی مل جانا بہت کم ہوتا ہے (مگر ہو سکتا ہے پس جب دردناک عذاب میں مبتلا ہونے کی صراحت کر دی تو) اس سے معافی کی طرف سے بالکل ناامید بنا دیا۔

وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۹۱﴾ اور ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا کہ عذاب کو دفع کر سکے۔ مِنْ کی زیادتی مفید استغراق ہے (یعنی کوئی بھی مددگار نہ ہوگا)۔ ۹ ع ۱۷

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن خفیف ترین عذاب والے دوزخی سے اللہ فرمائے گا اگر تیرے پاس روئے زمین کی تمام چیزیں ہوں تو کیا (آج) عذاب سے چھوٹنے کیلئے تو وہ سب چیزیں دے دیگا دوزخی کہے گا، جی ہاں، اللہ فرمائے گا جب تو آدم کی پشت میں تھا اس وقت میں نے تجھ سے اس سے بہت زیادہ آسان چیز کی خواہش کی تھی کہ (پیدا ہونے کے بعد) میرے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دینا۔ مگر تو بغیر شرک کئے نہ رہا۔ (متفق علیہ)

☆

marfat.com

چوتھا پارہ لن تنالوا (آل عمران

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ بِرّ کا معنی ہے انعام، جنت، بھلائی، احسان کی وسعت، سچائی، طاعت (قاموس) میں کہتا ہوں اگر بِرّ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو مراد ہوتی ہے طاعت، سچائی اور احسان کی وسعت۔ اس وقت اس کے مقابل فُجور اور عُقوق کا لفظ آتا ہے لیکن اگر اللہ کی طرف کی نسبت کی جاتی ہے تو مراد ہوتی ہے رضا، رحمت، جنت۔ اس وقت اس کے مقابل غضب اور عذاب کا لفظ آتا ہے۔

آیت مذکورہ میں حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کے نزدیک جنت مراد ہے۔ مقاتل بن حبان کے نزدیک تقویٰ۔ بعض علماء کے نزدیک طاعت اور بعض کے نزدیک بھلائی۔ حسن بصریؒ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا تم ابرار نہیں ہو سکتے یعنی کثیر الخیر، وسیع الاحسان اور طاعت گزار نہیں ہو سکتے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ تم حقیقتِ بر یعنی کمالِ خیر تک نہیں پہنچ سکتے یا اللہ کی بر یعنی رحمت، رضا اور جنت کو نہیں پا سکتے۔ اول قول پر اَلْبِر میں لام جنسی اور دوسری صورت میں عہدی ہوگا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچائی کو اختیار کرو کیونکہ سچائی بِرّ کی طرف لے جاتی ہے اور بِرّ جنت کی طرف، آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کی نیت کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کو صدیق لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ سے پرہیز رکھو کیونکہ جھوٹ بدکاری کی طرف۔ جاتا ہے اور بدکاری دوزخ کی طرف۔ آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کی نیت کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کو کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔ رواہ مسلم واحمد والترمذی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی مرفوع روایت ہے کہ صدق کو اختیار کرو، صدق بِرّ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں جنت میں (لے جاتے) ہیں اور کِذب سے پرہیز رکھو، کِذب فجور کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ دونوں دوزخ میں (لے جاتے) ہیں۔ رواہ احمد وابن ماجہ والبخاری فی الادب۔

حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ یہاں تک کہ تم اپنے محبوب مال کا کچھ حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔ مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی کچھ مال۔ مَا تُحِبُّوْنَ سے مراد ہر قسم کا مال ہے کیونکہ ہر قسم کے مال سے لوگوں کو محبت ہوتی ہے۔ ان کے دل ہر طرح کے مال کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ پس اگر کوئی کسی قسم کا مال کچھ بھی راہ خدا میں نہ خرچ کرے یہاں تک کہ زکوٰۃ بھی ادا نہ کرے وہ فاجر ہوگا اور بِرّ سے بالکل محروم۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قسم کے مال کا کچھ حصہ راہ خدا میں دینا فرض ہے اور اگر حلال حرام مال مخلوط ہو تو حلال مال کو چھوڑ کر حرام مال میں سے دینا ناجائز ہے۔ جیسے دوسری آیت میں آیا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَ مِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۪ وَ لَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَ لَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡهِ۔

اگر مقدار واجب سے کم دے گا تو واجب ادا نہ ہوگا، یہ حکم بالاجماع ہے پھر یہ فعل عنوان محبوبیّت کے تقاضے کے خلاف بھی ہے (جب مال محبوب ہے تو اس کی محبوبیّت کا تقاضا ہے کہ بقدر واجب اللہ کی راہ میں دیا جائے) ہر مال کی کتنی مقدار راہ خدا میں دینا واجب ہے اس کے متعلق آیت میں کوئی تفصیل نہیں البتہ مقدار زکوٰۃ کی تعین کرنے والی احادیث میں اس کا بیان ہے گویا آیت کے اجمال کی توضیح احادیث سے ہو رہی ہے۔ آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ہر مال کی زکوٰۃ واجب ہے، مال بڑھوتری والا اور روبترقی ہو یا نہ ہو (گھر میں بیکار پڑا ہو) مقدار نصاب (فقہی) کو پہنچ گیا ہو یا نہ پہنچا ہو، اپنی ضرورتوں سے بچا ہوا ہو یا ضرورت سے زائد نہ ہو، اس پر سال گزر گیا ہو یا نہ گزرا ہو، لیکن بعض دوسری آیات واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ کی کچھ

marfat.com

مخصوص صورتیں اور حالتیں ہیں (اس لئے اس آیت کا حکم عام مطلق نہیں ہے) ایک آیت ہے یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ اے پیغمبر مسلمان آپ سے پوچھتے ہیں کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں آپ جواب میں کہہ دیں کہ جو چیز ضرورت سے زائد ہو وہ راہ خدا میں دے دو۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ کام کرنے والے اور بوجھ اٹھانے والے اور گھروں میں چارہ کھا کر پرورش پانے والے جانوروں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کے علاوہ تجھ پر کچھ فرض نہیں ہاں اگر اپنی خوشی سے بطور نفل تو ادا کرے تو خیر۔ تیسری حدیث ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب بغیر تونگری کے نہیں ہوتا ہے (یعنی جو شخص غنی نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں) ان احادیث و آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ ان جانوروں میں واجب ہے جو (سال کے زیادہ حصہ میں) جنگل میں (مفت) چرتے ہوں (گھر پر ان کو خوراک نہ دی جاتی ہو) یا سونا چاندی بقدر نصاب ہو یا تجارتی سامان ہو (جس کی قیمت) بقدر نصاب ہو بشرطیکہ ایک سال سے یہ اشیاء ملکیت میں ہوں یا کھیتی کا غلہ ہو یا پھل ہوں، ان تمام چیزوں میں زکوٰۃ کے وجوب پر اجماع ہے۔ پس یہ آیت زکوٰۃ کے متعلق ہے لیکن حکم مخصوص بالبعض ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔ لیکن مجاہد و کلبی کے نزدیک اس آیت میں زکوٰۃ مراد نہیں ہے، بلکہ دوسری آیت زکوٰۃ اس آیت کے عمومی حکم کی ناسخ ہے مگر یہ قول غلط ہے۔ جب آیت کے حکم کو زکوٰۃ پر محمول کیا جاسکتا ہے (اور حکم آیت کو عام مخصوص بالبعض کہا جاسکتا ہے) تو منسوخ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

نسخ کا قول تو اس وقت اختیار کیا جاسکتا ہے جب دونوں آیات میں (ناقابل ازالہ) تعارض ہو، یہاں تعارض ہی نہیں ہے۔ اس آیت میں بلاشبہ محبوب ترین مال کو خرچ کرنے کا وجوبی حکم ہے لیکن محبوب ترین مال کے علاوہ دوسرے مال میں سے راہ خدا میں دینے کا عدم وجوب تو اس سے معلوم نہیں ہوتا (ہوسکتا ہے کہ محبوب مال میں سے راہ خدا میں دینا اس آیت کی رو سے واجب ہو اور دوسرے مال میں سے انفاق دوسری آیت سے ثابت ہو) نہ آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقدار زکوٰۃ کے علاوہ کوئی دوسری مقدار واجب نہیں ہے۔ پھر یہ آیت مدنی ہے اور زکوٰۃ کی آیات مکی ہیں، سابق النزول حکم مؤخر النزول کا ناسخ کس طرح ہوسکتا ہے، واللہ اعلم۔

عام مال کو بِمَا تُحِبُّوْنَ سے تعبیر کرنا اس امر کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ جو مال زیادہ محبوب خاطر ہوگا اس کو راہ خدا میں خرچ کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ دلالت النص سے یہ بات بھی معلوم ہورہی ہے کہ مال کا کچھ حصہ خرچ کرنا واجب ہے لیکن جو شخص کل مال راہ خدا میں دیدے وہ سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسلمان (جس قسم کا) جو مال خرچ کرے گا یہاں تک کہ ایک چھوارہ دینے والا بھی اس بِرّ کا مستحق ہے جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔ حضرت حسن کے اس قول کا مقتضایہ ہے کہ آیت میں جس انفاق کا حکم ہے وہ انفاق واجب اور انفاق مستحب دونوں کو شامل ہے اگر کوئی مطلقاً راہ خدا میں خرچ نہ کرے یہاں تک کہ فرض زکوٰۃ بھی نہ دے تو وہی بِرّ مذکور سے محروم ہوگا اور اسی پر فاجر (خارج از حکم خدا) کا اطلاق کیا جائے گا۔ عطاء نے آیت کا تفسیری مطلب ان الفاظ میں بیان کیا کہ تم فضیلت دین و تقویٰ اس وقت تک نہیں پاسکتے جب تک صحت اور ضرورت کی حالت میں تم خیرات نہ کرو۔

حضرت انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ مدینہ میں حضرت ابوطلحہؓ انصاریوں میں سب سے زیادہ مالدار تھے اور آپ کا مرغوب ترین مال (بستان) بیرحاء تھا جو مسجد کے سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ بھی (کبھی کبھی) تشریف لے جاکر وہاں کا عمدہ پانی پیتے تھے جب آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ مجھے اپنے مال میں بیرحاء سب سے زیادہ پسند ہے میں اللہ کی خوشنودی کے لئے اس کو دیتا ہوں امید ہے کہ اللہ اس کا ثواب اور اجر میرے لئے جمع

marfat.com

رکھے گا۔ آپ جس طرح چاہیں اس (باغ) میں تصرف کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا واہ واہ یہ تو نفع بخش مال ہے جو کچھ تم نے کہا میں نے سن لیا۔ میرے نزدیک یہی مناسب ہے کہ تم یہ اپنے قرابت داروں کو دیدو۔ حضرت ابو طلحہؓ نے کہا (بہت خوب) یا رسول اللہ ﷺ میں ایسا ہی کروں گا چنانچہ حضرت ابو طلحہؓ نے وہ باغ اپنے اقرباء اور چچازادوں کو تقسیم کر دیا۔ صحیح بخاری و مسلم۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ اپنے محبوب گھوڑے کو لے کر آئے اور عرض کیا یہ اللہ کی راہ میں (دیتا ہوں) رسول اللہ ﷺ نے وہ گھوڑا حضرت اسامہؓ بن زید کو سواری کے لئے دے دیا، حضرت زیدؓ نے کہا میں نے تو اس کو خیرات کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے تمہاری طرف سے اس کو قبول کر لیا (یعنی تم کو خیرات کا ثواب ملے گا) ابن المنذرؒ نے اس حدیث کو محمد بن منکدرؒ کی روایت سے مرسل بیان کیا ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ اس گھوڑے کا نام سبیل تھا۔ ابن جریرؒ نے یہ حدیث عمرو بن دینار کی روایت سے مرسل اور ایوب سجستانی کی روایت سے معضل بیان کی ہے۔

بغوی نے مجاہدؒ کی روایت لکھی ہے کہ جلولاء کی فتح کے دن حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو لکھا کہ میرے لئے جلولاء کے قیدیوں میں سے کوئی باندی خرید لو (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حسب الحکم ایک باندی خرید لی اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیج دی) آپ کو وہ باندی بہت پسند آئی اور فرمایا اللہ نے فرمایا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ اس لئے آپ نے اس باندی کو آزاد کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے حضرت حمزہؓ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے دل میں آیت لن تنالوا البر الخ کھٹکی تو دل میں سوچا کہ خداداد نعمتوں میں سب سے مرغوب چیز کیا ہے سوچنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ فلاں باندی سے زیادہ دل کو محبوب اور کوئی چیز نہیں، یہ سوچ کر فرمایا فلاں باندی لوجہ اللہ آزاد ہے اگر بارگاہ الٰہی میں پیش کی ہوئی چیز کو واپس لینے (کی ممانعت) کا خیال نہ ہوتا تو میں اس سے نکاح کر لیتا ان احادیث اور آثار صحابہؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ راہ خدا میں دینے کا مفہوم عام ہے اس کا اطلاق خیرات پر بھی ہوتا ہے اور استعمال کیلئے عاریۃً دینے پر بھی اور قرض دینے پر بھی اور باندی غلام کو آزاد کرنے پر بھی، حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کو دینا افضل ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے خواہ وہ محبوب و مرغوب ہو یا غیر محبوب، اللہ اس سے یقینی طور پر بخوبی واقف ہے، یعنی عمل اور نیت کے مطابق جزادے گا علم سبب ہے اور جزاو ثواب اس کا نتیجہ، سبب کو بجائے نتیجہ کے ذکر کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کریم کا اپنے بندہ کی نیکی کو جاننا ہی ثواب و جزا کے لئے کافی ہے۔ پھر ماضی (اَنْفَقْتُمْ) کی جگہ مستقبل کا صیغہ (تُنْفِقُوْا) ذکر کرنے سے یہ معلوم ہو گیا کہ انفاق (راہ خدا میں صرف) سے اللہ واقف ہے خواہ تھوڑا انفاق ہو یا زیادہ اور خواہ (ماضی میں ہو گیا ہو یا حال میں ہو رہا ہو یا) آئندہ ہونے والا ہو۔ اس سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ کے علم کے لئے علی الاعلان انفاق ضروری نہیں (چھپ کر بھی اگر خیرات کی جائے تو اللہ اس سے واقف ہوتا ہے بلکہ) پوشیدہ خیرات کرنے کی اس سے ترغیب مستفاد ہو رہی ہے۔ (آئندہ آیت کے شان نزول کے سلسلے میں)۔ بغوی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کو ملت ابراہیمی پر ہونے کا تو دعویٰ ہے مگر آپ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں باوجودیکہ ابراہیمؑ نہ اونٹ کا گوشت کھاتے تھے، نہ ان کا دودھ پیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام کے لئے تو یہ چیزیں حلال تھیں کہنے لگے ہم آج جن چیزوں کو حرام کہتے ہیں یہ نوح کے لئے بھی حرام تھیں اور ابراہیم (علیہ السلام) کے لئے بھی، اسی زمانہ سے آج تک ان کی حرمت چلی آئی ہے۔ اس قول کی وجہ یہ تھی کہ یہودی نسخ احکام کے قائل نہیں تھے۔ یہودیوں کی تکذیب کے لئے اللہ نے مندرجہ ذیل نازل فرمائی۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ طعام مصدر ہے غذا کھانا۔ یہاں مفعول کے معنی مراد ہیں یعنی غذا۔ الف لام عہدی ہے یعنی وہ پاکیزہ غذائیں جو (توریت سے پہلے) حلال تھیں لیکن یہودیوں کی حرکاتِ بیجا کی وجہ سے توریت میں ان کو حرام کر دیا گیا چونکہ الطعام میں معہود طعام مراد ہے اس لئے یہ لفظ مردار، خون، گوشت خنزیر اور دوسرے

marfat.com

درندوں کے گوشت کو شامل ہی نہیں ہے۔

حِلٌّ اصل میں مصدر ہے لیکن اس سے مراد صیغہ صفت ہے، مذکر مؤنث جمع واحد سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے ایک اور آیت میں آیا ہے لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وہ عورتیں ان مردوں کے لئے حلال نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ توارت میں جو کھانے حرام کر دیئے گئے ہیں وہ پہلے اولاد یعقوب اور یعقوب کے باپ دادا اسحاق وابراہیم کے لئے حلال تھے۔

اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ سوائے اس قسم کے کھانے کے جو یعقوب نے اپنے لئے خود حرام کر لئے تھے یعنی اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ۔

بات یہ ہوئی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ حضرت یعقوبؑ کی مرغوب ترین غذا تھی لیکن آپ کو عرق النسا (دردران) کی بیماری تھی اس لئے آپ نے مَنّت مانی تھی کہ اگر اللہ آپ کی بیماری دور کردے گا۔ تو آپ اس محبوب غذا کو کبھی نہیں کھائیں گے۔ احمد اور حاکم وغیرہ نے یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بسند صحیح بیان کی ہے اور بغوی نے ابوالعالیہ عطاء، مقاتل اور کلبی کی روایت سے اس کو لکھا ہے لیکن جویبر کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النسا میں مبتلا تھے طبیبوں نے تجویز کی کہ آپ اونٹ کے گوشت سے پرہیز رکھیں اس لئے آپ نے اونٹ کا گوشت اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔ یہ بھی بغوی نے لکھا ہے کہ حسنؒ بصری نے کہا کہ حضرت یعقوبؑ نے اونٹ کا گوشت خدا پرستی کے جذبہ کے تحت اپنے لئے حرام کر لیا تھا اور اللہ سے دعا کی تھی کہ اللہ اس حرمت کو نافذ فرمادے، حسب دعا اللہ نے آپ کی اولاد کے لئے اونٹ کا گوشت حرام کر دیا۔ عطیہ کا بیان ہے کہ اولادِ اسرائیل کے لئے اللہ کی طرف سے اونٹ کے گوشت کی حرمت نہیں ہوئی بلکہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کیلئے خود حرام کرر کھا تھا کیونکہ (بطور مَنّت کہا تھا کہ اگر اللہ مجھے شفا عطا فرمادے گا تو میری اولاد اونٹ کا گوشت نہیں کھائے گی۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ توارت نازل کئے جانے سے پہلے۔ اس فقرہ کا تعلق حَرَّمَ اِسْرَآئِيْلُ سے تو یقیناً نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت اسرائیل کا بعض اشیاء کو اپنے لئے حرام کرلینا یقیناً نزول توریت سے پہلے ہی تھا (اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے) پھر اس فقرہ کو ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور كَانَ حِلًّا سے بھی اس کا تعلق نہیں ہے، دورنہ الا ماحرم اسرائیل کو درمیان میں لانا خلاف ضابطہ ہے جب تک پوری صفت ذکر نہ کردی جائے۔ حصر صفت کا معنی کیا ہو سکتا ہے لامحالہ اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے۔ کلام کا مطلب اس طرح ہوگا کہ نزول توارت سے پہلے تمام پاکیزہ چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں مگر یہودیوں کی بیجا حرکتوں کی وجہ سے نزولِ توریت کے بعد بعض چیزیں حرام کردی گئیں۔ اللہ نے فرمایا ہے فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ۔ دوسری آیت ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ۔

کلبی کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل نے جب بھی (بحیثیت اجتماع) کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کیا اللہ نے (سزا میں) ان کے لئے یا کسی پاکیزہ حلال غذا کو حرام کردیا یا ہلاکت کی بارش کردی۔ ضحاک نے کہا بنی اسرائیل کے لئے کوئی غذا حرام نہیں تھی نہ توریت میں اللہ نے حرام قرار دی تھی بلکہ اپنے باپ (حضرت اسرائیل) کے اتباع میں انہوں نے خود اپنے لئے (بعض چیزوں کو) حرام کرلیا اور حکم حرمت کی نسبت اللہ کی طرف کردی مگر اللہ نے ان کے جھوٹ کو ظاہر کردیا۔ مگر ضحاک کا یہ قول غلط ہے کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ دوسری جگہ فرمایا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا۔ صحیح بخاری و مسلم میں ایک حدیث آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہودیوں پر اللہ کی لعنت ہو چربیاں ان پر حرام کردی گئیں تو انہوں نے ان کو پگھلا کر فروخت کیا اور قیمت کھائی (گویا چربی نہ کھائی چربی بیچ کر قیمت کھائی)۔

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر سچے ہو تو

marfat.com

توراۃ لاؤ اور پڑھو (تمہارا جھوٹ خود توراۃ سے ظاہر ہو جائے گا) توراۃ میں مذکور ہے کہ جو چیزیں یہودیوں کیلئے نزول توریت سے پہلے حرام نہ تھیں ان کی بیجا حرکات کی وجہ سے توریت میں حرام کر دی گئیں اللہ نے یہودیوں کو لاجواب بنانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ یہودیوں سے کہو کہ توریت لا کر پڑھو یہودی توریت نہیں لائے اور لاجواب ہو گئے۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور آپ کے مِلّتِ ابراہیمی پر ہونے کا ثبوت ہے اور نسخ احکام کی ممانعت کے جو یہودی قائل تھے ان کے قول کی تردید بھی ہے۔

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ پس اب جو لوگ اللہ پر دروغ بندی کریں گے اور دعویٰ کریں گے کہ اللہ نے اونٹ کا گوشت حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے لئے حرام کر دیا تھا۔

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ اس کے بعد کہ ان کے قول کے خلاف خود توریت میں دلیل موجود ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ پس یہی لوگ در حقیقت ظالم (حق ناشناس) ہیں جو حقانیت کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑا کرتے ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ قف اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور یہود و نصاریٰ جھوٹے ہیں جو اپنے اپنے گروہ کو دین ابراہیم پر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابراہیم یہودی یا عیسائی تھے۔

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ پس اے طلب گاران دینِ ابراہیمؑ، مِلّتِ ابراہیمی یعنی اسلام کا اتباع کرو جو محمد ﷺ اور ان کی امت کا دین ہے، یہی دین ابراہیمؑ تھا یعنی حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں آپ کا دین یہی تھا یا دین اسلام دین ابراہیم سے کامل مشابہت رکھتا ہے (گویا دونوں ایک ہی ہیں)۔

رسول اللہ ﷺ ان اسرائیلی پیغمبروں کی طرح نہیں تھے جن کو حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا تھا۔ (بلکہ آپ خود صاحب شریعت تھے) لہٰذا ملت ابراہیم کا اتباع اس اعتبار سے واجب ہے کہ یہ ملت محمدی ہے اس لحاظ سے اتباع واجب نہیں کہ یہ ملت ابراہیم ہے اور محمد ﷺ ابراہیمؑ کے تابع تھے یہی وجہ ہے کہ ملت ابراہیم (یعنی اسلام) پر چلنے کا حکم دیا اور ابراہیمؑ کی پیروی کا حکم نہیں دیا۔

ملت کا اطلاق دین کی طرح ان امور پر ہوتا ہے جو بندوں کو مرتبہ قرب تک پہنچانے اور دونوں جہان میں کامیاب بنانے کے لئے اللہ نے پیغمبروں کی معرفت بندوں تک بھیجے اور ان کا مکلّف کیا ہے۔ دین اور ملت کا فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف انبیاء کی طرف ہوتی ہے دوسرے افراد کی طرف نہیں ہوتی نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے نہ ملت خدا کہہ سکتے ہیں، نہ ملت زید و عمر بلکہ ملت محمد ﷺ، ملت موسیٰ، ملت ابراہیمؑ بولا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملت کا اطلاق پوری شریعت کے مجموعہ پر ہوتا ہے جیسے ملت اسلام ایک ایک رکن کو ملت نہیں کہتے اسی لئے صرف نماز (یا صرف زکوٰۃ یا صرف روزہ) کو ملت نہیں کہا جاتا دین اللہ کہا جاتا ہے۔ لفظ ملت اَمْلَلْتُ سے ماخوذ ہے (امللت میں نے لکھوایا گویا ہر ملت اسی پیغمبر کی لکھوائی ہوئی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کو لایا ہو) کذا فی صحاح الجوہری۔

حَنِيْفًا یعنی ابراہیمؑ نے تمام باطل مذاہب سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف رخ کر لیا تھا یا افراط و تفریط سے رخ پھیر کر اعتدال کی طرف مائل تھے (گویا آپ نہ یہودی دین پر تھے، نہ عیسائی مذہب پر کیونکہ) یہودیوں کے مذہب میں افراط اور شدت ہے اور عیسائیوں کے دین میں تفریط یعنی نرمی حد سے زائد ہے۔ یہی مؤخر الذکر مطلب اولیٰ ہے۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے یہ دونوں گروہ شرک کرنے کے باوجود دین ابراہیمی پر ہونے کے مدعی تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں سے کہا ہمارا قبلہ بیت المقدس ہے جو کعبہ سے افضل بھی ہے اور پرانا بھی اور

marfat.com

انبیاء کا مقام ہجرت بھی مسلمانوں نے جواب دیا بیت المقدس سے کعبہ افضل ہے (اور مقدم بھی) اس پر آیت ذیل کا نزول ہوا۔
اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے قائم کیا گیا یعنی اللہ نے لوگوں کے لئے قبلہ بنایا۔ بعض کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ لوگوں کے حج کرنے کے لئے سب سے پہلا مکان جو اللہ نے قائم کیا۔ حسنؒ اور کلبیؒ نے کہا کہ اول ترین مسجد اور عبادت خانہ مراد ہے جو اللہ کی عبادت کے لئے مقرر کیا گیا (گویا بیت سے مراد ہے مسجد) جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ اس جگہ بھی بیوت سے مراد ہیں مسجدیں۔
لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ یقیناً وہی مکان ہے جو مکہ میں ہے بکہ اور مکہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اہل عرب میم کو باء سے بدل لیتے ہیں جیسے نمیط و نبیط لازم ولازب۔ راتب ورام۔ بعض علماء نے کہا مکہ شہر کا نام ہے اور بکہ صرف وہ جگہ جہاں کعبہ ہے یا مقام طواف۔ بکتہ کا معنی ہے اژدہام۔ مکہ میں (ایام حج میں) لوگوں کا اژدھام ہوتا ہے اس لئے اس کو بکہ کہتے ہیں۔
حضرت عبداللہ بن زبیر نے فرمایا مکہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جس جابر نے اصحاب فیل کی طرح کعبہ (کو ڈھانے) کا ارادہ کیا اللہ نے اس کی گردن توڑ دی۔ مکہ کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مک کا معنی ہے پانی کی قلت) مکہ میں پانی کم ہے۔
آیت میں اولیت بیت سے کیا مراد ہے اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مجاہدؒ، قتادہ اور سدیؒ نے فرمایا آسمان و زمین کی پیدائش کے زمانہ میں پانی کی سطح سے سب سے اول کعبہ کا مقام نمودار ہوا شروع میں یہ سفید جھاگ تھے (جو منجمد ہوگئے تھے) زمین کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے اس کی تخلیق ہوئی تھی پھر اسی کے نیچے سے زمین پھیلائی گئی۔ حضرت علی بن الحسینؒ (امام زین العابدین) نے فرمایا کہ اللہ نے عرش کے نیچے ایک مکان بنایا جس کا نام بیت المعمور ہے اور (آسمان کے) فرشتوں کو اس کے طواف کرنے کا حکم دیا پھر زمین پر رہنے والے فرشتوں کو حکم دیا کہ بیت المعمور کی طرح زمین پر ایک مکان بنائیں فرشتوں نے حسب الحکم کعبہ کی تعمیر اور اس کا نام صراح رکھا پھر اللہ نے زمین والوں کو حکم دیا کہ جس طرح آسمان والے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں اسی طرح زمین والے صراح کا طواف کریں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آدمؑ کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں نے کعبہ کی عمارت بنائی تھی اور اس کا حج کیا کرتے تھے آدم نے حج کیا تو فرشتوں نے کہا آپ کا حج مبرور ہے ہم نے آپ سے دو ہزار سال پہلے اس کا حج کیا تھا۔
ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ حضرت آدمؑ نے سب سے اول زمین پر کعبہ کی عمارت بنائی تھی یہ روایت ازرقی نے تاریخ مکہ میں نقل کی ہے۔
صحیحین میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت آئی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ زمین پر کون سی مسجد سب سے پہلے قائم کی گئی، فرمایا مسجد حرام میں نے عرض کیا پھر کون سی، فرمایا مسجد اقصیٰ میں نے عرض کیا دونوں میں کتنا فصل تھا، فرمایا چالیس سال پھر جہاں بھی تم کو نماز کا وقت آجائے پڑھ لو اس میں فضیلت ہے۔
روایت میں آیا ہے کہ کعبہ کی عمارت سب سے اول حضرت آدمؑ نے بنائی تھی اور طوفان نوح کے وقت اس کو اٹھا لیا گیا تھا۔ بعض نے کہا کہ طوفان سے مٹ گئی تھی پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی پھر مٹ گئی تو قبیلہ جُرہم نے بنائی پھر عمالقہؒ نے بنائی پھر قریش نے تعمیر کی۔
ابن جریر ابن ابی حاتم اور بیہقی کا بیان ہے کہ طوفان کے زمانہ میں کعبہ کی عمارت اٹھالی گئی تھی۔ پھر حضرت ابراہیم نے اس کو بنانے کا ارادہ کیا تو اللہ نے اس کی جگہ آپ کو بتادی اس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ نے ججوج نام کی ہوا بھیجی ہوا نے کعبہ کے گرد اگرد کی مٹی اڑا کر بنیاد نمودار کردی اور آپ نے قدیم بنیاد پر تعمیر کی۔ ججوج ایک جانور ہوتا ہے جس کے دو باز و پرندوں کی طرح اور صورت سانپ کی طرح ہوتی ہے۔
بعض لوگوں نے کہا کعبہ کی اولیت زمانہ کے لحاظ سے مراد نہیں ہے بلکہ فضیلت کے اعتبار سے ہے یعنی کعبہ افضل ترین

marfat.com

عمارت ہے۔ اس قول کی نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کی طرف کی گئی ہے۔ ضحاک نے کہا کعبہ سب سے اول مکان ہے جس کو برکت عطا کی گئی کیونکہ اللہ نے اس کے بعد فرمایا۔

مُبٰرَكًا یعنی کعبہ برکت والا ہے اور اس کا اجر و ثواب بہت ہے۔ بعض عبادتیں تو کعبہ کے ساتھ ہی مخصوص ہیں (کسی دوسری جگہ نہیں ہو سکتیں) جیسے حج، حج کی قربانی کا جانور بھیجنا، عمرہ اور بعض عبادتیں اس جگہ ادا کرنے کا ثواب اتنا زائد ہے کہ کسی اور جگہ اس کی برابر نہیں جیسے نماز، روزہ اور اعتکاف۔ اسی لئے امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ جس نے مسجد حرام میں دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانی ہو اور دوسری جگہ پڑھ لے تو کافی نہ ہوگا، کیونکہ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر کے اندر آدمی کی نماز ایک نماز کے برابر ہے اور محلّہ کی مسجد میں ایک نماز پچیس نماز کے برابر ہے اور جامع مسجد میں پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے (ابن ماجہ) طحاوی نے حضرت عطاء بن زبیرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ہزار نمازوں سے افضل ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز (میری) اس مسجد میں سو نمازوں سے بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے مگر غیر مرفوع (یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہونا ظاہر نہیں کیا) اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث مرفوع آئی ہے۔ ابن جوزی نے حضرت جابرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز سو ہزار نمازوں سے افضل ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے کہ نمازوں کی یہ ترتیبی فضیلت صرف فرض نمازوں کے متعلق ہے نوافل میں یہ فضیلت نہیں ہے کیونکہ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ فرض کے علاوہ باقی نمازیں آدمی کی اپنے گھر میں افضل ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم۔

میں کہتا ہوں اعتکاف کا حکم فرض نمازوں کی طرح ہے کیونکہ بصورت اعتکاف آدمی مسجد کے اندر رہ کر فرض نمازوں کا انتظار کرتا رہتا ہے گویا وہ نماز میں مشغول رہتا ہے۔

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے فضائل مکہ میں حضرت عبداللہ بن عدی بن الحمراء کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کے بازار میں حردرہ مقام پر کھڑے فرمارہے تھے کہ خدا کی قسم تو بلاشبہ اللہ کی زمین میں سب سے اچھی اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے اگر مجھے تیرے اندر سے نکالا نہ جاتا تو میں نہ نکلتا۔ یہی حدیث ابن جوزی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی مرفوعاً بیان کی ہے۔

وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٦﴾ اور باعث ہدایت سب لوگوں کے لئے کیونکہ کعبہ سب کے لئے قبلہ ہے اس میں ایسی عجیب نشانیاں موجود ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ اسی میں (صداقت و حقانیت کی) بکثرت واضح علامات موجود ہیں مثلاً پرندے اس کے اوپر نہیں اڑتے۔ شکاری جانور حرم کے باہر اپنے شکار پر حملہ کرتا ہے لیکن اگر شکار بھاگ کر حرم میں داخل ہو جائے تو درندہ اندر نہیں آتا باہر ہی رک جاتا ہے۔

مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ڬ ان نشانیوں میں سے ایک نشانی مقام ابراہیم ہے یہ ترجمہ اس وقت ہوگا جب مقام ابراہیم کو مبتدا اور خبر کو محذوف قرار دیا جائے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ کو آیات سے بدل قرار دیا جائے اس وقت ترجمہ اس طرح ہوگا کہ کعبہ کے اندر بکثرت واضح نشانیاں ہیں یعنی مقام ابراہیم ہے وغیرہ وغیرہ۔ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی دیوار اونچی کی تھی اور اس پر آپ کے پاؤں کے نشانات پڑ گئے تھے لیکن (حاجیوں کے) ہاتھوں کی رگڑ سے رفتہ رفتہ مٹ گئے۔ پس پتھر کی چٹان پر قدموں کے نشانات پڑ جانا اور چٹان کے اندر قدموں کا ٹخنوں

marfat.com

تک سما جانا اور پتھر میں اتنا گہرا اگڑھا پڑ جانا اور آثار انبیاء میں سے صرف اسی اثر کا اتنے زمانہ تک باقی رہنا اور کثرت اعداء کے باوجود ہزاروں برس تک اس کا محفوظ رہنا ان امور میں سے ہر چیز کعبہ کے قبلہ ہونے کی واضح نشانی ہے اسی لئے بعض علماء نے مقام ابراھیم کو آیات کا عطف بیان قرار دیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مقام ابراہیمؑ پورا حرم ہے۔

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ اور جو حرم میں داخل ہوتا ہے وہ مقتول ہونے اور لوٹے جانے سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ یہ جملہ ابتدائیہ ہے یا شرطیہ ہے اور معنوی اعتبار سے مقام ابراہیمؑ پر اس کا عطف ہے یعنی آیات بینات میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ حرم میں داخل ہونے والا مأمون ہو جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب باہم کشت و خون اور قتل و غارت میں مشغول رہتے تھے لیکن جو شخص حرم میں داخل ہو جاتا تھا اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے۔ حسن، قتادہ اور اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ اسی آیت کی طرح ایک اور آیت ہے فرمایا ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا جو شخص حرم کے اندر آجائے وہ امن میں آجاتا ہے اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔ پس حرم سے باہر اگر کسی نے کوئی جرم موجب قصاص یا موجب حد کیا ہو اور حرم میں آکر پناہ گیر ہو جائے تو اس سے حرم کے اندر نہ قصاص لیا جائے گا، نہ حد جاری کی جائے گی البتہ اس کا کھانا پینا بند کر دیا جائے گا اور خرید و فروخت بھی اس سے ترک کر دی جائے گی تاکہ مجبور ہو کر وہ حرم سے باہر نکل آئے اور اس کو باہر سزا دی جاسکے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا بیرون حرم جرم کر کے حرم میں پناہ لینے والے سے حرم کے اندر بھی قصاص لیا جائے گا۔

لیکن حرم کے اندر کسی نے جرم کیا تو باتفاق علماء حرم کے اندر ہی اس کو سزا دی جائے گی آیت وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ حرم کے اندر مسلمانوں کی طرف سے کافروں کو قتل کرنے کی ابتداء نہ کی جائے اگر کافر مغلوب ہو کر حرم میں داخل ہو جائیں تو ہاتھوں یا تلواروں یا کوڑوں سے مار کر ان کو نکالدیا جائے یا ان کا محاصرہ کر لیا جائے اور (باہر سے) کھانے پینے کی رسد بند کر دی جائے تاکہ مجبور ہو کر وہ باہر نکلیں اس وقت ان سے قتال کیا جائے اور اگر کافر خود حرم کے اندر قتال کا آغاز کر دیں تو مسلمانوں کے لئے بھی حرم کے اندر ان سے لڑنا جائز ہے۔

پس آیت مذکورۂ بالا اگرچہ صورۃً خبر ہے۔ لیکن حقیقت میں امر ہے مطلب یہ ہے کہ جو حرم میں داخل ہو جائے اس کو امن دو، جیسے آیت فلا رفث ولا فسوق باوجود خبر ہونے کے امر کا حکم رکھتی ہے یعنی حج کے درمیان نہ بیہودہ فحش کلام کرو نہ گناہ کرو۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ جو شخص حرم کی تعظیم اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اندر داخل ہو گا قیامت کے دن عذاب سے مأمون ہو گا۔ ابو داؤد طیالسی نے مسند میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ کی روایت سے اور طبرانیؒ اور بیہقیؒ نے شعب میں حضرت سلمانؓ کی روایت سے اور طبرانی نے اوسط میں حضرت جابرؓ کی روایت سے اور دار قطنی نے سنن میں حضرت حاطبؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دونوں حرموں میں سے کسی میں مرے گا قیامت کے دن دوزخ سے بے خوف اٹھے گا۔

حارث بن ابی اسامہ نے مسند میں سالم بن عبد اللہؓ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن میں ابو بکر و عمر (کی قبروں) کے درمیان (قبر) سے اٹھایا جاؤں گا پھر بقیع غرقد کو جاؤں گا اور میرے ساتھ وہ بھی اٹھ کر آئیں گے پھر اہل مکہ کا انتظار کروں گا یہاں تک کہ وہ بھی آجائیں گے، پس میری بعثت اہل حرمین کے درمیان ہو گی۔

ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں سالم بن عبد اللہ کے حوالہ سے حضرت عبد اللہ کی یہ روایت موصولاً نقل کی ہے اور خطیب نے بحوالہ نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان اٹھاؤں گا یہاں تک کہ اہل حرمین کے درمیان جا کر کھڑا ہوں گا اور مدینہ و مکہ والے (وہاں میرے

marfat.com

پاس) آئیں گے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ اور لوگوں پر اللہ کا فرض ہے اور اس کی طرف سے لازم ہے الناس سے مراد ہیں وہ لوگ جو آزاد ہوں، ہوش مند ہوں اور بالغ ہوں، بچوں اور دیوانوں پر حج فرض نہیں کیونکہ ان میں مخاطب ہونے کی اہلیت ہی نہیں ہے نہ غلاموں پر فرض ہے یہ فیصلہ اجماعی ہے۔ پس اگر کسی کافر نے یا ہوشیار بچہ نے یا غلام نے حج کیا تو بالا جماع کافر پر مسلمان ہونے کے بعد اور بچہ پر بالغ ہونے کے بعد اور غلام پر آزاد ہونے کے بعد حج دوبارہ واجب ہے (سابق ادائیگی کافی نہیں ہوگی) حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جس بچہ نے حج کر لیا ہو پھر بالغ ہو گیا ہو تو اس پر دوسرا حج کرنا لازم ہے اور (جو غیر مسلم) دیہاتی حج کر چکا ہو پھر (مسلمان ہو کر) اس نے ہجرت کی ہو اس پر بھی دوسرا حج کرنا واجب ہے اور جو غلام حج کر چکا ہو پھر آزاد کر دیا گیا ہو تو اس پر بھی دوسرا حج کرنا فرض ہے (رواہ الحاکم)۔

دیہاتی سے غیر مسلم دیہاتی مراد ہے کیونکہ عرب کے مشرک بھی حج کیا کرتے تھے۔ حاکم نے اس حدیث کو شرط شیخین کے مطابق کہا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے بھی یہ حدیث (مصنف میں) ذکر کی ہے اور محمد بن کعب قرظی کی روایت سے ابوداؤد نے اس کو مرسلاً ذکر کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے ان احادیث کو امت اسلامیہ نے قبول کیا ہے اور ان کے مضامین پر اجماع امت ہے اس لئے آیت کے عموم کی تخصیص ان احادیث سے جائز ہے۔ (یعنی یہ احادیث اگرچہ آحاد ہیں لیکن امت اسلامیہ نے بالا جماع ان کے مضمون کو قبول کیا ہے تو گویا ان احادیث کا معنی درجہ استفاضہ یا تواتر تک پہنچا ہوا ہے اس لئے آیت میں اگرچہ بچہ یا دیوانہ یا غلام کی کوئی تخصیص حکم حج سے نہیں ہے مگر ان احادیث کی وجہ سے حکم کتاب عام نہیں رہے گا۔ اور الناس سے سب لوگ مراد نہ ہوں گے بلکہ وہ لوگ مراد ہوں گے جو بچے اور دیوانے اور غلام نہ ہوں)۔

حِجُّ الْبَيْتِ کعبہ کا حج۔ ابو جعفر، حمزہ، کسائی اور حفص کی قرأت میں حج بکسر حاء آیا ہے، باقی قاریوں نے حج بفتح حاء پڑھا ہے، کسر حاء اہل نجد کے محاورہ میں اور فتح حاء اہل حجاز کے محاورہ میں ہے معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ بکسر حاء اسم ہے اور بفتح حاء مصدر۔

حج کا لغوی معنی ہے قصد کرنا اس جگہ ایک مخصوص عبادت مراد ہے یہ لفظ اس جگہ مجمل ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے فعل اور دوسری آیات میں اس کا (تفصیلی) بیان موجود ہے، اللہ نے فرمایا ہے ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ، ایک اور آیت میں آیا ہے وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ پہلی آیت میں عرفات سے روانگی کا بیان ہے اور دوسری آیت میں طواف کعبہ کا حکم ہے)۔

مسئلہ :۔ اجماع امت ہے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن اور فرض عین ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام کی (عمارت کی) بناء پانچ امور پر ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا اقرار اور نماز ٹھیک ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔ صحیح بخاری و مسلم۔ فرضیت حج کے متعلق احادیث بکثرت آئی ہیں۔[1] **مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا**

یعنی ان لوگوں پر جو کعبہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ یہ جملہ الناس سے بدل ہے اس لئے جو مستطیع نہ ہو اس پر حج فرض نہیں۔ سبیلاً سے مراد ہے راستہ پر چلنا سبیلاً کی طرف استطاع کی نسبت مجازی ہے جیسے جری النہر میں نہر کی طرف نسبت مجازی ہے (کیونکہ بہنے والی چیز پانی ہے نہر یعنی گڑھا جس میں پانی بہتا ہے خود نہیں بہتا) چونکہ حج کی فرضیت صرف اہل استطاعت پر ہے۔ اس لئے علماء کا اتفاق ہے کہ وجوب حج کے لئے راستہ کا پرامن ہونا لازم ہے اور راستہ میں جو فردو

[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا اگر لوگ حج کو چھوڑ دیں تو میں ان سے جہاد کروں گا جیسے نماز اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں ہم جہاد کرتے ہیں۔ (از مولف)

marfat.com

گاہیں ہوں ان میں کھانا پانی ملنا بھی ضروری ہے خطرۂ راہ کی صورت میں حج فرض نہیں۔ اگر راستہ میں سمندر پڑتا ہو اور اکثر سلامتی کے ساتھ سمندری راستہ طے ہو جاتا ہو تو حج واجب ہو گا صرف سمندر کا درمیان میں ہونا وجوب حج سے مانع نہیں ہے۔[1] امام شافعیؒ کا ایک قول اس کے خلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جسمانی صحت بھی شرط ہے (زیادہ) ضعیف اور پاؤں سے معذور شخص پر حج واجب نہیں، خواہ وہ مال خرچ کر کے اپنے قائم مقام دوسرے کو بھیج سکتا ہو کیونکہ وہ خود اہل استطاعت نہیں اور حج ایک بدنی عبادت ہے اور بدنی عبادت کا مقصود ہوتا ہے خود تکلیف اٹھانا نائب کو اپنی جگہ بھیجنے سے اس عبادت کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ (کے نزدیک بدنی صحت شرط نہیں ہے اس لئے ان) کے نزدیک معذور، لنگڑا اور کمزور شخص اہل استطاعت ہے یعنی اس کو مالی استطاعت حاصل ہے۔ بغوی نے (اس قول کی تائید میں) لکھا ہے کہ محاورہ میں بولا جاتا ہے۔ زید اپنا مکان بنانے کی استطاعت رکھتا ہے یعنی مال خرچ کر کے مکان بنوا سکتا ہے خواہ خود اپنے ہاتھ سے تعمیر نہ کر سکتا ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ ایسا شخص حج کی استطاعت نہیں رکھتا یعنی حج کے خاص ارکان خود ادا نہیں کر سکتا خواہ مال خرچ کر کے دوسرے سے کرا سکتا ہو۔ حج کو مکان کی تعمیر پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ حج بدنی عبادت ہے اور مکان کی تعمیر کا مقصد خود تعمیر کرنا نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے اپنے قول کی دلیل میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت پیش کی ہے کہ فضل (بن عباسؓ) حضور اقدس ﷺ کے ردیف تھے: خاندان خثعم کی ایک عورت آئی فضل اس کی طرف دیکھنے لگے وہ بھی فضل کی طرف دیکھنے لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فضل کا منہ دوسری طرف موڑ دیا اور اس عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ کا فریضہ حج میرے باپ پر اس وقت آیا جبکہ وہ بہت بڑا بوڑھا ہے کجاوہ میں سنبھل کر بیٹھ بھی نہیں سکتا کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں فرمایا، ہاں۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ وہ ٹھیک سے کجاوہ میں بیٹھ بھی نہیں سکتا تو کیا اگر میں اس کی طرف سے حج کر لوں تو ادا ہو جائے گا فرمایا، ہاں! یہ واقعہ حج وداع کا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم۔

جواب :- یہ حدیث آحاد ہے کتاب اللہ کی قائم کی ہوئی استطاعت کی شرط حدیث احاد سے منسوخ نہیں کی جا سکتی۔ جواب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ کا فریضہ حج جس کی فرضیت کتاب اللہ میں بشرط استطاعت آئی ہے میرے باپ پر ایسی حالت میں آیا ہے کہ وہ استطاعت نہیں رکھتا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں یعنی کیا میرے لئے اس کی طرف سے حج کرنا جائز ہے یا یہ مطلب ہے کہ کیا میرے حج کرنے سے اس کو ثواب اور نفع ہو گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا (یعنی اگرچہ اس پر حج فرض نہیں ہے مگر تمہارے حج کرنے سے اس کو فائدہ ضرور ہو گا)۔

اعتراض :- بعض روایات میں یہ لفظ بھی آیا ہے کہ حج اس پر فرض ہے۔

جواب :- اگر یہ الفاظ پایہ ثبوت تک پہنچ جائیں تو ان سے اس عورت کے خیال کا اظہار ہوتا ہے (کہ وہ اپنے نزدیک یہی سمجھی تھی کہ بوڑھے باپ پر بھی حج فرض ہے)۔

اعتراض :- رسول اللہ ﷺ نے اس کو جواب دیا اگر اس کا خیال صحیح نہ ہوتا تو حضور ﷺ بیان فرما دیتے (کہ تیرا خیال غلط ہے تیرے باپ پر اس حالت میں حج فرض ہی نہیں ہے) اس اعتراض کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے جواب اس کے سوال کا دیا تھا اس نے حج کرنے کے متعلق پوچھا تھا۔ حضور ﷺ نے ہاں فرما دیا۔ یعنی اس کی طرف سے تو حج کر لے کیونکہ حضور ﷺ نے محسوس فرما لیا تھا کہ اس عورت کے دل میں اپنے باپ کو نفع اور ثواب پہنچانے کا بڑا شوق ہے اس مطلب کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے ہوتی ہے جس کو عبد الرزاق نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا اپنے باپ کی طرف سے حج کر لے اگر تو اس کی بھلائی میں اضافہ نہیں کر پائے گی تو برائی میں بھی زیادتی نہیں کرے گی۔ لیکن حفاظ

[1] فتاویٰ قاضی خان میں امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ منقول ہے کہ سمندر حائل ہو تو راستہ کو غیر مامون قرار دیا جائے گا یعنی حج فرض نہیں ہو گا، جیحون سیحون، دجلہ، فرات دریا ہیں سمندر نہیں ہیں۔ مولف

marfat.com

حدیث نے اس روایت کو شاذ کہا ہے (اور شاذ نا قابل استدلال ہے)۔

اولیٰ جواب یہ ہے

کہ حدیث مذکور کو اس صورت پر محمول کیا جائے کہ حالت صحت میں حج فرض ہوا ہو اور اداء فرض سے پہلے اس پر کمزوری کا دور آجائے یا پاؤں سے معذور ہو جائے، ایسے شخص سے فریضہ حج ساقط نہیں ہوتا جب تک اس کی زندگی میں اس کے مال سے کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے حج نہ کرے یا مرنے کے وقت حج کی وصیت نہ کردے بغیر حج کئے مرجائے تو اس کا وارث اس کی طرف سے حج کرے یا کسی غیر کو مال دے کر اس کی طرف سے حج کرادے۔ پس کسی کی طرف سے حج فرض کرنا قضائے حج ضرور ہے مگر بمثل غیر معقول (یعنی خلاف قیاس) مگر اس حدیث میں اس کا حکم آگیا ہے (لہٰذا خلاف قیاس بھی مانا جائے گا) جیسے پیر ناکارہ کے حق روزہ کا فدیہ کتاب اللہ کی صراحت سے ثابت ہے (اور خلاف قیاس ہے مگر واجب التسلیم) حج کی فرضیت حدیبیہ کے سال یعنی ۶ھ میں ہوئی تھی۔ اللہ نے فرمایا تھا واتموا الحج و العمرة لله اور حدیث والا قصہ حجۃ الوداع کا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس عورت کا باپ ۶ھ کے بعد حج وداع سے پہلے ضعیف ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

امام صاحبؒ کے نزدیک وجوب حج کے لئے بینائی بھی شرط ہے، نابینا پر حج واجب نہیں ہے، خواہ رہبر اس کے پاس موجود ہو کیونکہ وہ خود اہل استطاعت نہیں ہے اور دوسروں کے سہارے سے استطاعت قابل اعتبار نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور جمہور کے نزدیک نابینا پر حج فرض ہے بشرطیکہ اس کے پاس رہبر موجود ہو۔ وجوب جمعہ میں بھی یہی اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورت پر ادائیگی حج اس وقت واجب ہوتی ہے جب اس کے ساتھ اس کا شوہر یا کوئی دوسرا محرم ہو اور مکہ تک جانے میں تین منزل کا فاصلہ ہو۔ امام احمدؒ کے نزدیک مسافت کی قلت و کثرت کا اعتبار نہیں۔ بہر صورت بغیر محرم کے عورت پر وجوب حج ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اگر محرم موجود نہ ہو یا محرم اس کے ساتھ نہ جائے یا اتنی اجرت مانگتا ہو کہ عورت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حج واجب نہیں۔ کیونکہ شرعاً عورت کو بغیر شوہر یا محرم کے سفر کرنے کی ممانعت کردی گئی ہے اور جس چیز کی شرعاً ممانعت کردی گئی ہے وہ غیر موجود کے حکم میں ہے تو گویا بغیر محرم کے عورت کو صاحب استطاعت ہی نہیں سمجھا جائے گا۔

امام صاحبؒ کے قول کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت بغیر محرم کے تین منزل پر سفر نہ کرے (صحیح بخاری و مسلم) مسلم کی روایت میں آیا ہے کہ جو عورت اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہے وہ تین رات کا سفر بغیر محرم کے نہ کرے۔ دوسری روایت میں تین رات سے زائد کا لفظ آیا ہے۔ تین رات کے لفظ والی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے جس کو مسلم اور طحاوی نے نقل کیا ہے تین رات سے زائد کا لفظ طحاوی کی روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی منقول ہے۔

عمرو بن شعیبؒ کے دادا کی روایت میں تین دن کا لفظ طحاویؒ نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت میں ہے تین دن یا زائد کا فاصلہ، یہ روایت مسلم اور طحاوی نے نقل کی ہے۔ مسلم کی روایت میں تین رات سے اوپر یا زائد کا لفظ ہے۔

امام احمدؒ نے فرمایا تین رات یا تین رات سے زائد کی شرط محض اتفاقی ہے (تعیین مدت مقصود نہیں ہے پھر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو مفہوم مخالف معتبر بھی نہیں ہے کہ اگر تین دن کی مسافت نہ ہو تو بغیر محرم کے عورت کا سفر جائز ہو جائے اگر شرط کو ضروری قرار دیا جائے گا اور اتفاقی نہ مانا جائے گا تو پھر احادیث میں (نا قابل ازالہ) تعارض ہو گا تین اور تین سے زیادہ والی روایات میں توافق نہ ہو سکے گا۔ امام احمدؒ جو تین روز کی مسافت سے کم سفر کو بھی عورت کے لئے بغیر محرم کے ممنوع قرار دیتے ہیں ان کے اس قول کا ثبوت حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے جو صحیحین میں مذکور ہے اور اس میں ایک دن رات کی مسافت کی صراحت ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں فاصلہ ایک یوم اور دوسری روایت میں مسافت ایک شب مذکور ہے اور

marfat.com

حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت میں حسب ذکر مسلم مسافت دوروز اور حسب روایت طحاوی فاصلہ دو شب مذکور ہے۔
ابو داؤد اور طحاوی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے حدیث نقل کی ہے کہ سوائے شوہر یا کسی محرم کی ہمراہی کے عورت ایک منزل سفر نہ کرے۔ ابن حبانؒ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور حاکم نے نقل کرنے کے بعد شرط مسلم کے موافق کہا ہے اور طبرانی نے معجم میں تین میل کے لفظ کی صراحت کی ہے۔ ان مختلف روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دن یا دو دن یا تین دن کی شرط صرف تمثیلی ہے (عدد معین مراد نہیں ہے) قلیل ترین تعداد مراد ہے ایک دن تو کم ترین ابتدائی عدد ہوتا ہی ہے اور برید اکثر ایک ہی منزل ہوتا ہے، دو سے کثرت شروع ہوتی ہے اور تین جمع کا اول مرتبہ ہے۔
بعض احادیث میں بلا شرط ممانعت آئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بغیر محرم کے عورت سفر نہ کرے اور عورت کے پاس کوئی (اجنبی) شخص اس وقت تک نہ داخل ہو جب تک عورت کے پاس اس کا کوئی محرم نہ ہو۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں فلاں جہاد میں جانا چاہتا ہوں اور میری بیوی حج کرنا چاہتی ہے فرمایا تم اس کے ساتھ چلے جاؤ، صحیح مسلم و بخاری۔ اس سلسلہ کی حدیث حضرت ابو سعیدؓ خدری اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی آئی ہے۔
امام شافعیؒ کا قول ہے کہ معتمد عورتوں کے ساتھ عورت حج کو جا سکتی ہے، دوسرے قول میں کہ کسی ایک معتمد عورت کے ساتھ جا سکتی ہے، لیکن جن معتمد عورتوں کے ساتھ جائے ان میں سے کسی ایک کا محرم مرد اسکے ساتھ ہونا چاہئے۔ منہاج میں (یہ شرط مذکور نہیں ہے) بلکہ اس کا شرط نہ ہونا مذکور ہے۔ ایک روایت میں امام شافعیؒ کا قول اس طرح آیا ہے کہ بغیر (معتمد) عورتوں کے بھی عورت حج کو جا سکتی ہے۔
امام مالکؒ نے فرمایا اگر راستہ بے خطر ہو تو عورتوں کی جماعت (بغیر مرد کے) بھی حج کو جا سکتی ہے ان دونوں اماموں کے قول کے خلاف ہماری دلیل وہ حدیث ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ استطاعت سے مراد سفر کی ایسی استطاعت ہے جس کی موجودگی میں حج کو جانے سے کوئی خرابی نہ پیدا ہو۔ اسی لئے جمہور کے نزدیک دیگر لوازم سفر کی فراہمی کے علاوہ زاد راہ اور سواری ہونا استطاعت کے لئے ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ قرض دار نہ ہو اور بیوی بچوں کے مصارف واپسی تک کے دے چکا ہو کیونکہ جو مالدار اصلی ضروریات کی فراہمی میں مشغول ہو وہ نادار کی طرح ہوتا ہے اسی لئے اس کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں جس کے پاس زاد راہ یا سواری نہ ہو وہ عموماً سفر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور شریعت میں ہر قسم کی تنگی دفع کر دی گئی ہے (یعنی شریعت نے کسی پر تنگی نہیں کی ہے)۔ [1]
داؤدؒ ظاہری کے نزدیک وجوب حج کے لئے نہ زاد راہ ضروری ہے، نہ سواری۔ امام مالکؒ نے فرمایا اگر یہ شخص مانگنے کا عادی ہو یا راستہ میں کمائی کر سکتا ہو تو اس کے لئے زاد راہ کی شرط نہیں ہے اور اگر پیدل چلنے پر قادر ہو تو سواری کی شرط نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔
ہم کہتے ہیں کہ یاتوک ایک واقعہ کی خبر اور امر کا جواب ہے اور جو خبر امر کے جواب میں آتی ہے وہ امر کے حکم میں نہیں ہوتی، اس لئے آیت سے بلا سواری حج کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ رہا پیدل چلنے کی قدرت کا مسئلہ تو چلنے کی قدرت ایک پوشیدہ امر ہے۔ کبھی راستہ میں یہ قدرت جاتی رہتی ہے اس لئے شروع ہی سے زاد راہ اور سواری ہونا لازم ہے تاکہ انجام میں ہلاکت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شرعی احکام عمومی ہوتے ہیں (خاص خاص افراد کے لئے الگ الگ نہیں ہوتے) دیکھو بادشاہ کو سفر

---

[1] اگر کوئی غیر کسی نادار ہو اور اس کی اولاد اپنی طرف سے اس کے زاد راہ اور سواری کا انتظام کر دے تو اس سے یہ شخص صاحب استطاعت نہیں سمجھا جاتا۔ امام شافعیؒ کا قول اسکے خلاف ہے لیکن اگر زاد راہ اور سواری کا انتظام کرنے والا کوئی غیر شخص ہو تو اس میں۔ امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، مثبت اور منفی، بعض روایات میں آیا ہے کہ غیر ہونے کی حالت میں امام شافعیؒ عدم استطاعت کے قائل ہیں اور اولاد ہونے کی صورت میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں (فتاویٰ قاضی خانؒ)

marfat.com

میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن اس کے لئے بھی مسافت سفر میں نماز کا قصر اور روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور مسافت سفر سے کم میں اس کے لئے بھی روزہ کا ترک جائز نہیں جس کو روزہ رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔

جمہور کے قول کا ثبوت حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کی تفسیر میں فرمایا کہ سبیل (سے مراد) ہے زادو سواری۔ یہ حدیث دار قطنی بیہقی اور حاکم نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کی ہے، حاکمؒ نے اس کو شرط شیخین کے موافق صحیح کہا ہے، نیز حضرت حماد بن سلمہؒ کی روایت سے بھی حاکم نے نقل کیا ہے اور شرط مسلم کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور سعید بن منصور نے سنن میں مرسلاً مختلف طریقوں سے حسنؒ بصری کی روایت سے بیان کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے جس کو امام شافعیؒ، ترمذی، ابن ماجہ اور دار قطنی نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حج کو واجب کرنے والی کیا چیزیں ہیں فرمایا زاد اور سواری۔ ترمذی نے اس سلسلے کو حسن کہا ہے لیکن اس سلسلہ میں ابراہیم بن یزید جوزی ہے جو امام احمد و نسائی کے نزدیک متروک الحدیث ہے۔ ابن ماجہ اور دار قطنی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زاد و سواری یعنی اس آیت کی تفسیر میں (استطاعتِ سبیل کی تشریح کرتے ہوئے) فرمایا زاد و سواری مگر اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

دار قطنی نے اس حدیث کی روایت کی نسبت حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ اور عمرو بن شعیب کے دادا کی طرف بھی کی ہے مگر یہ سب طریقے ضعیف ہیں۔

حج میں توشہ ساتھ لینا واجب ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اور توشہ لے لیا کرو اور بہترین توشہ سوال سے بچا رہنا ہے۔ بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اہل یمن بغیر توشہ ساتھ لئے حج کرنے چل دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں لیکن جب مکہ میں پہنچتے تھے تو لوگوں سے بھیک مانگتے تھے اس پر آیت و تزودوا الخ کا نزول ہوا۔ [1]

وَمَنْ كَفَرَ اور جس نے فرضیت حج کا انکار کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصریؒ اور عطاءؒ خراسانی نے اس لفظ کی یہی تفسیر کی ہے۔ عبد بن حمیدؒ نے اپنی تفسیر میں نفیع کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جس نے حج کو ترک کر دیا وہ کافر ہو گیا۔ فرمایا جس نے (اس طرح) حج کو ترک کر دیا کہ اس کو نہ ترک حج کے عذاب کا خوف رہا، نہ ادائے حج کے ثواب کی امید (وہ کافر ہو گیا) نفیع تابعی ہے اس لئے یہ حدیث مرسل ہے۔ سعید بن مسیب نے فرمایا اس آیت کا نزول یہودیوں کے حق میں ہوا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ مکہ کا حج کرنا واجب نہیں ہے۔

سعید بن منصور اور ابن جریر نے ضحاک کا قول بیان کیا ہے کہ جب شروع آیت (وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الخ) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مختلف مذاہب والوں کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور فرمایا کہ اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے اس لئے تم حج کرو۔ یہ سن کر ایک مذہب والوں نے تو اس حکم کو مان لیا یعنی مسلمانوں نے اور پانچ مذاہب والوں نے ماننے سے انکار

---

[1] فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ بعض علماء نے کہا اگر کوئی تاجر جس کا گذران تجارت سے ہوتا ہے اتنے مال کا مالک ہو کہ جانے آنے کے لئے زاد راہ اور سواری کا انتظام کر لے اور واپسی کے وقت تک اہل و عیال کے لئے ضروری مصارف بھی فراہم کر دے اور پھر واپسی کے بعد اس کے پاس اتنا مال بھی رہ جائے کہ تجارت کر سکے تو اس پر حج فرض ہو گا ورنہ نہیں ہو گا اگر کوئی جائیداد والا کچھ جائیداد بیچ کر زاد راہ اور سواری اور بیوی بچوں کے گزارے کا سامان فراہم کر سکتا ہو اور پھر بھی اس کے پاس اتنی جائیداد رہ جائے کہ اس کی آمدنی سے گذارا کر سکتا ہو تو اس پر حج فرض ہے ورنہ نہیں اگر کوئی کاشتکار زاد راہ اور سواری اور بیوی بچوں کے گذران کی فراہمی کے بعد بیل، ہل اور دوسرے آلات کشاورزی باقی رکھتا ہو کہ واپس آکر کھیتی کر سکے تو اس پر حج فرض ہے ورنہ نہیں۔ (من المولف)

marfat.com

کر دیا یعنی یہودیوں نے، عیسائیوں نے، مشرکوں نے، صابیوں نے، مجوسیوں نے نہ مانا۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ سعید بن منصورؒ نے عکرمہؓ کا قول بیان کیا کہ جب آیت وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا (الآیہ) نازل ہوئی تو یہودیوں نے کہا ہم تو مسلمان ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اللہ نے مسلمانوں پر حج فرض کیا ہے یہودیوں نے حج کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے ہم پر حج فرض نہیں کیا گیا اس پر اللہ نے آیت ومن کفر الخ نازل فرمائی۔

(حج در حقیقت وسعتِ مال اور صحتِ جسمانی کا عملی شکریہ ہے) پس حج نہ کرنے کا معنی ہوا خداداد مال و صحت کا شکریہ ادا نہ کرنا یہی کفران نعمت ہے (اس صورت میں کفر کا معنی ہوا کفران نعمت کیا) اول صورت میں کفر کرنے کا معنی ہے حج نہ کرنا، حج نہ کرنے کی تعبیر کفر سے وجوب حج کو پختہ کرنے اور تارک حج کو سخت تنبیہ کرنے کے لئے کی۔ یہ دونوں معنی حضرت ابوامامہؓ کی روایت کردہ حدیث میں مراد ہو سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو کھلی ہوئی احتیاج یا روک دینے والا مرض یا ظالم بادشاہ حج سے روکنے والا نہ ہو اور اس پر بھی وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر (اللہ کو اس کی پرواہ نہیں) یہ روایت دارمی نے مسند میں اور بغوی نے اور ابن جوزی نے موضوعات میں ذکر کی ہے۔ حفاظ حدیث نے اس حدیث پر نکتہ چینی کی ہے۔ حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ جو شخص زادراہ اور سواری ایسی رکھتا ہو کہ بیت اللہ تک پہنچ سکے اور حج نہ کرے تو بعید نہیں کہ یہودی اور عیسائی ہونے کی حالت میں مرے۔ (رواہ الترمذی وضعفہ)۔

فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿۹۷﴾ تو بلاشبہ اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے (اس کو کسی کی عبادت کی ضرورت نہیں جو کرے گا اپنے لئے کرے گا)۔

آیت وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ سے عَنِ الْعَالَمِينَ تک حکم حج کو مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر تاکید کے ساتھ بیان کر رہی ہے نمبر ۱۔ امر وجوبی کی تعبیر صیغہ خبر سے کی گئی۔ نمبر ۲۔ امر کو جملہ اسمیہ کی صورت میں ظاہر کیا۔ نمبر ۳۔ اللہ کا وجوبی حق ہونا بیان کیا نمبر ۴۔ اول عمومی حکم دیا (اور فرمایا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ) پھر حکم کو ایک شرط کے ساتھ مخصوص کر دیا (اور فرمایا من استطاع الیہ سبیلا) گویا ابہام کے بعد وضاحت کی اور دوبارہ حکم دیا (ایک بار مبہم دوسری بار واضح) نمبر ۵۔ ترک حج کو کفر فرمایا گویا یہ کافروں کا فعل ہے نمبر ۶۔ اپنا استغنا ظاہر کیا اور اس جگہ استغناء کا ذکر نفرت اور بغض پر دلالت کر رہا ہے (گویا مستغنی ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تارک حج سے نفرت اور بغض کرتا ہے نمبر ۷۔ لفظ اللہ کو دوبارہ ذکر کیا اور ضمیر ذکر نہیں کی تاکہ تارک حج کی طرف سے اللہ کا استغنا بصورت تعمیم مدلل طور پر ظاہر ہو جائے اور اللہ کا انتہائی غضب معلوم ہو جائے۔

حِجُّ الْبَيْتِ میں حج کی اضافت بیت کی جانب بتا رہی ہے کہ کعبہ وجوب حج کا سبب ہے اور چونکہ کعبہ متعدد نہیں اس لئے عمر میں حج کا وجوب بھی بار بار نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے حج (فرض) ایک بار ہے جو زیادہ کرے تو نفل ہو گا۔ رواہ احمد والنسائی۔

کعبہ نام کسی خاص چھت یا پتھر مٹی کی دیواروں کا نہیں ہے، پتھر مٹی کو اٹھا کر کہیں دوسری جگہ ڈال دیا جائے تو کعبہ منتقل نہیں ہو جائے گا اگر اس مصالحہ سے کسی دوسری جگہ کوئی عمارت بنا دی جائے تو وہ قبلہ سجود نہ بن جائے گی۔ بلکہ کعبہ ایک ربانی لطیفہ ہے جس کی فرودگاہ ایک موہوم مکان ہے جہاں تجلیات ذاتیہ کی بارش ہوتی ہے۔ پس ظاہر کعبہ اگرچہ مخلوق ہے اور اس کا تعلق عالم خلق سے ہے مگر حقیقت میں کعبہ ایک باطنی نسبت ہے جس کا ادراک نہ حس کر سکتی ہے نہ خیال بلکہ محسوس (ظاہری) ہونے کے باوجود وہ محسوس نہیں ہے۔ اور جہت مخصوصہ میں ہونے کے باوجود اس کی کوئی جہت نہیں۔ یہ ظاہر کعبہ کی شان ہے رہی کعبہ کی حقیقت تو وہ کون جانے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے ممکنات کو وجوب کا آئینہ (اور پر تو گاہ) بنایا اور عدم (ذاتی) کو وجوب و وجود کا مظہر قرار دیا۔ پھر کعبہ کی حقیقت سے بالا حقیقت قرآن ہے (جو مخلوق بھی نہیں ہے) اور حقیقت قرآن سے بالا تر نماز کی حقیقت ہے اور اس مقام پر پہنچ کر سالک کی سیر بوساطت پیغمبر ختم ہو جاتی ہے اور فنا، وبقاء کا مقام آتا ہے اور اس سے

marfat.com

بھی اوپر خالص معبودیّت (الوہیّت) کا مقام ہے جس کی سیر صرف نظری ہی ہو سکتی ہے (سلوکی نہیں ہو سکتی) واللہ اعلم۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ﳓ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیں کہ اے حاملان کتاب (سماوی) تم اللہ کے ان نقلی اور عقلی دلائل کا کیوں انکار کرتے ہو جو محمد رسول اللہ کے فرضیتِ حج وغیرہ کے دعوے کی سچائی کو ظاہر کر رہی ہیں۔ اہل کتاب کو خصوصیّت کے ساتھ مخاطب کرنے کا حکم اس وجہ سے دیا کہ کتاب کو جانتے ہوئے کفر کرنا بدترین فعل ہے۔

وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے کفر اور تحریفِ کتاب کے عمل سے باخبر ہے (دیکھ رہا ہے) تم کو اس کی ضرور سزا دے گا اس لئے حق کو پوشیدہ رکھنے کی تمہاری خواہش سودمند نہیں ہو گی۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ آپ کہہ دیں اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کے راستہ سے یعنی اسلام کی راہ سے جو اللہ تک پہنچاتی ہے۔ ایمان لانے والوں کو روکتے ہو یعنی جو لوگ ایمان لانا چاہتے ہیں، ان کو ایمان لانے سے کیوں روکتے ہو خطاب اور استفہام کی تکرار سے اس طرف اشارہ ہے کہ کفر اور ایمان سے بازداشت دونوں بجائے خود قبیح اور موجبِ عذاب ہیں اور کسی ایک فعل کا عذر بھی ممکن نہیں، گویا دو مرتبہ خطاب اور استفہام کر کے یہودیوں کی دونوں بیجا حرکتوں پر قوت کے ساتھ تنبیہ فرمائی ہے۔

تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا عِوَجًا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے یعنی تم چاہتے ہو کہ اللہ کا راستہ ٹیڑھا ہو یا مصدری معنی ہی مراد ہے اور ھا سے پہلے لام محذوف ہے۔ یعنی تم اللہ کے راستہ کے کج ہونے کے طلب گار ہو۔ یہودی حق کو چھپاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف مندرجہ تورات کو بگاڑ کر بیان کرتے تھے مذہب یہودیّت کو دوامی کہتے تھے مؤمنوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے تھے تاکہ ان کی وحدت باقی نہ رہے اوس و خزرج کے قبائل کے درمیان گزشتہ جاہلیت کے زمانہ کی عداوتوں کی یاددہانی کر کے کوشش کرتے تھے کہ از سر نو دیرینہ عداوتیں زندہ ہو جائیں۔

وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ یعنی تم اپنے (نازیبا) کرتوت کے خود گواہ ہو یا یہ مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف اور اسلام کا دینِ خدا ہونا جو تورات میں مذکور ہے تم خود اس کے گواہ ہو (اگرچہ زبانوں سے اس کی شہادت نہیں دیتے ہو)۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے اور نہ تمہاری اس خیانت نفس سے ناواقف ہے جو تم مسلمان ہونے والوں کو ایمان لانے سے روکتے ہو۔

ابن اسحاق اور ابوالشیخ اور ابن جریرؒ نے زید کی مرسل روایت بیان کی ہے جس کو بغوی نے بھی ذکر کیا ہے کہ شماس بن قیس یہودی بڑا سخت کافر تھا مسلمانوں پر بہت طعن و تشنیع کرتا تھا ایک مجلس میں اوس اور خزرج قبیلوں کے کچھ لوگ جمع تھے شماس ادھر سے گزرا اور مسلمانوں کو باہم (الفت کی) بات چیت کرتے دیکھ کر جل گیا۔ جاہلیت کے زمانہ میں ان دونوں خاندانوں میں عداوت تھی دور اسلامی میں الفت ہو گئی۔ یہودی کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا کہنے لگا بنی قیلہ کی جماعتیں تو اس ملک میں کبھی جمع نہیں ہوئیں اگر یہ جمع ہو گئے تو ہمیں ان کے ساتھ اس جگہ استقرار حاصل نہ ہو گا یہ کہنے کے بعد اپنے ساتھی کو جو ایک یہودی جوان تھا حکم دیا کہ جاؤ اور جا کر انصار کی مجلس میں بیٹھو ان کے سامنے جنگ بعاث اور جنگ بعاث سے پہلی عداوتوں کا تذکرہ کرو اور جنگ بعاث کے متعلق فریقین نے جو (رجزیہ اور فخریہ) اشعار کہے ہیں وہ بھی ان کے سامنے پڑھو بعاث قبائل اوس خزرج کی باہمی ایک لڑائی کا نام ہے جس میں خزرج پر اوس کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ یہودی جوان نے اوس و خزرج سے جا کر گفتگو کی (اور دیرینہ عداوت یاد دلا کر ہر فریق کو دوسرے کے خلاف بھڑکایا) نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قبیلوں میں سے ایک ایک آدمی زانو کے بل کھڑا ہو گیا آپس میں سب جھگڑنے اور مقابل کے خلاف اپنے فخر کا اظہار کرنے لگے۔

ایک شخص قبیلہ اوس کے بنی حارثہ کے خاندان میں سے تھا جس کا نام اوس بن قبطی تھا۔ دوسرا خزرجی تھا جو بنی سلمہ میں سے تھا اس کا نام جبار بن صخر تھا دونوں کے درمیان لاگ ڈانٹ ہوئی ایک نے دوسرے سے کہا اگر تم چاہتے ہو تو ہم بھی اب از سر

marfat.com

نو اس کو (یعنی واقعہ بعاث کو) زندہ کرنے کو تیار ہیں دونوں فریق غضبناک ہوگئے اور کہنے لگے ہم زور آزمائی کو تیار ہیں مدینہ سے باہر، ظاہرۂ یعنی حرہ میں جنگ ہوگی سب لوگ حرہ کی طرف چل دیئے۔ اوس اور خزرج نے دور جاہلیت کے نعرے لگائے ہر فریق جمع ہوگیا۔ یہ اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھی پہنچ گئی آپ مہاجروں کی جماعت ساتھ لے کر تشریف لے آئے اور فرمایا اے گروہ اہل اسلام ابھی تو میں تمہارے اندر موجود ہوں باوجودیکہ اللہ نے تم کو اسلام کی عزت عطا فرمادی اور جاہلیت کی باتیں ختم کر دیں اور تمہارے آپس میں الفت پیدا کردی پھر کیا دوبارہ تم جاہلیت کی ایسی پکار مچا کر پہلے کی طرح کافر ہو جاؤ گے اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو اس وقت لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ شیطانی اغواء اور دشمن کی دسیسہ کاری تھی فوراً ہاتھوں سے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور آپس میں گلے مل گئے۔ پھر حضور اقدس ﷺ کے ساتھ انتہائی فرمانبرداری اور اطاعت گذاری کے ساتھ لوٹ آئے اس پر مندرجہ ذیل آیت اوس اور جبار اور ان کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اے اہل ایمان یعنی اے انصار۔

اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اگر تم اہل کتاب کے کسی فریق یعنی شماس اور اس کے ساتھیوں کے کہنے میں آجاؤ گے تو۔

یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ وہ تمہارے مؤمن ہونے کے بعد دوبارہ تم کو کفر کی طرف لوٹا دیں گے یعنی اعمال کفر کی طرف لے جائیں گے، زید کا بیان ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا میں نے اس روز سے زیادہ کوئی دن کبھی بد آغاز اور خوش انجام نہیں دیکھا۔

شماس بن قیس ہی کے متعلق آیت قل یا اھل الکتاب لم تصدون الخ، نازل ہوئی تھی اس میں رسول اللہ کو حکم دیا گیا کہ اہل کتاب سے دریافت کریں (براہ راست اہل کتاب کو خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اس قابل نہ تھے کہ اللہ ان کو خود مخاطب بناتا) اس سے اہل ایمان کی عظمتِ قدر کا اظہار اور مخاطبِ الٰہی بننے کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

فریابی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے کہ دور جاہلیت میں اوس و خزرج میں باہم جنگ تھی (دور اسلامی میں سب متفق ہوگئے لیکن پھر بھی جاہلیت کی یاد دلوں میں باقی تھی) ایک روز سب ملے جلے بیٹھے تھے کہ آپس کی عداوت کا کچھ ذکر آگیا اس تذکرۂ (پارینہ) کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب غضب ناک ہوگئے اور ایک دوسرے کے مقابل ہتھیار اٹھا کر آگیا اس پر آیت۔

وَكَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ نازل ہوئی کیف استفہامیہ تعجب وانکار کے لئے ہے یعنی تعجب ہے کہ تم اعمال کفر کی طرف جارہے ہو حالانکہ ابھی تازہ بتازہ اللہ کا کلام رسول اللہ ﷺ کی معرفت تم پر اتارا جارہا ہے اور پڑھ کو تم کو سنایا جارہا ہے۔

وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ اور اللہ کا رسول بھی تمہارے اندر موجود ہے جو تمہاری روک ٹوک کرتا، وعظ فرماتا اور تمہارے شبہات مٹاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ کفر سے روکنے والے اور ایمان کی طرف بلانے والے سارے اسباب الٰہی موجود ہیں اور تمہارے سامنے جمع ہیں، قتادہؒ نے کہا اس آیت میں دو واضح علم مذکور ہیں اللہ کی کتاب اور اللہ کا نبی، رسول خدا تو چلے گئے کتاب اللہ باقی ہے جو اللہ کی رحمت اور نعمت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد قیامت تک ہونے والے اپنے جانشینوں کی طرف ہماری رہنمائی فرمادی ہے، حضرت زید بن ارقم کی روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ہمارے مجمع میں کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اللہ کے حمد و ثناء کے بعد فرمایا لوگو میں محض ایک آدمی ہوں عنقریب میرے رب کا قاصد میرے پاس آئے گا اور میں اس کی دعوت قبول کروں گا میں تمہارے اندر دو بڑی عظمت والی چیزیں چھوڑ رہا ہے پہلی کتاب اللہ ہے جس کے اندر ہدایت اور نور ہے تم اللہ کی کتاب کو پکڑو اور مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو (دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے متعلق تم کو اللہ (کے احکام اور

marfat.com

خوف) کی یاد دلاتا ہوں۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ اللہ کی کتاب ہی اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے جو اس کے حکم پر چلے گا ہدایت پر ہوگا جو اس کو چھوڑ دے گا گمراہ ہوگا (رواہ مسلم)۔

ترمذی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ میں تمہارے اندر ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم اس کو تھامے رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے (یہ دو چیزیں ہیں جن میں سے) ایک دوسری سے مرتبہ میں زائد ہے (ایک) اللہ کی کتاب ہے جو آسمان سے زمین تک ایک آویختہ رسی ہے (اس کو پکڑ کر آسمان تک پہنچا جاسکتا ہے) (دوسری چیز) میری عترت یعنی میرے اہل بیت ہیں۔ حوض پر اترنے کے وقت تک یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے اسی لئے تم کو دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں کے معاملہ میں تم میری نیابت کس طرح کرتے ہو۔

ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت جابرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے حج میں عرفہ کے دن رسول اللہ ﷺ کو اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہونے کی حالت میں خطبہ دیتے دیکھا آپ فرما رہے تھے کہ لوگو! میں نے تمہارے اندر ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر اس کو پکڑ لو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب اور اپنی عزت یعنی اہل بیت، میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل بیت کو پکڑے رہنے کا اس لئے مشورہ دیا کہ اہل بیت ہی ولایت کے سلسلہ میں رہنمائی کے قطب ہیں۔ اگلوں اور پچھلوں میں سے کوئی بھی ان کے وسیلہ کے بغیر درجہ ولایت تک نہیں پہنچ سکتا۔ نمبر اول حضرت علیؓ کا ہے پھر آپ کے صاحبزادگان ہیں، حسن عسکری تک یہ سلسلہ آتا ہے اور آخری نمبر غوث الثقلین محی الدین عبد القادرؒ جیلانی کا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح بیان کیا ہے، ان کے بعد دوسرے اولیاء اور علماء امت کا مرتبہ ہے جو بطور وراثت اہل بیت کے حکم میں داخل ہیں کیونکہ سب کے سب اہل بیت کے تابع ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ اور جو مضبوط پکڑے گا اللہ کو یعنی اللہ کے دین کو اور اللہ کی طرف ہمیشہ رخ رکھے گا، اصل لغت میں عصمت کا معنی ہے حفاظت اور کسی چیز کی حفاظت کرنے سے اس کا بچاؤ ہو جاتا ہے لہٰذا عاصم کا معنی ہوا بچاؤ کرنے والا (یعنی اللہ کے دین کے ذریعہ سے اپنا بچاؤ کرنے والا) اعتصام (باب افتعال) کا معنی ہے مضبوطی سے کسی چیز کو پکڑ لینا تاکہ ہلاکت سے محفوظ ہو جائے۔

فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تو اس کو ضرور ہدایت مل جائے گی (اللہ تک پہنچنے کی) سیدھی راہ کی یعنی کھلے ہوئے راستہ کی جس پر چلنے والا کبھی بھٹک نہیں سکتا۔ ع ۱۰

بغویؒ نے مقاتلؒ بن حبان کی روایت سے لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں اوس اور خزرج کے درمیان دشمنی اور لڑائی تھی جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو آپؐ نے دونوں میں صلح کرا دی (اور دونوں قبیلے مسلمان ہو کر باہم صلح کے ساتھ رہنے لگے) اتفاقاً کچھ مدت کے بعد ثعلبہ بن غنم اوسی اور اسعد بن زرارہ خزرجی میں باہمی قبائلی برتری کے متعلق نزاع ہو گیا اوسی نے کہا ہم ہی میں سے تھا وہ خزیمہؓ بن ثابت جس کی تنہا شہادت کو دو گواہوں کے برابر مانا گیا تھا اور ہم ہی میں سے تھا حنظلہؓ جس کو ملائکہ نے غسل دیا تھا اور ہم میں ہی سے تھا عاصم بن ثابت بن افلح، اور ہم میں ہی سے تھا سعد بن معاذؓ جس کی وفات پر عرش الٰہی میں لرزہ آگیا تھا اور بنی قریظہ کے متعلق اس کے فیصلہ کو اللہ نے پسند کیا تھا، خزرجی نے کہا ہم میں چار آدمی ایسے ہیں جنہوں نے قرآن کو محکم کر لیا ہے (یعنی قرآن کے حافظ اور لفظ لفظ کے قاری اور معانی کے عالم ہیں)۔

ابی بن کعب اور معاذ بن جبلؓ اور زید بن ثابتؓ ابو زیدؓ اور ہم میں سے ہیں، سعدؓ بن عبادہ جو انصار کے خطیب اور سردار ہیں۔ غرض اسی طرح گفتگو کا ردوبدل ہو گیا دونوں کو غصہ آگیا اور دونوں نے فخریہ اشعار پڑھے آخر دونوں قبیلے اوس اور خزرج ہتھیار لے کر آگئے پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور اللہ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

marfat.com

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ اے ایمان والوں اللہ (کے عذاب سے ڈرو جیسا کہ حق ڈرنے کا ہے تقاۃ صل میں وُقْيَةٌ تھا تُؤَدَةٌ اور تخمۃ کی طرح واؤ کو تاء سے بدل دیا پھر یاء کو الف سے بدل دیا کیونکہ یاء سے پہلے حروف صحیح ساکن تھا اور یاء پر فتحہ تھا اس کے علاوہ یاء کو الف سے بدلنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ اس مصدر سے جتنے افعال آتے ہیں ان میں یاء الف سے بدل دی گئی ہے جیسے وقیٰ وقوا وغیرہ) لہٰذا فعل سے موافقت پیدا کرنے کے لئے مصدر میں بھی یاء کی جگہ الف آگیا۔

عبد الرزاق، فریابی، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفسیروں میں اور طبرانی نے معجم میں اور حاکم نے مستدرک میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی موقوف روایت نقل کی ہے بلکہ ابو نعیم نے تو اس روایت کو مرفوع بھی کہا ہے کہ حق تقویٰ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے احکام کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے، شکر کیا جائے ناشکری نہ کی جائے، اس کو یاد رکھا جائے فراموش نہ کیا جائے۔ بغوی نے بحوالہ حضرت ابن مسعود و حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم صرف اول ٹکڑا نقل کیا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے۔

میں کہتا ہوں یاد کرنے اور بھول جانے کا مدار فناء قلب پر ہے، رہی اطاعت و عدم عصیان اور شکر و عدم کفران تو ان امور کا مدار نفس کے فناء پر ہے۔ حقیقی ایمان اور قلبی ایمان پر ہی اطاعت کلی اور شکر دوامی کی بناء ہے، پس اس آیت کا تقاضا ہے کہ کمالات ولایت کو حاصل کرنا واجب ہے۔ آیت کے سبب نزول کا بھی یہی تقاضا ہے اوس و خزرج کا باہمی تفاخر باقی ماندہ امراض نفس کا نتیجہ تھا اس لئے تمام امراض باطنہ سے نفس کو پاک کرنے اور مکارم اخلاق خشیۃ اللہ اور ذکر دوامی سے قلب و نفس کو آراستہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

مجاہد نے آیت کے مطلب کی توضیح اس طرح کی ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ادا کرو احکام خداوندی کی تعمیل سے تم کو کسی ملامت گر کی ملامت نہ روکے۔ اللہ کے لئے انصاف قائم کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ خواہ خود تمہارا، تمہارے ماں باپ اور اولاد کا اس میں نقصان ہو رہا ہو، حضرت انسؓ کا قول ایک روائت میں آیا ہے کہ بندہ اس وقت تک حق تقویٰ ادا نہیں کرتا جب تک اپنی زبان کی نگہداشت نہ کرے، میں کہتا ہوں کہ مجاہد اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وہ راستہ بتایا ہے جو کمالات ولایت کو پہنچاتا ہے کیونکہ کم کھانا، کم سونا، ہمیشہ ذکر کرنا، زبان کو لغو باتوں سے روکنا، عوام سے اختلاط کو رکھنا، اللہ کے حقوق کے معاملہ میں لوگوں کی پروانہ کرنا کمال ولایت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ اہل تفسیر کا بیان ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ کے لئے بڑی دشواری ہو گئی اور انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اس حکم کی (پوری) تعمیل کرنے کی کس میں طاقت ہے اس قول کے بعد اللہ نے نازل فرمایا فاتقوا اللہ ما استطعتم، جہاں تک طاقت ہو تقویٰ اختیار کرو پس اس آیت سے اول آیت کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ مقاتل نے کہا کہ آل عمران میں سوائے اس آیت کے کوئی دوسری آیت منسوخ نہیں۔

میں کہتا ہوں اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ حق تقویٰ کا وجوب منسوخ ہو گیا کیونکہ غرور و بے جا غصہ، حسد، کینہ، نفاق، بد خلقی، دنیا کی محبت، اللہ کی طرف توجہ میں کمی، دوسروں سے دل کی لگاوٹ اور اسی طرح کی دوسری نفسانی خباثتیں بہر حال ہر وقت حرام ہیں ان کی حرمت کے منسوخ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ان بزرگوں کے قول کا مقصد یہ ہے کہ یک دم تمام امراض نفسانیہ کا دور کر دینا تو کسی شخص کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اللہ کا طریقہ یوں جاری ہے کہ امرض سے تزکیہ (رفتہ رفتہ) اہل دل اور مقدس نفوس والوں کی صحبت اور مختلف ریاضتیں کرنے سے ہوتا ہے، یکدم نہیں ہو جاتا اسی لئے اللہ نے اجازت دے دی اور بقدر امکان نفس کو پاکیزہ بنانے اور دل کو جلا دینے کی کوشش کو واجب قرار دے دیا اب جو شخص بالکل تزکیہ نفس کی کوشش سے منہ موڑ کر خواہشات کی طرف اپنا رخ پھیر لے گا اس پر تمام رزائل نفس کا گناہ ہوگا، جو کچھ دلوں کے اندر ہوگا خواہ اس کو ظاہر کرو یا نہ کرو، اللہ اس کی حساب فہمی ضرور کریگا پھر جس کو چاہے گا معاف کر دیگا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جو شخص ازالہ

marfat.com

امراض کے طریقہ کی جستجو میں لگا رہے گا اور اندرونی بیرونی خباثتوں کو دور کرنے کی امکانی کوشش کرتا رہے گا خواہ وہ درجہ کمال تک نہ پہنچا ہو مگر چونکہ ادائے قرض کر رہا ہے اس لئے امید ہے کہ اللہ اس کمی کو معاف کر دے گا جس کو پورا کرنا اختیار سے باہر ہے۔

وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ یعنی حقیقی اسلام پر ہی تم مرو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تمام نواہی واوامر کے پابند رہو تمام اعمال وافکار میں خلوص رکھو اپنے تمام کام اللہ کے سپرد کر دو اس کے فیصلہ پر دل سے راضی رہو اس کے علاوہ تمہاری کوئی حالت نہ ہونی چاہئے اسی حالت پر تمہاری موت ہو۔

اگر کسی صفت یا حالت کے ساتھ کوئی فعل مقید ہو اور اس فعل کی ممانعت کی جائے تو کبھی (وہ قید محض اتفاقی ہوتی ہے اور) مقصود ہوتا ہے مطلق فعل سے منع کرنا جیسے اللہ کی زمین پر زنا نہ کرو (لفظ زمین پر محض اتفاقاً مذکور ہے اس سے مراد ہے مطلق زناء کی ممانعت خواہ زمین پر ہو یا ہوائی جہاز میں) کبھی نفی اور نہی کا رخ قید کی طرف ہوتا ہے جیسے اس آیت میں ہے (کہ مطلق مرنے سے روکنا مقصود نہیں ہے بلکہ اسلام کے علاوہ کسی دوسری حالت پر مرنے کی ممانعت کی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ تمہاری کوئی دوسری حالت ہی نہ ہو کہ غیر اسلام پر تمہاری موت کبھی آجائے) کبھی مجموعہ کی طرف نہی کا رخ ہوتا ہے جیسے مچھلی نہ کھاؤ جب کہ دودھ پی رہے ہو (یعنی دودھ مچھلی ایک وقت میں نہ کھاؤ، الگ الگ مختلف اوقات میں دونوں چیزیں کھا سکتے ہو) کبھی ممانعت کا رجوع دونوں میں سے ہر ایک کی طرف انفرادی حالت میں ہوتا ہے جیسے ہمسایہ کی بیوی سے زنا نہ کرو (اس میں ہمسایہ کی بیوی سے زناء کرنے کی ممانعت بھی مقصود ہے اور مطلق زناء کی بھی)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا لوگو! اللہ سے پورے پورے ڈرتے رہو (یعنی آیت یایہا الذین آمنو اتقو اللہ حق تقتہ، تلاوت فرمائی اور فرمایا) اگر زقوم کا ایک قطرہ زمین پر ٹپکا دیا جاتا تو زمین والوں کی زندگی تلخ بنا دے، پس کیا حال ہوگا اس شخص کا جس کا کھانا سوائے زقوم کے اور کچھ نہ ہوگا، رواہ الترمذی وقال حسن صحیح۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اللہ کی رسی سے مراد ہے دین اسلام کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے ومن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لاانفصام لھا، (اس آیت میں ایمان باللہ کو عروۂ وثقیٰ فرمایا ہے) یا کتاب اللہ مراد ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی کتاب ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہو (اس کو پکڑ کر آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے)۔

جَمِيْعًا سب کے سب یعنی جو تفسیر کلام اللہ با جماع امت ہو اس کو مضبوطی سے پکڑ لو اجماع کی خلاف متفرق آراء کی طرف نہ جاؤ، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری تین باتیں اللہ کو پسند ہیں اور تین ناپسند تم اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ جانو اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اللہ جس کو تمہارا حاکم بنا دے اس کی خیر خواہی کرو، یہ باتیں اللہ کو پسند ہیں اور وہ ناپسند کرتا ہے فضول قیل وقال کو اور مال کو برباد کرنے کو اور کثرت سوال کو، رواہ مسلم واحمد۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ میری امت کو گمراہی پر مجتمع نہیں کرے گا، اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے جو بچھڑا وہ (جماعت سے) بچھڑ کر دوزخ میں گیا، رواہ الترمذی، یہ بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ عظمت والے فرقہ کا اتباع کرو اسلئے کہ جو اس سے بچھڑا وہ بچھڑ کر دوزخ میں گیا، رواہ ابن ماجہ۔ [1]

---

[1] حضرت مفسر قدس سرہ کے کلام سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے نزدیک سواد اعظم سے وہ فرقہ مراد ہے جس کی تعداد زیادہ ہو مگر اس فقیر کی نظر میں یہ مطلب غلط ہے کیونکہ حق وصداقت کا معیار کثرت تعداد نہیں، اگر شمار کی زیادتی پر صداقت کا مدار ہوتا تو سواد اعظم کی جگہ سواد اکثر کا لفظ ہوتا، بلکہ اعظم سے مراد ہے زیادہ عظمت والا، واللہ اعلم۔

marfat.com

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس طرح بکریوں کو شکار کرنے والا بھیڑیا گلے سے بچھڑنے والی، گلے سے دور رہ جانے والی اور گلے سے الگ ہونے والی بکری کو شکار کر لیتا ہے اسی طرح انسان کیلئے شیطان بھیڑیا ہے (جماعت سے ہٹ کر ادھر ادھر کی (گھاٹیوں (میں بھٹکتے پھرنے) سے بچو اور جماعت و جمہور کے ساتھ رہو، رواہ احمد۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو جماعت سے بالشت بھر الگ ہوا اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے نکال دی، رواہ احمد و ابوداؤد، یہ تفسیر اس صورت میں ہوگی جب جمیعاً کو اعتصموا کی فاعل ضمیر سے حال مانا جائے، لیکن حبل اللہ سے اگر حال قرار دیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ اللہ کی پوری کتاب کو پکڑے رہو ایسا نہ ہو کہ کتاب کے کچھ حصہ کو تو مانو اور کچھ کو نہ مانو کیونکہ رسی کے بل الگ الگ ہونے کی صورت میں طاقتور نہیں ہوتے۔

وَلَا تَفَرَّقُوا اور آپس میں پھوٹ نہ پیدا کرو، یہ جملہ اول صورت میں تاکیدی اور دوسری صورت میں تاسیسی ہے، (دوسری صورت پر اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ پورے قرآن کو مانو اور آپس میں بھی تفرقہ نہ کرو کہ کوئی مانے کوئی نہ مانے بلکہ سب مل کر پوری کتاب کو پکڑے رہو) مطلب یہ ہے کہ دوسرے اہل کتاب کی طرح آپس میں اختلاف کر کے حق سے متفرق نہ ہو جاؤ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو حالت بنی اسرائیل کی ہوئی وہی حالت میری امت پر آئے گی یہ ان کے نقش قدم پر چلے گی یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی نے اپنی ماں سے علانیہ زناء کیا ہوگا تو میری امت میں بھی کوئی ایسا کرے گا، بنی اسرائیل پھٹکر بہتر فرقہ بن گئے تھے اور میری امت پھٹ کر تہتر گروہ ہو جائے گی جن میں سے سوائے ایک فرقہ کے باقی سب دوزخی ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ (نجات پانے والا فرقہ) کون سا ہوگا فرمایا وہ (نجات یافتہ) ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا، رواہ الترمذی۔

معاویہؓ کی روایت (جو احمد، ابوداؤد نے نقل کی ہے) کے یہ الفاظ ہیں کہ بہتر (فرقے) دوزخ میں اور ایک جنت میں ہوگا اور وہ (ایک نجات یافتہ فرقہ) جماعت ہے اور میری امت میں سے عنقریب کچھ جماعتیں ایسی نکلے گی کہ خواہشات (ان کے رگ وپے میں گھس جائیں گی اور) ان کو ہلاکت میں گرادیں گی جیسے داء الکلب اپنے مریض کے اندر گھس جاتا ہے کوئی رگ اور کوئی جوڑ ایسا نہیں رہتا کہ یہ بیماری اس میں گھس نہ جائے، میں کہتا ہوں صحابہؓ میں یہ تفرقہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہوا، نہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر و حضرت عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خلافتوں میں، امام برحق کے خلاف اول ترین بغاوت اہل مصر نے کی جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف خروج کیا اور خلافت کے معاملہ میں معاویہؓ کی طرف سے اول ترین اختلاف پیدا ہوا اور دین میں اول ترین اختلاف فرقہ حروریہ (خوارج و نواصب) نے کیا جنہوں نے حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کی پھر عبداللہ بن سبا نے مخالفت ڈالی اور حق کو چھوڑا یہی شخص رافضیوں کا سرچشمہ ہے پھر تابعین کے دور میں معتزلہ کا مسلک پیدا ہوا جنہوں نے فلاسفہ کا دامن جا پکڑا، قیل و قال میں پھنس گئے، مناظرہ بازی میں پڑ گئے، کتاب اللہ کی کھلی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی سنت اور سلف کے طریقہ کو انہوں نے چھوڑ دیا اور اپنے ناقص گمراہ خیالات کے پیرو ہو گئے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اور اے گروہ انصار یاد رکھو اپنے اوپر اللہ کے احسان کو۔ مجملہ اس کے احسان کے ایک بات یہ ہے کہ اس نے تم کو اسلام کی ہدایت کی جس وجہ سے تمہارے اندر اتفاق پیدا ہو گیا۔

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً جب کہ اسلام سے پہلے تم باہم دشمن تھے۔

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ پھر اسلام کے ذریعہ سے اللہ نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی۔

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا اور تم اس کی رحمت و ہدایت سے بھائی بھائی ہو، یعنی دین، دوستی، ہمدردی اور محبت کے اعتبار سے بھائی بھائی بن گئے (اگرچہ نسبی برادری نہیں تھی)۔

محمد بن اسحاق اور دوسرے اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ قبائل اوس و خزرج ایک ماں باپ کی نسل سے تھے لیکن ایک مقتول کی

marfat.com

وجہ سے دونوں میں دشمنی ہو گئی اور اتنی بڑھی کہ ایک سو بیس برس تک باہم جنگ ہوتی رہی، آخر کار اسلام کی وجہ سے اللہ نے ان کی باہمی عداوت کی آگ بجھادی اور رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے سب میں اتفاق ہو گیا ان کے اسلام اور باہمی الفت کا آغاز اس طرح ہوا کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں ایک شخص تھا جس کا نام سوید بن صامت تھا اور قوم والے اس کو طاقتور اور اصیل ہونے کی وجہ سے کامل کہتے تھے۔ سوید حج یا عمرہ کرنے کیلئے مکہ کو گیا اس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو چکی تھی اور آپ ﷺ کو اسلام کی دعوت دینے کا حکم مل چکا تھا، آپ نے سوید کی آمد کی خبر سنی تو اس کے پیچھے گئے اور اللہ اور اسلام کی اس کو دعوت دی سوید نے کہا شاید تمہارے پاس ویسی ہی کوئی چیز ہے جیسی میرے پاس ہے حضور نے پوچھا تمہارے پاس کیا ہے، سوید نے کہا لقمان کا رسالہ یعنی لقمان کا پر حکمت کلام حضور ﷺ نے فرمایا میرے سامنے لاؤ سوید نے پیش کیا (یعنی پڑھ کر سنایا) حضور نے فرمایا یہ اچھا ہے مگر میرے پاس جو چیز ہے وہ اس سے افضل ہے، میرے پاس قرآن ہے جسکو اللہ نے نور اور ہدایت بنا کر اتارا ہے پھر آپ نے اس کو قرآن سنایا اور اسلام کی دعوت دی، سوید نے نفرت نہیں کی اور کہنے لگا یہ اچھی چیز ہے پھر واپس مدینہ چلا گیا اور کچھ ہی مدت کے بعد جنگ بعاث میں قبیلہ خزرج نے اس کو قتل کر دیا، اس کی قوم والوں کا بیان ہے کہ مسلمان ہونے کی حالت میں اسکو قتل کیا گیا۔

اس کے بعد ابوالحسیر انس بن رافع بنی اشہل کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر جس میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھا، قریش سے معاہدہ تعاون کرنے کے لئے آیا، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ تشریف لے گئے اور ان کے پاس بیٹھ کر فرمایا جس کام کے لئے تم آئے ہو کیا اس سے بہتر چیز کی تم کو خواہش ہے، لوگوں نے کہا وہ کیا چیز ہے، فرمایا میں اللہ کا پیغمبر ہوں اللہ نے مجھے اپنے بندوں کے پاس بھیجا ہے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ کسی چیز کو اللہ کا ساجھی نہ قرار دو، اللہ نے مجھ پر کتاب بھی نازل فرمائی ہے اس کے بعد آپ نے ان کے سامنے اسلام کا تذکرہ کیا اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ ایاس بن معاذ جو نوجوان لڑکا تھا کہنے لگا قوم والو جس کام کے لئے تم آئے ہو خدا کی قسم یہ اس سے بہتر ہے، ابوالحسیر نے ایک لپ بھر کر کنکریاں ایاس کے منہ پر ماریں اور بولا یہ اپنی بات رہنے دے کہ ہم دوسری غرض سے آئے ہیں، ایاس خاموش ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو گئے اور وہ لوگ بھی مدینہ کو لوٹ گئے، مدینہ پہنچنے کے بعد اوس و خزرج کے درمیان جنگ بعاث ہوئی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ایاس کا انتقال ہو گیا پھر جب اللہ نے چاہا کہ اس کا دین ظاہر اور رسول غالب ہو جائے تو ایک حج کے زمانہ میں ہر سال کے معمول کے موافق رسول اللہ ﷺ انصار کی ایک جماعت سے ملے اور۔ عقبہ کے پاس ایک خزرجی گروہ سے ملاقات ہوئی اس گروہ میں چھ شخص تھے اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث یعنی عوف بن عفراء، نافع بن مالک عجلانی، عطیہ بن عامر، عقبہ بن عامر اور جابر بن عبد اللہ، اللہ کو مقصود تھا کہ ان کو خیر نصیب ہو۔

حضور ﷺ نے دریافت کیا تم کون لوگ ہو انہوں نے جواب دیا خزرجی گروہ فرمایا کیا یہودیوں کے دوستوں میں سے ہو، انہوں نے کہا جی ہاں، فرمایا کیا تم بیٹھ کر میری بات نہیں سنو گے انہوں نے کہا کیوں نہیں سنیں گے اس کے بعد سب بیٹھ گئے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اللہ کی دعوت دی اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھ کر سنایا (وہ مسلمان ہو گئے) ان کے اسلام کی خدا کی طرف سے ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ مدینہ میں وہ یہودیوں کے ساتھ رہتے تھے یہودی اہل کتاب اور اہل علم تھے اور یہ لوگ بت پرست اور مشرک، یہودیوں سے ان کا کچھ جھگڑا ہو جاتا تھا تو یہودی کہتے تھے اب ایک نبی آنے والا ہے جس کی بعثت کا زمانہ قریب آگیا ہے ہم اس کا اتباع کریں گے اور اس کے ساتھ ہو کر تم کو قوم عاد کی طرح قتل کریں گے۔ بس اس گروہ نے جب رسول اللہ ﷺ کا کلام اور اسلام کی دعوت سنی تو آپس میں کہنے لگے لوگو تم جانتے ہو کہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کا نام لے کر یہودی تم کو دھمکیاں دیتے ہیں۔ اب یہودی تم سے اس کی مدد حاصل کرنے میں سبقت نہ کرنے پائیں چنانچہ سب نے حضور ﷺ کی تصدیق کی اور مسلمان ہو گئے اور عرض کیا ہم ایسی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں جن میں آپس کی جنگ اور دشمنی اتنی ہے کہ کسی قوم میں نہیں ہے اب امید ہے کہ اللہ آپ کے ذریعہ سے ان میں اتفاق کرا دے گا، عنقریب ہم ان کے پاس جائیں گے اور ان کو اس بات کی دعوت دیں گے، اگر اللہ نے ان سب کو آپ کے معاملہ میں متفق کر دیا تو آپ سے بڑھ کر پھر کوئی عزت یافتہ نہ ہو گا، پھر یہ لوگ رسول اللہ

marfat.com

ﷺ کے پاس سے اپنے شہر کو لوٹ گئے اور مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا اور مدینہ والوں کو اسلام کی دعوت دی، حضور ﷺ کا ذکر مدینہ میں اتنا پھیل گیا کہ انصار کے ہر گھر میں آپ ہی کا چرچا ہونے لگا۔

پھر آئندہ سال ایام حج میں بارہ انصاری آئے، اسعد بن زرارہ، عوف بن عفراء، معاذ بن عفراء، رافع بن مالک عجلانی ذکوان بن عبد القیس، عبادہ بن صامت، زید بن ثعلبہ، عباس بن عبادہ، عقبہ بن عامر، عطیہ بن عامر یہ سب خزرجی تھے اور قبیلہ اوس کے دو شخص تھے ابو الہیثم بن تیہان اور عویمر بن ساعدہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) عقبہ اولیٰ میں حضور ﷺ سے ان کی ملاقات ہوئی اور عورتوں کی بیعت کی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی کہ شرک نہیں کریں گے، زناء نہیں کریں گے (حضور ﷺ نے فرمایا) اگر تم ان شرطوں کو پورا کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہے اگر ان میں کچھ کھوٹ کرو گے اور دینوی سزائیں گرفتار ہو جاؤ گے تو گناہ کا کفارہ ہو جائے گا لیکن اگر تمہارے جرم پر پردہ پڑا رہا تو تمہارا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا وہ چاہے تم کو عذاب دے چاہے معاف کر دے۔

راوی کا بیان ہے کہ یہ واقعہ جنگ پیش آنے سے پہلے کا ہے ان لوگوں کی واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیر بن ہاشم بن مناف کو ان کے ساتھ کر دیا اور حکم دے دیا کہ ان کو قرآن پڑھانا، اسلام کی تعلیم دینا اور احکام سمجھانا، مدینہ میں مصعب کا لقب مُقری (قرآن پڑھانے والا) ہو گیا اور اسعد بن زرارہ کے مکان پر آپ کا قیام ہوا۔

کچھ مدت کے بعد اسعد بن زرارہؓ مصعبؓ کو ساتھ لے کر بنی ظفر کے ایک باغ کو گئے اور اندر جا کر بیٹھ گئے وہاں دوسرے مسلمان بھی جمع ہو گئے دوسری طرف سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا یہ دونوں آدمی ہمارے گھر میں آکر ہمارے کمزور سمجھ کے آدمیوں کو بہکانا چاہتے ہیں تم جا کر ان دونوں کو جھڑک کر نکال دو، اسعد میرے ماموں کا بیٹا ہے اگر یہ رشتہ نہ ہوتا تو میں خود ہی یہ کام کر لیتا تمہاری ضرورت بھی نہ ہوتی۔ سعد اور اسید، بنی اشہل کے سردار تھے اور اس وقت تک مشرک تھے حسب مشورہ اسید اپنا چھوٹا نیزہ لے کر مصعب اور اسعد کے پاس گیا دونوں باغ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے اسیدؓ کو دیکھ کر اسعد نے مصعب سے کہا یہ آنے والا اپنی قوم کا سردار ہے، اس کو مسلمان بناؤ، مصعب نے جواب دیا اگر یہ بیٹھ جائے گا تو میں اس سے بات کروں گا، اسید پہنچ کر دونوں کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور گالیاں دینے لگا کہنے لگا تم ہمارے ہاں کیوں آئے ہو کیا ہمارے کمزور سمجھ والوں کو بے وقوف بنا رہے ہو اگر تم کو اپنی جان سے کچھ محبت ہے تو یہاں سے ہٹ کر چلے جاؤ، مصعبؓ نے کہا آپ بیٹھ کر ذرا ہماری بات تو سن لیجئے اگر ہماری بات آپ کو پسند آجائے تو مان لینا ناپسند ہو تو آپ کے ناگوار خاطر بات نہیں کی جائے گی اسید نے کہا یہ بات تم نے ٹھیک کہی، یہ کہہ کر نیزہ زمین میں گاڑ کر دونوں کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔

مصعبؓ نے اسلام کے متعلق اس سے گفتگو کی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ مصعبؓ کا بیان ہے ابھی وہ کچھ بولا بھی نہ تھا مگر ہم کو اس کے چہرہ کی چمک اور بشاشت سے اسلام کے آثار دکھنے لگے تھے قرآن سننے کے بعد کہنے لگا یہ تو بڑی اچھی اور خوبصورت چیز ہے اچھا بتاؤ کہ اس مذہب میں داخل ہونے کے وقت تم کیا کرتے ہو۔ مصعبؓ اور اسعد نے جواب دیا غسل کر لو کپڑے پاک کرو پھر شہادت حق دو پھر دو رکعت نماز پڑھو۔ اسید نے فوراً اٹھ کر جا کر غسل کیا کپڑے پاک کئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کی پھر کہنے لگا میرے پیچھے ایک آدمی اور ہے اگر اس نے تمہاری بات مان لی تو اس کی قوم کا کوئی شخص تامل نہیں کرے گا۔ وہ سعدؓ بن معاذ ہے میں ابھی اس کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں پھر نیزہ لے کر چلدیا اور اپنی چوپال پر جا کر ٹھہر گیا۔

سعدؓ نے پوچھا پیچھے کیا چھوڑ کر آئے اسید نے کہا خدا کی قسم میں نے تو ان میں کوئی جرأت نہیں پائی میں نے ان کو روک دیا انہوں نے کہا جیسا آپ کو پسند ہے ہم ویسا ہی کریں گے۔ لیکن مجھے ایک خبر یہ ملی ہے کہ بنی حارثہ اسعد کو قتل کرنے کے لئے نکلے ہیں کیونکہ اسعد تمہارا ماموں کا بیٹا ہے وہ اس کو قتل کر کے تم سے عہد شکنی کرنی چاہتے ہیں یہ سن کر سعد غضب ناک ہو کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا نیزہ ہاتھ میں لیا اور بولا خدا کی قسم میرے خیال میں تم نے کچھ کام نہیں کیا باغ میں پہنچ کر دیکھا تو مصعب اور اسعد دونوں کو مطمئن پا کر سمجھ گیا کہ اسید نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں خود پہنچ کر ان کی بات سنوں جب سامنے جا کر کھڑا ہوا تو

marfat.com

گالیاں دینے لگا اور اسعد بن زرارہ سے بولا اگر مجھ سے تیرا رشتہ نہ ہوتا تو پھر میرے متعلق تیری یہ جرأت نہ ہوتی تو ہمارے گھر کے اندر ایسی باتیں لے کر آتا ہے جو ہم کو ناگوار ہیں سعد کو دیکھتے ہی اسعد نے مصعب سے کہہ دیا تھا کہ یہ آنے والا اپنی قوم کا سردار ہے اگر اس نے تمہاری بات مان لی تو پھر اس کی قوم میں کوئی تمہاری مخالفت نہیں کرے گا۔ مصعب نے سعد سے کہا ذرا بیٹھ کر ہماری بات سن لیجئے اگر آپ کو دل پسند اور مرغوب ہو تو مان لیں ورنہ آپ کے ناگوار خاطر کام ہم آپ سے الگ رکھیں گے۔ سعد نے کہا تیری یہ بات ٹھیک ہے۔ پھر نیزہ زمین میں گاڑ کر بیٹھ گیا۔ مصعب نے اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ مصعب اور اسعد کا بیان ہے کہ سعد کے چہرہ کی چمک اور بشاشت دیکھ کر ہی ہم پہچان گئے تھے کہ اسلام اس کو پسند آگیا چنانچہ قرآن سن کر سعد نے کہا جب تم مسلمان ہوتے اور اس دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو۔ مصعبؓ نے کہا غسل کر لو دونوں کپڑے پاک کر لو پھر شہادت حق ادا کرو اور دو رکعت نماز پڑھو۔

سعدؓ نے اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے پاک کئے شہادت حق ادا کی اور دو رکعت نماز پڑھی اور نیزہ لے کر قصداً اپنی قوم کی چوپال کی طرف گئے ساتھ میں اسید بن حضیر بھی تھے۔ قوم والوں نے آتا دیکھ کر کہا خدا کی قسم اب سعد کا وہ چہرہ نہیں جو جاتے وقت تھا۔ سعد نے قوم سے کہا اے بنی عبد الاشہل تم مجھے اپنے اندر کیسا جانتے ہو۔ قوم والوں نے کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں سب سے زیادہ آپ کی رائے فضیلت رکھتی ہے۔ آپ کا قول و عمل نہایت مبارک ہے۔ سعد نے کہا تو (سن لو کہ) تمہارے مردوں اور عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے جب تک تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لے آؤ۔ سعد کے اس قول کے بعد بنی عبد الاشہل کے احاطہ میں کوئی مرد عورت بغیر اسلام لائے نہیں رہا۔

اسعدؓ اور مصعبؓ دونوں لوٹ کر اسعدؓ کے گھر آگئے مصعبؓ یہیں مقیم رہے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے یہاں تک کہ انصار کے احاطوں میں کوئی احاطہ ایسا نہیں رہا جس میں کچھ مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوں ہاں بنی امیہ بن زید اور حطمہ اور وائل اور واقف کے احاطہ میں مسلمان نہ ہوئے کیونکہ .... ابو قیس بن اسلت شاعر ان میں موجود تھا اور یہ خاندان والے اسی کی بات سنتے اور کہا مانتے تھے۔ اس نے سب کو اسلام سے روک دیا تھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لے آئے اور بدر، احد اور خندق کی لڑائیاں بھی گزر گئیں (اس کے بعد یہ لوگ مسلمان ہوئے)۔

اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ اس کے بعد مصعبؓ بن عمیر مکہ کو واپس چلے گئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ ستر مسلمان انصاری اور کچھ مشرک تھے جو حج کے لئے گئے تھے مکہ پہنچ کر وسط ایام تشریق میں عقبہ ثانیہ پر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہونے کا وعدہ ہوا۔ یہ ہی بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ کعبؓ بن مالک کا بیان ہے کہ میں موجود تھا۔ ہم حج سے فارغ ہوئے اور وعدۂ ملاقات والی رات آئی یوں تو ہم اپنے ساتھ والے مشرکوں سے اپنی باتیں چھپا رکھتے تھے مگر ابو جابر عبد اللہ بن عمرو بن حرام کو ہم نے بتا دیا تھا اور اس سے گفتگو کر لی تھی اور کہہ دیا تھا کہ آپ ہمارے سرداروں میں سے ایک سردار ہیں اور ہمارے بزرگ ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کل کو آگ کا ایندھن بنیں اس لئے جس حالت میں آپ ہیں اس حالت میں آپ کو چھوڑ دینا ہم کو پسند نہیں۔ غرض ہم نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گیا اور ہم نے رسول اللہ ﷺ کے وعدۂ ملاقات کی اس کو اطلاع دیدی اور عقبہ میں ہمارے ساتھ آگیا اور نقیب ہو گیا۔ وعدہ والی رات کا کچھ حصہ ہم نے اپنی فرودگاہوں میں ہی گزارا جب ایک تہائی رات گزر گئی تو ہم چپکے چپکے چھپتے چھپاتے قطا (چکور) کی چال سے نکلے اور عقبہ کے پاس گھاٹی میں پہنچ کر جمع ہوئے اس وقت ہم ستر مرد اور دو عورتیں تھے ایک بنی نجار کی ام عمارہ نسیبہ بنت کعب اور دوسری بنی سلمہ کی ام منیع اسماء بنت عمرو بن عدی۔ گھاٹی کے اندر ہم رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرتے رہے، آخر رسول اللہ ﷺ حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کے ساتھ تشریف لے آئے۔

حضرت عباسؓ نے فرمایا اے گروہ خزرج (خزرج کا اطلاق انصاریوں کے پورے گروہ پر ہوتا تھا خزرجی ہوں یا اوسی) تم واقف ہو کہ محمد ﷺ ہم میں سے ہیں جو لوگ ہماری قوم میں ہمارے خیالات کے ہیں ان سے ہم نے ان کی حفاظت کی ہے۔

marfat.com

یہ اپنی قوم میں باعزت اور اپنے شہر میں حفاظت سے ہیں لیکن یہ سب سے کٹ کر تم سے جڑنا چاہتے ہیں اور تم سے کٹنے پر راضی نہیں ہیں پس سوچ لو اگر اس بات کو تم پورا کر سکو جس کے لئے ان کو بلا رہے ہو اور مخالفوں سے ان کی حفاظت کر سکو تو تمہاری ذمہ داری تم پر ہے اور اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ جب یہ تمہارے پاس پہنچ جائیں گے (اور ان کو مدد کی ضرورت ہو گی) تو تم ان کو بے مدد، بے سہارا چھوڑ دو گے تو ابھی سے ان کو چھوڑ دو۔ یہ عزت و حفاظت کے ساتھ ہیں (کعب کا بیان ہے) ہم نے جواب دیا جو کچھ آپ نے فرمایا ہم نے سن لیا۔ لیکن اے رسول خدا ﷺ آپ خود کچھ فرمایئے اور اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے ہم سے جو عہد لینا چاہیں لے لیجئے۔

راوی کا بیان ہے اس پر رسول اللہ ﷺ بولے، قرآن مجید کی تلاوت کی اور اللہ کی طرف بلایا اور اسلام کی طرف راغب کیا پھر فرمایا میں تم سے ان شرطوں پر بیعت لیتا ہوں کہ اپنی بیوی بچوں کی جس چیز سے حفاظت کرو گے اس سے میری بھی حفاظت کرنا۔ یہ سن کر براء بن معرور نے دست مبارک پکڑ لیا۔ اور عرض کیا، قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، ہم جس چیز سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اس سے آپ کی بھی حفاظت کریں گے یا رسول اللہ ﷺ ہماری بیعت قبول کیجئے، ہم خود بھی جنگجو ہیں اور دوسروں سے بھی تعاون کا ہمارا معاہدہ ہے جو بزرگوں سے موروثی چلا آتا ہے۔ براء رسول اللہ ﷺ سے بات کر ہی رہے تھے کہ ابوالہیثم بن تیہان بیچ میں بول اٹھے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ کچھ لوگوں سے ہمارے معاہدے ہیں اب ان کو ختم کرنا پڑے گا کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ ہم سب سے معاہدے ختم کر دیں اور اللہ آپ کو غلبہ عنایت فرمادے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف آجائیں۔ یہ کلام سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیئے اور فرمایا نہیں۔ تمہارا خون میرا خون ہے۔

تم مجھ سے ہو اور میں تم سے جس سے تم لڑو گے میں بھی لڑوں گا۔ جس سے تم صلح کرو گے میں بھی صلح کروں گا پھر حضور نے فرمایا۔ اپنے میں سے بارہ نمائندے چھانٹ کر نکال لو جو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرح اپنی اپنی قوم کے ذمہ دار ہوں حسب الحکم بارہ نمائندے چھانٹے گئے نو خزرج میں سے اور تین اوس میں سے۔

عاصم بن عمرو بن قتادہ کا بیان ہے کہ جب بیعت کے لئے لوگ جمع ہو گئے تو عباس بن عبادہ بن فضلہ انصاری نے کہا اے گروہ خزرج کیا تم جانتے ہو کہ کس شرط پر تم اس شخص کی بیعت کر رہے ہو۔ ہر گورے کالے سے لڑنے کی بیعت کر رہے ہو۔ اگر تمہارا خیال ہو کہ جب تمہارے مالوں پر کوئی مصیبت پڑے گی اور تمہارے سردار مارے جائیں گے تو تم اس کو بے مدد چھوڑ جاؤ گے تو ابھی بیعت نہ کرو، ورنہ اس وقت خدا کی قسم دنیا و آخرت کی رسوائی نصیب ہو گی اور اگر مالوں کی تباہی اور سرداروں کی ہلاکت کے باوجود تم اپنے اس وعدہ کو پورا کر سکتے ہو جس پر تم اس شخص کو دعوت دے رہے ہو تو اس کو لے لو۔ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔

انصار نے جواب دیا ہم مالوں کی تباہی اور سرداروں کے قتل ہو جانے کے بعد بھی ان کو نہیں چھوڑیں گے اور اسی شرط پر ان کو قبول کر رہے ہیں لیکن اے اللہ کے رسول اگر ہم نے یہ شرط پوری کر دی تو ہم کو اس کے عوض کیا ملے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا جنت۔ انصار نے عرض کیا تو دست مبارک پھیلایئے۔ حضور ﷺ نے ہاتھ پھیلایا۔ سب نے بیعت کر لی۔ اول براء بن معرور نے ہاتھ پر ہاتھ مارا پھر یکے بعد دیگرے دوسرے لوگوں نے۔

جب ہم بیعت کر چکے تو عقبہ کی چوٹی سے انتہائی بلند آواز سے شیطان نے چیخ کر کہا اے اہل حباجب کیا تم کو مُذَمَّم (محمدؐ) کی بھی اطلاع ہے بے دین اس کے ساتھ مل کر تم سے جنگ کرنے پر متفق ہو گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ اللہ کا دشمن ہے۔ یہ عقبہ کا ازب ہے (اس شیطان کا نام ازب تھا ازب لغت میں سانپ کو کہتے ہیں) اے دشمن خدا سن لے خدا کی قسم میں تیرے (مقابلہ کے لئے بالکل فارغ ہو جاؤں گا پھر فرمایا اب تم اپنے اپنے پڑاؤ پر چلے جاؤ۔ عباسؓ بن عبادہ بن فضلہ نے عرض کیا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ چاہیں تو ہم کل صبح ہی اہل منا پر تلواریں لے کر ٹوٹ

marfat.com

پڑیں فرمایا مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے تم اپنی فرودگاہوں پر چلے جاؤ حسب الحکم ہم اپنی خواب گاہوں پر آگئے اور سو گئے۔ صبح ہوئی تو قریش کے بڑے بڑے لوگ ہمارے پڑاؤ پر آئے اور کہنے لگے اے گروہ خزرج ہم کو اطلاع ملی ہے کہ تم ہمارے اس ساتھی کے پاس آئے ہو اس کو ہمارے پاس سے نکال کرلے جانا چاہتے ہو اور ہمارے خلاف جنگ کرنے کے لئے اس سے بیعت کررہے ہو خدا کی قسم عرب کے کسی قبیلہ سے جنگ چھڑ جانا ہمارے نزدیک اتنی قابل نفرت نہیں جتنی تم سے ہے یہ سن کر ہمارے (یعنی خزرج اور اوس کے) مشرک کھڑے ہوگئے اور اللہ کی قسمیں کھا کر انہوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہمیں اس کا علم ہے حقیقت میں انہوں نے سچ کہا تھا ان کو بیعت کا علم ہی نہ تھا۔ ان کی باتوں کے وقت ہم آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے غرض سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

قریش میں ایک شخص حارث بن مغیرہ مخزومی نئی جوتیاں پہنے ہوئے تھا۔ میں نے ابو جابر سے ایک بات کہی گویا میں (دوسرے قریش کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ میں) مشرکین انصار کے کلام کی تائید کررہا ہوں اور بات یہ تھی کہ میں نے اس سے کہا ابو جابر تم ہمارے سرداروں میں سے ہو لیکن اتنی بھی تم میں استطاعت نہیں کہ اس قریشی جوان کی جوتیوں کی طرح جوتیاں ہی بنوالو حارث نے یہ بات سنی تو فوراً جوتیاں پاؤں سے نکال کر میری طرف پھینک دیں اور بولا خدا کی قسم اب ان کو تو پہنے گا ابو جابر نے کہا ہائیں تو نے جوان کو غصہ دلا دیا جوتیاں واپس کردے میں نے کہا میں تو واپس نہیں کروں گا۔ یہ شگون اچھا ہے اگر فال سچی ہوئی تو خدا کی قسم میں اس کے کپڑے اتار لونگا۔ غرض مضبوط معاہدہ کے بعد انصار مدینہ کو لوٹ گئے اور مدینہ میں اسلام کا ظہور ہوگیا۔

قریش کو اس کی اطلاع ملی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کو دکھ دینے لگے حضور ﷺ نے ساتھیوں سے فرمایا اللہ نے تمہارے کچھ بھائی بنادیئے ہیں اور امن کی ایک جگہ بھی دے دی ہے تم ہجرت کرکے مدینہ چلے جاؤ اور اپنے انصاری بھائیوں میں مل کر رہو۔ اس حکم پر سب سے پہلے سلمہ بن عبداللہ مخزومی کے بھائی نے مدینہ کو ہجرت کی پھر عامر بن ربیعہ نے پھر عبداللہ بن جحش نے پھر، پے در پے جتھے جانے لگے اس طرح اسلام کی وجہ سے اللہ نے مدینہ والے اوس اور خزرج کے قبیلوں کو متفق بنادیا اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ان میں باہم صلح کرادی۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے یعنی قریب ہی تھا کہ اس میں گر پڑو سوائے موت علی الکفر کے کوئی چیز اس میں گرنے سے مانع نہیں رہی تھی۔

فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا پس اللہ نے اسلام کی وجہ سے تم کو اس آگ یا گڑھے یا گڑھے کے کنارے سے بچالیا۔ شفا کا لفظ اگرچہ مذکر ہے لیکن اس کا مضاف الیہ یعنی حفرۃ کا لفظ مونث ہے اس لئے مونث کی ضمیر اس کی طرف راجع ہوسکتی ہے اس کے علاوہ شفا اور شَفَةٌ ہم معنی ہیں۔ شفاء البئر اور شفة البئر کنویں کا کنارہ جیسے جَانِبٌ اور جَانِبَةٌ ہم معنی ہیں۔ دونوں کی اصل شفو تھی مذکر میں واؤ کو الف سے اور مونث میں تا سے بدل دیا اس لئے شفا کی جانب مونث کی ضمیر لوٹانا بھی درست ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی دلیلیں بیان فرماتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تاکہ تم ہدایت پر جمے رہو تمہاری ہدایت میں اضافہ ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ اور تم میں سے بعض لوگوں کی ایک جماعت ہونی چاہئے مِنْ تبعیضیہ ہے کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ ہر شخص پر فرض نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ امر و نہی کے لئے علم شریعت اور احتساب کی قدرت ضروری ہے (اور یہ بات سب لوگوں میں نہیں ہوسکتی بعض میں ہوتی ہے) آیت میں خطاب اہل اسلام کی پوری جماعت کو ہے مگر مکلف بعض کو کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی اس فرض کو انجام نہ دے گا تو فرض جماعت ادا نہ ہوگا اور سب گناہ گار ہوں گے (کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جماعت کا فرض ہے) اور اگر بعض نے کرلیا تو سب کے سر سے فرض ادا

marfat.com

ہو جائے گا۔ مِنْ بَیَانیہ بھی ہو سکتا ہے اس وقت ہر شخص پر ممنوع امر سے بازداشت کرنی لازم ہو گی (خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو) کم سے کم دل سے ہی (اس فعل سے نفرت) ہو۔

یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائیں یعنی ان عقائد، اخلاق اور اعمال کی دعوت دیں جن کے اندر دین و دنیا کی بہتری ہو۔ ابن مردویہ نے حضرت امام باقرؒ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ قرآن اور میری سنت پر چلنا ہی خیر ہے۔ سیوطیؒ نے اس حدیث کو معضل کہا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت میں آیا کہ آپ نے اس آیت کو (اتنی ترمیم اور اضافہ کے ساتھ) اس طرح پڑھا تھا وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ وَيَسْتَعِيْنُوْنَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ یعنی خیر مانگیں کہ لوگوں سے مصیبت دور ہو۔

وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ اور ایسے کام کا حکم دیتے ہیں جس کی خوبی وجوبی طور پر یا استحبابی طور سے شریعت کی طرف سے جان لی گئی ہے۔

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور بری باتوں سے روکیں یعنی جن محرمات اور مکروہات کو شرع نے برا قرار دیا ہے ان سے روکیں (خیر کا لفظ عام تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو شامل تھا لیکن) امر و نہی کی فضیلت خاص طور پر ظاہر کرنے کے لئے عطف کر دیا گیا۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہی کامیاب ہوں گے جو ایسا نہ کرے گا ناکام ہو گا اور گھاٹا اٹھائے گا۔

حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس کو بری بات دکھائی دے وہ اپنے ہاتھ سے اس کو بدل دے ہاتھ سے نہ کر سکے تو زبان ہی سے (اس سے روک تھام کرے) اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو دل سے ہی اس کو برا جانے، اور یہ کمزور ترین ایمان کا (درجہ) ہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضوابط الہیہ میں سستی کرنے والے اور ان میں پڑ جانے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگوں نے قرعہ اندازی کی ہو اور قرعہ ڈالنے کے بعد کوئی کشتی کے بالائی درجہ میں سوار ہو گیا اور کوئی نچلے درجہ میں۔ نچلے درجہ والا پانی لے کر بالائی درجہ والوں کی طرف سے گزرتا تھا تو ان کو تکلیف پہنچتی تھی اس لئے نچلے درجہ والے نے کلہاڑی لے کر کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کرنا شروع کیا۔ بالائی درجہ والوں نے جا کر کہا تو یہ کیا کر رہا ہے اس نے جواب دیا آپ لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوتی تھی اور مجھے پانی کی بہر حال ضرورت ہے (اس لئے کشتی میں سوراخ کر رہا ہوں) اب اگر وہ لوگ اس کے ہاتھ پکڑ لیں گے تو اس کو بھی ڈوبنے سے بچا لیں گے اور خود بھی محفوظ رہیں گے اور اگر (سوراخ کرتے) چھوڑ دیں گے تو اس کو بھی ہلاک کریں گے اور خود بھی ہلاک ہوں گے۔ رواہ البخاری۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو گے ورنہ قریب ہے کہ اللہ تم پر اپنا عذاب بھیج دے گا پھر تم اس کے دور ہونے کی دعا کرو گے مگر تمہاری دعا قبول نہ ہو گی۔ رواہ الترمذی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو! تم آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ پڑھتے ہو (اور خیال کرتے ہو کہ اگر کوئی برے کام کرے گا تو تم کو اس کا نقصان نہیں پہنچے گا خواہ ہم اس کی روک تھام کریں یا نہ کریں) حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے کہ اگر لوگ بدکاریاں دیکھ کر ان کو بدلنے کی کوشش (ہاتھ یا زبان یا دل سے) نہیں کریں گے تو ممکن ہے کہ اللہ ان سب پر اپنا عمومی عذاب بھیج دے۔ رواہ ابن ماجہ والترمذی وقال صحیح وروی ابوداؤد نحوہ وعن جریر بن عبد اللہ جاء نحوہ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ۔

marfat.com

عدی بن عدی کندی کے ایک آزاد کردہ غلام کے دادا کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے کہ مخصوص لوگوں کے (برے) اعمال سے اللہ تعالیٰ عام لوگوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ عام لوگ اپنے سامنے بدکاریاں دیکھ کر باوجود تردید کی قدرت کے انکار نہ کرتے ہوں جب وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ عام وخاص سب کو عذاب میں گرفتار کر دیتا ہے۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بنی اسرائیل گناہوں میں پڑ گئے تو ان کے علماء نے منع کیا مگر وہ نہ مانے مگر علماء ان کی مجلسوں میں ان کے ساتھ بیٹھتے اور کھاتے پیتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان سب کے دل ایک جیسے کر دیئے اور داؤدؑ و عیسیٰؑ کی زبانی ان پر لعنت کرائی ذٰلِکَ بِمَا عَصَوا وَّکَانُوا یَعْتَدُوْنَ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت تکیہ لگائے ہوئے تھے یہ فرمانے کے بعد بیٹھ گئے اور فرمایا نہیں خدا کی قسم یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرف جھک جاؤ گے پورے طور پر۔ رواہ الترمذی وابوداؤد۔

ایک سوال

اگر کوئی خیر نہ کرتا ہو اور شر سے باز نہ رہتا ہو (یعنی بدکار ہو) تو کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس پر بھی واجب ہے۔

جواب

ہاں آیت کی عبارت سے ثابت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس پر بھی واجب ہے لیکن اس سے بطور اقتضاء خود بھی پابندی کا وجوب نکل رہا ہے تاکہ آیت اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ اور لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ کا مصداق نہ بن جائے۔

حضرت اسامہؓ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک آدمی کو لا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے اور وہ اپنی انتڑیاں گھسیٹتا ہوا دوزخ میں اس طرح چکر کاٹے گا جیسے گدھا چکی کو لے کر گھومتا ہے، دوزخی اس کے پاس جمع ہو کر کہیں گے اے شخص یہ تیرا کیا حال ہے کیا تو ہم کو اچھے کام کرنے کا حکم اور برے کاموں سے بازداشت نہیں کرتا تھا وہ جواب دے گا میں تم کو نیکی کرنے کا حکم دیتا تھا مگر خود نہیں کرتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا مگر خود کرتا تھا۔ متفق علیہ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معراج کی رات میں نے کچھ آدمی دیکھے جن کے لب آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے میں نے پوچھا جبرئیل یہ کون لوگ ہیں جبرئیلؑ نے جواب دیا یہ آپ کی امت کے وہ خطیب ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینگے اور خود اپنے کو بھول جائیں گے۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ والبیہقی فی شعب الایمان۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پھٹ کر بٹ گئے۔ یعنی یہودیوں کی طرح نہ ہو جانا جو پھٹ کر بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔

وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ اور کھلے ہوئے قطعی دلائل آنے کے بعد باہم اختلاف کرنے لگے۔ البَیِّنَات سے مراد ہیں اللہ کی آیاتِ محکمہ اور انبیاء کی احادیث متواترہ اور انہی جیسی دوسری دلیلیں جیسے اجماع امت اسلامیہ۔

اختلاف عام ہے خواہ اصول دین میں ہو جیسے اہل سنت سے اہل بدعت (معتزلہ خوارج وغیرہ) کا اختلاف یا ان فروعی مسائل میں ہو جن کا ثبوت اجماعی ہے جیسے وضو میں پاؤں دھونا اور خفین پر مسح کرنا اور خلفاء اربعہ کی خلافت۔ قطعیت کی شرط لگانے سے اس امتناعی حکم سے وہ اختلاف خارج ہو گیا۔ جو ظنی دلائل میں اجتہادی اختلاف کی صورت میں ہوتا ہے کیونکہ ظنی دلائل کا اجتہادی اختلاف ضروری ہے اس اختلاف میں بعض مجتہدوں کی اجتہادی غلطی تو لامحالہ ہوتی ہے لیکن اگر ضد اور تعصب کے بغیر اجتہادی طاقت صرف کرنے کے بعد غلطی ہو جائے تو معاف ہے بلکہ لوگوں کے لئے رحمت (اور مجتہد کے

marfat.com

لئے موجب ثواب) ہے عبد بن حمیدؒ نے مسند میں اور دارمی اور ابن ماجہ نے اور عبدری نے الجمع بین الصحیحین میں اور ابن عساکر نے اور حاکم نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے اپنے ساتھیوں کے اس اختلاف کے متعلق دریافت کیا جو میرے بعد ہوگا (کہ ان لوگوں کا کیا ہوگا) اللہ نے وحی بھیجی کہ محمدؐ تیرے ساتھی میرے نزدیک ستاروں کی طرح ہیں بعض بعض سے زیادہ قوی (روشنی والے) ہیں۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ بعض بعض سے زیادہ روشن ہیں اور روشنی ہر ایک میں ہے۔ اب اختلافی مسائل میں جو بھی جس مسلک کو لے گا وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔ رواہ الدار قطنی فی فضائل الصحابہ وابن عبدالبر عن جابر والبیہقی فی المدخل عن ابن عباسؓ۔

بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کو جو کچھ (حکم) اللہ کی کتاب سے دیا گیا ہے اس پر عمل کرو کسی کیلئے کتاب اللہ کو ترک کرنے کا عذر نہیں ہو سکتا اگر اللہ کی کتاب میں نہ ہو تو نبی کی سنت فیصلہ کن ہے اگر نبی کی سنت (میں) بھی نہ ہو تو جو کچھ میرے صحابہؓ کہیں (اس پر عمل کرو) میرے اصحاب آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں جس کو پکڑ لو گے (اور پیچھے لگ جاؤ گے) ہدایت پاؤ گے میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔

بیہقی نے مدخل میں اور ابن سعدؒ نے طبقات میں قاسم بن محمد کا قول نقل کیا ہے کہ محمد ﷺ کے صحابیوں کا اختلاف اللہ کے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ بیہقی نے عمر بن عبدالعزیز کا قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۰۵﴾ یعنی قطعی دلائل کے بعد جن لوگوں نے تفرقہ کیا انہی کے لئے عذاب عظیم ہے۔

یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ وُجُوْہٌ میں دونوں جگہ تنوین مضاف الیہ کے عوض میں آئی ہے یعنی جس روز مؤمنوں کے چہرے گورے اور کافروں کے چہرے کالے ہوں گے۔ تنوین تکثیر کے لئے بھی ہو سکتی ہے یعنی بہت چہرے گورے اور بہت چہرے سیاہ ہوں گے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اہل سنت کے چہرے گورے اور اہل بدعت کے چہرے کالے ہوں گے۔ دیلمی نے مسند الفردوس میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل سنت کے چہرے گورے اور اہل بدعت کے چہرے کالے ہوں گے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۚ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ پس جن کے چہرے سیاہ پڑ گئے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ نبی اور کتاب پر ایمان لانے کے بعد پھر تم نے قطعی دلائل کا انکار کیا اور دین میں تفرقہ کیا اور متشابہات کی تفسیر کے پیچھے پڑ گئے۔ استفہام زجر اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ پس اپنے کفر کرنے کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ آیت اس امت اور گزشتہ امتوں کے بدعتیوں کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت ابوامامہؓ اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ امام احمدؒ وغیرہ نے حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ خارجی ہیں۔ لیکن حضرت اسماء کی روایت کردہ حدیث بتارہی ہے کہ اس آیت میں اہل رائی مراد ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں حوض پر دیکھتا ہوں گا کہ کون کون میرے پاس آتا ہے کچھ لوگ مجھ سے پرے ہی پکڑ لئے جائیں گے۔ (یعنی ان کو حوض پر نہیں آنے دیا جائے گا) میں کہوں گا اے رب یہ تو میرے ہیں میری امت کے (افراد) ہیں جواب دیا جائے گا کیا تم کو معلوم ہے کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کیا، خدا کی قسم یہ برابر اپنی ایڑیوں کے بل (تمہاری ہدایت سے) لوٹتے رہے (رواہ البخاری)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان فتنوں سے پہلے عمل کر لو جو تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح (آئندہ) چھا جائیں گے صبح کو آدمی مؤمن ہوگا اور شام کو کافر، شام کو کافر ہوگا اور صبح کو مؤمن۔ دین کو دنیا کے حقیر سامان کے عوض بیچ ڈالے گا۔ رواہ احمد و مسلم والترمذی۔

marfat.com

بعض اقوال میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول مرتدوں کے حق میں ہوا تھا۔ بعض علماء نے مورد نزول ان اہل کتاب کو قرار دیا ہے جنہوں نے حضرت موسیٰ اور تورات پر ایمان لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا انکار کر دیا یا بعثت سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ پر (غائبانہ) ایمان رکھتے تھے۔ مگر بعثت کے بعد انکار کر دیا۔ بعض نے کہا تمام کفار کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی کیونکہ اللہ نے سب کو (ازل میں) اپنی ربوبیت کا شاہد بنالیا تھا اور دنیا میں آنے کے بعد لوگ کافر ہو گئے۔ یا یوں کہا جائے کہ دلائل پر غور کرنے کے بعد ایمان لانے پر قادر تھے مگر ایمان نہ لائے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ اور جن لوگوں کے چہرے گورے ہوں گے یعنی اہل سنت۔

فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ پس وہ اللہ کی رحمت یعنی جنت اور لازوال ثواب میں ہوں گے جنت کی تعبیر بلفظ رحمت کرنے سے اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مؤمن کی چاہے پوری عمر اللہ کی اطاعت میں صرف ہوئی ہو مگر جنت میں اس کا داخلہ اللہ کی رحمت اور فضل کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راستی اختیار کرو اور درمیانی رفتار سے چلو اور خوش رہو کیونکہ جنت کے اندر کسی کو اس کے اعمال نہیں لے جائیں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کو بھی (آپ کے اعمال جنت میں نہیں لے جائیں گے) فرمایا نہ مجھ کو، ہاں اللہ اپنی مغفرت اور رحمت سے مجھ کو ڈھانک لے (تو جنت میں داخلہ مل جائے گا) رواہ الشیخان فی الصحیحین واحمد۔ شیخین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے اور مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ دوزخ سے بچائے گا اور نہ مجھے سوائے اللہ کی رحمت کے۔

یہ حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے امام احمد نے اور حضرت ابو موسیٰ اور حضرت شریک بن طارق کی روایت سے بزار نے نیز مؤخر الذکر راوی اور حضرت اسامہؓ بن شریک اور حضرت اسدؓ بن کرز کی روایت سے طبرانی نے نقل کی ہے لیکن ان تمام احادیث کا تعارض آیت اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ سے ہوتا ہے (کیونکہ آیت میں اعمال کو داخلہ جنت کا سبب بتلایا گیا ہے) اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ جنت کے اندر مختلف مدارج و مراتب ہیں جن کا حصول اعمال پر موقوف ہے آیت کا یہی مطلب ہے باقی ابتدائی داخلہ اور دوامی سکونت یہ اللہ کے فضل ورحمت کی ممنون ہے احادیث کا یہی مقصد ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ تم پل صراط سے گزرو گے اللہ کی معافی کی وجہ سے اور جنت میں داخل ہو گے اللہ کی رحمت سے اور (جنت کے اندر) تمہارے حصے میں (مختلف) منازل آئیں گے تمہارے اعمال کے موافق۔ رواہ ہناد فی الزہد۔ ابو نعیمؒ نے عون بن عبد اللہ کی سند سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۱۰۷ وہ رحمت یا جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ مستقل جملہ ما قبل کی تاکید بھی کر رہا ہے اور اس امر کی طرف اشارہ بھی کہ رحمت (یعنی ابتدائی داخلہ) مستقل نعمت ہے اور جنت کے اندر ہمیشہ کا قیام یہ الگ مستقل نعمت ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ یہ اللہ کی آیات ہیں جن کے اندر (جنت ورحمت کا) وعدہ اور دوزخ و عذاب سے وعید ہے۔

نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں اور یہ آیات برحق ہیں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ۝۱۰۸ اور اللہ اہل جہان پر ظلم کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اس کی طرف سے ظلم ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مالک مطلق ہے اپنی ملکیت میں جیسا چاہتا ہے کرتا ہے اس پر نہ کچھ کرنا لازم ہے نہ نہ کرنا اور جب کوئی چیز اس پر واجب ہی نہیں ہے تو ظلم کیسا؟ (ظلم تو ترک واجب کو کہتے ہیں)۔

میں کہتا ہوں آیت کی مراد بظاہر یہ ہے کہ اللہ بندوں کے معاملات میں ظلم کرنا نہیں چاہتا کہ نیکی کرنے والے کے ثواب کو گھٹا دے یا جرم کرنے والے کی سزا کو جرم کی مقدار سے بڑھا دے اور کفر چونکہ سب سے بڑا گناہ ہے اس لئے اس کا عذاب بھی سب گناہوں کے عذاب سے زیادہ اور دائمی ہوگا۔

marfat.com

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے اسی کی مخلوق ہے اور اسی کی ملک۔

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ اور اللہ ہی کی طرف تمام امور کی آخری واپسی ہو گی پس وہی وعدہ اور وعید کے موافق جزا سزا دے گا۔ ۱۱ع ۸ ۲

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ بغوی نے عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ مالک بن الصیف اور وہب بن یہود یہودی تھے، ان دونوں نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ سے کہا ہم تم سے افضل ہیں اور ہمارا مذہب اس دین سے بہتر ہے جس کی دعوت تم ہم کو دیتے ہو اس پر مندرجہ آیت نازل ہوئی۔ خیر کی اضافت امت کی جانب اضافت صفت الی الموصوف ہے (یعنی واقع میں معنی کے لحاظ سے خیر صفت اور امت موصوف ہے)۔

﴿ایک شبہ﴾

کُنْتُمْ ماضی کا صیغہ ہے یعنی ماضی میں تم بہترین امت تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بہترین نہیں رہے نہ آئندہ بہترین رہنے کی کوئی صراحت ہے۔

جواب :- بے شک کَانَ ماضی ہے جو زمانہ ماضی میں کسی چیز کے ثبوت پر دلالت کر رہا ہے لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ثبوت ماضی منقطع ہو گیا یا آئندہ منقطع ہو جائے گا اس کی تعیین تو خارجی قرینہ سے ہی ہوتی ہے (جیسے زید نے اگر سیر ہو کر کھانا کھالیا ہو اور کوئی کہے کہ زید دو گھنٹے پہلے بھوکا تھا یہاں قرینہ موجود ہے کہ زید اس وقت بھوکا نہیں ہے بھوک کا زمانہ ختم ہو گیا اگر انقطاع ماضی یا انقطاع مستقبل کا خارجی قرینہ موجود نہ ہو تو استمرار ہی سمجھا جائے گا جیسے) اللہ نے فرمایا ہے وکان اللہ غفورا رحیما (یعنی اللہ کا غفور و رحیم ہونا کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اگرچہ اس جگہ یہی کان صیغہ ماضی موجود ہے) پس کنتم خیر امۃ کی آیت دلالت کر رہی ہے کہ وہ ماضی میں بھی بہترین تھے اور وقت خطاب میں بہترین ہیں اور آئندہ بھی بہترین ہوں گے۔

جس طرح آیت تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ میں (مضارع کے صیغے استعمال کئے ہیں جو حال اور مستقبل دونوں پر دلالت کرتے ہیں) یہ بھی احتمال ہے کہ امت اسلامیہ کے خیر الامم ہونے سے مراد یہ ہو کہ تم علم الٰہی میں خیر الامم تھے یا ذکر کے وقت گزشتہ اقوام میں خیر الامم تھے۔

اُخْرِجَتْ وہ بہترین امت جو ظاہر کی گئی (عدم سے وجود میں لائی گئی) اور پیدا کی گئی ہے کنتم کے مخاطب یا تو صحابہؓ ہیں، بروایت ضحاک جویبر نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا کہ کنتم خیر امتہ ہمارے اولین کیلئے ہے پچھلوں کیلئے نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر اللہ چاہتا تو بجائے کنتم کے انتم فرماتا لیکن اس نے کنتم صرف صحابہؓ کیلئے اور ان لوگوں کیلئے جنہوں نے صحابیوں کی طرح کام کئے فرمایا۔ یا مخاطب عام امت محمدیہ ہے دونوں مضمون نصوص سے ثابت ہیں اور یہی اجماع امت کا فیصلہ ہے کیونکہ امت اسلامیہ تمام امتوں سے افضل ہے اور امت اسلامیہ میں قرن صحابہؓ افضل ہے۔[1]

اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ۔ دوسری آیت ہے ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا الخ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے جب تک میں داخل نہ

---

[1] حاشیہ از مولف، قتادہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت کنتم خیر امۃ الخ تلاوت کی پھر فرمایا لوگو! جس کو اس امت میں داخل ہونے سے خوشی ہوتی ہو جو سب لوگوں کی ہدایت کیلئے پیدا کی گئی ہے تو ان شرائط الٰہیہ کو ادا کرنا لازم ہے جو اللہ نے اس امت کیلئے مقرر کر دی ہیں۔

marifat.com

ہو جاؤں جنت میں داخلہ انبیاء کے لئے حرام کر دیا گیا ہے اور جب تک میری امت داخل نہ ہو جائے دوسری امتوں کے لئے جنت میں داخلہ حرام کر دیا گیا ہے۔ رواہ الطبرانی بسند حسن عن عمر بن الخطاب۔

طبرانی کی مرفوع روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ جنت تمام امتوں کے لئے حرام کر دی گئی ہے تاوقتیکہ میں اور میری امت یکے بعد دیگرے اس میں داخل نہ ہو جائیں۔ امام احمد اور بزار اور طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یقینی امید ہے کہ جنھوں نے میری پیروی کی وہ (کل) جنت والوں کے ایک چوتھائی ہوں گے پھر فرمایا مجھے امید ہے کہ وہ آدھے ہوں گے۔

ترمذی نے بسند حسن اور حاکم نے بسند صحیح بیان کیا ہے کہ اہل جنت کی ۱۲۰ قطاریں ہوں گی جن میں ۸۰ اس امت کی اور باقی دوسری امتوں کی ہوں گی۔ طبرانی نے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے اس حدیث کے راوی حضرت ابو موسیٰ، حضرت ابن عباس حضرت معاویہ بن جندہ اور حضرت ابن مسعود رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم ستر امتوں کا تتمہ ہو اور سب سے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والے ہو۔ یہ حدیث بہز بن حکیم کے دادا کی روایت سے ابن ماجہ اور دارمی نے بیان کی ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے اور بغوی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے میری امت کی مثال ایسی ہے جیسے بارش کہ معلوم نہیں اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے یا آخری حصہ۔ یہ حدیث ترمذی نے حضرت انسؓ اور حضرت جعفرؒ بن محمد کے دادا کی روایت سے بیان کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے معاف فرمادی میری امت کے لئے بھول چوک اور وہ گناہ جس پر اسکو مجبور کیا گیا ہو۔ یہ حدیث بیہقی اور ابن ماجہ نے بیان کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین لوگ میرے دور کے ہیں پھر وہ لوگ ہیں جو ان سے متصل ہوں گے اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد ہوں گے پھر ایسے لوگ آئیں گے جن میں سے بعض کی شہادت قسم سے پہلے اور قسم شہادت سے پہلے ہو گی۔ یہ حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے شیخین اور ترمذی اور احمد اور طبرانی نے بیان کی ہے اور ایسی ہی حدیث مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور ترمذی وحاکم نے حضرت عمران بن حصین کی روایت سے بیان کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے اصحاب کو گالی نہ دو کیونکہ تم میں سے اگر کوئی (کوہ) احد کے برابر سونا راہ خدا میں خرچ کرے گا تو ان کے سیر بھر بلکہ آدھے سیر (خرچ کرنے کے درجہ) کو بھی نہیں پہنچے گا۔ یہ حدیث شیخین نے حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے بیان کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہؓ میں سے جو کوئی کسی زمین میں مرے گا قیامت کے دن وہ ان لوگوں کے (یعنی اس زمین والوں کے) لئے قائد اور نور راہ بنا کر اٹھایا جائے گا۔ یہ حدیث ترمذی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

لِلنَّاسِ لوگوں کے لئے۔ اس لفظ کا تعلق خیر سے ہے یعنی تم لوگوں کے لئے خیر ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا، لوگوں کے لئے سب لوگوں سے زیادہ بہتر ہو کہ وہ زنجیروں میں بندھے آتے ہیں اور تم ان کو اسلام میں داخل کر لیتے ہو۔

میں کہتا ہوں کہ گذشتہ اقوام سے زیادہ اس امت کے مبلغین و مرشدین کی ہدایت میں اثر ہے کہ لوگوں کو کھینچ کر اللہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، قطب الارشاد اور شاہ ولایت تھے گذشتہ امتوں میں سے کوئی بھی آپ کی روحانی وساطت کے بغیر درجہ ولایت تک نہیں پہنچ سکا پھر آپ کی اولاد میں سے آئمہ کرام اس منصب پر فائز ہوئے جس کا سلسلہ امام حسنؓ عسکری اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی تک مسلسل پہنچا، اسی لئے حضرت شیخ جیلانی نے فرمایا ووقتی قبل قلبی قد صفالی۔ آپ اس منصب پر قیامت تک فائز رہیں گے اسی لئے آپؒ نے فرمایا تھا۔ افلت شموس الاولین و

marfat.com

شمسنا: ابدا علی افق العلی لاتغرب. پہلے لوگوں کے سورج چھپ گئے اور ہمارا سورج ہمیشہ بلندی پر رہے گا کبھی غروب نہ ہوگا۔ بعض لوگوں کے نزدیک للناس کا تعلق اخرجت سے ہے یعنی لوگوں کے لئے تم کو پیدا کیا گیا ہے۔

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ　یہ مستقل جملہ امت کی فضیلت کے بیان کے لئے لایا گیا ہے۔ یا پورا جملہ امۃ کی صفت ہے یعنی جو امتیں ان صفات کی حامل تھیں ان سب سے تم افضل ہو۔

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ　یعنی تم نیکی کا حکم دیتے ہو بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ ایمان باللہ سے مراد بعض علماء کے نزدیک ہر اس چیز پر ایمان لانا ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ ایسا ہی ایمان قابل اعتبار ہے (صرف اللہ کو ماننا اور کل یا بعض پیغمبروں کا انکار کر دینا یا قیامت کو نہ ماننا ایمان باللہ کے خلاف ہے) باوجودیکہ اہل کتاب (بعض پیغمبروں اور بعض کتابوں کو مانتے تھے مگر سب پیغمبروں اور کل کتابوں کو نہیں مانتے تھے مگر) اللہ پر ایمان رکھتے تھے پھر بھی اللہ نے ان کے متعلق فرمایا ولو امن اھل الکتاب۔

حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم واقف ہو کہ اللہ واحد پر ایمان لانا کیا (معنی رکھتا) ہے صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہے فرمایا (ایمان باللہ ہے) لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دینا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ دینا۔ شیخین فی الصحیحین

سوال :- ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایمان باللہ کا ذکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے پہلے کیا جاتا، کیونکہ ایمان کا درجہ مقدم ہے۔ اعمال خیر ایمان پر مبنی ہیں لیکن آیت میں ایمان کا ذکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بعد کو کیا گیا۔

جواب

اس تقدیم و تاخیر سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایمان باللہ اور تصدیق قلبی کے ساتھ کرتے ہیں دکھاوٹ کے لئے نہیں کرتے گویا تو منون باللہ امر بالمعروف کی خصوصی شرط ہے یا مؤخر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آئندہ جملہ کے ساتھ ارتباط ہو جائے۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ　یعنی تمہاری طرح تمام اہل کتاب ایمان لے آتے۔

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ　تو ان کے لئے بہتر ہوتا کیونکہ اس وقت ان کا شمول بھی خیر الامم میں ہو جاتا۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایمان باللہ سے مراد ہو حقیقی ایمان یعنی دل کو ماسوا کے خیال سے پاک اور نفس کو بری خصلتوں سے صاف کرنا اور ایسی خالص محبت کو دل میں جمانا جس میں کسی ذاتی غرض کی آمیزش نہ ہو، نہ دنیوی لالچ ہو، نہ دینی۔

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ　اہل کتاب میں سے کچھ لوگ قابل اعتبار ایمان رکھتے ہیں جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾　اور ان میں اکثر ایمان سے خارج ہیں۔ یہ جملہ سابق (ولو امن اھل الکتاب) کا بیان ہے کیونکہ جملہ سابقہ میں تمام اہل کتاب کا ایمان لانا مراد ہے اور موجود بعض کا ایمان ہے اکثر کافر ہیں۔ ولو امن اھل الکتاب سے ان اہل کتاب کو بدگمانی پیدا ہو سکتی تھی جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے تھے (کہ اللہ کے نزدیک ہمارا ایمان شاید معتبر نہیں ہے) اس بدگمانی کو دفع کرنے کے لئے منھم المومنون فرمادیا۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى　وہ تم کو ہرگز ضرر نہ پہنچا سکیں گے سوائے معمولی تکلیف کے یعنی زبان وغیرہ سے تکلیف کے علاوہ (کوئی جانی و مالی دکھ نہیں پہنچا سکیں گے) مقاتل کا بیان ہے کہ جب سرداران یہود نے مسلمان اہل کتاب (جیسے عبد اللہ بن سلام وغیرہ) کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کیا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی تاکہ مسلمان اہل کتاب کو تسلی ہو۔

marfat.com

وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ اور اے مسلمانو! اگر وہ یہودی تم سے لڑیں گے تو پیٹھ دے کر شکست کھا کر بھاگیں گے اور قتل و غارت یا قید کا دکھ تم کو نہ پہنچا سکیں گے۔

ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ پھر ان کو فتح نہیں مل سکتی فتح تمہاری ہی ہو گی۔ یہ آیت گذشتہ لا یضروکم کا بیان ہے اور ایک (سچی) پیشین گوئی ہے کیونکہ بنی قریظہ، بنی نضیر، اہل خیبر و فدک کا یہی حال ہوا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ ان یہودیوں پر ذلت کی مہر لگادی گئی ہے یعنی ان کی جان اہل و عیال اور مال کو مباح کر دیا گیا ہے۔

اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا جہاں بھی پائے جائیں۔

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ مگر قرآن یا دین اسلام کی وجہ سے (ان کی حفاظت ہو سکتی ہے) جس نے امن طلب کافروں اور ذمیوں سے تعرض نہ کرنے کا حکم دیا ہے اللہ نے فرمایا وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ دوسری جگہ فرمایا ہے حتی یعطوا الجزیۃ عن یدوھم صاغرون۔

وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ اور مسلمانوں کے عہد سے یعنی امان طلبی کے اگر مسلمان امان دہی کا عہد کر لیں یا قبول جزیہ کے بعد عقد ذمہ ہو جائے (تو یہودیوں کا جان و مال محفوظ ہو جائے گا) گویا حبل اللہ اور حبل من الناس سے ایک ہی مراد ہے (یعنی عقد ذمہ بعد قبول الجزیہ یا امان دہی) اگر دونوں جدا جدا چیزیں ہوتیں تو دونوں کے درمیان واؤ عاطفہ نہ ہوتا بلکہ اَوْ ہوتا۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ اور اللہ کے غضب کے سزاوار ہو کر اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹیں گے یعنی مریں گے یا مرنے کے بعد زندہ ہوں گے۔ اللہ نے فرمایا ہے کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ اور مسکینی یعنی کنجوسی اور حرص کا احاطہ ان پر کر دیا گیا جیسے نصب کردہ ڈیرہ خیمہ اپنے اندر رہنے والوں کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ کنجوس آدمی مال خرچ نہیں کرتا، ہمیشہ مسکینوں کے حلیہ میں رہتا ہے اور حریص ہمیشہ کمائی کی کوشش اور مشقت میں لگا رہتا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہودی بیشتر فقیر اور مساکین ہوتے ہیں (یعنی باوجود مالدار ہونے کے فقیروں کی طرح بھیک مانگتے، مفلسی دکھاتے اور مال کو چھپائے رہتے ہیں)۔

ذٰلِكَ یہ ذلت مسکینی اور غضب خدا کی مہر اس لئے ہے۔

بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ کہ وہ کفر کرتے رہے ہیں۔

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اللہ کی آیات کا

وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ اور انبیاء کو قتل کرتے رہے ہیں۔

بِغَيْرِ حَقٍّ ناحق۔ یعنی وہ جانتے رہے ہیں کہ انبیاء کو قتل کرنا ظلم اور خلاف حق ہے مطلب یہ کہ مذکورہ بالا ذلت و خواری اور غضب کی مار ان پر کفر اور قتل انبیاء کی پاداش میں پڑی۔

ذٰلِكَ یہ کفر اور قتل انبیاء۔

بِمَا عَصَوْا ضد اور عناد کے زیر اثر قصداً اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ہوا۔

وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اللہ کے ضوابط سے سرکشی کرتے رہے۔ بعض علماء کے نزدیک ذلک دوم کا مشار الیہ بھی وہی دنیوی ذلت اور اخروی استحقاق عذاب ہے اور ذلت و استحقاق عذاب کی دو علتیں ہیں ایک کفر و قتل انبیاء اور دوسری معصیت و تجاوز از ضوابط کیونکہ وہ فرعی احکام کے بھی مکلف تھے (پس اصول کی مخالفت اور فروعی احکام کی خلاف ورزی دونوں دنیوی ذلت اور اخروی استحقاق عذاب کی موجب ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس تفسیر پر دوسرے ذلک پر حرف عاطف لانا چاہئے تھا۔

marfat.com

ابن مندہ نے الصحابہ میں اور ابن ابی حاتم اور طبرانی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جب حضرت عبداللہ بن سلام اور ثعلبہ بن شعبہ اور اسید بن تیعہ اور اسد بن عبید اور ان کے ساتھ دوسرے یہودی مسلمان ہوگئے اور ایمان لے آئے اور اسلام کی انہوں نے تصدیق کی اور دل سے اسلام کی طرف راغب ہوئے تو علماء یہود نے کہا کہ محمد پر ایمان لانے والے اور ان کی پیروی کرنے والے صرف وہی لوگ ہیں جو ہم میں برے تھے اگر اچھے ہوتے تو اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر دوسرے کی طرف نہ جاتے، اس پر اللہ نے نازل فرمایا لیسوا سواء الی قولہ من الصلحین۔

احمد اور نسائی اور ابن حبان نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا کہ (ایک روز رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز میں تاخیر کردی پھر دیر کے بعد (نبوت کدہ سے) برآمد ہو کر مسجد میں تشریف لائے لوگ نماز کے منتظر تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا خبردار ہو جاؤ کہ اس وقت کسی مذہب کا کوئی شخص تمہارے سوا اللہ کی یاد نہیں کرتا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

لَيْسُوْا سَوَآءً یعنی تمام یہودی مذکورہ برائیوں میں برابر نہیں ان میں سے ہی بعض لوگ ان کے برعکس ہیں جس کی وضاحت یہ ہے کہ

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ اہل کتاب میں سے ہی ایک گروہ ہے جو نماز میں کھڑا رہتا ہے۔ قائمۃ سے مراد ہے نماز میں کھڑا رہنے والا۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد ہے ہدایت یافتہ اللہ کے امر پر قائم رہنے والا۔ مجاہدؒ نے کہا امت عادلہ مراد ہے۔ یہ لفظ اس جگہ اَقَمْتُ الْعُوْدَ سے ماخوذ ہے، میں نے لکڑی کو سیدھا کر دیا۔ سدّی نے کہا فرماں بردار، اللہ کی کتاب اور ضوابط کا پابند گروہ مراد ہے۔ امۃ قائمۃ سے مراد ہیں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی یہودی مسلمان۔

يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ جو اللہ کی آیات یعنی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔

اٰنَآءَ الَّيْلِ اوقات شب میں۔ یعنی کھڑے ہوتے ہیں اور پڑھتے ہیں اوقات شب میں اناء جمع ہے اس کا مفرد اِنْیٌ ہے۔

وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ ایسی حالت میں کہ وہ سجدے کرتے ہیں یعنی نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا عشاء کی نماز مراد ہے کیونکہ اہل کتاب عشاء کی نماز نہیں پڑھتے ہیں (یعنی ان کے مذہب میں عشاء کی نماز فرض نہیں ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ایک رات ہم عشاء کی نماز کا انتظار کرتے رہے ایک تہائی رات گزر جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ برآمد ہوئے ہم کو نہیں معلوم کہ تاخیر کا باعث کوئی کام تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ تشریف لا کر فرمایا تم نماز کے انتظار میں ہو (اس وقت) تمہارے علاوہ کسی اور مذہب والا نماز کا انتظار نہیں کرتا۔ اگر امت پر بار پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان کو اسی وقت نماز پڑھایا کرتا۔ پھر آپ نے حکم دیا مؤذن نے اقامت کہی اور آپ نے (لوگوں کے ساتھ) نماز پڑھی۔ رواہ مسلم۔

میں کہتا ہوں سیاق کلام سے ظاہر یہ ہے کہ تہجد کی نماز مراد ہے عشاء کی نماز مراد نہیں ہے کیونکہ آیت کی رفتار کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی دوامی حالت یہ ہے (کہ اوقات شب میں نماز پڑھتے اور قیام کرتے ہیں) رہا تاخیر عشاء کا قصہ وہ ضرور ایک واقعہ ہے (دوامی عادت نہیں) پھر اس قصہ کے سلسلہ میں اس آیت کا نازل ہونا صحیحین میں مذکور نہیں۔ اس کے علاوہ یتلون جمع کا صیغہ ہے اور عشاء کی نماز میں قرأت کرنے والا صرف امام ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو مجازاً ہی قرأت کرنے والا کہا جا سکتا ہے۔

عطاء نے کہا کہ امۃ قائمۃ سے مراد ہیں نجران کے چالیس اور حبش کے تیس اور روم کے آٹھ آدمی یہ سب عیسائی تھے جنہوں نے (بعثت سے پہلے ہی) رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی ہجرت سے پہلے انصار کی ان سے دوستی تھی۔ انصاریوں میں سے اسعد بن زرارہ اور براء بن معرور اور محمد بن مسلمہ اور محمود بن مسلمہ اور ابو قیس صرمہ بن انس

marfat.com

ان کے دوست تھے چونکہ شریعت حنیفہ (ملت ابراہیمی) سے یہ لوگ واقف تھے اس لئے غسل جنابت کرتے اور رات کو نماز پڑھتے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوگئے تو سب نے آپ ﷺ کی تصدیق کی اور مدد دی۔

یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور نیکی کا حکم دیتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔

وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ اور نیک کاموں میں تیزی سے بڑھتے ہیں کیونکہ ان کو اللہ سے کامل خوف ہے اور ان کے ہوا و ہوس کا سلسلہ کوتاہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے پہلے کہ ایسا بڑھاپا آجائے جس میں سر ہلنے لگے یا غفلت کی حالت میں موت آجائے یا (حرکت سے) روک دینے والی بیماری پیدا ہو جائے یا ناامید کر دینے والی تاخیر آجائے نیک اعمال کر لو۔ رواہ البیہقی عن ابی امامۃ۔

چونکہ یہودیوں کے اوصاف و اطوار قبیحہ متعدد تھے، حق سے منحرف تھے، دن رات خواب غفلت میں سرشار تھے، مشرک تھے، اللہ کی صفات کے عقیدہ میں کج رو تھے، آخرت کا عقیدہ رکھتے تھے، مگر غلط طور پر۔ بری باتوں کا حکم دیتے اور اچھے کاموں سے روکتے اور خود تیزی سے برائیوں میں گھستے تھے اس لئے آیات مذکورہ میں امۃ قائمۃ کے ایسے متعدد اوصاف بیان کئے جو یہودیوں کے اوصاف کی ضد تھے۔

وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ اور اوصاف مذکورہ کے پورے پورے حامل صالحین میں سے ہیں یعنی ان لوگوں میں ان کا شمول ہے جن کے دل درست اور نفوس پاکیزہ ہیں اور پاکیزگی قلب و نفس کی وجہ سے ان کے جسم بھی حامل صلاح ہیں۔

وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّكْفَرُوْهُ ؕ وہ جو نیکی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ یعنی ہم نہ اس نیکی کو گھٹائیں گے نہ ثواب میں کمی کریں گے۔ جس طرح تکمیل ثواب کو شکر کہا گیا ہے اسی طرح ثواب سے محرومی یا ثواب کے نقصان کو ناشکری فرمایا۔

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ اور اللہ تقوی والوں سے خوب واقف ہے یہ جملہ متقیوں کے لئے بشارت بھی ہے اور ناقدری نہ ہونے کی علت بھی ہے کیونکہ کریم کا اپنے بندہ کی نیکیوں کو جان لینا ہی اچھا بدلہ عطا فرمانے کی علت ہے۔ اس آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اوصاف مذکورہ سے جو لوگ متصف ہیں وہ صالح بھی ہیں اور متقی بھی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ جن لوگوں نے کفر کیا (اور کفر پر مرے) ان کے مال و اولاد اللہ کے عذاب کو ان سے بالکل دفع نہیں کر سکیں گے، وہ دوزخی ہوں گے اور وہی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس آیت کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ دیکھو آغاز سورت۔

مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ما مصدری ہے یعنی خرچ کرنا۔ مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں یا سخی اور فخر کا مظاہرہ کرنے کے لئے خرچ کرنا جیسے کفار قریش لڑائیوں میں کرتے تھے یا ثواب کی امید میں خرچ کرنا جیسے یہودی اپنے علماء کے لئے اور کفار قریش بتوں کے لئے کرتے تھے یا دکھاوٹ کے لئے خرچ کرنا جیسے منافق کرتے تھے اس کی حالت ایسی ہے۔

كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ جیسے وہ ہوا جس میں سخت سردی ہو۔ صِرٌّ سخت سردی (قاموس) ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول آیا ہے کہ صر سخت گرم اور ہلاک کر دینے والی لو کو کہتے ہیں۔

اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ کسی ایسے گروہ کی کھیتی کو لگ جائے جس نے کفر و معصیت و بدکاری کی وجہ سے خود اپنے پر ظلم کیا ہو پھر اس کھیتی کو تباہ کر دے۔

marfat.com

مطلب یہ کہ جس طرح سخت سرد ہوا یا جلاڈالنے والی لو ظالموں کی کھیتی کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح کافروں کا مال خرچ کرنا بھی تباہی کا موجب ہے کیونکہ ایسا خرچ اللہ کے عذاب کو لاتا ہے یا مال کو بالکل برباد کر دیتا ہے کہ نہ دنیا میں اس کا کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے نہ آخرت کے لئے ذخیرہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماینفقون میں ما موصولہ ہو اور تشبیہ مرکب ہو ایک قصہ کو دوسرے سے تشبیہ دی ہے اسی لئے حرف تشبیہ کو حرف پر داخل کرنے کی بجائے ریح پر داخل کر دیا (حالانکہ ریح مشبہ بہ نہیں ہے) یہ بھی جائز ہے کہ ضائع کردہ مال کو کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہو لیکن اس وقت ریح سے پہلے لفظ مہلک محذوف قرار دیا جائے گا یعنی وہ کھیتی جو ریح کی وجہ سے تباہ ہو گئی ہو۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ اور اس صرف کو ناکارہ یا کھیتی کو تباہ کر کے اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔

وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے کہ مال کو ایسے طریقہ پر صرف کرتے تھے جو اللہ کے ہاں فائدہ رساں نہیں تھا یا کھیتی والے ایسے کام کرتے تھے کہ سزا کے مستحق ہو گئے۔ ابن جریر اور ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہا کا قول نقل کیا ہے کہ کچھ مسلمانوں کا میل ملاپ کچھ یہودیوں کے ساتھ تھا کیونکہ دونوں ہمسائے تھے اور جاہلیت کے زمانہ میں حلیف (ہم عہد) بھی تھے۔ اس سلسلہ میں ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ اے اہل ایمان اپنے لوگوں یعنی مسلمانوں کے علاوہ دوسروں کو اندرونی یار غار نہ بناؤ۔ بطانۃ راز دار اور وہ شخص جس پر اعتماد کر کے کوئی اس کو اپنے رازوں سے واقف بنا دے۔ دون بمعنی ادنی۔ یعنی ان لوگوں کو اپنا یار غار نہ بناؤ جو تم سے نچلے اور کم مرتبہ والے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کی مدح ہے کہ تمہارا مرتبہ غیر مسلموں سے زیادہ ہے اور اس بات کی بھی آیت سے ہدایت (مستفاد) ہوتی ہے کہ اونچے مرتبہ والوں کے ساتھ رہو ادنی لوگوں کی صحبت اختیار کرو، گوشہ نشینی برے ہم نشیں سے بہتر ہے اور اچھا ہم نشیں تنہائی سے بہتر ہے۔

من دونکم کا لفظ رافضیوں، خارجیوں اور دوسرے بدعتیوں کو بھی شامل ہے اس لئے کافروں کی طرح ان کو بھی اندرونی راز دار بنانا جائز نہیں۔

لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا یعنی جو لوگ دوسرے مذہب پر ہیں وہ تمہارے اندر شر اور بگاڑ پیدا کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے بلکہ تمہارے اندر شر فساد کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش خرچ کر دیں گے۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ما مصدری ہے یعنی تمہارا سخت دکھ اور تکلیف میں پڑ جانا وہ دل سے پسند کرتے ہیں بلکہ (کبھی)

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ دشمنی ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتی ہے انتہائی بغض کی وجہ سے وہ اپنے پر قابو بھی نہیں رکھتے اور ایسی باتیں کہہ گزرتے ہیں جن سے تم کو دکھ ہو۔

وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ اور جو بغض ان کے دلوں کے اندر چھپا ہوا ہے وہ ظاہر شدہ بغض سے بہت بڑا ہے کیونکہ وہ دھوکہ اور فریب دینے کے لئے (عموماً) دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ ہم نے تمہارے سامنے کھلی ہوئی نشانیاں کھول کر بیان کر دیں جن سے ان کی عداوت معلوم ہو جاتی ہے یا جو دلالت کر رہی ہیں کہ اللہ کا مخلص ہونا اور مؤمنوں سے دوستی رکھنا اور کافروں سے دشمنی کرنا واجب ہے۔ مذکورہ بالا چاروں جملے علیحدہ علیحدہ مستقل ہیں اور عدم موالات کی علت ہیں یا پہلے تین جملے بطانۃ کے اوصاف ہیں۔

بہر صورت کلام سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسلمان سے اس کے ایمان کی وجہ سے دشمنی نہ رکھتا ہو اور شر و فساد اس کا مقصود نہ ہو یا رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے مسلمان سے مودت رکھتا ہو اس سے موالات کرنے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ مسلمان ہونے سے پہلے حضرت عباسؓ اور رسول اللہ کے درمیان معاملہ تھا یا ابو طالب اور رسول اللہ ﷺ کا تعلق تھا۔ حضرت عباسؓ راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ابو طالب کو آپ نے کچھ فائدہ پہنچایا وہ تو آپ کے ارد گرد گھومتے رہتے تھے (یعنی آپ کی حفاظت کرتے تھے) اور آپ کی حمایت میں دوسروں پر غصہ کرتے تھے فرمایا ہاں وہ ٹخنوں تک

marfat.com

آگ میں ہے لیکن اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے نچلے طبقہ میں ہوتا۔ رواہ مسلم۔ اسی طرح بزاز نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اور مسلم نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے بیان کیا ہے۔

اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ یہ شرطیہ جملہ ہے جس کو جزاء کی ضرورت نہیں کیونکہ کلام سابق مفہوم جزاء پر دلالت کررہا ہے یعنی اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو کافروں کی اندرونی دوستی سے باز رہو ان کو دشمن ہی سمجھو اللہ سے خلوص رکھو اور مسلمانوں سے موالات کرو۔

ھٰاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَھُمۡ وَلَا یُحِبُّوۡنَکُمۡ دیکھو تم تو قرابت یا دوستی کے پیش نظر ان سے محبت کرتے ہو حالانکہ وہ اختلاف مذہب کی وجہ سے تم سے محبت نہیں کرتے (یہ عجیب بات ہے)۔

وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ کُلِّہٖ باوجودیکہ تم ہی سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو یا پوری تورات پر تمہارا ہی ایمان ہے۔ اول مطلب پر الکتاب میں الف لام جنسی ہوگا اور دوسری صورت میں عہدی۔ اس جملہ میں واؤ حالیہ ہے اور مبتدا محذوف ہے اصل کلام وَاَنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ تھا۔ اَنۡتُمۡ (مسند الیہ) کو تومنون (خبر فعلی) سے پہلے لانا مفید حصر ہے یعنی تم ہی ایمان رکھتے ہو کافر تمام کتابوں پر یا پوری تورات پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ تورات کے اندر جو نبی ﷺ کے اوصاف کا بیان ہے اس کو نہیں مانتے اس بیان میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جتنے تم لوگ حق پر مضبوط ہو اس سے زیادہ وہ باطل پر سخت ہیں۔

وَاِذَا لَقُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو نفاق کے ساتھ کہتے ہیں ہم تمہاری طرح محمدؐ اور قرآن کو مانتے ہیں۔

وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَیۡکُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ ؕ اور جب تنہائی میں (اپنے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ) ہوتے ہیں تو غصہ سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں۔ صحاح میں ہے کہ غیظ کا معنی ہے شدت غضب یعنی وہ حرارت جو دل کے خون کے جوش میں آنے کی وجہ سے انسان محسوس کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ تمہاری سلطنت دیکھتے ہیں اور تم کو ضرر پہنچانے کا کوئی راستہ ان کو نہیں مل جاتا تو شدت غضب کی وجہ سے نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ اپنی انگلیاں چباتے ہیں یا اس سبب سے انگلیاں چباتے ہیں کہ اظہار ایمان کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہیں ہوتا اور وہ دل سے اس کو پسند نہیں کرتے۔ انگلیاں کاٹنے سے مراد مجازاً شدت غضب بھی ہو سکتی ہے، خواہ واقع میں انہوں نے انگلیاں نہ کاٹی ہوں۔

قُلۡ آپ کہہ دیں۔ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے یا ہر مسلمان کو ہے آئندہ کلام میں مسلمانوں کو کافروں کی عداوت پر برانگیختہ کیا گیا ہے اور اس طرح خطاب کرنے پر ابھارا گیا ہے جیسے دشمنوں سے خطاب کیا جاتا ہے کیونکہ زخم شمشیر سے بھی زخم زبان تکلیف دہ ہوتا ہے۔

مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِکُمۡ ؕ یعنی اے کافرو! اور منافقو! اپنے غصہ سے خود مر جاؤ۔ مطلب یہ کہ اسلام کی شان یونہی بڑھتی رہے گی اور تم اسلام کی شوکت دیکھ کر ہمیشہ جلتے اور مرتے رہو۔ اس کلام میں ایک خوبی یہ ہے کہ جس کے لئے بددعا کی جارہی ہے اس کی طرف کلام کا رخ نہیں ہے بلکہ دعا اللہ سے کی گئی ہے۔ بظاہر کلام میں دو باتیں ہیں اول کافروں کو اس امر کی اطلاع ہے کہ آئندہ کبھی تمہارے سامنے کوئی ایسی صورت نہیں آئے گی جو تمہارے لئے خوش کن ہو۔ دوسرے اس بات پر آگاہی دینا ہے کہ جو عداوت تمہارے دلوں میں ہے ہم اس سے واقف ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾ یہ حقیقت ہے کہ اللہ دلوں میں چھپی ہوئی باتوں سے خوب واقف ہے یعنی تمہارے دلوں کے اندر جو شدت غضب پوشیدہ ہے اس کو اللہ جانتا ہے۔

یہ جملہ یا تو موتوا بغیظکم کی طرح قل کے ذیل میں داخل ہے یعنی تم ان سے مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِکُمۡ بھی کہہ دو اور اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ بھی کہہ دو۔ یا مستقل اور الگ جملہ ہے یعنی اے مسلمانو! تم اگرچہ واقف نہیں کہ کافروں کو تم سے قلبی محبت نہیں ہے اور وہ غصہ سے تم پر اپنی انگلیاں چباتے ہیں مگر اللہ تو واقف ہے اس لئے تم پر لازم ہے کہ اللہ نے تم کو

marfat.com

جو کافروں سے بغض رکھنے کا حکم دیا ہے اس پر چلو اور باہمی تعلقات کی وجہ سے ان سے محبت نہ کرو۔
اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ؎ اے مسلمانو! اگر تم کو کوئی بھلائی چھو بھی جاتی ہے مثلاً دشمن پر تم کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اسلام کی شوکت بڑھتی ہے، تم کو مال غنیمت یا زندگی کی فراغت نصیب ہو جاتی ہے تو ان کو دکھ پہنچتا ہے وہ اس سے جلتے ہیں۔ لفظ مس سے اس طرف اشارہ ہے کہ تمہاری ادنیٰ بہتری بھی ان کے لئے رنج آفریں ہوتی ہے۔
وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؎ اور اگر تم پر کوئی برائی پڑ جاتی ہے مثلاً دشمن کو کچھ غلبہ حاصل ہو جاتا ہے یا قحط پڑ جاتا ہے اور تمہاری روزی تنگ ہو جاتی ہے تو وہ خوب خوش ہوتے ہیں۔
وَاِنْ تَصْبِرُوْا اور اگر ان کی دشمنی یا تمام مصائب یا حکم الٰہی کی تعمیل کی مشقت پر تم صبر کرو گے۔
وَتَتَّقُوْا اور ان کی موالات سے اور دوسرے ممنوعات سے بچتے رہو گے۔
لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ؎ تو ان کی مکاری تم کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ یعنی وہ پوشیدہ طور پر جو تم کو ضرر پہنچانا چاہتے ہیں کچھ ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ کا فضل اور اس کی طرف سے حفاظت جس کا وعدہ اہل صبر و تقویٰ سے کیا گیا ہے تمہارے شامل حال رہے گا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ صبر اور تقویٰ کا جو شخص آہستہ آہستہ مشاق ہو جائے اور رفتہ رفتہ کوشش کرتا رہے وہ متاثر بھی کم ہوتا ہے پھر مومن کو ہر مصیبت کے ثواب کی امید ہوتی ہے اس لئے نعمت ملنے سے زیادہ اس کو مصیبت سے خوشی ہوتی ہے۔ عاشق کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس پر جو دکھ آیا ہے وہ محبوب کا بھیجا ہوا ہے تو اس کو اس دکھ میں اتنی لذت حاصل ہوتی ہے جتنی نعمت میں نہیں حاصل ہوتی کیونکہ محبوب کی مرضی اور خوشی اس کو اپنی مرضی اور خوشی سے زیادہ لذت بخش ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیچھے تھا ارشاد فرمایا لڑکے اللہ کا خاظر رکھ، اللہ تیری نگہداشت کرے گا اللہ کا لحاظ رکھ، تو اپنے سامنے اللہ کو پائے گا اگر کچھ مانگے تو اللہ سے مانگ اور مدد کی درخواست کرے تو اللہ سے مدد طلب کر اور سمجھ لے کہ اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے کچھ نفع پہنچانا چاہیں تو بس اتنا ہی نفع پہنچائیں گے جتنا اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہوگا اور اگر سب مل کر کچھ نقصان پہنچانا چاہیں گے تو صرف اتنا ہی ضرر پہنچائیں گے جتنا اللہ نے لکھ دیا ہے قلم اٹھا لئے گئے اور لکھی ہوئی تحریریں خشک ہو گئیں۔ رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اگر لوگ اس کو پکڑ لیں تو وہی ان کے لئے کافی ہے اللہ نے فرمایا ہے۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ رواہ احمد وابن ماجہ والدارمی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر میرے بندے میری فرمانبرداری کرتے تو میں رات میں ان پر بقدر سیرابی پانی برساتا اور دن میں سورج نکالتا اور گرج کی آواز بھی نہیں سناتا۔ (یعنی لوگوں کی تجارت صنعت اور دوسرے کاروبار بھی خراب نہ ہوتے اور زراعت کا بھی نقصان نہ ہوتا اور نباتات وحیوانات پیاسے بھی نہ رہتے) رواہ احمد۔

حضرت صہیبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اس کے سارے کام خیر ہی خیر ہیں اور یہ بات مومن کے علاوہ کسی کو میسر نہیں اگر اس کو راحت ملتی ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ شکر اس کیلئے موجب خیر ہوتا ہے اور کچھ دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ صبر اس کے لئے موجب خیر ہوتا ہے۔ رواہ مسلم۔
اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۱۲۰ یقیناً اللہ ان کے اعمال کو گھیرے ہوئے ہے یعنی کفار جو مسلمانوں کو ضرر پہنچاتے ہیں اللہ کا علم اس کو محیط ہے وہ کافروں کو سزا دے گا اگر وہ چاہے گا تو ان کی ایذا رسانی سے تم کو محفوظ رکھے گا اور اس کی ع ۱۲/۱۲

marfat.com

مرضی ہو گی تو تم کو تکلیف کی جزاعنایت کرے گا۔

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم گھر سے نکل کر مسلمانوں کو لڑائی کے لئے ان کے مقامات یعنی میمنہ، میسرہ اور ساقہ میں ٹھیک کر کے بیٹھارہے تھے۔

وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٢١﴾ اور اللہ ان کے اقوال کو خوب سننے والا اور ان کی نیتوں کو جاننے والا تھا۔ حسنؒ بصری نے فرمایا یہ واقعہ جنگ بدر کا تھا اور مقاتل کے نزدیک جنگ احزاب کا اور باقی اہل تفسیر کے نزدیک جنگ احد کا یہی قول صحیح ہے۔

ابن ابی حاتم اور ابو یعلی نے بیان کیا ہے کہ حضرت مسور بن مخرمہؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے کہا مجھ سے جنگ احد کا واقعہ بیان فرمائیے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا آل عمران کی ایک سو بیس آیات کے بعد والی آیات پڑھو تم کو ہمارا قصہ وہاں مل جائے گا اللہ نے فرمایا وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ الی قوله إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا یہ بزدل ہو جانے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے کافروں سے امان طلب کی تھی اور وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ الخ میں اس آرزو کا بیان ہے جو مسلمانوں نے دشمن سے مقابلہ کے لئے کی تھی۔ اور افان مات اوقتل انقلبتم کا قصہ یہ ہوا کہ احد کے دن شیطان نے چیخ کر کہا تھا محمد ﷺ مارے گئے اور اَمَنَةً نعاسا کی صورت یہ ہوئی کہ مسلمانوں پر نیند کا دورہ پڑ گیا تھا (تاکہ خوف اور تھکان اور دہشت دور ہو جائے) حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ساٹھ آیات کے آخر تک یعنی وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ تک تلاوت فرمائی اور اس کے بعد آیت لقد سمع الله الخ ہے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اللہ نے آل عمران کی ساٹھ آیات جنگ احد کے حالات کے بیان میں نازل فرمائیں جن کے اندر ان باتوں کو ظاہر فرمایا جو اس روز ہوئی تھیں اور جو لوگ جنگ سے غیر حاضر تھے ان پر عتاب فرمایا۔

مجاہد، کلبی اور واقدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کو حضرت عائشہؓ کے مکان سے برآمد ہوئے اور پیادہ چل کر احد تک پہنچے اور لڑائی کے لئے اپنے ساتھیوں کی صف بندی (ایسی سیدھی) کرنے لگے جیسے تیر سیدھا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر اور بیہقی نے دلائل میں ابن اسحاق کے حوالہ سے اور عبدالرزاق نے مصنف میں معمر کی وساطت سے زہری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ۱۲ر شوال ۳ھ کو بروز بدھ تین ہزار مشرکوں نے احد میں پڑاؤ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا اور عبداللہ بن ابی بن سلول کو بھی (مشورہ کے لئے) بلوایا اس سے پہلے حضور ﷺ نے عبداللہ کو کبھی طلب نہیں فرمایا تھا، عبداللہ اور اکثر انصاریوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضورؐ کو (سب مسلمانوں کے ساتھ) مدینہ کے اندر ہی رہنا چاہئے باہر نہ نکلنا چاہئے۔ کیونکہ خدا کی قسم (ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ دشمن کے حملہ آور ہونے کے وقت ہم اگر باہر نکلے ہیں تو دشمن ہم پر کامیاب رہا ہے اور اگر دشمن اندر آ کر ہم پر حملہ آور ہوا ہے تو ہم اس پر کامیاب رہے ہیں اب جبکہ آپ ہم میں موجود ہیں ہم کو کیا ڈر ہے۔ اگر مشرک جہاں ہیں وہیں قیام پذیر رہیں گے تو وہ ان کے قیام کیلئے بری جگہ ہے اور اگر وہ شہر کے اندر گھسیں گے تو ہمارے مرد اور ان کے سامنے سے لڑیں گے اور بچے اور عورتیں اوپر سے ان پر پتھر برسائیں گے اور اگر لوٹ کر چلے جائینگے تو ناکام لوٹیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کو یہ رائے پسند آئی، بزرگ مہاجرین اور انصار کی یہی رائے تھی، لیکن حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت نعمان بن مالکؓ اور انصاریوں کی ایک جماعت (جن میں اکثر نوجوان تھے اور بدر کی شرکت سے محروم رہے تھے اور دشمن کے مقابلہ میں شہید ہونے کے خواستگار تھے اور اللہ نے احد کے دن ان کو شہادت عطا بھی فرما دی) کی رائے ہوئی کہ ان کتوں کی طرف نکل کر چلنا چاہئے تاکہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم بزدل اور کمزور ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے خواب میں گائے دیکھی ہے، جس کی تفسیر ہے بھلائی اور میں نے اپنی تلوار کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی ہے۔ میرے نزدیک اس کی تعبیر ہے شکست اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں نے اپنا ہاتھ مضبوط زرہ میں داخل کیا۔ اس کی تعبیر میں نے دی مدینہ میں داخلہ (یا قیام) پس اگر مدینہ میں ہی قیام رکھنے کی تمہاری رائے ہو (تو بہتر ہے) آپ کو یہی بات پسند تھی کہ دشمن

marfat.com

مدینہ کے اندر آجائیں اور گلی کوچوں میں ان سے لڑائی ہو۔

احمد، دارمی اور نسائی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ میں نے (اپنا ہاتھ) مضبوط زرہ میں اور دیکھا کا ئے کو ذبح کئے جاتے دیکھا تو میں نے اس کی تعبیر یہ دی کہ مضبوط زرہ مدینہ ہے اور گائے خدا کی قسم بھتری ہے۔ بزاز اور طبرانی نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں نے پڑاؤ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا میں نے خواب میں اپنی شمشیر ذوالفقار کو شکستہ دیکھا ہے اور یہ مصیبت ہے اور گائے کو ذبح ہوتے دیکھا ہے یہ بھی مصیبت ہے اور اپنے بدن پر اپنی زرہ دیکھی ہے یہ تمہارا شہر ہے انشاء اللہ وہ تمہارے شہر تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

ابن اسحاق، ابن عقبہ اور ابن سعد وغیرہ کا بیان ہے کہ یہ خواب جمعہ کی رات کو دیکھا تھا۔ عروہؒ نے کہا تلوار کی شکستگی جو دیکھی تھی وہ وہی زخم تھا جو چہرہ مبارک پر لگا تھا۔ ابن ہشام کی روایت میں ہے کہ (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تلوار کی شکستگی تو یہ ہے کہ میرے گھر والوں میں سے کوئی آدمی مارا جائے گا۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) پھر میں نے اس کو یعنی تلوار کو دوبارہ ہلایا تو وہ پہلی حالت سے بہتر حالت پر ہو گئی پس یہ وہی فتح ہے جو اللہ نے عنایت فرمائی۔ حضرت حمزہؓ نے کہا تھا قسم ہے اس کی جس نے آپ پر (قرآن) نازل کیا جب تک میں ان سے مدینہ کے باہر تلوار سے مقابلہ نہیں کر لوں گا، آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔ حضرت حمزہؓ جمعہ کے دن بھی روزہ دار رہے اور سنیچر کے دن بھی۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ! آپ ہم کو جنت سے محروم نہ کریں۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں تو جنت میں ضرور ضرور داخل ہوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کیوں۔ حضرت نعمانؓ نے جواب دیا میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور لڑائی کے دن نہیں بھاگوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے سچ کہا۔ چنانچہ حضرت نعمانؓ اس روز شہید ہو گئے۔ نیز مالک بن سنان خدری اور ایاس بن عتیک نے بھی لڑائی کے لئے مدینہ سے باہر نکلنے کی ترغیب دی۔

غرض جب لوگ نہ مانے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی اور نصیحت کی اور خوب کوشش و محنت کرنے کا حکم دیا اور بتادیا کہ اگر صبر رکھو گے تو فتح تمہاری ہو گی لوگ دشمن کی طرف روانہ ہونے (کی اجازت سننے) سے خوش ہو گئے لیکن مدینہ سے خروج بہت سے لوگوں کو پسند بھی نہیں آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز بھی لوگوں کو پڑھادی اور بالاء مدینہ کے رہنے والے بھی آگئے عورتوں کو اونچے ٹیلوں پر (محفوظ مقامات میں) بھیج دیا اور رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکرؓ وحضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر اپنے گھر میں تشریف لے گئے لوگ حجرہ مبارک سے ممبر تک صف بند ہو کر رسول اللہ ﷺ کی بر آمد گی کا انتظار کرنے لگے اتنے میں حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت اسید بن حضیر آئے اور لوگوں سے کہا تم نے رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے خلاف کیا اور جو کچھ کہنا تھا کہا حالانکہ آسمان سے وحی رسول اللہ ﷺ پر اترتی ہے (تم پر نہیں اترتی) مناسب یہ ہے کہ معاملہ کو حضور ﷺ ہی کے سپرد کر دو اور جو کچھ آپ حکم دیں وہی کرو۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ ہتھیار لگائے زرہ پہنے بر آمد ہو گئے۔ اس وقت آپ کمر پر تلوار کا چمڑہ کا پرتلہ بطور پیٹی باندھے، عمامہ پہنے اور تلوار لٹکائے ہوئے تھے لوگ حضور ﷺ کی مرضی کے خلاف رائے دینے پر پشیمان ہوئے اور عرض کیا۔

یا رسول اللہ ﷺ ہم نے حضورؐ کی مرضی کے خلاف رائے دی۔ ہم کو یہ نہ چاہئے تھا اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو بیٹھ جائیے (یعنی مدینہ سے باہر نہ نکلئے) فرمایا میں نے تم کو اسی بات کی دعوت دی تھی مگر تم نے نہ مانا اور کسی نبی کے لئے زیبا نہیں کہ جب وہ ہتھیار لگالے تو بغیر جنگ کے ہتھیار اتار دے، دیکھو میں جو حکم دوں اس پر چلو۔ اللہ کے نام پر (بھروسہ کر کے) روانہ ہو جاؤ جب صبر رکھو گے تو فتح تمہاری ہو گی۔

اس فرمان کے بعد مالک بن عمرو بخاری کا جنازہ جنازوں کے مقام میں آپ نے رکھا ہوا پایا، مالک کی وفات ہو گئی تھی اور

marfat.com

لوگوں نے میت کو لاکر رکھ دیا تھا۔ حضور ﷺ نے جنازہ کی نماز پڑھی، پھر باہر نکل کر اپنے گھوڑے پر جس کا نام سکب تھا سوار ہو گئے کمان کاندھے پر ڈالی۔ سعدؓ بن عبادہ اور سعد بن معاذؓ مسلح دائیں بائیں موجود تھے اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ گھاٹی کے سرے پر پہنچے تو وہاں ایک بہادر طاقتور فوجی دستہ ملا، دریافت فرمایا یہ کیا ہے لوگوں نے کہا یہ عبداللہ بن ابی کے یہودی معاہد ہیں (جنہوں نے عبداللہ سے تعاونی معاہدہ کیا ہوا ہے) فرمایا کیا یہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ جواب دیا گیا، نہیں۔ فرمایا تو مشرکوں کے خلاف اہل شرک سے ہم مدد کے طالب نہیں، یہاں سے چل کر مقام شیخین میں پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے لشکر بندی کی شیخین دو ٹیلوں کا نام تھا۔

اس روز رسول اللہ ﷺ کے سامنے کچھ لڑکے جن کی عمریں ۱۴ برس کی تھیں لشکر میں شامل کئے جانے کے لئے پیش کئے گئے۔ آپ ﷺ نے ان کو لوٹا دیا، ان کی تعداد سترہ تھی۔ کچھ اور لڑکے جن کی عمریں پندرہ سال کی تھیں پیش ہوئے آپ ﷺ نے ان کو لڑائی میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔ جن میں سے عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، اسامہ بن زید، زید بن ارقم، براء بن عازب، ابو سعید خدری اور اوس بن ثابت انصاریؓ بھی تھے، رافع بن خدیج کو لوٹا دیا گیا تھا لیکن جب بتایا گیا کہ یہ تیر انداز ہے تو شامل ہونے کی اجازت عطا فرمادی اس پر سمرہ بن جندب بولے کہ رافع بن خدیج کو تو رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور مجھے لوٹا دیا حالانکہ کشتی میں، میں اس کو پچھاڑوں گا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھی دی گئی تو آپ نے فرمایا دونوں کشتی لڑلو، کشتی ہوئی تو سمرہ نے رافع کو پچھاڑ لیا اس لئے سمرہ کو بھی جنگ میں شامل ہونے کی اجازت مل گئی، فوج کا معائنہ ختم ہو گیا اور سورج ڈوب گیا تو بلال نے مغرب کی اذان دی اور رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں کو نماز پڑھائی پھر (کچھ دیر کے بعد) عشاء کی اذان دی اور آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور رات شیخین میں بسر کی، اس رات لشکر کی نگرانی کے لئے محمدؓ بن مسلمہ کو پچاس آدمی دے کر مقرر کیا گیا ان لوگوں نے لشکر کے گرد گھوم پھر کر چوکیداری کی اور رسول اللہ ﷺ سو گئے۔ سحر ہوئی تو فجر کی نماز پڑھ کر فرمایا کیا کوئی ایسا رہبر ہے جو دشمنوں کی طرف سے گذارے بغیر ہم کو ٹیلہ سے نکال کر لے جائے، ابو خیثمہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں ایسا کروں گا چنانچہ ابو خیثمہ بنی حارثہ کے میدان اور ان کے باغات کے درمیان سے لے کر چلا یہاں تک کہ مربع بن قیظی کے باغ میں لے پہنچا، مربع منافق اور نابینا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی آہٹ پا کر ان حضرات کے منہ کی طرف خاک اڑانے لگا اور کہنے لگا کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ بھی ہو تب بھی اپنے باغ میں داخل ہونے کی میں تم کو اجازت نہیں دیتا یہ کہہ کر اس نے لپ بھر مٹی لی اور بولا اگر مجھے علم ہو جاتا کہ جس وقت میں یہ مٹی ماروں گا تو تمہارے چہرہ پر ہی پڑے گی تو ضرور مار دیتا لوگ اس کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے مگر حضور ﷺ نے فرمایا اس کا قتل نہ کرو یہ اندھا کور دل بھی ہے اور کور چشم بھی۔ لیکن حضور ﷺ کی ممانعت سے پہلے ہی سعد بن زید اشہلی اندھے کے پاس پہنچ چکے تھے اور کمان مار کر اس کو زخمی کر دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ مدینہ سے ہزار آدمی لے کر کوہ احد کی طرف نکلے تھے، بعض روایات میں نو سو پچاس کی تعداد آئی ہے جب دونوں فوجوں کے ملنے کے مقام پر پہنچے تو عبداللہ بن اُبی ایک تہائی یعنی تین سو آدمی لے کر واپس لوٹ گیا اور کہنے لگا ہم کیوں اپنی اور اپنی اولاد کی جانیں دیں۔ ابو جابر سلمی اس کے پیچھے گیا اور کہا میں تم کو تمہارے نبی اور تمہاری جانوں کا واسطہ دیتا ہوں (لوٹ کر نہ جاؤ) عبداللہ بولا، لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات سو آدمی اور دو گھوڑے رہ گئے ایک گھوڑا خود آپ کا تھا اور دوسرا ابو بردہ کا، ابن عقبہ کا بیان ہے کہ اس روز مسلمانوں کے پاس کوئی گھوڑا نہیں تھا قبیلہ خزرج میں سے بنو سلمہ اور قبیلہ اوس میں سے بنو حارثہ اسلامی لشکر کے دو بازو تھے ان دونوں قبیلوں نے بھی عبداللہ بن اُبی کے ساتھ لوٹ پڑنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے ان کو محفوظ رکھا اور وہ نہیں لوٹے اللہ نے اپنی یہی نعمت عظمیٰ ان کو یاد دلائی اور فرمایا۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ اس وقت کو یاد کرو جب دو گروہوں یعنی بنی حارثہ اور بنی اسلمہؓ نے ارادہ کر لیا تھا۔

marfat.com

مِنْكُمْ تم میں سے۔ اس میں عبد اللہ پر طنز ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی تم میں سے نہیں تھے اس لئے انکی واپسی کا ذکر نہیں کیا۔

اَنْ تَفْشَلَا کہ بزدل اور کمزور ہو جائیں۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا اور اللہ دونوں گروہوں کا دوست تھا یا اس خطرہ سے بچانے والا تھا یا ان کا مددگار اور کارساز تھا پس کیا سبب تھا کہ وہ بزدل ہو رہے تھے اور اللہ پر اعتماد نہیں کر رہے تھے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۲ اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے پس منافقوں کے بھاگنے سے ان کو بزدل نہ ہونا چاہئے تھا۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول ہمارے حق میں ہوا تھا (ہم نے ہی بھاگنے کا ارادہ کیا تھا) لوگوں نے کہا کہ جب اللہ نے فرمایا واللہ ولیھما تو اب ہم کو گذشتہ ارادۂ فرار سے اتنی مسرت ہے کہ اگر ہم ارادۂ فرار نہ کرتے تو اتنی مسرت نہ ہوتی۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ مسلمانوں کی تعداد کی قلت اور اسباب کی کمزوری کے باوجود اللہ نے بدر میں مسلمانوں کو فتح عنایت کی تھی اور یہ واقعہ موجب توکل تھا، اس لئے یہاں سے واقعہ بدر کی یاد دلائی ہے اکثر کے نزدیک بدر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام تھا، بعض نے کہا ایک کنویں کا نام تھا یہ بھی ایک قول مروی ہے کہ بدر نام کے ایک شخص کا کنواں تھا یہ قول شعبیؒ کا ہے۔

وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ اذلۃ کا مفرد ذلیل ہے ذلیل کی جمع ذلائل بھی ہے مگر اذلہ فرمایا ذلائل نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ (اذلۃ بروزن افعلۃ ہے اور یہ جمع قلت ہے اور ذلائل جمع کثرت ہے) حالات کی کمزوری، سواریوں اور ہتھیاروں کی کمی ظاہر کرنے کے ساتھ بدر میں مسلمانوں کی قلت کا اظہار بھی مقصود ہے، مسلمان تین سو مرد تھے اور ستر اونٹ ان کے ساتھ تھے جن پر باری باری سے سوار ہو جاتے تھے اور دو گھوڑے تھے ایک حضرت مقدادؓ کا اور دوسرا حضرت زبیرؓ بن عوام کا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲۳ اس آیت کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے ایک یہ کہ اللہ نے تم کو فتح عنایت فرمائی تاکہ تم اس کا شکر یہ اس طرح ادا کرو کہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہ کر اللہ سے ڈرتے رہو، دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ تم شکر گزار ہونے کی امید میں تقویٰ اختیار کرو۔ اس جملہ میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ بندہ کی اصل نظر شکر کی طرف ہونی چاہئے اس کو اللہ کی نعمت کی رغبت اس لئے ہو کہ حصول نعمت شکر ادا کرنے کا ذریعہ ہے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝۱۲۴

اللہ نے تم کو فتح یاب اس وقت کیا جب تم مؤمنوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تین ہزار فرشتوں کو اتار کر اللہ کی طرف سے تمہاری امداد کرنا کافی نہیں ہے۔ قتادہؒ نے فرمایا یہ واقعہ بدر کے دن کا تھا شروع میں اللہ نے ایک ہزار ملائکہ سے امداد فرمائی تھی جیسے فرمایا ہے فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملائکہ پھر فرشتے تین ہزار اور پھر پانچ ہزار کر دیئے گئے، الن یکفیکم میں استفہام انکاری ہے (اور لن نافیہ ہے اور انکار نفی، اثبات ہوتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ تین ہزار فرشتوں کی مدد تمہارے لئے کافی ہے)۔

ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں اور ابن ابی حاتم نے شعبیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ کرز بن جابرؓ محاربی مشرکوں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات مسلمانوں پر شاق گزری تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ لن (نفی تاکیدی) لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمان اپنی کمزوری اور قلت اور دشمن کی قوت و کثرت کو دیکھ کر فتح سے گویا ناامید ہو چکے تھے (ایسی حالت میں اللہ نے مدد کی)۔

بَلٰٓى لا کیوں کافی نہیں۔ یہ نفی مؤکد کے بعد اثبات ہے، آگے صبر و تقویٰ کی ترغیب دینے اور دلوں کو قوی بنانے کے

marfat.com

لئے مزید مشروط امداد کا وعدہ فرمایا۔

اِنْ تَصْبِرُوْا اگر تم قتال پر صبر رکھو گے۔

وَتَتَّقُوْا اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرتے رہو گے۔

وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا اور اسی حالت میں کہ تم کمزور ہو اور وہ طاقتور ہیں تم پر اسی وقت آپڑیں گے، فور بمعنی ساعت۔ اصل میں یہ فارت القدر کا مصدر ہے (ہانڈی میں ابال آگیا) مجازاً بمعنی سرعت ہے پر اس حالت کو کہنے لگے جو موجود ہو۔

میں کہتا ہوں کلام میں فور کی قید لگانے کا کوئی خاص مفہوم نہیں بلکہ بات میں قوت پیدا کرنا مقصود ہے کہ آئندہ جب تم میں مشرکوں سے مقابلہ کرنے کی قوت ہو جائے گی تو اس وقت بدرجۂ اولی اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تم کو فتحیاب کرے گا لیکن موجودہ حالت میں بھی اگر تم ثابت قدم رہے اور مخالفت امر رسول نہ کی اور مشرک تم پر آپڑے تب بھی۔

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اللہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا، امداد کا معنی ہے فوجی کمک۔

مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ جو نشاندار یعنی نشان والے ہوں گے۔ ؎۱

ابن ابی شیبہ اور ابن ابی حاتم نے اس روایت کی نسبت شعبی کی طرف کی ہے کہ کرز (بن جابرؓ کو بدر کے دن) مشرکوں کی شکست کی خبر پہنچی تو (وہ پست حوصلہ ہو گیا اور) اس نے مشرکوں کو مدد نہیں دی (اور چونکہ مسلمانوں کو ضرورت باقی نہیں رہی تھی) اس لئے پانچ ہزار فرشتوں کی کمک مسلمانوں کے لئے بھی اللہ نے نہیں بھیجی، مسومین تسویم سے اسم فاعل ہے تسویم کا معنی ہے نشاندار ہونا (یا نشان دار بنانا) قتادہ اور ضحاک نے کہا فرشتوں نے (اپنے) گھوڑوں کی پیشانیوں اور دموں میں اون کا نشان لگا دیا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں عمرو بن اسحاق کی روایت مرسلاً نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے بدر کے دن صحابہؓ سے فرمایا تم اپنا نشان لگا لو کیونکہ ملائکہ نے سفید اون کے نشان اپنی ٹوپیوں اور خودوں میں لگا لئے ہیں، ابن جریر نے بھی یہ روایت نقل کی ہے اور اتنا زائد لکھا ہے کہ یہ اول ترین جنگ تھی جس میں اون کا نشان لگایا گیا

یا تسویم کا معنی ہے اَسَامَۃٌ یعنی لٹکا نا چھوڑنا۔ عروہ بن زبیرؓ نے فرمایا ملائکہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کے عمامے زرد تھے، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان کے عمامے سفید تھے جن کی دمیں دونوں شانوں کے درمیان انہوں نے چھوڑ رکھی تھیں۔ ہشام بن عروہ اور کلبی نے کہا ان کے عمامے زرد تھے جو شانوں پر لٹکے ہوئے تھے۔

قتادہؒ نے فرمایا بدر کے دن مسلمان صابر رہے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی سے مجتنب رہے اس لئے اللہ نے حسب وعدہ پانچ ہزار ملائکہ کی ان کو مدد دی، حسن نے فرمایا بس یہی پانچ ہزار قیامت کے دن تک مسلمانوں کے لئے پشت پناہ رہیں گے یعنی بشرط صبر و تقویٰ۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کا بیان ہے کہ بدر کے علاوہ ملائکہ نے کسی معرکہ میں جنگ نہیں کی ہاں موجود ضرور رہے مگر لڑے نہیں، صرف تعداد بڑھانے اور مدد کرنے کے لئے حاضر رہے۔

کچھ علماء کا بیان ہے کہ بدر کے دن اللہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر لڑائیوں میں ثابت قدم رہیں گے اور ممنوعات سے اجتناب رکھیں گے تو اللہ تمام لڑائیوں میں ان کی مدد کرے گا مگر سوائے جنگ احزاب کے مسلمان کسی جنگ میں صابر نہیں رہے، چنانچہ احزاب کے دن قریظہ اور نضیر کے محاصرہ کے وقت اللہ نے ان کی مدد بھی کی، حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی کا بیان ہے کہ ہم بنی قریظہ اور بنی نضیر کا محاصرہ کئے رہے لیکن فتح حاصل نہیں ہوئی، رسول اللہ ﷺ پانی منگوا کر سر دھو رہے تھے

حاشیہ از مفسر قدس سرہ ؎۱ طبرانی اور ابن مردویہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لفظ مسومین کی تشریح میں فرمایا، معلمین، نشان والے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بدر کے دن فرشتوں کا نشان سیاہ عمامے تھے اور احد کے دن سرخ عمامے۔

marfat.com

کہ جبرئیلؑ نے آکر کہا تم لوگوں نے ہتھیار کھول دیئے اور ملائکہ نے ابھی تک اپنے اسلحہ نہیں اتارے یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فوراً ایک کپڑا منگوا کر سر سے لپیٹا، سر نہیں دھویا پھر ہم کو جمع کرنے کے لئے منادی کرائی ہم فوراً تیار ہو گئے اور قریظہ و نضیر کی بستیوں پر جا پہنچے اس روز تین ہزار ملائکہ نے ہماری مدد کی اور آسانی سے فتح عنایت کردی۔

ضحاک اور عکرمہ نے کہا کہ آیت اذتقول للمومنین الن یکفیکم الخ میں جنگ احد کے واقعہ کا بیان ہے (بدر کے واقعہ کا بیان نہیں ہے) اللہ نے مسلمانوں سے وعدۂ مدد بشرط صبر و تقویٰ کیا تھا لیکن انہوں نے صبر نہیں رکھا، رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کی اس لئے ان کی مدد نہیں کی گئی۔

مجاہدؒ و ضحاکؒ نے کہا کہ مِنْ فَوْرِهِمْ کا معنی ہے من غضبہم بات یہ ہوئی تھی کہ بدر کے دن کی شکست سے مشتعل ہو کر انتہائی غضب کے ساتھ احد میں لڑنے کے لئے کفار آئے تھے چونکہ رسول اللہ ﷺ احد کے دن ثابت قدم رہے تھے اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی اس لئے اللہ نے جبرئیل اور میکائیل کے ذریعہ سے آپ کی مدد کی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ احد کے دن میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اس وقت آپ کی معیت میں دو آدمی سفید کپڑے پہنے ہوئے دشمن سے لڑ رہے تھے ان دونوں آدمیوں کو میں نے نہ اس سے پہلے دیکھا تھا نہ بعد کو دیکھا، متفق علیہ، یہ دونوں آدمی جبرئیلؑ و میکائیلؑ تھے۔

محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر لوگ پراگندہ ہو گئے۔ صرف سعد بن مالک حضور ﷺ کی طرف سے تیر چلاتے رہے تھے اور ایک جوان تیروں میں بوریاں لگا کر دے رہا تھا جب بوریاں ختم ہو گئیں تو جبرئیل بوریاں لے کر آئے اور لا کر بکھیر دیں اور دو مرتبہ کہا ابو اسحاق تیر مار۔ جب معرکہ ختم ہو گیا تو اس جوان کے متعلق دریافت کیا گیا (کہ کون تھا) مگر کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ اللہ نے تم کو فرشتوں سے مدد صرف اس لئے دی کہ تم کو فتح کی بشارت ہو۔

وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت کی تم کو پروا نہ ہو، ظاہری اسباب پر اعتماد انسان کی فطرت ہے، مددگاروں کی ظاہری کثرت دیکھ کر آدمی کو اطمینان خاطر ہوتا ہی ہے۔ **وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ** لہ اور درحقیقت فتح تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے سامان کی فراوانی اور تعداد کی کثرت سے نہیں ہوتی، کیونکہ آدمی ہوں یا فرشتے سب کے افعال اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔

الْعَزِيْزِ ایسا غلبہ والا جس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

الْحَكِيْمِ (۱۲۶) حکمت والا کہ باقتضاء حکمت جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، خواہ بالواسطہ یا بلا ذریعہ اور جس کو چاہتا ہے بے مدد چھوڑ دیتا ہے اگر وہ مدد کرتا ہے تو اپنی مہربانی سے کرتا ہے اس پر لازم نہیں۔

لِيَقْطَعَ تاکہ کاٹ دے (ہلاک کردے) اس کا تعلق ینصرکم اللہ سے ہے یا یمدکم سے یا ماالنصر سے۔ مؤخر الذکر صورت میں النصر میں لام عہدی ہوگا۔

طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا تاکہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کردے۔ قاموس میں طرف کا معنی ہے

لہ عیاض اشعریؒ راوی ہیں کہ میں جنگ یرموک میں خود موجود تھا اس وقت ہمارے پانچ کمانڈر تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت یزیدؓ بن ابی سفیان، حضرت ابن حسنہ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عیاضؓ (یہ عیاض، عیاضؓ اشعری نہیں ہیں)، حضرت عمرؓ نے فرمادیا تھا کہ لڑائی کی نوبت آجائے تو تم سب کے کمانڈر ابو عبیدہؓ ہوں گے۔ ہم نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ موت سامنے ہے، کمک بھیجئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ مجھے تمہارا خط ملا تم مجھ سے مدد کے طالب ہو میں تم کو ایسی ہستی بتاتا ہوں جس کی امداد سب پر غالب اور جس کا لشکر ہر وقت موجود ہے، وہ ہستی اللہ کی ہے اسی سے مدد مانگو کیونکہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کا سامان اور جتھہ تم سے کم تھا مگر اللہ نے ان کو فتح یاب فرمایا تھا جب تم کو میرا یہ خط پہنچے تو خود کافروں سے جنگ کرنا مجھ سے مدد نہ مانگنا، اس خط کے وصول ہونے پر ہم نے دشمن سے جنگ کی اور چار فرسخ تک اس کو بھگا دیا، ۱۲۔

marfat.com

کنارہ، کسی چیز کا ایک ٹکڑا اور شریف آدمی۔ چنانچہ بدر میں کافروں کے کمانڈر اور سردار ستر مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے۔ جس مفسر نے ان آیات کو جنگ احد کے متعلق قرار دیا ہے اس نے کہا کہ احد میں کافروں کے سولہ سردار مارے گئے تھے اور شروع میں فتح مسلمانوں کی ہوئی تھی لیکن جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کی تو فتح شکست سے بدل گئی۔

اَوْ يَكْبِتَهُمْ یا ان کو لوٹا دے۔ کبت کا معنی ہے سختی کے ساتھ لوٹا دینا (صحاح) کبتہ اس کو پچھاڑا، ہلاک کیا، رسوا کیا، پھیر دیا، توڑ دیا، دشمن کو غصہ کے ساتھ لوٹا دیا، ذلیل کر دیا (قاموس)۔

میں کہتا ہوں شکست کے لئے یہ تمام باتیں لازم ہیں، لفظ او تردید کے لئے نہیں بلکہ نوعیت کے اختلاف کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی اللہ نے تمہاری مدد کی تاکہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کر دے اور باقی کو شکست دے کر بھگادے۔

فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ پس وہ اپنے شہروں کو ناکام ہو کر پلٹ جائیں، مسلم اور امام احمد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کا اگلا دانت اور چہرۂ مبارک زخمی ہو کر خون بہنے لگا، حضور ﷺ نے فرمایا ایسی قوم کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے جس نے اپنے پیغمبر ﷺ سے یہ سلوک کیا ہو، حالانکہ پیغمبر ان کو اللہ کی طرف بلا رہا ہے اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ آپ کو اس امر کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

(اس آیت کے شان نزول میں ایک اور قصہ بھی آیا ہے) جو امام احمدؒ اور بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے، حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے، اے اللہ فلاں شخص پر لعنت کر۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے دعا کی اے اللہ ابوسفیان پر لعنت کر، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت کر، اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت کر، اے اللہ صفوان ابن امیہ پر لعنت کر، اس پر آیت نازل ہوئی اور ان سب کو توبہ کی توفیق عنایت کی گئی، بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

شیخ ابن حجرؒ نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ جنگ احد کے دن جو واقعہ ہوا، (اور حضور ﷺ نے جو کچھ فرمایا) اس کے بعد مذکورۂ بالا اشخاص کے لئے رسول اللہ ﷺ نے نماز میں بد دعا کی، پس ان دونوں قصوں پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ سعید بن مسیب اور محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ جب احد کے دن رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے دیکھا کہ کافروں نے مسلمانوں کے ناک کان اور آلات تناسل کاٹ کر سب کو مثلہ بنادیا تو کہنے لگے اگر اللہ نے ہم کو ان پر غلبہ عنایت کیا تو جیسا انہوں نے کیا ہے ہم بھی ایسا ہی کریں گے اور اس طرح مثلہ بنائیں گے کہ کسی عرب نے کسی کے ساتھ نہ کیا ہوگا اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے بیخ و بن سے تباہ ہو جانے کی بد دعا دینے کا ارادہ کیا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ ان میں سے بہت لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔

لیکن ان روایات کا تعارض اس روایت سے ہوتا ہے جو مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں پڑھا کرتے تھے اللھم العن رعلا و ذکوان و عصیۃ یہاں تک کہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمادی (اور حضور ﷺ نے بد دعا کرنا موقوف کیا) کیونکہ رعل و ذکوان کا قصہ اس کے بعد کا ہے۔ رعل و ذکوان قبائل کا تعلق بیر معونہ کے قصہ سے تھا رسول اللہ ﷺ نے ستر قاری قرآن سکھانے پڑھانے کے لئے ان قبائل کے پاس روانہ کئے تھے جن کے امیر منذر بن عمروؓ تھے۔ مگر عامر بن طفیل نے ان سب قاریوں کو شہید کر دیا، حضور کو اس کا سخت رنج ہوا اور مہینہ بھر تک ہر نماز میں آپ نے ان قبائل کے لئے بد دعا کی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو مدرج قرار دیا ہے، تعارض کو دور کرنے کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جنگ احد سے چار ماہ بعد ماہ صفر ۴ھ میں رعل و ذکوان کا قصہ ہوا تھا اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت کا نزول دونوں واقعات کے بعد ہوا ہو، اگر سبب نزول سے کچھ مدت کے بعد آیت کا نزول ہوا ہو تو بعید نہیں۔ لیکن بخاریؒ نے تاریخ میں

marfat.com

اور ابن اسحاق نے سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے آیت کا سبب نزول یہ لکھا ہے کہ ایک قریشی شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر کہا تم ایک بات سے منع کرتے ہو پھر اس کو پلٹ دیتے ہو یہ کہہ کر اس نے اپنی پشت رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیر دی اور پیچھے سے سرین کھول دیئے، حضور ﷺ نے (اس گستاخی کی وجہ سے) اس کے لئے بددعا کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی پھر وہ شخص مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلام اچھا رہا، یہ روایت مرسل اور غریب ہے۔

اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ یہاں تک کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرمالے گا اگر وہ مسلمان ہو جائیں گے یا ان کو عذاب دے گا اگر وہ کفر پر جمے رہیں گے۔ دینوی عذاب بصورت قتل و گرفتاری ہو گا اور آخرت میں عذاب جہنم ہو گا۔

فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ اس لئے کہ وہ ظالم ہیں۔ یہ عذاب دینے کی علت ہے۔ فراء نے کہا اویتوب میں لفظ او، حتی (یہاں تک) کے معنی میں ہے۔ ابن عیسیٰ نے او کا معنی الا ان (مگر یہ کہ) کہا ہے جیسے بولا جاتا ہے لالزمنک او تعطینی حقے میں تیرا پیچھا نہیں چھوڑں گا یہاں تک کہ تو میرا حق دے دے (بر قول فراء) یا مگر یہ کہ تو میرا حق دے دے (بر قول ابن عیسیٰ) آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو عذاب دینا یا نہ دینا کوئی بات آپ کے اختیار میں نہیں ہے یہاں تک کہ اللہ مسلمان ہونے کی وجہ سے یا ان پر رحم فرمائے گا اور تم کو اس سے خوشی ہو گی یا (کفر پر جمے رہنے کی وجہ سے) ان کو عذاب دے گا اور اس سے تم کو تسکین حاصل ہو گی۔

بعض علماء نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ اویتوب کا عطف الامر یا شئی پر ہو یعنی آپ کو ان کے معاملہ کا یا ان کو عذاب دینے یا رحم کرنے کا کوئی اختیار نہیں آپ صرف اس بات پر مامور ہیں کہ ان کو ڈرائیں اور ان سے جہاد کریں، نتیجہ کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، تفتازانی نے اعتراض کیا ہے کہ اس صورت میں عام پر خاص کا عطف ہو گا (الامر عام ہے اور یتوب و یعذب خاص ہے) لیکن ایسے موقع پر لفظ او نہیں لایا جاتا، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ امر سے اس جگہ حال مراد ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امر بمعنی حکم ہو اس وقت یہ مطلب ہو گا کہ آپ جو حکم دیتے ہیں وہ آپ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ حکم دینا اور فرض کرنا آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ رحم کرنا اور عذاب دینا آپ کے اختیار میں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اس آیت کے نزول کو پہلی آیت سے مربوط قرار دیا جائے تو اویتوب علیہم کا عطف اویکبت پر ہو گا اور مطلب اس طرح ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں تمہاری مدد اس لئے کی کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کر دے یا شکست دے کر ایک گروہ کو ناکام لوٹا دے یا مسلمان ہو جانے کی وجہ سے ان پر رحم کرے یا ان کو عذاب دے۔ گویا احوال کفار کی چار انواع بیان فرمائیں، اس تفصیل پر لیس لک من الامر شئی بددعا سے روکنے کے لئے جملہ معترضہ ہو گا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کی مخلوق اور مملوک ہے اس لئے تمام امور اسی کے قبضہ میں ہیں۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وہ جس کی مغفرت چاہے گا اسلام کی توفیق دے کر کر دے گا، خواہ اس نے (گناہوں سے) توبہ کی ہو یا نہ کی ہو۔

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا، یہ آیت صراحۃً بتا رہی ہے کہ گناہ گاروں کو عذاب دینا اللہ پر لازم نہیں۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ اور اللہ غفور و رحیم ہے لہٰذا تم ان کے لئے بددعا کرنے میں پیش قدمی نہ کرو۔ فریابی ع ۱۳ ۲
نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ لوگ (ادائے ثمن کی) ایک مدت مقرر کر کے خرید و فروخت کرتے تھے اور جب میعادِ ادا پوری ہو جاتی تو ثمن میں اضافہ کر دیتے اور مدتِ ادا میں بھی توسیع کر دیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ اے اہل ایمان سود نہ کھاؤ چند در چند بڑھا کر اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً قید احترازی نہیں ہے (کہ اگر چند در چند نہ ہو تو سود کھانے کی ممانعت نہیں) بلکہ مطلق ربوا کی

marfat.com

ممانعت ہے اور ان کے طریق کار پر زجر ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ اور فلاح کی امید رکھتے ہوئے سود اور دوسرے ممنوعات میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے اس آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ آگ اصل میں کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے اور بالعرض گناہ گار مؤمنوں کے لئے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ (النار کی) صفت (یعنی اعدت للکافرین) تخصیص کے لئے ہے۔ جو آگ کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے وہ الگ ہے اور جو گناہ گار مؤمنوں کے لئے تیار کی گئی ہے وہ الگ ہے۔ اس توضیح پر آیت میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ سود کھانے سے دل میں اتنی قساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اکثر کفر تک لے جاتی ہے اس توضیح کی تائید تفسیر مدارک کی اس صراحت سے ہوتی ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے تھے قرآن میں یہ سب سے زیادہ خوفناک آیت ہے کہ اللہ نے اہل ایمان کو بصورت خلاف ورزی احکام اس آگ سے ڈرایا ہے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے اس کے بعد اللہ نے اپنی رحمت کی امید واری کو اطاعت خدا اور رسول سے وابستہ کیا ہے اس سے آیت سابقہ کے مضمون کی تائید ہوتی ہے (جس میں امید فلاح کو تقویٰ کے ساتھ وابستہ کیا ہے)۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اور رحمت کی امید رکھتے ہوئے اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، بہر حال آگ کی تخلیق اصل میں کافروں کے لئے اور عارضی طور پر اہل ایمان کے لئے قرار دی جائے یا کافروں کے لئے الگ اور گناہ گار مؤمنوں کے لئے الگ تخلیق مانی جائے دونوں صورتوں میں اس آیت کا مضمون مرجئہ کے مسلمہ کے خلاف ہے مرجئہ قائل ہیں کہ اگر ایمان موجود ہو تو پھر کسی گناہ سے کوئی ضرر نہ ہوگا

اکثر مفسرین نے صراحت کی ہے کہ اللہ کی طرف سے لعل اور عسیٰ کا استعمال تحقیق کے لئے ہے۔ (امید کا مفہوم نہیں ہے کیونکہ امید وہ کرتا ہے جس کو کسی بات کا انتظار ہو اور وہ بات حاصل نہیں ہوئی ہو اور اللہ کے لئے کوئی حالت منتظرہ نہیں اس لئے اس کی طرف سے کسی بات کی امید نہیں ہو سکتی) ظاہر یہ ہے کہ لعل اور عسیٰ مفید وجوب نہیں (یعنی رجائیت کا مفہوم بالکل معدوم ہو گیا ہو اور قطعیت کا مکمل مفہوم آیا ہو ایسا نہیں ہے) بلکہ بیم آمیز امید کے لئے ہے۔ بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ ایسے مقامات میں لعل اور عسیٰ آئندہ خبر تک پہنچے کی دلیل ہوتا ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ اور تیزی سے بڑھو اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف۔ حضرت ابن عباسؓ نے الی مغفرۃ کی تشریح میں الی الاسلام اور عکرمہؒ کی روایت میں الی التوبۃ فرمایا (یعنی مغفرت سے مراد ہے اسلام یا توبہ)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ادائے فرض اور حضرت انس بن مالکؓ نے نماز کی تکبیر اولیٰ سے تفسیر فرمائی۔ تمام اقوال کا مآل یہ ہے کہ مغفرت سے مراد ہیں ایسے عقائد، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ جن سے گناہوں کی مغفرت، دوزخ سے رہائی، اور ظل رحمت میں پہنچنے کا استحقاق ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت کردہ حدیث پہلے گزر چکی کہ بادروا بالاعمال ھرما ناغضا الخ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات امور سے پہلے اچھے اعمال کر لو تمہارے سامنے (بس یہی سات امور ہیں) یا تو ایسا افلاس ہے جو ہر چیز کو فراموش کرا دینے والا ہے یا ایسی مالداری ہے جو سرکش بنا دینے والی ہے یا نظام صحت کو بگاڑ دینے والی بیماری ہے یا سٹھیا دینے والا بڑھاپا ہے یا جلد آجانے والی موت ہے یا دجال ہے اور وہ بدترین انتظار کی چیز ہے یا قیامت ہے اور قیامت عظیم ترین مصیبت اور بہت ہی تلخ چیز ہے۔ رواہ الترمذی والحاکم۔

عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یہ جنت کی صفت ہے۔ یعنی یہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت

marfat.com

کی طرح ہے۔ یہ کلام بطور تمثیل ہے، حقیقت مراد نہیں ہے (جنت تو ان سب سے زیادہ وسیع ہے لیکن) عوام کے خیال میں سب سے زیادہ وسعت مکانی آسمان وزمین کی ہے اس لئے آیت میں آسمان وزمین کی وسعت سے جنت کی وسعت کو تشبیہ دے کر بیان کیا جس طرح آیت خالدین فیھا مادامت السمٰوات و الارض میں جنت کے اندر دوام سکونت کو بقاء ارض و سماء کی مدت سے تشبیہ دی ہے (کیونکہ عامی نظر میں آسمان وزمین سے زیادہ کسی چیز کی مدت کا بقاء نہیں ہے پس) انسانوں کے خیال کے مطابق تشبیہ دی۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت انسؓ بن مالک سے دریافت کیا گیا کہ جنت آسمان میں ہے یا زمین میں، فرمایا کس زمین و آسمان میں جنت کی سمائی ہو سکتی ہے، دریافت کیا گیا پھر کہاں ہے، فرمایا ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش کے نیچے۔ قتادہؒ نے کہا کہ وہ (یعنی صحابہؓ) خیال کرتے تھے کہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر اور جہنم ساتوں زمینوں کے نیچے ہے ابوالشیخ نے العظیمہ میں باسناد ابوالزعراء حضرت عبداللہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت سب سے اونچے ساتویں آسمان میں (یعنی ساتویں آسمان کے اوپر) ہے اور دوزخ سب سے نچلی، ساتویں زمین میں (یعنی ساتویں زمین کے نیچے) ہے۔

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۳﴾ جو کامل طور پر تقویٰ رکھنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے کامل متقی وہی ہیں جو اللہ کے سوا کسی چیز سے دل بستگی نہیں رکھتے اور رذائل نفس سے مجتنب رہتے ہیں۔

کیا حقیقت میں جنت کامل تقویٰ والوں کے لئے تیار کی گئی ہے اور غیر متقیوں کو ذیلی طور پر (عفو معاصی کے بعد) ملے گی یا دونوں گروہوں کے لئے الگ الگ مستقل طور پر بنائی گئی ہے یہ دونوں تشریحیں اسی طرح اس آیت کی بھی ہیں جیسے دوزخ کے متعلق دونوں تشریحیں آیت اعدت للکافرین کے ذیل میں بیان کردی گئی ہیں۔

الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وہ مسرت جو مالدار ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ الضراء مال کی کمی (قاموس) یعنی وہ لوگ جو کسی حالت میں راہ خدا میں خرچ کرنے سے باز نہیں رہتے تھوڑا بہت جو کچھ میسر ہو ہر حال میں راہ خدا میں دیتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ من جملہ ان اوصاف کے جو اہل تقویٰ کو مستحق جنت بناتے ہیں سب سے اول سخاوت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سخی اللہ سے قرب رکھنے والا ہے، جنت سے قرب رکھنے والا ہے، لوگوں سے قرب رکھنے والا ہے دوزخ سے دور رہنے والا ہے اور کنجوس اللہ سے دور جنت سے دور لوگوں سے دور، اور دوزخ سے قریب ہے۔ جاہل سخی، عابد بخیل سے اللہ کے نزدیک اچھا ہے۔ رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃ۔ بغوی کی نقل کردہ روایت میں عابد بخیل کی بجائے عالم بخیل کا لفظ آیا ہے۔ مذکورہ حدیث بیہقی نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ سخاوت اللہ کی سب سے بڑی صفت ہے۔ رواہ ابن النجار۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کی شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں جو شخص ان ٹہنیوں میں سے کسی ٹہنی کو پکڑ لے گا وہ ٹہنی اس کو جنت کی طرف کھینچ کر لے جائے گی اور کنجوسی دوزخ کے درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کی شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں جو شخص ان ٹہنیوں میں سے کسی ایک ٹہنی کو پکڑ لے گا وہ ٹہنی اس کو کھینچ کر دوزخ کی طرف لے جائے گی رواہ الدارقطنی والبیہقی عن علیؓ وابن عدی والبیہقی عن ابی ہریرہ وابو نعیم فی الحلیہ عن جابر والخطیب عن ابی سعیدؓ وابن عساکر عن انسؓ والدیلمی فی مسند الفردوس عن معاویہؓ

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم ایک لاکھ سے بازی لے گیا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے فرمایا ایک آدمی جو بڑا مالدار ہو اور اپنے مال میں سے وہ ایک لاکھ درہم خیرات کردے اور ایک اور آدمی ہو جس کے پاس صرف دو درہم ہوں اور وہ دو درہموں میں سے ایک درہم خیرات کردے (پس یہ ایک درہم ایک لاکھ سے بہتر ہوگا) رواہ النسائی وصححہ وابن خزیمۃ وابن حبان والحاکم۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ اور سخت غصہ کو ضبط کرنے والے۔ کظم کا معنی ہے باوجود بھر بھر کر آنے کے اپنے نفس کو روکنا۔ کظمت القربۃ میں نے مشک کو بھر دیا اور اس کے منہ کو باندھ دیا۔ یعنی باوجود قدرت رکھنے کے غصہ نکالنے سے

marfat.com

اپنے آپ کو روکنے والے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے سخت غصہ کو روک لیا، باوجودیکہ اس کو پورا کرنے کی قدرت تھی اللہ اس کے دل کو امن اور ایمان سے بھر دے گا۔ رواہ احمد وعبد الرزاق، وابن ابی الدنیا فی ذم الغضب۔ بغویؒ نے حضرت انسؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے جو شخص سخت غصہ کو پی گیا۔ باوجودیکہ غصہ نکالنے پر اس کو قابو تھا قیامت کے دن سب مخلوق کے سامنے اللہ اس کو بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے لے لے۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جو شخص اپنے غصہ کو روکے گا اللہ اس کی عیب پوشی کرے گا۔

وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ اور لوگوں سے درگزر کرنے والے یعنی باندی، غلاموں کی بے ادبی کو معاف کرنے والے (کلبی) یا حق تلفی کرنے والوں اور برا سلوک کرنے والوں سے درگزر کرنے والے (زید بن اسلم ومقاتل) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایسے لوگ میری امت کے تھوڑے ہیں سوائے اس کے جس کی اللہ نے حفاظت فرمائی۔ رواہ الثعلبی فی تفسیرہ عن مقاتل والبیہقی فی مسند الفردوس من حدیث ابن مالک۔

وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۳۴﴾ المحسنین میں لام جنسی ہے جو مذکورہ بالا متقیوں کو بھی شامل ہے یا عہدی ہے اور مذکورہ اوصاف کے مندرجہ بالا اشخاص ہی مراد ہیں۔ بر تقدیر دوم اسم ظاہر کو بجائے ضمیر کے لانے کی غرض مدح بھی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ کرنا بھی کہ محسنین کے اوصاف وہی ہیں جن کا ذکر کر دیا گیا۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا برائی کرنے والے سے بھلائی کرنا احسان ہے اور بھلائی کا بدلہ بھلائی سے تو تجارت ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا کہ جب حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے احسان کی تشریح پوچھی تو آپؐ نے فرمایا احسان (یعنی خوبی عبادت) یہ ہے کہ تم اپنے رب کی اس طرح عبادت کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں اس صورت میں تو اہل احسان صوفیہ ہیں اور شاید کظم غیظ سے بطور کنایہ فناء نفس مراد ہو کیونکہ غرور، حسد، کینہ، بخل اور اسی طرح کی دوسری رذیل صفات ہی غضب کی بنیاد ہیں اور شاید عفو سے بطور کنایہ فنائے قلب مراد ہو کیونکہ قلب کے فنا کے بعد آدمی کی نظر سے فاعلیت انسان کا پردہ ہٹ جاتا ہے اور اس کو دیکھنے لگتا ہے کہ تمام افعال کی (فاعل حقیقی) نسبت اللہ ہی کی طرف ہے لہٰذا وہ کسی آدمی کو کسی عمل کی وجہ سے قابل مؤاخذہ نہیں سمجھتا ہے اور ماخوذ سمجھتا ہے تو بسلسلۂ حق اللہ جتنا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور شاید تنگی و فراخی دونوں حالتوں میں راہ خدا میں خرچ کرنے سے یہ مراد ہے کہ ان کے دل دنیوی سامان سے وابستہ نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

اصحاب تقویٰ، اہل احسان، عارفوں کے ذکر کے بعد آئندہ آیت میں ان (گناہ گار) مسلمانوں کا ذکر فرمایا جو توبہ کر کے اہل تقویٰ کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً فاحشۃً فحش سے ماخوذ ہے فحش کا اصل معنی ہے بدی اور حد سے باہر نکل جانا یہاں فاحشۃً سے مراد ہے گناہ کبیرہ، کیونکہ مرتکب کبیرہ عصیان اور بدی کی حد سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا فاحشہ زنا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسلمانوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سے تو بنی اسرائیل ہی اللہ کی نظر میں زیادہ عزت والے تھے ان میں سے اگر کوئی (رات کو) گناہ کر لیتا تھا تو صبح کو دروازہ کی چوکھٹ پر اس کا کفارہ لکھا ہوا ملتا تھا کہ اپنی ناک یا کان کاٹ ڈال یا ایسا کر لے۔ حضور ﷺ یہ سن کر خاموش ہوئے تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

عطاء نے کہا اس آیت کا نزول نبہان خرمہ فروش کے حق میں ہوا تھا جس کی کنیت ابو معبد تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ ایک خوبصورت عورت چھوارے خریدنے اس کے پاس آئی نبہان نے کہا یہ چھوارے اچھے نہیں ہیں گھر کے اندر اس سے کھرے

marfat.com

موجود ہیں چنانچہ اس عورت کو لے کر نبہان گھر میں گیااور اندر جاکر اس کو چمٹالیااور بوسہ لیا عورت نے کہااللہ سے ڈر۔ نبہان نے فوراً چھوڑ دیااور اس حرکت پر پشیمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوااور قصہ عرض کر دیااس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مقاتل اور کلبی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کو بھائی بھائی بنادیا تھا۔ ایک انصاری تھادوسر اثقفی۔ ثقفی ایک جہاد پر گیااور انصاری بھائی کو اپنے بال بچوں کا نگراں بنا گیا۔ ایک روز انصاری نے ثقفی کے گھر والوں کے لئے گوشت خریدااور ثقفی کی بیوی نے جب انصاری سے گوشت لینا چاہا تووہ عورت کے پیچھے پیچھے گھر میں آگیااور اس کے ہاتھ کو چوم لیاپھر اس کو پشیمانی ہوئی اور واپس لوٹ آیا مگر خاک سر پر اڑاتا ہوا سرگرداں ہو کر (جنگل میں) نکل گیا۔ ثقفی لوٹ کر آیااور انصاری استقبال کے لئے نہ آیا تواس نے اپنی بیوی سے انصاری کا حال پوچھا عورت نے کہاایسے بھائیوں کی تعداد خدازیادہ نہ کرے اور پوری حالت بیان کر دی۔ ادھر انصاری پہاڑوں میں گھومتا اور توبہ استغفار کرتا پھر رہا تھا۔ ثقفی نے اس کی تلاش کی اور جب مل گیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے کر اس امید پر آیا کہ شاید کوئی سکون اور کشائش کا راستہ آپ کے پاس مل جائے۔ انصاری نے قصہ عرض کر دیااور کہامیں تباہ ہو گیا۔

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا تیرا برا ہو کیا تجھے معلوم نہیں کہ غازی کے سلسلے میں اللہ اتنی حمیت رکھتاہے کہ مقیم کے سلسلے میں نہیں رکھتا۔ اس کے بعد یہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہی جواب دیاجو حضرت ابو بکرؓ نے دیا تھا۔ آخر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر آپ نے بھی شیخین کا ساجواب دیااس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یا انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو یعنی صغیرہ گناہ کر کے یازنا سے کم درجہ کا گناہ کر کے جیسے بوسہ یامعانقہ اور ہاتھ لگانا۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیاہے کہ فاحشہ کاارتکاب کیا ہو قولاً اور اپنی جانوں پر ظلم کیاہو عملاً۔ بعض اہل علم نے کہاکہ فاحشہ وہ ہے جو متعدی گناہ ہواور ظلم نفس سے وہ گناہ مراد ہے جو متعدی نہ ہو، یہ ہی زیادہ ظاہر ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ جنت ان لوگوں کیلئے بھی تیار کی گئی ہے جو کسی فاحشہ کاارتکاب یااپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں پھر،

ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ـــــ اللہ کے عذاب کی یادان کو ہو جاتی ہے تو گناہ کے پیچھے وہ اپنے گناہوں کی معافی اللہ سے چاہتے ہیں۔ ذکر اللہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کو یاد کرتے ہیں اور ان کو یہ احساس ہو جاتاہے کہ اللہ ان سے پوچھے گا۔ لہٰذا پشیمان ہو کر وہ توبہ واستغفار کرتے ہیں۔ مقاتل بن حبان کے نزدیک ذکر اللہ سے مراد ہے اللہ کی زبانی یاد۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ ذکر اللہ سے صلوۃ استغفار مراد ہو کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیاہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے کہ جو مؤمن بندہ یاجو شخص کوئی گناہ کرتاہے پھر اچھی طرح وضو کر کے کھڑا ہو کر نماز پڑھتاہے پھر اللہ سے معافی کا طلب گار ہو تاہے تو اللہ اس کا گناہ ضرور معاف فرمادیتاہے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ وابن حبان۔ ترمذی نے اتنالفظ اور روایت کیاہے پھر حضور ﷺ نے پڑھا وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ، الآیۃ۔

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ استثناء مفرغ اور استفہام بمعنی نفی ہے۔ یعنی اللہ کے علاوہ کوئی بھی گناہ معاف نہیں کر سکتا، کیونکہ جو لوگ (دنیایا آخرت میں) دوسروں کو معاف کرنے والے ہیں وہ صرف اپنے حقوق سے درگزر کرنے والے ہیں، گناہ معاف نہیں کر سکتے۔ گناہ کو معاف کرنا تو اللہ کا حق ہے (معصیت اللہ کے حق کے خلاف کرنے کا نام ہے)

یایوں کہاجائے کہ معاف کرنے والے اشخاص جو لوگوں کو معاف کرتے ہیں وہ اس امید پر معاف کرتے ہیں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمادے گا گویاان کی معافی تجارتی ہوتی ہے اور گناہوں کو معاف کرنے والا وہی ہو تاہے جو بلا لالچ اور بغیر غرض کے معاف فرمادے اور ایسا سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ یہ جملہ معترضہ درمیان میں وسعت رحمت اور عموم مغفرت کو ظاہر کرنے کے لئے لایا گیاہے پھر اس میں استغفار کی ترغیب اور توبہ قبول ہونے کا وعدہ بھی ہے۔

marfat.com

وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوْا یعنی اور اپنے گناہوں پر جم کر نہ بیٹھ رہے۔ صحاح میں ہے کہ (اس جگہ) اصرار کا معنی ہے گناہ میں گھس کر بیٹھ رہنا اور شدت کرنا اور ترک گناہ سے باز رہنا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار کے لئے جس طرح گناہ پر ندامت ضروری ہے اسی طرح ترک گناہ کا عزم بھی لازم ہے خواہ آئندہ یہ عزم ترک ٹوٹ جائے اور گناہ صادر ہو جائے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے استغفار کیا اس نے اصرار نہیں کیا خواہ دن میں لوٹ لوٹ کر ستر بار (گناہ) کیا ہو۔ رواہ ابوداؤد والترمذی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا گناہ پر قائم رہتے ہوئے استغفار کرنے والا ایسا ہے جیسے کوئی اپنے رب سے استہزاء کر رہا ہو۔ رواہ البیہقی وابن عساکر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

مسئلہ :۔ صغیرہ گناہوں پر جم جانا کبیرہ ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ کبیرہ نہیں رہتا۔ اور اصرار کے ساتھ کوئی صغیرہ صغیرہ نہیں رہتا (بلکہ کبیرہ ہو جاتا ہے) رواہ الدیلمی فی مسند الفردوس۔

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی معصیت پر اصرار کو اس لئے انہوں نے ترک کر دیا کہ وہ معصیت کو معصیت جانتے ہیں اور معصیت پر اصرار سے ان کو اللہ کا خوف روکتا ہے۔ ترک گناہ کی وجہ ان کی اپنی سستی یا طبعی نفرت یا بندوں کا خوف یا موقع کا میسر نہ آنا نہیں کیونکہ اگر اطاعت کی نیت سے کسی ممنوع کام سے نفس کو روکا جائے تو اس پر ثواب مرتب ہوتا ہے (بغیر نیت اطاعت کے) محض ترک ممنوع موجب ثواب نہیں ہاں اس صورت میں اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مطلقاً ترک معصیت کی وجہ سے اس عذاب سے بچاؤ ہو جائے گا جو معصیت کے لئے مقرر ہے۔ گناہ پر قابو نہ پانا خود ایک قسم کا عذاب سے بچاؤ ہے۔

ضحاکؒ نے کہا ھم یعلمون سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کو مغفرت معاصی کا مالک جانتے ہیں۔ حسین بن فضلؒ نے کہا کہ وہ اس امر کو جانتے ہیں کہ ان کا ایک رب ہے جو گناہ معاف فرماتا ہے۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ گناہ کتنے ہی ہوں اللہ کے عفو سے بڑے نہیں۔ بعض دوسرے علماء نے یہ مطلب کہا ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ اللہ سے معافی کے طلب گار ہوں گے تو اللہ معاف فرما دے گا۔

شیخین نے صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی بندہ نے ایک گناہ کیا پھر عرض کیا میرے رب مجھ سے ایک گناہ ہو گیا ہے تو اسے معاف کر دے، اللہ نے فرمایا میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ کو معاف بھی کرتا ہے اور پکڑ بھی کرتا ہے، میں نے اپنے بندہ کو معاف کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد اسی شخص نے پھر ایک گناہ کیا اور عرض کیا پروردگار مجھ سے ایک اور گناہ ہو گیا تو معاف کر دے، اللہ نے فرمایا میرا بندہ واقف ہے کہ اس کا ایک مالک ہے جو گناہ بخش دیتا ہے اور (کبھی) گرفت بھی کر لیتا ہے، میں نے اپنے بندہ کا گناہ بخش دیا۔ کچھ وقت کے بعد بندہ نے ایک اور گناہ کیا اور عرض کیا پروردگار تو معاف فرما دے۔ اللہ نے فرمایا میرا بندہ سمجھتا ہے کہ اس کا ایک مالک ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گرفت بھی کر لیتا ہے، میں نے اپنے بندہ کو بخشا اب وہ جو کچھ چاہے کرے۔

طبرانی اور حاکم نے بسند صحیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ فرمان رسول اللہ ﷺ نقل کیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا جو شخص مجھے مغفرت معاصی پر قادر جانتا ہے میں اس کو بخش دیتا ہوں اور (اس کے گناہوں کی کثرت کی) پرواہ بھی نہیں کرتا جب کہ اس نے کسی چیز کو میرا ساجھی نہ ٹھہرایا ہو۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ان ہی سب تقویٰ رکھنے والوں اور توبہ کرنے والوں کی یا انہی توبہ کرنے والوں کی جزا مغفرت الٰہی ہے اور ایسے باغ ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں ان جنتوں میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

marfat.com

جنّت کی تنوین بتا رہی ہے کہ وہ اہل تقویٰ جو اوصاف مذکورہ کے حامل ہیں ان کی جزا سے ان مغفور گناہ گاروں کا ثواب کم درجہ کا ہوگا اسی لئے اہل تقویٰ کی جزا والی آیت کا تتمہ واللہ یحب المحسنین کے ساتھ کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل احسان محبت خداوندی کے مستحق ہیں اور مغفور اہل معصیت کے ثواب کا بیان ذیل کی آیت پر ختم کیا۔

وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ۝۱۳۶　　بے شک اپنی کوتاہی کی تلافی کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو فوت شدہ چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن فوت شدہ کی تلافی کر لینے والے میں اور صاحب احسان میں بڑا فرق ہے۔ اول اجیر ہے دوسرا محبوب اور اجیر محبوب کی طرح نہیں ہو سکتا۔ شاید لفظ جزاء کو اس جگہ لفظ اجر سے بدل کر ذکر کرنے میں یہی نکتہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہے۔ رواہ البیہقی وابن عساکر عن عباسؓ والقشیری فی الرسالۃ وابن النجار عن علی کرم اللہ وجہہ۔

فائدہ :- بے شک جنت اھل تقویٰ اور (گناہ گار) اہل توبہ کے لئے تیار کی گئی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گناہوں پر جم جانے والے (اہل ایمان) جنت میں نہیں جائیں گے جیسے دوزخ اگرچہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے لیکن دوسروں کا دوزخ میں نہ ہونا اس سے لازم نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مومن مرتکب کبیرہ کو اللہ گناہوں سے پاک کر کے جنت میں داخل فرما دے خواہ تطہیر کہ یہ صورت ہو کہ دوزخ کا عذاب دے کر پاک صاف کر دے جیسے بھٹی میں پڑ کر معدنی چیزوں کا میل صاف ہو جاتا ہے یا بغیر عذاب دیئے اللہ بخش دے اور اس طرح توبہ نہ کرنے والا گناہ گار بھی توبہ کرنے والے کہ طرح ہو جائے۔

ثابت بنانی نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ جب آیت والذین اذا فعلوا فاحشۃ ، نازل ہوئی تو ابلیس رویا۔

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۱۳۷

(سُنَنٌ ، سُنَّۃٌ کی جمع ہے اور) سنت کا معنی ہے اچھائی یا برائی کا وہ راستہ جس کہ پیروی کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اچھا طریقہ نکالا اس کو خود اس طریقہ پر چلنے کا ثواب بھی ملے گا اور ان لوگوں کو بھی جو اس طریقہ کے موافق عمل کریں گے مگر (ان عمل کرنے والوں) کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس نے برا طریقہ ایجاد کیا اس پر خود اپنا بھی گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا بھی جو اس طریقہ پر عامل ہوں گے مگر ان عمل کرنے والوں کے بار میں سے کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔

سُنَنٌ سے مضاف محذوف ماننا بھی جائز ہے یعنی سنن سے مراد اہل سنن ہیں

بعض علماء نے سنن کا ترجمہ کیا ہے اقوام سنۃ کا معنی ہے قوم ایک شاعر کا قول ہے لوگوں نے ان کے قضل جیسا کوئی قضل اور ان کی طرح کی کوئی قوم گذشتہ اقوام (سالف السنن) میں نہیں دیکھی۔ اول صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ تم سے پہلے خیر و شر کے بہت طریقوں والے گزر گئے تم ملک میں چل پھر کر دیکھ لو کہ تکذیب خیر کا نتیجہ کیسا ہوا اور انجام کار تکذیب کرنے والوں کی تباہی کس طرح ہوئی۔

مجاہدؒ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تم سے پہلے گذشتہ کافر قوموں کے لئے میرے طریقے یہ رہے ہیں کہ میں ان کو اس حد تک مہلت اور ڈھیل دیتا رہا کہ وہ اپنی مقررہ حدود زندگی تک پہنچ جائیں آخر جب ان کی تباہی کا وقت آگیا تو میں نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اور اپنے پیغمبروں کو اور ان کے متبعین کو فتح عنایت کی چل پھر کر دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔ کلبیؒ نے کہا ہر قوم کے لئے اللہ کہ طرف سے ایک طریقہ اور راستہ رہا ہے جن لوگوں نے اس کو مانا اور اس پر چلے اللہ ان سے راضی ہوا جس نے نہ مانا اور اس طریقے پر نہ چلا اللہ نے اس کو تباہ کر دیا۔ تکذیب کرنے والوں کا انجام دیکھ لو۔

هٰذَا　　یہ قرآن کی طرف اشارہ ہے یا آیت قد خلت کی طرف یا فانظروا کے مفہوم کی طرف۔

بَيَانٌ لِّلنَّاسِ　　کھلا ہوا بیان ہے عام طور پر لوگوں کے لئے۔

وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۝۱۳۸　　اور خصوصیت کے ساتھ متقیوں کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے کیونکہ متقی

marfat.com

ہی اس سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں۔

وَلَا تَهِنُوْا اور احد کے دن تمہارے جو آدمی قتل یا زخمی ہو گئے ان کی وجہ سے تم دشمنوں کے مقابلہ سے کمزور اور بے ہمت نہ ہو۔

وَلَا تَحْزَنُوْا اور مقتولوں کے قتل کا رنج نہ کرو۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ حالانکہ تم ہی ان سے اونچے ہو کیونکہ اس مصیبت کے اجر و ثواب کے تم امیدوار ہو اور کافروں کو آئندہ ثواب کی امید نہیں۔ تمہارے مقتولین جنت میں ہیں اور ان کے مقتول دوزخ میں۔ احد کی لڑائی میں پانچ مہاجر حضرت حمزہؓ اور حضرت مصعبؓ وغیرہ اور ستر انصاری شہید ہوئے تھے۔ یہی مفہوم ہے ایک اور آیت کا جس میں فرمایا ہے۔ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ۔ کلبیؒ کا بیان ہے کہ جنگ احد میں مسلمانوں کو زخمی ہونے کی تکلیف ہوئی لیکن باوجود زخمی ہو جانے کے رسول اللہ ﷺ نے ان کو دشمن کے تعاقب کا حکم دیا۔ یہ حکم مسلمانوں پر بار گزرا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یا یہ مطلب ہے کہ آخر میں تم ہی اونچے رہو گے اللہ کی طرف سے تم کو ہی فتح و ظفر حاصل ہو گی۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ گھاٹی میں صحابہؓ کو شکست ہو گئی، خالد بن ولید مشرکوں کا سوار دستہ ساتھ لے کر پہاڑ پر چڑھ کر اوپر سے حملہ کرنا چاہتے تھے رسول اللہ ﷺ نے دعا کی اے اللہ یہ ہمارے اوپر نہ آئے ہم کو تیرے سوا کسی اور کی قوت حاصل نہیں۔ مسلمان تیر اندازوں کی ایک جماعت پہاڑ پر چڑھ گئی تھی اور انہوں نے رات وہیں گزاری تھی اس گروہ نے مشرک رجمنٹ کو تیروں پر رکھ لیا اور بھگا دیا آیت وانتم الاعلون کا یہی مطلب ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ یعنی اگر تم ایماندار ہو اور تمہارا ایمان پکا ہے تو کمزور اور رنجیدہ نہ ہو کیونکہ ثواب کی امید رکھنا اور اللہ پر بھروسہ کر کے قوی دل ہونا ایمان کا تقاضا ہے یا یہ مطلب ہے کہ اگر تمہارا ایمان درست ہو گا تو تم ہی آخر میں اونچے رہو گے کیونکہ اہل ایمان کی مدد کرنے کا ہمارا ذمہ ہے۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ قَرْحٌ اور قُرْحٌ ہتھیار وغیرہ کی چوٹ جس سے بدن زخمی ہو جائے (قاموس) فراء نے کہا قَرْحٌ بفتح قاف زخم اور بضم قاف زخم کی تکلیف یعنی احد کے دن تم کو زخم لگے اور تکلیف ہوئی تو بدر کے دن کفار قریش کو بھی ایسے ہی زخم لگے اور تکلیف ہوئی تھی مگر وہ دوبارہ تم سے لڑنے کے لئے آنے سے بے ہمت نہ ہوئے پس تم تو اس کے زیادہ مستحق ہو۔ مسلمان جب دکھ اور رنج کے ساتھ احد سے لوٹے تو مسلمانوں کو تسلی دینے اور کافروں کے مقابلہ میں حوصلہ بڑھانے کے لئے اس آیت کا نزول ہوا۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ اور ایام فتح کو ہم لوگوں میں باری باری سے گھماتے پھیرتے رہتے ہیں یعنی ہماری عادت یونہی جاری ہے کبھی اس گروہ کی فتح ہوتی ہے اور کبھی اس کی۔ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پچاس پیادوں کا جبیر بن مطعمؓ کو سردار بنا کر (گھاٹی کے دہانہ پر جمے رہنے کا) حکم دے دیا تھا اور فرمایا تھا اگر تم دیکھو کہ پرندے ہم کو جھپٹ کر لئے جا رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹنا جب تک میرا پیام تمہارے پاس نہ پہنچ جائے اور اگر دیکھو کہ ہم نے دشمن کو بھگا دیا اور روند دیا تب بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا تاوقتیکہ میں تمہارے پاس پیام نہ بھیجوں۔

راوی کا بیان ہے کہ (شروع میں) رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھگا دیا میں نے خود دیکھا کہ عورتیں ٹانگوں سے کپڑے اٹھائے تیزی سے بھاگی جا رہی ہیں اور ان کی پازیبیں اور پنڈلیاں کھل گئیں ہیں۔ یہ دیکھ کر عبد اللہ بن جبیر کے ساتھی بولے لوگو! تمہارے ساتھی غالب آ گئے تم کیا انتظار کر رہے ہو، لوٹو، لوٹو۔ عبد اللہ بن جبیرؓ نے کہا کیا تم رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھول گئے۔ کہنے لگے خدا کی قسم ہم تو ضرور ان کے پاس پہنچ کر مال غنیمت حاصل کریں گے۔ چنانچہ جونہی یہ لوگ (بھاگتے ہوئے) کافروں پر پہنچے ان کے رخ پھر گئے اور یہ شکست کھا کر بھاگے (اور رسول اللہ ﷺ پچھلی قطار میں کھڑے تم کو پلٹ کر آنے کے لئے پکار

marfat.com

رہے تھے) یہ ہی مفہوم ہے والرسول یدعوکم فی اخراکم۔ کا حضور ﷺ کے ساتھ بارہ آدمیوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ کافروں نے ہمارے ستر آدمی قتل کئے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ نے بدر کے دن ستر مشرکوں کو قتل اور ستر کو قید کیا تھا۔ ابوسفیان نے تین بار (پکار کر) کہا کیا قوم میں محمد ﷺ ہیں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو جواب دینے سے منع فرمادیا۔ ابوسفیان نے تین بار کہا کیا ابو قحافہ کا بیٹا موجود ہے۔ پھر تین بار کہا کیا ابن خطاب ہے (جب کوئی جواب نہ ملا تو) لوٹ کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے سب مارے گئے یہ بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے قابو ہو گئے اور بولے۔

" اے دشمن خدا، خدا کی قسم تو جھوٹا ہے جن کے تو نے نام لئے وہ سب زندہ ہیں اور تجھے دکھ دینے والا کانٹا موجود ہے۔"

ابوسفیان بولا آج کا دن، بدر کے دن کا بدلہ ہو گیا۔ لڑائی چرخ کے ڈولوں کی طرح نیچی اونچی ہوتی رہتی ہے مقتولین میں تم کو کچھ لوگ مثلہ (ناک، کان، پیشاب گاہ کٹے ہوئے) ملیں گے لیکن میں نے اس کا حکم نہیں دیا تاہم مجھے یہ برا بھی نہیں معلوم ہوا۔ اس کے بعد جنگی لے میں گانے لگا ہبل کی جے۔ ہبل کی جے (ہبل ایک بت کا نام تھا قریش اس کی پوجا کرتے تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اس کو کیوں جواب نہیں دیتے لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہم کیا کہیں فرمایا کہو اللہ سب سے بالا و برتر ہے۔ ابوسفیان نے کہا ہماری عُزّیٰ ہے تمہاری کوئی عُزّیٰ نہیں (عُزّیٰ بھی ایک مورتی تھی جس کی شکل عورت کی تھی گویا ہبل دیوتا تھا اور عُزّیٰ دیوی)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جواب نہیں دیتے صحابہؓ نے عرض کیا ہم کیا کہیں فرمایا کہو اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے کہا تم خوشی کے ساتھ یہاں آؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عمرؓ جاؤ دیکھو اس کا کیا کام ہے حسب الحکم حضرت عمر گئے۔ ابوسفیان نے کہا عمرؓ میں تم کو اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا ہم نے محمد ﷺ کو قتل کر دیا حضرت عمرؓ نے فرمایا بخدا نہیں وہ تو اس وقت بھی تیرا کلام سن رہے ہیں۔ ابوسفیان نے کہا تم میری نظر میں ابن قمیہ سے زیادہ سچے ہو اور سچی قسم والے ہو۔ ابن قمیہ نے قریش سے جا کر کہہ دیا تھا کہ میں نے محمد ﷺ کو قتل کر دیا۔ پھر ابوسفیان نے کہا سال ختم ہونے پر آئندہ بدر صغریٰ پر تم سے مقابلہ ہو گا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہہ دو اچھا ہمارا تمہارا وعدہ ہو گیا پھر ابوسفیان اپنے ساتھیوں کو لے کر لوٹ گیا اور روانہ ہو گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی اسی مضمون کی حدیث منقول ہے اس حدیث میں آیا ہے کہ ابوسفیان نے کہا دن کے بدلے دن اور ایام کی گردش رہتی ہے اور لڑائی چرخ کے ڈولوں کی طرح اوپر نیچے ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا دونوں برابر نہیں ہیں ہمارے مقتول جنت میں ہیں اور تمہارے مقتول دوزخ میں۔

زجاج نے کہا مسلمانوں کا غلبہ تو ہوتا ہی ہے کیونکہ اللہ نے فرمادیا ہے وان جندنا لھم الغالبون احد کے دن جو مسلمانوں پر کافروں کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان نے فرمان رسول اللہ ﷺ کے خلاف کیا تھا۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس جملہ کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہے یعنی ہم ایام فتح و شکست کا باری باری تبادلہ مختلف حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت کرتے ہیں اور اس لئے بھی کہ جو مومن صبر اور ثبات ایمانی کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک ممتاز ہو چکے ہوں ان کو ہم جان لیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معطوف علیہ محذوف نہ ہو بلکہ اس جملہ پر عطف ہو جو آیت و تلک الایام نداولھا بین الناس سے سمجھ میں آرہا ہے اس صورت میں کلام اس طرح ہو گا کہ ایام فتح و شکست کا تبادلہ ہم اس لئے کرتے ہیں کہ یہی ہمارا معمول ہے پیدا کرنا اور فنا کرنا عادت خداوندی ہے اور اس لئے بھی کہ اللہ جان لے۔

اس جیسی (مثبت) یا اس کیخلاف (منفی) آیات میں اللہ کے علم کو ثابت کرنا یا نفی کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ برہانی طور پر معلوم خارجی کا ثبوت یا اس کی نفی مقصود ہوتی ہے کیونکہ علم خداوندی معلوم خارجی کے لئے لازم ہے اور نفی علم نفی معلوم کے لئے۔ دوسری طرف نفی معلوم نفی علم کو مستلزم ہے ورنہ علم علم نہیں رہے گا بلکہ جہالت ہو جائے گا۔ پس آیت میں ملزوم

marfat.com

بول کر لازم مراد لیا گیا ہے یعنی تبادل لیام کی علت یہ ہے کہ لوگوں کی نظر میں اہل ایمان کا دوسروں سے امتیاز ہو جائے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ لیعلم سے مراد ہے ایسا علم جس سے جزا و سزا وابستہ ہے اور یہ علم بندہ کے اعمال کے ظہور کے بعد ہی ہوتا ہے (رہا وہ علم خداوندی جو تخلیق کائنات سے پہلے سے ہے اس پر سزا و جزا مرتب نہیں)۔

وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ ۗ اور تم میں سے بعض لوگوں کو انعام شہادت سے سرفراز کر دے اس سے مراد شہداء احد ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن دوسری اقوام پر صبر اور ثبات کی شہادت دینے کی جن مسلمانوں میں اہلیت ہو ان کو چن لے۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ (احد کے دن) جب دیر تک عورتوں کو جنگ کی خبر نہ ملی تو دریافت حال کے لئے وہ نکلیں، سامنے سے دو شخص ایک اونٹ پر سوار آتے دکھائی دیئے ایک عورت نے پوچھا رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے سواروں نے کہا زندہ ہیں عورت بولی اب مجھے پروا نہیں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنا دے پس اسی عورت کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ﴿۱۴۰﴾ اور اللہ ظالموں یعنی ان کافروں منافقوں کو ناپسند کرتا ہے جن سے ایمان پر ثابت قدم رہنے کا ظہور نہیں ہوا (اور وہ منہ موڑ کر چلے آئے) اس آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ حقیقت میں تو کافروں کی مدد نہیں کرتا لیکن کبھی کبھی جو اُن کو غلبہ عنایت کر دیتا ہے تو یہ ان کے لئے ڈھیل اور مسلمانوں کا امتحان ہوتا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا اور اس لئے بھی کہ اہل ایمان کو گناہوں سے پاک صاف کر دے۔

وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ﴿۱۴۱﴾ اور کافروں کو آہستہ آہستہ مٹا دے، محق کا معنی ہے تھوڑا تھوڑا کر کے کسی چیز کو توڑ دیا، مطلب یہ ہے کہ اگر کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کے امتیاز کرنے، شہید بنانے اور گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے اور مسلمانوں کا غلبہ ہوتا ہے تو کافروں کو گھٹانے اور ان کے نشان مٹانے کے لئے ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ استفہام انکاری اور ام منقطعہ ہے۔

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جٰهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ ﴿۱۴۲﴾ حالانکہ تمہارے مجاہدوں کا اللہ نے (لوگوں کی نظر میں) امتیاز ابھی تک نہیں کیا اور نہ صبر کرنے والوں کا امتیاز کیا۔ یعنی ابھی تک نہ تم نے جہاد کیا (کہ لوگوں کو تمہارا مجاہد ہونا معلوم ہو گیا ہو اور نہ تم نے مصائب جنگ پر صبر کیا کہ تمہارا صابر ہونا معلوم ہو جاتا) دوسرے یعلم سے پہلے اَن مضمر ہے اور واؤ جمع کے لئے ہے جیسے لاتاکل السمک و تشرب اللبن یعنی مچھلی اور دودھ کو ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسکو حالت جزم میں قرار دے کر مفتوح پڑھا جائے کیونکہ دو ساکن جمع ہیں اور ساکن سے پہلے حرف (لام) پر فتح ہے۔

ابن ابی حاتم نے بطریق عوفی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ کچھ صحابی کہا کرتے تھے کاش ہم بھی بدر والوں کی طرح دشمنوں کو مارتے یا یوں کہتے کہ کاش بدر کے دن کی طرح ہم کو بھی کسی دن مشرکوں سے لڑنے کا موقع ملتا اور اس روز ہمارا اچھا امتحان ہوتا یا ہم شہادت پا کر جنت میں شہیدوں کی زندگی اور رزق کے طلب گار ہوتے لیکن (آزمائش کے وقت) سوائے ان کے جن کو اللہ نے چاہا کوئی (میدان جنگ میں) نہ ٹھہر سکا۔ اس پر اللہ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ اور تم بلاشبہ اللہ کی راہ میں مرنے کی تمنا کیا کرتے تھے یا موت سے مراد ہے لڑائی کیونکہ لڑائی موت کا ایک سبب ہے یعنی تم لڑائی کی تمنا کیا کرتے تھے۔

مِن قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ موت یا لڑائی کو دیکھنے اور اس کی شدت کا معائنہ کرنے سے پہلے۔

marfat.com

فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ اب تم نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا یعنی تمہارے بھائی بند تمہارے سامنے مارے گئے اور تم نے خود دیکھ لیا۔ آیت میں زجر ہے اس امر پر کہ پہلے لڑائی کی تمنا کیا کرتے تھے پھر لڑائی ہوئی تو بزدل بن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ یا زجر ہے تمناء شہادت پر کیونکہ شہادت مسلمین کی تمنا کا معنی ہے غلبۂ کفار کی تمنا۔

ابن ابی حاتم نے ربیع کا قول نقل کیا ہے کہ احد کے دن جب مسلمانوں پر زخمی ہونے کی جو مصیبت پڑنی تھی پڑی تو انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو پکارا۔ لوگوں نے کہا وہ تو شہید ہو گئے کچھ لوگ کہنے لگے اگر نبی ہوتے تو مارے نہ جاتے دوسرے لوگوں نے کہا جس چیز کے لئے تمہارے نبی نے قتال کیا تھا اسی کے لئے تم بھی اس وقت تک لڑو کہ اللہ تم کو فتح عطا فرمادے یا تم بھی رسول اللہ ﷺ سے جاملو۔ ابن المنذر نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ احد کے دن ہم رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر پراگندہ ہو گئے۔ میں پہاڑ پر چڑھ گیا اور ایک یہودی کو کہتے سنا، محمد مارے گئے میں نے کہا جو کوئی بھی کہے گا محمد مارے گئے میں اس کی گردن ماردوں گا اتنے میں میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اور دوسرے لوگ واپس آرہے ہیں۔

بیہقی نے دلائل میں ابوالبیح کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک مہاجر کسی انصاری کی طرف سے گزرا انصاری خون میں تڑپ رہا تھا۔ مہاجر نے انصاری سے (یا انصاری نے مہاجر سے) کہا کیا تم کو معلوم ہے کہ محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے اس نے جواب دیا اگر محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے تو وہ (پیام خداوندی) پہنچا گئے اب تم اپنے دین کی طرف سے لڑو۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ [1]

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ اور محمد ﷺ نہیں ہیں مگر رسول یعنی خدا نہیں ہیں جن کا مرنا اور فنا ہونا ناممکن ہو اور نہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔

محمد ﷺ کا مادہ حمد ہے اور مصدر (تحمید) قاموس میں ہے حمد کا معنی ہے شکر، رضا، جزا، ادائے حق اور تحمید کا معنی ہے پیہم حمد کرنا پس محمد ﷺ کا معنی ہوا وہ شخص جس کی پیہم حمد کی جائے۔ میں کہتا ہوں محمد ﷺ وہ شخص ہے جس کی پیہم غیر متناہی حمد کی جائے۔

بغویؒ نے لکھا ہے محمد ﷺ وہ شخص ہے جو تمام محامد کا جامع ہو کیونکہ حمد کا مستحق صرف وہی شخص ہوتا ہے جو کامل الصفات ہو اور تحمید کا درجہ حمد سے زیادہ ہے (باب تفعیل میں باب مجرد سے زیادہ قوت اور کثرت ہونی چاہئے کثرت لفظ کثرت معنی پر دلالت کرتی ہے) پس مستحق تحمید وہ ہی شخص ہوگا جو انتہائی کمالات کو محیط ہو۔ حضرت حسانؓ بن ثابت کا قول ہے۔

کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ نے اپنے بندہ کو اپنی برہان (یعنی قرآن) دے کر بھیجا اور اللہ سب سے بزرگ و برتر ہے۔ اور

---

[1] بخاری نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو بکر (کاشانۂ نبوت سے برآمد ہوئے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا عمرؓ بیٹھ جاؤ پھر فرمایا، امابعد جو محمد ﷺ کی پوجا کرتا تھا تو (اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ) محمد ﷺ کی وفات ہوگئی اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بلاشبہ اللہ زندہ ہے اللہ نے خود فرمایا ہے وما محمد الا رسول ...... الشاکرین تک، راوی کا بیان ہے خدا کی قسم ایسا معلوم ہوا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سے پہلے لوگوں کو علم ہی نہ تھا کہ اللہ نے یہ آیت بھی نازل فرمائی ہے اور ابو بکر سے سن کر سب نے اس کی تلاش شروع کر دی میں نے کوئی شخص نہیں پایا کہ وہ پڑھنے نہ لگا ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ اور عروہؓ وغیرہ راوی ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا اگر لوگ اونٹ کے پاؤں میں باندھنے کی رسی بھی مجھے دینے سے انکار کریں گے جو (زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ) وہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔

---

[1] حضرت علیؓ نے الشاکرین کی تفسیر میں فرمایا دین پر جمے رہنے والے یعنی ابو بکرؓ اور ان کے ساتھی۔ حضرت علیؓ فرماتے تھے ابو بکرؓ شاکرین کے سردار تھے، مؤلف

marfat.com

اس کی عزت افزائی کے لئے اپنے نام سے مشتق کر کے (اس کا نام رکھا) پس مالک عرش محمود ہے اور یہ محمد ﷺ ہیں (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم)۔

قَدْ خَلَتْ یعنی گزر گئے اور مر گئے۔

مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ان سے پہلے پیغمبر پس یقیناوہ بھی مریں گے۔

اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ پس کیا اگر وہ (اپنی موت) مر جائیں گے یا مارے جائیں گے تو تم ایڑیوں کے بل اپنے پہلے مذہب یعنی کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ استفہام انکاری ہے یعنی جب سابق انبیاء مر گئے تو ان کا دین نہیں مر گیا پس محمد بھی ایک رسول ہیں اگر مر جائیں گے تو ان کا دین نہیں مرے گا لہٰذا تم کو لوٹ کر مرتد نہ ہونا چاہئے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاء سببیت کے لئے ہے اور ہمزہ انکاری ہے یعنی رسول اللہ کی وفات تمہارے ارتداد کا سبب نہ ہونا چاہئے۔

وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ اور جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جائے گا یعنی دین سے پھر جائے گا۔

فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ اور جو لوگ اسلام پر قائم رہ کر نعمت اسلام کے شکر گزار رہیں گے اللہ ضرور ان کو جزا دے گا۔[1]

قصہ احد

اہل مغازی نے بیان کیا ہے کہ احد کی گھاٹی میں رسول اللہ ﷺ سات سو صحابہؓ کی جمعیت کے ساتھ اترے اور عبد اللہ بن جبیرؓ کو (پچاس) پیادوں کا سردار بنا کر گھاٹی پر مقرر فرما دیا جیسا کہ حضرت براء بن عازبؓ کی سابق روایت میں گذر چکا ہے اب قریش آئے میمنہ پر خالد بن ولید اور میسرہ پر عکرمہ بن ابی جہل کمانڈر تھے عورتیں ان کے ساتھ تھیں جو دف بجا بجا کر شعر گا رہی تھیں گھمسان کا رن پڑا رسول اللہ ﷺ نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا یہ تلوار لے کر کون اس کا حق ادا کرے گا کہ دشمن کو مارے اور خوب خون بہائے۔ ابو دجانہ سماک بن حرسہ انصاری نے وہ تلوار لے لی اور لے کر سرخ عمامہ باندھ کر اٹھلا کر چلنے لگے، حضور ﷺ نے فرمایا یہ چال اللہ کو ناپسند ضرور ہے مگر اس موقع پر درست ہے مشرکوں کے سرداروں کو ابو دجانہ نے اس تلوار سے قتل کیا، رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے مشرکوں پر حملہ کیا اور ان کو مار بھگایا اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح عنایت کی اور اپنا وعدہ پورا کیا مسلمانوں نے کافروں کو تلوار سے کاٹ کر رکھ دیا یا میدان جنگ سے ان کو بھگا دیا اور خوب قتل کیا۔

مشرکوں کے سواروں نے مسلمانوں پر تین بار حملہ کیا لیکن ہر بار ان پر تیروں کی بوچھاڑ کی گئی اور ان کو پسپا ہونا پڑا، تیر انداز مسلمانوں کی پشت کی حفاظت کر رہے تھے اور مشرکوں کے سواروں کو تیروں کا نشانہ بنا رہے تھے ہر تیر یا گھوڑے کے لگتا تھا یا آدمی کے، آخر کار سب پشت دے کر بھاگے۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب نے مشرکوں کے علمبردار طلحہ بن طلحہ کو قتل کر دیا اور مسلمان تکبیر کہہ کر کافروں کو خوب ہی مارنے لگے نتیجہ میں کافروں کی صفیں پراگندہ ہو گئیں، حضرت زبیر بن عوام نے فرمایا میں نے دیکھا کہ ہندہ اور اس کے ساتھ والیاں بھاگتی ہوئی تیزی کے ساتھ پہاڑ پر جا رہی تھیں۔ ان کی پازیبیں (یعنی پنڈلیاں) کھلی ہوئی تھیں ان کی گرفتاری سے کوئی مانع نہ تھا جب حضرت عبد اللہ بن جبیر کے ساتھ والے تیر اندازوں نے دیکھا کہ دشمنوں پرے چھٹ گئے تو لوٹنے کے لئے یہ بھی میدان جنگ کی طرف چل دیئے جیسا کہ حضرت براء کی سابق حدیث سے واضح ہو چکا ہے۔

---

[1] حضرت علیؓ نے الشاکرین کی تفسیر میں فرمایا دین پر جمے رہنے والے یعنی ابو بکرؓ اور ان کے ساتھی۔ حضرت علیؓ فرماتے تھے ابو بکرؓ شاکرین کے سردار تھے، مؤلف

marfat.com

تیر اندازوں کے کمانڈر یعنی حضرت عبداللہ کے ساتھ دس سے کم آدمی رہ گئے خالد بن ولید نے جب پہاڑ کی طرف نگاہ کی اور پہاڑ کے محافظ کم نظر آئے اور مسلمانوں کو لوٹ میں مشغول پایا اور ان کی پشت خالی دکھائی دی تو کافروں کے سواروں کو چیخ کر آواز دی اور مسلمانوں کے پیچھے آکر حملہ کیا، عکرمہؓ بھی خالدؓ کے پیچھے سے آگئے آخر مسلمانوں کو کافروں نے بھگا دیا اور قتل کیا، عبداللہ بن جبیر اپنی جگہ جمے رہے یہاں تک کہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے، کافروں نے آپ کے کپڑے اتار لئے اور بہت بری طرح سے مثلہ کیا جب مسلمان لوٹ کھسوٹ میں مشغول تھے اسی وقت خالد بن ولیدؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں پر پشت کی طرف سے حملہ کیا، مار بھگایا اور بے تامل قتل کیا، مسلمان ہر طرف سے پراگندہ ہو گئے جو مال لوٹا تھا اس کو بھی چھوڑ گئے جن لوگوں کو قید کیا تھا وہ بھی چھوڑنا پڑے شروع دن میں ہوا پر واتھی پھر (پچھلے دن میں) پچھمی ہو گئی، بھاگتے لوگوں کے تین حصے ہو گئے، ایک حصہ زخمی ہوا، ایک حصہ قتل ہوا اور ایک حصہ بھاگ گیا۔

بیہقی نے حضرت مقدادؓ کی روایت سے لکھا ہے حضرت مقدادؓ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے رسول اللہ کو حق کے ساتھ بھیجا آپ اپنی جگہ سے بالشت بھر نہیں ہٹے، دشمن کے سامنے مقابلہ پر رہے آپ کی طرف صحابہ کی ایک جماعت (حفاظت کے لئے) لوٹتی رہی اور کبھی اس میں شگاف پڑتے رہے، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ برابر کھڑے کمان سے تیر پھینک رہے تھے اور پتھر مار رہے تھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (اس روز) پندرہ آدمی بھی جمے رہے آٹھ مہاجر، ابو بکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم اور سات انصار حباب بن منذر، ابودجانہ، عاصم بن ثابت، حارث بن صمہ، سہل بن حنیف، محمد بن مسلمہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم۔ بعض روایات میں سعد بن معاذ کی جگہ سعد بن عبادہ کا ذکر ہے۔

عبدالرزاق نے مرسلاً زہری کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر تلوار کے ستر وار ہوئے اور کوئی ضرب کارگر نہ ہوئی اللہ نے محفوظ رکھا، عتبہ بن وقاص نے حضور پر چار پتھر مارے جن سے آپ کا اگلا دلیاں نچلا دانت ٹوٹ گیا اور زیریں لب زخمی ہو گیا، حافظ نے کہا اس سے مراد وہ دانت ہے جو کاٹنے والے اور چبھنے والے دانتوں کے درمیان تھا، حاطب بن بلتعہ کا بیان ہے میں نے عتبہ کو قتل کر دیا اور اس کا سر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لا کر حاضر کر دیا، آپ ﷺ کو اس سے خوشی ہوئی اور میرے لئے دعا فرمائی۔ رواہ الحاکم۔

عبداللہ بن شہاب زہری نے حضور ﷺ کے سر کو زخمی کر دیا، اس واقعہ کے بعد یہ شخص مسلمان ہو گیا تھا۔ چہرۂ مبارک پر خون بہنے لگا یہاں تک کہ ریش اقدس خون سے تر ہو گئی، عبداللہ بن قمیہ کے پتھر سے رخسار مبارک زخمی ہو گیا اور خود کی دو کڑیاں رخسار میں گھس گئیں عبداللہ بن قمیہ حضور ﷺ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آگے آیا لیکن مصعب بن عمیرؓ نے مدافعت کی۔ آپ رسول اللہ ﷺ کے علمبردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور یہ سمجھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا، لوٹ کر گیا تو اپنے لوگوں سے کہا میں نے محمد ﷺ کو قتل کر دیا اس پر ایک چیخنے والے نے ندا کی محمد مارے گئے، کہا جاتا ہے کہ یہ پکارنے والا ابلیس تھا، طبرانی نے حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن قمیہ سے فرمایا تھا، اقماک اللہ اللہ تجھے بیخ بن سے ہلاک کر دے۔

اس بد دعا ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ کسی پہاڑی بکرے کو اللہ نے اس پر مسلط کر دیا اور بکرے نے سینگ مارتے مارتے اس کو پارہ پارہ کر دیا، رسول اللہ ﷺ اٹھ کر ایک چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے لیکن تہ برتہ دو زرہیں پہنے تھے اس لئے خود چڑھ نہ سکے، حضرت طلحہ نے نیچے بیٹھ کر اپنے اوپر رسول اللہ ﷺ کو اٹھا لیا اور اس طرح آپ چٹان پر پہنچ گئے، حضور ﷺ نے فرمایا طلحہؓ نے واجب کر دیا (یعنی اپنے لئے جنت کو) ہندہ اور اس کے ساتھ دوسری عورتیں شہیدوں کے ناک کان کاٹنے لگیں یہاں تک کہ ہندہ نے ان کے ہار بنا کر وحشی کو دیئے اور حضرت حمزہؓ کا جگر نکال کر چبایا مگر نگل نہ سکی تھوک دیا۔

ادھر رسول اللہ ﷺ لوگوں کو پکار رہے تھے اللہ کے بندو (اوپر آؤ) آواز سن کر حضور (ﷺ) کے پاس تیس آدمی جمع

marfat.com

ہو گئے جن میں سے ہر ایک کہہ رہا تھا میرا چہرہ (زخمی ہو) آپ کا چہرہ نہ ہو، میری جان (کام آئے) آپ کی جان ایسی نہ ہو (یعنی آپ محفوظ رہیں میں قربان ہو جاؤں) آپ سالم رہیں۔ غرض سب آپ کے محافظ ہو گئے اور مشرکوں کو آپ کی طرف سے ہٹا دیا، سعدؓ بن ابی وقاص نے اتنے تیر مارے کہ آپ کی چھ کمانیں ٹوٹ گئیں رسول اللہ ﷺ نے ان کے سامنے اپنی ترکش سے تیر بکھیر دیئے اور فرمایا تیر مار تجھ پر میرے ماں باپ قربان، رواہ البخاری۔

ابو طلحہؓ بھی بڑے تیر انداز تھے اور کمان کھینچنے میں بڑے طاقتور تھے، آپ نے بھی اس روز دو یا تین کمانیں توڑی تھیں جو شخص بھی ان کی طرف سے تیر دان لے کر گزرتا آپ فرماتے تھے ابو طلحہؓ کے لئے تیر بکھیر دو، جب ابو طلحہؓ تیر پھینکتے تو رسول اللہ ﷺ بھی گردن اٹھا کر تیر لگنے کی جگہ کو دیکھتے۔

رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کا ہاتھ اتنا چٹیلا ہوا کہ آخر خشک ہو گیا۔ ابو داؤد طیالیسی اور ابن حبانؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا وہ دن سارا کا سارا طلحہؓ کے لئے ہوا (یعنی حضرت طلحہؓ کی حفاظت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ محفوظ رہے) محمد بن عمرؒ کا بیان ہے کہ اس روز حضرت طلحہؓ کے سر میں ایسی چوٹ لگی کہ خون نچڑ گیا اور آپ پر غشی طاری ہو گئی، حضرت ابو بکرؓ نے آپ کے چہرہ پر پانی چھڑکا جس سے آپ کو ہوش آ گیا، ہوش آتے ہی فرمایا رسول اللہ ﷺ کا کیا ہوا، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا خیریت سے ہیں انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، حضرت طلحہؓ نے کہا اللہ کا شکر ہے اس کے بعد ہر مصیبت حقیر ہے اس روز حضرت قتادہؓ بن نعمانؓ کی آنکھ میں چوٹ لگی تھی، جس کی وجہ سے آنکھ رخسار پر آ پڑی تھی رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ جگہ پر لوٹا دی اور آنکھ اچھی بچھی ہو گئی۔

رسول اللہ ﷺ احد سے واپس آرہے تھے کہ (راستہ میں) ابی بن خلف جمحی نے آلیا اور کہنے لگا اگر اب (میرے ہاتھ سے) تم بچ نکلے تو مجھے خدا نہ بچائے (یعنی اس وقت میں ضرور قتل کردوں گا) لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم میں سے کوئی آدمی اس پر نہ جھک پڑے (یعنی قتل نہ کردے) فرمایا رہنے دو، جب وہ قریب آ گیا، اس سے پہلے ابی رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے وقت کہا کرتا تھا میرے پاس خاکستری رنگ کی ایک گھوڑی ہے جس کو روزانہ ایک فرق جوار دے کر میں پالتا ہوں اسی پر سوار ہو کر تم کو قتل کروں گا۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہو گا بلکہ میں تجھے قتل کروں گا، تو رسول اللہ ﷺ نے حارث بن صمہ سے چھوٹا نیزہ لے کر ابی کے سامنے اس کی گردن پر مارا جس کی وجہ سے کچھ خراش پڑ گئی، ابی گھوڑے سے لڑھک کر نیچے گرا اور بیل کی طرح دھاڑنے لگا اور کہنے لگا محمد ﷺ نے مجھے مار ڈالا لوگوں نے کہا کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے، بولا کیوں نہیں ہے اگر یہ نیزہ کا زخم (تمام قبائل) ربیعہ و مضر کے لگتا تو ان کو بھی ہلاک کر دیتا کیا انہوں نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا، اس قول کے بعد تو اگر یہ مجھ پر تھوک دیتے تب بھی قتل کر دیتے غرض زیادہ مدت نہیں گزری کہ مقام سرف میں پہنچ کر وہ مر گیا۔

بخاری نے صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے جس کو نبی نے قتل کیا اس پر اللہ کا سخت غضب ہوا اور جس نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو خون آلود کر دیا اس پر بھی اللہ کا غضب سخت ہوا۔

اہل مغازی نے لکھا ہے کہ لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ محمد قتل کر دیئے گئے یہ سن کر بعض مسلمان کہنے لگے، کاش کوئی قاصد عبد اللہ بن ابی کے پاس چلا جاتا تاکہ ابن ابی ابو سفیان سے ہمارے لئے امان لے لیتا کچھ صحابی پست ہمت ہو کر بیٹھ رہے بعض اہل نفاق کہنے لگے اگر محمد مارے گئے تو تم اپنے پہلے مذہب میں شامل ہو جاؤ، حضرت انس بن مالکؓ کے چچا حضرت انسؓ بن نضر بولے قوم والو اگر محمد مارے بھی گئے ہوں تو محمد کا رب تو قتل نہیں ہو گیا تم رسول اللہ ﷺ کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے جس کام کے لئے رسول اللہ لڑے تم بھی اسی کے لئے لڑو اور جس غرض کے لئے وہ مرے تم بھی اسی کے لئے مر جاؤ پھر بولے اے اللہ یہ لوگ یعنی مسلمان جو کچھ کہہ رہے ہیں میں تیرے سامنے اس کی معذرت کرتا ہوں اور یہ لوگ یعنی منافق جو بات پیش کر رہے ہیں، میں اس سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں یہ کہہ کر تلوار لے کر حضرت انسؓ نے حملہ کیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

marfat.com

پھر رسول اللہ ﷺ پتھر کی چٹان کے پاس جاکر لوگوں کو پکارنے لگے سب سے پہلے حضرت کعب بن مالکؓ نے آپ کو پہچانا، خود کے نیچے حضور ﷺ کی آنکھیں چمکتی دیکھ کر شناخت کی، حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو پہچان کر اونچی آواز سے پکار کر کہا اے گروہ اہل اسلام تم کو بشارت ہو یہ رسول اللہ ﷺ موجود ہیں حضور ﷺ نے میری طرف اشارہ کیا کہ خاموش رہو پھر صحابہؓ کی ایک جماعت حضور ﷺ کے پاس آکر جمع ہوگئی آپ نے بھاگنے پر ان کو ملامت کی صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے نبی ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہم کو اطلاع ملی کہ آپ شہید کردیئے گئے اس لئے ہمارے دل خوف زدہ ہوگئے اور ہم پشت پھیر کر بھاگ نکلے (یعنی آپ کو چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے بلکہ جب آپ کی شہادت کی خبر سن لی تو لڑائی کو بیکار سمجھ کر ڈر کر بھاگ نکلے تھے) اس پر اللہ نے نازل فرمایا، وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی کوئی شخص بغیر اللہ کی مشیت اور حکم کے نہیں مر سکتا یا یہ مطلب کہ جب تک ملک الموت کو کسی کی جان قبض کرنے کی اجازت نہ مل جائے وہ نہیں مر سکتا۔

كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ موجلاً، کتاباً کی صفت ہے اور کتاباً مصدر ہے فعل محذوف ہے یعنی اللہ نے موت کی موقت تحریر لکھ دی ہے لکھے ہوئے وقت سے آگے پیچھے موت نہیں آسکتی اس آیت میں مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب اور جنگ کی جرات دلائی گئی ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ یعنی جو شخص اپنے عمل کا دنیوی بدلہ چاہتا ہے ہم دنیا میں ہی اس کو اپنی مشیت کے مطابق جو کچھ ہم نے اس کے لئے مقدر کردیا ہے دے دیتے ہیں اس آیت میں ان لوگوں پر تعریض ہے جو مال غنیمت کی طرف راغب ہوکر جہاد سے غافل ہوگئے تھے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ اور جو اپنے عمل سے آخرت کے ثواب کا خواستگار ہوگا ہم آخرت کا ثواب اس کو دیں گے۔

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اور شکر گزاروں کو یعنی ثابت قدم رہنے والوں کو ضرور جزا دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اس فقرہ سے یہ مراد ہے کہ جو شخص اپنے عمل سے صرف شکر گزار ہونے کا طلب گار ہو، نہ اس کے پیش نظر ثواب دنیا ہو، نہ ثواب آخرت تو اللہ اس کو ایسی عظیم الشان جزا دے گا جس کا اندازہ کوئی عقل نہیں کرسکتی، نہ کسی فہم کی رسائی وہاں تک ہوسکتی ہے اور یہ جزا صرف ذات باری ہے [1]، جزاء کو مبہم رکھنا (اور تعیین کے ساتھ کسی خاص قسم کے ثواب کا ذکر نہ کرنا) بتا رہا ہے کہ جزاء غیر معروف ہے انسان کی عقل اس کو نہیں جان سکتی۔

قاموس میں ہے شکر کا معنی ہے احسان کو پہچاننا اور اس کو پھیلانا۔ حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کی نیت طلب آخرت کی ہو اللہ اس کے دل میں دنیا کی طرف سے بے نیازی پیدا کردیتا ہے اور اس کی پریشانی کو جمع کردیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہوکر آتی ہے اور جس کی نیت طلب دنیا کی ہو اللہ محتاجی اس کی آنکھوں کے سامنے کردیتا ہے اس کی جمعیت (خاطر) کو پراگندہ بنا دیتا ہے اور دنیا میں سے اس کو اتنا ہی ملتا ہے جو اللہ نے اس کے لئے لکھ دیا ہے، رواہ البغوی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال صرف نیتوں سے وابستہ ہیں اور آدمی کے لئے صرف اس کی نیت کا پھل ہے پس جس کی ہجرت اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے اس کی ہجرت اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے لئے ہوگی اور جس کی ہجرت مال حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہوگی اس کی ہجرت اسی غرض

---

[1] مولف قدس سرہٗ نے اس جگہ حاشیہ میں فارسی کے یہ دو شعر کہے ہیں، ہر کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند، فرزند و عیال وخانماں راچہ کند، دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی، دیوانہ تو دو جہاں راچہ کند۔

یعنی جس نے تجھے پہچان لیا وہ اپنی جان اہل و عیال اور خاندان کا کیا کرے گا تو اپنا دیوانہ بنانے کے بعد اس کو دونوں جہان عطا فرماتا ہے تیرا دیوانہ دونوں جہان کا کیا کرے گا۔

marfat.com

کے لئے ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہوگی، متفق علیہ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ اور بہت سے پیغمبروں کے ساتھ مل کر بکثرت آدمیوں نے (کافروں سے) جنگ کی۔ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور قتادہؒ نے ربیون کا ترجمہ کیا ہے کثیر جتھے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس کا ترجمہ کیا ہے ہزارہا کلبی نے کہا ایک ربیہ دس ہزار۔ ضحاک نے کہا ایک ربیہ ایک ہزار۔ حسن بصریؒ نے ربیون کا معنی کیا، فقہاء، علماء، بعض نے متبعین ترجمہ کیا ہے اس صورت میں ربانیون سے مراد ہوں گے حکام اور ربیون سے رعایا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ربی، رب کی طرف منسوب ہے یعنی خدا پرست۔

فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی جو لوگ قتل سے بچ رہے تھے وہ اللہ کی راہ میں زخمی ہونے، شدائد سامنے آنے اور ساتھیوں کے مارے جانے کی وجہ سے پست ہمت نہ ہوئے۔

وَمَا ضَعُفُوْا اور نہ جہاد کرنے سے کمزور پڑ گئے۔

وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ اور نہ دشمن کے مطیع ہوئے، نہ ذلیل و عاجز بنے بلکہ وہ اللہ کے حکم پیغمبر کی اطاعت اور دشمن سے جہاد کرنے پر جمے رہے۔

استکان کا مادہ سکن اور (مجرد کا مصدر) سکون ہے عاجز فرمانبردار بھی اپنے مقابل کے سامنے بے حرکت ہو جاتا ہے وہ اس کے ساتھ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس جملہ میں تعریض ہے ان لوگوں پر جو ابو سفیان سے امن طلب کرنے کے خواستگار تھے یا لڑائی سے پست ہمت ہو بیٹھے تھے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اس لئے ان کی مدد اور عزت افزائی کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا قَوْلَهُمْ، کَانَ کی خبر ہے اور اَنْ قَالُوْا، کَانَ کا اسم ہے کیونکہ اسم کو خبر سے اعرف ہونا چاہئے اور قالوا چونکہ فاعلی نسبت اور زمانہ پر دلالت کر رہا ہے اس لئے قولہم سے (جو صرف نسبت پر دلالت کرتا ہے) معرفہ ہونے میں زیادہ ہے، ذنوب سے مراد ہیں صغیرہ گناہ۔

وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا اسراف حد عبدیت سے تجاوز۔ امر، حال، معاملہ۔ اسراف سے مراد ہیں کبیرہ گناہ، یعنی شدائد و مصائب میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ان کا قول (بجائے شکوہ و شکایت اور آہ و بکا و بے صبری کے) صرف یہ تھا کہ اے رب ہمارے چھوٹے بڑے گناہ معاف کر دے۔

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا اور ہمارے پاؤں اپنے سیدھے راستہ پر اور دشمن کے مقابل جہاد میں جمائے رکھ۔

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ **اور کافر قوم پر ہم کو فتح عطا فرما۔ اس قول کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ نے اہل ایمان سے نصرت و غلبہ کا وعدہ فرمالیا ہے،** چنانچہ ارشاد فرمایا ہے، حقا علینا نصر المومنین، دوسری جگہ فرمایا ہے ان جندنا لھم الغالبون اور اہل ایمان پر جو دکھ اور مصیبت آتی ہے وہ گناہوں کے اور حدود عبودیت سے تجاوز کرنے کے سبب سے آتی ہے، اللہ نے فرمایا ہے ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر، پس مصیبت کے وقت مومن کا فرض ہے کہ اپنے گناہ کا اقرار کرے تاکہ ندامت حاصل ہو اور معافی کا طلب گار ہو پھر اللہ سے امداد دینے اور ثابت قدم رکھنے کی دعا کرے، وما النصر الا من عند اللہ العزیز الحکیم گناہوں سے پاک ہونے اور استغفار کرنے کے بعد دعا باب قبول تک جلد پہنچتی ہے۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ اس قول کی برکت سے اللہ نے ان کو عطا فرمایا۔

ثَوَابَ الدُّنْيَا دنیاوی ثواب یعنی فتح، مال غنیمت، ملک اور نیک نامی (وغیرہ)۔

وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ اور ثواب آخرت کا۔ حسن یعنی جنت، مرتبہ قرب اور اپنی خوشنودی اور رب کی ادنیٰ خوشنودی ہی سب سے بڑھ کر ہے۔ حسن ثواب معمولی ثواب سے افضل ہے اور واجب القصد بھی، اس لئے ثواب آخرت

marfat.com

کے ساتھ حسن کا ذکر کیا۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٤٨﴾ اور اللہ اہل احسان کو پسند فرماتا ہے یحبہم نہیں فرمایا بلکہ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا تاکہ اس امر کی صراحت ہو جائے کہ مذکورہ مقولہ کے قائل ہی اہل احسان ہیں کیونکہ احسان کا معنی ہے اللہ کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے عبادت کرنا یعنی ہر طرح کی غفلت دور کر کے دل کو حاضر رکھنا پس احسان کا تقاضا ہے کہ مقولہ مذکورہ زبان سے کہا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ راحت درنج اور دکھ سکھ سب اللہ کی طرف سے آتا ہے مگر اللہ کریم ہے اس لئے انسان جب تک اپنی اطاعت میں کوئی قصور نہ کرے اللہ کی طرف سے نعمت نہیں بدلی جاتی جب اطاعت میں کمی آتی ہے تو اللہ اپنی نعمت بدل دیتا ہے اور نعمت کی جگہ کچھ تکلیف بھیج دیتا ہے تاکہ انسان بیدار ہو کر معافی کا طلب گار ہو اور دنیوی سزا بھگت کر پاک صاف ہو جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اے ایمان والو اگر تم (ان) کافروں کا کہا مانو گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ الذین کفروا سے منافق مراد ہیں اور اطاعت سے مراد ہے منافقوں کا یہ مشورہ ماننا کہ اپنے سابق مذہب میں لوٹ جاؤ۔ اگر محمدؐ نبی ہوتے تو مارے نہ جاتے۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر تم ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کی اطاعت کرو گے انکے سامنے عاجزی کرو گے اور ان سے امن کے خواہشمند ہو گے تو

يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تو وہ تم کو اسلام سے سابق شرک کی طرف ایڑیوں کے بل پلٹا دیں گے۔

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾ نتیجہ میں تم لوٹ کر گھاٹ میں پڑ جاؤ گے دنیا اور دین دونوں تباہ ہو جائیں گے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ (یہ تمہارے دوست نہیں ہیں) بلکہ اللہ تمہارا دوست مددگار اور مسلمان ہونے کی حالت میں محافظ ہے لہٰذا اس کے سوا تم کافروں سے (اندرونی) دوستی نہ کرو۔

وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿١٥٠﴾ اور وہی بہترین مددگار ہے پس اس کے ہوتے ہوئے تم کو کسی دوسرے کی دوستی اور امداد کی ضرورت نہیں، روایت میں آیا ہے کہ ۱۶/ شوال کو جب ابو سفیان اور مشرک مکہ کو جانے لگے اور روانہ ہو گئے تو کچھ راستہ طے کرنے کے بعد ان کو پشیمانی ہوئی اور کہنے لگے ہم نے برا کیا اول تو ہم نے ان کو قتل کیا پھر جب چند بھاگے ہوئے لوگوں کے سوا ہمارے مقابلہ میں کوئی نہ رہا تو ہم ان کو چھوڑ آئے اس لئے مناسب ہے کہ ابھی لوٹ چلو اور ان کی جڑ ہی اکھاڑ دو۔ کافروں نے یہ ارادہ کیا ہی تھا کہ اللہ نے ان کے دلوں کے اندر مسلمانوں کا رعب ڈال دیا اور وہ اپنے ارادہ سے باز آگئے اور اللہ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا

یعنی ہم ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے اس وجہ سے کہ وہ ایسی چیزوں کو اللہ کا ساجھی بناتے ہیں جن کی شرکت کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب مکہ واپس جاتے وقت مشرکوں نے مدینہ کو لوٹنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا گیا۔ اگر اس آیت کا نزول واقعہ کے بعد مانا جائے تو پھر سنلقی میں سین صرف تاکید کے لئے ہوگی، استقبالیہ نہ ہوگی، بلکہ گذشتہ واقعہ کی نقل ہوگی۔

سلطان کا اصل لغوی معنی ہے قوت۔ اس جگہ مراد ہے، برہان۔ مطلب یہ کہ ایسے معبودوں کو انہوں نے اللہ کا ساجھی بنا رکھا ہے جن کے شریک ہونے کی نہ کوئی دلیل ہے نہ برہان بلکہ عقلی نقلی تمام دلیلیں اور حجتیں اللہ کی توحید پر دلالت کر رہی ہیں۔

وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥١﴾ اور ان کا یعنی مشرکوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ ظالموں کی بری قرار گاہ ہے، ضمیر کی جگہ الظلمین کہنے کی وجہ سے ناراضگی کی درشتی کا اظہار بھی ہو گیا اور دوزخی ہونے کی علت کی بھی

marfat.com

صراحت ہو گئی۔ محمد بن کعب کا بیان ہے کہ جب احد کی افتاد کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ مدینہ کو لوٹے تو بعض صحابیوںؓ نے کہا کہ اللہ نے ہم سے وعدہ تو فتح یاب بنانے کا کیا تھا پھر یہ کیا ہوا اس پر اللہ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ یعنی اللہ نے جو تم کو فتحیاب بنانے کا وعدہ بشرط صبر و تقویٰ کیا تھا وہ اس نے پورا کیا آغاز جنگ میں تم کو فتحیاب کیا۔

اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ جب اللہ کے حکم و فیصلہ کے مطابق تم کافروں کو بے دریغ تلوار سے کاٹ رہے تھے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا حَسٌّ کا معنی ہے قتل کر کے بیخ و بن سے اکھاڑ دیا، یہاں قتل عام مراد ہے، یہ لفظ اَحَسَّهٗ سے نکلا ہے، اَحَسَّ کا معنی ہے حس کو باطل کر دیا، (پس تحسونهم کا مطلب یہ ہوا کہ تم قتل عام کر کے ان کے حواس بگاڑ رہے تھے ان کے اوسان بجا نہیں رہے تھے۔

حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ لیکن جب تم بزدل اور کمزور پڑ گئے۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب تمہاری رائے کمزور پڑ گئی اور تم مال غنیمت پر جھک پڑے (گویا کمزوری سے مراد ہے رائے کی کمزوری) کیونکہ مال کی حرص ضعف عقل کی علامت ہے

وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ اور قیام و عدم قیام کے معاملہ میں تم باہم جھگڑنے لگے۔ عبد اللہ بن جبیرؓ کے ساتھیوں نے جب مسلمانوں کا غلبہ اور مشرکوں کی شکست دیکھی تو بعض نے کہا اب یہاں ٹھہرے رہنے کی کیا ضرورت، عبد اللہؓ نے کہا کیا تم رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھول گئے انہوں نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ کی یہ مراد نہیں تھی (کہ کافروں کو شکست ہو جائے تب بھی تم یہاں سے نہ ہٹنا) ہم تو ضرور جا کر لوٹ کا مال حاصل کرینگے، عبد اللہ اور ان کے ہم خیال لوگوں نے کہا، ہم حکم رسول سے بالکل تجاوز نہیں کرینگے۔

وَعَصَيْتُمْ اور تم نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف کیا، بعض علماء نے کہا کہ حتیٰ اذا فشلتم اور تنازعتم کے درمیان واو زائد ہے (اور تنازعتم جزا ہے یعنی جب تم بزدل ہو گئے تو باہم نزاع کرنے لگے) مگر یہ بات غلط ہے ورنہ لازم آئے گا کہ نزاع باہمی سے پہلے بزدلی پیدا ہو گئی تھی (جزا سے پہلے شرط کا تحقق ضروری ہے) حالانکہ بزدلی باہمی نزاع کے بعد پیدا ہوئی تھی شروع میں تو وہ جرات مند تھے کافروں کی شکست دیکھ کر لوٹنے کے لئے میدان جنگ کی طرف گئے تھے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اگر واو کو زائد ہی مانا جائے تو کہنا پڑے گا کہ کلام کی ترتیب میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے اصل کلام یوں تھا حتیٰ اذا تنازعتم فی الامر وعصیتم فشلتم (یہ خواہ مخواہ کلام کی توڑ مروڑ ہے لہٰذا) صحیح یہی ہے کہ واو زائد نہیں ہے اور جزا محذوف ہے یعنی جب تم ہار بیٹھے اور قیام و عدم قیام کے متعلق باہم جھگڑنے لگے اور نافرمانی کی تو اللہ نے اپنی مدد روک لی اور تم پر مصیبت ڈال دی، چونکہ واؤ مطلق عطف کیلئے ہے ترتیب واقعہ کو ظاہر کرنے کیلئے نہیں ہے اس لئے نزاع اور نافرمانی پر بزدلی کی تقدیم لازم نہیں آتی۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ اس فقرہ کا تعلق فشلتم سے ہے یعنی تم بزدل ہو گئے اس کے بعد کہ تم کو اللہ نے تمہاری محبوب چیز یعنی فتح اور مال غنیمت کی صورت دکھا دی تھی۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا تم میں سے کچھ تو دنیا کے طالب تھے جنھوں نے مرکز کو چھوڑ دیا اور لوٹنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ اور کچھ آخرت کے طلبگار تھے جو عبد اللہ بن جبیرؓ کے ساتھ جمے رہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے کسی کو میں نے دنیا کا طلبگار نہیں پایا یہاں تک کہ احد کا دن آیا (اور) یہ آیت نازل ہوئی آپ کے کلام کا مقصد یہ ہے کہ صحابہؓ میں سے کسی نے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے مال غنیمت کی طلب کی تھی دنیا کی طلب نہیں کی اور انہی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ پھر تم کو تمہاری نافرمانی کی نحوست کی وجہ سے کافروں کی طرف سے پھیر دیا، پانسہ پلٹ

marfat.com

گیا، کافر تم پر غالب آگئے اور تم کو شکست ہو گئی۔

لِيَبْتَلِيَكُمْ تمہاری جانچ کرنے کیلئے۔ تاکہ اہل نفاق سے مؤمن ممتاز ہو جائیں۔ یا اس فقرہ کا یہ مطلب ہے کہ تمہاری بیجا حرکت کی وجہ سے اللہ نے تم پر مصیبت ڈالنی چاہی۔ اس مطلب پر یہ مسئلہ نکلے گا کہ بعض لوگوں کی نافرمانی کی وجہ سے کبھی عام لوگوں پر مصیبت پڑ جاتی ہے اور یہ مصیبت نافرمان کیلئے سزا اور فرماں بردار کیلئے زیادتی اجر کا باعث ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ اور اللہ نے تم سے در گزر فرمایا کہ معصیت اور حکم رسول کی مخالفت کے بعد بھی اللہ کی یہ مہربانی ہوئی کہ کفار تمہارا استیصال نہ کر سکے یا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ کی نافرمانی پر جب تم نادم ہوئے تو اللہ نے تم کو معاف کر دیا۔

وَاللهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۲﴾ اور اللہ مومنوں پر بڑا مہربان ہے کہ اگر اس کی مشیت ہوتی ہے تو اپنی مہربانی سے معاف کر دیتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ ہر حال میں اللہ مہربانی فرماتا ہے معصیت کے بعد مؤمنوں پر مصیبت ڈالنا بھی اس کی مہربانی ہے کہ گناہوں سے پاکیزگی اور صفائی ہو جاتی ہے۔ بغوی نے اپنی اسناد سے بیان کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے فرمایا کیا میں تم کو قرآن کی وہ بزرگ ترین آیت بتاؤں جو رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمائی تھی وہ آیت یہ ہے وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَ يَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے علیؓ میں تم سے اس آیت کی تفسیر بیان کرتا ہوں تم پر جو بیماری، عذاب یا دنیوی مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے اعمال کی وجہ سے آتی ہے (ایسے لوگوں کو) آخرت میں دوبار عذاب دینا اللہ کی شان سے بعید ہے اور دنیا میں اگر سزا دینے سے اللہ در گزر فرمادے تو (آخرت میں) دوبارہ پکڑنے کا اس کو اختیار ہے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ جب تم تیزی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اس فقرہ کا تعلق صرفکم سے ہے یا یبتلیکم سے یا عفا عنکم سے یا اذکر محذوف سے۔ ابو عبد الرحمٰن سُلمی حسن اور قتادہ کی قرأت میں تصعدون بفتح تاء مجرد سے آیا ہے لیکن اجماعی قرأت بضم تاء باب افعال سے ہے۔ مفضل نے کہا کہ صعد (صعود سے) اور اصعد (اصعاد سے) اور صعد (تصعید سے) سب ہم معنی ہیں۔ ابو حاتم نے کہا باب افعال سے اصعاد کا معنی ہے اپنے منہ کے سامنے ہموار میدان میں جانا اور صعود کا معنی ہے پہاڑ پر چڑھنا۔ مبرد نے کہا اصعد یعنی دور چلا گیا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ واقعہ دونوں طرح ہوا تھا کوئی ہموار میدان میں دور نکل گیا تھا اور کوئی پہاڑ پر چڑھ گیا تھا۔

وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ اور کسی کی طرف گردن موڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے یعنی شدت دہشت کی وجہ سے کوئی کسی کی طرف منہ موڑ کر نہیں دیکھتا تھا۔

وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ اور پچھلی جماعت میں (کھڑے) رسول تم کو پکار رہے تھے اور فرما رہے تھے اللہ کے بندو میری طرف آؤ میں اللہ کا رسول ہوں جو میری طرف مڑ کر آئے گا اس کے لئے جنت ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔

فَأَثَابَكُمْ بس اللہ نے تمہاری بزدلی اور نافرمانی کے بدلہ میں دیا۔ اثاب، ثواب سے ماخوذ ہے۔ بجائے عقاب کے ثواب کا لفظ (صرف استہزاء کے طور پر) ذکر کیا یعنی تم ثواب کی امید لگائے ہوئے تھے مگر جو حرکت تم نے کی اس کے عوض اللہ نے تم کو سزا دی (اور یہی سزا تمہارے لئے ثواب کی جگہ تھی) جیسے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (میں عذاب کی وعید کو بشارت سے تعبیر کیا ہے)۔

غَمًّا بِغَمٍّ غم بالائے غم یعنی متواتر غم قتل، زخم، شکست، مشرکوں کی فتح اور شہادت رسول کی جھوٹی خبر کی اشاعت۔ بعض علماء نے کہا پہلے غم سے مراد ہے مال غنیمت ہاتھ سے جاتے رہنے کا غم اور دوسرے غم سے مراد ہے قتل اور زخمی ہونا اور شکست کھانا یا پہلے غم سے قتل اور زخمی ہونے کی مصیبت اور دوسرے غم سے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر مراد ہے جس نے پہلے غم کو بھلا دیا تھا یا پہلے غم سے مراد ہے گھاٹی سے خالد بن ولید کا سواروں کا دستہ لے کر بر آمد ہونا اور دوسرے

marfat.com

غم سے مراد ہے ابوسفیان کا سامنے سے نمودار ہو جانا۔ قصہ یہ ہوا کہ اس روز رسول اللہ ﷺ لوگوں کو پکارتے پکارتے اس جگہ پہنچے جہاں چٹان والے (مسلمان) جمع تھے انہوں نے جب آپ کو دیکھا تو (نہ پہچاننے کی وجہ سے) ایک شخص نے کمان میں تیر جوڑ کر آپ ﷺ کو مارنا چاہا آپ ﷺ نے فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں رسول اللہ ﷺ کو پا کر وہ لوگ بہت خوش ہو گئے اور محافظین کو پا کر رسول اللہ ﷺ کو بھی خوشی ہوئی پھر یہ لوگ فتح شدہ مال غنیمت کا اور اپنے ساتھیوں کی شہادت کا ذکر کرنے لگے اتنے میں ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ساتھ سامنے سے آ کر گھاٹی کے دہانہ پر کھڑا ہو گیا۔ مسلمان ان کو دیکھ کر فکر میں پڑ گئے اور ان کو خیال ہوا کہ یہ لوگ ہم پر ٹوٹ پڑیں گے اور قتل کریں گے اس خیال نے آتے ہی ان کے پہلے خیال کو بھلا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ لوگ ہمارے اوپر نہیں آسکیں گے۔ اے اللہ اگر یہ گروہ مارا گیا تو زمین پر تیری پرستش کرنے والا کوئی نہیں رہے گا پھر اپنے صحابہؓ کو آواز دی صحابہؓ نے کافروں کو پتھر مار مار کر نیچے اتار دیا۔ میں کہتا ہوں آیت سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب اسی مقام پر نازل ہوئی۔ اسی جگہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرے غم سے مراد مدینہ کے لوٹے جانے کے خیال سے پیدا ہونے والا غم مراد ہو کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ جب ابوسفیان ساتھیوں سمیت کوچ کر کے مکہ کو چل دیا تو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ مدینہ پہنچ کر بچوں اور عورتوں کو ہلاک نہ کر دیں اس لئے آپ نے حضرت علیؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو دیکھنے کے لئے بھیجا اور فرمایا اگر وہ لوگ اونٹوں پر سوار ہوں اور اونٹوں کو ساتھ لے جا رہے ہوں تو یقیناً وہ مدینہ کو جانا اور لوٹنا چاہتے ہیں۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر انہوں نے مدینہ پر چڑھائی کی تو میں خود جا کر ان سے مقابلہ کروں گا۔ حسب الحکم حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ مشرکوں کے پیچھے گئے اور دیکھا کہ وہ خود اونٹوں پر سوار ہیں اور گھوڑوں کو پہلو سے لگائے لئے جا رہے ہیں لیکن ایسا انہوں نے مدینہ کو لوٹنے کے متعلق مشورہ کرنے کے بعد کیا تھا کیونکہ صفوان بن امیہ نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ایسا نہ کرو (یعنی مدینہ پر چڑھائی نہ کرو)۔

آیت کا مطلب اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کر کے جو غم تم نے رسول اللہ ﷺ کو چکھایا تھا اس کے بدلہ میں اللہ نے تم کو غم دیا۔

لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ تاکہ تم فوت شدہ فتح اور مال غنیمت پر غمگین ہو۔ لاتحزنوا میں لا معنی کے اعتبار سے زائد ہے۔

وَلَا مَا أَصَابَكُمْ اور قتل ہونے، زخمی ہونے اور شکست پانے کی جو مصیبت تم پر پڑی ہے اس پر بھی تم غمگین ہو۔

آیت کا مطلب اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے تم کو پیہم غم دیا اس کی غرض یہ تھی کہ مصائب پر صبر کرنے کی تم میں جرات پیدا ہو اور آئندہ کسی فوت شدہ فائدے یا پہنچنے والے دکھ سے تم کو رنج نہ ہو۔ میں کہتا ہوں یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ نے مسلسل غم کے عوض تم کو ثواب عطا فرمایا اور نبی کی زبانی تم کو اس کی اطلاع کر دی تاکہ فوت شدہ فائدے اور پہنچے ہوئے دکھ کا تم کو غم نہ ہو بلکہ اللہ کے ثواب کی خبر پا کر تم خوش ہو جاؤ۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اثابکم کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے اور باء سببیت یا بدلیت کے لئے ہے یعنی اس غم میں رسول اللہ ﷺ تمہارے برابر کے شریک ہو گئے۔ مطلب یہ کہ جس مصیبت کی وجہ سے تم غمگین ہوئے تمہاری طرح رسول اللہ ﷺ بھی ہوئے اور نافرمانی پر انہوں نے تم کو ملامت نہ کی تاکہ تم کو تسلی رہے اور فوت شدہ نعمت اور پہنچنے والی مصیبت کا تم کو غم ہو۔

وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۳﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے اور اعمال کی غرض سے باخبر ہے۔

ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً پھر اے گروہ اہل اسلام اللہ نے غم کے بعد تمہارے لئے امن یعنی قلبی اطمینان اور سکون اتارا۔ نزول رحمت کے وقت اس سکون کا وجدان صوفی کو ہوتا ہے۔

marfat.com

نُّعَاسًا یعنی اونگھ۔ یہ امنۃ سے بدل یا انزل کا مفعول ہے۔ ممکن ہے کہ نعاس سے مراد وہ استغراقی کیفیت ہو جو نزول رحمت کے وقت صوفی کو حاصل ہوتی ہے اور وہ تمام ماسوا سے غافل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کیفیت اونگھ سے بہت زیادہ مشابہ ہوتی ہے۔

یَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ جو تمہارے ایک گروہ پر چھاگئی تھی۔ یہ گروہ اہل ایمان کا تھا۔

بخاریؒ وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو طلحہؓ نے فرمایا کہ احد کی دن جب ہم صف بند میدان میں تھے کہ ہم پر ایسی اونگھ چھاگئی کہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر تلوار گری جا رہی تھی اور میں اس کو پکڑ رہا تھا وہ گری جا رہی تھی اور میں پکڑ رہا تھا۔ ثابتؓ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت ابو طلحہؓ نے فرمایا احد کے دن میں نے سر اٹھایا تو لوگوں میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آیا کہ اونگھ کی وجہ سے ڈھال کے نیچے وہ جھکا نہ پڑ رہا ہو۔

وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ اور ایک گروہ یعنی منافقوں کو (صرف) اپنی جانوں کو فکر تھی (اس لئے وہ نزول امن و سکون خاطر سے محروم رہے) یا یہ مطلب ہے کہ ان کے نفسوں نے خود ان کو غموں میں ڈال دیا تھا اور وہ سکون و اطمینان سے محروم تھے۔

یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ اللہ کے متعلق وہ نازیبا غلط گمان رکھتے تھے یعنی یہ گمان رکھتے تھے کہ اللہ محمد ﷺ کی مدد نہیں کرے گا یہ خیال کرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ نبی ہوتے تو مارے نہ جاتے۔

ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ اہل جاہلیت یعنی مشرکوں اور کافروں کے گمان کی طرح۔

یَقُوْلُوْنَ وہ رسول اللہ ﷺ سے کہتے ہیں یا اپنے دلوں میں کہتے ہیں۔

هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ استفہام انکاری یعنی جس نصرت کا وعدہ اللہ نے کیا تھا ہم کو اس سے کچھ نہیں ملا، روایت میں آیا ہے کہ بنی خزرج کے شہید ہونے کی اطلاع جب ابن ابی کو ملی تو اس نے یہ بات کہی۔

یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم کو خود اپنی تدبیر اور انتظار کرنے سے روک دیا گیا، ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا، یا یہ مطلب ہے کہ کیا ہم پر سے یہ جبر کبھی دور ہو گا اور اپنے معاملہ کا اختیار ہم کو حاصل ہو گا۔

ابن راہویہؒ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت زبیرؓ بن عوام نے فرمایا مجھے (اب تک) دکھ رہا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، سخت خوف کا وقت تھا تو اللہ نے ہم پر نیند مسلط کر دی ہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں رہا کہ اس کی ٹھوڑی سینہ سے نہ جا لگی ہو، خدا کی قسم مجھ پر اونگھ چھائی ہوئی تھی اور ایک خواب کی طرح میں معتب بن قشیر کا یہ قول سن رہا تھا لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا، اسی کے متعلق اللہ نے آیت ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا یَّغْشٰى ۔۔۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ تک نازل فرمائی۔

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیں کہ حکم سارا، اللہ ہی کا ہے وہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور جیسی منشا ہوتی ہے کرتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ حقیقی غلبہ تو اللہ اور اس کے دوستوں ہی کو حاصل ہے، اللہ کا گروہ ہی غالب رہتا ہے لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے بعض اوقات اس کا (عارضی طور پر) ظہور نہیں ہوتا۔

یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ وہ اپنے دلوں میں ایسی باتیں چھپائے رکھتے ہیں جن کا تم پر اظہار نہیں کرتے یعنی ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ وہ ہدایت کے طلبگار اور فتح کے خواستگار ہیں مگر باہم ایک دوسرے سے اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔

یَقُوْلُوْنَ یعنی ان الامر کلہ للہ کا انکار کرتے ہوئے آپس میں پوشیدہ طور پر کہتے ہیں۔

لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا کہ اگر ہمارے لئے وہی ہوتا جو محمد ﷺ نے وعدہ کیا تھا یا جو محمد ﷺ کا خیال تھا کہ غلبہ پورا پورا اللہ کو اور اس کے دوستوں کو ہوتا ہے تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، یا یہ مطلب ہے کہ اگر ہمارا

marfat.com

اختیار ہوتا اور ہماری تدبیر چلتی تو ہم مدینہ سے باہر نہ نکلتے جیسا کہ ابن ابی وغیرہ کا مشورہ تھا اور یہاں قتل نہ ہوتے۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ آپ کہہ دیں کہ اگر تم اپنے گھروں کے اندر بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کیلئے قتل ہونا لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا تھا اور مقدر ہو چکا تھا وہ ضرور اپنی خوابگاہوں یعنی قتل گاہوں میں نکل کر پہنچتے، مدینہ میں قیام رکھنا، ان کیلئے سود مند نہ ہوتا بلکہ وہ مدینہ کے اندر ٹھہر ہی نہ سکتے۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اس کا تعلق برز سے ہے اور عطف محذوف پر ہے یعنی گھروں میں بیٹھ رہنے والے بھی ضرور اپنی قتل گاہوں میں آتے (اور مارے جاتے) کیونکہ حکم الٰہی کا نفاذ ضروری تھا اس کے علاوہ دوسری مصلحتیں بھی تھیں۔ نیز دلوں کے اخلاص اور نفاق کی جانچ اور پوشیدہ خیالات کا اظہار بھی مقصود تھا، یا اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے اور جملہ کا عطف سابق جملہ پر ہے یعنی اللہ نے ایسا کیا تاکہ امتحان کرے، یا کیلا تحزنوا پر عطف ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ اور اس لئے بھی کہ تمہارے دلوں کے خیالات کو کھول دے اور چھانٹ دے یا اے مسلمانو تمہارے دلوں کے اندر پیدا ہونے والے وسوسوں کو دور کر دے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اور اللہ تمہارے اندرونی خیالات سے بخوبی واقف ہے نہ اس کو اظہار کی ضرورت ہے نہ جانچ کی، صرف مسلمانوں کو کسنا اور منافقوں کے حال کو ظاہر کرنا اور ان کے خلاف دلیل قائم کرنا اس کی علت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ جس روز دونوں گروہوں کا یعنی اہل اسلام اور اہل شرک کا مقابلہ ہوا اور تم میں سے اے مسلمانوں کچھ لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے۔ یہ احد کے دن کا واقعہ ہے سوائے تیرہ آدمیوں کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی باقی نہیں رہا سب بھاگ گئے اور عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھ صرف دس آدمی قائم رہے (چالیس آدمی ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے)۔

اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بس شیطان نے ڈگمگا دینا چاہا یا شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسے ڈال کر لغزش یعنی گناہ پر آمادہ کر دیا، ازل اور استزل کو ہم معنی بھی کہا گیا ہے۔

بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا یعنی ان کے گناہوں کی وجہ سے کہ بعض لوگوں نے مرکز کو چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تھا، حسنؒ بصری نے فرمایا ماکسبوا سے مراد ہے شیطان کے وسوسہ کو مان لینا۔

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ یقیناً اللہ نے ان کو معاف فرما دیا۔

جب مصر والوں نے حضرت عثمانؓ پر نکتہ چینی کی، احد کے دن آپؓ کے فرار ہونے کا ذکر کیا اور جنگ بدر اور بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونے کا بھی اظہار کیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہی بات ان کے جواب میں فرمائی، فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ جنگ احد سے فرار کو تو اللہ نے معاف فرما دیا اور بدر سے غیر حاضری کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا آپ کے عقد میں تھیں اور بیمار تھیں (جن کی وجہ سے باجازت آپ کو رکنا پڑا) اس لئے حضور ﷺ نے فرما دیا تھا کہ شرکاء بدر کے برابر تم کو ثواب بھی ملے گا اور حصہ بھی، رہا بیعت رضوان سے غیر حاضر رہنے کا معاملہ تو وادی مکہ کے اندر اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی معزز شخص ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کو (قریش مکہ کے پاس) بھیج دیتے (لیکن عثمانؓ ہی سب سے زیادہ عزت والے تھے اس لئے) حضور ﷺ نے آپ کو مکہ بھیج دیا تھا اور ان کے جانے کے بعد بیعت رضوان ہوئی، پس حضور ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے پھر اس کو دوسرے ہاتھ پر خود ہی مارا اور فرمایا یہ عثمانؓ کی بیعت ہے، حضرت ابن عمرؓ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد نکتہ چینی کرنے والے سے فرمایا اب اس (تفصیل) کو اپنے ساتھ لے جا، (رواہ البخاری)۔

لہٰذا جنگ احد سے فرار کرنے کی بنیاد پر کسی صحابی کو مطعون کرنا جائز نہیں، اس کے علاوہ یہ امر بھی تو ہے کہ فرار کی ممانعت سے پہلے یہ واقعہ ہوا تھا (اس لئے قابل طعن نہیں ہے کیونکہ ورود حکم سے پہلے عدم تعمیل کوئی جرم نہیں بلکہ قابل تصور ہی نہیں)۔

marfat.com

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ بڑی مغفرت اور حلم والا ہے (اس لئے اس نے اہل فرار سے مواخذہ نہیں کیا اور معاف فرمادیا)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اے اہل ایمان تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کفر کیا، کافروں سے مراد ہیں عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی منافق۔

منافقوں کی طرح نہ ہو جانے کا حکم اس لئے دیا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی قوم (کے افکار و اعمال اس) کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اسی قوم میں سے ہوگا، اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ابو داؤد نے مرفوعاً اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے طبرانی نے مرفوعاً نقل کیا ہے، خصوصاً ایسی مشابہت (سے تو اجتناب فرض ہے) جو موجب کفر ہو، اس جگہ جس مشابہت کو اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے وہ موجب کفر ہی ہے کیونکہ یہ تقدیر کا انکار ہے اور تقدیر کا انکار کفر ہے۔

وَقَالُوْا اور انہوں نے کہا، قالوا اگرچہ ماضی ہے لیکن اس جگہ استقبال کا معنی مراد ہے کیونکہ آگے اذا ضربوا اس کا ظرف (یعنی ظرف زمان) آیا ہے اذ نہیں ہے اور اذا اگر ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی معنی استقبال کے ہوتے ہیں (گویا مطلب یہ ہوا کہ یہ کافر آئندہ کہیں گے) لیکن صیغہ استقبال کی جگہ ماضی کا صیغہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ قول آئندہ کہنا، یقینی تھا اور مستقبل میں جو بات یقینی الوقوع ہو اسکو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کر لیا جاتا ہے (گویا وہ بات ہو گئی) جیسے اذا السماء انشقت میں (کہ اگرچہ آسمان ابھی نہیں پھٹا لیکن پھٹنا یقینی ہے اس لئے تنشق مضارع کی جگہ انشقت ماضی ذکر کیا ہے)۔

لِاِخْوَانِهِمْ اپنے نسبی بھائیوں کے متعلق یا منافق بھائیوں سے۔

بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ لاخوانہم کا مطلب اپنے بھائیوں کے بارے میں اور ان کے متعلق ہے (یعنی لاخوانہم کا ترجمہ بھائیوں سے نہیں ہے) کیونکہ آیت لوکانوا عندنا ماماتوا وما قتلوا بتا رہی ہے کہ اخوانہم سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو مخاطب تھے بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو مر چکے یا مارے جا چکے تھے)۔

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے اخوانہم سے مراد مخاطب ہی ہوں کیونکہ کچھ لوگ تو حاضر تھے ہی اور لوکانوا عندنا الخ میں وہ لوگ مراد ہوں جو مر گئے یا مارے گئے۔ اگر کسی فعل کے فاعل جماعت کے اندر چند اشخاص ہوں تو فعل کی نسبت جماعت کی جانب کر ہی دی جاتی ہے۔ اگر اخوان سے برادران نفاق مراد ہوں تو پھر صرف مخاطب ہی مراد ہوں گے کیونکہ غازی (سفر جہاد پر جانے والے) اکثر وہ لوگ تھے جو منافق نہ تھے۔

اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ جب وہ تجارت وغیرہ کے لئے ملک میں چلیں پھریں اور دور نکل جائیں۔ اذا کا تعلق قالوا سے ہے، گویا تین افعال کے صدور کا وقت ایک ہی ہے، ملک میں جانا مر جانا اور پھر کافروں کا یہ بات کہنا ایک ہی ممتد زمانہ کے واقعات ہیں۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ چونکہ قالوا ماضی کا صیغہ ہے اس لئے بجائے اذا کے اذ ہونا چاہئے تھا لیکن گذشتہ حال کی اس وقت حکایت کی گئی ہے (تو گویا قالوا ماضی کا صیغہ نہیں رہا بلکہ حال کا صیغہ ہو گیا اس لئے اذا لایا گیا) بیضاوی کا یہ قول قابل اعتراض ہے کیونکہ ماضی کے ساتھ اذا کا لانا تو ماضی کو مستقبل بنا دیتا ہے حال کا معنی پیدا نہیں ہوتا پھر ماضی کی حکایت کہ ماضی کو حال فرض کر لیا جائے یا حال کے کلام کو ماضی میں قرار دے دیا جائے کوئی صورت جائز نہیں، نہ اذا کے داخلہ سے ماضی حال بنتی ہے نہ اذا کے ساتھ ماضی لانے سے حال ماضی ہوتا ہے بلکہ ماضی مستقبل ہو جاتا ہے۔ اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ قالوا کا معنی اس جگہ استقبال کا ہے۔

اَوْ كَانُوْا غُزًّى غزی، غازی کی جمع ہے جیسے عفی، عافی کی جمع ہے یعنی سفر پر ہوں یا جہاد پر پھر

marfat.com

مر جائیں یا جہاد میں مارے جائیں۔

لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے (اور سفر پر نہ گئے ہوتے) تو مرتے نہیں اور (جہاد پر نہ جاتے تو) مارے نہ جاتے۔ یہ بات کہنے کی وجہ یہ تھی کہ تقدیر پر ان کا ایمان نہ تھا۔ (اسلام میں) فرقہ قدریہ بھی اسی کا قائل ہے۔

لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ لام غایت کا ہے (یعنی لام کے بعد والا کلام پہلے کلام کا نتیجہ اور علت ہے) اور ذلک سے اشارہ اعتقاد کی جانب ہے اور لام کا تعلق قالوا سے ہے یعنی ان کا عقیدۂ مذکورہ جس پر ان کا قول دلالت کر رہا ہے آخر کار ان کی قلبی حسرت بن جائے گا یا لاتکونوا سے لام کا تعلق ہے یعنی منافقوں کی طرح تمہارا عقیدہ اور قول نہ ہونا چاہئے تاکہ تمہارا یہ عقیدہ اور قول ان کے لئے حسرت بن جائے عقیدہ اور قول کی مخالفت منافقوں کے لئے حسرت آفریں ہے۔

وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ اور اللہ ہی زندگی اور موت دیتا ہے یعنی نہ سفر و جہاد موت آور ہیں نہ ترک سفر و جہاد حیات آفریں کبھی مقیم خانہ نشین مر جاتا ہے اور مسافر مجاہد زندہ رہتا ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے اس آیت میں اہل ایمان کو منافقوں کی مشابہت (اعتقادی و عملی) اختیار کرنے سے تہدید ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے بھی گئے یا مر گئے۔ نافع، حمزہ اور کسائی کے نزدیک مِتّم مِتّ مِتنا ہر جگہ بکسر میم باب خاف یخاف (سمع یسمع) سے ہے اور ابن کثیر وابوعمرو ابن عامر وابوبکرؒ کے نزدیک بضم میم۔ حفص کے نزدیک مُتّم باب نصر ینصر سے ہے۔ یہاں دونوں جگہ نصر ینصر سے بضم میم ہے باقی مقامات پر مِتّ مِتنا بکسر میم۔

لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ یہ کلام جواب قسم ہے اور جزاء شرط کے قائم مقام ہے۔ یعنی سفر اور جہاد کو موت اور زندگی میں کوئی دخل نہیں اللہ ہی حیات بخش اور موت آفریں ہے لیکن ظاہری طور پر اگر سفر و جہاد موت کا سبب نظر آتا بھی ہے تب بھی ایسی موت جس کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے گناہوں کی مغفرت اور رحمت حاصل ہو اس دنیوی مال و متاع سے بہتر ہے پس مناسب یہی ہے کہ آئندہ خیر کی طلب کی جائے اور فوت شدہ دنیا کا افسوس نہ کیا جائے۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ اور اللہ کی راہ میں اگر تم مر گئے یا مارے گئے خواہ کسی طور پر ہو تو اللہ ہی کی طرف تمہارا حشر ضرور ہوگا کسی دوسرے کے پاس جانا نہ ہوگا اس لئے تم کو امکانی کوشش کرنی چاہئے کہ اللہ کی محبت تم کو حاصل ہو تاکہ مرنے کے بعد تم فراق کے قید خانہ سے چھوٹ کر بارگاہ محبوب تک پہنچ جاؤ۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ پس اللہ ہی کی عظیم الشان رحمت (جو تم پر اور تمہاری امت پر ہے) کی وجہ سے تم مومنوں کے حق میں نرم دل ہو اور باوجودیکہ انہوں نے تمہارے حکم کے خلاف کیا پھر بھی ان کی تکلیف پر اللہ کی توفیق اور خداداد قلبی وجدان کے زیر اثر رنجیدہ ہوتے ہو۔ تمہاری یہ نرمی قلب باعث رحمت اس وجہ سے ہے کہ

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ اگر تم درشت روز شت خو اور سخت دل ہوتے۔ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ تو وہ تمہارے آس پاس سے بچھڑ جاتے آپ کے پاس نہ رہتے اور دائرہ اسلام سے نکل جاتے اور جنت کے استحقاق سے محروم ہو جاتے اور متبعین کی تعداد کم ہونے سے تمہارا اجر کم ہو جاتا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ پس ان پر جو تمہارا حق ہے اس سے درگزر کرو ان کو معاف کرو۔

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اور اللہ کے جو حقوق ان کے ذمہ ہیں اور یہ ادا نہیں کر سکے ہیں ان کے لئے ان حقوق کی

marfat.com

معافی کی اللہ سے دعا کرو۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ [1] اور جنگ کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ بہر حال جن چیزوں کا تعلق مشورہ سے ہو اور اللہ کی طرف سے تم کو کوئی خاص ہدایت نہ ملی ہو تو ان کی رائے طلب کرو تاکہ تم کو ان کے مشورہ سے قوت حاصل ہو اور ان کے دل بھی خوش ہو جائیں اور امت کیلئے بھی باہمی مشاورت کا ایک دستور مقرر ہو جائے۔ بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسول اللہ ﷺ سے زیادہ لوگوں کیلئے مشورہ لینے والا میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا۔

فَإِذَا عَزَمْتَ پھر جب مشورہ کے بعد تمہارا ارادہ محکم ہو جائے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ تو اللہ پر بھروسہ کرو، اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردو اور اس پر اعتماد رکھو۔ رسول اللہ ﷺ کی یہی حالت تھی۔ اسی لئے جب احد کے دن جنگ کے ارادہ سے برآمد ہو گئے (اور پھر پشیمان ہو کر لوگوں نے روکنا چاہا) تو فرمایا کسی نبی کے لئے زیبا نہیں کہ جب اس نے زرہ پہن لی ہو تو بغیر جنگ کئے اتارے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ باہم مشورہ کے بعد مشورہ سے جو کچھ طے ہو اس پر عمل کرو اور اعتماد اللہ پر رکھو، یہ مطلب نہیں کہ اپنی رائے پر عمل کرو (اور مشورہ کو نظر انداز کردو) کیونکہ غیب کا علم تو اللہ کو ہے مگر باہم مشورہ کے بعد افکار و خیالات کے ردوبدل سے وہ بات نکل آتی ہے جو زیادہ مفید ہوتی ہے۔ پھر بھی اجتماعی مشورہ قابل بھروسہ نہیں ہو تاکہ یقیناً مفید ہی ہو کیونکہ انسانی افکار کی رفتار کبھی اندھادھند ہوتی ہے اور اللہ معمول کے خلاف کبھی نتیجہ پیدا کر دیتا ہے اس لئے بھروسہ لوگوں کی رائے پر نہیں صرف اللہ پر ہونا چاہئے۔

توکل کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ کے سپرد کر دی جائے اسی سے درخواست کی جائے کہ کوشش کا نتیجہ اچھا نکلے اور اللہ پر بدگمانی نہ کی جائے حسن ظن رکھا جائے (کہ وہ ضرور اچھا نتیجہ نکالے گا)۔

بعض علماء کا قول ہے کہ رزق حاصل کرنے کے لئے اللہ کی نافرمانی نہ کرنا توکل ہے اس قول پر اللہ کی طرف (رزق کے معاملے میں) رجوع کرنا لازم ہے لیکن گناہ کے معاملہ میں اللہ سے التجا کا کوئی معنی نہیں۔

بعض علماء نے کہا کہ توکل کا معنی یہ ہے کہ اپنی ذات کے لئے اللہ کے سوا کسی کو ناصر اور رزق کا کسی کو خازن اور اعمال کا کسی کو نگران نہ قرار دیا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے ستر ہزار آدمی بلا حساب جنت میں جائیں گے عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ وہ کون ہوں گے فرمایا وہ لوگ وہ ہیں جو داغ نہیں لگواتے، منتر نہیں پڑھتے پڑھواتے، شگون نہیں لیتے اور اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ متفق علیہ۔ بغوی نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا توکل کا حق ہے تو اللہ تم کو اسی طرح رزق دے جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں، رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

اگر شبہ کیا جائے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری معمولی اسباب کو ترک کر دینا توکل ہے جیسے (زخم وغیرہ کے لئے) داغ نہ لگوانا اور منتر، افسوں کو ترک کرنا۔ میں کہتا ہوں ایسا نہیں ہے (ترک

---

[1] (حاشیہ از مولف قدس سرہٗ، حضرت ابن عباسؓ کا قول منقول ہے کہ آیت وشاورھم فی الامر، میں ابو بکرؓ و عمرؓ سے مشورہ لینے کا حکم ہے، دوسری روایت میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم دونوں مشورہ میں متفق الرائے ہو جاؤ تو میں مخالفت نہیں کروں گا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ جنگ کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ مشورہ لیا کرتے تھے اس لئے تم بھی مشورہ لیا کرو، ضحاک نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشورہ لیا کرتے تھے یہاں تک کہ عورت سے بھی، ۱۲۔

marfat.com

اسباب نہیں) بلکہ اسباب پر اعتماد نہ کرنا توکل ہے، دیکھو مشورہ لینا بھی تو ایک طرح کے سبب کا استعمال ہے جس کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس پر اعتماد کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ رہی حدیث ابن عباسؓ تو اس کے آخر میں وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ داغ نہ لگوانے اور افسوں نہ کرنے کرانے کی تفسیر نہیں ہے۔

عطف غیریت کو چاہتا ہے اور ان دونوں جملوں کے مفہوم میں تغایر و تضاد نہیں ہے۔

اور شاید ستر ہزار سے مراد وہ لوگ ہیں جو اکثر اسباب کا استعمال نہیں کرتے (کیونکہ مطلقاً ترک اسباب تو ممکن ہی نہیں) یا ترک تشبث سے مراد ہے اسباب مکروہہ کو چھوڑ دینا کیونکہ اسباب کا استعمال تو زندگی کے لوازم میں سے ہے (انکا ترک تو ناممکن ہے) کھانا پینا عادۃً زندگی کے اسباب میں سے ہے۔ نماز روزہ غالباً دخول جنت کا سبب ہے اور ان کو ادا کرنا واجب اور ضروری ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور اللہ کا محبوب ہونا ہی سب سے اونچا مقصد ہے اس کے علاوہ توکل علی اللہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ مدد فرماتا ہے اور (دین دنیا کی) صلاح کا راستہ دکھا دیتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ حدیث قدسی میں آیا ہے میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس ہوں (یعنی بندہ جیسا مجھ پر اچھا برا گمان کرتا ہے میں ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک کرتا ہوں)۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں کیونکہ جو اللہ کی طرف سے مدد یافتہ ہو وہ کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتا ورنہ اللہ کا عاجز اور کمزور ہونا لازم آئے گا جو قطعاً محال ہے۔

وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ اور اگر وہ تم کو بے مدد چھوڑ دے اور اپنی مدد کو روک دے تو پھر کون تمہاری مدد کر سکتا ہے (استفہام انکاری ہے) یعنی کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ بندوں کے تمام افعال اللہ کے پیدا کردہ ہیں اس لئے اگر وہ بے مدد چھوڑ دے تو پھر کسی کی طرف سے مدد کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اس کے مدد نہ کرنے کے بعد یا یہ مطلب ہے کہ جب تم نے اللہ سے مدد کی طلب چھوڑ دی تو کسی دوسرے کی طرف سے مدد کا تصور ممکن ہی نہیں۔ شرعاً اللہ پر توکل رکھنے کا حکم بصیغہ امر واجب ہے لیکن اس آیت میں توکل کے عقلی وجوب کو دلیل سے بھی ثابت کیا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو توکل کرنا چاہئے کیونکہ وہ جانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ مال غنیمت میں خیانت کرنا نبیؐ سے بعید ہے۔ غلول مال غنیمت میں خیانت کرنا۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول وحی کے متعلق ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی لالچ یا خوف یا سہل انگاری کی وجہ سے وحی کا کچھ حصہ ظاہر نہ کرنا نبی کے لئے جائز نہیں۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کچھ طاقتور لوگوں نے اصرار کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے مال غنیمت کی طلب کی، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ مطلب یہ کہ مال غنیمت میں خیانت کرنا کہ کسی گروہ کو دے اور کسی کو نہ دے۔ نبیؐ کے لئے جائز نہیں بلکہ مساوات کے ساتھ سب کو تقسیم کرنا اس پر لازم ہے۔ ابوداؤد ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن بھی کہا ہے کہ اس آیت میں اس سرخ دھاری والی کملی کا بیان ہے جو بدر کے دن گم ہوگئی تھی اور بعض لوگوں نے خیال کیا تھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے لے لی ہو اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ مال غنیمت میں خیانت نبی ﷺ کے لئے درست نہیں۔

کلبی اور مقاتل کا بیان ہے کہ آیت کا نزول جنگ احد کی غنیمت کے متعلق ہوا جب تیر اندازوں نے احد کی گھاٹی کے مرکز کو چھوڑ دیا اور کہنے لگے ہم کو اندیشہ ہے کہیں رسول اللہ ﷺ یہ نہ فرمادیں کہ جس نے جو چیز لی ہو وہ اسی کی ہے اور بدر کی لڑائی کی طرح آج بھی غنیمت کی تقسیم نہ کریں پس اس خیال سے انہوں نے اپنی مقررہ جگہ چھوڑ دی اور اموال غنیمت پر جا

marfat.com

پڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں نے تم کو حکم نہیں دیدیا تھا کہ جب تک میرا حکم تم کو نہ پہنچے اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔ کہنے لگے ہم اپنے دوسرے ساتھیوں کو وہیں کھڑا چھوڑ آئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں۔ بات یہ ہے کہ تم نے یہ خیال کیا کہ ہم مال غنیمت میں خیانت کرلیں گے بانٹ کر تم کو نہیں دیں گے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں اور ابن جریرؒ نے ضحاک کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ جاسوس دشمن کے حال کی دیکھ بھال کے لئے بھیجے تھے ان کی غیر حاضری میں رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں کو مال غنیمت بانٹ دیا اور جاسوسوں کو کوئی حصہ نہیں دیا اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ پس بعض مستحقین کے محروم رہ جانے کو غلول فرمایا۔ اگرچہ یہ خیانت نہ تھی لیکن سختی اور مبالغہ کی وجہ سے اس کو خیانت قرار دیا۔ آیت کی دوسری قرأت میں اَنْ یُغَلَّ فعل مجہول آیا ہے یعنی نبی کو خائن قرار دینا جائز نہیں یا یہ مطلب کہ نبی سے امت کا خیانت کرنا جائز نہیں۔

قتادہ نے فرمایا ہم سے بیان کیا گیا تھا کہ کچھ صحابہ نے مال غنیمت میں خیانت کی تھی ان کے بارے میں اس آیت کا نزول ہوا۔ طبرانی نے کبیر میں باوثوق سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ لشکر کہیں بھیجا مگر اس کا جھنڈا (ناکام) واپس آیا پھر بھیجا تو پھر واپس آگیا اور وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ہرن کے سر کے برابر سونے کی خیانت کرلی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور جو خیانت کرے گا قیامت کے دن چرائے ہوئے مال کے ساتھ آئے گا (ملزم مال کے ساتھ پکڑا ہوا آئے گا) کلبیؒ نے کہا دوزخ کے اندر اس چرائی ہوئی چیز کی ہم شکل کوئی شئ بنادی جائے گی اور اس خائن سے کہا جائے گا جا اتر کر اس کو لے لے وہ اتر کر اس چیز کو پشت پر اٹھا کر لے آئے گا جب اپنی جگہ آجائے گا تو وہ چیز چھوٹ کو پھر اندر گر پڑیگی اور اس شخص کو حکم دیا جائے گا کہ اتر کر جائے اور اس چیز کو لاد کر لے آئے وہ ایسا کریگا اور یہی معاملہ اس کے ساتھ (خدا جانے کب تک) ہوتا رہے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ خیبر کے سال ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب نکلے وہاں سونا چاندی کچھ لوٹ میں ہاتھ نہیں آیا صرف اونٹ، کپڑے اور سامان ملا۔ یہاں سے حضور ﷺ نے وادی قریٰ کا رخ کیا۔ ایک حبشی غلام جس کا نام مدعم تھا۔ رفاعہ بن زید نے رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کیا تھا (وہ بھی ساتھ تھا) جب ہم وادی قریٰ میں پہنچ گئے اور مدعم رسول اللہ ﷺ کے اونٹ کا کجاوہ اتارنے لگا تو اچانک ایک نامعلوم تیر اس کے آلگا۔ معلوم نہیں کس نے مارا اس تیر سے وہ مر گیا لوگوں نے کہا اس کو جنت مبارک ہو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ چھوٹی کملی جو اس نے خیبر کی جنگ میں مال غنیمت سے لے لی تھی اور اس کے حصہ میں نہیں آئی تھی وہ اس کے اوپر آگ بن کر بھڑک رہی ہے۔ یہ بات سن کر ایک شخص ایک یا دو تسمے لے کر آیا اور خدمت گرامی میں پیش کردیئے۔ فرمایا ایک یا دو تسمے بھی آگ کے ہیں (یعنی اگر داخل نہ کئے جاتے تو مرنے کے بعد یہ آگ کے ہو جاتے)، رواہ البغوی۔

صحیحین کی روایت میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ کسی شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک غلام جس کا نام مدعم تھا بطور ہدیہ بھیجا تھا۔

حضرت یزید بن خالد جہنی کی روایت ہے کہ خیبر کے دن ایک شخص کا انتقال ہو گیا لوگوں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنے ساتھی کی نماز پڑھو یہ سن کر لوگوں کے رنگ فق ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے ساتھی نے راہ خدا میں خیانت کی ہے ہم نے اس کا سامان کھول کر دیکھا تو اس میں یہودیوں سے لوٹے ہوئے کچھ تعلی سوتی (پوتھ) ملے جو دو درہم کی قیمت کے ہوں گے۔ رواہ مالکؒ والنسائی۔

حضرت ابو حمید ساعدی راوی ہیں کہ قبیلہ ازد کا ایک شخص تھا جس کا نام ابن الکتبیہ تھا اسے رسول اللہ ﷺ نے وصول صدقہ کا آفیسر بنا کر بھیجا جب وہ مال زکوٰۃ وصول کر کے واپس آیا تو (کچھ مال پیش کر کے) کہنے لگا یہ تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ

marfat.com

میں دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا اما بعد اللہ نے جن امور کا مجھے مہتمم بنایا ہے میں ان میں سے بعض کاموں کا ناظم تمہارے بعض اشخاص کو بنا دیتا ہوں پس وہ آ کر کہتے ہیں کہ یہ (مال تو اے مسلمانو) تمہارا ہے اور یہ مجھے تحفہ میں دیا گیا ہے آخر وہ اپنی اماں اور اپنے ابا کے گھر کیوں نہیں بیٹھ رہتا کہ اگر وہ سچا ہے تو اس کا ہدیہ (گھر بیٹھے) اس کے پاس آجاتا خدا کی قسم جو شخص بھی تم میں سے کوئی چیز ناحق لے گا وہ ضرور جب اللہ کے سامنے جائے گا تو وہ چیز اپنے اوپر لادے ہوگا پس میں کسی کو ایسا نہ پاؤں کہ اللہ کی پیشی کے وقت بلبلاتے اونٹ کو یا دہاڑتی گائے کو یا منمناتی بکری کو اپنے اوپر لادے ہوئے لائے۔ متفق علیہ۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ پھر حضور ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا اے اللہ کیا میں نے (تیرا حکم) پہنچا دیا۔ اے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا۔

حضرت عدیؓ بن عمیرہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ہم نے جس کسی کو تم میں سے کسی کام پر مقرر کیا اور اس نے ہم سے ایک سوئی یا اس سے زیادہ کوئی چیز چھپالی تو یہ چوری ہوگی جس کو ساتھ لے کر قیامت کے دن اس کو آنا ہوگا، رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (خطاب کرنے) کھڑے ہوئے اور (مال زکوٰۃ یا مال غنیمت کی) خیانت کو بڑا جرم بتایا اور فرمایا خوب سن لو قیامت کے دن تم میں سے کسی کی ایسی حالت میں مجھ سے ملاقات نہ ہو کہ اس کی گردن پر بلبلاتا اونٹ سوار ہو اور وہ کہہ رہا ہو یا رسول اللہ ﷺ دہائی ہے اور میں کہوں اللہ کے مقابلہ میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتا میں تو تجھے حکم پہنچا چکا تھا پھر حضور ﷺ نے اس شخص کا ذکر کیا جس کی گردن پر گھوڑا اور بکری اور سونا چاندی لدا ہوگا اور اس سے آگے وہی فریاد کرنے اور مدد نہ کرنے کا تذکرہ فرمایا۔ بخاری و مسلم۔

ابو یعلی اور بزاز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت سعد بن عبادہ اور بلب کی روایت سے اور بزار نے حضرت ابن عمرؓ و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابن عباس و حضرت بن مسعود اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم کی روایت سے اسی طرح کی حدیثیں نقل کی ہیں اور یہ تمام احادیث مال زکوٰۃ وصول کرنے والوں کے متعلق ہیں جو مال زکوٰۃ میں خیانت کرتے ہوں۔

حضرت ابو مالکؓ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے بڑی خیانتی چوری گز بھر زمین کی ہے کسی زمین یا مکان میں اگر دو شخص ہم جوار (شریک) ہوں اور ایک دوسرے کے حق کی ایک گز زمین کاٹ لے تو قیامت کے دن اللہ اس کو سات زمینوں کا طوق پہنائے گا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے (عامل بنا کر) یمن کو بھیجا اور فرمایا میری اجازت کے بغیر کوئی چیز نہ لے لینا کیونکہ وہ خیانتی چوری ہوگی ومن یغلل یات بما غل یوم القیامۃ جو شخص خیانتی چوری کرے گا وہ قیامت کے دن اس خیانتی مال کے ساتھ آئے گا۔

عمرو بن شعیبؒ کے دادا راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے خیانتی چور کا سامان جلوا دیا اور اس کو مارا۔ رواہ ابوداؤد۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامان پر ایک شخص مقرر تھا جس کو کرکرہ کہا جاتا تھا کرکرہ مر گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دوزخ میں ہے لوگ اس کا سامان دیکھنے گئے تو اس میں ایک عبا ملا جس کی اس نے خیانت کی تھی۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خیبر کے دن صحابہؓ کی ایک جماعت آئی اور کہنے لگی فلاں شہید ہوا فلاں شہید ہوا یہاں تک کہ ایک آدمی (کے جنازہ) کی طرف سے گزرے اور بولے فلاں شہید ہوا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں میں نے اس کو آگ میں دیکھا ہے ایک چادر کی خیانت کرنے کی وجہ سے یا فرمایا ایک عبا

marfat.com

کی خیانت کی وجہ سے۔ پھر فرمایا اے خطاب کے بیٹے جا اور تین بار لوگوں میں منادی کردے کہ جنت میں صرف مومن جائیں گے حسب الحکم میں نے باہر نکل کر تین بار لوگوں میں منادی کردی کہ جنت میں صرف مومن جائیں گے، رواہ مسلم۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہو گا یعنی کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اور ان کی حق تلفی نہیں کی جائے گی یعنی نہ اطاعت گزار کے ثواب میں کمی کی جائے گی نہ نافرمان کے عذاب میں زیادتی۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ بھلا جس شخص نے اللہ کی خوشنودی کی اتباع کی ہے یعنی انصار اور مہاجرین۔

كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کے ساتھ لوٹا یعنی منافق اور بعض فاسق۔

وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ حالانکہ اللہ کی ناراضگی کے ساتھ لوٹنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے۔

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ اور جہنم برا مقام واپسی ہے۔

هُمْ دَرَجٰتٌ مرضی خدا کا اتباع کرنے والے اور اللہ کی ناراضگی لے کر لوٹنے والے مختلف درجات والے ہیں مختلف مراتب ہیں ثواب وعذاب میں اول ودوئم کا بڑا تفاوت ہے اس لئے ان لوگوں کو درجات فرمایا۔

عِنْدَ اللّٰهِ اللہ کے نزدیک بعض مومن، بعض مومنوں سے اللہ کے زیادہ مقرب ہوں گے اور بعض کفار و نافرمان دوسرے کافروں اور نافرمانوں سے دوزخ کے زیادہ نچلے درجہ میں ہوں گے۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ اور اللہ ان کے اعمال سے واقف ہے پس اعمال کے موافق بدلہ دیگا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ ان کے اندر انہی میں سے ایک عظیم الشان پیغمبر مبعوث فرمایا۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک المؤمنین سے مراد ہیں صرف حضور ﷺ کے خاندان (قریش) کے مومن کیونکہ نعمت بعثت اگرچہ تمام مومنوں کے لئے عمومی ہے لیکن قریش کو زیادہ فائدہ حاصل ہوا اور حضور ﷺ کی ذات سے خصوصی بزرگی ملی۔ اس لئے قریش پر یہ اللہ کا خصوصی احسان تھا کہ ان میں سے اللہ کا پیغمبر مبعوث ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگ قریش کے تابع ہیں (عام) مومن قریشی مومنوں کے اور (عام) کافر قریشی کافروں کے۔ متفق علیہ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ امر یعنی خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گی جب تک ان میں سے دو شخص بھی باقی رہیں گے (یہ خبر بمعنی امر ہے یعنی خلافت ہمیشہ قریش میں رہنی چاہئے لیکن یہ حکم بشرط صلاحیت و تقویٰ ہے، فاسقوں اور ظالموں کے خلیفہ بنانے کے لئے امر نہیں ہے) بعض علماء کا خیال ہے کہ المؤمنین سے عرب کے تمام مومن مراد ہیں کیونکہ بنی تغلب کے علاوہ باقی ہر عربی قبیلہ کا قریش سے کچھ نہ کچھ نسبی تعلق ہے اللہ نے فرمایا ہے هوالذی بعث فی الامیین رسولاً منهم (الامیین) سے عام عرب مراد ہیں اس لئے المؤمنین سے بھی عام عربی مومن مراد ہونا چاہئے)۔

من انفسهم سے مراد ہے من جنسهم یعنی اللہ نے رسول کو عربوں کی جنس کا بنایا تاکہ آسانی سے اس کا کلام سمجھ لیں اور اس کی صداقت وامانت کی حالت سے واقف ہوں اور اس کی وجہ سے حامل فخر ہو جائیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے بغض نہ رکھنا (یعنی نفرت نہ کرنا) ورنہ دین سے الگ ہو جائے گا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں حضور ﷺ سے کیسے نفرت کر سکتا ہوں۔ حضور ﷺ ہی کے ذریعہ سے تو اللہ نے ہم کو ہدایت فرمائی ہے۔ فرمایا عرب سے بغض رکھے گا تو مجھ سے بغض رہے گا۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے اور اس کو حسن کہا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ تمام مومن مراد ہیں (عجمی ہوں یا عربی) جیسے آیت لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

marfat.com

میں تمام انسان مراد ہیں یعنی پیغمبر انسانوں میں سے آیا کوئی فرشتہ نہیں آیا تا کہ نوعی مناسبت کی وجہ سے اثر آفرینی اور اثر پذیری (بآسانی) ہو سکے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا۔ اگر زمین پر ملائکہ چلتے پھرتے رہتے بستے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے (مگر انسانوں کے لئے تو انسان ہی رسول ہونا چاہئے)۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ جو اللہ کی آیات یعنی قرآن ان کو پڑھ کر سناتا ہے حالانکہ وہ پہلے کچھ نہ جانتے تھے۔

وَيُزَكِّيهِمْ اور ان کو پاک کرتا ہے یعنی ان کے دلوں کو غلط عقائد اور اللہ کے سوا دوسروں کے ساتھ لو لگانے سے پاک کرتا ہے، نفوس کو رذیل خصائل سے طاہر بناتا ہے اور اجسام کو نجاستوں، گندگیوں اور برے اعمال سے صاف کرتا ہے۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ اور ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے یعنی وہ علوم سکھاتا ہے جو قرآن سے اخذ کئے جاتے ہیں یا وہ علوم سکھاتا ہے جو اوراق پر لکھے جانے کے قابل ہیں۔

وَالْحِكْمَةَ اور ان کو حکمت سکھاتا ہے یعنی ایسے صحیح یقینی علوم سکھاتا ہے جو ایک دانشمند دوسرے دانشمند سے کتاب اور بیان کے بغیر سیکھ لیتا ہے۔

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۱۶۴﴾ اِنْ شرطیہ نہیں ہے نہ وصلیہ ہے بلکہ مخففہ ہے یعنی اِنَّ تھا اور اِنَّ کا اسم ضمیر شان محذوف ہے یعنی بلاشبہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّى هَٰذَا اور جب تم پر ایسی مصیبت پڑی کہ اس سے دوگنی تم (دشمنوں پر) ڈال چکے تھے تو اب تم کہتے ہو کہ یہ کدھر سے آئی۔ مصیبت سے مراد ہے ستر آدمیوں کا قتل اور شکست جو احد کے دن واقع ہوئی اور دوگنی مصیبت ڈالنے سے مراد ہے بدر کی لڑائی میں کافروں کا قتل اور قید ہونا۔

امام احمد، بخاری، مسلم اور نسائی نے حضرت براءؓ کا قول نقل کیا ہے کہ احد کے دن مشرکوں نے ہمارے ستر آدمی مارے اور بدر کے دن رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ نے ایک سو چالیس مشرکوں پر مصیبت ڈالی۔ ستر کو قتل کیا اور ستر کو قید۔ میں کہتا ہوں قیدی کو بھی اللہ نے مقتول کے حکم میں قرار دیا کیونکہ مسلمان ان کو قتل کر سکتے تھے اور ان کو قتل کر ڈالنے کی ہی اللہ کی مرضی تھی۔ فدیہ لے کر قتل نہ کرنا (اور رہا کر دینا) تو مسلمانوں کی اپنی رائے سے ہوا (جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہوا)۔

لَمَّا کا تعلق قُلْتُمْ سے ہے۔ اَنّٰى هٰذَا یعنی تعجب سے تم نے کہا کہ یہ شکست اور قتل کی مصیبت ہم پر کہاں سے پڑی ہم تو مسلمان ہیں اور اللہ کا رسول ﷺ ہم میں موجود ہے۔ اَ لَمَّا میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے یعنی تم کو ایسا کہنا نہ چاہئے تھا۔ اس جملہ کا عطف یا آیت لقد صدقکم الله وعدہ پر ہے یعنی اللہ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ پورا کیا اور تم کہتے ہو کہ یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آ گئی یا استزلهم الشیطان پر عطف ہے یا لقد من الله پر عطف ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کا موجود ہونا تو تم پر اللہ کا احسان ہے اور تم مصیبت کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرتے اور کہتے ہو کہ ان کی وجہ سے یہ مصیبت آئی۔

یا محذوف جملہ پر عطف ہے کلام اس طرح تھا کہ اللہ نے تم سے فتح کا وعدہ صبر رکھنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی شرط پر کیا تھا تم نے صبر نہیں کیا اور مصیبت پڑی تو کہنے لگے یہ کدھر سے آ گئی۔ یا اس طرح کلام تھا کہ تم نے باہم اختلاف رائے کیا اور رسول کی نافرمانی کی اور بزدل بن گئے اور جب مصیبت پڑی تو ایسی بات کہنے لگے۔ وغیرہ

قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ اے محمد ﷺ تم کہہ دو کہ یہ مصیبت خود تمہاری طرف سے آئی ہے۔ یعنی مرکز کو چھوڑ دینے اور رسول اللہ ﷺ کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے آئی۔ کیونکہ فتح کا وعدہ تو صبر و تقویٰ کے ساتھ وابستہ تھا۔ بعض علماء نے کہا کہ من عندانفسکم سے مراد یہ ہے کہ تم نے بدر کے قیدیوں کا فدیہ لینا پسند کیا اور یہ تمہارا ذاتی فعل تھا اس سے یہ مصیبت پڑی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عمر بن خطابؓ کا قول نقل کیا ہے کہ احد کے دن مسلمانوں کو اس حرکت کی سزا

marfat.com

دی گئی جو انہوں نے بدر کے دن کی تھی کہ قیدیوں کا فدیہ لے لیا تھا (ستر کو فدیہ لے کر رہا کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ احد کے دن ستر مسلمان مارے گئے اور صحابہؓ کو شکست ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ کا اگلا دانت شہید ہو گیا اور سر مبارک پر خود ٹوٹ (کر گڑ) گیا اور چہرہ مبارک پر خون بہنے لگا اور اللہ نے آیت اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ الخ نازل فرمائی۔

بغویؒ نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جبرئیلؑ نے آکر رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ کی قوم کی یہ حرکت اللہ کو ناپسند ہوئی کہ قیدیوں کا معاوضہ لے لیا حالانکہ اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ ان کو دو باتوں میں سے ایک بات پسند کر لینے کا اختیار دیدیں یا تو وہ آگے بڑھ کر قیدیوں کی گردنیں ماردیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں، مگر اس صورت میں ان قیدیوں کی تعداد کے برابر مسلمانوں کا شہید ہونا لازم ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا تذکرہ مسلمانوں سے کیا، انہوں نے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے قبیلہ والے ہیں بھائی بند ہیں ہم ان سے فدیہ لے لیں گے اور اس مال سے دشمن کے مقابلہ کے لئے طاقت فراہم کر لیں گے ہم میں سے ان کی تعداد کے برابر شہید ہو جائیں گے تو ہو جائیں (ہم اس پر راضی ہیں) چنانچہ احد کے دن بدر کے قیدیوں کی تعداد کے برابر ستر مسلمان شہید ہو گئے آیت هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کا یہی مطلب ہے۔

فائدہ

سعیدؒ بن منصور نے ابوالضحٰی کی روایت سے مرسلاً نقل کیا کہ احد کے دن ستر شہید ہوئے چار مہاجر حضرت حمزہؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت عبداللہ بن جحش، حضرت شماسؓ بن عثمان اور باقی (۶۶) انصاری۔ لیکن ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابی بن کعبؓ کا قول نقل کیا ہے کہ احد کے دن ۶۴ انصاری اور چھ مہاجر شہید ہوئے (چار تو وہی تھے جن کا ذکر ابوالضحٰی کی روایت میں آچکا ہے اور) بقول حافظ پانچویں مہاجر شہید حضرت حاطب بن بلتعہ کے آزاد کردہ غلام سعد تھے اور چھٹے ثقیف بن عمرو اسلمی تھے۔ بخاری نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ انصار سے زیادہ شہداء عرب کے کسی قبیلہ کے ہم کو معلوم نہیں۔ ہم سے حضرت انسؓ نے فرمایا تھا کہ احد کے دن ستر انصاری شہید ہوئے اور بیر معونہ[1] کے دن ستر اور جنگ یمامہ میں ستر۔ حافظ محبؒ طبری نے بروایت مالک لکھا ہے کہ شہداء احد ۷۵ تھے جن میں ۷۱ انصاری تھے۔ امام شافعیؒ کے ایک قول میں ۷۲ کی تعداد آئی ہے اور العیون میں شہداء احد کے ناموں کی ترتیب وار فہرست آئی ہے یہ کل تعداد ۹۶ ہوتی ہے ۱۱ مہاجر ۳۸ اوس کے اور ۴۷ خزرج کے۔ العیون میں دمیاطی کے حوالہ سے کل شہداء احد کی تعداد ۱۰۴ یا ۱۰۵ آئی ہے لیکن قرآن ان کی تعداد ستر بتارہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾ مدد کرے یا بے مدد چھوڑ دے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ ان دونوں گروہوں کا مقابلہ ہوا پس اللہ کے حکم اور تقدیر سے پڑی یعنی احد کے دن جب مسلمانوں اور کافروں کا مقابلہ ہوا اور مسلمانوں پر قتل و شکست کی مصیبت پڑی تو وہ بحکم خدا پڑی۔

ایک شبہ

اذن یعنی اجازت خداوندی کا تعلق جائز امور سے ہوتا ہے جو امر غیر مشروع ہے اس کی اجازت اللہ کی طرف سے نہیں ہو سکتی اور جہاد سے فرار امر غیر مشروع ہے اس کا باذن الٰہی وقوع کیسے ممکن ہے۔

ازالہ :- اذن سے مراد ہے امر تکوینی یعنی وہ امر جس کی تعبیر کن فیکون سے کی ہے اور امر تکوینی کا تعلق مشروع

---

[1] حضور ﷺ نے قبائل عرب میں تبلیغ کے لئے ستر قراء انصاری بھیجے تھے کافروں نے دھوکہ سے چاہ معونہ کے قریب ان سب کو شہید کر دیا اور حضور ﷺ نے ان قبائل کے لئے بددعا کی، ۱۲۔

marfat.com

اور غیر مشروع دونوں سے ہے ہاں امر تکلیفی یعنی حکم شرعی کا تعلق امر مشروع سے ہی ہوتا ہے اور امر تکلیفی یہاں مراد نہیں بلکہ قضاء وتقدیر مراد ہے۔

وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ یعنی تم پر یہ مصیبت مختلف مصالح کی وجہ سے آئی اور اس لئے بھی کہ اللہ مومنوں کو دیکھ لے اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لے جنہوں نے نفاق کا برتاؤ کیا۔ یعنی لوگوں کی نظر میں دونوں گروہ الگ الگ آجائیں ان کا ایمان اور ان کا کفر پہچان لیا جائے۔

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ اور منافقوں سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا (کم سے کم) دفعیہ ہی کرو۔ مطلب یہ کہ اگر طاقت رکھتے ہو تو اللہ کی راہ میں کافروں سے جہاد کرو ورنہ مسلمانوں کی جماعت بڑھانے کے لئے اپنی جگہ جمے رہو فرار نہ کرو تاکہ دشمنوں کی مدافعت ہی ہو جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر سچے مومن ہو تو اخلاص کے ساتھ کافروں سے لڑو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے (اور اخلاص نہیں رکھتے) تو اپنے بچوں کی طرف سے ہی دشمنوں کو دفع کرو۔

قَالُوا انہوں نے کہا یعنی عبداللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھی جن کی تعداد تین سو تھی مسلمانوں کے مذکورہ بالا قول کے جواب میں کہنے لگے۔

لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ اگر ہم (اس ٹکراؤ کو) لڑائی جانتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے مگر یہ تو جنگ نہیں خودکشی ہے یا یہ مطلب کہ اگر تم حق پر ہوتے اور ہم اس جنگ کو راہ خدا میں جنگ سمجھتے تو تمہارا ساتھ دیتے یا یہ مطلب کہ اگر ہم سمجھتے کہ یہ لڑائی ہمارے ساتھ ہے تو ہم تمہارا ساتھ دیتے مگر یہ لڑائی تو ہمارے ساتھ نہیں مشرکوں کو صرف تم سے لڑنا مقصود ہے یا یہ مطلب کہ اگر ہم اچھی طرح لڑنا جانتے تو تمہارا ساتھ دیتے۔ اس صورت میں یہ قول محض استہزاء کے طور پر کہا تھا۔

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ وہ منافق جتنے ایمان سے قریب تھے اس روز اس سے زیادہ کفر کے قریب ہو گئے (یا قریب تھے) یعنی منافق ایمان وکفر کے درمیان چکر میں تھے جیسے اجنبی بکری دو گلوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اگر اسلام میں ان کو کچھ دنیوی فائدہ مل گیا تو اطمینان سے رہے اور اگر کچھ دکھ پڑ گیا تو کفر کی طرف پلٹ گئے۔ جنگ احد میں مصیبت آپڑی تھی اور یہ آزمائش تھی پس منافق اس روز کفر سے زیادہ قریب ہو گئے یہ ہی پہلا دن تھا جس میں ان کا کفر اور نفاق ظاہر ہوا۔ یا یہ مطلب ہے کہ بہ نسبت اہل ایمان کے کافروں سے ان کی مدد زیادہ قریب تھی کیونکہ مسلمانوں سے ان کا بچھڑ جانا اور مندرجہ بالا الفاظ کہنا اہل شرک کی قوت اور مسلمانوں کے ضعف کا باعث ہوا۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وہ اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ یعنی اسلام کو منہ سے ظاہر کرتے ہیں اور دلوں میں کفر پوشیدہ ہے۔ قول کی نسبت منہ کی طرف کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام پر ان کا عقیدہ نہیں کہ دل سے اقرار کریں ان کا ایمان صرف زبانی ہے جو ہیچ ہے۔ اس جملہ میں منافقوں کی عام حالت کو بیان کیا ہے۔ صرف احد کے دن کی خصوصی حالت کا اظہار نہیں ہے اسی لئے الگ یعنی بغیر عطف کے یہ جملہ ذکر کیا گیا۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ اور جس بات کو وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اس سے بخوبی واقف ہے یعنی ان کے نفاق کو خوب جانتا ہے۔

الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ یہ وہی لوگ ہیں کہ خود تو جنگ سے بیٹھ رہے اور اس حالت میں اپنے ان نسبی بھائیوں کے متعلق جو جنگ میں مارے گئے انہوں نے کہا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے یعنی ہماری طرح جنگ سے بیٹھ رہتے تو جس طرح ہم نہیں مارے گئے وہ بھی نہ مارے جاتے۔

marfat.com

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ اے محمد ﷺ آپ ان سے کہہ دیں کہ اب تو اپنی جانوں سے موت کو دفع کرو اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ تدبیر تقدیر کو ٹال دیتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ اور جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو۔ ترمذی نے باسناد حسنؒ اور ابن خزیمہؒ نے بسند صحیح اور ابن ماجہ اور بغوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ مجھے ملے اور فرمایا جابرؓ کیا سبب ہے میں تجھے کچھ شکستہ (خاطر) دیکھ رہا ہوں، میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرا باپ شہید ہو گیا اور اس کے بچے رہ گئے اور اس پر قرض بھی ہے فرمایا کیا تجھے بشارت نہ دوں کہ اللہ تیرے باپ سے کس طرح ملا، میں نے عرض کیا کیوں نہیں فرمائیے۔ ارشاد فرمایا اللہ نے جس سے بھی کلام کیا پردہ کی اوٹ سے کیا مگر تیرے باپ کو زندہ کر کے رو در رو کلام کیا اور فرمایا میرے بندے اپنی آرزو مجھ سے بیان کر میں تجھے دوں گا۔ تیرے باپ نے کہا میرے رب مجھے پھر زندہ کر دے کہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں اللہ نے فرمایا میرا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے کہ (مرنے کے بعد) پھر وہ نہیں لوٹیں گے۔ راوی کا بیان ہے پھر ان شہداء کے بارے میں نازل ہوئی آیت لاتحسبن الذین قتلوا الخ۔

مسلم، امام احمد، ابوداؤد، حاکم اور بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ احد کے دن جب تمہارے بھائی مارے گئے تو اللہ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے پوٹوں میں داخل کر دیا وہ جنت کی نہروں پر اترتے ہیں (یعنی انہار جنت کا پانی پیتے ہیں) جنت کے پھل کھاتے ہیں اور جنت میں جہاں چاہتے ہیں سیر کرتے پھرتے ہیں اور لوٹ کر سونے کی ان قندیلوں میں چلے جاتے ہیں جو عرش کے نیچے آویزاں ہیں۔ جب انہوں نے اپنی عمدہ خواب گاہ اور کھانا پینا دیکھا اور اللہ نے ان کے لئے جو عزت فراہم کی ہے اس کا معاینہ کیا تو بولے کاش ہماری قوم کو ہماری اس موجودہ راحت کی اور اس سلوک کی جو اللہ نے ہمارے ساتھ کیا اطلاع ہو جاتی تاکہ ان کو بھی جہاد کی رغبت ہوتی اور وہ جہاد سے روگرداں نہ ہوتے، اللہ نے فرمایا میں تمہاری طرف سے اطلاع دے دوں گا اور تمہارے بھائیوں کو خبر پہنچا دوں گا، شہداء یہ سن کر خوش اور ہشاش بشاش ہو گئے پس اللہ نے (آیت مذکورہ) نازل فرما دی۔

ابن المنذرؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ جب حضرت حمزہؓ اور آپ کے ساتھی احد کے دن شہید ہو گئے تو شہداء نے کہا کاش کوئی خبر پہنچانے والا ہمارے بھائیوں کو اللہ کی عطا کردہ اس عزت کی جس میں ہم آ گئے ہیں اطلاع دے دیتا، اللہ نے ان کو وحی بھیجی کہ میں تمہارے بھائیوں کو تمہارا پیام پہنچا دوں گا پس اللہ نے آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا ......لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ، تک نازل فرمائی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ شہداء کے اعزہ و اقارب کو جب (دنیا میں) کچھ راحت اور نعمت ملتی تو ان کو افسوس ہوتا کہ ہم تو ایسے مزے میں ہیں اور ہمارے باپ بھائی بیٹے قبروں میں ہیں (کاش وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے) اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ لاتحسبن کا خطاب یارسول اللہ ﷺ کو ہے یا شہیدوں کے اقارب کو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منافقوں کو خطاب ہو کیونکہ (بطور طعن) انہوں نے کہا تھا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا، اس وقت یہ آیت قل کے ذیل میں داخل ہو گی (یعنی قل کا مفعول ہو گی)۔

سبیل اللہ سے مراد ہے جہاد، یہ لفظ عام ہے ہر راہ خیر میں مرنے والے کو شامل ہے مگر لفظ قتل کی وجہ سے دوسرے خیر کے راستوں میں مرنے والوں کو صراحۃً شمول نہ ہو گا مگر بدلالت نص بدرجہ اولیٰ یا کم سے کم بالمساوات شمول ہو جائے گا یا نفس کے ساتھ جہاد ہونے والے کو مقتول فی سبیل اللہ پر قیاس کیا جائے گا کیونکہ اپنے نفس سے جہاد کرنا جہاد اکبر ہے اور جہاد اصغر سے زیادہ سخت ہے، اموات سے مراد ہیں وہ مرے جن کو لذت و راحت کا احساس نہ ہو۔

بَلْ اَحْيَاۗءٌ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ ابوالعالیہ نے اس فقرہ کی تشریح میں کہا کہ وہ سبز پرندوں کی شکلوں پر ہیں جنت کے اندر جہاں چاہتے ہیں اڑتے ہیں، رواہ ابو حاتم، بغوی نے لکھا ہے کہ روز قیامت تک ہر رات عرش کے نیچے ان کی روحیں رکوع

marfat.com

اور سجدہ کرتی رہیں گی۔

ابن مندہ راوی ہیں کہ حضرت طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہمانے فرمایا میں جنگل میں اپنے اونٹوں کی تلاش میں گیا وہاں مجھے رات ہو گئی تو میں عبداللہ بن عمرو بن حرام کی قبر کے پاس قیام پذیر ہو گیا وہاں قبر کے اندر سے مجھے قرآن پڑھنے کی ایسی اچھی آواز آئی کہ اس سے بہتر آواز میں نے نہیں سنی، میں نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا تذکرہ کیا فرمایا وہ عبداللہ تھا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ نے ان (شہداء) کی ارواح قبض کرنے کے بعد زمرد یا قوت کی قندیلوں میں رکھ کر وسط جنت میں ان قندیلوں کو لٹکا دیا ہے جب رات ہوتی ہے تو ان کی روحیں واپس لوٹا دی جاتی ہیں اور رات بھر ایسی ہی رہتی ہیں پھر فجر نکلتی ہے تو روحوں کو پھر ان کے اصل مقامات پر (قندیلوں کے اندر) واپس کر دیا جاتا ہے، اس قول پر شہید کو مرنے کے بعد کی طاعات کا ثواب اور درجے بھی ملتے رہتے ہیں، اور شہید قبر کے اندر گلتا سڑتا نہیں اور نہ اس کو زمین کھاتی ہے یہ اس کی زندگی کے نشانوں میں سے ایک نشان ہوتا ہے۔

بیہقی نے اپنی سندوں سے اور ابن سعد و بیہقی نے دوسرے طریقوں سے اور محمد بن عمرو نے اپنے مشائخ کی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا جب معاویہؓ نے چشمہ (نہر) جاری کر لیا تو ہم اپنے شہداء احد کے مزاروں پر چیختے ہوئے پہنچے اور ان کو باہر نکالا تو دیکھا وہ تر و تازہ ہیں اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں (زندہ کی طرح) لچک ہے محمد بن عمرو کے مشائخ کا بیان ہے کہ لوگوں نے حضرت جابرؓ کے والدؓ کو ایسی حالت میں پایا کہ ان کا ہاتھ اپنے زخم پر رکھا ہوا تھا جب ہاتھ زخم سے الگ کیا گیا تو خون ابلنے لگا مجبوراً ہاتھ کو پھر اس کی جگہ لوٹا دیا گیا تو خون تھم گیا، حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے باپ کو قبر کے اندر دیکھا معلوم ہوتا ہے کہ سو رہے ہیں اور جس دھاریدار کمبلی کا ان کو کفن دیا گیا تھا وہ بھی ویسی ہی تھی حالانکہ اس کو چھیالیس برس ہو چکے تھے، ان شہداء میں ایک شخص کی ٹانگ میں (زمین کھودتے وقت) پھاوڑا لگ گیا تو اس سے خون ابل پڑا مشائخ نے کہا یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تھے، حضرت ابو سعیدؓ خدری نے فرمایا اس کے بعد کوئی منکر (حیات شہداء کا) انکار نہیں کر سکتا، لوگ (ان مزاروں کی) مٹی کھودتے تھے جب تھوڑی سی ہی مٹی کھودتے تھے تو مشک کی خوشبو مہکنے لگتی تھی۔

بغوی نے حضرت عبید بن عمیر کا بیان نقل کیا ہے کہ احد سے واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ کا گذر حضرت مصعب بن عمیر (شہید احد) کی طرف سے ہوا مصعب شہید ہو چکے تھے آپ ان کے پاس کھڑے ہو گئے اور ان کے لئے دعا کی پھر یہ آیت پڑھی من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه، پھر فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ قیامت کے دن یہ سب اللہ کے نزدیک شہید ہوں گے، متنبہ ہو جاؤ تم ان کے پاس آیا کرو ان کی زیارت کیا کرو اور ان کو سلام کہا کرو، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے قیامت تک جو کوئی ان کو سلام کرے گا وہ ضرور اس کے سلام کا جواب دیں گے۔

حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت خبابؓ بن ارت کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت مصعبؓ بن عمیر کی طرف سے گزرتے، حضرت مصعبؓ حضور ﷺ ہی کے راستہ پر شہید پڑے تھے آپ وہاں ٹھیر گئے ان کے لئے دعا کی پھر پڑھا من المومنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه، اس کے بعد ارشاد فرمایا میں نے تجھے مکہ میں دیکھا تھا کہ تجھ سے زیادہ مکہ میں نہ کوئی خوش لباس تھا نہ حسین بالوں والا (یعنی نہ تجھ سے زیادہ خوش جمال اور آج اللہ کی راہ میں تیری یہ حالت ہو گئی کہ تجھے مثلہ کیا گیا)۔

سوال :- کیا شہید کے مرتبہ کو کوئی اور پہنچ سکتا ہے۔

جواب :- ہاں پہنچ سکتا ہے شہداء کے فضائل جو کچھ بیان کئے گئے ہیں ان کا اقتضاء یہ نہیں کہ دوسرے وہاں تک نہ پہنچیں۔ ابو داؤد اور نسائی نے حضرت عبیدؓ بن خالد کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں میں بھائی چارہ کرا دیا ان میں سے ایک راہ خدا میں شہید ہو گیا پھر تقریباً ایک جمعہ کے بعد دوسرا بھی مر گیا لوگوں نے اس کی نماز پڑھی رسول اللہ ﷺ نے

marfat.com

فرمایا تم نے (نماز میں اس کے لئے) کیا کہا لوگوں نے عرض کیا ہم نے اللہ سے دعا کی کہ اللہ اس کی مغفرت فرمادے اس پر رحم کرے اور اس کو اس کے ساتھی تک پہنچادے (یعنی اس کو بھی شہید کا درجہ مل جائے) حضور ﷺ نے فرمایا تو پھر اس کی نمازوں کے بعد اس کی نمازیں اور اس کے اعمال کے بعد والے اس کے اعمال یا فرمایا اس کے روزوں کے بعد والے اس کے روزے کہاں جائیں گے ان دونوں کے درمیان (مرتبہ) کا فاصلہ تو اتنا ہے جتنا آسمان زمین کا (یعنی بعد کو مرنے والا پہلے شہید ہونے والے سے مرتبہ میں بہت اونچا ہے اس کی نمازیں اور روزے اس سے زائد ہیں) انبیاء، شہداء، صدیقین اور مومنین کے مقامات کا بیان ہم نے سورۂ المطففین میں کیا ہے۔ اور حیاۃ شہداء کا مسئلہ سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ کی تفسیر کے ذیل میں ذکر کر دیا ہے۔

عِنْدَ رَبِّهِمْ اپنے رب کے پاس یعنی اللہ کے قرب میں جو بلا کیف ہے (جسمانی اور مکانی نہیں، انضمامی، ارغامی اور نسبی نہیں ان سب سے الگ ایک ایسا قرب ہے جس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی نہ سمجھی جاسکتی ہے یعنی قرب اعزازی ہے)۔

شیخ شہید نے جو میرے شیخ و امام تھے (غالباً حضرت مولف قدس سرہٗ کی شیخ شہید سے مراد حضرت مرزا مظہر جانؒ جاناں کی ذات مبارک ہے) کہ شہداء پر تجلیات ذاتیہ کی بارش کو کشف کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانیں دے دیں اور اللہ نے فرمایا ہے وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ پس ان لوگوں نے اپنے لئے اپنی ذاتیں (ہستیاں) خرچ کر دیں لہٰذا اللہ بھی ان کو خاص تجلیات ذاتیہ عطا فرمائے گا۔

يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ یعنی ان کو جنت سے رزق دیا جاتا ہے یہ ان کے زندہ ہونے کی تائید ہے۔

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اللہ جو کچھ ان کو اپنے فضل سے عطا فرماتا ہے وہ اس پر خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہاں تک کسی عقل کی رسائی نہیں نہ اس کی تفصیل لفظوں میں بیان کی جاسکتی ہے۔

عبد الرزاق نے مصنف میں اور ابن ابی شیبہؒ نے اور احمدؒ اور مسلمؒ اور ابن المنذرؒ نے مسروق کا قول بیان کیا ہے کہ ہم نے حضرت عبد اللہؓ یعنی ابن مسعودؓ سے ان آیات کی تشریح پوچھی فرمایا ہم نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا ان کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتی ہیں۔ عبد الرزاق کی روایت میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کی طرح ہوتی ہیں (بہر حال) ان پرندوں کے لئے سونے کی قندیلیں (پنجرے) عرش سے آویزاں ہیں وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی ہیں، پھر لوٹ کر قندیلوں میں آجاتی ہیں، اللہ ان کو ایک بار جھانکتا ہے اور فرماتا ہے کیا تم کچھ چاہتے ہو ایسا (روزانہ) تین بار کرتا ہے دوسری آیت میں آیا ہے کہ اللہ فرماتا ہے مجھ سے مانگو جو کچھ چاہو وہ جواب دیتے ہیں، اے رب ہم کیا مانگیں جس جنت میں ہم چاہتے ہیں سیر کرتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ بغیر مانگے ان کو نہیں چھوڑا جاتا تو عرض کرتے ہیں اے رب ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں کے اندر دوبارہ لوٹا دیا جائے تاکہ ہم ایک بار اور تیرے راستے میں جہاد کریں (اللہ فرماتا ہے میں لکھ چکا ہوں کہ دوبارہ دنیا میں لوٹنا نہیں ہوگا) آخر جب اللہ دیکھتا ہے کہ ان کی کوئی ضرورت (باقی) نہیں تو ان کو (ان کی حالت پر) چھوڑ دیا جاتا ہے۔

وَيَسْتَبْشِرُوْنَ اور وہ بشارت پائیں گے یعنی مسرور و خوش ہوں گے۔

بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ ان لوگوں کی جو ان سے نہیں ملے ہیں یعنی جن کو دنیا میں زندہ ایمان، اطاعت اور جہاد پر چھوڑ کر آئے تھے یا یہ مراد کہ جو مرتبہ میں ان کو نہیں پہنچے۔

مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ ان کے پیچھے والوں میں سے یعنی بعد کے زمانہ والے یا مرتبہ میں پیچھے رہنے والے۔

اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے نہ ان کو رنج ہے (یعنی نہ آئندہ تکلیف کا خوف ہے نہ دنیا کی زائل شدہ نعمت کا رنج) ممکن ہے آیت کا یہ معنی ہو کہ وہ اپنے ان بھائیوں کے سلسلہ میں جو ابھی نہیں مرے ہیں خوش ہوں کہ شہداء پر (زندہ) بھائیوں کی طرف سے کچھ اندیشہ نہیں یعنی بھائیوں کے حقوق جو شہداء کے ذمہ رہ گئے تھے

marfat.com

ان کا کوئی اندیشہ نہیں کیونکہ اللہ (شہداء کی طرف سے) اہل حقوق کو راضی کردے گا اور دعوئے سے دست بردار کرادے گا۔

میں کہتا ہوں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ شہداء کے بھائی بند اور دوست جو مرتبہ میں شہداء کے درجہ کو نہیں پہنچے شہداء ان کے معاملہ میں بشارت پائیں گے اور خوش ہوں گے کہ ان کے بھائی بندوں کو بھی عذاب کا کچھ اندیشہ نہیں اور نہ ان کو رنج ہوگا کیونکہ اللہ نے شہداء کو اپنے بھائی بندوں کی شفاعت کرنے کا حق عطا فرمایا ہے۔

ابوداؤد اور ابن حبان نے حضرت ابو درداءؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے شہید اپنے ستر گھر والوں کی شفاعت کرے گا، احمد اور طبرانی نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور ترمذیؒ و ابن ماجہؒ نے حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے، ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن انبیاء شفاعت کریں گے پھر علماء پھر شہداء بزاز نے بھی یہ حدیث لکھی ہے اور آخر میں اتنا زائد لکھا ہے پھر موذن۔ میں کہتا ہوں حدیث میں جن علماء کو شفاعت میں شہداء پر سبقت عطا فرمائی ہے شاید ان سے مراد وہ علماء راسخین ہیں جو حقیقت کے عالم ہیں۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ وہ بشارت پائیں گے یہ پہلے یستبشرون کی تاکید ہے یا پہلے سے دفع مضرت کی بشارت مراد ہے اور اس سے حصول منفعت کی۔

بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ اللہ کی طرف سے نعمت کی یعنی اعمال کے ثواب کی۔

وَفَضْلٍ اور (جزاء اعمال سے) زیادہ پانے کی بھی۔ اس سے مراد ہے دیدار الٰہی اور مراتب قرب، نعمۃ اور فضل کی تنوین ان دونوں کی عظمت شان کو ظاہر کر رہی ہے (کیونکہ تنوین کبھی عظمت قدر کا بھی اظہار کرتی ہے)۔

وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اور اس بات کی بھی ان کو بشارت ہوگی کہ اللہ اہل ایمان کے اجر کو اکارت نہیں کرے گا۔ ع ۱۷ ۸

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص راہ خدا میں جہاد کرے اور صرف جہاد فی سبیل اللہ (کا خیال) اور کلمۃ اللہ کی تصدیق ہی اسکے گھر سے نکلنے کا سبب ہو تو اللہ نے اس کے متعلق ذمہ لے لیا ہے کہ (اگر مر گیا تو) اسکو جنت میں داخل کرے گا یا اس گھر میں جس سے وہ نکلا ہے ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ واپس لے آئے گا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو کوئی راہ خدا میں زخمی ہوگا اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں زخم کھاتا ہے (اور کون نام آوری اور شہرت کے لئے زخمی ہوتا ہے) جب وہ قیامت کے دن (سامنے) آئے گا تو اس کے زخم سے خون ابلتا ہوگا جس کا رنگ تو خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی، رواہ البغوی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہید قتل کا دکھ بس اتنا (اتنی دیر) پاتا ہے جتنا (یعنی جتنی دیر) تم چیونٹی کے کاٹنے سے پاتے ہو، رواہ الدارمی والترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے، نسائی نے سنن میں اور طبرانی نے الوسط میں صحیح سند سے حضرت ابو قتادہؓ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے، آیت دلالت کر رہی ہے کہ مؤمنوں کا اجر ضائع نہ ہوگا خواہ کوئی مومن ہو، شہید ہو یا نہ ہو گویا شہداء کو سب مؤمنوں کی حالت سے خوشی ہوگی۔

بعض علماء نے کہا کہ اس آیت کا نزول شہداء بدر کے متعلق ہوا جن کی تعداد ۱۴ تھی، آٹھ انصاری اور چھ مہاجر، مگر یہ روایت ضعیف ہے، کسائی نے اَنَّ کی جگہ اِنَّ بکسر ہمزہ پڑھا ہے اور جملہ کو استینافیہ معترضہ کہا ہے گویا آیت اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ امر شہداء کے ایمان کا ہوگا کیونکہ جس کا ایمان نہ ہو اور اس کے تمام اعمال اکارت جائیں گے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس آیت کا نزول بئر معونہ کے شہداء کے حق میں ہوا جس کی تفصیل محمد بن اسحاق اور عبداللہ بن ابی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایت کی بناء پر اس طرح بیان کی ہے کہ عامر بن مالک بن جعفر عامری جس کا لقب مُلَاعِبُ الْاَسِنَّة تھا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو گھوڑے اور دو اونٹنیاں ہدیہ میں پیش کیں حضور ﷺ

marfat.com

نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمادیا میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارا ہدیہ قبول کرلوں تو مسلمان ہو جاؤ، وہ مسلمان نہیں ہوا لیکن اسلام سے دور بھی نہیں گیا (یعنی نفرت کا اظہار بھی نہیں کیا) اور بولا محمد (ﷺ) جس چیز کی تم دعوت دیتے ہو وہ ہے تو اچھی خوبصورت پس اگر تم اپنے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں کو اہل نجد کے پاس (دعوت دینے کے لئے) بھیج دو تو مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری دعوت کو قبول کرلیں گے حضور ﷺ نے فرمایا مجھے اہل نجد کی طرف سے اپنے آدمیوں کا خطرہ ہے۔ ابو براءؓ بولا میں ان کی پناہ کا ذمہ لیتا ہوں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت منذر بن عمر ساعدی کو ستر منتخب انصاری صحابہؓ کا سردار بنا کر سب کو بھیج دیا، ان ستر آدمیوں کو قاری کہا جاتا تھا (یعنی یہ سب قاری اور عالم قرآن تھے) انہی میں حضرت ابو بکرؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہ بھی تھے۔ یہ روانگی ماہ صفر ۴ھ میں ہوئی، غرض یہ لوگ چل دیئے اور بیر معونہ پہنچ کر پڑاؤ کیا، بیر معونہ کی زمین بنی عامر کی زمین اور بنی سلیم کے پتھریلے علاقہ کے درمیان واقع تھی یہاں پہنچ کر ان لوگوں نے حضرت حرامؓ بن ملحان کو رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک دے کر بنی عامر کے کچھ آدمیوں کے ساتھ عامر بن طفیل کے پاس بھیجا، حضرت حرامؓ نے پہنچ کر کہا کہ میں رسول ﷺ اللہ کا قاصد ہوں تمہارے پاس آیا ہوں میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ﷺ ہیں لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آؤ، حضرت حرامؓ کی اس تبلیغ کے بعد ایک شخص نیزہ لے کر گھر کی جھونپڑی سے برآمد ہوا اور آتے ہی حضرت حرامؓ کے پہلو پر برچھا مارا جو دوسرے پہلو سے نکل گیا۔ حضرت حرامؓ فوراً بول اٹھے، اللہ اکبر، رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا اس کے بعد عامر بن طفیل نے بنی عامر کو ان صحابیوںؓ کے خلاف چیخ کر آواز دی بنی عامر نے اس کی بات قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بولے ابو براء کی ذمہ داری کو نہ توڑو، عامر بن طفیل نے بنی سلیم کے قبائل عصیہ، رعل اور ذکوان کو پکارا انہوں نے آواز پر لبیک کہی اور نکل کر صحابہؓ پر چھا گئے اور فرودگاہ پر آکر سب کو گھیر لیا، صحابہؓ نے مقابلہ کیا یہاں تک کہ سب شہید ہو گئے، صرف کعبؓ بن زید بچ گئے اور وہ بھی اس طرح کہ کافر ان کو مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے مگر ان میں کچھ سانس باقی تھی اس لئے زندہ رہے اور آخر خندق کی لڑائی میں مارے گئے۔

حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں نے قید کر لیا تھا لیکن عمروؓ نے ان کو بتایا کہ میں قبیلہ مضر کا ہوں تو عامر بن طفیل نے ان کو چھوڑ دیا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ حرکت ابو براء کی ہے، ابو براء کو اس کی اطلاع ملی تو عامر بن طفیل کی طرف سے اس کو اپنی ذمہ داری کی شکست بہت بار گزری۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ عامر بن طفیل کہتا تھا ان میں وہ شخص کون تھا کہ جب وہ مارا گیا تو اس کو آسمان و زمین کے درمیان اٹھا لیا گیا، یہاں تک کہ آسمان مجھے اس سے نیچا نظر آنے لگا لوگوں نے کہا وہ عامر بن فہیرہؓ تھے۔

اس واقعہ کے بعد ابو براء کے بیٹے ربیعہ نے عامر بن طفیل پر حملہ کر دیا، عامر گھوڑے پر سوار تھا، ربیعہ نے اس کے نیزہ مارا اور قتل کر دیا، صحیحین میں بوساطت قتادہؒ حضرت انسؓ کا قول مروی ہے کہ رعل اور ذکوان اور عصیہ اور بنی لحیان کے قبائل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور دشمنوں کے خلاف رسول اللہ ﷺ سے (فوجی) مدد مانگی، حضور ﷺ نے ان کے ساتھ ستر انصاری جن کو ہم قاری کہتے تھے بطور مدد کر دیئے یہ حضرات دن میں لکڑیاں جمع کرتے (اور فروخت کر کے گزارا کرتے) اور رات کو نمازیں پڑھتے تھے جب یہ لوگ بیر معونہ پر پہنچے تو کافروں نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا اور (سب کو) شہید کر دیا، رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے ایک ماہ تک صبح کی نماز میں دعاء قنوت[1] پڑھی جس میں کچھ قبائل عرب یعنی رعل، ذکوان، عصیہ اور بنی لحیان کے لئے بد دعا کی۔

امام احمدؒ اور بخاریؒ اور مسلم اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی

[1] دعاء قنوت سے مراد قنوت نازلہ ہے۔ از مصحح

marfat.com

اللہ عنہ کی روایت سے اور بخاری نے عروہؒ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، ہمارے ساتھ کچھ لوگوں کو بھیج دیجئے جو ہم کو قرآن اور سنت کی تعلیم دیں، حضور ﷺ نے ان کے ساتھ ستر انصاری جن کو قاری کہا جاتا تھا بھیج دیئے، مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی یہ درخواست کرنے والے ان قاریوں کے درپے ہو گئے اور سب کو شہید کر دیا، شہداء نے کہا اے اللہ! ہمارے نبی کو یہ خبر پہنچادے، دوسری روایت میں آیا ہے کہ ہمارے بھائیوں کو یہ خبر پہنچا دے کہ ہم نے (اے اللہ) تجھے پالیا ہم تجھ سے راضی ہیں اور تو ہم سے راضی ہے اللہ نے وحی بھیجی کہ میں شہداء کی طرف سے (اے مسلمانو) تم کو یہ پیام پہنچاتا ہوں کہ اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے راضی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا پہلے ہم (قرآن میں) ان شہداء کے بارہ میں پڑھتے تھے، بلغو عنا قومنا انا قدلقينا ربنا فرضی عنا و ارهانا لیکن پھر یہ جملے منسوخ کر دیئے گئے (اور قرآن سے خارج کر دیئے گئے) اس واقعہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایک چلہ تک صبح کی نماز میں قبائل رعل، ذکوان، عصیہ اور بنی لحیان کے لئے بد دعا کی ان قبائل نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تھی۔

بغویؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول کے آخر میں اتنے الفاظ مزید نقل کئے ہیں کہ ہم اس کو ایک زمانہ تک پڑھتے رہے ہیں پھر اس کو اٹھالیا گیا اور اللہ نے نازل فرمایا ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا...... آخر آیت تک۔ میں کہتا ہوں آیت کے شان نزول میں اگرچہ اختلاف ہے جیسا سطور بالا سے ظاہر ہو رہا ہے لیکن آیت کے الفاظ تمام شہداء کو شامل ہیں اور حکم عام ہے۔

مسئلہ :- اجماع علماء ہے کہ شہید کو غسل نہ دیا جائے کیونکہ احد کے شہداء کو غسل نہیں دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے ہتھیار اور چمڑے (کا سامان) تو اتار لئے جائیں باقی خون اور کپڑوں سمیت دفن کر دیا جائے۔ رواہ ابو داؤد وابن ماجہ عن ابن عباسؓ۔

نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن ثعلبہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ ان کو خون سمیت چھپادو کیونکہ اللہ کی راہ میں جو شخص زخمی ہو گا وہ قیامت کے دن خون سمیت آئے گا اس کے خون کا رنگ تو خون کا سا ہو گا اور اس کی خوشبو مشک ہو گی۔ اسی مبحث کی ایک حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے آئی ہے کہ ایک آدمی کے سینہ میں تیر لگا جس سے اس کی موت ہو گئی اس کو انہی کپڑوں میں اور اسی طرح لپیٹ دیا گیا (اور دفن کر دیا گیا) اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ رواہ ابو داؤد باسناد علی شرط مسلم۔

مسئلہ :- اگر جنابت کی حالت میں کوئی شہید ہو جائے تو کیا اس کو غسل دیا جائے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک غسل دیا جائے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں غسل نہ دیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان زملوهم بدمائهم عام ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حضرت حنظلہ بن ابی عامرؓ کا قصہ ماخذ استدلال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فرشتے حنظلہ بن ابی عامرؓ کو آسمان و زمین کے درمیان سفید ابر کے پانی سے چاندی کے برتنوں میں غسل دے رہے تھے۔ ابو اسید ساعدی کا بیان ہے ہم نے جا کر حنظلہؓ کی نعش کو دیکھا تو ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا میں نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی، حضور ﷺ نے ان کی بیوی کے پاس دریافت حال کے لئے آدمی بھیجا بیوی نے کہا وہ جنابت کی حالت میں باہر گئے تھے۔ حنظلہؓ کی اولاد کو اسی لئے غسیل الملائکہ (فرشتوں کے غسل دیئے ہوئے) کی اولاد کہا جاتا ہے۔

ابن الجوزی نے اس حدیث کو محمد بن سعدؒ کی روایت سے مرسلاً اور ابن حبان اور حاکم اور بیہقی نے ابن اسحاق کے سلسلہ سے (بقول حافظ) مسنداً نقل کیا ہے حاکم نے اکلیل میں ابو اسید کی روایت سے بھی اس کو نقل کیا ہے لیکن اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی و بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے لیکن حاکم کی

marfat.com

روایت میں معلّٰی بن عبدالرحمٰن راوی متروک ہے اور طبرانی کی اسناد میں حجاج مدلس ہے اور بیہقی کی سند میں ابوشیبہ واسطی ضعیف ہے۔

مسئلہ :- شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے (امام ابوحنیفہ وامام مالکؒ) نہ پڑھی جائے (امام شافعیؒ) امام احمد کے دونوں قول روایت میں آئے ہیں۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نماز یا گناہوں کی مغفرت کے لئے ہے یا میت کی عزت افزائی اور ترقی درجات کے لئے اور شہید عزت افزائی کا زیادہ مستحق ہے اگر نماز نہ پڑھنے میں تکریم میت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس کے زیادہ مستحق تھے، آپ کی نماز نہ پڑھی جاتی حالانکہ اجماعاً آپ کی نماز پڑھی گئی۔ پھر اصل نماز ہی ہے (جب تک کوئی شرعی معنی ہو ترک کرنا ناجائز ہے) امام شافعیؒ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ احد کے شہدا میں دو دو کو رسول اللہ ﷺ ایک کپڑے میں جمع کر کے فرماتے تھے ان دونوں میں قرآن کس کو زیادہ یاد تھا جب ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو آپ اس کو لحد میں پہلے اترواتے۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میں قیامت کے دن ان سب کا گواہ رہوں گا۔ پھر آپ ﷺ نے سب کو انہی کے کپڑوں میں دفن کرنے کا حکم دے دیا اور ان کی نماز نہیں پڑھی نہ ان کو غسل دیا گیا۔ رواہ البخاری والنسائی وابن ماجۃ وابن حبان۔

حضرت انسؓ کی بھی روایت ہے کہ احد کے دن رسول اللہ ﷺ نے دو دو، تین تین آدمیوں کو ایک ہی کپڑے کا کفن دلوایا اور ان کو دفن کرایا اور ان کی نماز نہیں پڑھی رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والحاکم۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے مگر بخاریؒ نے اس کو معلل قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اسامہؓ بن زید کی روایت عن زہریؒ عن انسؓ غلط ہے۔ بخاریؒ نے مذکورہ بالا حضرت جابرؓ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے شہداء احد کی نماز اس لئے نہ پڑھی ہو کہ آپ خود زخمی ہو گئے تھے اور دندان مبارک بھی شہید ہو گیا تھا بہت ممکن ہے دوسروں نے پڑھی ہو اس احتمال کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے مراسیل میں اور حاکم اور طحاوی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت امیر حمزہؓ کی طرف سے گزرے آپ رضؓ کی میت کو مثلہ کر دیا گیا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت حمزہؓ کے علاوہ (احد کے دن) اور کسی شہید کی نماز نہیں پڑھی۔ طحاوی کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں قیامت کے دن تمہارا سب کا گواہ ہوں گا۔

ایک شبہ :- یہ حدیث دار قطنی نے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ سوائے عثمانؓ بن عمرو کے اور کسی راوی نے یہ آخری جملہ (کہ حمزہؓ کے علاوہ اور کسی شہید کی نماز نہیں پڑھی) نہیں بیان کیا بس یہ زیادتی (حدیث میں) محفوظ نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ عثمان سے تخریج حدیث صحیحین (بخاری و مسلم) میں کی گئی ہے۔ (معلوم ہوا کہ عثمان ثقہ ہے) اور ثقہ اگر حدیث میں کچھ زیادہ بیان کرے تو قابل قبول ہے۔ طحاویؒ نے لکھا ہے کہ اگر شہید کی نماز نہ پڑھنا سنت ہوتا تو رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہؓ کی نماز نہیں پڑھتے حالانکہ آپ کے شرف وفضل سے حضور ﷺ نے آپ کی میت کی نماز پڑھی البتہ دوسروں کی نہیں پڑھی کیونکہ حضور ﷺ کو خود (زخموں کا) دکھ تھا۔ پھر نماز نہ پڑھنے کی احادیث کے خلاف مختلف صحابہؓ سے متعدد احادیث آئی ہیں۔ مثلاً حضرت جابرؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ جب لوگ لڑائی سے (واپس) آئے تو رسول اللہ ﷺ نے حمزہؓ پر چادر ڈال دی پھر میت کو لایا گیا اور آپ نے اس کی نماز پڑھی۔ پھر دوسرے شہدائے کو لا کر حمزہؓ کے برابر رکھ دیا گیا اور آپ ﷺ نے ان کی نماز پڑھی پھر دوسرے شہداء کو اٹھالیا جانے لگا لیکن حمزہؓ کو (وہیں) چھوڑ دیا گیا آخر تمام شہداء کی نماز حضور ﷺ نے پڑھی اور فرمایا قیامت کے دن اللہ کے نزدیک حمزہؓ سید الشہداء ہوں گے۔

اس حدیث کو حاکم نے نقل کر کے صحیح الاسناد کہا ہے مگر اس کی سند میں ایک شخص مفضل بن صدقہ ابوحماد حنفی ہے جس کو بعض لوگوں نے متروک کہا ہے اور نسائی ویحییٰ نے بھی اسکو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اہوازی کا بیان ہے کہ عطاء بن مسلم اس کو ثقہ جانتے تھے اور احمد بن محمد بن شعیب اس کی پوری پوری تعریف کرتے تھے اور ابن عدی نے کہا کہ مجھے اس میں کوئی

marfat.com

خرابی نظر نہیں آتی۔ بہر حال یہ حدیث حسن کے درجے سے گری ہوئی نہیں ہے۔

ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر حضرت حمزہؓ (کی میت کو چادر سے ڈھانک دیا گیا اور آپ نے ان کی نماز سات تکبیروں کے ساتھ پڑھی پھر دوسرے شہداء کو لا کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے برابر رکھا جانے لگا اور حضور ﷺ شہداء کی اور ان کے ساتھ حضرت حمزہؓ کی نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ حمزہؓ کی نماز بہتر مرتبہ پڑھی۔ یہ حدیث ابن اسحاق نے نقل کی ہے اور صراحت کی ہے کہ مجھ سے یہ حدیث ایک ایسے شخص نے بیان کی جس کو میں (کذب سے) متہم نہیں کرتا اور اس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام مقسم نے بیان کی ہے مقسم سے حضرت ابن عباسؓ نے اس کو بیان کیا۔

مقدمہ مسلم میں عن شعبۃ عن الحسن بن عمارۃ عن الحکم عن مقسم عن ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہداء احد کی نماز پڑھی۔ لیکن میں نے حکم سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ حضورؐ نے شہداء احد کی نماز نہیں پڑھی۔ سہیلی نے کہا کہ حسن بن عمارہ ضعیف ہے۔ حافظ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث حاکم اور ابن ماجہ اور طبرانی اور بیہقی سب نے یزید بن زیاد کی وساطت سے بروایت مقسم عن ابن عباسؓ بیان کی ہے۔ حافظ نے کہا کہ یزید میں کسی قدر ضعف ہے ابن جوزی نے کہا اس کو پھینک دو۔ بخاریؒ نے کہا یہ منکر الحدیث ہے۔ نسائی نے کہا یہ متروک ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حمزہ کی ستر نمازیں پڑھیں۔ رواہ احمد۔ یہ حدیث بھی ضعیف ہے مگر ابن ہمام نے کہا ہے کہ حسن کے درجہ سے گری ہوئی نہیں ہے۔ ایک حدیث ابو مالکؒ غفاری (تابعی) کی روایت کردہ ہے جس کی تخریج ابو داؤد نے مراسیل میں کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہداء احد کی دس دس کی نماز (یکجائی) پڑھی اور ہر دس میں حمزہؓ (کا جنازہ) شامل تھا یہاں تک کہ حمزہ کی ستر نمازیں پڑھیں۔ حافظؒ نے کہا اس حدیث کے راوی ثقات ہیں اور ابن مالک تابعی تھے جن کا نام عزدان تھا۔

امام شافعیؒ نے اس حدیث کو معلل قرار دیا ہے کیونکہ اس کے مضمون میں خود باہم ٹکراؤ ہے کیونکہ شہداء ستر تھے جب دس دس کی ٹولی کی نماز پڑھی تو کل سات نماز ہوئیں (ستر کیسے ہوئیں) شافعیؒ کے اس اعتراض کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ حدیث کا مطلب (یہ نہیں ہے کہ دس دس کی ٹولی کی ستر نمازیں پڑھیں بلکہ) یہ ہے کہ ستر آدمیوں کی نمازیں پڑھیں اور ہر ایک کی نماز میں حمزہؓ کی میت کی نماز شامل تھی۔ ان احادیث کے اجتماع سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ شہداء کی نماز پڑھی گئی۔ مذکورہ بالا احادیث مختلفہ میں تطبیق اس طرح دی جائے گی کہ جس حدیث میں شہداء احد کی نماز پڑھنا مذکور ہے اس میں نماز پڑھنے کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف مجازی ہے یعنی آپ ﷺ نے نماز پڑھنے کا حکم دیا (خود نہیں پڑھی) اور جس حدیث میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہداء احد کی نماز نہیں پڑھی تو یہ کلام حقیقی ہے یعنی خود نہیں پڑھی اور جس روایت میں تفصیل آئی ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نماز حضورؐ نے پڑھی دوسروں کی نہیں تو یہ واقعہ کا صحیح بیان ہے۔

اس موضوع کی ایک حدیث وہ ہے جو نسائی اور طحاویؒ نے شداد بن ہاد کی روایت سے مرسلاً بیان کی ہے کہ ایک اعرابی خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور ایمان لا کر حضور ﷺ کا پیرو بن گیا اور عرض کیا میں حضور ﷺ کے ہم رکاب ہجرت کروں گا رسول اللہ ﷺ نے اس کی نگہداشت ایک صحابیؓ کے سپرد کر دی اس کے بعد کوئی جہاد ہوا جس میں رسول اللہ ﷺ کو کچھ چیزیں مال غنیمت کی ملیں آپ ﷺ نے وہ مال تقسیم کیا تو اس اعرابی کا بھی حصہ دیا۔

اس حدیث میں آیا ہے کہ اعرابی نے عرض کیا میں نے آپ کی پیروی اس غرض کے لئے نہیں کی بلکہ اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (کہا) اس لئے کی ہے کہ اس جگہ میرے تیر لگے اور میں مر جاؤں اور جنت میں چلا جاؤں۔ اس حدیث (کے آخر) میں ہے کہ اس شخص کو (شہید ہونے کے بعد) اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا اور جس جگہ اس نے اشارہ کیا وہیں اس کے تیر لگا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا وہی ہے صحابہؓ نے عرض کیا جی ہاں۔ حضور ﷺ نے اس کو آگے رکھا اور اس

marfat.com

کی نماز پڑھی اور نماز میں جو الفاظ ظاہر طور پر فرمائے تھے وہ یہ تھے اے اللہ یہ تیرا بندہ تیری راہ میں ہجرت کر کے نکلا تھا اور شہید ہو گیا میں اس کی شہادت دیتا ہوں۔ یہ حدیث مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل حدیث بھی حجت (کسی مسئلہ کی محکم دلیل) ہے۔

فصل :۔ بخاریؒ وغیرہ نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہداء احد کی نماز آٹھ برس کے بعد یعنی اپنی وفات سے کچھ پہلے پڑھی۔ بیہقی نے اس حدیث میں لفظ صلوۃ سے دعا مراد لی ہے (یعنی حضور ﷺ نے آٹھ برس کے بعد شہداء احد کے لئے دعا کی) مگر یہ تاویل لغو ہے کیونکہ آٹھ برس کے بعد دعا صرف ایک بار کی ہو یہ قطعاً لغو ہے بلکہ طحاوی وغیرہ کی بعض روایات میں ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث آئی کہ ایک روز رسول ﷺ نے باہر نکل کر احد والوں کی نماز ایسی پڑھی جیسی میت کی نماز ہوتی ہے۔

اگر شبہ کیا جائے کہ احناف کے نزدیک تو تین روز کے بعد میت کی نماز جائز ہی نہیں ہے (اور مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آٹھ برس بعد کا ہے پھر حنفیہ کے پاس اس کا کیا جواب ہے) تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ چونکہ تین روز کے اندر قبر میں مردہ پھٹ جاتا ہے (اور اس کا بدن اپنی ہیئت ترکیبی پر نہیں رہتا) اس لئے حنفیہ تین روز کے بعد جنازہ کی نماز کی اجازت نہیں دیتے لیکن شہید کے متعلق تو ثابت ہو چکا ہے کہ اس کو زمین نہیں کھاتی اور وہ ہمیشہ ویسا ہی رہتا ہے جیسا دفن کے دن ہوتا ہے اس لئے اس کی نماز (خواہ کتنی ہی مدت کے بعد ہو) جائز ہے اور اس کی صحت رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے (پھر انکار کی کوئی وجہ نہیں) الخ۔

فریابی نسائی اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب مشرک احد سے واپس چلے گئے تو آپس میں کہنے لگے تم نے بڑی غلطی کی نہ محمد کو قتل کر سکے نہ نوجوان عورتوں کو (لوٹ کر) اپنی پشت کے پیچھے سوار کر کے لائے اب لوٹ پڑو۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سنی تو مسلمانوں کو بلوایا سب نے دعوت پر لبیک کہی (اور حاضر ہو گئے)۔

محمد بن عمرؓ کی روایت ہے کہ جب سنیچر کے دن ۱۵ ر تاریخ کو احد سے لوٹے تو دشمن کے لوٹ پڑنے کے اندیشہ سے خزرج اور اوس کے سرداروں نے حضور ﷺ کے دروازہ پر ہی رات گزاری ۱۶ ر تاریخ اتوار کے دن کی فجر نکلی تو بلالؓ نے اذان دی اور حضور ﷺ کا انتظار کرنے لگے، حضور ﷺ برآمد ہوئے تو ایک مزنی شخص نے اطلاع دی کہ مشرک جب روحاء پر پہونچے تو ابو سفیان نے کہا (مدینہ کو) لوٹ چلو تاکہ جو لوگ باقی رہ گئے ہیں ہم ان کا جڑ سے صفایا کر دیں، صفوان بن امیہ نے انکار کر دیا اور کہنے لگا لوگو ایسا نہ کرو وہ لوگ شکست کھا چکے ہیں اب مجھے اندیشہ ہے کہ خزرج کے جو لوگ رہ گئے تھے وہ تمہارے خلاف جمع ہو جائیں گے، اگر لوٹ کر جاؤ گے تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں تمہاری فتح شکست سے نہ بدل جائے لہٰذا (مکہ کو ہی) واپس چلو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صفوان سیدھے راستہ پر تو نہیں ہے مگر اس رائے میں وہ سب سے زیادہ صائب تھا۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ان لوگوں پر برسنے کے لئے تو (غیبی) پتھر نامزد کر دیئے گئے تھے اگر وہ لوٹ پڑتے تو گزرے ہوئے دن کی طرح گئے گزرے ہو جاتے (ان کا نشان بھی باقی نہ رہا) پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو بلوایا اور اس خبر کا تذکرہ ان سے کیا دونوں نے جواب دیا یا رسول اللہ دشمن کا تعاقب کیجئے کہیں وہ ہمارے بال بچوں پر سر نہ اٹھائیں اس مشورہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بلال کو حکم دیا کہ منادی کر دو کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کا تعاقب کرنے کا تم کو حکم دیتے ہیں لیکن ہمارے ساتھ آج وہی لوگ نکلیں جو کل لڑائی میں حاضر تھے۔

اسید بن حضیر جن کے نو زخم لگے تھے اور وہ ان کا علاج کرنا چاہتے تھے اس نداء کو سن کر بولے بسر و چشم ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر حاضر ہیں۔ حضرت اسید زخموں کے علاج کی طرف مائل ہی نہ ہوئے (اور حاضر ہو گئے) خاندان بنی سلمہؓ کے چالیس زخمی نکل کھڑے ہوئے، طفیلؓ بن نعمان کے ۱۳ زخم لگے تھے خراشؓ بن صمہ کو دس، کعب بن مالک کو کچھ اوپر دس اور عطیہؓ بن عامر کو نو۔ غرض مسلمانوں نے اپنے زخموں کے علاج کی طرف توجہ بھی نہ کی اور دوڑ کر اسلحہ اٹھا لئے۔

marfat.com

ابن عقبہؒ راوی ہیں کہ عبداللہ بن ابیؒ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں حضور ﷺ کے ہم رکاب چلوں فرمایا نہیں۔ ابن اسحاق اور محمد بن عمرؒ راوی کی روایت ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ نے حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ آپ ﷺ کے منادی نے ندا کی ہے کہ صرف وہی لوگ ہمارے ساتھ آج نکل کر چلیں جو کل جنگ میں شریک تھے میرا قصہ یہ ہے کہ میں جنگ میں شریک ہونے کا بڑا خواہشمند تھا۔ لیکن میرے والد نے مجھے اپنی جگہ میری سات یا نو بہنوں کا نگراں مقرر کیا تھا اور کہا تھا کہ ان عورتوں کو بغیر کسی مرد کی سرپرستی کے یونہی چھوڑ جانا نہ تیرے لئے مناسب ہے نہ میرے لئے اور میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد پر جانے کے لئے تجھے اپنے اوپر ترجیح نہیں دے سکتا شاید اللہ مجھے شہادت نصیب فرمادے (تو میری جگہ تو ان کی نگرانی رکھے گا) اور میں شہادت کی تمنا رکھتا ہوں۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں لڑکیوں کا نگراں ہو کر شرکت جہاد سے رہ گیا اور باپ مجھے نگراں چھوڑ کر شہید ہو گئے۔ اب یارسول اللہ ﷺ مجھے اپنے ہمرکاب جانے کی اجازت دیدیجئے۔

اس درخواست پر رسول اللہ ﷺ نے جابر کو اجازت دیدی۔ حضرت جابر کا بیان ہے بہت سے ان لوگوں نے جو گذشتہ دن جہاد میں شریک نہیں ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ سے اس روز نکلنے کی درخواست کی مگر حضور نے انکار کر دیا اور گذشتہ دن کے غیر حاضروں میں سے سوائے میرے کوئی نہ جاسکا۔

ابن اسحاق اور ان کے متبعین کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کو ڈرانے کے لئے تعاقب میں نکلے تھے تاکہ ان کو اطلاع پہنچ جائے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے تعاقب میں نکلے ہیں اور مسلمانوں میں قوت ہے اور گزشتہ دن کی شکست دشمن کے مقابلہ سے ان کو کمزور نہیں بنا سکی چنانچہ رسول اللہ ﷺ ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکلے ان لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عبدؓاللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ بن یمان اور حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح بھی شامل تھے۔

مدینہ سے نکل کر حمراء الاسد کے مقام پر پہنچے یہ مقام مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر راستہ سے بائیں ہاتھ کو ذوالحلیفہ جاتے ہوئے پڑتا ہے، سعد بن عبادہؓ نے تیس اونٹ سواری کے لئے دیئے تھے اور کچھ جانور ذبح کرنے کے لئے اس جگہ پہنچ کر پیر کے دن ۱۷ تاریخ کو اور منگل کے دن ۱۸ تاریخ کو اونٹ ذبح کئے گئے (اور قیام کیا گیا) دن میں لکڑیاں جمع کرنے کا حضور ﷺ نے حکم دیدیا تھا۔ شام ہوئی تو آگ جلانے کا حکم دیا۔ حسب الحکم ہر شخص نے آگ روشن کی اور کل پانچ سو جگہ آگ روشن کی گئی (تاکہ کافروں کو دور سے دیکھ کر مسلمانوں کی کثرت محسوس ہو)۔

معبد خزاعی جو اس زمانہ میں مشرک تھا، لیکن ابو عمرو اور ابن جوزی نے اس کے مسلمان ہونے کی قطعی صراحت کی ہے، رسول اللہ ﷺ سے ملا اور بنی خزاعہ کے مسلمان اور کافر سب تہامہ میں رسول اللہ ﷺ سے میل جول رکھتے تھے، حضور ﷺ سے ان کا معاہدہ تھا وہ تہامہ کی کوئی بات رسول اللہ ﷺ سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے معبد خزاعی نے کہا محمد ﷺ جو مصیبت آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر پڑی اس کا ہم کو بڑا دکھ ہوا، ہماری دلی خواہش تھی کہ اللہ (اس سے) آپ کو بچائے رکھتا اس کے بعد یہاں سے نکل کر معبد ابوسفیان کے پاس روحاء میں پہنچا۔ مشرکوں نے لوٹ کر رسول اللہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے ساتھیوں اور لیڈروں کو تو ہم ختم کر چکے ہیں اب لوٹ کر باقی لوگوں پر حملہ کر کے ان کی طرف سے بالکل بے غم ہو جائیں گے۔ ابوسفیان نے جو معبد کو دیکھا تو پوچھا ادھر کی کیا خبر ہے معبد نے کہا محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اتنی بڑی فوج لے کر تمہاری تلاش میں نکلے ہیں کہ اتنی فوج میں نے کبھی نہیں دیکھی وہ تم پر دانت پیس رہے ہیں جو لوگ اس روز جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ اب ان کے ساتھ اکٹھے ہو گئے ہیں اور اپنی گذشتہ حرکت پر پشیمان ہیں ان کے اندر تمہارے اوپر اتنا شدید غصہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا غصہ نہیں دیکھا۔ ابوسفیان نے کہا ارے تیرا برا ہو کیا کہہ رہا ہے معبد نے کہا خدا کی قسم میرے خیال میں تم کوچ کرنے بھی نہ پاؤ گے کہ گھوڑوں کی پیشانیاں تم کو نظر آجائے گی۔ ابوسفیان نے کہا خدا کی قسم ہم تو یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ لوٹ کر ان پر حملہ کر دیں تاکہ ان کے باقی لوگوں کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، معبد نے کہا میں تم کو اس حرکت سے روکتا ہوں، معبد کے اس قول نے صفوان کے مشورہ کے ساتھ مل کر ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں

marfat.com

کا رخ موڑ دیا اور تعاقب کے ڈر سے وہ جلد جلد لوٹ پڑے۔

اسی اثناء میں ابوسفیان کی طرف سے عبدالقیس کے کچھ سوار گزرے ابوسفیان نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے سواروں نے کہا مدینہ کو غلہ لینے جارہے ہیں۔ ابوسفیان نے کہا کیا تم محمد ﷺ کو میری طرف سے ایک پیام پہنچادو گے اگر تم اس کام کو پورا کردو گے تو میں کل عکاظ میں تمہارے اونٹوں پر کشمش لادوں گا، سواروں نے کہاہاں، ابوسفیان نے کہاجب تم محمد ﷺ کے پاس پہنچو تو اس کو اطلاع دیدینا کہ ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ محمدؐ اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کریں گے تاکہ جو لوگ باقی رہ گئے ہیں ان کی بیخ کنی کردیں۔ یہ پیام بھیجنے کے بعد ابوسفیان مکہ کو چلا گیا اور سواروں نے جاکر مقام حمراء الاسد میں رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع دیدی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ یعنی پیر منگل اور بدھ تک قیام کیا اور اللہ نے آیت ذیل نازل کی۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ الذین مفعول ہے امدح فعل محذوف ہے یا مبتدا ہے اور آئندہ جملہ خبر ہے یا المؤمنین کی صفت ہے یعنی جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی دعوت جہاد کو قبول کیا یا ایسے مومن جنہوں نے اللہ اور رسول کی دعوت جہاد کو لبیک کہا۔

مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ جنگ احد میں زخموں کی تکلیف پہنچنے کے بعد۔ مع

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ ان میں سے جس نے نیک اعمال کئے اور تقویٰ اختیار کیا اس کے لئے بڑا اجر ہے۔ احسان اور تقویٰ کا ذکر بطور قید (یعنی بطور وصف تقیدی) نہیں ہے کیونکہ دعوت جہاد کو قبول کرنے والے سب ہی نیکوکار اور متقی تھے بلکہ ان دونوں کا ذکر بطور مدح ہے اور اجر عظیم ملنے کی علت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے [1] مجاہد اور عکرمہ نے اکثر اہل تفسیر کے خلاف صراحت کی ہے کہ اس آیت کا نزول غزوۂ بدر صغریٰ کے متعلق ہوا جس کی تفصیل یہ ہے کہ احد سے واپسی کے وقت ابوسفیان نے کہا محمد ﷺ اگر تم کو منظور ہو تو آئندہ سال بدر صغریٰ پر ہمارا تمہارا مقابلہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انشاء اللہ ہمارے تمہارے درمیان یہی ہوگا (یعنی آئندہ سال بدر صغریٰ پر فریقین کی جنگ ہوگی) اگلے سال ابوسفیان مکہ سے قریش کو لے کر چلا، کل تعداد دو ہزار تھی جن میں پچاس سوار تھے مکہ سے نکل کر مرالظہران کے اطراف میں بمقام مجنہ اس نے پڑاؤ کیا یہاں پہنچ کر اللہ نے اس کے دل میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا اور واپس ہوجانے کا خیال پیدا ہوگیا نعیم بن مسعود اشجعی عمرہ کرنے کے لئے آیا ہوا تھا (مجنہ میں) ابوسفیان سے اس کی ملاقات ہوئی ابوسفیان نے اس سے کہا نعیم میں نے محمد اور اس کے ساتھیوں کو چیلنج تو کردیا تھا کہ آئندہ ہمارا تمہارا مقابلہ بدر صغریٰ کے میلہ میں ہوگا مگر یہ خشکی کا سال ہے اور ہمارے لئے جنگ اسی سال مناسب ہے جب ہم جانوروں کو سبزہ چرائیں اور خود دودھ پئیں اب میری رائے یہ ہوگئی کہ بدر صغریٰ کو نہ جاؤں لیکن یہ امر بھی مناسب نہیں کہ میں وہاں نہ جاؤں اور محمد ﷺ پہنچ جائیں اس سے مسلمانوں کی جرأت بڑھ جائے گی۔ میری طرف سے چیلنج کی خلاف ورزی سے یہ بہتر ہے کہ محمد ﷺ کی طرف سے خلاف ورزی ہو لہٰذا تم مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کو روک دو اور ان سے جاکر یہ کہو کہ ابوسفیان کے پاس بہت فوج ہے تم میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے اگر تم اس خدمت کو انجام دیدو گے تو میں تم کو دس اونٹ دوں گا جو سہیل بن عمرو کے پاس بطور ضمانت جمع کردوں گا۔ چنانچہ سہیل اونٹوں کا ضامن ہوگیا اور نعیم مدینہ پہنچ گیا۔ وہاں لوگ ابوسفیان کے چیلنج کی تیاری کررہے تھے نعیم نے پوچھا تم لوگوں کا کہاں کا ارادہ ہے لوگوں نے جواب دیا بدر صغریٰ کے میلہ کے موقع پر ہم نے ابوسفیان سے لڑنے کا معاہدہ کیا ہے، نعیم نے کہا تمہاری رائے بری ہے وہ تمہارے گھروں میں اور تمہارے مستقر پر آئے تھے تو تم میں سے سوائے بھگوڑے کے اور کوئی بچ نہ

حاشیہ [1] شیخ عبدالقاہر جرجانی نے ذکر کیا ہے اور علامہ تفتازانی نے اس کو نقل بھی کیا ہے کہ اگر کسی کلام میں کسی صفت پر کوئی حکم مرتب کیا جائے تو وہ صفت اس حکم کی علت ہوتی ہے آیت میں اجر عظیم کا حکم صفت احسان و تقویٰ پر مرتب کیا گیا ہے اس لئے یہ دونوں وصف اجر عظیم کے استحقاق کی علت ہیں، مترجم۔

marfat.com

سکا اب خود نکل کر (چڑھائی کر کے) جانا چاہتے ہو وہ بھی تمہارے مقابلہ کے لئے بدر صغریٰ کے موقع پر جمع ہو گئے خدا کی قسم (اگر تم وہاں گئے تو) تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔

بعض صحابہ کو یہ تقریر سن کر مدینہ سے نکلنا مناسب نہیں معلوم ہوا اور منافقوں اور یہودیوں کو بڑی خوشی ہوئی اور کہنے لگے محمد ﷺ اس گروہ سے نہیں بچ سکیں گے، یہ اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھی پہنچ گئی اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ (شاید) کوئی نہ جائے۔ حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی یہ بات سن چکے تھے دونوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ بلاشبہ اللہ اپنے دین کو پھیلانے والا اور اپنے نبی ﷺ کو غالب کرنے والا ہے ہم ان لوگوں سے معاہدہ کر چکے ہیں۔ اب اس سے ہٹنا نہیں چاہتے آپ وقت مقرر پر چلئے بخدا یہی بہتر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس تقریر سے خوشی ہوئی اور فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ضرور جاؤں گا خواہ کوئی میرے ساتھ نہ جائے۔

چنانچہ آپ صحابہؓ کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور بدر صغریٰ پر پہنچ گئے وہاں مشرکوں سے قریش کے احوال دریافت کئے مشرک مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے کہتے تھے کہ قریش نے تمہارے مقابلہ کے لئے (بہت آدمی) جمع کئے ہیں مسلمان اس کے جواب میں کہتے تھے حسبنا اللہ و نعم الوکیل - جاہلیت کے زمانہ میں بدر کے مقام پر میلہ لگتا تھا لوگ جمع ہوتے تھے یکم ذیقعدہ سے آٹھ ذیقعدہ تک رہتا تھا آٹھویں تاریخ گزرنے کے بعد میلہ اکھڑ تا تھا اور لوگ اپنے اپنے شہروں کو چلے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ وہاں ٹھہر کر ابو سفیان کا انتظار کرنے لگے ابو سفیان مجنہ سے ہی لوٹ کر مکہ کو چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ نیز صحابہؓ سے کسی مشرک کا مقابلہ نہیں ہوا مسلمان بازار میں ٹھہرے رہے ان کے پاس کچھ تجارتی مال اور سودے بھی تھے جن کو بیچ کر انہوں نے ایک کے دو کئے اور مدینہ کو صحیح سالم نفع کما کر لوٹے اس وقت آیت اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ الخ نازل ہوئی۔

صحیح اول قول ہے معمول بخاری بھی اسی کا مقتضی ہے اور ابن جریرؒ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ میں کہتا ہوں آیت کی رفتار بھی اسی کی مؤید ہے کیونکہ آیت میں مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ آیا ہے اور مسلمانوں کی تعریف اس بنا پر کی ہے کہ زخمی ہونے اور زخموں کا دکھ پانے کے ساتھ ساتھ وہ جہاد کو نکلے اور اللہ و رسول کی دعوت کو قبول کیا اور ظاہر ہے کہ ایسا (احد کے بعد ہی) حمراء الاسد کے غزوہ میں ہوا۔ بدر صغریٰ کا غزوہ تو ایک سال بعد کو ہوا تھا جبکہ لوگ تندرست اور صحیح سالم ہو چکے تھے اگر یہ کہا جائے کہ غزوۂ بدر صغریٰ بھی احد کے بعد ہوا تھا خواہ ایک سال بعد کو ہوا مگر ہوا بعد ہی کو اس لئے آیت کا مطلب صحیح ہے، یعنی متصل بعدیت کی ضرورت نہیں۔ تو میں کہتا ہوں پھر بدر صغریٰ کا غزوہ مراد لینے ہی کی کیا وجہ ہے اور غزوۂ خندق اور بعد کو آنے والے تمام غزوات پر آیت کو محمول نہ کیوں کیا جائے یہ بھی تو احد کے بعد ہی ہوئے تھے۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اگر اس آیت اور پہلی آیت کا نزول ساتھ مانا جائے تو یہ الذین گذشتہ الذین استجابوا سے بدل ہوگا اور اگر دونوں کا نزول یکے بعد دیگرے اور جدا جدا مانا جائے تو یہ الذین یا امدح فعل محذوف کا مفعول ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی ھو الذین یا مبتدا ہے اور فانقلبوا خبر ہے۔

اکثر اہل تفسیر کے نزدیک الناس سے مراد عبدالقیس کے وہ شتر سوار ہیں جو ابو سفیان کی طرف سے اس وقت خدمت گرامی میں پہنچے تھے جب آپ حمراء الاسد میں تھے۔ مجاہدؒ اور عکرمہ کے نزدیک الناس سے مراد نعیم بن مسعود اشجعی ہے جو ابو سفیان اور اس کے مشرک ساتھیوں کی خبر لے کر مدینہ میں اس وقت پہنچا تھا جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ بدر صغریٰ کی تیاری میں مصروف تھے۔ اور الناس میں الف لام جنسی ہے۔ نعیم بن مسعود بھی انسانوں کی جنس سے تھا اس لئے الناس کہا گیا۔ جیسے زید یرکب الخیل زید گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے محاورہ ہے حالانکہ زید کے پاس ایک ہی گھوڑا ہوتا ہے یا یوں کہا جائے کہ نعیم کے ساتھ کچھ مدینہ کے آدمی بھی مل گئے اور انہوں نے اس کے کلام کو پھیلایا تھا یہ سب لوگ مراد ہیں۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ اس آیت کا نزول بدر صغریٰ کے غزوہ کے متعلق ہوا اور الناس سے مراد نعیم بن مسعود ہے اور پہلی آیت غزوۂ حمراء

marfat.com

الاسد کے متعلق نازل ہوئی تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک سال کا فصل تھا۔ نزول آیت بدر صغریٰ کے متعلق ہوا اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ آیت ان الناس قد جمعو الکم دلالت کر رہی ہے کہ مشرکوں کے جتھے کی یہ بھرتی پہلے نہیں تھی اب ہوئی ہے اور اس حدیث جمعیت کا تصور صرف بدر صغریٰ کے لئے کیا جاسکتا ہے جہاں جمع ہو کر لڑنے کے لئے آنے کا وعدہ کیا گیا تھا، رہا احد کے بعد مدینہ کی طرف رخ کرنے کا ارادہ تو اس کے لئے کسی جدید اجتماع کی ضرورت نہیں تھی سب مشرک تو پہلے ہی سے جمع تھے پھر جمعو الکم کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ امام رازی کے قول سے بھی ہماری اس تشریح کی تائید ہوتی ہے کیونکہ امام نے لکھا ہے کہ اللہ نے مومنوں کی تعریف دو غزووں میں شریک ہونے کی بناء پر کی، ایک غزوۂ حمراء الاسد جس کا ذکر پہلی آیت میں کیا گیا ہے اور دوسرا غزوہ بدر صغریٰ جس کا بیان اس آیت میں ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ کہ لوگوں نے یعنی ابوسفیان اور دوسرے مشرکوں نے تمہارے مقابلہ کے لئے آدمی اور ہتھیار جمع کئے ہیں۔

فَاخْشَوْهُمْ پس تم لوگ ان سے ڈرتے رہو (یعنی بدر صغریٰ کو جانے کا ارادہ ہی مت کرو مقابلہ سے بچتے رہو۔

فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ پس اللہ نے یا نعیم کے اس قول نے مسلمانوں کے اندر اور ایمان بڑھا دیا مطلب یہ کہ اس قول کی طرف انہوں نے توجہ ہی نہیں کی، نہ ہمت ہارے بلکہ حمایت اسلام کا مظاہرہ کیا اور اس عمل کی وجہ سے اللہ سے قربت بڑھ گئی۔ مراتب بزرگی میں اضافہ ہو گیا اور مرتبہ بلندی کے اضافہ سے ایمان میں بھی ترقی ہو گئی اور جو لوگ ایمان کے گھٹنے بڑھنے کے قائل نہیں ان کی نظر صرف ایمان مجازی پر ہے (یعنی اشاعرہ اور تمام اہل سنت جو ایمان کو کیفیت بسیطہ کہتے ہیں جس کے اندر ایمان کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی بلکہ وہ حد فاصل جس سے گرنے کے بعد آدمی حد شرک میں داخل ہو جاتا ہے بسیط ایمان ہے نا قابل تقسیم۔ یہ قول ایمان مجازی کے متعلق ہے ایمان حقیقی بہر حال ترقی کرتا رہتا ہے جتنا مرتبہ قرب بڑھتا ہے اتنا ہی ایمان بڑھتا ہے۔

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ اور انہوں نے کہا اللہ ہمارے لئے کافی ہے، حَسْبُ مصدر ہے جس کا معنی اسم فاعل کا ہے یعنی مُحْسِبُنَا۔ لفظ مُحْسِبُ اَحْسَبُ سے مشتق ہے۔ اَحْسَبَهٗ وہ اس کے لئے کافی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس طرح اسم فاعل مضاف ہونے کے بعد بھی نکرہ ہی رہتا ہے (کیونکہ اضافت لفظیہ مفید تعریف نہیں ہوتی) اسی طرح حَسْبُ بھی اضافت کے بعد نکرہ ہی رہتا ہے، کہا جاتا ہے هذا رجل حسبک (رجل موصوف حسبک صفت) یہ ایسا آدمی ہے جو تیرے لئے کافی ہے۔

وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ وکیل وہ شخص جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے یعنی وہ بہت اچھا وکیل ہے (مخلوق کے تمام امور کا وہی ذمہ دار ہے) نعم الوکیل جملہ انشائیہ ہے (کیونکہ افعال مدح وذم انشاء کی قسمیں ہیں) اس کا عطف حسبنا اللہ پر ہے اور حسبنا اللہ جملہ خبریہ ہے پھر یہ عطف کس طرح صحیح ہوا یہ مسئلہ آئمہ نحو کا اختلافی ہے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ واؤ عاطفہ جو دونوں جملوں کے درمیان ہے وہ مومنین کے کلام کا جز نہیں ہے بلکہ مومنین کے دونوں جملوں کو نقل کرنے والے نے درمیان میں عطف کے لئے بڑھا دیا ہے یعنی مومنین نے حسبنا اللہ کہا اور نعم الوکیل بھی کہا لیکن ظاہر یہ ہے کہ واؤ عاطفہ مومنین کے کلام کا جز ہے (یعنی مومنوں نے دونوں جملے ملا کر واؤ عاطفہ کے ساتھ کہے) کیونکہ حضرت ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ اس (ایک) جملہ کو حضرت ابراہیمؑ نے اس وقت کہا تھا جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا اور محمدؐ نے (اور آپ کے صحابہؓ نے) بھی یہ (جملہ) کہا جبکہ قَالُوْا اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (یعنی صحابہؓ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ جملہ کہا اس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ) انہوں نے کہا لوگوں نے تمہارا مقابلہ کرنے کے لئے بہت آدمی اور ہتھیار جمع کئے ہیں لہٰذا تم ان سے ڈرو (اور بدر صغریٰ کو نہ جاؤ) لیکن اس قول نے ان کا ایمان اور بڑھا دیا اور

marfat.com

انہوں نے کہا حسبنا الله و نعم الوکیل۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے کلام میں حسبنا الله و نعم الوکیل کی طرف مفرد کی ضمیر راجع کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں جملے بحیثیت مجموعی حضرت ابراہیمؑ نے کہے تھے اور حرف عاطف دونوں کے درمیان ذکر کیا تھا۔ اگر حرف عاطف کا اضافہ نقل کرنے والے کی طرف سے ہوتا تو حضرت ابن عباسؓ کا کلام اس طرح ہوتا کہ یہ دونوں (جملے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہے تھے یعنی تثنیہ کی ضمیر ہوتی۔ (اس صورت میں انشاء کا خبر پر عطف ہوگا) پس بعض علماء نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اول جملہ (خبریہ) کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اللہ پر اعتماد کیا اور دوسرے (انشائی) جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے امور اللہ کے سپرد کر دیئے۔

(یعنی یہ انشائی جملہ خبری جملہ کے معنی میں ہے) میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جملوں کا باہم کوئی اعرابی محل نہیں خواہ ایک خبری اور دوسرا انشائی ہو۔ بہر حال ایک کا دوسرے پر عطف جائز ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کرا دیا۔ (یہ جملہ خبریہ ہے) اور وہ بڑا اچھا باپ ہے (یہ جملہ انشائیہ ہے) نیز ایک آیت میں آیا ہے اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (یہ کلام خبری ہے) وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (یہ کلام انشائی ہے)۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ پس وہ لوٹ آئے اللہ کی نعمت کے ساتھ یعنی ایمان، عافیت، مال اور عزت کے ساتھ جس کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکلے تھے۔

وَفَضْلٍ اور لوٹ آئے زیادتی کے ساتھ یعنی ثواب کی زیادتی سے ایمان میں ترقی ہوئی اور تجارتی نفع سے مال میں زیادتی ہوئی اور دشمن کی بزدلی سے عزت میں اضافہ ہوا۔ مال کی زیادتی کا تصور اسی وقت ہو سکتا ہے جب غزوۂ بدر صغریٰ مراد لیا جائے کیونکہ وہیں پر مسلمانوں نے بازار لگایا اور تجارت کی اور نفع کمایا تھا غزوۂ حمراء الاسد میں کوئی تجارت نہیں ہوئی۔

لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ کسی دکھ نے ان کو چھوا بھی نہیں۔ یعنی کسی حالت میں کوئی دکھ ان کو نہیں پہنچا، نہ زخمی ہونے کا، نہ قتل ہونے کا، نہ لوٹے جانے کا۔

وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ اور وہ اللہ کی خوشنودی (کے راستہ) پر چلے جس پر دونوں جہان کی بھلائی موقوف ہے۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے کہا تھا کیا یہ جہاد ہوگا اس پر اللہ نے ان کو جہاد کا ثواب عطا فرمایا اور ان سے راضی ہوا۔

وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اور اللہ بڑے فضل والا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے پیام حسرت ہے جو جہاد میں شریک نہیں ہوئے نیز ان کی غلطی رائے کا اظہار ہے۔

اِنَّمَا ذٰلِکُمُ بے شک وہ یعنی نعیم یا ابوسفیان

الشَّیْطٰنُ شیطان ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ ذلکم کا اشارہ قول مذکور کی طرف بھی ہو سکتا ہے اس صورت میں الشیطان سے پہلے مضاف محذوف ہوگا یعنی قول مذکور شیطان کا فعل ہے شیطان نے ان کی زبانوں سے یہ بات کہلوائی ہے تاکہ وہ تم کو خوفزدہ بنا دیں اور تم پست ہمت ہو جاؤ۔

یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے یعنی ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کو نہیں نکلے تھے یا اولیاء سے پہلے حرف جر محذوف ہے یعنی اپنے دوستوں (ابوسفیان کے ساتھیوں) سے تم کو ڈراتا ہے۔ سدی نے یہ مطلب بیان کیا کہ تمہارے دلوں میں اپنے دوستوں کو بڑا کر کے ظاہر کرتا ہے تاکہ تم ان سے ڈر جاؤ۔

فَلَا تَخَافُوْهُمْ پس تم ان سے نہ ڈرو کیونکہ اللہ کے بغیر کسی میں طاقت نہیں ہو سکتی۔

وَخَافُوْنِ اور مجھ سے ڈرو کہ کہیں میں ان کو تم پر غالب نہ کر دوں جیسے احد کے دن کر دیا تھا، غلبہ میری طرف سے

marfat.com

عطا ہوتا ہے لہٰذا میرے احکام کے خلاف نہ کرو اور میرے رسول ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد کرو۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اگر تم ایماندار ہو کیونکہ ایمان کا یہی تقاضا ہے کہ اللہ سے ڈرا جائے اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر مانگو تو اللہ سے مانگو اور مدد چاہو تو اللہ سے چاہو اور جان رکھو کہ اگر سب لوگ مل کر نفع پہنچانا چاہیں گے تو بس اتنا ہی پہنچائیں گے۔ جتنا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور اگر سب مل کر تم کو کچھ ضرر پہنچانا چاہیں گے تو بس اتنا ہی پہنچائیں گے جو اللہ نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے قلم اٹھا لئے گئے اور کاغذ خشک ہو گئے۔ رواہ احمد والترمذی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

وَلَا يَحْزُنْكَ اور تم کو رنجیدہ نہ کر دیں۔ جمہور کی قرات یہی ہے۔ نافع کے نزدیک سارے قرآن میں سوائے سورۂ انبیاء کے یہ لفظ باب افعال سے آیا ہے صرف سورۂ انبیاء میں باب نصر سے ہے۔ ابو جعفر کی قرات میں صرف سورۂ انبیاء میں باب افعال سے ہے باقی مقامات پر مجرد سے۔

الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ وہ لوگ جو تیزی سے کفر میں گھس رہے ہیں۔ ضحاک کے نزدیک کفار قریش مراد ہیں اور دوسرے مفسرین کے نزدیک منافق مراد ہیں جو کافروں کی مدد کرنے کی وجہ سے کفر میں تیزی سے بڑھ رہے تھے، یعنی ان منافقوں کے کفر میں تیزی سے گھسنے سے تم کو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کوئی اندیشہ نہ ہو اور تم اس سے رنجیدہ نہ ہو، کیونکہ

اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا وہ اللہ کو یعنی اللہ کے دوستوں کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور نہ کافروں پر جذبہ رحم رکھنے کی وجہ سے تم کو منافقوں کی اس حرکت سے کوئی رنج ہو کیونکہ۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ اللہ ان کے لئے آخرت کے ثواب میں کوئی حصہ مقرر کرنا نہیں چاہتا چونکہ یہ بدبخت مخلوق ہے اور ان کے نقطہائے تعین اللہ کے اسم مضل کی طرف منسوب ہیں اسی لئے اللہ نے ان کی مدد نہیں کی اور یہ کفر میں تیزی کے ساتھ بڑھ گئے۔ (بقول اہل تصوف انسان صفات الٰہی کا مظہر ہے اور اللہ کی صفات متضاد ہیں، جس صفت کا جس پر توپڑا اسی وصف کا نقطہ تعین اس شخص میں پیدا ہو گیا اور وہ اس خصوصی وصف میں ممتاز ہو گیا پس اللہ کا ایک وصفی نام مضل بھی ہے اس کا بھی بعض لوگوں پر خصوصی پر توپڑا ہے اور وصف اضلال ان کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ پس منافق جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ کی صفت اضلال کا ظہور ہوتا ہے لہٰذا تم کو اپنے جذبہ رحمت کے زیر اثر اس سے رنجیدہ نہ ہونا چاہئے)۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اور انہی کے لئے عذاب عظیم ہے۔ یعنی ثواب سے محرومی کے ساتھ ساتھ ان کے لئے عذاب عظیم بھی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ جن لوگوں نے ایمان کے عوض کفر لے لیا۔ اس سے مراد اہل کتاب ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے (غائبانہ) آپ کی بعثت کا یقین رکھتے تھے لیکن جب آپ مبعوث ہو گئے اور کھلی ہوئی نشانیاں صداقت کی پیش کیں تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور دنیوی حرص میں آکر محض عناد کی وجہ سے ایمان کو چھوڑ دیا۔

لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وہ اللہ کو ہرگز کچھ ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور انہی کے لئے دکھ کا عذاب ہو گا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ الذین کفروا فاعل ہے اور انما نملی دو مفعولوں کے قائم مقام ہے یعنی کافر یہ نہ خیال کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا اور عمریں دراز کرنا اور ان کی حالت پر ان کو آزاد چھوڑنا ان کے لئے بہتر ہے انما میں ما مصدری ہے اس لئے رسم الخط میں اس کو ان سے جدا لکھنا چاہئے لیکن مصحف امام (حضرت عثمانؓ کے قرآن) میں اس کو متصل لکھا گیا ہے اس کے اتباع میں ملا کر لکھا جاتا ہے۔

marfat.com

اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَهُمۡ یہ گذشتہ حکم کی علت کا اظہار ہے۔

لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ ہم ان کو ڈھیل صرف اس وجہ سے دیتے ہیں کہ ان کے گناہ بڑھ جائیں۔ لیز دادوا میں لام ارادہ کا ہے یعنی ہم ان کے گناہ زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس آیت میں ہمارے مسلک کا ثبوت ہے کہ گناہ بھی اللہ کے ارادہ سے ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ بندہ کے لئے دنیا و آخرت میں جو چیز بہتر ہو اللہ وہی کرے۔ معتزلہ معاصی کو اللہ کے ارادہ سے وابستہ نہیں جانتے اور خلق اصلح کو واجب قرار دیتے ہیں پس اس آیت سے ہمارے مسلک کی تائید اور معتزلہ کے قول کی تردید نکلتی ہے۔ معتزلہ کے نزدیک لیز داد وا کا لام، لام عاقبت ہے یعنی ہمارے ڈھیل دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ گناہ گار ہو جاتے ہیں۔

وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۱۷۸﴾ اور انہی کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اس آیت کا نزول مقاتل کے نزدیک مکہ کے مشرکوں کے حق میں اور عطاء کے نزدیک قریظہ اور نضیر کے حق میں ہوا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے اچھا آدمی کون ہے فرمایا جس کی عمر دراز اور اعمال اچھے ہوں۔ عرض کیا گیا سب سے برا کون ہے فرمایا جس کی عمر دراز اور عمل برے ہوں۔ رواہ احمد والترمذی والدارمی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک منادی پکارے گا ساٹھ برس کی عمر والے کہاں ہیں اور یہی وہ عمر ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيۡرُ ۔ رواہ البیہقی فی الشعب۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِیَذَرَ میں لام تاکید نفی کیلئے ہے یعنی اللہ ہرگز مومنوں کو نہیں چھوڑیگا۔

عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ اس حالت پر جس پر تم اس وقت ہو کہ مخلصوں کے ساتھ منافق مخلوط ہیں مخلص اور منافق کا کوئی امتیاز نہیں۔ انتم کا خطاب تمام مدعیان اسلام کو ہے جن میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے مخلص مومن بھی داخل ہیں اور منافق بھی۔

حَتّٰى يَمِيۡزَ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ بغیر ناپاک کو پاک سے جدا کئے یعنی بغیر اس کے کہ چھانٹ کر کافر کو مومن سے جدا کر دے۔ خواہ وحی کے ذریعہ سے اطلاع دیدے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے یحذر المنافقون ان تنزل علیہم سورہ تنبئہم بمافی قلوبھم قل استھزء وآ ان اللہ مخرج ماتحذرون یا واقعات کے ذریعہ سے (جانچ کر کے) جیسے احد کا واقعہ ہوا کہ منافق مومنوں کو چھوڑ کر بچھڑ گئے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ اور اللہ تم کو غیب سے آگاہ کرنے والا بھی نہیں کہ تم منافقوں اور مومنوں کی الگ الگ تمیز کر لو جب تک اللہ ان دونوں گروہوں کو چھانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کر دے۔

وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ۖ بلکہ اللہ پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے انتخاب کر لیتا ہے اور بعض غیبی علوم پر کبھی مطلع کر دیتا ہے جیسا کہ اپنے پیغمبر محمد ﷺ کو منافقوں کے احوال پر بنور فراست مطلع فرمادیا۔ اسی کی مثل ہے سورت جن کی یہ آیت عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول۔ علم غیب کی تشریح ہم نے سورۂ جن کی اسی آیت کے ذیل میں کی ہے۔

بغویؒ نے بروایت سدی لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے میری امت اپنی شکلوں میں طینی (خمیر کی) حالت میں لائی گئی جیسے آدم کے سامنے (ان کی تمام نسل) لائی گئی تھی اور جو لوگ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور جو مجھ پر ایمان نہیں لانے والے ہیں سب مجھے بتادیئے گئے اس فرمان کی اطلاع منافقوں کو پہنچی تو وہ مذاق کرتے ہوئے بولے محمدؐ کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے ان میں کون مومن ہوگا اور کون غیر مومن۔ محمدؐ ان سب سے واقف ہیں اور ہم ان کے ساتھ رہتے ہیں اس کے باوجود وہ ہم کو نہیں پہچانتے۔

marfat.com

منافقوں کے اس قول کی خبر حضور ﷺ کو بھی پہنچ گئی تو آپ نے ممبر پر کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا لوگ کس وجہ سے میرے علم پر طنز کرتے ہیں تم اپنے زمانہ سے قیامت تک کی جو چیز مجھ سے پوچھو گے میں بتاؤں گا (پوچھو دیکھو) اس پر عبداللہ بن حذافہ سہمی نے کھڑے ہو کر پوچھا یا رسول اللہ ﷺ میرا باپ کون تھا فرمایا حذافہ۔ اس کے بعد فوراً عمرؓ کھڑے ہوگئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین (برحق) ہونے پر قرآن کے امام (یعنی واجب التسلیم والعمل کتاب) ہونے پر اور آپکے نبی ﷺ پر رضامند ہیں (یعنی دل سے مانتے ہیں) آپ ہم کو معاف فرما دیجئے اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم باز آگئے کیا تم باز آگئے پھر ممبر سے اتر آئے اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ اس روایت کی مجھے اطلاع نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بر تقدیر صحت روایت آیت سے اس حدیث کی مناسبت اس طرح ہوگی کہ آیت میں رسول ﷺ کے مجتبیٰ اور غیب پر مطلع ہونے کی صراحت ہے اور حدیث میں ان (منکرین) کے قول کو رد کیا گیا ہے کیونکہ رسول ﷺ کے لئے یہ امر جائز نہیں کہ بغیر اللہ کی اجازت کے دوسروں کو غیبی علم میں شریک بنالے پس پیغمبر کافروں کے کفر سے واقف ہیں لیکن ظاہر نہیں کرتے کیونکہ ان کا غیبی علم شخصی ہے (دوسروں کو بغیر اذن خداوندی مطلع کرنے کا حق نہیں ہے)۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ پس اخلاص کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو تاکہ رسوا نہ ہو۔

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ اور اگر تم سچے دل سے ایمان لاؤ گے اور نفاق و معاصی سے پرہیز رکھو گے تو تمہارے لئے بڑا اجر ہوگا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ جو لوگ خداداد مال میں بخل کرتے ہیں یعنی زکوٰۃ نہیں دیتے وہ بخل کو اپنے لئے بہتر نہ سمجھیں۔

الذین یبخلون کا فاعل ہے اور مفعول اول محذوف ہے اور مفعول دوئم خیراً ہے اور ھو ضمیر فصل ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ھو کو مفعول اول کے قائم مقام قرار دیا جائے۔ بہر صورت مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے مال دیا ہے اور وہ زکوٰۃ نہیں دیتے وہ اللہ کی اس عطا کو یا خداداد مال کو یا بخل کو اپنے لئے بہتر نہ سمجھیں۔ ما اٰتاھم اللہ سے خداداد مال مراد لینا اولیٰ ہے کیونکہ آگے آیا ہے کہ جس چیز میں انہوں نے بخل کیا تھا اس کا ان کی گردنوں میں طوق ڈالا جائے گا (لہٰذا مناسب یہ ہے کہ وہی چیز مراد لی جائے جو اللہ نے عطا فرمائی اور بخیلوں نے اس کی زکوٰۃ نہ دی)۔

بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ بلکہ وہ بخل یا عطاء خدا یا مال جو خدا نے دیا ہے ان کے لئے برا ہے۔

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ جس چیز کی انہوں نے زکوٰۃ نہیں دی قیامت کے دن اس کا طوق ان کو پہنایا جائے گا۔

اس آیت کا نزول زکوٰۃ نہ دینے والوں کے حق میں ہوا، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو وائل شعبیؒ اور سدیؒ کا یہی قول ہے حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ نہ دی تو قیامت کے دن اس کے مال کو ایسے سانپ کی شکل پر کر دیا جائے گا جو گنجا ہوگا اور اس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ دھبے ہوں گے۔ قیامت کے دن وہ سانپ زکوٰۃ نہ دینے والے کی گردن کا طوق ہو جائے گا اور اس کی دونوں باچھیں پکڑ کر کہے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا ذخیرہ کیا ہوا خزانہ ہوں اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی ولا یحسبن الذین یبخلون الخ۔ رواہ البخاری۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی بھی ایسا ہو کہ اس کے پاس اونٹ یا گائے بھینس یا بکریاں ہوں اور وہ ان کا فرض (زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو قیامت کے دن یہ جانور بہت ہی جسامت اور فربہی کے ساتھ سامنے آئیں گے اونٹ اپنے موزوں سے اس کو روندیں گے اور گائیں بکریاں اس کو سینگوں سے ماریں گی جب پچھلی قطار (

روندتی اور مارتی) اس پر پہنچے گی تو (گھوم کر) اول قطار آپہنچے گی۔ یہ روندنے اور مارنے کا سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم۔

عطیہؒ کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول آیا ہے کہ اس آیت کا نزول یہودی علماء کے حق میں ہوا جو رسول اللہ ﷺ کے خصوصی احوال اور ثبوت (جن کا اظہار توراۃ میں کیا گیا تھا) کو چھپاتے تھے۔ بخل سے مراد ہے علم کو پوشیدہ رکھنا اور سیطوقون ما بخلوا بہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے گناہ اور جرائم کا بار اٹھائیں گے۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط آسمان و زمین کی وراثت اللہ ہی کو حاصل ہے یعنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اللہ باقی رہنے والا ہے، سب مر جائیں گے مال چھوڑ جائیں گے اللہ جس کو چاہے گا ان کا مال دے گا خواہ وارث ہوں یا غیر اور مرنے والوں کی گردن پر اس کا عذاب رہے گا اور (مرتے وقت) مال چھوڑ جانے کی حسرت ہوگی پھر کیا وجہ کہ وہ بخل کرتے ہیں اور راہ خدا میں مال خرچ نہیں کرتے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے خبردار ہے کئے کا بدلہ ضرور دے گا۔

محمد ابن اسحاق ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ایک تحریر دے کر بنی قینقاع کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور تحریر میں ان کو اسلام لانے، نماز پڑھنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور اللہ کے لئے قرضہ حسنہ دینے کی دعوت دی حسب الحکم ایک روز حضرت ابو بکر یہودیوں کے مدرسہ میں گئے وہاں آپ نے دیکھا کہ بہت سے یہودی ایک شخص کے پاس جمع ہیں یہ شخص فنحاص بن عازورا تھا جو یہودیوں کے علماء میں سے تھا اور اس کے ساتھ ایک اور عالم بھی تھا جس کا نام اشیع تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فنحاص سے فرمایا اللہ سے ڈرو اور مسلمان ہو جاؤ خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں جو اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ آئے ہیں ان کا ذکر تمہارے پاس توراۃ میں لکھا ہوا موجود ہے لہٰذا ان پر ایمان لے آؤ ان کی تصدیق کرو اور اللہ کو قرض حسنہ دو، اللہ تم کو جنت میں داخل کرے گا اور دوہرا ثواب دے گا، فنحاص نے کہا ابو بکرؓ تم کہتے ہو کہ ہمارا رب ہم سے ہمارا مال قرض مانگتا ہے قرض تو فقیر غنی سے مانگتا ہے پس اگر تمہاری بات صحیح ہے تو اللہ فقیر ہوا اور ہم غنی۔ اللہ تم کو تو سود (دینے) سے منع کرتا ہے اور خود ہم کو دیگا اگر وہ غنی بھی ہو تب بھی ہم کو سود نہیں دیگا۔ یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ کو غصہ آیا اور فنحاص کے منہ پر آپ نے زور سے ضرب رسید کی اور فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر ہمارا تجھ سے معاہدہ نہ ہوتا تو اللہ کے دشمن میں تیری گردن مار دیتا۔ فنحاص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا دیکھو محمد ﷺ تمہارے ساتھی نے میرے ساتھ کیسی حرکت کی۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا تم نے ایسی حرکت کس وجہ سے کی حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اس دشمن خدا نے بہت بڑی بات کہی تھی اس نے کہا تھا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں مجھے یہ سن کر غصہ آیا اور میں نے اس کے منہ پر مارا۔ فنحاص نے حضرت ابو بکر کے اس قول کا انکار کر دیا (اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا) اس پر اللہ نے فنحاص کے قول کی تردید اور حضرت ابو بکرؓ کی تصدیق میں مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔ کذا قال عکرمۃ والسدی و مقاتل۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ م بیشک اللہ نے ان لوگوں کی بات سنی جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اللہ فقیر ہے ہم سے قرض مانگتا ہے۔ یہ بات یہودیوں نے اس وقت کہی تھی جب آیت من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا نازل ہو چکی تھی اس پر آیت لقد سمع اللہ نازل ہوئی۔ حسن نے فرمایا کہ اس کلام کا قائل حیی بن اخطب تھا۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا ہم لکھتے ہیں ان کے قول کو یعنی اعمال نامے لکھنے والے فرشتے ہمارے حکم سے لکھ لیتے ہیں

marfat.com

اسی کی مثل ہے آیت و اناله کاتبون ہم یعنی ہمارے فرشتے اس کو بلاشبہ لکھ لینے والے ہیں۔
وَقَتۡلَهُمُ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ اور ان کے قتل کر دینے کو انبیاء کو ناحق یعنی ان کے اسلاف نے جو انبیاء کو ناحق قتل کیا تھا اور انہوں نے اپنے اسلاف کے اس فعل کو پسند کیا ان کی اس پسندیدگی اور خوشنودی کو ہم لکھتے ہیں۔ قتل انبیاء کو قول مذکور کے ساتھ ملا کر بیان کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بیہودہ قول ان کا پہلا ہی جرم نہیں ہے (بلکہ اس سے پہلے یہ قتل انبیاء جیسے سخت جرم کر چکے ہیں)۔
وَنَقُوۡلُ اور قیامت کے دن ان کے قول و فعل کی پاداش میں ہم ملائکہ کی زبانی کہیں گے کہ
ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۱۸۱﴾ آتشِ سوزاں کے عذاب کو چکھو۔ حریق بمعنی محرق ہے یعنی جلانے والی آگ۔ جیسے عَذَابٌ اَلِیۡمٌ میں الیم بمعنی مولم (دکھ رساں) ہے یا عذاب الحریق میں اضافت بیانیہ ہے (موصوف کی صفت کی جانب اضافت ہے) یعنی جلانے والا عذاب۔ یہ قول ان سے اس وقت کہا جائے گا جب ان کو آگ میں ڈالا جائے گا۔ ذوق کا معنی ہے کسی مزہ کا احساس مجازاً تمام محسوسات کے احساس کو ذوق کہہ لیا جاتا ہے چونکہ یہودی اپنے زیر دستوں سے رشوت کھاتے تھے اس مناسبت کی وجہ سے ان کی پاداش میں لفظ ذوق ذکر کیا۔
ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡكُمۡ یہ عذاب ان اعمال کی سزا میں ہے جو تم نے پہلے کئے تھے یعنی قتل انبیاء اور دوسرے گناہ۔ ایدی (ید کی جمع ہاتھ) بول کر اشخاص اور نفوس مراد لئے کیونکہ اکثر حسی افعال ہاتھوں سے ہی ہوتے ہیں اور دل کے کاموں کا اظہار ہاتھوں اور پاؤں کی حرکات سے ہی ہوتا ہے۔
وَاَنَّ اللّٰهَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۱۸۲﴾ اور یہ عذاب تم پر اس وجہ سے بھی ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ ظالم نہیں اور نفی ظلم کے لئے عدل لازم ہے اور عدل کا تقاضا ہے کہ نیک کو ثواب اور بد کو عذاب دیا جائے پس اللہ کے ظالم نہ ہونے کا تقاضا ہے کہ کافروں کو عذاب دیا جائے۔

......ایک شبہ بر مسلکِ اشاعرہ......

ظلم کی نفی اللہ کی ذات کے لئے لازم ہے کیونکہ ظلم قبیح لذاتہ ہے اور تمام بری باتوں سے اللہ کا پاک ہونا ضروری ہے اور نفی ظلم عدل کو مستلزم ہے اور عدل کے لئے لازم ہے کہ نیک کو ثواب اور گناہ گار کو عذاب دیا جائے۔ پس فرمانبردار کو ثواب اور نافرمان کو عذاب دینا اللہ پر لازم قرار پایا اور یہ اشاعرہ کے مسلک کے خلاف ہے جو اللہ پر کسی چیز کو لازم قرار نہیں دیتے (بلکہ اللہ کو مختار کل جانتے ہیں) بلکہ یہ بعینہٖ معتزلہ کا مسلک ہے۔

......جواب......

لغت میں ظلم کا معانی ہے کسی چیز کو اس کی مخصوص جگہ کے علاوہ دوسری جگہ رکھنا خواہ کمی بیشی کے ساتھ یا زمان و مکان کے تبدل و تغیر کے سبب اور چونکہ بارگاہ الوہیت میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ورنہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی ملک میں تصرف لازم آئے گا یا حکم کے خلاف خود کرنا لازم آئے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر بغیر کسی جرم کے اللہ سارے جہان کو عذاب دے تب بھی یہ ظلم نہ ہوگا کیونکہ وہ مالک مطلق ہے اپنی ملک میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے لہٰذا اس کے لئے اس کے کسی فعل کو ظلم کہا ہی نہیں جا سکتا اور جب اس کی شان میں ظلم کا تصور ہی ممکن نہیں، تو ناممکن چیز کی نفی کا کوئی معنی نہیں کیونکہ قضیہ موجبہ کے لئے تو وجود موضوع کی یا ثبوت موضوع کی یا تقرر موضوع کی ضرورت ہے اور سالبہ اگرچہ ثبوت موضوع کا محتاج نہیں مگر بوقت حکم تصور موضوع بہر حال لازم ہے ورنہ نفی کس چیز کی ہوگی) پس اس جگہ لفظ ظلم کا استعمال حقیقی معنی میں نہیں ہے بلکہ نفی ظلم سے مراد یہ ہے کہ جو فعل بندوں کے باہمی معاملات میں ظلم کہلاتا ہے اگرچہ اللہ سے اس کا

marfat.com

صدور ظلم نہیں مگر اللہ اس سے بھی پاک ہے اور نفی ظلم بایں معنی اللہ کے لئے لازم نہیں (یعنی جو عمل بندوں کے باہمی معاملات میں ظلم کہلاتا ہے اس کی نفی بھی خدا کے لئے لازم ہو یہ ضروری نہیں کیونکہ حقیقت میں اس کا اللہ سے صدور ظلم ہی نہیں ہے پس اس کی نفی کیسے واجب ہو جائے گی) بلکہ اس ظلم کا بھی خدا سے صادر نہ ہونا محض اس کی مہربانی پر مبنی ہے۔

یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ انبیاء پر ظلم کرنے والوں اور تکذیب کرنے والوں اور انبیاء کو قتل کرنے والوں سے انتقام لینا اگرچہ خدا پر واجب نہیں مگر انتقام نہ لینا صورۃً ظلم معلوم ہوتا ہے کیونکہ انبیاء پر اللہ کا جو فضل و کرم ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء کے قاتلوں سے انتقام لیا جائے اور ان کو سزا دی جائے پس انتقام نہ لینا صورۃً ظلم ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا (لہٰذا انبیاء کا انتقام وہ ضرور لے گا اور ان کے قاتلوں کو عذاب دیگا) اس صورت میں عبید سے مراد ہوں گے انبیاء اور اس لفظ سے انبیاء کی مدح مستفاد ہو گی کہ وہ عبدیت اور فرمان پذیری میں بااختیار خود اور بالارادہ اتنے کامل ہیں جیسے دوسری بے عقل چیزیں بلا ارادہ صرف طبعاً فرمان پذیری پر مجبور ہیں۔

اس آیت میں ایک نازک توجیہ اور بھی ہے آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ کافر عذاب کے اتنے مستحق ہیں کہ اگر اللہ ان کو عذاب نہ دے تو ان پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہو گی پس گویا اس طرز کلام سے کافروں پر عذاب ہونے کو مؤکد طور پر ظاہر کر دیا۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا۔ کلبی نے بیان کیا ہے کہ کعب بن اشرف اور مالک بن ضیف اور وہب بن یہودا اور زید بن تابوت اور فنحاص بن عازورا اور حیی بن اخطب نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا محمد ﷺ تم دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ نے تم کو پیغمبر بنا کر ہمارے پاس بھیجا ہے اور تم پر کتاب اتاری ہے حالانکہ اللہ نے ہم کو توریت میں حکم دیدیا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کی طرف سے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرے تو تم اس پر ایمان نہ لانا تاوقتیکہ وہ ایسی قربانی تمہارے سامنے نہ لے آئے جس کو آگ (خود بخود آسمان سے اتر کر) کھالے پس اگر تم ایسی قربانی پیش کر دو گے تو ہم تمہاری تصدیق کریں گے اور ایمان لے آئیں گے اس پر اللہ نے آیت الذین قالوا الخ نازل فرمائی۔

اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَآ کہ اللہ نے توریت میں ہم کو حکم دیدیا ہے اور ہدایت کر دی ہے۔

اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ کہ جو شخص بھی اللہ کی طرف سے پیغمبر ہونیکا دعویٰ کرے ہم اس کی تصدیق نہ کریں۔

حَتّٰى یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ تاوقتیکہ وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ لائے جس کو (آسمانی) آگ کھا جائے۔ قُربان بروزن فُعلان قربت سے مشتق ہے اصل لغت میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کو پیش کر کے بندہ اللہ کے قرب کا جویاں ہوتا ہے خواہ کوئی ذبیحہ ہو یا صدقہ یا نیک عمل۔ پھر استعمال میں صرف اس ذبیحہ پر اطلاق ہونے لگا جس کو اللہ کا قرب حاصل کرنے کیلئے لوگ پیش کرتے قربانیاں اور مال غنیمت، بنی اسرائیل کیلئے خود کام میں لانا درست نہیں تھا اس لئے جب کوئی قربانی کرتے یا مال غنیمت اللہ کیلئے پیش کرتے تھے اور قبول یا عدم کی شکل یہ ہوتی کہ آسمان سے ایک آگ سفید بے دود آتی تھی جس کے آنے سے ایک گونج اور گڑگڑاہٹ کی آواز ہوتی تھی اور آکر اس قربانی کو کھا جاتی تھی یہ قبول ہونے کی علامت تھی اور اگر آگ نہ آتی اور وہ قربانی اصلی حالت پر رہ جاتی تو نامقبول سمجھی جاتی۔

سدی کا بیان ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ اگر کوئی شخص اللہ کی طرف سے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرے تو تم اس کی تصدیق نہ کرنا تاوقتیکہ وہ ایسی قربانی نہ پیش کرے جس کو آگ کھا جائے ہاں مسیح اور محمد اگر آئیں تو تم ان پر ایمان ضرور لانا وہ قربانی پیش نہیں کریں گے (اسی بناء پر) اللہ نے بنی اسرائیل کے قول کے خلاف دلیل قائم کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ اے گروہ یہود مجھ سے پہلے بہت پیغمبر کھلے کھلے معجزات تمہارے پاس لے کر آئے اور جس قربانی کو تم کہہ رہے ہو وہ بھی انہوں نے پیش کی یعنی زکریاؑ اور یحییٰؑ وغیرہ دوسرے انبیاءؑ آئے (معجزات لے کر آئے اور اپنے دعوے کی تصدیق کے لئے

marfat.com

انہوں نے قربانیاں بھی دیں)۔

فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ پھر تم نے ان کو کیوں قتل کر ڈالا یعنی تمہارے اسلاف نے ان کو کیوں قتل کیا اور ان کے اخلاف نے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھے کیوں ان کی اس حرکت کو پسند کیا چونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے یہودی اپنے اسلاف کی اس حرکت کو درست سمجھتے اور پسند کرتے تھے پس گویا یہ بھی اپنے باپ دادا کے فعل کے مرتکب ہوئے اسی لئے استفہام انکاری کا رخ حاضرین کی طرف کیا گیا۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ اگر تم سچے ہو۔ اس شرط کی جزا محذوف ہے یعنی اگر تم اس قول میں سچے ہو کہ تمہارا ایمان نہ لانا اللہ کے سابق حکم کی وجہ سے ہے تو بتاؤ تم زکریاؑ اور یحییٰؑ وغیرہ پر کیوں ایمان نہیں لائے (انہوں نے تو قربانیاں بھی پیش کی تھیں) پس جب تم ان پر ایمان نہیں لائے تو ظاہر ہو گیا کہ تمہارا ایمان نہ لانا محض عناد اور تعصب کی وجہ سے ہے حکم خدا کی وجہ سے نہیں ہے۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ اے اگر ان یہودیوں نے تم کو جھوٹا قرار دیا تو تم رنجیدہ نہ ہو۔

فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ تم سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی گئی تھی۔ اس مطلب پر فَاِنْ كَذَّبُوْكَ شرط ہے اور جزاء محذوف ہے اور فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ اس کے قائم مقام ہے (دوسرے پیغمبروں کی تکذیب کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو اپنی تکذیب پر صبر کرنا اور رنجیدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ پہلے سے کافروں کا دستور یہی چلا آیا ہے۔ صرف موجود الوقت کافروں ہی کی یہ حرکت نہیں ہے) پس سبب کو ذکر کر کے اصل جزاء کو حذف کر دیا۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو تنہا یہ آپ کی تکذیب نہیں ہے بلکہ آپ سے پہلے پیغمبروں کی بھی تکذیب ہے کیونکہ انہوں نے آپ کی بعثت کی خبر پہلے دیدی تھی (اور یہ آپ پر ایمان نہیں لائے پس حقیقت میں انہوں نے گذشتہ پیغمبروں کی پیشین گوئیوں کو نہیں مانا)۔

جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ جو کھلے ہوئے معجزات لائے تھے۔

وَالزُّبُرِ اور صحیفے بھی لائے تھے جیسے حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ۝ اور روشن کتاب بھی لائے تھے جیسے توریت و انجیل۔ اول الذکر تفسیر پر فَقَدْ كُذِّبَ سے المنیر تک رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسلی ہوگا کہ جیسے گذشتہ پیغمبروں نے صبر کیا آپ بھی صبر کریں اور موخر الذکر توجیہ پر یہ یہودیوں کی غلطی پر تنبیہ ہوگی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو جھوٹا قرار دینا حقیقت میں ان پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینا ہے جنہوں نے قربانیاں بھی پیش کی تھیں۔ اَلزُّبُر، زبور کی جمع ہے۔ زبور وہ کتاب ہے جس میں صرف احکام ہوں یہ لفظ زَبَرْتُ الشَّيْءَ سے ماخوذ ہے زَبَرْتُ کا معنی ہے اَحْسَنْتُ۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ہر شخص مؤمن ہو یا کافر موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے جب اللہ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو زمین نے اللہ سے شکوہ کیا کہ میرا ایک جز لیا گیا اور اس سے آدم کو بنایا گیا اللہ نے زمین سے وعدہ کر لیا کہ جو کچھ تجھ سے لیا گیا ہے وہ تجھے واپس کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جو شخص بھی جس مٹی سے بنا ہے وہ اسی مٹی میں دفن کیا جاتا ہے۔ آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ دنیوی زندگی اور اس کی آسائش اطاعت (اور اللہ کی فرماں برداری) کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اچھے عمل ہوں گے اچھا بدلہ ہوگا، برے عمل ہوں گے برا بدلہ ہوگا۔ پس تم کو صبر و طاعت کی جزا ملے گی اور کافروں کو تکذیب حق کی سزا۔ لفظ توفون بتا رہا ہے کہ اعمال کا کچھ بدلہ قیامت سے پہلے دنیا میں بھی ملتا ہے اللہ نے فرمایا ہے وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں ان کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ صالحین (کے گروہ) میں ہوگا۔

marfat.com

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر جنت کے چمنوں میں سے ایک چمن ہے یا آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا، رواہ الترمذی۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ پس جو شخص دوزخ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب اور بامراد ہوا۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں مگر صرف دھوکہ کا سودا ہے۔ متاع وہ سامان جس سے فائدہ اور نفع حاصل کیا جائے غر اور غرور مصدر ہے۔ باب نصر۔ غرہ اس کو دھوکہ دیا۔ غلط لالچ دیا یا غرور جمع ہے غار اس کا مفرد ہے۔ دنیا کو اس سودے سے تشبیہ دی جس کو بائع مشتری کو فریب دینے کے لئے پیش کرتا ہے تاکہ دھوکہ میں آکر خریدار اس کو خرید لے۔ ظاہر میں تو وہ کام کی چیز نظر آتی ہے اور حقیقت میں کچھ نہیں ہوتی، دنیا بھی ایسی ہی پر فریب ہے واقع میں مکروہات اور دکھوں سے بھری ہوئی ہے اور خواب کی طرح ناپائیدار بھی ہے مگر بظاہر راحت کدہ اور مجموعہ آسائش نظر آتی ہے)۔

قتادہؒ نے کہا غرور کا معنی ہے باطل۔ دنیا ایک ایسا سامان ہے جو دوسروں کا چھوڑا ہوا ہے اور چھوٹ جانے والا ہے، عنقریب دنیا اور دنیادار سب مٹ جائیں گے لہٰذا اس سامان میں سے تم اللہ کی فرمانبرداری کے ساتھ حسب توفیق لے لو۔ حسن بصریؒ نے فرمایا، دنیا گھاس کی سبزی اور لڑکیوں کی گڑیوں کی طرح ہے جس کا کوئی حاصل نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی چیزیں تیار رکھ چھوڑی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی کے دل میں ان کا تصور آیا (حضور ﷺ نے فرمایا) اگر تم (اس کا ثبوت) چاہتے ہو تو پڑھو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور جنت کے اندر ایک درخت ہے جس کے سایہ میں سو برس تک سوار چلتا رہے پھر بھی طے نہ کر پائے۔ اگر تم (اس کا ثبوت) چاہو تو پڑھو وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ اور جنت کی کوڑا برابر جگہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اگر تم چاہو تو پڑھو فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ رواہ البغوی بسندہ۔ صحیحین میں حدیث کا پہلا ٹکڑا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ تک موجود ہے لیکن دوسرے اور تیسرے ٹکڑوں میں اِقْرَءُ وا ان شئتم ظل ممدود اور اقرء وا ان شئتم فمن زحزح الخ نہیں ہے (صرف درخت کے سایہ کا اور جنت کے اندر کوڑا برابر جگہ کا تذکرہ ہے)۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ تمہاری ضرور آزمائش کی جائے گی بالوں اور جانوں (کے سلسلہ میں یعنی اوامر تکلیفیہ دے کر جیسے زکوٰۃ، صدقات، روزہ، نماز، حج اور جہاد یا تکالیف میں مبتلا کر کے جیسے (طرح طرح کی) مصیبتیں، مالی تباہیاں، آفات، تجارتی، گھاٹا، بیماریاں اور دوستوں عزیزوں کی موت۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ اور تم ضرور سنو گے ان لوگوں سے جن کو کتاب تم سے پہلے دی گئی اور مشرکوں سے دکھ کی باتیں بہت یعنی رسول اللہ ﷺ کی ہجاء دین پر طعنے مسلمانوں کے خلاف کافروں کو ترغیب۔ اللہ نے اس بات کی اطلاع پہلے سے اس لئے دیدی کہ آئندہ ہونے والے واقعات سے وہ تنگدل نہ ہوں۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور برداشت کرنے کے لئے تیار رہیں۔

ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی مسند میں بسند حسن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول اس واقعہ کے متعلق ہوا جو حضرت ابو بکر و فنحاص یہودی کے درمیان ہوا تھا۔ جس میں فنحاص نے کہا تھا ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء۔

عکرمہ مقاتل کلبی اور ابن جریج کا بیان بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ ان حضرات کا بیان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بنی قینقاع کے سردار فنحاص بن عازوراء کے پاس کچھ (مالی) امداد طلب کرنے کے لئے بھیجا اور ایک تحریر بھی اس کے نام لکھ دی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے بغیر تیزی میں کچھ حرکت نہ کر بیٹھنا

marfat.com

(بلکہ) واپس آجانا حضرت ابو بکرؓ گردن میں تلوار لٹکائے فخاص کے پاس پہنچے اور اس کو نامہ مبارک دیدیا، فخاص نے خط پڑھ کر کہا اب تمہارا رب ہماری مدد کا محتاج ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے (یہ بے ادبی کے الفاظ سن کر) تلوار کی ضرب رسید کرنی چاہی مگر حضور ﷺ کا فرمان یاد آگیا کہ واپس آجانا تیزی میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا یہ سوچ کر رک گئے اور یہ آیت نازل ہوئی۔

عبدالرزاق نے بروایت زہری عبداللہ بن کعب بن مالک کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول کعب بن اشرف کے حق میں ہوا یہ شخص اپنے اشعار میں رسول اللہ ﷺ کی ہجا کرتا تھا مسلمانوں کو گالیاں دیتا تھا اور مشرکوں کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے خلاف بھڑکاتا تھا۔

میں کہتا ہوں یہ قصہ واقعہ بدر کے بعد کا ہے کعب نے جب اسلامی حکومت دیکھی سرداران قریش بھی اس کی نظر کے سامنے مارے گئے تو مکہ کو خود گیا کہ مشرکوں کو رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کے لئے جمع کرے اور جب قریش نے اس سے پوچھا کہ ہمارا مذہب زیادہ ہدایت کا ہے یا محمد ﷺ کا دین تو کعب بن اشرف نے کہا تمہارا دین۔ رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس کی ہجاء کی تھی۔

صحیح روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کعب بن اشرف نے اپنے اشعار میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو دکھ پہنچایا ہے اور ہمارے خلاف مشرکوں کو طاقت بہم پہنچائی ہے، میرے لئے کون اس کا کام تمام کر سکتا ہے محمد بن مسلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں حضور ﷺ کی یہ خدمت کروں گا وہ میرا ماموں ہے میں اس کو قتل کر دوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم سے ہو سکے تو ایسا کر دو محمدؓ بن مسلمہ (گھر) لوٹ کر آئے لیکن تین روز تک سوائے اتنی غذا کے کہ سانس باقی رہے نہ کچھ کھایا نہ پیا، اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا گیا تو آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہؓ سے دریافت کیا تم نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا ابن مسلمہؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں ایک بات کہہ تو گزرا لیکن معلوم نہیں کہ پورا بھی کر سکوں گا یا نہیں حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے ذمے کوشش کرنا ہے سعد بن معاذ سے مشورہ کرو۔ محمد بن مسلمہؓ نے سعدؓ سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا تم اس کے پاس جاؤ اپنی ضرورت کا اس سے شکوہ کرو اور کچھ غلہ قرض دینے کی اس سے درخواست کرو۔

غرض اس کے بعد محمد بن مسلمہؓ اور عباد بن بشر اور ابو نائلہ سلکان بن سلامہ جو کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے اور حارثؓ بن عبس اور حارثؓ بن اوس بن معاذؓ جو حضرت سعدؓ بن معاذ کے بھتیجے تھے اور چچا نے ان کو بھیجا تھا اور ابو عبس بن حبر ایک جگہ جمع ہوئے اور خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم اس کو قتل تو کر دیں گے مگر آپ ہم کو اجازت دیجئے کہ آپ کے متعلق اگر کچھ (نازیبا) باتیں ہم آپس میں کہیں (تو قابل مؤاخذہ نہ قرار دیئے جائیں) فرمایا جیسا سمجھو ویسا کہو تم کو آزادی ہے اس کے بعد سب نے ابو نائلہ کو آگے بھیجا۔ ابو نائلہ کعب کے پاس گئے اس سے کچھ باتیں کیں اور آپس میں شعر سنانے لگے کیونکہ ابو نائلہ بھی شعر کہا کرتے تھے (اور کعب بن اشرف بھی شاعر تھا) پھر ابو نائلہ بولے ابن اشرف میں ایک کام سے تیرے پاس آیا تھا میں اس کا ذکر تو تجھ سے کرتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ ظاہر نہ کرنا ابن اشرف نے کہا بیان کرو۔ ابو نائلہ نے کہا ہمارے ملک میں اس شخص کا آنا ہمارے لئے مصیبت بن گیا ہے تمام عرب ہمارا دشمن ہو گیا اور ہمارے مقابلہ میں ایک کمان بن گیا ہمارے (سفر کے) راستے سارے کٹ گئے یہاں تک کہ بال بچے بھوکے مرنے لگے اور ہم سخت دشواریوں میں پڑ گئے۔ کعب نے کہا میں نے تو تم کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آخر یہی ہوگا۔ ابو نائلہ نے کہا میرے ساتھ میرے کچھ ساتھی ہیں ہم سب چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ہاتھ کچھ غلہ فروخت کر دو (اور قیمت کے عوض اس وقت) ہم تمہارے پاس کچھ رہن رکھ دیں گے اور تمہارا اعتماد کرا دیں گے تم ہم سے اتنا سلوک کر دو۔ کعب نے کہا اپنے بچے میرے پاس رہن رکھ دو۔ ابو نائلہ نے کہا ہم کو شرم آتی ہے کہ اپنی اولاد کو گروی ہونے کی عار میں مبتلا کریں کہ آئندہ لوگ کہیں یہ ایک وسق کے عوض گروی گیا تھا اور یہ دو وسق کے عوض۔ کعب نے کہا تو اپنی عورتیں رہن رکھ دو۔ ابو نائلہؓ نے کہا عورتوں کو کیسے رہن رکھ دیں تم عرب کے حسین ترین شخص ہو ہم تمہاری طرف سے بے خطر نہیں ہیں تمہاری خوبصورتی کو دیکھ کر کون عورت تم سے بچ سکتی ہے البتہ ہم اپنے

maarfat.com

اسلحہ تمہارے پاس رہن رکھ سکتے ہیں اور تم واقف ہی ہو کہ ہم کو اسلحہ کی کتنی ضرورت ہے۔

کعب نے کہا اچھا بیشک اسلحہ پر (ادائے قیمت کا) پورا اعتماد ہے۔ ابو نائلہؓ نے چاہا کہ کعب ہتھیاروں کو دیکھ کر کہیں انکار نہ کر دے اس لئے اس سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے لوٹ آئے اور اپنے ساتھیوں کو آکر اطلاع دیدی سب نے باتفاق رائے طے کر لیا کہ شام کو مقررہ وعدہ کے مطابق کعب کے پاس جائیں گے پھر رات کو آکر رسول اللہ ﷺ کو اس تدبیر اور گفتگو کی اطلاع دے دی۔

محمد بن اسحاق اور امام احمد نے بسند صحیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کو رخصت کرنے بقیع غرقد تک ان کے ساتھ گئے پھر ان کو بھیج کر فرمایا جاؤ اللہ کے نام پر۔ اے اللہ ان کی مدد فرما۔ اس کے بعد آپ چاندنی رات میں جو دن کی طرح تھی اپنے گھر لوٹ آئے یہ چاندنی ماہ ربیع الاول کی چودھویں رات کی تھی۔ ادھر وہ لوگ چلے گئے اور رات کو ابن اشرف کی گڑھی پر پہنچے، ساتھیوں سے ابو نائلہ نے کہا میں کعب کے سر کے بل ہاتھ سے بٹوں گا اور جب تم دیکھو کہ میں نے اس کے سر کے بل مضبوطی سے قابو میں کر لئے تو اپنا کام کرنا اور تلواروں سے اس پر حملہ کرنا۔ گڑھی کے پاس پہنچ کر ابو نائلہؓ نے آواز دی۔ ابن اشرف کی شادی نئی نئی ہوئی تھی آواز سن کر وہ چادر لپیٹے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ بیوی نے چادر کا کونہ پکڑ لیا اور کہنے لگی آپ جنگی آدمی ہیں اور جنگی آدمی ایسے وقت نہیں اترا کرتے (اس وقت باہر نکلنے میں آپ جیسے لوگوں کے لئے خطرہ ہے) میں ایسی آواز سن رہی ہوں جس سے خون ٹپک رہا ہے آپ گڑھی کے اوپر سے ہی ان سے گفتگو کر لیں۔ کعب نے کہا میں نے وعدہ کر لیا ہے اور یہ تو میرا بھانجہ محمد بن مسلمہ اور رضاعی بھائی ابو نائلہ ہے اگر یہ لوگ مجھے سوتا پائیں گے تو بیدار کر لیں گے اور شریف آدمی کو اگر رات میں نیزوں کی طرف بھی بلایا جائے تو وہ قبول کرتا ہے، غرض کعب چادر گلے میں ڈالے نیچے اتر آیا، چادر سے خوشبو مہک رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا کچھ دیر ہو گئی تو ان لوگوں نے کہا ابن اشرف چلو شعب عجوز تک ٹہلتے ہوئے چلیں وہاں پہنچ کر باقی رات باتیں کریں گے۔ کعب نے کہا اگر چاہتے ہو تو چلو۔ سب پیدل ٹہلتے ہوئے چل دیئے کچھ دیر ہی چلے تھے کہ ابو نائلہؓ نے کہا مجھے تمہاری طرف سے خوشبو کی مہک آرہی ہے۔ کعب نے جواب دیا فلاں عورت جو عرب کی عورتوں میں سب سے زیادہ معطر رہنے والی ہے میری بیوی ہے۔ ابو نائلہؓ نے کہا کیا مجھے سونگھنے کی اجازت ہے۔ کعب نے کہا ہاں ابو نائلہ نے اپنا ہاتھ کعب کے سر کے بالوں میں ڈالا پھر اپنے ہاتھ کو سونگھا اور کہا آج کی رات کی طرح میں نے کبھی کوئی خوشبو نہیں سونگھی۔

کعب حسین اور گھونگریالے بالوں والا شخص تھا، مشک کو پانی میں گھس کر اور عنبر ملا کر دونوں کنپٹیوں پر گوند کی طرح جما لیا کرتا تھا ابو نائلہ کچھ دیر اور چلتے رہے پھر لوٹ کر وہی عمل کیا جو پہلے کیا تھا یہاں تک کہ کعب کو پورا مطمئن کر دیا اور ابو نائلہ کا ہاتھ کعب کے بالوں میں پھرنے لگا آخر کار لوٹ کر اس کے سر کی لٹیں پکڑ لیں اور خوب قابو میں لے کر اپنے ساتھیوں سے کہا دشمن خدا کو مارو۔ فوراً تلواریں چلیں مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا محمد بن مسلمہؓ کا بیان ہے کہ مجھے ایک خنجر یاد آیا جو تلوار (کی نیام) میں میں نے رکھا تھا فوراً میں نے وہ خنجر ہاتھ میں لے لیا دشمن خدا نے ایک زور کی چیخ ماری۔ چیخ کے ساتھ ہی ہمارے گرداگرد جتنی گڑھیاں تھیں سب پر آگ روشن کر دی گئیں میں نے خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا اور خنجر پر دباؤ ڈال کر پیڑو کی ہڈی تک پہنچا دیا اور اللہ کا دشمن گر پڑا۔

ابن سعدؒ کی روایت میں آیا ہے کہ ابو عبسؓ نے کعب کے پہلو میں برچھا مارا پھر ان لوگوں نے اس کا سر کاٹ لیا۔ حارثؓ بن اوس بن معاذ کے سر پر ہماری ہی کسی تلوار سے چوٹ آگئی تھی ہم پہرہ دار یہودیوں کے ڈر سے وہاں سے نکل کر تیزی سے بھاگے مگر ہمارا ساتھی حارثؓ بن اوس سر کی چوٹ اور خون نکل جانے کی وجہ سے پیچھے رہ گیا اور اس نے ساتھیوں کو پکار کر کہا رسول اللہ ﷺ سے میرا سلام کہہ دینا۔ آواز سن کر لوگ اس کی طرف مڑے اور اٹھا لائے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چل دیئے آخر رات میں بقیع غرقد پر پہنچ کر سب نے تکبیر کہی رسول اللہ ﷺ اس وقت کھڑے نماز پڑھ

marfat.com

رہے تھے بقیع میں تکبیر کی آواز سن کر رسول اللہ ﷺ کو مسجد کے دروازہ پر کھڑا پایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا چہرے بامراد ہوں آنے والوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ کا چہرہ بھی بامراد ہو۔ آنے والوں نے حضور ﷺ کے سامنے کعب کا سر ڈال دیا آپ نے اس کے قتل پر اللہ کا شکر کیا۔ لوگوں نے اپنے ساتھی حارثؓ کو پیش کیا۔ حضور ﷺ نے ان کے زخم پر تھتکارا جس کی وجہ سے پھر زخم نے تکلیف نہیں دی اور لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

صبح کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو یہودی مرد تمہارے ہاتھ لگے اس کو قتل کر دو۔ شغینیہ ایک یہودی تاجر تھا جس کا مسلمانوں سے اختلاط تھا اور مسلمانوں سے خرید و فروخت کرتا تھا محیصہ بن مسعودؓ نے اس کو قتل کر دیا۔ محیصہ کا ایک بڑا بھائی خویصہ تھا اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا۔ خویصہ نے محیصہؓ کو مارا اور کہا اللہ کے دشمن تو نے اس کو قتل کر دیا۔ حالانکہ خدا کی قسم تیرے پیٹ کے اندر جتنی چربی ہے اس کا بیشتر حصہ اسی کے مال سے پیدا ہوا ہے۔ محیصہؓ نے کہا خدا کی قسم جس نے مجھے اس کے قتل کا حکم دیا تھا اگر وہ مجھے تیرے قتل کرنے کا حکم دیتا تو میں تیری بھی گردن مار دیتا۔ خویصہ نے کہا کہ اگر محمد ﷺ تجھے میرے قتل کا حکم دیدیں تو مجھے بھی تو قتل کر دے گا۔ محیصہؓ نے کہا ہاں۔ خویصہ نے کہا جس دین نے تجھے اس حد تک پہنچا دیا۔ خدا کی قسم وہ تو عجب دین ہے اس کے بعد خویصہ بھی مسلمان ہو گیا۔ کعب کے قتل کے بعد یہودی ڈر گئے پھر ان کے بڑے لوگوں میں سے کسی نے گردن نہیں اٹھائی اور کچھ نہ بولے ان کو اندیشہ ہو گیا کہ ابن اشرف کی طرح کہیں ان کو بھی رات کو قتل نہ کر دیا جائے۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ یہودی خوف زدہ ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے کہا ہمارے سردار کو نامعلوم طور پر قتل کر دیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے ان سے کعب کی حرکتوں کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ) کہ وہ کس کس طرح سے بھڑکاتا اور رسول اللہ سے لڑنے کی ترغیب دیتا اور حضور ﷺ کو دکھ پہنچاتا تھا اس کے بعد ان کو دعوت دی کہ رسول اللہ کے اور ان کے درمیان ایک صلح نامہ لکھ دیا جائے چنانچہ صلح نامہ لکھا گیا اور وہ تحریر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس رہی۔

مسئلہ :- اس قصہ سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی کافر رسول اللہ ﷺ کو گالی دے یا آپ ﷺ کی توہین کرے یا آپ کو دکھ پہنچائے تو اس کو قتل کر دینا جائز ہے، خواہ وہ معاہدہ ہو یا غیر معاہد۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر معاہد رسول اللہ ﷺ کو گالی دے تو اس کو قتل کرنا ناجائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینا کفر ہے اور کفر سے معاہدہ کی شکست نہیں ہوتی (معاہد تو پہلے سے ہی کافر ہوتا ہے) رہا ابن اشرف کا قتل تو اس کی وجہ جواز یہ تھی کہ اس نے خود عہد شکنی کی تھی مکہ کو جا کر مشرکوں کو رسول اللہ ﷺ سے لڑنے پر ابھارا تھا حالانکہ اس سے معاہدہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا مگر اس نے اس کے خلاف کیا۔

مسئلہ :- اس قتل کو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو نائلہ کی غداری کہنا جائز نہیں ایک شخص نے حضرت علیؓ کی مجلس میں ایسا کہا تھا تو آپ نے اس کی گردن مار دی تھی۔ غداری تو امان دینے کے بعد ہو سکتی ہے مگر حضرت محمد بن مسلمہؓ اور آپ کے ساتھیوں نے تو کعب کو امان نہیں دی تھی صرف بیع اور رہن کی گفتگو کی تھی یہاں تک کہ اس پر قابو پا لیا۔

فائدہ :- صحیح روایت میں آیا ہے کہ کعب سے گفتگو کرنے والے حضرت محمد بن مسلمہؓ تھے لیکن اکثر اہل مغازی نے لکھا ہے کہ گفتگو کرنے والے حضرت ابو نائلہؓ تھے دونوں روایتوں میں تطبیق کیلئے کہا جا سکتا ہے کہ دونوں حضرات نے گفتگو کی۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا اور اگر تم آزمائشوں پر صبر رکھو گے۔

وَتَتَّقُوا اور اللہ کے حکم کی مخالفت سے بچتے رہو گے۔

فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۱۸۶﴾ تو یہ صبر و تقویٰ تاکیدی احکام میں سے ہے۔ عَزْم مصدر بمعنی اسم مفعول ہے یعنی ان امور میں سے ہے جن پر عزم واجب ہے یا ان امور میں سے ہے جن کا اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے۔ عزم کا

marfat.com

اصل معنی ہے کسی چیز پر رائے کا جم جانا۔ عطاء نے عَزمِ الْاُمُورِ کا ترجمہ کیا ہے حقیقت ایمان۔ میں کہتا ہوں کہ صبر سے مراد ہے آزمائشوں کے وقت بے قرار نہ ہو جانا اور فرمانبردار رہنا اور (مصائب نازلہ پر) اعتراض نہ کرنا لیکن اگر کفار مسلمانوں کو ایذا دیں تو انتقام لینا صبر کے منافی نہیں ہے جیسے ابن اشرف کے قصہ سے واضح ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے اہل کتاب سے وعدہ لیا تھا یعنی توریت کے اندر علماء اہل کتاب سے وعدہ لیا تھا۔

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ کہ لوگوں کے سامنے اس کتاب (کے احکام) کو کھول کر بیان کرنا۔

وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ز اور اس (کے احکام اور بیانات) کو پوشیدہ نہ رکھنا۔

فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ پھر انہوں نے کتاب کو پس پشت پھینک دیا یعنی اس پر عمل چھوڑ دیا اور توریت کے اندر جو اوصاف محمدی کا بیان تھا اس کو پوشیدہ رکھا۔

وَاشْتَرَوْا بِهٖ اور اس کے (اخفاء کے) عوض انہوں نے لیا۔

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ حقیر معاوضہ یعنی کچھ کھانے کی چیزیں اور رشوتیں۔

فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ پس بری ہے وہ چیز جو وہ (حق کو چھپانے کے) معاوضہ میں لے رہے ہیں یعنی جو چیز وہ اپنے لئے پسند کر رہے ہیں وہ بری ہے۔ قتادہ نے کہا اللہ نے یہ عہد علماء سے لیا تھا کہ جو شخص کچھ جانتا ہو وہ دوسروں کو بتائے، چھپا کر نہ رکھے۔ اخفاء علم موجب ہلاکت ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ میں جو کچھ تم سے بیان کروں اس کو نہ چھپانا، پھر آپ نے آیت واذ اخذ الله ميثاق الذين اوتوا الكتب، تلاوت کی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی شخص سے کوئی ایسی علم کی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہو اور وہ چھپائے رکھے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی، رواہ احمد الحاکم بسند صحیح۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حسن بن عمارہؒ نے بیان کیا کہ میں زہری کے پاس اس زمانہ میں گیا جب انہوں نے حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا تھا میں نے ان کو دروازہ پر پایا اور کہا اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے کوئی حدیث بیان کریں بولے کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں نے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی ہے میں نے کہا یا تو آپ بیان کریں یا پھر میں آپ سے ایک حدیث بیان کروں، بولے تم بیان کرو میں نے کہا مجھ سے حکم بن عیینہ نے یحییٰ جزاز کے حوالے سے بیان کیا، جزاز نے کہا کہ میں نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ اللہ نے جاہلوں سے علم سیکھنے کا عہد اس وقت تک نہیں لیا جب تک علماء سے علم سکھانے کا وعدہ نہ لے لیا، پھر زہری نے مجھ سے چالیس حدیثیں بیان کیں۔ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں یہ حدیث حارث کی سند سے ابو اسامہ کی روایت سے لکھی ہے اور مسند الفردوس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ حدیث مرفوعاً منقول ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

جو لوگ اپنے (بد) کردار پر خوش ہوتے ہیں اور جو (اچھے) کام نہیں کئے، چاہتے ہیں کہ ان پر ان کی تعریف کی جائے سو تم ہرگز مت خیال کرنا کہ ایسے لوگ خصوصی عذاب سے بچے رہیں گے، (وہ نہیں بچیں گے) اور ان کو دکھ کا عذاب ہوگا۔ مَا اَتَوا سے مراد ہے لوگوں کو گمراہ کرنا، فریب کاری کرنا، حق کو چھپانا، یا عام گناہ مراد ہیں۔ مَالَمْ يَفْعَلُوا سے مراد ہے کہ عہد کو پورا کرنا، حق کو ظاہر کرنا سچی خبر دینا اور دوسری نیکیاں، بدکرداری پر خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بدکرداری تکذیب نبوت کی مددگار تھی۔

marfat.com

ممکن ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ سے مراد وہ منافق ہوں جنہوں نے واقع میں دل سے تو اطاعت نہیں کی مگر دکھاوٹ کے لئے طاعت کا اظہار کرتے تھے اور باوجود یہ کہ زاہد اور اللہ کے فرمانبردار نہ تھے مگر اس بات سے خوش ہوتے اور خواہش کرتے کہ ان کے زہد و اطاعت کی تعریف کی جائے اول لَا تَحْسَبَنَّ سے خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اس کا پہلا مفعول اَلَّذِيْنَ اور دوسرا مفعول بِمَفَازَةٍ ہے اور دوسرا اَلَا تَحْسَبَنَّ پہلے لَا تَحْسَبَنَّ کی تاکید ہے اور جو فاعل اور اول مفعول پہلے لَا تَحْسَبَنَّ کا ہے وہی اس کا ہے۔ اَلْعَذَابُ سے مراد ہے دنیا میں رسوائی، مذمت اور عدم قبول اور عَذَابٌ اَلِيْمٌ سے مراد ہے آخرت کا عذاب۔

شیخین وغیرہ نے حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف کے طریق سے اور بغوی نے بخاری کے طریق سے بروایت علقمہؒ بن وقاص بیان کیا کہ مروان نے اپنے دربان سے کہا جا کر ابن عباسؓ سے دریافت کرو کہ جب ہم میں سے ہر شخص اپنے کئے پر خوش اور ناکردہ نیکی پر تعریف کئے جانے کو پسند کرتا ہے اور ایسے شخص کو عذاب دیا جانا یقینی ہے تو کیا پھر ہم سب کو عذاب دیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تمہارا اس آیت سے کیا تعلق، اس کا واقعہ تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو طلب فرمایا اور کوئی بات پوچھی یہودیوں نے اصل بات چھپالی اور کوئی دوسری بات بتائی اور رسول اللہ ﷺ پر ظاہر یہ کیا کہ آپ نے جو کچھ دریافت کیا تھا ہم نے وہی بتایا اور اس فعل پر انہوں نے مستحق تعریف بننا چاہا، لیکن اپنی جگہ پر وہ اس امر سے خوش تھے کہ ہم نے وہ بات چھپالی جو رسول اللہ ﷺ نے دریافت کی تھی اس بیان کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے آیت وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ...... بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا تک تلاوت کی۔

شیخین نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ منافق ایسے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی جہاد پر جاتے تھے تو وہ رہ جاتے تھے جہاد پر نہیں جاتے تھے اور اپنے بیٹھ رہنے سے خوش ہوتے تھے لیکن جب حضور ﷺ واپس آتے تھے تو یہ لوگ قسمیں کھا کر معذرت پیش کرتے تھے اور ناکردہ نیکی پر تعریف کے خواستگار ہوتے تھے اس پر آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا الخ نازل ہوئی۔

عبدؒ نے اپنی تفسیر میں زید بن اسلمؒ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت رافعؓ بن خدیج اور حضرت زیدؓ بن ثابت مروان کے پاس موجود تھے۔ مروانؒ نے حضرت رافعؓ سے پوچھا کہ آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا الخ کس بابت نازل ہوئی تھی حضرت رافعؓ نے فرمایا کچھ منافق ایسے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی جہاد پر جاتے تو وہ عذر معذرت کر کے ساتھ نہیں جاتے تھے اور کہتے تھے ہم تو دل سے چاہتے تھے کہ آپ ﷺ لوگوں کے ساتھ ہوتے مگر خاص مجبوری کی وجہ سے رکنا پڑ گیا، انہی منافقوں کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا، حضرت رافع کا یہ کلام سن کر معلوم ہوتا تھا مروان کو اطمینان نہیں ہوا حضرت رافع نے گفتگو کا رخ بدل کر حضرت زید بن ثابتؓ سے کہا میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کیا آپ کو اس کا علم ہے حضرت زید نے فرمایا ہاں (ایسا ہی ہے) حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ آیت کا نزول دونوں گروہوں (یہود اور منافقین) کے حق میں ہوا یعنی دونوں واقعات ایک ہی زمانہ میں ہوئے اور آیت کا نزول دونوں کے متعلق ہوا۔ فراء نے بیان کیا ہے کہ یہودی کہتے تھے ہماری کتاب پہلے ہے۔ ہم اہل الصلوٰۃ اور اہل طاعت ہیں لیکن اس کے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ کی نبوّت کا اقرار نہیں کرتے تھے اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے مختلف طریقوں سے تابعین کی ایک جماعت کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور ابن جریر نے اسی کو ترجیح بھی دی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کے متعلق بھی یہ آیت نازل ہوئی ہو کوئی وجہ مانع نہیں، بغوی نے عکرمہؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آیت کا نزول فنحاص اور اشیع اور دوسرے علماء یہود کے متعلق ہوا جو لوگوں کو گمراہ کرنے اور علماء کہلانے سے خوش ہوتے تھے باوجود یہ کہ علماء نہیں تھے۔ مجاہدؒ نے کہا یہودی خوش ہوتے تھے کہ اللہ نے آل ابراہیمؑ کو مراتب عطا فرمائے حالانکہ وہ خود اس سے بے بہرہ تھے (حضرت ابراہیمؑ کے پیرو نہ تھے)۔

قتادہؒ اور مقاتلؒ نے کہا کہ خیبر کے یہودیوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر کہا ہم آپ کو پہچانتے ہیں اور تصدیق

marfat.com

کرتے ہیں (کہ آپ نبیؐ موعود ہیں) اور ہم تمہارے (یعنی مسلمانوں کے) خیال سے متفق ہیں اور تمہارے مددگار ہیں مگر یہ باتیں (وہ صرف زبان سے کہتے تھے) ان کے دلوں میں نہیں تھیں جب حضور ﷺ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے تو مسلمانوں نے ان سے کہا تم نے خوب کہا ایسا ہی کرنا، غرض مسلمانوں نے ان کی تعریف کی اور ان کیلئے دعا کی اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اور اللہ ہی کی ہے حکومت آسمانوں کی اور زمین کی، یعنی بارش، رزق اور زمین کی روئیدگی کے خزانے اللہ ہی کے اختیار میں ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾ اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے پس ان کو سزا دینے کی بھی اس کو قدرت ہے، اس آیت میں یہودیوں کے قول ان اللہ فقیر کی تردید ہے۔ ع ۱۹ ۱۰

طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ قریش یہودیوں کے پاس گئے اور ان سے پوچھا موسیٰؑ کیا معجزات لے کر آئے تھے، یہودیوں نے جواب دیا، عصا اور ید بیضاء۔ پھر عیسائیوں کے پاس گئے اور ان سے پوچھا عیسیٰؑ کی کیا کیفیت تھی عیسائیوں نے کہا وہ مادرزاد اندھوں اور برص کی بیماری والوں کو تندرست اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ کوہِ صفا کو ہمارے لئے سونے کا بنا دے، حضور ﷺ نے دعا کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بیشک آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے درمیانی کائنات کی تخلیق میں جو عجائب قدرت ہیں اور باوجود یہ کہ ذات ممکن مقتضی وجود نہیں (کیونکہ ذات امکان کی نسبت وجود و عدم دونوں سے برابر ہوتی ہے) پھر بھی اللہ نے ماہیات ممکنات پر فیضان وجود کیا (اور نیست سے ہست کیا)۔

وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اور رات دن کے تعاقب اور ترتیب کے ساتھ پر حکمت آمد و رفت میں۔

لَاٰیٰتٍ خالق کی ہستی کمال علمی، ہمہ گیری، قدرت اور ارادہ و حکمت کے ثبوت کی کھلی ہوئی دلیلیں موجود ہیں۔

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ ان لوگوں کے (جاننے اور ماننے کے) لئے جن کی دانش و فہم توہمات کی آمیزش سے پاک اور شیطانی وسوسوں سے منزہ ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افسوس ہے اس پر جو یہ (آیت) پڑھتا ہے اور اس پر غور نہیں کرتا، اخرجہ ابن حبان فی صحیحہ۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ (ایک رات) میں رسول اللہ ﷺ کے گھر سو گیا میں نے دیکھا کہ رات کو رسول اللہ ﷺ نے بیدار ہو کر مسواک کی، وضو کیا اور آیت ان فی خلق السمٰوٰت والارض آخر سورت تک پڑھی، پھر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی جس میں قیام رکوع اور سجود طویل کیا پھر واپس آکر سو گئے کہ سانس کی آواز آنے لگی پھر اسی طرح حضور ﷺ نے تین بار کیا، اس طرح چھ رکعتیں پڑھیں اور ہر مرتبہ مسواک بھی کی اور وضو بھی کیا اور ان آیات کی بھی تلاوت کی پھر تین وتر پڑھے، رواہ مسلم۔

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے۔ یہ اولی الالباب کی صفت ہے کیونکہ ذکر، فکر، تسبیح، استغفار، دعا، تضرع اور ایمان عقلی کا تقاضا ہے جو ان صفات سے متصف نہیں وہ جانور ہے بلکہ چوپایوں سے بھی زیادہ گمراہ کیونکہ چوپائے بھی کسی نہ کسی طرح تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، نخعی اور قتادہ کے نزدیک اس آیت میں آیت سے مراد نماز ہے، کھڑے ہو کر نماز پڑھے، کھڑا نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھ نہ سکے تو کروٹ سے لیٹ کر پڑھے، اسی آیت کی ہم مراد سورۂ نساء

marfat.com

کی یہ آیت ہے، فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ۔ [1]
حضرت عمران بن حصینؓ نے فرمایا مجھے بواسیر تھی میں نے رسول اللہ ﷺ سے مریض کی نماز کے متعلق پوچھا، حضور ﷺ نے فرمایا کھڑا ہو کر نماز پڑھ، کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو بیٹھ کر (پڑھ) اور بیٹھ بھی نہ سکتا ہو تو پہلو پر لیٹ کر (پڑھ) اخرجہ البخاری واصحاب السنن الاربعہ۔ نسائی نے حدیث کے آخر میں اتنا زائد نقل کیا ہے کہ اگر (کروٹ سے لیٹ کر) نہ پڑھ سکے تو چت لیٹ کر (پڑھ) اللہ کسی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مریض کھڑے ہو کر نماز پڑھے اگر (کھڑا) ہو سکے نہ الیسا کر سکے تو بیٹھ کر پڑھے پس اگر سجدہ نہ کر سکتا ہو تو اشارہ کرے اور سجدہ کا اشارہ رکوع سے زیادہ جھکا ہوا کرے اگر (بیٹھنے کی بھی) استطاعت نہ ہو تو دائیں کروٹ سے لیٹ کر قبلہ کی طرف منہ کر کے پڑھے اگر دائیں پہلو پر لیٹ نہ سکے تو چت لیٹ کر پاؤں کو قبلہ کی جانب کر کے پڑھے، رواہ دار قطنی لیکن اس حدیث کے راویوں میں ایک شخص حسین بن زید ہے جس کو ابن المدینی نے ضعیف کہا ہے ایک اور راوی حسن بن حسن مغربی بھی ہے جو متروک ہے اسی بنیاد پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ مریض اگر کھڑا ہونے سے عاجز ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے، بیٹھنے سے بھی عاجز ہو تو دائیں کروٹ سے لیٹ کر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے، اگر کروٹ سے لیٹنے سے بھی عاجز ہو تو چت لیٹ کر پاؤں کا رخ کعبہ کی طرف کر کے پڑھے تاکہ اس کے رکوع اور سجود کا اشارہ قبلہ کی طرف ہو سکے۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے مگر ان دونوں بزرگوں کا امام شافعیؒ سے اتنا اختلاف ہے کہ (امام شافعیؒ کے نزدیک چت لیٹنے کی اجازت اس وقت ہے جب دائیں کروٹ سے نہ لیٹ سکتا ہو لیکن) ان دونوں کے نزدیک اگر کروٹ سے لیٹ بھی سکتا ہو تب بھی چت لیٹ کر نماز پڑھنا درست ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر بیٹھ نہ سکتا ہو تو چت لیٹ کر کعبہ کی طرف پاؤں کر کے پڑھے اور چت نہ لیٹ سکتا ہو تو کروٹ سے لیٹ کر پڑھے، امام ابو حنیفہؒ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ آیت اور سورۂ نساء والی آیت کوئی بھی صلوٰۃ مریض کے متعلق نہیں ہے، بلکہ عام اہل تفسیر کے نزدیک آیت کی مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کی یاد کی جائے کیونکہ عموماً انسان کی یہی تین حالتیں ہوتی ہیں یا کھڑا ہوتا ہے یا بیٹھتا ہے یا لیٹتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص جنت کے باغوں کی سیر پسند کرتا ہو اس کو اللہ کا ذکر بہت کرنا چاہئے، رواہ ابن ابی شیبہ والطبرانی من حدیث معاذؓ۔

اور اگر ہم مان بھی لیں کہ آیت کا نزول صلوٰۃ مریض کے متعلق ہے تب بھی چت لیٹ کر نماز پڑھنے کی نفی اس سے نہیں نکلتی اور شافعیؒ نے جو ترتیب بیان کی ہے آیت اس پر دلالت نہیں کرتی، رہی حضرت عمرانؓ بن حصین والی حدیث تو ابن ہمام (صاحب فتح القدیر) نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت عمرانؓ کو بواسیر تھی آپ چت لیٹ ہی نہ سکتے تھے اسی لئے حدیث میں چت لیٹنے کا تذکرہ نہیں ہے، ہاں نسائی نے حدیث کے آخر میں جو زیادتی نقل کی ہے اگر وہ صحیح ثابت ہو جائے تو شافعیؒ کیلئے دلیل ہو سکتی ہے، باقی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث تو وہ (روایۃً) ضعیف ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

امام ابو حنیفہؒ نے جو چت لیٹنے کو کروٹ سے لیٹنے سے ترتیب میں پہلے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ (امام صاحبؒ کے نزدیک) نماز میں رکوع سجود کی اہمیت زیادہ ہے اس لئے امام صاحب نے فرمایا کہ جو شخص رکوع سجود نہ کر سکتا ہو مگر کھڑا ہو سکتا ہو اس کے لئے بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا افضل ہے کیونکہ بیٹھ کر اشارہ کرنا سجدہ سے قریب پہنچا دیتا ہے (اور کھڑے رہ کر اشارہ کرنے سے سجدہ سے دوری رہتی ہے) لیکن جمہور کا قول اس کے خلاف ہے (اگر قیام کی قدرت ہے تو جمہور کے نزدیک بیٹھ کر نماز صحیح نہ ہوگی سجدہ سے قرب وبعد کی اتنی اہمیت نہیں کہ قیام کا حکم ساقط ہو جائے) اور چت لیٹ کر اشارہ کرنے سے جبکہ

---

[1] سورۂ نساء کی یہ آیت مذکورہ آیت کے ہم معنی اگر قرار دی جائے تو اس آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا جب نماز ادا کرنے کا ارادہ کرو تو کھڑے بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے اللہ کی یاد کرو یعنی نماز پڑھو لیکن آیت کا مشہور مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز پڑھ چکو تو اللہ کا ذکر ہر طرح کرو، کھڑے بیٹھے لیٹے کوئی وقت یاد خدا سے خالی نہ رہنا چاہئے، واللہ اعلم۔

marfat.com

پاؤں قبلہ کی طرف ہوں اشارہ کعبہ کی طرف ہو گا لیکن کروٹ سے لیٹ کر خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے اشارہ کرنے سے اشارہ کعبہ کی طرف نہ ہو گا قدموں کی طرف ہو گا۔ لہٰذا کروٹ سے لیٹنے سے چت لیٹ کر پڑھنا بہتر ہے۔

امام مالکؒ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک رکوع سجود کی اہمیت قیام سے زیادہ نہیں (ارکان صلوٰۃ ہونے میں سب برابر ہیں) اس لئے جو کھڑا ہو سکتا ہو اس کی نماز بیٹھ کر صحیح نہیں خواہ رکوع سجود نہ کر سکتا ہو بلکہ کھڑا ہو کر اشارہ سے نماز پڑھنا لازم ہے، رہا چت لیٹنا تو یہ خیال غلط ہے کہ اس کا منہ کعبہ کی طرف ہو گا عام طور پر اس کا منہ آسمان کی طرف ہوتا ہے ہاں کروٹ سے لیٹ کر عموماً اس کا رخ قدموں کی طرف نہیں ہوتا کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور آیت فول وجھک شطر المسجد الحرام میں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ اور آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش پر نیز ان عجائب اور ندرتوں پر جو ان کے اندر اور درمیانی کائنات میں ہیں غور کرتے ہیں، تاکہ ان سے خالق، قادر، علیم، حکیم، وحدہٗ لاشریک کی ہستی پر استدلال کر سکیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (آیات قدرت پر) غور کرنے کے برابر کوئی عبادت نہیں، اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان وابن حبان فی الضعفاء، بیہقی اور ابن حبان دونوں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص اپنے بستر پر چت لیٹا ہوا تھا اوپر کو منہ تھا، اچانک اس کی نظر آسمان اور ستاروں پر پڑی تو اس نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرا ایک مالک اور خالق ہے اے اللہ مجھے بخش دے اللہ نے اس کی طرف (رحمت کی) نظر فرمائی اور بخش دیا۔ رواہ ابوالشیخ ابن حبان والثعلبی۔

(اہل منطق کے نزدیک) فکر کا معنی ہے نامعلوم چیز کو جاننے کے لئے معلوم چیزوں کو (دماغ کے اندر مناسب) ترتیب دینا۔ قاموس میں ہے کہ کسی چیز (کو جاننے) کے لئے غور سے کام لینا فکر ہے۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے، فکرۃ وہ قوت جو معلوم تک پہنچنے کے لئے علم کا راستہ بتاتی ہے اور تفکر کا معنی ہے قوت فکر کی حرکت جو عقلی نظر کے موافق ہو اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے دوسرے حیوان تفکر سے محروم ہیں (کیونکہ کسی حیوان کو قوت عقلیہ نہیں ملی حیوان کے پاس صرف حس ہے) تفکر کا تعلق صرف انہی چیزوں سے ہوتا ہے جن کی صورت دماغ میں آنا ممکن ہو اسی لئے روایت میں آیا ہے کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو، اللہ کی ذات میں غور نہ کرو، کیونکہ اللہ کی ذات ہر صورت سے پاک ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ لفظ فکر، لفظ فرک کا مقلوب ہے (فرک کا معنی ہے تراشنا، چھیلنا، رگڑنا) مگر فکر کا استعمال معانی میں ہوتا ہے یعنی معانی کو چھیلنا، کھودنا، رگڑنا، تاکہ ان کی حقیقت تک رسائی ہو جائے (تفکر ہے) انتہی کلام الجوہری، میں کہتا ہوں حدیث میں آیا ہے کہ ہر شئے میں غور و خوض کرو مگر اللہ کی ذات میں غور نہ کرو کیونکہ ساتویں آسمان سے اللہ کی کرسی تک سات ہزار نور ہیں اور اللہ اس سے بھی بالا ہے، رواہ ابوالشیخ فی العظمۃ عن ابن عباسؓ۔

حضرت ابن عباسؓ کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں خلق میں غور کرو خالق (کی ذات) میں غور نہ کرو کیونکہ تم اس کا اندازہ کر نہیں سکتے، حضرت ابوذرؓ کی روایت باایں الفاظ ہے کہ اللہ کی خلق میں غور کرو اللہ (کی ذات) میں غور نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ اللہ کی مخلوق میں غور کرو اللہ (کی ذات) میں غور نہ کرو، طبرانی نے الاوسط میں اور ابوالشیخ نے اور ابن عدیؒ نے اور بیہقی نے ضعیف سند سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں میں غور کرو، اللہ میں غور نہ کرو۔

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات میں غور کرنا منع ہے، صرف افعال خدا، صفات خدا اور اسماء خدا پر غور کیا جا سکتا ہے اس سے یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ اسماء اور صفات کی آمیزش کے بغیر (اور تمام صفات سے قطع نظر کر کے) تنہا خالص ذات کا علم حصولی (یعنی علم تصوری) ناممکن ہے بلکہ حضرت مجدد قدس سرہ نے تو فرمایا ہے کہ مرتبہ ذات سے تو علم

marfat.com

حضوری کا تعلق بھی محال ہے کیونکہ علم حضوری کی حرکت تو عالم کی جانب سے ہوتی ہے یعنی مرتبہ اتحاد و عینیت کی طرف ہوتی ہے۔ (مراد یہ ہے کہ علم حضوری بواسطہ صورت نہیں ہوتا مبدء انکشاف نفس ذات معلوم ہوتی ہے اس لئے علم حضوری کی حقیقت عالم کی ذات کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتی) پس اس سے کفر حقیقت لازم آتا ہے اللہ ہمارے نفس سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہے (شدت قرب نے ہی اس کو ہمارے لئے نامعلوم بنا دیا ہے) پس وہ وراء الوراء ہے پھر وراء الوراء ہے پھر وراء الوراء ہے مگر اس کا وراء الوراء (پردہ در پردہ) ہونا بعد کی جانب نہیں (ایسا نہیں کہ انتہائی دوری کی وجہ سے وہ مستور ہو) بلکہ قرب کی جانب ہے (یعنی انتہائی قرب کی وجہ سے وہ مجہول غیر مرئی غیر معقول اور مخفی ہے) لہٰذا مرتبہ ذات میں اس کی ذات کا علم حضوری بھی ناممکن ہے۔ بعض صوفیہ کو جو علم لدنی بسیط (بے کیف بے مقدار بے صورت اور بے حضور) ہر وقت حاصل رہتا ہے اور اس کے علم کا تعلق ذات خالص سے ہوتا ہے وہ علم نہ حصولی ہوتا ہے نہ حضوری، معلوم نہیں اس کی کیا حقیقت اور کیا کیفیت ہوتی ہے اس پر تفکر کا حقیقی اطلاق درست نہیں ہاں مجازاً اس کو تفکر کہا جاسکتا ہے جیسا کہ بعض صوفیہ کے کلام میں آیا ہے، شریعت میں اس کی تعبیر لفظ ذکر سے کی گئی ہے، حدیث میں جو آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے، اس سے مراد وہی مرتبہ علمی ہے جو نہ حصولی ہے نہ حضوری، ذکر لسانی مراد نہیں ہے کیونکہ ہر وقت ہمیشہ زبانی ذکر ناممکن ہے۔

چونکہ دوام ذکر ہی اصل مقصد ہے اور اس کا مرتبہ بہت اونچا ہے اور تفکر ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو ذکر تک پہنچاتا ہے اس لئے اللہ نے سب سے پہلے اولی الالباب کی صفت دوام ذکر کو قرار دیا اور اس کے بعد تفکر کا ذکر کیا جو علم (ذکر) تک پہنچاتا ہے اور ذکر کے لئے ایسا ہے جیسے کسی چیز کا سایہ پس کھڑے بیٹھے اور کروٹ کے بل ذکر کرنے سے مراد ہے ہر حال میں ہر وقت ذکر کرنا اس کے بعد فرمایا وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کے علاوہ فکر سے پہلے ذکر کو بیان کرنے سے اس امر پر تنبیہ بھی ہوتی ہے کہ عقل تنہا کوئی صحیح حکم اور فیصلہ نہیں کر سکتی جب تک نور ذکر اور ہدایت الٰہی سے ضیاء چیں نہ ہو (یعنی تفکر سے پہلے نور ذکر کی ضرورت ہے تنہا تفکر کرنے والے تو بہت ہیں مگر ذکر کی روشنی سے چونکہ وہ نور چیں نہیں اس لئے علم ذات سے محروم ہیں)۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے اس کو بیکار بے حقیقت محض کھیل کے لئے نہیں بنایا، یعنی وہ یہ بات کہتے ہوئے غور کرتے ہیں، باطل حق کی ضد ہوتا ہے (قاموس) حق کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے، ا۔ وہ موجود جس کا وجود اصلی ہو خود بخود ہو وہ اپنے وجود اور تحقق بلکہ کسی چیز میں دوسرے کا محتاج نہ ہو، بایں معنی حق صرف اللہ ہے، ۲۔ وہ موجود جس کا وجود محض وہمی تراشیدہ، اور خیالی نہ ہو بلکہ ذہن سے باہر واقع میں بھی ہو خواہ وہ اپنے تحقق میں موجود حق بمعنی اول سے خوشہ چیں ہو (جیسے آسمان زمین ہوا پانی انسان حیوان نباتات وغیرہ)، ۳۔ وہ موجود جس کا وجود پر حکمت، پر مصلحت اور مفید ہو بے کار، بے فائدہ، بے حکمت اور بیہودہ نہ ہو۔

حق کے یہ تین معانی ہیں اور ہر معنی کے مقابل لفظ باطل آتا ہے اول معنی کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب سے اچھا قول لبید (بن ربیعہ) کا یہ قول ہے اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے (یعنی اپنے وجود و لوازم وجود اور ہر وصف میں محتاج ہے کسی چیز کا وجود اصلی اور خود بخود نہیں ہے) باطل کا۔ دوسرا معنی بھی شعر میں مراد ہو سکتا ہے یعنی اللہ کے سوا ہر معبود کی معبودیت وہمی زائیدہ اور خیالی تراشیدہ ہے، واقعی نہیں۔ تیسرے معنی کے لحاظ سے باطل کا اطلاق شیطان پر ہوتا ہے اللہ نے فرمایا لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه اس کے آگے پیچھے (کسی طرف) سے شیطان نہیں آتا۔

آیت رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا میں بَاطِلًا بمعنی دوئم اور بمعنی سوئم مراد ہو سکتا ہے اگر باطل بمعنی دوئم مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ آسمان و زمین بے حقیقت نہیں ان کا وجود واقعی خارجی ہے محض خیال و وہم نہیں۔ اہل حق (اشاعرہ) نے صانع کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے اسی مسئلہ کو اساس قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ حقائق اشیاء (یعنی کائنات اراضی و

marfat.com

سماوی کی حقیقتیں) ثابت ہیں (صرف وہم کی آفریدہ اور خیال کی تراشیدہ نہیں ہے) اور ان کا علم واقعی ہے (محض فرضی اور اختراعی نہیں ہے) ہاں سوفسطائیہ کا قول اس کے خلاف ہے (ان کے نزدیک سارا عالم ایک فریب اور وہم ہے کسی چیز کی کوئی واقعی حقیقت اور خارجی وجود نہیں) اس آیت میں اہل حق کے قول کی صراحت ہے۔ اور اگر آیت میں باطل بمعنی سوم مراد ہو تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے رب تو نے اس کو بیکار اور محض کھیل نہیں بنایا بلکہ اس کی تخلیق میں تیری حکمت عظیمہ کار فرما ہے اس کا وجود تیری معرفت کی دلیل اور تیری شکر و طاعت کا موجب ہے۔

ما خلقت هذا میں اشارہ آسمان اور زمین کی طرف ہے۔ اسم اشارہ مذکر اس لئے لایا گیا کہ آسمان و زمین کے مجموعہ سے مراد ہے ان کا وجود جس پر اولی الالباب غور کرتے ہیں یا اس لئے کہ ان کا مجموعہ مخلوق ہے یا اشارہ خلق کی طرف ہے اور خلق بمعنی مخلوق ہے یا خلق بمعنی تخلیق ہے (پیدا کرنا) یہ بھی ممکن ہے کہ آسمان و زمین کے ہر جز کی پیدائش کی طرف اشارہ ہو۔

سُبْحٰنَكَ تو پاک ہے یعنی تو ہزل (مذاق کرنے اور محض کھیل) سے پاک ہے کیونکہ ہزل ایک قبیح فعل ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے لیکن اگر باطل بمعنی اول لیا جائے تو جملہ معترضہ ہوگا۔

فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ پس ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے یعنی اگر ہمارے تفکر اور غور میں کوئی خرابی ہو جائے اور ہم غور و فکر کا تقاضا پورا نہ کر سکیں (اور عذاب کے مستحق قرار پائیں) تو ہم کو عذاب سے محفوظ رکھ فَقِنَا کی فا (جو تفریع کے لئے ہے بتا رہی ہے کہ کائنات کی پیدائش (جو وجود صانع پر استدلال کرنے اور شکر و طاعت بجا لانے کے لئے ہے) کا تقاضا ہے کہ فرمان بردار کو ثواب اور نافرمان) کو عذاب ہو اور تخلیق ارض و سماء کے باطل اور بیکار نہ ہونے کا علم چاہتا ہے کہ ثواب کی امید اور عذاب کا خوف ہوا لہٰذا ضروری ہے کہ عذاب سے بچنے کی درخواست اور ثواب کی طلب کی جائے اور چونکہ دفع مضرت کی اہمیت حصول منفعت سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے عذاب سے بچاؤ کا ذکر حصول ثواب سے پہلے کیا جائے اور رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ کا ذکر فقنا عذاب النار کے بعد کیا جائے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ فَقِنَا میں فا جزائیہ ہے اصل کلام اس طرح تھا۔ جب ہم تیری پاکی کے مقر ہیں تو تو ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ اے ہمارے رب تو نے جس کو دوزخ میں داخل کیا تو بس اس کو رسوا ہی کر دیا۔ بار بار رَبَّنَا کا ذکر (چند وجوہ سے کیا گیا ہے) تضرع اور زاری میں زور پیدا کرنے کے لئے۔ ہر مقصد کو مستقل حیثیت میں ظاہر کرنے کے لئے ہر مطلب کی بلندی شان ظاہر کرنے کے لئے وصف ربوبیّت پر پورا پورا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اور اللہ کی ربوبیّت کا اقرار کرنے کے لئے خَزَاہ اس پر غالب آیا اس کو اس کی خواہش سے روک دیا یا خزی (سمع) مصیبت میں پڑ گیا، اَخْزَاہُ اللّٰہُ (انعال) اللہ نے اس کو رسوا کر دیا (قاموس)۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ اور ظالموں کا کوئی ساتھی نہیں۔ بجائے ضمیر کے لفظ ظلمین کہنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ظلم کی وجہ سے ہی وہ دوزخ میں جائیں گے۔ نصرت کا معنی ہے قوت سے دفع کرنا، قہار کے مقابلہ میں طاقت سے دفع کرنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اور نہ قہار کا عاجز ہونا لازم آئے گا اور عاجز ہونا صفت ربوبیّت کے منافی ہے لیکن اس سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی (کیونکہ شفاعت سے دفع مصیبت قوت کے ساتھ نہیں ہوتا)

ایک شبہ :- اللہ نے فرمایا ہے يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۔ اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کریگا۔ لیکن بعض مؤمن دوزخ میں جائیں گے اور اس آیت میں صراحت ہے کہ جو دوزخ میں جائیگا اللہ اس کو رسوا کر دیگا (نتیجہ یہ نکلا کہ بعض مؤمن رسوا ہونگے) دونوں آیتوں کے تضاد کو دور کرنے کی کیا صورت ہوگی۔

ازالہ :- ہم کہتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص دوزخ میں جائے گا جب تک وہ دوزخ میں رہے گا اس کی رسوائی ہوگی۔ یا جن مؤمنوں کو رسوا نہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ان سے کامل مؤمن مراد ہیں (معہ کا لفظ اس کا قرینہ ہے۔ مترجم) حضرت انسؓ اور قتادہؒ نے مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ کا ترجمہ کیا ہے جس کو تو دوزخ میں ہمیشہ رکھے۔ سعید بن منصور نے کہا

marfat.com

اس آیت (میں رسوانہ کرنے) کا حکم ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو کبھی دوزخ سے نہیں نکلیں گے۔ حضرت جابرؓ نے فرمایا مؤمن کو رسوا کرنے سے مراد ہے ادب آموزی، رسوائی کا درجہ اس سے اونچا ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا اے ہمارے رب ہم نے ایک ندا دینے والے سے سنا۔ حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ اور اکثر علماء کے نزدیک منادی سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ قرطبی نے کہا قرآن مراد ہے کیونکہ ہر شخص کی ملاقات تو رسول اللہ ﷺ سے نہیں ہو سکتی۔ میں کہتا ہوں رسول اللہ ﷺ کا متواتر فرمان سننا ہی ایسا ہے جیسے کسی نے خود حضور ﷺ سے سنا (یعنی رودررو ہو کر سننا جس طرح مفید یقین ہوتا ہے اسی طرح اگر کوئی فرمان تواتر کے ساتھ کسی کے پاس پہنچے تو وہ بھی خود زبان مبارک سے سننے کی طرح مفید یقین ہے) پکارنے والے کو سنا۔ فرمایا، پکارنے والے کے قول کو سنا نہیں فرمایا کیوں؟ سننے کی قوت، بتانے کے لئے، پہلے مُنَادِيًا کو نکرہ ذکر کیا۔ منادی کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے پھر اس کی ندا کو ایمان کے ساتھ مقید کیا منادی اور ندا کی مزید عظمت بیان کرنے کے لئے کیونکہ ایمان کے لئے پکارنے والے سے زیادہ باعظمت منادی اور ندائے ایمانی سے بڑھ کر کوئی ندا ممکن نہیں۔

يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ جو پکار رہا تھا ایمان لانے کیلئے، مادۂ نداء کے بعد الیٰ بھی آتا ہے کیونکہ ندا کے مفہوم میں پہنچنے کا مفہوم شامل ہے اور لفظ نداء کے بعد لام بھی آتا ہے کیونکہ لام خصوصیّت کو ظاہر کرتا ہے اور مقصود ندائے مخصوص ہوتا ہے۔

اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ اَنْ مفسرہ ہے نداء کے اندر قول کا معنی ہوتا ہے (یعنی وہ ایمان کے لئے پکار کر کہہ رہا تھا کہ) یا اَنْ مصدری ہے اور باء مقدر ہے اصل میں تھا بِاَنْ اٰمِنُوْا۔

فَاٰمَنَّا سو ہم اس پر ایمان لائے۔ فقط دعوت ایمان پر ایمان لانا بتا رہا ہے کہ ایمان کی بناء (عقلی دلیلوں پر نہیں ہے بلکہ) صرف شارع کی طرف سے دیئے ہوئے حکم پر ہے اس آیت سے شیخ ابو منصورؒ ماتریدی نے استدلال کیا ہے کہ ایمان میں استثناء باطل ہے (یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ میں انشاء اللہ مؤمن ہوں) بلکہ اس طرح کہنا واجب ہے کہ میں یقینی مؤمن ہوں۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اے ہمارے رب پھر معاف کردے ہمارے کبیرہ گناہ۔ فَاغْفِرْ میں فاء سببیت کی ہے (یعنی فاء سے پہلا کلام بعد والے کلام کا سبب ہے) کیونکہ ایمان سبب مغفرت ہے مغفرت بغیر ایمان کے نہیں ہو سکتی۔

وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا اور ہماری بدکاریاں (یعنی صغیرہ گناہ) ہم سے دور کردے کَفِّرْ باب تفعیل سے امر ہے اور باب تفعیل فعل کی کثرت کو ظاہر کرتا ہے صغیرہ گناہ بکثرت ہوتے ہیں اس لئے درخواست بھی بار بار معاف کرنے کی کی۔ یعنی بار بار ہماری برائیوں پر پردہ ڈال۔

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ اور نیکوں (کے گروہ) میں شامل کرکے ہمیں موت دے۔ اَبْرَار جمع ہے بَرٌّ یا بَارٌّ کی مراد ہیں، سچے اور بکثرت نیکی کرنے والے اور بہت بھلائی والے لوگ۔ اپنے آپ کو نیکوں میں شامل کرنے کی دعا کی اور خود نیک ہونے کا اظہار نہیں کیا محض عاجزی اور خضوع اور انکسار نفس کی وجہ سے کیونکہ خضوع ہی اللہ کو محبوب ہے۔ نیکوں کے ساتھ موت دینے کا معنی یہ نہیں ہے کہ نیکوں کی موت کے وقت ہماری موت ہو ایسی دعاء علاوہ غیر مفید ہونے کے عادۃً ناممکن بھی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہم کو ان کے زمرہ میں داخل کرکے اور نیک بنا کے موت دے۔

ایک شبہ :- یہ تو موت کی دعا اور تمنا ہے اور موت کی دعا سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا جیسے سورۂ بقرہ کی آیت فتمنوا الموت ان کنتم صادقین کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

ازالہ :- مسئلہ کی تحقیق ہم کرچکے ہیں کہ موت کی تمنا اور دعا کسی مالی نقصان یا جسمانی دکھ سے تنگ آکر ناجائز ہے مطلقاً ناجائز نہیں ہے اس کے علاوہ اس آیت سے مراد موت کی دعا نہیں ہے بلکہ مرتے دم تک نیکی اور صلاح عمل پر قائم رکھنے کی دعا مقصود ہے کہ موت آئے تو صلاح و نیکی کی حالت میں آئے، فوری موت کی طلب کا اظہار مقصود ہی نہیں ہے جیسے آیت ولا تموتن الا و انتم مسلمون میں غیر اسلامی حالت پر مرنے کی ممانعت کرنا نہیں ہے موت (کسی حالت میں ہو) انسان

marfat.com

کے بس میں ہی نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تمہاری زندگی کی ہر حالت اسلامی ہو اور ہر وقت تم مسلمان رہو تاکہ جب بھی موت آئے تو اسلام پر آئے۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا اے ہمارے پروردگار اور ہم کو عطا کر جو تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے یعنی ثواب جنت۔ اپنا دیدار اور مرتبۂ قرب آخرت میں اور دشمنوں پر فتح دنیا میں۔

عَلٰی رُسُلِكَ اپنے پیغمبروں پر ایمان لانے کے بدلہ میں یا اپنے پیغمبروں کی زبانی کئے ہوئے وعدہ پر۔ یا یہ مطلب کہ پیغمبروں پر جو وعدہ تو نے نازل کیا تھا وہ عطا فرما۔ یا یہ مطلب کہ اپنے پیغمبروں کے ساتھ ہم کو بھی دے اور ہم کو بھی اپنی داد و دہش میں ان کا شریک بنا دے۔ اس صورت میں علی کا معنی ہوگا مع۔ اس درخواست معیت کے اظہار سے مقصود ہے حق رسالت کو ادا کرنا اور پیغمبروں کی شرکت کی برکت سے اپنے لئے فضل کو بڑھانا۔

اٰتِنَا اور وَعَدْتَّنَا میں جمع متکلم کی ضمیر سے مراد ہے مسلمانوں کا گروہ یعنی تمام صالحین سے جو تو نے وعدہ کیا وہ عطا فرما۔

ایک شبہ :- کیا اہل ایمان کو اللہ کی طرف سے وعدہ خلافی کا کچھ اندیشہ تھا کہ دعا میں ایفاء وعدہ کی درخواست کی۔

ازالہ :- نہیں ایسا نہیں بلکہ یہ دعا اس اندیشہ کی وجہ سے ہے کہ کہیں سائل کا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جائے جن کو برے انجام کی وعید سنائی گئی ہے یا اس غرض سے ایسی دعا کر رہا ہے کہ اس کو اپنے ایمان اور طاعت میں کچھ قصور نظر آ رہا ہے یا یوں کہو کہ یہ دعا محض تعبدی اور اظہار عجز کے لئے ہے، ورنہ ہو گا وہی جو اللہ کو منظور ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ الفاظ دعا کے ہیں مگر معنی خبر کے مراد ہیں یعنی اے رب بلا شبہ جو تو نے پیغمبروں کی معرفت ہم سے فضل و رحمت کا وعدہ کیا وہ ہم کو ضرور دے گا۔ بعض علماء نے کہا دعا سے مراد ہے ایفاء وعدہ کی تعجیل یعنی یہ تو ہم جانتے ہیں کہ جس فتح کا تو نے وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا کرے گا اس کے خلاف نہیں کرے گا لیکن ہم کو تیرے حکم کی برداشت نہیں اب جلد ان کو رسوا اور ہم کو ان پر فتحیاب فرما دے۔

وَلَا تُخْزِنَا اور ہم کو رسوا نہ کر یعنی ہم کو دوزخ میں داخل نہ کر۔

یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ط قیامت کے دن یعنی اس دن جب یکدم سب لوگ قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے [1]۔ رسوا نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایسے اعمال کے ارتکاب سے بچا جن کے نتیجہ میں قیامت کے دن ہم کو رسوائی ہو اور ہم کو بخش دے اور ہمارے قصوروں پر پردہ ڈال دے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ بندہ کو اپنے قریب بلوا کر اس پر اپنا ہاتھ رکھے گا اور مخلوق سے چھپا کر اس کے سامنے اس کا اعمالنامہ لا کر فرمائے گا اپنا اعمالنامہ پڑھ۔ حسب الحکم بندہ پڑھے گا اور نیکی کو لکھا دیکھ کر اس کا چہرہ چمک جائے گا اور دل خوش ہو گا اللہ فرمائے گا میرے بندے کیا تو اس کو پہچانتا ہے، بندہ عرض کرے گا ہاں پروردگار پہچانتا ہوں اللہ فرمائے گا میں نے تیری نیکی قبول کی بندہ فوراً سجدہ میں گر پڑے گا اللہ فرمائے گا اپنا سر اٹھا اور اپنے اعمال نامہ کو (اور آگے) پڑھ۔ حسب الحکم بندہ پڑھے گا اور بدی لکھی دیکھ کر اس کا چہرہ سیاہ اور دل خوف زدہ ہو جائے گا۔ اللہ فرمائے گا میرے بندے کیا تو اس کو پہچانتا ہے بندہ عرض کرے گا، ہاں میرے رب پہچانتا ہوں اللہ فرمائے گا میں تجھ سے زیادہ اس کو جانتا ہوں مگر میں نے تجھے یہ گناہ معاف کیا۔ اسی طرح بندہ پڑھتا جائے گا نیکی کو پڑھے گا اور اللہ کی طرف سے قبول ہونے کا فرمان سن کر سجدہ کرے گا اور بدی کو پڑھے گا اور معافی کا حکم سن کر سجدہ کرے گا مگر مخلوق کو (کچھ معلوم نہ ہو گا کہ واقعہ کیا گزر رہا ہے فقط) اس کا سجدہ کرنا دکھائی دے گا اس لئے بعض لوگ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے بشارت ہو اس بندہ کو جس نے کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی کسی کو

[1] القیامۃ کی تفسیر یکدم اٹھ کھڑے ہونے سے کرنے میں اس طرح اشارہ ہے کہ القیامۃ میں تاء وحدت کی ہے یعنی ایک قیام کا دن اور وہ دن مقرر ہے یوں تو ہر شخص کا مرنا بھی اس کے لئے قیامت ہے اور ایسی قیامت کی تعداد اموات کے مطابق ہے مگر یہاں ایک مخصوص دن مراد ہے جو سب لوگوں کے لئے ایک ہی ہو گا یعنی قبروں کے نکلنے سے حساب کتاب اور فیصلہ کے بعد جنت اور دوزخ میں داخلہ تک کا وقت، ۱۲۔

marfat.com

معلوم نہ ہوگا کہ اللہ کا اور اس کا کیا معاملہ گزرا۔ رواہ عبد اللہ بن احمد فی الزوائد واخرج البیہقی عن ابی موسیٰ نحوہ۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے صحیحین میں بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔

اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿۱۹۴﴾ اس میں شبہ نہیں کہ تو وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا یعنی مومن کو ثواب دے گا اور دعا کرنے والے کی دعا قبول فرمائے گا۔ گذشتہ دعا میں اتنا ما وعدتنا سے چونکہ وہم ہو سکتا ہے کہ شاید دعا کرنے والے کے نزدیک اللہ کی وعدہ خلافی کا احتمال ہے اس لئے انک لا تخلف المیعاد کہہ کر اس وہم کو دور کر دیا۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ استجاب اور اجاب بعض علماء کے نزدیک ہم معنی ہیں لیکن بیضاوی نے لکھا ہے استجاب، اجاب سے خاص ہے استجاب کا معنی ہے دعا کو قبول کیا۔ یہ بغیر حرف جار کے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور لام کے ذریعہ سے بھی (پس استجاب لھم اور استجابھم دونوں طرح کہنا درست ہے)۔

اَنِّي لَآ اُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بایں طور یا یہ کہتے ہوئے ان کی دعا قبول کی کہ میں تم میں [1] سے کسی عمل کرنے والے کا کوئی عمل اکارت نہیں کروں گا، کرنے والا مرد ہو یا عورت۔ حضرت ام سلمہؓ میں سن رہی ہوں کہ ہجرت میں اللہ مردوں کا ذکر فرماتا ہے عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اخرجہ الحاکم وصححہ والترمذی وابن ابی حاتم وعبد الرزاق وسعید بن منصور۔

بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ تمہارے بعض بعض سے ہیں۔ کلبیؒ نے کہا یعنی دین میں باہم مدد کرنے میں اور آپس کی دوستی میں، بعض نے کہا نسب اور انسانیت میں ایک کا دوسرے سے ہونا مراد ہے کیونکہ سب آدمؑ وحواؑ کی اولاد ہیں ہر مرد بھی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے (با استثناء آدم وحواؑ) اور ہر عورت بھی مرد کی پشت سے پیدا ہوئی ہے۔ پس عورتوں کو بھی اعمال کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح مردوں کو عام عمل کرنے والوں سے جو وعدہ کیا ہے اس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی شرکت ظاہر کرنے کے لئے یہ جملہ معترضہ بیان کیا، اس سے آگے بعض عمل کرنے والوں کے بعض اعمال کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے مستقل طور پر فرمایا۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَاُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوا فِي سَبِيلِي پھر جن لوگوں نے وطن چھوڑے اور اپنی بستیوں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ان کو دکھ دیئے گئے۔ میری راہ سے مراد ہے میری طاعت اور میرے دین کی راہ میں یا مجھ پر ایمان لانے کی وجہ سے اور میرے سبب سے۔

وَقٰتَلُوا وَقُتِلُوا اور لڑے اور مارے گئے۔

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ میں ضرور ضرور دور کر دوں گا ان سے ان کے گناہ یعنی ان کے گناہ مٹا دوں گا اور مغفرت کر دوں گا۔

وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ اور ان کو ضرور ضرور ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ اللہ کی طرف سے ثواب کے طور پر۔ مبرد نے کہا ثواباً مفعول مطلق تاکیدی ہے فعل محذوف ہے یعنی لاثیبنھم ثوابا میں ان کو ضرور بالضرور یقیناً ثواب عطا کروں گا۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ثواباً جنت سے حال قرار دیا جائے یعنی جنات بطور ثواب دی جائیں گی۔ شاید من عند اللہ ثواب کہنے سے یہ مراد ہو کہ جنات سے بڑھ کر کوئی اور ثواب محض خدا داد ان کو ملے گا (اس وقت ثواباً حال نہ ہوگا بلکہ فعل محذوف کا مفعول ہوگا کیونکہ یہ ثواب جنات سے غیر ہوگا یہ ثواب

[1] تم میں سے یعنی اے اہل ایمان تمہارا کوئی عمل ضائع نہیں کروں گا، یہ قید اس لئے لگائی کہ کافروں کا کوئی عمل قبول نہیں تمام نیکیاں اکارت جائیں گی بغیر ایمان کے ہر نیکی بیکار ہے، ۱۲۔

marfat.com

جنات کے علاوہ اللہ کی طرف سے محض عطا ہو گی اور یہ ثواب ان کے اعمال کی جزا ہو گا مگر ہو گا اللہ کی مہربانی سے۔

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ اور اللہ کی قدرت میں ہے اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

حُسْنُ الثَّوَابِ﴿۱۹۵﴾ اچھا ثواب۔ حُسْن سے مراد حَسَنٌ ہے (اور صفت کی اضافت موصوف کی جانب ہے) یا سب سے اچھا ثواب مراد ہے جس پر کوئی قدرت نہ رکھتا ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے قرب کے بکثرت درجات ہیں اور اس کا قرب تمام جنات اور جنات کی نعمتوں سے بہتر ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مشرک بڑی راحت و آسائش میں تھے تجارت کرتے اور آرام سے رہتے تھے بعض مسلمانوں نے کہا دیکھو اللہ کے دشمن کیسے اچھے حال میں ہیں اور ادھر ہم ہیں کہ (باوجود مؤمن ہونے کے) دکھ اور تنگ حالی میں مبتلا ہیں اس پر آیت نازل ہوئی۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور مراد امت ہے (کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو تو کافروں کا عیش فریب دے ہی نہ سکتا تھا) یا مخاطب عام ہے کوئی ہو۔

تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ﴿۱۹۶﴾ ان کافروں کا ملک میں گھومنا، پھرنا شہروں شہروں میں گھومنا یعنی تجارت اور کمائی کے لئے ملک میں چلنا پھرنا (اور کمائی کر کے مزے اڑانا) کافروں کا گھومنا پھرنا مسلمانوں کی فریب خوردگی کا سبب تھا اس فریب خوردگی کی ممانعت فرمائی مراد یہ ہے کہ کافروں کی فراخ حالی پر نظر نہ کرو اور ان کی ظاہری وسعت معاشی سے فریب خوردہ نہ ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی فاجر (کی راحت اور اچھی حالت دیکھ کر اس) پر رشک نہ کرو تم کو نہیں معلوم کہ مرنے کے بعد اس کے سامنے کیا آئے گا اللہ کے نزدیک اس کے لئے ایک ایسا مار ڈالنے والا متعین ہے جو (خود) کبھی نہیں مرے گا یعنی دوزخ۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ یہ تھوڑا اور حقیر سامان ہے یا اس کے لئے تھوڑا اور بے مقدار سامان ہے کیونکہ اس عیش کی مدت کم ہے پھر اس کی مقدار تھوڑی بھی ہے اور حقیر بھی۔ حضرت مسورؓ بن شداد راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈال کر نکال لے پھر اپنی انگلی کو دیکھے کہ اس پر کتنی (تری لگ کر) لوٹی ہے۔ رواہ مسلم۔

ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴿۱۹۷﴾ پھر آخر میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور جہنم بری آرام گاہ ہے یعنی جو چیز انہوں نے اپنے لئے تیار کی ہے وہ جہنم ہے اور جہنم بری چیز ہے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرے انہی کے لئے ہوں گی جنتیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان جنتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اہل نحو کے نزدیک لکن کا استعمال استدراک کے لئے ہوتا ہے یعنی گذشتہ کلام سے جو مقصود کے خلاف وہم پیدا ہو سکتا ہے اس کو دفع کرنے کے لئے لکن سے دوسرا کلام شروع کیا جاتا ہے یہاں بھی یہ وہم پیدا ہوتا تھا کہ جب دنیا میں آسائش کے ساتھ رہنے والوں کی متاع قلیل ہے تو اہل تقویٰ کی متاع اس سے بھی قلیل ہو گی کیونکہ وہ تو ویسے ہی لذتوں سے دست کش ہو چکے ہیں اس وہم کو دور کرنے کے لئے اللہ نے فرمایا کہ جن متقیوں نے دنیا میں ایسی کمائی کر لی جو آخرت کی نعمتوں کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ ہے تو حقیقت میں انہوں نے ہی دنیا سے ایسا بیش بہا فائدہ اٹھالیا کہ اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا۔ علماء معانی کے نزدیک لکن کا استعمال مخاطب کے خیال کو رد کرنے کے لئے ہوتا ہے اس صورت میں کافروں کے اس خیال کا رد ہو جائے گا کہ ہم ہی دنیا میں لذت اندوز اور بہرہ یاب ہیں اور مسلمان سراسر گھاٹے میں ہیں۔

نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ یہ اللہ کی طرف سے (خصوصی) مہمانی ہو گی۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، نُزُلًا کی صفت ہے۔

marfat.com

نزل مہمانی کا وہ سامان جو کسی آنے والے مہمان کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ نزلا کا لفظ اہل تقویٰ کے مرتبہ کی بلندی کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ نے ان کو اپنا مہمان بنایا اور کریم میزبان اپنی استعداد و قدرت کے مطابق بہترین ضیافتی سامان مہمان کے لئے مہیا کرتا ہے۔ (پس اللہ اپنے مہمانوں کے لئے اپنی لامحدود قدرت اور محیط کل کرم کے موافق سامان ضیافت پیش فرمائے گا) نزلا جنات سے حال ہے یا مفعول مطلق تاکیدی اور فعل محذوف ہے یا مفعول بہ دوئم اور فعل مع مفعول اول کے محذوف ہے یعنی جعل ذلک نزلا یا تمیز ہے۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ اور جو چیز اللہ کے پاس ہے یعنی ثواب اور قرب کے درجات اور رضا ور حمت۔

خَيْرٌ وہ دنیا کے مال و متاع سے بہتر ہے یا ہر چیز سے بہتر ہے۔

لِّلْاَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ نیکوں کے لئے لھم نہیں فرمایا بلکہ لفظ ابرار کی صراحت کی۔ ان لوگوں کی تعریف اور ان کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے (کہ وہ نیک ہیں)۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بالاخانہ پر خدمت گرامی میں حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک کھری چٹائی پر استراحت فرما ہیں۔ سر کے نیچے چمڑے کا تکیہ تھا جس میں پوست کھجور کے ریشے بھرے ہوئے تھے قدموں کے پاس کچھ پکا چمڑا تہ کیا رکھا تھا سرہانے کچی کھال لٹک رہی تھی اور چٹائی کے نشان پہلو مبارک پر پڑ گئے تھے میں یہ دیکھ کر رونے لگا فرمایا کس وجہ سے روتے ہو۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کسریٰ اور قیصر اس (عیش کی) حالت میں ہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں (اور اس تنگ حالی میں ہیں) فرمایا کیا تم اس پر رضامند نہیں کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ دعا فرمائیے کہ اللہ آپ کی امت کو کشائش فرمادے کیونکہ اللہ نے فارس و روم والوں کو کشائش عطا فرمادی ہے حالانکہ وہ (خالص) اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے فرمایا اے ابن خطابؓ کیا تم اس خیال میں تھے کہ اس قوم کو تو اللہ نے دنیاوی زندگی میں ہی ان کی پسند کی چیزیں فوری طور پر دیدی ہیں۔ صحیحین۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (بن عاص) راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ اور کال (کا زمانہ) ہے جب وہ دنیا کو چھوڑتا ہے تو قید خانہ اور کال (کے زمانہ) سے چھوٹتا ہے۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔ حضرت قتادہ بن نعمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو دنیا سے اس کو بچاتا ہے جیسے تم اپنے بیمار کا پانی سے پرہیز کراتے ہو۔ احمد و الترمذی۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ نسائی نے حضرت انسؓ اور ابن جریرؒ نے حضرت جابرؓ کی راویت سے لکھا ہے کہ جب نجاشی کی وفات کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کی نماز پڑھو کسی نے کہا یارسول اللہ ﷺ ہم ایک حبشی غلام کی نماز پڑھیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا یہ آیت نجاشی کے متعلق نازل ہوئی، رواہ الحاکم فی المستدرک۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جس روز نجاشی کی وفات ہوئی اسی روز حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ کو وفات کی اطلاع دے دی آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا (شہر سے) باہر نکل کر اپنے بھائی نجاشی کی نماز پڑھو اس کا انتقال دوسرے ملک میں ہو گیا ہے چنانچہ بقیع کو تشریف لے گئے آپ کے سامنے سے سرزمین حبش تک پردہ ہٹا دیا گیا اور نجاشی کا جنازہ آپ نے خود (آنکھوں سے) دیکھ کر نماز جنازہ پڑھی (جس میں) چار تکبیریں کہیں اور دعا مغفرت کی۔ منافق کہنے لگے ان کو تو دیکھو ایک حبشی عیسائی کافر کی نماز پڑھ رہے ہیں جو ان کے دین پر نہیں تھا۔ نہ اس کو کبھی انہوں نے دیکھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ عطاء نے کہا یہ آیت چالیس نجرانیوں کے متعلق نازل ہوئی جن میں ۳۲ حبش کے رہنے والے تھے اور آٹھ رومی تھے یہ سب پہلے حضرت عیسیٰ کے مذہب پر تھے پھر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ ابن جریرؒ نے ابن جریج کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عبداللہ بنؓ سلام اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں ہوا مجاہدؒ نے کہا ان تمام اہل کتاب کے متعلق اس آیت کا نزول

marfat.com

ہوا جو ایمان لے آئے تھے۔

لَمَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ یقیناً اللہ پر یعنی اللہ کی ذات و صفات اور اسماء پر صحیح ایمان رکھتے ہیں۔

وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ اور اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری طرف اتارا گیا۔

وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ان کی طرف بھیجا گیا یعنی توریت انجیل اور زبور۔

خٰشِعِیۡنَ لِلّٰہِ ۙ اللہ کے سامنے عاجزی اور خضوع کرتے ہوئے خشعین، مَنْ سے حال ہے چونکہ مَنْ معنی کے لحاظ سے جمع ہے اس لئے خشعین بصیغہ جمع لایا گیا۔

لَا یَشۡتَرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اللہ کی آیات (یعنی توریت کی وہ آیات جن کے اندر رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کا بیان ہے ان کو چھپا کر اس) کے عوض حقیر معاوضہ نہیں لیتے (یعنی رشوتیں لے کر ان کو نہیں چھپاتے) جیسے اللہ کے کلام کو بگاڑنے والے علماء کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ یہی لوگ ہیں جن کا خصوصی اجر ان کے رب کے پاس ہے یعنی ان کے لئے مخصوص اجر ہے جو دوسروں سے زائد ہے جیسا کہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اولئک یوتون اجرھم مرتین حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین (شخص) ہیں جن کا اجر دوہرا ہے (تینوں میں سے) ایک وہ کتابی شخص ہے جو (پہلے) اپنے پیغمبرؑ پر ایمان لایا (پھر) محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ الحدیث صحیح مسلم و صحیح بخاری۔

اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ یہ حقیقت ہے کہ اللہ جلد حساب کر لینے والا ہے کیونکہ وہ اعمال اور اعمال کے لائق جزا و سزا سے واقف ہے اور سوچنے کی اس کو ضرورت نہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ اللہ تمام مخلوق کا حساب آدھے دن کی بقدر مدت میں طے کر دے گا اور آدھا دن بھی دنیا کے ایک دن کے آدھے کے برابر۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ جس اجر کا وعدہ کیا گیا ہے وہ بہت جلد ملنے والا ہے۔ سرعت حساب سے مجاز اً مراد ہے جلد بدلہ دینا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا اے ایمان والو جمے رہو یعنی اپنے دین پر اوامر و نواہی کی تکلیفوں پر خواہشات نفس کی مخالفت پر اپنے رب کی محبت و طاعت پر رب کی محبت و طاعت کسی وقت نہ چھوڑو نہ دکھ میں نہ سکھ میں نہ سختی میں نہ نرمی میں۔ اور جمے رہو دشمنوں سے جہاد کرنے پر شدائد و مصائب برداشت کرنے پر۔ جنیدؒ نے فرمایا صبر کا معنی ہے مصائب پر بغیر بے تابی کے نفس کو جمائے رکھنا۔

وَصَابِرُوۡا اور شدائد جنگ پر دشمنوں سے زیادہ جمے رہو کیونکہ تمہاری طرح (زخموں کا اور بھوک پیاس تھکان وغیرہ کا) ان کو بھی دکھ ہوتا ہے مگر (نتیجہ میں) ان کو (جزاء آخرت اور جنت کی) کوئی امید نہیں ہوتی اور تم اللہ سے امید رکھتے ہو۔ اصبروا میں عام صبر کا حکم دیا گیا ہے اور صابروا میں خاص قسم کے صبر کا۔

جس طرح کفار کے مقابلہ میں جہاد اصغر کرنے پر صبر ہوتا ہے اسی طرح نفس کے مقابلہ میں جہاد اکبر کرنے کا حکم ہے نفس، دنیا اور دنیا کی خواہشات کی طلب میں بڑی بڑی تکلیفیں اور دکھ برداشت کرتا ہے اور کبھی ابدی نعمات جنت کو حاصل کرنے کے لئے بھی دکھ اٹھاتا ہے پس صوفی پر لازم ہے کہ ان سب سے زیادہ مولیٰ کی طلب کے لئے شدائد برداشت کرے۔

وَرَابِطُوۡا ۟ قف اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔

یعنی سرحدوں پر دشمنوں سے لڑنے کے لئے خود بھی تیار رکھو۔ یا یہ مراد ہے کہ اپنی جانوں کو اپنے دلوں کو اور اپنے بدنوں کو اللہ کے ذکر و طاعت اور مسجدوں کے اندر ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار اور ذکر کے حلقوں کے لئے تیار رکھو۔

ربط کا لغوی معنی ہے باندھنا۔ مراد سرحدوں پر گھوڑے باندھے رکھنا اس کے بعد ربط کے مفہوم میں مزید توسیع کی گئی اور معنی ہو گیا سرحد پر ہر مقیم کا دشمن کو دفع کرنے کیلئے مستعد رہنا خواہ اس کے پاس گھوڑا ہو یا نہ ہو۔ پھر مفہوم میں اس سے بھی زیادہ توسیع کی گئی اور معنی ہو گئے۔ ہر نگرانی پر لگے ہوئے آدمی کا رکاوٹوں کو دفع کرنا۔ مرابطہ (باب مفاعلہ) مستعدی اور

marfat.com

چوکسائی میں دشمن سے بڑھ جانا یعنی تم سے لڑنے کے لئے مستعد تو دشمن بھی ہوتے ہیں۔ مگر تم کو ان سے زیادہ مستعد رہنا چاہئے۔

حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں سرحد پر ایک دن کی چوکسائی دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے اور جنت کے اندر ایک کوڑے کی برابر تم میں سے کسی کی جگہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے اور جو بندہ ایک شام یا ایک صبح کو راہ خدا میں نکلتا ہے وہ اس کیلئے دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے، رواہ البغوی من طریق البخاری۔ اس حدیث کا پہلا حصہ صحیحین میں حضرت سہل کی روایت سے اور تیسرا ٹکڑا حضرت انسؓ کی روایت سے بھی آیا ہے۔

حضرت سلمانؓ الخیر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں ایک دن اور ایک رات کی چوکسائی سرحد پر کی اس کو حالت اقامت میں ایک ماہ کے روزوں کا ثواب ملے گا اور جو سرحد پر چوکسائی کرنے کی حالت میں مر گیا اس کے لئے (قیامت تک یہ عمل اور) اس کا جیسا اجر جاری رکھا جائے گا اور (شہیدوں کی طرح) اس کو رزق ملتا رہے گا اور وہ (قبر کے) فتنہ سے مامون رہے گا۔ رواہ البغوی۔

مسلمؒ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں ایک دن رات کی سرحد پر چوکسائی مہینہ بھر کے روزوں سے اور مہینہ بھر راتوں کو نماز پڑھنے سے بہتر ہے اگر اسی حالت میں مر جائے گا تو جو عمل وہ کر رہا تھا وہ (قیامت تک) جاری رہے گا اور اس کا رزق جاری رکھا جائے گا اور وہ فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ احمد اور ابن ابی شیبہ کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں جس نے ایک دن یا ایک رات اللہ کی راہ میں سرحد پر چوکسائی کی اس کے لئے یہ عمل ایسا ہو گا جیسے رمضان بھر کے روزے اور رات بھر کی نمازیں کہ کوئی روزہ ناغہ نہ ہو اور قضاء حاجت کے علاوہ (کسی اور کام کے لئے) نماز کو ترک نہ کرے۔

حضرت فضالہ بن عبیدؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر میت اپنے عمل پر ختم ہو جاتی ہے۔ (یعنی ہر شخص کا عمل مرنے سے ختم ہو جاتا ہے) سوائے اس کے جو راہ خدا میں سرحد پر چوکسائی کرتا ہوا مرتا ہے اس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ رواہ الترمذی وابوداؤد۔ دارمی نے یہ حدیث حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راہ خدا میں سرحد پر ایک دن کی چوکسائی دوسرے مقامات پر ہزار دنوں (کی چوکیداری) سے بہتر ہے۔ رواہ الترمذی والنسائی

بغوی نے ابوسلمہ عبدالرحمٰن کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کبھی کوئی جہاد ایسا نہیں ہوا کہ اس میں سرحد پر چوکسائی کی گئی ہو بلکہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار ہی چوکسائی تھا اور یہی آیت میں مراد ہے) اس تفسیر کا ثبوت حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث سے ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسا عمل بتاؤں جس سے اللہ تو گناہوں کو مٹاتا اور درجات اونچے کرتا ہے وہ ہے پورا پورا وضو کرنا باوجود مکروہات کے (یعنی سخت سردی، برفباری وغیرہ کے وقت پورا پورا وضو کرنا) اور مسجدوں تک جانے کے لئے اپنے قدموں سے زیادہ مسافت طے کرنا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں لگا رہنا یہی تمہارا رباط ہے یہی تمہارا رباط ہے یہی تمہارا رباط ہے۔ رواہ البغویؒ و مسلمؒ والترمذیؒ نحوہ عن ابی ہریرۃؓ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ　　اور اللہ سے ڈرو۔

۲۰ ع۱ ۱۱ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝۲۰۰　　کامیاب ہونے کی امید رکھتے ہوئے۔ فلاح کا معنی ہے نامرغوب چیز سے خلاص ہونے کے بعد محبوب چیز کو پالینا۔ لعل (شاید امید رکھو) کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ مآل تو پوشیدہ ہے۔ کہیں لوگ بغیر اعمال کے امیدوں کے سہارے پر ہی نہ رہنے لگیں۔

سورۂ آل عمران کی تلاوت کے فضائل

حضرت عثمانؓ بن عفان نے فرمایا جو شخص آل عمران کا آخر حصہ کسی رات کو تلاوت کرے گا اس کے لئے قیام شب کا

marfat.com

ثواب لکھا جائے گا۔ (رواہ الدارمی) حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ زہراوین یعنی بقرہ اور آل عمران کو پڑھو قیامت کے دن یہ دونوں (پڑھنے والے کے سر پر) ایسی ہوں گی جیسے دو بدلیاں یا دو سائبان یا چھائے ہوئے پرندوں کے دو جھنڈ۔ اپنے پڑھنے والوں کی یہ دونوں سورتیں حمایت کریں گی۔ رواہ مسلم۔ حضرت نواسؓ بن سمعان کی روایت ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے قیامت کے دن قرآن اور ان قرآن والوں کو پیش کیا جائے گا جو قرآن پر عمل کرتے تھے سب سے آگے سورۂ بقرہ اور آل عمران ہوں گی یہ دونوں ایسی ہوں گی جیسے دو بدلیاں یا دو سیاہ سائبان جن کے اندر روشنی کی چمک ہو یا جیسے چھائے ہوئے پرندوں کے دو جھنڈ۔ یہ دونوں سورتیں اپنے پڑھنے والے کی حمایت کریں گی۔ (رواہ مسلم) مکحول کا قول ہے جمعہ کے دن جو شخص سورت آل عمران پڑھتا ہے رات تک اس کے لئے فرشتے دعا کرتے ہیں۔ رواہ الدارمی۔ [۱]

الحمدلله رب العلمين وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد واله و اصحابه اجمعين۔

سورۂ آل عمران کی تفسیر ۹ ذیقعد بروز دوشنبہ ۱۱۹۷ھ کو ختم ہوئی اس سے آگے سورۂ نساء کی تفسیر انشاء اللہ عنقریب آئے گی۔

الحمدلله و المنة له کہ سورۂ آل عمران کی تفسیر مظہری کا ترجمہ ۲۹ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو صبح تین بجے ختم ہوا۔ فالحمد قبل له و الحمد بعدله۔

---

[۱] طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ ابن ملیکہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن وہ سورت تلاوت کرے گا جس میں آل عمران کا تذکرہ ہے غروب آفتاب تک اللہ اس پر رحمت نازل فرمائے گا اور فرشتے اس کے لئے دعاء رحمت کریں گے۔ منہ۔ (حاشیہ از مولف قدس سرہٗ)

marfat.com

اے اللہ! اے مالک ملک ہم تیری ثنا کرتے ہیں تو جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک نکال لیتا ہے جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے۔ در حقیقت تو ہر چیز پر قابو رکھتا ہے۔ اے ہمارے رب پھر ہمارے کبیرہ گناہ معاف کر دے اور ہماری خطاؤں کو دور کر دے اور نیکوں کے گروہ میں شامل کر کے ہم کو موت دے اور اپنی رحمت سلامتی اور برکت نازل فرما اپنے حبیبؐ، پیغمبرؐ اور ہمارے آقا اور شفیعؐ اور سردار پر جن کا نام محمد ﷺ تھا اور وہ امی تھے لیکن تمام لوگوں کے لئے رحمت و ہدایت بنا کر ان کو بھیجا گیا تھا۔ اللہ کی رحمت و سلامتی ہو ان پر اور ان کی اولاد پر اور ان کے ساتھیوں پر سب پر۔ ☆

سورۃ النساء

یہ سورۃ مدنی ہے اس میں ایک سو چھیالیس آیات ہیں۔ بیہقی نے دلائل میں مختلف طریقوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ سورۂ نساء مدینہ میں نازل ہوئی۔ ابن منذرؒ نے قتادہؒ کا قول بھی یہی نقل کیا ہے اور بخاری نے قتادہؒ کی روایت سے ہی یہ مقولہ بیان کیا ہے۔

ربّ یسّر	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	وتمّم بالخیر

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اے لوگو! جو لوگ نزول آیت کے وقت موجود تھے ان کو براہ راست خطاب ہے اور آئندہ تمام آنے والے ان کے ذیل میں مخاطب ہیں۔

اتَّقُوْا رَبَّكُمُ اپنے رب سے ڈرو یعنی اسکے عذاب سے ڈرو جسکی (ظاہر) صورت یہ ہے کہ اس کے احکام پر چلو۔

الَّذِیْ خَلَقَكُمْ جس نے تم کو پیدا کیا یعنی آغاز تخلیق کے زمانہ میں

مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ایک شخص سے یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے

وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اسی سے پیدا کیا اس کے جوڑے کو یعنی حضرت حوا کو بائیں پسلی سے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں آدمؑ کی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ الحدیث صحیحین۔

ابو الشیخ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حوا کو آدمؑ کی سب سے چھوٹی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ آدم جب سو رہے تھے تو حوا کو ان سے پیدا کیا گیا پھر وہ بیدار ہوئے۔ دوسرا جملہ خلق منہا پہلے جملہ خلقکم من نفس واحدۃ کے مضمون کو پختہ کرنے کیلئے ذکر فرمایا۔

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً اور آدمؑ و حواؑ سے پھیلایا، بہت مردوں اور بہت عورتوں کو یعنی جن کو خطاب کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی بہت مرد اور عورتیں حضرت آدم و حواؑ کی نسل سے اللہ نے پھیلائیں[1] کثیراً رجالاً کی صفت ہے اور چونکہ رجالا سے مجموعہ مراد ہے اس لئے کثیراً بصیغہ مذکر ذکر کیا۔ مردوں کی کثرت کا ذکر کر کے عورتوں کی

[1] (حاشیہ از مولف قدس سرہٗ) ابن اسحاق اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آدمؑ کے چالیس بچے ہوئے بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں ۱۲۔

marfat.com

کثرت کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہی مگر مراد عورتوں کی کثرت بھی ہے کیونکہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو اسی حکمت کا اقتضا ہے کہ ایک مرد کے لئے چار عورتیں حلال کر دیں۔

تمام لوگوں کو ایک شخص کی نسل سے پیدا کرنا بلکہ اس کی بیوی کو بھی اسی سے تخلیق فرمانا اللہ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتا ہے اور یہ اس کی عظیم الشان نعمت بھی ہے قدرت واحسان کا تقاضا ہے کہ اس سے خوف کیا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے اس لئے آئندہ حکم تقویٰ کو اس آیت پر مبنی کیا اور فرمایا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈر (یعنی اس سے ڈرو اس لئے کہ وہ رب ہے اور اس لئے کہ اس نے تم کو عجیب طریقہ سے پیدا کیا ہے اور اس لئے کہ اس کی تمام صفات کامل ہیں اور اس لئے کہ اس کی ذات واجب الخشیۃ اور مستحق اطاعت ہے۔

الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، یہ تمہید ہے آئندہ دونوں حکموں کی ایک رشتہ داریوں کو جوڑے رکھنے کے حکم کی اور دوسرے حقوق العباد کو ادا کرنے کے حکم کی۔

وَالْاَرْحَامَ اور رشتہ داریاں قطع کرنے سے ڈرو، الارحام کا عطف اللہ پر ہے حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، رحم عرش سے آویختہ ہے اور کہہ رہا ہے آگاہ رہو جو مجھے جوڑا رکھے اللہ اس کو (اپنے سے) جوڑا رکھے اور جو مجھے کاٹ دے اللہ اس کو (اپنے سے) کاٹ دے (یا کلام خبری ہے اس صورت میں ترجمہ اس طرح ہوگا کہ جو مجھے جوڑے رکھے گا۔ اللہ اس کو جوڑے رکھے گا اور جو مجھے کاٹے گا اللہ اس کو کاٹ دے گا، متفق علیہ۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ مخلوق کو پیدا کر چکا تو رحم نے کھڑے ہو کر اللہ کا دامن پکڑ لیا اللہ نے فرمایا، ہائیں، رحم نے عرض کیا یہ مقام اس کا ہے جو کاٹے جانے سے تیری پناہ لے رہا ہے اللہ نے فرمایا کیا تو اس پر راضی نہیں کو جو تجھے جوڑے رکھے، میں اس (سے تعلق) کو جوڑے رکھوں اور جو تجھے کاٹ دے میں اس (سے تعلق) کو کاٹ دوں، رحم نے کہا بیشک میرے رب (میں اس پر راضی ہوں) اللہ نے فرمایا تو یونہی ہوگا، صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ [1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (رحم کو) جوڑنے والا وہ نہیں جو برابر بدلہ کرنے والا ہو جبکہ جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر اس سے رشتہ منقطع کیا جائے تب بھی وہ جوڑے رکھے، رواہ البخاری، حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو پسند کرتا ہو کہ اس کے رزق میں کشائش کی جائے اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو صلہ رحمی کرنی چاہئے، متفق علیہ، حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے کچھ رشتہ دار ہیں میں ان سے میل کرتا ہوں وہ مجھ سے کاٹ کرتے ہیں میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں میں ان کی برداشت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر جہالت کرتے ہیں فرمایا اگر تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے کہا تو گویا تو ان پر خاک ڈال رہا ہے اور جب تک تو اس حالت پر قائم رہے گا اللہ کی طرف سے ایک (غیبی) مددگار تیرے ساتھ ان کے مقابلہ میں رہے گا، رواہ مسلم۔ [2]

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ① بیشک اللہ تمہارے احوال سے پورا پورا باخبر اور نگراں ہے لہٰذا تم اس کی طرف سے غافل نہ ہو مقاتل اور کلبی نے بیان کیا کہ ایک غطفانی آدمی کے پاس اس کے یتیم بھتیجے کا بہت مال تھا جب یتیم بالغ ہو گیا تو اس نے چچا سے اپنا مال طلب کیا چچا نے دینے سے انکار کر دیا دونوں مقدمہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر

---

[1] اس حدیث میں لفظ حقو آیا ہے جس کا معنی ہے کمر اور ہم نے کمر پکڑنے کا لازمی اور مرادی ترجمہ کیا ہے دامن پکڑ لینا، حضرت مفسر نے لفظ حقو کی مندرجہ حاشیہ یہ تشریح کی ہے، حقو تہبند باندھنے کی جگہ مجازاً تہبند کو بھی کہہ لیتے ہیں رحم نے جب رحمٰن سے اپنا شکوہ کیا تو بطور استعارہ اس کو تہبند پکڑ لینے سے تعبیر کیا جیسے ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کو اور ایک عزیز دوسرے عزیز کو پکڑ لیتا ہے، حقو کا استعمال اس جگہ مجاز و تشبیہ کے طور پر ہے، ہکذا فی النہایۃ۔ (حاشیہ از مفسر قدس سرہٗ)

[2] ابن جریر ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اس آیت کی تشریح میں مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ لوگ باہم کہتے ہیں میں تجھ سے اللہ اور رحم کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں، ابراہیمؒ اور حسنؒ کا مقولہ بھی اسی طرح منقول ہے۔ (از مفسر قدس سرہٗ)

marfat.com

ہوئے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ اور یتیموں کو ان کا مال دے دو چچا نے جب یہ حکم سنا تو کہا ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمانبردار ہیں ہم گناہ کبیرہ سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں پھر اس نے یتیم کا مال دے دیا، حضور ﷺ نے فرمایا جو نفسانی حرص سے محفوظ رہا اور اس طرح اپنے رب کا حکم مانا وہ اللہ کے گھر میں یعنی اللہ کی جنت میں ضرور فروکش ہوگا۔ اس لڑکے نے مال وصول کرنے کے بعد اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا، اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اجر پکا ہو گیا اور بار رہ گیا یعنی اس لڑکے کا ثواب پکا ہو گیا اور اس کے باپ پر اس مال کو کمانے کا بار رہ گیا، رواہ الثعلبی والواحد وذکرہ البغوی، آیت میں اداء مال کا حکم سرپرستوں کو اور ان لوگوں کو ہے جن کو میت نے وصیت کی ہو۔

یتامی یتیم کی جمع ہے یتیم وہ بچہ ہوتا ہے جس کا باپ ہو نہ دادا لفظ، یتیم یتم سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اکیلا ہونا اسی سے درۃ یتیمۃ کہا جاتا ہے سیپ میں اکیلا یکتا موتی، لفظ یتامی کی تحقیق کے سلسلہ میں بیضاوی نے لکھا ہے کہ یتیم (اگرچہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے لیکن) اسماء کی طرح مستعمل ہے (گویا یہ موصوف کا محتاج نہیں رہا) جیسے صاحب اور فارس (باوجود اسم فاعل ہونے کے) اسماء کی طرح مستعمل ہیں اس لئے یتیم کی جمع یتائم ہے یا در یتائم کے ہمزہ اور میم کا قلب مکانی کرنے کے بعد یتامی ہو گیا یا یوں کہا جائے کہ یتیم کی جمع یتمی ہے جیسے اسیر کی جمع اسریٰ کیونکہ دونوں کے معنی کے اندر کسی نہ کسی دکھ کا مفہوم موجود ہے پھر یتمی کی جمع یتامی ہو گئی جیسے اسرای کی جمع اساریٰ۔

چونکہ یتم کا معنی ہے اکیلا ہونا اور باپ کے مرنے کے بعد اولاد بن باپ کے رہ جاتی ہے اس لئے ازروئے لغت تو یتیم سب کو کہہ سکتے ہیں بالغ ہو یا نابالغ، لیکن عرف نے اس لفظ کی تخصیص نابالغ کے ساتھ کر دی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلوغ کے بعد یتیمی نہیں اور دن بھر رات تک خاموش رہنا روزہ نہیں، (رواہ ابوداؤد باسناد حسن عن علیؓ) پس یہ حدیث یا تو عرفی معنی پر مبنی ہے یا شریعت کا ایک ضابطہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بالغ ہونے کے بعد یتیمی کا حکم نہیں رہتا، آیت کا مطلب باجماع علماء یہ ہے کہ یتیموں کو ان کا مال بالغ ہونے کے بعد دے دو، آیت ولا توتوا السفھاء اموالکم بھی اسی مطلب پر دلالت کر رہی کیونکہ سفیہ (سبک سر) باوجودیکہ صاحب عقل اور بالغ ہوتا ہے لیکن اس آیت میں اس کے قبضہ میں مال دینے کی ممانعت کر دی لہٰذا یتیم جو نابالغ ہو اس کو مال نہ دینے کی ممانعت بدرجہ اولیٰ ہونی چاہئے۔

ایک شبہ :- بالغ ہونے کے بعد تو یتیم نہیں رہتا اور یتیم کو مال دینے کا حکم ہے پس بالغ ہونے کی قید کہاں سے آئی۔

ازالہ :- اصل لغت کے اعتبار سے تو یتیم کا اطلاق بالغ پر بھی ہو سکتا ہے پس اس جگہ بالغ پر اس لفظ کا اطلاق مفہوم لغوی کے اعتبار سے ہے، یا اطلاق مجازی ہے چونکہ بالغ ہونے کے بعد ان کی یتیمی کا دور قریب ہی گزرا ہے اتنا قریبی کہ قابل اعتبار قلیل مدت بھی نہیں گزری اس لئے لفظ یتامی کا اطلاق ان پر کر دیا گیا، اس صورت میں آیت میں اس امر کی ترغیب ہوگی کہ بالغ ہونے کے بعد جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد یتیموں کا مال دے دو۔

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ اور ناپاک کو پاک کے عوض نہ لو یعنی یتیم کے مال کو جو تمہارے لئے ناپاک اور حرام ہے اپنے مال کے عوض جو تمہارے لئے پاک اور حلال ہے نہ لو، تبدل باب تفعل سے ہے مگر استبدال یعنی باب استفعال کے معنی میں ہے اور ایسا ہونا جائز ہے۔ سعید بن جبیرؒ زہری اور سدی کا بیان ہے کہ یتیموں کے سرپرست کا عمدہ مال خود لے لیتے اور اس کی جگہ اپنا ردی مال رکھ دیتے تھے، موٹی بکری لے لی اور دبلی بدلہ میں دے دی۔ کھرا درہم نکال لیا اور کھوٹا درہم ان کے مال میں رکھ دیا، وہ کہتے تھے کہ درہم کے عوض درہم ہو گیا اس آیت میں ایسا کرنے کی ممانعت کر دی گئی، مجاہد نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ فوری حرام رزق کو نہ لو اور جس حلال رزق کا اللہ نے وعدہ کر لیا ہے اس کے ملنے سے پہلے حرام روزی حاصل کرنے میں عجلت نہ کرو، بعض علماء نے کہا کہ خبیث سے مراد ہے خبیث امر یعنی یتیموں کے مال کو یونہی بغیر نگہداشت کے چھوڑ دینا اور طیب سے مراد ہے امر طیب یعنی یتیموں کے مال کی نگرانی رکھنا اور اصل مالک کو دینا۔

marfat.com

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ ۚ اور یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھالو بعض علماء نے کہا کہ الیٰ اموالکم میں الیٰ کا معنی ہے مع ابن المنذر نے قتادہ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔

إِنَّهُۥ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝ یتیموں کا مال کھانا بلاشبہ بڑا گناہ ہے، حضرت ابن عباسؓ نے یہی مطلب بیان فرمایا، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات تباہ کن چیزوں سے پرہیز رکھو، حضور ﷺ نے یتیم کا مال کھانے کو بھی ان سات چیزوں میں ذکر فرمایا، صحیح بخاری و صحیح مسلم۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ خطاب سرپرستوں کو ہے اقساط (باب افتعال) عدل کرنا ظلم نہ کرنا، کیونکہ قسط (ثلاثی مجرد) کا معنی ہے ظلم کرنا اور باب افعال کا ہمزہ سلب ماخذ (مادہ) کے لئے ہے اس لئے اقساط کا معنی ہو گیا ظلم نہ کرنا یعنی اے یتیموں کے سرپرستو! اگر تم کو اندیشہ ہو کہ جو یتیم لڑکیاں تمہاری زیر سرپرستی ہیں ان سے نکاح کرنے میں تم عدل نہ کر سکو گے اور حق تلفی کرو گے۔

فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ تو پھر یتیم لڑکیوں کے علاوہ دوسری عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کر لو یتامیٰ کا اطلاق مرد و عورت دونوں پر آتا ہے، بخاری نے صحیح میں زہری کی روایت سے لکھا ہے کہ عروہ بن زبیرؓ بیان کرتے تھے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا فرمایا اس سے مراد وہ یتیمہ ہے جو اپنے ولی کی سرپرستی میں ہوتی تھی اور ولی اس کا محرم نہ ہوتا تھا جیسے چچا کا بیٹا، ولی یتیمہ کے حسن و مال کو دیکھ کر ریجھ جاتا تھا اور اس سے نکاح کر لینا چاہتا تھا مگر مہر مثل سے کم دینے کا ارادہ کرتا تھا آیت میں ایسے سرپرستوں کو اپنی زیر پرورش یتیم لڑکیوں سے بغیر تکمیل مہر کے نکاح کرنے کی ممانعت کر دی گئی، باقی دوسری عورتوں سے (ہر طور سے) نکاح کی اجازت دے دی گئی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا پھر لوگوں نے یتامیٰ سے نکاح کا مسئلہ پوچھا تو آیت یستفتونک فی النساء سے ان تنکحوھن تک نازل ہوئی اس میں اللہ نے کھول کر بیان کر دیا اگر یتیمہ حسین اور مالدار ہوتی ہو تو لوگ اس کی طرف راغب ہوتے ہیں مگر اس کے درجہ کے موافق اس کو مہر نہیں دینا چاہتے اور جب مال و جمال کے لحاظ سے وہ گری ہوئی ہوتی ہے تو اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور دوسری عورتوں سے نکاح کے طلب گار ہوتے ہیں، پس جس طرح مال و حسن کی کمی کے وقت لوگ یتیمہ سے نکاح کرنے کے خواہشمند نہیں ہوتے اسی طرح مال و جمال کی زیادتی کے وقت بھی ان کو نکاح کا طلب گار نہ ہونا چاہئے ہاں اگر یتیمہ کا پورا پورا حق اور کامل ترین مہر (مثل) ادا کر دیں تو نکاح کر سکتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حسن (بصری) نے فرمایا، مدینہ میں کچھ لوگوں کے پاس یتیم لڑکیاں رہتی تھیں جن میں بعض ایسی بھی ہوتی تھیں جن سے اس سرپرست کا نکاح ہو سکتا تھا (اور وہ مالدار بھی ہوتی تھیں) یہ شخص مال کے لالچ میں اس یتیمہ سے نکاح کر لیتا تھا اور یہ امر اس کو گوارا نہ تھا کہ کوئی دوسرا اجنبی آجائے (اور مال میں شریک ہو جائے)۔

اس آیت کی تفسیر میں عکرمہ نے کہا اور حضرت ابن عباسؓ کا بھی عطاء کی روایت میں یہ قول آیا ہے کہ بعض قریشی دس دس بلکہ دس سے زیادہ عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے اور جب بیویوں کے مصارف کی وجہ سے نادار ہو جاتے تو زیر پرورش یتیم کے مال کی طرف جھکتے اور اس کو خرچ کرتے اسی بناء پر ان کو حکم دے دیا گیا کہ چار سے زائد سے نکاح نہ کرو کہ یتیموں کا مال لینے کی ضرورت پڑے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب یتیموں کا مال کھانے کے سلسلہ میں وعید نازل ہوئی تو اموال یتامیٰ کو صرف کرنے میں بڑی دشواری محسوس ہونے لگی تو (اس کا حل لوگوں نے یہ نکالا کہ) یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے لگے اور جس سے چاہتے نکاح کر لیتے مگر اکثر عورتوں میں برابر کا سلوک نہ کرتے اس پر حکم نازل ہوا کہ حقوق یتامیٰ میں عدل نہ کرنے کا جب تم کو خوف ہے تو عورتوں میں برابر کا سلوک نہ کرنے سے بھی ڈرو اس لئے اتنی ہی عورتوں سے نکاح کرو جن کے حقوق تم ادا کر سکتے ہو، اخرجہ ابن جریرؒ، سعید بن جبیرؒ، ضحاکؒ اور سدی کا بھی یہی قول منقول ہے، بعض علماء نے کہا کہ لوگ یتیموں کی سرپرستی میں تو وقت

marfat.com

محسوس کرتے تھے مگر زنا میں ان کے لئے کچھ دشواری نہ تھی اس پر حکم دیا گیا کہ جب یتیموں کے معاملہ میں عدل نہ کرنے سے تم ڈرتے ہو تو زنا سے بھی ڈرو اور حسب پسند نکاح کر لو۔ یہ مجاہد کا قول ہے ماطاب لکم میں بجائے من کے ما ذکر کیا گیا کیونکہ ما کا استعمال ذی عقل کے اوصاف کے لئے ہوتا ہے (اور من کا استعمال ذی عقل کی ذات کے لئے) اور یہاں صفت ہی کا بیان مقصود ہے گویا یوں کہا گیا کہ جن پسندیدہ اوصاف کی عورتوں سے چاہو نکاح کر لو۔ یا یوں کہا جائے کہ عورتیں چونکہ کم عقل ہوتی ہیں اس لئے ان کو بے عقل قرار دیتے ہوئے ایسا لفظ استعمال کیا جو بے عقل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے ماملکت ایمانکم میں۔ بعض علماء نے ماطاب لکم من النساء کا مطلب بیان کیا ہے کہ جو یتیم عورتیں بلوغ کو پہنچ جائیں ان سے نکاح کر سکتے ہو محاورہ میں طابت التمرۃ کا معنی ہوتا ہے خرما توڑنے کے قابل ہو گیا۔

یہ مطلب اس تفسیر کے مناسب ہے جو بخاری نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے نقل کی ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح نہ کرو اور بالغ عورتوں سے نکاح کرو مگر اس تفسیر پر لکم کا لفظ نامناسب ہوگا، فانحکوا ماطاب من النساء کہنا ہی مناسب ہے۔ (یعنی جو عورتیں بالغ ہو جائیں ان سے نکاح کر سکتے ہو، جب یہ مطلب ہے تو پھر لکم کا اضافہ کیوں کیا گیا ورنہ یوں مطلب ہو جائے گا کہ جو عورتیں تمہارے لئے بالغ ہو جائیں ان سے نکاح کرو، اور یہ مطلب بظاہر غلط ہے)۔

بعض علماء نے طاب کا ترجمہ حَلّ کیا ہے یعنی جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں ان سے نکاح کرو کیونکہ بعض عورتوں سے نکاح حرام بھی ہے جن کی تفصیل آیت تحریم میں آگئی ہے ان سے نکاح کی اجازت نہیں، یہ مطلب مجاہد کی تفسیر کے مناسب ہے کہ زنا سے ڈرو اور جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں ان سے نکاح کر لو، لیکن اس تفسیر پر آیت کا مجمل ہونا لازم آئے گا اور اجمال حکم خلاف اصل ہے، لہٰذا سب سے بہتر یہ ہے کہ وہی ترجمہ کیا جائے جو ہم نے لکھ دیا ہے کہ جو عورتیں دل کو پسند ہوں اور تمہاری طبیعت جن کی طرف مائل ہو ان سے نکاح کر لو یہ مطلب تمام تفسیری اقوال کے مناسب ہے، حضرت عائشہؓ کے قول کے موافق اس آیت کی تشریح یہ ہوگی کہ چونکہ یتیم لڑکیاں بے بس ہوتی ہیں ان کا کوئی حمایتی نہیں ہوتا پس اگر تم کو ان کی حق تلفی کا اندیشہ ہو اور عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو جو پسند خاطر ہو اس سے نکاح کر لو خواہ وہ یتیمہ نابالغہ ہو یا بالغہ کیونکہ تمہارا طبعی میلان ان کے حقوق کا محافظ ہو جائے گا اور منکوحہ کی طرف میلان ارتکاب زنا سے بھی روک دے گا، چونکہ مرغوبات کا وجود زیادہ نہیں ہوتا اس لئے یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ چار سے زیادہ کے ساتھ نکاح نہ کرو (ورنہ محبوبات بھی مرغوبات نہیں رہیں گے اور رغبت طبیعت بھی اعراض سے بدل جائے گی) واللہ اعلم۔

مسئلہ

اسی لئے پیام نکاح بھیجنے والے کے لئے نکاح سے پہلے مخطوبہ کے چہرے اور دونوں کف کو دیکھ لینا بالاجماع مسنون ہے، داؤد ظاہری نے تو مخطوبہ کے تمام بدن کو سوائے عورت غلیظہ کے نکاح سے پہلے دیکھنے کو جائز کہا ہے، حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیام بھجوائے تو اگر ایسی چیزوں کو دیکھ لینا ممکن ہو جو نکاح کی رغبت دلا رہی ہوں تو ایسا کرے (یعنی دیکھ لے) رواہ ابو داؤد، حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیام بھجوایا حضور ﷺ نے فرمایا کیا تو نے اس کو دیکھ لیا ہے میں نے عرض کیا نہیں، فرمایا اس کو دیکھ لے یہ دیکھ لینا تم دونوں کے درمیان اتفاق پیدا کرنے کے لئے بہت مناسب ہے، رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی۔

مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ دو دو اور تین تین اور چار چار یہ تینوں الفاظ اعداد مکررہ سے بنائے گئے، مثنی ثنتین ثنتین (دودو) اور ثلث ثلاث ثلاث (تین تین) اور رباع اربع اربع (چار چار) سے معدول ہے۔ یہ تینوں لفظ نحوی اعتبار سے غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ معدول بھی ہیں اور ان کے مفہوم میں معنی وصفی بھی ہے۔ ان الفاظ کی بناء ہی وصفی معنی پر ہے ہاں ان کے اصول یعنی ثنتین اور ثلاث اور اربع کی بناء وصفیت پر نہیں ہے (بلکہ ان کی وصفیت عارضی ہے) بعض لوگوں نے ان الفاظ کے غیر منصرف ہونے کی علت تکرار عدل کو قرار دیا ہے کیونکہ یہ الفاظ باعتبار لفظ بھی معدول ہیں اور باعتبار معنی بھی

marfat.com

لفظ مثنیٰ لفظ ثنتین ثنتین سے معدول ہے اور مثنیٰ کا معنی ثنتین ثنتین کے معنی سے ہے۔

ان الفاظ کا نصب حال ہونے کی بناء پر ہے اور ادباء بصرہ کے نزدیک تینوں نکرہ ہیں لیکن علماء کوفہ ان کو معرفہ قرار دیتے ہیں کیونکہ حرف تعریف ان پر داخل نہیں ہوتا اس صورت میں ان کا نصب بدل ہونے کی بناء پر ہوگا۔

مسئلہ

روافض نے نو عورتوں سے (ایک وقت میں) نکاح کو جائز قرار دیا ہے اور استدلال اسی آیت سے کیا ہے، نخعی اور ابن ابی لیلیٰ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ کہ واؤ مطلق جمعیت کے معنی کو بتاتی ہے پس آیت کا معنی یہ ہوا کہ نکاح کرو، دو عورتوں سے اور تین سے اور چار سے اس کا مجموعہ نو ہو گیا، خارجی اٹھارہ عورتوں سے (بیک وقت) نکاح کے جواز کے قائل ہیں کیونکہ لفظ اگرچہ مفرد ہے لیکن معنی میں تکرار ہے اس لئے نو کا دوگنا اٹھارہ ہو گیا، یہ دونوں قول غلط ہیں۔

خوارج کا قول اس لئے غلط ہے کہ یہ الفاظ اعداد مکررہ سے معدول ہیں مگر تکرار عدد کی کوئی خاص حد نہیں، تکرار کا معنی صرف دو بار یا دو عدد ہی نہیں بلکہ دو، دو، دو، دو، دو غرض لامحدود کو لفظ تکرار شامل ہے، پس جو شخص کسی جماعت سے کہے ان دراہم میں سے دو دو لے لو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص دو درہم لے لے، یہ مقصد نہیں ہوتا کہ تم سب چار درہم لے لو، آیت میں اگر یہی مراد ہوگا تو آیت کا مطلب ہی درست نہ ہوگا کیونکہ سب لوگوں کا دو یا تین یا چار یا نو یا اٹھارہ عورتوں سے نکاح ممکن ہی نہیں، اسی لئے صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ اگر ان الفاظ کو مفرد ذکر کیا جائے (یعنی معدول نہ کیا جائے اور معنوی تکرار کا مفہوم نہ پیدا ہو) تو کوئی معنی ہی نہ ہوگا یعنی اگر فانکحوا اثنتین و ثلاثا او اربعاً کہا جائے تو معنی صحیح نہ ہوگا۔

روافض کا قول اس لئے غلط ہے کہ اہل بلاغت نو عدد کو بیان کرنے کے لئے، دو اور تین اور چار نہیں بولتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے دو سے بھی نکاح جائز ہے اور ہر ایک کے لئے تین سے بھی نکاح جائز ہے اور ہر ایک کے لئے چار سے بھی نکاح جائز ہے۔

بیضاوی نے بجائے اَوْ کے واؤ عاطفہ لانے کا یہ فائدہ بتایا ہے کہ اگر اَوْ لایا جاتا تو جواز اختلاف عدد ختم ہو جاتا لیکن اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ واؤ کی وجہ سے جواز اتفاق عدد جاتا رہا، حق بات یہ ہے کہ واؤ ہو یا اَوْ اس جگہ فہم مقصود دونوں سے برابر ہو رہا ہے، یہاں نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تمام امت کا ان تینوں اقسام میں سے کسی ایک قسم پر اجتماع ضروری ہے نہ اس طرف ذہنی التفات ہوتا ہے کہ مختلف اقسام پر ہونا لازم ہے واؤ لانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب مجموعہ کا مجموعہ سے تقابل ہوتا ہے تو واؤ کی وجہ سے افراد کی تقسیم افراد پر زیادہ قابل فہم ہو جاتی ہے (پس جب مجموعہ امت کو اس مجموعہ کا حکم دیا گیا تو آسانی سے معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص دو نکاح کرلے کوئی تین کوئی چار)۔

مسئلہ:- ائمہ اربعہ اور جمہور اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ چار عورتوں سے زیادہ نکاح میں رکھنا جائز نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حلت نکاح کی کوئی تعداد مقرر نہیں، جتنی عورتوں کو چاہے نکاح میں رکھ سکتا ہے کیونکہ آیت فانکحوا ماطاب لکم مفید عموم ہے مثنیٰ و ثلث و رباع قید نہیں بلکہ عرفی تعداد کا اظہار ہے جیسے کہتے ہیں اس دریا میں سے جتنا پانی چاہو لے لو ایک مشک اور دو مشک اور تین مشک اگر اس تعداد کو قید مان بھی لیا جائے تب بھی چار کا جواز ثابت ہوتا ہے اور چار سے زیادہ کے عدم جواز پر کوئی لفظ دلالت نہیں کرتا ہاں ذکر عدد سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس عدد سے زائد جائز نہیں مگر مفہوم کا اعتبار نہیں دیکھو آیت جاعل الملائکۃ رسلا اولی اجنحۃ مثنی و ثلث و رباع میں اربعہ تک تعداد کو ذکر کرنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ چار سے زائد مرسل ملائکہ کے بازو نہیں پیدا کئے گئے بلکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل کے چھ سو بازو دیکھے۔ پھر نکاح میں اصل عمومی حلت ہے (یعنی اگر خصوصی ممانعت نہ ہو تو اصل یہ ہے کہ نکاح میں کسی محدود تعداد کی قید نہ لگائی جائے) دیکھو اللہ نے فرمایا ہے احل لکم ماوراء ذلکم دوسری آیت ہے

marfat.com

والمحصنات من المومنات، والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب یہ بھی صحیح روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ کے نکاح میں نو عورتیں تھیں اس میں رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت کی کوئی دلیل ہونی چاہئے ورنہ عدم خصوصیت اصل ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ آیت کا نزول قیسؓ بن حارث کے متعلق ہوا، بغوی نے لکھا ہے کہ قیسؓ بن حارث کی آٹھ بیویاں تھیں اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا چار کو طلاق دے دو اور چار کو رکھ لو، قیسؓ کا بیان ہے کہ میں نے ان بیویوں سے جن کے اولاد نہیں ہوئی تھی کہہ دیا تم جاؤ اور جن بیویوں کے اولاد ہوئی تھی ان سے کہہ دیا تم آؤ، پس رسول اللہ ﷺ کا فرمان آیت کا بیان ہو گیا، آپ ہی اللہ کی مراد کو خوب سمجھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نکاح میں اصل حلت نہیں بلکہ حرمت اور حکم بتنگی اصل ہے جیسے سورۂ بقرہ کی آیت فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں، نکاح میں اصل حلت کو قرار دینا نا قابل تسلیم ہے، رہی آیت و احل لکم ماوراء ذلکم تو اس سے مراد یہ ہے کہ محرمات مذکورہ کے علاوہ اور عورتیں تمہارے لئے حلال کر دی گئی لیکن ان کی کوئی خاص تعداد ہے یا ہر عورت حلال ہے اس پر کوئی دلالت نہیں (نہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محرکات کے علاوہ لاتعداد عورتوں سے نکاح حلال ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار سے حلال ہے) باقی دوسری آیت و المحصنات من المومنات الخ میں جمع کا مقابلہ جمع سے جس کا تقاضا ہے کہ اکائیوں کی تقسیم اکائیوں پر ہو۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ آیت زیر بحث فقط حلت نکاح کے لئے نہیں اتاری گئی بلکہ حلال تعداد کی تعیین کے لئے اتاری گئی، نفس نکاح کی حلت تو اس سے پہلے دوسری آیات واحادیث سے معلوم ہی ہو گئی تھی، اس آیت میں حلت کو تعداد کے ساتھ مقید کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ صرف حد تعداد کا بیان مقصود ہے یا یوں کہو کہ آیت میں حلت نکاح کا بیان ہی مقصود ہے مگر مطلق حلت کا نہیں بلکہ حلت مقید بالعدد کا۔

چار سے زیادہ عورتوں سے (ایک زمانہ میں) نکاح جائز نہ ہونا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غیلانؓ بن سلمہ ثقفی مسلمان ہوئے تو ان کے ساتھ ان کی وہ دس بیویاں بھی مسلمان ہو گئیں جو زمانہ جاہلیت میں ان کے نکاح میں تھیں حضور ﷺ نے فرمایا چار کو رہنے دو باقی کو چھوڑ دو، رواہ الشافعی واحمد والترمذی وابن ماجہ۔

حضرت نوفل بن معاویہؓ کا بیان ہے کہ میں جب مسلمان ہوا تو اس وقت میرے پاس پانچ بیویاں تھیں میں نے حضور ﷺ سے حکم دریافت کیا فرمایا ایک کو چھوڑو، چار کو روک لو میں نے اس عورت کو چھوڑ دیا جو سب سے پرانی ساٹھ برس سے میری رفیق تھی مگر بانجھ تھی، رواہ الشافعی والبغوی فی شرح السنۃ۔ صرف چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے پر اجماع ہو چکا ہے، اجماع کے مقابلہ میں بعض لوگوں کا قول باطل ہے غیر محدود تعداد سے نکاح کے جواز کا تو کوئی بدعتی بھی قائل نہیں، خارجیوں اور رافضیوں کے نزدیک بھی تعداد معین ہے، ۸ اور نو۔

مسئلہ :- اگر کوئی شخص اسلام لایا اور اس کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں تھیں یا دو بہنیں تھیں یا ماں اور اس کی بیٹی دونوں نکاح میں تھیں اور یہ عورتیں بھی مسلمان ہو گئیں یا کتابی تھیں تو امام مالکؒ، امام شافعی، امام احمدؒ، امام محمدؒ کا فیصلہ ہے کہ وہ جونسی چار چاہے رکھ لے زیادہ کو چھوڑ دے اور دو بہنوں میں سے جس ایک کو چاہے رکھ لے اور ماں بیٹی میں سے جس کو چاہے رکھ لے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر ایک ہی عقد میں سب سے نکاح کیا ہے تو (چونکہ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے اس لئے) سب کو چھوڑ دینا پڑے گا اور اگر ایک کے بعد دوسری سے نکاح کیا ہے تو جس عورت کی نکاح میں تقدیم ہو اس کا نکاح قائم رہے گا اور جس کی وجہ سے چار کی تعداد سے بیشی یا (دوسری بہن کے ساتھ نکاح میں) پہلی بہن کا اجتماع ہو رہا ہے اس کا نکاح ختم ہو جائے گا ہاں ماں اور بیٹی اگر کسی کے نکاح میں جمع ہوں تو اسلام کے بعد دونوں کا نکاح جاتا رہے گا بشرطیکہ دونوں سے قربت صنفی کر لی ہو کیونکہ اس وقت دونوں میں سے کسی ایک سے بھی نکاح درست نہیں۔

احادیث مذکورہ (جن میں رسول اللہ ﷺ نے زیادہ بیویاں رکھنے والے یا دو بہنوں کو ایک وقت میں نکاح میں جمع رکھنے

marfat.com

والے شوہروں کو انتخاب کا اختیار دیا تھا) اور مندرجہ ذیل حدیث امام ابو حنیفہؒ کے قول کے خلاف ثبوت بہم پہنچا رہی ہیں، ضحاک بن فیروز دیلمی کی روایت اپنے باپ کے حوالہ سے ہے ضحاکؒ کے والد نے کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرے نکاح میں دو بہنیں ہیں، فرمایا دونوں میں سے جونسی کو چاہئے اختیار کر لے۔

مسئلہ :- تین اماموں کے نزدیک غلام کو صرف دو عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک غلام کیلئے چار کو نکاح میں رکھنا جائز ہے کیونکہ آیت مذکورہ عام ہے آزاد اور غلام سب اس کے حکم میں داخل ہیں، داؤد ظاہری اور ربیعہ کا بھی یہی قول ہے۔

ہم کہتے ہیں آیت مذکورہ میں روئے خطاب صرف احرار کی طرف ہے غلام مخاطب ہی نہیں ہیں کیونکہ آیت کے آخر میں ہے فان خفتم الا تعدلوا فواحدة او ما ملکت ایمانکم اگر تم کو عدل نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو (اللہ نے تمہارے لئے صرف ایک حلال کی ہے یا) ایک سے نکاح کر و یا ان باندیوں کو اپنے پاس رکھو جن کے تم مالک ہو، باندیوں کی ملکیت غلاموں کو تو حاصل ہو نہیں سکتی، معلوم ہوا کہ آیت میں غلام مخاطب نہیں ہیں۔ ابن جوزیؒ نے التحقیق میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا غلام دو عورتوں کو نکاح میں رکھ سکتا ہے اور (صرف) دو طلاقیں دے سکتا ہے اور باندی کی عدت دو حیض ہیں، بغوی نے معالم میں بھی یہ روایت لکھی ہے بلکہ روایت کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ اگر اس کو حیض نہ آتا ہو تو دو ماہ یا ڈیڑھ ماہ عدت گزارے، ابن جوزی نے حاکم کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کا اجماع ہے کہ غلام دو عورتوں سے زائد نکاح میں نہ رکھے، رواہ ابن ابی شیبۃ والبیہقی۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا پس اے نکاح کا ارادہ کرنے والو! اگر تم کو عورتوں کے درمیان عدل نہ رکھ سکنے کا اندیشہ ہو۔

فَوَاحِدَةً پس ایک نکاح کرو (یا نکاح میں رکھو) اور (دو یا دو سے زائد کو نکاح میں) جمع کرنا چھوڑ دو۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یا باندیاں ہوں، مساوات حقوق جو منکوحہ (آزاد) عورتوں کے لئے لازم ہے وہ باندیوں کے لئے لازم نہیں نہ ان کی تعداد کی کوئی خاص حد مقرر ہے۔

مسئلہ :- حق تلفی کے ڈر سے صرف ایک بیوی یا باندیوں پر اکتفا کرنے کی ہدایت بتا رہی ہے کہ اگر بیویوں کے حقوق ادا کرنے کی طاقت ہو اور ان میں عدل کر سکتا ہو تو تعدد نکاح افضل ہے، اور مغلوب الشہوت پر تو بالاجماع نکاح فرض ہے بشرطیکہ بیوی کا خرچ ادا کرنے کی طاقت ہو اور مغلوب الشہوت نہ ہونے کی صورت میں نکاح مسنون ہے بشرطیکہ ادائے حقوق میں کوتاہی کا اندیشہ نہ ہو، حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے گروہ جوانان تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہو وہ نکاح کرلے اور استطاعت نہ ہو تو روزہ کا التزام کرے روزہ اس کے لئے خصی ہونا ہے (یعنی مغلوب الشہوت غیر مستطیع کے لئے خصی ہونا تو جائز ہی نہیں ہے اگر شہوت کا زور توڑنا اور فتنہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہنا مقصود ہو تو روزے رکھنا چاہئے، روزہ شہوت کے زور کو توڑ دے گا) متفق علیہ، صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مگر میں روزہ رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے متعلق نہیں۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نکاح کرنے کا حکم دیتے تھے اور ترک نکاح کی سخت ممانعت کرتے تھے اور فرماتے تھے شوہر سے زیادہ محبت کرنے والی، زیادہ بچے پیدا کرنے والی سے نکاح کرو، میں قیامت کے دن تمہاری کثرت کا (دوسرے) انبیاء (کی امتوں) سے مقابلہ کروں گا، (رواہ احمد) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عکاف بن خالد رضی اللہ عنہ سے فرمایا کیا تمہاری بی بی ہے عکاف نے عرض کیا نہیں فرمایا اور نہ باندی ہے عکاف نے کہا نہیں فرمایا

marfat.com

اور تم خیر سے مالدار بھی ہو عکاف نے کہا میں مالدار بھی ہوں فرمایا تو تم برادران شیاطین میں سے ہو ہمارا طریقہ نکاح ہے تم میں رنڈوے رہنے والے بہت برے ہیں اور کمینے ہیں تم میں رنڈوے رہنے والے مردے ہیں شیطانوں کے باپ۔

داؤد ظاہریؒ اسی آیت فانحکوا ماطاب لکم سے استدلال کرتے ہوئے نکاح کو فرض عین کہتے ہیں بشرطیکہ جماع اور بیوی کے مصارف کی طاقت ہو، واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ۝۳ یہ فعل یعنی صرف ایک عورت سے نکاح اور باندیوں پر قناعت ایک طرف مڑنہ جانے کے قریب تر ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ (اَلَّا تَعُوْلُوْا کی تشریح میں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یعنی حق تلفی نہ کرنے کے قریب تر ہے۔ اَلَّا تَعُوْلُوْا سے مراد ہے ایک کی طرف بہہ نہ جاؤ مڑنہ جاؤ۔ عال المیزاب پرنالہ بہہ گیا مڑ گیا۔ عال الحاکم۔ حاکم عدل سے پھر گیا۔ عول الفریضہ، مقرر کردہ میراثی سہام کی حد سے مڑ جانا مجاہد نے اس کا ترجمہ کیا ہے گمراہ نہ ہو جاؤ۔ فراء نے کہا اللہ کے فرض کی حد سے تجاوز نہ کر جاؤ۔ عول کا لغوی ترجمہ ہے تجاوز کرنا۔ عول الفرائض (علم الفرائض میں مخرج تقسیم کو وسیع کرنا) اسی سے بنا ہے۔

امام شافعیؒ نے ترجمہ کیا کہ تمہارے بچے زیادہ نہ ہو جائیں۔ بغوی نے کہا لا تعولوا کا یہ معنی کسی نے نہیں کہا۔ عیال کی کثرت ہو تو (باب افعال سے) عال (ماضی) یعیل (مضارع) اعالۃ (مصدر) آتا ہے۔ ابو حاتم نے کہا شافعیؒ ہم سے زیادہ عربی زبان سے واقف تھے ممکن ہے یہ بھی لغت ہو۔ بعض علماء نے کہا یہ قبائل حمیر (یعنی اہل یمن) کی لغت ہے۔ بیضاوی نے کہا عال الرجل عیاله اس شخص نے بیوی بچوں کا بار اٹھایا (یعنی اس کے بیوی بچے بہت ہیں) کثرت عیال کی درپردہ تعبیر کثرت مصارف سے کی (گویا بطور کنایہ کثرت عیال مراد ہے پس شافعیؒ کا ترجمہ صحیح ہو گیا) عیال سے مراد ہیں بیویاں اور اگر بچے مراد ہوں تب بھی درست ہے کیونکہ منکوحہ عورتوں کے مقابلہ میں باندیوں سے بچے ہونے کا احتمال کم ہے باندی سے عزل بھی جائز ہے جیسے ایک بیوی سے چار بیویوں کے مقابلہ میں کثرت اولاد کا احتمال کم ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ اور عورتوں کو ان کے مہر دو، صداق اور صدقۃ مہر کو کہتے ہیں۔ کلبی اور علماء کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ اس آیت میں خطاب عورت کے سرپرستوں کو ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابو صالح کا قول نقل کیا ہے کہ بعض لوگ اپنی لڑکی کا نکاح کرانے کے بعد مہر خود لے لیتے تھے لڑکی کو نہیں دیتے تھے اللہ نے اس کی ممانعت میں یہ آیت نازل فرمادی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عورت کا ولی جب اس کا نکاح کرادیتا اور نکاح کے بعد عورت خاندان میں ہی رہتی تو ولی مہر خود لے لیتا تھا اس کو کچھ بھی نہیں دیتا تھا اور اگر کوئی اجنبی آدمی عورت سے نکاح کر کے خاندان سے باہر لے جاتا تو ولی مہر پر خود قبضہ کرنے کے بعد عورت کو ایک اونٹ پر سوار کرا کے روانہ کر دیتا بس یہ اونٹ اس کو مہر میں ملتا اور کچھ نہ ملتا۔

حضرمی نے بیان کیا کہ لوگ نکاح شغار (تور کا نکاح) کرتے تھے جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کسی عورت کا ولی اس عورت کا نکاح کسی شخص سے کر دیتا اور وہ شخص اپنی بہن بیٹی کا نکاح تبادلہ میں اول شخص سے کر دیتا اور اس طرح عورتوں کا تبادلہ ہو جاتا مہر کسی کا کچھ نہ ہوتا اس کی ممانعت کر دی گئی اور مہر مقرر کرنے کا حکم دیدیا گیا۔

مسئلہ:- امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک نکاح شغار باطل ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا اگر نفس عقد میں یہ الفاظ کہے کہ ہر ایک کا بضع (گوشت کا ٹکڑا مراد فرج) دوسری کا مہر ہے تو ہر ایک کا نکاح باطل ہے اور اگر یہ الفاظ نہ کہے بلکہ اس طرح کہا کہ میں نے اپنی لڑکی کا نکاح تجھ سے اس شرط پر کیا کہ تو اپنی لڑکی کا نکاح مجھ سے بغیر مہر کے کردے اور دوسرے شخص نے جواب میں کہا میں نے (اپنی لڑکی کا نکاح) تجھ سے کر دیا تو دونوں نکاح صحیح ہو گئے اور دونوں میں مہر مثل لازم ہو گا۔ امام مالکؒ و امام احمدؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی نکاح باطل ہو گا۔ حقیقت میں یہ اختلاف شغار کی تعریف میں ہے۔ امام مالک و احمدؒ کے نزدیک مؤخر الذکر صورت بھی شغار کی ہے اور امام شافعیؒ اس کو شغار نہیں کہتے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا دونوں صورتوں میں نکاح صحیح ہو گا اور مہر مثل

marfat.com

لازم ہوگا۔

اگر ایک شخص نے کہا میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے اس شرط پر کیا تو اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دے۔ اور مہر کا ذکر نہیں کیا، نہ بغیر مہر کا لفظ کہا۔ تو بعض روایات میں آیا ہے کہ باتفاق آئمہ اربعہ نکاح صحیح ہوگا یہ شغار ہی نہ ہوگا اور اگر یوں کہا کہ میری بیٹی کا بضع تیری بیٹی کا مہر ہوگا اور دوسرے نے (زبان سے) قبول نہیں کیا بلکہ اپنی لڑکی کا نکاح کرادیا اور اس کا مہر کچھ مقرر نہیں کیا تو دوسرا نکاح باتفاق آئمہ صحیح ہوگا (اور مہر مثل لازم ہوگا) لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک پہلا نکاح بھی صحیح ہوگا (اور اس میں بھی مہر مثل لازم ہوگا) نکاح شغار کے باطل ہونے پر حضرت ابن عمرؓ کی حدیث دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح شغار کی ممانعت فرمائی ہے اور شغار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی (یا بہن) کا نکاح کسی شخص سے کر دے کہ وہ شخص اپنی بیٹی (یا بہن) کا نکاح اس سے کر دے اور کسی کا مہر نہ ہو۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے اور اصحاب [illegible] نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے اسلام میں شغار (تور کا نکاح) نہیں۔ یہ حدیث شغار کے شرعی وجود کی نفی کر رہی ہے اور اول الذکر حدیث میں شغار کی ممانعت مذکور ہے اور ممانعت کا تقاضا ہے کہ شئ ممنوع (کا اگر ارتکاب کیا جائے تو) صحیح نہ ہو اور غیر صحیح نکاح مفید ملک بالاتفاق نہیں ہوتا (لہٰذا مہر مثل ادا کرنے کے بعد شغار صحیح نہ ہوگا) شغار کے باطل ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ شغار میں ہر بضع بجائے خود منکوح بھی ہوتا ہے اور دوسرے بضع کا مہر بھی پس منکوح ہونے کے اعتبار سے مستحق مہر ہوگا اور مہر ہونے کے اعتبار سے دوسرے کے نکاح کا بدل گویا اس کی حیثیت مشترک ہوگی اور یہ باطل ہے۔

احناف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ احادیث مذکورہ میں نہی یا نفی کا تعلق شغار کے مفہوم سے ہے یعنی جس کو شغار کہا جاتا ہے وہ ممنوع اور منفی ہے شغار کے مفہوم کے دو جز ہیں (۱) مہر سے خالی ہونا۔ (۲) بضع کو مہر قرار دینا۔ اگر اس مفہوم کا شغار ہو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ بضع کو مہر قرار دینا باطل ہے۔ حقیقت شغار شرعاً منفی اور ممنوع ہے لیکن ماہیت شغار کی نفی سے نکاح کا نہ ہونا لازم نہیں بلکہ نکاح ہو جائے گا اور (بطور شغار جس چیز کو مہر قرار دیا ہے وہ مہر نہ ہوگا بلکہ) مہر مثل لازم ہوگا۔ جیسے وہ نکاح جس میں شراب یا خنزیر کو مہر قرار دیا گیا ہو باطل نہیں ہے بلکہ مہر مثل کا موجب ہے اور جس (مہر شغاری یعنی بضع) سے شرعی نہی کا تعلق ہے اس کو ہم ثابت نہیں کرتے اور جس (مہر مثل) کو ہم ثابت کرتے ہیں اس سے نہی غیر متعلق ہے بلکہ شرع کی عمومی عبارتیں تو اس کے صحیح ہونے کی مقتضی ہیں لہٰذا بضع کو مہر قرار دینا باطل ہے اور نکاح ہر طرح درست ہے بعض علماء کے نزدیک (اولیاء زوجہ کو خطاب نہیں ہے بلکہ) نکاح کرنے والے مردوں کو خطاب ہے کہ اپنی بیویوں کا مہر ادا کرو۔

نِحْلَةً بطیب خاطر (ابو عبیدہ)۔ یہ اٰتُوا کا مفعول مطلق ہے یا اٰتُوا کی فاعلی ضمیر سے حال ہے یعنی طیب خاطر رکھتے ہوئے دو یا صَدُقَاتِ سے حال ہے یعنی عورتوں کے مہر اس مال میں سے دو جو اللہ نے اپنی عنایت سے تم کو دیئے ہیں مراد یہ ہے کہ کسی غیر کے مال میں سے نہ دو نہ مشتبہ مال میں سے۔ ابو عبیدہؒ نے کہا نحلہ محدود معین ہی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے نحلہ کا ترجمہ عطیہ اور بخشش کیا ہے یعنی اللہ کی طرف سے عورتوں کے لئے مہر (ضروری قرار دینا) ایک مہربانی اور عطیہ ہے اور چونکہ حق مہر عورتوں کو اللہ کی طرف سے عنایت کیا ہوا ہے اس لئے مردوں کے ذمے وہ فرض اور لازم ہو گیا۔ اسی کا لحاظ کر کے قتادہ نے نحلہ کا ترجمہ فریضہ کیا ہے اور ابن جریج نے مقررہ فریضہ لیکن زجاج نے نحلہ کا ترجمہ تَدَيُّنًا کیا ہے یعنی مہر کا قانون اللہ کی طرف سے جاری کیا ہوا ہے پس دینی ضابطہ ہونے کی وجہ سے تم ان کا مہر ادا کرو۔

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا پس اگر وہ بیویاں خوش دلی کے ساتھ تم کو مہر کا کچھ حصہ چھوڑ دیں۔ منہ میں واحد مذکر کی ضمیر صداق کی طرف راجع ہے کیونکہ کلام سابق سے یہ سمجھا جارہا ہے کہ ہر ایک کو اس کا مہر دیدو (جب تمام عورتوں کو ان کے مہر دینے کا حکم دیا تو ہر ایک کو اس کا مہر دینے کا حکم سمجھ میں آہی گیا) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صدقات کے اندر جو صداق ضمناً مذکور ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو۔ بعض کے نزدیک ایتاء (دینا) کی طرف ضمیر راجع ہے (جس پر

marfat.com

اٰتُوا دلالت کر رہا ہے) نفساً تمیز ہے طبن معنی و تجاوز کو متضمن ہے یعنی اگر عورتیں خوش دلی کے ساتھ کچھ مہر چھوڑ دیں کچھ مہر سے در گزر کریں۔ منہ میں مِن تبعیضیہ ہے اس سے مردوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ مہر کا جو کچھ حصہ عورتیں تم کو معاف کر دیں تم اسی پر بس کرو کل یا زیادہ مہر کی معافی کی طمع نہ کرو۔

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا ۝۴ تو اس کو کھالو یعنی لے لو رچتے پچتے۔ مزے اور خوشگواری کے ساتھ۔ یعنی بطور حلال بلا اعتراض۔ ھَنِیْئً پاکیزہ خوشگوار جس میں کوئی تکدر نہ ہو۔ بعض نے کہا مزہ دار مَرِیْئً کا معنی ہے خوش انجام کامل الھضم غیر مضر ھَنِیٔ یَھْنِیٔ (ضرب یضرب) اور مَرِیٔ یَمْرِیٔ (سمع یسمع) سے ھَنِیْئاً اور مَرِیْئاً صفت مشبہ کے صیغے ہیں اور بجائے مصدر کے مستعمل ہیں۔ یا محذوف مصدر کی صفت ہیں۔ ابو جعفر نے دونوں لفظ بغیر ہمزہ کے یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھے ہیں۔ باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر اور دوسرے قاریوں کا یہی اختلاف بَرِیٌّ بَرِیْئُوْنَ بَرِیّاً اور کَھَیْئَۃِ میں ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ اور نہ دو اپنے مال بیوقوفوں کو یعنی اپنی عورتوں اور بچوں کو لے عورتوں اور بچوں کو سفیہ اس لئے فرمایا کہ (شرع کے نزدیک) یہ سبک عقل ہوتے ہیں ضحاک مجاہد زہری اور کلبی وغیرہ نے یہی بیان کیا اور آئندہ آیت کے بھی یہی مناسب ہے۔

الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا جن کو اللہ نے تمہارے لئے مایہ زندگانی بنایا ہے یعنی مال سے تمہاری زندگی کا بقاء اور گزران ہوتا ہے ضحاک نے کہا (مال کے مایہ زندگانی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ) مال ہی سے حج، جہاد اور نیکی کے کام ہوتے اور اسی کے ذریعہ سے دوزخ سے نجات ملتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے (آیت کے مطلب کی توضیح میں) فرمایا جو مال اللہ نے تم کو عنایت فرمایا ہے اور ذریعہ معاش بنایا ہے اس پر اپنی عورتوں اور بچوں کو تسلط نہ دو، ورنہ وہ تمہارے خلاف کھڑے ہو جائیں گے اور تم ان کے ہاتھوں کو تکتے رہو گے بلکہ اپنا مال اپنے قبضہ میں رکھو اور اس کو ترقی دو اور خود اہل وعیال کی پرورش اور تربیت میں صرف کرو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا اور اس میں سے اہل وعیال کو کھانے کو

وَاكْسُوْهُمْ اور پہننے کو دیتے رہو۔

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ اور ان سے نرم گفتگو کرتے رہو کہ ان کے دل خوش رہیں۔ سعیدؒ بن جبیر اور عکرمہؒ نے فرمایا اس آیت میں وہ یتیم مراد ہیں جو تمہارے زیر پرورش ہوں کہ ان کے قبضہ میں ان کا مال نہ دو۔ بلکہ خود ان کے صرف میں لاؤ۔ اموالکم میں خطاب اولیاء کو ہے یتیموں کے مال کو سرپرستوں کا مال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ سرپرست ہی اس مال کے منتظم اور کرتا دھرتا ہوتے ہیں۔ یہ تفسیر آیت کے سیاق اور اول و آخر حصوں کے مناسب ہے کیونکہ گذشتہ اور پیوستہ آیات میں روئے خطاب سرپرستوں ہی کی طرف ہے۔ وَارْزُقُوْھُمْ فِیْھَا فرمانے سے یہ مقصود ہے کہ اصل مال میں سے ان کے مصارف نہ کرو، ورنہ سارا مال خرچ ہو جائے گا بلکہ اس مال کو تجارت میں لگا کر اس کے نفع سے یتیموں کے مصارف کرو۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى اور یتیموں کی جانچ کر لو۔ یعنی بالغ ہونے سے پہلے یتیموں کی عقل کی جانچ کر لو تھوڑا سا مال ان کے قبضہ میں دے کر دیکھو کہ وہ کس طرح اس میں تصرف کرتے ہیں اگر وہ ہوشیار ہوں گے تو شروع میں ہی ان کی ہوشیاری ظاہر ہو جائے گی۔ ہوشیار بچہ کو تجارتی لین دین کی اجازت اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بچہ کو تجارت کی اجازت نہیں اور آیت میں جانچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے نکاح کے مبادی ان کے سپرد

لے بیہقی نے شعب میں اور حاکم نے تصحیح کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخص ہیں جو اللہ سے دعا کرتے ہیں اور ان کی دعا قبول نہیں ہوتی (ایک) وہ شخص جس کی بیوی بد خلق ہو اور اس نے اس کو طلاق نہ دی ہو اور (دوسرا) وہ شخص جس کا کسی پر کچھ مال ہو (یعنی مال کا دعویٰ کرے) اور شہادت پیش نہ کرے اور (تیسرا) وہ شخص جو سفیہ کو اس کا مال دے دے حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے ولا تؤتوا السفہاء اموالکم، از مفسر رحمۃ اللہ۔

marfat.com

کر دیئے جائیں۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول زیادہ ظاہر ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ یہاں تک کہ جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں یعنی اس عمر کو پہنچ جائیں کہ نکاح اور نسل آفرینی کی ان میں صلاحیت پیدا ہو جائے، لڑکے میں اس کی علامت احتلام، جماع کے وقت انزال اور صلاحیت تولید ہے اور لڑکی میں حیض، احتلام اور حاملہ ہونے کی صلاحیت ہے اگر ان علامات میں سے کوئی علامت نہ پیدا ہو تو امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک لڑکے اور لڑکی کے بلوغ کی عمر پورے پندرہ سال ہیں۔ ایک روایت میں امام ابو حنیفہؒ کا قول بھی یہی آیا ہے اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔ مگر امام صاحب کا مشہور قول یہ ہے کہ لڑکی کے لئے پورے سترہ اور لڑکے کے لئے پورے اٹھارہ سال اور ایک روایت کے بموجب پورے انیس سال ہونا چاہیے۔

جمہور نے اپنے مسلک کی دلیل میں حضرت انسؓ کی روایت کو پیش کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مولود (بچہ اور بچی) کی عمر پورے پندرہ سال کی ہو جاتی ہے تو اس کے مفید مضر اعمال لکھے جاتے ہیں اور اس پر حدود قائم کی جائیں۔ رواہ البیہقی فی الخلافیات، اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کا قول آیا ہے کہ احد کے دن جب کہ میری عمر چودہ سال تھی (شرکت جنگ کی اجازت کیلئے) مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا آپ نے شرکت کی اجازت نہیں دی۔ پھر خندق کے دن جب کہ میری عمر ۱۵ سال تھی مجھے حضور ﷺ کے معاینہ میں پیش کیا گیا اس وقت آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔

امام احمدؒ کے نزدیک بلوغ کی ایک علامت پوشیدہ بالوں کی روئید گی بھی ہے (مشرکین کے لئے بھی اور مسلمانوں کے لئے بھی) امام شافعیؒ کے نزدیک مشرکین کے لئے بلوغ کی علامت روئیدگی ہے۔ مسلمانوں کے لئے نہیں ہے یا ہے۔ یہ دونوں روایتیں امام شافعیؒ سے منقول ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ پوشیدہ بالوں کی روئیدگی یا عدم روئیدگی کو ہیچ قرار دیتے ہیں نا قابل اعتبار۔ امام احمد و امام شافعیؒ کے قول کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ابن حبان اور حاکم اور اصحاب سنن نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے کہ عطیہ قرظی نے فرمایا بنی قریظہ (کی گرفتاری و قتل) کے دن مجھے رسول اللہ ﷺ کے معاینہ میں پیش کیا گیا کیونکہ لوگوں کو میرے بالغ اور نابالغ ہونے میں شک تھا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ پوشیدہ بالوں کو دیکھو پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں۔ لوگوں نے حکم کی تعمیل کی مگر بال نہ پائے اس لئے مجھے (قتل سے) چھوڑ دیا گیا اور قیدیوں میں شامل کر دیا گیا۔

فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا پس اگر بلوغ کے بعد تم ان سے ہوشیاری دیکھو (محسوس کرو) یعنی لین دین میں خرابی محسوس نہ ہو اور معاملات میں درستی نظر آئے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے رشدا کا مطلب یہی بیان کیا ہے امام شافعیؒ نے فرمایا۔ صلاح دین، حفاظت مال اور مال کو ترقی دینے کی تدبیروں کا علم رشد سے مراد ہے۔

بیہقی نے علی بن طلحہؒ کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم کو ان کے اندر دینی صلاح اور حفاظت مال بلوغ کے بعد نظر آئے۔ ثوری نے جامع میں منصور کی روایت سے مجاہد کا قول بھی یہی نقل کیا ہے اور بیہقی نے یزید بن ہارون از ہشامؒ بن حسان کی روایت سے حسن بصریؒ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ نتیجہ اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک فاسق صاحب رشد نہیں ہے اور دوسرے لوگوں کے نزدیک فاسق رشید ہے۔

فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ توان کا مال فوراً بالغ ہوتے ہی بلا تاخیر ان کو دیدو۔

ترکیب عبارت :۔ اذابلغوا ظرف ہے لیکن اس میں شرط کا معنی ہے اور ظرف کا تعلق ادفعوا سے ہے حتی ابتدائیہ ہے، ما قبل حتیٰ مابعد کا سبب ہے یہ حتی جارہ نہیں ہے کیونکہ اذا کے اندر فی (ظرفیت) کا معنی ہے اس لئے حتیٰ جارہ اس پر داخل نہیں ہو سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ یتیموں کی جانچ کرلو تاکہ نکاح کی عمر کو پہنچنے پر جب تم کو ان کی ہوشیاری نظر آجائے توان کا مال ان کو دیدو۔ گویا جانچ کرنا مال دینے کا سبب ہے لیکن دینا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے بلوغ اور احساس رشد۔ اسی لئے امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور صاحبینؒ نے فرمایا کہ جب تک رشد دیکھ نہ لیا جائے ان کا مال ان کے ہاتھوں میں نہ دیا جائے مگر امام ابو حنیفہؒ کے

marfat.com

نزدیک احساس رشد لازم نہیں۔ مال دینے کے لئے پچیس سال کی عمر پوری ہو جانا کافی ہے کیونکہ مال دینے کی ممانعت بچپن کے آثار کی وجہ سے کی گئی ہے اور ابتدائی بلوغ میں بچپن کے آثار باقی رہتے ہیں اور زیادہ وقت گزرنے پر نشان طفولیت ختم ہو جاتا ہے لہٰذا ممانعت کا حکم بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے امام صاحبؒ کا قول ہے کہ بلوغ کے وقت اگر کوئی بچہ صاحب رشد تھا پھر (کسی بیماری کی وجہ سے) سفیہ ہو گیا تو مال سے اس کو نہیں روکا جائے گا کیونکہ اس کی یہ سفاہت بچپن کے اثر کی وجہ سے نہیں ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ (رشداً کی تنوین تقلیل کے لئے ہے یعنی اگر تم کو ان کے اندر کسی قسم کا تھوڑا سا رشد بھی نظر آئے تو ان کا مال دیدو۔ تکمیل رشد کا انتظار نہ کرو اور چونکہ پچیس سال کی عمر میں کسی نہ کسی قسم کا رشد کسی درجہ میں حاصل ہو ہی جاتا ہے لہٰذا اس کا مال دیدو، مال کی روک کا حکم تو ادب آموزی کے لئے تھا اس عمر کے بعد ادب سیکھنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں یا یوں کہو کہ غالباً امکان ادب آموزی ختم ہو جاتا ہے ایسی حالت میں مال روکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہٰذا دیدینا لازم ہے۔

مسئلہ :- جس سفیہ کو مال دینے کی ممانعت کی گئی ہے اس کا کوئی مالی معاملہ نافذ نہیں ہو سکتا نہ بیع کر سکتا ہے نہ غلام کو آزاد کر سکتا ہے، یہ مسلک امام شافعیؒ کا ہے۔ لیکن امام محمدؒ کے نزدیک سفیہ کا وہ تصرف تو جاری ہو جائے گا جو فسخ کر دینے کے قابل ہی نہیں ہے اور وہ تصرف نافذ نہ ہو گا جس کو ولی کی اجازت سے فسخ کیا جا سکتا ہے جیسے خرید و فروخت لیکن امام ابو یوسفؒ اور اکثر علماء کے نزدیک جب تک قاضی نے روک نہ کر دی ہو۔ سفیہ کے تمام تصرفات نافذ ہوں گے اور قاضی ہر تصرف سے روک سکتا ہے۔ اگر

قاضی روک دے تو سفیہ کی نہ بیع نافذ ہو گی نہ کوئی ایسا تصرف نافذ ہو گا جس میں مذاق کے طور پر زبان سے کہہ دینا بھی سنجیدگی کا حکم رکھتا ہے لیکن غلام کی آزادی کا حکم نافذ ہو جائے گا اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غلام پر لازم ہو گا کہ محنت مزدوری یا اور کوئی کام کر کے اپنی قیمت (سفیہ کے ولی کو) ادا کرے۔ امام محمدؒ کے مثبت و منفی دو قول آئے ہیں اول قول امام ابو یوسفؒ کے قول کے موافق ہے اور دوسرے قول میں غلام کو اپنی قیمت کا ذمہ دار نہیں قرار دیا۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا قاضی کے لئے جائز ہی نہیں کہ کسی عاقل بالغ کو سبکی عقل یا دین یا فسق کی وجہ سے تصرفات سے روک دے۔ اس فعل کا معنی یہ ہو گا کہ آدمیت کے حقوق سلب کر کے چوپایوں میں اس کو پہنچا دے اور حقوق انسانیت کا سلب بربادی مال سے زیادہ سخت ہے ادنیٰ ضرر کو دفع کرنے کے لئے بڑے ضرر کو نہیں اختیار کیا جا سکتا۔

شافعیؒ اور احمدؒ وغیرہ سفیہ کو تصرفات سے روک دینے کے جواز کے قائل ہیں ان کے اس مسلک کی دلیل یہی آیت ہے۔ آیت دلالت کر رہی ہے کہ سفیہ سے مال کو روک دیا جائے لیکن اگر اس کے ہاتھ کو تصرف سے روک بھی دیا جائے تب بھی کوئی نتیجہ نہ ہو گا کیونکہ وہ زبان سے (خرید و فروخت وغیرہ) تصرفات کر سکے گا اس لئے اس کو ہر طرح کی بازداشت قاضی کی طرف سے ہونی چاہئے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا مالی تصرف سے صرف ہاتھ کو روکنا بھی مفید ہو سکتا ہے کیونکہ سب کی عقل کا ظہور اکثر ہبہ اور صدقہ و خیرات کی صورت میں ہوتا ہے اور ایسا تصرف ہاتھ کا محتاج ہے زبانی ہبہ (اور صدقہ) بغیر قبضہ کے نافذ نہیں۔ امام اعظمؒ کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی بیع و شراء کے معاملہ میں کمزور تھا مگر خرید و فروخت کرتا ضرور تھا اس کے گھر والوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کو خرید و فروخت سے روک دیا جائے حضور ﷺ نے اس کو بلوا کر بیع کرنے کی ممانعت فرما دی۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے تو بغیر بیع کے صبر نہیں ہوتا فرمایا تو جب بیع کیا کرو تو یہ کہہ دیا کرو کہ کوئی دھوکہ نہ ہونا چاہئے (مجھے کا اختیار ہے) رواہ الترمذی واحمد۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے دیکھو رسول اللہ ﷺ نے اس کو بیع سے بالکل بازداشت نہیں کی اور تحریمی ممانعت نہیں فرمائی۔

شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اس کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ وہ شخص خود قصداً اپنا مال برباد نہیں کرتا تھا بلکہ سبک عقلی کی وجہ سے خرید و فروخت میں اس کو نقصان ہو جاتا تھا اس کا تدارک حضور ﷺ کے اس قول سے ہو سکتا تھا کہ کوئی دھوکہ نہ ہونا چاہئے۔ (چنانچہ آپؐ نے یہی فرمایا) اور ہماری گفتگو اس سفیہ کے متعلق ہے جو دانستہ خود اپنا مال برباد کرتا ہو۔ بغوی

marfat.com

نے لکھا کہ سفیہ کو تمام مالی تصرفات سے روک دینے کے جواز کی دلیل صحابہؓ کا اتفاق آراء ہے۔

عروہؒ نے ہشامؒ سے ہشامؒ نے قاضی ابو یوسفؒ سے امام ابو یوسفؒ نے امام محمدؒ سے امام محمدؒ نے امام شافعیؒ سے بیان کیا کہ عبداللہؓ بن جعفرؓ نے کچھ بھوڑ زمین ساٹھ ہزار درہم کو خریدی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا میں عثمانؓ کے پاس جاکر تیری خرید کا اختیار بند کرادوں گا۔ عبداللہؓ نے جاکر حضرت زبیرؓ سے یہ بات کہہ دی حضرت زبیرؓ نے کہا میں اس بیع میں تمہارا شریک (مشورہ) ہوں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا اپنے بھتیجا کو تصرفات سے روک دیجئے (وہ سفیہ ہے) حضرت زبیرؓ نے کہا میں (مشورہ میں) ان کا شریک ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا اب میں کسی کو کیسے اس تصرف سے روک دوں جس (کے مشورہ) میں زبیرؓ شریک ہیں۔ ابو عبیدہؒ نے کتاب الاموال میں اپنی سند سے ابن سیرین کی روایت سے لکھا ہے کہ عثمانؓ نے علیؓ سے کہا۔ [1]

آپ اپنے بھتیجا کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتے اور اس کی خرید و فروخت کی بندش کیوں نہیں کر دیتے اس نے ساٹھ ہزار درہم کے ایسی شورناک زمین خریدی ہے کہ مجھے وہ اپنی جوتی کے بدلہ میں بھی نہیں بھاتی۔ بغوی نے کہا اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیہ کی بندش غتیا پر صحابہ متفق تھے اسی وجہ سے تو حضرت زبیرؓ نے بندش اختیار کو دور کرنے کا حیلہ کیا۔

مسئلہ :۔ اگر نابالغ بالغ ہونے کے وقت تو صاحب رشد ہو پھر سبک سر برباد کن ہو جائے تو اس کو ممنوع التصرف قرار دینا ان علماء کے نزدیک جائز ہے جو بلوغ کے وقت سفیہ کو ممنوع التصرف قرار دینے کے قائل ہیں جیسا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کے قصہ سے واضح ہو رہا ہے۔ رہا قرض دار تو اس کو بھی ممنوع التصرف قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ کعب بن مالکؓ نے اپنے باپؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو مال میں تصرف (خرید و فروخت) کرنے سے قرض دار ہونے کی وجہ سے روک دیا تھا اور آپ کا مال بکوادیا تھا۔ رواہ الدار قطنی والحاکم والبیہقی۔

ابو داؤدؒ نے مراسیل میں اور سعیدؒ نے سنن میں مرسلاً عبدالرزاق کی روایت سے اور ابن جوزی نے ابن مبارک از معمر کی روایت سے مرسلاً بیان کیا کہ حضرت معاذ بن جبل سخی جوان تھے کچھ روک کر نہیں رکھتے تھے اور برابر قرض لیتے رہتے تھے یہاں تک کہ آپ کا کل مال قرض میں ڈوب گیا مجبوراً آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ حضور ﷺ قرض خواہوں سے آپ اس کے متعلق کچھ گفتگو کریں اگر قرض خواہ کسی کو چھوڑ دیتے تو رسول اللہ ﷺ کی سفارش سے حضرت معاذ کو چھوڑ دیتے (لیکن انہوں نے کچھ نہیں چھوڑا) رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ کا مال فروخت کر دیا اور حضرت معاذ ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہوگئے۔ عبدالحق نے کہا کہ یہ حدیث بصورت ارسال متصل سے زیادہ صحیح ہے۔ ابن صلاح نے احکام میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ثابت ہے۔ یہ واقعہ ۹ ھ کا ہے۔ حضور ﷺ نے قرض خواہوں کے مطالبہ کا ۷/۵ حصہ دیا۔ قرض خواہوں نے کہا ۷/۲ بھی فروخت کر کے ہم کو دیدیجئے فرمایا اب تمہارے لئے (باقی مال پر قبضہ کرنیکا) کوئی راستہ نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ قاضی قرض دار کو نہ ممنوع التصرف کر سکتا ہے نہ اس کا مال فروخت کر سکتا ہے کیونکہ اس کے مال کی خود اپنے حکم سے فرد ختگی بھی ایک قسم کی بندش تصرف ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ یہ بغیر رضامندی کی بیع ہے جو ناجائز ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے الا ان تکون تجارۃ عن تراض بلکہ قاضی یہ کر سکتا ہے کہ قرض دار کو قید کر دے یہاں تک کہ وہ تنگ آکر اپنا مال فروخت کر دے اور قرض خواہوں کا قرض چکادے اور اس پر بھی (قاضی کی طرف سے) ظلم نہ ہو۔ رہا حضرت معاذؓ کا قصہ تو ہم کو یہ تسلیم نہیں ہے کہ حضرت معاذؓ کی مرضی کے خلاف رسول اللہ ﷺ نے ان کا مال فروخت کر دیا تھا یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے معاذ ناراض ہوتے بلکہ حضور ﷺ نے ان کی مرضی سے ان کا مال فروخت کیا تھا جیسے کسی کی طرف سے وکیل فروخت کرتا ہے یا فضولی آدمی کسی کا مال بیچ ڈالتا ہے اور بعد کو اصل مالک رضامندی دیدیتا ہے۔

---

[1] غالباً کتابت کی غلطی ہے حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے یہ بات نہیں کہی بلکہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہی تھی جیسا کہ شافعیؒ کی مذکورہ بالا روایت میں صراحت ہے۔ ۱۲۔

marfat.com

روایت میں جو آیا ہے کہ حجر علی معاذ ماله وا باعه۔ یہ صرف راوی کا خیال ہے کہ حضرت معاذ کے مال کی فروخت کو انہوں نے حجر علی معاذ قرار دیدیا کیونکہ واقدی کے سلسلہ سے بیہقی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے اس حدیث کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد حضرت معاذؓ کی شکستہ دلی دور کرنے کے لئے یمن کا عامل بنا کر بھیج دیا۔ طبرانی نے کبیر میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حج کیا تو معاذؓ کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا آپ ہی سب سے پہلے اللہ کے مال (وصول کرنے) کے لئے اجیر بنے۔ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو ممنوع التصرف نہیں کیا تھا۔

مسئلہ :- اگر کوئی دیوالیہ ہو جائے اور حاکم اس کا مال قرض خواہوں کو تقسیم کرادے اور پھر بھی قرض باقی رہ جائے مگر اس کو پیشہ ایسا آتا ہو جس کی اجرت اس کے ضروری مصارف سے زائد ہو تو امام احمدؒ نے (ایک روایت کے اعتبار سے) کہا ہے کہ حاکم ادائے قرض کے لئے اس کو مزدوری کرنے کی اجازت دے سکتا ہے دوسری روایت میں امام احمدؒ کا قول اس کے خلاف ہے باقی ائمہ نفی اجازت کے قائل ہیں۔

اول قول کے ثبوت میں امام احمدؒ نے اس حدیث کو پیش کیا ہے جو دار قطنی نے زید بن اسلم کی روایت سے لکھی ہے زید بن اسلم نے کہا میں نے اسکندریہ میں ایک بوڑھا شخص دیکھا جس کو سرق کہا جاتا تھا میں نے کہا یہ کیسا نام ہے بوڑھے نے کہا میرا یہ نام رسول اللہ ﷺ نے رکھا تھا اور میں اس کو ہرگز ترک نہیں کروں گا۔ میں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے تمہارا یہ نام کیوں رکھا تھا، بوڑھے نے کہا میں (ایک بار) مدینہ کو گیا اور لوگوں سے کہا میرا مال آنے والا ہے۔ لوگوں نے میرے ساتھ آنے والے مال کا سودا کر لیا مال برباد ہو گیا (اور میرا مال نہیں آیا) لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے حضور ﷺ نے فرمایا تو چور ہے اور حضور ﷺ نے مجھے چار اونٹوں کی قیمت میں بیچ ڈالا جس شخص نے مجھے خریدا تھا قرض خواہوں نے اس سے پوچھا تم اس کو کیا کرو گے اس نے کہا میں اسے آزاد کر دوں گا قرض خواہوں نے کہا تو ثواب کی طلب میں ہم تم سے کم نہیں ہیں چنانچہ قرض خواہوں نے مجھے آزاد کر دیا نام باقی رہ گیا۔

ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ذات کو تو فروخت کیا نہ تھا کیونکہ آزاد تھا (اور آزاد مملوک نہیں ہو سکتا) بلکہ اس کے منافع (یعنی مزدوری کی آمدنی) کو فروخت کیا تھا پس آزاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے خدمت لینے سے مجھے آزاد کر دیا۔

میں کہتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ اس حدیث میں لفظ بیع سے بیع منافع مراد لی جائے کیونکہ یہ تو عمل مجہول کا ٹھیکہ ہو جائے گا لہٰذا یہ حدیث باجماع علماء متروک ہے) کیونکہ آزاد کی بیع بالاجماع ناجائز ہے) رہا رسول اللہ ﷺ کا عمل تو حضور ﷺ کو لوگوں کی جانوں میں تصرف کرنے کا حق تھا۔ دوسروں کو وہ حق حاصل نہیں۔ حضرت ابو سعیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے پھل خریدے اور اس کے پھل مارے گئے اور اس پر قرض بہت ہو گیا حضور ﷺ نے فرمایا اس کو خیرات دو حکم کی تعمیل کی گئی مگر چندہ اتنا نہیں ہوا کہ اس کا قرض پورا ہو سکتا۔ حضور ﷺ نے قرض خواہوں سے فرمایا جتنا تم کو مل گیا لے لو بس اس سے زیادہ تم کو نہیں ملے گا۔ یہ حدیث صاف بتا رہی ہے کہ وصول قرض کیلئے قرضدار کا فقط مال لیا جا سکتا ہے مدیون پر (قرض خواہوں کا) اور کوئی حق نہیں (یعنی قرضدار کو نہ ممنوع التصرف کیا جا سکتا ہے نہ مزدوری یا نوکری وغیرہ سے روکا جا سکتا ہے) واللہ اعلم۔

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ (یعنی اے یتیموں کے سرپرستو) یتیم کا مال نہ کھاؤ۔

اِسْرَافًا وَّبِدَارًا (حد اعتدال اور ضرورت سے) زیادہ اور جلدی جلدی۔

قاموس میں ہے سَرَفٌ توسط کی ضد۔ صحاح میں ہے سرف کا معنی ہے ہر فعل میں حد سے تجاوز کرنا۔ اللہ نے فرمایا ہے لا تسرف فی القتل قتل میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ دوسری آیت ہے یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسهم اے میرے

marfat.com

بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے لیکن مال کے صرف میں حد سے تجاوز کرنے پر سرف کا اطلاق زیادہ ہوتا ہے۔ حد سے تجاوز کبھی تو مقدار کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی کثرت ہو جاتی ہے، اللہ نے فرمایا ہے کلوا وا شربوا ولا تسرفوا کھاؤ اور پیو اور حد اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔ اور کبھی کیفیت کے لحاظ سے حد سے تجاوز ہوتا ہے اسی لئے سفیانؒ ثوری نے فرمایا کہ اللہ کی طاعت سے ہٹ کر جو کچھ بھی خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے خواہ اس کی مقدار قلیل ہی ہو، اللہ نے فرمایا ہے ان المسرفین هم اصحاب النار (اللہ کی طاعت سے ہٹ کر صرف کرنے والے ہی دوزخی ہیں۔ آیت کا یہ ترجمہ حضرت مؤلف کے مقصد کی تائید کر رہا ہے کیونکہ مؤلف قدس سرہ نے اسراف حسب الکیف کی تمثیل میں یہ آیت ذکر کی ہے لیکن ممکن ہے کہ المسرفین سے مراد وہ لوگ ہوں جو نافرمان گناہ گار اور حد اطاعت سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اس صورت میں یہ ترجمہ ہوگا کہ اللہ کی اطاعت سے ہٹنے والے خواہ تجاوز عملی ہو یا نظری پامالی دوزخی ہیں)۔

میں کہتا ہوں اس صورت میں مالدار سرپرست کے لئے یتیم کا مال کھانا خواہ قلیل مقدار میں ہی ہو اسراف ہے اور نادار کے لئے یتیم کا مال اتنا کھالینا جو دستور کے خلاف ہو (یعنی اجرتِ تربیت سے زائد ہو) اسراف اور افراط کہلائے گا۔

اَنۡ يَّكۡبَرُوۡا ؕ اس اندیشہ سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اور اپنا مال تم سے لے لیں گے۔ اسرافاً اور بدارا دونوں مصدر بمعنی اسم فاعل ہیں اور مقام حال میں ہیں یعنی اسراف اور جلدی کرتے ہوئے دونوں مفعول لہ بھی ہو سکتے ہیں یعنی اسراف اور جلدی کرنے کی وجہ سے۔

وَمَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ ۚ اور جو مالدار ہو وہ یتیم کے مال سے بچتا رہے۔ یتیم کا مال بالکل نہ لے تھوڑا نہ بہت۔ استعفاف کے معنی میں عفاف سے زیادہ زور ہے عفاف بچنا استعفاف بچتے رہنا۔

وَمَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ اور جو محتاج ہو وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔ حضرت عمرو بن شعیبؒ کے دادا کی روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا میں محتاج ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میرے زیر پرورش ایک یتیم ہے (جس کا مال موجود ہے) حضور ﷺ نے فرمایا اپنے یتیم کے مال میں سے کچھ کھالو مگر (حد اعتدال سے) زیادتی نہ کرنا نہ جلدی جلدی ہڑپ کرنا نہ (اپنی مزدوری کے) مال کو بچا کر اس کے مال کو کھانا۔ رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا میری گود میں ایک یتیم ہے کیا میں اس کے مال میں سے کھا سکتا ہوں فرمایا (کھا سکتے ہو) بغیر اس کے کہ اپنے مال کو بچا کر اس کے مال کو کھاؤ اور اپنا مال جمع رکھو۔ رواہ الثعلبی ۔ مراد یہ ہے کہ یتیم کی تربیت کے معاوضہ کے بقدر کھا سکتے ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہی مسلک ہے اور ہم بھی اسی مطلب کو لیتے ہیں۔ عطاء اور عکرمہ نے یاکل بالمعروف کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ انگلیوں کے پوروں سے کھائے زیادتی نہ کرے اور (یتیم کے مال میں سے) کپڑے نہ پہنے۔ نخعی نے کہا یتیم کے مال سے کتان اور صوف خرید کر نہ پہنے صرف بھوک دور کرنے کی بقدر کھالے۔ اور ستر پوشی کے بقدر پہن لے اور ان مصارف میں جتنی رقم آئی ہو اس کی واپسی لازم نہیں۔ حسن بصری اور ایک جماعت علماء نے کہا یتیم کے درختوں کے پھل کھا سکتا ہے اس کے جانوروں کا دودھ پی سکتا ہے مگر دستور کے موافق۔ اور اس کا معاوضہ لازم نہیں۔ البتہ چاندی سونا نہ لے، اگر لے گا تو اس کا معاوضہ ادا کرنا لازم ہے۔ کلبی نے کہا معروف سے مراد ہے یتیم کی سواری پر سوار ہونا اس کے خادم سے خدمت لینا یتیم کے مال میں سے کچھ کھانا جائز نہیں۔

بغوی نے اپنی سند سے قاسم بن محمد کی روایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا میرے زیر تربیت ایک یتیم ہے اور اس کے اونٹ ہیں کیا میں ان کا دودھ پی سکتا ہوں، فرمایا اگر ایسا ہو کہ تم اس کے گم شدہ اونٹوں کو تلاش کرو۔ خارشی اونٹوں کی مالش کرو، ان کے پیاؤ کو درست کرو اور پانی پلانے کے دن ان کو پانی پلاؤ تو ان کا دودھ بھی پی سکتے ہو لیکن اس طرح کہ اونٹوں کے بچوں کو (بھوک کا) ضرر نہ پہنچے اور نہ بالکل تھنوں سے دودھ نچوڑ لیا جائے۔ شعبی نے کہا ایسی

marfat.com

مجبوری کے بغیر جس میں آدمی مردار کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے یتیم کا مال نہ کھائے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے معروف کا ترجمہ قرض کیا ہے یعنی ضرورت ہو تو یتیم کے مال میں سے قرض لے سکتا ہے جب فراخدستی ہو تو واپس کر دے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے اللہ کے مال (بیت المال) کے معاملہ میں اپنی ذات کو یتیم کے سرپرست کی طرح قرار دے رکھا ہے۔ اگر غنی ہوں گا تو بچتا رہوں گا اور محتاج ہوں گا تو معروف کے ساتھ (یعنی بطور قرض) کھالوں گا اور جب فراخدست ہوں گا تو ادا کر دوں گا۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (یعنی بالغ ہونے اور ہوشیار پانے کے بعد) جب ان کا مال تم ان کو دو۔

فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ تو دیتے وقت شاہد بنالو۔ یہ حکم استحبابی ہے واجب نہیں ہے۔ تہمت کو دور کرنے اور آئندہ جھگڑے کو کاٹنے کے لئے گواہ بنانا اولیٰ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اگر سرپرست یتیم کے بالغ ہونے کے بعد مال ادا کر دینے کا دعویٰ کرے تو بغیر گواہوں کے اس کا دعویٰ قابل قبول نہ ہوگا۔ امام اعظمؒ نے فرمایا اگر گواہ نہ ہوں تو اس کا قول قسم کے ساتھ قبول کر لیا جائے گا کیونکہ وہ اپنے اوپر تاوان عائد کئے جانے کا منکر ہے (اور منکر کا قول قسم کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے) اسی مفہوم پر دلالت کر رہا ہے آئندہ قول۔ فرمایا۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۝ اور اللہ تعالیٰ ہی حساب لینے والا کافی ہے یعنی حساب فہمی کرنے والا، بدلہ دینے والا اور شہادت دینے والا اللہ ہی کافی ہے، کسی دوسرے گواہ کی ضرورت نہیں بلکہ ولی کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہے حقیقت معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ باللہ، کفی کا فاعل ہے با زائد ہے۔

آئندہ آیت کی شان نزول

ابو الشیخ ابن حبان نے کتاب الفرائض میں بطریق کلبی ابو صالح کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اہل جاہلیت نہ لڑکیوں کو میراث دیتے تھے نہ بالغ ہونے سے پہلے چھوٹے لڑکوں کو۔ ایک انصاری کا جن کا نام اوسؓ بن ثابت تھا انتقال ہو گیا اور انہوں نے دو لڑکیاں اور ایک چھوٹا لڑکا چھوڑا اس کے دو چچازاد بھائی خالد اور عرفجہ تھے دونوں نے آکر ساری میراث پر قبضہ کر لیا اس کی بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور واقعہ عرض کر دیا ارشاد فرمایا مجھے نہیں معلوم کہ کیا کہوں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ

یعنی والدین اور (باہم وارث ہونے والے) نزدیک ترین رشتہ داروں کے ترکہ میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی۔ عورتوں کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے مستقلاً ان کے لئے والدین اور اقارب کے ترکہ کا ذکر کیا۔

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ترکہ کم ہو یا زیادہ۔ یہ فقرہ مما ترک سے بدل ہے، قلیل مقدار کی جو لوگ پروا نہیں کرتے تھے اس فقرہ میں ان کو تنبیہ کر دی گئی (کہ ترکہ کم ہو یا زیادہ میراث سب میں جاری ہوگی)۔

نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۝ حصۂ قطعی۔ یہ مفعول مطلق تاکیدی ہے (فعل محذوف ہے) یا فاعل ظرف (للرجال) سے حال ہے، حال در حقیقت مفروضاً ہے نصیباً اس کی تمہید، یا فعل اختصاص محذوف ہے اور نصیباً کا نصب اختصاص کی وجہ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے وارثوں کے حصے قطعی اور واجب کر دیئے ہیں کسی کے لئے ان کو تبدیل کرنا جائز نہیں، لفظ مفروضاً بتا رہا ہے کہ وارث اگر اپنے حصہ سے اعراض بھی کر لے یا اظہار بیزاری کر دے تب بھی اس کا حصہ ساقط نہیں ہوتا، یہ آیت دو لحاظ سے مجمل ہے۔

(۱)...... اس میں حصوں کی تعیین نہیں (۲)...... اقرب سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت نہیں ان دونوں باتوں کا بیان شریعت (یعنی حدیث) میں آیا ہے۔

marfat.com

والدین بھی اگرچہ اقربین میں داخل تھے مگر مستقلاً والدین کے ذکر کی دو وجہیں ہیں۔ایک تو والدین کی اہمیت دکھانی مقصود ہے، دوسری یہ کہ والد کے ترکہ کی تقسیم کے متعلق (اصل میں) آیت کا نزول ہوا تھا (اقرباء کا ذکر تو ضمنی طور پر کر دیا گیا)۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت اوس بن ثابت انصاری کا انتقال ہوا اور پسماندگان میں ایک بیوی ام کحہ اور تین لڑکیاں رہیں، سوید اور عرفجہ جو میت کے چچا کے بیٹے اور وصی تھے کھڑے ہوگئے اور کل مال پر قابض ہوگئے نہ بیوی کو کچھ دیا نہ بیٹوں کو کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں وہ لوگ نہ عورتوں کو میراث دیتے تھے نہ چھوٹی اولاد کو خواہ اولاد میں کوئی لڑکا ہی ہوتا صرف بالغ مردوں کو میراث کا حصہ دیتے تھے اور کہتے تھے ہم صرف اسی کو دیں گے جو دشمن سے لڑے اور مال غنیمت لوٹے۔ام کحہ نے خدمت گرامی ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اوسؓ بن ثابت کا انتقال ہو گیا اوس نے تین بیٹیاں پیچھے چھوڑیں اور میں اس کی بیوی ہوں اور میرے پاس اتنا بھی نہیں کہ میں لڑکیوں کو کھلا سکوں، لڑکیوں کے باپ نے اچھا خاصا مال چھوڑا ہے مگر وہ مال سوید و عرفجہ کے قبضہ میں ہے انہوں نے نہ مجھے کچھ دیا نہ میری بچیوں کو، بچیاں میرے پاس ہیں نہ ان کے کھانے کو کچھ ہے نہ پینے کو۔رسول اللہ ﷺ نے سوید اور عرفجہ کو طلب فرمایا وہ بولے یا رسول اللہ ﷺ اس عورت کی اولاد اس قابل نہیں کہ گھوڑے پر سوار ہو سکے نہ (دیت اور تاوان وغیرہ کا) بار اٹھا سکتی ہے نہ دشمن سے لڑ سکتی ہے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔رسول اللہ ﷺ نے سوید اور عرفجہ کو بلوا کر فرمایا ابھی اوسؓ بن ثابت کے مال کو بالکل تقسیم نہ کرنا اللہ نے ترکہ میں اسکی لڑکیوں کو حصہ دار بنایا ہے مگر حصہ کی تعیین نہیں کی۔میں منتظر ہوں کہ لڑکیوں کے بارے میں کیا حکم (تعیین کے ساتھ) نازل ہوتا ہے اس پر اللہ نے آیت یوصیکم اللہ الخ نازل فرمائی رسول اللہ ﷺ نے سوید اور عرفجہ کو حکم دیا کہ اس کے مال میں سے ۸/۱ ام کحہ کو اور ۳/۲ لڑکیوں کو دیدو باقی تمہارا ہے میں کہتا ہوں کہ جب آیت للرجال نصیب کے بعد ہی آیت یوصیکم اللہ نازل ہو گئی تو وقت حاجت سے بیان کی تاخیر لازم نہیں آتی۔واللہ اعلم۔

سعدؒ نے لکھا ہے کہ معتبر کتابوں میں اور صحیح روایات میں آیا ہے کہ حضرت اوس بن ثابت، حضرت حسانؓ بن ثابت کے بھائی تھے اور جنگ احد میں شہید ہوئے تھے۔مگر شیخ جلال الدینؒ سیوطی کی نظر میں یہ قول محل اعتراض ہے کیونکہ بھائی کی موجودگی میں چچا کے بیٹوں کو میراث ملنے کا کوئی قانون نہیں (اور حضرت حسانؓ موجود تھے) بغویؒ کے بیان کردہ شان نزول کو ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے اور غلط قرار دیا ہے کیونکہ حضرت حسانؓ کے کسی بھائی کا نام اوس نہیں تھا اور نہ آپ ﷺ کے چچازادوں میں کوئی فطہ یا خالد تھا۔اس کے بعد شیخ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ متعدد صحابہؓ کا نام اوس تھا مگر سب کی ولدیت الگ الگ تھی اس لئے ممکن ہے کہ انہی میں سے کسی کی میراث کے سلسلہ میں آیت کا نزول ہوا ہو۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ اور اگر تقسیم میراث کے وقت (دور کے غیر مستحق) قرابتدار اور یتیم اور مسکین آجائیں۔ اولوا القربیٰ سے وہ قرابتدار مراد ہیں جن کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں۔

فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ تو ترکہ سے یا تقسیم سے ان کو بھی بطور خیرات کچھ دیدو۔

حسن نے بیان کیا کہ لوگ تابوت، برتن، پرانے کپڑے اور وہ سامان جس کو آپس میں تقسیم کرنے سے شرم آتی تھی دیدیا کرتے تھے۔سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا کہ آیت یوصیکم اللہ سے یہ آیت منسوخ ہے۔حضرت ابن عباسؓ شعبی، نخعی، زہری، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت نے اس آیت کو محکم قرار دیا ہے۔قتادہ نے یحییٰ بن یعمر کا قول نقل کیا ہے کہ تین مدنی آیات جو محکم ہیں لوگوں نے ان کو چھوڑ دیا ہے ایک یہی آیت اور دوسری طلب اجازت کے متعلق آیت یاایها الذین امنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم اور تیسری یاایها الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی- آیت کو محکم قرار دینے کی صورت میں بعض علماء کے نزدیک فارزقوهم کا امر وجوب کے لئے ہے۔وارث چھوٹے ہوں یا بڑے سب کے مال میں مقامی مساکین اور اقارب بعید کا واجبی حق ہے اگر وارث بڑے ہوں تو خود دیدیں اور نابالغ ہوں تو ان کی طرف سے ان کے ولی

marfat.com

دیدیں۔ محمد بن سیرین کی روایت ہے کہ اسی آیت کی وجہ سے عبیدہؓ سلمانی نے یتیموں کے مال میں سے بانٹ کر کچھ حصہ نکال کر ایک بکری خرید کر ذبح کرا کے کھانا پکولیا اور اس آیت میں جن کا ذکر ہے ان کو دیدیا ہے اور فرمایا اگر یہ آیت نہ ہوتی تو یہ میرے مال سے ہوتا۔ صحیح یہ ہے کہ امر استحبابی ہے (وجوبی نہیں ہے)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر وارث بڑے ہوں تو مذکورہ بالا آیت والوں کو کچھ دیدیں اور اپنے دیئے کو قلیل سمجھیں ان پر احسان نہ جتائیں اور اگر وارث چھوٹے ہوں تو ان کا ولی یا وصی مذکورہ بالا مستحقین سے عذر کرے اور کہہ دے یہ مال بچوں کا ہے میرا نہیں ہے، اگر میرا ہوتا تو میں ضرور کچھ دیتا، جب یہ بچے بڑے ہو جائیں گے تو تمہارے حقوق پہنچائیں گے۔ (اس وقت ان کو تمہارے حقوق کا علم نہیں) آیت ذیل میں قول سے یہی قول مراد ہے۔

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ⑧ اور ان سے اچھائی کے ساتھ بات کرو۔

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ اور ڈریں وہ لوگ جن کو اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے چھوٹے بچوں کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے بظاہر ڈرنے کا یہ حکم طاقت والے وارثوں کو ہے اور اس آیت کا ربط آیت للرجال نصیب اور اذا حضرا لقسمۃ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طاقتور وارث عورتوں اور کمزور وارثوں کا مقررہ میراثی حصہ دیدیں، کہیں یہ کمزور طبقہ برباد نہ ہو جائے جیسے ان کو اپنے بعد باقی رہنے والی بیوی اور کمسن بچوں کے تباہ ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے اسی طرح مورث کے دور اور قریب کمزور رشتہ داروں کا بھی پاس لحاظ رکھنا چاہئے۔

فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ پس اللہ سے ان کو ڈرنا چاہئے (یعنی جب ان کو اپنے بیوی بچوں کے تباہ ہونے کا ڈر رہتا ہے تو مورث کی بیوی اور دوسرے کمزور وارثوں اور دور کے رشتہ داروں اور یتیموں، فقیروں کے متعلق بھی ان کو ایسا ہی سوچ رہنا چاہئے کہ کہیں یہ تباہ نہ ہو جائیں اور ان کی بربادی کی باز پرس اللہ ہم سے کرے، پس ان کو اللہ کی باز پرس سے خوف کرنا چاہئے۔) خشیت کی انتہا تقویٰ ہے اس لئے دونوں کا حکم دیا اول ضعفا کی تباہی سے ڈرنے کا اور آخر میں اللہ سے ڈرنے کا۔

کلبی نے کہا حکم مذکور یتیموں کے سرپرستوں اور وصیت والوں کو دیا گیا ہے کہ یتیموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈریں اور ان سے سلوک اچھا کریں جیسا اپنے ان کمزور بچوں کے ساتھ لوگوں سے سلوک کرانا پسند کرتے ہیں جو ان کے پیچھے رہ جائیں اس وقت اس آیت کا تعلق و ابتلوا الیتمی سے ہوگا اور للرجال نصیب سے آخر تک معترضہ کلام ہوگا اور اس کلام کو بیچ میں لانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب تک جاہلیت کے دستور کو ختم نہ کر دیا جائے اور اہل جاہلیت جو کمزوروں کو میراث نہ دینے اور صرف اہل حرب کو حصہ دینے کے قائل تھے ان کے قول کو دفع رفع نہ کر دیا جائے اس وقت تک نہ یتیموں کی سرپرستی کا کوئی نتیجہ ہے، نہ ان کی جانچ کا، نہ ترکہ کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وارثوں کو حکم ہو کہ کمزور غیر وارث رشتہ دار اور یتیم و فقیر اگر تقسیم کے وقت موجود ہوں تو ان سے شفقت کا سلوک کریں اور یہ خیال کریں کہ اگر یہ ہماری اولاد ہوتے اور ہمارے بعد رہ جاتے تو ہم کسی طرح ان کو محروم رکھنا گوارا نہ کرتے۔

بعض علماء نے کہا کہ آیت میں وہ شخص مراد ہے جو مرنے کے قریب ہو اور اس کے گرد و پیش کے آدمی اس سے کہیں کہ تیرے اور تیرے وارث کام نہیں آئیں گے لہٰذا فلاں غلام کو آزاد کر دے اور فلاں فلاں شخص کو اتنا اتنا دے دے، غرض کل مال اپنی زندگی میں ہی تقسیم کر دینے کا اس کو مشورہ دیں، ایسے ہی لوگوں کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈریں اور مریض کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھیں کوئی ایسا مشورہ نہ دیں کہ ان کو نقصان پہنچے اور تمام مال صرف ہو جائے یا وصیت کرنے والوں کو حکم ہے کہ وہ کمزور وارثوں کے تباہ ہو جانے کا لحاظ رکھیں، وصیت میں حد سے تجاوز نہ کریں ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت نہ کریں تاکہ ورثہ محروم نہ رہ جائیں۔

وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ⑨ اور ان کو ٹھیک بات کہنی چاہئے، یعنی طاقت والے وارث کمزور وارثوں سے مہربانی اور تہذیب سے بات کریں، یا سرپرست یتیموں سے شفقت اور مہربانی سے بات کریں جیسے اپنے بچوں سے کرتے ہیں یا مرنے

marfat.com

کے وقت موجود ہونے والے لوگ مرنے والے کو مشورہ دیں کہ وہ تہائی مال سے کم خیرات کرنے اور کسی کو دینے کی وصیت کرے یا تقسیم کے وقت جو فقراء آجائیں ان سے تقسیم کرنے والے معذرت کریں، یا وصیت کرنے والے وصیت میں اچھی بات کہیں، ایک تہائی سے کم کی وصیت کریں اور وصیت میں نیت کو اللہ کے لئے خالص رکھیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا مقاتل بن حبان کا بیان ہے کہ مرثد بن زید غطفانی نے جب اپنے یتیم بھتیجا کا مال کھالیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی جو لوگ یتیموں کا مال بیجا طور پر کھاتے ہیں۔ ظلما مفعول مطلق ہے اس وقت موصوف محذوف ہوگا یعنی اکلا ظلما۔ یا حال ہوگا اس وقت مصدر بمعنی اسم فاعل ہوگا۔

ع ۱ اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ﴿۱۰﴾ بس وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور
۱۲ عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے یعنی ایسی چیز پیٹ میں بھرتے ہیں جو ان کو کھینچ کر دوزخ میں لے جائے گی۔ حدیث میں آیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شب معراج میں، میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ اونٹ کے لبوں کی طرح تھے بالائی لب سکڑا ہوا دونوں نتھنوں پر تھا اور نچلا ہونٹ سینہ پر لٹکا ہوا، جہنم کے کارندے ان کے منہ میں دوزخ کے انگارے اور پتھر بھر رہے تھے میں نے پوچھا جبرئیلؑ یہ کون ہیں جبرئیلؑ نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال بیجا طور پر کھاتے تھے۔ رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم من حدیث ابی سعید الخدریؓ۔

ابن ابی شیبہ نے مسند میں اور ابن ابی حاتمؒ نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حبان نے صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ قبروں سے کچھ لوگوں کو ایسی حالت میں اٹھائے گا کہ ان کے منہ سے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے عرض کیا گیا یہ کون لوگ ہوں گے فرمایا کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ فرما رہا ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں بس وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔ سعیر بروزن فعیل اسم مفعول کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہ لفظ سعرت النار (میں نے آگ روشن کی) سے ماخوذ ہے۔

بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ نے فرمایا (محلہ) بنی سلمہ میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ میری عیادت کو تشریف لائے اور مجھے غشی میں پاکر پانی منگوا کر وضو کیا پھر مجھ پر پانی کا چھینٹا دیا، فوراً مجھے ہوش آگیا میں نے عرض کیا حضور ﷺ کا کیا حکم ہے، میں اپنے مال میں کیا (وصیت) کر سکتا ہوں۔ اس پر آیت یوصیکم اللہ الخ نازل ہوئی۔ امام احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت سعد بن ربیع کی بیوی نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سعدؓ آپ کے ہمرکاب ہو کر احد میں شہید ہو گئے اور ان کی یہ دو لڑکیاں ہیں لڑکیوں کے چچا نے ان کا مال لے لیا اور ان کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا اور بغیر مال ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ ان کا فیصلہ فرمادے گا اس کے بعد آیت میراث نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے لڑکیوں کے چچا کو طلب فرما کر حکم دیا کہ ۲/۳ مال لڑکیوں کو اور ۱/۸، سعد کی بیوی کو دیدو باقی تمہارا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے کہا جو لوگ آیت کا نزول سعد کی لڑکیوں کے سلسلہ میں قرار دیتے ہیں اور جابر کے معاملہ میں نزول تسلیم نہیں کرتے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس زمانہ میں حضرت جابرؓ کی اولاد ہی نہ تھی۔ (اور آیت میں میراث اولاد کا بیان ہے) اس کا جواب یہ ہے کہ سبب نزول دونوں واقعات ہوئے لڑکیوں کا بھی اور حضرت جابرؓ کا بھی (اور متعدد واقعات کا ایک حکم کے لئے سبب نزول ہونا ناممکن نہیں) یہ بھی احتمال ہے کہ آیات کا ابتدائی حصہ حضرت سعد کی لڑکیوں کے حق میں اور آخری حصہ یعنی وان کان یورث کلالۃ الخ حضرت جابرؓ کے سلسلہ میں نازل ہوا ہو اور حضرت جابرؓ نے جو فرمایا تھا کہ اللہ نے آیت یوصیکم اللہ نازل فرمائی تو اس سے مراد ہے اس آیت سے بعد آنے والی آیت (جو کلالہ کے متعلق ہے)۔

شان نزول کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے ابن جریر نے سدی کی روایت سے لکھا ہے کہ جاہلیت والے نہ لڑکیوں کو میراث دیتے تھے نہ چھوٹے لڑکوں کو۔ اولاد میں سے میراث اسی کو ملتی تھی جو دشمن سے لڑنے کی طاقت رکھتا تھا۔

marfat.com

حضرت حسانؓ شاعر کے بھائی عبدالرحمنؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنے پیچھے ایک بی بی ام کحہ اور پانچ لڑکیاں چھوڑیں دوسرے وارث آکر مال پر قبضہ کرنے لگے ام کحہ نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی تو آیت فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ماترک نازل ہوئی اور ام کحہ کے متعلق نازل ہوا اولھن الربع مما ترکتم الخ حضرت سعدؓ بن ربیع کے سلسلہ میں ان آیات کا نزول ایک اور سند سے بھی مروی ہے۔ قاضی اسماعیل نے احکام القرآن میں عبدالملک بن محمد بن حزم کے طریق سے بیان کیا ہے کہ عمرہ بنت حرام، حضرت سعد بن ربیع کی بیوی تھیں اور عمرہ کے بطن سے سعد کی ایک لڑکی تھی۔ عمرہ اپنی لڑکی کی میراث طلب کرنے کے لئے خدمت گرامی میں حاضر ہوئیں تو ان کے حق میں ہی آیت یوصیکم اللہ الخ نازل ہوئی۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ اللہ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کی میراث کے بارہ میں۔ فی اولادکم میں فی بمعنی لام بھی ہو سکتا ہے یعنی تمہاری اولاد کے لئے اللہ تم کو حکم دیتا ہے جیسے حدیث مبارک میں آیا ہے دخلت امراۃ النار فی ھرۃ ایک بلی کی وجہ سے ایک عورت دوزخ میں گئی۔ یہاں تک مجمل حکم ہے آگے اس کی تفصیل ہے۔

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ اگر لڑکا اور لڑکی دونوں قسمیں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دو یا زیادہ لڑکیاں ہوں اور ایک لڑکا ہو یا ایک سے زیادہ لڑکے اور ایک لڑکی ہو تو ہر لڑکی سے ہر لڑکے کا حصہ دوگنا ہوگا۔ خصوصیت کے ساتھ لڑکے کے حصہ کا ذکر لڑکے کی فضیلت کو ظاہر کر رہا ہے اور اس امر پر تنبیہ کر رہا ہے کہ لڑکے کا دوگنا حصہ ہونا ہی اس کی فضیلت کے لئے کافی ہے لیکن رشتہ میں چونکہ دونوں اصناف برابر ہیں اس لئے محروم کوئی نہیں ہوگا یہ حکم تو اس وقت ہوگا جب دونوں صنفیں موجود ہوں لیکن اگر محض لڑکیاں ہوں تو

فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ اگر اولاد مونث ہو (اور) دو سے زائد (ہو) تو ان کے لئے میت کے ترکہ کا دو تہائی حصہ ہے۔

وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ اور اگر بچی ایک ہی ہو تو اس کے لئے (کل ترکہ کا) آدھا حصہ ہے۔ اس آیت میں دو لڑکیوں کے حصہ کو بیان نہیں کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ دو لڑکیوں کے لئے بھی وہی ہے جو ایک کے لئے ہے کیونکہ (دو تہائی اور نصف دونوں کا احتمال ہے مگر) کم سے کم لڑکی کا حصہ نصف یقینی ہے (لہٰذا یقینی کو چھوڑ کر احتمالی کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا)۔

صحیح یہ ہے کہ دو ہوں یا زیادہ سب کے لئے دو تہائی مقرر ہے اسی پر اجماع منعقد ہو چکا ہے لیکن آیت میں تو لفظ فوق موجود ہے، تو اس کی تاویل کے لئے بعض علماء نے کہا کہ لفظ فوق زائد ہے جیسے آیت فاضربوا فوق الاعناق میں لفظ فوق زائد ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت سعدؓ بن ربیع کے ترکہ کے سلسلہ میں اوپر ذکر کی جا چکی ہے اور آیت کا نزول بھی سعد کی دو لڑکیوں کے حق میں ہی ہوا ہے۔ بعض علماء نے دو لڑکیوں کے حصہ کو دو بہنوں کے حصہ پر قیاس کیا ہے۔ اللہ نے ایک بہن کا حصہ نصف مقرر کیا ہے جیسے ایک لڑکی کا حصہ نصف مقرر کیا ہے اور بھائی بہن اگر مخلوط ہوں تو بہن کا اکہرا اور بھائی کا دوہرا حصہ قرار دیا ہے جیسے اولاد اگر کچھ مذکر اور کچھ مونث ہو تو ان کا حصہ بھی دوہرا اور اکہرا رکھا ہے اور اگر محض دو بہنیں ہوں تو ان کیلئے دو تہائی کی صراحت کی ہے پس اگر صرف دو لڑکیاں ہوں تو قیاس کا تقاضا ہے کہ دو بہنوں کی طرح ان کو بھی دو تہائی دیا جائے پس سنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ دو بہنوں سے زائد کا حصہ بھی اتنا ہی ہے جتنا دو بہنوں کا نص سے ثابت ہے اور دو لڑکیوں کا بھی وہی حکم ہے جو دو سے زائد کا نص میں آیا ہے۔ دو لڑکیوں کو ایک کی طرح قرار دینے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں۔

پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہو تو لڑکی کا حصہ ایک تہائی سے کم نہیں ہو سکتا (دو تہائی لڑکے کا اور ایک تہائی لڑکی کا ہوگا) لہٰذا اگر ایک لڑکی کے ساتھ دوسری اس کی بہن ہو تب بھی اس کا حصہ ایک تہائی سے کم نہ ہونا چاہئے (پس دو لڑکیوں کا دو تہائی ہوگا) آیت میں تنہا لڑکے کا حصہ نہیں بتایا۔ یہ سکوت دلالت کر رہا ہے کہ اگر نرینہ اولاد تنہا ہو تو کل مال اس کا ہے محروم تو ہو نہیں سکتا کیونکہ لڑکی سے بہر حال اس کو فضیلت حاصل ہے اور جب تنہا لڑکی محروم نہیں ہوتی تو لڑکے کو محروم

marfat.com

نہ ہونا چاہئے لیکن اس کا حصہ کوئی مقرر نہیں کیا اگر اس کا کل مال نہ ہوتا تو کچھ حصہ مقرر کرنا اور بتانا چاہئے تھا ضرورت کے وقت بیان سے سکوت ناجائز ہے، لڑکے کی موجودگی میں کوئی دوسرا عصبہ بھی وارث نہیں ہو سکتا کیونکہ قریب ترین عصبہ لڑکا ہی ہے مال کا کوئی حصہ لڑکے سے بچ ہی نہیں سکتا کہ دوسرا کوئی وارث ہو۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ نے لڑکے کا لڑکی سے دوگنا حصہ مقرر کیا ہے اور لڑکی اگر تنہا ہو تو اس کے لئے نصف مقرر ہے لہٰذا لڑکا اگر تنہا ہو تو اس کے لئے نصف کا دوگنا یعنی کل ہونا چاہئے۔ چونکہ لڑکے کے لئے کل مال ہے اس لئے لڑے کی موجودگی میں پوتے اور پوتیاں بالاجماع محروم رہیں گے۔

مسئلہ :- اجماع سلف ہے کہ اگر صلبی اولاد نہ ہو تو پوتے اور پوتیاں صلبی اولاد کی قائم مقام ہو جائیں گے اگر صرف ایک پوتا یا چند پوتے ہوں تو کل مال ان کو ملے گا اور ایک پوتی ہو تی تو آدھا مال ملے گا اور زیادہ ہوں گی تو دو تہائی اور پوتے پوتیاں مخلوط ہوں تو مذکر کا دوہرا اور مونث کا اکہرا ہوگا۔ اور اگر پوتے پوتیوں کے ساتھ ایک صلبی لڑکی یا چند لڑکیاں ہوں تو جو لڑکی یا لڑکیوں سے بچے گا وہ پوتے پوتیوں کو دوہرے اور اکہرے کے حساب سے ملے گا۔ طحاویؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دو بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیوں اور پوتوں کو بقیہ (ایک تہائی) میں (دوہرے اور اکہرے کے حساب سے) باہم شریک کر دیا اسی طرح حقیقی بہنوں کی موجودگی میں علاتی (ایک باپ اور دو ماؤں کی اولاد) بہنوں اور بھائیوں کو باقی مال میں شریک کیا۔

اگر ایک صلبی لڑکی یا چند لڑکیوں کی موجودگی میں تنہا ایک پوتا یا چند پوتے ہوں گے تو لڑکیوں سے جو کچھ باقی رہے گا وہ پوتوں کو دیا جائے گا۔ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرض حصے اہل فرائض کو دو اور فرائض ادا کرنے سے جتنا بچ جائے وہ قریب ترین مرد کو دیدو۔ اگر ایک صلبی بیٹی ہو اور ایک یا زیادہ پوتیاں تو بیٹی کو (نصف) دینے کے بعد پوتیوں کو کل ترکہ کا چھٹا حصہ دیا جائے گا تاکہ دو تہائی ہو جائے (بیٹوں، پوتیوں، بہنوں کا دو تہائی سے زائد نہیں ہے اس لئے دو تہائی پورا کرنے کے لئے پوتیوں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا)۔

بخاری نے ہذیل بن شرحبیل کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابو موسیٰ اور حضرت سلمان بن ربیعہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ پوچھا کہ اگر کسی میت کی ایک بیٹی ایک پوتی اور ایک حقیقی بہن رہ جائے تو ترکہ کی تقسیم کس طرح کی جائے، دونوں صحابیوںؓ نے فیصلہ کیا کہ بیٹی کو آدھا اور بہن کو آدھا دیا جائے پوتی محروم ہوگی مگر یہ بھی فرمادیا کہ تم ابن مسعودؓ سے بھی جا کر پوچھو وہ بھی (اس فیصلہ میں) ہمارا ساتھ دیں گے وہ شخص حضرت ابنؓ مسعود کی خدمت میں پہنچا، آپ نے فرمایا اگر ایسا فیصلہ میں کردوں تو گمراہ ہو جاؤں گا، راہ راست پر نہ ہوں گا، میں تو وہی فتویٰ دوں گا جو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔ بیٹی کو آدھا اور پوتی کو چھٹا حصہ اور باقی ایک تہائی (بطور عصبیت) بہن کو دیا جائے۔ ہم حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس لوٹ کر گئے اور حضرت ابن مسعودؓ کا فتویٰ ان سے بیان کیا فرمایا جب تک یہ علامہ موجود ہے مجھ سے نہ پوچھا کرو (حضرت ابن مسعودؓ کے فتویٰ کی وجہ یہ تھی کہ میت کی نسل کی موجودگی میں میت کے باپ کی نسل کا رشتہ قریب ترین نہیں ہے اس لئے بیٹی اور پوتی کی موجودگی میں بہن وارث بطور فرض نہیں ہو سکتی ہے ہاں عصبہ ہو سکتی ہے لہٰذا بیٹی اور پوتی کا حصہ دو تہائی دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ بہن کو دیا جائے گا)۔

دو حقیقی بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیاں وارث نہ ہوں گی کیونکہ بیٹیوں کو دو تہائی پورا ملے گا (اور عورتوں کا حصہ بطور فرضیت دو تہائی سے زائد نہیں) ہاں اگر پوتیوں کے ساتھ مساوی رشتہ کا کوئی پوتا ہو گا یا پوتیوں سے نچلے درجہ میں کوئی پوتا ہو گا تو وہ چونکہ عصبہ ہو گا تو وہ اپنے ساتھ مساوی درجہ رکھنے والی پوتیوں کو بھی عصبہ بنادے گا بلکہ اوپر درجہ والی پوتیاں بھی اس کی وجہ سے عصبہ ہو جائیں گی۔

وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ اور میت کے ماں

باپ کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ ترکہ کا چھٹا حصہ ہے بشرطیکہ میت کی کوئی اولاد ہو صرف لابویہ کے لفظ سے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید چھٹا حصہ دونوں کو اشتراکاً ملے گا یعنی ایک ایک کو بارہواں حصہ دیا جائے گا اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمادیا کہ دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہو گا۔ ولد کا لفظ عام ہے بیٹا ہو یا بیٹی یا بیٹے کی اولاد، لیکن اگر مذکر اولاد نہ ہو بیٹی ہو تو باپ کو چھٹا حصہ بطور فرض ملے گا اور ذوی الفروض کو دینے کے بعد جتنا باقی رہے گا وہ بطور عصبہ ہونے کے ملے گا کیونکہ بیٹوں اور پوتوں کے بعد باپ کا رشتہ تمام عصبات سے زیادہ قریب ہے۔

فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ اگر میت کی کوئی صلبی اولاد نہ ہو، نہ پوتا ہو اور ماں باپ اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کے لئے ایک تہائی حصہ ہے یعنی اگر ماں باپ کے علاوہ کوئی دوسر اصاحب فرض وارث نہ ہو تو ماں کو کل ترکہ کا ایک تہائی حصہ ملے گا اور اگر کوئی دوسر اصاحب فرض یعنی شوہر یا بیوی بھی ہو تو شوہر یا بیوی کا حصہ دینے کے بعد جو کچھ بچے گا۔ اس کا ایک تہائی حصہ ملے گا۔ اگر اولاد صلبی اور پوتا نہ ہو اور ماں باپ، موجود ہوں تو علاوہ شوہر اور بیوی کے کوئی دوسر اصاحب فرض تو مستحق ہو سکتا ہی نہیں۔ بہن بھائی اور دادا باپ کی موجودگی میں وارث نہیں۔ اور دادی نانی ماں کی موجودگی کی وجہ سے محروم ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر صرف ماں باپ وارث ہوں تو کل ترکہ کا ایک تہائی ماں کا ہے کیونکہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں کل ترکہ کا ایک تہائی حصہ ماں کا تھا جیسا گذشتہ آیت میں بیان کیا تھا۔ رہی یہ بات کہ اگر زوجین میں سے کوئی موجود ہو تو ماں کو کیا دیا جائے (اس کی صراحت آیت میں نہیں ہے البتہ) اس کی تعیین قیاس سے معلوم ہو جاتی ہے اگر ماں باپ کے سوا کوئی وارث نہ ہو تو باپ کے مقابلہ میں ماں کو کل ترکہ کا ایک تہائی دیا جاتا ہے اور دو تہائی باپ کا ہو جاتا ہے پس اگر زوجین میں سے کوئی موجود ہو تو اسی پر قیاس کر کے زوج یا زوجہ کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا اس کا ایک تہائی ماں کو دیا جائیگا۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا جس راستہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ چلتے تھے ہم کو وہی آسان نظر آتا تھا اور ہم بھی اسی پر چلتے تھے آپ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی میت کے وارث ایک بیوی اور ماں باپ ہوں تو کیا حکم ہے۔ فرمایا عورت کا چوتھائی اور باقی ماندہ میں سے ماں کا ایک تہائی اور بقیہ (دو تہائی) باپ کا ہو گا۔ یہی قول حضرت زید بن ثابتؓ کا ہے کہ شوہر اور ماں باپ یا بیوی اور ماں باپ کی صورت میں زوجین کا حصہ دینے کے بعد باقی مال کے تین حصے کر کے ایک ماں کا اور دو باپ کے ہوں گے۔

اسی پر اجماع ہے اور اگر باپ نہ ہو بلکہ اس کی جگہ دادا ہو تو ماں کو کل مال کا ایک تہائی ملے گا۔ بیہقی نے عکرمہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک دونوں مسئلوں میں کل ترکہ کا ایک تہائی ماں کا حصہ ہو گا۔ شریح کا بھی یہی قول ہے لیکن ابن سیرین کے نزدیک بیوی اور ماں باپ کے مسئلہ میں تو ماں کے لئے کل مال کا ایک تہائی ہو گا مگر شوہر اور ماں باپ کے مسئلہ میں ماں کے لئے شوہر کو دینے کے بعد باقی مال کا ایک تہائی ہو گا۔ بیہقی نے نخعی کا قول بیان کیا ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت ابن عباسؓ کا قول تمام علماء فرائض کے خلاف ہے۔ آیت وورثه ابواه میں باپ کا کوئی حصہ نہیں بیان کیا۔ یہ سکوت بتارہا ہے کہ باقی دو تہائی باپ کا ہے کیونکہ ماں سے زیادہ باپ مستحق ہے اس کو محروم رکھنا صحیح نہیں اور باپ کی موجودگی میں کوئی دوسرا عصبہ وارث بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں باپ ہی قریب ترین عصبہ ہے کسی دوسرے کے لئے کچھ باقی ہی نہیں رہے گا۔ آیت وورثه ابواه سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ اگر باپ نہ ہو اور ماں تنہا وارث ہو تو بدرجۂ اولیٰ اس کو ایک تہائی مال ملے گا۔ زیادہ ملنے کی (آیت میں) کوئی دلیل نہیں ہے۔

فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ پس اگر میت کے بھائی (بہن) ہوں خواہ حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی (باپ کی طرف سے یا ماں کی طرف سے) مرد ہوں یا عورت یا مخلوط۔ اخوۃ سے مراد بالاجماع دو اور دو سے زائد ہیں۔ باب فرائض و وصیت میں ہر جگہ جمع کے صیغہ سے مراد ایک سے زائد ہوتا ہے یہ فیصلہ باتفاق علماء ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ (اخوۃ سے مراد کم سے کم تین ہیں) تین سے کم بھائی بہن میت کی ماں کے حصہ کو ایک تہائی سے گھٹا کر چھٹا حصہ نہیں بنا سکتے۔ حاکم نے بیان کیا ہے اور اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا دو بھائیوں کی وجہ سے آپ

marfat.com

ماں کے حصہ کو ایک تہائی سے گھٹا کر ۱/۶ کیسے کرتے ہیں حالانکہ دو بھائی اخوۃ نہیں ہوتے (اخوۃ جمع کا صیغہ ہے اور جمع کا اطلاق کم سے کم تین پر ہوتا ہے)۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا جو مسئلہ مجھ سے پہلے ہو چکا ہے اور ملک میں جاری ہو چکا ہے اور لوگ برابر اس پر عمل کرتے رہے ہیں، میں اس کو پلٹ نہیں سکتا، گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے جواب میں اجماع امت سے استدلال کیا لیکن جب حضرت زید بن ثابتؓ سے لوگوں نے یہی مسئلہ دریافت کیا اور یہی اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا عرب دو بھائیوں کو بھی اخوۃ کہتے ہیں (گویا حضرت زید بن ثابت نے لغت سے استشہاد کیا اور اشارہ کیا کہ ہمارا مسلک خلاف لغت نہیں ہے)۔

فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ تو میت کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے۔ یہ آیت مفہوم مخالف کے طور پر اور سابق آیت مفہوم موافق کے ساتھ دلالت کر رہی ہے اس امر پر کہ اگر ماں اور ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ماں کو بدرجۂ اولیٰ تہائی حصہ ملے گا کیونکہ جب ماں کو باپ کی موجودگی میں ایک تہائی ملتا ہے تو بھائی یا بہن کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ تہائی ملنا چاہئے۔

مسئلہ :- اگر ماں باپ اور چند بہن بھائی ہوں تو بھائی بہن اگرچہ باپ کی وجہ سے محروم ہوں گے مگر ماں کا حصہ گھٹا کر تہائی سے چھٹا کر دیں گے۔ یہ فتویٰ جمہور کا ہے لیکن حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (باپ کو دو تہائی اور) ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا تو ۱/۶ اجو باقی رہے گا وہ بہن بھائی کو دیدیا جائے گا۔ بھائی بہن محروم نہیں ہوں گے۔

مسئلہ :- دادا اور دادا سے اوپر جو دادا جہاں تک ہو سب کا حکم باپ کے نہ ہونے کی صورت میں باپ کا ہے نانا کا کوئی حصہ نہیں ہے کیونکہ نانا نہ تو باپ کی جگہ لے سکتا ہے اس لئے کہ نانا کا میت سے رشتہ باپ کی طرف سے نہیں ہے۔ نہ ماں کی جگہ لے سکتا ہے۔ کیونکہ دونوں جنسیں الگ الگ ہیں (ایک عورت دوسرا مرد) اسی لئے اس کو جد فاسد کہتے ہیں۔ پس دادا محض عصبہ ہے اگر میت کی اولاد نہ ہو (یعنی اصحاب فرائض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ سب دادا لے لے گا) اور اگر نرینہ اولاد ہو تو دادا کو ۱/۶ اکل ترکہ کا ملے گا اور اگر میت کی اولاد مؤنث ہو تو دادا کو چھٹا حصہ بھی ملے گا اور جو کچھ بچ رہے گا وہ بھی آخر میں لے گا یعنی عصبہ بھی ہوگا۔

باپ سے دادا کے حکم کا اختلاف

دادا کی وجہ سے ماں کا ایک تہائی حصہ گھٹ کر ۱/۶ انہیں ہوتا جب کہ ورثہ دادا ماں اور شوہر ہوں اور اگر دادا کی جگہ باپ ہو تو ماں کا حصہ ۱/۶ اہو جاتا ہے۔ تصحیح مسئلہ چھ سے ہوگی ۳ شوہر کے بہر حال ہوں گے ایک دادا کا اور ۲ ماں کے۔ اور اگر باپ ہوگا تو شوہر کے ۳ اور ۲ باپ کے اور ایک ماں کا ہوگا۔ لیکن اگر دادا یا باپ کے ساتھ میت کی ماں اور بی بی ہو تو دادا ماں کا حصہ ۱/۴ انہیں کردے گا مگر باپ کردے گا۔ اگر باپ ہوگا تو تصحیح مسئلہ ۴ سے ہوگی ایک بی بی کا ایک ماں کا اور ۲ باپ کے ہوں گے لیکن باپ کی جگہ اگر دادا ہوگا تو مسئلہ ۱۲ سے ہوگا ۳ بی بی کے ۴ ماں کے اور ۵ دادا کے ہونگے۔ باپ کی طرح دادا بھی تمام عینی اور علاتی اور اخیافی بھائیوں اور بہنوں کو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک محروم کر دیتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور صحابہؓ کی کثیر تعداد سے بھی یہی قول منقول ہے باقی تینوں ائمہ اور صاحبینؒ قائل ہیں کہ دادا اخیافی بھائی بہن کو محروم کر دیتا ہے۔ علاتی اور عینی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

ابن جوزیؒ نے محروم نہ ہونے کی یہ دلیل بیان کی ہے کہ اخوّت کی وجہ سے وراثت (یعنی بھائی بہن کا وارث ہونا) تو قرآن میں صراحت کے ساتھ موجود ہے لہٰذا ان کو محروم الارث قرار دینے کے لئے بھی کوئی قرآنی نص ہی ہونا چاہئے (اور ایسی کوئی نص دادا کے سلسلہ میں موجود نہیں ہے)۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر یہی بات ہے تو دادا کی وجہ سے اخیافی بھائی بہنوں کے محروم ہونے کے آپ کیوں قائل ہیں۔ اخیافی

marfat.com

کے وارث ہونے کی تو قرآن میں نص موجود ہے پھر جب تم پوتے کو ہر قسم کے بھائیوں کے لئے حاجب (محروم کن) مانتے ہو اور کہتے ہو کہ پوتا بیٹے کا قائم مقام ہے تو دادا کو ہر قسم کے بھائی بہنوں کے لئے حاجب (محروم کن) کیوں نہیں مانتے، دادا بھی تو باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ امام صاحبؒ کے قول کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرائض (مقررہ) اہل حصص کو پہنچادو۔ پھر جو کچھ رہ جائے وہ میت سے قریب ترین تعلق رکھنے والے مرد کو دیدو اور یہ امر یقینی ہے کہ دادا کا تعلق پوتے سے قریب ترین ہے کیونکہ وہ پوتے کی جڑ ہے۔ بھائی کو یہ قرب (نسبی) حاصل نہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ دادا اور بھائی بہنوں کی جہات قرابت جدا جدا ہیں۔ بھائیوں کی وجہ سے دادا کے محروم ہونے کا تو کوئی بھی قائل نہیں اور مقاسمہ کی کوئی وجہ نہیں لہٰذا دادا کی وجہ سے بھائی بہنوں کو ہی محروم کیا جائے گا شیخ ابن حجر نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ابن حزمؒ نے کچھ لوگوں کے اقوال ایسے بھی نقل کئے ہیں جو بھائی بہنوں کو دادا سے مقدم قرار دیتے ہیں (یعنی دادا کو محروم کہتے ہیں) پھر دادا کے محروم نہ ہونے پر اجماع کہاں ہوا۔ ہم کہتے ہیں کہ دادا کو محروم کر دینے والے تو دنیا سے چلے گئے اور ان کے مسلک کا کوئی قائل بھی نہیں رہا، انقطاع مسلک کے بعد امت کا اجماع اس بات پر ہو گیا کہ یا بھائی بہن محروم ہوں گے یا مقاسمہ ہو گا لہٰذا اجماع ثابت ہو گیا۔

مقاسمہ کا قول حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے حضرت زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) کے نزدیک اگر عینی یا علاتی بھائی بہن دادا کے ساتھ ہوں گے تو دادا کے لئے یا جمیع مال کا تہائی حصہ یا مقاسمہ کیا جائے گا جو دادا کے لئے بہتر ہو گا وہی اس کو دیا جائے گا بشرطیکہ کوئی دوسرا اصحاب فرض موجود نہ ہو مقاسمہ کی توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ تقسیم کے وقت دادا کو بجائے ایک بھائی کے مان لیا جائے اور جتنا ایک بھائی کا حصہ ہو اتنا دادا کو دیدیا جائے۔ اس وقت دادا کا حصہ کم کرنے کے لئے علاتی بھائی بہن حقیقی بھائی بہن کے ساتھ شریک ہو کر ان کی تعداد بڑھا دیں گے تاکہ دادا کا حصہ بحیثیت ایک بھائی ہونے کے کم ہو جائے اور دادا جب اپنا حصہ پالے گا تو علاتی تقسیم سے باہر نکل جائیں گے صرف حقیقی بھائی بہن وارث ہوں گے علاتی محروم رہیں گے۔ لیکن اگر ایک بہن کے سوا کوئی اور حقیقی بھائی بہن نہ ہو اور دادا کے ساتھ علاتی بھائی بہن موجود ہوں تو دادا کا حصہ اور حقیقی بہن کا حصہ یعنی کل مال کا نصف دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ علاتیوں کا دوہرے اور اکہرے کے حساب سے دے دیا جائے گا اور کچھ باقی نہیں رہے گا تو کچھ نہیں دیا جائے گا مثلاً دادا ایک حقیقی بہن اور دو علاتی بہنیں (اس صورت میں اگر مقاسمہ ہو گا تو دادا کو بجائے ایک بھائی کے مانا جائے گا اور ایک بھائی دو بہنوں کے برابر ہوتا ہے تو گویا کل پانچ بہنیں ہو گئیں اصل مسئلہ دس سے ہو گا دادا چونکہ دو بہنوں کی جگہ ہے اس لئے اس کو چار اور حقیقی بہن کو کل ترکہ کا نصف یعنی پانچ دینے کے بعد ایک باقی رہے گا وہ دونوں علاتی بہنوں کا ہو گا اور ایک کی دو پر تقسیم صحیح نہیں ہوتی اس لئے مسئلہ کی تصحیح ۲۰ سے کی جائے گی آٹھ دادا کو؛ دس حقیقی بہن کو اور دو علاتی بہنوں کو ملیں گے) لیکن اگر اسی مسئلہ میں دو علاتی نہ ہوں صرف ایک علاتی بہن ہو تو گویا وارث چار بہنیں ہوں گی دادا بجائے دو بہنوں کے ہے اس لئے دس سہام اس کے ہوں گے اور حقیقی بہن کل مال کا نصف یعنی دس سہام لے لے گی علاتی بہن کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔

اگر دادا اور بھائی بہنوں کے ساتھ کوئی دوسرا فرضی قطعی وارث بھی موجود ہو تو دادا کو کل مال کا ۱/۶ یا ذوی الفروض کو دینے کے بعد باقی مال کا ۱/۶ یا حصہ مقاسمہ تینوں میں سے جو بھی بہتر ہو گا وہ اس کو دیا جائے گا جیسے اگر دادا، دادی، بیٹی اور دو بھائی موجود ہو (تو اصل مسئلہ کی تصحیح چھ سے ہو گی ۳ بیٹی کو ایک دادی ایک دادا کو اور ایک دونوں بھائیوں کو دیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں دادا کو کل مال کا چھٹا حصہ یعنی ایک دینا زیادہ مفید ہے کیونکہ بصورت مقاسمہ تین بھائی ہو جائیں گے اور دو سہم کو تین بھائیوں پر تقسیم کرنے سے ایک ایک کے حصہ میں ایک سہم کا ۲/۳ آئے گا پورا سہم نہیں آئے گا اور بقیہ مال کا سدس یعنی چھٹا حصہ تو اس سے بھی کم ہو گا)۔

صورت مذکورہ میں کوئی مثال ایسی بھی ہوتی ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا، لامحالہ مسئلہ میں

marfat.com

عول کیا جاتا ہے یعنی مخرج میں توسیع کی جاتی ہے اور دادا کو چھٹا حصہ دیا جاتا ہے جیسے اگر دو بیٹیاں، ماں، شوہر اور دادا موجود ہوں (تو بیٹیوں کا دو تہائی، شوہر کا چہارم اور ماں کا چھٹا حصہ ہونا چاہئے مگر تنگی مخرج اس کی اجازت نہیں دیتی مجبوراً ۱۲ کو ۱۵ کی طرف عول کیا جائے گا) اور ۱۵ کی تقسیم اس طرح کی جائے گی بیٹیاں ۸، شوہر ۳، ماں ۲، دادا ۲۔

کبھی ذوی الفروض کو دینے کے بعد کچھ باقی تو رہتا ہے مگر ۱/۶ سے کم جیسے اگر دو بیٹیاں اور شوہر موجود ہوں (اس صورت میں اصل تصحیح ۱۲ سے ہوگی بیٹیوں کے آٹھ اور شوہر کے تین دینے کے بعد ایک باقی رہے گا جو ۱۲/۱ ہے ۱/۶ نہیں ہے (لہٰذا عول کر کے ۱۳ سے تصحیح کی جائے گی اور دادا کو ۲ سہام دیئے جائیں گے) کبھی پورا چھٹا حصہ باقی رہتا ہے جیسے اگر دو بیٹیاں اور ماں اور دادا موجود ہوں تو تصحیح ۶ سے کر کے بیٹیوں کو ۴ ماں کو اور دادا کو ایک دے دیا جائے گا) بہر حال ان تینوں صورتوں میں اگر بھائی بھی موجود ہوں گے تو محروم رہیں گے۔

دوسری صورت کی مثال (یعنی دادا کے لئے کل مال کا چھٹا حصہ دینے یا مقاسمہ کر کے حصہ دینے سے باقی مال کا چھٹا حصہ زیادہ مفید ہوتا ہے) جیسے اگر دادا، دادی دو بھائی اور ایک بہن موجود ہوں (تو اصل تصحیح ۶ سے ہوگی چھٹا حصہ دادی کو دینے کے بعد پانچ رہیں گے اور پانچ کا تہائی بغیر کسر کے نکل نہیں سکتا لہٰذا تہائی کے مخرج یعنی تین کو اصل تصحیح یعنی ۶ میں ضرب دی جائے گی تو ۱۸ ہو جائیں گے ۱۸ میں سے ۳ دادی کو دیئے جائیں گے اور باقی پندرہ کا ایک تہائی یعنی ۵ دادا کو اور ہر بھائی کو ۴ اور بہن کو ۲ دیئے جائیں گے، اگر دادا کو کل مال کا چھٹا دیا جائے تو اصل مسئلہ ۶ سے ہوگا ایک دادا کے حصہ میں آئے گا اور اس ایک سے پندرہ کا تہائی یعنی ۵ بہر حال زائد ہے۔ اور مقاسمہ سے بھی دادا کے یہ پانچ زائد ہیں کیونکہ اگر دادا کو ایک بھائی کی جگہ مان لیا جائے تو تین بھائی اور ایک بہن اور ایک دادی وارث ہوں گے اور دادا کا حصہ ایک بھائی کے برابر ہوگا یعنی $\frac{4}{7}$ ۱ اور اگر دادی کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی مال کا ایک تہائی دادا کو دیا جائے تو $\frac{2}{3}$ ۱ ہوگا اور $\frac{2}{3}$ ظاہر ہے کہ $\frac{2}{3}$ ۱ زائد ہے $\frac{4}{7}$ ۱ سے)۔

مسئلہ اکدریہ

حضرت زید بن ثابتؓ کے نزدیک دادا کی موجودگی میں حقیقی یا علاتی بہن صاحب فرض نہیں ہوتی صرف مندرجہ ذیل صورت اس سے مستثنیٰ ہے اس میں بہن صاحب فرض ہے، صورت مسئلہ یہ ہے کہ شوہر، ماں، دادا، بہن (اصل مسئلہ ۶ سے ہوگا) شوہر کو نصف، ماں کو ایک تہائی، دادا کو چھٹا حصہ (چھ پورے ہوگئے، بہن کے لئے کچھ نہیں بچا لیکن حضرت زید اس صورت میں بہن کو وارث قرار دینا ضروری سمجھتے ہیں اور ایک بہن کے لئے نصف ترکہ ہونا چاہئے لہٰذا) عول کر کے چھ کو نو قرار دیا جائے گا اور تین سہام بہن کے ہو جائیں گے اس صورت میں دادا کے لئے ایک اور بہن کے لئے ۳ ہوں گے پس دادا کا حصہ بہن سے کم ہو جائے گا اس لئے دادا کا حصہ بہن کے حصہ سے ملا دیا جائے گا (اور مجموعہ چار ہو جائے گا اور چونکہ دادا بجائے بھائی کے ہے اور بھائی کا حصہ دو بہنوں کے برابر ہوتا ہے اس لئے دادا بجائے دو بہنوں کے ہو گیا اور مسئلہ میں تین بہنیں ہو گئیں جن کو چار سہام دیئے جائیں گے اور چونکہ عدد رؤس یعنی ۳ اور سہام یعنی ۴ میں تباین ہے اس لئے ۳ کو عدد عول یعنی ۹ میں ضرب دیا جائے گا اور حاصل ضرب ۲۷ ہوگا) اور ۲۷ سے تصحیح مسئلہ کی جائے گی، شوہر کو ۹ ماں کو ۶ دادا کو ۸ اور بہن کو ۴ دیئے جائیں گے لیکن اگر بجائے ایک بہن کے ایک بھائی یا دو بہنیں ہوں تو نہ عول ہوگا نہ مسئلہ اکدریہ رہے گا (اصل تصحیح ۶ سے ہوگی شوہر کے ۳ ماں کے ۲ دادا کا ایک۔ بھائی عصبہ ہے مگر اس جگہ کچھ باقی نہ رہنے کی وجہ سے محروم ہے اور اگر بھائی کی جگہ دو بہنیں ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی نہ ہوگا بلکہ چھٹا ہوگا شوہر کو ۳ ماں کو ایک دادا کو ایک، دو بہنوں کو ایک اور چونکہ ایک کی تقسیم دو پر بغیر کسر کے نہیں ہوتی اس لئے ۲ کو اصل عدد تصحیح یعنی ۶ میں ضرب دیں گے اور حاصل ۱۲ ہوگا اب تقسیم اس طرح ہوگی شوہر ۶ ماں ۲ دادا ۲ ایک بہن ۲، دوسری بہن ۲)۔

چونکہ مسئلہ اکدریہ بنی اکدر کی ایک عورت کا واقعہ ہے اس لئے اس مسئلہ کو ہی اکدریہ کہا جانے لگا۔

marfat.com

فائدہ:- اگر دادا کے ساتھ بہن یا بھائی ہوں تو صحابہؓ کے درمیان تقسیم حصص میں اختلاف ہے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ حجاج نے شعبی سے مسئلہ پوچھا کہ اگر کل ورثہ ماں، ایک بہن اور دادا ہو تو تقسیم فرائض کس طرح ہوگی، شعبیؒ نے کہا اس کے متعلق پانچ صحابہؓ کرام کے پانچ مختلف اقوال ہیں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا میں کل مال کے تین حصے کروں گا ہر ایک کا ایک حصہ ہوگا، حضرت علیؓ نے فرمایا میں ترکہ کو چھ سہام پر تقسیم کروں گا تین بہن کے دو ماں کے ایک دادا کا، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا میں بھی ترکہ کے چھ سہام کروں گا مگر ۳ بہن کے دو دادا کے اور ایک ماں کا ہوگا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے فرمایا میں ترکہ کے نو سہام بناؤں گا بہن کو تین دوں گا، اور دادا کو چار اور ماں کو دو (حضرت ابن عباسؓ کا قول حجاج اور شعبی نفصلؓ سے نہیں پوچھا اس لئے شعبی نفصل نے نہیں بیان کیا) بیہقی نے ابراہیم نخعی کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھائی کو دادا پر ترجیح نہیں دیتے تھے لیکن ابن حزم نے اپنے طریق روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ بہن کو نصف، ماں کو ۱/۶، اور دادا کو بقیہ (ایک تہائی) دیتے تھے (گویا بھائی کو اگرچہ فضیلت نہیں دیتے تھے مگر بہن کو دادا پر ترجیح دیتے تھے)۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک نص اور قیاس دونوں سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

مسئلہ:- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جدۂ صحیحہ وہ ہے کہ میت سے اس کا رشتہ کسی جدّ فاسد کے ذریعہ سے نہ ہوتا ہو، امام صاحب کے نزدیک صحیح جدّات (دادیاں) کتنی ہی ہوں سب وارث ہوں گی بشرطیکہ فاسدات نہ ہوں اور ہم درجہ ہوں۔ امام مالکؒ اور داؤد ظاہریؒ کا قول ہے کہ صرف دو جدّات وارث ہوں گی باپ کی ماں یعنی دادی اور دادی کی ماں اور اس کی ماں اور اس کی ماں غرض دادی سے اوپر کی تمام نانیاں اور ماں کی ماں اور نانی کی ماں اور پرنانی کی ماں اور سکرنانی کی ماں، غرض ماں کی تمام نانیاں، قریب والی جس طرف کی ہو دور والی کو محروم کر دے گی۔

ایک قول شافعیؒ کا بھی یہی ہے لیکن امام شافعیؒ کا دوسرا اقوی قول اور امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ ماں باپ کے اوپر والی صرف تین عورتیں وارث ہوتی ہیں نانی، دادی اور دادا کی ماں۔

اجماعی قول ہے کہ ہم درجہ اور جدّات صحیحہ چند ہوں یا صرف ایک ہو بہرحال ایک سدس یعنی ۱/۶ ادیا جائے گا اگر ایک جدّہ کا میت سے ایک رشتہ ہو مثلاً دادی کی ماں ہو اور دوسری کے دو رشتے ہوں جیسے ماں کی نانی ہو اور وہی دادا کی ماں بھی ہو تو امام ابو یوسف کے نزدیک (دوسری اور اکہری رشتہ داری کا کوئی فرق نہیں بلکہ) دونوں کو چھٹا حصہ برابر برابر بانٹ دیا جائے گا، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک رشتہ داریوں کا تعداد اور وحدت قابل لحاظ رہے گا جس کا دوہرا رشتہ ہوگا اس کو دوہرا حصہ اور جس کا اکہرا رشتہ ہوگا اس کو اکہرا حصہ دیا جائے گا۔

تقسیم جدّات کے سلسلہ میں قبیصہ بن ذویبؓ کی روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں ایک جدّہ اپنی میراث مانگنے حاضر ہوئی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی کتاب میں تیرا کوئی حصہ نہیں، نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت میں تیرا کوئی حصہ ہے اب تو واپس چلی جا، میں لوگوں سے تیرا مسئلہ دریافت کروں گا۔ حسب وعدہ آپ نے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ ایک جدّہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور آپ نے اس کو ترکہ کا ۱/۶ ادیا تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا اس وقت تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا حضرت مغیرہؓ نے کہا محمد بن مسلمہؓ بھی تھے چنانچہ محمد بن مسلمہؓ نے بھی وہی کہا جو مغیرہؓ نے کہا تھا حضرت ابو بکرؓ نے سائلہ عورت کے لئے بھی یہی حکم جاری کر دیا۔

پھر ایک اور جدّہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہو کر اپنی میراث کی طالب ہوئی حضرت عمرؓ نے فرمایا، وہی چھٹا حصہ تیرا بھی ہے تم دونوں اگر موجود ہو تو ترکہ کا ۱/۶ تم دونوں کو (برابر برابر) تقسیم کیا جائے گا اور اگر (تم دو نہ ہو بلکہ) صرف ایک ہو تو (پورا) چھٹا حصہ اس ایک ہی کا ہوگا۔ رواہ مالک واحمد و الترمذی وابوداؤد والدارمی وابن ماجہ۔ ابن وہب کا بیان ہے کہ جس جدّہ کو رسول اللہ ﷺ نے حصہ دیا تھا وہ میت کی ماں کی ماں (نانی) تھی اور نانی ہی حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئی تھی اور جو عورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی تھی وہ باپ کی ماں (دادی) تھی حضرت عمرؓ نے لوگوں سے اس کا مسئلہ پوچھا مگر کسی نے کچھ نہیں بتایا، بنی

marfat.com

حارثہ کے ایک لڑکے نے کہا امیر المومنین آپ اس عورت کو ایسی میت کی میراث کیوں نہیں دیتے کہ اگر یہ عورت مرجاتی اور دنیا بھر کو چھوڑ جاتی تب بھی یہ مردہ اس کا وارث ہوتا (کیونکہ پوتا تھا بیٹا نہ ہوتا تو پوتا ضرور وارث ہوتا) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو وارث قرار دے دیا۔

موطا اور سنن بیہقی میں ہے کہ دو جدّات (نانی اور دادی) حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئیں آپ نے نانی کو ترکہ کا چھٹا حصہ دینا چاہا تو ایک انصاری نے کہا آپ ایسی عورت کو کیوں وارث نہیں قرار دیتے کہ اگر وہ مرجاتی اور یہ مردہ زندہ ہوتا تو یہ ضرور اس کا وارث ہوتا، یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے ترکہ کا ۱/۶ دونوں کو (یعنی نانی اور دادی کو برابر) بانٹ دیا، یہ اثر دار قطنی نے ابن عیینہ کے طریق سے بیان کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انصاری عبدالرحمن بن سہل بن حارثہ تھے۔

علماء نے بیان کیا ہے کہ نانی ماں کے قائم مقام تھی اس لئے اس کو ماں کا کم سے کم حصہ (یعنی ۱/۶) دے دیا اور دادی کو نانی پر قیاس کر کے حصہ دار بنا دیا کیونکہ بہر حال وہ بھی میّت (کی اصل یعنی) باپ کی ماں تھی (ورنہ دادی حقیقت میں نہ ماں کی قائم مقام ہو سکتی ہے کیونکہ ماں کے ذریعہ سے اس کا میت سے رشتہ نہیں ہوتا، نہ باپ کے قائم مقام ہو سکتی ہے کیونکہ باپ کی جنس جدا ہے وہ مرد ہے یہ عورت) حضرت ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین جدّات کو ترکہ کا چھٹا حصہ دیا تھا دو ماں کی طرف سے تھیں اور ایک باپ کی طرف سے۔ دار قطنی نے اس روایت کو مرسل سند سے بیان کیا ہے، ابو داؤد نے مراسیل میں دوسری سند سے ابراہیم نخعیؒ کی وساطت سے نقل کیا ہے، دار قطنی اور بیہقی نے اس کو مرسلِ حسنؒ (بصری) قرار دیا ہے۔ بیہقی کا بیان ہے کہ محمد بن نصر نے اس پر تمام صحابہؓ اور تابعینؒ کا متفق ہونا بیان کیا تھا البتہ سعد بن ابی وقاص اس کے منکر تھے مگر سعد کا یہ انکار صحیح اسناد سے مروی نہیں۔

مسئلہ :- ماں تمام جدّات کو (باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے) محروم کر دیتی ہے کیونکہ حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جدّہ کے لئے ترکہ کا چھٹا حصہ مقرر کیا ہے اگر اس کو روکنے والی ماں نہ ہو، رواہ ابو داؤد والنسائی، اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی عبیداللہ عتکی ہے جس کے متعلق علماء نقد کا اختلاف ہے ابن سکن نے اس کو صحیح کہا ہے۔

باپ اپنی وساطت کی تمام جدّات کا حاجب ہوتا ہے اس میں امام احمدؒ کے دو قول ہیں، انکاری اور تائیدی۔ انکاری قول کی تائید میں امام احمدؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میّت کے باپ کے زندہ ہوتے ہوئے دادی کے لئے سدس (ترکہ کا چھٹا حصہ) عطا فرمایا تھا، رواہ الترمذی والدارمی، ہم کہتے ہیں کہ ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، جمہور کے قول کا ثبوت اس ضابطہ سے ہوتا ہے کہ قریب ترین رشتہ دار دور والے کے لئے حاجب ہوتا ہے۔

مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ بعد اس وصیت کے جو مرنے والا کرے، اس فقرہ کا تعلق لِاُمِّهِ السُّدُسُ سے ہے، یعنی ماں کا چھٹا حصہ وصیّت پوری کرنے کے بعد (باقی ترکہ میں سے) ہے۔ یہ تو لفظی تعلق ہے لیکن معنوی تعلق تمام گذشتہ جملوں سے ہے یعنی مرد کا دوہرا اور عورت کا اکہرا حصہ ہونا، اور دو بیٹیوں کے لئے ترکہ کا دو تہائی ہونا اور ایک بیٹی ہو تو اس کے لئے نصف ہونا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہونا اور ماں کا ایک تہائی حصہ ہونا یہ تمام احکام اجراء وصیت کے بعد جاری ہوں گے بشرطیکہ کوئی وصیّت ہو۔

اَوۡ دَيۡنٍ اور ادائے قرض کے بعد اگر میّت پر کچھ قرض ہو۔ واو کی جگہ او کا استعمال بتا رہا ہے کہ وصیّت ہو یا قرض یا دونوں بہر حال تقسیم ترکہ، اجراء وصیت اور ادائے دین کے بعد ہوگی، وصیت کی دعوت چونکہ سب کو دی گئی ہے اس لئے باوجود یہ کہ دین ادا کرنے کا حکم اجراء وصیّت سے پہلے ہے ذکر میں وصیّت کو مقدم کر دیا گیا اور دین چونکہ سنت اسلامیہ کے نزدیک مغفرت سے بھی مانع ہے اس لئے تقاضائے سنت ہے کہ اتفاقاً ہی کسی میت پر ہو پس دین کو وصیّت سے پیچھے ذکر کیا۔

حضرت ابو قتادہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں ثواب کی امید میں صبر کے ساتھ کافروں کے مقابل راہ خدا میں مارا جاؤں اور مقابلہ کے وقت پیٹھ نہ دوں تو کیا اللہ میرے گناہوں

کا اتار کردے گا فرمایا ہاں (ایسا ہو جائے گا) سوائے قرض کے، جبرئیلؑ نے ایسا ہی کہا ہے، رواہ مسلم، حضرت عبداللہ بن عمرو راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے قرض کے شہید کا ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے، رواہ مسلم۔

مسئلہ :- علماء کا اجماع ہے کہ میّت کی تجہیز کا تعلق اس کے ترکہ سے مقدم ترین ہے پھر ادائے قرض لازم ہے خواہ پورے ترکہ سے ہو اس کے بعد ایک تہائی ترکہ سے میّت کی وصیت پوری کی جائے آخر میں جو کچھ بچ رہے وہ وارثوں کو تقسیم کر دیا جائے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا تم یہ آیت من بعد وصیة توصون بھا اودین پڑھتے ہو، اور رسول اللہ ﷺ نے تکمیل وصیّت سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا تھا، رواہ الترمذی وابن ماجہ[۱]، (یعنی آیت میں عطف ترتیبی نہیں ہے ادائے قرض کا مرتبہ اجراء وصیّت سے مقدّم ہے)۔

مسئلہ :- وصیت پوری کرنے کے لئے (صرف) ایک تہائی ترکہ صرف کیا جاسکتا ہے (علماء کا اس پر اتفاق ہے) کیونکہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ میں فتح مکہ کے سال ایسا بیمار ہوا کہ موت کے کنارے سے جالگا، رسول اللہ ﷺ میری عیادت کو تشریف لائے، میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے پاس بہت مال ہے اور سوائے ایک لڑکی کے اور کوئی (ذوی الفروض میں سے) وارث نہیں کیا میں اپنے کل مال کے متعلق وصیت کر سکتا ہوں، فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا تو دو تہائی مال کی، فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا تو آدھے مال کی فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا تو ایک تہائی مال کی فرمایا تہائی (کی وصیت کر سکتے ہو) اور تہائی بھی بہت ہے اگر تم اولاد کو مالدار چھوڑ جاؤ تو اس سے بہتر ہے کہ ان کو فقیر چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے ہاتھ تکتے پھریں تم جو خرچ بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرو گے تو اس کا ثواب تم کو ضرور ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دوگے (اس کا ثواب بھی ملے گا) بخاری و مسلم۔

ترمذی کی روایت کے الفاظ کچھ بدلے ہوئے ہیں اس روایت میں آیا ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) دسویں حصہ کی وصیّت کر سکتے ہو، میں حضورؐ سے برابر کم ترکہ چھوڑنے کی درخواست کرتا رہا یہاں تک کہ حضور ﷺ نے فرمایا ترکہ کے تیسرے حصہ کے متعلق وصیّت کر سکتے ہو اور تہائی بھی بہت ہو۔

حضرت معاذؓ کی مرفوع روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ مرنے کے وقت تہائی مال (کی وصیت کرنے کی اللہ نے اپنی مہربانی سے تمہاری نیکیاں بڑھانے کے لئے تم کو اجازت دے دی ہے تاکہ وہ تمہارے مالوں کو پاک کر دے، رواہ الطبرانی بسند حسن، یہ حدیث طبرانی اور امام احمد نے حضرت ابو درداء کی روایت سے مرفوعاً بیان کی ہے، ابن ماجہ، بزاز اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور عقیلی نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کی ہے۔

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ تمہارے اصول و فروع جو ہیں تم پورے طور پر نہیں جانتے کہ ان میں کون شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے یعنی تم کو نہیں معلوم کہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے تمہارے اصول زیادہ مفید ہوں گے یا فروع۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدمی جنت میں داخل ہو جائے گا تو اپنے ماں، باپ، بیوی اور اولاد کے متعلق دریافت کرے گا جواب ملے گا کہ تیرے مرتبہ اور تیرے عمل تک ان کی رسائی نہیں تھی (اس لئے وہ یہاں نہیں ہیں) وہ شخص عرض کرے گا میرے مالک میں نے تو اپنے اور ان کیلئے عمل کئے تھے فوراً حکم ہو گا کہ مذکورہ متعلقین کو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے یہ روایت طبرانی نے کبیر میں اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے۔

۱۔ حضرت مفسر قدس سرہ نے تجہیز میّت کو ادائے قرض سے مقدم قرار دیا ہے لیکن اس کلام میں کچھ ابہام ہے شاید مفسر کی مراد یہ ہے کہ جو قرض متعلق بعین نہ ہو اس پر تجہیز مقدم ہے کیونکہ علماء فرائض کا فیصلہ ہے کہ جو دین متعلق بعین ہو اس کی ادائیگی تجہیز پر بھی مقدم ہے جیسے زید نے اگر دو سو روپیہ کو گھوڑا خرید امگر قیمت ادا نہ کر سکا ادائے ثمن موجل تھا پھر ادائیگی سے پہلے مر گیا اور گھوڑا موجود ہے تو گھوڑے کا بائع تجہیز و تکفین سے پہلے اپنا گھوڑا واپس لے جائے گا ہاں دوسرے قرض خواہوں کا قرض ادا کرنے کی تجہیز و تکفین کے بعد کی جائیگی۔ واللہ اعلم

marfat.com

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم میں جو سب سے زیادہ اللہ کا فرمانبردار ہوگا قیامت کے دن وہی سب سے اونچے مرتبہ والا ہوگا، اور اللہ مؤمنوں کی ایک دوسرے کے لئے سفارش قبول فرمائے گا اگر جنت میں باپ عالی مرتبہ ہوگا تو بیٹے کو اٹھا کر اس کے پاس پہنچا دیا جائے گا اور بیٹے کا درجہ اونچا ہوگا تو باپ کو اٹھا کر اس کے پاس پہنچا دیا جائے گا ایسا صرف اس لئے کیا جائے گا کہ باپ اور بیٹوں کو آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہو اور چونکہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ وارثوں میں سے کون ہمارے لئے زیادہ فائدہ رساں ہوگا اس لئے ترکہ کی تقسیم ان کی مرضی پر موقوف نہیں رکھی گئی یعنی اگر معلوم ہو جاتا کہ کون ہمارے لئے زیادہ مفید ہوگا تو زیادہ مفید آدمی ہی کی طرف جھکاؤ ہو جاتا اور جب زیادہ مفید شخص کا علم ہی نہیں ہے تو (سب وارث برابر ہیں) کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی ناجائز ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، وارثوں کی مرضی کے بغیر کسی وارث کے لئے وصیت کرنی درست نہیں، رواہ الدار قطنی من حدیث ابن عباس ورواہ ابوداؤد مرسلاً عن عطاء الخراسانی ورواہ یونس موصولاً عن عطاء عن عکرمۃ عن ابن عباس اور رواہ الدار قطنی من حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔

ابوداؤد نے حضرت ابوامامہؓ کی روایت نقل کی ہے حضرت ابوامامہؓ نے فرمایا میں نے خود سنا کہ حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ ﷺ خطبہ میں فرما رہے تھے کہ اللہ نے ہر حقدار کو اس کا حق عطا فرمایا ہے لہٰذا وارث کے حق میں وصیت (درست) نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ تم کو نہیں معلوم کہ کون سا مورث تمہارے لئے زیادہ نفع رساں ہے کیا وہ مورث زیادہ نفع رساں ہے جو وصیت کرتا ہے اور تم کو موقع دیتا ہے کہ اس کی وصیت پوری کر کے تم ثواب حاصل کرو یا وہ مورث زیادہ نفع رساں ہے جو وصیت نہیں کرتا اور کل مال تمہارے لئے چھوڑ جاتا ہے۔

فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ　یہ حکم من جانب اللہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ فریضۃ فعل محذوف کا مفعول مطلق تاکیدی ہے آیت یوصیکم الله بھی فرضیت پر دلالت کر رہی ہے اور وصیت کرنے کا مفہوم بھی فرض کرنے کے علاوہ کچھ نہیں فریضۃ سے اسی کے مفہوم کی تاکید کر دی گئی۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪　یہ حقیقت ہے کہ اللہ بڑے علم و حکمت والا ہے، یعنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اور میراث وغیرہ کے احکام جو فرض کئے ہیں وہ پر حکمت ہیں۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ　ازواج سے مراد ہیں بیویاں۔

اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ　تمہارا میراثی حصہ اپنی بیویوں کے ترکہ میں سے (کل ترکہ کا) نصف ہے بشرطیکہ ان کی (بطنی) اولاد (صاحب فرض اور عصبہ موجود) نہ ہو (یعنی اولاد یا اولاد کی اولاد غرض نسل میں سے کوئی موجود نہ ہو)۔

فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ　اور اگر ان کی (نسلی ذوی الفرضی یا عصبہ) اولاد ہو تو انکے ترکہ میں سے تمہارا چہارم ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ　ان کی وصیت (تہائی مال سے) پوری کرنے اور (کل مال سے) قرض ادا کرنے کے بعد۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ　اور (بیویاں چند ہوں یا ایک ان سب کے لئے تمہارے ترکہ کا چہارم ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو یعنی صلبی اولاد اور بیٹے کی اولاد نہ ہو۔

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ　اور اگر تمہاری اولاد موجود ہو تو تمہاری بیویوں کے لئے تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ　تمہاری وصیت (تہائی مال سے) پوری کرنے اور (کل مال سے) قرض ادا کرنے کے بعد۔

جو عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو اور شوہر نے صحیح طلاق دی ہو تو وہ وارث ہوتی ہے اگر طلاق بائن کی عدت میں ہو

marfat.com

تو وارث نہیں ہوتی۔ شوہر نے اگر مرض موت میں طلاق رجعی دی تو ایسی مطلقہ بالاجماع وارث ہوتی ہے لیکن یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے، امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ایسی عورت اس وقت وارث ہوگی جب شوہر کے مرنے کے وقت عدت میں ہو۔ امام احمدؒ نے فرمایا عدت گزر جانے کے بعد بھی وارث ہوگی، بشرطیکہ شوہر کی موت سے پہلے اس نے نکاح جدید نہ کرلیا ہو۔ امام مالکؒ نے فرمایا اگر شوہر کے مرنے سے پہلے انقضا، عدت کے بعد اس نے کسی سے نکاح بھی کرلیا ہو تب بھی وارث ہوگی۔ امام شافعیؒ کے تین مختلف قول منقول ہیں ہر قول ایک امام کے موافق ہے، اگر مرض موت میں شوہر نے طلاق بائن دی ہو تب بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد کا یہی قول ہے مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس صورت میں وارث ہونے کی یہ شرط ہے کہ عورت نے خود طلاق کی درخواست نہ کی ہو، ورنہ سمجھا جائے گا کہ وہ خود اپنے حق کے سوخت ہونے پر راضی ہے (اس لئے اس کو میراث نہیں دی جائے گی) امام شافعیؒ کے دو قول آئے ہیں قوی قول یہ ہے کہ طلاق بائن والی عورت وارث نہ ہوگی۔

امام احمد نے معمر کی روایت سے لکھا ہے کہ غیلان بن سلمہ کی مسلمان ہونے کے وقت دس بیویاں تھیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان میں سے چار کا انتخاب کرلو (باقی کو چھوڑ دو) جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو غیلان نے بیویوں کو (رجعی) طلاق دے دی اور اپنا مال اپنے لڑکوں کو تقسیم کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو فرمایا میرا خیال ہے کہ جو شیطان (فرشتوں کی گفتگو) چوری سے سن لیتا ہے اسی نے تیری موت کی خبر سن کر تیرے دل میں ڈال دی ہے اور تجھے بتادیا ہے کہ تو زیادہ مدت زندہ نہیں رہے گا خدا کی قسم یا تو تو اپنی عورتوں سے مراجعت کرلے اور (لڑکوں سے) مال واپس لے لے، ورنہ میں ان عورتوں کو تیرا وارث بنادوں گا اور حکم دے دوں گا کہ جس طرح ابو رغال (دور جاہلیت میں ایک قومی غدار تھا) کی قبر پر سنگ باری کی جاتی ہے اسی طرح تیری قبر کو سنگسار کیا جائے۔

یہ حدیث جمہور سلف کے اس مسلک کی تائید کر رہی ہے کہ طلاق رجعی کے بعد (عدت کے اندر) عورت اپنے شوہر کی وارث ہوتی ہے، رہا طلاق بائن کے بعد عورت کا وارث ہونا تو جمہور کے اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنی بیوی کو (جس کا نام تماظر بنت اصبغ بن زیاد تھا اور یہ خاندان کلب میں سے تھی یا بنت عمرو بن الشرید کو جو قبیلہ سلیم کی تھی) جب قطعی طلاق دے دی اور عدت پوری ہونے نہ پائی تھی کہ آپ کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمانؓ نے مطلقہ بیوی کو حضرت عبدالرحمٰنؓ کا وارث قرار دیا یہ فیصلہ تمام صحابہؓ کی موجودگی میں صادر کیا اور کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا تو گویا اجماع ہو گیا اور یہ بھی فرمایا کہ میں عبدالرحمٰنؓ پر بدگمانی نہیں کرتا میرا مقصد صرف سنت پر عمل کرنا ہے۔

ہمارے مسلک کی تائید حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت مغیرہؓ کے اقوال سے ہوتی ہے، ابو بکرؒ رازی نے حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت عائشہؓ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے اقوال بھی اسی کی موافقت میں نقل کئے ہیں بلکہ کسی صحابیؓ کا قول اس کے خلاف منقول نہیں۔ نخعی، شعبی، سعید بن مسیب، ابن سیرین، عروہ، شریح، ربیعہ بن عبدالرحمٰن، طاؤس بن شبرمہ ثوری، حارث اور حماد بن ابی سلیمان کا بھی یہی مسلک ہے۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ اور اگر کوئی آدمی یعنی میّت یا وارث۔

يُّوْرَثُ جس کی وراثت تقسیم کی جارہی ہو یا جس کو وارث بنایا جارہا ہو۔ اگر رجل سے مراد میّت ہو تو اول ترجمہ ہو گا اور اگر وارث مراد ہو تو دوسرا ترجمہ کیا جائے گا۔

كَلٰلَةً ناٹھا نگوڑا ہو۔ کلالہ اصل لغت میں کلال کی طرح مصدر ہے اور کلال کا معنی ہے تھکنا عاجز ہو جانا کل الرجل فی مشیہ کلالاً فلاں شخص اپنی رفتار میں سست ہو گیا، تھک گیا و کل السیف عن ضربتہ کلولاً وکلالۃ اور تلوار مارنے سے کند ہو گئی، کل اللسان عن الکلام زبان بات سے عاجز ہو گئی، تیز نہ رہی، مجازاً کلالہ سے مراد وہ قرابتدار ہوتے ہیں جن کا آپس میں رشتہ تو الد نہ ہو یعنی باپ دادا اور بیٹے پوتے کا ان کے آپس میں رشتہ نہ ہو، یہ بھی ایک قسم کی عاجزی اور

marfat.com

درماندگی ہوتی ہے پھر کلالہ کو ذی کلالہ کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کی نہ اصل ہو نہ نسل کہ اس کی وارث ہو یا اس کا وارث ہو کذا قال البیضاوی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کلالہ وہ شخص ہے جس کی نہ اولاد ہو نہ والد، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے یہی فرمایا گویا دونوں طرف اس کے نسبی ستون کمزور ہیں سعید بن جبیرؒ نے کہا کلالہ وہ وارث ہے جو میت کا نہ والد (باپ دادا پر دادا وغیرہ) ہو نہ اولاد، ایسے وارث میّت کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں لیکن بیچ میں کوئی نسبی ستون ہوتا ہے جیسے سر پرستی پر بندھی ہوئی شاہی پٹی کو سر کو چاروں طرف سے محیط ہوتی ہے مگر سر کا درمیانی حصہ خالی ہوتا ہے، حضرت جابر والی حدیث میں کلالہ کا یہی مطلب ہے آپ ﷺ نے کہا تھا کہ میرے وارث کلالہ ہیں، یعنی نہ میری نرینہ اولاد ہے نہ والد۔

حضرت ابو بکرؓ سے کلالہ کے متعلق دریافت کیا گیا، فرمایا میں اپنی رائے سے کہتا ہوں اگر صحیح ہو گا تو اللہ کی طرف سے اور غلط ہو گا تو میری طرف سے ہو گا اور شیطان کی طرف سے، میرے خیال میں کلالہ وہ ہے جو نہ (کسی کا) والد ہو اور نہ اولاد جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو فرمایا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کہا مجھے ان کی تردید کرنے سے جھجک آتی ہے (یعنی ٹھیک ہے) رواہ البیہقی عن الشعبی، ابن ابی حاتم نے بھی اپنی تفسیر میں اس کو نقل کیا ہے اور حاکم نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ کلالہ کی تشریح میں آپ نے فرمایا وہ ایسا شخص ہے جو نہ (میّت کا) والد ہو نہ مولود، رواہ الحاکم۔

ابو الشیخ نے حضرت براء کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کلالہ کے متعلق دریافت کیا فرمایا (میّت کے) والد اور اولاد کے سوا (جو وارث ہو وہ) کلالہ ہے۔ ابو داؤد نے مراسیل میں ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن کے روایت سے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو والد کو چھوڑے نہ اولاد کو اس کے وارث کلالہ ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کلالہ کی تشریح میں والد اور ولد سے مراد ہیں مذکر اصول و فرع پس اگر میّت کی ماں یا بیٹی موجود ہو اور باپ اور بیٹا نہ ہو تو وہ کلالہ ہے اس قول کا ثبوت حضرت جابرؓ کی حدیث سے ملتا ہے کیونکہ نزول آیت کے وقت حضرت جابرؓ کی ایک لڑکی موجود تھی، والد نہ تھے آپ کے والد عبد اللہؓ بن حرام کا انتقال احد کے دن ہو چکا تھا اور بہن بھائی ماں اور بیٹی کی موجودگی میں بالاتفاق وارث ہوتے ہیں ولد کا لفظ بھی عام ہے پوتا بھی اس میں داخل ہے، یہاں تک کہ پوتے کے ساتھ بھائی بھی بالاجماع وارث ہوتے ہیں۔ اسی طرح والد سے مراد بھی عام ہے، حقیقی والد ہو یا دادا کیونکہ کلالہ کی تشریح میں جو ولد کا مفہوم ہے وہی والد کا دونوں میں فرق نہیں (یعنی جس طرح لفظ ولد پوتے کو شامل ہے اسی طرح دادا بھی لفظ والد کے تحت داخل ہے)۔

اَوِ امْرَاَةٌ یا عورت ہو اس کا عطف رجل پر ہے یعنی یا کلالہ عورت ہو۔

وَّلَهٗٓ ضمیر مذکر رَجُلٌ کی طرف راجع ہے، جس سے کلام کا آغاز کیا گیا ہے یا احد ھما کی طرف راجع ہے مراد یا عورت۔

اَخٌ اَوْ اُخْتٌ اور اس میّت کا کوئی بھائی یا بہن ہو۔ باجماع اہل تفسیر اس جگہ بھائی بہن سے مراد ہیں اخیافی بھائی بہن، حضرت ابیّ بن کعبؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی قرأت میں تو یہ صراحۃً آیا ہے، بیہقی کا بیان ہے کہ سعد (راوی کے گمان کے مطابق سعد سے مراد ہیں سعد بن ابی وقاص) پڑھتے تھے وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ لِاُمٍّ ابو بکر بن منذر نے بھی حضرت سعد کی طرف اس قرأت کی نسبت کی ہے۔ زمخشری نے حضرت سعد اور حضرت ابیّ بن کعبؓ دونوں کی یہی قرأت بیان کی ہے بعض علماء نے حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت بھی اسی طرح نقل کی ہے لیکن ابن حجر نے لکھا ہے میں نے ابن مسعود سے کوئی روایت ایسی نہیں دیکھی، یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ غیر متواتر قرأت پر بھی عمل کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی اسناد صحیح ہو۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔ شافعیؒ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا۔

marfat.com

سنو اللہ تعالیٰ نے جو آیت سورۃ النساء کے شروع میں بیان میراث کے سلسلہ میں نازل فرمائی وہ والد اور ولد کے متعلق ہے اور دوسری آیت شوہر بیوی اور اخیافی بھائی اور بہن کے متعلق ہے اور جس آیت پر سورت کو ختم کیا وہ حقیقی بھائیوں اور بہنوں کے متعلق ہے اور جس پر سورۂ انفال کو ختم کیا وہ ان رشتہ داروں کے متعلق ہے جو اصحاب فرائض نہیں ہیں اللہ کی کتاب میں جن کا تعلق بعض کے ساتھ بعض کا زیادہ ہے۔

فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ اگر ایک اخیافی بھائی یا بہن ہو تو دونوں میں سے کوئی ایک ہو ہر ایک کے لئے ترکہ کا چھٹا حصہ ہے۔

فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں (برابر کے) شریک ہوں گے یعنی اخیافی بھائی بہن اگر دو یا دو سے زائد ہوں تو ان کا کل حصہ ترکہ کا ایک تہائی ہے اس کی تہائی میں مرد عورت سب برابر کے شریک ہوں گے استحقاق اور حصہ میں سب مساوی ہیں۔

...... مسئلہ حماریہ ......

شوہر، ماں، دو اخیافی بھائی۔ ایک حقیقی بھائی، تصحیح مسئلہ ۶ سے ہوگی نصف یعنی ۳ شوہر کے چھٹا حصہ یعنی ۱/۶ اماں کا ایک تہائی یعنی ۲ اخیافی بھائیوں کے ہوں گے۔ حقیقی بھائی چونکہ عصبہ ہے اور اصحاب فرائض سے کچھ نہیں بچا اس لئے حقیقی بھائی کو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک کچھ نہیں ملے گا خواہ حقیقی بھائی ایک ہو یا متعدد۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ حقیقی بھائی کو اخیافی بھائیوں کے ساتھ تہائی میں شریک کر دیتے ہیں۔

طحاوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حقیقی بھائی کو اخیافی بھائیوں کے ساتھ میراث میں شریک نہیں کرتے تھے آخر ایک سوال سے لاجواب ہو گئے ایک حقیقی بھائی نے کہا امیر المومنین فرض کر لیجئے کہ ہمارا باپ گدھا تھا تو کیا کم سے کم ہم سب ایک ماں کی اولاد نہیں ہیں اس سوال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حقیقی بھائیوں کو بھی اخیافیوں کے ساتھ شریک کر دیا اسی وجہ سے اس مسئلہ کو حماریہ کہتے ہیں، اس مسئلہ کو حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے سنن میں حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف بھی نسبت کر کے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس روایت کو صحیح بھی کہا ہے مگر اس کی اسناد میں ایک شخص ابوامیہ بن یعلی ثقفی ہے جو ضعیف ہے، حاکم نے بطریق شعبی حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کا بھی یہ قول نقل کیا ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ باپ نے حقیقی بھائیوں کے قرب کو میت سے اور بڑھا دیا (یعنی اخیافی بھائیوں کو میت سے صرف قرب بطنی حاصل ہوتا ہے اور حقیقی بھائیوں کو قرب بطنی بھی اور شرکت صلبی بھی)۔

دار قطنی نے بطریق وہب بن منبہ مسعود بن حکم ثقفی کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی عورت مر جائے اور شوہر ماں چند اخیافی بھائی اور چند حقیقی بھائی چھوڑ جائے تو کیا حضرت عمرؓ نے حقیقی بھائیوں کو اخیافی بھائیوں کیساتھ (تہائی میں) شریک کر دیا ایک شخص نے عرض کیا آپ نے فلاں سال تو حقیقی بھائیوں کو اخیافیوں کی میراث میں شریک نہیں کیا تھا فرمایا وہ ویسا ہی رہے گا جو ہم نے کر دیا تھا اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسا ہم نے فیصلہ کر دیا۔

عبد الرزاق نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور بیہقی نے بطریق ابن مبارک، معمر کی روایت سے بھی لکھا ہے لیکن اس روایت میں مسعود بن حکم کا نام نہیں ہے بلکہ حکم از ابن مسعودؓ کی روایت ہے نسائی نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سب (اخیافی اور حقیقی) بھائیوں کو شریک کیا تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے (حقیقی بھائیوں کو اخیافیوں کے حصہ میں) شریک نہیں کیا۔

مسئلہ :- اگر میت کا بیٹا یا پوتا یا باپ یا دادا موجود ہو تو اخیافی بھائی بہن باتفاق آراء ساقط ہو جاتے ہیں۔ اختلاف اس مسئلہ

marfat.com

میں ہے کہ اگر دادا موجود ہو تو علاتی یا حقیقی بھائی بہن ساقط ہو جاتے ہیں یا نہیں، قیاس کا تقاضا ہے کہ ماں موجود ہو تو اخیافی بھائی بہن ساقط ہو جائیں کیونکہ جس شخص کا رشتہ میت سے کسی ذریعہ سے ہو جب وہ ذریعہ خود موجود ہو تو وہ شخص ساقط ہی ہو جاتا ہے لیکن (اجماع سلف اس کے خلاف ہے، اجماع کے خلاف ہم نے قیاس کو ترک کر دیا۔ ترک کی ایک قیاسی وجہ یہ بھی ہے کہ ماں پورے ترکہ کی وارث نہیں ہوتی (لہٰذا اخیافی بھائی بہن کے محروم ہونے کی کوئی وجہ نہیں)۔

مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَآ جو وصیت کی جائے اس کو پوری کرنے کے بعد۔

اَوۡ دَيۡنٍ ۙ غَيۡرَ مُضَآرٍّ اور اداء قرض کے بغیر اس کے کہ ضرر پہنچائے یعنی تہائی سے زیادہ کی وصیت کر کے یا کسی کے قرض کا جھوٹا اقرار کر کے وارثوں کو ضرر نہ پہنچائے، وارثوں کو نقصان پہنچانا مقصود ہو کہ اللہ کا قرب حاصل کرنا تو مقصود نہ ہو صرف وارثوں کو دکھ پہنچانے کی غرض ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بعض مرد اور عورتیں ساٹھ برس اللہ کی طاعت کے کام کرتے ہیں پھر موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں (وارثوں کو) ضرر پہنچاتے ہیں اسی وجہ سے دوزخ ان کے لئے واجب ہو جاتی ہے، یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے آیت من بعد وصية يوصى بها او دين غير مضار...... ذلک الفوز العظیم تک تلاوت کی، رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو وارثوں کی میراث کھائے گا اللہ قیامت کے دن اس کا جنت کا حصہ کاٹ دے گا۔ رواہ ابن ماجہ۔ بیہقی نے شعب الایمان میں یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اگر میں پانچویں حصہ کی وصیت کروں تو چوتھائی مال کی وصیت کرنے سے میرے نزدیک زیادہ اچھا ہے اور تہائی مال کی وصیت کروں تو چوتھائی مال کی وصیت کرنے سے میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے، رواہ البیہقی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ۵/۱ مال کی وصیت کرنے والا چہارم مال کی وصیت کرنے والے سے افضل ہے، الحدیث، رواہ البیہقی۔

نکتہ :- اس آیت میں اللہ نے وصیت اور قرض کو عدم ضرر کے ساتھ مشروط کیا اور پہلی آیت میں یہ قید نہیں لگائی حالانکہ وہاں بھی یہ قید ضروری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرابت توالد یا علاقۂ زوجیت کا خود تقاضا ہے کہ وصیت یا اقرار دین سے اس کو ضرر نہ پہنچایا جائے ہاں اخیافی رشتہ دار چونکہ قریبی قرابت نہیں رکھتے اس لئے ان کے معاملہ میں احتمال ہو سکتا تھا کہ کہیں وصیت کرنے اور اقرار قرض کرنے میں ان کو ضرر پہنچانے کا جذبہ کار فرما ہو اس لئے اس جگہ قید لگا دی۔

فصل :- وصیت کی مختلف قسمیں ہیں۔ واجب، مستحب، مباح، حرام اور مکروہ۔ اگر میت قرض دار ہو یا اس پر زکوٰۃ یا منت یا حج فرض یا فوت شدہ نماز یا روزہ واجب الادا ہو تو اس وقت قرض اور زکوٰۃ وغیرہ کو ادا کرنے اور نماز روزہ وغیرہ کا فدیہ دینے کی وصیت کرنا واجب ہے پس اس کے کل ترکہ سے قرض ادا کیا جائے اور قرض میں بھی اس قرض کی ادائیگی مقدم ہے جس کا سبب متعین معلوم ہو یہ قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ہر قسم کا قرض برابر ہے معلوم السبب ہو یا مجہول السبب، قرض کے علاوہ ہر قسم کی وصیت تہائی ترکہ سے پوری کی جائے گی (زیادہ کی وصیت نا قابل تعمیل ہے) اس قسم کی (واجب) وصیت کی طرف سے غفلت کرنا جائز نہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان آدمی پر کوئی حق ہو جس کی اس کو وصیت کرنا ہے اس کے لئے درست نہیں کہ دو راتیں بھی بغیر تحریر وصیت کے گزارے، صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ مسلم کی روایت میں دو راتوں کی جگہ تین راتوں کا لفظ بھی آیا ہے۔

جس پر کوئی حق واجب نہ ہو اس کے لئے ۱۰/۱ سے ۳/۱ ترکہ تک خیرات کرنے کی وصیت کرنا مستحب ہے بشرطیکہ اس کے وارث غنی ہوں اس کا ثبوت گذشتہ احادیث سے ملتا ہے اور اگر وارث نادار ہوں تو ایسی حالت میں وصیت اور خیرات کرنا مکروہ تنزیہی ہے ترک وصیت اولیٰ ہے ترک وصیت میں اقارب کے لئے اس کا مال میراث ہو گا اور خیرات بھی رسول اللہ ﷺ

marfat.com

نے فرمایا کسی (غیر) مسکین کو خیرات دینا خیرات ہے اور کسی قرابت دار کو خیرات دینا خیرات بھی ہے اور صلہ رحم بھی، رواہ احمد و الترمذی وابن ماجہ والدارمی۔ جس وصیت سے وارثوں کو ضرر پہنچانا مقصود ہو یا ضرر پہنچ رہا ہو ایسی وصیت حرام ہے۔

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ یہ یوصیکم کا مفعول مطلق تاکیدی ہے یا مضار کا مفعول بہ ہے یعنی اللہ نے جو حکم دیدیا ہے کہ تہائی ترکہ سے زائد وصیت نہ ہو یا اولاد اور زوجین واقارب (قریبہ) کیلئے وصیت نہ ہو اس حکم کو ضرر نہ پہنچایا جائے نہ وصیت کی شرعی حدود سے تجاوز کر کے نہ جھوٹے قرض کا اقرار کر کے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ اور اللہ ضرر پہنچانے والے کو خوب جانتا ہے۔

حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ (مگر وہ) حلیم بھی ہے اس لئے عذاب میں جلدی نہیں کرتا۔

تِلْكَ یہ یتیموں اور وصیتوں اور میراثوں کے تمام احکام۔

حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ اللہ کے قائم کئے ہوئے ضوابط ہیں ان کی حدود سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔

۲۴۷ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾
۱۲ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی پوری اطاعت کرے گا اللہ اس کو ایسی جنتوں میں لے جائے گا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ہی بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا (یعنی حکم کا انکار کرے گا) اور اس کے ضابطوں سے ہٹ جائے گا وہ اس کو آگ میں لے جائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ذلت آفریں عذاب ہو گا۔

چونکہ لفظ مَنْ مفرد ہے اس لئے ضمیر مفرد مذکر اور خَالِدًا حال بصیغہ مفرد مذکر ذکر کیا لیکن معنی کے لحاظ سے مَنْ جمع ہے اس لئے خَالِدِيْنَ حال بصیغہ جمع مذکر ذکر کیا۔ واللہ اعلم۔

حقیقی اور علاتی بہن بھائی کا ذکر اس سورت کے آخر میں آئے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ فرائض کے مسائل اس جگہ پر سیر حاصل طور پر بیان کریں۔

"مسئلہ عول"

اگر اہل فرائض کے حصے ترکہ کے سہام سے زائد ہوں تو لا محالہ ہر حصے والے کے حصہ میں اس کے حصہ کے تناسب سے کچھ کمی کی جائے گی اور اس طرح تمام اہل فرائض کو ان کا حصہ (کچھ کمی کے ساتھ) دیدیا جائے گا ایسے مسئلہ کو عائلہ (اور ایسا عمل کرنے کو عول) کہتے ہیں۔ عول کا معنی ہے موڑنا جھکانا چونکہ اہل فرائض میں باہم تعارض ہوتا ہے اور کسی ایک کے مقررہ حصہ کو دوسرے کو مقررہ حصہ پر ترجیح نہیں دی جاسکتی اس لئے ترکہ کے اندر مقرر کئے ہوئے سہام کو (اصل تعداد سے) موڑ کر کچھ بڑھا دیا جاتا ہے۔ عول کی وجہ تسمیہ یہی ہے اس کے علاوہ میراث کو قرض پر بھی قیاس کیا جاتا ہے (اگر قرض خواہ متعدد ہوں جن کے لئے ترکہ کافی نہ ہو تو قرض کے تناسب سے ہر قرض خواہ کے حق میں کچھ کمی کر کے دیا جاتا ہے اور قرض کے مناسب ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عول پر اجماع منعقد ہوا تھا آپ کی خدمت میں ایک مسئلہ پیش ہوا کہ ایک عورت شوہر اور دو بہنوں کو چھوڑ کر مری تو تقسیم کس طرح ہو گی (شوہر کو نصف ترکہ کا اور دو بہنوں کو دو تہائی ترکہ کا حق ہے نصف اور دو تہائی مل کر کل ترکہ سے ۱/۶ بڑھ جاتا ہے پھر تقسیم کیسے ہو، مثلاً مسئلہ کی تصحیح ۶ سے کی گئی تو ۳ شوہر کے اور ۴ بہنوں کے ہونا چاہئے اور ان دونوں کا مجموعہ ۷ ہوتا ہے گویا ۶ سے ایک زائد ہو گیا پھر چھ کو دونوں فریق پر کس طرح بانٹا جائے)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیا اور فرمایا دیکھو اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کا

marfat.com

ترکہ صرف چھ روپیہ ہو لیکن دو مستحق ہوں ایک تین روپیہ کا طلب گار ہو اور دوسرا چار روپیہ کا تو گیا کل مال کے سات حصے کر کے تقسیم نہیں کی جائے گی، صحابہؓ نے اس کی تائید کی اور آپ کے قول کے موافق عمل کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے اس کی مخالفت کی کسی نے پوچھا آپ علیہ السلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایسا کیوں نہیں کیا فرمایا ان کی ہیبت کی وجہ سے، وہ پُر ہیبت شخص تھے۔ لوگوں نے کہا جو رائے آپ کی جماعت کے ساتھ تھی ہم کو آپ کی اس انفرادی سے وہی زیادہ پسند ہے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جو شخص (صحراء عالج کے ذروں کو گن سکتا ہے وہ مال کو آدھا آدھا کرنے کے بعد پھر اسی میں سے ایک تہائی بھی نکالتا ہے (یہ کیسا حساب ہے) نصف اور نصف کرنے سے پورا مال ختم ہو جاتا ہے پھر تہائی مزید نکالنے کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ دریافت کیا گیا سب سے پہلے میراث کے مقررہ حصوں میں عول کس نے کیا تھا فرمایا حضرت عمرؓ نے، اس کے بعد پورا قصہ نقل کر دیا۔ پھر آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر اس کو حصہ میراث میں مقدم رکھا جائے جس کو اللہ نے مقدم رکھا ہے اور اس کو پیچھے رکھا جائے جس کو اللہ نے پیچھے رکھا ہے تو فرائض میں عول کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ حاکم نے بھی حضرت ابن عباسؓ کا یہی مقولہ نقل کیا ہے ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا فرائض میں مقدم کون ہے اور مؤخر کون ہے۔ فرمایا اللہ نے مقدم اس کو رکھا ہے کہ جب اس کا مقرر کردہ حصہ کچھ گرایا گیا تو بدلے ہوئے حصہ کی بھی مقدار مقرر کر دی اور پیچھے اس کو رکھا ہے کہ جب اس کے مقررہ حصہ کو بدلا تو پھر اس کے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں کیا بلکہ اگر کچھ بچ رہے تو اس کو دیدیا جائے گا ورنہ کچھ نہیں۔ مقدم فریضہ والے تو شوہر بیوی اور ماں ہے (کہ شوہر کا اصل حصہ نصف اور بیوی کا چہارم اور ماں کا تہائی ہے لیکن اگر میت کی اولاد ہو تو نصف بدل کر چہارم اور چہارم بدل کر آٹھواں اور تہائی بدل کر چھٹا ہو جاتا ہے) اور مؤخر فریضہ والی بیٹیاں اور بہنیں ہیں (کہ ان کا اصل حصہ تو ایک بیٹی کے لئے یا ایک بہن کے لئے نصف ہے اور دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں تو دو تہائی ہے اور ایک بیٹی ایک بہن کے ساتھ ہو تو بیٹی کا نصف اور بہن کا چھٹا حصہ ہے لیکن جب بیٹیاں یا بہنیں اپنے بھائی کے ساتھ ہوں تو ان کا حصہ مقرر نہیں رہتا بلکہ یہ عصبہ ہو جاتی ہیں) اب اگر وہ وارث بھی ہوں جن کو اللہ نے مقدم رکھا اور وہ وارث بھی جن کو اللہ نے پیچھے رکھا ہے تو مقدم وارثوں کا پورا حصہ دیا جائے گا اور اگر کچھ باقی رہے گا تو بیٹیوں اور بہنوں کو دیا جائے گا ورنہ کچھ نہیں۔ محمد بن حنفیہ کا قول بھی اس مسئلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موافق ہے۔

مسئلہ:- اجماع صحابہؓ ہے کہ اہل فرائض کے مقررہ حصے دینے کے بعد جتنا مال باقی رہے گا وہ اس مرد کو دیا جائے گا جس کی قرابت میت سے سب سے زیادہ ہو گی جیسا کہ حدیث مذکورہ بالا میں آچکا ہے ایسے شخص کو عصبہ کہتے ہیں اگر اہل فرض نہ ہو تو عصبہ کل مال کا وارث ہوتا ہے۔ میت کا قریب ترین قرابت دار اس کا بیٹا ہوتا ہے بیٹے کے بعد پوتا، اسی طرح نیچے تک تمام نرینہ نسل کا درجہ ہے۔ نرینہ نسل کے بعد قریب ترین شخص باپ ہے، پھر دادا، پھر پردادا۔ اسی طرح نرینہ سلسلہ کی اصل کا حسب ترتیب مرتبہ ہے۔ پھر حقیقی بھائی کا پھر علاتی بھائی پھر حقیقی بھائی کے بیٹے کا، پھر علاتی بھائی کے بیٹے کا، اسی طرح باپ کی نرینہ نسل کی ترتیب نیچے تک دی جائے گی۔ پھر دادا کے حقیقی بھائی کا پھر اس کے علاتی بھائی کا پھر دادا کے حقیقی بھائی کے بیٹے کا پھر دادا کے علاتی بھائی کے بیٹے کا اسی طرح پردادا کی نسل نیچے تک جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حقیقی بھائی باہم وارث ہوتے ہیں (یعنی عصبہ ہوتے ہیں) ان کی موجودگی میں علاتی بھائی وارث نہیں ہوتے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ والحاکم۔ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں صرف مقاسمۃ الجد کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔

مسئلہ:- علماء کا اجماعی قول ہے کہ جن عورتوں کے لئے ایک ہونے کی حالت میں نصف اور دو ہونے کی حالت میں دو تہائی مقرر ہے وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ ہو جاتی ہیں اہل فرض نہیں رہتیں۔ کیونکہ اولاد (مذکر و مونث اگر مخلوط ہوں) اور بھائیوں بہنوں کے لئے اللہ نے فرمایا ہے للذکر مثل حظ الانثیین اور جو عورتیں اہل فرض نہیں ہیں اور ان کا

marfat.com

بھائی عصبہ ہے تو ایسی عورتیں بھائی کے ساتھ مل کر بھی عصبہ نہیں ہوتیں جیسے پھوپھی اور بھتیجی
مسئلہ :- باجماع اہل فرائض آخری عصبہ مولیٰ عتاقہ ہے (اگر کسی آقا نے غلام کو آزاد کر دیا تو اس آقا کو مولیٰ عتاقہ کہا جاتا ہے۔ آزاد شدہ غلام اگر مر جائے تو سب سے پہلے اس کے وارث اس کے اہل فرائض ہوں گے پھر وہ رشتہ دار وارث ہوں گے جو رشتہ میں عصبہ ہیں پھر نسبی عصبات نہ ہوں گے تو عصبہ سببی یعنی مولیٰ عتاقہ وارث ہوگا)۔

بیہقی اور عبد الرزاق نے لکھا ہے کہ ایک آدمی دوسرے شخص کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے اس کو خرید کر آزاد کر دیا اس کی میراث کا کیا حکم ہے فرمایا اگر یہ (نسبی) عصبہ چھوڑے گا تو (اہل فریضہ کے بعد) عصبہ سب سے زیادہ مستحق ہوگا ورنہ حق آقائی (یعنی آزاد شدہ غلام کی میراث) تجھے ملے گا۔ صحیحین میں ہے کہ حق آقائی اس کا ہے جس نے آزاد کیا ہو پھر مولیٰ عتاقہ کے عصبات کو حق آقائی حاصل ہے اور عورتوں کے لئے صرف انہی غلاموں کا حق آقائی ہے جن کو انہوں نے آزاد کیا ہو یا ان کے آزاد کردہ غلاموں نے آزاد کیا ہو۔

نسائی اور ابن ماجہؒ نے بنت حمزہؓ کی حدیث کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ بنت حمزہؓ نے کسی غلام کو آزاد کیا۔ آزادی کے بعد وہ غلام مر گیا، اور اس کی ایک بیٹی اور آزاد کرنے والی بی بی رہ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا آدھا مال اس کی بیٹی کو اور آدھا بنت حمزہؓ کو دلوا دیا۔ دار قطنی اور طحاوی نے اس حدیث کو مرسلاً بیان کیا ہے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ تمام راویوں کا متفقہ قول ہے کہ آزاد کرنے والی بنت حمزہؓ تھی بنت حمزہؓ کا باپ نہ تھا اس مبحث کی ایک روایت حضرت ابن عباسؓ کی بھی آئی ہے جس کو دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ :- اہل فرائض کے حصے دینے کے بعد اگر کچھ مال بچ رہے اور عصبات نہ ہوں تو لوٹا کر پھر اہل فرائض کو ان کے حصوں کے تناسب سے بانٹ دیا جائے گا مگر شوہر اور بیوی کو لوٹا کر دوبارہ کچھ نہیں دیا جائے گا یہ قول امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا ہے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک بقیہ مال اہل فرائض کو دوبارہ نہیں دیا جائے گا بلکہ بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔ متأخرین شافعیہؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ بیت المال کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ بقول قاضی عبد الوہاب مالکی، ابو الحسن نے بیان کیا کہ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ غنی، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ بقیہ مال کا وارث نہ ذوی الارحام (وہ رشتہ دار جو نہ اہل فرائض ہیں نہ عصبہ) کو قرار دیتے تھے نہ اہل فرائض کو دوبارہ تقسیم کراتے تھے۔ ابو الحسن نے کہا یہ روایت صحیح ہے طحاوی نے اپنی سند سے ابراہیم (نخعی) کا مقولہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عبد اللہؓ ذوی الارحام کو وارث قرار دیتے تھے۔ راوی کا بیان ہے میں نے کہا کہ کیا حضرت علی بھی ایسا کرتے تھے ابراہیم نے کہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ تو اس امر میں بہت سخت تھے۔

طحاوی نے دو طریقوں سے سوید بن غفلہ کا بیان نقل کیا ہے، سوید نے کہا ایک شخص مر گیا اس کی ایک لڑکی ایک بیوی اور اس کو آزاد کرنے والا ایک مرد پسماندگان کی فہرست میں رہے میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ مسئلہ حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش ہوا آپ نے لڑکی کو نصف ترکہ اور بیوی کو ۸/ ا دیا اور جو باقی رہا وہ بھی لڑکی کو دوبارہ دیدیا مولیٰ (آزاد کرنے والے آقا) کو کچھ نہیں دیا۔ ابو جعفر کا مقولہ دو سلسلوں سے منقول ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، (عطاء فرائض کے بعد) باقی مال بھی ان قرابتداروں کو دلواتے تھے جو اہل فریضہ ہوتے تھے۔

طحاوی نے اپنی سند سے مسروق کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر چند اخیافی بھائی ہوں اور ماں ہو تو تقسیم میراث کس طرح کی جائے آپ نے بھائیوں کو ایک تہائی اور ماں کو باقی کل مال دلوا دیا۔ اور فرمایا جس کا کوئی عصبہ نہ ہو تو ماں اس کی عصبہ ہے۔ آپ ماں کی موجودگی میں اخیافی بھائیوں کو لوٹا کر باقی مال میں سے کچھ نہیں دیتے تھے نہ حقیقی بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو دوبارہ کچھ دیتے تھے نہ حقیقی بہن کے ساتھ علاتی بہنوں پر مال کو رد کرتے تھے اور نہ بیوی اور شوہر اور دادا کو فریضہ مقررہ سے زائد (بطور رد) کچھ دیتے تھے۔ طحاوی نے لکھا ہے کہ ہماری نظر میں حضرت علیؓ کا مسلک صحیح ہے حضرت ابن

marfat.com

مسعودؓ کا قول ہمارے ہمارے لئے جاذب نہیں یعنی ذوی الفروض کو بقیہ میراث ان کے حصوں کے مطابق لوٹا کر دی جائے اور دور کے رشتہ والے پر قریب کے رشتہ دار کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ سب کو انکے حصوں کے موافق دیا جائے کیونکہ قرابت داروں کے جو حصہ مقرر کئے ہیں ہم نے دیکھا کہ وہ سب اپنی مختلف قرابتوں کے لحاظ سے وارث ہیں اور کوئی بھی اپنے قربِ قرابت کی وجہ سے دور کی قرابت والے سے استحقاق میراث میں اولیت کا حامل نہیں ہے یہی مسلک امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کا ہے۔

مسئلہ :- اجماع علماء ہے کہ جب کسی شخص میں دو جہتیں جمع ہو جائیں، اہل فرض بھی ہو اور عصبہ بھی تو دونوں کا لحاظ کیا جائے گا۔ مثلاً ایک عورت مر گئی اس کے تین چچا کے بیٹے رہے (تینوں کا شمار عصبات میں ہے) لیکن اس کا اخیافی بھائی بھی ہے اور دوسرا اس کا شوہر ہے، تو اخیافی بھائی کو اس کا فریضہ یعنی ۱/۶ ادیا جائے گا شوہر کو نصف ملے گا اور باقی مال تینوں کو عصبہ ہونے کی وجہ سے برابر برابر دیدیا جائے گا۔ مسئلہ کے ابتدائی سہام ۶ ہوں گے اور تصحیح ۱۸ سے کی جائے گی جن میں ۵ اخیافی کے ۱۱ شوہر کے اور ۲ صرف عصبہ کے ہوں گے (کیونکہ شوہر کا فریضہ ۱۸ میں سے نو ہے اور ۲ عصبہ ہونے کی جہت سے ملا کر کل ۱۱ ہو گئے اور اخیافی کے فریضہ کے ۳ ہیں اور دو عصبہ ہونے کی جہت سے ملا کر ۵ ہو گئے اور تیسرے کی جہت صرف عصبہ ہونے کی ہے اس لئے اس کو صرف ۲ ملیں گے)۔

اگر کسی شخص کو دو طرف سے فریضہ کا استحقاق ہو تو یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک تو قوی ترین قرابت کا لحاظ کیا جائے گا اور ضعیف قرابت قابل ترک ہو گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک دونوں استحقاق معتبر رہیں گے اور دونوں قرابتوں کا حصہ اس کو دیا جائے گا۔ اس قسم کی صورت صرف دو مسئلوں میں پیش آسکتی ہے، ایک تو صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی محرم عورت سے وطی شبہ میں کر لے اور پھر مر جائے (تو اس عورت کا دوہرا استحقاق ہو جاتا ہے) دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی مجوسی کسی محرم عورت سے نکاح کرے پھر مسلمان ہو جائے اور مر جائے مثلاً کسی مجوسی نے اپنی بیٹی (پروین) سے نکاح کیا اور لڑکی (زرینہ) پیدا ہوئی پھر اس نواسی (زرینہ) سے بھی نکاح کر لیا اور اس سے لڑکا پیدا ہوا (سہراب) پس زرینہ سہراب کی ماں بھی ہے اور باپ کی لڑکی یعنی علاتی بہن بھی، اور پروین، سہراب کی نانی ہے اور علاتی بہن بھی۔

مسئلہ :- اس پر تو علماء کا اجماع ہے کہ شوہر اور بیوی کو چھوڑ کر باقی اہل فرائض میں سے کوئی ایک بھی موجود ہو گا یا عصبات میں سے اگر ایک شخص بھی ہو گا تو ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن (باستثناء زوجین) اگر کوئی اہل فرض بھی نہ ہو اور عصبہ بھی نہ ہو تو ذوی الارحام کی میراث میں اختلاف رائے ہے۔ ہاں صرف سعید بن مسیب قائل ہیں کہ (باوجودیکہ ماموں ذوی الارحام میں سے ہے اور بیٹی اہل فرض ہے مگر) بیٹی کی موجودگی میں ماموں کو بھی میراث ملے گی۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ ذوی الارحام کو وارث قرار دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی مسلک منقول ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ ذوی الارحام کو وارث نہیں مانتے اور (عصبہ نہ ہونے کی صورت میں بقیہ) کل مال بیت المال میں داخل کراتے ہیں۔ علماء کا قول ہے کہ یہی مسلک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، زہریؒ اور اوزاعیؒ کا بھی منقول ہے، متأخرین شافعیہ کا فتویٰ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ذوی الارحام کو وارث بنانے کے سلسلہ میں اللہ نے فرمایا ہے واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے خطبہ میں فرمایا یہ آیت ذوی الارحام کے متعلق نازل ہوئی کہ ذوی الارحام میں بعض بعض سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ مخالفین نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ تمہارے قول کی کوئی دلیل نہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ اہل جاہلیت منہ بولے بیٹے کو بھی میراث دیتے تھے جیسے رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بنؓ حارثہ کو بیٹا بنالیا تھا اسی طرح کچھ لوگ آپس میں معاہدہ کر لیتے تھے کہ ایک دوسرے کا وارث ہو گا اس کی تردید میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی تاکہ میراث ذوی الارحام (قرابتداروں) ہی کی طرف لوٹ جائے اور (بنائے ہوئے بیٹوں کے متعلق) فرمایا ادعوهم لاٰبائهم هو اقسط عند اللہ۔ آیت میں اولوا الارحام سے مراد ہیں ذوی الفروض اور عصبات۔

marfat.com

ہم کہتے ہیں کہ آیت کا نزول اگر اسی سلسلہ میں مان لیا جائے جو آپ نے بیان کیا تب بھی اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں ہوتا اور اولوا الارحام کا لفظ عام ہے ذوی الفروض کو بھی شامل ہے اور عصبات کو بھی اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی۔

بعض احادیث سے بھی ہمارے قول کا ثبوت ملتا ہے، حضرت امامہ بن سہل کی روایت ہے کہ ایک شخص کے تیر لگا وہ مر گیا اور ماموں کے سوا اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا آپ نے جواب میں لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، جس کا کوئی وارث (زندہ) نہ ہو اس کا ماموں وارث ہے۔ رواہ احمد والبزاز۔ طحاوی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے اور جس کا کوئی وارث نہ ہو (اور ماموں موجود ہو) تو ماموں اس کا وارث ہے۔

حضرت مقدام بن معد یکرب کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا کوئی وارث نہ ہو، ماموں اس کا وارث ہے وہ اس کا وارث ہوگا اور اس کی طرف سے دیت دے گا۔ رواہ احمد وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ والحاکم وابن حبان، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے ابن ابی حاتم نے ابوزرعہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے لیکن بیہقی نے اس کو مضطرب قرار دیا ہے۔

طحاوی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کے لئے ہے اور میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کی طرف سے دیت ادا کروں گا اور اس کا وارث ہوں گا اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو وہ اس کے مال کا وارث ہوگا اور اس کی دیت بھی دے گا۔ دوسری روایت میں ہے میں اس کا وارث ہوں گا اور اس کی جان چھڑاؤں گا اور جس کا کوئی وارث نہ ہو ماموں اس کا وارث ہوگا اس کا مال بھی اس کی جان بھی چھڑائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے جو فرمایا کہ میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مال بیت المال کا ہے اور رسول اللہ ﷺ بیت المال کے متولی تھے۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ رواہ الترمذی والنسائی والطحاوی۔ نسائی نے اس حدیث کو مضطرب اور دار قطنی نے راجح اور بیہقی نے موقوف کہا ہے۔ حضرت واسع بن حبان کا بیان ہے کہ ثابت بن وحداح کا انتقال ہو گیا، ثابت باہر سے آیا ہوا تھا اس کے اصل (خاندان) کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے عاصم بن عدی سے فرمایا کیا تم کو اپنے (گروہ کے) اندر اس کا نسب معلوم ہے، عاصم نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ ﷺ (مجھے نہیں معلوم) حضور ﷺ نے ثابت کے بھانجے ابولبابہؓ بن منذر کو بلوا کر ثابت کی میراث اس کو دیدی رواہ الطحاوی۔

حضرت عمر بن خطابؓ کے چند آثار طحاوی نے نقل کئے ہیں کہ پھوپھی اور خالہ کو آپ ﷺ نے وارث قرار دے کر پھوپھی کو دو تہائی اور خالہ کو ایک تہائی دیا۔ پھوپھی کی قرابت باپ سے ہوتی ہے اس لئے اس کو دہرا اور خالہ کی قرابت ماں سے ہوتی ہے اس لئے اس کو اکہرا حصہ دیا جو لوگ ذوی الارحام کو وارث نہیں کہتے وہ اپنی دلیل میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا جب تک جبرئیلؑ نہ آئیں مجھے نہیں معلوم، کچھ دیر کے بعد فرمایا پھوپھی اور خالہ کی میراث کا مسئلہ پوچھنے والا کہاں ہے وہ شخص حاضر ہو گیا۔ فرمایا جبرئیلؑ نے مجھے خاموشی سے بتادیا ہے کہ ان دونوں کے لئے کچھ نہیں ہے رواہ الدار قطنی۔ یہ حدیث ضعیف ہے اسناد میں مسعدہ عن محمد بن عمرو ہے جو ضعیف ہے بلکہ جھوٹی حدیثیں بنانے والا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا ہم نے اس کی حدیث کو آگ لگادی۔ حاکم نے یہ حدیث عبداللہ بن دینار عن ابن عمر بیان کی ہے اور اس کو صحیح بھی کہا ہے مگر اس کی سند میں عبداللہ بن جعفر مدنی ہے جو ضعیف ہے۔ حاکم نے ایک اور حدیث اس کی شاہد بھی بیان کی ہے۔ شریک بن عبداللہ کا بیان ہے کہ حارث بن ابی عبیدؒ نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے متعلق دریافت کیا گیا الخ۔ اس سند میں سلیمان بن داؤد واقع ہے جو متروک ہے۔ دار قطنی نے شریک کی وساطت کے بغیر دوسرے طریقہ سے اس حدیث کو مرسلاً بیان کیا ہے۔

marfat.com

زید بن اسلم نے عطاء بن یسار کی روایت سے بیان کیا کہ ایک انصاری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ایک شخص مر گیا اور ایک پھوپھی اور خالہ چھوڑ گیا۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت اپنے گدھے پر چڑھ رہے تھے یہ بات سن کر رک گئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا اے اللہ ایک آدمی مر گیا اور اپنی پھوپھی اور خالہ کو چھوڑ گیا، اس شخص نے دوبارہ سوال کیا آپ ﷺ نے دوبارہ ایسا ہی کہا، اس نے تیسری بار پوچھا آپ نے تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی کیا، پھر فرمایا ان دونوں کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس حدیث کو طحاوی نے چند طریقوں سے بیان کیا ہے اور نسائی و دار قطنی نے بھی نقل کیا ہے حدیث مرسل ہے۔ ابو داؤد نے مراسیل میں اس کو لکھا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں موصولاً بروایت ابو سعید بیان کیا ہے لیکن اس کی سند میں ضعف ہے طبرانی نے صغیر میں محمد بن حارث مخزومی کی سوانح کے ذیل میں اس حدیث کو موصولاً ابو سعیدؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اس سلسلہ میں بھی کوئی دوسرا شخص سوائے ابو سعیدؓ کے قابل نظر نہیں۔

احادیث مختلفہ کو باہم مطابق اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ آیت واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ کے نزول سے پہلے جب حضور ﷺ سے پھوپی اور خالہ کی میراث کا مسئلہ پوچھا گیا تو چونکہ اس وقت تک ذوی الارحام کے متعلق کچھ نازل نہیں ہوا تھا اس لئے آپ نے فرمادیا کہ ان کے لئے کچھ نہیں ہے پھر جب ذوی الارحام کی میراث کا حکم نازل ہو گیا تو آپ نے فرمایا ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو، واللہ اعلم۔

مسئلہ :- ذوی الارحام کی چار قسمیں ہیں (۱) میت کی نسل (۲) میت کی اصل (۳) میت کی اصل قریب کی نسل (۴) میت کی اصل بعید کی نسل۔ نمبر اول نمبر دوم کو وارث ہونے سے روک دیتا ہے اور نمبر دوم نمبر سوم کو اور نمبر سوم نمبر چہارم کو (یعنی نمبر چہارم کو اس وقت میراث ملے گی جب نمبر سوئم بھی نہ ہو اور نمبر سوئم اس وقت وارث ہو گا جب نمبر دوم بھی نہ ہو اور نمبر دوم کا استحقاق اس وقت ہو گا جب نمبر اول نہ ہو) ہر صنف میں جو میّت سے زیادہ قریب ہو گا وہ دور والے کو میراث پانے سے روک دے گا اگر قرب میں سب برابر ہوں تو میّت سے جس کا رشتہ کسی وارث کے ذریعہ سے ہو گا وہ اس شخص کو روک دے گا جس کا میّت سے رشتہ کسی ذی رحم کے ذریعہ سے ہو گا بھائی بہن چچا چچی ماموں اور خالہ کی نسل میں قوتِ قرابت کا لحاظ ہوتا ہے بشرطیکہ دائرۂ قرابت سب کا ایک ہو مثلاً حقیقی چچا کی لڑکی باپ کے علاتی بھائی کی لڑکی سے اولیٰ ہوتی ہے اگر دائرۂ قرابت مختلف ہو تو قوتِ قرابت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا جیسے باپ کی علاتی بہن اور ماں کی حقیقی بہن کوئی بھی دوسری کے لئے حاجب نہیں ہے۔ ترکہ کے تین حصے کر کے دو تہائی باپ کی قرابت والی کو اور ایک تہائی ماں کی قرابت والی کو دیا جاتا ہے، طحاوی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر اسی طرح نقل کیا ہے۔

جس کی قرابت دو جہت سے ہو اس کا حصہ ایک جہت کی قرابت والے سے دگنا ہو گا۔

ذوی الارحام میں امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور حسنؒ بن زیاد کے نزدیک (تعدد جہات کا اعتبار نہیں بلکہ) اشخاص کا اعتبار ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک اشخاص کے ساتھ ساتھ کیفیت رشتہ بھی قابل لحاظ ہے (مثلاً اگر ایک دور رشتہ والی ہو اور ایک کا میّت سے رشتہ اکہرا ہو تو امام صاحبؒ کے نزدیک ترکہ آدھا آدھا تقسیم کر دیا جائے گا اور امام محمدؒ کے نزدیک کل ترکہ کے تین حصے کر کے دو حصے دو قرابت والی کو اور ایک حصہ ایک قرابت والی کو دیا جائے گا) اس جگہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

مسئلہ :- اجماعی فیصلہ ہے کہ قتل عمد قاتل کو مقتول کی میراث سے محروم کر دیتا ہے اسی طرح قتل خطاء بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مانع میراث ہے، امام مالکؒ کے نزدیک قتل خطاء کا مرتکب مقتول کے مال کا وارث ہو گا لیکن جو دیت خود ادا کرے گا اس میں بطور ارث قاتل کا کوئی حصہ نہ ہو گا، ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا عام فرمان ہے کہ قاتل وارث نہیں ہوتا، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے یہ حدیث ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی اسحاق بن عبد اللہ ہردی ہے جو متروک الحدیث ہے، نسائی اور دار قطنی نے ایسی ہی حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت سے بیان کی ہے اور بیہقیؒ و دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے۔

marfat.com

امام مالکؒ نے اپنے قول کے ثبوت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا دو (مختلف) مذہبوں والے باہم وارث نہیں ہونگے بیوی اپنے شوہر کی دیت کی بھی وارث ہو گی اور اس کے مال کی بھی اور شوہر اپنی بیوی کی دیت کا بھی وارث ہو گا اور اسکے مال کا بھی، بشرطیکہ ایک نے دوسرے کو قتل نہ کیا ہو اگر ایک نے دوسرے کو عمداً قتل کیا ہو تو قاتل مقتول کی دیت کا وارث نہ ہو گا، رواہ الدار قطنی، اس سند میں حسن بن صالح راوی مجروح ہے۔

دوسری حدیث امام مالکؒ نے یہ بیان کی کہ ہشام بن عروہ نے بروایت عروہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی اپنے ولی (قرابت دار مورث) کو خطاءً قتل کر دے وہ اس کے مال کا وارث ہو گا اور (اپنی دی ہوئی) دیت کا وارث نہ ہو گا۔ اس سند میں ایک راوی مسلم بن علی ہے جس کے متعلق یحییٰ نے کہا کہ وہ کچھ نہیں ہے اور دار قطنی نے کہا وہ متروک الحدیث ہے۔ دار قطنی نے مرسلاً سعید بن مسیب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) قاتل عمداً ہو یا خطاءً دیت کا وارث نہ ہو گا۔ رواہ ابو داؤد۔

ہم کہتے ہیں ان احادیث کے مفہوم سے پتہ چلتا ہے کہ قتل خطاء کا مرتکب مقتول کے ترکہ کا وارث ہو گا اور مفہوم ہمارے نزدیک قابل حجت نہیں۔ پھر یہ بات اصول کے بھی خلاف ہے کیونکہ قاتل جب مقتول کے ترکہ کا وارث ہو گا تو دیت کا کس طرح وارث نہ ہو گا۔ (دیت بھی ترکہ کا ایک حصہ ہے)۔

مسئلہ :- اجماعی فیصلہ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو گا اور نہ کافر مسلمان کا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے مسلمان کافر کا وارث نہیں اور نہ کافر مسلمان کا۔ اس حدیث کے راوی حضرت اسامہ بن زید ہیں۔ رواہ الشیخان واصحاب السنن الاربعۃ حضرت معاذؓ اور ابن مسیبؒ اور نخعیؒ کا قول اس طرح روایت میں آیا ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہو گا کافر مسلمان کا وارث نہ ہو گا جیسے اگر کوئی مسلمان کتابی عورت سے نکاح کر لے تو اس کا وارث ہو گا لیکن وہ اس کی وارث نہ ہو گی۔

امام احمدؒ نے عدم توارث کے قانون سے دو صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے ایک یہ کہ اگر آزاد شدہ غلام کافر ہو اور مر جائے تو اس کا حق ولاء مسلمان آقا کو مل جائے گا۔ حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ مسلمان نصرانی کا وارث نہیں ہوتا ہاں اگر وہ نصرانی اس کا غلام یا باندی ہو (تو وارث ہو جائے گا) رواہ الدار قطنی۔ دار قطنی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ باندی غلام سے وہ باندی غلام مراد ہیں جن کو تجارت کرنے کی آقا کی طرف سے اجازت ہو ایسے باندی غلام کا مال آقا کا ہوتا ہے اسی مال کو مجازاً میراث کہا ہے کیونکہ آزاد کردہ غلام تو غلام ہی نہیں ہوتا (اور حدیث میں لفظ عبد آیا ہے) دوسری استثنائی صورت یہ ہے کہ میت مسلمان ہو اور اس کے قرابتدار کافر ہوں لیکن تقسیم ترکہ سے پہلے مسلمان ہو جائیں اس وقت میراث کے مستحق ہو جائیں گے۔ دوسری روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک بھی میراث کے مستحق نہیں ہوں گے گویا اس صورت میں امام احمدؒ کا قول بھی جمہور کے موافق ہے۔ اول قول کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو حصہ جاہلیت کے زمانہ میں بانٹ دیا گیا وہ سابقہ تقسیم کے موافق رہے گا اور جو حصہ اسلام کے دور میں تقسیم ہوا وہ اسلامی تقسیم کے موافق ہو گا، رواہ ابو داؤد۔

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ جو میراث جاہلیت کے زمانہ میں بانٹ دی گئی وہ جاہلیت کی تقسیم پر رہے گی اور جو میراث دور اسلامی میں تقسیم ہوئی وہ اسلامی تقسیم پر ہو گی رواہ ابن ماجہ۔ لیکن دونوں حدیثوں میں امام احمدؒ کے قول کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی حالت میں اللہ کے قائم کردہ حصص کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔ جاہلیت کے نظام کے مطابق تقسیم نہیں ہو گی۔ عروہ بن زبیرؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان ہونے کے وقت جو چیز جس کی تھی وہ اسی کی ہے۔ علماء نے اس سے بھی امام احمدؒ کے قول پر استدلال کیا ہے مگر اس سے بھی کسی دلیل کا استنباط نہیں کیا جا سکتا۔ رواہ ابن الجوزی۔

مسئلہ :- یہودی نصرانی کا وارث ہو گا اور نصرانی یہودی کا اسی طرح الگ الگ ملت والے باہم وارث ہوں گے کیونکہ کفر

marfat.com

ایک ہی ملت ہے (خواہ کوئی فرقہ ہو) اور اصل میراث ہے۔ یہ مسلک امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا ہے۔ امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ایک فرقہ کا کافر دوسرے فرقہ کے کافر کا وارث نہیں ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے دو مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے، رواہ احمد والنسائی وابوداؤد وابن ماجہ والدار قطنی من حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ اس سند میں ایک راوی یعقوب بن عطاء ہے جو ضعیف ہے ابن حبان نے یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کی ہے اور ترمذی نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اس کو لکھا ہے اور روایت کو غریب کہا ہے اس سند میں ایک ضعیف راوی ابن ابی لیلیٰ ہے۔ بزاز نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کوئی ملت دوسری ملت کی وارث نہیں ہوگی اسکی سند میں عمرو بن راشد ہے جو لَیِّنُ الحَدِیث ہے۔

نسائی حاکم اور دار قطنی نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کی روایت سے انہی الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو لکھا ہے لیکن دار قطنی نے کہا ہے کہ حضرت اسامہؓ کی حدیث میں یہ الفاظ محفوظ نہیں ہیں عبدالحق کو وہم ہو گیا انہوں نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ مسلم کی طرف منسوب کیا ہے، بیہقی نے حضرتؓ اسامہ کی روایت کردہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوگا اور نہ کافر مسلمان کا اور نہ دو ملتوں والے باہم وارث ہوں گے اس سند میں خلیل بن مرہ ضعیف راوی ہے پھر یہ بات بھی ہے کہ دو ملتوں سے مراد اسلام اور کفر ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ :- اجماعی فیصلہ ہے کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ انبیاء کا ترکہ خیرات کا مال ہے جو مسلمانوں کے کاموں میں صرف کیا جانا چاہئے۔ اس فیصلہ کے مخالف صرف شیعہ ہیں جو حضرت ابو بکرؓ صدیق پر طعن کرتے ہیں کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کا ترکہ حضرت سیدہ فاطمہؓ کو نہیں دیا۔ شیعہ نے اعتراض کیا ہے کہ حدیث نحن معاشر الانبیاء لانورث ماترکناہ صدقۃ ہمارا انبیاء کا گروہ ہے ہم کسی کو اپنے مال کا وارث نہیں کرتے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ (عمومی) خیرات ہوتی ہے۔

یہ حدیث خبر واحد ہے اور آیت یوصیکم اللہ الخ کے مخالف ہے لہٰذا آیت پر خبر واحد کی ترجیح لازم آتی ہے پھر دوسری آیات کے بھی یہ حدیث خلاف ہے۔ ایک آیت ہے وورث سلیمان داؤد الخ سلیمان داؤد کے وارث ہوئے۔ دوسری آیت میں حضرت زکریاؑ کا قول نقل کیا رب ھب لی من لدنک ولیا یرثنی ویرث من ال یعقوب۔ یہ لوگ عجیب بے وقوف ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ حدیث ہمارے لئے آحاد میں سے ہے لیکن صدیق اکبرؓ نے جب اپنے کانوں سے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن لی تو متواتر سے بھی بڑھ گئی محسوس کا درجہ متواتر سے بڑھ کر ہے۔ پھر یہ کہنا کہ اس حدیث کو صرف حضرت ابو بکرؓ نے روایت کیا بجائے خود غلط ہے اس کی راوی تو صحابہؓ کی ایک جماعت ہے جن میں سے حضرت حذیفہؓ بن یمان حضرت ابو درداؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ بھی ہیں۔

بخاری نے بیان کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے سامنے جن میں حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، حضرت عمرؓ نے کہا میں آپ کو اس اللہ کی جس کے حکم سے آسمان و زمین قائم ہیں قسم دیتا ہوں کیا آپ کو علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا لانورث ماترکناہ صدقۃ ہم کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ خیرات ہے اس سے مراد حضور ﷺ کی اپنی ذات تھی سب صحابہؓ نے جواب دیا جی ہاں (ایسا فرمایا تھا) پھر حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (خصوصی) رخ موڑ کر کہا میں آپ دونوں صاحبوں کو اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا دونوں نے جواب دیا جی ہاں بیشک۔ الحدیث

ان تمام صحابہؓ کی روایات حدیث کی کتابوں میں صحت کے ساتھ مذکور ہیں۔ پس یہ حدیث ہمارے لحاظ سے بھی درجۂ شہرت تک پہنچ چکی ہے اور امت اسلامیہ نے بھی اس کو (بالاتفاق) قبول کیا ہے اور سب کا اس کی صحت پر اجماع ہو چکا ہے پھر شیعہ کی کتابوں میں بھی ایسی احادیث آئی ہیں جو اس حدیث کی تائید کرتی ہیں۔ محمد بن یعقوب رازی نے بروایت ابو البختری

marfat.com

حضرت ابو عبداللہ جعفر بن محمد صادق کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں اور یہ اس طرح کہ انبیاء نے نہ درہم کا کسی کو وارث کیا، نہ دینار کا بلکہ صرف اپنی احادیث کا وارث بنایا ہے جس کو ان احادیث کا کچھ حصہ بھی مل گیا اس کو پورا حصہ مل گیا (یعنی پوری میراث مل گئی) اس حدیث میں لفظ صرف حصر کے لئے ہے (مطلب یہ کہ انبیاء کی میراث مال نہیں ہوتا علم کے سوا ان کا کوئی ترکہ بطور میراث تقسیم نہیں کیا جاسکتا)۔

رہی آیت وورث سلیمان داؤد کا جواب، تو اس میں علم کی میراث مراد ہے آیت اسی پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ حضرت سلیمان نے فرمایا تھا یایہا الناس علمنا منطق الطیر اس آیت میں علمنا سے اسی علمی میراث کو بیان کیا ہے۔ حضرت زکریاؑ کی دعا میں بھی ایسے لڑکے کیلئے دعا ہے جو علمی میراث کا وارث ہو کیونکہ اس کا تو امکان ہی نہیں ہے کہ حضرت یحییٰ بن زکریاؑ تمام بنی اسرائیل کے مال کے وارث ہوتے ہاں علم کے وارث ہو سکتے تھے اور ہوئے تھے (اسی علمی میراث کی دعا حضرت زکریاؑ نے کی تھی) واللہ اعلم۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں کھلی بے حیائی کریں الفاحشة سے مراد ہے زناء اسی حکم میں عورت سے عورت کی زنا بھی داخل ہے کیونکہ لفظ عام ہے کسی غیر عورت سے لواطت کرنے کو بھی یہ لفظ شامل ہے۔

فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ پس (اے حکام الزام زنا، لگانے والوں سے) تم اپنے لوگوں میں سے چار گواہ طلب کرو یعنی چار مرد جو مؤمن ہوں اور فاسق نہ ہوں عورتوں کی شہادت زنا کے مقدمہ میں بالاجماع جائز نہیں۔ مرد شہادت دیں کہ ہم نے اس طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی۔

فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ اب اگر وہ (چاروں) شہادت دیدیں تو عورتوں کو گھروں کے اندر (قیدی کے طور پر) بند کردو۔

حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ یہاں تک کہ ان کو یعنی ان کی جانوں کو موت یعنی موت کے فرشتے لے لیں۔

اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکال دے یعنی کوئی شرعی حکم جاری کر دے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس جگہ لفظ اَوْ بمعنی اِلٰی اَنْ کے ہے (یعنی اس وقت تک قید رکھو کہ اللہ ان کے لئے کوئی جدید حکم جاری کرے) مسلم نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لو مجھ سے لو مجھ سے۔ عورتوں کے لئے اللہ نے راہ نکال دی ناکتحذا ناکتحذا سے کرے تو اس کے لئے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ سے کرے تو سو کوڑے اور سنگساری۔

فائدہ :- گھر میں بند کرنا کیا ایک طرح کی سزا تھی جو منسوخ ہوگئی یا حوالات تھی کہ حکم سزا ظاہر ہونے تک کے لئے تھی یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حکم سزا کے نزول تک اللہ نے بند رکھنے کا حکم دیا لیکن حکم سزا کے نزول کے بعد بھی یہ حکم منسوخ نہیں ہو گیا بلکہ باقی ہے تاکہ حوالات کے بعد (جب تحقیقات سے جرم ثابت ہو جائے تو) سزا دی جاسکے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ اصل میں مذکور ہے حاکم اس کو بند کر دے تاکہ گواہوں کے عادل یا فاسق ہونے کی انکوائری کرلے۔ زنا کی سزا کے مسائل ہم انشاء اللہ سورۂ نور میں ذکر کریں گے۔

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا تم میں سے جو دونوں فاحشہ یعنی زنا یا لواطت کا ارتکاب کریں تو دونوں کو دکھ پہنچاؤ۔ اکثر علماء کے نزدیک دونوں سے مراد دونوں زنا کرنے والے مرد اور عورت ہیں۔ اور اٰذُوْهُمَا کی تشریح میں عطا اور قتادہ نے کہا ان کو زبانی دکھ پہنچاؤ سخت سست کہو کہ تجھے اللہ سے شرم نہیں آتی تو اللہ سے نہیں ڈرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا زبان سے عار دلاؤ اور ہاتھ سے بھی دکھ پہنچاؤ جوتے مارو۔ اگر آیت میں زانی اور زانیہ مراد ہوں تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ آیت میں تو جس کی سزا تجویز کی تھی اور اس آیت میں ایذاء کا حکم دیا (کون سا حکم قابل عمل ہے اور دونوں

marfat.com

میں تطبیق کی کیا شکل ہے) اس اشکال کو دور کرنے کے لئے بعض علماء نے کہا کہ پہلی آیت میں کتخدا کی سزا کا بیان ہے اور اس آیت میں نا کتخدا کی سزا کا۔ بعض نے کہا کہ مؤخر الذکر آیت نزول میں مقدم الذکر آیت سے پہلے ہے پہلے زانی کی سزا ایذا مقرر کی پھر حبس پھر تازیانہ۔

میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ اَللَّذَانِ سے مراد (زانی اور زانیہ نہیں ہیں بلکہ) وہ دونوں مرد ہیں جو لواطت کے مجرم ہوتے ہیں یہی قول مجاہد کا ہے اس وقت اشکال دفع ہو جائے گا (کیونکہ پہلی آیت میں زانی اور زانیہ کی سزا کا ذکر ہے اور اس آیت میں اہل لواطت کی سزا کا) ایذا کی شرع میں کوئی حد مقرر نہیں ہے بمقدار اور کیفیت ایذاء امام (حاکم) کی تجویز پر موقوف ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے امام جیسا مناسب سمجھے دونوں کو تعزیر کرے بار بار سزا دینے کے بعد بھی اگر مجرم باز نہ آئیں تو امام دونوں کو قتل کرا سکتا ہے اس میں شادی شدہ اور کنوارے کی کوئی تفریق نہیں ہے سیاست کا جیسا تقاضا ہو ویسا کیا جائے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک حد مقرر نہیں بلکہ تعزیر کی جائے اور مرتے دم تک قید رکھا جا سکتا ہے اور اگر کوئی لواطت کا عادی ہو تو امام اس کو قتل کرا دے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک لواطت موجب حد شرعی ہے امام احمدؒ کے قوی قول میں اور امام شافعیؒ سے ایک قول میں اور امام مالکؒ کی رائے میں لواطت کی سزا سنگسار کر دینا ہے۔ شادی شدہ ہو یا کنوارہ۔ شافعیؒ کے دوسرے قول میں آیا ہے کہ تلوار سے اس کو قتل کر دیا جائے۔ صاحبینؒ کا اور امام احمدؒ کا ایک قول اور شافعیؒ کا قوی ترین قول یہ ہے کہ لواطت کی سزا زنا کی طرح ہے نا کتخدا کو کوڑے مارے جائیں اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے حقیقت کے اعتبار سے لواطت بھی ایک قسم کا زنا ہے یہ بھی کامل شہوت رانی ہے بلکہ زنا سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ فعل زنا کی حرمت تو نکاح سے ختم ہو جاتی ہے (اور لواطت کی حرمت کبھی ختم نہیں ہوتی) پس دلالت النص سے لواطت حکم زنا میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ بیہقی نے حضرت ابو موسیٰ کی مرفوع حدیث بھی بیان کی ہے کہ جب مرد مرد سے اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو دونوں زانی ہوتے ہیں لیکن اس حدیث کی سند میں ایک راوی محمد بن عبد الرحمٰن قشیری ہے جس کو ابو حاتم نے جھوٹا کہا ہے اور ابو الفتح ازدی نے اس کا شمار ضعفاء میں کیا ہے۔ طبرانی نے اس حدیث کو ایک اور سند سے حضرت ابو موسیٰ کی روایت سے بیان کیا ہے مگر اس سلسلہ میں ایک شخص بشر بن فضل بجلی مجہول ہے۔ یہ حدیث ابو داؤد نے اپنی مسند میں بھی نقل کی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے کہ لغتہً لواطت زنا کا ہم معنی نہیں ہے اسی لئے صحابہؓ کا اس کے موجب میں اختلاف ہے اور زنا کی نسبت سے اس جرم کا وقوع بھی کم ہوتا ہے کیونکہ دونوں طرف سے اس فعل کے ارتکاب کا جذبہ تو کار فرما ہوتا نہیں (صرف فاعل کا اقتضاء ہوتا ہے) لہٰذا لواطت زنا کے معنی میں نہیں ہے۔ جو علماء لواطت کو موجب حد شرعی کہتے ہیں ان کی دلیل حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو تم قوم لوط کا ایسا عمل کرتے پاؤ تو فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دو۔ رواہ احمد و ابو داؤد الترمذی و ابن ماجہ و الحاکم و البیہقی عن عکرمۃ عن ابن عباسؓ، ترمذی نے کہا حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت عکرمہ ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے، حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے، بخاری نے کہا کہ عکرمہ کا شاگرد عمرو بن ابی عمرو ہے تو سچا مگر عکرمہ کی طرف نسبت کر کے اس نے بہت سی منکرات نقل کی ہیں، نسائی نے بھی اس کو منکر قرار دیا اور کہا یہ قوی نہیں ہے۔ ابن معین نے اس کو ثقہ کہا ہے مگر جو حدیث اس نے بوساطت عکرمہ از ابن عباسؓ بیان کی ہے اس کو منکر کہا ہے ایک جماعت نے اس سے روایت کی ہے۔ حاکم نے دوسرے طریقوں سے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور جرح و تعدیل کی طرف سے خاموشی اختیار کی ہے البتہ ذہبی نے گرفت کی ہے کہ عبد الرحمٰن عمری ساقط الاعتبار ہے، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے مگر اس کی سند اول اسناد سے بھی زیادہ کمزور ہے حافظ نے کہا کہ ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث جو نقل کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

بزاز نے عاصمؒ بن عمر عمری کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے مگر عاصم متروک ہے، ابن ماجہ نے اپنے طریق سے ان

marfat.com

الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ اوپر اور نیچے والے کو سنگسار کرنے کا حکم دینے کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے نہیں ملتا ہاں اتنا حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا فاعل اور مفعول (دونوں) کو قتل کردو۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہمارے نزدیک صحیح خبر آحاد سے بھی کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں اور اس حدیث کی صحت تو محل تردد میں ہے اس لئے اس حدیث کی وجہ سے قتل کر دینے کا اس بنیاد پر فیصلہ کرنا کہ لواطت کی حد شرعی قتل ہے درست نہیں ہے کتاب اللہ سے صرف ایذاء ثابت ہے اور ہر تعزیر ایذا ہے۔

ایک شبہ :- آیت مذکورہ کا لواطت کے متعلق ہونا قطعاً ثابت نہیں بلکہ اکثر اہل تفسیر نے اس آیت کو زانی اور زانیہ کے متعلق قرار دیا ہے۔

ازالہ :- آیت کا ورود اگرچہ زانی کے سلسلہ ہی میں ہو مگر لفظ عام ہے کیونکہ فاحشہ کا لفظ جس طرح زنا کو شامل ہے اسی طرح لواطت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اللہ نے قوم لوط کے سلسلہ میں فرمایا ہے اتاتون الفاحشة ماسبقكم بهامن احد من العالمين۔

بحث لواطت کے متعلق صحابہؓ کے مختلف اقوال روایات میں آئے ہیں، بیہقی نے شعب الایمان میں ابن ابی الدنیا کے طریق سے محمد بن المنکدر کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو لکھا کہ اطراف عرب میں ایک مرد ہے جس سے عورت کی طرح جماع (یا نکاح) کیا جاتا ہے حضرت ابو بکرؓ نے صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ لیا تمام مشوروں میں حضرت علیؓ کا قول شدید ترین تھا آپ نے فرمایا یہ ایسا گناہ ہے کہ صرف ایک امت نے اس کا ارتکاب کیا تھا اور اللہ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کو آگ سے جلادیا جائے چنانچہ اس سزا پر سب صحابہ کا اتفاق رائے ہو گیا۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایسے مجرم کو بستی کی سب سے اونچی عمارت کی چوٹی سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا جائے اور اوپر سے سنگ باری کی جائے اس قول کا ماخذ یہ ہے کہ قوم لوط کو اسی طرح ہلاک کیا گیا تھا ان کی بستیوں کو اٹھا کر الٹا کر کے گرا دیا گیا تھا اور یقیناً جب انکو نیچے گرایا گیا تھا تو اوپر سے منہدم عمارتیں ان پر گری تھیں۔

حضرت ابن زبیرؓ کا قول منقول ہے کہ انتہائی بدبودار مکان میں دونوں کو بند کیا جائے یہاں تک کہ دونوں مر جائیں۔

بیہقی نے چند طریقوں سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے ایک لوطی کو سنگسار کرایا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث اور ان تمام اقوال کی وجہ جامع یہ صورت ہے کہ اگر کوئی شخص اس فعل کا عادی ہو بار بار اس سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہو اور تعزیر سے بھی باز نہ آیا ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے خواہ کسی طریقہ سے ہو۔ بار بار کرنے اور عادی ہو جانے پر حدیث کا لفظ یعمل دلالت کر رہا ہے فرمایا ہے من وجدتم يعمل عمل قوم لوط جس کو تم پاؤ کہ وہ قوم لوط کا عمل کیا کرتا ہے من عمل عمل قوم لوط نہیں فرمایا۔ یہی قول امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا پھر اگر وہ فاحشہ سے توبہ کر لیں اور اپنے عمل درست کر لیں یعنی توبہ کے بعد ان کے اعمال درست ہو جائیں۔

فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا ۚ تو پھر تم بھی ان سے کوئی تعرض مت کرو ان کو ایذاء دینی چھوڑ دو۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ توبہ کا لغوی معنی ہے لوٹنا بندہ کی توبہ کا معنی ہے گناہ سے لوٹنا اور اللہ کے توّاب ہونے کا معنی ہے ارادہ عذاب سے باز رہنا یا توبہ قبول کرنا یا توبہ کی توفیق عطا کرنا۔

رَّحِيمًا ⑯ مہربان ہے یعنی توبہ کرنے والوں پر رحم کرتا ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ توبہ قبول کرنا یا گناہ معاف کر کے ارادۂ عذاب سے باز رہنا۔

عَلَى اللَّهِ اللہ کے ذمہ یعنی اس ذمہ داری کے تحت جس کا اللہ نے خود وعدہ کر لیا ہے۔

marfat.com

لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کے ساتھ گناہ کرتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کا اتفاق رائے ہے اس امر پر کہ ہر گناہ خواہ قصداً ہو یا بلا قصد جہالت ہے جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ جاہل ہے۔ ابن جریر نے ابو العالیہ کا قول بھی یہی نقل کیا ہے۔ کلبی نے (بِجَهَالَةٍ کی تفسیر کرتے ہوئے) کہا کہ گناہ ہونے سے وہ ناواقف نہیں ہے مگر اس کے عذاب سے ناواقف ہے، بعض علماء نے جہالت کی تشریح میں کہا دوامی عیش کو چھوڑ کر عارضی فناپذیر لذت کو اختیار کرنا جہالت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نفس حیوانی کے جوش کے وقت اللہ کے عذاب سے غافل ہو جانا ہی جہالت ہے۔

ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ پھر قریب وقت میں ہی توبہ کر لیتے ہیں مِنْ قَرِيْبٍ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ قریب سے مراد یا یہ ہے کہ نیکیوں کو گناہ گھیر کر تباہ نہ کر چکے ہوں یا یہ مراد ہے کہ گناہ کی محبت دل کو چڑ نہ گئی ہو، دل پر گناہ کا ٹھپہ نہ لگ گیا ہو۔ زنگ نہ چڑھ گیا ہو، سدی اور کلبی نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ مرضِ موت میں مبتلا ہونے سے پہلے صحت کی حالت میں توبہ کی ہو۔ صحیح بات یہ ہے کہ قریب وقت میں توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موت کے سامنے آنے سے پہلے زندگی میں توبہ کر لی ہو یعنی عذاب کے فرشتوں کو دیکھنے سے پہلے توبہ کی ہو۔ عکرمہ اور ضحاک نے یہی تفسیر کی ہے اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے آیت اذا حضر احد هم الموت الخ (جس میں حضور موت کے وقت توبہ کو قبول کرنے کی نفی کی گئی ہے) اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان کہ غرغرہ ہونے سے پہلے اللہ بندہ کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم والبیہقی عن ابن عمرؓ یہ حدیث صحیح ہے۔ دوسری حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان نے عرض کیا تیری عزت وجلال کی قسم میں آدمیوں کو برابر گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کے اندر جان ہو گی اللہ نے فرمایا مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم میں بھی ان کو ہمیشہ بخشتا رہوں گا جب بھی وہ مجھ سے معافی کے طلب گار ہوں گے۔ رواہ احمد وابو یعلی۔

حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گناہ گار توبہ کرلے (اور اس کی توبہ کو اللہ اپنے ہاتھ سے لے کر قبول فرمائے) اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گناہ گار توبہ کرلے (اور یہ سلسلہ بند نہ ہو گا) یہاں تک کہ سورج مغرب کی طرف سے برآمد ہو جائے رواہ مسلم۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورج کے مغرب کی جانب سے برآمد ہونے سے پہلے تک جو شخص توبہ کرلے گا اللہ نے اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ رواہ مسلم۔

اللہ نے مدت عمر کو قریب اس لئے فرمایا کہ زندگی کے بعد آنے والی مدت بہت زیادہ (اور بعید) ہے اللہ نے خود فرمایا ہے قل متاع الدنیا قلیل (یعنی آئندہ زندگی کے مقابلہ میں اس دنیا کا ساز وسامان قلیل ہے)

فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ پس یہی وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا کیونکہ اللہ کے وعدہ کی خلاف ورزی ناممکن ہے اور اس نے (اپنے وعدہ کے ساتھ) توبہ قبول کرنے کو اپنے لئے فرض قطعی کی طرح کر لیا ہے۔ گویا یہ جملہ کلام سابق کے نتیجہ کی طرح ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۱۷) اور اللہ علیم و حکیم ہے یعنی اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے والے کو جانتا ہے توبہ کے بعد عذاب نہیں دے گا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ

اور توبہ قبول ان لوگوں کی نہیں ہے جو بدیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب موت سامنے آجاتی ہے تو کہتے ہیں کہ اب میں نے توبہ کی۔ یعنی جاں کنی کی حالت ہو گئی اور عذاب کے فرشتے دکھنے لگے اور روح کی روانگی ہونے لگی تو اس وقت کافر کا ایمان اور (مؤمن) گنہگار کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔

marfat.com

وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ اور نہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہے جو حالت کفر میں مر جائیں۔
یعنی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا اور نہ ان کے عذاب سے رجوع کرے گا یا یہ مطلب کہ آخرت میں جب وہ توبہ کریں گے اور کہیں گے ربنا ابصرنا و سمعنا فارجعنا نعمل صالحاً انا موقنون (اے ہمارے مالک ہم نے عذاب کو دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو دنیا میں دوبارہ لوٹا دے اگر تو دوبارہ دنیا میں لوٹا دے گا تو ہم اچھے عمل کریں گے یقیناً ہم ایماندار ہو گئے) تو اس وقت ان کی توبہ قبول نہ ہو گی یا یہ مطلب ہے کہ اگر بعض گناہوں سے توبہ کرلی ہو مگر خاتمہ کفر پر ہوا ہو تو ان کی توبہ کا کوئی اثر نہ ہو گا بلکہ کفر اور معاصی دونوں کا عذاب ان کو ہو گا۔

أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾ یہ ہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔ أَعْتَدْنَا، عتید سے ماخوذ ہے اور عتی د کا معنی ہے حاضر۔ یہ جملہ توبہ قبول نہ ہونے کی مزید تاکید کر رہا ہے۔

بخاری اور ابو داؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ (دور جاہلیت میں دستور تھا کہ) جب کوئی شخص مر جاتا تھا تو اس کے قریب ترین عزیز اس کی بیوی کے زیادہ حقدار ہوتے تھے اگر چاہتے تو خود نکاح کر لیتے اور چاہتے تو کسی دوسرے سے نکاح کر دیتے عورت کے قریب ترین عزیزوں کو بھی اس کا اختیار نہیں ہوتا اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ اے اہل ایمان تمہارے لئے حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔ یعنی یہ جائز نہیں کہ عورتوں کو مال میراث کی طرح اپنے قبضہ میں لے لو اور ان سے نکاح کر لو مجبور کر کے یا کَرْهًا کا یہ معنی ہے کہ وہ نہ چاہتی ہوں اور تم ان سے نکاح کر لو (اول معنی پر کَرْهًا مصدر مجہول ہو گا اور دوسرے معنی پر مصدر مبنی للفاعل) حمزہ اور کسائی نے اس جگہ اور سورۂ توبہ میں کُرْهًا بضم کاف پڑھا ہے۔ دوسرے قراء نے ہر جگہ بفتح کاف روایت کیا ہے۔ فراءؔ نے کہا بضم کاف کا معنی یہ ہے کہ دوسرے کو مجبور کیا جائے اور بفتح کاف کا معنی یہ ہے کہ کوئی خود بادل ناخواستہ کوئی فعل کرے۔ کسائی نے کہا دونوں لفظوں کا ایک ہی معنی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ دور جاہلیت میں جب کوئی شخص بیوی کو چھوڑ کر مر جاتا تھا تو ایسی حالت میں...... اس شخص کا جو (بڑا) بیٹا ہوتا تھا وہ یا (اس کے نہ ہونے کی صورت میں کوئی اور) مردہ کا قریبی عزیز آکر اپنا کپڑا اس عورت پر یا اس کے خیمہ پر ڈال دیتا تھا اور اس کا حقدار بن جاتا تھا اس عورت کو اپنی ذات پر خود کوئی حق نہ رہتا تھا اب اگر چاہتا تو بغیر کسی جدید مہر کے صرف مردہ باپ کے مہر پر اس سے نکاح کر لیتا تھا (یعنی خود کچھ مہر نہ دیتا تھا بلکہ باپ نے جو مہر دیا ہوتا وہی کافی سمجھا جاتا) اور خود نکاح کرنا نہ چاہتا تو کسی دوسرے سے نکاح کر دیتا اور مہر خود لے لیتا اور اگر چاہتا تو بالکل ہی نکاح سے روک دیتا تاکہ عورت مجبور ہو کر وہ مال واپس کر دے جو مردہ کے ترکہ سے اس کو ملا ہو اور اس طرح اپنی جان چھڑا لے۔

اس آیت میں اس فعل کی ممانعت کر دی گئی۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ہی بیان نقل کیا ہے۔ بغوی نے اتنا مزید بیان کیا ہے کہ اگر عورت مر جاتی تھی تو جس نے اس پر اپنا کپڑا ڈالا ہوتا تھا وہی اس کا وارث ہوتا تھا اور اگر مردہ شوہر کے کسی قریب ترین عزیز کے کپڑا ڈالنے سے پہلے وہ اپنے میکے میں چلی جاتی تھی تو پھر اس کو اپنا خود اختیار ہوتا تھا۔ یہی اہل جاہلیت کا دستور تھا اور یہی دستور رائج تھا کہ (دور اسلامی میں) ابو قیس کے بیٹے نے جس کا نام حصن بتایا گیا ہے اور مقاتل بن حبان نے قیس بن ابی قیس کہا ہے اپنا کپڑا کبیشہ پر ڈال دیا اور اس کے نکاح کا وارث ہو گیا لیکن اس کو یونہی چھوڑے رکھا نہ قربت کی نہ خرچ دیا مقصد یہ ہے کہ تنگ کر کے اس سے (وہ مال وصول کر لے جو ترکہ میں اس کو ملا ہے اور) فدیہ لے کر چھوڑ دے، کبیشہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ابو قیس مر گیا اور اس کا بیٹا میرے نکاح کا وارث ہو گیا۔ اب نہ وہ مجھے خرچ دیتا ہے نہ میرے پاس آتا ہے نہ میرا راستہ چھوڑتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا تو اس وقت تک اپنے گھر میں بیٹھ جا کہ اللہ کا حکم تیرے متعلق نازل ہو جائے۔ اس پر آیت لایحل لکم ان ترثوا النساء کرهاً الخ نازل ہوئی۔

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ اور نہ یہ حلال ہے کہ تم ان کو روکے رکھو۔ لفظ لا تاکید نفی کے لئے ہے یعنی نہ مال میراث کی

marfat.com

طرح ان کا مالک بن جانا حلال ہے نہ ان کو روکے رکھنا۔ عضل کا لغوی معنی ہے تنگ کرنا مراد ہے نکاح سے روک دینا۔

لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ تاکہ جو مہر تمہارے مردہ باپ یا عزیز نے ان عورتوں کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ ان سے (واپس) لے لو۔ آیت میں خطاب تمام مسلمانوں کو ہے مگر مخاطب کی ضمیر سے بعض افراد مراد ہیں لِتَذْهَبُوا سے مردہ کے عزیز مراد ہیں اور اٰتَيْتُمْ سے مردہ شوہر۔ مطلب یہ ہے کہ مردہ شوہر نے جو مہر عورتوں کو اپنی زندگی میں دیا ہو اس کے کچھ حصہ کو بطور فدیۂ رہائی وصول کرنے کے لئے عورتوں کو نکاح سے باز نہ رکھو۔ بعض علماء کا قول ہے کہ توراث نساء اور عضل دونوں کی ممانعت کا رخ شوہروں کی طرف ہے جو عورتوں کو روک رکھتے تھے نہ تو ان کو ان عورتوں کی کوئی ضرورت ہوتی تھی نہ رغبت خاطر۔ صرف مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کے مال کے وارث ہو جائیں (اگر وہ مر جائیں) یا وہ عورتیں مال دے کر اپنے کو رہا کرلیں۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا میں تو خطاب کا رخ مردہ کے عزیزوں کی طرف ہے اور اس کے بعد از سر نو کلام شروع ہوتا ہے جس میں خطاب کا رخ شوہروں کی طرف ہے اور لَا تَعْضُلُوْا نہی کا صیغہ ہے جو حالت جزم میں ہے (یعنی اس کا عطف تَرِثُوْا پر نہیں ہے ورنہ حالت نصب میں ہوگا اور نہ لا تاکید نفی کے لئے ہے بلکہ نہی کے لئے ہے)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ آیت اس شخص کے بارے میں ہے جو خود بیوی کی طرف راغب نہ ہو اس کی صحبت سے نفرت کرتا ہو لیکن عورت کا مہر اس پر واجب ہو اور اس طرح تنگ کر کے چاہتا ہو کہ جو کچھ مہر دیا ہو (یا دینے والا ہو) اس کو تاوان رہائی کے طور پر واپس لے لے۔ اللہ نے لَا تَعْضُلُوْهُنَّ فرما کر اس حرکت سے ممانعت کر دی۔ اس صورت میں جملہ کا عطف جملہ پر ہوگا مفرد پر نہ ہوگا۔

پہلا جملہ منفی خبری ہے اور یہ جملہ منہی انشائی لیکن چونکہ دونوں کا کوئی محل اعرابی نہیں اس لئے خبر پر انشاء کا عطف جائز ہے اس کے علاوہ جملہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اگرچہ لفظاً نفی ہے خبر ہے مگر معنی کے اعتبار سے نہی اور انشاء ہے اس لئے لَا تَعْضُلُوْهُنَّ کا عطف اس پر درست ہے۔

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ مگر یہ کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کریں یعنی کسی وقت فدیہ لینے کے لئے نہ روکو مگر اس وقت روک سکتے ہو جب وہ ارتکاب فاحشہ کریں (استثناء محل ظرفیت میں ہے) یا یہ مطلب کہ فدیہ وصول کرنے کی غرض سے یا کسی اور وجہ سے ان کو نہ روکو صرف ارتکاب فاحشہ کی وجہ سے روک سکتے ہو (استثناء مفعول لہ ہے) یا یہ مطلب کہ وصول فدیہ کی غرض ہو یا کوئی دوسری غرض کسی غرض سے نہ روکو مگر روکنے کی علت اگر ارتکاب فاحشہ ہو تو روک سکتے ہو (اس صورت میں بھی استثناء مفعول لہ ہوگا) یا یہ مطلب کہ کسی حالت میں سوائے ارتکاب فاحشہ کی حالت کے نہ روکو۔ حضرت ابن مسعودؓ اور قتادہؒ کے نزدیک فاحشہ سے شوہر کی نافرمانی مراد ہے اور حسنؒ بصری کے نزدیک زناء یعنی اگر عورت ناشزہ ہو جائے یا ارتکاب زنا کرے تو شوہر کے لئے اس سے عوض خلع طلب کرنا جائز ہے۔ خلع کے مسائل ہم سورۂ بقرہ میں ذکر کر چکے ہیں۔ قتادہ نے کہا جب کسی شخص کی بیوی فاحشہ کی مرتکب ہو جاتی تھی تو وہ اس کو دیا ہوا مال واپس لے لیتا اور پھر نکال دیتا تھا۔ اس حکم کو حد زنا سے منسوخ کر دیا گیا۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ اور گزران کرو خوبی کے ساتھ یعنی حسن معاملہ، ادائے حقوق اور اچھے کلام کے ساتھ۔ اس جملہ کا عطف لَا تَعْضُلُوْا یا لَا يَحِلُّ پر ہے۔ حسن بصریؒ نے کہا اس کلام کا ربط آیت اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً سے ہے (یعنی خوشی خاطر کے ساتھ عورتوں کے مہر ادا کرو اور ان سے اچھا برتاؤ کرو)۔

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ اور اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو یعنی بد صورتی یا بد اخلاقی کی وجہ سے تو پھر بھی صبر کرو، نہ ان کو دکھ دو، نہ ترک تعلق کرو۔

فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز

marfat.com

تم کو پسند نہ ہو اور اللہ اس میں تمہارے لئے بڑا فائدہ کر دے یعنی (آخرت میں) بڑا ثواب یا (دنیا میں) نیک اولاد عطا کر دے عَسٰی کا فاعل (صرف اَنْ تَكْرَهُوْا نہیں ہے بلکہ) معطوف اور معطوف علیہ سے مل کر جو پورا جملہ بنتا ہے وہ فاعل ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی چیز ناپسند بھی ہو تب بھی (اس کا برا ہونا ضروری نہیں) ہو سکتا ہے کہ اللہ اس میں بھلائی کر دے پس ناپسندیدگی کے وقت بھی اس چیز کی بھلائی کی امید رکھنی چاہئے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو یعنی بغیر نافرمانی کرنے اور مرتکب زنا ہونے کے اگر کسی بیوی کو طلاق دے کر تم دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہو۔

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا اور بیویوں میں سے کسی بیوی کے مہر میں تم نے ڈھیروں مال دیدیا ہو۔ هُنَّ کی ضمیر زَوْج کی طرف راجع ہے کیونکہ زوج کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی اور چونکہ یہاں مردوں کی جماعت سے خطاب ہے اس لئے زوج سے عورتوں کی جماعت مراد ہے تاکہ افراد کا مقابلہ افراد سے صحیح ہو جائے۔ قِنْطَار کا معنی ہے مالِ کثیر، مراد ہے مہر میں دیا ہوا مال کثیر۔ ابن جریرؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے قنطار کی تشریح میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ ایک ہزار دو سو (قنطار) ہے اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ (شارع کے نزدیک) کثرت مہر کی کوئی حد بندی نہیں، اسی پر اجماع ہے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کی تو ایک عورت نے اسی آیت سے کثرت مہر کے جواز پر استدلال کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس دلیل کو سن کر فرمایا۔ عمرؓ سے ہر شخص دینی سمجھ زیادہ رکھتا ہے یہاں تک کہ پردہ نشین عورتیں بھی۔ ؎1

اجماعاً مستحب یہ ہے کہ مہر میں زیادتی نہ کی جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا خبردار عورتوں کے مہر میں کثرت نہ کرنا اگر مہر کی کثرت دنیا میں عزت اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کی چیز ہوتی تو رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی بی بی سے یا کسی بیٹی کا بارہ ۱۲ اوقیہ سے زائد مہر پر نکاح کیا ہو۔ رواہ احمد واصحاب السنن الاربعتہ والدارمی۔

خطابی نے اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین عورت وہ ہے جس کا مہر سب سے زیادہ سہل (الاداء) ہو۔ ابن حبان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا بی بی کے امور (نفقات وغیرہ) کا آسان ہونا اور مہر کا کم ہونا اس کی برکت ہے۔ احمد اور بیہقی کی روایت میں ہے سب سے بڑی برکت والی وہ عورت ہے جس کا مہر سب سے آسان (یعنی کم) ہو۔ اس روایت کی سند عمدہ ہے۔

ابوسلمہؓ کا بیان ہے میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کا (یعنی حضور ﷺ کی بیویوں کا) مہر کتنا تھا فرمایا رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کا مہر ۱۲ اوقیہ اور نش تھا تم جانتے ہو کہ نش کتنا ہوتا ہے میں نے کہا نہیں فرمایا نش آدھا اوقیہ ہوتا ہے، رواہ مسلم۔ بارہ اوقیہ اور ایک نش کے پانچ سو درہم ہوتے ہیں۔ حضرت ام حبیبہؓ کے علاوہ حضور ﷺ کی تمام بیویوں کا مہر یہی تھا۔ حضرت ام حبیبہؓ کا مہر چار ہزار درہم تھا کیونکہ حضور ﷺ کی طرف سے نجاشی نے یہ مہر ادا کیا تھا۔ رواہ ابوداؤد النسائی۔ ابن

؎1 عبدالرحمن سلمی کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ عورتوں کے مہر بیش از بیش نہ کیا کرو ایک عورت نے عرض کیا عمرؓ آپ کو یہ حکم دینے کا اختیار نہیں ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے، واتیتم احدا ھن قنطارا من ذھب، راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت اس طرح ہے (یعنی من ذھب کا لفظ بھی آیا ہے) حضرت عمرؓ نے فرمایا ایک عورت مناظرہ میں عمرؓ پر غالب آگئی بکر بن عبداللہ مزنی کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تم کو مہر کی کثرت سے منع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قرآن مجید کی آیت اتیتم احدا ھن قنطارا میرے سامنے آگئی، یہ دونوں حدیثیں کہ کثرت مہر کی ممانعت سے حضرت عمرؓ نے رجوع کر لیا تھا میرے نزدیک صحیح ہیں، اور حضرت عمرؓ نے کثرت مہر کی ممانعت تحریمی نہیں کی استحبابی ممانعت فرمائی تھی اور تحریمی نہی سے رجوع کیا تھا، ۱۲۔ (حاشیہ از مولف)

marfat.com

اسحاق نے ابو جعفرؒ کی روایت سے چار سو دینار لکھا ہے۔ خلاصۃ السیر میں حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کا مہر بارہ اوقیہ طلائی مقرر کیا تھا ایک طلائی اوقیہ کے سات مثقال ہوتے ہیں۔ احمد اور ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جویریہ ثابت بن قیس بن شماس اور ان کے چچازاد بھائی کے حصہ میں مشترکاً آئی تھیں مدینہ میں ثابت کے کچھ کھجور کے درخت تھے ثابت نے چچازاد بھائی کو وہ درخت دے کر جویریہ کو منفرداً خود لے لیا اور مکاتب بنادیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا بدل کتابت اپنے پاس سے ادا کر دیا اور خود ان سے نکاح کر لیا اور بدل کتابت ہی ان کا مہر قرار پایا۔ سبیل الرشاد میں ہے کہ ثابتؓ اور ان کے چچازاد بھائی نے مشترکاً جویریہ کو مکاتب کیا تھا اور نو اوقیہ طلائی بدل کتاب مقرر کیا تھا۔

فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ؕ تو نہ لو دیئے ہوئے مال میں سے کچھ۔

أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ۝ کیا تم اس مال کو باطل طور پر اور کھلے ہوئے گناہ کا ارتکاب کر کے لو گے۔ بُهْتَانًا اور اِثْمًا حال ہیں بمعنی اسم فاعل یا مفعول لہ ہیں۔ بُهْتَان کا معنی ہے باطل قول (تہمت) باطل فعل میں بھی اس کا استعمال آیا ہے یہاں باطل فعل ہی مراد ہے اسی لئے بہتانا کا تفسیری معنی ظلماً کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص سابق عورت کی جگہ جدید عورت سے نکاح کرنا چاہتا تھا تو پہلی عورت پر زنا کی تہمت لگاتا تھا تاکہ وہ مجبور ہو کر کچھ مال دے کر اپنی گلو خلاصی کرا لے (اس صورت میں بُهْتَانًا سے مراد ہو گا باطل قول) أَتَأْخُذُونَهُ میں استفہام انکاری زجر آگیں ہے (یعنی ایسا نہ کرنا چاہئے یا ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں)۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ اور کون سی وجہ ہے کہ اس کو لے لو۔ یہ بھی انکاری سوال ہے یعنی جب مہر مقرر ہو چکا اور ادا کرنا واجب ہو گیا تو پھر واپس لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ

امام شافعیؒ کے نزدیک افضاء سے کنایۃً جماع مراد ہے۔ اسی لئے انہوں نے آیت کا ترجمہ کیا ہے تم جماع کر چکے ان سے۔ امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ظاہر ترین قول یہ ہے کہ صرف خلوت سے مہر پختہ نہیں ہوتا ہے اگر جماع نہ کیا ہو، اسی بنا پر انہوں نے فرمایا کہ اگر خلوت صحیحہ ہو گئی اور جماع نہ کیا مگر جماع سے کوئی طبعی اور شرعی مانع نہ تھا پھر طلاق دیدی تو نصف مہر کی ادائیگی واجب ہے۔ امام اعظمؒ اور امام احمدؒ نے فرمایا خلوت صحیحہ سے (پورا) مہر پختہ ہو جاتا ہے خواہ جماع نہ کیا ہو۔ افضاء کا معنی ہے فضاء یعنی صحراء میں داخل ہو جانا یہاں فضاء میں داخل ہونے سے مراد ہے خالی مکان میں (جہاں کوئی روک ٹوک نہ ہو) داخل ہو جانا۔ امام مالکؒ کے نزدیک بھی خلوت صحیحہ بغیر جماع کے موجب مہر ہو جاتی ہے بشرطیکہ خلوت کی مدت طویل ہو۔ ابن قاسم نے طول مدت کی حد ایک سال بیان کی ہے۔

امام شافعیؒ کے قول کی دلیل یہ آیت ہے وان طلقتموهن من قبل ان تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم یعنی اگر تم نے عورتوں کا مہر مقرر کر دیا تھا اور جماع سے پہلے طلاق دیدی تو مقرر کردہ مہر کا آدھا لازم ہے (گویا شافعیؒ کے نزدیک اس آیت میں مس (چھوے) سے مراد جماع ہے)۔

ہم کہتے ہیں یہ امر قطعی ہے کہ مس سے مجازی معنی مراد ہے مس کا حقیقی معنی تو جماع نہیں ہے (بلکہ مس کا لفظ عام ہے اور جماع کا معنی خاص) عام لفظ بول کر شافعیؒ نے خاص معنی مراد لیا ہے اور یہ مجاز ہے لیکن لفظ مس سے خلوت بھی بطور مجاز مراد لی جا سکتی ہے کیونکہ خلوت مس کا سبب ہے اور مس خلوت کا نتیجہ ہے مسبب بول کر سبب مراد لینا مجاز کا عام ضابطہ ہے۔ عام بول کر خاص مراد لینے سے تو تسمیۃ السبب باسم المسبب اولیٰ ہے لہٰذا آیت میں خلوت مراد ہے۔ (رہا نصف یا کل مہر کا وجوب تو ہم کل مہر کے وجوب کے قائل ہیں کیونکہ) قرن اول کا اجماع ہے کہ اگر خلوت صحیحہ ہو گئی خواہ جماع نہ ہوا ہو پھر بھی کل مہر واجب ہے۔ شیخ ابوبکرؒ رازی نے الاحکام میں اس کو نقل کیا ہے اور طحاوی نے اس پر صحابہ کا اجماع ہونا بیان کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا کہ یہی قول حضرات عمر و علی و زید بن ثابت و عبداللہ بن عمر و جابر و معاذ بن جبل و ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ بیہقی نے بروایت

---

۲ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا مہر بیس جوان اونٹنیاں یا چار سو اشرفیاں تھیں۔ کذا فی شرح خلاصۃ السیر۔ (از مولفؒ)

marfat.com

احنف بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر دروازہ بند کر لیا اور پردہ چھوڑ دیا تو عورت کے لئے پورا مہر لازم ہو گیا اور عدت بھی ضروری ہو گئی۔ یہ روایت منقطع ہے۔

مؤطا میں یحییٰ بن سعید کی وساطت سے سعید بن مسیب کی روایت آئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا جب پردے چھوڑ دیئے گئے (یعنی کامل خلوت ہو گئی) تو مہر واجب ہو گیا۔ عبد الرزاق نے مصنف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔

دار قطنی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جب دروازہ بند کر دیا اور پردہ چھوڑ دیا اور ستر کو دیکھ لیا تو شوہر پر مہر واجب ہو گیا۔ ابو عبیدہؒ نے کتاب النکاح میں زرارہ بن اوفی کا قول نقل کیا ہے کہ خلفاء راشدینؓ کا یہ فیصلہ ہے کہ جب دروازہ بند کر دیا اور پردہ چھوڑ دیا تو مہر واجب ہو گیا اور عدت لازم ہو گئی۔ دار قطنی نے اس مبحث کی ایک مرفوع حدیث محمد بن عبد الرحمٰن بن ثوبان کی روایت سے مرسلاً نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عورت کا دوپٹہ کھول دیا اور اس کی طرف دیکھ لیا تو مہر واجب ہو گیا جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ضعیف ہے لیکن ابن جوزی کا بیان ہے کہ علماء نے ابن لہیعہ کی روایت کو لیا ہے۔ ابو داؤد نے مراسیل میں ابن ثوبان کی اس روایت کو نقل کیا ہے اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں اور مرسل ہمارے نزدیک قابل استدلال ہے۔ مذہب شافعیؒ کی تائید میں حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بعض اقوال بھی روایات میں آئے ہیں لیکن یہ روایات صحیح نہیں ہیں۔ بیہقی نے بروایت شعبی حضرت ابن مسعودؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ اگر کسی نے کسی عورت سے خلوت کر لی ہو اور جماع نہ کیا ہو تو عورت کا نصف مہر لازم ہو جاتا ہے۔ یہ روایت منقطع ہے، شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے مگر وہ سند بھی صحیح نہیں ہے)۔

وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۲۱ اور عورتیں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ اس جملہ کا عطف اَفْضٰى پر ہے۔ حسن، ابن سیرین، ضحاک اور قتادہ کے نزدیک پختہ عہد سے مراد عورت کے ولی کا یہ قول ہے کہ میں نے اس عورت کو تیرے نکاح میں ان شرائط و حقوق کے بموجب دیا جو اللہ نے عورتوں کے لئے مردوں پر رکھے ہیں یعنی ضابطہ اور دستور کے مطابق نکاح میں رکھنا یا خوبی کے ساتھ آزاد کر دینا۔

شعبی اور عکرمہ نے کہا پختہ عہد سے وہ مضمون مراد ہے جو حدیث مسلم میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو تم نے انکو بامانِ خدا لیا ہے اور ان کی شرم گاہوں کو بحکم خدا اپنے لئے حلال بنایا ہے۔ رواہ جابر۔

ابن جریرؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ نے عورتوں کے لئے تم پر کچھ بندشیں لگائی ہیں گویا عورتوں نے تم سے عہد لیا ہے (کہ ان بندشوں کی پابندی کریں گے)۔

ابن سعد نے محمد بن کعب قرظی کا بیان نقل کیا ہے کہ (دور جاہلیت میں دستور تھا کہ) جب کوئی شخص مر جاتا تھا تو اس کی بیوی کا حقدار اس کا (بڑا) بیٹا ہوتا تھا چاہے وہ خود اس سے نکاح کر لے بشرطیکہ وہ عورت اس لڑکے کی ماں نہ ہو اور چاہے کسی دوسرے سے اس عورت کا نکاح کرا دے۔ ابو قیس بن سلمہ کا انتقال ہوا تو (دستور جاہلیت کے مطابق) ابو قیس کا بیٹا محصن باپ کی بیوی سے نکاح کا حقدار ہو گیا اور ابو قیس کی بیوی کو ترکہ میں کوئی حصہ اس نے نہیں دیا عورت نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اب تو واپس چلی جا امید ہے کہ تیرے بارے میں کوئی حکم نازل ہو گا۔

ابن ابی حاتم، فریابی اور طبرانی نے حضرت عدی بن ثابت کی وساطت سے یہ قصہ ایک انصاری کی روایت سے نقل کیا ہے، اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابو قیس بن سلمہؓ کا انتقال ہو گیا ابو قیس بڑا نیک انصاری تھا اس کے بیٹے قیس نے ابو قیس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کرنا چاہا عورت نے قیس سے کہا میں تو تجھے اپنا بیٹا جانتی ہوں اور تو قوم کے نیک لوگوں میں سے بھی ہے (پھر نکاح کیسا) اس کے بعد عورت نے حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کو واقعہ کی اطلاع دیدی، حضور ﷺ نے فرمایا اب تو اپنے گھر چلی جا (اور حکم کا انتظار کر) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

marfat.com

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اور جن عورتوں سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرو۔ ما موصولہ ہے اور چونکہ وصفی معنی مراد ہے اس لئے (بجائے من کے کا لفظ ذکر کیا۔ بعض نے کہا ما مصدری ہے اور مصدر بمعنی مفعول ہے (باپ کی نکاح کی ہوئی عورت سے نکاح نہ کرو) یہ تو ظاہر تھا کہ باپ دادا نے جن سے نکاح کیا ہوگا وہ عورتیں ہی ہوں گی پھر بھی ماں کے ابہام کی توضیح من النساء سے صرف تعمیم کے لئے کردی۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ بظاہر یہ استثناء منقطع ہے یعنی جو پہلے ہو چکا اس کا مؤاخذہ نہ ہوگا۔ بعض علماء نے کہا استثناء متصل ہے نہی کے لئے جو معنی لازم تھا اس سے استثناء ہے گویا یوں کہا گیا کہ جس سے باپ دادا نے نکاح کیا ہوگا اس سے اگر نکاح کرو گے تو عذاب ہوگا مگر جو پہلے ہو چکا اس پر عذاب نہ ہوگا۔

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً یہ کام یقیناً بڑی بے حیائی کا ہے یعنی اللہ کے نزدیک بدترین گناہ ہے کسی گذشتہ امت کو اللہ نے اس کی اجازت نہیں دی۔

وَّمَقْتًا اور نفرت کا اللہ کے نزدیک بھی اور شرفاء کے نزدیک بھی۔ مقت کا معنی ہے سخت ترین بغض (بدترین نفرت) اگر باپ کی بیوی سے کسی کا کوئی بیٹا ہو جاتا تھا تو عرب اس کو مقیت (بمعنی ممقوت انتہائی قابل نفرت) کہتے تھے۔ اشعث بن قیس اور ابو معیط عمرو بن امیہ مقیت ہی تھے۔

وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ اور برا طریقہ ہے۔ حضرت براء بن عازب کا بیان ہے کہ میرا ماموں جھنڈا لئے میری طرف سے گزرا میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو اس نے جواب دیا ایک شخص نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے اس کا سر لانے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے مجھے بھیجا ہے۔ رواہ الترمذی وابو داؤد، ابو داؤد اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ امں کے کہا مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس لئے بھیجا ہے کہ میں اس کی گردن مار دوں اور اس کا مال لیلوں۔ اس روایت میں ماموں کی بجائے چچا کا لفظ آیا ہے۔ ۱۴ ع ۸ ۳

فائدہ:- باجماع علماء آباء سے مراد عموم مجاز کے طور پر تمام اصول ہیں خواہ ددھیالی ہو یا ننھیالی۔

بعض علماء کے نزدیک نکاح کا حقیقی معنی ہے جماع اور یہی معنی اس جگہ مراد ہے، ابن جوزی نے تحقیق میں یہی لکھا ہے اور اسی آیت سے مزنیہ کی بیٹی اور ماں سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جس عورت سے تمہارے باپ دادا نانا وغیرہ نے جماع کیا اس سے نکاح نہ کرو خواہ نکاح صحیح کے بعد جماع کیا ہو یا نکاح فاسد کے بعد یا حق تملیک کی وجہ سے یا (بیوی ہونے کے) شبہ میں یا بصورت زنا۔

قاموس میں ہے نکاح کا معنی ہے جماع اور عقد اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا لفظ مشترک ہے۔ صحاح میں جوہری نے لکھا ہے کہ نکاح کا اصل (یعنی حقیقی) معنی ہے، عقد مجاز اً جماع پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ممکن نہیں کیونکہ جماع کے عمل کو عرب جس طرح قبیح جانتے تھے اسی طرح اس کے ذکر کو بھی صراحتاً برا سمجھتے تھے اسی لئے معنی جماع پر دلالت کرنے والے تمام الفاظ بطور کنایہ بولتے تھے۔ اس صورت میں ناممکن ہے کہ فحش لفظ بول کر وہ معنی مراد لئے جائیں جو فحش نہیں ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وانکحوا الایامی منکم وغیرہ۔

میرے نزدیک۔ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں نکاح سے مراد ہے عقد، جماع مراد نہیں ہے کیونکہ بالاجماع باپ کی منکوحہ بیٹے کے لئے حرام ہے خواہ باپ نے اس سے جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو اور مزنیہ کی ماں اور بیٹی سے نکاح کی حرمت اجماعی نہیں اختلافی ہے (شافعیؒ کے نزدیک حرمت نہیں ہے) اس لئے اجماعی معنی پر آیت کو محمول کرنا ہی اولیٰ ہے۔

ایک اعتراض:- اگر آیت میں نکاح سے مراد عقد ہی ہے تو کیا وجہ کہ جس عورت سے باپ نے ملکیت کی وجہ سے جماع کر لیا ہو اس سے بیٹے کے لئے بالاجماع نکاح حرام ہو جاتا ہے وہ تو باپ کی منکوحہ نہیں ہے۔ جواب: یہ حرمت دلالت النص کی وجہ سے ہے کیونکہ نکاح سے اصل مقصد ہوتا ہے جماع اور جماع ہی جزئیت کا سبب ہے پس جب وہ نکاح جو حلال جماع کا

marfat.com

سبب ہے حرمت مصاہرت کا موجب ہے تو جائز جماع بدرجہ اولیٰ موجب حرمت مصاہرت ہوگا۔
مسئلہ :- امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک زنا سے حرمت مصاہرت نہیں ہوتی (یعنی مزنیہ کی ماں یا بیٹی سے نکاح حرام نہیں ہو جاتا) امام اعظمؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک زنا حرمت مصاہرت کی موجب ہے امام مالکؒ کا بھی ایک قول اسی طرح مروی ہے۔ امام احمدؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کوئی مرد کسی عورت یا مرد سے لواطت کرے تو اس مفعول مرد و عورت کی ماں اور بیٹی سے اس فاعل کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس آیت سے حرمت مصاہرت پر استدلال ضعیف ہے قوی استدلال یہ ہے کہ حلال جماع پر زنا کو قیاس کیا جائے علت حرمت صرف یہ ہے کہ جماع سبب اولاد ہے حلال اور حرام جماع کی قید قابل التفات نہیں۔ دیکھو مشترک باندی سے یا بیٹے کی باندی سے یا مکاتب باندی سے یا ظہار والی عورت سے یا مجوسی باندی سے یا حائضہ عورت سے یا نفاس والی عورت سے یا حالت احرام یا روزہ میں جماع کرنا حرام ہے ان میں سے ہر صورت ممنوع ہے لیکن باجماع علماء اس سے حرمت مصاہرت ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصل موجب حرمت جماع ہے حرام ہو یا حلال اس کی کوئی تعیین نہیں، ابن ہمام نے بیان کیا ہے کہ ہمارے علماء نے اس کی تائید میں چند احادیث ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جاہلیت کے زمانہ میں میں نے ایک عورت سے زنا کیا تھا کیا اس کی لڑکی سے اب نکاح کر سکتا ہوں فرمایا میں اس کو جائز نہیں سمجھتا یہ مناسب نہیں کہ جن مخفی حصوں پر کسی عورت کے تم مطلع ہو گئے ہو اس کی بیٹی کے بھی ان ہی مخفی حصوں پر مطلع ہو۔ یہ روایت مرسل منقطع ہے اس کی سند میں ایک راوی ابو بکر بن عبد الرحمٰن بن بنت حکیم ہے۔

ابن وہب نے بوساطت ایوب ابن جریج کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے ہاتھ سے کسی عورت کو دبایا ہو اس سے زیادہ کچھ نہ کیا ہو کہ اس کی لڑکی سے نکاح نہ کرے یہ روایت بھی مرسل منقطع ہے مگر ہمارے نزدیک مرسل منقطع کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں اگر تمام راوی ثقہ ہوں (انتہی کلام ابن ہمام) امام شافعیؒ نے اپنی دلیل میں دو حدیثیں بیان کی ہیں ایک حضرت عائشہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا حرام حلال کو فاسد نہیں کرتا۔ رواہ الدار قطنی۔

اس سند میں ایک راوی عثمان بن عبد الرحمٰن وقاصی ہے جس کو یحییٰ بن معین نے کہا ہے یہ ہیچ ہے جھوٹ کہتا تھا۔ ابن مدینی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ بخاری، نسائی، رازی اور ابو داؤد نے بھی کہا ہے کہ یہ کچھ نہ تھا دار قطنی نے متروک کہا ہے۔ ابن حبان نے کہا یہ ثقات کی طرف نسبت کر کے موضوع احادیث نقل کرتا تھا اس کی روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔
دوسری حدیث حضرت عائشہؓ کی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی آئی ہے یہ حدیث دار قطنی اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے اس کی سند میں عبید اللہ کا بھائی عبد اللہ بن عمرؓ ہے جس کے متعلق ابن حبان نے کہا اس کی خطا فاحش ہے اس لئے مستحق ترک ہے۔ ایک راوی اسحاق بن محمد عروی بھی ہے جس کو یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہے بڑا جھوٹا ہے۔ بخاری نے کہا ہے علماء روایت نے اس کو ترک کر دیا ہے۔

مسئلہ :- مزنیہ کے بیٹے کے لئے زانی باپ کی منکوحہ حرام ہے اسی طرح مزینہ کی بیٹی اپنے زانی باپ کے لئے حرام ہے کیونکہ اول صورت میں وہ زانی کا بیٹا اور دوسری صورت میں زانی کی بیٹی ہے عربی زبان میں وہ بیٹا بیٹی ہی ہے (خواہ نکاحی نہیں ہے) اور جب تک لغت کے خلاف نقل شرعی نہ ہو اس وقت تک لغوی معنی ہی کلام میں معتبر رہیں گے ہاں اگر نقل شرعی ہو تو شرعی معنی کا اعتبار ہوگا جیسے لفظ صلوٰۃ (کہ مخصوص ہیئت کی عبادت کو شرعاً کہا جاتا ہے اور یہی معنی شرعاً مراد ہوتا ہے) اگر زید نے اپنی بیوی ہندہ سے لعان کیا کہ تیرا بیٹا عمر میرا بیٹا نہیں ہے اور قاضی نے بھی اس دعوے کو تسلیم کر لیا اور زید سے عمر کے نسب کی نفی کر دی اس صورت میں عمر کے لئے جائز نہیں کہ زید کی منکوحہ سے نکاح کر سکے اور نہ زید کے لئے اس عورت کی بیٹی سے نکاح درست ہے کیونکہ ممکن ہے زید اپنے دعوے کی خود تکذیب کر دے اور اس وقت گذشتہ دعویٰ اور حاکم کی ڈگری لغو قرار

marfat.com

پا جائے۔

مسئلہ :- اگر کسی مرد نے کسی عورت کو اور کسی عورت نے کسی مرد کو شہوت کے ساتھ چھولیا تو اس چھونے کا حکم جماع کی طرح ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک اس سے حرمت مصاہرۃ ہو جاتی ہے اس طرح اگر مرد نے عورت کی اندرونی شرمگاہ کو یا عورت نے مرد کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھ لیا تو اس سے بھی حرمت مصاہرت ہو جاتی ہے۔

اگر مرد نے عورت کو چھولیا اور انزال ہو گیا یا اندرونی شرمگاہ کو دیکھنے سے انزال ہو گیا یا کسی عورت سے لواطت کی اور انزال ہو گیا تو ایک روایت میں آیا ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک اس سے حرمت مصاہرت ہو جاتی ہے لیکن صحیح قول یہ ہے کہ حرمت مصاہرت نہیں ہوتی باقی تینوں اماموں کے نزدیک چھونے اور دیکھنے سے حرمت مصاہرت نہیں ہوتی۔ امام اعظمؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ چھونا اور دیکھنا جماع کے داعی ہیں لہٰذا احتیاط کے مقام میں ان کو جماع کے قائم مقام قرار دیا جائے گا لیکن انزال کے بعد جماع کا مقتضی ہی ختم ہو جاتا ہے اس لئے انزال کے بعد حرمت مصاہرت کا حکم نہ ہوگا۔ شہوت کے ساتھ چھونے سے مراد یہ ہے کہ آلہ میں انتشار پیدا ہو جائے یا زیادہ ہو جائے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ تمہاری مائیں تمہارے لئے حرام کر دی گئی ہیں بطور عموم مجاز ماؤں سے مراد ہیں باپ دادا یا ماں اور نانی نانا کی طرف سے تمام اصولی عورتیں (جیسے ماں، دادی پر دادی نانی پرنانی وغیرہ) بعض علماء نے کہا کہ لفظ ام کا لغوی معنی ہے اصل۔ قاموس میں ہے ام کل شی اصلہ ہر چیز کی ماں اس کی اصل کو کہتے ہیں۔ ام القری مکہ ام الکتاب سورۂ فاتحہ یا لوح محفوظ اس تحقیق پر لفظ امہات باپ اور ماں کی طرف سے تمام جدات کو خواہ کتنا ہی اونچا رشتہ ہو لغتاً باجماع علماء شامل ہے۔

وَبَنٰتُكُمْ اور تمہاری بیٹیاں۔ بنات کا لفظ بھی بطور عموم تمام فروع کو شامل ہے پوتیاں اور نواسیاں نیچے تک بالاجماع اس لفظ میں داخل ہیں۔

وَاَخَوٰتُكُمْ اور تمہاری بہنیں حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی۔

وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ اور تمہاری پھوپھیاں اور خالائیں لفظ عمات کے اندر باپ کی حقیقی اور علاتی اور اخیافی بہنیں داخل ہیں۔ اسی طرح خیالات کے اندر ماں کی حقیقی اور علاتی اور اخیافی بہنیں مندرج ہیں۔ یہ فیصلہ اجماعی ہے۔ انہی کے ذیل میں باجماع علماء باپ اور ماں کی پھوپھیاں اور خالائیں اور دادا دادی نانا نانی کی پھوپھیاں اور خالائیں اور اسی طرح تمام ذکور و اناث اصول کی پھوپھیاں اور خالائیں داخل ہیں گویا بطور عموم مجاز اصل بعید کی تمام فروع قریبہ کو حکم حرمت شامل ہے لیکن اصل بعید کی فرع بعید بالاجماع جائز ہے جیسے چچا یا پھوپھی یا خالہ یا ماموں کی بیٹیاں۔

وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ اور بھائی بہن کی بیٹیاں یعنی بھائی اور بہن کی تمام فروع لڑکیاں پوتیاں نواسیاں نیچے تک۔ بھائی اور بہن کا لفظ عام ہے حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی۔ اللہ نے نسبی محرمات سات بیان فرمائیں جن کا خلاصہ یہ ہوا کہ چار اصناف کی عورتیں حرام ہیں۔ نکاح کرنے والے کی اصل، نکاح کرنے والے کی فرع، اصل قریب کی فرع خواہ قریب ہو یا بعید، اصل بعید کی فرع قریب۔ اس سے بھی زیادہ مختصر الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان دو مرد و عورت کا باہم نکاح حرام ہے جن میں باہم رشتہ ولادت ہو یا ایک دوسرے کے باپ یا ماں کی فرع ہو۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور دودھ شریک بہنیں باجماع علماء رضاعی پھوپھیاں خالائیں بھتیجیاں بھانجیاں بھی حرام ہیں اور نسب کی وجہ سے جس سے نکاح حرام ہے رضاعت کی وجہ سے بھی اس سے نکاح درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے رضاعت سے (بھی) وہی حرام جو نسب سے حرام ہے، دوسری روایت میں نسب کی جگہ ولادت کا لفظ آیا ہے، رواہ الشیخان، (البخاری و المسلم) یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے مذکور ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا

marfat.com

آپ کو اپنے چچا حمزہؓ کی لڑکی (سے نکاح کرنے) کی خواہش ہے وہ قریش میں حسین ترین عورت ہے فرمایا کیا تم کو علم نہیں ہے کہ حمزہؓ میرے رضاعی بھائی ہیں اور اللہ نے جس نسبی رشتہ میں نکاح حرام کیا ہے اسی رضاعی رشتہ میں بھی حرام کیا ہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میرا رضاعی چچا آیا اور میرے پاس اندر آنے کی اس نے اجازت طلب کی۔ میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت نہ کرلوں اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے میں نے مسئلہ دریافت کیا فرمایا وہ تیرا چچا ہے اس کو اجازت دیدے میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے تو عورت نے دودھ پلایا تھا مرد نے نہیں پلایا فرمایا بلاشبہ وہ تیرا چچا ہے تیرے پاس اندر آسکتا ہے۔ یہ واقعہ پردہ کی آیت نازل ہونے کے بعد کا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف فرما تھے کہ میں نے ایک مرد کی آواز سنی جو حضرت حفصہؓ کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگ رہا تھا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کوئی شخص آپ ﷺ کے گھر کے اندر داخلہ کی اجازت کا طلب گار ہے آپ ﷺ نے حضرت حفصہؓ کے رضاعی چچا کے متعلق فرمایا میرے خیال میں فلاں شخص ہوگا میں نے (یہ سن کر) اپنے رضاعی چچا کا نام لے کر کہا یارسول اللہ ﷺ اگر فلاں شخص زندہ ہوتا تو کیا وہ (میرے پاس) اندر آسکتا تھا فرمایا ہاں جو حرمت ولادت (کے رشتہ) سے ہوتی ہے وہی رضاعت (کے رشتہ) سے ہوتی ہے۔ رواہا البغوی

فائدہ :- امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک رضاعت تھوڑی ہو یا بہت (چاہے ایک چسکی ہو) وہی حرمت پیدا کردیتی ہے جو نسب سے ہوتی ہے کیونکہ یہ آیت مطلق ہے نیز حدیث یحرم من الرضاعة مایحرم من النسب بھی مطلق ہے (آیت اور حدیث دونوں میں کمی زیادتی کی کوئی قید نہیں) ایک روایت میں امام احمدؒ کا قول بھی یہی آیا ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا رضاعت سے حرمت صرف اس وقت ہوگی جب بھوک کی حالت میں پانچ مختلف جدا جدا اوقات میں پانچ مرتبہ پیٹ بھر کر دودھ پیا ہو۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا قول بھی یہی آیا ہے ایک اور روایت میں امام احمدؒ بجائے پانچ مرتبہ کے تین مرتبہ کے قائل ہیں، ابوثور، ابن المنذر، داؤد اور ابوعبید کا قول بھی یہی ہے۔ تین مرتبہ کی تعیین کی وجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک چسکی اور دو چسکیاں حرمت کی موجب نہیں۔ ام فضل کی مرفوع روایت میں چسکی اور دو چسکی کی جگہ۔ ایک بار پینا اور دو بار پینا کا لفظ آیا ہے۔ بعض روایات میں املاجة و املاجتان کا لفظ آیا ہے مطلب ایک ہی ہے یہ تمام روایات مسلم نے نقل کی ہیں۔

احمد نسائی، ابن حبان اور ترمذی نے یہ حدیث بحوالہ حضرت عبداللہ بن زبیر بوساطت حضرت زبیر حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کی ہے لیکن طبری نے اس کو مضطرب کہا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ نے حضرت زبیر کی وساطت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے اور بعض روایات میں عبداللہ عن عائشہؓ عن رسول اللہ ﷺ اور بعض میں بلاواسطہ عن عبداللہ عن رسول اللہ ﷺ آیا ہے۔ ابن حبانؒ نے تینوں اسناد کی وجہ جامع اس طرح بیان کی ہے کہ ممکن ہے حضرت ابن زبیرؓ نے اپنے باپ سے بھی سنا ہو اور حضرت عائشہؓ سے بھی اور خود حضور ﷺ کی زبان مبارک سے بھی۔

بخاری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث عن ابن الزبیر عن عائشہؓ صحیح ہے بیچ میں حضرت زبیر کی وساطت صرف محمد بن دینار کے قول میں ہے اور اس میں ضعف ہے اور اختلاف بھی ہے۔ بعض روایات میں حضرت عائشہؓ کا ذکر نہیں ہے اور سند میں ارسال ہے لیکن مرسل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نسائی نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے ابن عبدالبر نے کہا یہ حدیث مرفوعاً صحیح نہیں ہے۔

علماء حنابلہ نے اسی حدیث کو اپنے مسلک کی تائید میں پیش کیا ہے کیونکہ حدیث میں صرف ایک یا دو بار دودھ پینے کو غیر محرم فرمایا ہے لہٰذا تین بار پینے سے حرمت ہو جائے گی۔ جو لوگ کم سے کم پانچ مرتبہ دودھ پینے کو موجب حرمت قرار دیتے ہیں ان کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے ام المومنینؓ نے فرمایا کہ قرآن میں عشر رضعات معلومات نازل ہوا تھا پھر خمس

marfat.com

معلومات سے اس کو منسوخ کر دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو قرآن میں اسی کو پڑھا جاتا تھا۔ ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن میں عشر رضعات نازل ہوا تھا۔ پھر اس سے پانچ منسوخ کر دیئے گئے اور پانچ رضعات رہ گئے اور رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو اس وقت تک امر یونہی تھا (یعنی اسی کو پڑھا جاتا تھا) ہم کہتے ہیں کہ قرآن کی نص متواتر کے مقابلہ میں حدیث آحاد نا قابل وقعت ہے اور تعارض کے وقت احتیاطاً تحریم کو ترجیح دی جائے گی اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ کی حدیث اگرچہ سند کے لحاظ سے صحیح ہے مگر واقع میں متروک ہے ورنہ لازم آئے گا کہ حضور ﷺ کی وفات تک قرآن میں خمس معلومات کی قرأت کی جاتی تھی (یعنی حضور ﷺ کی وفات کے بعد قرآن جمع کرنے کے وقت اس لفظ کو چھوڑ دیا گیا) اس صورت میں روافض کی بات صحیح ماننی پڑے گی کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد قرآن کا بہت حصہ ضائع ہو گیا حالانکہ یہ کلمہ کفر ہے اس سے آیت وانالہٗ لحٰفظون کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اگر حضرت عائشہؓ کے قول کی توجیہ اس طرح کی جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہونے سے حضرت عائشہؓ کے قول میں مراد ہے حضور ﷺ کی وفات کا زمانہ قریب آجانا تو مطلب اس طرح ہو جائے گا کہ عشر معلومات کا نسخ تو خس معلومات سے ہو گیا تھا پھر حضور ﷺ کی وفات سے کچھ تھوڑا پہلے خمس معلومات بھی منسوخ ہو گیا یہی صحیح ہے حضرت ابن عباسؓ سے جب کہا گیا کہ لوگ کہتے ہیں ایک بار دودھ پینے سے حرمت نہیں ہوتی تو فرمایا پہلے ایسا تھا پھر یہ منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا امر رضاعت بھی موجب حرمت ہے جب حضرت ابن عمرؓ سے کہا گیا کہ حضرت ابن زبیرؓ تو فرماتے ہیں کہ ایک دو بار پینے سے حرمت نہیں ہوتی فرمایا اللہ کا فیصلہ ابن زبیرؓ کے فیصلے سے بہتر ہے اللہ نے فرمایا ہے و امھاتکم الاتی ارضعنکم (یعنی اس آیت میں ایک دو بار پینے کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا) اگر حضرت عائشہؓ کے قول توفی رسول اللہ وھی فیما یقرأ کا مطلب یہ بیان کیا جائے کہ وفات کے وقت پانچ رضعات کا حکم قرأت میں موجود تھا تو یہ مطلب غلط ہے کیونکہ قرأت کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے حکم سے نہیں ہوتا۔

مسئلہ :- مدت شیر خوارگی کے بعد دودھ پینا موجب حرمت نہیں کیونکہ اس سے نہ تولید ہوتی ہے نہ نمو۔ مدت رضاعت کے بعد دودھ پلانے والی کو ماں نہیں کہا جاتا۔ داؤد (ظاہری) کے نزدیک ہر زمانہ میں شیر خوارگی سے حرمت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ابو حذیفہؓ کی بیوی سہلہ بنت سہیل نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ سالم (جو ابو حذیفہؓ کے حلیف ہیں) کے آنے سے میں ابو حذیفہؓ کے چہرہ پر کچھ ناگواری محسوس کرتی ہوں فرمایا سالم کو تو پانچ بار دودھ پلادے تو اس کی محرم ہو جائے گی۔ رواہ الشافعی۔ مسلم وغیرہ نے اس حدیث میں تعداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ باجماع علماء یہ حدیث منسوخ ہے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان روایۃً صحیح ہے کہ صرف وہ رضاعت موجب حرمت ہے جو پستان سے ہو اور انتڑیوں کو پھاڑنے والی ہو۔ حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے یہ حدیث ترمذی نے بیان کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ابو داؤد نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بیان کی ہے کہ صرف وہی رضاعت موجب حرمت ہے جس سے گوشت پیدا ہو اور ہڈیوں میں نمو ہو۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت آئی ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اس وقت میرے پاس ایک آدمی موجود تھا فرمایا عائشہؓ یہ کون ہے میں نے عرض کیا میرا رضاعی بھائی ہے فرمایا عائشہ اپنے بھائیوں کو دیکھ لیا کرو رضاعت (وہی موجب حرمت ہے جو) بھوک سے ہو (یعنی دودھ پینے کے زمانہ میں ہو)۔

مسئلہ :- موجب حرمت رضاعت کی مدت دو سال ہے امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام مالکؒ، سعید بن مسیبؒ، عروہؒ اور شعبیؒ کا یہی قول ہے۔ دار قطنی نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کی طرف بھی اسی قول کی نسبت کی ہے۔ امام مالکؒ کے تین قول اور بھی مروی ہیں ایک قول میں دو سال ایک ماہ دوسری روایت میں ایک سال دو ماہ آئے ہیں اور تیسری روایت میں کوئی محدود مدت نہیں ہے جب تک بچہ حاجتمند ہو وہی مدت رضاعت ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک دو سال چھ ماہ اور امام زفرؒ کے نزدیک تین سال مدت رضاعت

marfat.com

ہے۔ اول قول کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعه اس آیت میں پوری مدت رضاعت دوسال بیان کی ہے پوری کے بعد زیادہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک اور آیت میں وفصاله فی عامین صاف فرمایا ہے ایک تیسری آیت ہے وحمله و فصاله ثلثون شهرا حمل اور فصال کی مدت تیس ماہ ہے اور چونکہ حمل کی مدت (کم سے کم) چھ ماہ ہے اس لئے دودھ پلانے کی مدت دوسال ہی باقی رہتی ہے رسول اللہ ﷺ کا بھی ارشاد ہے کہ رضاعت (معتبر) نہیں مگر وہی جو دوسال کے اندر ہو۔ دار قطنی نے یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ صرف ہیثم بن جمیل نے اس حدیث کو مرفوع کیا ہے، مگر ہیثم ثقہ اور حافظ تھا احمد اور عجلی نے بھی اس کو ثقہ کہا ہے ابن عدی نے کہا یہ غلطی کر دیتا تھا سعید بن منصور نے ابن عیینہ کی روایت سے اس کو موقوفاً بیان کیا ہے (مرفوع نہیں کیا)

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ آیت و حمله وفصاله ثلثون شهرا میں حمل اور فصل دو چیزوں کی مدت ۳۰ ماہ بیان کی ہے لہٰذا دونوں میں سے ہر ایک کی مدت پوری ۳۰ ماہ ہو تو ہر مقروض کے اداء قرض کی مدت ۳۰ ماہ کامل قرار دی جاتی ہے (ایسا نہیں ہو سکتا کہ ۱۵ ماہ ایک کے لئے اور ۱۵ ماہ دوسرے کے لئے) لیکن مدت حمل کو (باوجودیکہ آیت سے ۳۰ مستنبط ہوتی ہے ہم نے) دوسال قرار دیا ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کے قول میں یہی آیا ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ کے اندر دوسال سے زیادہ نہیں رہتا اگرچہ تکلے کے دمڑکہ کے برابر ہو۔ دوسری روایت میں ہے اگرچہ تکلے کے سایہ کے برابر ہو۔ یہ قول اگرچہ حضرت عائشہ کا ہے لیکن مدت کی حد بندی صرف رائے سے نہیں ہو سکتی سماع کے بغیر تعیین مدت ممکن نہیں (معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہی یہ تحدید مدت کی ہے) رہی مدت فصال تو وہ ظاہر آیت کے مطابق (۳۰ ماہ) ہی رہے گی۔

یہ دلیل چند وجوہ سے غلط ہے (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوسال کے بعد رضاعت (کا حکم) نہیں۔ آیت میں آیا ہے یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة یہ دونوں مدت رضاعت کی (۳۰ ماہ سے کم کر کے) دو سال میں تحدید کر رہی ہیں پھر یہ کہنا کہ حضرت عائشہؓ کے قول نے مدت حمل کی تنقیص کر دی قابل ترجیح نہیں لفظ ثلاثون شهرا میں حقیقت و مجاز کا اجتماع لازم آئے گا حمل کے پیش نظر ۲۴ ماہ (مجازاً) مراد ہوں گے اور مدت رضاعت کے لحاظ سے ۳۰ ماہ (حقیقۃً) لفظ ثلاثین سے ۲۴ مراد لینا پڑے گا حالانکہ اسماء عدد کو بول کر دوسرا عدد مجازاً مراد نہیں لیا جا سکتا اسم عدد کا درجہ وہی ہے جو اسم معین کا اپنے معین شخص کے لئے ہے بکثرت اہل تحقیق نے اس کی صراحت کی ہے۔ امام اعظمؒ کے قول کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ دوسال تک اعضاء کا نمو دودھ سے ہوتا رہتا ہے۔ اس کے بعد غذا بدلنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مزید اتنی مدت کی ضرورت ہے کہ بچہ تبدیل غذا کا عادی ہو جائے۔ امام مالکؒ نے اس اضافی مدت کی کوئی حد بندی نہیں کی۔ امام زفر نے ایک سال کی تعیین کی ہے تاکہ چاروں فصلیں گزر جائیں اور امام صاحبؒ نے ایک ششماہی مقرر کی کیونکہ یہی حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ دوسال کے اندر دودھ کے علاوہ کوئی اور غذا دینے کی شریعت نے ممانعت نہیں کی ہے پھر دوسال سے زیادہ مدت مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے دوسال ختم ہونے سے پہلے بھی بچہ دودھ کے ساتھ دوسری غذا کا عادی بن سکتا ہے۔ ابن ہمام اور طحاوی نے صاحبین کے قول کو ہی اختیار کیا ہے۔

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ اور تمہاری عورتوں کی مائیں۔ یہ لفظ تمام جدات کو شامل ہے تمام دور اور قریب کی دادیاں اور نانیاں اس میں داخل ہیں اور از روئے حدیث بیویوں کی رضاعی مائیں اور نانیاں دادیاں بھی نسبی کے ساتھ شامل ہیں۔ جن عورتوں سے ملکیت یا شبہ ملکیت کی وجہ سے قربت کر لی گئی ہو۔ باجماع علماء ان کی ماؤں کا بھی یہی حکم ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک مزنیہ (جس عورت سے زنا کیا گیا ہو) کی امہات بھی اسی حکم میں داخل ہیں اور اگر کسی اجنبی عورت کو شہوت کے ساتھ چھو لیا تو اس کی امہات بھی مزنیہ کی امہات کی طرح حرام ہو جائیں گے۔

وَرَبَآئِبُكُمُ اور تمہاری پروردہ لڑکیاں۔ ربائب، ربيبة کی جمع ہے ربیب وہ بچہ جو پہلے شوہر کا ہو اور ماں کے ساتھ

marfat.com

چلا آئے (کڈھیلڑ۔ پر کتا) لفظ ربائب میں بعموم مجاز از روئے قیاس باجماع علماء بیویوں کی تمام پوتیاں اور نواسیاں خواہ قریبی ہوں یا دور کی داخل ہیں اور ان عورتوں کی نسل کو بھی یہ لفظ شامل ہے جن سے ملکیت یا شبہ ملکیت کی وجہ سے قربت کر لی ہو۔ بلکہ امام صاحبؒ کے نزدیک تو مزنیہ کی تمام نسوانی نسل کا یہی حکم ہے۔

الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ جو تمہاری گود میں (یعنی زیر پرورش) ہوں بالاجماع یہ شرط احترازی نہیں (کہ اگر ربائب زیر پرورش نہ ہوں تو حلال ہو جائیں) بلکہ عام طور پر چونکہ ایسا ہوتا ہی ہے کہ یتیم لڑکیاں سوتیلے باپوں کی پرورش میں آجاتی ہیں اس لئے اس قید کو ذکر کر دیا۔ داؤد کے نزدیک قید احترازی ہے یعنی جو ربائب زیر پرورش نہ ہوں وہ حلال ہیں عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت علیؓ کا قول بھی یہ بیان کیا ہے اگر روایتاً حضرت علیؓ کا یہ قول ثابت ہو جائے تو پھر مطلق ربائب کی حرمت پر اجماع صحابہؓ ثابت نہ ہوگا بلکہ اجماع سے قرن اول کے بعد کا اجماع مراد ہوگا۔

مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز ربائب ان عورتوں کی بیٹیاں ہوں جن سے تم نے قربت کر لی ہو۔ التی دخلتم بھن نساء کی صفت ہے اور باجماع علماء قید احترازی ہے (یعنی جن عورتوں سے قربت نہ کی ہو ان کی بیٹیاں حرام نہ ہوں گی) یہ دونوں نسائکم کی صفت نہ ہوگی کیونکہ دونوں کے عامل مختلف ہیں اور ایک معمول پر دو مختلف عاملوں کا عمل نہیں ہو سکتا صرف فراء کا ایک قول اس کا مجوز ہے۔

ترکیب عبارت :- من نسائکم کا تعلق فعل محذوف سے ہے اور فی حجور کم اسی سے متعلق ہے اس وقت اول الذکر التی کا یہ صلہ ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فی حجور کم کی ضمیر سے من نسائکم حال ہو لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کو ربائبکم سے حال قرار دیا جائے۔ اس صورت میں من نسائکم کا تعلق امہات سے نہ ہوگا کیونکہ ربائب سے تعلق ہونے کی بناء پر من نسائکم میں من ابتدائیہ ہوگا اور امہات سے تعلق کی بنا پر من بیانیہ ہوگا اور جمہور کے نزدیک ایک لفظ کا (ایک حالت میں) دو مختلف معانی پر حمل نہیں کیا جا سکتا ہاں امام شافعیؒ عموم مشترک کے جواز کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خرابی یہ ہوگی کہ جب من کو بیانیہ کہا جائے گا تو اس کا حال ہونا بھی صحیح ہوگا تو اس کا یہ معنی ہوا کہ من نسائکم جس طرح ربائبکم سے حال ہے اسی طرح نسائکم (جو امہات نسائکم میں مذکور ہے) سے بھی حال ہے اور یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں کہ ذوالحال دو ہوں اور دونوں کا حال ایک ہو ربائبکم تو مرفوع ہے اور نسائکم مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے ہاں اگر لفظ من اتصالیہ (یعنی محض ملابست اور مصاحبت کے لئے) ہو نہ ابتدائیہ ہو نہ بیانیہ تو دو معنی مختلف نہ ہوں گے اس وقت من محض مصاحبت کے لئے ہوگا اور امہات سے بھی حال ہوگا اور ربائب سے بھی کیونکہ دونوں مرفوع ہیں اور دونوں کا رفع ایک ہی جہت سے ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ توجیہ دور از کار ہے اس کے علاوہ حدیث مرفوع اور اجماع علماء کے خلاف ہے ترمذی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا ہو اس شخص کے لئے جائز نہیں کہ اس عورت کی ماں سے نکاح کرے خواہ جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ سند کے لحاظ سے یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ ابن لہیعہ اور مثنی بن صباح جو اس سند میں دو راوی ہیں دونوں کمزور ہیں۔

شیخ ابن حجرؒ نے لکھا کہ ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں نہایت قوی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیدے یا عورت مر جائے اور جماع کی نوبت نہ آئی ہو تب بھی اس عورت کی ماں سے اس شخص کو نکاح کرنا درست نہیں۔ طبرانی نے اس مسئلہ پر اجماع ہونا بیان کیا ہے۔ [1] لیکن حضرت زید بن ثابت کے قول کے متعلق روایات میں

---

[1] روایت میں آیا ہے کہ کسی شخص کو اپنی بیوی کی ماں پسند آگئی اور بیوی سے اس نے قربت نہیں کی تھی اس نے حضرت ابن مسعود سے مسئلہ پوچھا آپ نے حکم دیا کہ بیوی کو طلاق دے کر اس کی ماں سے نکاح کر سکتے ہو اس شخص نے ایسا کر لیا اور چند بچے بھی پیدا ہو گئے کچھ

بقیہ اگلے صفحہ پر

marfat.com

اختلاف ہے مسند ابن ابی شیبہؒ میں ہے کہ اگر جماع نہ کیا ہو اور طلاق دیدے تو حضرت زید کے نزدیک مطلقہ کی ماں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن جماع سے قبل عورت مر جائے تو اس کی ماں سے نکاح کرنے کو آپ مکروہ جانتے تھے۔ مالک نے یحییٰ بن سعید کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت زید سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی کی بیوی جماع سے پہلے ہی مر جائے تو کیا اس کی ماں سے اس کے لئے نکاح کرنا درست ہے فرمایا نہیں۔ ماں کا کوئی حال وضاحت سے نہیں بیان کیا گیا ہے (جماع کی) شرط ربائب کے متعلق ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں کی حرمت (جماع سے) مشروط ہے۔ مجاہدؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن ابی شیبہ وغیرہ نے حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ عبد الرزاق اور ابن ابی حاتم کی روایت میں حضرت ابن زبیر کا بھی یہی قول منقول ہے۔ اگر حضرت علیؓ اور مجاہد کا قول مذکور روایتاً صحیح ثابت ہو جائے تو طبرانی کے قول میں جو اجماع کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہو گی کہ صحابہؓ اور تابعین کے دور کے بعد علماء کا اجماع ہے کہ ساس سے بہر حال نکاح جائز نہیں خواہ بیوی سے جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

میں باء تعدیہ کے لئے ہے یعنی تم نے عورتوں کو پردہ کے اندر داخل کر لیا ہو یا مصاحبت کے لئے ہے یعنی تم ان کو لے کر پردہ کے اندر داخل ہو گئے ہو۔ پردہ میں داخل ہونے سے بطور کنایہ جماع مراد ہے جیسے عرب کا محاورہ ہے بنی علیہا و ضرب علیہا الحجاب اس عورت پر خیمہ نصب کر دیا اور پردہ لگا دیا یعنی جماع کیا۔ کسی عورت کو شہوت سے چھونا اور اندرونی شرم گاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھ لینا امام اعظمؒ کے نزدیک جماع کے حکم میں ہے۔

فَإِنْ لَّمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ پھر اگر تم ان کے پاس داخل نہ ہوئے ہو تو ربائب سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں (ممکن تھا کہ غیر مدخولہ کو مدخولہ پر قیاس کر کے غیر مدخولہ کی بیٹیوں سے بھی نکاح کو حرام سمجھ لیا جاتا اس) قیاس کو دفع کرنے کیلئے صراحتاً فرما دیا کہ غیر مدخولہ کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں اگرچہ بطور اشارہ گذشتہ آیت میں (التی دخلتم بھن) سے بھی یہ بات معلوم ہو گئی تھی (لیکن صراحت نہیں تھی اس جگہ صراحت ہے)

وَحَلَائِلُ اور حرام کی گئی ہیں بیویاں۔ حلائل جمع ہے حلیلہ کی حلیلہ کا معنی ہے بیوی، بیوی کو حلیلہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بیوی شوہر کے لئے حلال ہوتی ہے۔ (اس صورت میں فعیل بمعنی مفعول ہوگا) یا یہ وجہ کہ عورت شوہر کے بستر پر فروکش ہوتی ہے (اس صورت میں فعیل بمعنی فاعل ہوگا۔ اول معنی کے لحاظ سے حلیلہ کا مصدر حل ہوگا اور دوسرے معنی پر مصدر حلول ہوگا)۔

جن عورتوں سے بیٹوں نے بحق ملکیت یا بشبہ ملکیت جماع کر لیا ہو گا وہ بھی بیویوں کے حکم میں آجائیں گی یہ مسئلہ اجماعی ہے اور جن عورتوں سے بیٹوں نے زنا کیا ہو امام اعظمؒ کے نزدیک باپ کے لئے ان کی حرمت بھی منکوحہ کی طرح ہے۔

أَبْنَائِكُمُ تمہارے بیٹوں کی عموم مجاز۔ کے طور پر لفظ ابنا تمام فروع کو شامل ہے پوتے ہوں نواسے ہوں غرض نیچے تک بیٹوں اور بیٹیوں کے تمام بیٹوں کو شامل ہے۔

الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ جو تمہاری پشت سے (یعنی نسل سے) ہوں اس قیدلہ سے منہ بولا بیٹا خارج ہو گیا اہل عرب منہ بولے بیٹے کو بھی بیٹا کہتے تھے۔ ابن جریرؒ نے لکھا ہے کہ ابن جریج کہتے تھے میں نے عطاء سے آیت و حلائل ابنائکم الذین من اصلابکم کی تشریح دریافت کی عطاء نے جواب دیا ہم آپس میں کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب زید بن حارثہ کی بیوی سے نکاح کر لیا تو مشرک چہ میگوئیاں کرنے لگے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور آیت وما جعل ادعیاء

(بقیہ) مدت کے بعد حضرت ابن مسعودؓ مدینہ پہنچے تو حضرت عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا دوسری روایت میں آیا ہے کہ صحابہؓ سے دریافت کیا سب نے جواب دیا جائز نہیں، جب آپ کوفہ لوٹ کر آئے تو اس شخص سے فرمایا وہ عورت تیرے لئے حرام ہے حسب الحکم اس شخص نے عورت کو چھوڑ دیا، میں کہتا ہوں اس روایت میں ثابت ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع تھا، ۱۲۔

marfat.com

کم ابناء کم بھی نازل ہوئی اور آیت ماکان محمد ابا احد من رجالکم بھی نازل ہوئی۔ نسبی پوتا اور نواسا خواہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ اس آیت سے خارج نہیں ہوا کیونکہ یہ سب صلبی نسل سے ہوتے ہیں۔ رہا رضاعی بیٹا اور اس کی فروع تو اس قید (من اصلابکم) سے وہ ضرور خارج ہو گئے مگر ان کی بیویوں کی حرمت حدیث یحرم من الرضاع مایحرم من النسب سے ثابت ہے اور اس پر اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اور حرام ہے دو بہنوں کو جمع کرنا یعنی نکاح میں جمع کرنا اور ملکیت کی وجہ سے دونوں سے جماع کرنا لیکن دو نسبی بہنیں ہوں (۱) دو رضاعی بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت حدیث کی وجہ سے نسبی بہنوں کو جمع کرنے کی حرمت کی طرح ہے دونوں بہنیں نسبی حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی یا رضاعی حقیقی یا رضاعی اخیافی۔ لیکن اگر ایک بہن سے زنا کیا ہو تو دوسری سے نکاح کرنا حرام نہیں جیسے ایک بہن کے مرنے کے بعد یا طلاق دیدینے اور عدت گزر جانے کے بعد دوسری بہن سے نکاح حرام نہیں۔

حدیث اور اجماع کی وجہ سے مندرجہ ذیل دو عورتوں کو بھی نکاح میں جمع کرنا درست نہیں۔ پھوپھی، بھتیجی، خالہ، بھانجی کوئی عورت اور اس کے باپ یا ماں کی پھوپھی یا دونوں میں سے کسی کی خالہ یا دادا نانا اور دادی نانی کی پھوپھی خواہ کتنے ہی اوپر کی ہو اور باپ کی طرف سے ہو یا ماں کی طرف سے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کو اس کی پھوپھی کے ساتھ جمع نہ کیا جائے نہ عورت کو اس کی خالہ کے ساتھ جمع کیا جائے۔ (متفق علیہ) ابو داؤد ترمذی اور دارمی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے پھوپھی پر بھتیجی سے نکاح نہ کیا جائے اور نہ بھتیجی پر اس کی پھوپھی سے اور نہ خالہ پر اس کی بھانجی سے اور نہ بھانجی پر اس کی خالہ سے نہ چھوٹی پر بڑی سے نہ بڑی پر چھوٹی سے۔ نسائی کی روایت میں آخری جملہ نہیں ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ بخاریؒ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اور ابن عبدالبر نے مختلف سندوں سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اس کو نقل کیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے احمد اور ابو داؤد اور ترمذی اور ابن حبانؒ نے اور حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے ضعیف سند کے ساتھ ابن ماجہ نے اور حضرت علیؓ کی روایت سے بزاز نے اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ابن حبان نے یہ حدیث بیان کی ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی بی بی زینبؓ اور حضرت ابو امامہؓ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت سمرہؓ بن جندب بھی اس حدیث کے ناقل ہیں۔ ابن عدی نے اور صحیح میں ابن حبان نے عکرمہ کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ پوری حدیث بیان کی ہے جس کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو ان عورتوں کے آپس کی قرابتیں منقطع کر دو گے۔

ابو داؤد نے مراسیل میں عیسیٰ بن طلحہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی عورت سے اس کی قرابتدار (یعنی اصل یا نسل) پر نکاح کرنے سے اس اندیشہ کے تحت ممانعت فرمائی ہے کہ اس سے قرابت کٹ جائے گی۔ ابن حبان نے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ تم اگر ایسا کرو گی تو ان کی قرابتیں کاٹ دو گی۔

دو رضاعی بہنوں کو (نکاح وغیرہ میں) جمع کرنے کی ممانعت پر اجماع سلف ہوتا بتا رہا ہے کہ جس طرح قرابت نسبی منقطع کرنا حرام ہے اسی طرح رشتہ رضاعت کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ اکرام مرضعہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی حدیث منقول ہے کہ حضرت ابو طفیلؓ غنوی نے کہا میں حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت سامنے سے آئی حضور ﷺ نے اس کے لئے چادر مبارک بچھادی اور وہ بیٹھ گئی جب وہ چلی گئی تو بتایا گیا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ رواہ ابو داؤد۔

خلاصہ بیان یہ ہے کہ نسب و رضاعت دونوں سلسلوں میں عورت کے لئے شوہر کے اصول و فروع سے مطلقاً نکاح حرام ہے اور شوہر کے لئے عورت کے اصول سے تو مطلقاً نکاح ناجائز ہے اور عورت کی فروع سے اس وقت ناجائز ہے جب عورت سے قربت کر لی ہو اور زوج و زوجہ کے اقارب میں سے سوائے نسبی ستونوں کے اور کسی سے نکاح ناجائز نہیں ہاں قطع رحم اور رشتہ رضاعت منقطع ہونے کے اندیشہ سے ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا ناجائز ہے جن میں سے ایک دوسری کی اصل قریب کی

marfat.com

فرع ہو۔ واللہ اعلم۔ ۱

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ط مگر جو گزر گیا یعنی ممنوعہ عورتوں سے نکاح پر عذاب ہوگا مگر ممانعت کے حکم سے پہلے جو ہو چکا اس پر عذاب نہ ہوگا یا یہ مطلب کہ جو پہلے گزر چکا اس پر اللہ مؤاخذہ نہیں کرے گا معاف فرمادے گا اول صورت میں مستثنیٰ منہ وہ معنی ہوگا جو نہی کے لئے لازم ہے اور دوسری صورت میں استثناء منقطع ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾ بلا شبہ اللہ غفور رحیم ہے معاف کردے گا اور رحم فرمائے گا۔ قانون خداوندی کو نہ جاننے کا عذر مقبول ہو جائے گا۔ اللہ نے خود فرمادیا ہے وما کان اللہ لیضل قوما بعد اذھداھم حتی یبین لھم ما یتقون دوسری آیت میں آیا ہے وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔

چوتھا پارہ ختم

---

۱ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ اگر دو باندیاں آپس میں بہنیں ہوں اور ایک کے بعد دوسری سے جماع کیا جائے تو کیا جائز ہے؟ آپ نے اس کی ممانعت فرمادی اور فرمایا دونوں کو جمع کرنے کی اجازت دینا میں پسند نہیں کرتا۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے بروایت قبیصہ بن ذویب بیان کیا کہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ سے دو بہنوں کو ملکیت میں جمع کرنے (اور دونوں سے جماع کرنے) کا مسئلہ پوچھا فرمایا ایک آیت نے تو دونوں کو حلال کہا ہے اور دوسری آیت نے حرام کہا ہے اور میں تو ایسا نہیں کر سکتا، سائل نے حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ایک اور صحابی سے دریافت کیا میرے خیال میں وہ حضرت علی بن ابی طالبؓ تھے انہوں نے فرمایا اگر میرا کچھ اختیار ہوتا اور پھر میں کسی کو ایسا کرتے پاتا تو اس کو عبرتناک سزا دیتا، لیکن ابو صالح کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے دو مملوک بہنوں کے مسئلہ میں فرمایا ایک آیت نے دونوں کو حلال قرار دیا ہے اور دوسری آیت نے حرام، نہ حکم ہے نہ ممانعت۔ میں نہ حلال کہتا ہوں نہ حرام اور خود نہ میں کرتا ہوں نہ میرے اہل خانہ۔ رواہ ابن ابی شیبۃ والبیہقی، ابن منذر اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو حرمت آزاد عورتوں کی ہے وہی حکم باندیوں کی حرمت کا ہے سوائے تعداد کے (کہ باندیاں رکھنے کی کوئی تعداد مقرر نہیں اور نکاح میں چار عورتوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا) یہی قول عبدالرزاق نے حضرت عمارؓ بن یاسر کا بھی نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کا یہ قول کہ ایک آیت نے دونوں کو حلال کہا ہے اور دوسری آیت نے حرام اس سے مراد شک کا اظہار نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جب محرم اور محلل دونوں موجود ہیں تو محرم کو محلل پر ترجیح ہے ابن عبدالبر نے استذکار میں لکھا ہے کہ ایاسؓ بن عامر نے آپ سے پوچھا کہ دو بہنیں باندیاں ہیں میں نے ان کو غنیمت میں حاصل کیا ہے اور ایک کے بطن سے میری اولاد بھی ہوئی ہے اس میں دوسری سے رغبت کرنا چاہتا ہوں کیا کروں فرمایا جس سے تم جماع کرتے تھے پہلے اس کو آزاد کردو پھر دوسری سے قربت کرنا، پھر فرمایا مملوک باندیوں کی حرمت کا بھی وہی حکم ہے جو آزاد عورتوں کے متعلق قرآن میں حکم حرمت آیا ہے سوائے تعداد کے یا فرمایا سوائے چار کے اور سلسلہ رضاعت کی حرمت کا بھی یہی حکم ہے جو کتاب اللہ میں نسبی حرمت کا ہے۔ (از مولف قدس سرہ)

marfat.com

دارالاشاعت کی مطبوعہ فقہی کتب ایک نظر میں

خواتین کے مسائل اور انکا حل ۲ جلد ـــــ جمع و ترتیب مفتی ثناء اللہ محمود فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

فتاویٰ رشیدیہ مبوّب ـــــ حضرت مفتی رشید احمد گنگوہیؒ

کتاب الکفالۃ والنفقات ـــــ مولانا عمران الحق کلیانوی

تسہیل الضروری لمسائل القدوری ـــــ مولانا محمد عاشق الٰہی البرنیؒ

بہشتی زیور مُدلل مُکمل ـــــ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رح

فتاویٰ رحیمیہ اردو ۱۰ حصے ـــــ مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری

فتاویٰ رحیمیہ انگریزی ۳ حصے ـــــ ״ ״ ״ ״

فتاویٰ عالمگیری اردو ۱۰ جلد مع پیش لفظ مولانا محمد تقی عثمانی ـــــ اورنگ زیب عالمگیر

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۲ حصے ۱۰ جلد ـــــ مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۲ جلد کامل ـــــ مولانا مفتی محمد شفیع رح

اسلام کا نظامِ اراضی ـــــ ״ ״ ״

مسائلِ معارف القرآن (تفسیر معارف القرآن میں ذکر قرآنی احکام) ״ ״ ״

انسانی اعضاء کی پیوندکاری ـــــ ״ ״ ״

پراویڈنٹ فنڈ ـــــ ״ ״ ״

خواتین کے لیے شرعی احکام ـــــ اہلیہ ظریف احمد تھانوی رح

بیمہ زندگی ـــــ مولانا مفتی محمد شفیع رح

رفیق سفر سفر کے آداب و احکام ״ ״ ״ ״

اسلامی قانون نکاح، طلاق، وراثت ـــــ فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

علم الفقہ ـــــ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رح

نماز کے آداب و احکام ـــــ انشاء اللہ خان مرحوم

قانونِ وراثت ـــــ مولانا مفتی رشید احمد صاحب

داڑھی کی شرعی حیثیت ـــــ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

الصبح النوری شرح قدوری اعلیٰ ـــــ مولانا محمد حنیف گنگوہی

دین کی باتیں یعنی مسائل بہشتی زیور ـــــ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رح

ہمارے عائلی مسائل ـــــ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

تاریخ فقہ اسلامی ـــــ شیخ محمد خضری

معدن الحقائق شرح کنز الدقائق ـــــ مولانا محمد حنیف گنگوہی

احکام اسلام عقل کی نظر میں ـــــ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رح

حیلۂ ناجزہ یعنی عورتوں کا حق تنسیخ نکاح ״ ״ ״ ״

دارالاشاعت — اردو بازار ۵ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱، پاکستان ۰۲۱-۲۶۳۱۸۶۱ — مستند اسلامی و علمی کتب کا مرکز

marfat.com

کتب ادعیہ عملیات وتعویذات، طب ومعالجات

آئینۂ عملیات	مجرب عملیات وتعویذات	صوفی عزیز الرحمٰن
اصلی جواہر خمسہ	عملیات کی مشہور کتاب	شاہ محمد غوث گوالیاریؒ مجلد
اصلی بیاض محمدی	مجرب عملیات وتعویذات	شیخ محمد تھانویؒ
اعمال قرآنی	قرآنی وظائف وعملیات	مولانا اشرف علی تھانویؒ
مکتوبات وبیاض یعقوبی	علمائے دیوبند کے مجرب عملیات وطبی نسخے	مولانا محمد یعقوبؒ
بیماریوں کا گھریلو علاج	ہر وقت پیش آنے والے گھریلو نسخے	
جنات کے پراسرار حالات	ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر	شبیر حسین چشتی
حصن حصین	عربی دعائیں مع ترجمہ اور شرح اردو	امام ابن جزائیؒ
خواص حسبنا اللہ ونعم الوکیل	اردو	شیخ ابو الحسن شاذلیؒ
ذکر اللہ اور فضائل درود شریف		مولانا مفتی محمد شفیع
زاد السعید	فضائل درود شریف	مولانا اشرف علی تھانویؒ
شمس المعارف الکبریٰ	تعویذات وعملیات کی مستند کتاب	علامہ بونیؒ
طب جسمانی وروحانی	ایک مستند کتاب	امام غزالیؒ
طب روحانی مع خواص القرآن	قرآنی عملیات	مولانا محمد ابراہیم دہلوی
طب نبوی کلاں اردو		امام ابن القیم الجوزیہ مجلد
طب نبوی خورد	آنحضرت کے فرمودہ علاج ونسخے	حافظ اکرام الدین
علاج الغرباء	طب یونانی کی مقبول کتاب جس میں مستند نسخے درج ہیں	
کمالات عزیزی	حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے مجرب عملیات	
میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات		مولانا مفتی محمد شفیعؒ
مناجات مقبول مترجم	دعاؤں کا مستند ومقبول مجموعہ	مولانا اشرف علی تھانویؒ
مناجات مقبول	صرف عربی بہت چھوٹا جیبی سائز	مولانا اشرف علی تھانویؒ
مناجات مقبول	کا نظم میں مکمل اردو ترجمہ	مولانا اشرف علی تھانویؒ
نقش سلیمانی	عملیات ونقوش وتعویذات کی مشہور کتاب	خواجہ اشرف لکھنوی
مشکل کشا	تمام دینی ودنیوی مقاصد کے لئے مجرب دعائیں۔	مولانا احمد سعید دہلویؒ
مصیبت کے بعد راحت مع رسالہ دافع الافلاس		مولانا مفتی محمد شفیعؒ
نافع الخلائق	عملیات وتعویذات کی مشہور کتاب	حاجی محمد زردار خاں
مجموعہ وظائف کلاں	مستند ترین نسخہ	

ناشر:- دار الاشاعت اردو بازار کراچی فون ۲۶۳۱۸۶۱-۲۷۶۸-۲۲۱۳-۰۲۱

marfat.com